تفسیر ابن کثیر

رئیس المفسرین

حافظ عماد الدین ابو الفداء ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ

مترجمہ

خطیب الہند مولانا محمد جونا گڑھی رحمۃ اللہ علیہ

جلد اوّل

تسہیل وتخریج وعنوانات
مولانا ابو عُبیدُ اللہ صاحب

حواشی
مولانا سید انظر شاہ صاحب کشمیری

اسلامی کتب خانہ
فضل الٰہی مارکیٹ ۔ چوک اردو بازار ۔ لاہور
Ph:7223506-7230718

تفسیر ابن کثیر

رئیس المفسرین

حافظ عماد الدین ابو الفدا ابن کثیرؒ

مترجم

خطیب الہند مولانا محمد جونا گڑھی

جلد اوّل

تسہیل وتخریج و عنوانات — مولانا ابو عبیداللہ صاحب

حواشی — مولانا سید انظر شاہ صاحب کشمیری

اسلامی کتب خانہ
فضل الٰہی مارکیٹ، اردو بازار، لاہور
اسلامی کتب خانہ
Islami Kutab Khana

خوبصورت اور معیاری مطبوعات

کتاب : تفسیر ابن کثیر
مترجم : مولانا ابو محمد جونا گڑھی
حواشی : مولانا سید انظر شاہ کشمیری خلف الرشید علامہ سید انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ
تسہیل : مولانا ایوب صاحب' لاہور
متن قرآن : مولانا رحیم بخش صاحب ملتان' مولانا عزیز الرحمٰن صاحب کراچی
تخریج : مولانا ابو عبید اللہ صاحب' حفظہ اللہ
طابع : اسلامی کتب خانہ' فضل الٰہی مارکیٹ' چوک اردو بازار لاہور ۷۲۲۳۵۰۶ ۷۲۳۰۷۱۸

اس تفسیر میں قرآن کریم کے متن کا اردو ترجمہ
حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا درج کیا گیا ہے

استدعا

اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے انسانی طاقت اور بساط کے مطابق کتابت' طباعت' تصحیح اور جلد سازی میں پوری پوری احتیاط کی گئی ہے۔

بشری تقاضے سے اگر کوئی غلطی نظر آئے یا صفحات درست نہ ہوں تو از راہ کرم مطلع فرما دیں۔ ان شاء اللہ ازالہ کیا جائے گا۔ نشاندہی کے لئے ہم بے حد شکر گزار ہوں گے۔

(ادارہ)

عَرضِ ناشر

الحمد للّٰہ الذی ارسل رسولہ الکریم لیھدینا الی الصراط المستقیم

وصلی اللّٰہ تعالٰی علیہ وعلی الہ واصحٰبہ اجمعین

اللہ عزوجل نے اپنے انبیاء ورُسل علیہم السلام کے ذریعے سے دُنیا کو اپنا پیغام ہدایت پہنچایا

﴿اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَۃِ وَالْمَوْعِظَۃِ الْحَسَنَۃِ ...﴾ [النحل: ۱۲۵]

''اپنے رب کے راستے کی طرف حکمت اور اچھی نصیحت کے ساتھ بلایئے۔''

اور پیغام کے پہنچاتے ہی یہ نوید بھی سنا دی کہ جو ان اچھی باتوں پر عمل پیرا ہوگا اور دین کی باتوں کی تبلیغ واشاعت میں تن' من' دھن قربان کرنے کے لئے تیار ہوگا وہ یہ خوشخبری سن لے کہ اُس کے لئے اَبدی نعمتیں تیار کی گئی ہیں جنہیں ایسا دوام حاصل ہے کہ اُس کا مقابلہ دُنیا کی بڑی سے بڑی نعمت سے کرنا تو کجا تشبیہ دینا بھی محال ہے۔

لیکن ساتھ یہ تنبیہ بھی کر دی:

﴿اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰہَ مِنْ عِبَادِہِ الْعُلَمٰٓؤُا﴾ [فاطر: ۲۸]

''اللہ سے صرف اُس کے بندوں میں سے علماء ہی ڈرتے ہیں۔''

لوگوں کو خوشخبری سنانے اور ڈرانے کے لئے اللہ عزوجل نے انبیاء علیہم السلام کو مبعوث فرمایا اور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اب اس کام کی ذمہ داری علماء کرام پر آ پڑی۔

اللہ کا پیغام پہنچانا کتنی بڑی ذمہ داری ہے کہ اللہ خود محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مخاطب ہو کر فرماتا ہے:

﴿یٰٓاَیُّھَا الْمُدَّثِّرُ ① قُمْ فَاَنْذِرْ ②﴾ [المدثر: ۱، ۲]

''اے چادر اوڑھنے والے، اُٹھ اور لوگوں کو ڈرا۔''

اب آپ خود ہی غور کیجئے جس کام کی تلقین سردارِ انبیاء محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو فرمائی جا رہی ہے اگر وہی والی ذمہ داری اُمت میں سے کچھ سر کردہ افراد کے سر آ پڑے تو اُن کی ''فکر'' کا کیا عالم ہوگا اور قربان جایئے علماء کرام کی سعی بلیغ پر بھی کہ انہوں نے بھی اس کو کمال حسن خوبی کے ساتھ انجام دیا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمودات کو اتنے احسن طریقے سے ہم تک پہنچایا کہ سبحان اللہ!

علمائے کرام نے قرآن کی خدمت میں اپنی زندگیاں وقف کر ڈالیں۔ انہیں ائمہ میں سے ایک نام امام ابن کثیر کا بھی ہے اور ان کی تفسیر کو اردو کے قالب میں ڈھالنے کا سہرا جناب مولانا جونا گڑھی صاحب کو جاتا ہے اور آج آپ کے سامنے بھی یہی ترجمہ بمعہ حواشی (احناف) وتسویب پیش کرنے کی ادارہ سعادت حاصل کر رہا ہے۔

اس کام جدید ترتیب وتسویب کو کرنے کے لئے بھی ایک ایسے عالم کی ضرورت تھی جو نہ صرف عربی زبان پہ عبور رکھتا ہو بلکہ وہ

صاحب زبان بھی ہو اور اس کا ادب سے بھی لگاؤ ہوتا کہ زبان کو سلیس کرنے میں سہولت رہے۔

ادارہ نے اس کام پہ جس قدر وقت اور سرمایہ صرف کیا اُس سے کوئی دُنیاوی لالچ ہرگز مقصود نہیں بلکہ محض مقصد یہ ہے کہ اللہ عزوجل اس کتاب کو شائع کرنے کا حق ادا کرنے کی توفیق عطا فرما دے اور آج اسے شائع کرتے وقت دِل بے حد سکون محسوس کر رہا ہے کہ اپنے تئیں تو ہم نے کوشش کر ڈالی' آگے اُجر تو محض ربّ کی ذات سے وابستہ کر رکھا ہے۔

اِس کام پہ جتنی محنت اور زرِ کثیر صرف ہوا' اُس کی تفصیل لا حاصل ہے لیکن قارئین کرام اِس کے باوجود اگر ہماری کسی لغزش سے آپ مطلع ہوں تو ہمیں اُس سے ضرور آگاہ فرمائیں۔ ادارہ اگلی اشاعت میں اُس کا ازالہ کرنے کی ہر ممکن کوشش کرے گا۔

اللہ عزوجل سے دعا ہے کہ وہ ہمیں پاکیزہ اعمال اور برکاتِ عظیمہ سے نوازے۔

ممتاز احمد

فروری ۲۰۰۵ء

اعتزار

آ ج بحمد اللہ تفسیر ابن کثیر کا یہ ایڈیشن آپ قارئین کرام کے ہاتھوں میں ہے بندہ نے اس پر کام کرنے کو اپنی سعادت سمجھ کر حصہ لیا اور اللہ عزوجل کا صد ہا شکر و احسان کہ اپنے حد تک تو اس کو خوبی سے نبھانے کی سعی کی۔

مولانا جونا گڑھی صاحب کا ترجمہ تو پہلے بھی بازار میں دستیاب ہے لیکن بندہ نے جن چیزوں پہ سب زیادہ توجہ دی اُن میں:

① ترجمہ میں جہاں کہیں عربی عبارت کا ترجمہ ہونے سے رہ گیا تھا اُسے حتی الامکان (اگر وہ اصل عربی میں بھی حذف ہو تو علیحدہ بات ہے) کوشش کی۔

② حواشی جو کہ مولانا سیّد انظر شاہ کاشمیری صاحب کے لکھے ہوئے ہیں وہ اتنے مکمل ہین کہ اُس کا تو قارئین کو مطالعہ کر کے ہی اندازہ ہوگا کہ انہوں نے کس احسن طریقے سے احناف کے نقطہ نظر کو واضح کر ڈالا ہے لیکن اس کا باوجود بندہ کو بھی جہاں ضرورت محسوس ہوئی وہاں احناف کا نقطہ نظر واضح کرنے کی اپنے حد تک کوشش کی۔

③ تخریج' اس تفسیر میں سب سے زیادہ وقت تخریج پہ صرف ہوا لیکن اس کے باوجود ہمیں معلوم ہے کہ اس کا حق ادا نہیں ہوا قارئین کرام اگر قرآنی آیات کی تخریج میں کوئی سقم دیکھیں تو اس سے بندہ کو ضرور آگاہ کریں۔ اللہ عزوجل غلطیوں پہ معاف فرمانے والا ہے۔

④ کچھ ایسے الفاظ جو کہ اب مستعمل نہیں یا مرورِ زمانہ کی وجہ سے متروک ہو چکے ہیں اُن کو تبدیل کر کے عام معاف الفاظ میں تحریر کیا تا کہ قاری اجنبیت محسوس نہ کرے۔

ان سب باتوں کے باوجود مجھے اپنی تہی دامنی کا کما حقہ احساس ہے اس لئے علماء کرام کی حوصلہ افزائی اور آگاہی اگلے کاموں کا پیش خیمہ ثابت ہوگی۔ اس لئے خامیوں' کوتاہیوں سے ضرور بندہ کو آگاہ کیا جائے باقی جو بھی کام بحسن وخوبی انجام پایا اُس میں بندہ کا کوئی کمال نہیں بلکہ اساتذہ کرام کی دعاؤں اور محنتوں کا ثمر ہے اور انہی کی طرف اس کام کو منسوب کرتا ہوں۔

حافظ ابو عبید اللہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فہرست

''اللہ عزوجل کا بے حد شکر و احسان ہے کہ اُس نے ہمیں اِس عظیم کتاب کے شائع کرنے کی سعادت بخشی۔ ہم نے اپنے تئیں اِسے بہترین معیار پہ شائع کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ کسی کتاب کی تخریج و تحقیق اور حاشیہ بندی پہ جتنا زرِ کثیر صرف ہوتا ہے وہ تو ایک طرف اس کے علاوہ وقت بھی بے حد صرف ہوتا ہے۔ ہم نے اپنے طور پر پوری سعی کی کہ کتاب میں ایک زیر، زبر کی بھی غلطی نہ رہ جائے لیکن یہ انسانی کاوش سے ماوراء ہے۔ برائے مہربانی اگر کوئی غلطی دیکھیں تو ادارہ ''اسلامی کتب خانہ'' کو اطلاع دیں تا کہ اگلے ایڈیشن میں اُس کی اصلاح کی جاسکے۔ شکریہ

پیش لفظ

علامہ ابو الفداء عماد الدین اسمٰعیل بن عمر الخطیب ابن کثیر القرشی رحمۃ اللہ علیہ جو حافظ ابن کثیر کے نام سے مشہور ہیں' آٹھویں صدی ہجری کے جلیل القدر مصنفین میں سے ہیں۔ ان کی تفسیر قرآن کریم کی مقبولیت میں آج بھی نہ صرف کمی نہیں آئی بلکہ اضافہ ہی ہوتا جا رہا ہے۔ آپ خود شافعی مسلک تھے لیکن مشہور حنبلی عالم' امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کی شاگردی کے باعث وسعتِ مشرب رکھتے تھے۔ حنفی مسلک پر اگرچہ وہ اپنی تفسیر میں بعض جگہ اعتراضات سے احتراز نہیں کر سکے' تاہم دورِ حاضر کے مشہور حنفی علمائے دین نے ان کی اس تصنیف کو تفسیری ادب میں سرفہرست رکھا ہے۔ ان علمائے کرام میں حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ یعنی استاذ الاساتذہ حضرت علامہ سید انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ بھی شامل ہیں' جن کے فاضل صاحبزادہ مولانا انظر شاہ کشمیری نے تفسیر ابن کثیر کے اس جدید ترجمے میں مدلل حواشی کے ساتھ ان اعتراضات کا شافی جواب دے دیا ہے۔ اس طرح یہ نیا اردو ایڈیشن ہر مسلک و مکتب کے لیے انتہائی مفید و مستند بن گیا ہے۔

حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ ۷۰۱ھ (بمطابق ۱۳۰۱ء) میں دمشق میں پیدا ہوئے اور چونسٹھ برس کی عمر میں ۷۷۴ھ (بمطابق ۱۳۷۳ء) میں خالق حقیقی سے جا ملے۔ امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کے شاگردوں میں ان کا مقام امام ابن قیم الجوزیہ رحمۃ اللہ علیہ کے بعد سب سے زیادہ بلند ہے۔ آپ نے عظیم استاد کی زندگی میں محدث کی حیثیت سے شہرت پائی اور انہی کے ساتھ قید و بند کی کڑیاں بھی جھیلیں۔ حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے متعدد کتابیں تصنیف کیں' جن میں سب سے زیادہ شہرت ان کی تاریخ عالم البدایہ والنہایہ کے علاوہ اس تفسیر کو ہوئی۔ ان دونوں کتابوں میں انہوں نے تیسری صدی ہجری کے عظیم مؤرخ و مفسر ابن جریر الطبری رحمۃ اللہ علیہ کی ضخیم تاریخ و تفسیر سے بھرپور استفادہ کیا ہے۔ تفسیر کے بارے میں تو شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ:

"اگر کوئی کتاب کسی دوسری کتاب سے بے نیاز کر سکتی ہے تو وہ تفسیر ابن کثیر ہے' جو تفسیر ابن جریر سے بے نیاز کر دیتی ہے۔"

نیز ابن کثیر' رازی' ابو السعود اور آلوسی (صاحب روح المعانی) رحمہم اللہ کی تفاسیر کے باب میں علامہ بنوری رحمۃ اللہ علیہ کا کہنا ہے کہ علمِ دین کے طلبہ قرآن کریم کے سمجھنے کے لیے ان چار کتابوں پر قناعت کرنا چاہیں تو وہ ان کے لئے ان شاء اللہ کافی ہوں گی' اس مشورے میں بھی تفسیر ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ کو اولیت حاصل ہے۔

اس تصنیف میں حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے عظیم پیشرو ابن جریر الطبری کا تتبع کرتے ہوئے تفسیر بالروایۃ کا

طریق اختیار کیا ہے اور انہی کے مواد سے استفادہ کیا ہے لیکن اجمال و اختصار کے ساتھ روایات کا محاکمہ ان کی کتاب کا طرّہ امتیاز ہے۔ وہ آیاتِ قرآنی کے بہت مربوط مجموعوں کو یکے بعد دیگرے لے کر اوّل تو ان کا خلاصہ بیان کرتے ہیں' پھر اُن کے مختلف حصوں سے متعلق احادیث و آثار اور قرنِ اوّل کے مفسرین کی روایات درج کرتے ہیں اور آخر میں ان پر ضروری جرح و تنقید بھی کرتے ہیں تاکہ ان کی ممکنہ کمزوریوں کی نشاندہی ہو جائے۔ اس طریق تفسیر نے ان کی تصنیف کو متقدمین کی لکھی ہوئی تفاسیر میں سب سے زیادہ مفید بنا دیا ہے۔

یہ بات البتہ ملحوظ رہے کہ قرنِ اوّل کے جن مفسرین پر انہوں نے تفسیر روایات کے سلسلے میں اعتماد کیا ہے' اُن میں ایسے ضعفاء بھی شامل ہیں' جن کی راست بازی معرضِ شک میں رہی ہے۔ مولانا تقی عثمانی (جج سپریم کورٹ پاکستان) نے اس ضمن میں جن چند افراد کا اپنی کتاب ''علوم القرآن'' میں ذکر کیا ہے۔ خود انہی کے بارے میں وہ دوسری جگہ تنقید کرتے ہیں۔ یہ نام محمد بن السائب الکلبی' عطیہ العوفی اور مقاتل کے ہیں۔ ان کے علاوہ اسمٰعیل السدی سے بھی ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے بڑی روایات لی ہیں۔ یہ سُدی کبیر کہلاتے ہیں اور علمائے دین کے نزدیک مختلف فیہ ہیں۔ کوئی انہیں معتبر جانتا ہے اور کوئی برعکس۔ مزید برآں ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ اسرائیلیات سے بھی ایک حد تک متاثر تھے۔ اِن کمزوریوں کی بناء پر یہ خیال درست نہیں کہ اس تفسیر کی ہر روایت جرح و تنقید سے بالا و شک و شبہ سے ماوراء ہے۔ یہ ضرور ہے کہ تفسیر ابن کثیر روایت کی رُو سے بڑی جامع ہے اور اس اعتبار سے تفسیرِ قرآن کے طلبہ کے لیے بالخصوص اور ائمہ کرام و علمائے عظام کے لیے بالعموم بے نظیر خزانہ ہے۔

ادارہ اس اہم تفسیر کے نظر ثانی شدہ مکمل ترجمہ کا نیا ایڈیشن مع اہم اضافات و حواشی شائع کرنے کا شرف حاصل کر رہا ہے۔

امام حافظ عماد الدین ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ

نام و نسب ☆

اسمٰعیل نام ابوالفداء کنیت' عماد الدین لقب اور ابن کثیر عرف ہے۔

امام ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ کا سلسلہ نسب اس طرح بیان کیا جاتا ہے:

اسمٰعیل بن عمر بن کثیر بن ضوء بن ذرع القیسی البصروی ثم الدمشقی۔

پیدائش ☆

ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ کی پیدائش ۷۰۱ھ (بمطابق ۱۳۰۱ء) کو دمشق میں مجدل کے علاقہ میں ہوئی۔ تاریخ پیدائش کی بابت اگرچہ کچھ اختلافات پائے جاتے ہیں مگر ہمارے نزدیک جو معتبر روایت ہے وہی درج کی گئی ہے۔

تعلیم و تربیت ☆

ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ کے والد ماجد اپنے علاقے کی مسجد میں خطیب کے عہدہ پر فائز تھے اور گھر میں ابتداء ہی سے دینی ماحول کا رنگ نمایاں میسر آیا لیکن ابھی ابن کثیر بمشکل پانچ برس کے بھی نہ ہوئے تھے کہ والد ماجد کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ والد ماجد کی وفات کے بعد آپ کے بڑے بھائی نے آپ کی تربیت اور ذمہ داریوں کا بیڑا اپنے سر اٹھا لیا اور اس کام کو بڑی خوش اسلوبی سے سرانجام دیا۔

ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے ابتدائی فقہ کی تعلیم (جس کا اس زمانے میں عام رواج تھا) اپنے بڑے بھائی ہی سے حاصل کی۔ اس کے کچھ عرصہ بعد شیخ برہان الدین ابراہیم بن عبدالرحمٰن فزاری معروف با بن فرکاح اور شیخ کمال الدین ابن قاضی شہبہ سے اس فن کی تکمیل کی۔ اس زمانے کا عام چلن یہ تھا کہ طالب جس فن کو حاصل کرنے کی کوشش کرتا (بطور سعادت) اُس فن کی کوئی مختصر کتاب حافظ کر لیا کرتا (یا د اسی وجہ سے اُس زمانے کے لوگوں کے حافظے مضبوط تھے) امام ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے بھی فقہ میں "التنبیہ فی فروع الشافعیہ" مصنفہ شیخ ابو اسحٰق شیرازی المتوفی ۴۷۶ھ کو حفظ کر کے اپنے استادِ محترم کو مکمل طور پر سنائی۔

اساتذہ کرام ☆

ہم یہاں صرف اُن چیدہ چیدہ علماء کرام کا تذکرہ کریں گے جن کا ذکر علماء کرام نے تسلسل سے کیا ہے۔ اُن کے اسماء گرامی یوں ہیں:

- عیسیٰ بن المطعم
- بہاؤ الدین قاسم بن عساکر
- عفیف الدین اسحٰق بن یحییٰ الآمدی
- محمد بن زرارہ
- بدر الدین محمد بن ابراہیم معروف با بن سویدی
- ابن الرضی
- حافظ مزی
- شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ
- حافظ ذہبی
- عماد الدین محمد بن الشیرازی

درس وافتاء☆

آپ رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تمام عمر ہی درس وافتاء اور تصنیف و تالیف میں گزاری دی۔ امام ذہبی کی وفات کے بعد مدرسہ امّ صالح اور مدرسہ تنکزیہ میں آپ شیخ الحدیث کے عہدہ پر فائز رہے۔

تصانیف☆

- تفسیر القرآن العظیم
- البدایہ والنھایہ
- التکمیل فی معرفۃ الثقات والضعفاء والمجاھیل
- الھدیٰ والسنن فی احادیث المسانید والسنن
- طبقات الشافعیہ
- مناقب الشافعی
- تخریج احادیث ادلۃ التنبیہ
- تخریج احادیث مختصر ابن الحاجب' وغیرہ

وفات حسرت آیات☆

امام ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ کی اپنی زندگی کے آخری ایام میں بینائی بے حد کمزور ہوگئی تھی بلکہ بڑی حد تک دیکھنے سے بھی قاصر ہو چکے تھے۔ آپ رحمۃ اللہ علیہ ۷۷۴ھ (بمطابق ۱۳۷۳ء) کو اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ آپ کو مقبرہ صوفیہ میں اپنے محبوب استاد علامہ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کے پہلو میں دفن کیا گیا۔ جن سے آپ رحمۃ اللہ علیہ کو تمام عمر خصوصی لگاؤ رہا۔

مُقَدَّمَه

اے ہمارے ربّ! تیرے لیے ہیں سب تعریفیں آسمان وزمین بھر جانے کے برابر☆

تمام تعریفیں اُس اللہ کے لیے ہیں جس نے اپنی کتاب کو اَلْحَمْدُ کے ساتھ شروع کیا اور فرمایا: ﴿ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ﴾ (فاتحہ: ۱ تا ۳) دوسری جگہ فرمایا: ﴿ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلٰى عَبْدِهِ الْكِتٰبَ...... ﴾ (الکہف: ۱) یعنی ہر قسم کی تعریف کا مستحق اللہ تعالیٰ ہی ہے جس نے اپنے محبوب بندے پر قرآنِ کریم نازل کیا' جس میں کوئی کجی نہیں جو ہمیشہ دین کو قائم رکھنے والا ہے تاکہ اللہ تعالیٰ کے سخت عذاب سے اللہ تعالیٰ کا پیغمبر لوگوں کو خبردار کر دے اور جو لوگ ایمان لاکر نیک اعمال کرتے ہیں انہیں ان کے بہترین اور نہ ختم ہونے والے اَجر و ثواب کی خوشخبری سنا دے اور جو اپنے جاہل باپ' دادا کی سنی سنائی باتوں پر اللہ کی اولاد مانتے ہیں' انہیں بھی خبردار کر دے کہ یہ بہت بڑی جسارت اور قطعاً غلط بات ہے جس کو وہ اپنے مُنہ سے نکال رہے ہیں۔ اے نبی (ﷺ) تم ان کے پیچھے خود کو ہلاکت میں نہ ڈالو' جس طرح اس پروردگار نے اپنی کتاب کو حمد سے شروع کیا' اسی طرح اس نے اپنی مخلوق کو بھی اپنی حمد سے شروع کیا۔ ارشاد ہوتا ہے: ﴿ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَ جَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَالنُّوْرَ ثُمَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ يَعْدِلُوْنَ ﴾ (الانعام: ۱) یعنی سب تعریف اللہ ہی کے لیے ہے جس نے آسمان اور زمین کو اور اندھیرے اور اجالے کو پیدا کیا لیکن کفار باوجود اس کے بھی اللہ کا شریک ٹھہراتے ہیں۔ اسی طرح مخلوق کا خاتمہ بھی اپنی حمد و ثناء پر کیا۔ اہل جنت اور اہل جہنم کے انجام کا بیان کر کے ارشاد ہوتا ہے: ﴿ وَ تَرَى الْمَلٰٓئِكَةَ حَآفِّيْنَ مِنْ حَوْلِ الْعَرْشِ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَ قُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْحَقِّ وَ قِيْلَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴾ (الزمر: ۷۵) یعنی تو دیکھے گا کہ فرشتے عرش (الٰہی) کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہوں گے اور اپنے رب کی حمد و ثناء' تسبیح و تقدیس بیان کرتے ہوں گے۔ فیصلے حق کے ساتھ ہو چکے ہوں گے اور کہہ دیا گیا ہوگا کہ تمام تعریفیں اللہ رب العالمین ہی کے لیے ہیں۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَهُوَ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ لَهُ الْحَمْدُ فِي الْاُوْلٰى وَالْاٰخِرَةِ وَلَهُ الْحُكْمُ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴾ (القصص: ۷۰) یعنی وہی اللہ ہے' اس کے سوا کوئی معبود نہیں سب تعریفیں اوّل اور آخر اسی کے لیے ہیں۔ اسی کا حکم ہے اور اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے۔ ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے:

﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ وَلَهُ الْحَمْدُ فِی الْاٰخِرَةِ وَهُوَ الْحَكِیْمُ الْخَبِیْرُ﴾ (سباء:۱)
فَلَهُ الْحَمْدُ فِی الْاُوْلٰی وَالْاٰخِرَةِ یعنی سب تعریفیں اللہ ہی کے لیے ہیں‘ آسمان وزمین کی کل چیزیں اسی کی ہیں۔آخرت میں بھی حمد اسی کے لیے ہے۔وہی حکمت والا اور خبردار ہے۔اوّل‘ آخر اسی کی تعریف ہے۔یعنی جو کچھ اس نے پیدا کیا اور جو کچھ پیدا کرے گا وہ ان سب تعریفوں والا ہے جیسا کہ نمازی سَمِعَ اللّٰہُ...... کے بعد کہتا ہے: اللھم ربنا لك الحمد ملاء السموت و ملاء الارض و ملاء ما شئت من کل شیء بعد۔ اے اللہ! اے ہمارے رب! تیرے لیے ہی سب تعریفیں آسمان وزمین بھر جانے کے برابر اور ان کے اور اس کے بعد بھی تو جس چیز کو بھر دینا چاہے۔اس لیے جتنے لوگ بھی حمد وثنا کا الہام کیے جائیں گے اور ان کے سانس کے ساتھ ہی بلا تکلف اللہ تعالیٰ کی تعریف اور اس کی تسبیح ادا ہوتی رہے گی کیونکہ اللہ تعالیٰ کی عظیم الشان نعمتیں اور اس کی قدرتِ کاملہ اور اس کی زبردست سلطنت اور اس کی مسلسل رحمتیں اور اس کی ہمیشگی والے احسانات اس کے پیش نظر ہوں گے۔اسی کو قرآنِ پاک نے بیان فرمایا: ﴿اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ یَهْدِیْهِمْ رَبُّهُمْ بِاِیْمَانِهِمْ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهِمُ الْاَنْهٰرُ فِیْ جَنّٰتِ النَّعِیْمِ دَعْوٰىهُمْ فِیْهَا سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ وَ تَحِیَّتُهُمْ فِیْهَا سَلٰمٌ وَاٰخِرُ دَعْوٰىهُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ﴾ (یونس:۱۰) یعنی ایمان کے ساتھ نیک عمل کرنے والوں کو ان کا رب‘ ان کے ایمان کے ذریعہ ان نعمت والے باغوں کی راہ دکھائے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ان کی آواز سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ اور آپس میں سلام کا تحفہ ہوگا اور ان کی گفتگو کا آخری ٹکڑا یہی ہوگا کہ سب تعریف اللہ ہی کے لیے ہے جو تمام جہان والوں کا ربّ ہے اور فرمایا: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَرْسَلَ ﴿رُسُلًا مُّبَشِّرِیْنَ وَ مُنْذِرِیْنَ لِئَلَّا یَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ﴾ (النساء:۱۶۵) یعنی اللہ ہی کے لیے تعریف ہے جس نے اپنے رسولوں کو بشارتیں دینے والے اور خبردار کرنے والے بنا کر بھیجا تاکہ رسولوں کے آجانے کے بعد لوگوں کی کوئی حجت اللہ پر باقی نہ رہے۔ان رسولوں کا سلسلہ نبی امّی عربی مکی (ﷺ) پر ختم کیا جو سب سے زیادہ اور واضح راہ کی ہدایت کرنے والے ہیں۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے سے لے کر قیامت تک جتنے جنات وانسان ہیں‘ ان سب کی طرف آپ ﷺ نبی بنا کر بھیجے گئے ہیں۔جیسا کہ قرآنِ پاک میں ہے: ﴿قُلْ یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْكُمْ جَمِیْعًا......﴾ (الاعراف:۱۵۸) اے نبی! تم کہہ دو کہ اے لوگو! میں تم سب کی طرف اللہ تعالیٰ کا رسول ہوں۔وہ اللہ جو آسمان اور زمین کے ملک کا مالک ہے‘ جس کے سوا کوئی معبود نہیں‘ جو جلاتا ہے اور مارتا ہے۔پس اے لوگو! تم سب ایمان لاؤ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول (ﷺ) پر جو نبی امّی ہے‘ جو اللہ تعالیٰ پر اور اس کی باتوں پر ایمان رکھتے ہیں۔لوگو! انہی کی پیروی میں تمہاری ہدایت ہے۔ایک جگہ ارشادِ خداوندی ہے: ﴿لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَ مَنْۢ بَلَغَ﴾ (الانعام:۱۹) تاکہ میں تمہیں ڈراؤں اور انہیں بھی جنہیں کلام اللہ پہنچے۔پس جس عربی‘ عجمی‘ کالے گورے‘ جن وانس کو یہ قرآن پہنچا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کے لیے ڈرانے والے ہیں۔اس کے لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَمَنْ یَّكْفُرْ بِهٖ مِنَ الْاَحْزَابِ فَالنَّارُ مَوْعِدُهٗ﴾ (هود:۱۷) یعنی اس کے ساتھ کفر کرنے والا جہنمی ہے۔پس جو کوئی قرآن کے ساتھ کفر کرے وہ بحکم قرآن جہنمی ہے۔

دوسری جگہ قرآنِ کریم کا ارشاد ہوتا ہے: ﴿فَذَرْنِیْ وَمَنْ یُّكَذِّبُ بِهٰذَا الْحَدِیْثِ سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَیْثُ لَا

يَعْلَمُوْنَ (القلم ۴۴) یعنی تم ان جھٹلانے والوں کو اور مجھ کو چھوڑ دو میں انہیں اس طرح بتدریج پکڑوں گا کہ انہیں معلوم بھی نہ ہوگا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ میری پیغمبری عام ہے۔ ہر سرخ و سیاہ کی طرف میں پیغمبر بنا کر بھیجا گیا ہوں۔ (احمد) مجاہد فرماتے ہیں یعنی جن وانس کی طرف۔ پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تمام انسانوں اور جنات کی طرف اللہ کے رسول ہیں۔ سب کو خداوند کریم کی وحی اور عزت والے قرآن کو آپ پہنچانے والے ہیں۔ جس پاک کتاب کے باطل قریب بھی نہیں آ سکتا' جو حکمتوں اور تعریفوں والے خدا کا نازل کیا ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے اس پاک کلام کو سمجھنے کی تاکید بھی اس میں کر دی ہے۔ فرمایا: ''تم کیوں قرآنِ پاک میں تدبر اور غور وفکر نہیں کرتے۔ اگر یہ اللہ کے سوا اور کسی کی طرف سے ہوتا تو اس میں تم بہت کچھ اختلاف پاتے''۔

ایک اور جگہ فرمایا: اس مبارک کتاب کو ہم نے تیری طرف اتارا تا کہ لوگ اس میں غور وخوض کریں اور عقلمند لوگ نصیحت حاصل کریں''۔ دوسرے موقع پر فرمایا: ''یہ لوگ قرآن کو سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے کیا ان کے دلوں پر قفل لگے ہیں''۔

پس علماء پر واجب ہے کہ کلام اللہ کا مطلب واضح کریں۔ اس کی صحیح تفسیر کر دیں اور اسے باقاعدہ طلب کریں اور سیکھیں اور سکھائیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ''ہم نے کتاب والوں سے عہد لیا ہے کہ وہ اسے بیان کرتے رہیں' چھپائیں نہیں لیکن ان لوگوں نے اسے پیٹھ پیچھے ڈال دیا اور اس کے بدلے دنیا طلب کرنے لگے۔ ان کا یہ بیوپار نہایت ہی برا ہے'' ایک جگہ فرمایا: ''جو لوگ اللہ کے عہد اور اپنی قسموں کو تھوڑی رقم کے بدلے بیچتے پھریں' ان کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہیں۔ ان سے اللہ تعالیٰ قیامت کے دن بات تک نہ کرے گا۔ نہ ان کی طرف نظر رحمت سے دیکھے گا' نہ انہیں پاک کرے گا بلکہ ان کے لیے دردناک عذاب ہے'' پس دوسری اقوام وامم' جن پر ہم سے پہلے آسمانی کتابیں نازل کی گئیں اور انہوں نے اس سے روگردانی کی اور دنیا کے حاصل کرنے اور اس کے جمع کرنے میں مشغول ہو گئے اور اللہ تعالیٰ کی منع کی ہوئی چیزوں کے پیچھے پڑ کر اللہ پاک کی کتاب کو چھوڑ دیا۔ پروردگار نے ان کی مذمت بیان کی۔ مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ ایسا نہ کریں جو مذمت کا سبب بنے بلکہ انہیں چاہیے کہ احکام خداوندی کی تعمیل میں بدل وجان لگے رہیں اور قرآنِ پاک کے سیکھنے' سکھانے اور سمجھنے سمجھانے میں مشغول رہا کریں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ''کیا اب تک وہ وقت نہیں آیا کہ مسلمانوں کے دل اللہ تعالیٰ کے ذکر سے اور جو اُن کی طرف حق آیا ہے اس سے اِن کے دِل کانپ اُٹھیں اور ان کی طرح نہ ہو جائیں جنہیں ان سے پہلے کتاب دی گئی لیکن کچھ زمانہ گزرتے ہی ان کے دل سخت ہو گئے اور اکثر لوگ نافرمان ہو گئے۔ جان لو کہ مردہ زمین کو جلانا اللہ ہی کا کام ہے۔ ہم نے تو تمہاری سمجھ بوجھ کے لیے اپنی آیتیں بیان کر دیں۔'' ان دونوں آیتوں کے ترجمے پر غور کرو کس لطافت کے ساتھ بیان ہوا ہے کہ جس طرح بارش سے خشک زمین لہلہانے لگتی ہے' اسی طرح ایمان وہدایت سے وہ دل جو نافرمانیوں اور گناہوں کے باعث سخت ہو گئے ہوں' نرم پڑ جایا کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ بزرگ وبرتر' جواد وسخی سے قبولیت کی اُمید پر ہم بھی دعا کرتے ہیں کہ وہ مالک ہمارے دلوں کو بھی نرم کر دے آمین۔

تفسیر سے متعلق کچھ اہم حقائق

سنو! تفسیر کا بہترین اور صحیح طریقہ یہ ہے کہ اول تو قرآن کی تفسیر قرآن ہی سے ہو۔ اس لیے کہ ایک بیان کہیں مختصر ہے تو کہیں اس کی تفصیل بھی ہے۔ اس کے بعد قرآن کی تفسیر حدیث سے ہوتی ہے۔ اس لیے کہ حدیث قرآنِ کریم کی شرح اور تفسیر ہے بلکہ امام ابوعبداللہ بن محمد ادریس شافعیؒ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے تمام احکام قرآن ہی سے سمجھے ہوئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ''ہم نے تم پر یہ کتاب حق کے ساتھ نازل فرمائی ہے تاکہ تم لوگوں کے درمیان اللہ کے بتائے ہوئے احکام کے مطابق فیصلے کر سکو۔ خبردار! تم خیانت کرنے والوں کے طرفدار مت بننا''

ایک جگہ اور ارشاد ہوتا ہے: ''ہم نے تم پر اسی لیے یہ کتاب اتاری ہے کہ لوگوں کے اختلاف کا فیصلہ کر دیا کرو۔ یہ کتاب ایمانداروں کے لیے ہدایت و رحمت (کا باعث) ہے'' ایک اور مقام پر فرمایا: ''ہم نے اس کے ذکر کو تیری طرف اس لیے اتارا ہے کہ تم اسے لوگوں کو کھول کھول کر پہنچا دو تاکہ وہ غور کر سکیں''۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: ''میں قرآن بھی دیا گیا ہوں اور اسی کے مثل ایک اور چیز بھی اسی کے ساتھ دیا گیا ہوں'' اس سے مراد سنت ہے۔ (ابوداؤد کتاب السنہ)

یہ یاد رہے کہ احادیث بھی اللہ کی وحی ہیں۔ جس طرح قرآنِ پاک بذریعہ وحی اُترا اسی طرح حدیث رسول (ﷺ) بھی خداوندی ہے۔ مگر قرآن وحی متلو ہے اور حدیث وحی غیر متلو[1]۔ حضرت امام شافعی اور دوسرے بڑے بڑے ائمہ نے اسے دلائل سے خوب ثابت کر دیا ہے لیکن یہاں اس کے بیان کرنے کا موقع نہیں۔ مقصد یہ ہے کہ قرآنِ پاک کی تفسیر اولاً خود قرآن سے اور پھر حدیث سے کرنی چاہیے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو یمن کی جانب بھیجا تو دریافت کیا کہ حکم کس طرح کرو گے؟ انہوں نے جواب دیا: کتاب اللہ سے۔ فرمایا: اگر اس میں نہ پاؤ؟ تو کہا: سنتِ رسول اللہ (ﷺ) سے۔ فرمایا: اگر اس میں نہ پاؤ؟ تو کہا: اب اجتہاد کروں گا۔ حضور ﷺ نے یہ جواب سن کر ان کے سینے پر ہاتھ رکھ کر فرمایا: اللہ کا شکر ہے کہ اس نے اپنے نبی (ﷺ) کے قاصد کو اس چیز کی توفیق دی جو اس کے نبی (ﷺ) کو پسند ہے۔ (رواہ احمد)

یہ حدیث مسند میں بھی ہے اور سنن میں بھی اور سند بھی اس کی بہت عمدہ ہے جیسا کہ اپنی جگہ اس کا ثبوت ہے۔

اس بناء پر جب کسی آیت کی تفسیر قرآن و حدیث دونوں میں نہ ملے تو اقوالِ صحابہ کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ وہ تفسیر قرآن کو بہت زیادہ جانتے تھے۔ اس لیے کہ جو قرینے اور احوال اس وقت تھے ان کا علم انہی کو ہو سکتا ہے وہ اس وقت موجود اور حاضر تھے۔ علاوہ ازیں کامل سمجھ بوجھ، صحیح علم اور نیک عمل انہیں حاصل تھا۔ بالخصوص ان بزرگوں کو جو ان میں بھی بڑے مرتبے کے اور زبردست عالم تھے۔ جیسے چاروں امام جو خلفاء تھے اور رُشد و ہدایت والے تھے یعنی حضرت ابوبکر

---

[1] وحی متلو قرآنِ حکیم ہے جس کو نماز میں پڑھا جائے تو نماز ہو جائے اور وحی غیر متلو احادیث ہیں جن کو نماز میں پڑھنے سے نماز نہیں ہوتی۔ متلو تلاوت سے اسم مفعول کا صیغہ ہے۔ ۱۲

صدیق، حضرت عمر فاروق، حضرت عثمان ذوالنورین، حضرت علی (شیر خدا) رضی اللہ عنہم اور جیسے حضرت عبداللہ بن مسعود۔
حضرت عبداللہ سے تو مروی ہے فرماتے ہیں: ''اس خدا کی قسم جس کے سوا کوئی معبود نہیں، کتاب اللہ کی کوئی آیت ایسی نہیں
کہ میں نہ جانتا ہوں کہ کس کے بارے میں نازل ہوئی اور کہاں نازل ہوئی۔ میں اگر جانتا کہ کتاب اللہ کے علم میں کوئی مجھ
سے زیادہ ہے اور وہاں تک میں کسی طرح پہنچ بھی سکتا ہوں تو ضرور اس کی شاگردی میں اپنے آپ کو پیش کرتا۔'' (بخاری)
آپ یہ بھی فرماتے ہیں کہ ہم میں سے ہر شخص جب تک دس آیتوں کا پورا مطلب نہ جان لیتا اور ان پر عمل نہ کر لیتا اگلی آیت
نہیں پڑھتا تھا۔ حضرت عبدالرحمن سلمی تابعیؒ فرماتے ہیں کہ ہم نے جن سے قرآن سیکھا وہ ہم سے فرمایا کرتے تھے کہ ہم
نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پڑھا' جب تک ہم دس آیتوں کا علم و عمل حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے نہ سیکھ لیتے' آگے نہیں
بڑھتے تھے۔ غرض قرآن کا علم اور قرآن پر عمل دونوں ہی کو سیکھا۔

انہی میں سے ایک قرآنی علوم کے زبردست ماہر حضرت عبداللہ بن عباسؓ ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کے چچا زاد بھائی اور
ترجمان القرآن ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے لیے برکت کی دعا کی تھی اور کہا تھا: ((اللھم فقھہ فی الدین و
علمہ التاویل)) (احمد) ''خدایا انہیں دین کی سمجھ عطا کر اور قرآن کی تفسیر کا علم بھی نصیب کر۔'' حضرت عبداللہ بن مسعود فرمایا
کرتے تھے: ''قرآن کے بہترین ترجمان حضرت عبداللہ بن عباسؓ ہیں۔'' (طبری) حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے اس قول کو
پیش نظر رکھ کر خیال کیجیے کہ ان کا انتقال ۳۲ھ میں ہوا اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ ان کے بعد چھتیس برس تک زندہ رہے تو
اس مدت میں آپ نے علم میں کس قدر ترقی کی ہوگی۔

حضرت ابو وائلؒ فرماتے ہیں کہ حضرت علیؓ کے زمانہ میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ امیر حج مقرر ہوئے تھے۔ آپ
نے اپنے خطبہ میں سورۂ بقرہ کی تلاوت فرمائی اور اس عمدگی سے تفسیر کی کہ اگر کفار ترک و دیلم بھی سن لیتے' تو فوراً مسلمان ہو
جاتے۔ (طبری) بعض روایتوں میں ہے کہ آپ نے اپنے خطبہ میں سورۂ نور کی تفسیر بیان فرمائی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اسمٰعیل
ابن عبدالرحمن سدی کبیر اپنی تفسیر میں انہی دونوں بزرگوں کی اکثر تفسیر نقل کیا کرتے ہیں لیکن کبھی کبھی اہل کتاب سے یہ
بزرگ جو روایت لے لیا کرتے ہیں' اسے بھی وہ بیان کر دیتے ہیں۔ بنی اسرائیل سے روایت لینا مباح ہے۔ صحیح بخاری میں
حضرت ابن عمروؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میری طرف سے پہنچا دیا کرو اگرچہ ایک آیت ہی ہو۔ (بخاری'
کتاب احادیث الانبیاء) بنی اسرائیل سے بھی روایت لینے میں کوئی حرج نہیں' مجھ پر قصداً جھوٹ بولنے والا قطعاً جہنمی ہے۔
حضرت عبداللہ بن عمروؓ نے جنگ یرموک میں دو بوریاں یہود و نصاریٰ کی کتابوں کی پائی تھیں۔ ان کی باتیں وہ اس حدیث کو
مدنظر رکھ کر نقل کر دیا کرتے تھے لیکن یہ یاد رہے کہ بنی اسرائیل کی یہ روایتیں صرف مسئلہ کی تائید اور اس کے استحکام کے لیے
لائی جاتی تھیں خود ان سے مسائل ثابت نہیں ہو سکتے۔

اسرائیلیات کی اقسام☆

روایات بنی اسرائیل تین اقسام پر ہیں: ① وہ جن کی تصدیق خود ہمارے ہاں موجود ہے یعنی قرآن پاک کی کسی
آیت یا حدیث کے مطابق بنو اسرائیل کی کتاب میں بھی کوئی روایت مل جائے۔ اس کی صحت میں کوئی کلام نہیں۔ ② دوسرے

یہ کہ جن کی تکذیب خود ہمارے ہاں موجود ہو یعنی کسی آیت یا حدیث کے خلاف ہو۔اس کے غلط ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔
③ تیسرے وہ کہ جس کی نہ ہم تصدیق کر سکتے ہیں نہ تکذیب۔اس لیے کہ ہمارے یہاں نہ تو ایسی کوئی روایت ہے جس سے مطابقت کی وجہ سے ہم اسے صحیح کہہ سکیں۔نہ کوئی ایسی روایت ہے جو اس کے مخالف ہو اور اس بنا پر ہم اسے جھوٹ اور غلط کہہ سکیں۔لہٰذا یہ تیسری قسم کی روایتیں وہ ہیں جن سے ہم خاموش ہیں' نہ انہیں غلط کہیں نہ صحیح سمجھیں' البتہ انہیں ذکر کرنا جائز ہے اور یہ روایتیں ہیں بھی ایسی جن میں ہمارے دین کا کوئی فائدہ نہیں۔

باوجود اس کے ایسی باتوں میں خود اہل کتاب میں بھی بڑے بڑے اختلاف موجود ہیں اور اسی وجہ سے ان روایتوں کو لینے والے مفسرین میں بھی ایسے ہی اختلافات پائے جاتے ہیں۔مثلاً اصحاب کہف کے نام' ان کے کتے کا رنگ' ان کی تعداد' حضرت موسیٰ علیہ السلام کی لکڑی کس درخت کی تھی؟ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جن پرندوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا تھا اور پھر خدا کے حکم سے وہ جی اٹھے تھے وہ پرندے کیا کیا تھے؟ اور جس مقتول کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں گائے ذبح کر کے اس کے گوشت کا ایک ٹکڑا لگایا تھا اور اسے اللہ نے زندہ کر دیا تھا' وہ ٹکڑا کونسا تھا؟ اور کس جگہ کا تھا؟ اور وہ کونسا درخت تھا جس پر موسیٰ علیہ السلام نے نور دیکھا تھا اور اس میں سے اللہ کا کلام سنا تھا؟ وغیرہ وغیرہ۔پس یہ وہ چیزیں ہیں جن پر اللہ نے پردہ ڈال رکھا ہے اور ہمیں ان کا جاننا نہ جاننا کوئی نفع نقصان نہیں پہنچا سکتا' نہ اس کی تعیین میں کوئی دینی فائدہ ہے نہ دنیوی۔ہاں! یہ بات البتہ ہے کہ اس اختلاف کو نقل کرنا جائز ہے جیسا کہ خود قرآن پاک نے اصحاب کی تعداد کا اختلاف نقل کیا ہے۔فرماتا ہے: ﴿ سَيَقُوْلُوْنَ ثَلٰثَةٌ رَّابِعُهُمْ كَلْبُهُمْ ..... ﴾ (الکہف:۲۲) یعنی یہ لوگ کہتے ہیں کہ اصحاب کہف تین تھے اور ان کا کتا چوتھا تھا اور کہتے ہیں کہ پانچ تھے اور چھٹا کتا تھا۔یہ سب ظنی باتیں ہیں اور یہ بھی کہتے ہیں کہ وہ سات تھے اور آٹھواں اُن کا کتا۔اے نبی ﷺ! کہہ دو کہ ان کی تعداد کو میرا رب ہی بخوبی جانتا ہے۔تم ان سے اس بارے میں صرف سرسری گفتگو کرو اور اس بارے میں ان سے نہ پوچھو۔اس آیت نے بتلا دیا کہ ہمیں ایسے مقام پر کیا کرنا چاہیے۔اللہ تعالیٰ نے یہاں تین اقوال بیان فرمائے ہیں دو کو تو ضعیف قرار دیا اور تیسرے پر ضعف کا حکم نہیں لگایا۔جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ صحیح ہے کیونکہ اگر یہ بھی باطل ہوتا تو ان دونوں کی طرح اسے بھی رد کر دیا جاتا۔پھر ساتھ ہی ساتھ یہ بھی ارشاد فرمایا کہ ان کی تعداد کا علم تمہیں کوئی فائدہ نہیں دے سکتا۔پھر تم اس کی چھان بین میں کیوں لگو؟ کیوں نہ کہہ دو کہ ان کی تعداد کا حقیقی علم تو صرف اللہ تعالیٰ ہی کو ہے۔بہت کم ایسے لوگ ہیں جنہیں اللہ نے ان کی صحیح تعداد پر مطلع فرمایا ہے۔جب یہ معلوم ہو چکا کہ وہ اٹکل پچو باتیں بنا رہے ہیں۔پھر اس کے پیچھے پڑنے اور ان سے دریافت کرنے کی کیا ضرورت؟

اسی طرح ان آیتوں سے معلوم ہوا کہ کسی اختلاف کو نقل کرنے کا بہترین طریقہ یہی ہے کہ تمام اختلافی اقوال بیان کر دیے جائیں۔صحیح غیر صحیح پر تنبیہ کر دی جائے اور اس اختلاف کا فائدہ بھی بیان کر دیا جائے تاکہ بیکار کام میں پڑ کر کوئی شخص کارآمد شغل سے رک نہ جائے۔جو شخص اختلاف نقل کرنے میں تمام اقوال بیان نہ کرے تو یہ قصور اس کا ہے ممکن ہے صحیح قول وہی ہو جسے اس نے چھوڑ دیا ہے۔اسی طرح جو شخص اختلافات نقل کر کے فیصلہ کیے بغیر چھوڑ دے اس نے بھی تقصیر کی۔اگر غیر صحیح کو جان بوجھ کر صحیح کہہ دے پھر تو وہ کاذب ہوتا ہے اور اگر جہالت سے ایسا کرے جب بھی خطاء کار ہے۔اسی طرح

جو شخص کسی ایسی باریک بات میں جس میں کوئی بڑا فائدہ نہ ہو بہت سارے اقوال اختلافی نقل کرے یا ایسے اختلافات نقل
کرنے بیٹھ جائے جن کے الفاظ مختلف ہوں مگر نتیجہ کے اعتبار سے یا تو اختلاف بالکل ہی اُٹھ جاتا ہو یا معمولی اختلاف رہ
جاتا ہو اس نے بھی اپنے عزیز وقت کو بیکار ضائع کیا اور کوئی مفید کام نہیں کیا۔ اس کی بھی مثال ایسی ہی ہے جیسے کوئی شخص
چھوٹے کپڑے پہن لے۔ بھلائی اور سیدھی بات کی توفیق اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔

فصل ☆ جب کسی آیت کی تفسیر قرآن وحدیث اور اقوال صحابہ تینوں میں نہ ملے۔ اکثر ائمہ نے کہا ہے کہ ایسے موقعہ پر
تابعین کی تفسیر لی جائے جیسے مجاہد بن جبیرؒ جو تفسیر میں اللہ کی ایک نشانی تھے۔ خود فرماتے ہیں کہ میں نے تین مرتبہ اول سے
آخر تک حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے قرآن پاک سیکھا اور سمجھا۔ ایک ایک آیت کو پوچھ پوچھ کر سمجھ سمجھ کر پڑھا۔ (طبری) ابن
ابی ملیکہ فرماتے ہیں۔ خود میں نے حضرت مجاہدؒ کو دیکھا کہ کتاب، قلم، دوات لے کر حضرت ابن عباسؓ کے پاس پہنچ کر تے
اور تفسیر قرآن دریافت کر کے اس میں تحریر فرماتے۔ پورے قرآن کریم کی تفسیر اسی طرح نقل کی۔ (طبری) حضرت سفیان
ثوری کا تو فرمان تھا کہ مجاہدؒ کسی آیت کی تفسیر کر دیں تو پھر اس کی تحقیق کرنا بے سود ہے۔ بس ان کی تقلید کافی ہے۔ (طبری)
حضرت مجاہد کی طرح حضرت سعید بن جبیر، حضرت عکرمہ جو حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے مولیٰ تھے اور حضرت عطاء بن ابی
رباحؒ، حضرت حسن بصریؒ حضرت مسروق بن اجدعؒ حضرت سعید بن مسیبؒ، حضرت ابوالعالیہؒ، حضرت ربیع بن انسؒ،
حضرت قتادہؒ اور حضرت ضحاک بن مزاحم وغیرہ تابعین، تبع تابعین اور ان کے بعد والوں کی تفسیر معتبر مانی جائے گی۔ کبھی ایسا
ہوتا ہے کہ کسی آیت کی تفسیر میں ان بزرگوں کے اقوال جب ذکر کیے ہیں اور ان کے الفاظ میں بظاہر اختلاف نظر آتا ہے تو
بے علم لوگ اسے معنوی اختلاف سمجھ کر کہہ بیٹھتے ہیں کہ اس آیت کی تفسیر میں اختلاف ہے حالانکہ حقیقتاً ایسا نہیں ہوتا بلکہ کسی
نے ایک چیز کی تعبیر اس کے لازم سے کی، کسی نے اس کی نظیر سے، کسی نے خود اس چیز کو ہی بیان کر دیا۔ پس ان صورتوں میں
گو الفاظ میں اختلاف ہو لیکن معنی ایک ہی رہتے ہیں۔ عقلمند کو چاہیے کہ ایسی جگہ لغزش نہ کھائے۔ واللہ الھادی۔

شعبہ بن حجاج کہتے ہیں کہ جب تابعین کے اقوال فروعی مسائل میں حجت نہیں تو تفسیر قرآن میں کیسے حجت ہو
جائیں گے؟ شعبہ کا یہ قول صحیح ہے۔ اُن کا اختلاف کرنے والوں پر ان کے اقوال حجت نہیں لیکن ان کے اجماعی اقوال کے
حجت ہونے میں کوئی شک نہیں۔ ہاں! اختلاف کے وقت نہ ان کا قول آپس میں ایک دوسرے پر حجت ہے، نہ غیروں پر۔
اس وقت لغت قرآن وحدیث اور عام لغت عرب اور اقوال صحابہ کی طرف رجوع کیا جائے گا۔

ہاں! صرف رائے سے تفسیر کرنا محض حرام ہے۔ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں کہ جس نے قرآن میں اپنی رائے کو دخل
دیا یا جہالت سے کچھ کہہ دیا اس نے اپنی جگہ جہنم میں بنالی۔

ابن جریرؒ ترمذی، ابوداؤد میں یہ حدیث ہے کہ امام ترمذی علیہ الرحمۃ نے اسے حسن کہا ہے۔ یہی الفاظ حضرت عبداللہ
بن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی منقول ہیں۔ حضرت جندبؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ جس نے قرآن کریم
میں اپنی رائے سے کچھ کہا اس نے خطاء کی۔ ابن جریرؒ ابوداؤدؒ ترمذی اور نسائی میں بھی یہ حدیث موجود ہے۔ امام ترمذیؒ نے
اسے غریب کہا ہے اور اس کے راوی سہیل پر بعض اہل علم نے کلام بھی کیا ہے۔ اس حدیث میں یہ الفاظ بھی مروی ہیں کہ جس

نے اپنی رائے سے قرآن میں کوئی ٹھیک بات بھی کہہ دی جب بھی وہ خطا کار ہے۔ اس لیے کہ اس نے اس چیز میں تکلف کیا جس کا اسے علم نہ تھا اور اس نے ایسی روش اختیار کی جس کا اختیار کرنا مناسب نہ تھا۔ پس اگرچہ اس کے منہ سے ٹھیک بات نکل گئی۔ پھر بھی خطا کار ہے۔ اس لیے کہ کام کو کام کی طرح پر اس نے نہیں کیا۔ اس کی ایسی ہی مثال ہے جیسے کوئی شخص بے علم ہے پھر فیصلے کرنے بیٹھ جائے' اسے جہنمی کہا گیا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ایسے شخص کی صحیح بات پر مواخذہ کم ہو لیکن ہے خطا کار' واللہ اعلم۔ دیکھئے تہمت لگا کر گواہ نہ پیش کرنے والے کو اللہ تعالیٰ نے قرآن میں کاذب یعنی جھوٹا فرمایا ہے۔ گو حقیقت میں وہ سچا ہی ہو اور جس کی نسبت وہ زنا کا الزام لگا رہا ہے وہ واقعی زانی ہو لیکن چونکہ اسے اس خبر کو بلا شہادت پھیلانا ٹھیک نہ تھا اور اس نے پھیلائی تو جھوٹا ٹھہرا' واللہ اعلم۔

یہی وجہ تھی کہ سلف کی بڑی جماعت بلا علم تفسیر کرنے سے بہت ڈرتی تھی۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا فرمان ہے' مجھے کونسی زمین اٹھائے گی اور کونسا آسمان سایہ دے گا اگر میں قرآن میں وہ کہوں جو نہیں جانتا۔ (طبری) آپ سے ایک مرتبہ اللہ کے فرمان: ﴿وَفَاكِهَةً وَّأَبًّا﴾ کی تفسیر پوچھی جاتی ہے تو فرماتے ہیں مجھے کونسا آسمان سایہ دے گا اور کونسی زمین اٹھائے گی' جبکہ میں قرآن میں وہ کہوں جو نہیں جانتا۔ یہ روایت منقطع ہے۔ ایک مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ منبر پر اسی آیت کی تلاوت کرتے ہیں' پھر فرماتے ہیں: فَاكِهَةً کو ہم جانتے ہیں لیکن یہ "اَبّ" کیا چیز ہے؟ پھر خود ہی فرماتے ہیں کہ اے عمر! اس تکلیف میں کیوں پڑو۔ حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ ہم حضرت عمر بن خطابؓ کے پاس بیٹھے تھے۔ آپ کی قمیص کے پیچھے چار پیوند لگے ہوئے تھے۔ آپؓ نے اس آیت: ﴿وَفَاكِهَةً وَّأَبًّا......﴾ (عبس: ۳۱) کی تلاوت کی اور کہا کہ اب کیا چیز ہے؟ پھر فرمانے لگے: اس تکلیف کی تمہیں کیا ضرورت ہے؟ اس کے نہ جاننے میں کیا حرج ہے؟ مطلب یہ ہے کہ "اَبّ" کے معنی تو معلوم ہیں' یعنی چارہ' زمین کی پیداوار لیکن اس کی کیفیت کا پوری طرح علم نہیں۔ خود اسی آیت میں موجود ہے: ﴿فَأَنبَتْنَا فِيهَا حَبًّا وَّعِنَبًا﴾ (عبس: ۲۷) یعنی ہم نے زمین میں اناج اور انگور اُگا دیئے۔

ابن جریر میں صحیح سند کے ساتھ مروی ہے کہ ابن ابی ملیکہؒ فرماتے ہیں کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے کسی شخص نے ایک آیت کی تفسیر پوچھی تو آپ نے کچھ نہ فرمایا حالانکہ اگر اس کی تفسیر تم میں کسی سے پوچھی جاتی تو فوراً جواب دے دیتا۔ (طبری)

دوسری روایت میں ہے کہ ایک شخص نے آپ سے پوچھا کہ قرآن میں جو ایک ہزار سال کے برابر ایک دن کا ذکر ہے یہ کیا؟ آپ نے فرمایا: اور پچاس ہزار سال کے برابر کے دن کا ذکر ہے۔ وہ کیا؟ اس نے کہا: میں تو آپ سے پوچھنا چاہتا ہوں۔ آپ نے فرمایا: یہ دو دن ہیں جن کا ذکر اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں کیا ہے۔ ان کا حقیقی علم اللہ تعالیٰ ہی کو ہے۔ (طبری) خیال فرمایئے کہ اتنے بڑے مفسر نے تفسیر میں کس قدر احتیاط برتی کہ جس بات کا علم نہ تھا' اس کا صاف انکار کر دیا۔ تفسیر ابن جریر میں ہے کہ حضرت جندب بن عبداللہؓ سے ایک مرتبہ طلق بن حبیبؓ نے ایک آیت کی تفسیر پوچھی تو فرمانے لگے کہ اگر تم مسلمان ہو تو تمہیں قسم ہے اگر تم یہاں سے چلے نہ جاؤ۔ یا فرمایا: اگر یہاں بیٹھے رہو۔ حضرت سعید بن مسیبؒ سے قرآن کی تفسیر پوچھی جاتی تو فرماتے ہم قرآن میں کچھ نہیں کہتے۔ آپ کی عادت مبارک تھی کہ جو کچھ معلوم ہوتا' اسی کو

قران کی تفسیر میں بیان فرماتے۔ (طبری) ایک مرتبہ ایک شخص کے سوال پر آپ نے فرمایا: مجھ سے قران کی تفسیر نہ پوچھو۔ قرآن کی تفسیر اُس سے پوچھو جو کہتا ہے کہ مجھ پر قرآن کی کوئی آیت مخفی نہیں یعنی حضرت عکرمہؒ سے۔

یزید بن ابو یزید کہتے ہیں' ہم حضرت سعید بن میتب سے حلال وحرام کے مسائل پوچھتے تھے۔ آپ ان میں سب سے زیادہ عالم نظر آتے لیکن جب ہم قرآن کی کسی آیت کی تفسیر پوچھتے تو ایسے خاموش ہو جاتے گویا سنا ہی نہیں۔ حضرت عبید اللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں میں نے مدینہ کے بڑے بڑے فقیہوں کو دیکھا کہ قرآن کی تفسیر کرتے ہوئے جھجکتے تھے۔ جیسے سالم بن عبداللہ' قاسم بن محمدؒ سعید بن میتب' نافع رحمہم اللہ وغیرہم۔ حضرت ہشام فرماتے ہیں' میں نے اپنے والد عروہ کو کسی آیت کی تفسیر کرتے ہوئے نہیں سنا۔ عبیداللہ سلمانیؒ سے قرآن کی ایک آیت کی تفسیر پوچھی جاتی ہے' تو فرماتے ہیں' جو لوگ قرآن کی آیتوں کو جانتے تھے کہ کس بارے میں نازل ہوئیں وہ تو اس دنیا کو خالی کر گئے۔ اب تم ٹھیک ٹھاک اور سیدھے سادے ہو۔ (طبری) حضرت مسلم بن یسار فرماتے ہیں کہ جب تم کتاب اللہ کی تفسیر میں کچھ کہنا چاہو تو آگے پیچھے دیکھ لو کیونکہ خداوند تعالیٰ کی طرف نسبت کر کے بات کہنی ہے۔ حضرت ابراہیمؒ فرماتے ہیں' ہمارے سب ساتھی قرآن کی تفسیر کو بڑی چیز جانتے تھے اور اس میں سخت احتیاط کرتے۔ شعبیؒ فرماتے ہیں' گو میں نے قرآنِ کریم کی ایک ایک آیت کا علم حاصل کر لیا ہے تاہم میں کہتے ہوئے جھجکتا ہوں' اس لیے کہ یہ اللہ تعالیٰ سے روایت کرنی ہے۔ حضرت مسروقؒ کا قول ہے کہ تفسیر میں بے حد احتیاط کرو۔ تفسیر تو اللہ تعالیٰ سے روایت کرنی ہے۔ (طبری) ان تمام اور ان جیسے اور آثارِ صحیحہ کا جو ائمہ سلفؒ سے منقول ہیں' یہ مطلب ہے کہ یہ علماء کرام ہرگز ہرگز بغیر علم قرآن کے معنی مطلب میں لب کشائی نہیں کرتے تھے۔ ہاں! لغت کی رو سے یا شریعت کی رو سے جو تفسیر معلوم ہو' اس کے بیان کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ اسی لیے خود ان بزرگوں کے پاکیزہ اقوال قرآنِ کریم کی تفسیر میں بکثرت مروی ہیں۔ کوئی یہ نہ کہے کہ جب یہ بزرگ قرآن کی تفسیر میں اس درجہ احتیاط سے کام لیتے تھے اور تفسیر بیان نہیں فرماتے تھے پھر ان سے تفسیر منقول کیوں ہے؟ جواب اس کا یہ ہے کہ خاموش وہاں رہتے تھے جہاں نہیں جانتے تھے اور کہتے اس جگہ تھے جہاں کا علم ہوتا تھا اور یہ دونوں ہی باتیں ہر ایک پر واجب ہیں' یعنی بے علمی کے وقت چپ رہنا اور علم کو بیان کرنا' قرآن فرماتا ہے: ﴿لَتُبَيِّنُنَّهٗ لِلنَّاسِ وَلَا تَكْتُمُوْنَهٗ﴾ (آل عمران ۱۸۷) یعنی اسے لوگوں کے سامنے بیان کرتے رہو اور چھپاؤ نہیں۔ حدیث شریف میں ہے جس سے کوئی مسئلہ پوچھا جائے اور باوجود جاننے کے اُسے چھپائے' قیامت کے دن اسے آگ کی لگام چڑھائی جائے گی۔ (ابوداؤد' کتاب العلم) ابن جریر میں حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کی انہی آیتوں کی تفسیر فرمایا کرتے تھے' جن کی تفسیر جبریل علیہ السلام سمجھا جائیں لیکن یہ حدیث منکر اور غریب ہے اور اس کے راوی جعفر ہیں جو محمد بن خالد بن زبیر بن عوام قریشی کے لڑکے ہیں۔ ان کی بابت حضرت امام بخاریؒ فرماتے ہیں' ان کی حدیث میں متابعت نہیں کی جاتی۔ حافظ ابوالفتح ازدیؒ فرماتے ہیں' یہ منکر الحدیث ہیں۔ اگر یہ حدیث صحیح ہے تو اس کا صحیح مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ اس سے مراد وہ آیتیں ہیں جن کے معنی اللہ تعالیٰ کے بتائے بغیر معلوم نہیں ہو سکتے۔ ایسی آیتوں کے مطالب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بذریعہ جبریلؑ معلوم کرا دیئے جاتے تھے۔ امام ابوجعفر نے اس روایت کے جو معنی بیان فرمائے ہیں' اس کا ماحصل بھی یہی ہے اور یہی معنی درست بھی ہو سکتے ہیں' اس لیے کہ قرآن میں ایسی آیتیں بھی ہیں جن کا علم

محض اللہ تعالیٰ ہی کو ہے اور ایسی آیتیں بھی ہیں جن کا علم علماء کو ہے اور ایسی آیتیں بھی ہیں کہ جن کے معنی عرب لوگ اپنی لغت سے سمجھ سکتے ہیں اور ایسی بھی ہیں کہ جن کے معنی مطلب اس طرح واضح ہیں کہ کسی کا کوئی عذر باقی نہیں رہتا۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں' تفسیر کی چار قسمیں ہیں' ایک تو کلامِ عرب سے معلوم ہو جاتی ہے' دوسری وہ جس کی جہالت میں کوئی معذور نہیں' تیسری وہ جسے ذی علم لوگ جان سکتے ہیں' چوتھی وہ جسے خدا کے سوا کوئی اور نہیں جانتا۔ (طبری)

ایک مرفوع حدیث بھی اس بارے میں مروی ہے لیکن اس کی اسناد میں کلام ہے۔ اس میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قرآن کا نزول چار طریق پر ہوا ہے۔ حلال وحرام کی آیتیں' جن سے اگر کوئی ناواقف رہا تو اس کا کوئی عذر قیامت کے دن کام نہ آئے گا اور وہ تفسیر جسے عرب بیان کریں اور وہ تفسیر جو ذی علم جان سکے اور وہ متشابہ آیتیں جن کا حقیقی علم بجز باری تعالیٰ کے کسی اور کو حاصل نہیں۔ جو لوگ اسے جاننے کا دعویٰ کریں وہ جھوٹے ہیں۔ اس حدیث کی سند میں محمد بن سائب کلبی ہیں جو متروک الحدیث ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ انہوں نے موقوف روایت یعنی عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے قول کو مرفوع حدیث سمجھ لیا ہو' واللہ اعلم۔

سورۂ فاتحہ کی تفسیر اور اِس سلسلہ کا ایک مفید مقدمہ

حضرت قتادہؒ فرماتے ہیں' سورۂ بقرہ' سورۂ آلِ عمران' سورۂ نساء' سورۂ مائدہ' سورۂ براۃ' سورۂ رعد' سورۂ نحل' سورۂ حج' سورۂ نور' سورۂ احزاب' سورۂ محمد' سورۂ فتح' سورۂ حجرات' سورۂ رحمٰن' سورۂ حدید' سورۂ حشر' سورۂ ممتحنہ' سورۂ صف' سورۂ جمعہ' سورۂ منافقون' سورۂ تغابن' سورۂ طلاق' سورۂ زلزال اور سورۂ نصر۔ یہ سب سورتیں تو مدینہ شریف میں نازل ہوئیں اور باقی تمام سورتیں مکہ شریف میں نازل ہوئیں۔ قرآن کی تمام آیتیں چھ ہزار ہیں۔ اس سے اوپر اختلاف ہے۔ بعض تو اس پر زیادہ نہیں بتلاتے۔ بعض دو سو چار آیتیں چھ ہزار سے زائد بتلاتے ہیں۔ بعض دو سو چودہ آیتیں' بعض دو سو انیس' بعض دو سو پچیس' بعض دو سو چھبیس۔ ابو عمرو دانی نے کتاب البیان میں یہ سب لکھا ہے۔ قرآن شریف کے کلام کی نسبت حضرت عطاء بن یسار فرماتے ہیں کہ ستر ہزار چار سو انتالیس کلمات ہیں۔ حروف کی گنتی کی نسبت حضرت مجاہد سے مروی ہے کہ کُل قرآن شریف کے حروف تین لاکھ اکیس ہزار ایک سو اسی ہیں۔ فضل بن عطاء بن یسار فرماتے ہیں کہ کُل حروف تین لاکھ تیئس ہزار پندرہ ہیں۔

حجاج نے اپنے زمانہ میں قاریوں' حافظوں اور کاتبوں کو جمع کر کے دریافت کیا کہ قرآنِ کریم کے حروف گنتی کر کے مجھے بتلاؤ۔ تو سب نے حساب کر کے بالاتفاق کہا کہ تین لاکھ چالیس ہزار سات سو چالیس حروف ہیں۔ پھر حجاج نے کہا کہ حروف کے اعتبار سے آدھا قرآن شریف کہاں ہوتا ہے؟ تو حساب سے معلوم ہوا کہ سورۂ کہف میں ﴿ وَلْيَتَلَطَّفْ ﴾ (الکہف ۱۹) کی ''ف'' پر ٹھیک آدھا قرآن ہوتا ہے اور سورۂ براءت کی سو آیتوں پر قرآنِ کریم کا پہلا تہائی حصہ حروف کے اعتبار سے ختم ہوتا ہے اور دوسری تہائی سورۂ شعرا کی سو آیت کے سرے پر یا ایک سو ایک آیت کے سرے پر ختم ہوتی ہے اور

تیسری تہائی آخر تک اور اگر منزلوں کا شمار کیا جائے یعنی سات حصے قرآنِ کریم کے کیے جائیں تو پہلی منزل صدّعَ ''ن'' پر ختم
ہوتی ہے جو اس آیت میں ہے: ﴿فَمِنْهُم مَّنْ آمَنَ بِهِ وَمِنْهُم مَّن صَدَّعَنْهُ﴾ (النساء ۵۵) اور دوسری منزل حَبِطَتْ کی
''ت'' پر ختم ہوتی ہے جو سورۂ اعراف کی آیت: ﴿أُولَٰئِكَ حَبِطَتْ﴾ (الاعراف ۴۷) میں ہے اور تیسری منزل اکلھا کے
آخری ''ا'' پر جو سورۂ رعد (۳۵) میں ہے اور چوتھی منزل جَعَلْنَا کے ''ا'' پر جو سورۂ حج کی آیت جَعَلْنَا مَنسَكًا (۶
۶۷) میں ہے اور پانچویں منزل مُؤْمِنَةٍ کی ''ۃ'' پر جو احزاب میں آیت: ﴿وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَا مُؤْمِنَةٍ﴾ (۳۶) میں ہے
اور چھٹی منزل السَّوْءِ کی ''ؤ'' پر سورۂ فتح کی آیت (۶) الظَّانِّينَ بِاللَّهِ ظَنَّ السَّوْءِ میں ہے اور ساتویں منزل قرآن
پاک کے خاتمہ پر ہے۔

ابو محمد سلام حمانی کا بیان ہے کہ ہم نے چار مہینے کی متواتر محنت سے یہ سب باتیں معلوم کر کے حجاج کو بتائیں۔ حجاج کا
معمول تھا کہ ہر رات پاؤ قرآن شریف پڑھا کرتا تھا۔ اس لحاظ سے پاؤ قرآن شریف سورۂ انعام کے خاتمہ پر ہوتا ہے اور
آدھا سورۂ کہف (۱۹) کے لفظ وَلْيَتَلَطَّفْ پر اور پونا سورۂ زمر کے خاتمہ پر اور پورا پورے قرآن پر۔ شیخ ابو عمرو دانی نے اپنی
کتاب البیان میں ان باتوں میں بھی اختلاف بیان کیا ہے۔

رہے قرآن شریف کے پڑھنے کے اعتبار سے حصے اور اجزاء۔ سو مشہور تو تیس پارے ہیں اور ایک حدیث میں صحابہ
کرام کا قرآنِ کریم کو سات منزلیں کر کے پڑھنے کا بیان ہے۔ مسند احمد، سنن ابوداؤد اور ابن ماجہ میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ
وسلم کی حیات میں صحابہؓ سے پوچھا گیا کہ آپ قرآن کے وظیفے کس طرح کرتے ہیں؟ تو فرمایا کہ پہلی تین سورتوں کی ایک
منزل۔ پھر ان کے بعد پانچ سورتوں کی دوسری منزل۔ پھر ان کے بعد سات سورتوں کی تیسری منزل۔ پھر ان کے بعد نو
سورتوں کی چوتھی منزل۔ پھر ان کے بعد گیارہ سورتوں کی پانچویں منزل۔ پھر ان کے بعد کی تیرہ سورتوں کی چھٹی منزل اور
مفصل کی یعنی سورۂ ق سے لے کر آخر تک کی ایک منزل۔ (احمد)

لفظ سورہ کی تحقیق ☆

سورت کی لفظی بحث کے بیان میں بعض تو کہتے ہیں کہ اس کے معنی علیحدگی، بلندی کے ہیں۔ چنانچہ نابغہ کے ایک
شعر میں سورۃ کا لفظ اس معنی میں آیا ہے تو اس معنی کا تعلق قرآن کی سورتوں کے ساتھ اس طرح ہوگا کہ گویا قرآن پڑھنے والا
ایک منزل سے دوسری منزل کی طرف جاتا رہتا ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ شرافت اور اونچائی کے معنی میں ہے۔ اسی لیے
شہر پناہ کو عربی میں ''سور'' کہتے ہیں اور بعض کہتے ہیں کہ برتن میں جو حصہ باقی رہ جائے اسے عربی میں ''اسآرہ'' کہتے ہیں
اور سورہ کا لفظ اسی سے لیا گیا ہے۔ چونکہ سورہ بھی قرآن کا ایک حصہ اور ٹکڑا ہوتی ہے۔ ہمزہ کی تخفیف کر دی گئی ہے پھر ہمزہ کو
واؤ سے بدل دیا گیا۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ سورۃ کے معنی تمام و کمال کے ہیں۔ پوری اونٹنی کو عربی زبان میں سورہ کہتے ہیں
اور یہ بھی ممکن ہے کہ جس طرح قلعہ کو عربی میں اسے لیے سور کہتے ہیں کہ محلوں اور گھروں کو احاطہ کر لیتا ہے اور انہیں جمع کر لیتا
ہے اسی طرح چونکہ آیتوں کو سورۃ جمع کر لیتی ہے اور ان کا احاطہ کر لیتی ہے اس کو بھی سورۃ کہا گیا ہے۔ سورۃ کی جمع ''سُوَرٌ''
آتی ہے، کبھی سوراتٌ اور سواراتٌ بھی آتی ہے۔

آیت کی وجہ تسمیہ ☆

آیت کو آیت اس وجہ سے کہتے ہیں کہ آیت کے لفظی معنی علامت اور نشانی کے ہیں۔ چونکہ آیت پر کلام ختم ہوتا ہے اور اوّل آخر سے جدا ہوتا ہے اس لیے اسے آیت کہتے ہیں۔ قرآن میں بھی آیت علامت اور نشان کے معنی میں ارشاد ہے: ﴿اِنَّ اٰیَةَ مُلْكِهٖ﴾ (البقرۃ: ۲۴۸) یعنی اس کے بادشاہ ہونے کی نشانی اور علامت۔ اس طرح نابغہ کے شعر میں بھی آیت اس معنی میں ہے اور آیت کے معنی جماعت اور گروہ کے بھی آتے ہیں۔ عرب کے شعروں میں یہ لفظ اس معنی میں آیا ہے۔ چونکہ آیت بھی حروف کی ایک جماعت اور گروہ ہے اس روایت سے اسے بھی آیت کہتے ہیں اور آیت کے معنی عجیب کے بھی ہیں۔ چونکہ یہ عجیب چیز ہے' معجزہ ہے' تمام انسان اس جیسی بات نہیں کہہ سکتے' ان لیے بھی اسے آیت کہتے ہیں۔ سیبویہ کہتے ہیں یہ اَیَیَةٌ تھا جیسے اَکَمَةٌ اور شَجَرَةٌ۔ پہلی یا عربی کے قاعدے کے مطابق الف بن گئی۔ کسائی کا قول ہے کہ آیت کی اصل: اَیِیَةٌ تھی جیسے اٰمِنَةٌ اٰیَتَةٌ کی یا الف ہوگئی اور التباس کی وجہ سے گرگئی۔ فراء کہتے ہیں یہ اصل میں ایّۃٌ تھا۔ پھر تشدید کی وجہ سے الف سے بدل دیا گیا۔ اٰیَةٌ ہوگیا۔ آیت کی جمع اٰیٌ' ایایٌ اور ایاتٌ آتی ہے۔

کلمہ کی تعریف ☆

کلمہ کہتے ہیں ایک لفظ کو۔ کبھی تو اس کے دو ہی حرف ہوتے ہیں جیسے مَا اور لَا اور لَهٗ وغیرہ اور کبھی زیادہ بھی ہوتے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ دس حروف ایک کلمہ میں ہوتے ہیں۔ جیسے لَیَسْتَخْلِفَنَّهُمْ اور اَنُلْزِمُكُمُوْهَا اور فَاَسْقَیْنٰكُمُوْهُ اور کبھی ایک ہی کلمہ کی ایک آیت ہوتی ہے۔ جیسے وَالْفَجْرِ اور وَالضُّحٰی اور وَالْعَصْرِ اور اسی طرح الٓمّٓ اور طٰهٰ اور یٰسٓ اور حٰمٓ۔ کوفیوں کے قول میں حٰمٓ عسٓقٓ۔ ان کے دو کلمہ ہیں اور ان کے سوا اور لوگ کہتے ہیں کہ یہ آیتیں نہیں بلکہ سورتوں کے شروع ہیں۔ ابوعمرودانی فرماتے ہیں کہ ایک کلمہ کی آیت قرآن کریم میں سوا مُدْهَآمَّتٰنِ کے جو سورہ رحمٰن میں ہے اور کوئی نہیں۔

فصل ☆ قرطبی فرماتے ہیں کہ عربی زبان کے سوا عجمی ترکیب تو قرآن میں ہے ہی نہیں۔ البتہ عجمی نام ہیں جیسے ابراہیم' نوح' لوط اور اس میں اختلاف ہے کہ کیا قرآن میں اس کے سوا بھی کچھ عجمی ہے؟ تو باقلانی اور طبری نے تو صاف انکار کر دیا ہے اور کہہ دیا ہے کہ عجمیت کے مطابق جو ہے وہ حقیقت میں عربی ہی ہے' لیکن موافقت ہے۔

سورہ فاتحہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم: اس سورت کا نام سورۂ فاتحہ ہے۔ فاتحہ کہتے ہیں شروع کرنے کو چونکہ قرآنِ کریم میں سب سے پہلے یہی سورت لکھی ہے' اس لیے اسے سورۂ فاتحہ کہتے ہیں اور اس لیے بھی کہ نماز میں قراءت بھی اسی سے شروع ہوتی ہے۔ اس کا نام ام الکتاب بھی ہے۔ جمہور یہی کہتے ہیں۔ حسن اور ابن سیرین اس کے قائل نہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ لوح محفوظ کا نام ام الکتاب ہے اور حسن کا قول ہے کہ محکم آیتوں کو ام الکتاب کہتے ہیں۔ ترمذی کی ایک صحیح حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ﴾ پوری سورۃ تک یہی ام القرآن ہے اور ام الکتاب ہے اور سبع مثانی ہے اور قرآنِ عظیم ہے۔ (بخاری کتاب التفسیر)

اس سورۃ کا نام سورۃ الحمد اور سورت الصلوۃ بھی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ میں نے صلوۃ کو (یعنی سورۂ فاتحہ کو) اپنے اور اپنے بندوں کے درمیان آدھوں آدھ تقسیم کردیا ہے۔ جب بندہ کہتا ہے۔ ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ﴾ تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میرے بندے نے میری تعریف کی۔ (مسلم) اس حدیث سے معلوم ہوا کہ سورۂ فاتحہ کا نام صلوٰۃ بھی ہے۔ اس لیے کہ اس سورت کا نماز میں پڑھنا شرط ہے۔ اس سورت کا نام سورت الشفا بھی ہے۔ دارمی میں حضرت ابوسعیدؓ سے مرفوعاً روایت ہے کہ سورۂ فاتحہ ہر زہر کی شفاء ہے اور اس کا نام سورۃ الرقیہ بھی ہے۔ (دارمی) حضرت ابوسعیدؓ نے جب سانپ کے کاٹے ہوئے شخص پر اس سورت کو پڑھ کر دم کیا اور وہ اچھا ہو گیا۔ تب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا: تمہیں کیسے معلوم ہو گیا کہ یہ رقیہ ہے۔ یعنی پڑھ کر پھونکنے کی سورت ہے۔ (بخاری)

ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما اسے اساس القرآن کہتے تھے۔ یعنی قرآن کی جڑ اور نیو اور اس سورت کی نیو آیت: بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ہے۔ سفیان بن عیینہ فرماتے ہیں کہ اس کا نام وافیہ ہے۔ یحیٰی بن کثیر کہتے ہیں کہ اس کا نام کافیہ بھی ہے۔ اس لیے کہ یہ اپنے ماسوا سے کفایت کرتی ہے اور دوسری کوئی سورت اس سورت سے کفایت نہیں کرتی۔ بعض مرسل حدیثوں میں بھی یہ مضمون آیا ہے کہ ام القرآن سب کا عوض بن سکتی ہے لیکن ام القرآن کا غیر ام القرآن عوض نہیں ہو سکتا۔ اسے سورۃ الصلوٰۃ اور سورۃ الکنز بھی کہا گیا ہے۔ زمخشری کی تفسیر کشاف دیکھیے۔ ابن عباسؓ، قتادہؒ و ابوالعالیہ فرماتے ہیں کہ یہ سورت مکی ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ، مجاہدؒ، عطاء بن یسار اور زہری فرماتے ہیں کہ سورت مدنی ہے اور یہ بھی ایک قول ہے کہ یہ سورت دو مرتبہ نازل ہوئی' ایک مرتبہ مکہ میں اور دوبارہ مدینہ میں لیکن پہلا قول ہی زیادہ بہتر ہے۔ اس لیے دوسری آیت میں ہے: ﴿وَلَقَدْ اٰتَیْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِیْ﴾ (الحجر ۸۷) یعنی ہم نے سبع مثانی سات آیتیں دوہرائی جانے والی دی ہیں' واللہ اعلم۔ ابواللیث سمرقندیؒ کا قول قرطبیؒ نے یہ نقل کیا ہے کہ اس سورت کا نصف تو مکہ شریف میں نازل ہوا اور آخری آدھا حصہ مدینہ شریف میں نازل ہوا لیکن یہ قول بالکل غریب ہے۔

الٓمّٓ ①

اس کی آیتوں کی نسبت اتفاق ہے کہ سات ہیں لیکن عمرو بن عبید نے آٹھ اور حسین جعفی نے چھ بھی کہی ہیں اور یہ دونوں قول شاذ ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ اس سورت کی مستقل آیت ہے یا نہیں؟ اس میں اختلاف ہے۔ تمام کوفی قاری اور صحابہؓ اور تابعینؒ کی ایک جماعت اور پچھلے بہت سارے بزرگ تو اسے سورۂ فاتحہ کی ایک پوری اور مستقل آیت کہتے ہیں۔ بعض اسے اس کا جزو مانتے ہیں اور بعض سرے سے اس آیت کو اس کے شروع میں مانتے ہی نہیں جیسا کہ مدینہ شریف کے قاریوں اور فقیہوں کے یہ تینوں اقوال ہیں۔ اس کی تفصیل ان شاء اللہ آگے آئے گی۔ اس سورت کے کلمات پچیس ہیں اور حروف ایک سو تیرہ ہیں۔

امام بخاریؒ کتاب التفسیر کے شروع میں صحیح بخاری کے اندر لکھتے ہیں: امّ الکتاب اس سورت کا نام اس لیے ہے کہ قرآن شریف کی کتابت اسی سے شروع ہوتی ہے۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ چونکہ تمام قرآن شریف کے مضامین اجمالی طور پر اس میں ہیں' اس لیے اس کا نام امّ الکتاب ہے اور عرب کی عادت ہے کہ ہر ایک جامع کام اور کام کی جڑ کو جس کی شاخیں اور اجزاء اسی کے تابع ہوں' امّ کہتے ہیں۔ دیکھئے امّ الراس اس جلد کو کہتے ہیں جو دماغ کی جامع ہے اور لشکری جھنڈے اور نشان کو بھی' جس کے نیچے لوگ جمع ہوتے ہیں' اُم کہتے ہیں۔ شعراء کے اشعار میں بھی اس کا ثبوت ملتا ہے۔ مکہ شریف کو امّ القریٰ کہنے کی بھی یہی وجہ ہے کہ وہ سب سے پہلے ہے اور سب کا جامع ہے۔ زمین وہیں سے پھیلائی گئی ہے چونکہ اس سے نماز کی قراءت شروع ہوتی ہے اور قرآن شریف کے لکھنے کے وقت بھی صحابہؓ نے اسی کو پہلے لکھا۔ اس لیے اسے فاتحہ بھی کہتے ہیں۔ اس کا صحیح نام سبع مثانی بھی ہے۔ اس لیے کہ وہ بار بار نماز میں پڑھی جاتی ہے۔ ہر رکعت میں اسے پڑھا جاتا ہے اور مثانی کے معنی اور بھی ہیں جو ان شاء اللہ تعالیٰ اپنی جگہ بیان ہوں گے' واللہ اعلم۔ مسند احمد میں حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے امّ القرآن کے بارے میں فرمایا: یہ امّ القران ہے' یہی امّ القرآن ہے' یہی سبع مثانی ہے اور یہی قرآنِ عظیم ہے۔ (احمد)

ایک اور حدیث میں ہے' یہی امّ القرآن ہے۔ یہی فاتحۃ الکتاب ہے اور یہی سبع مثانی ہے۔ (احمد) تفسیر مردویہ میں ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ﴾ کی سات آیتیں ہیں۔ ﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ بھی ان میں سے ایک آیت ہے۔ اسی کا نام سبع مثانی ہے۔ یہی قرآنِ عظیم ہے۔ یہی امّ الکتاب ہے۔ یہی فاتحۃ الکتاب ہے۔ دار قطنی میں بھی اسی طرح کی ایک حدیث ہے اور بقول امام دارقطنی اس کے سب راوی ثقہ ہیں۔ بیہقی میں ہے کہ حضرت علیؓ، حضرت ابن عباسؓ، حضرت ابو ہریرہؓ نے سبع مثانی کی تفسیر میں یہی کہا ہے کہ وہ سورۂ فاتحہ ہے اور بسم اللہ...... اس کی ساتویں آیت ہے۔ بسم اللہ کی بحث میں یہ بیان پورا آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔ حضرت ابن مسعودؓ سے کہا گیا کہ آپ نے سورۂ فاتحہ کو اپنے لکھے ہوئے قرآن شریف کے شروع میں کیوں نہیں لکھا؟ تو کہا: اگر میں لکھتا تو ہر سورت کے پہلے اس کو لکھتا۔ ابو بکر بن داؤد فرماتے ہیں' اس قول کا مطلب یہ ہے کہ نماز میں پڑھے جانے کی حیثیت سے اور چونکہ تمام مسلمانوں کو حفظ ہے' اس لیے لکھنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ دلائل النبوۃ میں امام بیہقیؒ نے ایک حدیث کی تخریج کی ہے۔ جس میں ہے کہ یہ سورت سب سے پہلے نازل ہوئی۔ باقلانی نے نقل کیا ہے کہ ایک قول یہ ہے کہ سورۂ فاتحہ سب سے پہلے نازل ہوئی اور دوسرا قول یہ ہے کہ:

﴿ يٰۤاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ﴾ (المدثر:۱) سب سے پہلے نازل ہوئی۔ جیسا کہ صحیح حدیث میں حضرت جابرؓ سے مروی ہے اور تیسرا قول یہ ہے کہ سب سے پہلے ﴿ اِقْرَاْ بِاسْمِ ﴾ (العلق ۱) نازل ہوئی اور یہی صحیح ہے۔ اس کی تفصیل آگے آئے گی' ان شاء اللہ۔

سورۂ فاتحہ کی فضیلت ☆

مسند احمد میں حضرت ابو سعید بن معلّیٰ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نماز پڑھ رہا تھا اور رسول اللہ ﷺ نے مجھے بلایا۔ میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ جب نماز سے فارغ ہو کر میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ ﷺ نے فرمایا: اب تک کس کام میں تھے؟ میں نے کہا: حضور ﷺ نماز میں تھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: کیا اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان تم نے نہیں سنا؟ ﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ ﴾ (الانفال ۲۴) اے ایمان والو! اللہ کے رسول جب تمہیں پکاریں' تم جواب دو۔ اچھا سنو! میں تمہیں مسجد جانے سے پہلے بتلا دوں گا کہ قرآن پاک کی سب سے بڑی سورت کونسی ہے؟ پھر میرا ہاتھ پکڑے ہوئے جب آپ ﷺ نے مسجد سے جانے کا ارادہ کیا تو میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا وعدہ یاد دلایا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: وہ سورت ﴿ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴾ ہے۔ یہی سبع مثانی ہے اور یہی وہ قرآنِ عظیم ہے جو مجھ کو دیا گیا ہے۔ (احمد)

اسی طرح یہ روایت صحیح بخاری شریف' ابوداؤد' نسائی اور ابن ماجہ میں بھی دوسری سندوں کے ساتھ ہے۔

واقدی نے یہ واقعہ حضرت ابی بن کعب کا بیان کیا ہے۔ مؤطا امام مالک میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابی بن کعب کو آواز دی۔ وہ نماز میں تھے۔ فارغ ہو کر آپ ﷺ سے ملے۔ فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ نے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں رکھا' مسجد سے باہر نکل ہی رہے تھے تو فرمایا کہ میں چاہتا ہوں کہ مسجد سے نکلنے سے پہلے میں تجھے ایک ایسی سورت بتاؤں کہ توراۃ' انجیل اور قرآن میں اس کے مثل نہیں۔ اب میں نے اس اُمید پر آہستہ آہستہ چلنا شروع کر دیا اور پوچھا: حضور ﷺ وہ سورت کیا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: نماز کے شروع میں تم کیا پڑھتے ہو؟ میں نے کہا: ﴿ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ...... ﴾ سے پوری سورت تک۔ آپ ﷺ نے فرمایا: یہی سورت ہے' سبع مثانی اور قرآنِ عظیم جو مجھے دیا گیا ہے' وہ بھی یہی ہے۔ (موطا) اس حدیث کے آخری راوی ابو سعیدؒ ہیں۔

اس بناء پر ابن اثیر اور ان کے ساتھ والے یہاں دھوکہ کھا گئے ہیں۔ وہ انہیں ابو سعید بن معلّیٰ سمجھ بیٹھے ہیں۔ یہ ابو سعید دوسرے ہیں' یہ مولیٰ خزاعی ہیں اور تابعین میں سے ہیں اور وہ ابو سعید انصاریؓ صحابی ہیں۔ ان کی حدیث صحیح اور متصل ہے اور یہ حدیث ظاہر میں منقطع معلوم ہوتی ہے۔ اگر ابو سعید تابعی کا حضرت ابیؓ سے سننا ثابت نہ ہو اور اگر سنا ہو تو یہ حدیث شرطِ مسلم پر ہے' واللہ اعلم۔

اس حدیث کے اور بھی بہت سے طرق ہیں' مسند احمد میں ہے کہ حضور ﷺ نے جب انہیں پکارا تو یہ نماز میں تھے۔ التفات کیا مگر جواب نہ دیا۔ آپ ﷺ نے پھر پکارا۔ حضرت اُبیؓ نے نماز ہلکی (مختصر ۱۲) کر دی اور فارغ ہو کر جلدی سے حاضرِ خدمت ہوئے۔ سلام علیک عرض کیا۔ آپ ﷺ نے جواب دیا اور فرمایا: اُبی تم نے مجھے جواب کیوں نہ دیا؟ کہا حضور ﷺ میں نماز میں تھا۔ آپ ﷺ نے وہی آیت پڑھ کر فرمایا: کیا تم نے یہ آیت نہیں سنی؟ کہا: حضور (ﷺ) قصور ہوا'

اب ایسا نہ کروں گا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا تم چاہتے ہو کہ میں تمہیں ایسی سورت بتا دوں کہ تورات' انجیل' زبور اور (حتی کہ) قرآن میں اس جیسی سورت نہیں؟ کہا: ضرور ارشاد فرمائیے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہاں سے جانے سے پہلے تمہیں بتا دوں گا۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم میرا ہاتھ تھامے ہوئے دوسری باتیں کرتے رہے اور میں نے اپنی رفتار دھیمی کر دی کہ ایسا نہ ہو وہ بات رہ جائے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم (مسجد سے باہر) چلے جائیں۔ آخر جب دروازے کے قریب پہنچ گئے تو میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو وعدہ یاد دلایا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نماز میں کیا پڑھتے ہو؟ میں نے ام القرآن پڑھ کر سنائی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: خدا کی قسم! جس کے ہاتھ میں میری جان ہے' تورات' انجیل' زبور اور قرآن میں اس جیسی کوئی اور سورت نہیں۔ یہ سبع مثانی ہے۔ (احمد) ترمذی میں اتنی زیادتی اور بھی ہے کہ یہی وہ بڑا قرآن ہے جو مجھے عطا فرمایا گیا۔ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ حضرت انسؓ سے بھی اس باب میں ایک حدیث مروی ہے۔ (حاکم) مسند احمد کی ایک مطول حدیث میں بھی اسی طرح مروی ہے۔ (احمد) نسائی کی روایت میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ سورت اللہ تعالیٰ اور بندے کے درمیان تقسیم کر دی گئی ہے۔ ترمذی اسے حسن غریب کہتے ہیں۔ مسند احمد میں حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ میں ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت استنجے سے فارغ ہوئے تھے۔ میں نے تین مرتبہ سلام کیا لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ بھی جواب نہ دیا۔ اب آپ صلی اللہ علیہ وسلم گھر تشریف لے گئے۔ میں رنج و غم کی حالت میں مسجد میں چلا گیا۔ تھوڑی دیر میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم طہارت کر کے تشریف لائے اور تین مرتبہ میرے سلام کا جواب دیا' پھر فرمایا: اے ابن عبداللہ جابر سنو' تمام قرآن میں بہترین سورۃ ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ (احمد) ہے۔ اس کی اسناد بہت عمدہ ہیں۔ ابن عقیل جو اس کا راوی ہے' اس کی حدیث بڑے بڑے ائمہ روایت کرتے ہیں اور یہ جابر' عبداللہ سے مراد عبدی صحابیؓ ہیں۔ ابن الجوزی کا یہی قول ہے' واللہ اعلم۔ حافظ ابن عساکرؒ کا قول ہے کہ یہ عبداللہ بن جابر بیاضیؓ ہیں۔

قرآنی آیات وسور اور ان کی باہمی فضیلت ☆

یہ حدیث اور اس جیسی اور احادیث سے استدلال کر کے ابن راہویہ' ابوبکر بن عربی' ابن الحصار وغیرہ اکثر علماء نے کہا ہے کہ بعض آیتیں اور بعض سورتیں بعض پر فضیلت رکھتی ہیں۔ ایک دوسری جماعت کا خیال ہے کہ کلام اللہ کُل کا کُل برابر ہے۔ ایک کو ایک پر فضیلت دینے سے یہ قباحت ہو گی کہ دوسری سورتیں اور آیتیں اس سے کم درجہ کی نظر آئیں گی۔ حالانکہ کلام اللہ سارا کا سارا فضیلت والا ہے۔ قرطبی نے اشعری اور ابوبکر باقلانی اور ابو حاتم ابن حبان بستی اور ابو حیان اور یحییٰ بن یحییٰ سے یہی نقل کیا ہے۔ امام مالکؒ سے بھی ایک روایت میں یہ مذہب منقول ہے (لیکن صحیح اور حدیث کے مطابق پہلا قول ہے' واللہ اعلم' مترجم)

سورۂ فاتحہ کے فضائل میں مندرجہ بالا حدیثوں کے علاوہ اور حدیثیں بھی ہیں۔ صحیح بخاری شریف میں فضائل القرآن میں حضرت ابو سعید خدریؓ سے روایت ہے' ہم لوگ ایک مرتبہ سفر میں تھے' ایک جگہ اُترے ہوئے تھے' ناگہاں ایک لونڈی آئی اور کہا کہ یہاں کے قبیلہ کے سردار کو سانپ نے کاٹ کھایا ہے۔ ہمارے آدمی یہاں موجود نہیں ہیں۔ آپ میں سے کوئی ایسا ہے کہ جھاڑ پھونک کر دے؟ ہم میں سے ایک شخص اُٹھ کر ساتھ ہو لیا۔ ہم نہیں جانتے تھے کہ یہ کچھ جھاڑ پھونک بھی جانتا ہے۔

اُس نے وہاں جا کر کچھ پڑھ کر دَم کیا۔ خدا کے فضل سے وہ بالکل اچھا ہو گیا۔ تیس بکریاں اُس نے دیں اور ہماری مہمانی کے لیے دودھ بھی بہت سارا بھیجا۔ جب وہ واپس آئے تو ہم نے کہا: کیا تم کو اس کا علم یاد تھا؟ (انہوں نے کہا ''نہ'') میں نے تو صرف سورۂ فاتحہ پڑھ کر دم کیا ہے۔ ہم نے کہا: اس آئے ہوئے مال کو ابھی نہ چھیڑو۔ پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مسئلہ پوچھ لو۔ مدینہ میں آ کر ہم نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ذکر کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اسے کیسے معلوم ہو گیا کہ یہ پڑھ کر دم کرنے کی سورت ہے؟ اس مال کے حصے کر لو میرا بھی حصہ لگانا۔ (بخاری) صحیح مسلم شریف اور ابوداؤد میں بھی یہ حدیث ہے۔ مسلم کی بعض روایتوں میں ہے دَم کرنے والے حضرت ابوسعید خدریؓ ہی تھے۔

مسلم اور نسائی میں حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک مرتبہ حضرت جبرئیل بیٹھے ہوئے تھے کہ اُوپر سے ایک زوردار دھماکہ کی آواز آئی۔ جبرئیل نے اوپر دیکھا اور فرمایا: آج آسمان کا وہ دروازہ کھلا ہے جو کبھی نہیں کھلا تھا۔ پھر وہاں سے ایک فرشتہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آتا ہے اور کہتا ہے خوش ہو جائیے۔ دو نور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسے دیئے گئے ہیں جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے کسی نبی کو نہیں دیئے گئے تھے۔ سورۂ فاتحہ اور سورۂ بقرہ کی آخری آیتیں۔ ایک ایک حرف پر ان میں سے نور ہے۔ (مسلم) صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص اپنی نماز میں ام القرآن نہ پڑھے اُس کی نماز ناقص ہے ناقص ہے ناقص ہے پوری نہیں ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ سے پوچھا گیا کہ جب ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے ہوں تو؟ فرمایا: پھر بھی چپکے چپکے پڑھ لیا کرو۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ میں نے نماز کو اپنے اور اپنے بندے کے درمیان آدھا آدھا کر دیا ہے اور میرا بندہ مجھ سے جو مانگتا ہے میں دیتا ہوں۔ جب بندہ کہتا ہے: ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ﴾ تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: حَمِدَنِىْ عَبْدِىْ میرے بندے نے میری تعریف کی۔ پھر بندہ کہتا ہے: ﴿الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اَثْنٰى عَلَىَّ عَبْدِىْ میرے بندے نے میری ثناء بیان کی۔ پھر بندہ کہتا ہے: ﴿مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ﴾ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: مَجَّدَنِىْ عَبْدِىْ یعنی میرے بندے نے میری بزرگی بیان کی۔ بعض روایتوں میں ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے جواب میں فرماتا ہے: فَوَّضَ اِلَىَّ عَبْدِىْ یعنی میرے بندے نے میرے سپرد کر دیا۔ پھر بندہ کہتا ہے: ﴿اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ﴾ تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے یہ ہے میرے اور میرے بندے کے درمیان اور میرا بندہ جو کچھ مجھ سے مانگے گا میں دوں گا۔ پھر بندہ آخر سورت تک پڑھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے یہ سب میرے بندے کے لیے ہے اور یہ جو مانگے گا وہ اس کے لیے ہے۔ (مسلم) نسائی میں یہ روایت ہے۔ بعض روایات کے الفاظ میں کچھ اختلاف بھی ہے۔ ترمذی نے اس حدیث کو حسن کہا ہے۔ ابوزرعہ نے انہیں صحیح کہا ہے۔ (ترمذی) مسند احمد میں بھی یہ حدیث مطوّل موجود ہے۔ اس کے راوی حضرت اُبی بن کعبؓ ہیں۔ (احمد) ابن جریر کی ایک روایت میں اس حدیث میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے یہ میرے لیے ہے اور جو باقی ہے وہ میرے بندہ کے لیے ہے۔ یہ حدیث غریب ہے۔

فوائد ☆ اب اس حدیث کے فائدوں پر نظر ڈالئے۔ اوّل اس حدیث میں لفظ صلوٰۃ یعنی نماز کا اطلاق ہے اور مراد اس سے قراءت ہے جیسے کہ قرآن میں اور جگہ پر ہے۔ ﴿وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ﴾ (بنی اسرائیل ۱۱۰) یعنی اپنی نماز (یعنی

الٓمّٓ ۱

قراءت) کو نہ تو بہت بلند آواز سے پڑھو نہ بہت پست آواز سے بلکہ درمیانی آواز سے پڑھا کرو۔ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے اس کی تفسیر میں صراحت سے مروی ہے کہ یہاں صلوٰۃ سے مراد قراءت ہے اور اسی طرح مندرجہ بالا حدیث میں قراءت کو صلوٰۃ کہا گیا ہے۔ اس سے نماز میں قراءت کی جو عظمت ہے وہ معلوم ہوتی ہے اور ظاہر ہوتا ہے کہ قراءت نماز کا اعلیٰ رکن ہے۔ اس لیے عبادت کا مطلق نام لیا گیا ہے اور اس کے ایک جزو یعنی قراءت کا ارادہ کیا گیا۔ یہ بھی خیال رہے کہ اس کے برخلاف ایسا بھی ہوا ہے کہ قراءت کا اطلاق کیا گیا ہے اور مراد نماز لی گئی۔ فرمان ہے: ﴿ وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ ...... ﴾ (بنی اسرائیل ۷۸) یعنی صبح کے قرآن پر فرشتے حاضر کیے جاتے ہیں۔ (بخاری) یہاں مراد قرآن سے نماز ہے۔ صحیحین کی حدیث میں ہے کہ فجر کی نماز کے وقت رات کے اور دن کے فرشتے جمع ہو جاتے ہیں۔ ان آیات واحادیث سے یہ معلوم ہوا کہ نماز میں قراءت کا پڑھنا ضروری ہے اور علماء کا بھی اس پر اتفاق ہے۔ دوم اس میں اختلاف ہے کہ نماز میں سورۂ فاتحہ کا پڑھنا ہی ضروری ہے یا قرآن میں سے جو کچھ پڑھ لے وہی کافی ہے۔ امام ابوحنیفہؒ اور ان کے ساتھی وغیرہ کہتے ہیں کہ اس کا پڑھنا متعین نہیں بلکہ قرآن میں سے جو کچھ پڑھ لے گا وہ کافی ہوگا۔ ان کی دلیل آیت: ﴿ فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ ﴾ (المزمل ۲۰) ہے۔ یعنی قرآن میں سے جو آسان ہو پڑھ لو۔ صحیحین کی حدیث ہے جس میں ہے کہ حضور ﷺ نے ایک شخص سے جو نماز کو جلدی جلدی پڑھ رہا تھا، فرمایا: جب تو نماز کے لیے کھڑا ہو تو تکبیر کہہ پھر جو قرآن میں سے تجھے آسان نظر آئے پڑھ۔ (بخاری) وہ کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اس شخص کو یہ فرمانا اور سورۂ فاتحہ کی تعیین نہ کرنا بتا رہا ہے کہ جو کچھ قرآن پڑھ لے کافی ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ سورۂ فاتحہ کا پڑھنا ضروری ہے اور اس کے پڑھے بغیر نماز نہ ہوگی۔ ان کے علاوہ اور سب ائمہ کرام کا یہی قول ہے۔ امام مالکؒ، امام شافعیؒ امام احمد بن حنبلؒ اور ان کے سب کے سب شاگرد وغیرہ اور جمہور علماء کرام کا یہی فرمان ہے۔ ان کی دلیل یہ حدیث شریف ہے جو اللہ کے رسول (ﷺ) نے اللہ تعالیٰ ان پر درود و رحمت بھیجے۔ بیان فرمائی ہے کہ جو شخص نماز پڑھے، خواہ کوئی نماز ہو اور اس میں ام القرآن نہ پڑھے، وہ نماز ناقص ہے، پوری نہیں۔ (مسلم) اسی طرح ان بزرگوں کی یہ دلیل بھی ہے جو صحیحین میں حضرت عبادہ بن صامتؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو شخص سورۂ فاتحہ کو نہ پڑھے اس کی نماز نہیں ہے۔ (بخاری) صحیح ابن خزیمہ اور صحیح ابن حبان میں حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول ﷺ نے فرمایا: وہ نماز نہیں ہوتی جس میں ام القرآن نہ پڑھی جائے۔ (ابن ماجہ) ان کے علاوہ اور بھی بہت سی حدیثیں ہیں۔ ہمیں یہاں پر مناظرانہ پہلو اختیار کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ وہ بہت لمبی بحثیں ہیں۔ ہم نے تو مختصراً ان بزرگوں کی دلیلیں بیان کر دیں۔

اب یہ بھی سن لیجئے کہ امام شافعیؒ وغیرہ علماء کرام کی ایک بڑی جماعت کا تو یہ مذہب ہے کہ سورۂ فاتحہ کا ہر ہر رکعت میں پڑھنا واجب ہے اور لوگ کہتے ہیں کہ اکثر رکعتوں میں پڑھنا واجب ہے۔ حسن اور اکثر بصرہ کے لوگ کہتے ہیں کہ نمازوں میں کسی ایک رکعت میں اسکا پڑھ لینا واجب ہے۔ اسلئے کہ حدیث میں نماز کا ذکر مطلق ہے۔ ابوحنیفہؒ ان کے ساتھی ثوریؒ اور اوزاعی کہتے ہیں کہ اس کا پڑھنا متعین ہی نہیں بلکہ اور کچھ بھی پڑھ لے تو کافی ہے کیونکہ قرآن میں مَا تَيَسَّرَ کا لفظ ہے، واللہ اعلم لیکن یہ خیال رہے کہ ابن ماجہ کی حدیث میں ہے کہ جو شخص فرض وغیرہ نماز کی ہر ہر رکعت میں

سورۂ فاتحہ اور سورت نہ پڑھے اُسکی نماز نہیں۔ (ابن ماجہ) البتہ اس حدیث کی صحت میں نظر ہے اور ان سب باتوں کی تفصیل کا موقعہ احکام کی بڑی بڑی کتابیں ہیں' واللہ اعلم۔ سوم: مقتدی پر سورۂ فاتحہ کے واجب ہونے کے مسئلے میں علماء کے تین اقوال ہیں۔ ایک تو یہ کہ سورۂ فاتحہ کا پڑھنا جس طرح امام پر واجب ہے' اسی طرح مقتدی پر واجب ہے۔ اس کی دلیل وہ عام حدیثیں ہیں' جو ابھی دوسرے فائدے کے بیان میں گزر چکیں۔ دوسرا یہ کہ سرے سے مقتدی کے ذمے قراءت واجب ہی نہیں' نہ یہ سورت نہ کچھ اور۔ نہ جہری نماز میں' نہ سری نماز میں۔ ان کی دلیل مسند احمد کی۔ حدیث ہے جس میں حضور ﷺ نے فرمایا: جس کا امام ہو تو امام کی قراءت اس کی قراءت ہے۔ (احمد) لیکن یہ روایت ضعیف[1] ہے اور یہ خود حضرت جابرؓ کے قول سے مروی ہے۔ گو اس مرفوع حدیث کی اور بھی سندیں ہیں لیکن کوئی سند صحیح نہیں' واللہ اعلم۔

تیسرا قول یہ ہے کہ جن نمازوں میں امام آہستگی سے قراءت کرے۔ ان میں تو مقتدی پر قراءت واجب ہے لیکن کوئی سند صحیح نہیں' واللہ اعلم۔ لیکن جن نمازوں میں اُونچی قراءت پڑھی جاتی ہے ان میں واجب نہیں۔ ان کی دلیل صحیح مسلم والی حدیث ہے کہ امام اسی لیے مقرر کیا گیا ہے کہ اس کی اقتداء کی جائے اس کی تکبیر سن کر تکبیر کہو اور جب وہ پڑھے تم چپ رہو۔ (مسلم) سنن میں بھی یہ حدیث ہے۔ (ابوداؤد) امام مسلم نے اس کی تصحیح کی ہے۔ امام شافعیؒ کا پہلا قول یہی ہے اور امام احمد سے بھی ایک روایت ہے۔

ہماری غرض ان مسائل کو یہاں بیان کرنے سے یہ ہے کہ سورۂ فاتحہ کے ساتھ احکام کا جس قدر تعلق ہے کسی اور سورت کے ساتھ نہیں۔ مسند بزار میں حدیث ہے حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ جب تم بستر پر لیٹو تو سورۂ فاتحہ اور سورۂ اخلاص پڑھ لو تو موت کے سوا ہر چیز سے امن میں ہو گے۔

اعوذ باللہ کی تفسیر اور اِس کے احکام ☆

قرآنِ پاک میں ہے: ﴿ خُذِ الْعَفْوَ ﴾ (الاعراف: ۱۹۹) یعنی درگزر کرنے کی عادت رکھو۔ بھلائی کا حکم کیا کرو اور جاہلوں سے منہ موڑ لیا کرو۔ اگر شیطان کی طرف سے کوئی وسوسہ آ جائے تو اللہ تعالیٰ سننے والے' جاننے والے سے پناہ طلب کیا کرو اور جگہ فرمایا: ﴿ اِدْفَعْ بِالَّتِیْ ﴾ (المؤمنون: ۹۶) برائی کو بھلائی سے ٹال دو۔ ہم ان کے بیانات کو خوب جانتے ہیں' کہا کرو کہ خدایا شیطان کے وسوسوں اور ان کی حاضری سے ہم تیری پناہ چاہتے ہیں اور جگہ ارشاد ہوتا ہے: ﴿ اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِیْ...... ﴾ (حم السجدۃ: ۳۴) یعنی بھلائی کے ساتھ دفع کرو۔ تم میں اور جس دوسرے شخص سے عداوت ہو گی وہ ایسا ہو جائے گا جیسے دلی دوست۔ یہ کام صبر کرنے والوں اور خوش قسمتوں کا ہے۔ جب شیطانی وسوسہ آ جائے تو اللہ تعالیٰ سننے والے' جاننے والے سے پناہ چاہو۔ یہ تین آیتیں ہیں اور اس کے معنی کی کوئی اور آیت نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان آیتوں

---

[1] ابن ہمام نے اسی حدیث کو احمد بن منیع کے مسند سے علی شرط شیخین صحیح ثابت کیا ہے۔ اس لیے اس حدیث کو ضعیف کہنا بڑی زیادتی ہے اور پھر احناف کے مسلک کا دارومدار صرف یہی حدیث نہیں ہے بلکہ احادیث قوی کا حنفیہ کے پاس اسی سلسلہ میں کافی مواد موجود ہے اور سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ قرآنی آیت صاف طور پر احناف ہی کے مذہب کی تائید ہے۔ ۱۲

میں حکم فرمایا ہے کہ انسانوں میں سے جو تمہاری دشمنی کرے اُس کی دشمنی کا علاج تو یہ ہے کہ اس کے ساتھ سلوک واحسان کرو۔ تاکہ اس کی انصاف پسند طبیعت خود اسے شرمندہ کردے اور وہ تمہاری دشمنی سے نہ صرف باز رہے بلکہ تمہارا بہترین دوست بن جائے اور شیاطین کی دشمنی سے محفوظ رہنے کے لیے اس نے اپنی پناہ سکھائی۔ کیونکہ یہ پلید دشمن سلوک اور احسان سے بھی قبضہ میں نہیں آتا۔ اسے تو انسان کی تباہی اور بربادی میں ہی مزہ آتا ہے اور اس کی پرانی عداوت باوا آدمؑ کے وقت سے ہے۔ قرآن فرماتا ہے: اے نبی آدم! دیکھو کہیں شیطان تمہیں بھی بہکا نہ دے۔ جس طرح تمہارے ماں باپ کو بہکا کر جنت سے نکلوا دیا اور جگہ فرمایا کہ شیطان تمہارا دشمن ہے اسے دشمن ہی سمجھو۔ اس کی جماعت کی تو یہی آرزو ہے کہ تم جہنمی ہو جاؤ اور جگہ فرمایا:

کیا تم اس شیطان کی اور اس کی ذریات کی دوستی کرتے ہو مجھے چھوڑ کر؟ وہ تمہارا دشمن ہے۔ یاد رکھو ظالموں کے لیے برا بدلہ ہے۔ یہی ہے جس نے قسم کھا کر ہمارے باپ حضرت آدم علیہ السلام سے کہا تھا کہ میں تمہارا خیر خواہ ہوں تو اب خیال کر لیجئے کہ ہمارے ساتھ اس کا کیا معاملہ ہوگا؟ ہمارے لیے تو وہ حلف اُٹھا کر آیا ہے کہ عزت خداوندی کی قسم میں ان سب کو بہکاؤں گا۔ ہاں! ان میں سے جو مخلص بندے ہیں وہ محفوظ رہیں گے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ فَإِذَا قَرَأْتَ الْقُرْآنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ﴾ (النحل ۹۸) جب قرآن کی تلاوت کرو تو اللہ تعالیٰ سے پناہ طلب کر لیا کرو۔ شیطان راندے ہوئے سے۔ ایماندار توکل والوں پر اس کا کوئی زور نہیں۔ اس کا زور تو انہیں پر ہے جو اس سے دوستی رکھیں اور خدا کے ساتھ شرک کریں۔

قاریوں کی ایک جماعت تو کہتی ہے کہ قرآن پڑھ چکنے کے بعد اعوذ ...... پڑھنی چاہیے۔ اس میں دو فائدے ہیں: ایک تو قرآن کے طرز بیان پر عمل، دوسرے عبادت کے بعد غرور کا توڑ۔ ابو حاتم سجستانی اور ابن فلوفا نے حمزہ کا یہی مذہب نقل کیا ہے جیسے کہ ابو القاسم یوسف بن علی جناوہ نے اپنی کتاب العبادہ الکامل مین بیان کیا ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے بھی یہی مروی ہے لیکن اسناد غریب ہے۔ رازی نے اپنی تفسیر میں اسے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ ابراہیم نخعی، داؤد ظاہری کا بھی یہی قول ہے۔ قرطبی نے امام مالکؒ کا مذہب بھی یہی بیان کیا ہے لیکن ابن العربی اسے غریب کہتے ہیں۔ ایک مذہب یہ بھی ہے کہ اوّل آخر دونوں مرتبہ اعوذ ...... پڑھے تاکہ دونوں دلیلیں جمع ہو جائیں اور جمہور علماء کا مشہور مذہب یہ ہے کہ تلاوت سے پہلے اعوذ ...... پڑھنا چاہیے تاکہ وسوسے دُور ہو جائیں۔ تو ان بزرگوں کے نزدیک آیت کے معنی "جب پڑھے تو" یعنی "پڑھنا چاہے تو" ہو جائیں گے جیسے کہ آیت: ﴿ إِذَا قُمْتُمْ ...... ﴾ (المائدہ:۶) یعنی جب تم نماز کے لیے کھڑے ہو (تو وضو کر لیا کرو) کے معنی جب تم نماز کے لیے کھڑے ہونے کا ارادہ کرو کے ہیں۔ حدیثوں کی رُو سے بھی یہی معنی ٹھیک معلوم ہوتے ہیں۔ مسند احمد کی حدیث میں ہے جب رسول اللہ ﷺ رات کو نماز کے لیے کھڑے ہوتے تو "اللہ اکبر" کہہ کر نماز شروع کرتے۔ پھر: سبحانك اللهم وبحمدك و تبارك اسمك و تعالى جدك ولا اله غيرك تین مرتبہ پڑھتے۔ پھر فرماتے: اعوذ بالله السمع العليم من الشيطان الرجيم من همزه و نفخه و نفثه۔ سنن اربع میں بھی یہ حدیث ہے۔ (احمد) امام ترمذیؒ فرماتے ہیں اس باب میں سب سے زیادہ مشہور یہی ہے۔

ہمزہ کے معنی گلا گھونٹنے کے اور نفخ کے تکبر کے اور نفث کے معنی شعر گوئی کے ہیں۔ ابن ماجہ کی ایک روایت میں یہی معنی بیان کیے گئے ہیں اور اس میں ہے کہ حضور ﷺ نماز میں داخل ہوتے ہیں تین مرتبہ '' اللہ اکبر کبیرًا ''تین مرتبہ ''الحمد للہ کثیرًا'' اور تین مرتبہ سبحان اللہ بکرۃً واصیلا پڑھتے۔ پھر یہ پڑھتے: اللّٰھم انی اعوذبك من الشیطان من ھمزہ و نفخہ و نفثہ۔ (ابوداؤد) ابن ماجہ میں یہ روایت اور سند کے ساتھ مختصر بھی آئی ہے۔ مسند احمد کی حدیث میں ہے کہ آپ پہلے تین مرتبہ تکبیر کہتے پھر تین مرتبہ ''سبحان اللہ وبحمدہ'' کہتے پھر اعوذ باللہ پڑھتے۔ (احمد) مسند ابو یعلیٰ میں ہے کہ حضور ﷺ کے سامنے دو اشخاص لڑنے جھگڑنے لگے' غصہ کے مارے ایک کے نتھنے پھول گئے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اگر یہ اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم کہہ لے تو اس کا غصہ ابھی جاتا رہے۔ نسائی نے اپنی کتاب ''الیوم واللیلہ'' میں بھی اسے روایت کیا ہے۔ مسند احمد' ابوداؤد' ترمذی میں بھی یہ حدیث ہے۔ اس کی ایک روایت میں اتنی زیادتی اور بھی ہے کہ حضرت معاذؓ نے اس شخص سے اس کے پڑھنے کو کہا لیکن اس نے نہ پڑھا اور اس کا غصہ بڑھتا ہی گیا۔ امام ترمذیؒ فرماتے ہیں' یہ زیادتی والی روایت مرسل ہے۔ اس لیے کہ عبدالرحمٰن بن ابو لیلیٰ جو حضرت معاذؓ سے اسے روایت کرتے ہیں' ان کا حضرت معاذؓ سے ملاقات کرنا ثابت نہیں بلکہ یہ بیس برس پہلے فوت ہو چکے تھے۔ لیکن یہ ہوسکتا ہے کہ شاید عبدالرحمٰن نے حضرت اُبی بن کعبؓ سے سنا ہو۔ وہ بھی اس حدیث کے راوی ہیں اور اسے حضرت معاذؓ تک پہنچایا ہو کیونکہ اس واقعہ کے وقت تو بہت سے صحابہ موجود تھے۔ صحیح بخاری' صحیح مسلم' ابوداؤد' نسائی میں بھی مختلف سندوں سے مختلف الفاظ کے ساتھ یہ حدیث مروی ہے۔ استعاذہ کے متعلق اور بھی بہت حدیثیں ہیں۔ یہاں سب کو بیان کرنے سے طول ہوگا۔ ان کے بیان کرنے کے لیے اذکار و وظائف کی اور فضائل اعمال کے بیان کی کتابیں ہیں' واللہ اعلم۔

ایک روایت میں ہے کہ جبرئیل علیہ السلام محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر جب سب سے پہلے وحی لے کر آئے تو پہلے اعوذ پڑھنے کا حکم دیا۔ تفسیر ابن جریر میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ پہلے پہل حضرت جبرئیل محمد (ﷺ) پر وحی لے کر آئے تو فرمایا اعوذ ..... پڑھیے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: استعیذ باللہ السمیع العلیم من الشیطن الرجیم۔ پھر جبرئیل علیہ السلام نے کہا' کہیے: بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ پھر کہا: ﴿ اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ ﴾ (العلق: ۱) حضرت عبداللہؓ فرماتے ہیں' سب سے پہلی سورت جو اللہ تعالیٰ نے حضرت جبرئیل کی معرفت محمد ﷺ پر نازل فرمائی' یہی ہے لیکن یہ اثر غریب ہے اور اس کی اسناد میں ضعف اور انقطاع ہے۔ ہم نے اسے صرف اس لیے بیان کیا ہے کہ معلوم رہے' واللہ اعلم۔

مسئلہ ☆ جمہور علماء کا قول ہے کہ اعوذ پڑھنا مستحب ہے' واجب نہیں کہ اس کے نہ پڑھنے سے گناہ ہو۔ عطاء بن ابی رباحؒ کا قول ہے کہ جب کبھی قرآن پڑھے استعاذہ کا پڑھنا واجب ہے' خواہ نماز میں خواہ غیر نماز میں۔ امام رازیؒ نے یہ قول نقل کیا ہے۔ ابن سیرینؒ فرماتے ہیں کہ عمر بھر میں صرف ایک مرتبہ پڑھ لینے سے وجوب ساقط ہو جاتا ہے۔ حضرت عطاء کے قول کی دلیل آیت کے ظاہری الفاظ ہیں کیونکہ اس میں فاستعذ امر ہے اور عزیمت کے قواعد کے لحاظ سے امر وجوب کے لیے ہوتا ہے۔ اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اس پر ہمیشگی کرنا بھی وجوب کی دلیل ہے اور اس سے شیطان کا شر دور ہوتا

ہے اور اس کا دُور کرنا واجب ہے اور جس چیز سے واجب پورا ہوتا ہے وہ بھی واجب ہو جاتی ہے اور استعاذہ زیادہ احتیاط والا ہے اور وجوب کا ایک طریقہ یہ بھی ہے۔ بعض علماء کا قول ہے کہ اعوذ...... پڑھنا حضور پر واجب تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت پر واجب نہیں۔ امام مالکؒ سے یہ بھی روایت کی جاتی ہے کہ فرض نماز میں اعوذ ...... پڑھے اور رمضان شریف کی اول رات کی نماز میں اعوذ...... پڑھ لے۔

مسئلہ ☆ امام شافعیؒ املا میں لکھتے ہیں کہ اعوذ زور سے پڑھے اور اگر پوشیدہ پڑھے تو کوئی حرج نہیں اور امام حنبلؒ لکھتے ہیں کہ بلند اور آہستہ پڑھنے میں اختیار ہے۔ اس لیے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے پوشیدہ پڑھنا اور حضرت ابو ہریرہؓ سے اونچی آواز سے پڑھنا ثابت ہے۔ پہلی رکعت کے سوا اور رکعتوں میں اعوذ پڑھنے میں امام شافعیؒ کے دو اقوال ہیں: ایک مستحب ہونے کا اور دوسرا مستحب نہ ہونے کا اور ترجیح دوسرے قول ہی کو ہے' واللہ اعلم۔ صرف اعوذ باللّٰہ من الشیطن الرجیم کہہ لینا امام شافعیؒ اور امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک تو کافی ہے لیکن بعض کہتے ہیں: اعوذ باللّٰہ السمیع العلیم من الشیطان الرجیم پڑھے اور بعض کہتے ہیں: اعوذ باللّٰہ من الشیطن الرجیم ان اللّٰہ ھو السمیع العلیم پڑھے اور اوزاعیؒ کا یہی مذہب ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ: استعیذ باللّٰہ من الشیطن الرجیم پڑھے تاکہ آیت کے پورے الفاظ پر عمل ہو جائے اور ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث پر بھی عمل ہو جائے جو پہلے گزر چکی لیکن جو صحیح حدیثیں پہلے گزر چکیں وہی اتباع میں اولیٰ ہیں' واللہ اعلم۔ نماز میں اعوذ پڑھنا ابو حنیفہؒ اور محمدؒ کے نزدیک تو تلاوت کے لیے ہے اور ابو یوسفؒ کے نزدیک نماز کے لیے ہے تو مقتدی کو بھی پڑھ لینا چاہیے اگرچہ وہ قراءت نہیں پڑھے اور عید کی نماز میں پہلی تکبیر کے بعد پڑھ لینا چاہیے۔ جمہور کا مذہب ہے کہ عید کی تکبیریں کل کہہ کر پھر اعوذ پڑھے پھر قراءت پڑھے گا۔

"اعوذ" کے فوائد کا بیان ☆

اعوذ میں عجیب وغریب فوائد ہیں۔ واہی تباہی باتوں سے مُنہ میں جس قدر ناپاکی ہوتی ہے وہ اس سے دُور ہو جاتی ہے اور مُنہ کلام اللہ کی تلاوت کے قابل ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اس میں اللہ تعالیٰ سے امداد طلب کرنی ہے اور اس کی عظیم الشان قدرتوں کا اقرار کرتا ہے اور اس باطنی کھلے ہوئے دشمن کے مقابلہ میں اپنی کمزوری اور عاجزی کا اقرار ہے کیونکہ انسانی دشمن کا مقابلہ ہو سکتا ہے احسان اور سلوک سے اس کی دشمنی دفع ہو سکتی ہے جیسے کہ قرآنِ پاک کی اُن تین آیتوں میں ہے جو پہلے بیان ہو چکی ہیں اور جگہ ارشادِ خداوندی ہے: ﴿اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَكَ عَلَیْهِمْ سُلْطٰنٌ......﴾ (الحجر:۴۲) یعنی میرے خاص بندوں پر تیرا کوئی غلبہ نہیں۔ رب کی وکالت کافی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے دشمنانِ اسلام کے مقابلے میں اپنے پاک فرشتے بھیجے اور انہیں نیچا دکھا دیا۔ یہ یاد رکھنے کے قابل امر ہے کہ جو مسلمان کافروں کے ہاتھ سے مارا جائے' وہ شہید ہے لیکن جو اس باطنی دشمن کے ہاتھ سے مارا جائے وہ راندۂ درگاہ ہے۔ جس پر کفار غالب آ جائیں وہ اَجر پاتا ہے لیکن جس پر شیطان غالب آ جائے وہ ہلاک و برباد ہوتا ہے چونکہ شیطان انسان کو دیکھتا ہے اور انسان اسے نہیں دیکھ سکتا اس لیے قرآنی تعلیم ہوئی کہ تم اس کے شر سے اللہ کی پناہ چاہو جو اسے دیکھتا ہے اور یہ اُسے نہیں دیکھ سکتا۔

فصل ☆ اعوذ پڑھنا اللہ تعالیٰ کی طرف التجا کرنا ہے اور ہر برائی والے کی برائی سے اس کے دامن میں پناہ طلب کرنا ہے۔ عیاذہ کے معنی برائی کے دفع کرنے کے ہیں اور لیاذہ کے معنی بھلائی حاصل کرنے کے ہیں۔ متنبی کا شعر ہے

يَا مَنْ اَعُوْذُ بِهٖ فِيْ مَا اُؤَمِّلُهٗ ☆ وَ مَنْ اَعُوْذُ بِهٖ مِمَّا اُحَاذِرُهٗ
لَا يَجْبُرُ النَّاسُ عَظْمًا اَنْتَ كَاسِرُهٗ ☆ وَلَا يُهِيْضُوْنَ عَظْمًا اَنْتَ جَابِرُهٗ

''اے وہ پاک ذات جس کی ذات سے میری تمام اُمیدیں وابستہ ہیں اور اے وہ پروردگار کہ تمام برائیوں سے میں اس کی پناہ پکڑتا ہوں جسے وہ توڑے اُسے کوئی جوڑ نہیں سکتا اور جسے وہ جوڑے اسے کوئی توڑ نہیں سکتا۔ اعوذ کے معنی یہ ہیں کہ میں اللہ تعالیٰ کی پناہ پکڑتا ہوں کہ شیطان رجیم مجھے دنیا میں کوئی ضرور نہ پہنچا سکے۔ جن جن احکام کی بجا آوری کا مجھے حکم ہے۔ ایسا نہ ہو کہ میں ان سے رک جاؤں اور جن کاموں سے منع کیا گیا ہوں ایسا نہ ہو کہ مجھ سے وہ بدافعال سرزد ہو جائیں۔''

یہ ظاہر ہے کہ شیطان سے بچانے والا سوائے اللہ تعالیٰ کے اور کوئی نہیں۔ اسی لیے پروردگار عالم نے انسانوں کے شر سے محفوظ رہنے کی تو ترکیب سلوک واحسان وغیرہ بتلائی اور شیطان کے شر سے صورت یہ بتلائی کہ ہم اس کی ذاتِ پاک سے پناہ طلب کریں۔ اس لیے کہ نہ تو اسے رشوت دی جا سکے نہ وہ بھلائی اور سلوک کی وجہ سے اپنی شرارت سے باز آئے۔ اس کی برائی سے بچانے والا تو صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ تینوں پہلی آیتوں میں یہ مضمون گزر چکا ہے۔ سورۂ اعراف میں ہے: ﴿خُذِ الْعَفْوَ﴾ (الاعراف ۱۹۹) اور سورۂ مؤمنون میں ہے: ﴿اِدْفَعْ بِالَّتِیْ﴾ (المومنون ۹۶) اور سورۂ سجدہ میں ہے: ﴿وَلَا تَسْتَوِی الْحَسَنَةُ﴾ (حم السجدہ ۳۴) ان تینوں آیتوں کا مفصل بیان اور ترجمہ پہلے گزر چکا ہے۔

لفظ شیطان کی لغوی تحقیق ☆

لفظ شیطان 'شطن' سے بنا ہے۔ اس کے لفظی معنی دُور کے ہیں چونکہ یہ مردود بھی انسانی طبیعت سے دُور ہے بلکہ ہر بھلائی سے بعید ہے۔ اس لیے اسے شیطان کہتے ہیں اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ شاط سے مشتق ہے۔ اس لیے کہ وہ آگ سے پیدا شدہ ہے اور شاط کے معنی یہی ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ معنی کی رو سے تو دونوں ٹھیک ہیں لیکن اوّل زیادہ صحیح ہے۔ عرب شاعروں کے شعر بھی اس کی تصدیق میں ملتے ہیں۔ امیہ بن ابوصلت اور نابغہ کے شعروں میں بھی یہ لفظ شطن سے مشتق ہے اور دُور ہونے کے معنی میں مستعمل ہے۔ سیبویہ کا قول ہے کہ جب کوئی شیطانی کام کرے تو عرب کہتے ہیں تشیطن فلانٌ۔ یہ نہیں کہتے کہ تشیط فلانٌ۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ لفظ شاط سے نہیں بلکہ شطن سے ماخوذ ہے اور اس کے صحیح معنی بھی دُوری کے ہیں جو جن وانس وحیوان سرکشی کرے اُسے شیطان کہہ دیتے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے ﴿وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ﴾ (الانعام ۱۱۲) یعنی اسی طرح ہم نے ہر نبی کے دشمن شیاطین جن وانس پیدا کیے ہیں۔ جو آپس میں ایک دوسرے کو دھوکے کی بناوٹی باتیں پہنچاتے رہتے ہیں۔ مسند احمد میں حضرت ابوذرؓ سے حدیث ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: اے ابوذر! جنات اور انسان کے شیطانوں سے اللہ تعالیٰ کی پناہ طلب

کرو۔ میں نے کہا: کیا انسانوں میں شیطان ہوتے ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں! ہیں (احمد) صحیح مسلم شریف میں انہی سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: نماز کو عورت' گدھا اور کالا کتا توڑ دیتا ہے[1]۔ میں نے کہا: حضور ﷺ! سرخ' زرد کتوں میں سے کالے کتے کی تخصیص کی کیا وجہ ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: کالا کتا شیطان ہے۔ (مسلم) حضرت عمرؓ ایک مرتبہ ترکی گھوڑے پر سوار ہوتے ہیں۔ وہ ناز و خرام سے چلتا ہے۔ حضرت عمرؓ اسے مارتے پیٹتے بھی ہیں لیکن اس کا اکڑنا اور بھی بڑھ جاتا ہے۔ آپؓ اُتر پڑتے ہیں اور فرماتے ہیں تم تو میری سواری کے لیے کسی شیطان کو پکڑ لائے۔ میرے نفس میں تکبر آنے لگا۔ چنانچہ میں نے اس سے اُترنا ہی مناسب سمجھا۔ (طبری)

رَجِیْم فَعِیل کے وزن پر مفعول کے معنی میں ہے۔ یعنی وہ مرجوم ہے یعنی ہر بھلائی سے دُور ہے جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَلَقَدْ زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيْحَ ......﴾ (الملک: ۵) ہم نے دُنیا کے آسمان کو ستاروں سے مزین کیا اور انہیں شیطانوں کے لیے رجم بنایا۔ ﴿اِنَّا زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا ......﴾ (الصفت: ۵) یعنی ہم نے آسمانِ دنیا کو تاروں سے زینت دی اور ہر سرکش شیطان سے بچاؤ بنایا۔ وہ اعلیٰ فرشتوں کی باتیں نہیں سن سکتے اور ہر طرف سے مارے جاتے ہیں' بھگائے جاتے ہیں اور لازمی عذاب اُن کے لیے ہے جو ان میں سے کوئی بات اُچک کر بھاگتا ہے۔ اس کے پیچھے ایک چمکیلا شعلہ لگتا ہے اور جگہ ارشاد ہے: ﴿وَلَقَدْ جَعَلْنَا فِي السَّمَآءِ بُرُوْجًا......﴾ (سورۃ الحجر: ۱۶) یعنی ہم نے آسمان پر برج بنائے اور انہیں دیکھنے والوں کے لیے زینت بنایا اور اُسے ہر راندے ہوئے شیطان سے ہم نے محفوظ کرلیا۔ مگر جو کسی بات کو چرا لے جائے اُس کو پیچھے چمکتا ہوا شعلہ لگتا ہے۔ اسی طرح کی اور آیتیں بھی ہیں۔ رجیم کے معنی رجم سے بھی کیے گئے ہیں چونکہ شیطان لوگوں کو وسوسوں اور گمراہیوں سے رجم کرتا ہے۔ اس لیے اسے رجیم یعنی راجم کہتے ہیں۔

اب ''بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ'' کی تفسیر پڑھیے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان' نہایت رحم والا ہے

صحابہؓ نے کتاب اللہ کو اسی کے ساتھ شروع کیا۔ علماء کا اتفاق ہے کہ سورۂ نمل کی یہ ایک آیت ہے۔ البتہ اس میں اختلاف ہے کہ وہ ہر سورت کے شروع میں ایک مستقل آیت ہے یا ہر سورت کی ایک مستقل آیت ہے' جو اس کے شروع میں لکھی گئی ہے یا ہر سورت کی بعض آیت ہے یا اسی طرح سورۂ فاتحہ ہی کی آیت ہے اور دوسری سورتوں کی نہیں؟ یا صرف ایک

---

[1] نمازوں کا فساد ان تینوں چیزوں سے اس طرح نہیں ہوتا کہ نماز باطل ہو جائے اور اس کو از سر نو شروع کرنا پڑے۔ صرف امام احمد بن حنبلؒ کا یہ مذہب ہے کہ سیاہ کتا اگر نمازی کے سامنے سے نکل جائے تو نماز فاسد ہو جائے گی۔ ان کے علاوہ کوئی امام اس کا قائل نہیں ہے۔ نماز کی حالت مناجات جیسی ہے کہ دو آدمی اگر گفتگو کرتے ہوں تو تیسرے کے حائل ہونے کی وجہ سے ان کو تشویش ہوگی۔ ایسے ہی نماز میں اگر کوئی چیز سامنے سے گزر جائے گی تو نماز میں ذہنی طور پر سکون باقی نہ رہے گا لیکن ان تین چیزوں کی تخصیص بعض خاص اسباب کی بناء پر ہے' جن کا مفصل بیان مطولات میں مل سکتا ہے۔

سورت کو دوسری سورت سے علیحدہ کرنے کے لیے لکھی ہے اور آیت نہیں ہے؟ علماء سلف و خلف کا ان اُمور میں اختلاف چلا آتا ہے اور اپنی جگہ پر اس کی تفصیل موجود ہے۔

سنن ابو داؤد میں صحیح سند کے ساتھ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ ایک سورت کو دوسری سورت سے علیحدہ نہیں فرماتے تھے' جب تک کہ آپ ﷺ پر بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ نازل نہیں ہوتی تھی۔

مستدرک حاکم میں بھی یہ حدیث ہے۔ ایک مرسل حدیث میں بھی حضرت سعید بن جبیرؒ سے بھی یہ روایت مروی ہے۔ صحیح ابن خزیمہ میں حضرت ام سلمہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ کو سورۂ فاتحہ کے شروع میں نماز میں پڑھا اور اسے ایک آیت شمار کیا لیکن اس کے ایک راوی عمر بن ہارون بلخی ضعیف ہیں اور اس کی متابعت میں ایک روایت حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اور اسی کے مثل حضرت علیؓ' حضرت ابن عباسؓ وغیرہ سے بھی مروی ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس' حضرت عبداللہ بن عمر' حضرت عبداللہ بن زبیر' حضرت ابو ہریرہ' حضرت علی (رضی اللہ عنہم) اور حضرت عطاء' حضرت طاؤس' حضرت سعید ابن جبیر' حضرت مکحول' حضرت زہری (رحمۃ اللہ علیہم) کا یہی مذہب ہے کہ بسم اللہ ہر سورت کی ایک مستقل آیت ہے' سوائے سورت براءت کے۔ علاوہ ان صحابہؓ اور تابعین کے حضرت عبداللہ بن مبارکؒ اور امام شافعیؒ و امام احمدؒ کے ایک قول میں' ایک اسحٰق بن راہویہ اور ابو عبیدہ قاسم ابن سلام رحمہم اللہ کا یہی مذہب ہے۔ البتہ امام مالکؒ اور امام ابو حنیفہؒ اور ان کے ساتھی کہتے ہیں کہ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ نہ تو سورۂ فاتحہ کی آیت ہے' نہ کسی سورت کی۔ امام شافعیؒ کا ایک قول تو یہ مروی ہے کہ یہ سورۂ فاتحہ کی تو ایک آیت ہے لیکن اور سورتوں کی نہیں۔ ایک قول ان کا یہ بھی ہے کہ ہر سورت کی بعض اول کی آیت ہے لیکن یہ دونوں اقوال غریب ہیں۔ داؤد کہتے ہیں کہ یہ ہر سورت کے اوّل میں ایک مستقل آیت ہے۔ سورت میں داخل نہیں۔ امام احمد بن حنبلؒ سے بھی یہی روایت ہے اور ابو بکر رازی نے ابو الحسن کرخیؒ کا بھی یہی مذہب بیان کیا ہے۔ امام ابو حنیفہؒ کے یہ بڑے پایہ کے ساتھی ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ جہری پڑھیں یا سری؟

یہ تو تھی بحث بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ کے سورۂ فاتحہ کی آیت ہونے نہ ہونے کی۔ اب اس میں بھی اختلاف ہے کہ آیا اسے باآواز بلند پڑھنا چاہیے یا پست آواز سے؟ جو لوگ اسے سورۂ فاتحہ کی آیت نہیں کہتے' وہ تو اسے بلند آواز سے پڑھنے کے بھی قائل نہیں۔ اسی طرح جو لوگ اسے سورۂ فاتحہ سے الگ ایک آیت مانتے ہیں وہ اس کے پست آواز سے پڑھنے کے قائل ہیں۔ رہے وہ لوگ جو کہتے ہیں کہ یہ ہر سورت کے اوّل سے ہے۔ ان میں اختلاف ہے۔ امام شافعیؒ کا تو مذہب ہے کہ سورۂ فاتحہ اور سورت کے پہلے اسے اونچی آواز سے پڑھنا چاہیے۔ صحابہ کی' تابعین کی' مسلمانوں کے اگلے پچھلے اماموں کی جماعتوں کا یہی مذہب ہے۔ صحابہؓ میں سے اسے اونچی آواز سے پڑھنے والے حضرت ابو ہریرہ' حضرت ابن عمر' حضرت ابن عباس' حضرت معاویہ' حضرت عمر' حضرت علی' حضرت ابو بکر اور حضرت عثمان (رضی اللہ عنہم) ہیں۔ حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عثمانؓ سے بھی غریب سند سے امام خطیب نے نقل کیا ہے اور بیہقی اور ابن عبد البرؒ نے حضرت عمر اور حضرت علیؓ سے بھی روایت کی ہے۔

تابعین میں سے حضرت سعید بن جبیر' حضرت عکرمہ' حضرت ابو قلابہ' حضرت زہری' حضرت علی بن حسین' ان کے لڑکے محمد سعید بن مسیب' عطاء' طاؤس' مجاہد' سالم' محمد ابن کعب' قرظی' عبداللہ بن ابوبکر بن محمد بن عمرو' ابن حزم' ابووائل' ابن سیرین' محمد بن منکدر' علی بن عبداللہ بن عباس' ان کے صاحبزادے محمد' نافع' ابن عمر کے مولیٰ زید بن اسلم' عمر بن عبدالعزیز' ارزق بن قیس' حبیب بن ابی ثابت' ابوشعشاء' مکحول' عبداللہ بن مغفل بن مقرن' اور بروایت بیہقی' عبداللہ بن صفوان' محمد ابن حنیفہ اور بروایت ابن عبدالبر' عمرو بن دینار' یہ سب ان نمازوں میں جن میں قراءت اونچی آواز سے پڑھی جاتی ہے بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ بھی بلند آواز سے پڑھتے تھے۔

ایک دلیل تو اس کی یہ ہے کہ جب یہ آیت سورۂ فاتحہ میں سے ہے تو پھر پوری سورت کی طرح یہ بھی اونچی آواز سے ہی پڑھنی چاہیے۔ علاوہ ازیں سنن نسائی' صحیح ابن خزیمہ' صحیح ابن حبان' مستدرک حاکم میں مروی ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ نے نماز پڑھی اور قراءت میں اُونچی آواز سے بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ پڑھی اور فارغ ہونے کے بعد فرمایا: میں تم سب سے زیادہ مشابہ ہوں' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز میں۔ اس حدیث کو دارقطنی' خطیب اور بیہقی وغیرہ نے صحیح کہا ہے۔ (نسائی) ابوداؤد اور ترمذی میں ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نماز کو بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ سے شروع کرتے تھے۔ امام ترمذیؒ فرماتے ہیں' یہ حدیث ایسی زیادہ صحیح نہیں۔ مستدرک حاکم میں انہی سے روایت ہے کہ حضور ﷺ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ کو اُونچی آواز سے پڑھتے تھے۔ امام حاکم نے اسے صحیح کہا ہے۔

صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت انسؓ سے سوال ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قراءت کس طرح تھی؟ فرمایا: ہر کھڑے لفظ کو آپ ﷺ دراز کر کے پڑھتے تھے۔ پھر بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ پڑھ کر سنائی۔ بسم اللہ پر مد کیا الرحمن پر مد کیا۔ الرحیم پھر ٹھہر کر ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ﴾ پھر ٹھہر کر ﴿الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ﴾ پھر ٹھہر کر ﴿مٰلِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ﴾۔ دارقطنی نے اسے صحیح بتایا ہے۔ (مسند الشافعی) امام شافعیؒ، امام حاکم نے حضرت انسؓ سے روایت کی ہے کہ حضرت معاویہؓ نے مدینہ میں نماز پڑھائی اور بسم اللہ نہ پڑھی تو مہاجر اصحابؓ اس وقت موجود تھے' انہوں نے ٹوکا۔ چنانچہ پھر جب نماز پڑھانے کو کھڑے ہوئے تو بسم اللہ پڑھی۔ غالباً اس قدر احادیث وآثار اس مذہب کی حجت کے لیے کافی ہیں۔ باقی رہے اس کے خلاف آثار اور روایت اور ان کی سندیں اور ان کی تعلیل' ان کا ضعف اور ان کی تقریر وغیرہ' ان کے لیے اور جگہ ہے۔

دوسرا مذہب یہ ہے کہ نماز میں بسم اللہ کو زور سے نہ پڑھنا چاہیے۔ خلفاء اربعہ سے عبداللہ بن مغفل اور تابعینؒ اور بعد والوں کی جماعتوں سے یہ ثابت ہے کہ ابوحنیفہؒ، ثوریؒ، احمد بن حنبلؒ کا یہی مذہب[1] ہے۔ امام مالکؒ کا مذہب ہے کہ سرے سے بسم اللہ پڑھے ہی نہیں' نہ تو آہستہ نہ بلند۔ انکی دلیل ایک تو صحیح مسلم والی عائشہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نماز کو تکبیر سے اور قراءت کو ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ﴾ سے شروع کیا کرتے تھے۔ صحیحین میں ہے کہ حضرت انس بن مالکؓ

---

[1] اگر مسلک کی تائید خلفاء اربعہ ﷡ کے تعامل سے ہوتی ہو تو اس کے قوی اور محکم ہونے میں کیا شبہ باقی رہ جاتا ہے لیکن اس کے باوجود کہنا یہ ہے کہ یہ مذہب صرف خلفاء اربعہ کا ہی نہیں ہے بلکہ صحابہؓ اور تابعینؒ کے جم غفیر کا بھی یہی قول ہے۔ مگر افسوس کہ ابن کثیرؒ نے مذہبی تعصب کی وجہ سے ان کے اسماء کی فہرست اتنی طویل پیش نہ کی جتنی لمبی فہرست اُس نے اپنے پسندیدہ مذہب پر پیش کی۔

فرماتے ہیں' میں نے نبی اکرم ﷺ حضرت ابوبکرؓ' حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کے پیچھے نماز پڑھی۔ یہ سب ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ﴾ سے شروع کرتے تھے۔ مسلم میں ہے کہ بسم اللہ کا ذکر نہیں کرتے تھے' نہ تو قراءت کے شروع میں اور نہ قراءت کے آخر میں۔ سنن میں حضرت معقلؓ سے بھی اسی طرح مروی ہے۔ (ترمذی) یہ ہے دلیل ان ائمہ کی بسم اللہ آہستہ پڑھنے کی۔ یہ خیال رہے کہ یہ کوئی بڑا اختلاف نہیں۔ ہر ایک فریق دوسرے کی نماز کی صحت کا قائل ہے۔ فالحمدللہ۔

نوٹ ☆ بسم اللہ کا مطلق نہ پڑھنا تو ٹھیک نہیں' بلند و پست پڑھنے کی احادیث میں اس طرح تطبیق ہو سکتی ہے کہ دونوں جائز ہیں۔ گو پست پڑھنے کی احادیث قدرے[1] زوردار ہیں' واللہ اعلم۔ مترجم)

فصل: بسم اللہ کی فضیلت کا بیان ☆

تفسیر ابن ابی حاتم میں ہے کہ حضرت عثمان بن عفانؓ نے رسول اللہ ﷺ سے بسم اللہ کی نسبت سوال کیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کا نام ہے۔ اللہ تعالیٰ کے بڑے نام ہیں اور اس میں اس قدر نزدیکی ہے جیسے آنکھ کی سیاہی اور سفیدی میں۔ ابن مردویہ میں بھی اس طرح کی روایت ہے اور یہ روایت بھی ابن مردویہ میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب عیسیٰ علیہ السلام کو ان کی والدہ نے معلم کے پاس بٹھایا۔ اس نے کہا: لکھئے بسم اللہ۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کہا: بسم اللہ کیا ہے؟ استاد نے جواب دیا: میں نہیں جانتا۔ آپ نے فرمایا: ''ب'' سے مراد اللہ کا بہا یعنی بلندی ہے اور ''س'' سے مراد اس کی سنا یعنی نور اور روشنی ہے اور ''م'' سے مراد اس کی مملکت یعنی بادشاہی ہے اور ''اللہ'' کہتے ہیں معبودوں کے معبود کو اور ''رحمٰن'' کہتے ہیں دُنیا اور آخرت میں رحم کرنے والے کو اور ''رحیم'' کہتے ہیں آخرت میں رحم و کرم کرنے والے کو۔ ابن جریر میں بھی یہ روایت ہے لیکن سند کے لحاظ سے بے حد غریب ہے' ممکن ہے کسی صحابیؓ وغیرہ سے مروی ہو اور ممکن ہے کہ بنی اسرائیل کی روایتوں میں ہو۔ مرفوع حدیث نہ ہو' واللہ اعلم۔

ابن مردویہ میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مجھ پر ایک ایسی آیت اُتری ہے کہ کسی نبی پر سوائے سلیمان علیہ السلام کے ایسی آیت نہیں اُتری۔ وہ آیت بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ہے۔ حضرت جابرؓ فرماتے ہیں جب یہ آیت اُتری تو بادل مشرق کی طرف چھٹ گئے۔ ہوائیں ساکن ہو گئیں۔ سمندر ٹھہر گیا۔ جانوروں نے کان لگا لئے۔ شیاطین پر آسمان سے شعلے گرے اور پروردگارِ عالم نے اپنی عزت و جلال کی قسم کھا کر فرمایا کہ جس چیز پر میرا یہ نام لیا جائے گا' اس میں ضرور برکت ہوگی۔ حضرت ابن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ جہنم کے انیس داروغوں سے جو بچنا چاہے وہ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ پڑھے۔ اس کے بھی انیس حروف ہیں۔ ہر حرف ہر فرشتے سے بچاؤ بن جائے گا۔ اسے ابن عطیہ نے بیان کیا ہے اور اس کی تائید ایک حدیث سے بھی کی ہے جس میں ہے کہ میں نے تیس سے اُوپر فرشتوں کو دیکھا کہ وہ جلدی کر رہے تھے۔ یہ حضور ﷺ نے اُس وقت فرمایا تھا جب ایک شخص نے ربنا لك الحمد حمدًا كثيرًا طيبًا مباركًا فيه پڑھا تھا۔ (بخاری) اس میں بھی تیس سے زیادہ حروف ہیں۔ اُتنے ہی فرشتے اُترے۔ اسی طرح بسم اللہ میں بھی اُنیس حروف ہیں اور وہاں فرشتوں کی تعداد بھی اُنیس ہے وغیرہ وغیرہ۔

---

[1] لفظ ''قدرے'' پر مترجم کا زورِ مذہبی تعصب کا آئینہ دار ہے۔

مسند احمد میں ہے کہ آنحضرت ﷺ کی سواری پر آپ ﷺ کے پیچھے جو صحابی سوار تھے ان کا بیان ہے کہ حضور ﷺ کی اونٹنی ذرا پھسلی تو میں نے کہا: شیطان کا ستیاناس ہو۔ آپ ﷺ نے فرمایا: یہ نہ کہو اس سے شیطان پھولتا ہے اور خیال کرتا ہے کہ گویا اس نے اپنی قوت سے گرایا۔ ہاں! بسم اللہ کہنے سے وہ مکھی کی طرح ذلیل و پست ہو جاتا ہے۔ نسائی نے اپنی کتاب عمل الیوم واللیلہ میں اور ابن مردویہ نے اپنی تفسیر میں بھی اسے بیان کیا ہے اور ان کا نام اسامہ بن عمیر بتلایا ہے اور اس میں ہے کہ بسم اللہ کہہ۔ یہ بسم اللہ برکت ہے اس لیے ہر کام اور ہر بات کے شروع میں بسم اللہ کہہ لینا مستحب ہے۔ خطبہ کے شروع میں بسم اللہ کہنی چاہیے۔ حدیث میں ہے کہ جس کام کو بسم اللہ الرحمن الرحیم سے شروع نہ کیا جائے وہ بے برکت ہوتا ہے۔

رفع حاجت جاتے وقت بھی بسم اللہ پڑھ لے۔ (ترمذی) حدیث میں یہ بھی ہے کہ وضو کے وقت بھی پڑھ لے۔ مسند احمد اور سنن ابو ہریرہؓ سعید بن زید اور ابو سعید رضی اللہ عنہم سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو شخص وضو میں اللہ کا نام نہ لے اس کا وضو نہیں ہوتا۔ یہ حدیث حسن ہے۔ بعض علماء تو وضو کے وقت بسم اللہ پڑھنا واجب بتلاتے ہیں۔ بعض مطلق وجوب کے قائل ہیں۔

جانور کو ذبح کرتے وقت بھی اس کا پڑھنا مستحب ہے۔ امام شافعیؒ اور ایک اور جماعت کا یہی خیال ہے۔ بعضوں نے ذکر کے وقت اور بعضوں نے مطلقاً اسے واجب کہا ہے۔ اس کا بیان عنقریب آئے گا' ان شاء اللہ تعالیٰ۔ امام رازیؒ نے اپنی کتابت میں اس آیت کی فضیلت میں بہت سی احادیث بیان کی ہیں۔ ایک روایت میں ہے کہ جب تو اپنی بیوی کے پاس جائے تو بسم اللہ پڑھ لے اور اسی سے اللہ کوئی اولاد بخشے تو اس کی اولاد کے سانس کی گنتی کے برابر تیرے نامۂ اعمال میں نیکیاں لکھی جائیں گی لیکن یہ روایت بالکل قطعی لاحاصل ہے۔ میں نے تو اسے کہیں نہیں پایا۔ کھاتے وقت بھی بسم اللہ پڑھنی مستحب ہے۔ صحیح مسلم میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے عمر بن ابو سلمہؓ سے فرمایا: جو آپ کے گھر میں حضرت ام سلمہؓ کے پہلے خاوند سے تھے' بسم اللہ کہو اور اپنے داہنے ہاتھ سے کھایا کرو اور اپنے سامنے سے نوالہ اٹھایا کرو۔ بعض علماء اس وقت بھی بسم اللہ کا کہنا واجب بتلاتے ہیں۔

شریک حیات سے ملنے (ہمبستری) کے وقت بھی بسم اللہ پڑھنی چاہیے۔ صحیحین میں حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب تم میں سے کوئی اپنی بیوی سے ''ملنے'' کا ارادہ کرے تو یہ پڑھے: بسم اللہ اللھم جنبنا الشیطن و جنب الشیطان ما رزقتنا۔ یعنی اے اللہ! ہمیں اور جو ہمیں تو (اولاد ۱۲) دے اسے شیطان سے بچا۔ فرماتے ہیں کہ اگر اس جماع سے حمل ٹھہر گیا تو اس بچہ کو شیطان کبھی نقصان نہ پہنچا سکے گا۔ یہاں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ بسم اللہ کی ''ب'' کا تعلق کس سے ہے۔

ترکیبِ نحوی ☆

نحویوں کے اس میں دو اقوال ہیں اور دونوں قریب قریب ہیں۔ بعض اسم بتلاتے ہیں اور بعض فعل۔ ہر ایک کی دلیل قرآن میں ملتی ہے۔ جو لوگ اسم کے ساتھ متعلق کرتے ہیں وہ تو کہتے ہیں: بسم اللہ ابتدائی یعنی اللہ کے نام سے

میری ابتداء ہے۔ قرآن میں ہے: ﴿ارْكَبُوْا فِيْهَا بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖهَا وَ مُرْسٰهَا﴾ (ھود ۴۱) اس میں اسم یعنی مصدر ظاہر کر دیا گیا ہے اور جو لوگ فعل کے ساتھ مقدر بتلاتے ہیں' چاہے وہ اَمر ہو یا خبر ہو جیسے ابدا بسم الله اور ابتداء ت باسم الله اور ان کی دلیل آیت: ﴿اِقْرَاْ بِاسْمِ﴾ (العلق ۱) ہے۔ دراصل دونوں ہی صحیح ہیں۔ اس لیے کہ فعل کے لیے بھی مصدر کا ہونا ضروری ہے تو اختیار ہے کہ ان کو مقدر مانا جائے اور اس کے مصدر کے مطابق۔ اس فعل کے جس کا نام پہلے لیا گیا ہے کھڑا ہونا ہو' بیٹھنا ہو' کھانا پینا ہو' قرآن پڑھنا ہو یا وضو اور نماز وغیرہ ہو۔ ان سب کے شروع میں برکت حاصل کرنے کے لیے امداد چاہنے کے لیے اور قبولیت کے لیے اللہ تعالیٰ کا نام لینا ضروری ہے' واللہ اعلم۔

ابن جریر اور ابن ابی حاتم میں روایت ہے' حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ سب سے پہلے جبریل علیہ السلام محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر جب وحی لے کر آئے تو فرمایا: اے محمد کہیے: اَسْتَعِيْذُ بِاللّٰهِ السَّمِيْعِ الْعَلِيْمِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ پھر کہیے: بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ مقصود یہ تھا کہ اُٹھنا بیٹھنا سب اللہ کے نام سے شروع ہو۔

لفظ اسم کی تحقیق ☆

اسم یعنی نام ہی مسمّی یعنی نام والا ہے یا کچھ اور' اس میں اہل علم کے تین اقوال ہیں۔ ایک تو یہ کہ اسم ہی مسمّی ہے۔ ابو عبیدہ کا اور سیبویہ کا یہی قول ہے۔ باقلانی اور ابن فورک بھی اسی کو پسند کرتے ہیں۔ ابن خطیب رازی اپنی تفسیر کے مقدمات میں لکھتے ہیں' حشویہ اور کرامیہ اور اشعریہ تو کہتے ہیں کہ اسم نفس مسمّی ہے اور نفس تسمیہ کا غیر ہے اور معتزلہ کہتے ہیں کہ اسم مسمّی کا غیر ہے اور نفس تسمیہ ہے۔ ہمارے نزدیک اسم مسمّی کا بھی غیر ہے اور تسمیہ کا بھی۔ ہم کہتے ہیں کہ اگر اسم سے مراد لفظ ہے جو آوازوں کے ٹکڑوں اور حروف کا مجموعہ ہے تو بالبداہت ثابت ہے کہ یہ مسمّی کا غیر ہے اور اگر اسم سے مراد ذات مسمّی ہے تو یہ وضاحت کو واضح کرتا ہے جو محض بیکار ہے۔ اس لیے ظاہر ہے کہ اس بیکار بحث میں پڑنا ہی فضول ہے۔ اس کے بعد اسم اور مسمّی کے فرق پر دلائل لائے ہیں کہ کبھی اسم ہوتا ہے اور مسمّی ہوتا ہی نہیں جیسے معدوم کا لفظ۔ کبھی ایک مسمّی کے کئی اسم ہوتے ہیں' جیسے مترادف کبھی اسم ایک ہوتا ہے اور مسمّی کئی ایک ہوتے ہیں جیسے مشترک۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسم اور چیز ہے اور مسمّی اور چیز ہے یعنی نام الگ ہے اور نام والا الگ ہے اور دلیل سنئے کہ اسم تو لفظ ہے اور عرض ہے اور مسمّی کبھی تو ذات ہوتی ہے ممکن یا واجب اور سنئے! اگر اسم ہی کو مسمّی مانا جائے تو چاہیے کہ آگ کا نام لیتے ہی حرارت معلوم ہو اور برف کا نام لیتے ہیں ٹھنڈک پہنچے حالانکہ کوئی عاقل ایسا نہیں کہہ سکتا۔ دلیل یہ ہے کہ اللہ کا فرمان ہے کہ اللہ کے بہت سے بہترین نام ہیں' تم ان ناموں سے اُسے پکارو۔ حدیث شریف میں ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ننانوے نام ہیں۔ (بخاری) تو خیال کیجیے کہ نام کس قدر بکثرت ہیں حالانکہ مسمّی ایک ہی ہے' فقط ایک ہی ہے اور وہ اللہ تعالیٰ وحدہ لاشریک لہ ہے۔ اسی طرح اَسْمَاء کو اللہ کی طرف اس آیت میں مضاف کرنا۔ اور جگہ فرمایا: فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيْمِ (الواقعہ ۹۶) یہ اضافت بھی اسی کا تقاضا کرتی ہے کہ اسم اور ہو اور مسمّی اور۔ کیونکہ اضافت کا مقتضاء مغائرت ہے۔ اسی طرح یہ حکم فرمایا ہے کہ ﴿فَادْعُوْهُ بِهَا﴾ (الاعراف ۱۸۰) یعنی اللہ تعالیٰ کو اس کے ناموں کے ساتھ پکارو۔ یہ بھی اس اَمر کی دلیل ہے کہ نام اور ہے اور نام والا اور۔

اب ان کے دلائل سنئے! جو اسم اور مسمّی کو ایک ہی بتلاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: تَبٰرَكَ اسْمُ رَبِّكَ (الرحمن

۷۸) یعنی جلال واکرام والے تیرے ربّ کا بابرکت نام ہے تو نام کو برکتوں والا فرمایا حالانکہ خود اللہ تعالیٰ برکتوں والا ہے۔ اس کا آسان جواب یہ ہے کہ اس مقدس ذات کی وجہ سے اس کا نام بھی بڑائیوں والا ہے۔ دوسری دلیل ان کی یہ ہے کہ جب کوئی شخص کہے کہ زینب پر طلاق ہے تو طلاق اس کی بیوی پر جس کا نام زینب ہے پڑ جاتی ہے۔ اگر نام اور نام والے میں فرق ہوتا تو نام پر طلاق پڑتی' نام والے پر کیسے پڑ جاتی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس سے مراد یہی ہوتی ہے کہ اس ذات پر طلاق ہے جس کا نام زینب ہے۔ تسمیہ کا اسم سے الگ ہونا اسی دلیل کی بناء پر ہے کہ تسمیہ کہتے ہیں کسی کے نام مقرر کرنے کو اور ظاہر ہے کہ یہ اور چیز ہے اور نام والا اور چیز ہے۔ رازیؒ کا قول یہی ہے۔ یہ سب کچھ تو لفظ 'باسم' کے متعلق تھا۔ اب لفظ ''اللہ'' کے متعلق سنئے۔

لفظ ﴿اللہ﴾ کی تحقیق ☆

''اللہ'' خاص نام ہے۔ ربّ تبارک وتعالیٰ کا۔ کہا جاتا ہے کہ اسم اعظم یہی ہے۔ اسی لیے تمام عمدہ صفتوں کے ساتھ یہی موصوف ہوتا ہے جیسے قرآنِ پاک میں ہے: ﴿ هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ...... ﴾ (الحشر: ۲۲'۲۴) یعنی وہ اللہ ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں' جو کھلے چھپے کا جاننے والا ہے' جو رحم کرنے والا مہربان ہے۔ وہ اللہ جس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں۔ جو بادشاہ ہے' پاک ہے' سلامتی والا ہے' امن والا ہے' محافظ ہے' غلبہ والا ہے' زبردست ہے' بڑائی والا ہے۔ وہ ہر شرک اور شرک کی چیز سے پاک ہے۔ وہ اللہ پیدا کرنے والا ہے' بنانے والا ہے' صورت بخشنے والا ہے۔ اس کے لیے بہترین پاکیزہ نام ہیں۔ آسمان وزمین کی تمام چیزیں اُس کی تسبیح بیان کرتی ہیں۔ وہ عزتوں اور حکمتوں والا ہے۔ ان آیتوں میں باقی کُل نام صفت ہیں۔ پس اصلی نام اللہ ہے جیسے اور جگہ فرمایا کہ اللہ ہی کے لیے ہیں پاکیزہ اور عمدہ نام۔ پس تم اس کو ان ناموں سے پکارو اور فرماتا ہے اللہ یا رحمٰن کو پکارو جس نام سے (بھی'۱۲) پکارو۔ اسی کے پیارے پیارے اور اچھے اچھے نام ہیں۔

بخاری ومسلم میں حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کے ننانوے نام ہیں۔ ایک کم ایک سو۔ جو انہیں یاد کر لے جنتی ہے۔ ترمذی اور ابن ماجہ کی روایت میں ان ناموں کی تفصیل بھی آئی ہے اور دونوں کی روایتوں میں الفاظ کا کچھ فرق' کچھ کمی زیادتی بھی ہے۔ رازی نے اپنی تفسیر میں بعض لوگوں سے روایت کی ہے اللہ تعالیٰ کے پانچ ہزار نام ہیں۔ ایک ہزار تو قرآن شریف اور صحیح حدیث میں اور ایک ہزار تورات میں اور ایک ہزار انجیل میں اور ایک ہزار زبور میں اور ایک ہزار لوحِ محفوظ میں۔

اللہ وہ نام ہے جو سوائے اللہ تبارک وتعالیٰ کے کسی اور کا نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج تک عرب کو یہ بھی معلوم نہیں کہ اس کا اشتقاق کیا ہے۔ اس کا باب کیا ہے بلکہ نحویوں کی ایک بڑی جماعت کا خیال ہے کہ اسم جامد ہے اور اس کا کوئی اشتقاق ہے ہی نہیں۔ قرطبی نے علماء کرام کی ایک بڑی جماعت کا یہ مذہب نقل کیا ہے' جن میں حضرت امام شافعی' امام خطابی' امام الحرمین' امام غزالی رحمہم اللہ وغیرہ ہیں۔ خلیل سیبویہ سے روایت ہے کہ الف لام اس میں لازم ہے۔ امام خطابی نے اس کی ایک دلیل یہ دی ہے کہ یا اللہ تو کہہ سکتے ہیں مگر یا الرحمٰن کہتے کسی کو نہیں سنا۔ اگر لفظ اللہ میں الف لام اصل کلمہ نہ ہوتا تو اس پر نداء کا لفظ یا داخل نہ ہوسکتا کیونکہ قواعد عربی کے لحاظ سے حرفِ ندا کا الف لام والے اسم پر داخل ہونا جائز نہیں۔

بعض لوگوں کا یہ قول بھی ہے کہ یہ مشتق ہے اور اس پر عربی کا ایک شعر بطور دلیل پیش کرتے ہیں جس میں مصدر تالہ کا بیان ہے۔ جس کا ماضی مضارع اَلَہَ یَاْلَہُ' اِلٰھَۃً اور تَاَلُّھًا ہے۔ جیسے ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ وہ وَیَذَرُكَ اٰلِھَتَكَ پڑھتے تھے۔ مراد اس سے عبادت ہے یعنی اس کی عبادت کی جاتی ہے اور وہ کسی کی عبادت نہیں کرتا۔ مجاہدؒ وغیرہ کہتے ہیں بعضوں نے اس پر اس آیت سے دلیل دی ہے کہ: ﴿وَهُوَ اللّٰهُ فِي السَّمٰوٰتِ وَ فِي الْاَرْضِ﴾ (الانعام ۲) اور آیت میں ہے ﴿وَهُوَ الَّذِيْ فِي السَّمَآءِ اِلٰهٌ وَّفِي الْاَرْضِ اِلٰهٌ﴾ (الزخرف ۸۴) یعنی وہی اللہ ہے آسمانوں میں اور زمین میں، وہی ہے جو آسمان میں معبود ہے اور زمین میں معبود ہے۔ سیبویہ خلیل سے نقل کرتے ہیں کہ اصل میں یہ اِلٰہٌ تھا جیسے فِعَالٌ پھر ہمزہ کے بدلے الف ولام لایا گیا۔ جیسے اَلنَّاس کہ اس کی اصل اُنَاسٌ ہے۔ بعضوں نے کہا کہ لفظ اللہ کی اصل لاہٌ ہے۔ الف لام حرف تعظیم کے طور پر لایا گیا ہے۔ سیبویہ کا بھی پسندیدہ قول یہی ہے۔ عرب شعرا کے اشعار میں بھی یہ لفظ ملتا ہے۔ کسائی اور فراء کہتے ہیں اس کی اصل الا لہٰ تھی۔ ہمزہ کو حذف کر کے پہلے لام کو دوسرے میں ادغام کیا۔ ﴿لٰكِنَّا هُوَ اللّٰهُ رَبِّيْ﴾ (الکہف ۳۸) میں لکن انا کا لکنا ہوا ہے۔ چنانچہ حسن کی قراءت میں لکن انا ہی ہے اور اس کا اشتقاق وله سے ہے اور اس کے معنی تحیر ہیں ولہٌ عقل کے چلے جانے کو کہتے ہیں۔ عربی میں رجل واله اور امراة ولهی اور مولوهةٌ اسی وقت کہتے ہیں جب اسے جنگل میں بھیج دیا جائے چونکہ ذاتِ باری تعالیٰ میں اور اس کی صفتوں کی تحقیق میں عقل حیران و پریشان ہو جاتی ہے اس لیے اس ذاتِ پاک کو اللہ کہا جاتا ہے۔ اس بناء پر اصل میں یہ لفظ ولاہٌ تھا۔ واؤ کو ہمزہ سے بدل دیا گیا جیسے کہ وشاحٌ اور وسارةٌ میں اشاح اور اسادہ کہتے ہیں۔ رازی کا قول ہے کہ یہ لفظ الهت الی فلان سے مشتق ہے جو کہ معنی میں مسکنت کے ہے۔ یعنی میں نے فلاں سے سکونت اور راحت حاصل کی۔ چونکہ عقل کا سکون صرف ذاتِ باری تعالیٰ کے ذکر کی طرف ہے اور روح کی حقیقی خوشی اس کی معرفت میں ہے اس لیے کہ علی الاطلاق وہی ہے۔ کامل اس کے سوا کوئی اور نہیں۔ اسی وجہ سے اللہ کہا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے: ﴿اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ﴾ (الرعد ۲۸) یعنی ایمانداروں کے دِل صرف اللہ تعالیٰ کے ذکر سے ہی اطمینان حاصل کرتے ہیں۔

ایک قول یہ بھی ہے کہ یہ لاہ یلوہ سے ماخوذ ہے، جس کے معنی چھپ جانے اور حجاب کرنے کے ہیں اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ اله الفصیل سے ہے۔ چونکہ بندے اسی کی طرف تضرع اور زاری سے جھکتے ہیں۔ اسی کے دامن رحمت کو ہر حال میں تھامتے ہیں۔ اسی لیے اسے اللہ کہا گیا ہے۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ عرب اله الرجل یاله اُس وقت کہتے ہیں جب کسی اچانک اَمر سے کوئی گھبرا اُٹھے اور دوسرا اسے پناہ دے اور بچا لے۔ چونکہ تمام مخلوق کو ہر مصیبت سے نجات دینے والا اللہ سبحانہ وتعالیٰ ہے۔ اس لیے اسے اللہ کہتے ہیں جیسا کہ قرآنِ کریم میں ہے: ﴿وَهُوَ يُجِيْرُ وَلَا يُجَارُ عَلَيْهِ﴾ (المومنون ۸۸) یعنی وہی بچاتا ہے اور اس پر کوئی نہیں بچایا جاتا۔ حقیقی منعم وہی ہے۔ فرماتا ہے تم پر جتنی نعمتیں ہیں وہ سب اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی ہیں۔ وہی مطعم ہے۔ فرماتا ہے وہ کھلاتا ہے اور کوئی اسے نہیں کھلاتا۔ وہی موجود ہے۔ فرماتا ہے ہر چیز کا وجود اللہ کی طرف سے ہے۔ رازی کا مختار مذہب یہی ہے کہ لفظ اللہ مشتق نہیں ہے۔ خلیل، سیبویہ، اکثر اصولی اور فقہاء کا یہی قول ہے۔ اس کی بہت سی دلیلیں بھی ہیں۔ اگر یہ مشتق ہوتا تو اس کے معنی میں بہت سے افراد کی شرکت ہوتی حالانکہ ایسا نہیں۔

الٓمّٓ ①

پھر اس لفظ کو موصوف بنایا جاتا ہے اور بہت سی اس کی صفتیں آتی ہیں۔ جیسے رحمٰن' رحیم' مالک' قدوس وغیرہ۔ تو معلوم ہوا کہ مشتق نہیں۔ قرآن میں ایک جگہ ﴿عَزِيزُ الْحَمِيدِ اللهِ.....﴾ (ابراہیم:۱) جو آتا ہے وہاں یہ عطف بیان ہے۔ ایک دلیل اس کے مشتق نہ ہونے کی ﴿هَلْ تَعْلَمُ لَهُ سَمِيًّا﴾ (مریم:۶۵) یعنی کیا اس کا ہمنام بھی کوئی جانتے ہو؟ بیان کی جاتی ہے لیکن غور طلب ہے' واللہ اعلم۔ بعض لوگوں نے یہ بھی کہا ہے کہ یہ لفظ عبرانی ہے لیکن رازی نے اس قول کو ضعیف کہا ہے اور فی الواقع وہ ہے بھی ضعیف۔ رازی فرماتے ہیں کہ مخلوق کی دو قسمیں ہیں: ایک تو وہ جو معرفت خداوندی کے آخری درجہ پر پہنچ گئے۔ دوسرے وہ جو اس سے محروم ہیں۔ جو حیرت کی اندھیریوں میں اور جہالت کی پُر خار وادیوں میں پڑے ہوئے ہیں وہ تو عقل کو رو بیٹھے ہیں اور روحانی کمالات کو کھو بیٹھے ہیں لیکن جو ساحل معرفت پر پہنچ چکے ہیں' جو نورانیت کے وسیع باغوں میں جا ٹھہرے ہیں' جو کبریائی اور جلال کی وسعت کا اندازہ کر چکے ہیں' وہ بھی یہاں تک پہنچ کر بھونچکے رہ گئے ہیں اور بارگاہِ یزدانیت اور دربارِ صمدیت میں مبہوت کھڑے رہ گئے ہیں۔ غرض ساری مخلوق اس کی پوری معرفت سے عاجز اور سرگشتہ و حیران ہے۔

پس اس معنی کو اس پاک ذات کا نام اللہ ہے۔ ساری مخلوق اس کی محتاج' اس کے سامنے جھکنے والی اور اس کی تلاش کرنے والی ہے۔ اس معنی کو اس کو اللہ کہتے ہیں جیسا کہ خلیل کا قول ہے۔ عرب کے محاورے میں ہر اونچی اور بلند چیز کو لا کہتے ہیں۔ سورج جب طلوع ہوتا ہے تب بھی وہ کہتے ہیں: لَاهَتِ الشَّمْسُ۔ چونکہ پروردگارِ عالم بھی سب سے بلند و بالا ہے۔ اس کو بھی اللہ کہتے ہیں اور الٰہ کے معنی عبادت کرنے کے ہیں اور تالہٗ کے معنی حکم برداری اور قربانی کرنے کے ہیں اور خداوند عالم کی عبادت کی جاتی ہے اور اس کے نام پر قربانیاں کی جاتی ہیں۔ اس لیے اسے اللہ کہتے ہیں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما کی قراءت میں ہے: ﴿وَيَذَرَكَ وَإِلٰهَتَكَ﴾ (الاعراف:۱۲۷) اس کی اصل الا له ہے۔ پس ''ف'' کلمہ کی جگہ جو ہمزہ ہے وہ حذف کی گئی۔ پھر نفس کلمہ کا لام زائد لام سے جو تعریف کے لیے لایا گیا ہے۔ اس سے مل گیا اور ایک کو دوسرے میں ادغام کہا گیا تو ایک لام مشدد رہ گیا اور تعظیماً اللہ کہا گیا۔ یہ تو تفسیر لفظ اللہ کی تھی۔ اب آگے اور بیان ہوتا ہے۔

الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ ☆ ﴿الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ﴾: یہ دونوں نام رحمت سے مشتق ہیں۔ دونوں میں مبالغہ ہے رحمٰن میں رحیم سے زیادہ مبالغہ ہے۔ علامہ ابن جریر کے قول سے تو معلوم ہوتا ہے کہ گویا اس پر اتفاق ہے۔ بعض سلف کی تفسیروں سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا قول بھی اسی معنی میں پہلے گزر چکا ہے کہ رحمٰن سے مراد دنیا اور آخرت میں رحم کرنے والا اور رحیم سے مراد آخرت میں رحم کرنے والا ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ رحمٰن مشتق نہیں ہے۔ اگر یہ اس طرح ہوتا تو مرحوم کے ساتھ ملتا حالانکہ قرآن میں ﴿بِالْمُؤْمِنِينَ رَحِيمًا﴾ (الاحزاب:۴۳) آیا ہے۔ مبرد کہتے ہیں کہ رحمٰن عبرانی نام ہے۔ دونوں کو جمع کر دیا گیا ہے لیکن ابواسحٰق فرماتے ہیں کہ اس قول کو دل قبول نہیں کرتا۔ قرطبی فرماتے ہیں' اس لفظ کے مشتق ہونے کی دلیل یہ ہے کہ ترمذی کی صحیح حدیث میں ہے' رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں کہ اللہ کا فرمان ہے کہ میں رحمٰن ہوں۔ میں نے رحم کو پیدا کیا اور اپنے ناموں سے اس کا نام مشتق کیا۔ اس کے ملانے والے کو میں ملاؤں گا اور اس کے توڑنے والے کو میں کاٹ دوں گا۔

اب صریح حدیث کی مخالفت اور انکار کرنے کی کوئی گنجائش نہیں۔ رہا کفار عرب کا اس نام سے انکار کرنا۔ یہ محض ان کی جہالت کا ایک کرشمہ تھا۔ قرطبی کہتے ہیں کہ رحمٰن اور رحیم کے ایک ہی معنی ہیں جیسے ندمان اور ندیم۔ ابوعبیدہ کا یہی قول ہے۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ فعلان' فعیلٌ کی طرح نہیں۔ فعلان میں مبالغہ ضروری ہوتا ہے جیسے غضبان اسی شخص کو کہہ سکتے ہیں جو بہت ہی غصہ والا ہو اور فعیل صرف فاعل اور صرف مفعول کے لیے ہی آتا ہے جو مبالغہ سے خالی ہوتا ہے۔ ابوعلی فارسی کہتے ہیں کہ رحمٰن عام اسم ہے' جو ہر قسم کی رحمتوں میں شامل ہے اور صرف خداوند تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہے اور رحیم باعتبار مؤمنوں کے ہے۔ فرماتا ہے: ﴿وَكَانَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَحِيْمًا﴾ (الاحزاب:۴۳) مؤمنوں کے ساتھ رحیم ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں یہ دونوں نام رحمت و رحم والے ہیں۔ ایک میں دوسرے سے زیادہ رحمت و رحم ہے۔ (قرطبی)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی اس روایت میں لفظ ارق ہے۔ اس کے معنی خطابی وغیرہ ارفق کرتے ہیں۔ جیسا کہ حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ رفیق یعنی نرمی اور مہربانی والا ہے۔ وہ ہر کام میں نرمی اور آسانی کو پسند کرتے ہیں۔ وہ نرمی اور آسانی پر نعمتیں مرحمت فرماتا ہے جو سختی پر عطا نہیں فرماتا۔ (مسلم) ابن المبارک فرماتے ہیں کہ رحمٰن اُسے کہتے ہیں کہ جب اس سے جو مانگا جائے' عطا فرمائے اور رحیم وہ ہے کہ جب اس سے نہ مانگا جائے وہ غضب ناک ہو۔ (ترمذی) ترمذی کی حدیث میں ہے جو شخص اللہ تعالیٰ سے نہ مانگے اللہ تعالیٰ اس پر غضبناک ہوتا ہے۔ بعض شاعروں کا قول ہے۔

اللّٰہ یغضب ان ترکت سوالہ ☆ و بنی ادم حین یسئال یغضب

یعنی اللہ تعالیٰ سے نہ مانگو تو وہ ناراض ہوتا ہے اور بنی آدم سے مانگو تو وہ بگڑتے ہیں۔ عزرمی فرماتے ہیں کہ رحمٰن کے معنی تمام مخلوق پر رحم کرنے والا اور رحیم کے معنی مؤمنوں پر رحم کرنے والا ہے۔ (طبری) دیکھئے قرآن کریم کی دو آیتوں: ﴿ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ﴾ (الفرقان:۵۹) ﴿اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى﴾ (طٰہٰ:۵) میں اسْتَوٰی کے رحمٰن کا لفظ ذکر کیا تاکہ تمام مخلوق کو یہ لفظ اپنے عام رحم و کرم کے معنی سے شامل ہو سکے اور مؤمنوں کے ذکر کے ساتھ لفظ رحیم فرمایا۔ ﴿وَكَانَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَحِيْمًا﴾ (الاحزاب:۴۳) پس معلوم ہوا کہ رحمٰن میں مبالغہ بہ نسبت رحیم کے بہت زیادہ ہے لیکن حدیث کی ایک دعا میں یَا رَحْمٰنَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَ رَحِيْمَهُمَا بھی آیا ہے۔ رحمٰن' یہ نام بھی اللہ تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہے۔ اس کے سوا دوسرے کا نام نہیں۔ جیسا کہ فرمان ہے کہ اللہ کو پکارو یا رحمٰن کو جس نام سے چاہو اسے پکارو۔ اس کے بہت اچھے اچھے نام ہیں۔ ایک اور آیت میں: ﴿وَسْئَلْ مَنْ اَرْسَلْنَا......﴾ (الزخرف:۴۵) یعنی اپنے سے پہلے کے رسولوں کو پوچھ لو۔ کیا ان کے لیے سوا اس کے کوئی اور معبود تھا۔ جس کی عبادت کرتے ہوں۔ جب مسیلمہ کذاب نے دعوے شروع کیے اور اپنا نام رحمٰن الیمامہ رکھا تو پروردگار نے اسے بے انتہاء رسوا اور برباد کیا اور جھوٹ اور کذب کے ساتھ وہ مشہور ہو گیا۔ آج اسے مسیلمہ کذاب کہا جاتا ہے اور ہر جھوٹے دعویدار کو اس کے ساتھ تشبیہ دی جاتی ہے۔ ہر دیہاتی اور ہر شہری پڑھے لکھے گھر والا اسے بخوبی جانتا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ رحیم میں رحمٰن سے زیادہ مبالغہ ہے۔ اس لیے کہ اس لفظ کے ساتھ اگلے لفظ کی تاکید کی گئی ہے اور تاکید بہ نسبت اس کے کہ جس کی تاکید کی جائے زیادہ قوت والی ہوتی ہے۔ اس کا جواب یہ ہے' یہاں تاکید ہے ہی نہیں بلکہ یہ تو صفت ہے اور صفت میں یہ قاعدہ نہیں۔ پس اللہ تعالیٰ کا نام لیا گیا جس نام میں بھی اس کا کوئی شریک نہیں اور

اس کی صفت سب سے پہلے رحمٰن بیان کی گئی کہ یہ نام رکھنا بھی دوسروں کو ممنوع ہے جیسے فرمایا اللہ یا رحمٰن کو پکارو۔ جس نام سے چاہو پکارو۔ اس کے لیے اسماء حسنٰی بہت سارے ہیں۔ مسیلمہ نے گو یہ بدترین جرأت کی لیکن برباد ہوا اور اس کے گمراہ ساتھیوں کے سوا اس کی یہ بات اوروں پر نہ چل سکی۔ رحیم کے وصف کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے دوسروں کو بھی موصوف کیا ہے۔ فرماتا ہے: ﴿لَقَدْ جَآءَكُمْ......﴾ (التوبہ:۱۲۸) اس آیت میں اپنے نبی (ﷺ) کو رحیم کہا۔ اس طرح اپنے بعض ناموں سے دوسروں کو بھی اُس (اللہ عزوجل) نے یاد کیا ہے۔ جیسا کہ: ﴿اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ﴾ میں انسان کو سمیع اور بصیر کہا ہے۔ حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بعض نام تو ایسے ہیں کہ دوسروں پر بھی دوسرے معنی میں ان کا اطلاق ہوسکتا ہے اور بعض ایسے ہیں کہ نہیں ہوسکتا۔ جیسے اللہ اور رحمٰن اور خالق اور رازق وغیرہ۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اپنا پہلا نام اللہ پھر اس کی صفت رحمٰن سے کی۔ اس لیے کہ رحیم کی نسبت یہ زیادہ خاص ہے اور زیادہ مشہور ہے۔ قاعدہ ہے کہ اوّل سب سے زیادہ بزرگ نام سے نام لیا جائے۔ اس لیے سب سے پہلے سب سے زیادہ خاص نام لیا۔ پھر اس سے کم' پھر اس سے کم۔ اگر کہا جائے کہ جب رحمٰن میں رحیم سے زیادہ مبالغہ موجود ہے پھر اس پر کیوں اکتفاء نہ کی گئی؟ تو اس کے جواب میں حضرت عطاء خراسانی کا یہ قول پیش ہوسکتا ہے کہ چونکہ کافروں نے رحمٰن نام بھی غیروں کا رکھ لیا تھا اس لیے رحیم کا لفظ بھی لائے تا کہ کسی قسم کا شائبہ تک نہ رہے۔

رحمٰن و رحیم صرف اللہ تعالیٰ ہی کا نام ہے۔ ابن جریر نے اس قول کو نقل کیا ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ جاہلیت کے زمانے کے عرب رحمٰن سے واقف ہی نہ تھے۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ پاک کی آیت: ﴿قُلِ ادْعُو اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ......﴾ (بنی اسرائیل:۱۱۰) نازل فرما کر اُن کی تردید کی۔ کفار قریش نے حدیبیہ والے سال بھی جب رسول اللہ ﷺ نے حضرت علیؓ سے فرمایا تھا کہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کو لکھو کہا تھا کہ ہم رحمٰن و رحیم کو نہیں جانتے۔ بخاری میں یہ روایت موجود ہے۔ بعض روایتوں میں ہے کہ انہوں نے کہا تھا کہ رحمٰن یمامہ کو جانتے ہیں' کسی اور رحمٰن کو نہیں جانتے۔ اسی طرح اور جگہ قرآنِ پاک میں ہے: ﴿وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اسْجُدُوْا لِلرَّحْمٰنِ......﴾ (الفرقان:۶۰) یعنی جب ان سے کہا جاتا ہے کہ رحمٰن کے سامنے سجدہ کرو تو اور وحشت کرنے لگتے ہیں کہ رحمٰن کون ہے' جسے ہم تیرے کہنے کی وجہ سے سجدہ کریں۔

ان سب کا صحیح مطلب یہ ہے کہ یہ بدکار لوگ صرف عناد اور تکبر' سرکشی اور دشمنی کی بناء پر رحمٰن کا انکار کرتے تھے نہ کہ وہ اس نام سے ناآشنا تھے۔ اس لیے کہ جاہلیت کے زمانے کے پرانے اشعار میں بھی اللہ تعالیٰ کا نام رحیم موجود ہے۔ جو انہی شاعروں کے شعر ہیں۔ سلامہ کے شعر' دیگر اشعار ملاحظہ ہوں۔ حضرت عبداللہ ابن عباسؓ سے تفسیر ابن جریر میں ہے کہ رحمٰن انفعلان کے وزن پر رحمت سے ماخوذ ہے اور کلام عرب میں سے ہے۔ وہ خدا رفیق و رقیق جس پر رحم کرنا چاہے' مگر جس سے غصے ہو اس سے بہت دور اور اس پر بہت سخت گیر بھی ہے۔ اسی طرح اس کے نام ہیں۔ حسن فرماتے ہیں رحمٰن کا نام دوسروں کے لیے منع ہے۔ خود اللہ تعالیٰ کا نام ہے۔ لوگوں کو اس نام کا کوئی حق نہیں۔ ام سلمہؓ والی حدیث جس میں ہے کہ ہر آیت پر حضور ﷺ ٹھہرا کرتے تھے۔ (ابوداوٗد) پہلے گزر چکی ہے اور ایک جماعت اسی طرح بسم اللہ...... پر آیت کر کے اس کو الگ پڑھتی ہے اور بعض ملا کر پڑھتے ہیں۔ میم کو دو ساکن جمع ہو جانے کی وجہ سے زیر دیتے ہیں۔ جمہور کا یہی قول ہے۔ کوفی کہتے

ہیں کہ بعض عرب میم کے زبر سے پڑھتے ہیں۔ ہمزہ کی حرکت زبر میم کو دیتے ہیں جیسے: ﴿الٓمّٓ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ﴾ (آل عمران ۱) ابن عطیہ کہتے ہیں کہ زبر کی قراءت کسی سے بھی میرے خیال میں تو مروی نہیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کی تفسیر ختم ہوئی۔ اب آگے سورۂ فاتحہ کی تفسیر ملاحظہ ہو

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝۲

سب تعریفیں اللہ کو لائق ہیں جو مربی ہیں ہر ہر عالم کے

ساتوں قاری اَلْحَمْدُ کو دال کے پیش سے پڑھتے ہیں اور اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ کو مبتدا، خبر مانتے ہیں۔ سفیان بن عیینہ اور روبہ بن عجاج کا قول ہے کہ دال کے زبر کے ساتھ ہے اور فعل یہاں مقدر ہے۔ ابن ابی عبد اَلْحَمْدُ کی دال کو اور لِلّٰهِ کے پہلے لام دونوں کو پیش کے ساتھ پڑھتے ہیں اور اس لام کو پہلے کے تابع کرتے ہیں۔ گو اس کی شہادت زبانِ عرب سے ملتی ہے لیکن شاذ ہے۔ حسن اور زید بن علی ان دونوں حرفوں کو زیر سے پڑھتے ہیں اور لام کے تابع دال کو کرتے ہیں۔ ابن جریر فرماتے ہیں کہ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ کے معنی یہ ہیں کہ صرف اللہ تعالیٰ کا شکر ہے۔ اس کے سوا کوئی اس کے لائق نہیں۔ خواہ وہ مخلوق میں سے کوئی بھی ہو۔ اس وجہ سے کہ تمام نعمتیں جنہیں ہم گن بھی نہیں سکتے اور سوا اس مالک کے اور کوئی ان کی تعداد کو نہیں جانتا' اسی کی طرف سے ہیں۔ اسی نے اپنی اطاعت کرنے کے تمام اسباب ہمیں عطا فرمائے۔ اسی نے اپنے فرائض پورے کرنے کے لیے جسمانی تمام نعمتیں ہمیں انعام دیں' پھر دنیاوی بے شمار نعمتیں اور زندگی کی تمام ضروریات ہمارے کسی بھی حق کے بغیر ہمیں اس نے ہبہ کیں۔ اس کی ہمیشگی والی نعمتیں اس کے تیار کردہ پاکیزہ مقام جنت میں ہم کس طرح حاصل کر سکتے ہیں؟ یہ بھی اس نے ہمیں سکھا دیا۔ پس ہم تو کہتے ہیں کہ اول آخر اسی مالک کی پاک ذات ہر طرح تعریف اور حمد و شکر کے لائق ہے۔ (ترمذی)

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ: یہ ثنا کا کلمہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی ثناء خود آپ کی ہے اور اس ضمن میں گویا یہ فرما دیا ہے کہ تم کہو: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ۔ بعضوں نے کہا ہے کہ الحمد للہ کہنا یہ اللہ تعالیٰ کے پاکیزہ ناموں اور اس کی بلند و بالا صفتوں سے اس کی ثنا کرنا ہے اور الشکر للہ کہنا' یہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں اور اس کے احسان کا شکریہ ادا کرنا ہے۔ (طبری) لیکن یہ قول ٹھیک نہیں۔ اس لیے کہ زبانِ عرب کو جاننے والے علماء کا اتفاق ہے کہ شکر کی جگہ حمد اور حمد کی جگہ شکر کا لفظ بولتے ہیں۔ جعفر صادق اور ابن عطاء صوفی یہی فرماتے ہیں۔ حضرت ابن عباس ؓ فرماتے ہیں کہ ہر شکر کرنے والے کا کلمہ الحمد للہ ہے۔ قرطبیؒ نے ابن جریر کے قول کو معتبر کرنے کے لیے یہ دلیل بھی بیان کی ہے کہ اگر کوئی الحمد للہ شکرًا کہے تو جائز ہے۔ دراصل علامہ ابن جریر کے اس دعوے میں کلام ہے۔ پچھلے علماء میں مشہور ہے کہ حمد کہتے ہیں زبانی تعریف بیان کرنے کو۔ خواہ جس کی حمد کی جاتی ہو اس کی لازم صفتوں پر ہو یا متعدی صفتوں پر اور شکر صرف متعدی صفتوں پر ہوتا ہے اور وہ دِل' زبان اور جملہ ارکان سے ہوتا ہے۔ عرب شاعروں کے اشعار بھی اس پر دلیل ہیں۔

ہاں! اس میں اختلاف ہے کہ حمد کا لفظ عام ہے یا شکر کا اور صحیح بات یہ ہے کہ اس میں عمومِ خصوص ہے۔ اس حیثیت

سے کہ جس پر واقع ہوں۔ حمد کا لفظ شکر کے لفظ سے عام ہے۔ اس لیے کہ وہ لازم اور متعدی دونوں اوصاف پر آتا ہے۔ قدوسیت اور کرم دونوں پر حمدته کہہ سکتے ہیں لیکن اس حیثیت سے کہ وہ صرف زبان ہی سے ادا ہو سکتا ہے۔ یہ لفظ خاص ہے اور شکر کا لفظ عام ہے کیونکہ وہ قول وفعل نیت تینوں پر بولا جاتا ہے اور صرف متعدی صفتوں پر بولے جانے کے اعتبار سے شکر کا لفظ خاص ہے۔ قدوسیت پر شکرته نہیں کہہ سکتے۔ البتہ شکرته علی کرمه و احسانه الی کہہ سکتے ہیں۔ یہ تھا خلاصہ متاخرین کے قول کا' واللہ اعلم۔

ابونصر اسمٰعیل بن حماد جوہری کہتے ہیں' حمد مقابل ہے ذم کے۔ یوں کہتے ہیں: حمدت الرجل احمده حمدًا و محمدةً فهو حميدٌ و محمودٌ۔ تحمید میں حمد سے بھی زیادہ مبالغہ ہے۔ حمد شکر سے عام ہے۔ شکر کہتے ہیں کسی محسن کی دی ہوئی نعمتوں پر اس کی ثناء کرنے کو عربی زبان میں شکرته اور شکرت له دونوں طرح کہتے ہیں لیکن لام کے ساتھ کہنا زیادہ فصیح ہے۔ مدح کا لفظ حمد سے بھی زیادہ عام ہے۔ اس لیے کہ زندہ' مردہ بلکہ جمادات پر بھی مدح کا لفظ بول سکتے ہیں۔ کھانے کی اور مکان کی اور ایسی ہی دوسری چیزوں کی مدح کی جاتی ہے۔ احسان سے پہلے احسان کے بعد لازم صفتوں پر متعدی صفتوں پر بھی اس کا اطلاق ہو سکتا ہے تو اس کا عام ہونا ثابت ہوا' واللہ اعلم۔

حمد کی تفسیر اور سلف رحمۃ اللہ علیہم کی رائے ☆

حضرت عمرؓ نے ایک مرتبہ فرمایا کہ: سبحان الله اور لا اله الا الله اور بعض روایتوں میں ہے کہ الله اكبر تو ہم جانتے ہیں لیکن یہ الحمد لله کا کیا مطلب؟ حضرت علیؓ نے جواب دیا کہ اس کلمہ کو اللہ تعالیٰ نے اپنے لیے پسند فرما لیا ہے اور بعض روایتوں میں ہے کہ اس کا کہنا اللہ کو بھلا لگتا ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ یہ کلمہ شکر ہے۔ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میرے بندے نے میرا شکر کیا۔ پس اس کلمہ میں شکر کے علاوہ ان نعمتوں' ہدایتوں' احسان وغیرہ کا اقرار بھی ہے۔ کعب احبارؒ کا قول ہے کہ یہ کلمہ اللہ تعالیٰ کی ثناء ہے۔ ضحاک کہتے ہیں کہ اللہ کی چادر ہے۔ ایک حدیث بھی ایسی ہے۔ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں کہ جب تم نے ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ کہہ لیا' تم نے اللہ تعالیٰ کا شکر یہ ادا کر لیا۔ اب اللہ تعالیٰ تمہیں برکت دے گا۔ (طبری) اسود بن سریع ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کرتے ہیں کہ میں نے ذاتِ باری تعالیٰ کی حمد میں چند اشعار کہے ہیں۔ اگر اجازت ہو تو سنا دوں۔ فرمایا: اللہ کو اپنی حمد بہت پسند ہے۔
(مسند احمد ونسائی)

ترمذی' نسائی اور ابن ماجہ میں حضرت جابر بن عبداللہؓ سے روایت ہے' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''افضل ذکر لا الٰہ الا اللہ اور افضل دعا الحمد للہ ہے''۔ امام ترمذیؒ اس حدیث کو حسن غریب کہتے ہیں۔ ابن ماجہ کی حدیث میں ہے کہ جس بندے کو اللہ کوئی نعمت دے اور وہ اس پر الحمد للہ کہے تو دی ہوئی نعمت لی ہوئی سے افضل ہے۔

قرطبی فرماتے ہیں' مطلب یہ ہے کہ ساری دنیا دے دینا اتنی بڑی نعمت نہیں جتنی الحمد للہ کہنے کی توفیق دینا ہے۔ اس لیے کہ دنیا تو فانی ہے اور اس کلمہ کا ثواب باقی ہے۔ جیسا کہ قرآنِ پاک میں ہے: ﴿اَلْمَالُ وَالْبَنُوْنَ ...﴾ (الکہف ٤٦) یعنی مال اور اولاد دنیا کی زینت ہے اور نیک اعمال باقی رہنے والے ثواب والے اور نیک اُمید والے۔ ابن ماجہ میں ابن عمر

رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''ایک شخص نے ایک مرتبہ : یا رب لك الحمد کما ینبغی لجلال وجھك و عظیم و سلطانك کہا۔ فرشتے گھبرا اٹھے کہ ہم اس کا کتنا اجر لکھیں۔ آخر اللہ تعالیٰ سے انہوں نے عرض کی کہ تیرے ایک بندے نے ایسا کلمہ پڑھا کہ ہم نہیں جانتے کہ اسے کس طرح لکھیں؟ پروردگار نے باوجود جاننے کے اُن سے پوچھا کہ اُس نے کیا کہا ہے؟ انہوں نے بیان کیا کہ اس نے یہ کلمہ کہا ہے: فرمایا: تم یوں ہی اسے لکھ لو میں اپنی ملاقات کے وقت اس کا اجر دے دوں گا۔''

قرطبی ایک جماعت علماء سے نقل کرتے ہیں کہ لا الٰہ الا اللہ سے بھی ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ﴾ افضل ہے کیونکہ اس میں توحید اور حمد دونوں ہیں اور علماء کا خیال ہے کہ لا الٰہ الا اللہ افضل ہے۔ اس لیے کہ ایمان و کفر میں یہی فرق کرتا ہے۔ اسی کے کہلوانے کے لیے کفار سے لڑائیاں کی جاتی ہیں۔ جیسا کہ صحیح بخاری، صحیح مسلم کی حدیث میں ہے۔ ایک مرفوع حدیث میں ہے کہ جو کچھ میں نے اور مجھ سے پہلے انبیاء کرام نے کہا ہے ان میں سب سے افضل لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریك له ہے۔ حضرت جابرؓ کی ایک مرفوع حدیث پہلے گزر چکی ہے کہ افضل الذکر لا الٰہ الا اللہ ہے اور افضل دعا الحمد للہ ہے۔ ترمذی نے اس حدیث کو حسن کہا ہے۔

لغت میں حمد و ربّ کا اطلاق ☆

الحمد میں الف لام استغراق کا ہے۔ یعنی حمد کی تمام قسمیں اور جنسیں سب کی سب صرف اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ثابت ہیں۔ جیسا کہ حدیث میں ہے کہ باری تعالیٰ تیرے ہی لیے تمام تعریفیں ہیں اور تمام ملک ہے۔ تیرے ہی ہاتھ میں تمام بھلائیاں ہیں اور تمام کام تیری ہی طرف لوٹتے ہیں۔ (احمد) رب کہتے ہیں مالک اور متصرف کو۔ لغت میں اس کا اطلاق سردار اور اصلاح کے لیے تبدیلی کرنے والے پر بھی ہوتا ہے اور ان سب معانی کے اعتبار سے ذات باری کے لیے یہ پاک نام زیب دیتا ہے۔ رب کا لفظ بھی سوائے اللہ تعالیٰ کے دوسرے پر نہیں بولا جا سکتا ہے۔ ہاں! اضافت کے ساتھ ہو تو اور بات ہے۔ جیسے رب الدار یعنی گھر کا پالنے والا وغیرہ۔ بعض کا قول ہے کہ اسم اعظم یہی ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی تفسیر ☆

عالمین جمع ہے عالم کی۔ اللہ تعالیٰ کے سوا تمام مخلوق کو عالم کہتے ہیں۔ لفظ عالم بھی جمع ہے اور اس کا واحد لفظ ہے ہی نہیں۔ آسمان کی مخلوق، خشکی اور تری کی مخلوقات کو بھی عوالم یعنی کئی عالم کہتے ہیں۔ اسی طرح ایک ایک زمانے اور ایک ایک وقت کو بھی عالم کہا جاتا ہے۔ ابن عباسؓ سے اس آیت کی تفسیر میں مروی ہے کہ اس سے مراد کل مخلوق ہے۔ خواہ آسمانوں کی ہو یا زمینوں کی ہو یا ان کے درمیان کی۔ خواہ اس کا ہمیں علم ہو یا نہ ہو۔ انہی سے اس کی مراد جنات اور انسان بھی روایت کی گئی ہے۔ سعید بن جبیر، مجاہد اور ابن جریج سے بھی یہ مروی ہے۔ حضرت علیؓ سے بھی غیر معتبر سند سے یہ منقول ہے۔ اس قول کی دلیل قرآن کی آیت: ﴿لِیَکُوْنَ لِلْعٰلَمِیْنَ نَذِیْرًا﴾ (الفرقان: ۱) بھی بیان کی جاتی ہے یعنی تاکہ وہ العالمین یعنی جن اور انس کے لیے ڈرانے والا ہو جائے۔

فرا اور ابوعبیدہ کا قول ہے کہ سمجھ دار کو عالم کہا جاتا ہے۔ انسان' جنات' فرشتے' شیاطین انہیں عالم کہا جائے گا۔ جانوروں کو نہیں کہا جائے گا۔ زید بن اسلم اور ابوخیص فرماتے ہیں کہ ہر روح والی چیز کو عالم کہا جاتا ہے۔ قتادہ کہتے ہیں کہ ہر قسم کو ایک عالم کہتے ہیں۔ ابن مروان بن حکم عرف جعد جن کا لقب حمار تھا' جو بنوامیہ میں سے ہیں اور اپنے زمانے کے خلیفہ تھے' کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے سترہ ہزار عالم پیدا کیے ہیں۔ آسمان والے سب ایک عالم' زمینوں والے سب ایک عالم اور باقی کو خدا ہی جانتا ہے' مخلوق کو اُن کا علم نہیں۔ ابوالعالیہ فرماتے ہیں' انسان کل ایک عالم ہے۔ سارے جنات کا ایک عالم ہے اور ان کے سوا اٹھارہ ہزار یا چودہ ہزار عالم اور ہیں۔ فرشتے زمین پر ہیں اور زمین کے چار کونے ہیں۔ ہر کونے میں ساڑھے تین ہزار عالم ہیں۔ جنہیں اللہ تعالیٰ نے صرف اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا ہے۔ یہ قول بالکل غریب ہے اور ایسی باتیں جب تک کسی صحیح دلیل سے ثابت نہ ہوں' نہ ماننے کے قابل نہیں ہوتیں۔

حمیری کہتے ہیں کہ ایک ہزار اُمتیں ہیں۔ چھ سو تو تری میں اور چار سو خشکی میں۔ سعید بن مسیب سے بھی یہ مروی ہے۔ ایک ضعیف روایت میں ہے کہ حضرت فاروقؓ کی خلافت کے زمانے میں ایک سال ٹڈیاں نظر نہیں آئیں بلکہ دریافت کرنے پر بھی پتہ نہ چلا۔ آپ غمگین ہو گئے اور یمن' شام اور عراق کی طرف سوار دوڑا دیے کہ کہیں بھی ٹڈیاں نظر آتی ہیں یا نہیں؟ تو یمن والے سوار تھوڑی سی ٹڈیاں لے کر آئے اور امیر المومنین کے سامنے پیش کیں۔ آپ نے انہیں دیکھ کر تکبیر کہی اور فرمایا: میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے' اللہ تعالیٰ نے ایک ہزار اُمتیں پیدا کیں ہیں' جن میں سے چھ سو تری میں ہیں اور چار سو خشکی میں۔ ان میں سب سے پہلے جو اُمت ہلاک ہوگی وہ ٹڈیاں ہوں گی۔ بس ان کی ہلاکت کے بعد پے در پے اور سب اُمتیں ہلاک ہو جائیں گی۔ جس طرح کی تسبیح کا تاگا (رسی' دھاگہ) ٹوٹ جائے اور ایک کے بعد ایک کر کے سب موتی جھڑ (بکھر) جاتے ہیں لیکن اس روایت کے راوی محمد بن عیسیٰ ہلالی ضعیف ہیں۔ سعید بن مسیبؒ سے بھی یہ قول مروی ہے۔

وہب بن منبہ فرماتے ہیں' اٹھارہ ہزار عالم ہیں۔ دُنیا ساری کی ساری ان میں سے ایک عالم ہے۔ حضرت ابوسعید خدریؓ فرماتے ہیں' چالیس ہزار عالم ہیں۔ ساری دنیا ان میں سے ایک عالم ہے۔ زجاج کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے دُنیا و آخرت میں جو کچھ پیدا کیا ہے وہ سب عالم ہے۔ قرطبی کہتے ہیں کہ یہی قول صحیح ہے۔ اس لیے کہ یہ تمام عالمین کو شامل ہے جیسے فرعون کے اس سوال کے جواب میں کہ رب العالمین کون ہے؟ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا تھا کہ آسمان' زمینوں اور دونوں کے درمیان جو کچھ ہے اُن سب کا رب۔ عالم کا لفظ علامت سے مشتق ہے۔ اس لیے کہ عالم یعنی مخلوق اپنے پیدا کرنے والے اور بنانے والے پر نشان اور اس کی وحدانیت پر علامت ہے۔

جیسے کہ ابن معتز شاعر کا قول ہے

فیا عجبا کیف یعصی الا اله ☆ ام کیف یجحده الجاحد

ونی کل شیءٍ له ایة ☆ تدل علی انه واحد

یعنی تعجب ہے کس طرح خدا کی نافرمانی کی جاتی ہے اور کس طرح اس سے انکار کیا جاتا ہے۔ حالانکہ ہر چیز میں ایک

ایسی نشانی ہے جو اس کی وحدانیت پر واضح دلالت کرتی ہے۔

الحمد للہ ... کے بعد اب الرحمٰن الرحیم کی تفسیر

الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴿۳﴾

جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے

اس کی تفسیر پہلے پوری گزر چکی۔ اب اعادہ (تکرار) کی ضرورت نہیں۔ قرطبی فرماتے ہیں: رب العالمین کے وصف کے بعد الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ کا وصف ترہیب (ڈراوے) کے بعد ترغیب یعنی (امید) ہے جیسے فرمایا نَبِّئْ عِبَادِيْ (الحجر ۴۹) یعنی میرے بندوں کو خبر کر دو کہ میں بخشنے والا مہربان بھی ہوں اور میرے عذاب بھی دردناک ہیں اور فرمایا: تیرا رب جلد سزا کرنے والا ہے اور مہربانی اور بخشش کرنے والا بھی ہے۔ رب کے لفظ میں تخویف ہے اور رحمٰن اور رحیم کے لفظ میں اُمید ہے۔ صحیح مسلم شریف میں بروایت حضرت ابو ہریرہؓ مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر ایماندار خدا کے غضب وغصہ سے اور اس کے سخت عذابوں سے پورا واقف ہوتا (تو اس وقت) اس کے دل سے جنت کی طمع ہٹ جاتی اور اگر کافر اللہ تعالیٰ کی نعمتوں اور اس کی رحمتوں کو پوری طرح جان لیتا تو کبھی نا اُمید نہ ہوتا۔

مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ﴿۴﴾

جو مالک ہیں روزِ جزا کے

امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے مروی روایت ☆

بعض قاریوں نے ملك پڑھا ہے اور باقی سب نے مالك اور دونوں قراءتیں صحیح اور متواتر ہیں اور سات قراءتوں میں سے ہیں اور مالك کے لام کے زیر اور اس کے سکون کے ساتھ اور مليك اور ملكى بھی پڑھا گیا ہے۔ پہلے کی دونوں قراءتیں معنی کی رُو سے ترجیح والی ہیں اور دونوں صحیح ہیں اور اچھی ہیں۔ زمخشری نے ملک کو ترجیح دی ہے اس لیے کہ حرمین والوں کی یہ قراءت ہے اور قرآن میں بھی ﴿لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ﴾ (المؤمنون ۱۶) اور ﴿قَوْلُهُ الْحَقُّ وَلَهُ الْمُلْكُ﴾ (الانعام ۷۳) ہے۔ امام ابوحنیفہؒ سے بھی نقل کیا گیا ہے کہ انہوں نے ملک پڑھا۔ اس بنا پر کہ کبھی فاعل' فعل اور مفعول آتا ہے لیکن یہ شاذ ہے اور بے حد غریب[1] ہے۔ ابوبکر بن ابوداؤدؒ نے اس میں ایک اور غریب روایت پیش کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے تینوں خلفاء اور حضرت معاویہ اور ان کے لڑکے ملك پڑھتے تھے۔ ابن شہاب کہتے ہیں سب سے پہلے مروان نے ملک پڑھا۔ لیکن ہمارا خیال ہے کہ مروان کو اپنی اس قراءت کی صحت پر اطلاع تھی جو راوی حدیث ابن شہاب کو نہ تھی' واللہ اعلم۔

---

[1] امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق یہ روایت بجائے خود قابلِ اعتبار نہیں ہے۔ افسوس کہ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کے متعلق اپنا فیصلہ نافذ کر دیا لیکن امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی طرف اس روایت کی قبولیت کے انتساب پر کوئی کلام نہ کیا۔

ابن مردویہ نے کئی مسندوں سے اسے بیان کیا ہے کہ آنحضرت ﷺ ملک پڑھتے تھے۔ مالک کا لفظ مُلک سے ماخوذ ہے۔ جیسا کہ قرآن میں ہے: ﴿ اِنَّا نَحْنُ نَرِثُ الْاَرْضَ...... ﴾ (مریم: ۴۰) یعنی زمین اور اس کے اوپر کی تمام مخلوق کے مالک ہم ہی ہیں اور ہماری ہی طرف سب لوٹائے جائیں گے۔ اور فرمایا: ﴿ قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ مَلِكِ النَّاسِ ﴾ (الناس: ۱، ۲) یعنی کہہ کہ میں پناہ پکڑتا ہوں لوگوں کے ربّ کی اور لوگوں کے مالک کی اور مالک کا لفظ مُلک سے ماخوذ ہے جیسے فرمایا: ﴿ لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ...... ﴾ یعنی آج مُلک کس کا ہے؟ صرف اللہ واحد غلبہ والے کا اور فرمایا: ﴿ قَوْلُهُ الْحَقُّ...... ﴾ اسی کا فرمان حق ہے اور اسی کا سب ملک ہے اور فرمایا آج کے دن ملک رحمٰن ہی کا حق ہے اور ان کا دِل کافروں پر بہت سخت ہے۔ اس فرمان میں قیامت کے دن کے ساتھ ملکیت کی تخصیص کرنے سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ قیامت کے علاوہ اور چیزوں کو اپنا مملوک قرار دینے سے انکار کیا جا رہا ہے۔ اس لیے کہ پہلے اپنا وصف رب العالمین ہونا بیان فرما چکا ہے۔ جو دنیا و آخرت کو شامل ہے۔ قیامت کے دن کے ساتھ اس کی تخصیص کی وجہ یہ ہے کہ اس دن تو کوئی ملکیت کا دعویدار بھی نہ ہوگا بلکہ بغیر اس حقیقی مالک کی اجازت کے کوئی زبان تک نہ ہلا سکے گا۔ جیسا فرمایا: جس دن روح اور فرشتے صف بستہ کھڑے ہوں گے اور کوئی کلام نہ کر سکے گا۔ یہاں تک کہ رحمٰن اُسے اجازت دے اور وہ ٹھیک بات کہے اور جگہ ارشاد ہے: سب آوازیں رحمٰن کے سامنے پست ہوں گی اور سوا گنگناہٹ کے کچھ سنائی نہ دے گا اور فرمایا: جب قیامت آئے گی اُس دن بغیر خداوند تبارک وتعالیٰ کی اجازت کے کوئی شخص بول نہ سکے گا۔ بعض ان میں سے بدبخت ہوں گے اور بعض سعادت مند۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی تفسیر ☆

ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں' اس دن کی بادشاہت میں اس کے سوا کوئی نہ ہوگا جیسا کہ دنیا میں مجازاً تھے۔ یوم الدین سے مراد مخلوق کے حساب کا یعنی قیامت کا دن ہے۔ جس دن تمام بھلے برے اعمال کا بدلہ دیا جائے گا۔ ہاں! اگر رب کسی برائی سے درگزر کرے' یہ اُس کا اختیاری امر ہے۔ صحابہؓ، تابعینؒ اور سلف صالحین سے بھی یہ مروی ہے۔ بعض سے یہ بھی منقول ہے کہ مراد اس سے یہ ہے کہ خدائے تعالیٰ قیامت کے قائم کرنے پر قادر ہے۔ ابن جریر نے اس قول کو ضعیف قرار دیا ہے لیکن ان دونوں اقوال میں کوئی مخالفت نہیں۔ ہر ایک قول کا قائل دوسرے کے قول کی تصدیق کرتا ہے اور پہلا قول مطلب پر زیادہ دلالت کرتا ہے جیسا کہ فرمان ہے: ﴿ اَلْمُلْكُ يَوْمَئِذٍ...... ﴾ (حج: ۵۶) اور دوسرا قول اس آیت کے مشابہ ہے جو فرمایا: ﴿ وَ يَوْمَ يَقُوْلُ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴾ (الانعام: ۷۳) یعنی جس دن کہے گا ہو جا' بس اسی وقت ہو جائے گی' واللہ اعلم۔ حقیقی مالک اللہ تعالیٰ ہی ہے جیسے فرمایا: ﴿ هُوَ اللّٰهُ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْمَلِكُ...... ﴾ (الحشر: ۲۳) صحیحین میں حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: بدترین نام اللہ تعالیٰ کے نزدیک اُس شخص کا ہے جو شہنشاہ کہلائے۔ حقیقی مالک اللہ کے سوا کوئی نہیں اور حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ زمین کو قبضہ میں لے لے گا اور آسمان اُس کے داہنے ہاتھ میں لپٹے ہوئے ہوں گے' پھر فرمائے گا میں بادشاہ ہوں' کہاں گئے زمین کے بادشاہ؟ کہاں ہیں تکبر والے۔ (بخاری و مسلم)

قرآنِ عظیم میں ہے آج بادشاہت کس کی ہے؟ فقط اللہ کے لیے غلبہ والے کی ہے اور کسی کو ملک کہہ دینا یہ صرف مجازاً ہے جیسا کہ قرآن میں طالوت کو ملک کہا گیا ہے اور ﴿ وَكَانَ وَرَآءَهُمْ مَّلِكٌ ﴾ (الکھف: ۷۹) کا لفظ آیا ہے اور بخاری

اور مسلم میں ملوک کا لفظ آیا ہے اور قرآن کی ایک آیت میں ہے: ﴿ اِذْ جَعَلَ فِیْكُمْ اَنْۢبِیَآءَ وَ جَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا ﴾ (آل عمران ۲۰) یعنی تم میں انبیاء کئے اور تمہیں بادشاہ بنایا۔ دفن کے معنی بدلے جزاء اور حساب کے ہیں۔ جیسا کہ قرآنِ پاک میں ہے: اس دن اللہ تعالیٰ انہیں پورا پورا بدلہ دے گا اور وہ جان لیں گے۔ ایک اور جگہ ہے: ﴿ اِنَّا لَمَدِیْنُوْنَ ﴾ (الصافات ۵۳) کیا ہم بدلہ دیئے جائیں گے۔ حدیث میں ہے' دانا وہ ہے جو اپنے نفس سے خود بدلہ لے اور موت کے بعد کام آنے والے اعمال کرے۔ یعنی اپنے نفس سے خود حساب لو اس سے پہلے کہ تمہارا حساب لیا جائے اور اپنے اعمال کا خود وزن کر لو اس سے پہلے کہ وہ ترازو میں رکھے جائیں اور اس بڑی پیشی کے لیے تیار ہو جاؤ' جب تم اس خدا کے سامنے پیش کیے جاؤ گے' جس پر تمہارا کوئی عمل پوشیدہ نہیں جیسا کہ خود خداوند عالم نے فرمایا: جس دن تم پیش کیے جاؤ گے تو کوئی بات اللہ پر چھپنے کی نہیں۔

اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ ؕ۝۵

ہم آپ ہی کی عبادت کرتے ہیں اور آپ ہی سے درخواست اعانت کی کرتے ہیں

ساتوں قاریوں اور جمہور نے اسے اِیَّاكَ پڑھا ہے۔ عمرو بن فائد نے اِیَاكَ پڑھا ہے لیکن یہ قراءت شاذ اور مردود ہے اس لیے کہ اِیَا کے معنی سورج کی روشنی کے ہیں اور بعض نے اَیَّاكَ پڑھا ہے اور بعضوں نے هِیَاكَ پڑھا ہے۔ عرب شاعروں کے شعر میں بھی هیاك ہے۔ نستعینُ کی یہی قراءت تمام کی ہے۔ سوائے یحییٰ بن وثاب اور اعمش کے۔ یہ دونوں پہلے نون کو زیر سے پڑھتے ہیں۔ قبیلہ بنو اسد ربیعہ بنو تمیم کا لغت اسی طرح پر ہے۔ لغت میں عبادت کہتے ہیں ذلت اور پستی کو۔ طریق معبد: اُس راستے کو کہتے ہیں جو ذلیل ہو۔ اسی طرح بعیرٌ معبدٌ اُس اونٹ کو کہتے ہیں جو ذلیل ہو اور شریعت میں عبادت نام ہے' محبت' خشوع' خضوع اور خوف کے مجموعے کا۔ لفظ ایاك کو جو مفعول ہے پہلے لائے اور پھر اسی کو دہرایا تاکہ اس کی اہمیت ہو جائے اور عبادت اور طلب و مدد اللہ تعالیٰ ہی کے لیے مخصوص ہو جائے۔ تو اس جملے کے معنی یہ ہوئے کہ ہم تیرے سوا کسی کی عبادت نہیں کرتے اور تیرے سوا کسی پر بھروسہ نہیں کرتے۔ کامل اطاعت اور پورے دین کا حاصل صرف یہی دو چیزیں ہیں۔

اِس بارے میں سلف رحمۃ اللہ علیہم کی آراء ☆

بعض سلف کا فرمان ہے کہ سارے قرآن کا راز سورۂ فاتحہ میں ہے اور پوری سورت کا راز اس آیت: ﴿اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ﴾ میں ہے۔ آیت کے پہلے حصہ میں شرک سے بیزاری کا اعلان ہے اور دوسرے جملے میں اپنی طاقتوں اور قوتوں کا انکار ہے اور اللہ عزوجل کی طرف اپنے کاموں کی سپردگی ہے۔ اس مضمون کی اور بھی بہت سی آیتیں قرآن پاک میں موجود ہیں جیسے فرمایا: ﴿فَاعْبُدْهُ وَ تَوَكَّلْ عَلَیْهِ ....﴾ (ھود: ۱۲۳) یعنی اللہ ہی کی عبادت کرو اور اسی پر بھروسہ کرو۔ تمہارا رب تمہارے اعمال سے غافل نہیں۔ فرمایا: ﴿قُلْ هُوَ الرَّحْمٰنُ.....﴾ (الملک ۲۹) کہہ دے کہ وہی رحمن ہے' ہم اُس پر ایمان لائے اور اسی پر ہم نے توکل کیا۔ فرمایا: ﴿رَبُّ الْمَشْرِقِ وَ الْمَغْرِبِ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَاتَّخِذْهُ وَكِیْلًا﴾ (المزمل ۹) یعنی مشرق و مغرب کا رب وہی ہے۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں' تو اسی کو اپنا کارساز سمجھ۔ یہی مضمون اس آیۂ کریمہ میں

ہے۔ اس سے پہلے کی آیتوں میں تو خطاب نہ تھا لیکن اس آیت میں اللہ تعالیٰ سے خطاب کیا گیا جو نہایت لطافت اور مناسبت رکھتا ہے۔ اس لیے کہ جب بندے نے اللہ تعالیٰ کی صفت وثناء بیان کی تو گویا قربِ خداوندی میں حاضر ہو گیا اور خداوند جل وعلاء کے حضور میں پہنچ گیا۔ اب اس مالک کو خطاب کر کے اپنی ذلت اور مسکینی کا اظہار کرنے لگا اور کہنے لگا کہ خدایا! ہم تو تیرے ذلیل غلام ہیں اور اپنے تمام کاموں میں تیرے ہی محتاج ہیں۔ اس آیت میں اس بات کی بھی دلیل ہے کہ اس سے پہلے کے تمام جملوں میں خبر تھی۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی بہترین صفات پر اپنی ثناء آپ کی تھی اور بندوں کو اپنی ثناء انہی الفاظ کے ساتھ بیان کرنے کے لیے ارشاد فرمایا تھا۔ اسی لیے اس شخص کی نماز صحیح نہیں جو اس سورت کو پڑھنا جانتا ہو اور پھر نہ پڑھے جیسا کہ بخاری ومسلم کی حدیث میں حضرت عبادہ بن صامتؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اُس شخص کی نماز کو نماز نہیں کہا جا سکتا' جو سورۃ فاتحہ اپنی نماز میں نہ پڑھے۔ صحیح مسلم شریف میں حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ میں نے نماز کو اپنے اور اپنے بندے کے درمیان نصف' نصف بانٹ لیا ہے۔ اس کا آدھا حصہ میرا ہے اور آدھا حصہ میرے بندے کے لیے ہے اور میرے بندے کے لیے نصف' نصف بانٹ لیا ہے۔ اس کا آدھا حصہ ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ کہتا ہے تو اللہ فرماتا ہے' میرے بندے نے میری حمد بیان کی۔ جب کہتا ہے: الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ اللہ فرماتا ہے میرے بندے نے میری بزرگی بیان کی۔ جب وہ ﴿اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ﴾ کہتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے یہ میرے اور میرے بندے کے درمیان ہے اور میرے بندے کے لیے وہ ہے' جو مانگے۔ پھر وہ آخر سورت تک پڑھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے' یہ میرے بندے کے لیے ہے اور میرا بندہ جو مجھ سے مانگے' اس کے لیے ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: ﴿اِيَّاكَ نَعْبُدُ﴾ کے معنی یہ ہیں کہ اے ہمارے ربّ! ہم خاص تیری ہی توحید مانتے ہیں اور تجھ سے ڈرتے ہیں اور تیری ذات سے اُمید رکھتے ہیں۔ تیرے سوا کسی اور کی نہ تو ہم عبادت کریں' نہ ڈریں' نہ اُمید رکھیں اور اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ سے مراد یہ ہے کہ ہم تیری تمام اطاعت پر اور اپنے تمام کاموں میں تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں۔ قتادہؒ فرماتے ہیں' مطلب یہ ہے کہ خداوند تبارک وتعالیٰ کا حکم یہ ہے کہ تم اسی کی خالص عبادت کرو اور تمام اپنے کاموں میں اُسی سے مدد مانگو۔ ﴿اِيَّاكَ نَعْبُدُ﴾ کو پہلے لانا اس لیے ہے کہ اصل مقصود اللہ تعالیٰ کی عبادت ہی ہے اور مدد طلب کرنا یہ عبادت کا وسیلہ اور اہتمام اور اس پر پختگی ہے اور ظاہر ہے کہ زیادہ اہمیت والی چیز کو آگے کیا جاتا ہے اور اس سے کم کو اس کے بعد لایا جاتا ہے' واللہ اعلم۔

اگر یہ کہا جائے کہ یہاں جمع کے صیغہ کو لانے کی یعنی ہم کہنے کی کیا ضرورت ہے؟ اگر یہ جمع کے لیے ہے تو کہنے والا تو ایک ہے اور اگر تعظیم کے لیے ہے تو اس مقام پر یہ نہایت نامناسب ہے کیونکہ یہاں تو مسکینی اور عاجزی کا ظاہر کرنا مقصود ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ گویا ایک بندہ تمام بندوں کی طرف سے خبر دے رہا ہے۔ بالخصوص جب کہ وہ جماعت میں کھڑا ہو یا امام بنا ہوا ہو۔ پس گویا وہ اپنی اور اپنے سب مؤمن بھائیوں کی طرف سے اقرار کر رہا ہے کہ وہ سب اس کے بندے ہیں اور اسی کی عبادت کے لیے پیدا کیے گئے ہیں اور یہ ان کی طرف سے بھلائی کے لیے آگے بڑھا ہوا ہے۔ بعضوں نے کہا ہے کہ یہ تعظیم کے لیے ہے۔ گویا کہ بندہ جب عبادت میں داخل ہوتا ہے تو اسی کو کہا جاتا ہے کہ تو شریف ہے اور تیری عزت ہمارے

دربار میں بہت زیادہ ہے تو اب ﴿اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ﴾ کہہ کر اپنے تئیں عزت سے یاد کر۔ ہاں! اگر عبارت سے الگ ہو تو اس وقت ہم نہ کہہ' گو ہزاروں' لاکھوں میں ہو کیونکہ سب کے سب اللہ تعالیٰ کے محتاج اور اس کے دربار کے فقیر ہیں۔ بعض کا قول ہے کہ ﴿اِيَّاكَ نَعْبُدُ﴾ میں جو تواضع اور عاجزی ہے اور ایاك عبدنا میں نہیں۔ اس لیے کہ اس میں اپنے نفس کی بڑائی اور اپنی عبادت کی اہلیت پائی جاتی ہے حالانکہ کوئی بندہ اللہ تعالیٰ کی پوری عبادت اور جیسی چاہیے ویسی ثناء و صفت بیان کرنے پر قدرت ہی نہیں رکھتا۔ کسی شاعر کا قول ہے کہ مجھے اس کا غلام کہہ کر ہی پکارو کیونکہ میرا سب سے اچھا نام یہی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا نام عبد یعنی غلام' ان جگہوں پر لیا ہے جہاں پر اپنی بڑی بڑی نعمتوں کا ذکر کیا ہے۔ جیسے قرآن نازل کرنا' نماز میں کھڑے ہونا' معراج کرانا وغیرہ۔ فرمان ہے: ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلٰى عَبْدِهِ﴾ (الکھف ۱) فرمایا: ﴿وَّاَنَّهٗ لَمَّا قَامَ عَبْدُ اللّٰهِ......﴾ (الجن ۱۹) ﴿سُبْحٰنَ الَّذِيْٓ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ﴾ (بنی اسرائیل:۱) ساتھ ہی قرآن پاک نے یہ تعلیم دی کہ اے نبی! جس وقت تمہارا دل مخالفین کے جھٹلانے کی وجہ سے تنگ ہو تو تم میری عبادت میں مشغول ہو جاؤ۔ فرمان ہے: ﴿وَلَقَدْ نَعْلَمُ......﴾ (النحل:۹۷) یعنی ہم جانتے ہیں کہ مخالفین کی باتیں تیرا دل دکھاتی ہیں تو ایسے وقت اپنے رب کی تسبیح اور حمد بیان کر اور سجدہ کر اور موت کے وقت تک اپنے رب کی عبادت میں لگا رہ۔ رازی نے اپنی تفسیر میں بعض لوگوں سے نقل کیا ہے کہ عبودیت کا مقام رسالت کے مقام سے افضل ہے کیونکہ عبادت کا تعلق مخلوق سے خالق کی طرف ہوتا ہے اور رسالت کا تعلق حق سے خلق کی طرف ہوتا ہے اور اس دلیل سے بھی کہ عبد کی کل اصلاح کے کاموں کا متولی خود اللہ تبارک و تعالیٰ ہوتا ہے اور رسول اپنی اُمت کی مصلحتوں کا والی ہوتا ہے لیکن یہ قول غلط ہے اور اس کی یہ دونوں دلیلیں بھی کمزور اور لا حاصل ہیں۔ افسوس رازی نے نہ تو اس کو ضعیف کہا' نہ اُسے روکا۔ بعض صوفیوں کا قول ہے کہ عبادت یا تو ثواب حاصل کرنے کے لیے ہوتی ہے یا عذاب دفع کرنے کے لیے۔ وہ کہتے ہیں کوئی فائدے کی بات نہیں اس لیے کہ اس وقت مقصود خود اپنی مراد کا حاصل کرنا ٹھہرا۔ اس کی تکالیف کے لیے آمادگی کرنا یہ بھی ضعیف ہے۔ اعلیٰ مرتبہ عبادت کا یہ ہے کہ انسان اپنی ذاتِ مقدس کی جو تمام کامل صفتوں سے موصوف ہے' محض اُس کی ذات کے لیے ہی عبادت کرے اور مقصود کچھ نہ ہو۔ اسی لیے نماز کی نیت للّٰہ نماز پڑھنے کی ہوتی ہے۔ اگر وہ ثواب پانے اور عذاب سے بچنے کے لیے ہو تو باطل ہے۔ دوسرا گروہ ان کی تردید کرتا ہے اور کہتا ہے کہ عبادت کا اللہ تعالیٰ کے لیے ہونا کچھ اس کے خلاف نہیں کہ ثواب کی طلب اور عذاب کے بچاؤ کا مطلوب نہ ہو۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ ایک اعرابی نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر کہا کہ حضور ﷺ میں نہ تو آپ ﷺ جیسا پڑھنا جانتا ہوں نہ حضرت معاذؓ جیسا۔ میں تو اللہ تعالیٰ سے جنت کا سوال کرتا ہوں اور جہنم سے نجات چاہتا ہوں۔ حضورؐ نے فرمایا: اسی کے قریب قریب ہم بھی پڑھتے ہیں۔ (ابن ماجہ)

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۙ﴿۶﴾

بتلا دیجیے ہم کو رستہ سیدھا

جمہور نے صِرَاطَ پڑھا ہے۔ بعضوں نے سِرَاطَ کہا ہے اور زے سے بھی ایک قراءت ہے۔ فراء کہتے ہیں بنی عذرہ اور بنی کلب کی قراءت یہی ہے چونکہ پہلے ثناء وصفت بیان کی تو اب مناسب تھا کہ اپنی حاجت طلب کرے جیسے کہ پہلے حدیث میں گزر چکا ہے کہ اس کا آدھا حصہ میرے لیے ہے اور آدھا میرے بندے کے لیے وہ ہے جو طلب کرے۔ خیال کیجئے کہ اس میں کس قدر لطافت اور عمدگی ہے کہ پہلے پروردگار عالم کی تعریف وتوصیف کی۔ پھر اپنی اور اپنے بھائیوں کی حاجت طلب کی۔ یہ وہ لطیف پیرایہ ہے جو مقصود کو حاصل کرنے اور مراد کو پالینے کے لیے تیر بہدف ہے۔ اس کامل طریقہ کو پسند فرما کر خداوند تبارک وتعالیٰ نے اس کی ہدایت کی۔ کبھی سوال اس طرح ہوتا ہے کہ سائل اپنی حاجت اور حالت کو ظاہر کر دیتا ہے جیسے موسیٰ علیہ السلام نے کہا تھا: ﴿رَبِّ اِنِّیْ لِمَآ اَنْزَلْتَ اِلَیَّ مِنْ خَیْرٍ فَقِیْرٌ﴾ (القصص:۲۴) پروردگار جو بھلائیاں تو نے میری طرف نازل فرمائی ہیں میں ان کا محتاج ہوں۔ حضرت یونسؑ نے بھی اپنی دعا میں کہا: ﴿لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّیْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ﴾ (الانبیاء:۸۷) خدایا! تیرے سوا کوئی معبود نہیں تو پاک ہے میں ظالموں میں سے ہوں۔ کبھی سوال اس طرح بھی ہوتا ہے کہ سائل صرف تعریف اور بزرگی بیان کر کے چپ ہو جاتا ہے جیسے شاعر کا قول ہے کہ مجھے اپنی حاجت کے بیان کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ تیری مہربانیوں بھری بخشش مجھے کافی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ داد و دہش تیری پاک عادتوں میں داخل ہے۔ صرف تیری پاکیزگی بیان کر دینا، تیری حمد وثناء کرنا ہی مجھے اپنی حاجت پوری کرنے کے لیے کافی ہے۔ ہدایت کے معنی یہاں پر ارشاد اور توفیق کے ہیں، کبھی تو ہدایت بنفسہٖ متعدی ہوتی ہے۔ جیسے یہاں ہے تو معنی اَلْهِمْنَا وَفِّقْنَا اُرْزُقْنَا اور اَعْطِنَا یعنی ہمیں عطا فرمائے ہوں گے اور جگہ ہے: ﴿وَهَدَیْنٰهُ النَّجْدَیْنِ﴾ (البلد:۱۰) یعنی ہم نے اسے دونوں راستے دکھا دیئے بھلائی اور برائی دونوں کے اور کبھی ہدایت الٰی کے ساتھ متعدی ہوتی ہے جیسے فرمایا: ﴿اِجْتَبٰهُ وَ هَدٰهُ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ﴾ (النحل:۱۲۰) اور فرمایا: ﴿فَاهْدُوْهُمْ اِلٰی صِرَاطِ الْجَحِیْمِ﴾ (الصافات:۲۳) یہاں ہدایت ارشاد اور دلالت کے معنی میں ہے۔ اسی طرح فرمان ہے: ﴿وَاِنَّكَ لَتَهْدِیْ......﴾ (الشوریٰ:۵۲) یعنی تو البتہ سیدھی راہ دکھاتا ہے اور کبھی ہدایت لام کے ساتھ متعدی ہوتی ہے جیسے جنتیوں کا قول قرآنِ کریم میں ہے: ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ هَدٰنَا لِهٰذَا﴾ (الاعراف:۴۳) یعنی خدا کا شکر ہے کہ اس نے ہمیں اس کی راہ دکھائی یعنی توفیق دی اور ہدایت والا بنایا۔ صراطِ مستقیم کے معنی متعدد ہیں۔ امام ابوجعفر ابن جریر فرماتے ہیں کہ مراد اس سے واضح اور صاف راستہ ہے، جو کہیں ٹیڑھا نہ ہو۔ عرب کی لغت میں اور شاعروں کے شعر میں یہ معنی صاف طور پر پائے جاتے ہیں اور اس پر بے شمار شاہد موجود ہیں۔ (طبری) صراط کا استعمال استعارۃً قوت اور فعل میں بھی ہوتا ہے اور پھر صراط کی صفت کبھی استقامت ہوتی ہے اور گاہے کجی۔ سلف اور خلف مفسرین رحمہم اللہ سے اس کی بہت سی تفسیریں منقول ہیں اور ان سب کا خلاصہ ایک ہے اور وہ اللہ اور رسول کی پیروی اور تابعداری ہے۔

احادیثِ مبارکہ سے صراطِ مستقیم کی وضاحت ☆

ایک مرفوع حدیث میں ہے کہ صراطِ مستقیم کتاب ہے۔ (ابن ابی حاتم) اسی طرح ابن جریر نے بھی روایت کی ہے۔ فضائل قرآن کے بارے میں پہلے حدیث گزر چکی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مضبوط رسّی، حکمتوں والا ذکر اور سیدھی راہ یعنی صراطِ

مستقیم یہی اللہ کی کتاب قرآن کریم ہے۔ (مسند احمد' ترمذی) حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قول بھی یہی ہے اور مرفوع حدیث کا بھی موقوف ہونا ہی زیادہ مشابہ ہے' واللہ اعلم۔ حضرت عبداللہ سے بھی یہی روایت ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے کہ جبریل نے کہا کہ اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ﴾ یعنی ہمیں ہدایت والے راستہ کا الہام کر اور اس دین الٰہی کی سمجھ دے جس میں کوئی کجی نہیں۔ آپ سے یہ قول بھی مروی ہے کہ اس سے مراد اسلام ہے۔ ابن عباس' ابن مسعود اور بہت سے صحابہ سے بھی یہی تفسیر منقول ہے۔ حضرت جابر فرماتے ہیں' صراط مستقیم سے مراد اسلام ہے جو ہر اس چیز سے جو آسمان اور زمین کے درمیان ہے' زیادہ وسعت والا ہے۔ ابن حنفیہ فرماتے ہیں' اس سے مراد اللہ تعالیٰ کا وہ دین ہے جس کے سوا اور دین مقبول نہیں۔ عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم کا قول ہے کہ صراط مستقیم اسلام ہے۔

مسند احمد کی ایک حدیث میں مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے ایک مثال بیان کی کہ اس کے دونوں طرف دو دیواریں ہیں۔ ان میں کئی ایک کھلے ہوئے دروازے ہیں اور دروازوں پر پردے لٹک رہے ہیں۔ صراط مستقیم پر ایک پکارنے والا مقرر ہے' جو کہتا ہے کہ اے لوگو! تم سب کے سب اس سیدھی راہ پر چلے جاؤ' ٹیڑھی ترچھی' ادھر ادھر کی راہوں پر نہ لگو۔ ایک پکارنے والا اس راستے کے اوپر ہے جب کوئی شخص ان دروازوں میں سے کسی کو کھولنا چاہتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ خبردار اسے نہ کھولنا۔ اگر کھولا تو اس راہ لگ جائے گا اور صراط مستقیم سے ہٹ جائے گا۔ پس صراط مستقیم تو اسلام ہے اور دیواریں اللہ کی حدیں ہیں اور کھلے ہوئے دروازے اللہ تعالیٰ کی حرام کردہ چیزیں ہیں اور دروازے پر پکارنے والا قرآن کریم ہے اور راستے کے اوپر سے پکارنے والا خوف الٰہی ہے جو ہر ایماندار کے دل میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے بطور واعظ کے ہوتا ہے۔ یہ حدیث ابن ابی حاتم' ابن جریر' ترمذی اور نسائی میں بھی ہے اور اس کی اسناد حسن صحیح ہیں' واللہ اعلم۔

مجاہد فرماتے ہیں' اس سے مراد حق ہے۔ ان کا یہ قول سب سے زیادہ جامع ہے اور ان سب اقوال میں باہمی کوئی تضاد نہیں۔ ابو العالیہ فرماتے ہیں کہ اس سے مراد نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دونوں خلفاء ہیں۔ ابو العالیہ اس قول کی تصدیق اور تحسین کرتے ہیں۔ دراصل یہ سب اقوال صحیح ہیں اور ایک دوسرے سے موافق ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دونوں خلفاء صدیق و فاروق (رضی اللہ عنہما) کا تابعدار حق کا تابع ہے اور حق کا تابع اسلام کا تابع' قرآن کا مطیع ہے اور قرآن اللہ کی کتاب' اس کی طرف کی مضبوط رسی اور اس کی سیدھی راہ ہے۔ پھر صراط مستقیم کی تفسیر میں یہ تمام اقوال صحیح ہیں۔ ایک دوسرے کی تصدیق کرتے ہیں' فالحمدللہ۔

حضرت عبداللہ فرماتے ہیں' صراط مستقیم وہ ہے جس پر ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چھوڑا۔ امام ابوجعفر بن جریر کا فیصلہ ہے کہ میرے نزدیک اس آیت کی تفسیر میں سب سے اولیٰ یہ ہے کہ ہم توفیق دیئے جائیں' اس چیز کی جو اللہ کی مرضی کی ہو اور جس پر چلنے کی وجہ سے اللہ اپنے بندوں پر راضی ہوا ہو اور انعام کیا ہو۔ صراط مستقیم یہی ہے۔ اس لیے کہ جو شخص اس چیز کی توفیق دیا گیا جس کی توفیق اللہ کے نیک بندوں کو تھی' جن پر اللہ تعالیٰ کا انعام ہوا تھا اور جو نبی اور صدیق اور شہید اور صالح لوگ تھے' وہ اسلام کی اور رسولوں کی تصدیق کی اور کتاب اللہ کو مضبوط تھام رکھنے کی اور اللہ تعالیٰ کے احکام کو بجالانے کی اور اس کے منع کیے ہوئے کاموں سے رک جانے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چاروں خلفاء اور تمام نیک بندوں کی راہ کی

توفیق دیا گیا اور یہی صراطِ مستقیم ہے۔

اگر یہ کہا جائے کہ مؤمن کو تو خدا کی طرف سے ہدایت حاصل ہو چکی ہے پھر نماز اور غیر نماز میں ہدایت مانگنے کی کیا ضرورت ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ مراد اس سے ہدایت پر ثابت قدمی اور رسوخ اور بینائی اور ہمیشگی کی طلب ہے۔ اس لیے کہ بندہ ہر ساعت اور ہر حالت میں خداوند تبارک وتعالیٰ کا محتاج ہے۔ اسی لیے اللہ نے اس کو سکھایا کہ ہر وقت وہ اللہ تعالیٰ سے ہدایت طلب کرتا رہے اور ثابت قدمی اور توفیق چاہتا رہے۔ بھلا اور نیک بخت انسان وہ ہے جسے اللہ تعالیٰ اپنے در کا بھکاری بنا لے۔ وہ اللہ پر پکارنے والے کی پکار کے قبول کرنے کا کفیل ہے۔ بالخصوص بے قرار' محتاج اور اس کی طرف اپنی حاجت دن رات پیش کرنے والے کی ہر پکار کو قبول کرنے کا وہ ضامن ہے اور جگہ قرآنِ کریم میں ہے: ﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ......﴾ (النساء: ۱۳۶) اے ایمان والو! اللہ پر اور اس کے رسولوں پر' اس کی کتاب پر جو اس نے اپنے رسول (ﷺ) کی طرف نازل فرمائی اور جو کتابیں اس سے پہلے نازل ہوئیں' سب پر ایمان لاؤ۔

اس آیت میں ایمان والوں کو ایمان لانے کا حکم دینا ایسا ہی ہے جیسے یہاں ہدایت والوں کو ہدایت کی طلب کا حکم دینا۔ مراد دونوں جگہ ثابت قدمی اور استمرار ہے اور ایسے اعمال پر ہمیشگی کرنی جو اس مقصد کے حاصل کرنے میں مدد پہنچائیں۔ اس پر یہ اعتراض وارد ہو بھی نہیں سکتا کہ یہ حاصل شدہ چیز کا حاصل کرنا ہے' واللہ اعلم۔ اور دیکھیے اللہ رب العزت نے اپنے ایماندار بندوں کو حکم دیا ہے کہ وہ کہیں کہ: ﴿رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَیْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ﴾ (آل عمران: ۸) یعنی اے ہمارے ربّ! ہمارے دِلوں کو ہدایت کے بعد ٹیڑھا نہ کر اور ہمیں اپنے پاس کی رحمت عطا فرما' تو بہت بڑا دینے والا اور عطا فرمانے والا ہے۔ یہ بھی وارد ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ مغرب کی تیسری رکعت میں سورۂ فاتحہ کے بعد اس آیت کو پست آواز میں پڑھا کرتے تھے۔ پس ﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ﴾ کے معنی یہ ہوئے کہ اے اللہ! ہمیں صراطِ مستقیم پر ثابت قدم رکھ اور اس سے ہمیں نہ ہٹا۔

صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ ۙ۬ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ ۟ ع

رستہ اُن لوگوں کا جن پر آپ نے انعام فرمایا' نہ رستہ اُن لوگوں کا جن پر آپ کا غضب کیا گیا اور نہ اُن لوگوں کا جو رستہ سے گم ہو گئے ○

اس کا بیان گزر چکا ہے کہ بندے کے اس قول پر اللہ کریم فرماتا ہے یہ میرے بندے کے لیے ہے اور میرے بندے کے لیے ہے جو کچھ وہ مانگے۔ یہ آیت تفسیر ہے صراطِ مستقیم کی اور نحویوں کے نزدیک یہ اس سے بدل ہے اور عطف بھی ہو سکتی ہے' واللہ اعلم

انعام یافتہ کون ہیں؟

اور جن پر انعام ہوا' ان کا بیان سورۂ نساء میں آ چکا ہے۔ فرمان ہے: ﴿وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ... ﴾ (النساء: ۵۹) یعنی اللہ اور رسول کے ماننے والے ان کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ کا انعام ہے۔ جو نبی اور صدیق اور شہید اور صالح لوگ ہیں۔ یہ بہترین ساتھی اور اچھے رفیق ہیں۔ یہ فضل الٰہی ہے اور اللہ کا جاننے والا ہونا کافی ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں' مطلب یہ ہے کہ اے اللہ! تو مجھے اُن فرشتوں' نبیوں' صدیقوں' شہیدوں اور صالحین کی راہ پر چلا' جن پر تو نے اپنی اطاعت وعبادت کی وجہ سے انعام نازل فرمایا۔ یہ آیت ٹھیک ﴿وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ ... ﴾ (ایضاً) کی طرح ہے۔ ربیع بن انس کہتے ہیں' اس سے مراد انبیاء ہیں۔ ابن عباسؓ اور مجاہد فرماتے ہیں' مؤمن ہیں۔ وکیع کہتے ہیں مسلمان ہیں۔ عبدالرحمٰن فرماتے ہیں' رسول اللہ ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابہؓ مراد ہیں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول زیادہ جامع اور ہمہ گیر ہے' واللہ اعلم۔

جمہور کی قراءت میں غیرِ را کے زیر کے ساتھ ہے اور صفت ہے۔ زمخشری کہتے ہیں را کی زبر کے ساتھ پڑھا گیا ہے اور حال ہے۔ رسول اللہ ﷺ اور حضرت عمر بن خطابؓ کی قراءت یہی ہے اور ابن کثیرؒ سے بھی روایت کی گئی ہے۔ عَلَيْهِمْ میں جو ضمیر ہے وہ اس کا ذوالحال ہے اور اَنْعَمْتَ عامل ہے۔ معنی یہ ہوئے کہ یا اللہ! تو ہمیں سیدھا راستہ دکھا۔ اُن کا راستہ جن پر تو نے انعام کیا۔ جو ہدایت اور استقامت والے تھے اور اللہ اور رسول (ﷺ) کے اطاعت گزار' اس کے حکموں پر عمل کرنے والے' اس کے منع کیے ہوئے کاموں سے رکنے والے تھے۔

مغضوب کون ہیں؟

ان کی راہ سے بچا' جن پر غضب وغصہ کیا گیا' جن کے ارادے فاسد ہو گئے' حق کو جان کر پھر اس سے ہٹ گئے اور گم گشتہ راہ لوگوں کے طریقے سے بھی ہمیں بچا لے جو سرے سے علم ہی نہیں رکھتے۔ مارے مارے پھرتے ہیں۔ راہ سے ہٹے ہوئے حیران وسرگرداں ہیں اور راہِ حق کی طرف راہنمائی نہیں کیے جاتے۔ لا کو دوبارہ لا کر کلام کی تاکید کرنا اس لیے ہے کہ معلوم ہو جائے کہ یہاں دو غلط راستے ہیں' ایک یہود کا دوسرا نصاریٰ کا۔ بعض نحوی کہتے ہیں کہ غیر کا لفظ یہاں پر استثناء کے لیے ہے۔ تو استثناء منقطع ہو سکتا ہے کیونکہ جن پر انعام کیا گیا ہے اُن میں سے یہ استثناء ہوتا ہے اور یہ لوگ انعام والوں میں داخل ہی نہ تھے لیکن ہم نے جو تفسیر کی ہے یہ بہت اچھی ہے۔ عرب شاعروں کے شعر میں ایسا پایا جاتا ہے کہ وہ موصوف کو حذف کر دیتے ہیں اور صرف صفت بیان کر دیا کرتے ہیں۔ اسی طرح اس آیت میں بھی صفت کا بیان ہے اور موصوف محذوف ہے۔ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ سے مراد غَيْرِ الصِّرَاطِ الْمَغْضُوْبِ ہے۔ مضاف الیہ کے ذکر سے کفایت کی گئی ہے اور مضاف بیان نہ کیا گیا۔ اس لیے کہ نشستِ الفاظ ہی اس پر دلالت کر رہی ہے۔ پہلے دو مرتبہ یہ لفظ آ چکا ہے۔ بعض کہتے ہیں وَلَا الضَّآلِّيْنَ میں لَا زائد ہے اور ان کے نزدیک تقدیر کلام اس طرح ہے۔ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ اور اس کی شہادت عرب شاعروں کے شعر میں بھی ملتی ہے لیکن صحیح بات وہی ہے جو ہم پہلے لکھ چکے۔

حضرت عمر بن خطابؓ سے غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ پڑھنا صحیح سند سے مروی ہے اور اسی طرح حضرت اُبی بن کعبؓ سے بھی روایت ہے اور یہ محمول ہے اس پر کہ ان بزرگوں سے یہ بطور تفسیر صادر ہوا تو ہمارے قول کی تائید ہوئی کہ ''لا'' نفی کی تائید کے لیے ہی لایا گیا ہے تاکہ یہ وہم ہی نہ ہو کہ یہ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ پر عطف ہے اور اس لیے بھی کہ دونوں راہوں کا فرق معلوم ہو جائے تاکہ ہر شخص ان سے بچتا رہے۔ اہل ایمان کا تو طریقہ یہ ہے کہ حق کا علم بھی ہو اور حق پر عمل بھی ہو۔ یہودیوں کے یہاں عمل نہیں اور نصاریٰ کے علم نہیں۔ اسی لیے یہودیوں پر غضب ہوا اور نصرانیوں کو گمراہی ملی۔ اس لیے کہ باوجود علم کے عمل کو چھوڑنا سبب ہے غضب کا اور نصرانی گو ایک چیز کا قصد تو کرتے ہیں لیکن اس کے صحیح راستہ کو نہیں پا سکتے' اس لیے ان کا طریقہ کار غلط ہے۔ وہ اتباعِ حق سے ہٹے ہوئے ہیں۔ یوں تو غضب اور گمراہی ان دونوں جماعتوں کے حصہ میں ہے لیکن یہودی غضب کے حصہ میں پیش پیش ہیں۔ جیسا کہ اور جگہ قرآنِ کریم میں ہے: ﴿مَنْ لَّعَنَهُ اللّٰهُ وَ غَضِبَ عَلَیْهِ﴾ (المائدہ: ۶۰) اور نصرانی ضلالت میں بڑھے ہوئے ہیں۔ فرمانِ خداوندی ہے: ﴿قَدْ ضَلُّوْا مِنْ قَبْلُ وَاَضَلُّوْا كَثِیْرًا وَّضَلُّوْا عَنْ سَوَآءِ السَّبِیْلِ﴾ (المائدہ: ۷۷) یعنی یہ پہلے ہی گمراہ ہیں اور بہتوں کو گمراہ کر بھی چکے ہیں اور سیدھی راہ سے بھٹکے ہوئے ہیں۔ اس کی تائید میں بہت سی احادیث و روایات پیش کی جا سکتی ہیں۔

مسند احمد میں ہے کہ حضرت عدیؓ بن حاتم نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ کے لشکر نے میری پھوپھی اور چند لوگوں کو گرفتار کر کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کیا' تو میری پھوپھی نے کہا کہ میری خبر گیری کرنے والا دور ہے اور عمر رسیدہ بڑھیا ہوں' جو کسی خدمت کے لائق نہیں۔ آپ ﷺ مجھ پر احسان کیجیے اور مجھے رہائی دیجیے۔ اللہ تعالیٰ آپ ﷺ پر احسان کرے گا۔ حضور ﷺ نے دریافت کیا کہ تیری خبر لینے والا کون ہے؟ اس نے کہا: عدیؓ بن حاتم۔ آپ ﷺ نے فرمایا: وہی جو اللہ اور رسول (ﷺ) سے بھاگتا پھرتا ہے؟ پھر آپ ﷺ نے اُسے آزاد کر دیا۔ جب لوٹ کر آپ ﷺ آئے تو آپ ﷺ کے ساتھ ایک شخص تھے اور غالباً حضرت علیؓ تھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: لوان سے سواری مانگ لو۔ میری پھوپھی نے اُن سے درخواست کی جو منظور ہوئی اور سواری مل گئی۔ وہ یہاں سے آزاد ہو کر میرے پاس آئیں اور کہنے لگیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سخاوت نے تو تیرے باپ حاتم کی سخاوت کو بھی ماند کر دیا۔ آپ ﷺ کے پاس جو آتا ہے' آپ ﷺ کے پاس جو جاتا ہے وہ خالی ہاتھ واپس نہیں جاتا۔ یہ سن کر میں بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ میں نے دیکھا کہ چھوٹے بچے اور بوڑھی عورتیں بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آتی جاتی ہیں اور آپ ﷺ اُن سے بھی بے تکلفی کے ساتھ گفتگو کرتے ہیں۔ اس بات نے مجھے یقین دلایا کہ آپ (ﷺ) قیصر و کسریٰ کی طرح بادشاہت اور وجاہت کے طلب کرنے والے نہیں۔ آپ ﷺ نے مجھے دیکھ کر فرمایا: عدی لا الٰہ الا اللہ کہنے سے کیوں بھاگتے ہو؟ کیا اللہ کے سوا اور کوئی عبادت کے لائق ہے؟ اللہ اکبر کہنے سے کیوں منہ موڑتے ہو؟ کیا اللہ عزوجل سے بھی بڑا کوئی ہے؟ مجھ پر ان کلمات نے اور آپ (ﷺ) کی سادگی و بے تکلفی نے ایسا اثر کیا کہ میں فوراً کلمہ پڑھ کر مسلمان ہو گیا۔ جس سے آپ ﷺ بہت خوش ہوئے اور فرمانے لگے۔ مَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ سے مراد یہود ہیں اور ضَآلِّیْنَ سے مراد نصاریٰ ہیں۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ حضرت عدیؓ کے سوال پر حضور ﷺ نے یہ تفسیر ارشاد فرمائی تھی۔ اس حدیث کی بہت سی روایات ہیں اور مختلف الفاظ سے

مروی ہیں۔ بنو قین کے ایک شخص نے وادی القریٰ میں حضور ﷺ سے یہی سوال کیا۔ آپ ﷺ نے جواب میں یہی فرمایا۔
بعض روایتوں میں ان کا نام عبداللہ بن عمروؓ آیا ہے واللہ اعلم۔

ابن مردویہ میں ابوذرؓ سے بھی یہی روایت ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت ابن مسعود اور بہت سے صحابیوں (رضی اللہ عنہم) سے بھی یہ منقول ہے۔ ربیع بن انس، عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم (رحمہم اللہ) وغیرہ بھی یہی فرماتے ہیں بلکہ ابن ابی حاتم تو فرماتے ہیں کہ مفسرین میں اس بارے میں اختلاف ہی نہیں۔ ان ائمہ کی تفسیر کی دلیل ایک تو وہ حدیث ہے جو پہلے گزری۔ دوسری سورۂ مائدہ کی یہ آیت، جس میں بنی اسرائیل کو خطاب کر کے کہا گیا ہے: ﴿بِئْسَ مَا اشْتَرَوْا بِهٖ﴾ (البقرہ ۹۰) اس آیت میں ہے کہ ان پر غضب در غضب نازل ہوا اور سورۂ مائدہ کی آیت: ﴿قُلْ هَلْ اُنَبِّئُكُمْ بِشَرٍّ﴾ (المائدہ ۶۰) میں بھی ہے کہ ان پر غضب الٰہی نازل ہوا۔ ایک اور جگہ فرمانِ الٰہی ہے: ﴿لُعِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا﴾ (المائدہ ۷۸) یعنی بنی اسرائیل میں سے جن لوگوں نے کفر کیا، اُن پر لعنت کی گئی۔ داؤد علیہ السلام اور عیسیٰ بن مریم علیہ السلام کی زبانی یہ بوجہ ان کی نافرمانی اور حد سے گزر جانے کے ہے۔ یہ لوگ کسی برائی کے کام سے آپس میں روک ٹوک نہیں کرتے تھے؟ یقیناً ان کے کام بہت برے تھے اور تاریخ کی کتابوں میں ہے کہ زید بن عمرو بن نفیل جبکہ دین خالص کی تلاش میں اپنے ساتھیوں سمیت نکلے اور ملک شام میں آئے تو ان سے یہودیوں نے کہا کہ آپ ہمارے دین میں داخل نہیں ہو سکتے جب تک غضب الٰہی کا ایک حصہ نہ لیں۔ انہوں نے جواب دیا کہ اس سے بچنے کے لیے تو دین کی تلاش میں نکلے ہیں، پھر اسے کیسے قبول کر لیں؟ نصرانیوں سے ملے، انہوں نے کہا: جب تک اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا حصہ نہ لیں، تب تک آپ ہمارے دین میں نہیں آ سکتے۔ انہوں نے کہا: ہم یہ بھی نہیں کر سکتے۔ چنانچہ وہ اپنی فطرت پر ہی رہے۔ بتوں کی عبادت اور قوم کا دین چھوڑ دیا لیکن یہودیت یا نصرانیت اختیار نہ کی۔ البتہ زید کے ساتھیوں نے عیسائی مذہب قبول کر لیا، اس لیے کہ یہودیوں کے مذہب سے یہ ملتا جلتا تھا۔ انہی میں حضرت ورقہ بن نوفل تھے۔ انہیں نبی کریم ﷺ کی نبوت کا زمانہ ملا اور ہدایت الٰہی نے اُن کی رہبری کی اور یہ حضور ﷺ پر ایمان لائے اور جو وحی اُس وقت تک اُتری تھی، اُس کی تصدیق کی۔ (رضی اللہ عنہ)

مسئلہ ☆ ضاد اور ظے کی قراءت میں بہت باریک فرق ہے اور ہر ایک کے بس کا نہیں۔ اس لیے علمائے کرام کا صحیح مذہب یہ ہے کہ یہ فرق معاف ہے۔ ضاد کا صحیح مخرج تو یہ ہے کہ زبان کا اول کنارہ اور اس کے پاس کی ڈاڑھیں اور ظے کا مخرج زبان کے ایک طرف اور سامنے والے اُوپر کے دو دانت کے کنارے دوسرے یہ کہ دونوں حرف مجہورہ اور رخوہ اور مطبقہ ہیں۔ پس اُس شخص کو جسے ان دونوں میں تمیز کرنی مشکل ہو اُسے معاف ہے کہ ضاد کو ظے کی طرح پڑھ لے۔ ایک حدیث میں ہے کہ ضاد کو سب سے زیادہ صحیح پڑھنے والا میں ہوں لیکن یہ حدیث بالکل بے اصل اور ضعیف ہے۔

فصل ☆ یہ مبارک سورت نہایت کارآمد مضامین کا مجموعہ ہے۔ ان سات آیتوں میں اللہ تعالیٰ کی حمد، اس کی بزرگی، اس کی ثناء وصفت اور اس کے پاکیزہ ناموں کا اور اس کی بلند و بالا صفتوں کا بیان ہے۔ ساتھ قیامت کے دن کا ذکر ہے اور بندوں کا ارشاد ہے کہ وہ اس مالک سے سوال کریں۔ اس کی طرف تضرع وزاری کریں۔ اپنی مسکینی و بے کسی کا اقرار کریں اور اس کی عبادت خلوص کے ساتھ کریں اور اس کی توحید و الوہیت کا اقرار کریں اور اسے شریک، نظیر اور مثل سے پاک اور برتر جانیں۔

صراطِ مستقیم کی اور اس پر ثابت قدمی کی اور اس سے طلب کریں اور یہی ہدایت انہیں قیامت کے دن پل صراط سے بھی پار اُتار دے گی اور نبیوں، صدیقوں، شہیدوں اور صالحوں کے پڑوس میں جنت الفردوس میں جگہ دلوائے گی۔ ساتھ ہی اس سورت میں نیک اعمال کی ترغیب ہے تاکہ قیامت کے دن نیکوں کا ساتھ ملے اور باطل راہوں پر چلنے سے ڈراوا ہے تاکہ قیامت کے دن بھی ان کی جماعتوں سے دُوری ہو۔ یہ باطل پرست یہود و نصاریٰ ہیں۔

اس باریک نکتہ پر بھی غور کیجئے کہ انعام کی اسناد تو اللہ تعالیٰ کی طرف کی گئی اور انعمت کہا گیا اور غضب کی اسناد نہیں کی گئی۔ یہاں فاعل حذف کر دیا گیا اور مَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ کہا گیا[1]۔ اسی طرح ضلالت کی اسناد بھی ان کی طرف کی گئی جو گمراہ ہیں۔ حالانکہ اور جگہ ہے: ﴿مَنْ یَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ وَمَنْ یُّضْلِلْ......﴾ (بنی اسرائیل: ۹۷) یعنی اللہ جسے راہ دکھا دے وہ راہ یافتہ ہے اور جسے وہ گمراہ کر دے اس کا ولی اور مرشد کوئی نہیں اور جگہ فرمایا: ﴿مَنْ یُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَا هَادِیَ لَهٗ......﴾ (الاعراف: ۱۸۶)

یعنی جسے اللہ گمراہ کر دے اس کا ہادی کوئی نہیں۔ وہ تو اپنی سرکشی میں بہکے رہتے ہیں۔ اسی طرح اور بھی بہت سی آیتیں ہیں جن سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ راہ دکھانے والا اور گمراہ کرنے والا صرف اللہ سبحانہ وتعالیٰ ہی ہے۔

قدریہ فرقہ جو اِدھر اُدھر کی متشابہ آیتوں کو دلیل بنا کر کہتا ہے کہ بندے خود مختار ہیں، وہ خود پسند کرتے ہیں اور خود کرتے ہیں، یہ غلط ہے۔ صریح اور صاف آیتیں اُن کی تردید میں موجود ہیں لیکن باطل پرست فرقوں کا یہی قاعدہ ہے کہ صراحت کو چھوڑ کر متشابہ کے پیچھے لگتے ہیں۔ (بخاری)

صحیح حدیث میں ہے کہ جب تم ان لوگوں کو دیکھو جو متشابہ آیتوں کے پیچھے لگتے ہیں تو سمجھ لو کہ انہی لوگوں کا اللہ تعالیٰ نے نام لیا ہے، تم ان کو چھوڑ دو۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اشارہ اس فرمان میں اس آیت شریف کی طرف ہے: ﴿فَاَمَّا الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ زَیْغٌ......﴾ (آل عمران: ۷) یعنی جن لوگوں کے دِل میں کجی ہے، وہ متشابہ کے پیچھے لگتے ہیں، فتنوں اور تاویلوں کو ڈھونڈنے کے لیے۔ پس الحمدللہ بدعتوں کے لیے قرآنِ پاک میں صحیح دلیل کوئی نہیں۔ قرآنِ کریم تو حق اور باطل، ہدایت و ضلالت میں فرق کرنے کے لیے آیا ہے۔ اس میں تناقض اور اختلاف نہیں۔ یہ تو حکیم و حمید خدا کا نازل کردہ ہے۔

فصل ☆ سورۂ فاتحہ کو ختم کر کے آمین کہنا مستحب ہے۔ امین مثل یاسین کے اور امین بھی کہا گیا ہے اور اس کے معنی یہ ہیں کہ اے اللہ! تو قبول فرما۔ آمین کہنے کے مستحب ہونے کی دلیل وہ حدیث ہے جو مسند احمد، ابوداؤد اور ترمذی میں وائل بن حجرؓ سے مروی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سنا کہ آپ ﷺ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ کہہ کر آمین کہتے تھے اور آواز دراز (کھینچا[۱۲]) کرتے تھے۔ ابوداؤد میں ہے آواز بلند کرتے تھے۔ امام ترمذیؒ اس حدیث کو حسن کہتے ہیں۔ حضرت علی، حضرت ابن مسعود، حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہم وغیرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آمین پہلی صفت والے لوگ جو آپ ﷺ کے قریب ہوتے سن لیتے۔ ابوداؤد اور ابن ماجہ میں یہ حدیث ہے۔

---

[1] اس میں پروردگارِ عالم کی جناب میں ادب کیا گیا ہے۔ دراصل حقیقی فاعل اللہ تعالیٰ ہی ہے جیسے اور جگہ ہے: ﴿غَضِبَ اللّٰهُ عَلَیْهِمْ﴾۔ [الفتح ۶]

ابن ماجہ میں یہ بھی ہے کہ آمین کی آواز سے مسجد گونج اُٹھتی تھی۔ دارقطنی میں بھی یہ حدیث ہے اور دارقطنی اسے حسن بتاتے ہیں۔ حضرت بلالؓ سے روایت ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ سے کہتے تھے کہ مجھ سے پہلے آمین نہ کہا کیجئے۔ (ابوداؤد)

حسن بصریؒ اور جعفر صادقؒ سے آمین کہنا مروی ہے جیسا کہ آمِّيْنَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ قرآن میں ہے۔

''آمین'' کی بابت احادیث مبارکہ سے وضاحت مزید☆

ہمارے اصحاب وغیرہ کہتے ہیں' جو نماز میں نہ ہو اُسے بھی آمین کہنا چاہیے۔ ہاں! جو نماز میں ہو اس پر تاکید زیادہ ہے۔ نمازی خواہ اکیلا ہو' خواہ مقتدی ہو' خواہ امام ہو' ہر حالت میں اُسے بھی آمین کہے۔ صحیحین میں ابوہریرہؓ سے روایت ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب امام آمین کہے تم بھی آمین کہو۔ جس کی آمین فرشتوں کی آمین سے مل جائے' اُس کے تمام پچھلے گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ مسلم شریف میں ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: جب تم میں سے کوئی نمازی آمین کہتا ہے اور فرشتے آسمان میں آمین کہتے ہیں اور جس کی آمین دوسرے کی آمین سے مل جاتی ہے تو اس کے تمام پچھلے گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اس کی آمین اور فرشتوں کی آمین کا وقت ایک ہی ہو جائے یا موافقت سے مراد قبولیت میں موافق ہونا ہے یا اخلاص میں۔ صحیح مسلم میں حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ سے مرفوعاً روایت ہے کہ جب امام وَلَا الضَّآلِّيْنَ کہے تو تم آمین کہو' اللہ قبول فرمائے گا۔

ابن عباس رضی اللہ عنہما نے حضور ﷺ سے دریافت کیا' آمین کے کیا معنی ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: اے اللہ تو کر۔ جوہریؒ کہتے ہیں اس کے معنی ''اس طرح ہو'' ہیں۔ ترمذی کہتے ہیں اس کے معنی ہیں کہ ہماری اُمیدوں کو نہ توڑ۔ اکثر علماء فرماتے ہیں' اس کے معنی ''اے اللہ تو ہماری دعا قبول فرما'' کے ہیں۔ مجاہد' جعفر صادق' ہلال بن سیاف رحمہم اللہ فرماتے ہیں کہ آمین اللہ تعالیٰ کے ناموں میں سے ایک نام ہے۔ ابن عباسؓ سے مرفوعاً بھی یہ مروی ہے لیکن صحیح نہیں۔ امام مالکؒ کے اصحاب کا مذہب ہے کہ امام آمین نہ کہے' مقتدی آمین کہیں کیونکہ مؤطا امام مالک کی حدیث میں ہے کہ جب امام وَلَا الضَّآلِّيْنَ کہے تو تم آمین کہو۔ اسی طرح ان کی دلیل کی تائید صحیح مسلم والی ابوموسیٰ اشعری کی یہ روایت بھی آتی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: جب امام وَلَا الضَّآلِّيْنَ کہے تو تم آمین کہو لیکن بخاری ومسلم کی حدیث پہلے بیان ہو چکی ہے کہ جب امام کہے تو تم بھی آمین کہو اور یہ بھی حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم وَلَا الضَّآلِّيْنَ پڑھ کر آمین کہتے تھے۔

جہری نمازوں میں مقتدی اُونچی آواز سے آمین کہے یا نہ کہے۔ اس میں ہمارے ساتھیوں کا اختلاف ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر امام آمین کہنا بھول گیا ہو تو مقتدی بآوازِ بلند آمین کہیں۔ اگر امام نے خود اُونچی آواز سے آمین کہی ہو تو نیا قول یہ ہے کہ مقتدی بآوازِ بلند نہ کہیں۔ امام ابوحنیفہؒ کا یہی مذہب ہے اور ایک روایت میں امام مالکؒ سے بھی مروی ہے۔ اس لیے کہ نماز کے اور اذکار کی طرح یہ بھی ایک ذکر ہے۔ تو نہ وہ بلند آواز سے پڑھے جاتے ہیں کہ یہ بلند آواز سے پڑھا جائے لیکن ایک قول یہ ہے کہ آمین بلند آواز سے بھی کہی جائے۔ امام احمد بن حنبلؒ کا بھی یہی مذہب ہے اور امام مالکؒ کا بھی دوسری روایت کے اعتبار سے یہی مذہب ہے اور اس کی دلیل وہی حدیث ہے جو پہلے بیان ہو چکی کہ آمین کی آواز سے مسجد گونج اُٹھتی تھی۔ ہمارے یہاں پر ایک تیسرا قول بھی ہے کہ اگر مسجد چھوٹی ہو تو مقتدی بآوازِ بلند آمین نہ کہیں۔ اسلئے کہ وہ امام کی قراءت سنتے ہیں اور اگر بڑی ہو تو اُونچی آواز سے آمین کہیں تاکہ مسجد کے کونے کونے میں آمین پہنچ جائے' واللہ اعلم۔

مسند احمد میں حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس یہودیوں کا ذکر ہوا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ہماری تین چیزوں پر یہودیوں کو اتنا بڑا حسد ہے کہ کسی اور چیز پر نہیں۔ ایک تو جمعہ (جمعۃ المبارک) کہ اللہ نے ہمیں اس کی ہدایت کی اور یہ بہک گئے۔ دوسرے قبلہ۔ تیسرا ہمارا امام کے پیچھے آمین کہنا۔ ابن ماجہ کی حدیث میں یوں ہے کہ یہودیوں کو سلام پر اور آمین پر جتنی چڑ ہے اتنی کسی اور چیز پر نہیں اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت میں ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: جس قدر یہودی تمہاری آمین پر حسد کرتے ہیں اس قدر حسد (کسی ۱۲) اور امر پر نہیں کرتے۔ تم بھی آمین بکثرت کہا کرو۔ (ابن ماجہ) اس کی اسناد میں طلحہ بن عمرو راوی ضعیف ہیں۔ ابن مردویہ میں بروایت حضرت ابو ہریرہؓ مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: آمین اللہ کی مُہر ہے اپنے مؤمن بندوں پر۔ حضرت انسؓ والی حدیث میں ہے کہ نماز میں آمین کہنی اور دعا پر آمین کہنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے مجھے عطا کی گئی ہے جو مجھ سے پہلے کسی کو نہیں دی گئی۔ ہاں! اتنا ہے کہ موسیٰ کی خاص دعا پر حضرت ہارونؑ آمین کہتے تھے۔ تم اپنی دعاؤں کو آمین پر ختم کیا کرو۔ اللہ تعالیٰ انہیں تمہارے حق میں قبول فرمایا کرے گا۔ اس حدیث کو پیش نظر رکھ کر قرآنِ کریم کے ان الفاظ کو دیکھئے جن میں حضرت موسیٰ کی دعا: ﴿رَبَّنَآ اِنَّكَ اٰتَيْتَ فِرْعَوْنَ﴾ (یونس ۸۸) یعنی اللہ نے فرعون اور فرعونیوں کو دُنیا کی زینت اور مالِ دنیا کی زندگانی میں عطا فرمایا ہے جس سے وہ تیری راہ سے دوسروں کو بہکا رہے ہیں۔ یا اللہ! ان کے مال برباد کر اور ان کے دِل سخت کر یہ نہ ایمان لائیں جب تک دردناک عذاب نہ دیکھ لیں۔ حضرت موسیٰ کی اس دعا کی قبولیت کا اعلان ان الفاظ میں ہوتا ہے: ﴿قَدْ اُجِيْبَتْ دَّعْوَتُكُمَا﴾ (یونس ۸۹) یعنی تم دونوں کی دعا قبول کی گئی۔ تم مضبوط رہو اور بے علموں کی راہ نہ جاؤ۔ دعا صرف حضرت موسیٰ کرتے تھے اور حضرت ہارونؑ صرف آمین کہتے تھے لیکن قرآن نے دعا کی نسبت دونوں کی طرف کی۔ اس سے بعض لوگوں نے استدلال کیا ہے کہ جو شخص کسی دعا پر آمین کہے اس نے گویا خود دعا کی۔

اب اس استدلال کو سامنے رکھ کر پھر وہ قیاس کرتے ہیں کہ مقتدی قراءت نہ کرے۔ اسلئے کہ اس کا سورۂ فاتحہ پر آمین کہنا قائم مقام پڑھنے کے ہے اور اس حدیث مبارکہ کو بھی دلیل میں لاتے ہیں کہ جس کا امام ہو تو امام کی قراءت اسکی قراءت ہے۔ (مسند احمد) حضرت بلال رضی اللہ عنہ کہا کرتے تھے کہ حضور ﷺ آمین میں مجھ سے سبقت نہ کی جائے۔ (ابوداؤد) اس کھینچا تانی سے مقتدی پر جہری نمازوں میں الحمد نہ پڑھنا ثابت کرنا چاہتے ہیں' واللہ اعلم (یہ یاد رہے کہ اس کی مفصل بحث پہلے گزر چکی ہے)۔

حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب امام ﴿غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ﴾ کہہ کر آمین کہتا ہے اور آسمان والوں کی آمین زمین والوں کی آمین سے مل جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ بندے کے تمام پچھلے گناہ معاف فرما دیتا ہے۔ آمین نہ کہنے کی مثال ایسی ہے جیسے ایک شخص نے ایک قوم کے ساتھ مل کر غزوہ کیا۔ غالب آئے' مالِ غنیمت جمع کیا۔ اب قرعہ ڈال کر حصہ لینے لگتے تو اس شخص کے نام کا قرعہ نکلا ہی نہیں اور کوئی حصہ نہ ملا' اس نے کہا: یہ کیوں؟ تو جواب ملا کہ تیرے آمین نہ کہنے کی وجہ سے۔

تفسیر سورۃ البقرہ

رَبِّ یَسِّرْ وَاَعِنْ یَا کَرِیْمُ

سورۃ البقرہ اور اِس کے فضائل

حضرت معقل بن یسار رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: سورۂ بقرہ قرآن کی کوہان اور اس کی بلندی ہے۔ اس کی ایک ایک آیت کے ساتھ اسی اسی فرشتے نازل ہوتے تھے اور بالخصوص آیت الکرسی تو خاص عرش سے نازل ہوئی اور اس سورت کے ساتھ ملائی گئی۔ سورۂ یٰسین قرآن کا دل ہے۔ جو شخص اسے اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کے لیے اور آخرت طلبی کے لیے پڑھے اُسے بخش دیا جاتا ہے۔ اس سورت کو مرنے والوں کے سامنے پڑھا کرو۔ (مسند احمد) اس حدیث کی سند میں ایک جگہ عن رجل ہے۔ جس سے یہ نہیں معلوم ہوتا تھا کہ اس سے مراد کون ہیں لیکن مسند احمد ہی کی دوسری روایت میں ان کا نام ابو عثمان آ گیا ہے۔ یہ حدیث اسی طرح ابوداؤد، نسائی اور ابن ماجہ میں بھی ہے۔ ترمذی کی ایک ضعیف سند والی حدیث میں ہے کہ ہر چیز کی ایک بلندی ہوتی ہے اور قرآن پاک کی بلندی سورۂ بقرہ ہے۔ اس سورۃ میں ایک آیت ہے جو تمام آیتوں کی سردار ہے اور وہ آیت الکرسی ہے۔ مسند احمد، صحیح مسلم، ترمذی اور نسائی میں حدیث ہے کہ اپنے گھروں کو قبریں نہ بناؤ۔ جس گھر میں سورۂ بقرہ پڑھی جائے وہاں شیطان داخل نہیں ہوسکتا۔ امام ترمذی اسے حسن صحیح بتاتے ہیں۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ جس گھر میں سورۂ بقرہ پڑھی جائے وہاں شیطان داخل نہیں ہوسکتا۔ اس حدیث میں ایک راوی کو امام یحییٰ بن معین رحمۃ اللہ علیہ تو ثقہ بتاتے ہیں لیکن بعض دیگر ان کی حدیث کو منکر کہتے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے بھی اسی طرح کا قول منقول ہے۔ اسے نسائی نے الیوم واللیلہ میں اور حاکم نے مستدرک میں روایت کیا ہے اور اس کی سند کو صحیح کہا ہے۔

ابن مردویہ میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں تم میں سے کسی کو ایسا نہ پاؤں کہ وہ پیر پر پیر چڑھائے پڑھتا چلا جائے لیکن سورۂ بقرہ نہ پڑھے۔ سنو! جس گھر میں یہ مبارک سورت پڑھی جائے وہاں سے شیطان بھاگ کھڑا ہوتا ہے۔ سب گھروں میں بدترین اور ذلیل گھر وہ ہے جس میں کتاب اللہ کی تلاوت نہ کی جائے۔ امام نسائی نے الیوم واللیلہ میں بھی اسے بیان کیا ہے۔ مسند دارمی میں حضرت ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ جس گھر میں سورۂ بقرہ پڑھی جائے اس گھر سے شیطان گوز مارتا ہوا بھاگ جاتا ہے۔ ہر چیز کی اونچائی ہوتی ہے اور قرآن کی اونچائی سورۂ بقرہ ہے۔ ہر چیز کا مغز ہوتا ہے اور قرآن کا مغز مفصل کی سورتیں ہیں۔ حضرت ابن مسعودؓ کا فرمان ہے کہ جو شخص سورۂ بقرہ کی چار پہلی آیتیں اور آیۃ الکرسی اور دو آیتیں اس کے بعد کی اور تین آیتیں سب سے آخر کی یہ جملہ دس آیتیں رات کے وقت پڑھے۔ اس گھر میں شیطان اس رات نہیں جا سکتا اور اسے اس کے گھر والوں کو اس دن شیطان یا کوئی اور بری چیز ستا نہیں سکتی۔ یہ آیتیں مجنون پر پڑھی جائیں تو اس کا دیوانہ پن بھی دور ہو جاتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: جس طرح ہر چیز کی بلندی ہوتی ہے۔ قرآن کی بلندی سورۂ بقرہ ہے۔ جو شخص رات کے وقت اسے اپنے گھر میں پڑھے، تین راتوں تک شیطان اس کے گھر میں نہیں جا سکتا اور

گھر میں پڑھ لے تو تین دن تک شیطان اس کے گھر میں قدم نہیں رکھ سکتا۔ (طبرانی' ابن حبان و ابن مردویہ) ترمذی' نسائی اور ابن ماجہ میں ہے کہ حضور ﷺ نے ایک چھوٹا سا لشکر ایک جگہ بھیجا اور اس کی سرداری آپ ﷺ نے انہیں دی' جنہوں نے فرمایا تھا کہ مجھے سورۂ بقرہ یاد ہے۔ اس وقت ایک شریف آدمی نے کہا کہ میں بھی اسے یاد کر لیتا لیکن مجھے ڈر لگا کہ ایسا نہ ہو۔ میں اس پر عمل نہ کر سکوں۔ حضور ﷺ نے فرمایا: قرآن سیکھو' قرآن کو پڑھو۔ جو شخص اسے سیکھتا ہے' پڑھتا ہے۔ پھر اس پر عمل بھی کرتا ہے' اس کی مثال ایسی ہے جیسے مشک بھرا ہوا برتن جس کی خوشبو ہر طرف مہک رہی ہے۔ اسے سیکھے ہوئے سو جانے والے کی مثال اس برتن کی سی ہے' جس میں مشک تو بھری ہوئی ہے لیکن اُوپر سے منہ بند کر دیا گیا ہے۔ امام ترمذی اسے حسن کہتے ہیں اور مرسل روایت بھی ہے' واللہ اعلم۔

صحیح بخاری شریف میں ہے کہ حضرت اُسید بن حضیرؓ نے ایک مرتبہ رات کو سورۂ بقرہ کی تلاوت شروع کی۔ ان کا گھوڑا جو ان کے پاس ہی بندھا ہوا تھا' اس نے بدکنا شروع کیا۔ آپ نے قراءت چھوڑ دی۔ گھوڑا بھی سیدھا ہو گیا۔ آپ نے پھر پڑھنا شروع کیا۔ گھوڑے نے بھی پھر بدکنا شروع کیا۔ آپ نے پھر پڑھنا موقوف کیا۔ گھوڑا بھی ٹھیک ٹھاک ہو گیا۔ تیسری مرتبہ بھی یہی ہوا۔ چونکہ ان کے صاحبزادے یحییٰ گھوڑے کے پاس ہی لیٹے ہوئے تھے' اس لیے ڈر معلوم ہوا کہ کہیں بچے کو چوٹ نہ آ جائے۔ قرآن کا پڑھنا بند کر کے اُسے اٹھا لیا۔ پھر آسمان کی طرف دیکھا کہ گھوڑے کے چمکنے کی کیا وجہ ہے؟ صبح حضور ﷺ کی خدمت میں آ کر واقع بیان کرنے لگے۔ آپ ﷺ سنتے جاتے ہیں اور فرماتے جاتے ہیں' اُسید پڑھتے چلے جاؤ۔ حضرت اُسید نے کہا: حضور ﷺ تیسری مرتبہ کے بعد تو یحییٰ کی وجہ سے میں نے پڑھنا بالکل بند کر دیا۔ اب جو نگاہ اُٹھی تو کیا دیکھتا ہوں کہ ایک بڑی نورانی چیز ابر کی طرح سایہ فگن ہے اور اس میں چراغوں کی سی روشنی ہے۔ بس میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ اُوپر کو اُٹھ گئی۔ آپ ﷺ نے فرمایا: جانتے ہو یہ کیا چیز تھی؟ یہ فرشتے تھے جو تمہاری آواز کو سن کر قریب آ گئے تھے۔ اگر تم پڑھنا موقوف نہ کرتے تو وہ صبح تک یوں ہی رہتے اور ہر شخص انہیں دیکھ لیتا۔ کسی سے نہ چھپتے۔ یہ حدیث کئی کتابوں میں مختلف سندوں کے ساتھ موجود ہے' واللہ اعلم۔

اس کے قریب قریب واقعہ حضرت ثابت بن قیس بن شماس رضی اللہ عنہ کا ہے کہ ایک مرتبہ لوگوں نے حضور ﷺ کی خدمت میں عرض کی کہ گزشتہ رات ہم نے دیکھا کہ رات بھر حضرت ثابت رضی اللہ عنہ کا گھر نور کا بقعہ بنا رہا اور چمکدار روشن چراغوں سے جگمگاتا رہا۔ حضور ﷺ نے فرمایا: شاید انہوں نے رات کو سورۂ بقرہ پڑھی ہوگی۔ جب اُن سے پوچھا گیا تو انہوں نے کہا: سچ ہے رات کو میں سورۂ بقرہ کی تلاوت میں مشغول تھا۔ اس کی اسناد تو بہت عمدہ ہے۔ مگر اس میں ابہام ہے اور یہ مرسل بھی ہے' واللہ اعلم۔

سورۂ بقرہ اور سورۂ آل عمران کی فضیلت ☆

نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں: سورۂ بقرہ سیکھو۔ اس کا سیکھنا برکت ہے اور اس کا چھوڑنا حسرت ہے۔ جادوگر اس کی طاقت نہیں رکھتے پھر کچھ دیر چپ رہنے کے بعد فرمایا: سورۂ بقرہ اور سورۂ آل عمران سیکھو' یہ دونوں نورانی سورتیں ہیں۔ اپنے پڑھنے والے پر سائبان یا بادل یا پرندوں کے جھنڈ کی طرح قیامت کے روز سایہ کریں گی۔ قرآن پڑھنے والا جب قبر سے اُٹھے گا تو دیکھے گا کہ ایک نوجوان نورانی چہرہ والا شخص اس کے پاس کھڑا ہوا کہتا ہے کہ کیا آپ مجھے پہچانتے ہیں؟ یہ کہے گا:

نہیں۔ تو وہ جواب دے گا کہ میں قرآن ہوں‘ جس نے دنوں کو تجھے بھوکا پیاسا رکھا تھا اور راتوں کو بستر سے دُور بیدار رکھا تھا۔ ہر تاجر اپنی تجارت کے پیچھے ہے لیکن آج سب تجارتیں تیرے پیچھے ہیں۔ اب اسے ملک داہنے ہاتھ میں دیا جائے گا اور ہمیشگی بائیں ہاتھ میں۔ اس کے سر پر وقار اور عزت کا تاج رکھا جائے گا۔ اس کے ماں‘ باپ کو دو ایسے عمدہ قیمتی حلے پہنائے جائیں گے کہ ساری دُنیا بھی اس کی قیمت کے سامنے ہیچ ہو۔ وہ حیران ہو کر کہیں گے کہ آخر اس رحم و کرم کی‘ اس انعام و اکرام کی کیا وجہ ہے؟ تو اُنہیں جواب دیا جائے گا کہ تمہارے بچے کی قرآن خوانی کی وجہ سے تم پر یہ نعمت انعام کی گئی ہے۔ پھر اس سے کہا جائے گا پڑھتا جا اور جنت کے درجات پر چڑھتا جا۔ چنانچہ وہ پڑھتا جائے گا اور اعلیٰ سے اعلیٰ طبقے پر چڑھتا جائے گا۔ خواہ ترتیل سے پڑھے‘ خواہ بے ترتیل کے۔ (احمد) ابن ماجہ میں بھی اس حدیث کا بعض حصہ مروی ہے۔ اس کی اسناد حسن ہے اور شرطِ مسلم پر ہے۔ اس کے راوی بشیر بن مہاجر سے امام مسلمؒ بھی روایت لیتے ہیں اور امام ابن معین اسے ثقہ کہتے ہیں۔ نسائی کا قول ہے کہ اس میں کوئی حرج نہیں۔ ہاں امام احمد اسے منکر الحدیث بتلاتے ہیں اور فرماتے ہیں‘ میں نے تلاش کی تو دیکھا کہ وہ عجیب عجیب حدیثیں لاتا ہے۔ امام بخاریؒ فرماتے ہیں اس کی بعض حدیثوں کا خلاف کیا جاتا ہے۔ ابو حاتم رازی کا فیصلہ ہے کہ اس کی حدیثیں لکھی جاتی ہیں لیکن دلیل نہیں بنائی جاسکتیں۔ ابن عدی کا قول ہے ان کی ایسی روایتیں بھی ہیں جن کی متابعت نہیں کی جاتی۔ دارقطنی فرماتے ہیں‘ یہ قوی نہیں ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ اس کی اس روایت کے بعض مضامین دوسری سندوں میں بھی آئے ہیں۔

مسند احمد میں ہے قرآن پڑھا کرو یہ اپنے پڑھنے والوں کی قیامت کے دن شفاعت کرے گا۔ دونورانی سورتوں بقرہ اور آلِ عمران کو پڑھتے رہا کرو۔ یہ دونوں قیامت کو اسی طرح آئیں گی کہ گویا دو سائبان ہیں یا دو اَبر ہیں یا پر کھولے پرندوں کی دو جماعتیں ہیں۔ اپنے پڑھنے والوں کی طرف سے خدا تعالیٰ سے سفارش کریں گی۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سورۂ بقرہ پڑھا کرو۔ اس کا پڑھنا برکت ہے اور چھوڑنا حسرت ہے۔ اس کی طاقت باطل والوں کو نہیں۔ صحیح مسلم شریف میں بھی حدیث ہے۔ مسند احمد کی ایک اور حدیث میں ہے کہ قرآن اور قرآن پڑھنے والوں کو قیامت کے دن بلوایا جائے گا۔ آگے آگے سورۂ بقرہ اور سورۂ آلِ عمران ہوگی‘ بادل کی طرح یا سائے اور سائبان کی طرح یا پر کھولے پرندوں کے جھرمٹ کی طرح۔ یہ دونوں پروردگار سے ڈٹ کر سفارش کریں گی۔ مسلم اور ترمذی میں بھی یہ حدیث ہے۔ امام ترمذیؒ اسے حسن غریب کہتے ہیں۔

ایک شخص نے اپنی نماز میں سورۂ بقرہ اور سورۂ آلِ عمران پڑھی۔ اس کے فارغ ہونے کے بعد حضرت کعبؓ نے فرمایا: خدا کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے‘ ان میں خدا کا وہ نام ہے جب کبھی اسے پکارا جائے وہ قبول فرماتا ہے۔ اب اس شخص نے حضرت کعبؓ سے عرض کی کہ مجھے بتلایئے وہ نام کونسا ہے؟ حضرت کعبؓ نے اس سے انکار کیا اور فرمایا کہ اگر میں بتادوں تو خوف ہے کہ کہیں اس نام کی برکت سے ایسی دعا نہ مانگ لے جو میری اور تیری ہلاکت کا سبب بن جائے۔ حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں تمہارے بھائی کو خواب میں دکھلایا گیا کہ گویا لوگ ایک بلند و بالا پہاڑ پر چڑھ رہے ہیں۔ پہاڑ کی چوٹی پر دو سرسبز درخت ہیں اور ان میں سے آوازیں آ رہی ہیں کہ کیا تم میں کوئی سورۂ بقرہ پڑھنے والا ہے؟ جب کوئی کہتا ہے کہ ہاں! تو وہ دونوں درخت اپنے پھلوں سمیت اس کی طرف جھک آتے ہیں اور یہ اس کی شاخوں پر بیٹھ

جاتا ہے اور وہ اسے اوپر اُٹھا لیتے ہیں۔

حضرت ام درداء رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ایک قرآن پڑھے ہوئے شخص نے اپنے پڑوسی کو مار ڈالا۔ پھر قصاص میں وہ بھی مارا گیا۔ پھر قرآن کریم ایک ایک سورت ہو ہو کر الگ ہونا شروع ہوا۔ یہاں تک کہ اس کے پاس سورۂ آل عمران اور سورۂ بقرہ رہ گئیں۔ ایک جمعہ کے بعد سورۂ آل عمران بھی چلی گئی۔ پھر ایک جمعہ اور گزرا تو آواز آئی کہ میری باتیں نہیں بدلا کرتیں اور میں اپنے بندوں پر ظلم نہیں کرتا۔ چنانچہ یہ مبارک سورت یعنی سورۂ بقرہ بھی اس سے الگ ہوگئیں۔ مطلب یہ ہے کہ یہ دونوں سورتیں اس کی طرف سے بلاؤں اور عذابوں کی آڑ بنی رہیں اور اس کی قبر میں اس کی دلجوئی کرتی رہیں اور سب سے آخر بوجہ اس کے گناہوں کی زیادتی کے ان کی سفارش بھی نہ چلی۔ یزید بن اسود جرشی کہتے ہیں کہ ان دونوں سورتوں کو دن میں پڑھنے والا دن بھر میں نفاق سے بری رہتا ہے اور رات کو پڑھنے والا ساری رات نفاق سے بری رہتا ہے۔ خود حضرت یزید اپنے معمولی وظیفہ قرآن کے علاوہ ان دونوں سورتوں کو ہر روز صبح وشام پڑھا کرتے تھے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں جو شخص ان دونوں سورتوں کو رات کو پڑھتا رہے گا اللہ تعالیٰ کے نزدیک وہ فرمانبرداروں میں شمار ہوگا۔ اس کی سند منقطع ہے۔ صحیحین میں ہے: رسول اللہ ﷺ نے ان دونوں سورتوں کو ایک رکعت میں پڑھا۔

سات لمبی سورتوں کی فضیلت ☆

رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں کہ مجھے لمبی سورتیں توریت کی جگہ دی گئیں ہیں اور انجیل کی جگہ مجھ کو دو سو آیتوں والی سورتیں ملی ہیں اور زبور کے قائم مقام میں دو سو سے کم آیتوں والی سورتیں دیا گیا ہوں اور پھر مجھے فضیلت میں خاصۃً سورۂ ق سے لے کر آخر تک کی سورتیں ملی ہیں۔ یہ حدیث غریب ہے اور اس کے ایک راوی سعید بن ابو بشیر میں کچھ کلام ہے۔ ابو عبید نے اسے دوسری سند سے بھی روایت کیا ہے' واللہ اعلم۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ جو شخص ان سات سورتوں کو حاصل کرلے وہ بہت بڑا عالم ہے۔ یہ روایت بھی غریب ہے۔ مسند احمد میں بھی یہ روایت ہے۔ ایک مرتبہ حضور ﷺ نے ایک لشکر بھیجا اور اس کا امیر انہیں بنایا جنہیں سورۂ بقرہ یاد تھی۔ حالانکہ وہ اُن سب سے چھوٹی عمر کے تھے۔ (ترمذی) حضرت سعید بن جبیر تو ﴿وَلَقَدْ اٰتَيْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ﴾ (الحجر ۸۷) کی تفسیر میں یہی فرماتے ہیں کہ اس سے مراد یہی سات سورتیں ہیں۔ سورۂ بقرہ' سورۂ آلِ عمران' سورۂ نساء' سورۂ مائدہ' سورۂ انعام' سورۂ اعراف اور سورۂ یونس۔ حضرت مجاہد' مکحول' عطیہ بن قیس' ابو محمد فارسی' شداد بن اوس' یحییٰ بن حارث ذماری سے بھی یہی منقول ہے۔

فصل ☆ سورۂ بقرہ ساری کی ساری مدینہ شریف میں نازل ہوئی ہے اور شروع شروع میں جو سورتیں نازل ہوئیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے۔ البتہ اس کی ایک آیت: ﴿وَاتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ اِلَى اللّٰهِ......﴾ (البقرہ ۲۸۱) یہ سب سے آخر نازل شدہ بتلائی جاتی ہے۔ یعنی قرآنِ کریم میں سب سے آخر یہ آیت نازل ہوئی ہے۔ ممکن ہے کہ نازل بعد میں ہوئی ہو لیکن ہے اسی میں سے اور اسی طرح سود کی حرمت کی آیتیں بھی آخر آخر نازل ہوئی ہیں۔ حضرت خالد بن معدان سورۂ بقرہ کو فسط القرآن یعنی قرآن کا خیمہ کہا کرتے تھے۔ بعض علماء کا فرمان ہے کہ اس میں ایک ہزار خبریں ہیں اور ایک ہزار حکم ہیں اور ایک ہزار کاموں سے ممانعت ہے۔ اس کی آیتیں دو سو ستاسی ہیں۔ اس کے کلمات چھ ہزار دو سو اکیس ہیں۔ اس کے حروف ساڑھے پچیس ہزار ہیں' واللہ اعلم۔ (تفسیر درِ منثور)

ابن عباسؓ فرماتے ہیں یہ سورت مدنی ہے۔ (تفسیر در منثور) حضرت عبداللہ بن زبیر اور زید بن ثابت رضی اللہ عنہما اور بہت سے ائمہ علماء اور مفسرین سے بھی اختلاف سے یہی مروی ہے۔ ابن مردویہ کی ایک حدیث میں ہے کہ سورۃ البقرہ، سورہ آلِ عمران، سورۃ النساء وغیرہ نہ کہا کرو بلکہ یوں کہو کہ وہ سورت جس میں بقرہ کا ذکر ہے وہ سورت جس میں آل عمران کا بیان ہے اور اسی طرح قرآن کی سب سورتوں کا نام لیا کرو لیکن یہ حدیث غریب ہے بلکہ اس کا فرمان رسول ﷺ ہونا ہی ٹھیک نہیں۔ اس کے راوی عیسیٰ بن میمون ابوسلمہ خواص ضعیف ہیں۔ ان کی روایت سے سند نہیں لی جا سکتی۔ اس کے برخلاف صحیحین میں حضرت ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے بطن وادی سے شیطان پر کنکر پھینکے۔ بیت اللہ ان کی بائیں جانب تھا اور منیٰ دائیں طرف اور فرمایا اسی جگہ کنکر پھینکے تھے رسول اللہ ﷺ نے جن پر سورۂ بقرہ اتری ہے۔ گو اس حدیث سے صاف ثابت ہو گیا ہے کہ سورۂ بقرہ وغیرہ کہنا جائز ہے لیکن مزید سنئے' ابن مردویہ میں ہے کہ جب آنحضرت ﷺ نے اپنے اصحاب میں کچھ سستی دیکھی تو انہیں یا اصحاب سورۃ البقرۃ کہہ کر پکارا۔ غالباً یہ حنین والے دن کا ذکر ہے جب لشکر کے قدم اکھڑ گئے تھے تو حضور ﷺ کے حکم سے حضرت عباسؓ نے اسے درخت والو! یعنی اے بیعت رضوان کرنے والو اور اے سورۃ البقرہ والو کہہ کر پکارا تھا تا کہ ان میں خوشی اور دلیری پیدا ہو۔ چنانچہ اس آواز کے ساتھ ہی صحابہؓ ہر طرف سے دوڑ پڑے۔ مسیلمہ جس نے نبوت کا جھوٹا دعویٰ کیا تھا' اس کے ساتھ لڑنے کے وقت بھی جب قبیلہ بنو حنیفہ کی چیرہ دستیوں نے پریشان کر دیا اور قدم ڈگمگا گئے۔ صحابہؓ نے اسی طرح لوگوں کو یا اصحاب سورۃ البقرہ یعنی سورۃ البقرہ والوں کہہ کر پکارا اور اس آواز پر سب کے سب جمع ہو گئے اور جم کر لڑے۔ یہاں تک کہ ان مرتدوں پر اللہ تعالیٰ نے اپنے لشکر کو فتح دی۔ اللہ تعالیٰ اپنے رسول ﷺ کے سب صحابہ (رضی اللہ عنہم) سے خوش ہو۔

کل رکوع: ۴۰ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ کل آیات: ۲۸۶

شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان' نہایت رحم والا ہے

الٓمّٓ ①

حروفِ مقطعات ☆

الٓمّٓ، جیسے حروفِ مقطعہ' جو سورتوں کے اول میں آئے ہیں۔ ان کی تفسیر میں مفسرین کا اختلاف ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ ان کے معنی صرف اللہ تعالیٰ ہی کو معلوم ہیں۔ کسی اور کو معلوم نہیں۔ اس لیے وہ ان حروف کی کوئی تفسیر نہیں کرتے۔ قرطبی نے حضرت ابوبکرؓ' حضرت عمرؓ' حضرت عثمانؓ' حضرت علیؓ' حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہم سے یہی نقل کیا ہے۔ عامر شعبی' سفیان ثوری' ربیع بن خثیم رحمہم اللہ بھی یہی کہتے ہیں۔ ابو حاتم بن حبان بھی اسی کو پسند کرتے ہیں اور بعض لوگ ان حروف کی تفسیر بھی کرتے ہیں لیکن ان کی تفسیر میں بہت کچھ اختلاف ہے۔ عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم فرماتے ہیں یہ سورتوں کے نام ہیں۔ علامہ ابوالقاسم محمود بن عمر زمخشری اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں اکثر لوگوں کا اسی پر اتفاق ہے۔ سیبویہ نے بھی یہی کہا ہے اور اس کی دلیل صحیحین کی وہ حدیث ہے جس میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ جمعہ کے دن صبح کی نماز میں الم السجدہ اور هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ پڑھتے تھے۔ حضرت مجاہد فرماتے ہیں کہ الم' حم' المص اور ص یہ سب سورتوں کی ابتداء ہے۔

جن سے یہ سورتیں شروع ہوتی ہیں۔ انہی سے یہ بھی منقول ہے کہ الم قرآن کے ناموں میں سے ایک نام ہے۔ حضرت قتادہ اور حضرت زید بن اسلم کا بھی یہی قول ہے اور شاید اس قول کا مطلب بھی وہی ہے۔ حضرت عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم فرماتے ہیں کہ یہ سورتوں کے نام ہیں اس لیے کہ ہر سورت کو قرآن کہہ سکتے ہیں اور یہ نہیں ہوسکتا کہ سارے قرآن کا نام المص ہو کیونکہ جب کوئی شخص کہے کہ میں نے سورۂ المص پڑھی تو ظاہر یہی سمجھا جاتا ہے کہ اس نے سورۂ اعراف پڑھی نہ کہ پورا قرآن' واللہ اعلم۔

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کے نام ہیں۔ حضرت شعبی سالم بن عبداللہ اسماعیل بن عبدالرحمٰن سدی کبیر بھی یہی کہتے ہیں۔ حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ الم اللہ تعالیٰ کا بڑا نام ہے اور روایت میں ہے کہ حم' طس اور الم یہ سب اللہ تعالیٰ کے بڑے نام ہیں۔ حضرت علیؓ اور حضرت ابن عباسؓ دونوں سے یہ مروی ہے۔ ایک اور روایت میں ہے کہ یہ اللہ کی قسم اور اس کا نام بھی ہے۔ حضرت عکرمہؒ فرماتے ہیں یہ قسم ہے۔ ابن عباسؓ سے یہ بھی مروی ہے کہ اس کے معنی انا اللہ اعلم ہیں یعنی میں ہوں اللہ زیادہ جاننے والا۔ حضرت سعید بن جبیرؒ سے بھی یہ مروی ہے۔ ابن عباسؓ، ابن مسعودؓ اور بعض دیگر صحابہؓ سے روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ناموں کے الگ الگ حروف ہیں۔ ابوالعالیہ فرماتے ہیں کہ یہ تین حروف الف اور لام اور میم اُنتیس حرفوں میں سے ہیں جو تمام زبانوں میں آتے ہیں۔ ان میں سے ہر ہر حرف اللہ تعالیٰ کے ایک ایک نام کے شروع کا حرف ہے اور اللہ تعالیٰ کی نعمت اور اس کی بلا کا ہے اور اس میں قوموں کی مدت اور اُن کے وقت کا بیان ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے تعجب کرنے پر کہا گیا ہے کہ وہ لوگ کیسے کفر کریں گے' ان کی زبانوں پر اللہ تعالیٰ کے نام ہیں۔ اس کے دیئے ہوئے رزق پر وہ پلتے ہیں۔ الف سے خدا کا نام اللہ شروع ہوتا ہے اور لام سے اس کا نام لطیف شروع ہوتا ہے اور میم سے اس کا نام مجید شروع ہوتا ہے اور الف سے مراد الآء یعنی نعمتیں ہیں اور لام سے مراد اللہ تعالیٰ کا لطف ہے اور میم سے مراد اللہ تعالیٰ کا مجد یعنی بزرگی ہے۔ الف سے مراد ایک سال ہے اور لام سے تیس سال ہے اور میم سے چالیس سال۔

(ابن ابی حاتم)

امام ابن جریر نے ان سب مختلف اقوال میں تطبیق دی ہے یعنی ثابت کیا ہے کہ ان میں ایسا اختلاف نہیں جو ایک دوسرے کے خلاف ہو۔ ہوسکتا ہے کہ یہ سورتوں کا نام بھی ہوں اور سورتوں کے شروع کے الفاظ بھی ہوں اور ان میں سے ہر ہر حرف سے خدا تعالیٰ کے ایک ایک نام کی طرف اشارہ بھی ہو اور اس کی صفتوں کی طرف بھی اور مدت وغیرہ کی طرف بھی۔ ایک ایک لفظ کئی کئی معنی میں آتا ہے جیسے لفظ اُمَّةٌ کہ اس کے ایک معنی ہیں دِین۔ جیسے قرآن میں ہے: ﴿اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ﴾ (الزخرف:۲۳) یعنی ہم نے اپنے باپ دادوں کو اسی دین پر پایا۔ دوسرے معنی ہیں خدا کا اطاعت گزار بندہ جیسے فرمایا: ﴿اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ كَانَ اُمَّةً﴾ (النحل:۱۲۰) یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے مطیع' فرمانبردار اور مخلص بندے تھے اور وہ مشرکوں میں سے نہ تھے۔ تیسرے معنی ہیں جماعت۔ جیسے فرمایا: ﴿وَجَدَ عَلَيْهِ اُمَّةً......﴾ (القصص:۲۳) یعنی ایک جماعت کو اس کنوئیں پر پانی پلاتے ہوئے پایا اور ایک جگہ ہے: ﴿وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا ...﴾ (النحل ۳۶) یعنی ہم نے ہر جماعت میں رسول بھیجا۔ چوتھے معنی ہیں زمانہ اور مدت۔ فرمان ہے: ﴿وَادَّكَرَ بَعْدَ اُمَّةٍ﴾ (یوسف:۴۵) یعنی ایک مدت کے بعد اسے یاد آیا۔ پس جس طرح یہاں لفظ کے کئی معنی ہوئے اسی طرح ممکن ہے کہ ان حروف مقطعہ کے بھی کئی معنی

ہوں۔ امام ابن جریر کی اس تحقیق پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ ابوالعالیہ نے جو تفسیر کی ہے اس کا مطلب تو یہ ہے کہ یہ ایک لفظ ایک ساتھ ہی ایک ہی جگہ ان سب معنی میں ہے اور لفظ امت وغیرہ جو کئی کئی معنی میں آتے ہیں جنہیں اصطلاح میں الفاظِ مشترکہ کہتے ہیں۔ ان کے معنی ہر جگہ جدا جدا تو ضرور ہوتے ہیں لیکن ہر جگہ ایک ہی معنی ہوتے ہیں جو عبارت کے قرینے سے معلوم ہو جاتے ہیں۔ ایک ہی جگہ سب کے سب معنی مراد نہیں ہوتے اور سب پر ایک جگہ محمول کرنے کے بارے میں علماء اصول کا بڑا اختلاف ہے اور ہمارے تفسیری موضوع سے اس کا بیان خارج ہے' واللہ اعلم۔

دوسرے یہ کہ امت وغیرہ الفاظ کے معنی ہیں تو بہت سارے اور یہ الفاظ اسی لیے بنائے گئے ہیں اور بندشِ کلام اور نشست الفاظ سے ایک معنی ٹھیک بیٹھ جاتے ہیں لیکن ایک حرف کی دلالت ایک ایسے نام پر کہ ممکن ہے کہ وہ دوسرے ایسے نام پر بھی دلالت کرتا ہو اور ایک کو دوسرے پر کوئی فضیلت نہ ہو نہ تو مقدر ماننے سے' نہ ضمیر لانے سے' نہ وضع کے اعتبار سے اور نہ اور اعتبار سے تو ایسی بات علمی طور پر نہیں سمجھی جا سکتی البتہ اگر منقول ہو تو اور بات ہے لیکن یہاں اختلاف اور اجماع نہیں اس لیے یہ فیصلہ قابل غور ہے۔ اب بعض عربی اشعار' جو اس بات کی دلیل میں پیش کیے جاتے ہیں کہ کلمہ کو بیان کرنے کے لیے صرف اس کا پہلا حرف بول دیتے ہیں' یہ ٹھیک ہے۔ لیکن ان اشعار میں خود عبارت ایسی ہوتی ہے جو اس پر دلالت کرتی ہے۔ ایک حرف کے بولتے ہی پورا کلمہ سمجھ میں آ جاتا ہے لیکن یہاں ایسا بھی نہیں' واللہ اعلم۔

قرطبی کہتے ہیں' ایک حدیث میں ہے کہ جو مسلمان کے قتل پر آدھے کلمہ سے بھی مدد کرے مطلب یہ ہے کہ اقتل پورا نہ کہے بلکہ صرف اُق کہے۔ مجاہد کہتے ہیں کہ سورتوں کے شروع میں جو یہ حرف ہیں مثلاً قٓ' صٓ' حٰمٓ' طٰسٓمٓ' الٓرٰ وغیرہ۔ یہ سب حروف ہجا ہیں۔ بعض عربی دان کہتے ہیں کہ یہ حروف الگ الگ جو اٹھائیس ہیں' ان میں سے چند ذکر کر کے باقی کو چھوڑ دیا گیا ہے جیسے کوئی کہے کہ میرا بیٹا' اَ' بَ' تَ' ثَ لکھتا ہے تو مطلب یہ ہوتا ہے کہ یہ تمام اٹھائیس حروف لکھتا ہے لیکن ابتداء کے چند حروف ذکر کر دیئے' باقی کو چھوڑ دیا۔ سورتوں کے شروع میں اس طرح کے کُل چودہ حروف آئے ہیں: ١) ا' ٢) ل' ٣) م' ٤) ص' ٥) ر' ٦) ک' ٧) ہ' ٨) ی' ٩) ع' ١٠) ط' ١١) س' ١٢) ح' ١٣) ق' ١٤) ن ان سب کو اگر ملا لیا جائے تو یہ عبارت بنتی ہے: نَصٌّ حَكِيْمٌ قَاطِعٌ لَّهٗ سِرٌّ تعداد کے لحاظ سے یہ حروف چودہ ہیں اور جملہ حروف چونکہ اٹھائیس ہیں اس لیے یہ پورے آدھے ہوئے جو حروف بیان کیے گئے ہیں یہ ان حروف سے جو نہیں لائے گئے زیادہ فضیلت والے ہیں اور یہ صناعت تصریف ہے۔ ایک حکمت اس میں یہ بھی ہے کہ جتنی قسم کے حروف تھے اتنی قسمیں باعتبارِ اکثریت کے ان میں آ گئیں یعنی مہموسہ' مجہورہ وغیرہ۔ سبحان اللہ ہر چیز میں اس مالک کی ایک شان نظر آتی ہے۔ یہ یقینی بات ہے کہ خدا کا کلام لغو اور بیہودہ اور بے کار اور بے معنی الفاظ سے پاک ہے' جو جاہل لوگ کہتے ہیں' سرے سے ان حروف کے کچھ معنی ہی نہیں' وہ بالکل خطاء پر ہیں۔ اس کے کچھ نہ کچھ معنی یقیناً ہیں۔ اگر نبی معصوم ﷺ سے اس کے معنی کچھ ثابت ہوں تو ہم وہ معنی کریں گے اور سمجھیں گے ورنہ جہاں حضور ﷺ سے اس کے معنی بیان نہیں ملے' ہم بھی نہ کریں گے اور ایمان لائیں گے کہ یہ خدا کی طرف سے ہے۔ حضور ﷺ نے اس بارے میں کوئی تصریح نہیں فرمائی ہے اور علماء کا اس میں بے حد اختلاف ہے۔ اگر کسی کو کسی قول کی دلیل معلوم ہو جائے تو خیر' وہ اسے مان لے ورنہ بہتر یہ ہے کہ ان حروف کے کلام خدا ہونے پر ایمان لائے اور یہ جانے کہ اس کے معنی ضرور ہیں' جو خدا ہی کو معلوم ہیں' اور ہم پر ظاہر نہیں ہوئے۔ دوسری حکمت ان حروف کے لانے میں یہ بھی ہے کہ

تیری طرف نازل کیا تا کہ تو لوگوں کو اپنے ربّ کے حکم سے اندھیروں سے نکال کر اُجالے میں لائے۔ ارشاد ہوتا ہے: ﴿ الٓمّٓ تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ لَارَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴾ (سجدۃ: ۱، ۲) اس کتاب کے ربّ العالمین کی طرف سے نازل شدہ ہونے میں کوئی شک وشبہ نہیں۔ فرماتا ہے: ﴿ حٰمٓ تَنْزِيْلٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴾ (حم السجدۃ: ۱، ۲) بخششوں اور مہربانیوں والے خدا نے اسے نازل فرمایا ہے: ﴿ حٰمٓ عٓسٓقٓ كَذٰلِكَ يُوْحِيْٓ اِلَيْكَ...... ﴾ (الشوریٰ: ۱ تا ۳) یعنی اسی طرح وحی کرتا ہے اللہ تعالیٰ غالب حکمتوں والا تیری طرف اور ان نبیوں کی طرف' جو تجھ سے پہلے تھے۔ اسی طرح اور ایسی سورتوں کے شروع کو بغور دیکھئے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان حروف کے بعد کلام پاک کی عظمت وعزت کا ذکر ہے۔ جس سے یہ بات تو صحیح معلوم ہوتی ہے کہ یہ حروف اس لیے لائے گئے ہیں کہ لوگ اس کے معارضے اور مقابلے سے عاجز ہیں' واللہ اعلم۔

بعض لوگوں نے یہ بھی کہا ہے کہ ان حروف سے مدت معلوم کرائی گئی ہے اور فتنوں اور لڑائیوں اور دوسرے ایسے ہی کاموں کے اوقات بتلائے گئے ہیں لیکن یہ قول بھی بالکل ضعیف معلوم ہوتا ہے۔ اس کی دلیل میں ایک حدیث بھی بیان کی جاتی ہے لیکن اول تو وہ ضعیف ہے' دوسرے اس حدیث سے اس قول کی پختگی تو ایک طرف اس کا باطل ہونا زیادہ ثابت ہے۔ وہ حدیث محمد بن اسحٰق بن یسار نے وارد کی ہے جو تاریخ کے مصنف ہیں۔ اس حدیث میں ہے کہ ابو یاسر بن اخطب یہودی اپنے چند ساتھیوں کو لے کر حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ ﷺ اس وقت سورۂ بقرہ کی شروع آیت: ﴿ الٓمّٓ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَارَيْبَ فِيْهِ ﴾ تلاوت فرما رہے تھے۔ وہ اسے سن کر اپنے بھائی حیی بن اخطب کے پاس آتا ہے اور کہتا ہے کہ میں نے آج حضور ﷺ کو اس آیت کی تلاوت کرتے ہوئے سنا ہے۔ وہ پوچھتا ہے تو نے خود سنا ہے؟ اس نے کہا: ہاں! میں نے خود سنا ہے۔ حیی ان سب یہودیوں کو لے کر پھر حضور ﷺ کے پاس آتا ہے اور کہتا ہے حضور ﷺ کیا یہ سچ ہے کہ آپ ﷺ اس آیت کو پڑھ رہے تھے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں! سچ ہے۔ اس نے کہا: سنئے! آپ ﷺ سے پہلے جتنے نبی آئے' کسی کو بھی نہیں بتلایا گیا تھا کہ اس کا ملک اور مذہب کب تک رہے گا لیکن آپ ﷺ کو بتلا دیا گیا۔ پھر کھڑا ہو کر لوگوں سے کہنے لگا۔ سنو! الف کا عدد ہوا ایک' لام کے تیس' میم کے چالیس' جملہ اکہتر ہوئے۔ کیا تم اس نبی ﷺ کی تابعداری کرنا چاہتے ہو جس کے ملک اور امت کی مدت کل اکہتر سال ہو؟ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف متوجہ ہو کر دریافت کیا کہ کیا کوئی اور آیت بھی ایسی ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں! الٓمّٓصٓ۔ کہنے لگا یہ بڑی بھاری اور بہت لمبی ہے۔ الف کا ایک' لام کے تیس' میم کے چالیس' صاد کے نوے۔ یہ سب ایک سو اکسٹھ سال ہوئے۔ کہا: اور کوئی بھی ایسی آیت ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں! الٓرٰ کہنے لگا: یہ بھی بہت بھاری اور لمبی ہے۔ الف کا ایک۔ لام کے تیس اور ر کے دو سو۔ جملہ دو سو اکتیس برس ہوئے۔ کہا: اس کے ساتھ کوئی اور ایسی آیت بھی ہے؟ فرمایا: ہاں! الٓمّٓرٰ کہا: یہ بہت ہی بھاری ہے۔ الف کا ایک' لام کے تیس' میم کے چالیس' رے کے دو سو اکہتر ہو گئے۔ اب تو کام مشکل ہو پڑا اور بات غلط ہو گئی۔ لوگو! اٹھ چلو۔ ابو یاسر نے اپنے بھائی سے اور دوسرے علماء یہود سے کہا: کیا عجب کہ ان سب حروف کا مجموعہ حضرت محمد ﷺ کو ملا ہو۔ اکہتر ایک' ایک سو اکتیس ایک' دو سو اکتیس ایک۔ یہ سب مل کر سات سو چار برس ہوئے۔ انہوں نے کہا: اب کام خلط ملط ہو گیا۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ آیتیں انہی لوگوں کے حق میں نازل ہوئیں۔ ﴿ هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ ﴾ (آل عمران: ۷) یعنی وہ خدا جس نے تجھ پر کتاب نازل فرمائی' جس میں محکم آیتیں ہیں' جو اصل

کتاب ہیں اور دوسری آیتیں مشابہت والی بھی ہیں۔اس حدیث کا دارومدار محمد سائب کلبی پر ہے اور جس حدیث کا اکیلا راوی ہو محدثین اس سے حجت نہیں پکڑتے اور پھر اس طرح اگر مان لیا جائے اور ہر ایسے حرف کے عدد نکالے جائیں تو جن چودہ حروف کو ہم نے بیان کیا ان کے عدد بہت سارے ہو جائیں گے اور جو حروف ان میں سے کئی کئی بار آئے ہیں۔اگر ان کے عدد کا شمار بھی کئی بار لگایا جائے تو بہت ہی بڑی گنتی ہو جائے گی' واللہ اعلم۔

ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَیْبَ ۛ فِیْهِ ۛ هُدًى لِّلْمُتَّقِیْنَ ۝

کتاب ایسی ہے جس میں کوئی شبہ نہیں' راہ بتلانے والی ہے خدا سے ڈرنے والوں کو ○

متقین کے لیے سراپا ہدایت ☆

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں یہاں ذالک معنی میں ھٰذَا کے ہے۔مجاہد' عکرمہ' سعید بن جبیر' سدی' مقاتل' ابن حبان' زید بن اسلم اور ابن جریج رحمہم اللہ کا بھی یہی قول ہے۔یہ دونوں الفاظ ایک دوسرے کے قائم مقام عربی زبان میں اکثر آتے رہتے ہیں۔حضرت امام بخاریؒ نے ابو عبیدہ سے بھی یہی نقل کیا ہے۔مطلب یہ ہے کہ ذالک اصل میں ہے تو دُور کے اشارے کے لیے جس کے معنی ہیں "وہ" لیکن کبھی نزدیک کے لیے بھی لاتے ہیں۔اس وقت اس کے معنی ہوتے ہیں "یہ"۔یہاں بھی اس معنی میں ہے۔زمخشری کہتے ہیں اس سے اشارہ الم کی طرف ہے جیسے اس آیت میں ہے: ﴿لَا فَارِضٌ وَّلَا بِكْرٌ عَوَانٌ بَیْنَ ذٰلِكَ﴾ (البقرہ: ۵۸) یعنی نہ تو وہ گائے بڑھیا ہے نہ بچہ ہے' بلکہ اس کے درمیان عمر کی جوان ہے اور جگہ فرمایا: ﴿ذٰلِكُمْ حُكْمُ اللّٰهِ یَحْكُمُ بَیْنَكُمْ﴾ (الممتحنۃ: ۱۰) یہ ہے اللہ کا حکم جو تمہارے درمیان حکم کرتا ہے اور جگہ فرمایا: ذٰلِكُمُ اللّٰهُ یہ ہے اللہ تعالیٰ اور اس کی مثال اور مواقع جو پہلے گزر چکے۔واللہ اعلم۔بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اس سے اشارہ ہے قرآنِ کریم کی طرف۔جس کے اتارنے کا وعدہ رسول اللہ ﷺ سے ہوا تھا۔بعض نے تورات کی طرف' کسی نے انجیل کی طرف بھی اشارہ بتلایا ہے اور اسی طرح کے دس اقوال ہیں لیکن ان کو اکثر مفسرین نے ضعیف کہا ہے' واللہ اعلم۔

کتابؑ سے مراد ہے قرآن کریم۔جن لوگوں نے کہا ہے کہ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ کا اشارہ تورات اور انجیل کی طرف ہے' انہوں نے نہایت دُور کا راستہ لیا اور بڑی تکلیف اٹھائی اور خواہ مخواہ بلاوجہ وہ بات کہی جس کا انہیں علم نہیں۔ ریب کے معنی ہیں شک اور شبہ۔حضرت ابن عباس' حضرت ابن مسعود اور کئی ایک صحابہ (رضی اللہ عنہم) سے یہی معنی مروی ہیں۔(طبری) ابو درداء' ابن عباس' مجاہد' سعید بن جبیر' ابو مالک' نافع جو ابن عمر کے مولیٰ ہیں۔عطاء' ابو عالیہ' ربیع بن انس' مقاتل ابن حیان' سدی' قتادہ' اسمٰعیل بن ابو خالدؒ سے بھی یہی مروی ہے۔ابن ابی حاتم فرماتے ہیں' مفسرین میں اس میں اختلاف نہیں۔ ریبؔ کا لفظ عرب شاعروں کے شعروں میں تہمت کے معنی میں بھی آیا ہے اور حاجت کے معنی میں بھی اس کا استعمال ہوا ہے۔اس جملے کے معنی یہ ہوئے کہ اس قرآن کے خدا کی طرف سے نازل شدہ ہونے میں کچھ شک نہیں' جیسا کہ سورۂ سجدہ میں ہے: ﴿الٓمّٓ تَنْزِیْلُ الْكِتٰبِ لَا رَیْبَ فِیْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِیْنَ﴾ (السجدۃ: ۱'۲) یعنی بے شک یہ قرآن کریم تمام جہانوں کے پالنے والے خدا کی طرف سے اترا ہے۔بعضوں نے کہا ہے گو یہ خبر ہے مگر معنی میں نہی کے ہے یعنی اس میں شک نہ کرو۔

بعض قاری لَا رَیْبَ پر وقف کرتے ہیں اور فِیْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ کو الگ جملہ پڑھتے ہیں لیکن لَا رَيْبَ فِيْهِ پر ٹھہرنا بہت بہتر ہے۔ کیونکہ یہی مضمون اسی طرح سورۂ سجدہ کی آیت میں گزر چکا ہے اور اس میں بہ نسبت فِيْهِ هُدًى کے زیادہ مبالغہ ہے۔ هُدًى نحوی اعتبار سے صفت ہو کر مرفوع ہو سکتا ہے اور حال کی بناء پر منصوب بھی ہو سکتا ہے۔ اس جگہ ہدایت کو متقین کے ساتھ خاص کیا جیسے اور جگہ فرمایا: ﴿ قُلْ هُوَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هُدًى وَّ شِفَآءٌ ﴾ (حم السجدہ: ۴۴) یعنی یہ قرآن ہدایت اور شفاء ہے۔ ایمان والوں کے لیے اور بے ایمانوں کے کان بوجھل ہیں اور آنکھیں اندھی ہیں۔ یہ بہت دُور کی جگہ سے پکارے جاتے ہیں۔ ﴿ وَ نُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّ رَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ...... ﴾ (بنی اسرائیل ۸۲) یعنی یہ قرآن ایمانداروں کے لیے شفاء اور رحمت ہے اور ظالم لوگ تو اپنے خسارے میں ہی بڑھتے جاتے ہیں۔ اس مضمون کی اور آیتیں بھی ہیں اور ان سب کا مطلب یہ ہے کہ گو قرآنِ کریم خود ہدایت اور محض ہدایت ہے اور سب کے لیے ہے لیکن اس ہدایت سے نفع اٹھانے والے صرف نیک بخت لوگ ہیں جیسا کہ فرمایا: ﴿ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ...... ﴾ (یونس: ۵۷) لوگو! تمہارے پاس خداوند تعالیٰ کی نصیحت اور سینے کی بیماریوں کی شفاء آ چکی ہے جو مؤمنوں کے لیے شفاء اور رحمت ہے۔ ابن عباس، ابن مسعود اور بعض دیگر صحابہ (رضی اللہ عنہم) سے مروی ہے کہ ہدایت سے مراد نور ہے۔

ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں، متقین وہ جو ایمان لا کر شرک سے دُور رہ کر خداوند تعالیٰ کے احکام بجا لائیں۔ ایک اور روایت میں ہے متقی وہ لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ کے عذابوں سے ڈر کر ہدایت کو نہیں چھوڑتے اور اس کی رحمت کی اُمید رکھ کر اس کی طرف سے جو نازل ہوا اُسے سچا جانتے ہیں۔ حضرت حسن بصری فرماتے ہیں متقی وہ لوگ ہیں جو حرام سے بچیں اور فرائض بجا لائیں۔ حضرت اعمش، حضرت ابوبکر بن عیاشؒ سے سوال کرتے ہیں کہ متقی کون ہیں؟ آپ بولے: جو کبائر سے بچے۔ پھر میں نے کہا: ذرا حضرت کلبیؒ سے تو دریافت کر لو۔ وہ کہتے ہیں متقی وہ ہیں جو کبیرہ گناہوں سے بچیں۔ اس پر دونوں کا اتفاق ہوتا ہے۔ قتادہ فرماتے ہیں متقی وہ ہے جس کا وصف اللہ تعالیٰ نے خود اس آیت کے بعد بیان فرمایا کہ: ﴿ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ...... ﴾ (البقرہ: ۳) امام ابن جریرؒ فرماتے ہیں کہ یہ سب اوصاف متقین میں جمع ہوتے ہیں۔ ترمذی اور ابن ماجہ کی حدیث میں ہے رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں: بندہ حقیقی متقی نہیں ہو سکتا، جب تک کہ ان چیزوں کو نہ چھوڑ دے جن میں حرج نہیں، اس خوف سے کہ کہیں وہ حرج میں گرفتار نہ ہو جائے۔ امام ترمذیؒ اسے حسن غریب کہتے ہیں۔ ابن ابی حاتم میں ہے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں جبکہ لوگ ایک میدان میں قیامت کے دن روک لیے جائیں گے، اس وقت ایک پکارنے والا پکارے گا کہ متقی کہاں ہیں؟ اس آواز پر وہ کھڑے ہوں گے اور اللہ انہیں اپنے بازو میں لے لے گا اور بے حجاب انہیں اپنے دیدار سے مشرف فرمائے گا۔ ابو عفیف نے پوچھا: حضرت! متقی کون لوگ ہیں؟ آپ نے فرمایا: جو لوگ شرک سے اور بت پرستی سے بچیں اور خدا کی خالص عبادت کریں۔ وہ اسی عزت کے ساتھ جنت میں پہنچائے جائیں گے۔

ہدایت کے معنی کبھی تو دِل میں ایمان پیوست ہو جانے کے آتے ہیں۔ اس ہدایت پر تو سوائے خداوند جل وعلاء کے اور کوئی قدرت نہیں رکھتا۔ فرمان ہے: ﴿ اِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ اَحْبَبْتَ ﴾ (القصص: ۵۶) یعنی اے نبی! جسے تو چاہے ہدایت نہیں دے سکتا۔ (اللہ عزوجل ۱۲) فرماتا ہے: ﴿ لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰىهُمْ ﴾ (البقرۃ: ۲۷۲) تجھ پر ان کی ہدایت نہیں۔ (اللہ عزوجل ۱۲) فرماتا ہے: ﴿ مَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ ﴾ (الاعراف: ۱۸۶) جسے خدا گمراہ کرے اُسے کوئی ہدایت پر لانے والا نہیں۔

فرمایا: ﴿ مَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ ...... ﴾ (بنی اسرائیل: ۹۷) یعنی جسے خدا ہدایت دے وہی ہدایت والا ہے اور جسے وہ گمراہ کرے تم ہرگز اُس کا نہ کوئی ولی پاؤ گے نہ مرشد۔ اس قسم کی اور آیتیں بھی ہیں اور ہدایت کے معنی کبھی حق کے اور حق کو واضح کر دینے اور حق پر دلالت اور حق کی طرف راہ دکھانے کے بھی آئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿ وَاِنَّكَ لَتَهْدِيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴾ (الشوریٰ: ۵۲) یعنی تو صرف ڈرانے والا ہے اور ہر قوم کے لیے ہادی ہے۔ ایک اور جگہ فرمان ہے: ﴿ وَاَمَّا ثَمُوْدُ فَهَدَيْنٰهُمْ ...... ﴾ یعنی ہم نے ثمودیوں کو ہدایت دکھائی لیکن انہوں نے اندھے پن کو ہدایت پر پسند کر لیا۔ فرماتا ہے: ﴿ وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ ﴾ (البلد: ۱۰) ہم نے اسے دونوں راہیں دکھائیں یعنی بھلائی اور برائی کی۔ تقویٰ کے اصل معنی بری چیزوں سے بچ رہنے کے ہیں۔

اصل میں یہ وقویٰ ہے وقایت سے ماخوذ۔ نابغہ وغیرہ کے اشعار میں آیا ہے۔ حضرت ابی بن کعبؓ سے حضرت عمر بن خطابؓ نے پوچھا کہ تقویٰ کیا ہے؟ انہوں نے کہا کہ کبھی خاردار راستے میں چلنے کا اتفاق ہوا ہے؟ جیسے وہاں کپڑوں کو اور جسم کو بچائے ہوا ایسے ہی گناہوں سے بال بال بچنے کا نام تقویٰ ہے۔ ابن معتز شاعر کا قول ہے

خل الذنوب صغيرها ☆ وكبيرها ذاك التقى
واصنع كماش فوق ارض ☆ الشوك يحذر ما يرىٰ
لا تحقرن صغيرةً ☆ ان الجبال من الحصىٰ

''یعنی چھوٹے اور بڑے سب گناہوں کو چھوڑ دو۔ یہی تقویٰ ہے۔ ایسے رہو جیسے کانٹوں والی راہ پر چلنے والا انسان۔ چھوٹے گناہوں کو بھی ہلکا نہ جانو''۔

دیکھو! پہاڑ کنکروں سے ہی بن جاتا ہے۔ ابو درداء اپنے اشعار میں فرماتے ہیں: انسان اپنی تمناؤں کا پورا ہونا چاہتا ہے اور خدا کے ارادوں پر نگاہ نہیں رکھتا حالانکہ ہونا وہی ہے جو خدا کا ارادہ ہو۔ وہ اپنے دنیوی فائدے اور مال کے پیچھے پڑا ہوا ہے حالانکہ اس کا بہترین فائدہ اور عمدہ مال خدا کا تقویٰ ہے۔ ابن ماجہ کی حدیث ہے رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں: سب سے عمدہ فائدہ جو انسان حاصل کر سکتا ہے وہ اللہ کا ڈر ہے۔ اس کے بعد نیک بیوی ہے کہ خاوند جب اُس کی طرف دیکھے وہ اسے خوش کر دے اور جو حکم دے اُسے بجالائے اور اگر قسم دے دے تو پوری کر دکھائے اور جب وہ موجود نہ ہو تو اُس کے مال کی اور اپنے نفس کی حفاظت کرے۔

الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ

وہ خدا سے ڈرنے والے لوگ ایسے ہیں کہ یقین لائے ہیں چھپی ہوئی چیزوں پر

ایمان بالغیب لانے والے ☆

حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ایمان کہتے ہیں تصدیق کو۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بھی یہی فرماتے ہیں۔ حضرت زہری فرماتے ہیں ایمان کہتے ہیں عمل کو۔ ربیع بن انس کہتے ہیں یہاں مراد ایمان لانے سے خوف خداوندی کا دل میں پیدا ہونا ہے۔ ابن جریر (صاحب تفسیر طبری) فرماتے ہیں: ان اقوال میں کوئی زیادہ اختلاف نہیں ہے۔ یہ تمام تقریباً

ایک ہی معنی کو ادا کرتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ زبان سے دِل سے اور عمل سے غیب پر ایمان لاتے ہیں اور اللہ کا ڈر رکھتے ہیں۔ ایمان کا لفظ شامل ہے اللہ تعالیٰ پر اس کی کتابوں پر اس کے رسولوں پر ایمان لانے کو اور اس اقرار کی تصدیق عملی کے ساتھ کرنے کو۔ میں کہتا ہوں لغت میں ایمان کہتے ہیں صرف سچا مان لینے کو۔ قرآن میں اس معنی میں استعمال آیا ہے۔ جیسے فرمایا: ﴿ یُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَ یُؤْمِنُ لِلْمُؤْمِنِیْنَ ﴾ (التوبۃ: ٦١) یعنی اللہ کو مانتے ہیں اور ایمان والوں کو سچا جانتے ہیں۔ یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے اپنے باپ سے کہا تھا: ﴿ وَمَاۤ اَنْتَ بِمُؤْمِنٍ لَّنَا وَلَوْ كُنَّا صٰدِقِیْنَ ﴾ (یوسف: ١٧) یعنی تو ہمارا یقین نہیں کرنے کا اگرچہ ہم سچے ہوں۔ اسی طرح ایمان یقین کے معنی میں آتا ہے۔ اس وقت کہ جب اعمال کے ذکر کے ساتھ ملا ہوا ہو۔ جیسے فرمایا: ﴿ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ﴾ (العصر: ٣) ہاں! جس وقت اس کا استعمال مطلق ہو تو ایمان شرعی جو خدا کے ہاں مقبول ہے وہ اعتقاد قول و عمل کے مجموعہ کا نام ہے۔ اکثر ائمہ کا یہی مذہب ہے بلکہ امام شافعی امام احمد اور امام ابوعبیدہ رحمۃ اللہ علیہم وغیرہ نے اس پر اجماع نقل کیا ہے کہ ایمان نام ہے زبان سے کہنے اور عمل کرنے کا اور ایمان بڑھتا اور گھٹتا رہتا ہے اور اسی کے ثبوت میں بہت سے آثار اور حدیثیں بھی آئی ہیں جو ہم نے بخاری شریف کی شرح میں بیان کی ہیں۔ فالحمدللہ

بعضوں نے ایمان کے معنی اللہ کے ڈر کے بھی کیے ہیں جیسے فرمان ہے: ﴿ اِنَّ الَّذِیْنَ یَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَیْبِ ﴾ (الملک: ١٢) جو لوگ اپنے ربّ سے در پردہ ڈرتے رہتے ہیں۔ ایک جگہ فرمایا: ﴿ مَنْ خَشِیَ الرَّحْمٰنَ بِالْغَیْبِ ﴾ (ق: ٣٣) یعنی جو شخص اللہ تعالیٰ سے بن دیکھے ڈرا ہے اور جھکنے والا دِل لے کر آیا ہے۔ حقیقت میں اللہ کا خوف ایمان کا اور علم کا خلاصہ ہے۔ جیسے فرمایا: ﴿ اِنَّمَا یَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا ﴾ (فاطر: ٢٨) خدا سے وہی بندے ڈرتے ہیں جو ذی علم ہیں۔ بعض کہتے ہیں وہ غیب پر ایسا ہی ایمان رکھتے ہیں جیسا حاضر پر اور ان کا حال منافقوں جیسا نہیں کہ جب ایمان والوں کے سامنے ہوں تو اپنا ایماندار ہونا ظاہر کریں لیکن جب اپنے والوں میں ہوتے ہیں تو ان سے کہتے ہیں کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ ہم تو ان کا مذاق بناتے ہیں۔ ان منافقین کا حال اور جگہ اس طرح بیان ہوا ہے کہ: ﴿ اِذَا جَآءَكَ الْمُنٰفِقُوْنَ...... ﴾ (المنافقون: ١) یعنی منافق جب تیرے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہمارے دِل کی شہادت ہے کہ تو اللہ کا رسول ﷺ ہے۔ اللہ خوب جانتا ہے کہ تو اس کا رسول ﷺ ہے لیکن خدا گواہی دیتا ہے کہ یہ منافق تجھ سے جھوٹ کہتے ہیں۔ اس معنی کے اعتبار سے بِالْغَیْبِ حال ٹھہرے گا یعنی وہ ایمان لاتے ہیں درآنحالیکہ لوگوں سے پوشیدہ ہوتے ہیں۔ غیب کا لفظ جو یہاں ہے اس کے معنی میں بھی مفسرین کے بہت سے اقوال ہیں اور وہ سب صحیح ہیں اور جمع ہو سکتے ہیں۔

ابوالعالیہؒ فرماتے ہیں اس سے مراد اللہ تعالیٰ پر فرشتوں پر کتابوں پر رسولوں پر قیامت پر جنت و دوزخ پر ملاقاتِ خداوندی پر مرنے کے بعد جی اٹھنے پر ایمان لانا ہے۔ قتادہ بن دعامہؒ کا یہی قول ہے۔ (طبری) ابن عباس ابن مسعود (رضی اللہ عنہم) اور بعض دیگر اصحاب سے مروی ہے کہ مراد اس سے وہ پوشیدہ چیزیں ہیں جو نظروں سے اوجھل ہیں جیسے جنت و دوزخ وغیرہ۔ وہ اُمور جو قرآن میں مذکور ہیں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں اللہ کی طرف سے جو آیا ہے وہ غیب میں داخل ہے۔ حضرت ابودرداءؓ فرماتے ہیں مراد اس سے قرآن ہے۔ عطاء بن ابورباح فرماتے ہیں اللہ پر ایمان لانے والا غیب پر ایمان لانے والا ہے۔ اسمٰعیل بن ابوخالد فرماتے ہیں مراد اسلام کی تمام پوشیدہ چیزیں ہیں۔ زید بن اسلم کہتے ہیں

مراد تقدیر پر ایمان لانا ہے۔ پس یہ تمام اقوال معنی کی رُو سے ایک ہی ہیں۔ اس لیے کہ یہ سب چیزیں پوشیدہ ہیں اور غیب کی تفسیر ان سب کو شامل ہے اور سب پر ایمان لانا واجب ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی مجلس میں ایک مرتبہ صحابہؓ کے فضائل بیان ہو رہے تھے۔ آپ نے فرمایا: حضور ﷺ کے دیکھنے والوں کو تو آپ پر ایمان لانا ہی تھا لیکن خدا کی قسم ایمانی حیثیت سے وہ لوگ افضل ہیں' جو بن دیکھے ایمان لاتے ہیں۔ پھر آپ نے الٓمّٓ سے لے کر مُفْلِحُوْنَ تک آیتیں پڑھیں۔ ابن ابی حاتم' مردویہ' مستدرک حاکم' امام حاکم اس روایت کو صحیح بتلاتے ہیں۔

مسند احمد میں بھی اس مضمون کی ایک حدیث ہے۔ ابو جمعہ صحابیؓ سے ابن محیریز نے کہا کہ کوئی حدیث ایسی سناؤ جو تم نے خود رسول اللہ ﷺ سے سنی ہو۔ فرمایا: اچھا! میں تمہیں ایک بہت ہی عمدہ حدیث سناؤں۔ ہم نے حضور ﷺ کے ساتھ ایک مرتبہ ناشتہ کیا۔ ہمارے ساتھ ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ انہوں نے کہا: یارسول اللہ ﷺ! کیا ہم سے بہتر بھی کوئی اور ہے؟ ہم آپ ﷺ کے ساتھ اسلام لائے۔ آپ ﷺ کے ساتھ جہاد کیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں! وہ لوگ جو تمہارے بعد آئیں گے' مجھ پر ایمان لائیں گے حالانکہ انہوں نے مجھے دیکھا بھی نہ ہوگا۔

تفسیر ابن مردویہ میں ہے' صالح بن جبیر کہتے ہیں کہ ابو جمعہ انصاریؓ ہمارے پاس بیت المقدس میں آئے۔ رجاء بن حیوۃ رضی اللہ عنہ بھی ہمارے ساتھ ہی تھے۔ جب وہ واپس جانے لگے تو ہم انہیں پہنچانے چلے۔ جب جدا ہونے لگے تو فرمایا: تمہاری ان مہربانیوں کا بدلہ اور حق مجھے ادا کرنا چاہیے۔ سنو! میں تمہیں ایک حدیث سناتا ہوں جو میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنی ہے۔ ہم نے کہا: اللہ تعالیٰ تم پر رحم کرے' ضرور سناؤ۔ کہا: سنو! ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھے۔ ہم دس آدمی تھے۔ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ ہم نے کہا: یارسول اللہ! ہم سے بڑے اجر کا مستحق بھی کوئی ہوگا؟ ہم اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے اور آپ ﷺ کی تابعداری کی۔ آپ ﷺ نے فرمایا: تم کیوں نہ کرتے؟ خدا کا رسول ﷺ تم میں موجود ہے۔ وحی خداوندی آسمان سے تمہارے سامنے نازل ہو رہی ہے۔ ایمان تو ان لوگوں کا ہے۔ جو تمہارے بعد آئیں گے کہ دو جلدوں کے درمیان کتاب پائیں گے اور اس پر ایمان لائیں گے اور اس پر عمل کریں گے۔ یہ لوگ اجر میں تم سے دوگنے ہیں۔ اس حدیث میں وِجادۃ کی قبولیت کی دلیل ہے۔ جس میں محدثین کا اختلاف ہے۔ میں نے اس مسئلہ کو بخاری شریف کی شرح میں خوب واضح کر دیا ہے۔ اس لیے بعد والوں کی تعریف اسی بناء پر ہو رہی ہے اور ان کا بڑے اجر والا ہونا' اسی حیثیت سے ہے۔ ورنہ علی الاطلاق ہر طرح سے بہتر اور افضل تو صحابہ ہی ہیں۔ (رضی اللہ تعالیٰ عنہم)

ایک اور حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے ایک مرتبہ صحابہؓ سے پوچھا: تمہارے نزدیک ایمان لانے میں کون زیادہ افضل ہیں؟ انہوں نے کہا: فرشتے۔ فرمایا: وہ ایمان کیوں نہ لاتے۔ وہ تو اپنے ربّ کے پاس ہی ہیں۔ لوگوں نے کہا: پھر انبیاء۔ فرمایا: وہ ایمان کیوں نہ لائیں۔ اُن پر تو وحی نازل ہوتی ہے۔ کہا: پھر ہم؟ فرمایا: تم ایمان کو قبول کیوں نہ کرتے؟ حالانکہ میں تم میں موجود ہوں۔ سنو! میرے نزدیک سب سے زیادہ افضل ایمان والے وہ لوگ ہوں گے جو تمہارے بعد آئیں گے۔ صحیفوں میں کتاب لکھی ہوئی پائیں گے۔ اس پر ایمان لے آئیں گے۔ اس کی سند میں مغیرہ بن قیس ہیں۔ ابو حاتم رازی انہیں منکر الحدیث بتلاتے ہیں۔ لیکن اسی کے مثل ایک اور حدیث ضعیف سند سے مسند ابو یعلیٰ' تفسیر ابن مردویہ

مستدرک حاکم میں بھی مروی ہے اور حاکم اسے صحیح بتلاتے ہیں۔ حضرت انس بن مالکؓ سے بھی اسی کے مثل مرفوعاً مروی ہے واللہ اعلم۔

ابن ابی حاتم میں ہے حضرت بدیلہ بنت اسلم رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں' بنو حارثہ کی مسجد میں ہم ظہر یا عصر کی نماز میں تھے اور بیت المقدس کی طرف ہمارا منہ تھا۔ دو رکعت ادا کر چکے تھے کہ کسی نے آ کر خبر کی کہ نبی ﷺ نے بیت اللہ کی طرف مُنہ کر لیا ہے۔ ہم سنتے ہی گھوم گئے۔ عورتیں مردوں کی جگہ آ گئیں اور مرد عورتوں کی جگہ چلے گئے اور باقی دو رکعتیں ہم نے بیت اللہ شریف کی طرف ادا کیں۔ جب حضور ﷺ کو خبر پہنچی تو آپ ﷺ نے فرمایا: یہ لوگ ہیں جو غیب پر ایمان رکھتے ہیں۔ یہ حدیث اس اسناد سے غریب ہے۔

وَيُقِيمُونَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝

اور قائم رکھتے ہیں نماز کو اور جو کچھ دیا ہے ہم نے ان کو اس میں سے خرچ کرتے ہیں ○

اقامتِ صلوٰۃ اور انفاق فی سبیل اللہ ☆

ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں' فرائض نماز بجالاتے ہیں۔ رکوع' سجدہ' تلاوت خشوع اور توبہ کو قائم کرتے ہیں۔ قتادہ کہتے ہیں وقتوں کا خیال رکھنا' وضو اچھی طرح کرنا' رکوع' سجدہ اچھی طرح کرنا' اقامت صلوٰۃ ہے۔ مقاتل کہتے ہیں وقت کی نگہبانی کرنا' کامل طہارت کرنا' رکوع سجدہ اطمینان سے کرنا' تلاوت اچھی طرح کرنا' التحیات اور درود پڑھنا اقامت صلوٰۃ ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: ﴿مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ﴾ کے معنی زکوٰۃ ادا کرنے کے ہیں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما' ابن مسعود رضی اللہ عنہ اور بعض صحابہؓ نے کہا ہے کہ اس سے مراد آدمی کا اپنے بال بچوں کو کھلانا پلانا ہے۔ یہ زکوٰۃ کے حکم سے پہلے کی آیت ہے۔ حضرت ضحاک فرماتے ہیں کہ زکوٰۃ کی سات آیتیں جو سورۂ براءت میں ہیں' ان کے نازل ہونے سے پہلے یہ حکم تھا کہ اپنی اپنی طاقت کے مطابق تھوڑا بہت جو میسر ہو دیتے رہو۔

قتادہ فرماتے ہیں' یہ مال تمہارے پاس خدا کی امانت ہے۔ عنقریب تم سے جدا ہوگا۔ اپنی زندگی میں اسے خدا کی راہ میں لگا دو۔ امام ابن جریرؒ فرماتے ہیں: یہ آیت عام ہے۔ زکوٰۃ کو اہل وعیال کے خرچ کو اور جن لوگوں کو دینا ضروری ہو ان سب کے دینے کو شامل ہے۔ اس لیے پروردگار نے ایک عام وصف بیان فرمایا ہے اور عام تعریف کی ہے تو ہر طرح کے خرچ کو ہوگی۔ میں کہتا ہوں' قرآنِ کریم میں اکثر جگہ نماز کا اور مال خرچ کرنے کا ذکر ملا جلا آتا ہے۔ اس لیے نماز خدا کا حق اور اس کی عبادت ہے جو اس کی توحید' اس کی ثناء' اس کی بزرگی' اس کی طرف جھکنے' اس پر توکل کرنے' اس سے دعا کرنے کا نام ہے اور خرچ کرنا مخلوق کی طرف احسان کرنا ہے' جس سے انہیں نفع پہنچے۔ اس کے زیادہ حقدار اہل وعیال اور غلام ہیں۔ پھر دور والے اجنبی۔ پس تمام واجب خرچ اخراجات اور فرض زکوٰۃ اس میں شامل ہے۔

صحیحین میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اسلام کی بنائیں (بنیاد) پانچ ہیں: ۱) اللہ تعالیٰ کی توحید اور محمد ﷺ کی رسالت پر گواہی دینا' ۲) نماز قائم رکھنا' ۳) زکوٰۃ دینا' ۴) رمضان کے روزے رکھنا' ۵) اور بیت اللہ کا حج کرنا۔ اس بارے میں اور بہت سی حدیثیں ہیں۔ عربی لغت میں صلوٰۃ کے معنی دعا کے ہیں۔ ۶ ب

شاعروں کے اشعار اس پر شاہد ہیں۔ پھر شریعت میں اس کا استعمال نماز پر ہے۔ جو رکوع وسجود اور دوسرے خاص افعال کا نام ہے جو مخصوص اوقات میں جملہ شرائط اور صفات اور اقسام کے ساتھ بجالائی جاتی ہیں۔ ابن جریر فرماتے ہیں کہ نماز کو صلوٰۃ اس لیے کہا جاتا ہے کہ نمازی اللہ تعالیٰ سے اپنے عمل کا ثواب طلب کرتا ہے اور اپنی حاجتیں اللہ تعالیٰ سے مانگتا ہے۔ بعضوں نے کہا ہے کہ جو دو رگیں پیٹھ سے لے کر ریڑھ کی ہڈی کی دونوں طرف آتی ہیں انہیں عربی زبان میں صلوین کہتے ہیں چونکہ نماز میں یہ ہلتی ہیں' اس لیے نماز کو صلوٰۃ کہا گیا ہے لیکن یہ قول ٹھیک نہیں۔ بعضوں نے کہا ہے یہ ماخوذ ہے صلی سے' جس کے معنی ہیں چپک جانا اور لازم ہو جانا۔ جیسا کہ قرآن میں ہے: ﴿ لَا يَصْلٰهَآ ...... ﴾ (اللیل: ۱۵) یعنی جہنم میں ہمیشہ نہ رہے گا مگر بد بخت۔ بعض علماء کا قول ہے کہ جب لکڑی کو درست کرنے کے لیے آگ پر رکھتے ہیں تو عرب تَصْلِيَه کہتے ہیں۔ چونکہ نمازی بھی اپنے نفس کی کجی کو نماز سے درست کرتا ہے اس لیے اسے صلوٰۃ کہتے ہیں۔ جیسے قرآن میں ہے: ﴿ اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ ...... ﴾ (العنکبوت: ۴۵) یعنی نماز ہر بے حیائی اور برائی سے روکتی ہے لیکن اس کا دعا کے معنی میں ہونا ہی زیادہ صحیح ہے اور زیادہ مشہور ہے' واللہ اعلم۔ لفظ زکوٰۃ کی بحث ان شاء اللہ آئندہ آئے گی۔

وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ۝

اور وہ لوگ ایسے ہیں کہ یقین رکھتے ہیں اس کتاب پر بھی جو آپ کی طرف اتاری گئی ہے اور ان کتابوں پر بھی جو آپ ﷺ سے پہلے اتاری جا چکی ہیں اور آخرت پر بھی وہ لوگ یقین رکھتے ہیں ○

ایمان بالقرآن' ایمان بالرسل' ایمان بالکتب وایمان بالآخرۃ ☆

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں' مطلب یہ ہے کہ تو جو کچھ خدا کی طرف سے لایا اور جو تجھ سے پہلے کے انبیاء لائے وہ ان سب کی تصدیق کرتے ہیں۔ یہ نہیں کہ کسی کو مانیں اور کسی کا انکار کریں بلکہ اپنے ربّ کی سب باتوں کو مانتے ہیں اور آخرت پر بھی ایمان رکھتے ہیں۔ (طبری) یعنی بعث وقیامت' جنت ودوزخ' حساب ومیزان سب کو مانتے ہیں قیامت چونکہ دنیا کے فنا ہونے کے بعد آئے گی اس لیے اسے آخرت کہتے ہیں۔ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ جن کی پہلے ایمان بالغیب وغیرہ کے ساتھ صفت بیان کی گئی تھی انہی کی دوبارہ یہ صفتیں بیان کی گئی ہیں۔ یعنی ایماندار خواہ عرب مؤمن ہوں خواہ اہل کتاب وغیرہ۔ مجاہد' ابو العالیہ' ربیع بن انس اور قتادہ کا یہی قول ہے۔ بعض نے کہا ہے یہ دونوں ہیں تو ایک مگر مراد اس سے صرف اہل کتاب ہی ہیں۔ ان دونوں میں واؤ عطف کا ہوگا اور صفت کا عطف صفت پر ہوگا جیسے: ﴿ سَبِّحِ اسْمَ ...... ﴾ (الاعلیٰ: ۱) میں صفت کا عطف صفت پر ہے۔ اس طرح کا عطف شعراء کے کلام میں بھی آیا ہے۔ تیسرا قول یہ ہے کہ پہلی صفتیں تو عرب مؤمنوں کی اور ﴿ وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ ...... ﴾ سے اہل کتاب کے مؤمنوں کی صفتیں ہیں۔ سدی نے حضرت ابن عباس' ابن مسعود اور دیگر صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین سے نقل کیا ہے اور ابن جریر نے بھی اسی کو پسند کیا ہے اور اس کی شہادت میں یہ آیت لائے ہیں: ﴿ وَاِنَّ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَمَنْ يُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ ...... ﴾ (آل عمران: ۱۹۹) یعنی اہل کتاب میں ایسے لوگ بھی ہیں جو اللہ تعالیٰ پر اور اس وحی پر جو تمہاری طرف

نازل کی گئی اور اس وحی پر جو اُن کی طرف اتاری گئی ایمان لاتے ہیں اور خدا تعالیٰ سے ڈرتے رہتے ہیں۔ ایک جگہ ارشاد ہے: ﴿ اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِهٖ...... ﴾ (القصص: ۵۲) یعنی جنہیں اس سے پہلے کی کتاب ہم نے دی تھی وہ اس کے ساتھ ایمان رکھتے ہیں اور جب ان پر (یہ قرآن) پڑھا جاتا ہے تو کہتے ہیں' ہم اس پر ایمان لائے اور اسے اپنے رب کی طرف سے حق جانا' ہم تو اس سے پہلے ہی مسلمان تھے انہیں ان کے صبر کرنے اور برائی کے بدلے بھلائی کرنے اور راہ الٰہی میں خرچ کرنے کی وجہ سے دوہرا اجر ملے گا۔

بخاری و مسلم میں ہے' رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں: تین اشخاص کو دوہرا اجر ملے گا' ایک اہل کتاب جو اپنے نبی پر ایمان لائیں اور مجھ پر بھی ایمان رکھیں' دوسرا وہ غلام جو اللہ تعالیٰ کا حق ادا کرے اور اپنے مالک کا بھی' تیسرا وہ شخص جو اپنی لونڈی کو اچھا ادب سکھائے' پھر اُسے آزاد کر کے اس سے نکاح کر لے۔ امام ابن جریرؒ کے اس فرق کی مناسبت اس سے بھی معلوم ہوتی ہے کہ اس سورۃ کے شروع میں مؤمنوں اور کافروں کا بیان ہوا ہے تو جس طرح کفار کی دو قسمیں ہیں' کافر اور منافق۔ اسی طرح مؤمنوں کی بھی دو قسمیں کیں۔ عربی مؤمن اور کتابی مؤمن۔ میں کہتا ہوں ظاہر یہ ہے کہ حضرت مجاہد کا قول ٹھیک ہے کہ سورۃ بقرہ کی اوّل کی چار آیتیں مؤمنوں کے اوصاف کے بیان میں ہیں اور دو آیتیں اس کے بعد کافروں کے بارے میں ہیں ان بعد کی تیرہ آیتیں منافقوں کے حق میں ہیں۔ پس یہ چاروں ہر مؤمن کے حق میں عام ہیں' عربی ہو یا عجمی' کتابی ہو یا غیر کتابی۔ انسانوں میں سے ہو یا جنات میں سے۔ اس لیے کہ ان میں سے ہر ایک وصف دوسرے کو لازم اور شرط ہے۔ ایک بغیر دوسرے کے نہیں ہو سکتا۔

غیب پر ایمان لانا' نماز کو قائم کرنا اور زکوٰۃ دینا صحیح نہیں' جب تک رسول اللہ ﷺ پر اور اگلے انبیاء پر جو کتابیں اُتری ہیں' ان پر ایمان نہ ہو اور ساتھ ہی آخرت کا یقین کامل نہ ہو جس طرح پہلی تین چیزیں بغیر پچھلی تین چیزوں کے غیر معتبر ہیں' اسی طرح پچھلی تین چیزیں بغیر پہلی تینوں کے صحیح نہیں۔ اسی لیے ایمان والوں کو حکم خداوندی ہے: ﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْ نَزَّلَ عَلٰي رَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ ﴾ (النساء: ۱۳۶) یعنی ایمان والو! اللہ پر اور اس کے رسول ﷺ پر اور جو کتاب اُن پر اتری ہے اس پر اور جو کتابیں ان سے پہلے اُتری ہیں' ان پر ایمان لاؤ اور ایک جگہ فرمایا: ﴿ وَلَا تُجَادِلُوْٓا اَهْلَ الْكِتٰبِ ﴾ (العنکبوت: ۱۳۶) یعنی اہل کتاب سے جھگڑنے میں بہترین طریقہ برتو اور کہو کہ ہم ایمان لائے ہیں اُس پر جو ہماری طرف نازل کیا گیا ہے اور جو تمہاری طرف اتارا گیا ہے۔ ہمارا اور تمہارا معبود ایک ہی ہے اور جگہ ارشاد ہے: اے اہل کتاب جو ہم نے اتارا ہے اس پر ایمان لاؤ۔ یہ اس کو سچا کرنے والا ہے جو تمہارے پاس ہے اور جگہ فرمایا: اے اہل کتاب! تم کسی چیز پر نہیں ہو جب تک تورات اور انجیل کو اور جو کچھ تمہاری طرف تمہارے رب کی جانب سے اتارا گیا ہے قائم نہ رکھو اور جگہ تمام ایمان والوں کی طرف سے خبر دیتے ہوئے قرآنِ پاک میں فرمایا: ﴿ اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ...... ﴾ یعنی رسول ایمان لائے اس پر جو ان کی طرف ان کے ربّ کی طرف سے نازل ہوا ہے اور تمام ایمان والے بھی۔ ہر ایک ایمان لایا اللہ تعالیٰ پر اور اس کے فرشتوں پر اور اس کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر۔ ہم رسولوں میں فرق اور جدائی نہیں کرتے۔ اسی طرح ارشاد ہوتا ہے کہ جو لوگ اللہ پر اور اس کے رسولوں پر ایمان لاتے ہیں اور رسولوں میں سے کسی میں تفریق نہیں کرتے۔ اس مضمون کی اور بہت سی آیتیں ہیں' جن میں کل ایمان والوں کا اللہ تعالیٰ پر اور اس کے تمام

رسولوں اور سب کتابوں پر ایمان لانے کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اہل کتاب کے ایمانداروں کی ایک خاص خصوصیت ہے کیونکہ ان کا ایمان اپنے ہاں کی کتابوں پر تفصیل کے ساتھ ہوتا ہے اور پھر جب حضور ﷺ کے ہاتھ پر وہ اسلام قبول کرتے ہیں تو قرآن کریم پر بھی تفصیل کے ساتھ ایمان لاتے ہیں۔ اسی لیے ان کو دوہرا اجر ملتا ہے اور اس امت کے لوگ بھی اگلی کتابوں پر ایمان لاتے ہیں لیکن ان کا ایمان اجمالی طور پر ہوتا ہے۔

جیسے صحیح حدیث میں ہے کہ جب تم سے اہل کتاب کوئی خبر بیان کریں تو تم نہ اسے سچا کہو نہ اسے جھٹلاؤ بلکہ کہہ دیا کرو کہ جو کچھ ہم پر اُترا ہے اس پر بھی ایمان رکھتے ہیں۔ (بخاری) بعض موقعہ پر ایسا بھی ہوتا ہے کہ جو لوگ حضور ﷺ پر ایمان لاتے ہیں اُن کا ایمان بہ نسبت اہل کتاب کے ایمان کے زیادہ پورا' زیادہ کمال والا' زیادہ راسخ اور زیادہ مضبوط ہوتا ہے۔ اس حیثیت سے ممکن ہے کہ انہیں اہل کتاب سے بھی زیادہ اجر ملے گا' گو وہ بسبب اپنے پیغمبر اور پیغمبر آخر الزمان ﷺ پر ایمان لانے کے دوہرا اجر پائے ہوئے ہیں لیکن یہ لوگ بہ سبب کمالِ ایمان اَجر میں ان سے بھی بڑھ جاتے ہیں' واللہ اعلم۔

أُولَٰئِكَ عَلَىٰ هُدًى مِّن رَّبِّهِمْ ۖ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ۝

پس یہ لوگ ہیں ٹھیک راہ پر جو ان کے پروردگار کی طرف سے ملی ہے اور یہ لوگ ہیں پورے کامیاب ○

اللہ عزوجل کے نزدیک کامیاب گروہ ☆

یعنی وہ لوگ جن کے اوصاف پہلے بیان ہوئے مثلاً غیب پر ایمان لانا' نماز قائم کرنا' اللہ کے دیئے ہوئے میں سے دینا۔ حضور ﷺ پر جو اترا ہے اس پر ایمان لانا۔ آپ ﷺ سے پہلے جو کتابیں اتریں اُن کو ماننا اور آخرت پر یقین رکھ کر وہاں کام آنے والے نیک عمل کرنا' برائیوں اور حرام کاریوں سے بچنا۔ یہی لوگ ہدایت یافتہ ہیں جنہیں خدا کی طرف سے نور ملا ہے اور بیان وبصیرت حاصل ہوئی ہے اور انہی لوگوں کے لیے دنیا اور آخرت میں فلاح اور نجات ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے ہدایت کی تفسیر نور اور استقامت سے کی ہے اور فلاح کی تفسیر اپنی چاہت کو پالینے اور برائیوں سے بچ جانے سے کی ہے۔ ابن جریرؒ فرماتے ہیں کہ یہ لوگ ربّ کی طرف سے نور اور دلیل اور ثابت قدمی اور سچائی اور توفیق حق پر ہیں اور یہی لوگ اپنے پاکیزہ اعمال کی وجہ سے نجات' ثواب اور جنت کی ہمیشگی کو پانے کے مستحق ہیں اور عذابوں سے دُور ہیں۔ ابن جریرؒ یہ بھی فرماتے ہیں کہ دوسرے اُولٰٓئِكَ کا اشارہ اہل کتاب کی طرف سے ہے' جن کی صفت اس سے پہلے بیان ہو چکی ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ اس اعتبار سے ﴿وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ......﴾ پہلی کی آیت سے جدا ہوگا اور مبتداء بن کر مرفوع ہوگا اور اس کی خبر ﴿اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ﴾ ہوگی۔ لیکن پسندیدہ قول یہی ہے کہ اس کا اشارہ پہلے کے سب اوصاف والوں کی طرف ہے۔ اہل کتاب ہوں یا عرب۔ حضرت ابن عباس' حضرت ابن مسعود اور بعض صحابہ (رضی اللہ عنہم) سے مروی ہے کہ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ سے مراد عرب کے مومنین ہیں اور اس کے بعد کے جملے سے مراد مومنین اہل کتاب ہیں۔ پھر دونوں کے لیے یہ بشارت ہے کہ یہ لوگ ہدایت اور فلاح والے ہیں اور ہر طرح بیان ہو چکا ہے کہ یہ آیتیں عام ہیں اور یہ اشارہ بھی عام ہے' واللہ اعلم۔

مجاہد' ابو العالیہ' ربیع بن انس اور قتادہ (رحمہم اللہ) سے اس طرح ہے' ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ سے کسی نے دریافت کیا

کہ حضور ﷺ قرآنِ پاک کی بعض آیات تو ہمیں ڈھارس دیتی ہیں اور امید قائم کرا دیتی ہیں اور بعض آیات کمر توڑ دیتی ہیں اور قریب ہوتا ہے کہ ہم نا اُمید ہو جائیں۔ آپ نے فرمایا: میں تو تمہیں جنتی اور جہنمی کی پہچان صاف صاف بتا دوں۔ پھر آپ نے ﴿الٓمّٓ﴾ سے ﴿مُفْلِحُوْنَ﴾ تک پڑھ کر فرمایا: یہ جنتی ہیں۔ صحابہؓ نے خوش ہو کر فرمایا: الحمد للہ' ہمیں اُمید ہے کہ ہم انہی میں سے ہوں گے پھر ﴿اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا﴾ سے ﴿عَظِیْمٌ﴾ تک تلاوت کی اور فرمایا: یہ جہنمی ہیں' انہوں نے کہا: ہم ایسے نہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں! (ابن ابی حاتم)

اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَیْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ ﴿۶﴾

بے شک جو لوگ کافر ہو چکے ہیں برابر ہے اُن کے حق میں خواہ آپ اُن کو ڈرائیں یا نہ ڈرائیں وہ ایمان نہ لائیں گے ○

کفار کی ہٹ دھرمی ☆

یعنی جو لوگ حق کے پوشیدہ کرنے اور چھپا لینے کے عادی ہیں اور ان کی قسمت میں یہی ہے۔ یہ کبھی خداوند تعالیٰ کی اس وحی کی تصدیق نہ کریں گے جو آپ ﷺ پر نازل ہوئی ہے جیسا کہ ایک دوسرے موقع پر فرمایا: ﴿اِنَّ الَّذِیْنَ حَقَّتْ عَلَیْهِمْ كَلِمَةُ رَبِّكَ لَا یُؤْمِنُوْنَ وَلَوْ جَآءَتْهُمْ كُلُّ اٰیَةٍ حَتّٰى یَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِیْمَ﴾ (یونس ۹۶'۹۷) یعنی جن لوگوں پر خدا کی بات ثابت ہو چکی ہے وہ ایمان نہ لائیں گے اگرچہ تمام آیتیں دیکھ لیں۔ یہاں تک کہ دردناک عذاب دیکھیں اور ایسے ہی سرکش اہل کتاب کی نسبت فرمایا: ﴿وَلَىِٕنْ اَتَیْتَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ ......﴾ (البقرہ: ۴۵) یعنی اہل کتاب کے پاس اگرچہ تمام دلائل لے آؤ تاہم تمہارے قبلہ کو نہیں ماننے کے۔ یعنی ان بدنصیبوں کو سعادت حاصل ہی نہیں ہونے کی۔ ان گمراہوں کو ہدایت کہاں؟ تو اے نبی ﷺ ان پر افسوس نہ کر' تیرا کام صرف رسالت کا حق ادا کر دینا اور پہنچا دینا ہے جو مان لیں وہ سعادت مند سعید ہیں' وہ مالا مال ہو جائیں گے' اور اگر کوئی نہ مانے تو نہ سہی' تیرا فرض ادا ہو گیا۔ ہم خود ان سے حساب لے لیں گے تو صرف ڈرانے والا ہے۔ ہر چیز پر اللہ ہی وکیل ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اس بات کی بڑی ہی حرص تھی کہ تمام لوگ ایماندار ہو جائیں اور ہدایت کو قبول کر لیں لیکن پروردگار نے فرما دیا کہ یہ سعادت ہر ایک کے حصہ کی نہیں۔ یہ نعمت بٹ چکی ہے جس کے حصہ میں آئی وہ آپ ﷺ کی مانے گا اور جو بدقسمت ہے وہ ہرگز ہرگز اطاعت کی طرف نہ جھکے گا۔ (طبری) پس مطلب یہ ہے کہ جو قرآن سے انکاری ہے وہ کہتے ہیں کہ ہم اگلی کتابوں کو مانتے ہیں' انہیں ڈراوے کا کوئی فائدہ نہیں' یہ اس لیے کہ وہ خود اپنی کتاب کو بھی حقیقتاً نہیں مانتے کیونکہ ان میں تیرے ماننے کا عہد ہے۔ تو جب وہ اس کتاب کو اور اس نبی ﷺ کی نصیحت کو نہیں مانتے جس کے ماننے کے اقراری ہیں تو بھلا اے نبی ﷺ! تمہاری باتوں کو کیا مانیں گے۔ ابوالعالیہ کا قول ہے' یہ آیت جنگ احزاب کے ان سرداروں کے بارے میں اُتری ہے جن کی نسبت فرمانِ باری ہے: ﴿اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِیْنَ بَدَّلُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ كُفْرًا......﴾ لیکن جو معنی ہم نے پہلے بیان کیے ہیں وہ زیادہ ظاہر ہیں اور دوسری آیتوں کے مطابق ہیں' واللہ اعلم۔

کی تاکید ہے یعنی ڈرانا نہ ڈرانا دونوں برابر ہیں۔ دونوں حالتوں میں ان کا کفر نہ ٹوٹے گا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ﴿لَا یُؤْمِنُوْنَ﴾ خبر ہو۔ اس لیے کہ تقدیر کلام ﴿ اَلَّذِیْنَ كَفَرُوْا لَا یُؤْمِنُوْنَ ﴾ ہے اور ﴿ سَوَآءٌ عَلَیْهِمْ ﴾ جملہ معترضہ ہے۔ واللہ اعلم۔

خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ ؕ وَعَلٰۤى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ ؗ وَّلَهُمْ عَذَابٌ عَظِیْمٌ ۠۝۷

بند لگا دیا ہے اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں پر اور ان کے کانوں پر اور ان کی آنکھوں پر پردہ ہے اور ان کے لیے سزا بڑی ہے ۝

اللہ عزوجل کا فیصلہ ☆

حضرت سدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں ختم سے مراد طبع ہے یعنی مہر کر دینا۔ قتادہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں یعنی ان پر شیطان غالب آ گیا۔ وہ اسی کے ماتحت ہو گئے۔ یہاں تک کہ مہر خدا وندی ان کے دلوں پر ان کے کانوں پر لگ گئی اور آنکھوں پر پردہ پڑ گیا۔ ہدایت کو نہ وہ دیکھ سکتے ہیں' نہ سن سکتے ہیں' نہ سمجھ سکتے ہیں۔ (ابن ابی حاتم) حضرت مجاہدؒ فرماتے ہیں کہ گناہ لوگوں کے دلوں پر چڑھ جاتے اور انہیں ہر طرف سے گھیر لیتے ہیں۔ یہی طبع اور ختم یعنی مہر ہے۔ دِل اور کان کے لیے محاورہ میں مہر آتی ہے۔ مجاہد رحمہ اللہ فرماتے ہیں' قرآن میں ران لفظ ہے۔ طَبَعَ کا لفظ ہے اور اَقْفَال کا لفظ ہے۔ ران طبع سے کم ہے اور طبع اقفال سے کم ہے۔ اقفال سب سے زیادہ ہے۔ حضرت مجاہد رحمہ اللہ نے اپنا ہاتھ دکھا کر کہا کہ دِل ہتھیلی کی طرح اور بندے کے گناہ کی وجہ سے وہ سمٹ جاتا ہے اور بند ہو جاتا ہے۔ اس طرح کہ ایک گناہ کیا تو گویا چھنگلیا بند ہو گئی پھر دوسرا گناہ کیا دوسری انگلی بند ہو گئی۔ یہاں تک کہ تمام انگلیاں بند ہو گئیں اور اب مٹھی بند ہو گئی جس میں کوئی چیز داخل نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح گناہوں سے دِل پر پردے پڑ جاتے ہیں۔ مہر لگ جاتی ہے۔ پھر اس میں حق اثر نہیں کرتا' اسے رین بھی کہتے ہیں۔ (طبری) مطلب یہ ہوا کہ اُنکا تکبر اُن کا حق سے مُنہ پھیر لینا بیان ہو رہا ہے جیسے کہا جاتا ہے کہ فلاں شخص اس بات کے سننے سے بہرا بن گیا۔ مطلب یہ ہوتا ہے کہ تکبر اور بے پروائی کر کے اس نے اس بات کی طرف کان نہ لگایا۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ فرماتے ہیں لیکن یہ مطلب ٹھیک نہیں ہو سکتا۔ اسلئے کہ یہاں تو خود خداوند تعالیٰ فرماتا ہے کہ اس نے انکے دِلوں پر مُہر لگا دی۔

زمخشری نے اس کا بہت کچھ رَد کیا ہے اور پانچ تاویلیں کی ہیں لیکن سب کی سب بالکل بودی اور واہی ہیں اور صرف اپنے معتزلی ہونے کی وجہ سے اسے یہ تکلفات کرنے پڑے ہیں کیونکہ ان کے نزدیک یہ بہت بری بات ہے کہ کسی کے دِل پر خداوند قدوس مہر کر دے لیکن افسوس اس نے دوسری صاف اور صریح آیت پر غور نہیں کیا۔ ایک جگہ ارشاد ہے: ﴿فَلَمَّا زَاغُوْۤا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ﴾ (الصف: ۵) یعنی جب ٹیڑھے ہو تو اللہ نے ان کے دل ٹیڑھے کر دیئے اور فرمایا: ﴿وَ نُقَلِّبُ اَفْـِٕدَتَهُمْ وَ اَبْصَارَهُمْ﴾ (الانعام: ۱۱۰) ہم ان کے دِلوں کو اور ان کی نگاہوں کو الٹ دیتے ہیں۔ گویا وہ سرے سے ایمان ہی نہ لائے تھے اور ہم انہیں ان کی سرکشی میں بھٹکتے ہوئے ہی چھوڑ دیتے ہیں۔ اس قسم کی اور آیتیں بھی ہیں جو صاف بتلاتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے دِلوں پر مُہر لگا دی ہے اور ہدایت کو اُن سے دُور کر دیا ہے۔ ان کے حق کو ترک کرنے اور باطل پر جمے

رہنے کی وجہ سے اور یہ سراسر عدل وانصاف ہے اور عدل اچھی چیز ہے نہ کہ بری۔ اگر زمخشری بھی بغور ان آیات پر نظر ڈالتے تو تاویل نہ کرتے' واللہ اعلم۔

قرطبی فرماتے ہیں کہ اُمت کا اجماع ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اپنی ایک صفت مُہر کرنا بھی بیان کی ہے جو کفار کے کفر کا بدلہ ہے۔ فرماتا ہے: ﴿ بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ ﴾ (النساء: ۱۵۵) بلکہ ان کے کفر کی وجہ سے اللہ نے ان پر مہر لگا دی۔ حدیث میں بھی ہے کہ اللہ دلوں کو اُلٹ پلٹ کرتا ہے۔ دعا میں ہے: **یا مقلب القلوب ثبت قلم بنا علی وینك** یعنی اے دلوں کے پھیرنے والے ہمارے دِلوں کو اپنے دین پر قائم رکھ۔ (قرطبی)

حضرت حذیفہؓ والی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: دِلوں پر فتنے اس طرح پیش ہوتے ہیں جیسے ٹوٹے ہوئے بوریئے کا ایک تنکا جو دِل انہیں قبول کر لیتا ہے اس میں ایک سیاہ نقطے کا نشان ہو جاتا ہے اور جس دِل میں یہ فتنے اثر نہیں کرتے' اس میں ایک سفید نقطہ ہو جاتا ہے جس کی سفیدی بڑھتے بڑھتے بالکل صاف ہو کر سارے دِل کو منور کر دیتی ہے۔ پھر اسے کوئی فتنہ نقصان نہیں پہنچا سکتا اور اس دوسرے سے دل کی سیاہی بھی پھیلتی جاتی ہے یہاں تک کہ سارا دل سیاہ ہو جاتا ہے۔ اب وہ اُلٹے کوزے کی طرح ہو جاتا ہے' نہ اچھی بات اُسے اچھی لگتی ہے نہ برائی بری معلوم ہوتی ہے۔ (مسلم) امام ابن جریرؒ کا فیصلہ یہ ہے کہ حدیث میں آ چکا ہے کہ مؤمن جب گناہ کرتا ہے اس کے دل میں ایک سیاہ نکتہ ہو جاتا ہے اگر وہ باز آ گیا' توبہ کر لی اور رک گیا تو وہ نکتہ ہٹ جاتا ہے اور اس کا دل صاف ہو جاتا ہے اور اگر وہ گناہ میں پڑ گیا تو وہ سیاہی بھی پھیل جاتی ہے یہاں تک کہ وہ سارے دل پر چھا جاتی ہے۔ یہی وہ ران ہے جس کا ذکر اس آیت میں ہے: ﴿ كَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴾ (المطففین: ۱۴) یعنی یقیناً ان کے دِل پر رَانَ ہے' ان کی بداعمالیوں کی وجہ سے۔ (ترمذی' نسائی) ابن جریرؒ' امام ترمذیؒ نے اس حدیث کو حسن صحیح کہا ہے تو معلوم ہوا کہ گناہوں کی زیادتی دِلوں پر غلاف ڈال دیتی ہے اور اس کے بعد مُہر خداوندی ہو جاتی ہے جسے ختم اور طبع کہا جاتا ہے۔ اب اس دِل میں ایمان جانے اور کفر کے نکلنے کی کوئی راہ باقی نہیں رہتی۔

اِسی مہر کا ذکر اس آیت: خَتَمَ اللّٰهُ میں ہے۔ ہماری آنکھوں دیکھی نظیر ہے کہ جب کسی چیز کا منہ بند کر کے اس پر مُہر لگا دیں تو جب تک وہ مہر نہ ٹوٹے گی' نہ اس میں کچھ جا سکتا ہے' نہ اس میں سے کوئی چیز نکل سکتی ہے۔ اسی طرح جن کفار کے دِلوں اور کانوں پر مہرِ خداوندی لگ چکی ہے۔ ان میں بغیر اس کے ہٹے اور ٹوٹے نہ ہدایت جائے نہ کفر آئے۔ سَمْعِهِمْ پورا وقف ہے اور عَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ الگ پورا جملہ ہے۔ ختم اور طبع دِلوں اور کانوں پر ہوتی ہے اور غشاوت یعنی پردہ آنکھوں پر پڑتا ہے جیسے کہ عبداللہ بن عباس' عبداللہ بن مسعود اور دوسرے صحابہ (رضی اللہ عنہم) سے مروی ہے۔ قرآن میں ہے: ﴿ فَاِنْ يَّشَاِ اللّٰهُ يَخْتِمْ عَلٰى قَلْبِكَ ﴾ (النور: ۲۴) ایک اور جگہ ہے: ﴿ وَ خَتَمَ عَلٰى سَمْعِهٖ وَ قَلْبِهٖ وَ جَعَلَ عَلٰى بَصَرِهٖ غِشٰوَةً ﴾ (الجاثیہ: ۲۳) ان آیتوں میں دِل اور کان پر ختم کا ذکر ہے اور آنکھ پر پردے کا۔

بعضوں نے یہاں ﴿غِشَاوَةً﴾ زبر کے ساتھ پڑھا ہے تو ممکن ہے کہ ان کے نزدیک فعل جَعَلَ مقدر ہو اور ممکن ہے کہ نصب محل کی اتباع سے ہو جیسے وَ حُوْرٌ عِيْنٌ میں۔ شروع سورت کی چار آیتوں میں مؤمنین کے اوصاف بیان ہوئے۔ پھر ان دو آیتوں میں کفار کا حال بیان ہوا۔ اب منافقوں کا ذکر ہوتا ہے جو بظاہر ایماندار بنتے ہیں لیکن حقیقت میں کفار ہیں

چونکہ ان لوگوں کی چالاکیاں عموماً پوشیدہ رہ جایا کرتی ہیں۔اس لیے ان کا بیان ذرا تفصیل سے ہوا اور بہت کچھ ان کی نشانیاں بیان کی گئیں۔انہی کے بارے میں سورت براءت اُتری اور انہی کا ذکر سورۂ نور وغیرہ میں کیا گیا۔تاکہ ان سے پورا بچاؤ ہو اور ان مذموم خصلتوں سے مسلمان دُور رہیں،پس فرمایا:

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ ۝۸ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۚ وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ۝۹

اور ان لوگوں میں بعضے ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں ہم ایمان لائے اللہ پر اور آخری دن پر حالانکہ وہ بالکل ایمان والے نہیں۔چالبازی کرتے ہیں اللہ سے اور ان لوگوں سے جو ایمان لائے (یعنی محض چالبازی کی راہ ایمان کا اظہار کرتے ہیں) اور واقع میں کسی کے ساتھ بھی چالبازی نہیں کرتے بجز اپنی ذات کے اور وہ اس کا شعور نہیں رکھتے ○

اپنی راہ میں آپ گڑھا کھودنے والے☆

اور اصل نفاق کہتے ہیں بھلائی کے ظاہر کرنے اور برائی کے پوشیدہ رکھنے کو۔نفاق کی دو قسمیں ہیں: اعتقادی اور عملی۔پہلی قسم کے منافق تو ابدی جہنمی ہیں اور دوسری قسم کے بدترین مجرم ہیں۔اس کا بیان تفصیل کے ساتھ ان شاء اللہ کسی مناسب جگہ ہوگا۔امام ابن جریر فرماتے ہیں: منافق کا قول اس کے فعل کے خلاف،اس کی پوشیدگی ظاہر کے خلاف،اس کا آنا جانے کے خلاف،اس کی موجودگی عدم موجودگی کے خلاف ہوا کرتی ہے۔نفاق مکہ شریف میں تو تھا ہی نہیں بلکہ اس کا خلاف تھا۔بعض لوگ ایسے تھے جو زبردستی سے بظاہر کافروں کا ساتھ دیتے تھے مگر دِل میں مسلمان ہوتے تھے بلکہ آنحضرت ﷺ ہجرت کر کے مکہ چھوڑ کر مدینہ میں تشریف لائے اور یہاں پر اوس وخزرج کے قبائل نے انصار بن کر آپ ﷺ کا ساتھ دیا اور جاہلیت کے زمانہ کی مشرکانہ بت پرستی ترک کی اور دونوں قبیلوں میں خوش نصیب لوگ مشرف باسلام ہو گئے لیکن یہودی اب تک خداوند کریم کی اس نعمت سے محروم تھے۔ان میں سے صرف عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ نے اس سچے دین کو قبول کیا تھا تب تک بھی منافقوں کا خبیث گروہ قائم نہ ہوا تھا اور حضور ﷺ نے ان یہودیوں سے اور عرب کے بعض اور قبائل سے صلح کر لی تھی۔اس جماعت کے قیام کی ابتداء یوں ہوئی کہ مدینہ شریف کے یہودیوں کے تین قبیلے تھے: بنو قینقاع،بنو نضیر اور بنو قریظہ۔بنو قینقاع تو خزرج کے حلیف اور بھائی بند بنے ہوئے تھے اور باقی دو قبیلوں کا بھائی چارہ اوس سے تھا۔جب جنگ بدر ہوئی اور اس میں پروردگار نے اپنے دین والوں کو غالب کیا اور شوکت وشانِ اسلام ظاہر ہوئی اور مسلمانوں کا سکہ جم گیا اور کفر کا دھڑ ٹوٹ گیا۔تب یہ ناپاک گروہ قائم ہوا۔عبداللہ بن اُبی بن سلول تھا تو خزرج کے قبیلے میں سے لیکن اوس اور خزرج دونوں اسے اپنا بڑا مانتے تھے بلکہ اس کی باقاعدہ سرداری اور بادشاہت کے اعلان کا پختہ ارادہ ہو چکا تھا کہ ان دونوں قبیلوں کا رُخ اسلام کی طرف پھر جاتا ہے اور اس کی سرداری یوں ہی (دھری ۱۲) رہ جاتی ہے۔(بخاری) یہ خار تو اس کے دِل میں تھا ہی، اُدھر اسلام کی روز افزوں ترقی،اِدھر لڑائی میں کامیابی نے اسے مخبوط الحواس بنا دیا۔اب اس نے دیکھا کہ یوں کام نہیں چلنے

کا۔ جھٹ سے بظاہر اسلام قبول کر لیتے اور بہ باطن کافر رہنے کی ٹھان لی اور جس قدر جماعت اس کے زیر اثر تھی' سب کو یہی ہدایت کی اور اس طرح منافقین کی ایک جمعیت مدینہ میں اور مدینہ کے آس پاس قائم ہوگئی۔ ان منافقین میں بحمد اللہ مکی مہاجر ایک بھی نہ تھا بلکہ یہ بزرگ تو اپنے اہل وعیال مال ومتاع کو تمام خدا پر قربان کر کے خدا کے رسول ﷺ کا ساتھ دے کر آئے تھے۔ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمْ اَجْمَعِیْنَ. حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: یہ منافق اوس اور خزرج کے قبیلوں سے تھے اور یہودی بھی جو اُن کے طریقے پر تھے' قبیلہ اوس اور خزرج کے نفاق کا ان آیتوں میں بیان ہے۔ ابو العالیہؒ، حضرت حسن قتادہ سدی نے یہی بیان کیا ہے۔

پروردگارِ عالم نے منافقوں کی بہت سی بدخصلتوں کا ذکر فرمایا تاکہ ان کے ظاہر حال سے مسلمان دھوکہ میں نہ آ جائیں اور انہیں مسلمان خیال کر کے اپنا نہ سمجھ بیٹھیں جس کی وجہ سے کوئی بڑا فساد پھیل جائے۔ یہ یاد رہے کہ بدکاروں کو نیکی سمجھنا بھی بجائے خود بہت برا اور نہایت خوفناک اَمر ہے۔ جس طرح اس آیت میں فرمایا گیا ہے کہ یہ لوگ زبانی اقرار تو کرتے ہیں مگر دِل میں ان کے ایمان نہیں۔ اسی طرح سورۂ منافقون میں بھی کہا گیا ہے کہ: ﴿ اِذَا جَآءَكَ الْمُنٰفِقُوْنَ قَالُوْا نَشْهَدُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ...... ﴾ یعنی منافق تیرے پاس آ کر کہتے ہیں کہ ہماری گواہی ہے کہ آپ رسول اللہ ﷺ ہیں اور اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ تو اس کا رسول ہے لیکن حقیقت میں منافقوں کا قول ان کے عقیدہ کے مطابق نہ تھا۔ اس لیے باوجود ان لوگوں کے شاندار اور تاکیدی الفاظ کے خداوند تعالیٰ نے انہیں جھٹلا دیا اور سورۂ منافقون میں فرمایا: ﴿ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ ﴾ (المنافقون:۱) یعنی اللہ تعالیٰ گواہی دیتا ہے کہ بالیقین منافق جھوٹے ہیں اور یہاں بھی فرمایا: وَمَاهُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ یعنی دراصل وہ ایماندار نہیں۔ وہ ایمان کو ظاہر کر کے اور اپنے کفر کو چھپا کر اپنی جہالت سے اللہ تعالیٰ کو دھوکہ دیتے ہیں اور اسے نفع دینے والی اور خدا کے یہاں چل جانے والی کاریگری خیال کرتے ہیں جیسا کہ بعض مؤمنوں پر ان کا مکر چل جاتا ہے۔ قرآن میں ایک اور جگہ ہے: ﴿ يَوْمَ يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا فَيَحْلِفُوْنَ لَهٗ...... ﴾ (مجادلہ:۱۸) یعنی قیامت والے دن جب کہ اللہ تعالیٰ سب کو کھڑا کرے گا تو جس طرح وہ دنیا میں ایمان والوں کے سامنے قسمیں کھاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے سامنے بھی قسمیں کھائیں گے اور سمجھیں گے کہ وہ بھی کچھ ہیں۔ خبردار یقیناً وہ جھوٹے ہیں۔ یہاں بھی ان کے اس غلط عقیدے کے مقابلہ میں فرمایا کہ دراصل وہ اپنے اس کام کی برائی کو جانتے ہی نہیں۔ یہ دھوکہ تو خود اپنی جانوں کو دے رہے ہیں جیسا کہ اور جگہ ارشاد ہوا: ﴿ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَهُوَ خَادِعُهُمْ ﴾ (النساء:۱۴۲) یعنی منافقین خدا کو دھوکہ دیتے ہیں اور وہ انہیں دے رہا ہے۔ بعض قاریوں نے يَخْدَعُوْنَ پڑھا ہے اور بعض نے يُخٰدِعُوْنَ اور دونوں قراءتوں کے معنی کا مطلب ایک ہو جاتا ہے۔ اگر کوئی کہے کہ اللہ تعالیٰ کو اور ایمان والوں کو منافق کیسے دھوکہ دیں گے؟ وہ جو اپنے دِل کے خلاف ظاہر کرتے ہیں وہ صرف بچاؤ کے لیے ہوتا ہے تو جواباً کہا جائے گا کہ اس طرح کی بات کرنے والے کو بھی جو کسی خوف سے بچنا چاہتا ہے' عربی زبان میں مخادع کہا جاتا ہے۔ چونکہ منافق بھی قتل' قید اور دنیاوی عذابوں سے محفوظ رہنے کے لیے یہ چال چلتے تھے اور باطن کے خلاف ظاہری الفاظ کہتے تھے۔ اس لیے انہیں دھوکہ باز کہا گیا۔ ان کا یہ فعل گو کسی کو دنیا میں کچھ دھوکہ دے بھی لیکن درحقیقت وہ خود اپنے تئیں دھوکہ دے رہے ہیں۔ اس لیے کہ وہ اس میں بھلائی اور کامیابی جانتے ہیں اور دراصل یہ سبب ہوگا ان کی برائی عذاب اور غضب خداوندی کا۔ جس کے سہنے کی اس میں طاقت نہیں۔ پس یہ دھوکہ

حقیقتاً ان پر وہاں ہوگا۔ وہ جس کام کو اچھا جانتے ہیں ان کے حق میں برا اور بہت برا ہوگا۔ ان کے کفر شرک اور تکذیب کی وجہ سے ان کا رب ان پر ناراض ہوگا لیکن افسوس انہی اس کا شعور ہی نہیں اور یہ اپنے غلط خیالات میں ہی مست ہیں۔ ابن جریج اس کی تفسیر میں فرماتے ہیں لا الٰہ الا اللہ کہہ کر وہ اپنی جان و مال کا بچاؤ کرنا چاہتے ہیں۔ یہ کلمہ ان کے دلوں میں جاگزیں نہیں ہوتا۔ حضرت قتادہؒ فرماتے ہیں منافقوں کی یہی حالت ہے کہ زبان پر کچھ دل میں کچھ عمل کچھ عقیدہ کچھ صبح کچھ شام کچھ کشتی (ناؤ) کی طرح کہ ہوا کے جھونکے سے کبھی ادھر ہو جاتی ہے کبھی اُدھر۔

فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ ۙ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ۢ بِمَا كَانُوْا یَكْذِبُوْنَ ⑩

ان کے دلوں میں بڑا مرض ہے' سو اور بھی بڑھا دیا اللہ تعالیٰ نے ان کو مرض اور ان کے لیے سزائے دردناک ہے اس وجہ سے کہ وہ جھوٹ بولا کرتے تھے ○

منافقین کا روگ ☆

بیماری سے مراد یہاں شک وشبہ ہے۔ حضرت ابن عباس' حضرت ابن مسعود اور چند صحابہ (رضی اللہ عنہم) سے یہی مروی ہے۔ حضرت مجاہد' عکرمہ' حسن بصری' ابوالعالیہ' ربیع بن انس' قتادہ کا بھی یہی قول ہے حضرت عکرمہ اور طاؤس نے اس کی تفسیر ریاء سے کی ہے اور ابن عباسؓ سے اس کی تفسیر نفاق بھی مروی ہے۔ زید بن اسلمؒ فرماتے ہیں: یہاں دینی بیماری مراد ہے نہ جسمانی۔ انہیں اسلام میں شک کی بیماری تھی اور ان کی ناپاکی میں خدا نے اور اضافہ کر دیا۔ جیسا کہ قرآن میں ایک اور جگہ ہے: ﴿ فَاَمَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا فَزَادَتْهُمْ اِیْمَانًا وَّهُمْ یَسْتَبْشِرُوْنَ وَاَمَّا الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَتْهُمْ رِجْسًا اِلٰى رِجْسِهِمْ ﴾ (التوبہ:۱۲۵) یعنی ایمان والوں کے ایمان میں زیادتی کرتی ہے اور خوشیاں مناتے ہیں لیکن بیماری والوں کی ناپاکی اور پلیدی کو اور زیادہ کر دیتی ہے یعنی ان کی بدی اور گمراہی بڑھ جاتی ہے بلکہ ان کے عمل سے مشابہ ہے۔ یہ تفسیر اچھی ہے' ٹھیک اسی کے مثل یہ فرمان بھی ہے: ﴿ وَالَّذِیْنَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى وَّاٰتٰىهُمْ تَقْوٰىهُمْ ﴾ (محمد:۱۷) یعنی ہدایت والوں کو ہدایت میں بڑھا دیتا ہے اور ان کو تقویٰ عطا فرماتا ہے۔ ﴿ یَكْذِبُوْنَ ﴾ کو یُكَذِّبُوْنَ بھی قاریوں نے پڑھا ہے۔ یہ دونوں بد خصلتیں ان میں تھیں' جھٹلاتے بھی تھے اور جھوٹے بھی تھے۔ رسول اللہ ﷺ کے باوجود بعض منافقوں کو اچھی طرح جاننے کے پھر بھی قتل نہ کرنے کی وجہ وہ ہے جو بخاری و مسلم کی روایت میں ہے کہ حضور ﷺ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ میں اس بات کو ناپسند کرتا ہوں کہ لوگوں میں یہ چرچے ہوں کہ محمد ﷺ اپنے ساتھیوں کو قتل کر ڈالتے ہیں۔ (بخاری) مطلب یہ ہے کہ جو اعرابی آس پاس ہیں' انہیں یہ تو معلوم نہ ہوگا کہ ان منافقوں کے پوشیدہ کفر کی بناء پر انہیں قتل کیا گیا ہے' ان کی نظریں تو ظاہر داری پر ہوں گی۔ جب ان میں یہ بات مشہور ہو جائے گی کہ حضور ﷺ اپنے ساتھیوں کو قتل کر ڈالتے ہیں تو خوف ہے کہ کہیں وہ اسلام قبول کرنے سے رک نہ جائیں۔

قرطبیؒ فرماتے ہیں ہمارے علماء وغیرہ کا بھی یہی قول ہے ٹھیک اسی طرح آنحضرت ﷺ مؤلفۃ القلوب کو جن کے دل اسلام کی جانب مائل کیے جاتے ہیں' مال عطا فرمایا کرتے تھے باوجودیکہ جانتے تھے کہ ان کے برے عقیدے ہیں۔

حضرت امام مالکؒ بھی منافقوں کو قتل نہ کرنے کی یہی وجہ بیان فرماتے ہیں جیسے محمد بن جہم' قاضی اسمٰعیل اور ابہری نے نقل کیا ہے۔ حضرتؒ سے بقول ابن ماجشون ایک وجہ یہ بھی نقل کی گئی ہے کہ یہ اس لیے تھا کہ آپ ﷺ کی امت کو معلوم ہو جائے کہ حاکم اپنے علم پر فیصلہ نہیں کر سکتا۔ قرطبی فرماتے ہیں گو علماء میں تمام مسائل میں اختلاف ہو لیکن اس مسئلہ میں سب کا اتفاق ہے کہ قاضی صرف اپنی ذاتی معلومات کی بناء پر کسی کو قتل نہیں کر سکتا۔ حضرت امام شافعیؒ نے ایک اور وجہ بھی بیان کی ہے۔ آپؒ فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ کا قتل منافقین سے رک رہنے کا سبب ان کا اپنے ایمان کو اپنی زبان سے ظاہر کرنا تھا۔ گو اس کا علم تھا کہ ان کے دل اس کے خلاف ہیں لیکن ظاہری کلمہ اس پہلی بات کو ہٹا دیتا تھا۔ اس کی تائید میں بخاری و مسلم وغیرہ کی یہ حدیث بھی پیش کی جا سکتی ہے جس میں ہے کہ مجھے حکم کیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے لڑوں' یہاں تک کہ وہ لا الٰہ الاّ اللہ کہیں۔ جب وہ اسے کہہ دیں تو انہوں نے مجھ سے اپنی جانیں اور مال بچا لیا اور ان کا حساب اللہ عزوجل پر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس کلمہ شریف کے کہتے ہی ظاہری احکام اسلام ان پر جاری ہو جائیں گے۔ اب اگر ان کا عقیدہ بھی اسی کے مطابق ہے تو آخرت والے دن نجات کا سبب ہوگا۔ ورنہ وہاں کچھ بھی نفع نہ ہوگا لیکن دنیا میں تو مسلمانوں کے احکام ان پر جاری رہیں گے۔ گو یہ لوگ یہاں مسلمانوں کی صفوں میں اور ان کی فہرست میں نظر آئیں لیکن آخرت میں عین پل صراط پر ان سے دُور کر دیئے جائیں گے اور اندھیروں میں حیران و پریشان ہوتے ہوئے بآوازِ بلند مسلمانوں کو پکار کر کہیں گے کہ کیا ہم تمہارے ساتھ نہ تھے؟ لیکن وہاں سے جواب ملے گا کہ تھے تو سہی مگر تم فتنوں میں پڑ گئے اور انتظار میں ہی رہ گئے اور اپنی من مانی خواہشوں کے پھیر میں پڑ گئے۔ یہاں تک کہ امر خداوندی آ پہنچا۔

غرضِ دارِ آخرت میں مسلمانوں کے پیچھے لگے لپٹے رہیں گے لیکن بالآخر ان سے الگ کر دیئے جائیں گے اور ان کی اُمیدوں پر پانی پھر جائے گا۔ وہ چاہیں گے کہ مسلمانوں کے ساتھ سجدے میں گر پڑیں گے لیکن سجدہ نہیں کر سکیں گے جیسا کہ احادیث میں مفصل بیان آ چکا ہے کہ بعض محققین نے کہا ہے کہ ان کے قتل نہ کیے جانے کی وجہ یہ تھی کہ خدا کے رسول ﷺ کی موجودگی میں اُن کی شرارتیں نہیں چل سکتیں تھیں۔ مسلمانوں کو جناب باری اپنی وحی کے ذریعے ان کی برائیوں سے محفوظ رکھ لیتا تھا لیکن حضور ﷺ کے بعد اگر خدانخواستہ ایسے لوگ ہوں کہ ان کا نفاق کھل جائے اور مسلمان بخوبی معلوم کر لیں تو قتل کر دیئے جائیں گے۔ حضرت امام مالکؒ کا فتویٰ ہے کہ نفاق حضور ﷺ کے زمانہ میں تھا لیکن آج کل تو وہ بے دینی اور زندیقیت ہے۔ یہ بھی یاد رہے کہ زندیق کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے کہ وہ کفر ظاہر کرے تو اس کے قتل سے پہلے اس پر توبہ پیش کی جائے یا نہیں؟ اور وہ زندیق جو لوگوں کو بھی اس کی تعلیم دیتا ہو اور وہ زندیق جو معلم نہ ہو' ان دونوں میں فرق کیا جائے گا یا نہیں؟ اور یہ رجوع کرنا خود اس کی اپنی طرف سے ہو یا اس پر غلبہ پا لینے کے بعد بھی یہی حکم ہے؟ غرض ان سب باتوں میں اختلاف ہے لیکن اس کے بیان کی جگہ احکام کی کتابیں ہیں نہ کہ تفسیریں۔

چودہ شخصوں کے نفاق کا تو آپ کو قطعی علم تھا۔ یہ وہ بدباطن لوگ تھے جنہوں نے غزوۂ تبوک میں مشورہ کر کے یہ اَمر طے کر لیا تھا کہ حضور ﷺ کے ساتھ دغابازی کریں۔ آپ ﷺ کے قتل کی پوری سازش کر چکے تھے کہ رات کے اندھیرے میں جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم فلاں گھاٹی کے قریب پہنچیں تو آپ ﷺ کی اونٹنی کو بدکا دو۔ وہ بھڑک کر بھاگے گی اور حضور ﷺ گھاٹی میں گر پڑیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کی طرف اسی وقت وحی بھیج کر ان کی اس ناپاک غداری کا علم کرا

دیا۔ حضور ﷺ نے حذیفہ رضی اللہ عنہ کو بلا کر اس واقعہ کی خبر دی اور ان غداروں کے نام بھی بتلا دیئے پھر بھی آپ نے ان کے قتل کے احکام صادر نہ فرمائے۔ ان کے سوا اور منافقوں کے نام کا آپ کو علم نہ تھا۔ چنانچہ قرآن کہتا ہے: ﴿ وَمِمَّنْ حَوْلَكُمْ مِّنَ الْاَعْرَابِ مُنٰفِقُوْنَ وَمِنْ اَهْلِ الْمَدِيْنَةِ مَرَدُوْا عَلَى النِّفَاقِ لَا تَعْلَمُهُمْ نَحْنُ نَعْلَمُهُمْ...... ﴾ (التوبہ:۱۱) یعنی تمہارے آس پاس کے اعرابی منافق ہیں اور بعض سرکش منافق مدینہ میں بھی ہیں۔ تم انہیں نہیں جانتے لیکن ہم جانتے ہیں اور جگہ فرمایا: ﴿ لَئِنْ لَّمْ يَنْتَهِ الْمُنٰفِقُوْنَ...... ﴾ (الاحزاب:۶۰) اگر یہ منافق گندے دل والے اور فساد و تکبر والے اپنی شرارتوں سے باز نہ آئے تو ہم بھی انہیں نہ چھوڑیں گے اور مدینہ میں بہت کم باقی رہ سکیں گے بلکہ ان پر لعنت کی جائے گی۔ جہاں پائے جائیں گے پکڑے جائیں گے اور ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے جائیں گے۔ ان آیتوں سے معلوم ہوا کہ حضور ﷺ کو ان منافقوں کا علم نہ تھا کہ کون کون ہیں؟ ہاں ان کی مذموم خصلتیں جو بیان ہوئی تھیں یا جس میں پائی جاتی تھیں اس پر نفاق صادق آتا تھا، جیسے اور جگہ ارشاد فرمایا: ﴿ وَلَوْ نَشَآءُ لَاَرَيْنٰكَهُمْ...... ﴾ (محمد:۳۰) یعنی اگر ہم چاہیں تو ہم تمہیں ان کو دکھا دیں لیکن تم ان کی نشانیوں اور ان کی دبی بھینچی زبان سے ہی ان کو پہچان لو گے۔ ان منافقوں میں سب سے زیادہ مشہور عبداللہ بن ابی سلول تھا۔ حضرت زید بن ارقمؓ نے اس کی منافقانہ خصلتوں پر حضور ﷺ کے سامنے گواہی بھی دی تھی۔ باوجود اس کے جب یہ مرتا ہے تو آپ ﷺ اس کے جنازے کی نماز پڑھاتے ہیں اور اس کے دفن میں شرکت کرتے ہیں۔ ٹھیک اسی طرح اور مسلمان صحابیوں کے ساتھ بلکہ حضرت عمر بن خطابؓ نے جب حضور ﷺ کو ذرا زور سے یاد دلایا تو آپ ﷺ نے فرمایا: میں نہیں چاہتا کہ لوگ چہ میگوئیاں کریں کہ محمد ﷺ اپنے صحابیوں کو مار ڈالا کرتے ہیں۔ (بخاری) اور صحیح روایت میں ہے کہ مجھے اختیار دیا گیا استغفار کرنے نہ کرنے کا تو میں نے کرنے کو پسند کیا۔ ایک اور روایت میں ہے کہ اگر ستر مرتبہ سے زیادہ استغفار کرنے میں بھی اس کی بخشش جانتا تو یقیناً زیادہ کرتا۔ (بخاری)

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوْا فِى الْاَرْضِ قَالُوْٓا اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ ⑪

اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ وَلٰكِنْ لَّا يَشْعُرُوْنَ ⑫

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ فساد مت کرو زمین میں تو کہتے ہیں ہم تو اصل نقل کرنے والے ہیں۔ یاد رکھو بے شک یہی لوگ مفسد ہیں لیکن وہ اس کا شعور نہیں رکھتے ○

زمین پر فساد بپا کرنے والے ☆

حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہم اور نبی ﷺ کے بعض اور صحابہؓ سے مروی ہے کہ اس آیت میں بھی منافقوں کا ذکر ہے اور ان کے فساد فی الارض کفر و معصیت پر انہیں تنبیہ کی گئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ زمین میں خداوند تعالیٰ کی نافرمانی کرنا یا نافرمانی کرنے کا حکم دینا زمین میں فساد کرنا ہے اور زمین و آسمان کی اصلاح اطاعت خداوندی میں ہے۔ حضرت مجاہد فرماتے ہیں کہ انہیں جب خداوند تعالیٰ کی نافرمانی سے روکا جاتا ہے تو کہتے ہیں کہ ہم تو ہدایت و اصلاح پر ہیں۔

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں اس خصلت کے لوگ اب تک نہیں آئے۔ مطلب یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں یہ بدخصلت لوگ تھے تو سہی لیکن اب جو آئیں گے وہ ان سے بھی بدتر ہوں گے۔ یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ وہ یہ کہتے ہیں کہ اس وصف کا کوئی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں تھا ہی نہیں۔ امام ابن جریرؒ فرماتے ہیں کہ ان منافقوں کو فساد برپا کرنا یہ تھا کہ خداوند تعالیٰ کی نافرمانیاں کرتے تھے۔ جس کام سے اللہ تعالیٰ منع فرماتا تھا اسے کرتے تھے' فرائض خداوندی ضائع کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ کے سچے دین میں شک وشبہ کرتے۔ اس کی حقیقت اور صداقت پر یقین کامل نہیں رکھتے تھے' مؤمنوں کے سامنے آتے تو اپنا ایمان جتاتے' حالانکہ دِل اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں شک اور وسوسہ سے بھرا پڑا تھا۔ موقعہ ملتا تو دشمنانِ خدا کی امداد و اعانت کرتے تھے اور اللہ کے نیک بندوں کے مقابلہ میں ان کی پاسداری کرتے تھے اور باوجود اس مکاری اور مفسدانہ چال کے اپنے تئیں مصلح اور صلح کُل کے حامی جانتے تھے۔ (طبری)

قرآنِ کریم نے کفار سے موالات اور دوستی رکھنے کو بھی زمین میں فساد سے تعبیر کیا ہے اور ارشاد ہوتا ہے: ﴿ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بَعْضُهُمْ اَوْلِيَاءُ بَعْضٍ اِلَّا تَفْعَلُوْهُ تَكُنْ فِتْنَةٌ فِي الْاَرْضِ وَ فَسَادٌ كَبِيْرٌ ﴾ (الانفال ۷۳) یعنی کفار آپس میں ایک دوسرے کے دوست ہیں' اگر تم نے ایسا نہ کیا یعنی ان کفار سے دوستی کی تو زمین میں بھاری فتنہ اور بڑا فساد پھیل جائے گا۔ اس آیت نے مسلمان اور کفار کے دوستانہ تعلقات منقطع کر دیئے اور جگہ فرمایا: اے ایمان والو! مؤمنوں کو چھوڑ کر کافروں کو دوست نہ بناؤ۔ کیا تم چاہتے ہو کہ خداوند تعالیٰ کا تم پر کھلا غلبہ ہو جائے یعنی تمہاری دلیل نجات کٹ جائے۔ پھر فرمایا: منافق لوگ جہنم کے نچلے طبقہ میں ہوں گے اور ہرگز تم ان کے لیے کوئی مددگار نہ پاؤ گے چونکہ منافقوں کا ظاہر اچھا ہوتا ہے اس لیے مسلمانوں پر حقیقت پوشیدہ رہ جاتی ہے وہ ایمانداروں کو اپنی چکنی چپڑی باتوں سے دھوکہ دے دیتے ہیں اور ان کے بے حقیقت دعوؤں اور کفار کے ساتھ ان کی پوشیدہ دوستیوں سے مسلمانوں کو خطرناک مصائب جھیلنے پڑتے ہیں۔ پس بانیٔ فساد یہ منافقین ہوئے۔ اگر یہ اپنے کفر پر ہی رہتے تو ان کی خوفناک سازشوں اور گہری چالوں کا مسلمانوں کو اتنا نقصان ہرگز نہ پہنچتا اور اگر پورے مسلمان ہو جاتے اور ظاہر و باطن یکساں کر لیتے تب تو دنیا کے امن و امان کے ساتھ آخرت کی نجات و فلاح بھی پا لیتے۔ باوجود اس خطرناک پالیسی کے جب انہیں یکسوئی کی نصیحت کی جاتی تو جھٹ بول پڑتے کہ ہم تو صلح کُل ہیں۔ ہم کسی سے بگاڑنا نہیں چاہتے۔ ہم فریقین کے ساتھ اتفاق رکھتے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ وہ کہتے تھے کہ ہم دونوں جماعتوں یعنی مؤمنوں اور اہل کتاب کے درمیان صلح کرانے والے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ نری ان کی جہالت ہے جسے یہ صلح جانتے ہیں۔ وہ عین فساد ہے لیکن انہیں شعور ہی نہیں۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا كَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ قَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ كَمَآ اٰمَنَ السُّفَهَاۗءُ ۭ اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَاۗءُ وَلٰكِنْ لَّا يَعْلَمُوْنَ ﴿١٣﴾

اور جب اُن سے کہا جاتا ہے کہ تم بھی ایسا ہی ایمان لے آؤ جیسا ایمان لائے ہیں اور لوگ تو کہتے ہیں کہ کیا ہم ایمان لائیں گے جیسا ایمان لے آئے یہ بیوقوف یاد رکھو بے شک یہی ہیں بیوقوف لیکن وہ اس کا علم نہیں رکھتے ○

منافقین کی بدزبانی ☆

مطلب یہ ہے کہ جب ان منافقوں کو صحابہ کی طرح اللہ تعالیٰ پر اور اس کے فرشتوں، کتابوں اور رسولوں پر ایمان لانے کو موت کے بعد جی اٹھنے کو اور جنت اور دوزخ کی حقانیت کے تعلیم کرنے کو اللہ اور رسول ﷺ کی تابعداری کر کے نیک اعمال بجالانے اور برائیوں سے رکے رہنے کو کہا جاتا ہے تو یہ ملعون فرقہ ایسے ایمان کو بیوقوفوں کا ایمان بتاتا ہے۔ ابن مسعودؓ اور بعض دیگر صحابہؓ اور ربیع بن انس، عبدالرحمٰن بن زید بن اسلمؒ وغیرہ نے یہی تفسیر بیان کی ہے۔ سُفَهَآءُ سَفِيهٌ کی جمع ہے۔ جیسے حکماء حکیم کی جمع اور علماء علیم کی۔ جاہل، کم عقل اور نفع نقصان کے پوری طرح نہ جاننے والے کو سفیہ کہتے ہیں۔ قرآن میں اور جگہ ہے: ﴿وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَآءَ ...... ﴾ (النساء: ۵) بیوقوفوں کو اپنے وہ مال نہ دے بیٹھو جو تمہارے قیام کا سبب ہیں۔ عام مفسرین کا قول ہے کہ اس آیت میں سُفَهَآءَ سے مراد عورتیں اور بچے ہیں۔ ان منافقین کے جواب میں یہاں بھی خود پروردگار عالم نے جواب دیا اور تاکید اً حصر کے ساتھ فرمایا: بیوقوف تو یہ ہیں لیکن ساتھ ہی جاہل بھی ایسے ہیں کہ اپنی بیوقوفی کا احساس بھی نہیں رکھتے نہ اپنی جہالت وضلالت کو سمجھ سکتے ہیں۔ اس سے زیادہ ان کی برائی اور ہدایت سے دُوری اور کیا ہوگی؟

وَإِذَا لَقُوا الَّذِينَ آمَنُوا قَالُوا آمَنَّا ۚ وَإِذَا خَلَوْا إِلَىٰ شَيَاطِينِهِمْ قَالُوا إِنَّا مَعَكُمْ إِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِئُونَ ﴿۱۴﴾ اللَّهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ وَيَمُدُّهُمْ فِي طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُونَ ﴿۱۵﴾

اور جب ملتے ہیں وہ منافقین ان لوگوں سے جو ایمان لائے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں اور جب خلوت میں پہنچتے ہیں اپنے شریر سرداروں کے پاس تو کہتے ہیں ہم بے شک تمہارے ساتھ ہیں ہم تو صرف استہزاء کیا کرتے ہیں اللہ تعالیٰ ہی استہزاء کر رہے ہیں ان کے ساتھ اور ڈھیل دیتے چلے جاتے ہیں اُن کو کہ وہ اپنی سرکشی میں حیران وسرگرداں ہو رہے ہیں ○

منافقین کی خفیہ مجلسیں ☆

مطلب یہ ہے کہ یہ بدباطن مسلمانوں کے پاس آ کر اپنا ایمان اور دوستی اور خیر خواہی ظاہر کر کے انہیں دھوکے میں ڈالنا چاہتے ہیں تاکہ مال وجان کا بچاؤ بھی ہو جائے اور بھلائی اور غنیمت کے مال میں حصہ بھی قائم ہو جائے اور جب اپنے والوں میں ہوتے ہیں تو اُنکی سی کہنے لگتے ہیں۔ خَلَوْا کے معنی یہاں ہیں اِنْصَرَفُوْا اور ذَهَبُوْا اور خَلَعُوْا اور مَضَوْا کے یعنی لوٹتے ہیں اور پہنچتے ہیں اور تنہائی میں ہوتے ہیں اور جاتے ہیں۔ پس خَلَوْا جو کہ اِلٰی کے ساتھ متعدی ہے یہ معنی لوٹ جانے کے ہے۔ فعل مضمر اور ملفوظ دونوں پر یہ دلالت کرتا ہے۔ بعض کہتے ہیں اِلٰی معنی میں مع کے ہے۔ مگر اوّل ہی ٹھیک ہے اور ابن جریر کے کلام کا خلاصہ بھی یہی ہے۔ شیاطین سے مراد رؤسا بڑے اور سرداز ہیں۔ جیسے یہودی علماء اور سرداران کفار قریش ومنافقین۔

حضرت ابن عباسؓ ابن مسعود اور دیگر صحابہ (رضی اللہ عنہم) کا قول ہے کہ یہ شیاطین ان کے امراء اور سرداران کفر تھے اور ان کے ہم عقیدہ لوگ بھی۔ یہ شیاطین یہود بھی انہیں پیغمبری کے جھٹلانے اور قرآن کی تکذیب کرنے کا مشورہ دیا کرتے تھے۔ مجاہد کہتے ہیں شیاطین سے مراد ان کے وہ ساتھی ہیں جو یا مشرک تھے یا منافق۔ قتادہ فرماتے ہیں مراد اس سے وہ لوگ ہیں جو برائیوں اور شرک میں ان کے سردار تھے۔ ابوالعالیہ سدی ربیع بن انس بھی یہی تفسیر کرتے ہیں۔ امام ابن جریرؒ فرماتے ہیں ہر بہکانے اور سرکشی کرنے والے کو شیطان کہتے ہیں۔ جنوں میں سے ہوں یا انسانوں میں سے۔ قرآن میں بھی: ﴿شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ﴾ (الانعام: ۱۱۲) آیا ہے۔

حدیث شریف میں ہے کہ ہم جنوں اور انسانوں کے شیطان سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگتے ہیں۔ ابوذر رضی اللہ عنہ نے پوچھا: یارسول اللہ ﷺ! کیا انسان کے شیطان بھی ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں۔ (احمد) جب یہ منافق مسلمانوں سے ملتے تو کہتے ہم تمہارے ساتھ ہیں یعنی جیسے تم ہو ویسے ہی ہم ہیں ہم تو ان کا مذاق اڑاتے ہیں۔ حضرت ابن عباسؓ ربیع بن انس رضی اللہ عنہم اور قتادہؒ کی یہی تفسیر ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کو جواب دیتے ہوئے ان کے اس مکروہ فعل کے مقابلہ میں فرماتا ہے کہ اللہ تعالیٰ بھی ان سے مذاق کرے گا اور انہیں ان کی سرکشی میں بہکنے دے گا۔ جیسے اور جگہ ہے کہ قیامت کے روز منافق مرد و عورت ایمان والوں سے کہیں گے۔ ذرا ٹھہر جاؤ۔ ہم بھی تمہارے نور سے فائدہ اٹھائیں۔ کہا جائے گا: اپنے پیچھے لوٹ جاؤ اور نور کی تلاش کرو۔ ان کے لوٹتے ہی درمیان میں ایک دیوار حائل کر دی جائے گی جس میں دروازہ ہوگا۔ اس طرف تو رحمت ہوگی۔ اس طرف عذاب ہوگا اور جگہ فرمانِ الٰہی ہے: کافر ہماری ڈھیل کو اپنے حق میں بہتر نہ جانیں۔ اس تاخیر میں وہ اپنی بدکرداریوں میں اور بڑھ جاتے ہیں۔ پس قرآن میں جہاں استہزاء تحریت یعنی مذاق مکر خدیعت یعنی دھوکہ کے الفاظ آئے ہیں وہاں یہی مراد ہے۔

ایک اور جماعت کہتی ہے کہ یہ الفاظ صرف ڈانٹ ڈپٹ اور تنبیہ کے طور پر استعمال کیے گئے ہیں ان کی بدکرداریوں اور ان کے کفر و شرک پر انہیں ملامت کی گئی ہے اور مفسرین کہتے ہیں یہ الفاظ صرف جواب میں لائے گئے ہیں جیسے کوئی بھلا آدمی کسی مکار کے فریب سے بچ کر اس سے غالب آ کر کہتا ہے کہو میں نے کیسا فریب دیا حالانکہ اس کی طرف سے فریب نہیں ہوتا۔ اسی طرح یہ فرمانِ الٰہی ہے کہ: ﴿وَمَكَرُوْا وَمَكَرَ اللّٰهُ......﴾ (آل عمران: ۵۴) اور ﴿اَللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ﴾ ورنہ خدا کی ذات مکر اور مذاق سے پاک ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ان کا فن فریب انہی کو برباد کرتا ہے۔ ان الفاظ کا یہ بھی مطلب بیان کیا گیا ہے کہ اللہ ان کی ہنسی دھوکہ تمسخر اور مذاق کا ان کو بدلہ دے گا تو بدلہ میں وہی الفاظ استعمال کیے گئے۔ معنی دونوں لفظوں کے دونوں جگہ جدا جدا ہیں۔ دیکھئے قرآنِ کریم میں ہے: ﴿جَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا﴾ (الشوریٰ: ۴۰) یعنی برائی کا بدلہ ویسی ہی برائی ہے۔

﴿فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ﴾ (البقرہ: ۱۹۴) جو تم پر زیادتی کرے تم بھی اس پر زیادتی کرو تو ظاہر ہے کہ برائی کا بدلہ لینا حقیقتاً برائی نہیں۔ زیادتی کے مقابلہ میں بدلہ لینا زیادتی نہیں لیکن لفظ دونوں جگہ ایک ہی ہے۔ اسی طرح جہاں جہاں کلام اللہ میں ایسی عبارتیں ہیں وہاں بھی یہ مطلب ہے۔ ایک اور مطلب بھی سنئے دنیا میں یہ منافق اپنی اس پلید پالیسی سے مسلمانوں کے ساتھ مذاق کرتے تھے۔ اللہ نے ان کے ساتھ یہی کیا کہ دنیا میں انہیں امن و امان مل گیا۔ اب یہ

مست بن گئے حالانکہ یہ عارضی امن ہے۔ قیامت والے دن انہیں کوئی اُمن نہیں۔ یہاں گو ان کے مال اور ان کی جانیں بچ گئیں لیکن اللہ کے یہاں دردناک عذاب کا شکار ہوں گے۔ امام جریر نے اس قول کو ترجیح دی ہے اور اس کی بہت کچھ تائید کی ہے۔ اس لیے کہ مکر' دھوکہ اور مذاق جو بلا وجہ ہو اُس سے تو خدا کی ذات پاک ہے۔ ہاں! انتقام اور بدلہ کے طور پر یہ الفاظ اللہ کی نسبت کہنے میں کوئی حرج نہیں۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بھی یہی فرماتے ہیں کہ یہ ان سے بدلہ ہے اور ان کی سزا ہے۔ یَمُدُّھُمْ کا مطلب ڈھیل دینا اور بڑھانا بیان کیا گیا ہے۔ جیسا کہ فرمایا: ﴿ اَیَحْسَبُوْنَ اَنَّمَا نُمِدُّھُمْ بِهٖ...... ﴾ (المؤمنون ۵۵) یعنی کیا یہ یوں سمجھ بیٹھے ہیں کہ ان کے مال اولاد کی زیادتی ان کے لیے کوئی بھلی چیز ہے۔ نہیں' نہیں' انہیں شعور ہی نہیں ہے اور فرمایا: ﴿ سَنَسْتَدْرِجُھُمْ مِّنْ حَیْثُ لَا یَعْلَمُوْنَ ﴾ (القلم:۴۴) اس طرح انہیں ڈھیل دے کر پکڑیں گے کہ انہیں پتہ بھی نہ چلے۔ تو مطلب یہ ہوا کہ اِدھر یہ گناہ کرتے ہیں اُدھر دنیوی نعمتیں زیادہ ہوتی ہیں۔ یہ خوش ہو جاتے ہیں حالانکہ دراصل وہ عذاب ہی ہے۔ قرآنِ پاک نے اور جگہ فرمایا: ﴿ فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ فَتَحْنَا عَلَیْھِمْ اَبْوَابَ كُلِّ شَیْءٍ حَتّٰۤی اِذَا فَرِحُوْا بِمَاۤ اُوْتُوْۤا اَخَذْنٰھُمْ بَغْتَةً فَاِذَا ھُمْ مُّبْلِسُوْنَ فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴾ (الانعام:۴۴) یعنی جب اُن لوگوں نے نصیحت بھلا دی' ہم نے ان پر تمام چیزوں کے دروازے کھول دیئے۔ یہاں تک کہ وہ اپنی چیزوں پر نازاں ہو گئے تو ہم نے انہیں اچانک پکڑ لیا۔ اب گھبرا گئے۔ ظالموں کی بربادی ہوئی اور کہہ دیا گیا کہ تعریفیں رب العالمین کے لیے ہیں۔ ابن جریرؒ فرماتے ہیں کہ انہیں ڈھیل دینے اور انہیں اپنی سرکشی اور بغاوت میں بڑھنے کے لیے یہ زیادتی دی جاتی ہے جیسے اور جگہ فرمایا: ﴿ وَنُقَلِّبُ اَفْئِدَتَھُمْ...... ﴾ (الانعام:۱۱۰) طغیان کہتے ہیں کسی چیز میں گھس جانے کو۔ جیسے فرمایا: ﴿ لَمَّا طَغَا الْمَآءُ ﴾ (الحاقہ:۱۱) ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں' وہ اپنے کفر میں گرے جاتے ہیں۔ عمہ کہتے ہیں گمراہی کو تو اس جملہ کا مطلب یہ ہوا کہ ضلالت وکفر میں ڈوب گئے اور اس ناپاکی نے انہیں گھیر لیا۔ اب یہ اسی دلدل میں اترے جاتے ہیں اور اسی ناپاکی میں پھنسے جاتے ہیں اور چھٹکارے کی تمام راہیں ان پر بند ہو گئی ہیں۔ بھلا ایسے دلدل میں ہو اور پھر اندھا' بہرا اور بیوقوف ہو' وہ کیسے نجات پا سکتا ہے۔ آنکھوں کے اندھے پن کے لیے عربی میں عَمٰی کا لفظ آتا ہے اور دِل کے اندھے پن کے لیے عَمَهٌ کا لیکن کبھی دِل کے اندھے پن کے لیے بھی عمہ کا لفظ آتا ہے۔ جیسے قرآن میں آتا ہے: ﴿ وَلٰكِنْ تَعْمَی الْقُلُوْبُ الَّتِیْ فِی الصُّدُوْرِ ﴾ (حج:۴۶)

اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْھُدٰی فَمَا رَبِحَتْ تِّجَارَتُھُمْ وَمَا كَانُوْا مُھْتَدِیْنَ ﴿۱۶﴾

• یہ وہ لوگ ہیں کہ انہوں نے گمراہی لے لی بجائے ہدایت کے تو سود مند نہ ہوئی ان کی یہ تجارت اور نہ یہ ٹھیک طریقہ پر چلے ○

منافقین کی تجارت خسارے کا سودا ہے ☆

حضرت ابن عباس' ابن مسعود اور بعض دیگر صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین سے مروی ہے کہ انہوں نے ہدایت چھوڑ دی اور گمراہی لے لی۔ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں' انہوں نے ایمان کے بدلہ کفر قبول کیا۔ مجاہدؒ فرماتے ہیں ایمان لائے پھر

کافر ہو گئے۔ قتادہ فرماتے ہیں ہدایت پر گمراہی کو یہ پسند کرتے ہیں جیسے اور جگہ قوم ثمود کے بارے میں ہے: ﴿وَاَمَّا ثَمُوْدُ فَهَدَيْنٰهُمْ فَاسْتَحَبُّوا الْعَمٰى عَلَى الْهُدٰى﴾ (حم السجدة: ١٧) یعنی باوجودیکہ ہم نے قوم ثمود کو راہ دکھا دی' مگر پھر بھی انہوں نے اس راہنمائی کے بجائے بے راہی کو پسند کیا۔ مطلب یہ ہوا کہ منافقین ہدایت سے ہٹ کر گمراہی پر آ گئے اور ہدایت کے بدلے گمراہی لے لی۔ گویا ہدایت کو بیچ کر گمراہی لی۔ اب ایمان لا کر پھر کافر ہوئے ہوں' خواہ سرے سے ایمان ہی نصیب نہ ہوا ہو اور ان منافقین میں دونوں قسم کے لوگ تھے۔ چنانچہ قرآن میں ہے: ﴿ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا فَطُبِعَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ ...﴾ (المنافقون: ٣) یہ اس لیے ہے کہ یہ لوگ ایمان لا کر پھر کافر ہو گئے۔ پس ان کے دلوں پر مہر کر دی گئی اور ایسے بھی منافق تھے' جنہیں ایمان نصیب ہی نہ ہوا۔ پس نہ انہیں سودے میں فائدہ ہوا نہ راہ ملی بلکہ ہدایت کے چمنستان سے نکل کر گمراہی کے خارزار میں اور جماعت کے مضبوط قلعہ سے نکل کر انتشار اور افراتفری میں پڑ گئے۔ امن کے وسیع میدان سے نکل کر خوف کی اندھیری کوٹھڑی میں اور سنت کے پاکیزہ گلشن سے نکل کر بدعت کے پژمردہ جنگل میں آ گئے۔

مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًا ۚ فَلَمَّآ اَضَآءَتْ مَا حَوْلَهٗ ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوْرِهِمْ وَتَرَكَهُمْ فِيْ ظُلُمٰتٍ لَّا يُبْصِرُوْنَ ﴿١٧﴾ صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ ﴿١٨﴾

ان کی حالت اُس شخص کی حالت کے مشابہ ہے جس نے کہیں آگ جلائی ہو پھر جب روشن کر دیا ہو اس آگ نے اس شخص کے گرداگرد کی سب چیزوں کو ایسی حالت میں سلب کر لیا اللہ تعالیٰ نے ان کی روشنی کو اور چھوڑ دیا ان کو اندھیروں میں کہ کچھ دیکھتے بھالتے نہ ہوں۔ بہرے ہیں' گونگے ہیں' اندھے ہیں۔ سو یہ اب رجوع نہ ہوں گے ○

بہرے' گونگے اور اندھے کون ہیں؟

مثال کو عربی میں مثل بھی کہتے ہیں۔ اس کی جمع اِمثال آتی ہے۔ جیسے قرآن میں ہے: ﴿وَتِلْكَ الْاَمْثَالُ ......﴾ (العنکبوت: ٤٣) یعنی یہ مثالیں ہم لوگوں کے لیے بیان کرتے ہیں' جنہیں صرف عالم ہی سمجھتے ہیں۔ آیت شریف کا مطلب یہ ہے کہ منافق جو گمراہی کو ہدایت کے بدلے اور اندھے پن کو بینائی کے بدلے مول لیتے ہیں' ان کی مثال اس شخص جیسی ہے جو اندھیرے میں آگ جلائے۔ اس سے دائیں بائیں کی چیزیں اسے نظر آنے لگیں۔ پریشانی دور ہو اور فائدے کی اُمید بندھے کہ دفعۃً آگ بجھ جائے اور سخت اندھیرا چھا جائے۔ نہ تو نگاہ کام کرے نہ راستہ معلوم ہو سکے اور باوجود اس کے وہ شخص خود بہرا ہو۔ کسی کی بات کو نہ سن سکتا ہو۔ گونگا ہو کسی سے دریافت نہ کر سکتا ہو۔ اندھا ہو جو روشنی سے کام نہ چلا سکتا ہے۔ اب بھلا یہ راہ کیسے پا سکے گا؟ ٹھیک اسی طرح یہ منافق بھی ہیں کہ ہدایت کو چھوڑ کر یہ راہ گم کر بیٹھے اور بھلائی کو چھوڑ کر برائی کو چاہنے لگے۔ اس مثال سے پتہ چلتا ہے کہ ان لوگوں نے ایمان قبول کر کے کفر کیا تھا۔ جیسے قرآن کریم میں کئی جگہ یہ صراحت موجود ہے' واللہ اعلم۔ امام رازی نے اپنی تفسیر میں سدی سے یہی نقل کیا ہے پھر کہا ہے کہ یہ تشبیہ ظاہر ہے کہ بہت ہی درست اور صحیح ہے۔ اس لیے کہ اوّلاً تو ان منافقوں کو نورِ ایمان حاصل ہوا۔ پھر ان کے نفاق کی وجہ سے وہ بجھ

گیا اور یہ حیرت میں پڑ گئے اور دین کی حیرت سے بڑی حیرت اور کیا ہو گی؟

امام ابن جریر فرماتے ہیں کہ جن کی یہ مثال بیان کی گئی ہے انہیں کسی وقت بھی ایمان نصیب ہی نہ ہوا تھا کیونکہ پہلے فرمانِ خداوند کریم گزر چکا ہے کہ: ﴿وَمَاهُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ﴾ (البقرۃ: ۸) یعنی گو یہ زبان سے اللہ تعالیٰ پر اور قیامت پر ایمان لانے کی کہتے ہیں مگر حقیقتاً یہ ایماندار نہیں۔ لیکن ٹھیک بات یہ ہے کہ اس آیۂ مبارکہ میں ان کے کفر و نفاق کے وقت کی خبر دی گئی ہے۔ اس سے اس کا انکار نہیں ہوتا کہ اس حالت کفر و نفاق سے پہلے کبھی انہیں ایمان حاصل ہی نہیں ہوا۔ ممکن ہے ایمان لائے ہوں' پھر اس سے ہٹ گئے اور اب دِلوں پر مہریں لگ گئی ہوں۔ دیکھئے اور جگہ قرآن میں ہے: ﴿ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا......﴾ (المنافقون: ۳) یہ اس لیے ہے کہ انہوں نے ایمان کے بعد کفر کیا۔ پھر ان کے دِلوں پر مہر لگ گئی۔ اب وہ کچھ نہیں سمجھتے۔ یہی وجہ ہے کہ اس مثال میں روشنی اور اندھیرے کا ذکر ہے۔ یعنی کلمہ ایمان کے ظاہر کرنے کی وجہ سے دُنیا میں کچھ نور ہو گیا لیکن کفر کے چھپانے کی وجہ سے پھر آخرت کے اندھیروں نے گھیر لیا۔

ایک جماعت کی مثال شخص واحد سے اکثر آیا کرتی ہے۔ قرآنِ پاک میں ایک اور جگہ ارشاد ہے: ﴿رَاَيْتَهُمْ يَنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ تَدُوْرُ اَعْيُنُهُمْ......﴾ (الاحزاب: ۱۹) تو دیکھے گا کہ وہ تیری طرف آنکھیں پھیر پھیر کر اس طرح دیکھتے ہیں' جس طرح وہ شخص جو سکراتِ موت میں ہو اور اس آیت کو بھی دیکھئے: ﴿مَا خَلْقُكُمْ وَلَا بَعْثُكُمْ اِلَّا كَنَفْسٍ وَّاحِدَةٍ﴾ (لقمان: ۲۸) تم سب کا پیدا کرنا اور مار ڈالنے کے بعد پھر زندہ کر دینا ایسا ہی ہے جیسے ایک جان کا' تیسری جگہ پر توراۃ کو سیکھ کر عمل عقیدہ اس کے مطابق نہ رکھنے والوں کی مثال میں کہا گیا ہے: ﴿كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا﴾ (الجمعۃ: ۵) گدھے کی مانند ہیں جو کتابیں لادے ہوئے ہو۔ ان سب آیتوں میں جماعت کی مثال تو ایک سی دی گئی ہے۔ اسی طرح مذکورہ بالا آیت میں منافقوں کی جماعت کی مثال ایک شخص سے دی گئی ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ تقدیر کلام یوں ہے: مَثَلُ قِصَّتِهِمْ كَمَثَلِ قِصَّةِ الَّذِيْنَ اسْتَوْقَدُوْا نَارًا۔ یعنی ان کے واقعہ کی مثال ان لوگوں کے واقعہ کی طرح ہے جو آگ روشن کریں۔ بعض کہتے ہیں کہ آگ جلانے والا تو ایک ہے لیکن جلاتا ہے ایک جماعت کیلئے جو اس کے ساتھ ہے اور لوگ کہتے ہیں: الَّذِيْ یہاں معنی میں الَّذِيْنَ کے ہے جیسا کہ شاعروں میں اشعار میں بھی آتا ہے۔ میں کہتا ہوں خود مثال میں بھی واحد کے صیغہ کے بعد ہی جمع کے صیغے ہیں۔ بِنُوْرِهِمْ اور تَرَكَهُمْ اور لَا يَرْجِعُوْنَ۔ اس طرح کلام میں اعلیٰ فصاحت اور بہترین خوبی آ گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان سے روشنی لے گیا۔ اس سے مطلب یہ ہے کہ جو نور نفع دینے والا تھا وہ ان سے ہٹا لیا اور جس طرح آگ کے بجھ جانے کے بعد تپش اور اندھیرا اور دھواں رہ جاتا ہے اسی طرح ان کے پاس نقصان پہنچانے والی چیز یعنی شک' کفر و نفاق رہ گیا ہے' نہ تو راہِ راست کو خود دیکھ سکیں' نہ دوسرے کی بھلی بات سن سکیں' نہ کسی سے بھلائی کا سوال کر سکیں۔ اب پھر لوٹ کر ہدایت پر آنا محال ہو گیا۔ اس کی تائید میں مفسرین کے اقوال سنئے:

حضرت ابن عباس' ابن مسعود اور بعض صحابہ رضوان اللہ علیہم فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ کے مدینہ تشریف لانے کے بعد کچھ لوگ اسلام میں آئے مگر پھر منافق بن گئے۔ ان کی مثال اس شخص جیسی ہے جو اندھیرے میں ہو' پھر آگ جلا کر روشنی حاصل کرے اور آس پاس کی بھلائی دیکھنے لگے اور معلوم کرے کہ کس راہ میں کیا ہے کہ اچانک آگ بجھ جائے' روشنی جاتی رہے۔ اب معلوم نہیں ہو سکتا کہ کس راہ میں کیا کیا ہے؟ اسی طرح منافق شرک و کفر کی ظلمت میں تھے۔ پھر اسلام لا کر بھلائی'

برائی یعنی حلال وحرام وغیرہ دیکھنے لگے مگر پھر کافر ہو گئے اور حلال وحرام خیر وشر میں کچھ تمیز نہ رہی۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں نور سے مراد ایمان اور ظلمت سے مراد ضلالت وکفر ہے۔ یہ لوگ ہدایت پر تھے لیکن پھر سرکشی کر کے بہک گئے۔ حضرت مجاہد فرماتے ہیں ایمانداری اور ہدایت کی طرح رخ کرنے کو مثال میں آس پاس کی چیز کے روشن کرنے سے تعبیر کیا گیا۔ حضرت عطاء خراسانی کا قول ہے کہ منافق کبھی کبھی بھلائی کو دیکھ لیتا ہے اور پہچان بھی لیتا ہے لیکن پھر اس کے دِل کا اندھاپن اس پر غالب آ جاتا ہے۔ عکرمہ' عبدالرحمٰن' حسن' سدی اور ربیع سے بھی یہی منقول ہے۔ عبدالرحمٰن بن زید بن اسلمؒ فرماتے ہیں منافقین کی یہی حالت ہے کہ ایمان لاتے ہیں اور اس کی پاکیزہ روشنی سے ان کے دِل جگمگا اُٹھتے ہیں' جس طرح آگ کے جلانے سے آس پاس کی چیزیں روشن ہو جاتی ہیں لیکن کفر کی وجہ سے وہ روشنی ختم ہو جاتی ہے۔ جس طرح آگ کے بجھ جانے سے اندھیرا چھا جاتا ہے۔ یہ سب اقوال تو ہماری اس تفسیر کی تائید میں تھے کہ جن منافقوں کی یہ مثال بیان کی گئی ہے وہ ایمان لا چکے تھے پھر کفر کیا۔ اب امام ابن جریر کی تائید میں جو تفسیر ہے اُسے ملاحظہ کیجئے:

ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ یہ مثال منافقوں کی ہے کہ وہ اسلام کی وجہ سے عزت پا لیتے ہیں' مسلمانوں میں نکاح' ورثہ اور تقسیم مال غنیمت ہونے لگتا ہے۔ لیکن مرتے ہی یہ عزت کھوئی جاتی ہے۔ جس طرح ظاہر ہے کہ آگ کی روشنی آگ بجھتے ہی جاتی رہتی ہے۔ ابوالعالیہ فرماتے ہیں جب منافق لا الٰہ الا اللہ پڑھتا ہے' دِل میں نور پیدا ہوتا ہے۔ پھر جہاں شک کیا وہ نور گیا۔ جس طرح لکڑیاں جب تک جلتی ہیں' روشنی رہی۔ جہاں بجھیں روشنی ختم ہوئی۔

ضحاک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں نور سے مراد ایمان ہے جو ان کی زبان پر تھا۔ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں لا الٰہ الا اللہ ان کے لیے روشنی کر دیتا تھا۔ امن وامان اور کھانا پینا' بیوی' بچے سب مل جاتے تھے لیکن شک ونفاق مرتے ہی راحتیں چھین لیتا ہے جس طرح آگ کا بجھ جانا روشنی دُور کر دیتا ہے۔ حضرت قتادہ کا قول ہے کہ لا الٰہ الا اللہ کہنے سے منافق کو دنیوی فائدہ مثلاً مسلمانوں میں لڑکے لڑکی کا لین دین' ورثہ کی تقسیم' جان و مال کی حفاظت وغیرہ مل جاتی ہے لیکن چونکہ اس کے دِل میں ایمان اور اس کے کاموں میں سچائی نہیں ہوتی اس لیے موت کے وقت وہ سب منافع سلب ہو جاتے ہیں جیسے آگ کی روشنی جو بجھ جائے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں اندھیروں میں چھوڑ دینا مرنے کے بعد عذاب ہوتا ہے۔ یہ لوگ حق دیکھتے ہیں' زبان سے کہتے ہیں اور ظلمت کفر سے نکل جاتے ہیں لیکن پھر اپنے کفر ونفاق کی وجہ سے ہدایت اور حق پر قائم رہنا ان سے چھن جاتا ہے۔

سدی کا قول ہے کہ اندھیرے سے مراد ان کا نفاق ہے۔ حسن بصریؒ فرماتے ہیں' موت کے وقت منافق کی بداعمالیاں اندھیروں کی طرح اس پر چھا جاتی ہیں اور کوئی بھلائی کی روشنی اس کے لیے باقی نہیں رہتی' جس سے اس کی توحید کی تصدیق ہو۔ وہ بہرے ہیں' حق کے سننے سے' اندھے ہیں راہِ راست کو دیکھنے اور سمجھنے سے' ہدایت کی طرف لوٹ نہیں سکتے' نہ تو انہیں توبہ نصیب ہوتی ہے' نہ نصیحت حاصل کر سکتے ہیں۔

اَوْ كَصَيِّبٍ مِّنَ السَّمَآءِ فِيْهِ ظُلُمٰتٌ وَّرَعْدٌ وَّبَرْقٌ ۚ يَجْعَلُوْنَ اَصَابِعَهُمْ

فِيْٓ اٰذَانِهِمْ مِّنَ الصَّوَاعِقِ حَذَرَ الْمَوْتِ ۭ وَاللّٰهُ مُحِيْطٌۢ بِالْكٰفِرِيْنَ ۝۱۹ يَكَادُ الْبَرْقُ يَخْطَفُ اَبْصَارَھُمْ ۭ كُلَّمَآ اَضَاۗءَ لَھُمْ مَّشَوْا فِيْهِ ڎ وَاِذَآ اَظْلَمَ عَلَيْهِمْ قَامُوْا ۭ وَلَوْ شَاۗءَ اللّٰهُ لَذَھَبَ بِسَمْعِهِمْ وَاَبْصَارِهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝۲۰

یا ان منافقوں کی ایسی مثال ہے جیسے بارش ہو یا آسمان کی طرف سے اس میں اندھیری بھی ہو اور رعد و برق بھی ہو جو لوگ اس بارش میں چل رہے ہیں وہ ٹھونسے لیتے ہیں اپنی انگلیاں اپنے کانوں میں کڑک کے سبب اندیشہ موت سے اور اللہ تعالیٰ احاطہ میں لیے ہوئے ہیں کافروں کو۔ برق کی یہ حالت ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ ابھی ان کی بینائی اس نے لی۔ جہاں ذرا ان کو بجلی کی چمک ہوئی تو اس کی روشنی میں چلنا شروع کیا اور جب ان پر تاریکی ہوئی پھر کھڑے کے کھڑے رہ گئے اور اگر اللہ تعالیٰ ارادہ کرتے تو ان کے گوش و چشم سب سلب کر لیتے۔ بلا شک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہیں ○

منافقین کی دوسری جماعت کی مثال ☆

یہ دوسری مثال ہے جو دوسری قسم کے منافقوں کے لیے بیان کی گئی ہے۔ یہ وہ قوم ہے جن پر کبھی حق ظاہر ہو جاتا ہے اور کبھی شک میں پڑ جاتے ہیں۔ شک کے وقت ان کی مثال برسات کی سی ہے۔ صیّب کے معنی مینہ اور بارش کے ہیں۔ بعض نے بادل کے معنی بھی بیان کیے ہیں لیکن زیادہ مشہور معنی بارش کے ہی ہیں جو اندھیرے میں برسے۔ ظلمات سے مراد شک اور کفر و نفاق ہے اور رعد یعنی گرج جو اپنی خوفناک آواز سے دل ہلا دیتی ہے۔ یہی حال منافق کا ہے کہ اسے ہر وقت ڈر، خوف، گھبراہٹ اور پریشانی ہی رہتی ہے۔

جیسے اور جگہ ارشاد ہے: ﴿ يَحْسَبُوْنَ كُلَّ صَيْحَةٍ عَلَيْهِمْ ﴾ (المنافقون: ۴) یعنی ہر آواز کو اپنے اوپر ہی سمجھتے ہیں اور جگہ ارشاد ہے کہ یہ منافقین خدا کی قسمیں کھا کھا کر کہتے ہیں کہ وہ تم میں سے ہیں لیکن دراصل وہ ڈرپوک لوگ ہیں۔ اگر وہ کوئی جائے پناہ یا راستہ پالیں تو یقیناً وہ اس میں سمٹ کر گھس جائیں۔ بجلی سے مثال دی ہے اس نور ایمان کی جو ان کے دلوں میں کسی وقت چمک اٹھتا ہے تو وہ اس وقت اپنی انگلیاں موت کے ڈر سے کانوں میں ڈال لیتے ہیں لیکن یہ انہیں کوئی نفع نہ دے گا۔ یہ اللہ تعالیٰ کی قدرتوں اور اس کے ارادے کے ماتحت ہیں، یہ بچ نہیں سکتے۔ جیسے اور جگہ فرمایا: ﴿ هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ الْجُنُوْدِ فِرْعَوْنَ وَ ثَمُوْدَ...... ﴾ (البروج: ۱۷-۱۸) یعنی کیا تمہیں لشکریوں کی فرعونیوں اور ثمودیوں کی روایتیں نہیں پہنچیں۔ پہنچی تو ہیں لیکن ان کافروں کو سوائے جھٹلانے کے اور کوئی کام نہیں ہے اور اللہ تعالیٰ بھی انہیں ان کے پیچھے سے گھیر رہا ہے، بجلی کا آنکھوں کو اُچک لینا اس کی قوت اور سختی اور ان منافقین کی بینائی کی کمزوری کا ضعف ایمان ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں، مطلب یہ ہے کہ قرآن کی مضبوط آیتیں ان منافقین کی قلعی کھول دیں

گی اور ان کے چھپے ہوئے عیوب ظاہر کر دیں گی اور اپنی نورانیت سے انہیں مبہوت کر دیں گی۔ جب ان پر اندھیرا ہو جاتا ہے تو کھڑے ہو جاتے ہیں یعنی ایمان جب ان پر ظاہر ہو جاتا ہے تو ذرا روشن دِل ہو کر پیروی کرنے لگتے ہیں لیکن پھر جہاں شک وشبہ آیا کہ دِل میں کدورت اور ظلمت بھر گئی اور بھونچکے رہ گئے۔ اس کا یہ مطلب بھی ہے کہ اسلام کو ذرا عروج ملا تو ان کے دل میں قدرے اطمینان پیدا ہوا لیکن جہاں اس کے خلاف نظر آیا تو یہ اُلٹے پیروں کفر کی طرف لوٹنے لگے۔ جیسے ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ ﴾ (الحج:۱۱) یعنی بعض لوگ وہ بھی ہیں جو کنارے پر کھڑے اللہ کی عبادت کرتے ہیں اگر بھلائی ملی تو مطمئن ہوئے اور اگر برائی پہنچی تو اسی وقت پھر گئے ۔۔۔ حضرت ابن عباسؓ یہ بھی فرماتے ہیں کہ ان کا روشنی میں چلنا حق کو جان کر کلمہ اسلام پڑھنا ہے اور اندھیرے میں ٹھہر جانا کفر کی طرف لوٹ جانا ہے اور بھی بہت سے مفسرین کا یہی قول ہے اور زیادہ صحیح اور ظاہر بھی یہی قول ہے واللہ اعلم۔

روزِ قیامت میں ان کا یہی حال رہے کہ جب لوگوں کو ان کے ایمان کے اندازے کے مطابق نور ملے گا بعض کو کئی کئی میلوں تک کا بعض کو اس سے بھی زیادہ کسی کو اس سے کم یہاں تک کہ کسی کو اتنا نور ملے گا کہ بجلی روشن ہو اور بھی اندھیرا۔ کچھ لوگ ایسے بھی ہوں گے جو ذرا سی دُور چل سکیں گے پھر ٹھہر جائیں گے پھر ذرا سی دُور کا نور ملے گا پھر بجھ جائے گا اور بعض وہ بے نصیب بھی ہوں گے کہ ان کا نور بالکل بجھ جائے گا۔ یہ پورے منافق ہوں گے جن کے بارے میں فرمانِ الٰہی ہے: ﴿يَوْمَ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالْمُنٰفِقٰتُ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوا انْظُرُوْنَا...... ﴾ (الحدید:۱۳) یعنی جس دن منافق مرد اور منافق عورتیں ایمان والوں کو پکاریں گے اور کہیں گے کہ ذرا رکو ہمیں بھی آ لینے دو تا کہ ہم بھی تمہارے نور سے فائدہ اُٹھائیں۔ تو کہا جائے گا کہ اپنے پیچھے لوٹ جاؤ اور نور ڈھولاؤ...... اور مؤمنوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿ يَوْمَ تَرَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ يَسْعٰى نُوْرُهُمْ...... ﴾ (الحدید:۱۲) یعنی اس دن تو دیکھے گا کہ مؤمن مردوں وعورتوں کو آگے آگے اور دائیں جانب نور ہوگا اور کہا جائے گا کہ تجھے آج کے دن جنتوں کی خوشخبریاں ہیں جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی اور فرمایا کہ جس دن نہ رسوا کرے گا اللہ تعالیٰ نبی کو اور ان لوگوں کو جو اُن کے ساتھ ایمان لائے اور نور ان کے آگے ہوگا اور دائیں ہوگا وہ کہہ رہے ہوں گے: اے ہمارے رب! ہمارے لیے ہمارا نور پورا کر اور ہمیں بخش یقیناً تو ہر چیز پر قادر ہے۔ ان آیتوں کے بعد اب اس مضمون کی احادیث بھی قابل غور ہیں۔

نبی ﷺ فرماتے ہیں بعض مؤمنوں کو مدینہ سے لے کر عدن تک نور ملے گا بعض کو اس سے کم یہاں تک کہ بعض کو اتنا کم کہ صرف پاؤں رکھنے کی جگہ ہی روشن ہوتی ہوگی۔ (ابن جریر) حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں ایمان والوں کو ان کے اعمال کے مطابق نور ملے گا۔ بعض کو کھجور کے درخت جتنا کسی کو قد آدم جتنا کسی کو صرف اتنا ہی کہ اس کا انگوٹھا ہی روشن ہو۔ کبھی بجھ جاتا ہو کبھی روشن ہو جاتا ہو۔ (ابن ابی حاتم) حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں انہیں نور ملے گا اُن کے اعمال کے مطابق جس کی روشنی میں وہ پل صراط سے گزریں گے۔ بعض لوگوں کا نور پہاڑ جتنا ہوگا بعضوں کا کھجور جتنا اور سب سے کم نور والا وہ ہوگا جس کا نور اس کے انگوٹھے پر ہوگا کبھی چمک اٹھے گا اور کبھی بجھ جائے گا۔ (ابن ابی حاتم) حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ سب توحید والوں کو قیامت کے دن نور ملے گا۔ جب منافقوں کا نور بجھ جائے گا تو موحد ڈر کر کہیں گے: ﴿ رَبَّنَآ اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا ﴾ (التحریم:۸) خدایا! ہمارے نور کو پورا کر۔ (ابن ابی حاتم) ضحاک بن مزاحم رحمۃ اللہ علیہ کا بھی یہی قول ہے۔

ان حدیثوں سے معلوم ہوا کہ قیامت والے دن لوگ کئی قسم کے ہوں گے' خالص مؤمن' وہ جن کا بیان اگلی چار آیتوں میں ہوا۔ خالص کفار جن کا ذکر اس کے بعد کی دو آیتوں میں ہوا ہے اور منافق جن کی دو قسمیں ہیں: ایک تو خالص منافق جن کی مثال آگ کی روشنی سے دی گئی ہے دوسرے وہ منافق جو تر دد میں ہیں' کبھی تو ایمان چمک اٹھتا ہے کبھی بجھ جاتا ہے۔ ان ہی کی مثال بارش سے دی گئی ہے۔ یہ پہلی قسم کے منافقوں سے کچھ کم ہیں۔ ٹھیک اسی طرح سورۂ نور میں بھی اللہ تبارک وتعالیٰ نے مؤمن کی اور اس کے دل کے نور کی مثال اس منور چراغ سے دی ہے جو روشن فانوس میں ہو اور خود فانوس بھی چمکتے ہوئے تارے کی طرح ہو۔ چنانچہ ایماندار کا ایک تو خود دل روشن' دوسرے خالص شریعت کی اسے امداد۔ پس روشنی پر روشنی' نور بالائے نور ہو جاتا ہے۔ اسی طرح دوسری جگہ کافروں کی مثال بھی بیان کی' جو اپنی نادانی کی وجہ سے اپنے تئیں کچھ سمجھتے ہیں' وہ کچھ نہیں ہوتے۔ فرمایا کہ کافروں کے اعمال کی مثال سراب کی طرح ہے' جسے پیاسا پانی سمجھتا ہے یہاں تک کہ پاس آ کر دیکھتا ہے لیکن کچھ بھی نہیں پاتا۔ پھر اور موقع پر ان جاہل کافروں کی مثال بیان کی' جو جہل بسیط میں مبتلا ہیں۔ فرمایا: مانند سخت اندھیروں کے جو گہرے سمندر میں ہوں' جو موجوں پر موجیں مار رہا ہو۔ پھر ابر سے ڈھکا ہوا ہو اور اندھیروں پر اندھیرے چھائے ہوں۔ ہاتھ نکالے تو دیکھ بھی نہیں سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ جس کے لیے اللہ کی طرف سے نور نہ ہو' اس کے پاس نور کہاں سے آئے؟ پس کفار کی بھی دو قسمیں کیں: ایک تو دوسروں کو کفر کی طرف بلانے والے' دوسرے ان کی تقلید کرنے والے۔ جیسے سورۂ حج کے شروع میں ہے: ﴿ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ...... ﴾ (الحج: ۳) بعض وہ لوگ ہیں جو اللہ کے بارے میں جھگڑتے ہیں بغیر علم کے اور ہر سرکش شیطان کی پیروی کرتے ہیں اور جگہ فرمایا: ﴿ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّلَا هُدًى وَّلَا كِتَابٍ مُّنِيْرٍ ﴾ (الحج: ۸) بعض علم اور ہدایت اور روشن کتاب بغیر خدا کے بارے میں لڑتے جھگڑتے ہیں۔ سورۂ واقعہ کے شروع میں اور آخر میں سورۃ النساء میں مؤمنوں کی بھی دو قسمیں بیان کی گئی ہیں۔ سابقین اور اصحاب یمین۔ یعنی مقرب بارگاہ خداوندی اور پرہیزگار نیکوکار لوگ۔ پس ان آیتوں سے معلوم ہوا کہ مؤمنوں کی دو جماعتیں ہیں' مقرب اور ابرار اور کافروں کی بھی دو قسمیں ہیں: کفر کی طرف بلانے والے اور ان کی تقلید کرنے والے اور منافقوں کی بھی دو قسمیں ہیں: خالص اور پکے منافق اور وہ منافق جن میں نفاق کی ایک آدھ شاخ ہے۔

صحیحین میں حدیث ہے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تین خصلتیں ہیں' جس میں تینوں ہوں وہ پکا منافق ہے اور جس میں ایک ہو اس میں ایک خصلت نفاق کی ہے جب تک اسے نہ چھوڑے۔ (یہ تین خصلتیں ہیں:) ﴿۶﴾ بات کرنے میں جھوٹ بولنا' ﴿۷﴾ وعدہ خلافی کرنا' ﴿۸﴾ امانت میں خیانت کرنا۔ اس سے ثابت ہوا کہ انسان میں کبھی نفاق کا کچھ حصہ ہوتا ہے۔ خواہ وہ نفاق عملی ہو یا اعتقادی جیسا کہ آیت وحدیث سے معلوم ہوتا ہے۔ سلف کی ایک جماعت اور علمائے کرام کے ایک گروہ کا یہی مذہب ہے۔ اس کا بیان پہلے بھی گزر چکا ہے اور آئندہ بھی آئے گا' ان شاءاللہ۔ مسند احمد میں ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: دل چار قسم کے ہیں: ایک تو صاف دل جو روشن چراغ کی طرح چمک رہا ہو۔ دوسرے وہ دل جو غلاف آلود ہیں۔ تیسرے وہ دل جو اُلٹے ہیں۔ چوتھے وہ دل جو مخلوط ہیں۔ پہلا دل تو مؤمن کا ہے جو پوری طرح نورانی ہے' دوسرا دل کافر کا ہے جس پر پردے پڑے ہوئے ہیں۔ تیسرا دل خالص منافقوں کا ہے جو جانتا ہے اور انکار کرتا ہے۔ چوتھا دل اُس منافق کا ہے جس میں ایمان ونفاق دونوں جمع ہیں۔ ایمان کی مثال اس سبزے کی سی ہے جو

پاکیزہ پانی سے بڑھ رہا ہو اور نفاق کی مثال اس پھوڑے کی طرح ہے جس میں پیپ اور خون بڑھتا ہی جاتا ہو۔ اب جو مادہ بڑھ جائے وہ دوسرے پر غالب آ جاتا ہے۔ یہ حدیث سند کے لحاظ سے بہت قوی ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں' اگر اللہ چاہے تو ان کے کان اور آنکھیں برباد کر دے۔ مطلب یہ ہے کہ جب انہوں نے حق کو جان کر اسے چھوڑ دیا تو ہر چیز پر قادر ہے یعنی اگر چاہے تو عذاب و سزا کرے' اگر چاہے معاف کر دے۔ یہاں قدرت کا بیان اس لیے کیا کہ پہلے منافقوں کو اپنے عذاب اور اپنی جبروت سے ڈرایا اور کہہ دیا کہ وہ انہیں گھیر لینے پر قادر ہے۔ قدیر کے معنی قادر کے ہیں۔ جیسے علیم کے معنی عالم کے ہیں۔ امام ابن جریرؒ فرماتے ہیں یہ دو مثالیں ایک ہی قسم کے منافقوں کی ہیں۔ او معنی میں وَ کے ہیں۔ یعنی اور جیسے فرمایا: ﴿ وَلَا تُطِعْ مِنْهُمْ اٰثِمًا اَوْ كَفُوْرًا ﴾ (الدھر: ۲۴) یا لفظ او تخییر یعنی اختیار کے لیے ہے۔ یعنی خواہ یہ مثال بیان کرو' خواہ وہ مثال بیان کرو اختیار ہے۔

قرطبیؒ فرماتے ہیں اَوْ یہاں پر تساوی یعنی برابری کے لیے ہے جیسے عربی زبان کا محاورہ ہے: جالس الحسن او ابن سیرین۔ زمخشری بھی یہی توجیہ کرتے ہیں تو مطلب یہ ہوگا کہ ان دونوں مثالوں میں سے جونسی مثال چاہو بیان کرو۔ دونوں ان کے حال کے مطابق ہیں لیکن ہمارا اپنا خیال یہ ہے کہ یہ باعتبار منافقوں کی قسموں کے ہے جیسا کہ سورۃ براءت میں وَمِنْهُمْ' وِ مِنْهُمْ' وَ مِنْهُمْ کر کے ان کی بہت سی قسمیں' بہت سے افعال اور بہت سے اقوال بیان کیے ہیں تو یہ دونوں مثالیں دو قسم کے منافقوں کی ہیں جو ان کے احوال اور صفات سے بالکل مشابہ ہیں' واللہ اعلم۔ جیسے کہ سورۂ نور میں دو قسم کے کفار کی مثالیں بیان کیں۔ ایک کفر کی طرف بلانے والے دوسرے مقلد۔ فرمایا: ﴿ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍ بِقِيْعَةٍ ﴾ (النور: ۳۹۔۴۰) اور فرمایا: ﴿ اَوْ كَظُلُمٰتٍ ﴾ پس پہلی مثال یعنی ریت کے تودے کی کفر کی طرف بلانے والوں کی ہے جو جہل مرکب میں پھنسے ہوئے ہیں۔ دوسری مثال مقلدوں کی ہے جو جہل بسیط میں مبتلا ہیں' واللہ اعلم۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝۲۱ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّالسَّمَاۗءَ بِنَاۗءً ۠ وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَاۗءِ مَاۗءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ ۚ فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝۲۲

اے لوگو! عبادت اختیار کرو اپنے اس پروردگار کی جس نے پیدا کیا تم کو اور ان لوگوں کو بھی جو تم سے پہلے گزر چکے ہیں۔ عجب نہیں کہ تم دوزخ سے بچ جاؤ۔ وہ ذات پاک ہے جس نے بنایا تمہارے لیے زمین کو فرش اور آسمان کو چھت اور برسایا آسمان سے پانی پھر پردۂ عدم سے نکالا بذریعہ اس پانی کے پھلوں سے غذا کو تم لوگوں کے واسطے۔ اب تو مت ٹھہراؤ اللہ پاک کے مقابل اور تم جانتے بوجھتے ہو ○

توحیدِ باری کا بیان☆

یہاں سے اللہ تعالیٰ کی توحید اور اس کی الوہیت کا بیان شروع ہوتا ہے۔ وہی اپنے بندوں کو عدم سے وجود میں لایا۔ اسی نے ہر طرح کی ظاہری اور باطنی نعمتیں عطا فرمائیں۔ اسی نے زمین کا فرش بنایا اور اس میں مضبوط پہاڑوں کی میخیں گاڑ دیں اور آسمان کو چھت بنایا۔ جیسے دوسری آیت میں آیا: ﴿ وَجَعَلْنَا السَّمَآءَ سَقْفًا مَّحْفُوْظًا...... ﴾ (الانبیاء: ۳۲) یعنی آسمان کو محفوظ چھت بنایا۔ باوجود اس کے وہ نشانیوں سے مُنہ موڑ لیتے ہیں۔ پانی آسمان سے اتارنے کا مطلب بادل سے نازل فرمانا ہے۔ اس وقت جبکہ وہ لوگ اس کے پورے محتاج ہوں۔ پھر اس پانی سے طرح طرح کے پھل پھول پیدا کرنا ہے جس سے لوگ فائدہ اٹھائیں اور ان کے جانور بھی۔ جیسے قرآن مجید میں جابجا اس کا بیان ہے۔ ایک جگہ فرمان ہے: ﴿ اَللّٰهُ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ قَرَارًا ﴾ (المومن: ۶۴) اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے زمین کو فرش اور آسمان کو چھت بنایا اور تمہیں پیاری پیاری صورتیں عطا فرمائیں اور بھلی بھلی روزیاں پہنچائیں۔ یہی اللہ ہے جو برکتوں والا اور تمام عالم کو پالنے والا ہے۔ پس سب کا خالق، سب کا رازق، سب کا مالک اللہ تعالیٰ ہی ہے اور اسی وجہ سے وہی مستحق ہے ہر قسم کی عبادتوں کا اور شریک نہ کیے جانا کا۔ اس لیے فرما: اللہ تعالیٰ کے شریک نہ ٹھہراؤ حالانکہ تم جانتے ہو۔

صحیحین میں حدیث ہے، ابن مسعودؓ پوچھتے ہیں، حضور ﷺ سب سے بڑا گناہ کونسا ہے؟ فرمایا: اللہ تعالیٰ کے ساتھ، جو خالق ہے، شریک ٹھہرایا۔ حضرت معاذؓ والی حدیث میں ہے، کیا جانتے ہو کہ اللہ کا حق بندوں پر کیا ہے؟ یہ کہ اُس کی عبادت کریں اور کسی کو اس عبادت میں شریک نہ کریں۔ دوسری حدیث میں ہے، تم میں سے کوئی یہ نہ کہے کہ اللہ چاہے اور فلاں چاہے بلکہ یوں کہے کہ جو کچھ اللہ اکیلا چاہے۔ (ابوداؤد) طفیل بن سنجرہ حضرت عائشہؓ کے سوتیلے بھائی فرماتے ہیں، میں نے خواب میں چند یہودیوں کو دیکھا۔ میں نے ان سے پوچھا: تم کون ہو؟ انہوں نے کہا: ہم یہودی ہیں۔ میں نے کہا: افسوس! تم میں یہ بڑی خرابی ہے کہ تم حضرت عزیرؑ کو خدا کا بیٹا کہتے ہیں۔ انہوں نے کہا: تم بھی اچھے لوگ ہو، لیکن افسوس تم کہتے ہو جو اللہ چاہے اور محمد ﷺ چاہیں۔ پھر میں نصرانیوں کی جماعت کے پاس گیا اور اُن سے بھی اسی طرح پوچھا۔ انہوں نے بھی یہی جواب دیا۔ میں نے اُن سے کہا: افسوس تم بھی مسیحؑ کو خدا کا بیٹا جانتے ہو۔ انہوں نے بھی یہی جواب دیا۔ میں نے صبح اپنے اس خواب کا ذکر کچھ لوگوں سے کیا۔ پھر دربارِ نبوی ﷺ میں حاضر ہو کر آپ ﷺ سے بھی واقعہ بیان کیا۔ آپ ﷺ نے پوچھا: کیا کسی سے بھی تم نے اس خواب کا ذکر کیا؟ میں نے کہا: ہاں حضور ﷺ! اب آپ ﷺ کھڑے ہو گئے اور اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء بیان کی اور فرمایا: طفیلؓ نے ایک خواب دیکھا اور تم میں سے جس سے بھی بیان کیا، میں چاہتا تھا کہ تمہیں اس کلمہ کے کہنے سے روک دوں لیکن فلاں فلاں کاموں کی وجہ سے میں اب تک نہ کہہ سکا۔ یاد رکھو! اب ہرگز ہرگز ''خدا چاہے اور اس کا رسول ﷺ'' کبھی نہ کہنا بلکہ یوں کہو کہ صرف اللہ تعالیٰ اکیلا جو چاہے۔ (ابن مردویہ)

ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے کہا: جو اللہ تعالیٰ چاہے اور آپ ﷺ چاہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: تو مجھے اللہ تعالیٰ کا شریک ٹھہراتا ہے؟ یوں کہہ جو اللہ تعالیٰ اکیلا چاہے۔ (ابن مردویہ) یہ تمام کلمات توحید کے سراسر خلاف ہیں۔ توحید باری کے لیے یہ سب احادیث بیان ہوئی ہیں، واللہ اعلم۔

تمام کفار اور منافقوں کو اللہ تعالیٰ نے اپنی عبادت کا حکم دیا اور فرمایا: اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو۔ یعنی اس کی توحید کے

پابند بن جاؤ۔ اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو۔ جو نہ نفع دے سکے نہ نقصان پہنچا سکے اور تم جانتے ہو کہ اس کے سوا کوئی رب نہیں جو تمہیں روزی پہنچا سکے اور تم جانتے ہو کہ اللہ تعالیٰ کے رسول ﷺ تمہیں اس توحید کی طرف بلا رہے ہیں' جس کے حق اور سچ ہونے میں کوئی شک نہیں۔ شرک اس سے بھی زیادہ پوشیدہ ہے' جیسے چیونٹی جو رات کے اندھیرے میں کسی صاف پتھر پر چل رہی ہو۔ انسان کا یہ کہنا کہ قسم ہے اللہ کی اور قسم ہے آپ کی حیات کی' یہ بھی شرک ہے۔ کسی کا یہ کہنا کہ اگر اللہ نہ ہوتا اور فلاں نہ ہوتا۔ یہ کلمات شرک ہیں۔

صحیح حدیث میں ہے کہ کسی نے رسول اللہ ﷺ سے کہا: جو اللہ چاہے اور آپ ﷺ چاہیں' تو آپ ﷺ نے فرمایا: کیا تو مجھے اللہ تعالیٰ کا شریک ٹھہراتا ہے؟ (ابن ماجہ) دوسری حدیث میں ہے' تم اچھے لوگ ہو' اگر تم شرک نہ کرتے۔ تم کہتے ہو جو اللہ چاہے اور جو فلاں چاہے۔ ابوالعالیہ فرماتے ہیں انداداً کے معنی شریک اور برابر کے ہیں۔ مجاہدؒ فرماتے ہیں تم توراۃ و انجیل پڑھتے ہو اور جانتے ہو کہ اللہ تعالیٰ ایک اور بے شریک ہے۔ پھر جانتے ہوئے کیوں اللہ کا شریک کرتے ہو؟

مسند احمد میں ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ عزوجل نے حضرت یحییٰؑ کو پانچ چیزوں کا حکم دیا کہ ان پر عمل کرو اور بنی اسرائیل کو بھی ان پر عمل کرنے کا حکم دو۔ قریب تھا کہ وہ اس میں ڈھیل کریں تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے انہیں یاد دلایا کہ آپ کو پروردگارِ عالم کا حکم تھا کہ ان پانچ چیزوں پر خود کاربند ہو کر دوسروں کو بھی حکم دو۔ پس یا تو خود آپ کہہ دیجئے یا میں پہنچا دوں۔ حضرت یحییٰؑ نے فرمایا: مجھے ڈر ہے کہ اگر آپ سبقت لے گئے تو کہیں مجھے عذاب نہ کیا جائے یا زمین میں دھنسا نہ دیا جائے۔ پس یحییٰؑ نے بنی اسرائیل کو بیت المقدس کی مسجد میں جمع کیا۔ جب مسجد پُر ہو گئی تو اونچی جگہ بیٹھ گئے اور اللہ تعالیٰ کی حمد وثناء بیان کر کے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے پانچ باتوں کا حکم دیا ہے کہ خود عمل کر کے تم سے بھی ان پر عمل کراؤں۔

ایک یہ کہ اللہ ایک کی عبادت کرو۔ اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص خاص اپنے مال سے کسی غلام کو خریدے۔ غلام کام کاج کرے اور جو کچھ پائے اُسے کسی اور کو دیدے۔ کیا تم میں سے کوئی اس بات کو پسند کرتا ہے کہ اس کا غلام ایسا ہو؟ ٹھیک اسی طرح تمہارا پیدا کرنے والا' تمہیں روزیاں دینے والا' تمہارا حقیقی مالک اللہ تعالیٰ وحدہٗ لاشریک ہی ہے۔ پس تم اسی کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ۔

دوسری یہ کہ نماز کو ادا کیا کرو۔ اللہ تعالیٰ بندے کے مُنہ کی طرف متوجہ ہوتا ہے' جب تک کہ وہ نماز میں اِدھر اُدھر التفات نہ کرے۔ جب تم نماز میں ہو تو خبردار! اِدھر اُدھر التفات نہ کرنا۔

تیسرا حکم یہ ہے کہ روزے رکھا کرو۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کسی شخص کے پاس مشک کی تھیلی بھری ہو۔ جس سے اس کے تمام ساتھیوں کے دماغ معطر رہیں۔ یاد رکھو روزے دار کے مُنہ کی خوشبو اللہ تعالیٰ کو مشک کی خوشبو سے بھی زیادہ پسند ہے۔

چوتھا حکم اُس کا یہ ہے کہ صدقہ دیتے رہا کرو۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کسی شخص کو دشمنوں نے قید کر لیا اور گردن کے ساتھ اس کے ہاتھ باندھ دیئے اور گردن مارنے کے لیے لے چلے' تو وہ کہنے لگا کہ تم مجھ سے فدیہ لے لو اور مجھے چھوڑ دو۔ چنانچہ جو کچھ تھا کم زیادہ دے دلا کر اپنی جان چھڑا لی۔

پانچواں حکم اس کا یہ ہے کہ بکثرت اُس کے نام کا وظیفہ کرو اور ذکر کیا کرو۔ اس کی مثال اس شخص کی طرح ہے جس

کے پیچھے تیزی کے ساتھ دشمن دوڑتا آتا ہو اور وہ ایک مضبوط قلعہ میں گھس جاتا ہے اور وہاں امن وامان پالیتا ہے۔اسی طرح اللہ کے ذکر کے وقت شیطان سے بچا ہوا ہوتا ہے۔

یہ فرما کر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اب میں بھی پانچ باتوں کا حکم کرتا ہوں' جن کا حکم جناب باری نے مجھے دیا ہے:
﴿۱﴾ مسلمانوں کی جماعت کو لازم پکڑے رہنا (اللہ اور اس کے رسول ﷺ اور مسلمان حاکم وقت کے احکام)' ﴿۲﴾ سننا اور ﴿۳﴾ ماننا' ﴿۴﴾ ہجرت کرنا اور ﴿۵﴾ جہاد کرنا۔ جو شخص جماعت سے ایک بالشت بھی نکل گیا۔اس نے اسلام کے پٹے کو اپنے گلے سے اُتار پھینکا۔ ہاں! یہ بات اور ہے کہ رجوع کرلے۔ جو شخص جاہلیت کی پکار پکارے وہ جہنم کا کوڑا کرکٹ ہے۔لوگوں نے کہا: حضور ﷺ اگر چہ وہ روزے دار اور نمازی ہو؟ فرمایا: اگر چہ نماز پڑھتا ہو اور روزے رکھتا ہو اور اپنے تئیں مسلمان سمجھتا ہو۔ مسلمانوں کو ان کے ناموں کے ساتھ پکارتے رہو جو خود اللہ تعالیٰ نے رکھے ہیں۔ مسلمین' مؤمنین اور عباد اللہ۔ (احمد) یہ حدیث حسن ہے۔

اِس آیت میں بھی یہی بیان ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی نے تمہیں پیدا کیا ہے۔ وہی تمہیں روزیاں دیتا ہے۔ پس عبادت بھی اسی کی کرو۔اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو۔اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ عبادت میں توحید باری تعالیٰ کا پورا خیال رکھنا چاہیے کسی اور کی عبادت نہ کرنی چاہیے۔ جملہ عبادتوں کے لائق صرف وہی ہے۔

امام رازیؒ وغیرہ نے اللہ تعالیٰ کے وجود پر بھی اس آیت سے استدلال کیا ہے اور فی الواقع یہ آیت بہت بڑی دلیل ہے' اللہ تعالیٰ کے وجود پر۔ زمین وآسمان کی مختلف شکل وصورت' مختلف رنگ' مختلف مزاج اور مختلف نفع کی موجودات' ان میں سے ہر ایک کا نفع والا ہونا اور خاص حکمت سے ہونا ثبوت ہے' ان کے خالق کے وجود کا اور اس کی عظیم الشان قدرت اور حکمت اور زبردست سلطنت اور سطوت کا۔ کسی بدوی سے پوچھا گیا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے ہونے پر کیا دلیل ہے؟ تو اس نے کہا: یا سبحان اللہ ان البعر کیدل علی البعیر و ان اثر الا قد امر لتدل علی السیرہ فسماء ذات ابراج و ارض ذات فجاج و بحار ذات امواج الا یدل ذالك علی وجود اللطیف الخبیر یعنی مینگنی سے اونٹ معلوم ہو سکے اور پاؤں کے نشان کو زمین پر دیکھ کر معلوم ہو جائے کہ کوئی آدمی گیا ہے تو کیا یہ برجوں والا آسمان' یہ راستوں والی زمین پر موجیں مارنے والے سمندر اللہ تعالیٰ باریک بین اور خبردار کے وجود پر دلیل نہیں بن سکتے؟ حضرت امام مالکؒ سے ہارون رشید نے پوچھا کہ اللہ تعالیٰ کے وجود پر کیا دلیل ہے؟ آپؒ نے فرمایا: زبانوں کا مختلف ہونا' آوازوں کا جداگانہ ہونا' نغموں کا الگ الگ ہونا ثابت کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہے۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے ذاتِ باری کی بابت سوال اور دہریوں کا ایمان لانا ☆

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے بھی سوال ہوتا ہے تو آپ جواب دیتے ہیں کہ چھوڑو میں ابھی کسی اور سوچ میں ہوں۔لوگوں نے مجھ سے کہا کہ ایک بڑی کشتی جس میں طرح طرح کی تجارتی چیزیں ہیں' نہ اس کا کوئی نگہبان ہے' نہ چلانے والا ہے۔ باوجود اس کے وہ برابر آ جا رہی ہے اور بڑی بڑی موجوں کو خود بخود چیرتی پھاڑتی گزر جاتی ہے۔ ٹھہرنے کی جگہ پر ٹھہر جاتی ہے' چلنے کی جگہ چلتی رہتی ہے اور نہ کوئی ملاح ہے نہ منتظم۔ سوال کرنے والے دہریوں نے کہا: آپ کس سوچ میں پڑ گئے۔ کوئی عاقل ایسی بات کہہ سکتا ہے کہ اتنی بڑی کشتی نظام کے ساتھ' تلاطم والے سمندر میں آئے جائے اور کوئی اس کا چلانے

والا نہ ہو؟ آپ نے فرمایا: افسوس تمہاری عقلوں پر' ایک کشتی تو بغیر چلانے والے کے چل نہ سکے لیکن یہ ساری دنیا' آسمان و زمین کی سب چیزیں ٹھیک اپنے کام پر لگی رہیں اور ان کا مالک' حاکم' خالق کوئی نہ ہو؟ یہ جواب سن کر وہ لوگ ہکے بکے رہ گئے اور حق معلوم کر کے مسلمان ہو گئے۔

حضرت امام شافعیؒ سے بھی یہی سوال ہوا تو آپؒ نے جواب دیا کہ توت کے پتے ایک ہی ہیں اور ایک ذائقہ کے ہیں۔ ان کو کیڑے' شہد کی مکھی اور گائیں بکریاں' ہرن وغیرہ سب کھاتے اور چرتے ہیں۔ اسی کو کھا کر کیڑے سے ریشم نکلتا ہے' مکھی شہد دیتی ہے۔ ہرن میں مشک پیدا ہوتا ہے اور گائیں' بکریاں مینگنیاں دیتی ہیں۔ کیا یہ اس امر کی صاف دلیل نہیں کہ ایک پتے میں یہ مختلف خواص پیدا کرنے والا کوئی ہے؟ اور اسی کو ہم اللہ تبارک وتعالیٰ مانتے ہیں۔ وہی موجد اور صانع ہے۔

حضرت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ سے بھی ایک مرتبہ وجودِ باری تعالیٰ پر دلیل طلب کی جاتی ہے تو آپؒ فرماتے ہیں' سنو! یہاں ایک مضبوط قلعہ ہے جس میں کوئی دروازہ نہیں' نہ کوئی راستہ ہے بلکہ سوراخ تک نہیں۔ باہر سے چاندی کی طرح چمک رہا ہے اور اندر سے سونے کی طرح دمک رہا ہے اور اُوپر نیچے' دائیں' بائیں چاروں طرف سے بالکل بند ہے۔ ہوا تک اس میں نہیں جاسکتی۔ اچانک اس کی ایک دیوار گرتی ہے اور ایک آنکھوں' کانوں والا' بولتا چالتا' خوبصورت شکل اور پیاری بولی والا چلتا پھرتا جانور نکل آتا ہے۔ کہو اس بند اور محفوظ مکان میں اسے پیدا کرنے والا کوئی ہے یا نہیں اور وہ ہستی انسانی ہستیوں سے بالاتر' اس کی قدرت غیر محدود ہے یا نہیں؟ مطلب آپ کا یہ تھا کہ انڈے کو دیکھو چاروں طرف سے بند ہے۔ پھر اس میں پروردگارِ خالق یکتا جاندار بچہ پیدا کرتا ہے۔ یہی دلیل ہے اللہ کے وجود پر اور اس کی توحید پر۔

شاعر ابونواس نے جب یہ مسئلہ پوچھا گیا تو فرمایا: آسمان سے بارش کا برسنا اور اس سے درختوں کا پیدا ہونا اور ان ہری' ہری شاخوں پر خوش ذائقہ میووں کا لگنا ہی اللہ تعالیٰ کے وجود اور اس کی وحدانیت کی کافی دلیل ہے۔ ابن معتز فرماتے ہیں' افسوس اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اور اس کی ذات کے جھٹلانے پر لوگ کسی دلیری دکھاتے ہیں حالانکہ ہر ہر چیز اس پروردگار کی ہستی اور لاشریک ہونے پر گواہ ہے اور بزرگوں کا مقولہ ہے کہ آسمان کو دیکھو' ان کی بلندی' ان کی وسعت' ان کے چھوٹے بڑے چمکیلے اور روشن ستاروں پر نظریں ڈالو' ان کے چمکنے' دمکنے' ان کے چلنے' پھرنے اور ٹھہر جانے' ظاہر ہونے اور چھپ جانے کا مطالعہ کرو' پھر سمندروں کو دیکھو جو موجیں مارتے ہوئے زمین کو گھیرے ہوئے ہیں۔ پھر اونچے نیچے مضبوط پہاڑوں کو دیکھو' جو زمین میں کھڑے ہوئے ہیں اور اسے ہلنے نہیں دیتے۔ جن کے رنگ' جن کی صورتیں مختلف ہیں۔ پھر قسم قسم کی اور مخلوقات پر نظر ڈالو' پھر ادھر سے اُدھر پھر جانے والی کھیتیوں اور باغوں کو شاداب کرنے والی خوشنما نہروں کو دیکھو۔ کھیتوں اور باغوں کی سبزیوں اور ان کے طرح طرح کے پھول' پھل مزے مزے کے میووں پر غور کرو۔ زمین ایک' پانی ایک لیکن شکلیں' صورتیں اور خوشبوئیں' رنگت' ذائقہ' فائدہ الگ الگ۔ کیا یہ ساری مخلوق اپنے خالق کی ہستی' اس کی ذات اور اس کی توحید پر دلالت نہیں کرتی؟ یہ ہیں زوردار دلائل جو خداوند جل وعلا نے اپنی ذات کے منوانے کے لیے ہر نگاہ کے سامنے کر رکھے ہیں۔ جو اس کی زبردست قدرتوں' اس کی پُرزور حکمتوں' اس کی لافانی رحمتوں' اس کے بے نظیر انعاموں' اس کے لازوال احسانوں پر دلالت کرنے کے لیے کافی وافی ہیں۔

ہمارا اقرار ہے کہ اس کے سوا نہ کوئی پالنے پوسنے والا نہ اس کے سوا کوئی پیدا کرنے اور حفاظت کرنے والا نہ اس کے سوا کوئی معبودِ برحق' نہ اس کے سوا کوئی معبود لا شک۔ ہاں! دنیا کے لوگو!! سن رکھو' میرا توکل اور بھروسہ اسی پر ہے۔ میری انابت اور التجا اسی کی طرف ہے' میرا جھکنا اور پست ہونا اسی کے سامنے ہے۔ میری تمناؤں کا مرکز' میری اُمیدوں کا آسرا' میرا ہادی اور ملجا و ہی ایک ہے۔ اسی کے دست رحمت کو تکتا ہوں اور اسی کا نام جپتا ہوں۔

وَاِنْ كُنْتُمْ فِىْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ ۠ وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۲۳﴾ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِىْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ ۚ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۴﴾

اگر تم لوگ خلجان میں ہو اس کتاب کی نسبت جو ہم نے نازل فرمائی ہے اپنے بندہ خاص پر تو اچھا پھر تم بنا لاؤ ایک محدود ٹکڑا جو اس کا ہم پلہ ہو اور بلا لو اپنے حمایتیوں کو جو اللہ سے الگ تجویز کر رکھے ہیں' اگر تم سچے ہو۔ پھر تم اگر یہ کام نہ کر سکے اور قیامت تک بھی نہ کر سکو گے تو پھر ذرا بچتے رہو دوزخ سے جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہیں' تیار ہوئی رکھی ہے' کافروں کے واسطے ○

نبوت اور اس پر سیر حاصل بحث ☆

توحید کے بیان کے بعد نبوت کی تصدیق بیان ہو رہی ہے۔ کفار کو خطاب کر کے فرمایا جا رہا ہے کہ ہم نے جو قرآنِ پاک اپنے بندے حضرت محمد ﷺ پر اتارا ہے' اسے اگر تم ہمارا کلام نہیں مانتے تو تم اور تمہارے مددگار سب مل کر پورا قرآن تو نہیں' صرف ایک سورت اس جیسی بنا لاؤ۔ جب تم اسے نہیں کر سکتے اور اس سے عاجز ہو تو پھر اس قرآن کے کلام اللہ ہونے میں کیوں شک کرتے ہو؟ ﴿ شُهَدَآءَ ﴾ سے مراد مددگار اور شریک ہیں' جو ان کی مدد اور موافقت کیا کرتے تھے تو مطلب یہ ہوا کہ جنہیں تم نے اپنا معبود بنا رکھا ہے انہیں بھی بلا لو اور ان سے بھی مدد چاہو۔ پھر اس جیسی ایک سورت تو بنا لاؤ۔ حضرت مجاہدؒ فرماتے ہیں کہ تم اپنے حاکموں اور اپنے زبان دان فصیح و بلیغ لوگوں سے بھی امداد لے لو۔ قرآنِ پاک کے اس معجزے کا اظہار اور اس طرز کا کلام کئی جگہ ہے۔

سورۂ قصص میں ہے: ﴿ فَاْتُوْا بِكِتٰبٍ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ هُوَ اَهْدٰى مِنْهُمَآ اَتَّبِعْهُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴾ (القصص: ۴۹) یعنی اگر تم سچے ہو تو ان دونوں سے (یعنی تورات و قرآن سے) زیادہ ہدایت والی کوئی اور خدائی کتاب لاؤ' تو میں بھی اس کی تابعداری کروں گا۔ سورۂ سبحان میں فرمایا: ﴿ قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا ﴾ (بنی اسرائیل: ۸۸) یعنی اگر تمام جنات اور انسان جمع ہو کر اور ہر ایک دوسرے کی مدد کر کے یہ چاہیں کہ اس جیسا قرآن بنائیں تو بھی ان کے امکان میں نہیں۔ سورۂ ہود میں فرمایا: ﴿ اَمْ يَقُوْلُوْنَ

افۡتَرٰىهُ قُلۡ فَاۡتُوۡا بِعَشۡرِ سُوَرٍ مِّثۡلِهٖ مُفۡتَرَيٰتٍ وَّادۡعُوۡا مَنِ اسۡتَطَعۡتُمۡ مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ﴾ (ھود: ۱۸) یعنی کیا یہ لوگ یوں کہتے ہیں کہ اس قرآن کو خود اس پیغمبر نے گھڑ لیا' تم کہو کہ اگر تم سچے ہو تو تم سب مل کر اور اللہ کے سوا جنہیں تم بلا سکتے ہو بلا کر اس جیسی دس سورتیں بنا لاؤ۔

سورۂ یونس میں ہے: ﴿ وَمَا كَانَ هٰذَا الۡقُرۡاٰنُ اَنۡ يُّفۡتَرٰى مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ وَلٰكِنۡ تَصۡدِيۡقَ الَّذِىۡ بَيۡنَ يَدَيۡهِ وَ تَفۡصِيۡلَ الۡكِتٰبِ لَا رَيۡبَ فِيۡهِ مِنۡ رَّبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ اَمۡ يَقُوۡلُوۡنَ افۡتَرٰىهُ قُلۡ فَاۡتُوۡا بِسُوۡرَةٍ مِّثۡلِهٖ وَادۡعُوۡا مَنِ اسۡتَطَعۡتُمۡ مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ﴾ (یونس: ۳۷۔۳۸) یعنی یہ قرآن اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کی طرف سے گھڑا ہوا نہیں بلکہ یہ اگلی کتابوں کو سچا بتانے والا اور کتاب کی تفصیل ہے جس کے الٰہی کلام ہونے میں کوئی شک نہیں' جو ربّ العالمین کی طرف سے ہے۔ کیا یہ لوگ اسے خود ساختہ بتاتے ہیں' ان سے کہو کہ اللہ کے سوا ہر شخص کو بلا کر اس قرآن کی سینکڑوں سورتوں میں سے ایک چھوٹی سی سورت جیسی کوئی سورت تو بنا لاؤ تا کہ تمہارا سچ ظاہر ہو۔

یہ تمام آیتیں تو مکہ مکرمہ میں نازل ہوئیں اور اہل مکہ کو اس کے مقابلہ میں عاجز ثابت کر کے پھر مدینہ شریف میں بھی اس مضمون کو دوہرایا گیا' جیسے اُوپر کی آیت ﴿ مِّثۡلِهٖ ﴾ کی ضمیر کو بعض نے تو قرآن کی طرف لوٹایا ہے یعنی کوئی سورت اس جیسی بنا لاؤ۔ بعض نے یہ ضمیر محمد ﷺ کی طرف لوٹائی ہے یعنی آپ ﷺ جیسا کوئی اُمی ایسا ہو ہی نہیں سکتا ہے کہ باوجود کچھ پڑھا ہوا نہ ہونے کے وہ کلام کہے جس کا مثل کسی سے نہ بن سکے لیکن صحیح قول پہلا ہی ہے۔ مجاہد' قتادہ' عمرو بن مسعود' ابن عباس' حسن بصری اور اکثر محققین کا یہی قول ہے۔ امام ابن جریر' طبری اور محترم رازی نے بھی اس قول کو پسند کیا ہے۔ اس کی ترجیح کی بہت سی وجوہ ہیں۔ ایک اس میں سب کو ڈانٹ ڈپٹ ہے' جمع کر کے بھی اور الگ الگ بھی۔ خواہ وہ اُمی (ان پڑھ) ہوں' خواہ اہل کتاب اور پڑھے لکھے لوگ ہوں۔ اس میں اس معجزے کا کمال ہے اور بہ نسبت اس کے کہ صرف اَن پڑھ لوگوں کو عاجز کیا جائے اس میں زیادہ مبالغہ ہے۔ پھر دس سورتوں کا مطالبہ کرنا اور اس کے مثل نہ لا سکنے کی پیش گوئی کرنا بھی اسی کو ثابت کرتا ہے کہ اس سے مراد قرآن ہے نہ کہ ذاتِ رسول ﷺ۔

پس اس عام اعلان سے جو بار بار کیا گیا اور ساتھ ہی پیش گوئی بھی کر دی گئی کہ یہ لوگ اس پر قادر نہیں۔ مکہ میں اور مدینہ میں بارہا اس کا اعادہ کیا گیا اور وہ لوگ جن کی مادری زبان عربی تھی' جنہیں اپنی فصاحت اور بلاغت پر ناز تھا۔ جو لوگ آپ ﷺ پر اور آپ ﷺ کے دین پر خار کھائے بیٹھے تھے وہ درحقیقت اس سے عاجز آ گئے۔ نہ پورے قرآن کا جواب دے سکے نہ دس سورتوں کا بلکہ نہ ایک سورت کا پس ایک معجزہ تو یہ کہ اس جیسی ایک چھوٹی سی سورت بھی وہ نہ بنا سکے۔

دوسرا معجزہ ☆ دوسرا معجزہ یہ کہ پیش گوئی سچ ثابت ہوئی کہ یہ ہرگز اس جیسا نہیں بنا سکتے' گو سب جمع ہو جائیں اور قیامت تک محنت کریں۔ پس ایسا ہی ہوا' نہ تو اس زمانہ میں کسی کی ایسی جرأت ہوئی اور نہ اس کے بعد آج تک اور نہ قیامت تک کسی سے یہ ہو سکے گا اور بھلا کیسے ہو سکتا؟ جس طرح اللہ تعالیٰ کی ذات بے مثل' اسی طرح اس کا کلام بھی۔ حقیقت بھی یہ ہے کہ قرآن پاک کو بیک نظر دیکھنے سے اس کے ظاہری اور باطنی' لفظی اور معنوی وہ وہ کمالات ظاہر ہوتے ہیں جو مخلوق کے بس کے نہیں۔ خود ربّ العالمین فرماتا ہے: الٓرٰ كِتٰبٌ اُحۡكِمَتۡ اٰيٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتۡ (ھود: ۱) یعنی اس کتاب کی آیتیں' جو حکمت والے خبردار خداوند کی طرف سے نازل شدہ ہیں۔ محکم' مضبوط اور مفصل الگ الگ ہیں۔ پس الفاظ محکم اور معانی

مفصل یا الفاظ مفصل اور معانی محکم۔ پس قرآن اپنے الفاظ میں اور اپنے مضامین میں بے نظیر ہے۔ جس کے مقابلے[1] اور معارضے سے، جس کی نظیر اور مثل سے دنیا عاجز و بے بس ہے۔ اس پاک کلام میں جو اگلی خبریں دنیا میں پوشیدہ تھیں، وہ ہو بہو بیان کی گئیں۔ آنے والے اُمور کے تذکرے ہوئے، جو لفظ بلفظ پورے اُترے۔ تمام بھلائیوں کا حکم اس میں، تمام برائیوں سے ممانعت اس میں ہے، سچ ہے: ﴿ وَ تَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّ عَدْلًا ﴾ (الانعام: ۱۱۵) یعنی سچائی خبروں میں اور عدل احکام میں تیرے ربّ کے کلام میں پورا پورا ہے۔ یہ پاکیزہ کلام قرآن سارا حق و صداقت، عدالت اور ہدایت سے پُر ہے۔

قرآن شاعری نہیں ☆ نہ قرآن میں واہی تباہی باتیں ہیں، نہ اس میں ہنسی مذاق، کذب و افتراء جو شاعروں کے کلام میں عموماً پایا جاتا ہے بلکہ ان کے اشعار کی قدر و قیمت ہی اسی پر ہے۔ مقولہ مشہور ہے: اغذبه اکذبه جو جھوٹ زیادہ وہ زیادہ مزیدار۔ تم دیکھو گے کہ لمبے لمبے پُر زور قصیدے، مبالغہ اور کذب آمیز یا تو عورتوں کی تعریف و توصیف میں ہوں گے یا گھوڑوں اور شراب کی ستائش میں ہوں گے یا کسی انسان کی بڑھی چڑھی مدح و تعریف میں ہوں گے یا اونٹنیوں کی آرائش یا بہادری کے پر مبالغہ گیت یا لڑائیوں کی چالبازیوں یا ڈر و خوف کے خیالی منظروں کے بیان میں ہوں گے، جن سے کوئی فائدہ نہیں۔ نہ دنیا کا، نہ دین کا۔ صرف شاعر کی زبان دانی اور اس کی قدرتِ کلام ظاہر ہوتی ہے اور بس، نہ تو اخلاق پر ان سے کوئی عمدہ اثر، نہ اعمال پر[2]۔

پھر نفس مضمون کے بھی پورے قصیدے میں بمشکل دو ایک شعر ہوتے ہیں۔ باقی سب بھرتی کے اور ادھر اُدھر کی لا یعنی اور فضول بکواس کے۔ برخلاف اس کے قرآنِ پاک پر نظر ڈالو تو تم دیکھو گے کہ اس کا ایک ایک لفظ فصاحت و بلاغت سے، دین و دنیا کے نفع سے، خیر و برکت سے پُر ہے۔ پھر کلام کی ترتیب و تہذیب، الفاظ کی بندش اور عبارت کی روانی، معانی کی نورانیت، مضمون کی پاکیزگی سونے پہ سہاگہ ہے۔ اس کی خبروں کی حلاوت، اس کے بیان کردہ واقعات کی سلاست، مردہ

---

[1] سبحان اللہ! اللہ تعالیٰ کتنے سہل اور سادہ الفاظ میں ایک دعویٰ (آفر) کرتا ہے لیکن دُنیا بھر کے مستشرقین و منکرین آج تک جواب دینا تو کجا اس دعویٰ سے آنکھیں ہی چرائے چھپتے پھرتے ہیں۔ ۱۱ ستمبر کے حادثے کے بعد دہشت گرد امریکہ کی ہمدردی میں ساری عیسائی دنیا اور یہود و ہنود اگرچہ ایک ہو چکے ہیں اور جگہ جگہ پہلے مسلمانوں پہ وار کرتے پھرے اور اس کے بعد جب مسلمانوں کی پست ہمتی کی وجہ سے کوئی ردِ عمل نہ ملا تو زبانیں یہاں تک دراز ہوئیں کہ اب چند روز پہلے امریکی یونیورسٹی کے پروفیسر نے ''ایک اسلامی حکومت'' سے یہ مطالبہ داغ دیا کہ قرآن میں جہاں جہاں یہود کے بارے میں نافرمان ہونے کا ذکر ہے اور جہاد کی ترغیب ہے اُن آیات کو نکال دیا جائے۔ سبحان اللہ! لیکن کوئی فرد واحد تو کیا، کوئی مملکت تو کیا، بلکہ پوری دُنیا بھی مل جائے تو قرآن کے ایک حرف کو ادھر سے اُدھر کرنے کی سکت نہیں رکھتی کجا کہ اس جیسی ایک اور آیت بنا سکے۔ اس لیے یہود و ہنود جتنا مرضی کہے کہ مسلمانوں کے خلاف "Crostatde War" ''مقدس جنگ'' شروع ہو چکی ہے اور اس کا پہلا نشانہ قرآن ہے لیکن دُنیا نے اُن کی ناکامیاں پہلے بھی دیکھیں اور اب بھی ہر ٹیکنالوجی میں ماہر کہلوانے کے باوجود قرآن کے مقابل اُن کی جیت کے کوئی آثار نہیں دکھتے نہ ہمیں اور نہ ہی خود اُنہیں۔ کاش کہ مسلمان ایک ہو جائیں تو پھر بقول شخصے ؎ یہ بازو میرے آزمائے ہوئے ہیں۔ (حافظ)

[2] عموماً شعر و شاعری کی یہی خصوصیات ہیں لیکن اگر بعض اشعار اخلاق کی تعلیم، پاکیزہ عادات و اطوار کی ترغیب، مہمات، مسائل اور مشکلات کو انگیز کرنے یا پھر حمد باری اور سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم کی توصیف و منقبت وغیرہ پر پھیلے ہوئے ہوں تو وہ ابن کثیرؒ کی اس تنقید کے دائرے سے یقیناً باہر ہوں گے۔

دِلوں کی زندگی ہے۔ اس کا اختصار کمال کا اعلیٰ نمونہ اور اس کی تفصیل معجزے کی جان ہے۔ اس کا کسی چیز کو دہرانہ قند مکرر کا مزہ دیتا ہے۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ گویا سچے موتیوں کی بارش ہو رہی ہے۔ بار بار پڑھو اور دِل نہ اُکتائے۔ مزے لیتے جاؤ اور ہر وقت نیا مزہ پاؤ۔ مضامین سمجھتے جاؤ اور ختم نہ ہوں۔ یہ قرآن کا ہی خاصہ ہے۔ اس چاشنی کا ذائقہ اس مٹھاس کا مزہ کوئی اُن سے پوچھے، جنہیں عقل و حواس، علم و فضل کا کچھ حصہ قدرت نے عطا فرمایا ہے۔ اس کا ڈروا اور دھمکاوا عذابوں اور پکڑ دھکڑ کا بیان، مضبوط پہاڑوں کو ہلا دے انسانی دِل تو کیا ہیں۔ اس کا وعدے اور خوشخبریاں نعمتوں اور رحمتوں کا بیان دلوں کی پژمردہ کلی کو کھلا دینے والا شوق و تمنا کے بجھے جذبات کو اُبھار دینے والا جنتوں اور راحتوں کے پیارے پیارے مناظر کو آنکھوں کے سامنے کر دینے والا ہے۔ دِل کھل جاتے ہیں اور کان لگ جاتے ہیں آنکھیں کھل جاتی ہیں۔

رغبت دیتے ہوئے وہ فرماتا ہے: ﴿ فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ...... ﴾ (سجدہ: ۱۷) کوئی کیا جانے کہ اس کے نیک اعمال کے بدلے اس کی آنکھوں کی ٹھنڈک کا کیا کیا سامان چپکے چپکے تیار کیا جا رہا ہے۔ ﴿ وَفِيهَا مَا تَشْتَهِيهِ الْاَنْفُسُ ..... ﴾ (الزخرف: ۷۱) اس ہمیشگی والی جنت میں ہر وہ چیز ہے جو دِل کو بھائے اور دل کو سرور پہنچائے اور آنکھوں میں کھب جائے (یعنی انسان دیکھتا ہی رہ جائے ۱۲) ڈراتے اور دھمکاتے ہوئے فرماتا ہے: ﴿ اَفَاَمِنْتُمْ اَنْ يَّخْسِفَ بِكُمْ جَانِبَ الْبَرِّ ﴾ (بنی اسرائیل ۶۸) فرمایا: ﴿ ءَاَمِنْتُمْ مَّنْ فِي السَّمَآءِ اَنْ يَّخْسِفَ بِكُمُ الْاَرْضَ فَاِذَا هِيَ تَمُوْرُ اَمْ اَمِنْتُمْ مَّنْ فِي السَّمَآءِ اَنْ يُّرْسِلَ عَلَيْكُمْ حَاصِبًا فَسَتَعْلَمُوْنَ كَيْفَ نَذِيْرِ ﴾ (الملک: ۱۶-۱۷) کیا تم اپنے دھنسائے جانے یا آسمان سے پتھر برسائے جانے سے نڈر ہو گئے ہو؟ کیا آسمانوں والا اس پر قادر نہیں؟ اسے محض دھمکی ہی نہ سمجھو بلکہ اس کی حقیقت عنقریب تم پر کھل جائے گی۔

زجر و توبیخ ڈانٹ ڈپٹ کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے: ﴿ فَكُلًّا اَخَذْنَا بِذَنْبِهٖ ﴾ (العنکبوت: ۴۰) ایک ایک کو ہم نے اس کی بدکرداریوں میں پکڑ لیا۔ بطرزِ وعظ نصیحت بیان ہوتا ہے۔ ﴿ اَفَرَاَيْتَ اِنْ مَّتَّعْنٰهُمْ سِنِيْنَ ثُمَّ جَآءَهُمْ مَّا كَانُوْا يُوْعَدُوْنَ مَآ اَغْنٰى عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يُمَتَّعُوْنَ ﴾ (الشعراء: ۲۰۷) اگر ہم نے کچھ سال انہیں فائدہ بھی دیا تو کیا ہوا؟ آخر وعدے کی گھڑی آ پہنچی اور اس جاہ و جلال نے کوئی نفع نہ بخشا۔ غرض کوئی کہاں تک بیان کرے۔ جس مضمون کو بھی لیا اُسے کمال تک پہنچا کر چھوڑا ہے اور طرح طرح کی فصاحت و بلاغت، حلاوت و حکمت سے معمور کر دیا ہے۔ حکم احکام، روک ٹوک کو دیکھئے۔ ہر حکم اچھائی، بھلائی نفع اور پاکیزگی کا جامع۔ ہر ممانعت، قباحت، رذالت، دنائت اور خباثت کا قاطع۔

ابن مسعودؓ وغیرہ اسلافِ امت کا قول ہے کہ جب قرآن میں ﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ﴾ سنو تو کان لگا دو کہ یا تو کسی اچھائی کا حکم ہوگا یا کسی برائی سے منع کیا جائے گا۔ خود پروردگارِ عالم فرماتا ہے: ﴿ يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَ يَنْهٰهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ يُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَ يُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَ يَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ ﴾ (الاعراف ۱۵۷) یعنی بھلائیوں کا حکم دیتا ہے برائیوں سے روکتا ہے۔ پاکیزہ چیز حلال کرتا ہے۔ خبیث چیزیں حرام کرتا ہے۔ وہ بوجھل بیڑیاں جو پاؤں میں تھیں وہ سخت طوق جو گلے میں تھا اُتار پھینکتا ہے ......۔

قیامت کے بیان کی آیتیں وہاں کے خوفناک منظر جنت و دوزخ کا بیان رحمتوں اور زحمتوں کا پورا پورا وصف اولیاء اللہ کے لیے طرح طرح کی نعمتیں دشمنانِ خدا کے لیے طرح طرح کے عذاب۔ کہیں بشارت ہے کہیں ڈراوا ہے کہیں

نیکیوں کی طرف رغبت ہے۔ کہیں بدکاریوں سے ممانعت ہے' کہیں دُنیا کی طرف رغبت کرنے کی' کہیں آخرت کی طرف رغبت کرنے کی تعلیم ہے۔ یہی وہ تمام آیتیں ہیں جو راہِ راست دکھاتی ہیں اور بہترین راہنمائی کرتی ہیں اور اللہ کی پسندیدہ شریعت کی طرف جھکاتی ہیں اور دِلوں کو جلا دیتی ہیں اور شیطانی دروازوں کو بند کر دیتی ہیں اور برے اثرات زائل کرتی ہیں۔

صحیح مسلم و بخاری میں بروایت حضرت ابو ہریرہؓ مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ہر نبی کو ایسے معجزے دیئے گئے کہ جنہیں دیکھ کر لوگ اُن پر ایمان لائے اور میرا معجزہ اللہ کی وحی یعنی قرآنِ پاک ہے۔ اس لیے مجھے اُمید ہے کہ میرے تابعدار بہ نسبت اور نبیوں کے بہت زیادہ ہوں گے۔ اس لیے کہ اور انبیاء کے معجزے ان کے ساتھ چلے گئے لیکن حضور ﷺ کا یہ معجزہ قیامت تک باقی رہے گا۔ لوگ اسے دیکھتے جائیں گے اور اسلام میں داخل ہوتے جائیں گے۔ حضور ﷺ کا یہ فرمان کہ میرا معجزہ وحی ہے' جو مجھ کو دیا گیا ہے' سے مطلب یہ ہے کہ یہ معجزہ میرے ساتھ خاص ہے اور یہ قرآنِ پاک مجھی کو ملا ہے جو اپنے معارضے اور مقابلے سے تمام دنیا کو عاجز کر دینے والا ہے۔ بخلاف دوسری آسمانی کتابوں کے کہ وہ اکثر علماء کے نزدیک اس وصف سے خالی ہیں' واللہ اعلم۔

آنحضرت ﷺ کی نبوت' آپ ﷺ کی صداقت اور دین اسلام کی حقانیت پر علاوہ اس معجزے کے اور بھی اس قدر دلائل ہیں جو گنے بھی نہیں جاسکتے۔ وللہ الحمد والمنہ۔

بعض متکلمین نے قرآنِ کریم کے اعجاز کو ایسے طریقہ پر بیان کیا ہے جو اہل سنت کے اور معتزلہ کے قول کو شامل ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ یا تو یہ قرآن فی نفسہٖ معجزہ ہے۔ انسان کے امکان میں ہی نہیں کہ وہ اس جیسا بنا سکے۔ انہیں اس کا معارضہ کرنے کی قدرت و طاقت ہی نہیں یا یہ کہ گو اس کا معارضہ ممکن ہے اور انسانی طاقت سے باہر نہیں لیکن باوجود اس کے انہیں معارضہ کا چیلنج دیا جاتا ہے۔ وہ عداوت اور دشمنی میں بڑھے ہوئے ہیں۔ وہ دین حق کو مٹانے کے لیے ہر وقت اور ہر طاقت کو خرچ کرنے اور ہر چیز کے برباد کرنے کے لیے تیار ہیں۔ تاہم قرآن کا معارضہ اور مقابلہ ان سے نہیں کیا جا سکتا۔ یہ دلیل ہے اس بات کی کہ یہ قرآن اللہ کی جانب سے ہے کہ باوجود قدرت و طاقت ہونے کے وہ انہیں روک دیتا ہے اور وہ قرآن کا مثل پیش کرنے سے عاجز ہو جاتے ہیں۔ گو یہ پچھلی وجہ اتنی پسندیدہ نہیں۔ تاہم اگر اسے بھی مان لیا جائے تو اس سے بھی قرآنِ پاک کا معجزہ ہونا ثابت ہے جو بطریق تنزل حمایت حق اور مناظرے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ امام رازیؒ نے بھی چھوٹی چھوٹی سورتوں کے سوال کے جواب میں یہی طریقہ اختیار کیا ہے۔

وَقُوْدُ: وَقُوْدُ کے معنی ایندھن جس سے آگ جلائی جائے۔ جیسے چھپٹیاں' لکڑیاں وغیرہ۔ قرآنِ کریم میں ایک جگہ ہے: ﴿وَاَمَّا الْقٰسِطُوْنَ فَكَانُوْا لِجَهَنَّمَ حَطَبًا﴾ (الجن: ۱۵) ظالم لوگ جہنم کی لکڑیاں ہیں اور جگہ فرمایا: تم اور تمہارے وہ معبود جو اللہ کے سوا ہیں' جہنم کی لکڑیاں ہیں' تم سب اس میں آؤ گے۔ اگر وہ سچے معبود ہوتے تو وہاں وارد نہ ہوتے۔ دراصل یہ سب کے سب اس میں ہمیشہ رہنے والے ہیں اور حجارہ کہتے ہیں پتھر کو۔ یہاں مراد گندھک کے سخت سیاہ اور بڑے بڑے اور بدبودار پتھر ہیں۔ جن کی آگ بہت تیز ہوتی ہے۔ اللہ ہمیں محفوظ رکھے۔ حضرت ابن مسعودؓ فرماتے ہیں' ان پتھروں کو زمین و آسمان کی پیدائش کے ساتھ ہی آسمانِ اوّل پر پیدا کیا گیا ہے۔ (ابن جریر) ابن ابی حاتم مستدرک حاکم' ابن عباسؓ' ابن مسعود اور چند صحابہ (رضی اللہ عنہم) سے سعدی نے نقل کیا ہے کہ جہنم میں یہ سیاہ گندھک کے پتھر بھی

ہیں۔ جن کی سخت آگ سے کافروں کو عذاب دیا جائے گا۔ حضرت مجاہد فرماتے ہیں ان پتھروں کی بو مردار کی بو سے بھی زیادہ سخت ہے۔ محمد بن علی اور ابن جریج بھی کہتے ہیں' مراد گندھک کے بڑے بڑے اور سخت پتھر ہیں۔ بعضوں نے کہا ہے مراد وہ پتھر ہیں: جن کی تصویریں وغیرہ بنائی جاتی تھیں اور پھر ان کی پرستش کی جاتی تھی جیسے اور جگہ ہے: ﴿ اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ ﴾ (الانبیاء ۹۸) تم اور تمہارے وہ معبود جو اللہ کے سوا ہیں' جہنم کی لکڑیاں ہو۔ قرطبی اور رازی نے اسی قول کو ترجیح دی ہے اور کہا ہے کہ گندھک کے پتھر کو آگ لگنا کوئی نئی بات نہیں۔ اس لیے مراد یہی اصنام و انداد بت اور جو پتھر کسی شکل میں بھی اللہ کے سوا پوجے جاتے ہیں لیکن یہ وجہ کوئی قوی نہیں۔ اس لیے کہ جب آگ گندھک کے پتھروں سے سلگائی جائے تو ظاہر ہے کہ اس کی تیزی اور حرارت معمولی آگ سے بہت زیادہ ہوگی۔ اس کا بھڑکنا' جلنا اور سوزش اور شعلے بھی بہت زیادہ ہوں گے۔ علاوہ اس کے پھر سلف سے بھی اس کی تفسیر یہی مروی ہے۔ اسی طرح ان پتھروں میں آگ لگنا بھی ظاہر ہے اور آیت میں مقصود آگ کی تیزی اور اس کی سوزش کا بیان کرنا ہے اور اس کے بیان کے لیے بھی یہاں پتھر سے مراد گندھک کے پتھر لینا ہی زیادہ مناسب ہے تاکہ وہ آگ تیز ہو اور اس سے بھی عذاب میں سختی ہو۔ قرآنِ کریم میں ہے: ﴿ كُلَّمَا خَبَتْ زِدْنٰهُمْ سَعِيْرًا ﴾ (بنی اسرائیل ۹۷) جہاں شعلے ہلکے ہوئے کہ ہم نے اور بھڑکا دیا۔

ایک حدیث میں ہے کہ ہر موذی آگ میں ہے لیکن یہ حدیث محفوظ و معروف نہیں۔ قرطبی فرماتے ہیں' اس کے دو معنی ہیں۔ ایک یہ کہ ہر وہ شخص جو دوسروں کو ایذاء دے' جہنمی ہے۔ دوسرے یہ کہ ہر ایذاء دہندہ شے جہنم کی آگ میں موجود ہوگی جو جہنمیوں کو عذاب دے گی۔ اُعِدَّتْ یعنی تیار کی گئی سے مراد بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ آگ کافروں کے لیے تیار کی گئی ہے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ مراد پتھر ہوں۔ یعنی وہ پتھر تیار کیے گئے ہیں کافروں کے لیے۔ ابن مسعودؓ کا یہی قول ہے اور فی الحقیقت دونوں معنی میں کوئی اختلاف نہیں' اس لیے کہ پتھروں کا تیار کیا جانا آگ کے جلانے کے لیے ہے اور آگ کے تیار کرنے کے لیے پتھروں کا تیار کیا جانا ضروری ہے۔ لہٰذا ایک دوسرے کے ساتھ لازم و ملزوم ہوگیا۔ ابن عباسؓ فرماتے ہیں ہر وہ شخص جو کفر پر ہو' اس کے لیے وہ آگ تیار ہے۔ (طبری) اس آیت سے استدلال کیا گیا ہے کہ جہنم اب بھی موجود اور پیدا شدہ ہے کیونکہ اُعِدَّتْ کا لفظ استعمال ہوا ہے اور اس کی دلیل میں بہت سی حدیثیں بھی ہیں۔

ایک طویل حدیث میں ہے' جنت اور دوزخ میں جھگڑا ہوا...... (بخاری) دوسری حدیث میں ہے' جہنم نے اللہ تعالیٰ سے دو سانس لینے کی اجازت چاہی اور اسے سردی میں ایک سانس لینے کی اور گرمی میں دوسرا سانس لینے کی اجازت دی گئی۔ (بخاری) تیسری حدیث میں ہے' صحابہؓ کہتے ہیں' ہم نے ایک مرتبہ بڑے زور کی آواز سنی۔ حضور ﷺ سے پوچھا گیا' یہ کس چیز کی آواز ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ستر سال پہلے ایک پتھر جہنم میں پھینکا گیا تھا۔ آج وہ پہنچا۔ (مسلم) چوتھی حدیث میں ہے کہ حضور ﷺ نے سورج گہن کی نماز پڑھتے ہوئے جہنم کو دیکھا۔ (بخاری) پانچویں حدیث میں یہ ہے کہ آپ ﷺ نے شبِ معراج میں جہنم کو اور اس کے عذابوں کو ملاحظہ فرمایا۔ اسی طرح کی اور بہت سی صحیح متواتر احادیث ہیں۔ معتزلہ اپنی جہالت کی وجہ سے اسے نہیں مانتے اور اس کے خلاف کہتے ہیں اور قاضی اندلس منذر بن سعید بلوطی نے بھی ان کی موافقت کی ہے۔

فوائد ☆ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ یہاں اور سورۂ یونس میں جو کہا گیا ہے کہ ایک ہی سورت اس کے مانند لاؤ' یہ شامل ہے۔

چھوٹی بڑی ہر سورت کو اس لیے کہ عربیت کے قاعدے کے مطابق جو اسم نکرہ ہو اور شرط کے طور پر لایا گیا ہو۔ وہ عمومیت کا فائدہ دیتا ہے۔ جیسا کہ نکرہ نفی کے تحت میں استغراق کا فائدہ دیتا ہے۔ پس لمبی سورتوں اور چھوٹی سورتوں میں ہر ایک میں اعجاز ہے اور اس بات پر سلف و خلف کا اتفاق ہے۔

امام رازی رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیق ☆ امام رازیؒ اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ اگر کوئی کہے کہ سورت کا لفظ سورۂ کوثر اور سورۃ العصر اور سورۃ الکافرون جیسی چھوٹی سورتوں کو بھی شامل ہے اور یہ بالیقین معلوم ہے کہ اس جیسی یا اس کے قریب قریب کسی سورۃ کا بنا لینا ممکن ہے' اسے انسانی طاقت سے خارج کہنا نری ہٹ دھرمی اور بے جا طرفداری ہے۔ تو ہم جواب دیں گے کہ ہم نے اس کے معجز نماز ہونے کے دو طریقے بیان کر کے دوسرے طریقہ کو اسی لیے پسند کیا ہے۔ ہم کہتے ہیں اگر یہ چھوٹی سورتیں بھی فصاحت و بلاغت میں اسی پایہ کی ہیں کہ وہ معجزہ کہی جا سکیں اور ان کا تعارض ممکن نہ ہو تو مقصود حاصل ہو گیا اور اگر یہ سورتیں ایسی نہیں تو بھی ہمارا مقصود حاصل ہے۔ اس لیے کہ باوجود ان جیسی سورتوں کے بنا لانے پر انسانی قدرت ہونے کے پھر لوگوں کا بنا نہ سکنا' جو سخت تر دشمنی اور ہر طرح کی زبردست کوششوں کے صاف دلیل ہے۔ اس امر پر کہ یہ قرآن مع اپنی اپنی چھوٹی سورتوں کے سراسر معجزہ ہے۔ یہ تو کلام رازیؒ کا ہے لیکن صحیح قول یہ ہے کہ قرآن پاک کی ہر چھوٹی بڑی سورت فی الواقع معجزہ ہے اور انسان اس کی نظیر بنانے سے محض عاجز اور بالکل ناطاقت ہے۔

امام شافعیؒ فرماتے ہیں' اگر لوگ غور و تدبر سے' عقل و ہوش سے صرف سورۃ العصر کو سمجھ لیں تو سب کو کافی ہو جائے۔

حضرت عمرو بن العاصؓ جب وفد میں مسیلمہ کذاب کے پاس گئے اور ابھی یہ خود بھی مسلمان نہ ہوئے تھے' تو مسیلمہ نے اُن سے پوچھا کہ مکہ سے تم آ رہے ہو' بتاؤ تو آج کل کوئی تازہ وحی بھی نازل ہوئی ہے؟ اُس نے کہا: ابھی ابھی ایک مختصر سی سورت نازل ہوئی ہے جو بے حد فصیح و بلیغ اور جامع و مانع ہے۔

پھر سورۃ العصر پڑھ کر سنائی تو مسیلمہ نے کچھ دیر سوچ کر اس کے مقابلہ میں کہا کہ مجھ پر بھی ایک ایسی ہی سورت نازل ہوئی ہے۔ اُس نے کہا: ہاں! تم بھی سناؤ۔ تو اس نے کہا: **یاوبرہ انما انت اذنان و سدرہ و سائرك حقر فقر**۔ یعنی اے جنگلی چوہے' اے جنگلی چوہے' تیرا وجود سوائے دو کانوں اور سینے کے اور کچھ بھی نہیں' باقی تو سراسر بالکل ناچیز ہے۔ پھر فخر یہ کہنے لگا: کہو' اے عمرو کیسی ہے؟ اس نے کہا: مجھ سے کیا پوچھتے ہو؟ اسے تو خود جانتا ہے کہ سراسر کذب و بہتان ہے۔ بھلا کہاں یہ فضول کلام اور کہاں حکمتوں سے پُر وہ کلام۔

وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ؕ كُلَّمَا رُزِقُوْا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا ۙ قَالُوْا هٰذَا الَّذِيْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ ۙ وَاُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا ؕ وَلَهُمْ فِيْهَآ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ۙ وَّهُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۵﴾

اور خوشخبری سنا دیجئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اے پیغمبر ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور کام کیے اچھے۔ اس بات کی کہ بیشک ان

نے واسطے بہشتیں ہیں کہ چلتی ہوں گی ان کے نیچے نہریں۔ جب کبھی دیئے جائیں گے وہ لوگ ان بہشتوں میں سے کسی پھل کی غذا تو ہر بار یہی کہیں گے کہ یہ تو وہی ہے جو ہم کو ملا تھا اس سے پیشتر اور ملے گا بھی ان کو دونوں بار کا پھل ملتا جلتا اور ان کے واسطے ان بہشتوں میں بیبیاں ہوں گی' صاف پاک کی ہوئی اور وہ لوگ ان بہشتوں میں ہمیشہ کو بسنے والے ہوں گے ○

بہشتیوں کے لیے اَبدی نعمتیں ☆

چونکہ پہلے کافروں اور دشمنانِ دین کی سزا عذاب اور رسوائی کا ذکر ہوا تھا' اس لیے یہاں ایمانداروں اور نیک صالح لوگوں کی جزاء' ثواب اور سرخروئی کا بیان ہوا۔ قرآن کے مثالی ہونے کے ایک معنی یہ ہیں اور صحیح تر قول بھی یہی ہے کہ اس میں ہر مضمون جوڑ جوڑ ہے۔ اس کا مفصل ذکر بھی کسی مناسب جگہ آئے گا۔ مطلب یہ ہے کہ ایمان کے ساتھ ہی کفر کا' کفر کے ساتھ ایمان کا' نیکوں کے ساتھ بدوں کا اور بدوں کے ساتھ نیکوں کا ذکر ضرور آتا ہے۔ جن چیز کا بیان ہوتا ہے ساتھ ہی اس کے مقابلہ کی چیز کا بھی ذکر کر کے اس کی نظیر کو بھی کہیں بیان کیا گیا ہے۔ یہ معنی ہیں متشابہ ہونے کے اور یہ دونوں الفاظ قرآن کے اوصاف میں وارد ہوئے ہیں۔ اسے مثالی بھی کہا گیا ہے اور متشابہ بھی فرمایا گیا ہے۔ جنتوں کے نیچے نہریں بہنا' اس کے درختوں اور بالا خانوں کے نیچے بہنا ہے۔

حدیث شریف میں ہے کہ نہریں بہتی ہیں لیکن گڑھا نہیں اور حدیث میں ہے کہ نہر کوثر کے دونوں کنارے سچے موتیوں کے قبے ہیں۔ اس کی مٹی مشک خالص ہے اور اس کی کنکریاں لولو اور جواہر ہیں۔ (بخاری) اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے ہمیں بھی یہ نعمتیں عطا فرمائے۔ وہ احسان کرنے والا اور بڑا رحیم ہے۔ حدیث میں ہے جنت کی نہریں مشکی پہاڑوں کے نیچے سے جاری ہوتی ہیں۔ (ابن ابی حاتم)

حضرت عبداللہؓ سے بھی یہ مروی ہے' جنتیوں کا یہ قول کہ پہلے بھی ہمیں یہ دیئے گئے تھے' اس سے مراد یہ ہے کہ دنیا میں بھی یہ میوے ہمیں ملے تھے۔ صحابہؓ وغیرہ سے یہ مروی ہے۔ ابن جریر بھی اس کی تائید کرتے ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ مطلب یہ ہے کہ ہم اس سے پہلے یعنی کل بھی یہی دیئے گئے تھے۔ یہ اس لیے کہیں گے کہ ظاہری شکل وصورت میں وہ بالکل مشابہ ہوں گے۔ یحییٰ بن کثیر کہتے ہیں کہ ایک پیالہ آئے گا' کھائیں گے' پھر دوسرا آئے گا تو کہیں گے یہ تو ابھی کھایا ہے۔ فرشتے کہیں گے آپ کھائیے تو اگر صورت وشکل یکساں ہے لیکن مزہ اور ہی ہے۔ فرماتے ہیں جنت کی گھاس زعفران ہے۔ اس کے ٹیلے مشک کے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے خوبصورت غلمان اِدھر سے اُدھر سے میوے لا لا کر پیش کر رہے ہیں۔ وہ کھا رہے ہیں۔ وہ پھر پیش کرتے ہیں تو کہتے ہیں۔ اسے تو ابھی کھایا ہے۔ وہ جواب دیتے ہیں۔ حضرت رنگ وروپ ایک ہے لیکن ذائقہ اور ہی ہے۔ چکھ کر دیکھئے۔ کھاتے ہیں تو اور ہی لطف پاتے ہیں۔ یہی معنی ہیں کہ ہم شکل لائیں گے۔ دنیا کے میووں سے بھی نام اور شکل وصورت میں ملتے جلتے ہوں گے لیکن مزہ کچھ دوسرا ہی ہوگا۔

حضرت ابن عباسؓ کا قول ہے کہ صرف نام میں مشابہت ہے۔ ورنہ کہاں یہاں کی چیز' کہاں وہاں کی چیز۔ یہاں تو صرف نام ہی ہے۔ (طبری) عبدالرحمٰن کا قول ہے کہ دُنیا کے پھلوں جیسے ہیں' دیکھ کر کہہ دیں گے یہ تو کھا رکھا ہے مگر جب چکھیں گے تو لذت کچھ اور ہی ہوگی۔ وہاں جو بیویاں انہیں ملیں گی وہ گندگی' ناپاکی' حیض ونفاس' پیشاب' پاخانہ' تھوک

رینٹ، منی وغیرہ سے پاک صاف ہوں گی۔

حوا علیہا السلام بھی پہلے حیض سے پاک تھیں لیکن نافرمانی سرزد ہوتے ہی یہ بلا آ گئی لیکن یہ قول سنداً غریب ہے۔ ایک غریب مرفوع حدیث میں ہے کہ حیض، پاخانہ، تھوک، رینٹ سے وہ پاک ہیں۔ حاکم اس حدیث کو صحیح اور شرطِ شیخین پر بتاتے ہیں لیکن یہ دعویٰ صحیح نہیں۔ اس کے ایک راوی عبدالرزاق بن عمر بزیعی ہیں۔ جنہیں ابو حاتم البستی نے احتجاج کے قابل نہیں سمجھا۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ مرفوع حدیث نہیں بلکہ حضرت قتادہؒ کا قول ہے، واللہ اعلم۔ ان تمام نعمتوں کے ساتھ اس زبردست نعمت کو دیکھئے کہ نہ یہ نعمتیں فنا ہوں، نہ نعمتوں والے فنا ہوں۔ نہ نعمتیں ان سے چھنیں، نہ یہ نعمتوں سے الگ کیے جائیں گے۔ نہ موت ہے، نہ خاتمہ ہے، نہ آخر ہے، نہ ٹوٹنا ہے اور کم ہونا ہے۔ اللہ ربّ العالمین جواد و کریم و رحیم سے التجا ہے کہ وہ مالک ہمیں بھی اہل جنت کے زمرے میں شامل کرے اور انہی کے ساتھ ہمارا حشر کرے۔ آمین

إِنَّ اللَّهَ لَا يَسْتَحْيِي أَنْ يَضْرِبَ مَثَلًا مَا بَعُوضَةً فَمَا فَوْقَهَا ۚ فَأَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا فَيَعْلَمُونَ أَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَبِّهِمْ ۖ وَأَمَّا الَّذِينَ كَفَرُوا فَيَقُولُونَ مَاذَا أَرَادَ اللَّهُ بِهَٰذَا مَثَلًا ۘ يُضِلُّ بِهِ كَثِيرًا وَيَهْدِي بِهِ كَثِيرًا ۚ وَمَا يُضِلُّ بِهِ إِلَّا الْفَاسِقِينَ ﴿٢٦﴾ الَّذِينَ يَنْقُضُونَ عَهْدَ اللَّهِ مِنْ بَعْدِ مِيثَاقِهِ وَيَقْطَعُونَ مَا أَمَرَ اللَّهُ بِهِ أَنْ يُوصَلَ وَيُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ ۚ أُولَٰئِكَ هُمُ الْخَاسِرُونَ ﴿٢٧﴾

ہاں! واقعی اللہ تعالیٰ تو نہیں شرماتے اس بات سے کہ بیان کر دیں کوئی مثال بھی خواہ مچھر کی ہو، خواہ اس سے بھی بڑھی ہوئی ہو۔ سو! جو لوگ ایمان لائے ہوئے ہیں خواہ کچھ ہی ہو وہ تو یقین کریں گے کہ بے شک یہ مثال بہت ہی موقع کی ہے۔ ان کے رب کی جانب سے اور رہ گئے وہ لوگ جو کافر ہو چکے ہیں سو چاہے کچھ بھی ہو جائے وہ یوں ہی کہتے رہیں گے وہ کون۔ مطلب ہو گا کہ جس کا قصد کیا ہو گا اللہ تعالیٰ نے اس حقیر مثال سے، گمراہ کرتے ہیں اللہ تعالیٰ اس مثال کی وجہ سے بہتوں کو اور ہدایت کرتے اس کی وجہ سے بہتوں کو اور گمراہ نہیں کرتے اس مثال سے کسی کو مگر صرف بے حکمی کرنے والوں کو جو کہ توڑتے رہتے ہیں۔ اس معاہدہ کو جو اللہ تعالیٰ سے کر چکے تھے۔ اس کے استحکام کے بعد اور قطع کرتے رہتے ہیں ان تعلقات کو کہ حکم دیا ہے اللہ تعالیٰ نے ان کے وابستہ رکھنے کا اور فساد کرتے رہتے ہیں، زمین میں۔ پس یہ لوگ ہیں پورے خسارے میں پڑنے والے ○

اللہ عزوجل حقیر امثال بیان کرنے سے نہیں شرماتا ☆

ابن عباس' ابن مسعود اور چند صحابہ رضی اللہ عنہم سے روایت ہے کہ جب اُوپر کی تین آیتوں میں دو مثالیں منافقوں کی بیان ہوئیں' یعنی آگ کی اور پانی کی۔ تو وہ کہنے لگے کہ ایسی ایسی چھوٹی مثالیں اللہ تعالیٰ ہرگز بیان نہیں کرتا۔ اس پر دونوں آیتیں نازل ہوئیں۔ حضرت قتادہؒ فرماتے ہیں جب قرآنِ پاک میں مکڑی اور مکھی کی مثال بیان ہوئی تو مشرک کہنے لگے: بھلا ایسی حقیر چیزوں کے بیان کی کیا ضرورت ہے؟ تو جواباً یہ آیتیں اُتریں اور کہا گیا کہ حق کے بیان سے اللہ تعالیٰ نہیں شرماتا' خواہ وہ کم ہو یا زیادہ لیکن اس سے کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ گویا یہ آیت مکہ میں اُتری۔ حالانکہ ایسا نہیں' واللہ اعلم اور بزرگوں سے بھی اسی طرح شانِ نزول مروی ہے۔

ربیع بن انس فرماتے ہیں کہ یہ خود ایک مستقل مثال ہے جو دنیا کی بیان کی گئی ہے۔ مچھر جس وقت تک بھوکا ہوتا ہے زندہ رہتا ہے' جہاں موٹا تازہ ہوا' مرا۔ اسی طرح یہ لوگ ہیں کہ جب دُنیاوی نعمتوں دِل کھول کر حاصل کر لیتے ہیں۔ وہیں اللہ تعالیٰ کی پکڑ آ جاتی ہے۔ جیسے اور جگہ فرمایا: ﴿ فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ ... ﴾ (الانعام ۱۴۴) جب یہ ہماری نصیحت بھول جاتے ہیں' ہم ان پر تمام چیزوں کے دروازے کھول دیتے ہیں' یہاں تک کہ اِترانے لگتے ہیں۔ اب دفعتاً ہم انہیں پکڑ لیتے ہیں۔ (ابن جریر' ابن ابی حاتم) امام ابن جریر نے پہلے قول کو پسند فرمایا ہے اور مناسبت بھی اسی کی زیادہ معلوم ہوتی ہے' واللہ اعلم۔

تو مطلب یہ ہوا کہ کوئی سی مثال چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی کسی مقام پر بیان کرنے سے اللہ تعالیٰ نہ رکتا ہے' نہ جھجکتا ہے۔ مَا یہاں پر کسی کے معنی بتانے کے لیے ہے اور بعوضۃً کا زبر ہدایت کی بنا پر عربی قاعدے کے مطابق ہے جو ادنیٰ چیز پر صادق آ سکتا ہے یا نکرہ موصوفہ ہے اور بعوضۃً صفت ہے۔ ابن جریرؒ مَا کا موصولہ ہونا اور بعوضۃً کا اسی کے اعراب سے معرب ہونا پسند فرماتے ہیں اور کلام عرب میں یہ بکثرت شائع ہے کہ وہ مَا اور مَن کے صلہ کو انہی دونوں کا اعراب دے دیا کرتے ہیں۔ اس لیے کبھی یہ نکرہ ہوتے ہیں کبھی معرفہ۔ جیسا کہ حسان بن ثابتؓ کے شعروں میں ہے۔

یکفی بنا فضلاً علی من غیرنا ☆ حب النبی محمدٍ ایانا

''ہمیں غیروں پر صرف یہی فضیلت کافی ہے کہ ہمارے دل حبِّ نبی (ﷺ) سے پُر ہیں۔''

اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ بعوضۃً منصوب ہو حذف جاری کی بناء پر اور اس سے پہلے بَیْنَ کا لفظ مقدر مانا جائے۔ کسائی اور فراء اسی کو پسند کرتے ہیں۔ ضحاک اور ابراہیم بن عبلہ بعوضۃٌ پڑھتے ہیں۔ ابن جنی کہتے ہیں یہ ما کا صلہ ہوگا اور عائد حذف مانی جائے گی۔ جیسے: تماماً علی الذی احسن میں ﴿فَمَا فَوْقَهَا﴾ (الانعام ۱۵۴) کے معنی بیان کیے ہیں۔ ایک تو یہ کہ اس سے ہلکی اور ردی چیز جیسے کسی شخص کی بخیلی وغیرہ۔ ایک بیان کرے تو دوسرا کہتا ہے وہ اس سے سوا ہے۔ تو مراد یہ ہوتی ہے کہ وہ اس سے زیادہ گرا ہوا ہے۔ کسائی اور ابوعبید یہی کہتے ہیں۔ ایک حدیث میں آتا ہے کہ اگر دنیا کی قدر اللہ کے نزدیک ایک مچھر کے پر کے برابر بھی ہوتی تو کسی کافر کو ایک گھونٹ پانی بھی نہیں پلاتا۔ دوسرے یہ معنی ہیں' اس سے زیادہ بڑی اس لیے کہ بھلا مچھر سے ہلکی اور چھوٹی چیز کیا ہوگی؟ قتادہ بن دعامہ کا یہی قول ہے۔ ابن جریر بھی اسی کو پسند کرتے ہیں۔ صحیح مسلم میں حدیث ہے کہ کسی مسلمان کو کانٹا چبھے یا اس سے زیادہ' تو اس پر بھی اس کے درجے بڑھتے ہیں اور گناہ مٹتے ہیں۔

اس حدیث میں بھی لفظ : فَمَا فَوْقَهَا ہے تو مطلب یہ ہوا کہ جس طرح اللہ تعالیٰ ان چھوٹی بڑی چیزوں کے پیدا کرنے سے شرماتا نہیں اور نہ رکتا ہے۔ اسی طرح انہیں مثال کے طور پر بیان کرنے سے بھی اُسے کوئی عار نہیں ۔ ایک جگہ قرآن میں کہا گیا ہے کہ اے لوگو! ایک مثال بیان کی جاتی ہے' کان لگا کر سنو' جنہیں اللہ کے سوا پکارتے ہو' وہ سارے کے سارے جمع ہو جائیں تو ایک مکھی بھی پیدا نہیں کر سکتے بلکہ مکھی اگر اُن سے کچھ چھین لے جائے تو اس سے واپس نہیں لے سکتے ۔ عابد اور معبود دونوں ہی بے حد کمزور ہیں ۔ (الحج: ۷۳)

دوسری جگہ فرمایا: ان لوگوں کی مثال جو اللہ تعالیٰ کے سوا دوسروں کو مددگار بناتے ہیں' مکڑی کے جالے جیسی ہے جس کا گھر تمام گھروں سے زیادہ بودا اور کمزور ہے اور جگہ اللہ تعالیٰ نے کلمہ طیبہ کی مثال دی' پاک درخت سے جس کی جڑ مضبوط ہو اور اس کی شاخیں آسمان میں ہوں جو بحکم الٰہی ہر وقت پھل دیتا ہو۔ (العنکبوت: ۴۱) ان مثالوں کو اللہ تعالیٰ لوگوں کے غور و تدبر کے لیے بیان فرماتا ہے اور ناپاک کلام کی مثال ناپاک درخت جیسی ہے جو زمین کے اوپر ہی ہو اور جڑیں مضبوط نہ ہوں ۔ اللہ تعالیٰ ایمان والوں کو مضبوط بات کے ساتھ دُنیا اور آخرت میں برقرار رکھتا ہے اور ظالموں کو گمراہ کرتا ہے' اللہ جو چاہے کرے ۔ (ابراہیم ۲۴ تا ۲۶) اور جگہ فرمایا: اللہ تعالیٰ اس مملوک غلام کی مثال پیش کرتا ہے' جسے کسی چیز پر اختیار نہیں ۔ (النحل: ۷۵) اور جگہ فرمایا: دو شخصوں کی مثال اللہ تعالیٰ بیان فرماتا ہے جن میں ایک تو گونگا اور بالکل گرا پڑا' بے طاقت ہے جو اپنے آقا پر بوجھ ہے' جہاں جائے برائی ہی دے کر آئے اور دوسرا وہ عدل و حق کا حکم کرے ۔ کیا یہ دونوں برابر ہو سکتے ہیں......؟ (النحل: ۷۰) دوسری جگہ اللہ تعالیٰ تمہارے لیے خود تمہاری مثال بیان فرماتا ہے ۔ کیا تم اپنی چیزوں میں اپنے غلاموں کو بھی اپنا شریک اور برابر کا حصہ دار سمجھتے ہو؟ (الروم: ۲۸) اور جگہ ارشاد ہے اللہ تعالیٰ اُس شخص کی مثال بیان فرماتا ہے جس کے بہت سے برابر کے شریک ہوں...... (الزمر: ۲۹) اور جگہ ارشادِ باری ہے: ان مثالوں کو ہم لوگوں کے لیے بیان کرتے ہیں اور انہیں (پوری طرح) صرف علم والے ہی سمجھتے ہیں ۔ (العنکبوت: ۴۳)

ان کے علاوہ اور بھی بہت سی مثالیں قرآنِ پاک میں بیان ہوئی ہیں ۔ بعض سلف صالحینؒ فرماتے ہیں' جب میں قرآن میں کسی مثال کو سنتا ہوں اور سمجھ نہیں سکتا تو مجھے رونا آتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمادیا ہے کہ ان مثالوں کو صرف عالم ہی سمجھ سکتے ہیں ۔ حضرت مجاہدؒ فرماتے ہیں' مثالیں خواہ چھوٹی ہوں خواہ بڑی' ایماندار ان پر ایمان لاتے ہیں اور انہیں حق جانتے ہیں اور ان سے ہدایت پاتے ہیں ۔ قتادہؒ کا قول ہے کہ وہ انہیں اللہ کا کلام سمجھتے ہیں ۔ اَنَّهُ کی ضمیر کا مرجع مثال ہے ۔ یعنی مؤمن اس مثال کو اللہ کی جانب سے اور حق سمجھتے ہیں اور کافر باتیں بناتے ہیں ۔ جیسے سورۂ مدثر میں ہے: ﴿وَمَا جَعَلْنَآ اَصْحٰبَ النَّارِ ......﴾ یعنی ہم نے آگ والے فرشتوں کی گنتی کو کفار کی آزمائش کا سبب بنایا ہے ۔ اہل کتاب یقین کرتے ہیں ۔ ایماندار ایمان میں بڑھ جاتے ہیں ۔ ان دونوں جماعتوں میں کوئی شک نہیں رہتا ۔ لیکن بیمار دِل اور کفار کہہ اُٹھتے ہیں کہ اس مثال سے کیا مراد ہے؟ اسی طرح اللہ جسے چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے ۔ تیرے ربّ کے لشکروں کو اس کے سوا کوئی نہیں جانتا ۔ یہاں بھی اسی ہدایت و ضلالت کو بیان کیا ۔

صحابہ کرامؓ سے مروی ہے کہ اس سے گمراہ منافق ہوتے ہیں اور راہ مؤمن پاتے ہیں ۔ وہ اپنی گمراہی میں بڑھ جاتے ہیں کیونکہ باوجود اس عالم کے کہ مثال حق ہے درست اور صحیح ہے ۔ پھر بھی وہ اسے جھٹلاتے ہیں اور مؤمن اقرار کر کے ایمان و

ہدایت بڑھا لیتے ہیں۔ فاسقین سے مراد منافق ہیں۔ بعضوں نے کہا ہے کہ کافر مراد ہیں' جو پہچانتے ہیں اور انکار کرتے ہیں۔ حضرت سعد کہتے ہیں مراد خوارج ہیں۔ اگر اس قول کی سند حضرت سعد بن وقاصؓ سے صحیح ہو تو مطلب یہ ہوگا کہ یہ تفسیر معنوی ہے۔ یہ نہیں کہ اس سے مراد خوارج ہیں بلکہ یہ کہ یہ فرقہ بھی فاسقوں میں شامل ہے۔ جنہوں نے نہروان میں حضرت علیؓ پر چڑھائی کی تھی۔ تو یہ لوگ گو نزولِ آیت کے وقت موجود نہ تھے لیکن اپنے بدترین وصف کی وجہ سے معناً یہ بھی فاسقوں میں داخل ہیں۔ انہیں خارجی اس لیے کہا گیا ہے کہ امام برحق کی اطاعت سے نکل گئے تھے اور شریعت اسلامی کی پابندی سے آزاد ہو گئے تھے۔ لغت میں فاسق کہتے ہیں اطاعت و فرمانبرداری سے نکل جانے والے کو۔ جب چھلکا ہٹا کر خوشہ نکلتا ہے تو عرب کہتے ہیں: فَسَقَتْ۔ چوہے کو بھی فُوَيْسِقَةٌ کہتے ہیں کیونکہ وہ اپنے بلوں سے نکل کر فساد کرتا ہے۔

صحیحین کی حدیث میں ہے' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: پانچ جانور فاسق ہیں' حرم میں اور باہر حرم کے قتل کر دیئے جائیں۔ ۱) کوا' ۲) چیل' ۳) بچھو' ۴) چوہا اور ۵) کتا۔ پس لفظ فاسق کافر کو اور ہر نافرمان کو شامل ہے لیکن کافر کا فسق زیادہ سخت اور زیادہ برا ہے اور آیت میں مراد فاسق سے کافر ہے' واللہ اعلم۔

اس کی بڑی دلیل یہ ہے کہ بعد میں ان کا وصف یہ بیان فرمایا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا توڑ توڑتے ہیں۔ اس کے فرمان کاٹتے ہیں اور زمین میں فساد پھیلاتے ہیں اور یہ سب اوصاف کفار کے ہیں۔

مؤمنوں کے اوصاف تو اس کے برخلاف ہوتے ہیں۔ جیسے سورۂ رعد میں بیان ہے کہ ﴿ اَفَمَنْ يَّعْلَمُ...... ﴾ پس وہ شخص جانتا ہے کہ جو کچھ تیرے ربّ کی طرف سے تجھ پر اُترا' وہ حق ہے۔ کیا اس شخص جیسا ہو سکتا ہے جو اندھا ہو؟ نصیحت تو صرف عقل مند حاصل کرتے ہیں جو اللہ کے وعدوں کو پورا کرتے ہیں اور میثاق توڑتے نہیں اور اللہ تعالیٰ نے جن کاموں کے جوڑنے کا حکم دیا ہے' انہیں جوڑتے ہیں۔ اپنے رب سے ڈرتے رہتے ہیں اور حساب کی برائی سے کانپتے رہتے ہیں۔

آگے چل کر فرمایا: جو لوگ اللہ کے عہد کو اس مضبوطی کے بعد توڑ دیں اور جس چیز کو ملانے کا اللہ کا حکم ہو وہ اسے نہ ملائیں اور زمین میں فساد پھیلائیں' ان کے لیے لعنتیں ہیں اور ان کے لیے برا گھر ہے۔ یہاں عہد سے مراد وہ وصیت ہے جو اللہ تعالیٰ نے بندوں کو کی تھی جو اس کے تمام احکام بجالانے اور تمام نافرمانیوں سے بچنے کو شامل ہے۔ اس کا توڑ دینا' اس پر عمل نہ کرنا ہے۔

بعض کہتے ہیں کہ توڑنے والے اہل کتاب کے کافر اور ان کے منافق ہیں اور عہد وہ ہے جو ان سے تورات میں لیا گیا تھا کہ وہ اس کی تمام باتوں پر عمل کریں اور محمد ﷺ کی اتباع کریں۔ جب بھی آپ ﷺ تشریف لے آئیں' آپ ﷺ کی نبوت کا اقرار کریں اور جو کچھ آپ ﷺ اللہ کی جانب سے لے کر آئیں' اُس کی تصدیق کریں اور اس عہد کو توڑ دینا یہ ہے کہ انہوں نے آپ ﷺ کی نبوت اور اطاعت کا انکار کر دیا۔ باوجود علم کے اور باوجود عہد کے اسے چھپایا اور دُنیاوی مصلحتوں کی بناء پر اس کے خلاف کام کیا۔ امام ابن جریرؒ اس قول کو پسند کرتے ہیں اور مقاتل بن حیان کا بھی یہی قول ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ اس سے مراد کوئی خاص جماعت نہیں بلکہ شرک' کفر و نفاق والے سب کے سب مراد ہیں۔ عہد سے مراد اپنی توحید و سنت سے مُنہ موڑنا اور انکار کرنا ہے۔ یہ قول زیادہ قوی اور مناسب ہے۔ زمخشری کا میلان بھی اسی طرف ہے۔ وہ کہتے ہیں عہد سے مراد اللہ تعالیٰ کی توحید ماننے کا اقرار ہے۔ یہ قول زیادہ قوی اور مناسب ہے۔ زمخشری کا میلان بھی اسی طرف ہے۔

وہ کہتے ہیں عہد سے مراد اللہ تعالیٰ کی توحید ماننے کا اقرار ہے جو فطرتِ انسان میں داخل ہونے کے علاوہ روزِ میثاق میں بھی اسکا وعدہ لیا گیا تھا۔ فرمایا گیا تھا کہ: ﴿ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ﴾ (الاعراف: ۱۷۲) کیا میں تمہارا ربّ نہیں؟ تو سب نے جواب دیا تھا: بَلٰی بے شک تو ہمارا ربّ ہے۔ پھر جو کتابیں دی گئیں ان میں بھی اقرار کرایا گیا۔ جیسے ﴿ وَاَوْفُوْا بِعَهْدِیْ...... ﴾ (البقرة: ۴۰) میرے عہد کو نبھاؤ' میں بھی اپنے وعدے پورے کرونگا۔ بعض کہتے ہیں مراد وہ عہد ہے جو روحوں سے لیا تھا' جب انہیں آدم کی پیٹھ سے نکالا گیا تھا۔ جیسے فرمایا ہے۔ ﴿ وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ...... ﴾ جب تیرے ربّ نے اولادِ آدم سے وعدہ لیا کہ میں ہی تمہارا ربّ ہوں اور ان سب نے اقرار کیا...... اور اسکا توڑنا اسکا چھوڑنا ہے۔ یہ تمام اقوال تفسیر ابن جریر میں منقول ہیں۔

منافق کی علامات☆

ابو العالیہؒ فرماتے ہیں عہدِ خداوندی کو توڑنا جو منافقوں کا کام تھا وہ چھ خصلتیں ہیں: ۱) بات کرنے میں جھوٹ بولنا' ۲) وعدہ خلافی کرنا' ۳) امانت میں خیانت کرنا' ۴) اللہ کے عہد کو اس کی مضبوطی کے بعد توڑنا' ۵) اللہ تعالیٰ نے جن کاموں کے ملائے جانے کا حکم دیا ہے' انہیں نہ ملانا' ۶) زمین میں فساد پھیلانا۔ یہ چھ خصلتیں ان کی اُس وقت ظاہر ہوتی ہیں جبکہ ان کا غلبہ ہو اور جب وہ مغلوب ہوتے ہیں تو تین اگلے کام کرتے ہیں۔ سدی فرماتے ہیں' قرآن کے احکام کا پڑھنا' جاننا' سچ کہنا' پھر نہ ماننا بھی عہد کو توڑنا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے جن کاموں کے جوڑنے کا حکم کیا ہے۔ ان سے مراد صلہ رحمی کرنا' قرابت کے حقوق ادا کرنا وغیرہ ہے۔ جیسے اور جگہ قرآنِ مجید میں ہے: ﴿ فَهَلْ عَسَيْتُمْ اِنْ تَوَلَّيْتُمْ اَنْ تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ وَ تُقَطِّعُوْٓا اَرْحَامَكُمْ ﴾ (محمد: ۲۲) قریب ہے کہ اگر تم لوٹو تو زمین میں فساد کرو اور رشتے ناطے توڑ دو۔ ابن جریرؒ اسی کو ترجیح دیتے ہیں اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ آیت عام ہے جس کو ملانے' ادا کرنے کا حکم جاری تھا۔ انہوں نے اس کو توڑا اور نہ کیا۔

﴿ خٰسِرُوْنَ ﴾ سے مراد آخرت میں نقصان اُٹھانے والے ہیں' جیسے فرمانِ باری ہے: ﴿ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ اللَّعْنَةُ وَلَهُمْ سُوْٓءُ الدَّارِ ﴾ (الرعد: ۲۵) ان لوگوں پر لعنت ہے اور اُن کے لیے برا گھر ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا فرمان ہے کہ اہل اسلام کے سوا دوسروں کو جہاں قرآن نے خاسر کہا ہے وہاں مراد کافر ہے اور اہل اسلام کے لیے جہاں یہ لفظ آیا ہے وہاں مراد گنہگار ہیں۔ (طبری)

﴿ خٰسِرُوْنَ ﴾ جمع ہے خاسر کی۔ چونکہ ان لوگوں نے نفسانی خواہشوں اور دنیاوی لذتوں میں پڑ کر رحمت الٰہی سے دوری حاصل کر لی۔ اسلئے اسے نقصان یافتہ کہا گیا ہے جیسے وہ شخص جسے اپنی تجارت میں گھاٹا آئے۔ اسی طرح یہ کافر و منافق ہیں کہ جب رحم و کرم کی بہت ہی حاجت ہوگی' یعنی قیامت والے دن اس رحمت الٰہی سے یہ محروم رہ جائینگے۔

كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ۚ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۲۸﴾

بھلا کیونکر ناسپاسی کرتے ہو اللہ کے ساتھ حالانکہ تھے تم محض بے جان' پھر تم کو جاندار کیا' پھر تم کو موت دیں گے' پھر زندہ کریں گے (یعنی قیامت کے دن) پھر انہی کے پاس لے جائے جاؤ گے ○

وجودِ باری پہ پُرزور دلائل ☆

اس بات کا ثبوت دیتے ہوئے کہ اللہ تعالیٰ موجود ہے وہ قدرتوں والا ہے وہی پیدا کرنے والا ہے اور اختیار والا ہے۔ اس آیت میں فرمایا' تم اللہ تعالیٰ کے وجود کا انکار کیسے کر سکتے ہو؟ یا اس کے ساتھ دوسرے کو کیسے پوج سکتے ہو؟ جبکہ تمہیں عدم سے وجود میں لانے والا ایک وہی ہے۔ جیسے اور جگہ فرمایا' کیا یہ بغیر کسی چیز کے پیدا کئے گئے؟ یا یہ خود پیدا کرنے والے ہیں؟ یا انہوں نے زمین و آسمان بھی پیدا کئے ہیں؟ ہرگز نہیں' بلکہ یہ بے یقین لوگ ہیں اور جگہ ارشاد ہوتا ہے: هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُنْ شَيْئًا مَّذْكُوْرًا (الدھر:۱) یقیناً انسان پر وہ زمانہ آیا بھی ہے۔ جس وقت یہ قابل ذکر چیز ہی نہ تھا اور بھی اسی طرح کی بہت سی آیتیں ہیں۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ کفار جو کہیں گے: رَبَّنَآ اَمَتَّنَا اثْنَتَيْنِ (المؤمن:۱۱) اے اللہ دو دفعہ تو نے ہمیں مارا اور دو دفعہ جلایا' ہمیں اپنے گناہوں کا اقرار ہے۔ اس سے مراد یہی ہے جو اس آیت: وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا کا مطلب ہے کہ تم اپنے باپوں کی پیٹھ میں مردہ تھے۔ یعنی کچھ بھی نہ تھے۔ اس نے تمہیں زندہ کیا۔ پھر تمہیں مار ڈالے گا۔ یعنی ایک دن ضرور آئے گا۔ پھر تمہیں قبروں سے اٹھائے گا۔ پس ایک حالت دنیا میں آنے سے پہلے۔ پھر دوسری دنیا میں آنے کی پھر مرنے کی اور قبروں کی طرف جانے کی۔ پھر روز قیامت میں اُٹھ کھڑا ہونے کی۔ دو زندگیاں اور دو موتیں۔ ابو صالح فرماتے ہیں کہ قبر میں انسان کو زندہ کر دیا جاتا ہے۔ عبدالرحمٰن بن زید کا بیان ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کی پیٹھ میں انہیں پیدا کیا۔ پھر ان سے عہد و پیمان لے کر بے جان کر دیا۔ پھر ماں کے پیٹ میں انہیں پیدا کیا۔ پھر دنیوی موت ان پر آئی۔ پھر قیامت والے دن انہیں زندہ کرے گا۔ لیکن یہ رائے کمزور ہے۔ پہلا قول ہی ٹھیک ہے۔ ابن مسعود' ابن عباس رضی اللہ عنہم اور تابعین کی ایک جماعت کا یہی قول ہے۔ قرآن میں اور جگہ ہے: قُلِ اللّٰهُ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يَجْمَعُكُمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ (الجاثیہ:۲۶) اللہ ہی تمہیں پیدا کرتا ہے پھر مارتا ہے پھر تمہیں قیامت کے دن جمع کرے گا۔ ان پتھروں اور تصویروں کو جنہیں مشرکین پوجتے تھے۔ قرآن نے مردہ کہا ہے فرماتا ہے: اَمْوَاتٌ غَيْرُ اَحْيَآءٍ (النحل:۲۱) وہ سب مردہ ہیں زندہ نہیں۔ زمین کے بارے میں فرمایا: وَاٰيَةٌ لَّهُمُ الْاَرْضُ الْمَيْتَةُ (یٰسین:۳۳) ان کے لئے مردہ زمین نشان ہے جسے ہم زندہ کرتے ہیں اور اس سے دانے نکالتے ہیں جسے یہ کھاتے ہیں۔

هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ۗ ثُمَّ اسْتَوٰٓى اِلَى السَّمَآءِ فَسَوّٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ ۭ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۲۹﴾

وہ ذات پاک ایسی ہے جس نے پیدا کیا تمہارے فائدے کے لئے جو کچھ بھی زمین میں موجود ہے سب کا سب۔ پھر توجہ فرمائی آسمان کی طرف۔ سو درست کر کے بنا دیئے ان کو سات آسمان اور وہ تو سب چیزوں کے جاننے والے ہیں ۞

دلائل کا ایک اور نا قابلِ تردید دفتر ☆

اُوپر کی آیت میں ان دلائل قدرت کا بیان ہوا تھا جو خود انسان کے اندر ہیں اس لئے اس مبارک آیت میں ان دلائل کا بیان ہو رہا ہے جو روزمرہ آنکھوں کے سامنے ہیں۔ اِسْتَوٰٓی یہاں پر قصد کرنے اور متوجہ ہونے کے معنی میں ہیں۔ اس لئے کہ اس کا صلہ اِلٰی ہے۔ سَوّٰىهُنَّ کے معنی درست کرنے اور ساتوں کو بنانے کے ہیں۔ سماء اسم جنس ہے۔ پھر بیان فرمایا کہ اس کا علم محیط کل ہے۔ جیسے اور

جگہ ارشاد فرمایا ﴿اَلَا یَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ﴾ (الملک:۱۴) کیا وہ بے علم ہو سکتا ہے۔ جو خالق ہو؟ سورۂ سجدہ کی آیت ﴿قُلْ اَئِنَّكُمْ لَتَكْفُرُوْنَ﴾ گویا اس آیت کی تفصیل ہے۔ جس میں فرمایا ہے کیا تم اس اللہ کے ساتھ کفر کرتے ہو جس نے زمین کو دو دن میں پیدا کیا۔ کیا تم اس کے شریک ٹھہراتے ہو جو رب العالمین ہے۔ جس نے زمین میں مضبوط پہاڑ اوپر سے گاڑ دیئے۔ جس نے اس زمین میں برکتیں دیں اور روزیاں رکھیں اور چار دن میں زمین کی سب چیزیں درست کر دیں۔ جس میں دریافت کرنے والوں کی تشفی ہے۔ پھر آسمان کی طرف متوجہ ہو کر جو دھوئیں کی شکل میں تھے۔ فرمایا کہ اے زمینو اور آسمانو! خوشی یا ناخوشی سے آؤ۔ تو دونوں نے کہا کہ باری تعالیٰ ہم تو خوشی خوشی حاضر ہیں۔ دو دن میں آسمانوں کو پورا کر دیا اور ہر آسمان میں اس کا کام بانٹ دیا اور دنیا کے آسمان کو ستاروں کے ساتھ مزین کر دیا اور نگہبانی (شیطانوں سے بچاؤ بنایا)۔ یہ ہے اندازہ اس اللہ کا جو بہت بڑا غالب اور بہت بڑے علم والا ہے۔

مخلوقات کی ترتیب ☆ اس سے معلوم ہوا کہ پہلے زمین پیدا کی۔ پھر ساتوں آسمانوں کو بنایا اور ہم دیکھتے ہیں کہ ہر عمارت کا یہی طریقہ ہے کہ پہلے نیچے کا حصہ بنایا جائے پھر اوپر کا۔ مفسرین نے بھی اس کی تصریح کی ہے جس کا بیان ابھی آتا ہے ان شاء اللہ تعالیٰ۔ لیکن یہ سمجھ لینا چاہئے کہ قرآن کریم میں اور جگہ ہے ﴿ءَاَنْتُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمِ السَّمَاءُ ....﴾ (سورۂ نازعات:۲۷) تمہاری پیدائش مشکل ہے یا آسمانوں کی؟ اللہ تعالیٰ نے اس کی چوٹی بلند کر کے اسے ٹھیک ٹھاک کیا اور اس میں سے رات دن پیدا کئے۔ پھر اس کے بعد زمین بچھائی۔ اس سے پانی اور چارہ نکالا اور پہاڑوں کو گاڑا۔ جو سب تمہارے اور تمہارے جانوروں کے کام کی چیزیں ہیں۔ اس آیت میں یہ فرمایا ہے کہ زمین کی پیدائش آسمان کے بعد ہے۔ بعض بزرگوں نے تو یہ فرمایا ہے مندرجہ بالا آیت میں ثم صرف عطف خبر کے لئے ہے عطف فعل کے لئے نہیں۔ یعنی یہ مطلب نہیں کہ زمین کے بعد آسمان کی پیدائش شروع کی۔ بلکہ صرف خبر دینا مقصود ہے کہ آسمانوں کو بھی پیدا کیا اور زمینوں کو بھی۔ عرب شاعروں کے شعر میں یہ موجود ہے کہ کہیں ثم صرف خبر کا خبر پر عطف ڈالنے کے لئے ہوتا ہے۔ تقدیم تاخیر مراد نہیں ہوتی اور بعض بزرگوں نے فرمایا ہے کہ آیت ﴿ءَاَنْتُمْ ...﴾ میں آسمانوں کی پیدائش کے بعد زمین کو ٹھیک ٹھاک کیا تو دونوں آیتیں ایک دوسرے کی مخالف نہ رہیں۔ اس عیب سے خدا کا کلام بالکل محفوظ ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے یہی معنی بیان فرمائے ہیں۔ (یعنی پہلے زمین کی پیدائش پھر آسمانوں کی پھر زمین کی درستگی وغیرہ ذیل بعد کی چیز ہے)۔

حضرت ابن مسعود، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم اور دیگر صحابہؓ سے مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا عرش پانی پر تھا اور کسی چیز کو پیدا نہیں کیا تھا۔ جب اور مخلوق کو پیدا کرنا چاہا تو پانی سے دھواں بلند کیا۔ وہ اونچا چڑھا اور اس سے آسمان بنائے پھر پانی خشک ہو گیا اور اس کی زمین بنائی۔ پھر اس کو الگ الگ کر کے سات زمینیں بنائیں۔ اتوار اور پیر کے دو دن میں یہ ساتوں زمینیں بن گئیں۔ زمین مچھلی پر ہے۔ مچھلی وہ ہے جس کا ذکر قرآن مجید کی اس آیت میں ہے ﴿نٓ وَالْقَلَمِ﴾ (القلم:۱-۲) مچھلی پانی میں ہے اور پانی صفاۃ پر ہے اور صفاۃ فرشتہ پر اور فرشتہ پتھر پر۔ پتھر ہوا پر ہے۔ جس کا ذکر لقمان نے کیا ہے۔ وہ پتھر ہوا پر ہے۔ مچھلی کے ہلنے سے زمین کانپنے لگی تو اللہ تعالیٰ نے پہاڑوں کو گاڑ دیا اور وہ ٹھہر گئی۔ یہی معنی ہیں اللہ تعالیٰ کے فرمان ﴿وَجَعَلْنَا فِي الْاَرْضِ رَوَاسِيَ اَنْ تَمِيْدَ بِهِمْ﴾ (الانبیاء:۳۱) زمین نہ ہلے اس لئے ہم نے پہاڑ بنائے۔ پہاڑ، زمین کی پیداوار، درخت وغیرہ اور زمین کی کل چیزیں منگل اور بدھ کے دو دنوں میں پیدا کیں اسی کا بیان ﴿قُلْ اَئِنَّكُمْ لَتَكْفُرُوْنَ﴾ (حم سجدہ:۹) والی آیت میں ہے۔ پھر آسمان کی طرف توجہ فرمائی جو دھواں تھا آسمان بنایا۔ پھر اس میں سے سات آسمان بنائے۔ جمعرات اور جمعہ کے دو دنوں میں۔ جمعہ کے دن کو اسی لئے جمعہ کہا جاتا ہے کہ اس میں زمین و آسمان کی پیدائش جمع ہوئی۔ ہر آسمان میں اس نے فرشتوں کو پیدا کیا اور ان ان چیزوں کو جن کا علم اس کے سوا کسی کو نہیں۔ آسمان دنیا کو ستاروں کے ساتھ زینت دی

اور شیطان سے حفاظت کا سبب بنایا۔ ان تمام چیزوں کو پیدا کر کے پروردگار نے عرش عظیم پر قرار پکڑا۔ جیسے فرماتا ہے: ﴿خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ﴾ (الاعراف: ۵) یعنی چھ دن میں آسمانوں اور زمینوں کو پیدا کر کے پھر عرش پر مستوی ہو گیا اور جگہ فرمایا: ﴿کَانَتَا رَتْقًا ...... ﴾ (الانبیاء: ۳۰) یعنی یہ دونوں دھواں سے تھے۔ ہم نے انہیں پہاڑ اور پانی سے ہر چیز کی زندگی کی۔ (تفسیر سدی) یہ موقوف قول جس میں کئی قسم کا احتمال ہے۔ بظاہر ایسی اہم بات میں حجت تامہ نہیں ہو سکتا۔ واللہ اعلم

تخلیق عالم کی کل مدت ☆ ابن جریر میں ہے حضرت عبداللہ بن سعید رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ اتوار سے مخلوق کی پیدائش شروع ہوئی۔ دو دن میں زمینیں پیدا ہوئی۔ دو دن ان کی تمام چیزیں پیدا کیں اور دو دن میں آسمانوں کو پیدا کیا۔ جمعہ کے دن آخری وقت ان کی پیدائش ختم ہوئی اور اسی وقت حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا کیا اور اسی وقت میں قیامت قائم ہوگی۔ مجاہد فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے زمین کو آسمان سے پہلے پیدا کیا۔ اس سے جو دھواں اُوپر چڑھا' اس کے آسمان بنائے جو ایک پر ایک اس طرح سات ہیں' اور زمینیں ایک کے نیچے ایک' اس طرح سات ہیں۔ اس آیت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ زمین کی پیدائش آسمانوں سے پہلے ہے۔ جیسے سورۂ سجدہ میں ہے۔ علماء بھی اس پر متفق ہیں۔ صرف قتادہؒ فرماتے ہیں کہ آسمان زمین سے پہلے پیدا ہوئے ہیں۔ قرطبی اس میں توقف کرتے ہیں: ﴿وَالنّٰزِعٰتِ﴾ (النازعات: ۲۸) کی آیت کی وجہ سے یہ لوگ کہتے ہیں کہ یہاں آسمان کی پیدائش کا ذکر زمین سے پہلے ہے۔ صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے جب یہ سوال ہوا تو آپ نے جواب دیا کہ زمین پیدا تو آسمانوں سے پہلے کی گئی ہے لیکن پھیلائی گئی بعد میں۔ یہی جواب عام علماء کا ہے۔ سورۂ وَالنّٰزِعٰتِ کی تفسیر میں بھی اس کا بیان ہوگا۔ ان شاء اللہ۔ حاصل امر یہ ہے کہ زمین کا پھیلانا اور بچھانا بعد میں ہے اور ﴿دَحٰهَا﴾ (النازعات: ۳۰) کا لفظ قرآن میں ہے اور اس کے بعد جو پانی چارہ پہاڑ وغیرہ کا ذکر ہے۔ یہ گویا اس لفظ کی تشریح ہے۔ جن جن چیزوں کے نشوونما کی قوت اس زمین میں رکھی گئی تھی۔ اُن سب کو ظاہر کر دیا اور زمین کی پیداوار طرح طرح کی مختلف شکل اور مختلف قسموں کی نکل آئی۔ اسی طرح آسمان میں بھی ٹھہرے رہنے والے چلنے والے ستارے وغیرہ بنائے۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

صحیح مسلم ونسائی میں حدیث ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرا ہاتھ پکڑا اور فرمایا مٹی کو اللہ تعالیٰ نے ہفتہ والے دن پیدا کیا اور پہاڑوں کو اتوار کے دن اور درختوں کو پیر کے دن اور برائیوں کو منگل کے دن اور نور کو بدھ کے دن اور جانوروں کو جمعرات کے دن اور آدم علیہ السلام کو جمعہ کے دن عصر کے بعد جمعہ کی آخری ساعت میں عصر کے بعد سے رات تک۔ یہ حدیث غرائب مسلم میں ہے۔ امام ابن مدینی امام بخاری وغیرہ نے اس میں کلام کیا ہے اور فرمایا کہ کعب رضی اللہ عنہ کا اپنا قول ہے اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے کعب کا یہ کلام سنا ہے اور بعض راویوں نے ان غلطی سے مرفوع حدیث قرار دے دیا ہے۔ امام بیہقی یہی کہتے ہیں۔

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً ؕ قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِیْهَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا وَیَسْفِكُ الدِّمَآءَ ۚ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ ؕ قَالَ اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۳۰﴾

اور جس وقت ارشاد فرمایا آپ کے رب نے فرشتوں سے کہ ضرور میں بناؤں گا زمین میں ایک نائب' فرشتے کہنے لگے کیا آپ پیدا کریں گے زمین میں ایسے لوگوں کو جو فساد کریں گے اور خونریزیاں کریں گے اور ہم برابر تسبیح کرتے رہتے ہیں بحمد اللہ اور تقدیس کرتے ہیں آپ کی۔ حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ میں جانتا ہوں اس بات کو جس کو تم نہیں جانتے ○

اللہ تعالیٰ کے اس احسان کو دیکھو کہ اس نے آدم علیہ السلام کو پیدا کرنے سے فرشتوں میں اُن کا ذکر کیا۔ جس کا بیان اس آیت میں ہے۔ فرماتا ہے کہ اے نبی تم یاد کرو اور اپنی اُمت کو یہ خبر پہنچاؤ۔ ابوعبیدہ تو کہتے ہیں' لفظ اذ یہاں زائد ہے لیکن ابن جریرؒ وغیرہ مفسرین اس کا رد کرتے ہیں۔

خلافت کی حقیقت ☆ خَلِیْفَه سے مراد یہ ہے کہ ان کے بعد بھی جانشین ہوں گے۔ یکے بعد دیگرے اور ایک کے بعد دوسرے زمانے میں۔ یوں ہی قرنوں تک یہ سلسلہ رہے گا۔ جیسے اور جگہ ارشاد ہے: ﴿هُوَ الَّذِیْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ﴾ (الانعام:۱۶۵) اور فرمایا: ﴿وَیَجْعَلُكُمْ خُلَفَآءَ الْاَرْضِ﴾ (النمل:۶۲) یعنی تمہیں اس نے زمین کا خلیفہ بنایا اور جگہ فرمایا کہ اگر ہم چاہتے تو فرشتوں کو اس زمین میں تمہارا خلیفہ بنا دیتے اور جگہ ارشاد ہے کہ ان کے بعد ان کے خلیفہ جانشین برے لوگ ہوئے۔ ایک شاذ قراءت میں خَلِیْفَةً بھی ہے۔ بعض مفسرین کہتے ہیں کہ خلیفہ سے مراد حضرت آدم علیہ السلام ہیں۔ اس میں تامل ہے۔ تفسیر رازی وغیرہ میں اس اختلاف کو ذکر کیا گیا ہے۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ مطلب نہیں۔ اس کی ایک دلیل تو فرشتوں کا یہ قول ہے کہ وہ زمین میں فساد کریں گے اور خون بہائیں گے۔ ظاہر ہے کہ انہوں نے اولادِ آدم کی نسبت یہ فرمایا تھا نہ کہ خاص حضرت آدم کی نسبت۔ یہ اور بات ہے کہ اس کا علم فرشتوں کو کیونکر ہوا؟ یا تو کسی خاص طور سے انہیں یہ معلوم ہوا ہوگا یا بشری طبیعت کے اقتضا کو دیکھ کر انہوں نے یہ فیصلہ کیا ہوگا کیونکہ یہ فرما دیا گیا کہ ان کی پیدائش مٹی سے ہوگی۔ یا لفظ خلیفہ کے مفہوم سے انہوں نے یہ سمجھ لیا ہوگا کہ وہ فیصلہ کرنے والا۔ مظالم کی روک تھام کرنے والا اور حرام کاموں اور گناہوں کی باتوں سے روکنے والا ہوگا۔ یا انہوں نے چونکہ زمین کی پہلی مخلوق کو دیکھا ہوگا۔ اسی پر اُسے قیاس کیا ہوگا۔

یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ فرشتوں کی یہ عرض بطور اعتراض کے نہ تھی۔ نہ بنی آدم پر حسد کی وجہ سے تھی۔ جن لوگوں کا یہ خیال ہے وہ قطعی غلطی کر رہے ہیں۔ فرشتوں کی شان میں قرآن فرماتا ہے: ﴿لَا یَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ﴾ (الانبیاء:۲۷) یعنی جس بات کے دریافت کرنے کی انہیں اجازت نہ ہو اس میں وہ لب نہیں ہلاتے (اور یہ بھی ظاہر ہے کہ فرشتوں کی طبیعت حسد سے پاک ہے) بلکہ صحیح مطلب یہ ہے کہ یہ سوال صرف اس حکمت کے معلوم کرنے کے لئے اور اس راز کے ظاہر کرانے کے لئے تھا جو ان کی سمجھ سے بالاتر تھا۔ یہ تو جانتے تھے کہ اس مخلوق میں فسادی لوگ بھی ہوں گے۔ تو اب باادب سوال کیا کہ پروردگار ایسی مخلوق کے پیدا کرنے میں کون سی حکمت ہے؟ اگر عبادت مقصود ہے تو عبادت تو ہم کرتے ہی ہیں۔ تسبیح اور تقدیس وتحمید ہر وقت ہماری زبانوں پر ہے اور پھر فساد وغیرہ سے پاک ہیں۔ تو پھر اور مخلوق' جن میں فسادی بھی ہوں گے۔ کس مصلحت پر پیدا کی جاتی ہیں؟ اللہ تعالیٰ نے ان کے سوال کا جواب دیا کہ باوجود اس کے فساد کے پھر بھی اسے جن مصلحتوں اور حکمتوں کی بنا پر میں پیدا کر رہا ہوں' انہیں میں ہی جانتا ہوں کہ ان میں انبیاء اور رسول ہوں گے۔ ان میں صدیق اور شہید ہوں گے۔ ان میں عابد وزاہد' اولیاء' ابرار' نیک کار' مقرب بارگاہ' علماء' صلحاء' متقی پرہیزگار' خوف خداوندی۔ حُب باری رکھنے والے ہوں گے۔ میرے احکام کی بسر وچشم تعمیل کرنے والے میرے نبیوں کے ارشاد پر لبیک کہنے والے ہوں گے۔

صحیحین کی حدیث میں ہے کہ دن کے فرشتے صبح صادق کے وقت آتے ہیں اور عصر کو چلے جاتے ہیں اور اس وقت رات کے فرشتے آتے ہیں اور وہ پھر صبح جائیں گے۔ آنے والے جب آتے ہیں' تب' اور جاتے ہیں' تب' صبح کی اور عصر کی نماز میں لوگوں کو پاتے

ہیں اور دربار خداوندی میں پروردگار کے سوال کے جواب میں دونوں جماعتیں یہی کہتی ہیں کہ گئے تو نماز میں پایا اور آئے تو نماز میں چھوڑ کر آئے۔ یہی ہے وہ مصلحت خداوندی‘ جسے فرشتوں نے فرمایا تھا کہ میں جانتا ہوں تم نہیں جانتے۔ ان فرشتوں کو اسی چیز کے دیکھنے کے لئے بھیجا جاتا ہے اور دن کے اعمال رات سے پہلے اور رات کے اعمال دن سے پہلے خداوندِ عالم کی طرف چڑھائے جاتے ہیں۔ غرض تفصیلی حکمت جو پیدائش انسان میں تھی‘ اس کی نسبت فرمایا کہ یہ میرے مخصوص علم میں ہے۔ تمہیں معلوم ہی نہیں۔ بعض کہتے ہیں یہ جواب ہے ان کے اس قول کا کہ ہم تیری تسبیح بیان کرتے رہتے ہیں۔ تو انہیں فرمایا گیا کہ میں ہی جانتا ہوں۔ یعنی جیسا اپنے سمجھتے ہو اور سب کو یکساں کر رہے ہو‘ ایسا نہیں بلکہ تم میں ایک ابلیس بھی ہے۔ ایک تیسرا قول یہ ہے کہ فرشتوں کا یہ سب کہنا اسی وجہ سے تھا کہ ہمیں زمین میں بسایا جائے تو جواباً کہا گیا کہ تمہاری آسمانوں میں رہنے کی مصلحت میں ہی جانتا ہوں اور مجھے علم ہے کہ تمہارے لائق جگہ یہی ہے واللہ اعلم۔ حسن‘ قتادہ وغیرہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو خبر دی‘ سدی کہتے ہیں مشورہ لیا۔ لیکن اس کے معنی بھی خبر دینے کے ہو سکتے ہیں۔ اگر نہ ہوں تو پھر یہ قول گرا ہوا ہے۔ ابن ابی حاتم میں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب مکہ سے زمین پھیلائی اور بچھائی گئی‘ تو بیت اللہ شریف کا طواف سب سے پہلے فرشتوں نے کیا اور زمین میں خلیفہ بنانا ہے‘ یہ حدیث مرسل ہے پھر اس میں ضعف ہے اور مدرج ہے یعنی زمین سے مکہ مراد لینا راوی کا اپنا خیال ہے واللہ اعلم۔

بظاہر تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ زمین سے مراد عام ہے۔ ساری زمین مراد ہے۔ فرشتوں نے جب یہ سنا تو پوچھا تھا کہ وہ خلیفہ کیا ہوگا؟ اور جواب میں کہا گیا تھا کہ اس کی اولاد میں ایسے لوگ بھی ہوں گے جو زمین میں فساد کریں‘ حسد بغض کریں‘ قتل وخون کریں۔ ان میں وہ عدل وانصاف کرے گا اور میرے احکام جاری کرے گا۔ تو اس سے مراد حضرت آدم علیہ السلام ہیں اور جو ان کے کام ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور مخلوق میں عدل وانصاف کرنے میں لیکن فساد پھیلانے اور خون بہانے والے خلیفہ نہیں۔ یہ یاد رہے کہ یہاں مراد خلافت سے ایک زمانہ والوں کا دوسرے زمانہ والوں کے بعد آنا ہے۔ خلیفہ فعیلہ کے وزن پر ہے۔ جب ایک کے بعد دوسرا اس کے قائم مقام ہو تو عرب کہتے ہیں: خَلَفَ فُلَانٌ فُلَانًا فلاں شخص فلاں کا خلیفہ ہوا۔ جیسے قرآن میں ہے کہ ہم ان کے بعد تمہیں زمین کا خلیفہ بنا کر دیکھتے ہیں کہ تم کیسے عمل کرتے ہو اور اسی لئے سلطان اعظم کو خلیفہ کہتے ہیں۔ اس لئے کہ وہ اگلے بادشاہ کا جانشین ہوتا ہے۔ محمد ابن اسحاق کہتے ہیں‘ مراد یہ ہے کہ زمین کا ساکن اس کو آباد کرنے والا۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں‘ پہلے زمین میں جنات بستے تھے۔ انہوں نے اس میں فساد کیا اور خون بہایا اور قتل وغارت کیا۔ ابلیس کو بھیجا گیا‘ اس نے اور اس کے ساتھیوں نے انہیں مار مار کر جزیروں اور پہاڑوں میں بھگا دیا۔ پھر حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا کر کے زمین میں بسایا گیا تو گویا یہ ان پہلے والوں کے خلیفہ اور جانشین ہوئے۔ پس فرشتوں کے قول سے مراد اولادِ آدم ہیں۔ جس وقت اُن سے کہا گیا کہ زمین اور اس میں بسنے والی مخلوق کو پیدا کرنا چاہتا ہوں۔ اس وقت زمین تھی لیکن اس میں آبادی نہ تھی۔ بعض صحابہ سے یہ بھی مروی ہے کہ چونکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں معلوم کرایا تھا کہ اولادِ آدم ایسے ایسے کام کرے گی تو انہوں نے یہ پوچھا اور یہ بھی مروی ہے کہ جنات کے فساد پر انہوں نے بنی آدم کے فساد کو قیاس کر کے یہ سوال کیا۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ آدمؑ سے دو ہزار سال پہلے سے جنات زمین پر آباد تھے۔ ابوالعالیہ فرماتے ہیں‘ فرشتے بدھ کے دن پیدا ہوئے اور جنات کو جمعرات کے دن پیدا کیا اور جمعہ کے دن آدم علیہ السلام پیدا ہوئے۔ حضرت حسنؒ اور حضرت قتادہؒ کا قول ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں خبر دی تھی کہ ابن آدم ایسا ایسا کریں گے۔ اس بنا پر انہوں نے سوال کیا۔ ابوجعفر محمد بن علیؒ فرماتے ہیں‘ بجل نامی ایک فرشتہ ہے جس کے ساتھی ہاروت ماروت تھے۔ اسے ہر دن تین مرتبہ لوحِ محفوظ پر نظر ڈالنے کی اجازت تھی۔ ایک مرتبہ اس نے آدم علیہ

السلام کے امور کا جب مطالعہ کیا تو چپکے سے اپنے ان دونوں ساتھیوں کو بھی خبر کر دی۔ اب جو اللہ تعالیٰ نے اپنا ارادہ ظاہر فرمایا' تو ان دونوں نے یہ سوال کیا۔ لیکن یہ روایت غریب ہے اور قابل تردید ہے۔ واللہ اعلم۔

پھر اس میں ہے کہ دو فرشتوں نے یہ سوال کیا۔ یہ قرآن کی روانی عبارت کے بھی خلاف ہے۔ یہ بھی روایت مروی ہے کہ یہ کہنے والے فرشتے دس ہزار تھے اور وہ سب کے سب جلا دیئے گئے۔ یہ بھی اسرائیلی روایت ہے اور بہت ہی غریب ہے۔ امام ابن جریرؒ فرماتے ہیں' اس سوال کی انہیں اجازت دی گئی تھی اور یہ بھی معلوم کرا دیا گیا تھا کہ یہ مخلوق نافرمان بھی ہوگی تو انہوں نے تعجب کے ساتھ مصلحت خداوندی معلوم کرنے کے لئے یہ سوال کیا' نہ کہ کوئی مشورہ دیا ہو یا انکار کیا ہو یا اعتراض کیا ہو۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ جب آدم علیہ السلام کی پیدائش شروع ہوئی تو فرشتوں نے کہا ناممکن ہے کہ کوئی مخلوق ہم سے زیادہ بزرگ اور عالم ہو تو ان پر یہ امتحان خداوندی آیا اور کوئی مخلوق امتحان سے نہیں چھوٹی۔ زمین و آسمان پر امتحان آیا تھا اور انہوں نے سرخم کر کے اطاعتِ خداوندی کے لئے آمادگی ظاہر کی تھی۔ فرشتوں کی تسبیح و تقدیس سے مراد خداوند تعالیٰ کی پاکی بیان کرنا' نماز پڑھنا' بے ادبی سے بچنا' بڑائی عظمت وغیرہ کرنا' نافرمانی نہ کرنا۔ سُبُّوْحٌ قُدُّوْسٌ وغیرہ پڑھنا۔ قدس کے معنی پاک ہیں' پاک زمین کو مقدس کہتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال ہوتا ہے کہ کون سا کلام افضل ہے؟ جواب دیتے ہیں' وہ جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے فرشتوں کے لئے پسند فرمایا ہے: ((سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ)) (صحیح مسلم)۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے معراج والی رات آسمانوں میں فرشتوں سے یہ تسبیح سُنی: سُبْحَانَ العلی الْاَعْلٰی سُبْحَانَهٗ وَتَعَالٰی۔

امام قرطبی وغیرہ نے اس آیت سے استدلال کیا ہے کہ خلیفہ کا مقرر کرنا واجب ہے تاکہ وہ لوگوں کے اختلافات کا فیصلہ کرے۔ ان کے جھگڑے چکائے۔ مظلوم کا بدلہ ظالم سے لے' حدود قائم کرے۔ برائیوں کے کرنے سے لوگوں کو باز رکھے وغیرہ وغیرہ۔ وہ بڑے بڑے کام' جو بغیر امام کے انجام نہیں پا سکتے۔ چونکہ یہ کام واجب ہیں اور یہ بغیر امام کے پورے نہیں ہو سکتے اور جو چیز بغیر واجب پوری نہ ہو وہ بھی واجب ہو جاتی ہے۔ پس خلیفہ کا مقرر کرنا واجب ثابت ہوا۔ امامت یا تو قرآن و حدیث کے ظاہری لفظوں سے ملے گی۔ جیسے کہ اہل سنت کی ایک جماعت کا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی نسبت یہ خیال ہے کہ ان کا نام حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خلافت کے لئے لیا تھا۔ یا قرآن و حدیث سے اس کی جانب اشارہ ہو۔ جیسے اہل سنت ہی کی دوسری جماعت کا خلیفہ اوّل کی بابت یہ خیال ہے کہ اشارۃً ان کا ذکر حضور ﷺ نے خلافت کے لئے کیا ہے یا ایک خلیفہ اپنے بعد دوسرے کو نامزد کر جائے۔ جیسے کہ حضرت صدیق اکبرؓ نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اپنا جانشین مقرر کر دیا تھا یا وہ صالح لوگوں کی ایک کمیٹی بنا کر انتخاب کا کام ان کے سپرد کر دیا جائے جیسے کہ حضرت عمرؓ نے کیا تھا یا اہل حل و عقد (یعنی بااثر سردارانِ لشکر' علماء' صلحا وغیرہ) اس کی بیعت پر اجماع کر لیں یا ان میں سے کوئی بیعت کر لے تو جمہور کے نزدیک اس کا مان لینا واجب ہو جائے گا۔ امام الحرمین نے اس پر اجماع نقل کیا ہے واللہ اعلم۔ یا کوئی شخص لوگوں کو بزور و جبر اپنی ماتحتی پر بے بس کر دے تو بھی واجب ہو جاتا ہے کہ اس کے ہاتھ پر بیعت کر لیں تاکہ پھوٹ اور اختلاف نہ پھیلے۔

امام شافعیؒ نے صاف لفظوں میں اس کا فیصلہ کیا ہے۔ اس بیعت کے وقت گواہوں کی موجودگی کے واجب ہونے میں اختلاف ہے۔ بعض تو کہتے ہیں یہ شرط نہیں۔ بعض کہتے ہیں شرط ہے اور دو گواہ کافی ہیں۔ جبائی کہتے ہیں کہ بیعت کرنے والے اور جس کے ہاتھ پر بیعت ہوئی ہے۔ ان دونوں کے علاوہ چار گواہ چاہئیں۔ جیسے عمر رضی اللہ عنہ نے شوریٰ کے چھ ارکان مقرر کئے تھے۔ پھر انہوں نے حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اختیار دیا اور آپ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر باقی چاروں کی موجودگی میں بیعت کی لیکن اس استدلال میں کلام ہے۔ واللہ اعلم۔

۱) امام کا مرد ہونا ۔۲) آزاد ہونا۔۳) بالغ ہونا۔۴) عقل مند ہونا ۔۵) مسلمان ہونا ۔۶) عادل ہونا۔۷) مجتہد ہونا ۔ ۸) آنکھوں والا ہونا۔۹) صحیح وسالم اعضاء والا ہونا۔۱۰) فنون جنگ سے ۔۱۱) اور رائے عامہ سے خبردار ہونا۔۱۲) قریشی ہونا واجب ہے اور یہی صحیح ہے۔ ہاں ہاشمی ہونا اور خطا سے معصوم ہونا شرط نہیں ۔ یہ دونوں شرطیں غالی رافضی لگاتے ہیں۔امام اگر فاسق ہو جائے تو اسے معزول کر دینا چاہئے یا نہیں۔اس میں اختلاف ہے اور صحیح یہ ہے کہ معزول نہ کیا جائے ۔کیونکہ حدیث میں آ چکا ہے کہ جب تک ایسا کھلا کفر نہ دیکھ لو جس کے کفر ہونے کی ظاہر دلیل خدا کی طرف سے تمہارے پاس ہو۔اسی طرح خود امام اپنے آپ معزول ہو سکتا ہے یا نہیں؟ اس میں بھی اختلاف ہے۔ حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہ خود بخود آپ ہی معزول ہو گئے تھے اور امر امامت حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو سونپ دیا تھا۔لیکن عذر کے باعث تھا۔جس پر ان کی تعریف کی گئی ہے۔روئے زمین پر ایک سے زیادہ امام ایک وقت میں نہیں ہو سکتے ۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ جب تمہارا کام اجتماعی طور پر ہو رہا ہو اور کوئی آ کر افتراق پیدا کرنے لگے تو اُسے قتل کر دو' خواہ کوئی بھی ہو۔(مسلم) جمہور کا یہی مذہب ہے اور بہت سے بزرگوں نے اس پر اجماع نقل کیا ہے۔جن میں سے ایک امام الحرمین ہیں۔

کرامیہ (شیعہ) کا قول ہے کہ دو اور اس سے زیادہ بھی ایک وقت میں امام ہو سکتے ہیں۔جیسا کہ حضرت علی اور حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم دونوں اطاعت کے لائق تھے اگر وہ کہتا ہے کہ جب ایک وقت میں دو دو اور زیادہ نبوت کا ہونا جائز ہے' تو اماموں کا ہونا جائز کیوں نہ ہو؟ نبوت کا مرتبہ تو یقیناً امامت کے مرتبے سے بہت زیادہ ہے لیکن صحیح مسلم والی حدیث آپ اُوپر پڑھ چکے ہیں کہ دوسرے کو قتل کر ڈالو۔اس لئے صحیح مذہب یہی ہے جو پہلے بیان ہوا۔امام الحرمین نے استاد ابو اسحاق سے بھی حکایت کی ہے کہ وہ دو اور زیادہ اماموں کا مقرر کرنا اس وقت جائز جانتے ہیں' جب مسلمانوں کی سلطنت بہت وسیع ہو اور ہر طرف پھیلی ہوئی ہو اور دونوں اماموں کے درمیان کئی ملکوں کا فاصلہ ہو۔امام الحرمین اس میں متردد ہیں۔خلفاء بنی عباس کا عراق میں اور خلفاء بنی فاطمہ کا مصر میں اور خاندان امویہ کا مغرب میں ۔میرے خیال میں یہ حال تھا۔اس کی بسط و تفصیل ان شاء اللہ کتاب الاحکام کی کسی مناسب جگہ ہم کریں گے۔

وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ فَقَالَ اَنْۢبِـُٔوْنِىْ بِاَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۳۱﴾ قَالُوْا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ﴿۳۲﴾ قَالَ يٰٓاٰدَمُ اَنْۢبِئْهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ ۚ فَلَمَّآ اَنْۢبَاَهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ ۙ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ اِنِّىْٓ اَعْلَمُ غَيْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۙ وَاَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ﴿۳۳﴾

اور علم دے دیا ہے اللہ تعالیٰ نے (حضرت) آدم (علیہ السلام) کو (ان کو پیدا کر کے) سب چیزوں کے اسماء کا پھر وہ چیزیں فرشتوں کے روبرو کر دیں۔ پھر فرمایا کہ بتاؤ مجھ کو اسماء ان چیزوں کے (یعنی مع ان کے آثار و خواص کے) اگر تم سچے ہو۔ فرشتوں نے عرض کیا کہ آپ تو پاک ہیں کہ ہم کو ہی علم نہیں مگر وہ جو کچھ ہم کو آپ نے علم دیا ہے۔ بے شک آپ بڑے علم والے ہیں حکمت والے ہیں۔ (کہ جس قدر جس کے لئے مصلحت جانا اسی قدر فہم و علم عطا فرمایا' حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ

اے آدم ان کو ان چیزوں کے نام بتلا دو۔ سو جب بتلا دیئے ان کو آدم نے ان چیزوں کے اسماء تو حق تعالیٰ نے فرمایا (دیکھو) میں تم سے کہتا نہ تھا کہ بے میں جانتا ہوں تمام پوشیدہ چیزیں آسمانوں کی اور زمین کی اور جانتا ہوں جس بات کو ظاہر کر دیتے ہو اور جس بات کو تم دِل میں رکھتے ہو ○

یہاں سے اس بات کا بیان ہو رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک خاص علم میں حضرت آدم علیہ السلام کو فرشتوں پر بھی فضیلت دی۔ یہ واقعہ فرشتوں کے سجدہ کرنے کے بعد کا ہے۔ لیکن حکمت خداوندی جو آپ کے پیدا کرنے میں تھی اور جس کا علم فرشتوں کو نہ تھا۔ جس کا اجمالی بیان اُوپر کی آیت میں گزرا ہے۔ اس کی مناسبت کی وجہ سے اس واقعہ کو پہلے بیان کیا اور فرشتوں کا سجدہ کرنا جو اس سے پہلے ہوا تھا۔ میں بیان پیچھے کر دیا۔ تاکہ خلیفہ کے پیدا کرنے کی مصلحت اور حکمت ظاہر ہو جائی اور یہ معلوم ہو جائے کہ شرافت اور فضیلت حضرت آدم علیہ السلام کو ملی کہ انہیں وہ علم ہے۔ جس سے یہ فرشتے خالی ہیں۔ فرمایا کہ حضرت آدم علیہ السلام کو تمام نام بتائے۔ یعنی ان کی تمام اولاد کے، سب جانوروں کے۔ زمین آسمان، پہاڑ، تری، خشکی، گدھے، گھوڑے، برتن، بھانڈے، چرند پرند، فرشتے تارے وغیرہ تمام چھوٹی بڑی چیزوں کے نام۔ ابن جریرؒ فرماتے ہیں کہ فرشتوں اور انسانوں کے نام معلوم کرائے گئے تھے کیونکہ اس کے بعد لفظ عَرَضَهُمْ آتا ہے اور ذی عقل لوگوں کے لئے آتا ہے۔ لیکن یہ کوئی ایسی معقول وجہ نہیں۔ جہاں ذی عقل اور غیر ذی عقل جمع ہوتے ہیں۔ وہاں جو لفظ لایا جاتا ہے وہ عقل و ہوش رکھنے والوں کا ہی لایا جاتا ہے۔ جیسے قرآن میں ہے: ﴿وَاللّٰهُ خَلَقَ كُلَّ دَآبَّةٍ مِّنْ مَّآءٍ......﴾ (النور ۴۵) اللہ تعالیٰ نے تمام جانوروں کو پانی سے پیدا کیا ہے۔ جن میں سے بعض تو پیٹ کے بل رینگتے ہیں۔ بعض دو پیروں پر چلتے ہیں۔ بعض چار پاؤں پر چلتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے۔ وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ پس اس آیت میں ظاہر ہے کہ غیر ذی عقل بھی داخل ہیں مگر معنی سب ذی عقل کے ہیں۔ علاوہ ازیں عَرَضَهُنَّ بھی حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی قراءت میں ہے اور اُبی بن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی قراءت میں عَرَضَهَا بھی ہے۔ صحیح قول یہی ہے کہ تمام چیزوں کے نام سکھائے تھے۔ ذاتی نام بھی، صفاتی نام اور کاموں کے نام بھی۔ جیسے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا قول ہے کہ گوز کا نام بھی تایا گیا تھا۔ صحیح بخاری کتاب التفسیر میں۔

ایک طویل حدیث ☆ اس آیت کی تفسیر میں حضرت امام بخاریؒ یہ حدیث لائے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ ایمان دار قیامت کے دن جمع ہوں گے اور کہیں گے کیا اچھا ہوتا اگر کسی کو ہم سفارشی بنا کر خدا کے پاس بھیجتے۔ چنانچہ یہ سب کے سب حضرت آدم علیہ السلام کے پاس آئیں گے اور ان سے کہیں گے کہ آپ ہم سب کے باپ ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اپنے ہاتھ سے پیدا کیا۔ اپنے فرشتوں سے آپ کو سجدہ کرایا۔ آپ کو تمام چیزوں کے نام سکھائے آپ اللہ کے سامنے ہماری سفارش لے جائیں جو ہم اس سے راحت پائیں۔ حضرت آدمؑ یہ سن کر جواب دیں گے کہ میں اس قابل نہیں۔ انہیں گناہ یاد آ جائے گا۔ تم نوح علیہ السلام کے پاس جاؤ۔ وہ پہلے رسول ہیں، جنہیں اللہ تعالیٰ نے زمین والوں کی طرف بھیجا۔ سب یہ جواب سن کر نوح علیہ السلام کی طرف آئیں گے۔ آپ بھی یہی جواب دیں گے اور خداوند تعالیٰ کی مرضی کے خلاف اپنے بیٹے کے لئے اپنا دعا مانگنا یاد کر کے شرما جائیں گے اور فرمائیں گے تم خلیل الرحمن ابراہیم علیہ السلام کے پاس جاؤ۔ یہ سب آپ کے پاس آئیں گے لیکن یہاں سے بھی یہی جواب پائیں گے۔ آپ فرمائیں گے تم موسیٰ علیہ السلام کے پاس جاؤ۔ جن سے خدا نے کلام کیا اور جنہیں تورات عنایت فرمائی یہ سُن کر سب کے سب حضرت موسیٰ علیہ السلام کے

پاس آئیں گے اور آپ سے بھی یہی درخواست کریں گے لیکن یہاں سے بھی یہی جواب پائیں گے۔ آپ کو ایک شخص کا بغیر قصاص کے مار ڈالنا یاد آ جائے گا اور شرمندہ ہو جائیں گے اور فرمائیں گے تم حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پاس جاؤ۔ وہ اللہ کے بندے اور اس کے رسول اور کلمۃ اللہ اور روح اللہ ہیں۔ یہ سب یہاں آئیں گے لیکن یہاں سے بھی یہی جواب پائیں گے کہ میں اس لائق نہیں۔ تم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جاؤ' جن کے تمام اگلے پچھلے گناہ بخش دیئے گئے ہیں۔ وہ اب سارے کے سارے میرے پاس آئیں گے۔ میں آمادہ ہو جاؤں گا اور اپنے رب سے اجازت طلب کروں گا مجھے اجازت دی جائے گی۔ میں اپنے ربّ کو دیکھتے ہی سجدے میں گر پڑوں گا۔ جب تک خدا کو منظور ہوگا سجدے میں پڑا رہوں گا۔ پھر آواز آئے گی کہ سر اُٹھایئے' سوال کیجئے پورا کیا جائے۔ کہیئے سنا جائے گا۔ شفاعت کیجئے قبول کی جائے گی۔ اب میں سر اٹھاؤں گا اور اللہ تعالیٰ کی وہ تعریفیں بیان کروں گا جو اسی وقت اللہ تعالیٰ مجھے سکھائے گا۔ پھر میں شفاعت کروں گا۔ میرے لئے حد مقرر کر دی جائے گی۔ میں انہیں جنت میں پہنچا کر پھر آؤں گا۔ پھر اپنے ربّ کو دیکھ کر سجدے میں گر پڑوں گا۔ پھر شفاعت کروں گا۔ پھر حد مقرر ہوگی۔ انہیں بھی جنت میں پہنچا کر تیسری مرتبہ آؤں گا۔ پھر چوتھی بار حاضر ہوں گا۔ یہاں تک کہ جہنم میں صرف وہی رہ جائیں گے' جنہیں قرآن نے روک رکھا ہو اور جن کے لئے جہنم کی ہیشگی واجب ہوگئی ہو۔ (یعنی شرک و کفر کرنے والے)۔ صحیح مسلم شریف میں' نسائی میں' ابن ماجہ وغیرہ میں بھی یہ حدیث شفاعت موجود ہے۔ یہاں اس کے نقل کرنے سے مقصود یہ ہے کہ اس حدیث میں یہ جملہ بھی ہے کہ لوگ حضرت آدم علیہ السلام سے کہیں گے کہ خدا تعالیٰ نے آپ کو تمام چیزوں کے نام سکھائے۔ پھر ان چیزوں کو فرشتوں کے سامنے پیش کیا اور ان سے فرمایا کہ لاؤ اگر تم اپنے قول میں کہ تم ساری مخلوق سے علم والے ہو یا اس قول میں کہ اللہ تعالیٰ زمین خلیفہ نہ بنائے گا' سچے ہو تو ان چیزوں کے نام بتاؤ۔ یہ بھی مروی ہے کہ اگر آپ اپنی اس بات میں کہ بنی آدم فساد کریں گے اور خون بہائیں گے' سچے ہو تو ان کے نام بتاؤ۔ لیکن زیادہ صحیح قول پہلا ہی ہے۔ گویا اس انہیں ڈانٹا گیا کہ بتاؤ تمہارا قول کہ تم ہی خلافت زمین کے لائق ہو اور اگر تم نہیں بتا سکتے ہو تو تم سمجھ لو کہ موجودہ چیزوں کے نام بھی تمہیں نہیں معلوم۔ تو آئندہ آنے والی چیزوں کی نسبت تمہیں کیسے علم ہوگا؟ فرشتوں نے یہ سنتے ہی اللہ تعالیٰ کی پاکیزگی اور بڑائی اور اپنے علم کی کمی بیان کرنی شروع کر دی اور کہہ دیا کہ جسے جتنا کچھ اے خداوند تعالیٰ سکھا دیا' اُتنا ہی اُسے علم ہے۔ تمام چیزوں پر احاطہ رکھنے والا علم تو صرف تجھی کو ہے' تو ہر چیز کا جاننے والا اور اپنے تمام احکام میں حکمت رکھنے والا ہے۔ جسے جو کچھ سکھائے وہ بھی حکمت سے اور جسے نہ سکھائے وہ بھی حکمت سے۔ تو حکمتوں والا اور عدل والا ہے۔

"سُبْحَانَ اللّٰه" کے معنی اور اِس کی تفسیر ☆ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں' سبحان اللہ کے معنی اللہ تعالیٰ کی پاکیزگی کے ہیں کہ وہ ہر برائی سے منزہ ہے۔ حضرت عمرؓ نے حضرت علیؓ اور اپنے پاس کے دوسرے اصحاب سے ایک مرتبہ سوال کیا کہ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ تو ہم جانتے ہیں لیکن سُبْحَانَ اللّٰه کیا کلمہ ہے؟ تو حضرت علیؓ نے جواب دیا کہ اس کلمہ کو باری تعالیٰ نے اپنے لئے پسند فرمایا ہے اور اس سے وہ خوش ہوتا ہے اور اس کا کہنا اُسے محبوب ہے۔ حضرت میمون بن مہران فرماتے ہیں کہ اس میں اللہ تعالیٰ کی تعظیم ہے اور تمام برائیوں سے پاکیزگی کا بیان ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام نے نام بتا دیئے کہ تمہارا نام جبرئیل ہے۔ تمہارا نام میکائیل ہے۔ تم اسرافیل ہو۔ یہاں تک کہ چیل کوے وغیرہ سب کے نام جب ان سے پوچھے گئے تو انہوں نے بتا دیئے۔ جب حضرت آدم علیہ السلام کی یہ فضیلت فرشتوں کو معلوم ہوئی تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا۔ دیکھو میں نے تم سے پہلے ہی نہ کہا تھا کہ ہر کھلے چھپے کا جاننے والا ہوں۔ جیسے اور جگہ ہے: ﴿وَاِنْ تَجْهَرْ بِالْقَوْلِ فَاِنَّهٗ يَعْلَمُ السِّرَّ وَاَخْفٰى﴾ (طٰہٰ: ۷) تم بلند آواز سے کہو (یا نہ کہو) اللہ تعالیٰ پوشیدہ سے پوشیدہ چیز کو جانتا ہے اور

جگہ ہے کہ: ﴿ اَلَّا یَسْجُدُوْا...... ﴾ (النمل: ۲۵) کیوں یہ لوگ اس خدا کو سجدہ نہیں کرتے جو آسمانوں اور زمین کی چھپی چیزوں کو نکالتا ہے اور تمہارے ہر پوشیدہ اور ظاہر کو جانتا ہے اللہ تعالیٰ اکیلا ہی معبود ہے اور وہ ہی عرش عظیم کا رب ہے۔ جو تم ظاہر کرتے ہو اور چھپاتے تھے اسے میں جانتا ہوں۔ مطلب یہ ہے کہ ابلیس کے دل میں جو تکبر اور غرور تھا اُسے میں جانتا تھا۔

فرشتوں کا یہ قول کہ زمین میں اُسے کیوں پیدا کرتا ہے جو فساد کرے اور خون بہائے' یہ تو وہ قول تھا جسے انہوں نے ظاہر کیا تھا اور چھپایا تھا۔ وہ ابلیس کے دل میں تکبر اور غرور تھا۔ ابن عباس اور ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہم اور بعض اور صحابہ رضوان اللہ علیہ اجمعین اور سعید بن جبیرؒ اور مجاہد اور سدی اور ضحاک اور ثوری کا یہی قول ہے۔ ابن جریر بھی اسی کو پسند کرتے ہیں اور ابوالعالیہ ربیع بن انس' حسن اور قتادہ کا قول ہے کہ ان کی چھپی ہوئی بات۔ ان کا کہنا تھا کہ جس مخلوق کو بھی خدا پیدا کرے گا کہ ہم اس سے زیادہ عالم اور زیادہ بزرگ ہوں گے۔ لیکن بعد میں ثابت ہو گیا اور خود انہوں نے بھی جان لیا کہ آدم علیہ السلام کو علم اور کرم دونوں میں ان پر فوقیت حاصل ہے۔ حضرت عبدالرحمٰن بن زید بن اسلمؒ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے فرمایا' جس طرح تم ان چیزوں کے ناموں سے بے خبر ہو اسی طرح یہ بھی نہیں جان سکتے کہ ان میں بھلے بُرے ہر طرح کے ہوں گے۔ فرماں بردار بھی ہوں گے اور نافرمان بھی اور میں پہلے ہی لکھ چکا ہوں کہ مجھے جنت و دوزخ دونوں پُر کرنے ہیں۔ لیکن تمہیں میں نے اس کی خبر نہیں کی۔ اب جبکہ فرشتوں نے حضرت آدمؑ کو دیا ہوا علم دیکھا تو ان کی بزرگی کا اقرار کر لیا۔

امام ابن جریر فرماتے ہیں سب سے اولیٰ قول حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا ہے کہ آسمان و زمین کے غیب کا علم' تمہارے ظاہر و باطن کا علم مجھے ہے۔ ان کے ظاہری قول کو اور ابلیس کے باطنی عجب و غرور کو بھی خدا جانتا تھا۔ اس میں چھپانے والا صرف ایک ابلیس ہی تھا۔ لیکن صیغہ جمع کا لایا گیا ہے۔ اس لئے کہ عرب میں یہ دستور ہے اور ان کے کلام میں یہ بات پائی جاتی ہے کہ ایک کے یا بعض کے ایک کام کو سب کی طرف نسبت کر دیا کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ لشکر مار ڈالا گیا۔ انہیں شکست ہوئی۔ حالانکہ شکست اور قتل ایک کا یا بعض کا ہوتا ہے اور صیغہ جمع کا لگاتے ہیں۔ بنو تمیم کے ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو آپ کے حجرے کے پیچھے سے پکارا تھا۔ لیکن قرآن پاک میں اس کا بیان ان لفظوں میں ہے کہ: ﴿ اِنَّ الَّذِیْنَ یُنَادُوْنَكَ مِنْ وَّرَآءِ الْحُجُرٰتِ ﴾ (الحجرات: ۴) جو لوگ تمہیں اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم حجروں کے پیچھے سے پکارتے ہیں تو دیکھئے پکارنے والا صرف ایک تھا اور صیغہ جمع کا لایا گیا۔ اسی طرح ﴿ وَمَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ﴾ میں بھی اپنے دل میں بدی کو چھپانے والا صرف ایک ابلیس ہی تھا لیکن صیغہ جمع کا لایا گیا۔

وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ اَبٰى وَاسْتَكْبَرَ ۫ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۳۴﴾

اور جس وقت حکم دیا ہم نے فرشتوں کو (اور جنوں کو بھی) کہ سجدہ میں گر جاؤ آدم کے سامنے۔ سو سب سجدے میں گر پڑے بجز ابلیس کے اس نے کہنا نہ مانا اور غرور میں آ گیا اور ہو گیا کافروں میں سے ○

سجدۂ ملائکہ اور آدم علیہ السلام کی فضیلت ☆

حضرت آدم علیہ السلام کی اس بہت بڑی بزرگی کو ذکر کر کے اللہ تعالیٰ نے انسانوں پر اپنا بہت بڑا احسان ظاہر کیا اور خبر دی کہ اس

نے فرشتوں کو حکم دیا کہ وہ حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کریں۔ اصلی دلالت میں بھی بہت سی حدیثیں ہیں۔ ایک تو حدیث شفاعت جو ابھی بیان ہوئی اور دوسری حدیث میں ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے درخواست کی کہ میری ملاقات حضرت آدم علیہ السلام سے کرا۔ جو خود بھی جنت سے نکلے اور ہم کو بھی نکالا۔ جب دونوں پیغمبر جمع ہوئے تو موسیٰ علیہ السلام نے کہا' تم وہ آدمؑ ہو کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں اپنے ہاتھ سے پیدا کیا اور اپنی روح تم میں پھونکی۔ اپنے فرشتوں سے تمہیں سجدہ کرایا (آخر تک) پوری حدیث عنقریب بیان ہوگی۔

شیطان کیا ہے؟ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں' ابلیس فرشتوں کے ایک قبیلہ میں سے تھا۔ جنہیں جن کہتے ہیں۔ جو آگ کے شعلوں سے پیدا ہوئے تھے۔ اس کا نام حارث تھا اور جنت کا خازن تھا۔ اس قبیلے کے سوا اور فرشتے سب کے سب نوری تھے۔ قرآن نے بھی ان جنوں کی پیدائش کا بیان کیا ہے اور فرمایا ہے: ﴿مِنْ مَّارِجٍ مِّنْ نَّارٍ...... ﴾ (الرحمٰن:۱۵) آگ کے شعلے کی جو تیزی بلند ہوتی ہے اُسے مارج کہتے ہیں۔ جس سے جن پیدا کئے گئے تھے اور انسان مٹی سے پیدا کیا گیا۔ زمین میں پہلے جن بستے تھے۔ انہوں نے فساد اور خونریزی شروع کی تو اللہ تعالیٰ نے ابلیس کو فرشتوں کا لشکر دے کر بھیجا۔ انہی کو جن کہا جاتا تھا۔ ابلیس نے لڑ بھڑ کر مارتے اور قتل کرتے ہوئے انہیں سمندروں کے جزیروں اور پہاڑ کے دامنوں میں پہنچا دیا۔ ابلیس کے دل میں تکبر سما گیا کہ میں نے وہ کام کیا جو کسی اور سے نہ ہو سکا۔ چونکہ دل کی اس بدی اور پوشیدہ خودی کا علم اللہ تعالیٰ کو ہی تھا۔ جب پروردگار نے فرمایا کہ زمین میں خلیفہ پیدا کرنا چاہتا ہوں۔ تو ان فرشتوں نے عرض کیا کہ پھر ایسوں کو کیوں کرتا ہے جو اگلی قوم کی طرح فساد و خونریزی کریں؟ تو انہیں جواب دیا گیا کہ میں جانتا ہوں' جو تم نہیں جانتے۔ یعنی ابلیس کے دل میں جو کبر و غرور ہے' اس کا مجھی کو علم ہے۔ تمہیں خبر نہیں۔ پھر آدم کی مٹی اٹھائی گئی' جو چکنی اور اچھی تھی۔ جب اسی کا خمیر اُٹھا' تب اس سے حضرت آدم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے اپنے ہاتھ سے پیدا کیا اور چالیس دن تک وہ یونہی پتلے کی شکل میں رہے۔ ابلیس آتا تھا اور اس کو لات مار کر دیکھتا تھا کہ وہ بجتی مٹی تھی۔ جیسے کوئی کھوکھلی چیز ہو۔ پھر منہ کے سوراخ سے گھس کر پیچھے کے سوراخ سے اور اس کے خلاف آتا جاتا رہا اور کہتا رہا کہ درحقیقت یہ کوئی چیز نہیں اور اگر میں اس پر مسلط کیا گیا تو اسے برباد کر کے چھوڑوں گا اور اسے مجھ پر مسلط کیا گیا تو ہرگز تسلیم نہ کروں گا۔ پھر جب اللہ تعالیٰ نے ان میں روح پھونکی اور وہ سر کی طرف سے نیچے کی طرف آئی تو جہاں جہاں تک پہنچتی رہی' خون گوشت بنتا گیا۔ جب ناف تک روح پہنچی تو اپنے جسم کو دیکھ کر خوش ہوئے اور جھٹ سے اُٹھنا چاہا لیکن نیچے کے دھڑ میں روح نہیں پہنچی تھی۔ اس لئے اُٹھ نہ سکے۔ اسی جلدی کا بیان اس آیت میں ہے: ﴿وَكَانَ الْإِنْسَانُ عَجُوْلًا﴾ (بنی اسرائیل:۱۱) یعنی انسان بے صبر اور جلد باز ہے نہ تو خوشی میں صبر نہ رنج میں۔ جب روح جسم میں پہنچی' اور چھینک آئی تو کہا اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔ اللہ تعالیٰ نے جواب دیا یَرْحَمُكَ اللّٰهُ۔ پھر صرف ابلیس کے ساتھی فرشتوں سے فرمایا کہ آدم کو سجدہ کرو۔ تو ان سب نے تو سجدہ کیا۔ لیکن ابلیس کا غرور و تکبر ظاہر ہو گیا۔ اس نے نہ مانا اور سجدہ سے انکار کر دیا اور کہنے لگا کہ میں اس سے بہتر ہوں۔ اس سے بڑا عمر والا ہوں اور اس سے قوی اور مضبوط ہوں۔ یہ مٹی سے پیدا کیا گیا ہے اور میں آگ سے بنا ہوں اور آگ مٹی سے قوی ہے۔ اس انکار پر اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے ناامید کر دیا اور اسی لئے اسے ابلیس کہا جاتا ہے۔ اس کی نافرمانی کی سزا میں اسے راندۂ درگاہ شیطان بنایا۔ پھر حضرت آدم علیہ السلام کو انسان' جانور' زمین' سمندر' پہاڑ وغیرہ کے نام بتا کر ان پر پیش کیا۔ جو ابلیس کے ساتھی اور آگ سے پیدا شدہ تھے اور ان سے فرمایا کہ اگر تم اس بات میں سچے ہو کہ میں زمین میں خلیفہ نہ بناؤں' تو ذرا مجھے ان چیزوں کے نام بتاؤ۔ جب فرشتوں نے دیکھا کہ ہماری اگلی بات سے خداوند عالم ناراض ہے۔ وہ کہنے لگے کہ خدایا تو اس بات سے پاک ہے کہ تیرے سوا

کوئی دوسرا غیب کو جانے۔ ہماری تو یہ اور اقرار ہے کہ ہم غیب داں نہیں۔ ہم تو صرف وہی جان سکتے ہیں کہ جو تو ہمیں معلوم کرا دے جیسے تو نے ان کے نام صرف آدم علیہ السلام کو سکھائے ہیں۔ اب اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام سے فرمایا کہ تم انہیں ان چیزوں کے نام بتاؤ۔ چنانچہ انہوں نے بتا دیئے تو فرمایا اے فرشتو' کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ آسمان وزمین کا غیب جاننے والا صرف میں اکیلا ہی ہوں اور کوئی نہیں۔ میں پوشیدگی کو بھی ویسا ہی جانتا ہوں جیسے ہر ظاہر کو۔ یعنی ابلیس کا اندرونی کبر وغرور بھی میں جانتا تھا اور تم سب اس سے بے خبر تھے۔ لیکن یہ قول بھی غریب ہے اور اس میں بہت سی باتیں ایسی ہیں' جو محل نظر ہیں۔ اگر ہم انہیں الگ الگ بیان کریں تو مضمون بہت بڑھ جائے گا اور ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما تک اس اثر کی سند بھی وہی ہے۔ جس سے ان کی مشہور تفسیر مروی ہے۔ ایک اور اثر بھی اسی طرح کا مروی ہے۔ اس میں کچھ کمی زیادتی بھی ہے اور اس میں یہ بھی ہے کہ زمین کی مٹی لینے کے لئے حضرت جبرئیل گئے تو زمین نے کہا کہ میں اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگتی ہوں کہ تو مجھ میں سے کچھ گھٹائے۔ وہ واپس چلے گئے۔ پھر ملک الموت کو بھیجا۔ زمین نے پھر بھی یہی کہا۔ لیکن انہوں نے جواب دیا کہ میں بھی اللہ تعالیٰ کی پناہ میں آتا ہوں کہ میں خدا کا حکم پورا کئے بغیر واپس چلا جاؤں۔ چنانچہ انہوں نے تمام روئے زمین سے ایک مٹھی مٹی کی لی۔ چونکہ مٹی کا رنگ کہیں سرخ تھا اور کہیں سفید' کہیں سیاہ اسی وجہ سے انسانوں کی رنگتیں بھی طرح طرح کی ہوئیں لیکن یہ اثر بھی بنو اسرائیل کی باتوں سے پُر ہے۔ غالباً اس میں بہت سی باتیں نیچے کے لوگوں کی ملائی ہوئی ہوں۔ صحابہ کا بیان ہے ہی نہیں اور اگر صحابی کا قول بھی ہو' تو بھی انہوں نے بعض اگلی کتابوں سے لیا ہوگا۔ واللہ اعلم۔

حاکم اپنی مستدرک میں بہت سی ایسی روایتیں لائے ہیں اور ان کی سند کو شرط بخاری پر کہا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو حکم دیا کہ تم حضرت آدمؑ کو سجدہ کرو تو اس خطاب میں ابلیس بھی داخل تھا اور پھر نافرمانی کی سزا بھگتی۔ اس کی تفصیل ان شاء اللہ تعالیٰ ﴿كَانَ مِنَ الْجِنِّ﴾ (الکہف: ۵۰) کی تفسیر میں آئے گی۔ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کہتے ہیں' نافرمانی سے پہلے وہ فرشتوں میں تھا۔ عزازیل اس کا نام تھا زمین پر اس کی رہائش تھی۔ اجتہاد اور علم میں بہت بڑا تھا اور اسی وجہ سے دماغ میں رعونت تھی اور اس کی جماعت کا اور اس کا تعلق جنوں سے تھا (طبری)۔ اس کے چار پَر تھے۔ جنت کا خازن تھا۔ زمین اور آسمانِ دنیا کا سلطان تھا۔ حضرت حسن فرماتے ہیں کہ ابلیس کبھی فرشتہ نہ تھا۔ اس کی اصل جنات سے ہے جیسے کہ آدمؑ کی اصل اس سے مٹی ہے۔ اس کی اسناد صحیح ہے۔ عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم اور شہر بن حوشب کا بھی یہی قول ہے۔ سعد بن مسعود کہتے ہیں کہ فرشتوں نے جنات کو مارا تب اسے قید کیا تھا اور آسمان پر لے گئے تھے۔ وہاں عبادت کی وجہ سے رہ پڑا۔ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے یہ بھی مروی ہے کہ پہلے ایک مخلوق کو اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا۔ انہیں اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کو سجدہ کرنے کو کہا۔ انہوں نے انکار کیا۔ جس پر وہ جلا دیئے گئے۔ پھر دوسری مخلوق پیدا کی۔ ان کا یہی حشر ہوا۔ پھر تیسری مخلوق پیدا کی۔ انہوں نے تعمیل ارشاد کی۔ لیکن یہ اثر بھی غریب ہے اور اس کی اسناد بھی تقریباً صحیح ہے۔ اس میں ایک راوی مبہم ہے۔ اس وجہ سے یہ روایت قابل حجت نہیں۔ كَافِرِيْنَ سے مراد نافرمان ہیں۔ ابلیس کی ابتداء آفرینش ہی کفر وضلالت پر تھی۔ کچھ دن ٹھیک ٹھاک رہا۔ لیکن پھر اپنی اصلیت پر آ گیا۔ سجدہ کرنے کا حکم بجالانا خداوند تعالیٰ کی اطاعت اور آدم علیہ السلام کا اکرام تھا۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ سجدہ سلام' عزت واکرام کا تھا۔ جیسے حضرت یوسف علیہ السلام کے بارے میں فرمان ہے کہ انہوں نے اپنے ماں باپ کو تخت پر بٹھا لیا اور سب کے سب سجدے میں گر پڑے اور حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا۔ ابا! یہی میری اس خواب کی تعبیر ہے جسے میرے رب نے سچا کر دکھایا۔ اگلی امتوں میں یہ جائز تھا۔ لیکن ہمارے دین میں یہ منسوخ ہو گیا۔ حضرت معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے شامیوں کو اپنے سرداروں اور علماء کے سامنے سجدہ کرتے ہوئے دیکھا تھا تو حضور ﷺ سے گزارش کی

کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم آپ اس کے زیادہ حقدار ہیں کہ آپ کو سجدہ کیا جائے تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں اگر کسی انسان کو کسی انسان کے سامنے سجدہ کرنے کی اجازت دے سکتا تو عورتوں کو حکم دیتا کہ وہ خاوندوں کو سجدہ کریں کیونکہ ان کا ان پر بڑا حق ہے (ابن ماجہ)۔ امام رازیؒ نے اسی کو ترجیح دی ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ سجدہ اللہ تعالیٰ ہی کے لئے تھا۔ حضرت آدم بطور قبلہ تھے جیسے قرآن کریم میں اور جگہ ہے: ﴿اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ﴾ (بنی اسرائیل: ۷۸) لیکن اس میں نظر ہے اور پہلے قول کا ہی زیادہ ظاہر ہونا اچھا معلوم ہوتا ہے۔ یہ سجدہ حضرت آدم کے اکرام، بڑائی، احترام اور سلام کے طور پر تھا اور خداوند تعالیٰ کی اطاعت کے ماتحت تھا کیونکہ اس کا حکم تھا کہ جس کی بجا آوری ضروری تھی۔ امام رازی نے بھی اسی قول کو قوی بتایا ہے اور اس کے سوا دونوں قولوں کو ضعیف قرار دیا ہے۔ ایک تو حضرت آدم علیہ السلام کا بطور قبلہ کے ہونا، جس میں کوئی بڑا اشرف ظاہر نہیں ہوتا۔ دوسرے سجدے سے مراد پست عاجز ہونا ہے۔ نہ کہ زمین پر پیشانی رکھ کر حقیقی سجدہ کرنا، لیکن یہ دونوں تاویلیں ضعیف ہیں۔ حضرت قتادہؒ فرماتے ہیں کہ سب سے پہلا گناہ یہی تکبر کا ہے جو ابلیس سے سرزد ہوا۔ صحیح حدیث میں ہے۔ جس کے دِل میں رائی کے دانے کے برابر تکبر ہوگا۔ وہ جنت میں داخل نہ ہوگا۔ (مسلم) اسی تکبر کفر وعناد کی وجہ سے ابلیس کے گلے میں طوق لعنت پڑا۔ رحمت سے مایوس ہوکر جناب باری سے دھتکارا گیا۔ یہاں كَانَ صَارَ کے معنی میں بھی بتایا گیا ہے۔ جیسے: ﴿فَكَانَ مِنَ الْمُغْرَقِيْنَ﴾ (ھود ۴۳) اور ﴿فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ﴾ (البقرۃ ۳۵) شاعروں کے اشعار میں بھی اس معنی میں استعمال ہوا ہے۔ تو معنی یہ ہوئے کہ وہ کافر ہوگیا۔

چند خرقِ عادات رونما ہو جانے کسی کے ولی ہونے کی دلیل نہیں ☆

ابن فورک کہتے ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے علم میں کافروں میں سے تھا۔ قرطبی اسی کو ترجیح دیتے ہیں اور یہاں ایک مسئلہ بیان فرماتے ہیں کہ کسی شخص کے ہاتھ سے کچھ کرامتیں سرزد ہو جانا اس کے ولی اللہ ہونے کی دلیل نہیں۔ گو بعض صوفی اور رافضی اس کے خلاف بھی کہتے ہیں۔ اس لئے کہ ہم کسی بات کا کسی کے لئے فیصلہ نہیں کر سکتے کہ وہ ایمان ہی کی حالت میں اللہ سے جا ملے گا (اسی شیطان کو دیکھئے ولی چھوڑ کر فرشتہ بنا ہوا تھا لیکن آخر سردار کفر ہوگیا) علاوہ ازیں ایسی خلاف عادت وعقل باتیں جو بظاہر کرامات نظر آتی ہیں۔ اولیاء اللہ کے سوا اور لوگوں کے ہاتھوں بھی سرزد ہوئی ہیں۔ بلکہ فاسق، فاجر، مشرک، کافر سے بھی ظاہر ہو جاتی ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دل میں: ﴿فَارْتَقِبْ يَوْمَ تَاْتِي السَّمَآءُ بِدُخَانٍ مُّبِيْنٍ﴾ (الدخان ۱۰) کی آیت پوشیدہ کر کے جب ابن صیاد کافر سے پوچھا کہ میں نے کیا چھپا رکھا ہے؟ تو اس نے کہا: دخ۔ (بخاری) بعض روایات میں ہے کہ غصہ کے وقت وہ اتنا پھول جاتا تھا کہ اس کے جسم سے تمام راستہ رک جاتا تھا۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے اسے مارا (مسلم)۔ دجال کی تو بہت سی باتیں حدیثوں میں وارد ہیں۔ مثلاً اس کا آسمان سے بارش برسانا۔ زمین سے پیداوار اُگانا۔ زمین کے خزانوں کا اس کے پیچھے لگنا۔ ایک نوجوان کو قتل کر کے پھر زندہ کرنا وغیرہ وغیرہ۔ (بخاری) حضرت زید بن سعد اور حضرت امام شافعی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔ اگر تم کسی کو چلتے ہوئے اور ہواؤں میں اُڑتے ہوئے دیکھو تو اُسے ولی نہ سمجھ بیٹھنا۔ جب تک کہ اس کے تمام اعمال وافعال قرآن وحدیث کے مطابق نہ پاؤ۔ اس سجدہ کا حکم زمین و آسمان کے تمام فرشتوں کو تھا۔ گو ایک جماعت کا قول یہ بھی ہے کہ صرف زمین کے فرشتوں کو یہ حکم تھا۔ لیکن یہ ٹھیک نہیں۔ قرآن کریم میں ہے: ﴿فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ اِلَّآ اِبْلِيْسَ﴾ (الحجر ۳۰) یعنی ابلیس کے سوا تمام فرشتوں نے سجدہ کیا۔ پس اول تو جمع کا صیغہ لانا پھر كُلُّهُمْ سے تاکید کرنا۔ پھر اَجْمَعُوْنَ سے اور صرف ابلیس کا استثناء کرنا۔ ان چاروں وجہوں سے صاف ظاہر ہے کہ یہ حکم عام تھا۔ واللہ اعلم۔

وَقُلْنَا يَا آدَمُ اسْكُنْ أَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا ۖ وَلَا تَقْرَبَا هَٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُونَا مِنَ الظَّالِمِينَ ﴿٣٥﴾ فَأَزَلَّهُمَا الشَّيْطَانُ عَنْهَا فَأَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيهِ ۖ وَقُلْنَا اهْبِطُوا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۖ وَلَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَمَتَاعٌ إِلَىٰ حِينٍ ﴿٣٦﴾

اور ہم نے حکم دیا اے آدم رہا کر وتم اور تمہاری بیوی بہشت میں پھر کھاؤ اس میں سے با فراغت جس جگہ سے چاہو اور نزدیک نہ جائیو اس درخت کے ورنہ تم بھی ان ہی میں شمار ہو جاؤ گے جو اپنا نقصان کر بیٹھے ہیں۔ پھر لغزش دے دی آدم وحوا کو شیطان نے اس درخت کی وجہ سے۔ سو بر طرف کر کے رہا ان کو اس عیش سے جس میں وہ تھے اور ہم نے کہا کہ نیچے اترو تم میں سے بعضے بعضوں کے دشمن رہیں گے اور تم کو زمین پر چندے ٹھہرنا ہے اور کام چلانا ہے ایک میعاد معین تک ۞

سیدنا آدم علیہ السلام کی بزرگی اور اُن پر اللہ عزوجل کے انعامات کا بیان ☆

حضرت آدم علیہ السلام کی یہ اور بزرگی بیان ہو رہی کہ فرشتوں سے سجدہ کرانے کے بعد انہیں جنت میں رکھا اور ہر ہر چیز کی رخصت دے دی۔ ابن مردویہ کی حدیث میں ہے کہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیا حضرت آدم نبی تھے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہاں! نبی بھی تھے اور رسول بھی۔ بلکہ خداوند تعالیٰ نے ان سے آمنے سامنے بات چیت کی اور اُن سے فرمایا کہ تم اور تمہاری بیوی جنت میں رہو۔ عام مفسرین کا خیال ہے کہ آسمانی جنت میں انہیں بسایا گیا تھا لیکن معتزلہ اور قدریہ کہتے ہیں کہ یہ جنت زمین پر تھی۔ سورہ اعراف میں اس کا بیان آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

اس عبارت قرآنی سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جنت میں رہنے سے پہلے حضرت حوا پیدا کی گئی تھیں۔ محمد بن اسحاق فرماتے ہیں کہ اہل کتاب وغیرہ علما سے بروایت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما مروی ہے کہ ابلیس کی ڈانٹ ڈپٹ کے بعد حضرت آدم علیہ السلام کا علم ظاہر کر کے پھر ان پر اونگھ ڈال دی گئی اور ان کی بائیں پسلی سے حضرت حوا کو پیدا کیا۔ جب آنکھ کھول کر حضرت آدم نے دیکھا تو خون اور گوشت کی وجہ سے اُنس ومحبت دل میں پیدا ہوئی۔ پھر پروردگار عالم نے انہیں ان کے نکاح میں دیا اور جنت میں رہائش کا حکم عطا ہوا۔ بعض کہتے ہیں کہ آدم علیہ السلام کے جنت میں داخل ہو جانے کے بعد حضرت حوا پیدا کی گئیں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما' ابن مسعودؓ وغیرہ صحابہؓ سے مروی ہے کہ ابلیس کو جنت سے نکالنے کے بعد حضرت آدم علیہ السلام کو جنت میں جگہ دی گئی۔ لیکن اس وقت آپ تن تنہا تھے۔ اس وجہ سے ان کی نیند میں حضرت حوا کو ان کی پسلی سے پیدا کیا گیا۔ جاگ کر جب انہیں دیکھا تو پوچھنے لگے' تم کون ہو اور کیوں پیدا کی گئی ہو؟ حضرت حوا نے فرمایا' میں ایک عورت ہوں اور آپ کے ساتھ رہنے اور تسکین کا سبب بننے کے لئے پیدا کی گئی ہوں۔ تو جھٹ سے فرشتوں نے پوچھا' فرمایئے' ان کا نام کیا ہے؟ حضرت آدم نے کہا' حوا۔ انہوں نے کہا' اس نام کی وجہ؟ فرمایا یہ اس لئے کہ یہ ایک زندہ سے پیدا کی گئی ہے۔ وہیں خداوند تعالیٰ کی آواز آئی کہ اب تم اور تمہاری بیوی جنت میں بآرام واطمینان رہو اور جو چاہو کھاؤ پیو۔

اس ایک درخت سے روکنا یہ امتحان تھا۔ بعض کہتے ہیں یہ انگور کی بیل تھی۔ کوئی کہتا ہے گیہوں کا درخت تھا۔ کسی نے سنبلہ کہا ہے۔ کسی نے کھجور بتلائی ہے کسی نے انجیر کہا ہے۔ کوئی کہتا ہے اس درخت کے پھل کھانے سے انسانی حاجت ہوتی تھی۔ جو جنت کے لائق نہیں۔ کوئی کہتا ہے اس درخت کا پھل کھا کر فرشتے ہمیشگی کی زندگی والے ہو جاتے تھے۔ امام ابن جریر فرماتے ہیں کوئی درخت تھا جس سے خداتعالیٰ نے روک دیا۔ نہ قرآن سے تعیین ثابت ہوتی ہے نہ کسی صحیح حدیث سے اور مفسرین میں اختلاف ہے اور اس کے معلوم کر لینے سے کوئی اہم فائدہ اور نہ معلوم ہونے سے کوئی نقصان نہیں۔ لہٰذا ہمیں اس کدوکاوش کی کیا ضرورت؟ اللہ تعالیٰ ہی کو اس کا بہتر علم ہے امام رازیؒ وغیرہ نے بھی یہی فیصلہ کیا ہے اور ٹھیک بات بھی یہی معلوم ہوتی ہے۔ عَنْھَا کی ضمیر کا مرجع بعض نے جنت کہا ہے اور بعض نے شجرہ۔ ایک قرات فَاَزَالَھُمَا بھی ہے تو معنی یہ ہو گئے کہ اس جنت سے ان دونوں کو یک سو اور الگ کر دیا اور دوسرے معنی یہ ہوئے کہ اسی درخت کے سبب شیطان نے انہیں بہلایا۔

لفظ عَنْ سبب کے معنی میں بھی آیا ہے۔ یُؤْفَكُ عَنْهُ میں۔ اس نافرمانی کی وجہ سے جنتی لباس' وہ پاک مکان' وہ نفیس روزی وغیرہ سب چھین گئی اور دنیا میں اتار دیئے گئے اور کہہ دیا گیا کہ اب زمین میں ہی تمہارے رزق وغیرہ ہیں۔ قیامت تک یہیں پڑے رہو گے اور یہاں کا فائدہ حاصل کرتے رہو گے سانپ اور ابلیس کا قصہ۔ ابلیس کس طرح جنت میں پہنچا؟ کس طرح وسوسہ ڈالا وغیرہ لمبے چوڑے قصے یہاں پر مفسرین نے وارد کئے ہیں لیکن وہ سب بنی اسرائیل کے ہاں کا خزانہ ہے۔ تاہم ہم انہیں سورہ اعراف میں بیان کریں۔ کیونکہ اس واقعہ کا بیان وہاں کسی قدر تفصیل کے ساتھ ہے۔ ابن ابی حاتم کی ایک حدیث میں ہے کہ درخت چکھتے ہی جنتی لباس اتر گیا۔ اپنے کو ننگا دیکھ کر ادھر اُدھر دوڑنے لگے۔ لیکن چونکہ قد طویل تھا اور سر کے بال لمبے' وہ ایک درخت میں اٹک گئے۔ خداوند تعالیٰ نے فرمایا' اے آدمؑ کیا مجھ سے بھاگتے ہو؟ عرض کیا نہیں خدایا میں تو شرمندگی سے منہ چھپائے پھرتا ہوں اور روایت میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے آدم میرے پاس سے چلے جاؤ۔ میری عزت کی قسم میرے پاس میرے نافرمان نہیں رہ سکتے۔ اتنی مخلوق میں تم جیسی پیدا کروں کہ زمین بھر جائے اور پھر وہ میری نافرمانی کریں تو یقیناً میں انہیں بھی نافرمانوں کے گھر میں پہنچا دوں۔ یہ روایت غریب ہے اور ساتھ ہی اس میں انقطاع بلکہ اعضال بھی ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی کہ حضرت آدم علیہ السلام عصر کے بعد سے لے کر سورج کے غروب ہونے تک ہی جنت میں رہے۔ حضرت حسن رضی اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ ایک ساعت ایک سو تیس سال کی تھی۔ ربیع بن انس فرماتے ہیں کہ نویں یا دسویں ساعت میں حضرت آدم علیہ السلام کا اخراج ہوا۔ ان کے ساتھ جنت کی ایک شاخ تھی اور جنت کے درخت کا ایک تاج سر پر تھا۔ سدی کا قول ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام ہند میں اُترے۔ آپ کے ساتھ حجر اسود تھا اور جنتی درخت کے پتے تھے۔ جنہیں آپ نے ہند میں پھیلا دیا اور اس سے خوشبودار درخت پیدا ہوئے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ ہند کے شہر دحنا میں اُترے تھے۔ ایک روایت میں ہے کہ مکہ اور طائف کے درمیان اُترے تھے۔ حضرت حسن بصری فرماتے ہیں کہ حضرت آدم ہند میں اور حوا جدہ میں اتریں اور ابلیس بصرہ سے چند میل کے فاصلہ پر دستیمان میں پھینکا گیا اور سانپ اصبہان میں۔ ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا قول ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام صفا پر اور حوا مروہ میں اُتریں۔ اُترنے کے وقت ہاتھ گھٹنوں پر تھے اور سر جھکا ہوا تھا اور ابلیس انگلیوں میں انگلیاں ڈالے آسمان کی طرف نظریں جمائے اُترا۔ حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں تمام صنعتیں سکھا دیں اور پھلوں کا توشہ دیا۔ ایک حدیث میں ہے کہ تمام دنوں میں بہترین دن جمعہ کا دن ہے۔ اسی میں حضرت آدم پیدا کئے گئے۔ اسی میں

جنت میں داخل گئے اور اسی دن نکالے گئے۔ ملاحظہ ہو صحیح مسلم ونسائی۔

امام رازیؒ فرماتے ہیں کہ اس آیت میں کئی کئی وجوہ سے ڈانٹ ڈپٹ ہے۔ اوّل تو یہ سوچنا چاہئے کہ ذرا سی لغزش پر حضرت آدمؑ کو کس قدر سزا ہوئی۔ کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے کہ تم گناہ پر گناہ کئے جاتے ہو اور جنت کے طالب ہو۔ کیا تم بھول گئے کہ تمہارے باپ آدم علیہ السلام کو محض ایک ہلکے سے گناہ پر جنت سے نکال دیا گیا۔ ہم تو دشمن کی قید میں ہیں۔ دیکھئے کب صحت وسلامتی کے ساتھ اپنے وطن پہنچیں۔ فتح موصلی کہتے ہیں' ہم جنتی تھے۔ ابلیس کی قید میں دنیا میں آ پڑے۔ اب سوائے غم ورنج کے یہاں کیا رکھا ہے؟ یہ قید و بند اسی وقت ٹوٹے گی جبکہ ہم وہیں پہنچ جائیں۔ جہاں سے نکالے گئے ہیں۔

اگر کوئی معترض اعتراض کرے کہ جب آدمؑ آسمانی جنت میں تھے اور ابلیس راندۂ درگاہ ہو چکا تھا۔ تو پھر وہاں کیسے پہنچا؟ تو اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ ایک قول یہ بھی ہے کہ وہ جنت زمین میں تھی لیکن اس کے علاوہ اور بھی بہت سے جوابات ہیں کہ بطور اکرام کے اس کا داخل ہونا منع تھا نہ کہ بطور اہانت اور چوری کے۔ چنانچہ تورات میں ہے کہ وہ سانپ کے منہ میں بیٹھ کر جنت میں گیا اور یہ بھی جواب ہے کہ وہ جنت میں داخل نہیں کیا گیا تھا بلکہ باہر ہی سے اس نے وسوسہ ڈالا تھا اور بعضوں نے کہا کہ زمین میں سے ہی وسوسہ ان کے دل میں ڈالا۔ قرطبیؒ نے یہاں پر سانپوں سے متعلق اور ان کے مار ڈالنے کے حکم کی حدیثیں بھی وارد کی ہیں۔ جو بہت مفید اور باموقع ہیں۔

فَتَلَقّٰٓى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ ۭ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۳۷﴾

بعد ازاں حاصل کر لئے آدم (علیہ السلام) نے اپنے رب سے چند الفاظ' تو اللہ تعالیٰ نے رحمت کے ساتھ توجہ فرمائی ان پر (یعنی توبہ قبول کر لی) بے شک وہی ہیں بڑے توبہ قبول کرنے والے بڑے مہربان ﴿۳۷﴾

جو کلمات حضرت آدمؑ نے سیکھے تھے' ان کا بیان خود قرآن میں موجود ہے: ﴿قَالَا رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ﴾ (الاعراف: ۲۳) یعنی ان دونوں نے کہا ''اے ہمارے رب! ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا۔ اگر تو ہمیں نہ بخشے گا اور ہم پر رحم نہ کرے گا تو یقیناً ہم نقصان والے ہو جائیں گے۔'' اکثر بزرگوں کا یہی قول ہے۔ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے احکام حج سیکھنا بھی مروی ہے۔ عبید بن عمیر کہتے ہیں کہ وہ کلمات یہ تھے کہ انہوں نے کہا' خدایا جو خطا میں نے کی' آیا وہ میرے پیدا کرنے سے پہلے میری تقدیر میں لکھ لی گئی تھی یا میں نے خود اس کی ایجاد کی؟ جواب ملا کہ ایجاد نہیں بلکہ پہلے ہی سے لکھ رکھی تھی۔ اسے سن کر آپ نے کہا' پھر خدایا مجھے بخشش اور معافی مل جائے۔ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے یہ بھی روایت ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام نے کہا' خدایا کیا تو نے مجھے اپنے ہاتھ سے پیدا نہیں کیا؟ اور مجھ میں اپنی روح نہیں پھونکی؟ میرے چھینکنے پر یَرْحَمُكَ اللّٰهُ نہیں کہا؟ کیا تیری رحمت غضب پر سبقت نہیں کر گئی؟ کیا میری پیدائش سے پہلے یہ خطا میری تقدیر میں نہیں تھی؟ جواب ملا کہ ہاں یہ سب میں نے کیا ہے۔ تو کہا' پھر خدایا میری توبہ قبول کر کے مجھے پھر جنت مل سکتی ہے یا نہیں؟ جواب ملا کہ ہاں۔ یہی وہ کلمات یعنی چند باتیں تھیں' جو آپ نے خدا سے سیکھ لیں۔ ابن ابی حاتم کی ایک اور مرفوع روایت میں ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام نے کہا کہ خدایا اگر میں توبہ کروں اور رجوع کروں تو کیا جنت میں پھر بھی جا سکتا ہوں؟ جواب ملا کہ ہاں۔ یہی معنی ہیں اللہ سے کلمات کی تلقین حاصل کرنے کے لیکن یہ حدیث علاوہ غریب ہونے کے منقطع بھی ہے۔ بعض بزرگوں سے مروی ہے کہ کلمات کی تفسیر ﴿رَبَّنَا ظَلَمْنَا......﴾ کو اور ان باتوں کو سب کو شامل ہے۔ حضرت مجاہد سے مروی ہے کہ وہ کلمات یہ ہیں: ((اَللّٰهُمَّ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ سُبْحَانَكَ وَبِحَمْدِكَ رَبِّ اِنِّیْ ظَلَمْتُ نَفْسِیْ فَاغْفِرْلِیْ اِنَّكَ خَيْرُ الْغَافِرِيْنَ اَللّٰهُمَّ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ سُبْحَانَكَ وَبِحَمْدِكَ رَبِّ اِنِّیْ ظَلَمْتُ نَفْسِیْ فَارْحَمْنِیْ اِنَّكَ

خَیْرُ الرَّاحِمِیْنَ اَللّٰھُمَّ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ سُبْحَانَكَ وَبِحَمْدِكَ رَبِّ اِنِّیْ ظَلَمْتُ نَفْسِیْ فَتُبْ عَلَیَّ اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ.)) قرآن کریم میں اور جگہ ہے کہ کیا یہ لوگ نہیں جانتے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی توبہ قبول فرماتا ہے۔(التوبہ ۱۰۴) اور جگہ ہے جو شخص کوئی برا کام کر گزرے یا اپنی جان پر ظلم کر بیٹھے۔ پھر توبہ استغفار کرے۔ تو وہ دیکھ لے گا کہ خدا اس کی توبہ قبول کرے گا اور اسے اپنے رحم وکرم میں لے لیگا (النساء:۱۱۵) اور جگہ ہے: ﴿وَمَنْ تَابَ وَعَمِلَ صَالِحًا...... ﴾ (الفرقان:۷۱) ان سب آیتوں میں بیان ہے کہ اللہ تعالیٰ بندوں کی توبہ قبول کرتا ہے۔ اسی طرح یہاں بھی فرمان ہے کہ وہ خدا توبہ کرنے والوں کی توبہ قبول کرنے والا اور بہت بڑا رحم وکرم والا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اس عام لطف وکرم اسکے فضل ورحم کو دیکھو کہ وہ اپنے گنہگار بندوں کو بھی اپنے در سے محروم نہیں پھیرتا۔ سچ ہے اسکے سوا کوئی معبود و برحق نہیں۔ نہ اس سے زیادہ کوئی مہر وکرم کرنے والا' نہ اس سے زیادہ کوئی خطا بخشنے والا اور رحم وبخشش عطا فرمانے والا۔

قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِیْعًا ۚ فَاِمَّا یَاْتِیَنَّكُمْ مِّنِّیْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَایَ فَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ ﴿۳۸﴾ وَالَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۳۹﴾

ع

ہم نے حکم فرمایا نیچے جاؤ اس بہشت سے سب کے سب۔ پھر اگر آوے تمہارے پاس میری طرف سے کسی قسم کی ہدایت سو جو شخص پیروی کرے گا میری اس ہدایت کی تو نہ تو کچھ اندیشہ ہوگا ان پر اور نہ ایسے لوگ غمگین ہوں گے اور جو لوگ کفر کریں گے اور تکذیب کریں گے ہمارے احکام کی تو یہ لوگ ہوں گے دوزخ والے وہ اُس میں ہمیشہ کو رہیں گے ○

کائنات کا نقشہ ☆

جنت سے نکالتے ہوئے جو خبر حضرت آدم علیہ السلام حضرت حوا اور ابلیس کو دی گئی' اس کا بیان یہاں ہو رہا ہے کہ کتابیں' انبیاء اور رسول بھیجے جائیں گے۔ معجزے ظاہر کئے جائیں گے۔ دلائل بیان فرمائے جائیں گے راہ حق واضح کر دی جائے گی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی آئیں گے۔ آپ ﷺ پر قرآن بھی نازل فرمایا جائے۔ جو اپنے زمانے کی کتاب اور نبی کی تابعداری کرے گا' اُسے آخرت کے میدان میں کوئی خوف نہ ہوگا اور دنیا کے فوت ہونے پر کوئی غم نہ ہوگا۔ سورۂ طٰہٰ میں بھی یہی فرمایا گیا ہے کہ میری ہدایت کی پیروی کرنے والے نہ گمراہ ہوں گے نہ بدبخت دبے نصیب لیکن میری یاد سے منہ موڑنے والے دنیا کی تنگی اور آخرت کی رسوائی کے عذاب میں گرفتار ہوں گے۔ یہاں فرمایا کہ انکار اور تکذیب کرنے والے ہمیشہ جہنم میں رہیں گے۔ ابن جریر کی حدیث ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ جو اصلی جہنمی ہیں' انہیں تو جہنم میں نہ موت آئے نہ کارآمد بھلی زندگی ملے۔ ہاں جن موحد تبع سنت لوگوں کو ان کی بعض خطاؤں پر جہنم میں ڈال دیا جائے گا' یہ جل کر کوئلہ ہو کر مر جائیں گے اور شفاعت سے نکال لئے جائیں گے۔ صحیح مسلم شریف میں بھی یہ حدیث ہے۔ دوسری دفعہ جو جنت سے نکل جانے کے حکم کا ذکر کیا گیا ہے تو بعض تو کہتے ہیں کہ یہ اس لئے کہ یہاں دوسرے احکام بیان کرنے تھے اور بعض کہتے ہیں پہلی مرتبہ جنت سے آسمان اوّل پر اتار دیا گیا۔ دوبارہ آسمان اوّل سے زمین کی طرف اتارا گیا۔ لیکن صحیح قول پہلا ہی ہے۔ واللہ اعلم۔

يٰبَنِىٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِىَ الَّتِىْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَوْفُوْا بِعَهْدِىْٓ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ ۚ وَاِيَّاىَ فَارْهَبُوْنِ ۝٤٠ وَاٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ وَلَا تَكُوْنُوْٓا اَوَّلَ كَافِرٍۢ بِهٖ ۖ وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِىْ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۡ وَّاِيَّاىَ فَاتَّقُوْنِ ۝٤١

اے بنی اسرائیل یاد کرو تم لوگ میرے احسانوں کو جو کئے ہیں میں نے تم پر اور پورا کرو تم میرے عہد کو پورا کروں گا میں تمہارے عہد کو اور صرف مجھی سے ڈرو اور ایمان لے آؤ اس کتاب پر جو میں نے نازل کی ہے (یعنی قرآن پر) ایسی حالت میں کہ وہ سچ بتلانے والی ہے اس کتاب کو جو تمہارے پاس ہے (یعنی تورات کے کتاب الٰہی ہونے کی تصدیق کرتی ہے اور مت بنو تم سب میں پہلے انکار کرنے والے اس قرآن کے اور مت لو بمقابلہ میرے احکام کے معاوضہ حقیر کو اور خاص مجھی سے پورے طور پر ڈرو ○

بنی اسرائیل کو دعوتِ اسلام ☆

ان آیات میں بنی اسرائیل کو اسلام قبول کرنے اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تابعداری کرنے کا حکم ہو رہا ہے اور کس لطیف پیرایہ میں انہیں سمجھایا جا رہا ہے۔ کہ تم ایک پیغمبر کی اولاد میں سے ہو اور تمہارے ہاتھوں میں کتاب اللہ موجود ہے اور قرآن اس کی تصدیق کر رہا ہے۔ پھر تمہیں نہ چاہئے کہ اول اول انکار تمہیں سے شروع ہو۔ اسرائیل نام تھا حضرت یعقوب علیہ الصلوٰۃ والسلام کا۔ گویا ان سے کہا جاتا ہے کہ تم میرے صالح اور فرماں بردار بندے کی اولاد ہو۔ تمہیں چاہئے کہ اپنے جدّ امجد کی طرح حق کی تابعداری میں لگ جاؤ۔ جیسے کہا جاتا ہے کہ تم سخی کے لڑکے ہو۔ سخاوت میں آگے بڑھو' تم پہلوان کی اولاد ہو دادِ شجاعت دو۔ تم عالم کے بچے ہو علم میں کمال پیدا کرو۔ دوسری جگہ اسی طرزِ کلام کو اس طرح ادا کیا گیا ہے۔ ﴿ذُرِّيَّةَ مَنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوْحٍ ۭ اِنَّهٗ كَانَ عَبْدًا شَكُوْرًا﴾ (بنی اسرائیل:۳) یعنی ہمارے شکر گزار بندے حضرت نوحؑ کے ساتھ جنہیں ہم نے ایک عالم گیر طوفان سے بچایا تھا۔ یہ اُن کی اولاد ہیں۔

ایک حدیث میں ہے کہ یہودیوں کی ایک جماعت سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت کیا کہ تم نہیں جانتے کہ اسرائیل نام تھا حضرت یعقوب علیہ السلام کا وہ سب قسم کھا کر کہتے ہیں کہ واللہ یہ سچ ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا خدایا تو گواہ رہ (ابوداؤ الطیالسی) اسرائیل کے لفظی معنی عبداللہ کے ہیں۔ ان نعمتوں کو یاد دلایا جاتا ہے' جو قدرت کاملہ کی بڑی بڑی نشانیاں تھیں۔ مثلاً پتھر میں سے نہروں کو جاری کرنا۔ من و سلویٰ اُتارنا۔ فرعونیوں سے آزاد کرانا۔ انہیں میں سے انبیاء اور رسولوں کو مبعوث کرنا۔ ان میں سلطنت اور بادشاہت عطا فرمانا وغیرہ۔ میرے وعدوں کو پورا کرو۔ یعنی جو عہد میں نے تم سے لیا تھا کہ جب محمد صلی اللہ علیہ وسلم آئیں اور آپ پر میری کتاب قرآن کریم اُترے تم اس پر اور آپ کی ذات پر ایمان لانا۔ وہ تمہارا بوجھ ہلکا کریں گے اور تمہاری زنجیریں توڑ دیں اور تمہارے طوق اُتار دیں گے اور میرا وعدہ بھی پورا ہو جائے گا کہ میں اس دین کے سخت احکام کو جو تم نے اپنے ذمے ڈال رکھے ہیں۔ ہٹا دوں گا اور اس آخر الزماں پیغمبر کے ہاتھوں تمہیں ایک آسان دین دوں گا۔ دوسری جگہ اس کا بیان اس طرح ہوتا ہے: ﴿وَقَالَ اللّٰهُ اِنِّىْ مَعَكُمْ ۭ لَىِٕنْ اَقَمْتُمُ الصَّلٰوةَ وَاٰتَيْتُمُ الزَّكٰوةَ ... ﴾ (المائدۃ:۱۲) یعنی اگر تم نمازوں کو قائم کرو گے اور زکوٰۃ دیتے رہو گے' مجھے اچھا قرضہ دیتے رہو گے تو میں تمہاری

برائیاں دور کردوں گا اور تمہیں بہتی نہروں والی جنت میں داخل کردوں گا۔ یہ مطلب بھی بیان کیا گیا ہے کہ تورات میں وعدہ کیا گیا تھا کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں سے ایک اتنا بڑا عظیم الشان پیغمبر پیدا کروں گا۔ جس کی تابعداری تمام مخلوق پر فرض کروں گا۔ ان کے تابعداروں کو بخشوں گا۔ انہیں جنت میں داخل کروں گا اور دہرا اجر دوں گا۔

حضرت امام رازی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر میں بڑے بڑے انبیاء علیہم السلام سے آپ کی بابت پیش گوئی نقل کی ہے۔ یہ بھی مروی ہے کہ بندوں کا عہد اسلام کو ماننا اور اس پر عمل کرنا تھا۔ خدا کا اپنے عہد کو پورا کرنا' ان سے خوش ہونا اور جنت عطا فرمانا ہے اور مجھ سے ڈرو کہ ایسا نہ ہو جو عذاب تم سے پہلے لوگوں پر نازل ہوئے کہیں تم پر بھی نہ آ جائیں۔ اس لطیف پیرایہ کو بھی ملاحظہ فرمائیے کہ ترغیب کے بیان کے ساتھ ہی کس طرح ترہیب کے بیان کی طرف لوٹ آئے۔ رغبت ورہبت دونوں کو جمع کر کے اتباع حق اور نبوت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت دی گئی۔ قرآن کے ساتھ نصیحت حاصل کرنے' اس کے بتلائے ہوئے احکام کو ماننے اور اس کے رکے ہوئے کاموں سے رُک جانے کی ہدایت کی گئی۔ اسی لئے اس کے بعد ہی فرمایا کہ تم اس قرآن پر ایمان لاؤ۔ تمہاری اپنی کتاب کی بھی تصدیق کرتا ہے اور تائید کرتا ہے۔ جسے لے کر وہ نبی آئے ہیں جو اُمّی ہیں۔ جو عربی ہیں' جو بشیر ہیں' جو نذیر ہیں' سراج منیر ہیں' جن کا اسم شریف محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہے۔ تورات وانجیل کو سچا بتانے والے اور حق کو پھیلانے والے ہیں۔ چونکہ تورات وانجیل میں بھی آپ کا ذکر تھا۔ تو آپ کا تشریف لانا تورات کی سچائی کی دلیل تھی۔ اس لئے کہا گیا کہ وہ تمہارے ہاتھوں کی چیزوں کی تصدیق ہیں۔ باوجودیکہ تمہیں علم ہے پھر تم ہی اس کے پہلے منکر نہ بنو بعض کہتے ہیں بہ کی ضمیر کا مرجع قرآن ہے اور پہلے بھی آ چکا ہے: ﴿بِمَا اَنْزَلْتُ﴾ اور دونوں قول درحقیقت سچے اور ایک ہی ہیں۔ قرآن کو ماننا رسول کو ماننا ہے اور رسول کی تصدیق قرآن کی تصدیق ہے: اَوَّلَ كَافِرٍ سے مطلب بنی اسرائیل کے اول کافر ہیں۔ کیونکہ کفار قریش بھی انکار اور کفر کر چکے تھے۔ تو اب بنی اسرائیل کا انکار اہل کتاب میں سے پہلی جماعت کا انکار تھا۔ اس لئے اول کافر کہا گیا ہے۔ ان کے پاس وہ علم تھا جو دوسروں کے پاس نہ تھا۔ میری آیتوں کے بدلے تھوڑا مول نہ لو۔ یعنی دنیا کے بدلے جو قلیل اور فانی ہے' میری آیات پر ایمان لانا اور میرے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق کرنا نہ چھوڑو۔ اگر دنیا ساری کی ساری مل جائے۔ جب بھی وہ آخرت کے مقابلہ میں تھوڑی اور بہت تھوڑی ہے اور یہ خود ان کی کتابوں میں بھی موجود ہے۔ سنن ابوداؤد میں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ جو شخص اس علم کو جس سے خدا کی رضامندی حاصل ہوتی ہے' اس لئے سیکھے کہ اس سے دنیا کمائے۔ وہ قیامت کے روز جنت کی خوشبو تک نہ پائے گا۔ (ابوداؤد) علم سکھانے کی اُجرت بغیر مقرر کئے ہوئے لینا جائز ہے۔ اسی طرح علم سکھانے والے علماء کو بیت المال سے لینا بھی جائز ہے۔ تاکہ وہ خوشحال رہ سکیں اور اپنی ضروریات پوری کرسکیں۔ اگر بیت المال سے کچھ مال نہ ملتا ہو اور علم سکھانے کی وجہ سے کوئی کام دھندا بھی نہ کرسکتے ہوں تو اُجرت مقرر کر کے لینا بھی جائز ہے۔ امام مالک' امام شافعی' امام احمد اور جمہور علماء کا یہی مذہب ہے۔ اس کی دلیل وہ حدیث بھی ہے جو صحیح بخاری شریف میں حضرت ابوسعید خدریؓ کی روایت سے ہے کہ انہوں نے اُجرت مقرر کر کے لی اور ایک سانپ کے کاٹے ہوئے شخص پر قرآن پڑھ کر دم کیا۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے یہ قصہ پیش ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((اِنَّ اَحَقَّ مَا اَخَذْتُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا كِتَابُ اللّٰهِ.)) یعنی جن چیزوں پر تم اُجرت لو۔ ان سب میں زیادہ حقدار چیز کتاب اللہ ہے۔ ایک دوسری طویل حدیث میں ہے کہ ایک شخص کا نکاح ایک عورت سے آپ کر دیتے ہیں اور فرماتے ہیں: ((زَوَّجْتُكَهَا بِمَا مَعَكَ مِنَ الْقُرْاٰنِ.)) (بخاری) میں نے اس کو تیری زوجیت میں دیا اس مہر پر کہ جو قرآن تجھے یاد ہے۔ اُسے یاد کرا دے۔ ابوداؤد کی ایک حدیث میں ہے کہ ایک شخص نے اہل صفہ میں سے کسی کو کچھ قرآن سکھایا۔ اس نے ایک کمان بطور ہدیہ کے اُسے دی۔ اس نے رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم سے مسئلہ پوچھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا' اگر تجھے آگ کی کمان لینی ہے تو اسے لے۔ چنانچہ اس نے اُسے چھوڑ دیا۔ حضرت ابی بن کعب سے بھی ایسی ہی ایک حدیث مرفوع مروی ہے۔ ان دونوں حدیثوں کا مطلب یہ ہے کہ جب اس نے خالص اللہ کے واسطے کی نیت سے سکھایا۔ پھر اس پر تحفہ ہدیہ لے کر اپنے ثواب کو کھونے کی کیا ضرورت ہے اور جبکہ شروع ہی سے اُجرت پر تعلیم دی ہے تو پھر بلا شک و شبہ جائز ہے۔ جیسے اُوپر کی دونوں حدیثوں میں بیان ہو چکا ہے واللہ اعلم۔ صرف اللہ ہی سے ڈرنے کے یہ معنی ہیں کہ اللہ کی رحمت کی اُمید پر اس کی عبادت و اطاعت میں لگا رہے اور اس کے عذابوں سے ڈر کر اس کی نافرمانیوں کو چھوڑ دے اور دونوں حالتوں میں اپنے ربّ کی طرف سے ایک نور پر رہے۔ غرض اس جملہ سے اُنہیں خوف دلایا گیا کہ وہ دنیاوی لالچ میں آ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی تصدیق کو جو ان کی کتابوں میں ہے۔ نہ چھپائیں اور دنیاوی ریاست کی طمع پر آپ کی مخالفت پر آمادہ نہ ہوں۔ بلکہ رب سے ڈر کر اظہارِ حق کرتے رہیں۔

وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۴۲﴾ وَأَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ ﴿۴۳﴾

اور مخلوط مت کرو حق کو ناحق کے ساتھ اور پوشیدہ بھی مت کرو حق کو' جس حالت میں کہ تم جانتے ہو اور قائم کرو نماز کو (یعنی مسلمان ہو کر) اور دو زکوٰۃ اور عاجزی کرو عاجزی کرنے والوں کے ساتھ ○

انتباہ ☆

یہودیوں کی اس بدخصلت پر اُن کو تنبیہ ہو رہی ہے کہ وہ باوجود جاننے کے کبھی تو حق و باطل کو گڈمڈ کر دیا کرتے تھے۔ کبھی حق کو چھپا لیا کرتے تھے۔ کبھی باطل کو ظاہر کرتے تھے۔ تو انہیں ان ناپاک عادتوں کے چھوڑنے کو کہا جاتا ہے اور حق کو ظاہر کرنے اور اُسے کھول کھول کر بیان کرنے کی ہدایت کی جاتی ہے کہ حق و باطل' سچ جھوٹ نہ ملاؤ۔ اللہ کے بندوں کی خیر خواہی کرو۔ یہودیت و نصرانیت کی بدعات کو اسلام کی تعلیم کے ساتھ نہ ملاؤ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق جو پیش گوئیاں جو تم اپنی کتابوں میں پاتے ہو۔ انہیں عوام الناس سے نہ چھپاؤ۔ تَكْتُمُوْا مجزوم بھی ہو سکتا ہے اور منصوب بھی۔ یعنی اسے اور اُسے جمع نہ کرو۔ ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی قراءت میں تَكْتُمُوْنَ بھی ہے۔ یہ حال ہوگا اور اس کے بعد کا جملہ بھی حال ہوگا۔ معنی یہ ہوئے کہ حق کو حق جانتے ہوئے ایسی بے حیائی نہ کرو اور یہ بھی معنی ہیں کہ باوجود اس علم کے اس چھپانے اور میل جول کرنے کا کیسا کچھ وبال ہوگا۔ پھر بھی افسوس کہ تم اس بدکرداری پر آمادہ نظر آتے ہو۔

پھر انہیں حکم دیا جاتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز پڑھو اور آپ کو زکوٰۃ بھی دیا کرو اور اُمت محمدیہ کے ساتھ رکوع و سجود میں شامل رہا کرو۔ انہیں میں مل جاؤ اور خود بھی آپ ہی کی اُمت بن جاؤ۔ اطاعت و اخلاص کو بھی زکوٰۃ کہتے ہیں۔ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما اس آیت کی تفسیر میں یہی فرماتے ہیں۔ زکوٰۃ دو سو درہم پر پھر اس سے زیادہ رقم پر واجب ہوتی ہے۔ نماز و زکوٰۃ فرض و واجب ہے۔ بغیر اس کے اعمال غارت ہیں۔ زکوٰۃ سے بعض لوگوں نے فطرہ بھی مراد لیا ہے۔ رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو سے مراد یہ ہے کہ اچھے اعمال میں ایمانداروں کا ساتھ دو اور ان میں بہترین چیز نماز ہے۔ اس آیت سے اکثر علما نے نماز باجماعت کے فرض ہونے

پر استدلال کیا ہے۔ یہاں پر امام قرطبیؒ نے مسائل جماعت کو بسط سے بیان فرمایا ہے۔

اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝۴۴

کیا غضب ہے کہ کہتے ہو اور لوگوں کو نیک کام کرنے کو (نیک کام کرنے سے مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانا ہی ہے) اور اپنی خبر نہیں لیتے حالانکہ تم تلاوت کرتے رہتے ہو کتاب کی تو پھر کیا تم اتنا بھی نہیں سمجھتے؟ ○

تذکیر و نصیحت ☆

یعنی اے اہل کتاب! باوجود اس علم کے کہ جو کہے اور نہ کرے' اس پر کیا کچھ وبال ہے۔ پھر تم خود ایسا کیوں کرنے لگے ہو؟ جیسا دوسرے کو تقویٰ' طہارت اور پاکیزگی سکھاتے ہو۔ خود بھی اس کے عامل بن جاؤ۔ لوگوں کو روزے' نماز کا حکم دینا اور خود اس کے پابند نہ ہونا' یہ تو بڑی شرم کی بات ہے۔ دوسروں کو کہنے سے پہلے انسان کو خود عامل ہونا چاہئے۔ یہ معنی ہیں کہ تم دوسروں کو تو اپنی کتاب کے ساتھ کفر کرنے سے روکتے ہو لیکن اللہ تعالیٰ کے اس نبی کو جھٹلا کر تم خود اپنی ہی کتاب کے ساتھ کفر کیوں کرتے ہو؟ یہ بھی مطلب ہے کہ دوسروں کو اس دین اسلام کو قبول کرنے کے لئے کہتے ہو مگر دنیاوی ڈر اور خوف سے خود قبول نہیں کرتے۔ حضرت ابوالدرداء رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں۔ انسان پورا سمجھدار نہیں ہوسکتا۔ جب تک کہ لوگوں کو خدا کے خلاف کرتے ہوئے دیکھ کر ان کا دشمن نہ بن جائے اور اپنے نفس کا ان سے بھی زیادہ۔ ان لوگوں کو اگر رشوت وغیرہ نہ ملتی تو حق بتا دیتے۔ لیکن خود عامل نہ تھے۔ جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کی مذمت کی۔

ایک لطیف فرق ☆ یہاں پر یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ اچھی چیز کا حکم دینے پر اُن کی برائی نہیں کی گئی بلکہ خود نہ کرنے پر برائی بیان کی گئی ہے۔ اچھی بات کو کہنا تو خود اچھائی بلکہ یہ تو واجب ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ انسان کو خود بھی اس پر عمل کرنا چاہئے۔ جیسے حضرت شعیب علیہ السلام نے فرمایا تھا: ﴿وَمَآ اُرِيْدُ اَنْ اُخَالِفَكُمْ اِلٰى مَآ اَنْهٰىكُمْ عَنْهُ﴾ (ھود ۸۸) یعنی میں ایسا نہیں ہوں کہ تمہیں روکوں اور خود کروں۔ میرا ارادہ تو اپنی طاقت کے مطابق اصلاح کا ہے اور میری توفیق اللہ تعالیٰ کی مدد سے ہے۔ میرا بھروسہ اُسی پر ہے اور میری رغبت و رجوع بھی اسی کی طرف ہے۔ پس نیک کاموں کے کرنے کو کہنا بھی واجب اور خود کرنا بھی واجب۔ ایک کے نہ کرنے سے دوسرا بھی چھوڑ دیا جائے۔ یہ نہ چاہئے۔ علماء سلف و خلف کا قول یہی ہے۔ گو بعض لوگوں کا قول یہ بھی ہے کہ برائیوں والا دوسروں کو اچھائیوں کا حکم نہ کرے لیکن یہ قول ٹھیک نہیں۔ پھر ان حضرات کا اس آیت کو بطور دلیل پیش کرنا تو بالکل ٹھیک نہیں۔ بلکہ صحیح یہی ہے کہ بھلائی کا حکم کرے اور برائی سے روکے اور خود بھی کرے اور رُکے۔ اگر دونوں چھوڑے گا تو دہرا گنہگار ہوگا۔ ایک کے ترک پر اکہرا۔

واعظِ بے عمل کی سزا ☆ طبرانی کی معجم کبیر میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا' جو عالم لوگوں کو بھلائی سکھائے اور خود عمل نہ کرے' اس کی مثال چراغ جیسی ہے کہ لوگ اس کی روشنی سے فائدہ اٹھا رہے ہیں لیکن وہ خود جل رہا ہے۔ یہ حدیث غریب ہے۔ مسند احمد کی حدیث میں ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں' معراج والی رات میں نے دیکھا کہ کچھ لوگوں کے ہونٹ آگ کی قینچیوں سے کاٹے جا رہے ہیں۔ میں نے پوچھا' یہ کون لوگ ہیں؟ تو کہا گیا کہ یہ آپ کی اُمت کے خطیب اور واعظ و عالم ہیں' جو لوگوں کو بھلائی سکھاتے تھے مگر خود نہیں کرتے تھے۔ باوجود علم کے سمجھ نہیں رکھتے تھے۔ دوسری حدیث میں ہے کہ ان کی زبانیں اور ہونٹ دونوں کاٹے جا

رہے تھے۔ یہ حدیث صحیح ہے۔ ابن حبان ابن ابی حاتم ابن مردویہ وغیرہ میں موجود ہے۔ ابووائلؒ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت اسامہؓ سے کہا گیا کہ آپ حضرت عثمانؓ سے کچھ کہتے نہیں؟ آپ نے جواب دیا کہ جب تمہیں سنا کر کہوں جب ہی کہنا ہوگا۔ میں تو انہیں پوشیدہ طور سے ہر وقت کہتا رہتا ہوں لیکن کسی کام کو پھیلانا نہیں چاہتا۔ خدا کی قسم میں کسی شخص کو سب سے افضل نہیں کہوں گا۔ اس لئے کہ جناب رسول اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ ایک شخص کو قیامت کے دن لایا جائے گا اور اسے جہنم میں ڈالا جائے گا۔ اس کی آنتیں نکل آئیں گی اور وہ اس کے ارد گرد چکر کھاتا رہے گا اور جہنمی جمع ہو کر اس سے پوچھیں گے کہ حضرت آپ تو ہمیں اچھی باتوں کا حکم کرنے والے اور برائیوں سے روکنے والے تھے۔ یہ آپ کی کیا حالت ہے؟ وہ کہے گا میں تمہیں کہتا تھا اور خود نہیں کرتا تھا۔ میں تمہیں روکتا تھا لیکن خود نہیں رُکتا تھا۔ (مسند احمد) بخاری و مسلم میں بھی یہ روایت ہے۔ مسند کی ایک اور حدیث ہے کہ اللہ تعالیٰ اَن پڑھ لوگوں سے اتنا درگزر کرے گا جتنا جاننے والوں سے نہیں کرے گا۔ بعض آثار میں یہ بھی وارد ہے کہ عالم کو ایک دفعہ بخشا جائے گا تو عامی کو ستر دفعہ بخشا جاتا ہے۔ عالم جاہل یکساں نہیں ہو سکتے۔ قرآن کریم میں ہے: ﴿هَلْ يَسْتَوِي الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ اِنَّمَا يَتَذَكَّرُ اُولُوا الْاَلْبَابِ﴾ (الزمر: ۹) جاننے والے اور نجان برابر نہیں۔ نصیحت صرف عقلمند لوگ ہی حاصل کر سکتے ہیں۔

ابن عساکر میں ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا جنتی لوگ جہنمیوں کو دیکھ کر کہیں گے کہ تمہاری نصیحتیں سُن سُن کر ہم تو جنتی ہو گئے۔ یہ تم جہنم میں کیوں آ پڑے؟ وہ کہیں گے افسوس ہم تمہیں کہتے تھے لیکن خود نہیں کرتے تھے۔

ایک واقعہ ☆ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے ایک شخص نے کہا کہ حضرت میں بھلائیوں کا حکم کرنا اور برائیوں سے لوگوں کو روکنا چاہتا ہوں۔ آپ نے فرمایا کیا تم اس درجہ تک پہنچ گئے ہو؟ اس نے کہا کہ ہاں آپ نے فرمایا کہ اگر تم ان تین آیتوں کی فضیحت سے نڈر ہو گئے ہو تو شوق سے وعظ شروع کرو۔ اس نے پوچھا وہ تین آیتیں کیا ہیں؟ آپ نے فرمایا ایک تو: ﴿اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ﴾ کیا تم لوگوں کو حکم دیتے ہو اور خود اپنے تئیں بھولے جا رہے ہو؟ دوسری آیت: ﴿لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ. كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ﴾ (الصف: ۳) کیوں تم کہتے ہو جو خود نہیں کرتے؟ خدا کے نزدیک یہ بڑی ناپسندیدہ بات ہے کہ تم وہ کہو جو خود نہ کرو۔ تیسری آیت حضرت شعیب علیہ السلام کا فرمان: ﴿وَمَآ اُرِيْدُ اَنْ اُخَالِفَكُمْ اِلٰى مَآ اَنْهٰكُمْ عَنْهُ اِنْ اُرِيْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ﴾ (ہود: ۸۸) یعنی میں جن کاموں کو تمہیں منع کرتا ہوں ان میں تمہاری مخالفت کرنا نہیں چاہتا۔ میرا ارادہ صرف اپنی طاقت بھر اصلاح کرنا ہے۔ کہو تم ان تینوں آیتوں سے بے خوف ہو؟ اس نے کہا نہیں۔ فرمایا پھر تم اپنے نفس سے شروع کرو۔ (تفسیر ابن مردویہ) ایک ضعیف حدیث طبرانی میں ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا جو لوگوں کو کسی قول و فعل کی طرف بلائے اور خود نہ کرے۔ تو اللہ تعالیٰ کے غضب و غصہ میں رہتا ہے یہاں تک کہ وہ خود آپ عمل کرنے لگ جائیں۔ حضرت ابراہیم نخعی نے بھی حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما والی تینوں آیتیں پیش کر کے فرمایا ہے کہ میں ان کی وجہ سے قصہ گوئی پسند نہیں کرتا۔ (قرطبی)

وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ۚ وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ ﴿۴۵﴾ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَاَنَّهُمْ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ﴿۴۶﴾

اور اگر تم کو حب مال و جاہ کے غلبہ سے ایمان لانا دشوار معلوم ہو تو مدد لو صبر اور نماز سے اور بے شک وہ نماز دشوار ضرور ہے مگر جن کے قلوب میں خشوع ہو۔ ان پر کچھ بھی دشوار نہیں وہ خاشعین وہ لوگ ہیں جو خیال رکھتے ہیں اس کا کہ وہ بے شک ملنے

والے ہیں اپنے رب سے وہ اس بات کا بھی خیال رکھتے ہیں کہ وہ بے شک اپنے رب کی طرف واپس جانے والے ہیں۔ ○

اِس آیت میں حکم فرمایا جاتا ہے کہ تم دنیا اور آخرت کے کاموں پر نماز اور صبر کے ساتھ مدد طلب کرو۔

صبر اور نماز ☆ فرائض کو بجالاؤ اور نماز کو ادا کرتے رہو۔ روزہ رکھنا بھی صبر کرنا ہے اور اسی لئے رمضان کو صبر کا مہینہ کہا گیا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں' روزہ آدھا صبر ہے (ترمذی)۔ صبر سے مراد گناہوں سے رک جانا بھی ہے۔ آیت میں اگر صبر سے مراد یہ لی جائے تو برائیوں سے رُکنا اور نیکیاں کرنا دونوں کا بیان ہو گیا۔ نیکیوں میں سب سے اعلیٰ چیز نماز ہے۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں۔ صبر کی دو قسمیں ہیں (۱) مصیبت کے وقت صبر اور (۲) گناہوں کے کرنے سے صبر اور یہ صبر پہلے صبر سے زیادہ اچھا ہے۔ حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں' انسان کا ہر چیز کے خدا کی طرف سے ہونے کا اقرار کرنا۔ ثواب کی طلب کرنا۔ اللہ کے پاس مصیبتوں کے اجر کا ذخیرہ سمجھنا' یہ صبر ہے۔ اللہ تعالیٰ کی مرضی کے کام پر صبر کرو اور اسے بھی اللہ تعالیٰ کی اطاعت سمجھو۔ نیکیوں کے کاموں پر نماز سے بڑی مدد ملتی ہے۔ خود قرآن میں ہے: ﴿اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ﴾ (العنکبوت: ۴۵) نماز کو قائم رکھ۔ یہ تمام بدیوں اور برائیوں سے روکنے والی چیز ہے اور یقیناً اللہ کا ذکر بہت بڑی چیز ہے۔

حضرت حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں' جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کوئی کام مشکل اور غم میں ڈال دیتا تو آپ ﷺ نماز پڑھا کرتے فوراً نماز پر لگ جاتے۔ (ابوداؤد) چنانچہ جنگ خندق کے موقعہ پر رات کے وقت جب حضرت حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ خدمت نبوی ﷺ میں حاضر ہوتے ہیں تو آپ ﷺ کو نماز میں پاتے ہیں۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں کہ بدر کی لڑائی کی رات میں نے دیکھا کہ ہم سب سو گئے تھے' مگر خدا کے رسول **(اللھم صل وسلم علیہ)** ساری رات نماز میں مشغول رہے۔ صبح تک نماز میں اور دعا میں لگے (احمد)۔ ابن جریر[1] میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو دیکھا کہ بھوک کے مارے پیٹ کے درد سے بے تاب ہو رہے ہیں۔ آپ نے ان سے فارسی زبان میں دریافت فرمایا کہ "درد شکم داری؟" کیا تمہارے پیٹ میں درد ہے؟ انہوں نے کہا' ہاں! آپ نے فرمایا' اُٹھو نماز شروع کر دو۔ اس میں شفا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کو سفر میں اپنے بھائی قثم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے انتقال کی خبر ملتی ہے تو آپ: ﴿اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ﴾ پڑھ کر راستے سے ایک طرف ہٹ کر اُونٹ کو ہٹا کر نماز شروع کر دیتے ہیں اور بہت لمبی نماز ادا کرتے ہیں۔ پھر اپنی سواری کی طرف جاتے ہیں اور اس آیت کو پڑھتے ہیں۔ (حاکم) غرض ان دونوں چیزوں صبر و صلوٰۃ سے خدا کی رحمت میسر ہوتی ہے۔ اِنَّهَا کی ضمیر کا مرجع بعض لوگوں نے تو صلوٰۃ یعنی نماز کہا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ مدلول کلام یعنی ولیت اس کا مرجع ہے۔ جیسے قارون کے قصہ میں ﴿وَلَا يُلَقّٰهَآ﴾ (القصص: ۸۰) کی ضمیر اور برائی کے بدلے بھلائی کرنے کے حکم میں وَمَا يُلَقّٰهَا کی ضمیر۔ مطلب یہ ہے کہ یہ کام صبر و صلوٰۃ ہر شخص کے بس کی چیز نہیں۔ یہ حصہ ڈر' خوف رکھنے والی جماعت کا ہے۔ یعنی قرآن کے ماننے والے سچے مؤمن کا نپنے والے متواضع' اطاعت کرنے والے' وعدے وعید کو سچا ماننے والے ہی اس وصف سے موصوف ہوتے ہیں۔ جیسے حدیث میں ایک سائل کے سوال پر حضور ﷺ نے فرمایا تھا۔ یہ بڑی چیز ہے' لیکن جس پر خدا کی مہربانی ہو' آسان ہے۔ (ترمذی) ابن جریرؒ نے آیت کے معنی بیان کرتے ہوئے اسے بھی یہودیوں کے خطاب میں رکھا ہے لیکن ظاہر بات یہ ہے کہ گو یہ بیان میں ان ہی کیلئے ہے لیکن حکم کے

---

[1] ابن جریر کی یہ روایت ضعیف ترین اور اصول حدیث کے معیار پر ناقص بلکہ موضع ہے۔ اگرچہ صاحب جریر نے اس کی کچھ تاویلات کی ہیں لیکن وہ سب کشفی امور ہیں جن پر کسی تحقیقی بات کی بنیاد نہیں اُٹھائی جا سکتی۔

اعتبار سے عام ہے۔ واللہ اعلم۔

خاشعین ☆ آگے چل کر خاشعین کی صفت ہے۔ اس میں ظن معنی میں یقین کے ہے۔ گوظن شک کے معنی میں بھی آتا ہے۔ جیسے صدفه اندھیرے کے معنی میں بھی آتا ہے اور روشنی کے معنی میں بھی اور صارخ کا لفظ بھی فریادرس اور فریادکن دونوں پر بولا جاتا ہے اور اسی طرح کے بہت سے نام ہیں جو ایسی دو مختلف چیزوں پر بولے جاتے ہیں۔ ظن یقین کے معنی میں عرب شعراء کے شعروں میں بھی آیا ہے۔ خود قرآن میں اور جگہ آیا ہے: ﴿وَرَاَ الْمُجْرِمُوْنَ النَّارَ فَظَنُّوْآ اَنَّهُمْ مُّوَاقِعُوْهَا﴾ (الکہف: ۵۳) یعنی گنہگار جہنم کو دیکھ کر یقین کر لیں گے کہ اب ہم اس میں جھونک دیئے جائیں گے۔ یہاں بھی ظن یقین کے معنی میں آتا ہے۔ بلکہ حضرت مجاہد فرماتے ہیں کہ قرآن میں ایسی ہر جگہ ظن کا لفظ یقین اور علم کے معنی میں آتا ہے۔ ابوالعالیہ بھی یہاں ظن کے معنی یقین کے کرتے ہیں۔ حضرت مجاہد، سدی، ربیع بن انس اور قتادہ کا بھی یہی قول ہے۔ ابن جریج بھی یہی فرماتے ہیں۔ قرآن میں اور جگہ ہے: ﴿اِنِّیْ ظَنَنْتُ اَنِّیْ مُلٰقٍ حِسَابِیَهْ﴾ (الحاقہ: ۲۰) یعنی مجھے یقین تھا کہ مجھے حساب سے دوچار ہونا پڑے گا۔ ایک صحیح حدیث میں کہ قیامت کے دن ایک گنہگار بندے سے اللہ تعالیٰ فرمائے گا۔ کیا میں نے تجھے بیوی بچے نہیں دیئے تھے؟ کیا تجھ پر طرح طرح کے اکرام نہیں کئے تھے؟ کیا تیرے لئے گھوڑے اور اونٹ مسخر نہیں کئے تھے؟ کیا تجھے راحت و آرام، کھانا پینا نہیں دیا تھا؟ یہ کہے گا ہاں پروردگار یہ سب کچھ تھا۔ پھر تیرا کیا علم و یقین اس بات پر نہ تھا کہ تو مجھ سے ملنے والا ہے؟ یہ کہے گا ہاں خدایا میں اسے نہیں مانتا تھا۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا بس تو جیسا مجھے بھول گیا تھا ایسا ہی آج میں تجھے بھلا دوں گا۔ اس حدیث میں بھی لفظ ظن ہے اور معنی میں یقین کے ہیں۔ اس کی مزید تحقیق و تفصیل ان شاء اللہ تعالیٰ ﴿نَسُوا اللّٰهَ فَاَنْسٰهُمْ اَنْفُسَهُمْ﴾ (الحشر: ۱۹) کی تفسیر میں آگے آئے گی۔

يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَنِّيْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ۝۴۷

اے اولاد یعقوب کی، تم لوگ میری اس نعمت کو یاد کرو جو میں نے تم کو انعام میں دی تھی اور اس (بات) کو (یاد کرو) کہ میں نے تم کو تمام دنیا جہان والوں پر (خاص برتاؤ میں) فوقیت دی تھی۔ ۝

تذکیر اور نعمت ہائے الٰہی کا مفصل تذکرہ ☆

بنی اسرائیل کے باپ دادوں پر جو نعمت خداوند تعالیٰ انعام کی گئی تھی اس کا ذکر ہو رہا ہے کہ ان میں سے رسول ہوئے۔ ان پر کتابیں اُتریں اور ان کے زمانے کے اور لوگوں پر انہیں مرتبہ دیا۔ جیسے فرمایا: ﴿وَلَقَدِ اخْتَرْنٰهُمْ عَلٰى عِلْمٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ﴾ (الدخان: ۳۲) یعنی انہیں اُن کے زمانے کے (اور لوگوں پر) فضیلت دی اور جگہ فرمایا: ﴿وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَعَلَ فِيْكُمْ اَنْۢبِيَآءَ وَجَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا ۖ وَّاٰتٰىكُمْ مَّا لَمْ يُؤْتِ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ﴾ (المائدۃ: ۲۰) یعنی موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا، اے میری قوم! تم اللہ تعالیٰ کی اس نعمت کو یاد کرو جو تم پر انعام کی ہے۔ تم میں سے اس نے پیغمبر بنائے، تمہیں بادشاہ بنایا اور وہ دیا جو تمام زمانے کو نہیں دیا۔ تمام لوگوں پر فضیلت ملنے سے مراد ان کے زمانے کے تمام اور لوگ ہیں۔ اس لئے کہ اُمت محمد یہ ان سے یقیناً افضل ہے۔ اس اُمت کی نسبت فرمایا گیا ہے: ﴿كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ......﴾ (آل عمران: ۱۱۰) تم بہتر اُمت ہو جو لوگوں کے لئے بنائی گئی ہو۔ تم بھلائیوں کا حکم کرنے والے اور برائیوں سے روکنے والے ہو اور اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتے ہو۔ اگر اہل کتاب بھی ان پر ایمان لاتے تو ان کے لئے بہتر ہوتا۔ مسانید اور سنن میں مروی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں، تم ستر ویں اُمت ہو اور سب سے بہتر اور بزرگ ہو۔

اس قسم کی اور بہت سی حدیثوں کا ذکر انشاء اللہ تعالیٰ ﴿کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّةٍ...... ﴾ کی تفسیر میں آئے گا اور کہا گیا ہے کہ تمام لوگوں پر ایک خاص قسم کی فضیلت مراد ہے۔ جس سے ہر قسم کی فضیلت لازم نہیں آتی۔ راوی نے یہی کہا مگر یہ غور طلب بات ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ان کی فضیلت اور تمام امتوں پر ہے۔ اس لئے انبیاء کرامؑ ان ہی میں سے ہوتے چلے آئے لیکن اس میں بھی غور وخوض کی ضرورت ہے۔ اس لئے کہ طرح کا عموم ان سے اگلے لوگوں کو بھی شامل ہے اور حقیقت ہے اگلے انبیاء ان میں سے نہ تھے۔ جیسے ابراہیم خلیل اللہ اور آنحضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم جوان سب کے بعد تھے' جو تمام مخلوق سے افضل تھے اور تمام اولاد آدمؑ کے سردار ہیں۔ دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی: صلاة الله و سلامه عليه۔

وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِىْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْئًا وَّ لَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿۴۸﴾

اور ڈرو تم ایسے دن سے کہ نہ کوئی شخص کسی شخص کی طرف سے کچھ مطالبہ ادا کر سکتا ہے اور نہ کسی شخص کی طرف سے کوئی سفارش قبول ہو سکتی ہے اور نہ کسی کی طرف سے کوئی معاوضہ لیا جا سکتا ہے اور نہ ان لوگوں کی طرفداری چل سکے گی۔ ○

تخویف اور عذاب کا خطرہ ☆

نعمتوں کا بیان کر کے اب عذابوں سے ڈرایا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ کوئی کسی کو کچھ بھی فائدہ نہ دے گا' جیسے فرمایا: ﴿وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى﴾ (الانعام: ۱۶۴) یعنی کسی کا بوجھ کسی پر نہ پڑے گا۔ اور جگہ فرمایا: ﴿لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ يَوْمَئِذٍ شَاْنٌ يُّغْنِيْهِ﴾ (عبس: ۳۷) یعنی اس دن ہر شخص ایک عجیب حال میں پڑا ہوگا اور جگہ فرمایا اے لوگو! اپنے رب سے خوف کھاؤ' اس دن سے ڈرو' جس دن باپ بیٹے کو اور بیٹا باپ کو کچھ بھی فائدہ نہ پہنچا سکے گا اور جگہ ہے: ﴿وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ﴾ یعنی کسی کافر کی کوئی سفارش نہ کرے گا نہ اس کی سفارش قبول ہوگی اور جگہ ہے' اُن کفار کو شفاعت کرنے والوں کی شفاعت فائدہ نہ دے گی اور جگہ اہلِ جہنم کا یہ مقولہ نقل کیا گیا ہے کہ افسوس ہمارا نہ کوئی سفارشی ہے نہ دوست اور جگہ ہے فدیہ بھی نہ لیا جائے گا اور جگہ ہے جو لوگ کفر پر مر جاتے ہیں وہ اگر زمین بھر سونا دیں اور ہمارے عذابوں سے چھوٹنا چاہیں تو یہ بھی نہیں ہو سکتا اور جگہ ہے کافروں کے پاس اگر تمام زمین کی چیزیں اور اس کے مثل اور بھی ہوں اور قیامت کے دن وہ اسے فدیہ دے کر عذابوں سے بچنا چاہیں تو بھی قبول نہ ہوگا اور دردناک عذابوں میں مبتلا رہیں گے اور جگہ ہے' گو وہ زبردست فدیہ دیں' پھر قبول نہیں اور جگہ ہے آج نہ تم سے بدلہ لیا جائے' نہ کافروں سے' تمہارا ٹھکانہ جہنم ہے' اسی کی آگ تمہاری مولا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ ایمان کے بغیر صرف سفارش اور شفاعت کا آسرا بیکار محض ہے۔ قرآن میں اور جگہ ہے کہ اس دن سے پہلے نیکیاں کر لو۔ جس دن نہ خرید وفروخت ہوگی نہ دوستی نہ شفاعت اور جگہ ہے: ﴿لَّا بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا خِلٰلٌ﴾ (ابراہیم ۳۱) اس دن نہ بیع ہے نہ دوستی۔ عدل کے معنی یہاں بدلے کے ہیں اور بدلہ اور فدیہ ایک ہے۔ حضرت علیؓ والی حدیث میں شفاعت کے معنی نفل اور عدل کے معنی فریضہ مروی ہیں۔ (بخاری) لیکن یہ قول یہاں غریب اور صحیح قول پہلا ہی ہے۔ ایک روایت ہے' حضور ﷺ سے پوچھا گیا کہ یا رسول اللہ ﷺ! عدل کے کیا معنی ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: فدیہ' ان کی مدد بھی نہ کی جائے گی۔ یعنی کوئی حمایتی نہ ہوگا۔ قرابتیں کٹ جائیں گی

جاہ وحشم جاتا رہے گا۔ کسی کے دل میں ان کی طرف رحم نہ رہے گا۔ نہ خود ان میں کوئی قوت وقدرت رہے گی اور جگہ ہے: ﴿هُوَ يُجِيرُ وَلَا يُجَارُ عَلَيْهِ﴾ (المؤمنون: ۸۸) وہ پناہ دیتا ہے اور اس کی پکڑ سے نجات دینے والا کوئی نہیں اور جگہ ہے' آج کے دن نہ خدا کا سا کوئی عذاب کر سکے گا نہ اس کی سی قید و بند اور جگہ ہے ﴿مَا لَكُمْ لَا تَنَاصَرُونَ بَلْ هُمُ الْيَوْمَ مُسْتَسْلِمُونَ﴾ (الصافات: ۲۵) تم آج کیوں ایک دوسرے کی مدد نہیں کرتے؟ بلکہ وہ سب کے سب آج گردن جھکائے تابع فرمان بنے کھڑے ہیں اور آیت میں ہے: ﴿فَلَوْلَا نَصَرَهُمُ الَّذِينَ اتَّخَذُوا مِنْ دُونِ اللَّهِ قُرْبَانًا آلِهَةً ......﴾ (الاحقاف: ۲۶) جن کی وہ خدا کے سوا خدا کی نزدیکی کے لئے پوجا پاٹ کرتے تھے۔ آج وہ معبودان عابدوں کی مدد کیوں نہیں کرتے بلکہ وہ تو کھوئے گئے۔ مطلب یہ کہ محبتیں فنا ہو گئیں۔ رشوتیں کٹ گئیں۔ شفاعتیں مٹ گئیں۔ آپس کی امداد و نصرت ہٹ گئی۔ معاملہ اس عادل' حاکم جبار و قہار خدا تعالیٰ مالک الملک سے پڑا ہے جس کے پاس سفارشیوں کی سفارشیں اور مددگاروں کی مدد کچھ کام نہ آئے گی بلکہ اپنی تمام برائیوں کا بدلہ بھگتنا پڑے گا۔ ہاں یہ اس کی کمال بندہ پروری اور رحم و کرم' انعام و اکرام ہے کہ گناہ کا بدلہ برابر دے اور نیکی کا بدلہ کم از کم دس گنا بڑھا کر دے۔ قرآن کریم میں اور جگہ ہے کہ انہیں ذرا ٹھہرا تو لو ان سے ایک سوال کیا جائے کہ آج یہ ایک دوسرے کی مدد سے ہٹ کر اپنی اپنی فکر کیوں لگ گئے۔ بلکہ ہمارے سامنے سرافگندہ اور تابع فرمان ہیں۔

وَإِذْ نَجَّيْنَاكُمْ مِنْ آلِ فِرْعَوْنَ يَسُومُونَكُمْ سُوءَ الْعَذَابِ يُذَبِّحُونَ أَبْنَاءَكُمْ وَيَسْتَحْيُونَ نِسَاءَكُمْ ۚ وَفِي ذَٰلِكُمْ بَلَاءٌ مِنْ رَبِّكُمْ عَظِيمٌ ﴿٤٩﴾ وَإِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ فَأَنْجَيْنَاكُمْ وَأَغْرَقْنَا آلَ فِرْعَوْنَ وَأَنْتُمْ تَنْظُرُونَ ﴿٥٠﴾

اور (وہ زمانہ یاد کرو) جب کہ رہائی دی ہم نے تم کو متعلقین فرعون سے جو فکر میں لگے رہتے تھے تمہاری سخت آزاری کے گلے کاٹتے تھے تمہاری اولاد ذکور کے اور زندہ چھوڑ دیتے تھے تمہاری عورتوں کو۔ اس (واقعہ) میں ایک امتحان تھا تمہارے پروردگار کی جانب سے بڑا بھاری اور جب شق کر دیا ہم نے تمہاری وجہ سے دریائے شور کو۔ پھر ہم نے ڈوبنے سے بچا لیا تم کو اور غرق کر دیا متعلقین فرعون کو (مع فرعون کے) اور تم اس کا معائنہ کر رہے تھے۔ ۞

ان آیتوں میں فرمایا ہے کہ اے اولاد یعقوب میری اس مہربانی کو بھی یاد رکھو کہ میں نے تمہیں فرعونیوں کے بدترین عذابوں سے چھٹکارا دیا۔ فرعون علیہ اللعن نے ایک خواب دیکھا تھا کہ بیت المقدس کی طرف سے ایک آگ بھڑکی جو مصر کے ہر ہر قبطی کے گھر گھس گئی اور بنی اسرائیل کے مکانات میں وہ نہیں گئی۔ جس کی تعبیر یہ تھی کہ بنی اسرائیل میں ایک شخص ہوگا۔ جس کے ہاتھوں اس کا غرور ٹوٹے گا اور اس کے خدائی دعوے کی بدترین سزا اُسے ملے گی۔ اس لئے اس ملعون نے چوطرف احکام جاری کر دیئے کہ بنی اسرائیل میں جو بچہ ہو' سرکاری طور سے اس کی دیکھ بھال رہے۔ اگر لڑکا ہو تو فوراً مار ڈالا جائے اور اگر لڑکی ہو تو چھوڑ دی جائے اور بنی اسرائیل سے سخت بیگار لی جائے اور مشقت کے کاموں کا بوجھ ان پر ڈال دیا جائے۔

یہاں عذاب کی تفسیر لڑکوں کے مار ڈالنے سے کی گئی اور سورۂ ابراہیم میں ایک کا دوسرے پر عطف ڈالا جس کی پوری تشریح ان شاء اللہ سورہ قصص کے شروع میں بیان کی جائے گی۔ اللہ تعالیٰ ہمیں مضبوطی دے۔ ہماری مدد فرمائے اور تائید کرے۔ آمین۔ یَسُومُونَکُمْ کے معنی لگا دینے اور ہمیشہ کرنے کے ہیں یعنی وہ برابر دکھ دیتے جاتے تھے' چونکہ اس آیت میں پہلے یہ فرمایا تھا کہ میری انعام کی ہوئی نعمت

کو یاد کرو۔اس لئے فرعونیوں کے عذاب کو تفسیر کے طور پر لڑکوں کے قتل کرنے سے بیان فرمایا اور سورۂ ابراہیم میں شروع میں فرمایا تھا کہ تم اللہ کی نعمتوں کو یاد کرو۔اس لئے وہاں عطف کے ساتھ بیان فرمایا تا کہ نعمتوں کی تعداد زیادہ ہو۔یعنی متفرق عذابوں سے اور بچوں کے قتل ہونے سے تمہیں حضرت موسٰی علیہ السلام کے ہاتھوں نجات دلوائی۔مصر کے جتنے بادشاہ عمالیق وغیرہ کفار میں سے ہوئے ہیں۔اُن سب کو فرعون کہا جاتا تھا۔جیسے کہ روم کے کافر بادشاہ کو قیصر اور فارس کے کافر بادشاہ کو کسریٰ اور یمن کے کافر بادشاہ کو تبع اور حبشہ کے کافر بادشاہ کو نجاشی اور ہند کے کافر بادشاہ کو بطلیموس۔اس فرعون کا نام ولید بن مصعب بن ریان تھا۔بعضوں نے مصعب بن ریان بھی کہا ہے۔عملیق بن اود بن ارم بن سام بن نوح کی اولاد میں سے تھا۔اس کی کنیت ابو مرہ تھی۔اصل میں اصطخر کے فارسیوں کی اصل میں سے تھا۔خدا کی پھٹکار اور لعنت اس پر نازل ہو۔پھر فرمایا کہ اس نجات دینے میں ہماری طرف سے ایک بڑی بھاری نعمت تھی۔بَلَآء کے اصلی معنی آزمائش کے ہیں۔لیکن یہاں پر حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما' حضرت مجاہد' ابو العالیہ' ابو مالک' سدی وغیرہ سے نعمت کے معنی منقول ہیں۔امتحان اور آزمائش بھلا اور برائی دونوں کے ساتھ ہوتی ہے لیکن بلوتہ بلاء کا لفظ عموماً برائی کی آزمائش کے لئے اور اَبۡلَیۡتُهٗ اِبۡلَآءً کا لفظ بھلائی کے ساتھ آزمائش کے لئے آتا ہے۔ یہ کہا جاتا ہے کہ اس میں تمہاری آزمائش تھی یعنی اس عذاب میں اور اس کے بچوں کے قتل ہونے میں قرطبیؒ اور اس دوسرے مطلب کو جمہور کا قول کہتے ہیں۔تو اس میں اشارہ ذبح وغیرہ کی طرف ہوگا اور بَلَآء کے معنی برائی کے ہوں گے۔پھر فرمایا کہ ہم نے فرعونیوں سے بچالیا۔تم موسٰی علیہ السلام کے ساتھ نکل کھڑے ہوئے اور فرعون تمہیں پکڑنے کو نکلا تو ہم نے تمہارے لئے پانی کھڑا کر دیا اور تمہیں اس میں پار اتار کر تمہارے سامنے فرعون کو اس کے لشکروں سمیت ڈبو دیا۔ان سب باتوں کا تفصیل وار بیان سورۃ شعراء میں آئے گا۔ان شاء اللہ تعالیٰ۔

عمرو بن میمون اودی فرماتے ہیں کہ جب حضرت موسٰی علیہ السلام بنی اسرائیل کو لے کر نکلے اور فرعون کو خبر ہوئی تو اس نے کہا کہ مرغ جب بولے تب تم سب نکلو اور انہیں پکڑ کر قتل کر ڈالو لیکن اس رات قدرت خداوند سے مرغ نہ بولا۔مرغ کی آواز سنتے ہی فرعون نے ایک بکری ذبح کی اور کہا کہ اس سے پہلے کہ میں اس کی کلیجی سے فارغ ہوں' چھ لاکھ قبطیوں کا لشکر جرار میرے پاس حاضر ہو جانا چاہئے۔چنانچہ لشکر حاضر ہوگیا۔فرعون اس جمعیت کو لے کر بنی اسرائیل کی ہلاکت کے لئے بڑے کرّ وفر سے نکلا اور دریا کے کنارے انہیں پالیا۔اب بنی اسرائیل پر دنیا تنگ ہوگئی۔پیچھے ہٹیں تو فرعونیوں کی تلواروں کی بھینٹ چڑھیں گے۔آگے بڑھیں تو مچھلیوں کا لقمہ بنیں۔اس وقت حضرت یوشع بن نون نے کہا کہ اے اللہ کے نبی! اب کیا کیا جائے؟ آپ نے فرمایا' امر رب آگے آگے ہے' یہ سنتے ہی انہوں نے اپنا گھوڑا پانی میں ڈال دیا لیکن گہرے پانی میں جب غوطے کھانے لگے تو پھر کنارے کی طرف لوٹ آئے اور پوچھا اے موسیٰ! ربّ کی مدد کہاں ہے؟ ہم نہ آپ کو جھوٹا جانتے ہیں نہ ربّ کو۔تین مرتبہ ایسا ہی کیا۔اب حضرت موسٰی علیہ السلام کی طرف وحی آئی کہ اپنی لکڑی دریا پر مارو۔لکڑی لگتے ہی پانی نے راستہ دے دیا اور پہاڑوں کی طرح کھڑا ہوگیا۔حضرت موسٰی علیہ السلام اور آپ کے ماننے والے ان راستوں سے گزر گئے۔انہیں اس طرح پار اُترتے دیکھ کر فرعون اور فرعونیوں نے بھی اپنے گھوڑے اسی راستے پر ڈال دیئے جب سارے کے سارے اس میں آ گئے تو پانی کو مل جانے کا حکم ہوا اور چوطرف ریل پیل ہوگئی اور سارے کے سارے ڈوب مرے۔بنی اسرائیل نے قدرت خداوندی کا یہ نظارہ اپنی آنکھوں کنارے پر کھڑے دیکھا۔جس سے وہ بہت ہی خوش ہوئے۔اپنی آزادی اور فرعون کی بربادی ان کے لئے خوشی کا سبب بنی۔یہ بھی مروی ہے کہ یہ دن عاشورے کا تھا۔یعنی محرم کی دسویں تاریخ۔

مسند احمد میں حدیث ہے کہ جب حضور علیہ السلام مدینہ تشریف لائے تو دیکھا کہ یہودی عاشورے کا روزہ رکھتے ہیں۔پوچھا کہ تم

اس دن کا روزہ کیوں رکھتے ہو؟ انہوں نے کہا کہ اس لئے کہ اس مبارک دن میں بنی اسرائیل فرعون کے ہاتھوں سے چھوٹے اور ان کا دشمن غرق ہوا۔ جس کے شکریے میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ روزہ رکھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا' تم سے بہت زیادہ حقدار موسیٰ علیہ السلام کا میں ہوں پس حضور ﷺ نے خود بھی اس دن روزہ رکھا اور لوگوں کو بھی روزہ رکھنے کا حکم دیا۔ بخاری' مسلم' نسائی' ابن ماجہ وغیرہ میں بھی یہ حدیث موجود ہے۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا' اس دن اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے لئے پانی کھڑا کر دیا تھا۔ اس حدیث کے راوی زید العمی ضعیف ہیں اور ان کے استاد یزید رقاشی ان سے بھی زیادہ ضعیف ہیں۔

وَاِذْ وٰعَدْنَا مُوْسٰۤى اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿۵۱﴾ ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۵۲﴾ وَاِذْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَالْفُرْقَانَ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿۵۳﴾

اور (وہ زمانہ یاد کرو) جبکہ وعدہ کیا تھا ہم نے موسیٰ سے چالیس رات کا۔ پھر تم لوگوں نے تجویز کر لیا گوسالہ کو موسیٰ کے (جانے کے) بعد اور تم نے ظلم پر کمر باندھ رکھی تھی۔ پھر بھی ہم نے (تمہارے توبہ کرنے پر) درگزر کیا۔ تم سے اتنی بڑی بات ہوئے پیچھے اس توقع پر کہ تم احسان مانو گے اور (وہ زمانہ یاد کرو) جب دی ہم نے موسیٰ کو کتاب (توراۃ) اور فیصلہ کی چیز اس توقع پر کہ تم راہ پر چلتے رہو۔ ○

یہاں بھی خداوند تعالیٰ اپنے احسانات یاد دلا رہا ہے کہ جب تمہارے نبی حضرت موسیٰ علیہ السلام چالیس دن کے وعدے پر تمہارے پاس سے گئے اور پیچھے سے تم نے گوسالہ پرستی شروع کر دی۔ پھر ان کے آنے پر جب تم نے اس شرک سے توبہ کی تو ہم نے تمہارے اتنے بڑے کفر کو بھی بخش دیا اور جگہ قرآن میں ہے: ﴿وَوٰعَدْنَا مُوْسٰى ثَلٰثِيْنَ لَيْلَةً وَّاَتْمَمْنٰهَا بِعَشْرٍ﴾ (الاعراف:۱۴۲) یعنی ہم نے موسیٰ سے تیس راتوں کا وعدہ کیا اور دس بڑھا کر پوری چالیس کر دیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہ وعدہ کا زمانہ ذی قعدہ کا پورا مہینہ اور دس دن ذی الحجہ کا تھا۔ یہ واقعہ فرعونیوں سے نجات پانے کے بعد پیش آیا تھا۔ کتاب سے مراد توراۃ ہے اور فرقان' ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو حق و باطل' ہدایت و ضلالت میں فرق کرے۔ یہ کتاب بھی اس واقعہ کے بعد ملی۔ جیسے کہ سورہ اعراف کے اس واقعہ کے طرز بیان سے ظاہر ہوتا ہے۔ دوسری جگہ: ﴿بَعْدِ مَاۤ اَهْلَكْنَا الْقُرُوْنَ الْاُوْلٰى﴾ (القصص:۴۳) بھی آیا ہے۔ یعنی ہم نے اگلے لوگوں کو ہلاک کرنے کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام کو وہ کتاب دی جو سب لوگوں کے لئے بصیرت افزا اور ہدایت و رحمت ہے۔ تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ واؤ زائد ہے اور خود کتاب کو فرقان کہا گیا ہے۔ لیکن یہ غریب ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ کتاب پر فرقان کا عطف ہے۔ یعنی کتاب بھی دی اور معجزہ بھی دیا۔ دراصل معنیٰ کے اعتبار سے دونوں کا مفاد ایک ہی ہے اور ایسی ایک چیز دو ناموں سے بطور عطف کے کلام عرب میں آیا کرتی ہے۔ شعراء عرب کے بہت سے اشعار اس کے شاہد ہیں۔

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَكُمْ بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجْلَ فَتُوْبُوْۤا اِلٰى بَارِئِكُمْ فَاقْتُلُوْۤا اَنْفُسَكُمْ ؕ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ عِنْدَ بَارِئِكُمْ ؕ

فَتَابَ عَلَيْكُمْ ۗ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۵۴﴾

اور (وہ زمانہ یاد کرو) جب موسیٰ (علیہ السلام نے) فرمایا اپنی قوم سے کہ اے میری قوم بے شک تم نے اپنا بڑا نقصان کیا اپنے اس گئو سالہ (پرستی) کی تجویز سے' سو تم اب اپنے خالق کی طرف متوجہ ہو۔ پھر بعض آدمی بعض آدمیوں کو قتل کرو۔ (یہ عملدرآمد) تمہارے لئے بہتر ہوگا۔ تمہارے خالق کے نزدیک پھر حق تعالیٰ تمہارے حال پر (اپنی عنایت سے) متوجہ ہوئے بیشک وہ تو ایسے ہی ہیں کہ توبہ قبول کر لیتے ہیں اور عنایت فرماتے ہیں۔ ○

یہاں اُن کی توبہ کا طریقہ بیان ہو رہا ہے۔ انہوں نے بچھڑے کو پوجا اور اس کی محبت نے ان کے دلوں کو گھیر لیا۔ پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سمجھانے سے ہوش آیا اور نادم ہوئے اور اپنی گمراہی کا یقین کر کے توبہ استغفار کرنے لگے۔ تب انہیں حکم ہوا کہ تم آپس میں قتل کرو۔ چنانچہ انہوں نے یہ کہا اور خداوند تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول کی اور قاتل و مقتول دونوں کو بخش دیا۔ اس کا پورا بیان سورہ طٰہٰ کی تفسیر میں آئے گا ان شاء اللہ۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا یہ فرمان کہ اپنے خالق سے توبہ کرو' بتلا رہا ہے کہ اس سے بڑھ کر ظلم کیا ہوگا کہ تمہیں پیدا اللہ تعالیٰ کرے اور تم پوجو غیروں کو۔ ایک روایت میں ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے انہیں حکم خداوندی سنایا اور جن لوگوں نے بچھڑا پوجا تھا' انہیں بٹھا دیا اور دوسرے لوگ کھڑے ہو گئے اور قتل کرنا شروع کیا۔ قدرتی طور پر اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ جب وہ ہٹا اور انہیں روک دیا گیا تو شمار کرنے پر معلوم ہوا کہ ستر ہزار آدمی قتل ہو چکے ہیں اور ساری قوم کی توبہ قبول ہوئی۔ یہ ایک سخت فرمان تھا کہ جسے ان لوگوں نے پورا کیا اور اپنوں اور غیروں کو یکساں تہ تیغ کیا۔ یہاں تک کہ رحمت خداوندی نے انہیں بخش دیا اور موسیٰ علیہ السلام سے فرمادیا کہ اب بس کرو۔ مقتول کو شہید کا اجر دیا اور باقی ماندہ لوگوں کی توبہ قبول کی اور انہیں جہاد کا ثواب دیا۔ موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام نے جب اس طرح اپنی قوم کا قتل دیکھا تو دعا کرنی شروع کی کہ خدایا اب تو بنی اسرائیل مٹ جائیں گے۔ چنانچہ انہیں معاف کر دیا گیا اور پروردگار عالم نے فرمایا کہ اے میرے پیغمبر! مقتولوں کا غم نہ کرو۔ وہ ہمارے پاس شہیدوں کے درجہ میں ہیں۔ وہ یہاں زندہ ہیں اور روزیاں پا رہے ہیں۔ اب آپ کو اور آپ کی قوم کو صبر آیا اور عورتوں اور بچوں کی گریہ وزاری موقوف ہوئی' تلواریں' نیزے' چھرے اور چھریاں چلنی بند ہوئیں آپس میں باپ بیٹوں' بھائیوں میں قتل و خون موقوف ہوا اور خدائے تواب درحیم نے ان کی توبہ قبول کی۔

وَاِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً فَاَخَذَتْكُمُ الصّٰعِقَةُ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ﴿۵۵﴾ ثُمَّ بَعَثْنٰكُمْ مِّنْ بَعْدِ مَوْتِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۵۶﴾

اور جب تم لوگوں نے (یوں) کہا کہ اے موسیٰ ہم ہرگز نہ مانیں گے تمہارے کہنے سے یہاں تک کہ ہم (خود) دیکھ لیں اللہ تعالیٰ کو علانیہ طور پر سو (اس گستاخی پر) پر کڑک بجلی کی اور تم (اس کا آنا) آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ پھر ہم نے تم کو زندہ کر اُٹھایا۔ تمہارے مر جانے کے بعد اس توقع پر کہ تم احسان مانو گے۔ ○

موسیٰ علیہ السلام جب اپنے ساتھ بنی اسرائیل کے ستر شخصوں کو لے کر خدا کے وعدے کے مطابق کوہ طور پر گئے اور ان لوگوں نے کلام خداوندی سنا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہنے لگے' ہم تو جب مانیں جب اللہ تعالیٰ کو اپنے سامنے دیکھ لیں۔ اس گستاخانہ سوال

پر اُن پر آسمان سے دیکھتے ہی دیکھتے بجلی گری اور ایک سخت ہولناک آواز بلند ہوئی۔ جس سے سب کے سب مر گئے۔ موسیٰ علیہ السلام یہ دیکھ کر گریہ وزاری کرنے لگے اور رو رو کر جناب باری میں عرض کرنے لگے کہ خدایا بنی اسرائیل کو میں کیا جواب دوں گا۔ یہ جماعت تو ان کے سرداروں اور بہترین لوگوں کی تھی۔ پروردگار اگر یہی منظور تھا تو انہیں اور مجھے اس سے پہلے ہی مار ڈالتا خدایا بے وقوفوں کی بیوقوفی کے کام پر ہمیں نہ پکڑ۔ یہ دعا قبول ہوئی اور آپ کے معلوم کرایا گیا کہ یہ بھی دراصل بچھڑا پوجنے والوں میں سے تھے۔ انہیں سزا مل گئی۔ پھر انہیں زندہ کر دیا اور ایک کے بعد ایک کر کے سب زندہ کئے گئے۔ ایک دوسرے کے زندہ ہونے کو ایک دوسرا دیکھتا رہا۔

محمد بن اسحاق فرماتے ہیں کہ جب موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کے پاس آئے اور انہیں بچھڑا پوجتے ہوئے دیکھا اور اپنے بھائی کو اور سامری کو تنبیہ کی۔ بچھڑے کو جلا دیا اور اس کی راکھ دریا میں بہادی۔ اس کے بعد اُن میں سے بہترین لوگوں کو چن کر اپنے ساتھ لیا۔ جن کی تعداد ستر تھی اور کوہ طور پر توبہ کرنے کے لئے چلے۔ اُن سے کہا کہ تم توبہ کرو' روزہ رکھو' پاک صاف ہو جاؤ۔ کپڑوں کو پاک کرلو' جب بحکم خداوندی طور سینا پر پہنچے تو اُن لوگوں نے کہا کہ اے خدا کے پیغمبر! اللہ تعالیٰ سے دعا کیجئے کہ وہ اپنا کلام ہمیں بھی سنائے۔ جب موسیٰ علیہ السلام پہاڑ کے پاس پہنچے تو ایک بادل نے آ کر سارے پہاڑ کو ڈھک لیا اور آپ اسی کے اندر اندر خدا کے قریب ہو گئے۔ جب کلام خداوندی شروع ہوا۔ تب موسیٰ علیہ السلام کی پیشانی نور سے چمکنے لگی۔ اس وقت کوئی آپ کی طرف نظر اُٹھانے کی تاب نہیں رکھتا تھا۔ بادل کی اوٹ ہو گئی اور سب لوگ سجدے میں گر پڑے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا سے آپ کے ساتھی بنی اسرائیل بھی خدا کا کلام سننے لگے کہ انہیں حکم احکام ہو رہے ہیں۔ جب کلام خداوندی ختم ہوا ابر ہٹ گیا اور موسیٰ علیہ السلام ان کے پاس چلے آئے تو یہ لوگ کہنے لگے کہ موسیٰ ہم تو ایمان نہ لائیں گے جب تک اپنے رب کو اپنے سامنے نہ دیکھ لیں۔ اس گستاخی پر ایک زلزلہ آیا اور سب کے سب ہلاک ہو گئے۔ اب موسیٰ علیہ السلام نے خلوص دل کے ساتھ دعائیں شروع کیں اور کہنے لگے کہ اس سے تو یہی اچھا تھا کہ ہم سب اس سے پہلے ہی ہلاک ہو جاتے۔ بیوقوفوں کے کاموں پر ہمیں ہلاک نہ کر۔ یہ لوگ ان کے چیدہ اور پسندیدہ لوگ تھے۔ جب میں تنہا بنی اسرائیل کے پاس جاؤں گا تو انہیں کیا جواب دوں گا۔ کون میری اس بات کو سچا جانے گا اور پھر اس کے بعد کون مجھ پر ایمان لے آئے گا؟ خدایا ہماری توبہ قبول فرما اور ہم پر فضل و کرم کر۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام یونہی خشوع خضوع سے دعا مانگتے رہے۔ یہاں تک کہ پروردگار نے ان کی اس دعا کو قبول فرمایا اور ان مردوں کو زندہ کر دیا۔ اب سب نے یک زبان ہو کر بنی اسرائیل کی طرف سے توبہ شروع کی۔ ان سے فرمایا گیا کہ جب تک وہ اپنی جانوں کو ہلاک نہ کریں گے اور ایک دوسرے کو قتل نہ کریں گے میں اُن سے توبہ قبول نہ فرماؤں گا۔ سدی کبیر کہتے ہیں' یہ واقعہ بنی اسرائیل کے آپس میں لڑ چکنے کے بعد کا ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ یہ خطاب گو عام ہے لیکن حقیقت میں اس سے مراد یہی ستر اشخاص ہیں۔

رازی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر میں ان ستر شخصوں کے قصے میں لکھا ہے کہ انہوں نے اپنے جینے کے بعد کہا کہ اے نبی اللہ! اللہ تعالیٰ سے دعا کیجئے کہ وہ ہمیں نبی بنا دے۔ آپ نے دعا کی اور وہ قبول ہوگئی۔ لیکن یہ قول غریب ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں سوائے حضرت ہارون علیہ السلام کے کسی اور کی نبوت ثابت نہیں۔ اہل کتاب کا یہ دعویٰ ہے کہ ان لوگوں نے اپنی دعا کے مطابق خدا کو اپنی آنکھوں سے اسی جگہ دیکھا' یہ بھی غلط ہے۔ اس لئے کہ خود موسیٰ علیہ السلام نے جب دیدار باری کا سوال کیا تو انہیں منع کر دیا گیا۔ پھر بھلا یہ ستر اشخاص دیدار باری کی تاب کیسے لا سکتے تھے؟ اس قول کی تفسیر میں ایک دوسرا قول بھی ہے کہ موسیٰ علیہ السلام تورات لے کر آئے جو احکام کا مجموعہ تھی اور ان سے کہا کہ یہ خدائی کتاب ہے اس پر عمل کرو اور مضبوطی کے ساتھ اس کے پابند ہو جاؤ۔ تو وہ کہنے لگے کہ حضرت

ہمیں کیا خبر خدا خود ظاہر ہو کر ہم سے کیوں نہیں کہتا؟ کیا وجہ ہے کہ وہ آپ سے باتیں کرے اور ہم سے نہ کرے؟ جب تک ہم خدا کو خود نہ دیکھ لیں ہرگز ایمان نہ لائیں گے۔ اس قول پر ان کے اوپر غضب خداوندی نازل ہوا اور ہلاک کر دیئے گئے۔ پھر زندہ کئے گئے۔ پھر موسیٰ علیہ السلام نے ان سے کہا کہ اب تو اس تورات کو تھام لو۔ انہوں نے پھر انکار کر دیا۔ اب کی مرتبہ فرشتے پہاڑ اٹھا کر لائے اور ان کے سروں کے اوپر معلق کر دیا کہ اگر نہ مانو گے تو یہ پہاڑ گرا دیا جائے اور تم سب پیس ڈالے جاؤ گے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مرنے کے بعد یہ جی اُٹھے اور پھر بھی مکلف رہے یعنی احکام خداوندی ان پر پھر بھی جاری رہے۔

ماوردی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ جب انہوں نے خدا تعالیٰ کی یہ زبردست نشانی دیکھ لی۔ مرنے کے بعد زندہ ہوئے تو تکلیف شرعی ان پر سے ہٹ گئی۔ اس لئے کہ اب تو یہ مجبور تھے کہ سب کچھ مان لیں۔ خود اُن پر یہ واردات پیش آئیں۔ اب تصدیق ایک بے اختیار امر ہو گیا۔ دوسری جماعت کہتی ہے کہ نہیں بلکہ باوجود اس کے وہ احکام شرع کے مکلف رہے کیونکہ عاقل مکلف ہے۔ قرطبیؒ کہتے ہیں ٹھیک قول یہی ہے۔ یہ امور ان پر قدرتی طور پر آئے تھے۔ جو انہیں پابندی شرع سے آزاد نہیں کر سکتے۔ خود بنی اسرائیل نے بڑے بڑے معجزات دیکھے۔ خود ان کے ساتھ ایسے ایسے کام ہوئے جو بالکل نادر خلاف قیاس اور زبردست معجزات تھے۔ باوجود اس کے وہ بھی مکلف رہے۔ اسی طرح یہ بھی ٹھیک قول یہی ہے اور واضح امر بھی یہی ہے۔ واللہ اعلم۔

وَظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ وَأَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى ۖ كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ ۖ وَمَا ظَلَمُوْنَا وَلٰكِنْ كَانُوْا أَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿۵۷﴾

اور سایہ افگن کیا ہم نے تم پر ابر کو (میدان تیہ میں) اور (خزانہ غیب سے) پہنچایا ہم نے تمہارے پاس ترنجبین اور بٹیریں کھاؤ نفیس چیزوں سے جو کہ ہم نے تم کو دی ہیں اور (اس سے) انہوں نے ہمارا کوئی نقصان نہیں کیا لیکن اپنا ہی نقصان کرتے تھے۔ ○

اُوپر بیان ہوا تھا کہ فلاں بلائیں ہم نے تم پر سے دفع کر دیں۔ اب بیان ہو رہا ہے کہ فلاں فلاں نعمتیں بھی ہم نے تمہیں عطا فرمائیں۔ غَمَامٌ غَمَامَةٌ کی جمع ہے چونکہ یہ آسمان کو چھپا لیتا ہے۔ اس لئے اسے غمامہ کہتے ہیں۔ یہ ایک سفید رنگ کا بادل تھا جو وادیٔ تیہ میں ان کے سروں پر سایہ کئے رہتا تھا۔ جیسے نسائی وغیرہ میں ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے ایک طویل حدیث میں روایت ہے۔ ابن ابی حاتم کہتے ہیں کہ ابن عمر ربیع بن انس ابومجلز ضحاک اور سدیؒ نے یہی کہا ہے۔ حسن اور قتادہ بھی یہی کہتے ہیں اور لوگ کہتے ہیں کہ یہ بادل عام بادلوں سے زیادہ ٹھنڈک والا اور زیادہ عمدہ تھا۔ حضرت مجاہد فرماتے ہیں یہ وہی بادل تھا جس میں اللہ تعالیٰ کی قیامت کے دن آئے گا۔ ابو حذیفہ کا قول بھی یہی ہے: ﴿هَلْ يَنْظُرُوْنَ إِلَّآ أَنْ يَّأْتِيَهُمُ اللّٰهُ فِيْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ وَالْمَلٰٓئِكَةُ......﴾ (البقرۃ: ۲۱۰) اس آیت میں اس کا ذکر ہے کہ کیا ان لوگوں کو اس کا انتظار ہے کہ اللہ تعالیٰ بادل میں آئے اور اس کے فرشتے یہی وہ بادل ہے جس میں بدر والے دن فرشتے نازل ہوئے تھے۔

من وسلویٰ ☆ جو من اُن پر اُترا وہ درختوں پر اُترتا تھا یہ صبح جاتے تھے اور جمع کر کے کھا لیا کرتے تھے۔ وہ گوند کی قسم کا تھا کوئی کہتا ہے شبنم کی وضع کا تھا۔ حضرت قتادہ فرماتے ہیں بادلوں کی طرح من اُن کے گھروں میں اُترتا تھا۔ جو دودھ سے زیادہ سفید اور شہد سے زیادہ میٹھا تھا۔ صبح صادق سے لے کر آفتاب نکلنے تک اُترتا رہتا تھا۔ ہر شخص اپنے گھر بار کے لئے اتنی مقدار میں لے لیتا تھا جتنا اس دن کافی ہو

جائے۔ اگر کوئی زیادہ لے تو بگڑ جاتا تھا۔ جمعہ کے دن وہ دو دن کا لیتے تھے۔ جمعہ اور ہفتہ کا' اس لئے کہ ہفتہ کا بڑا دن تھا۔ ربیع بن انس کہتے ہیں' من شہد جیسی چیز تھی۔ جس میں پانی ملا کر پیتے تھے۔ شعبیؒ فرماتے ہیں تمہارا یہ شہد اس من کا سترواں حصہ ہے۔ شعروں میں بھی من شہد کے معنی میں آیا ہے۔ یہ سب اقوال قریب قریب ہیں۔ غرض یہ ہے کہ ایک چیز تھی جو انہیں بلا تکلیف و تکلف ملتی تھی۔ اگر صرف اُسے کھایا جائے تو وہ کھانے کی چیز تھی اور اگر پانی میں ملائی جائے تو پینے کی چیز تھی اور اگر دوسری چیزوں کے ساتھ مرکب کردی جائے تو اور چیز ہو جاتی تھی لیکن یہاں من سے مراد یہی من مشہور نہیں۔

صحیح بخاری کی حدیث میں ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کھمبی من میں سے ہے اور اس کا پانی آنکھ کے لئے شفا ہے۔ ترمذی اسے حسن صحیح کہتے ہیں۔ ترمذی میں ہے کہ عَجوہ' جو مدینہ کی کھجوروں کی ایک قسم ہے وہ جنتی چیز ہے اور اس میں زہر کا تریاق ہے اور کھمبی من میں سے ہے اور اس کا پانی آنکھ کے درد کی دوا ہے۔ یہ حدیث حسن غریب ہے۔ دوسرے بہت سے طریقوں سے بھی مروی ہے۔ ابن مردویہ کی حدیث ہے کہ صحابہؓ نے اس درخت کے بارے میں اختلاف کیا جو زمین کے اوپر ہوتا ہے۔ جس کی جڑیں مضبوط نہیں ہوتیں۔ بعض کہنے لگے کھمبی کا درخت ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کھمبی تو من میں سے ہے اور اس کا پانی آنکھ کے لئے شفا ہے۔

سلویٰ ایک قسم کا پرندہ ہے۔ چڑیا سے کچھ بڑا ہوتا ہے۔ سرخی مائل رنگ کا' جنوبی ہوائیں چلتی تھیں اور اُن پرندوں کو وہاں لا کر جمع کر دیتی تھیں۔ بنی اسرائیل اپنی ضرورت کے مطابق انہیں پکڑ لیتے تھے اور ذبح کر کے کھا لیتے تھے۔ اگر ایک دن گزر کر بچ جاتا تو وہ بگڑ جاتا تھا اور جمعہ کے دن دو دن کے لئے جمع کر لیتے تھے کیونکہ ہفتہ کا دن ان کے لئے عید کا دن ہوتا تھا۔ اس دن عبادتوں میں مشغول رہنے کا اور شکار وغیرہ سے بچنے کا حکم تھا۔ بعض لوگوں نے کہا کہ یہ پرندے کبوتر کی مانند ہوتے تھے۔ ایک میل کی لمبائی چوڑائی میں ایک نیزے کے برابر اونچا ڈھیر ان پرندوں کا ہو جاتا تھا۔ یہ دونوں چیزیں ان پر وادی تیہ میں اُترتی تھیں۔ جہاں انہوں نے اپنے پیغمبر سے کہا تھا کہ اس جنگل میں ہمارے کھانے کا بندوبست کیسے ہوگا؟ تب ان پر من و سلویٰ اتارا گیا اور پانی کے لئے جب حضرت موسیٰ سے درخواست کی گئی تو پروردگار عالم نے فرمایا کہ اس پتھر پر لکڑی مارو۔ لکڑی لگتے ہی اس سے بارہ چشمے جاری ہو گئے اور بنی اسرائیل کے بارہ ہی فرقے تھے۔ ہر قبیلے نے ایک ایک چشمہ اپنے لئے بانٹ لیا۔ پھر سایہ کے وہ طالب ہوئے کہ اس چٹیل میدان میں سایہ بغیر گزر مشکل ہے تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے طور پہاڑ کا ان پر سایہ کر دیا۔ رہ گیا لباس' تو قدرت خداوندی سے جو لباس وہ پہنے ہوئے تھے۔ وہ اُن کے قد کے بڑھنے کے ساتھ بڑھتا رہتا تھا۔ ایک سال کے بچہ کا لباس' جوں جوں اس کا قد و قامت بڑھتا جاتا' نہ وہ پھٹتا نہ خراب پڑتی نہ میلا پڑتا۔ ان تمام نعمتوں کا ذکر مختلف جگہ قرآن پاک میں موجود ہے۔ جیسے یہ آیت اور: اِذِ اسْتَسْقٰی والی آیت وغیرہ۔ ہذلی کہتے ہیں کہ سلویٰ شہد کو کہتے ہیں لیکن ان کا یہ قول غلط ہے۔ ثورج نے اور جوہری نے بھی یہی کہا ہے اور اس کی شہادت میں عرب شاعروں کے شعر اور بعض عربی محاورے بھی پیش کئے ہیں۔ بعضوں نے کہا ہے کہ ایک دوا کا نام ہے۔ کسائی کہتے ہیں سلویٰ واحد لفظ ہے اور اس کی جمع سلاویٰ آتی ہے اور بعض کہتے ہیں کہ جمع میں اور مفرد میں یہی صیغہ رہتا ہے۔ یعنی لفظ سلویٰ۔ غرض یہ خدا کی دو نعمتیں تھیں' جن کا کھانا ان کے لئے مباح کیا گیا لیکن ان لوگوں نے خدا تعالیٰ کی ان نعمتوں کی ناشکری کی اور یہی ان کا اپنے جانوں پر ظلم کرنا تھا۔ باوجودیکہ اس سے پہلے بھی بہت کچھ خدائی نعمتیں ان پر نازل ہو چکی تھیں۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی خصوصیت وفضیلت ☆ بنی اسرائیل کی حالت کا یہ نقشہ آنکھوں کے سامنے رکھ کر پھر اصحابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حالت پر نظر ڈالو کہ باوجود سخت سے سخت مصیبتیں جھیلنے کے اور بے انتہا تکلیفیں برداشت کرنے کے وہ اتباع نبی پر اور عبادت

خداوندی پر جمے رہے۔ نہ معجزات طلب کئے نہ دنیا کی راحتیں مانگیں۔ نہ کسی کام کے نوپید کرنے کی خواہش کی۔ جنگ تبوک میں جب کہ بھوک کے مارے بے تاب ہو گئے اور نبوت کا مزہ آنے لگا۔ تب حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ رسول اللہ! اس کھانے میں برکت کی دعا کیجئے اور جس کے پاس جو کچھ بچا کھچا تھا جمع کر کے حاضر کر دیا۔ جو سب مل کر بھی نہ ہونے کے برابر یہی تھا۔ حضور ﷺ نے دعا کی اور خدائے تبارک وتعالیٰ نے قبول فرما کر اس میں برکت دی۔ انہوں نے خوب کھایا بھی اور تمام توشے دان بھر لئے۔ پانی کے قطرے قطرے سے جب ترسنے لگے تو خدا کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا سے ایک ابر آیا اور ریل پیل کر دی۔ پیا پلایا اور مشکیں اور مشکیزے سب بھر لئے۔ پس صحابہؓ کی اس ثابت قدمی اولوالعزمی کامل اتباع اور سچی توحید نے اُن کی اصحاب موسیٰ پر قطعی فضیلت ثابت کر دی۔

وَإِذْ قُلْنَا ادْخُلُوا هَٰذِهِ الْقَرْيَةَ فَكُلُوا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ رَغَدًا وَادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَقُولُوا حِطَّةٌ نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطَايَاكُمْ ۚ وَسَنَزِيدُ الْمُحْسِنِينَ ﴿۵۸﴾ فَبَدَّلَ الَّذِينَ ظَلَمُوا قَوْلًا غَيْرَ الَّذِي قِيلَ لَهُمْ فَأَنزَلْنَا عَلَى الَّذِينَ ظَلَمُوا رِجْزًا مِّنَ السَّمَاءِ بِمَا كَانُوا يَفْسُقُونَ ﴿۵۹﴾ ع ۶ ۱۴

اور جب ہم نے حکم کیا کہ تم لوگ اس کی آبادی کے اندر داخل ہو پھر کھاؤ اس (کی چیزوں میں) سے جس جگہ تم رغبت کرو بے تکلفی سے اور دروازہ میں داخل ہونا (عاجزی سے) جھکے جھکے اور (زبان سے) کہتے جانا کہ توبہ ہے (توبہ ہے) ہم معاف کر دیں گے تمہاری خطائیں اور ابھی ابھی مزید برآں اور دیں گے دل سے نیک کام کرنے والوں کو سو بدل ڈالا ان ظالموں نے ایک اور کلمہ جو خلاف تھا اس کلمہ کے جس (کے کہنے) کی ان سے فرمائش کی گئی تھی۔ اس پر ہم نے نازل کی ان ظالموں پر ایک آفت سماوی اس وجہ سے کہ وہ عدول حکمی کرتے تھے۔

حکم جہاد اور اس سے انکار ☆

جب موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو لے کر مصر سے آئے اور انہیں زمینِ مقدس میں جانے کا حکم ہوا۔ جو زمین ان کی موروثی تھی۔ ان سے کہا گیا کہ یہاں جو عمالیق ہیں ان سے جہاد کرو۔ تو ان لوگوں نے نامردی دکھائی۔ جس کی سزا میں انہیں میدان تیہ میں ڈال دیا گیا۔ جیسے سورہ مائدہ میں ذکر ہے۔ قریہ سے مراد بیت المقدس ہے۔ سدی ربیع قتادہ ابومسلم وغیرہ نے یہی کہا ہے۔ قرآن میں ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا کہ اے میری قوم اس پاک زمین میں جاؤ جو تمہارے لئے لکھ دی ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ اس سے مراد لدیحا ہے۔ بعضوں نے کہا ہے مصر مراد ہے لیکن صحیح قول پہلا ہی ہے کہ مراد اس سے بیت المقدس ہی ہے۔ یہ واقعہ تیہ سے نکلنے کے بعد کا ہے۔ جمعہ کے دن شام کو اللہ تعالیٰ نے اسے ان کے ہاتھ پر فتح کرایا بلکہ سورج کو ان کے لئے کافی دیر ٹھہرا دیا تھا تاکہ فتح ہو جائے۔ فتح کے بعد انہیں یہ حکم ہوا کہ اس شہر میں سجدہ کرتے ہوئے جاؤ۔ جو اس فتح کی شکر گزاری کا ہو گا۔

ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے سجدے سے مراد رکوع لی ہے۔ (طبری) راوی کہتے ہیں کہ سجدے سے مراد یہاں پر خشوع و خضوع ہے کیونکہ حقیقت پر اسے محمول کرنا ناممکن ہے۔ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کہتے ہیں یہ دروازہ قبلہ کی جانب تھا۔ اس کا نام باب

الحظہ تھا۔ رازی نے یہ بھی کہا ہے کہ دروازے سے مراد جہت قبلہ ہے۔ بجائے سجدے کے اس قوم نے اپنی رانوں پر کھسکنا شروع کیا اور کروٹ کے بل داخل ہونے لگے۔ سروں کو جھکانے کے بجائے اونچا کرلیا۔ حِطَّةٌ کے معنی بخشش کے ہیں۔ بعضوں نے کہا کہ یہ امر حق ہے۔ عکرمہ کہتے ہیں اس سے مراد لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہنا ہے۔ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کہتے ہیں اس میں گناہوں کا اقرار ہے۔ حسن اور قتادہ فرماتے ہیں۔ خدایا ہماری خطاؤں کو ہم سے دور کردے پھر ان سے وعدہ کیا جاتا ہے کہ اگر تم اسی طرح یہی کہتے ہوئے شہر میں گئے اور اس فتح کے وقت بھی اپنی پستی اور خدا کی نعمت اور اپنے گناہوں کا اقرار تم نے کیا اور مجھ سے بخشش طلب کی تو چونکہ یہ چیزیں مجھے بہت ہی پسند ہیں۔ میں بھی تمہاری خطاؤں سے درگزر کرلوں گا۔

فتح مکہ کے موقعہ پر فرمانِ خداوندی سورہ اِذَا جَآءَ...... نازل ہوئی تھی اور اس میں بھی یہی حکم دیا گیا تھا کہ جب خدا کی مدد آ جائے۔ مکہ فتح ہو اور لوگ دین خدا میں آ جائیں تو اے نبی تم اپنے ربّ کی تسبیح اور حمد وثنا بیان کرو۔ اس سے استغفار کرو۔ وہ توبہ قبول کرنے والا ہے۔ اس سورت میں جہاں ذکر و استغفار کا ذکر ہے۔ وہاں حضور ﷺ کے آخری وقت کی خبر بھی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے اس سورت کا ایک مطلب یہ بھی بیان کیا تھا' جسے آپ نے پسند فرمایا تھا۔ جب مکہ فتح ہونے کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم شہر میں داخل ہوئے تو انتہائی تواضع اور مسکینی کے آثار آپ ﷺ پر تھے۔ یہاں تک کہ سر جھکائے ہوئے تھے کہ اونٹنی کے پالان سے سر لگ گیا تھا۔ شہر میں جاتے ہی غسل کرکے ضُحیٰ کے وقت آٹھ رکعت نماز ادا کی۔ جو ضُحیٰ کی نماز بھی تھی اور فتح شکریہ کی بھی اور دونوں طرح کے قول محدثین کے ہیں۔ حضرت سعد بن وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جب ملک ایران فتح کیا اور کسریٰ کے شاہی محلات میں پہنچے تو اسی سنت کے مطابق آٹھ رکعتیں پڑھیں۔ دو دو رکعت ایک سلام سے پڑھنے کا بعض کا مذہب ہے اور بعضوں نے یہ بھی کہا ہے کہ آٹھ ایک ساتھ ایک ہی سلام سے پڑھیں۔ واللہ اعلم۔

صحیح بخاری شریف میں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ بنی اسرائیل کو حکم کیا گیا کہ وہ سجدہ کرتے ہوئے اور حِطَّةٌ کہتے ہوئے دروازے میں جائیں۔ لیکن انہوں نے بدل دیا اور اپنی رانوں پر گھسیٹتے ہوئے اور حَبَّةٌ حَبَّةٌ فِیْ شَعرة کہتے ہوئے جانے لگے۔ نسائی' عبدالرزاق' ابوداؤد' مسلم اور ترمذی میں بھی یہ حدیث بہ اختلاف الفاظ موجود ہے اور سنداً صحیح ہے۔ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جارہے تھے۔ ذات الحَنظل نامی گھاٹی کے قریب پہنچے تو آپ نے فرمایا کہ اس گھاٹی کی مثال بھی بنی اسرائیل کے اس دروازے جیسی ہے۔ جہاں انہیں سجدہ کرتے ہوئے داخل ہونے کو کہا گیا تھا اور ان کے گناہوں کی معافی کا وعدہ کیا گیا تھا۔ حضرت براء فرماتے ہیں: ﴿سَيَقُوْلُ السُّفَهَآءُ﴾ میں سُفَهَاء یعنی بیوقوفوں سے مراد یہود ہیں۔ جنہوں نے اللہ کی بات کو بدل دیا تھا۔

حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں حِطَّةٌ کے بدلے انہوں نے حِنْطَةٌ حَبَّةٌ حَمْرَآءُ فِيْهَا شَعِيْرَةٌ کہا تھا۔ ان کی اپنی زبان میں ان کے الفاظ یہ تھے: **هطا سمعاتا ازبة مزما**۔ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما بھی ان کی اس تبدیلی کو بیان فرماتے ہیں کہ رکوع کرنے کے بدلے وہ رانوں پر گھسیٹتے ہوئے اور حِطَّةٌ کے بدلے حِنْطَةٌ کہتے ہوئے چلے۔ حضرت عطاء' مجاہد' عکرمہ' ضحاک' حسن' قتادہ' ربیع' یحییٰ نے بھی یہی بیان کیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس قول وفعل کا انہیں حکم دیا گیا تھا۔ انہوں نے اسے مذاق میں اُڑایا۔ جو صریح مخالفت اور معاندت تھی۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان پر اپنا عذاب نازل فرمایا۔ فرماتا ہے کہ ہم نے ظالموں پر ان کے فسق کی وجہ سے آسمانی عذاب نازل فرمایا۔ رِجز سے مراد عذاب ہے۔ کوئی کہتا ہے غضب ہے کسی نے طاعون کہا ہے۔ ایک مرفوع حدیث میں

ہے۔ طاعون رجز ہے اور یہ عذاب تم سے اگلے لوگوں پر اتارا گیا تھا۔

بخاری و مسلم میں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں' جب تم سنو کہ فلاں جگہ طاعون ہے تو وہاں نہ جاؤ۔ ابن جریر میں ہے کہ یہ دکھ اور بیماری رجز ہے جس سے تم سے پہلے لوگ عذاب کیے گئے ہیں۔

وَاِذِ اسْتَسْقٰى مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ فَقُلْنَا اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ ؕ فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا ؕ قَدْ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ ؕ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا مِنْ رِّزْقِ اللّٰهِ وَلَا تَعْثَوْا فِى الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ﴿۶۰﴾

اور وہ (زمانہ یاد کرو) جب (حضرت) موسیٰ نے پانی کی دعا مانگی اپنی قوم کے واسطے اس پر ہم نے (موسیٰ کو) حکم دیا کہ اپنے عصا کو فلاں پتھر پر مارو پس فوراً اس سے پھوٹ نکلے بارہ چشمے (اور بارہ ہی خاندان تھے بنی اسرائیل کے۔ چنانچہ) معلوم کر لیا ہر ہر شخص نے اپنے پانی پینے کا موقعہ۔ کھاؤ اور (پینے کو) پیو اللہ تعالیٰ کے رزق سے حد اعتدال سے مت نکلو فساد فتنہ کرتے ہوئے سر زمین میں۔ ○

ایک اور انعام ☆

یہ ایک اور نعمت یاد دلائی جا رہی ہے کہ جب تمہارے نبی نے تمہارے لئے پانی طلب کیا تو ہم نے اس پتھر سے چشمے بہا دیئے' جو تمہارے ساتھ رہا کرتا تھا۔ تمہارے ہر ہر قبیلے کے لئے ایک چشمہ ہم نے اس میں جاری کرا دیا۔ جسے ہر قبیلے نے جان لیا اور ہم نے کہہ دیا کہ من وسلویٰ کھاتے رہو اور ان چشموں کا پانی پیتے رہو اور اس بے محنت کی روزی کھا پی کر ہماری عبادت میں لگے رہو۔ نافرمانی کر کے زمین میں فساد مت پھیلاؤ۔ ورنہ یہ نعمتیں چھن جائیں گی۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں۔ یہ ایک چوکوشہ پتھر تھا' جو ان کے ساتھ ہی رہتا تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بحکم خداوندی اس پر لکڑی ماری۔ چاروں طرف سے تین تین نہریں بہہ نکلیں۔ جب کوچ کرتے' اٹھا لیتے' نہریں بند ہو جاتیں اور پتھر کو ساتھ رکھ لیتے۔ یہ پتھر طور پہاڑ کا تھا' ایک ہاتھ لمبا اور ایک ہاتھ چوڑا تھا۔ بعض کہتے ہیں یہ جنتی پتھر تھا۔ دس دس ہاتھ لمبا چوڑا تھا۔ دو شاخیں تھیں' جو چمکتی رہتی تھیں۔ ایک اور قول میں ہے کہ یہ پتھر حضرت آدم علیہ السلام کے ساتھ جنت سے آیا تھا اور یونہی ہاتھوں ہاتھ پہنچتا ہوا حضرت شعیب علیہ السلام کو ملا تھا۔ انہوں نے لکڑی اور یہ پتھر دونوں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دیئے تھے۔ بعض کہتے ہیں یہ وہی پتھر ہے جس پر حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنے کپڑے رکھ کر نہا رہے تھے اور بحکم خدا یہ پتھر آپ کے کپڑے لے کر بھاگا تھا۔ اسے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بمشورہ حضرت جبریل علیہ السلام اٹھا لیا تھا۔ جس سے یہ معجزہ آپ کا ظاہر ہوا۔

زمخشری کہتے ہیں کہ حجر پر الف لام جنس کے لئے ہے عہد کے لئے نہیں۔ یعنی کسی ایک پتھر پر لکڑی مارو۔ یہ نہیں کہ فلاں پتھر پر ہی مارو۔ حضرت حسن سے بھی مروی ہے اور یہی معجزے کا کمال اور قدرت کا پورا اظہار ہے۔ آپ کی لکڑی لگتے ہی وہ بہنے لگتا اور پھر دوسری لکڑی لگتے ہی وہ خشک ہو جاتا۔ بنی اسرائیل آپس میں کہنے لگے کہ اگر یہ پتھر گم ہو گیا تو ہم پیاسے مرنے لگیں گے۔ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تم لکڑی نہ مارو۔ صرف زبانی کہو' تاکہ انہیں یقین آ جائے واللہ اعلم۔ ہر ایک قبیلہ اپنی اپنی نہر کو اس طرح جان لیتا کہ ہر قبیلہ کا ایک ایک

آدمی پتھر کے پاس کھڑا رہ جاتا اور لکڑی لگتے ہی اس میں سے چشمے جاری ہو جاتے۔ جس شخص کی طرف جو چشمہ جاتا وہ اپنے قبیلہ کو بلا کر کہہ دیتا کہ یہ تمہارا ہے۔ یہ واقعہ میدان تیہ کا ہے۔ سورہ اعراف میں بھی اس واقعہ کا بیان ہے لیکن چونکہ وہ سورت مکی ہے اس لئے وہاں ان کا بیان غائب کی ضمیر سے کیا گیا ہے اور اللہ تعالیٰ جو احسانات ان پر نازل فرماتے تھے وہ اپنے رسول کے سامنے دہرائے ہیں اور یہ سورت مدنی ہے اس لئے یہاں خود انہیں خطاب کیا گیا ہے۔ سورۂ اعراف میں فَانْبَجَسَتْ کہا اور یہاں فَانْفَجَرَتْ کہا۔ اس لئے کہ وہاں اوّل اوّل جاری ہونے کے معنی میں ہے اور یہاں آخری حال کا بیان ہے۔ واللہ اعلم اور ان دونوں جگہ کے بیان میں دس وجہ سے فرق ہے۔ جو فرق لفظی بھی ہے اور معنوی بھی۔ زمخشری نے ان سب وجوہ کو بیان کیا ہے اور حقیقت اس میں قریب ہے۔ واللہ اعلم۔

وَإِذْ قُلْتُمْ يٰمُوسٰى لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰى طَعَامٍ وَّاحِدٍ فَادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُخْرِجْ لَنَا مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ مِنْۢ بَقْلِهَا وَقِثَّآئِهَا وَفُوْمِهَا وَعَدَسِهَا وَبَصَلِهَا ؕ قَالَ اَتَسْتَبْدِلُوْنَ الَّذِىْ هُوَ اَدْنٰى بِالَّذِىْ هُوَ خَيْرٌ ؕ اِهْبِطُوْا مِصْرًا فَاِنَّ لَكُمْ مَّا سَاَلْتُمْ ؕ

اور جب تم لوگوں نے یوں کہا کہ اے موسیٰ (روز کے روز) ہم ایک ہی قسم کے کھانے کھانے پر کبھی نہ رہیں گے آپ ہمارے واسطے اپنے پروردگار سے دعا کریں کہ وہ ہمارے لئے ایسی چیزیں پیدا کرے جو زمین میں اُگا کرتی ہیں ساگ (ہوا) ککڑی (ہوئی) گیہوں (ہوا) مسور (ہوئی) پیاز (ہوئی) آپ نے فرمایا کیا تم عوض میں لینا چاہتے ہو ادنیٰ درجہ کی چیزوں کو ایسی چیز کے مقابلہ میں جو اعلیٰ درجے کی ہے۔ کسی شہر میں جا کر اُترو (وہاں) البتہ تم کو وہ چیزیں ملیں گی جن کی تم درخواست کرتے ہو۔ ○

جیسا کرنا ویسا بھرنا: ☆

یہاں بنی اسرائیل کی بے صبری اور نعمت خداوندی کی بے قدری بیان ہو رہی ہے کہ من و سلویٰ جیسے پاکیزہ طعام پر ان سے صبر نہ ہو سکا اور ردی چیزیں مانگنے لگے۔ ایک طعام سے مراد ایک قسم کا طعام ہے یعنی من و سلویٰ۔ فوم کے معنی میں اختلاف ہے۔ ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی قراءت میں ثوم ہے۔ مجاہد نے فوم کی تفسیر ثوم کے ساتھ کی ہے یعنی لہسن' حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے بھی یہ تفسیر مروی ہے۔ پچھلی لغت کی کتابوں میں فَوِّمُوْا لَنَا کے معنی اِخْتَبِزُوْا یعنی ہماری روٹی پکاؤ کے ہیں۔ امام ابن جریر فرماتے ہیں۔ اگر یہ صحیح ہو تو یہ حروف مبدلہ میں سے ہیں۔ جیسے: عَاثُوْرُ شَر' عَافُوْرُ شَر' اثافی' اثاثی' مَغَافِيْر' مَغَاثِيْر وغیرہ جن میں ف سے ث اور ث سے ف بدلا گیا ہے۔ کیونکہ یہ دونوں مخرج کے اعتبار سے بہت قریب ہیں۔ واللہ اعلم۔

اور لوگ کہتے ہیں فوم کے معنی گیہوں کے ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے بھی یہ تفسیر منقول ہے اور ایک شاعر کے شعر میں بھی فوم گیہوں کے معنی میں آیا ہے۔ بنی ہاشم کی زبان میں فوم گیہوں کے معنی میں مستعمل تھا۔ فوم کے معنی روٹی کے بھی ہیں۔ بعض نے سنبلہ کے معنی کئے ہیں۔ حضرت قتادہ اور حضرت عطاؒ فرماتے ہیں' جس اناج کی روٹی پکتی ہے اُسے فوم کہتے ہیں۔ بعض کہتے ہیں' فوم

ہر قسم کے اناج کو کہتے ہیں۔ حضرت موسٰی علیہ السلام نے اپنی قوم کو ڈانٹا کہ تم بہتر چیز کو رڈی کے بدلے کیوں طلب کرتے ہو۔ پھر فرمایا جاؤ شہر میں یہ سب چیزیں پاؤ گے۔ جمہور کی قراءت مِصْرًا ہی ہے اور تمام قرآنوں میں یہی لکھا ہے۔

ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے کہ شہروں میں سے کسی شہر میں چلے جاؤ۔ ابی بن کعبؓ اور ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مِصْرَ کی قراءت بھی ہے اور اس کی تفسیر مصر شہر سے کی گئی ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مِصْرًا سے بھی مراد مخصوص شہر مصر ہی لیا جائے اور یہ الف مصراً کا ایسا ہی ہے جیسے: ﴿قَوَارِيْرَا قَوَارِيْرَا﴾ (الدھر: ۱۵) میں ہے۔ مصر سے مراد عام شہر لینا ہی بہتر معلوم ہوتا ہے تو مطلب یہ ہوا کہ جو چیز تم طلب کرتے ہو یہ تو آسان چیز ہے۔ جس شہر میں جاؤ گے یہ تمام چیزیں پاؤ گے۔ میری دعا کی بھی کیا ضرورت ہے؟ کیونکہ ان کا یہ قول محض تکبر، سرکشی اور بڑائی کے طور پر تھا۔ اس لئے انہیں کوئی جواب نہیں دیا گیا۔ واللہ اعلم۔

وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ۗ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ الْحَقِّ ۗ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ﴿٦١﴾ ع

اور جم گئی ان پر ذلت اور پستی (کہ دوسروں کی نگاہ میں قدر اور خود ان میں اولوالعزمی نہ رہی) اور مستحق ہو گئے غضب الٰہی کے اوّل یہ اس وجہ سے ہوا کہ وہ لوگ منکر ہو جاتے تھے احکام الٰہیہ کے اور قتل کر دیا کرتے تھے پیغمبروں کو ناحق (نیز) یہ اس وجہ سے (ہوا) کہ ان لوگوں نے اطاعت نہ کی اور دائرہ (اطاعت) سے نکل نکل جاتے تھے۔ O

مطلب یہ ہے کہ ذلت اور مسکینی ان پر مسلط کر دی گئی۔ اہانت و پستی ان پر ڈال دی گئی۔ جزیہ ان سے وصول کیا گیا۔ مسلمانوں کے قدموں تلے انہیں ڈالا گیا۔ فاقہ کشی اور بھیک کی نوبت پہنچی۔ خدا کا غضب و غصہ ان پر اُترا۔ بَآءُوْا کے معنی لوٹے اور رجوع کیا کے ہیں۔ بَآءَ کبھی بھلائی کے صلہ کے ساتھ اور کبھی برائی کے صلہ کے ساتھ آتا ہے۔ یہاں برائی کے ساتھ ہے۔ یہ تمام عذاب ان کے تکبر، عناد، حق کی قبولیت سے انکار، اللہ کی آیتوں سے کفر اور انبیاء اور ان کے تابعداروں کی اہانت اور ان کے قتل کی بناء پر تھا اس سے زیادہ بڑا کفر اور کونسا ہو گا کہ اللہ تعالیٰ کی آیتوں سے کفر کرتے ہیں اور اس کے نبیوں کو بلاوجہ قتل کرتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں۔ تکبر کے معنی حق کو چھپانے اور لوگوں کو ذلیل سمجھنے کے ہیں۔ مالک بن مرارہ رہاویؓ ایک روز خدمتِ رسولؐ میں عرض کرتے ہیں کہ یا رسول ﷺ اللہ! میں خوبصورت آدمی ہوں۔ میرا دل نہیں چاہتا کہ کسی کی جوتی کا تسمہ بھی خوبصورت ہو تو کیا یہ تکبر اور سرکشی ہے؟ آپ نے فرمایا' نہیں بلکہ تکبر و سرکشی حق کو رد کرنا اور لوگوں کو حقیر سمجھنا ہے۔ چونکہ بنی اسرائیل کا تکبر کفر و قتل انبیاء تک پہنچ گیا تھا۔ اسی لئے خدا کا غضب ان پر لازم ہو گیا دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ بنی اسرائیل ایک ایک دن میں تین تین سو نبیوں کو قتل کر ڈالتے تھے۔ پھر بازاروں میں جا کر اپنے لین دین میں لگتے تھے۔ (ابوداؤد طیالسی) رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں۔ سب سے زیادہ سخت عذاب قیامت کے دن اس شخص کو ہو گا' جسے نبی نے قتل کیا ہو یا اس نے کسی نبی کو مار ڈالا ہو اور گمراہی کا امام اور تصویریں بنانے والا مصور۔ یہ بدلہ تھا ان کی نافرمانی اور ظلم و زیادتی کا۔ یہ دوسرا سبب ہے کہ ان کو منع کئے ہوئے کاموں کو کرتے تھے اور حد سے بڑھ جاتے تھے۔ واللہ اعلم۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالنَّصٰرٰى وَالصّٰبِـِٕيْنَ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۶۲﴾

یہ تحقیقی بات ہے کہ مسلمان اور یہودی اور نصاریٰ اور فرقہ صابئیں (ان سب میں) جو شخص یقین رکھتا ہو اللہ تعالیٰ (کی ذات اور صفات) پر اور روز قیامت پر اور کارگزاری اچھی کرے ایسوں کے لئے ان کا حق الخدمت بھی ہے ان کے پروردگار کے پاس اور (وہاں جاکر) کسی طرح کا اندیشہ بھی نہیں ان پر اور نہ وہ مغموم ہوں گے۔ ○

جزائے نیکوکاراں ☆

اوپر چونکہ نافرمانیوں کے عذاب کا ذکر تھا تو یہاں ان میں جو لوگ نیک تھے ان کے ثواب کا بیان ہو رہا ہے۔ نبی کی تابعداری کرنے والوں کے لئے یہ بشارت تاقیامت ہے کہ وہ آئندہ کے خوف سے نڈر اور چھوڑی ہوئی چیزوں پر حسرت سے پاک ہیں اور جگہ ہے: ﴿اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ﴾ (یونس:۶۲) یعنی اللہ کے دوستوں پر کوئی خوف و غم نہیں اور وہ فرشتے جو مسلمانوں کی روح نکلنے کے وقت آتے ہیں یہی کہتے ہیں کہ: ﴿ تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ﴾ نہیں، تم اداس نہ ہو تمہیں اس جنت کی خوشخبری دیتے ہیں۔ جس کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا۔ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہونے سے پہلے جن دینداروں سے ملا تھا ان کی عبادت اور نماز روزے وغیرہ کا ذکر کیا تو یہ آیت اُتری۔ (ابن ابی حاتم) ایک اور روایت میں ہے کہ سلمان نے ان کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ وہ نمازی اور روزہ دار ایماندار اس بات کے معتقد تھے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہونے والے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ وہ جہنمی ہیں۔ حضرت سلمان کو اس سے بڑا رنج ہوا۔ وہیں آیت نازل ہوئی لیکن یہ واضح رہے کہ یہودیوں میں سے ایماندار وہ ہے جو تورات کو مانتا ہو اور سنت موسیٰ علیہ السلام کا عامل ہو لیکن جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام آ جائیں تو ان کی تابعداری کرے اور ان کی نبوت کو برحق سمجھے۔ اگر اب بھی وہ تورات اور سنت موسیٰ علیہ السلام کا انکار کیا اور تابعداری نہ کی تو پھر بے دین ہو جائے گا۔

اسی طرح نصرانیوں میں سے ایماندار وہ ہے جو انجیل کو کلام اللہ مانے۔ شریعت عیسوی پر عمل کرے اور اور اگر اپنے زمانے میں پیغمبر آخر الزماں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو پالے اور آپ ﷺ کی تابعداری اور آپ کی تصدیق کرے۔ اگر اب بھی اس نے انجیل کو اور اتباع عیسوی کو نہ چھوڑا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں کے پیچھے نہ لگ گیا تو ہلاک ہوگا۔ (ابن ابی حاتم) سدی نے یہی روایت کی ہے اور سعید بن جبیر بھی یہی فرماتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ہر نبی کا تابعدار اس کا ماننے والا ایماندار اور صالح ہے اور خدا کے ہاں نجات پانے والا لیکن جب دوسرا نبی آیا اور اس سے انکار کر گیا تو کافر ہو جائے گا۔ قرآن کی ایک تو یہ آیت جو آپ کے سامنے ہے اور دوسری وہ آیت جس میں بیان ہے: ﴿وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ﴾ (آل عمران:۸۵) یعنی جو شخص اسلام کے سوا اور دین ڈھونڈے اس سے قبول نہ کیا جائے گا۔ آخرت میں وہ نقصان اُٹھانے والا ہوگا۔ ان دونوں آیتوں میں یہی تطبیق ہے۔ کسی شخص کا کوئی عمل، کوئی طریق مقبول نہیں۔ تاوقتیکہ وہ شریعت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق نہ ہو مگر یہ اس وقت ہے جب کہ

آپ ﷺ مبعوث ہو کر دنیا میں آ گئے۔ آپ سے پہلے جس نبی کا جو زمانہ تھا اور جو لوگ اس زمانہ میں تھے۔ ان کے لئے ان کے زمانہ کے نبی کی تابعداری اور اس کی شریعت کی متابعت شرط ہے۔

یہود کی تاریخ ☆ لفظ یہود ہوادۃ سے ماخوذ ہے جس کے معنی مودّت اور دوستی کے ہیں یا ھود سے جس کے معنی توبہ ہیں۔ جیسے قرآن میں ہے: ﴿اِنَّا هُدْنَآ اِلَيْكَ﴾ (الاعراف۔ ۱۵۶) حضرت موسیٰ علیہ السلام فرماتے ہیں۔ ہم اے اللہ تیری طرف توبہ کرتے ہیں۔ پس انہیں ان دونوں وجوہ سے یہود کہا گیا ہے۔ توبہ کی وجہ سے اور آپ کی دوستی کی وجہ سے اور بعض کہتے ہیں' یہ یہودا کی اولاد میں سے تھے۔ اس لئے انہیں یہود کہا گیا ہے۔ یہودا حضرت یعقوب علیہ السلام کے بڑے لڑکے کا نام تھا۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ یہ تورات پڑھتے وقت ہلتے تھے۔ اس بنا پر انہیں یہود (یعنی حرکت کرنے والا) کہا گیا ہے۔

نصاریٰ کون ہیں؟ ☆ جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت کا زمانہ آیا تو بنی اسرائیل پر آپ کی نبوت کی تصدیق اور آپ کے فرمان کی اتباع واجب ہوئی اور ان کا نام نصاریٰ ہوا کیونکہ انہوں نے آپس میں ایک دوسرے کی نصرت یعنی تائید اور مدد کی تھی۔ انہیں انصار بھی کہا گیا ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا قول ہے: ﴿مَنْ اَنْصَارِىٓ اِلَى اللّٰهِ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ﴾ (آل عمران ۵۲) یعنی اللہ کے دین میں میرا مددگار کون ہے؟ حواریوں نے کہا کہ ہم ہیں۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ لوگ جہاں اُترے تھے۔ اس زمین کا نام ناصرہ تھا۔ اس لئے نصاریٰ کہا گیا۔ قتادہؒ اور ابن جریج کا یہی قول ہے۔ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے یہی مروی ہے واللہ اعلم۔ نصاریٰ نصران کی جمع ہے۔ جیسے نشوان کی جمع نشاویٰ اور سکران کی جمع سکاریٰ۔ اسکا مؤنث نصرانۃ آتا ہے۔ اب جبکہ خاتم النبیین ﷺ کا زمانہ آیا اور آپ ﷺ تمام دنیا کی طرف رسول و نبی بنا کر بھیجے گئے تو ان پر اور سب پر آپ کی تصدیق و اتباع واجب ہوئی اور آپ کی اُمت کا نام مؤمن رکھا گیا۔ انکے ایمان و یقین کی پختگی کی وجہ سے اور اسلئے بھی کہ اسکا ایمان تمام اگلے انبیا پر بھی ہے اور تمام آنے والی باتوں پر بھی۔

فرقہ صابیہ ☆ صابی کے معنی ایک تو بے دین اور لامذہب کے گئے ہیں اور اہل کتاب کے ایک فرقہ کا نام بھی یہ تھا جو زبور پڑھا کرتے تھے۔ اسی بناء پر امام ابو حنیفہؒ اور اسحٰق کا مذہب ہے کہ ان کے ہاتھ کا ذبیحہ ہمارے لئے حلال ہے اور ان کی عورتوں سے نکاح کرنا بھی۔ حضرت حسنؒ اور حضرت حکمؒ فرماتے ہیں۔ یہ گروہ مانند مجوسیوں کے ہے۔ یہ بھی مروی ہے کہ یہ لوگ فرشتوں کے پجاری تھے۔ زیاد نے جب یہ سنا کہ یہ لوگ پانچ وقت کی نماز قبلہ کی طرف پڑھا کرتے ہیں تو ارادہ کیا کہ ان کا جزیہ معاف کر دے لیکن ساتھ ہی معلوم ہوا کہ وہ مشرک ہیں تو اپنے ارادہ سے باز رہا۔ ابو الزناد فرماتے ہیں۔ یہ لوگ عراقی ہیں۔ بکوثی کے رہنے والے سب نبیوں کو مانتے ہیں۔ ہر سال میں تیس روزے رکھتے ہیں اور یمن کی وقت منہ کر کے ہر دن میں پانچ نمازیں پڑھتے ہیں۔ وہب بن منبہؒ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو یہ لوگ جانتے ہیں لیکن کسی شریعت کے پابند نہیں اور کفار بھی نہیں۔ عبدالرحمٰن بن زید کا قول ہے کہ یہ بھی ایک مذہب ہے۔ جزیرۂ موصل میں یہ لوگ تھے۔ لا الٰہ الا اللہ پڑھتے تھے اور کسی کتاب یا نبی کو نہیں مانتے تھے اور نہ کوئی خاص شرع کے عامل تھے۔ مشرکین اسی بناء پر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ ﷺ کے صحابہ کو صابی کہتے تھے۔ لا الٰہ الا اللہ کہنے کی بنا پر ان کا دین نصرانیوں سے ملتا جلتا تھا۔ ان کا قبلہ جنوب کی طرف تھا۔ یہ لوگ اپنے تئیں حضرت نوحؑ کے دین پر بتاتے تھے۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ یہود و مجوسی کے دین کا خلط ملط یہ مذہب تھا۔ ان کا ذبیحہ کھانا اور ان کی عورتوں سے نکاح کرنا ممنوع ہے۔ مجاہدؒ حسن اور ابن ابی نجیح کا یہی فتویٰ ہے۔ قرطبی فرماتے ہیں۔ مجھے جہاں تک معلوم ہوا ہے یہ لوگ موحد تھے۔ لیکن تاروں کی تاثیر اور نجوم کے معتقد تھے۔ ابو سعید اصطخری نے ان پر کفر کا فتویٰ دیا ہے۔ رازی فرماتے ہیں یہ ستارہ پرست لوگ تھے۔ کشرانیین میں سے تھے۔ جن کی جانب حضرت ابراہیم علیہ السلام بھیجے گئے تھے۔ حقیقت حال کا علم تو محض

اللہ تعالیٰ کو ہے مگر بظاہر یہی قول ٹھیک معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ نہ یہودی تھے نہ نصرانی نہ مجوسی نہ مشرک۔ بلکہ یہ لوگ فطرت پر تھے۔ کسی مذہب کے پابند نہ تھے اور اسی معنی کو مشرکین' اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو صابی کہا کرتے تھے۔ یعنی ان لوگوں نے تمام مذہب ترک کر دیئے۔ بعض علماء کا قول ہے کہ صابی وہ ہیں جنہیں کسی نبی کی دعوت نہیں پہنچی۔ واللہ اعلم۔

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ ؕ خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاذْكُرُوْا مَا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۶۳﴾ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ ۚ فَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ لَكُنْتُمْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۶۴﴾

اور جب ہم نے تم سے قول وقرار لیا کہ تورات پر عمل کریں گے اور ہم نے طور پہاڑ کو اٹھا کر تمہارے اوپر (محاذات میں) معلق کر دیا کہ جلدی قبول کرو جو کہ ہم نے کتاب تم کو دی ہے مضبوطی کے ساتھ اور یاد رکھو جو احکام الٰہی اس میں ہیں جس سے توقع ہے کہ تم متقی بن جاؤ پھر تم اس قول وقرار کے بعد بھی اس سے پھر گئے۔ سو اگر تم لوگوں پر اللہ تعالیٰ کا فضل اور رحم نہ ہوتا تو ضرور تم (فوراً) تباہ اور ہلاک ہو جاتے۔ ○

یاددہانی ☆

ان آیتوں میں اللہ تعالیٰ بنی اسرائیل کو ان کے عہد و پیمان یاد دلا رہا ہے کہ اپنی عبادت اور اپنے نبی کی اطاعت کا وعدہ میں تم سے لے چکا ہوں اور اس وعدہ کو پورا کرانے اور ماننے کے لئے میں نے طور پہاڑ کو تمہارے سروں پر لا کھڑا کر دیا تھا جیسے اور جگہ ہے: ﴿وَاِذْ نَتَقْنَا الْجَبَلَ فَوْقَهُمْ﴾ (الاعراف:۱۷۱) جب ہم نے ان کے سروں پر سائبان کی طرح پہاڑ لا کر کھڑا کیا اور یہ یقین کر چکے کہ اب وہ گرا اور انہیں کچل ڈالے گا۔ اس وقت ہم نے کہا' ہماری دی ہوئی چیز کو مضبوط تھام لو اور اس میں جو کچھ ہے اسے یاد کرو تو بچ جاؤ گے۔ طور سے مراد پہاڑ ہے۔ جیسے سورۂ اعراف کی آیت میں ہے اور جیسے صحابہ اور تابعین نے اس کی تفسیر کی ہے اور یہی ظاہر ہے۔ طور اس پہاڑ کو کہتے ہیں جس پر روئیدگی ہوتی ہے۔ حدیث فتون میں بروایت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما مروی ہے کہ جب انہوں نے اطاعت سے انکار کر دیا۔ اس وقت یہ پہاڑ ان کے سروں پر لا کھڑا کیا کہ اب تو سنیں' سدی کہتے ہیں ان کے سجدے سے انکار کے باعث ان کے سر پر پہاڑ آ گیا لیکن اسی وقت یہ سب سجدے میں گر پڑے اور مارے ڈر کے کنکھیوں سے اوپر کو دیکھتے رہے۔ خدا تعالیٰ نے ان پر رحم فرمایا اور پہاڑ ہٹا لیا۔ اسی وجہ سے وہ اسی سجدے کو پسند کرتے ہیں کہ آدھا دھڑ سجدے میں ہو اور دوسری طرف سے اونچے دیکھ رہے ہوں۔ جو ہم نے دیا اس سے مراد تورات ہے۔ قوت سے مراد طاقت ہے۔ یعنی تورات پر مضبوطی سے جم کر عمل کرنے کا وعدہ کرو۔ ورنہ پہاڑ تم پر گرا دیا جائے گا اور اس میں جو ہے اسے یاد کرو۔ یعنی تورات پڑھتے پڑھاتے رہو لیکن ان لوگوں نے اتنے پختہ میثاق' اتنے اعلیٰ عہد اور اس قدر زبردست وعدے کی بھی پروانہ کی اور عہد شکنی کی۔ اب اگر اللہ تعالیٰ کی کرم فرمائی اور رحمت نہ ہوتی' اگر وہ توبہ قبول نہ فرماتا اور نبیوں کے سلسلہ کو جاری نہ رکھتا تو یقیناً تمہیں زبردست نقصان پہنچتا۔ اس وعدے کو توڑنے کی بنا پر دنیا اور آخرت میں تم برباد ہو جاتے۔

وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِيْنَ اعْتَدَوْا مِنْكُمْ فِى السَّبْتِ فَقُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً

خٰسِئِيْنَ ﴿٦٥﴾ فَجَعَلْنٰهَا نَكَالًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهَا وَمَا خَلْفَهَا وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿٦٦﴾

اورتم جانتے ہی ہو ان لوگوں کا حال جنہوں نے تم میں سے (شرح سے) تجاوز کیا تھا دوبارہ (اس حکم کے جو) یوم ہفتہ کے متعلق تھا سو ہم نے ان کو کہہ دیا کہ تم بندر ذلیل بن جاؤ پھر ہم نے اس کو ایک (واقعہ) عبرت (انگیز) بنا دیا ان لوگوں کے لئے بھی جو اس قوم کے معاصر تھے اور ان لوگوں کے لئے بھی جو مابعد زمانے میں آتے رہے اور موجب نصیحت (بنایا خدا سے) ڈرنے والوں کے لئے۔O

مسخ کا واقعہ☆

اِس واقعہ کا بیان بسط کے ساتھ سورۂ اعراف میں ہے۔ جہاں فرمایا: ﴿وَسْئَلْهُمْ عَنِ الْقَرْيَةِ الَّتِيْ..... ﴾ (الاعراف ١٦٦) وہیں اس کی پوری تفسیر بھی بیان ہوگی ان شاء اللہ تعالیٰ۔ یہ ایلہ بستی کے باشندے تھے۔ ان پر ہفتہ کے دن کی تعظیم ضروری کی گئی تھی۔ اس دن کا شکار منع کیا گیا تھا اور حکم باری تعالیٰ سے مچھلیاں اسی دن بکثرت آیا کرتی تھیں تو انہوں نے حیلہ کیا' گڑھے کھود لئے۔ رسیاں اور کانٹے ڈال دیئے' ہفتہ والے دن وہ آ گئیں۔ یہاں پھنس گئیں' اتوار کی رات کو جا کر پکڑ لیا۔ اس جرم پر خدا نے ان کی شکلیں بدل دیں۔ حضرت مجاہد فرماتے ہیں صورتیں نہیں بدلی تھیں بلکہ دل مسخ ہو گئے تھے۔ یہ صرف بطور مثال کے ہیں۔ جیسے عمل نہ کرنے والے علما گدھوں سے مثال دی گئی ہے لیکن یہ قول غریب ہے اور عبارت قرآن کے ظاہر الفاظ کے بھی خلاف ہے۔ اس آیت پر پھر سورہ اعراف کی آیت: ﴿وَسْئَلْهُمْ..... ﴾ اور ﴿وَجَعَلَ مِنْهُمُ الْقِرَدَةَ..... ﴾ (المائدۃ: ٦٠) پر نظر ڈالو۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ جہاں لوگ بندر بن گئے اور بوڑھے سور ہو گئے۔ حضرت قتادہؒ فرماتے ہیں' یہ تمام مرد و عورت دُم والے بندر ہو گئے تھے۔ آسمانی آواز آئی کہ تم سب بندر بن جاؤ۔ چنانچہ سب کے سب بندر بن گئے۔ جو لوگ انہیں مکر و حیلہ سے روکتے تھے وہاں آئے کہنے لگے' دیکھو ہم پہلے ہی سے تمہیں منع کرتے نہیں تھے؟ تو وہ سر ہلاتے تھے' یعنی ہاں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں تھوڑی مدت میں وہ سب ہلاک ہو گئے اور ان کی نسل نہیں چلی۔ تین دن سے زیادہ کوئی مسخ شدہ قوم زندہ نہیں رہتی۔ یہ سب بھی تین دن میں ہی یوں ہی ناک رگڑتے رگڑتے مر گئے۔ کھانا پینا اور نسل سب منقطع ہو گئی۔ یہ بندر جو اب ہیں اور جو اس وقت بھی تھے۔ یہ تو جانور ہیں۔ جو اسی طرح پیدا کئے گئے تھے۔ اللہ تعالیٰ جو چاہے اور جس طرح چاہے پیدا کرتا ہے اور جسے جس طرح کا چاہے بنا دیتا ہے (اللہ تعالیٰ اپنے غضب و غصہ سے اور اپنی پکڑ دھکڑ سے اور اپنے دنیوی و اخروی عذابوں سے نجات دے۔ آمین۔ خَاسِئِيْنَ کے معنی ذلیل اور کمینہ۔

واقعہ کی تفصیلات ☆ ان کا واقعہ تفصیل کے ساتھ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما وغیرہ نے جو بیان کیا ہے۔ وہ بھی سن لیجئے۔ ان پر جمعہ کی عزت و ادب کو فرض کیا گیا لیکن انہوں نے جمعہ کے دن کو پسند نہ کیا اور ہفتہ کا دن رکھا۔ اس دن کی عزت کے طور پر ان کا شکار کھیلنا وغیرہ اس دن حرام کر دیا گیا۔ اِدھر خدا کی آزمائش کی بنا پر ہفتہ والے دن تمام مچھلیاں اُوپر آ جایا کرتی تھیں اور کودتی اُچھلتی رہتی تھیں اور دنوں میں کوئی نظر بھی نہیں آتی تھیں۔ ایک مدت تک تو یہ لوگ خاموش رہے اور شکار کرنے سے رکے رہے۔ ازاں بعد اُن میں سے ایک شخص نے یہ حیلہ نکالا کہ ہفتہ والے دن مچھلی کو پکڑ لیا اور پھندے میں پھنسا کر ڈوری کو کنارے پر کسی چیز سے باندھ دیا۔ اتوار والے دن جا کر نکال لائے اور پکا کر کھائی۔ لوگوں نے خوشبو پا کر پوچھا تو اس نے کہا میں نے تو آج اتوار کو شکار کیا ہے۔ آخر یہ راز کھلا تو اور لوگوں نے

بھی اس حیلہ کو پسند کیا اور اس طرح وہ سب مچھلیوں کا شکار کرنے لگے۔ پھر تو بعضوں نے دریا کے اردگرد گڑھے کھود لئے۔ ہفتہ والے دن جب مچھلیاں اس میں آ جاتیں تو اسے بند کر دیتے اور اتوار کو پکڑ کر لاتے۔ کچھ لوگ جو ان میں نیک دل اور سچے مسلمان تھے۔ وہ انہیں روکتے اور منع کرتے رہے لیکن ان کا جواب یہی ہوتا تھا کہ ہم تو ہفتہ کو شکار ہی نہیں کھیلتے' ہم تو اتوار والے دن پکڑتے ہیں۔ ان کا شکار کھیلنے والوں اور منع کرنے والوں کے سوا ایک گروہ ان میں اور پیدا ہو گیا' جو مصلحت وقت برتنے والے اور دونوں فرقوں کو راضی رکھنے والے تھے کہ وہ نہ تو ان کا پورا ساتھ دیتے تھے نہ ان کا شکار کھیلتے تھے۔ نہ شکاریوں کو روکتے تھے بلکہ روکنے والوں سے کہتے تھے کہ اس قوم کو کیوں وعظ و نصیحت کرتے ہو۔ جنہیں خدا ہلاک کرے گا یا سخت عذاب کرے گا اور تم اپنا فرض بھی ادا کر چکے تھے۔ انہیں منع کر چکے۔ جب نہیں مانتے تو اب انہیں چھوڑ دو۔ یہ جواب دیتے کہ ایک تو خدا کے ہاں ہم معذور ہو جائیں اس لئے اور دوسرے اس لئے بھی کہ شاید آج نہیں تو کل اور کل نہیں تو پرسوں یہ مان جائیں اور عذاب خدا سے نجات پائیں۔

بالآخر اس مسلم جماعت نے اس حیلہ جو فرقہ کا بالکل بائیکاٹ کر دیا اور ان سے بالکل الگ ہو گئے۔ بستی کے درمیان ایک دیوار کھینچ لی اور ایک دروازہ اپنے آنے جانے کا رکھا اور ایک دروازہ ان حیلہ جو نافرمانوں کے لئے۔ اس پر بھی ایک مدت اس طرح گزر گئی۔ ایک دن صبح مسلمان جاگے' دن چڑھ گیا لیکن اب تک ان لوگوں نے اپنا دروازہ نہیں کھولا تھا اور نہ ان کی آوازیں آ رہی تھیں۔ یہ لوگ متحیر تھے کہ آج کی بات ہے؟ آخر جب زیادہ دیر لگ گئی تو ان لوگوں نے دیوار پر چڑھ کر دیکھا تو وہاں عجب منظر آیا' دیکھا وہ تمام لوگ مع عورتوں بچوں کے بندر بن گئے ہیں۔ ان کے گھر جو راتوں کو بند تھے اسی طرح بند ہیں اور اندر وہ کل انسان بندر کی صورتوں میں ہیں۔ جن کی دُمیں نکلی ہوئی ہیں۔ بچے چھوٹے بندروں کی شکل میں' مرد بڑے بندروں کی صورت میں' عورتیں بندریاں بنی ہوئی ہیں اور ہر ایک پہچانا جاتا ہے کہ یہ فلاں مرد ہے' یہ فلاں عورت ہے' یہ فلاں بچہ ہے وغیرہ۔ یہ بھی یاد رہے کہ جب یہ عذاب آیا تو نہ صرف وہی ہلاک ہوئے جو شکار کھیلتے تھے بلکہ ان کے ساتھ وہ بھی ہلاک ہوئے جو انہیں منع نہ کرتے تھے اور خاموش بیٹھے ہوئے تھے۔ میل جول ترک نہ کیا تھا۔ اس عذاب سے صرف وہ محفوظ رہے جو انہیں منع کرتے رہے اور ان سے الگ تھلگ ہو گئے تھے۔ یہ تمام اقوال اور قرآن کریم کی کئی ایک آیتیں وغیرہ شاہد ہیں کہ صحیح بات یہی ہے کہ ان کی صورتیں بدل دی گئی تھیں۔ سچ مچ بندر بنا دیئے گئے نہ یہ کہ مصنوعی مسخ تھا۔ یعنی ان کے دِل بندروں جیسے ہو گئے جیسے مجاہد کا قول ہے۔ ٹھیک تفسیر یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں بندر اور سؤر بنا دیا تھا اور ظاہری صورتیں بھی ان کی جانوروں جیسی ہو گئیں۔ واللہ اعلم۔

فَجَعَلْنَا هَا میں هَا کی ضمیر کا مرجع قِرَدَة ہے یعنی ہم نے بندروں کو سبب عبرت بنایا۔ یا ان کا مرجع حیتان ہے۔ یعنی ان مچھلیوں کو یا ان کا مرجع عقُوْبَةً ہے یعنی اس سزا کو اور یہ بھی کہا گیا ہے اس کا مرجع قَرْيَةً ہے۔ یعنی اس بستی کو ہم نے اگلے پچھلوں کے لئے عبرتناک امر بنایا اور صحیح بات یہی معلوم ہوتی ہے کہ قریہ مراد ہے اور قریہ سے مراد اہل قریہ ہیں۔

نَكَالٌ کہتے ہیں عذاب و سزا کو جیسے اور جگہ ہے: ﴿فَأَخَذَهُ اللَّهُ نَكَالَ الْآخِرَةِ وَالْأُولَىٰ﴾ (النازعات: ۲۵) اس کو عبرت کا سبب بنایا آگے پیچھے والی بستیوں کے لئے جیسے اور جگہ ہے: ﴿وَلَقَدْ أَهْلَكْنَا مَا حَوْلَكُم مِّنَ الْقُرَىٰ وَصَرَّفْنَا الْآيَاتِ ...... ﴾ (الاحقاف: ۲۷) ہم نے تمہاری آس پاس کی بستیوں کو ہلاک کیا اور اپنی نشانیاں بیان فرمائیں۔ تاکہ وہ لوگ لوٹ آئیں اور ارشاد ہے: ﴿أَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّا نَأْتِي الْأَرْضَ ﴾ (الرعد: ۴۱) اور یہ بھی مطلب بیان کیا گیا ہے کہ اس وقت کے موجودہ لوگوں کے لئے اور بعد میں آنے والوں کے لئے یہ عبرتناک واقعہ دلیل راہ بن جائے۔

گو بعض لوگوں نے یہ بھی کہا ہے کہ اگلوں پچھلوں کے لئے یہ ایک سبق ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ گزرے ہوئے اگلے لوگوں کے لئے یہ واقعہ گو کتنا ہی زبردست عبرتناک ہو دلیل نہیں بن سکتا۔ اس لئے کہ وہ تو گزر چکے۔ تو ٹھیک قول یہی ہے کہ یہاں مراد مکان اور جگہ ہے۔ آس پاس کی بستیاں اور یہی تفسیر ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما اور حضرت سعید بن جبیرؒ کی۔ واللہ عالم۔

اور یہ بھی معنی بیان کئے گئے ہیں۔ ان کے اگلے گناہ اور ان کے بعد آنے والے لوگوں کے ایسے ہی گناہوں کے لئے ہم نے اس سزا کو عبرت کا سبب بنایا لیکن صحیح قول وہی ہے جس کی صحت ہم نے بیان کی۔ یعنی آس پاس کی بستیاں۔ قرآن فرماتا ہے: ﴿وَلَقَدْ اَهْلَكْنَا مَا حَوْلَكُمْ ...﴾ (الاحقاف: ۲۷) اور فرمان ہے: ﴿وَلَا يَزَالُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا﴾ (الرعد: ۳۱) اور فرمان ہے: ﴿اَفَلَا يَرَوْنَ اَنَّا نَاْتِي الْاَرْضَ ...﴾ (الانبیاء: ۴۴) غرض یہ عذاب ان کے آنے والوں کے لئے اور بعد میں آنے والوں کے لئے ایک سبق ہے اور اسی لئے فرمایا: ﴿وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ﴾ یعنی اس میں بعد آنے والوں کے لئے نصیحت اور موعظت کا سرمایہ ہے۔ یہاں تک کہ امت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے بھی۔ یہ لوگ ڈرتے ہیں کہ عذاب وسزا ان پر ان کے حیلوں کی وجہ سے اور ان کے مکروفریب سے حرام وحلال کر لینے کے باعث نازل ہوئی۔ اب جو ایسا کرے گا' ایسا نہ ہو کہ وہی عذاب اور وہی سزا ان پر بھی آجائے۔ ایک صحیح حدیث ابوعبداللہ بن بطہ نے نقل کی ہے کہ رسول خدا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: ((لَا تَرْتَكِبُوْا مَا ارْتَكَبَتِ الْيَهُوْدُ فَتَسْتَحِلُّوا مَحَارِمَ اللّٰهِ بِاَدْنَى الْحِيَلِ.)) یعنی تم وہ نہ کرو جو یہودیوں نے کیا۔ حیلے سے اللہ کے حرام کو حلال نہ کر لیا کرو۔ یعنی شرعی احکام میں حیلہ جوئی سے بچو۔ یہ حدیث بالکل صحیح ہے اور اس کے سب راوی ثقہ ہیں واللہ عالم۔

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖٓ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَةً ؕ قَالُوْٓا اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا ؕ قَالَ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ﴿۶۷﴾

اور (وہ زمانہ یاد کرو) جب موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے فرمایا کہ حق تعالیٰ تم کو حکم دیتے ہیں کہ تم ایک بیل ذبح کرو وہ لوگ کہنے لگے کیا آپ ہم کو مسخرا بناتے ہیں۔ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا نعوذ باللہ جو ایسی جہالت والوں کا سا کام کروں۔ {بیان}

بنی اسرائیل کی حیلہ جوئی کی ایک اور داستان ☆

اس کا پورا واقعہ یہ ہے کہ بنی اسرائیل میں ایک شخص بہت بڑا مالدار اور تونگر تھا۔ اس کی کوئی نرینہ اولاد نہ تھی۔ صرف ایک لڑکی تھی اور ایک بھتیجا تھا۔ بھتیجے نے جب دیکھا کہ بڈھا مرتا ہی نہیں تو ورثہ کی دھن میں اُسے کیوں نہ مار ڈالوں۔ تاکہ اس کی لڑکی سے نکاح بھی کر لوں اور قتل کی تہمت دوسروں پر رکھ کر دیت بھی وصول کر لوں اور مقتول کے مال کا مالک بھی بن جاؤں۔ یہ شیطانی خیال اس کے دل میں خوب جم گیا اور ایک دن موقع پا کر اپنے چچا کو قتل کر ڈالا۔ بنی اسرائیل کے بھلے لوگ ان کے جھگڑوں بکھیڑوں سے تنگ آ کر یکسو ہو کر ان سے الگ ایک اور شہر میں رہتے تھے۔ شام کو اپنے قلعہ کا دروازہ بند کر لیتے تھے اور صبح کو کھولتے تھے۔ کسی مجرم کو اپنے ہاں گھسنے بھی نہیں دیتے تھے۔ اس بھتیجے نے اپنے اس چچا کی لاش کو لے جا کر اس قلعہ کے سامنے ڈال دیا اور یہاں آ کر اپنے چچا کو ڈھونڈنے لگا۔ پھر دہائی مچا دی کہ میرے چچا کو کسی نے مار ڈالا اور ان قلعہ والوں پر تہمت لگائی۔ ان سے دیت کا روپیہ طلب کرنے لگا۔ انہوں نے اس قتل سے اور اس کے علم سے بالکل انکار کیا لیکن یہ سر ہو گیا۔ یہاں تک کہ اپنے ساتھیوں کو لے کر ان سے لڑائی کرنے پر تل گیا۔ یہ لوگ عاجز آ کر

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس آئے اور واقعہ عرض کیا کہ یا رسول اللہ یہ شخص ہم پر خواہ مخواہ ایک قتل کی تہمت لگا رہا ہے۔ حالانکہ ہم بری الذمہ ہیں۔ موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی۔ وہاں سے وحی نازل ہوئی کہ ایک گائے ذبح کرلو۔ انہوں نے کہا کہ اے اللہ کے نبی! کہاں قاتل کی تحقیق اور کہاں آپ کی گائے کا ذبیحہ کا حکم؟ کیا آپ ہم سے مذاق کرتے ہیں؟ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا' اعوذ باللہ (مسائل شرعیہ کے موقعہ پر) مذاق جاہلوں کا کام ہے۔ اللہ عزوجل کا یہی حکم ہے۔ اب اگر یہ لوگ جا کر کسی گائے کو ذبح کر دیتے تو کافی تھا لیکن انہوں نے سوالات کا دروازہ کھولا اور کہا وہ گائے کیسی ہونی چاہئے؟ اس پر حکم ہوا کہ وہ نہ بہت بڑھیا ہے نہ بچہ ہے۔ جوان عمر کی ہے۔ انہوں نے کہا' حضرت ایسی گائیں تو بہت ہیں' یہ بیان فرمائیے کہ اس کا رنگ کیا ہے؟ وحی ہوئی کہ اس کا رنگ بالکل صاف زردی مائل ہے۔ ہر دیکھنے والے کی آنکھوں میں کھبی جاتی ہے۔ پھر ہنسنے لگے حضرت ایسی گائیں بھی بہت ہیں۔ کوئی ممتاز وصف بیان فرمائیے۔ وحی نازل ہوئی کہ وہ کبھی ہل میں نہیں جُتی۔ کھیتوں کو پانی نہیں پلایا۔ ہر عیب سے پاک ہے۔ یک رنگی ہے' کوئی داغ دھبہ نہیں' جوں جوں وہ سوالات بڑھاتے گئے حکم میں سختی ہوتی گئی۔

اب نکلے ایسی گائے ڈھونڈنے کو۔ وہ صرف ایک لڑکے کے پاس ملی۔ یہ بچہ اپنے ماں باپ کا نہایت فرمانبردار تھا۔ ایک مرتبہ جب اس کا باپ سویا تھا اور نقدی والی پیٹی کی کنجی اس کے سرہانے تھی۔ ایک سوداگر ایک قیمتی ہیرا بیچتا ہوا آیا اور کہنے لگا میں بیچنا چاہتا ہوں لڑکے نے کہا میں خریدوں گا قیمت ستر ہزار طے ہوئی۔ لڑکے نے کہا ذرا ٹھہرو' جب میرے والد جاگیں گے تو ان سے کنجی لے کر آپ کو قیمت ادا کردوں گا۔ اس نے کہا نہیں' ابھی قیمت دو' تو دس ہزار کم کر دیتا ہوں۔ اس نے کہا نہیں حضرت میں اپنے والد کو جگاؤں گا نہیں۔ اگر تم ٹھہر جاؤ' میں ستر ہزار کے بجائے اسی ہزار دوں گا۔ یونہی ادھر کی اُدھر سے زیادتی ہونی شروع ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ تاجر تیس ہزار قیمت لگا دیتا ہے کہ اگر تم اب جگا کر مجھے روپیہ دے دو تو میں تیس ہزار میں دیتا ہوں۔ لڑکا کہتا ہے اگر تم ٹھہر جاؤ یا ٹھہر کر آؤ جب میرے والد جاگ جائیں تو میں تمہیں ایک لاکھ دوں گا۔ آخر وہ ناراض ہو کر اپنا ہیرا واپس لے کر چلا گیا۔ باپ کی اس بزرگی کو جاننے اور ان کو راحت رسانی کی کوشش کرنے اور ان کا ادب واحترام کرنے سے پروردگار اس لڑکے سے خوش ہو جاتا ہے اور اسے یہ گائے عطا فرماتا ہے۔ جب بنی اسرائیل اس قسم کی گائے ڈھونڈنے نکلتے ہیں تو سوائے اس لڑکے کے اور کسی کے پاس نہیں پاتے۔ اس سے کہتے ہیں کہ اس گائے کے بدلے دو گائیں لے لو۔ یہ انکار کرتا ہے۔ پھر کہتے ہیں تین لے لو چار لے لو' لیکن یہ راضی نہیں ہوتا۔ دس تک کہتے ہیں مگر پھر بھی نہیں مانتا۔ یہ آ کر حضرت موسیٰ علیہ السلام سے شکایت کرتے ہیں۔ آپ فرماتے ہیں جو یہ مانگے دو' اور اسے راضی کر کے گائے خرید و۔ آخر گائے کے وزن کے برابر سونا دیا گیا تب اس نے اپنی گائے بیچی۔ یہ برکت خدا نے ماں باپ کی خدمت کی وجہ سے اُسے عطا فرمائی۔ جب کہ یہ بہت محتاج تھا' اس کے والد کا انتقال ہو گیا تھا اور اس کی بیوہ ماں غربت اور تنگی کے دن بسر کر رہی تھی۔ غرض اب یہ گائے خرید لی گئی اور اسے ذبح کیا گیا اور اس کے جسم کا ایک ٹکڑا لے کر مقتول کے جسم سے لگایا گیا تو اللہ تعالیٰ کی قدرت سے وہ مردہ جی اُٹھا۔ اس سے پوچھا گیا کہ تمہیں کس نے قتل کیا ہے؟ اس نے کہا میرے بھتیجے نے۔ اس لئے کہ وہ میرا مال لے لے۔ میری لڑکی سے نکاح کرلے۔ بس اتنا کہہ کر وہ پھر مر گیا اور قاتل کا پتہ چل گیا اور بنی اسرائیل میں جو جنگ وجدال ہونے والی تھی وہ رک گئی اور یہ فتنہ دب گیا۔ اس بھتیجے کو لوگوں نے پکڑ لیا۔ اس کی مکاری کھل گئی اور اسے اس کے بدلے میں قتل کر ڈالا۔ یہ قصہ مختلف الفاظ میں نقل ہے۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل کے ہاں کا واقعہ ہے جس کی تصدیق تکذیب ہم نہیں کر سکتے۔ ہاں روایت جائز ہے تو اس آیت میں یہی بیان ہو رہا ہے کہ اے بنی اسرائیل میری اس نعمت کو بھی نہ بھولو کہ میں نے عادت کے خلاف بطور معجزے کے ایک گائے کے جسم کو لگانے سے ایک مردے کو زندہ کر

دیا اور اس مقتول نے اپنے قاتل کا پتہ بتا دیا اور ایک اُبھرنے والا فتنہ دب گیا۔[1]

قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِيَ ۚ قَالَ إِنَّهُ يَقُولُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا فَارِضٌ وَلَا بِكْرٌ عَوَانٌ بَيْنَ ذَٰلِكَ ۖ فَافْعَلُوا مَا تُؤْمَرُونَ ﴿٦٨﴾ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّن لَّنَا مَا لَوْنُهَا ۚ قَالَ إِنَّهُ يَقُولُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ صَفْرَاءُ فَاقِعٌ لَّوْنُهَا تَسُرُّ النَّاظِرِينَ ﴿٦٩﴾ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّن لَّنَا مَا هِيَ إِنَّ الْبَقَرَ تَشَابَهَ عَلَيْنَا وَإِنَّا إِن شَاءَ اللَّهُ لَمُهْتَدُونَ ﴿٧٠﴾ قَالَ إِنَّهُ يَقُولُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا ذَلُولٌ تُثِيرُ الْأَرْضَ وَلَا تَسْقِي الْحَرْثَ مُسَلَّمَةٌ لَّا شِيَةَ فِيهَا ۚ قَالُوا الْآنَ جِئْتَ بِالْحَقِّ ۚ فَذَبَحُوهَا وَمَا كَادُوا يَفْعَلُونَ ﴿٧١﴾

ع ۸/۸

وہ لوگ کہنے لگے کہ آپ درخواست کیجئے ہمارے لئے اپنے رب سے ہم سے بیان کر دیں کہ اس (بیل) کے اوصاف ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ وہ یہ فرماتے ہیں کہ وہ ایسا بیل ہو کہ نہ بالکل بوڑھا ہو نہ بہت بچہ ہو (بلکہ) پٹھا ہو دونوں عمروں کے وسط میں۔ سو آپ (زیادہ حجت مت کرو بلکہ) کر ڈالو جو کچھ تم کو حکم ملا ہے۔ کہنے لگے کہ (اچھا یہ بھی) درخواست کر دیجئے ہمارے لئے اپنے رب سے ہم سے یہ بھی بیان کر دیں کہ اس کا رنگ کیسا ہوا۔ آپ نے فرمایا حق تعالیٰ یہ فرماتے ہیں کہ وہ ایک زرد رنگ کا بیل ہے جس کا رنگ تیز زرد ہو کہ ناظرین کے لئے فرحت بخش ہو کہنے لگے (اب کی بار اور) ہماری خاطر اپنے رب سے دریافت کر دیجئے کہ ہم سے بیان کر دیں کہ اس کے اوصاف کیا کیا ہوں۔ کیونکہ ہم کو اس بیل میں (قدرے) اشتباہ ہے اور ہم ضرور ان شاء اللہ تعالیٰ (اب کی بار) ٹھیک سمجھ جائیں گے۔ موسیٰ (علیہ السلام) نے جواب دیا کہ حق تعالیٰ یوں فرماتے ہیں کہ وہ نہ تو ہل میں چلا ہوا ہو جس سے زمین جوتی جائے نہ اس سے زراعت کی آب پاشی کی جائے (غرض ہر قسم کے عیب سے) سالم ہو اور اس میں کوئی داغ نہ ہو۔ (یہ سُن کر) کہنے لگے اب آپ نے پوری بات فرمائی پھر اس کو ذبح کیا اور (ان کی حجتوں سے تو ظاہراً کرتے ہوئے معلوم نہ ہوتے تھے۔○

بنی اسرائیل کی سرکشی سرتابی اور حکم خداوندی امرِ الٰہی میں کرید کا یہاں بیان ہو رہا ہے کہ حکم پاتے ہی اس پر عمل نہ کر ڈالا۔ شقیں

[1] جیسا کہ ابن کثیر نے بیان کیا۔ واقعہ کی تفصیلات میں کافی اختلاف ہے۔ نیز ابن کثیر نے جو روایت پیش کی ہے تمام روایت میں وہ سب سے زیادہ صحیح بھی نہیں ہے۔ قابل غور بات یہ ہے کہ بنی اسرائیل کی وہی جماعت خواہ مخواہ سوالات اور پھر غیر ضروری سوالات کا دروازہ کھول رہی تھی۔ جو خود فتنہ میں الجھی ہوئی تھی غالباً قرآن حکیم اس واقعہ کو پیش کر کے یہی بتانا چاہتا ہے کہ بنی اسرائیل کی فطرت اس درجہ خراب اور مسخ ہو چکی تھی کہ انہی کے فائدہ کی چیز لیکن اس میں کٹ حجتی کے بدترین مظاہرے بنی اسرائیل کی سرشت بن چکے تھے۔۱۲

نکالنے اور بار بار سوال کرنے لگے۔ ابن جریج فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ حکم ملتے ہی وہ اگر کسی گائے کو ذبح کر ڈالتے تو کافی تھا۔ لیکن انہوں نے پے در پے سوالات شروع کئے اور کام میں سختی بڑھتی گئی۔ یہاں تک کہ وہ آخر میں اگر ان شاء اللہ نہ کہتے تو کبھی بھی یہ سختی نہ ہٹتی اور اظہار ان پر نہ ہوتا۔ پہلے سوال کے جواب میں کہا گیا نہ تو وہ بڑھیا ہے نہ بالکل کم عمر ہے۔ پھر دوسرے سوال کے جواب میں اس کا رنگ بیان کیا گیا کہ وہ زرد رنگ کی اور خوش منظر ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا قول ہے کہ جو زرد جوتی پہنے وہ ہر وقت خوش و خرم رہے گا اور اس جملہ سے استدلال کیا ہے۔ تَسُرُّ النّٰظِرِيْنَ بعض نے کہا کہ مراد سخت سیاہ رنگ ہے لیکن اوّل قول ہی صحیح ہے۔ ہاں یہ اور بات ہے کہ ہم یوں کہیں کہ اپنی شوخی اور چمکیلے پن سے وہ مشکی کالے رنگ کے لگتا تھا۔ وہب بن منبہ کہتے ہیں۔ اس کا رنگ اس قدر شوخ اور گہرا تھا کہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا سورج کی شعاعیں اس سے اُٹھ رہی ہیں۔ تورات میں اس کا رنگ سرخ بیان کیا گیا ہے لیکن شاید یہ عربی میں ترجمہ کرنے والوں کی غلطی ہے۔ واللہ علم۔

چونکہ اس رنگ اور اس عمر کی گائیں بھی انہیں بکثرت نظر آئیں تو انہوں نے پھر کہا کہ اے اللہ کے نبی! کوئی اور نشانی بھی پوچھیے تا کہ شبہ مٹ جائے۔ ان شاء اللہ اب ہمیں راستہ مل جائے گا۔ اگر یہ انشاء اللہ نہ کہتے تو انہیں قیامت تک پتہ نہ چلتا اور اگر یہ سوالات ہی نہ کرتے تو اتنی سختی ان پر نہ ہوتی۔ بلکہ جس گائے کو ذبح کر دیتے کفایت ہو جاتی۔ یہ مضمون ایک مرفوع حدیث میں بھی ہے لیکن اس کی سند غریب ہے۔ صحیح بات یہی معلوم ہوتی ہے کہ یہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا اپنا کلام ہے۔ واللہ علم۔

اب کی مرتبہ اس کے اوصاف بیان کئے گئے کہ وہ ہل میں نہیں جتی' پانی نہیں سینچا' اس کے چمڑے پر کوئی داغ دھبہ نہیں' یک رنگی ہے' سارے بدن میں کہیں رنگ نہیں۔ اس کے ہاتھ پاؤں اور کل اعضاء بالکل درست اور توانا ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ وہ گائے کام کرنے والی نہیں۔ ہاں کھیتی کا کام کرتی ہے لیکن پانی نہیں پلاتی' مگر یہ قول غلط ہے۔ اس لئے کہ ذلول کی تفسیر یہ ہے کہ وہ ہل نہیں جوتی اور نہ پانی پلاتی ہے نہ اس میں کوئی داغ دھبہ ہے۔ اب اتنی بڑی کدوکاوش کے بعد بادل نخواستہ وہ اس کی قربانی کی طرف متوجہ ہوئے۔ اسی لئے فرمایا کہ ذبح کرنے کے قریب نہ تھے اور ذبح نہ کرنے کے بہانے ڈھونڈتے تھے۔ کسی نے تو کہا ہے کہ اس لئے کہ انہیں اپنی رسوائی کا خیال تھا کہ نہ جانے کون قاتل ہو۔ بعض کہتے ہیں کہ اس کی قیمت سن کر گھبرا گئے تھے لیکن بعض روایتوں میں آیا ہے کہ کل تین دینار اس کی قیمت لگی تھی لیکن یہ تین دینار والی اور گائے کے وزن کے برابر سونے والی دونوں روایتیں اسرائیلی ہیں۔ صحیح بات یہی ہے کہ ان کا ارادہ بجا آوری حکم کا تھا ہی نہیں۔ لیکن اب اس قدر وضاحت کے بعد اور قتل کا مقدمہ ہونے کی وجہ سے انہیں یہ حکم ماننا ہی پڑا۔ واللہ اعلم۔

اس آیت سے اس مسئلہ پر بھی استدلال ہو سکتا ہے کہ جانوروں کو بلا دیکھے اُدھار دینا جائز ہے۔ اس لئے کہ صفات کا حصہ کر دیا گیا اور اوصاف پورے بیان کر دیئے گئے۔ جیسے کہ امام مالک' امام اوزاعی' امام لیث' امام شافعی' امام احمد اور جمہور علماً کا مذہب ہے اگلوں کا اور پچھلوں کا اور اس کی دلیل صحیحین کی یہ حدیث بھی ہے کہ کوئی عورت کسی اور عورت کے اوصاف اس طرح اپنے خاوند کے سامنے بیان نہ کرے کہ گویا وہ اسے دیکھ رہا ہے اور حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دیت کے اونٹوں کے اوصاف بھی بیان کئے ہیں۔ قتل خطا میں اور اس قتل میں جو مشابہ عمد کے ہے۔ ہاں امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور دوسرے کوئی اور امام ثوری وغیرہ بیع مسلم کے قائل نہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ جانوروں کے اوصاف و احوال پوری طرح ضبط نہیں ہو سکتے۔ اسی طرح کی روایت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہما' حذیفہ بن یمان اور عبدالرحمٰن بن سمرہ وغیرہ سے بھی کی جاتی ہے۔

وَاِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادّٰرَءْتُمْ فِيْهَا ۭ وَاللّٰهُ مُخْرِجٌ مَّا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ﴿۷۲﴾ فَقُلْنَا اضْرِبُوْهُ بِبَعْضِهَا ۭ كَذٰلِكَ يُحْيِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى ۙ وَيُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۷۳﴾

اور جب تم لوگوں (میں سے کسی) نے ایک آدمی کا خون کر دیا پھر ایک دوسرے پر اس کو ڈالنے لگے اور اللہ تعالیٰ کو اس امر کا ظاہر کرنا منظور تھا جس کو تم مخفی رکھنا چاہتے تھے۔ اس لئے ہم نے حکم دیا کہ اس کو اس کے کوئی سے ٹکڑے سے چھوا دو۔ اسی طرح حق تعالیٰ (قیامت میں) مردوں کو زندہ کر دیں گے اور اللہ تعالیٰ اپنے نظائر قدرت تم کو دکھلاتے ہیں اس توقع پر کہ تم عقل سے کام لیا کرو۔○

صحیح بخاری شریف میں اِدّٰرَءْ تُمْ کے معنی تم نے اختیار کیا کئے ہیں۔ حضرت مجاہد وغیرہ سے بھی یہی مروی ہے۔ میسب بن رافع کہتے ہیں کہ جو شخص سات گھروں میں چھپ کر بھی کوئی نیک عمل کرے گا۔ اللہ اس کی نیکی کو ظاہر کر دے گا۔ اسی طرح اگر کوئی سات گھروں میں گھس کر بھی کوئی برائی کرے گا۔ اللہ تعالیٰ اُسے بھی ظاہر کر دے گا۔ پھر یہ آیت تلاوت کی: ﴿وَاللّٰهُ مُخْرِجٌ مَّا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ﴾ یہاں وہی واقعہ چچا بھتیجے کا بیان ہو رہا ہے۔ جس کے باعث انہیں ذبیحہ گاؤ کا حکم ہوا تھا اور کہا جاتا ہے کہ اس کا کوئی ٹکڑا لے کر مقتول کے جسم پر لگاؤ' وہ ٹکڑا کونسا تھا؟ اس کا بیان نہ تو قرآن میں ہے نہ کسی صحیح حدیث میں ہے۔ ہمیں اس کے معلوم ہونے سے کوئی فائدہ بھی نہیں اور نہ ہی نہ معلوم ہونے سے کوئی نقصان ہے۔ سلامت روی اسی میں ہے کہ جس چیز کا بیان نہیں' ہم بھی اس کی تلاش و تفتیش میں نہ پڑیں۔ گو بعض نے کہا ہے کہ وہ غضروف کی نرم ہڈی تھی۔ کوئی کہتا ہے ہڈی نہیں بلکہ ران کا گوشت تھا۔ کوئی کہتا ہے زبان کا گوشت' کوئی کہتا ہے دم کا گوشت وغیرہ لیکن ہماری بہتری اسی میں ہے کہ جسے خدا نے مبہم رکھا ہے' ہم بھی مبہم ہی رکھیں۔ اس ٹکڑے کے لگتے ہی وہ مردہ جی اٹھا اور خدا تعالیٰ نے ان کے جھگڑے کا فیصلہ بھی اسی سے کیا اور قیامت کے دن جی اُٹھنے کی دلیل بھی اسی کو بنایا۔ اس سورت میں پانچ جگہ مرنے کے بعد جینے کا بیان ہوا ہے۔ ایک تو آیت: ﴿بَعَثْنٰكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَوْتِكُمْ﴾ (البقرۃ:۵۶) میں اور دوسرے اس قصے میں اور تیسرے ان لوگوں کے واقعے میں جو ہزاروں کی تعداد میں نکلے تھے اور ایک ویران بستی پر ان کا گزر ہوا تھا۔ چوتھے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے چار پرندوں کے مار ڈالنے کے بعد زندہ ہو جانے میں۔ پانچویں زمین کی مردنی کے بعد روئیدگی کو موت و زیست سے تشبیہ دینے پر۔

ابوداؤد طیالسی کی ایک حدیث میں ہے۔ ابورزین عقیلی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مردوں کو اللہ تعالیٰ کس طرح زندہ کرے گا۔ فرمایا کبھی تمہارا گزر کسی ویرانہ سے ہوا ہے؟ کہا ہاں۔ پھر کبھی اُسے سرسبز و شاداب بھی دیکھا ہے؟ کہا ہاں۔ فرمایا اسی طرح موت کے بعد زیست ہے۔ قرآن کریم میں اور جگہ آیا ہے: ﴿وَاٰيَةٌ لَّهُمُ الْاَرْضُ الْمَيْتَةُ﴾ (یٰسین ۳۳) یعنی ان منکرین کے لئے مردہ زمین بھی ایک نشانی ہے۔ جسے ہم زندہ کرتے ہیں اور اس میں سے دانے نکلتے ہیں' جسے یہ کھاتے ہیں اور جس میں ہم کھجوروں اور انگوروں کے باغ پیدا کرتے ہیں اور چوطرف نہروں کی ریل پیل کر دیتے ہیں اور وہاں پھلوں کو مزے مزے سے یہ کھاتے ہیں حالانکہ یہ ان کے ہاتھوں کا بنایا ہوا یا پیدا کیا ہوا نہیں۔ کیا پھر بھی یہ شکر گزاری نہ کریں گے؟ کوئی زخمی شخص اگر کہے کہ فلاں شخص نے مجھے برانگیختگی کے باعث قتل کیا ہے تو اس کا یہ قول ثبوت سمجھا جائے گا۔ اس مسئلہ پر اس آیت سے استدلال کیا گیا ہے اور

حضرت امام مالکؒ کے مذہب کو اس سے تقویت پہنچائی گئی ہے۔ اس لئے کہ مقتول کے جی اُٹھنے کے بعد اُس سے دریافت کرنے پر جسے قاتل بتایا' اُسے قتل کیا گیا اور مقتول کا قول باور کیا گیا۔ ظاہر ہے کہ دم آخر ایسی حالت میں انسان سچ ہی بولتا ہے اور اس وقت اس پر تہمت نہیں لگائی جاتی۔

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک یہودی نے ایک لونڈی کے سر پر پتھر رکھ کر دوسرے پتھر سے کچل ڈالا اور اس کے کپڑے اتار لے گیا۔ جب اس کا علم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ہوا۔ تو آپ نے فرمایا کہ اس لونڈی سے پوچھو کہ اُسے کس نے مارا ہے۔ لوگوں نے پوچھنا شروع کیا کہ کیا تجھے فلاں نے مارا' فلاں نے مارا؟ وہ اپنے سر کے اشارے سے انکار کرتی جاتی تھی۔ یہاں تک کہ جب اس یہودی کا نام آیا تو اس نے سر کے اشارے سے کہاں ہاں۔ چنانچہ اس یہودی کو گرفتار کیا گیا اور اس سے باصرار پوچھنے پر اس نے اقرار کیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ اس کا سر بھی اسی طرح دو پتھروں کے درمیان کچل دیا جائے اور امام مالک کے نزدیک جب یہ برانگیختگی کے باعث ہو تو مقتول کے وارثوں کو قسم دلائی جائے گی بطور قسامہ لیکن جمہور اس کے مخالف ہیں اور مقتول کے قول کو اس بارے میں ثبوت نہیں جانتے۔

ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِّنْ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً ۭ وَاِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْاَنْهٰرُ ۭ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَشَّقَّقُ فَيَخْرُجُ مِنْهُ الْمَاۗءُ ۭ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ۭ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۷۴﴾

ایسے ایسے واقعات کے بعد تمہارے دل پھر بھی سخت ہی رہے (یوں کہنا چاہئے کہ) ان کی مثال پتھر کی سی ہے یا سختی میں (پتھر سے بھی) زیادہ سخت اور بعضے پتھر تو ایسے ہیں جن سے (بڑی بڑی) نہریں پھوٹ کر چلتی ہیں اور انہیں پتھروں میں سے بعضے ایسے ہیں کہ جوشق ہو جاتے ہیں پھر ان سے (اگر زیادہ نہیں تو تھوڑا ہی) پانی نکل آتا ہے اور ان ہی پتھروں میں بعضے ایسے ہیں جو خدا تعالیٰ کے خوف سے اوپر سے نیچے لڑھک آتے ہیں اور حق تعالیٰ تمہارے اعمال سے بے خبر نہیں ہیں۔ ○

پتھر سے بھی سخت دِل ☆

اس آیت میں اسرائیل کو زجر و توبیخ کی گئی ہے کہ اس قدر زبردست معجزے اور نشانہائے قدرت دیکھ کر پھر بھی بہت جلد تمہارے دل سخت پتھر جیسے بن گئے۔ اسی لئے ایمان والوں کو اس طرح سختی سے روکا گیا اور کہا گیا: ﴿اَلَمْ يَاْنِ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ وَلَا يَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلُ فَطَالَ عَلَيْهِمُ الْاَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوْبُهُمْ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ﴾ (الحدید ۱۶) یعنی کیا اب تک وہ وقت نہیں آیا کہ ایمان والوں کے دل اللہ تعالیٰ کے ذکر اور خدا کے نازل کردہ حق سے کانپ اُٹھیں؟ اور اگلے اہل کتاب کی طرف نہ ہو جائیں۔ جن کے دل زمانہ گزرنے کے بعد سخت ہو گئے اور ان میں سے اکثر فاسق ہیں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے کہ اس مقتول کے بھتیجے نے بھی اپنے چچا کے دوبارہ مرنے کے بعد اس کی تکذیب کی اور کہا کہ اس نے جھوٹ کہا۔ (طبری) اور پھر کچھ وقت گزر جانے کے بعد بنی اسرائیل کے دل بھی پتھر سے بھی زیادہ سخت ہو گئے کیونکہ پتھروں سے تو نہریں نکلتی ہیں اور بہنے لگتی ہیں۔ بعض پتھر پھٹ جاتے ہیں اور ان سے پانی نکلتا ہے گو وہ بہنے کے قابل نہ ہو۔ بعض پتھر خوف

خدا سے گر پڑتے ہیں لیکن ان کے دل کسی وعظ و نصیحت سے کسی پند و نصیحت سے نرم ہی نہیں ہوتے۔

جمادات میں بھی ادراک ہے ☆ یہاں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ پتھروں میں ادراک اور سمجھ ہے اور جگہ ہے: ﴿تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ اِنَّهٗ كَانَ حَلِيْمًا غَفُوْرًا﴾ (بنی اسرائیل:۴۴) یعنی ساتوں آسمان اور زمینیں اور ان کی تمام مخلوق اور ہر ہر چیز اللہ تعالیٰ کی تسبیح بیان کرتی ہے لیکن تم ان کی تسبیح سمجھتے نہیں ہو۔ اللہ تعالیٰ حلم و بردباری والا اور بخشش و عفو والا ہے۔ ابو یعلی حیانی نے پتھر کے خوف سے گر پڑنے کی تاویل اولوں کے برسنے سے کی ہے لیکن یہ ٹھیک نہیں۔ رازی بھی اسے غیر درست بتلاتے ہیں اور فی الواقع یہ تاویل صحیح نہیں کیونکہ اس میں بے دلیل لفظی معنی کو چھوڑنا لازم آتا ہے۔ واللہ اعلم۔ نہریں بہہ نکلنا زیادہ رونا ہے۔ پھٹ جانا اور پانی نکلنا اس سے کم رونا ہے۔ گر پڑنا دل سے ڈرنا ہے۔ بعض کہتے ہیں یہ مجازاً کہا گیا۔ جیسے اور جگہ ہے: ﴿يُّرِيْدُ اَنْ يَّنْقَضَّ﴾ (الکہف:۷۷) یعنی دیوار گرا چاہتی تھی۔ ظاہر ہے کہ یہ مجاز ہے۔ حقیقتاً کا ارادہ ہی نہیں ہوتا۔

رازی قرطبیؒ کہتے ہیں ایسی تاویلوں کی کوئی ضرورت نہیں۔ اللہ تعالیٰ جو صفت جس چیز میں چاہے پیدا کر سکتا ہے۔ دیکھئے اس کا فرمان ہے: ﴿اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ......﴾ (الاحزاب:۷۲) یعنی ہم نے امانت کو آسمانوں زمینوں اور پہاڑوں پر پیش کیا۔ انہوں نے اس کے اُٹھانے سے مجبوری ظاہر کی اور ڈر گئے۔ اُوپر آیت گزر چکی کہ تمام چیزیں اللہ تعالیٰ کی تسبیح بیان کرتی ہیں اور جگہ ہے: ﴿وَّالنَّجْمُ وَّالشَّجَرُ يَسْجُدٰنِ﴾ (الرحمٰن:٦) یعنی ستارے اور درخت اللہ تعالیٰ کو سجدہ کرتے ہیں اور فرمایا: ﴿يَتَفَيَّؤُا ظِلٰلُهٗ......﴾ (النحل:۴۸) اور فرمایا: ﴿قَالَتَآ اَتَيْنَا طَآئِعِيْنَ﴾ (حم السجدة:۱۱) زمین اور آسمان نے کہا' ہم خوشی خوشی حاضر ہیں اور جگہ ہے کہ پہاڑ بھی قرآن سے متاثر ہو کر ڈر کے مارے پھٹ پھٹ جاتے ہیں اور جگہ فرمان ہے: ﴿وَقَالُوْا لِجُلُوْدِهِمْ﴾ (حم السجدة:۲۱) یعنی گنہگار لوگ اپنے جسموں سے کہیں گے تم نے ہمارے خلاف شہادت کیوں دی؟ وہ جواب دیں گے کہ ہم سے اس اللہ نے بات کرائی جو ہر چیز کو بولنے کی طاقت عطا فرماتا ہے۔

ایک صحیح حدیث میں ہے کہ اُحد پہاڑ کی نسبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا' یہ پہاڑ ہم سے محبت رکھتا ہے اور ہم بھی اس سے محبت رکھتے ہیں۔ (بخاری) ایک اور حدیث میں ہے کہ جس کھجور کے تنے پر ٹیک لگا کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم جمعہ کا خطبہ پڑھا کرتے تھے' جب منبر بنا اور وہ تنا ہٹا دیا گیا تو وہ تنا پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ (بخاری) صحیح مسلم شریف کی حدیث میں ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں' میں مکہ کے اس پتھر کو پہچانتا ہوں جو میری نبوت سے پہلے مجھے سلام کیا کرتا تھا۔ حجر اسود کے بارے میں ہے کہ جس نے اُسے حق کے ساتھ بوسہ دیا ہوگا' یہ اس کے ایمان کی گواہی قیامت والے دن دے گا اور اس طرح کی بہت سی آیتیں اور حدیثیں ہیں جن سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان چیزوں میں ادراک و حس ہے اور یہ تمام حقیقت پر محمول ہے نہ کہ مجاز پر۔

آیت میں لفظ اَوْ کے متعلق قرطبی اور رازیؒ تو کہتے ہیں کہ یہ تخییر کے لئے ہے یعنی ان کے دلوں کو خواہ پتھر جیسے سخت سمجھ لو' خواہ اس سے بھی زیادہ سخت۔ رازیؒ نے ایک وجہ یہ بھی بیان کی ہے کہ یہ ابہام کے لئے ہے گویا مخاطب کے سامنے باوجود ایک بات کا پختہ علم ہونے دو چیزیں بطور ابہام پیش کی جا رہی ہیں۔ بعض کا قول ہے کہ مطلب یہ ہے کہ بعض دل پتھر جیسے اور بعض اس سے بھی زیادہ سخت ہیں۔ واللہ اعلم۔

اس لفظ کے جو معنی یہاں پر ہیں' وہ بھی سن لیجئے۔ اس پر تو اجماع ہے کہ اَوْ شک کے لئے نہیں' یا تو معنی میں واو کے لئے ہے یعنی ان کے دل پتھر جیسے اور اس سے بھی زیادہ سخت ہو گئے ہیں' جیسے: ﴿لَا تُطِعْ مِنْهُمْ اٰثِمًا اَوْ كَفُوْرًا﴾ (الدھر:۲۴) میں اور ﴿عُذْرًا اَوْ نُذْرًا﴾

(المرسلات.٦) میں۔ شاعروں کے اشعار میں او واؤ کے معنی میں جمع کے لئے آیا ہے۔ یا اَو یہاں پر معنی میں بَل یعنی بلکہ کے ہے۔ جیسے: ﴿کَخَشْیَةِ اللّٰهِ اَوْ اَشَدَّ خَشْیَةً﴾ (النساء: ۷۷) میں اور: ﴿اَرْسَلْنٰهُ اِلٰی مِائَةِ اَلْفٍ اَوْ یَزِیْدُوْنَ﴾ (الصفت: ۱۴۷) میں اور: ﴿فَکَانَ قَابَ قَوْسَیْنِ اَوْ اَدْنٰی﴾ (النجم: ۹) میں۔ بعض کا قول ہے کہ مطلب یہ ہے کہ وہ پتھر جیسے ہیں یا سختی میں تمہارے نزدیک اس سے بھی زیادہ۔ بعض کہتے ہیں صرف مخاطب پر ابہام ڈالا گیا ہے اور یہ شاعروں کے شعروں میں بھی پایا جاتا ہے کہ باوجود پختہ علم ویقین کے صرف مخاطب پر ابہام ڈالنے کے لئے ایسا کلام کرتے ہیں۔ قرآن کریم میں اور جگہ ہے: ﴿وَاِنَّآ اَوْ اِیَّاکُمْ لَعَلٰی هُدًی اَوْ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ﴾ (سباء ۲۴) یعنی ہم یا تم صاف ہدایت یا کھلی گمراہی پر ہیں تو ظاہر ہے کہ مسلمانوں کا ہدایت پر ہونا اور کفار کا گمراہی پر ہونا یقینی چیز ہے لیکن مخاطب کے ابہام کے لئے اس کے سامنے کلام مبہم بولا گیا۔ یہ بھی مطلب ہو سکتا ہے کہ تمہارے قول ان دو سے خارج نہیں یا تو وہ پتھر جیسے ہیں یا اس سے بھی زیادہ سخت یعنی بعض ایسی اور بعض ایسے اور بعض ایسے اس قول کے مطابق یہ قول بھی: کمثل الذی استوقد نارا پھر فرمایا: او کصیب...... اور فرمان ہے: کسراب...... پھر فرمایا او کظلمت...... مطلب یہی ہے کہ بعض ایسے اور بعض ایسے اور بعض ایسے واللہ اعلم۔

تفسیر ابن مردویہ میں ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں اللہ کے ذکر کے سوا زیادہ باتیں نہ کیا کرو۔ ایسے کلام کی کثرت دل کو سخت کر دیتی ہے اور سخت دل والا خدا سے بہت دور ہو جاتا ہے۔ امام ترمذی نے بھی اس حدیث کی روایت کی ہے اور اس کے ایک طریقہ کو غریب کہا ہے۔ بزار میں حضرت انسؓ سے مرفوعاً روایت ہے کہ چار چیزیں بدبختی اور شقاوت کی ہیں:

۱) خوفِ خدا سے آنکھوں میں آنسو نہ بہنا' ۲) دِل کا سخت ہو جانا' ۳) اُمیدوں کا بڑھ جانا' ۴) لالچی بن جانا۔

اَفَتَطْمَعُوْنَ اَنْ یُّؤْمِنُوْا لَکُمْ وَقَدْ کَانَ فَرِیْقٌ مِّنْهُمْ یَسْمَعُوْنَ کَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ یُحَرِّفُوْنَهٗ مِنْۢ بَعْدِ مَا عَقَلُوْهُ وَهُمْ یَعْلَمُوْنَ ﴿۷۵﴾ وَاِذَا لَقُوا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۚ وَاِذَا خَلَا بَعْضُهُمْ اِلٰی بَعْضٍ قَالُوْٓا اَتُحَدِّثُوْنَهُمْ بِمَا فَتَحَ اللّٰهُ عَلَیْکُمْ لِیُحَآجُّوْکُمْ بِهٖ عِنْدَ رَبِّکُمْ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۷۶﴾ اَوَلَا یَعْلَمُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ یَعْلَمُ مَا یُسِرُّوْنَ وَمَا یُعْلِنُوْنَ ﴿۷۷﴾

(اے مسلمانو) کیا اب بھی تم توقع رکھتے ہو کہ یہ یہود تمہارے کہنے سے ایمان لے آئیں گے حالانکہ ان میں سے کچھ لوگ ایسے گزرے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا کلام سنتے تھے اور پھر اس کو کچھ کا کچھ کر ڈالتے تھے (اور) اس کو سمجھنے کے بعد (ایسا کرتے) اور وہ جانتے تھے اور جب ملتے ہیں (منافقین اور یہود) مسلمانوں سے تو (ان سے تو) کہتے ہیں کہ ہم (بھی) ایمان لے آئے ہیں اور جب تنہائی میں جاتے ہیں یہ بعضے دوسرے بعض (علانیہ) یہودیوں کے پاس تو وہ ان سے کہتے ہیں کہ تم کیا مسلمانوں کو وہ باتیں بتلا دیتے ہو جو اللہ تعالیٰ نے تم پر منکشف کر دی ہیں تو نتیجہ یہ ہو گا وہ لوگ تم کو حجت میں مغلوب کر دیں گے کہ یہ مضمون

اللہ کے پاس سے ہے کیا تم (اتنی موٹی بات) نہیں سمجھتے۔ کیا ان کو اس کا علم نہیں ہے کہ حق تعالیٰ کو سب خبر ہے اُن چیزوں کی بھی جن کو وہ مخفی رکھتے ہیں اور اُن کی بھی جن کا وہ اظہار کر دیتے ہیں۔ ○

حق بات کو چھپانے والے کون؟

اس گمراہ قوم یہود کے ایمان سے اللہ تعالیٰ اپنے نبی اور ان کے اصحاب کو نا امیدی دلا رہا ہے کہ جب ان لوگوں نے اتنی بڑی بڑی نشانیاں دیکھتے ہوئے اپنے دلوں کو سخت پتھر جیسا بنا لیا۔ خدا کے کلام کو سن کر سمجھ کر پھر بھی اس کی تحریف اور تبدیلی کر ڈالی تو ان سے تم کیا اُمید رکھتے ہو؟ ٹھیک ایسی آیت ایک جگہ اور ہے کہ: ﴿فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّیْثَاقَهُمْ ...... ﴾ (المائدة:۱۳) یعنی ان کی عہد شکنی کی وجہ سے ہم نے ان پر لعنت نازل کی اور ان کے دل سخت کر دیئے۔ یہ خدا کے کلام کو ردوبدل کر ڈالا کرتے تھے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں' یہاں اللہ تعالیٰ نے کلام اللہ سننے کو فرمایا۔ اس سے مراد حضرت موسیٰ علیہ السلام کے صحابیوں کی وہ جماعت ہے آپ سے اللہ کا کلام اپنے کانوں سے سننے کی درخواست کی تھی اور جب وہ پاک صاف ہو کر روزہ رکھ کر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ طور پہاڑ پر جا کر سجدے میں گر پڑے تو اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنا کلام سنایا۔ جب یہ واپس آئے اور نبی اللہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے خدا کا یہ کلام بنی اسرائیل میں بیان کرنا شروع کیا تو ان لوگوں نے اس کی تحریف اور تبدیلی شروع کر دی۔ سدیؒ فرماتے ہیں۔ ان لوگوں نے توراۃ کی تحریف کی تھی۔ یہی عام معنی ٹھیک ہیں۔ جس میں وہ لوگ بھی شامل ہو جائیں گے اور اس بُری عادت والے دوسرے یہودی بھی۔ قرآن میں اور جگہ ہے: ﴿فَاَجِرْهُ حَتّٰی یَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ﴾ (التوبہ:۶) یعنی مشرکوں میں سے کوئی اگر تجھ سے پناہ طلب کرے تو تُو اُسے پناہ دے۔ یہاں تک کہ وہ کلام اللہ سن لے تو اس سے یہ مراد نہیں کہ خدا کا کلام اپنے کانوں سے سنے بلکہ قرآن سنے۔ تو یہاں بھی کلام اللہ سے مراد تورات ہے۔ یہ تحریف کرنے والے اور چھپانے والے ان کے علماء تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصاف ان کی کتاب میں تھے۔ ان سب میں انہوں نے تاویلیں کر کے اصل مطلب کو بدل دیا۔ اسی طرح حلال کو حرام' حرام کو حلال' حق کو باطل' باطل کو حق کر دیا کرتے تھے۔ رشوتیں لینی اور غلط مسائل بتانے کی عادت ڈال لی تھی۔ ہاں کبھی کبھی جبکہ رشوت وغیرہ ملی نہ ہوتی' ریاست کے جانے کا خوف نہ ہوتا' مریدوں سے الگ ہوتے تو حق بات بھی کہہ دیتے۔ مسلمانوں سے ملتے تو کہہ دیا کرتے کہ تمہارے نبی سچے ہیں۔ یہ برحق رسول ہیں لیکن پھر آپس میں بیٹھ کر کہتے' کیوں عرب سے یہ باتیں کہتے ہو' پھر تو یہ تم پر چھا جائیں گے' خدا کے ہاں بھی تمہیں لاجواب کر دیں گے۔ تو ان کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ان بیوقوفوں کو کیا اتنا علم نہیں کہ ہم پوشیدگی اور ظاہرداری سب کو جانتے ہیں۔

ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا' مدینہ میں ہمارے پاس سوائے ایمان والوں کے اور کوئی نہ آئے' تو ان کافروں اور یہودیوں نے کہا' جاؤ کہہ دو ہم بھی ایمان لاتے ہیں اور یہاں آ کر تو پھر ویسے ہی رہو جیسے تھے۔ پس یہ لوگ صبح آ کر ایمان کا دعویٰ کرتے تھے اور شام کو جا کر کفار میں شامل ہو جاتے تھے۔ قرآن میں ہے: ﴿وَقَالَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اٰمِنُوْا بِالَّذِیْٓ...... ﴾ (آل عمران:۷۲) یعنی اہل کتاب کی ایک جماعت نے کہا' ایمان والوں پر جو اترا ہے' اس پر دن کے ایک حصہ میں ایمان لاؤ پھر دوسرے میں کفر کرو تا کہ ایمان والے بھی اس دین سے پھر جائیں۔ یہ لوگ اس فریب سے یہاں کے راز معلوم کرنا اور انہیں اپنے والوں کو بتانا چاہتے تھے اور مسلمانوں کو بھی گمراہ کرنا چاہتے تھے مگر ان کی چالاکی نہ چلی اور یہ راز خدا نے کھول دیا۔ جب یہ یہاں ہوتے اور اپنا ایمان اسلام ظاہر کرتے تو صحابہؓ ان سے پوچھتے کیا تمہاری کتاب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارت وغیرہ نہیں؟ وہ اقرار کرتے۔ جب اپنے بڑوں کے جاتے تو وہ انہیں ڈانٹتے اور کہتے اپنی باتیں ان سے کہہ کر کیوں ان کے ہاتھوں میں ہتھیار دے رہے ہو؟

مجاہد فرماتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قریظہ پر حملہ کر کے ان یہودیوں کے قلعہ تلے کھڑے ہو کر فرمایا اے بندر اور خنزیر اور طاغو
کے عابدوں کے بھائیو! تو وہ آپس میں کہنے لگے' یہ ہماری گھر کی باتیں انہیں کس نے بتا دیں۔ خبردار اپنی آپس کی باتیں انہیں نہ دو ورنہ
کے سامنے حجت ہو جائے گی۔ اب اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ گو تم چھپاؤ لیکن مجھ سے تو کوئی چیز چھپ نہیں سکتی۔ تم جو یہ چپکے چپکے اپنے والو
سے کہتے ہو کہ اپنی باتیں ان تک نہ پہنچاؤ اور تم جو اپنی کتاب کی باتوں کو چھپاتے ہو تو میں تو تمہارے اس برے کام سے بخوبی آگاہ ہو
اور تم جو اپنا ایمان ظاہر کرتے ہو اس تمہارے اعلان کی حقیقت کا علم بھی مجھے حاصل ہے۔

وَمِنْهُمْ اُمِّيُّوْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ الْكِتٰبَ اِلَّآ اَمَانِيَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ ۝ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ لِيَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا ؕ فَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا كَتَبَتْ اَيْدِيْهِمْ وَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا يَكْسِبُوْنَ ۝۷۹

اور ان (یہودیوں) میں بہت سے ناخواندہ (بھی) ہیں جو کتابی علم نہیں رکھتے لیکن (بلاسند) دل خوش کن باتیں (بہت یاد ہیں) اور وہ لوگ اور کچھ نہیں خیالات پکا لیتے ہیں' تو بڑی خرابی ان کی ہوگی جو لکھتے ہیں (بدل سدل کر) کتاب (توریت) کو اپنے ہاتھوں سے پھر کہہ دیتے ہیں کہ یہ (حکم) خدا کی طرف سے ہے غرض (صرف) یہ ہوتی ہے کہ اس ذریعے سے کچھ نقد قدرے قلیل وصول کر لیں۔ سو بڑی خرابی پیش آئے گی ان کو اس کی بدولت (بھی) جس کو ان کے ہاتھوں نے لکھا تھا اور بڑی خرابی ہوگی ان کو اس کی بدولت (بھی) جس کو وہ وصول کر لیا کرتے ہیں۔ ○

نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی ایک صفت اُمّی بھی ہے ☆

اُمّی کے معنی وہ شخص جو اچھی طرح لکھنا نہ جانتا ہو۔ اُمِّيُّوْنَ اس کی جمع ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صفتوں میں سے ایک صفت اُمّی بھی آئی ہے۔ اس لئے کہ آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم بھی لکھنا نہیں جانتے تھے۔ قرآن کہتا ہے: ﴿وَمَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ وَّلَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ اِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ﴾ (العنکبوت: ۴۸) یعنی اے نبی صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم اس سے پہلے نہ تو پڑھ سکتا تھا نہ لکھ سکتا تھا۔ اگر ایسا ہوتا تو ان باطل پرستوں کے شبہ کی گنجائش ہو جاتی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں' ہم اُمّی اور اَن پڑھ لوگ ہیں۔ نہ لکھنا جانیں نہ حساب مہینہ کبھی اتنا اتنا ہوتا ہے اور کبھی اتنا اتنا۔ پہلی بار تو آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے دونوں ہاتھوں کی کل انگلیوں کو تین بار نیچے کی طرف جھکایا یعنی تیس دن اور دوسری بار تیسری مرتبہ میں انگوٹھے کا حلقہ کر لیا۔ (بخاری) یعنی انتیس دن کا۔ مطلب یہ ہے کہ ہماری عبادتیں اور ان کے وقت حساب کتاب پر موقوف نہیں۔ قرآن کریم نے اور جگہ فرمایا' اللہ تعالیٰ نے اَن پڑھوں میں ایک رسول انہی میں سے بھیجا ہے۔ امام ابن جریر فرماتے ہیں کہ اس لفظ میں بے پڑھے آدمی کو ماں کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے ایک روایت ہے کہ یہاں پر اُمّی اُنہیں کہا گیا ہے جنہوں نے نہ تو کسی رسول کی تصدیق کی تھی۔ نہ کسی کتاب کو مانا تھا اور اپنی لکھی ہوئی کتابوں

اوروں سے کتاب خدا منوانا چاہتے تھے لیکن اول یہ قول محاورات عرب کے خلاف ہے دوسرے اس قول کی سند ٹھیک نہیں ۔امانی کے معنی باتیں اور اقوال ۔حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے۔

کذب کے معنی آرزو کے جھوٹ باندھ لینے کے بھی کئے گئے ہیں ۔تلاوت اور ظاہری الفاظ کے معنی بھی مروی ہیں ۔جیسے قرآن مجید میں اور جگہ ہے: ﴿اِلَّآ اِذَا تَمَنّٰٓی ..... ﴾ (الحج ۵۲) یہاں تلاوت کے معنی صاف ہیں ۔شعراء کے شعروں میں بھی یہ لفظ تلاوت کے معنی میں آیا ہے اور صرف گمان ہی پر ہیں ۔یعنی حقیقت کو نہیں جانتے اور ناحق کا گمان کرتے ہیں اور انکل پچو کی باتیں بتاتے ہیں ۔پھر یہودیوں کی ایک دوسری قسم کا بیان ہو رہا ہے۔ جو پڑھے لکھے لوگ تھے اور گمراہی کی طرف دوسروں کو بلاتے تھے ۔خدا پر جھوٹ باندھتے تھے اور مریدوں سے مال وصول کرنے کے لئے غلط ذرائع استعمال کرتے تھے۔

ویل کے معنی ہلاکت اور بربادی کے ہیں اور جہنم کے گڑھے کا نام بھی جس کی آگ اتنی تیز ہے کہ اگر اس میں پہاڑ ڈالے جائیں تو گھل جائیں ۔ابن ابی حاتم کی ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا' جہنم کی ایک وادی کا نام ویل ہے۔ جس میں کافر ڈالے جائیں گے ۔چالیس سال کے بعد سب سے نچلے حصہ میں پہنچ سکیں گے کیونکہ اس کی گہرائی بہت زیادہ ہے لیکن سند کے اعتبار سے یہ حدیث غریب بھی ہے۔ منکر بھی ہے اور ضعیف بھی ہے اور ایک غریب حدیث میں ہے کہ جہنم کے ایک پہاڑ کا نام ویل ہے۔ یہودیوں نے تورات کی تحریف کر دی ۔اس میں کمی زیادتی کی ۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نام نکال ڈالا ۔اس لئے اللہ کا غضب ان پر نازل ہوا ۔بعض تورات اٹھالی گئی اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ان کے ہاتھوں کے لکھے کو اور ان کی کمائی کو بربادی اور ہلاکت ہے۔ ویل کے معنی سخت عذاب' سخت خرابی' سخت برائی' ہلاکت' افسوس' دکھ درد' رنج ملال وغیرہ کے بھی آتے ہیں: ویل' ویح' ویش' ویہ' ویلك' ویب سب ایک ہی معنی میں ہیں ۔گو بعضوں نے ان الفاظ کے جدا جدا معنی بھی کئے ہیں' لفظ ویل نکرہ ہے اور نکرہ مبتدا نہیں بن سکتا لیکن چونکہ یہ معنی میں بدعا کے ہیں ۔اس لئے اسے مبتدا بنا دیا گیا ہے۔ بعض لوگوں نے اسے نصب دینا بھی جائز رکھا ہے۔ لیکن ویلاً کی قراءت نہیں۔

یہاں یہودیوں کے علما کی مذمت ہو رہی ہے کہ وہ اپنی باتوں کو خدا کا کلام کہتے تھے اور اپنے والوں کو خوش کر کے دنیا کماتے تھے ۔حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ تم اہل کتاب سے کچھ بھی کیوں پوچھو؟ خدا کی تازہ کتاب تمہارے ہاتھوں میں ہے۔ اہل کتاب نے تو کتاب اللہ میں تحریف کی' اپنی ہاتھوں سے لکھی ہوئی باتوں کو خدا کے طرف نسبت دے کر پھیلایا ۔پھر تمہیں اپنی محفوظ کتاب کو چھوڑ کر ان کی مبدل کتاب کی کیا ضرورت ہے؟ افسوس کہ وہ تم سے نہ پوچھیں اور تم ان سے دریافت کرتے پھرو ۔تھوڑے مول سے مراد یہ نسبت آخرت کے کمی ہے تو گو ساری دنیا مل جائے لیکن جنت کے مقابلہ میں وہ بے حد حقیر چیز ہے۔ پھر فرمایا کہ ان کے اس فعل کی وجہ سے کہ وہ اپنی باتوں کو خدا کی باتوں کی طرح لوگوں سے منواتے ہیں اور اس پر دنیا کماتے ہیں' ہلاکت اور بربادی ہے۔

وَقَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً ۭ قُلْ اَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللّٰهِ عَهْدًا فَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ عَهْدَهٗٓ اَمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝۸۰

اور یہودیوں نے (یہ بھی) کہا کہ ہرگز ہم کو آتش (دوزخ) چھوئے گی (بھی) نہیں مگر (بہت) تھوڑے روز جو (انگلیوں پر) شمار کر لئے جاسکیں ۔آپ یوں فرما دیجئے کیا تم لوگوں نے حق تعالیٰ سے (اس کے متعلق) کوئی معاہدہ لے لیا ہے۔ جس میں اللہ تعالیٰ اپنے معاہدہ کے خلاف نہ کریں گے ۔یا اللہ تعالیٰ کے ذمہ ایسی بات لگاتے ہو جس کی کوئی علمی سند اپنے پاس

نہیں رکھتے۔ ○

اللہ عزوجل کی جانب سے یہود کی ایک بے سروپا ''بڑ'' کا مسکت جواب ☆

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں' یہودی لوگ کہا کرتے تھے کہ دنیا کی کل مدت سات ہزار سال ہے۔ ہزاروں سال کے بدلے ایک دن ہمیں عذاب ہوگا۔ تو صرف سات دن ہمیں جہنم میں رہنا پڑے گا۔ اس قول کی تردید میں یہ آیتیں نازل ہوئیں۔ بعض لوگ کہتے ہیں یہ لوگ چالیس دن اپنا جہنم میں رہنا مانتے تھے کیونکہ ان کے بڑوں نے چالیس دن تک بچھڑے کی پوجا کی تھی۔ بعض کا قول ہے کہ یہ دھوکا انہیں اس سے لگا تھا کہ وہ کہتے تھے کہ تورات میں ہے۔ جہنم کے دونوں طرف زقوم کے درخت تک چالیس برس کا راستہ ہے تو وہ کہتے تھے کہ اس مدت کے بعد عذاب اُٹھ جائیں گے۔ ایک روایت میں ہے کہ انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے آ کر کہا کہ چالیس دن تک تو ہم جہنم میں رہیں گے' پھر دوسرے لوگ ہماری جگہ آ جائیں گے۔ یعنی آپ کی اُمت۔ آپ ﷺ نے ان کے سروں پر ہاتھ رکھ کر فرمایا' نہیں بلکہ تم ہمیشہ ہمیشہ جہنم میں پڑے رہو گے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں۔ فتح خیبر کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بطور ہدیہ کے بکری کا پکا ہوا گوشت زہر آلود آیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا' یہاں یہودیوں کو جمع کر لو پھر ان سے پوچھا تمہارا باپ کون ہے؟ انہوں نے کہا فلاں۔ آپ ﷺ نے فرمایا جھوٹے ہو' تمہارا باپ فلاں ہے۔ انہوں نے کہا' بجا ارشاد ہوا۔ وہی ہمارا باپ ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا' دیکھو اب میں تم سے کچھ اور پوچھتا ہوں' سچ سچ بتانا۔ انہوں نے کہا' اے ابوالقاسم (صلی اللہ علیہ وسلم) اگر جھوٹ بھی کہیں گے تو آپ ﷺ کے سامنے نہ چل سکے گا۔ ہم تو آزما چکے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: جہنمی کون لوگ ہیں؟ انہوں نے کہا کچھ دن تو ہم ہیں پھر آپ ﷺ کی اُمت۔ آپ ﷺ نے فرمایا پرے ہٹو ہرگز نہیں۔ پھر فرمایا اچھا بتلاؤ' اس گوشت میں تم نے زہر ملایا ہے۔ انہوں نے کہا' ہاں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا' کیوں؟ اگر آپ سچے ہیں تو یہ زہر ہرگز آپ کو ضرر نہ دے گا اور جھوٹے ہیں تو ہم آپ سے نجات حاصل کر لیں گے۔ (مسند احمد' بخاری' نسائی)

بَلٰى مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّاَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْٓئَتُهٗ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿٨١﴾ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿٨٢﴾

کیوں نہیں' جو شخص قصداً بری باتیں کرتا ہے اور اس کو اس کی خطا (اور قصور اس طرح) احاطہ کر لے (کہ کہیں نیکی کا اثر تک نہ رہے) سو ایسے لوگ اہل دوزخ ہوتے ہیں اور وہ اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے اور جو لوگ (اللہ اور رسول پر) ایمان لائیں اور نیک کام کریں ایسے لوگ اہل بہشت ہوتے ہیں (اور) وہ اس میں ہمیشہ (ہمیشہ) رہیں گے۔ ○

کئے گئے گناہوں کو کبھی حقیر نہیں سمجھنا چاہیے ☆

مطلب یہ ہے کہ جس کے اعمال سراسر بد ہیں' جو نیکیوں سے خالی ہاتھ ہے وہ جہنمی ہے اور جو شخص اللہ رسول پر ایمان لائے' اور سنت کے مطابق عمل کرے وہ جنتی ہے جیسے اور جگہ ہے: ﴿لَيْسَ بِاَمَانِيِّكُمْ ......﴾ (النساء: ۱۲۵) یعنی نہ تو تمہارے منصوبے چل سکیں گے

اور نہ اہل کتاب کے۔ ہر برائی کرنے والا اپنی برائی کا بدلہ پائے گا اور ہر بھلائی والا اپنی نیک کاری کا۔ بُرے کا کوئی مددگار نہ ہوگا' اور بھلے کا کوئی عمل برباد نہ ہوگا' نہ مرد کا نہ عورت کا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں' یہاں بُرائی سے مطلب کفر ہے اور ایک روایت میں ہے کہ مراد شرک ہے۔ ابووائل' ابوالعالیہ' مجاہد' عکرمہ' حسن' قتادہ' ربیع بن انس وغیرہ سے بھی مروی ہے۔ سدی کہتے ہیں مراد کبیرہ گناہ ہیں جو تہہ بہ تہہ ہو کر دل کی حالت خراب کر دیں۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ وغیرہ فرماتے ہیں' مراد شرک ہے جو دل پر قابض ہو جائے۔ ربیع ابن خثیم کا قول ہے جو گناہوں پر ہی مرے اور توبہ نصیب نہ ہو۔ مسند احمد میں ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں' گناہوں کو حقیر نہ سمجھا کرو۔ وہ جمع ہو کر انسان کی ہلاکت کا سبب بن جاتے ہیں۔ دیکھتے نہیں ہو کہ اگر کئی آدمی ایک ایک لکڑی لے آئیں تو انبار لگ جاتا ہے۔ پھر اگر آگ لگ جائے تو بڑی بڑی چیزوں کو وہ جلا کر خاکستر کر دیتی ہے۔ پھر ایمانداروں کا حال بیان فرمایا کہ جو تم جیسا عمل نہیں کرتے بلکہ تمہارے کفر کے مقابلہ میں ان کا ایمان ہے اور تمہاری بداعمالیوں کے مقابلے ان کے پاکیزہ اعمال ہیں' انہیں ابدی راحتیں اور ہمیشہ والی جنتیں ملیں گی۔ خدا کے عذاب اور ثواب دونوں پائیدار ہیں۔

وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَ بَنِيٓ إِسْرَآءِيلَ لَا تَعْبُدُونَ إِلَّا اللّٰهَ ۬ وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا وَّذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِينِ وَقُولُوا لِلنَّاسِ حُسْنًا وَّأَقِيمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ۭ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ إِلَّا قَلِيلًا مِّنْكُمْ وَأَنْتُمْ مُّعْرِضُونَ ﴿۸۳﴾

اور (وہ زمانہ یاد کرو) جب لیا ہم نے (توریت میں) قول و قرار بنی اسرائیل سے کہ عبادت مت کرنا (کسی کی) بجز اللہ تعالیٰ کے اور ماں باپ کی اچھی طرح خدمت گزاری کرنا اور اہل قرابت کی بھی اور بے باپ کے بچوں کی بھی اور غریب محتاجوں کی بھی اور عام لوگوں سے بات اچھی طرح (خوش خلقی سے) کہنا اور پابندی رکھنا نماز کی اور ادا کرتے رہنا زکوٰۃ پھر تم (قول و قرار کر کے) اس سے پھر گئے بجز معدودے چند کے اور تمہاری تو معمولی عادت ہے اقرار کر کے ہٹ جانا۔ ○

بنی اسرائیل سے چند عہد اور ان کی تفصیلات ☆

بنی اسرائیل کو جو حکم احکام دیئے گئے اور ان سے جن چیزوں پر عہد لیا گیا' ان کا بیان ہو رہا ہے اور ان کی عہد شکنی کا ذکر ہو رہا ہے۔ انہیں حکم دیا تھا کہ وہ توحید کو تسلیم کریں۔ خدا کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں۔ نہ صرف بنی اسرائیل کو بلکہ تمام مخلوق کو یہی حکم ہوا ہے۔ فرمان ہے: ﴿وَمَآ أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ إِلَّا نُوْحِيْٓ إِلَيْهِ أَنَّهٗ لَآ إِلٰهَ إِلَّآ أَنَا فَاعْبُدُوْنِ﴾ (الانبیاء: ۲۵) یعنی تمام رسولوں کو ہم نے یہی حکم دیا کہ وہ اعلان کر دیں کہ قابل عبادت میرے سوا کوئی نہیں۔ سب لوگ میری ہی عبادت کیا کریں اور پھر فرمایا: ﴿وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ أُمَّةٍ رَّسُوْلًا أَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ﴾ (النحل: ۳۶) یعنی ہم نے ہر اُمت میں رسول بھیجا کہ اللہ کی ہی عبادت کرو اور اس کے سوا دوسرے معبودان باطل سے بچو۔ سب سے بڑا حق اللہ تعالیٰ ہی کا ہے اور اس کے تمام حقوق میں بڑا حق یہی ہے کہ اس کی عبادت کی جائے اور دوسرے کسی کی عبادت نہ کی جائے۔ پھر حق تعالیٰ کے بعد حقوق العباد کا بیان ہو رہا ہے۔ بندوں کے حقوق میں ماں باپ کا حق چونکہ بہت بڑا ہے۔ اسی لئے پہلے ان کا حق بیان ہوا اور جگہ ارشاد ہے: ﴿أَنِ اشْكُرْ لِيْ وَلِوَالِدَيْكَ﴾ (لقمان: ۱۴) میرا شکر اور اپنے

ماں باپ کا بھی احسان مان اور فرمایا: ﴿وَقَضٰى رَبُّكَ......﴾ (بنی اسرائیل:۲۳) تیرے ربّ کا فیصلہ یہ فیصلہ ہے کہ اس کے سوا دوسرے کی عبادت نہ کر اور ماں باپ کے ساتھ احسان سلوک کرتے رہو۔ صحیحین میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے پوچھا 'یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کون سا عمل سب سے افضل ہے؟ آپ نے فرمایا نماز کو وقت پر ادا کرنا۔ پوچھا کہ اس کے بعد؟ فرمایا کہ ماں باپ کے ساتھ سلوک اور احسان کرنا۔ پوچھا پھر کون سا؟ فرمایا اللہ کی راہ میں جہاد کرنا اور ایک صحیح حدیث میں ہے۔ کسی نے کہا' حضور ﷺ میں کس کے ساتھ سلوک اور بھلائی کروں؟ آپ نے فرمایا اپنی ماں کے ساتھ' پوچھا پھر کس کے ساتھ؟ فرمایا اپنی ماں کے ساتھ' پھر پوچھا کس کے ساتھ؟ فرمایا اپنے باپ کے ساتھ۔ پھر اور قرابت داروں کے ساتھ (مسلم)۔ آیت میں لَا تَعْبُدُوْنَ فرمایا' اس کے لئے اس میں بہ نسبت لَا تَعْبُدُوْا کے مبالغہ زیادہ ہے۔ یہ خبر ہے لیکن اس کی معنی میں طلب کا مفہوم ہے۔ بعض لوگوں نے اَنْ لَّا تَعْبُدُوْنَ بھی پڑھا ہے۔ اُبی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے بھی مروی ہے کہ وہ لَا تَعْبُدُوْا پڑھتے تھے۔ یتیم اُن چھوٹے بچوں کو کہتے ہیں جن کا سرپرست باپ نہ ہو۔ مسکین ان لوگوں کو کہتے ہیں جو اپنی ماں اور اپنے بال بچوں کی پرورش اور دیگر ضروریات پوری طرح مہیا نہ کر سکتے ہوں۔ اس کی مزید تشریح ان شاء اللہ العظیم سورہ نساء کے اس معنی کی آیت میں آئے گی۔ پھر فرمایا لوگوں کو اچھی بات کہا کرو۔ یعنی ان کے ساتھ نرم کلامی اور کشادہ پیشانی کے ساتھ پیش آیا کرو۔ بھلی باتوں کا حکم دو۔ برائی سے روکو حضرت حسنؒ فرماتے ہیں بھلائی کا حکم دو برائی سے روکو۔ بُردباری درگزر اور خطاؤں سے معافی کو اپنا شیوہ بنالو۔ یہی اچھا خلق ہے جسے اختیار کرنا چاہئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ اچھی چیز کو حقیر نہ سمجھو۔ اگر اور کچھ نہ ہو سکے تو اپنے بھائیوں سے ہنستے ہوئے چہرے سے ملاقات تو کر لیا کرو۔ (مسند احمد) پس قرآن کریم نے پہلے اپنی عبادت کا حکم دیا۔ پھر لوگوں کے ساتھ بھلائی کرنے کا۔ پھر اچھی بات کہنے کا۔ پھر بعض اہم چیزوں کا ذکر بھی کر دیا کہ نمازیں پڑھو۔ زکوٰۃ دو۔ پھر خبر دی کہ ان لوگوں نے عہد شکنی کی اور عموماً نافرمان بن گئے مگر تھوڑے سے۔ اس اُمت کو بھی یہی حکم دیا گیا۔ فرمایا: ﴿وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا......﴾ (النساء:۳۶) اللہ کی عبادت کرو۔ اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو۔ ماں باپ کے ساتھ رشتہ داروں کے ساتھ' یتیموں کے ساتھ اور مسکینوں کے ساتھ' قرابت دار پڑوسیوں کے ساتھ' اجنبی پڑوسیوں کے ساتھ' ساتھ والوں کے ساتھ' مسافروں کے ساتھ' لونڈی غلاموں کے ساتھ' سلوک' احسان' بھلائی کیا کرو۔ یاد رکھو تکبر اور فخر کرنے والوں کو خدا پسند نہیں کرتا۔ الحمد للہ کہ یہ اُمت بہ نسبت اور امتوں کے ان فرمانوں کے ماننے میں' ان پر عمل پیرا ہونے میں زیادہ مضبوط ثابت ہوئی۔ اسد بن وداعہ سے مروی ہے کہ وہ یہودیوں اور نصرانیوں کو سلام کیا کرتے تھے اور دلیل یہ دیتے تھے کہ فرمان باری تعالیٰ ہے: ﴿وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا﴾ لیکن یہ اصل غریب ہے اور حدیث کے خلاف ہے۔ حدیث میں صاف موجود کہ یہود و نصاریٰ کو ابتداءً سلام علیک نہ کیا کرو۔ واللہ اعلم۔

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ لَا تَسْفِكُوْنَ دِمَآءَكُمْ وَلَا تُخْرِجُوْنَ اَنْفُسَكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ ثُمَّ اَقْرَرْتُمْ وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ ﴿۸۴﴾ ثُمَّ اَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ تَقْتُلُوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَتُخْرِجُوْنَ فَرِيْقًا مِّنْكُمْ مِّنْ دِيَارِهِمْ تَظٰهَرُوْنَ عَلَيْهِمْ بِالْاِثْمِ

وَالْعُدْوَانِ ۚ وَاِنْ يَّاْتُوْكُمْ اُسٰرٰى تُفٰدُوْهُمْ وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ اِخْرَاجُهُمْ ۚ اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ۚ فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ ۚ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۸۵﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ ۡ فَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿۸۶﴾

اور (وہ زمانہ بھی) یاد کرو جب ہم نے تم سے یہ قول وقرار (بھی) لیا کہ باہمی خونریزی مت کرنا اور ایک دوسرے کو ترک وطن مت کرانا۔ پھر تم نے اقرار بھی کر لیا اور (اقرار بھی ضمناً نہیں بلکہ ایسا صریح جیسے) تم شہادت دیتے ہو۔ پھر تم یہ آنکھوں کے سامنے موجود ہو (کہ) باہم قتل وقتال بھی کرتے ہو ایک دوسرے کو ترک وطن بھی کراتے ہو (اس طور پر کہ) ان اپنوں کے مقابلہ میں ان کی مخالف قوموں کی امداد کرتے ہو گناہ اور ظلم کے ساتھ اور ان لوگوں میں سے کوئی گرفتار ہو کر تم تک پہنچ جاتا ہے تو ایسوں کو کچھ خرچ کر کر رہا کرا دیتے ہو۔ حالانکہ یہ بات (بھی معلوم) ہے کہ تم کو ان کا ترک وطن کرا دینا نیز ممنوع ہے۔ کیا تو (پس یوں کہو کہ) کتاب (توریت) کے بعض احکام پر تم ایمان رکھتے ہو اور بعض پر ایمان نہیں رکھتے۔ سو اور کیا سزا ہو ایسے شخص کی جو تم لوگوں میں ایسی حرکت کرے بجز رسوائی کے دنیوی زندگانی میں اور روز قیامت کو بڑے سخت عذاب میں ڈال دیئے جاویں گے اور اللہ تعالیٰ (کچھ) بے خبر نہیں ہیں تمہارے اعمال (زشت) سے یہ وہ لوگ ہیں کہ انہوں نے دنیوی زندگی (کے خطوط) کو لے لیا ہے بعوض (نجات) آخرت کے سو نہ تو ان کی سزا میں (کچھ) تخفیف دی جائے گی اور نہ کوئی ان کی طرف داری (پیروی) کرنے پاوے گا۔ ○

مدینہ کے دو مشہور خاندان اور ان کی باہمی رقابتیں ☆

انصار مدینہ کے دو قبیلے تھے اوس اور خزرج۔ اسلام سے پہلے ان دونوں قبیلوں میں کبھی بنتی نہ تھی۔ ہمیشہ آپس میں جنگ وجدال رہتا تھا۔ مدینہ کے یہودیوں کے تین قبیلے تھے۔ بنی قینقاع' بنونضیر اور بنو قریظہ' بنو قینقاع اور بنو نضیر تو خزرج کے طرفدار تھے اور ان کے بھائی بند بنے ہوئے تھے بنو قریظہ کا بھائی چارہ اوس کے ساتھ تھا۔ جب اوس اور خزرج میں جنگ کی ٹھہرتی تو یہودیوں کے یہ تینوں گروہ بھی اپنے اپنے حلیف کا ساتھ دیتے اور ان سے مل کر ان کے دشمن سے لڑتے۔ دونوں طرف کے یہودی یہودیوں کے ہاتھ سے مارے بھی جاتے اور موقعہ پا کر ایک دوسرے کے گھروں کو بھی اُجاڑ ڈالتے اور دیس نکالا بھی دے دیا کرتے تھے اور مال ودولت پر بھی قبضہ لیا کرتے تھے۔ جب لڑائی موقوف ہوتی تو فریق مغلوب قیدیوں کا فدیہ دے کر چھڑا لیتے اور کہتے کہ ہمیں اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ ہم میں سے جب کوئی قید ہو جائے تو ہم فدیہ دے کر چھڑا لیں۔ اس پر جناب باری انہیں فرماتا ہے کہ اس کی کیا وجہ ہے کہ میرے اس حکم کو تو تم نے مان لیا لیکن میں نے کہا تھا کہ آپس میں کسی کو قتل بھی نہ کرو نہ گھروں سے نکالو اُسے کیوں نہیں مانتے؟ کسی حکم پر ایمان لانا اور کسی کو نہ ماننا' یہ کہاں کی ایمانداری ہے؟ آیت میں فرمایا کہ اپنے خون نہ بہاؤ اور اپنے آپ کو اپنے گھروں سے نہ نکالو۔ یہ اس لئے کہ ہم مذہب سارے کے

سارے مانند ایک جان کے ہیں۔ حدیث میں بھی ہے کہ تمام ایمان دار دوستیوں' صلہ رحمی اور رحم و کرم میں مثل ایک جسم کے ہیں۔ کسی ایک عضو کے درد سے تمام جسم بے تاب ہو جاتا ہے۔ بخار چڑھ آتا ہے۔ راتوں کو نیند اچاٹ ہو جاتی ہے (بخاری) اسی طرح ایک ادنیٰ مسلمان کے لئے سارے جہان کے مسلمانوں کو تڑپ اُٹھنا چاہئے۔

عبد خیرؒ کہتے ہیں ہم سلمان بن ربیع کی ماتحتی میں بلنجر میں جہاد کر رہے تھے محاصرہ کے بعد ہم نے اس شہر کو فتح کیا۔ جس میں بہت سے قیدی بھی ملے۔ حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان میں ایک یہودیہ لونڈی کو سات سو میں خریدا۔ راس الجالوت کے پاس جب ہم پہنچے تو حضرت عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس کے پاس گئے اور فرمایا یہ لونڈی تیری ہم مذہب ہے' میں نے اسے سات سو میں خریدا ہے۔ اب تم اسے مجھ سے خرید لو اور آزاد کر دو۔ اس نے کہا بہت اچھا' میں چودہ سو دیتا ہوں۔ آپ نے فرمایا' میں تو چار ہزار سے کم میں نہیں بیچوں گا۔ اس نے کہا پھر میں نہیں خریدوں گا۔ آپ نے کہا سن! یا تو تُو خرید کر' ورنہ تیرا دین جاتا رہے گا۔ تورات میں لکھا ہوا ہے کہ بنو اسرائیل کا کوئی بھی شخص گرفتار ہو جائے تو اسے خرید کر آزاد کیا کرو۔ اگر وہ قیدی ہو کر تمہارے پاس آئیں تو فدیہ دے کر چھڑا لیا کرو اور انہیں ان کے گھروں سے بے گھر بھی نہ کیا کرو۔ اب یا تو تورات کو مان کر تو اسے خرید' یا تورات کا منکر بن۔ وہ سمجھ گیا اور کہنے لگا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم شاید عبداللہ بن سلامؓ ہو۔ آپ نے فرمایا ہاں۔ چنانچہ وہ چار ہزار لے آیا آپ نے دو ہزار لے لئے اور دو ہزار لوٹا دیئے۔

بعض اور روایتوں میں ہے کہ راس الجالوت کوفہ میں تھا۔ یہ اُن لونڈیوں کا فدیہ نہیں دیتا تھا جو عرب سے نہ بچی ہوں۔ اس پر حضرت عبداللہ نے اسے تورات کی یہ آیت سنائی۔ غرض اس آیت میں یہودیوں کی مذمت کی ہے کہ وہ احکام خدا کو جانتے ہوئے پھر بھی پس پشت ڈال دیا کرتے تھے۔ امانتداری اور ایمانداری ان سے اُٹھ چکی تھی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی صفتیں' آپ کی نشانیاں' آپ کی نبوت کی تصدیق آپ کی جائے پیدائش' جائے ہجرت وغیرہ وغیرہ۔ سب چیزیں ان کی کتاب میں موجود تھیں لیکن یہ اُن سب کو چھپائے ہوئے تھے اور اتنا ہی نہیں بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کرتے تھے۔ اسی باعث ان پر دنیوی رسوائی آئی اور کم نہ ہونے والے اور ہمیشگی والے اخروی عذاب بھی۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَقَفَّيْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ بِالرُّسُلِ ۡ وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ؕ اَفَكُلَّمَا جَآءَكُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰٓى اَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ ۚ فَفَرِيْقًا كَذَّبْتُمْ ۡ وَفَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ ﴿۸۷﴾

اور ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو کتاب (تورات) دی اور (پھر) ان کے بعد یکے بعد دیگرے پیغمبروں کو بھیجتے رہے اور (پھر) ہم نے عیسیٰ بن مریم کو (نبوت کے) واضح دلائل عطا فرمائے اور ہم نے اُن کو روح القدس سے تائید دی کیا جب کبھی (بھی) کوئی پیغمبر تمہارے پاس ایسے احکام لائے جن کو تمہارا دل نہ چاہتا تھا۔ جب (ہی) تم نے تکبر کرنا شروع کر دیا سو بعضوں کو تو تم نے جھٹلا دیا اور بعضوں کو (بے دھڑک) قتل ہی کر ڈالتے تھے۔ ○

بنی اسرائیل کی ہٹ دھرمی اور تکبّر کا بیان ☆

بنی اسرائیل کے عناد و تکبر اور ان کی خواہش پرستی کا بیان ہو رہا ہے کہ تورات کی تحریف و تبدیل کی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد انہی کی شریعت پر جو اور انبیاء آئے ان کی بھی مخالفت کی۔ چنانچہ فرمایا: ﴿اِنَّا اَنْزَلْنَا التَّوْرٰىةَ..... ﴾ (المائدہ ۴۴) یعنی ہم نے تورات نازل فرمائی۔ جس میں ہدایت تھی اور نور تھا۔ جس پر اور انبیاء بھی اسلام لا کر یہودیوں کو حکم دیتے رہے۔ ان کے علماء اور درویش بھی ان کے ماننے کا حکم کرتے تھے۔ غرض پے در پے یکے بعد دیگرے انبیائے کرام بنی اسرائیل میں آتے رہے۔ یہاں تک کہ یہ سلسلہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ختم ہوا۔ انہیں انجیل ملی جس میں بعض احکام تورات کے بھی خلاف تھے۔ اسی لئے انہیں نئے نئے معجزات بھی ملے۔ جیسے مردوں کو بحکم خدا زندہ کر دینا۔ مٹی سے پرند بنا کر اس میں پھونک مار کر بحکم خدا اُڑا دینا' بیماریوں کو اپنے دم کر دینے سے خدا کے حکم سے اچھا کر دینا۔ بعض بعض غیب کی خبریں خدا کے معلوم کرانے سے دینا وغیرہ۔ پھر آپ کی تائید پر روح القدس یعنی حضرت جبرئیلؑ کو لگا دیا لیکن بنی اسرائیل اپنی تکذیب اور تکبر میں اور بڑھ گئے اور حسد کرنے لگے اور ان تمام انبیاء کرام کے ساتھ برے سلوک سے پیش آئی۔ کہیں جھٹلاتے تھے کہیں مار ڈالتے تھے۔ محض اس بنا پر کہ انبیاء کی تعلیم ان کی طبیعتوں کے خلاف ہوا کرتی تھی۔ ان کی رائے اور ان کے قیاسات اور ان کے بتائے ہوئے اصول و احکام اس کی قبولیت سے مانع ہوتے تھے۔ اس لئے دشمنی پر تل جاتے تھے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہما' حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما' محمد بن کعب' اسمٰعیل بن خالد' سدی' ربیع بن انس' عطیہ' عوفی اور قتادہؒ وغیرہ کا قول یہی ہے کہ روح القدس سے مراد حضرت جبرئیلؑ ہیں۔ جیسے قرآن شریف میں اور جگہ ہے: ﴿نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ﴾ (الشعراء: ۱۹۳) یعنی اسے لے کر روح الامین اترتے ہیں۔

صحیح بخاری میں تعلیقاً مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حسان شاعر کے لئے مسجد میں منبر رکھوایا۔ وہ مشرکین کی ہجو کا جواب دیتے تھے اور آپ ان کے لئے دعا کرتے تھے کہ خدایا حسان کی مدد روح القدس سے کر۔ جیسے کہ یہ تیرے نبی کی طرف سے جواب دیتے ہیں۔ صحیحین کی ایک اور حدیث میں ہے کہ حضرت حسان رضی اللہ تعالیٰ عنہ خلافت فاروقی کے زمانے میں ایک مرتبہ مسجد نبوی میں کچھ اشعار پڑھ رہے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے آپ کی طرف تیز نگاہیں اُٹھائیں تو آپ نے فرمایا' میں اس وقت بھی ان شعروں کو یہاں پڑھتا تھا جب تم سے بہتر شخص موجود تھے۔ پھر حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طرف دیکھ کر فرمایا' ابو ہریرہ تمہیں خدا کی قسم' کیا تم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے نہیں سنا؟ کہ حسان تو مشرکوں کے اشعار کا جواب دے۔ خدایا تو حسان کی تائید روح القدس سے کر۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا' ہاں خدا کی قسم میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ سنا ہے۔

بعض روایتوں میں یہ بھی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حسانؓ تم ان مشرکوں کی ہجو کرو۔ جبرئیل بھی تمہارے ساتھ ہیں۔ حضرت حسان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے شعر میں بھی جبریل علیہ السلام کو روح القدس کہا گیا ہے۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ جب یہودیوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روح کی بابت پوچھا تو آپ نے فرمایا تمہیں خدا کی قسم خدا کی نعمتوں کو یاد کر کے کہو کیا خود تمہیں معلوم نہیں کہ وہ جبریل ہیں اور وہی میرے پاس وحی لاتے ہیں۔ اُن سب سے کہا ہاں بے شک۔ (ابن اسحاق) ابن حبان میں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں' جبریل علیہ السلام نے میرے دل میں کہا کہ کوئی شخص اپنی روزی اور زندگی پوری کئے بغیر نہیں مرتا۔ اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو اور دنیا کمانے میں دین کا خیال رکھو۔

بعضوں نے روح القدس سے مراد اسم اعظم لیا ہے۔ بعضوں نے کہا ہے فرشتوں کا ایک سردار فرشتہ ہے۔ بعض کہتے ہیں' قدس

سے مراد اللہ تعالیٰ اور روح سے مراد جبریل علیہ السلام ہیں۔ کسی نے کہا ہے قدس یعنی برکت‘ کسی نے کہا ہے پاک‘ کسی نے کہا روح سے مراد انجیل ہے۔ جیسے فرمایا: ﴿وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا﴾ (الشوریٰ:۵۲) یعنی اسی طرح ہم نے تیری طرف روح کی وحی اپنے حکم سے کی۔ امام ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ کا فیصلہ یہی ہے کہ یہاں مراد روح القدس سے حضرت جبریل علیہ السلام ہیں۔ جیسے اور جگہ ہے: ﴿اِذْ اَيَّدْتُّكَ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ...... ﴾ (المائدہ:۱۱۰) اس آیت میں روح القدس کی تائید کے ذکر کے ساتھ کتاب وحکمت تورات و انجیل کے سکھانے کا بیان بھی ہے۔ معلوم ہوا کہ یہ اور چیز ہے اور وہ اور چیز اور روحانی عبادت بھی اس کی تائید کرتی ہے۔ قدس سے مراد مقدس ہے جیسے: ﴿حَاتِمِ جُوْدٌ﴾ اور ﴿رَجُلُ صِدْقٍ﴾ میں روح القدس کہنے میں اور رُوْحٌ مِّنْهُ کہتے ہیں۔ ایک خصوصیت قربت اور بزرگی کی پائی جاتی ہے۔ یہ اس لئے بھی کہا گیا ہے۔ بعض مفسرین نے اس سے مراد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی روح لی ہے کیونکہ ان کی روح انسانی پیٹھ وغیرہ سے پاک صاف اور الگ تھلگ رہی تھی۔ پھر فرمایا کہ ایک فرقے کو تم نے جھٹلایا اور ایک فرقہ کو قتل کرتے ہو۔ جھٹلانے میں ماضی کا صیغہ لائے لیکن قتل میں مستقبل کا۔ اس لئے ان کا حال آیت نزول کے بعد بھی یہی رہا۔ چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مرض الموت میں فرمایا کہ اس زہر آلود لقمہ کا اثر برابر مجھ پر رہا جو میں نے خیبر میں کھایا تھا اس وقت اس نے رگ رگ کر جان کاٹ دی۔ (بخاری)

وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ۭ بَلْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ فَقَلِيْلًا مَّا يُؤْمِنُوْنَ ۸۸

اور وہ (یہودی افتخاراً) کہتے ہیں کہ ہمارے قلوب محفوظ ہیں بلکہ ان کے کفر کے سبب ان پر خدا کی مار ہے سو بہت ہی تھوڑا سا ایمان رکھتے ہیں۔ ○

مُہر لگی ہونے کا مفہوم ☆

یہودیوں کا ایک قول یہ بھی تھا کہ ہمارے دلوں پر غلاف ہیں۔ یعنی یہ علم سے بھرپور ہیں۔ اب ہمیں نئے علم کی ضرورت نہیں۔ اس لئے جواب ملا کہ یوں نہیں بلکہ لعنت خدائی کی مہر لگ گئی ہے۔ ایمان نصیب ہی نہیں ہوتا۔ غُلْفٌ کو غُلُفٌ بھی پڑھا گیا ہے۔ یعنی یہ علم کے برتن ہیں اور جگہ قرآن کریم میں ہے: ﴿وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا فِيْٓ اَكِنَّةٍ ...... ﴾ (حم السجدۃ:۵) یعنی جس چیز کی طرف تم ہمیں بلاتے ہو۔ اس چیز سے ہمارے دل پردے اور آڑ میں ہیں۔ اُن پر مہر لگی ہوئی ہے۔ وہ اُسے نہیں سمجھتے اور نہ اس کی طرف مائل ہوتے ہیں نہ اُسے یاد رکھتے ہیں۔ ایک حدیث میں بھی ہے کہ بعض دل غلاف والے ہیں۔ جن پر غضب خدا ہوتا ہے۔ یہ دل کفار کے ہوتے ہیں۔ (احمد) سورہ نساء میں بھی ایک آیت اسی معنی کی ہے: ﴿وَقَوْلِهِمْ قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ...... ﴾ (النساء:۱۵۵) تھوڑا ایمان لانے کے ایک معنی تو یہ ہے کہ ان میں سے بہت کم لوگ ایماندار ہیں اور دوسرے معنی یہ بھی ہیں کہ ان کا ایمان بہت کم ہے۔ یعنی قیامت ثواب عذاب وغیرہ کے قائل حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان رکھنے والے تورات کو خدائی کتاب ماننے والے ہیں مگر اس پیغمبر آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم کو مان کر اپنا ایمان پورا نہیں کرتے بلکہ آپ ﷺ کے ساتھ کفر کر کے اس تھوڑے ایمان کو بھی غارت اور برباد کر دیتے ہیں۔ تیسرے معنی یہ ہیں کہ یہ سرے سے بے ایمان ہیں۔ کیوں کہ عربی زبان میں ایسے موقع پر بالکل نہ ہونے کی صورت میں بھی ایسے الفاظ بولے جاتے ہیں۔ مثلاً میں نے اس جیسا بہت ہی کم دیکھا۔ مطلب یہ ہے کہ دیکھا ہی نہیں۔ واللہ اعلم۔

وَلَمَّا جَآءَهُمْ كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ ۙ وَكَانُوْا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۚ فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ ۫ فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ﴿٨٩﴾

اور جب ان کو ایک ایسی کتاب پہنچی (یعنی قرآن) جو منجانب اللہ ہے (اور) اس کی (بھی) تصدیق کرنے والی ہے جو پہلے سے ان کے پاس ہے (یعنی تورات) حالانکہ اس کے قبل وہ (خود) بیان کیا کرتے تھے کفار سے پھر جب وہ چیز آ پہنچی جس کو وہ (خوب جانتے) پہچانتے ہیں تو اس کا (صاف) انکار کر بیٹھے سو (بس) خدا کی مار ہو ایسے منکروں پر۔ ○

یہود کو آنحضور ﷺ کا انتظار تھا ☆

جب کبھی یہودیوں اور عرب کے مشرکین کے درمیان لڑائی ہوتی تو یہود کہا کرتے تھے کہ عنقریب خدا کی سچی کتاب لے کر ایک عظیم الشان پیغمبر تشریف لانے والے ہیں۔ ہم ان کے ساتھ ہو کر تمہیں قتل و غارت کریں گے کہ تمہارا نام ونشان مٹا دے گے۔ اللہ تعالیٰ سے دعائیں کیا کرتے تھے کہ خدایا تو اس نبی کو جلد بھیج۔ جس کی صفتیں ہم تورات میں پاتے ہیں۔ تاکہ ہم اُن پر ایمان لا کر ان کے ساتھ ہو کر اپنا بازو مضبوط کر کے تیرے دشمن سے انتقام لیں۔ مشرکوں کو کہا کرتے تھے کہ اس نبی کا زمانہ اب بالکل قریب آ گیا ہے۔ لیکن جس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے' تمام نشانیاں آپ ﷺ میں دیکھ لیں' پہچان لیا' دل سے قائل ہو گئے مگر چونکہ آپ عرب میں سے تھے' حسد کر کے آپ ﷺ کی نبوت کا انکار کر دیا اور اللہ تعالیٰ کی لعنت میں آ گئے۔ بلکہ وہ مشرکین مدینہ جو ان سے یہ سنتے چلے آتے تھے' انہیں ایمان نصیب ہوا اور بالآخر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہو کر وہ یہود پر غالب آ گئے۔

ایک مرتبہ حضرت معاذ بن جبل' حضرت بشیر بن براء' حضرت داؤد بن سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے ان یہود مدینہ سے کہا کہ تم تو ہماری شرک کی حالت میں ہم سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا ذکر کیا کرتے تھے۔ بلکہ ہمیں ڈرایا کرتے تھے۔ جو جو اوصاف تم حضرت کے بیان کرتے تھے۔ وہ تمام اوصاف آپ ﷺ میں ہیں۔ پھر تم خود ایمان کیوں نہیں لاتے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ کیوں نہیں دیتے؟ تو سلام بن مشکم نے جواب دیا کہ ہم انہیں نہیں کہتے تھے۔ اسی کا ذکر اس آیت میں ہے کہ پہلے سے مانتے تھے' منتظر تھے۔ لیکن آنے کے بعد حسد اور تکبر سے اپنی ریاست کے کھوئے جانے کے خیال سے صاف انکار کر بیٹھے۔ (طبری)

بِئْسَمَا اشْتَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ اَنْ يَّكْفُرُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بَغْيًا اَنْ يُّنَزِّلَ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۚ فَبَآءُوْ بِغَضَبٍ عَلٰى غَضَبٍ ۭ وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴿٩٠﴾

وہ حالت (بہت ہی) بُری ہے جو کو اختیار کر کے وہ اپنی جانوں کو چھڑانا چاہتے ہیں (اور وہ حالت) یہ (ہے) کہ انکار

کرتے ہیں ایسی چیز کا جو حق تعالیٰ نے نازل فرمائی محض (اسی) ضد پر کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے جس بندہ پر اس کو منظور ہو نازل فرمادے۔ سو وہ لوگ غضب بالائے غضب کے مستحق ہو گئے اور ان کفر کرنے والوں کو ایسی سزا ہو گی جس میں ذلت بھی ہے۔ ○

غضب بالائے غضب ☆

مطلب یہ ہے کہ ان یہودیوں نے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق کے بدلے تکذیب کی اور آپ ﷺ پر ایمان لانے کے بدلے کفر کیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نصرت و امداد کے بدلے مخالفت اور دشمنی کی اور اس وجہ سے اپنے آپ کو جس غضب الٰہی کا سزاوار بنایا' یہ بدترین چیز ہے' جو بہترین چیز کے بدلے انہوں نے لی اور اس کی وجہ سوا حسد و بغض تکبر و عناد کے اور کچھ نہیں۔ چونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان میں سے نہ تھے بلکہ آپ عرب میں سے تھے۔ اس لئے یہ منہ چڑھا کر بیٹھ گئے۔ حالانکہ اللہ پر کوئی حاکم نہیں۔ وہ رسالت کے حقدار کو خوب جانتا ہے۔ وہ اپنا فضل و کرم اپنے جس بندہ کو چاہے' عطا فرماتا ہے۔ پس ایک تو تورات کے احکام کی پابندی نہ کرنے کی وجہ سے ان پر غضب تھا ہی۔ اب دوسرا حضور ﷺ کے ساتھ کفر کرنے سے نازل ہوا۔ یا یوں سمجھ لیجئے کہ اوّل غضب حضرت عیسٰی علیہ السلام کی پیغمبری نہ ماننے کا اور دوسرا غضب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پیغمبری نہ ماننے کا یا پہلا غضب وہ جو بچھڑے کے پوجنے کی وجہ سے تھا۔ دوسرا غضب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کی بنا پر۔

چونکہ یہ حسد و بغض کی وجہ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت سے انکاری ہوئے تھے اور اس حسد و بغض کا اصلی باعث ان کا تکبر تھا۔ اس لئے انہیں ذلیل عذابوں میں مبتلا کیا۔ تاکہ گناہ کا پورا بدلہ ہو جائے' جیسے فرمان ہے: ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِيْ سَيَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دٰخِرِيْنَ﴾ (المؤمن: ۶۰) میری عبادت سے جو بھی تکبر کرے' وہ ذلیل ہو کر جہنم میں داخل ہوگا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں' متکبر لوگوں کا حشر قیامت کے دن انسانی صورت میں چیونٹیوں کی طرح ہوگا۔ جنہیں تمام چیزیں روندتی ہوئی چلیں گی اور جہنم کے بوس نامی قید خانے میں ڈال دیئے جائیں گے۔ جہاں کی آگ جہنم کی دوسری آگ سے تیز ہو گی اور جہنمیوں کا لہو پیپ وغیرہ انہیں پلایا جائے گا۔ (ترمذی)

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا نُؤْمِنُ بِمَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَيَكْفُرُوْنَ بِمَا وَرَآءَهٗ ۗ وَهُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَهُمْ ۗ قُلْ فَلِمَ تَقْتُلُوْنَ اَنْۢبِيَآءَ اللّٰهِ مِنْ قَبْلُ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۹۱﴾ وَلَقَدْ جَآءَكُمْ مُّوْسٰى بِالْبَيِّنٰتِ ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْ بَعْدِهٖ وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿۹۲﴾

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ تم ایمان لاؤ ان (تمام) کتابوں پر جو اللہ تعالیٰ نے (متعدد پیغمبروں پر) نازل فرمائی ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم (تو صرف) اس (ہی) کتاب پر ایمان لائیں گے جو ہم پر نازل کی گئی ہے (یعنی تورات) اور جتنی اس کے علاوہ ہیں ان کا سب کا وہ انکار کرتے ہیں۔ حالانکہ وہ بھی حق ہیں اور تصدیق کرنے والی بھی ہیں اس کی جو ان کے پاس ہے

(یعنی تورات کی) آپ کہئے کہ (اچھا تو) پھر کیوں قتل کیا کرتے تھے اللہ کے پیغمبروں کو اس کے قبل کے زمانہ میں اگر تم تورات پر ایمان رکھنے والے تھے اور حضرت موسیٰ (علیہ السلام) تم لوگوں کے پاس صاف صاف دلیلیں لائے (مگر) اس پر بھی تم لوگوں نے گوسالہ کو (معبود) تجویز کرلیا موسیٰ علیہ السلام کے طور پر جانے کے بعد اور تم ستم ڈھار ہے تھے۔ ○

یہود کا نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے سے انکار' توراۃ وانجیل پر ایمان نہ لانے کے مترادف ہے ☆

یعنی جب ان سے قرآن پر اور نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کو کہا جاتا ہے تو کہہ دیتے ہیں کہ ہمیں تورات انجیل پر ایمان رکھنا کافی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ اس میں بھی جھوٹے ہیں' قرآن تو ان کتابوں کی تصدیق کرنے والا ہے اور خود ان کی کتابوں میں بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق موجود ہے۔ جیسے فرمایا: ﴿اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ﴾ (البقرہ: ۱۴۶) یعنی اہل کتاب آپ کو اس طرح جانتے ہیں' جس طرح کوئی اپنی اولاد کو پہچانتا ہو۔ پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے انکار سے تورات انجیل پر بھی ایمان نہ رہا۔ اس بحث کو قائم کر کے اب دوسری طرح حجت قائم کی جاتی ہے کہ اچھا تورات انجیل پر تو تمہارا ایمان ہے۔ پھر اگلے انبیاء جو ان کی تصدیق اور تابعداری کرتے ہوئے نئی شریعت اور نئی کتاب بغیر آئے تم نے انہیں کیوں قتل کیا؟ معلوم ہوا کہ تمہارا ایمان نہ تو اس کتاب پر ہے نہ اس کتاب پر۔ تم محض خواہش کے بندے' نفس کے غلام' اپنی رائے قیاس کے تحت ہو۔ پھر فرمایا' اچھا موسیٰ علیہ السلام سے تو تم نے بڑے بڑے معجزات دیکھے۔ طوفان' ٹڈیاں' جوئیں' مینڈک' خون وغیرہ ان کی بدعا سے بطور معجزے کے ظاہر ہوئے۔ لکڑی کا سانپ بننا' ہاتھ کا روشن چاند کی طرح بن جانا' دریا کو چیر دینا اور پانی کو پتھر کی طرح بنا دینا' بادلوں کا سایہ کرنا' من وسلویٰ اتارنا' پتھر سے نہریں جاری کرنا وغیرہ وغیرہ تمام بڑے بڑے معجزات جو ان کی نبوت کی اور خدا کی توحید کی روشن دلیلیں تھیں۔ سب کچھ اپنی آنکھوں دیکھے لیکن ادھر حضرت موسیٰ علیہ السلام طور پہاڑ پر گئے اُدھر تم نے بچھڑے کو خدا بنا لیا۔ اب بتاؤ کہ تورات پر اور خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر تمہارا ایمان کہاں رہا؟ کیا یہ بدکاریاں تمہیں ظالم کہلوانے والی نہیں؟ مِنْۢ بَعْدِهٖ سے مراد موسیٰ علیہ السلام کے طور پر جانے کے بعد ہے۔

جیسے اور جگہ ہے: ﴿وَاتَّخَذَ قَوْمُ مُوْسٰى ...... ﴾ (الاعراف: ۱۴۸) یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے طور پر جانے کے بعد آپ کی قوم نے بچھڑے کو معبود بنا لیا اور اپنی جانوں پر اس گوسالہ پرستی سے صریح ظلم کیا جس کا احساس بعد میں خود انہیں بھی ہوا۔ جیسے فرمایا: ﴿وَلَمَّا سُقِطَ فِيْٓ اَيْدِيْهِمْ ...... ﴾ (الاعراف: ۱۴۹) یعنی جب انہیں ہوش آیا' نادم ہوئے اور اپنی گمراہی کو محسوس کرنے لگے۔ اس وقت کہا کہ خدایا اگر تو ہم پر رحم نہ کرے گا اور ہماری خطا نہ بخشے گا تو ہم زیاں کار ہو جائیں گے۔

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ ۭ خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاسْمَعُوْا ۭ قَالُوْا سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا ۤ وَاُشْرِبُوْا فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْعِجْلَ بِكُفْرِهِمْ ۭ قُلْ بِئْسَمَا يَاْمُرُكُمْ بِهٖٓ اِيْمَانُكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۹۳

اور جب ہم نے تمہارا قول وقرار لیا تھا اور طور کو تمہارے سروں کے اوپر لا کھڑا کیا تھا لو جو کچھ (احکام) ہم تم کو دیتے ہیں' ہمت (اور پختگی) کے ساتھ اور سنو۔ اس وقت انہوں نے زبان سے کہہ دیا کہ ہم نے سن لیا اور ہم سے عمل نہ ہوگا اور (وجہ اس کی یہ

ہے) کہ ان کے قلوب میں وہی گوسالہ پیوست ہو گیا تھا اس کے کفر (سابق) کی وجہ سے۔ آپ فرما دیجئے کہ یہ افعال بہت بُرے ہیں جن کی تعلیم تمہارا ایمان تم کو کر رہا ہے اگر تم اہل ایمان۔ O

ایک کان سے سننا اور دوسرے سے نکال دینا ☆

اللہ تبارک وتعالیٰ بنی اسرائیل کی خطائیں' مخالفتیں' سرکشی اور حق سے روگردانی بیان فرما رہا ہے کہ طور پہاڑ جب سروں پر دیکھا تو اقرار کیا لیکن جب ہٹ گیا تو پھر منکر ہو گئے۔ اس کی تفسیر پہلے بیان ہو چکی ہے۔ بچھڑے کی محبت ان کے دلوں میں رچ گئی۔ جیسے کہ حدیث میں ہے۔ کسی چیز کی محبت انسان کو اندھا بہرا بنا دیتی ہے۔ (ابوداؤد) حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس بچھڑے کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے جلا کر اس کی راکھ کو ہوا میں اُڑا کر دریا میں ڈال دیا تھا۔ جس پانی کو بنی اسرائیل نے پی لیا اور اس کا اثر ان پر ظاہر ہوا۔ گو بچھڑا نیست و نابود کر دیا گیا لیکن ان کے دلوں کا تعلق اب بھی اس معبود باطل سے لگا رہا۔ دوسری آیت کا مطلب یہ ہے کہ تم ایمان کا دعویٰ کس طرح کرتے ہو؟ اپنے ایمان پر نظر نہیں ڈالتے؟ بار بار کی عہد شکنی اور موقعہ موقعہ کے کفر کیا بھول گئے؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سامنے تم نے کفر کیا۔ ان کے بعد پیغمبروں کے ساتھ تم نے سرکشی کی۔ یہاں تک کہ افضل النبیین ختم المرسلین حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کو بھی نہ مانا جو سب سے بڑا کفر ہے۔

قُلْ اِنْ كَانَتْ لَكُمُ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ عِنْدَ اللّٰهِ خَالِصَةً مِّنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۹۴﴾ وَلَنْ يَّتَمَنَّوْهُ اَبَدًا بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ ۗ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ بِالظّٰلِمِيْنَ ﴿۹۵﴾ وَلَتَجِدَنَّهُمْ اَحْرَصَ النَّاسِ عَلٰى حَيٰوةٍ ۚ وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا ۚ يَوَدُّ اَحَدُهُمْ لَوْ يُعَمَّرُ اَلْفَ سَنَةٍ ۚ وَمَا هُوَ بِمُزَحْزِحِهٖ مِنَ الْعَذَابِ اَنْ يُّعَمَّرَ ۗ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ﴿۹۶﴾

آپ کہہ دیجئے کہ اگر (بقول تمہارے) عالم آخر محض تمہارے ہی لئے نافع ہے بلا شرکت غیرے تو تم (اس کی تصدیق کے لئے ذرا) موت کی تمنا کر (کے دکھلا) دو اگر تم سچے ہو اور وہ ہرگز کبھی اس (موت) کی تمنا نہ کریں گے بوجہ (خوف سزا) ان اعمال (کفریہ) کے جو اپنے ہاتھوں سمیٹے ہیں اور حق تعالیٰ کو خوب اطلاع ہے ان ظالموں (کے حال) کی اور آپ (تو) ان کو حیات (دنیویہ) کا حریص (عام) آدمیوں سے (بھی) بڑھ کر پائیں گے اور مشرکین سے بھی ان میں کا ایک ایک (شخص) اس ہوس میں ہے کہ اس کی عمر ہزار برس کی ہو جائے اور یہ اگر عذاب سے تو نہیں بچا سکتا کہ (کسی کی بڑی) عمر ہو جائے اور حق تعالیٰ کے سب پیش نظر ہیں اُن کے اعمال (بد)۔ O

یہود کو دعوتِ مباہلہ ☆

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ ان یہودیوں کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانی پیغام دیا گیا کہ اگر تم سچے ہو

تو مقابلہ کے لئے آ ؤ ۔ تم اور ہم مل کر اللہ تعالیٰ سے دعا کریں کہ وہ ہم میں سے جھوٹے کو ہلاک کر دے ۔ لیکن ساتھ ہی پیش گوئی بھی کر دی کہ یہ لوگ ہرگز اس پر آمادہ نہیں ہونے کے ۔ چنانچہ یہی ہوا کہ یہ لوگ مقابلہ پر نہ آئے ۔ (ابن ابی حاتم) اس لئے کہ وہ دل سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اور آسمانی کتاب قرآن کریم کو سچا جانتے تھے ۔ اگر یہ لوگ اس اعلان کے ماتحت مقابلہ میں نکلتے تو سب کے سب ہلاک ہو جاتے ۔ روئے زمین پر ایک یہودی باقی نہ رہتا ۔ ایک مرفوع حدیث میں بھی آیا ہے کہ اگر یہودی مقابلہ پر آتے اور جھوٹے کے لئے موت طلب کرتے تو سب کے سب مر جاتے اور اپنی جگہ جہنم میں دیکھ لیتے ۔ اسی طرح جو نصرانی آپ کے پاس آئے تھے ۔ وہ بھی اگر مباہلہ کے لئے تیار ہوتے تو وہ لوٹ کر اپنے اہل وعیال اور مال و دولت کا نام ونشان تک نہ پاتے ۔ (مسند احمد)

سورہ جمعہ میں بھی اسی طرح دعوت انہیں دی گئی ہے آیت: ﴿قُلْ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ هَادُوْٓا﴾ (آیت:٦) آخر تک پڑھیے ۔ ان کا دعویٰ تھا کہ: ﴿نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ﴾ (المائدة:١٨) ہم تو اللہ کی اولاد ہیں اور اس کے پیارے ہیں ۔ یہ کہا کرتے تھے: ﴿لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى﴾ (البقرة:١١١) جنت میں صرف یہودی اور نصاریٰ ہی جائیں گے ۔ اس لئے انہیں کہا گیا کہ آ ؤ اس کا فیصلہ اس طرح کر لیں کہ دونوں فریق میدان میں نکل کر خدا سے دعا کریں کہ ہم میں سے جھوٹے کو ہلاک کر ڈالے لیکن چونکہ اس جماعت کو اپنے جھوٹ کا یقین تھا ۔ یہ اس کے لئے تیار نہ ہوئے اور ان کا کذب سب پر کھل گیا ۔ اسی طرح جب نجران کے نصرانی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے ۔ بحث مباحثہ ہو چکا تو اسے بھی یہی کہا گیا کہ: ﴿تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَآءَنَا وَاَبْنَآءَكُمْ ...... ﴾ (آل عمران:٦١) آ ؤ ہم تم دونوں اپنی اپنی اولادوں' بیویوں کو لے کر نکلیں اور اللہ تعالیٰ سے دعا کریں کہ وہ جھوٹوں پر اپنی لعنت نازل فرمائے لیکن وہ آپس میں کہنے لگے کہ ہرگز اس نبی سے مباہلہ نہ کرو ۔ ورنہ فوراً برباد ہو جاؤ گے ۔ چنانچہ مباہلہ سے انکار کر دیا ۔ صلح کر لی اور دب کر جزیہ دینا منظور کر لیا ۔ آپ نے حضرت ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ان کے ساتھ امین بنا کر بھیج دیا ۔ اسی طرح مشرکین عرب سے بھی کہا گیا ہے: ﴿قُلْ مَنْ كَانَ فِي الضَّلٰلَةِ فَلْيَمْدُدْ لَهُ الرَّحْمٰنُ مَدًّا﴾ (المریم:٧٥) یعنی ہم میں سے جو گمراہ ہو اللہ تعالیٰ اس کی گمراہی بڑھا دے ۔ اس کی پوری تفصیل اس آیت کے ساتھ بیان ہو گی ان شاء اللہ تعالیٰ ۔ مندرجہ بالا آیت کی تفسیر میں ایک مرجوع قول یہ بھی ہے کہ تم خود اپنی جانوں کے لئے موت طلب کرو کیونکہ بقول تمہارے آخرت کی بھلائی صرف تمہارے لئے ہے ۔ انہوں نے اس سے انکار کیا لیکن یہ قول کچھ دل کو نہیں لگتا ۔ اس لئے کہ بہت سے اچھے اور نیک آدمی بھی زندگی چاہتے ہیں ۔ بلکہ حدیث میں ہے کہ تم میں سے بہتر وہ ہے جس کی لمبی عمر ہوئی ہو اور اعمال اچھے ہوں ۔ (ترمذی) علاوہ ازیں یہی قول یہودی بھی کہہ سکتے تھے تو بات فیصل کن نہ ہوتی ۔ ٹھیک تفسیر وہی ہے جو پہلے بیان ہوئی کہ دونوں فریق مل کر جھوٹے کی ہلاکت اور اس کی موت کی دعا کریں اس اعلان کے سنتے ہی یہود تو ٹھنڈے پڑ گئے اور تمام لوگوں پر ان کا جھوٹ کھل گیا اور وہ پیش گوئی بھی سچی ثابت ہوئی کہ یہ لوگ ہرگز موت کی تمنا نہیں کریں گے ۔ اس مباہلہ کا نام اصطلاح میں تَمَنّٰى رکھا گیا لیکن ہر فریق باطل پرست کی موت کی آرزو کرتا ہے ۔ پھر فرمایا یہ تو مشرکین سے بھی زیادہ طول عمر کے خواہاں ہیں' کیونکہ ان کفار کے لئے دُنیا جنت ہے اور اُن کی تمنا اور کوشش ہے کہ یہاں زیادہ رہیں ۔ حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں' منافق کو حیات دنیوی کی حرص کافر سے بھی زیادہ ہوتی ہے ۔ یہ یہودی تو ایک ایک ہزار سال کی عمریں چاہتے ہیں ۔ حالانکہ یہ لمبی عمر بھی انہیں عذابوں سے نجات نہیں دے سکتی چونکہ کفار کو تو آخرت پر یقین ہی نہیں ہوتا' اور انہیں تھا ۔ پھر ان کی سیاہ کاریاں بھی سامنے تھیں ۔ اس لئے موت سے بہت دوڑتے تھے لیکن ابلیس کے برابر بھی عمر پالیں تو کیا ہوا عذاب سے تو نہیں بچ سکتے ۔ اللہ تعالیٰ ان کے اعمال سے بے خبر نہیں ۔ تمام بندوں کے تمام بھلے برے اعمال کو وہ بخوبی جانتا ہے اور ویسا ہی بدلہ دے گا ۔

قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ فَإِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ بِإِذْنِ اللّٰهِ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَهُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۹۷﴾ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَرُسُلِهٖ وَجِبْرِيْلَ وَمِيْكٰلَ فَإِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلْكٰفِرِيْنَ ﴿۹۸﴾

آپ (ان سے) یہ کہیے کہ جو شخص جبریل سے عداوت رکھے سو انہوں نے یہ قرآن آپ کے قلب تک پہنچا دیا ہے۔ خداوندی حکم سے (سو) اسکی (خود) یہ حالت ہے کہ تصدیق کر رہا ہے اپنے سے قبل والی (سماوی) کتابوں کی اور رہنمائی کر رہا ہے اور خوشخبری سنا رہا ہے ایمان والوں کو۔ جو (کوئی) شخص خدا تعالیٰ کا دشمن ہو اور فرشتوں کا (ہو) اور پیغمبروں کا (ہو) اور جبریل کا (ہو) اور میکائیل کا (ہو) تو اللہ تعالیٰ دشمن ہے ایسے کافروں کا۔ ○

امام ابو جعفر طبری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس پر مفسرین کا اتفاق ہے کہ جب یہودیوں نے حضرت جبریل کو اپنا دشمن اور حضرت میکائیل کو اپنا دوست بتلایا تھا۔ اس وقت ان کے جواب میں آیت نازل ہوئی لیکن بعض کہتے ہیں کہ امر نبوت کے بارے میں جو گفتگو ان کی حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ہوئی تھی۔ اس میں انہوں نے یہ کہا تھا۔ بعض کہتے ہیں حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ان کو جو مناظرہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے بارے میں ہوا تھا۔ اس میں انہوں نے یہ کہا تھا۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر چند دلائل ☆ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں' یہودیوں کی ایک جماعت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئی اور کہا کہ ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے چند سوال کرتے ہیں' جن کے صحیح جواب نبی کے بغیر کوئی نہیں جانتا۔ اگر آپ سچے نبی ہیں تو ان کے جوابات دیجئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا' بہتر ہے جو چاہو پوچھو' مگر عہد کرو کہ اگر میں ٹھیک ٹھاک جواب دوں گا تو تم میری نبوت کا اقرار کرو گے اور میری فرماں برداری میں لگ جاؤ گے؟ انہوں نے اس کا وعدہ کیا اور عہد دیا۔ آپ نے حضرت یعقوبؑ کی طرح خدا کی شہادت کے ساتھ ان سے پختہ وعدہ لے کر انہیں سوال کرنے کی اجازت دی۔ انہوں نے کہا پہلے تو یہ بتائیے کہ تورات نازل ہونے سے پہلے حضرت اسرائیل علیہ السلام نے اپنے نفس پر کس چیز کو حرام کیا تھا؟ آپ نے فرمایا' سنو حضرت یعقوب علیہ السلام عرق النساء کی بیماری میں سخت بیمار ہوئے تو نذر مانی کہ اگر خدا مجھے اس مرض سے شفا دے گا تو اپنی سب سے زیادہ مرغوب چیز کھانے کی اور سب سے زیادہ محبوب چیز پینے کی چھوڑ دوں گا۔ جب تندرست ہو گئے تو اونٹ کا گوشت کھانا اور اونٹنی کا دودھ پینا' جو آپ کے پسند خاطر تھا' چھوڑ دیا۔ تمہیں خدا کی قسم' جس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر تورات اتاری' بتاؤ یہ سچ ہے؟ ان سب نے قسم کھا کر کہا کہ ہاں حضور سچ ہے' بجا ارشاد ہوا۔ اچھا اب ہم پوچھتے ہیں کہ عورت مرد کے پانی کی کیا کیفیت ہے؟ اور کیوں کبھی لڑکا پیدا ہوتا ہے اور کبھی لڑکی؟ آپ نے فرمایا' سنو! مرد کا پانی گاڑھا اور سفید ہوتا ہے اور عورت کا پانی پتلا اور زردی مائل ہوتا ہے۔ جو پانی غالب آ جائے' اسی کے مطابق پیدائش ہوتی ہے اور شبیہ بھی۔ جب مرد کا پانی عورت پر غالب آ جائے تو حکم خداوندی سے اولاد نرینہ ہوتی ہے اور عورت کا پانی مرد کے پانی پر غالب آ جائے تو حکم خداوندی سے اولاد لڑکی ہوتی ہے۔ تمہیں خدا کی قسم' جس کے سوا کوئی معبود برحق نہیں' سچ بتاؤ میرا جواب صحیح ہے؟ سب نے قسم کھا کر اقرار کیا کہ آپ نے بجا ارشاد فرمایا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں باتوں پر خدا کو گواہ کیا۔ انہوں نے کہا کہ اچھا اب یہ فرمائیے گا کہ تورات میں جس نبی اُمّی کی خبر ہے' اس کی خاص نشانی کیا ہے اور اس کے پاس کونسا فرشتہ وحی لے کر آتا ہے؟ آپ نے فرمایا' اس کی

خاص نشانی یہ ہے کہ اس کی آنکھیں جب سوئی ہوئی ہوں' اُس کا دل جاگتا رہتا ہے۔ تمہیں اس ربّ کی قسم' جس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تورات دی' بتاؤ تو میں نے ٹھیک جواب دیا؟ سب نے قسم کھا کر کہا کہ آپ نے بالکل صحیح جواب دیا۔ اب ہمارے اس سوال کی دوسری شق کا جواب بھی عنایت فرما دیجئے۔ اسی پر بحث کا خاتمہ ہے۔ آپ نے فرمایا میرا ولی جبرئیل ہے وہی میرے پاس وحی لاتا ہے اور وہی تمام انبیائے کرام کے پاس پیغام باری لاتا رہا ہے۔ سچ کہو اور قسم کھا کر کہو کہ میرا یہ جواب بھی درست ہے؟ انہوں نے قسم کھا کر کہا کہ جواب تو درست ہے لیکن چونکہ جبریل ہمارا دشمن ہے وہ سختی اور خونریزی وغیرہ لے کر آتا رہتا ہے اس لئے ہم اس کی نہیں مانیں گے نہ آپ کی مانیں گے۔ ہاں اگر آپ کے پاس حضرت میکائیل علیہ السلام وحی لے کر آتے' جو رحمت' بارش' پیداوار وغیرہ لے کر آتے ہیں۔ جو ہمارے دوست ہیں' تو ہم آپ کی تابعداری اور تصدیق کرتے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

بعض روایتوں میں ہے کہ انہوں نے یہ بھی سوال کیا تھا کہ رعد کیا چیز ہے؟ آپ نے فرمایا وہ ایک فرشتہ ہے جو بادلوں پر مقرر ہے۔ جو اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق انہیں اِدھر اُدھر لے جاتا ہے۔ انہوں نے کہا یہ گرج آواز کیا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا' یہ اسی فرشتے کی آواز ہے۔ ملاحظہ ہو مسند احمد وغیرہ۔

صحیح بخاری کی ایک روایت میں ہے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لائے۔ اس وقت حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنے باغ میں تھے اور یہودیت پر تھے۔ آپ نے جب یہ خبر سنی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوئے اور کہا کہ حضور ﷺ تین باتیں پوچھتا ہوں' جن کا جواب نبیوں کے سوا کسی کے پاس نہیں۔ یہ فرمائیے کہ قیامت کی پہلی شرط کیا ہے؟ اور جنتیوں کا پہلا کھانا کیا ہے؟ اور کونسی چیز بچہ کو کبھی ماں کی طرف کھینچتی ہے اور کبھی باپ کی طرف؟ آپ نے فرمایا' ان تینوں سوالوں کے جواب ابھی ابھی جبریل علیہ السلام نے مجھے بتلائے ہیں' سنو! حضرت عبداللہ نے کہا وہ تو ہمارا دشمن ہے۔ آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی۔ پھر فرمایا پہلی نشانی قیامت کی ایک آگ ہے جو لوگوں کے پیچھے لگے گی اور انہیں مشرق سے مغرب کی طرف اکٹھا کر دے گی۔ جنتیوں کی پہلی خوراک مچھلی کی کلیجی ہے۔ اولاد کے سلسلہ میں مرد کا پانی عورت کے پانی پر سبقت لے جاتا ہے تو لڑکا پیدا ہوتا ہے اور جب عورت کا پانی مرد کے پانی پر سبقت لے جاتا ہے تو لڑکی ہوتی ہے۔ یہ جواب سنتے ہی حضرت عبداللہ بن سلام مسلمان ہو گئے اور پکار اُٹھے: اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنَّكَ رَسُوْلُ اللّٰهِ پھر کہنے لگے حضور ﷺ یہودی بڑے بیوقوف لوگ ہیں' اگر انہیں پہلے سے میرا اسلام لانا معلوم ہو جائے گا تو وہ مجھے بُرا کہنے لگیں گے۔ آپ پہلے انہیں قائل معقول تو کیجئے۔ آپ کے پاس جب یہ یہودی آئے تو آپ نے ان سے پوچھا کہ عبداللہ بن سلام تم میں کیسے شخص ہیں؟ کہا بڑے بزرگ اور باخبر آدمی ہیں۔ بزرگوں کی اولاد میں سے ہیں۔ وہ تو ہمارے سردار ہیں اور سرداروں کی اولاد میں سے ہیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا اچھا اگر وہ مسلمان ہو جائیں تو پھر تمہیں اسلام کے قبول کرنے میں تامل نہ ہوگا؟ وہ کہنے لگے اعوذ باللہ' اعوذ باللہ وہ آخر مسلمان ہی کیوں ہونے لگے۔ حضرت عبداللہ جواب تک چھپے ہوئے تھے' باہر آ گئے اور زور سے کلمہ پڑھنے لگے۔ پس یہ سارے کے سارے شور مچانے لگے کہ یہ خود بھی برا ہے اور اس کے باپ دادے بھی برے تھے۔ یہ بڑا نیچے درجہ کا آدمی ہے اور خاندانی کمینہ ہے۔ حضرت عبداللہ نے فرمایا' حضور ﷺ اسی چیز کا مجھے ڈر تھا۔

صحیح بخاری میں ہے حضرت عکرمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں: جِبْرِ' مِيْكَ' اِسْرَاف کے معنی عبد یعنی بندہ کے ہیں اور ایل کے معنی اللہ ہیں تو جبرئیل وغیرہ کے معنی عبداللہ کے ہوئے۔ بعض لوگوں نے اس کے خلاف معنی بھی کئے ہیں' وہ کہتے ہیں ایل کے معنی عبد کے ہیں اور ان سے پہلے کے الفاظ خدا کے نام کے ہیں۔ جیسے عربی میں عبداللہ' عبدالرحمٰن' عبدالملک' عبدالقدوس وعبدالسلام' عبدالکافی'

عبدالجلیل وغیرہ۔ لفظ عبد ہر جگہ باقی رہا اور خدا کے نام بدلتے رہے۔ اسی طرح ایل ہر جگہ باقی ہی اور خدا کے اسمائے حسنہ بدلتے رہتے ہیں۔ غیر عربی زبان میں مضاف الیہ پہلے آتا ہے اور مضاف بعد میں۔ اسی قاعدے کے مطابق ان ناموں میں بھی جیسے جبرائیل' میکائیل' اسرافیل' عزرائیل وغیرہ۔

اب مفسرین کی دوسری جماعت کی دلیل سنئے' جو کہتے ہیں کہ یہ گفتگو حضرت عمرؓ سے ہوئی تھی۔ شعبی کہتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ روحاء میں آئے۔ دیکھا کہ لوگ دوڑ بھاگ کر ایک پتھر کے تودے کے پاس جا کر نماز ادا کر رہے ہیں۔ پوچھا کہ یہ کیا بات ہے؟ جواب ملا کہ اس جگہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز ادا کی ہے۔ آپ ناراض ہوئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو جہاں کہیں نماز کا وقت آتا پڑھ لیا کرتے تھے۔ پھر چلے جایا کرتے تھے۔ اب ان مقامات کو متبرک سمجھ کر خواہ مخواہ وہیں جا کر نماز ادا کرنا کس نے بتلایا؟ پھر آپ اور باتوں میں لگ گئے۔ فرمانے لگے میں یہودیوں کے مجمع میں کبھی کبھی چلا جایا کرتا اور یہ دیکھتا رہتا تھا کہ کس طرح قرآن تورات کو اور تورات قرآن کو سچا بتا رہی ہے۔ یہودی بھی مجھ سے محبت ظاہر کرنے لگے اور اکثر بات چیت ہوا کرتی تھی۔ ایک دن میں ان سے باتیں کر ہی رہا تھا کہ راستے سے حضور ﷺ نکلے۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ تمہارے نبی وہ جا رہے ہیں۔ میں نے کہا خیر میں جاتا ہوں۔ لیکن یہ تو بتلاؤ' تمہیں اللہ واحد قسم خدا کے حق یاد کرو اور خدا کی نعمتوں پر نظر رکھو۔ خدا کی کتاب تم میں موجود ہونے کا خیال رکھ کر اسی رب کی قسم کھا کر کہو کہ کیا تم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو رسول نہیں مانتے۔ اب سب خاموش ہو گئے۔ اُن کے بڑے عالم نے جو اُن سب میں علم میں بھی کامل تھا اور سب کا سردار بھی تھا۔ اُن سے کہا اتنی سخت قسم اس نے دی ہے کیوں تم صاف اور سچا جواب نہیں دیتے؟ انہوں نے کہا حضرت آپ ہی ہمارے بڑے ہیں' ذرا آپ ہی جواب دیجئے۔ اس لاٹ پادری نے کہا' سنئے جناب! آپ نے زبردست قسم دی ہے' سچ تو یہ ہے کہ ہم دل سے جانتے ہیں کہ حضور ﷺ خدا کے سچے رسول ہیں۔ میں نے کہا' افسوس جب جانتے ہو تو مانتے کیوں نہیں ہو؟ کہا صرف اس وجہ سے کہ ان کے پاس وحی آسمانی لے کر آنے والے جبریل علیہ السلام ہیں۔ وہ نہایت سختی' تنگی' شدتِ عذاب اور تکلیف کے فرشتے ہیں۔ ہم ان کے اور وہ ہمارے دشمن ہیں۔ اگر وحی لے کر حضرت میکائیل آتے' جو رحمت و رافت' تخفیف و راحت والے فرشتے ہیں تو ہمیں ماننے میں بھی تامل نہ ہوتا۔ میں نے کہا اچھا بتلاؤ تو ان دونوں کی خدا کے نزدیک کیا کچھ قدر و منزلت ہے؟ انہوں نے کہا کہ ایک تو جناب باری کے داہنے بازو کی طرف ہے اور دوسرا دوسری طرف میں نے کہا کہ اس خدا کی قسم جس کے سوا اور کوئی معبود نہیں' جو ان میں سے کسی کا دشمن ہو اس کا دشمن خدا بھی ہے اور دوسرا فرشتہ بھی۔ جبریل کے دشمن سے میکائیل دوستی نہیں رکھ سکتے اور میکائیل کا دشمن جبریل کا دوست نہیں ہو سکتا۔ نہ ان میں سے کسی کا دشمن خدا کا دوست ہو سکتا ہے۔ نہ ان دونوں میں سے کوئی بے اجازت باری تعالیٰ کی زمین پر آ سکتا ہے۔ نہ کوئی کام کر سکتا ہے۔ واللہ مجھے نہ تم سے لالچ ہے نہ خوف ہے۔ سنو جو شخص اللہ تعالیٰ کا دشمن ہو۔ اس کے فرشتوں' اس کے رسولوں اور جبریل و میکائیل کا دشمن ہو تو ایسے کافر کا خدا بھی دشمن ہے۔ اتنا کہہ کر میں چلا آیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچا تو آپ نے مجھے دیکھتے ہی فرمایا' اے ابن خطاب! مجھ پر تازہ وحی نازل ہوئی ہے۔ میں نے کہا حضور سنائیے۔ آپ نے یہی آیت پڑھ کر سنائی۔ میں نے کہا حضور آپ پر میرے ماں باپ قربان' یہی باتیں ابھی ابھی یہودیوں سے میری ہو رہی تھیں میں تو چاہتا ہی تھا بلکہ اسی لئے حاضر خدمت ہوا تھا کہ آپ کو خبر کر دوں۔ مگر میرے آنے سے پہلے لطیف خبیر سننے جاننے والے خدا نے آپ کو خبر پہنچا دی۔ ملاحظہ ہو ابن ابی حاتم وغیرہ۔ مگر یہ روایت منقطع ہے سند متصل نہیں۔ شعبی نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا زمانہ نہیں پایا۔

آیت کا مطلب یہ ہے کہ جبریل علیہ السلام خدا کے امین فرشتے ہیں۔ اللہ کے حکم سے آپ کے دل میں خدا کی وحی پہنچانے

مقرر ہیں۔ وہ فرشتوں میں سے خدا کے رسول ہیں۔ کسی ایک رسول سے عداوت رکھنے والا سب رسولوں کی عداوت رکھنے والا ہے۔ جیسے ایک رسول پر ایمان سب رسولوں پر ایمان لانے کا نام ہے اور ایک رسول کے ساتھ کفر تمام نبیوں کے ساتھ کفر کرنے کے برابر ہے۔ خود خدا تعالیٰ نے بعض رسولوں کے نہ ماننے والوں کو کوکافر بتایا ہے۔ فرمایا ہے: ﴿اِنَّ الَّذِیْنَ یَکْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَیُرِیْدُوْنَ ...﴾ (النساء ۱۵۸) یعنی جو لوگ اللہ تعالیٰ کے ساتھ اور اس کے رسولوں کے ساتھ کفر کرتے ہیں اور اللہ اور اس کے درمیان تفریق کرنا چاہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم بعض کو مانتے ہیں اور بعض کو نہیں مانتے۔ دوسری آیت کے آخر تک۔ پس ان آیتوں میں صراحتہً ان لوگوں کو کافر کہا جو کسی رسول کو نہ مانیں۔ اسی طرح جبریل کا دشمن اللہ کا دشمن ہے کیونکہ وہ اپنی مرضی سے نہیں آتے قرآن فرماتا ہے: ﴿وَمَا نَتَنَزَّلُ اِلَّا بِاَمْرِ رَبِّكَ﴾ (مریم:۶۴) فرماتا ہے: ﴿وَاِنَّهٗ لَتَنْزِیْلُ﴾ (الشعراء:۱۹۲) یعنی ہم اللہ کے سوا نہیں اُترتے۔ یہ نازل کیا ہوا ربّ العالمین کا ہے۔ جسے لے کر روح الامین آتے ہیں اور تیرے دل میں ڈالتے ہیں تاکہ لوگوں کو ہوشیار کر دے۔ صحیح بخاری کی حدیث قدسی میں ہے'میرے دوستوں سے دشمنی کرنے والا مجھ سے لڑائی کرنے کا اعلان کرنے والا ہے۔ (بخاری) قرآن کریم میں یہ بھی ایک صفت ہے کہ وہ اپنے سے پہلے کے تمام ربانی کلام کی تصدیق کرتا ہے اور ایمانداروں کی ہدایت اور ان کے لئے جنت کی خوشخبری دیتا ہے۔ فرمایا: ﴿هُوَ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا هُدًى وَّشِفَآءٌ﴾ (حم السجدۃ:۴۴) فرمایا: ﴿وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ﴾ یعنی یہ قرآن ایمان والوں کے لئے ہدایت و شفا ہے۔ رسولوں میں انسانی رسول اور ملکی رسول سب شامل ہیں۔ جیسے فرمایا: ﴿اللّٰهُ یَصْطَفِیْ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا وَّمِنَ النَّاسِ﴾ اللہ تعالیٰ فرشتوں میں سے اور انسانوں میں سے اپنے رسول چھانٹ لیتا ہے۔ جبریل اور میکائیل بھی فرشتوں میں سے ہیں لیکن ان کا خاص طور پر اس لئے نام لیا تاکہ مسئلہ بالکل صاف ہو جائے اور یہودی جان لیں کہ ان میں سے ایک کا دشمن دوسرے کا دشمن ہے۔ بلکہ خدا بھی اس کا دشمن ہے۔ حضرت میکائیل علیہ السلام بھی کبھی کبھی انبیاءؑ کے پاس آتے رہے ہیں۔ جیسے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شروع شروع میں تھے لیکن اس کام پر مقرر حضرت جبریل علیہ السلام ہیں۔ جیسے حضرت میکائیل علیہ السلام روئیدگی اور بارش وغیرہ اور جیسے حضرت اسرافیل علیہ السلام صور پھونکنے پر۔ ایک صحیح حدیث میں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رات کو جب جاگتے' تب یہ دعا پڑھتے: اَللّٰهُمَّ رَبَّ جِبْرَائِیْلَ وَمِیْکَائِیْلَ وَاِسْرَافِیْلَ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ عَالِمَ الْغَیْبِ وَالشَّهَادَةِ اَنْتَ تَحْکُمُ بَیْنَ عِبَادِكَ فِیْمَا کَانُوْا فِیْهِ یَخْتَلِفُوْنَ اِهْدِنِیْ لِمَا اخْتُلِفَ فِیْهِ مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِكَ اِنَّكَ تَهْدِیْ مَنْ تَشَآءُ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ۔ (مسلم) اے اللہ! اے جبریل میکائیل کے ربّ' اے زمین و آسمان کے پیدا کرنے والے' اے چھپے کھلے کے جاننے والے اپنے بندوں کے اختلاف کا فیصلہ تو ہی کرتا ہے۔ خدایا اختلافی امور میں اپنے حکم سے حق کی طرف میری رہبری کر۔ تو جسے چاہے سیدھی راہ دکھاتا ہے۔ لفظ جبریل وغیرہ کی تحقیق اور اس کے معانی پہلے بیان ہو چکے ہیں۔ حضرت عبدالعزیز بن عمر فرماتے ہیں' فرشتوں میں حضرت جبریل کا نام خادم اللہ ہے۔ ابوسلیمان دارانی یہ سن کر بہت ہی خوش ہوئے اور فرمانے لگے یہ ایک روایت میری روایتوں کے ایک دفتر سے مجھے زیادہ محبوب ہے۔ جبریل اور میکائیل کے لفظ میں بہت سارے لغت ہیں اور مختلف قراءت ہیں جن کے بیان کی مناسب جگہ کتب لغت ہیں۔ ہم انہیں بیان کر کے کتاب کو طویل کرنا نہیں چاہتے کیونکہ کسی معنی کی سمجھ یا کسی حکم کا مفاد ان پر موقوف نہیں۔ اللہ ہماری مدد کرے۔ ہمارا بھروسہ اور توکل اسی کی ذات پر ہے۔ آیت کے خاتمہ میں یہ نہیں فرمایا کہ اللہ بھی ان لوگوں کا دشمن ہے۔ بلکہ فرمایا اللہ کافروں کا دشمن ہے۔ اس میں ایسے لوگوں کا حکم بھی معلوم ہو گیا۔ اسے عربی میں مضمر کی جگہ مظہر کہتے ہیں اور کلام عرب میں اکثر اس کی مثالیں شعروں میں بھی پائی جاتی ہے۔ گویا یوں کہا جاتا ہے کہ جس نے اللہ کے دوست سے دشمنی کی' اس نے اللہ سے دشمنی کی اور جو اللہ کا

دشمن' اللہ بھی اس کا دشمن اور جس کا دشمن خود خدا ہو جائے' اس کے کفر و بربادی میں کیا شبہ رہ گیا؟ صحیح بخاری کی حدیث پہلے گزر چکی ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے' میرے دوستوں سے دشمنی رکھنے والے کو میں اعلان جنگ دیتا ہوں اور حدیث میں ہے' میں اپنے دوستوں کا بدلہ لے لیا کرتا ہوں اور حدیث میں ہے' جس کا دشمن میں ہو جاؤں وہ برباد ہو کر ہی رہتا ہے۔

وَلَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ ۚ وَمَا يَكْفُرُ بِهَآ اِلَّا الْفٰسِقُوْنَ ﴿۹۹﴾ اَوَكُلَّمَا عٰهَدُوْا عَهْدًا نَّبَذَهٗ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ ۭ بَلْ اَكْثَرُھُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۰۰﴾ وَلَمَّا جَاۗءَھُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَھُمْ نَبَذَ فَرِيْقٌ مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ ڎ كِتٰبَ اللّٰهِ وَرَاۗءَ ظُهُوْرِھِمْ كَاَنَّھُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۰۱﴾ وَاتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ عَلٰي مُلْكِ سُلَيْمٰنَ ۚ وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ ۤ وَمَآ اُنْزِلَ عَلَي الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ ھَارُوْتَ وَمَارُوْتَ ۭ وَمَا يُعَلِّمٰنِ مِنْ اَحَدٍ حَتّٰى يَقُوْلَآ اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ ۭ فَيَتَعَلَّمُوْنَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُوْنَ بِهٖ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهٖ ۭ وَمَا ھُمْ بِضَاۗرِّيْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ وَيَتَعَلَّمُوْنَ مَا يَضُرُّھُمْ وَلَا يَنْفَعُھُمْ ۭ وَلَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ اشْتَرٰىهُ مَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ڟ وَلَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَھُمْ ۭ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۰۲﴾ وَلَوْ اَنَّھُمْ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَمَثُوْبَةٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ خَيْرٌ ۭ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۰۳﴾

اور ہم نے تو آپ کے پاس بہت سے دلائل واضح نازل کئے ہیں اور کوئی انکار نہیں کیا کرتا مگر صرف وہی لوگ جو عدول حکمی کے عادی ہیں۔ کیا اور جب کبھی بھی ان لوگوں نے کوئی عہد کیا ہوگا (ضرور) اس کو ان میں سے کسی نہ کسی فریق نے نظر انداز کر دیا ہوگا بلکہ ان میں زیادہ تو ایسے ہی نکلیں گے جو (میرے اس عہد کا) یقین ہی نہیں رکھتے اور جب ان کے پاس ایک پیغمبر

آ ئے اللہ کی طرف سے جو تصدیق بھی کر رہے ہیں اس کتاب کی جو ان لوگوں کے پاس ہے (یعنی تورات کی) ان اہل کتاب میں کے ایک فریق نے خود اس کتاب اللہ کو ہی پس پشت ڈال دیا۔ جیسے ان کو گویا اصلاً علم ہی نہیں اور انہوں نے ایسی چیز کا (یعنی سحر کا) اتباع کیا۔ جس کا چرچا کیا کرتے تھے شیاطین (یعنی خبیث جن) حضرت سلیمان (علیہ السلام) کے عہد سلطنت میں اور حضرت سلیمان علیہ السلام نے کفر نہیں کیا مگر (ہاں) شیاطین کفر کیا کرتے تھے اور حالت یہ تھی کہ آ دمیوں کو بھی (اس) سحر کی تعلیم کیا کرتے تھے اور اس (سحر) کا بھی جو کہ ان دونوں فرشتوں پر نازل کیا گیا تھا شہر بابل میں' جن کا نام ہاروت اور ماروت تھا اور وہ دونوں کسی کو نہ بتلاتے تھے جب تک یہ (نہ) کہہ دیتے کہ ہمارا وجود بھی ایک امتحان ہے سو تو کہیں کافر مت بن جائیو (کہ اس میں پھنس جاوے) سو بعضے لوگ ان دونوں سے اس قسم کا سحر سیکھ لیتے تھے' جن کے ذریعے سے (عمل کر کے) کسی مرد اور اس کی بیوی میں تفریق پیدا کر دیتے تھے اور یہ ساحر لوگ اس کے ذریعے سے کسی کو بھی ضرر نہیں پہنچا سکتے مگر خدا ہی کے (تقدیری) حکم سے اور ایسی چیز سیکھ لیتے ہیں جو (خود) ان کو ضرر رساں ہیں اور ان کو نافع نہیں ہیں اور ضرور یہ (یہودی) بھی اتنا جانتے ہیں کہ جو شخص اس کو اختیار کرے ایسے شخص کا آخرت میں کوئی حصہ (باقی) نہیں اور بے شک بری ہے وہ چیز جس میں وہ لوگ اپنی جان دے رہی ہیں۔ کاش کہ ان کو (اتنی) عقل ہوتی اور اگر وہ لوگ (بجائے اس کے) ایمان اور تقویٰ (اختیار) کرتے تو خدا تعالیٰ کے ہاں کا معاوضہ بہتر تھا کاش اُن کو (اتنی) عقل ہوتی۔ ○

قرآن ایک زندہ جاوید معجزہ ☆

یعنی اے محمد ﷺ ہم نے ایسی نشانیاں جو آپ ﷺ کی نبوت کی صریح دلیل بن سکیں' نازل فرمادی ہیں۔ یہودیوں کی مخصوص معلومات کا ذخیرہ' ان کی کتاب کی پوشیدہ باتیں' اُن کی تحریف وتبدیلی احکام وغیرہ سب ہم نے اپنی معجزنما کتاب قرآن کریم میں بیان فرما دیئے ہیں۔ جنہیں سن کر ہر زندہ ضمیر آپ کی نبوت کی تصدیق کے لئے مجبور ہو جاتا ہے۔ ہاں یہ اور بات ہے کہ یہودیوں کو ان کا حسد و بغض روک دے۔ ورنہ ہر شخص جان سکتا ہے کہ ایک اُمی شخص سے ایسا پاکیزہ خوبیاں والا' حکمتوں والا کلام بن نہیں سکتا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ ابن صوریا قطوینی نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا تھا کہ آپ ﷺ کوئی ایسی چیز نہیں لائے جسے ہم پہچان لیں۔ نہ آپ ﷺ کے پاس کوئی ایسی روشن دلیلیں ہیں۔ اس پر یہ آیت پاک نازل ہوئی۔ چونکہ یہودیوں نے اس بات سے انکار کر دیا تھا کہ ہم سے پیغمبر آخرالزماں کی بابت کوئی عہد لیا گیا ہو۔ اس پر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ تو ان کی عادت ہی ہے کہ عہد کیا اور توڑا۔ بلکہ ان کے اکثر تو ایمان سے خالی ہیں۔ نَبَذَ کے معنی پھینک دینا ہے۔ چونکہ ان لوگوں نے کتاب اللہ کو' عہد باری کو اس طرح چھوڑ رکھا تھا' گویا پھینک دیا تھا۔ اس لئے ان کی مذمت میں یہی لفظ لایا گیا۔

دوسری جگہ صاف بیان ہے کہ ان کی کتابوں میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر موجود ہے۔ فرمایا: ﴿يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ﴾ (الاعراف: ۱۵۷) یعنی لوگ تورات وانجیل میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر موجود پاتے ہیں۔ یہاں بھی فرمایا ہے کہ جب ان کی کتاب کی تصدیق کرنے والا ہمارا پیغمبر ان کے پاس آیا تو ان کے ایک فریق نے خدا کی کتاب سے بے پروائی کر کے اس طرح اسے چھوڑ دیا گویا کوئی علم ہی نہیں۔ بلکہ جادو کے پیچھے پڑ گئے اور خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر جادو کیا۔ جس کی اطلاع آپ کو جناب باری نے دی اور اس کا اثر زائل ہوا اور آپ کو شفا ملی۔ تورات سے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ اس لئے کہ وہ تو اسے چھوڑ دوسری کتابیں لے کر ان کے پیچھے لگ گئے اور اللہ کی کتاب کو اس طرح چھوڑ دیا کہ گویا کبھی جانتے ہی نہ تھے۔ نفسانی خواہشوں کو

سامنے رکھ لیا اور کتاب کو پیچھے ڈال دیا۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ راگ باجے کھیل تماشے اور خدا کے ذکر سے روکنے والی ہر چیز مَا تَتْلُوا الشَّیٰطِیْنُ میں داخل ہے۔

قصہ سلیمان علیہ السلام اور سحر کی حقیقت پر ایک پر مغز تبصرہ ☆ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے پاس ایک انگوٹھی تھی۔ جب آپ پاخانے جاتے تو اپنی بیوی حضرت جرادہ کو وہ دے جاتے۔ جب حضرت سلیمان علیہ السلام کی آزمائش کا وقت آیا۔ اس وقت ایک شیطان جن آپ کی صورت میں آپ کی بیوی صاحبہ کے پاس آیا اور انگوٹھی طلب کی' جو دے دی گئی۔ اس نے پہن لی اور تخت سلیمانی پر بیٹھ گیا۔ تمام جنات وغیرہ حاضر خدمت ہو گئے۔ حکومت کرنے لگا' ادھر جب حضرت سلیمان علیہ السلام واپس آئے اور انگوٹھی طلب کی تو جواب ملا' تو جھوٹا ہے' انگوٹھی تو حضرت سلیمان لے گئے۔ آپ نے سمجھ لیا کہ یہ خدا کی طرف سے آزمائش ہے۔ ان دنوں میں شیاطین نے جادو کی اور نجوم کی اور کہانت کی اور شعر و اشعار کی اور غیب کی جھوٹی سچی خبروں کی کتابیں لکھ کر حضرت سلیمان کی کرسی تلے دفن کرنے شروع کر دیں۔ آپ کی آزمائش کا یہ زمانہ ختم ہو گیا۔ آپ پھر تخت و تاج کے مالک ہوئے۔ عمر طبعی کو پہنچ کر جب رحلت فرمائی تو شیاطین نے انسانوں سے کہنا شروع کیا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کا خزانہ اور وہ کتابیں جن کے ذریعے سے وہ ہواؤں اور جنات پر حکمرانی کرتے تھے' ان کی کرسی تلے دفن ہیں۔ چونکہ جنات اس کرسی کے پاس نہیں جا سکتے تھے۔ اس لئے انسانوں نے اسے کھودا تو وہ کتابیں برآمد ہوئیں۔ پس ان کا چرچا ہو گیا اور ہر شخص کی زبان پر چڑھ گیا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی حکومت کا یہی راز تھا۔ بلکہ لوگ حضرت سلیمان علیہ السلام کی نبوت سے انکاری ہو گئے اور آپ کو جادوگر کہنے لگے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کی عقدہ کشائی کی اور فرمان باری نازل ہوا کہ جادوگری کا یہ کفر تو شیاطین کا پھیلا ہوا ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام اس سے بری الذمہ ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے پاس ایک شخص آیا' آپ نے پوچھا کہاں سے آئے ہو؟ اس نے کہا عراق سے' فرمایا عراق کے کس شہر سے؟ اس نے کہا کوفہ سے' پوچھا وہاں کیا خبریں ہیں' اس نے کہا' وہاں باتیں ہو رہی ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ انتقال نہیں کر گئے بلکہ زندہ روپوش ہیں اور عنقریب آئیں گے۔ آپ کانپ اٹھے اور فرمانے لگے۔ اگر ایسا ہوتا تو ہم ان کی میراث تقسیم نہ کرتے اور نہ ان کی عورتیں اپنا دوسرا نکاح کرتیں۔ سنو! شیاطین آسمانی باتیں چرا لایا کرتے تھے اور ان میں اپنی باتیں ملا کر پھیلایا کرتے تھے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے یہ تمام کتابیں جمع کر کے اپنی کرسی تلے دفن کر دیں۔ آپ کے انتقال کے بعد جنات نے وہ پھر نکال لیں۔ وہی کتابیں عراقیوں میں پھیلی ہوئی ہیں اور ان کتابوں کی باتیں وہ بیان کرتے اور پھیلاتے رہتے ہیں اسی کا ذکر اس آیت میں: ﴿وَاتَّبَعُوْا......﴾ میں ہے۔

اس زمانہ میں یہ بھی مشہور ہو گیا تھا کہ شیاطین علم غیب جانتے ہیں۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے ان کتابوں کو صندوق میں بھر کر دفن کر دینے کے بعد یہ حکم جاری کر دیا کہ جو یہ کہے گا' اس گردن ماردی جائے گی۔ بعض روایتوں میں ہے کہ جنات نے ان کتابوں کو حضرت سلیمان علیہ السلام کے انتقال کے بعد آپ کی کرسی تلے دفن کیا تھا اور ان کے شروع صفحہ پر لکھ دیا تھا کہ یہ علمی خزانہ آصف بن برخیا کا جمع کیا ہوا ہے۔ جو حضرت سلیمان علیہ السلام بن داؤد کے وزیر اعظم مشیر خاص اور ولی دوست تھے۔ یہودیوں میں مشہور تھا کہ حضرت سلیمان نبی نہ تھے' بلکہ جادوگر تھے' اس بنا پر یہ آیتیں نازل ہوئیں اور اللہ کے سچے نبی نے ایک سچے نبی کی برأت کی اور یہودیوں کے اس عقیدے کا ابطال کیا۔ وہ حضرت سلیمان علیہ السلام کا نام نبیوں کے زمرہ میں سن کر بہت بد کتے تھے۔ اس لئے تفصیل کے ساتھ اس واقعہ کو بیان کر دیا۔ ایک وجہ یہ بھی ہوئی کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے تمام موذی جانوروں سے عہد لیا تھا کہ وہ لوگوں کو نہ ستائیں۔ جب انہیں

وہ عہد یاد کرایا جاتا تھے۔ تو وہ ستاتے نہ تھے۔ پھر لوگوں نے اپنی طرف عبارتیں بنا کر جادو کی قسم کے منتر وغیرہ ان سب کی طرف منسوب کر دیا۔ جس کا بطلان ان آیات کریمہ میں ہے۔ یہ یاد رہے کہ عَلٰی یہاں پر فِیْ کے معنی میں ہے یا تَتْلُوْا متضمن ہے تَکْذِیْبُ کا اور یہی اولیٰ اور احسن ہے واللہ اعلم۔ خواجہ حسن بصری کا قول ہے کہ جادو حضرت سلیمان علیہ السلام کے پہلے بھی تھا اور یہ بالکل سچ ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد ہیں اور موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں جادوگروں کا ہونا قرآن سے ثابت ہے اور حضرت سلیمان علیہ السلام کا حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد ہونا بھی قرآن سے ظاہر ہے۔ داؤد علیہ السلام اور جالوت کے قصے میں ہے: ﴿مِنْ بَعْدِ مُوْسٰی﴾ (البقرہ: ۲۴۶) بلکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے بھی پہلے حضرت صالح علیہ السلام کو ان کی قوم نے کہا تھا: ﴿اِنَّمَآ اَنْتَ مِنَ الْمُسَحَّرِیْنَ﴾ (الشعراء: ۱۵۳) تو جادو کئے گئے لوگوں میں سے ہے۔ پھر فرمایا ہے: ﴿وَمَآ اُنْزِلَ ......﴾ بعض تو کہتے ہیں یہاں پر مَا نافیہ ہے یعنی انکار کے معنی میں ہے اور اس کا عطف مَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ پر ہے۔ یہودیوں کے اس دوسرے اعتقاد کی کہ جادو فرشتوں پر نازل ہوا ہے' اس آیت میں تردید ہے۔

ہاروت ماروت لفظ شیاطین کا بدل ہے۔ تثنیہ پر بھی جمع کا اطلاع ہوتا ہے۔ جیسے: ﴿اِنْ كَانَ لَهٗۤ اِخْوَةٌ﴾ میں یا اس لئے جمع کیا گیا ہو ان کے ماننے والوں کو بھی شامل کر لیا گیا ہے اور ان کا نام اُن کی زیادہ سرکشی کی وجہ سے کھول دیا گیا ہے۔ قرطبی تو کہتے ہیں کہ یہی ٹھیک مطلب اس آیت کا ہے۔ اس کے سوا کسی اور مفتی کی طرف التفات بھی نہ کرنا چاہئے۔ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں' جادو خدا کا نازل کیا ہوا نہیں۔ ربیع بن انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں' ان پر کوئی جادو نہیں اُترا۔ اس بنا پر آیت کا ترجمہ اس طرح ہو گا کہ ان یہودیوں نے اس چیز کی تابعداری کی' جو حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانہ میں شیطان پڑھا کرتے تھے حضرت سلیمان نے کفر نہیں کیا نہ اللہ تعالیٰ نے جادو کو ان دو فرشتوں پر اتارا ہے (جیسا اے یہودیو تمہارا خیال جبریل و میکائیل کی طرف ہے) بلکہ یہ کفر شیطانوں کا ہے۔ جو بابل میں لوگوں کو جادو سکھایا کرتے تھے اور ان کے سردار جو آدمی تھے جن کا نام ہاروت و ماروت تھا۔ حضرت عبدالرحمٰن بن ابزیٰ اسے اس طرح پڑھتے تھے: وَمَآ اُنْزِلَ عَلَى عَلَى الْمَلِكَيْنِ دَاوٗدَ سُلَيْمٰنِ۔ یعنی داؤد و سلیمان دونوں بادشاہوں پر جادو نہیں اتارا گیا۔ یا یہ کہ وہ اس سے روکتے تھے کیونکہ یہ کفر ہے۔ امام ابن جریرؒ نے اس کا زبردست رد کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں مَا معنی میں اَلَّذِیْ کے ہے اور ہاروت و ماروت وہ فرشتے ہیں' جنہیں خدا نے زمین کی طرف اتارا ہے اور اپنے بندوں کی آزمائش اور امتحان کے لئے انہیں جادو کی تعلیم کی اجازت دی ہے۔ لہٰذا ہاروت و ماروت اس فرمان باری کو بجالا رہے ہیں۔

ایک غریب قول یہ ہے کہ جنوں کے دو قبیلے ہیں مَلَكَيْن یعنی دو بادشاہوں کی قراءت پر اَنْزَلَ خَلَقَ کے معنی میں ہوگا۔ جیسے فرمایا: ﴿وَاَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ الْاَنْعَامِ ثَمٰنِيَةَ اَزْوَاجٍ﴾ (الزمر: ۶) اور فرمایا: ﴿وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ﴾ (الحدید: ۲۵) اور کہا: ﴿وَيُنَزِّلُ لَكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ رِزْقًا﴾ (المؤمن: ۱۳) یعنی ہم نے تمہارے لئے آٹھ قسم کے چوپائے پیدا کئے۔ لوہا بنایا' آسمان سے روزیاں اُتاریں' حدیث میں ہے: مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ دَآءً...... یعنی اللہ تعالیٰ نے جتنی بیماریاں پیدا کی ہیں' اُن سب کے علاج بھی پیدا کئے ہیں۔ مثل مشہور ہے کہ بھلائی برائی کا نازل کرنے والا اللہ ہے۔ یہاں سب جگہ انزال خلق یعنی پیدائش کے معنی میں ہے۔ ایجاء یعنی لانے اور اتارنے کے معنی میں نہیں۔ اسی طرح اس آیت میں بھی اکثر سلف کا مذہب یہ ہے کہ یہ دونوں فرشتے تھے[1]۔ ایک مرفوع حدیث میں یہ مضمون بسط وطول کے ساتھ

---

[1] ہاروت و ماروت کے سلسلہ میں اختلاف ہے۔ خدا جانے ابن کثیر نے کیسے لکھ دیا کہ اکثر اسلاف ان کے فرشتے ہونے پر اتفاق رکھتے ہیں حالانکہ یہ غلط ہے۔ علما اور محققین کی بڑی جماعت ہمیشہ اس کی قائل رہی ہے کہ ہاروت و ماروت فرشتے نہیں تھے۔ شیخ ابو منصور ماتریدی نے تو اُس شخص =

ہے۔ جو بھی بیان ہو گی ان شاء اللہ تعالیٰ۔ یہ کوئی اعتراض نہ کرے کہ فرشتے تو معصوم ہیں وہ گناہ کرتے ہی نہیں' چہ جائے کہ لوگوں کو جادو سکھائیں جو کفر ہے۔ اس لئے کہ یہ دونوں بھی عام فرشتوں میں سے خاص ہو جائیں گے۔ جیسے کہ ابلیس کی بابت آپ: ﴿وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ...... ﴾ کی تفسیر میں پڑھ چکے ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ' حضرت ابن مسعودؓ حضرت ابن عباسؓ' حضرت ابن عمرؓ حضرت کعب بن احبار رضی اللہ تعالیٰ عنہم' حضرت سدیؒ' حضرت کلبی یہی فرماتے ہیں۔

اب اس حدیث کو سنئے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جب آدم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے زمین پر اتارا اور ان کی اولاد پھیلی' اور زمین میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہونے لگی تو فرشتوں نے کہا کہ دیکھو یہ کس قدر بُرے لوگ ہیں' کیسے نافرمان اور سرکش لوگ ہیں۔ ہم اگر ان کی جگہ ہوتے تو ہرگز خدا کی نافرمانی نہ کرتے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اچھا تو اپنے میں دو فرشتوں کو طلب کر لو۔ میں اُن میں انسانی خواہشات پیدا کرتا ہوں اور انہیں میں بھیجتا ہوں۔ پھر دیکھتا ہوں کہ وہ کیا کرتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے ہاروت و ماروت کو پیش کیا۔ اللہ تعالیٰ نے ان میں انسانی طبیعت پیدا کی اور ان سے کہہ دیا کہ دیکھو بنی آدم کو تو میں نبیوں کی معرفت اپنے احکام پہنچاتا ہوں لیکن تم سے بلاواسطہ خود کہہ رہا ہوں کہ میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کرنا' زنا نہ کرنا' شراب نہ پینا' اب یہ دونوں زمین پر اُترے اور زہرہ کو ان کی آزمائش کے لئے حسین و شکیل عورت کی صورت میں ان کے پاس بھیجا جسے دیکھ کر یہ مفتون ہو گئے اور اس سے زنا کرنا چاہا۔ اس نے کہا کہ اگر تم شرک کرو تو میں منظور کرتی ہوں۔ انہوں نے جواب دیا کہ یہ تو ہم سے نہ ہو سکے گا۔ وہ چلی گئی' پھر آئی' کہنے لگی اچھا اس بچے کو قتل کر ڈالو تو مجھے تمہاری خواہش پوری کرنی منظور ہو گی۔ انہوں نے اسے بھی نہ مانا' وہ پھر آئی' کہا کہ اچھا یہ شراب پی لو۔ انہوں نے اسے ہلکا گناہ سمجھ کر اسے منظور کر لیا۔ اب نشہ میں مست ہو کر زنا کاری بھی کی اور اس بچہ کو بھی قتل کر ڈالا۔ جب ہوش و حواس درست ہوئے تو اس نے کہا جن جن کاموں کا تم پہلے انکار کرتے تھے' سب تم نے کر ڈالے۔ یہ نادم ہوئے' انہیں اختیار دیا گیا۔ کہ یہ عذاب دنیا کو اختیار کریں یا عذاب آخرت کو۔ انہوں نے دنیا کے عذاب کو پسند کیا۔ صحیح ابن حبان' مسند احمد' ابن مردویہ' ابن جریر' مصنف عبدالرزاق میں یہ حدیث مختلف الفاظ سے مروی ہے۔ مسند احمد کی یہ روایت غریب ہے۔ اس میں ایک راوی موسیٰ بن جبیر انصاری سلمی کو ابن ابی حاتم نے مستور الحال لکھا ہے۔

ابن مردویہ کی روایت میں یہ بھی ہے کہ ایک رات کو اثنائے سفر میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے حضرت نافعؒ سے پوچھا کہ کیا زہرہ تارا نکلا؟ انہوں نے کہا' نہیں۔ دو تین مرتبہ کے سوال کے بعد کہا' جب زہرہ طلوع ہوا تو فرمانے لگے' اسے نہ خوشی ہو نہ بھلائی ملے۔ حضرت نافع نے کہا' حضرت ایک ستارا جو حکم خدا سے طلوع و غروب ہوتا ہے' آپ اسے برا کہتے ہیں؟ فرمایا میں وہی کہتا ہوں جو میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے پھر اس کے بعد مندرجہ بالا حدیث باختلاف الفاظ سنائی لیکن یہ بھی غریب ہے حضرت کعب والی روایت مرفوع سے زیادہ موقوف ہے اور ممکن ہے کہ وہ اسرائیلی روایت ہو' واللہ اعلم۔ صحابہ اور تابعین سے بھی اس قسم کی روایتیں بہت کچھ منقول ہے۔ بعض میں ہے کہ زہرہ ایک عورت تھی' اس نے ان فرشتوں سے یہ شرط کی تھی کہ تم مجھے وہ شرط سکھا دو جسے پڑھ کر تم آسمان پر چڑھ جاتے ہو۔ انہوں نے سکھا دی۔ یہ پڑھ کر چڑھ گئی اور وہاں تارے کی شکل میں بنا دی گئی۔ بعض مرفوع روایتوں میں

= پر کفر کا فتویٰ لگایا ہے۔ جو ہاروت و ماروت کو فرشتہ سمجھتا ہو۔ علامہ آلوسی زادہ نے روح المعانی میں اس تمام بحث کو سیر حاصل انداز میں ذکر کیا ہے۔ اہل علم کو روح المعانی اس موقعہ پر ضرور دیکھ لینا چاہئے پھر آیات کی تفسیر میں اس موقع پر ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے محققانہ انداز اختیار نہیں کیا۔ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے قصص القرآن جلد ا میں جن اقوال کو آیات کی مناسب اور صحیح تفسیر قرار دیا ہے۔ ابن کثیر کی تفسیر اس کے سراسر خلاف ہے۔ تحقیق کے طالب قصص القرآن کا بھی اس موقع پر مطالعہ کریں تو اچھا ہے۔ ۱۲

بھی ہے لیکن وہ منکر اور غیر صحیح ہیں۔ ایک اور روایت میں ہے کہ اس واقعہ سے پہلے تو فرشتے صرف ایمان والوں کی بخشش کی دعا مانگتے تھے لیکن اس کے بعد تمام اہل زمین کے لئے دعا شروع کر دی۔ بعض روایتوں میں ہے کہ جب ان دونوں فرشتوں سے یہ نافرمانیاں سرزد ہوئیں' تب اور فرشتوں نے اقرار کر لیا' کہ بنی آدم جو اللہ تعالیٰ سے دور ہیں اور بن دیکھے ایمان لاتے ہیں' ان سے خطاؤں کا سرزد ہو جانا کوئی ایسی انوکھی چیز نہیں ان دونوں فرشتوں سے کہا گیا کہ اب یا تو دنیا کے عذاب کو پسند کر لو یا آخرت کے عذابوں کے لئے تیار ہو جاؤ۔ دونوں نے آپس میں مشورہ کر کے دنیا کے عذاب کو اختیار کیا کیونکہ یہ فنا ہو جانے والا ہے اور آخرت کے عذاب دائمی ہیں۔ چنانچہ انہیں بابل میں عذاب ہو رہا ہے۔

ایک روایت میں ہے کہ انہیں اللہ تعالیٰ نے جو احکام دیئے تھے ان میں قتل سے مال حرام سے ممانعت بھی تھی اور یہ حکم بھی تھا کہ حکم عدل کے ساتھ کریں۔ یہ بھی وارد ہے کہ یہ تین فرشتے تھے لیکن ایک نے آزمائش سے انکار کر دیا اور واپس چلا گیا۔ پھر دو کی آزمائش ہوئی۔ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں' یہ واقعہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانے کا ہے یہاں بابل سے مراد بابل دنیاوی ہے۔ اس عورت کا نام عربی میں زہرہ تھا اور نبطی زبان میں اس کا نام بیدخت تھا اور فارسی میں ناہید تھا۔ یہ عورت اپنے خاوند کے خلاف ایک مقدمہ لائی تھی۔ جب انہوں نے اس سے برائی کا ارادہ کیا۔

اس نے کہا پہلے مجھے میرے خاوند کے خلاف حکم دو' جب منظور ہے۔ انہوں نے ایسا ہی کیا' پھر اس نے کہا مجھے یہ بھی بتا دو کہ تم کیا پڑھ کر آسمان پر چڑھ جاتے ہو اور کیا پڑھ کر اتر آتے ہو؟ انہوں نے یہ بھی بتا دیا۔ چنانچہ وہ اسے پڑھ کر آسمان پر چڑھ گئی لیکن اترنے کا وظیفہ بھول گئی اور وہیں ستارے کی صورت میں مسخ کر دی گئی۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما جب کبھی زہرہ ستارے کو دیکھتے تو لعنت بھیجا کرتے تھے۔ اب ان فرشتوں نے جب چڑھنا چاہا تو نہ چڑھ سکے۔ سمجھ گئے کہ اب ہم ہلاک ہو گئے۔ حضرت مجاہدؒ فرماتے ہیں' پہلے پہل چند دنوں تک تو یہ فرشتے ثابت قدم رہے۔ صبح سے شام تک عدل کے ساتھ حکم کرتے رہتے' شام کو آسمان پر چڑھ جاتے' پھر زہرہ کو دیکھ کر اپنے نفس پر قابو نہ رکھ سکے۔ زہرہ ستارے کو ایک خوبصورت عورت کی شکل میں بھیجا گیا تھا۔

الغرض ہاروت و ماروت کا یہ قصہ تابعین میں سے بھی اکثر لوگوں نے بیان کیا ہے۔ جیسے مجاہد' سدی' حسن بصری' قتادہ' ابو العالیہ' زہری' ربیع بن انس' مقاتل بن حیان وغیرہ وغیرہ رحمہم اللہ اجمعین اور متقدمین اور متاخرین مفسرین نے بھی اپنی اپنی تفسیروں میں اسے وارد کیا ہے لیکن اس کا زیادہ تر دارومدار بنی اسرائیل کی کتابوں پر ہے۔ کوئی صحیح مرفوع متصل حدیث اس باب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں اور نہ قرآن کریم میں اس قدر بسط و تفصیل ہے۔ پس ہمارا ایمان ہے کہ جس قدر قرآن میں ہے صحیح اور درست ہے اور حقیقت حال کا علم اللہ تعالیٰ کو ہی ہے (قرآن کریم کے ظاہری الفاظ' مسند احمد' ابن حبان' بیہقی وغیرہ کی مرفوع حدیث' حضرت علی' حضرت ابن عباس' ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہم وغیرہ کی موقوف روایات۔ تابعین وغیرہ کی تفاسیر مل ملا کر اس واقعہ کو بہت مضبوط بنا دیتی ہے۔ نہ اس میں کسی اصول اسلامی کا خلاف ہے۔ پھر ظاہر سے ہٹا کر بے جا تکلف اٹھانے کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی۔ واللہ اعلم۔ (فتح البیان)

ابن جریر میں ایک غریب اثر اور ایک عجیب واقعہ ہے' اسے بھی سنیئے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ دومۃ الجندل کی ایک عورت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال کے تھوڑے ہی زمانہ کے بعد آپ کی تلاش میں آئی اور آپ کے انتقال کی خبر پا کر بے چین ہو کر رونے پیٹنے لگی۔ میں نے اسے پوچھا' آخر کیا بات ہے؟ تو اس نے کہا کہ مجھ میں اور میرے شوہر میں ہمیشہ نا چاقی رہا کرتی

تھی۔ ایک مرتبہ وہ مجھے چھوڑ کر لا پتہ کہیں چلا گیا۔ ایک بڑھیا سے میں نے یہ سب ذکر کیا۔ اس نے کہا جو میں کہوں وہ کر وہ خود بخود تیرے پاس آ جائے گا۔ میں تیار ہوگئی' وہ رات کو دو کتے لے کر میرے پاس آئی۔ ایک پر وہ خود سوار ہوئی' دوسرے پر میں بیٹھ گئی۔ تھوڑی دیر میں ہم دونوں بابل گئیں۔ میں نے دیکھا کہ دو شخص اُدھر لٹکے ہوئے ہیں اور لوہے میں جکڑے ہوئے ہیں۔ اس عورت نے مجھ سے کہا' ان کے پاس جا اور ان سے کہہ کہ میں جادو سیکھنے آئی ہوں۔ میں نے ان سے کہا۔ انہوں نے کہا سن' ہم تو آزمائش میں ہیں' تو جادو نہ سیکھ۔ اس کا سیکھنا کفر ہے۔ میں نے کہا کہ میں تو سیکھوں گی۔ انہوں نے کہا اچھا پھر جا اور اس تنور میں پیشاب کر کے چلی آ۔ میں گئی ارادہ کیا' لیکن کچھ دہشت سی طاری ہوئی' میں واپس آ گئی اور کہا میں فارغ ہوگئی۔ انہوں نے پوچھا کیا دیکھا؟ میں نے کہا کچھ نہیں' انہوں نے کہا تو غلط کہتی ہے' ابھی تک کچھ نہیں بگڑا' تیرا ایمان ثابت ہے۔ اب بھی لوٹ جا اور کفر نہ کر میں نے کہا مجھے تو جادو سیکھنا ہے۔ انہوں نے پھر کہا' جا کر اور اسی تنور میں پیشاب کر آ۔ میں پھر گئی لیکن اب کی مرتبہ بھی دل نہ چلا' واپس آ گئی۔ پھر اسی طرح سوال و جواب ہوئے۔ تیسری مرتبہ پھر تنور کے پاس گئی اور دل کڑا کر کے پیشاب کرنے کو بیٹھ گئی۔ میں نے دیکھا کہ گھوڑا سوار منہ پر نقاب ڈالے نکلا اور آسمان پر چڑھ گیا۔ میں واپس چلی آئی۔ اُن سے ذکر کیا۔ انہوں نے کہا' ہاں اب کی مرتبہ تو سچ کہتی ہے وہ تیرا ایمان تھا جو تجھ میں سے نکل گیا۔ اب چلی جا میں آئی اور اس بڑھیا سے کہا کہ انہوں نے تو مجھے بھی نہیں سکھایا۔ اس نے کہا' بس تجھے سب کچھ آ گیا۔ اب تو جو کہے گی ہو جائے گا۔ میں نے آزمائش کے لئے ایک دانہ گیہوں کا لیا' اسے زمین پر ڈال کر کہا اگ جا' وہ فوراً اگ گیا۔ میں نے کہا تجھ میں بال پیدا ہو جائے چنانچہ ہو گئی۔ میں نے کہا سوکھ جا وہ بال سوکھ گئی۔ میں نے کہا الگ الگ دانہ دانہ ہو جا۔ وہ بھی ہو گیا۔ پھر میں نے کہا' سوکھ جا' سوکھ گیا۔ پھر میں نے کہا آٹا بن جا تو آٹا بن گیا۔ میں نے کہا' روٹی پک جا تو روٹی پک گئی۔ یہ دیکھتے ہی میرا دل نادم ہونے لگا اور مجھے اپنے بے ایمان ہونے کا صدمہ ہونے لگا۔ اے اُم المومنین خدا کی قسم' نہ میں نے اس جادو سے کوئی کام لیا نہ کسی پر کیا۔ یونہی روتی پیٹتی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کہوں۔ لیکن افسوس بدقسمتی سے آپ کو بھی میں نے نہ پایا۔ اب میں کیا کروں؟ اتنا کہہ کر اس نے گریہ و بکا شروع کی اور اس قدر روئی کہ ہر ایک کو اس پر ترس آنے لگا۔ صحابہ کرامؓ بھی متحیر تھے کہ اسے کیا فتویٰ دیں۔ آخر بعض صحابہؓ نے کہا اب اس کے سوا کیا ہو کہ تم اس فعل کو نہ کرو۔ توبہ استغفار کرو اور اپنے ماں باپ کی خدمت گزاری کرتی رہو۔

یہاں یہ بھی خیال رکھنا چاہئے کہ صحابہ کرامؓ فتوی دینے میں بہت احتیاط کرتے تھے کہ چھوٹی سی بات بتانے میں بھی تامل ہوتا تھا۔ آج ہم بڑی سے بڑی بات میں بھی اپنی رائے اور قیاس کو سب سے بڑا درجہ دیتے ہیں۔ اس کی اسناد بالکل صحیح ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ عین چیز جادو کے زور سے پلٹ جاتی ہے اور بعض کہتے ہیں' نہیں صرف دیکھنے والے کو ایسا خیال پڑتا ہے۔ اصل چیز جیسی ہوتی ہے ویسی ہی رہتی ہے۔ (الاعراف: ۱۱۶) جیسے: ﴿سَحَرُوْٓا اَعْيُنَ النَّاسِ ...... ﴾ یعنی انہوں نے لوگوں کی آنکھوں پر جادو کر دیا اور فرمایا: ﴿يُخَيَّلُ اِلَيْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ اَنَّهَا تَسْعٰى﴾ (طٰہٰ: ۶۶) حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف خیال ڈالا جاتا تھا کہ گویا وہ سانپ وغیرہ ان کے جادو کے زور سے چل پھر رہے ہیں۔ اس واقعہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آیت میں لفظ بابل سے مراد بابل عراق ہے بابل دنباوند نہیں۔

ابن ابی حاتم کی ایک روایت میں ہے کہ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ تعالیٰ عنہ بابل کی زمین میں جا رہے تھے۔ عصر کی نماز کا وقت آ گیا لیکن آپ نے وہاں نماز ادا نہ کی بلکہ اس زمین کی سرحد سے نکل جانے کے بعد نماز پڑھی فرمایا میرے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے قبرستان میں نماز پڑھنے سے روک دیا ہے اور بابل کی زمین میں نماز پڑھنے سے بھی ممانعت فرمائی ہے۔ یہ زمین ملعون ہے۔ ابوداؤد (میں بھی یہ حدیث مروی ہے) اور امام ابوداؤدؒ نے بھی اس پر کوئی کلام نہیں کیا اور جس حدیث کو حضرت امام ابوداؤدؒ اپنی کتاب میں لائیں

اوراس کی سند پر خاموشی اختیار کریں تو وہ حدیث امام صاحب کے نزدیک حسن ہوتی ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ بابل کی سرزمین میں نماز مکروہ ہوتی ہے۔ جیسے کہ ثمودیوں کی سرزمین کی بابت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ان لوگوں کی منزلوں میں نہ جاؤ۔ اگر اتفاقاً جانا پڑے تو خوف خدا سے روتے ہوئے جاؤ۔ ہیئت دان لوگوں کا قول ہے کہ بابل کی دوری بحر غربی اوقیانوس سے ستر درجہ لمبی اور وسط زمین سے جنوب کی جانب بخط استوا تینتیس درجہ ہے واللہ اعلم۔ چونکہ ہاروت و ماروت کو اللہ تعالیٰ نے خیر وشر کفر وایمان کا علم دے رکھا ہے۔ اس لئے ہر ایک کفر کی طرف جھکنے والے کو نصیحت کرتے ہیں اور ہر طرح روکتے ہیں جب نہیں مانتے تو وہ اسے کہہ دیتے ہیں اس کا نور ایمان جاتا رہتا ہے۔ ایمان سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے اور جادو آ جاتا ہے۔ شیطان اس کا رفیق کار بن جاتا ہے۔ ایمان کے نکل جانے کے بعد خدا کا غضب اس پر نازل ہوتا ہے۔ ابن جریج فرماتے ہیں سوائے کافر کے اور کوئی جادو سیکھنے کی جرأت نہیں کرتا۔ فتنہ کے معنی یہاں پر بلا آزمائش اور امتحان کے ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قول قرآن پاک میں مذکور ہے: ﴿اِنْ هِيَ اِلَّا فِتْنَتُكَ﴾ (الاعراف: ۱۵۵) اس آیت سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ جادو سیکھنا کفر ہے۔ حدیث میں بھی ہے کہ جو شخص کسی جادوگر کے پاس جائے اس کی بات کو سچ سمجھے اس نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اتری ہوئی وحی کے ساتھ کفر کیا (بزار) یہ حدیث صحیح ہے اور اس کی تائید میں دوسری حدیثیں بھی آئی ہیں۔

پھر فرمایا کہ لوگ ہاروت ماروت سے جادو سیکھتے ہیں۔ جس سے برے کام کرتے ہیں۔ عورت مرد کی محبت اور موافقت کو بغض اور مخالفت سے بدل دیتے ہیں۔ صحیح مسلم میں حدیث ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں شیطان اپنا عرش پانی پر رکھتا ہے پھر اپنے لشکروں کو بہکانے کے واسطے بھیجتا ہے۔ سب سے زیادہ مرتبہ والا اس کے نزدیک وہ ہے جو فتنے میں سب سے زیادہ بڑھا ہوا ہو۔ یہ جب واپس آتے ہیں تو اپنے بدترین کاموں کا ذکر کرتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ میں نے فلاں کو اس طرح بے راہ کر دیا ہے۔ کوئی کہتا ہے میں نے فلاں شخص سے یہ گناہ کرایا۔ شیطان ان سے کہتا ہے کچھ نہیں معمولی کام ہے۔ یہاں تک کہ ایک آ کر کہتا ہے کہ میں نے ایک شخص کے اور اس کی بیوی کے درمیان جھگڑا ڈال دیا۔ یہاں تک کہ جدائی ہو گئی۔ شیطان اسے گلے لگا لیتا ہے اور کہتا ہے ہاں تو نے بڑا کام کیا۔ اسے اپنے پاس بٹھا لیتا ہے اور اس کا مرتبہ بڑھا دیتا ہے۔ پس جادوگر بھی اپنے جادو سے وہ کام کرتا ہے جس سے میاں بیوی میں جدائی ہو جائے۔ مثلاً اس کی شکل صورت اسے بری معلوم ہونے لگے یا اس کے عادات واطوار سے جو غیر شرعی نہ ہوں یہ نفرت کرنے لگے یا دل میں عداوت آ جائے وغیرہ وغیرہ۔ رفتہ رفتہ یہ باتیں بڑھتی جائیں اور آپس میں چھوٹ چھٹاؤ ہو جائے "مَرْءٌ" کہتے ہیں۔ اس کا مذکر مؤنث اور تثنیہ تو ہے جمع نہیں بنتا۔ پھر فرمایا یہ کسی کو بھی بغیر خدا کی مرضی کے اندر نہیں پہنچا سکتے یعنی ان کے اپنے بس کی بات نہیں۔ اللہ تعالیٰ کی قضا وقدر اور اس کے ارادے کے ماتحت یہ نقصان بھی پہنچتا ہے۔ اگر خدا نہ چاہے تو اس کا جادو محض بے اثر اور بے فائدہ ہو جاتا ہے۔ یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ یہ جادو اسی شخص کو نقصان دیتا ہے جو اسے حاصل کرے اور اس میں داخل ہو۔ پھر ارشاد ہوتا ہے وہ سیکھتے ہیں جو ان کے لئے سراسر نقصان دہ ہے۔ جس میں کوئی نفع نہیں اور یہ یہودی جانتے ہیں کہ رسول کی تابعداری چھوڑ کر جادو کے پیچھے لگنے والے کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں۔ نہ ان کی کوئی قدر ووقعت خدا کے پاس ہے۔ نہ وہ دیندار سمجھے جاتے ہیں۔ پھر فرمایا اگر یہ اس کام کی برائی کو محسوس کرتے اور ایمان اور تقویٰ برتتے تو یقیناً ان کے لئے بہت ہی بہتر ہوتا مگر یہ بے علم لوگ ہیں۔ یہی اور جگہ فرمایا کہ اہل علم نے کہا تم پر افسوس ہے اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا ثواب ایمانداروں اور نیک اعمال کے لئے بہت ہی بہتر ہے لیکن اسے صبر کرنے والے ہی پا سکتے ہیں۔ اس آیت سے یہ بھی استدلال بزرگان دین نے کیا ہے کہ جادوگر کافر ہے کیونکہ آیت میں: ﴿وَلَوْ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا﴾ فرمایا ہے۔ حضرت

امام احمد اور سلف کی ایک جماعت بھی جادو سیکھنے والے کو کافر کہتی ہے۔ بعض کافر تو نہیں کہتے لیکن فرماتے ہیں کہ جادوگر کی سزا یہ ہے کہ اسے قتل کر دیا جائے۔

بجالہ بن عبید کہتے ہیں' حضرت عمرؓ نے اپنے ایک فرمان میں لکھا تھا کہ ہر ایک جادوگر مرد عورت کو قتل کر دو۔ چنانچہ ہم نے تین جادوگروں کی گردن ماری۔ (احمد) صحیح بخاری شریف میں ہے کہ ام المؤمنین حضرت حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا پر ان کی لونڈی نے جادو کیا۔ جس پر اسے قتل کیا گیا۔ حضرت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں تین صحابیوں سے جادوگر کے قتل کا فتویٰ ثابت ہے۔ ترمذی شریف میں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں' جادوگر کی سزا تلوار سے قتل کر دینا ہے۔ اس حدیث کے ایک راوی اسمٰعیل بن مسلم ضعیف ہیں۔ صحیح بات یہی معلوم ہوتی ہے کہ غالباً یہ حدیث موقوف ہے لیکن طبرانی میں ایک دوسری سند سے بھی یہ حدیث مرفوعاً مروی ہے۔ واللہ اعلم۔

ولید بن عقبہ کے پاس ایک جادوگر تھا' جو اپنے کرتب بادشاہ کو دکھایا کرتا تھا۔ بظاہر ایک شخص کا سر کاٹ لیتا' پھر آواز دیتا تو سر جڑ جاتا اور وہ موجود ہو جاتا ہے۔ مہاجرین صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین میں سے ایک بزرگ صحابی نے یہ دیکھا اور دوسرے دن تلوار باندھے ہوئے آئے۔ جب ساحر نے اپنا کھیل شروع کیا تو آپ نے تلوار سے خود اس کی گردن اُڑا دی اور فرمایا' لے اب اگر سچا ہے تو خود جی اُٹھ۔ پھر قرآن پاک کی یہ آیت پڑھ کر لوگوں کو سنائی: ﴿اَفَتَاْتُوْنَ السِّحْرَ وَاَنْتُمْ تُبْصِرُوْنَ﴾ (الانبیاء:۳) کیا تم دیکھتے بھالتے جادو کے پاس جاتے ہو؟ چونکہ ان بزرگ نے ولید کی اجازت اس کے قتل میں نہیں لی تھی۔ اس لئے بادشاہ نے ناراض ہو کر انہیں گرفتار کر کے پھر چھوڑ دیا۔ امام شافعی نے حضرت عمر کے فرمان اور حضرت حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے واقعہ کے متعلق یہ کہا ہے کہ یہ حکم اس وقت ہے جب جادو میں شرکیہ الفاظ ہوں۔

معتزلہ جادو کے وجود کے منکر ہیں۔ وہ کہتے ہیں جادو کوئی چیز نہیں۔ بلکہ بعض لوگ تو بعض دفعہ اتنا بڑھ جاتے ہیں کہ کہتے ہیں جو جادو کا وجود مانتا ہے وہ کافر ہے لیکن اہل سنت جادو کے وجود کے قائل ہیں' یہ مانتے ہیں کہ جادوگر اپنے جادو کے زور سے ہوا پر اُڑ سکتے ہیں اور انسان کو بظاہر گدھا اور گدھے کو بظاہر انسان بنا ڈالتے ہیں۔ مگر کلمات اور منتر تنتر کے وقت ان چیزوں کو پیدا کرنے والا اللہ تعالیٰ ہے۔ آسمان کو اور تاروں کو تاثیر پیدا کرنے والا اہل سنت نہیں مانتے۔ فلسفے اور نجوم والے اور بے دین لوگ تو تاروں کو اور آسمان کو ہی اثر پیدا کرنے والا جانتے ہیں۔ اہل سنت کی ایک دلیل تو آیت: ﴿وَمَا هُمْ بِضَآرِّيْنَ﴾ ہے اور دوسری دلیل خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر جادو کیا جانا اور آپ ﷺ پر اس کا اثر ہونا ہے۔ تیسرے اس عورت کا واقعہ ہے جسے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بیان فرمایا ہے۔ جو اُوپر ابھی گزرا ہے اور بھی بیسیوں ایسے ہی واقعات وغیرہ ہیں۔

رازی نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ جادو کا حاصل کرنا برا نہیں۔ محققین کا یہی قول ہے۔ اس لئے کہ وہ بھی ایک علم ہے اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ﴾ (الزمر:۹) یعنی علم والے اور بے علم برابر نہیں ہو سکتے اور اس لئے بھی کہ یہ معلوم ہوگا تو اس سے معجزے اور جادو میں فرق پوری طرح واضح ہو جائے گا اور معجزے کا علم واجب ہے اور وہ موقوف ہے۔ جادو کے سیکھنے پر جس سے فرق محسوس ہو۔ پس جادو کا سیکھنا بھی واجب ہوا۔ رازی کا یہ قول سرتاپا غلط ہے۔ اگر عقلاً وہ اُسے برا نہ بتائیں تو معتزلہ موجود ہیں جو عقلاً بھی اس برائی کے قائل ہیں اور اگر شرعاً برا نہ بتلاتے ہوں تو قرآن کی یہ آیت شرعی برائی بتلانے کے لئے کافی ہے۔ صحیح حدیث میں ہے جو شخص کسی جادوگر یا کاہن کے پاس جائے وہ کافر ہوا۔

سنن میں حدیث ہے کہ جس نے گرہ دی اور اس میں پھونکا اُس نے جادو کیا۔ پس رازی کا یہ قول غلط ہے۔ ان کا یہ کہنا کہ محققین کا قول یہی ہے۔ یہ بھی ٹھیک نہیں۔ آخر ان محققین کے ایسے قول کہاں ہیں؟ ائمہ اسلام میں سے کسی نے یہ کہا ہے۔ پھر: ﴿هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ ..... ﴾ کی آیت کو پیش کرنا بھی نری جرأت ہے کیونکہ آیت میں علم سے مراد دینی علم ہے۔ آیت میں شرعی علم والے علما کی فضیلت بیان ہوئی ہے۔ پھر اُن کا یہ قول کہ اسی سے معجزے کا علم حاصل ہوتا ہے یہ تو لغوبات ہے اس لئے کہ ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا سب سے بڑا معجزہ قرآن پاک ہے۔ جو باطل سے سراسر محفوظ ہے لیکن ان کا معجزہ جاننا جادو جاننے پر موقوف نہیں۔ وہ لوگ جنہیں جادو سے دور کا بھی تعلق نہیں۔ وہ بھی اسے جادو مان گئے۔ صحابہؓ، تابعین، ائمہ مسلمین بلکہ عام مسلمان بھی اسے معجزہ مانتے ہیں۔ حالانکہ ان تمام میں سے کبھی ایک بھی جادو جاننا تو کیا جادو کے پاس تک نہیں پھٹکا نہ سیکھا نہ سکھایا' نہ کیا نہ کرایا۔ بلکہ ان سب کاموں کو کفر کہتے رہے۔ پھر یہ دعویٰ کرنا کہ معجزے کا جاننا واجب اور معجزے کا فرق جادو کے جاننے پر موقوف ہے۔ لہٰذا جادو کا سیکھنا واجب ہوا۔ یہ کسی قدر مہمل دعویٰ ہے۔

جادو کی اقسام کا بیان ☆

اب جادو کی قسمیں سنیے۔ جنہیں ابو عبداللہ رازی نے بیان کیا ہے۔

﴿۱﴾ ایک جادو تو ستارہ پرست فرقہ کا ہے۔ وہ سیاروں کی نسبت عقیدہ رکھتے ہیں کہ بھلائی برائی انہیں کے باعث ہوتی ہے۔ اس لئے ان کو خطاب کر کے مقررہ الفاظ پڑھا کرتے ہیں اور انہیں کی پرستش کرتے ہیں۔ اس قوم میں حضرت ابراہیم آئے اور انہیں ہدایت کی۔ رازی نے اس فن میں ایک خاص کتاب تصنیف کی ہے جس کا نام: **السر المکتوم فی مخاطبه الشمس والنجوم** رکھا ہے۔ ملاحظہ ہو ابن خلکان وغیرہ۔ بعض تو کہتے ہیں کہ پھر اس سے توبہ کر لی ہے اور بعض کہتے ہیں کہ صرف معلوم کرانے کے لئے اور اپنے اس علم کو ظاہر کرنے کے لئے یہ کتاب لکھی تھی۔ نہ کہ ان کا اعتقاد بھی یہی تھا جو سراسر کفر ہے۔ اس کتاب میں ان لوگوں کے طور طریقے لکھے ہیں۔

﴿۲﴾ دوسرا جادو قوی نفس اور قوت واہمہ والے لوگوں کا ہے۔ وہم اور خیال کو بڑا اثر ہوتا ہے۔ دیکھئے اگر ایک تنگ پل زمین پر رکھ دیا جائے تو اس پر انسان بآسانی چلا جائے گا لیکن یہی تنگ پل اگر دریا پر ہو تو نہیں گزر سکے گا۔ اس لئے کہ اس وقت خیال ہوتا ہے کہ اب گرا اور اب گرا۔ تو واہمہ کی کمزوری کے باعث جتنی جگہ پر زمین میں چل پھر سکتا تھا' اتنی ہی جگہ پر ایسے ڈر کے وقت نہیں چل سکتا۔ حکیموں اور طبیبوں نے بھی نکسیر والے کو سرخ چیزوں کے دیکھنے سے روک دیا ہے اور مرگی والوں کو زیادہ روشنی اور تیز حرکت کرنے والی چیزوں کے دیکھنے سے منع کر دیا ہے۔ جس سے ظاہر ہے کہ قوت واہمہ کا ایک خاص اثر طبیعت پر پڑتا ہے عقل مند لوگوں کا اس پر بھی اتفاق ہے کہ نظر لگتی ہے۔ صحیح حدیث میں بھی آیا ہے کہ نظر کا لگنا حق ہے۔ اگر کوئی چیز تقدیر پر سبقت کرنے والی ہوتی تو نظر ہوتی۔ اب اگر نفس قوی ہے تو ظاہری سہاروں اور ظاہری کاموں کی کوئی ضرورت نہیں اور اگر اتنا قوی نہیں تو پھر ان آلات کی بھی ضرورت پڑتی ہے جس قدر نفس کی قوت بڑھتی جائے وہ روحانیت میں ترقی کرتا جائے گا اور تاثیر میں بڑھتا جائے گا اور جس قدر یہ قوت کم ہوتی جائے گی' اسی قدر یہ گھٹتا جائے گا۔ یہ بات کبھی غذا کی کمی' لوگوں کے میل جول کے ترک وغیرہ سے بھی حاصل ہو جاتا ہے۔ کبھی تو اسے حاصل کر کے انسان نیکی کے کام شریعت کے مطابق اس سے لیتا ہے۔ اس حال کو

شریعت کی اصطلاح میں کرامت کہتے ہیں' جادو نہیں کہتے اور کبھی اس حال میں باطل میں اور خلاف شرع کاموں میں مدد لیتا ہے اور دین سے دور پڑ جاتا ہے۔ ایسے لوگوں کے یہ خلاف عادت کاموں میں کسی کو دھوکا کھا کر انہیں ولی نہ سمجھ لینا چاہئے کیونکہ شریعت کے خلاف چلنے والا ولی اللہ نہیں ہو سکتا۔ آپ دیکھتے نہیں کہ صحیح حدیثوں میں دجال کی بابت کیا کچھ آیا ہے؟ وہ کیسے کیسے خلاف عادت کام کر کے دکھائے گا لیکن ان کی وجہ سے وہ خدا کا ولی نہیں بلکہ وہ ملعون و مطرود ہے۔

۳ تیسری قسم کا جادو جنات وغیرہ زمین والوں کی روحوں سے امداد و اعانت طلب کرنے کا۔ معتزلہ اور فلاسفہ اس کے قائل نہیں۔ ان روحوں سے بعض مخصوص الفاظ اور اعمال کے ذریعے تعلق پیدا کرتے ہیں۔ اسے سحر بالعزائم اور عمل تسخیر بھی کہتے ہیں۔

۴ چوتھی قسم خیالات کا بدل دینا' آنکھوں پر اندھیرا ڈال دینا اور شعبدہ بازی کرنا ہے۔ جس سے حقیقت کے خلاف کچھ کا کچھ دکھائی دینے لگتا ہے۔ تم نے دیکھا ہو گا کہ شعبدہ باز پہلے ایک کام شروع کرتا ہے۔ جب دلچسپی کے ساتھ اس طرف نظریں جما دیتے ہیں اور اس کی باتوں کی طرف متوجہ ہو کر ہمہ تن اس میں مصروف ہو جاتے ہیں تو وہ پھرتی سے ایک دوسرا کام کر ڈالتا ہے جو لوگوں کی نگاہوں سے پوشیدہ رہتا ہے اور اسے دیکھ کر وہ حیران رہ جاتے ہیں۔ بعض مفسرین کا قول ہے کہ فرعون کے جادوگروں کا جادو بھی اسی قسم کا تھا۔ اسی لئے قرآن میں ہے: ﴿سَحَرُوْٓا اَعْیُنَ النَّاسِ وَاسْتَرْهَبُوْهُمْ...... ﴾ (الاعراف: ۱۱۶) لوگوں کی آنکھوں پر جادو کر دیا اور ان کے دلوں میں ڈر بٹھا دیا اور جگہ ہے: ﴿یُخَیَّلُ اِلَیْهِ...... ﴾ (طٰہٰ: ۶۶) موسیٰ علیہ السلام کے خیال میں وہ سب لکڑیاں اور رسیاں سانپ بن کر دوڑتی ہوئی نظر آنے لگیں۔ حالانکہ در حقیقت ایسا نہ تھا۔ واللہ اعلم۔

۵ پانچویں قسم بعض چیزوں کی ترکیب دے کر کوئی عجیب کام اس سے لینا ہے۔ مثلاً گھوڑے کی شکل بنا دی۔ اس پر ایک سوار بنا کر بٹھا دیا۔ اس کے ہاتھ میں ترہی (ناقوس) ہے۔ جہاں ایک ساعت گزری اور اس کے کرنائے میں سے آواز نکلی۔ حالانکہ کوئی نہیں چھیڑتا۔ اسی طرح انسانی صورت اس کاریگری سے بنائی کہ گویا اصل انسان ہنس رہا ہے یا رو رہا ہے۔ فرعون کے جادوگروں کا جادو بھی اسی قسم میں سے تھا کہ وہ بنائے ہوئے سانپ وغیرہ زمیق کے باعث زندہ حرکت کرنے والے دکھائی دیتے تھے۔ گھڑی اور گھنٹے اور چھوٹی چھوٹی چیزیں جن سے بڑی بڑی وزنی چیزیں کھنچ آتی ہیں' سب اسی قسم میں داخل ہیں۔ حقیقت میں اُسے جادو ہی نہ کہنا چاہئے کیونکہ یہ تو ایک ترکیب اور کاریگری ہے۔ جس کے اسباب بالکل ظاہر ہیں۔ جو نہیں جانتا ہو وہ ان کلوں سے یہ کام لے سکتا ہے۔ اسی طرح وہ حیلہ بھی ہے جو بیت المقدس کے نصرانی کرتے تھے کہ پوشیدگی سے گرجے کی قندیلیں جلا دی اور اسے گرجے کی کرامت مشہور کر دی اور لوگوں کو اپنے دین کی طرف جھکا لیا۔ بعض کرامیہ صوفیہ کا بھی خیال ہے کہ اگر ترغیب و ترہیب کی حدیثیں گھڑ لی جائیں اور لوگوں کو عبادت کی طرف مائل کیا جائے تو کوئی حرج نہیں لیکن یہ بڑی غلطی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں' جو شخص مجھ پر جان بوجھ کر جھوٹ بولے وہ اپنی جگہ جہنم میں مقرر کر لے اور فرمایا میری حدیثیں بیان کرتے رہو لیکن مجھ پر جھوٹ نہ باندھو' مجھ پر جھوٹ بولنے والا قطعاً جہنمی ہے۔ ایک نصرانی پادری نے ایک مرتبہ دیکھا کہ ایک پرندہ کا چھوٹا سا بچہ جسے اُڑنے اور چلنے پھرنے کی طاقت نہیں۔ ایک گھونسلے میں بیٹھا ہے۔ جب وہ اپنی ضعیف اور پست آواز نکالتا ہے تو اور پرندے اُسے سن کر رحم کھا کر زیتون کا پھل اس کے گھونسلے میں لا لا کر رکھ جاتے ہیں۔ اس نے اسی صورت کا ایک پرندہ کسی چیز کا بنایا اور نیچے سے اُسے کھوکھلا رکھا اور ایک سوراخ اس چونچ کی طرف رکھا۔ جس سے ہوا اس کے اندر گھستی تھی۔ پھر

جب نکلتی تھی تو اسی طرح کی آواز اس سے پیدا ہوتی تھی۔ اسے لا کر اپنے گرجے میں ہوا کے رخ رکھ دیا۔ چھت میں ایک چھوٹا سا سوراخ کر دیا تا کہ ہوا اس سے آئے جائے۔ اب جب ہوا چلتی اور اس کی آواز نکلتی تو قسم کے پرندے جمع ہو جاتے اور زیتون کا پھل لا لا کر رکھ جاتے۔ اس نے لوگوں میں شہرت دینی شروع کی کہ اس گرجے میں یہ کرامت ہے جہاں ایک بزرگ کا مزار ہے اور یہ کرامت انہی کی ہے۔ لوگوں نے بھی جب اپنی آنکھوں یہ انہونی عجیب بات دیکھی تو معتقد ہو گئے اور اس پر نذر نیاز چڑھانے لگا اور یہ کرامت دور دراز تک مشہور ہو گئی۔ حالانکہ نہ کوئی کرامت تھی اور نہ معجزہ۔ صرف ایک پوشیدہ فن تھا' جسے اس ملعون شخص نے پیٹ بھرنے کے لئے پوشیدہ طور پر کر رکھا تھا اور وہ لعنتی فرقہ اس پر رتجھا ہوا تھا۔

⑥ جادو کی چھٹی قسم بعض دواؤں کے مخفی خواص معلوم کر کے انہیں کام میں لانا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ دواؤں میں عجیب عجیب خاصیتیں ہیں۔ مقناطیس ہی کو دیکھو کہ لوہا کس طرح اس کی طرف کھنچ جاتا ہے۔ اکثر صوفی اور درویش انہی حیلہ سازیوں کو کرامت کر کے لوگوں کو دکھاتے ہیں اور انہیں مرید بناتے پھرتے ہیں۔

⑦ ساتویں قسم میں ایک خاص قسم کا اثر ڈال کر اس سے جو چاہا منوالیا۔ مثلاً اس سے کہہ دیا کہ مجھے اسم اعظم یاد ہے یا جنات میرے قبضہ میں ہیں۔ اب اگر سامنے والا کمزور دل کا اور کچے کانوں کا اور بودے عقیدے والا ہے تو اسے سچ سمجھ لے گا اور اس کی طرف سے ایک قسم کا خوف' ڈر' ہیبت اور رعب اس کے دل پر بیٹھ جائے گا۔ جو اس کو ضعیف بنا دے گا۔ اب اس وقت جو چاہے گا کرے گا اور اس کا کمزور دل اُسے عجیب عجیب باتیں دکھاتا جائے گا۔ اسی کو تمبلہ کہتے ہیں اور یہ اکثر کم عقل لوگوں پر ہو جایا کرتا ہے اور علم فراست سے کامل عقل والا اور کم عقل والا انسان معلوم ہو سکتا ہے اور اس حرکت کا کرنے والا اپنا یہ فعل قیافے سے کم عقل شخص پر معلوم کر کے ہی کرتا ہے۔

⑧ آٹھویں قسم چغلی کرنا' جھوٹ سچ ملا کر کسی کے دل میں اپنا گھر کر لینا اور خفیہ چالوں سے اُسے اپنا گرویدہ کر لینا۔ یہ چغل خوری اگر لوگوں کو بھڑکانے بدکانے اور ان کے درمیان عداوت و دشمنی ڈالنے کے لئے ہو تو شرعاً حرام ہے۔ جب اصلاح کے طور پر اور آپس میں ایک دوسرے مسلمان ملانے کے لئے کوئی ایسی بات کہہ دی جائے' جس سے یہ اس سے اور وہ اس سے خوش ہو جائے یا کوئی آنے والی مصیبت مسلمانوں پر سے ٹل جائے یا کفار کی قوت زائل ہو جائے۔ ان میں بد دلی پھیل جائے اور مخالفت اور پھوٹ پڑ جائے تو یہ جائز ہے جیسے حدیث میں ہے کہ وہ شخص جھوٹا نہیں جو بھلائی کے لئے اِدھر اُدھر باتیں لے جاتا ہے اور جیسے حدیث میں ہے کہ لڑائی مکر کا نام ہے اور جیسے نعیم بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جنگ احزاب کے موقعہ پر کفار عرب اور کفار یہود کے درمیان کچھ اِدھر اُدھر کی باتیں کہہ کر جدائی ڈلوادی تھی اور انہیں مسلمانوں کے مقابلہ میں شکست ہوئی۔ یہ کام بڑے عالی دماغ' زیرک اور معاملہ فہم شخص کا ہے۔

یہ یاد رہے کہ امام رازی نے جادو کی جو یہ آٹھ قسمیں کی ہیں' یہ صرف باعتبار لفظ کے ہیں کیونکہ عربی زبان میں سحر یعنی جادو اس چیز کو کہتے ہیں جو بہت لطیف اور باریک ہو اور ظاہر میں انسان کی نگاہوں سے اس کے اسباب پوشیدہ رہ جائیں اسی واسطے ایک حدیث میں ہے کہ بعض بیان میں بھی جادو ہوتا ہے اور اسی لئے صبح کے اوّل وقت کو سحور کہتے ہیں کہ وہ مخفی ہوتا ہے اور اس رگ کو بھی سحر کہتے ہیں' جو غذا کی جگہ ہے۔ ابو جہل نے بدر والے دن یہی کہا تھا کہ اس کی سحر یعنی رگ طعام مارے خوف کے پھول گئی۔ حضرت عائشہ فرماتی ہیں' میرے

سحر ونحر کے درمیان رسول اللہ ﷺ فوت ہوئے۔ تو نحر سے مراد سینہ اور سحر سے رگ غذا۔ قرآن میں بھی ہے: ﴿سَحَرُوْٓا اَعْیُنَ النَّاسِ﴾ (الاعراف: ۱۱۶) یعنی لوگوں کی نگاہوں سے اپنا کام مخفی کر کے انجام دیا۔ ابوعبداللہ قرطبی کہتے ہیں' ہم کہتے ہیں کہ جادو ہے اور مانتے ہیں کہ جب اللہ کو منظور ہوتا ہے وہ جادو کے وقت جو چاہتا ہے' کر دیتا ہے۔ گو معتزلہ اور ابواسحٰق اسفرائینی شافعی اس کے قائل نہیں۔ جادو کبھی ہاتھ کی چالاکی سے بھی ہوتا ہے اور کبھی ڈوروں' دھاگوں سے بھی۔ کبھی اللہ کا نام پڑھ کر دم کرنے سے' اس میں بھی ایک خاص اثر ہوتا ہے۔

کبھی شیاطین کا نام لے کر شیطانی کاموں سے بھی لوگ کرتے ہیں۔ کبھی دواؤں وغیرہ کے ذریعے سے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان کا کہ بعض بیان جادو ہے' دو مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ بطور تعریف کے آپ نے فرمایا ہو اور ممکن ہے کہ بطور مذمت کے یہ ارشاد ہوا ہو کہ وہ اپنی غلط بات اس طرح بیان کرتا ہے کہ سچ معلوم ہوتی ہے۔ جیسے ایک اور حدیث میں ہے کہ میرے پاس تم مقدمہ لے کر آتے ہو' ایک اپنی چرب زبانی سے اپنے غلط دعوے کو صحیح ثابت کر دیتا ہے۔ وزیر ابوالمظفر یحییٰ بن محمد بن ہبیر رحمہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب الاشراف علی مذاہب الاشراف میں سحر کے باب میں کہا ہے کہ اجماع ہے کہ جادو کی حقیقت ہے لیکن ابوحنیفہؒ اس کے قائل نہیں۔ جادو کے سیکھنے والے اور اسے استعمال میں لانے والے کو امام ابوحنیفہ' امام مالک اور امام احمدؒ رحمہم اللہ تو کافر بتلاتے ہیں۔ امام ابوحنیفہؒ کے بعض شاگردوں کا قول ہے کہ اگر جادو کو بچاؤ کے لئے سیکھے تو کافر نہیں ہوتا۔ ہاں جو اس کا اعتقاد رکھے اور اسے نفع دینے والا سمجھے' وہ کافر ہے اور اس طرح جو یہ خیال کرتا ہے کہ شیاطین یہ کام کرتے ہیں اور اتنی قدرت رکھتے ہیں' وہ بھی کافر ہے۔ امام شافعی فرماتے ہیں جادوگر سے دریافت کیا جائے کہ اگر وہ بابل والوں کا سا عقیدہ رکھتا ہو اور سات سیاروں کو تاثیر پیدا کرنے والا جانتا ہو تو کافر ہے۔ اگر یہ نہ ہو اور جادو کو جائز جانتا ہو تو بھی کافر ہے۔ امام مالکؒ اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کا قول یہ بھی ہے کہ جادوگر نے جب جادو کیا اور جادو کو استعمال میں لایا ہو ہیں اسے قتل کر دیا جائے امام شافعیؒ اور امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں' جب تک بار بار نہ کرے یا کسی معین شخص کے بارے میں خود اقرار نہ کرے۔ تب تک قتل نہ کیا جائے۔ تینوں امام فرماتے ہیں کہ اس کا قتل بوجہ حد کے ہے مگر امام شافعیؒ کا بیان ہے کہ بوجہ قصاص کے ہی ہے۔ امام مالک' امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور ایک مشہور قول میں امام احمدؒ کا فرمان ہے کہ جادوگر سے توبہ بھی نہ کرائی جائے۔ اس کی توبہ سے اس پر سے حد نہیں ہٹے گی اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کہ اس کی توبہ مقبول ہوگی۔ ایک قول امام احمد کا بھی ایک روایت میں یہ ہے۔ اہل کتاب کا جادوگر بھی امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک قتل کر دیا جائے گا لیکن تینوں اماموں کا مذہب اس کے برخلاف ہے۔ لبید ابن اعصم یہودی نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر جادو کیا تھا اور آپ نے اسکے قتل کرنے کو نہیں فرمایا۔ اگر کوئی مسلمان عورت جادوگرنی ہو تو اس کے بارے میں امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ اُسے قید کر دیا جائے اور انہی تین ائمہ کا قول ہے کہ اسے بھی مرد کی طرح قتل کر دیا اور مشرک قتل نہ کیا جائے۔ امام مالک فرماتے ہیں اگر ذمی کے جادو سے کوئی مر جائے تو ذمی کو بھی مار ڈالنا چاہئے۔ یہ بھی آپ سے روایت ہے کہ پہلے تو اسے کہا جائے کہ توبہ کرو' کر لے اور اسلام قبول کر لے تو خیر' ورنہ قتل کر دیا جائے[1] اور یہ بھی آپ سے مروی ہے کہ اگرچہ اسلام قبول کر لے تاہم قتل کر دیا

[1] امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا مطلب یہ ہے کہ اسلام چونکہ سحر اور جادو کے تمام کاروبار پر علی الاطلاق حرمت کا حکم لگاتا ہے۔ اس لئے ایک شخص مسلمان ہونے کے بعد سحر سے کسی قسم کی دلچسپی رکھ ہی نہیں سکتا۔ اس لئے جادوگر سے اسلام قبول کرنیکا مطلب بھی گویا جادو کی ممانعت کی ایک مفید صورت ہے۔ اس سے یہ سمجھنا کہ اسلام قبول نہ کرنے پر قتل کیا گیا ہے' قطعاً غلط ہوگا' اس کو یوں سمجھئے' جیسا کہ کوئی طبیب جس کو پیہم کسی مریض کے متعلق یہ اطلاع پہنچ رہی ہو کہ یہ سخت بد پرہیز ہے۔ ساتھ ہی اس حکیم کا کوئی مخصوص ہسپتال بھی ہو۔ جس میں پرہیز کھانے کی ایک معقول رقم وصول کی جاتی ہو۔ تو وہ طبیب اس مریض سے کہے کہ چونکہ تم بد پرہیز ہو اور کامل پرہیز ہی سے تم کو شفا ہو سکتی ہے۔ اس لئے فوراً تم ہمارے دارالشفا میں داخلہ لے لو۔ ظاہر ہے کہ یہ مشورہ محض خیر خواہی پر موقوف ہے۔ یہ سمجھنا تو صحیح نہ ہوگا کہ طبیب نے ایک معقول رقم اینٹھنے کے لئے ایسا مشورہ دیا ہے۔ ۱۲

جائے۔ اس جادوگر کو جس کے جادو میں شرکیہ الفاظ ہوں' چاروں امام وغیرہ کافر کہتے ہیں کیونکہ قرآن میں ہے: ﴿فَلَا تَكْفُرْ﴾ (البقرة:۱۰۲) امام مالک فرماتے ہیں' جب اس پر غلبہ پالیا جائے' پھر بہرصورت مارا جائے گا۔ امام شافعی فرماتے ہیں' اگر وہ کہے کہ مار ڈالنے کے لئے میں نے اس پر جادو نہیں کیا تو قتل خطا کی دیت (جرمانہ) لے لی جائے۔ جادوگر سے اس کے اتروانے کی حضرت سعید بن میتب نے اجازت دی ہے۔ جیسے صحیح بخاری شریف میں ہے۔ عامر شعبی بھی اس میں کوئی حرج نہیں بتلاتے لیکن خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ اسے مکروہ بتاتے ہیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا تھا کہ آپ ﷺ کیوں جادو کھلواتے نہیں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا مجھے تو اللہ تعالیٰ نے شفا دے دی اور میں لوگوں پر برائی کھلوانے سے ڈرتا ہوں۔ (بخاری)

جادو کا علاج ☆ حضرت وہب فرماتے ہیں' بیری کے سات پتے لے کر سل بٹے پر کوٹ لئے جائیں اور پانی ملا لیا جائے پھر آیت الکرسی پڑھ کر اس پر دم کیا جائے اور جس پر جادو کیا گیا ہے' اسے تین گھونٹ پلا دیا جائے' اور باقی پانی سے غسل کروایا جائے۔ ان شاء اللہ جادو کا اثر جاتا رہے گا۔ یہ عمل خصوصیت سے اس شخص کے لئے بہت ہی اچھا ہے جو اپنی بیوی سے روک دیا گیا ہو۔ جادو کو دور کرنے کے لئے اور اس کے اثر کو زائل کرنے کے لئے سب سے اعلیٰ چیز: ﴿قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ﴾ اور ﴿قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ﴾ کی سورتیں ہیں۔ حدیث میں ہے کہ ان جیسا کوئی تعویذ نہیں۔ (نسائی)' اسی طرح آیت الکرسی بھی شیطان کو دفع کرنے میں اعلیٰ درجہ کی چیز ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا وَقُوْلُوا انْظُرْنَا وَاسْمَعُوْا ۭ وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۰۴﴾ مَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَلَا الْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يُّنَزَّلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ خَيْرٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۭ وَاللّٰهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ﴿۱۰۵﴾

اے ایمان والوں تم (لفظ) راعنا مت کہا کرو اور اُنظرنا کہہ دیا کرو اور نہ اچھی طرح سن لیجیو اور (ان) کافروں کو (تو) سزائے دردناک ہوگی۔ ذرا بھی پسند نہیں کرتے کافر لوگ (خواہ) ان اہل کتاب میں سے (ہوں) اور (خواہ) مشرکین میں سے اس اَمر کو کہ تم کو کسی طرح کی بہتری (بھی) نصیب ہو تمہارے پروردگار کی طرف سے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت (وعنایت) کے ساتھ جس کو منظور ہوتا ہے مخصوص فرما لیتے ہیں اور اللہ بڑا فضل (کرنے) والا ہے۔○

یہود کا نبی کریم ﷺ کو ذومعنی الفاظ سے پکارنا ☆

اس آیت میں اللہ تعالیٰ اپنے بندوں' مؤمنوں کو کافروں کی بول چال اور ان کے کاموں کی مشابہت سے روک رہا ہے۔ یہودی بعض الفاظ زبان دبا کر بولتے تھے اور مطلب برا لیتے تھے۔ جب انہیں یہ کہنا ہوتا کہ ہماری سنیئے تو کہتے تھے: راعنا اور مراد اس سے رعونت اور سرکشی لیتے تھے۔ جیسے اور جگہ بیان ہے: ﴿مِنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا...... ﴾ (النساء:۴۶) یعنی یہودیوں میں ایسے لوگ بھی ہیں جو باتوں کو اصلیت سے ہٹا دیتے ہیں اور کہتے ہیں ہم سنتے ہیں لیکن مانتے نہیں۔ اپنی زبانوں کو موڑ توڑ کر دین میں طعنہ زنی کے لئے راعنا کہتے ہیں۔ اگر یہ کہتے کہ ہم نے سنا اور مانا ہماری بات سنیئے اور ہماری طرف توجہ کیجئے تو ان کے لئے بہتر اور مناسب ہوتا لیکن ان کے کفر کی وجہ

سے خدا نے انہیں اپنی رحمت سے دور ڈال دیا ہے۔ ان میں ایمان بہت ہی کم ہے۔ حدیثوں میں یہ بھی آیا ہے کہ جب لوگ سلام کرتے تو اَلسَّامُ عَلَیْکُمْ کہتے ہیں اور سَام کے معنی موت کے ہیں تو تم ان کے جواب میں وَعَلَیْکُمْ کہا کرو ہماری دعا ان کے حق میں قبول ہوگی (بخاری) اور ان کی بدعا ہمارے حق میں قبول نہ ہوگی۔ الغرض قول وفعل میں ان سے مشابہت کرنی منع ہے۔ مسند احمد کی حدیث میں ہے میں قیامت کے قریب تلوار کے ساتھ بھیجا گیا ہوں۔ میری روزی حق تعالیٰ نے میرے نیزے تلے رکھی ہے۔ ذلت اور پستی اس کے لئے ہے جو میرے احکام کے خلاف کرے اور جو شخص کسی (غیر مسلم) قوم سے مشابہت کرے انہی میں سے ہے۔ ابوداؤد میں بھی یہ پچھلا حصہ روایت ہے۔ اس آیت اور حدیث سے ثابت ہوا کہ کفار کے اقوال وافعال لباس اور عبادت میں ان کی مشابہت کرنا جو ہمارے مشرف اور مقرر نہیں، سخت منع ہے اور اس پر شریعت میں عذاب کی دھمکی اور سخت ڈر اور حرمت ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ جب تم قران کریم میں: ﴿یٰٓاَیُّھَاالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا﴾ سنو تو کان لگا دو اور دل سے متوجہ ہو جایا کرو یا تو کسی برائی سے ممانعت ہوگی۔ حضرت خثیمہ فرماتے ہیں۔ تورات میں بنی اسرائیل کو خطاب کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے: ﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ الْمَسَاکِیْنَ﴾ فرمایا ہے لیکن اُمت محمدی کو: ﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا﴾ کے معزز خطاب سے یاد فرمایا ہے۔ راعنا کے معنی ہماری طرف کان لگانے کے ہیں۔ جیسے عَاطِنَا (طبری)۔ حضرت مجاہد فرماتے ہیں اس کے معنی خلاف کے ہیں یعنی خلاف نہ کہا کرو۔ ان سے یہ بھی مروی ہے کہ مطلب یہ ہے کہ آپ ہماری سنیے اور ہم آپ کی۔ انصار نے بھی یہی لفظ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے شروع کر دیا تھا۔ جس سے قرآن پاک نے انہیں روک دیا۔ حسن فرماتے ہیں۔ راعن کہتے ہیں مذاق کی بات کو یعنی تم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی باتوں اور اسلام سے مذاق نہ کیا کرو۔ ابوصخر کہتے ہیں جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم جانے لگتے تو جنہیں کوئی بات کہنی ہوتی۔ وہ کہتے اپنا کان ادھر کیجئے۔ اللہ تعالیٰ نے اس بے ادبی کے کلمہ سے روک دیا اور اپنے نبی کی عزت کرنے کی تعلیم فرمائی۔ سدی کہتے ہیں رفاعہ بن زید یہودی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے باتیں کرتے ہوئے یہ لفظ کہا کرتا تھا۔ مسلمانوں نے بھی یہ خیال کر کے یہ لفظ ادب کے ہیں، یہی لفظ بولنے شروع کر دیئے جس پر انہیں روک دیا گیا۔ جیسے سورہ نساء میں ہے۔ مقصد یہ ہے کہ اس کلمہ کو خدا نے برا جانا اور اس کے استعمال سے مسلمانوں کو روک دیا۔ جیسے حدیث میں آیا کہ انگور کو کرم اور غلام کو عبد نہ کہو وغیرہ۔ اللہ تعالیٰ ان بدباطن لوگوں کے حسد وبغض کو بیان فرماتا ہے کہ اے مسلمانو! تمہیں جو اس کامل نبی کے ذریعے کامل شریعت ملی ہے اس سے تو یہ جل بھن رہے ہیں۔ ان سے کہہ دو کہ یہ تو اللہ تعالیٰ کا فضل ہے، جسے چاہے عنایت فرمائے وہ بڑے ہی فضل وکرم والا ہے۔

مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰیَةٍ اَوْ نُنْسِھَا نَاْتِ بِخَیْرٍ مِّنْھَآ اَوْ مِثْلِھَا ؕ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴿۱۰۶﴾ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰہَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ مِنْ وَّلِیٍّ وَّ لَا نَصِیْرٍ ﴿۱۰۷﴾

ہم کسی آیت کا حکم جو موقوف کر دیتے ہیں یا اس آیت (ہی) کو (ذہنوں سے) فراموش کر دیتے ہیں تو ہم اس آیت سے بہتر یا اس آیت ہی کی مثل لے آتے ہیں (اے معترض) کیا تجھ کو یہ معلوم نہیں کہ حق تعالیٰ ہر شے پر قدرت رکھتے ہیں۔ کیا تجھ کو یہ معلوم نہیں کہ حق تعالیٰ ایسے ہی ہیں کہ خاص ان ہی کی ہے سلطنت آسمانوں کی اور زمین کی اور (یہ بھی سمجھ رکھو کہ) تمہارا حق

تعالیٰ کے سوا کوئی یار و مددگار نہیں۔

نسخ کی حقیقت ☆

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں' نسخ کے معنی بدل کے ہیں۔ مجاہد فرماتے ہیں' مٹانے کے معنی ہیں۔ جو (کبھی) لکھنے میں باقی رہتی ہے اور حکم بدل جاتا ہے۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے شاگرد اور ابوالعالیہ اور محمد بن کعب قرظی سے بھی اسی طرح مروی ہے۔ ضحاک فرماتے ہیں' بھلا دینے کے معنی ہیں۔ عطا فرماتے ہیں چھوڑ دینے کے معنی ہیں۔ سدی کہتے ہیں' اٹھا لینے کے معنی ہیں۔ جیسے آیت: اَلشَّيْخُ وَالشَّيْخَةُ اِذَا زَنَيَا فَارْجُمُوْهُمَا اَلْبَتَّةَ۔ یعنی زانی مرد و عورت کو سنگسار کر دیا کرو اور جیسے آیت: لَوْ كَانَ لِابْنِ اٰدَمَ وَ ادِيَانِ مِنْ ذَهَبٍ لَابْتَغٰى لَهُمَا ثَالِثًا۔ یعنی ابن آدم کو اگر دو جنگل سونے کے مل جائیں' جب بھی وہ تیسرے کی جستجو میں رہے گا۔ (بخاری) امام ابن جریر فرماتے ہیں کہ احکام میں تبدیلی ہم کر دیا کرتے ہیں۔ حلال کو حرام' حرام کو حلال' جائز کو ناجائز' ناجائز کو جائز وغیرہ۔ امر و نہی روک اور رخصت جائز اور ممنوع کاموں میں نسخ ہوتا ہے۔ ہاں جو خبریں دی گئی ہیں واقعات بیان کئے گئے ہیں۔ ان میں رد و بدل اور ناسخ و منسوخ نہیں ہوتا۔ نسخ کے لفظی معنی نقل کرنے کے ہیں۔ جیسے کتاب کے ایک نسخے سے دوسرا نقل کر لینا۔ اسی طرح یہاں بھی چونکہ ایک حکم کے بدلے دوسرا حکم ہوتا ہے' اس لئے اسے نسخ کہتے ہیں۔ خواہ وہ حکم کا بدل ہو خواہ الفاظ کا۔

نسخ کی حقیقت پر علمائے اصول کی رائے ☆ علمائے اصول کی عبارتیں اس مسئلہ میں گو مختلف ہیں مگر معنی کے لحاظ سے سب قریب قریب ہیں۔ نسخ کے معنی کسی حکم شرعی کا پچھلی دلیل سے ہٹ جانا ہے۔ کبھی ہلکی چیز کے بدلے بھاری ہوتی ہے۔ کبھی بھاری کے بدلے ہلکی اور کبھی کوئی بدل ہی نہیں ہوتا۔ رہے نسخ کے احکام' اس کی قسمیں' اس کی شرطیں وغیرہ۔ سو اس کے لئے اس فن کی کتابوں کو دیکھنا چاہئے۔ تفسیر ان احکام کے بسط کی جگہ نہیں۔ طبرانی میں ایک روایت ہے کہ دو شخصوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک سورت یاد کی تھی۔ اسے وہ پڑھتے رہے۔ ایک مرتبہ رات کی نماز میں ہر چند اسے پڑھنا چاہا' لیکن یاد ہی نہیں پڑی۔ گھبرا کر خدمت نبوی میں حاضر ہوئے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا ذکر کیا۔ آپ نے فرمایا' یہ منسوخ ہو گئی اور بھلا دی گئی۔ دلوں سے نکال لی گئی تم غم نہ کرو' بےفکر ہو جاؤ۔

حضرت زہری نون خفیفہ پیش کے ساتھ پڑھتے تھے۔ اس کے ایک راوی سلیمان بن راقم ضعیف ہیں۔ ابوبکر انباری نے بھی دوسری سند سے اسے مرفوع روایت کیا ہے۔ جیسے قرطبی کا بیان ہے: نُنْسِهَا کو نَنْسَاهَا بھی پڑھا گیا ہے۔ نَنْسَاهَا کے معنی مؤخر کرنے پیچھے ہٹا دینے کے ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما اس کی تفسیر میں فرماتے ہیں' یعنی ہم اسے چھوڑ دیتے ہیں' منسوخ نہیں کرتے۔ ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے شاگرد کہتے ہیں' یعنی ہم اس کے الفاظ کو باقی رکھتے ہیں اور حکم کو بدل دیتے ہیں۔ عبد بن عمیر مجاہد اور عطا سے مروی ہے' اسے ہم مؤخر کرتے ہیں اور پیچھے ہٹا دیتے ہیں۔ عطیہ عوفی کہتے ہیں' یعنی منسوخ نہیں کرتے۔ سدی اور ربیع بھی یہی کہتے ہیں۔ ضحاک فرماتے ہیں' یعنی ناسخ کو منسوخ کے پیچھے رکھتے ہیں۔ ابوالعالیہ کہتے ہیں' اپنے پاس اسے روک لیتے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے خطبہ میں نُنْسَأْهَا اور اس کے معنی مؤخر ہونے کے بیان کئے۔ نُنْسَأْهَا جب پڑھیں تو یہ مطلب ہو گا کہ ہم اسے بھلا دیں۔ اللہ تعالیٰ جس حکم کو اٹھا لینا چاہتا تھا وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بھلا دیتا تھا۔ اس طرح وہ آیت اُٹھ جاتی تھی۔ حضرت سعد بن وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ ننسھا پڑھتے تھے تو ان سے قاسم بن ربیعہ نے کہا کہ سعید بن مسیب تو ننسا ھا پڑھتے ہیں۔ تو آپ نے فرمایا' سعید پر یا سعید کے خاندان پر تو قرآن نہیں اترا؟ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰى﴾ (الاعلیٰ: ۶) ہم تجھے پڑھائیں گے جسے تو

نہ بھولے گا اور فرماتا ہے: ﴿وَاذْكُرْ رَّبَّكَ إِذَا نَسِيْتَ﴾ (الکہف:۲۴) جب بھول جا تو اپنے رب کو یاد کر۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا فرمان ہے کہ علیؓ سب سے اچھا فیصلہ کرنے والے اور ابی سب سے زیادہ قاری قرآن ہیں اور ہم اُبیؓ کا قول چھوڑ دیتے ہیں۔ اس لئے کہ اُبیؓ کہتے ہیں' میں نے تو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے اُسے نہیں چھوڑوں گا اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿مَا نَنْسَخْ......﴾ یعنی ہم منسوخ کریں یا بھلادیں۔ اس سے بہتر لاتے ہیں یا اس جیسا (بخاری و مسند احمد) اس سے بہتر ہوتا ہے یعنی بندوں کی سہولت اور ان کے آرام کے لحاظ سے' یا اس جیسا ہوتا ہے۔ لیکن مصلحت الٰہی اس پچھلی چیز میں ہوتی ہے۔

مخلوق میں ہیر پھیر کرنے والا' پیدائش اور حکم کا اختیار رکھنے والا ایک اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ جس طرح جسے چاہتا ہے بناتا ہے' جسے چاہے نیک بختی دے' جسے چاہے بدبختی دے' جسے چاہے بیماری دے' جسے چاہے توفیق دے' جسے چاہے بے نصیب کر دے' بندوں میں جو حکم چاہے جاری کر دے' جسے چاہے حلال کر دے' جسے چاہے حرام فرما دے' جسے چاہے رخصت دے' جسے چاہے روک دے۔ وہ حاکم مطلق ہے جو چاہے احکام جاری فرمائے۔ کوئی اس کے حکموں کو رد نہیں کر سکتا۔ جو چاہے کرے' کوئی اس سے باز پُرس نہیں کر سکتا۔ وہ بندوں کو آزماتا ہے اور دیکھتا ہے کہ وہ نبیوں رسولوں کے کیسے تابع دار ہیں۔ کسی چیز کا کسی مصلحت کی بنا پر حکم دیا۔ پھر مصلحت کی وجہ سے ہی اس حکم کو ہٹا دیا۔ اب آزمائش ہو جاتی ہے۔ نیک لوگ تو اس وقت بھی اطاعت کے لئے کمربستہ تھے اور اب بھی ہیں لیکن بد باطن لوگ باتیں بناتے ہیں اور ناک بھوں چڑھاتے ہیں۔ حالانکہ تمام مخلوق کو اپنی خالق کی تمام باتیں ماننی چاہئیں اور ہر حال میں رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کرنی چاہئے اور جو وہ کہے اسے دل سے سچا ماننا چاہئے۔ جو حکم دے بجالانا چاہئے۔ جس سے روکے' رُک جانا چاہئے اس مقام پر بھی یہودیوں کا زبردست رد ہے اور ان کے کفر کا بیان ہے کہ وہ نسخ کے قائل نہ تھے۔ بعض تو کہتے تھے کہ اس میں عقلی طور پر بھی اشکالات ہیں اور بعض اس میں نقلاً بھی مشکلات کا اقرار کرتے ہیں۔ اس آیت میں خطاب گو فخر عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے مگر دراصل یہ کلام یہودیوں کو سنانا ہے۔ جو انجیل کو اور قرآن کو اس لئے نہیں مانتے تھے کہ ان میں بعض احکام تورات کے منسوخ ہو گئے تھے اور اسی وجہ سے وہ ان نبیوں کی نبوت کے بھی منکر ہو گئے تھے۔ صرف عناد و تکبر کی بنا پر۔ ورنہ عقلاً نسخ محال نہیں۔ اس لئے کہ جس طرح چاہے وہ اپنے کاموں میں باختیار ہے۔ اسی طرح حکموں میں بھی اختیار ہے جو چاہے اور جب چاہے پیدا کرے۔ جسے چاہے اور جس طرح چاہے اور جس وقت چاہے رکھے۔ اسی طرح جو چاہے اور جس وقت چاہے حکم دے۔ ظاہر ہے کہ اس پر کس کا حکم نافذ ہو سکتا ہے؟ اسی طرح نقلاً بھی یہ ثابت شدہ امر ہے۔ اگلی کتابوں اور پہلی شریعتوں میں موجود ہے۔

حضرت آدم علیہ السلام کی بیٹیاں بیٹے آپس میں بھائی بہن ہوتے تھے لیکن نکاح جائز تھا۔ پھر اسے حرام کر دیا نوح علیہ السلام جب کشتی سے اُترتے ہیں تب تمام حیوانات کا کھانا حلال تھا لیکن بعض کی حلت منسوخ ہو گئی۔ دو بہنوں کا نکاح اسرائیل اور ان کی اولاد پر حلال تھا لیکن پھر تورات میں اور اس کے بعد حرام ہو گیا۔ ابراہیم علیہ السلام کو بیٹے کی قربانی کا حکم دیا۔ پھر قربان کرنے سے پہلے ہی منسوخ کر دیا۔ بنو اسرائیل کو حکم دیا جاتا ہے کہ بچھڑا پوجنے میں جو شامل تھے سب اپنی جانوں کو قتل کر ڈالیں لیکن پھر بہت سے باقی رہے' جو منسوخ ہو جانا ہے۔ اسی طرح کے اور بہت سے واقعات موجود ہیں اور خود یہودیوں کو ان کا اقرار ہے لیکن پھر بھی قرآن اور نبی آخر الزماں کو یہ کہہ کر نہیں مانتے کہ اس سے خدا کے کلام میں نسخ لازم آتا ہے اور وہ محال ہے۔ بعض لوگ جو اس کے جواب میں لفظی بحثوں میں جاتے ہیں۔ وہ یاد رکھیں کہ اس سے دلالت نہیں بدلتی اور مقصود وہی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارت یہ لوگ اپنی کتابوں میں پاتے تھے' آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تابعداری کا حکم بھی دیکھتے تھے۔ یہ بھی معلوم تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت کے مطابق جو عمل نہ ہو' وہ مقبول نہیں۔

اور بات ہے کہ کوئی کہے وہ اگلی شریعتیں صرف آپ کے آنے تک ہی تھیں۔اس لئے یہ شریعت ان کی ناسخ نہیں یا کہے کہ ناسخ ہے۔بہر صورت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی تابعداری بغیر کوئی چارہ نہیں۔اس لئے کہ آپ آخری کتاب کو خدا کے پاس سے لے کر آئے ہیں۔پس اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے نسخ کے جواز کو بیان فرما کر اس ملعون یہود کا رد کیا ہے۔سورہ آل عمران میں بھی' جس کے شروع میں بنی اسرائیل کو خطاب کیا گیا ہے' نسخ کے واقع ہونے کا ذکر موجود ہے۔فرمایا ہے: ﴿كُلُّ الطَّعَامِ...... ﴾ (آل عمران ۹۳) یعنی کل کھانے بنی اسرائیل پر حلال تھے مگر جس چیز کو حضرت اسرائیل علیہ السلام نے اپنی اوپر حرام کر لیا تھا۔اس کی مزید تفسیر وہیں آئے گی ان شاءاللہ تعالیٰ۔مسلمان کل کے کل متفق ہیں کہ احکام باری تعالیٰ میں نسخ کا ہونا جائز ہے بلکہ واقع بھی ہے اور اسی میں پروردگار کی حکمت بالغہ ہے۔ابو مسلم اصبہانی مفسر نے لکھا ہے کہ قرآن میں نسخ واقع نہیں ہوتا لیکن اس کا یہ قول ضعیف ہے۔جہاں جہاں نسخ قرآن میں موجود ہے۔اس کے جواب میں گو بہت محنت اٹھائی ہے لیکن محض بے سود ہیں۔دیکھئے پہلے اس عورت کی عدت' جس کا خاوند مر جائے' ایک سال تھی۔لیکن پھر چار مہینے دس دن ہوئی اور دونوں آیتیں قرآن پاک میں موجود ہیں۔قبلہ پہلے بیت المقدس تھا' پھر کعبۃ اللہ ہوا۔دوسری آیت صاف اور پہلا حکم بھی ضمناً مذکور ہے۔پہلے مسلمانوں کو حکم تھا کہ ایک ایک مسلمان دس دس کافروں سے لڑے اور ان کے مقابلے سے نہ ہٹے لیکن پھر یہ حکم منسوخ ہو کر دو دو کے مقابلہ میں صبر کرنے کا حکم ہوا اور دونوں آیتیں کلام اللہ میں موجود ہیں۔پہلے حکم تھا کہ نبی ﷺ سے سرگوشی کرنے سے پہلے صدقہ دیا کرو لیکن پھر یہ حکم منسوخ ہوا اور یہ دونوں آیتیں قران کریم میں موجود ہیں وغیرہ وغیرہ۔واللہ اعلم۔

اَمْ تُرِيْدُوْنَ اَنْ تَسْـَٔلُوْا رَسُوْلَكُمْ كَمَا سُئِلَ مُوْسٰى مِنْ قَبْلُ ۭ وَمَنْ يَّتَبَدَّلِ الْكُفْرَ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ ضَلَّ سَوَاۗءَ السَّبِيْلِ ۱۰۸

ہاں تم کیا یہ چاہتے ہو کہ اپنے رسول سے (بے جا) درخواستیں کرو جیسا کہ اس سے قبل حضرت موسیٰ (علیہ السلام) سے بھی (ایسی ہی) درخواست کی جا چکی ہیں اور جو شخص بجائے ایمان لانے کے کفر (کی باتیں) کرے۔بلا شک وہ شخص راہ راست سے دور جا پڑا۔O

کثرتِ سوال اور پوچھ تاچھ سے ممانعت ☆

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ ایمان والوں کو روکتا ہے کہ کسی واقعہ کے ہونے سے پہلے میرے نبی سے فضول سوال نہ کیا کرو۔یہ کثرتِ سوال کی عادت بہت بری ہے۔جیسے اور جگہ ارشاد ہے: ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَسْـَٔـلُوْا عَنْ اَشْيَاۗءَ ..... ﴾ (المائدۃ:۱۰۱) ایمان والو! ان چیزوں کا سوال نہ کیا کرو جو اگر ظاہر کر دی جائیں تو تمہیں برا لگے گا اور اگر تم قرآن کے نازل ہونے کے زمانے میں ایسی پوچھ گچھ جاری رکھو گے تو یہ چیزیں ظاہر کر دی جائیں گی۔کسی چیز کے واقع ہونے سے پہلے اس کی نسبت سوال کرنے میں خوف ہے کہ کہیں اس سوال کی وجہ سے وہ حرام نہ ہو جائے۔صحیح حدیث میں ہے کہ مسلمانوں میں سب سے بڑا مجرم وہ ہے جو اس چیز کے بارے میں سوال کرے جو حرام نہ تھی۔پھر اس کے سوال سے حرام ہو گئی۔(بخاری ومسلم) ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال ہوا کہ ایک شخص اپنی بیوی کے ساتھ غیر مرد کو پائے تو کیا کرے؟ اگر لوگوں کو خبر کرے تو یہ بھی بڑی بے شرمی کی بات ہے اور اگر چپ ہو جائے تو بڑی بے غیرتی کی بات ہے۔حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ سوال بہت برا معلوم ہوا۔آخر اُسی شخص پر ایسا واقعہ پیش آ گیا اور لعان کا حکم نازل ہوا۔

صحیحین کی ایک حدیث میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم فضول بکواس سے اور مال کو ضائع کرنے میں اور زیادہ پوچھ گچھ سے منع

فرمایا کرتے تھے۔ صحیح مسلم میں ہے میں جب تک کچھ نہ کہوں تم بھی نہ پوچھو۔ تم سے اگلے لوگوں کو اسی بری خصلت نے ہلاک کر دیا کہ وہ بکثرت سوال کیا کرتے تھے اور اپنے نبیوں پر اختلاف کرتے تھے۔ جب میں تمہیں کوئی حکم دوں تو اپنی طاقت کے مطابق عمل کرو اور اگر منع کروں تو رک جایا کرو۔ یہ آپ نے اس وقت فرمایا تھا' جب لوگوں کو خبر دی کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے تم پر حج فرض کیا ہے تو کسی نے کہا' حضور ﷺ ہر سال؟ آپ ﷺ خاموش ہو گئے۔ اس نے پھر پوچھا' آپ ﷺ نے کوئی جواب نہ دیا اس نے تیسری دفعہ پھر سوال کیا۔ آپ نے فرمایا ہر سال نہیں لیکن اگر میں ہاں کر دیتا تو ہر سال فرض ہو جاتا اور پھر تم کبھی بھی اس حکم کو نہ بجا لا سکتے تھے۔ پھر آپ نے مندرجہ بالا فرمان ارشاد فرمایا۔ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں' جب ہمیں آپ ﷺ سے سوال کرنے سے روک دیا گیا تو ہم حضور ﷺ سے پوچھنے میں بہت ہیبت کھاتے تھے۔ چاہتے تھے کہ کوئی بادیہ نشین ناواقف شخص آ جائے وہ پوچھے تو ہم بھی سن لیں۔ حضرت بن عازب رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں' میں کوئی سوال حضور ﷺ سے کرنا چاہتا تھا تو سال سال گزر جاتا تھا اور رعب کی وجہ سے پوچھنے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔ ہم تو خواہش رکھتے تھے کہ کوئی اعرابی آئے اور حضور ﷺ سے سوال کرے' پھر ہم بھی سن لیں۔ حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں' اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے بہتر کوئی جماعت نہیں۔ انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے صرف بارہ ہی مسئلہ پوچھے۔ جو سب سوال مع جواب کے قرآن پاک میں مذکور ہیں۔ جیسے چاند وغیرہ کا سوال۔ حرمت والے مہینوں کی بابت سوال' یتیموں کی بابت سوال وغیرہ وغیرہ۔ یہاں پر اَمْ یا بَلْ کے معنی میں ہے یا اپنے اصلی معنی میں ہے یعنی سوال کے بارے میں جو یہاں پر انکاری ہے۔ یہ حکم مومن کافر سب کو ہے کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت سب کی طرف تھی۔ قرآن میں اور جگہ ہے: ﴿يَسْـَٔلُكَ اَهْلُ الْكِتٰبِ﴾ (النساء:۱۵۳) اہل کتاب تجھ سے سوال کرتے ہیں کہ تو ان پر کوئی آسمانی کتاب اتارے۔ انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اس سے بھی بڑا سوال کیا تھا کہ خدا کو ہم اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتے ہیں۔ جس ظلم کی وجہ سے انہیں ایک تند آواز سے ہلاک کر دیا۔ رافع بن خریملہ اور وہب بن یزید نے کہا تھا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کوئی آسمانی کتاب ہم پر نازل کیجئے۔ جسے ہم پڑھیں اور ہمارے شہروں میں دریا جاری کر دیں۔ تو ہم آپ کو مان لیں گے۔ اس پر یہ آیت اتری۔

ابو العالیہ کہتے ہیں کہ ایک شخص نے حضور ﷺ سے کہا یا رسول اللہ! کاش کہ ہمارے گناہوں کا کفارہ بھی اسی طرح ہو جاتا جس طرح بنی اسرائیل کے گناہوں کا ہوا تھا۔ آپ ﷺ نے یہ سنتے ہی تین دفعہ جناب باری میں عرض کیا کہ نہیں خدایا نہیں ہم یہ نہیں چاہتے۔ پھر فرمایا سنو! بنی اسرائیل میں سے جہاں کوئی گناہ کرتا' اس کے دروازے پر لکھا ہوا پایا جاتا اور ساتھ ہی اس کا کفارہ بھی لکھا ہوا ہوتا تھا۔ اب یا تو دنیا کی رسوائی کو منظور کر کے کفارہ ادا کر دے اور اپنے پوشیدہ گناہوں کو ظاہر کرے یا کفارہ نہ دے اور آخرت کی رسوائی کو منظور کر کے کفارہ ادا کر دے لیکن تم سے اللہ تعالیٰ نے فرما دیا: ﴿وَمَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا اَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهٗ ثُمَّ يَسْتَغْفِرِ اللّٰهَ يَجِدِ اللّٰهَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا﴾ (النساء:۱۱۰) یعنی جس سے کوئی برا کام ہو جائے یا وہ اپنی جان پر ظلم کر بیٹھے۔ پھر استغفار کرے تو وہ اللہ تعالیٰ کو بہت بڑا بخشش اور مہربانی کرنے والا پائے گا۔ اسی طرح ایک نماز دوسری نماز تک گناہوں کا کفارہ ہو جاتی ہے۔ پھر جمعہ دوسرے جمعہ تک کیلئے کفارہ ہو جاتا ہے۔ سنو' جو شخص برائی کا ارادہ کرے' لیکن برائی نہ کرے تو برائی لکھی نہیں جاتی اور اگر کر گزرے تو ایک ہی برائی لکھی جاتی ہے اور اگر بھلائی کا ارادہ کرے لیکن نہ کرے تو بھلائی لکھ لی جاتی ہے اور اگر کر بھی لے تو دس بھلائیاں لکھی جاتی ہیں۔ اب بتاؤ تم اچھے رہے یا بنی اسرائیل؟ بنی اسرائیل کی بہ نسبت تمہارے لئے بہت سہولتیں ہیں۔ ہاں باوجود اتنے کرم اور رحم کے پھر بھی کوئی ہلاک ہو تو سمجھو کہ یہ خود ہلاک ہونے ہی والا تھا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ قریشیوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ اگر صفا پہاڑ سونے کا ہو جائے تو ہم

ایمان لاتے ہیں۔آپ نے فرمایا اچھا لیکن پھر مائدہ (آسمانی دسترخوان) مانگنے والوں کا جو انجام ہوا' وہی تمہارا بھی ہوگا۔اس پر وہ انکاری ہو گئے اور اپنے سوال کو چھوڑ دیا۔مراد یہ ہے کہ تکبر وعناد سرکشی کے ساتھ نبیوں سے سوال کرنا نہایت مذموم حرکت ہے۔جو کفر کو ایمان کے بدلے مول لے اور آسانی کو سختی سے بدلے۔وہ سیدھی راہ سے ہٹ کر جہالت وضلالت میں گھر جاتا ہے۔اسی طرح غیر ضروری سوال کرنے والا بھی۔جیسے اور جگہ ہے: ﴿اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ بَدَّلُوْا...... ﴾ (ابراہیم:۲۸) کیا تو انہیں دیکھا' جو اللہ کی نعمت کو کفر سے بدلتے ہیں اور اپنی قوم کو ہلاکت میں ڈالتے ہیں۔وہ جہنم میں داخل ہوں گے اور وہ بڑی بری قرار گاہ ہے۔

وَدَّ كَثِيْرٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يَرُدُّوْنَكُمْ مِّنْ بَعْدِ اِيْمَانِكُمْ كُفَّارًا ۚ حَسَدًا مِّنْ عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ مِّنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ ۚ فَاعْفُوْا وَاصْفَحُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ۗ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۰۹﴾ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ۗ وَمَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ ۗ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۱۱۰﴾

ان اہل کتاب (یعنی یہود) میں سے بہتیرے دل سے یہ چاہتے ہیں کہ تم کو تمہارے ایمان لائے پیچھے پھر کافر کر ڈالیں محض حسد کی وجہ سے جو کہ خود ان کے دلوں ہی سے (جوش مارتا) ہے حق واضح ہوئے پیچھے خیر (اب تو) معاف کرو اور درگزر کرو جب تک حق تعالیٰ (اس معاملہ کے متعلق) اپنا حکم (قانون جدید) بھیجیں۔اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے اور (سردست) نمازیں پابندی سے پڑھے جاؤ اور زکوۃ دیئے جاؤ اور جو نیک کام بھی اپنی بھلائی کے لئے جمع کرتے رہو گے حق تعالیٰ کے پاس پہنچ کر اس کو پالو گے کیونکہ اللہ تعالیٰ تمہارے سب کئے ہوئے کاموں کو دیکھ بھال رہے ہیں۔○

شانِ نزول ☆

ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ حیی بن اخطب اور ابو یاسر بن اخطب یہ دونوں یہودی سب سے زیادہ مسلمانوں کے حاسد تھے۔لوگوں کو اسلام سے روکتے تھے اور عرب سے جلتے تھے۔ان کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی۔کعب بن اشرف کا بھی یہی شغل تھا۔زہری کہتے ہیں' اس کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی ہے۔یہ بھی یہودی تھا اور اپنے شعروں میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجو کیا کرتا تھا۔(ابن ابی حاتم) گو ان کی کتاب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق موجود تھی اور یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سفتیں اچھی طرح جانتے تھے اور آپ ﷺ کو اچھی طرح پہچانتے تھے۔پھر یہ بھی دیکھ رہے تھے کہ قرآن ان کی کتاب کی تصدیق کر رہا ہے۔ایک امی اور ان پڑھ وہ کتاب پڑھتا ہے' جو سراسر معجزہ ہے لیکن صرف حسد کی بنا پر کہ عرب میں آپ ﷺ کیوں مبعوث ہوئے۔کفر وانکار پر آمادہ ہو گئے۔بلکہ اور لوگوں کو بھی بہکانا شروع کر دیا تو اس وقت گہرے مصالح کی بناء پر اللہ تعالیٰ نے مؤمنوں کو حکم دیا کہ تم درگزر کرتے رہو اور خدا کے حکم کا اور اس کے فیصلے کا انتظار کرو۔جیسے اور جگہ فرمایا تمہیں مشرکوں اور اہل کتاب سے بہت ناگوار باتیں سننی پڑیں گی۔بالآخر حکم نازل

فرمادیا کہ ان مشرکین سے اب دب کر نہ رہو۔ ان سے لڑائی کرنے کی تمہیں اجازت ہے۔ حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب مشرکین اور اہل کتاب سے درگزر کرتے تھے اور ان کی ایذا اور تکلیف سہتے تھے اور اس آیت پر عمل پیرا تھے۔ یہاں تک کہ دوسری آیتیں اتریں اور پہلا حکم منسوخ ہوگیا اور اب ان سے بدلہ لینے اور اپنا بچاؤ کرنے کا حکم ملا اور پہلی ہی لڑائی جو بدر کے میدان میں ہوئی۔ اس میں کفار کو شکست فاش ہوئی اور ان کے بڑے بڑے سرداروں کی لاشیں میدان میں بچھ گئیں۔ پھر مومنوں کو رغبت دلائی جاتی ہے کہ تم نماز اور زکوٰۃ وغیرہ کی حفاظت کرو یہ تمہیں آخرت کے عذابوں سے بچانے کے علاوہ دنیا میں بھی غلبہ اور نصرت دے گی۔ پھر فرمایا کہ خدا تمہارے ہر نیک و بد عمل کا بدلہ دونوں جہان میں دے گا۔ اس سے کوئی چھوٹا بڑا چھپا کھلا اچھا برا عمل پوشیدہ نہیں' یہ اس لئے فرمایا کہ لوگ اطاعت کی طرف توجہ دیں اور نافرمانی سے بچیں۔ مبصر کے بدلے بصیر کہا' جیسے مبدع کے بدلے بدیع اور مولم کے بدلے الیم۔ ابن حاتم کے مجموعہ احادیث میں ایک حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس آیت میں ﴿سَمِيْعٌۢ بَصِيْرٌ﴾ پڑھتے اور فرماتے تھے اللہ تعالیٰ ہر چیز کو دیکھتا ہے۔

وَقَالُوْا لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى ؕ تِلْكَ اَمَانِيُّهُمْ ؕ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۱۱﴾ بَلٰى ۚ مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗٓ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ۪ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۱۱۲﴾ وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ لَيْسَتِ النَّصٰرٰى عَلٰى شَيْءٍ ۪ وَّقَالَتِ النَّصٰرٰى لَيْسَتِ الْيَهُوْدُ عَلٰى شَيْءٍ ۙ وَّهُمْ يَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ؕ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ مِثْلَ قَوْلِهِمْ ۚ فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ﴿۱۱۳﴾

اور یہود اور نصاریٰ (یوں) کہتے ہیں کہ بہشت میں ہرگز کوئی نہ جانے پائے گا۔ بجز اُن لوگوں کے جو یہودی ہوں یا اُن کے جو نصاریٰ ہوں' (خالی) دل بہلانے کی باتیں ہیں۔ آپ کہیئے کہ (اچھا) اپنی دلیل لاؤ اگر تم سچے ہو۔ ضرور دوسرے لوگ جاویں گے جو کوئی شخص بھی اپنا رخ اللہ تعالیٰ کی طرف جھکا دے اور وہ مخلص بھی ہو تو ایسے شخص کو اس کا عوض ملتا ہے' اس کے پروردگار کے پاس پہنچ کر ملے گا۔ نہ ایسے لوگوں پر (قیامت میں) کوئی اندیشہ ہے اور نہ ایسے لوگ (اس روز) مغموم ہوں گے اور یہود کہنے لگے کہ نصاریٰ (کا مذہب) کسی بنیاد (پر قائم) نہیں اور اسی طرح نصاریٰ کہنے لگے کہ یہود کسی بنیاد پر نہیں حالانکہ یہ سب (لوگ آسمانی) کتابیں (بھی) پڑھتے ہیں۔ اس طرح یہ لوگ (بھی) جو کہ (محض) بے علم ہیں۔ ان کا سا قول کہنے لگے سو اللہ تعالیٰ ان سب کے درمیان (عملی) فیصلہ کردیں گے قیامت کے روز ان تمام (مقدمات) میں جن میں وہ باہم اختلاف کر رہے تھے۔ ○

یہود کی فریب خوردگی اور خدا تعالیٰ کی جانب سے اس پر شدید انتباہ ☆

یہاں پر یہودیوں اور نصرانیوں کے غرور کا بیان ہو رہا ہے کہ وہ اپنے سوا کسی کو کچھ بھی نہیں سمجھتے اور صاف کہتے ہیں کہ ہمارے سوا جنت میں کوئی نہیں جائے گا۔ سورہ مائدہ میں ان کا ایک قول یہ بھی بیان ہوا ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کی اولاد اور اس کے محبوب ہیں۔ جس کے جواب میں ارشاد باری ہوا اور یہ دعویٰ بھی محض بے دلیل ہے۔ اسی طرح پہلے گزرا کہ ان کا دعویٰ یہ بھی تھا کہ ہم چند دن جہنم میں رہیں گے۔ جس کے جواب میں ارشاد باری ہوا کہ یہ دعویٰ بھی بے دلیل ہے۔ اسی طرح یہاں ان کے ایک دعویٰ کے تردید کی اور کہا کہ لاؤ دلیل پیش کرو۔ انہیں عاجز ثابت کر کے پھر فرمایا کہ ہاں جو کوئی بھی خدا کا فرماں بردار ہو جائے اور خلوص و توحید کے ساتھ نیک عمل کر لے اسے پورا پورا اجر ثواب ملے گا۔ جیسے اور جگہ فرمایا کہ یہ اگر جھگڑیں تو ان سے کہہ دو کہ میں نے اور مجھے ماننے والوں نے اپنے چہرے خدا کی طرف جھکا دیئے۔ غرض یہ ہے کہ اخلاص اور مطابقت سنت ہر عمل کی قبولیت کے لئے شرط ہے تو: ﴿أَسْلَمَ وَجْهَهُ﴾ سے مراد خلوص اور ﴿وَهُوَ مُحْسِنٌ﴾ سے مراد اتباع سنت ہے۔ نرا خلوص بھی عمل کو مقبول نہیں کرا سکتا۔ جب تک سنت کی تابعداری نہ ہو۔ حدیث شریف میں ہے جو شخص ایسا عمل کرے جس پر ہمارا حکم نہ ہو وہ مردود ہے۔ (مسلم)

پس رہبانیت کا عمل گو خلوص پر مبنی ہو لیکن سنت کے سراسر خلاف ہونے کی وجہ سے وہ مردود ہے۔ ایسے ہی اعمال کی نسبت قرآن حکیم کا ارشاد ہے: ﴿وَقَدِمْنَآ إِلَىٰ مَا عَمِلُوا مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنَٰهُ هَبَآءً مَّنثُورًا﴾ (الفرقان: ۲۳) یعنی انہوں نے جو اعمال کئے تھے ہم نے سب رد کر دیئے اور جگہ ہے۔ کافروں کے اعمال ریت کے چمکیلے تودوں کی طرح ہیں، جنہیں پیاسا پانی سمجھتا ہے لیکن جب اس کے پاس جاتا ہے تو کچھ نہیں پاتا اور جگہ ہے کہ قیامت کے دن بہت سے چہروں پر ذلت برستی ہوگی۔ جو کام کرنے والے تکلیفیں اٹھانے والے ہوں گے اور بھڑکتی ہوئی آگ میں داخل ہوں گے اور گرم کھولتا ہوا پانی انہیں پلایا جائے گا۔ حضرت امیر المؤمنین عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس آیت کی تفسیر میں مراد یہود و نصاریٰ کے علما اور عابد لئے ہیں۔ یہ بھی یاد رہے کہ کوئی عمل گو ظاہراً سنت کے مطابق ہو لیکن عمل میں اخلاص نہ ہو، مقصود خدا کی خوشنودی نہ ہو تو وہ عمل بھی مردود ہے۔ ریاکار اور منافق لوگوں کے اعمال کا یہی حال ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ منافق خدا کو دھوکہ دیتے ہیں اور وہ انہیں دھوکہ دیتا ہے اور نماز کو کھڑے ہوتے ہیں تو سستی سے کھڑے ہوتے ہیں۔ صرف لوگوں کو دکھانے کے لئے عمل کرتے ہیں اور اللہ کا ذکر بہت ہی کم کرتے ہیں اور فرمایا: ﴿فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّينَ ......﴾ (الماعون: ۴) ان نمازیوں کے لئے ہلاکت اور تباہی ہے جو اپنی نماز سے غافل ہیں۔ جو ریاکاری کرتے ہیں اور چھوٹی چھوٹی چیزیں بھی روکتے پھرتے ہیں اور جگہ ارشاد ہے: ﴿فَمَنْ كَانَ يَرْجُوا ......﴾ (الکہف: ۱۱۰) جو شخص اپنے رب کی ملاقات کا آرزومند ہے، اسے نیک عمل کرنا چاہئے اور اپنے رب کی عبادت میں کسی کو شریک نہ کرنا چاہئے۔ پھر فرمایا انہیں ان کا رب اجر دے گا اور ڈر خوف سے بچائے گا۔ آخرت میں انہیں ڈر نہیں اور دنیا کے چھوڑنے کا ملال نہیں۔ پھر یہود و نصاریٰ کی آپس میں بغض و عداوت کا ذکر فرمایا۔ نجران کے نصرانیوں کا وفد جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا تو ان کے پاس یہودیوں کے علما بھی آئے۔ اس وقت ان لوگوں نے یہود کو اور یہود نے ان کو گمراہ بتلایا۔ حالانکہ دونوں اہل کتاب ہیں تورات میں انجیل کی تصدیق اور انجیل میں تورات کی تصدیق موجود ہے۔ پھر ان کا یہ قول کس قدر لغو ہے۔ اگلے یہود و نصاریٰ دین حق پر قائم تھے لیکن پھر بدعتوں اور فتنہ پردازیوں کی وجہ سے دین ان سے چھن گیا۔ اب نہ یہود ہدایت پر تھے نہ نصرانی پھر فرمایا کہ نہ جاننے والوں نے بھی اسی طرح کہا کہ اس میں بھی اشارہ انہی کی طرف ہے اور بعض نے کہا کہ مراد اس سے یہود و نصاریٰ سے پہلے کے لوگ ہیں۔ بعض کہتے ہیں عرب لوگ مراد ہیں۔ امام ابن جریرؒ اس سے عام مراد لیتے ہیں جو سب کو شامل ہے اور یہی

ٹھیک ہے۔ واللہ اعلم۔

پھر فرمایا' ان کے اختلاف کا فیصلہ قیامت میں خود اللہ تعالیٰ کرے گا۔ جس دن کوئی ظلم وزور نہیں ہوگا اور جگہ بھی یہ مضمون آیا ہے۔ سورہ حج میں ارشاد ہے: ﴿اِنَّ اللّٰہَ یَفْصِلُ بَیْنَھُمْ﴾ (الحج:۱۷) (پوری آیت) یعنی مؤمنوں اور یہودیوں اور صابیوں اور نصرانیوں اور مجوسیوں اور مشرکوں میں قیامت کے دن اللہ فیصلہ فرمائے گا۔ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر گواہ ہے اور وہ موجود ہے اور جگہ ارشاد ہے: ﴿قُلْ یَجْمَعُ بَیْنَنَا رَبُّنَا﴾ (سبا:۲۶) کہہ دے کہ ہمارا رب ہمیں جمع کرے گا وہ باخبر فیصلہ کرنے والا ہے۔

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰہِ اَنْ یُّذْکَرَ فِیْھَا اسْمُہٗ وَسَعٰی فِیْ خَرَابِھَا ط اُولٰٓئِکَ مَا کَانَ لَھُمْ اَنْ یَّدْخُلُوْھَآ اِلَّا خَآئِفِیْنَ ۥ لَھُمْ فِی الدُّنْیَا خِزْیٌ وَّلَھُمْ فِی الْاٰخِرَۃِ عَذَابٌ عَظِیْمٌ ﴿۱۱۴﴾

اور اس شخص سے زیادہ اور کون ظالم ہوگا۔ جو خدا تعالیٰ کی مسجدوں میں اُن کا ذکر (اور عبادت) کیے جانے سے بندش کرے اور ان کے ویران (و معطل) ہونے (کے بارے) میں کوشش کرے۔ ان لوگوں کو تو کبھی بے ہیبت ہو کر ان میں قدم بھی نہ رکھنا چاہئے تھا۔ (بلکہ جب جاتے ہیبت اور ادب سے جاتے) ان لوگوں کو دنیا میں بھی رسوائی (نصیب) ہوگی اور ان کو آخرت میں سزائے عظیم ہوگی۔ ○

اس آیت کی تفسیر میں دو اقوال ہیں' ایک تو یہ کہ اس سے مراد نصاریٰ ہیں۔ دوسرا یہ کہ اس سے مراد مشرکین ہیں۔ نصرانی بھی بیت المقدس کی مسجد میں پلیدی ڈال دیتے تھے اور لوگوں کو اس میں نماز ادا کرنے سے روکتے تھے۔ بخت نصر نے جب بیت المقدس کی بربادی کے لئے چڑھائی کی تھی تو ان نصرانیوں نے اس کا ساتھ دیا تھا اور مدد کی تھی۔

بختِ نصر کی مختصر تاریخ اور بیت المقدس پر اُس کا خوفناک حملہ ☆ بخت نصر بابل کا رہنے والا مجوسی تھا اور یہودیوں کے علی الرغم نصرانیوں نے بھی اس کا ساتھ دیا تھا اور اس لئے بھی کہ بنی اسرائیل نے حضرت یحییٰ بن زکریا علیہ السلام کو قتل کر ڈالا تھا اور مشرکین نے بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حدیبیہ والے سال کعبۃ اللہ سے روکا تھا۔ یہاں تک کہ ذی طویٰ میں آپ کو قربانیاں دینی پڑیں اور مشرکین سے صلح کر کے آپ وہیں سے واپس آ گئے۔ حالانکہ یہ امن کی جگہ تھی۔ باپ اور بھائی کے قاتل کو بھی یہاں کوئی نہیں چھیڑتا تھا اور اس کے اجازنے کی کوشش یہی تھی کہ ذکر اللہ اور حج وعمرہ کرنے والی مسلم جماعت کو انہوں نے روک دیا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا یہی قول ہے۔ ابن جریر نے پہلے قول کو صحیح فرمایا ہے اور کہا ہے کہ مشرکین کعبۃ اللہ کو برباد کرنے کی سعی نہیں کرتے تھے۔ یہ سعی نصاریٰ کی تھی کہ وہ بیت المقدس کی ویرانی کے درپے ہو گئے تھے لیکن حقیقت میں دوسرا قول زیادہ صحیح ہے۔ ابن زید اور حضرت عباس کا قول بھی یہی ہے اور اس بات کو بھی نہ بھولنا چاہئے کہ نصرانیوں نے یہودیوں کو بیت المقدس سے روکا تھا۔ اس وقت یہودی بھی تو محض بے دین ہو چکے تھے۔ ان پر تو حضرت داؤد اور حضرت عیسیٰ بن مریم علیہ السلام کی زبانی لعنتیں کی جا چکی تھیں۔ وہ نافرمان اور حد سے متجاوز ہو چکے تھے اور نصرانی حضرت مسیح علیہ السلام کے دین پر تھے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت سے مراد مشرکین مکہ ہیں اور یہ بھی ایک وجہ ہے کہ اوپر یہود ونصاریٰ کی مذمت بیان ہوئی تھی اور مشرکین عرب کی اس بری خصلت کا بیان ہو رہا ہے کہ انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اور آپ کے

صحابیوں کو مسجد حرام سے روکا۔ مکہ سے نکالا۔ پھر حج وعمرہ سے بھی روک دیا۔

بیت اللہ کی ویرانی کی ایک نئی توجیہ ☆ امام ابن جریر کا فرمان کہ مکہ والے بیت اللہ کی ویرانی میں کوشاں نہ تھے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کو وہاں سے روکنے اور نکال دینے اور بیت اللہ میں بُت بٹھا دینے سے بڑھ کر اس کی ویرانی کیا ہو سکتی ہے؟ خود قرآن میں موجود ہے: ﴿وَهُمْ يَصُدُّوْنَ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ﴾ (الانفال ۸) اور جگہ فرمایا: ﴿مَاكَانَ لِلْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يَّعْمُرُوْا...... ﴾ (التوبہ: ۱۷) یعنی یہ لوگ مسجد حرام سے روکتے ہیں۔ مشرکوں سے اللہ کی مسجدیں آباد نہیں ہو سکتیں جو اپنے کفر کے خود گواہ ہیں۔ جن کے اعمال غارت ہیں اور جو ہمیشہ کے لئے جہنمی ہیں۔ مسجدوں کی آبادی ان لوگوں سے ہوتی ہے جو اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان رکھنے والے اور نماز اور زکوٰۃ کے پابند اور صرف اللہ ہی سے ڈرنے والے ہیں۔ یہی لوگ راہ راست والے ہیں۔ اور جگہ فرمایا: ﴿هُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ...... ﴾ (الفتح ۲۵) ان لوگوں نے بھی کفر کیا اور تمہیں مسجد حرام سے بھی روکا اور قربانیوں کو ان کے ذبح ہونے کی جگہ تک نہ پہنچنے دیا۔ اگر ہمیں ان مؤمن مردوں' عورتوں کا خیال نہ ہوتا' جو اپنی ضعیفی اور کم قوتی کے باعث مکہ سے نہیں نکل سکے۔ جنہیں تم جانتے بھی نہیں ہو تو ہم تمہیں ان سے لڑ کر ان کے غارت کر دینے کا حکم دے دیتے لیکن یہ بے گناہ مسلمان نہ پیس دیئے جائیں اس لئے ہم نے سر دست یہ حکم نہیں دیا لیکن اگر یہ باز نہ آئے اپنی شرارتوں سے' تو وہ وقت دور نہیں' جب ان پر ہمارے دردناک عذاب برس پڑیں۔ پس جب وہ مسلمان ہستیاں جن سے مسجدوں کی آبادی حقیقی معنوں میں ہے وہ ہی روک دیئے گئے' تو مسجدوں کے اجاڑنے میں کون سی کمی باقی رہ گئی؟ مسجدوں کی آبادی صرف ظاہری زیب و زینت' رنگ و روغن سے نہیں ہوتی بلکہ اس میں ذکر اللہ کا ہونا اس میں شریعت کا قائم رہنا' انہیں شرک اور ظاہری میل کچیل سے پاک رکھنا یہ اُن کی حقیقی آبادی ہے۔ پھر فرمایا کہ انہیں یہ بات زیب نہیں دیتی کہ وہ بے خوف ہو کر مسجد میں آئیں۔ مطلب یہ ہے کہ اے مسلمانو! انہیں بے خوفی اور بے باکی کے ساتھ بیت اللہ میں نہ آنے دو' ہم تمہیں غالب کر دیں گے اس وقت یہی کرنا۔ چنانچہ جب مکہ فتح ہو گیا' آپ نے اگلے سال ۹ ہجری میں اعلان کرا دیا کہ اس سال کے بعد حج میں کوئی مشرک نہ آنے پائے اور بیت اللہ شریف کا طواف کوئی ننگا ہو کر نہ کرے۔ جن لوگوں کے درمیان صلح کی کوئی مدت مقرر ہوئی وہ قائم ہے۔ یہ حکم دراصل تصدیق اور عمل ہے اس آیت پر: ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هٰذَا...... ﴾ (التوبہ: ۲۸) یعنی مشرک لوگ نجس ہیں۔ اس سال کے بعد انہیں مسجد حرام میں نہ آنے دو اور معنی بھی بیان کئے گئے ہیں کہ چاہئے تو یہ تھا کہ یہ مشرک خشیۃ اللہ کا پیکر بن کر مسجد میں آئیں لیکن برخلاف اس کے یہ مسلمانوں کو روک رہے ہیں۔ یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ ایمان داروں کو بشارت دیتا ہے کہ عنقریب میں تمہیں غلبہ دوں گا اور یہ مشرک اس مسجد کی طرف رخ کرنے سے بھی تھرانے لگیں گے۔ چنانچہ یہی ہوا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے وصیت کی کہ جزیرہ عرب میں دو دین باقی نہ رہنے پائیں' اور یہود و نصاریٰ کو وہاں سے نکال دیا۔

الحمد للہ کہ اس امت کے بزرگوں نے اس وصیت رسول علیہ السلام پر بھی عمل کر دکھایا۔ اس سے مسجدوں کی فضیلت اور بزرگی بھی ثابت ہوئی۔ بالخصوص اس جگہ کی مسجد کی۔ جہاں سب سے بڑے اور کل جن وانس کے رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم بھیجے گئے تھے۔ ان کفار پر دنیا کی رسوائی بھی آئی اور جس طرح انہوں نے مسلمانوں کو روکا' جلاوطن کیا' ٹھیک اس کا پورا بدلہ انہیں ملا۔ یہ بھی روکے گئے اور جلاوطن کئے گئے اور ابھی اُخروی عذاب باقی ہیں کیونکہ انہوں نے بیت اللہ شریف کی حرمت وغیرہ کو پامال کیا اور ننگے ہو کر بیت اللہ کا طواف کیا وغیرہ اور اگر اس سے مراد نصرانی لئے جائیں' تو بھی ظاہر ہے کہ وہ بھی بیت المقدس کی مسجد میں خشیت کا مظہر بن کر آئیں۔

انہوں نے بھی مسجد بیت المقدس کی بے حرمتی کی تھی۔ بالخصوص اس صخرہ (پتھر) کی جس کی طرف یہود نماز پڑھتے تھے۔ اسی طرح جب یہودیوں نے بھی بے حرمتی کی اور نصرانیوں سے بہت زیادہ تو ان پر ذلت بھی اس سے زیادہ نازل ہوئی۔ دنیا کی رسوائی سے مراد امام مہدی کے زمانہ کی رسوائی بھی ہے اور جزیہ کی ادائیگی بھی ہے۔ حدیث شریف میں ایک دعا وارد ہوئی ہے: ﴿اَللّٰهُمَّ اَحْسِنْ عَاقِبَتَنَا فِی الْاُمُوْرِ كُلِّهَا وَاَجِرْنَا مِنْ خِزْیِ الدُّنْیَا وَعَذَابِ الْاٰخِرَةِ﴾ اے اللہ تو ہمارے تمام کاموں کا انجام اچھا کر اور دنیا کی رسوائی اور آخرت کے عذاب سے نجات دے۔ یہ حدیث حسن ہے مسند احمد میں موجود ہے۔ صحاح ستہ میں نہیں۔ اس کے راوی بشیر بن ارطاۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ صحابی ہیں۔ ان سے ایک تو یہ حدیث مروی ہے۔ دوسری وہ حدیث مروی ہے جس میں ہے کہ غزوے اور جنگ کے موقعہ پر وہیں ہاتھ نہ کاٹے جائیں۔

وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ۚ فَاَیْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ ﴿۱۱۵﴾

اور اللہ ہی کی مملوک ہیں (سب جہتیں) مشرق بھی اور مغرب بھی۔ پس تم لوگ جس طرف منہ کرو اُدھر (ہی) اللہ تعالیٰ کا رخ ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ (تمام جہات کو) محیط ہیں کامل العلم ہیں۔ ○

شانِ نزول ☆

اس آیت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کو تسلی دی جا رہی ہے جو مکہ سے نکالے گئے اور اپنی مسجد سے روکے گئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم مکہ شریف میں بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے تھے تو کعبۃ اللہ بھی سامنے ہی ہوتا تھا۔ جب مدینہ تشریف لائے تو سولہ یا سترہ ماہ تک تو ادھر ہی نماز پڑھتے رہے۔ مگر پھر اللہ تعالیٰ نے کعبۃ اللہ کی طرف متوجہ ہونے کا حکم دیا۔ (بخاری و مسلم)

قرآن میں سب سے پہلا منسوخ حکم ☆ امام ابوعبید قاسم بن سلام نے اپنی کتاب ناسخ منسوخ میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت کی ہے کہ قرآن میں سب سے پہلا منسوخ حکم یہی قبلہ کا ہے: ﴿لِلّٰهِ الْمَشْرِقُ﴾ والی آیت نازل ہوئی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نمازیں پڑھنے لگے۔ پھر آیت: ﴿وَمِنْ حَیْثُ خَرَجْتَ﴾ (البقرۃ:۱۴۹) نازل ہوئی اور آپ نے بیت اللہ کی طرف متوجہ ہو کر نماز ادا کرنی شروع کی۔ مدینہ میں جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نمازیں پڑھنے لگے تو یہودی بہت خوش ہوئے لیکن جب یہ حکم چند ماہ بعد منسوخ ہوا اور آپ اپنی تمنا اور دعا اور انتظار کے مطابق کعبۃ اللہ کی طرف منہ کر کے نمازیں پڑھنے کا حکم دیئے گئے تو ان یہودیوں نے طعنے دینے شروع کر دیئے کہ اب اس قبلہ سے کیوں ہٹ گئے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اتاری کہ مشرق و مغرب کا مالک اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ پھر یہ اعتراض کیا؟ جدھر اس کا حکم ہو پھر جانا چاہئے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے یہ بھی مروی ہے کہ مشرق مغرب میں جہاں کہیں بھی ہو منہ کعبہ کی طرف کرو۔ بعض بزرگوں کا بیان ہے کہ یہ آیت کعبہ کی طرف متوجہ ہونے کے حکم سے پہلے اُتری ہے اور مطلب یہ ہے کہ مشرق و مغرب جدھر چاہو منہ پھیرو سب جہتیں اللہ ہی کے لئے ہیں اور سب طرف خدا موجود ہے۔ اس سے کوئی جگہ خالی نہیں۔ جیسے فرمایا: ﴿وَلَآ اَدْنٰی مِنْ ذٰلِكَ وَلَآ اَكْثَرَ اِلَّا هُوَ مَعَهُمْ اَیْنَ مَا كَانُوْا﴾ (المجادلۃ:۷) تھوڑے بہت جو بھی ہوں اللہ اُن کے ساتھ ہے۔

پھر یہ حکم منسوخ ہو کر کعبۃ اللہ کی طرف متوجہ ہونا فرض ہوا۔ اس قول میں جو یہ لفظ ہیں کہ خدا سے کوئی جگہ خالی نہیں۔ اگر اس سے مراد علم خدا ہو تو صحیح ہے۔ کوئی مکان اللہ کے علم سے خالی نہیں اور اگر ذات باری مراد ہو تو ٹھیک نہیں۔ اللہ تعالیٰ کی پاک ذات اس سے بہت بلند و بالا ہے کہ وہ اپنی مخلوق میں سے کسی چیز میں محصور ہو۔ ایک مطلب آیت کا یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ یہ آیت سفر اور راہ روی اور خوف کے وقت کے لئے ہے کہ ان وقتوں میں نفل نماز کو جس طرف منہ ہو پڑھ لیا کرو۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے کہ ان کی اونٹنی کا منہ جس طرف ہوتا تھا نماز پڑھ لیتے تھے اور فرماتے تھے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ یہی ہے اور اس آیت کا مطلب بھی یہی ہے۔ آیت کا ذکر کئے بغیر حدیث مسلم ترمذی نسائی ابن ابی حاتم ابن مردویہ وغیرہ میں مروی ہے اور اصل اس کی صحیح مسلم میں بھی موجود ہے۔ صحیح بخاری شریف میں ہے کہ ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے جب نماز خوف کے بارے میں پوچھا جاتا تو نماز خوف کو بیان فرماتے اور کہتے کہ جب اس سے بھی زیادہ خوف ہو تو پیدل اور سوار کھڑے کھڑے پڑھ لیا کرو۔ منہ خواہ قبلہ کی جانب ہو خواہ نہ ہو۔ حضرت نافع کا بیان ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما میرے خیال میں اسے مرفوع بیان کرتے تھے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا مشہور قول اور امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کہ سفر خواہ پُر امن ہو خواہ خوف ڈر اور لڑائی کا ہو سواری پر نفل ادا کر لینے جائز ہیں۔ امام مالک اور آپ کی جماعت اس کے خلاف ہے۔ امام ابو یوسف اور ابو سعید اصطخری بغیر سفر کے بھی اسے جائز کہتے ہیں۔ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بھی یہ روایت ہے امام ابو جعفر طبری بھی اسے پسند فرماتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ تو پیدل چلنے والے کو بھی رخصت دیتے ہیں۔

بعض اور مفسرین کے نزدیک یہ آیت ان لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے جنہیں قبلہ معلوم نہ ہو سکا اور انہوں نے انکل سے مختلف جہتوں کی طرف نماز پڑھی۔ جس پر یہ آیت نازل ہوئی اور ان کی اس نماز کو ادا شدہ بتلایا گیا۔ حضرت ربیعہ فرماتے ہیں ہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک سفر میں تھے۔ ایک منزل پر اُترے رات اندھیری تھی۔ لوگوں نے پتھر لے لے کر بطور نشان قبلہ رخ رکھ کر نماز پڑھنی شروع کر دی۔ صبح اُٹھ کر چاندنی میں دیکھا تو نماز قبلہ کی طرف ادا نہیں ہوئی تھی۔ ہم نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ذکر کیا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ یہ حدیث ترمذی شریف میں ہے۔ امام ترمذی نے اسے حسن کہا ہے۔ اس کے دو راوی ضعیف ہیں۔ ایک اور روایت میں ہے کہ اس وقت گھٹا ٹوپ اندھیرا چھایا ہوا تھا اور ہم نے نماز پڑھ کر اپنے اپنے سامنے خط کھینچ دیئے تھے۔ تاکہ صبح روشنی میں معلوم ہو جائے کہ نماز قبلہ کی طرف ادا ہوئی یا نہیں۔ صبح معلوم ہوا کہ قبلہ جاننے میں ہم نے غلطی کی لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں وہ نماز لوٹانے کا حکم نہیں دیا اور یہ آیت نازل ہوئی۔ اس روایت کے بھی دو راوی ضعیف ہیں۔ یہ روایت دار قطنی وغیرہ میں موجود ہے۔ ایک روایت میں ہے کہ ان کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نہ تھے۔ یہ بھی سنداً ضعیف ہے۔ ایسی نماز کے بارے میں علماء کے دو اقوال ہیں ٹھیک قول یہی ہے کہ دہرائی نہ جائی اور اسی قول کی تائید کرنے والی یہ حدیثیں ہیں۔ جو اُوپر بیان ہوئیں۔

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ اس کے نازل ہونے کا باعث نجاشی ہے۔ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی موت کی خبر دی اور کہا کہ ان کے جنازہ کی غائبانہ نماز پڑھو تو بعض نے کہا کہ وہ تو مسلمان نہ تھا۔ نصرانی تھا اس پر آیت نازل ہوئی کہ: ﴿وَاِنَّ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَمَنْ يُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ...... ﴾ (آل عمران: ۱۹۹) بعض اہل کتاب اللہ پر اس چیز پر جو اے مسلمانو! تمہاری طرف نازل ہوئی اور اس چیز پر جو ان پر نازل کی گئی ایمان لاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ حضور وہ قبلہ کی طرف منہ کر کے نماز نہیں پڑھتا تھا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی لیکن یہ روایت غریب ہے۔ واللہ اعلم۔ اس کے معنی میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ بیت المقدس کی طرف اس لئے نمازیں پڑھتے رہے کہ انہیں اس کے منسوخ ہو جانے کا علم نہیں ہوا تھا۔ قرطبیؒ اس سلسلہ میں فرماتے ہیں کہ ان کے جنازہ کی نماز

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑھی اور یہ دلیل ہے کہ جنازے کی نماز غائبانہ ادا کرنی چاہئے اور اس کے نہ ماننے والے اسے مخصوص جانتے ہیں اور اس کی تین تاویلیں کرتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ آپ نے اس کے جنازہ کو دیکھ لیا۔ زمین آپ کے لئے لپیٹ دی گئی۔ دوسری یہ کہ چونکہ وہاں اُن کے پاس ان کے جنازہ کی نماز پڑھنے والا اور کوئی نہ تھا۔ اس لئے آپ نے یہاں غائبانہ ادا کی۔ ابن عربی اسی جواب کو پسند کرتے ہیں۔ قرطبیؒ کہتے ہیں کہ یہ ناممکن ہے کہ ایک بادشاہ مسلمان ہو اور اس کی قوم کا کوئی شخص اس کے پاس مسلمان نہ ہو۔ ابن عربی اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ شاید ان کے نزدیک جنازے کی نماز کی شریعت نہ ہو۔ یہ جواب بہت اچھا ہے۔ تیسری یہ کہ نماز آپ نے اس لئے ادا کی کہ دوسرے لوگوں کی رغبت کا سبب ہو اور اس جیسے دوسرے بادشاہ دین اسلام کی طرف مائل ہوں۔

لیکن یہ تینوں تاویلیں ظاہر کے خلاف ہونے کے علاوہ صرف احتمالات کی بنا پر ہیں اور مان لینے کے بعد بھی مسئلہ یہی رہتا ہے کہ جنازہ غائبانہ پڑھنا چاہئے کیونکہ گو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جنازے کا مشاہدہ کر لیا ہو لیکن پھر بھی صحابہ کی نماز تو غائبانہ ہی رہی۔ اگر ہم دوسرا جواب مان لیں تو بھی جنازہ تو غائبانہ ہی ہوا۔ جو لوگ سرے سے نماز جنازہ غائبانہ کے قائل ہی نہیں وہ تو اس صورت میں بھی قائل نہیں اور یہ بات تو دل کو لگتی بھی نہیں کہ ان کے نزدیک نماز جنازہ مشروع نہ ہو۔ شریعت ان کی اسلام ہی تھی نہ کہ کوئی اور۔ تیسرا جواب بھی کچھ ایسا ہی ہے اور بر تقدیر اب بھی وہ وجہ باقی ہے کہ جنازہ غائبانہ ادا کریں تاکہ دوسرے لوگوں کی رغبت اسلام کا باعث ہو۔ واللہ اعلم۔ (مترجم)

ابن مردویہ میں حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں' اہل مدینہ' اہل شام' اہل عراق کا قبلہ مشرق و مغرب کے درمیان ہے۔ یہ روایت ترمذی میں بھی دوسرے الفاظ سے مروی ہے اور اس کے ایک راوی ابو معشر کے حافظہ پر بعض اہل علم نے کلام کیا ہے۔ امام ترمذی نے ایک اور سند سے بھی اس کو نقل کیا ہے اور اسے حسن صحیح کہا ہے۔ حضرت عمر بن خطاب حضرت علی بن ابی طالب' حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم سے بھی یہ روایت ہے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں' جب تو مغرب کو اپنی دائیں جانب اور مشرق کو بائیں جانب کر لے تو تیرے سامنے کی جہت قبلہ ہو جائے گا۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے بھی اوپر کی طرح حدیث روایت ہے کہ مشرق و مغرب کے درمیان قبلہ ہے۔ ملاحظہ ہو دار قطنی' بیہقی وغیرہ۔ امام ابن جریر فرماتے ہیں' یہ مطلب بھی اس آیت کا ہو سکتا ہے کہ تم مجھ سے دعائیں مانگنے پر اپنا منہ جس طرف بھی کرو' میرا منہ بھی اس طرف پاؤ گے اور میں تمہاری دعاؤں کو قبول فرماؤں گا۔ حضرت مجاہد سے مروی ہے کہ جب یہ آیت: ﴿اُدْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَکُمْ﴾ (المؤمن: ۶۰) مجھ سے دعا کرو میں قبول کروں گا' اُتری' تو لوگوں نے کہا کس طرف دعا کریں۔ اس کے جواب میں آیت: ﴿فَاَیْنَمَا تُوَلُّوْا﴾ نازل ہوئی۔ پھر فرماتا ہے کہ اللہ وسعت سمائی اور گنجائش والا اور علم والا ہے۔ جس کی کفایت سخاوت اور فضل و کرم نے تمام مخلوق کا احاطہ کر رکھا ہے۔ وہ سب چیزوں کو جانتا بھی ہے کوئی چھوٹی سے چھوٹی چیز بھی اس کے علم سے باہر نہیں بلکہ وہ تمام چیزوں کا عالم ہے۔

وَقَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا ۙ سُبْحٰنَهٗ ؕ بَلْ لَّهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ ﴿۱۱۶﴾ بَدِیْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَاِذَا قَضٰۤی اَمْرًا فَاِنَّمَا یَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَیَكُوْنُ ﴿۱۱۷﴾

اور وہ لوگ کہتے ہیں کہ خدا تعالیٰ اولاد رکھتا ہے سبحان اللہ (کیا مہمل بات ہے) بلکہ خاص اللہ تعالیٰ کے مملوک ہیں جو کچھ بھی آسمانوں اور زمین میں (موجودات) ہیں (وارد) سب ان کے محکوم (بھی) ہیں (حق تعالیٰ) موجد ہیں آسمانوں

اور زمین کے اور جب کسی کام کا پورا کرنا چاہتے ہیں تو بس اس کام کی نسبت (اتنا) فرما دیتے ہیں کہ ہو جا۔ بس وہ (اسی طرح) ہو جاتا ہے۔○

خدا کے اولاد نہیں اس حقیقت پر چند دلائل ☆

یہ اور اس کے ساتھ کی آیت نصرانیوں کے رد میں ہے اور اسی طرح ان جیسے یہود و مشرکین کے رَد میں' جو خدا کی اولاد بتاتے تھے۔ ان سے کہا جاتا ہے کہ زمین و آسمان وغیرہ تمام چیزوں کا تو خدا مالک ہے' ان کا پیدا کرنے والا' انہیں روزی دینے والا' ان کے انداز ے مقرر کرنے والا' انہیں قبضہ میں رکھنے والا' ان میں ہیر پھیر کرنے والا اللہ ہی ہے پھر بھلا اس کی مخلوق سے کوئی اس کی اولاد ہو سکتا ہے نہ عمر اور نہ عیسیٰ خدا کے بیٹے بن سکتے ہیں جیسا کہ یہود و نصاریٰ کا خیال تھا۔ نہ فرشتے اس کی بیٹیاں بن سکتے ہیں جیسا کہ مشرکین عرب کا خیال تھا کہ برابر کی مناسبت رکھنے والے ہم جنس سے اولاد ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ کا نہ کوئی نظر نہ اُس کی عظمت و کبریائی میں اس کا کوئی شریک نہ اس کی جنس کا کوئی اور۔ وہ تو آسمانوں اور زمینوں کا پیدا کرنے والا ہے' اس کی اولاد کیسے ہوگی؟ اس کی کوئی بیوی بھی نہیں۔ وہ ہر چیز کا خالق اور ہر چیز کا عالم ہے۔

یہ رحمٰن کی اولاد بتاتے ہیں۔ یہ کتنی بودی بھدی اور واہی بات تم کہتے ہو۔ یہ اتنی بری بات زبان سے نکالتے ہو کہ اس سے آسمانوں کا پھٹ جانا اور زمین کا شق ہو جانا اور پہاڑوں کا ریزہ ریزہ ہو جانا ممکن ہے۔ ان کا دعویٰ ہے کہ اللہ تعالیٰ صاحب اولاد ہے۔ اللہ تعالیٰ کی اولاد تو کوئی ہو ہی نہیں سکتی۔ اس کے سوا جو بھی ہے اس کی ملکیت ہے۔ زمین و آسمانوں کی کل ہستیاں اس کی غلامی میں حاضر ہونے والی ہیں۔ جنہیں ایک ایک کر کے اس نے گھیر رکھا ہے اور شمار کر رکھا ہے۔ ان میں سے ہر ایک اس کے پاس قیامت والے دن تنہا تنہا پیش ہونے والا ہے۔ پس غلام اولاد نہیں بن سکتا۔ ملکیت اور ولدیت دو مختلف اور متضاد حیثیتیں ہیں اور جگہ پوری سورت میں اس کی نفی فرمائی۔ ارشاد ہوا: ﴿قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ اللّٰهُ الصَّمَدُ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ﴾ (الاخلاص) کہہ دو کہ خدا ایک ہی ہے۔ اللہ بے نیاز ہے۔ اس کی نہ اولاد ہے نہ ماں باپ۔ اس کا ہم جنس کوئی نہیں۔ ان آیتوں اور ان جیسی اور آیتوں میں اس خالق کائنات نے تسبیح و تقدیس بیان کی۔ اپنا بے نظیر بے مثل اور لاشریک ہونا ثابت کیا اور ان مشرکین کے اس گندے عقیدے کا بطلان کیا اور بتایا کہ وہ تو سب کا خالق و ربّ ہے۔ پھر اس کی اولاد بیٹے بیٹیاں کہاں سے ہوں گی؟

مسئلہ ولادت پر ایک جامع حدیث ☆ سورۂ بقرہ کی اس آیت کی تفسیر میں صحیح بخاری شریف کی ایک قدسی حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ مجھے ابن آدم جھٹلاتا ہے۔ اُسے یہ لائق نہ تھا۔ مجھے وہ گالیاں دیتا ہے' اسے یہ نہیں چاہئے تھا۔ اس کا جھٹلانا تو یہ ہے کہ وہ خیال کم بیٹھتا ہے کہ میں اسے مار ڈالنے کے بعد پھر زندہ کرنے پر قادر نہیں ہوں اور اس کو گالیاں دینا یہ ہے کہ وہ میری اولاد بتاتا ہے۔ حالانکہ میں پاک ہوں اس سے کہ میری اولاد اور بیوی ہو۔ یہی حدیث دوسری سندوں سے اور کتابوں میں بھی باختلاف الفاظ مروی ہے۔ صحیحین میں ہے' حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام فرماتے ہیں کہ بری باتیں سن کر صبر کرنے میں اللہ تعالیٰ سے زیادہ کوئی نہیں۔ لوگ اس کی اولادیں بتائیں اور وہ انہیں رزق و عافیت دیتا رہے۔ پھر فرمایا' ہر چیز اس کی اطاعت گزار ہے۔ اس کی غلامی کی اقراری ہے۔ اس کے لئے اخلاص کرنے والی ہے۔ اس کی سرکار میں قیامت کے روز دست بستہ کھڑی ہونے والی اور دنیا میں عبادت گزار ہے۔ جس کو کہے یوں ہو' اس طرح بن' وہ اسی طرح ہو جاتی ہے اور بن جاتی ہے اور اسی طرح ہر ایک اس کے سامنے پست مطیع ہے کفار بھی گو نہ چاہیں لیکن ان کے سائے خدا کے سامنے جھکتے رہتے ہیں۔ قرآن میں اور جگہ فرمایا: ﴿وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ...... ﴾ (الرعد: ۱۵) آسمان اور زمین کی کل چیزیں

خوشی ناخوشی اللہ تعالیٰ کو سجدہ کرتی ہیں۔ان کے سائے صبح شام جھکتے رہتے ہیں۔ایک حدیث مروی ہے کہ جہاں کہیں قرآن میں قنوت کا لفظ ہے۔وہاں مراد اطاعت ہے لیکن اس کا مرفوع ہونا صحیح نہیں۔ممکن ہے صحابی کا یا اور کسی کا کلام ہو۔اس سند سے دوسری آیتوں کی تفسیر بھی مرفوعاً مروی ہے لیکن یاد رکھنا چاہئے کہ یہ ضعیف ہے۔کوئی شخص اس سے دھوکہ میں نہ پڑے۔واللہ اعلم۔

آسمان اور زمین کا پہلے سے کوئی نمونہ نہیں تھا ☆ پھر فرمایا وہ آسمان کو بغیر نمونہ کے پہلی ہی بار کی پیدائش میں پیدا کرنے والا ہے۔

لغت میں بدعت کے معنی تو پیدا کرنے نیا بنانے کے ہیں۔ہر نئی بات بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے۔یہ تو ہوئی شرعی بدعت۔کبھی بدعت کا اطلاق صرف لغتاً ہوتا ہے۔شرعاً مراد نہیں ہوتی ہے۔جیسے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے لوگوں کو نماز تراویح پر جمع کر کے پھر اسے اسی طرح جاری دیکھ کر فرمایا تھا اچھی بدعت ہے: بَدِيْعٌ مُبْدِعٌ سے پھیرا گیا ہے۔جیسے مُؤْلِمٌ سے اَلِيْمٌ اور مُسْمِعٌ سے سَمِيْعٌ معنی مُبْدِعٌ کے انشا اور نو پیدا کرنے والے ہیں۔بغیر مثال کے اور بغیر نمونہ کے اور بغیر پہلی پیدائش کے پیدا کرنے والے بدعتی کو اس لئے بدعتی کہا جاتا ہے کہ وہ بھی دین خدا میں وہ کام یا وہ طریقہ ایجاد کرتا ہے جو اس سے پہلے شریعت میں نہ ہو۔اسی طرح کسی نئی بات کے پیدا کرنے والے کو عرب مبتدع کہتے ہیں۔امام ابن جریر فرماتے ہیں' مطلب یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ اولاد سے پاک ہے۔آسمان وزمین کی تمام چیزیں اسی کی ملکیت ہیں۔ہر چیز اس کی وحدانیت کی دلیل ہے۔ہر چیز اس کی اطاعت گزاری کی اقراری ہے۔سب کا پیدا کرنے والا بنانے والا موجود کرنے والا بغیر اصل اور مثال کے انہیں وجود میں لانے والا ایک وہی رب العالمین ہے۔اس کی گواہی ہر چیز دیتی ہے خود مسیح علیہ السلام بھی اس کے گواہ اور بیان کرنے والے ہیں جس ربّ نے ان تمام چیزوں کو نمونہ کے اور بغیر مادے اور اصل کے پیدا کیا۔اس نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بھی بے باپ کے پیدا کر دیا۔پھر کوئی وجہ نہیں کہ انہیں تم خواہ مخواہ خدا کا بیٹا مان لو۔پھر فرمایا کہ اس خدا کی قدرت وسلطنت' سطوت وشوکت ایسی ہے کہ جس چیز کو جس طرح کی بنانا اور پیدا کرنا چاہے' اسے کہہ دیتا ہے کہ اس طرح اور ایسی ہو جا وہ اسی وقت ہو جاتی ہے جیسے فرمایا:﴿اِنَّمَا اَمْرُهٗ اِذَا اَرَادَ شَيْئًا......﴾(یٰسین:۸۲) دوسری جگہ فرمایا:﴿اِنَّمَا قَوْلُنَا لِشَيْءٍ اِذَا اَرَدْنٰهُ اَنْ نَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ﴾(النحل:۴۰) اور ارشاد ہوتا ہے:﴿وَمَا اَمْرُنَا اِلَّا وَاحِدَةٌ كَلَمْحٍ بِالْبَصَرِ﴾(القمر:۵۰) شاعر کہتا ہے

اِذَا مَا اَرَادَ اللّٰهُ اَمْرًا فَاِنَّمَا ☆ يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ قَوْلَةً فَيَكُوْنُ

مطلب سب کا یہ ہے کہ ادھر خدا کا ارادہ کسی چیز کا ہوا اور اس نے کہا ہو جاؤ' وہیں وہ ہو گیا۔اس کے ارادے سے مراد خدا نہیں۔پس مندرجہ بالا آیت میں عیسائیوں کو نہایت لطیف پیرایہ میں یہ بھی سمجھا دیا گیا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی اسی کن کے کہنے سے پیدا ہوئے۔دوسری جگہ صاف صاف فرما دیا:﴿اِنَّ مَثَلَ عِيْسٰى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ﴾(آل عمران:۵۹) یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی مثال اللہ تعالیٰ کے نزدیک حضرت آدم جیسی ہے۔جنہیں مٹی سے پیدا کیا۔پھر فرمایا ہو جا وہ ہو گئے۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ لَوْلَا يُكَلِّمُنَا اللّٰهُ اَوْ تَاْتِيْنَا اٰيَةٌ ۗ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّثْلَ قَوْلِهِمْ ۗ تَشَابَهَتْ قُلُوْبُهُمْ ۗ قَدْ بَيَّنَّا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ﴿۱۱۸﴾

اور (بعض) جاہل یوں کہتے ہیں کہ (خود) ہم سے کیوں نہیں کلام فرماتے اللہ تعالیٰ یا ہمارے پاس کوئی اور ہی دلیل آ جاوے اسی طرح وہ (جاہل) لوگ بھی کہتے چلے آئے ہیں جو ان سے پہلے گزرے ہیں۔ ان ہی کا سا (جاہلانہ) قول ان سب کے قلوب (کج فہمی میں) باہم ایک دوسرے کے مشابہ ہیں۔ ہم نے بہت سی دلیلیں صاف صاف بیان کر دی ہیں۔ (مگر وہ) ان لوگوں کے لئے (نافع) ہیں جو یقین (حاصل کرنا) چاہتے ہیں۔ ○

شانِ نزول ☆

رافع بن جریملہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا تھا کہ اگر آپ ﷺ سچے ہیں تو اللہ تعالیٰ خود ہم سے کیوں نہیں کہتا۔ ہم خود اس سے اس کا کلام سنیں۔ اس پر یہ آیت اُتری۔ مجاہدؒ فرماتے ہیں' یہ بات نصرانیوں نے کہی تھی۔ ابن جریر فرماتے ہیں' یہی ٹھیک بھی معلوم ہوتا ہے۔ اس لئے کہ اس آیت کا موقع یہود کی ہی ذہنی وفکری غلطیوں کے پردے چاک کرنے کا ہے۔ تاہم یہ قول زیادہ اعتماد کے قابل نہیں۔ قرطبی فرماتے ہیں کہ انہوں نے کہا تھا کہ آپ کی نبوت کی اطلاع خود جناب باری ہمیں کیوں نہیں دیتا؟ اور یہی بات ٹھیک ہے۔ واللہ اعلم۔ بعض اور مفسر کہتے ہیں' یہ قول کفارِ عرب کا تھا اور پھر جو فرمایا کہ اسی طرح بے علم لوگوں نے بھی کہا تھا۔ اس سے مراد یہود و نصاریٰ ہیں۔ قرآن کریم میں اور جگہ ہے: ﴿وَاِذَا جَآءَتْهُمْ اٰيَةٌ قَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ حَتّٰى نُؤْتٰى مِثْلَ مَآ اُوْتِيَ رُسُلُ اللّٰهِ﴾ (الانعام ۱۲۴) ان کے پاس جب کبھی کوئی نشانی آتی ہے تو کہتے ہیں ہم تو نہیں مانیں گے' جب تک کہ ہم کو وہ نہ دیئے جائیں جو اللہ کے رسولوں کو دیا جاتا ہے اور جگہ فرمایا: ﴿وَقَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ﴾ (بنی اسرائیل ۹۰) یعنی انہوں نے کہا کہ ہم آپ پر ہرگز ایمان نہ لائیں گے جب تک کہ آپ ہمارے لئے ہماری ان زمینوں میں چشمے جاری نہ کر دیں اور جگہ فرمایا: ﴿وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا ...﴾ (الفرقان ۲۱) یعنی ہماری ملاقات کے منکر کہتے ہیں ہم پر فرشتے کیوں نہیں اتارے جاتے۔ اللہ تعالیٰ ہمارے سامنے کیوں نہیں آتا اور جگہ فرمایا: ﴿بَلْ يُرِيْدُ كُلُّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ ......﴾ (المدثر:۵۲) ان میں سے ہر شخص چاہتا ہے کہ وہ خود کوئی کتاب دیا جائے وغیرہ وغیرہ۔

آیتیں جو صاف بتلاتی ہیں کہ مشرکین عرب نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے صرف تکبر و عناد کی بنا پر ایسی ایسی چیزیں طلب کیں۔ اسی طرح یہ مطالبہ بھی انہیں مشرکین کا تھا۔ ان سے پہلے اہل کتاب نے بھی ایسے ہی واہی سوالات کئے تھے۔ ارشاد ہوتا ہے: ﴿يَسْئَلُكَ اَهْلُ الْكِتٰبِ ......﴾ (النساء:۱۵۳) اہل کتاب تم سے چاہتے ہیں کہ تم ان پر کوئی آسمانی کتاب اتارو اور حضرت موسیٰ علیہ السلام سے انہوں نے اس سے بڑا سوال کیا تھا۔ ان سے تو کہا تھا کہ ہمیں خدا کو آمنے سامنے دکھا اور جگہ فرمان ہے کہ جب تم نے کہا اے موسیٰ! ہم تجھ پر ہرگز ایمان نہ لائیں گے۔ جب تک اپنے ربّ کو سامنے نہ دیکھ لیں۔ پھر فرمایا ان کے اور اُن کے دل یکساں اور مشابہ ہو گئے یعنی ان مشرکین کے دل اگلے کفار جیسے ہو گئے اور جگہ فرمایا کہ اگلے لوگوں نے بھی اپنے انبیاء کو بھی جادوگر اور دیوانہ کہا تھا۔ انہوں نے بھی ان کی موافقت کی۔ پھر فرمایا ہم نے یقین والوں کے لئے اپنی آیتیں بیان کر دیں۔ جن سے رسول کی تصدیق عیاں ہے۔ کسی اور چیز کی طلب حاجت باقی نہیں رہتی۔ یہی نشانیاں ایمان لانے کے لئے کافی ہیں۔ ہاں جن کے دلوں پر مہر لگی ہوئی ہو انہیں کسی آیت سے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ آپ نے فرمایا: ﴿الَّذِيْنَ حَقَّتْ عَلَيْهِمْ ......﴾ (یونس:۹۶) جن پر تیرے ربّ کی بات ثابت ہو چکی ہے وہ ایمان نہ لائیں گے۔ گو ان کے پاس تمام آیتیں آ جائیں' جب تک کہ وہ دردناک عذاب نہ دیکھ لیں۔

اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ بَشِيْرًا وَّ نَذِيْرًا ۙ وَّ لَا تُسْئَلُ عَنْ اَصْحٰبِ الْجَحِيْمِ ﴿۱۱۹﴾

ہم نے آپ کو سچا دین دے کر بھیجا ہے کہ خوشخبری سناتے رہیئے اور ڈراتے رہیئے اور آپ سے دوزخ میں جانے والوں کی بازپرس نہ ہوگی۔ ○

ایک تنبیہ☆

حدیث میں ہے خوشخبری جنت کی اور ڈراوا جہنم سے لَا تُسْئَلُ کی دوسری قراءت مَا تُسْئَلُ بھی ہے اور ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی قراءت میں لَنْ تُسْئَلَ بھی ہے۔ یعنی تجھ سے کفار کی بابت سوال نہیں کیا جائے گا۔ جیسے فرمایا: ﴿فَإِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ وَعَلَيْنَا الْحِسَابُ﴾ (الرعد: ۴۰) یعنی تجھ پر صرف پہنچا دینا ہے۔ حساب تو ہمارے ذمہ ہے اور فرمایا: ﴿فَذَكِّرْ إِنَّمَآ أَنْتَ مُذَكِّرٌ لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ﴾ (غاشیہ: ۲۱ تا ۲۲) تو نصیحت کرتا رہ' تو صرف نصیحت کرنے والا ہے' ان پر داروغہ نہیں اور جگہ فرمایا: ﴿نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَقُوْلُوْنَ...... ﴾ (ق: ۴۵) ہم ان کی باتیں بخوبی جانتے ہیں۔ تم ان پر جبر کرنے والے نہیں ہو۔ تم قرآن کی نصیحتیں انہیں سنادو۔ جو قیامت سے ڈرتے ہوں۔ اسی مضمون کی اور بھی بہت سی آیتیں ہیں۔ ایک قراءت اس کی وَلَا تَسْئَلْ بھی ہے یعنی ان جہنمیوں کے بارے میں اے نبی مجھ سے نہ پوچھو۔ عبدالرزاق میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا' کاش کہ میں اپنے ماں باپ کا حال جان لیتا۔ اس پر یہ فرمان نازل ہوا۔ پھر آخری دم تک آپ نے اپنے والدین کا ذکر نہ فرمایا۔ ابن جریر نے بھی اسے بروایت موسیٰ بن عبیدہ وارد کیا ہے لیکن اس کے راوی پر کلام ہے۔ قرطبی کہتے ہیں' مطلب یہ ہے کہ جہنمیوں کا حال اتنا بد اور اتنا برا ہے کہ تم کچھ نہ پوچھو۔ تذکرہ میں قرطبی نے ایک روایت بیان کی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے والدین زندہ کیے گئے اور ایمان لے آئے اور صحیح مسلم میں جو حدیث ہے جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی کے سوال پر فرمایا کہ میرا باپ اور تیرا باپ آگ میں ہیں اس کا جواب بھی وہاں ہے لیکن یاد رہے کہ آپ کے ماں باپ کے زندہ ہونے کی روایت کتب صحاح ستہ وغیرہ میں نہیں اور اس کی اسناد ضعیف ہے۔ واللہ اعلم۔ ابن جریر کی ایک مرسل حدیث میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن پوچھا کہ میرے ماں باپ کہاں ہیں؟ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ ابن جریر نے اس کی تردید کی ہے اور فرمایا کہ یہ محال ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ماں باپ کے بارے میں شک کریں۔ پہلی ہی قراءت ٹھیک ہے لیکن ہمیں امام ہمام پر تعجب آتا ہے کہ انہوں نے اسے محال کیسے کہہ دیا؟ ممکن ہے یہ واقعہ اس وقت کا ہو جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ماں باپ کے لئے استغفار کرتے تھے اور انجام معلوم نہ تھا۔ پھر جب ان دونوں کی حالت معلوم ہوگئی تو آپ اس سے ہٹ گئے اور بیزاری ظاہر فرمائی اور صاف بتلا دیا کہ وہ دونوں جہنمی ہیں۔ جیسے کہ صحیح حدیث سے ثابت ہو چکا ہے۔ اس کی اور بھی بہت سی مثالیں ہیں۔

مسند احمد میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے حضرت عطا بن یسارؒ نے پوچھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صفت وثنا تورات میں کیا ہے؟ تو آپ نے فرمایا ہاں خدا کی قسم جو صفتیں آپ کی قرآن میں ہیں وہی تورات میں بھی ہیں۔ تورات میں ہے کہ اے نبی ہم نے تجھے گواہ اور خوشخبریاں دینے والا اور ڈرانے والا اور ان پڑھوں کا بچاؤ بنا کر بھیجا ہے۔ تو میرا بندہ اور میرا رسول ہے۔ میں نے تیرا نام متوکل رکھا ہے۔ تو نہ بدزبان ہے' نہ سخت گو' نہ بدخلق' نہ بازاروں میں شور وغل کرنے والا ہے' نہ برائی کے بدلے برائی کرنے والے ہیں۔ بلکہ معاف اور درگزر کرنے والے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو دنیا سے نہ اٹھائے گا جب تک کہ ٹیڑھے دین کو ان کی وجہ سے بالکل ٹھیک اور درست نہ کردے اور لوگ لا الٰہ الا اللہ کا اقرار نہ کرلیں اور ان کی اندھی آنکھیں کھل نہ جائیں اور ان کے بہرے کان سننے نہ لگ جائیں اور ان کے زنگ آلود دل صاف نہ ہو جائیں گے۔ بخاری کی کتاب البیوع میں بھی یہ حدیث ہے اور کتاب التفسیر

میں بھی۔ ابن مردویہ میں اس روایت کے بعد ہے کہ میں نے پھر جا کر حضرت کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے یہی سوال کیا تو انہوں نے بھی ٹھیک یہی جواب دیا۔

وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ ؕ قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى ؕ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ بَعْدَ الَّذِيْ جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ﴿۱۲۰﴾ اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ ؕ اُولٰٓئِكَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ ؕ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۱۲۱﴾ ع ۱۴

اور کبھی خوش نہ ہوں گے آپ سے یہ یہود اور نہ یہ نصاریٰ جب تک کہ آپ (خدانخواستہ) کے مذہب کے (بالکل) پیرو نہ ہو جائیں (آپ صاف) کہہ دیجئے کہ (بھلائی) حقیقت میں تو ہدایت کا وہی رستہ ہے جس کو خدا نے بتلایا ہی اور اگر آپ اتباع کرنے لگیں ان کے غلط خیالات کا علم (قطعی ثابت بالوحی) آچکنے کے بعد۔ تو آپ کو کوئی خدا سے بچانے والا نہ یاد نکلے اور نہ مددگار جن لوگوں کو ہم نے کتاب (تورات' انجیل) دی بشرطیکہ وہ اس کی تلاوت (اس طرح) کرتے رہے جس طرح کہ تلاوت کرنے کا حق ہے ایسے لوگ اس پر ایمان لے آتے ہیں اور جو شخص نہ مانے گا (کس کا نقصان کرے گا) خود ہی ایسے لوگ خسارہ میں رہیں گے۔ ○

کفر ایک ہی (ملّت) مذہب ہے ☆

آیت بالا کا مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ تجھ سے ہرگز راضی نہیں ہوں گے۔ تو بھی انہیں چھوڑ اور ربّ کی رضا کے پیچھے لگ جا۔ انہیں دعوتِ رسالت پہنچا دے۔ دین حق وہی ہے جو خدا نے تجھے دیا ہے تو اس پر جم جا۔ حدیث شریف میں ہے میری اُمت کی ایک جماعت حق پر جم کر دوسروں کے مقابلہ میں رہے گی اور غلبہ کے ساتھ رہے گی۔ یہاں تک کہ قیامت آئے۔ پھر اپنے نبی کو دھمکایا کہ ہرگز ان کی رضا مندی اور ان سے صلح جوئی کے لئے اپنے دین میں سست نہ ہونا۔ ان کی طرف نہ جھکنا۔ ان کی نہ ماننا۔ فقہاء کرام نے اس آیت سے استدلال کیا ہے کہ کفر ایک ہی مذہب ہے۔ خواہ وہ یہود ہوں' نصرانی ہوں یا کوئی اور ہوں۔ اس لئے کہ ملت کا لفظ یہاں مفرد ہی رکھا جیسے اور جگہ ہے: ﴿لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ﴾ (الکافرون: ٦) تمہارے لئے تمہارا دین ہے اور میرے لئے میرا دین ہے۔

ایک عظیم الشان مسئلہ ☆ اس استدلال پر اس مسئلہ کی بنا ڈالی ہے کہ مسلمان اور کفار آپس میں وارث نہیں ہو سکتے ہیں۔ گو وہ دونوں ایک ہی قسم کے کافر ہوں یا دو الگ الگ کفروں کے کافر ہوں۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا یہی مذہب ہے۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ سے بھی ایک روایت میں یہی قول منقول ہے اور دوسری روایت میں امام احمدؒ و امام مالکؒ کا یہ قول مروی ہے کہ دو مختلف مذاہب والے آپس میں ایک دوسرے کے وارث نہ ہوں۔ صحیح حدیث میں بھی یہی مضمون ہے واللہ اعلم' پھر فرمایا کہ جنہیں ہم نے کتاب دی ہے وہ حق تلاوت ادا کرتے ہوئے پڑھتے ہیں۔ قتادہ کہتے ہیں' اس سے مراد یہودی و نصاریٰ ہیں ایک روایت میں ہے کہ اس سے مراد اصحاب رسول صلی اللہ

علیہ وسلم ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتے ہیں' حق تلاوت یہ ہے کہ جنت کے ذکر کے وقت سوال جنت ہو اور جہنم کے ذکر کے وقت اس سے پناہ مانگی جائے۔ ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں' حلال وحرام کو جاننا' کلمات کو ان کی جگہ رکھنا' ہیر پھیر نہ کرنا وغیرہ یہی تلاوت کا حق ادا کرنا ہے۔ حسن بصری فرماتے ہیں کھلی آیتوں پر عمل کرنا متشابہ آیتوں پر ایمان لانا' مشکلات کو علما کے سامنے پیش کرنا حق تلاوت کے ساتھ پڑھنا ہے۔ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے اس کا مطلب حق اتباع بجالانا بھی مروی ہے۔ پس تلاوت بمعنی اتباع ہے۔ جیسے: ﴿وَالْقَمَرِ اِذَا تَلٰهَا﴾ (الشمس:۲) میں۔ ایک مرفوع حدیث میں بھی اس کے معنی مروی ہیں لیکن اس کے بعض راوی مجہول ہیں۔ گو معنی ٹھیک ہے۔ حضرت ابو موسیٰ اشعری فرماتے ہیں' قرآن کی اتباع کرنے والا جنت کے باغیچوں میں اُترنے والا ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ تلاوت ☆ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مطابق یہ بھی مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب کوئی رحمت کے ذکر والی آیت پڑھتے تو ٹھہر جاتے اور اللہ تعالیٰ سے رحمت طلب کرتے اور جب بھی کسی عذاب کی آیت تلاوت فرماتے تو رک کر اللہ تعالیٰ سے پناہ طلب کرتے۔ پھر فرمایا اس پر ایمان یہی لوگ رکھتے ہیں' یعنی جو اہل کتاب اپنی کتاب کو سوچ سمجھ کر تلاوت کرتے ہیں' وہ قرآن پر ایمان لانے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ جیسے اور جگہ ہے: ﴿وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ...... ﴾ (المائدۃ:۶۶) اگر یہ تورات وانجیل پر اور خدا کی ان کی طرف نازل کردہ چیز پر قائم رہتے تو ان کے اوپر سے اور پیروں تلے سے انہیں کھانا ملتا اور فرمایا اے اہل کتاب جب تک تم تورات وانجیل کو جو تمہاری طرف تمہارے ربّ کی طرف سے اُتری ہیں کو قائم نہ کر لو تب تک تم کسی چیز پر نہیں ہو۔ ان کا قائم کرنا مستلزم ہے کہ ان میں جو ہے اسے سچا جانو اور اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر آپ کی صفت آپ کی تابعداری کا حکم۔ آپ کی ہم رکابی کی رغبت سب کچھ موجود ہے اور جگہ فرمایا جو لوگ نبی اُمی کی تابعداری کرتے ہیں' جس رسول کا ذکر اور تصدیق اپنی کتاب تورات وانجیل میں بھی وہ لکھا دیکھتے ہیں اور جگہ فرمایا: ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهٖ...... ﴾ (بنی اسرائیل:۱۰۷) یعنی تم ایمان لاؤ یا نہ لاؤ' جنہیں اس سے پہلے علم دیا گیا ہے ان پر جب اللہ کی آیتیں پڑھی جاتی ہیں' منہ کے بل سجدے میں گر پڑتے ہیں اور زبانی کہتے ہیں کہ ہمارا ربّ پاک ہے ہمارے ربّ کا وعدہ بالکل سچا اور صحیح ہے اور جگہ ہے' جنہیں ہم نے اس سے اگلی کتاب دی ہے وہ بھی اس پر ایمان لاتے ہیں اور ان پر یہ پڑھی جاتی ہے تو اپنے ایمان کا اقرار کر کے کہتے ہیں' ہم تو پہلے ہی ماننے والوں میں ہیں۔ انہیں ان کے صبر کا' دہرا اُجر دیا جائے گا۔ یہ لوگ برائی کو بھلائی سے ہٹاتے ہیں اور ہمارے دیئے ہوئے میں سے دیتے رہتے ہیں اور جگہ ارشاد ہے: ﴿قُلْ لِّلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَالْاُمِّيّٖنَ...... ﴾ (آل عمران:۲۰) یعنی پڑھے لکھے اور بے پڑھے لوگوں سے کہہ دو کہ کیا تم اسلام قبول کرتے ہو؟ اگر مان لیں تو راہ پر ہیں اور اگر نہ مانیں تو تجھ پر تو صرف تبلیغ ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو خوب دیکھ رہا ہے۔ اسی لئے یہاں فرمایا' اس کے ساتھ کفر کرنے والے خسارے والے ہیں۔ جیسے فرمایا: ﴿وَمَنْ يَّكْفُرْ بِهٖ مِنَ الْاَحْزَابِ فَالنَّارُ مَوْعِدُهٗ﴾ (ہود:۱۷) جو اس کے ساتھ کفر کرے اس کے وعدے کی جگہ آگ ہے۔ صحیح حدیث میں ہے' اس کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے۔ اس اُمت میں سے جو بھی مجھے سنے' خواہ یہودی ہو خواہ نصرانی ہو مجھ پر ایمان نہ لائے وہ جہنم میں جائے گا۔ (مسلم)

يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَنِّيْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى

الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۲۲﴾ وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِىْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْـًٔا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا تَنْفَعُهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿۱۲۳﴾

اے اولادِ یعقوب (علیہ السلام) میری اُن نعمتوں کو یاد کرو جن کا میں نے تم پر (وقتاً فوقتاً) انعام کیا اور اس کو (بھی) کہ میں نے تم کو بہت لوگوں پر فوقیت دی اور تم ڈرو ایسے دن سے جس میں کوئی شخص کسی شخص کی طرف سے نہ کوئی مطالبہ (حق واجب) ادا کرنے پائے گا اور نہ کسی طرف سے کوئی معاوضہ قبول کیا جائے گا اور نہ کسی کو کوئی سفارش (جبکہ ایمان نہ ہو) مفید ہوگی اور نہ ان لوگوں کو بچا سکے گا۔

پہلے بھی اس جیسی آیت شروع سورت میں گزر چکی ہے اور اس کی مفصل تفسیر بھی بیان ہو چکی ہے۔ یہاں صرف تاکید کے طور پر ذکر کی گئی اور انہیں نبی اُمی ﷺ کی تابعداری کی رغبت دلائی گئی۔ جن کی صفتیں وہ اپنی کتابوں میں پاتے تھے جن کا نام اور کام بھی اس میں لکھا ہوا تھا۔ بلکہ ان کی امت کا ذکر بھی اس میں موجود ہے۔ پس انہیں اس کے چھپانے اور اللہ کی دوسری نعمتوں کو پوشیدہ کرنے سے ڈرایا جا رہا ہے اور اپنی اور دنیوی نعمتوں کو ذکر کرنے کو کہا جا رہا ہے اور عرب میں جو نسبی طور پر بھی ان کے چچا زاد بھائی ہیں۔ خدا کی جو نعمت آئی اُن میں خاتم النبیین کو خدا نے مبعوث فرمایا۔ ان سے حسد کر کے نبی کی مخالفت اور تکذیب پر آمادہ نہ ہونے کی ہدایت ہو رہی ہے۔

وَاِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ ۭ قَالَ اِنِّىْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ۭ قَالَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِىْ ۭ قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِى الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۲۴﴾

اور جس وقت امتحان کیا حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کا ان کے پروردگار نے چند باتوں میں اور وہ اُن کو پورے طور پر بجا لائے (اس وقت) حق تعالیٰ نے (اُن سے) فرمایا کہ میں تم کو لوگوں کا مقتدا بناؤں گا۔ انہوں نے عرض کی اور میری اولاد میں سے کسی کسی کو (نبوت دیجئے) ارشاد ہوا کہ میرا (یہ) عہدہ (نبوت) خلاف ورزی کرنے والوں کو نہ ملے گا۔

توحید کا سب سے بڑا داعی:

اس آیت میں خلیل اللہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بزرگی کا بیان ہو رہا ہے جو توحید میں دنیا کے امام ہیں۔ جنہوں نے تکالیف پر صبر کر کے بجا آوری حکمِ خداوندی میں ثابت قدمی اور جوانمردی دکھائی۔ اللہ فرماتا ہے اے نبی ﷺ تم ان مشرکین اور اہل کتاب کو جو ملت ابراہیمی کے دعویدار ہیں۔ ذرا ابراہیم علیہ السلام کی فرمانبرداری اور اطاعت گزاری کے واقعات تو سناؤ۔ تاکہ معلوم ہو جائے کہ دینِ حنیف پر اور اسوۂ ابراہیمی پر کون قائم ہے۔ وہ تو آپ اور آپ کے اصحاب؟ اور جگہ قرآن کریم کا ارشاد ہے: ﴿وَاِبْرٰهِيْمَ الَّذِىْ وَفّٰٓى﴾ (النجم: ۳۷) ابراہیم وہ ہیں جنہوں نے پوری وفاداری دکھائی اور جگہ فرمایا: ﴿اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ كَانَ اُمَّةً قَانِتًا لِّلّٰهِ﴾ (النحل: ۱۲۰) ابراہیم علیہ السلام لوگوں کے پیشوا اللہ تعالیٰ کے فرمانبردار، مخلص اور شکر گزار بندے تھے۔ جنہیں خدا نے پسند فرما کر راہ راست پر لگا دیا تھا۔ جنہیں ہم نے دنیا میں بھلائی دی تھی اور آخرت میں بھی صالح

اور نیکو کار بنایا تھا۔ پھر ہم نے تیری طرف اے نبی وحی کی کہ تو بھی ابراہیم حنیف کی ملت کی پیروی کر۔ جو مشرکین میں سے نہ تھے اور جگہ ارشاد ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نہ تو یہودی تھے نہ نصرانی تھے۔ نہ مشرک تھے بلکہ خالص مسلمان تھے۔ ان سے قربت اور نزدیکی والا وہ شخص ہے جو ان کی تعلیم کا تابع ہو اور یہ نبی اور ایمان والے ان ایمان والوں کا دوست اللہ تعالیٰ خود ہے۔ ابتلی کے معنی امتحان اور آزمائش کے ہیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی آزمائش' کلماتِ تفسیر اور امتحانی مرحلہ میں کامیاب ہونے کی اطلاع ☆ ''کلمات'' سے مراد شریعت کا حکم اور ممانعت وغیرہ ہے۔ کلمات سے مراد کلمات تقدیریہ بھی ہوتی ہے۔ جیسے مریم علیہا السلام کی بابت ارشاد ہے: ﴿صَدَّقَتْ بِكَلِمٰتِ رَبِّهَا﴾ (التحریم:۱۲) یعنی انہوں نے اپنے ربّ کے کلمات کی تصدیق کی اور اس کے لکھے ہوئے کی بھی۔ وہ بڑی فرمانبردار تھیں اور کلمات سے مراد کلمات شرعیہ بھی ہوتی ہے: ﴿وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا﴾ (الانعام:۱۱۵) یعنی اللہ تعالیٰ کے شرعی کلمات سچائی اور عدل کے ساتھ پورے ہوئے۔ یہ کلمات یا تو سچی خبریں ہیں یا طلب عدل ہے۔ غرض ان کلمات کو پورا کرنے کی جزا میں انہیں امامت کرنے کا درجہ ملا۔ ان کلمات کی نسبت بہت سے اقوال ہیں۔ مثلاً احکام حج' مونچھوں کو کم کرنا' کلی کرنا' ناک صاف کرنا' مسواک کرنا' سر کے بال منڈوانا یا رکھوانا تو مانگ نکالنا' ناخن ترشوانا' زیر ناف بال لینا' ختنہ کرانا' بغل کے بال لینا' پیشاب پاخانہ کے بعد استنجا کرنا' جمعہ کے دن غسل کرنا' طواف کرنا' صفا مروہ کے درمیان سعی کرنا' رمی جمار کرنا' طواف افاضہ کرنا۔

حضرت عبداللہ فرماتے ہیں۔ اس سے مراد پورا اسلام ہے۔ جس کے تیس حصے ہیں۔ دس کا بیان سورہ براءت میں ہے۔ اَلتَّآئِبُوْنَ عَابِدُوْنَ سے مُؤْمِنِيْنَ تک۔ یعنی توبہ کرنی' حمد کرنی' خدا کی راہ میں دوڑنا' رکوع کرنا' سجدہ کرنا' بھلائی کا حکم دینا' برائی سے روکنا' اللہ کی حدوں کی حفاظت کرنا' ایمان لانا' دس کا بیان قَدْ اَفْلَحَ کے شروع سے يُحَافِظُوْنَ تک ہے اور سورہ معارج میں ہے یعنی نماز کو خشوع خضوع سے ادا کرنا۔ لغو اور فضول باتوں اور کاموں سے منہ پھیر لینا' زکوٰۃ دیتے رہا کرنا' شرم گاہ کی حفاظت کرنا' امانت داری کرنا' وعدہ وفائی کرنا' نماز پر ہمیشگی اور حفاظت کرنا' قیامت کو سچا جاننا' عذابوں سے ڈرتے رہنا' سچی شہادت پر قائم رہنا اور دس کا بیان سورۂ احزاب میں ہے: ﴿اِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ﴾ سے ﴿عَظِيْمًا﴾ (الاحزاب:۳۵) تک ہے۔ یعنی اسلام لانا' ایمان رکھنا' قرآن پڑھنا' سچ بولنا' صبر کرنا' عاجزی کرنا' خیرات دینا' روزہ رکھنا' بدکاری سے بچنا۔ اللہ تعالیٰ کا ہر وقت بکثرت ذکر کرنا۔ ان تیسوں احکام کا جو عامل ہو وہ پورے اسلام کا پابند ہے اور خدا کے عذابوں سے بری ہے۔

کلماتِ ابراہیمی میں اپنی قوم سے علیحدگی کرنی۔ بادشاہ وقت سے نڈر ہو کر اسے بھی تبلیغ کرنی۔ پھر راہ خدا میں جو مصیبت آئے اس پر صبر و سہار کرنا۔ پھر وطن اور گھر بار کو راہ اللہ چھوڑ کر ہجرت کرنی' مہمانداری کرنی' جانی اور مالی مصیبت صرف اللہ کی خوشنودی اور اس کی مرضیات کو حاصل کرنے کے لئے برداشت کرنی' یہاں تک کہ بچہ کو راہ اللہ پر قربان کرنا اور وہ بھی اپنے ہاتھ سے یہ کل احکام خلیل الرحمٰن علیہ السلام بجالائے۔ سورج' چاند اور ستاروں سے بھی آپ کی آزمائش ہوئی۔ امامت کے ساتھ بیت اللہ بنانے کے حکم کے ساتھ' احکام حج کے ساتھ' مقام ابراہیم کے ساتھ' بیت اللہ کے رہنے والوں کی روزیوں کے ساتھ' حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو آپ کے دین پر بھیجنے کے ساتھ بھی آزمائش ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اے خلیل! میں تمہیں آزماتا ہوں' دیکھتا ہوں کیا ہو؟ تو آپ نے فرمایا' مجھے لوگوں کا امام بنا دے۔ اس کعبہ کو لوگوں کے ثواب اور اجتماع کا مرکز بنا دے۔

یہاں والوں کو امن دے۔ ہمیں مسلمان فرماں بردار بنا دے۔ ہماری اولاد میں اپنی اطاعت گزار ایک جماعت رکھ۔ یہاں والوں کو پھلوں سے روزیاں دے۔ یہ تمام باتیں اللہ عزوجل نے پوری کر دیں اور یہ سب نعمتیں آپ کو عطا ہوئیں۔ صرف ایک آرزو پوری نہ ہوئی۔ کہا تھا کہ میری تمام اولاد بھی امامت پائے۔ جواب ملا ظالموں کو یہ عظیم الشان ذمہ داری نہیں سونپی جاتی۔ کلمات سے مراد اس کے ساتھ کی آیتیں بھی ہیں۔

مؤطا وغیرہ میں ہے کہ سب سے پہلے ختنہ کرانے والے یا سب سے پہلے مہمان نوازی کرنے والے سب سے پہلے ناخن کٹوانے والے سب سے پہلے مونچھیں ترشوانے والے۔ سب سے پہلے سفید بال دیکھنے والے حضرت ابراہیم ہی ہیں۔ انہوں نے سفید بال دیکھ کر پوچھا کہ خدایا یہ کیا ہے؟ جواب ملا وقار و عزت ہے۔ کہنے لگے پھر تو خدایا اسے زیادہ کر۔ سب سے پہلے منبر پر خطبہ کہنے والے سب سے پہلے قاصد بھیجنے والے۔ سب سے پہلے تلوار چلانے والے سب سے پہلے مسواک کرنے والے سب سے پہلے پانی کے ساتھ استنجا کرنے والے سب سے پہلے پائجامہ پہننے والے حضرت ابراہیم خلیل اللہ (علیہ السلام) ہیں۔ ایک ضعیف بلکہ موضوع حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اگر میں منبر بناؤں تو میرے باپ ابراہیم علیہ السلام نے بھی بنایا تھا اور لکڑی ہاتھ میں رکھوں تو یہ بھی میرے باپ ابراہیم علیہ السلام کی سنت ہے۔ مختلف بزرگوں نے کلمات کی تفسیر میں جو کہا تھا ہم نے نقل کر دیا اور ٹھیک بھی یہی ہے کہ یہ سب باتیں ان کلمات میں تھیں کسی خاص تخصیص کی کوئی قوی وجہ ہمیں نہیں ملی واللہ اعلم۔ صحیح مسلم شریف میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے۔ دس باتیں فطرت اور اصل دین کی ہیں۔ مونچھیں کم کرانا داڑھی بڑھنا مسواک کرنا ناک میں پانی دینا ناخن لینا پوریاں دھونا بغل کے بال لینا زیر ناف بال لینا استنجا کرنا۔ راوی کہتے ہیں میں دسویں بات بھول گیا شاید کلی کرنا تھی۔

صحیحین میں ہے حضور ﷺ فرماتے ہیں۔ پانچ باتیں فطرت کی ہیں۔ ختنہ کرانا موئے زہار (بال) لینا مونچھیں کم کرانا ناخن لینا بغل کے بال لینا ایک حدیث میں ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو وفا کرنے والا اس لئے فرمایا ہے کہ وہ ہر صبح کے وقت پڑھتے تھے: ﴿فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ حِيْنَ تُمْسُوْنَ وَ حِيْنَ تُصْبِحُوْنَ وَلَهُ الْحَمْدُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَعَشِيًّا وَّحِيْنَ تُظْهِرُوْنَ يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَيُحْيِي الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَكَذٰلِكَ تُخْرَجُوْنَ﴾ (الروم: ۱۷-۱۸) ایک روایت میں ہے کہ ہر دن چار رکعتیں پڑھتے تھے لیکن یہ دونوں حدیثیں ضعیف ہیں اور ان میں کئی کئی راوی ضعیف ہیں اور ضعف کی بہت سی وجود ہیں بلکہ ان کا بیان بھی بے بیان ضعف جائز نہیں۔ متن بھی ضعف پر دلالت کرتا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنی امامت کی خوشخبری سن کر اپنی اولاد کے لئے بھی یہی دعا کرتے ہیں جو قبول کی جاتی ہے لیکن ساتھ ہی خبر دی جاتی ہے کہ آپ کی اولاد میں نافرمان بھی ہوں گے۔ جنہیں اللہ تعالیٰ کا عہد نہ پہنچے گا۔ وہ امام نہ بنائے جائیں گے۔ نہ اُن کی اقتدا اور پیروی کی جائے گی۔ سورۂ عنکبوت میں یہ آیت اس مطلب کو واضح کر دیتی ہے کہ خلیل کی یہ دعا قبول ہوئی۔ وہاں ہے: ﴿وَجَعَلْنَا فِيْ ذُرِّيَّتِهِ النُّبُوَّةَ وَالْكِتٰبَ﴾ (العنکبوت: ۲۷) یعنی ہم نے اُن کی اولاد میں نبوت اور کتاب کا سلسلہ جاری رکھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بعد جتنے انبیاء اور رسول آئے وہ سب آپ ہی کی اولاد میں سے تھے اور جتنی کتابیں نازل ہوئیں سب آپ ہی کی اولاد میں ہوئیں۔ صَلَوٰتُ اللّٰهِ وَسَلَامُهٗ عَلَيْهِمْ اَجْمَعِيْنَ یہاں یہ

بھی خبر دی گئی ہے کہ آپ کی اولاد میں ظلم کرنے والے بھی ہوں گے۔ حضرت مجاہد فرماتے ہیں' مطلب یہ ہے کہ میں ظالم کو امام نہیں بناؤں گا۔ ظالم سے مراد بعض نے مشرک بھی لی ہے۔ عہد سے مراد امر ہے۔ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں' ظالم کو کسی چیز کا والی اور بڑا نہ بنانا چاہئے۔ گو وہ اولاد ابراہیم میں سے ہو۔ حضرت خلیل علیہ السلام کی دعا ان کی اولاد کے نیکوں کے حق میں قبول ہوئی ہے۔ یہ بھی معنی کئے گئے ہیں کہ ظالم کا کوئی عہد کہ اس کی اطاعت کی جائے۔ اس کا عہد توڑ دیا جائے[1] پورا نہ کیا جائے اور یہ بھی مطلب ہے کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کا اچھائی کا وعدہ اس سے نہیں۔ دنیا میں تو کھا پی رہا ہے اور عیش وعشرت کر رہا ہے۔ عہد سے مراد دین بھی ہے یعنی تیری کل اولاد دین دار نہیں۔ جیسے اور جگہ ہے: ﴿وَمِنْ ذُرِّيَّتِهِمَا مُحْسِنٌ وَّظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ مُبِيْنٌ﴾ (الصافات ۱۱۳) یعنی ان کی اولاد میں بھلے بھی ہیں اور برے بھی اور اطاعت کے معنی بھی کئے گئے ہیں۔ یعنی اطاعت صرف معروف میں اور بھلائی میں ہے اور عہد کے معنی نبوت کے بھی آئے ہیں۔ ابن خویز منداد مالکی فرماتے ہیں' ظالم شخص نہ تو خلیفہ بن سکتا ہے نہ حاکم نہ مفتی نہ گواہ نہ راوی[2]

وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَاَمْنًا ؕ وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى ؕ

اور وہ وقت بھی قابل ذکر ہے کہ جس وقت ہم نے خانہ کعبہ کو لوگوں کا معبد اور (مقام) امن (ہمیشہ سے) مقرر رکھا اور مقام ابراہیم کو (کبھی کبھی) نماز پڑھنے کی جگہ بنالیا کرو۔

پہلا وہ گھر خدا کا:

مَثَابَةً سے مراد بار بار آنا' حج کر کے گو جائیں لیکن تاہم دل میں لگن رہتی ہے۔ ہر ہر جگہ سے لوگ بھاگے دوڑے اس کی طرف جوق در جوق چلے آ رہی ہیں۔ یہی جمع ہونے کی جگہ ہے یہی امن کا مقام ہے جس میں ہتھیار نہیں اُٹھایا جاتا۔ جاہلیت کے زمانہ میں بھی اس کے آس پاس لوٹ مار ہوتی رہتی لیکن یہاں امن وامان رہتا۔ کسی کو کوئی گالی بھی نہ دیتا۔ یہ جگہ ہمیشہ متبرک اور شریف رہی۔ نیک روحیں اس کی طرف مشتاق رہتی ہیں۔ گو ہر سال زیارت کریں لیکن تاہم شوق لگا رہتا ہے۔ یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا کا اثر ہے۔ آپ نے دعا مانگی تھی کہ: ﴿فَاجْعَلْ اَفْئِدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِيْ اِلَيْهِمْ ...... ﴾ (ابراہیم: ۳۷) تو لوگوں کے دلوں کو اس کی طرف جھکا دے۔ یہاں باپ اور بھائی کے قاتل کو بھی کوئی دیکھتا تو خاموش ہو جاتا۔ سورۂ مائدہ میں ہے: ﴿قِيٰمًا لِّلنَّاسِ﴾ یعنی یہ لوگوں کے قیام کا باعث ہے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں' اگر لوگ حج کرنا چھوڑ دیں تو آسمان زمین پر گرا دیا جائے۔ اس گھر کے اس شرف کو دیکھ کر پھر اس کے بانی اوّل حضرت ابراہیم خلیل اللہ کے شرف کو خیال فرمایئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿وَاِذْ بَوَّاْنَا لِاِبْرٰهِيْمَ ...... ﴾ (الحج: ۲۶) ہم نے بیت اللہ کی جگہ ابراہیم

---

[1] مطلب یہ ہے کہ ظالم سے اگر خدا کی کسی معصیت کا کسی دباؤ کی وجہ سے یا کسی لالچ کی وجہ سے عہد کیا گیا تو اس کی پابندی لازم نہیں ہے۔ اس سے یہ سمجھنا کہ عام وعدوں کے متعلق بھی یہی تعلیم دے رہے ہیں۔ غلط ہوگا۔ اسلام ایفاء عہد کی زبردست تاکید کرتا ہے۔ سوسائٹی میں وعدہ کی تکمیل ایک اخلاقی وصف سمجھا جاتا ہے اور اسلام نے جس قدر اخلاق کے شعبوں کی تہذیب وتکمیل کی ہے اتنی کسی اور مذہب سے ثابت نہیں۔ ۲۱ مصحح

[2] یعنی قانون اسلامی کے مطابق ان کو یہ عہدے اور ذمہ داریاں ہرگز نہ سونپنی چاہئیں۔

علیہ السلام کو دی (اور کہہ دیا) کہ میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کرنا اور جگہ ہے: ﴿اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ ﴾ (آل عمران ۹۶) اللہ کا پہلا گھر مکہ ہے جو برکت و ہدایت والا' نشانیوں والا' مقام ابراہیم والا' امن و امان والا ہے۔ مقام ابراہیم سے مراد کل حرم ہے اور خاص مقام ابراہیم بھی ہے اور یہ کل کا کل بھی ہے۔ مثلاً عرفات مشعر الحرام منیٰ رمی جمار صفا مروہ کا طواف مقام ابراہیم دراصل وہ ہے جسے حضرت اسماعیل علیہ السلام کی بیوی صاحبہ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے نہانے کے لئے ان کے پاؤں کے نیچے رکھا تھا لیکن حضرت سعید بن جبیر کہتے ہیں' یہ غلط ہے۔ دراصل یہ وہ پتھر ہے' جس پر کھڑے ہو کر حضرت ابراہیم کعبہ بناتے تھے۔

حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ایک طویل حدیث میں ہے کہ جب نبی ﷺ نے طواف کیا تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مقام ابراہیم کی طرف اشارہ کر کے کہا کیا یہی ہمارے باپ ابراہیم کا مقام ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا' ہاں۔ کہا پھر ہم اسے قبلہ کیوں نہ بنالیں؟ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ ایک اور روایت میں ہے کہ فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سوال پر تھوڑی ہی دیر گزری تھی جو یہ حکم نازل ہوا۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ فتح مکہ والے دن مقام ابراہیم کی طرف اشارہ کر کے حضرت عمرؓ نے پوچھا یہی ہے جسے قبلہ بنانے کا حکم ہوا ہے؟ آپ نے فرمایا' ہاں یہی ہے۔

سیّدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ لسان الغیب ہیں ☆ صحیح بخاری شریف میں ہے' حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے ربّ سے تین باتوں میں موافقت کی۔ جو خدا کو منظور تھا' وہی میری زبان سے نکلا۔ میں نے کہا' حضور ﷺ کاش کہ ہم مقام ابراہیم کو قبلہ بنا لیتے تو حکم: ﴿وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهِمَ مُصَلًّى﴾ نازل ہوا۔ میں نے کہا یا رسول اللہ! کاش کہ آپ امہات المؤمنین کو پردے کا حکم دیں۔ اس پر پردے کی آیت اُتری۔ جب مجھے معلوم ہوا کہ آج حضور ﷺ اپنی بیویوں سے خفا ہیں' تو میں نے جا کر ان سے کہا کہ اگر تم باز نہ آؤ گی تو اللہ تعالیٰ تم سے اچھی بیویاں تمہارے بدلے اپنی نبی ﷺ کو دے گا۔ (بخاری) اس پر یہی فرمان باری نازل ہوا کہ: ﴿عَسٰى رَبُّهٗ ..... ﴾ اس حدیث کی بہت سی اسناد ہیں اور بہت سی کتابوں میں مروی ہے۔ ایک روایت میں بدر کے قیدیوں کے بارے میں بھی حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی موافقت مروی ہے۔ آپ نے فرمایا تھا کہ ان سے فدیہ نہ لیا جائے بلکہ انہیں قتل کر دیا جائے' منظور خدا بھی یہی تھا۔ عبداللہ بن ابی بن سلول منافق جب مر گیا اور حضور ﷺ اس کے جنازے کی نماز ادا کرنے کے لئے تیار ہوئے تو میں نے کہا کہ کیا آپ اس منافق کافر کا جنازہ پڑھیں گے؟ آپ نے مجھے ڈانٹ دیا۔ اس پر آیت: ﴿وَلَا تُصَلِّ عَلٰٓى اَحَدٍ مِّنْهُمْ ﴾ (التوبة: ۸۴) نازل ہوئی اور آپ کو ایسوں کے جنازے سے روکا گیا۔ ابن جریج میں روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے پہلے طواف میں تین مرتبہ رمل کیا۔ یعنی اکڑ کر چلے اور چار پھیرے چل کر کئے۔ پھر مقام ابراہیم علیہ السلام کے پیچھے آ کر دو رکعت نماز ادا کی اور یہ آیت تلاوت فرمائی: ﴿وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهِمَ مُصَلًّى﴾ (مسلم' کتاب الحج) حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث میں ہے کہ

---

۱ مکہ سے مدینہ ہجرت کے بعد ایک غیر مانوس جگہ کی آب و ہوا مسلمانوں کو ناموافق آئی۔ بخار اور دوسرے امراض نے کمزور و ناتواں کر دیا۔ ادھر آپ کو مسلمانوں کے ساتھ حج کرنا تھا۔ کفار اگر کمزور و نیم جان مسلمانوں کو دیکھتے تو مذاق بناتے اور طرح طرح کی باتیں کہتے اس سے آپ نے مصلحتاً حکم دیا کہ مسلمان طواف کے وقت اکڑ اکڑ کے اس طرح چلیں کہ ان کی کسی بھی حرکت سے بیماری سے متاثر ہونے اور علالت کے نتیجہ میں کمزور ہونے کا اظہار نہ ہو۔ اسکو رمل کہا جاتا ہے۔ اگر آج اگرچہ مصلحت ختم ہو گئی لیکن سنت کی حیثیت سے رمل کا حکم اب بھی موجود ہے۔ ۱۲

مقام ابراہیم علیہ السلام کو آپ نے اپنے اور بیت اللہ کے درمیان کر لیا تھا۔ ان حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ مقام ابراہیم سے مراد وہ پتھر ہے۔ جس پر کھڑے ہو کر حضرت ابراہیم علیہ السلام کعبہ بنا رہے تھے۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام آپ کو پتھر دیتے جاتے تھے اور آپ کعبہ کی بنا کرتے جاتے تھے اور اس پتھر کو سرکاتے جاتے تھے۔ جہاں دیوار اونچی کرنی ہوتی تھی' وہاں لے جاتے تھے۔ اسی طرح کعبہ کی دیواریں پوری کیں۔ اس کا پورا بیان حضرت ابراہیم علیہ السلام کے واقعہ میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔ اس پتھر پر آپ کے دونوں قدموں کے نشان ظاہر تھے۔ عرب کی جاہلیت کے زمانہ کے لوگوں نے بھی دیکھے تھے۔ ابو طالب نے اپنے مشہور قصیدے میں کہا ہے۔

وَمَوْطِئُ اِبْرٰهِيْمَ فِي الصَّخْرِ رِطْبَةً ☆ عَلٰى قَدَمَيْهِ حَافِيًا غَيْرَ نَاعِلِ

یعنی اس پتھر میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دونوں پیروں کے نشانات تازہ بتازہ ہیں' جن میں جوتی نہیں' بلکہ مسلمانوں نے بھی اسے دیکھا تھا۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے مقام ابراہیم میں حضرت خلیل اللہ علیہ السلام کے پیروں کی انگلیوں اور آپ کے تلوے کا نشان دیکھا تھا۔ پھر لوگوں کے چھونے سے وہ نشان مٹ گئے۔ حضرت قتادہ فرماتے ہیں۔ حکم اس کی جانب نماز ادا کرنے کا ہے۔ تبرک کے طور پر چھونے اور ہاتھ لگانے کا نہیں۔ اس امت نے بھی اگلی امتوں کی طرح بلا حکم خدا بعض کام اپنے ذمہ لازم کر لئے ہیں جو نقصان رساں ہیں۔ وہ نشان لوگوں کے ہاتھ لگانے سے مٹ گئے۔ یہ مقام ابراہیم پہلے دیوار کعبہ سے متصل تھا۔ کعبہ کے دروازے کی طرف حجر اسود کی جانب دروازے سے جانے والے کے دائیں جانب مستقل جگہ پر تھا۔ جو آج بھی لوگوں کو معلوم ہے۔ خلیل اللہ نے یا تو اپنے یہاں رکھوا دیا تھا یا بیت اللہ بناتے ہوئے آخری حصہ یہی بنایا ہوگا اور یہیں وہ پتھر رکھا کہ امیر المومنین حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنی خلافت کے زمانہ میں اسے پیچھے ہٹا دیا۔ اس کے ثبوت میں بہت سی روایتیں ہیں۔ پھر ایک مرتبہ پانی کے سیل (ریلے) میں یہ پتھر یہاں سے ہٹ گیا تھا۔ خلیفہ ثانی نے اسے پھر اپنی جگہ رکھوا دیا۔ حضرت سفیانؒ فرماتے ہیں مجھے نہیں معلوم ہوا کہ یہ اصلی جگہ سے ہٹا ہوا ہے اور اس سے پہلے دیوار کعبہ سے کتنی دور تھا۔ ایک روایت میں ہے کہ خود آنحضرت ﷺ نے اس کی جگہ سے ہٹا کر وہاں رکھا تھا جہاں اب ہے لیکن یہ روایت مرسل ہے۔ ٹھیک بات یہی ہے کہ حضرت عمر نے اسے پیچھے رکھا تھا۔ واللہ اعلم۔

وَعَهِدْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ اَنْ طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْعٰكِفِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ﴿۱۲۵﴾ وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ قَالَ وَمَنْ كَفَرَ فَاُمَتِّعُهٗ قَلِيْلًا ثُمَّ اَضْطَرُّهٗٓ اِلٰى عَذَابِ النَّارِ ؕ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿۱۲۶﴾ وَاِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَاِسْمٰعِيْلُ ؕ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۱۲۷﴾ رَبَّنَا

وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ ۖ وَاَرِنَا مَنَا
سِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا ۚ اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۲۸﴾

اور ہم نے حضرت ابراہیم وحضرت اسماعیل (علیہما السلام) کی طرف حکم بھیجا کہ میرے (اس) گھر کو خوب پاک رکھا کرو۔ بیرونی اور مقامی لوگوں (کی عبادت) کے واسطے اور رکوع اور سجدہ کرنے والوں کے واسطے اور جس وقت ابراہیم (علیہ السلام) نے دعا میں عرض کیا کہ اے میرے پروردگار اس کو ایک آباد شہر بنا دیجئے۔ امن (امان والا) اور اس کے بسنے والوں کو پھلوں سے بھی عنایت کیجئے۔ ان کو (کہتا ہوں) جو کہ ان میں سے اللہ تعالیٰ پر اور روز قیامت پر ایمان رکھتے ہیں۔ حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا اور اس شخص کو جو کافر رہے تو ایسے شخص کو تھوڑے روز تو خوب آرام برتاؤں گا پھر اس کو کشاں کشاں عذاب دوزخ میں پہنچا دوں گا اور ایسی پہنچنے کی جگہ تو بہت بری ہے اور جبکہ اُٹھا رہے تھے ابراہیم علیہ السلام دیواریں خانہ کعبہ کی اور اسمٰعیل بھی (اور یہ کہتے جاتے تھے) اے ہمارے پروردگار (یہ خدمت) ہم سے قبول کیجئے بلاشبہ آپ خوب سننے والے اور جاننے والے ہیں۔ اے ہمارے پروردگار اور ہم کو اپنا اور زیادہ مطیع بنا لیجئے اور ہماری اولاد میں سے بھی ایک ایسی جماعت (پیدا کیجئے) جو آپ کی مطیع ہو اور (نیز) ہم کو ہمارے حج (وغیرہ) کے احکام بھی بتا دیجئے اور ہمارے حال پر توجہ رکھئے اور فی الحقیقت آپ ہی ہیں توجہ فرمانے والے مہربانی کرنے والے۔ ○

بیت اللہ کی عظمت اور اس کے تقاضے:

یہاں عہد سے مراد حکم ہے۔ پاک رکھنا گندی اور نجس اور بری چیزوں سے عہد کا تعدیہ اِلٰی سے ہو تو اب معنی یہ ہوئے کہ ہم نے وحی کی اور پہلے سے کہہ چکے کہ بیت اللہ کو بتوں سے پاک رکھنا۔ غیر اللہ کی عبادت وہاں نہ ہونے دینا۔ لغو کاموں، فضول بکواس، جھوٹی باتوں، شرک وکفر، ہنسی مذاق سے اسے محفوظ رکھنا بھی شامل ہیں۔ طائف کے ایک معنی تو طواف کرنے والے کے ہیں۔ دوسرے معنی باہر سے آنے والوں کے ہیں۔ اس تقدیر پر عَاكِفِيْن کے معنی مکہ کے باشندے ہوں گے۔ ایک مرتبہ لوگوں نے سوچا کہ امیر وقت سے کہنا چاہئے کہ لوگوں کو بیت اللہ شریف میں سونے سے منع کریں کیونکہ ممکن ہے کسی وقت جنبی ہو جائیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ آپس میں فضول باتیں کریں تو ہم نے سنا کہ انہیں نہ روکنا چاہئے۔ ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما انہیں بھی عَاكِفِيْن کہتے تھے۔ ایک حدیث میں ہے کہ مسجد نبوی میں حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے صاحبزادے عبداللہ سویا کرتے تھے۔ وہ جوان اور غیر شادی شدہ تھے۔ رُكَّعِ السُّجُوْدِ سے مراد نمازی ہیں۔ یہ پاک رکھنے کا حکم اس واسطے دیا گیا ہے کہ اس وقت بھی بت پرستی رائج تھی۔ دوسرے اس لئے کہ یہ بزرگ اپنی نیتوں میں یہ بات رکھیں۔ دوسری جگہ ارشاد ہے: ﴿وَاِذْ بَوَّاْنَا...... ﴾ (الحج: ۲۶) اس آیت میں یہی حکم ہے کہ میرے ساتھ شریک نہ کرنا اور میرے گھر کو پاک صاف رکھنا۔ فقہا کا اس میں اختلاف ہے کہ بیت اللہ کی نماز افضل ہے یا طواف۔ امام مالک فرماتے ہیں باہر والوں کے لئے طواف افضل ہے اور جمہور کا قول ہے کہ ہر ایک کے لئے نماز افضل ہے۔ اس کی تفصیل کی جگہ تفسیر نہیں۔ مقصد اس سے مشرکین کو تنبیہ اور تردید ہے کہ بیت اللہ تو خاص خدا کی عبادت کے لئے بنایا گیا ہے۔ اس میں اوروں کی عبادت کرنا اور خالص خدا کے پجاریوں کو روکنا کس

قدر صریح بے انصافی ہے۔ اسی لئے اور جگہ فرمایا کہ ایسے ظالموں کو ہم دردناک عذاب چکھائیں گے۔ مشرکین کی اس کھلی تردید کے ساتھ ہی یہود و نصاریٰ کی بھی تردید اس میں ہو گئی کہ جب وہ ابراہیم واسماعیل سلام اللہ علیہما کی فضیلت بزرگی اور نبوت کے قائل ہیں۔ جب وہ جانتے اور مانتے ہیں کہ یہ شریف گھر انہی متبرک ہاتھوں کا بنا ہوا ہے جب وہ اس کے بھی قائل ہیں کہ یہ محض نماز وطواف ودعا اور عبادتِ خدا کے لئے بنایا گیا ہے۔ حج وعمرے اور اعتکاف وغیرہ کے لئے مخصوص کیا گیا ہے تو پھر باوجود ان نبیوں کی تابعداری کے دعوے کے کیوں حج وعمرے سے رُکے ہوئے ہیں کیوں بیت اللہ شریف میں حاضری نہیں دیتے بلکہ خود موسیٰ علیہ السلام نے اس گھر کا حج کیا۔ جیسا کہ حدیث میں صاف موجود ہے۔ اس آیت کریمہ سے یہ بھی ثابت ہوا کہ اور مسجدوں کو بھی پاک صاف رکھنا چاہئے اور جگہ قرآن میں ہے: ﴿فِیْ بُیُوْتٍ اَذِنَ اللّٰهُ اَنْ تُرْفَعَ وَیُذْكَرَ فِیْهَا اسْمُهٗ یُسَبِّحُ لَهٗ فِیْهَا بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ﴾ (النور:۳۶) اللہ تعالیٰ نے مسجدوں کو بلند کرنے کی اجازت دی ہے۔ ان میں اس کا ذکر کیا جائے۔ ان میں صبح وشام اس کی تسبیح اس کے نیک بندے کرتے ہیں۔ حدیث شریف میں بھی ہے کہ مسجدیں جس کام کے لئے ہیں' اسی کے لئے ہیں اور احادیث میں بہت ہی تاکید کے ساتھ مسجدوں کی پاکیزگی کا حکم آیا ہے۔[1]

بیت اللہ کی تعمیر اور اس کا سب سے پہلا معمار ☆ بعض لوگ تو کہتے ہیں' سب سے پہلے کعبۃ اللہ فرشتوں نے بنایا تھا لیکن یہ روایت اعتماد کے قابل نہیں۔ بعض کہتے ہیں' آدم علیہ السلام نے سب سے پہلے بنایا تھا جبل حرا' طور سینا' طور زیتا' جبل لبنان اور جودی ان پانچ پہاڑوں سے بنایا تھا لیکن یہ روایت بھی صحیح نہیں۔ بعض کہتے ہیں' شیث علیہ السلام نے سب سے پہلے بنایا تھا لیکن یہ اہل کتاب کی بات ہے۔ حدیث شریف میں ہے' حضرت ابراہیم نے مکہ کو حرم بنایا' میں مدینہ کو حرم کرتا ہوں۔ اس کا شکار نہ کھیلا جائے۔ یہاں کے درخت نہ کاٹے جائیں۔ یہاں ہتھیار نہ اُٹھائے جائیں۔ صحیح مسلم شریف کی ایک حدیث ہے کہ لوگ تازہ پھل لے کر خدمت نبوی میں حاضر ہوا کرتے تھے۔ حضور ﷺ اسے لے کر دعا کرتے کہ خدایا ہمارے پھلوں میں' ہمارے شہر میں' ہمارے ناپ تول میں برکت دے۔ خدایا ابراہیم علیہ السلام تیرے بندے' تیرے خلیل اور تیرے رسول تھے۔ میں بھی تیرا بندہ اور تیرا رسول ہوں۔ انہوں نے تجھ سے مکہ کے لئے دعا کی تھی۔ میں بھی تجھ سے مدینہ کے لئے دعا کرتا ہوں۔ جیسے انہوں نے مکہ کے لئے کی تھی بلکہ ایسی ہی ایک اور بھی۔ پھر اور کسی چھوٹے بچہ کو بلا کر وہ پھل اسے عطا کر دیا کرتے۔ انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ نے ایک مرتبہ ابوطلحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کہا کہ جاؤ اپنے بچوں میں سے کوئی بچہ میری خدمت کے لئے لے آؤ۔ ابوطلحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ مجھے لے چلے۔ میں اب سفر وحضر میں حاضرِ خدمت رہنے لگا۔ ایک مرتبہ آپ باہر سے آ رہے تھے' جب اُحد پہاڑ نظر پڑا تو آپ نے فرمایا یہ پہاڑ ہم سے اور ہم اس سے محبت کرتے ہیں۔ جب مدینہ نظر آیا تو فرمانے لگے' یا اللہ میں اس کے دو کناروں کے درمیان کی جگہ کو حرم مقرر کرتا ہوں جیسے کہ ابراہیم علیہ السلام کو حرم بنایا۔ اے اللہ ان کے مُد اور صاع میں اور ناپ میں برکت دے اور روایت میں ہے یا اللہ جتنی برکت تو نے مکہ میں دی ہے اس سے دوگنی برکت مدینہ میں دے اور روایت میں ہے مدینہ میں قتل نہ کیا جائے اور چارے کے سوا اور پتے بھی یہاں کے درختوں کے نہ جھاڑے جائیں۔ اسی مضمون کی اور حدیثیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ مدینہ بھی مثل مکہ کے حرم ہے' بہت سی ہیں۔

---

[1] ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ کی مساجد کے احترام کے موضوع پر ایک مفصل تصنیف بھی موجود ہے۔ ۱۲

یہاں ان احادیث کے نقل کرنے سے ہماری غرض مکہ شریف کی حرمت اور یہاں کا امن بیان کرنا ہے۔ بعض تو کہتے ہیں کہ یہ شروع سے حرم اور مامن ہے۔ بعض کہتے ہیں خلیل اللہ کے زمانے سے لیکن پہلا قول زیادہ ظاہر ہے۔ صحیحین کی حدیث میں ہے رسول اللہ ﷺ نے فتح مکہ والے دن فرمایا' جب سے اللہ تعالیٰ نے آسمان زمین پیدا کئے۔ تب سے اس شہر کو حرمت و عزت والا بنایا ہے۔ اب یہ قیامت تک حرمت عزت والا ہی رہے گا۔ اس میں جنگ وقتال کسی کو حلال نہیں۔ میرے لئے بھی صرف آج کے دن ہی ذرا سی دیر کے لئے حلال ہوا تھا۔ اب وہ حرام ہی حرام ہے۔ سنو! اس کے کانٹے نہ کاٹے جائیں۔ اس کا شکار نہ بھگایا جائے۔ اس میں کسی کی گری ہوئی چیز نہ اُٹھائی جائے۔ ہاں جو پہنچوائے[1]' اس کے لئے اٹھانا جائز ہے۔ اس کی گھاس نہ کاٹی جائے۔ دوسری روایت میں ہے کہ یہ حدیث آپ نے اثناء خطبہ میں بیان فرمائی تھی اور حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے سوال پر آپ نے اذخر نامی گھاس کے کاٹنے کی اجازت دی تھی۔

حضرت ابن شریح عدویؓ نے عمرو بن سعید سے اس وقت کہا جبکہ وہ مکہ کی طرف لشکر بھیج رہا تھا کہ اے امیر سن فتح مکہ والے دن صبح ہی صبح رسول اللہ ﷺ نے اپنے خطبہ میں فرمایا' جسے میرے کانوں نے سنا۔ دل نے یاد رکھا اور میں نے آنکھوں سے حضور ﷺ کو اس وقت دیکھا۔ آپ ﷺ نے حمد وثنا کے بعد فرمایا کہ مکہ کو خدا نے حرم کیا ہے لوگوں نے نہیں کیا۔ کسی ایماندار کو اس میں خون بہانا یا اس کا درخت کاٹنا حلال نہیں اگر کوئی میری اس لڑائی کو دلیل بنائے تو کہہ دینا کہ میرے لئے صرف آج ہی کے دن کی اس ساعت یہاں جہاد حلال تھا۔ پھر اس شہر کی حرمت آ گئی ہے' جیسے کل تھی' خبردار حاضرین میرا یہ حکم ان تک پہنچا دیں' جو آج اس مجمع میں نہیں ہیں لیکن عمرو نے یہ حدیث سن کر صاف جواب دیا کہ میں تجھ سے زیادہ اس حدیث کو جانتا ہوں۔ حرم نافرمان کو اور خونی کو اور بربادی کرنے والے کو نہیں بچاتا۔ (بخاری ومسلم)

کوئی ان دونوں حدیثوں میں تعارض نہ سمجھے۔ تطبیق یوں ہے کہ مکہ روز اول سے حرمت والا تھا لیکن اس کی حرمت کی تبلیغ حضرت خلیل اللہ نے کی۔ جس طرح آنحضرت ﷺ نبی تو اس وقت سے تھے' جبکہ حضرت آدم کا خمیر تیار ہوا تھا بلکہ اس وقت بھی خاتم النبیین لکھے ہوئے تھے لیکن تاہم حضرت ابراہیم علیہ السلام نے آپ کی نبوت کی دعا کی کہ: ﴿وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ﴾ (البقرۃ:۱۲۹) انہی میں سے ایک رسول ان میں بھیج۔ جو اللہ نے پوری کی اور تقدیر میں لکھی بات ظاہر ہوئی۔ ایک حدیث میں ہے کہ لوگوں نے آپ ﷺ سے کہا کہ آپ اپنی ابتدائے نبوت کا تو کچھ ذکر کیجئے۔ آپ ﷺ نے فرمایا' میرے باپ ابراہیم علیہ السلام کی دعا اور عیسیٰ بن مریم کی بشارت اور میری ماں کا خواب۔ وہ دیکھتی ہیں کہ ان میں سے گویا ایک نور نکلا جس نے شام کے محلات کو روشن کر دیا اور وہ نظر آنے لگے۔

مکہ اور مدینہ میں افضل کون؟ اس بات کا بیان کہ آیا مکہ افضل ہے مدینہ سے' جیسا کہ جمہور کا قول ہے یا مدینہ افضل ہے مکہ سے' جیسے کہ امام مالکؒ اور ان کے تابعین کا مذہب ہے۔ اسے دونوں جماعتوں کے دلائل کے ساتھ عنقریب ہم بیان کریں گے ان شاء اللہ تعالیٰ۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام دعا کرتے ہیں کہ باری تعالیٰ اس جگہ کو امن والا شہر بنا۔ یعنی یہاں کے

---

[1] مطلب یہ ہے کہ چیز کو اٹھا کر اس کے مالک تک پہنچانے کی جدوجہد کرے اور اس کی صورت یہ ہے کہ بآواز بلند اعلان کرے کہ یہ کس کی چیز ہے۔ ۱۲

رہنے والوں کو نڈر اور بے خوف رکھ۔ اللہ تعالیٰ اسے قبول فرماتا ہے۔ جیسے کہ فرمایا: ﴿وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا﴾ (آل عمران: ۹۷) یعنی اس میں جو آیا وہ امن والا ہو گیا اور جگہ ارشاد ہے: ﴿اَوَلَمْ يَرَوْا﴾ (العنکبوت: ۶۷) کیا وہ نہیں دیکھتے کہ ہم نے حرم کو امن والا بنایا۔ لوگ اس کے آس پاس سے اُچک لئے جاتے ہیں اور یہاں وہ پرامن رہتے ہیں۔ اسی قسم کی آیتیں بھی ہیں اور اس مضمون کی بہت سی حدیثیں بھی اوپر گزر چکی ہیں کہ مکہ شریف میں قتال حرام ہے۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں' میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا آپ فرماتے تھے' کسی کو حلال نہیں کہ مکہ میں ہتھیار اُٹھائے۔ (صحیح مسلم) آپ کی یہ دعا حرمت کعبۃ اللہ کی بنا سے پہلے تھی۔ اس لئے کہا کہ خدایا اس جگہ کو امن والا شہر بنا۔ سورۂ ابراہیم میں یہی دعا ان لفظوں میں ہے: ﴿رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا﴾ شاید یہ دعا دوبارہ کی تھی' جب بیت اللہ شریف تیار ہو گیا اور شہر بس گیا اور حضرت اسحاق علیہ السلام جو حضرت اسماعیل سے تین سال چھوٹے تھے' تولد ہو چکے تھے۔ اسی لئے اس دعا کے آخر میں ان کی پیدائش کا شکریہ بھی ادا کیا۔

﴿وَمَنْ كَفَرَ﴾ سے آخر تک خدا تعالیٰ کا کلام ہے۔ بعضوں نے اسے بھی دعا میں داخل کیا ہے تو اس تقدیر پر یہ مطلب ہو گیا کہ کفار کو بھی تھوڑا سا فائدہ دے۔ پھر انہیں بھی عذاب میں مبتلا کر۔ اس میں بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی خلت ظاہر ہوتی ہے کہ وہ اپنی بری اولاد کے بھی مخالف ہیں اور اسے کلام خدا ماننے پر یہ مطلب ہو گا کہ چونکہ امامت کا سوال جب اپنی اولاد کے لئے کیا اور ظالموں کی محرومی کا اعلان سن چکے اور معلوم ہو گیا کہ آپ کے پیچھے آنے والوں میں بھی خدا کے نافرمان ہوں گے۔ تو اب مارے ڈر کے ادب کے ساتھ پھلوں کی روزی کی طلب بھی صرف ایمان دار اولاد کے لئے کی۔ مگر ارشاد باری تعالیٰ ہوا کہ دنیاوی فائدہ تو کفار کو بھی دیتا ہوں۔ جیسے اور جگہ ہے: ﴿كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَهٰٓؤُلَآءِ مِنْ عَطَآءِ رَبِّكَ ......﴾ (بنی اسرائیل: ۲۰) یعنی ہم انہیں اور انہیں فائدہ دیں گے۔ تیرے ربّ کی عطا کی ہوئی نہیں۔

اور جگہ ہے جو لوگ اللہ پر جھوٹ باندھتے ہیں وہ فلاح نہیں پاتے۔ دنیا کا کچھ فائدہ گو اُٹھالیں لیکن ہماری طرف آ کر اپنے کفر کے بدلے سخت عذاب چکھیں گے اور جگہ ہے' کافروں کا کفر تجھے غمگین نہ کرے۔ ہماری طرف یہ لوٹیں گے اور ان کے اعمال پر ہم انہیں تنبیہ کریں گے۔ اللہ تعالیٰ سینوں کی چھپی ہوئی باتوں کو بخوبی جانتا ہے۔ ہم انہیں معمولی فائدہ پہنچا کر سخت شدید عذاب میں مبتلا کر دیں گے اور جگہ ہے: ﴿لَوْ لَآ اَنْ يَّكُوْنَ النَّاسُ ......﴾ (الزخرف: ۳۳) اگر یہ خطرہ نہ ہوتا کہ لوگ ایک ہی امت ہو جائیں تو ہم کافروں کی چھتیں اور سیڑھیاں چاندی کی بنا دیتے ہیں اور ان کے دروازے اور تخت جن پر تکیے لگائے بیٹھے رہتے ہیں اور سونا بھی دیتے ہیں لیکن یہ سب دنیاوی فوائد ہیں۔ آخرت کا بھلا گھر تو صرف پرہیزگاروں کے لئے ہے۔

یہی مضمون اس آیت میں بھی ہے کہ ان کا انجام بُرا ہے۔ یہاں ڈھیل پالیں' پھر وہاں سخت پکڑ ہو گی۔ جیسے اور جگہ ہے: ﴿وَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ ......﴾ بہت سی ظالم بستیوں کو ہم نے مہلت دی' پھر پکڑ لیا۔ انجام کار تو ہمارے ہی پاس لوٹنا ہے۔ صحیحین کی حدیث میں ہے' گندی باتوں کو سن کر صبر کرنے میں خدا سے بڑھ کر کوئی نہیں۔ لوگ اس کی اولاد بتاتے ہیں لیکن تاہم وہ انہیں رزق و عافیت دے رہا ہے اور حدیث میں ہے اللہ تعالیٰ ظالم کو ڈھیل دیتا ہے پھر انہیں اچانک پکڑ لیتا ہے۔ پھر حضور ﷺ نے یہ آیت تلاوت فرمائی: ﴿وَكَذٰلِكَ اَخْذُ رَبِّكَ ......﴾ (سورۂ ہود' بخاری) اس جملہ کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا میں شامل کرنا شاذ قراءت کی بنا پر ہے۔ جو ساتوں قاریوں کی قراءت کے خلاف ہے اور ترکیب سیاق بظاہر اس کا انکار کرتی ہے۔ واللہ اعلم۔ اس لئے کہ قال کی ضمیر کا مرجع اللہ کی طرف ہے اور اس شاذ قراءت کی بنا پر اس کے فاعل اور قائل بھی حضرت ابراہیم علیہ

السلام سے ہی ہوتے ہیں جو نظم کلام سے بظاہر مخالف ہے واللہ اعلم۔
قواعد جمع ہے قَاعِدَۃٌ کی۔ ترجمہ اس کا پایہ اور بنیاد ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اے نبی اپنے متعلقین کو بناء ابراہیمی کی خبر دو۔ ایک قراءت میں وَاِسْمٰعِیْلُ کے بعد وَیَقُوْلَانِ بھی ہے۔ اسی کی دلالت میں آ گے لفظ مُسْلِمَیْنِ بھی ہے۔

اخلاص بھری دعائیں ☆ دونوں نبی نیک کام میں مشغول ہیں اور قبول نہ ہونے کا کھٹکا ہے تو اللہ تعالیٰ سے قبولیت کی دعا کرتے ہیں۔ حضرت وہیب بن ورد جب اس آیت کی تلاوت کرتے تو بہت روتے اور فرماتے آہ خلیل الرحمٰن جیسے خدا کا مقبول پیغمبر خدا کا کام خدا کے حکم سے کرتے ہیں۔ اس کا گھر اس کے فرمان سے بناتے ہیں اور پھر دہشت ہے کہ کہیں یہ قبولیت سے گر نہ جائے۔ سچ ہے مخلص مؤمنوں کا خشیت سے یہی حال ہے۔ ﴿یُؤْتُوْنَ مَآ اٰتَوْا وَّقُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ﴾ (المؤمنون ۶۰) وہ نیک کام کرتے ہیں لیکن پھر بھی خوف خدا سے کانپتے رہتے ہیں (کہ ایسا نہ ہو قبول نہ ہو) حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے سوال پر اس آیت کا یہی مطلب زبان رسالت مآب سے بیان ہوا ہے۔ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ بنیادیں حضرت ابراہیم علیہ السلام اُٹھاتے تھے اور دعا حضرت اسماعیل علیہ السلام کرتے تھے لیکن صحیح یہی ہے کہ دونوں ہر ایک کام میں شریک تھے۔ صحیح بخاری شریف کی ایک روایت اور بعض اور آثار بھی اس واقعہ کے متعلق یہاں ذکر کیے جانے کے قابل ہیں۔ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ کمر بند باندھنا عورتوں نے حضرت اسماعیل کی والدہ محترمہ سے سیکھا۔ انہوں نے اسے باندھا تھا کہ حضرت سارہ کو ان کا نقش قدم نہ ملے۔ انہیں اور ان کے جگر کے ٹکڑے اپنے اکلوتے فرزند حضرت اسماعیل علیہ السلام کو لے کر حضرت ابراہیم علیہ السلام نکلے' جب کہ یہ پیارا بچہ دودھ پیتا تھا۔ اب جہاں پر بیت اللہ بنا ہوا ہے۔ یہاں ایک ٹیلہ تھا اور سنسان اور بیابان پڑا ہوا تھا۔ کوئی رہنے سہنے والا وہاں نہ تھا۔ یہاں ماں بیٹے کو بٹھا کر پاس تھوڑی سی کھجوریں اور ایک مشکیزہ پانی کا رکھ کر چلے گئے' جب خلیل اللہ نے پیٹھ موڑی اور جانے لگے تو حضرت ہاجرہؑ آوازیں دینے لگیں کہ اے خلیل خدا ہمیں اس وحشت و دہشت والے بیابان میں یکہ و تنہا چھوڑ کر جہاں ہمارا کوئی مونس و ہمدم نہیں' آپ کہاں تشریف لے جا رہے ہیں؟ لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کوئی جواب نہ دیا بلکہ اس طرف کوئی توجہ نہ دی۔ حضرت ہاجرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے بار بار کہنے پر بھی جب آپ نے کوئی التفات نہ فرمایا تو آپ فرمانے لگیں۔

ابراہیم علیہ السلام اطاعتِ ربانی کے پیکر ☆ اللہ کے خلیل آپ ہمیں کسے سونپ چلے؟ آپ نے کہا' اللہ تعالیٰ کو۔ کہا' اے خلیل اللہ کیا اللہ تعالیٰ کا آپ کو یہ حکم ہے؟ آپ نے فرمایا ہاں ہاں مجھے خدا کا یہی حکم ہے۔ یہ سن کر حضرت ہاجرہ صاحبہ کو تسکین ہوگئی اور فرمانے لگیں' پھر تشریف لے جائیے' وہ خدا ہمیں ہرگز ضائع نہ کرے گا۔ اسی کا بھروسہ اور اسی کا سہارا ہے۔ حضرت ہاجرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا لوٹ گئیں اور اپنے کلیجہ کی ٹھنڈک کو' اپنی آنکھوں کے نور ابن نبی اللہ کو گود میں لے کر اس سنسان بیابان میں اس ہُو کے عالم میں لاچار اور مجبور ہو کر بیٹھی رہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام جب ثنیہ کے پاس پہنچے اور یہ معلوم کر لیا کہ اب حضرت ہاجرہ پیچھے نہیں اور وہاں سے یہاں تک ان کی نگاہ کام بھی نہیں کر سکتی تو بیت اللہ شریف کی طرف متوجہ ہو کر ہاتھ اُٹھا کر دعا کی اور کہا: ﴿رَبَّنَآ اِنِّیْٓ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ بِوَادٍ غَیْرِ ذِیْ زَرْعٍ عِنْدَ بَیْتِكَ الْمُحَرَّمِ ......﴾ (ابراہیم: ۳۷) خدایا میں نے اپنے بال بچوں کو ایک غیر آباد جنگل میں تیرے برگزیدہ گھر کے پاس چھوڑا ہے تا کہ وہ نماز قائم کریں۔ تو لوگوں کے دلوں کو ان کی طرف جھکا دے اور انہیں پھلوں کی روزیاں دے۔ شاید وہ شکر گزاری کریں۔ آپ تو یہ دعا کر کے حکم خدا بجا لا کر اپنے اہل و

عیال کو سپرد خدا کر کے چل دیئے۔ ادھر حضرت ہاجرہ صبر وشکر کے ساتھ بچے سے دل بہلانے لگیں۔ وہ تھوڑی سی کھجوریں اور ذرا سا پانی ختم ہو گیا۔ اب اناج کا نہ ایک دانہ پاس ہے نہ پانی کا گھونٹ۔ خود بھی بھوکی پیاسی ہیں اور بچہ بھی بھوک پیاس سے بے تاب ہے۔ یہاں تک کہ اس معصوم نبی زادے کا پھول سا چہرہ کملانے لگا۔ مامتا بھری ماں کبھی اپنی تنہائی اور بے کسی کا خیال کرتی ہے' کبھی اپنے ننھے سے اکلوتے بیٹے کا حال بغور دیکھتی ہے اور سہی جاتی ہے۔ معلوم ہوا کہ کسی انسان کا گزر اس بھیانک جنگل میں نہیں۔ میلوں تک آبادی کا نام ونشان نہیں' کھانا تو کہاں؟ پانی کا ایک قطرہ بھی میسر نہیں آ سکتا۔ آخر اس ننھی سی جان کا یہ ابتر حال نہیں دیکھا جاتا تو اُٹھ کر چلی جاتی ہیں اور صفا پہاڑ جو پاس ہی تھا' اس پر چڑھ جاتی ہیں اور میدان کی طرف نظریں دوڑاتی ہیں کہ کوئی آتا جاتا نظر آ جائے لیکن نگاہیں مایوسی کے ساتھ ہر طرف سے واپس آتی ہیں تو اُتر کر وادی میں پہنچ کر دامن اُٹھا کر دوڑتی ہوئی مروہ پہاڑ کی طرف جاتی ہیں' اس پر چڑھ کر نگاہیں چاروں طرف دوڑتی ہیں اور کسی کو بھی نہ دیکھ کر پھر وہاں سے اُتر آتی ہیں اور اسی طرح درمیان میں تھوڑا سا حصہ دوڑ کر باقی حصہ جلدی جلدی طے کر کے پھر صفا پر چڑھتی ہیں۔ اسی طرح سات مرتبہ کرتی ہیں۔ ہر بار آ کر بچہ کو دیکھ جاتی ہیں کہ اس کی حالت ساعت بساعت بگڑتی جا رہی ہے۔ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں' صفا مروہ کی سعی جو حاجی کرتے ہیں' اس کی ابتدا یہی ہے۔ ساتویں مرتبہ جب ہاجرہ مروہ پر آتی ہیں تو کچھ آواز کان میں پڑتی ہے۔ آپ خاموش ہو کر احتیاط سے اس کی طرف متوجہ ہوتی ہیں کہ یہ آواز کیسی ہے آواز پھر آتی ہے اور اب کی مرتبہ صاف سنائی دیتی ہے تو آپ آواز کی طرف لپک آتی ہیں اور اب جہاں زمزم ہے۔ وہاں حضرت جبریل کو پاتی ہیں۔ حضرت پوچھتے ہیں تم کون ہو؟ آپ جواب دیتی ہیں' میں ہاجرہ ہوں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لڑکے کی ماں ہوں۔ فرشتہ پوچھتا ہے' ابراہیم تمہیں اس سنسان بیابان میں کسے سونپ گئے ہیں؟ آپ فرماتی ہیں اللہ کو' فرمایا' پھر تو وہ کافی ہے۔ حضرت ہاجرہ نے فرمایا' اے غیبی شخص آواز تو میں نے سن لی' کیا کچھ میرا کام بھی نکلے گا؟

زمزم کا چشمۂ شیریں ☆ حضرت جبریل علیہ السلام نے اپنی ایڑی زمین پر رگڑی۔ وہیں زمین میں سے ایک چشمہ پانی کا اُبلنے لگا۔ حضرت ہاجرہ علیہا السلام نے ہاتھوں سے اس پانی کو مشک میں بھرنا شروع کیا۔ مشک پر کر کے پھر اس خیال سے کہ پانی اِدھر اُدھر بہہ کر نکل نہ جائے۔ آس پاس باڑ باندھنی شروع کر دی۔ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں۔ اللہ ام اسماعیل پر رحم کرے۔ اگر وہ اس طرح پانی کو نہ روکتی تو زمزم کنوئیں کی شکل میں نہ ہوتا بلکہ وہ ایک جاری نہر کی صورت میں ہوتا۔ اب حضرت ہاجرہؑ نے پانی پیا اور بچہ کو بھی پلایا اور دودھ پلانے لگیں۔ فرشتے نے کہہ دیا کہ تم بے فکر رہو۔ خدا تمہیں ضائع نہ کرے گا۔ جہاں تم بیٹھی ہو' یہاں خدا کا ایک گھر اس بچہ اور اس کے باپ کے ہاتھوں بنے گا۔ حضرت ہاجرہ اب یہیں رہ پڑیں۔ زمزم کا پانی پیتیں اور بچے سے دل بہلاتیں بارش کے موسم میں پانی کے سیلاب ہر طرف سے آتے لیکن یہ جگہ ذرا اُونچی تھی' اِدھر اُدھر سے پانی گزر جاتا اور یہاں امن رہتا۔

سنسان وادی میں جرہم قبیلہ کے قدم ☆ کچھ مدت کے بعد جرہم کا قبیلہ کدا کی راستہ کی طرف سے اتفاقاً گزرا اور مکہ شریف کے نیچے کے حصے میں اُترا۔ ان کی نظریں ایک آبی پرندہ پر پڑیں تو آپس میں کہنے لگے' یہ پرندہ تو پانی کا ہے اور یہاں پانی کبھی نہ تھا۔ ہماری آمدورفت یہاں سے کئی مرتبہ ہوئی۔ یہ تو خشک جنگل اور چٹیل میدان ہے' یہاں پانی کہاں؟ چنانچہ انہوں نے اپنے آدمی واقعہ معلوم کرنے کے لئے بھیجے۔ انہوں نے واپس آ کر خبر دی کہ وہاں تو بہترین اور بہت سا پانی ہے۔ اب وہ

سب آئے اور حضرت اُم اسماعیل سے عرض کرنے لگے کہ اگر آپ اجازت دیں تو ہم بھی یہاں ٹھہر جائیں۔ پانی کی جگہ ہے۔ آپ نے فرمایا' ہاں شوق سے رہو۔ لیکن پانی پر قبضہ میرا ہی رہے گا۔ حضور ﷺ فرماتے ہیں۔ حضرت ہاجرہ تو چاہتی ہی تھیں کہ کوئی ہم جنس مل جائے۔ چنانچہ یہ قافلہ یہاں رہ پڑا۔ حضرت اسماعیل بھی بڑے ہو گئے۔ اُن سب کو آپ سے بڑی ہی محبت ہو گئی۔ یہاں تک کہ جب آپ بالغ ہو گئے تو انہیں میں نکاح بھی کیا اور انہی سے عربی زبان بھی سیکھی۔ ہاجرہ علیہا السلام کا انتقال یہیں ہوا۔

لختِ جگر سے پہلی ملاقات ☆ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو خدائے تعالیٰ کی طرف سے اجازت ملی تو آپ نے اپنے لختِ جگر کی ملاقات کے لئے تشریف لائے۔ بعض روایت میں ہے کہ آپ کا آنا جانا براق پر ہوتا ہے۔ ملک شام سے آتے تھے اور پھر واپس جاتے تھے۔ یہاں آئے تو حضرت اسماعیل گھر پر نہ ملے۔ اپنی بہو سے پوچھا کہ وہ کہاں ہیں؟ تو جواب ملا کہ کھانے پینے کی تلاش میں' یعنی شکار کو گئے ہیں۔ آپ نے پوچھا تمہارا کیا حال ہے؟ کہا برا حال ہے۔ بڑی تنگی اور سختی ہے۔ فرمایا' اچھا جب تمہارے خاوند آئیں تو انہیں سلام کہنا کہہ دینا کہ اپنے دروازے کی چوکھٹ بدل ڈالیں۔ حضرت ذبیح اللہ جب واپس آئے تو گویا آپ کو کچھ انس سا معلوم ہوا۔ پوچھنے لگے' کیا کوئی صاحب تشریف لائے تھے؟ بیوی نے کہا' ہاں ایسی ایسی شکل وصورت کے ایک عمر رسیدہ بزرگ آئے تھے۔ آپ کی نسبت پوچھا میں نے کہا وہ شکار کی تلاش میں باہر گئے ہوئے ہیں۔ پھر پوچھا گزر بسر کیسی ہے؟ میں نے کہا بڑی سختی اور تنگی سے گزر اوقات ہوتی ہے۔ پوچھا کچھ مجھ سے کہنے کو بھی فرما گئے ہیں۔ بیوی نے کہا ہاں کہہ گئے ہیں کہ جب وہ آئیں تو میرا اسلام کہنا اور کہہ دینا کہ اپنے دروازے کی چوکھٹ بدل دینا۔ آپ فرمانے لگے' بیوی سنو! یہ میرے والد صاحب تھے اور جو فرما گئے ہیں' اس سے مطلب یہ ہے کہ (چونکہ تم نے ناشکری کی) میں تم کو الگ کردوں' جاؤ میں نے تمہیں طلاق دی۔ انہیں طلاق دے کر آپ نے اس قبیلہ میں اپنا دوسرا نکاح کر لیا۔

دوسری بار ملاقات کی کوشش ☆ ایک مدت کے بعد پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام باجازتِ الٰہی یہاں آئے۔ اب کی مرتبہ بھی اتفاقاً حضرت ذبیح علیہ السلام سے ملاقات نہ ہوئی۔ بہو سے پوچھا تو جواب ملا کہ ہمارے لئے روزی کی تلاش میں شکار کو گئے ہیں۔ آپ آیئے تشریف رکھیئے۔ جو کچھ حاضر ہے وہ تناول فرمایئے۔ آپ نے فرمایا یہ تو بتاؤ کہ گزر بسر کیسی ہو رہی ہے؟ کیا حال ہے؟ جواب ملا' الحمدللہ ہم خیریت سے ہیں اور بفضل خدا کشادگی اور راحت ہے۔ اللہ کا بڑا شکر ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا تمہاری خوراک کیا ہے؟ کہا گوشت۔ پوچھا تم پیتے کیا ہو؟ جواب ملا پانی۔ آپ نے دعا کہ پروردگار انہیں گوشت اور پانی میں برکت دے۔ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں' اگر اناج ان کے پاس ہوتا اور یہ کہتیں تو حضرت خلیل علیہ السلام ان کے لئے اناج کی برکت کی دعا بھی کرتے۔ اب اس دعا کی برکت سے اہل مکہ صرف گوشت اور پانی پر گزارہ کر سکتے ہیں اور لوگ نہیں کر سکتے۔ آپ نے فرمایا' اچھا' تو میں جاتا ہوں تم اپنے میاں کو میرا اسلام کہنا اور کہہ دینا کہ وہ اپنی چوکھٹ کو ثابت اور بار آور رکھیں۔ اس کے بعد حضرت اسماعیل علیہ السلام کو سارا واقعہ معلوم ہوا۔ آپ نے فرمایا یہ میرے والد مکرم تھے مجھے حکم دے گئے ہیں کہ میں تمہیں الگ نہ کروں (تم شکر گزار رہو) پھر ایک مدت کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اجازت ملی اور آپ تشریف لائے تو حضرت اسماعیل علیہ السلام کو زمزم کے پاس ایک ٹیلے پر تیر سیدھا کرتے ہوئے پایا۔ حضرت اسماعیلؑ باپ کو دیکھتے ہی کھڑے ہو گئے۔

کعبۃ اللہ کی جدید تعمیر ☆ جب باپ بیٹے مل لئے تو خلیل اللہ علیہ السلام نے فرمایا' اے اسماعیل مجھے خدا کا ایک حکم ہوا ہے۔ آپ نے فرمایا' ابا جان جو حکم ہو اس کی تعمیل کیجئے۔ کہا بیٹا تمہیں بھی میرا ساتھ دینا پڑے گا۔ غرض کرنے لگے میں حاضر ہوں۔ کہا اس جگہ خدا کا ایک گھر بنانا ہے۔ کہنے لگے بہت بہتر' اب باپ بیٹے نے بیت اللہ کی نیو (بنیاد) رکھی اور دیواریں اونچی کرنی شروع کر دیں۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام پتھر لا کر دیتے جاتے تھے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام چنتے جاتے تھے۔ جب دیواریں قدرے اونچی ہو گئیں تو حضرت ذبیح اللہ یہ پتھر یعنی مقام ابراہیم کا پتھر لائے۔ اس اونچے پتھر پر کھڑے ہو کر حضرت ابراہیم علیہ السلام کعبہ کے پتھر رکھتے اور دونوں باپ بیٹا یہ دعا مانگتے کہ باری تعالیٰ کو ہماری اس ناچیز خدمت کو قبول فرما' تو سننے والا اور جاننے والا ہے۔ یہ روایت اور کتب حدیث میں بھی ہے۔ کہیں مختصراً اور کہیں مفصلاً۔ ایک صحیح حدیث میں یہ بھی ہے کہ حضرت ذبیح اللہ علیہ السلام کے بدلے جو دنبہ ذبح ہوا تھا' اس کے سینگ بھی کعبۃ اللہ میں تھے۔ اُوپر کی طویل روایت بروایت حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی نقل ہے۔ اس میں یہ بھی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام جب بیت اللہ شریف کے قریب پہنچے تو آپ نے اپنے سر پر بادل سا ملاحظہ فرمایا۔ جس میں آواز آئی کہ اے ابراہیم علیہ السلام جہاں جہاں تک اس بادل کا سایہ ہے وہاں تک کی زمین بیت اللہ میں لے لو' کمی زیادتی نہ ہو۔ اس روایت میں یہ بھی ہے کہ بیت اللہ بنا کر وہاں حضرت ہاجرہ اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کو چھوڑ کر آپ تشریف لے گئے لیکن پہلی ہی روایت ٹھیک ہے اور اس طرح تطبیق بھی ہو سکتی ہے کہ بنا پہلے رکھ دی تھی لیکن بنایا بعد میں اور بنانے میں بیٹا اور باپ دونوں شامل تھے۔ جیسے کہ قرآن پاک کے الفاظ بھی بتاتے ہیں۔ ایک اور روایت میں ہے کہ لوگوں نے حضرت علیؓ سے بناء بیت اللہ کی کیفیت دریافت کی تو آپ نے فرمایا' اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حکم دیا کہ میرا گھر بناؤ۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام گھبرائے کہ مجھے بنانا چاہئے کس قدر اور کتنا بڑا بنانا چاہئے وغیرہ۔ اس پر سکینہ نازل ہوا اور حکم ہوا کہ جہاں یہ ٹھہرے' وہاں تم میرا گھر بناؤ' آپ نے بنانا شروع کیا۔ جب حجر اسود کی جگہ پہنچے تو حضرت اسماعیل علیہ السلام سے کہا' بیٹا کوئی اچھا سا پتھر ڈھونڈ لاؤ۔ آپ پتھر ڈھونڈ لائے۔ تو دیکھا کہ ابا وہ پتھر وہاں لگا چکے ہیں۔ پوچھا یہ کون لایا؟ آپ نے فرمایا خدا کے حکم سے یہ پتھر حضرت جبرئیل علیہ السلام آسمان سے لے آئے۔ حضرت کعب احبارؒ فرماتے ہیں کہ اب جہاں بیت اللہ ہے وہاں زمین کی پیدائش سے پہلے پانی پر بلبلوں کے ساتھ جھاگ سے تھے۔ یہیں سے زمین بھی پھیلائی گئی۔

حضرت علیؓ فرماتے ہیں' کعبۃ اللہ بنانے کے لئے حضرت خلیل اللہ ارمینیہ سے تشریف لائے تھے۔ حضرت سدی فرماتے ہیں' حجر اسود حضرت جبریل ہند سے لائے تھے۔ اس وقت وہ سفید چمکدار یاقوت تھا۔ جو حضرت آدم کے ساتھ جنت سے اُترا تھا۔ پھر لوگوں کے خطا کار ہاتھوں سے اس کا رنگ سیاہ ہو گیا۔ اس روایت میں یہ بھی ہے کہ نیو اور بنیادیں پہلے سے موجود تھیں۔ انہیں پر حضرت ابراہیم نے بنا کی۔ مسند عبدالرزاق میں ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام ہند میں اُترے تھے۔ اس وقت اُن کا قد لمبا تھا۔ زمین پر آنے کے بعد فرشتوں کی تسبیح نماز وغیرہ سنتے تھے۔ جب قد گھٹ گیا اور وہ پیاری آوازیں آنی بند ہو گئیں تو آپ گھبرانے لگے۔ حکم ہوا کہ مکہ کی طرف جاؤ۔ آپ چلے' جہاں جہاں آپ کا قدم پڑا وہاں آبادی ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے یہاں ایک یاقوت جنت سے اُتارا اور بیت اللہ کی جگہ رکھا اور اسے اپنا گھر قرار دیا۔ حضرت آدم یہاں طواف کرنے لگے اور مانوس ہو گئے۔ حضرت نوح علیہ السلام کے طوفان کے زمانہ میں یہ پھر اُٹھ گیا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ میں پھر

اللہ تعالیٰ نے بنوایا۔ حضرت آدم علیہ السلام نے یہ گھر حرا طور زیتا طور سینا' جودی اور لبنان پہاڑوں سے بنایا تھا لیکن ان تمام روایتوں میں ظاہر ہے کہ اختلافات ہیں۔ واللہ اعلم۔ بعض روایتوں میں ہے کہ زمین کی پیدائش سے دو ہزار سال پہلے بیت اللہ بنایا گیا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ بیت اللہ کے نشان بتانے کے لئے حضرت جبرئیل چلے تھے۔ اس وقت یہاں جنگلی درختوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ بہت دور عمالیق کی آبادی تھی۔ یہاں آپ حضرت ام اسماعیل کو اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کو ایک چھپر تلے بٹھا گئے۔ ایک اور روایت میں ہے کہ بیت اللہ کے چار ارکان ہیں اور ساتویں زمین تک وہ نیچے ہوتے ہیں۔ ایک اور روایت میں ہے ذوالقرنین جب یہاں پہنچے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بیت اللہ بناتے ہوئے دیکھا تو پوچھا یہ کیا کر رہے ہیں؟ انہوں نے کہا ہم خدا کے حکم سے اس کا گھر بنا رہے ہیں۔ پوچھا کیا دلیل ہے؟ کہا یہ بھیڑیے گواہی دیں گے۔ پانچ بھیڑیوں نے کہا۔ ہم گواہی دیتے ہیں کہ یہ دونوں خدا کے مامور ہیں۔ ذوالقرنین خوش ہو گئے اور کہنے لگے۔ میں نے مان لیا۔ ارزقی کی تاریخ مکہ میں ہے کہ ذوالقرنین نے خلیل اللہ اور ذبیح اللہ کے ساتھ بیت اللہ کا طواف کیا[1]۔ واللہ اعلم۔

صحیح بخاری شریف میں ہے قواعد بنیاد اور اساس کو کہتے ہیں۔ یہ قَاعِدَۃٌ کی جمع ہے۔ قرآن میں اور جگہ: ﴿وَالْقَوَاعِدُ مِنَ النِّسَاءِ﴾ بھی آیا ہے۔ اس کا مفرد بھی قَاعِدَۃٌ ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے فرمایا' کیا تم نہیں دیکھتی کہ تمہاری قوم نے جب بیت اللہ بنایا تو قواعد ابراہیم سے گھٹا دیا۔ میں نے کہا حضور! آپ اسے بڑھا کر اصلی پر بنا کر دیں۔ فرمایا کہ اگر تیری قوم کا اسلام تازہ اور ان کا زمانہ کفر قریب نہ ہوتا تو میں ایسا کر لیتا۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کو جب یہ حدیث معلوم ہوئی تو فرمانے لگے کہ شاید یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ حجر اسود کے پاس کے دوستونوں کو چھوتے نہ تھے۔

صحیح مسلم شریف میں ہے۔ حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ اے عائشہ اگر تیری قوم کا جاہلیت کا زمانہ نیا نہ ہوتا تو میں کعبہ کے خزانہ کو خدا کی راہ میں خیرات کر ڈالتا اور دروازے کو زمین دوز کر دیتا اور حطیم کو بیت اللہ میں داخل کر دیتا۔ صحیح بخاری شریف میں حدیث میں یہ بھی ہے کہ میں اس کا دوسرا اور دروازہ بھی بنا دیتا ایک آنے کے لئے اور دوسرا جانے کے لئے۔ چنانچہ ابن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے زمانہ خلافت میں ایسا ہی کیا اور ایک روایت میں ہے' اسے میں دوبارہ بنائے ابراہیم پر بناتا اور روایت میں ہے کہ ایک دروازہ مشرق رُخ کرتا اور دوسرا مغرب رُخ اور چھ ہاتھ حطیم کو اس میں داخل کرا لیتا۔ جسے قریش نے باہر کر دیا ہے۔ نبی ﷺ کی نبوت سے پانچ سال پہلے قریش نے نئے سرے سے کعبہ بنایا تھا۔ اس کا مفصل ذکر ملاحظہ ہو۔ اس بنا میں خود حضور ﷺ بھی شریک تھے۔ پینتیس سال کی آپ کی عمر تھی اور پتھر آپ بھی اُٹھاتے تھے۔ محمد بن اسحاق بن یسار رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جب رسول اللہ ﷺ کی عمر پینتیس سال کی ہوئی' اس وقت قریش نے کعبتہ اللہ کو نئے سرے سے بنانے کا ارادہ کیا۔ ایک تو اس لئے کہ اس کی دیواریں چھوٹی تھیں' چھت نہ تھی' دوسرے اس لئے بھی کہ بیت اللہ کا خزانہ چوری ہو گیا تھا' جو بیت اللہ کے بیچ میں گہرے گڑھے میں رکھا ہوا تھا۔ یہ مال دویک کے پاس سے ملا تھا۔ جو خزاعہ کے قبیلہ بنی ملیح بن عمرو کا مولیٰ تھا۔ ممکن ہے چوروں نے یہاں لا رکھا ہو لیکن اس کے ہاتھ اس چوری کی وجہ سے کاٹے گئے' ایک قدرتی سہولت بھی ان

[1] یہ روایت جن میں ابراہیم علیہ السلام اور ذوالقرنین کی ملاقات کا تذکرہ آتا ہے' حد درجہ غلط ہیں۔ علامہ آلوسی زادہ نے روح المعانی میں ان روایات پر تنقید کرتے ہوئے بتایا ہے کہ ایسی روایات ناقابل قبول ہیں۔ ۱۲

کے لئے ہوگئی تھی کہ روم کے تاجروں کی ایک کشتی' جس میں بہت اعلیٰ درجہ کی لکڑیاں تھیں' وہ طوفان کی وجہ سے جدہ کے کنارے آ گئی تھیں۔ یہ لکڑیاں چھت میں کام آ سکتی تھیں۔ اس لئے قریشیوں نے انہیں خرید لیا اور مکہ کے بڑھئی کو جو قبطی قبیلہ میں تھا' چھت کا کام سونپا' یہ سب تیاریاں تو ہو رہی تھیں لیکن بیت اللہ کو گرانے کی ہمت نہیں پڑتی تھی۔ اس کے قدرتی اسباب بھی مہیا ہو گئے۔ بیت اللہ کے خزانے میں ایک بہت بڑا اژدہا تھا۔ جب کبھی لوگ اس کے قریب بھی جاتے تو وہ منہ پھاڑ کر ان کی طرف لپکتا تھا۔ یہ سانپ ہر روز اس کنوئیں سے نکل کر بیت اللہ کی دیواروں پر آ بیٹھتا تھا۔ ایک روز وہ بیٹھا ہوا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ایک بہت بڑا پرندہ بھیجا۔ وہ اسے پکڑ کر لے اُڑا۔ قریشیوں نے سمجھ لیا کہ ہمارا ارادہ منشائے الٰہی کے مطابق ہے۔ لکڑیاں بھی ہمیں مل گئیں۔ بڑھئی ہمارے پاس موجود ہے۔ سانپ کو بھی اللہ تعالیٰ نے دفع کیا۔ اب انہوں نے مستقل ارادہ کر لیا کہ کعبۃ اللہ کو گرا کر نئے سرے سے بنائیں۔

کعبہ کی تعمیر اور غیبی اشارے ☆ سب سے پہلے ابن وہب کھڑا ہوا اور ایک پتھر کعبۃ اللہ کا اتارا۔ جو اس کے ہاتھ سے اُڑ کر پھر وہیں جا کر نصب ہو گیا۔ اس نے تمام قریش کو خطاب کر کے کہا' سنو! بیت اللہ کے بنانے میں ہر شخص اپنا طیب اور پاک مال ہی خرچ کرے۔ اس میں زنا کاری کا روپیہ' سودی بیوپار کا روپیہ' ظلم سے حاصل کیا ہوا مال نہ لگانا' بعض لوگ کہتے ہیں یہ مشورہ ولید بن مغیرہ نے دیا تھا۔ اب بیت اللہ کے حصے بانٹ لئے گئے۔ دروازے کا حصہ بنو عبد مناف اور زہرہ بنائیں۔ حجر اسود اور رکن یمانی کا حصہ عبدالدار بن قصی اور بنو اسد بن عبدالعزیٰ اور بنو عدی بن کعب بنائیں۔ یہ مقرر کر کے اب بنی ہوئی عمارت کو ڈھانے کے لئے چلے لیکن کسی کی ہمت نہیں پڑتی کہ اسے ڈھانا شروع کرے۔ آخر ولید بن مغیرہ نے کہا' لو میں شروع کرتا ہوں۔ کدال لے کر اُوپر چڑھ گئے اور کہنے لگے' اے اللہ' تجھے خوب علم ہے کہ ہمارا ارادہ برا نہیں۔ ہم تیرے گھر کو اُجاڑنا نہیں چاہتے بلکہ اس کے آباد کرنے کی فکر میں ہے۔ یہ کہہ کر کچھ حصہ دونوں رکن کے کناروں کا گرایا۔ قریشیوں نے کہا بس اب چھوڑ دو اور رات بھر انتظار کرو۔ اگر اس شخص پر کوئی وبال آ جائے تو یہ پتھر اسی جگہ پر لگا دینا اور خاموش ہو جانا اور اگر کوئی عذاب نہ آئے تو سمجھ لینا کہ اس کا گرانا خدا کو ناپسند نہیں پھر کل سب مل کر اپنے اپنے کام میں لگ جانا' چنانچہ صبح ہوئی اور ہر طرح خیریت رہی۔ اب سب آ گئے اور بیت اللہ شریف کی اگلی عمارت کو گرا دیا۔ یہاں تک کہ اصلی نیو یعنی بنائے ابراہیمی تک پہنچ گئے۔ یہاں سبز رنگ کے پتھر تھے اور ایک دوسرے میں گویا پیوست تھے۔ ایک شخص نے دو پتھروں کو الگ کرنا چاہا۔ اس نے کدال ڈال کر زور لگایا تو پتھر کے ہلنے کے ساتھ تمام زمین بھی ہلنے لگی۔ تو انہوں نے سمجھ لیا کہ انہیں جدا کر کے اور پتھر ان کی جگہ لگانا خدا کو منظور نہیں۔ اس لئے یہ ہمارے بس کی بات نہیں۔ چنانچہ اس ارادے سے باز رہے اور اُن پتھروں کو اسی طرح رہنے دیا۔ پھر ہر قبیلہ نے اپنے اپنے حصہ کے مطابق علیحدہ علیحدہ پتھر جمع کئے اور عمارت بنی شروع ہوئی۔ یہاں تک کہ حجر اسود رکھنے کی جگہ تک پہنچے۔ اب ہر قبیلہ چاہتا تھا کہ یہ شرف اسے ملے۔ آپس میں لڑنے جھگڑنے لگے۔ یہاں تک کہ باقاعدہ جنگ کی نوبت آ گئی۔ فرقے آپس میں کھنچ گئے اور لڑائی کی تیاریوں میں مشغول ہو گئے۔ بنی عبدالدار و بنو عدی نے ایک لگن میں خون بھر کر اس میں ہاتھ ڈبو کر حلف اٹھایا کہ سب کٹ مریں گے لیکن کسی کو حجر اسود نہیں رکھنے دیں گے۔ اسی طرح چار پانچ دن گزر گئے۔ پھر قریش مسجد میں جمع ہوئے کہ آپس میں مشورہ اور انصاف کریں تو ابو امیہ بن مغیرہ نے جو قریش میں سب سے زیادہ عمر والے اور عقل مند تھے۔ کہا' سنو! لوگو تم اپنا حکم کسی کو بنا لو وہ جو فیصلہ کرے سب منظور کر لو لیکن پھر حکم بنانے میں بھی اختلاف ہو گا۔

لئے ایسا کرو کہ اب جو سب سے پہلے یہاں مسجد میں آئے۔ وہی ہمارا منصف ہو۔ اس رائے پر سب نے اتفاق کر لیا۔ سب منتظر ہیں کہ دیکھیں سب سے پہلے کون آتا ہے۔

حجرِ اسود اور امینِ عرب کا فیصلہ ☆ پس سب سے پہلے حضرت محمد ﷺ آئے۔ آپ کو دیکھتے ہی یہ لوگ خوش ہو گئے اور کہنے لگے' ہمیں آپ کا فیصلہ منظور ہے۔ ہم آپ کے حکم پر رضامند ہیں۔ یہ تو امین ہیں۔ یہ تو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہیں۔ پھر سب آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سارا واقعہ آپ کو کہہ سنایا۔ آپ نے فرمایا۔ جاؤ کوئی موٹی اور بڑی سی چادر لے آؤ۔ وہ لے آئے۔ آپ نے حجرِ اسود اٹھا کر اپنے دست مبارک سے اس میں رکھا۔ پھر فرمایا ہر قبیلہ کا سردار آئے اور اس کپڑے کا کونہ پکڑ لے اور اس طرح حجرِ اسود کے اٹھانے کا حصہ دار بنے۔ اس پر سب لوگ بہت خوش ہوئے اور تمام سرداروں نے اسے تھام کر اونچا کیا۔ جب اس کے رکھنے کی جگہ تک پہنچے تو اللہ کے نبی ﷺ نے اسے لے کر اپنے ہاتھ سے اس کی جگہ رکھ دیا اور نزاع' اختلاف بلکہ جدال و قتال رفع ہو گیا اور اس طرح اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کے ہاتھ سے اپنے گھر میں اس مبارک پتھر کو نصب کرایا۔ حضور ﷺ پر وحی نازل ہونے سے پہلے قریش آپ کو امین کہا کرتے تھے۔ اب پھر اوپر کا حصہ بنا اور کعبۃ اللہ کی عمارت تمام ہوئی۔ ابن اسحاق مؤرخ فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ کے زمانہ میں کعبہ اٹھارہ ہاتھ کا تھا۔ قباطی کا پردہ چڑھایا جاتا تھا۔ پھر چادر کا پردہ چڑھنے لگا۔ ریشمی پردہ سب سے پہلے حجاج بن یوسف نے چڑھایا۔ کعبہ کی یہی عمارت رہی۔ یہاں تک کہ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خلافت کے ابتدائی زمانہ میں ساٹھ سال کے بعد یہاں آگ لگی اور کعبہ جل گیا۔ یہ یزید بن معاویہ کی ولایت کا آخری زمانہ تھا اور اس نے ابن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا مکہ میں محاصرہ کر رکھا تھا۔

عمارتِ کعبہ اور اس کے مختلف ادوار ☆ ان دونوں میں خلیفہ مکہ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنی خالہ حضرت عائشہ صدیقہ سے جو حدیث سنی تھی' اس کے مطابق حضور ﷺ کی تمنا پر بیت اللہ کو گرا کر ابراہیمی قواعد پر بنایا۔ حطیم اندر شامل کر لیا۔ مشرق مغرب دو دروازے رکھے۔ ایک اندر آنے کا' دوسرا باہر جانے کا اور دروازوں کو زمین کے برابر رکھا۔ آپ کی امارت کے زمانہ تک کعبۃ اللہ یونہی رہا۔ یہاں تک کہ ظالم حجاج کے ہاتھوں آپ شہید ہو گئے۔ اب حجاج نے عبدالملک بن مروان کے حکم سے کعبہ کو پھر توڑ کر پہلے کی طرح بنا لیا۔ صحیح مسلم میں ہے۔ یزید بن معاویہ کے زمانہ میں جبکہ شامیوں نے مکہ شریف پر چڑھائی کی اور جو ہونا تھا وہ ہوا۔ اس وقت حضرت عبداللہ نے بیت اللہ کو یونہی چھوڑ دیا۔ موسم حج کے موقع پر لوگ جمع ہوئے۔ انہوں نے یہ سب کچھ دیکھا۔ ازاں بعد آپ نے لوگوں سے مشورہ کیا کہ کیا سارے کعبہ کو گرا کر نئے سرے سے بناؤں. یا جو ٹوٹا ہوا ہے اس کی اصلاح کر لوں؟ تو حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا' میری رائے ہے کہ آپ جو ٹوٹا ہوا ہے اسی کی مرمت کر دیں۔ باقی سب پرانا ہی رہنے دیں۔ آپ نے فرمایا' اگر تم میں سے کسی کا گھر جل جاتا تو وہ تو خوش نہ ہوتا۔ جب تک اسے نئے سرے سے نہ بنائے' پھر تم اپنے رب عزوجل کے گھر کی نسبت ایسی رائے کیوں رکھتے ہو؟ اچھا تین دن تک استخارہ کروں گا۔ پھر جو سمجھ میں آئے گا وہ کروں گا۔ تین دن کے بعد آپ کی رائے یہی ہوئی کہ باقی ماندہ دیواریں بھی توڑ دی جائیں اور از سرِ نو کعبہ کی تعمیر کی جائے۔ چنانچہ یہ حکم دے دیا گیا لیکن کعبہ کے توڑنے کی کسی کی ہمت نہیں پڑتی تھی ڈر تھا کہ جو پہلے توڑنے کے لئے چڑھے گا۔ اس پر عذاب نازل ہو گا لیکن ایک باہمت شخص چڑھ گیا اور اس نے ایک پتھر توڑا۔ جب لوگوں نے دیکھا کہ اسے کچھ ایذا نہیں پہنچی' تو اب ڈھانا شروع کیا اور زمین تک بالکل صاف کر دیا۔ اس وقت فرمایا' میں نے

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے سنا' وہ کہتی تھیں' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا' اگر لوگوں کا کفر کا زمانہ قریب نہ ہوتا اور میرے پاس خرچ بھی ہوتا۔ جس سے میں بنا سکوں' تو حطیم میں سے پانچ ہاتھ بیت اللہ میں لے لیتا اور کعبہ کے دو دروازے کرتا۔ ایک آنے کا اور ایک جانے کا۔ حضرت عبداللہ نے یہ روایت بیان کر کے فرمایا' اب لوگوں کے کفر کا زمانہ قریب نہیں رہا۔ ان سے خوف جاتا رہا اور خزانہ بھی معمور ہے۔ میرے پاس کافی روپیہ ہے۔ پھر کوئی وجہ نہیں کہ میں حضور ﷺ کی تمنا پوری نہ کروں۔ چنانچہ پانچ ہاتھ حطیم اندر لے لیا اور اب جو دیوار کھڑی کی تو ٹھیک ابراہیمی نیو نظر آنے لگی۔ جو لوگوں نے اپنی آنکھوں دیکھ لی اور اسی پر دیوار کھڑی کی۔ بیت اللہ کا طول اٹھارہ ہاتھ کا تھا۔ اب اس میں پانچ ہاتھ اور بڑھ گیا تو چھوٹا ہو گیا۔ اس لئے طول میں دس ہاتھ اور بڑھ گیا اور دو دروازے بنائے گئے۔ ایک اندر آنے کا اور دوسرا باہر جانے کا۔

ابن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہادت کے بعد حجاج نے عبدالملک کو لکھا اور ان سے مشورہ لیا کہ اب کیا کیا جائے؟ یہ بھی لکھا کہ مکہ شریف کے عادلوں نے دیکھا ہے' ٹھیک حضرت ابراہیم کی نیو پر کعبہ تیار ہوا ہے لیکن عبدالملک نے جواب دیا کہ طول کو تو باقی رہنے دو اور حطیم کو باہر کر دو اور دوسرا دروازہ بند کر دو۔ حجاج نے اس حکم کے مطابق کعبہ کو توڑ کر پھر اس کو اسی بنا پر بنا دیا لیکن سنت طریقہ یہی تھا کہ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بنا کو باقی رکھا جاتا۔ اس لئے کہ حضور ﷺ کی خواہش یہی تھی لیکن اس وقت آپ کو یہ خوف تھا کہ لوگ بدگمانی نہ کریں۔ ابھی نئے نئے اسلام میں داخل ہوئے ہیں لیکن یہ حدیث عبدالملک بن مروان کو معلوم نہ تھی اس لئے اس نے اسے تڑوا دیا۔ جب اُسے حدیث معلوم ہوئی تو رنج کرتے تھے اور کہتے تھے' کاش کہ ہم اسے یونہی رہنے دیتے اور نہ تڑواتے۔ چنانچہ صحیح مسلم کی ایک اور حدیث میں ہے کہ حارث بن عبداللہ جب ایک وفد میں عبدالملک بن مروان کے پاس پہنچے تو عبدالملک نے کہا' میرا خیال ہے کہ ابو حبیب یعنی عبداللہ بن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے (اپنی خالہ) حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے یہ حدیث نہ سنی ہو گی؟ حارث نے کہا ضرور سنی تھی۔ خود میں نے بھی حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے سنا ہے۔ پوچھا تم نے کیا سنا ہے؟ کہا میں نے سنا ہے' آپ فرماتی تھیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک مرتبہ مجھ سے فرمایا کہ عائشہ تیری قوم نے بیت اللہ کو تنگ کر دیا۔ اگر تیری قوم کا زمانہ شرک کا قریب نہ ہوتا تو میں نئے سرے سے ان کی کمی کو پورا کر دیتا لیکن آؤ میں تجھے اصلی نیو بتا دوں۔ شاید کسی وقت تیری قوم پھر اسے اس کی اصلیت پر بنانا چاہے تو آپ نے حضرت صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو حطیم میں سے قریباً سات ہاتھ اندر داخل کرنے کو فرمایا اور فرمایا میں اس کے دو دروازے کر دیتا۔ ایک آنے کا اور ایک جانے کا اور دونوں دروازے زمین کے برابر رکھتا۔ ایک مشرقی رخ رکھتا اور دوسرا مغربی رخ۔ جانتی بھی ہو کہ تمہاری قوم نے دروازے کو اتنا اونچا کیوں رکھا ہے؟ آپ نے فرمایا حضور مجھے خبر نہیں۔ فرمایا محض اپنی اونچائی اور بڑائی کے لئے جسے چاہیں اندر جانے دیں اور جسے چاہیں داخل نہ ہونے دیں۔ جب کوئی شخص اندر جانا چاہتا تو اسے اوپر سے دھکا دیتے' وہ گر پڑتا اور جسے داخل کرنا چاہتے' اس کا ہاتھ تھام کر اندر لے لیتے۔ عبدالملک نے کہا' اے حارث تم نے خود اس حدیث کو حضرت عائشہ سے سنا ہے؟ انہوں نے کہا' ہاں میں نے خود سنا ہے۔ تو تھوڑی دیر تک تو عبدالملک اپنی لکڑی پر سہارا دیئے سوچتے رہے۔ پھر کہنے لگے کاش کہ میں اسے یونہی چھوڑ دیتا۔

صحیح مسلم شریف کی ایک اور حدیث میں ہے کہ عبدالملک بن مروان نے ایک مرتبہ طواف کرتے ہوئے حضرت عبداللہ کو کوس کر کہا کہ وہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا پر بہتان رکھتا تھا تو حضرت حارث نے روکا اور شہادت دی کہ وہ سچے تھے۔

میں نے بھی حضرت صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے یہ سنا ہے' اب عبدالملک افسوس کرنے لگے۔ اگر مجھے پہلے سے معلوم ہوتا تو میں ہرگز اسے نہ توڑتا۔ قاضی عیاض اور امام نوویؒ نے لکھا ہے کہ خلیفہ ہارون رشید نے حضرت امام مالکؒ سے پوچھا تھا کہ اگر آپ اجازت دیں تو میں پھر کعبہ کو حضرت ابن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بنائے ہوئے کے مطابق بنادوں؟ امام مالکؒ نے فرمایا: آپ ایسا نہ کیجئے' ایسا نہ ہو کہ کعبہ بھی بادشاہوں کا ایک کھلونا بن جائے' جو آئے اپنی طبیعت کے مطابق توڑ پھوڑ کرتا رہے۔ چنانچہ خلیفہ اپنے ارادے سے باز رہے۔ یہی بات ٹھیک بھی معلوم ہوتی ہے کہ کعبہ کو بار بار چھیڑنا ٹھیک نہیں۔

بنائے کعبہ کا انہدام' العیاذ باللہ ☆ صحیحین کی ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا' کعبہ کو دو چھوٹی پنڈلیوں والا ایک حبشی پھر خراب کرے گا۔ حضور ﷺ فرماتے ہیں' گویا میں اُسے دیکھ رہا ہوں۔ وہ سیاہ فام ایک ایک پتھر الگ الگ کر دے گا۔ اس کا غلاف لے جائے گا اور اس کا خزانہ بھی۔ وہ ٹیڑھے ہاتھ پاؤں والا گنجا ہوگا۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ وہ کدال بجا رہا ہے اور برابر ٹکڑے کر رہا ہے۔ غالباً یہ ناشدنی واقعہ (جس کے دیکھنے سے خدا ہمیں محفوظ رکھے) یاجوج ماجوج کے نکلنے کے بعد ہوگا۔ صحیح بخاری شریف کی ایک حدیث میں ہے۔ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں' تم یاجوج ماجوج کے نکلنے کے بعد بھی بیت اللہ شریف کا حج وغیرہ کرو گے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام اپنی دعا میں کہتے ہیں کہ ہمیں مسلمان بنا لے یعنی مخلص بنا لے۔ موحد بنا' مطیع بنا لے۔ شرک سے بچا۔ ریاکاری سے محفوظ رکھ۔ خضوع و خشوع عطا فرما۔ حضرت سلام بن ابی مطیع رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں' مسلمان تو تھے ہی لیکن اسلام کی ثابت قدمی طلب کرتے ہیں۔ جس کے جواب میں ارشاد باری ہوا: ﴿قَدْ فَعَلْتُ﴾ میں نے تمہاری یہ دعا قبول فرمائی۔ پھر اپنی اولاد کے لئے بھی یہی دعا کرتے ہیں جو قبول ہوتی ہے۔ بنی اسرائیل بھی آپ کی اولاد ہیں اور عرب بھی۔ قرآن میں ہے: ﴿وَمِنْ قَوْمِ مُوْسٰۤی اُمَّةٌ یَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَبِهٖ یَعْدِلُوْنَ ...... ﴾ (الاعراف:۱۵۹) یعنی موسیٰ کی قوم میں ایک جماعت حق و عدل پر تھی لیکن روانی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ عرب کے لئے یہ دعا ہے۔ گو عام طور پر دوسروں کو بھی شامل ہو۔ اس لئے کہ اس کے بعد دوسری دعا میں ہے کہ اُن میں ایک رسول بھیج اور اس رسول سے مراد حضرت محمد مصطفی ﷺ ہیں۔ چنانچہ یہ دعا بھی پوری ہوئی۔ جیسے فرمایا: ﴿هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ﴾ (الجمعہ:۲) لیکن اس سے آپ کی رسالت عام ہے۔ عرب عجم سب کے لئے جیسے فرمایا: ﴿قل یایها الناس انی رسول الله الیکم جمیعا﴾ (الاعراف:۱۵۸) کہہ دو کہ اے لوگو! میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہوں۔ ان دونوں نبیوں کی یہ دعا جیسی ہے ایسی ہی ہر متقی کی دعا ہونی چاہئے۔ جیسے قرآنی تعلیم ہے کہ مسلمان یہ دعا کریں: ﴿رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّیّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْیُنٍ وَّاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِیْنَ اِمَامًا﴾ (الفرقان:۷۴) اے ہمارے ربّ ہمیں ہماری بیویوں' اولادوں سے ہماری آنکھوں کی ٹھنڈک عطا فرما اور ہمیں پرہیزگاروں کا امام بنا۔ یہ بھی اللہ تعالیٰ کی عبرت کی دلیل ہے کہ انسان یہ چاہے کہ میری اولاد میرے بعد بھی خدا کی عابد رہے اور جگہ اس دعا کے الفاظ یہ ہے: ﴿وَّاجْنُبْنِیْ وَبَنِیَّ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ﴾ (ابراہیم:۳۵) خدایا مجھے اور میری اولاد کو بت پرستی سے بچا۔ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں' انسان کے مرتے ہی اس کے اعمال ختم ہو جاتے ہیں مگر تین کام جاری رہتے ہیں۔ ایک تو صدقہ جاریہ دوسرے علم جس سے نفع حاصل کیا جائے۔ تیسرے نیک اولاد جو دعا کرتی رہے۔ (مسلم) پھر آپ دعا کرتے ہیں کہ مناسک سکھا' یعنی حج و ذبح وغیرہ سکھا۔ حضرت جبریل علیہ السلام آپ کو لے کر کعبہ کی عمارت پوری ہو جانے کے بعد صفا پر آتے ہیں' پھر مروہ پر جاتے ہیں اور فرماتے ہیں یہ شعائر اللہ ہیں۔ پھر منیٰ کی طرف لے چلے۔ عقبہ

پر شیطان درخت کے پاس کھڑا ہوا ملا۔ تو فرمایا' تکبیر کہہ کر اسے کنکر مارو۔ ابلیس یہاں سے بھاگ کر جمرۂ وسطیٰ کے پاس جا کھڑا ہوا۔ یہاں بھی اسے کنکریاں ماریں تو یہ خبیث نا اُمید ہو کر چلا گیا۔ اس کا ارادہ تھا کہ حج کے احکام میں کچھ خلل ڈالے لیکن موقعہ نہ ملا اور مایوس ہو گیا۔ یہاں سے آپ کو مشعر الحرام میں لائے۔ پھر عرفات میں پہنچایا۔ پھر تین مرتبہ پوچھا' کہو سمجھ لیا۔ آپ نے فرمایا ہاں۔ دوسری روایت میں تین جگہ شیطان کو کنکریاں مارنی مروی ہیں اور ہر شیطان کو سات سات کنکریاں مارنی ہیں۔

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ ۚ إِنَّكَ أَنتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ﴿١٢٩﴾

ع ۸ ۱۵ ۱۵

اے ہمارے پروردگار اور اس جماعت کے اندر ان ہی میں کا ایک ایسا پیغمبر بھی مقرر کیجئے جو ان لوگوں کو آپ کی آیتیں پڑھ پڑھ کر سنایا کریں اور ان کو (آسمانی) کتاب کی خوش فہمی کی تعلیم دیا کریں اور ان کو پاک کر دیں۔ بلاشبہ آپ ہی ہیں غالب القدرۃ کامل الانتظام والے۔ ○

نبی آخر الزماں ﷺ اور دُعائے ابراہیمؑ:

اہل حرم کے لئے یہ اور دعا ہے کہ آپ کی اولاد میں سے ہی رسول ان میں آئے۔ چنانچہ یہ بھی پوری ہوئی۔ مسند احمد میں ہے رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں۔ میں خدا کے نزدیک خاتم النبیین اس وقت سے ہوں' جبکہ آدم ابھی مٹی کی صورت میں تھے۔ میں تمہیں اپنا ابتدائی امر بتاؤں۔ میں اپنے باپ ابراہیم علیہ السلام کی دعا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بشارت ہوں اور اپنی ماں کا خواب ہوں۔ انبیاء کی والدہ کو ایسے ہی خواب آتے ہیں۔ ابوامامہ نے ایک مرتبہ سوال کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ آپ کی نبوت کا آغاز کس طرح ہوا؟ ہمیں بتایئے۔ آپ ﷺ نے فرمایا' میرے والد حضرت ابراہیم کی دعا اور میری خوشخبری جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے دی اور میری ماں نے دیکھا کہ گویا ان میں سے ایک نور نکلا جس نے شام کے محل چمکا دیئے۔ مطلب یہ ہے کہ دنیا میں شہرت کا ذریعہ یہ چیزیں ہوئیں۔ آپ کی والدہ صاحبہ کا خواب بھی عرب میں پہلے ہی سے مشہور ہو گیا تھا اور وہ کہتے تھے کہ بطن آمنہ سے کوئی بڑا شخص پیدا ہو گا۔ بنی اسرائیل کے نبیوں کے ختم کرنے والے حضرت روح اللہ نے تو بنی اسرائیل میں خطبہ پڑھتے ہوئے آپ کا صاف نام بھی لے دیا اور فرمایا لوگو! میں تمہاری طرف اللہ کا رسول ہوں۔ مجھ سے پہلی کتاب تورات کی میں تصدیق کرتا ہوں اور میرے بعد آنے والے نبی کی میں تمہیں بشارت دیتا ہوں۔ جن کا نام احمد ہے (صلی اللہ علیہ وسلم) اسی کی طرف اس آیت میں اشارہ ہے۔ خواب میں نور سے شام کے محلات کا چمک اٹھنا اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ دین وہاں جم جائے گا بلکہ روایتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ آخر زمانہ میں شام اسلام اور اہل اسلام کا مرکز بن جائے گا شام کے مشہور شہر دمشق ہی میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام مینارہ پر نازل ہوں گے۔ بخاری اور مسلم میں ہے' میری اُمت کی ایک جماعت حق پر قائم رہے گی۔ ان کے مخالفین انہیں نقصان نہ پہنچا سکیں گے۔ یہاں تک کہ خدا کا حکم آ جائے۔ صحیح بخاری میں اتنی زیادتی ہے کہ وہ شام میں ہوں گے۔ کتاب سے مراد قرآن اور حکمت سے مراد دین کی سمجھ بوجھ بھی ہے۔ پاک کرنا یعنی طاعت و اخلاص سکھانا' بھلائیاں کرنا' برائیوں سے بچانا' اطاعت الٰہی کر کے رضائے رب حاصل کرنا' نافرمانی سے بچ کر

ناراضگی سے محفوظ رہنا۔ اللہ عزیز ہے جسے کوئی چیز عاجز نہیں کر سکتی۔ جو ہر چیز پر غالب ہے۔ وہ حکیم ہے یعنی اس کا کوئی قول و فعل حکمت سے خالی نہیں۔ وہ ہر چیز کو اپنے محل پر ہی حکمت وعدل کے ساتھ رکھتا ہے۔

وَمَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهٖمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ ؕ وَلَقَدِ اصْطَفَيْنٰهُ فِى الدُّنْيَا ۚ وَاِنَّهٗ فِى الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۳۰﴾ اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗۤ اَسْلِمْ ۙ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۳۱﴾ وَوَصّٰى بِهَاۤ اِبْرٰهٖمُ بَنِيْهِ وَ يَعْقُوْبُ ؕ يٰبَنِىَّ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى لَكُمُ الدِّيْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۱۳۲﴾

اور ملت ابراہیمی سے تو وہی روگردانی کرے گا جو اپنی ذات ہی سے احمق ہو اور ہم نے ان (ابراہیم علیہ السلام) کو دنیا میں منتخب کیا اور (اُسی کی بدولت) وہ آخرت میں بڑے لائق لوگوں میں شمار کئے جاتے ہیں جبکہ ان سے ان کے پروردگار نے فرمایا کہ تم اطاعت اختیار کرو۔ انہوں نے عرض کیا میں نے اطاعت اختیار کی رب العالمین کی اسی کا حکم کر گئے ہیں ابراہیم (علیہ السلام) اپنے بیٹوں کو اور (اسی طرح) یعقوب بھی میرے بیٹو اللہ تعالیٰ نے اس دین (اسلام) کو تمہارے لئے منتخب فرمایا ہے۔ سوتم بجز اسلام کے اور کسی حالت پر جان مت دینا۔ ○

ابراہیم علیہ السلام سچے موحد تھے ☆

ان آیتوں میں مشرکین کا رد ہے کہ وہ اپنے تئیں دین ابراہیم پر بتلاتے تھے۔ حالانکہ کامل مشرک تھے اور حضرت خلیل اللہ تو موحدوں کے امام تھے۔ توحید کو شرک سے ممتاز کرانے والے تھے۔ عمر بھر میں ایک آنکھ جھپکنے کے برابر بھی خدا کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کیا۔ بلکہ ہر مشرک سے اور ہر قسم کے شرک سے اور ہر غیر خدا سے جو خدا مانا جاتا ہو وہ تو دل سے نفرت کرتے تھے اور اُن سب سے بیزار تھے۔ اسی قوم سے الگ ہوئے وطن چھوڑا بلکہ باپ تک کی مخالفت کی پروانہ کی اور صاف کہہ دیا کہ: ﴿اِنِّىْ بَرِىْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ﴾ (الانعام: ۷۸) میں بیزار ہوں اس چیز سے جسے تم شریک کرتے ہو۔ میں نے تو یکسو ہو کر اپنی تمام تر توجہ اس پاک ذات کی طرف کر دی ہے۔ جس نے زمین و آسمان کو پیدا کیا ہے۔ میں شرک کرنے والوں میں سے نہیں اور جگہ ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ سے اور اپنی قوم سے صاف کہہ دیا کہ میں تمہارے معبودوں سے بری ہوں۔ میں تو اپنے خالق ہی کا گرویدہ ہوں۔ وہی مجھے راہ راست دکھائے اور جگہ ہے: ﴿وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ اِبْرٰهِيْمَ﴾ (التوبۃ ۱۱۴) ابراہیم اپنے والد کے لئے بھی ایک وعدے کی بنا پر استغفار کرتے تھے۔ لیکن جب انہیں معلوم ہوا کہ وہ خدا کا دشمن ہے تو اس سے بیزار ہو گئے۔

ابراہیم علیہ السلام بڑے ہی رجوع کرنے والے اور بردبار تھے اور جگہ ہے ابراہیم مخلص اور مطیع اُمت تھے مشرک ہرگز نہ تھے۔ رب کی نعمتوں کے شکر گزار تھے خدا کے پسندیدہ تھے اور راہ راست پر لگے ہوئے تھے۔ دنیا کے بھلے لوگوں میں سے تھے اور آخرت میں صالح لوگوں میں ہوں گے۔ ان آیتوں کی طرف یہاں بھی فرمایا کہ اپنی جانوں پر ظلم کرنے والے بے تدبیر

اور گمراہ لوگ ہی ملت ابراہیمی کو ترک کرتے ہیں کیونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو خدا نے ہدایت کے لئے چن لیا تھا اور بچپن سے ہی توفیق حق ان کو دے رکھی تھی۔ خلیل جیسا معزز خطاب انہی کو دیا تھا۔ آخرت میں بھی سعید بخت لوگوں میں وہ ہیں۔ ان کے مسلک کو ملت کو چھوڑ کر ضلالت و گمراہی میں پڑنے والے سے زیادہ بے وقوف اور ظالم اور کون ہوگا؟ اس آیت میں یہودیوں کا بھی رَد ہے۔ جیسے اور جگہ ہے: ﴿مَا كَانَ اِبْرٰهِيْمُ يَهُوْدِيًّا﴾ (آل عمران:۶۷) ابراہیم علیہ السلام نہ تو یہودی تھے نہ نصرانی بلکہ موحد مسلمان تھے اور مخلص تھے۔ ان کے قریب وہی ہیں جو ان کی مانیں اور یہ نبی اور ایمان دار اللہ بھی مؤمنوں کا ولی ہے۔ جب کبھی خدا فرماتا ہے کہ یہ مان لو وہ جواب دیتے کہ اے رب العالمین میں نے مان لیا۔ اسی ملت وحدانیت کی وصیت ابراہیم علیہ السلام و یعقوب علیہ السلام نے اپنی اولاد کو کی۔ ھا کی ضمیر کا مرجع یا تو ملت ہے یا کلمہ۔

ملت سے مراد اسلام اور کلمہ سے مراد: ﴿اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ ہے۔ دیکھئے ان کے دل میں اسلام کی کس قدر محبت وعزت تھی کہ خود بھی مدت العمر عامل رہے۔ اپنی اولاد کو بھی اسی کی وصیت کرتے رہے جیسے اور جگہ ہے: ﴿وَجَعَلَهَا كَلِمَةً بَاقِيَةً فِيْ عَقِبِهٖ﴾ (الزخرف:۲۸) ہم نے اُسے ان کی اولاد میں بھی باقی رکھا۔ بعض سلف نے وَيَعْقُوْبَ بھی پڑھا ہے تو بَنِيْهِ پر عطف ہوگا اور مطلب یہ ہوگا کہ خلیل اللہ علیہ السلام نے اپنی اولاد کو اور اولاد کی اولاد میں سے حضرت یعقوب علیہ السلام کو جو اس وقت موجود تھے دین اسلام کی استقامت کی وصیت کی' قشیری کہتے ہیں حضرت یعقوب علیہ السلام حضرت ابراہیم علیہ السلام کے انتقال کے بعد پیدا ہوئے تھے لیکن یہ مجرد دعویٰ ہے جس پر کوئی صحیح دلیل نہیں۔ واللہ اعلم۔ بلکہ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام و حضرت اسحٰق علیہ السلام کے ہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زندگی میں پیدا ہوئے تھے کیونکہ قرآن پاک کی آیت میں ہے: ﴿فَبَشَّرْنٰهَا بِاِسْحٰقَ وَمِنْ وَّرَآءِ اِسْحٰقَ يَعْقُوْبَ﴾ (ہود:۷۱) یعنی ہم نے انہیں اسحٰق کی اور اسحٰق کے پیچھے یعقوب کی خوشخبری دی اور اس کا نصب خفض کو ہٹا کر بھی پڑھا گیا ہے۔ پس اگر حضرت یعقوب علیہ السلام حضرت ابراہیم کی حیات میں موجود نہ ہوں تو پھر ان کا نام لینے میں کوئی زبردست فائدہ باقی نہیں رہتا۔ سورۂ عنکبوت میں بھی ہے کہ ہم نے ابراہیم کو اسحٰق دیا اور یعقوبؑ عطا فرمایا اور اس کی اولاد میں ہم نے نبوت و کتاب دی اور آیت میں ہے' ہم نے اسحٰق دیا اور یعقوب زائد عطا فرمایا۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یعقوب' حضرت ابراہیم کی زندگی میں ہی موجود تھے۔ اگلی کتابوں میں بھی ہے کہ وہ بیت المقدس میں آئیں گے۔ ابوذرؓ ایک مرتبہ پوچھتے ہیں' یا رسول اللہ کون سی مسجد پہلے تعمیر کی گئی؟ آپ نے فرمایا' مسجد حرام۔ پوچھا پھر' فرمایا بیت المقدس۔ میں نے کہا' دونوں کے درمیان کس قدر مدت تھی؟ فرمایا چالیس سال۔ ابن حبان نے کہا ہے کہ حضرت ابراہیم اور حضرت سلیمان علیہما السلام کے درمیانی فاصلے کا یہ بیان ہے حالانکہ یہ قول بالکل مخالف ہے۔ ان دونوں نبیوں کے درمیان تو ہزاروں سال کی مدت تھی بلکہ مطلب حدیث کا کچھ اور ہی ہے اور شاہِ زمان حضرت سلیمان علیہ الصلوٰۃ الرحمٰن تو اس مسجد کے مجدد تھے' موجد نہ تھے۔ اسی طرح حضرت یعقوب نے وصیت کی تھی' جیسے عنقریب ذکر آئے گا۔ وصیت اس امر کی ہوتی ہے کہ حال حیات میں احسان والے رہو' تاکہ موت بھی اس پر آئے۔

عموماً انسان زندگی میں جس چیز پر رہتا ہے۔ اسی پر موت بھی آتی ہے اور جس پر مرتا ہے اسی پر اٹھے گا بھی۔ عادت اللہ اسی طرح ہے کہ بھلائی کے قصد کرنے والے کو بھلائی کی توفیق بھی دی جاتی ہے۔ بھلائی اس پر آسان کر دی جاتی ہے اور اسے ثابت قدم بھی رکھا جاتا ہے۔ کوئی شک نہیں کہ حدیث میں یہ بھی آیا کہ انسان جنتیوں کے کام کرتے کرتے جنت سے ایک

ہاتھ دور رہ جاتا ہے کہ تقدیر غالب آ جاتی ہے اور جہنمیوں کے کام کر کے جہنمی بن جاتا ہے اور کبھی اس کے خلاف بھی ہوتا ہے۔(بخاری) لیکن اس سے مطلب یہ ہے کہ کام اچھے برے ظاہر ہوتے ہیں' حقیقی نہیں ہوتے۔ چنانچہ بعض روایات میں یہ لفظ بھی ہے۔ قرآن کہتا ہے' سخاوت' تقویٰ اور لا الٰہ الا اللہ کی تصدیق کرنے والے کو ہم آسانی کا راستہ آسان کر دیتے ہیں اور بخل و بے پروائی اور بھلی بات کی تکذیب کرنے والوں کو ہم سختی کی راہ آسان کر دیتے ہیں۔

اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ حَضَرَ يَعْقُوْبَ الْمَوْتُ ۙ اِذْ قَالَ لِبَنِيْهِ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْۢ بَعْدِيْ ؕ قَالُوْا نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَاِلٰهَ اٰبَآئِكَ اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚۖ وَّنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ﴿۱۳۳﴾ تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۚ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ۚ وَلَا تُسْـَٔلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۳۴﴾

کیا تم خود (اس وقت) موجود تھے جس وقت یعقوب علیہ السلام کا آخری وقت آیا (اور) جس وقت انہوں نے اپنے بیٹوں سے پوچھا کہ تم لوگ میرے مرنے کے بعد کس چیز کی پرستش کرو گے۔ انہوں نے (بالاتفاق) جواب دیا کہ ہم اس کی پرستش کریں گے جس کی آپ اور آپ کے بزرگ (حضرت) ابراہیم اور اسمٰعیل و اسحٰق پرستش کرتے آئے ہیں۔ یعنی وہی معبود جو وحدہ لاشریک ہے اور ہم اسی کی اطاعت پر قائم رہیں گے یہ (ان بزرگوں کی) ایک جماعت تھی جو گزر گئی ان کے کام ان کا کیا ہوا آئے گا اور تمہارا کام کیا ہوا آئے گا اور تم سے ان کے کئے ہوئے کی پوچھ بھی تو نہ ہوگی۔ O

مشرکین عرب پر جو حضرت اسمٰعیل کی اولاد تھے اور کفار بنی اسرائیل پر جو حضرت کی اولاد تھے' دلیل بناتے ہوئے اللہ تعالیٰ بیان فرماتا ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے تو اپنی اولاد کو اپنے آخری وقت بھی اللہ تعالیٰ وحدہٗ لاشریک لہٗ کی عبادت کی وصیت کی تھی۔ ان سے پہلے تو پوچھا کہ تم میرے بعد کس کی عبادت کرو گے۔ سب نے جواب دیا کہ آپ اور آپ کے بزرگوں کے معبود برحق کی۔ حضرت یعقوب علیہ السلام' حضرت اسحٰق علیہ السلام کے لڑکے اور حضرت اسحٰق علیہ السلام حضرت ابراہیم علیہ السلام' حضرت اسماعیل علیہ السلام کا نام باپ دادوں کے ذکر میں بطور تغلیب کے آ گیا ہے کیونکہ آپ چچا ہوتے ہیں اور یہ بھی واضح رہے کہ عرب میں چچا کو بھی باپ کہہ دیتے ہیں۔ اس آیت سے استدلال کر کے دادا کو بھی باپ کے حکم میں رکھ کر دادا کی موجودگی میں بہن بھائی کو ورثہ سے محروم کیا ہے۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا فیصلہ یہی ہے۔ جیسا کہ صحیح بخاری شریف میں موجود ہے۔ ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا مذہب بھی یہی ہے۔ حسن بصری' طاؤس اور عطاؒ بھی یہی کہتے ہیں۔ امام ابوحنیفہؒ اور بہت سے سلف و خلف کا مذہب یہی ہے قاضی ابو یوسف اور محمد بن حسن بھی یہی کہتے ہیں اور دونوں امام ابوحنیفہؒ کے شاگرد رشید ہیں۔ اس مسئلہ کی صفائی کا یہ مقام نہیں اور نہ تفسیر کا یہ موضوع ہے۔

ان سب بچوں نے اقرار کیا کہ ہم ایک ہی معبود کی عبادت کریں گے۔ یعنی اس خدا کی الوہیت میں کسی کو شریک نہ کریں گے اور ہم اس کی اطاعت گزاری' فرمانبرداری اور خشوع و خضوع میں مشغول رہا کریں گے جیسے اور جگہ ہے: ﴿وَلَهٗ

اَسْلَمَ..... ﴾ (آل عمران:۸۳) زمین آسمان کی ہر چیز خوشی ناخوشی سے اس کی مطیع ہے۔ اس کی طرف تم سب لوٹائے جاؤ گے۔ تمام انبیاء کا دین یہی اسلام رہا ہے۔ اگرچہ احکام میں جدائی رہی ہے جیسے فرمایا: ﴿وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْٓ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ ﴾ (الانبیاء:۲۵) یعنی تجھ سے پہلے جتنے رسول ہم نے بھیجے سب کی طرف ہم نے وحی کی کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں۔ تم سب میری ہی عبادت کرتے رہو اور آیتیں بھی اس مضمون کی بہت سی ہیں اور احادیث میں بھی یہ مضمون بکثرت وارد ہے۔ آنحضرت ﷺ فرماتے ہیں۔ ہم علاتی بھائی ہیں۔ ہمارا دین ایک ہی ہے۔ پھر فرماتا ہے یہ امت ہے جو گزر چکی۔ تمہیں ان کی طرف نفع نہ دے گی۔ ہاں اگر عمل ہوں تو اور بات ہے ان کی کرنی ان کے ساتھ ہے اور تمہاری کرنی تمہارے ساتھ۔ تم سے ان کے افعال کے بارے میں نہیں پوچھا جائے گا۔ حدیث شریف میں ہے۔ جس کا عمل دیر لگائے اس کا نسب جلدی نہ کرے گا۔ (ابن ابی حاتم)

وَقَالُوْا كُوْنُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى تَهْتَدُوْا ۭ قُلْ بَلْ مِلَّةَ اِبْرٰهٖمَ حَنِيْفًا ۭ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۱۳۵﴾

اور یہ (یہودی و نصرانی) لوگ کہتے ہیں کہ تم لوگ یہودی ہو جاؤ یا نصرانی ہو جاؤ۔ تم بھی راہ پر پڑ جاؤ گے۔ آپ کہہ دیجئے کہ ہم تو ملت ابراہیم (یعنی اسلام) پر رہیں گے جس میں کجی کا نام نہیں اور ابراہیم (علیہ السلام) مشرک بھی نہ تھے۔ ○

عبداللہ بن صوریا اعور نے رسول اللہ ﷺ سے کہا تھا کہ ہدایت پر ہم ہیں۔ تم ہماری مانو تو تمہیں بھی ہدایت ملے گی۔ نصرانیوں نے بھی یہی کہا تھا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی کہ ہم تو ابراہیم حنیف علیہ السلام کے متبع ہیں۔ جو استقامت والے اخلاص والے حج والے بیت اللہ کی طرف منہ کرنے والے استطاعت کے وقت حج کو فرض جاننے والے۔ خدا کی فرمانبرداری کرنے والے تمام رسولوں پر ایمان لانے والے لا الٰہ الا اللہ کی شہادت دینے والے ماں بیٹی خالہ پھوپھی کو حرام جاننے والے اور تمام حرام کاریوں سے بچنے والے تھے۔ یہ سب معنی حنیف کے مختلف حضرات نے بیان کئے ہیں۔ (ابن ابی حاتم)

قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَمَآ اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ڮ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ﴿۱۳۶﴾

(مسلمانوں) کہہ دو کہ ہم ایمان رکھتے ہیں اللہ پر اور اس (حکم) پر جو ہمارے پاس بھیجا گیا ہے اور اس پر بھی جو حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسمٰعیل علیہ السلام اور حضرت اسحٰق علیہ السلام اور حضرت یعقوب علیہ السلام اور اولاد یعقوب کی طرف بھیجا گیا اور (اس حکم و معجزہ پر بھی) جو حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو دیا گیا اور اس پر بھی جو کچھ اور انبیاء (علیہم السلام) کو دیا گیا ان کے پروردگار کی طرف سے اس کی کیفیت سے ہم

ان (حضرات) میں سے کسی ایک میں بھی تفریق نہیں کرتے اور ہم تو اللہ تعالیٰ کے مطیع ہیں۔○

تمام آسمانی کتابوں پر ایمان لانا☆

اللہ تعالیٰ اپنے ایماندار بندوں کو ارشاد فرماتا ہے کہ جو کچھ حضرت محمد ﷺ پر اترا' اس پر تفصیل وار ایمان لائیں اور جو آپ سے پہلے انبیاء پر اترا' اس پر بھی اجمالاً ایمان لائیں۔ ان اگلے انبیاء کرام میں سے بعض کے نام بھی لے دیئے اور باقی نبیوں کا مجمل ذکر کر دیا۔ ساتھ ہی فرمایا کہ یہ کسی نبی کے درمیان تفریق نہ کریں کہ ایک کو مانیں اور دوسرے سے انکار کر جائیں جو عادت پچھلے لوگوں کی تھی کہ وہ انبیاء میں تفریق کرتے تھے۔ کسی کو مانتے تھے کسی سے منکر تھے۔ یہودی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو نصرانی حضرت محمد ﷺ کو' حجازی عرب موسیٰ اور عیسیٰ اور محمد ﷺ تینوں کو نہیں مانتے تھے۔ اُن سب کو فتویٰ ملا کہ: ﴿اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ حَقًّا﴾ (النساء:۱۵۱) یہ لوگ بالیقین کافر ہیں۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں۔ اہل کتاب تورات کو عبرانی زبان میں پڑھتے تھے اور عربی میں تفسیر کر کے اہل اسلام کو سناتے تھے۔ نبی ﷺ نے فرمایا کہ اہل کتاب کی سچائی یا تکذیب نہ کرو۔ کہہ دیا کرو کہ اللہ پر اور اس کی نازل کی ہوئی کتابوں پر ہمارا ایمان ہے۔ نبی ﷺ صبح کی دوسنتوں میں پہلی رکعت میں یہ آیت: ﴿اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا﴾ (المائدۃ:۵۹) پوری آیت اور دوسری رکعت میں آیت: ﴿اٰمَنَّا وَاشْهَدْ بِاَنَّنَا مُسْلِمُوْنَ﴾ (المائدۃ:۱۱۱) پڑھا کرتے تھے۔ اسباط حضرت یعقوب علیہ السلام کے بیٹوں کو کہتے ہیں' جو بارہ تھے۔ جن میں سے ہر ایک کی نسل میں بہت سے انسان ہوئے۔ بنی اسمٰعیل کو قبائل کہتے تھے اور بنی اسرائیل کو اسباط کہتے تھے زمخشریؒ نے کشاف میں لکھا ہے کہ یہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے پوتے تھے۔ جو ان کے بارہ لڑکوں کی اولاد تھی بخاری میں ہے کہ قبائل بنی اسرائیل مراد ہیں۔ ان میں بھی نبی ہوئے تھے' جن پر وحی نازل ہوئی تھی۔ جیسے موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: ﴿اِذْ جَعَلَ فِيْكُمْ اَنْبِيَآءَ...... ﴾ (المائدۃ:۲۰) اللہ کی نعمت کو یاد کرو کہ اس نے تم میں انبیاء اور بادشاہ بنائے اور جگہ ہے: ﴿وَقَطَّعْنٰهُمُ اثْنَتَيْ عَشْرَةَ اَسْبَاطًا﴾ (الاعراف:۱۶۰) ہم نے ان کے بارہ گروہ کر دیئے۔ سبط کہتے ہیں تابع کو' یہ بھی ایک کے پیچھے ایک تھے۔ بعض کہتے ہیں' یہ ماخوذ ہے سبط سے سبط کہتے ہیں۔ درخت کو' یعنی یہ مثل درخت کے ہیں۔ جس کی شاخیں پھیلی ہوئی ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں' کل انبیاء بنی اسرائیل میں سے ہی ہوئے ہیں۔ سوائے دس کے نوح' ہود' صالح' شعیب' ابراہیم' اسحاق' یعقوب' اسماعیل' محمد علیہم الصلوٰۃ والسلام۔ سبط کہتے ہیں اس جماعت اور قبیلہ کو جن کا مورث اعلیٰ اوپر جا کر ایک ہو۔ ہمیں تورات وانجیل پر ایمان لانا ضروری ہے لیکن عمل کے لئے صرف قرآن وحدیث ہی ہے۔ ابن ابی حاتم میں ہے۔ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں تورات' زبور' انجیل پر ایمان رکھو لیکن (عمل کے لئے) قرآن کافی ہے۔

فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا هُمْ فِيْ شِقَاقٍ ۚ فَسَيَكْفِيْكَهُمُ اللّٰهُ ۚ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۱۳۷﴾ صِبْغَةَ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً ۫ وَّنَحْنُ لَهٗ عٰبِدُوْنَ ﴿۱۳۸﴾

سو اگر وہ بھی اسی طریق سے ایمان لے آئیں جس طریق سے تم (اہل اسلام) ایمان لائے ہو تب تو وہ بھی راہ حق

پر لگ جائیں گے اور اگر وہ روگردانی کریں تو وہ لوگ تو (ہمیشہ سے) برسر مخالفت ہیں ہی تو (سمجھ لیجئے کہ) آپ کی طرف سے عنقریب نمٹ لیں گے۔ اللہ تعالیٰ سنتے ہیں اور جانتے ہیں۔ ہم (دین کی) اس حالت پر رہیں گے جس میں (ہم کو) اللہ تعالیٰ نے رنگ دیا ہے اور دوسرا کون ہے جس کے رنگ دینے کی حالت اللہ تعالیٰ سے خوب تر ہو اور (اسی لئے) ہم اسی کی غلامی اختیار کیے ہوئے ہیں۔ ○

یعنی اے ایماندار صحابیو! اگر یہ کفار بھی تم جیسا ایمان لائیں۔ یعنی تمام کتابوں اور رسولوں کو مان لیں تو حق و رشد و ہدایت و نجات پائیں گے اور اگر باوجود قیام حجت کے پھر بھی باز رہیں تو یقیناً خلاف حق پر ہیں۔ اللہ تعالیٰ تجھے اُن پر غالب کر کے تجھے کفایت کرے گا۔ وہ سننے جاننے والا ہے۔ نافع بن ابی نعیم کہتے ہیں کہ کسی خلیفہ کے پاس حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا قرآن بھیجا گیا۔ زیاد نے سن کر کہا کہ لوگوں میں مشہور ہے کہ جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو لوگوں نے شہید کیا' اس وقت یہ کلام اللہ ان کی گود میں تھا اور آپ کا خون ٹھیک ان الفاظ پر پڑا تھا: ﴿فَسَيَكْفِيكَهُمُ اللّٰهُ وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ﴾ کیا یہ صحیح ہے؟ حضرت نافع رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا بالکل ٹھیک ہے۔ میں نے اس آیت پر خود حضرت ذوالنورین کا خون دیکھا (رضی اللہ عنہ)۔ (ابن ابی حاتم) رنگ سے مراد دین ہے اور اس کا زبر بطور اغراء کے ہے۔ جیسے فطرۃ اللّٰہ میں۔ مطلب یہ ہے کہ خدا کے دین کو لازم پکڑ لو اور اس سے منسلک ہو جاؤ۔ بعض کہتے ہیں۔ یہ بدل: مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ سے جو اس سے پہلے موجود ہے۔ سیبویہ کہتے ہیں یہ مصدر موکدہ ہے۔ اٰمَنَّا بِاللّٰہِ کی وجہ سے منصوب ہے۔ جیسے وَعْدَ اللّٰهِ ایک مرفوع حدیث میں ہے کہ بنی اسرائیل نے کہا' اے رسول اللہ' کیا ہمارا رب رنگ بھی کرتا ہے؟ آپ نے فرمایا اللہ سے ڈرو' آواز آئی' ان سے کہہ دو کہ تمام رنگ میں ہی تو پیدا کرتا ہوں۔ یہی مطلب اس کا آیت کا بھی ہے کہ لیکن اس بات کا موقوف ہونا ہی صحیح ہے اور یہ بھی اس وقت جب کہ اس کی اسناد صحیح ہو۔

قُلْ اَتُحَآجُّوْنَنَا فِي اللّٰهِ وَهُوَ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ ۚ وَلَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ ۚ وَنَحْنُ لَهٗ مُخْلِصُوْنَ ﴿۱۳۹﴾ اَمْ تَقُوْلُوْنَ اِنَّ اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطَ كَانُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى ۭ قُلْ ءَاَنْتُمْ اَعْلَمُ اَمِ اللّٰهُ ۭ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَهٗ مِنَ اللّٰهِ ۭ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۰﴾ تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۚ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ۚ وَلَا تُسْــَٔلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۱﴾ ع ۱۶

آپ فرما دیجئے کہ کیا تم لوگ ہم سے (اب بھی) حجت کئے جاتے ہو حالانکہ وہ ہمارا اور تمہارا (سب کا) رب ہے اور ہم کو ہمارا کیا ہوا ملے گا اور تم کو تمہارا کیا ہوا ملے گا اور ہم نے صرف حق تعالیٰ کے لئے اپنے دین کو (شرک وغیرہ سے) خالص کر رکھا ہے یا کہے جاتے ہو کہ ابراہیم اور اسمٰعیل اور اسحٰق اور یعقوب اور اولاد یعقوب (میں جو انبیاء گزرے ہیں

یہ سب حضرات) یہود یا نصاریٰ تھے۔ (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کہہ دیجئے کہ تم زیادہ واقف ہو یا حق تعالیٰ اور ایسے شخص سے زیادہ ظالم کون ہوگا جو ایسی شہادت کا اخفا کرے جو اس کے پاس من جانب اللہ پہنچی ہو اور اللہ تعالیٰ تمہارے کئے ہوئے سے بے خبر نہیں ہیں۔ یہ (ان بزرگوں کی) ایک جماعت تھی جو گزر گئی۔ ان کے کام ان کا کیا ہوا آئے گا اور تمہارے کام تمہارا کیا ہوئے آئے گا اور تم سے ان کے کئے ہوئے کی پوچھ بھی تو نہ ہوگی۔ ○

میرے لئے میرا عمل اور تمہارے لئے تمہارا عمل ☆

مشرکوں کے جھگڑے کو دفع کرنے کا حکم رب العالمین اپنے نبی کو دے رہا ہے کہ تم ہم سے اللہ کی توحید' اخلاص' اطاعت وغیرہ کے بارے میں کیوں جھگڑتے ہو؟ وہ صرف ہمارا ہی نہیں بلکہ تمہارا رب بھی تو وہی ہے۔ ہم پر اور تم پر قابض و متصرف بھی وہی اکیلا ہے۔ ہمارے عمل ہمارے ساتھ ہیں اور تمہارے عمل تمہارے کام آئیں گے۔ ہم تم سے اور تمہارے شرک سے بیزار ہیں اور جگہ فرمایا: ﴿اِنْ كَذَّبُوْكَ فَقُلْ﴾ (یونس:۴۱) یعنی یہ اگر تجھے جھٹلائیں تو تو کہہ دے کہ میرے لئے میرا عمل ہے اور تمہارے لئے تمہارا عمل ہے۔ تم میرے (نیک) کام سے اور میں تمہارے اعمال سے بیزار ہوں اور جگہ ارشاد ہے: ﴿فَاِنْ حَآجُّوْكَ...... ﴾ (آل عمران:۲۰) اگر یہ تجھ سے جھگڑیں تو تو کہہ دے "میں نے اور میرے ماننے والوں نے اپنے منہ خدا کی طرف کر دیئے" حضرت ابراہیمؑ بھی اپنی قوم سے یہی فرمایا تھا: ﴿اَتُحَآجُّوْنِّيْ فِي اللّٰهِ...... ﴾ (الانعام:۸۰) اللہ کے بارے میں اختلاف کیا؟ اور جگہ ہے: ﴿اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْ حَآجَّ اِبْرٰهٖمَ فِيْ رَبِّهٖٓ﴾ (البقرۃ:۲۵۰) تو نے اسے دیکھا جو ابراہیمؑ سے اسکے ربّ کے بارے میں جھگڑنے لگا۔ پس یہاں ان جھگڑالو لوگوں سے کہا گیا کہ ہمارے اعمال ہمارے لئے اور تمہارے' تمہارے لئے۔ ہم تم سے بیزار تم ہم سے الگ۔ ہم عبادت اور توجہ میں اخلاص اور یک سوئی کرنے والے لوگ ہیں۔ پھر ان لوگوں کے دعویٰ کی تردید ہو رہی ہے کہ ابراہیمؑ نہ تو یہودی تھے نہ نصرانی۔ تم اے یہودیو اور اے نصرانیو' کیوں یہ باتیں بنا رہے ہو۔ کیا تمہارا علم خدا سے بھی بڑھ گیا۔ خدا نے صاف فرما دیا: ﴿مَا كَانَ اِبْرٰهِيْمُ يَهُوْدِيًّا وَّلَا نَصْرَانِيًّا وَّلٰكِنْ كَانَ حَنِيْفًا مُّسْلِمًا وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ﴾ (آل عمران:۶۷) ابراہیمؑ نہ تو یہودی تھے نہ نصرانی نہ مشرک بلکہ خالص مسلمان تھے۔ انکا خدائی شہادت کو چھپا کر بڑا ظلم کرنا یہ تھا کہ خدا کی کتاب جو انکے پاس آئی۔ اس میں انہوں نے پڑھا کہ حقیقی دین اسلام ہے۔ محمد ﷺ سچے رسول ہیں۔ ابراہیمؑ اسمٰعیلؑ اسحٰقؑ یعقوب علیہم السلام وغیرہ یہودیت اور نصرانیت سے الگ تھے۔ لیکن نہ مانا اور اتنا ہی نہیں بلکہ اس بات کو بھی چھپا دیا۔

پھر فرمایا تمہارے اعمال خدا پر پوشیدہ نہیں۔ اس کا محیط علم سب چیزوں کو گھیرے ہوئے ہے۔ وہ ہر بھلائی اور برائی کا پورا پورا بدلہ دے گا۔ یہ دھمکی دے کر پھر فرمایا کہ یہ پاکباز جماعت تو خدا کے پاس پہنچ چکی ہے۔ تم جب تک ان کے نقش قدم پر نہ چلو۔ صرف ان کی اولاد میں سے ہونا تمہیں خدا کے ہاں کوئی عزت اور نفع نہیں دے سکتا ہے۔ ان کے نیک اعمال میں تمہارا کوئی حصہ نہیں اور تمہاری بداعمالیوں کا اُن پر کوئی بوجھ نہیں۔ "کرے سو بھرے"۔ تم نے جب ایک نبی کی تکذیب کی تو گویا تمام انبیاء کو جھٹلایا۔ بالخصوص اے وہ لوگو! جو نبی آخر الزماں ﷺ کے مبارک زمانہ میں ہو۔ تم تو بڑے ہی وبال میں آ گئے۔ تم نے تو اس نبی کو جھٹلایا جو سید الانبیاء ہیں جو ختم المرسلین ہیں۔ جو رسول ربّ العالمین ہیں۔ جن کی رسالت تمام انسانوں اور جنوں کی طرف ہے۔ جن کی رسالت کے ماننے کا ہر ایک شخص مکلف ہے۔ اللہ تعالیٰ کے بے شمار درود و سلام آپ پر نازل ہوں اور آپ کے سوا تمام انبیاء کرام علیہ الصلوٰۃ والسلام پر بھی۔

سَيَقُولُ السُّفَهَاءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلَّاهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِي كَانُوا عَلَيْهَا ۚ قُلْ لِلَّهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ۚ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ إِلَىٰ صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ ﴿١٤٢﴾ وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا لِتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا ۗ وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِي كُنْتَ عَلَيْهَا إِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَتَّبِعُ الرَّسُولَ مِمَّنْ يَنْقَلِبُ عَلَىٰ عَقِبَيْهِ ۚ وَإِنْ كَانَتْ لَكَبِيرَةً إِلَّا عَلَى الَّذِينَ هَدَى اللَّهُ ۗ وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُضِيعَ إِيمَانَكُمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوفٌ رَحِيمٌ ﴿١٤٣﴾

اب تو (یہ) بیوقوف لوگ ضرور کہیں گے کہ ان (مسلمانوں) کو اُن کے (سابق سمت) قبلہ سے کہ بیت المقدس تھا جس طرف پہلے متوجہ ہوا کرتے تھے۔ کس (بات) نے بدل دیا۔ آپ فرما دیجئے کہ سب مشرق اور مغرب اللہ ہی کی ملک ہیں جس کو خدا ہی چاہیں (یہ) سیدھا طریق بتلا دیتے ہیں اور ہم نے تم کو ایسی ہی ایک جماعت بنا دی ہے جو (ہر پہلو سے) نہایت اعتدال پر ہے تاکہ تم (مخالف) لوگوں کے مقابلہ میں گواہ ہو اور تمہارے لئے رسول اللہ ﷺ گواہ ہوں اور جس سمت قبلہ پر آپ رہ چکے ہیں (یعنی بیت المقدس) وہ تو محض اس لئے تھا کہ ہم کو معلوم ہو جائے کہ کون رسول اللہ کا اتباع اختیار کرتا ہے اور کون پیچھے کو ہٹا جاتا ہے اور یہ قبلہ کا بدلنا (منحرف لوگوں پر) ہوا بڑا ثقیل (ہاں) مگر جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے ہدایت فرمائی ہے اور اللہ تعالیٰ ایسے نہیں کہ تمہارے ایمان کو ضائع (اور ناقص) کر دیں (اور) واقعی اللہ تعالیٰ تو (ایسے) لوگوں پر بہت ہی شفیق (اور) مہربان ہیں ﴿۱۴۳﴾

تحویلِ قبلہ آیت کا شانِ نزول اسلام کے خلاف طاقتوں کے بے سروپا اعتراضات کے شافی جوابات ☆

کہا جاتا ہے کہ بیوقوف لوگوں سے عرب کے مشرکین مراد ہیں ایک قول یہ ہے کہ علمائے یہود مراد ہیں اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ منافقین مراد ہیں۔ صحیح بخاری میں حضرت براء رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے سولہ یا سترہ ماہ تک بیت المقدس کی طرف نماز پڑھی۔ آپ کی یہ خواہش تھی کہ قبلہ خانہ کعبہ ہو۔ چنانچہ حکم ملنے کے بعد آپ نے اس طرف منہ کر کے پہلی نماز عصر کی پڑھی۔ جن لوگوں نے آپ کے ساتھ نماز پڑھی تھی ان میں سے ایک شخص مسجد کے پاس سے گزرا۔ وہاں لوگ رکوع میں تھے۔ اس نے کہا' خدا کی قسم میں نے مکہ کی طرف رخ کر کے نبی ﷺ کے ساتھ نماز پڑھی ہے۔'' یہ سن کو وہ لوگ اسی حالت میں کعبہ کی طرف گھوم گئے اور ایسے لوگ جو تبدیل قبلہ سے قبل انتقال کر گئے۔ بہت سے تھے جو شہید ہوئے۔ لوگوں کو معلوم نہ تھا کہ ان کی نمازوں کے بارے میں کیا کہیں؟ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت: ﴿وَمَا كَانَ اللَّهُ...... ﴾ نازل فرمائی۔ ''یعنی اللہ تعالیٰ تم لوگوں کے ایمان ضائع نہ کرے گا۔'' صحیح مسلم میں روایت دوسری طرح سے ہے وہ یہ کہ ''رسول اللہ ﷺ بیت المقدس کی طرف نماز پڑھا کرتے تھے اور اکثر آسمان کی جانب نظریں اُٹھا کر حکم کا انتظار کرتے تھے۔ یہاں تک کہ

یہ آیت نازل ہوئی: ﴿قَدْ نَرٰی...... ﴾ اور کعبہ شریف قبلہ مقرر رہا۔ اس موقع پر مسلمانوں میں سے کچھ لوگوں نے کہا کاش ہم کو ان لوگوں کا حال معلوم ہوتا' جو سمتِ قبلہ بدلنے سے قبل وفات پا گئے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ: ﴿وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ﴾ نازل فرمائی۔

اہل کتاب میں سے بعض بیوقوفوں نے اس تبدیلی قبلہ پر اعتراض کیا' تو اللہ تعالیٰ نے آیت: ﴿سَيَقُوْلُ السُّفَهَآءُ مِنَ النَّاسِ مَاوَلّٰهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِیْ...... ﴾ نازل فرمائی۔'' جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ کی طرف ہجرت فرمائی تھی' تو بیت المقدس کو قبلہ بنانے کا حکم ہوا تھا۔ اس سے یہودی بہت خوش ہوئے تھے۔ مگر آپ قبلہ ابراہیمی کو پسند کرتے تھے۔ چنانچہ جب تبدیلی قبلہ کا حکم ہوا تو یہودیوں نے حسد کی وجہ سے اعتراضات کئے۔ جس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی کہ ''مشرق اور مغرب سب کا مالک اللہ تعالیٰ ہی ہے ......'' اس بارے میں دوسری بہت سی احادیث بھی مروی ہیں۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ آپ مکہ میں دو رکنوں کے درمیان صخرہ بیت المقدس کو سامنے رکھ کر نماز پڑھتے تھے۔ جب آپ نے مدینہ کی طرف ہجرت کی' تو ان دونوں کو جمع کرنا ناممکن ہو گیا۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے آپ کو بیت المقدس کی طرف منہ کرنے کا حکم دیا۔ اس بارے میں اختلاف ہے کہ آپ کو اس بات کا حکم قرآن کے ذریعے سے دیا گیا یا کسی دوسرے ذریعہ سے؟ بعض مفسرین کہتے ہیں کہ یہ آپ کا اجتہادی امر تھا اور مدینہ آنے کے کئی ماہ بعد تک آپ اسی پر عامل رہے۔ اگرچہ آپ اللہ تعالیٰ سے تبدیلی قبلہ کے خواستگار تھے۔ بالآخر دعا قبول کی گئی اور آپ نے اس پر پہلی نماز عصر پڑھی۔ بعض روایات میں ہے کہ وہ نماز ظہر تھی۔ حضرت ابو سعید بن المعلی نے کہا کہ میں نے اور میرے ساتھی نے اوّل اوّل کعبہ کی طرف نماز پڑھی ہے اور یہ ظہر کی نماز تھی۔ بعض مفسرین کا بیان ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر جب قبلہ بدلنے کی آیت نازل ہوئی۔ اس وقت آپ مسجد بنی سلمہ میں ظہر کی نماز پڑھ رہے تھے۔ دو رکعت ادا کر چکے تھے۔ پھر باقی دو رکعتیں آپ نے بیت المقدس شریف کی طرف پڑھیں۔ اسی وجہ سے اس مسجد کا نام ہی مسجد القبلتین یعنی دو قبلے والی مسجد ہے۔ حضرت نویلہ بنت مسلم رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ ہم ظہر کی نماز میں تھے کہ ہمیں خبر ملی اور ہم نماز ہی میں گھوم گئے۔ مرد عورتوں کی جگہ آ گئے اور عورتیں مردوں کی جگہ جا پہنچیں۔ ہاں اہل قبا کو دوسرے دن صبح کی نماز کے وقت یہ خبر پہنچی۔ صحیحین میں حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ لوگ مسجد قبا میں صبح کی نماز ادا کر رہے تھے کسی آنے والے نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر رات کو حکمِ قرآنی نازل ہوا اور کعبہ کی طرف متوجہ ہونے کا حکم ہو گیا۔ چنانچہ ہم لوگ بھی شام کی طرف منہ ہٹا کر کعبہ کی طرف متوجہ ہو گئے۔

اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ نئے حکم کی تعمیل کرنا اس وقت ہوتی ہے جب اس کا علم ہو جائے۔ گو وہ پہلے ہی پہنچ چکا ہو۔ اس لئے کہ ان حضرات کو عصر' مغرب اور عشا کے لوٹانے کا حکم نہیں ہوا۔ واللہ اعلم۔ اب باطل پرست کمزور عقیدے والے باتیں بنانے لگے کہ اس کی کیا وجہ ہے کہ کبھی اس کو قبلہ ٹھہرایا جاتا ہے تو کبھی اور کو۔ انہیں جواب ملا کہ حکم اور تصرف اور امر اللہ تعالیٰ کا ہی ہے۔ جدھر منہ کرو اُسی طرف اس کا منہ ہے۔ بھلائی کچھ اس میں نہیں آ گئی۔ بلکہ اصلیت تو ایمان کی مضبوطی ہے جو ہر حکم کے ماننے پر مجبور کر دیتی ہے اور اس میں گویا مومنوں کو ادب سکھایا گیا ہے کہ ان کا کام صرف حکم کی بجا آوری کا ہے۔ جدھر انہیں متوجہ ہونے کا حکم دیا یہ متوجہ ہو جاتے ہیں۔ عبودیت کے معنی اس کی حکم برداری کے ہیں۔ اگر وہ ایک دن میں سو مرتبہ ہر طرف گھمائے تو ہم بخوشی گھوم جائیں گے ہم اس کے غلام ہیں۔ ہم اس کے ماتحت ہیں۔ اس کے فرمانبردار ہیں اور اس کے

خادم ہیں۔ جدھر وہ حکم دے گا' منہ پھیر لیں گے۔ امت محمدیہ پر یہ بھی خدا تعالیٰ کا اکرام ہے کہ انہیں خلیل الرحمٰن علیہ السلام کے قبلہ کی طرف منہ کرنے کا حکم ہوا' جو اسی خدائے لاشریک کے نام پر بنایا گیا اور تمام تر فضیلتیں جسے حاصل ہیں۔

مسند احمد کی ایک مرفوع حدیث میں ہے کہ یہودیوں کو ہم سے اس بات پر بڑا حسد ہے کہ خدا نے ہمیں جمعہ کے دن کی توفیق دی اور یہ اس سے بھٹک گئے اور اس پر کہ یہ ہمارا قبلہ ہے اور وہ اس سے گمراہ ہو گئے اور بڑا حسد ان کو ہماری آمین کہنے پر بھی ہے جو ہم امام کے پیچھے کہتے ہیں۔ پھر ارشاد ہوتا ہے کہ اس پسندیدہ قبلہ کی طرف تمہیں متوجہ کرنا اس لئے ہے کہ تم خود بھی پسندیدہ امت ہو تم اور اُمتوں پر قیامت کے دن گواہ بنے رہو گے کیونکہ وہ سب تمہاری فضیلت مانتے ہیں۔ وسط کے معنی یہاں پر بہتر اور عمدہ کے ہیں۔ جیسے کہا جاتا ہے کہ قریش نسب کے اعتبار سے وسط عرب ہیں اور کہا گیا ہے کہ حضور ﷺ اپنی قوم میں وسط تھے۔ یعنی اشرف نسب والے اور صلوٰۃ وسطیٰ یعنی افضل تر نماز جو عصر ہے۔ جیسا کہ صحیح حدیثوں میں ثابت ہے اور چونکہ تمام اُمتوں میں یہ امت بھی بہتر افضل اور اعلیٰ تھی۔ اس لئے انہیں شریعت بھی کامل ملی۔ راستہ بھی بالکل درست ملا اور دین بھی بہت واضح دیا گیا جیسے فرمان ہے: ﴿هُوَ اجْتَبٰكُمْ......﴾ (الحج: ۷۸) اس خدا نے تمہیں چن لیا اور تمہارے دین میں کوئی تنگی نہیں۔ اپنے باپ ابراہیم علیہ السلام کے دین پر تم ہو۔ اسی نے تمہارا نام مسلم رکھا ہے۔ اس سے پہلے بھی اور اس میں بھی تاکہ رسول ﷺ تم پر گواہ ہو اور تم لوگوں پر۔

امت محمدیہ ﷺ کی دوسری اُمم کے مقابلہ میں شہادت ☆ مسند احمد میں ہے رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں۔ نوح علیہ السلام کو قیامت کے دن بلایا جائے گا اور ان سے دریافت کیا جائے گا کہ کیا تم نے میرا پیغام میرے بندوں کو پہنچا دیا تھا۔ وہ کہیں گے کہ ہاں خدایا پہنچا دیا تھا۔ ان کی امت کو بلایا جائے گا اور ان سے پرسش ہوگی کہ کیا نوح علیہ السلام نے میری باتیں تمہیں پہنچائی تھیں؟ وہ صاف انکار کریں گے ہمارے پاس کوئی ڈرانے والا نہیں آیا۔ نوح علیہ السلام سے کہا جائے گا' تمہاری اُمت انکار کرتی ہے تم گواہ پیش کرو۔ یہ کہیں گے کہ ہاں محمد ﷺ اور آپ کی امت میری گواہ ہے۔ یہی مطلب اس آیت کا: ﴿وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ......﴾ کا ہے۔ وسط کے معنی عدل کے ہیں۔ اب تمہیں بلایا جائے گا اور گواہی دو گے اور میں تم پر گواہی دوں گا۔ (بخاری' ترمذی' ابن ماجہ) مسند احمد کی ایک اور روایت ہے۔ قیامت کے دن نبی آئیں گے اور ان کے ساتھ ان کی امت کے صرف دو ہی شخص ہوں گے اور اس سے زیادہ بھی۔ ہر ایک کی اُمت کو بلایا جائے گا اور ان سے پوچھا جائے گا کہ کیا اس نبی نے تمہیں تبلیغ کی تھی؟ وہ انکار کریں گے۔ نبی سے کہا جائے گا' تم نے تبلیغ کیا۔ وہ کہیں گے ہاں' کہا جائے گا کہ کیا تمہارا کوئی گواہ ہے؟ وہ کہیں گے محمد ﷺ اور آپ کی اُمت۔ پس محمد ﷺ اور آپ کی اُمت بلائی جائے گی۔ ان سے یہی سوال ہوگا کہ کیا اس پیغمبر نے تبلیغ کی؟ یہ کہیں گے ہاں۔ ان سے کہا جائے گا کہ تمہیں کیسے علم ہوا؟ یہ جواب دیں گے کہ ہمارے پاس ہمارے نبی آئے اور آپ نے خبر دی کہ انبیاء علیہم السلام نے آپ کا پیغام اپنی اُمتوں کو پہنچایا۔ یہی مطلب ہے اللہ عزوجل کے اس فرمان: ﴿وَكَذٰلِكَ......﴾ کا۔

مسند احمد کی ایک اور حدیث میں وَسَطاً بمعنی عدلاً آیا ہے۔ ابن مردویہ اور ابن ابی حاتم میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ میں اور میری اُمت قیامت کے دن ایک اونچے ٹیلے پر ہوں گے۔ تمام مخلوق میں نمایاں ہوں گے اور سب کو دیکھ رہے ہوں گے۔ اس روز تمام دنیا تمنا کرے گی کہ کاش وہ بھی ہم میں سے ہوتے۔ جس جس نبی کی قوم نے اسے جھٹلایا ہے۔ ہم دربار

ربّ العالمین میں شہادت دیں گے کہ ان تمام انبیاء نے حق رسالت ادا کیا تھا۔ مستدرک حاکم کی ایک حدیث میں ہے کہ بنی مسلمہ کے قبیلے کے ایک شخص کے جنازے میں ہم حضور ﷺ کے ساتھ تھے۔ لوگ کہنے لگے حضور ﷺ یہ بڑا نیک آدمی' بڑا متقی' پارسا اور سچا مسلمان تھا اور بھی بہت سی تعریفیں کیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا تم یہ کس طرح کہہ رہے ہو؟ انہوں نے کہا حضور باطن کا علم تو خدا ہی کو ہے لیکن ظاہر اً تو اس کی ایسی ہی حالت تھی۔ آپ نے فرمایا اس کے لئے واجب ہوگئی۔ پھر بنو حارثہ کے ایک شخص کے جنازے میں تھے۔ لوگ کہنے لگے حضرت یہ برا آدمی تھا۔ بڑا بدزبان اور کج خلق تھا۔ آپ ﷺ نے اس کی برائیاں سن کر پوچھا' تم یہ کیسے کہہ رہے ہو؟ انہوں نے بھی یہی کہا۔ آپ نے فرمایا اس کے لئے واجب ہوگئی۔ محمد بن کعبؒ اس حدیث کو سن کر فرمانے لگے اللہ کے رسول سچے ہیں۔ دیکھو قرآن بھی کہہ رہا ہے: ﴿وَكَذٰلِكَ...... ﴾۔

مسند احمد میں ہے ابوالاسود فرماتے ہیں' میں مدینہ میں آیا' یہاں بیماری تھی' لوگ بکثرت مر رہے تھے۔ میں حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ ایک جنازہ نکلا اور لوگوں نے مرحوم کی نیکیاں بیان کرنی شروع کیں۔ آپ نے فرمایا' اس کے لئے واجب ہوگئی۔ میں نے کہا امیر المؤمنین کیا واجب ہوگئی؟ آپ نے فرمایا' میں نے وہی کہا جو جناب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ جس مسلمان کی بھلائی کی شہادت چار شخص دیں' اللہ اُسے جنت میں داخل کرتا ہے۔ ہم نے کہا' حضور اگر تین دیں؟ آپ نے فرمایا تین بھی۔ ہم نے کہا اگر دو ہوں؟ آپ نے فرمایا دو بھی۔ پھر ہم نے ایک کی بابت سوال نہ کیا ابن مردویہ کی ایک حدیث میں ہے' قریب ہے کہ تم اپنے بھلے بروں کو پہچان لیا کرو۔ لوگوں نے کہا' حضور ﷺ کس طرح؟ آپ نے فرمایا اچھی تعریف اور بری شہادت سے تم زمین پر خدا کے گواہ ہو۔

پھر ارشاد ہے کہ اگلا قبلہ صرف امتحاناً تھا یعنی پہلے بیت المقدس کو قبلہ مقرر کر کے پھر کعبۃ اللہ کی طرف پھرنا صرف اس لئے تھا کہ معلوم ہو جائے کہ سچا تابعدار کون ہے؟ اور جہاں آپ توجہ کریں وہیں اپنی توجہ کرنے والا کون ہے؟ اور کون ہے؟ جو آپ کی تابعداری سے انکار کرتا ہے اور اس طرح مرتد ہو جاتا ہے۔ یہ کام فی الحقیقت اہم کام تھا لیکن جن کے دلوں میں ایمان ویقین ہے۔ جو رسول اللہ ﷺ کے سچے پیروکار ہیں جو جانتے ہیں کہ حضور جو فرمائیں سچ ہے۔ جن کا عقیدہ ہے کہ خدا جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ اپنے بندوں کو جس طرح چاہے حکم دے۔ جو چاہے حکم منسوخ کر دے' جو چاہے باقی رکھے۔ اس کا ہر کام ہر حکم حکمت سے پُر ہے۔ اس حکم کی بجا آوری کچھ بھی مشکل نہیں۔ ہاں بیمار دل والے تو جہاں نیا حکم آیا اور انہیں اضطراب ہوا۔ قرآن کریم میں اور جگہ ہے: ﴿وَاِذَا مَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ...... ﴾ (التوبہ:۱۲۴) یعنی جب کبھی کوئی سورت نازل ہوتی ہے تو اُن میں بعض پوچھتے ہیں' اس سے کس کا ایمان بڑھا؟ حقیقت یہ ہے کہ ایمانداروں کے ایمان بڑھتے ہیں اور ان کی دلی خوشی بھی اور بیمار دل والے کفروانکار میں اور بڑھ جاتے ہیں اور جگہ فرمان ہے: ﴿قُلْ هُوَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هُدًى وَّشِفَآءٌ ۚ وَالَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ فِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرٌ وَّهُوَ عَلَيْهِمْ عَمًى﴾ (فصلت:۴۴) یعنی ایمان والوں کے لئے یہ ہدایت اور شفا ہے اور بے ایمان لوگوں کے کانوں میں بوجھ اور آنکھوں میں اندھا پن ہے اور جگہ فرمایا ہے: ﴿وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۙ وَلَا يَزِيْدُ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا خَسَارًا﴾ (بنی اسرائیل:۸۲) یعنی ہمارا اُتارا ہوا قرآن مؤمنوں کے لئے سراسر شفا اور رحمت ہے اور ظالموں کا نقصان ہی بڑھتا رہتا ہے۔[1]

[1] یعنی قرآن کا انکار کرنے کی وجہ سے ان کی ضلالت اور گمراہی اور بڑھتی ہے۔ یہ مطلب نہیں کہ قرآن نے ان کی گمراہی میں اور =

تحویل قبلہ اور صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا حیرت انگیز استقلال ☆ اس واقعہ میں بھی تمام بزرگ صحابہ ثابت قدم رہے۔ اوّل اوّل سبقت والے مہاجر اور انصار دونوں قبلوں کی طرف نماز پڑھنے والے ہیں۔ چنانچہ اُوپر حدیث بیان ہو چکی کہ کس طرح وہ نماز پڑھتے ہوئے یہ خبر سن کر گھوم گئے۔ مسلم شریف میں روایات ہے کہ رکوع کی حالت میں تھے اور اسی میں کعبہ کی طرف پھر گئے۔ جس سے ان کی کمال اطاعت اور اعلیٰ درجہ کی فرمانبرداری ثابت ہوئی۔ پھر ارشاد ہوتا ہے کہ خدا تمہارے ایمان کو ضائع نہیں کرے گا یعنی تمہاری بیت المقدس کی طرف پڑھی ہوئی نمازیں رد نہیں ہوں گی۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں بلکہ ان کی اعلیٰ ایمانداری ثابت ہوئی۔ انہیں دونوں قبلوں کی طرف نماز پڑھنے کا ثواب عطا ہوگا۔ یہ مطلب بھی بیان کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ محمد ﷺ کو اور ان کے تحویل قبلہ میں تمہاری اطاعت کو ضائع نہ کرے گا۔ پھر ارشاد ہوتا ہے کہ خدا رؤف ورحیم ہے۔

صحیح حدیث میں ہے کہ حضور ﷺ نے ایک قیدی عورت کو دیکھا' جس سے اس کا بچہ چھوٹ گیا تھا۔ وہ اپنے بچہ کو دیوانوں کی طرح تلاش کر رہی تھی اور جب وہ نہیں ملا تو قیدیوں میں سے جس کسی کو دیکھتی' اسی کو گلے لگا لیتی۔ یہاں تک کہ اس کا اپنا بچہ مل گیا۔ خوشی خوشی لپک کر اسے گود میں بٹھا لیا۔ سینے سے لگا کر پیار کیا اور اس کے منہ میں دودھ دیا۔ یہ دیکھ کر حضور ﷺ نے صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے فرمایا' بتلاؤ کیا یہ خود اس بچہ کو آگ میں ڈال دے گی؟ لوگوں نے کہا یا رسول اللہ ﷺ ہرگز نہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا اللہ کی قسم جس قدر یہ ماں اپنے بچہ پر مہربان ہے' اس سے کہیں زیادہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر رؤف ورحیم ہے۔ (بخاری)

قَدْ نَرٰی تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ ۚ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰىهَا ۠ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ ؕ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۴﴾

ہم آپ کے منہ کا (یہ) بار بار آسمان کی طرف اٹھنا دیکھ رہے ہیں۔ اس لئے ہم آپ کو اسی قبلہ کی طرف کی متوجہ کر دیں گے جس کے لئے آپ کی مرضی ہے (لو) پھر اپنا چہرہ (نماز میں) مسجد حرام (کعبہ) کی طرف کیا کیجئے اور تم سب لوگ جہاں کہیں بھی موجود ہوا پنے چہروں کو اسی (مسجد حرام) کی طرف کیا کرو اور یہ اہل کتاب بھی یقیناً جانتے ہیں کہ یہ (حکم) بالکل ٹھیک ہے (اور) وہ ان کے پروردگار ہی کی طرف سے (ہے۔) اور اللہ تعالیٰ ان کی کارروائیوں سے کچھ بے خبر نہیں ہیں۔ O

= اضافہ کر دیا جیسا کہ طبیب کسی خطرناک مرض کی حالت کوئی نسخہ تجویز کرے اور مریض بجائے اس کو استعمال کرنے کے الٹی اس کی مخالفت شروع کر دے۔ جس کے نتیجے میں اس کا مرض بڑھتا ہو۔ تو یہ ہرگز نہیں کہا جائے کہ طبیب نے مرض بڑھایا ہے بلکہ مریض کی خود اپنی ضد اور ہٹ دھرمی ہے اس کو خطرہ کی حد تک پہنچا دیا ہے۔ بس اسی طرح قرآن کی مخالفت کا بھی معاملہ سمجھے۔ ۱۲ محشی۔

قبلہ ابراہیمی' نبی کریم ﷺ کی دِلی خواہش ☆

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا بیان ہے کہ قرآن میں پہلا نسخ قبلہ کا حکم ہے۔ حضور ﷺ نے مدینہ کی طرف ہجرت کی۔ یہاں کے اکثر باشندے یہود تھے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو بیت المقدس کی طرف نمازیں پڑھنے کا حکم کیا۔ یہود اس سے بہت خوش ہوئے۔ آپ کئی ماہ تک اسی کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے رہے لیکن خود آپ کی خواہش قبلہ ابراہیمی کی تھی۔ آپ ﷺ اللہ تعالیٰ سے دعائیں مانگا کرتے تھے اور نگاہیں آسمان کی طرف اُٹھایا کرتے تھے۔ بالآخر آیت: ﴿قَدْ نَرٰی...... ﴾ نازل ہوئی۔ اس پر یہود کہنے لگے کہ اس قبلہ سے یہ کیوں ہٹ گئے؟ جس کے جواب میں کہا گیا کہ مشرق اور مغرب کا مالک اللہ تعالیٰ ہی ہے اور فرمایا جدھر تمہارا منہ ہو اُدھر ہی خدا ہے اور فرمایا کہ اگلا قبلہ امتحاناً تھا اور روایت میں ہے کہ حضور ﷺ نماز کے بعد اپنا سر آسمان کی طرف اٹھاتے تھے۔ اس پر یہ آیت اُتری اور حکم ہوا کہ مسجد حرام کی طرف' کعبہ کی طرف' میزاب کی منہ کرو۔ جبرئیل علیہ السلام نے امامت کرائی۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مسجد حرام میں میزاب کے سامنے بیٹھے ہوئے اس آیت پاک کی تلاوت کی اور میزاب کعبہ کی طرف نماز پڑھنے کے متعلق یہ آیت نازل ہوئی۔ امام شافعی کا بھی ایک قول تو یہ ہے کہ عین کعبہ کی طرف توجہ مقصود ہے اور دوسرا قول آپ کا یہ ہے کہ کعبہ کی طرف رخ کر لینا ہی کافی ہے اور یہی مذہب اکثر ائمہ کرام کا ہے۔

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں۔ مراد اس کی طرف ہے۔ ابوالعالیہ' مجاہد' عکرمہ' سعید بن جبیر' قتادہ' ربیع بن انسؒ وغیرہ کا بھی یہی قول ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ مشرق و مغرب کے درمیان قبلہ ہے۔ ابن جریج کی حدیث ہے رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں' بیت اللہ قبلہ ہے مسجد حرام والوں کا اور مسجد قبلہ ہے اہل حرم کا اور حرم قبلہ ہے تمام زمین والوں کا خواہ مشرق میں ہوں خواہ مغرب میں ہوں' میری تمام اُمت کا قبلہ یہی ہے۔ ابونعیم میں بروایت براء رضی اللہ تعالیٰ عنہ مروی کہ حضور اکرم ﷺ نے سولہ سترہ مہینے تک تو بیت المقدس کی طرف نماز پڑھی لیکن آپ کو پسند یہ امر تھا کہ بیت اللہ کی طرف پڑھیں چنانچہ حکم خدا سے آپ نے بیت اللہ کی طرف متوجہ ہو کر عصر کی نماز ادا کی۔ پھر نمازیوں میں سے ایک شخص مسجد قبا والوں کے پاس گیا وہ رکوع میں تھے۔ اس نے کہا میں حلفیہ گواہی دیتا ہوں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ مکہ شریف کی طرف نماز ادا کی۔ وہ یہ سُن کر جس حالت میں تھے اسی حالت میں بیت اللہ شریف کی طرف پھر گئے۔ عبدلرزاق میں یہ روایات قدرے کمی بیشی کے ساتھ موجود ہے۔ نسائی میں حضرت ابوسعید بن معلیٰ سے روایت ہے کہ ہم صبح کے وقت مسجد نبوی میں حضور ﷺ کے زمانہ میں جایا کرتے تھے اور وہاں کچھ نوافل پڑھا کرتے تھے۔ ایک دن ہم گئے تو دیکھا کہ نبی کریم ﷺ منبر پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ میں نے کہا آج کوئی نئی بات ضرور ہوئی ہے۔ میں بھی بیٹھ گیا تو حضور ﷺ نے یہ آیت: ﴿قَدْ نَرٰی...... ﴾ تلاوت فرمائی۔ میں نے اپنے ساتھی سے کہا آؤ نبی ﷺ فارغ ہوں' اس سے پہلے ہی ہم اس نئے حکم کی تعمیل کریں اور اوّل فرمانبردار بن جائیں۔ چنانچہ ہم ایک طرف ہو گئے اور سب سے پہلے بیت اللہ کی طرف نماز پڑھی۔ پھر حضور ﷺ بھی منبر سے اُتر آئے اور اس قبلہ کی طرف پہلے نماز ظہر ادا کی گئی۔ ابن مردویہ میں بروایت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما مروی ہے کہ پہلی نماز جو حضور ﷺ نے کعبہ کی طرف ادا کی۔ وہ ظہر کی نماز ہے اور یہی نماز صلوٰۃ وسطیٰ ہے لیکن مشہور یہ ہے کہ پہلی نماز کعبہ کی طرف عصر کی ادا ہوئی۔ اسی وجہ سے اہل قبا کو دوسرے دن صبح کے وقت اطلاع پہنچی۔ ابن مردویہ میں بروایت نویلہ بنت مسلم موجود ہے کہ ہم مسجد بنو حارثہ میں ظہر یا عصر کی

نماز بیت المقدس کی طرف منہ کئے ہوئے ادا کر رہے تھے۔ دو رکعت پڑھ چکے تھے کہ کسی نے آ کر قبلہ کے بدل جانے کی خبر دی۔ چنانچہ ہم بیت اللہ کی طرف متوجہ ہو گئے اور باقی نماز اسی طرف ادا کی۔ اس گھومنے میں مرد عورتوں کی جگہ اور عورتیں مردوں کی جگہ آ گئیں آپ کے پاس جب یہ خبر پہنچی تو خوش ہو کر فرمایا' یہ ہیں ایمان بالغیب رکھنے والے۔

ابن مردویہ میں بروایت عمارۃ بن اوس رضی اللہ تعالیٰ عنہ موجود ہے کہ رکوع کی حالت میں حالت میں ہمیں اطلاع ہوئی اور ہم سب مرد' عورت' بچے اسی حالت میں اس قبلہ کی طرف گھوم گئے۔ پھر ارشاد ہوتا ہے تم جہاں بھی ہو' مشرق' مغرب' شمال جنوب میں نماز کے وقت منہ کعبہ کی طرف کرو لیکن علما نے کہا ہے کہ سفر میں سواری پر نفل پڑھنے والا جدھر سواری جا رہی ہو' ادھر ہی نفل ادا کر لے۔ اس کے دل کی توجہ کعبہ کی طرف ہونی کافی ہے۔ اسی طرح میدان جنگ میں نماز پڑھنے والے جس طرح اور جس طرف بن پڑے نماز ادا کر لے اور اسی طرح وہ شخص جسے قبلہ کی جہت کا قطعی علم نہیں۔ وہ اندازے سے جس طرف زیادہ دل جھکے نماز ادا کر لے۔ پھر گو اس کی نماز فی الواقع قبلہ کی طرف نہ بھی ہوئی' ہو تو بھی وہ خدا کے ہاں معاف ہے۔[1]

امام اعظم امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا فرمان کہ حالتِ نماز میں نگاہیں سجدہ کی جگہ پر رہیں ☆

مسئلہ: مالکیہ نے اس آیت سے استدلال کیا ہے کہ نمازی حالتِ نماز میں اپنے سامنے اپنی نظریں رکھے نہ کہ سجدہ کی جگہ' جیسے شافعی' احمد اور ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہم کا مذہب ہے۔ اس لئے کہ آیت کے لفظ یہ ہیں کہ منہ مسجد حرام کی طرف کرو اور اگر سجدے کی جگہ نظر جمانا چاہے گا تو قدرے جھکنا پڑے گا اور یہ تکلف خشوع کے خلاف ہوگا۔ بعض مالکیہ کا یہ قول بھی ہے کہ قیام کی حالت میں اپنے سینے پر نظر رکھے۔ قاضی شریح کہتے ہیں کہ قیام میں سجدے کی جگہ نظر رکھے۔ جیسے کہ جمہور علما کا قول ہے۔ اس لئے کہ یہ پورا پورا خشوع خضوع ہے اور ایک حدیث بھی اس مضمون کی موجود ہے اور رکوع کی حالت میں اپنے قدموں کی جگہ پر نظر رکھے اور سجدے کے وقت ناک کی جگہ اور التحیات کے وقت اپنی آغوش کی طرف۔ پھر ارشاد ہوتا ہے کہ یہودی یا اور اہل کتاب جو چاہیں باتیں بنائیں لیکن ان کے دل جانتے ہیں کہ قبلہ کی تبدیلی خدا کی جانب سے ہے اور برحق ہے کیونکہ یہ خود ان کی کتابوں میں بھی موجود ہے لیکن یہ لوگ کفر و عناد اور تکبر و حسد کی وجہ سے اسے چھپاتے ہیں مگر اللہ تعالیٰ بھی ان کے ان کرتوتوں سے بے خبر نہیں۔

وَلَئِنْ اَتَيْتَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ بِكُلِّ اٰيَةٍ مَّا تَبِعُوْا قِبْلَتَكَ ۚ وَمَآ اَنْتَ بِتَابِعٍ قِبْلَتَهُمْ ۚ وَمَا بَعْضُهُمْ بِتَابِعٍ قِبْلَةَ بَعْضٍ ۭ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَاۗءَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَاۗءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ اِنَّكَ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۴۵﴾

اور اگر آپ (ان) اہل کتاب کے سامنے تمام (دنیا بھر کی) دلیلیں پیش کر دیں۔ جب بھی یہ (کبھی) آپ کے قبلہ کو

[1] فقہی اصطلاح میں اس کو تحری کہتے ہیں۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ قبلہ معلوم نہ ہونے کی صورت میں جس جانب قبلہ ہونے کا ظن غالب ہو' ادھر ہی نماز پڑھ لی جائے اور کیونکہ تحری کے بعد جو سمت اس نے متعین کی تھی' وہی اس کا قبلہ ہو گئی تھی۔ اس لئے اب اگر بعد میں معلوم ہو کہ اس جانب قبلہ نہیں تھا۔ پھر بھی نماز کے لوٹانے کی ضرورت نہ ہو گی۔ ۱۲

قبول نہ کریں اور آپ بھی ان کے قبلہ کو قبول نہیں کر سکتے (پھر موافقت کیا کیا صورت) اور ان کا کوئی (فریق) بھی دوسرے (فریق) کے قبلہ کو قبول نہیں کرتا اور اگر آپ ان کے (ان) نفسانی خیالات کو اختیار کر لیں (اور وہ بھی) آپ کے پاس علم (وحی) آئے پیچھے تو یقیناً آپ (نعوذ باللہ) ظالموں میں شمار ہونے لگیں۔

یہودیوں کے کفر و عناد اور مخالفت و سرکشی کا بیان ہو رہا ہے کہ باوجودیکہ شان رسول ﷺ کا انہیں علم ہے لیکن پھر بھی یہ حالت ہے کہ ہر قسم کے دلائل پیش کئے جانے کے باوجود حق کی پیروی نہیں کرتے۔ جیسے اور جگہ ہے: ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ حَقَّتْ عَلَيْهِمْ كَلِمَتُ رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ وَلَوْ جَآءَتْهُمْ كُلُّ اٰيَةٍ حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ﴾ (یونس:۹۶) یعنی جن لوگوں پر تیرے رب کی بات ثابت ہو چکی ہے۔ وہ ایمان نہ لائیں گے گو ان کے پاس تمام آیتیں آ جائیں یہاں تک کہ دردناک عذاب نہ دیکھ لیں۔ اس کے بعد اپنے نبی کی استقامت بیان فرمائی ہے کہ جس طرح یہودی ناحق اڑے ہوئے ہیں۔ وہاں سے ہٹنا نہیں چاہتے۔ تو وہ سمجھ لیں کہ ہمارے نبی ایسے نہیں کہ ان کی باتوں میں آ جائیں اور ان کی راہ لگ جائیں۔ وہ ہمارے تابع فرمان ہیں اور ہماری مرضی کے عامل ہیں۔ وہ ان کی غلط خواہش کی تابعداری ہرگز نہیں کریں گے نہ ان سے یہ ہو سکتا ہے کہ ہمارا حکم آ جانے کے بعد ان کے قبلہ کی طرف توجہ کریں۔ پھر بظاہر اپنے نبی ﷺ کو خطاب کر کے اور واقعۃً علماء کو دھمکایا گیا ہے کہ حق کے واضح ہو جانے کے بعد کسی کے پیچھے لگ جانا اور اپنی یا دوسروں کی خواہش پرستی کرنا صریح ظلم ہے۔

اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ ۭ وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنْهُمْ لَيَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿١٤٦﴾ اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ ﴿١٤٧﴾ ع

جن لوگوں کو ہم نے کتاب (توات و انجیل) دی ہے وہ لوگ رسول اللہ کو ایسا پہچانتے ہیں جیسا کہ اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں اور بعضے ان میں سے امر واقعی کو باوجودیکہ خوب جانتے ہیں (مگر) اخفا کرتے ہیں۔ حالانکہ یہ امر واقعی من جانب اللہ ثابت ہو چکا ہے۔ سو ہرگز شک و شبہ لانے والوں میں شمار نہ ہونا۔

ارشاد ہوتا ہے کہ علمائے اہل کتاب رسول اللہ ﷺ کی لائی ہوئی باتوں کی حقانیت کو اس طرح جانتے ہیں جس طرح باپ اپنے بیٹوں کو پہچانے۔ یہ ایک مثال تھی جو کامل یقین کے وقت عرب بولا کرتے تھے۔ ایک حدیث میں ہے ایک شخص کے ساتھ چھوٹا بچہ تھا۔ آپ ﷺ نے اس سے پوچھا' یہ تیرا لڑکا ہے؟ اس نے کہا' ہاں حضور ﷺ آپ بھی گواہ رہئے۔ آپ ﷺ نے فرمایا نہ یہ تجھ پر پوشیدہ ہے نہ تو اس پر۔

قرآنی بیان اور عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کی تصدیق ☆ قرطبیؒ کہتے ہیں' ایک مرتبہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے جو یہودیوں کے زبردست عالم تھے' پوچھا کیا تو حضرت محمد ﷺ کو ایسا ہی جانتا ہے جس طرح اپنی اولاد کو پہچانتا ہے؟ جواب دیا ہاں۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ۔ اس لئے آسمانوں کا امین فرشتہ زمین کے امین شخص پر نازل ہوا اور اس نے آپ کی صحیح تعریف بتلا دی یعنی حضرت جبریل حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پاس آئے اور پھر پروردگار عالم نے آپ کی صفتیں بیان کیں۔ جو سب کے سب آپ میں موجود ہیں۔ پھر ہمیں آپ کے نبی برحق ہونے میں کیا شک رہا؟ ہم آپ کو بیک نگاہ کیوں نہ پہچان لیں؟ بلکہ ہمیں اپنی اولاد کے بارے میں شک ہو سکتا ہے لیکن آپ کی نبوت میں

کچھ شک نہیں۔غرض یہ ہے کہ جس طرح لوگوں کے ایک بڑے مجمع میں ایک شخص اپنے لڑکے کو پہچان سکتا ہے اسی طرح حضور ﷺ کے اوصاف جو اہل کتاب کی آسمانی کتاب میں ہیں وہ آپ ﷺ میں اسی طرح نمایاں ہیں کہ یہ یک نگاہ ہر شخص آپ کو پہچان جاتا ہے۔ پھر فرمایا باوجود اس طرح علم حق کے پھر بھی یہ لوگ اسے چھپاتے ہیں۔ پھر اپنے نبی اور مسلمانوں کو ثابت قدمی کا حکم دیا کہ خبردار تم ہرگز حق کے حق ہونے میں شک نہ کرنا۔

وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ ۗ اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يَاْتِ بِكُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا ۗ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۴۸﴾

اور ہر شخص (ذی مذہب) کے واسطے ایک ایک قبلہ رہا ہے جس کی طرف وہ (عبادت میں) منہ کرتا رہا ہے سو تم نیک کاموں میں تگاپو کرو تم خواہ کہیں ہو گے (لیکن) اللہ تعالیٰ تم سب کو حاضر کریں گے۔ بالیقین اللہ تعالیٰ ہر امر پر پوری قدرت رکھتے ہیں۔ ○

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ہر مذہب والوں کا ایک قبلہ ہے لیکن سچا قبلہ وہ ہے جس پر مسلمان ہیں۔ ابوالعالیہ رحمتہ اللہ علیہ کا قول ہے کہ یہود کا بھی قبلہ ہے۔ نصرانیوں کا بھی قبلہ ہے اور تمہارا بھی قبلہ ہے لیکن ہدایت والا قبلہ وہی ہے جس پر اے مسلمانو تم ہو۔ مجاہد سے یہ بھی مروی ہے کہ ہر ایک وہ قوم جو کعبہ کو قبلہ مانتی ہے۔ وہ بھلائیوں میں سبقت کرے۔ مُوَلِّيهَا کی دسری قراءت مُوَلَّاهَا ہے جیسے اور جگہ ہے: لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً...... یعنی ہر شخص کو اپنے اپنے قبلہ کی پڑی ہوئی ہے۔ ہر شخص اپنی اپنی راہ لگا ہوا ہے۔ فرمایا کہ گو تمہارے جسم اور بدن مختلف ہو جائیں۔ گو تم ادھر ادھر ہو جاؤ، لیکن خدا تمہیں اپنی قدرت کاملہ سے اسی زمین سے جمع کرلے گا۔

وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۗ وَاِنَّهٗ لَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ ۗ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۹﴾ وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۗ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ ۙ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ ۙ اِلَّا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ ۚ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِيْ ۚ وَلِاُتِمَّ نِعْمَتِيْ عَلَيْكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿۱۵۰﴾

اور جس جگہ سے بھی (کہیں سفر میں) آپ باہر جائیں تو (بھی) اپنا چہرہ (نماز میں) مسجد حرام (یعنی کعبہ) کی طرف رکھا کیجئے اور (یہ حکم عام قبلہ کا) بالکل حق ہے (اور) منجانب اللہ (ہے) اور اللہ تعالیٰ تمہارے کئے ہوئے کاموں سے اصلاً بے خبر نہیں اور مکرر کہا جاتا ہے کہ آپ جس جگہ سے بھی (سفر میں) باہر جائیں اپنا چہرہ مسجد حرام کی

طرف رکھیئے اور تم لوگ جہاں کہیں (موجود) ہو اپنا چہرہ اسی کی طرف رکھا کرو تا کہ (ان مخالف) لوگوں کو تمہارے مقابلہ میں گفتگو (کی) مجال نہ رہے۔ مگر ان میں (جو بالکل ہی) بے انصاف ہیں تو ایسے لوگوں سے (اصلاً) اندیشہ نہ کرو' اور مجھ سے ڈرتے رہو اور تا کہ تم پر جو (کچھ) میرا انعام ہے اس کی تکمیل کر دوں اور تا کہ (دنیا میں) تم راہ راست (حق) پر رہو۔○

امام رازی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک سہ مرتبہ ذکر کرنے کی وجہ☆

یہ تیسری مرتبہ حکم ہو رہا ہے کہ روئے زمین کے مسلمانوں کو نماز کے وقت مسجد حرام کی طرف منہ کرنا چاہئے۔ تین مرتبہ تاکید اس لئے کی گئی کہ یہ تبدیلیٔ حکم پہلی بار واقع ہوئی تھی۔ فخر الدین رازیؒ نے اس کی یہ وجہ بیان کی ہے کہ پہلا حکم تو ان کے لئے ہے جو کعبہ کو دیکھ رہے ہیں۔ دوسرا حکم ان کے لئے ہے جو مکہ میں ہوں۔ لیکن کعبہ ان کے سامنے نہ ہو۔ تیسری بار انہیں حکم دیا جو مکہ کے باہر ہوں روئے زمین پر۔ قرطبیؒ نے ایک توجیہ یہ بھی بیان کی ہے کہ پہلا حکم مکہ والوں کو ہے۔ دوسرا اور شہروں والوں کو۔ تیسرا مسافروں کو۔ بعض کہتے ہیں تینوں حکموں کا تعلق اگلی پچھلی عبارت سے ہے۔ پہلے حکم میں تو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طلب کا اور پھر اس کی قبولیت کا ذکر ہے اور دوسرے حکم میں اس بات کا بیان ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ آرزو بھی ہماری مشیت کے مطابق تھی اور حق یہی تھا اور تیسرے حکم میں یہودیوں کی کٹ حجتی کا جواب ہے کہ ان کی کتابوں میں پہلے سے موجود تھا کہ آپ کا قبلہ کعبہ ہوگا۔ تو اس حکم سے وہ پیش گوئی بھی پوری ہوئی۔ ساتھ ہی مشرکین کی حجت بھی ختم ہوئی۔ وہ کعبہ کو متبرک اور مشرف مانتے تھے اور اب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی توجہ بھی اسی کی طرف ہوگئی۔ رازی وغیرہ نے یہاں اس حکم کو بار بار لانے کی حکمتوں کو تفصیل سے بیان کیا ہے واللہ اعلم۔ پھر فرمایا' تا کہ اہل کتاب کی کوئی حجت تم پر باقی نہ رہے۔ وہ جانتے تھے کہ اس امت کی صفت کعبہ کی طرف نماز پڑھنا ہے۔ جب وہ صفت نہ پائیں گے تو انہیں شک کی گنجائش ہو سکتی ہے لیکن جب انہوں نے اس قبلہ کی طرف رخ کرتے ہوئے آپ کو دیکھ لیا تو اب انہیں کسی طرح کا شک نہ رہنا چاہئے اور یہ بات بھی ہے کہ جب وہ تمہیں اپنے قبلہ کی طرف نماز پڑھتے ہوئے دیکھیں گے تو ان کے ہاتھ ایک بہانہ لگ جائے گا لیکن جب تم ابراہیمی قبلہ کی طرف متوجہ ہو جاؤ گے تو ان کے لئے کوئی اعتراض کا موقع نہ رہے گا۔ حضرت ابوالعالیہؒ فرماتے ہیں۔ یہود کی یہ حجت تھی کہ آج ہمارے قبلہ کو قبلہ بنایا ہے۔ کل ہمارا مذہب بھی مان لیں گے لیکن جب آپ نے خدا کے حکم سے اصل قبلہ اختیار کر لیا تو ان کی اس ہوس پر پانی پھر گیا۔

پھر فرمایا' مگر جو اُن میں سے ضدی لوگ ہیں وہ نہیں مان سکتے۔ جو مشرکین اعتراضاً کہتے تھے کہ یہ شخص ملت ابراہیمی پر ہونے کا دعویٰ کرتا ہے اور پھر ابراہیمی قبلہ کی طرف نماز نہیں پڑھتا تو گویا انہیں جواب مل گیا کہ یہ نبی ہمارے احکام کا تبع ہے۔ پہلے ہم نے اپنی کمال حکمت سے انہیں بیت المقدس کی طرف منہ کرنے کا حکم دیا' جسے یہ بجا لائے۔ پھر ابراہیمی قبلے کی طرف پھر جانے کو کہا' جسے جان و دل سے بجا لائے۔ پس ہر حال میں ہمارے احکام کے ماتحت ہیں (صلی اللہ علیہ وسلم) پھر فرمایا ان ظالموں کے شبہ ڈالنے سے تم شک میں نہ پڑو۔ ان باغیوں کی سرکشی سے تم خوف نہ کرو۔ ان کے بے سروپا اعتراضات کی مطلق پروانہ کرو۔ ہاں میرے احکام کی مخالفت سے بالکل بچنا چاہئے۔ صرف مجھ ہی سے ڈرتے رہا کرو۔ قبلہ بدلنے میں جہاں یہ مصلحت تھی کہ لوگوں کی زبانیں بند ہو جائیں' وہاں یہ بھی بات تھی کہ میں چاہتا تھا کہ اپنی نعمت تم پر پوری کر دوں اور قبلہ کی طرح تمہاری کل شریعت کامل کر دوں اور تمہارے دین کو ہر طرح مکمل کر دوں اور اس میں یہ ایک راز بھی تھا کہ جس قبلہ سے اگلی امتیں

بہک گئیں' تم اس سے نہ ہو۔ ہم نے اس قبلہ کو خصوصیت کے ساتھ تمہیں عطا فرما کر تمہارا شرف اور تمہاری فضیلت و بزرگی تمام اُمتوں پر ثابت کر دی۔

كَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَيُزَكِّيْكُمْ وَ يُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۵۱﴾ فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوْا لِيْ وَلَا تَكْفُرُوْنِ ﴿۱۵۲﴾

جس طرح تم لوگوں میں ہم نے ایک عظیم الشان رسول کو بھیجا تم ہی میں سے ہماری آیات واحکام' پڑھ پڑھ کر تم کو سناتے ہیں اور (جہالت سے) تمہاری صفائی کرتے رہتے ہیں اور تم کو کتاب (الٰہی) اور فہم کی باتیں بتلاتے رہتے ہیں اور تم کو ایسی (مفید) باتیں تعلیم کرتے رہتے ہیں جن کی تم کو خبر بھی نہ تھی۔ ان (نعمتوں) پر مجھ کو یاد کرو میں تم کو (عنایت سے) یاد رکھوں گا اور میری (نعمت کی) شکر گزاری کرو اور میری ناسپاسی مت کرو۔

تحویل قبلہ بھی ایک انعام تھا اور اس سے بڑھ کر بعثت نبوی (ﷺ) ہے ☆

یہاں اللہ تعالیٰ اپنی بہت بڑی نعمت کا ذکر فرما رہا ہے کہ اس نے ہم میں ہماری جنس کا ایک نبی مبعوث فرمایا جو اللہ تعالیٰ کی روشن اور نورانی کتاب کی آیتیں ہمارے سامنے تلاوت فرماتا ہے اور رذیل عادتوں' نفس کی شرارتوں اور جاہلیت کے کاموں سے ہمیں روکتا ہے اور ظلمت کفر سے نکال کر نور ایمان کی طرف رہبری کرتا ہے اور کتاب و حکمت یعنی قرآن و حدیث ہمیں سکھاتا ہے اور وہ راز ہم پر کھولتا ہے' جو آج تک ہم پر نہیں کھلے تھے۔ پس آپ ﷺ کی وجہ سے وہ لوگ جن پر قرنوں سے جہل چھایا ہوا تھا۔ جنہیں صدیوں سے تاریکی نے گھیر رکھا تھا۔ جن پر مدتوں سے بھلائی کا پرتو بھی نہیں پڑا تھا' دنیا کی زبردست علامہ ہستیوں کے استاد بن گئے۔ وہ علم میں گہرے' تکلف میں تھوڑے' دلوں کے پاک اور زبان کے سچے بن گئے۔ دنیا کی حالت کا یہ انقلاب بجائے خود محمد ﷺ کی رسالت کی تصدیق کا ایک شاہد عدل ہے اور جگہ ارشاد ہے: ﴿لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ...... ﴾ (آل عمران:۱۶۴) ایسے اولوالعزم پیغمبر کی بعثت مؤمنوں پر ایک زبردست احسان ہے۔ اس نعمت کی قدر نہ کرنے والوں کو قرآن کہتا ہے: ﴿اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ بَدَّلُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ كُفْرًا...... ﴾ (ابراہیم:۲۸) کیا تو انہیں نہیں دیکھتا۔ جنہوں نے خدا کی اس نعمت کے بدلے کفر کیا اور اپنی قوم کو ہلاکت کے گڑھے میں ڈالا۔ یہاں نعمت اللہ سے مراد حضرت محمد ﷺ ہیں۔ اسی لئے اس آیت میں بھی اپنی نعمت کا ذکر فرما کر لوگوں کو اپنی یاد اور اپنے شکر کا حکم دیا کہ جس طرح میں نے یہ احسان تم پر کیا' تم بھی میرے ذکر اور شکر سے غفلت نہ کرو۔ موسیٰ علیہ السلام رب العزت سے عرض کرتے ہیں کہ خدایا تیرا شکر کس طرح کروں؟ ارشاد ہوتا ہے' مجھے یاد رکھ بھول نہیں۔ یاد شکر ہے اور بھول کفر ہے۔ حسن بصریؒ وغیرہ کا قول ہے کہ خدا کے یاد کرنے والے کو خدا بھی یاد کرتا ہے۔ اس کے شکر کرنے والے کو وہ زیادہ دیتا ہے اور ناشکرے کو عذاب کرتا ہے۔ بزرگانِ سلف سے مروی ہے کہ خدا سے پورا ڈرنا یہ ہے کہ اس کی اطاعت کی جائے۔ نافرمانی نہ کی جائے۔ اس کا ذکر کیا جائے غفلت نہ کی جائے۔ اس کا شکر کیا جائے' ناشکری نہ کی جائے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے سوال ہوتا ہے کہ کیا زانی' شرابی'

چور اور قاتل نفس کو بھی اللہ یاد کرتا ہوگا؟ فرمایا ہاں برائی سے۔ حسن بصری فرماتے ہیں' مجھے یاد کرو یعنی میرے ضروری احکام بجا لاؤ۔ میں تمہیں یاد کروں گا یعنی اپنی نعمتیں عطا فرماؤں گا۔ حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں' میں تمہیں بخش دوں گا اور اپنی رحمتیں تم پر نازل کروں گا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ خدا کا یاد کرنا تمہاری یاد خدا سے بہت بڑی چیز ہے۔ ایک حدیث قدسی[1] میں ہے' جو مجھے اپنے دِل میں یاد کرتا ہے میں بھی اسے اپنے دِل میں یاد کرتا ہوں اور جو مجھے کسی جماعت میں یاد کرتا ہے میں بھی اسے اس سے بہتر جماعت میں یاد کرتا ہوں۔ مسند احمد میں ہے کہ وہ جماعت فرشتوں کی ہے۔ جو شخص میری طرف ایک بالشت بڑھتا ہے' میں اس کی طرف ایک ہاتھ بڑھتا ہوں اور اگر تو اے ابن آدم میری طرف ایک ہاتھ بڑھے گا تو میں طرف دو ہاتھ بڑھوں گا اور اگر تو میری طرف چلتا ہوا آئے گا تو میں طرف دوڑتا ہوا آؤں گا۔ صحیح بخاری میں بھی یہ حدیث ہے حضرت قتادہ فرماتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت اس سے بھی زیادہ قریب ہے۔ پھر فرمایا شکر کرو ناشکری نہ کرو اور جگہ ہے: ﴿لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ...... ﴾ (ابراہیم: ۷) یعنی تیرے ربّ کی طرف سے عام آگہی ہے کہ اگر تم شکر کرو گے تو میں تمہیں برکت دوں گا اور اگر ناشکری کرو گے تو یاد رکھنا میرا عذاب سخت ہے۔ مسند احمد میں ہے کہ عمران بن حصین رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایک مرتبہ نہایت قیمتی حلہ پہنے ہوئے آئے اور فرمایا اللہ تعالیٰ جب کسی پر انعام کرتا ہے تو اس کا اثر اس پر دیکھنا چاہتا ہے۔

يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ۝۱۵۳ وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ۭ بَلْ اَحْيَاۗءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ۝۱۵۴

اے ایمان والو! صبر اور نماز سے سہارا حاصل کرو بلاشبہ اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ رہتے ہیں اور نماز پڑھنے والوں کے ساتھ تو بدرجۂ اُولیٰ اور جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل کیے جاتے ہیں ان کی نسبت یوں بھی مت کہو کہ وہ (معمولی مردوں کی طرح) مردے ہیں بلکہ وہ تو (ایک ممتاز) حیات کے ساتھ زندہ ہیں لیکن تم (ان حواس سے اس حیات کا) ادراک نہیں کر سکتے۔ O

شکر اور صبر دونوں کو دوش بدوش ذکر کرنے کی حکمت:

شکر کے بعد صبر کا بیان ہو رہا ہے اور ساتھ ہی نماز کا ذکر کر کے ان بڑے بڑے نیک کاموں کو ذریعہ نجات بنانے کا حکم ہو رہا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ انسان یا تو بھلائی میں ہوگا تو موقعہ شکر کا ہے یا برائی میں ہوگا تو یہ موقعہ صبر کا ہوگا۔ حدیث میں ہے کہ مؤمن کی کیا ہی اچھی حالت ہے کہ ہر کام میں اسکے لئے بھلائی ہی بھلائی ہے۔ اسے راحت ملتی ہے شکر کرتا ہے تو اجر پاتا ہے اور رنج پہنچتا ہے' صبر کرتا ہے تو اجر پاتا ہے۔ آیت میں اس کا بھی بیان ہوگا کہ مصیبتوں پر تحمل کرے اور انہیں ٹالنے کا ذریعہ صبر و صلوٰۃ ہے۔ جیسے اس سے پہلے گزر چکا کہ: ﴿وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ۭ وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَي الْخٰشِعِيْنَ﴾ (البقرہ ۴۵) صبر اور صلوٰۃ کے ساتھ استعانت چاہو۔ یہ ہے تو اہم کام لیکن ربّ کا ڈر رکھنے والوں پر بہت آسان ہے۔ حدیث میں

[1] اصطلاح محدثین میں قدسی اس حدیث کو کہتے ہیں جس میں رسول صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ سے روایت فرمائیں۔ لیکن حدیث قدسی کے پڑھنے سے نماز نہیں ہوسکتی یہی فرق قرآن و حدیث قدسی میں ہے۔ ۱۲ انظر۔

ہے۔ جب کوئی کام حضورﷺ کو غم میں ڈال دیتا تو آپ نماز شروع کر دیتے۔

صبر کی اقسام کا بیان ☆ صبر کی دو قسمیں ہیں: (۱) حرام اور گناہ کے کاموں کے ترک کرنے پر‘ (۲) اطاعت اور نیکی کے کاموں کے کرنے پر۔ یہ صبر پہلے صبر سے بڑا ہے۔ تیسری قسم صبر کی مصیبت اور دکھ درد پر۔ یہ بھی واجب ہے۔ جیسے عیبوں سے استغنا کرنا واجب ہے حضرت عبدالرحمنؒ فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری میں استقلال سے لگے رہنا گو نفس پر شاق گزرے۔ طبیعت کے خلاف ہو۔ جی نہ چاہے‘ ایک صبر تو یہ ہے۔ دوسرا صبر اللہ تعالیٰ کی نامرضی کے کاموں سے رک جانا‘ گو طبعی میلان اس طرف ہو۔ خواہش نفس اکسا رہی ہو۔ امام زین العابدینؒ فرماتے ہیں‘ قیامت کے دن ایک نداوی ندا کرے گا کہ صبر کرنے والے کہاں ہیں؟ اٹھیں اور بغیر حساب کتاب کے جنت میں چلے جائیں۔ کچھ لوگ اٹھ کھڑے ہوں گے اور جنت کی طرف بڑھیں گے۔ فرشتے انہیں اس حال میں دیکھ کر پوچھیں گے کہ کہاں جا رہے ہو؟ یہ کہیں گے جنت میں۔ وہ کہیں گے ابھی تو حساب بھی نہیں ہوا۔ کہیں گے ہاں حساب سے بھی پہلے۔ پوچھیں گے آخر آپ لوگ کون ہیں؟ جواب دیں گے ہم صابر لوگ ہیں۔ خدا کی فرمانبرداری میں لگے اور اس کی نافرمانی سے بچتے رہے۔ مرتے دم تک اس پر اور اس پر صبر کیا اور جمے رہے۔ فرشتے کہیں گے پھر تو ٹھیک ہے۔ بے شک تمہارا یہی بدلہ ہے اور اسی لائق تم ہو۔ جاؤ جنت میں مزے کرو۔ اچھے کام والوں کا اچھا ہی انجام ہے۔ یہی قرآن فرماتا ہے: ﴿اِنَّمَا یُوَفَّی الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَھُمْ بِغَیْرِ حِسَابٍ﴾ (الزمر: ۱۰) صابروں کو ان کا پورا پورا بدلہ بے حساب دیا جائے گا۔ حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں۔ صبر کے یہ معنی ہیں کہ خدا تعالیٰ کی نعمتوں کا اقرار کرے اور مصیبتوں کا بدلہ خدا کے ہاں جان کر ان پر ثواب طلب کرے۔ ہر گھبراہٹ‘ پریشانی اور کٹھن موقعہ پر استقلال اور نیکی کی امید پر وہ خوش نظر آئے۔ پھر فرمایا کہ شہداء کو مردہ نہ کہو۔ بلکہ وہ ایسی زندگی میں ہیں جسے تم نہیں سمجھ سکتے۔ انہیں حیات برزخی حاصل ہے اور وہاں وہ روزیاں پا رہے ہیں۔ صحیح مسلم شریف میں ہے کہ شہدا کی روحیں سبز رنگ کے پرندوں کے قالب میں ہیں اور جنت میں جس جگہ چاہیں‘ پھرتی ہیں۔ پھر ان قندیلوں میں آ کر بیٹھ جاتی ہیں۔ جو عرش کے نیچے لٹک رہی ہیں۔ ان کے ربّ نے ایک مرتبہ انہیں دیکھا اور ان سے یہ دریافت کیا کہ اب تم کیا چاہتے ہو؟ انہوں نے جواب دیا‘ خدایا ہمیں تو تُو نے وہ دے رکھا ہے جو کسی کو نہیں دیا۔ پھر ہمیں کس چیز کی ضرورت ہوگی؟ ان سے پھر یہی سوال ہوگا۔ جب انہوں نے دیکھا کہ اب ہمیں نہیں چھوڑا جاتا تو کہا کہ خدایا ہم چاہتے ہیں کہ تو ہمیں دوبارہ دنیا میں بھیج۔ ہم تیری راہ میں پھر جنگ کریں۔ پھر شہید ہو کر تیرے پاس آئیں اور شہادت کا دگنا درجہ پائیں۔ ربّ جل جلالہ نے فرمایا‘ یہ نہیں ہو سکتا‘ یہ تو میں لکھ چکا ہوں کہ کوئی بھی مرنے کے بعد دنیا کی طرف پلٹ کر نہیں جائے گا مسند احمد کی ایک اور حدیث میں ہے کہ مؤمن کی روح ایک پرندہ ہے جو جنت کے درختوں پر رہتی ہے اور قیامت کے دن وہ اپنے جسم کی طرف لوٹ آئے گی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر مؤمن کی روح وہاں زندہ ہے لیکن شہداء کی روح کو ایک طرح کی شرافت‘ کرامت‘ عزت اور عظمت حاصل ہے۔

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَیْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ؕ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِیْنَ ۝ الَّذِیْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِیْبَةٌ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ

وَاِنَّآ اِلَيۡهِ رٰجِعُوۡنَ ﴿۱۵۶﴾ اُولٰٓئِكَ عَلَيۡهِمۡ صَلَوٰتٌ مِّنۡ رَّبِّهِمۡ وَرَحۡمَةٌ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الۡمُهۡتَدُوۡنَ ﴿۱۵۷﴾

اور (دیکھو) ہم تمہارا امتحان کریں گے کسی قدر خوف سے اور فاقہ سے اور مال اور جان اور پھلوں کی کمی سے اور آپ ایسے صابرین کو بشارت سنا دیجئے جن کی یہ عادت ہے کہ جب ان پر کوئی مصیبت پڑتی ہے تو کہتے ہیں کہ ہم تو مع مال و اولاد حقیقتاً اللہ تعالیٰ ہی کی ملک ہیں اور ہم سب دنیا سے اللہ کے پاس جانے والے ہیں۔ ان لوگوں پر (جدا جدا) خاص خاص رحمتیں بھی ان کے پروردگار کی طرف سے ہوں گی اور (سب پر بالاشتراک) عام رحمت ہو گی اور یہی لوگ ہیں جن کی (حقیقت حال تک) رسائی ہو گئی۔ ○

صبر کے بعد مصائب اور آسمانی اُفتاد کا ذکر لطف سے خالی نہیں:

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ وہ اپنے بندوں کی آزمائش ضرور کر لیا کرتا ہے۔ کبھی ترقی اور بھلائی سے اور کبھی تنزل اور برائی سے۔ جیسے فرماتا ہے: ﴿وَلَنَبۡلُوَنَّكُمۡ حَتّٰى نَعۡلَمَ الۡمُجٰهِدِيۡنَ مِنۡكُمۡ وَالصّٰبِرِيۡنَ...... ﴾ (محمد: ۳۱) یعنی ہم آزما کر مجاہدوں اور صبر کرنے والوں کو معلوم کریں گے اور جگہ ہے: ﴿فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الۡجُوۡعِ وَالۡخَوۡفِ...... ﴾ (النحل: ۱۱۲) مطلب یہ ہے کہ تھوڑا سا خوف کچھ بھوک' کچھ مال کی کمی کچھ جانوں کی کمی' یعنی اپنوں اور غیروں کی' خویش و اقارب کی' دوست احباب کی موت' کبھی پھلوں اور پیداوار کے نقصان وغیرہ سے اللہ تعالیٰ اپنی بندوں کو آزما لیتا ہے۔ صبر کرنے والوں کو نیک اجر' اور اچھا بدلہ عنایت فرماتا ہے اور بے صبری' جلد بازی اور نا اُمیدی کرنے والوں پر اس کے عذاب اُتر آتے ہیں۔ بعض سلف سے منقول ہے کہ یہاں خوف سے مراد اللہ تعالیٰ کا ڈر ہے۔ بھوک سے مراد روزوں کی بھوک ہے۔ مال کی کمی سے مراد زکوٰۃ کی ادائیگی ہے۔ جان کی کمی سے مراد بیماریاں ہیں۔ پھلوں سے مراد اولاد ہے لیکن یہ تفسیر ذرا غور طلب ہے۔ واللہ اعلم۔

اب بیان ہو رہا ہے کہ جن صبر کرنے والوں کی خدا کے ہاں قدر ہے' وہ کون لوگ ہیں۔ پس فرماتا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں' جو تنگی اور مصیبت کے وقت اِنَّا لِلّٰهِ پڑھ لیا کرتے ہیں اور اس بات سے اپنے دل کو تسلی دے لیا کرتے ہیں کہ وہ خدا کی ملکیت ہیں اور جو انہیں پہنچا ہے وہ خدا کی طرف سے ہے اور ان میں جس طرح وہ چاہے تصرف کرتا رہتا ہے اور پھر خدا کے ہاں اس کا بدلہ ہے' جہاں انہیں بالآخر جانا ہے۔ ان کے اس قول کی وجہ سے خدا کی نوازشیں اور الطاف ان پر نازل ہوتے ہیں۔ عذاب سے نجات ملتی ہے اور ہدایت بھی نصیب ہوتی ہے۔ امیر المؤمنین حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں' دو برابر کی چیزیں سلوات' رحمت اور ایک درمیان کی چیز یعنی ہدایت ان صبر کرنے والوں کو ملتی ہے۔ مسند احمد میں ہے' حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں' میرے خاوند حضرت ابو سلمہؓ ایک روز میرے پاس حضور ﷺ کی خدمت سے ہو کر آئے اور خوشی خوشی فرمانے لگے آج تو میں نے ایک ایسی حدیث سنی ہے کہ میں بہت ہی خوش ہوا ہوں۔ وہ حدیث یہ ہے کہ جس کسی مسلمان کو کوئی تکلیف پہنچے اور وہ کہے: اَللّٰهُمَّ اَجِرۡنِيۡ فِيۡ مُصِيۡبَتِيۡ وَاخۡلُفۡ لِيۡ خَيۡرًا مِّنۡهَا۔ یعنی خدایا مجھے اس مصیبت میں اجر دے اور مجھے اس سے بہتر بدلہ عطا فرما۔ تو اللہ تعالیٰ اسے اجر اور بدلہ ضرور ہی دیتا ہے۔ حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں میں نے اس دعا کو یاد کر لیا۔ جب حضرت ابو سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا انتقال ہوا تو میں نے اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيۡهِ رٰجِعُوۡنَ پڑھ کر پھر یہ دعا

بھی پڑھ لی۔ لیکن مجھے خیال آیا کہ بھلا ابو سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بہتر شخص کون مل سکتا ہے؟ جب میری عدت گزر چکی تو میں ایک روز ایک کھال کو دباغت دے رہی تھی جو آنحضور ﷺ لائے اور اندر آنے کی اجازت چاہی۔ میں نے اپنے ہاتھ دھو ڈالے' کھال رکھ دی اور حضور ﷺ سے اندر تشریف لانے کی درخواست کی اور آپ کو ایک گدی پر بٹھا دیا۔ آپ نے مجھ سے اپنا نکاح کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ میں نے کہا حضور ﷺ یہ تو میری خوش قسمتی کی بات ہے لیکن اول تو میں بڑی غیرت دار عورت ہوں' ایسا نہ ہو کہ حضور ﷺ کی طبیعت کے خلاف کوئی بات مجھ سے سرزد ہو جائے اور خدا کے ہاں عذاب ہو۔ دوسرے یہ کہ میں عمر رسیدہ ہوں۔ تیسرے بال بچوں والی ہوں۔ آپ ﷺ نے فرمایا سنو! ایسی بے جا غیرت اللہ تعالیٰ تمہاری دور کر دے گا اور عمر میں کچھ میں بھی چھوٹی عمر کا نہیں اور تمہارے بال بچے میرے ہی بال بچے ہیں۔ میں نے یہ سُن کر کہا' پھر حضور ﷺ مجھے عذر نہیں۔ چنانچہ میرا نکاح اللہ تعالیٰ کے نبی ﷺ سے ہو گیا اور مجھے اللہ تعالیٰ نے اس دعا کی برکت سے میرے میاں سے بہت ہی بہتر یعنی اپنا رسول ﷺ عطا فرمایا۔ (احمد) فالحمد اللہ۔

صحیح مسلم شریف میں بھی یہ حدیث باختلاف الفاظ روایت ہے مسند احمد میں حضرت علیؓ سے روایت ہے' کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ جس کسی مسلمان کو کوئی رنج و مصیبت پہنچے' اس پر گو زیادہ وقت گزر جائے۔ پھر اسے یاد آئے اور وہ اِنَّا لِلّٰہِ ..... پڑھے تو مصیبت کے صبر کے وقت جو اجر ملا تھا وہ اب بھی ملے گا۔ ابن ماجہ میں ہے' حضرت ابوسنان رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں' میں نے اپنے ایک بچے کو دفن کیا۔ ابھی میں اس کی قبر میں سے نہ نکلا تھا کہ ابو طلحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ خولانی نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے نکالا اور کہا سنو! میں تمہیں ایک خوشخبری سناؤں' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ ملک الموت سے دریافت کرتا ہے کہ تو نے میرے بندے کی آنکھوں کی ٹھنڈک اور اس کے کلیجے کا ٹکڑا چھین لیا' تو اس نے کیا کہا؟ وہ کہتے ہیں خدایا تیری تعریف کی اور انا للہ ...... پڑھا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے' اس کے لئے جنت میں ایک گھر بناؤ اور اس کا نام بیت الحمد رکھو۔

إِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِن شَعَآئِرِ اللّٰهِ ۖ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ أَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ أَن يَطَّوَّفَ بِهِمَا ۚ وَمَن تَطَوَّعَ خَيْرًا فَإِنَّ اللّٰهَ شَاكِرٌ عَلِيمٌ ﴿۱۵۸﴾

تحقیقاً صفا اور مروہ منجملہ یادگار (دین) خداوندی ہیں سو جو شخص حج کرے بیت (اللہ) کا یا (اس کا) عمرہ کرے۔ اس پر ذرا بھی گناہ نہیں۔ ان دونوں کے درمیان آمدورفت کرنے میں (جس کا نام سعی ہے) اور جو شخص خوشی سے کوئی امر خیر کرے حق تعالیٰ (اس کی بڑی) قدردانی کرتے ہیں (اور اس خیر کرنے والے کی نیت کا خلوص) خوب جانتے ہیں۔ ○

شعائرِ اسلامی کا ایک تذکرہ اور شانِ نزول ☆

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے حضرت عروہؓ دریافت کرتے ہیں کہ اس آیت سے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ طواف نہ کرنے میں کوئی حرج نہیں؟ آپ نے فرمایا: بھتیجے تم صحیح نہیں سمجھے۔ اگر یہ بیان مدنظر ہوتا تو اَنْ لَّا يَطَّوَّفَ بِهِمَا ہوتا۔ سنو! آیت شریف کا شانِ نزول یہ ہے کہ مشلل (جگہ کا نام ہے' مترجم) کے پاس مناۃ بت تھا۔ اسلام سے پہلے انصار اسے پوجتے تھے اور جو اس کے نام لبیک پکار لیتا وہ صفا مروہ کے طواف میں حرج جانتا تھا۔ اب بعد از اسلام ان لوگوں نے حضور ﷺ سے صفا

مروہ کے طواف کے حرج کے بارے میں سوال کیا تو یہ آیت اتری کہ اس میں کوئی حرج نہیں۔ پھر حضور ﷺ نے صفا مروہ کا طواف کیا۔ اس لئے مسنون ہوا اور کسی کے لئے مناسب نہ رہا کہ اسے ترک کردے۔ (بخاری و مسلم) ابوبکر بن عبدالرحمٰن نے جب یہ روایت سنی تو وہ کہنے لگے کہ بے شک یہ علمی بات ہے۔ میں نے تو اس سے پہلے یہ سنی ہی نہ تھی۔ بعض اہل علم فرمایا کرتے تھے کہ انصار نے کہا تھا کہ ہمیں بیت اللہ کے طواف کا حکم ہے۔ صفا مروہ کے طواف کا نہیں۔ اس پر یہ آیت اتری ممکن ہے کہ اس کے شانِ نزول یہ دونوں ہوں۔ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم صفا مروہ کے طواف کو جاہلیت کا کام جانتے اور اسلام کی حالت میں اس سے بچتے تھے۔ یہاں تک کہ آیت نازل ہوئی۔

ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ ان دونوں پہاڑیوں کے درمیان بہت سے بت تھے اور شیاطین رات بھر اس کے درمیان گھومتے رہتے تھے۔ اسلام کے بعد لوگوں نے حضور ﷺ سے یہاں کے طواف کے بارے میں دریافت کیا۔ جس پر یہ آیت اتری۔ اساف بت صفا پر تھا اور نائلہ مروہ پر۔ مشرک لوگ انہیں چھوتے اور چومتے تھے۔ اسلام کے بعد لوگ اس سے الگ ہو گئے لیکن یہ آیت اتری' جس سے یہاں کا طواف ثابت ہوا۔ سیرت محمد بن اسحاق میں ہے کہ اساف اور نائلہ دو مرد و عورت تھے ان بدکاروں نے کعبہ میں زنا کیا۔ خدا نے انہیں پتھر بنا دیا۔ قریش نے انہیں کعبہ کے باہر رکھ دیا تا کہ لوگوں کو عبرت ہو لیکن کچھ زمانہ کے بعد ان کی عبادت شروع ہو گئی اور صفا مروہ پر لا کر نصب کر دیئے گئے اور ان کا طواف شروع ہو گیا۔ صحیح مسلم شریف کی ایک طویل حدیث میں ہے کہ آنحضرت ﷺ جب بیت اللہ شریف کا طواف کر چکے تو رکن کو چھوڑ کر باب الصفا سے نکلے اور یہ آیت تلاوت فرمائی۔ پھر فرمایا میں بھی شروع کروں گا۔ اس سے جس سے اللہ تعالیٰ نے شروع کیا یعنی صفا سے چل کر مروہ جاؤ۔ حضرت حبیبہ بنت ابی تجزاۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں۔ میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا۔ آپ صفا مروہ کا طواف کر رہے تھے۔ لوگ آپ کے آگے آگے تھے اور آپ ان کے پیچھے تھے۔ آپ قدرے دوڑ لگا رہے تھے اور اس کی وجہ سے آپ کو تہمد آپ کے ٹخنوں کے درمیان ادھر اُدھر ہو رہا تھا اور زبان مبارک سے فرماتے جاتے تھے' لوگو! دوڑ کر چلو' اللہ تعالیٰ نے تم پر سعی لکھ دی ہے۔ (مسند احمد) اسی کے ہم معنی ایک روایت اور بھی ہے۔

یہ حدیث دلیل ہے ان لوگوں کی جو صفا مروہ کی سعی کو حج کا رکن جانتے ہیں۔ جیسے حضرت امام شافعیؒ اور ان کے موافقین کا مذہب ہے[1]۔ امام احمدؒ سے بھی ایک روایت اسی طرح کی ہے۔ امام مالک کا مشہور مذہب بھی یہی ہے۔ بعض اسے واجب تو کہتے ہیں لیکن حج کا رکن نہیں مانتے۔ اگر عمداً یا سہواً کوئی شخص اسے چھوڑ دے تو ایک جانور ذبح کرنا پڑے۔ امام احمدؒ سے ایک روایت اسی طرح مروی ہے اور ایک اور جماعت بھی یہی کہتی ہے اور ایک قول میں یہ مستحب ہے۔ امام ابوحنیفہ' ثوری' شعبی' ابن سیرین یہی کہتے ہیں۔ حضرت انس' ابن عمر اور ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے یہی روایت ہے۔ امام مالکؒ سے عتبیہ میں یہی روایت ہے۔ ان کی دلیل: ﴿مَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا﴾ ہے لیکن پہلا قول ہی زیادہ راجح ہے۔ اس لئے کہ آنحضرت ﷺ نے خود صفا مروہ کا طواف فرمایا اور فرمایا احکام حج مجھ سے لو۔ پس آپ ﷺ نے اپنے اس حج میں جو کچھ کیا' وہ واجب ہو گیا۔ اس کا کرنا ضروری ہے۔ اگر کوئی کام کسی خاص وجوب سے ہٹ جائے تو اور بات ہے۔ واللہ اعلم۔

[1] محض شعائر کے الفاظ رکنیت ثابت نہیں ہو سکتی۔ مزدلفہ کو مشعر حرام کہا گیا ہے۔ لیکن مزدلفہ میں قیام اور رات گزارنا رکن حج نہیں ہے۔ نیز فلا جناح کے الفاظ سے رکنیت اور وجوب کے استدلالات خود ختم ہو جاتے ہیں۔

علاوہ ازیں حدیث میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تم پر سعی لکھ دی۔ یعنی فرض کر دی۔ غرض یہاں بیان ہو رہا ہے کہ صفا مروہ کا طواف بھی شرعی احکام میں سے ہے۔ جو کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بجا آوری حج کے لئے سکھائے تھے یہ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ اس کی اصل حضرت ہاجرہؓ کا یہاں سات چکر لگانا ہے۔ جب کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام انہیں ان کے چھوٹے بچے سمیت یہاں چھوڑ کر چلے گئے تھے اور ان کے پاس کھانا پینا ختم ہو چکا تھا اور ان کے بچے کی جان پر آ بنی تھی۔ تب حضرت ہاجرہ نہایت بیقراری بے بسی ڈر خوف اور اضطراب کے ساتھ ان پاک پہاڑوں کے درمیان اپنا دامن پھیلائے خدا سے بھیک مانگتی پھر رہی تھیں۔ یہاں تک کہ آپ کا غم وہم رنج وکرب تکلیف ودکھ دور ہوا۔ یہاں کے چکر کرنے والے حاجی کو بھی چاہئے کہ نہایت ذلت ومسکنت خشوع وخضوع سے یہاں چکر لگائے اور اپنی فقیری حاجت اور ذلت ومسکنت خدا کے سامنے پیش کرے اور اپنے دل کی صلاحیت اور اپنے حال کی ہدایت اور اپنے گناہوں کی بخشش طلب کرے اور نقائص اور عیبوں سے پاکیزگی اور نافرمانیوں سے نفرت چاہے اور ثابت قدمی نیکی فلاح اور بہبودی کی دعا مانگے اور اللہ تعالیٰ سے عرض کرے کہ گناہوں اور برائیوں اور تنگی کی راہ سے ہٹا کر کمال وغفران اور نیکی کی توفیق بخشے۔ جیسے کہ ہاجرہ کے حال کو اس مالک نے ادھر سے اُدھر کر دیا۔ پھر ارشاد ہوتا ہے کہ جو شخص اپنی خوشی سے نیکی میں زیادتی کرے۔ یعنی بجائے سات چکروں کے آٹھ نو کرے یا نفلی حج وعمرے میں بھی صفا مروہ کا طواف کرے اور بعضوں نے اسے عام رکھا ہے یعنی ہر نیکی میں زیادتی کرے۔ واللہ اعلم۔ پھر فرمایا اللہ تعالیٰ قدردان اور علم والا ہے۔ یعنی تھوڑے سے کام پر بڑا ثواب دیتا ہے اور جزا کی صحیح مقدار کو جانتا ہے نہ تو وہ کسی کے ثواب کو کم کرے نہ کسی پر ذرہ برابر ظلم کرے۔ ہاں نیکیوں کا ثواب بڑھا کر عطا فرماتا ہے اور اپنے پاس سے اجر عظیم عنایت فرمایا ہے۔ فالحمد والشکر للہ۔

إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَا أَنزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنَاتِ وَالْهُدَىٰ مِن بَعْدِ مَا بَيَّنَّاهُ لِلنَّاسِ فِي الْكِتَابِ ۙ أُولَٰئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللَّهُ وَيَلْعَنُهُمُ اللَّاعِنُونَ ﴿١٥٩﴾ إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا وَأَصْلَحُوا وَبَيَّنُوا فَأُولَٰئِكَ أَتُوبُ عَلَيْهِمْ ۚ وَأَنَا التَّوَّابُ الرَّحِيمُ ﴿١٦٠﴾ إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَمَاتُوا وَهُمْ كُفَّارٌ أُولَٰئِكَ عَلَيْهِمْ لَعْنَةُ اللَّهِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ ﴿١٦١﴾ خَالِدِينَ فِيهَا ۖ لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنظَرُونَ ﴿١٦٢﴾

جو لوگ اخفا کرتے ہیں ان مضامین کا جن کو ہم نے نازل کیا ہے جو کہ (اپنی ذات میں) واضح ہیں اور (دوسروں کو) ہادی ہیں۔ اس حالت کے بعد کہ ہم ان کو کتاب (الٰہی توراۃ وانجیل) میں عام لوگوں پر ظاہر کر چکے ہوں ایسے لوگوں پر اللہ تعالیٰ بھی لعنت فرماتے ہیں اور دوسرے بہتیرے لعنت کرنے والے بھی ان پر لعنت بھیجتے ہیں۔ مگر جو

لوگ توبہ کرلیں اور اصلاح کر دیں اور (ان مضامین کو) ظاہر کر دیں۔ تو ایسے لوگوں پر میں متوجہ ہوتا ہوں اور میری تو بکثرت عادت ہے توبہ قبول کرلینا اور مہربانی فرمانا۔ البتہ جو لوگ (ان میں سے) اسلام نہ لائیں اور اسی حالت غیر اسلام پر مر جائیں' ایسے لوگوں پر (وہ) لعنت (مذکورہ) اللہ تعالیٰ کی اور فرشتوں اور آدمیوں کی بھی سب کی۔ (ایسے طور پر برسا کرے گی) کہ وہ ہمیشہ ہمیشہ کو اس (لعنت) میں رہیں گے۔ ان سے عذاب ہلکا نہ ہونے پائے گا اور نہ (داخل ہونے کے قبل) ان کو مہلت دی جائے گی۔ ○

مسائل وحقائق کا کتمان بڑا ظلم ہے:

اِس میں زبردست وعید ہے۔ ان لوگوں کو جو اللہ تعالیٰ کی باتیں اور شرعی مسائل چھپالیا کرتے ہیں۔ اہل کتاب نے نعتِ نبی ﷺ کو چھپالیا تھا۔ جس پر ارشاد ہوتا ہے کہ حق کے چھپانے والے ملعون لوگ ہیں۔ جس طرح اس عالم کے لئے جو لوگوں میں خدا کی باتیں پھیلائے' ہر چیز استغفار کرتی ہے۔ یہاں تک کہ پانی کی مچھلیاں اور ہوا کے پرند بھی۔ اسی طرح ان لوگوں پر جو حق بات کو جانتے ہوئے گونگے اور بہرے بن جاتے ہیں۔ ہر چیز لعنت بھیجتی ہے۔

صحیح حدیث میں کہ حضور ﷺ نے فرمایا' جس شخص سے کسی شرعی امر کی نسبت سوال کیا جائے اور وہ اسے چھپالے' اسے قیامت کے دن آگ کی لگام پہنائی جائے گی۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں۔ اگر یہ آیت نہ ہوتی تو میں ایک حدیث بھی بیان نہ کرتا۔ حضرت براء بن عازب فرماتے ہیں' ہم حضور ﷺ کے ساتھ ایک جنازہ میں تھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ قبر میں کافر کی پیشانی پر اس زور سے ہتھوڑا مارا جاتا ہے کہ تمام جانور اس کا دھماکا سنتے ہیں سوائے جن وانس کے' پھر وہ سب اس پر لعنت بھیجتے ہیں۔ یہی معنی ہیں کہ ان پر خدا کی اور تمام لعنت کرنے والوں کی لعنت ہے۔ یعنی تمام جانداروں کی۔ حضرت عطاء فرماتے ہیں: لَاعِنُوْنَ سے مراد تمام جانور اور کل جن وانس ہیں۔ حضرت مجاہد فرماتے ہیں' جب خشک سالی ہوتی ہے۔ بارش نہیں برستی تو چوپائے جانور کہتے ہیں' یہ بنی آدم کے گنہگاروں کے گناہ کی شومی سے ہے۔ اللہ تعالیٰ بنی آدم کے گنہگاروں پر لعنت نازل کرے۔ بعض مفسرین کہتے ہیں۔ اس سے مراد فرشتے اور مؤمن لوگ ہیں۔ حدیث میں ہے عالم کے لئے ہر چیز استغفار کرتی ہے۔ یہاں تک کہ سمندر کی مچھلیاں بھی۔ اس آیت میں ہے کہ علم کے چھپانے والوں کو خدا لعنت کرتا ہے اور فرشتے اور تمام لوگ اور کل لعنت کرنے والے یعنی ہر بازبان اور ہر بے زبان' چاہے زبان سے کہے چاہے قرائن سے اور قیامت کے دن بھی سب چیزیں ان پر لعنت کریں گی۔ واللہ اعلم۔

پھر ان میں سے ان لوگوں کو خاص کرلیا جو اپنے اس فعل سے باز آجائیں اور اپنے اعمال کی پوری اصلاح کریں اور جو چھپایا تھا اسے ظاہر کر دیں۔ ان لوگوں کی توبہ وہ خدائے تواب ورحیم قبول فرمالیتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جو شخص کفر وبدعت کی طرف لوگوں کو بلانے والا ہو۔ وہ بھی جب سچے دل سے رجوع کرلے تو اس کی توبہ بھی قبول ہے۔ بعض روایتوں سے پتہ چلتا ہے کہ اگلی امتوں میں ایسے زبردست بدکاروں کی توبہ قبول نہ تھی لیکن نبی التوبہ اور نبی الرحمہ حضرت محمد ﷺ کی اُمت کے ساتھ یہ مہربانی مخصوص ہے۔

اِس کے بعد اُن لوگوں کا بیان ہو رہا ہے جو کفر کریں' لیکن توبہ نصیب نہ ہو اور کفر کی حالت میں مرجائیں کہ ان پر اللہ تعالیٰ کی فرشتوں کی اور تمام لوگوں کی لعنت ہے۔ یہ لعنت ان پر ہمیشہ کے لئے مسلّط ہو جاتی ہے اور قیامت تک ساتھ رہے گی

اور دوزخ کی آگ میں لے جائے گی۔ نہ تو عذاب میں کبھی کمی ہو نہ کبھی موقوف ہو بلکہ ہمیشہ سخت سے سخت عذاب ہوتے رہیں گے :نَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ عَذَابِ اللّٰہِ۔

حضرت ابو العالیہ اور حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہما فرماتے ہیں۔ قیامت کے دن کافر کو ٹھہرایا جائے گا۔ پھر اس پر اللہ تعالیٰ لعنت کرے گا۔ پھر فرشتے' پھر سب لوگ کافروں پر لعنت بھیجنے کے مسئلہ پر کسی کا اختلاف نہیں۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور آپ کے بعد کے ائمہ کرام سب کے سب قنوت وغیرہ میں کفار پر لعنت بھیجتے تھے لیکن کسی معین کافر پر لعنت کے بارے میں علماء کرام کا ایک گروہ کہتا ہے کہ یہ جائز نہیں۔ اس لئے کہ اس کے خاتمہ کا کسی کو علم نہیں اور اس آیت کی یہ قید کہ مرتے دم تک وہ کافر رہے دلیل ہے۔ کسی معین کافر پر لعنت نہ بھیجنے کی۔ ایک دوسری جماعت اس کی بھی قائل ہے۔ جیسے فقیہ ابوبکر ابن عربی مالکی لیکن ان کی دلیل ایک ضعیف حدیث ہے۔ بعضوں نے اس حدیث کو بھی دلیل میں پیش کیا ہے کہ حضور ﷺ کے پاس ایک شخص نشہ کی حالت میں لایا گیا اور اس پر بار بار حد لگائی گئی' تو ایک شخص نے کہا' اس پر خدا کی لعنت ہو' بار بار شراب پیتا ہے۔ یہ سن کر حضور ﷺ نے فرمایا' اس پر لعنت نہ بھیجو۔ یہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کو دوست رکھتا ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ جو شخص خدا اور رسول سے دوستی نہ رکھے۔ اس پر لعنت بھیجنی جائز ہے۔ واللہ اعلم۔ (لیکن یہ قیاس زیادہ صحیح نہیں' ۱۲)

ع ۱۹ / ۱۱ / ۳

وَاِلٰـهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۶۳﴾

اور (ایسا معبود) جو تم سب کا معبود بننے کا مستحق ہے وہ تو ایک ہی معبود (حقیقی) ہے۔ اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں (وہی) رحمٰن اور رحیم ہے۔ ○

اللہ عزوجل کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں ☆

یعنی خدائی میں وہ اکیلا ہے۔ اس کا کوئی ساجھی نہیں نہ اس جیسا کوئی ہے۔ وہ واحد اور احد ہے۔ وہ فرد اور صمد ہے۔ اس کے سوا عبادت کے لائق کوئی نہیں۔ وہ رحمٰن اور رحیم ہے۔ سورہ فاتحہ کے شروع میں ان دونوں ناموں کی پوری تفسیر گزر چکی ہے رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں اسم اعظم ان دونوں آیتوں میں ہے۔ ایک یہ آیت۔ دوسری آیت: ﴿الٓمّٓ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ﴾ (ابوداؤد) اس کے بعد اس توحید کی دلیل ہو رہی ہے۔ اسے بھی توجہ سے سنئے۔ فرماتا ہے۔

اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِيْ تَجْرِيْ فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِيْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ ۠ وَّتَصْرِيْفِ الرِّيٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ

يَّعْقِلُوْنَ ﴿١٦٤﴾

بلاشبہ آسمانوں کے اورزمینوں کے بنانے میں اور یکے بعد دیگرے رات اوردن کے آنے میں اور جہازوں میں جو کہ سمندر میں چلتے ہیں آدمیوں کے نفع کی چیز (اوراسباب) لے کراور (بارش کے) پانی میں جس کواللہ تعالیٰ نے آسمان سے برسایا پھراس سے زمین کوتروتازہ کیااس کے خشک ہوئے پیچھے اور ہرقسم کے حیوانات اس میں پھیلا دیئے اور ہواؤں کے بدلنے میں اورابر میں جوزمین وآسمان کے درمیان (مقیداورمعلق) رہتا ہے۔ دلائل (توحید کے موجود) میں ان لوگوں کے لئے جوعقل (سلیم) رکھتے ہیں۔ ○

کائنات کا ذرّہ ذرّہ ایک دلیل ہے:

مطلب یہ ہے کہ اس خدا کی خدائی اوراس کی توحید پر دلیل ایک تو یہ آسمان ہے جس کی بلندی' لطافت' کشادگی' جس کے ٹھہرے ہوئے اور چلنے پھرنے والے روشن ستارے تم دیکھ رہے ہو۔ پھر زمین کی پیدائش جو کثیف چیز ہے' جوتمہارے قدموں تلے بچھی ہوئی ہے جس میں بلند بلند چوٹیوں کے سربفلک پہاڑ ہیں' جس میں موجیں مارنے والے بے پایاں سمندر ہیں۔ جس میں انواع واقسام کے خوش رنگ بیل بوٹے ہیں' جس میں طرح طرح کی پیداوار ہوتی ہے۔ جس پر تم رہتے سہتے ہو اوراپنی مرضی کے مطابق آرام دہ مکانات بنا کر بستے ہواور جس سے صدہا طرح کا نفع اُٹھاتے ہو۔ پھر رات دن کا آنا جانا رات گئی دن آیا' دن گیا رات آ گئی۔ نہ وہ اس پر سبقت کرے نہ یہ اس پر۔ ہر ایک اپنے صحیح اندازے سے آئے اور جائے۔ کبھی کے دن بڑے' کبھی کی راتیں بڑی۔ کبھی دن کا کچھ حصہ رات میں جائے۔ کبھی رات کا دن میں آ جائے۔ پھر کشتیوں کو دیکھو جو خودتمہیں اورتمہارے مال اسباب اورتجارتی چیزوں کو لے کر سمندر میں ادھر اُدھر جاتی آتی رہتی ہیں۔ اس ملک والے اس ملک والوں سے اوراُس ملک والے اس ملک والوں سے رابطہ اور لین دین کر سکتے ہیں یہاں کی چیزیں وہاں اور وہاں کی چیزیں یہاں پہنچ سکتی ہیں۔

پھر اللہ تعالیٰ کا اپنی رحمتِ کاملہ سے بارش برسانا اوراس سے مردہ زمین کو زندہ کر دینا' اس سے اناج اور کھیتیاں پیدا کر دینا' چوطرف ریل پیل کر دینا' زمین میں مختلف قسم کے چھوٹے بڑے کارآمد جانوروں کو پیدا کرنا' ان سب کی حفاظت کرنا' انہیں روزیاں پہنچانا' ان کے لئے سونے' بیٹھنے' چرنے چگنے کی جگہ تیار کرنا' ہواؤں کو پُروا پچھوا (پورب پچھم) چلانا' ضرورت کی جگہ برسانا وغیرہ' یہ سب قدرت خدا تعالیٰ کی نشانیاں ہیں جن سے عقل منداپنے خدا تعالیٰ کے وجوداوراس کی وحدانیت کو پا لیتے ہیں اورزمین آسمان کی پیدائش میں غوروفکر سے کام لیتے ہیں اور کہتے ہیں' اے رب ہمارے تو نے انہیں بے کار نہیں بنایا۔ تیری ذات پاک ہے تو ہمیں جہنم کے عذاب سے بچا۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں' کہ قریش رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے اور کہنے لگے آپ اللہ تعالیٰ سے دعا کیجئے کہ وہ صفا پہاڑ کو سونے کا بنا دے۔ ہم اس سے گھوڑے اور ہتھیار وغیرہ خریدیں اورآپ کا ساتھ دیں اور ایمان بھی لائیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا پختہ وعدہ کرتے ہو؟ انہوں نے کہا پختہ وعدہ ہے۔ آپ ﷺ نے اللہ سے دعا کی۔ حضرت جبریل علیہ السلام آئے اور فرمایا تمہاری دعا قبول تو ہے لیکن اگر پھر بھی یہ لوگ ایمان نہ لائے تو ان پر خدا تعالیٰ کا وہ عذاب آئے گا جو آج سے پہلے کسی پر نہ آیا ہو۔ آپ کانپ اٹھے اور عرض کرنے لگے نہیں خدایا' تو انہیں یوں ہی رہنے دے۔ میں انہیں تیری طرف بلاتا رہوں گا۔ کیا عجب آج نہیں کل اور کل نہیں پرسوں ان میں سے تیری

طرف جھک جائے۔ اس پر یہ آیت اُتری کہ اگر انہیں قدرت کی نشانیاں دیکھنی ہیں تو کیا یہ نشانیاں کچھ کم ہیں؟ اس کے علاوہ ایک اور شانِ نزول یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ جب آیت ﴿وَاِلٰهُكُمْ......﴾ اُتری تو مشرکین کہنے لگے ایک خدا تمام جہان کا بندوبست کیسے کرے گا؟ اس پر یہ آیت نازل ہوئی کہ وہ خدا تعالیٰ اتنی بڑی قدرتوں والا ہے۔ بعض روایتوں میں ہے کہ خدا کا ایک ہونا سن کر انہوں نے دلیل طلب کی۔ جس پر یہ آیت نازل ہوئی اور نشان ہائے قدرت پر ظاہر کیے گئے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ ۭ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ۭ وَلَوْ يَرَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اِذْ يَرَوْنَ الْعَذَابَ ۙ اَنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعَذَابِ ﴿١٦٥﴾ اِذْ تَبَرَّاَ الَّذِيْنَ اتُّبِعُوْا مِنَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْا وَرَاَوُا الْعَذَابَ وَتَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْاَسْبَابُ ﴿١٦٦﴾ وَقَالَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْا لَوْ اَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَتَبَرَّاَ مِنْهُمْ كَمَا تَبَرَّءُوْا مِنَّا ۭ كَذٰلِكَ يُرِيْهِمُ اللّٰهُ اَعْمَالَهُمْ حَسَرٰتٍ عَلَيْهِمْ ۭ وَمَا هُمْ بِخٰرِجِيْنَ مِنَ النَّارِ ﴿١٦٧﴾

اور ایک آدمی وہ ہیں جو علاوہ خدا تعالیٰ کے اوروں کو بھی شریک (خدائی) قرار دیتے ہیں۔ ان سے ایسی محبت رکھتے ہیں جیسی محبت اللہ سے (رکھنا) ضروری ہے اور جو مومن ہیں ان کو (صرف) اللہ تعالیٰ کے ساتھ نہایت قوی محبت ہے اور کیا خوب ہوتا اگر یہ ظالم (مشرکین) جب (دنیا میں) کسی مصیبت کو دیکھتے تو اس کے وقوع میں غور کر کے یہ سمجھ لیا کرتے کہ سب قوت حق تعالیٰ ہی کو ہے اور یہ (سمجھ لیا کرتے) کہ اللہ تعالیٰ کا عذاب (آخرت میں اور بھی) سخت ہوگا۔ جب کہ وہ لوگ جن کے کہنے پر دوسرے چلتے تھے ان لوگوں سے صاف الگ ہو جائیں جیسا کے جوان کے کہنے پر چلتے تھے اور سب عذاب کا مشاہدہ کر لیں گے اور باہم ان میں جو تعلقات تھے اس وقت سب قطع ہو جائیں گے اور یہ تابع لوگ یوں کہنے لگیں گے کسی طرح ہم سب کو ذرا ایک دفعہ (دنیا میں) جانا مل جائے تو ہم بھی ان سے صاف الگ ہو جائیں کہ یہ ہم سے صاف الگ ہو بیٹھے۔ اللہ تعالیٰ یوں ہی ان کی بداعمالیوں کو خالی ارمان کے ان کو دکھلا دیں گے اور ان کو دوزخ سے نکلنا کبھی نصیب نہ ہوگا۔ ○

گناہِ عظیم ☆

اِس آیت میں مشرکین کا دینوی اور اُخروی حال بیان ہو رہا ہے۔ یہ خدا کا شریک مقرر کرتے ہیں۔ اس جیسا اوروں کو ٹھہراتے ہیں اور پھر ان کی محبت اپنے دل میں ایسی جماتے ہیں جیسی خدا تعالیٰ کی ہونی چاہئے حالانکہ وہ معبود برحق صرف ایک ہی ہے۔ وہ شریک اور ساجھی سے پاک ہے۔ صحیحین میں عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے۔ فرماتے ہیں' میں نے پوچھا یا رسول اللہ ﷺ سب سے بڑا گناہ کیا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا خدا تعالیٰ کے ساتھ شرک کرنا' حالانکہ پیدا اسی ایک

اکیلے نے کیا ہے۔ پھر فرمایا ایماندار اللہ تعالیٰ کی محبت میں بہت سخت ہوتے ہیں۔ ان کے دل عظمت الٰہی اور توحید ربانی سے معمور ہوتے ہیں۔ وہ نہ خدا کے سوا دوسرے کی ایسی محبت کریں۔ نہ کسی اور کی طرف التجا کریں' نہ دوسروں کی طرف جھکیں' نہ اس کی پاک ذات کے ساتھ کسی کو شریک کریں۔ پھر ان مشرکین کو جو اپنی جانوں پر بوجہ شرک کے ظلم کرتے ہیں' عذابوں کی خبر پہنچاتا ہے کہ اگر یہ لوگ عذابوں کو دیکھ لیتے تو یقین ہو جاتا کہ قدرتوں والا صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ تمام چیزیں اس کے ماتحت اور زیر فرمان ہیں اور اس کے عذاب بھی بڑے بھاری ہیں۔

جیسے اور جگہ ہے کہ اس دن نہ تو اس کے عذاب جیسا کوئی عذاب کر سکتا ہے نہ اس کی پکڑ جیسی کسی کی پکڑ ہو سکتی ہے۔ دوسرا مطلب یہ بھی ہے کہ اگر انہیں اس منظر کا علم ہوتا تو اپنی گمراہی اور شرک و کفر پر ہرگز نہ اڑتے۔ اس دن جن جن کو ان لوگوں نے اپنا پیشوا بنا رکھا ہے وہ سب ان سے الگ ہو جائیں گے۔ فرشتے کہیں گے' خدایا ہم ان سے بیزار ہیں۔ یہ ہماری ہی عبادت نہیں کرتے تھے۔ خدایا تو پاک ذات ہے تو ہی ہمارا ولی ہے' یہ لوگ تو جنات کی عبادت کرتے تھے۔ انہیں پر ایمان رکھتے تھے' اسی طرح جنات بھی ان سے بیزاری کا اعلان کریں گے اور صاف صاف انکار کر لیں گے۔ قرآن میں یہ بھی ہے کہ جن جن کی لوگ عبادت کرتے تھے وہ سب کے سب قیامت کے دن: ﴿سَيَكْفُرُوْنَ بِعِبَادَتِهِمْ وَيَكُوْنُوْنَ عَلَيْهِمْ ضِدًّا﴾ (مریم ۸۲) ان کی عبادت سے انکار کریں گے اور ان کے دشمن بن بیٹھے گے۔ حضرت خلیل اللہ علیہ السلام کا فرمان ہے: ﴿اِنَّمَا اتَّخَذْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْثَانًا......﴾ (العنکبوت: ۲۵) تم نے خدا کے سوا بتوں کی محبت دل میں بٹھا کر ان کی پوجا شروع کر دی ہے۔ قیامت کے دن وہ تمہاری عبادت کا انکار کریں گے اور آپس میں ایک دوسرے پر لعنت بھیجیں گے اور تمہارا ٹھکانا جہنم ہوگا اور تمہارا مددگار کوئی نہ ہوگا اور یہ بھی ارشاد ہے کہ: ﴿وَلَوْ تَرٰٓى اِذِ الظّٰلِمُوْنَ......﴾ (سبا: ۳۱) یعنی یہ ظالم ربّ کے سامنے کھڑے ہوں گے اور اپنے پیشواؤں سے کہہ رہے ہوں گے کہ اگر تم نہ ہوتے تو ہم ایماندار بن جاتے۔ وہ جواب دیں گے' کیا ہم نے تمہیں خدا پرستی سے روکا؟ حقیقت یہ ہے کہ تم خود مجرم تھے۔ وہ کہیں گے تمہاری دن رات کی مکاریاں' تمہارے کفر یہ احکام' تمہاری شرک کی تعلیم نے ہمیں پھانس لیا۔ اب سب کو ندامت ہوگی اور ان کی گردنوں میں ان کے اعمال کے بدلے طوق ہوں گے اور جگہ ہے کہ اس دن شیطان بھی کہے گا: ﴿اِنَّ اللّٰهَ وَعَدَكُمْ وَعْدَ الْحَقِّ......﴾ (ابراہیم: ۲۲) یعنی خدا کا وعدہ تو سچا تھا اور میں تمہیں جو سبز باغ دکھا رہا تھا وہ محض دھوکہ تھا تم پر میرا کوئی زور تو تھا ہی نہیں مگر میں نے تمہیں کہا' تم نے منظور کر لیا۔ اب مجھے ملامت کرنے سے کیا فائدہ؟ اپنی جانوں کو لعنت ملامت کرو۔ نہ میں تمہاری فریاد رسی کر سکوں گا نہ تم میری۔ میں تمہارے شرک سے انکاری ہوں۔ جان لو کہ ظالموں کے لئے دردناک عذاب ہے۔

پھر فرمایا کہ وہ عذاب دیکھ لیں گے اور تمام اسباب منقطع ہو جائیں گے۔ نہ کوئی بھاگنے کی جگہ رہے گی نہ چھٹکارے کی کوئی صورت نظر آئے گی۔ دوستیاں کٹ جائیں گی اور رشتے ٹوٹ جائیں گے۔ بلا دلیل باتیں ماننے والے اور بے وجہ اعتقاد رکھنے والے اور پوجا پاٹ اور اطاعت کرنے والے جب اپنے پیشواؤں کو اس طرح بری الذمہ ہوتے ہوئے دیکھیں گے تو نہایت حسرت و یاس سے کہیں گے کہ اگر ہم دنیا میں پھر جائیں تو ہم بھی ان سے ایسے ہی بیزار ہو جائیں جیسے یہ ہم سے ہوئے نہ ان کی طرف التفات کریں نہ ان کی باتیں مانیں نہ انہیں شریک خدا سمجھیں۔ بلکہ اللہ واحد کی خالص عبادت کریں حالانکہ درحقیقت اگر بالفرض یہ لوٹائے بھی جائیں تو وہی کریں گے جو اس سے پہلے کرتے تھے۔ جیسے فرمایا: ﴿لَوْ رُدُّوْا لَعَادُوْا لِمَا

نُهُوْا عَنْهُ﴾ (الانعام:۲۸) اسی لئے یہاں فرمایا' انہیں اللہ تعالیٰ ان کے کرتوت اسی طرح دکھائے گا۔ ان پر حسرت وافسوس ہے یعنی اعمال نیک جو تھے وہ ضائع ہو گئے۔ جیسے اور جگہ ہے: ﴿وَقَدِمْنَآ اِلٰى مَا عَمِلُوْا......﴾ (الفرقان:۲۳) اور جگہ ہے: ﴿اَعْمَالُهُمْ كَرَمَادِ...... ﴾ (ابراہیم:۸۱) اور جگہ ہے: ﴿اَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍ......﴾ (النور:۳۹) یعنی ان کے اعمال برباد ہیں۔ ان کے اعمال کی مثال راکھ کی طرح ہیں جسے تند ہوائیں اڑائیں۔ ان کے اعمال ریت کی طرح ہیں جو دور سے پانی دکھائی دیتا ہے مگر پاس جاؤ تو ریت کا تودا ہے۔ پھر فرماتا ہے کہ یہ لوگ آگ سے نکلنے والے نہیں۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ كُلُوْا مِمَّا فِى الْاَرْضِ حَلٰلًا طَيِّبًا ۖ وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ؕ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۱۶۸﴾ اِنَّمَا يَاْمُرُكُمْ بِالسُّوْٓءِ وَالْفَحْشَآءِ وَاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۶۹﴾

اے لوگو جو چیزیں زمین میں موجود ہیں ان میں سے (شرعی) حلال پاک چیزوں کو کھاؤ (برتو) اور شیطان کے قدم بقدم مت چلو فی الواقع وہ تمہارا صریح دشمن ہے۔ وہ تم کو انہیں باتوں کی تعلیم کرے گا جو کہ شرعاً بری اور گندی ہیں اور یہ (بھی تعلیم کرے گا) کہ اللہ کے ذمہ وہ باتیں لگاؤ کہ جس کی تم سند بھی نہیں رکھتے ۔O

رزاقِ عالم کون ہے؟ ایک سوال کا جواب:

اُوپر چونکہ توحید کا بیان ہوا تھا۔ اس لئے یہاں یہ بیان ہو رہا ہے کہ تمام مخلوق کا روزی رساں بھی وہی ہے' فرماتا ہے کہ میرا یہ احسان بھی نہ بھلاؤ کہ میں نے تم پر پاکیزہ چیزیں حلال کیں۔ جو تمہیں لذیذ اور مرغوب ہیں جو نہ جسم کو ضرر پہنچائیں نہ صحت کو نہ عقل و ہوش کو میں تمہیں روکتا ہوں کہ شیطان کی راہ نہ چلو۔ جس طرح اور لوگوں نے اس کی چال چل کر بعض حلال چیزیں اپنے اوپر حرام کر لیں۔ صحیح مسلم میں ہے رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں کہ پروردگار عالم فرماتا ہے' میں نے جو مال اپنے بندوں کو دیا ہے اسے ان کے لئے حلال کر دیا ہے۔ میں نے اپنے بندوں کو موحد پیدا کیا ہے مگر شیطان نے اس دین حنیف سے انہیں ہٹا دیا اور میری حلال کردہ چیزوں کو ان پر حرام کر دیا۔ حضور ﷺ کے سامنے جس وقت اس آیت کی تلاوت ہوئی تو حضرت سعد بن ابی وقاص ؓ نے کھڑے ہو کر کہا' حضور ﷺ میرے لئے دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ میری دعاؤں کو قبول فرمایا کرے۔ آپ ﷺ نے فرمایا' اے سعدؓ پاک چیزیں اور حلال لقمہ کھاتے رہو۔ اللہ تعالیٰ تمہاری دعائیں قبول فرماتا رہے گا۔ قسم ہے اس خدا کی' جس کے ہاتھ میں میری جان ہے' حرام لقمہ جو انسان اپنے پیٹ میں ڈالتا ہے اس کی شومی کی وجہ سے چالیس دن اس کی عبادت قبول نہیں ہوتی۔ جو گوشت پوست حرام سے پلا' وہ جہنمی ہے۔ پھر فرمایا کہ شیطان تمہارا کھلا دشمن ہے۔

جیسے اور جگہ ہے کہ شیطان تمہارا دشمن ہے تم بھی اسے دشمن سمجھو۔ اس کی اور اس کے گروہ کی تو عین تمنا ہے کہ لوگوں کو عذاب میں جھونکیں اور جگہ فرمایا: ﴿اَفَتَتَّخِذُوْنَهٗ وَذُرِّيَّتَهٗٓ اَوْلِيَآءَ......﴾ (الکہف:۵۰) کیا اسے اور اس کی اولاد کو اپنا دوست جانتے ہو حالانکہ حقیقتاً وہ تمہارا دشمن ہے۔ ظالموں کے لئے برا بدلہ ہے۔

شیطان اور اُس کی اطاعت ☆ ﴿خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ﴾ سے مراد خدا تعالیٰ کی ہر معصیت ہے۔ جس میں شیطان کا اغوا

ہوتا ہے۔ شعبی فرماتے ہیں ایک شخص نے نذر مانی کہ وہ اپنے لڑکے کو ذبح کرے گا حضرت بروق کے پاس جب یہ واقعہ پہنچا تو آپ نے فتویٰ دیا کہ وہ شخص ایک بھیڑ ذبح کر دے۔ یہ نذر ﴿خُطُوٰتِ الشَّیْطٰنِ﴾ سے ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہما ایک دن بکری کا کھر نمک لگا کر کھا رہے تھے۔ ایک شخص جو آپ کے پاس بیٹھا ہوا تھا وہ ہٹ کر دور جا بیٹھا۔ آپ نے فرمایا کھاؤ۔ اس نے کہا' میں نہیں کھاؤں گا۔ آپ نے فرمایا کیا روزے سے ہو؟ کہا نہیں' میں تو اسے اپنے اوپر حرام کر چکا ہوں۔ آپ نے فرمایا یہ شیطان کی راہ چلنا ہے۔ اپنی قسم کا کفارہ دو اور کھالو۔ ابو رافع کہتے ہیں' ایک دن میں اپنی بیوی سے ناراض ہوا تو وہ کہنے لگی کہ میں ایک دن یہودیہ ہوں' ایک دن نصرانیہ ہوں اور میرے تمام غلام آزاد ہیں۔ اگر تو اپنی بیوی کو طلاق نہ دے۔ اب میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے پاس مسئلہ پوچھنے آیا کہ اس صورت میں کیا کیا جائے؟ تو آپ نے فرمایا یہ شیطان کے قدموں کی پیروی ہے۔ پھر میں حضرت زینب بن سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے پاس گیا اور اس وقت مدینہ بھر میں ان سے زیادہ فقیہہ عورت کوئی نہ تھی۔ میں نے ان سے بھی یہ مسئلہ پوچھا۔ یہاں سے بھی یہی جواب ملا۔ عاصم اور ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے بھی یہی فتویٰ دیا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا فتویٰ ہے کہ جو قسم غصہ کی حالت میں کھائی جائے اور جو نذر ایسی حالت میں مانی جائے وہ شیطانی قدم کی تابعداری ہے۔ اس کا کفارہ قسم کے کفارے کے برابر دے۔ پھر فرمایا کہ شیطان تمہیں برے کاموں اور اس سے بھی بڑھ کر زنا کاری اور اس سے بڑھ کر خدا پر ان باتوں کی تہمت تراشی کو کہتا ہے' جن کا تمہیں علم نہ ہو۔ پس ہر کافر اور بدعتی اس میں داخل ہے۔ جو برائی کا حکم اور بدی کی طرف رغبت دلائے۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَآ اَلْفَيْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ؕ اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ شَيْـًٔا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ ﴿۱۷۰﴾ وَمَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا كَمَثَلِ الَّذِيْ يَنْعِقُ بِمَا لَا يَسْمَعُ اِلَّا دُعَآءً وَّنِدَآءً ؕ صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ﴿۱۷۱﴾

اور جب کوئی ان (مشرک) لوگوں سے کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو حکم بھیجا ہے' اس پر چلو تو کہتے ہیں کہ (نہیں) بلکہ ہم تو اسی (طریقہ) پر چلیں گے جن پر اپنے باپ دادا کو پایا ہے۔ کیا اگر چہ ان کے باپ دادا (دین کی) نہ کچھ سمجھ رکھتے ہوں اور نہ کسی آسمانی کتاب کی ہدایت رکھتے ہوں اور ان کافروں کی کیفیت (نافہمی میں) اس (جانور کی) کیفیت کے مثل ہے کہ ایک شخص ہے وہ ایسے جانور کے پیچھے چلا جا رہا ہے جو بجز بلانے اور پکارنے کے کوئی بات نہیں سنتا اسی طرح کفار بہرے ہیں گونگے ہیں اندھے ہیں سو سمجھتے کچھ نہیں۔ ○

یعنی ان کافروں اور مشرکوں سے کہا جاتا ہے کہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ کی پیروی کرو اور اپنی ضلالت و جہالت کو چھوڑ دو۔ تو وہ کہتے ہیں کہ ہم تو اپنے بڑوں کی راہ لگے ہوئے ہیں۔ جن چیزوں کی وہ پوجا پاٹ کرتے تھے۔ ہم بھی کر رہے ہیں اور کرتے رہیں گے۔ جس کے جواب میں قرآن کہتا ہے کہ وہ تو فہم و ہدایت سے غافل تھے۔ یہ آیت یہودیوں کے بارے میں اُتری پھر ان کی مثال دی کہ جس طرح چرنے چگنے والے جانور اپنے چرواہے کی کوئی بات صحیح طور سے سمجھ نہیں سکتے۔

صرف آواز کانوں میں پڑتی ہے اور کلام کی بھلائی برائی سے بے خبر رہتے ہیں۔ اسی طرح یہ لوگ ہیں۔ یہ مطلب بھی ہوسکتا ہے کہ جن جن کو یہ خدا کے سوا پوجتے ہیں اور ان سے اپنی حاجتیں طلب کرتے ہیں اور مرادیں مانگتے ہیں۔ وہ نہ سنتے ہیں نہ جانتے ہیں نہ دیکھتے ہیں نہ ان میں زندگی ہیں نہ انہیں کچھ احساس ہے۔ کافروں کی یہ جماعت حق کی باتوں کے سننے سے بہری ہے۔ حق کہنے سے بے زبان ہے۔ سیدھی راہ چلنے سے اندھی ہے۔ عقل وفہم سے دور ہے جیسے اور جگہ ہے: ﴿صُمٌّ وَّبُكْمٌ فِي الظُّلُمٰتِ﴾ (الانعام:۳۹) یعنی ہماری باتوں کو جھٹلانے والے بہرے گونگے اور اندھیرے میں ہیں جسے خدا چاہے گمراہ کرے اور جسے وہ چاہے سیدھی راہ لگادے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَاشْكُرُوْا لِلّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ﴿۱۷۲﴾ اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيْرِ وَمَاۤ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ ۚ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَاۤ اِثْمَ عَلَيْهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۷۳﴾

اے ایمان والو جو (شرع کی رُو سے) پاک چیزیں ہم نے تم کو مرحمت فرمائی ہیں۔ ان میں سے (جو چاہو) کھاؤ (برتو) اور حق تعالیٰ کی شکر گزاری کرو۔ اگر تم خاص انکے ساتھ غلامی کا تعلق رکھتے ہو۔ اللہ نے تو تم پر صرف حرام کیا ہے مردار کو اور خون کو (جو بہتا ہو) اور خنزیر کے گوشت کو (اسی طرح کے سب اجزاء کو بھی) اور ایسے جانور کو جو (بقصد تقرب) غیر اللہ کیلئے نامزد کر دیا ہو۔ پھر بھی جو شخص (بھوک سے بہت ہی) بے تاب ہو جائے بشرطیکہ نہ تو طالب لذت ہو اور نہ قدر حاجت سے تجاوز کرنے والا ہو تو اس شخص پر کچھ گناہ نہیں ہوتا۔ واقعی اللہ تعالیٰ ہے بڑا غفور ورحیم۔ ○

قبولیت کے لئے بعض اہم شرائط ☆

اس آیت میں اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو حکم دیتا ہے کہ تم پاک صاف اور حلال طیب چیزیں کھایا کرو اور میری شکر گزاری کرو۔ لقمہ حلال دعا اور عبادت کی قبولیت کا سبب ہے اور لقمۂ حرام عدم قبولیت کا۔ مسند احمد میں حدیث ہے رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں لوگو اللہ تعالیٰ پاک ہے وہ پاک چیز کو قبول فرماتا ہے۔ اس نے رسولوں کو اور ایمان والوں کو یہ حکم دیا کہ وہ پاک چیزیں کھائیں اور نیک اعمال کریں۔ فرمان ہے: ﴿يٰۤاَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ......﴾ (المؤمنون:۵۱) اور فرمایا: ﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ......﴾ آپ ﷺ نے فرمایا ایک شخص لمبا سفر کرتا ہے وہ پراگندہ بالوں والا غبار آلود ہوتا ہے۔ اپنے ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا کر دعا کرتا ہے اور گڑگڑا کر اللہ تعالیٰ کو پکارتا ہے لیکن اس کا کھانا پینا' لباس اور غذا سب حرام کی ہیں۔ اس لئے اس کی ایسے وقت کی ایسی دعا بھی قبول نہیں ہوتی۔[1]

[1] یعنی باوجودیکہ اس پریشانی اور بے سروسامانی کے عالم میں دعاؤں کے مقبول ہونے کے امکانات بہت زیادہ تھے۔ لیکن اکلِ حلال کے نہ ہونے کی وجہ سے دعا مقبول نہ ہوسکی۔

حرام اشیاء اور کھانوں کی کچھ تفصیل ☆ حلال چیزوں کا ذکر کرنے کے بعد پھر حرام چیزوں کا بیان ہو رہا ہے کہ تم پر مردار جانور جو اپنی موت آپ مر گیا ہو جسے شرعی طور پر ذبح نہ کیا گیا ہو حرام ہے خواہ کسی نے اس کا گلا گھونٹ دیا ہو یا لکڑی اور بھٹے سے مر گیا ہو یا کہیں سے گر پڑا ہو اور مر گیا ہو یا دوسرے جانوروں نے اپنے سینگ سے اسے ہلاک کیا ہو یا درندوں نے اسے مار ڈالا ہو۔ یہ سب میتہ میں داخل ہے اور حرام ہے لیکن اس میں پانی کے جانور مخصوص ہیں۔ وہ اگر خود بخود مر جائیں' تو بھی حلال ہیں' قرآن کہتا ہے: ﴿أُحِلَّ لَكُمْ صَيْدُ الْبَحْرِ وَطَعَامُهُ ...﴾ (المائدہ: ۹۶) اس کا پورا بیان اس آیت کی تفسیر میں آئے گا ان شاءاللہ تعالیٰ عنبر نامی جانور کا مرا ہوا ملنا اور صحابہ کا اسے کھانا پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی خبر ہونا اور آپ کا اسے جائز قرار دینا' یہ سب حدیث میں ہے۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ سمندر کا پانی پاک ہے اور کا مردہ حلال ہے۔ ایک اور حدیث میں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ دو مُردے اور دو خون ہم پر حلال ہیں۔ مچھلی اور ٹڈی' کلیجی اور تلی۔ سورہ مائدہ میں اس کا بیان تفصیلاً آئے گا۔ ان شاءاللہ۔

مسئلہ ☆ مردار جانور کا دودھ اور اس کے انڈے جو اس میں ہوں' نجس ہیں' امام شافعی کا یہی مذہب ہے۔ اس لئے کہ وہ بھی میت کا ایک جزو ہے۔ امام مالکؒ سے ایک روایت میں ہے کہ ہے تو وہ پاک' لیکن میت کے ملنے کی وجہ سے نجس ہو جاتی ہے۔ اسی طرح مردار کی کھیس (پیوسی) بھی مشہور مذہب میں ان بزرگوں کے نزدیک ناپاک ہے گو اس میں اختلاف بھی ہے۔ صحابہ کا مجوسیوں کی پنیر کھانا گو ان پر بطور اعتراض کے وارد ہو سکتا ہے۔ مگر اس کا جواب قرطبی نے یہ دیا ہے کہ دودھ بہت ہی کم ہوتا ہے اور کوئی بہنے والی ایسی تھوڑی سی چیز جب زیادہ میں پڑ جائے تو کوئی حرج نہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے گھی' پنیر اور گورخر کے بارے میں سوال ہوتا ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں' حلال وہ ہے' جسے خدا نے اپنی کتاب میں حلال فرمایا اور حرام وہ ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں حرام کیا اور جس کا بیان نہیں وہ سب معاف ہیں۔ پھر فرمایا تم پر سؤر کا گوشت بھی حرام ہے۔ خواہ اسے ذبح کیا ہو خواہ وہ خود مر گیا ہو۔ سؤر کی چربی کا بھی وہی حکم ہے۔ اس لئے کہ چونکہ اکثر گوشت ہی ہوتا ہے اور چربی گوشت کے ساتھ ہی ہوتی ہے۔ پس جب گوشت حرام ہوا تو چربی بھی حرام ہوئی۔ دوسرے اس لئے بھی کہ گوشت میں ہی چربی ہوتی ہے اور قیاس کا اقتضا بھی یہی ہے پھر فرمایا کہ جو چیز اللہ کے سوا اور کسی کے نام پر مشہور کی جائے وہ بھی حرام ہے۔ جاہلیت کے زمانہ میں کافر لوگ اپنے معبودانِ باطل کے نام پر جانور ذبح کرتے تھے جنہیں اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیا۔ ایک مرتبہ ایک عورت نے گڑیا کے نکاح پر ایک جانور ذبح کیا تو حسن بصری نے فتویٰ دیا کہ اسے نہ کھانا چاہئے' اس لئے کہ وہ ایک تصویر کے لئے ذبح کیا گیا ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے سوال ہوتا ہے کہ عجمی لوگ جو اپنی تہوار اور عید کے موقع پر جانور ذبح کرتے ہیں اور مسلمانوں کو بھی اس میں سے ہدیہ بھیجتے ہیں' ان کا گوشت کھانا چاہئے یا نہیں؟ تو فرمایا اس دن کی عظمت کے لئے جو جانور ذبح کیا جائے اسے نہ کھاؤ۔ ہاں ان کے درختوں کے پھل کھاؤ۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ضرورت اور حاجت کے وقت جبکہ کچھ اور کھانے کو نہ ملے' ان حرام چیزوں کا کھانا مباح کیا اور فرمایا جو شخص بے بس ہو جائے اور وہ باغی سرکش اور حد سے بڑھ جانے والا نہ ہو۔ اس پر ان چیزوں کے کھانے میں گناہ نہیں۔ اللہ تعالیٰ بخشش کرنے والا مہربان ہے۔

باغی کی تفسیر اور تشریحی اقوال ☆ باغٍ اور عادٍ کی تفسیر میں حضرت مجاہد فرماتے ہیں۔ ڈاکو' راہزن' مسلمان بادشاہ پر چڑھائی کرنے والا۔ سلطنتِ اسلام کا مخالف اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں سفر کرنے والا مراد ہے۔ انہیں اضطرار کے وقت بھی حرام چیزیں حرام ہی رہتی ہیں۔ غَيْرَ بَاغٍ کی تفسیر حضرت مقاتل بن حبان یہ بھی کرتے ہیں کہ وہ اسے حلال سمجھنے والا نہ ہو۔ اس میں لذت اور مزہ کا خواہش مند نہ ہو' اسے بھون بھان کر اسے لذیذ بنا کر اچھا پکا کر نہ کھائے۔ بلکہ جیسا تیسا جان بچانے

کے لئے کھالے اور اگر ساتھ لے تو اتنا کہ زندگی کے ساتھ حلال چیز کے ملنے تک باقی رہ جائے۔ جب حلال چیز مل گئی اسے پھینک دے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں اسے خوب پیٹ بھر کر نہ کھائے۔ حضرت مجاہد فرماتے ہیں جو شخص اس کے کھانے کے لئے مجبور کر دیا جائے اور بے اختیار ہو جائے اس کا بھی یہی حکم ہے۔

مسئلہ ☆ ایک شخص بھوک کے مارے بے بس ہو گیا ہے۔ اسے ایک مردار جانور نظر آیا اور کسی دوسرے کی حلال چیز بھی دکھائی دی۔ جس میں نہ رشتہ کا ٹوٹنا ہے نہ ایذا دہی تو اسے دوسرے کی چیز کو کھا لینا چاہئے مردار نہ کھائے۔ پھر آیا اس چیز کی قیمت یا وہ چیز اس کے ذمے رہے گی یا نہیں اس میں دو اقوال ہیں۔ ایک یہ کہ رہے گی۔ دوسرے یہ کہ نہ رہے گی۔ نہ رہنے والے قول کی تائید میں یہ حدیث ہے جو ابن ماجہ میں ہے۔ حضرت عباد بن شرحبیل غزی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں ہمارے یہاں قحط سالی کی شدت ہوئی۔ میں مدینہ گیا اور ایک کھیت میں سے کچھ بالیں توڑ کر چھیل کر دانے چبانے لگا اور تھوڑی سی بالیں اپنی چادر میں باندھ کر چلا۔ کھیت والے نے دیکھ لیا اور مجھے پکڑ کر مارا پیٹا اور میری چادر چھین لی۔ میں آنحضرت ﷺ کے پاس گیا اور آپ سے واقعہ عرض کیا تو آپ نے اس شخص کو کہا اس بھوکے کو نہ تو تو نے کھانا کھلایا نہ اس کے لئے کوئی اور کوشش کی۔ نہ اسے کچھ سمجھایا یا سکھایا۔ یہ بے چارہ بھوکا تھا نادان تھا جاؤ اس کا کپڑا واپس کر دو اور ایک وسق یا آدھا وسق غلہ اسے دے دو ایک وسق چار من کے قریب ہوتا ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ درختوں میں لگے ہوئے پھلوں کی نسبت حضور علیہ السلام سے پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا جو حاجت مند شخص یہیں کچھ کھالے لے کر نہ جائے اس پر کچھ جرم نہیں۔

حضرت مجاہد فرماتے ہیں مطلب آیت کا یہ ہے کہ اضطرار اور بے بسی کے وقت اتنا کھا لینے میں کوئی مضائقہ نہیں کہ بے بسی اور اضطرار ہٹ جائے۔ یہ بھی مروی ہے کہ تین لقموں سے زیادہ نہ کھائے۔ غرض ایسے وقت میں خدا کی مہربانی اور نوازش سے یہ حرام اس کے لئے حلال ہے۔

ایک اہم مسئلہ ☆ حضرت مسروق فرماتے ہیں اضطرار کے وقت بھی جو شخص حرام چیز نہ کھائے اور مر جائے وہ جہنمی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ایسے وقت ایسی چیز کھانی ضروری ہے نہ کہ صرف رخصت ہی ہو۔ یہی بات زیادہ صحیح ہے جیسے بیمار کا روزہ چھوڑ دینا وغیرہ۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ الْكِتٰبِ وَ يَشْتَرُوْنَ بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۙ اُولٰٓئِكَ مَا يَاْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ اِلَّا النَّارَ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَلَا يُزَكِّيْهِمْ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۷۴﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى وَالْعَذَابَ بِالْمَغْفِرَةِ ۚ فَمَآ اَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ ﴿۱۷۵﴾ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ نَزَّلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ ۗ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِي الْكِتٰبِ لَفِيْ شِقَاقٍ بَعِيْدٍ ﴿۱۷۶﴾ ع ۲۱ ۹ ۵

اِس میں کوئی شبہ نہیں کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کی بھیجی ہوئی کتاب (کے مضامین) کا اخفا کرتے ہیں اور اس کے معاوضہ میں (دنیا کا) متاعِ قلیل وصول کرتے ہیں۔ ایسے لوگ اور کچھ شبہ نہیں اپنے شکم میں آگ (کے انگارے) بھر رہے ہیں اور اللہ تعالیٰ ان سے نہ تو قیامت میں (لطف کے ساتھ) کلام کریں گے اور نہ (گناہ معاف کر کے) ان کی صفائی کریں گے اور ان کو سزائے درد (ناک ہوگی)۔ یہ ایسے لوگ ہیں جنہوں نے (دنیا میں تو) ہدایت چھوڑ کر ضلالت اختیار کی اور (آخرت میں) مغفرت چھوڑ کر عذاب (سر پر لیا) سو دوزخ کے لئے کیسے باہمت ہیں۔ یہ (ساری مذکورہ) سزائیں (ان کو) اس وجہ سے ہیں کہ حق تعالیٰ نے اس کتاب کو ٹھیک ٹھیک بھیجا تھا اور جو لوگ (ایسی) کتاب میں بے راہی کریں وہ بڑی دور کے خلاف میں ہوں گے۔ ○

جاہ و منزلت کے ناپائیدار نقوش اسلام قبول کرنے سے مانع بنے ☆

یعنی جو یہود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات کی آیتوں کو جو تورات میں ہیں اور اس کے باعث اپنی آؤ بھگت عرب میں کراتے ہیں اور عوام سے تحفے اور ہدیے سمیٹتے رہتے ہیں اور اس دنیائے فانی کے بدلے اپنی آخرت خراب کر رہے ہیں۔ انہیں ڈر لگا ہوا ہے کہ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی سچائی اور آپ کے دعوے کی تصدیق کی آیتیں جو تورات میں ہیں لوگوں پر ظاہر ہو گئیں۔ تو لوگ آپ کے ماتحت ہو جائیں گے اور انہیں چھوڑ دیں گے۔ اس خوف سے وہ ہدایت و مغفرت کو چھوڑ بیٹھے اور ضلالت و عذاب پر خوش ہو گئے۔ اس باعث دنیا اور آخرت کی بربادی ان پر نازل ہوئی۔ آخرت کی رسوائی تو ظاہر ہے لیکن دنیا میں بھی لوگوں پر ان کا مکر کھل گیا۔ وقتاً فوقتاً وہ آیتیں جنہیں یہ بدترین علماء چھپاتے رہے تھے۔ ظاہر ہو گئیں۔ علاوہ ازیں خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات اور آپ کی پاکیزہ عادتوں نے لوگوں کو آپ کی تصدیق پر آمادہ کر دیا اور ان کی وہ جماعت جن کے ہاتھ سے نکل جانے کے ڈر نے انہیں کلام خدا چھپانے پر آمادہ کیا تھا بالآخر ہاتھ سے جاتی رہی۔ ان لوگوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت کر لی۔ ایمان لے آئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مل کر ان حق کے چھپانے والوں کی جانیں لیں اور ان سے باقاعدہ جہاد کیا۔ قرآن کریم نے ان کی ایسی بیہودہ کوششیں جگہ جگہ بیان کی ہیں۔ یہاں بھی فرمایا کہ یہ مال جو خدا کی باتوں کو چھپا کر تم کماتے ہو یہ دراصل آگ کے انگارے ہیں۔ جنہیں تم اپنے پیٹ میں بھر رہے ہو۔ قرآن کریم نے ان لوگوں کے بارے میں جو یتیموں کا مال کھاتے ہیں یہی فرمایا ہے کہ وہ بھی اپنے پیٹ میں جہنم کی آگ بھر رہے ہیں اور قیامت کے دن بھڑکتی ہوئی آگ میں داخل ہوں گے۔ صحیح حدیث میں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ جو شخص سونے چاندی کے برتن میں کھاتا پیتا ہے وہ اپنے پیٹ میں جہنم کی آگ بھرتا ہے۔ (بخاری) پھر فرمایا ان سے اللہ تعالیٰ قیامت کے دن بات چیت بھی نہ کرے گا۔ نہ انہیں پاک کرے گا بلکہ المناک عذابوں میں مبتلا رہیں گے۔ اس لئے کہ ان کے اس کرتوت کی وجہ سے خدا کا غضب ان پر نازل ہوا ہے اور اب ان پر سے نظر رحمت ہٹ گئی ہے اور یہ ستائش اور تعریف کے قابل نہیں رہے بلکہ سزایاب ہوں گے اور وہاں تلملاتے رہیں گے۔

حدیث شریف میں ہے تین قسم کے لوگوں سے اللہ بات چیت نہ کرے گا نہ ان کی طرف دیکھے گا۔ نہ انہیں پاک کرے گا اور ان کے لئے دردناک عذاب ہیں۔ بڈھا زانی' بادشاہ جھوٹا' فقیر متکبر۔ (مسلم) پھر فرماتا ہے کہ ان لوگوں نے ہدایت کے بدلے گمراہی لے لی۔ انہیں چاہئے تھا کہ تورات میں جو خبریں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت تھیں انہیں ان پڑھوں تک پہنچاتے لیکن اس کے بدلے انہوں نے انہیں چھپا لیا اور خود بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کفر کیا اور آپ کی تکذیب کی۔ پس اظہار پر جو نعمتیں اور مغفرتیں انہیں ملنے والی تھیں۔ ان کے بدلے زحمتیں اور عذاب اپنے سر لے لئے۔ پھر فرمایا ہے انہیں وہ دردناک اور حیرت

انگیز عذاب ہوں گے کہ دیکھنے والا ششدر رہ جائے اور یہ بھی معنی ہیں کہ انہیں آگ کے عذاب کی برداشت پر کس چیز نے آمادہ کیا۔ جو یہ خدا کی نافرمانیوں میں مشغول ہو گئے۔ پھر ارشاد ہوتا ہے کہ یہ لوگ اس عذاب کے مستحق یوں ہوئے کہ انہوں نے اللہ کی باتوں کو ہنسی کھیل سمجھا اور جو کتاب خدا نے حق کو ظاہر کرنے اور باطل کو نابود کرنے کے لئے اتاری تھی۔ انہوں نے اس کی مخالفت کی ظاہر کرنے کی باتیں چھپائیں۔ اللہ کے نبی ﷺ کی دشمنی کی۔ آپ ﷺ کی صفتوں کو ظاہر نہ کیا۔ فی الواقع اس کتاب کے بارے میں اختلاف کرنے والے دور کی گمراہی میں جا پڑے۔

لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَ الْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۚ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ۙ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ ۚ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ ۚ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ۚ وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ ۭ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ۭ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ﴿۱۷۷﴾

کچھ سارا کمال اسی میں نہیں (آ گیا) کہ تم اپنا منہ مشرق کو کر لو یا مغرب کو لیکن اصلی کمال تو یہ ہے کہ کوئی شخص اللہ تعالیٰ پر یقین رکھے اور قیامت کے دن پر اور فرشتوں پر اور (سب) کتب (سماویہ) پر اور پیغمبروں پر اور مال دیتا ہو اللہ کی محبت میں رشتہ داروں کو اور یتیموں کو اور محتاجوں کو اور بے خرچ مسافروں کو اور سوال کرنے والوں کو اور گردن چھوڑانے میں اور نماز کی پابندی رکھتا ہو اور زکوٰۃ بھی ادا کرتا ہو اور جو اشخاص (ان عقائد و اعمال کے ساتھ یہ اخلاق بھی رکھتے ہوں) کہ اپنے عہدوں کو پورا کرنے والے ہوں جب عہد کر لیں اور وہ لوگ مستقل رہنے والے ہوں۔ تنگ دستی میں اور بیماری میں اور قتال میں یہ لوگ ہیں جو سچے (کمال کے ساتھ موصوف ہیں) اور یہی لوگ ہیں جو (سچے) اور متقی (کہے جا سکتے) ہیں۔○

ایمان کی تعریف اور اس کے برگ و بار ☆

اس پاک آیت میں صحیح عقیدے اور راہ مستقیم کی تعلیم ہو رہی ہے۔ حضرت ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جب حضور ﷺ سے ایمان کے بارے میں سوال کیا کہ ایمان کیا چیز ہے؟ تو حضور ﷺ نے اس آیت کی تلاوت فرمائی۔ پھر انہوں نے سوال کیا' حضور ﷺ نے پھر یہی آیت تلاوت فرمائی۔ پھر یہی سوال کیا' آپ ﷺ نے فرمایا' سن نیکی کی محبت اور برائی کی عداوت ایمان ہے۔ (ابن ابی حاتم) لیکن اس روایت کی سند منقطع ہے۔ مجاہد حضرت ابوذرؓ سے اس حدیث کو روایت کرتے ہیں۔ حالانکہ ان کی ملاقات ثابت نہیں ہوئی' ایک شخص نے حضرت ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے سوال کیا کہ ایمان کیا ہے؟ تو

آپ نے یہی آیت تلاوت فرمائی۔ اس نے کہا' حضرت آپ سے بھلائی کے بارے میں سوال نہیں کرتا میرا سوال ایمان کے بارے میں ہے۔ تو آپ نے فرمایا سُن ایک شخص نے یہی سوال حضور ﷺ سے کیا۔ آپ ﷺ نے اسی آیت کی تلاوت کر دی۔ وہ بھی تمہاری طرح راضی نہ ہوا۔ تو آپ نے فرمایا' مؤمن جب نیک کام کرتا ہے تو اس کا جی خوش ہو جاتا ہے اور اسے ثواب کی اُمید ہوتی ہے اور جب گناہ کرتا ہے اس کا دِل غمگین ہو جاتا ہے اور وہ عذاب سے ڈرنے لگتا ہے۔ (ابن مردویہ) یہ روایت بھی منقطع ہے۔

اب اِس آیت کی تفسیر پڑھیئے: مؤمنوں کو پہلے حکم ہوا کہ وہ بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھیں۔ پھر انہیں کعبہ کی طرف گھما دیا گیا۔ جو اہل کتاب پر اور بعض ایمان والوں پر بھی شاق گزرا۔ پس اللہ تعالیٰ نے اس کی حکمت بیان فرمائی کہ اصل مقصد اطاعتِ فرمانِ خدا ہے۔ وہ جدھر مُنہ کرنے کو کہے کر لو۔ اصل تقویٰ' اصل بھلائی اور کامل ایمان یہی ہے کہ مالک کے زیرِ فرمان رہے۔ اگر کوئی مشرق کی طرف منہ کرے یا مغرب کی طرف منہ پھیر لے اور خدا کا حکم نہ ہو تو وہ اس توجہ سے ایماندار نہیں ہو جائے گا بلکہ حقیقت میں باایمان وہ ہے جس میں وہ اوصاف ہوں' جو اس آیت میں بیان ہوئے۔ قرآن کریم نے ایک اور جگہ فرمایا ہے: ﴿لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآءُ هَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ﴾ (الحج: ۳۷) یعنی تمہاری قربانیوں کے گوشت اور لہو خدا کو نہیں پہنچتے بلکہ اس تک تقویٰ پہنچتا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ تم نمازیں پڑھو اور دوسرے اعمال نہ کرو۔ یہ کوئی بھلائی نہیں۔ یہ حکم اس وقت تھا' جب مکہ سے مدینہ کی طرف لوٹے تھے لیکن پھر اس کے بعد اور فرائض اور احکام نازل ہوئے اور ان پر عمل کرنا ضروری قرار دیا گیا۔ مشرق و مغرب کو اس لئے خاص کیا گیا کہ یہود مغرب کی طرف اور نصاریٰ مشرق کی طرف منہ کیا کرتے تھے۔ پس غرض یہ ہے کہ یہ تو ایمان کا کلام ہے اور حقیقت ایمان کی عمل ہے۔ حضرت مجاہد فرماتے ہیں' بھلائی یہ ہے کہ اطاعت کا مادہ دل میں پیدا ہو جائے۔ فرائض پابندی کے ساتھ ادا ہوں۔ تمام بھلائیوں کا عامل ہو۔ حق تو یہ ہے کہ جس نے اس آیت پر عمل کیا' اس نے کامل اسلام لے لیا اور دل کھول کر بھلائی لے لی۔ اس کا ذات باری پر ایمان ہے۔ یہ جانتا ہے کہ معبود برحق وہی ہے۔ فرشتوں کے وجود کو اور اس بات کو کہ وہ خدا کا پیغام' خدا کے مخصوص بندوں پر لاتے ہیں۔ یہ مانتا ہے کل آسمانی کتابوں کو برحق جانتا ہے اور سب سے آخری کتاب قرآن کریم کو' جو کہ تمام اگلی کتابوں کی تصدیق کرنے والی' تمام بھلائیوں کی جامع اور دین و دنیا کی سعادت کو شامل ہے وہ مانتا ہے۔ اسی طرح اوّل سے آخر تک کے تمام انبیاءؑ پر بھی اس کا ایمان ہے بالخصوص خاتم الانبیاء رسول خدا ﷺ پر بھی۔

بعض مصارفِ خیر کی تفصیل ☆ مال کو باوجود مال کی محبت کے راہِ خدا میں خرچ کرتا ہے۔ صحیح حدیث شریف میں ہے رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں۔ افضل صدقہ یہ ہے کہ تو اپنی صحت اور مال کی محبت کی حالت میں اللہ کے نام دے۔ تجھے مال کی کمی کا اندیشہ ہو اور زیادتی کی رغبت ہو۔ (صحیحین) مستدرک حاکم میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے: ﴿وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ﴾ پڑھ کر فرمایا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ تم صحت میں اور مال کی محبت کی حالت میں؟ ڈرتے ہوئے اور امیری کی خواہش رکھتے ہوئے صدقہ کرو لیکن اس روایت کا موقوف ہونا زیادہ صحیح ہے۔ اصل میں یہ فرمان حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا ہے۔ قرآن کریم میں سورۂ دہر میں فرمایا: ﴿وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ......﴾ مسلمان باوجود کھانا کھانے کی شدید ضرورت کہ مسکینوں' یتیموں اور قیدیوں کو کھانا کھلاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم تمہیں خدا کی خوشنودی کے لئے کھلاتے ہیں' نہ تم سے اس کا

بدلہ چاہتے ہیں نہ شکریہ اور جگہ فرمایا: ﴿لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ﴾ (آل عمران: ۹۲) جب تک تم اپنی محبوب چیزیں خدا کے نام نہ دو تم حقیقی بھلائی نہیں پا سکتے اور جگہ فرمایا: ﴿وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ﴾ (الحشر: ۹) یعنی باوجود اپنی حاجت اور ضرورت کے وہ دوسروں کو اپنے نفس پر مقدم کرتے ہیں۔ پس یہ لوگ بڑے پایہ کے ہیں کیونکہ پہلی قسم کے لوگوں نے تو اپنی پسندیدہ چیز باوجود اس کی محبت کے دوسرے کو دی لیکن ان بزرگوں نے اپنی محبت اور ضرورت کی وہ چیز جس کے وہ خود محتاج تھے دوسروں کو دے دی اور اپنی حاجت مندی کا خیال بھی نہ کیا۔

ذَوِي الْقُرْبٰى انہیں کہتے ہیں جو رشتہ دار ہوں۔ صدقہ دینے کے وقت یہ دوسروں سے زیادہ مقدم ہیں۔ حدیث میں مسکین کو دینا بھی ثواب ہے۔ لیکن قرابت دار مسکین کو دینا دوہرا ثواب ہے۔ ایک ثواب صدقہ کا' دوسرا صلہ رحمی کا' تمہاری بخشش اور خیراتوں کے زیادہ مستحق یہ ہیں۔ قرآن کریم میں ان کے ساتھ سلوک کرنے کا حکم کئی جگہ ہے۔ یتیم سے مراد چھوٹے بچے ہیں' جن کے والد مر گئے ہوں اور کوئی ان کا کمانے والا نہ ہو۔ نہ خود انہیں اپنی روزی حاصل کرنے کی قوت و طاقت ہو۔ حدیث شریف میں ہے بلوغت کے بعد یتیمی نہیں رہتی۔ مساکین وہ ہیں جن کے پاس اتنا نہ ہو' جو ان کے کھانے پینے' پہننے اوڑھنے رہنے سہنے کو کافی ہو سکے۔ ان کے ساتھ بھی سلوک کیا جائے۔ جس سے ان کی حاجت پوری ہو اور فقر و فاقہ اور قلت و ذلت کی حالت سے بچ سکیں۔ صحیحین میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں۔ مسکین صرف وہی لوگ نہیں جو مانگتے پھرتے ہوں اور ایک ایک دو کھجوریں یا ایک ایک دو دو لقمے روٹی کے لے جاتے ہوں بلکہ مسکین وہ بھی ہیں' جن کے پاس اتنا نہ ہو کہ ان کے سب کام نکل جائیں۔ نہ اپنی حالت وہ ایسی بنائیں جس سے لوگوں کو علم ہو جائے اور انہیں کوئی کچھ دے دے۔

اِبْنُ السَّبِيْلِ مسافر کو کہتے ہیں' یہاں مراد وہ مسافر ہیں' جن کے پاس سفر خرچ نہ رہا ہو۔ انہیں اتنا دیا جائے جس سے یہ باطمینان اپنے وطن پہنچ جائیں۔ اسی طرح وہ شخص بھی جو اطاعت خدا میں سفر کر رہا ہو۔ اسے جانے آنے کا خرچ دینا' مہمان بھی اسی حکم میں ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما مہمان کو بھی ابن السبیل میں داخل کرتے ہیں اور دوسرے بزرگ سلف بھی۔ سائلین وہ لوگ ہیں جو اپنی حاجت ظاہر کر کے لوگوں سے کچھ مانگیں' انہیں بھی صدقہ زکوٰۃ دینا چاہئے۔ حضور ﷺ نے فرمایا: سائل کا حق ہے اگرچہ وہ گھوڑے پر سوار آئے۔ (ابوداؤد) في الرقاب سے مراد غلاموں کی آزادی ہے۔ خواہ یہ وہ غلام ہوں جنہوں نے اپنے مالکوں کو لکھ دیا ہو کہ اتنا اتنا ہم تمہیں دے دیں تو ہم آزاد ہیں لیکن اب ان بیچاروں سے نہیں پہنچا جاتا تو ان کی امداد کر کے انہیں آزاد کرانا۔ ان تمام قسموں کی اور دوسرے اسی قسم کے لوگوں کی پوری تفسیر سورہ براءۃ میں: ﴿اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ﴾ کی تفسیر میں بیان ہوگی ان شاء اللہ۔ اللہ حضرت فاطمہ بنت قیس رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا' مال میں زکوٰۃ کے سوا کچھ اور بھی اللہ تعالیٰ کا حق ہے۔ پھر آپ نے یہ آیت پڑھ کر سنائی۔ اس حدیث کا ایک راوی ابو حمزہ میمون اعور ضعیف ہے۔ پھر فرمایا نماز کو وقت پر پورے رکوع سجدے اطمینان اور خشوع اور خضوع کے ساتھ ادا کرے جس طرح کی ادائیگی کا شریعت کا حکم ہے اور زکوٰۃ کو بھی ادا کرے۔ یا یہ معنی کہ اپنے نفس کو واہی باتوں اور ذلیل اخلاق سے پاک کرے جیسے فرمایا: ﴿قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا ......﴾ (الشمس: ۹) اپنے نفس کو پاک کرنے والا فلاح پا گیا اور اسے گندگی میں لتھیڑنے والا تباہ ہو گیا۔ موسیٰ علیہ السلام نے فرعون سے یہی فرمایا تھا کہ: ﴿هَلْ لَّكَ اِلٰٓى اَنْ تَزَكّٰى ....﴾ (النازعات: ۱۸)

اور جگہ خدا تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿وَوَيْلٌ لِّلْمُشْرِكِيْنَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ﴾ (فصلت: ۶) یعنی ان مشرکوں کی ہلاکت ہے جو زکوٰۃ ادا نہیں کرتے یا یہ کہ جو اپنے آپ کو شرک سے پاک نہیں کرتے۔ پس یہاں مندرجہ بالا آیت میں زکوٰۃ سے مراد زکوٰۃ نفس یعنی اپنے آپ کو گندگیوں اور شرک وکفر سے پاک کرنا ہے اور ممکن ہے مال کی زکوٰۃ مراد ہو تو اور احکام نفلی صدقہ کے سمجھے جائیں گے۔ جیسے اوپر حدیث بیان ہوئی ہے کہ مال میں زکوٰۃ کے سوا اور حق بھی ہیں پھر فرمایا' وعدے پورے کرنے والے جیسے اور جگہ ہے: ﴿يُوْفُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ...... ﴾ (الرعد: ۲۰) یہ لوگ خدا کے عہد کو پورا کرتے ہیں اور وعدے نہیں توڑتے۔ وعدہ توڑنا نفاق کی خصلت ہے۔ جیسے حدیث میں ہے۔ منافق کی تین نشانیاں ہیٔ بات کرتے ہوئے جھوٹ بولنا' وعدہ خلافی کرن' امانت میں خیانت کرنا' ایک اور حدیث میں جھگڑے کے وقت گالیاں بکنا۔ پھر فرمایا فقر و فاقہ میں مال کی کمی کے وقت' بدن میں بیماری کے وقت' لڑائی کے موقعہ پر دشمنانِ دین کے سامنے میدان جنگ میں جہاد کے وقت صبر وسہار کرنے والے اور لوہے کی لاٹھ کی طرح جم جانے والے۔ صابرین کا نصب بطور مدح کے ہے۔ ان سختیوں اور مصیبتوں کے وقت صبر کی تعلیم اور تلقین ہو رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہماری مدد کرے' ہمارا بھروسہ اسی پر ہے۔ پھر فرمایا' جن میں یہ اوصاف ہیں' سچے ایمان والے وہی ہیں' ان کا ظاہر و باطن قول وفعل یکساں ہے اور متقی بھی یہی لوگ ہیں کیونکہ اطاعت گزار ہیں اور نافرمانیوں سے دور ہیں۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلٰى ؕ اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْاُنْثٰى بِالْاُنْثٰى ؕ فَمَنْ عُفِيَ لَهٗ مِنْ اَخِيْهِ شَيْءٌ فَاتِّبَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ وَاَدَآءٌ اِلَيْهِ بِاِحْسَانٍ ؕ ذٰلِكَ تَخْفِيْفٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ ؕ فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۷۸﴾ وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۱۷۹﴾

اے ایمان والو تم پر (قانون) قصاص فرض کیا جاتا ہے مقتولین (بقتلِ عمد) کے بارے میں۔ آزاد آدمی آزاد آدمی کے عوض میں اور غلام غلام کے عوض میں اور عورت عورت کے عوض میں ہاں جس کو اس کے فریق کی طرف سے کچھ معافی ہو جائے مگر پوری معافی نہ ہو تو مدعی کے ذمے معقول طور پر (خون بہا کا) مطالبہ کرنا اور (قاتل کے ذمے) خوبی کے ساتھ اس کے پاس پہنچا دیا۔ (یہ قانون دیت وعفو) تمہارے پروردگار کی طرف سے (سزائیں) تخفیف ہے اور (شاہانہ) ترحم ہے پھر جو شخص اس کے بعد تعدی کا مرتکب ہو تو اس شخص کو بڑا دردناک عذاب ہوگا اور فہیم لوگو (اس قانون) قصاص میں تمہاری جانوں کا بڑا بچاؤ ہے۔ ہم امید کرتے ہیں کہ تم لوگ (ایسے قانون امن کی خلاف ورزی کرنے سے) پرہیز رکھو گے۔ ○

قصاص امن وامان کی ضمانت ہے☆

یعنی مسلمانو قصاص کے وقت عدل سے کام لیا کرو۔ آزاد کے بدلے آزاد۔ غلام کے بدلے غلام، عورت کے بدلے عورت۔ اس بارے میں حد سے نہ بڑھو، جیسے کہ اگلے لوگ حد سے بڑھ گئے اور خدا کا حکم بدل دیا۔ اس آیت کا شان نزول یہ ہے کہ جاہلیت کے زمانہ میں بنوقریظہ اور بنونضیر کی جنگ ہوئی تھی۔ جس میں بنونضیر غالب آئے تھے۔ اب یہ دستور ہو گیا کہ جب نضیری کسی قرظی کو قتل کرے تو اس کے بدلے اسے قتل نہ کیا جاتا تھا بلکہ ایک سو وسق کھجور دیت میں لی جاتی تھی اور جب کوئی قرظی، نضیری کو مار ڈالے تو قصاص میں اسے بھی قتل کر دیا جاتا تھا اور اگر دیت لی جائے تو ڈبل دیت یعنی دو وسق کھجور لی جاتی تھی۔ پس اللہ تعالیٰ نے جاہلیت کی اس رسم کو مٹایا اور عدل و مساوات کا حکم دیا۔ ابوحاتم کی روایت میں شان نزول یوں بیان ہوا ہے کہ عرب کے دو قبیلوں میں جدال و قتال ہوا تھا۔ اسلام کے بعد اس کا بدلہ لینے کی ٹھانی اور کہا کہ ہمارے غلام کے بدلے ان کا آزاد قتل ہو اور عورت کے بدلے مرد قتل ہو تو ان کے رد میں یہ آیت نازل ہوئی اور یہ حکم بھی منسوخ ہے۔ قرآن فرماتا ہے: ﴿النَّفْسَ بِالنَّفْسِ﴾ (المائدہ: ۴۵) پس ہر قاتل مقتول کے بدلے مار ڈالا جائے گا۔ خواہ آزاد نے کسی غلام کو قتل کیا ہو۔ خواہ اس کے برعکس ہو۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ یہ لوگ مرد کو عورت کے بدلے قتل نہیں کرتے تھے۔ جس پر ﴿النَّفْسَ بِالنَّفْسِ وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ﴾ (المائدہ: ۴۵) نازل ہوئی، پس آزاد لوگ سب برابر ہیں، جان کے بدلے جان لی جائے گی۔ خواہ قاتل مرد ہو خواہ عورت ہو۔ اسی طرح مقتول خواہ مرد ہو خواہ عورت ہو۔ جب کہ ایک آزاد انسان نے ایک آزاد انسان کو مار ڈالا ہے تو اسے بھی مار ڈالا جائے گا۔ اسی طرح یہی حکم غلاموں اور لونڈیوں میں بھی جاری ہوگا اور جو کوئی جان لینے کے قصد سے دوسرے کو قتل کرے گا۔ وہ قصاص میں قتل کیا جائے اور یہی حکم قتل کے علاوہ اور زخموں کا اور دوسرے اعضاء کی بربادی کا بھی ہے۔ حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ بھی اس آیت کو: ﴿النَّفْسَ بِالنَّفْسِ﴾ سے منسوخ بتلاتے ہیں۔

مسئلہ ☆ امام ابوحنیفہ، امام ثوری، امام ابن ابی لیلیٰ اور امام داؤد رحمۃ اللہ علیہم کا مذہب ہے کہ آزاد نے اگر غلام کو قتل کیا ہے۔ تو اس کے بدلے وہ بھی قتل کیا جائے گا۔ حضرت علی، حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہم حضرت سعید بن جبیر، حضرت ابراہیم نخعی، حضرت قتادہ اور حضرت حکم کا بھی مذہب یہی ہے کہ اگر کوئی آقا اپنے غلام کو نکٹا کرے، ہم بھی اس کی ناک کاٹ دیں گے اور جو اسے خصی کرے اس سے بھی یہی بدلہ لیا جائے گا لیکن جمہور کا مذہب ان بزرگوں کے خلاف ہے۔ وہ کہتے ہیں آزاد، غلام کے بدلے قتل نہیں کیا جائے گا۔ اس لئے کہ غلام مال ہے اگر وہ خطا سے قتل ہو جائے تو دیت یعنی جرمانہ نہیں دینا پڑتا۔ صرف اس کے مالک کو اس کی قیمت ادا کرنی پڑتی ہے اور اسی طرح اُس کے ہاتھ پاؤں وغیرہ کے نقصان پر بدلے کا حکم نہیں[۱] آیا مسلمان کافر کے بدلے قتل کیا جائے گا یا نہیں؟ اس بارے میں جمہور علماء امت کا مذہب تو یہ ہے کہ قتل نہ کیا جائے گا اور دلیل صحیح بخاری شریف کی یہ حدیث ہے: ((لا يقتل مسلم بكافر)) مسلمان کافر کے بدلے قتل نہ کیا جائے۔ اس حدیث کے خلاف نہ تو کوئی صحیح حدیث ہے نہ کوئی ایسی ہو سکتی ہے جو اس کے خلاف ہو لیکن تاہم صرف امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب یہ ہے کہ مسلمان کافر کے بدلے قتل کر دیا جائے[۲]۔

---

[۱] افسوس کہ جس مذہب کی تائید سینکڑوں اجلہ علماء مجتہدین صحابہؓ کے اقوال سے ہو رہی ہے۔ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ اس مذہب جمہور کی رائے کے خلاف صرف اس وجہ سے قرار دے رہے ہیں کہ وہ حضرت ابوحنیفہ الامام رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب ہے۔ ۱۲

مسئلہ ☆ حسن بصری اور حضرت عطاء کا قول ہے کہ مرد کو عورت کے بدلے قتل نہ کیا جائے اور دلیل میں مندرجہ بالا آیت کو پیش کرتے ہیں لیکن جمہور علماء اسلام اس کے خلاف ہیں کیونکہ سورۂ مائدہ کی آیت عام ہے جس میں: ﴿النَّفْسَ بِالنَّفْسِ﴾ موجود ہے۔ علاوہ ازیں حدیث شریف میں بھی ہے: ((المسلمون تتکا فاد مائھم)) یعنی مسلمانوں کے خون آپس میں یکساں ہیں۔ حضرت لیثؒ کا مذہب ہے کہ خاوند اگر اپنی بیوی کو مار ڈالے تو اس کے بدلے اس کی جان نہیں لی جائے گی۔

مسئلہ ☆ چاروں اماموں اور جمہور امت کا مذہب ہے کہ کئی ایک نے مل کر ایک مسلمان کو قتل کیا ہے تو وہ سارے اس کے بدلے قتل کر دیئے جائیں گے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانہ میں ایک شخص کو سات شخص مل کر مار ڈالتے ہیں تو آپ ان ساتوں کو قتل کراتے ہیں اور فرماتے ہیں اگر صنعا بستی کے سب لوگ اس قتل میں شریک ہوتے تو میں قصاص میں سب کو قتل کرا دیتا۔ آپ کے اس فرمان کا خلاف آپ کے زمانہ میں کسی صحابی نے نہیں کیا۔ پس اس بات پر گویا اجماع ہو گیا لیکن امام احمدؒ سے روایت ہے کہ وہ فرماتے ہیں ایک کے بدلے صرف ایک ہی قتل کیا جائے زیادہ قتل نہ کئے جائیں۔ حضرت معاذ' حضرت زبیر' عبدالملک بن مروان زہری ابن سیرین' حبیب بن ابی ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے بھی یہی قول نقل ہے۔ ابن المنذر رفرماتے ہیں یہی صحیح ہے اور ایک جماعت کو ایک مقتول کے بدلے قتل کرنے کی کوئی دلیل نہیں اور حضرت ابن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے یہ ثابت ہے کہ وہ اس مسئلہ کو نہیں مانتے تھے۔ پس جب صحابہؓ میں اختلاف ہوا تو اب مسئلہ غور طلب ہو گیا پھر فرماتا ہے کہ یہ اور بات ہے کہ کسی قاتل کو مقتول کا کوئی وارث کچھ حصہ معاف کر دے۔ یعنی قتل کے بدلے وہ دیت قبول کر کے یا دیت بھی اپنے حصہ کی چھوڑ دے اور صاف معاف کر دے۔ اگر وہ دیت پر راضی ہو گیا ہے تو قاتل پر زور نہ ڈالے۔ بلکہ خوش اخلاقی اور نرمی سے وصول کرے اور قاتل کو بھی چاہئے کہ فوری طور پر اسے ادا کرے۔ حیل حجت نہ کرے۔

......= ۲ کیا مسلمان ایک کافر کو قتل کرنے کے بعد قصاص میں قتل کیا جائے گا؟ ائمہ مجتہدین میں یہ مسئلہ کافی اختلاف کا باعث بنا ہوا ہے۔ امام مالک' امام شافعی' امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ کا اتفاقی فیصلہ ہے کہ مسلمان کو قصاص میں قتل نہیں کیا جائے گا لیکن ابو حنیفہ الامام' ابو داؤد ظاہری' ابو بکر ضحاک رحمہم اللہ کہتے ہیں کہ مسلمان نے اگر کسی کافر کو قتل کر دیا تو مسلمان قصاص میں ضرور قتل ہوگا۔ اب یہ حدیث حسن میں بصراحت موجود ہے کہ مسلمان کافر کے قصاص میں قتل نہ ہوگا۔ امام ابو حنیفہؒ کے مذہب کے بظاہر خلاف نظر آتی ہے لیکن علما احناف نے اس کے بعض شافی جواب دیئے ہیں۔ مثلاً طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے یہ حدیث کافروں کے سلسلے میں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر کسی مسلمان نے اس کافر کو قتل کر دیا۔ جس کا تعلق محارب قوم سے تھا تو اس کے قصاص میں مسلمان کو قتل کرنا ٹھیک نہیں کیونکہ اس کافر کی پوری قوم مسلمانوں کے ساتھ ہر وقت جنگ کے لئے تیار ہے۔ ایسے حالات میں اگر اس کا کوئی فرد مسلمان کے ہاتھ قتل ہو جائے تو وہ ہنگامی حالات کے تحت سمجھا جائے گا اور جنگی نقطہ نظر سے اس پر کوئی دارو گیر نہ ہوگی اور ابن ہمام نے اس حدیث کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ مطلب یہ ہے کہ کوئی مسلمان جس نے اسلام لانے سے پہلے کسی کافر کو قتل کر دیا تھا' اسلام لانے کے بعد اس پر قصاصاً قتل نہ ہوگا لیکن اسلام لانے کے بعد مسلمان کسی کافر کو قتل کرے گا تو بلا شبہ قصاص میں اس کی گردن اس طرح اتار لی جائے گی جیسا کہ دوسری قوم سے مجرم کی۔ سیدنا الامام مولانا انور شاہ کشمیری نوراللہ مرقدہ نے ابن ہمام کے اس جواب کو بے حد پسند فرمایا ہے۔ امام کشمیری کہتے ہیں کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد فتح مکہ کے موقع پر فرمایا تھا اور آپ ﷺ نے اپنے اس خطبہ میں جاہلیت کی بہت سی غلط رسموں کو ختم کرنے کا اعلان کیا تھا۔ لہٰذا جاہلیت کی اس شاخ کو بھی آپ ﷺ کاٹ دینا چاہتے تھے۔ جس میں اسلام سے کے قتل وقتال پر طول وطویل معرکوں کی بنیاد پڑتی تھی۔ اہل علم اس موقع پر فیض الباری جلد اول صفحہ ۲۱ کا ضرور مطالعہ کریں۔ افسوس کہ ابن کثیرؒ نے یہاں بھی مذہبی تعصب سے کام لیا اور لکھا ہے کہ ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اپنی اس رائے میں متفرد ہیں۔ حالانکہ عمر فاروق' علی کرم اللہ وجہہ' عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا بھی یہی قول ہے۔ دیکھو احکام القرآن۔

مسئلہ ☆ امام مالک کا مشہور مذہب ہے کہ امام ابو حنیفہؒ اور آپ کے شاگردوں کا اور امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کا ایک روایت کی رو سے یہ مذہب ہے کہ مقتول کے ورثا کا قصاص چھوڑ کر دیت پر راضی ہونا اس وقت جائز ہے جب خود قاتل بھی اس پر آمادہ ہو لیکن اور بزرگانِ دین فرماتے ہیں کہ اس میں قاتل کی رضامندی شرط نہیں۔

مسئلہ ☆ سلف کی ایک جماعت کہتی ہے کہ عورتیں قصاص کے درگزر کر کے دیت پر اگر رضامند ہوں تو ان کا اعتبار نہیں' حسن قتادہ' زہری' ابن شبرمہ' لیث اور اوزاعی کا یہی مذہب ہے لیکن باقی علماء دین ان کے مخالف ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ اگر کسی عورت نے بھی دیت پر رضامندی ظاہر کی تو قصاص جاتا رہے گا۔ پھر فرماتا ہے کہ قتل عمد میں دیت لینا یہ خدا کی طرف سے تخفیف اور مہربانی ہے۔ اگلی اُمتوں کو یہ اختیار نہ تھا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں' بنی اسرائیل پر قصاص فرض تھا۔ انہیں نے قصاص سے درگزر کرنے اور دیت لینے کی اجازت نہ تھی لیکن اس امت پر یہ مہربانی ہوکہ دیت لینی بھی جائز کی گئی۔ تو یہاں تین چیزیں ہوئیں: قصاص' دیت اور معافی۔ اگلی امتوں میں صرف قصاص اور معافی ہی تھی دیت نہ تھی۔ بعض لوگ کہتے ہیں اہل تورات کے ہاں صرف قصاص اور معافی تھی اور اہل انجیل کے ہاں صرف معافی ہی تھی۔ پھر فرمایا جو شخص دیت یعنی جرمانہ لینے کے بعد یا دیت قبول کر لینے کے بعد بھی زیادتی پر تل جائے' اس کے لئے سخت دردناک عذاب ہے۔ مثلاً دیت لے لی پھر قتل کے درپے ہوا وغیرہ۔ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں' جس شخص کا کوئی مقتول یا مجروح ہو تو اسے تین باتوں میں سے ایک کا اختیار ہے۔ یا قصاص یعنی بدلہ لے لے یا درگزر کرے اور معاف کر دے یا دیت یعنی جرمانہ لے لے اور اگر کچھ اور کرنا چاہے تو اسے روک دو۔ ان میں سے ایک کرنے کے بعد جو زیادتی کرے وہ ہمیشہ کے لئے جہنمی ہو جائے گا (احمد) دوسری حدیث میں ہے کہ جس نے دیت لے لی' پھر قاتل کو قتل کیا۔ تو اب میں اس سے دیت بھی نہ لوں گا بلکہ اسے قتل ہی کراؤں گا پھر ارشاد ہوتا ہے کہ اے عقل مندو قصاص میں نسل انسان کی بقا ہے۔ اس میں حکمت عظیمہ ہے۔ گو بظاہر تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک کے بدلے ایک قتل ہوا تو دو مرے لیکن اگر سوچو تو معلوم ہوگا کہ یہ سبب زیست ہے۔ قاتل کو خود خیال ہوگا کہ میں اسے قتل نہ کروں ورنہ خود بھی قتل کر دیا جاؤں گا' تو وہ اقدام سے رک جائے گا' تو دو آدمی قتل و خون سے بچ گئے۔ اگلی کتابوں میں بھی یہ بات بیان فرمائی تھی کہ: القتل انفی للقتل قتل' قتل کو روک دیتا ہے۔ لیکن قرآن پاک میں بہت ہی فصاحت و بلاغت کے ساتھ اس مضمون کو بیان کیا گیا ہے۔ فرمایا یہ تمہارے بچاؤ کا سبب ہے کہ ایک تو خدا کی نافرمانی سے محفوظ رہو گے۔ دوسرے نہ کوئی کسی کو قتل کرے گا نہ وہ قتل کیا جائے گا۔ زمین پر امن و امان و سکون و سلام رہے گا۔ تقویٰ کل نیکیوں کے کرنے اور کل برائیوں کے چھوڑنے کا نام ہے۔

كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ إِنْ تَرَكَ خَيْرًا ۖ الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ بِالْمَعْرُوفِ ۖ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِينَ ﴿١٨٠﴾ فَمَنْ بَدَّلَهُ بَعْدَمَا سَمِعَهُ فَإِنَّمَا إِثْمُهُ عَلَى الَّذِينَ يُبَدِّلُونَهُ ۚ إِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿١٨١﴾ فَمَنْ

خَافَ مِنْ مُّوْصٍ جَنَفًا اَوْ اِثْمًا فَاَصْلَحَ بَيْنَهُمْ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۸۲﴾

ع ۲۲ / ۶

تم پر فرض کیا جاتا ہے کہ جب کسی کو موت نزدیک معلوم ہونے لگے بشرطیکہ کچھ مال بھی ترکہ میں چھوڑا ہو تو والدین اور اقارب کے لئے معقول طور پر (کہ مجموعہ ایک ثلث سے زیادہ نہ ہو) کچھ بتلا جائے (اس کا نام وصیت ہے) جن کو خدا کا خوف ہے ان کے ذمہ ضروری ہے پھر جو شخص (اس وصیت کے) سن لینے کے بعد اس کو تبدیل کرے گا تو اس کا گناہ ان ہی لوگوں کو ہوگا جو ان کو تبدیل کردیں گے۔ اللہ تعالیٰ یقیناً سنتے جانتے ہیں۔ ہاں جس شخص کو وصیت کرنے والے کی جانب سے کسی بے عنوانی کی یا کسی جرم کے ارتکاب کی تحقیق ہوئی ہو۔ پھر یہ شخص ان میں باہم مصالحت کرا دے تو اس پر کوئی گناہ نہیں ہے۔ واقعی اللہ تعالیٰ تو (خود گناہوں کے) معاف کرنے والے اور گنہگاروں پر رحم کرنے والے ہیں۔ ○

قتل جو ایک موت تھی اِسکے بعد وصیت کی طرف توجہ دلانا لطف سے خالی نہیں:

اِس آیت میں ماں باپ اور قرابت داروں کے لئے وصیت کرنے کا حکم ہو رہا ہے۔ میراث کے حکم سے پہلے یہ واجب تھی' لیکن میراث کے احکام نے اس وصیت کے حکم کو منسوخ کر دیا۔ ہر وارث اپنا مقررہ حصہ بغیر وصیت بھی لے سکے گا۔ سنن وغیرہ میں حضرت عمرو بن خارجہؓ سے حدیث ہے۔ کہتے ہیں' میں نے رسول اللہ ﷺ کو خطبہ میں یہ فرماتے ہوئے سنا کہ اللہ تعالیٰ نے ہر حقدار کو اس کا حق پہنچا دیا ہے۔ اب کسی وارث کے لئے کوئی وصیت نہیں۔ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سورۂ بقرہ کی تلاوت کرتے ہیں' جب آپ اس آیت پر پہنچتے ہیں تو فرماتے ہیں یہ آیت منسوخ ہے۔ (مسند احمد) آپ سے یہ بھی روایت ہے کہ پہلے ماں باپ کے ساتھ اور کوئی رشتہ دار نہ تھا اوروں کے لئے صرف وصیت ہوتی تھی۔ پھر میراث کی آیتیں نازل ہوئیں اور ایک تہائی مال کا وصیت کا اختیار باقی رہا۔ اس آیت کو منسوخ کرنے والی آیت: ﴿لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ . . . ﴾ (النساء ۷) ہے۔ حضرت ابن عمر' حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہم' سعید بن المسیب' حسن' مجاہد' عطا' سعید بن جبیر' محمد بن سیرین' عکرمہ' زید بن اسلم' ربیع بن انس' قتادہ' سدی' مقاتل بن حبان' طاؤس' ابراہیم نخعی' شریح' ضحاک اور زہری رحمہم اللہ یہ سب حضرات بھی اس آیت کو منسوخ بتلاتے ہیں لیکن باوجود اس کے تعجب ہے کہ امام رازی نے اپنی تفسیر کبیر میں ابو مسلم اصفہانی سے یہ کیسے نقل کر دیا کہ یہ آیت منسوخ نہیں بلکہ آیت میراث اس کی تفسیر ہے اور مطلب آیت کا یہ ہے کہ تم پر وہ وصیت فرض کی گئی جس کا بیان آیت: ﴿يُوْصِيْكُمُ اللّٰهُ فِيْٓ اَوْلَادِكُمْ . . . ﴾ (النساء ۷) میں ہے اور یہی قول اکثر مفسرین اور معتبر فقہا کا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ وصیت کا حکم وارثوں کے حق میں منسوخ ہے اور جن کا ورثہ مقرر نہیں' ان کے حق میں ثابت ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما' حسن' مسروق' طاؤس' ضحاک' مسلم بن یسار اور علامہ بن زیاد رحمہم اللہ کا مذہب بھی یہی ہے۔ میں کہتا ہوں سعید بن جبیر' ربیع بن انس' قتادہ اور مقاتل بن حبانؒ بھی یہی کہتے ہیں لیکن ان حضرات کے اس قول کی بناء پر پچھلے فقہا کی اصطلاح میں یہ آیت منسوخ نہیں ٹھہرتی۔ اس لئے کہ میراث کی آیت میں وہ لوگ تو اس حکم سے مخصوص ہو گئے۔ جن کا حصہ شریعت نے خود مقرر کر دیا اور جو اس سے پہلے اس آیت کے حکم کی رُو سے وصیت میں داخل تھے کیونکہ قرابت دار عام ہیں' خواہ ان کا ورثہ مقرر

ہو یا نہ ہو تو اب وصیت ان کے حق میں نہ رہی جو وارث ہیں۔ یہ قول اور بعض دیگر حضرات کا یہ قول کے وصیت کا حکم ابتداء اسلام میں تھا اور وہ بھی غیر ضروری۔ دونوں کا مطلب تقریباً ایک ہو گیا۔ لیکن وجو لوگ وصیت کے اس حکم کو واجب کہتے ہیں اور روانی عبارت اور سیاق کلام سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے ان کے نزدیک تو یہ آیت منسوخ ہی ٹھہرے گی۔ جیسے کہ اکثر مفسرین اور معتبر فقہاء کرام کا قول ہے۔ پس والدین اور ورثہ پانے والے قرابت داروں کے لئے وصیت کرنا بالا جماع منسوخ ہے بلکہ ممنوع ہے۔ حدیث شریف میں آ چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر حقدار کو اس کا حق دے دیا ہے۔ اب وارث کے لئے کوئی وصیت نہیں۔ آیت میراث کا حکم مستقل ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے وہ واجب و فرض ہے۔ ذوی الفروض اور عصبات کا حصہ مقرر ہے اور اس سے اس آیت کا حکم کلیتہً اُٹھ گیا۔ باقی رہ گئے وہ قرابت دار جن کا کوئی ورثہ مقرر نہیں۔ ان کے لئے تہائی مال میں وصیت کرنا مستحب ہے۔ کچھ تو اس کا حکم اس آیت سے بھی نکلتا ہے۔ دوسرے یہ کہ حدیث شریف میں صاف آ چکا ہے۔

صحیحین میں حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں کسی مرد مسلمان کو لائق نہیں کہ اس کے پاس کوئی چیز ہو اور وہ وصیت کرنا چاہتا ہو کہ دو راتیں بھی وصیت لکھے بغیر گزار دے۔ راوی حدیث حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے صاحبزادے فرماتے ہیں اس فرمان کے سننے کے بعد میں نے تو ایک رات بھی بلا وصیت نہیں گزاری۔ قرابت داروں اور رشتہ داروں سے سلوک و احسان کرنے کے بارے میں بہت سی آیتیں اور حدیثیں آئی ہیں۔ ایک حدیث میں ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اے ابن آدم تو جو مال میری راہ میں خرچ کرے گا میں اس کی وجہ سے تجھے پاک صاف کر دوں گا اور تیرے انتقال کے بعد بھی اپنے نیک بندوں کی دعاؤں کا سبب بناؤں گا۔ خیراً سے مراد یہاں مال ہے۔ اکثر جلیل القدر مفسرین کی تفسیر یہی ہے۔ بعض مفسرین کا تو قول ہے کہ مال خواہ تھوڑا ہو خواہ بہت وصیت مشروع ہے۔ جیسے میراث تھوڑے مال میں ہے اور زیادہ میں۔ بعض کہتے ہیں وصیت کا حکم اس وقت ہے جب مال زیادہ ہو۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ذکر ہوتا ہے کہ ایک قریشی مر گیا ہے اور تین چار سو دینار اس کے ورثہ میں ہیں اور اس نے وصیت کچھ نہیں کی۔ آپ نے فرمایا یہ رقم وصیت کے قابل ہی نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے: ﴿اِنْ تَرَكَ خَيْرَا﴾ فرمایا ہے۔ ایک اور روایت میں ہے کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنی قوم کے ایک بیمار کی بیمار پرسی کو گئے۔ اس سے کسی نے کہا وصیت کرو تو آپ نے فرمایا وصیت خیر میں ہوتی ہے اور تو تو کم مال چھوڑ رہا ہے۔ اسے اپنی اولاد کے لئے ہی چھوڑ جا۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں جس نے ساٹھ دینار نہیں چھوڑے اس نے خیر نہیں چھوڑی یعنی اس کے ذمہ وصیت کرنا نہیں۔ طاؤس اسی دینار بتلاتے ہیں۔ قتادہؒ ایک ہزار بتلاتے ہیں۔ معروف سے مراد نرمی اور احسان ہے۔ حضرت حسنؒ فرماتے ہیں وصیت کرنا ہر مسلمان پر ضروری ہے۔ اس میں بھلائی کرے برائی نہ کرے۔ وارثوں کو نقصان نہ پہنچائے۔ اسراف اور فضول خرچی نہ کرے۔

صحیحین میں ہے کہ حضرت سعدؓ نے فرمایا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! میں مالدار ہوں اور میری وارث صرف میری ایک لڑکی ہی ہے تو آپ اجازت دیجئے کہ میں اپنے دو تہائی مال کی وصیت کروں۔ آپ نے فرمایا نہیں۔ کہا آدھے کی اجازت دیجئے؟ فرمایا نہیں کہا ایک تہائی کی اجازت دیجئے۔ کہا خیر تہائی مال کی وصیت کرو۔ گو یہ بھی بہت ہے تم اپنے پیچھے اپنے وارثوں کو مالدار چھوڑ کر جاؤ۔ یہ بہتر ہے اس سے کہ تم انہیں فقیر اور تنگدست چھوڑ کر جاؤ کہ وہ اوروں کے سامنے ہاتھ پھیلائیں۔ صحیح بخاری شریف میں ہے ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کاش کہ لوگ تہائی سے ہٹ کر چوتھائی پر آ جائیں اس لئے کہ

آنحضرت ﷺ نے تہائی کی رخصت دیتے ہوئے یہ بھی فرمایا ہے کہ تہائی بہت ہے۔

مسند احمد میں ہے' حنظلہ کے دادا حنفیہ نے ایک یتیم بچے کے لئے جوان کے ہاں پلتے تھے' سو اونٹوں کی وصیت کی۔ ان کی اولاد پر بہت گراں گزرا۔ معاملہ حضور ﷺ تک پہنچا۔ حضور ﷺ نے فرمایا نہیں نہیں۔ صدقہ میں پانچ دو' ورنہ دس دو' ورنہ پندرہ دو' ورنہ بیس' ورنہ پچیس دو' ورنہ تیس' ورنہ پینتیس دو۔ اگر اس پر بھی نہ مانو' خیر زیادہ سے زیادہ چالیس دو پھر فرمایا ہے جو شخص وصیت کو بدل دے۔ اس میں کمی بیشی کر دے یا وصیت کو چھپا لے' اس کا گناہ بدلنے والے کے ذمہ ہے۔ میت کا اجر خدا تعالیٰ کے ذمہ ثابت ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ وصیت کرنے والے کی وصیت کی اصلیت کو بھی جانتا ہے اور بدلنے والی کی تبدیلی کو بھی۔ نہ اس سے کوئی آواز پوشیدہ' نہ کوئی راز۔ جنف کے معنی خطاء اور غلطی کے ہیں۔ مثلاً کسی وارث کو کسی طرح زیادہ دلوا دینا' مثلاً کہہ دیا کہ فلاں چیز فلاں کے ہاتھ اتنے اتنے میں بیچ دی جائے وغیرہ۔ اب یہ خواہ بطور غلطی اور خطا کے ہو یا زیادتی محبت و شفقت کی وجہ سے بغیر قصد ایسی حرکت سرزد ہو گئی ہو یا گناہ کے طور پر ہو' تو وصی کو اس کے ردوبدل میں کوئی گناہ نہیں۔ وصیت کو شرعی احکام کے مطابق کر کے جاری کر دے تاکہ میت بھی عذاب الٰہی سے بچے اور حقداروں کو حق بھی پہنچے اور وصیت بھی مطابق شرع پوری ہو۔ ایسی حالت میں بدلنے والے پر کوئی گناہ یا حرج نہیں واللہ اعلم۔

ابی حاتم میں ہے رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں' زندگی میں ظلم کر کے صدقہ دینے والے کا صدقہ اسی طرح لوٹا دیا جائے گا جس طرح موت کے وقت خطا کاری کرنے کا صدقہ لوٹا دیا جاتا ہے۔ یہ حدیث ابن مردویہ میں بھی مروی ہے۔ ابن ابی حاتم فرماتے ہیں۔ ولید بن یزید جو اس حدیث کا راوی ہے۔ اس نے اس میں غلطی کی ہے۔ دراصل یہ کلام حضرت عروہ کا ہے۔ ولید بن مسلم نے اسے اوزاعی سے روایت کیا ہے اور عروہ سے آگے سند نہیں لے گئے۔ امام ابن مردویہ بھی ایک مرفوع بروایت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما بیان کرتے ہیں کہ وصیت کی کمی بیشی کبیرہ گناہ ہے لیکن اس حدیث کے مرفوع ہونے میں بھی کلام ہے۔ اس بارے میں سب سے جامع وہ حدیث ہے' جو مسند عبدالرزاق میں بروایت حضرت ابوہریرہؓ موجود ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ آدمی نیک لوگوں کے اعمال ستر سال تک کرتا رہتا ہے اور وصیت میں ظلم کرتا ہے اور برائی کے عمل پر خاتمہ ہونے کی وجہ سے جہنمی بن جاتا ہے اور بعض لوگ ستر برس تک بداعمالیاں کرتے رہتے ہیں لیکن وصیت میں عدل و انصاف کرتے ہیں' اور آخری عمل ان کا بھلا ہوتا ہے اور وہ جنتی بن جاتے ہیں پھر حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا' اگر چاہو تو قرآن پاک کی اس آیت کو پڑھ لو: ﴿تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوْهَا ...... ﴾ (البقرۃ:۲۲۹) یعنی یہ اللہ تعالیٰ کی حدیں ہیں' ان سے آگے نہ بڑھو۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۱۸۳﴾ اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ ۭ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ عَلٰي سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ ۭ وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ

طَعَامُ مِسْكِينٍ ۖ فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهُ ۚ وَأَنْ تَصُومُوا خَيْرٌ لَّكُمْ

إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿۱۸۴﴾

اے ایمان والو تم پر روزہ فرض کیا گیا ہے جس طرح تم سے پہلے (امتوں کے) لوگوں پر فرض کیا گیا تھا۔ اس توقع پر کہ تم (روزہ کی بدولت رفتہ رفتہ) متقی بن جاؤ۔ تھوڑے دنوں روزہ رکھ لیا کرو پھر (اس میں اتنی آسانی کہ) جو شخص تم میں (ایسا) بیمار ہو (جس میں روزہ رکھنا مشکل یا مضر ہو) یا (شرعی) سفر میں ہو تو دوسرے ایام کا شمار کر کے ان میں روزہ رکھنا (اس پر واجب ہے اور دوسری آسانی جو بعد میں منسوخ ہوگئی یہ ہے) کہ جو لوگ روزے کی طاقت رکھتے ہوں' ان کے ذمہ فدیہ یہ ہے کہ وہ ایک غریب کو کھانا کھلا دینا یا دے دینا ہے اور جو شخص خوشی سے (زیادہ) خیر (خیرات) کرے (کہ زیادہ فدیہ دے) تو اس شخص کے لئے اور بھی بہتر ہے اور تمہارا روزہ رکھنا (اس حال میں) زیادہ بہتر ہے اگر تم (روزے کی فضیلت سے) خبر رکھتے ہو۔○

اسلام کا دوسرا عملی ستون' اِس کے احکام اور متعلقہ تفصیلات ☆

اللہ تعالیٰ اس اُمت کے ایمانداروں کو مخاطب کر کے انہیں حکم دے رہا ہے کہ روزے رکھو۔ روزے کے معنی اللہ تعالیٰ کے فرمان کی بجا آوری کی خالص نیت کے ساتھ کھانے پینے اور جماع سے رک جانے کے ہیں۔ اس سے فائدہ یہ ہے کہ نفس انسان پاک صاف اور طیب وطاہر ہو جاتا ہے۔ ردی اخلاط اور واہی اخلاق سے انسان کا تنقیہ ہو جاتا ہے۔ اس حکم کے ساتھ ہی فرماتا ہے کہ اس حکم کے ساتھ تم تنہا نہیں' بلکہ تم سے اگلوں کو بھی روزوں کا حکم تھا۔ اس بیان سے یہ بھی مقصد ہے کہ یہ اُمت اس فریضہ کی بجا آوری سے اگلی امتوں سے پیچھے نہ رہ جائے۔ جیسے اور جگہ ہے: ﴿لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا......﴾ (المائدہ: ۴۸) یعنی ہر ایک کے لئے ایک طریقہ اور راستہ ہے۔ اگر خدا چاہتا تو تم سب کو ایک ہی اُمت کر دیتا لیکن وہ تمہیں آزماتا ہے۔ تمہیں چاہئے کہ نیکیوں میں سبقت کرتے رہو۔ یہی یہاں فرمایا کہ تم پر بھی روزے اسی طرح فرض کئے گئے ہیں جس طرح تم سے اگلی امتوں پر تھے۔ روزے سے بدن کی پاکیزگی ہے اور شیطانی راہ کی روک ہے۔ صحیحین میں ہے رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں اے جوانو! تم میں سے جسے نکاح کی طاقت ہو وہ نکاح کر لے اور جسے طاقت نہ ہو وہ روزے رکھے اس کے لئے یہ خصی[1] ہونا ہے۔ پھر روزوں کے مقدار بیان ہو رہی ہے کہ یہ چند دن ہی ہیں' تاکہ کسی پر بھاری نہ پڑے اور ادائیگی سے قاصر نہ رہ جائے بلکہ ذوق شوق سے خدائی فریضہ کو بجا لائے۔ پہلے تو ہر ماہ میں تین روزوں کا حکم ہوا اور اگلا حکم منسوخ ہوا۔ اس کا

[1] حدیث میں ہے کہ روزہ رکھو کیونکہ وہ شہوت کو توڑتا ہے۔ اب اس حدیث پر اشکال یہ ہے کہ تجربہ سے یہ بات سامنے آ چکی ہے کہ روزہ سے شہوت ختم ہونے کی بجائے اور بڑھتی ہے کیونکہ روزہ (یا فاقہ) سے صحت ہوتی ہے اور صحت جسمانی پر شہوت میں اضافہ بدیہی ہے۔ اس اشکال کا حل یہ ہے کہ روزہ سے دو فائدے حاصل ہوں گے۔ پہلا فائدہ تو ترک اکل وشراب وشرب سے مراقبہ کا ملکہ راسخ ہوگا اور دوسرے کہ کھانے اور پینے کے چھوڑنے سے منہیات سے محفوظ رہنے کی راہ آسان ہو جائے گی۔ تو گویا روزہ سے جب ایک خواہش پر کنٹرول کر لیا جاتا ہے یعنی کھانے پینے کی خواہش پر۔ تو باقی نفسانی خواہشوں پر کنٹرول کرنے کی طاقت اور ملکہ بآسانی حاصل ہو جائے گی۔ بس یہ روزہ کا فائدہ ہے کہ جس کو آپ ﷺ نے بیان فرمایا ہے۔۱۲

مفصل بیان آ رہا ہے ان شاء اللہ۔ حضرت معاذ' حضرت ابن مسعود' حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہم' عطا' قتادہ' ضحاک کا فرمان ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کے زمانہ سے ہر مہینہ میں تین روزوں کا حکم تھا۔ جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت کے لئے بدلا اور ان پر اس مبارک مہینہ کے روزے فرض ہوئے حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ اگلی امتوں پر بھی ایک مہینہ کامل کے روزے فرض تھے۔ ایک مرفوع حدیث میں ہے کہ رمضان کے روزے تم سے اگلی امتوں پر بھی فرض تھے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ اگلی امتوں کو یہ حکم تھا کہ جب وہ عشا کی نماز ادا کرلیں اور سو جائیں تو ان پر کھانا پینا' عورتوں سے مباشرت کرنا حرام ہو جاتا تھا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں' اگلے لوگوں سے مراد اہل کتاب ہیں۔ پھر بیان ہو رہا ہے کہ تم میں سے جو شخص ماہ رمضان میں بیمار یا سفر میں ہو تو وہ اس حالت میں روزے چھوڑ دے مشقت نہ اُٹھائے اور اس کے بعد اور دنوں میں جب کہ وہ عذر ختم ہو جائے' قضا کر لے' ہاں ابتداء اسلام میں جو شخص تندرست ہو اور مسافر بھی نہ ہو۔ اسے بھی اختیار تھا' خواہ روزے رکھے خواہ نہ رکھے اور فدیہ میں ایک مسکین کو کھانا کھلا دے۔ اگر ایک سے زیادہ کو کھلائے تو افضل تھا۔ گو روزہ رکھنا فدیہ دینے سے زیادہ بہتر تھا۔ ابن مسعود' ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہم' مجاہد' طاؤس' مقاتل وغیرہ یہی فرماتے ہیں۔

کچھ تبدیلیاں ☆ مسند احمد میں ہے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں۔ نماز کی اور روزے کی تین حالتیں اسلام میں بدلی گئیں۔ پہلے تو سولہ سترہ مہینے تک مدینہ میں آ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بیت المقدس کی طرف نماز ادا کی۔ پھر ﴿قَدْ نَرٰى ......﴾ والی آیت اُتری اور مکہ شریف کی طرف آپ نے منہ پھیرا۔ دوسری تبدیلی یہ ہوئی کہ نماز کے لئے ایک دوسرے کو پکارتا تھا اور جمع ہو جاتے تھے لیکن اس سے عاجز آ گئے۔ پھر ایک انصاری حضرت عبداللہ بن زید بن عبدربہ رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! میں نے خواب میں دیکھا' لیکن وہ خواب گویا بیداری کی سی حالت میں تھا کہ ایک شخص سبز رنگ کا حلہ پہنے ہوئے ہے اور قبلہ کی طرف متوجہ ہو کر کہہ رہا ہے: **اللہ اکبر اللہ اکبر اشھد ان لا الہ الا اللہ** دو بار۔ غرض یونہی اذان پوری کی۔ پھر تھوڑی دیر بعد اس نے تکبیر کہی جس میں: **قد قامت الصلوۃ** بھی دو مرتبہ کہا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو یہ سکھاؤ وہ اذان کہیں گے۔ چنانچہ سب سے پہلے حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اذان کہی۔ دوسری روایت میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بھی آ کر اپنا یہی خواب بیان فرمایا تھا لیکن اس سے پہلے زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ آ چکے تھے۔ تیسری تبدیلی یہ ہوئی کہ پہلے یہ دستور تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھا رہے ہیں۔ کوئی آیا کچھ رکعتیں ہو چکی ہیں تو وہ کسی سے دریافت کرتا کہ کتنی رکعتیں ہو چکی ہیں۔ وہ جواب دیتا کہ اتنی رکعتیں پڑھ لی ہیں۔ وہ اتنی رکعتیں ادا کرتا۔ پھر حضور کے ساتھ مل جاتا۔ حضرت معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایک مرتبہ آئے اور کہنے لگے کہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو جس حال میں پاؤں گا' اسی حال میں مل جاؤں گا اور جو نماز چھوٹ گئی ہے اسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سلام پھیرنے کے بعد ادا کروں گا۔ چنانچہ انہوں نے یہی کیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سلام پھیرنے کے بعد اپنی باقی رکعتیں ادا کرنے کے لئے کھڑے ہوئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں دیکھ کر فرمایا' حضرت معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے تمہارے لئے یہ اچھا طریقہ نکالا ہے۔ تم بھی اب یونہی کیا کرو۔ یہ تین تبدیلیاں تو نماز کی ہوئیں۔ روزوں کی تبدیلیاں سنیں اوّل جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں آئے تو ہر مہینہ میں تین روزے رکھتے تھے اور عاشورہ کا روزہ رکھا کرتے تھے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے آیت: ﴿كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ......﴾ نازل فرما کر رمضان کے روزے فرض کئے۔ دوسری ابتداء یہ حکم تھا کہ جو چاہے روزہ رکھے جو چاہے نہ رکھے اور

فدیہ دے دے۔ پھر یہ آیت اُتری: ﴿فمن شَهِدَ مِنكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ﴾ (البقرہ:۱۸۵) تم میں سے جو شخص رمضان کے مہینے میں قیام کی حالت میں ہو وہ روزے رکھا کرے۔ پس جو شخص مقیم ہو مسافر نہ ہو تندرست ہو بیمار نہ ہو اس پر روزہ رکھنا ضروری ہو گیا۔ ہاں بیمار اور مسافر کے لئے رخصت ملی اور ایسا بوڑھا کھوسٹ جو روزے کی طاقت ہی نہ رکھتا ہو اسے بھی رخصت دی گئی۔ تیسری حالت یہ کہ ابتدا میں کھانا پینا عورتوں کے پاس آنا سونے سے پہلے پہلے جائز تھا۔ سو گیا تو پھر گو رات ہی کو جاگے لیکن کھانا پینا اور جماع اس لئے منع تھا۔ پھر صرمہ نامی ایک انصاری صحابی رضی اللہ تعالیٰ دن بھر کام کاج کر کے رات کو تھکے ہارے گھر آئے۔ عشا کی نماز ادا کی اور نیند آ گئی۔ دوسرے دن کچھ کھائے پیئے بغیر رکھا لیکن حالت نازک ہو گئی۔ حضور ﷺ نے پوچھا کہ یہ کیا بات ہے؟ تو انہوں نے سارا واقعہ کہہ سنایا۔ اِدھر یہ واقعہ تو ان کے ساتھ ہوا۔ اُدھر حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے سو جانے کے بعد اپنی بیوی صاحبہ سے مجامعت کر لی اور حضور ﷺ کے پاس آ کر حسرت و افسوس کے ساتھ اپنے اس قصور کا اقرار کر لیا۔ جس پر یہ آیت: ﴿اُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ اِلٰى نِسَآئِكُمْ﴾ سے ﴿ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيْلِ﴾ (البقرہ:۱۸۷) تک نازل ہوئی اور مغرب کے بعد سے لے کر صبح صادق طلوع ہونے تک رمضان کی راتوں میں کھانے پینے اور مجامعت کرنے کی رخصت دی گئی۔

بخاری و مسلم میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی ہے کہ پہلے عاشورہ کا روزہ رکھا جاتا تھا۔ جب رمضان کی فرضیت نازل ہوئی تو اب ضروری نہ رہا' جو چاہتا رکھ لیتا جو نہ چاہتا نہ رکھتا۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے بھی یہ نقل ہے: ﴿وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ﴾ کا مطلب حضرت معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ ابتداء اسلام میں جو چاہتا روزہ رکھتا۔ جو چاہتا نہ رکھتا۔ ہر دن کے بدلے ایک مسکین کو کھانا کھلا دیتا۔ حضرت سلمہ بن اکوع رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بھی صحیح بخاری میں ایک روایت آئی ہے کہ اس آیت کے نازل ہونے کے وقت جو شخص چاہتا افطار کرتا اور فدیہ دے دیتا۔ یہاں تک کہ اس کے بعد کی آیت اُتری اور یہ منسوخ ہوئی۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما بھی اس کو منسوخ کہتے ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں یہ منسوخ نہیں' مراد اس سے بوڑھا مرد اور بڑھیا عورت ہے۔ جسے طاقت روزے کی نہ ہو۔ ابن ابی لیلیٰ کہتے ہیں' عطاء رحمۃ اللہ علیہ کے پاس میں رمضان میں گیا' دیکھا کہ وہ کھانا کھا رہے ہیں۔ مجھے دیکھ کر فرمانے لگے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا قول ہے کہ اس آیت نے پہلی آیت کو منسوخ کر دیا۔ اب یہ حکم صرف بہت زیادہ بے طاقت بوڑھے ناتواں کے لئے ہے۔

حاصل کلام ☆ جو شخص مقیم ہو اور تندرست ہو۔ اس کے لئے یہ حکم نہیں بلکہ اسے روزہ ہی رکھنا ہو گا۔ ہاں ایسے بوڑھے بڑے معمر اور کمزور آدمی' جنہیں روزے کی طاقت ہی نہ ہو وہ روزہ نہ رکھیں اور نہ ان پر قضا ضروری ہے لیکن اگر وہ مالدار ہوں تو آیا انہیں کفارہ بھی دینا پڑے گا یا نہیں۔ اس میں اختلاف ہے۔ امام شافعی کا ایک قول تو یہ ہے کہ چونکہ اس میں روزے کی طاقت نہیں' لہٰذا مثل بچے کے یہ بھی ہے' اس پر کفارہ نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کسی کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا۔ دوسرا قول امام شافعی کا یہ ہے کہ اس کے ذمہ کفارہ ہے۔ اکثر علماء کرام کا بھی یہی فیصلہ ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی تفسیر سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا راجح قول یہی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ بہت عمر والا بڈھا جسے روزے کی طاقت نہ ہو تو فدیہ دے دے۔ جیسے انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بڑھاپے کی آخری وقتوں میں سال

دو سال تک روزہ نہ رکھا اور ہر روزے کے بدلے ایک مسکین کو روٹی گوشت کھلا دیا۔

مسند ابو یعلی میں ہے کہ جب حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ روزہ رکھنے سے عاجز ہو گئے تو روٹی گوشت تیار کر کے تیس مسکینوں کو بلا کر کھلا دیا۔ اسی طرح حمل والی اور دودھ پلانی والی عورت کے بارے میں جب انہیں اپنی اپنی جان کا یا اپنے بچے کی جان کا خوف ہو۔ علماء میں سخت اختلاف ہے۔ بعض تو کہتے ہیں کہ وہ روزہ نہ رکھیں' فدیہ دے دیں اور جب خوف ہٹ جائے قضا بھی کر لیں۔

بعض کہتے ہیں۔ صرف فدیہ کافی ہے قضا نہ کریں۔ بعض کہتے ہیں قضا کر لیں فدیہ نہیں' اور بعض کا قول ہے کہ نہ روزہ رکھیں نہ فدیہ دیں نہ قضا کریں۔

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَ بَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَ الْفُرْقَانِ ۚ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ۭ وَمَنْ كَانَ مَرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ ۭ يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ ۡ وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۱۸۵﴾

وہ تھوڑے (ایام) ماہ رمضان ہے جس میں قرآن مجید بھیجا گیا ہے۔ جس کا (ایک) وصف یہ ہے کہ لوگوں کے لئے (ذریعہ) ہدایت ہے اور دوسرا (وصف) واضح الدلالۃ ہے۔ منجملہ ان کتب کے جو کہ (ذریعہ) ہدایت (بھی) ہیں اور (حق و باطل میں) فیصلہ کرنے والی (بھی) ہیں۔ سو جو شخص اس ماہ میں موجود ہو اس کو ضرور اس میں روزہ رکھنا چاہئے اور جو شخص بیمار ہو یا سفر میں ہو تو دوسرے ایام کا (اتنا ہی) شمار (کر کے ان میں روزہ) رکھنا (اس پر واجب) ہے اللہ تعالیٰ کو تمہارے ساتھ (احکام میں) آسانی کرنا منظور ہے اور تمہارے ساتھ (احکام وقوانین مقرر کرنے میں) دشواری منظور نہیں اور تاکہ تم لوگ (ایام ادا یا قضا کی) شمار کی تکمیل کر لیا کرو (کہ ثواب میں کمی نہ رہے) اور تاکہ اللہ تعالیٰ کی بزرگی (وثنا) بیان کیا کرو۔ اس پر کہ تم کو (ایک ایسا طریقہ بتلا دیا جس سے تم برکات و ثمرات صیام رمضان سے محروم نہ رہو گے) اور (عذر سے خاص۔ رمضان میں' روزہ نہ رکھنے کی اجازت اس لئے دے دی) تاکہ تم لوگ (اس نعمت کی آسانی پر اللہ کا) شکر ادا کیا کرو۔ ○

رمضان کے مبارک ماہ کی فضیلت:

ماہِ رمضان شریف کی فضیلت وعظمت کا بیان ہو رہا ہے کہ اسی ماہِ مبارک میں قرآن کریم اُترا۔ مسند احمد کی حدیث ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ ابراہیمی صحیفہ رمضان کی پہلی تاریخ میں اترا اور تورات چھٹی تاریخ کو۔ انجیل تیرھویں تاریخ اور قرآن چوبیسویں تاریخ میں نازل ہوا۔ ایک اور روایت میں ہے کہ زبور بارھویں کو اور انجیل اٹھارھویں کو' اگلے تمام صحیفے اور تورات و

انجیل وزبور جس جس پیغمبر پر اتریں ایک ساتھ ایک ہی مرتبہ اتریں لیکن قرآن کریم بیت العزۃ سے آسمان دنیا تک تو ایک ساتھ ایک مرتبہ نازل ہوا اور پھر وقتاً فوقتاً حسب ضرورت زمین پر نازل ہوتا رہا۔ یہی مطلب ہے: ﴿اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ﴾ (القدر:۱) اور ﴿اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ﴾ (الدخان:۲) اور ﴿اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ﴾ کہ قرآن کریم ایک ساتھ آسمان اوّل پر رمضان المبارک کے مہینے میں لیلۃ القدر کو نازل ہوا اور اس کو لیلۂ مبارکہ بھی کہا ہے۔ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے یہی روایت ہے۔ آپ سے جب یہ سوال ہوا کہ قرآن کریم تو مختلف مہینوں میں برسوں میں اُترتا رہا۔ پھر رمضان میں اور وہ بھی لیلۃ القدر میں اُترنے کے کیا معنی ہیں؟ تو آپ نے یہی مطلب بیان کیا (ابن مردویہ وغیرہ) آپ سے یہ بھی روایت ہے کہ آدھے رمضان میں قرآن کریم آسمانِ دنیا کی طرف اُترا۔ بیت العزۃ میں رکھا گیا۔ پھر حسب ضرورت وقائع اور سوالات پر تھوڑا تھوڑا اترتا رہا اور بیس سال میں کامل ہوا۔ اس میں بہت سی آیتیں کفار کے جواب میں بھی اُتریں۔ کفار کا ایک اعتراض یہ بھی تھا کہ یہ قرآن کریم ایک ساتھ سارے کا سارا کیوں نہیں اُترا۔ جس کے جواب میں فرمایا گیا: ﴿لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ وَرَتَّلْنٰهُ تَرْتِيْلًا ......﴾ (الفرقان:۳۲) یہ اس لئے کہ تیرے دل کو برقرار اور مضبوط رکھیں وغیرہ۔ پھر قرآن کریم کی تعریف میں بیان ہو رہا ہے کہ یہ لوگوں کے دلوں کی ہدایت ہے اور اس میں واضح اور روشن دلیلیں ہیں غور فکر کرنے والا اس سے صحیح راہ پر پہنچ سکتا ہے۔ یہ حق و باطل، حرام وحلال میں فرق ظاہر کرنے والا ہے۔ ہدایت و گمراہی اور رشد و برائی میں جدائی کرنے والا ہے۔

بعض سلف رحمۃ اللہ علیہم سے منقول ہے کہ صرف رمضان کہنا مکروہ ہے۔ شہر رمضان یعنی رمضان کا مہینہ کہنا چاہئے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے نقل ہے رمضان نہ کہو یہ اللہ تعالیٰ کا نام ہے۔ شہر رمضان یعنی رمضان کا مہینہ کہا کرو۔ حضرت مجاہد اور محمد بن کعب سے بھی یہی نقل ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما اور حضرت زید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا مذہب اس کے خلاف ہے۔ رمضان نہ کہنے کے بارے میں ایک مرفوع حدیث بھی ہے لیکن سنداً وہ کمزور ہے۔ امام بخاریؒ نے بھی اس کے رد میں باب باندھ کر بہت سی حدیثیں بیان فرمائیں ہیں۔ ایک روایت میں ہے جو شخص رمضان کے روزے ایمان اور نیک بختی کے ساتھ رکھے۔ اس کے سبب اگلے گناہ بخش دیئے جاتے ہیں وغیرہ۔ غرضیکہ اس آیت سے ثابت ہوا کہ جب رمضان کا چاند چڑھے کوئی شخص اپنے گھر ہو مسافرت میں نہ ہو اور تندرست بھی ہو۔ اسے روزے رکھنے لازمی اور ضروری ہیں۔ پہلے اس قسم کے لوگوں کو بھی جو رخصت تھی وہ اُٹھ گئی۔

بیمار کو روزہ نہ رکھنے کی رخصت ☆ اس کا بیان فرما کر پھر بیمار اور مسافر کی رخصت کا بیان فرمایا گیا کہ یہ لوگ روزہ ان دنوں میں نہ رکھیں اور پھر یہ قضا کرلیں۔ یعنی جس کے بدن میں کوئی تکلیف ہو۔ جس کی وجہ سے روزے میں مشقت پڑے یا تکلیف بڑھ جائے یا سفر میں ہو تو افطار کرلے اور جتنے روزے جائیں اتنے دن پھر قضا کرلے۔ پھر ارشاد ہوتا ہے کہ ان حالتوں میں رخصت عنایت فرما کر تمہیں مشقت سے بچالینا یہ سراسر ہماری رحمت کا ظہور ہے اور احکام اسلام میں آسانی ہے۔ اس موقع پر چند مسائل قابل غور ہیں:

① سلف رحمۃ اللہ علیہم کی ایک جماعت کا خیال ہے کہ جو شخص اپنے گھر میں مقیم ہو رمضان شریف کا مہینہ آجائے۔ پھر درمیان میں اسے سفر درپیش ہو تو اسے روزہ ترک کرنا جائز نہیں کیونکہ ایسے لوگوں کو جو روزہ رکھنا کا صاف حکم قرآن پاک میں موجود ہے۔ ہاں ان لوگوں کو بحالت سفر روزہ چھوڑنا جائز ہے جو سفر میں ہوں اور رمضان کا مہینہ آجائے لیکن یہ قول

غریب ہے۔ ابو محمد بن حزم نے اپنی کتاب محلّی میں صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعین رحمۃ اللہ علیہم کی ایک جماعت کا یہی مذہب نقل کیا ہے لیکن اس میں کلام ہے واللہ اعلم۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم رمضان المبارک میں فتح مکہ کے غزوہ کے لئے تو روزے سے تھے۔ کدید (ایک جگہ کا نام ہے ۱۲) میں پہنچ کر روزہ افطار کیا اور لوگوں کو بھی حکم دیا کہ روزہ توڑ دیں۔ (متفق علیہ)

۲۔ صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعین رحمۃ اللہ علیہم کی ایک اور جماعت نے کہا ہے کہ مسافرت میں روزہ توڑ دینا واجب ہے کیونکہ قرآن کریم میں ہے: ﴿فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ﴾ لیکن صحیح قول جو جمہور کا مذہب ہے یہ ہے کہ آدمی کو اختیار ہے خواہ رکھے خواہ نہ رکھے۔ اس لئے کہ ماہِ رمضان میں لوگ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نکلتے تھے۔ بعض روزے سے ہوتے تھے۔ بعض روزے سے نہیں ہوتے تھے۔ پس روزے دار بے روزہ پر اور بے روزہ روزہ دار پر کوئی عیب نہیں پکڑتا تھا۔ اگر افطار واجب ہوتا تو روزہ رکھنے والوں پر انکار کیا جاتا۔ بلکہ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بحالت سفر روزہ رکھنا ثابت ہے۔ صحیحین میں ہے' حضرت ابودرداء رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں' رمضان المبارک میں سخت گرمی کے موسم میں ہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک سفر میں تھے۔ گرمی کی شدت کی وجہ سے سر پر ہاتھ رکھے رکھے پھر رہے تھے۔ ہم میں سے کوئی بھی روزے سے نہ تھا۔ سوائے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے۔

۳۔ ایک جماعت علماء کا خیال ہے جن میں حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ بھی ہیں کہ سفر میں روزہ رکھنا نہ رکھنے سے افضل ہے۔ کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بحالت سفر روزہ رکھنا ثابت ہے۔ ایک دوسری جماعت کا خیال ہے کہ روزہ نہ رکھنا افضل ہے کیونکہ اس میں رخصت پر عمل ہے اور ایک حدیث میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سفر کے روزے کی بابت سوال ہوا۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو روزہ توڑ دے' اس نے اچھا کیا اور جو نہ توڑے اس پر کوئی گناہ نہیں۔ ایک اور حدیث شریف میں ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ خدا کی رخصتوں کو جو اس نے تمہیں دی ہیں' تم لے لو۔ تیسری جماعت کا قول ہے کہ رکھنا نہ رکھنا دونوں برابر ہیں۔ ان کی دلیل حضرت عائشہؓ والی حدیث ہے کہ حضرت حمزہ ابن عمرو اسلمیؓ نے کہا' یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! میں روزے اکثر رکھا کرتا ہوں تو کیا اجازت ہے کہ سفر میں بھی روزے رکھ لیا کروں۔ فرمایا اگر چاہو رکھو چاہو نہ رکھو۔ (بخاری ومسلم) بعض لوگوں کا قول ہے کہ اگر روزہ بھاری پڑتا ہو تو افطار کرنا افضل ہے۔ حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو دیکھا کہ اس پر سایہ کیا گیا ہے۔ پوچھا کیا بات ہے؟ لوگوں نے کہا' حضور یہ روزے سے ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سفر میں روزہ رکھنا نیکی نہیں۔ (بخاری ومسلم)

یہ خیال رہے کہ جو شخص سنت کو ترک کرے اور روزہ چھوڑنا سفر کی حالت میں بھی مکروہ ہو جائے تو اس پر افطار کرنا ضروری ہے اور روزہ رکھنا حرام ہے۔ مسند احمد وغیرہ میں حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما حضرت جابر وغیرہ سے نقل ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کی رخصت کو قبول نہ کرے۔ اس پر عرفات کے پہاڑوں کے برابر گناہ ہوگا۔

چھوٹا مسئلہ: قضا کس طرح ہوگی؟

سوال آیا قضا روزوں میں پے در پے روزے رکھنے ضروری ہیں یا جدا جدا بھی رکھ لئے جائیں تو حرج نہیں؟

جواب ایک مذہب بعض لوگوں کا یہ ہے کہ قضا کو مثل ادا کے پورا کرنا چاہئے' ایک کے پیچھے ایک یونہی لگا تار روزے رکھنے چاہئیں۔ دوسرے یہ کہ پے در پے رکھنے واجب نہیں۔ خواہ الگ الگ رکھے۔ خواہ ایک ساتھ اختیار کرے۔ جمہور سلف وخلف کا

یہی قول ہے اور دلائل سے ثبوت بھی اسی کا ہے۔ رمضان میں پے در پے رکھنا اس لئے ہے کہ وہ مہینہ ہی ادائیگی روزہ کا ہے اور رمضان کے ختم ہو جانے کے بعد تو صرف وہ گنتی پوری کرنی ہے۔ خواہ کوئی دن ہو اسی لئے قضا کے حکم کے بعد خدا کی آسانی کی نعمت کا بیان ہوا ہے مسند احمد میں ہے' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا' بہتر دین وہی ہے جو آسانی والا ہو۔ بہترین دین وہی ہے جو آسانی والا ہو۔ مسند ہی کی ایک اور حدیث میں ہے۔ ابو عروہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں' ہم ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ کا انتظار کر رہے تھے کہ آپ ﷺ تشریف لائے۔ سر سے پانی کے قطرے ٹپک رہے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ وضو یا غسل کر کے تشریف لا رہے ہیں۔ جب نماز سے فارغ ہوئے تو لوگوں نے آپ ﷺ سے سوالات کرنے شروع کر دیئے کہ حضور ﷺ کیا فلاں کام میں کوئی حرج ہے؟ فلاں کام میں کوئی حرج ہے؟ آخر میں حضور ﷺ نے فرمایا' اللہ کا دین آسانیوں والا ہے۔ تین مرتبہ یہی فرمایا۔ مسند احمد ہی کی ایک اور حدیث میں ہے۔ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں۔ لوگو آسانی کرو سختی نہ کرو' تسکین دو' نفرت نہ دلاؤ۔ صحیحین کی حدیث میں بھی ہے رسول اللہ ﷺ نے حضرت معاذ اور حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہما کو جب یمن کی طرف بھیجا تو فرمایا تم دونوں خوشخبریاں دینا' نفرت نہ دلانا' آسانیاں کرنا سختیاں نہ کرنا' آپس میں اتفاق سے رہنا' اختلاف نہ کرنا۔

سنن اور مسانید میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ میں یک طرفہ نرمی اور آسانی والے دین کے ساتھ بھیجا گیا ہوں۔

محجن بن ادرع رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھا۔ غور سے آپ ﷺ اسے دیکھتے رہے۔ پھر فرمایا کہ تم اسے سچائی کے ساتھ نماز پڑھتے ہوئے دیکھ رہے ہو لوگوں نے کہا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم' یہ تمام اہل مدینہ سے زیادہ نماز پڑھنے والا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا' اسے نہ سناؤ کہیں یہ اس کی ہلاکت کا سبب نہ ہو سنو! اللہ تعالیٰ کا ارادہ اس امت کے ساتھ آسانی کا ہے سختی کا نہیں۔ پس آیت کا مطلب یہ ہوا کہ مریض اور مسافر وغیرہ کو یہ رخصت دینا اور انہیں معذور جاننا اس لئے ہے کہ خدائے تعالیٰ کا ارادہ آسانی کا ہے سختی کا نہیں اور قضا کا حکم گنتی کے پورا کرنے کے لئے ہے اور اس رحمت' نعمت' ہدایت اور عبادت پر تمہیں اللہ تبارک وتعالیٰ کی بڑائی اور ذکر کرنا چاہئے جیسے اور جگہ حج کے موقعہ پر فرمایا: ﴿فَاِذَا قَضَيْتُمْ مَّنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ......﴾ (البقرہ:٢٠٠) یعنی جب احکام حج ادا کر چکو تو خدا کا ذکر کرو اور جگہ جمعہ کی نماز کی ادائیگی کے بعد فرمایا کہ جب نماز پوری ہو جائے تو زمین میں پھیل جاؤ' رزق تلاش کرو اور خدا کا ذکر زیادہ کرو تا کہ تمہیں فلاح ملے اور جگہ فرمایا: ﴿سَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ......﴾ (ق:٣٩) یعنی سورج کے نکلنے سے پہلے۔ سورج کے ڈوبنے سے پہلے۔ رات کو اور سجدوں کے بعد اللہ تعالیٰ کی تسبیح بیان کرو۔ اسی لئے مسنون طریقہ یہ ہے کہ ہر فرض نماز کے بعد اللہ تعالیٰ کی حمد' تسبیح اور تکبیر پڑھنی چاہئے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ ہم رسول اللہ ﷺ کا نماز سے فارغ ہونا صرف اللہ اکبر کی آوازوں سے جانتے تھے۔ یہ آیت دلیل ہے اس امر کی کہ عید الفطر میں بھی تکبیریں پڑھنی چاہئیں۔ داؤد بن علی اصبہانی ظاہری کا مذہب ہے کہ اس عید میں تکبیروں کا کہنا واجب ہے کیونکہ اس امر میں صیغہ امر کا ہے۔ ﴿وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ﴾ اور اس کے بالکل برخلاف حنفی مذہب کا ہے۔ وہ کہتے ہیں' اس عید میں تکبیریں پڑھنا مسنون نہیں[1]۔ باقی بزرگان دین اسے مستحب بتلاتے

[1] امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ تکبیر میں آواز بلند کرنا خلاف اولیٰ ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ''اپنے خدا کو ...... =

ہیں۔ گو بعض تفصیلوں میں قدرے اختلاف ہے۔ پھر فرمایا تاکہ تم شکر کرو۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے احکام بجالا کر اس کے فرائض کو ادا کر کے اس کے حرام کردہ کاموں سے بچ کر اس کے حدود کی حفاظت کر کے تم شکر گزار بندے بن جاؤ۔

وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي فَإِنِّي قَرِيبٌ أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ فَلْيَسْتَجِيبُوا لِي وَلْيُؤْمِنُوا بِي لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُونَ ﴿۱۸۶﴾

اور جب آپ سے میرے بندے میرے متعلق دریافت کریں تو (آپ میری طرف سے فرما دیجئے) میں قریب ہی ہوں (اور باستثنا نامناسب درخواست کے) منظور کر لیتا ہوں (ہر) عرضی درخواست کرنے والے کی جبکہ وہ میرے حضور میں درخواست دے۔ سو ان کو چاہئے کہ میرے احکام کو قبول کیا کریں اور مجھ پر یقین رکھیں۔ اُمید ہے کہ وہ لوگ رشد (وفلاح) حاصل کر سکیں گے۔ ○

دِل کے آئینہ میں ☆

ایک اعرابی نے پوچھا تھا کہ یا رسول اللہ ﷺ کیا ہمارا رب قریب ہے؟ اگر قریب ہو تو ہم اس سے سرگوشیاں کر لیں یا دور ہے؟ اگر دور ہو تو ہم اونچی اونچی آوازوں سے اسے پکاریں۔ نبی ﷺ خاموش رہے۔ اس پر آیت اُتری۔ (ابن ابی حاتم) ایک اور روایت میں ہے کہ صحابہ کے اس سوال پر کہ ہمارا رب کہاں ہے؟ یہ آیت اُتری۔ (ابن جریر) حضرت عطا فرماتے ہیں کہ جب آیت: ﴿ادْعُونِي أَسْتَجِبْ لَكُمْ﴾ (المومن: ۶۰) نازل ہوئی یعنی مجھے پکارو' میں تمہاری دعائیں قبول کرتا ہوں تو لوگوں نے پوچھا کہ دعا کس وقت کرنی چاہئے۔ اس پر یہ آیت اُتری۔ (ابن جریج) حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا بیان ہے کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ایک غزوے میں تھے۔ ہر اونچائی پر چڑھتے وقت ہر بلندی پر چڑھتے وقت ہر وادی میں اُترتے وقت بلند آواز سے تکبیر کہتے جاتے تھے۔ نبی ﷺ ہمارے پاس آ کر فرمانے لگے۔ لوگو! اپنی جانوں پر رحم کرو۔ تم کسی کم سننے والے یا دور والے کو نہیں پکار رہے بلکہ جسے تم پکارتے ہو وہ تو تم سے تمہاری سواریوں کی گردن سے بھی زیادہ قریب ہے۔ اے عبداللہ بن قیس سن جنت کا خزانہ: **لاحول و لا قوة الا باللہ** ہے۔ (مسند احمد)۔

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا' اللہ تعالیٰ فرماتا ہے' میرا بندہ میرے ساتھ جیسا عقیدہ رکھتا ہے' میں بھی اس کے ساتھ ویسا ہی برتاؤ برتتا ہوں۔ جب وہ مجھ سے دعا مانگتا ہے' میں اس کے ساتھ ہی ہوتا ہوں۔ (مسند احمد) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میرا بندہ جب مجھے یاد کرتا ہے اور اس کے ہونٹ میرے ذکر میں ہلتے ہیں۔ میں اس کے ساتھ ہوتا ہوں۔ (رواہ الامام احمد) اس مضمون کی آیت کلام پاک میں بھی ہے۔ فرمان ہے: ﴿إِنَّ اللَّهَ مَعَ الَّذِينَ اتَّقَوا وَّالَّذِينَ هُمْ مُّحْسِنُونَ﴾ (النحل: ۱۲۸) جو تقویٰ اور احسان و خلوص والے لوگ ہوں' ان کے ساتھ اللہ تعالیٰ ہوتا ہے۔ حضرت موسیٰ اور ہارون علیہما السلام سے فرمایا جاتا ہے:

= چپکے چپکے دِل ہی میں یاد کرو' اسی طرح آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''بہترین ذکر وہ ہے جو دل ہی دل میں ہو' اور تکبیر بلند آواز سے صرف عیدالاضحیٰ میں ثابت رہے اس لئے عیدالفطر میں خلافِ اولیٰ کے ارتکاب کی کیا ضرورت ہے۔ ۱۲

حاصلِ کلام ☆ یہاں ساری تفصیل نماز سے باہر کی تکبیروں کی ہے۔ ۱۲

﴿اِنَّنِیْ مَعَکُمَآ اَسْمَعُ وَاَرٰی﴾ (طٰہٰ:۴۶) میں تم دونوں کے ساتھ ہوں۔ سنتا ہوں اور دیکھ رہا ہوں۔ مقصود یہ ہے کہ باری تعالیٰ دعا کرنے والے کی دعا کو بیکار نہیں کرتا' نہ ایسا ہوتا ہے کہ وہ اس دعا سے غافل رہے' نہ سنے' اس میں دعا کرنے کی رغبت دلائی ہے اور اس کے ضائع نہ ہونے کا وعدہ کیا ہے۔

☆ **دُعا کی اہمیت' اس کی شرائط اور قبولیتِ دُعا کے اسباب** ☆ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں' نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ بندہ جب اللہ تعالیٰ کے سامنے ہاتھ بلند کر کے دعا مانگتا ہے تو وہ ارحم الرحمین اس کے ہاتھوں کو خالی پھیرتے ہوئے شرماتا ہے۔ (مسند احمد) حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں' رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ بندہ اللہ تعالیٰ سے کوئی ایسی دعا کرتا ہے جس میں نہ گناہ ہو نہ رشتے ناتے ٹوٹتے ہوں تو اسے اللہ تعالیٰ تین باتوں میں سے ایک ضرور عطا فرماتا ہے۔ یا تو اس وقت قبول فرما کر اس کی منہ مانگی مراد پوری کرتا ہے یا اسے ذخیرہ کر کے رکھ چھوڑتا ہے اور آخرت میں عطا فرماتا ہے یا اس کی وجہ سے کوئی آنے والی بلا اور مصیبت کو ٹال دیتا ہے۔ لوگوں نے یہ سن کر کہا کہ حضور ﷺ پھر تو ہم بکثرت دعا مانگا کریں گے۔ آپ ﷺ نے فرمایا پھر خدا کے ہاں کیا کمی ہے؟ (مسند احمد)

عبادہ بن صامت رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا ہے کہ روئے زمین کا جو مسلمان اللہ عزوجل سے دعا مانگے' اسے خدا تعالیٰ قبول فرماتا ہے یا تو اسے منہ مانگی مراد ملتی ہے یا ویسی ہی برائی ٹلتی ہے' جب تک کہ گناہ اور رشتہ داری کے کٹنے کی دُعا نہ ہو۔ (مسند احمد) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا' جب تک کوئی شخص دعا میں جلدی نہ کرے اس کی دعا ضرور قبول ہوتی ہے۔ جلدی کرنا یہ ہے کہ کہنے لگے میں نے ہر چند دعا مانگی لیکن خدا قبول نہیں کرتا۔ (موطا مالک) بخاری کی روایت میں یہ بھی ہے کہ اسے ثواب میں جنت عطا فرماتا ہے۔ صحیح مسلم میں یہ بھی ہے کہ نامقبولیت کا خیال کر کے وہ نا اُمیدی کے ساتھ دعا مانگنا ترک کر دے۔ یہ جلدی کرنا ہے۔ ابو جعفر طبری کی تفسیر میں یہ قول' حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا بیان کیا گیا ہے' حضرت عبداللہ بن عمروؓ فرماتے ہیں' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ دل مثل برتنوں کے ہیں' بعض بعض سے زیادہ نگرانی کرنے والے ہوتے ہیں۔ اے لوگو! تم جب اللہ تعالیٰ سے دعا مانگا کرو تو قبولیت کا یقین رکھا کرو۔ سنو! غفلت والے دِل کی دُعا اللہ تعالیٰ قبول نہیں فرماتا۔ (مسند احمد) حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے ایک مرتبہ حضور ﷺ سے اس آیت کے بارے میں سوال کیا تو آپ نے دعا کی کہ خدایا عائشہ کے اس سوال کا کیا جواب ہے؟ جبرئیل علیہ السلام آئے اور فرمایا اللہ تعالیٰ آپ کو سلام کہتا ہے اور فرماتا ہے' مراد اس سے وہ شخص ہے جو نیک اعمال کرنے والا ہو اور سچی نیت اور نیک دلی کے ساتھ مجھے پکارے تو میں لبیک کہہ کر اس کی حاجت ضرور پوری کر دیتا ہوں۔ (ابن مردویہ) یہ حدیث اسناد کی رو سے غریب ہے۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ حضور ﷺ نے اس آیت کی تلاوت کی۔ پھر فرمایا' خدایا! تو نے دعا کا حکم دیا ہے اور اجابت کا وعدہ فرمایا ہے۔ میں حاضر ہوا' الٰہی میں حاضر ہوں۔ اے لاشریک خدا میں حاضر ہوں' حمد و نعت اور ملک تیرے ہی لئے ہے۔ تیرا کوئی شریک نہیں۔ میری گواہی ہے کہ تو نرالا' یکتا بے مثل اور ایک ہی ہے تو پاک ہے' بیوی اور اولاد سے دور ہے۔ نہ تیرا ہم سر کوئی' نہ تیری کفو کا کوئی' نہ تجھ جیسا کوئی میری گواہی یہ ہے کہ تیرا وعدہ سچا۔ تیری ملاقات حق' جنت' دوزخ' قیامت اور دوبارہ جینا یہ سب برحق اَمر ہے۔ (ابن مردویہ)

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے کہ اے ابن آدم ایک چیز

تو تیری ہے ایک میری ہے اور ایک مجھ میں اور تجھ میں مشترک ہے۔ خالص میرا حق تو یہ ہے کہ ایک میری ہی عبادت کرے اور میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کرے۔ تیرے لئے مخصوص یہ ہے کہ تیرے ہر ہر عمل کا پورا پورا بدلہ میں تجھے ضرور دوں گا۔ کسی نیکی کو ضائع نہیں کروں گا۔ مشترک چیز یہ ہے کہ تو دعا کر اور قبول کروں۔ ایک کام دعا کرنا تیرا اور ایک کام قبول کرنا میرا۔ (بزار)

دعا کی اس آیت کو روزوں کے احکام کی آیتوں کے درمیان ذکر کرنے کی حکمت یہ ہے کہ روزے ختم ہونے کے بعد لوگوں کو دعا کی ترغیب ہو بلکہ ہر روز افطار کے وقت وہ بکثرت دعائیں کیا کریں۔ حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ روزے دار افطار کے وقت جو دعا کرتا ہے اللہ تعالیٰ اسے قبول فرماتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ افطار کے وقت اپنے گھر والوں کو اور بچوں کو سب کو بلا لیتے اور دعائیں کیا کرتے تھے۔ (ابوداؤد طیالسی) ابن ماجہ میں بھی یہ روایت ہے اور اس میں صحابہ کی یہ دعا منقول ہے: ((اللّٰهم انی اسئلك برحمتك اللتی وسعت كل شی ان تغفرلی.)) یعنی اے اللہ! میں تیری اس رحمت کو تجھے یاد دلا کر جس نے تمام چیزوں کو گھیر رکھا ہے۔ تجھ سے سوال کرتا ہوں کہ تو میرے گناہ معاف فرما دے اور حدیث میں ہے تین شخصوں کی دعا رد نہیں ہوتی: (۱) عادل بادشاہ (۲) روزے دار شخص اور (۳) مظلوم۔ اسے قیامت والے دن اللہ تعالیٰ بلند کرے گا۔ مظلوم کی بد دعا کے لئے آسمان کے دروازے کھل جاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے' مجھے میری عزت کی قسم میں تیری مدد ضرور کروں گا' گو دیر سے کروں۔ (مسند ترمذی' نسائی اور ابن ماجہ)

اُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ اِلٰى نِسَآئِكُمْ ؕ هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ ؕ عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنْكُمْ ۚ فَالْـٰٔنَ بَاشِرُوْهُنَّ وَابْتَغُوْا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ ۪ وَكُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ۪ ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيْلِ ۚ وَلَا تُبَاشِرُوْهُنَّ وَاَنْتُمْ عٰكِفُوْنَ فِى الْمَسٰجِدِ ؕ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَقْرَبُوْهَا ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ﴿۱۸۷﴾

تم لوگوں کے لئے روزہ کی شب میں اپنی بیبیوں سے مشغول ہونا حلال کر دیا گیا ہے کیونکہ وہ تمہارے (بجائے) اوڑھنے بچھونے (کے) ہیں اور تم ان کے (بجائے) اوڑھنے بچھونے (کے) ہو۔ خدا تعالیٰ کو اس کی خبر تھی کہ تم خیانت (کر کے) کے گناہ میں اپنے کو مبتلا کر رہے تھے۔ مگر خیر اللہ تعالیٰ نے تم پر عنایت فرمائی اور تم سے گناہ دھو دیا۔ سو اب ان سے ملو ملاؤ اور جو (قانون اجازت) تمہارے لئے تجویز کر دیا ہے (بلا تکلف) اس کا سامان کرو اور

کھاؤ اور پیو (بھی) اس وقت تک کہ تم کو سفید خط (یعنی نور) صبح (صادق) متمیز ہو جائے سیاہ خط سے پھر (صبح صادق سے) رات تک روزہ کو پورا کیا کرو اور ان بیبیوں سے اپنا بدن بھی مت ملنے دو جس زمانہ میں کہ تم لوگ اعتکاف والے ہو مسجدوں میں خداوندی ضابطے ہیں سو ان سے نکلنے کے نزدیک بھی مت ہونا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ اپنے (اور) احکام (بھی) لوگوں (کی اصلاح) کے واسطے بیان فرمایا کرتے ہیں اس امید پر کہ وہ لوگ (مطلع) ہو کر خلاف کرنے سے پرہیز رکھیں۔ ○

ابتداء میں کچھ احکام روزہ سے متعلق تھے لیکن پھر منسوخ ہو گئے:

ابتدائے اسلام میں یہ حکم تھا کہ افطار کے بعد کھانا پینا' جماع کرنا عشا کی نماز تک جائز تھا اور اگر کوئی اس سے بھی پہلے سو گیا تو اس پر نیند آتے ہی حرام ہو گیا۔ اس پر صحابہ کو قدرے مشقت ہوئی۔ جس پر یہ رخصت کی آیتیں نازل ہوئیں اور آسانی کے احکام مل گئے۔ ﴿رفث﴾ سے مراد یہاں جماع ہے۔ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما' عطا' مجاہد' سعید بن جبیر' طاؤس' سالم بن عبداللہ' عمرو بن دینار' حسن' قتادہ' زہری' ضحاک' ابراہیم نخعی' سدی' عطا خراسانی' مقاتل بن حبان رحمہم اللہ بھی یہی فرماتے ہیں۔ ﴿لباس﴾ سے مراد سکون ہے۔ ربیع بن انس لحاف کے معنی بیان کرتے ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ میاں بیوی کے آپس میں تعلقات اس قسم کے ہیں کہ انہیں ان راتوں میں بھی اجازت دی جاتی ہے۔ پہلے حدیث گزر چکی ہے کہ اس آیت کا شان نزول کیا ہے۔ جس میں بیان ہو چکا ہے کہ یہ جب حکم تھا کہ افطار سے پہلے اگر کوئی سو جائے تو اب رات کو جاگ کر کھا پی نہیں سکتا۔ اب اسے یہ رات اور دوسرا دن گزار کر بعد از مغرب کھانا پینا حلال ہو گا۔

حضرت قیس بن صرمہ انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ دن بھر کھیتی باڑی کا کام کر کے شام کو گھر آئے۔ بیوی سے کچھ کھانے کو ہے؟ جواب ملا کچھ نہیں۔ میں جاتی ہوں اور کہیں سے لاتی ہوں۔ تو وہ گئیں اور یہاں ان کی آنکھ لگ گئی۔ جب آ کر دیکھا تو بڑا افسوس کیا کہ اب یہ رات اور دوسرا دن بھوکے پیٹوں کیسے گزرے گا۔ چنانچہ جب آدھا دن ہوا تو حضرت قیس رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھوک کے مارے بیہوش ہو گئے۔ حضور ﷺ کے پاس ذکر ہوا اس پر یہ آیت اُتری اور مسلمان بہت خوش ہوئے۔ ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ صحابہؓ رمضان بھر عورتوں کے پاس نہیں جاتے تھے لیکن بعض لوگوں سے کچھ ایسے قصور بھی ہو جایا کرتے تھے جس پر یہ آیت مبارکہ نازل ہوئی۔ ایک روایت میں ہے کہ یہ قصور کئی ایک حضرات سے ہو گیا تھا۔ جن میں عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی تھے۔ جنہوں نے عشاء کی نماز کے بعد اپنی اہلیہ سے مباشرت کی تھی۔ پھر دربارِ نبوت میں شکایتیں ہوئیں اور یہ رحمت کی آیتیں اُتریں۔ ایک روایت میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے آ کر جب یہ واقعہ سنایا تو آپ ﷺ نے فرمایا' عمر تم سے تو ایسی اُمید نہ تھی۔ اسی وقت یہ آیت اُتری۔ ایک روایت میں ہے کہ حضرت قیس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عشاء کی نماز کے بعد نیند سے بیدار ہو کر کھا پی لیا تھا اور صبح حاضر ہو کر حضور ﷺ سے اپنا یہ قصور بیان کیا تھا۔ ایک اور روایت میں یہ بھی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جب مباشرت کا ارادہ کیا تو بیوی صاحبہ نے فرمایا کہ مجھے نیند آ گئی تھی لیکن انہوں نے اسے بہانہ سمجھا۔ اس رات آپ دیر تک مجلس نبوی میں بیٹھے رہے تھے اور بہت رات گئے گھر پہنچے تھے۔ ایک اور روایت میں ہے کہ کعب بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بھی ایسا ہی قصور ہو گیا تھا۔ ﴿مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ﴾ سے مراد اولاد ہے۔ بعضوں نے کہا ہے جماع مراد ہے۔ بعض کہتے ہیں لیلۃ القدر مراد ہے قتادہ کہتے ہیں مراد اس سے رخصت ہے۔ تطبیق ان سب اقوال میں اس

طرح ہوسکتی ہے کہ عموم کے طور پر سب ہی مراد ہیں جماع کی رخصت کے بعد کھانے پینے کی اجازت مل رہی ہے کہ صبح صادق تک اس کی اجازت ہے۔

صحیح بخاری شریف میں ہے کہ حضرت سہل بن سعد رضی اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ پہلے من الفجر کا لفظ نہیں اُترا تھا' تو چند لوگوں نے اپنے پاؤں میں سفید اور سیاہ دھاگے باندھ لئے اور جب تک ان کی سفیدی اور سیاہی میں تمیز نہ ہوئی' کھاتے پیتے رہے اس کے بعد یہ لفظ اترا اور معلوم ہوگیا کہ اس سے مراد رات دن ہے۔ مسند احمد میں ہے' حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے بھی دو دھاگے سیاہ اور سفید اپنے تکیئے تلے رکھ لئے اور جب تک ان کے رنگ میں تمیز نہ ہوئی' کھاتے پیتے رہے۔ صبح کو حضور ﷺ سے ذکر کیا تو آپ نے فرمایا' تیرا تکیہ بڑا لمبا چوڑا نکلا۔ اس سے مراد تو صبح کی سفیدی کا رات کی سیاہی سے ظاہر ہونا ہے۔ یہ حدیث صحیحین میں بھی ہے۔ مطلب حضور ﷺ کے اس قول کا یہ ہے کہ آیت میں تو دھاگوں سے مراد دن کی سفیدی اور رات کی تاریکی ہے۔ تو اگر تیرے تکیئے تلے یہ دونوں آ جاتی ہوں تو گویا اس کی لمبائی مشرق مغرب تک محیط ہے۔ صحیح بخاری میں یہ تفسیر بھی روایتاً موجود ہے بعض روایتوں میں یہ لفظ بھی ہیں کہ پھر تو تُو بڑی لمبی چوڑی گردن والا ہے۔ بعض لوگوں نے اس کے معنی بیان کئے ہیں کہ کند ذہن ہے لیکن یہ معنی غلط ہیں بلکہ مطلب دونوں جملوں کا ایک ہی ہے کیونکہ جب تکیہ اتنا بڑا ہے تو گردن بھی اتنی بڑی ہوگی۔ واللہ اعلم۔ بخاری شریف میں حضرت عدی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا اسی طرح کا سوال اور آپ کا اسی طرح کا جواب تفصیل سے یہی ہے۔ آیت کے ان الفاظ سے سحری کھانے کا استحباب بھی ثابت ہوتا ہے۔ اس لئے کہ خدا کی رخصتوں پر عمل کرنا اسے پسند ہے۔ حضور ﷺ کا فرمان ہے کہ سحری کھایا کرو۔ اس میں برکت ہے۔ (بخاری و مسلم) ہمارے اور اہل کتاب کے روزوں میں سحری کھانے ہی کا فرق ہے۔ (مسلم) سحری کا کھانا برکت ہے' اسے نہ چھوڑو۔ اگر کچھ نہ ملے تو پانی کا گھونٹ ہی سہی۔ اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے سحری کھانے والوں پر رحمت بھیجتے ہیں (مسند احمد) اسی طرح اور بھی بہت سی حدیثیں ہیں۔ سحری کو دیر کر کے کھانا چاہئے۔ ایسے وقت کہ فراغت کے کچھ ہی دیر بعد صبح صادق ہو جائے حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم سحری کھاتے ہی نماز کے لئے کھڑے ہو جایا کرتے تھے۔ اذان اور سحری کے درمیان اتنا ہی فرق ہوتا تھا کہ پچاس آیتیں پڑھ لی جائیں۔ (بخاری' مسلم)

رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں جب تک میری اُمت افطار میں جلدی کرے اور سحری میں تاخیر کرے اس وقت تک بھلائی سے رہے گی۔ (مسند احمد) یہ بھی حدیث سے ثابت ہے کہ حضور ﷺ نے اس کا نام غذائے مبارک رکھا ہے۔ مسند احمد وغیرہ کی ایک حدیث میں ہے۔ حضرت حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم نے حضور ﷺ کے ساتھ سحری کھائی' ایسے وقت کہ گویا سورج طلوع ہونے ہی والا تھا' لیکن اس میں ایک راوی عاصم بن ابونجور منفرد ہیں اور مراد اس سے دن کی نزدیکی ہے۔ جیسے فرمان باری تعالیٰ ہے: ﴿فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ......﴾ (البقرہ ۲۳۴) یعنی جب وہ عورتیں اپنے وقتوں کو پہنچ جائیں۔ مراد یہ ہے کہ عدت کا زمانہ ختم ہو جانے کے قریب آ جائے۔ یہی مراد اس حدیث میں بھی ہے کہ انہوں نے سحری کھائی اور صبح ہو جانے کا یقین نہ تھا بلکہ ایسا وقت تھا کہ کوئی کہتا تھا ہوگئی' کوئی کہتا تھا نہیں ہوئی۔ اکثر اصحاب رسول ﷺ کا دیر سے سحری کھانا اور آخری وقت تک کھاتے رہنا ثابت ہے۔ جیسے حضرت ابوبکر' حضرت عمر' حضرت ابن مسعود' حضرت حذیفہ' حضرت ابو ہریرہ' حضرت ابن عمر' حضرت ابن عباس' حضرت زید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین اور تابعین کی بھی ایک بہت بڑی جماعت

سے صبح صادق کے طلوع ہونے کے بالکل قریب ہی سحری کھانا نقل ہے جیسے محمد بن علی بن حسین' ابومجلز' ابراہیم نخعی' ابوالضحیٰ' ابووائل وغیرہ شاگردانِ ابن مسعود اور عطاء اور حسن اور حاکم بن عیینہ اور مجاہد اور عروہ بن زبیر اور ابوالشعثاء جابر بن زید اور یہی مذہب ہے اعمش اور جابر بن رشد کا اللہ تعالیٰ ان سب پر اپنی رحمتیں نازل فرمائے۔ ہم نے ان سب کی اسناد دیں اپنی مستقل کتاب ''کتاب الصیام'' میں بیان کردی ہیں۔ وللہ الحمد۔

ابن جریر نے اپنی تفسیر میں بعض لوگوں سے یہ بھی نقل کیا ہے کہ سورج کے طلوع ہونے تک کھانا پینا جائز ہے جیسے غروب ہوتے ہی افطار کرنا لیکن یہ قول کوئی عالم قبول نہیں کرسکتا کیونکہ نص قرآن کے خلاف ہے۔ قرآن میں خیط کا لفظ موجود ہے۔ بخاری' مسلم کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ حضرت بلال (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) اذان سن کر تم سحری سے نہ رک جایا کرو۔ وہ رات باقی ہوتے ہوئے اذان دیا کرتے ہیں۔ تم کھاتے پیتے رہو۔ جب تک حضرت عبداللہ بن ام مکتوم (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) کی اذان نہ سن لو۔ وہ اذان نہیں کہتے' جب تک فجر طلوع نہ ہوجائے۔ مسند احمد میں حدیث ہے' رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں کہ وہ فجر نہیں جو آسمانوں کے کناروں میں لمبی پھیلتی ہے۔ بلکہ وہ سرخی والی اور کنارے ظاہر ہونے والی ہوتی ہے۔ ترمذی میں بھی یہ روایت ہے۔ اس میں ہے کہ اس پہلی فجر کو جو طلوع ہو کر اُوپر کو چڑھتی ہے' دیکھ کر کھانے پینے سے نہ رکو۔ بلکہ کھاتے پیتے رہو' یہاں تک کہ سرخ دھاری سامنے آجائے ایک اور حدیث میں صبح کاذب اور اذان بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ایک ساتھ بھی بیان فرمایا ہے۔ ایک اور روایت میں صبح کاذب کو سپیدی صبح کے ستون کے مانند بتلایا ہے۔ دوسری روایت میں اس پہلی اذان کی جس کے مؤذن حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھے' یہ وجہ بیان کی ہے کہ وہ سوتوں کو جگانے اور نماز (تہجد) پڑھنے والوں کو لوٹانے کے لئے ہوتی ہے۔ فجر اس طرح نہیں ہے۔ جب تک اس طرح نہ ہو یعنی آسمان میں اونچی چڑھنے والی نہیں' بلکہ کناروں میں دھاری کی طرح ظاہر ہونے والی ہے۔ ایک مرسل حدیث میں ہے۔ فجر دو ہیں۔ ایک تو بھیڑیے کی دم کی طرح' اس سے روزے دار پر کوئی چیز حرام نہیں ہوتی ہاں وہ فجر جو کناروں میں ظاہر ہو۔ وہ نماز صبح کا وقت ہے اور روزے دار کے کھانے پینے کو موقوف کرنے کا۔ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں جو سفیدی آسمان کے نیچے سے اوپر چڑھتی ہے اسے نماز کی علت اور روزے کی حرمت سے کوئی سروکار نہیں۔ لیکن وہ فجر جو پہاڑوں کی چوٹیوں پر چمکنے لگتی ہے' وہ کھانا پینا حرام کرتی ہے۔ حضرت عطاء سے روایت ہے کہ آسمان میں لمبی لمبی چڑھنے والی روشنی نہ تو روزہ رکھنے والے پر کھانا پینا حرام کرتی ہے۔ نہ اس سے نماز کا وقت آیا ہوا معلوم ہوسکتا ہے نہ حج فوت ہوتا ہے۔ لیکن جو صبح پہاڑ کی چوٹیوں پر پھیل جاتی ہے۔ یہ وہ صبح ہے کہ روزہ دار کو سب چیزیں حرام کردیتی ہے اور نمازی کو نماز حلال کردیتی ہے اور حج فوت ہوجاتا ہے۔ ان روایتوں کی سند صحیح ہے اور بہت سے سلف سے یہ منقول ہے۔ اللہ تعالیٰ ان پر اپنی رحمتیں نازل فرمائے۔

مسئلہ ☆ چونکہ جماع کا اور کھانے پینے کا آخری وقت اللہ تعالیٰ نے روزہ رکھنے والے کے لئے صبح صادق مقرر کیا ہے اس سے اس مسئلہ پر استدلال ہوسکتا ہے کہ صبح کے وقت جو شخص جنبی اٹھا وہ غسل کرلے اور اپنا روزہ پورا کرلے۔ اس پر کوئی حرج نہیں۔ چاروں اماموں اور سلف و خلف کے جمہور علما کرام کا یہی مذہب ہے۔ بخاری مسلم میں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے اور حضرت اُم سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ رات کو جماع کرتے' صبح کے وقت جنبی اٹھتے پھر غسل کرکے روزے سے رہتے۔ آپ کا یہ جنبی ہونا احتلام کے سبب نہ ہوتا تھا۔ حضرت اُم سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی

روایت میں ہے' پھر آپ ﷺ نہ افطار کرتے نہ قضا کرتے تھے۔ صحیح مسلم شریف میں حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے کہا کہ یا رسول اللہ! میں صبح نماز کا وقت آ جانے تک جنبی ہوتا ہوں۔ تو پھر کیا میں روزہ رکھ لوں؟ آپ نے فرمایا یہی بات میرے ساتھ بھی ہوتی ہے اور میں روزہ رکھتا ہوں اس نے کہا' یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! ہم تو آپ جیسے نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کے تو سب اگلے پچھلے گناہ معاف فرما دیئے ہیں۔ آپ نے فرمایا' واللہ مجھے تو اُمید ہے کہ تم سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والا اور تم سب سے تقویٰ کی باتوں کو جاننے والا میں ہوں۔ مسند احمد کی ایک حدیث میں ہے کہ جب صبح کی اذان ہو جائے اور تم میں سے کوئی جنبی ہو تو وہ اس دن روزہ نہ رکھے۔ اس کی اسناد نہایت صحیح ہیں اور یہ حدیث شرط شیخین پر ہے' جیسا کہ ظاہر ہے۔ یہ حدیث بخاری' مسلم میں بھی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے وہ فضل بن عباسؓ سے روایت کرتے ہیں وہ نبی ﷺ سے' سنن نسائی میں یہ حدیث بروایت ابو ہریرہؓ ہے وہ اسامہ ابن زیدؓ سے اور فضل بن عباسؓ سے روایت کرتے ہیں اور مرفوع نہیں کرتے۔ اسی لئے بعض علماء کا تو قول ہے کہ اس حدیث میں یہ علت ہے کہ وہ مرفوع نہیں اور بعض دیگر علماء کا یہی مذہب ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ' سالم' عطا' ہشام بن عروہ اور حسن بصری یہی کہتے ہیں۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ اگر جنبی ہو کر سو گیا ہو اور آنکھ کھلی تو صبح صادق ہو گئی ہو تو اس کے روزے میں کوئی نقصان نہیں۔ حضرت عائشہؓ اور حضرت ام سلمہؓ والی حدیث کا یہی مطلب ہے اور اگر اس نے عمداً غسل نہیں کیا اور اسی حالت میں صبح ہو گئی تو اس کا روزہ نہیں ہو گا۔ حضرت عروہ' طاؤس اور حسن یہی کہتے ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ اگر فرضی روزہ ہو تو پورا تو کر لے لیکن قضا لازم ہے اور نفلی روزہ ہو تو کوئی حرج نہیں۔ ابراہیم نخعیؒ یہی کہتے ہیں۔ خواجہ حسن بصریؒ سے بھی ایک روایت یہی ہے۔ بعض کہتے ہیں حضرت ابو ہریرہؓ والی حدیث حضرت عائشہؓ والی حدیث سے منسوخ ہے لیکن حقیقت میں تاریخ کا پتہ نہیں۔ جس سے نسخ ثابت ہو سکے۔ ابن حزم فرماتے ہیں' اس کی ناسخ یہ آیت قرآنی ہے لیکن یہ بھی کمزور سی ہے۔ اس لئے کہ اس آیت کا بعد میں ہونا تاریخ سے ثابت نہیں۔ بلکہ اس حیثیت سے تو بظاہر یہ حدیث اس آیت کے بعد کی ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں' حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ والی حدیث میں لا نفی کمال ہے یعنی اس شخص کا روزہ کامل نہیں کیونکہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اور حضرت اُم سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا والی حدیث سے جواز صاف طور سے ثابت ہو رہا ہے۔ یہی مسلک ٹھیک بھی ہے اور دوسری تمام اقوال سے یہ قول زیادہ صحیح ہے۔ اور یوں کہنے سے دونوں روایتوں میں تطبیق کی صورت بھی نکل آتی ہے۔ واللہ اعلم۔

پھر ارشاد ہوتا ہے کہ روزے کو رات تک پورا کرو۔ اس سے ثابت ہوا کہ سورج کے ڈوبتے ہی روزہ افطار کر لینا چاہئے۔ بخاری' مسلم میں امیر المومنین حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا' جب ادھر سے رات آ جائے اور اُدھر سے دن چلا جائے تو روزہ دار افطار کر لے۔ بخاری' مسلم میں حضرت سہل بن سعد ساعدی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا' جب تک لوگ افطار کرنے میں جلدی کریں گے' خیر سے رہیں گے۔ مسند احمد میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا' اللہ عزوجل کا ارشاد ہے کہ مجھے سب سے زیادہ پیارے وہ بندے ہیں جو روزہ افطار کرنے میں جلدی کرنے والے ہیں۔ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ اس حدیث کو حسن غریب کہتے ہیں۔ مسند کی ایک اور حدیث میں ہے کہ بشیر بن خصاصیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بیوی صاحبہ حضرت لیلی فرماتی

ہیں' میں نے دوروزوں کو بغیر افطار کئے ملانا چاہا تو میرے خاوند نے مجھے منع کیا اور کہا رسول اللہ ﷺ نے اس سے منع کیا ہے اور فرمایا ہے کہ یہ کام نصرانیوں کا ہے۔ تم تو روزے اس طرح رکھو' جس طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ رات کو روزہ افطار کر لیا کرو اور بھی بہت سی حدیثوں میں پے در پے روزہ کو ملانے کی ممانعت آئی ہے۔ مسند احمد کی ایک حدیث میں ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا' روزہ سے روزہ نہ ملاؤ تو لوگوں نے کہا کہ یا رسول اللہ ﷺ خود آپ تو ملاتے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ میں تم جیسا نہیں ہوں۔ میں رات گزارتا ہوں۔ میرا ربّ مجھے کھلا پلا دیتا ہے لیکن پھر بھی اس سے باز نہ رہے تو آپ نے دو دن دو راتوں کا برابر روزہ رکھا۔ پھر چاند دکھائی دے گیا تو آپ نے فرمایا' اگر چاند نہ چڑھتا تو میں یونہی روزوں کو ملائے جاتا۔ گویا آپ ان کی عاجزی ظاہر کرنا چاہتے تھے۔ صحیحین میں بھی یہ حدیث ہے اور اسی طرح روزے کو بے افطار کئے اور رات کو کچھ کھائے بغیر دوسرے روزے سے ملا لینے کی ممانعت میں بخاری مسلم میں حضرت انسؓ' حضرت ابن عمر اور حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے بھی مرفوع حدیثیں نقل ہیں۔ پس ثابت ہوا کہ امت کو ممانعت ہے اور آپ کی ذات اس سے مخصوص تھی۔ آپ ﷺ کو اس کی طاقت تھی اور خدائے تعالیٰ کی طرف سے اس پر آپ ﷺ کی مدد کی جاتی تھی۔ یہ بھی خیال رہے کہ یہ جو آپ ﷺ نے فرمایا کہ مجھے ربّ کھلا پلا دیتا ہے۔ اس سے مراد حقیقتاً کھانا پینا نہیں کیونکہ پھر تو روزے سے روزے کا وصال نہ ہو بلکہ یہ صرف روحانی طور پر مدد ہے۔ جیسے ایک عربی شاعر کا شعر ہے۔

لها احاديث من ذكراك تشغلها ☆ عن الشراب و تلهيها عن الزاد

یعنی اسے تیرے ذکر اور تیری باتوں میں وہ دلچسپی ہے کہ کھانے پینے سے یک قلم بے پروا ہو جاتی ہے۔

ہاں اگر کوئی شخص دوسری سحری تک رُکا رہنا چاہے تو یہ جائز ہے۔ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ والی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا' وصال نہ کرو جو کرنا ہی چاہے تو سحری تک کر لے۔ لوگوں نے کہا آپ ﷺ تو وصال کرتے ہیں' آپ ﷺ نے فرمایا' میں تم جیسا نہیں۔ مجھے تو رات ہی کو کھلانے والا کھلا دیتا ہے اور پلانے والا پلا دیتا ہے۔ (بخاری و مسلم) ایک اور روایت میں ہے کہ ایک صحابیہ عورت نبی ﷺ کے پاس آئی۔ آپ سحری کھا رہے تھے۔ فرمایا' آؤ تم بھی کھا لو۔ اس نے کہا میں تو روزے سے ہوں۔ آپ نے فرمایا' تم روزہ کس طرح رکھتی ہو؟ انہوں نے بیان کیا' آپ نے فرمایا آل محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی طرح سحری کے وقت سے دوسری سحری کے وقت تک کا ملا ہوا روزہ کیوں نہیں رکھتیں؟ (ابن جریر) مسند احمد کی حدیث میں ہے کہ نبی ﷺ ایک سحری سے دوسری سحری تک روزہ رکھتے تھے۔ ابن جریر میں حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ وغیرہ سلف صالحین سے مروی ہے کہ وہ کئی کئی دن تک پے در پے بغیر کچھ کھائے روزہ رکھتے تھے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ عبادت کے طور پر نہ تھا بلکہ نفس کے مارنے کے لئے ریاضت کے طور پر تھا۔ واللہ اعلم۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ انہوں نے سمجھا ہو کہ حضور ﷺ کا اس سے روکنا صرف شفقت اور مہربانی کی راہ سے ہے نہ کہ ناجائز ہونے کی بنا پر' جیسا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں' آپ نے لوگوں پر رحم کھا کر اس سے منع فرمایا تھا۔ پس ابن زبیرؓ اور ان کے صاحبزادے عامرؒ اور ان کی راہ چلنے والے اپنے نفس میں قوت پاتے تھے اور روزے پر روزے رکھے جاتے تھے۔ یہ بھی مروی ہے کہ وہ افطار کرتے تو پہلے گھی اور کڑوا گوند کھاتے تھے تاکہ پہلے پہل غذا پہنچنے سے آنتیں جل نہ جائیں۔ روایت ہے کہ حضرت ابن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سات سات دن تک برابر روزے سے رہتے۔ اس اثنا میں دن کو یا رات کو کچھ نہ کھاتے اور پھر ساتویں دن خوب

تندرست چست و چالاک اور سب سے زیادہ قوی پائے جاتے۔ ابوالعالیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں' اللہ تعالیٰ نے دن کا روزہ فرض کر دیا۔ رہی رات تو جو چاہے کھالے جو نہ چاہے نہ کھائے۔

پھر فرمان ہوتا ہے کہ اعتکاف کی حالت میں عورتوں سے مباشرت نہ کرو۔ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا قول ہے جو شخص مسجد میں اعتکاف بیٹھا ہو۔ خواہ رمضان میں خواہ اور مہینوں میں' اس پر دن کے وقت' رات کے وقت اپنی بیوی سے جماع کرنا حرام ہے۔ جب تک اعتکاف پورا نہ ہو جائے۔ حضرت ضحاک فرماتے ہیں' پہلے لوگ اعتکاف کی حالت میں بھی جماع کر لیا کرتے تھے۔ جس پر یہ آیت اتری اور جس نے مسجد میں اعتکاف کیا ہو۔ اس کے لئے یہ کام حرام کر دیا گیا۔ مجاہد اور قتادہ بھی یہی کہتے ہیں۔ پس علماء کرام کا متفقہ فتویٰ ہے کہ اعتکاف والا اگر کسی ضروری حاجت کے لئے گھر میں جائے مثلاً پیشاب یا پاخانہ کے لئے یا کھانا کھانے کے لئے تو اس کام سے فارغ ہوتے ہی مسجد میں چلا آئے۔ وہاں ٹھہرنا جائز نہیں ہے۔ نہ اپنی بیوی سے بوس و کنار وغیرہ جائز ہے نہ کسی اور کام میں سوائے اعتکاف کے مشغول ہونا اس کے لئے جائز ہے۔ بلکہ بیمار کی بیمار پرسی کے لئے جانا بھی جائز نہیں۔ ہاں یہ اور بات ہے کہ چلتے چلتے پوچھ لے۔ اعتکاف کے اور بھی بہت سے احکام ہیں۔ بعض میں اختلاف بھی ہے۔ جن کو ہم نے اپنی مستقل کتاب "کتا ب الصیام" کے آخر میں بیان کیا ہے **وللّٰہ الحمد والمنۃ** چونکہ قرآن پاک میں روزوں کے بیان کے بعد اعتکاف کا ذکر ہے۔ اسی لئے اکثر مصنفین نے بھی اپنی اپنی کتابوں میں روزے کے بعد ہی اعتکاف کے احکام بیان کئے ہیں۔ اس میں اس بات کی طرف بھی اشارہ ہے کہ اعتکاف روزے کی حالت میں کرنا چاہئے یا رمضان کے آخر میں۔ آنحضرت ﷺ بھی رمضان شریف کے آخری دنوں میں اعتکاف کیا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ آپ ﷺ کی وفات ہوئی۔ آپ ﷺ کے بعد امہات المومنین آپ کی بیویاں اعتکاف کیا کرتی تھیں۔ (بخاری و مسلم) صحیحین میں ہے کہ حضرت صفیہ بنت حییؓ نبی ﷺ کی خدمت میں آپ کے اعتکاف کی حالت میں حاضر ہوتی تھیں اور کوئی ضروری بات پوچھنے کی ہوتی' وہ دریافت کر کے چلی جاتیں۔ ایک مرتبہ رات کو جب جانے لگیں تو چونکہ مکان مسجد نبوی سے فاصلہ پر تھا۔ اس لئے حضور ﷺ ساتھ ہو لئے کہ پہنچا آئیں۔ راستہ میں دو انصاری صحابی مل گئے اور آپ کے ساتھ آپ کی بیوی صاحبہ کو دیکھ کر شرم کے مارے جلدی جلدی قدم بڑھا کر جانے لگے۔ آپ نے فرمایا' ٹھہر جاؤ' سنو یہ میری بیوی صفیہ ہیں۔ وہ کہنے لگے سبحان اللہ (کیا ہمیں کوئی خیال بھی ہو سکتا ہے؟) آپ نے فرمایا' شیطان انسان کی رگ رگ میں خون کی طرح پھرتا رہتا ہے۔ مجھے خیال ہوا کہ کہیں تمہارے دل میں وہ کوئی بدگمانی نہ پیدا کر دے۔ حضرت امام شافعی فرماتے ہیں کہ نبی ﷺ اس اپنے واقعہ سے اپنی اُمت کو گویا سبق سکھا رہے ہیں کہ وہ تہمت کی جگہوں سے بچتے رہیں۔ ورنہ ناممکن ہے کہ وہ پاک باز صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین حضور ﷺ کی نسبت کوئی بُرا خیال بھی دل میں لائیں اور یہ بھی ناممکن ہے کہ ان کی نسبت یہ خیال فرمائیں۔ واللہ اعلم۔

آیت میں مراد مباشرت سے جماع اور اس کے اسباب ہیں' جیسے بوس و کنار وغیرہ ورنہ کسی چیز کا لینا دینا وغیرہ یہ سب باتیں جائز ہیں۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ اعتکاف کی حالت میں میری طرف سر جھکا دیا کرتے تھے۔ میں آپ ﷺ کے سر میں کنگھی کر دیا کرتی تھی۔ حالانکہ میں حیض سے ہوتی تھی۔ آپ اعتکاف کے دنوں میں ضروری حاجت کے رفع کے سوا اور وقت گھر میں تشریف نہیں لاتے تھے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں

اعتکاف کی حالت چلتے چلتے ہی گھر کے بیمار کی بیمار پرسی کرلیا کرتی ہوں۔

پھر ارشاد ہوتا ہے کہ یہ ہماری بیان کردہ باتیں اور فرض کئے ہوئے احکام اور مقرر کی ہوئی حدیں روزے اور روزوں کے احکام اور اس کے مسائل اس میں جو کام جائز ہیں جو نا جائز ہیں' وہ سب ہماری حد بندیاں ہیں۔ خبردار ان کے قریب بھی نہ آنا نہ ان سے تجاوز کرنا نہ ان سے آگے بڑھنا۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ حد اعتکاف کی حالت میں مباشرت سے الگ رہنا ہے۔ بعض کہتے ہیں ان آیتوں کے چاروں حکم مراد ہیں۔ پھر فرمایا جس طرح روزے اور اس کے احکام اور اس کے مسائل اور اس کی تفصیل ہم نے بیان کردی۔ اس طرح اور احکام بھی ہم اپنے بندے اور رسول ﷺ کی معرفت سب کے سب تمام جہان کے لئے بیان کیا کرتے ہیں۔ تاکہ وہ یہ معلوم کرسکیں کہ ہدایت کیا ہے اور اطاعت کسے کہتے ہیں؟ اور اس بناء پر وہ متقی بن جائیں۔ جیسے اور جگہ ہے: ﴿هُوَ الَّذِىْ يُنَزِّلُ عَلٰى عَبْدِهٖۤ اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ لِّيُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ بِكُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ﴾ (الحدید: ۹) یعنی وہ خدا جو اپنے بندے پر روشن آیتیں نازل فرماتا ہے' تاکہ تمہیں اندھیروں سے نکال کر روشنی میں لائے۔ اللہ تعالیٰ تم پر رافت و رحمت کرنے والا ہے۔

وَلَا تَاْكُلُوْۤا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوْا بِهَاۤ اِلَى الْحُكَّامِ لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸۸﴾

اور آپس میں ایک دوسرے کے مال ناحق (طور) مت کھاؤ اور اور ان (کے جھوٹے مقدمہ کو) حکام کے یہاں اس غرض سے رجوع مت کرو (کہ اس کے ذریعہ سے) لوگوں کے مالوں کا ایک حصہ بطریق گناہ (یعنی ظلم) کے کھا جاؤ اور تم کو (اپنے جھوٹ اور ظلم کا) علم بھی ہو۔ ○

لوگوں کے اموال ہڑپ کر لینا گناہِ عظیم ہے:

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں' یہ آیت اس شخص کے بارے میں ہے' جس پر کسی اور کا مال چاہئے اور اس حقدار کے پاس کوئی دلیل نہ ہو تو یہ شخص اس کا انکار کر جائے اور حاکم کے پاس جا کر بری ہو جائے' حالانکہ وہ جانتا ہو کہ اس پر اس کا حق ہے وہ اس کا مال مار رہا ہے اور حرام کھا رہا ہے اور اپنے تئیں گنہگاروں میں شامل ہو رہا ہے۔

حضرت مجاہد' سعید بن جبیر' عکرمہ' حسن' قتادہ' سدی' مقاتل بن حیان' عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم بھی یہی فرماتے ہیں کہ باوجود اس علم کے کہ تو ظالم ہے جھگڑا نہ کر۔ صحیحین میں حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا' میں انسان ہوں' میرے پاس لوگ جھگڑا لے کر آتے ہیں۔ شاید ایک دوسرے سے زیادہ حجت باز ہو۔ اس کی چکنی چپڑی تقریر سن کر اس کے حق میں فیصلہ کردوں (حالانکہ درحقیقت میرا فیصلہ واقعہ کے خلاف ہو) تو سمجھ لو کہ جس کے حق میں اس طرح کے فیصلہ سے کسی مسلمان کے حق کو میں دلوادوں وہ آگ کا ایک ٹکڑا ہے۔ خواہ اٹھالے خواہ نہ اٹھالے۔

میں کہتا ہوں یہ آیت اور یہ حدیث اس امر پر دلیل ہے کہ حاکم کا حکم کسی معاملہ کی حقیقت کو شریعت کے نزدیک بدلتا

نہیں۔ فی الواقع جو حرام ہو وہ قاضی کے فیصلے سے حلال اور حلال حرام نہیں ہو سکتا۔ قاضی کا فیصلہ صرف ظاہری ہوتا ہے۔ باطن میں نافذ نہیں ہوتا۔ اگر فی الواقع بھی نفس الامر کے مطابق ہو تو خیر ورنہ حاکم کو تو اجر ملے گا لیکن اس فیصلہ کی بنا پر حق کو ناحق اور ناحق کو حق بنانے والا خدا کا مجرم ٹھہرے گا اور اس پر وبال باقی رہے گا۔ جس پر آیت مندرجہ بالا گواہ ہے کہ تم اپنے دعویٰ کے باطل ہونے کا علم رکھتے ہوئے لوگوں کے مال مار کھانے کے لئے جھوٹے مقدمات بنا کر جھوٹے گواہ گزار کر ناجائز طریقوں سے حکام کو دھوکہ دے کر اپنے دعووں کو ثابت نہ کیا کرو۔ حضرت قتادہ رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں' لوگو! سمجھ لو کہ قاضی کا فیصلہ تمہارے لئے حرام کو حلال نہیں کر سکتا اور نہ باطل کو حق کر سکتا ہے۔ قاضی تو اپنی عقل سمجھ سے گواہوں کی گواہی کے مطابق ظاہری حالات کے دیکھتے ہوئے فیصلہ صادر کر دیتا ہے باطل کو حق کر سکتا ہے۔ قاضی تو اپنی عقل سمجھ سے گواہوں کی گواہی کے طابق ظاہری حالات کے دیکھتے ہوئے فیصلہ صادر کر دیتا ہے اور وہ بھی آخر انسان ہی ہے۔ ممکن ہے خطا کرے اور ممکن ہے خطا سے بچ جائے تو اگر فیصلہ قاضی کا واقعہ کے خلاف ہو۔ تو تم صرف قاضی کا فیصلہ سمجھ کر اسے جائز مال نہ سمجھ لو۔ یہ جھگڑا باقی ہے۔ یہاں تک کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ دونوں کو جمع کرے اور باطل والوں پر حق والوں کو غلبہ دے کر ان کا حق ان سے دلوائے گا اور دنیا میں جو فیصلہ ہوا تھا' اس کے خلاف فیصلہ صادر فرما کر اس کی نیکیوں میں سے اسے بدلہ دلوائے۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ ۭ قُلْ هِىَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ ۭ وَلَيْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِھَا وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰى ۚ وَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا ۠ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۱۸۹

آپ سے چاندوں کی حالت تحقیقات کی کرتے ہیں۔ آپ فرما دیجئے کہ وہ چاند آلہ شناخت اوقات ہیں لوگوں کے (اختیاری معاملات مثل مدت و مطالبہ حقوق کے) لئے اور غیر اختیاری عبادات مثل (حج زکوۃ روزہ وغیرہ) کے لئے اور اس میں کوئی فضیلت نہیں کہ گھروں میں ان کی پشت کی طرف سے آیا کرو۔ لیکن فضیلت یہ ہے کہ کوئی شخص حرام (چیزوں) سے بچے اور گھروں میں اُن کے دروازوں سے آیا کرو اور خدا تعالیٰ سے ڈرتے رہو امید ہے کہ تم کامیاب ہو جاؤ۔ ○

لایعنی سوالات کا جواب ضروری نہیں:

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے چاند کے بارے میں سوال کیا۔ جس پر یہ آیت نازل ہوئی کہ اس سے قرض وغیرہ کے وعدوں کے میعاد معلوم ہو جاتی ہے۔ عورتوں کی عدت کا وقت معلوم ہوتا ہے۔ حج کا وقت معلوم ہوتا ہے۔ مسلمانوں کے روزے کے افطار کا تعلق بھی اسی سے ہے۔ مسند عبدالرزاق میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا' اللہ تعالیٰ نے چاند کو لوگوں کے وقت معلوم کرنے کے لئے بنایا ہے۔ اُسے دیکھ کر روزے رکھو' اسے دیکھ کر عید مناؤ' اگر ابر و باراں کی وجہ سے چاند نہ دیکھ سکو تو تیس دن پورے گن لیا کرو۔ اس روایت کو حضرت امام حاکمؒ نے صحیح کہا ہے۔ یہ حدیث اور سندوں سے بھی روایت ہے۔ حضرت علیؓ سے ایک موقوف روایت میں

بھی یہ مضمون ہوا ہے۔ آگے چل کر ارشاد ہوتا ہے کہ بھلائی گھروں کے پیچھے سے آنے میں نہیں بلکہ بھلائی تقویٰ میں ہے۔ گھروں میں دروازوں سے آؤ۔ صحیح بخاری شریف میں ہے کہ جاہلیت کے زمانہ میں یہ دستور تھا کہ احرام میں ہوتے تو گھروں کی پشت کی جانب سے آتے۔ جس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ ابوداؤد طیالسی میں بھی یہ روایت ہے۔ انصار کا عام دستور تھا کہ سفر سے جب واپس آتے تو گھر کے دروازے سے گھر میں نہیں گھستے تھے۔ دراصل یہ بھی جاہلیت کے زمانہ کے قریشیوں نے اپنے لئے ایک امتیاز قائم کرلیا تھا کہ اپنا نام انہوں نے حمس رکھا تھا۔ احرام کی حالت میں یہ تو براہ راست اپنے گھروں میں آسکتے تھے لیکن باقی کے سب لوگ اس طرح نہیں جاتے تھے۔ آنحضرت ﷺ ایک باغ میں تھے۔ وہاں سے آپ ﷺ اس دروازے میں سے نکلے۔ آپ کے ایک انصاری صحابی حضرت قطبہ بن عامر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی آپ کے ساتھ ہی اسی دروازے سے نکلے۔ اس پر لوگوں نے حضرت سے کہا' حضور ﷺ کو جس طرح کرتے دیکھا' کیا۔ مانا کہ آپ حمس میں سے ہیں لیکن میں بھی تو آپ کے دین پر ہوں۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی (ابن ابی حاتم)۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما وغیرہ سے بھی یہ روایت ہے۔ حضرت حسن بصری رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جاہلیت کے زمانہ میں بہت سی قوموں کا یہ رواج تھا کہ جب وہ سفر کے ارادے سے نکلتے۔ پھر سفر ادھورا چھوڑ کر اگر کسی وجہ سے واپس چلے آتے تو گھر کے دروازے سے گھر میں نہ آتے بلکہ پیچھے کی طرف سے چڑھ کر آتے تھے۔ جس سے اس آیت میں روکا گیا۔ محمد بن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں۔ اعتکاف کی حالت میں بھی یہی دستور تھا۔ جسے اسلام نے مٹایا۔ عطا فرماتے ہیں' اہل مدینہ کا عیدوں میں بھی یہی دستور تھا جو اسلام تھا جو اسلام نے اُٹھا دیا۔ پھر فرمایا' خدا کے حکموں کو بجالانا' اس کے منع کیے ہوئے کاموں سے رُک جانا' اس کا ڈر دل میں رکھنا۔ یہ چیزیں ہیں' جو دراصل اس دن کام آنے والی ہیں۔ جس دن ہر شخص خدا کے سامنے پیش ہوگا اور پوری پوری جزا سزا پائے گا۔

وَقَاتِلُوْا فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ﴿۱۹۰﴾ وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ وَاَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ حَيْثُ اَخْرَجُوْكُمْ وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ ۚ وَلَا تُقٰتِلُوْهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتّٰى يُقٰتِلُوْكُمْ فِيْهِ ۚ فَاِنْ قٰتَلُوْكُمْ فَاقْتُلُوْهُمْ ؕ كَذٰلِكَ جَزَآءُ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۹۱﴾ فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۹۲﴾ وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ ؕ فَاِنِ انْتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ اِلَّا

عَلَى الظّٰلِمِيْنَ ﴿١٩٣﴾

اور (بے تکلف) تم لڑو اللہ کی راہ میں ان لوگوں کے ساتھ جو (نقض عہد کر کے) تمہارے ساتھ لڑنے لگیں۔ اور (از خود) حد (معاہدہ) سے نہ نکلو۔ واقعی اللہ تعالیٰ حد (قانون شرعی) سے نکلنے والوں کو پسند نہیں کرتے اور (جس حالت میں وہ خود عہد شکنی کریں اس وقت خواہ) ان کو قتل کرو جہاں ان کو پاؤ اور (خواہ) ان کو نکال باہر کرو جہاں سے انہوں نے تم کو نکلنے پر مجبور کیا اور شرارت قتل سے بھی سخت تر ہے اور ان کے ساتھ مسجد حرام کے قرب (ونواح) میں (کہ حرم کہلاتے ہے) قتال مت کرو۔ جب تک کہ وہ لوگ وہاں تم سے خود نہ لڑیں۔ ہاں اگر وہ (کفار) خود ہی لڑنے کا سامان کرنے لگیں تو تم (بھی) ان کو مارو۔ ایسے کافروں کی (جو حرم میں لڑنے لگیں) ایسی ہی سزا ہے۔ پھر اگر وہ لوگ (اپنے کفر سے) باز آ جائیں (اور اسلام قبول کر لیں) تو اللہ تعالیٰ بخش دیں گے اور مہربانی فرما دیں گے اور ان کے ساتھ اس حد تک لڑو کہ فساد عقیدہ (شرک) نہ رہے اور ان کا دین (خالص اللہ ہی کا ہو جائے) اور اگر وہ لوگ (کفر سے) باز آ جائیں تو سختی کسی پر نہیں ہوا کرتی بجز بے انصافی کرنے والوں کے۔ ○

اعلاء کلمۃ اللہ کے لئے جدوجہد:

حضرت ابو العالیہ رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مدینہ شریف میں جہاد کا پہلا حکم یہی نازل ہوا ہے۔ حضور ﷺ اس آیت کی رو سے صرف ان لوگوں سے ہی لڑتے تھے جو آپ سے لڑیں۔ خود آپ ﷺ ان سے لڑائی نہیں کرتے تھے۔ یہاں تک کہ سورۂ براءت نازل ہوئی۔ بلکہ عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم رحمتہ اللہ علیہ تو یہاں تک فرماتے ہیں کہ یہ آیت منسوخ ہے اور ناسخ آیت: ﴿فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ﴾ (التوبۃ:٥) ہے۔ یعنی جہاں کہیں مشرکین کو پاؤ' انہیں قتل کرو لیکن یہ توجیہہ محل نظر ہے۔ اس لئے کہ یہ تو صرف مسلمانوں کو رغبت دلانا اور انہیں آمادہ کرنا ہے کہ اپنے دشمنوں سے کیوں جہاد نہ کرو۔ جو تمہارے اور تمہارے دین کے کھلے دشمن ہیں۔ جیسے وہ تم سے لڑتے ہیں تم بھی ان سے لڑو۔ جیسے اور جگہ فرمایا: ﴿وَقَاتِلُوا الْمُشْرِكِيْنَ كَآفَّةً كَمَا يُقَاتِلُوْنَكُمْ كَآفَّةً﴾ (التوبۃ:٣٦) یعنی مل جل کر مشرکوں سے جہاد کرو' جس طرح وہ تم سے سب کے سب مل کر لڑائی کرتے ہیں۔ چنانچہ اس آیت میں بھی فرمایا' انہیں قتل کرو جہاں پاؤ اور انہیں وہاں سے نکالو جہاں سے انہوں نے تمہیں نکالا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس طرح ان کا قصد تمہارے قتل کا اور تمہیں جلاوطن کرنے کا ہے تمہارا بھی ان کے ساتھ یہی ارادہ رہنا چاہئے۔

پھر فرمایا تجاوز کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ پسند نہیں کرتا۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی معصیت نہ کرو۔ ناک' کان وغیرہ نہ کاٹو۔ خیانت اور چوری نہ کرو۔ عورتوں اور بچوں کو قتل نہ کرو۔ اُن بوڑھوں بڑے لوگوں کو بھی نہ مارو جو لڑنے کے قابل ہیں نہ لڑائی میں دخل دیتے ہیں۔ درویشوں اور تارک دنیا لوگوں کو بھی قتل نہ کرو بلکہ بلا مصلحت جنگی نہ درخت کاٹو نہ حیوانوں کو ضائع کرو' حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما' حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور مقاتل بن حیانؒ وغیرہ نے اس آیت کی تفسیر میں یہی فرمایا ہے۔ صحیح مسلم شریف میں ہے' رسول اللہ ﷺ مجاہدین کو ہدایت دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرو' خیانت نہ کرو' بدعہدی سے بچو' ناک کان وغیرہ اعضاء نہ کاٹو' بچوں کو اور زاہد لوگوں کو جو عبادت خانوں میں پڑے رہتے ہیں' قتل نہ کرو' مسند احمد کی ایک روایت میں ہے کہ آپ فرمایا کرتے تھے۔ اللہ کا نام لے کر نکلو' اللہ کی راہ میں جہاد کرو' کفار سے لڑو'

ظلم وزیادتی نہ کرو، دھوکہ بازی نہ کرو، دشمن کے اعضاء بدن نہ کاٹو، درویشوں کو قتل نہ کرو، صحیحین میں ہے کہ ایک مرتبہ ایک غزوہ میں ایک عورت قتل کی ہوئی پائی گئی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت برا مانا اور عورتوں اور بچوں کے قتل کو منع فرمادیا۔ مسند احمد میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، ایک تین پانچ سات نو گیارہ مثالیں ہیں۔ ایک تو ظاہر کردی باقی چھوڑ دیں۔ فرمایا کچھ لوگ کمزور اور مسکین تھے۔ ان پر زور آور اور مالدار دشمن چڑھ آیا۔ اللہ تعالیٰ نے ان ضعیفوں کی مدد کی اور ان زور آوروں پر انہیں غالب کردیا۔ اب ان لوگوں نے ان پر ظلم وزیادتی شروع کردی۔ جس کے باعث اللہ تعالیٰ ان پر قیامت تک کے لئے ناراض ہوگیا۔ یہ حدیث اسناداً صحیح ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب یہ کمزور قوم غالب آ گئی تو انہوں نے ظلم وزیادتی شروع کردی۔ فرمانِ باری تعالیٰ کا کوئی لحاظ نہ کیا۔ اس وجہ سے پروردگار عالم اُن پر ناراض ہوگیا۔ اس بارے میں احادیث اور آثار بکثرت ہیں۔ جن سے صاف ظاہر ہے کہ ظلم وزیادتی خدا کو ناپسند ہے اور ایسے لوگوں سے خدا ناخوش رہتا ہے۔ چونکہ جہاد کے احکام میں بظاہر قتل وخون ہوتا ہے۔ اس لئے یہ بھی فرمادیا کہ ادھر اگر قتل وخون ہے تو ادھر خدا کے ساتھ شرک وکفر ہے اور اس مالک کی راہ سے اس کی مخلوق کو روکنا ہے اور یہ فتنہ قتل سے بہت زیادہ سخت ہے۔ ابو مالک فرماتے ہیں، تمہاری یہ خطا کاریاں اور بدکاریاں قتل سے زیادہ بُری ہیں۔ پھر فرمان سرزد ہوتا ہے کہ بیت اللہ میں ان سے لڑائی نہ کرو۔ جیسے صحیحین میں ہے کہ یہ شہر حرمت والا ہے۔ آسمان وزمین کی پیدائش سے لے کر قیامت تک باحرمت ہی رہے گا۔ صرف تھوڑے سے وقت کے لئے اللہ تعالیٰ نے میرے لئے اسے حلال کردیا تھا لیکن آج اس وقت بھی حرمت والا ہے اور قیامت تک اس کا یہ احترام اور بزرگی باقی رہے گی۔ اس کے درخت نہ کاٹے جائیں۔ اس کے کانٹے نہ اُکھیڑے جائیں۔ اگر کوئی شخص اس میں لڑائی کو جائز کہے اور میری جنگ کو دلیل بنائے تو تم کہہ دینا کہ اللہ تعالیٰ نے صرف اپنے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے لئے اجازت دی تھی لیکن تمہیں کوئی اجازت نہیں۔ مراد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان سے فتح مکہ کا دن ہے۔ جس دن آپ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ والوں سے جہاد کیا اور مکہ کو فتح کیا تھا۔ چند مشرکین مارے بھی گئے۔ گو بعض علمائے کرام یہ بھی فرماتے ہیں کہ مکہ صلح سے فتح ہوا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صاف ارشاد فرمادیا تھا کہ جو شخص اپنا دروازہ بند کرلے وہ امن میں ہے جو مسجد میں چلا جائے امن میں ہے۔ جو ابو سفیان کے گھر میں چلا جائے، وہ امن میں ہے۔ پھر فرمایا کہ ہاں اگر وہ تم سے یہاں لڑائی شروع کردیں تو تمہیں اجازت ہے کہ تم بھی یہیں اُن سے لڑو۔ تاکہ یہ ظلم دفع ہوسکے۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیبیہ والے دن اپنے اصحاب سے لڑائی کی بیعت لی۔ جبکہ قریشیوں نے اور ان کے ساتھیوں نے مل ملا کر یورش کی تھی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے درخت تلے اپنی اصحاب سے بیعت لی۔

پھر اللہ تعالیٰ نے اس لڑائی کو دفع کردیا چنانچہ اس نعمت کا بیان اس آیت میں ہے: ﴿وَهُوَ الَّذِیْ كَفَّ اَیْدِیَهُمْ عَنْكُمْ...... ﴾ (المائدۃ: ۱۱) پھر ارشاد ہوتا ہے کہ اگر یہ کفار حرم میں لڑائی بند کردیں اور اس سے باز آ جائیں اور اسلام کی طرف جھکیں تو اللہ تعالیٰ ان کے گناہ معاف کردے گا۔ گو انہوں نے مسلمانوں کو حرم میں قتل کیا ہو، تاہم باری تعالیٰ ایسے بڑے گناہ کو بھی معاف فرماوے گا۔ پھر حکم ہوتا ہے کہ ان مشرکین سے جہاد جاری رکھو۔ تاکہ یہ شرک کا فتنہ مٹ جائے اور اللہ کا دین غالب اور عالی ہوجائے تمام ادیان پر غالب ہوجائے۔ جیسے صحیحین میں حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ ایک شخص اپنی بہادری جتانے کے لئے لڑتا ہے۔ ایک شخص حمیت وغیرت قومی سے لڑتا ہے۔ ایک شخص ریا کاری اور دکھاوے کے طور پر لڑتا ہے تو فرمایئے کہ ان میں کون شخص اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرنے والا ہے؟ آپ

صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا' اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرنے والا وہی ہے' جو اس لئے لڑے کہ اللہ تعالیٰ کی بات بلند ہو۔ اس کے دین کا بول بالا ہو۔ بخاری و مسلم کی ایک اور حدیث میں ہے۔ مجھے حکم کیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے جہاد کرتا رہوں' یہاں تک کہ وہ لا الہ الا اللہ کہیں[1]۔ جب اسے وہ کہہ لیں گے تو مجھ سے اپنے خون اور مال بچالیں گے مگر اسلامی احکام میں اور ان کا باطنی حساب اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہے۔ پھر فرمایا اگر یہ کفار شرک و کفر سے اور تمہیں قتل کرنے سے باز آ جائیں تو تم بھی ان سے رک جاؤ۔ اس کے بعد جو قتال کرے گا۔ وہ ظالم ہوگا اور ظالموں کو ظلم کا بدلہ دینا ضروری ہے۔ یہی معنی ہیں حضرت مجاہد کے اس قول کے کہ جو لڑا جائے یا مطلب یہ ہے کہ اگر وہ ان حرکات سے رک جائیں تو وہ ظلم یعنی شرک سے ہٹ گئے۔ پھر کوئی وجہ نہیں کہ ان سے جنگ و جدال ہو۔ یہاں لفظ عدوان جو کہ زیادتی کے معنی میں ہے۔ وہ زیادتی کے مقابلہ میں زیادتی کے بدلے کے لئے ہے۔ حقیقتاً وہ زیادتی نہیں۔ جیسے فرمایا: ﴿فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ﴾ (البقرہ ۱۹۴) یعنی تم پر جو زیادتی کرے تم بھی اس پر اس جیسی زیادتی کرلو اور جگہ ہے: ﴿جَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا﴾ (الشوری ۴۰) یعنی برائی کا بدلہ اسی جیسی برائی ہے اور جگہ فرمان ہے: ﴿وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ﴾ (النحل ۱۲۶) یعنی اگر تم سزا اور عذاب دو تو اسی کے مثل سزا کرو جو تم کیے گئے ہو۔ پس ان تینوں جگہوں میں زیادتی' برائی اور سزا بدلہ کے طور پر کہا گیا ہے ورنہ فی الواقع وہ زیادتی برائی اور سزا و عذاب نہیں۔ حضرت عکرمہ اور حضرت قتادہ کا فرمان ہے اصلی ظالم وہی ہے لا الہ الا اللہ کا منکر ہو۔

صحیح بخاری شریف میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے پاس دو اشخاص آئے جبکہ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر لوگوں نے چڑھائی کر رکھی تھی اور آ کر کہا کہ لوگ کٹ مر رہے ہیں۔ آپ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے صاحبزادے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی ہیں کیونکہ اس لڑائی میں شامل نہیں ہوتے؟ آپ نے فرمایا' سنو! اللہ تعالیٰ نے مسلمان بھائی کا خون حرام کر دیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ کیا یہ فرمان جناب باری کا نہیں کہ ان سے لڑو' یہاں کہ فتنہ باقی نہ رہے۔ آپ نے جواب دیا کہ ہم تو لڑتے رہے یہاں تک کہ فتنہ دب گیا اور اللہ تعالیٰ کا پسندیدہ دین غالب آ گیا۔ لیکن اب تم چاہتے ہو کہ تم لڑتا کہ فتنہ پیدا ہو اور دوسرے مذہب اُبھر آئیں۔ ایک اور روایت میں ہے کہ کسی نے آپ سے کہا کہ اے ابوعبدالرحمٰن آپ نے خدا کی راہ میں جہاد کیوں چھوڑ رکھا ہے اور یہ کیا اختیار کر رکھا ہے کہ حج پر حج کر رہے ہو۔ ہر دوسرے سال حج کو جایا کرتے ہو حالانکہ جہاد کے فضائل آپ سے مخفی نہیں۔ آپ نے فرمایا' بھتیجے سنو! اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے۔ اللہ تعالیٰ پر اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانا' پانچوں وقتوں کی نماز ادا کرنا' رمضان کے روزے رکھنا' زکوٰۃ دینا۔ بیت اللہ شریف کا حج کرنا۔ اس نے کہا' کیا قرآن پاک کا یہ حکم آپ نے نہیں سنا کہ ایمانداروں کی دو جماعتیں اگر آپس میں جھگڑیں تو تم ان میں صلح کرادو۔ اگر پھر بھی ایک گروہ دوسرے پر بغاوت کرے تو باغی گروہ سے لڑو' یہاں تک کہ وہ پھر سے خدا کا فرماں بردار بن جائے اور جگہ ارشاد ہے' ان سے لڑو تاوقتیکہ فتنہ مٹ جائے۔ آپ نے فرمایا ہم نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اس کی تعمیل کر لی جبکہ اسلام کمزور تھا اور مسلمان تھوڑے تھے۔ جو اسلام قبول کرتا تھا' اس پر فتنہ آ پڑتا تھا۔ یا تو قتل کر دیا جاتا یا سخت عذابوں میں

---

[1] اس کو آپ موجودہ اصطلاح میں جنگی آرڈیننس کہئے۔ یعنی جب جنگ ہو جائے تو اس وقت اسلام کو قبول کرو۔ اس کے سوا اور کوئی راہ نہیں لیکن امن کی حالت میں بجبر و قہر اسلام کو قبول کرنے کا مطالبہ خود اسلام کی جانب سے نہیں۔ آج بھی لڑائی چھڑ جانے کے بعد اس طرز کے مطالبات متمدن اقوام میں جنگی احکام سمجھے جاتے ہیں۔

پھنس جاتا۔ یہاں تک کہ دین پھیل گیا اور اس کے حلقہ بگوش بکثرت ہو گئے اور فتنہ ختم ہو گیا۔ اس نے کہا اچھا تو فرمائیے کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے آپ کا کیا خیال ہے۔ فرمایا عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو تو خدا نے معاف فرما دیا گو تم اس معافی سے برا مانو[1] اور علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ تو رسول اللہ ﷺ کے چچا زاد بھائی اور آپ کے داماد تھے اور دیکھو ان کا مکان یہ رہا جو تمہاری آنکھوں کے سامنے ہے۔

اَلشَّهْرُ الْحَرَامُ بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ وَالْحُرُمٰتُ قِصَاصٌ ۚ فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ ۠ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۹۴﴾

حرمت والا مہینہ ہے بعوض حرمت والے مہینے کے اور یہ حرمتیں تو عوض معاوضہ کی چیزیں ہیں سو جو تم پر زیادتی کرے تو تم بھی اس پر زیادتی کرو جیسی اس نے تم پر زیادتی کی اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو اور یقین کر لو کہ اللہ تعالیٰ ان ڈرنے والوں کے ساتھ ہے۔ ○

بعض مہینے، جن میں جہاد مناسب نہیں ☆

ذوالقعدہ ۶ ہجری میں رسول کریم ﷺ عمرے کے لئے اپنے صحابہ کرام سمیت مکہ کو تشریف لے چلے لیکن مشرکین نے آپ کو حدیبیہ والے میدان میں روک لیا۔ بالآخر اس بات پر صلح ہوئی کہ آئندہ سال آپ عمرہ کریں اور اس سال واپس تشریف لے جائیں۔ چونکہ ذی القعدہ کا مہینہ بھی حرمت والا مہینہ ہے۔ اس لئے یہ آیت نازل ہوئی۔ مسند احمد میں حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ حرمت والے مہینوں میں جنگ نہیں کرتے تھے ہاں اگر کوئی آپ پر چڑھائی کرے تو اور بات ہے بلکہ جنگ کرتے ہوئے اگر حرمت والے مہینے آ جاتے تو آپ لڑائی موقوف کر دیتے۔ حدیبیہ کے میدان میں بھی جب حضور ﷺ کو یہ خبر پہنچی کہ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو مشرکوں نے قتل کر دیا۔ جو کہ حضور ﷺ کا پیغام لے کر مکہ شریف میں گئے تھے۔ تو آپ ﷺ نے اپنے چودہ سو اصحاب سے ایک درخت تلے مشرکوں سے جہاد کرنے کی بیعت لی۔ پھر جب معلوم ہوا کہ یہ خبر غلط ہے تو آپ ﷺ نے اپنا ارادہ ملتوی کر دیا اور صلح کی طرف مائل ہو گئے۔ پھر جو واقعہ ہوا وہ ہوا۔ اسی طرح آپ جبکہ ہوازن کی لڑائی سے حنین والے دن فارغ ہوئے اور مشرکین طائف میں جا کر قلعہ بند ہو گئے تو آپ نے اس کا محاصرہ کر لیا۔ چالیس دن تک یہ محاصرہ رہا۔ بالآخر کچھ صحابہ کی شہادت کے بعد محاصرہ اٹھا کر مکہ کی طرف لوٹ گئے اور جعرانہ سے آپ نے عمرے کا احرام باندھا یہیں حنین کے غنائم تقسیم کیں اور یہ عمرہ آپ کا ذوالقعدہ میں ہوا۔ یہ ۸ ہجری کا واقعہ ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ پر درود وسلام بھیجے پھر فرماتا ہے جو تم پر زیادتی کرے تم بھی اس پر اتنی زیادتی کر لو۔ یعنی مشرکین میں بھی عدل کا خیال رکھو۔ یہاں بھی زیادتی کے بدلے کو زیادتی سے تعبیر کرنا ویسا ہی ہے۔ جیسے اور جگہ عذاب وسزا کے بدلے کو بھی عذاب کے لفظ سے ہی تعبیر کیا گیا ہے

[1] یعنی حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بعض شکایتوں اور بخششوں کی بناء پر یہ کچھ تم کو اچھا معلوم نہ ہوگا کہ خدا تعالیٰ ان کو معاف کر دے۔ تاہم تمہارے علی الرغم خدائے غفار نے ان کے ساتھ عفو وتسامح ہی کا معاملہ کیا ہے۔ ۱۲ انظر شاہ

اور برائی کے بدلے کو بھی برائی کے لفظ سے بیان کیا گیا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں' یہ آیت مکہ شریف میں اُتری۔ جہاں کے مسلمان میں کوئی شوکت وشان نہ تھی نہ جہاد کا حکم تھا۔ پھر یہ آیت مدینہ شریف میں جہاد کے حکم سے منسوخ ہوگئی۔ لیکن امام ابن جریر رحمتہ اللہ علیہ نے اس بات کی تردید کی ہے اور فرماتے ہیں کہ یہ آیت مدنی ہے۔ عمرۂ قضا کے بعد نازل ہوئی ہے حضرت مجاہد کا قول بھی یہی ہے۔ پھر فرماتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور پرہیزگاری اختیار کرو اور اسے جان لو کہ ایسے ہی لوگوں کے ساتھ دین دنیا میں اللہ تعالیٰ کی تائید ونصرت رہتی ہے۔

وَاَنْفِقُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَلَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ ۛ وَاَحْسِنُوْا ۛ اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ ﴿۱۹۵﴾

اور تم لوگ (جان کے ساتھ مال بھی) خرچ کیا کرو اللہ کی راہ میں اور اپنے آپ کو اپنے ہاتھوں تباہی میں مت ڈالو اور کام اچھی طرح کیا کرو۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ پسند کرتا ہے اچھی طرح کام کرنے والوں کو۔ ﴿۱۹۵﴾

ترکِ جہاد خودکشی کے مترادف ہے☆

حضرت حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ یہ آیت خدا کی راہ میں خرچ کرنے کے بارے میں نازل ہوئی ہے (بخاری) اور بزرگوں نے بھی اس آیت کی تفسیر میں یہی بیان فرمایا ہے۔ حضرت ابو عمران ؒ فرماتے ہیں کہ مہاجرین میں سے ایک نے قسطنطنیہ کی جنگ میں کفار کے لشکر پر دلیرانہ حملہ کیا اور ان کی صفوں کو چیرتا ہوا اُن میں گھس گیا۔ تو بعض لوگ کہنے لگے کہ دیکھو یہ اپنے ہاتھوں اپنی جان کو ہلاکت میں ڈال رہا ہے۔ حضرت ابوایوب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہ سن کر فرمایا' اس آیت کا صحیح مطلب ہم خوب جانتے ہیں۔ سنو! یہ آیت ہمارے ہی بارے میں نازل ہوئی ہے۔ ہم نے حضور ﷺ کی صحبت اُٹھائی۔ آپ کے ساتھ جنگ و جہاد میں شریک رہے۔ آپ کی مدد پر تلے رہے۔ یہاں تک کہ اسلام چہار سُو پھیل گیا اور مسلمان غالب آ گئے تو ہم انصاریوں نے ایک مرتبہ جمع ہو کر آپس میں مشورہ کیا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کریم ﷺ کی صحبت کے ساتھ ہمیں مشرف فرمایا۔ ہم نے آپ ﷺ کی خدمت کی۔ ہم آپ ﷺ کی ہمرکابی میں جہاد کرتے رہے۔ بحمد اللہ اسلام پھیل گیا۔ مسلمان کا غلبہ ہو گیا۔ لڑائی ختم ہوگئی۔ ان دنوں میں نہ ہم نے اولاد کی خبرگیری کی' نہ مال کی دیکھ بھال کی' نہ کھیتوں اور باغوں کا کچھ خیال کیا۔ پس اب ہمیں چاہیے کہ اپنے خانگی معاملات کی طرف توجہ کریں۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ جہاد کو چھوڑ کر بال بچوں اور بیوپار تجارت میں مشغول ہو جانا یہ اپنے ہاتھوں اپنے تئیں ہلاک کرنا ہے۔

(ابوداؤد' ترمذی' نسائی وغیرہ)

ایک اور روایت میں ہے کہ قسطنطنیہ کی لڑائی کے وقت مصریوں کے سردار حضرت عقبہ بن عامر تھے اور شامیوں کے سردار یزید بن فضار بن عبید تھے۔ حضرت براء بن عازب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ایک شخص نے پوچھا کہ اگر میں اکیلا تنہا دشمن کی صف میں گھس جاؤں اور وہاں گھر جاؤں اور قتل کر دیا جاؤں تو کیا اس آیت کے مطابق میں اپنی جان کو آپ ہی ہلاک کرنے والا ہوں گا؟ آپ نے جواب دیا نہیں نہیں' اللہ تعالیٰ اپنے نبی سے فرماتا ہے: ﴿فَقَاتِلْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ۚ لَا تُكَلَّفُ اِلَّا نَفْسَكَ﴾ (النساء: ۸۴) اے نبی اللہ کی راہ میں لڑتا رہ' تو اپنی جان کا ہی مالک ہے' اُسی کو تکلیف دے۔ یہ آیت تو خدا کی راہ

میں خرچ کرنے سے رک جانے والوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ (ابن مردویہ وغیرہ) ترمذی کی ایک اور روایت میں اتنی زیادتی بھی ہے کہ آدمی کا گناہوں پر گناہ کئے چلے جانا اور توبہ نہ کرنا یہ اپنے ہاتھوں اپنے تئیں ہلاک کرنا ہے۔ ابن ابی حاتم میں ہے کہ مسلمانوں نے دمشق کا محاصرہ کیا اور از دشنوءہ قبیلہ کا ایک آدمی جرأت کر کے دشمنوں میں گھس گیا' ان کی صفیں چیرتا پھاڑتا اندر چلا گیا۔ لوگوں نے اسے بُرا جانا اور حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس یہ شکایت کی۔ چنانچہ حضرت عمروؓ نے انہیں بلا لیا اور فرمایا قرآن میں ہے اپنی جانوں کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں لڑائی میں اس طرح کی بہادری کرنا یہ اپنی جانوں کو ہلاکت میں ڈالنا نہیں بلکہ خدا کی راہ میں مال خرچ نہ کرنا یہ ہلاکت میں پڑنا ہے۔ حضرت ضحاک بن ابو جبیرہؒ فرماتے ہیں کہ انصار اپنے مال خدا کی راہ میں کھلے دل سے خرچ کرتے رہتے تھے لیکن ایک سال قحط سالی کے موقع پر انہوں نے وہ خرچ روک لیا۔ جس پر یہ آیت نازل ہوئی حضرت امام حسن بصریؒ فرماتے ہیں' اس سے مراد بخل کرنا ہے۔

حضرت نعمان بن بشیر فرماتے ہیں کہ گنہگار کا رحمتِ باری سے نا اُمید ہو جانا' ہلاک ہو جانا ہے اور حضرات مفسرین بھی فرماتے ہیں کہ اگر گناہ ہو جائیں تو پھر بخشش سے نا اُمید ہو کر گناہوں میں مشغول ہونا یہ اپنے ہاتھوں ہلاک ہونا ہے۔ تَهْلُكَة سے مراد اللہ کا عذاب بیان کیا گیا ہے۔ قرطبی وغیرہ سے روایت ہے کہ لوگ حضور ﷺ کے ساتھ جہاد میں جاتے تھے اور اپنے ساتھ کچھ خرچ نہیں لے جاتے تھے۔ اب یا تو بھوک سے مریں یا اُن کا بوجھ دوسرے پر پڑے تو ان سے اس آیت میں فرمایا جاتا ہے کہ خدا نے جو تمہیں دیا ہے' اسے اس کی راہ کے کاموں میں لگاؤ اور اپنے ہاتھوں ہلاکت میں نہ پڑو کہ بھوک' پیاس سے یا پیدل چل چل کر مر جاؤ' اس کے ساتھ ہی ان لوگوں کو جن کے پاس کچھ ہے' حکم ہو رہا ہے کہ تم احسان کرو' تا کہ خدا تمہیں خوش رکھے۔ نیکی کے ہر کام میں خرچ کیا کرو۔ بالخصوص جہاد کے موقع پر خدا کی راہ میں خرچ کرنے سے نہ رکو۔ یہ دراصل خود تمہاری ہلاکت ہے۔ پس احسان اعلیٰ درجہ کی اطاعت ہے۔ جس کا یہاں حکم ہو رہا ہے اور ساتھ ہی بیان ہو رہا ہے کہ احسان کرنے والے خدا کے دوست ہیں۔

وَاَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ ۭ فَاِنْ اُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ ۚ وَلَا تَحْلِقُوْا رُءُوْسَكُمْ حَتّٰى يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهٗ ۭ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ بِهٖٓ اَذًى مِّنْ رَّاْسِهٖ فَفِدْيَةٌ مِّنْ صِيَامٍ اَوْ صَدَقَةٍ اَوْ نُسُكٍ ۚ فَاِذَآ اَمِنْتُمْ ۣ فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ اِلَى الْحَجِّ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ ۚ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ فِي الْحَجِّ وَسَبْعَةٍ اِذَا رَجَعْتُمْ ۭ تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ ۭ

ذٰلِكَ لِمَنْ لَّمْ يَكُنْ اَهْلُهٗ حَاضِرِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿۱۹۶﴾

ع ۸

اور (جب حج و عمرہ کرنا ہو تو اس) حج و عمرہ کو اللہ تعالیٰ کے واسطے پورا پورا کیا کرو۔ پھر اگر (کسی دشمن یا مرض کے سبب) روک دیئے جاؤ تو قربانی کا جانور جو کچھ میسر ہو (ذبح کرو) اور اپنے سروں کو اس وقت تک مت منڈاؤ جب تک کہ قربانی اپنے موقع پر نہ پہنچ جائے (اور وہ موقع حرم ہے کہ کسی کے ہاتھ جانور بھیج دیا جائے) البتہ اگر کوئی تم میں سے بیمار ہو یا اس کے سر میں کچھ تکلیف ہو (جس سے پہلے ہی سر منڈانے کی ضرورت پڑ جائے) تو (وہ سر منڈوا کر) فدیہ (اس کا شرعی بدلہ) دے دے (تین) روزے سے یا (چھ مسکین کو) خیرات دے دینے سے یا ایک بکری ذبح کر دینے سے۔ پھر جب تم امن کی حالت میں ہو (یا پہلے ہی سے کوئی خوف و مزاحمت پیش آیا ہو یا ہو کر جاتا رہا ہو تو جو شخص عمرہ سے اس کو حج کے ساتھ ملا کر متمتع ہوا ہو (یعنی ایام حج میں عمرہ کو بھی کیا ہو) تو جو کچھ میسر ہو قربانی (ذبح) کرے (اور جس نے صرف عمرہ یا حج کیا اس پر حج وغیرہ کے متعلق کوئی قربانی نہیں) پھر جس شخص کو قربانی کا جانور میسر نہ ہو (اس کے ذمہ) تین دن کے روزے ہیں (ایام حج میں) اور سات ہیں جبکہ حج سے تمہارا لوٹنے کا وقت آ جائے یہ پورے دس ہوئے۔ یہ اس شخص کے لئے ہے جس کے اہل (وعیال) مسجد حرام (یعنی کعبہ کے قریب میں نہ رہتے ہوں یعنی قریب کا وطن دار نہ ہو) اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو (کہ کسی امر میں خلاف نہ ہو جائے) اور جان لو کہ بلاشبہ اللہ تعالیٰ (بیباکی اور مخالفت کرنے والوں کو) سزائے سخت دیتے ہیں۔ ○

اسلام کا تیسرا عظیم الشان رُکن:

اُوپر چونکہ روزوں کا ذکر ہوا تھا۔ پھر جہاد کا بیان ہوا۔ اب حج کا ذکر ہو رہا ہے اور حکم ہوتا ہے کہ حج اور عمرے کو پورا کرو۔ ظاہر الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ حج اور عمرے کو شروع کرنے کے بعد ان کو پورا کرنا چاہئے۔ تمام علماء اس پر متفق ہیں کہ حج و عمرے کو شروع کرنے کے بعد ان کو پورا کرنا لازم ہے۔ گو عمرے کے واجب ہونے میں اور مستحب ہونے میں علماء کے دو اقوال ہیں۔ جنہیں ہم نے پوری طرح کتاب الاحکام میں بیان کر دیا ہے۔ **فللّٰہ الحمد والمنۃ** ۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ پورا کرنا یہ ہے کہ تم اپنے گھر سے احرام باندھو۔

حضرت سفیان ثوری رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ان کا تمام کرنا یہ ہے کہ تم اپنے گھر سے احرام باندھو۔ تمہارا یہ سفر حج و عمرے کی غرض سے ہو۔ میقات پہنچ کر لبیک پکارنا شروع کر دو۔ تمہارا ارادہ تجارت یا کسی اور غرض دنیوی کا نہ ہو کہ نکلے تو اپنے کام کو مکہ کے قریب پہنچ کر خیال آ گیا کہ آؤ حج و عمرہ بھی کرتا چلوں۔ گو اس طرح بھی حج و عمرہ ادا ہو جائے گا لیکن یہ پورا کرنا نہیں۔ پورا کرنا یہ ہے کہ صرف اسی ارادہ سے گھر سے نکلے۔ حضرت مکحولؒ فرماتے ہیں کہ ان کا پورا کرنا یہ ہے کہ انہیں میقات سے شروع کرے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ ان کا پورا کرنا یہ ہے کہ دونوں کو الگ الگ ادا کرے اور عمرے کو حج کے مہینوں میں نہ کرے۔ اس لئے کہ قرآن مجید میں ہے: ﴿اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ﴾ (بقرہ ۱۹۷) حج کے مہینے مقرر ہیں۔ قاسم بن محمدؒ فرماتے ہیں کہ حج کے مہینوں میں عمرہ کرنا پورا ہوتا نہیں۔ اُن سے پوچھا گیا کہ محرم میں عمرہ کرنا کیسا ہے؟ کہا لوگ

اسے تو پورا کہتے تھے لیکن یہ قول زیادہ صحیح نہیں ہے۔ اس لئے کہ یہ بات مسلّم ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے چار عمرے کئے اور چاروں ذوالقعدہ میں کئے۔ ایک ۶ ہجری میں ذوالقعدہ کے مہینے میں دوسرا ذوالقعدہ ۷ھ میں عمرۃ القضاء۔ تیسرا ذوالقعدہ ۸ھ میں عمرۃ الجعرانہ۔ چوتھا ذوالقعدہ ۹ھ میں حج کے ساتھ ان چاروں عمروں کے سوا ہجرت کے بعد آپ کا کوئی اور عمرہ نہیں ہوا۔ ہاں آپ نے اُم ہانی رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے فرمایا تھا کہ رمضان میں عمرہ کرنا میرے ساتھ حج کرنے کے برابر ہے۔ یہ آپ نے اس لئے فرمایا تھا کہ ان صاحبہ نے آپ ﷺ کے ساتھ حج کرنے کی نیت سے جانے کا ارادہ کیا تھا لیکن سواری کی وجہ سے ساتھ نہ جاسکیں۔ جیسے کی بخاری شریف میں یہ واقع پورا منقول ہے۔ حضرت سعید بن جبیر رحمتہ اللہ علیہ تو صاف فرماتے ہیں کہ یہ حضرت اُم ہانی رضی اللہ عنہا کے لئے مخصوص حکم ہے۔ واللہ اعلم۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ حج وعمرہ کا احرام باندھنے کے بعد بغیر پورا کئے چھوڑنا جائز نہیں۔ حج اس وقت پورا ہوتا ہے' جبکہ قربانی والے دن جمرۂ عقبہ کو کنکر مارے اور بیت اللہ کا طواف کرلے اور صفا مروہ کے درمیان دوڑ لے۔ اب ادا ہوگیا۔ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں' حج عرفات کا نام ہے اور عمرہ طواف ہے۔ حضرت عبداللہ کی قراءت یہ ہے: **واتموا الحج والعمرة الى البيت**۔ عمرہ بیت اللہ تک جاتے ہی پورا ہوگیا۔ حضرت سعید بن جبیر سے جب یہ ذکر ہوا تو آپ نے فرمایا' حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی قراءت بھی یہی تھی۔ حضرت علقمہ بھی یہی فرماتے ہیں۔ ابراہیمؒ سے نقل ہے: **واقيموا الحج والعمرة الى البيت**۔ حضرت شعبی کی قرأت میں **والعمرة** ہے۔ وہ فرماتے ہیں عمرہ واجب نہیں۔ گو اس کے خلاف بھی ان سے روایت ہے۔ بہت سی احادیث میں کئی کئی سندوں کے ساتھ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ وغیرہ صحابہ کی ایک جماعت سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حج وعمرہ دونوں کو جمع کیا اور صحیح حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے اپنے اصحاب سے فرمایا' جس کے ساتھ قربانی کا جانور ہے' وہ حج وعمرہ کا ایک ساتھ احرام باندھے۔

ایک اور حدیث میں ہے عمرہ حج میں قیامت تک کے لئے داخل ہوگیا۔ ابو محمد بن ابی حاتم نے اپنی کتاب میں ایک روایت تخریج کی ہے کہ ایک شخص آنحضرت ﷺ کے پاس آیا۔ وہ زعفران کی خوشبو سے مہک رہا تھا۔ اس نے پوچھا یا رسول اللہ ﷺ میرے احرام کے بارے میں کیا حکم ہے؟ اس پر یہ آیت اُتری۔ حضور ﷺ نے پوچھا' وہ سائل کہاں ہے؟ اس نے کہا' یا رسول اللہ موجود ہوں۔ فرمایا' اپنے زعفرانی کپڑے اتار ڈال اور خوب مَل وَل کر غسل کرکے اور جو اپنے حج میں کرتا ہے' وہی عمرے میں بھی کر۔ یہ حدیث غریب ہے اور یہ سیاق عجیب ہے۔ بعض روایتوں میں غسل کا اور اس آیت کے نازل ہونے کا ذکر نہیں۔ ایک روایت میں ان کا نام یعلی بن اُمیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ آیا ہے۔ اور دوسری رویت میں صفوان بن اُمیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ آیا ہے۔ واللہ اعلم۔ پھر فرمایا' اگر تم گھیر لئے جاؤ تو جو قربانی میسر ہو' کر ڈالو۔ مفسرین نے ذکر کیا ہے کہ یہ آیت ۶ھ میں حدیبیہ کے میدان میں اُتری جبکہ مشرکین نے رسول اللہ ﷺ کو مکہ جانے سے روکا تھا اور اسی بارہ میں پوری سورہ فتح اُتری اور حضور ﷺ کے صحابہ کو رخصت ملی کہ وہ اپنی قربانیوں کو وہیں ذبح کر ڈالیں۔ چنانچہ ستر اونٹ ذبح کئے گئے۔ سر منڈوائے گئے اور احرام کھول دیئے گئے۔ اوّل مرتبہ حضور ﷺ کے فرمان کو سن کر لوگ ذرا جھجکے اور انہیں انتظار تھا کہ شاید کوئی ناسخ حکم اُترے۔ یہاں تک کہ خود آپ ﷺ باہر آئے اور اپنا سر منڈوا دیا۔ پھر سب لوگ آمادہ ہوگئے۔ بعضوں نے سر منڈا لیا۔ بعضوں نے بال کتروائے۔ جس پر آنحضرت ﷺ نے فرمایا' اللہ تعالیٰ سر منڈوانے والوں پر رحم کرے۔ لوگوں نے کہا حضور

بال کتروانے والوں کے لئے بھی دعا کیجئے۔ آپ نے پھر سر منڈوانے والوں کے لئے ہی دعا کی۔ تیسری مرتبہ کتروانے والوں کے لئے بھی دعا کردی۔ سات سات شخص ایک ایک اونٹ میں شریک تھے۔ تعداد صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی چودہ سو تھی۔ حدیبیہ کے میدان میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ جو حدِ حرم سے باہر تھا۔ گو یہ بھی روایت ہے کہ حد حرم کے کنارے پر تھے واللہ اعلم۔ علماء کا اس میں اختلاف ہے کہ یہ حکم صرف ان لوگوں کے لئے ہے جنہیں دشمن گھیر لے یا کسی بیماری وغیرہ سے بھی کوئی مجبور ہو جائے تو اس کے لئے بھی رخصت ہے کہ وہ اسی جگہ احرام کھول ڈالے اور سر منڈوانے اور قربانی کردے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما تو صرف پہلی قسم کے لوگوں کے لئے ہی بتلاتے ہیں۔ ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما' طاؤس' زہری اور زید بن اسلم بھی یہی فرماتے ہیں لیکن مسند احمد کی ایک مرفوع حدیث میں ہے کہ جس شخص کا ہاتھ پاؤں ٹوٹ جائے یا بیمار ہو جائے یا لولا لنگڑا ہو جائے تو وہ حلال ہو گیا۔ (یعنی احرام اتار دے) وہ اگلے سال حج کر لے۔ راوی حدیث کہتا ہے کہ میں نے اسے ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما اور ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ذکر کیا' انہوں نے بھی فرمایا سچ ہے' سنن اربعہ میں بھی یہ حدیث ہے۔

حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہما' ابن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ' علقمہ' سعید بن مسیب' عمروہ بن زبیر' مجاہد' نخعی' عطاء مقاتل بن حیانؒ سے بھی یہی مروی ہے کہ بیمار ہو جانا اور لنگڑا لولا ہو جانا بھی ایسا ہی عذر ہے۔ حضرت سفیان ثوری ہر مصیبت و ایذاء کو ایسا ہی عذر بتلاتے ہیں۔ صحیحین کی ایک حدیث میں ہے کہ حضرت زبیر بن عبدالمطلب کی صاحبزادی ضباعہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا رسول اللہ ﷺ سے دریافت کرتی ہیں کہ حضور میرا ارادہ حج کا ہے لیکن میں بیمار رہتی ہوں۔ آپ ﷺ نے فرمایا' حج کو چلی جاؤ اور شرط کر لو کہ میرے احرام سے فارغ ہونے کی وہی جگہ ہے' جہاں میں مرض کی وجہ سے رُک جاؤں۔ اسی حدیث کی بناء پر بعض علماء کرام کا فتویٰ ہے کہ حج میں شرط کرنا جائز ہے۔ امام شافعی بھی فرماتے ہیں کہ اگر یہ قول صحیح ہے تو میرا قول بھی یہی ہے۔ حضرت امام بیہقی فرماتے ہیں' یہ حدیث بالکل سچی ہے۔ پس امام صاحب کا مذہب بھی یہی ہوا۔ فالحمد للہ۔ پھر ارشاد ہوتا ہے کہ جو قربانی میسر ہو اُسے قربان کر دے۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں' یعنی ایک بکری ذبح کر دے۔ ابن عباس فرماتے ہیں' اونٹ ہو' گائے ہو' بکری ہو' بھیڑ ہو' ان کے نر ہوں۔ ان آٹھ قسموں میں سے جسے چاہے' ذبح کر دے۔ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے صرف بکری بھی مروی ہے اور بھی بہت سے مفسرین نے یہی فرمایا ہے اور چاروں اماموں کا بھی یہی مذہب ہے۔ غالباً ان کی دلیل حدیبیہ والا واقعہ ہوگا۔ اس میں کسی صحابی سے بکری کا ذبح کرنا منقول نہیں۔ گائے اور اُونٹ ہی ان بزرگوں نے قربانی میں کئے ہیں۔ صحیحین میں حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ ہمیں اللہ کے نبی نے حکم دیا کہ ہم سات سات آدمی گائے اور اُونٹ میں شریک ہو جائیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے بھی یہ منقول ہے کہ جس جانور کے ذبح کرنے کی وسعت ہو' اُسے ذبح کر ڈالے۔ اگر مالدار ہے تو اونٹ اس سے کم حیثیت والا ہے تو گائے ورنہ پھر بکری۔ حضرت عروہ فرماتے ہیں' مہنگے سستے داموں پر موقوف ہے۔ جمہور کے اس قول کی کہ بکری کافی ہے۔ یہ دلیل ہے کہ قرآن نے میسر ہونے' آسانی ہونے کا ذکر فرمایا ہے۔ یعنی کم از کم وہ چیز جس پر قربانی کا اطلاق ہو سکے اور قربانی کے جانور' اونٹ' گائے' بکریاں اور بھیڑیں ہیں۔ جیسے حبر البحر ترجمان قرآن رسول اللہ ﷺ کے چچازاد بھائی حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا فرمان ہے۔ صحیحین کے ایک حدیث میں ہے کہ حضور ﷺ نے ایک مرتبہ بکری کی قربانی کی۔ پھر فرمایا' جب تک قربانی اپنی جگہ پر نہ پہنچ جائے تم اپنے سروں کو نہ منڈواؤ۔ اس کا عطف: وَاَتِمُّوا الْحَجَّ...... پر ہے فَاِنْ اُحْصِرْتُمْ پر

نہیں۔ امام ابن جریر سے یہاں سہو ہو گیا ہے کہ آنحضرت ﷺ اور آپ کے ساتھیوں نے حدیبیہ والے سال جبکہ مشرکین حائل ہو گئے اور آپ کو حرم میں نہ جانے دیا' تو حرم سے باہر ہی سب نے سر بھی منڈوائے اور قربانیاں بھی کر دیں لیکن امن کی حالت میں جبکہ حرم میں پہنچ سکتے ہوں تو جائز نہیں جب تک قربانی اپنی جگہ نہ پہنچ جائے اور حاجی حج وعمرے کے جملہ احکام سے فارغ نہ ہو جائے' اگر وہ حج عمرے کا ایک ساتھ احرام باندھے ہوئے ہو تو اور ان میں سے ایک کا کرنے والا ہو تو' خواہ اس نے صرف حج کا احرام باندھا ہوا ہو خواہ تمتع کی نیت سے ہو۔ بخاری مسلم میں ہے کہ حضرت حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم' سب نے تو احرام کھول ڈالے' لیکن آپ ﷺ احرام ہی سے ہیں۔ آپ نے فرمایا' ہاں میں نے اپنا سر منڈوالیا ہے اور اپنی قربانی کے جانور کے گلے میں علامت ڈال دی ہے۔ جب تک یہ ذبح نہ ہو جائے' میں احرام اتار نہیں سکتا۔ پھر حکم ہوتا ہے کہ بیمار اور سر کی تکلیف والا شخص فدیہ دے دے۔

صحیح بخاری شریف میں ہے' عبداللہ بن معقل کہتے ہیں کہ میں کوفہ کی مسجد میں حضرت کعب بن عجرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے ان سے اس آیت کے بارے میں پوچھا تو کہا کہ مجھے لوگ اٹھا کر حضور ﷺ کے پاس لے گئے۔ جوئیں میرے منہ پر چل رہی تھیں۔ آپ نے دیکھ کر فرمایا' میں نہیں خیال کرتا تھا کہ تمہاری حالت یہاں تک پہنچ گئی ہو گی۔ کیا تمہیں اتنی طاقت نہیں کہ ایک بکری ذبح کر ڈالو۔ میں نے کہا حضور صلی اللہ علیہ وسلم' میں تو مفلس آدمی ہوں۔ آپ ﷺ نے فرمایا' اچھا جاؤ' اپنا سر منڈوا دو اور تین روزے رکھ لینا یا چھ مسکینوں کو آدھا آدھا صاع (تقریباً سوا سیر سوا چھٹانک) اناج دے دینا۔ پس یہ آیت میرے بارے میں اُتری ہے اور حکم کے اعتبار سے ہر ایک ایسے معذور شخص کو شامل ہے۔ ایک اور روایت میں ہے کہ میں ہنڈیا تلے آگ سلگا رہا تھا تو حضور ﷺ نے میری یہ حالت دیکھ کر مجھے یہ مسئلہ بتایا۔ ایک اور روایت میں ہے کہ یہ واقعہ حدیبیہ کا ہے اور میرے سر پر بڑے بڑے بال تھے۔ جن میں بکثرت جوئیں ہو گئی تھیں۔ ابن مردویہ کی روایت ہے کہ پھر میں نے سر منڈوا دیا اور ایک بکری ذبح کر دی۔ ایک اور حدیث میں ہے نسک یعنی قربانی ایک بکری ہے اور روزے اگر رکھے تو تین ہیں اور صدقہ اگر دے تو ایک فرق (پیمانہ) چھ مسکینوں کے درمیان تقسیم کر دینا ہے۔ حضرت علی بن محمد بن کعب' علقمہ' ابراہیم' مجاہد' عطا' سدی اور ربیع بن انس رحمہم اللہ کا بھی یہی فتویٰ ہے۔ ابن ابی حاتم کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت کعب بن عجرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو تینوں مسئلے بتا کر فرما دیا تھا کہ اس میں سے جس پر تم عمل کر لو' کافی ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں' جہاں دو تین صورتیں لفظ او کے ساتھ بیان ہوئی ہوں' وہاں اختیار ہوتا ہے' جسے چاہے کر لے۔ حضرت مجاہد' عکرمہ' عطا' طاؤس' حسن حمید' اعرج' ابراہیم نخعی اور ضحاک سے بھی روایت ہے۔ چاروں اماموں اور اکثر علماء کا بھی یہی مذہب ہے کہ اگر چاہے روزے رکھ لے' اگر چاہے صدقہ کر لے' اگر چاہے قربانی کر لے۔ روزے تین ہیں۔ صدقہ ایک فرق یعنی تین صاع (یعنی آٹھ سیر میں آدھی چھٹانک کم) ہے۔ چھ مسکینوں پر تقسیم کر دے اور قربانی ایک بکری کی ہے۔ ان تینوں صورتوں میں سے جو چاہے کر لے۔ پروردگار رحمٰن ورحیم کو چونکہ یہاں رخصت دینی تھی۔ اس لئے سب سے پہلے روزے بیان فرمائے' جو سب سے آسان صورت ہے۔ پھر صدقہ کا ذکر کیا' پھر قربانی کا اور حضور ﷺ کو چونکہ افضلیت پر عمل کرانا تھا' اس لئے پہلے بکری کی قربانی کا ذکر کیا۔ پھر چھ مسکینوں کو کھانا کھلانے کا پھر تین روزے رکھنے کا۔ سبحان اللہ دونوں مقام کے اعتبار سے دونوں ترتیبیں کس قدر درست اور برمحل ہیں۔ فالحمد للہ۔ سعید بن جبیرؒ سے اس آیت

کا مطلب پوچھا جاتا ہے تو فرماتے ہیں کہ غلہ کا حکم لگایا جائے گا' اگر اس کے پاس ہے تو بکری خرید لے ورنہ بکری کی قیمت درہموں سے لگائی جائے اور اس کا غلہ خریدا جائے اور صدقہ کر دیا جائے۔ ورنہ ہر آدھے صاع کے بدلے ایک روزہ رکھے۔ حضرت حسنؒ فرماتے ہیں' جب محرم کے سر میں تکلیف ہو تو وہ بال منڈوا دے اور ان تین میں سے ایک فدیہ کر دے۔ روزے دس ہیں' صدقہ دس مسکینوں پر تقسیم کرنا پڑے گا۔ ہر ہر مسکین کو ایک ملوک کھجور اور ایک ملوک گیہوں اور قربانی میں بکری' حسن اور عکرمہ بھی دس مسکینوں کا کھانا بتلاتے ہیں لیکن یہ اقوال ٹھیک نہیں۔ اس لئے کہ مرفوع حدیث میں آ چکا ہے کہ روزے تین ہیں اور کھانا چھ مسکینوں کا ہے اور ان تینوں صورتوں میں اختیار ہے۔ قربانی کی بکری کر دے خواہ روزے تین رکھ لے۔ خواہ چھ فقیروں کو کھانا کھلا دے۔ ہاں یہ ترتیب احرام کی حالت میں شکار کرنے والے پر ہے۔ جیسے کہ قرآن کریم کے الفاظ ہیں اور فقہا کا اجماع ہے لیکن یہاں ترتیب ضروری نہیں' اختیار ہے' طاؤس فرماتے ہیں یہ قربانی اور یہ صدقہ مکہ ہی میں کرے۔ ہاں روزے جہاں چاہے رکھ لے۔

ایک ترتیب ضروری نہیں' اختیار ہے۔ طاؤس فرماتے ہیں کہ حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ تعالیٰ عنہ حج کو نکلے۔ آپ کے ساتھ حضرت علی اور حضرت حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہما بھی تھے۔ میں ابوجعفر کے ساتھ تھا۔ ہم نے دیکھا کہ ایک شخص سویا ہوا ہے اور اس کی اونٹنی اس کے سرہانے بندھی ہوئی ہے۔ میں نے اسے جگایا' دیکھا تو وہ حضرت حسن رضی اللہ تعالیٰ تھے۔ ابن جعفر انہیں لے کر چلے۔ یہاں تک کہ ہم سقیا میں پہنچے۔ وہاں بیس دن تک ہم ان کی تیمارداری میں رہے۔ ایک مرتبہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے پوچھا کیا حال ہے؟ جناب حسین نے اپنے سر کی طرف اشارہ کیا۔ آپ نے حکم دیا کہ سر منڈوا لو' پھر اونٹ منگوا کر ذبح کر دیا۔ تو اگر اونٹ کی قربانی کرنا احرام سے حلال ہونے کے لئے تھا تو خیر اور اگر یہ فدیہ کے لئے تھا تو ظاہر ہے کہ مکہ کے باہر یہ قربانی ہوئی۔ پھر ارشاد ہوتا ہے کہ تمتع والا شخص بھی قربانی کرے۔ خواہ حج و عمرے کا ایک ساتھ احرام باندھا ہو یا پہلے عمرے کا احرام باندھا ہو اور اس سے فارغ ہو کر حج کا احرام باندھ لیا ہو۔ اصل تمتع یہی ہے اور فقہا کے کلام میں بھی مشہور یہی ہے اور عام تمتع ان دونوں قسموں کو شامل ہے۔ جیسے کہ اس پر صحیح حدیثیں دلالت کرتی ہیں۔ بعض راوی تو کہتے ہیں کہ حضور ﷺ نے خود حج تمتع کیا تھا۔ بعض کہتے ہیں آپ قارن تھے اور اتنا سب کہتے ہیں کہ قربانی کے جانور آپ کے ساتھ تھے۔ پس آیت میں یہ حکم ہے کہ تمتع کرنے والا جس قربانی پر قادر ہو وہ کر ڈالے۔ جس کا ادنیٰ درجہ ایک بکری کی قربانی کرنا ہے۔ گو گائے کی قربانی بھی کر سکتا ہے۔ چنانچہ حضور ﷺ نے اپنی بیویوں کی طرف سے گائے کی قربانی کی تھی۔ جو سب کی سب تمتع والی تھیں۔ (ابن مردویہ) اس سے ثابت ہوتا ہے کہ تمتع بھی مشروع ہے۔ عمران بن حصین رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ تمتع کی آیت بھی قرآن میں نازل ہو چکی ہے اور ہم نے خود آنحضرت ﷺ کے ساتھ تمتع کیا۔ پھر نہ تو قرآن میں اس کی ممانعت نازل ہوئی۔ نہ حضور ﷺ نے اس سے روکا لیکن لوگوں نے اپنی رائے سے اسے ممنوع قرار دے لیا۔ امام بخاریؒ فرماتے ہیں' اس سے مراد غالباً حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں۔ حضرت امام المحدثین کی یہ بات بالکل صحیح ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ وہ لوگوں کو اس سے روکتے تھے اور فرماتے تھے کہ اگر ہم کتاب اللہ کو لیں تو اس میں بھی حج و عمرے کے پورا کرنے کا حکم موجود ہے: ﴿وَاَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ﴾ لیکن یہ یاد رہے کہ یہ ممانعت حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اس طرح نہ تھی کہ آپ بالکل ہی حرام سمجھ رہے ہوں بلکہ اس لئے تھی کہ لوگ بکثرت بیت اللہ شریف کا قصد حج و

نہیں۔ امام ابن جریر سے یہاں سہو ہو گیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں نے حدیبیہ والے سال جبکہ مشرکین حائل ہو گئے اور آپ کو حرم میں نہ جانے دیا' تو حرم سے باہر ہی سب نے سر بھی منڈوائے اور قربانیاں بھی کر دیں لیکن امن کی حالت میں جبکہ حرم میں پہنچ سکتے ہوں تو جائز نہیں جب تک قربانی اپنی جگہ نہ پہنچ جائے اور حاجی حج وعمرے کے جملہ احکام سے فارغ نہ ہو جائے' اگر وہ حج عمرے کا ایک ساتھ احرام باندھے ہوئے ہو تو اور ان میں سے ایک کا کرنے والا ہو تو' خواہ اس نے صرف حج کا احرام باندھا ہوا ہو خواہ تمتع کی نیت سے ہو۔ بخاری مسلم میں ہے کہ حضرت حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم' سب نے تو احرام کھول ڈالے' لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم احرام ہی سے ہیں۔ آپ نے فرمایا' ہاں میں نے اپنا سر منڈوا لیا ہے اور اپنی قربانی کے جانور کے گلے میں علامت ڈال دی ہے۔ جب تک یہ ذبح نہ ہو جائے' میں احرام اتار نہیں سکتا۔ پھر حکم ہوتا ہے کہ بیمار اور سر کی تکلیف والا شخص فدیہ دے دے۔

صحیح بخاری شریف میں ہے' عبداللہ بن معقل کہتے ہیں کہ میں کوفہ کی مسجد میں حضرت کعب بن عجرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے ان سے اس آیت کے بارے میں پوچھا تو کہا کہ مجھے لوگ اٹھا کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لے گئے۔ جوئیں میرے منہ پر چل رہی تھیں۔ آپ نے دیکھ کر فرمایا' میں نہیں خیال کرتا تھا کہ تمہاری حالت یہاں تک پہنچ گئی ہو گی۔ کیا تمہیں اتنی طاقت نہیں کہ ایک بکری ذبح کر ڈالو۔ میں نے کہا حضور صلی اللہ علیہ وسلم' میں تو مفلس آدمی ہوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا' اچھا جاؤ' اپنا سر منڈوا دو اور تین روزے رکھ لینا یا چھ مسکینوں کو آدھا آدھا صاع (تقریباً سوا سیر سوا چھٹانک) اناج دے دینا۔ پس یہ آیت میرے بارے میں اُتری ہے اور حکم کے اعتبار سے ہر ایک ایسے معذور شخص کو شامل ہے۔ ایک اور روایت میں ہے کہ میں ہنڈیا تلے آگ سلگا رہا تھا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے میری یہ حالت دیکھ کر مجھے یہ مسئلہ بتایا۔ ایک اور روایت میں ہے کہ یہ واقعہ حدیبیہ کا ہے اور میرے سر پر بڑے بڑے بال تھے۔ جن میں بکثرت جوئیں ہو گئی تھیں۔ ابن مردویہ کی روایت' ہے کہ پھر میں نے سر منڈوا دیا اور ایک بکری ذبح کر دی۔ ایک اور حدیث میں ہے نسک یعنی قربانی ایک بکری ہے اور روزے اگر رکھے تو تین ہیں اور صدقہ اگر دے تو ایک فرق (پیمانہ) چھ مسکینوں کے درمیان تقسیم کر دینا ہے۔ حضرت علی بن محمد بن کعب' علقمہ' ابراہیم' مجاہد' عطا' سدی اور ربیع بن انس رحمہم اللہ کا بھی یہی فتویٰ ہے۔ ابن ابی حاتم کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت کعب بن عجرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو تینوں مسئلے بتا کر فرما دیا تھا کہ اس میں سے جس پر تم عمل کر لو' کافی ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں' جہاں دو تین صورتیں لفظ او کے ساتھ بیان ہوئی ہوں' وہاں اختیار ہوتا ہے' جسے چاہے کر لے۔ حضرت مجاہد' عکرمہ' عطا' طاؤس' حسن حمید' اعرج' ابراہیم نخعی اور ضحاک سے بھی روایت ہے۔ چاروں اماموں اور اکثر علماء کا بھی یہی مذہب ہے کہ اگر چاہے روزے رکھ لے' اگر چاہے صدقہ کر لے' اگر چاہے قربانی کر لے۔ روزے تین ہیں۔ صدقہ ایک فرق یعنی تین صاع (یعنی آٹھ سیر میں آدھی چھٹانک کم) ہے۔ چھ مسکینوں پر تقسیم کر دے اور قربانی ایک بکری کی ہے۔ ان تینوں صورتوں میں سے جو چاہے کر لے۔ پروردگار رحمٰن ورحیم کو چونکہ یہاں رخصت دینی تھی۔ اس لئے سب سے پہلے روزے بیان فرمائے' جو سب سے آسان صورت ہے۔ پھر صدقہ کا ذکر کیا' پھر قربانی کا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو چونکہ افضلیت پر عمل کرانا تھا' اس لئے پہلے بکری کی قربانی کا ذکر کیا۔ پھر چھ مسکینوں کو کھانا کھلانے کا پھر تین روزے رکھنے کا۔ سبحان اللہ دونوں مقام کے اعتبار سے دونوں ترتیبیں کس قدر درست اور برمحل ہیں۔ فالحمد للہ۔ سعید بن جبیرؒ سے اس آیت

کا مطلب پوچھا جاتا ہے تو فرماتے ہیں کہ غلہ کا حکم لگایا جائے گا' اگر اس کے پاس ہے تو بکری خرید لے ورنہ بکری کی قیمت درہموں سے لگائی جائے اور اس کا غلہ خریدا جائے اور صدقہ کر دیا جائے۔ ورنہ ہر آدھے صاع کے بدلے ایک روزہ رکھے۔ حضرت حسنؒ فرماتے ہیں' جب محرم کے سر میں تکلیف ہو تو وہ بال منڈ وادے اور ان تین میں سے ایک فدیہ کر دے۔ روزے دس ہیں' صدقہ دس مسکینوں پر تقسیم کرنا پڑے گا۔ ہر ہر مسکین کو ایک مکوک کھجور اور ایک مکوک گیہوں اور قربانی میں بکری' حسن اور عکرمہ بھی دس مسکینوں کا کھانا بتلاتے ہیں لیکن یہ اقوال ٹھیک نہیں۔ اس لئے کہ مرفوع حدیث میں آ چکا ہے کہ روزے تین ہیں اور کھانا چھ مسکینوں کا ہے اور ان تینوں صورتوں میں اختیار ہے۔ قربانی کی بکری کر دے خواہ روزے تین رکھ لے۔ خواہ چھ فقیروں کو کھانا کھلا دے۔ ہاں یہ ترتیب احرام کی حالت میں شکار کرنے والے پر ہے۔ جیسے کہ قرآن کریم کے الفاظ ہیں اور فقہا کا اجماع ہے لیکن یہاں ترتیب ضروری نہیں' اختیار ہے' طاؤس فرماتے ہیں یہ قربانی اور یہ صدقہ مکہ ہی میں کرے۔ ہاں روزے جہاں چاہے رکھ لے۔

ایک ترتیب ضروری نہیں' اختیار ہے۔ طاؤس فرماتے ہیں کہ حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ تعالیٰ عنہ حج کو نکلے۔ آپ کے ساتھ حضرت علی اور حضرت حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہما بھی تھے۔ میں ابو جعفر کے ساتھ تھا۔ ہم نے دیکھا کہ ایک شخص سویا ہوا ہے اور اس کی اونٹنی اس کے سرہانے بندھی ہوئی ہے۔ میں نے اسے جگایا' دیکھا تو وہ حضرت حسن رضی اللہ تعالیٰ تھے۔ ابن جعفر انہیں لے کر چلے۔ یہاں تک کہ ہم سقیا میں پہنچے۔ وہاں بیس دن تک ہم ان کی تیمارداری میں رہے۔ ایک مرتبہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے پوچھا کیا حال ہے؟ جناب حسین نے اپنے سر کی طرف اشارہ کیا۔ آپ نے حکم دیا کہ سر منڈ والو' پھر اونٹ منگوا کر ذبح کر دیا۔ تو اگر اونٹ کی قربانی کرنا احرام سے حلال ہونے کے لئے تھا تو خیر اور اگر یہ فدیہ کے لئے تھا تو ظاہر ہے کہ مکہ کے باہر یہ قربانی ہوئی۔ پھر ارشاد ہوتا ہے کہ تمتع والا شخص بھی قربانی کرے۔ خواہ حج و عمرے کا ایک ساتھ احرام باندھا ہو یا پہلے عمرے کا احرام باندھا ہو اور اس سے فارغ ہو کر حج کا احرام باندھ لیا ہو۔ اصل تمتع یہی ہے اور فقہا کے کلام میں بھی مشہور یہی ہے اور عام تمتع ان دونوں قسموں کو شامل ہے۔ جیسے کہ اس پر صحیح حدیثیں دلالت کرتی ہیں۔ بعض راوی تو کہتے ہیں کہ حضور ﷺ نے خود حج تمتع کیا تھا۔ بعض کہتے ہیں آپ قارن تھے اور اتنا سب کہتے ہیں کہ قربانی کے جانور آپ کے ساتھ تھے۔ پس آیت میں یہ حکم ہے کہ تمتع کرنے والا جس قربانی پر قادر ہو وہ کر ڈالے۔ جس کا ادنیٰ درجہ ایک بکری کی قربانی کرنا ہے۔ گو گائے کی قربانی بھی کر سکتا ہے۔ چنانچہ حضور ﷺ نے اپنی بیویوں کی طرف سے گائے کی قربانی کی تھی۔ جو سب کی سب تمتع والی تھیں۔ (ابن مردویہ) اس سے ثابت ہوتا ہے کہ تمتع بھی مشروع ہے۔ عمران بن حصین رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ تمتع کی آیت بھی قرآن میں نازل ہو چکی ہے اور ہم نے خود آنحضرت ﷺ کے ساتھ تمتع کیا۔ پھر نہ تو قرآن میں اس کی ممانعت نازل ہوئی۔ نہ حضور ﷺ نے اس سے روکا لیکن لوگوں نے اپنی رائے سے اسے ممنوع قرار دے لیا۔ امام بخاریؒ فرماتے ہیں' اس سے مراد غالباً حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں۔ حضرت امام المحدثین کی یہ بات بالکل صحیح ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ وہ لوگوں کو اس سے روکتے تھے اور فرماتے تھے کہ اگر ہم کتاب اللہ کو لیں تو اس میں بھی حج و عمرے کے پورا کرنے کا حکم موجود ہے: ﴿وَاَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ﴾ لیکن یہ یاد رہے کہ یہ ممانعت حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اس طرح نہ تھی کہ آپ بالکل ہی حرام سمجھ رہے ہوں بلکہ اس لئے تھی کہ لوگ بکثرت بیت اللہ شریف کا قصد حج و

عمرے کے ارادے سے کریں۔ جیسے کہ آپ سے صراحتاً یہی نقل ہے' رضی اللہ تعالیٰ عنہ پھر فرماتا ہے' جو شخص نہ پائے' وہ تین روزے حج میں رکھ لے اور سات روزے اس وقت رکھ لے جب حج سے لوٹے یہ پورے دس دن ہو جائیں گے۔ یعنی قربانی کی طاقت جسے نہ ہو وہ روزے رکھ لے' تین تو ایام حج میں۔ علماء کا بیان ہے کہ بہتر یہ ہے کہ یہ روزے عرفہ سے پہلے پہلے ذی الحجہ کے دنوں میں رکھ لے۔ حضرت عطاء کا قول یہی ہے یا احرام باندھتے ہی رکھ لے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما وغیرہ کا یہی قول ہے کیونکہ فی الحج کا لفظ ہے۔ حضرت طاؤس' مجاہد وغیرہ یہ فرماتے ہیں کہ اول شوال میں بھی یہ روزے جائز ہیں۔ حضرت شعبی وغیرہ فرماتے ہیں کہ ان روزوں کو اگر عرفہ کے دن کا روزہ شامل کر کے ختم کرے تو بھی اختیار ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے یہ بھی منقول ہے کہ اگر عرفہ سے پہلے دو دنوں میں دو روزے رکھ لئے اور تیسرا عرفہ کا دن ہو تو بھی جائز ہے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ ایک روزہ یوم الترویہ سے پہلے۔ ایک یوم الترویہ کا' ایک عرفہ کا۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا فرمان بھی یہی ہے۔ اگر کسی شخص سے یہ تینوں روزے یا ایک دو چھوٹ گئے ہوں اور ایام تشریق یعنی بقرعید کے بعد تین دن آ جائیں' تو حضرت عائشہ' حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا فرمان ہے کہ وہ ان دنوں میں یہ روزے رکھ سکتا ہے۔ (بخاری) امام شافعی کا بھی پہلا قول یہی ہے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے بھی یہی نقل ہے۔ عکرمہ' حسن بصری اور عروہ بن زبیرؒ سے بھی یہی روایت ہے اور اس کی دلیل یہ ہے کہ و الحج عام ہے اور ان دنوں کو بھی شامل ہے۔

حضرت امام شافعی[1] کا نیا قول یہ ہے کہ ان دنوں میں یہ روزے ناجائز ہیں کیونکہ صحیح مسلم شریف میں حدیث ہے کہ ایام تشریق کھانے پینے اور ذکر اللہ کرنے کے دن ہیں۔ پھر سات روزے لوٹتے وقت' اس سے مراد یا تو یہ ہے کہ جب لوٹ کر اپنی قیام گاہ پر پہنچ جاؤ۔ پس لوٹتے وقت راستہ میں یہ سات روزے بھی رکھ سکتا ہے۔ مجاہد اور عطا یہی کہتے ہیں' یا مراد وطن میں پہنچ جانا ہے۔ ابن عمر بھی یہی فرماتے ہیں اور بھی بہت سے تابعین کا یہی مذہب ہے بلکہ ابن جریرؒ اس پر اجماع بتلاتے ہیں۔ بخاری شریف کی ایک طویل حدیث میں ہے کہ حضور ﷺ نے حجۃ الوداع میں عمرے کا حج کے ساتھ تمتع کیا اور قربانی دی۔ ذوالحلیفہ سے آپ ﷺ نے قربانی ساتھ لے لی تھی۔ عمرے کی پھر حج کی تہلیل کی۔ لوگوں نے بھی آپ کے ساتھ تمتع کیا۔ بعض لوگوں نے تو قربانی ساتھ رکھ لی تھی۔ بعضوں کے ساتھ قربانی کے جانور نہ تھے۔ مکہ شریف پہنچ کر آپ نے فرمایا کہ جس کے ساتھ قربانی ہے وہ حج ختم ہونے تک احرام میں رہے اور جس کے ساتھ قربانی نہیں وہ بیت اللہ شریف کا طواف کر کے صفا مروہ کے درمیان دوڑ کر احرام کھول ڈالے۔ سر کے بال منڈوا لے یا کتروا لے۔ پھر حج کا احرام باندھے۔ اگر قربانی کی طاقت نہ ہو تو تین روزے تو حج میں رکھ لے اور سات روزے جب اپنے وطن پہنچے تب رکھ لے۔ (بخاری مسلم)

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ سات روزے وطن میں جانے کے بعد ہیں۔ پھر فرمایا' یہ پورے دس ہیں۔ یہ ارشاد تاکید کے لئے ہے۔ جیسے عربوں میں کہا جاتا ہے۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ کانوں سے سنا۔ ہاتھ سے لکھا اور قرآن میں بھی ہے: ﴿وَلَا طٰٓئِرٍ يَّطِيْرُ بِجَنَاحَيْهِ﴾ (الانعام: ۳۸) نہ کوئی پرند جو اپنے دونوں پروں سے اُڑتا ہے اور جگہ ہے: ﴿وَلَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ﴾ (العنکبوت: ۴۸) تو اپنے دائیں ہاتھ سے لکھتا نہیں اور جگہ ہے ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو تیس راتوں کا وعدہ دیا اور

[1] امام شافعی رحمتہ اللہ علیہ نے مصر میں قیام کے بعد اپنی بعض رائیں تبدیل کی تھیں۔ اب اصطلاحِ فقہا میں شافعی الامام کا قول جدید وہ ہے جو آپ نے مصر کے قیام کے بعد اختیار کیا۔ ۱۲

مزید دس کے ساتھ اسے پورا کیا اور اس کے رب کا وقت مقررہ چالیس راتوں کو پورا ہوا۔ پس ان سب جگہوں میں صرف تاکید ہے ایسے ہی یہ جملہ بھی تاکید کے لئے ہے اور یہ کہا گیا ہے کہ یہ حکم ہے تمام وکمال کرنے کا اور کاملة کا مطلب یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ یہ قربانی کے بدلے کافی ہیں۔ اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے کہ یہ حکم ان لوگوں کے لئے ہے' جن کے گھر والے مسجد حرام کے پاس رہنے والے نہ ہوں۔ اس پر تو اجماع ہے کہ حرم والے تمتع نہیں کر سکتے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما یہی فرماتے ہیں۔ بلکہ آپ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا اے مکہ والو تم تمتع نہیں کر سکتے۔ باہر والوں کے تمتع ہے۔ تم کو ذرا سی دور جانا پڑتا ہے۔ تھوڑا سا فاصلہ طے کیا۔ پھر عمرے کا طواف باندھ لیا۔ حضرت طاؤس کی تفسیر بھی یہی ہے لیکن حضرت عطاء رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میقات یعنی احرام باندھنے کے مقامات سے درے (اندر) جو ہوں' وہ بھی اسی حکم میں ہیں۔ ان کے لئے بھی تمتع کرنا جائز نہیں۔ مکحول بھی یہی فرماتے ہیں۔ تو عرفات والوں کا مزدلفہ والوں کا' عرنہ اور رجیع کے رہنے والوں کا بھی یہی حکم ہے۔ زہری فرماتے ہیں' مکہ شریف سے ایک دن کے راہ کے فاصلہ پر ہو یا اس کے قریب' وہ تو تمتع کر سکتا ہے اور لوگ نہیں کر سکتے۔ حضرت عطاء دو دن بھی فرماتے ہیں۔ امام شافعی کا مذہب یہ ہے کہ اہل حرم اور وہ اشخاص جو اتنے فاصلہ پر ہوں کہ وہاں کے لوگوں کے لئے نماز قصر کرنا جائز نہ ہو۔ اُن سب کے لئے یہی حکم ہے۔ اس لئے کہ یہ سب حاضر کئے جائیں گے' ان کے علاوہ مسافر۔ ان سب کے لئے حج میں تمتع کرنا جائز ہے۔ واللہ اعلم۔ پھر فرمایا اللہ تعالیٰ سے ڈرو۔ جو اس کے احکام ہیں' بجا لاؤ۔ جن کاموں سے اس نے منع کیا ہے رک جاؤ اور یقین رکھو کہ وہ اپنے نافرمانوں کو سخت سزا کرتا ہے۔

اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ ۚ فَمَنْ فَرَضَ فِيْهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ ۗ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ يَّعْلَمْهُ اللّٰهُ ؕ وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى ۚ وَاتَّقُوْنِ يٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ ﴿۱۹۷﴾

(زمانہ) حج چند مہینے ہیں جو معلوم ہیں (شوال' ذی قعدہ اور دس تاریخیں ذی الحجہ کی) سو جو شخص ان میں حج مقرر کرے تو پھر (اس کو) نہ کوئی فحش بات جائز ہے نہ کوئی بے حکمی (درست ہے) اور نہ کسی قسم کا نزاع زیبا ہے اور جو نیک کام کرو گے خدا تعالیٰ کو اس کی اطلاع ہوتی ہے اور (جب حج کو جانے لگو) خرچ ضرور لے لیا کرو کیونکہ سب سے بڑی یا خرچ میں (گداگری سے) بچا رہنا ہے اور اے ذی عقل لوگو مجھ سے ڈرتے رہو۔ ○

حج بیت اللہ کے متعین ایام:

عربی جاننے والوں نے کہا ہے کہ مطلب اگلے جملہ کا یہ ہے کہ حج حج ہے ان مہینوں کا جو معلوم اور مقرر ہیں۔ پس حج کے مہینوں میں احرام باندھنا دوسرے مہینوں کے احرام سے زیادہ کامل ہے۔ گو اور ماہ کا احرام بھی صحیح ہے۔ امام مالک' امام ابو حنیفہ' امام احمد' امام اسحٰق' امام ابراہیم نخعی' امام ثوری' امام لیث' اللہ تعالیٰ ان سب پر رحمتیں نازل فرمائے۔ فرماتے ہیں کہ سال بھر میں جس مہینہ میں چاہے' حج کا احرام باندھ سکتا ہے۔ ان بزرگوں کی دلیل: ﴿يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ﴾ (البقرة ۱۸۹)۔

دوسری دلیل یہ ہے کہ حج اور عمرہ دونوں کو نسک کیا گیا ہے اور عمرے کا احرام ہر مہینہ میں باندھ سکتا ہے تو حج کا احرام بھی جب باندھے گا' صحیح ہوگا۔ ہاں حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حج کا احرام حج کے مہینوں میں ہی باندھنا صحیح ہوگا۔ بلکہ اگر اور ماہ میں حج کا احرام باندھا تو غیر صحیح ہے لیکن اس سے عمرہ بھی ہوسکتا ہے یا نہیں؟ اس میں امام صاحب کے دو اقوال ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما' حضرت جابر' حضرت عطا مجاہد رحمہم اللہ کا بھی یہی مذہب ہے کہ حج کا احرام حج کے مہینوں کے سوا باندھنا غیر صحیح ہے اور اس پر دلیل اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ ہے۔ عربی جاننے والوں کی ایک دوسری جماعت کہتی ہے کہ آیت کے ان الفاظ سے مطلب یہ ہے کہ حج کا وقت خاص خاص مقرر کردہ مہینے ہیں تو ثابت ہوا کہ ان مہینوں سے سے پہلے جو احرام حج کا باندھے گا وہ صحیح نہ ہوگا۔ جس طرح نماز کے وقت سے پہلے کوئی نماز پڑھ لے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مسلم خالد نے خبر دی' انہوں نے ابن جریج سے سنا۔ ان سے عمر بن عطا نے کہا' ان سے عکرمہ نے ذکر کیا کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا فرمان ہے کہ کسی شخص کو لائق نہیں کہ حج کے مہینوں کے سوا بھی حج کا احرام کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ اس روایت کی اور بھی بہت سی سندیں ہیں۔

ایک سند میں ہے کہ سنت یہی ہے۔ صحیح ابن خزیمہ میں بھی یہ روایت منقول ہے۔ اصول کی کتابوں میں یہ مسئلہ طے شدہ ہے کہ صحابی کا یہ فرمان کہ سنت یوں ہے۔ حکم میں مرفوع حدیث کے ہوتا ہے۔ پس یہ حکم رسول ﷺ ہو گیا اور صحابی بھی یہاں وہ صحابی ہیں جو مفسر قرآن اور ترجمان القرآن ہیں۔ علاوہ ازیں ابن مردویہ کی ایک مرفوع حدیث میں ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حج کا احرام باندھنا کسی کو سوا حج کے مہینوں کے لائق نہیں۔ اس کی اسناد بھی مضبوط ہیں لیکن شافعیؒ اور بیہقی نے روایت کی ہے کہ اس حدیث کے راوی حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا کہ کیا حج کے مہینوں سے پہلے حج کا احرام باندھ لیا جائے؟ تو آپ نے فرمایا نہیں۔ یہ موقوف حدیث ہی زیادہ ثابت اور زیادہ صحیح ہے اور صحابی کے اس فتوے کی تقویت حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے اس قول سے بھی ہوتی ہے کہ سنت یوں ہے۔ واللہ اعلم[1]۔ ﴿اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ﴾ سے مراد حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ شوال' ذوالقعدہ اور دس دن ذی الحجہ کے ہیں (بخاری) یہ روایت ابن جریر میں بھی ہے۔ مستدرک حاکم میں بھی ہے اور حاکم[2] اسے صحیح بتلاتے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ' حضرت علی' حضرت ابن مسعود' حضرت عبداللہ بن زبیر' حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم سے بھی یہی مروی ہے۔ حضرت عطاء' حضرت مجاہد' حضرت ابراہیم نخعی' حضرت شعبی' حضرت حسن' حضرت ابن سیرین' حضرت مکحول' حضرت قتادہ' حضرت ضحاک بن مزاحم' حضرت ربیع بن انس' حضرت مقاتل بن حبان رحمہم اللہ بھی یہی کہتے ہیں۔ حضرت امام شافعی' امام ابوحنیفہ' امام احمد بن حنبل' ابو یوسف اور ابوثور رحمۃ اللہ علیہم کا بھی یہی مذہب ہے۔ امام ابن جریر بھی اسی کو پسند کرتے ہیں۔ اَشْهُرٌ تو اس کا اطلاق دو پورے مہینوں اور تیسرے کے بعض حصہ پر بھی ہوسکتا ہے جیسے عربی میں کہا جاتا ہے۔ میں نے اس سال یا آج کے دن اُسے دیکھا ہے پس حقیقت میں سارا سال اور پورا دن تو دیکھا نہیں رہتا بلکہ دیکھنے کا وقت تھوڑا سا ہی ہوتا ہے۔ مگر تغلیباً[3] ایسا بول دیا جاتا ہے۔

---

[1] افسوس کے ابن کثیرؒ نے مذہبی تعصب میں ابوحنیفہ الامام کے قول کو اختیار نہیں کیا۔ حالانکہ خود ابن کثیر کا بیان ہے کہ امام ابوحنیفہ کی رائے سے بیشتر علما نے اتفاق کیا ہے۔۱۲

[2] علماء کا بیان ہے کہ حاکم کی تصحیح کا اس وقت تک اعتبار نہ کیا جائے جب تک ذہبی کی تنقید نہ دیکھ لی جائے۔ اسلئے کہ حاکم ہر حدیث کو صحیح کہنے میں بڑی فیاضی سے کام لیتے ہیں۔۱۲

[3] تغلیب کا مطلب یہ ہے کہ ایک چیز کو دوسری چیز پر غلبہ دیا جائے۔ جیسا کہ قمرین بولتے ہیں اور شمس وقمر دونوں مراد ہوتے ہیں یا عمرین سے حضرت ابوبکر صدیق اور عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہما دونوں ہی مراد ہوتے ہیں۔۱۲۔ انظر شاہ۔

اِسی طرح یہاں بھی تغلیباً تیسرے مہینہ کا ذکر ہے۔ قرآن میں بھی ہے: ﴿فمن تعجل فی یومین﴾ حالانکہ وہ جلدی ڈیڑھ دن کی ہوتی ہے۔ مگر گنتی میں دو دن کہے گئے۔ امام مالک امام شافعی کا ایک پہلا قول یہ بھی ہے کہ شوال ذوالقعدہ اور ذوالحجہ کا پورا مہینہ ہے۔ ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے بھی یہی مروی ہے۔ ابن شہاب عطا جابر بن عبداللہ سے بھی یہی مروی ہے۔ طاؤس مجاہد عروہ ربیع اور قتادہ سے بھی یہی مروی ہے۔ ایک مرفوع حدیث میں بھی یہ آیا ہے لیکن وہ مرفوع ہے کیونکہ اس کا راوی حصین بن مخارق ہے جس پر حدیثوں کو وضع کرنے کی تہمت ہے۔ بلکہ اس کا مرفوع ہونا ثابت نہیں۔ واللہ اعلم۔

امام مالکؒ کے اس قول کو مان لینے کے بعد یہ ثابت ہوتا ہے کہ ذوالحجہ کے مہینہ میں عمرہ کرنا صحیح نہیں ہوگا۔ یہ مطلب نہیں کہ دس ذی الحجہ کے بعد بھی حج ہو سکتا ہے۔ چنانچہ حضرت عبداللہ سے روایت ہے کہ حج کے مہینوں میں عمرہ درست نہیں۔ امام ابن جریر بھی ان اقوال کا یہی مطلب بیان کرتے ہیں کہ حج کا زمانہ تو منیٰ کا دن گزرتے ہی جاتا رہا۔ محمد بن سیرین کا بیان ہے کہ میرے علم میں تو کوئی ایسا اہل علم نہیں جو حج کے مہینوں کے علاوہ عمرہ کرنے کو ان مہینوں کے اندر عمرہ کرنے سے افضل ماننے میں شک کرتا ہو۔ قاسم بن محمدؒ سے ابن عون نے حج کے مہینوں میں عمرہ کرنے کے مسئلہ کو پوچھا تو آپ نے جواب دیا کہ اُسے لوگ پورا عمرہ نہیں جانتے۔ حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہما بھی حج کے مہینوں کے علاوہ عمرہ کرنا پسند فرماتے تھے بلکہ ان مہینوں میں عمرہ کرنے کو منع کرتے تھے۔ واللہ اعلم۔ پھر ارشاد ہوتا ہے کہ جو شخص ان مہینوں میں حج مقرر کر لے۔ یعنی حج کا احرام باندھ لے۔ اس سے ثابت ہوا کہ حج کا احرام باندھنا اور اسے پورا کرنا لازم ہے۔ فرض سے مراد یہاں واجب و لازم کر لینا ہے۔ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں حج اور عمرہ کا احرام باندھنے والا مراد ہے۔ عطا فرماتے ہیں فرض سے مراد احرام ہے۔ ابراہیم اور ضحاک کا بھی یہی قول ہے۔ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں احرام باندھ لینے اور لبیک پکارنے کے بعد کہیں ٹھہرا رہنا ٹھیک نہیں اور بزرگوں کا بھی یہی قول ہے۔ بعض بزرگوں نے یہ بھی کہا ہے کہ فرض سے مراد لبیک پکارنا ہے۔ رفث سے مراد جماع ہے۔ جیسے اور جگہ قرآن میں ہے: ﴿اُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ اِلٰى نِسَآئِكُمْ﴾ (البقرة:۱۸۷) یعنی روزے کی راتوں میں اپنی بیویوں سے جماع کرنا تمہارے لئے حلال کیا گیا ہے۔

احرام کے بعد کیا چیزیں ممنوع ہیں؟ احرام کی حالت میں جماع اور اس کے تمام مقدمات بھی حرام ہیں۔ جیسے مباشرت کرنا بوسہ لینا ان باتوں کا عورتوں کی موجودگی میں ذکر کرنا گو بعضوں نے مردوں کے اجتماع میں بھی ایسی باتیں کرنے کو رفث میں داخل کیا ہے لیکن حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے اس کے خلاف مروی ہے۔ انہوں نے ایک مرتبہ کوئی ایسا ہی شعر پڑھا اور دریافت کرنے پر فرمایا کہ عورتوں کے سامنے اس قسم کی باتیں کرنا رفث ہے۔ رفث کا ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ جماع وغیرہ کا ذکر کیا جائے۔ فحش باتیں کرنا دبی زبان سے ایسے ذکر کرنا اشاروں کنایوں میں جماع کا ذکر کرنا اپنی بیوی سے کہنا کہ احرام کھل جائے تو جماع کریں۔ چھیڑ چھاڑ کرنا مساس وغیرہ یہ سب رفث میں داخل ہے اور احرام کی حالت میں یہ باتیں حرام ہیں۔ مختلف مفسروں کے مختلف اقوال کا مجموعہ یہ ہے۔ فسوق کے معنی عصیان و نافرمانی شکار گالی گلوچ وغرہ بدزبانی ہے۔ جیسے حدیث میں مسلمان کو گالی دینا فسق ہے اور اسے قتل کرنا کفر ہے۔ خدا کے سوا دوسروں کے تقرب کے لئے جانوروں کو ذبح کرنا بھی فسق ہے۔ جیسے قرآن کریم میں ہے: ﴿اَوْ فِسْقًا اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ﴾ (الانعام:۱۴۵) برے انقاب سے یاد کرنا بھی فسق ہے۔ قرآن فرماتا ہے: ﴿لَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ﴾ (الحجرات:۱۱) مختصر یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کی ہر نافرمانی فسق میں داخل ہے۔ گو

یہ فسق ہر وقت حرام ہے لیکن حرمت والے مہینے میں اس کی حرمت اور بڑھ جاتی ہے خدا تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿فَلَا تَظْلِمُوْا فِيْهِنَّ اَنْفُسَكُمْ﴾ (التوبۃ: ۳۶) ان حرمت والے مہینوں میں اپنی جان پر اتنا ظلم نہ کرو۔ اسی طرح حرم میں بھی اس کی حرمت بڑھ جاتی ہے۔ ارشاد ہے: ﴿وَمَنْ يُّرِدْ فِيْهِ بِاِلْحَادٍ بِظُلْمٍ نُّذِقْهُ مِنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ﴾ (الحج: ۲۵) یعنی حرم میں جو الحاد اور بے دینی کا ارادہ کرے اسے ہم المناک عذاب دیں گے۔ امام ابن جریر فرماتے ہیں یہاں مراد فسق سے وہ کام ہیں جو احرام کی حالت میں منع ہیں۔ جیسے شکار کھیلنا' بال منڈوانا یا کتروانا' ناخن لینا وغیرہ۔ حضرت ابن عمر سے بھی یہی روایت ہے لیکن بہترین تفسیر وہی ہے جو ہم نے بیان کی یعنی ہر گناہ سے روکا گیا ہے۔ واللہ اعلم۔

صحیحین میں ہے جو شخص اس بیت اللہ کا حج کرے۔ نہ رفث کرے نہ فسق۔ وہ گناہوں سے ایسا نکل جاتا ہے جیسے اپنے پیدا ہونے کا دن تھا۔ پھر ارشاد ہوتا ہے کہ حج میں جھگڑا نہیں۔ یعنی حج کے وقت اور حج کے ارکان وغیرہ میں جھگڑا نہ کرو اس کا پورا بیان اللہ تعالیٰ نے فرما دیا ہے۔ حج کے مہینے مقرر ہو چکے ہیں۔ ان میں کمی زیادتی نہ کرو۔ موسم حج کو آگے پیچھے نہ کرو۔ جیسا کہ مشرکین کا وطیرہ تھا۔ جس کی مذمت قرآن کریم میں اور جگہ فرما دی گئی ہے۔ اس طرح قریش مشعر حرام کے پاس مزدلفہ میں ٹھہر جاتے تھے اور باقی عرب عرفات میں ٹھہرتے تھے۔ پھر آپس میں جھگڑتے تھے اور ایک دوسرے سے کہتے تھے کہ ہم صحیح راہ پر اور طریق ابراہیمی پر ہیں۔ جس سے یہاں ممانعت کی جاری ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی نبی کے ہاتھوں وقت حج' ارکان حج اور ٹھہرنے وغیرہ کی جگہیں بیان کر دی ہیں۔ اب نہ کوئی ایک دوسرے پر فخر کرے نہ حج کے دن آگے پیچھے کرے۔ بس جھگڑے اب ختم کر دو۔ واللہ اعلم۔ یہ مطلب بھی بیان کیا گیا ہے کہ حج کے سفر میں آپس میں نہ جھگڑو۔ نہ ایک دوسرے کو غصہ دلاؤ۔ نہ کسی کو گالی دو۔ بہت سے مفسرین کا یہ قول بھی ہے اور بہت سے مفسرین کا پہلا قول بھی ہے۔ حضرت عکرمہ فرماتے ہیں کہ کسی کا اپنے غلام کو ڈانٹ ڈپٹ کرنا اس میں داخل نہیں۔ ہاں مارے نہیں لیکن میں کہتا ہوں کہ غلام کو اگر مار بھی لے تو کوئی ڈر خوف نہیں۔

مسند احمد کی حدیث ہے کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ سفر حج میں تھے اور عرج میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا آنحضرت ﷺ کے پاس بیٹھی ہوئی تھیں۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور آنحضرت ﷺ کے اونٹوں کا سامان حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے خادم کے پاس تھا۔ حضرت صدیق اس کا انتظار کر رہے تھے۔ تھوڑی دیر میں وہ آ گیا۔ اس سے پوچھا کہ اونٹ کہاں ہے؟ اس نے کہا' حضرت کل رات کو گم ہو گیا۔ آپ ناراض ہوئے اور فرمانے لگے ایک اونٹ کو بھی تو سنبھال نہ سکا۔ یہ کہہ کر آپ نے اسے مارا' نبی ﷺ مسکرا رہے تھے اور فرماتے جا رہے تھے کہ دیکھو احرام کی حالت میں یہ کیا کر رہے ہیں۔ یہ حدیث ابوداؤد اور ابن ماجہ میں بھی ہے۔ بعض سلف سے یہ بھی نقل ہے کہ حج کے تمام ہونے میں یہ بھی ہے لیکن یہ خیال رہے کہ حضور ﷺ کا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اس کام پر یہ فرمانا' اس میں نہایت لطافت کے ساتھ ایک قسم کا انکار ہے۔ پس مسئلہ یہ ہوا کہ اسے چھوڑ دینا ہی اولیٰ ہے واللہ اعلم۔

مسند عبد بن حمید میں ہے کہ جو شخص اپنا حج پورا کرے اور مسلمان اس کی زبان سے اور ہاتھ سے ایذا نہ پائیں۔ اس کے تمام اگلے گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ پھر فرمایا' تم جو بھلائی کرو اس کا علم اللہ تعالیٰ کو ہے چونکہ اوپر ہر برائی سے روکا تھا کہ نہ کوئی برا کام کرو۔ نہ بری بات کہو تو یہاں نیکی کی رغبت دلائی جا رہی ہے کہ ہر نیکی کا پورا پورا بدلہ قیامت کے دن پاؤ گے۔ پھر ارشاد ہوتا ہے کہ توشہ اور سفر خرچ لے لیا کرو۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں' لوگ بلا خرچ سفر حج کو نکل کھڑے

ہوتے تھے، پھر لوگوں سے مانگتے پھرتے تھے۔ جس پر یہ حکم ہوا۔ حضرت عکرمہ حضرت عیینہ بھی یہی فرماتے ہیں۔ بخاری، نسائی وغیرہ میں یہ روایتیں مروی ہیں۔ ایک روایت یہ بھی مروی ہے کہ یمنی لوگ ایسا کرتے تھے اور اپنے تئیں متوکل کہتے تھے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے یہ روایت ہے کہ جب احرام باندھتے تو جو کچھ توشہ وغیرہ ہوتا، سب پھینک دیتے اور نئے سرے سے نیا سامان کرتے۔ اس پر یہ حکم ہوا کہ ایسا نہ کرو، آٹا، ستو وغیرہ توشے میں لے لو۔ دیگر بہت سے مفسرین نے بھی اسی طرح کہا ہے۔ بلکہ ابن عمر تو یہ بھی فرماتے ہیں کہ انسان کی عزت اسی میں ہے کہ وہ عمدہ سامان سفر ساتھ رکھے۔ آپ اپنے ساتھیوں سے دل کھول کر خرچ کرنے کی شرط کر لیا کرتے تھے۔ چونکہ دنیوی توشہ کا حکم دیا، تو ساتھ ہی فرماتا ہے کہ آخرت کے توشہ کی تیاری بھی کر لو۔ یعنی اپنی قبر میں اپنے ساتھ خوفِ خدا لے کر جاؤ۔ جیسے اور جگہ لباس کا ذکر کر کے ارشاد فرمایا: ﴿وَلِبَاسُ التَّقْوٰى ذٰلِكَ خَيْرٌ﴾ (الاعراف: ۲۶) پرہیزگاری کا لباس بہتر ہے۔ یعنی خشوع وخضوع، طاقت وتقویٰ کے باطنی لباس سے بھی خالی نہ ہو۔ بلکہ یہ لباس ظاہری لباس سے کہیں زیادہ بہتر اور نفع دینے والا ہے۔ ایک حدیث میں بھی ہے کہ دنیا میں اگر کرو گے تو آخرت میں پاؤ گے۔ یہاں کا توشہ وہاں فائدے دے گا۔ (طبرانی) اس حکم کو سن کر ایک مسکین صحابیؓ نے حضور ﷺ سے کہا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، ہمارے پاس تو کچھ ہے ہی نہیں۔ آپ نے فرمایا، اتنا ہونا چاہئے، جس سے کسی سے سوال نہ کرنا پڑے اور بہترین خزانہ خوفِ خدا ہے۔ (ابن ابی حاتم) پھر ارشاد ہوتا ہے کہ عقل مندو مجھ سے ڈرتے رہو۔ یعنی میری پکڑ دھکڑ سے، میری گرفت سے، میری سزاؤں سے ڈرو اور میرے احکام کی تعمیل کرو۔ میرے ارشاد کا خلاف نہ کرو۔ تاکہ نجات پاسکو۔ یہ ہی عقلی امتیاز ہے۔

لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ ۭ فَاِذَآ اَفَضْتُمْ مِّنْ عَرَفٰتٍ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ ۠ وَاذْكُرُوْهُ كَمَا هَدٰىكُمْ ۚ وَاِنْ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الضَّاۗلِّيْنَ ﴿١٩٨﴾

تم کو اس میں ذرا بھی گناہ نہیں کہ (حج میں) معاش کی تلاش کرو جو تمہارے پروردگار کی طرف سے ہے پھر جب تم عرفات سے واپس آنے لگو تو مشعرِ حرام کے پاس (مزدلفہ میں شب کو قیام کرے) خدا تعالیٰ کی یاد کرو اور اس طرح یاد کرو جس طرح تم کو بتلا رکھا ہے (نہ یہ کہ اپنی رائے کو دخل دو) اور حقیقت میں قبل اس کے تم محض ہونا واقف تھے۔ ○

ایّامِ حج میں تجارت کوئی گناہ کا کام نہیں ☆

صحیح بخاری شریف میں اس آیت کی تفسیر میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ عکاظ مجنہ اور ذوالمجاز نامی جاہلیت کے زمانہ میں بازار تھے۔ اسلام کے بعد ان میں موسم حج کے موقع پر تجارت کرنے میں صحابہؓ کچھ گناہ ہونے سے ڈرے۔ جس پر انہیں اجازت دی گئی کہ ایامِ حج میں تجارت کوئی گناہ کا کام نہیں۔ ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ

مسئلہ آنحضرت ﷺ سے دریافت کیا گیا' جس پر یہ آیت نازل ہوئی کہ حج کے دنوں میں احرام سے پہلے یا احرام کے بعد حاجی کو خرید وفروخت حلال ہے۔ ابن عباس کی قراءت میں: من ربکم کے بعد فی مواسم الحج کا لفظ بھی ہے۔ ابن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بھی یہ مروی ہے اور مفسرین نے بھی اس کی تفسیر اسی طرح کی ہے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے پوچھا جاتا ہے کہ ایک شخص حج کو نکلتا ہے اور ساتھ تجارت بھی کرتا جاتا ہے تو اس کے بارے میں کیا حکم ہے۔ آپ نے یہی آیت پڑھ کر سنائی۔ (ابن جریر)

مسند احمد کی روایت میں ہے کہ ابوامامہ تیمیؒ نے حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے کہا کہ ہم حج میں جانور کرایہ پر دیتے ہیں کیا ہمارا بھی حج ہو جاتا ہے؟ آپ نے فرمایا کیا تم بیت اللہ شریف کا طواف نہیں کرتے؟ کیا تم عرفات میں نہیں ٹھہرتے؟ کیا تم شیطان کو کنکریاں نہیں مارتے؟ کیا تم سر نہیں منڈواتے؟ اس نے کہا یہ سب کام تو ہم کرتے ہیں۔ تو آپ نے فرمایا' سنو! ایک شخص نے یہی سوال نبی ﷺ سے کیا تھا اور اس کے جواب میں حضرت جبرئیل علیہ السلام آیت: ﴿لیس علیکم جناح.....﴾ لے کر اُترے اور حضور ﷺ نے اسے بلا کر فرمایا کہ تم حاجی ہو تمہارا حج ہو گیا۔ مسند عبدالرزاق میں بھی یہ روایت ہے اور تفسیر عبد بن حمید وغیرہ میں بھی بعض روایتوں میں الفاظ کی کچھ کمی زیادتی بھی ہے۔ ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ کیا تم احرام نہیں باندھتے؟ امیر المؤمنین حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے سوال ہوتا ہے کہ کیا آپ حج کے دنوں میں تجارت بھی کرتے تھے؟ آپ نے فرمایا اور تجارت کا موسم ہی کونسا تھا؟ عَرَفَات کو منصرف پڑھ گیا ہے۔ حالانکہ غیر منصرف ہونے کے دو سبب اس میں موجود ہیں یعنی علمیت اور تانیث۔ اس لئے کہ دراصل یہ جمع ہے جیسے ﴿مسلمات﴾ اور ﴿مومنات﴾ ایک خاص جگہ کا یہ نام مقرر کر دیا گیا ہے۔ اس لئے اصلیت کی رعایت کی گئی منصرف پڑھا گیا۔

حج کا ایک رُکن ☆ عرفہ وہ جگہ ہے' جہاں کا ٹھہرنا حج کا بہترین کام ہے۔ مسند احمد وغیرہ میں حدیث ہے کہ حج عرفات ہے تین مرتبہ حضور ﷺ نے یہی فرمایا' جو سورج نکلنے سے پہلے عرفات میں پہنچ گیا' اس نے حج کو پا لیا۔ منیٰ میں تین دن ہیں۔ دو دن کا آگا پیچھا کرنے والے پر کوئی گناہ نہیں۔ ٹھہرنے کا وقت عرفہ کے دن سورج ڈھلنے کے بعد سے لے کر عید کی صبح صادق کے طلوع ہونے تک ہے۔ نبی ﷺ حجۃ الوداع میں ظہر کی نماز کے بعد سے سورج غروب ہونے تک یہاں ٹھہرے رہے تھے اور فرماتے تھے' مجھ سے حج کے طریقے سیکھ لو۔ حضرت امام مالک' امام ابوحنیفہ اور امام شافعی کا یہی مذہب ہے کہ دسویں کی فجر سے پہلے جو شخص عرفات میں پہنچ گیا' اس نے حج پا لیا۔ حضرت امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ ٹھہرنے کا وقت عرفہ کے دن شروع سے ہے۔ ان کی دلیل وہ حدیث ہے' جس میں ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ مزدلفہ میں نماز کے لئے نکلے' تو ایک شخص حاضر خدمت ہوا اور اس نے پوچھا کہ یا رسول اللہ میں طی کی پہاڑیوں سے آ رہا ہوں۔ اپنی سواری کو میں نے تھکا دیا اور اپنے نفس پر بڑی مشقت اٹھائی۔ واللہ ہر ہر پہاڑ پر ٹھہرتا ٹھہرتا آیا ہوا ہوں' کیا میرا حج ہو گیا؟ آپ نے فرمایا جو شخص ہمارے یہاں کی اس نماز میں پہنچ جائے اور ہمارے ساتھ چلتے وقت ٹھہرا رہے اور اس سے پہلے وہ عرفات میں بھی ٹھہر چکا ہو۔ خواہ رات کو' خواہ دن کو' پس اس کا حج پورا ہو گیا اور وہ فریضہ سے فارغ ہو گیا۔ (مسند احمد وسنن) امام ترمذیؒ اسے صحیح کہتے ہیں۔ امیر المومنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے روایت ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس اللہ تعالیٰ نے حضرت جبرئیل علیہ السلام کو بھیجا اور انہوں نے آپ کو حج کرایا۔ جب عرفات میں پہنچے تو پوچھا کہ عَرَفْتُ کیا تم نے پہچان لیا؟ حضرت خلیل اللہ علیہ السلام نے جواب دیا عرفت میں

نے پہچان لیا۔ کیونکہ اس سے پہلے یہاں آ چکے تھے۔ اس لئے اس جگہ کا نام عرفہ ہو گیا۔ حضرت عطاء: حضرت ابن عباس حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہم اور حضرت ابومجلز رحمۃ اللہ علیہ سے بھی یہی مروی ہے واللہ اعلم۔

عرفات کا نام مشعر الحرام، مشعر الاقصیٰ اور الال بھی ہے اور اس پہاڑ کو بھی عرفات کہتے ہیں۔ جس کے درمیان جبل الرحمۃ ہے۔ ابوطالب کے ایک مشہور قصیدہ میں ایک شعر ان معنوں کا ہے۔ اہل جاہلیت بھی عرفات میں ٹھہرتے تھے۔ جب دھوپ پہاڑ کی چوٹیوں پر ایسی باقی رہ جاتی تھی جیسے آدمی کے سر پر عمامہ ہوتا ہے تو وہ وہاں سے چل پڑتے لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم یہاں سے اس وقت چلے جب سورج بالکل غروب ہو گیا۔ پھر مزدلفہ میں پہنچ کر یہاں پڑاؤ کیا اور سویرے بالکل اول وقت رات کے اندھیرے اور صبح کے پاندنے کے ملے جلے وقت میں آپ نے یہیں نماز صبح ادا کی اور جب چاندنا صاف ہو گیا تو صبح کی نماز کے گویا آخری وقت میں آپ نے یہاں سے کوچ کیا۔ حضرت مسور بن مخرمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں عرفات میں خطبہ سنایا اور حسب عادت حمد و ثنا کے بعد امابعد کہہ کر فرمایا کہ حج اکبر آج ہی کا دن ہے۔ دیکھو مشرک وبت پرستی والے تو یہاں سے جب دھوپ پہاڑوں کی چوٹیوں پر اس طرح ہوتی تھی۔ جس طرح لوگوں کے سروں پر عمامہ ہوتا ہے۔ لوٹ جاتے تھے۔ سورج غروب ہونے کے پیشتر ہی لیکن ہم سورج غروب ہونے کے بعد یہاں سے واپس چلیں گے اور مشعر الحرام سے وہ سورج نکلنے کے بعد چلتے تھے جبکہ اتنی دھوپ چڑھ جاتی تھی کہ پہاڑوں کی چوٹیوں پر اس طرح نمایاں ہو جائے، جس طرح لوگوں کے سروں پر عمامہ ہوتے ہیں لیکن ہم وہاں سے سورج نکلنے سے پہلے ہی چل دیں گے۔ ہمارا طریقہ مشرکین کے طریقے کے خلاف ہے۔ (ابن مردویہ ومستدرک، حاکم) امام حاکم نے اسے شرط شیخین پر اور بالکل صحیح بتایا ہے۔ اس سے یہ ثابت ہو گیا کہ حضرت مسور رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے ان لوگوں کا قول ٹھیک نہیں، جو فرماتے ہیں کہ حضرت مسور رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا ہے لیکن آپ سے کچھ سنا نہیں۔ حضرت معرور بن سوید رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ میں نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو عرفات سے لوٹتے ہوئے دیکھا۔ گویا اب تک وہ منظر میرے سامنے ہے۔ آپ کے سر کے اگلے حصہ پر بال نہ تھے۔ اپنے اونٹ پر سوار تھے اور فرما رہے تھے۔ ہم نے لوٹنے کو صاف پایا۔ صحیح مسلم کی حضرت جابر والی ایک طویل حدیث جس میں حجۃ الوداع کا پورا بیان ہے۔ اس میں یہ بھی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سورج کے غروب ہونے تک عرفات میں ٹھہرے جب سورج چھپ گیا اور قدرے زردی ظاہر ہو گئی تو آپ نے اپنے پیچھے اپنی سواری پر حضرت اسامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو سوار کیا اور اونٹنی کی نکیل تان لی۔ یہاں تک کہ اس کا سر پالان کے قریب پہنچ گیا اور دائیں ہاتھ سے لوگوں کو اشارہ فرماتے جاتے تھے کہ لوگو آہستہ آہستہ چلو، نرمی، اطمینان، سکینت اور دلجمعی کے ساتھ چلو۔ جب کوئی پہاڑی آئی تو نکیل قدرے ڈھیلی کر دیا کرتے، تاکہ جانور بآسانی اوپر چڑھ جائے۔ مزدلفہ میں آ کر آپ نے مغرب اور عشاء کی نماز ادا کی، اذان ایک ہی کہلوائی اور دونوں کی تکبیریں الگ الگ کہلوائیں۔ مغرب کے فرضوں اور عشاء کے فرضوں کے درمیان سنت، نوافل کچھ نہیں پڑھے۔ پھر لیٹ گئے۔ صبح صادق کے طلوع ہونے کے بعد نماز فجر ادا کی۔ جس میں اذان واقامت ہوئی۔ پھر قصواء نامی اونٹنی پر سوار ہو کر مشعر الحرام میں آئے۔ قبلہ کی طرف متوجہ ہو کر دعا میں مشغول ہو گئے اور اللہ اکبر اور لا الہ الا اللہ اور خدا کی توحید بیان کرنے لگے۔ یہاں تک کہ خوب سویرا ہو گیا۔ سورج نکلنے سے پہلے ہی پہلے آپ یہاں سے روزانہ ہو گئے۔ حضرت اسامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے سوال ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جب یہاں سے چلے تو کس طرح تشریف لے جاتے تھے۔ فرمایا درمیانہ میٹھی

چال میں سواری چلا رہے تھے۔ہاں جب راستہ میں کشادگی دیکھتے تو ذرا تیز کر لیتے۔(بخاری)

پھر فرمایا' عرفات سے لوٹتے ہوئے مشعر الحرام میں خدا کا ذکر کرو۔یعنی یہاں دونوں نمازیں جمع کر لیں۔عمر بن میمون رحمۃ اللہ علیہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مشعر الحرام کے بارے میں دریافت فرماتے ہیں تو آپ خاموش رہتے ہیں۔جب قافلہ مزدلفہ میں جا اترتا ہے۔تو فرماتے ہیں' سائل کہاں ہے' یہ ہے مشعر الحرام۔آپ سے یہ بھی روایت ہے کہ مزدلفہ کل کا کل مشعر الحرام ہے۔پہاڑ بھی اور اس کے آس پاس کی کل جگہ۔آپ نے لوگوں کو دیکھا کہ قزح پر بھیڑ بھاڑ کر رہے ہیں' تو فرمایا کہ یہ لوگ کیوں بھیڑ کر رہے ہیں۔یہاں کی یہ سب جگہ مشعر الحرام ہے۔حضرت عطا سے سوال ہوتا ہے کہ مزدلفہ کہاں ہے؟ آپ فرماتے ہیں' جب عرفات سے چلے اور میدان عرفات کے دونوں کنارے چھوڑ دیئے۔پھر مزدلفہ شروع ہو گیا۔وادی محسر[1] تک جہاں چاہو ٹھہرو۔لیکن میں قزح سے ورے ہی ٹھہرنا پسند کرتا ہوں۔تاکہ راستے سے یکسوئی ہو جائے۔مشاعر کہتے ہیں' ظاہری نشانوں کو مزدلفہ کو مشعر الحرام اس لئے کہتے ہیں کہ وہ حرم میں داخل ہے۔سلف صالحین کی ایک جماعت اور بعض اصحاب شافعی کا مثلاً قفال اور ابن خزیمہ کا خیال ہے کہ یہاں کا ٹھہرنا حج کا رکن ہے۔بغیر یہاں ٹھہرے حج صحیح نہیں ہوتا کیونکہ ایک حدیث حضرت عروہ بن مفرس سے اسی معنی کی روایت ہے۔بعض کہتے ہیں یہ ٹھہرنا واجب ہے۔حضرت امام شافعی کا ایک قول یہ بھی ہے اگر کوئی یہاں نہ ٹھہرے تو قربانی دینی پڑے گی۔امام صاحب کا دوسرا قول یہ ہے کہ اگر نہ بھی ٹھہرا تو کچھ حرج نہیں۔پس یہ تین اقوال ہوئے۔ہم یہاں اس بحث کو طول دینا مناسب نہیں سمجھتے۔واللہ اعلم۔

ایک مرسل حدیث میں ہے کہ عرفات کا سارا میدان ٹھہرنے کی جگہ ہے۔عرفات سے بھی اٹھو اور مزدلفہ کی کل حد بھی ٹھہرنے کی جگہ ہے' ہاں وادی محسر نہیں مسند احمد کی اس حدیث میں اس کے بعد ہے کہ مکہ شریف کی تمام گلیاں قربانی کی جگہ ہے۔اور ایام تشریق سب کے سب قربانی کے دن ہیں۔لیکن یہ حدیث بھی منقطع ہے۔اس لئے کہ سلیمان بن موسیٰ رشدق نے جبیر بن مطعم کو نہیں پایا لیکن اس کی اور سندیں بھی ہیں۔واللہ اعلم۔پھر ارشاد ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ذکر جیسے کہ اس نے تمہیں ہدایت دی ہے کہ احکام حج وضاحت کے ساتھ بیان فرما دیئے اور خلیل اللہ علیہ السلام کی اس سنت کو واضح کر دیا۔حالانکہ اس سے پہلے تم اس سے بے خبر تھے یعنی اس ہدایت سے پہلے یا اس قرآن سے پہلے یا اس رسول اللہ ﷺ سے پہلے۔فی الواقع ان تینوں باتوں سے پہلے دنیا گمراہی میں تھی۔فالحمد للہ

ثُمَّ اَفِيْضُوْا مِنْ حَيْثُ اَفَاضَ النَّاسُ وَاسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۹۹﴾

پھر تم سب کو ضرور ہے کہ اسی جگہ ہو کر واپس آؤ جہاں اور لوگ جا کر وہاں سے واپس آتے ہیں اور (احکام حج میں

[1] عرفات و مزدلفہ کے درمیان کچھ وادیاں ایسی ہیں کہ جہاں شیطان نے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے قلب میں اس وقت وساوس ڈالنے کی کوشش کی تھی جبکہ وہ اپنے والد کے حکم پر اپنی قربانی دینے کے لئے تشریف لے جا رہے تھے۔ان وادیوں میں سے ایک وادی "محسر" کے نام سے بھی ہے کیونکہ یہاں اب بھی شیطان کے اثرات ہیں۔اس لئے احادیث میں ان وادیوں کے قیام سے منع کیا گیا ہے۔۱۲

پرانی رسموں پر عمل کرنے سے) خدا تعالیٰ کے سامنے توبہ کرو (یقینا) اللہ تعالیٰ معاف کردیں گے اور مہربانی فرمائیں گے۔ ○

ثم: یہاں پر خبر کا خبر پر عطف ڈالنے کے لئے ہے تاکہ ترتیب ہو جائے گویا عرفات میں ٹھہرنے والے کو حکم ملا کہ وہ یہاں سے مزدلفہ جائے تاکہ مشعر الحرام کے پاس اللہ تعالیٰ کا ذکر کر سکے اور یہ بھی فرمایا کہ وہ تمام لوگوں کے ساتھ عرفات میں ٹھہرے' جیسے عام لوگ یہاں ٹھہرتے تھے۔ البتہ قریشیوں نے فخر و تکبر اور نشان امتیاز کے طور پر یہ ٹھہرا لیا تھا کہ وہ حد حرم سے باہر نہیں جاتے تھے اور حرم کی آخری حد پر ٹھہر جاتے تھے کہ ہم اللہ والے ہیں' اسی شہر کے رئیس ہیں اور اس کے گھر کے مجاور ہیں۔ صحیح بخاری شریف میں ہے کہ قریش اور ان کے ہم خیال لوگ مزدلفہ میں ہی رک جایا کرتے تھے اور اپنا نام حمس رکھتے تھے۔ باقی کل عرب عرفات میں جا کر ٹھہرتے تھے اور وہیں سے واپس لوٹتے تھے۔ اسی لئے اسلام نے حکم دیا کہ جہاں سے عام لوگ لوٹتے ہیں' تم وہیں سے لوٹا کرو۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما' حضرت مجاہد' حضرت عطاء' حضرت قتادہ' حضرت سدی وغیرہ یہی فرماتے ہیں۔ امام ابن جریر بھی اسی تفسیر کو پسند کرتے ہیں اور اس پر اجماع بتاتے ہیں۔ مسند احمد میں ہے حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میرا اُونٹ عرفات میں گم ہو گیا۔ میں اسے ڈھونڈنے کے لئے نکلا تو میں نے نبی ﷺ کو وہاں ٹھہرے ہوئے دیکھا۔ میں کہنے لگا یہ کیا بات ہے کہ یہ حمس ہیں اور پھر یہاں حرم کے باہر آ کر ٹھہرے ہیں۔ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں افاضہ سے مراد یہاں مزدلفہ سے رمی جمار کے لئے منیٰ کو جانا ہے۔ واللہ اعلم۔ اور الناس سے مراد حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام ہیں۔ بعض کہتے ہیں' مراد امام ہے۔ ابن جریر فرماتے ہیں' اگر اس کے خلاف اجماع کی حجت نہ ہوتی تو یہی قول راجح ہوتا۔

پھر استغفار کا ارشاد ہوتا ہے۔ جو عموماً عبادات کے بعد فرمایا جاتا ہے۔ حضور ﷺ فرض نماز سے فارغ ہو کر تین مرتبہ استغفار کیا کرتے تھے۔ (مسلم) آپ لوگوں کو سبحان اللہ' الحمد اللہ' اللہ اکبر تینتیس تینتیس مرتبہ پڑھنے کا حکم دیا کرتے تھے۔ (بخاری مسلم) یہ بھی روایت ہے کہ عرفہ کے دن شام کے وقت آنحضرت ﷺ نے اپنی امت کے لئے استغفار کیا۔ (ابن جریر) آپ کا یہ ارشاد بھی ہے کہ تمام استغفاروں کا سردار یہ استغفار ہے: ((اللھم انت ربی لااله الا انت خلقتنی و انا عبدك وانا علی عهدك ووعدك ما استطعت اعوذبك من شر ما صنعت ابوء لك بنعمتك علی وابوء بذنبی فاغفرلی فانه لا یغفرالذنوب الا انت)) حضور ﷺ فرماتے ہیں' جو شخص اُسے رات کے وقت پڑھ لے۔ اگر اسی رات مر جائے گا تو قطعاً جنتی ہوگا اور جو شخص اسے دن کے وقت پڑھے گا اور اسی دن مرے گا تو بھی جنتی ہوگا۔ (بخاری) حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک مرتبہ کہا یا رسول اللہ ﷺ مجھے کوئی دعا سکھائیں کہ میں نماز میں اسے پڑھا کروں۔ آپ نے فرمایا یہ پڑھو: ((اللھم انی ظلمت نفسی ظلما کثیرا ولا یغفرالذنوب الا انت فاغفرلی مغفرة من عندك وارحمنی انك انت الغفور رحیم.)) (بخاری و مسلم) استغفار کے بارے میں اور بہت سی حدیثیں ہیں۔

فَإِذَا قَضَيْتُم مَّنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا اللَّهَ كَذِكْرِكُمْ آبَاءَكُمْ أَوْ أَشَدَّ ذِكْرًا ۗ فَمِنَ النَّاسِ مَن يَقُولُ رَبَّنَا آتِنَا

فِی الدُّنْیَا وَمَا لَهٗ فِی الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ۝۲۰۰ وَمِنْهُمْ مَّنْ یَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّفِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۝۲۰۱ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ نَصِیْبٌ مِّمَّا كَسَبُوْا ؕ وَاللّٰهُ سَرِیْعُ الْحِسَابِ ۝۲۰۲

پھر جب تم اپنے اعمال حج پورے کر چکوتو حق تعالیٰ کا ذکر کیا کرو۔ جس طرح تم اپنے آباء (واجداد) کا ذکر کرتے ہو بلکہ یہ ذکر اس سے (بدر جہا) بڑھ کر ہو بعضے آدمی (جو کافر ہیں) ایسے ہیں جو کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار ہم کو (جو کچھ دینا ہیں) دنیا میں دیجئے اور ایسے شخص کو آخرت میں (بوجہ انکار آخرت کے) کوئی حصہ نہ ملے گا اور بعضے آدمی (جو کہ مؤمن ہیں) ایسے ہیں جو کہتے ہیں اے ہمارے پروردگار ہم کو دنیا میں بھی بہتری عنایت کیجئے اور آخرت میں بھی بہتری دیجئے اور ہم کو عذاب دوزخ سے بچائیے۔ ایسے لوگوں کو (دونوں جہان میں) بڑا حصہ ملے گا۔ بدولت ان کے اس عمل کے اور اللہ جلد ہی حساب لینے والے ہیں۔○

حج کے بعد بعض احکام جن میں غفلت عام ہے ☆

یہاں اللہ تعالیٰ حکم کرتا ہے کہ فراغت حج کے بعد اللہ تعالیٰ کا بکثرت ذکر کرو۔ اگلے جملہ کے ایک معنی تو یہ بیان کئے گئے ہیں کہ اس طرح ذکر اللہ کرو' جس طرح بچہ اپنے ماں باپ کو یاد کرتا رہتا ہے۔ دوسرے معنی یہ ہیں کہ اہل جاہلیت حج کے موقعہ پر ٹھہرتے تھے۔ کوئی کہتا تھا' میرا باپ بڑا مہمان نواز تھا' کوئی کہتا تھا' وہ لوگوں کے کام کاج کر دیا کرتا تھا۔ سخاوت و شجاعت میں یکتا تھا وغیرہ۔ تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے یہ فضول باتیں چھوڑ دو اور اللہ کی بزرگی' بڑائی' عظمتیں اور عزتیں بیان کیا کرو۔ اکثر مفسرین نے یہی کہا ہے۔ غرض یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ذکر کی کثرت کرو۔ اسی لئے اَوْ اَشَدَّ پر زبر تمیز کی بناء پر لایا گیا ہے۔ یعنی اس طرح خدا کی یاد کرو' جس طرح اپنے بڑوں پر فخر کیا کرتے تھے۔ اَوْ سے یہاں خبر کی مثلیت کی تحقیق ہے۔ جیسے: ﴿اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً﴾ (البقرۃ:۷۴) میں اور ﴿اَوْ اَشَدَّ خَشْیَةً﴾ (النساء:۷۷) میں اور ﴿اَوْ یَزِیْدُوْنَ﴾ (الصافات:۱۴۷) اور ﴿اَوْ اَدْنٰی﴾ (النجم:۹) میں ان تمام مقامات میں لفظ اَوْ ہرگز ہرگز شک کے لئے نہیں ہے بلکہ مخبر عنہ کی تحقیق کے ہے۔ یعنی وہ ذکر اتنا ہی نہ ہو۔ بلکہ اس سے زیادہ۔

پھر ارشاد ہوتا ہے کہ ذکر بکثرت کر کے دعائیں مانگو کیونکہ یہ موقعہ قبولیت کا ہے۔ ساتھ ہی ان لوگوں کی برائی بیان ہو رہی ہے۔ جو اللہ سے سوال کرتے ہوئے صرف دنیا طلبی کرتے ہیں اور آخرت کی طرف نظریں نہیں اُٹھاتے۔ فرمایا ان کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا بیان ہے کہ بعض اعراب یہاں دعائیں مانگتے تھے کہ خدایا اس سال بارشیں اچھی برسا غلے اچھے پیدا ہوں۔ اولادیں بکثرت ہوں وغیرہ لیکن مؤمنوں کی دعائیں دونوں جہانوں کی بھلائیوں کی ہوتی تھیں۔ اس لئے ان کی تعریفیں کی گئیں۔ اس دعا میں تمام بھلائیاں دین و دنیا کی جمع کر دی ہیں اور تمام برائیوں سے حفاظت ہے۔ اس لئے کہ دنیا کی بھلائی میں عافیت' راحت' آسانی' تندرستی' گھربار' بیوی بچے' روزی' علم' عمل'

اچھی سواریاں' نوکر چاکر' لونڈی غلام' عزت آبرو وغیرہ تمام چیزیں آ گئیں اور آخرت کی بھلائی میں حساب کا آسان ہونا۔ گھبراہٹ سے نجات پانا۔ نامۂ اعمال کا دائیں ہاتھ میں ملنا۔ سرخرو ہونا۔ بالآخر عزت کے ساتھ جنت میں داخل ہونا سب آ گیا۔ پھر اس کے بعد عذاب جہنم سے نجات چاہنا' اس سے یہ مطلب ہے کہ ایسے اسباب اللہ تعالیٰ مہیا کر دے۔ مثلاً حرام کاریوں سے اجتناب' گناہ اور بدیوں کا ترک وغیرہ۔ قاسمؒ فرماتے ہیں جسے شکر گزاری اور ذکر کرنے والی زبان اور صبر کرنے والا جسم مل گیا' اسے دنیا اور آخرت کی بھلائی مل گئی اور عذاب سے نجات پا گیا۔ بخاری میں ہے کہ آنحضرت ﷺ اس دعا کو بکثرت پڑھا کرتے تھے۔ اس حدیث میں رَبَّنَا سے پہلے اَللّٰھُمَّ بھی ہے۔ حضرت قتادہ نے حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے پوچھا کہ رسول اللہ ﷺ زیادہ تر کس دعا کو پڑھتے تھے' تو آپ نے جواب میں یہی دعا بتائی (احمد) حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ خود بھی جب کبھی دعا مانگتے' اس دعا کو نہ چھوڑتے۔ چنانچہ حضرت ثابت نے رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایک مرتبہ کہا کہ حضرت آپ کے یہ بھائی چاہتے ہیں کہ آپ ان کے لئے دعا کریں۔ آپ نے یہی دعا: ((اللھم اتنا فی الدنیا .....)) پڑھی پھر کچھ دیر بیٹھنے اور بات چیت کرنے کے بعد جب وہ جانے لگے تو پھر دعا کی درخواست کی۔ آپ نے فرمایا' کیا تم ٹکڑے کرانا چاہتے ہو۔ اس دعا میں تو تمام بھلائیاں آ گئیں۔ (ابن ابی حاتم)

آنحضرت ﷺ ایک مسلمان بیمار کی عیادت کے لئے تشریف لے گئے۔ دیکھا کہ وہ بالکل دبلا پتلا ہو رہا ہے۔ صرف ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گیا ہے۔ آپ نے پوچھا کیا تم کوئی دعا بھی اللہ تعالیٰ سے مانگا کرتے تھے۔ اس نے کہا ہاں میری یہ دعا تھی کہ خدایا جو عذاب تو مجھے آخرت میں کرنا چاہتا ہے' وہ دنیا میں ہی کر ڈال۔ آپ نے فرمایا' سبحان اللہ کسی میں ان کے برداشت کی طاقت بھی ہے؟ تو نے یہ دعا: ربنا اتنا...... کیوں نہ پڑھی؟ چنانچہ بیمار نے اب سے اسی دعا کو پڑھنا شروع کر دیا' اور اللہ تعالیٰ نے اسے شفا دے دی (احمد) رکن بنی جمح اور رکن اسود کے درمیان حضور ﷺ اس دعا کو پڑھا کرتے تھے۔ (ابن ماجہ وغیرہ) لیکن اس کی سند میں ضعف ہے۔ واللہ اعلم۔ آپ فرماتے ہیں' جب کبھی رکن کے پاس سے گزرتا ہوں' دیکھتا ہوں کہ وہاں فرشتہ ہے اور وہ آمین کہہ رہا ہے۔ تم جب کبھی یہاں سے گزرو تو ربنا اتنا...... پڑھا کرو۔ (ابن مردویہ) حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے ایک شخص نے آن کر پوچھا کہ میں نے ایک قافلہ کے ساتھ ملازمت کر لی ہے' اس اُجرت پر کہ وہ مجھے اپنے ساتھ سواری پر سوار کر لیں اور حج کے موقع پر مجھے وہ رخصت دیں کہ حج ادا کر لوں۔ ویسے اور دنوں میں ان کی خدمت میں لگا رہوں۔ تو فرمایئے کیا اس طرح میرا حج ادا ہو جائے گا۔ آپ نے فرمایا' ہاں بلکہ تُو تو اُن لوگوں میں سے' جن کے بارے میں فرمان ہے۔ اُولٰٓئِكَ لَھُمْ نَصِيْبٌ۔ (مستدرک حاکم)

وَاذْكُرُوا اللّٰهَ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ ۭ فَمَنْ تَعَجَّلَ فِيْ يَوْمَيْنِ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۚ وَمَنْ تَاَخَّرَ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۙ لِمَنِ اتَّقٰى ۭ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ۝۲۰۳

اور اللہ تعالیٰ کا ذکر کرو گنتی کے چند روز تک پھر جو شخص دو دن میں (مکہ واپس آنے میں) تعجیل کرے اس پر بھی کچھ گناہ نہیں

اور جو شخص دو دن میں تاخیر کرے اس پر بھی گناہ نہیں اس شخص کے واسطے جو (خدا سے) ڈرنے اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو اور خوب یقین رکھو کہ تم کو خدا ہی کے پاس جمع ہونا ہے۔○

بعض ایام ہیں کہ اُن میں ذکر بڑھ جانا چاہئے ☆

﴿اَيَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ﴾ سے مراد ایام تشریق اور ایام معلومات سے مراد ذی الحجہ کے دس دن ہیں۔ ذکر اللہ سے مراد یہ ہے کہ ایام تشریق میں فرض نمازوں کے بعد اللہ اکبر اللہ اکبر کہیں۔ آنحضرت ﷺ فرماتے ہیں' عرفہ کا دن قربانی کا دن اور ایام تشریق ہمارے یعنی اہل اسلام کی عید کے دن ہیں اور یہ دن کھانے پینے کے ہیں۔ (احمد) اور حدیث میں ہے' ایام تشریق کھانے پینے اور ذکر اللہ کرنے کے ہیں۔ (احمد) پہلے یہ حدیث بھی بیان ہو چکی ہے کہ عرفات کل ٹھہرنے کی جگہ ہے اور ایام تشریق سب قربانی کے دن ہیں اور یہ حدیث بھی پہلے گزر چکی ہے کہ منیٰ کے دن تین ہیں۔ دو دن کی جلدی یا دیر کرنے والے پر کوئی گناہ نہیں۔ ابن جریر کی ایک حدیث میں ہے کہ ایام تشریق کھانے اور ذکر اللہ کرنے کے دن ہیں۔ حضور ﷺ نے عبداللہ بن حذافہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بھیجا کہ وہ منیٰ میں گھوم کر منادی کر دیں کہ ان دنوں میں کوئی روزہ نہ رکھیں' یہ دن کھانے پینے اور ذکر اللہ کرنے کے ہیں۔ ایک اور مرسل حدیث میں اتنی زیادتی ہے کہ مگر جس پر قربانی کے بدلے کے روزے ہوں' اس کے لئے یہ زائد نیکی ہے۔ ایک اور روایت میں ہے کہ منادی بشیر بن سحیم رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھے اور حدیث میں ہے کہ آپ نے ان دنوں کے روزوں کی ممانعت فرمائی ہے۔ ایک اور روایت میں ہے کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضور ﷺ کے سفید خچر پر سوار ہو کر شعب انصار میں کھڑے ہو کر یہ حکم سنایا تھا کہ لوگو' یہ دن روزوں کے نہیں بلکہ کھانے پینے اور ذکر اللہ کرنے کے ہیں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں ایام معدودات ایام تشریق ہیں اور یہ چار دن ہیں۔ دسویں ذی الحجہ کی اور تین دن اس کے بعد یعنی دس سے تیرہ تک' ابن عمر' ابن زبیر' ابو موسیٰ' عطا' مجاہد' عکرمہ' سعید بن جبیر' ابو مالک' ابراہیم نخعی' یحییٰ بن ابی کثیر' حسن' قتادہ' سدی' زہری' ربیع بن انس' ضحاک' مقاتل بن حیان' عطا خراسانی' امام مالکؒ وغیرہ بھی یہی فرماتے ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں' یہ تین دن ہیں۔ دسویں' گیارھویں اور بارھویں۔ ان میں جب چاہو' قربانی کرو لیکن افضل پہلا دن ہے۔ مگر مشہور قول پہلا ہی ہے اور آیت کریمہ کے الفاظ کی ظاہری دلالت بھی اسی پر ہے کیونکہ دو دن کی جلدی اور دیر معاف ہے۔ تو ثابت ہوا کہ عید کے بعد تین دن ہونے چاہئیں اور ان دنوں میں اللہ کا ذکر کرنا' قربانیوں کے ذبح کے وقت ہے اور یہ بھی پہلے بیان ہو چکا ہے کہ راجح مذہب اس میں حضرت امام شافعی کا ہے کہ قربانی کا وقت عید کے دن سے ایام تشریق کے ختم ہونے تک ہے اور اس سے مراد نمازوں کے بعد کا مقررہ ذکر بھی ہے اور ویسے عام طور پر ذکر اللہ سے مراد ہے اور اس کے مقررہ وقت میں گو علمائے کرام کا اختلاف ہے لیکن زیادہ مشہور قول[1] جس پر عملدرآمد بھی ہے' یہ ہے کہ عرفہ کی صبح سے ایام تشریق کے آخر دن کی عصر کی نماز تک۔ اس بارے میں ایک مرفوع حدیث بھی دار قطنی میں ہے لیکن اس کا مرفوع ہونا صحیح نہیں۔ واللہ اعلم۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنے خیمہ میں تکبیر کہتے اور آپ کی تکبیر پر بازار والے لوگ تکبیر کہتے۔ یہاں تک کہ منیٰ کا میدان گونج اُٹھتا۔ اسی طرح یہ بھی مطلب ہے کہ شیطانوں کو کنکریاں مارنے کے وقت تکبیر اور ذکر اللہ کیا جائے' جو ایام تشریق

[1] کاش ابن کثیرؒ ابو حنیفہ الامام ؒ کے دلائل احادیث آثار کو بھی اس موقع پر سامنے رکھ کر کسی مذہب کی ترجیح کا فیصلہ کرتے۔ ۱۲

کے ہر دن ہوگا۔ ابوداؤد وغیرہ میں حدیث ہے کہ بیت اللہ کا طواف صفا مروہ کی سعی شیطانوں کو کنکریاں مارنی یہ سب اللہ تعالیٰ کے ذکر کو قائم کرنے کے لئے ہے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ نے حج کی پہلی اور دوسری واپسی کا ذکر کیا اور اس کے بعد لوگ ان پاک مقامات کو چھوڑ کر اپنے شہروں اور مقامات کو لوٹ جائیں گے۔ اس لئے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہا کرو اور یقین رکھو کہ تمہیں اس کے سامنے جمع ہونا ہے۔ اسی نے تمہیں زمین میں پھیلایا پھر وہی سمیٹ لے گا۔ پھر اسی کی طرف حشر ہوگا۔ پس جہاں کہیں ہو اس سے ڈرتے رہا کرو۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّعْجِبُكَ قَوْلُهٗ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيُشْهِدُ اللّٰهَ عَلٰى مَا فِيْ قَلْبِهٖ ۙ وَهُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ ﴿٢٠٤﴾ وَاِذَا تَوَلّٰى سَعٰى فِي الْاَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيْهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ ؕ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ ﴿٢٠٥﴾ وَاِذَا قِيْلَ لَهُ اتَّقِ اللّٰهَ اَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْاِثْمِ فَحَسْبُهٗ جَهَنَّمُ ؕ وَلَبِئْسَ الْمِهَادُ ﴿٢٠٦﴾ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ ﴿٢٠٧﴾

اور بعض آدمی ایسا بھی ہے کہ آپ کو اس کی گفتگو جو محض دنیوی غرض سے ہوتی ہے مزہ دار معلوم ہوتی ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کو حاضر ناظر بتاتا ہے اپنے مافی الضمیر پر حالانکہ وہ (آپ کی) مخالفت میں (نہایت) شدید ہے اور جب پیٹھ پھرتا ہے تو اس دوڑ دھوپ میں پھرتا رہتا ہے کہ شہر میں فساد کر دے اور (کسی کے) کھیت یا مویشی کو تلف کر دے اور اللہ تعالیٰ فساد کو پسند نہیں فرماتے اور جب اس سے کوئی کہتا ہے کہ خدا کا خوف کر تو نخوت اس کو گناہ پر (روز) آمادہ کر دیتی ہے سو ایسے شخص کی کافی سزا جہنم ہے اور وہ بری ہی آرام گاہ ہے اور بعض آدمی ایسا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی میں اپنی جان تک صرف کر ڈالتا ہے اور اللہ تعالیٰ ایسے بندوں کے حال پر نہایت مہربان ہے۔ ○

دُنیا کی زندگی میں بعض چرب زبانوں کی کامیابی ☆

سدی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ یہ آیت اخنس بن شریق ثقفی کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ یہ منافق شخص تھا۔ ظاہر میں مسلمان تھا لیکن باطن میں مخالف تھا۔ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کہتے ہیں کہ منافقوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ جنہوں نے حضرت خبیب رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور ان ساتھیوں کی برائیاں کی تھیں جو رجیع میں شہید کئے گئے تھے۔ تو ان شہدا کی تعریف میں ﴿مَنْ يَّشْرِيْ﴾ والی آیت اتری اور منافقین کی مذمت کے بارے میں ﴿مَنْ يُّعْجِبُكَ﴾ والی آیت نازل ہوئی۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ آیت عام ہے۔ تمام منافقوں کے بارے میں پہلی اور دوسری آیت ہے اور تمام مومنوں کی تعریف کے بارے میں تیسری آیت ہے۔ قتادہؒ وغیرہ کا قول یہی ہے اور یہی صحیح ہے۔ حضرت نوف بکالی جو توراۃ انجیل کے بھی

عالم تھے' فرماتے ہیں کہ میں اس اُمت کے بعض لوگوں کی برائیاں اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ کتاب میں پاتا ہوں۔ مرقوم ہے کہ بعض لوگ دین کے حیلے دنیا کماتے ہیں۔ ان کی زبانیں تو شہد سے زیادہ میٹھی ہیں لیکن ایلوے سے زیادہ کڑوے ہیں۔ لوگوں کے لئے بکریوں کی کھالیں پہنتے ہیں لیکن دل اُن کے بھیڑیوں جیسے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کیا وہ مجھ پر جرأت کرتے ہیں اور میرے ساتھ دھوکے بازیاں کرتے ہیں۔ مجھے اپنی ذات کی قسم کہ میں ان پر وہ فتنہ بھیجوں گا کہ بردبار لوگ بھی حیران رہ جائیں گے۔ قرظی لکھتے ہیں' میں نے غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ یہ منافقوں کا وصف ہے اور قرآن میں بھی موجود ہے۔ پڑھیئے آیت: ﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّعْجِبُكَ......﴾ (طبری) حضرت سعید نے بھی جب یہ بات اور کتابوں کے حوالے سے بیان کی تو حضرت محمد بن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہی فرمایا تھا کہ یہ قرآن شریف میں بھی ہے اور اسی آیت کی تلاوت کی تھی۔ سعید کہنے لگے میں جانتا ہوں کہ یہ آیت کس کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ آپ نے فرمایا' سنیے آیت شانِ نزول کے اعتبار سے گو کسی کے بارے میں ہی ہو لیکن حکم کے اعتبار سے عام ہوتی ہے۔ ابن محیصن کی قراءت میں یشھد اللہ ہے' معنی یہ ہوں گے کہ گو وہ اپنی زبان سے کچھ ہی کہے لیکن اس کے دل کا حال اللہ تعالیٰ کو خوب معلوم ہے' جیسے اور جگہ ہے: ﴿اِذَا جَآءَكَ الْمُنٰفِقُوْنَ......﴾ (المنافقون:۱) یعنی منافق تیرے پاس آ کر تیری نبوت کی گواہی دیتے ہیں۔ خدا جانتا ہے کہ تو اس کا رسول ہے لیکن خدا کی گواہی ہے کہ یہ منافق یقیناً جھوٹے ہیں لیکن جمہور کی قراءت ﴿يُشْهِدُ اللّٰهَ﴾ ہے۔ تو معنی یہ ہوئے کہ لوگوں کے سامنے تو اپنی خباثت کو چھپاتے ہیں لیکن خدا کے سامنے ان کے دل کا کفر و نفاق ظاہر ہے۔ جیسے اور جگہ ہے: ﴿يَسْتَخْفُوْنَ مِنَ النَّاسِ وَلَا يَسْتَخْفُوْنَ مِنَ اللّٰهِ......﴾ (النساء:۱۰۸) یعنی لوگوں سے چھپاتے ہیں لیکن خدا سے نہیں چھپا سکتے۔ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے یہ معنی بیان کئے ہیں کہ لوگوں کے سامنے اسلام ظاہر کرتے ہیں اور ان کے سامنے قسمیں کھا کر باور کراتے ہیں کہ جو ان کی زبان پر ہے وہ ہی ان کے دل میں ہے۔ صحیح معنی آیت کے یہی ہیں۔ عبدالرحمٰن بن زید اور مجاہدؒ سے بھی یہی مروی ہے۔ ابن جریر بھی اسی کو پسند کرتے ہیں۔ الد کے معنی لغت میں ہیں سخت ٹیڑھا۔ جیسے اور جگہ ہے: ﴿وَتُنْذِرَ بِهٖ قَوْمًا لُّدًّا﴾ (مریم:۹۷) یہی منافق کی ہے کہ وہ اپنی حجت میں جھوٹ بولتا ہے اور حق سے ہٹ جاتا ہے۔ سیدھی بات چھوڑ دیتا ہے اور افترا اور بہتان باندھتا ہے اور گالیاں بکتا ہے۔ صحیح حدیث میں ہے۔ سب سے زیادہ برا شخص اللہ تعالیٰ کے نزدیک وہ ہے جو سخت جھگڑالو ہو۔ اس کی کئی ایک سندیں ہیں کہ جس طرح یہ برے اقوال ہے۔ اسی طرح افعال بھی اس کے بدترین ہیں۔ قول تو یہ ہے لیکن فعل اس کے سراسر خلاف ہے۔ عقیدہ بالکل فاسد ہے۔

سعی سے مراد یہاں قصد ہے جیسے اور جگہ ہے: ﴿ثُمَّ اَدْبَرَ يَسْعٰى......﴾ اور فرمان ہے' ﴿فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ......﴾ (الجمعہ:۹) یعنی جمعہ کی نماز کا قصد و ارادہ کرو۔ یہاں سعی کے معنی دوڑنے کے نہیں' کیونکہ نماز کے لئے دوڑ کر جانا ممنوع ہے۔ حدیث شریف میں ہے جب تم نماز کے لئے آؤ تو دوڑتے ہوئے نہ آؤ بلکہ سکینت و وقار کے ساتھ آؤ۔ غرض یہ ہے کہ ان منافقوں کا قصد زمین میں فساد پھیلانا' کھیتی باڑی' زمین کی پیداوار اور حیوانوں کی نسل کو برباد کرنا ہی ہوتا ہے۔ یہ بھی معنی مجاہد سے روایت ہیں کہ ان لوگوں کے نفاق اور ان کی بدکرداریوں کی وجہ سے اللہ تعالیٰ بارش کو روک لیتا ہے۔ جس سے کھیتوں کو اور جانوروں کو نقصان پہنچتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو جو بانی فساد ہوں' ناپسند کرتا ہے۔ ان بدکرداروں کو جب وعظ تذکیر کے ذریعے سمجھایا جائے تو یہ اور بھڑک اُٹھتے ہیں اور مخالفت کے جوش میں گناہوں پر اور آمادہ ہو جاتے ہیں۔ جیسے اور جگہ

ہے: ﴿وَاِذَا تُتْلٰی عَلَیْهِمْ اٰیٰتُنَا بَیِّنٰتٍ تَعْرِفُ فِیْ وُجُوْهِ الَّذِیْنَ كَفَرُوا الْمُنْكَرَ......﴾ (الحج:۷۲) یعنی اللہ تعالیٰ کے کلام کی آیتیں جب ان کے سامنے تلاوت کی جاتی ہیں تو ان کافروں کے منہ چڑھ جاتے ہیں اور پڑھنے والوں پر جھپٹتے ہیں۔ سنو اس سے بھی بڑھ کر سنو! کافروں کے لئے ہمارا فرمان جہنم کا ہے جو بدترین جگہ ہے یہاں بھی یہی فرمایا کہ انہیں جہنم کافی ہے۔ یعنی سزا میں اور بدترین اوڑھنا بچھونا ہے۔ منافقوں کی مذموم خصلتیں بیان فرما کر اب مؤمنوں کی تعریفیں ہو رہی ہیں۔

مؤمن کی دُنیاوی زندگی' کامیابی کا مرقع اور حسین انجام کی تمہید ☆ یہ آیت حضرت صہیب بن سنان رومی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حق میں نازل ہوئی ہے۔ یہ مکہ میں مسلمان ہوئے تھے۔ جب مدینہ کی طرف ہجرت کرنی چاہی تو کافروں نے ان سے کہا کہ ہم تمہیں مال لے کر نہیں جانے دیں گے اگر تم مال چھوڑ کر جانا چاہتے ہو تو تمہیں اختیار ہے۔ آپ نے سب مال سے علیحدگی اختیار کر لی اور کفار نے اس پر قبضہ کر لیا اور آپ نے ہجرت کی۔ جس پر یہ آیت اُتری۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور صحابہ کرام کی ایک بڑی جماعت آپ کے استقبال کے لئے حرہ تک آئی اور مبارک باد دی کہ آپ نے بڑا اچھا بیوپار کیا۔ بڑے نفع کی تجارت کی آپ یہ سن کر فرمانے لگے خدائے تعالیٰ آپ کی تجارتوں کو بھی نقصان والی نہ کرے۔ آخر بتاؤ تو یہ مبارک باد کس لئے ہیں۔ اُن بزرگوں نے فرمایا' آپ کے بارے میں حضور ﷺ پر یہ آیت نازل ہوئی ہے۔ جب حضور ﷺ کے پاس پہنچے تو آپ ﷺ نے بھی یہی خوشخبری سنائی۔ قریش نے ان سے کہا تھا کہ جب آپ مکہ میں آئے' آپ کے پاس مال نہ تھا۔ یہ سب مال یہیں کمایا۔ اب اس مال کو لے کر ہم جانے نہیں دیں گے۔ چنانچہ آپ نے مال کو چھوڑا اور دین کی خدمت رسول ﷺ میں حاضر ہو گئے۔ ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ جب آپ ہجرت کے ارادے سے نکلے تھے اور کفار مکہ کو علم ہوا تو سب نے آن کر گھیر لیا۔ آپ نے اپنے ترکش سے تیر نکال لئے اور فرمایا اے مکہ والو! تم خوب جانتے ہو کہ میں کیسا تیر انداز ہوں' میرا ایک نشانہ بھی خطا نہیں جاتا۔ جب تک یہ تیر ختم نہ ہوں گے میں تم کو چھیدتا رہوں گا۔ اس کے بعد تلوار سے میں تم سے لڑوں گا اور اس میں بھی تم میں سے کسی سے کم نہیں ہوں۔ جب تلوار کے بھی ٹکڑے ہو جائیں گے' پھر تم میرے پاس آ سکتے ہو۔ پھر جو چاہو کر لو۔ اگر یہ تمہیں منظور ہے تو بسم اللہ۔ ورنہ سنو! میں تمہیں اپنا کل مال بتا دیتا ہوں۔ سب لے لو اور مجھے جانے دو۔ وہ مال لینے پر رضامند ہو گئے اور اس طرح آپ نے ہجرت کی۔ آنحضرت ﷺ کے پاس پہنچنے سے پہلے ہی وہاں بذریعہ وحی یہ آیت نازل ہو چکی تھی۔ آپ کو دیکھ کر حضور ﷺ نے مبارک باد دی۔ اکثر مفسرین کا یہ قول بھی ہے کہ یہ آیت عام ہے اور ہر مجاہد فی سبیل اللہ کی شان میں ہے جیسے اور جگہ ہے: ﴿اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ......﴾ (التوبۃ:۱۱۱) یعنی اللہ تعالیٰ نے مؤمنین کی جانیں اور مال خرید لئے ہیں اور ان کے بدلے جنت دے دی ہے۔ یہ اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ہیں' مارتے بھی ہیں اور شہید بھی ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا یہ سچا عہد تورات انجیل اور قرآن میں موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ سے زیادہ سچے عہد والا اور کون ہو گا تم اے ایماندارو! اس خرید و فروخت اور ادلے بدلے سے خوش ہو جاؤ۔ یہی بڑی کامیابی ہے۔ حضرت ہشام بن عامر نے جب کفار کی دونوں صفوں میں گھس کر ان پر یکہ و تنہا بے پناہ حملہ کر دیا تو بعض لوگوں نے اسے خلاف شرع سمجھا۔ لیکن حضرت عمر اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما وغیرہ نے ان کی تردید کی اور اسی آیت: ﴿مَنْ یَّشْتَرِیْ﴾ کی تلاوت کر کے سنا دی۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً ۖ وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ۗ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۲۰۸﴾ فَاِنْ زَلَلْتُمْ مِّنْ بَعْدِ مَا جَآءَتْكُمُ الْبَيِّنٰتُ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۰۹﴾

اے ایمان والو اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ اور (فاسد خیالات میں پڑ کر) شیطان کے قدم بقدم مت چلو واقعی وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔ پھر اگر تم بعد اس کے کہ تم کو واضح دلیلیں پہنچ چکی ہیں (صراطِ مستقیم سے) لغزش کرنے لگو تو یقین کر رکھو کہ حق تعالیٰ (بڑے) زبردست حکمت والے ہیں۔ O

اسلام پوری زندگی پر چھا جانا چاہئے ☆

اللہ تعالیٰ اپنے اوپر ایمان لانے والوں اور اپنے نبی کی تصدیق کرنے سے ارشاد فرماتا ہے کہ وہ کل احکام کو بجالائیں۔ کل ممنوعات سے بچ جائیں کامل شریعت پر عمل کریں۔ سلم سے مراد اسلام ہے۔ اطاعت اور صلح جوئی بھی مراد ہے۔ کافۃ کے معنی سب کے سب پورے۔ عکرمہ کا قول ہے کہ حضرت عبداللہ بن سلام اسد بن عبیر ثعلبہ وغیرہ جو یہود سے مسلمان ہوئے تھے۔ انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے گزارش کی کہ ہمیں ہفتہ کے دن کو عبادت میں گزارنے کی اور راتوں کے وقت تورات پر عمل کرنے کی اجازت دی[1] جائے۔ جس پر یہ آیت اتری کہ اسلامی احکام پر عمل کرتے رہو لیکن اس حضرت عبداللہ کا نام کچھ ٹھیک نہیں معلوم ہوتا وہ زبردست عالم تھے اور پورے مسلمان تھے۔ انہیں کامل طور پر معلوم تھا کہ ہفتہ کے دن کا اہتمام منسوخ ہو چکا ہے۔ اس کے بجائے اسلامی عید جمعہ کے دن مقرر ہو چکی ہے۔ پھر ناممکن ہے کہ وہ ایسی خواہش میں اوروں کا ساتھ دیں۔ بعض مفسرین نے کافۃ کو حال کہا ہے یعنی تم سب کے سب اسلام میں داخل ہو جاؤ۔ لیکن پہلی بات زیادہ صحیح ہے یعنی اپنی طاقت بھر اسلام کے کل احکام مانو' حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا بیان ہے کہ بعض اہل کتاب باوجود ایمان لانے کے تورات کے بعض احکام پر جمے ہوئے تھے۔ ان سے کہا جاتا ہے کہ دین محمدی میں پوری طرح آ جاؤ۔ اس کا کوئی عمل نہ چھوڑو' تورات پر صرف ایمان رکھنا کافی ہے۔ پھر فرمان ہے کہ اللہ کی اطاعت کرتے رہو' شیطان کی نہ مانو وہ تو برائیوں اور بدکاریوں کو اور خدا پر بہتان باندھنے کو کہتا ہے۔ اس کے اور اس کے گروہ کی تو خواہش یہ ہے کہ تم جہنمی بن جاؤ۔ تمہارا کھلم کھلا دشمن ہے اگر تم دلائل معلوم کرنے کے بعد بھی حق سے ہٹ جاؤ تو جان رکھو کہ خدا بھی بدلہ لینے میں غالب ہے۔ نہ اس سے کوئی بھاگ کر بچ سکے گا نہ اس پر کوئی غالب آ سکے گا۔ وہ اپنے احکام کے جاری کرنے میں حکمتوں والا ہے۔ وہ غالب ہے اپنی پکڑ میں وہ حکیم ہے اپنے امر میں وہ کفار پر غلبہ رکھتا ہے اور عذر و حجت کاٹ دینے میں حکمت رکھتا ہے۔

[1] ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے یہ بھی منقول ہے کہ عبداللہ بن سلام اور ان کے رفقاء نے یہود کے دستور کے موافق اسلام لانے کے بعد اونٹ کے گوشت اور دودھ کے استعمال سے بھی پرہیز کیا تھا۔ گویا کہ ابن کثیر نے اس روایت کے بعض اجزا یہاں ذکر کئے اور بعض کو حذف کر دیا۔ ۱۲

هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيَهُمُ اللّٰهُ فِيْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَقُضِيَ الْاَمْرُ ۭ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ۝۲۱۰

یہ کج راہ لوگ اس امر کے منتظر (معلوم ہوتے ہیں) کہ حق تعالیٰ اور فرشتے بادل کے سائبانوں میں (نمودار ہونے کے لئے) ان کے پاس آ ئیں اور سارا قصہ ہی ختم ہو جائے اور یہ سارے مقدمات اللہ تعالیٰ ہی کی طرف رجوع کئے جائیں گے۔○

اسلام سے رُوگردانی کرنے والے کیا بڑے عذاب کے منتظر ہیں؟

اس آیت میں اللہ تبارک وتعالیٰ کفار کو دھمکار ہے ہیں کہ کیا انہیں قیامت ہی کا انتظار ہے۔ جس دن حق کے ساتھ فیصلے ہو جائیں گے اور ہر شخص اپنے کئے کو بھگت لے گا جیسے اور جگہ ارشاد ہے: كَلَّآ اِذَا دُكَّتِ الْاَرْضُ (فجر۲۱) یعنی جب زمین کے ریزے ریزے اُڑ جائیں گے اور تیرا رب خود آ جائے گا اور فرشتوں کی صفیں کی صفیں بندھ جائیں گی اور جہنم بھی لا کر کھڑی کردی جائے گی۔ اس دن یہ لوگ عبرت ونصیحت حاصل کریں گے لیکن اس سے کیا فائدہ؟ اور جگہ فرمایا: هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيَهُمُ اللّٰهُ فِيْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ وَالْمَلٰٓئِكَةُ (الانعام:۱۵۸) یعنی کیا انہیں اس بات کا انتظار ہے کہ ان کے پاس فرشتے آ جائیں یا خود اللہ تعالیٰ آ جائے یا اس کی بعض نشانیاں آ جائیں۔ اگر یہ ہو گیا تو پھر نہ ایمان نفع دے گا۔ نہ نیک اعمال کا وقت رہے۔ امام ابن جریرؒ نے یہاں پر ایک لمبی حدیث لکھی ہے۔ جس میں صور وغیرہ کا مفصل بیان آیا ہے۔ جس کے راوی حضرت ابو ہریرہ ہیں۔ مسند وغیرہ میں یہ حدیث ہے۔ اس میں ہے کہ جب لوگ گھبرا اُٹھیں گے تو انبیاء علیہم السلام سے شفاعت طلب کریں گے۔ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر ایک ایک پیغمبر کے پاس جائیں گے اور وہاں سے صاف جواب پائیں گے۔ یہاں تک کہ ہمارے نبی اکرم حضرت محمد ﷺ کے پاس پہنچیں گے۔ آپ جواب دیں گے' تیار ہوں' میں ہی اس کا اہل ہوں۔ پھر آپ جائیں گے اور عرش تلے سجدے میں گر پڑیں گے اور اللہ تعالیٰ سے سفارش کریں گے کہ وہ بندوں کا فیصلہ کرنے کے لئے تشریف لائے۔ اللہ تعالیٰ آپ کی شفاعت قبول فرمائے گا اور بادلوں کے سائبان میں آئے گا۔ آسمان دنیا ٹوٹ جائے گا اور اس کے تمام فرشتے آ جائیں گے۔ پھر دوسرا بھی پھٹ جائے گا اور اس کے فرشتے بھی آ جائیں گے۔ اسی طرح ساتوں آسمان پھٹ جائیں گے اور ان کے فرشتے آ جائیں گے۔ پھر اللہ تعالیٰ کا عرش اُترے گا اور بزرگ تر فرشتے نازل ہوں گے اور وہ خود جبار خدا تشریف لائے گا۔ فرشتے سب کے سب تسبیح خوانی میں مشغول ہوں گے۔ ان کی تسبیح اس وقت یہ ہوگی: ((سبحان ذی الملك والملكوت سبحان ذی العزة والجبروت سبحان الحی الذی لایموت سبحان الذین یمیت الخلائق ولا یموت سبوح قدوس ربّ الملئكة والروح سبوح قدوس سبحان ربنا الاعلی سبحان ذی السلطان والعظمة سبحانه ابدا ابدا.)) حافظ ابوبکر ابن مردویہ نے بھی اس آیت کی تفسیر میں بہت سی احادیث بیان کی ہیں' جن میں غرابت ہے۔ واللہ اعلم۔

ان میں سے ایک یہ ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا' اللہ تعالیٰ اگلوں پچھلوں کو اس دن جمع کرے گا' جس کا وقت مقرر ہے

وہ سب کے سب کھڑے ہوں گے۔ آنکھیں پتھرائی ہوئی اور اُوپر کو لگی ہوئی ہوں گی۔ ہر ایک کو فیصلہ کا انتظار ہوگا۔ اللہ تعالیٰ ابر کے سائبان میں عرش سے کرسی پر نزول فرمائے گا ابن ابی حاتم میں ہے' عبداللہ بن عمر فرماتے ہیں کہ جس وقت وہ اُترے گا تو مخلوق اور اس کے درمیان ستر ہزار پردے ہوں گے۔ نور کے اندھیرے اور پانی کے' وہ پانی اس اندھیرے میں ایسی آوازیں کر رہا ہوگا۔ جس سے دل ہل جائیں۔ زہیر بن محمدؒ فرماتے ہیں کہ وہ بادل کا سائبان یاقوت کا جڑا ہوا اور جوہر وزبرجد والا ہوگا۔ حضرت مجاہدؒ فرماتے ہیں یہ بادل معمولی بادل نہیں بلکہ یہ وہ بادل ہے جو بنی اسرائیل کے سروں پر وادی تیہ میں تھا۔ ابوالعالیہؒ فرماتے ہیں' فرشتے بھی بادل کے سایہ میں آئیں گے اور اللہ تعالیٰ آئے گا جس میں چاہے۔ چنانچہ بعض قراءتوں میں یوں بھی ہے: ﴿هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيَهُمُ اللّٰهُ فِيْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ......﴾ (الفرقان: ۲۵) جیسے اور جگہ ہے: ﴿وَيَوْمَ تَشَقَّقُ السَّمَآءُ بِالْغَمَامِ وَنُزِّلَ الْمَلٰٓئِكَةُ تَنْزِيْلًا﴾ یعنی اس دن آسمان بادل سمیت پھٹے گا اور فرشتے اُتر آئیں گے۔

سَلْ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ كَمْ اٰتَيْنٰهُمْ مِّنْ اٰيَةٍۢ بَيِّنَةٍ ۭ وَمَنْ يُّبَدِّلْ نِعْمَةَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَاۗءَتْهُ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿۲۱۱﴾ زُيِّنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَيَسْخَرُوْنَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۘ وَالَّذِيْنَ اتَّقَوْا فَوْقَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ وَاللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَاۗءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿۲۱۲﴾

آپ (علما) بنی اسرائیل سے (ذرا) پوچھیے (تو سہی) ہم نے ان کو کتنی واضح دلیلیں دی تھیں اور جو شخص اللہ تعالیٰ کی نعمت کو بدلتا ہے اس کے پاس پہنچنے کے بعد تو یقیناً حق تعالیٰ سخت سزا دیتے ہیں دنیوی معاش کفار کو آراستہ پیراستہ معلوم ہوتی ہے اور (اسی وجہ سے) ان مسلمانوں سے تمسخر کرتے ہیں حالانکہ یہ (مسلمان) جو کفر وشرک سے بچتے ہیں ان کافروں سے اعلیٰ درجہ میں ہوں گے قیامت کے روز اور روزی تو اللہ تعالیٰ جس کو چاہتے ہیں بے انداز دیتے ہیں۔ ○

مسلسل نشانیاں پیش ہوتی رہیں لیکن بنی اسرائیل کی غفلت بدستور قائم رہی:

اللہ تعالیٰ بیان فرماتا ہے کہ دیکھو بنی اسرائیل کو میں نے بہت سے معجزات دکھلا دیئے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھوں کی لکڑی ان کے ہاتھ سے روشنی ان کے لئے دریا کو چیر دینا۔ ان پر سخت گرمیوں میں ابر کا سایہ کرنا۔ من وسلویٰ اتارنا وغیرہ وغیرہ جن سے میرا خودمختار فاعل کل ہونا صاف ظاہر تھا اور میرے نبی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نبوت کی کھلی تصدیق ہوتی تھی لیکن تاہم ان لوگوں نے میری ان نعمتوں کا انکار کیا اور بجائے ایمان کے کفر پر اڑے رہے اور میری نعمتوں پر بجائے شکر کے ناشکری کی۔ پھر میرے سخت عذابوں سے یہ کیسے بچ رہیں گے۔ یہی خبر کفار قریش کے بارے میں بیان فرمائی ہے۔ ارشاد ہے: ﴿اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ بَدَّلُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ كُفْرًا......﴾ (ابراہیم: ۲۸) کیا تو نے ان لوگوں کو دیکھا جنہوں نے اللہ کی نعمت کو کفر سے بدل دیا اور اپنی قوم کو ہلاکت کے گھر یعنی جہنم جیسی بدترین قرارگاہ میں پہنچا دیا۔ پھر بیان ہوتا ہے کہ یہ کفار صرف دنیا کی

زندگی پر ریجھے ہوئے ہیں۔ مال جمع کرنا اور خدا کی راہ میں خرچ سے بخل کرنا یہی ان کا رنگ ڈھنگ ہے۔ بلکہ جو ایماندار اس دنیائے فانی سے سرچشم ہیں اور پروردگار کی رضامندی میں اپنے مال لٹاتے رہتے ہیں۔ یہ ان کا مذاق اُڑاتے ہیں۔ حالانکہ سعید یہی لوگ ہیں۔ قیامت کے دن ان کے مرتبے دیکھ کر ان کافروں کی آنکھیں کھل جائیں گی۔ اس وقت اپنی بدتری اور اُن کی بدتری دیکھ کر معاملہ کی اونچ نیچ سمجھ میں آ جائے گی۔ روزی دینا جسے خدا جتنی چاہے دے دے۔ جسے چاہے بے حساب دے بلکہ جسے یہاں بھی دے اور پھر وہاں بھی دے۔ حدیث شریف میں ہے۔ اے ابن آدم تو میری راہ میں خرچ کر میں تجھے دیتا ہی چلا جاؤں گا۔ آپ نے حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فرمایا راہ خدا میں دیئے جاؤ اور عرش والے سے تنگی کا خوف نہ کر۔ قرآن میں ہے: ﴿وَمَا اَنْفَقْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَهُوَ یُخْلِفُهٗ﴾ (سبا:۳۹) تم جو کچھ خرچ کرو خدا اس کا بدلہ دے گا۔ صحیح حدیث میں ہے ہر صبح دو فرشتے اترتے ہیں۔ ایک دعا کرتا ہے خدایا اپنی راہ میں خرچ کرنے والے کو برکت عنایت فرما۔ دوسرا کہتا ہے خدایا بخیل کے مال کو برباد کر اور حدیث میں ہے انسان کہتا رہتا ہے میرا مال میرا مال۔ حالانکہ تیرا مال وہ ہے جسے تو نے کھالیا وہ تو فنا ہو چکا اور جسے پہن لیا وہ بوسیدہ ہو گیا۔ ہاں جو تو نے صدقہ کر لیا اسے تو نے باقی رکھ لیا۔ اس کے سوا جو کچھ ہے اسے دوسروں کے لئے چھوڑ کر یہاں سے چل دے گا۔ مسند احمد کی ایک حدیث میں ہے۔ دنیا اس کا گھر ہے جس کا گھر نہ ہو۔ دنیا اس کا مال ہے جس کا مال نہ ہو۔ دنیا کے لئے جمع وہ کرتا ہے جسے عقل نہ ہو۔

كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً ۬ فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ ۠ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ؕ وَمَا اخْتَلَفَ فِيْهِ اِلَّا الَّذِيْنَ اُوْتُوْهُ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ بَغْيًاۢ بَيْنَهُمْ ۚ فَهَدَى اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِهٖ ؕ وَاللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۲۱۳﴾

(ایک زمانہ میں) سب آدمی ایک ہی طریق کے تھے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے پیغمبروں کو بھیجا جو کہ خوشی (کے وعدے) سناتے تھے اور ڈراتے تھے اور ان کے ساتھ (آسمانی) کتابیں بھی ٹھیک طور پر نازل فرمائیں۔ اس غرض سے کہ اللہ تعالیٰ لوگوں میں ان کے امور اختلافیہ (مذہبی) میں فیصلہ فرما دیں اور اس کتاب میں (یہ) اختلاف اور کسی نے نہیں کیا مگر صرف ان لوگوں نے جن کو (اولاً) وہ کتاب ملی تھی بعد اس کے کہ ان کے پاس دلائل واضح پہنچ چکے تھے باہمی ضدا ضدی کی وجہ سے پھر اللہ تعالیٰ نے (ہمیشہ) ایمان والوں کو وہ امر حق جس میں (مختلفین) اختلاف کیا کرتے تھے بفضلہ تعالیٰ بتلا دیا اور اللہ تعالیٰ جس کو چاہتے ہیں اس کو راہ راست بتلا دیتے ہیں۔ ○

نسلِ آدم ایک ہی طریقہ پر گامزن تھی ☆

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا بیان ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام اور حضرت آدم علیہ السلام کے درمیان دس زمانے تھے۔ یہ لوگ حق اور شریعت کے پابند تھے۔ پھر اختلاف پڑ گیا تو اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کو مبعوث فرمایا بلکہ آپ کی قراءت بھی یوں ہے کہ: كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَاخْتَلَفُوْا فَبَعَثَ...... حضرت ابی کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی قراءت بھی یہی ہے۔ قتادہ نے بھی اس کی تفسیر اس طرح کی ہے کہ جب ان میں اختلاف پیدا ہو گیا تو اللہ تعالیٰ نے اپنا پہلا پیغمبر بھیجا یعنی حضرت نوح علیہ السلام، حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ بھی یہی کہتے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے ایک روایت مروی ہے کہ پہلے سب کے سب کافر تھے لیکن اول قول معنی کے اعتبار سے بھی اور سند کے اعتبار سے بھی زیادہ صحیح ہے۔ پس ان پیغمبروں نے خوشیاں سنائیں ایمان والوں کو اور ڈرایا ایمان نہ لانے والوں کو۔ ان کے ساتھ خدائی کتاب بھی تھی تاکہ لوگوں کے ہر اختلاف کا فیصلہ قانونِ الٰہی سے ہو سکے۔

اتفاق کے بعد اختلاف کی خلیج وسیع ہوتی چلی گئی ☆ لیکن ان دلائل کے بعد بھی صرف آپس کے حسد و بغض، تعصب و ضد اور نفسانیت کی بنا پر پھر اتفاق نہ کر سکے۔ لیکن ایماندار سنبھل گئے اور اس اختلاف کے چکر سے نکل کر سیدھی راہ لگ گئے۔ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں، ہم دنیا میں آنے کے اعتبار سے تو سب سے پیچھے ہیں لیکن قیامت کے دن میں جانے کے اعتبار سے سب سے آگے ہوں گے۔ اہلِ کتاب کو کتاب اللہ ہم سے پہلے دی گئی، ہمیں ان کے بعد دی گئی لیکن انہوں نے اختلاف کیا اور اللہ پاک نے ہماری رہبری کی، جمعہ کے بارے میں بھی ان کا اختلاف رہا لیکن ہمیں ہدایت نصیب ہوئی۔ یہ کُل کے کُل اہلِ کتاب اس لحاظ سے بھی ہمارے پیچھے ہیں۔ جمعہ ہمارا ہے، ہفتہ یہودیوں کا اور اتوار نصرانیوں کا۔ زید بن اسلمؒ فرماتے ہیں، جمعہ کے علاوہ قبلہ کے بارے میں بھی یہی ہوا۔ نصاریٰ نے مشرق کو قبلہ بنایا۔ یہود نے بیت المقدس کو لیکن محمدیوں نے کعبہ کو قبلہ مقرر کیا۔ اسی طرح نماز میں بھی ان میں سے بعضوں کی نماز میں رکوع ہے سجدہ نہیں۔ بعضوں کے ہاں سجدہ ہے اور رکوع نہیں۔ بعض نماز میں بولتے چالتے رہتے ہیں۔ بعض چلتے پھرتے رہتے ہیں لیکن اُمت محمد ﷺ کی نماز سکون والی و وقار والی ہے۔ نہ یہ بولیں نہ چلیں پھیریں۔ روزوں میں بھی اسی طرح اختلاف ہوا ہے اور اس میں بھی محمدیوں کو ہدایت ہوئی ہے۔ ان میں سے کوئی تو دن کے بعض حصے کا روزہ رکھتا ہے۔ کوئی گروہ بعض قسم کے کھانے چھوڑ دیتا ہے لیکن ہمارا روزہ ہر طرح کامل ہے اور اس میں بھی راہ حق ہمیں سمجھائی گئی ہے۔ اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں یہود نے کہا کہ وہ یہودی تھے۔ نصرانیوں کے کہا انہیں نصاریٰ کہا لیکن دراصل وہ قطعاً مسلمان تھے۔ پس اس بارے میں ہماری رہبری کی گئی اور خلیل اللہ علیہ السلام کی نسبت صحیح عقیدہ تک ہم پہنچا دیئے گئے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بھی یہودیوں نے جھٹلایا اور ان کی والدہ ماجدہ کی نسبت بدکلامی کی، نصرانیوں نے انہیں خدا اور خدا کا بیٹا کہا لیکن مسلمان اس افراط و تفریط سے بچا لئے گئے اور انہیں روح اللہ اور کلمۃ اللہ اور نبی برحق مانا۔

ربیع بن انسؒ فرماتے ہیں مطلب آیت کا یہ ہے کہ جس طرح ابتدا میں سب لوگ خدائے واحد کی عبادت کرنے والے نیکیوں کے عامل برائیوں سے مجتنب تھے۔ بیچ میں اختلاف رونما ہو گیا تھا۔ پس اس آخری اُمت کو اوّل کی طرح اختلاف سے ہٹا کر صحیح راہ پر لگا دیا یہ امت اور امتوں پر گواہ ہوگی۔ یہاں تک کہ امت نوح پر بھی ان کی شہادت ہوگی۔ قوم ہود علیہ السلام، قوم

صالح، قوم شعیب علیہ السلام اور آل فرعون کا بھی چکوتا (حساب کتاب) انہی کی گواہیوں پر ہوگا۔ یہ کہیں گے کہ ان پیغمبروں نے تبلیغ کی اور ان امتوں نے تکذیب کی۔ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی قراءت میں: وَاللّٰهُ يَهْدِیْ کے ساتھ یہ لفظ بھی ہیں: وَلِيَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ۔ ابوالعالیہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں اس آیت میں گویا حکم ہے کہ شبہ سے گمراہی سے اور فتنوں سے بچنا چاہئے۔ یہ ہدایت خدا کے علم اور اس کی رہبری سے ہوئی وہ جسے چاہے راہ استقامت سمجھا دیتا ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک دعا ☆ بخاری مسلم میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم رات کو جب تہجد کے لئے اٹھتے تو یہ دعا پڑھتے ((اللھم ربّ جبریل و میکائیل و اسرافیل فاطر السموت والارض عالم الغیب والشھادۃ انت تحکم بین عبادك فیما کانوا فیه یختلفون اھد فی لما اختلف فیه من الحق باذنك انك تھدی من تشاء الی صراط مستقیم.)) یعنی اے اللہ! اے جبریل اور میکائیل اور اسرافیل کے خدا! اے آسمانوں اور زمینوں کے پیدا کرنے والے خدا! اے چھپے کھلے کے جاننے والے خدا! تو ہی اپنے بندوں کے آپس کے اختلاف کا فیصلہ کرتا ہے۔ میری دعا ہے کہ جس جس چیز میں یہ اختلاف کریں تو مجھے اس میں حق بات سمجھا' تو جسے چاہے راہِ راست دکھلا دیتا ہے۔

ایک اور دُعاء ماثور ☆ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک دُعا یہ بھی منقول ہے: ((اللھم ارنا الحق حقا وارزقنا اتباعه وارنا الباطل باطلا وارزقنا اجتنابه ولا تجعله ملتبسا علینا فنضل واجعلنا للمتقین اماما.)) اے اللہ! ہمیں حق کو دکھا اور اس کی تابعداری نصیب فرما اور باطل کو باطل دکھا' اور اس سے بچا' ایسا نہ ہو کہ حق و باطل ہم پر خلط ملط ہو جائے۔ خدایا ہمیں نیک کار پرہیزگار لوگوں کا امام بنا۔

أَمْ حَسِبْتُمْ أَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَأْتِكُمْ مَثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ ۖ مَسَّتْهُمُ الْبَأْسَآءُ وَالضَّرَّآءُ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ ۗ أَلَآ إِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ ﴿۲۱۴﴾

دوسری بات سنو کیا تمہارا یہ خیال ہے کہ جنت میں (بے مشقت) جاؤ گے حالانکہ تم کو ہنوز ان (مسلمان) لوگوں کا سا کوئی عجیب واقعہ پیش نہیں آیا جو تم سے پہلے ہو گزرے ہیں۔ ان پر (مخالفین کے سبب) ایسی ایسی تنگی اور سختی واقع ہوئی اور (مصائب سے) ان کو یہاں تک جنبشیں ہوئیں کہ (اس زمانہ کے) پیغمبر تک اور جوان کے ہمراہ اہل ایمان تھے۔ بول اُٹھے کہ اللہ تعالیٰ کی امداد (موجود) کب ہوگی یاد رکھو بیشک اللہ کی امداد (بہت) نزدیک ہے۔ ○

جنت الفردوس جو سب سے بڑی کامیابی ہے آزمائشوں کے بغیر اسکا حاصل ہونا آسان نہیں:

مطلب یہ ہے کہ آزمائش اور امتحان سے پہلے جنت کی آرزوئیں ٹھیک نہیں۔ اگلی تمام امتوں کا بھی امتحان لیا گیا۔

انہیں بھی بیماریاں اور مصیبتیں پہنچیں۔ باساء کے معنی فقیر اور ضواء معنی بیماری بھی کیا گیا ہے۔ ان پر دشمنوں کا خوف اس قدر طاری ہوا کہ بے چارے کانپنے لگے۔ ان تمام سخت امتحانوں میں وہ کامیاب ہوئے اور جنت کے وارث بنے۔ صحیح حدیث میں ہے۔ ایک مرتبہ حضرت خباب بن ارت رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا' یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ ہماری امداد کی دعا نہیں کرتے؟ آپ نے فرمایا' بس ابھی سے گھبرا اُٹھے' سنو! تم سے اگلے موحدوں کو پکڑ کر ان کے سروں پر آرے رکھ دیئے جاتے تھے اور چیر کر ٹھیک دو ٹکڑے کر دیئے جاتے تھے لیکن تاہم وہ توحید و سنت سے نہ ہٹتے تھے۔ لوہے کی کنگھیوں سے ان کے گوشت پوست نوچے جاتے تھے لیکن تاہم دین خدا کو نہیں چھوڑتے تھے۔ قسم خدا کی اس میرے دین کو تو میرا ربّ اس قدر پورا کرے گا کہ بلا خوف و خطر صنعا سے حضر موت تک کا سفر یکسو کرنے لگے گا۔ اسے سوائے خدا کے کسی کا خوف نہ ہو گا۔ البتہ دل ہی دل میں یہ خیال ہونا اور بات ہے کہ کہیں میری بکریوں پر بھیڑیا نہ آ پڑے لیکن افسوس کہ تم جلدی کرتے ہو۔ قرآن میں ٹھیک یہی مضمون دوسری جگہ ان الفاظ میں فرمایا ہے: ﴿اَلٓمّٓ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ یُّتْرَكُوْٓا......﴾ (العنکبوت:۲۱) کیا لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ وہ محض ایمان کے اقرار سے چھوڑ دیئے جائیں گے اور ان کی آزمائش نہ ہو گی۔ ہم نے تو اگلوں کی بھی آزمائش کی سچوں کی اور جھوٹوں کو یقیناً ایک دوسرے سے علیحدہ کیا جائے گا۔

اسی طرح صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی پوری آزمائش یوم الاحزاب کو (یعنی جنگ خندق) میں ہوئی۔ جیسے خود قرآن پاک نے اس کا نقشہ کھینچا ہے۔ فرمان ہے: ﴿اِذْ جَآءُوْكُمْ مِّنْ فَوْقِكُمْ......﴾ (الاحزاب:۱۰) یعنی جبکہ کافروں نے تمہیں اوپر نیچے سے گھیر لیا جبکہ آنکھیں پتھرا گئیں' دل حلقوم تک آ گئے اور خدائے تعالیٰ کے ساتھ گمان ہونے لگے۔ اس جگہ مؤمنوں کی پوری آزمائش ہو گی اور خوب جھنجھوڑ دیئے جبکہ منافق اور ڈھل مل یقین لوگ کہنے لگے کہ خدا رسول کے وعدے تو دھوکہ ہی تھے۔ ہرقل نے جب ابوسفیان سے ان کے کفر کی حالت میں پوچھا تھا کہ تمہاری کوئی لڑائی بھی اس دعویدار نبوت سے ہوئی ہے۔ ابوسفیان نے کہا ہاں۔ پوچھا' پھر کیا رنگ رہا۔ کہا' کبھی ہم غالب رہے کبھی وہ غالب رہے۔ تو ہرقل نے کہا' انبیاء کی اس طرح آزمائش ہوتی رہتی ہے لیکن انجام کار کھلا غلبہ انہیں کا ہوتا ہے۔ مثل کے معنی طریقہ کے ہیں جیسے اور جگہ ہے: ﴿وَمَضٰى مَثَلُ الْاَوَّلِيْنَ﴾ (الزخرف:۸) اگلے نبیوں مع مؤمنوں کے ایسے وقت میں اللہ کی مدد طلب کی اور سختی اور تنگی سے نجات چاہی جنہیں جواب ملا کہ امداد خدا بہت ہی نزدیک ہے جیسے اور جگہ ہے: ﴿فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا﴾ (الانشراح:۵۔۶) یقیناً سختی کے ساتھ آسانی ہے۔ برائی کے ساتھ بھلائی ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ بندے جب نا اُمید ہونے لگتے ہیں تو اللہ تعالیٰ تعجب کرتا ہے کہ میری فریاد رسی تو آ پہنچنے کو ہے اور یہ نا اُمید ہوتا چلا جا رہا ہے۔ پس اللہ تعالیٰ ان کی عجلت اور اپنی رحمت کے قرب پر ہنس دیتا ہے......

يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۭ قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۭ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ۝۲۱۵

لوگ آپ سے پوچھتے ہیں کہ کیا چیز خرچ کریں آپ فرما دیجئے کہ جو کچھ مال خرچ کرنا ہو سو ماں باپ کا حق ہے اور قرابت داروں کا اور بے باپ کے بچوں کا اور محتاجوں کا اور مسافر کا اور جونسا نیک کام کرو گے سو اللہ تعالیٰ کو اس کی خوب خبر ہے (وہ اس پر ثواب دیں گے)۔ ○

مصارفِ خیر کی تفصیل ☆

مقاتلؒ فرماتے ہیں' یہ آیت نفلی خیرات کے بارے میں ہے۔ سدی کہتے ہیں' اسے آیت زکوٰۃ نے منسوخ کر دیا لیکن یہ قول ذرا غور طلب ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آیت کا' کہ اے نبی ﷺ لوگ تم سے سوال کرتے ہیں کہ وہ کس طرح خرچ کریں۔ تم انہیں کہہ دو کہ ان لوگوں سے سلوک کریں' جن کا بیان ہوا۔ حدیث میں ہے اپنی ماں سے سلوک کر' باپ سے' بہن سے' بھائی سے پھر درجہ بدرجہ عزیز و اقارب سے۔ یہ حدیث بیان فرما کر میمون بن مہران نے اس آیت کی تلاوت کی اور فرمایا' یہ ہیں جن کے ساتھ مالی سلوک کیا جائے اور ان پر مال خرچ کیا جائے۔ نہ طبلوں' باجوں' تصویروں اور دیواروں پر کپڑا چسپاں کرنے میں۔ پھر ارشاد ہوتا ہے' تم جو بھی نیک کام کرو' اسکا علم اللہ کو ہے اور وہ اس پر بہترین بدلہ عطا فرمائیگا۔ وہ ذرہ برابر ظلم نہیں کرتا۔

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسَىٰ أَن تَكْرَهُوا شَيْئًا وَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۖ وَعَسَىٰ أَن تُحِبُّوا شَيْئًا وَهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ ۗ وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنتُمْ لَا تَعْلَمُونَ ﴿٢١٦﴾

جہاد کو تم پر فرض کیا گیا ہے اور وہ تم کو (طبعاً) گراں (معلوم) ہوتا ہے اور یہ بات ممکن ہے کہ تم کسی امر کو گراں سمجھو اور وہ تمہارے حق میں خیر ہو اور یہ (بھی) ممکن ہے کہ تم کسی امر کو مرغوب سمجھو اور وہ تمہارے حق میں (باعث خرابی ہو) اور اللہ تعالیٰ جانتے ہیں اور تم (پورا پورا) نہیں جانتے۔ ○

اعلاءِ کلمۃ الحق کے لئے جدوجہد کا بیان:

دشمنانِ اسلام سے دین اسلام کے بچاؤ کے لئے جہاد کی فرضیت کا اس آیت میں حکم ہو رہا ہے۔ زہری فرماتے ہیں' جہاد ہر شخص پر فرض ہے۔ خواہ لڑائی میں نکلے خواہ بیٹھا رہے۔ بیٹھنے رہنے والوں پر یہ فریضہ ہے کہ جب ان سے مدد طلب کی جائے' وہ امداد کریں' جب ان سے فریاد کی جائے۔ یہ فریاد رسی کریں۔ جب انہیں میدان میں بلایا جائے یہ نکل کھڑے ہوں۔ صحیح حدیث شریف میں ہے جو شخص مر جائے اور اس نے نہ تو جہاد کیا ہو' نہ اپنے دل میں جہاد کی بات چیت کی ہو وہ جاہلیت کی موت مرے گا اور حدیث میں ہے۔ فتح مکہ کے بعد ہجرت نہیں رہی۔ ہاں جہاد اور نیت ہے اور جب تم سے جہاد کے لئے نکلنے کو کہا جائے تو نکل کھڑے ہو جایا کرو۔ یہ حکم آپ ﷺ نے مکہ کی فتح کے دن فرمایا تھا۔ حکم جہاد گو تم پر بھاری پڑے گا اور اس میں تمہیں مشقت اور تکلیف نظر آئے گی کیونکہ ممکن ہے قتل بھی کئے جاؤ۔ ممکن ہے زخمی ہو جاؤ۔ پھر سفر کی تکلیف دشمنوں کی یورش وغیرہ۔ ممکن ہے تم برا جانو اور تمہارے لئے اچھا ہے کیونکہ اسی سے تمہارا غلبہ ہے اور دشمن کی پامالی ہے۔ ان کے مال' ان کے ملک بلکہ ان کے بال بچے تک تمہارے قدموں میں گر پڑیں گے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تم کسی چیز کو اپنے لئے اچھا جانو اور وہی

تمہارے لئے بُری ہو۔ عموماً ایسا ہوتا ہے کہ انسان ایک چیز کو چاہتا ہے لیکن فی الواقع نہ اس میں مصلحت ہوتی ہے نہ خیر و برکت۔ اسی طرح گو تم جہاد نہ کرنے کو اچھائی سمجھو لیکن دراصل وہ تمہارے لئے زبردست برائی ہے کیونکہ اس سے دشمن تم پر غالب آ جائے گا اور دنیا میں قدم ٹکانے کو بھی تمہیں جگہ نہ ملے گی۔ تمام کاموں کے انجام کا علم محض پروردگار عالم کو ہی ہے۔ وہ جانتا ہے کہ کون سا کام تمہارے لئے انجام کے لحاظ سے اچھا ہے اور کونسا برا ہے۔ وہ اسی کام کا حکم دیتا ہے جس میں تمہارے لئے دونوں جہان کی بہتری ہو۔ تم اس کے احکام کو دل و جان سے قبول کر لیا کرو۔ اسی میں تمہارے لئے بھلائی اور خوبی ہے۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيْهِ ؕ قُلْ قِتَالٌ فِيْهِ كَبِيْرٌ ؕ وَصَدٌّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَكُفْرٌۢ بِهٖ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۗ وَاِخْرَاجُ اَهْلِهٖ مِنْهُ اَكْبَرُ عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَالْفِتْنَةُ اَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ ؕ وَلَا يَزَالُوْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ حَتّٰى يَرُدُّوْكُمْ عَنْ دِيْنِكُمْ اِنِ اسْتَطَاعُوْا ؕ وَمَنْ يَّرْتَدِدْ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَيَمُتْ وَهُوَ كَافِرٌ فَاُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ وَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿٢١٧﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۙ اُولٰٓئِكَ يَرْجُوْنَ رَحْمَتَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿٢١٨﴾

لوگ آپ سے شہر حرام میں قتال کرنے کے متعلق سوال کرتے ہیں۔ آپ فرما دیجئے کہ اس میں خاص طور پر قتال کرنا (یعنی عمداً) جرم عظیم ہے اور اللہ تعالیٰ کی راہ سے روک ٹوک کرنا اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ کفر کرنا اور مسجد حرام (یعنی کعبہ) کے ساتھ اور جو لوگ مسجد حرام کے اہل تھے ان کو اس کے خارج کر دینا۔ جرم عظیم ہیں اللہ تعالیٰ کے نزدیک اور فتنہ پردازی کرنا (اس) قتل (خاص) سے بدرجہا بڑھ کر ہے اور یہ کفار تمہارے ساتھ ہمیشہ جنگ رکھیں گے اس غرض سے کہ اگر (خدا نہ کرے) قابو پائیں تو تم کو تمہارے دین (اسلام) سے پھیر دیں اور جو شخص تم میں سے اپنے دین سے پھر جائے پھر کافر ہی ہونے کی حالت میں مر جائے تو ایسے لوگوں کے (نیک) اعمال دنیا اور آخرت میں سب غارت ہو جاتے ہیں اور ایسے لوگ دوزخی ہوتے ہیں (اور) یہ لوگ دوزخ میں ہمیشہ رہیں گے۔ حقیقتاً جو لوگ ایمان لائے ہوں اور جن لوگوں نے راہ خدا میں ترک وطن کیا ہو اور جہاد کیا ہو ایسے لوگ تو رحمت خداوندی کے امیدوار ہوا کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ (اس غلطی کو معاف کر دیں گے اور تم پر) رحمت کریں گے۔ ○

امنِ عامہ کے کچھ مہینے:

رسول اللہ ﷺ نے ایک جماعت کو بھیجا اور ان کا امیر حضرت ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بنایا جب وہ جانے لگے تو حضور ﷺ کی جدائی کے صدمے سے رو دیئے۔ آپ ﷺ نے انہیں تو روک لیا اور ان کے بدلے حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو سردارِ لشکر مقرر کیا اور انہیں ایک خط لکھ کر دیا اور فرمایا کہ جب تک بطن نخلہ نہ پہنچو۔ اس خط کو نہ پڑھنا اور وہاں پہنچ کر جب اس مضمون کو دیکھو تو اپنے ساتھیوں میں سے کسی کو اپنے ساتھ چلنے پر مجبور نہ کرنا' چنانچہ حضرت عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس مختصر سی جماعت کو لے کر چلے۔ جب اس موقع پر پہنچے تو فرمان نبی پڑھا اور ﴿ انا للہ ..... ﴾ پڑھ کر کہا کہ میں نے حضور ﷺ کے فرمان کو پڑھا اور میں فرماں برداری کے لئے تیار ہوں۔ پھر اپنے ساتھیوں کو پڑھ کر سنایا اور واقعہ بیان کیا۔ دو شخص واپس لوٹ گئے لیکن اور سب چلنے کے لئے آمادہ ہو گئے۔ آگے چل کر ابن الحضرمی کافر کو انہوں نے پایا۔ چونکہ یہ علم نہ تھا کہ جمادی الاخریٰ کا یہ آخری دن ہے یا رجب کا پہلا دن ہے۔ انہوں نے اس لشکر پر حملہ کر دیا۔ ابن الحضرمی مارا گیا اور صحابہ کی یہ جماعت وہاں سے واپس لوٹی۔ اب مشرکین نے مسلمانوں پر اعتراض شروع کیا کہ دیکھو انہوں نے حرمت والے مہینوں میں لڑائی کی اور قتل بھی کیا۔ اس بارے میں یہ آیت اُتری۔ (ابن ابی حاتم)

ایک اور روایت میں ہے کہ اس جماعت میں حضرت عمار بن یاسر' حضرت ابوحذیفہ بن عتبہ بن ربیعہ' حضرت سعد بن ابی وقاص' حضرت عتبہ بن غزوان سلمی اور حضرت سہیل بن بیضاء اور حضرت عامر بن فہیرہ اور حضرت واقد بن عبداللہ یربوعی رضی اللہ تعالیٰ عنہم تھے۔ بطن نخلہ پہنچ کر حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے صاف فرما دیا تھا کہ جو شخص شہادت کا آرزو مند ہو وہی آگے بڑھے۔ یہاں سے واپس جانے والے حضرت سعد بن ابی وقاص اور عتبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم تھے۔ ان کے ساتھ نہ جانے کی وجہ یہ تھی کہ ان کا اونٹ گم ہو گیا تھا۔ جس کے تلاش کرنے میں رہ گئے مشرکین میں حکم بن کیسان' عثمان بن عبداللہ وغیرہ تھے۔ حضرت واقد کے ہاتھوں عمرو قتل ہوا اور یہ جماعت مال غنیمت لے کر واپس لوٹی۔ یہ پہلی ہی غنیمت تھی جو مسلمان صحابہ کو ملی اور یہ جانباز جماعت دو قیدیوں اور مالِ غنیمت لے کر واپس آئی۔ مشرکین مکہ نے قیدیوں کا فدیہ ادا کرنا منظور کر لیا لیکن اس کے ساتھ ہی انہوں نے اعتراضاً کہا کہ دیکھو حضرت کا دعویٰ تو یہ ہے کہ وہ خدا کے اطاعت گزار ہیں لیکن حرمت والے مہینے کی کوئی حرمت نہیں کرتے اور وہ ماہ رجب میں جدال و قتال کرتے ہیں۔ مسلمان کہتے تھے کہ رجب میں قتل نہیں کیا بلکہ جمادی الاخریٰ میں لڑائی ہوئی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ رجب کی پہلی رات اور جمادی الاخریٰ کی آخری شب تھی۔ رجب شروع ہوتے ہی مسلمانوں کی تلواریں میان میں ہو گئی تھیں۔ مشرکین کے اس اعتراض کا جواب اس آیت میں دیا جا رہا ہے کہ یہ سچ ہے کہ ان مہینوں میں جنگ حرام ہے لیکن اے مشرکو! تمہاری بداعمالیاں تو برائی میں اس سے بھی سوا ہیں۔ تم خدا کا انکار کرتے ہو تم میرے نبی اور ان کے ساتھیوں کو میری مسجد سے روکتے ہو۔ تم نے انہیں وہاں سے نکال دیا۔

پس اپنی ان سیاہ کاریوں پر نظر ڈالو کہ یہ کس قدر بدترین کام ہیں۔ انہی حرمت والے مہینوں میں ہی مشرکین نے مسلمانوں کو بیت اللہ شریف سے روکا تھا اور آپ مجبوراً واپس ہوئے تھے۔ اگلے سال اللہ تعالیٰ نے حرمت والے مہینوں میں ہی مکہ کو اپنے نبی کے ہاتھ پر فتح کرایا اور مسلمانوں کا پورا تسلط وہاں ہو گیا۔ اب اعتراض کرنے لگے۔ جس پر انہیں ان آیتوں میں معقول جواب دیا گیا۔ عمرو ابن الحضرمی جو قتل کیا گیا۔ یہ طائف سے مکہ کو آ رہا تھا گو رجب کا چاند نکل چکا تھا لیکن صحابہ کو

معلوم نہ تھا' وہ اس رات کو جمادی الاخریٰ کی آخری رات جانتے تھے۔ ایک اور روایت میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ آٹھ آدمی تھے۔ سات تو وہی' جن کے نام اوپر بیان ہوئے۔ آٹھویں حضرت رباب اسدی رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھے۔ انہیں بدر اولیٰ سے واپسی کے وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھیجا تھا۔ یہ سب مہاجر صحابہؓ تھے۔ ان میں ایک بھی انصاری نہ تھا۔ دو دن چل کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس نامۂ مبارک کو پڑھا تھا۔ جس میں تحریر تھا کہ میرے اس حکم نامہ کو پڑھ کر مکہ اور طائف کے درمیان نخلہ میں جاؤ۔ وہاں ٹھہرو اور قریش کے قافلہ کا انتظار کرو اور ان کی خبریں معلوم کر کے مجھے پہنچاؤ۔ جب یہ بزرگ یہاں سے چلے تو سارے کے سارے ہی چلے تھے۔ دو صحابی جو اونٹ کو ڈھونڈنے کے لئے رہ گئے تھے۔ وہ بھی یہاں سے ساتھ ہی تھے لیکن فرع کے اوپر معدن پہنچ کر نجران میں انہیں اونٹوں کی طلبی میں رک جانا پڑا۔ قریشیوں کے اس قافلہ میں زیتون وغیرہ تجارتی مال تھا۔ مشرکین میں علاوہ ان لوگوں کے جن کے نام اوپر بیان ہوئے ہیں۔ نوفل بن عبداللہ وغیرہ بھی تھے۔ مسلمان اوّل تو ان لوگوں کے جن کے نام اوپر بیان ہوئے ہیں' نوفل بن عبداللہ وغیرہ بھی تھے۔ مسلمان اوّل تو انہیں دیکھ کر گھبرائے لیکن پھر مشورہ کر کے مسلمانوں نے یہ سوچ کر کہ اگر انہیں چھوڑ دیا تو اس رات کے بعد حرمت کا مہینہ آ جائے گا۔ تو پھر کچھ بھی نہ کر سکیں گے۔ انہوں نے شجاعت و مردانگی کے ساتھ حملہ کیا۔

حضرت واقد بن عبداللہ تمیمی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عمرو بن حضرمی کو ایسا تاک کر تیر لگایا کہ اس کا تو فیصلہ ہی ہو گیا۔ عثمان اور حکم کو قید کر لیا اور مال وغیرہ لے کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچے۔ راستہ میں ہی سردار لشکر نے کہہ دیا تھا کہ اس مال میں سے پانچواں حصہ تو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے۔ چنانچہ یہ حصہ تو الگ کر کے رکھ دیا گیا اور باقی مال صحابہ میں تقسیم کر دیا گیا اور اب تک یہ حکم نازل نہیں ہوا تھا کہ مال غنیمت میں سے پانچواں حصہ نکالنا چاہئے۔ جب یہ لشکر سرکار نبوی میں پہنچا تو آپ نے واقعہ سن کر ناراضگی ظاہر فرمائی' اور فرمایا کہ میں نے تمہیں حرمت والے مہینوں میں لڑائی کرنے کو کب کہا تھا۔ نہ تو قافلہ کا کچھ مال آپ نے لیا نہ قیدیوں کو قبضہ میں کیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول و فعل سے یہ مسلمان سخت نادم ہوئے اور اپنے جرم کا انہیں یقین ہو گیا پھر اور مسلمانوں نے بھی انہیں کچھ کہنا سننا شروع کیا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور آپ کے صحابہؓ حرمت والے مہینوں میں بھی جدال و قتال سے باز نہیں رہتے۔ دوسری جانب یہودیوں نے ایک بدفال نکالی۔ چونکہ عمرو قتل کیا گیا تھا تو انہوں نے کہا: عَمَّرَتِ الْحَرْبُ۔ لڑائی پُر رونق اور خوب زور و شور سے لمبی مدت تک ہو گی۔ اس کے باپ کا نام حضرمی تھا۔ اس سے انہوں نے فال لی کہ حضرت الحرب وقت لڑائی آ پہنچا۔ قاتل کا نام واقد رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھا جس سے انہوں نے کہا: وَقَدَتِ الْحَرْبُ لڑائی کی آگ بھڑک اٹھی لیکن قدرت نے اسے برعکس کر دیا اور نتیجہ تمام تر مشرکین کے خلاف نکلا اور ان کے اس اعتراض کے جواب میں یہ آیت نازل ہوئی کہ اگر بالفرض جنگ حرمت والے مہینہ میں ہوئی بھی تو اس سے بدترین تمہاری سیہ کاریاں موجود ہیں۔ تمہارا یہ فتنہ کہ تم دین اللہ سے مسلمانوں کو مرتد کرنے کی تمام تر امکانی کوششیں کر رہے ہو۔ یہ اس قتل سے بھی بڑھ کر ہے اور تم نہ تو اپنے کاموں سے رکتے ہو نہ اس پر نادم ہوتے ہو۔ ان آیات کے نازل ہونے کے بعد مسلمان اس رنج و افسوس سے چھٹے اور حضورؐ نے قافلہ کو اور قیدیوں کو اپنے قبضہ میں لے لیا۔ قریشیوں نے پھر آپ کے پاس قاصد بھیجا کہ ان دونوں قیدیوں کا فدیہ لے لیجئے۔ مگر آپؐ نے فرمایا کہ میرے دونوں صحابی سعد بن ابی وقاص اور عتبہ بن غزوانؓ جب آ جائیں' تب آؤ' مجھے ڈر ہے کہ تم انہیں ایذا نہ پہنچاؤ۔ چنانچہ جب وہ آ گئے تو آپؐ نے فدیہ لے لیا اور دونوں قیدیوں کو رہا کر دیا۔

حکم بن کیسان رضی اللہ تعالیٰ عنہ تو مسلمان ہو گئے اور حضور ﷺ کی خدمت میں ہی رہ گئے۔ آخر بیر معونہ کی لڑائی میں شہید ہو گئے (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) ہاں عثمان بن عبداللہ مکہ واپس گیا اور وہیں کفر کی حالت میں ہی مرا۔ ان غازیوں کو اس آیت کو سن کر بڑی خوشی ہوئی اور حضور ﷺ کی ناراضگی کی وجہ سے حرمت والے مہینوں کی بے ادبی کے سبب سے دوسرے صحابہ کی چشمک کی بناء پر کفار کے طعنہ کے باعث جو رنج و غم ان دلوں پر تھا' سب دور ہو گیا لیکن اب فکر پڑی کہ ہمیں اُخروی اجر بھی ملے گا یا نہیں۔ ہم غازیوں میں شمار کئے جائیں گے یا نہیں جب حضور ﷺ سے یہ سوالات کئے گئے تو اس کے جواب میں یہ آیت ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا...... ﴾ نازل ہوئی اور ان کی بڑی بڑی امیدیں بندھ گئیں رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین۔ اسلام اور کفر کے مقابلہ میں سب سے پہلے یہی ابن الحضرمی مارا گیا۔ کفار کا وفد حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور سوال کیا کہ کیا حرمت والے مہینوں میں قتل کرنا جائز ہے؟ اس پر آیت: ﴿يَسْئَلُوْنَكَ...... ﴾ نازل ہوئی۔ یہی مال غنیمت تھا' جو سب سے پہلے مسلمانوں کے ہاتھ لگا اور سب سے پہلے خمس حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ہی نکالا۔ جو اسلام میں باقی رہا اور حکم خدا بھی اسی طرح نازل ہوا اور یہی دو قیدی تھے جو سب سے پہلے مسلمانوں کے اسیر ہوئے۔ اس واقعہ کو ایک نظم میں بھی ادا کیا گیا ہے بعض تو کہتے ہیں کہ یہ اشعار حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ہیں اور یہ بھی کہا گیا کہ یہ اشعار خود عبداللہ جحش کے ہیں جو اس مختصر سے لشکر کے سردار تھے۔ خدا ان سے خوش ہو۔

يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ ؕ قُلْ فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ ۫ وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا ؕ وَيَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۬ؕ قُلِ الْعَفْوَ ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ ۙ﴿۲۱۹﴾ فِى الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ؕ وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْيَتٰمٰى ؕ قُلْ اِصْلَاحٌ لَّهُمْ خَيْرٌ ؕ وَاِنْ تُخَالِطُوْهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَاَعْنَتَكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۲۰﴾

لوگ آپ سے شراب اور قمار کی نسبت دریافت کرتے ہیں آپ فرما دیجئے کہ ان دونوں (کے استعمال) میں گناہ کی بڑی بڑی باتیں بھی ہیں اور لوگوں کو (بعضے) فائدے بھی ہیں اور (وہ) گناہ کی باتیں ان فائدوں سے زیادہ بڑھی ہوئی ہیں اور لوگ آپ سے دریافت کرتے ہیں کہ (خیر خیرات میں) کتنا خرچ کیا کریں آپ فرما دیجئے کہ جتنا آسان ہو۔ اللہ تعالیٰ اسی طرح احکام کو صاف صاف بیان فرماتے ہیں تاکہ تم دنیا و آخرت کے معاملات میں سوچ لیا کرو اور لوگ آپ سے یتیم بچوں کا بچوں کا حکم پوچھتے ہیں۔ آپ فرما دیجئے کہ ان کی مصلحت کی رعایت رکھنا زیادہ بہتر ہے اور اگر تم ان کے ساتھ خرچ شامل رکھو تو وہ تمہارے دینی بھائی ہیں اور اللہ مصلحت کے ضائع کرنے والے کو

اور مصلحت کی رعایت رکھنے والے کو الگ الگ جانتے ہیں اور اگر اللہ تعالیٰ چاہتے تو تم کو مصیبت میں ڈال دیتے کیونکہ اللہ تعالیٰ کی زبردست ہیں حکمت والے ہیں۔ ○

شراب کی حرمت اور بتدریج اِس کی حرمت کی جانب شریعت کے قدم:

جب شراب کی آیت نازل ہوئی تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا' خدایا تو اس کا واضح بیان فرما۔ اس پر سورہ بقرہ کی یہ آیت ﴿يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ...﴾ نازل ہوئی۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بلوایا گیا اور انہیں یہ آیت پڑھ کر سنائی گئی لیکن حضرت عمر نے بھی یہی دعا کی کہ خدایا اسے ہمارے لئے اور صاف بیان فرما۔ اس پر سورہ نسا کی آیت: ﴿يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى......﴾ (النساء:۴۳) نازل ہوئی اور ہر نماز کے وقت پکارا جانے لگا کہ نشے والے لوگ نماز کے قریب بھی نہ آئیں۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بلوایا گیا اور ان کے سامنے اس آیت کی بھی تلاوت کی گئی۔ آپ نے پھر بھی یہی دعا کی کہ خدایا ہمارے لئے اس کا بیان اور واضح کر۔ اس پر سورہ مائدہ کی آیت: ﴿اِنَّمَا الْخَمْرُ...﴾ (المائدہ ۹۰) اُتری۔ جب فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بلا کر یہ آیت بھی سنائی گئی اور جب ان کے کان میں آیت کے آخری الفاظ: ﴿فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ﴾ (المائدۃ:۹۱) پڑے تو آپ بول اُٹھے: اِنْتَهَيْنَا اِنْتَهَيْنَا ہم رک گئے ہم باز آ گئے۔ ملاحظہ ہو مسند احمد۔ ابوداؤد' ترمذی اور نسائی وغیرہ۔ ابن ابی حاتم اور ابن مردویہ میں بھی یہ روایت ہے۔ لیکن اس کا راوی ابو میسرہ ہے۔ جن کا نام عمرو بن شرحبیل ہمدانی کوفی ہے۔ ابوزرعہ فرماتے ہیں کہ ان کا سماع حضرت عمرؓ سے ثابت نہیں۔ واللہ اعلم۔ امام علی بن مدینی فرماتے ہیں' اس کی اسناد صالح اور صحیح ہے۔ امام ترمذی بھی اسے صحیح کہتے ہیں۔ ابن ابی حاتم میں حضرت عمرؓ کے اِنْتَهَيْنَا اِنْتَهَيْنَا کے قول کے بعد یہ بھی ہے کہ شراب مال کو برباد کرنے والی چیز ہے۔ یہ روایت اور اسی کے ساتھ کے سند حضرت ابوہریرہؓ والی روایتیں سورہ مائدہ کی آیت: ﴿اِنَّمَا الْخَمْرُ......﴾ کی تفسیر میں مفصل بیان ہوں گی ان شاءاللہ تعالیٰ۔

خمر کے لغوی معنی ☆ امیر المومنین حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں' خمر ہر وہ چیز ہے' جو عقل کو ڈھانپ لے۔ اس کا پورا بیان بھی سورہ مائدہ میں ہی آئے گا۔ ان شاءاللہ تعالیٰ میسر کہتے ہیں جوئے بازی کو۔ گناہ ان کا وبال اُخری ہے اور فائدہ صرف دنیوی ہے کہ بدن کو کچھ نفع پہنچے یا غذا ہضم ہو یا فضلے برآمد ہوں یا بعض ذہن تیز ہو جائیں۔ یا ایک طرح کا سرور حاصل ہو۔ جیسے کہ حسان بن ثابت کا جاہلیت کے زمانہ کا شعر ہے کہ شراب پی کر ہم بادشاہ اور دلیر بن جاتے ہیں اور اسی طرح اس کی خرید و فروخت اور کشید میں بھی تجارتی نفع ممکن ہے ہو جائے۔ اسی طرح جوئے بازی میں ممکن ہے جیت ہو جائے لیکن ان کے فوائد کے مقابلہ میں نقصانات ان کے بکثرت ہیں۔ کیونکہ اس سے عقل کا جاتا رہنا۔ ہوش و حواس کا بے کار ہونا ضروری ہے۔ ساتھ ہی دین کا برباد ہونا بھی ہے۔ یہ آیت گویا شراب کی حُرمت کا پیش خیمہ تھی چونکہ اس میں صاف صاف حرمت بیان نہ ہوئی تھی۔ اس لئے حضرت ﷺ کی خواہش تھی کہ کھلے لفظوں میں شراب کی حرمت نازل ہو۔ چنانچہ آخرش سورہ مائدہ کی آیت میں صاف فرما دیا گیا ہے کہ شراب اور جوا اور پانسے اور تیر سے فال نکالنا سب حرام اور شیطانی کام ہیں۔ اے مسلمانوں اگر نجات کے طالب ہو تو ان سب سے باز آ جاؤ۔ شیطان کی تمنا ہے کہ شراب اور جوئے کے باعث تم میں عداوت ڈال دے اور تمہیں ذکر اللہ اور نماز سے روک دے۔ اب تم ان شیطانی کاموں سے رُک جانے والے بن جاؤ گے؟ اس کا پورا بیان ان شاء اللہ سورہ مائدہ میں آئے گا۔

مفسرین تابعی فرماتے ہیں کہ شراب کے بارے میں پہلے یہی آیت نازل ہوئی۔ پھر سورۂ مائدہ کی آیت اُتری اور شراب مکمل طور پر حرام ہوگئی۔ ﴿قُلِ الْعَفْوَ﴾ کی ایک قراءت ﴿قُلِ الْعَفْوُ﴾ بھی ہے اور دونوں قرائتیں ٹھیک ہیں۔ معنی قریب قریب اور ایک ہو سکتے ہیں۔ حضرت معاذ بن جبل اور حضرت ثعلبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے اور دریافت کیا کہ حضور ہمارے غلام بھی ہیں' بال بچے بھی ہیں اور مالدار بھی ہیں' کیا کچھ اللہ خرچ کریں؟ جس کے جواب میں ﴿قُلِ الْعَفْوَ﴾ کہا گیا۔ یعنی جو اپنے بال بچوں کے خرچ کے بعد بچے۔ بہت سے صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعین رحمۃ اللہ علیہم سے اسی کی یہی تفسیر نقل ہے۔ حضرت طاؤس کہتے ہیں' ہر چیز میں سے تھوڑا تھوڑا راہِ اللہ بھی دیتے رہا کرو۔ ربیع رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں' افضل اور بہتر مال خدا کی راہ میں دو۔

خیر و خیرات میں اپنا خیال بھی ضروری ہے ☆ سب اقوال کا خلاصہ یہ ہے کہ حاجت سے زائد چیز خدا کی راہ میں خرچ کرو۔ حضرت حسن فرماتے ہیں کہ ایسا نہ کرو کہ سب دے ڈالو اور پھر خود سوال کے لئے بیٹھ جاؤ۔ چنانچہ صحیح مسلم میں ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے کہا' حضور میرے پاس ایک دینار ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا اپنے کام میں لاؤ' کہا میرے پاس ایک اور ہے۔ فرمایا اپنی بیوی پر خرچ کرو۔ کہا حضرت ایک اور ہے فرمایا اپنے بچوں کی ضروریات میں لگاؤ۔ کہا ایک اور بھی ہے۔ فرمایا اب تو آپ خوب دیکھ بھال سکتا ہے۔ مسلم شریف کی ایک اور حدیث میں ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا اپنے نفس سے شروع کر' پہلے اسی پر صدقہ کر۔ پھر بچے تو اپنے بال بچوں پر۔ پھر بچے تو اپنے رشتہ داروں پر۔ پھر بھی بچے تو اور دوسرے حاجت مندوں پر۔ اسی کتاب میں ایک اور حدیث ہے کہ سب سے افضل خیرات وہ ہے جو انسان اپنے خرچ کے مطابق باقی رکھ کر بچی ہوئی چیز کو راہِ اللہ دے۔ اوپر والا ہاتھ نیچے والے ہاتھ سے افضل ہے۔ پہلے انہیں دے' جن کا خرچ تیرے ذمہ ہے۔ ایک اور حدیث میں ہے۔ اے ابن آدم جو تیرے پاس اپنی ضرورت سے زائد ہو' اسے اللہ کی راہ میں دے ڈالنا ہی تیرے لئے بہتر ہے۔ اس کا روک رکھنا تیرا برا ہے۔ ہاں اپنی ضرورت کے مطابق خرچ کرنے میں تجھ پر کوئی ملامت نہیں۔ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا ایک قول یہ بھی ہے کہ یہ حکم زکوٰۃ کے حکم سے منسوخ ہوگیا۔ حضرت مجاہد فرماتے ہیں' زکوٰۃ کی آیت گویا اس آیت کی تفسیر اور اس کا واضح بیان ہے۔ ٹھیک قول یہی ہے۔ پھر ارشاد ہے کہ جس طرح یہ احکام واضح کر کے کھول کھول کر کے ہم نے بیان فرمائے' اسی طرح ہم باقی احکام بھی وضاحت اور تشریح کے ساتھ بیان فرمائیں گے وعدے وعید بھی صاف طور پر کھول دیئے جائیں گے۔ تا کہ تم دنیائے فانی کی طرف سے بے رغبت ہو کر آخرت کی طرف ہو جاؤ جو ہمیشہ باقی رہنے والی ہے۔

غور و فکر کی ضرورت ☆ حضرت حسنؒ نے اس آیت کی تلاوت کر کے فرمایا واللہ جو غور و فکر و تدبر کرے گا' جان لے گا کہ دنیا بلا کا گھر ہے اور اس کا انجام فنا ہے اور آخرت جزا کا گھر ہے اور بقا کا۔ حضرت قتادہ فرماتے ہیں' فکر کرنے سے صاف معلوم ہو سکتا ہے کہ دنیا پر آخرت کی کس قدر فضیلت ہے۔ پس عقل مند کو چاہئے کہ آخرت کی بھلائی کے جمع کرنے کی کوشش میں لگ جائے۔

یتیم سے متعلق چند احکام ☆ پھر یتیم کے بارے میں احکام نازل ہوئے ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں' پہلے یہ حکم ہوا تھا کہ: ﴿وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ﴾ (الانعام: ۱۵۱) یعنی یتیم کے مال کے قریب بھی نہ جاؤ مگر اس طریقہ سے جو بہترین طریقہ ہے اور فرمایا گیا تھا: ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْيَتٰمٰى ظُلْمًا اِنَّمَا يَاْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا وَسَيَصْلَوْنَ سَعِيْرًا﴾ (النساء: ۱۰) یعنی جو لوگ ظلم سے یتیموں کا مال کھا جاتے ہیں' وہ اپنے پیٹ میں آگ بھر

رہے ہیں اور وہ بھڑکتی ہوئی جہنم میں عنقریب داخل ہو جائیں گے۔ تو ان آیتوں کو سن کر ان لوگوں نے جو یتیموں کے والی تھے یتیموں کا کھانا ان کا پانی اپنے گھر کے کھانے اور گھر کے پانی سے بالکل جدا کر دیا۔ اب اگر اس کا پکا ہوا کھانا بچ رہا تو اسے یا تو وہی دوسرے وقت کھائے یا خراب ہو جائے۔ تو یوں ایک طرف تو ان یتیموں کا نقصان ہونے لگا۔ دوسری جانب والیان یتیم بھی تنگ آ گئے کہ کب تک ایک گھر میں اس طرح رکھ رکھاؤ کیا کریں۔ تو ان لوگوں نے آ کر حضور ﷺ سے عرض کی۔ جس پر یہ آیت: ﴿قُلْ اِصْلَاحٌ لَّهُمْ خَيْرٌ......﴾ نازل ہوئی اور نیک نیتی اور دیانت داری کے ساتھ ان کے مال کو اپنے مال میں ملا لینے رخصت دی گئی۔ ابوداؤد و نسائی وغیرہ میں یہ روایتیں موجود ہیں اور سلف وخلف کی ایک بہت بڑی جماعت نے اس کا شان نزول یہی بیان فرمایا ہے۔

حضرت صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں' یتیم کے ذرا ذرا سے مال کی اس طرح دیکھ بھال سخت مشکل ہے کہ اس کا کھانا الگ ہو' اس کا پینا الگ ہو۔ ﴿اِصْلَاحٌ لَّهُمْ خَيْرٌ﴾ سے تو یہی علیحدگی مراد ہے لیکن پھر ﴿وَاِنْ تُخَالِطُوْهُمْ﴾ فرما کر کھانا پینا ملا جلا رکھنے کی اجازت دی گئی۔ اس لئے کہ وہ بھی دینی بھائی ہیں۔ ہاں نیت نیک ہونی چاہئے قصد اور ارادہ اگر یتیم کی نقصان رسانی کا ہے تو وہ بھی خدائے تبارک وتعالیٰ سے پوشیدہ نہیں اور اگر مقصود یتیم کی بھلائی اور اس کے مال کی نگہبانی ہے تو اسے بھی وہ علام الغیوب بخوبی جانتا ہے۔ پھر فرمایا کہ خدا تمہیں تکلیف ومشقت میں مبتلا رکھنا نہیں چاہتا جو تنگی اور حرج تم پر یتیم کا کھانا پینا بالکل جدا رکھنے میں تھا' وہ اللہ تعالیٰ نے دور فرما دیا اور تم پر تخفیف کر دی اور ایک ہنڈیا رکھنا اور ملا جلا کام کرنا تمہارے لئے مباح قرار دے دیا بلکہ والی یتیم اگر فقیر مسکین محتاج ہو تو مطابق دستور اپنے خرچ میں لا سکتا ہے اور اگر کسی مال دار نے بوقت ضرورت اسکی چیز کام میں لے لی تو پھر ادا کر دے۔ یہ مسائل ان شاء اللہ وضاحت کے ساتھ سورہ نساء کی تفسیر میں بیان ہونگے۔

وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ ۭ وَلَاَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ وَّلَوْ اَعْجَبَتْكُمْ ۚ وَلَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَتّٰى يُؤْمِنُوْا ۭ وَلَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكٍ وَّلَوْ اَعْجَبَكُمْ ۭ اُولٰۗىِٕكَ يَدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ ښ وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلَى الْجَنَّةِ وَالْمَغْفِرَةِ بِاِذْنِهٖ ۚ وَيُبَيِّنُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۲۲۱﴾

اور نکاح مت کرو کافر عورتوں کے ساتھ جب تک کہ وہ مسلمان نہ ہو جائیں اور مسلمان عورت (چاہے) لونڈی (کیوں نہ ہو وہ ہزار درجہ) بہتر ہے کافر عورت سے گو وہ تم کو اچھی ہی معلوم ہو اور عورتوں کو کافر مردوں کے نکاح میں مت دو جب تک کہ وہ مسلمان نہ ہو جائیں اور مسلمان مرد غلام بہتر ہے کافر مرد سے گو وہ تم کو اچھا ہی معلوم ہو

(کیونکہ) یہ لوگ دوزخ (میں جانے کی) تحریک دیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ جنت اور مغفرت کی تحریک دیتے ہیں اپنے حکم سے اور اللہ تعالیٰ اس واسطے آدمیوں کو اپنے احکام بتلاتے ہیں تاکہ وہ نصیحت پر عمل کریں۔ ○

ازدواجی رشتے شوہر و بیوی کی نفسیات پر گہرے اثر ڈالتے ہیں' اسلئے نکاح سوچ سمجھ کر کرنا چاہئے:

بت پرست مشرکہ عورتوں سے نکاح کی حرمت بیان ہو رہی ہے گو آیت کا عموم تو ہر ایک مشرکہ عورت سے نکاح کرنے کی ممانعت پر ہی دلالت کرتا ہے لیکن دوسری جگہ فرمان ہے: ﴿وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ﴾ (المائدة ۵) یعنی تم سے پہلے جو کتاب اللہ دیئے گئے ہیں' ان کی پاک دامن عورتوں سے بھی جو زنا کاری سے بچنے والی ہوں' ان کے مہر ادا کر کے ان سے نکاح کرنا تمہارے لئے جائز ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا قول بھی یہی ہے کہ ان مشرکہ عورتوں میں سے اہل کتاب عورتیں مخصوص ہیں۔ مجاہد' عکرمہ' سعید بن جبیر' مکحول' حسن' قتادہ' زید بن اسلم اور ربیع بن انس رحمہم اللہ کا بھی یہی فرمان ہے بعض کہتے ہیں۔ یہ آیت صرف بت پرست مشرکہ عورتوں ہی کے لئے نازل ہوئی ہے۔ مطلب دونوں کا ایک ہی ہے واللہ اعلم۔ ابن جریر میں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کئی قسم کی عورتوں سے نکاح کرنے کو ناجائز کیا۔ سوا ایمان دار ہجرت کر کے آنے والی عورتوں کے اور سب ان عورتوں سے جو کسی دوسرے مذہب کی پابند ہوں' نکاح کرنا حرام قرار دے دیا گیا۔ قرآن کریم میں اور جگہ ہے: ﴿وَمَنْ يَّكْفُرْ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهٗ﴾ (المائدہ ۵) یعنی کافروں کے اعمال برباد ہیں۔ ایک روایت میں ہے کہ حضرت طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہودیہ عورت سے نکاح کیا تھا اور حضرت حذیفہ بن یمانؓ نے ایک نصرانیہ عورت سے نکاح کر لیا تھا جس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ سخت ناراض ہوئے' یہاں تک کہ قریب تھا انہیں کوڑے لگائیں۔ ان دونوں بزرگوں نے کہا کہ اے امیر المؤمنین آپ ناراض نہ ہوں ہم انہیں طلاق دے دیتے ہیں۔ آپ نے فرمایا' اگر طلاق دینی جائز ہے تو پھر نکاح بھی جائز ہونا چاہئے۔ میں انہیں تم سے چھین لوں گا اور ذلت کے ساتھ انہیں الگ کر دوں[1] گا۔ لیکن یہ حدیث نہایت ہی غریب ہے اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بالکل ہی غریب ہے۔ امام ابن جریر نے اہل کتاب عورتوں سے نکاح جائز ہونے پر اجماع[2] کیا ہے اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اس اثر کے بارے میں تحریر کیا ہے کہ یہ صرف سیاسی مصلحت کی بنا پر تھا تاکہ مسلمان عورتوں سے لوگ بے رغبتی نہ کریں یا اور کوئی حکمت عملی اس فرمان میں تھی۔ چنانچہ ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ جب حضرت حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو یہ فرمان ملا تو انہوں نے جواب میں لکھا کہ کیا آپ اسے حرام کہتے ہیں۔ خلیفۃ المسلمین رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جواب دیا کہ حرام تو نہیں مگر مجھے خوف ہے تم مؤمن عورتوں سے کیوں نہ نکاح کرو۔ اس روایت کی اسناد بھی صحیح ہے۔ ایک روایت میں ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ مسلمان مرد نصرانی عورت سے نکاح کر سکتا ہے لیکن نصرانی مرد کا نکاح مسلمان عورت سے نہیں ہو سکتا۔ اس روایت کی سند پہلی روایت سے زیادہ صحیح ہے۔ ابن جریر میں تو ایک مرفوع حدیث بھی باسناد مروی ہے کہ ہم اہل کتاب کی عورتوں سے نکاح کر لیں

[1] طلاق نکاح پر مرتب ہونے والی چیز ہے۔ اگر نکاح ہی نہیں ہوا تو طلاق کا سوال ہی غلط ہے۔ حضرت فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا مطلب یہی تھا کہ جب نکاح ہی صحیح نہیں ہوا تو طلاق دینے نہ دینے کا سوال کیسے اٹھایا جا سکے گا۔۱۲

[2] حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے تصریح کی ہے کہ مسلمانوں کو اہل کتاب سے نکاح کی جو اجازت دی تھی' اس میں بھی چند خاص شرائط ملحوظ تھیں کیونکہ اب وہ خصوصیات اہل کتاب میں موجود نہیں ہیں۔ اس لئے موجودہ وقت کے اہل کتاب سے نکاح جائز نہ ہوگا۔ اہل کتاب وہ ہیں جو کسی نبی مرسل پر ایمان رکھتے ہوں اور ایمان بھی ان تمام شرائط کے ساتھ جو ایمان میں مطلوب ہیں۔۱۲

لیکن اہل کتاب مرد مسلمان عورتوں سے نکاح نہیں کر سکتے لیکن اس کی سند میں کچھ کمزوری ہے۔ مگر اُمت کا اجماع اسی پر ہے۔ ابن ابی حاتم کی روایت میں ہے کہ حضرت فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اہل کتاب کے نکاح کو ناپسند کیا اور اس آیت کی تلاوت فرمادی۔ امام بخاری' حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ قول بھی نقل فرماتے ہیں کہ میں کسی شرک کو اس شرک سے بڑھ کر نہیں پاتا کہ وہ عورت کہتی ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام اس کے خدا ہیں۔ حضرت امام احمدؒ سے اس آیت کا مطلب پوچھا جاتا ہے تو آپ فرماتے ہیں' مراد اس سے عرب کی وہ مشرکہ عورتیں ہیں' جو بت پرست تھیں۔ پھر ارشاد ہوتا ہے کہ ایمان والی لونڈی شرک کرنے والی آزاد عورت سے اچھی ہے یہ فرمان حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں نازل ہوتا ہے۔ ان کی سیاہ رنگ لونڈی تھی۔ ایک مرتبہ غصہ میں آکر اسے تھپڑ مار دیا تھا۔ پھر گھبرائے ہوئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور واقعہ بیان کیا۔ آپ نے پوچھا' اس کا کیا حال ہے؟ کہا حضور وہ روزے رکھتی ہے۔ نماز پڑھتی ہے۔ اچھی طرح وضو کرتی ہے۔ خدا کی وحدانیت اور آپ ﷺ کی رسالت کی گواہی دیتی ہے۔ آپ نے فرمایا اے ابو عبداللہ پھر تو وہ ایماندار ہے۔ کہنے لگے یارسول اللہ ﷺ قسم ہے اس خدا کی جس نے آپ ﷺ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے۔ میں اسے آزاد کر دوں گا اور اتنا ہی نہیں بلکہ پھر اس سے نکاح بھی کرلوں گا۔ چنانچہ یہی کیا۔ جس پر بعض مسلمانوں نے انہیں طعنہ دیا۔ وہ چاہتے تھے کہ مشرکوں میں ان کا نکاح کرا دیں اور انہیں اپنی لڑکیاں بھی دیں تاکہ شرافت نسب قائم رہے۔ اس پر یہ فرمان نازل ہوا کہ مشرک آزاد عورت سے تو مسلمان لونڈی ہزار ہا درجہ بہتر ہے اور اسی طرح مشرک آزاد مرد سے مسلم غلام بھی بڑھ چڑھ کر ہے۔

ازدواجی رشتے اور آپ کی کچھ ہدایات ☆ عبد بن حمید میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا' عورتوں کے محض حسن پر فریفتہ ہو کر ان سے نکاح نہ کرلیا کرو' ممکن ہے کہ ان کا حسن انہیں مغرور کر دے' عورتوں کے مال کے پیچھے ان سے نکاح نہ کرلیا کرو۔ ممکن ہے مال انہیں سرکش کر دے۔ نکاح کرو تو دینداری دیکھا کرو۔ بدصورت سیاہ فام لونڈی بھی اگر وہ دیندار ہو تو بہت افضل ہے لیکن اس حدیث کے راویوں میں افریقی ضعیف ہے۔ بخاری مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا' چار باتیں دیکھ کر عورتوں سے نکاح کیا جاتا ہے ایک تو مال' دوسرے حسب نسب' تیسرے جمال و خوبصورتی' چوتھے دین۔ تم دینداری ٹٹولو' مسلم شریف میں ہے۔ دنیا کل کی کل ایک متاع ہے۔ متاع دنیا میں سب سے افضل چیز نیک بخت عورت ہے۔ پھر فرمان ہے کہ مشرک مردوں نکاح میں مسلمان عورتیں بھی نہ دو جیسے اور جگہ ہے: ﴿لَا هُنَّ حِلٌّ لَّهُمْ وَلَا هُمْ يَحِلُّوْنَ لَهُنَّ﴾ (الممتحنہ: ۱۰) نہ کافر عورتیں مسلمان مردوں کے لئے حلال نہ مسلمان مرد کافر عورتوں کے لئے حلال' پھر فرمان ہے کہ مؤمن مرد گو حبشی غلام ہو' مگر پھر بھی رئیس اور سردار آزاد کافر سے بہتر ہے۔ ان لوگوں کا میل جول ان کی صحبت' محبت دنیا' حفاظت دنیا اور دنیا طلبی اور دنیا کو آخرت پر ترجیح دینا سکھاتی ہے۔ جس کا انجام جہنم ہے اور اللہ تعالیٰ کے فرمان کی پابندی' اس کے حکموں کی تعمیل' جنت کی رہبری کرتی ہے۔ گناہوں کی مغفرت کا باعث بنتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے وعظ و نصیحت اور پند و عبرت کے لئے اپنی آیتیں واضح طور پر بیان فرمادیں۔

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ ۖ قُلْ هُوَ اَذًى ۙ فَاعْتَزِلُوا النِّسَآءَ فِي الْمَحِيْضِ

وَلَا تَقْرَبُوْهُنَّ حَتّٰى يَطْهُرْنَ ۚ فَاِذَا تَطَهَّرْنَ فَاْتُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ اَمَرَكُمُ اللّٰهُ ۗ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ ﴿۲۲۲﴾ نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ فَاْتُوْا حَرْثَكُمْ اَنّٰى شِئْتُمْ ۫ وَقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ ۗ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ مُّلٰقُوْهُ ۗ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۲۲۳﴾

اور لوگ آپ سے حیض کا حکم پوچھتے ہیں آپ فرما دیجئے کہ وہ گندی چیز ہے تو حیض میں تم عورتوں سے علیحدہ رہا کرو اور ان سے قربت مت کیا کرو جب تک کہ وہ پاک نہ ہو جائیں۔ پھر جب وہ اچھی طرح پاک ہو جائیں تو ان کے پاس آؤ جاؤ جس جگہ سے تم کو اللہ تعالیٰ نے اجازت دی ہے (یعنی آگے سے) یقیناً اللہ تعالیٰ محبت رکھتے ہیں توبہ کرنے والوں سے اور محبت رکھتے ہیں پاک صاف رہنے والوں سے تمہاری بیبیاں تمہارے لئے (بمنزلہ) کھیت (کے) ہیں سو اپنے میں جس طرح سے ہو کر چاہو آؤ اور آئندہ کے واسطے (بھی) اپنے لئے کچھ کرتے رہو اور اللہ سے ڈرتے رہو اور یقین رکھو کہ بیشک تم اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش ہونے والے ہو اور (اے محمد ﷺ) ایسے ایمانداروں کو خوشی کی خبر سنا دیجئے۔ ○

ایام حیض کے بعض احکام اور شریعت کی قائم کردہ حدود:

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ یہودی لوگ حائضہ عورتوں کو نہ اپنے ساتھ کھلاتے تھے نہ اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ صحابہؓ نے اس بارے میں حضور ﷺ سے سوال کیا' جس کے جواب میں یہ آیت اتری اور حضور ﷺ نے فرمایا' سوائے جماع کے اور سب کچھ حلال ہے۔ یہودی یہ سن کر کہنے لگے کہ انہیں تو ہماری مخالفت سے ہی غرض ہے۔ حضرت اسید بن حضیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت عباد بن بشر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہودیوں کا یہ کلام نقل کر کے کہا کہ حضور پھر ہمیں جماع کی بھی رخصت دی جائے۔ آپ کا چہرہ یہ سن کر متغیر ہو گیا۔ یہاں تک کہ اور صحابہؓ نے خیال کیا کہ آپ ان پر ناراض ہو گئے۔ جب یہ بزرگ جانے لگے تو آنحضرت ﷺ کے پاس کوئی بزرگ تحفتاً دودھ لے کر آئے۔ آپ نے ان کے پیچھے آدمی بھیج کر انہیں بلایا اور وہ دودھ پلایا۔ اب معلوم ہوا کہ وہ غصہ جاتا رہا۔ (مسلم) پس اس فرمان کا کہ حیض کی حالت میں عورتوں سے الگ رہو' یہ مطلب ہوا کہ خود حضور ﷺ بھی ایسی حالت میں ازدواج مطہرات سے ملتے جلتے تھے لیکن وہ تہبند باندھے ہوئے ہوتی تھیں (ابوداؤد) حضرت عمارہ کی پھوپھی صاحبہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے سوال کرتی ہیں کہ اگر عورت حیض میں ہو اور گھر میں میاں بیوی کا ایک ہی بستر ہو تو وہ کیا کرے؟ یعنی ایسی حالت میں اس کے ساتھ اس کا خاوند سو سکتا ہے یا نہیں؟ آپ نے فرمایا سنو! ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ گھر میں تشریف لائے' آتے ہی اپنی نماز کی جگہ تشریف لے گئے اور نماز میں مشغول ہو گئے۔ دیر زیادہ لگ گئی اور اس عرصہ میں مجھے نیند آ گئی۔ آپ کو جاڑا (سردی) لگنے لگی۔ تو آپ نے مجھے فرمایا' یہاں آؤ میں نے کہا' حضور میں تو حیض سے ہوں۔ آپ نے میرے گھٹنوں کے اوپر سے کپڑا ہٹانے کا حکم دیا اور پھر میری ران پر رخسار اور سینہ رکھ کر

لیٹ گئے۔ میں بھی آپ پر جھک گئی تو سردی کچھ کم ہوئی اور اس گرمی میں آپ کو نیند آ گئی صلی اللہ علیہ و آلہ واصحابہ وازواجہ وسلم۔

حضرت مسروقؒ ایک مرتبہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے پاس آئے اور کہا کہ: اَلسَّلَامُ عَلَى النَّبِيِّ وَعَلَىٰ اَهْلِهٖ۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے جواب دے کر مَرْحَبًا مَرْحَبًا کہا اور اندر آنے کی اجازت دی۔ آپ نے کہا' میں ایک مسئلہ پوچھتا ہوں' لیکن شرم معلوم ہوتی ہے۔ آپ نے فرمایا' سن میں تیری ماں ہوں۔ تو قائم مقام میرے بیٹے کے ہے۔ جو پوچھنا ہو پوچھ۔ کہا فرمایئے آدمی کو اپنی حائضہ بیوی سے کیا حلال ہے؟ فرمایا سوائے شرمگاہ کے اور سب جائز ہے۔ (ابن جریر) اور سندوں سے بھی مختلف الفاظ کے ساتھ حضرت ام المومنینؓ کا یہ قول نقل ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما' مجاہد' حسن اور عکرمہ کا فتویٰ بھی یہی ہے۔ مقصد یہ ہے کہ حائضہ عورت کے ساتھ لیٹنا بیٹھنا' اس کے ساتھ کھانا پینا وغیرہ امور بالاتفاق جائز ہیں۔

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے منقول ہے کہ میں نبی ﷺ کا سر دھویا کرتی۔ آپ میری گود میں ٹیک لگا کر قرآن شریف کی تلاوت فرماتے۔ حالانکہ میں حیض سے ہوتی تھی۔ میں ہڈی چوستی تھی اور آپ بھی اسی ہڈی کو وہیں منہ لگا کر چوستے تھے۔ میں پانی پیتی تھی' پھر گلاس آپ کو دیتی' آپ بھی وہیں منہ لگا کر اس گلاس سے وہی پانی پیتے اور میں اس وقت حائضہ ہوتی تھی۔ ابوداؤد میں روایت ہے کہ میرے حیض کے شروع دنوں میں آنحضرت ﷺ میرے ساتھ ایک ہی لحاف میں سوتے تھے۔ اگر آپ ﷺ کا کپڑا کہیں سے خراب ہو جاتا تو آپ اتنی جگہ کو دھو ڈالتے۔ اگر جسم مبارک پر کچھ لگ جاتا' تو اسے بھی دھو ڈالتے اور پھر انہیں کپڑوں میں نماز پڑھتے۔ ہاں ابوداؤد کی ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ حضرت صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں۔ میں جب حیض سے ہوتی تو بستر سے اتر جاتی اور بوریے پر آ جاتی نبی کریم ﷺ میرے قریب بھی نہ آتے۔ جب تک میں پاک نہ ہو جاؤں۔ تو یہ روایت محمول ہے کہ آپ پرہیز اور احتیاط کرتے تھے۔ نہ یہ کہ یہ محمول ہو حرمت اور ممانعت پر۔ بعض حضرات یہ فرماتے ہیں کہ تہبند ہوتے ہوئے فائدہ اٹھائے[1]۔ حضرت میمونہ بنت حارث ہلالیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی ﷺ جب اپنی کسی اہلیہ سے ان کی حیض کی حالت میں ملنا چاہتے تھے تو انہیں حکم دیتے تھے کہ تہہ بند باندھ لیں۔ (بخاری) اسی طرح بخاری و مسلم میں بھی یہ حدیث حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ حضور ﷺ سے ایک شخص سوال کرتا ہے کہ میری بیوی سے مجھے اس کے حیض کی حالت میں کیا کچھ حلال ہے؟ آپ نے فرمایا' تہبند کے اوپر کا کل (ابوداؤد وغیرہ) ایک اور روایت میں ہے کہ اس سے بھی بچنا بہتر ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا' حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما' حضرت سعید بن مسیب اور حضرت شریح رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا مذہب بھی یہی ہے۔ امام شافعی کے اس بارے میں دو اقوال ہیں' جن میں ایک یہ بھی ہے۔ اکثر عراقیوں وغیرہ کا بھی یہی مذہب ہے۔ یہ حضرات فرماتے ہیں کہ یہ تو متفقہ فیصلہ ہے کہ جماع حرام ہے۔ اس لئے اس کے آس پاس بھی بچنا ہی چاہئے تاکہ حرمت میں واقع ہونے کا خطرہ نہ رہے۔ حالت حیض میں جماع کی حرمت اور اس کام کے کرنے والے کا گنہگار ہونا تو یقینی امر ہے۔ جسے توبہ استغفار کرنا لازمی ہے لیکن اسے کفارہ بھی دینا پڑے گا یا نہیں؟ اس میں علماء کرام کے دو اقوال ہیں:

---

[1] یعنی مجامعت کے علاوہ اور سب کچھ کر سکتا ہے جیسا کہ بوس و کنار' تفخیذ وغیرہ لیکن یہ اجازت بھی اسی کے لئے جس کو اپنے نفس پر قدرت ہو اور جماع میں مبتلا ہونے کا خطرہ نہ ہو۔۱۲

① ایک تو یہ کہ کفارہ بھی ہے۔ چنانچہ مسند احمد اور سنن میں حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص اپنی حائضہ بیوی سے جماع کرے وہ ایک دینار یا آدھا دینار صدقہ دے۔ ترمذی میں ہے کہ خون اگر سرخ ہے تو ایک دینار اور زرد رنگ ہو تو آدھا دینار[1]۔ مسند احمد میں ہے کہ اگر خون تھم ہو رہا ہو اور ابھی عورت نے غسل نہ کیا ہو اور اس حالت میں اس کا خاوند اس سے ملے تو آدھا دینار ورنہ پورا دینار۔

② دوسرا قول یہ ہے کہ کفارہ کچھ بھی نہیں صرف اللہ عزوجل سے استغفار کرے۔ امام شافعی کا بھی آخری اور زیادہ صحیح یہی مذہب ہے اور جمہور علما بھی اسی کے قائل ہیں۔ جو حدیثیں اور بیان ہوئیں ان کی نسبت یہ حضرات فرماتے ہیں کہ ان کا مرفوع ہونا صحیح نہیں بلکہ صحیح یہی ہے کہ موقوف ہیں۔ گو یہ حدیث روایتاً مرفوع اور موقوف دونوں طرح منقول ہے لیکن اکثر ائمہ حدیث کی تحقیق ہے کہ صحیح بات یہی ہے کہ یہ موقوف ہے۔ یہ فرمان کہ جب تک عورتیں پاک نہ ہو جائیں ان کے قریب نہ جاؤ یہ تفسیر ہے اس فرمان کی کہ عورتوں سے ان کے حیض کی حالت میں جدا رہو۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جس وقت حیض ختم ہو جائے پھر نزدیکی حلال ہے۔

حضرت امام ابوعبداللہ احمد بن محمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں طہر یعنی پاکی دلالت کرتی ہے کہ اب اس سے نزدیکی جائز ہے۔ حضرت میمونہ اور حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا یہ فرمانا کہ ہم میں سے جب کوئی حیض سے ہوجاتی تو تہبند باندھ لیتی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ آپ کی چادر میں سوتی اس بات کو ثابت کرتا ہے کہ جس نزدیکی سے منع کیا گیا ہے وہ جماع کرنا ہے۔ ویسے سونا بیٹھنا وغیرہ سب جائز ہے۔ اس کے بعد یہ فرمان کہ ان کے پاک ہو جانے کے بعد ان کے پاس آؤ۔ اس میں ارشاد ہے کہ ان کے غسل کر لینے کے بعد ان سے جماع کرو۔ امام ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ہر حیض کی پاکیزگی کے بعد جماع واجب ہے۔ ان کی دلیل لفظ فَأْتُوهُنَّ ہے لیکن یہ دلیل کوئی پختہ نہیں۔ یہ امر تو صرف حرمت کو ہٹا دینے کا اعلان ہے اور اس کے سوا اس کی کوئی دلیل ان کے پاس نہیں۔

علمائے اصول میں سے بعض تو کہتے ہیں کہ امر یعنی حکم مطلقاً وجوب کے لئے ہوتا ہے۔ ان لوگوں کے لئے امام ابن حزم کا جواب بہت مشکل ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ امر حرف اباحت کے لئے ہے اور چونکہ اس سے پہلے ممانعت ہو چکی ہے۔ یہ قرینہ ہے جو امر کو وجوب سے ہٹا دیتا ہے لیکن یہ غور طلب بات ہے۔ دلیل سے جو بات ثابت ہے وہ یہ ہے کہ ایسے موقع پر یعنی پہلے منع ہو پھر حکم ہو۔ تو حکم اصل پر رہتا ہے یعنی جو بات منع سے پہلے جیسی تھی ویسی ہی اب ہو جائے گی یعنی منع سے پہلے اگر وہ کام واجب تھا تو اب بھی واجب ہی رہے گا۔ جیسے قرآن کریم میں ہے: ﴿فَإِذَا انْسَلَخَ الْأَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِينَ﴾ (التوبہ ۵) یعنی جب حرمت والے مہینے گزر جائیں تو مشرکوں سے جہاد کرو اور اگر وہ کام ممانعت سے پہلے مباح تھا تو اب بھی مباح رہے گا۔ جیسے: ﴿وَإِذَا حَلَلْتُمْ فَاصْطَادُوا﴾ (المائدہ ۲) جب تم احرام کھول دو تو شکار کھیلو اور جگہ ﴿فَإِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوا فِي الْأَرْضِ﴾ (الجمعہ ۱۰) یعنی جب نماز پوری ہو جائے تو زمین میں پھیل جاؤ۔ ان

[1] سرخ خون حیض کے بالکل ابتدا میں ہوتا ہے اور زرد رنگ کا خون ایام کے آخری اوقات میں۔ اس لئے ابتدا میں جماع کرنا بڑا جرم ہے۔ تو کفارہ بھی اس کا اس کے موافق ہونا چاہئے اور آخری اوقات میں حیض ختم ہو جانے کا بھی شبہ ہو جاتا ہے۔ اس لئے جرم کی نوعیت بھی ہلکی پڑنے کے ساتھ سزا میں بھی تخفیف ہوگی۔ ۱۲

علمائے کرام کا یہ فیصلہ ان مختلف اقوال کو جمع بھی کر دیتا ہے جو امر کے وجوب وغیرہ کے بارے میں ہیں۔ غزالی وغیرہ نے بھی اسے بیان کیا ہے اور بعض ائمہ متاخرین نے بھی اسے پسند کیا ہے اور یہی صحیح بھی ہے۔ یہ مسئلہ بھی یاد رہے کہ تمام علمائے امت کا اتفاق ہے کہ خون حیض کا آنا رک جائے مدت حیض گزر جائے پھر بھی اس کے خاوند کو اپنی بیوی سے مجامعت کرنی حلال نہیں جب تک غسل نہ کر لے۔ ہاں اگر معذور ہو اور غسل کے عوض تیمم کرنا اسے جائز ہو تو تیمم کر لے۔ اس کے بعد اس کے پاس اس کا خاوند آ سکتا ہے ہاں امام ابوحنیفہؒ ان تمام علماء کے مخالف[1] ہیں وہ فرماتے ہیں کہ جب حیض زیادہ سے زیادہ دنوں تک کی آخری میعاد یعنی دس دن تک رہ کر بند ہو گیا تو اس کے خاوند کو اس سے صحبت کرنا جائز ہے گو اس نے غسل نہ کیا ہو۔ واللہ اعلم۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ تو لفظ ہے یَطْهُرْنَ کا۔ اس سے مراد خون حیض کا بند ہونا ہے اور تَطَهَّرْنَ سے مراد غسل کرنا ہے۔ حضرت مجاہد حضرت عکرمہ حضرت حسن حضرت مقاتل بن حیان حضرت لیث بن سعدؒ وغیرہ بھی یہی فرماتے ہیں۔ پھر ارشاد ہوتا ہے اس جگہ سے آؤ جہاں کا حکم خدا نے تمہیں دیا ہے۔ مراد اس سے آگے کی جگہ ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما حضرت مجاہد وغیرہ بہت سے مفسرین نے اس کے یہی معنی بیان کئے ہیں کہ مراد اس سے بچوں کے تولد ہونے کی جگہ ہے۔ اس کے سوا اور جگہ یعنی پاخانہ کی جگہ جانا حرام ہے۔ ایسے کرنے والے حد سے تجاوز کرنے والے ہیں۔ صحابہ اور تابعین سے بھی یہ نقل ہے کہ مطلب یہ ہے کہ جس جگہ سے حالت حیض میں تم روکے گئے تھے اب وہ جگہ تمہارے لئے جائز ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ پاخانہ کی جگہ میں وطی کرنا حرام ہے۔ اس کا مفصل بیان آتا ہے ان شاء اللہ۔ یہ معنی بھی کئے گئے ہیں کہ پاکیزگی کی حالت میں آؤ جبکہ حیض سے وہ نکل جائیں اسی لئے اس کے بعد کے جملہ میں ہے کہ گناہوں سے توبہ کرنے والوں کو اس حالت میں جماع سے باز رہنے والوں کو اللہ تعالیٰ پسند فرماتا ہے اور گندگیوں اور ناپاکیوں سے بچنے والوں حیض کی حالت میں اپنی بیویوں سے نہ ملنے والوں اسی طرح دوسری جگہ سے محفوظ رہنے والوں کو بھی پروردگار اپنا محبوب بنا لیتا ہے۔ پھر فرمایا کہ تمہاری عورتیں تمہاری کھیتیاں ہیں یعنی اولاد ہونے کی جگہ تم اپنی کھیتی میں جیسے بھی چاہو آؤ۔ یعنی جگہ تو وہی ایک ہو طریقہ خواہ کوئی ہو۔ سامنے کر کے یا اس کے خلاف۔ صحیح بخاری میں ہے کہ یہود کہتے تھے کہ جب عورت سے مجامعت سامنے رخ کر کے نہ کی جائے اور حمل ٹھہر جائے تو بچہ بھینگا پیدا ہوتا ہے۔ ان کی تردید میں یہ جملہ نازل ہوا کہ مرد کو اختیار ہے۔

ابن ابی حاتم میں کہ یہودیوں نے یہی بات مسلمانوں سے بھی کہی تھی۔ ابن جریج فرماتے ہیں کہ آیت نازل ہونے کے بعد رسول اللہ ﷺ نے اختیار دیا کہ خواہ سامنے سے آؤ خواہ پیچھے کی طرف سے لیکن جگہ ایک ہی رہے۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ آپ سے ایک شخص نے پوچھا کہ ہم اپنی عورتوں کے پاس کیا آئیں اور کیا چھوڑیں؟ آپ نے فرمایا وہ تیری کھیتی

---

[1] قرآن کریم میں حتی یطھرن کی قراءت دو طرح پر ہے۔ ایک تخفیف کے ساتھ اور دوسری قراءت تشدید کے ساتھ۔ دونوں قراتوں کے تقاضے جدا جدا ہیں۔ ہر دو میں توفیق کی یہی صورت ہو سکتی ہے۔ جو امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ نے فرمائی یعنی دس روز سے کم میں اگر حیض بند ہو جائے تو غسل سے قبل جماع ہرگز جائز نہیں اور اگر دس روز کے بعد ختم ہو جو حیض کی اکثر مدت ہے تو پھر بغیر غسل کے بھی مجامعت کی اجازت ہو گی۔ ساتھ ہی اس اجازت میں یہ بات بھی ملحوظ رکھنی چاہئے کہ بعض شوہر زیادہ دیر تک مجامعت سے رک نہیں سکتے۔ اس لئے شرعی حدود کو باقی رکھتے ہوئے ان کے لئے کوئی صورت نکالنا عین حکمت و تفقہ ہے۔ ۱۲

ہے جس طرح چاہ آ۔ ہاں اس کے منہ پر نہ مار زیادہ برا نہ کہہ۔ اس سے روٹھ کر الگ نہ ہو۔ ایک ہی گھر میں رہ (احمد وسنن) ابن ابی حاتم میں ہے کہ حمیر کے قبیلہ کے ایک آدمی نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ مجھے اپنی بیویوں سے زیادہ محبت ہے تو اس کے بارے میں احکام مجھے بتایئے۔ اس پر یہ حکم نازل ہوا۔ مسند احمد میں ہے کہ چند انصاریوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ پوچھا تھا۔ طحاوی کی کتاب مشکل الحدیث میں ہے کہ ایک شخص نے اپنی بیوی سے اسے الٹا لٹا کر مباشرت کی تھی۔ لوگوں نے اسے برا بھلا کہا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ ابن جریر میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن سابط رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضرت حفصہ بنت عبدالرحمن بن ابی بکر کے پاس آئے اور کہا میں ایک مسئلہ پوچھنا چاہتا ہوں لیکن شرم آتی ہے۔ فرمایا' بھتیجے تم نہ شرماؤ اور جو پوچھنا چاہو پوچھ لو۔ کہا فرمایئے عورتوں کے پیچھے کی طرف سے جماع کرنا جائز ہے؟ فرمایا سنو! مجھ سے حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے فرمایا ہے کہ انصار عورتوں کو اُلٹا لٹایا کرتے تھے اور یہود کہتے تھے کہ اس طرح سے بچہ بھینگا پیدا ہوتا ہے۔ جب مہاجر مدینہ شریف آئے اور یہاں کی عورتوں سے ان کا نکاح ہوا اور انہوں نے بھی یہی کرنا چاہا' تو ایک عورت نے اپنے خاوند کی یہ بات نہ مانی اور کہا' جب تک میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں یہ واقعہ بیان نہ کرلوں' تیری بات نہ مانوں گی۔ چنانچہ وہ دربار نبوت میں حاضر ہوئی۔ ام سلمہ نے بٹھایا اور کہا' ابھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم آ جائیں گے۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے' یہ عورت شرمندگی کی وجہ سے نہ پوچھ سکی اور واپس چلی گئی لیکن حضرت ام سلمہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا انصاریہ عورت کو بلاؤ۔ پھر یہ آیت پڑھ کر سنائی اور فرمایا جگہ ایک ہی ہو۔

مسند احمد میں ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ حضور میں تو ہلاک ہوگیا۔ آپ نے پوچھا کیا بات ہے۔ کہا میں نے رات کو اپنی سواری الٹی کردی۔ آپ نے کچھ جواب نہ دیا۔ اسی وقت یہ آیت نازل ہوئی اور آپ نے فرمایا سامنے سے آ' یا پیچھے سے آ اختیار ہے لیکن حالت حیض میں نہ آ اور پاخانہ کی جگہ نہ آ انصاری والا واقعہ قدرے تفصیل کے ساتھ بھی مروی ہے اور اس میں یہ بھی ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کو خدا بخشے' انہیں کچھ وہم سا ہوگیا۔ بات یہ ہے کہ انصاریوں کی جماعت پہلے بُت پرست تھی اور یہودی اہل کتاب تھے۔ بت پرست لوگ ان کی فضیلت اور علمیت کے قائل تھے اور اکثر افعال میں ان کی بات مانا کرتے تھے۔ یہودی ایک طرح اپنی بیویوں سے ملتے تھے۔ یہی عادت ان انصار کی بھی تھی۔ اس کے برخلاف مکہ والے کسی خاص طریقہ کے پابند نہ تھے۔ وہ جس طرح سے جی چاہتا ملتے۔ اسلام کے بعد مکہ والے مہاجرین مدینہ میں جب آئے تو ایک مکی مہاجر نے ایک مدنی انصاریہ عورت سے نکاح کیا اور مجامعت میں اپنا پسندیدہ طریقہ اختیار کرنا چاہا۔ عورت نے انکار کردیا اور صاف کہہ دیا کہ اسی ایک مقررہ طریقہ کے علاوہ میں اجازت نہیں دیتی۔ بات بڑھتے بڑھتے حضور تک پہنچی اور یہ فرمان نازل ہوا۔ پس سامنے سے پیچھے کی طرف سے جس طرح چاہے' اختیار ہے ہاں جگہ ایک ہی ہو۔

حضرت مجاہد رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں' میں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے قرآن شریف سیکھا۔ اوّل سے آخر تک انہیں سنایا۔ ایک ایک آیت کی تفسیر اور مطلب پوچھا۔ اس پر پہنچ کر جب میں اس کا مطلب پوچھا تو انہوں نے یہی بیان کیا (جو اوپر گزرا) ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا وہم یہ تھا کہ بعض روایتوں میں ہے کہ آپ قرآن پڑھتے ہوئے کسی سے بولتے چالتے نہ تھے لیکن ایک دن تلاوت کرتے ہوئے جب اس آیت تک پہنچے' تو اپنے شاگرد حضرت نافع سے فرمایا' جانتے

ہو یہ آیت کس بارے میں نازل ہوئی؟ انہوں نے کہا نہیں۔ فرمایا' یہ عورتوں کی دوسری جگہ کی وطی کے بارے میں اُتری ہے۔
ایک روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا' ایک شخص نے اپنی بیوی سے پیچھے سے کیا تھا۔ جس پر اس آیت میں رخصت نازل ہوئی لیکن ایک تو اس میں محدثین نے کچھ علت بھی بیان کی ہے۔ دوسرے اس کے معنی بھی یہی ہو سکتے ہیں کہ پیچھے کی طرف سے آگے کی جگہ میں کیا اور اُوپر کی جو روایتیں ہیں وہ بھی سند اً صحیح نہیں بلکہ انہی حضرت نافع سے نقل ہے کہ ان سے کہا گیا کہ کیا آپ یہ کہتے ہیں کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے' وطی دبر کو جائز کیا ہے؟ تو فرمایا لوگ جھوٹ کہتے ہیں۔ پھر وہی انصاریہ عورت اور مہاجر مرد والا واقعہ بیان کیا اور فرمایا حضرت عبداللہ تو اس آیت کا یہ مطلب ارشاد فرماتے تھے۔ اس روایت کی اسناد بھی بالکل صحیح ہیں اور اس کے خلاف کی سند صحیح نہیں۔ معنی مطلب بھی اور ہو سکتا ہے اور خود حضرت ابن عمرؓ نے اس کے خلاف بھی نقل ہے اور وہ روایتیں عنقریب بیان ہوں گی ان شاء اللہ جن میں ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ نہ یہ مباح ہے نہ حلال ہے بلکہ حرام ہے۔ گو یہ قول یعنی جواز کا بعض فقہائے مدینہ وغیرہ کی طرف بھی منسوب ہے اور بعض لوگوں نے تو اسے امام مالک کی طرف بھی منسوب کیا ہے لیکن اکثر لوگ اس کا انکار کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ امام صاحب کا قول ہرگز یہ نہیں۔ صحیح حدیثیں بکثرت اس فعل کی حرمت پر وارد ہیں۔

ایک روایت میں ہے لوگو! شرم و حیا کرو۔ اللہ تعالیٰ حق بات فرمانے سے شرم نہیں کرتا۔ عورتوں کے پاخانہ کی جگہ میں وطی نہ کرو۔ دسری روایت میں ہے کہ آپ نے اس حرکت سے لوگوں کو منع فرمایا۔ (مسند احمد) اور روایت میں ہے کہ جو شخص کسی عورت یا مرد کے ساتھ یہ کام کرے اس کی طرف اللہ تعالیٰ نظر رحمت سے نہیں دیکھے گا۔ (ترمذی) حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے ایک شخص یہ مسئلہ پوچھتا ہے تو آپ فرماتے ہیں کہ کیا تو کفر کے کرنے کی بابت سوال کرتا ہے؟ ایک شخص نے آ کر آپ سے کہا کہ میں نے ﴿اَنّٰى شِئْتُمْ﴾ کا یہ مطلب سمجھا اور میں نے اس پر عمل کیا تو آپ بہت ناراض ہوئے' اسے برا بھلا کہا اور فرمایا کہ مطلب یہ ہے کہ خواہ کھڑے ہو کر خواہ بیٹھ کر۔ خواہ چت یا پٹ لیکن جگہ وہی ایک ہو۔ ایک اور مرفوع حدیث میں ہے کہ جو شخص اپنی بیوی سے پاخانہ کی جگہ میں وطی کرے وہ چھوٹا لوطی ہے (مسند احمد) حضرت ابوداؤد رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ یہ کفار کا کام ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمروؓ بن عاص کا یہ فرمان بھی منقول ہے اور یہی زیادہ صحیح ہے۔ واللہ اعلم۔

☆ **الرحم الراحمین کی نظر لطف و کرم سے محروم** رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں' سات قسم کے لوگ ہیں' جن کی طرف اللہ تعالیٰ قیامت کے دن نظر رحمت سے نہیں دیکھے گا اور نہ انہیں پاک کرے گا اور ان سے فرمائے گا کہ جہنمیوں کے ساتھ جہنم میں چلے جاؤ۔ ایک تو اغلام بازی کرنے والا' خواہ وہ اوپر کرنے والا ہو خواہ نیچے کرنے والا ہو اور اپنے ہاتھ سے حاجت روائی (مشقت زنی) کرنے والا اور چوپائے جانور سے یہ کام کرنے والا اور عورت کی دبر میں وطی کرنے والا اور عورت اور اس کی بیٹی دونوں سے نکاح کرنے والا اور اپنے پڑوسی کی بیوی سے زنا کرنے والا اور ہمسایہ کو ستانے والا' یہاں تک کہ وہ اس پر لعنت کرے لیکن س کی سند میں ابن لہیعہ اور ان کے استاد دونوں ضعیف ہیں مسند کی ایک حدیث میں ہے کہ جو شخص اپنی بیوی سے دوسرے راستے میں وطی کرتا ہے اس کو اللہ تعالیٰ نظر رحمت سے نہیں دیکھتا (مسند) مسند احمد اور سنن میں مروی ہے کہ جو شخص حائضہ عورت سے جماع کرے یا غیر جگہ کرے یا کاہن کے پاس جائے اور اسے سچا سمجھے اس نے اُس چیز کے ساتھ کفر کیا جو محمد ﷺ کے اوپر اُتاری ہے۔ امام ترمذی فرماتے ہیں کہ امام بخاری اس حدیث کو ضعیف بتلاتے ہیں۔ ترمذی میں روایت ہے کہ ابوسلمہ بھی دبر

کی وطی کو حرام بتاتے ہیں۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں' لوگوں کا اپنی بیویوں سے یہ کام کرنا کفر ہے (نسائی) ایک مرفوع حدیث میں بھی اس معنی کی ہے لیکن زیادہ صحیح اس کا موقوف ہونا ہی ہے اور روایت میں ہے کہ یہ جگہ حرام ہے۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہما بھی یہی فرماتے ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے جب یہ بات پوچھی گئی تو آپ نے فرمایا' بڑا کمینہ ہے وہ شخص' دیکھو قرآن میں ہے کہ لوطیوں سے کہا گیا' تم وہ بدکاری کرتے ہو' جس کی طرف کسی نے تم سے پہلے توجہ تک نہ کی۔ پس صحیح حدیثوں سے اور صحابہ کرامؓ سے بہت سی روایتوں اور سندوں سے اس فعل کی حرمت نقل ہے۔ یہ بھی یاد رہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما بھی اسے حرام ہی کہتے ہیں۔ چنانچہ دارمی میں ہے کہ آپ سے ایک مرتبہ یہ سوال ہوا تو آپ نے فرمایا کیا مسلمان بھی ایسا کر سکتا ہے؟ اس کی اسناد صحیح ہیں اور حکم بھی حرمت کا صاف ہے پس غیر صحیح اور مختلف معنی والی روایتوں میں پڑ کر اتنے بڑے جلیل القدر صحابی کی طرف ایک ایسا گندہ مسئلہ منسوب کرنا ٹھیک نہیں۔ گو روایتیں تو اس قسم کی بھی ملتی ہیں۔ رہے امام مالک' سو ان کی طرف بھی اس مسئلہ کی نسبت صحیح نہیں۔ بلکہ معمر بن عیسیٰ فرماتے ہیں کہ امام صاحب اسے حرام جانتے تھے۔ اسرائیل ابن روح نے آپ سے ایک مرتبہ یہی سوال کیا تو آپ نے فرمایا تم بے سمجھ ہو' بوائی کھیت میں ہی ہوتی ہے' خبردار شرم گاہ کے سوا اور جگہ سے بچو۔ سائل نے کہا' حضرت لوگ تو کہتے ہیں کہ آپ اس فعل کو جائز کہتے ہیں۔ آپ نے فرمایا جھوٹے ہیں مجھ پر تہمت باندھتے ہیں۔ امام مالک سے اس کی حرمت ثابت ہے۔

امام ابو حنیفہ' شافعی' احمد اور ان کے تمام شاگرد اور ساتھی سعید مسیب ابو سلمہ' عکرمہ' طاؤس' عطا' سعید بن جبیر' عروہ بن زبیر' مجاہد بن جبر' حسن وغیرہ سلف صالحین رحمۃ اللہ علیہم سب کے سب اسے حرام کہتے ہیں اور اس بارے میں سخت تشدد کرتے ہیں بلکہ بعض تو اسے کفر کہتے ہیں۔ جمہور علمائے کرام کا بھی اس کی حرمت پر اجماع ہے۔ گو بعض لوگوں نے فقہائے مدینہ بلکہ امام مالکؒ سے بھی اس کی حلت نقل کی ہے لیکن یہ صحیح نہیں۔ عبدالرحمٰن بن قاسم کا قول ہے کہ کسی دیندار شخص کو میں نے تو اس حرمت میں شک کرنے والا نہیں پایا۔ پھر ﴿نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ﴾ پڑھ کر فرمایا' خود یہ لفظ ''حرث'' ہی اس کی حرمت ظاہر کرنے کے لئے کافی ہے کیونکہ وہ دوسری جگہ کھیتی کی نہیں کھیتی میں جانے کے طریقہ کا اختیار ہے نہ کہ جگہ بدل لینے کا۔ گو امام مالکؒ سے اس کے مباح ہونے کی روایتیں بھی منقول ہیں لیکن ان کی سندوں میں سخت ضعف ہے واللہ اعلم۔ ٹھیک اسی طرح امام شافعی سے بھی ایک روایت لوگوں نے گھڑ لی ہے حالانکہ انہوں نے اپنی چھ کتابوں میں کھلے لفظوں میں اسے حرام لکھا ہے۔ پھر فرماتا ہے' اپنے لئے کچھ آگے بھی بھیجو یعنی ممنوعات سے بچو' نیکیاں کرو تاکہ ثواب آگے جائے۔ اللہ سے ڈرو۔ اس سے ملنا ہے وہ حساب کتاب لے گا۔ ایماندار ہر حال میں خوشیاں منائیں۔ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں' یہ بھی مطلب ہے کہ جماع کا ارادہ کرے یہ دعا پڑھے: ((بِسْمِ اللّٰهِ اَللّٰهُمَّ جَنِّبْنَا الشَّيْطٰنَ وَجَنِّبِ الشَّيْطٰنَ مَا رَزَقْتَنَا)) یعنی خدایا تو ہمیں اور ہماری اولاد کو شیطان سے بچالے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ اگر اس جماع سے نطفہ قرار پکڑ گیا تو اس بچے کو شیطان ہرگز کوئی ضرر نہ پہنچا سکے گا۔

وَلَا تَجْعَلُوا اللّٰهَ عُرْضَةً لِّاَيْمَانِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْا وَتَتَّقُوْا وَتُصْلِحُوْا بَيْنَ النَّاسِ ۭ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۲۴﴾ لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ

وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوْبُكُمْ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ﴿۲۲۵﴾

اور اللہ کو اپنی قسموں کے ذریعہ سے ان امور کا حجاب مت بناؤ کہ تم نیکی اور تقویٰ کے اور اصلاح فیما بین خلق کے کام کرو اور اللہ تعالیٰ سب کچھ سنتے جانتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ تم پر (آخرت میں) داروگیر نہ فرمائیں گے تمہاری قسموں میں (ایسی) بیہودہ قسم پر لیکن داروگیر فرمائیں گے اس (جھوٹی قسم) پر جس میں تمہارے دلوں نے (جھوٹ بولنے کا) ارادہ کیا ہے اور اللہ تعالیٰ غفور ہیں حلیم ہیں۔

خدا کی ذاتِ گرامی کی قسمیں کھانا بہت برا ہے:

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ نیکی اور صلہ رحمی کی چھوڑنے کے لئے خدا کی قسموں کو نشانہ نہ بناؤ جیسے اور جگہ ہے: ﴿وَلَا يَاْتَلِ اُولُوا الْفَضْلِ مِنْكُمْ وَالسَّعَةِ ....﴾ (النور:۲۲) یعنی وہ لوگ جو کشادہ حال اور فارغ البال ہیں وہ قرابت داروں مسکینوں اور راہ اللہ میں ہجرت کرنے والوں کو نہ دینے پر نہ قسمیں کھا بیٹھیں۔ انہیں چاہئے کہ معاف کرنے اور درگزر کرنے کی عادت ڈالیں۔ کیا تمہاری خودخواہش نہیں کہ خدا تمہیں بخشے۔ ایسی قسم اگر کوئی کھا بیٹھے تو اسے چاہئے کہ اسے توڑ دے اور کفارہ ادا کر دے۔ صحیح بخاری شریف کی حدیث میں ہے کہ ہم پیچھے آنے والے ہیں لیکن قیامت کے دن سب سے آگے بڑھنے والے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ تم میں سے کوئی ایسی قسم کھا لے اور کفارہ ادا نہ کرے اور اس پر اڑا رہے وہ بڑا گنہگار ہے۔ یہ حدیث اور بھی بہت سی سندوں سے بہت سی کتابوں میں موجود ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما بھی اس آیت کی تفسیر میں یہی فرماتے ہیں۔ حضرت مسروق وغیرہ بہت سے مفسرین سے بھی نقل ہے۔ ان جمہور کے اس قول کی تائید اس حدیث سے بھی ہوتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں۔ خدا کی قسم ان شاء اللہ میں اگر کوئی قسم کھا بیٹھوں گا اور اس کے توڑنے میں مجھے بھلائی نظر آئے گی تو میں قطعاً اسے توڑ دوں گا اور اس قسم کا کفارہ ادا کروں گا۔ حضور ﷺ نے ایک مرتبہ حضرت عبدالرحمٰن بن سمرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فرمایا' اے عبدالرحمٰن سرداری' امانت اور امامت کی طلب نہ کر۔ اگر بغیر مانگے تو دیا جائے گا تو خدا کی جانب سے تیری مدد کی جائے گی اور اگر تو نے آپ مانگ کر لی ہے تو تجھے اس کی طرف سونپ دیا جائے گا۔ تو اگر کوئی قسم کھا لے اور اس کے خلاف میں بھلائی دیکھے تو اپنی قسم کا کفارہ دے دے اور اس نیک کام کو کر لے۔ (صحیحین)

صحیح مسلم میں حدیث ہے کہ جو شخص کوئی قسم کھا لے پھر اس کے سوا خوبی نظر آئے تو اسے چاہئے کہ اس خوبی والے کام کو کر لے اور اپنی اس قسم کو توڑ دے اور اس کا کفارہ دے دے۔ مسند احمد کی ایک روایت میں ہے کہ اس کا چھوڑ دینا ہی اس کا کفارہ ہے۔ ابوداؤد میں ہے نذر اور قسم اس چیز میں نہیں جو انسان کی ملکیت میں نہ ہو اور نہ خدا تعالیٰ کی نافرمانی میں ہے اور نہ رشتہ ناتوں کو توڑنے میں۔ جو شخص کوئی قسم کھا لے اور نیکی اس کے کرنے میں نہ ہو تو وہ قسم کو چھوڑ دے اور نیکی کا کام کرے۔ اس قسم کو چھوڑ دینا ہی اس کا کفارہ ہے۔ امام ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں' کل کی کل حدیثوں میں یہ لفظ ہیں کہ اپنی ایسی قسم کا کفارہ دے۔ ایک ضعیف حدیث میں ہے کہ اپنی ایسی قسم کا پورا کرنا یہی ہے کہ اسے توڑ دے اور اس سے رجوع کر لے۔ ابن عباس' سعید بن مسیب' مسروق اور شعبی رحمۃ اللہ علیہم بھی اس کے قائل ہیں کہ ایسے شخص کے ذمے کفارہ نہیں۔ پھر فرماتا ہے جو قسمیں تمہارے منہ سے بغیر قصد اور ارادے کے عادۃً نکل جائے' ان پر پکڑ نہیں۔ بخاری و مسلم کی حدیث میں ہے جو شخص لات اور عزیٰ کی قسم کھا بیٹھے وہ لا الٰہ الا اللہ پڑھ لے۔ یہ ارشاد حضور ﷺ کا ان کو ہوا تھا جو ابھی ابھی اسلام لائے تھے اور جاہلیت

کے زمانہ کی قسمیں ان کی زبانوں پر چڑھی ہوئی تھیں۔ تو ان سے فرمایا اگر عادتاً کبھی ایسے شرکیہ الفاظ نکل جائیں تو فوراً کلمہ توحید پڑھ لیا کرو تا کہ بدلہ ہو جائے۔ پھر فرماتا ہے۔ ہاں جو قسمیں پختگی کے ساتھ دل کی ارادت کے ساتھ قصداً کھائی جائیں' ان پر پکڑ ہے۔ دوسری آیت کے لفظ: ﴿بِمَا عَقَّدْتُّمُ الْاَيْمَانَ﴾ (المائدہ:۸۹) ہیں۔

ابوداؤد میں بروایت حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا ایک مرفوع حدیث میں موجود ہے جو اور روایتوں میں موقوف وارد ہوئی ہے کہ یہ لغو قسمیں وہ ہیں جو انسان اپنے گھر بار میں بال بچوں میں کہہ دیا کرتا ہے کہ ہاں خدا کی قسم اور نہیں خدا کی قسم۔ غرض بطور تکیہ کلام کے یہ لفظ نکل جاتے ہیں۔ دل میں اس کی پختگی کا خیال بھی نہیں ہوتا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے یہ بھی نقل ہے کہ یہ وہ قسمیں ہیں جو ہنسی ہنسی میں انسان کے منہ سے نکل جاتی ہیں۔ ان پر کفارہ نہیں۔ ہاں جو ارادے کے ساتھ قسم ہو۔ پھر اس کا خلاف کرے تو کفارہ ادا کرنا پڑے گا۔ آپ کے علاوہ اور بھی بعض صحابہ اور تابعین نے یہی تفسیر اس آیت کی بیان کی ہے۔ یہ بھی نقل ہے کہ ایک آدمی اپنی تحقیق پر بھروسہ کر کے کسی معاملہ کی نسبت قسم کھا بیٹھے اور حقیقت میں وہ معاملہ یوں نہ ہو تو قسمیں لغو ہیں۔ یہ معنی بھی دیگر بہت سے حضرات سے نقل ہیں ایک حسن حدیث میں ہے جو مرسل ہے' کہ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ تیراندازوں کی ایک جماعت کے پاس جا کھڑے ہو گئے وہ تیراندازی کر رہے تھے اور ایک شخص کبھی کہتا تھا خدا کی قسم اس کا تیر نشانے پر لگے گا۔ کبھی کہتا تھا خدا کی قسم یہ خطا کرے گا۔ آپ کے صحابی نے کہا' دیکھئے حضور ﷺ اس کی قسم کے خلاف ہوا۔ آپ نے فرمایا یہ قسمیں لغو ہیں۔ ان پر کفارہ نہیں اور نہ کوئی سزا یا عذاب ہے بعض بزرگوں نے فرمایا ہے' یہ وہ قسمیں ہیں جو انسان کھا لیتا ہے پھر خیال نہیں رہتا۔ یا کوئی شخص اپنے لئے کسی کام کے نہ کرنے پر کوئی بددعائیہ کلمات اپنی زبان سے نکال دیتا ہے وہ بھی لغو میں داخل ہے۔ یا غصے اور غضب کی حالت بے ساختہ زبان سے قسم نکل جائے یا حلال کو حرام یا حرام کو حلال کر لے تو اسے چاہئے کہ ان قسموں کی پروا نہ کرے اور خدا کے احکام کے خلاف نہ کرے حضرت سعید بن مسیّب سے روایت ہے کہ انصار کے دو شخص جو آپس میں بھائی بھائی تھے۔ ان کے درمیان کچھ میراث کا مال تھا۔ تو ایک نے دوسرے سے کہا اب اس مال کو تقسیم کر دو۔ دوسرے نے کہا اگر تو نے تقسیم کرنے کو کہا تو میرے تمام مال کعبہ کا خزانہ ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہ واقعہ سن کر فرمایا کہ کعبہ ایسے مال سے غنی ہے۔ اپنی قسم کا کفارہ دے اور اپنے بھائی سے بول چال۔ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی رشتے ناتوں کے کاٹنے اور جس چیز کی ملکیت نہ ہو' اس میں نہ قسم ہے نہ نذر پھر فرماتا ہے تمہارے دل جو کریں اس پر گرفت ہے۔ یعنی اپنے جھوٹ کا علم ہو اور پھر قسم کھانے۔ اور جگہ ہے: ﴿وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا عَقَّدْتُّمُ الْاَيْمَانَ﴾ یعنی جو تم مضبوط اور تاکید والی قسم کھا لو۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو بخشنے والا اور ان پر حلم و کرم کرنے والا ہے۔

لِلَّذِيْنَ يُؤْلُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ تَرَبُّصُ اَرْبَعَةِ اَشْهُرٍ ۚ فَاِنْ فَآءُوْ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲۲۶﴾ وَاِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ فَاِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۲۷﴾

جو لوگ قسم کھا بیٹھتے ہیں اپنی بیبیوں (کے پاس جانے) سے ان کے لئے چار مہینے تک کی مہلت ہے سو اگر یہ لوگ (قسم توڑ کر عورت کی طرف) رجوع کر یں تو اللہ تعالیٰ معاف کر دیں گے رحمت فرمائیں گے اور اگر بالکل چھوڑ ی

ہی دینے کا پختہ ارادہ کرلیا ہے تو اللہ تعالیٰ سنتے ہیں جانتے ہیں۔ ○

ایلاء کے احکام ☆

ایلا کہتے ہیں قسم کو۔ اگر کوئی شخص اپنی بیوی سے مجامعت نہ کرنے کی ایک مدت تک کے لئے قسم کھالے۔ تو دوصورتیں ہیں یا تو وہ مدت چار مہینے سے کم ہوگی یا زیادہ ہوگی۔ اگر کم ہو تو وہ مدت پوری کرے اور اس درمیان میں عورت بھی صبر کرے۔ اس سے مطالبہ اور سوال نہیں کرسکتی۔ پھر میاں بیوی آپس میں ملیں جلیں جیسے کہ صحیح بخاری صحیح مسلم کی حدیث میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ماہ کے لئے قسم کھائی تھی اور انتیس دن پورے الگ رہے اور فرمایا مہینہ انتیس دن کا بھی ہوتا ہے اور چار مہینے کی زائد مدت کے لئے قسم کھائی ہو تو چار ماہ کے بعد عورت کو حق حاصل ہے کہ وہ تقاضا اور مطالبہ کرے کہ وہ یا تو میل ملاپ کرلے یا طلاق دے دے اور حاکم اس خاوند کو ان دو باتوں میں سے ایک کے کرنے پر مجبور کرے گا تاکہ عورت کو ضرر نہ پہنچے۔ یہی بیان ہو رہا ہے کہ جو لوگ اپنی بیویوں سے ایلاء کریں گے۔ یعنی ان سے مجامعت کرنے کی قسم کھائیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ ایلاء خاص ہے بیویوں کے لئے لونڈیوں کے لئے نہیں۔ یہی مذہب جمہور علمائے کرام کا ہے۔ یہ لوگ چار مہینے تک تو آزاد ہیں۔ اس کے بعد انہیں مجبور کیا جائے گا کہ یا تو وہ اپنی بیویوں سے مل لیں یا طلاق دے دیں۔ یہ نہیں کہ اب بھی وہ اسی طرح چھوڑے رہیں۔ پھر اگر وہ لوٹ آئیں یہ کنایہ ہے جماع کرنے سے 'تو اللہ تعالیٰ بھی بخش دے گا' اور جو تقصیر عورت کے حق میں ان سے ہوئی ہے' اسے اپنی مہربانی سے معاف کردے گا۔ اس میں دلیل ہے ان علماء کی' جو کہتے ہیں کہ اس صورت میں خاوند کے ذمہ کفارہ کچھ بھی نہیں۔ امام شافعی رحمتہ اللہ علیہ کا بھی پہلا قول یہی ہے۔ اس کی تائید اس حدیث سے بھی ہوتی ہے جو اگلی آیت کی تفسیر میں گزر چکی ہے کہ قسم کھانے والا اگر اپنی قسم کے توڑ ڈالنے پر نیکی دیکھتا ہو تو توڑ ڈالے' یہی اس کا کفارہ ہے اور علماء کرام کی ایک دوسری جماعت کا یہ مذہب ہے کہ اسے قسم کا کفارہ دینا پڑے گا۔ اس کی حدیثیں بھی اوپر گزر چکی ہیں اور جمہور کا مذہب بھی یہی ہے۔ واللہ اعلم۔ پھر فرمان ہے کہ اگر چار ماہ گزر جانے کے باوجود وہ طلاق دینے کا قصد کرے' اس سے ثابت ہوتا ہے کہ چار مہینے گزرتے ہی طلاق نہیں پڑ جائے گی۔ جمہور متاخرین کا یہی مذہب ہے۔ گویا ایک دوسری جماعت یہ بھی کہتی ہے کہ بمجرد چار ماہ گزرنے کے طلاق ہو جائے گی۔ حضرت عمر' حضرت عثمان' حضرت ابن مسعود' حضرت ابن عباس' حضرت ابن عمر' حضرت زید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہم اور بعض تابعین سے یہی نقل ہے۔ پھر بعض تو کہتے ہیں یہ طلاق رجعی ہوگی۔ بعض کہتے ہیں بائن ہوگی۔ جو لوگ طلاق پڑنے کے قائل ہیں' وہ فرماتے ہیں کہ اس کے بعد اُسے عدت بھی گزارنی پڑے گی۔ ہاں ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما اور ابو الشعثاء رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ اگر ان چار مہینوں میں اس عورت کو تین حیض آ گئے ہیں تو اس پر عدت بھی نہیں ہے۔ امام شافعی رحمتہ اللہ علیہ کا بھی قول یہی ہے لیکن جمہور متاخرین علماء کا فرمان یہی ہے کہ اس مدت کے گزرتے ہی طلاق واقع نہ ہوگی۔ بلکہ اب ایلا کرنے والے کو مجبور کیا جائے گا کہ یا تو وہ اپنی قسم سے ہٹے یا طلاق دے۔ موطا امام مالک میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے یہی مروی ہے۔ صحیح بخاری میں بھی یہی روایت موجود ہے۔

امام شافعی اپنی سند سے حضرت سلیمان بن یسار سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے دس سے زیادہ صحابیوں سے سنا کہ وہ کہتے تھے کہ چار ماہ کے بعد ایلا کرنے والے کو کھڑا کیا جائے گا۔ پس کم سے کم یہ تیرہ صحابی ہو گئے۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بھی یہی منقول ہے۔ امام شافعی فرماتے ہیں' یہی ہمارا مذہب ہے اور یہی حضرت عمر' حضرت عائشہ' حضرت عثمان بن عفان

زید بن ثابت اور دس سے اوپر دوسرے صحابہ کرامؓ سے نقل ہے۔ دارقطنی میں ہے۔ حضرت ابو صالح فرماتے ہیں۔ میں نے بارہ صحابیوں سے اس مسئلہ کو پوچھا۔ سب نے یہی جواب عنایت فرمایا۔ حضرت عمرؓ حضرت عثمانؓ حضرت علیؓ حضرت ابوالدرداءؓ حضرت اُم المؤمنین عائشہ صدیقہؓ حضرت ابن عمرؓ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہم بھی یہی فرماتے ہیں اور تابعین میں سے حضرت سعید بن میسبؒ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ حضرت مجاہدؒ حضرت طاؤسؒ حضرت محمد بن کعبؒ حضرت قاسم رحمتہ اللہ علیہم اجمعین کا بھی یہی قول ہے اور حضرت امام مالکؒ حضرت امام شافعیؒ حضرت امام احمد رحمتہ اللہ علیہم اور ان کے ساتھیوں کا بھی یہی مذہب ہے۔ امام ابن جریر بھی اسی قول کو پسند کرتے ہیں۔ لیث' اسحاق بن راہویہ' ابوعبید' ابوثور' داؤد وغیرہ بھی یہی فرماتے ہیں۔ یہ سب حضرات یہی فرماتے ہیں کہ اگر چار ماہ کے بعد وہ رجوع نہ کرے تو اسے طلاق دینے پر مجبور کیا جائے گا۔ اگر طلاق نہ دے تو حاکم آپ اسکی طرف سے طلاق دے دے گا اور یہ طلاق رجعی ہوگی۔ عدت کے اندر رجعت کا حق خاوند کو حاصل ہے ہاں صرف امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ اُسے رجعت جائز نہیں۔ یہاں تک کہ عدت میں جماع کرے لیکن یہ قول غریب ہے۔

یہاں جو چار مہینے کی تاریخ کی اجازت دی ہے۔ اس کی مناسبت میں موطا مالک میں حضرت عبداللہ بن دینار کی روایت سے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ایک واقعہ عموماً فقہائے کرام ذکر کیا کرتے ہیں جو یہ کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ عموماً راتوں کو مدینہ شریف کی گلیوں میں گشت لگاتے رہتے۔ ایک رات کو نکلے تو آپ نے سنا کہ ایک عورت اپنے سفر میں گئے ہوئے خاوند کی یاد میں کچھ اشعار پڑھ رہی ہے جن کا ترجمہ یہ ہے "افسوس ان کالی کالی اور لمبی لمبی راتوں میں میرا خاوند نہیں' جس سے میں' ہنسوں' بولوں' قسم خدا کی اگر خدا کا خوف نہ ہوتا تو اس وقت پلنگ کے پائے حرکت میں ہوتے۔" آپ اپنی [illegible] ادی اُم المؤمنین حضرت حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے پاس تشریف لائے اور فرمایا' بتلاؤ زیادہ سے زیادہ عورت اپنے خاوند کی جدائی پر کتنی مدت صبر کر سکتی ہے۔ فرمایا چھ مہینے یا چار مہینے۔ آپ نے فرمایا' اب حکم جاری کر دوں گا کہ مسلمان مجاہد سفر میں اس سے زیادہ نہ ٹھہریں۔ بعض روایتوں میں کچھ زیادتی بھی ہے اور اس کی بہت سی سندیں ہیں اور یہ واقعہ مشہور ہے۔

وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ ۭ وَلَا يَحِلُّ لَهُنَّ اَنْ يَّكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِيْٓ اَرْحَامِهِنَّ اِنْ كُنَّ يُؤْمِنَّ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ وَبُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِيْ ذٰلِكَ اِنْ اَرَادُوْٓا اِصْلَاحًا ۭ وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۠ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ ۭ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۲۸﴾

ع ۲۸ / ۷ / ۲

اور طلاق دی ہوئی عورتیں اپنے آپ کو (نکاح سے) روکے رکھیں تین حیض تک اور ان عورتوں کو یہ بات حلال نہیں کہ خدا تعالیٰ نے جو کچھ ان کے رحم میں پیدا کیا ہو (خواہ حمل یا حیض) اس کو پوشیدہ کریں اگر وہ عورتیں اللہ تعالیٰ پر

اور یوم قیامت پر یقین رکھتی ہیں اور ان عورتوں کے شوہران کے (بلا تجدید نکاح) پھر لوٹا (لینے کا حق رکھتے ہیں) اس عدت کے اندر بشرطیکہ اصلاح کا قصد رکھتے ہوں اور عورتوں کے لئے بھی حقوق ہیں جو کہ مثل ان ہی حقوق کے ہیں جو ان عورتوں پر ہیں قاعدہ (شرعی) موافق اور مردوں کا ان کے مقابلہ میں کچھ درجہ بڑھا ہوا ہے اور اللہ تعالیٰ زبردست (حاکم) ہیں، حکیم ہیں۔ ○

عدت کے احکام اور مسائل ☆

ان عورتوں سے متعلق جو خاوندوں سے مل چکی ہوں اور بالغہ ہوں، حکم ہو رہا ہے کہ طلاق کے بعد تین حیض تک رکی رہیں۔ پھر اگر چاہیں تو اپنا نکاح دوسرا کر سکتی ہیں۔ ہاں چاروں اماموں نے اس سے لونڈی کو مستثنیٰ کر دیا ہے۔ وہ دو حیض عدت گزارے کیونکہ لونڈی ان معاملات میں آزاد عورت سے آدھے پر ہے لیکن حیض کی مدت کا نصف ٹھیک نہیں بیٹھتا۔ اس لئے وہ دو حیض گزارے۔ ایک حدیث میں بھی ہے کہ لونڈی کی طلاقیں بھی دو ہیں اور اس کی عدت بھی دو حیض ہیں۔ (ابن جریر) لیکن اس کے راوی حضرت مظاہر ضعیف ہیں۔ یہ حدیث ترمذی، ابوداؤد اور ابن ماجہ میں بھی ہے۔ امام حافظ دارقطنی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ صحیح بات یہ ہے کہ حضرت قاسم بن محمد کا اپنا قول ہے لیکن حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت مرفوع ہے مگر اس کی نسبت بھی امام دارقطنی رحمۃ اللہ علیہ یہی فرماتے ہیں کہ یہ حضرت عبداللہ کا اپنا قول ہی ہے۔ اسی طرح خود خلیفۃ المسلمین حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے نقل ہے۔ بلکہ صحابہ میں اس مسئلہ میں اختلاف ہی نہ تھا۔ ہاں بعض سلف سے یہ بھی روایت ہے کہ عدت کے بارے میں آزاد اور لونڈی برابر ہے کیونکہ آیت اپنی عمومیت کے لحاظ سے دونوں کو شامل ہے اور اسلئے بھی کہ یہ جبلی امر ہے۔ لونڈی اور آزاد عورت اس میں یکساں ہیں۔ محمد بن سیرین رحمۃ اللہ علیہ اور بعض اہل ظاہر کا بھی یہی قول ہے لیکن یہ ضعیف ہے۔ ابن ابی حاتم کی ایک غریب سند والی روایت میں ہے کہ حضرت اسما بنت یزید بن سکن انصاریہ کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی ہے۔ اس سے پہلے طلاق کی عدت نہ تھی۔ سب سے پہلے عدت کا حکم ان ہی کی طلاق کے بعد نازل ہوا۔

قُرُوْءٍ کے معنی میں سلف خلف کا برابر اختلاف رہا ہے۔ ایک قول تو یہ ہے کہ اس سے مراد طہر یعنی پاکی ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا یہی فرمان ہے۔ چنانچہ انہوں نے اپنی بھتیجی حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بیٹی حفصہ کو جبکہ وہ تین طہر گزار چکیں اور تیسرا حیض شروع ہوا تو حکم دیا کہ وہ مکان بدل لیں۔ حضرت عروہ نے جب یہ روایت بیان کی تو حضرت عمرہؒ نے جو صدیقہؓ کی دوسری بھتیجی ہیں۔ اس واقعہ کی تصدیق کی اور فرمایا کہ لوگوں نے حضرت صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا پر اعتراض بھی کیا تو آپ نے فرمایا اقراء سے مراد طہر ہیں (موطا مالک) بلکہ موطا میں ابوبکر بن عبدالرحمٰن رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا تو یہ قول بھی موجود ہے کہ میں نے سمجھ دار علما فقہاء کو قروء کی تفسیر طہر سے ہی کرتے سنا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما بھی یہی فرماتے ہیں کہ جب تیسرا حیض شروع ہوا تو یہ اپنے خاوند سے بری ہو گئی اور خاوند اس سے الگ ہوا (موطا) امام مالک فرماتے ہیں، ہمارے نزدیک بھی محقق یہی ہے۔ ابن عباس، زید بن ثابت، سالم، قاسم، عروہ، سلیمان بن یسار، ابوبکر بن عبدالرحمٰن، ابان ابن عثمان، عطاء بن ابو رباح، قتادہ، زہری اور باقی ساتوں فقہاء کا بھی یہی قول ہے۔ امام مالک، امام شافعی کا یہی مذہب ہے داؤد اور ابوثور رحمۃ اللہ علیہ بھی یہی فرماتے ہیں۔ امام احمد سے بھی ایک روایت اسی طرح کی موجود ہے۔ اس کی

دلیل ان بزرگوں نے قرآن کی اس آیت سے بھی نکالی ہے کہ: ﴿فَطَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ﴾ (الطلاق ۱۰) یعنی انہیں عدت میں طلاق دو یعنی طہر میں پاکیزگی کی حالت میں چونکہ جس طہر میں طلاق دی جاتی ہے وہ گنتی میں آتا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ آیت مندرجہ بالا میں بھی قُرُوْءٍ سے مراد بھی حیض کے سوا کی یعنی پاکی کی حالت ہے۔ اسی لئے یہ حضرات فرماتے ہیں کہ جہاں تیسرا حیض شروع ہوا۔ عورت اپنی خاوند کی عدت سے باہر ہوگئی اور اس سے کم از کم مدت جس میں اگر عورت کہے کہ اسے تیسرا حیض شروع ہوگیا ہے تو اسے سچا سمجھا جائے بتیس دن اور دو لحظہ ہیں۔ عرب شاعروں کے شعر میں بھی یہ لفظ طہر کے معنی میں مستعمل ہوا ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ اس سے مراد تین حیض ہیں اور جب تک تیسرے حیض سے پاک نہ ہو لے تب وہ عدت میں ہی ہے۔ بعضوں نے غسل کر لینے تک کہا ہے اور اس کی کم سے کم مدت تینتیس دن اور ایک لحظہ ہے۔ اس کی دلیل میں ایک تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ فیصلہ ہے کہ ان کے پاس ایک مطلقہ عورت آئی اور کہا کہ میرے خاوند نے مجھے ایک یا دو طلاقیں دی تھیں۔ پھر وہ میرے پاس اس وقت آیا جبکہ میں اپنے کپڑے اتار کر دروازے بند کئے ہوئے تھی۔ (یعنی تیسرے حیض سے نہانے کی تیاری میں تھی) تو فرمایئے کیا حکم ہے (یعنی رجوع ہو جائے گا یا نہیں؟) آپ نے فرمایا میرا خیال تو یہی ہے کہ رجوع ہو گیا۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے اس کی تائید کی' حضرت صدیق اکبر' حضرت عمر' حضرت عثمان' حضرت علی' حضرت ابودردا' حضرت عبادہ بن صامت' حضرت انس بن مالک' حضرت عبداللہ بن مسعود' حضرت معاذ' حضرت ابی بن کعب' حضرت ابوموسیٰ اشعری' حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے یہی مروی ہے۔ سعید بن مسیب' علقمہ' اسود' ابراہیم' مجاہد' عطا' طاؤس' سعید بن جبیر' عکرمہ' محمد بن سیرین' حسن' قتادہ' شعبی' ربیع' مقاتل بن حیان' سدی' مکحول' ضحاک' عطا خراسانی بھی یہی فرماتے ہیں۔ امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب کا بھی یہی مذہب ہے۔ امام احمد رحمتہ اللہ علیہ سے بھی زیادہ صحیح روایت یہی ہے۔ آپ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ کے بڑے بڑے صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین سے یہی روایت ہے۔ ثور' اوزاعی' ابن ابی لیلیٰ بن شبرمہ' حسن بن صالح' ابوعبیدہ اور اسحاق بن راہویہ کا قول بھی یہی ہے۔ ایک حدیث میں بھی ہے کہ نبی ﷺ نے حضرت فاطمہ بنت ابی حبیش سے فرمایا تھا' نماز کو اپنے اقراء کے دنوں میں چھوڑ دو۔ پس معلوم ہوا کہ قروء سے مراد حیض ہے لیکن اس حدیث کا ایک راوی منذر مجہول ہے۔ جو مشہور نہیں۔ ہاں ابن حبان اسے ثقہ بتلاتے ہیں۔ امام ابن جریر فرماتے ہیں۔ لغتہً قروء کہتے ہیں۔ ہر اس چیز کے آنے اور جانے کے وقت کو جس کے آنے جانے کا وقت مقرر ہو۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس لفظ کے دونوں معنی ہیں حیض کے بھی اور طہر کے بھی اور بعض اصولی حضرت کا یہی مسلک ہے۔ واللہ اعلم۔

اصمعی بھی فرماتے ہیں کہ قروۃ کہتے ہیں وقت کو۔ ابوعمر بن علاء کہتے ہیں' عرب میں حیض کو اور طہر دونوں کو قروء کہتے ہیں۔ ابوعمر بن عبدالبر کا قول ہے کہ زبان عرب کے ماہر اور فقہاء کا اس میں اختلاف ہی نہیں کہ طہر اور حیض دونوں معنی قروء کے ہیں۔ ہاں اس آیت کے معنی مقرر کرنے میں ایک جماعت اس طرف گئی ہے اور دوسری اس طرف۔ پھر فرمایا ان کے رحم میں جو ہو اس کا چھپانا حلال نہیں یعنی حمل ہو تو اور حیض آئے تو۔ پھر فرماتا ہے کہ اگر انہیں خدا پر اور قیامت پر ایمان ہو۔ اس میں انہیں دھمکایا جا رہا ہے کہ خلاف نہ کہیں اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس خبر میں ان کی بات کا اعتبار کیا جائے گا کیونکہ اس پر کوئی بیرونی شہادت قائم نہیں کی جا سکتی۔ اس لئے انہیں ہوشیار کر دیا گیا کہ عدت سے نکل جانے کے لئے حیض نہ آیا ہو اور کہہ نہ دیں

کہ انہیں حیض آ گیا یا عدت کو بڑھانے کے لئے آیا ہو اور اسے چھپا نہ لیں۔ اسی طرح حمل کی بھی خبر کر دیں۔ پھر فرمایا کہ عدت کے اندر اس شوہر کو جس نے طلاق دے ہے لوٹا لینے کا پورا حق حاصل ہے جبکہ طلاق رجعی ہو۔ یعنی ایک طلاق کے بعد بھی اور دو طلاقوں کے بعد بھی۔ باقی رہی طلاق بائن یعنی تین طلاقیں جب ہو جائیں تو یاد رہے کہ جب یہ آیت اُتری ہے تب تک طلاق بائن تھی ہی نہیں بلکہ اس وقت تک تو چاہے سو طلاقیں ہو جائیں سب رجعی ہی تھیں۔ طلاق بائن تو پھر اسلام کے احکام میں آئی کہ تین اگر ہو جائیں تو اب رجعت کا حق نہیں رہے گا۔ جب یہ بات خیال میں رہے گی تو علمائے اصول کے اس قاعدے کا ضعف بھی معلوم ہو جائے گا۔ کہ ضمیر کے لوٹانے سے پہلے کے عام لفظ کی خصوصیت ہو جاتی ہے یا نہیں۔ اس لئے کہ اس آیت کے وقت دوسری شکل تھی ہی نہیں طلاق کی ایک ہی صورت تھی۔ واللہ اعلم۔

باہمی حقوق ☆ پھر فرماتا ہے کہ جیسے ان عورتوں پر مردوں کے حقوق ہیں ویسے ہی ان عورتوں کے مردوں پر بھی حقوق ہیں۔ ہر ایک کو دوسرے کا پاس ولحاظ عمدگی سے رکھنا ہوگا۔ صحیح مسلم شریف میں حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حجۃ الوداع کے اپنے خطبہ میں فرمایا لوگو! عورتوں کے بارے میں اللہ سے ڈرتے رہو۔ تم نے اللہ کی امانت سے انہیں لیا ہے اور اللہ کے کلمہ (نکاح سے) سے ان کی شرمگاہوں کو اپنے لئے حلال کیا ہے۔ عورتوں پر تمہارا یہ حق ہے کہ وہ تمہارے فرش پر کسی ایسے کو نہ آنے دیں (زنا نہ کرائیں) جس سے تم ناراض ہو۔ اگر وہ ایسا کریں تو انہیں مارو لیکن ایسی مار نہ ہو کہ ظاہر ہو۔ ان کا تم پر یہ حق ہے کہ انہیں اپنی بساط کے مطابق کھلاؤ پلاؤ پہناؤ اوڑھاؤ۔ ایک شخص نے حضور ﷺ سے دریافت کیا کہ ہماری عورتوں کے ہم پر کیا حقوق ہیں؟ آپ نے فرمایا جب تم کھاؤ تو اسے بھی کھلاؤ۔ جب تم پہنو تو اسے بھی پہناؤ۔ اس کے منہ پر نہ مارو اسے گالیاں نہ دو۔ اس سے روٹھ کر اور کہیں نہ بھیج دو۔ وہاں گھر میں ہی رکھو۔ اسی آیت کو پڑھ کر حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرمایا کرتے تھے کہ میں پسند کرتا ہوں کہ اپنی بیوی کو خوش کرنے کے لئے میں بھی اپنی زینت کروں۔ جس طرح وہ مجھے خوش کرنے کے لئے اپنا بناؤ سنگھار کرتی ہے۔ پھر فرمایا کہ مردوں کو ان پر فضیلت ہے۔ جسمانی حیثیت سے بھی اخلاقی سے بھی مرتبہ کی حیثیت سے بھی۔ حکمرانی کی حیثیت سے بھی خرچ اخراجات کی حیثیت سے بھی دیکھ بھال اور نگرانی کی حیثیت سے بھی غرض دنیوی اور اُخروی حیثیت سے بھی غرض دنیوی اور اُخروی فضیلت کے ہر اعتبار سے جیسے اور جگہ ہے: ﴿الرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ.....﴾ یعنی مرد عورتوں کے سردار ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ایک کو ایک پر فضیلت دے رکھی ہے اور اس لئے بھی کہ یہ مال خرچ کرتے ہیں۔ پھر فرمایا اللہ تعالیٰ اپنے نافرمانوں سے بدلہ لینے پر غالب ہے اور اپنے احکام میں حکمت والا ہے۔

اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ ۗ وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ شَيْـًٔا اِلَّآ اَنْ يَّخَافَآ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ۭ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ۙ فَلَا جُنَاحَ

عَلَيْهِمَا فِيمَا افْتَدَتْ بِهِ ۗ تِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ فَلَا تَعْتَدُوهَا ۚ وَمَن يَتَعَدَّ حُدُودَ اللَّهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ ﴿٢٢٩﴾ فَإِن طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهُ مِن بَعْدُ حَتَّىٰ تَنكِحَ زَوْجًا غَيْرَهُ ۗ فَإِن طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا أَن يَتَرَاجَعَا إِن ظَنَّا أَن يُقِيمَا حُدُودَ اللَّهِ ۗ وَتِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ يُبَيِّنُهَا لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ ﴿٢٣٠﴾

وہ طلاق دو مرتبہ (کی) ہے پھر خواہ رکھ لینا قاعدہ کے موافق خواہ چھوڑ دینا خوش عنوانی کے ساتھ اور تمہارے لئے یہ بات حلال نہیں کہ (چھوڑنے کے وقت) کچھ بھی لو (گو) اس میں سے (سہی) جو تم نے ان کو (مہر میں) دیا تھا۔ مگر یہ کہ میاں بیوی دونوں کو احتمال ہو کہ اللہ تعالیٰ کے ضابطوں کو قائم نہ کر سکیں گے۔ سو اگر تم لوگوں کو یہ احتمال ہو کہ دونوں ضوابط خداوندی کو قائم نہ کر سکیں گے تو کوئی گناہ نہ ہوگا اس (مال کے لینے دینے) میں جس کو دے کر عورت اپنی جان چھڑا لے یہ خدائی ضابطے ہیں سو تم ان سے باہر مت نکلنا اور جو شخص خدائی ضابطوں سے بالکل باہر نکل جائے (ایسے ہی لوگ اپنا نقصان کرنے والے ہیں) پھر اگر کوئی (تیسری) طلاق دے دے عورت کو تو پھر وہ اس کے لئے حلال نہ رہے گی اس کے بعد یہاں تک کہ وہ اس کے سوا ایک اور خاوند کے ساتھ (عدت کے بعد) نکاح کر لے۔ پھر اگر وہ اس کو طلاق دے دے تو ان دونوں پر اس میں کچھ گناہ نہیں کہ بدستور پھر مل جائیں۔ شرطیکہ دونوں غالب گمان رکھتے ہیں کہ (آئندہ) خداوندی ضابطوں کو قائم رکھیں گے اور یہ خداوندی ضابطے ہیں۔ حق تعالیٰ ان کو بیان فرماتے ہیں ایسے لوگوں کے لئے جو دانش مند ہیں۔ ○

طلاق کے احکام ومسائل:

اسلام سے پہلے یہ دستور تھا کہ خاوند جتنی چاہے طلاقیں دیتا چلا جائے اور عدت میں رجوع کرتا جائے۔ اس سے عورت کی جان غضب میں تھی کہ طلاق دی اور عدت گزرنے کے قریب آئی' رجوع کر لیا۔ پھر طلاق دے دی۔ اسی طرح عورتوں کو تنگ کرتے رہتے تھے۔ پس اسلام نے حد بندی کر دی کہ اس طرح کی طلاقیں صرف دو ہی دے سکتے ہیں۔ تیسری طلاق کے بعد لوٹانے کا کوئی حق نہیں رہے گا۔ سنن ابوداؤد میں باب ہے کہ تین طلاقوں کے بعد مراجعت منسوخ ہے۔ پھر یہ روایت لائے ہیں کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما یہی فرماتے ہیں۔ ابن ابی حاتم میں ہے کہ ایک شخص نے اپنی بیوی سے کہا کہ نہ تو میں تجھے بساؤں گا نہ چھوڑوں گا۔ اس نے کہا یہ کس طرح؟ کہا طلاق دے دوں گا اور عدت ختم ہونے کا وقت آیا اور رجوع کر لوں گا۔ پھر طلاق دے دوں گا' پھر عدت ختم ہونے سے پہلے رجوع کر لوں گا۔ یونہی کرتا چلا جاؤں گا۔ وہ عورت حضور ﷺ کے پاس آئی اور اپنا یہ دکھ رونے لگی۔ اس پر یہ آیت مبارکہ نازل ہوئی۔ ایک اور روایت میں ہے کہ اس آیت کے نازل ہونے کے بعد اب لوگوں نے نئے سرے سے طلاقوں کا خیال رکھنا شروع کیا اور وہ سنبھل گئے اور تیسری طلاق کے بعد

اس خاوند کو لوٹا لینے کا کوئی حق حاصل نہ رہا اور فرمادیا گیا کہ دو طلاقوں تک تو تمہیں اختیار ہے کہ اصلاح کی نیت سے اپنی بیوی کو لوٹا لو۔ اگر وہ عدت کے اندر ہے اور یہ بھی اختیار ہے کہ نہ لوٹاؤ اور عدت گزر جانے دو۔ تاکہ وہ دوسرے سے نکاح کرنے کے قابل ہو جائے اور اگر تیسری طلاق دینا چاہتے ہو تو بھی احسان و سلوک کے ساتھ طلاق دو۔ نہ اس پر کوئی ظلم کرو۔ نہ اس کا کوئی حق مارو۔ نہ اس کو ضرر نقصان پہنچاؤ۔ ایک شخص نے حضور ﷺ سے سوال کیا کہ دو طلاقیں تو اس میں بیان ہو چکی ہیں' تیسری کا ذکر کہاں ہے۔ آپ نے فرمایا: ﴿اَوْ تَسْرِيْحٌ بِاِحْسَانٍ﴾ میں۔ جب تیسری طلاق کا ارادہ کرے تو عورت کو تنگ کرنا' اس پر سختی کرنا' تاکہ وہ اپنا حق چھوڑ کر طلاق پر آمادگی ظاہر کرے' یہ مردوں پر حرام ہے۔ جیسے اور جگہ ہے: ﴿وَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ لِتَذْهَبُوْا بِبَعْضِ مَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ ...﴾ (النساء:۱۹) یعنی عورتوں کو تنگ نہ کرو تاکہ انہیں دیئے ہوئے میں سے کچھ لے لو۔ ہاں یہ اور بات ہے عورت اپنی خوشی سے کچھ دے کر طلاق طلب کرے۔ جیسے فرمایا: ﴿فَاِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَيْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا فَكُلُوْهُ هَنِيْٓئًا مَّرِيْٓئًا﴾ (النساء:۴) یعنی عورتیں اگر اپنی راضی خوشی سے کچھ چھوڑ دیں تو بے شک وہ تمہارے لئے حلال طیب ہے اور جب میاں بیوی میں نااتفاقی بڑھ جائے تو عورت اس سے ناخوش نہ ہو اور اس کے حق نہ بجالاتی ہو۔ ایسی صورت میں وہ کچھ لے دے کر اپنے خاوند سے طلاق حاصل کر لے تو اسے دینے میں اور اسے لینے میں کوئی گناہ نہیں۔ یہ بھی یاد رہے کہ اگر عورت بلاوجہ اپنے خاوند سے خلع طلب کرتی ہے تو وہ سخت گنہگار ہے۔ چنانچہ ترمذی وغیرہ میں حدیث ہے کہ جو عورت اپنے خاوند سے بے سبب طلاق طلب کرے' اس پر جنت کی خوشبو حرام ہے۔

اور روایت میں ہے کہ ایسی عورتیں منافقہ ہیں' ائمہ سلف و خلف کی ایک بڑی جماعت کا فرمان ہے کہ خلع صرف اسی صورت میں ہے کہ نافرمانی اور سرکشی عورت کی طرف سے ہو۔ اس وقت مرد فدیہ لے کر اس عورت کو الگ کر سکتا ہے۔ جیسے کہ قرآن پاک کی اس آیت میں ہے۔ اس کے سوا اور کسی صورت میں یہ جائز نہیں بلکہ حضرت امام مالک رحمتہ اللہ علیہ تو فرماتے ہیں کہ اگر عورت کو تکلیف پہنچا کر اس کے حق میں کمی کر کے اسے مجبور کیا گیا اور کچھ مال واپس کیا گیا تو اس کا لوٹا دینا واجب ہے۔ امام شافعی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جب حالت اختلاف میں جائز ہے تو حالت اتفاق میں بطور اولیٰ جائز ٹھہرے گا۔ بکر بن عبداللہ کہتے ہیں' سرے سے خلع منسوخ ہے کیونکہ قرآن میں ہے: ﴿وَّاٰتَيْتُمْ اِحْدٰىهُنَّ قِنْطَارًا فَلَا تَاْخُذُوْا مِنْهُ شَيْئًا﴾ (النساء:۲۰) یعنی تم نے اگر اپنی بیویوں کو ایک خزانہ بھی دے رکھا ہو تو بھی اس میں سے کچھ بھی نہ لو لیکن یہ قول مردود ہے اور ضعیف ہے۔

آیت کا شان نزول ☆ اب آیت کا شانِ نزول سُنیئے' موطا مالک میں ہے کہ حبیبہ بنت سہل انصاریہ حضرت ثابت قیس بن شماس رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی بیوی تھیں۔ آنحضرت ﷺ ایک دن صبح کی نماز کے لئے اندھیرے میں نکلے تو دیکھا کہ دروازے پر حضرت حبیبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کھڑی ہیں۔ آپ نے پوچھا کون ہے؟ کہا میں حبیبہ بنت سہل ہوں۔ فرمایا کیا بات ہے؟ حضور میں ثابت قیس کے گھر نہیں رہ سکتی یا وہ نہیں یا میں نہیں۔ آپ سُن کر خاموش ہو گئے۔ جب حضرت ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ آئے' آپ نے فرمایا' تمہاری بیوی صاحبہ کچھ کہہ رہی ہیں۔ حضرت حبیبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے کہا' حضور میرے خاوند نے مجھے جو دیا ہے وہ سب میرے پاس ہے اور میں اسے واپس کرنے کو آمادہ ہوں۔ آپ نے حضرت ثابت کو فرمایا سب لے لو۔ چنانچہ انہوں نے لے لیا اور حضرت حبیبہ آزاد ہو گئیں۔ ایک روایت میں ہے کہ حضرت ثابت نے انہیں مارا تھا اور اس مار سے کوئی

ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ حضورﷺ نے جب انہیں یہ فرمایا' اس وقت انہوں نے دریافت کیا کہ کیا میں مال لے سکتا ہوں۔ آپ نے فرمایا ہاں' کہا' میں نے اسے دو باغ دیئے ہیں۔ یہ واپس دلوا دیجئے۔ چنانچہ وہ مہر کے دونوں باغ واپس کئے گئے اور جدائی ہو گئی۔ ایک اور روایت میں ہے کہ جیبیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے یہ بھی فرمایا تھا کہ میں اس کے اخلاق اور دین میں کوئی عیب بیان نہیں کرتی لیکن اسلام میں کفر کو ناپسند کرتی ہوں۔ چنانچہ مال لے کر حضرت ثابت نے طلاق دے دی۔ بعض روایت میں ان کا نام جمیلہ بھی آیا ہے۔ بعض روایت میں یہ بھی ہے کہ مجھے اب غیظ وغضب کے برداشت کی طاقت نہیں رہی۔

سیّدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا ایک فقیہانہ فیصلہ☆

ایک روایت یہ بھی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا جو دیا ہے لے لو زیادہ نہ لینا' ایک روایت میں ہے کہ حضرت جیبیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے فرمایا تھا وہ صورت کے اعتبار سے بھی کچھ حسین نہیں' ایک روایت میں ہے کہ یہ حضرت عبداللہ بن اُبی کی بہن تھیں اور سب سے پہلا خلع تھا جو اسلام میں ہوا۔ ایک وجہ یہ بھی بیان کی تھی کہ حضرت میں نے ایک مرتبہ خیمے کے پردہ کو جو اٹھایا تو دیکھا کہ میرے خاوند چند آدمیوں کے ساتھ آ رہے ہیں۔ ان تمام میں یہ سیاہ فام' چھوٹے قد والے اور بدصورت تھے۔ حضور ﷺ کے اس فرمان پر کہ اس کا باغ واپس کرو۔ جیبیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے یہ بھی کہا کہ آپ فرمائیں تو میں کچھ بھی دینے کو تیار ہوں اور روایت میں ہے کہ جیبیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے یہ بھی کہا تھا کہ حضور ﷺ اگر خدا کا خوف نہ ہوتا تو میں اس کے منہ پر تھوک دیا کرتی۔ جمہور کا مذہب تو یہ ہے کہ خلع میں عورت سے اپنے دیئے ہوئے سے زیادہ لے تو بھی جائز ہے کیونکہ قرآن نے: ﴿فِيْمَا افْتَدَتْ بِهٖ﴾ فرمایا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس ایک عورت اپنے خاوند سے ناراض آئی۔ آپ نے فرمایا' اسے گندگی والے گھر میں قید کر دو۔ پھر قید خانے سے بلوایا اور کہا کیا حال ہے؟ اس نے کہا آرام کی راتیں مجھ پر میری زندگی میں یہی گزری ہیں۔ آپ نے اس کے خاوند کو فرمایا' اس سے خلع کر لے' اگرچہ گوشوارہ کے بدلہ ہی ہو۔ ایک روایت میں ہے اسے تین دن وہاں قید رکھا تھا۔

ایک روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا اگرچہ یہ اپنی چٹیا کی دھجی بھی دے تو لے لے اور اسے الگ کر دے۔ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں اس کے سوا سب کچھ لے کر بھی خلع ہو سکتا ہے۔ ربیع بنت معوذ بن عفراء فرماتی ہیں' میرے خاوند اگر موجود ہوتے تو بھی میرے ساتھ سلوک کرنے میں کمی کرتے اور کہیں چلے جاتے تو بالکل ہی محروم کر دیتے۔ ایک مرتبہ جھگڑے کے موقع پر میں نے کہہ دیا کہ میرے ملکیت میں جو کچھ ہے' لے لو اور مجھ سے خلع کر لو۔ اس نے ہاں کہا اور یہ معاملہ فیصل ہو گیا۔ میرے چچا معاذ بن عفراء اس قصہ کو لے کر حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس گئے۔ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بھی اسے برقرار رکھا اور فرمایا کہ چوٹی کی دھجی چھوڑ کر اور سب کچھ لے لو۔ بعض روایتوں میں ہے یہ بھی اور اس سے چھوٹی چیز بھی غرض سب کچھ لے لو۔ پس مطلب ان واقعات کا یہ ہے کہ یہ دلیل ہے اس پر کہ عورت کے پاس جو کچھ ہے سب کچھ دے کر وہ خلع کرا سکتی ہے اور خاوند اپنی دی ہوئی چیز سے زائد لے کر بھی خلع کر سکتا ہے۔ ابن عمر' ابن عباس' مجاہد' عکرمہ' ابراہیم نخعی' قبیصہ بن ذویب' حسن بن صالح عثمان بھی یہی فرماتے ہیں۔ امام مالک' لیث' امام شافعی اور ابوثور کا مذہب بھی یہی ہے۔ امام ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ بھی اسی کو پسند کرتے ہیں اور اصحاب ابوحنیفہ کا قول ہے کہ اگر قصور اور ضرر رسانی عورت کی طرف سے ہو تو خاوند کو جائز ہے کہ جو اس نے دیا ہے واپس لے لے لیکن اس سے زیادہ جائز نہیں۔ گو زیادہ لے لے تو بھی قضا

کے وقت جائز ہوگا۔ اگر خاوند کی اپنی جانب سے زیادتی ہو تو اسے کچھ بھی لینا جائز نہیں۔ گو لے لے تو قضاءً[1] جائز ہوگا۔ امام احمد' ابوعبیدہ اور اسحاق بن راہویہ رحمتہ اللہ علیہم فرماتے ہیں کہ خاوند کو اپنے دیئے سے زیادہ لینا جائز نہیں۔ سعید بن مسیب' عطا عمرو بن شعیب' زہری' طاؤس' شعبی' حماد بن ابوسلیمان اور ربیع بن انس کا بھی مذہب ہے۔ معمر اور حاکم کہتے ہیں' حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا بھی یہی فیصلہ ہے کہ دیئے ہوئے سے زیادہ لینا اس کے خیال میں جائز نہیں۔ اس مذہب کی دلیل وہ حدیث بھی ہے۔ جو اوپر بیان ہو چکی ہے۔ جس میں ہے کہ اپنا باغ لے لو اور اس سے زیادہ نہ لو۔ مسند عبد بن حمید میں بھی ایک مرفوع حدیث میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خلع لینے والی عورت سے اپنے دیئے ہوئے سے زیادہ لینا مکروہ رکھا اور اس صورت میں جو کچھ فدیہ وہ دے کا لفظ جو قرآن میں ہے اس کے معنی یہ ہوں گے کہ دیئے ہوئے میں سے جو کچھ دے کیونکہ اس سے یہ فرمان موجود ہے کہ تم نے جو انہیں دیا ہے اس میں سے کچھ نہ لو۔ ربیع کی قراءت میں بِہٖ کے بعد مِنْہُ کا لفظ بھی ہے۔ پھر فرمایا کہ یہ حدود خدا ہیں۔ ان سے تجاوز نہ کرو ورنہ گنہگار ہو گے۔

فصل ☆ خلع کو بعض حضرات طلاق میں شمار نہیں کرتے۔ وہ فرماتے ہیں کہ اگر ایک شخص اپنی بیوی کو دو طلاقیں دے۔ پھر اس عورت نے خلع کرا لیا ہے تو اگر خاوند چاہے تو اس سے پھر بھی نکاح کر سکتا ہے اور اس پر دلیل یہی آیت پیش کرتے ہیں۔ یہ قول حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا ہے۔ حضرت عکرمہ بھی فرماتے ہیں کہ یہ طلاق نہیں۔ دیکھو آیت کے اوّل و آخر طلاق کا ذکر ہے پہلے دو طلاقوں کا پھر آخر میں تیسری طلاق کا اور درمیان میں خلع کا ذکر ہے۔

پس معلوم ہوا کہ خلع طلاق نہیں بلکہ فسخ ہے۔ امیر المؤمنین حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما' طاؤس' عکرمہ' احمد بن حنبل' اسحاق بن راہویہ' ابوثور' داؤد بن علی' ظاہری کا بھی یہی مذہب ہے۔ امام شافعی کا بھی قدیم قول یہی ہے۔ بعض دیگر بزرگ فرماتے ہیں کہ خلع طلاق بائن ہے اور اگر ایک سے زیادہ کی نیت ہوگی تو وہ بھی معتبر ہے۔ ایک روایت میں ہے کہ ام بکر اسلمیہ نے اپنے خاوند عبداللہ بن خالد سے خلع لیا اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اسے ایک طلاق ہونے کا فتویٰ دیا اور ساتھ ہی فرمایا کہ اگر کچھ نام لیا ہو تو جو کچھ نام لیا ہو وہ ہے لیکن یہ اثر ضعیف ہے۔ واللہ اعلم۔

حضرت عمر' حضرت علی' حضرت ابن مسعود' حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہم سعید بن مسیب حسن' عطا' شریح' شعبی' ابراہیم' جابر بن زید' مالک' ابوحنیفہ' ان کے ساتھی' ثوری' اوزاعی' ابوعثمان n سب ہی کا یہی قول ہے۔ ہاں حنفیہ کہتے ہیں کہ اگر دو طلاقوں کی نیت خلع دینے والے کی ہے تو وہ ہو جائیں گی۔ اگر کچھ لفظ نہ کہے اور مطلق خلع ہو۔ تو ایک طلاق بائن ہوگی۔ اگر نیت تین کی ہی تو تین ہو جائیں گی۔ امام شافعی کا ایک اور قول بھی ہے کہ اگر طلاق کا لفظ نہیں اور کوئی دلیل وشہادت بھی نہیں تو وہ بالکل کوئی چیز ہی نہیں۔

مسئلہ ☆ امام ابوحنیفہ' شافعی' احمد' اسحاق بن راہویہ رحمہم اللہ کا مسلک ہے کہ خلع کی عدت طلاق کی عدت ہے۔ عمر' علی' ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہم اور سعید بن مسیب' سلیمان بن یسار' عروہ سالم' ابوسلمہ' عمر بن عبدالعزیز' ابن شہاب' حسن' شعبی'

[1] دیانتاً اور قضاءً فقہا کی دو اصطلاحیں ہیں۔ دیانت کا مطلب تو یہ ہے کہ اگر فتویٰ کسی مسئلہ میں دریافت کیا جائے گا تو مفتی کو یہ جواب دینا چاہئے اور قضاء کا مطب یہ ہے کہ قاضی کی عدالت میں اگر پہنچ جائے تو فیصلہ اس طرح ہوگا۔ مطلب یہ ہے کہ دیانۃً اور قضاءً فیصلے کبھی کبھی ایک دوسرے کے خلاف ہو جاتے ہیں۔ ۱۲

ابراہیم نخعی' ابوعیاض' خلاس بن عمرو' قتادہ' سفیان ثوری' اوزاعی' لیث بن سعد اور ابوعبیدہ رحمتہ اللہ علیہم اجمعین کا بھی یہی فرمان ہے۔ امام ترمذی فرماتے ہیں اکثر اہل علم اسی طرف گئے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ چونکہ خلع طلاق ہے۔ پس عدت اس کی مثل عدت طلاق کے ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ صرف ایک حیض اس کی عدت ہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہی فیصلہ ہے۔ ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما گو تین حیض کا فتویٰ دیتے تھے۔ لیکن صاف فرمادیا کرتے تھے کہ حضرت عثمانؓ ہم سے بہتر ہیں اور ہم سے بڑے عالم ہیں اور ابن عمر سے ایک حیض کی عدت بھی روایت ہے۔ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما' عکرمہ' ابان بن عثمان اور تمام وہ لوگ جن کے نام ذکر ہوئے جو خلع کو فسخ کہتے ہیں' ضروری ہے کہ ان سب کا قول بھی ہو۔ ابوداؤد اور ترمذی کی حدیث میں بھی یہی ہے کہ ثابت بن قیس کی بیوی صاحبہ کو آپ نے اس صورت میں ایک حیض عدت گزارنے کا حکم دیا۔ ترمذی میں ہے کہ ربیع بنت معوذ کو بھی خلع کے بعد ایک ہی حیض گزارنے کا حضور ﷺ کا فرمان صادر ہوا تھا۔ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے خلع والی عورت سے فرمایا تھا کہ تجھ پر عدت ہی نہیں۔ ہاں اگر قریب کے زمانہ میں ہی خاوند سے ملی ہو تو ایک حیض آجانے تک اس کے پاس ٹھہری رہو۔ مریم مغالبہ کے بارے میں حضور ﷺ کا جو فیصلہ تھا۔ اس کی متابعت حضرت امیر المؤمنین نے کی۔

مسئلہ ☆ جمہور علمائے کرام اور چاروں اماموں کے نزدیک خلع والی عورت سے رجوع کرنے کا حق خاوند کو نہیں۔ اس لئے کہ اس نے مال دے کر اپنے آپ کو آزاد کرالیا ہے۔ عبداللہ بن ابی اوفی ماہان حنفی' سعید اور زہری کا قول ہے کہ اگر واپس لیا ہوا پھیر دے تو حق رجعت حاصل ہے۔ بغیر عورت کی رضامندی کے بھی رجوع کرسکتا ہے۔ سفیان ثوری رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں' اگر خلع میں طلاق کا لفظ نہیں تو وہ صرف جدائی ہے اور رجوع کرنے کا حق نہیں اور اگر طلاق کا نام لیا ہے تو بے شک وہ رجعت کا پورا پورا حقدار ہے۔ داؤد ظاہری بھی یہی فرماتے ہیں۔ ہاں سب کا اتفاق ہے کہ اگر دونوں رضامند ہوں تو نیا نکاح عدت کے اندر اندر کرسکتے ہیں۔ ابن عبدالبر ایک فرقہ کا یہ قول بھی حکایت کرتے ہیں کہ عدت کے اندر جس طرح دوسرا کوئی اس سے نکاح نہیں کرسکتا' اسی طرح خلع دینے والا خاوند بھی نہیں کرسکتا لیکن یہ قول شاذ اور مردود ہے۔

مسئلہ ☆ اس عورت پر عدت کے اندر اندر دوسری طلاق بھی وارد ہوسکتی ہے یا نہیں۔ اس میں علماء کے تین اقوال ہیں۔ ایک یہ کہ نہیں' کیونکہ وہ عورت اپنے نفس کی مالک ہے اور اس خاوند سے الگ ہوگئی ہے۔ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما' ابن زبیر' عکرمہ' جابر بن زید' حسن بصری' شافعی' احمد' اسحاق' ابوثور کا یہی قول ہے۔ دوسرا قول امام مالک کا ہے کہ اگر خلع کے ساتھ ہی بغیر خاموش رہے طلاق دے دے تو واقع ہوجائے گی ورنہ نہیں۔ یہ مثل اس کے ہے جو حضرت عثمان سے روایت ہے۔ تیسرا قول یہ ہے کہ عدت میں طلاق واقع ہوجائے گی۔ ابوحنیفہ' ان کے اصحاب' ثوری' اوزاعی' سعید بن مسیب' شریح' طاؤس' ابراہیم' زہری' حاکم' حکم' حماد کا یہی قول ہے۔ ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہما اور ابوالدرداء سے بھی یہ نقل تو ہے لیکن ثابت نہیں۔
پھر فرماتا ہے' یہ خدا کی حدیں ہیں...... صحیح حدیث میں ہے' اللہ تعالیٰ کی حدوں سے آگے نہ بڑھو۔ فرائض کو ضائع نہ کرو۔ محارم کی بے حرمتی نہ کرو۔ جن چیزوں کا ذکر شریعت میں نہیں۔ تم بھی ان سے خاموش رہو۔ کیونکہ خدا کی ذات بھول چوک سے پاک ہے۔ اس آیت سے استدلال ہے ان لوگوں کا جو کہتے ہیں کہ تینوں طلاقیں ایک مرتبہ ہی دینا حرام ہیں۔ مالکیہ اور ان کے موافقین کا یہی مذہب ہے۔ ان کے نزدیک سنت طریقہ یہی ہے کہ طلاق ایک ایک دی جائے کیونکہ: الطلاق

مرتان﴾ کہا۔ پھر فرمایا کہ یہ حدیں ہیں اللہ کی ان سے تجاوز نہ کرو۔ اس کی تقویت اس کی حدیث سے بھی ہوتی ہے جو سنن نسائی میں ہے کہ حضور ﷺ کو ایک مرتبہ یہ معلوم ہوا کہ کسی شخص نے اپنی بیوی کو طلاقیں ایک ساتھ دی ہیں۔ آپ سخت غضب ناک ہو کر کھڑے ہو گئے اور فرمانے لگے کیا میری موجودگی میں کتاب اللہ کے ساتھ کھیل کیا جانے لگا۔ یہاں تک کہ ایک شخص نے کھڑے ہو کر کہا کہ حضور ﷺ اگر اجازت دیں تو میں اس شخص کو قتل کر ڈالوں لیکن روایت کی سند میں انقطاع ہے۔

پھر ارشاد ہے کہ جب کوئی شخص اپنی بیوی کو دو طلاقیں دے چکنے کے بعد تیسری بھی دے دے تو وہ اس پر حرام ہو جائے گی۔ یہاں تک کہ دوسرے سے باقاعدہ نکاح ہو۔ ہم بستری ہو پھر مر جائے یا طلاق دے دے۔ پس اگر بغیر نکاح کے مثلاً لونڈی بنا کر گو وطی بھی کر لے تو بھی اگلے خاوند کے لئے حلال نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح گو نکاح باقاعدہ ہو لیکن دوسرے خاوند نے مجامعت نہ کی ہو تو بھی پہلے شوہر کے لئے حلال نہیں۔ اکثر فقہاء میں مشہور ہے کہ حضرت سعید بن مسیب رحمتہ اللہ علیہ بمجرد عقد کے حلال کہتے ہیں گو میل نہ ہوا ہو لیکن یہ بات اس سے ثابت نہیں۔ ایک حدیث میں ہے کہ نبی ﷺ سے سوال کیا گیا کہ ایک شخص ایک عورت سے نکاح کرتا ہے اور دخول سے پہلے ہی طلاق بتہ دے دیتا ہے۔ وہ دوسرا نکاح کرتی ہے۔ وہ بھی دخول سے پہلے ہی طلاق دے دیتا ہے تو کیا اگلے خاوند کو اب اس سے نکاح کرنا حلال ہے۔ آپ نے فرمایا نہیں نہیں جب تک کہ یہ اس سے اور وہ اس سے لطف اندوز نہ ہو لیں۔ (مسند احمد ابن ماجہ وغیرہ)

اس روایت کے راوی حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے خود امام سعید بن میتب ہیں۔ پس کیسے ممکن ہے کہ وہ روایت بھی کریں اور پھر مخالفت بھی کریں اور پھر وہ بھی بلا دلیل۔ ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ عورت رخصت ہو کر جاتی ہے ایک مکان میں میاں بیوی جاتے ہیں۔ پردہ ڈال دیا جاتا ہے لیکن صحبت نہیں ہوتی۔ جب بھی یہی حکم ہے۔ خود آپ کے زمانہ میں ایسا واقعہ ہوا۔ آپ سے پوچھا گیا مگر آپ نے پہلے خاوند کی اجازت نہ دی (بخاری) مسلم میں ہے کہ حضرت رفاعہ قرظی کی بیوی صاحبہ تمیمہ بنت وہب کو جب انہوں نے آخری تیسری طلاق دے دی تو ان کا نکاح حضرت عبدالرحمٰن بن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ہوا لیکن یہ شکایت لے کر دربار رسالت مآب میں آئیں اور کہا کہ وہ عورت کے مطلب کا نہیں۔ مجھے اجازت ہو کہ میں اپنے اگلے خاوند کے گھر چلی جاؤں۔ آپ نے فرمایا یہ نہیں ہو سکتا جب تک کہ تیری کسی اور خاوند سے مجامعت نہ ہو۔ ان احادیث کی بہت سی سندیں ہیں اور مختلف الفاظ سے روایت ہے۔

فصل ☆ یہ یاد رہے کہ مقصود دوسرے خاوند سے یہ ہے کہ خود اسے رغبت ہو اور وہ ہمیشہ بیوی بنا کر رکھنے کا خواہش مند ہو کیونکہ نکاح سے مقصود یہی ہے۔ یہ نہیں کہ اگلے خاوند کے لئے حلال ہو جائے اور بس۔ بلکہ امام مالک رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ بھی شرط ہے کہ یہ مجامعت بھی مباح اور جائز طریق پر ہو۔ مثلاً عورت روزے سے نہ ہو۔ اسی طرح احرام کی حالت میں نہ ہو۔ اعتکاف کی حالت میں نہ ہو۔ حیض یا نفاس کی حالت میں نہ ہو۔ اسی طرح خاوند بھی روزے سے نہ ہو۔ محرم یا معتکف نہ ہو۔ اگر طرفین میں سے کسی کی یہ حالت ہو اور پھر گو وطی بھی ہو جائے۔ پھر بھی پہلے شوہر پر حلال نہ ہو گی۔ اسی طرح اگر دوسرا خاوند ذمی ہو تو بھی اگلے مسلم خاوند کے لئے حلال نہ ہو گی کیونکہ امام صاحب کے نزدیک کفار کے آپس میں نکاح باطل ہیں۔ امام حسن بصری رحمتہ اللہ علیہ تو یہ بھی شرط لگاتے ہیں کہ انزال بھی ہو کیونکہ حضور ﷺ کے الفاظ سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ جب تک وہ تیرا اور تو اس کا مزہ نہ چکھے اور اگر یہی حدیث ان کے پیش نظر ہو تو چاہئے کہ عورت کی طرف

سے بھی یہ شرط معتبر ہو لیکن حدیث کے لفظ عُسَیلَہ سے منی مراد نہیں۔ یہ یاد رہے کیونکہ مسند احمد اور نسائی میں حدیث ہے کہ عسیلہ سے مراد جماع ہے اور اگر دوسرے خاوند کا ارادہ اس نکاح سے یہ ہے کہ یہ عورت پہلے خاوند کے لئے ہو جائے تو ایسے لوگوں کی مذمت بلکہ ملعون ہونے کی تصریح حدیثوں میں آ چکی ہے۔ مسند احمد میں ہے گودنے والی' گدوانے والی' بال ملانے والی ملوانے والی عورتیں ملعون ہیں۔ حلالہ کرنے والے اور جس کے لئے حلالہ کیا جاتا ہے۔ ان پر بھی خدا کی پھٹکار ہے۔ سود خوار اور سود کھلانے والے بھی لعنتی ہیں۔ امام ترمذی فرماتے ہیں' صحابہ کا عمل اسی پر ہے۔ حضرت عمر' عثمان اور ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا یہی مذہب ہے۔ تابعین فقہاء بھی یہی کہتے ہیں' علی' ابن مسعود اور ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا بھی یہی فرمان ہے اور روایت میں ہے کہ بیاج کی گواہی دینے والوں اور اس کے لکھنے والوں پر بھی لعنت ہے۔ زکوٰۃ نہ دینے والوں اور لینے میں زیادتی کرنے والوں پر بھی لعنت ہے۔ ہجرت کے بعد لوٹ کر اعرابی بننے والے پر بھی پھٹکار ہے۔ نوحہ کرنا بھی ممنوع ہے۔ ایک حدیث میں ہے میں تمہیں بتاؤں کہ ادھار لیا ہوا سانڈ کون سا ہے؟ لوگوں نے کہا ہاں۔ فرمایا جو حلالہ کرے یعنی طلاق والی عورت سے اس لئے نکاح کرے کہ وہ اگلے خاوند کے لئے حلال ہو جائے۔ اس پر اللہ کی لعنت ہے اور جو اپنے لئے ایسا کرائے وہ بھی ملعون ہے۔ (ابن ماجہ)

ایک روایت میں ہے کہ ایسے نکاح کی بابت حضور ﷺ سے پوچھا گیا' تو آپ نے فرمایا' یہ نکاح ہی نہیں جس میں مقصود اور ہو اور ظاہر اور ہو۔ جس میں خدا کی کتاب کے ساتھ مذاق اور ہنسی ہو۔ نکاح صرف وہی ہے جو رغبت کے ساتھ ہو۔ مستدرک حاکم میں ہے کہ ایک شخص نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے سوال کیا کہ ایک شخص نے اپنی بیوی کو تیسری طلاق دے دی اس کے بعد اس کے بھائی نے بغیر اپنے بھائی کے کہے از خود اس سے اس ارادے سے نکاح کر لیا کہ یہ میرے بھائی کے لئے حلال ہو جائے۔ تو آیا یہ نکاح صحیح ہو گیا۔ آپ نے فرمایا ہرگز نہیں۔ ہم تو اسے نبی ﷺ کے زمانہ میں زنا شمار کرتے تھے۔ نکاح وہی ہے جس میں رغبت ہو۔ اس حدیث کے اس پچھلے جملے نے اسے گو یہ موقوف ہے' حکم میں مرفوع کر دیا بلکہ ایک اور روایت میں ہے کہ امیر المؤمنین حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا۔ اگر ایسا کرے گا یا کرائے گا تو میں دونوں کو زنا کی حد لگاؤں گا۔ یعنی رجم کر دوں گا۔ خلیفہ وقت حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایسے نکاح میں تفریق کر دی۔ اسی طرح حضرت علی اور حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہم وغیرہ بہت سے صحابہ کرام سے بھی یہی مروی ہے رضی اللہ تعالیٰ عنہم پھر فرمان ہے کہ اگر دوسرا خاوند نکاح اور وطی کے بعد طلاق دے دے تو پہلے خاوند پر پھر اسی عورت سے نکاح کر لینے میں گناہ نہیں جبکہ یہ اچھی طرح گزر اوقات کر لیں اور یہ بھی جان لیں کہ وہ دوسرا نکاح صرف دھوکا اور مکروفریب کا نہ تھا۔ بلکہ حقیقت تھی۔ یہ تین احکام شرعی' جنہیں علم والوں کے لئے خدا نے واضح کر دیا۔ ائمہ کا اس میں اختلاف ہے کہ ایک شخص نے اپنی بیوی کو دو یا ایک طلاق دے دی۔ پھر چھوڑے رہا' یہاں تک کہ وہ عدت سے نکل گئی۔ پھر اس نے دوسرے سے گھر بسا لیا۔ اس سے ہم بستری بھی ہوئی۔ پھر اس نے بھی طلاق دے دی اور اس کی عدت ختم ہو چکی پھر اگلے خاوند نے اس سے نکاح کر لیا تو کیا اسے تین میں سے جو طلاقیں یعنی ایک یا دو' جو باقی ہیں' صرف انہی کا اختیار رہے گا۔ یا پہلے کی تین طلاقیں گنتی سے ساقط ہو جائیں گی اور اس سے از سرِ نو تینوں طلاق کا حق ہو جائے گا۔ پہلا مذہب تو ہے امام مالک' امام شافعی اور امام احمد n کا اور صحابہ کی ایک جماعت کا اور دوسرا مذہب امام ابوحنیفہ m اور ان کے ساتھیوں کا اور ان کی دلیل یہ ہے کہ جب اس طرح تیسری طلاق ہی گنتی میں نہیں تو

پہلی دوسری کیا آئے گی۔ واللہ اعلم۔

وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ سَرِّحُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ ۪ وَّلَا تُمْسِكُوْهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوْا ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ ؕ وَلَا تَتَّخِذُوْٓا اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا ۡ وَّاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمَآ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ وَالْحِكْمَةِ يَعِظُكُمْ بِهٖ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۲۳۱﴾

ع ۲۹ ۱۳

اور جب تم نے عورتوں کو (رجعی) طلاق دی (ہو) پھر وہ اپنی عدت گزرنے کے قریب پہنچ جائیں تو (یا تو) تم ان کو قاعدہ کے موافق رجعت کر کے نکاح میں رہنے دو یا قاعدہ کے موافق کو رہائی دو اور ان کو تکلیف پہنچانے کی غرض سے مت رکھو اس ارادے سے کہ ان پر ظلم کیا کرو گے اور جو شخص ایسا (برتاؤ) کرے گا سو وہ اپنا ہی نقصان کرے گا اور حق تعالیٰ کے احکام کو لہو و لعب (کی طرح بے وقعت) مت سمجھو اور حق تعالیٰ کی جو نعمتیں ہیں ان کو یاد کرو اور (خصوصاً) اس کتاب اور (مضامین) حکمت کو جو اللہ تعالیٰ نے تم پر نازل فرمائی ہیں کہ تم کو ان کے ذریعہ سے نصیحت فرماتے ہی اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو اور یقین رکھو کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کو خوب جانتے ہیں۔ ○

عورت کو پریشان کرنا شرعاً ناجائز ہے ☆

مردوں کو حکم ہو رہا ہے کہ جب وہ اپنی بیویوں کو طلاق دیں۔ جن طلاقوں میں لوٹا لینے کا حق انہیں حاصل ہے وہ عدت ختم ہونے کے قریب پہنچ جائے تو یا تو عمدگی کے ساتھ لوٹا لے یعنی رجعت پر گواہ مقرر کرے اور اچھائی سے بسانے کی نیت رکھے یا اسے عمدگی سے چھوڑ دے اور عدت ختم ہونے کے بعد اپنے ہاں سے بغیر اختلاف جھگڑے دشمنی اور بدزبانی کے نکال دے جاہلیت کے اس دستور کو اسلام نے ختم کر دیا۔ جو ان میں تھا کہ طلاق دے دی' عدت ختم ہونے کے قریب رجوع کر لیا۔ پھر طلاق دے دی' پھر رجوع کر لیا۔ یونہی اس دکھیا عورت کی عمر برباد کر دیتے تھے کہ نہ وہ سہاگن ہی رہے نہ رانڈ۔ تو اس سے خدا نے روکا اور فرمایا کہ ایسا کرنے والا ظالم ہے۔ پھر فرمایا کہ آیتوں کو ہنسی نہ بناؤ۔ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ اشعری قبیلہ پر ناراض ہوئے تو حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حاضر خدمت ہو کر سبب دریافت کیا۔ آپ نے فرمایا' کیوں یہ لوگ کہہ دیا کرتے ہیں کہ میں نے طلاق دی' میں نے رجوع کیا۔ یاد رکھو یہ مسلمانوں کی طلاقیں نہیں۔ عورتوں کو عدت کے مطابق طلاقیں دو۔ یہ بھی مطلب کہا گیا ہے کہ یہ وہ شخص ہے جو بلا وجہ طلاق دے اور عورت کو ضرر پہنچانے کے لئے اور اس کی عدت لمبی کرنے کے لئے رجوع ہی کرتا چلا جائے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ شخص ہے جو طلاق دے یا آزاد کرے یا نکاح

کرے۔ پھر کہہ دے کہ میں نے تو ہنسی ہنسی میں یہ کیا ہے۔ ایسی صورتوں میں یہ تینوں کام فی الحقیقت واقع ہو جائیں گے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں' ایک شخص نے اپنی بیوی کو طلاق دی۔ پھر کہہ دیا کہ میں نے تو مذاق کیا تھا۔ اس پر یہ آیت اُتری اور حضور ﷺ نے فرمایا' یہ طلاق ہوگئی۔ (ابن مردویہ)

حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں' لوگ طلاق دیتے اور آزاد کر دیتے۔ نکاح کر لیتے اور پھر کہہ دیتے کہ ہم نے بطور دل لگی کے یہ کیا تھا۔ اس پر یہ آیت اُتری اور حضور ﷺ نے فرمایا' جو طلاق دے یا غلام آزاد کرے یا نکاح کرے یا کرا دے خواہ پختگی کے ساتھ' خواہ ہنسی مذاق میں' وہ سب ہو گیا۔ (ابن ابی حاتم) یہ حدیث مرسل اور موقوف کئی سندوں سے مروی ہے۔ ابوداؤد' ترمذی اور ابن ماجہ میں حدیث ہے کہ تین چیزیں ہیں کہ پکے ارادے سے ہوں اور دل لگی سے ہوں تو تینوں ہی ثابت ہو جائیں گی۔ نکاح' طلاق اور رجعت۔ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ اسے حسن غریب کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی نعمت یاد کرو کہ اس نے رسول بھیجے۔ ہدایت اور دلیلیں نازل فرمائیں۔ کتاب اور سنت دکھائی۔ حکم بھی کئے' منع بھی کئے وغیرہ وغیرہ۔ جو کام کرو اور جو نہ کرو۔ ہر ایک میں خدا سے ڈرتے رہا کرو اور جان رکھو کہ اللہ تعالیٰ ہر پوشیدگی اور ہر ظاہرداری کو بخوبی جانتا ہے۔

وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ يَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ اِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ ذٰلِكَ يُوْعَظُ بِهٖ مَنْ كَانَ مِنْكُمْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ ذٰلِكُمْ اَزْكٰى لَكُمْ وَاَطْهَرُ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۳۲﴾

اور جب تم میں سے ایسے لوگ پائے جائیں کہ وہ اپنی بیبیوں کو طلاق دے دیں۔ پھر وہ عورتیں اپنی میعاد (عدت بھی) پوری کر چکیں تو تم ان کو مت روکو اس امر سے کہ وہ اپنے شوہر سے نکاح کر لیں جب کہ باہم سب رضامند ہو جائیں قاعدے کے موافق اس مضمون سے نصیحت کی جاتی ہے اس شخص کو جو کہ تم میں سے اللہ پر اور روز قیامت پر یقین رکھتا ہو۔ اس نصیحت کو قبول کرنا تمہارے لئے زیادہ صفائی اور زیادہ پاکی کی بات ہے اور اللہ تعالیٰ جانتے ہیں اور تم نہیں جانتے۔ O

نکاحِ ثانی سے عورت کو روکنا جرم ہے:

اس آیت میں عورتوں کے ولی وارثوں کو ممانعت ہو رہی ہے کہ جب کسی عورت کو طلاق ہو جائے اور عدت بھی گزر جائے۔ پھر میاں بیوی نکاح کرنا چاہیں تو انہیں نہ روکیں۔ اس آیت میں دلیل ہے اس امر کی بھی کہ عورت خود اپنا نکاح نہیں کر سکتی اور نکاح بغیر ولی نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ ترمذی اور ابن جریر نے اس آیت کی تفسیر میں یہ حدیث پیش کی ہے کہ عورت' عورت کا نکاح نہیں کر سکتی۔ نہ عورت اپنا نکاح آپ کر سکتی ہے۔ وہ عورتیں زناکار ہیں جو اپنا نکاح آپ کر لیں۔ دوسری حدیث میں ہے نکاح بغیر راہ یافتہ کے اور دو عادل گواہوں کے نہیں۔ گو اس مسئلہ میں بھی اختلاف ہے لیکن اس کے بیان کی جگہ تفسیر نہیں۔ ہم

اِس کا بیان کتاب الاحکام میں کر چکے ہیں[1]۔ فالحمدللہ۔ یہ آیت حضرت معقل بن یسار رضی اللہ تعالیٰ عنہ اوران کی ہمشیرہ صاحبہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ صحیح بخاری شریف میں اس آیت کی تفسیر کے بیان میں ہے کہ حضرت معقل بن یسار رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں' میری بہن کا رشتہ میرے پاس آیا تھا۔ میں نے نکاح کر دیا۔ اس نے کچھ دنوں بعد طلاق دے دی۔ پھر عدت گزرنے کے بعد نکاح کی درخواست کی میں نے انکار کر دیا۔ اس پر یہ آیت اُتری۔ جسے سن کر حضرت معقل رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے باوجودیکہ قسم کھا رکھی تھی کہ میں تیرے نکاح میں نہ دوں گا' نکاح پر آمادہ ہو گئے اور کہنے لگے میں نے خدا کا فرمان سنا اور میں نے مان لیا اور اپنے بہنوئی کو بلا کر دوبارہ نکاح کرا دیا اور اپنی قسم کا کفارہ ادا کیا۔ ان کا نام جمیل بنت یسار رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھا۔ ان کے خاوند کا نام ابوالبداح تھا۔ بعض نے ان کا نام فاطمہ بنت یسار بتایا ہے۔ سدی فرماتے ہیں' کہ یہ آیت حضرت جابر بن عبداللہ اور ان کے چچا کی بیٹی کے بارے میں نازل ہوئی ہے لیکن پہلی بات ہی زیادہ صحیح ہے۔ پھر فرمایا یہ نصیحت ان لوگوں کے لئے ہے جنہیں شریعت پر ایمان ہو' خدا کا ڈر ہو قیامت کا خوف ہو انہیں چاہئے کہ وہ جن عورتوں کے ولی ہوں' انہیں ایسی حالت میں نکاح سے روکیں۔

وَالْوَالِدٰتُ یُرْضِعْنَ اَوْلَادَھُنَّ حَوْلَیْنِ کَامِلَیْنِ لِمَنْ اَرَادَ اَنْ یُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ ؕ وَعَلَی الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ اِلَّا وُسْعَهَا ۚ لَا تُضَآرَّ وَالِدَةٌۢ بِوَلَدِهَا وَلَا مَوْلُوْدٌ لَّهٗ بِوَلَدِهٖ ۚ وَعَلَی الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ ۚ فَاِنْ اَرَادَا فِصَالًا عَنْ تَرَاضٍ مِّنْهُمَا وَتَشَاوُرٍ فَلَا جُنَاحَ عَلَیْهِمَا ؕ وَاِنْ اَرَدْتُّمْ اَنْ تَسْتَرْضِعُوْٓا اَوْلَادَكُمْ فَلَا جُنَاحَ عَلَیْكُمْ اِذَا سَلَّمْتُمْ مَّآ اٰتَیْتُمْ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ ﴿۲۳۳﴾

اور مائیں اپنے بچوں کو دو سال کامل دودھ پلایا کریں یہ مدت اس لئے ہے جو کوئی شیرخوارگی کی تکمیل کرنا چاہے اور جس کا بچہ (یعنی باپ) اس کے ذمہ ہے ان (ماؤں) کا کھانا اور کپڑا قاعدہ کے موافق کسی شخص کو حکم نہیں دیا جاتا مگر اس کی برداشت کے موافق کسی ماں کو تکلیف نہ پہنچانا چاہئے اس کے بچہ کی وجہ سے اور نہ کسی باپ کو تکلیف دینی چاہئے اس کے بچہ کی وجہ سے اور طریق مذکور کے اس ذمہ ہے جو وارث ہو پھر اگر دونوں دودھ چھڑانا چاہیں اپنی رضامندی سے اور مشورہ سے تو دونوں پر کسی قسم کا گناہ نہیں اور اگر تم لوگ اپنے بچوں کو کسی اور انا کا دودھ پلوانا چاہو

[1] امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب یہی ہے کہ عورت خود اپنا نکاح نہیں کر سکتی لیکن امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ عاقل بالغ لڑکی کو اس کے نکاح کی اجازت اس طرح بھی دیتے ہیں کہ وہ خود اپنا نکاح بھی کر لے۔ یہ آیت صاف ابوحنیفہ الامام رحمۃ اللہ علیہ کے مذہب کی تائید کرتی ہے کیونکہ اس میں نکاح کرنے کی نسبت عورت کی جانب کی گئی ہے مگر ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ اسی آیت کو اپنے مذہب کی حجت بنا کر کھینچ تان کر بنا رہے ہیں۔ ۱۲

تب بھی تم پر کوئی گناہ نہیں ۔ جب کہ ان کے حوالہ کر دو جو کچھ ان کو دینا کیا ہے قاعدے کے موافق اور حق تعالیٰ سے ڈرتے رہو اور یقین رکھو کہ حق تعالیٰ تمہارے کیئے ہوئے کاموں کو خوب دیکھ رہے ہیں ۔ ○

شیر خوارگی کی مدت' احکام و مسائل:

یہاں اللہ تعالیٰ بچوں والیوں کو ارشاد فرماتا ہے کہ پوری مدت دودھ پلانے کی دو سال ہے۔ اس کے بعد دودھ پلانے کا کوئی اعتبار نہیں نہ اس سے رضاعت کے احکام ثابت ہو سکتے ہیں اور نہ حرمت ہوتی ہے۔ اکثر ائمہ کرام کا یہی مذہب ہے۔ ترمذی میں باب ہے کہ رضاعت جو حرمت ثابت کرتی ہے وہ دینی ہے جو دو سال پہلے کی ہو۔ پھر حدیث لائے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں وہی رضاعت حرام کرتی ہے جو آنتوں کو پُر کر دے اور دودھ چھوٹنے سے پہلے ہو۔ یہ حدیث حسن صحیح ہے اور اکثر اہل علم صحابہؓ وغیرہ کا اسی پر عمل ہے کہ دو سال پہلے کی رضاعت تو معتبر ہے۔ اس کے بعد کی نہیں۔ اس حدیث کے راوی شرط صحیحین پر ہیں حدیث میں فی الثدی کا جو لفظ ہے' اس کے معنی بھی محل رضاعت کے یعنی دو سال سے پہلے کے ہیں۔ یہی لفظ حضور ﷺ نے اس وقت بھی فرمایا تھا۔ جب آپ کے صاحبزادے حضرت ابراہیم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا انتقال ہوا تھا کہ وہ شیر خوارگی کی مدت میں انتقال کر گئے ہیں اور انہیں دودھ پلانے والی جنت میں مقرر ہے۔ حضرت ابراہیم کی عمر اس وقت ایک سال اور دس مہینے کی تھی۔ دارقطنی میں ایک حدیث دو سال کی مدت کے بعد رضاعت کے معتبر نہ ہونے کی ہے۔ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما بھی فرماتے ہیں کہ اس کے بعد کوئی چیز نہیں۔ ابوداؤد طیالسی کی روایت میں ہے کہ دودھ چھوٹ جانے کے بعد رضاعت نہیں اور بلوغ کے بعد یتیمی کا حکم نہیں۔ خود قرآن حکیم میں اور جگہ ہے: ﴿فِصٰلُهٗ فِيْ عَامَيْنِ......﴾ (لقمان: ۱۴) دودھ چھوٹنے کی مدت دو سال ہے اور جگہ ہے: ﴿وَحَمْلُهٗ وَفِصٰلُهٗ ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا﴾ (الاحقاف: ۱۵) یعنی حمل اور دودھ (کی مدت) تیس ماہ ہیں۔ یہ قول کہ دو سال کے بعد دودھ پلانے اور پینے سے رضاعت کی حرمت ثابت نہیں ہوتی ان تمام حضرات کا ہے۔ حضرت علی' حضرت ابن عباس' حضرت ابن مسعود' حضرت جابر' حضرت ابو ہریرہ' حضرت ابن عمر' حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم۔ حضرت سعید بن المسیب' حضرت عطا اور جمہور کا یہی مذہب ہے۔ امام شافعی' امام احمد' امام اسحٰق' امام ثوری' امام ابو یوسف' امام محمد' امام مالکؒ کا بھی یہی مذہب ہے گو امام مالک سے دو سال دو ماہ بھی نقل ہیں اور ایک روایت میں دو تین ماہ بھی ہیں۔ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ ڈھائی سال کی مدت بتاتے ہیں۔ زفر کہتے ہیں' جب تک دودھ نہیں چھٹا تو تین سال کی مدت ہے۔ امام اوزاعی سے یہ بھی روایت ہے کہ اگر کوئی بچہ دو سال سے پہلے دودھ چھٹا لیا جائے پھر اس کے بعد کسی عورت کا دودھ وہ پیئے تو بھی حرمت ثابت نہ ہو گی۔ اس لئے کہ اب قائم مقام خوراک کے ہو گیا ہے۔ امام اوزاعی سے ایک روایت یہ بھی ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ' حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اور روایت ہے کہ دودھ چھٹا لینے کے بعد رضاعت نہیں۔ اس قول کے دونوں مطلب ہو سکتے ہیں یعنی یا تو یہ کہ دو سال بعد یا یہ کہ جب بھی اس سے پہلے دودھ چھوٹ گیا۔ اس کے بعد جیسے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا فرمان ہے۔ واللہ اعلم۔ ہاں صحیح بخاری صحیح مسلم میں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی ہے کہ وہ اس کے بعد کی بلکہ بڑے آدمی کی رضاعت کو حرمت میں مؤثر جانتی ہیں۔ عطا اور لیث کا بھی یہی قول ہے۔ حضرت عائشہؓ جس شخص کا کسی کے گھر کا آنا جانا ضروری جانتیں وہاں حکم دیتیں کہ وہ عورتیں اسے اپنا دودھ پلائیں اور اس حدیث سے دلیل پکڑتی تھیں کہ حضرت سالم کو جو حضرت ابو حذیفہ کے مولیٰ تھے' آنحضرت ﷺ نے حکم دیا تھا کہ وہ اپنی بیوی صاحبہ کا دودھ

پی لیں۔ حالانکہ وہ بڑی عمر کے تھے اور اس رضاعت کی وجہ سے پھر وہ برابر آتے جاتے رہتے تھے لیکن حضور ﷺ کی دوسری ازدواج مطہرات اس کا انکار کرتی تھیں اور کہتی تھیں کہ یہ حکم خاص انہیں کے لئے تھا۔ ہر شخص کے لئے یہ حکم نہیں۔ یہ مذہب جمہور کا ہے۔ یعنی ائمہ اربعہ اور فقہاء سبعہ کا تمام بڑے صحابہ کرام اور تمام امہات المومنین کا سوائے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے اور ان کی دلیل وہ حدیث ہے بخاری و مسلم میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا دیکھ لیا کرو کہ تمہارے بھائی کون ہیں۔ رضاعت اس وقت ہے جب دودھ بھوک مٹا سکتا ہو۔ باقی رضاعت کا پورا مسئلہ: ﴿وَ اُمَّهٰتُكُمُ الّٰتِيْٓ اَرْضَعْنَكُمْ﴾ (النساء:۲۳) کی تفسیر میں آئے گا ان شاءاللہ تعالیٰ۔

پھر فرمان ہے بچوں کی ماں کا نان ونفقہ بچوں کے والد پر ہے۔ اپنے اپنے شہروں کی عادت اور دستور کے مطابق ادا کریں نہ تو زیادتی ہو نہ کمی بلکہ حسب طاقت و وسعت درمیانی خرچ دے دیا کریں۔ جیسے فرمایا: ﴿لِيُنْفِقْ ذُوْ سَعَةٍ مِّنْ سَعَتِهٖ﴾ (الطلاق:۷) یعنی کشادگی والے اپنی کشادگی کے مطابق اور تنگی والے والے اپنی تنگی کے مطابق دیں۔ اللہ تعالیٰ طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا۔ عنقریب اللہ تعالیٰ سختی کے بعد آسانی کردے گا۔ ضحاک فرماتے ہیں کہ جب کسی شخص نے اپنی بیوی کو طلاق دی اور اس کے ساتھ بچہ بھی ہے تو اس کے شیر خوارگی کے زمانہ تک کا خرچ اس مرد پر واجب ہے۔ پھر ارشاد باری ہے کہ عورت اپنے بچے کو دودھ پلانے سے انکار کر کے اس کے والد کو تنگی میں نہ ڈالے۔ بلکہ بچہ کو دودھ پلاتی رہے۔ اس لئے کہ یہی اس کے گزران کا سبب ہے۔ دودھ سے جب بچہ بے نیاز ہو جائے تو بے شک بچے کو دے دے۔ لیکن پھر بھی نقصان رسائی کا ارادہ نہ ہو اسی طرح خاوند اس سے جبراً بچے کو الگ نہ کرے۔ اس کے حقوق کی نگہداشت کے اور اسے ضرر نہ پہنچائے۔ حنفیہ اور حنبلیہ میں سے جو لوگ اس کے قائل ہیں کہ رشتہ داروں میں سے بعض کا نفقہ بعض پر واجب ہے۔ انہوں نے اسی آیت سے استدلال کیا ہے۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور جمہور سلف صالحین سے یہی مروی ہے۔

سمرہ والی مرفوع حدیث سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے جس میں ہے کہ جو شخص اپنے کسی محرم رشتہ دار کا مالک ہو جائے تو وہ آزاد ہو جائے گا۔ یہ بھی یاد رہے کہ دو سال کے بعد دودھ پلانا عموماً بچہ کو نقصان دیتا ہے یا تو جسمانی یا دماغی۔ حضرت علقمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک عورت کو دو سال سے بڑے بچے کو دودھ پلاتے ہوئے دیکھ کر منع فرمایا۔ پھر فرماتا ہے اگر یہ رضامندی اور مشورہ سے دو سال کے اندر اندر جب کبھی بھی دودھ چھڑانا چاہیں تو ان پر کوئی حرج نہیں۔ ہاں ایک کی رضامندی بغیر دوسرے کی رضامندی ناکافی ہوگی۔ یہ بچے کی حفاظت اور اس کی نگرانی کی ترکیب ہے۔ خیال فرمائیے کہ خدا تعالیٰ اپنے بندوں پر کس قدر رحیم و کریم ہے کہ چھوٹے بچوں کے والدین کو ان کاموں سے روک دیا۔ جس میں بچوں کی بربادی کا خوف تھا اور وہ حکم دیا کہ جس سے ایک طرف بچے کی حفاظت اور دوسری طرف ماں باپ کی بھی اصلاح ہو۔ سورہ طلاق میں فرمایا: ﴿فَاِنْ اَرْضَعْنَ لَكُمْ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ ۔۔﴾ (الطلاق:۶) اگر عورتیں بچے کو دودھ پلایا کریں تو تم ان کی اُجرت بھی ادا کر دیا کرو اور آپس میں عمدگی کے ساتھ معاملہ رکھو۔ یہ اور بات ہے کہ تنگی کے وقت کسی اور سے دودھ پلوا دو۔ چنانچہ یہاں بھی فرمایا اگر والدہ اور والد متفق ہو کر کسی عذر کی بنا پر کسی اور سے دودھ شروع کرائیں اور پہلے کی اجرت کامل طور پر والد والدہ کو دے دے تو بھی دونوں پر گناہ نہیں۔ اب دوسری کسی دایہ سے اجرت چکا کر دودھ پلوا دیں۔ لوگو! اللہ تعالیٰ سے ہر امر میں ڈرتے رہا کرو اور جان رکھو کہ تمہارے اقوال و افعال کو وہ بخوبی جانتا ہے۔

وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا يَّتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّعَشْرًا ۚ فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿۲۳۴﴾

اور جو لوگ تم میں سے وفات پا جاتے ہیں اور بیبیاں چھوڑ جاتے ہیں وہ بیبیاں اپنے آپ کو (نکاح وغیرہ سے) رد کے رکھیں چار مہینے اور دس دن پھر جب اپنی میعاد (عدت) ختم کر لیں تو تم کو کچھ گناہ نہ ہوگا۔ ایسی بات میں کہ وہ عورتیں اپنی ذات کے لئے کچھ کارروائی (نکاح کی) کریں قاعدہ کے موافق اور اللہ تعالیٰ تمہارے تمام افعال کی خبر رکھتے ہیں۔ ○

عدت اور اس کے احکام:

اس آیت میں حکم ہو رہا ہے کہ عورتیں اپنے خاوند کے انتقال کے بعد چار مہینے دس دن عدت گزاریں۔ خواہ ان سے مجامعت ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہو۔ اس بات پر اجماع ہے۔ دلیل اس کی ایک تو اس آیت کا عموم دوسرے یہ حدیث جو مسند احمد اور سنن میں ہے۔ جسے امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ صحیح کہتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے سوال ہوتا ہے کہ ایک شخص نے ایک عورت سے نکاح کیا۔ اس سے مجامعت نہیں کی تھی نہ مہر مقرر ہوا تھا کہ اس کا انتقال ہو گیا۔ فرمایئے اس کی نسبت کیا فتویٰ ہے؟ جب کئی مرتبہ وہ آئے تو آپ نے فرمایا' میں اپنی رائے سے فتویٰ دیتا ہوں' اگر ٹھیک ہو تو خدا کی طرف سے جانو اور خطا ہو تو میرے اور شیطان کی طرف سے سمجھو۔ اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ اس سے بری ہیں۔ میرا فتویٰ یہ ہے کہ اس عورت کو اس کے خاوند کے دستور کے مطابق پورا مہر دیا جائے اس میں کوئی کمی بیشی نہ ہو اور اس عورت کو پوری عدت گزارنی چاہئے اور اسے وراثت بھی ملے گی۔ یہ سن کر حضرت معقل بن یسار اشجعی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کھڑے ہو گئے اور فرمانے لگے بروع بنت واشق رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے یہی فیصلہ کیا تھا۔ حضرت عبداللہ یہ سن کر بہت خوش ہوئے۔ بعض روایات میں ہے کہ اشجع کے بہت لوگوں نے یہ روایت بیان کی۔ ہاں جو عورت اپنے خاوند کی وفات کے وقت حمل سے ہو' اس کے لئے یہ عدت نہیں۔ اس کی عدت وضع حمل ہے گو انتقال کی ایک ساعت بعد ہی ہو جائے۔ قرآن میں ہے: ﴿وَاُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ يَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ﴾ (الطلاق ۴) حمل والیوں کی عدت وضع حمل ہے۔ ہاں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ وضع حمل اور چار مہینے دس دن میں جو دیر کی عدت ہو' وہ حاملہ کی عدت ہے۔ یہ قول تو بہت اچھا ہے اور دونوں آیتوں میں اس سے تطبیق بھی عمدہ طور پر ہوتی ہے۔ لیکن اس کے خلاف صحیحین کی ایک صاف اور صریح حدیث موجود ہے۔ جس میں ہے کہ حضرت سبیعہ اسلمیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے خاوند کا جب انتقال ہوا اس وقت حمل سے تھیں اور چند راتیں ہی گزرنے پائی تھیں کہ بچہ تولد ہوا۔ جب نہا دھو چکیں تو لباس اچھا پہن لیا۔ حضرت ابوالسنابل بن بعلبک نے یہ دیکھ کر فرمایا کہ کیا تم نکاح کرنا چاہتی ہو؟ خدا کی قسم جب تک چار مہینے دس دن نہ گزر جائیں' تم نکاح نہیں کر سکتیں۔ حضرت سبیعہ یہ سن کر خاموش ہو گئیں اور شام کے وقت خدمت نبوی ﷺ میں حاضر ہوئیں اور مسئلہ پوچھا تو آپ نے فرمایا کہ جب بچہ ہو گیا اسی

وقت تم عدت سے نکل گئیں۔ اب تم چاہو تو بے شک نکاح کر سکتی ہو۔ یہ بھی مروی ہے کہ جب حضرت عبداللہ کو اس حدیث کا علم ہوا تو آپ نے بھی اپنے قول سے رجوع کر لیا۔ اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ حضرت عبداللہ کے ساتھی اور شاگرد بھی اسی حدیث کے مطابق فتویٰ دیا کرتے تھے۔ اسی طرح لونڈی کی عدت بھی اتنی نہیں۔ اس کی عدت اس سے آدھی ہے یعنی دو مہینے اور پانچ راتیں۔ جمہور کا مذہب یہی ہے۔ جس طرح لونڈی کی حد بہ نسبت آزاد عورت کے آدھی ہے اسی طرح عدت بھی۔ محمد بن سیرین اور بعض علمائے ظاہر یہ لونڈی کی اور آزاد عورت کی عدت میں برابری کے قائل ہیں۔ ان کی دلیل ایک تو آیت کا عموم ہے۔ دوسرے یہ کہ عدت ایک جبلی امر ہے‘ جس میں تمام عورتیں یکساں ہیں۔ حضرت سعید بن مسیب ابوالعالیہ وغیرہ فرماتے ہیں۔ اس عدت میں حکمت یہ ہے کہ اگر عورت کو حمل ہو گا تو اس مدت میں بالکل ظاہر ہو جائے گا۔

حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی صحیحین والی مرفوع حدیث میں ہے کہ انسان کی پیدائش کا یہ حال ہے کہ چالیس دن تک تو رحم مادر میں نطفہ کی شکل میں ہوتا ہے۔ پھر خون بستہ کی شکل چالیس دن رہتی ہے۔ پھر چالیس دن تک گوشت کا لوتھڑا رہتا ہے پھر اللہ تعالیٰ فرشتے کو بھیجتا ہے اور وہ اس میں روح پھونکتا ہے تو یہ ایک سو بیس دن ہوئے۔ جس کے چار مہینے ہوئے۔ دس دن احتیاطاً رکھ دیئے کیونکہ بعض مہینے انتیس دن کے بھی ہوتے ہیں اور جب روح پھونک دی گئی تو اب بچہ کی حرکت محسوس ہونے لگتی ہے اور حمل بالکل ظاہر ہو جاتا ہے۔ اس لئے اتنی عدت مقرر کی گئی۔ واللہ اعلم۔

سعید بن مسیب فرماتے ہیں‘ دس دن اس لئے ہیں کہ روح انہی دنوں پھونکی جاتی ہے۔ ربیع بن انس رحمتہ اللہ علیہ بھی یہی فرماتے ہیں۔ حضرت امام احمد سے ایک روایت میں یہ بھی مروی ہے کہ جس لونڈی سے بچہ ہو جائے‘ اس کی عدت بھی آزاد عورت کے برابر ہے۔ اس لئے کہ وہ فراش بن گئی اور اس لئے بھی کہ مسند میں حدیث ہے۔ حضرت عمرو بن عاص نے فرمایا۔ لوگو! سنت نبوی کو ہم پر خلط ملط نہ کرو۔ اولاد والی کی عدت جبکہ اس کا سردار فوت ہو جائے چار مہینے دس دن ہیں۔ یہ حدیث ایک اور طریق سے بھی ابوداؤد میں مروی ہے۔

امام احمد رحمتہ اللہ علیہ اس حدیث کو منکر بتاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس کے ایک راوی قبیصہ نے اپنے استاد عمر سے یہ روایت نہیں سنی۔ حضرت سعید بن مسیب رحمتہ اللہ علیہ‘ مجاہد‘ سعید بن جبیر‘ حسن بن سیرین‘ ابوعیاض زہری اور عمرو بن عبدالعزیز کا یہی قول ہے۔ یزید بن عبدالملک بن مروان جو امیر المؤمنین تھے‘ یہی حکم دیتے تھے۔ اوزاعی‘ اسحٰق بن راہویہ اور احمد بن حنبل بھی ایک روایت میں یہی فرماتے ہیں لیکن طاؤس اور قتادہ رحمتہ اللہ علیہ اس کی عدت بھی آدھی بتلاتے ہیں یعنی دو ماہ پانچ راتیں۔ ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ ان کے ساتھی‘ حسن بن صالح بن حی فرماتے ہیں‘ تین حیض عدت گزارے۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہما‘ عطا اور ابراہیم نخعی کا قول بھی یہی ہے۔ امام مالک‘ امام شافعی اور امام احمد کی مشہور روایت میں یہ ہے کہ اس کی عدت ایک حیض ہی ہے۔ ابن عمر‘ شعبی‘ مکحول‘ لیث‘ ابوعبید اور جمہور کا یہی مذہب ہے۔ حضرت لیث فرماتے ہیں کہ اگر حیض کی حالت میں اس کا سید فوت ہوا تو اسی حیض کا ختم ہو جانا اس کی عدت کا ختم ہو جانا ہے۔ امام مالک فرماتے ہیں کہ اگر حیض نہ آتا ہو تو تین مہینے عدت گزار دے۔ امام شافعی اور جمہور فرماتے ہیں‘ ایک مہینہ اور تین دن مجھے زیادہ پسند ہیں۔ واللہ اعلم۔ ازاں بعد جو ارشاد (فرمایا) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سوگ واجب ہے۔ صحیحین میں حدیث ہے کہ عورت خدا پر اور قیامت پر ایمان رکھتی ہو اُسے تین دن سے زیادہ کسی مصیبت پر سوگواری کرنا حرام ہے۔ ہاں خاوند پر چار مہینے

دس دن سوگوار رہے۔ ایک عورت نے حضور ﷺ سے پوچھا کہ میری بیٹی کا شوہر مرگیا ہے۔ اس کی آنکھیں دُکھ رہی ہیں' کیا میں اس کے سرمہ لگادوں؟ آپ نے فرمایا نہیں' دو تین مرتبہ اس نے اپنا سوال دوہرایا اور آپ نے یہی جواب دیا۔ آخر فرمایا' یہ تو چار مہینے دس دن ہی ہیں۔ جاہلیت میں تو تم سال سال بھر بیٹھی رہا کرتی تھیں۔ حضرت زینب ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ پہلے جب کبھی کسی عورت کا خاوند مرجاتا تو اسے کسی جھونپڑے میں ڈال دیتے تھے۔ وہ بدترین کپڑے پہنتی۔ خوشبو وغیرہ سے الگ رہتی اور سال بھر تک اسی برے حال میں رہتی تھی۔ سال بھر کے بعد نکلتی اور اونٹ کی مینگنی لے کر پھینکتی اور کسی جانور مثلاً گدھے یا بکری یا پرندے کے جسم کے ساتھ اپنے جسم کو رگڑتی۔ بسا اوقات وہ مرہی جاتی۔ یہ تھی زمانہ جاہلیت کی رسم پس یہ اس کے بعد کی آیت کے لئے ناسخ ہے۔ جس میں ہے کہ ایسی عورتیں سال بھر تک رکی رہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما وغیرہ یہی فرماتے ہیں لیکن بات غور طلب ہے۔ اس کی تفصیل عنقریب آئے گی ان شاء اللہ تعالیٰ۔

مطلب یہ ہے کہ اس زمانہ میں رانڈ عورت کو زینت اور خوشبو اور بھڑکیلے کپڑے اور زیور وغیرہ پہننا منع ہے اور یہ سواری واجب ہے۔ ہاں ایک قول یہ بھی ہے کہ طلاق رجعی کی عدت میں یہ واجب نہیں اور واجب طلاق بائن ہو تو وجوب اور عدم وجوب کے دونوں قول ہیں۔ شوہر کے انتقال کی صورت میں تو تمام بیبیوں پر یہ سوگواری واجب ہے' خواہ وہ بالغہ ہو' خواہ وہ عورتیں ہوں' جو زمانہ حیض اور توالد و تناسل کی حد سے گزر چکی ہوں یا آزاد عورتیں ہوں۔ لونڈیاں ہو یا مسلمان عورتیں ہوں یا کافرہ ہوں کیونکہ آیت میں عام حکم ہے۔ ہاں ثوری اور حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کافرہ عورت کی سوگواری کے قائل نہیں۔ اشہب اور ابن نافع کا قول بھی یہی ہے۔ ان کی دلیل وہ حدیث ہے۔ جس میں ہے کہ جو عورت خدا اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتی ہو پس معلوم ہوا کہ حکم تعبدی ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ اور ثوری کم سن بالغہ عورت کے لئے بھی یہی فرماتے ہیں کیونکہ وہ غیر مکلفہ ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ اور ان کے اصحاب مسلمان لونڈی کو اس میں ملاتے ہیں لیکن ان مسائل کے تصفیہ کا یہ موقع نہیں۔ واللہ الموفق بالصواب۔ پھر فرمایا جب ان کی عدت گزر چکے تو ان کے اولیا پر کوئی گناہ نہیں کہ وہ عورتیں اپنا چناؤ یا نکاح کریں۔ یہ سب ان کے لئے حلال طیب ہے۔ حسن زہرا اور سدی سے بھی اسی طرح مروی ہے۔

وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيمَا عَرَّضْتُمْ بِهٖ مِنْ خِطْبَةِ النِّسَآءِ اَوْ اَكْنَنْتُمْ فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ ۭ عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ سَتَذْكُرُوْنَهُنَّ وَلٰكِنْ لَّا تُوَاعِدُوْهُنَّ سِرًّا اِلَّآ اَنْ تَقُوْلُوْا قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ڛ وَلَا تَعْزِمُوْا عُقْدَةَ النِّكَاحِ حَتّٰى يَبْلُغَ الْكِتٰبُ اَجَلَهٗ ۭ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ فَاحْذَرُوْهُ ۚ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ﴿۲۳۵﴾

ع ۳۰ ۱۴

اور تم پر کوئی گناہ نہیں ہوگا جو ان مذکورہ عورتوں کو پیغام (نکاح) دینے کے بارے میں کوئی بات اشارۃً کہو یا اپنے

دِل میں (ارادہ نکاح کو) پوشیدہ رکھو۔ اللہ تعالیٰ کو یہ بات معلوم ہے کہ تم ان عورتوں کا (ضرور) ذکر مذکورہ کرو گے لیکن ان سے نکاح کا وعدہ (اور گفتگو) مت کرو مگر یہ کہ کوئی بات قاعدے کے موافق کہو اور تم تعلق نکاح (فی الحال) کا ارادہ بھی مت کرو یہاں تک کہ عدت مقررہ اپنی ختم کو پہنچ جائے اور یقین رکھو اس کا کہ اللہ تعالیٰ کو تمہارے دِلوں کی بات کی اطلاع ہے۔ سو اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہا کرو اور یقین رکھو کہ اللہ تعالیٰ معاف بھی کرنے والے ہیں۔ حلیم بھی ہیں۔O

زمانۂ عدت میں نکاح کی خواہش مبہم الفاظ میں ہونی چاہئے:

مطلب یہ ہے کہ صراحت کے بغیر نکاح کی خواہش کا اظہار کسی اچھے طریق پر عدت کے اندر کرنے میں گناہ نہیں۔ مثلاً یوں کہنا کہ میں نکاح کرنا چاہتا ہوں۔ میں ایسی عورت کو پسند کرتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ خدا میرا جوڑا بھی ملا دے۔ ان شاء اللہ میں تیرے سوا دوسری عورت سے نکاح نہیں کروں گا۔ میں کسی نیک اور دیندار عورت سے نکاح کرنا چاہتا ہوں۔ اسی طرح اس عورت سے جسے طلاق بائن مل چکی ہو عدت کے اندر ایسے مبہم الفاظ کہنا بھی جائز ہیں۔ جیسے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت فاطمہ بنت قیس رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے فرمایا تھا جبکہ ان کے خاوند ابوعمرو بن حفص نے انہیں آخری تیسری طلاق دے دی تھی کہ جب تم عدت ختم کرو تو مجھے خبر دینا۔ عدت کا زمانہ حضرت ابن اُم مکتوم کے گزارو۔ جب حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے عدت نکل جانے کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع دی تو آپ نے اسامہ بن زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ان کا نکاح کرا دیا۔ ہاں رجعی طلاق کے بعد کی عدت کے زمانہ میں بجز اس کے خاوند کے کسی کو بھی یہ حق نہیں کہ وہ اشارۃً کنایۃً بھی اپنی رغبت ظاہر کرے۔ واللہ اعلم۔

یہ فرمان کہ تم اپنے نفس میں چھپاؤ۔ یعنی منگنی کی خواہش اور جگہ ہے تیرا رب ان سینوں کی پوشیدگیوں کو اور ظاہر کو جانتا ہے اور جگہ ہے میں تمہارے چھپے کھلے کا جاننے والا ہوں۔ پس اللہ تعالیٰ بخوبی جانتا ہے کہ تم اپنے دلوں میں ضرور ذکر کرو گے اس واسطے اس نے تنگی ہٹا دی لیکن ان عورتوں سے پوشیدہ وعدے نہ کرو۔ یعنی زنا کاری سے بچو۔ ان سے یوں نہ کہو کہ میں تم پر عاشق ہوں تم بھی وعدہ کرو کہ میرے سوا کسی اور سے نکاح نہ کرو گی وغیرہ۔ عدت میں ایسے الفاظ کا کہنا جائز نہیں۔ نہ یہ جائز ہے کہ پوشیدہ طور پر عدت میں نکاح کر لے اور عدت گزر جانے کے بعد اس نکاح کا اظہار کرے۔ پس یہ سب اقوال اس آیت کے عموم میں آ سکتے ہیں۔ اسی لئے فرمان ہوا لیکن تم ان سے اچھی بات ہی کرو مثلاً ولی سے کہہ دیا کہ جلدی نہ کرنا' عدت گزر جانے کی مجھے بھی خبر کرنا وغیرہ۔ جب تک عدت ختم نہ ہو جائے تب تک نکاح منعقد نہ کیا کرو۔

علماء کا اجماع ہے کہ عدت کے اندر نکاح صحیح نہیں۔ اگر کسی نے کر لیا اور دخول بھی ہو گیا تو بھی ان کی جدائی کرا دی جائے گی۔ اب آیا یہ عورت اس پر ہمیشہ کے لئے حرام ہو جائے گی یا پھر عدت گزر جانے کے بعد نکاح کر سکتا ہے۔ اس میں اختلاف ہے۔ جمہور تو کہتے ہیں کر سکتا ہے لیکن امام مالک فرماتے ہیں کہ وہ ہمیشہ کے لئے حرام ہو گئی۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ جس عورت کا نکاح عدت کے اندر ہو جائے' اگر اس کا خاوند اس سے نہیں ملا تو ان دونوں میں جدائی کرا دی جائے گی اور جب اس کے پہلے خاوند کی عدت گزر جائے تو یہ شخص منجملہ اور لوگوں کے اس کے نکاح کا پیغام دے سکتا ہے اور اگر دونوں میں تعلق زن وشوئی بھی ہو گیا ہے۔ جب بھی جدائی کرا دی جائے گی اور پہلے خاوند کی عدت گزار کر پھر اس دوسرے خاوند کی عدت گزارے گی اور پھر یہ شخص اس سے ہرگز نکاح نہیں سکتا۔ اس فیصلہ کا ماخذ یہ معلوم ہوتا

ہے کہ جب اس شخص نے جلدی کر کے خدا تعالیٰ کے مقرر کردہ وقت کا لحاظ نہ کیا تو اسے اس کے خلاف سزا دی گئی کہ وہ عورت اس پر ہمیشہ کے لئے حرام کر دی گئی۔ جیسے کہ قاتل اپنے مقتول کے ورثہ سے محروم کر دیا جاتا ہے۔ امام شافعی نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے بھی یہ اثر روایت کیا ہے۔ امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ پہلا قول تو امام صاحب کا یہی تھا لیکن جدید قول آپ کا یہ ہے کہ اسے بھی نکاح کرنا جائز ہے کیونکہ حضرت علی کا یہی فتویٰ ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ والا اثر سند منقطع ہے بلکہ حضرت مسروق رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس سے رجوع کر لیا ہے اور فرمایا ہے۔ مہر ادا کر دے اور عدت کے بعد یہ دونوں آپس میں اگر چاہیں تو نکاح کر سکتے ہیں۔ پھر فرمایا جان لو کہ خدائے تعالیٰ تمہارے دلوں کی پوشیدہ باتوں کو جانتا ہے۔ اس کا لحاظ اور خوف رکھو۔ اپنے دل میں عورتوں کے متعلق فرمان باری کے خلاف خیال بھی نہ آنے دو۔ ہمیشہ دل کو صاف رکھو۔ برے خیال سے اسے پاک رکھو۔ ڈر خوف کے حکم کے ساتھ ہی اپنی رحمت کی طمع اور لالچ بھی دلائی اور فرمایا کہ خدائے عالم خطاؤں کو بخشنے والا اور حلم و کرم والا ہے۔

لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ مَا لَمْ تَمَسُّوهُنَّ أَوْ تَفْرِضُوا لَهُنَّ فَرِيضَةً ۚ وَّمَتِّعُوهُنَّ ۚ عَلَى الْمُوسِعِ قَدَرُهُ وَ عَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهُ ۚ مَتَاعًا بِالْمَعْرُوفِ ۖ حَقًّا عَلَى الْمُحْسِنِينَ ﴿۲۳۶﴾

تم پر (مہر کا) کچھ مواخذہ نہیں اگر بیبیوں کو ایسی حالت میں طلاق دے دو کہ نہ انکو تم نے ہاتھ لگایا ہے اور نہ ان کے لئے کچھ مہر مقرر کیا ہے اور صرف انکو ایک جوڑا دے دو۔ صاحب وسعت کے ذمہ اسکی حیثیت کے مطابق اور تنگدست کے ذمہ اسکی حیثیت کے موافق ہے۔ جوڑا دینا قاعدہ کے موافق واجب ہے خوش معاملہ لوگوں پر۔ ○

طلاق کی ایک اور صورت ☆

عقد نکاح کے بعد دخول سے پہلے بھی طلاق دینا مباح ہو رہا ہے۔ مفسرین نے فرمایا ہے کہ یہاں مراد مس سے نکاح ہے۔ دخول سے پہلے طلاق دے دینا بلکہ مہر کا بھی ابھی تقرر نہیں ہوا اور طلاق دے دینا بھی جائز ہے۔ گو اس میں عورت کی بے حد دل شکنی ہے۔ اس لئے حکم ہوا کہ اپنے مقدور بھر اس صورت میں مرد کو عورت کے ساتھ سلوک کرنا چاہئے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں اس کا اعلیٰ حصہ خادم ہے اور اس سے کم چاندی ہے اور اس سے کم کپڑا ہے یعنی اگر مالدار ہے تو غلام وغیرہ دے اور اگر مفلس ہے تو کم سے کم تین کپڑے دے۔ حضرت شعبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں درمیانہ درجہ اس فائدہ پہنچانے کا یہ ہے کہ کرتا دوپٹہ لحاف اور چادر دے دے۔ شریح فرماتے ہیں پانچ سو درہم دے۔ ابن سیرین فرماتے ہیں غلام دے یا خوراک دے یا کپڑے لتے دے۔ حضرت حسن بن علی رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے دس ہزار دیئے تھے لیکن پھر بھی وہ بیوی صاحبہ فرماتی تھیں کہ اس محبوب مقبول کی جدائی کے مقابلہ میں یہ حقیر چیز کچھ بھی نہیں۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کہ اگر دونوں اس فائدہ کی مقدار میں تنازعہ کریں تو اس کے خاوند کے مہر سے آدھی رقم دلوادی جائے حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا فرمان ہے کہ کسی مقرر چیز پر خاوند کو مجبور نہیں کیا جا سکتا بلکہ کم سے کم جس چیز کو متعہ یعنی فائدہ اور اسباب کہا جا سکتا ہے وہ کافی ہو

گا۔ میرے نزدیک اتنا کپڑا متعہ ہے جتنے میں نماز پڑھ لینی جائز ہو جائے۔ گو پہلا قول حضرت الامام کا یہ تھا کہ مجھے اس کا کوئی صحیح اندازہ معلوم نہیں لیکن میرے نزدیک بہتر یہ ہے کہ کم سے کم تیس درہم ہونے چاہئیں جیسے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے۔ اس بارے میں بہت اقوال ہیں کہ ہر طلاق والی عورت کو کچھ نہ کچھ اسباب دینا چاہئے۔ یا صرف اسی عورت کو جس سے تعلق زن وشوئی نہ ہوا ہو۔ بعض تو سب کے لئے کہتے ہیں کیونکہ قرآن کریم میں ہے: ﴿وَلِلْمُطَلَّقٰتِ مَتَاعٌ بِالْمَعْرُوْفِ......﴾ (البقرۃ:۲۴۱) پس اس آیت کے عموم سے سب کے لئے وہ ثابت کرتے ہیں۔ اسی طرح ان کی دلیل یہ آیت بھی ہے: ﴿فَتَعَالَيْنَ اُمَتِّعْكُنَّ......﴾ (الاحزاب:۲۸) یعنی اے نبی اپنی بیویوں سے کہو کہ اگر تمہارے خواہش دنیا کی زندگی اور اسی کی زینت کی ہے تو آؤ میں تمہیں کچھ اسباب بھی دوں اور تمہیں اچھائی کے ساتھ چھوڑ دوں۔ پس یہ تمام ازواج مطہرات وہ تھیں جن کا مہر بھی مقرر تھا اور جو حضور ﷺ کی خدمت میں بھی آ چکی تھیں۔ سعید بن جبیر ابو العالیہ حسن بصری کا قول یہی ہے واللہ اعلم۔

بعض کہتے ہیں اسباب کا دینا اس طلاق کو ضروری ہے جس سے خلوت ہوئی ہو۔ گو مہر مقرر ہو چکا ہو کیونکہ قرآن کریم میں ہے: ﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا نَكَحْتُمُ الْمُؤْمِنٰتِ ثُمَّ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ فَمَا لَكُمْ عَلَيْهِنَّ مِنْ عِدَّةٍ تَعْتَدُّوْنَهَا فَمَتِّعُوْهُنَّ وَسَرِّحُوْهُنَّ سَرَاحًا جَمِيْلًا﴾ (الاحزاب:۴۹) یعنی اے ایمان والو! تم جب ایمان والی عورتوں سے نکاح کر لو۔ پھر انہیں ہاتھ لگانے سے پہلے ہی طلاق دے دو تو ان پر تمہاری طرف سے کوئی عدت نہیں' جو عدت وہ گزاریں تم انہیں کچھ مال اسباب دے دو اور بھل منساہت سے چھوڑ دو۔ سعید بن مسیب کا قول ہے کہ سورہ احزاب کی یہ آیت سورہ بقرہ کی آیت سے منسوخ ہو چکی ہے۔ حضرت سہل بن سعد اور ابو اسید رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت امیمہ بنت شرجیل سے نکاح کیا۔ جب وہ رخصت ہو کر آئیں اور آپ نے ہاتھ بڑھایا تو اس نے برا مانا۔ آپ نے ابو اسید سے فرمایا اسے دو رنگین کپڑے دے کر رخصت کرو۔ تیسرا قول یہ ہے کہ صرف اسی صورت میں بطور فائدہ کے اسباب ومتاع کا دینا ضروری ہے جبکہ عورت کی وداع نہ ہوئی ہو اور مہر بھی مقرر نہ ہوا ہو اور اگر دخول ہو گیا ہو تو مہر مثل یعنی خاندان کے مہر کے مطابق دینا پڑے گا' اگر مقرر نہ ہوا ہو اگر مقرر ہو چکا ہو اور رخصت سے پہلے طلاق دے دے تو آدھا مہر دینا پڑے گا اور رخصتی بھی ہو چکی ہے تو پورا مہر دینا پڑے گا اور یہی متعہ کا عوض ہو گا۔ ہاں اس مصیبت زدہ عورت کے لئے متعہ ہے۔ جس سے نہ ملاپ ہوا نہ مہر مقرر ہوا اور طلاق مل گئی۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما اور مجاہد کا یہی قول ہے۔

گو بعض علماء اسی کو مستحب بتلاتے ہیں کہ ہر طلاق والی عورت کو کچھ نہ کچھ دے دینا چاہئے۔ ان کے سوا جو مہر مقرر کئے ہوئے نہ ہوں اور نہ خاوند بیوی کا میل ہوا ہو۔ یہی مطلب سورہ احزاب کی اس آیت تخییر کا ہے جو اس سے پہلے اسی آیت کی تفسیر میں بیان ہو چکی ہے اور اسی لئے یہاں اس خاص صورت کے لئے فرمایا گیا کہ امیر اپنی وسعت کے مطابق دیں اور غریب اپنی وسعت کے مطابق ...... حضرت شعبی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے سوال ہوتا ہے کہ یہ اسباب نہ دینے والا کیا گرفتار کیا جائے گا' تو آپ فرماتے ہیں اپنی طاقت کے مطابق دے دے۔ خدا کی قسم اس بارے میں کسی کو گرفتار نہیں کیا گیا۔ اگر یہ واجب ہوتا تو قاضی لوگ ضرور ایسے شخص کو قید کر لیتے۔

وَاِنْ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيْضَةً

فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ اِلَّآ اَنْ يَّعْفُوْنَ اَوْ يَعْفُوَا الَّذِيْ بِيَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ ۭ وَاَنْ تَعْفُوْٓا اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ۭ وَلَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۲۳۷﴾

اور اگر تم ان بیبیوں کو طلاق دو قبل اس کے کہ ان کو ہاتھ لگاؤ اور ان کے لئے کچھ مہر بھی مقرر کر چکے تھے تو جتنا مہر تم نے مقرر کیا ہو' اس کا نصف (واجب) ہے مگر یہ کہ وہ عورتیں (اپنا نصف) معاف کر دیں یا وہ شخص رعایت کر دے جس کے ہاتھ میں نکاح کا تعلق (رکھنا اور توڑنا) ہے اور تمہارا معاف کر دینا (بہ نسبت وصول کرنے کے) تقویٰ کے قریب ہے اور آپس میں احسان کرنے میں غفلت مت کرو۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ تمہارے سب کاموں کو دیکھتے ہیں۔O

ضمنی مسائل' ذیلی مباحث☆

آیت میں صاف دلالت ہے اس امر پر کہ پہلی آیت میں جن عورتوں کے لئے متعہ مقرر کیا گیا تھا۔ وہ صرف وہی عورتیں ہیں۔ جن کا ذکر اس آیت میں تھا کیونکہ اس آیت میں یہ بیان ہوا ہے کہ دخول سے پہلے جب کہ طلاق دے دی گئی اور مہر مقرر ہو چکا تھا' تو آدھا مہر دینا پڑے گا۔ اگر یہاں بھی اس کے سوا کوئی متعہ واجب ہوتا تو ضرور ذکر کیا جاتا کیونکہ دونوں آیتوں کی دونوں صورتیں ایک کے بعد ایک بیان ہو رہی ہیں۔ واللہ اعلم۔ اس صورت میں جو یہاں بیان ہو رہی ہے۔ آدھے مہر پر علماء کا اجماع ہے لیکن بعض کے نزدیک پورا مہر اس وقت واجب ہوتا ہے۔ جبکہ خلوت ہو گئی یعنی میاں بیوی تنہائی کی حالت میں کسی مکان میں جمع ہو گئے گو ہمبستری نہ ہوئی ہو۔ امام شافعی رحمتہ اللہ علیہ کا پہلا قول یہی ہے اور خلفائے راشدین رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا فیصلہ بھی یہی ہے لیکن امام شافعی رحمتہ اللہ علیہ کی روایت سے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے نقل ہے کہ اس صورت میں بھی صرف نصف مہر مقررہ ہی دینا پڑے گا۔ امام شافعی فرماتے ہیں میں بھی یہی کہتا ہوں اور ظاہر الفاظ کتاب اللہ کے بھی یہی کہتے ہیں۔ امام بیہقی فرماتے ہیں کہ اس روایت کے راوی لیث بن ابی سلیم اگرچہ مجروح ہیں لیکن ابن ابی طلحہ سے ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی یہ روایت نقل کی ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا فرمان یہی ہے۔ پھر فرمایا کہ اگر عورتیں خود ایسی حالت میں اپنا آدھا مہر بھی خاوند کو معاف کر دیں تو یہ اور بات ہے۔ اس صورت میں خاوند کو سب معاف ہو جائے گا۔

ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ ثیبہ عورت اگر اپنا حق چھوڑ دے اسے اختیار ہے۔ بہت سے مفسرین تابعین کا یہی قول ہے۔ محمد بن کعب قرظی کہتے ہیں کہ اس سے مراد عورتوں کا معاف کرنا نہیں بلکہ مردوں کا معاف کرنا ہے یعنی مرد اپنا آدھا حصہ چھوڑ دے اور پورا مہر دے دے لیکن یہ قول شاذ ہے' کوئی اور اس قول کا قائل نہیں۔ پھر فرماتا ہے کہ یا وہ معاف کر دے جس کے ہاتھ میں نکاح کی گرہ ہے۔ ایک حدیث میں ہے۔ اس سے مراد خاوند ہے۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے سوال ہوا کہ اس سے مراد کیا عورت کے اولیا ہیں۔ فرمایا نہیں بلکہ اس سے مراد خاوند ہے اور بھی بہت سے مفسرین سے

یہی روایت ہے امام شافعی کا جدید قول بھی یہی ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کا بھی یہی مذہب ہے۔ اس لئے کہ حقیقتہً نکاح کو باقی رکھنا' توڑ دینا وغیرہ یہ سب خاوند ہی کے اختیار میں ہے اور جس طرح ولی کو اس کی طرف سے جس کا ولی ہے' اس کے مال کا دے دینا جائز نہیں' اسی طرح اس کے مہر کے معاف کر دینے کا بھی اختیار نہیں۔ دوسرا قول اس بارے میں یہ ہے کہ اس سے مراد عورت کے باپ بھائی اور وہ لوگ ہیں' جن کا اجازت کے بغیر عورت نکاح نہیں کر سکتی۔ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما' علقمہ' حسن' عطا' طاؤس' زہری' ربیعہ' زید بن اسلم' ابراہیم نخعی' عکرمہ' محمد بن سیرین سے بھی یہی نقل ہے۔ ان دونوں بزرگوں کا بھی ایک قول یہی ہے۔ امام مالک رحمتہ اللہ علیہ اور امام شافعی کا قول قدیم بھی یہی ہے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ ولی نے اس حق کا حقدار اسے کیا تھا تو اس میں تصرف کرنے کا بھی اسے اختیار ہے۔ گو اور مال میں ہیر پھیر اختیار نہ ہو۔ عکرمہ فرماتے ہیں' اللہ تعالیٰ نے معاف کر دینے کی رخصت عورت کو دی اور اگر وہ بخیلی اور تنگدلی کرے تو اس کا ولی معاف کر سکتا ہے۔ گو وہ عورت سمجھدار ہو۔ حضرت شریح بھی یہی فرماتے ہیں لیکن جب شعبی نے انکار کیا تو آپ نے اس سے رجوع کر لیا اور فرمانے لگے کہ اس سے مراد خاوند ہی ہے بلکہ وہ اس بات پر مباہلہ کے لئے تیار رہتے تھے۔ پھر فرماتا ہے تمہارا معاف کرنا ہی تقویٰ سے زیادہ قریب ہے۔ اس سے مراد وہ دونوں ہی ہیں یعنی دونوں میں سے اچھا وہی ہے جو اپنا حق چھوڑ دے۔ یعنی عورت یا تو اپنا آدھا حصہ بھی اپنے خاوند کو معاف کر دے یا خاوند ہی اسے بجائے آدھے کے پورا مہر دے دے۔ آپس کی فضیلت یعنی احسان کو نہ بھولو۔ اسے بے کار نہ چھوڑو بلکہ اسے کام میں لاؤ۔

ابن مردویہ کی ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا' لوگوں پر ایک کاٹ کھانے والا زمانہ آئے گا۔ مؤمن بھی اپنے ہاتھوں کی چیز کو دانتوں سے پکڑ لے گا اور فضیلت و بزرگی کو بھول جائے گا۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے اپنے آپس کے فضل کو نہ بھولو۔ برے ہیں وہ لوگ جو ایک مسلمان کی بے کسی اور تنگدستی کے وقت اس سے سستے داموں کی چیز خریدتے ہیں حالانکہ رسول اللہ ﷺ نے اس بیع سے منع فرمایا ہے۔ اگر تیرے پاس بھلائی ہو تو اپنے بھائی کو بھی وہ بھلائی پہنچا۔ اس کی ہلاکت میں حصہ نہ لے۔ ایک مسلمان دوسرے کا بھائی ہے۔ نہ اسے بھلائیوں سے محروم رکھے نہ سے رنج و غم پہنچائے۔ حضرت عون رضی اللہ تعالیٰ عنہ حدیثیں بیان کرتے جاتے اور روتے جاتے۔ یہاں تک کہ آنسو ڈاڑھی سے ٹپکتے رہتے اور فرماتے ہیں' مالداروں کی صحبت میں بیٹھا اور دیکھا کہ ہر وقت دل ملول رہتا کیونکہ جدھر نظر اٹھتی' ہر ایک کو اپنے سے اچھے کپڑوں میں' اچھی خوشبوؤں میں اور اچھی سواریوں میں دیکھتا۔ ہاں مسکینوں کی صحبت میں میں نے بڑی راحت پائی۔ خدائے عالم بھی یہی فرماتا ہے۔ ایک دوسرے کی فضیلت فراموش کرو۔ کسی کے پاس جب کبھی کوئی سائل آئے اور اس کے پاس کچھ نہ ہو تو وہ اس کے لئے دعائے خیر ہی کر دے۔ اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال سے خبردار ہے۔ اس پر تمہارے کام اور تمہارا حال روشن ہے اور عنقریب وہ ہر ایک عامل کو اس کے عمل کا بدلہ دے گا۔

حَافِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى ۗ وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ ﴿۲۳۸﴾

فَإِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا أَوْ رُكْبَانًا ۚ فَإِذَا أَمِنْتُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَمَا عَلَّمَكُمْ مَّا

لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ ﴿۲۳۹﴾

محافظت کرو سب نمازوں کی (عموماً) اور درمیان والی نماز کی (خصوصاً) اور کھڑے ہوا کرو اللہ کے سامنے عاجز بنے ہوئے۔ پھر اگر تم کو اندیشہ ہو تو تم کھڑے کھڑے یا سواری پر چڑھے چڑھے پڑھ لیا کرو۔ پھر جب تم کو اطمینان ہو جائے تو تم خدا تعالیٰ کی یاد اس طریق سے کرو کہ جو تم کو سکھایا ہے۔ جس کو تم نہ جانتے تھے۔ ○

دُنیا میں اِس قدر انہماک کہ دین ہی ہاتھ سے جاتا رہے' دینی ہلاکت ہے:

اللہ تعالیٰ کا حکم ہو رہا ہے کہ نمازوں کے وقت کی حفاظت کرو' اس کی حدود کی نگرانی رکھو اور اول وقت ادا کرتے رہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سوال کرتے ہیں کہ کونسا عمل افضل ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نماز کو وقت پر پڑھنا۔ پوچھا پھر کونسا؟ فرمایا خدا کی راہ میں جہاد کرنا پوچھا' پھر کونسا؟ فرمایا' ماں باپ سے بھلائی کرنا۔ حضرت عبداللہ فرماتے ہیں اگر میں کچھ اور بھی پوچھتا تو آپ اور بھی جواب دیتے۔ (صحیحین) حضرت امام فردہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا جو بیعت کرنے والی عورتوں میں سے ہیں' فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے میں نے سنا' آپ صلی اللہ علیہ وسلم اعمال کا ذکر فرما رہے تھے۔ اس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا' سب سے زیادہ پسندیدہ عمل اللہ کے نزدیک نماز کو اول وقت ادا کرنے کی جلدی کرنا ہے (مسند احمد)۔ امام ترمذی اس حدیث کے ایک راوی عمری کو غیر قوی بتلاتے ہیں۔ پھر صلوٰۃ وسطیٰ کی مزید تاکید ہو رہی ہے۔

صلوٰۃِ وسطیٰ کے بارے میں اختلافی اقوال ☆ سلف و خلف کا اس میں اختلاف ہے کہ صلوٰۃ وسطیٰ کس نماز کا نام ہے۔ حضرت علی' حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہم وغیرہ کا قول ہے کہ اس سے مراد صبح کی نماز ہے۔ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما ایک دفعہ نماز صبح پڑھتے ہیں۔ جس میں ہاتھ اٹھا کر قنوت بھی پڑھتے ہیں' پھر فرماتے ہیں' یہی وہ نماز وسطیٰ ہے جس میں قنوت کا حکم ہوا ہے۔ دوسری روایت میں ہے کہ یہ واقعہ بصرے کی مسجد کا ہے اور قنوت آپ نے رکوع سے پہلے پڑھی تھی۔ ابو العالیہ رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں' بصرے میں میں نے حضرت ابن قیس کے پیچھے صبح کی نماز ادا کی۔ پھر میں نے ایک صحابی سے پوچھا کہ صلوٰۃِ وسطیٰ کونسی ہے؟ آپ نے فرمایا یہی صبح کی ہے اور روایت میں ہے کہ بہت اصحاب اس مجمع میں تھے اور سب نے یہی جواب دیا۔ جابر عبداللہ بھی یہی فرماتے ہیں اور بھی بہت سے صحابہ' تابعین کا یہی مسلک ہے۔ امام شافعی رحمتہ اللہ علیہ بھی یہی فرماتے ہیں۔ اس لئے کہ ان کے نزدیک صبح کی نماز میں ہی قنوت ہے۔ بعض کہتے ہیں اس سے مراد نماز مغرب ہے۔ اس لئے کہ اس سے پہلے بھی چار رکعت والی نماز ہے اور سفر میں دونوں قصر کی جاتی ہیں اور مغرب پوری پڑھی جاتی ہے۔ یہ وجہ بھی ہو سکتی ہے کہ اس کے بعد دو نمازیں رات کی' یعنی عشا اور فجر وہ ہیں' جن اونچی آواز سے قراءت پڑھی جاتی ہے اور دو نمازیں اس سے پہلے دن کی وہ ہیں' جن میں آہستہ قراءت پڑھی جاتی ہے۔ یعنی ظہر عصر' بعض کہتے ہیں یہ نماز ظہر کی ہے۔ ایک مرتبہ چند لوگ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی مجلس میں بیٹھے ہوئے تھے۔ وہاں یہی مسئلہ چھڑا۔ لوگوں نے ایک آدمی بھیج کر حضرت اُسامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے دریافت کیا۔ آپ نے فرمایا یہ ظہر کی نماز ہے۔ جسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم اول وقت پڑھا کرتے تھے۔ (طیالسی) زید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں اس سے زیادہ بھاری نماز صحابہ پر کوئی نہ تھی۔ اس لئے یہ آیت نازل ہوئی اور اس سے پہلے بھی دو نمازیں ہیں۔ اس کے بعد بھی دو ہیں۔

آپ ہی سے یہ بھی مروی ہے کہ قریشیوں کی ایک جماعت کے بھیجے ہوئے دو شخصوں نے آپ سے یہی سوال کیا۔

جس کے جواب میں آپ نے فرمایا وہ عصر ہے۔ پھر دو اور شخصوں نے پوچھا' آپ نے فرمایا وہ ظہر ہے۔ پھر ان دونوں نے حضرت اسامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے پوچھا۔ آپ نے فرمایا یہ ظہر ہے۔ آپ اسے آفتاب ڈھلتے ہی پڑھا کرتے تھے مشکل ایک دو صف کے لوگ آتے تھے۔ کوئی نیند میں ہوتا۔ کوئی کاروبار میں مشغول ہوتا۔ جس پر یہ آیت اُتری۔ اور آپ ﷺ نے فرمایا یا تو یہ لوگ اس حرکت سے باز آ جائیں یا میں ان کے گھروں کو جلا دوں گا لیکن اس کے راوی زبرقان نے صحابہ سے ملاقات نہیں کی لیکن حضرت زید سے اور روایات سے بھی یہ ثابت ہے کہ آپ اس سے مراد ظہر کی نماز ہی بتلاتے تھے۔ ایک مرفوع حدیث میں بھی یہ ہے۔ حضرت ابن عمر' حضرت ابوسعید' حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم وغیرہ سے بھی یہی مروی ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے بھی ایک روایت اسی کی ہے۔ بعض کہتے ہیں اس سے مراد عصر کی نماز ہے۔ اکثر علماء صحابہ وغیرہ کا یہی قول ہے اور جمہور تابعین کا بھی یہی قول ہے اور اکثر اہل اثر کا بھی۔ بلکہ جمہور لوگوں کا' حافظ ابومحمد' عبدالمومن ومیاطی نے اس بارے میں ایک مستقل رسالہ تصنیف فرمایا ہے۔ جس کا نام **کشف انعطافی تبیین الصلوٰۃ الوسطی** ہے۔ اس میں ان کا فیصلہ بھی یہی ہے کہ صلوٰۃ وسطیٰ عصر کی نماز ہے۔ حضرت عمر علی ابن مسعود' ابوایوب عبداللہ بن عمرو سمرہ بن جندب' ابوہریرہ' ابو سعید' حفصہ ' ام حبیبہ' ام سلمہ' ابن عمر' ابن عباس' عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم وغیرہ کا فرمان بھی یہی ہے اور ان حضرات رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے یہی روایت ہے اور بہت سے تابعین سے یہ منقول ہے۔ امام احمد کا امام شافعی کا بھی یہی مذہب[1] ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا بھی مذہب یہی ہے۔ ابو یوسف' محمد سے بھی یہی مروی ہے۔ ابن حبیب مالکی بھی یہی فرماتے ہیں رحمۃ اللہ علیہم اجمعین اس قول کی دلیل سنیے رسول اللہ ﷺ نے جنگ احزاب میں فرمایا' اللہ تعالیٰ ان مشرکین کے دلوں کو اور گھروں کو آگ سے بھردے کہ انہوں نے صلوٰۃ وسطیٰ یعنی نماز عصر سے روک دیا۔ (مسند احمد)

حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ اس سے مراد صبح یا عصر کی نماز مراد لیتے تھے۔ یہاں تک کہ جنگ احزاب میں میں نے حضورؐ سے یہ سنا۔ اس میں قبروں کو بھی آگ سے بھرنا وارد ہوا ہے مسند احمد میں ہے کہ حضورؐ نے اس آیت کی تلاوت کی اور فرمایا' یہ عصر کی نماز ہے۔ اس حدیث کے بہت سے طریق ہیں اور بہت سی کتابوں میں موجود ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ سے ایک مرتبہ سوال ہوا تو آپ نے فرمایا' ہم نے بھی ایک مرتبہ اس میں اختلاف کیا تو ابوہاشم بن عتبہؓ مجلس میں سے اُٹھ کر نبی ﷺ کے مکان پر گئے۔ اجازت مانگ کر اندر داخل ہوئے اور آپ ﷺ سے معلوم کر کے باہر آ کر ہمیں فرمایا کہ یہ نماز عصر ہے۔ (ابن جریر)

عبدالعزیز بن مروان کی مجلس میں بھی ایک مرتبہ یہی مسئلہ پیش آیا۔ آپ نے فرمایا' جاؤ فلاں صحابی سے پوچھ آؤ' تو ایک شخص نے کہا کہ مجھ سے سنیئے' مجھے حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہم نے میرے بچپن میں یہی مسئلہ پوچھنے کے لئے رسول اللہ ﷺ کے پاس بھیجا تھا۔ آپ نے میری چھنگلیا یعنی سب سے چھوٹی انگلی پکڑ کر فرمایا' دیکھ یہ تو ہے فجر کی نماز' پھر اس کے پاس والی انگلی تھام کر فرمایا یہ ہوئی ظہر کی نماز' پھر انگوٹھا پکڑ کر فرمایا یہ مغرب کی نماز۔ پھر شہادت کی انگلی پکڑ کر فرمایا یہ ہوئی عشا کی نماز۔ پھر مجھ سے کہا اب تمہاری کونسی انگلی باقی رہی' میں نے کہا بیچ کی۔ فرمایا اور نماز کونسی باقی رہی؟ میں نے کہا عصر' فرمایا بس

---

[1] امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا رجحان بلکہ ان کا مشہور ترین مذہب یہی ہے کہ صلوٰۃ وسطیٰ سے فجر کی نماز مراد ہے لیکن جمہور امت' اکابر صحابہ اجلہ تابعین کیونکہ صلوٰۃ وسطیٰ سے عصر کی نماز مراد لیتے ہیں اور وہی امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب ہے۔ اس لئے غریب ابن کثیر کو کہنا پڑا کہ امام شافعی کا قول بھی یہی ہے اور پھر ابن کثیر کی چابکدستی کی داد دیجئے کہ ابوحنیفہ کا ذکر اس طرح کر رہے ہیں جیسا کہ ان کا یہ قول ہے لیکن وہ اس پر زیادہ مصر نہیں اور اصل میں یہ تحقیق شافعی الامام کی ہے۔ ۱۲

یہی صلوٰۃ وسطیٰ ہے۔ (ابن جریر) لیکن یہ روایت بہت ہی غریب ہے۔ غرض صلوٰۃ وسطیٰ سے نماز عصر مراد ہونا بہت سی حدیثوں میں وارد ہے۔ جن میں کوئی حسن ہے کوئی صحیح ہے کوئی ضعیف ہے۔ ترمذی مسلم وغیرہ میں بھی یہ حدیثیں ہیں۔ پھر اس نماز کے بارے میں حضور ﷺ کی تاکید میں اور سختی کے ساتھ مخالفت بھی ثابت ہے۔ چنانچہ ایک حدیث میں ہے جس سے عصر کی نماز فوت ہو جائے گویا اس کا گھرانہ تباہ ہو گیا اور مال و اسباب تباہ ہو گیا اور حدیث میں ہے ابر والے دن نماز اول وقت پر پڑھو۔ سنو! جس نے عصر کی نماز چھوڑ دی اس کے اعمال غارت ہو جاتے ہیں۔ ایک مرتبہ حضور ﷺ نے عصر کی نماز قبیلہ عقار کی ایک وادی میں جس کا نام حمیص تھا میں ادا کی۔ پھر فرمایا یہی نماز تم سے اگلے لوگوں پر بھی پیش کی گئی تھی لیکن انہوں نے ضائع کر دیا۔ سنو! اسے پڑھنے والے کو دوہرا اجر ملتا ہے۔ اس کے بعد کوئی نماز نہیں جب تک کہ تم تارے نہ دیکھ لو (مسند احمد)۔

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اپنے آزاد کردہ غلام ابو یونس سے فرماتی ہیں کہ میرے لئے ایک قرآن شریف لکھو اور جب اس آیت: ﴿حافظوا﴾ تک پہنچو تو مجھے اطلاع کرنا۔ چنانچہ جب آپ کو اطلاع دی گئی تو آپ نے: **والصلوٰۃ الوسطیٰ** کے بعد **و صلوٰۃ العصر** لکھوایا اور فرمایا میں نے اسے یونہی رسول اللہ ﷺ سے خود سنا۔ (مسند احمد)

ایک روایت میں: **وھی صلوٰۃ العصر** کا لفظ بھی ہے (ابن جریر) حضور ﷺ کی دوسری بیوی صاحبہ حضرت حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے عمرو بن رافع کو جو آپ کے قرآن کے کاتب تھے اسی طرح یہ آیت لکھوائی تھی (موطا امام مالک) اس حدیث کے بھی بہت سے طریقے ہیں اور کئی ایک کتابوں میں موجود ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے فرمایا میں نے رسول اللہ ﷺ سے یہی الفاظ سنے ہیں۔ حضرت نافع رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں میں نے یہ قرآن شریف خود بھی دیکھا یہی عبارت واؤ کے ساتھ تھی۔ ابن عباس اور عبید بن عسیر کی قراءت بھی یونہی ہے۔

ان روایات کو مدنظر رکھ کر بعض حضرات کہتے ہیں کہ چونکہ واؤ عطف کے لئے ہوتا ہے اور عطف معطوف میں مغائرت ہوتی ہے۔ پس ثابت ہوا کہ صلوٰۃ وسطیٰ اور ہے اور صلوٰۃ عصر اور ہے لیکن اس کا جواب یہ ہے کہ اگر اسے بطور حدیث کے مانا جائے تو حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ والی حدیث بہت زیادہ صحیح ہے اور اس میں صراحت موجود ہے۔ رہا واؤ سو ممکن ہے کہ زائد ہو عاطفہ نہ ہو۔ جیسے: ﴿وَكَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ وَلِتَسْتَبِيْنَ سَبِيْلُ الْمُجْرِمِيْنَ﴾ میں اور ﴿وَكَذٰلِكَ نُرِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلِيَكُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِيْنَ﴾ (الانعام: ۵۵ و ۷۵) میں یا یہ واؤ عطف صفت کے لئے ہو عطف ذات کے لئے نہ ہو جیسے: ﴿وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ﴾ (الاحزاب: ۴۰) میں اور جیسے: ﴿سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلَى الَّذِيْ خَلَقَ فَسَوّٰى وَالَّذِيْ قَدَّرَ فَهَدٰى وَالَّذِيْٓ اَخْرَجَ الْمَرْعٰى﴾ (الاعلیٰ ۱ تا ۴) میں۔ اس کی مثالیں اور بھی بہت سی ہیں۔ شعراء کے کلام میں بھی اس کی نظیر پائی جاتی ہے۔ سیبویہ جو نحویوں کے امام ہیں۔ فرماتے ہیں کہ: مَرَرْتُ بِاَخِيْكَ وَصَاحِبِكَ کہنا درست ہے۔ حالانکہ صاحب اور اخ سے مراد ایک ہی شخص ہے۔ واللہ اعلم۔

اور اگر اس قراءت کے ان الفاظ کو بطور قرآنی الفاظ کے مانا جائے تو ظاہر ہے کہ اس خبر واحد سے قراءت قرآنی ثابت نہیں ہوتی۔ جب تک کہ تواتر ثابت نہ ہو۔ اسی لئے حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے قرآن میں اس قراءت کو نہیں لیا اور نہ ساتوں قاریوں کی قراءت میں یہ الفاظ ہیں بلکہ نہ کسی اور ایسے معتبر قاری کی یہ قراءت پائی گئی ہے۔ علاوہ ازیں ایک حدیث اور ہے جس سے اس قراءت کا منسوخ ہونا ثابت ہو رہا ہے۔ صحیح مسلم شریف میں ہے کہ یہ آیت اتری: حٰفِظُوْا عَلَى

الصَّلٰوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى وَصَلٰوةِ الْعَصْرِ۔ ہم ایک مدت تک اسی طرح حضور ﷺ کے سامنے اس آیت کو پڑھتے رہے۔ پھر یہ تلاوت منسوخ ہوگئی اور آیت یوں رہی: ﴿حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى﴾ ایک شخص نے راوی حدیث حضرت شقیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کہا کہ پھر کیا یہ نماز ہی ہے۔ فرمایا' میں تو سن چکا کہ کس وقت آیت اتری اور کس وقت منسوخ ہوگئی۔ پس اس بنا پر یہ قراءت حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اور حضرت حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی روایت والی یا تو لفظاً منسوخ کی جائے گی اور اگر واؤ کو مغائرت کے لئے مانا جائے تو لفظاً و معنی دونوں کے اعتبار سے منسوخ کی جائے گی۔ بعض کہتے ہیں اس سے مراد مغرب کی نماز ہے۔ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے بھی یہ روایت ہے لیکن اس کی سند میں کلام ہے۔ بعض اور حضرات کا قول بھی یہی ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ بیان کی جاتی ہے کہ اور فرض نمازیں یا تو چار رکعت والی ہیں یا دو رکعت والی ہیں اور اس کی تین رکعتیں ہیں۔ پس یہ درمیانی نماز ٹھہری اور دوسری وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ فرض نمازوں کی یہ وتر ہے اور اس لئے بھی کہ اس کی فضیلت میں بھی بہت کچھ حدیثیں وارد ہوئی ہیں۔ بعض لوگ اس سے مراد عشاء کی نماز بھی بتاتے ہیں۔ بعض کہتے ہیں پانچ وقتوں میں سے ایک وقت کی نماز ہے لیکن ہم متعین نہیں کر سکتے۔ یہ مبہم ہے۔ جس طرح لیلۃ القدر پورے سال میں یا پورے مہینے میں یا پچھلے دس دنوں میں مبہم ہے۔ بعض حضرات فرماتے ہیں' پانچوں نمازوں کا مجموعہ مراد ہے اور بعض کہتے ہیں' یہ عشا اور صبح ہے بعض کا قول ہے یہ جماعت کی نماز ہے۔ بعض کہتے ہیں جمعہ کی نماز ہے۔ کوئی کہتا ہے صلوٰۃ خوف مراد ہے۔ کوئی کہتا ہے نماز عید مراد ہے۔ کوئی کہتا ہے صلوٰۃ ضحیٰ مراد ہے۔ یعنی کہتے ہیں ہم توقف کرتے ہیں اور رائے پیش نہیں کرتے۔ اس لئے کہ دلیلیں مختلف ہیں۔ وجہ ترجیح معلوم نہیں۔ کسی قول پر اجماع ہوا نہیں بلکہ زمانہ صحابہؓ سے لے کر آج تک جھگڑا رہا ہے۔ جس طرح حضرت سعید بن مسیب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ صحابہ کرام اس بارے میں اس طرح مختلف تھے۔ پھر انگلیوں میں انگلیاں ڈال کر دکھائیں۔

لیکن یہ یاد رہے کہ یہ پچھلے اقوال سب کے سب ضعیف ہیں۔ جھگڑا صرف صبح اور عصر کی نماز میں ہے اور صحیح حدیثوں سے عصر کی نماز کا صلوٰۃ وسطیٰ ہونا ثابت ہے۔ پس لازم ہو گیا کہ ہم سب اقوال کو چھوڑ کر یہی عقیدہ رکھیں کہ صلوٰۃ وسطیٰ نماز عصر ہے۔ امام ابومحمد عبدالرحمٰن بن ابوحاتم رازی نے اپنی کتاب فضائل شافعی رحمۃ اللہ علیہ میں روایت کی ہے کہ حضرت امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے: كل ماقلت فكان عن النبي اولى ولا تقلدوني. یعنی میرے جس قول کے خلاف کوئی صحیح حدیث شریف موجود ہو تو حدیث ہی اولیٰ ہے۔ خبردار میری تقلید نہ کرنا۔ امام شافعی کے اس فرمان کو امام ربیع' امام زعفرانی اور امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہم بھی روایت کرتے ہیں اور موسیٰ ابوالولید بن جارود رحمۃ اللہ علیہ امام شافعی سے نقل کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا: اذا اصح الحديث وقلت قولا فانا راجع عن قولي وقائل بذالك. یعنی میری جو بات حدیث شریف کے خلاف ہو۔ میں اپنی اس بات سے رجوع کرتا ہوں اور صاف کہتا ہوں کہ میرا مذہب وہی ہے جو حدیث میں ہو۔

یہ امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی امانت اور سرداری ہے اور آپ جیسے ائمہ کرام میں سے ہر ایک نے بھی یہی کہا ہے کہ ان کے اقوال کو دین نہ سمجھا جائے۔ رحمهم الله ورضي عنهم اجمعين. اسی لئے قاضی ماوردی فرماتے ہیں کہ امام صاحب کا صلوٰۃ وسطیٰ کے بارے میں یہی مذہب سمجھنا چاہئے کہ وہ عصر ہے۔ گو امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا اپنا نیا قول یہ ہے کہ وہ عصر نہیں ہے مگر آپ کے اس فرمان کے مطابق حدیث صحیح کے خلاف اس قول کو پا کر ہم نے چھوڑ دیا۔ شافعی مذہب کے اور

بھی بہت سے محدثین نے بھی فرمایا ہے فالحمدللہ۔ بعض فقہاء شافعی تو کہتے ہیں کہ امام صاحب کا صرف ایک ہی قول ہے کہ وہ صبح کی نماز ہے لیکن یہ سب باتیں طے کرنے کے لئے تفسیر مناسب نہیں۔ علیحدہ اس کا بیان میں نے کر دیا ہے۔ فالحمدللہ۔

پھر فرمایا اللہ تعالیٰ کے سامنے خشوع وخضوع اور مسکینی کے ساتھ کھڑے ہوا کرو۔ جس کو یہ لازم ہے کہ انسانی بات چیت نہ ہو۔ اسی لئے حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے سلام کا جواب حضور ﷺ نے نماز میں نہ دیا اور بعد فراغت فرمایا کہ نماز مشغولیت کی چیز ہے اور حضرت معاویہ بن حکم سے جبکہ انہوں نے نماز پڑھتے ہوئے بات کی تو فرمایا' نماز میں بات چیت نہ کرنی چاہئے۔ یہ تو صرف تسبیح اور تکبیر اور ذکر اللہ ہے۔ (مسلم) مسند احمد وغیرہ میں ہے کہ اس آیت کے نازل ہونے سے پہلے لوگ ضروری بات چیت بھی نماز میں کر لیا کرتے تھے۔ جب یہ آیت اُتری تو خاموش رہنے کا حکم دے دیا گیا لیکن اس حدیث میں ایک اشکال یہ ہے کہ علمائے کرام کی ایک جماعت کے نزدیک نماز میں بات چیت کرنے کی حرمت حبشہ کی ہجرت کے بعد اور مدینہ شریف کی ہجرت سے پہلے ہی مکہ شریف میں نازل ہو چکی تھی۔ چنانچہ صحیح مسلم میں ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ حبشہ کی ہجرت سے پہلے ہم نبی ﷺ کو سلام کرتے تھے' آپ نماز میں ہوتے' پھر بھی جواب دیتے جب حبشہ سے ہم واپس آئے تو حضور ﷺ کو میں نے آپ کی نماز کی حالت میں ہی سلام کیا۔ آپ نے جواب نہ دیا۔ اب میرے رنج وغم کا کچھ نہ پوچھئے۔ نماز سے فارغ ہو کر آپ نے مجھے فرمایا' عبداللہ اور کوئی بات نہیں' میں نماز میں تھا۔ اس وجہ سے میں نے جواب نہ دیا۔ خدا چاہے جو نیا حکم اتارے۔ اس نے یہ نیا حکم نازل فرمایا ہے کہ میں نماز میں نہ بولا کروں۔ پس یہ واقعہ ہجرت مدینہ سے پہلے کا ہے اور یہ آیت مدینہ میں نازل ہوئی۔ اب تو بعض کہتے ہیں کہ زید بن ارقم کے قول کا مطلب کلام سے ہے اور اس کی حرمت پر اس آیت سے استدلال بھی خود ان کا فہم ہے واللہ اعلم۔ بعض کہتے ہیں ممکن ہے دو دفعہ جائز ہوا اور دو دفعہ ممانعت ہوئی۔ لیکن یہ پہلا قول زیادہ ظاہر ہے حضرت ابن مسعودؓ والی روایت جو ابو یعلی میں ہے۔ اس میں ہے کہ حضور ﷺ کے جواب نہ دینے سے مجھے یہ خوف ہوا کہ شاید میرے بارے میں کوئی وحی نازل ہوئی ہے آپ نے مجھ سے فارغ ہو کر فرمایا: عَلَيْكَ السَّلَامُ اَيُّهَا الْمُسْلِمُ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ نماز میں جب تم ہو تو خاموش رہا کرو۔

صلوٰۃ خوف اور اِس سے متعلق تفصیلات ☆ چونکہ نمازوں کی پوری حفاظت کرنے کا فرمان صادر ہو چکا تھا۔ اس لئے اس حالت کو بیان فرمایا جاتا ہے۔ جس میں تمام ادب آداب کی پوری رعایت عموماً نہیں رہ سکتی۔ یعنی میدان جنگ میں' جب کہ دشمن سر پر ہو' تو فرمایا کہ جس طرح ممکن ہو' سوار پیدل قبلہ کی طرف منہ کر کے نہ کر کے نماز ادا کر لیا کرو۔ ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما اس آیت کا یہی مطلب بیان کرتے ہیں۔ بلکہ نافع فرماتے ہیں' میں تو جانتا ہوں یہ مرفوع حدیث ہے۔ مسلم شریف میں ہے' سخت خوف کے وقت اشارے سے ہی نماز پڑھ لیا کرو۔ گو سواری پر سوار ہو۔ عبداللہ بن انیس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو جب حضور علیہ وسلم نے خالد بن سفیان کے قتل کے لئے بھیجا تھا تو آپ نے اسی طرح نماز عصر اشارے سے ادا کی تھی۔ (ابوداؤد)

پس اس میں جناب باری نے اپنے بندوں پر بہت آسانی کر دی اور بوجھ کو ہلکا کر دیا۔ صلوٰۃ خوف ایک رکعت پڑھنی بھی آئی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ نے تمہارے نبی ﷺ کی زبانی حضر کی حالت میں چار رکعتیں فرض کی ہیں اور سفر کی حالت میں دو اور خوف کی حالت میں ایک۔ (مسلم) امام احمد فرماتے ہیں' یہ اس وقت ہے جب بہت زیادہ خوف ہو جابر بن عبداللہ اور بہت سے اور بزرگ صلوٰۃ خوف ایک بتلاتے ہیں۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے صحیح

بخاری میں باب باندھا ہے کہ فتوحات قلعہ کے موقعہ پر اور دشمن سے مڈبھیڑ کے موقعہ پر نماز ادا کرنا اوزاعی فرماتے ہیں۔ اگر فتح قریب آ گئی ہو اور نماز پڑھنے پر قدرت نہ ہو تو ہر شخص اپنے طور پر اشارے سے نماز پڑھ لے۔ اگر اتنا وقت بھی نہ ملے تو تاخیر کریں' یہاں تک کہ لڑائی ختم ہو جائے اور چین نصیب ہو تو دو رکعتیں پڑھ لے۔ ورنہ ایک رکعت پڑھنا کافی ہے لیکن صرف تکبیر کہہ لینا کافی نہیں بلکہ تاخیر کر دیں۔ یہاں تک کہ امن ملے۔ مکحول بھی یہی کہتے ہیں۔ حضرت انس بن مالک کہتے ہیں کہ تستر قلعہ کی لڑائی میں میں بھی فوج میں تھا۔ صبح صادق کے وقت گھمسان کی لڑائی ہو رہی تھی' ہمیں وقت ہی نہ ملا کہ ہم نماز ادا کرتے' خوب دن چڑھے اس دن ہم نے صبح کی نماز پڑھی۔ اگر اس نماز کے لئے بدلے میں مجھے دنیا اور جو کچھ اس میں ہے مل جائے تاہم خوش نہیں ہوں۔

ازاں بعد حضرت امام المحدثین نے اس حدیث سے استدلال کیا ہے جس میں ہے کہ جنگ خندق میں سورج غروب ہونے تک آنحضرت ﷺ عصر کی نماز نہ پڑھ سکے۔ پھر دوسری حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے جب اپنے صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو بنی قریظہ کی طرف بھیجا۔ تو ان سے فرما دیا تھا کہ تم میں سے کوئی بھی بنی قریظہ سے درے (پہلے) نماز عصر نہ پڑھے۔ اب جب کہ نماز عصر کا وقت آ گیا تو بعضوں نے وہیں پڑھ لی اور کہا کہ مطلب حضور ﷺ کا یہ تھا کہ ہم بہت جلد جائیں تاکہ عصر کی نماز کا وقت ہمیں وہاں پہنچ کر ہو اور بعض لوگوں نے نہ پڑھی۔ یہاں تک کہ سورج غروب ہو گیا۔ وہیں جا کر نماز پڑھی۔ حضور ﷺ کو جب اس کا علم ہوا تو نہ آپ نے انہیں کچھ ڈانٹا نہیں۔ پس اس سے حضرت امام بخاری رحمتہ اللہ علیہ یہ مسئلہ ثابت کرتے ہیں۔ گو جمہور اس کے مخالف ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ سورۂ نساء میں جو نماز خوف کا حکم ہوا ہے اور جس نماز کی مشروعیت اور طریقہ حدیثوں میں وارد ہوا ہے' وہ جنگ خندق کے بعد کا ہے۔ جیسے کہ ابوسعید وغیرہ کی روایت میں صراحتہً بیان ہے لیکن امام بخاری' امام مکحول اور امام اوزاعی رحمہم اللہ کا جواب یہ ہے کہ اس کی مشروعیت بعد میں ہونا اس جواز کے خلاف نہیں ہو سکتا ہے کہ یہ بھی جائز ہو اور وہ بھی طریقہ ہو کیونکہ ایسی حالت شاذ و نادر کبھی ہی ہوتی ہے اور خود صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے حضرت فاروق اعظم رحمتہ اللہ علیہ کے زمانے میں فتح تستر میں اس پر عمل کیا اور کسی نے انکار نہیں کیا۔ واللہ اعلم۔ پھر فرمان ہے کہ امن کی حالت میں حکم کی بجا آوری کا پورا خیال رکھو۔ جس طرح میں نے تمہیں ایمان کی راہ دکھائی اور جہل کے بعد علم دیا۔ تو تمہیں بھی چاہئے کہ اس کے شکریہ میں ذکر اللہ باطمینان کیا کرو۔ جیسے کہ نماز خوف کا بیان کر کے فرمایا' جب اطمینان ہو جائے تو نمازوں کو اچھی طرح قائم کرو۔ نماز مومنوں پر وقت مقررہ پر فرض ہے۔ صلوٰۃ خوف کا پورا بیان سورہ نساء کی آیت: ﴿وَاِذَا كُنْتَ فِيْهِمْ......﴾ (النساء:۱۰۲) کی تفسیر میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا ۚۖ وَّصِيَّةً لِّاَزْوَاجِهِمْ مَّتَاعًا اِلَى الْحَوْلِ غَيْرَ اِخْرَاجٍ ۚ فَاِنْ خَرَجْنَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْ مَا فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ مِنْ مَّعْرُوْفٍ ۗ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۴۰﴾ وَلِلْمُطَلَّقٰتِ مَتَاعٌۢ

بِالْمَعْرُوْفِ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ ﴿۲۴۱﴾ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۲۴۲﴾

اور جو لوگ وفات پا جاتے ہیں تم میں سے اور چھوڑ جاتے ہیں بیبیوں کو وہ وصیت کر جایا کریں اپنی ان بیبیوں کے واسطے ایک سال تک منتفع ہونے کی اس طور پر نہ وہ گھر سے نکال جائیں ہاں اگر وہ خود نکل جائیں تو تم کو کوئی گناہ نہیں اس قاعدہ کی بات میں جس کو اپنے بارہ میں کریں اور اللہ تعالیٰ زبردست ہیں حکمت والے ہیں اور سب طلاق دی ہوئی عورتوں کے لئے کچھ کچھ فائدہ پہنچانا قاعدہ کے موافق اور (یہ) مقرر ہوا ہے ان پر جو (شرک وکفر سے) پرہیز کرتے ہیں۔اسی طرح حق تعالیٰ تمہارے لئے اپنے احکام بیان فرماتے ہیں اس توقع پر کہ تم سمجھو (اور عمل کرو)۔○

میدانِ کارزار کے بعض احکام کے بعد شوہر کی وفات سے متعلق مسائل' ربطِ آیات کی واضح دلیل:

اکثر مفسرین کا قول ہے کہ یہ آیت اس سے پہلے کی آیت یعنی چار مہینے دس دن کی عدت والی آیت سے منسوخ ہو چکی ہے۔صحیح بخاری شریف میں ہے کہ حضرت ابن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کہا کہ جب یہ آیت منسوخ ہو چکی ہے تو پھر آپ اسے قرآن کریم میں کیوں لکھوا رہے ہیں؟ آپ نے فرمایا' بھتیجے جس طرح اگلے قرآن میں یہ موجود ہے' یہاں بھی موجود رہے گی۔ہم کوئی ہیر پھیر نہیں کر سکتے۔حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ پہلے تو یہی حکم تھا کہ سال بھر تک نان ونفقہ اس رانڈ عورت کو میت کے مال سے دیا جائے اور اسی کے مکان میں رہے۔پھر یہ آیت میراث نے اسے منسوخ کر دیا اور خاوند کی اولاد ہونے کی صورت میں مال متروکہ کا آٹھواں حصہ اور اولاد نہ ہونے کے وقت چوتھائی مال ورثہ کا مقرر کیا گیا اور عدت چار ماہ دس دن مقرر ہوئی۔اکثر صحابہ اور تابعین سے منقول ہے کہ یہ آیت منسوخ ہے۔سعید بن میتب کہتے ہیں کہ سورۂ احزاب کی آیت: ﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا نَكَحْتُمُ الْمُؤْمِنٰتِ ......﴾ (الاحزاب ۴۹) نے اسے منسوخ کر لیا۔حضرت مجاہد رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں سات مہینے بیس دن جو اصلی عدت چار مہینے دس دن کے سوا کے ہیں۔اس آیت میں اس مدت کا حکم ہو رہا ہے۔عدت تو واجب ہے لیکن یہ زیادتی کی مدت کا عورت کو اختیار ہے۔خواہ وہیں بیٹھ کر یہ زمانہ گزارے خواہ نہ گزارے اور چلی جائے۔میراث کی آیت نے رہنے سہنے کے مکان کو بھی منسوخ کر دیا۔وہ جہاں چاہے عدت گزارے۔مکان کا خرچ خاوند کے ذمہ نہیں۔

پس ان اقوال سے معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت نے سال بھر کی عدت کو واجب ہی نہیں کیا' منسوخ ہونے کے کیا معنی؟ یہ تو صرف خاوند کی وصیت ہے اور اسے بھی اگر عورت پورا کرنا چاہے تو کرے ورنہ اس پر جبر نہیں۔وصیة سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں وصیت کرتا ہے۔جیسے: ﴿يُوْصِيْكُمُ اللّٰهُ فِيْۤ اَوْلَادِكُمْ ....﴾ (النساء ۱۱) اس کا نصب فلتوصوا الهن کو محذوف مان کر ہے وصیة پس اگر عورتیں سال تک اپنے فوت شدہ خاوندوں کے مکانوں میں رہیں تو انہیں نہ نکالا جائے اور اگر وہ عدت گزار کر جانا چاہیں تو ان پر کوئی جبر نہیں۔امام ابن تیمیہ رحمتہ اللہ علیہ بھی اسی قول کو پسند فرماتے ہیں اور بہت سے لوگ اسی کو اختیار کرتے ہیں اور باقی جماعت اسے منسوخ بتلاتے ہے۔پس اگر ان کا ارادہ اصلی عدت کے بعد کے زمانہ کے منسوخ ہونے کا ہے تو خیر' ورنہ اس بارے میں ائمہ کا اختلاف ہے۔وہ کہتے ہیں خاوند کے گھر میں عدت گزارنی ضروری ہے اور اس کے دلیل

موطا مالک کی یہ حدیث ہے۔ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ہمشیرہ صاحبہ فریعہ بنت مالک رسول اللہ ﷺ کے پاس آئیں اور کہا ہمارے غلام بھاگ گئے تھے جنہیں ڈھونڈنے کے لئے میرے خاوند گئے۔ قدوم میں ان غلاموں سے ملاقات ہوئی لیکن انہوں نے آپ کو قتل کر دیا۔ ان کا کوئی مکان نہیں جس میں عدت گزاروں اور نہ کچھ کھانے پینے کو ہے۔ اگر آپ اجازت دیں تو اپنے میکے چلی جاؤں اور وہیں عدت پوری کروں۔ آپ نے فرمایا' اجازت ہے۔ میں لوٹی' ابھی تو میں حجرے میں ہی تھی کہ حضور ﷺ نے مجھے بلوایا یا خود بلایا اور فرمایا تم نے کیا کہا۔ میں نے پھر قصہ بیان کیا۔ آپ نے فرمایا اپنے گھر میں ہی ٹھہری رہو۔ یہاں تک کہ عدت گزر جائے۔ چنانچہ میں نے وہیں عدت کا زمانہ پورا کیا یعنی چار مہینے دس دن۔ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانہ میں آپ نے مجھے بلوایا اور مجھ سے یہی مسئلہ پوچھا۔ میں نے اپنا یہ واقعہ حضور ﷺ کے فیصلے سمیت سنایا۔ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بھی اسی کی پیروی کی اور یہی فیصلہ دیا۔ اس حدیث کو امام ترمذی حسن صحیح کہتے ہیں۔

مطلقہ عورت کو فائدہ دینے کے بارے میں لوگ کہتے تھے کہ اگر ہم چاہیں دیں چاہیں نہ دیں۔ اس پر یہ آیت اُتری۔ اسی آیت سے بعض لوگوں نے ہر طلاق والی کو کچھ نہ کچھ دینا واجب قرار دیا ہے اور بعض دوسرے بزرگوں نے اسے ان عورتوں کے ساتھ مخصوص مانا ہے جن کا بیان پہلے گزر چکا ہے۔ یعنی جن عورتوں سے صحبت نہ ہوئی ہو اور مہر بھی مقرر نہ ہوا ہو اور طلاق دے دی جائے لیکن پہلی جماعت کا جواب یہ ہے کہ عام میں سے ایک عورت کا ذکر کرنا اسی صورت کے ساتھ اس حکم کو مخصوص نہیں کرتا جیسے کہ مشہور اور منصور مذہب ہے واللہ اعلم۔ پھر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اسی طرح اپنی آیتیں حلال و حرام اور فرائض و حدود اور امر و نواہی کے بارے میں واضح اور مفصل بیان کرتا ہے تاکہ کسی قسم کا ابہام اور اجمال باقی نہ رہے کہ ضرورت کے وقت اٹک بیٹھو بلکہ اس قدر صاف بیان ہوتا ہے کہ ہر شخص سمجھ سکے۔

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ خَرَجُوا مِن دِيَارِهِمْ وَهُمْ أُلُوفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ فَقَالَ لَهُمُ اللَّهُ مُوتُوا ثُمَّ أَحْيَاهُمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ لَذُو فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُونَ ﴿۲۴۳﴾ وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿۲۴۴﴾ مَّن ذَا الَّذِي يُقْرِضُ اللَّهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضَاعِفَهُ لَهُ أَضْعَافًا كَثِيرَةً ۚ وَاللَّهُ يَقْبِضُ وَيَبْسُطُ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ﴿۲۴۵﴾

(اے مخاطب کیا) تجھ کو ان لوگوں کا قصہ تحقیق نہیں ہوا جو کہ اپنے گھروں سے نکل گئے تھے اور وہ لوگ ہزاروں ہی تھے موت سے بچنے کے لئے سو اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے (حکم) فرما دیا کہ مر جاؤ (سب مر گئے) پھر ان کو جلا دیا۔ بے شک اللہ تعالیٰ بڑا فضل کرنے والا ہے (لوگوں کے حال) پر مگر اکثر لوگ شکر نہیں کرتے۔ (اس قصہ میں غور کرو) اور اللہ کی راہ میں قتال کرو اور یقین رکھو اس بات کا کہ اللہ تعالیٰ خوب سننے والے (اور) خوب جاننے والا ہے۔ کون

شخص ایسا ہے جو اللہ تعالیٰ کو قرض دے اچھے طور پر قرض دینا۔ پھر (اللہ تعالیٰ اس کے ثواب) کو بڑھا کر بہت سے کر دے اور اللہ کمی کرتا ہے اور فراخی کرتا ہے اور تم اسی کی طرف (بعد مرنے کے) لے جائے جاؤ گے۔○

موت وحیات کے فیصلے من جانب اللہ ہیں:

ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں۔ یہ لوگ چار ہزار تھے اور روایت میں ہے کہ آٹھ ہزار تھے۔ بعض نو ہزار کہتے ہیں۔ بعض چالیس ہزار بتلاتے ہیں۔ بعض تیس ہزار سے کچھ اوپر بتلاتے ہیں۔ یہ لوگ: زوروان نامی بستی کے تھے۔ جو واسط کی طرف ہے۔ بعض کہتے ہیں اس بستی کا نام اوزعات تھا۔ یہ لوگ طاعون کے مارے اپنے شہر کو چھوڑ کر بھاگے تھے۔ ایک بستی میں جب پہنچے وہیں خدا کے حکم سے سب مر گئے اتفاق سے ایک نبی اللہ کا وہاں سے گزر ہوا۔ ان کی دعا سے خدا تعالیٰ نے پھر دوبارہ انہیں زندہ کر دیا۔ بعض لوگ کہتے ہیں ایک چٹیل صاف ہوادار کھلے پُر فضا میدان میں ٹھہرے تھے اور دو فرشتوں کی چیخ سے ہلاک کئے گئے تھے۔ جب ایک لمبی مدت گزر چکی ان کی ہڈیوں کا بھی چونا ہو گیا۔ اس جگہ بستی بس گئی تب حزقیل نامی ایک نبی وہاں سے نکلے۔ انہوں نے دعا کی اور اللہ تعالیٰ نے قبول فرمائی اور حکم دیا کہ تم کہو کہ اے بوسیدہ ہڈیو اللہ تعالیٰ تمہیں حکم دیتا ہے کہ تم سب جمع ہو جاؤ۔ چنانچہ ہر ہر جسم کی ہڈیوں کا ڈھانچہ کھڑا ہو گیا۔ پھر خدا کا حکم ہوا کہ ندا کرو کہ اے ہڈیو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ تم گوشت پوست رگیں پٹھے بھی جوڑ لو۔ چنانچہ اس نبی اللہ کے دیکھتے ہوئے یہ بھی ہو گیا۔ پھر آواز لگائی کہ اے روحو اللہ تعالیٰ کا تمہیں حکم ہو رہا ہے کہ ہر روح اپنے اپنے قدیم جسم میں آ جائے۔ چنانچہ یہ سب جس طرح ایک ساتھ مرے تھے اسی طرح ایک ساتھ جی اٹھے اور بے ساختہ ان کی زبان سے نکلا: سُبْحَانَكَ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ۔ خدایا تو پاک ہے تیرے سوا کوئی معبود نہیں۔ یہ دلیل ہے قیامت کے دن اسی جسم کے ساتھ دوبارہ جی اٹھنے کی۔ پھر فرماتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا لوگوں پر بڑا بھاری فضل و کرم ہے کہ وہ زبردست ٹھوس نشانیاں اپنی قدرت قاہرہ کی دکھا رہا ہے لیکن باوجود اس کے بھی اکثر لوگ ناقدرے اور بے شکرے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ کے سوا کسی جگہ بچاؤ اور پناہ نہیں۔ یہ لوگ وبا سے بھاگے تھے اور زندگی کے حریص تھے۔ تو اس کے خلاف عذاب آیا اور فوراً ہلاک ہو گئے۔

مسند احمد کی حدیث میں ہے کہ جب حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ شام کی طرف گئے اور سرغ میں پہنچے تو حضرت ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ تعالیٰ عنہ وغیرہ سرداران لشکر ملے اور خبر دی کہ شام میں آج کل وبا ہے۔ چنانچہ اس میں اختلاف ہوا کہ اب وہاں جائیں یا نہ جائیں بالآخر حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ تعالیٰ عنہ جب آئے اور فرمایا میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ جب وبا کسی جگہ آئے اور تم وہاں ہو تو اس کے ڈر سے بھاگو مت اور جب تم کسی جگہ وہاں کی خبر سن لو تو وہاں اس حالت میں جاؤ بھی مت۔ حضرت فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہ سن کر خدا تعالیٰ کی حمد و ثنا کی پھر وہاں سے واپس چلے گئے۔ (بخاری مسلم) ایک اور روایت میں ہے کہ یہ خدا کا عذاب ہے جو اگلی اُمتوں پر ڈالا گیا۔

موت وحیات کے فیصلے ہو چکے اب جہاد سے فرار بزدلی ہے ☆ پھر فرمایا جس طرح ان لوگوں کا بھاگنا انہیں موت سے نہ بچا سکا اسی طرح جہاد سے منہ موڑنا بھی بے کار ہے۔ اجل اور رزق دونوں قسمت میں مقرر ہو چکے ہیں۔ رزق نہ بڑھے نہ گھٹے۔ موت نہ پہلے آئے نہ پیچھے ہٹے اور جگہ ارشاد ہے کہ جو لوگ راہ خدا سے رک بیٹھے ہیں اور اپنے ساتھیوں سے بھی کہتے ہیں کہ یہ جہاد شہدا بھی اگر ہماری طرح رہتے تو مارے نہ جاتے۔ ان سے کہو کہ ذرا اپنی جانوں سے بھی موت کو ہٹا دو اگر تم سچے

ہو اور جگہ ہے کہ یہ لوگ کہتے ہیں' خدایا ہم پر لڑائی کیوں لکھ دی۔ کیوں نہ ہمیں ایک وقت تک فرصت دی۔ جس کے جواب میں فرمایا کہ مضبوط برج بھی موت کے سامنے ہیچ ہیں۔ اس موقع پر اسلامی لشکروں کے جیوٹ (شجاع) سردار اور بہادروں کے پیشوا۔ خدا کی تلوار' اسلام کے پشت پناہ ابوسلیمان خالد بن ولید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا وہ ارشاد نقل کرنا مناسب ہوگا جو آپ نے اپنے انتقال کے وقت فرمایا تھا کہ کہاں ہیں موت سے ڈرنے والے لڑائی سے جی چرانے والے نامرد۔ وہ دیکھیں کہ میرا جوڑ جوڑ راہِ خدا میں زخمی ہو چکا ہے۔ سارے جسم میں کوئی جگہ ایسی نہیں' جہاں تیر' تلوار' نیزہ' برچھا نہ لگا ہو لیکن دیکھو کہ آج میں اپنے بستر پر فوت ہو رہا ہوں۔ میدان جنگ میں نہ مرا۔

قرضِ حسنہ ☆ پھر پروردگارِ عالم اپنے بندوں کو اپنی راہ میں خرچ کرنے کی ترغیب دے رہا ہے جو جگہ بہ جگہ دی جاتی ہے۔ حدیث نزول میں بھی ہے' کون ہے جو ایسے خدا کو قرض دے جو نہ مفلس ہے نہ ظالم۔ اس آیت کو سن کر حضرت ابوالاصداح انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا تھا' یا رسول اللہ ﷺ کیا اللہ تعالیٰ ہم سے قرض طلب فرماتا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا ہاں۔ فرمایا اپنا ہاتھ دیجئے' پھر ہاتھ میں ہاتھ دے کر کہا' حضور میں نے اپنا باغ جس میں چھ سو کھجور کے درخت ہیں' اللہ تعالیٰ کو قرض دیا اور وہاں سے سیدھے اپنے باغ آئے اور باہر ہی کھڑے رہ کر اپنی بیوی صاحبہ کو آواز دی کہ بچوں کو لے کر باہر آ جاؤ' میں نے یہ باغ راہ خدا میں دے دیا ہے۔ (ابن ابی حاتم) قرض حسنہ سے مراد راہ خدا کا خرچ ہے اور بال بچوں کا خرچ بھی ہے اور تسبیح و تقدیس بھی ہے۔ پھر فرمایا کہ خدا اسے دوگنا چوگنا کر کے دے گا۔ جیسے اور جگہ ہے: ﴿مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ...... ﴾ (البقرۃ: ۲۶۱) یعنی خدا کی راہ میں خرچ کی مثال اس دانہ جیسی ہے' جس کی سات بالیں نکلیں اور ہر بالی میں سات دانے ہوں اور خدا اس سے بھی زیادہ جسے چاہے دیتا ہے۔ اس آیت کی تفسیر بھی عنقریب آئے گی۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔ حضرت ابوہریرہ سے ابوعثمان نہدی پوچھتے ہیں۔ میں نے سنا ہے کہ آپ فرماتے ہیں کہ ایک ایک نیکی کا بدلہ ایک ایک لاکھ نیکیوں کا ملتا ہے۔ آپ نے فرمایا' اس میں تعجب کیا کرتے ہو۔ میں نے نبی ﷺ سے سنا ہے کہ ایک نیکی کا بدلہ دو لاکھ کے برابر ملتا ہے۔ (مسند احمد) لیکن یہ حدیث غریب ہے۔

ابن حاتم میں ہے کہ حضرت ابوعثمان نہدی فرماتے ہیں' مجھ سے زیادہ حضرت ابوہریرہ کی خدمت میں کوئی نہیں رہتا تھا۔ آپ حج کو گئے۔ پھر پیچھے سے میں بھی گیا۔ بصرے میں پہنچ کر میں نے سنا کہ وہ لوگ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت سے مندرجہ بالا حدیث بیان کرتے ہیں۔ میں نے ان سے کہا' خدا کی قسم سب سے زیادہ آپ کا صحبت یافتہ میں ہوں' میں نے تو کبھی بھی آپ سے یہ حدیث نہیں سنی۔ پھر میرے جی میں آئی کہ چلوں چل کر خود حضرت ابوہریرہؓ سے پوچھ لوں چنانچہ وہاں سے چلا آیا۔ یہاں آیا تو معلوم ہوا کہ وہ حج کو گئے ہیں' میں صرف اس ایک حدیث کی خاطر مکہ کو چل کھڑا ہوا۔ وہاں آپ سے ملاقات ہوئی۔ میں نے کہا حضرت یہ بصرے والے آپ سے کیسی روایت کرتے ہیں۔ آپ نے فرمایا' واہ اس میں تعجب کی کون سی بات ہے۔ پھر یہی آیت پڑھی اور فرمایا کہ ساتھ یہ قولِ باری بھی پڑھو: ﴿فَمَا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا قَلِيْلٌ﴾ (التوبۃ ۳۸) یعنی ساری دنیا کے اسباب آخرت کے مقابلہ میں حقیر چیز ہیں۔ خدا کی قسم میں نے تو رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ ایک نیکی کے بدلے اللہ تعالیٰ دو لاکھ نیکیاں عنایت فرماتا ہے۔ اسی مضمون کی ترمذی کی یہ حدیث بھی ہے کہ جو شخص بازار میں جائے اور وہاں: لا اله الله وحده لاشريك له له الملك وله الحمد وهو على كل شئ

قدیر پڑھے۔ اللہ تعالیٰ اس کے لئے ایک لاکھ نیکیاں لکھتا ہے اور ایک لاکھ گناہ معاف فرماتا ہے۔ ابن ابی حاتم میں ہے ﴿مثل الذین ...﴾ کی آیت جب اُتری تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا کی کہ خدایا میری امت کو اور زیادتی عطا فرما۔ پس ﴿مَنْ ذَا الَّذِیْ ...﴾ کی آیت اُتری۔ آپ نے پھر بھی یہی دعا کی تو: ﴿اِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ﴾ (الزمر ۱۰) کی آیت اتری۔ حضرت کعب احبار سے ایک شخص نے کہا' میں نے ایک شخص سے یہ سنا ہے کہ جو شخص سورۃ: ﴿قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ﴾ کو ایک دفعہ پڑھے۔ اس کے لئے موتی اور یاقوت کے دس لاکھ محل جنت میں بنتے ہیں' کیا میں اسے سچ مان لوں؟ آپ نے فرمایا' اس میں تعجب کی کونسی بات ہے۔ بلکہ بیس اور بھی اور بیس لاکھ اور بھی اور اس قدر کہ ان کی گنتی بجز جناب باری کے کسی کو معلوم ہی نہ ہو۔ پھر آپ نے اس آیت کی تلاوت فرمائی اور فرمایا جب اللہ تعالیٰ: ﴿اَضْعَافًا كَثِيْرَةً﴾ فرماتا ہے تو پھر اسے مخلوق گنتی کی طاقت کیسے رکھے گی؟ پھر فرمایا' رزق کی کمی بیشی خدا تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ خدا کی راہ میں خرچ کرتے ہوئے بخیلی نہ کرو۔ وہ جسے دے اس میں بھی حکمت ہے اور نہ دے اس میں بھی مصلحت ہے۔ تم سب قیامت کے دن اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الْمَلَاِ مِنْۢ بَنِیْۤ اِسْرَآءِيْلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰى ۘ اِذْ قَالُوْا لِنَبِیٍّ لَّهُمُ ابْعَثْ لَنَا مَلِكًا نُّقَاتِلْ فِیْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ قَالَ هَلْ عَسَيْتُمْ اِنْ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ اَلَّا تُقَاتِلُوْا ؕ قَالُوْا وَمَا لَنَاۤ اَلَّا نُقَاتِلَ فِیْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَقَدْ اُخْرِجْنَا مِنْ دِيَارِنَا وَاَبْنَآئِنَا ؕ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ تَوَلَّوْا اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ ﴿۲۴۶﴾

(اے مخاطف) کیا تجھ کو بنی اسرائیل کی جماعت کا قصہ جو موسیٰ علیہ السلام کے بعد ہوا ہے تحقیق نہیں ہوا۔ جب کہ ان لوگوں نے اپنے ایک پیغمبر سے کہا کہ ہمارے لئے ایک بادشاہ مقرر کر دیجئے کہ ہم اللہ کی راہ میں (جالوت سے) قتال کریں۔ ان پیغمبروں نے فرمایا کہ کیا یہ احتمال ہے کہ اگر تم کو جہاد کا حکم دیا جائے کہ تم (اس وقت) جہاد نہ کرو وہ لوگ کہنے لگے کہ ہمارے واسطے ایسا کون سا سبب ہوگا کہ ہم اللہ کی راہ میں جہاد نہ کریں حالانکہ ہم اپنی بستیوں اور اپنے فرزندوں سے بھی جدا کر دیئے گئے ہیں۔ پھر جب ان لوگوں کو جہاد کا حکم ہوا تو باستثنا ایک قلیل تعداد کے (باقی) سب پھر گئے اور اللہ تعالیٰ ظالموں کو خوب جانتے ہیں۔ ○

ترغیبِ جہاد ☆

جس نبی کا یہاں ذکر ہے ان کا نام حضرت قتادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت یوشع علیہ السلام بن نون بن افرائیم بن یوسف بن یعقوب علیہم السلام بتلایا ہے لیکن یہ قول کچھ ٹھیک نہیں معلوم ہوتا۔ اس لئے کہ یہ واقعہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بہت

بعد کا ہے حضرت داؤد علیہ السلام کے زمانے کا ہے۔ جیسے کہ بصراحتہً وارد ہوا ہے اور حضرت داؤد اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے درمیان ایک ہزار سال سے زیادہ کا فاصلہ ہے۔ واللہ اعلم۔ سدی کا قول ہے کہ یہ پیغمبر حضرت شمعون علیہ السلام ہیں مجاہد کہتے ہیں یہ شمویل بن یالی بن علقمہ بن ترخام بن یہد بن بہرض بن علقمہ بن ماجب بن عمرصا بن غرریا بن صفیہ بن علقمہ بن ابو ہاشف بن قارون بن بصہر بن فاحث بن لاوی بن یعقوب بن اسحاق بن ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام ہیں۔ واقعہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد کچھ زمانہ تک تو بنی اسرائیل راہِ حق پر رہے۔ پھر شرک و بدعت میں پڑ گئے۔ مگر تاہم ان میں پے در پے انبیاء علیہ السلام مبعوث ہوتے رہے۔ یہاں تک کہ بنی اسرائیل کی بے باکیاں حد سے گزر گئیں۔ اب اللہ تعالیٰ نے ان کے دشمنوں کو ان پر غالب کر دیا۔ خوب پٹے کٹے اور نچے لٹے۔ پہلے تو تورات کی موجودگی تابوتِ سکینہ کی موجودگی جو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے موروثی چلی آتی تھی۔ ان کے لئے باعث غلبہ ہوتی تھی مگر ان کی سرکشی اور بدترین گناہوں کی وجہ سے خدا کی یہ نعمت بھی ان کے ہاتھوں سے چھن گئی اور نبوت بھی ان کے گھرانے میں ختم ہو گئی۔

لاوی جن کی اولاد میں پیغمبری کی نسل چلی آ رہی تھی' وہ سارے کے سارے لڑائیوں میں مرکھپ گئے۔ ان میں سے صرف ایک حاملہ عورت رہ گئی تھی۔ ان کے خاوند بھی قتل ہو چکے تھے۔ اب بنی اسرائیل کی نظریں اس عورت پر لگی ہوئی تھیں۔ انہیں امید تھی کہ خدا اسے لڑکا دے اور وہ لڑکا نبی بنے۔ خود ان بیوی صاحبہ کی بھی دن رات یہی دعا تھی جو خدا نے قبول فرمائی اور انہیں لڑکا دیا۔ جن کا نام شموئل یا شمعون رکھا۔ اس کے لفظی معنی ہیں کہ خدا نے میری دعا قبول فرمائی۔ نبوت کی عمر پر پہنچ کر انہیں بھی نبوت ملی۔ جب آپ نے دعوتِ نبوت دی تو قوم نے درخواست کی کہ کسی کو آپ ہمارا بادشاہ مقرر کر دیجئے تاکہ ہم اس کی ماتحتی میں جہاد کریں۔ بادشاہ تو ظاہر ہو ہی گیا تھا لیکن پیغمبر نے اپنا اندیشہ ظاہر کیا کہ کہیں تم پھر جہاد سے بھی نہ چراؤ۔ قوم نے جواب دیا کہ حضرت ہمارا ملک ہم سے چھین لئے گئے۔ ہمارے بال بچے گرفتار کئے گئے اور پھر بھی کیا ہم ایسے بے حمیت ہیں کہ مرنے مارنے سے ڈریں؟ اب جہاد فرض کر دیا گیا اور حکم ہوا کہ اس بادشاہ کے ساتھ اٹھو۔ بس سنتے ہی سن ہو گئے اور سوائے معدودے چند کے باقی سب نے منہ موڑ لیا۔ ان سے یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ جس کا خدا کو علم نہ ہوا۔

وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ اِنَّ اللّٰهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوْتَ مَلِكًا ؕ قَالُوْٓا اَنّٰى يَكُوْنُ لَهُ الْمُلْكُ عَلَيْنَا وَنَحْنُ اَحَقُّ بِالْمُلْكِ مِنْهُ وَلَمْ يُؤْتَ سَعَةً مِّنَ الْمَالِ ؕ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىهُ عَلَيْكُمْ وَزَادَهٗ بَسْطَةً فِى الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ ؕ وَاللّٰهُ يُؤْتِىْ مُلْكَهٗ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۴۷﴾

اور اُن لوگوں سے اُن کے پیغمبر نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تم پر طالوت کو بادشاہ مقرر فرمایا کہنے لگے ان کو ہم پر حکمرانی کا کیسے حق حاصل ہو سکتا ہے حالانکہ بہ نسبت ان کے ہم حکمرانی کے زیادہ مستحق ہیں اور ان کو تو کچھ مالی وسعت بھی نہیں دی گئی ان پیغمبر نے (جواب دیا) فرمایا کہ (اوّل تو) اللہ تعالیٰ نے تمہارے مقابلہ میں اُن کو منتخب فرمایا ہے اور (دوسرے) علم اور جسامت میں ان کو زیادتی دی ہے اور (تیسرے) اللہ تعالیٰ اپنا ملک جس کو

چاہیں دیں اور (چوتھے) اللہ تعالیٰ وسعت دینے والا ہے جاننے والا ہے۔ ○

طالوت کی شہنشاہیت ☆

مطلب یہ ہے کہ جب بادشاہ بنادینے کی خواہش انہوں نے اپنے پیغمبر علیہ السلام سے کی۔ تو پیغمبر نے بحکم خدا حضرت طالوت کو پیش کیا جو شاہی خاندان سے نہ تھے بلکہ ایک لشکری تھے۔ شاہی خاندان یہودا کی اولاد تھی قوم نے اعتراض کیا کہ حقدار بادشاہت کے تو اس سے بہت زیادہ ہم ہیں۔ پھر دوسری بات یہ کہ اس کے پاس مال بھی نہیں، مفلس شخص ہے۔ بعض کہتے ہیں یہ سقے تھے، کسی نے کہا یہ دباغ تھے۔ پس پہلی سرکشی تو اعتراض کی صورت میں احکام نبوی کے سامنے ان سے یہ ہوئی۔ پیغمبر علیہ السلام نے انہیں جواب دیا کہ یہ تعین میری رائے سے نہیں، جس میں میں دوبارہ غور کرسکوں۔ یہ تو حکم خدا ہے، جس کی بجا آوری ضرور ہے۔ پھر وہ تم میں سے بڑے عالم ہیں اور قوی اور طاقتور شکیل وجمیل شجاع و بہادر اور لڑائی کے فنون سے پورے واقف کار ہیں۔ یہاں سے یہ بھی ثابت ہوا کہ بادشاہ ذی علم، شکیل، قوی طاقت ور اور مدبر، ذی رائے ہونا چاہئے۔ پھر فرمایا کہ اصلی اور حقیقی حاکم اللہ تعالیٰ ہی ہیں۔ ملک کا ملک فی الواسع اسی کا ہے۔ جسے چاہے ملک دے وہ علم وحکمت والا ہے۔ رافت ورحمت والا ہے۔ اس سے کسی کی مجال کہ سوال کرے، جو چاہے، کرے۔ سب سے سوال کرنے والا کوئی نہ کوئی ہے لیکن پروردگار اس سے مستثنیٰ ہے۔ وہ وسیع فضل والا اپنی نعمتوں سے جسے چاہے، مخصوص کرے، وہ علم والا ہے، خوب جانتا ہے کہ کون کس چیز کا مستحق ہے اور کسے کسی چیز کا استحقاق نہیں۔

وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ إِنَّ آيَةَ مُلْكِهِ أَنْ يَأْتِيَكُمُ التَّابُوتُ فِيهِ سَكِينَةٌ مِنْ رَبِّكُمْ وَبَقِيَّةٌ مِمَّا تَرَكَ آلُ مُوسَى وَآلُ هَارُونَ تَحْمِلُهُ الْمَلَائِكَةُ ۚ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً لَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ﴿٢٤٨﴾

ع ۳۲ / ۱۶

اور ان سے ان کے پیغمبر نے فرمایا کہ ان کے (منجانب اللہ) بادشاہ ہونے کی یہ علامت ہے کہ تمہارے پاس وہ صندوق آجائے گا۔ جس میں تسکین (اور برکت کی چیز) ہے تمہارے رب کی طرف سے اور کچھ بچی ہوئی چیزیں جن کو حضرت موسیٰ وہارون (علیہما السلام) چھوڑ گئے ہیں۔ اس صندوق کو فرشتے لے آئیں گے اس میں تم لوگوں کے لئے پوری نشانی ہے اگر تم یقین لانے والے ہو۔ ○

واقعہ کی تفصیل ☆

نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام فرمارہے ہیں کہ طالوت کی بادشاہت کی پہلی علامت برکت یہ ہے کہ کھویا ہوا تابوت سکینہ تمہیں پھر مل جائے گا۔ جس میں وقار و عزت، دلجمعی اور جلالت، رافت ورحمت ہے۔ جس میں خدا کی نشانیاں ہیں۔ جنہیں تم بخوبی جانتے ہو۔ بعض کا قول ہے کہ سکینہ ایک سونے کا طشت تھا جس میں انبیاء کے دل دھوئے جاتے تھے۔ جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ملا تھا اور جس میں آپ نے تورات کی تختیاں رکھی تھیں۔ کسی نے کہا ہے اس کا منہ بھی تھا، جیسے انسان کا منہ ہوتا ہے اور روح تھی، ہوا بھی تھی، دوسر تھے، دوپر تھے اور دُم بھی تھی۔ وہب کہتے ہیں، مردہ بلی کا سر تھا جب وہ تابوت میں بولتا تو انہیں نصرت کا یقین ہوجاتا

اور لڑائی فتح ہو جاتی۔ یہ قول بھی ہے کہ یہ ایک روح تھی خدا کی طرف سے جب کبھی بنی اسرائیل میں کوئی اختلاف پڑتا یا کسی بات کی اطلاع نہ ہوتی تو وہ کہہ دیا کرتی تھی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام کے ورثے کے باقی حصے سے مراد لکڑی اور تورات کی تختیاں اور من اور کچھ ان کے کپڑے اور جوتی ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ فرشتے آسمان وزمین کے درمیان اس تابوت کو اُٹھائے ہوئے سب لوگ کے سامنے لائے اور حضرت طالوت بادشاہ کے سامنے لا رکھا۔ اس تابوت کو ان کے یہاں دیکھ کر انہیں نبی کی نبوت اور طالوت کی بادشاہت کا یقین ہو گیا۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ گائے کے اوپر لایا گیا۔ بعض کہتے ہیں کہ کفار نے جب یہودیوں پر غلبہ پایا تو تابوت سکینہ کو ان سے چھین لیا اور اریحا میں لے گئے اور بڑے بت کے نیچے رکھ دیا۔ جب خدا کو اسے واپس بنی اسرائیل تک پہنچانا تھا تب وہ کفار صبح کو جب بت خانہ میں گئے تو بت نیچے ہے اور تابوت اوپر ہے۔ انہوں نے پھر بُت کو اوپر کر دیا لیکن دوسری صبح دیکھا کہ پھر وہی معاملہ ہے۔ انہوں نے پھر بت کو اوپر کر دیا۔ صبح کو جب گئے تو دیکھا کہ بت ایک طرف ٹوٹا پھوٹا پڑا ہے تو یقین ہو گیا کہ یہ قدرت کا کرشمہ ہے۔ چنانچہ انہوں نے تابوت کو یہاں سے لے کر کسی اور چھوٹی سی بستی میں رکھ دیا۔ وہاں ایک وبائی بیماری پھیلی آخر بنی اسرائیل کی ایک عورت نے جو وہاں قید تھی انہیں کہا اسے واپس بنی اسرائیل کو پہنچا دو تو تمہیں اس سے نجات ملے گی۔ ان لوگوں نے دو گایوں پر تابوت کو چڑھا کر بنی اسرائیل کے شہر کی طرف بھیج دیا۔ شہر کے قریب پہنچ کر گائیں تو رسیاں تڑوا کر بھاگ گئیں اور تابوت وہیں رہا۔ جسے بنی اسرائیل لے آئے۔ بعض کہتے ہیں دو نوجوان اسے پہنچا گئے واللہ اعلم۔ (لیکن الفاظ قرآن میں موجود ہے کہ اسے فرشتے اٹھا کر لائیں گے) یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ فلسطین کی بستیوں میں سے ایک بستی میں تھا۔ جس کا نام ازدوہ تھا۔

پھر فرماتا ہے میرے نبوت کی دلیل اور طالوت کی بادشاہت کی دلیل یہ بھی ہے کہ تابوت فرشتے پہنچا جائیں گے۔ اگر تمہیں خدا پر اور قیامت پر ایمان ہو۔

فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوتُ بِالْجُنُودِ قَالَ إِنَّ اللَّهَ مُبْتَلِيكُمْ بِنَهَرٍ فَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّي وَمَنْ لَمْ يَطْعَمْهُ فَإِنَّهُ مِنِّي إِلَّا مَنِ اغْتَرَفَ غُرْفَةً بِيَدِهِ فَشَرِبُوا مِنْهُ إِلَّا قَلِيلًا مِنْهُمْ فَلَمَّا جَاوَزَهُ هُوَ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ قَالُوا لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ بِجَالُوتَ وَجُنُودِهِ قَالَ الَّذِينَ يَظُنُّونَ أَنَّهُمْ مُلَاقُو اللَّهِ كَمْ مِنْ فِئَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيرَةً بِإِذْنِ اللَّهِ وَاللَّهُ مَعَ الصَّابِرِينَ ﴿۲۴۹﴾

پھر جب طالوت فوجوں کو لے کر (بیت المقدس سے عمالقہ کی طرف) چلے تو انہوں نے کہا کہ حق تعالیٰ تمہارا امتحان کریں گے ایک نہر سے سو جو شخص (افراط کے ساتھ) اس سے پانی پیئے گا تو وہ میرے ساتھیوں میں نہیں اور جو اس

کوزبان پر بھی نہ رکھے وہ میرے ساتھیوں میں ہے لیکن جو شخص اپنے اپنے ہاتھ سے ایک چلو بھر لے۔ سو سب نے اس سے (بے تحاشا) پینا شروع کر دیا مگر تھوڑے آدمیوں نے ان میں سے سو جب طالوت اور جو مؤمنین ان کے ساتھ تھے نہر سے پار اتر گئے کہنے لگے کہ آج تو ہم میں جالوت اور اس کے لشکر کے مقابلہ کی طاقت نہیں معلوم ہوتی۔ (یہ سن کر) ایسے لوگ جن کو یہ خیال تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے روبرو پیش ہونے والے ہیں' کہنے لگے کہ کثرت ہے بہت سی چھوٹی چھوٹی جماعتیں بڑی بڑی جماعتوں پر خدائے حکم سے غالب آ گئی ہیں اور اللہ تعالیٰ استقلال والوں کا ساتھ دیتا ہے۔ O

قصہ کے بعض اور اجزا ☆

اب واقعہ بیان ہو رہا ہے کہ جب ان لوگوں نے طالوت کی بادشاہت تسلیم کر لی اور وہ انہیں لے کر جہاد کو چلے۔ حضرت سدی رحمتہ اللہ علیہ کے قول کے مطابق ان کی تعداد اسی ہزار تھی۔ راستے میں طالوت نے کہا کہ اللہ تعالیٰ تمہیں ایک نہر کے ساتھ آزمانے والا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے مطابق یہ نہر اردن اور فلسطین کے درمیان تھی۔ اس کا نام اشریعہ تھا۔ طالوت نے انہیں ہوشیار کر دیا کہ اس کا پانی کوئی نہ پئے۔ اگر پی لے گا تو میرے ساتھ نہ چلے۔ ایک آدھ گھونٹ اگر کسی نے پی لیا' تو کچھ حرج نہیں لیکن جب وہاں پہنچے' پیاس کی شدت تھی' نہر پر جھک پڑے اور خوب پیٹ بھر کر پانی پی لیا۔ مگر کچھ لوگ ایسے پختہ ایمان والے بھی تھے جنہوں نے نہ پیا' ایک چلو پی لیا۔ بقول ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے ایک چلو پینے والوں کی تو پیاس بھی بجھ گئی اور وہ جہاد میں بھی شامل رہے لیکن پوری پیاس پینے والوں کی نہ تو پیاس بجھی نہ وہ قابل جہاد رہے۔ سدی فرماتے ہیں اسی ہزار میں سے چھہتر ہزار نے پانی پی لیا۔ صرف چار ہزار آدمی حقیقی فرمانبردار نکلے۔ حضرت براء بن عازب فرماتے ہیں کہ اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم اکثر فرمایا کرتے تھے کہ بدر کی لڑائی والے دن ہماری تعداد اتنی ہی تھی جتنی تعداد حضرت طالوت بادشاہ کے اس فرماں بردار لشکر کی تھی۔ جو آپ کے ساتھ نہر سے پار ہوا تھا یعنی تین سو تیرہ۔ یہاں سے پار ہوتے ہی نافرمانوں کے چھکے چھوٹ گئے اور نہایت بزدلانہ پن سے انہوں نے جہاد سے انکار کر دیا اور دشمنوں کی زیادتی نے ان کے حوصلے توڑ دیئے۔ صاف جواب دے بیٹھے کہ آج تو ہم جالوت کے لشکر سے لڑنے کی طاقت اپنے میں نہیں پاتے۔ گو سرفروش مجاہد علما کرام نے انہیں ہر طرح ہمت بندھوائی' وعظ کیے' فرمایا کہ قلت و کثرت پر فتح موقوف نہیں۔ صبر پر اور نیک نیتی پر ضرور خدا کی امداد ہوتی ہے۔ بارہا ایسا ہوا ہے کہ مٹھی بھر لوگوں نے بڑی بڑی جماعتوں کو نیچا دکھایا ہے۔ تم صبر کرو' طبیعت میں استقلال اور عزم رکھو۔ خدا کے وعدوں پر نظریں رکھو۔ اس صبر کے بدلے خدا تمہارا ساتھ دے گا۔ لیکن تاہم ان کے سرد دل نہ گرمائے اور ان کی بزدلی دور نہ ہوئی۔

وَلَمَّا بَرَزُوا لِجَالُوتَ وَجُنُودِهِ قَالُوا رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۵۰﴾ فَهَزَمُوْهُمْ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۙ وَقَتَلَ دَاوٗدُ جَالُوْتَ وَاٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَهٗ مِمَّا يَشَآءُ ۭ وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ

بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۲۵۱﴾

تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ ۚ وَاِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۲۵۲﴾

اور جب جالوت اوراس کی فوجوں کے سامنے میدان میں آئے تو کہنے لگے اے ہمارے پروردگار ہم پر استقلال (غیب سے) نازل فرمائیے اور ہمارے قدم جمائے رکھیے اور ہم کو اس کافرقوم پر غالب کیجئے۔ پھر طالوت والوں نے جالوت والوں کو خدا کے حکم سے شکست دی اور داؤد علیہ السلام نے جالوت کو قتل کرڈالا اوران کو (یعنی داؤد) کو اللہ تعالیٰ نے سلطنت اور حکمت عطا فرمائی اور بھی جو جو منظور ہوا' ان کو تعلیم فرمایا اور اگر یہ بات نہ ہوتی کہ اللہ تعالیٰ بعضے آدمیوں کو بعضوں کے ذریعہ سے دفع کرتے رہا کرتے ہیں۔ تو سرزمین (تمام تر) فساد سے پُر ہو جاتی لیکن اللہ تعالیٰ بڑے فضل والے ہیں جہان والوں پر یہ اللہ کی آیتیں ہیں جو صحیح صحیح طور پر ہم تم کو پڑھ کر سناتے ہیں اور (اس سے ثابت ہوا کہ) بلاشبہ پیغمبروں میں سے ہیں۔ ○

فتح وشکست میں خدا کے حکم کو کارفرما جاننا ایمان کا رسوخ ہے ☆

یعنی جس وقت مسلمانوں کی اس مختصر جماعت نے کفار کے ٹڈی دل لشکر دیکھے تو جناب باری میں گڑگڑا کر دعائیں کرنی شروع کیں کہ خدایا ہمیں صبر وثبات کا پہاڑ بنادے اور لڑائی کے وقت ہمارے قدم جمادے۔ منہ موڑنے اور بھاگنے سے ہمیں بچالے اوران دشمنوں پر ہمیں غالب کر۔ چنانچہ ان کی یہ عاجزانہ اور مخلصانہ دعائیں قبول ہیں۔ خدا کی مدد نازل ہوتی ہے اور یہ مٹھی بھر جماعت اس ٹڈی دل لشکر کا تہس نہس کر دیتی ہے اور حضرت داؤد علیہ السلام کے ہاتھوں مخالفین کا سردار اور سرتاج جالوت مارا جاتا ہے۔ اسرائیلی روایتوں میں یہ بھی ہے کہ حضرت طالوت نے ان سے وعدہ کیا تھا کہ اگر تم جالوت کو قتل کر دو گے تو میں اپنی بیٹی تمہارے نکاح میں دوں گا اور اپنا مال بھی آدھوں آدھ تمہیں دے دوں گا اور حکومت میں شریک کرلوں گا چنانچہ حضرت داؤد نے پتھر کو فلاخن میں رکھ کر جالوت پر چلایا اوراسی سے وہ مارا گیا۔ حضرت طالوت نے اپنا وعدہ پورا کیا۔ بالآخر سلطنت کے مستقل سلطان آپ ہی ہو گئے اور پروردگار عالم کی طرف سے بھی نبوت جیسی زبردست نعمت عطا ہوئی اور حضرت شموئل علیہ السلام کے بعد یہ پیغمبر بھی بنے اور بادشاہ بھی۔ حکمت سے مراد نبوت ہے اور بہت سے مخصوص علم بھی' جو خدا نے چاہے اپنے نبی کو سکھائے۔ صلی اللہ علیہ وسلم۔

پھر ارشاد باری ہوتا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ یوں پست لوگوں کی پستی نہ بدلتا۔ جس طرح بنی اسرائیل کو طالوت جیسے مدبر بادشاہ اور داؤد جیسے دلیر سپہ سالار عطا فرما کر بدلی تو لوگ ہلاک ہو جاتے جیسے اور جگہ ہے: ﴿وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا﴾ (الحج ۴۰) یعنی یوں اگر ایک دوسرے کا دفعیہ نہ ہوتا تو عبادت خانے اور وہ مسجدیں جن میں خدا کا نام بکثرت ذکر کیا جاتا ہے' توڑ دی جاتیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں ایک نیک ایماندار کی وجہ سے اس کے آس پاس کے سو گھرانوں سے خدا تعالیٰ بلاؤں کو دور کر دیتا

ہے۔ پھر راوی حدیث حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اسی آیت کی تلاوت کی۔ (ابن جریر) لیکن اس حدیث کی سند ضعیف ہے۔ ابن جریر کی ایک اور غریب حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک سچے مسلمان کی وجہ سے اس کی اولاد کو اس کے گھر والوں کو سنوار دیتا ہے اور اس کی موجودگی تک وہ سب خدا کی حفاظت میں رہتے ہیں۔ ابن مردویہ کی ایک حدیث میں ہے کہ قیامت تک ہر زمانہ میں سات اشخاص تم میں ضرور ایسے رہیں گے جن کی وجہ سے تمہاری مدد کی جائے گی اور تم پر بارش برسائی جائے گی اور تمہیں روزی دی جائے گی۔ ابن مردویہ کی دوسری حدیث میں ہے' میری اُمت میں تمیں ابدال ہوں گے۔ جن کی وجہ سے تمہیں روزیاں دی جائیں گے۔ تم پر بارشیں برسائی جائیں گی اور تمہاری مدد کی جائے گی۔ اس حدیث کے راوی حضرت قتادہ فرماتے ہیں کہ میرا خیال ہے حضرت حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی ان ہی ابدال میں سے تھے۔

پھر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی یہ نعمت اور اس کا احسان ہے کہ وہ ایک کو دوسرے سے دفع کرتا ہے۔ وہی سچا حاکم ہے۔ اس کے تمام کام حکمت سے پُر ہوتے ہیں۔ وہ اپنی دلیلیں اپنے بندوں پر واضح فرما رہا ہے۔ وہ تمام مخلوق پر فضل و کرم کرتا ہے۔ یہ واقعات اور تمام حق کی باتیں اے نبی ہماری سچی وحی سے تمہیں معلوم ہوئیں۔ تم میرے سچے رسول ہو۔ میری ان باتوں کی اور خود آپ کی نبوت کی سچائی کا علم ان لوگوں کو بھی ہے۔ جن کے ہاتھوں میں کتاب ہے۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے زوردار پرتاکید الفاظ میں قسم کھا کر اپنے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی نبوت کی تصدیق کی۔

تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۘ مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ ؕ وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلَ الَّذِيْنَ مِنْ بَعْدِهِمْ مِّنْ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ وَلٰكِنِ اخْتَلَفُوْا فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ وَمِنْهُمْ مَّنْ كَفَرَ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلُوْا ۟ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ ﴿۲۵۳﴾

یہ حضرات مرسلین ایسے ہیں کہ ہم نے ان میں سے بعضوں کو بعضوں پر فوقیت بخشی ہے (مثلاً) بعضے ان میں سے وہ ہیں جن سے اللہ تعالیٰ ہمکلام ہوئے ہیں (یعنی موسیٰ) اور بعضوں کو اس نے بہت سے درجوں میں سرفراز کیا اور ہم نے عیسیٰ بن مریم (علیہم السلام) کو کھلے کھلے دلائل عطا فرمائے اور ہم نے ان کی تائید (روح القدس یعنی جبریل) سے فرمائی اور اگر اللہ تعالیٰ کو منظور ہوتا تو (امت کے) جو لوگ ان کے بعد ہوئے ہیں باہم قتل وقتال نہ کرتے بعد اس کے کہ ان کے پاس (امر حق) کے دلائل پہنچ کے تھے لیکن وہ لوگ باہم (دین میں) مختلف ہوئے سو ان میں کوئی تو ایمان لایا اور کوئی کافر رہا (اور نوبت قتل وقتال کی پہنچی) اور اگر اللہ کو منظور ہوتا تو وہ لوگ قتل وقتال نہ کرتے لیکن اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے وہی کرتا ہے۔ ○

گروہ انبیاء علیہم السلام میں بعض، بعض سے افضل ہیں ☆

یہاں بیان ہو رہا ہے کہ رسولوں میں بھی مراتب ہیں۔ جیسے اور جگہ فرمایا: ﴿وَلَقَدْ فَضَّلْنَا بَعْضَ النَّبِيّٖنَ عَلٰى بَعْضٍ وَّاٰتَيْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا﴾ (بنی اسرائیل: ۵۵) ہم نے بعض نبیوں کو بعض پر فضیلت دی اور حضرت داؤد کو ہا ہم نے زبور دی۔ یہاں بھی اسی کو بیان کر کے ارشاد ہوتا ہے کہ ان میں سے بعض کو شرفِ ہم کلامی بھی نصیب ہوا۔ جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت آدم علیہ السلام۔ صحیح ابن حبان میں حدیث ہے جس میں معراج کے بیان کے ساتھ یہ بھی ہے کہ کسی نبی کو آپ نے کس آسمان پر پایا۔ جو دلیل ہے ان کے مرتبوں میں کم وبیش ہونے کی۔ ہاں ایک حدیث میں ہے کہ ایک مسلمان اور یہودی کی کچھ بات چیت ہوگئی تو یہودی نے کہا' قسم اس کی خدا جس نے موسیٰ علیہ السلام کو تمام جہان والوں پر فضیلت دی۔ مسلمان سے ضبط نہ ہوگا۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر ایک تھپڑ مارا' اور کہا' خبیث کیا ہمارے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے وہ افضل ہیں؟ یہودی نے سرکار نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) میں آ کر اس کی شکایت کی۔ آپ نے فرمایا' مجھے نبیوں پر فضیلت نہ دو۔ قیامت کے دن سب بے ہوش ہوں گے سب سے پہلے میں ہوش میں آؤں گا۔ تو میں دیکھوں گا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام خدا کے عرش کا پایہ تھامے ہوئے ہوں گے۔ مجھے نہیں معلوم کہ وہ مجھ سے پہلے ہی ہوش میں آ گئے؟ یا وہ بے ہوش ہی نہیں ہوئے تھے اور طور کی بے ہوشی کے بدلے یہاں کی بے ہوشی سے بچا لئے گئے۔ پس مجھے نبیوں پر فضیلت نہ دو۔ (بخاری) ایک اور روایت میں ہے کہ پیغمبر کے درمیان فضیلت نہ دو۔

پس یہ حدیث بظاہر قرآن کریم کی اس آیت کے خلاف معلوم ہوتی ہے لیکن دراصل کوئی تعارض نہیں ممکن ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان اس سے پہلے ہو کہ آپ کو فضیلت کا علم ہوا ہو لیکن یہ قول ذرا غور طلب ہے۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ آپ نے محض تواضع اور فروتنی کے طور پر فرمایا ہے نہ کہ حقیقت کے طور پر تیسرا جواب یہ ہے کہ ایسے جھگڑے اور خلافت کے وقت ایک کو ایک پر فضیلت دینا دوسرے کی شان گھٹانا ہے۔ اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے۔ چوتھا جواب یہ ہے کہ تم فضیلت نہ دو۔ یعنی صرف اپنی رائے اپنے خیال اور اپنے ذہنی تعصب سے اپنے نبی کو دوسرے پر فضیلت نہ دو۔ پانچواں جواب یہ ہے کہ فضیلت وتکریم کا فیصلہ تمہارے بس کا نہیں بلکہ یہ خدا کی طرف سے ہے۔ وہ جسے چاہے جو فضیلت دے تم مان لو۔ تمہارا کام تسلیم کرنا اور ایمان لانا ہے۔ پھر فرماتا ہے کہ ہم نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو واضح دلیلیں اور ایسی حجتیں عطا فرمائی تھیں جن سے بنی اسرائیل پر صاف واضح ہو گیا کہ آپ کی رسالت بالکل سچی ہے اور ساتھ ہی آپ کی یہ حیثیت بھی واضح ہو گئی کہ مثل اور بندوں کے آپ بھی اللہ تعالیٰ کے عاجز بندے اور بے کس غلام ہیں اور روح القدس یعنی حضرت جبریل علیہ السلام سے ہم نے ان کی تائید کی۔ پھر فرمایا' کہ بعد والوں کے اختلاف بھی ہمارے قضاوقدر کا نمونہ ہیں۔ ہماری شان یہ ہے کہ جو چاہیں کریں۔ ہمارے کسی ارادے سے مراد جدا نہیں۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا خُلَّةٌ وَّلَا شَفَاعَةٌ ۭ وَالْكٰفِرُوْنَ ھُمُ الظّٰلِمُوْنَ ○۲۵۴

اے ایمان والو خرچ کرلو ان چیزوں سے جو تم کو دی ہیں قبل اس کے کہ وہ دن (قیامت کا) آجائے جس میں نہ تو خرید وفروخت ہوگی اور نہ دوستی ہوگی اور نہ (بلا اذنِ الٰہی) کوئی سفارش ہوگی اور کافر ہی لوگ ظلم کرتے ہیں (تو تم ایسے مت بنو)۔○

ایک دن وہ ہوگا جس میں صرف اپنے ہی اعمال کام آئیں گے ☆

اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو حکم کرتا ہے کہ وہ بھلائی کی راہ میں اپنا مال خرچ کریں۔ تاکہ خدا کے پاس ان کا ثواب جمع رہے اور پھر فرماتا ہے کہ اپنی زندگی ہی میں خیرات وصدقات کرلو۔ قیامت کے دن نہ تو خرید وفروخت ہے نہ زمین بھر سونا دینے سے جان چھوٹ سکتی ہے۔ نہ کسی کا نسب اور دوستی محبت کام آسکتی ہے۔ جیسے اور جگہ فرمایا: ﴿فَاِذَا نُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَلَآ اَنْسَابَ بَيْنَهُمْ يَوْمَىِٕذٍ وَّلَا يَتَسَاۗءَلُوْنَ﴾ (المومنون:۱۰۱) یعنی جب صور پھونکا جائے گا' اس دن نہ تو نسب رہے گا نہ کوئی کسی کا پرسان حال ہوگا اور اس دن سفارشیوں کی سفارش بھی کچھ نفع نہ دے گی۔ پھر فرمایا کافر ہی ظالم ہیں یعنی پورے اور پکے ظالم وہ ہیں جو کفر کی حالت میں ہی خدا سے ملیں۔ عطاء بن دینار رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں' شکر ہے خدا نے کافروں کو ظالم فرمایا لیکن ظالموں کو کافر نہیں فرمایا۔

اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا ھُوَ ۚ اَلْـحَيُّ الْقَيُّوْمُ ڬ لَا تَاْخُذُهٗ سِـنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ ۭ لَهٗ مَا فِي

السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ مَنْ ذَا الَّذِيْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ؕ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ ۚ وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖٓ اِلَّا بِمَا شَآءَ ۚ وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ۚ وَلَا يَئُوْدُهٗ حِفْظُهُمَا ۚ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ ﴿۲۵۵﴾

اللہ تعالیٰ (ایسا ہے) کہ اس کے سوا کوئی عبادت کے قابل نہیں۔ زندہ ہے۔ سنبھالنے والا ہے (تمام عالم کا) نہ اس کو اونگھ دبا سکتی ہے اور نہ نیند اسی کے مملوک ہیں سب جو کچھ آسمانوں میں ہیں اور جو کچھ زمین میں ہیں۔ ایسا کون شخص ہے جو اس کے پاس (کسی کی) سفارش کر سکے بدون اس کی اجازت کے۔ وہ جانتا ہے ان کے تمام حاضر اور غائب حالات کو اور وہ موجودات اس کی معلومات میں سے کسی چیز کو اپنے احاطہ علمی میں نہیں لا سکتے۔ مگر جس قدر (علم دینا وہی) چاہے۔ اس کی کرسی نے سب آسمانوں اور زمین کو اپنے اندر لے رکھا ہے اور اللہ تعالیٰ کو ان دونوں کی حفاظت کچھ گراں نہیں گزرتی اور وہ عالی شان عظیم الشان ہے۔ ○

خداوند ذوالجلال والکرام کا تعارف' صفات وذات اور خصوصیات کا ایک بیان ☆

یہ آیت آیۃ الکرسی ہے۔ جو بڑی عظمت والی آیت ہے۔ حضرت اُبی بن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم دریافت فرماتے ہیں کہ کتاب اللہ میں سب سے زیادہ عظمت والی آیت کونسی ہے؟ آپ جواب دیتے ہیں خدا اور اس کے رسولؐ ہی کو سب سے زیادہ علم ہے۔ آپ پھر یہی سوال کرتے ہیں بار بار کے سوالات پر جواب دیتے ہیں کہ آیت الکرسی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں' ابوالمنذر! خدا تجھے تیرا علم مبارک کرے۔ اس خدا کی قسم' جس کے ہاتھ میں میری جان ہے' اس کی زبان ہوگی اور ہونٹ ہوں گے اور یہ بادشاہ حقیقی کی تقدیس بیان کرے گی اور عرش کے پایہ سے لگی ہوئی ہوگی (مسند احمد) صحیح مسلم شریف میں بھی یہ حدیث ہے لیکن یہ آخری قسمیہ جملہ اس میں نہیں۔ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں' میرے ہاں کھجور کی ایک بوری تھی۔ میں نے دیکھا کہ اس میں سے کھجوریں دن بدن گھٹ رہی ہیں۔ ایک رات میں جاگتا رہا اور اس کی نگہبانی کرتا رہا۔ میں نے دیکھا کہ ایک جانور مثل جوان لڑکے کے آیا۔ میں نے اسے سلام کیا۔ اس نے میرے سلام کا جواب دیا۔ میں نے کہا تو انسان ہے یا جن؟ اس نے کہا میں جن ہوں۔ میں نے کہا ذرا اپنا ہاتھ تو دے۔ اس نے ہاتھ بڑھایا۔ میں نے اپنے ہاتھ میں لیا تو کتے جیسا ہاتھ تھا اور اس پر کتے جیسے بال بھی تھے۔ میں نے کہا کیا جنوں کی پیدائش ایسی ہی ہے؟ اس نے کہا تمام جنات میں سے سب سے زیادہ قوت والا میں ہی ہوں۔ میں نے کہا کہ تجھ کو میری چیز چرانے کی جرأت کیسے ہوئی؟ اس نے کہا مجھے معلوم ہے کہ تو صدقہ کو پسند کرتا ہے' ہم نے کہا پھر ہم کیوں محروم رہیں؟ میں نے کہا تمہارے شر سے بچانے والی کونسی چیز ہے؟ اس نے کہا' آیت الکرسی۔ صبح کو جب سرکار محمدی صلی اللہ علیہ وسلم میں حاضر ہوا تو میں نے رات کا سارا واقعہ بیان کیا۔ آپ نے فرمایا خبیث نے یہ بات تو بالکل سچ کہی۔ (ابویعلیٰ) مہاجرین کے پاس آپ گئے تو ایک شخص نے کہا' حضور صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کی کونسی آیت بہت عظمت والی ہے؟ آپ نے یہی آیت الکرسی پڑھ کر سنائی۔ (طبرانی) آپ نے ایک مرتبہ صحابہ میں سے ایک سے پوچھا کیا تم نے نکاح کر لیا؟ اس نے کہا کہ حضرت میرے پاس مال نہیں

اس لئے نکاح نہیں کیا۔ آپ نے فرمایا: ﴿قُلْ هُوَ اللّٰهُ ......﴾ یاد نہیں؟ اس نے کہا وہ تو یاد ہے فرمایا چوتھائی قرآن تو یہ ہو گیا۔ کیا: ﴿قُلْ یٰاَیُّهَا الْكٰفِرُوْنَ ......﴾ یاد نہیں؟ کہا ہاں وہ بھی یاد ہے۔ چوتھائی قرآن یہ ہوا۔ پھر پوچھا کیا: ﴿اِذَا زُلْزِلَتِ ......﴾ بھی یاد ہے؟ کہا ہاں' فرمایا' چوتھائی قرآن یہ ہوا۔ کیا: ﴿اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ ......﴾ بھی یاد ہے؟ کہا ہاں' فرمایا چوتھائی ہوا۔ کیا آیت الکرسی یاد ہے؟ کہا ہاں' فرمایا' چوتھائی قرآن یہ ہوا (مسند احمد)۔ حضرت ابوذر رضی اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں' میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ اس وقت مسجد میں تشریف فرماتھے۔ میں آ کر بیٹھ گیا۔ آپ ﷺ نے پوچھا کیا تم نے نماز پڑھ لی؟ میں نے کہا' نہیں۔ فرمایا' اٹھو نماز ادا کرلو۔ میں نے نماز پڑھی۔ پھر آ کر بیٹھا تو آپ نے فرمایا' ابوذر شیطان انسانوں اور جنوں سے پناہ مانگ۔ میں نے کہا' حضور صلی اللہ علیہ وسلم کیا انسانی شیطان بھی ہوتے ہیں؟ فرمایا' ہاں۔ میں نے کہا حضورؐ نماز کی نسبت کیا ارشاد ہے؟ فرمایا وہ سراسر خیر ہے۔ جو چاہے کم حصہ لے جو چاہے زیادہ۔ میں نے کہا' حضورؐ روزہ؟ فرمایا کفایت کرنے والا فرض ہے اور خدا کے نزدیک زیادتی ہے۔ میں نے کہا صدقہ؟ فرمایا بہت زیادہ اور بڑھ چڑھ کر بدلہ دلوانے والا۔ میں نے کہا سب سے افضل صدقہ کونسا ہے؟ فرمایا' کم مال والے کا ہمت کرنا یا پوشیدگی سے محتاج کی احتیاج پوری کرنا۔ میں نے سوال کیا سب سے پہلے نبی کون ہیں؟ فرمایا حضرت آدم علیہ السلام۔ میں نے کہا وہ نبی تھے؟ فرمایا نبی اور خدا سے ہم کلام ہونے والے۔ میں نے پوچھا رسولوں کی تعداد کتنی ہے؟ فرمایا تین سو اور اوپر دس بہت بڑی جماعت۔ ایک روایت میں تین سو پندرہ کا لفظ ہے۔ میں پوچھا' حضور صلی اللہ علیہ وسلم آپ پر سب سے زیادہ عظمت والی آیت کونسی اُتری ہے؟ فرمایا آیت الکرسی: ﴿لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ ......﴾ (مسند احمد)

حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میرے خزانہ میں سے جنات چرا کر لے جایا کرتے تھے۔ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کی۔ آپ ﷺ نے فرمایا جب تو اسے دیکھے تو کہنا: بسم الله اجیبی رسول الله۔ جب وہ آیا' میں نے یہی کہا' پھر اسے چھوڑ دیا۔ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا آپ نے فرمایا تیرے قیدی نے کیا کیا؟ میں نے کہا' میں نے اسے پکڑ لیا تھا لیکن اس نے وعدہ کیا کہ اب پھر نہیں آؤں گا۔ آپ ﷺ نے فرمایا وہ پھر بھی آئے گا۔ میں نے اسے اسی طرح دو تین بار پکڑا اور اقرار لے کر چھوڑ دیا۔ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ذکر کیا اور آپ نے ہر دفعہ یہی فرمایا کہ وہ پھر بھی آئے گا۔ آخری مرتبہ میں نے کہا کہ اب میں تجھے نہ چھوڑوں گا۔ اس نے کہا چھوڑ دے' میں تجھے ایک چیز بتاؤں گا کہ کوئی جن یا شیطان تیرے پاس ہی نہ آ سکے۔ میں نے کہا اچھا بتا' تو کہا وہ آیۃ الکرسی ہے۔ میں نے آ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ذکر کیا۔ آپ نے کہا اس نے سچ کہا گو وہ[1] جھوٹا ہے؟ (مسند احمد)

صحیح بخاری شریف میں کتاب فضائل القرآن اور کتاب الوکالۃ اور صفت ابلیس کے بیان میں بھی یہ حدیث حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے۔ اس میں ہے کہ زکوٰۃ رمضان کے مال پر میں پہرہ دے رہا تھا کہ شیطان آیا اور سمیٹ سمیٹ کر اپنی چادر میں جمع کرنے لگا۔ تیسری مرتبہ اس نے بتلایا کہ اگر تو رات کو بستر پر جا کر اس آیت کو پڑھ لے گا تو خدا کی طرف سے تجھ پر حافظ مقرر نہ ہوگا اور صبح تک شیطان تیرے قریب نہ آ سکے گا۔ (بخاری) دوسری روایت میں ہے کہ یہ کھجوریں تھیں اور مٹھی بھر وہ لے گیا تھا اور آپ نے فرمایا تھا کہ اگر اسے پکڑنا چاہے تو وہ دروازہ کھولے تو کہنا سبحان من

[1] اس سے معلوم ہوا کہ بعض اوقات جھوٹے بھی کوئی بات ٹھیک اور سچی کہہ دیتے ہیں۔

سخرك محمد۔ شیطان نے عذر یہ بتلایا تھا کہ ایک فقیر جن کے بال بچوں کے لئے میں یہ لے جا رہا تھا۔ (ابن مردویہ)
پس یہ واقعہ تین صحابہ کا ہوا حضرت اُبی بن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا۔ حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں ایک انسان کی اور ایک جن کی ملاقات ہوئی۔ جن کے کہا' مجھ سے کشتی کرے گا' اگر مجھے گرا دے تو میں تجھے ایک ایسی آیت سکھا دوں گا کہ جب تو اپنے گھر جائے اور اسے پڑھے تو شیطان اس میں نہ آ سکے۔ کشتی ہوئی اور اس آدمی نے اس جن کو گرا دیا۔ اس شخص نے کہا' تو تو نحیف اور ڈرپوک ہے اور تیرے ہاتھ مثل کتے کے ہیں۔ کیا جنات ایسے ہی ہوتے ہیں؟ یا صرف تو ہی ایسا ہے؟ کہا میں تو ان سب میں قوی ہوں۔ پھر دوبارہ کشتی ہوئی اور دوسری مرتبہ بھی اس نے گرا دیا تو جن نے کہا کہ وہ آیت الکرسی ہے۔ جو شخص اپنے گھر میں جاتے ہوئے سے پڑھ لے تو شیطان اس گھر سے گدھے کی طرح چیختا ہوا بھاگ کھڑا ہوتا ہے۔ یہ شخص حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھے۔ (کتاب الغریب) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں' سورہ بقرہ میں ایک آیت ہے جو قرآن کریم کی تمام آیتوں کی سردار ہے۔ جس گھر میں وہ پڑھی جائے وہاں سے شیطان بھاگ جاتا ہے۔ یہ آیت آیۃ الکرسی ہے۔ (مستدرک حاکم) ترمذی میں ہے ہر چیز کی کوہان اور بلندی ہے اور قرآن کی بلندی سورہ بقرہ ہے اور اس میں بھی آیت الکرسی تمام آیتوں کی سردار ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اس سوال پر کہ سارے قرآن میں سب سے زیادہ باعظمت آیت کونسی ہے؟ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا' مجھے خوب معلوم ہے' میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ وہ آیت آیۃ الکرسی ہے۔ (ابن مردویہ)

اسم اعظم ☆ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں' ان دونوں آیتوں میں اللہ تعالیٰ کا اسم اعظم ہے۔ ایک آیۃ الکرسی' دوسری آیت: ﴿ الٓمّٓ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ ﴾ (مسند احمد) اور حدیث میں ہے کہ اسم اعظم وہ ہے جس کی برکت سے جو دعا خدا سے مانگی جائے وہ قبول ہوگی۔ ان تین سورتوں میں ہے۔ سورہ بقرہ' سورہ آل عمران اور سورہ طٰہٰ (ابن مردویہ) ہشام بن عمار خطیب دمشق فرماتے ہیں۔ سورہ بقرہ کی آیت الکرسی ہے اور آل کی پہلی ہی آیت اور طٰہٰ کی آیت: ﴿ وَعَنَتِ الْوُجُوْهُ لِلْحَیِّ الْقَیُّوْمِ ﴾ (طٰہٰ:۱۱۱) ہے اور حدیث میں ہے جو شخص ہر فرض نماز کے بعد آیت الکرسی پڑھ لے اسے جنت میں جانے سے کوئی چیز نہیں روکے گی۔ سوائے موت کے۔ (ابن مردویہ) اس حدیث کو امام نسائی نے بھی اپنی کتاب عمل الیوم و اللیلہ میں نقل کیا ہے اور ابن حبان نے بھی اسے اپنی صحیح میں ذکر کیا ہے۔ اس حدیث کی سند شرط بخاری پر ہے لیکن ابو الفرج ابن جوزی اسے موضوع کہتے ہیں۔ واللہ اعلم۔ تفسیر ابن مردویہ میں بھی یہ حدیث ہے لیکن اس کی اسناد بھی ضعیف ہے۔

ابن مردویہ کی ایک حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ بن عمران کی طرف وحی کی کہ ہر فرض نماز کے بعد آیت الکرسی پڑھ لیا کرو۔ جو شخص یہ کرے گا۔ میں اسے شکر گزار دل اور ذکر کرنے والی زبان دوں گا اور اسے نبیوں کا ثواب اور صدیقوں کا عمل دوں گا۔ اس ہمیشگی صرف نبیوں سے ہوتی ہے یا صدیقوں سے یا اس بندے سے جس کا دل میں نے ایمان کے لئے آزما لیا ہو۔ یا اسے راہ میں شہید کرنا چاہتا ہوں لیکن یہ حدیث بہت منکر ہے۔ ترمذی کی حدیث میں ہے جو شخص سورۂ حم المومن کو الیہ المصیر تک اور آیت الکرسی کو صبح کے وقت پڑھ لے گا وہ شام تک خدا کی حفاظت میں رہے گا اور شام کو پڑھنے والے کی صبح تک حفاظت ہوگی لیکن یہ حدیث بھی غریب ہے۔ اس آیت کی فضیلت میں اور بھی بہت سی حدیثیں ہیں لیکن ایک تو

اس کے لئے کہ ان کی سندیں ضعیف ہیں۔ دوسرے اس لئے بھی کہ ہمیں اختصار مدنظر ہے ہم نے انہیں ذکر نہیں کیا۔

آیت الکرسی کی جامعیت ☆ اس مبارک آیت میں دس مستقل جملے ہیں۔ پہلے جملے میں اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا بیان ہے کہ مخلوق کا وہی ایک اللہ ہے۔ دوسرے جملہ میں ہے کہ وہ خود زندہ ہے۔ جس پر کبھی موت نہیں آئے گی۔ دوسروں کو قائم رکھنے والا ہے قَیُّوْمُ کی دوسری قراءت قَیَّامٌ بھی ہے۔ پس تمام موجودات اس کی محتاج ہیں اور وہ سب سے بے نیاز ہے۔ کوئی بھی بغیر اس کی اجازت کے کسی چیز کا سنبھالنے والا نہیں ہے۔ جیسے اور جگہ ہے: ﴿وَمِنْ اٰیٰتِهٖۤ اَنْ تَقُوْمَ السَّمَآءُ وَالْاَرْضُ بِاَمْرِهٖ﴾ [الروم: ۲۵] یعنی اس کی نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ آسمان وزمین اسی کے حکم سے قائم ہیں۔ پھر فرمایا نہ تو اس پر کوئی نقصان نہ آئے نہ کبھی وہ اپنی مخلوق سے غافل اور بے خبر ہو۔ بلکہ ہر شخص کے اعمال پر وہ حاضر۔ ہر شخص کے احوال پر وہ ناظر دل کے ہر خطرہ سے وہ واقف' مخلوق کا کوئی ذرّہ بھی اس کی حفاظت اور علم سے کبھی باہر نہیں۔ یہی پوری قیومیت ہے۔ اونگھ اور غفلت ہے' نیند اور بے خبری سے اس کی ذات پاک ہے۔ صحیح حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ کھڑے ہو کر صحابہ کرام کو چار باتیں بتلائیں۔ فرمایا اللہ تبارک وتعالیٰ سوتا نہیں' نہ نینداس کی ذات کے لائق ہے۔ وہ ترازو کا حافظ ہے جس کے لئے چاہے جھکا دے جس کے لئے چاہے نہ جھکائے۔ دن کے اعمال رات سے پہلے اور رات کے عمل دن سے پہلے اس کی طرف اٹھائے جاتے ہیں۔ اس کے سامنے نور یا آگ کے پردے ہیں' اگر وہ ہٹ جائیں تو اس کے چہرے کی تجلیاں ان تمام چیزوں کو جلادیں۔ جن تک ان کی نگاہ پہنچتی ہے۔ عبدالرزاق میں حضرت عکرمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے فرشتوں سے پوچھا کہ کیا اللہ تعالیٰ سوتا بھی ہے تو اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کی طرف وحی بھیجی کہ حضرت موسیٰ کو تین راتوں تک بیدار رکھیں۔ انہوں نے یہی کیا' تین راتوں تک سونے نہ دیا۔ اس کے بعد دو بوتلیں ان کے ہاتھوں میں دے دی گئیں اور کہہ دیا گیا کہ انہیں تھامے رہو۔ خبردار یہ گرنے اور ٹوٹنے نہ پائیں۔ آپ نے انہیں تھام لیا۔ نیند کا غلبہ ہوا' اونگھ آنے لگی۔ آنکھ بند ہو جاتی لیکن پھر ہوشیار ہو جاتے' مگر کب تک؟ آخر ایک مرتبہ ایسا نیند کا جھونکا آیا کہ بوتلیں ٹوٹ گئیں۔ گویا اس طرح بتلایا گیا کہ جب ایک اونگھنے والا اور سونے والا دو بوتلیں نہیں سنبھال سکتا تو اللہ تعالیٰ اگر اونگھے یا سوئے تو زمین وآسمان کی حفاظت کس طرح ہو سکے؟ لیکن یہ بنی اسرائیل کی بات ہے اور کچھ دل کو لگتی بھی نہیں' اس لئے کہ یہ ناممکن ہے کہ موسیٰ علیہ السلام جیسے جلیل القدر عارف باللہ خدا کی اس صفت سے ناواقف ہوں اور انہیں اس میں تردد ہو کہ خدا جاگتا ہی رہتا ہے یا سو بھی جاتا ہے اور اس سے بھی بہت زیادہ غرابت والی وہ حدیث ہے جو ابن جریر میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس واقعہ کو منبر پر بیان فرمایا۔ یہ حدیث بہت ہی غریب ہے اور بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ اس کا فرمانِ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم ہونا ثابت نہیں بلکہ بنی اسرائیل کی بات ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے یوں نقل ہے کہ بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے یہ سوال کیا تھا اور پھر آپ کو بوتلیں پکڑوائی گئیں اور بوجہ نیند کے نہ سنبھال سکے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ آیت نازل ہوئی۔ آسمان وزمین کی تمام چیزیں اس کی غلامی میں ہیں اور اس کی ماتحتی میں اور اس کی سلطنت میں ہیں۔ جیسے فرمایا: ﴿اِنْ كُلُّ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ﴾ (مریم: ۹۳) یعنی زمین وآسمان کی کل چیزیں رحمٰن کی غلامی میں حاضر ہونے والی ہیں' ان سب کو خدا نے ایک ایک کر کے گن رکھا ہے اور گھیر رکھا ہے۔ ساری مخلوق تن تنہا اس کے پاس حاضر ہوگی' کوئی نہیں جو اس کی اجازت

کے بغیر اس کے سامنے سفارش یا شفاعت کر سکے۔ جیسے ارشاد ہے: ﴿وَكَمْ مِّنْ مَّلَكٍ فِي السَّمٰوٰتِ......﴾ (النجم: ٢٦) یعنی آسمانوں میں بہت سے فرشتے ہیں لیکن ان کی شفاعت کچھ فائدہ نہیں دے سکتی۔ ہاں یہ اور بات ہے کہ خدا تعالیٰ کی منشا اور مرضی سے ہو اور جگہ ہے: ﴿وَلَا يَشْفَعُوْنَ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى﴾ (الانبیاء: ٢٨) کسی کی وہ سفارش نہیں کرتے مگر اس کی جس سے خدا خوش ہو۔ پس یہاں بھی اللہ تعالیٰ کی عظمت اس کا جلال اور اس کی کبریائی بیان ہو رہی ہے کہ بغیر اس کی اجازت اور رضا مندی کے کسی کو جرأت نہیں کہ اس کے سامنے کسی کی سفارش میں منہ کھولے۔ حدیث شفاعت میں بھی ہے کہ میں خدا کے عرش کے نیچے جاؤں گا اور سجدے میں گر پڑوں گا۔ اللہ تعالیٰ مجھے سجدے میں ہی چھوڑ دے گا' جب تک چاہے۔ پھر کہا جائے گا کہ اپنا سر اٹھاؤ' کہو سنا جائے گا۔ شفاعت کرو' منظور کی جائے گی۔ آپ فرماتے ہیں' پھر میرے لئے حد مقرر کر دی جائے گی اور میں انہیں جنت میں لے جاؤں گا۔ وہ خدا تمام گزشتہ' موجودہ اور آئندہ کا عالم ہے۔ اس کا علم تمام مخلوق کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ جیسے اور جگہ فرشتوں کا قول ہے کہ: ﴿مَا نَتَنَزَّلُ اِلَّا بِاَمْرِ رَبِّكَ......﴾ (مریم: ٦٤) ہم تیرے ربّ کے حکم بغیر اتر نہیں سکتے۔ ہمارے آگے پیچھے اور سامنے کی سب چیزیں اسی کی ملکیت ہیں اور تیرا ربّ بھول چوک سے پاک ہے۔

کرسی کی تشریح ☆ کرسی سے مراد حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے علم منقول ہے۔ دوسرے بزرگوں سے دونوں پاؤں رکھنے کی جگہ منقول ہے۔ ایک مرفوع حدیث میں یہی ہے اور یہ بھی ہے کہ اس کا اندازہ بجز ذاتِ باری تعالیٰ کے اور کسی کو معلوم نہیں۔ خود ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے بھی یہی نقل ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے بھی مرفوعاً یہی روایت ہے لیکن رفع ثابت نہیں۔ ابو مالک فرماتے ہیں کرسی عرش کے نیچے ہے۔ سدی کہتے ہیں آسمان و زمین کرسی کے جوف میں اور کرسی عرش کے سامنے ہے۔ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں ساتوں زمینیں اور ساتوں آسمان اگر پھیلا دیئے جائیں اور سب کو ملا کر بسیط کر دیا جائے' تاہم کرسی کے مقابلہ میں ایسے ہوں گے جیسے ایک حلقہ کسی چٹیل میدان میں۔ حضرت ابو ذر غفاریؓ نے ایک مرتبہ کرسی کے بارے میں سوال کیا تو حضورؐ نے قسم کھا کر یہی فرمایا اور فرمایا کہ پھر عرش کی فضیلت کرسی پر بھی ایسی ہی ہے۔ ایک عورت نے آ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ میری لئے دعا کیجئے کہ خدا مجھے جنت میں لے جائے۔ آپ نے اللہ تعالیٰ کی عظمت بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ اس کی کرسی نے آسمان و زمین کو گھیر رکھا ہے مگر جس طرح نیا پالان چرچراتا ہے۔ وہ کرسی عظمت پروردگار سے چرچرا رہی ہے۔ گو یہ حدیث بہت سی سندوں سے بہت سی کتابوں میں موجود ہے لیکن کسی سند میں کوئی راوی غیر مشہور ہے' کسی میں ارسال ہے' کوئی موقوف ہے کسی میں بہت غریب زیادتی ہے کسی میں حذف ہے اور ان سب میں زیادہ غریب حضرت جبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ والی حدیث ہے۔ جو ابو داؤد میں ہے اور وہ روایات بھی ہیں۔ جن میں قیامت کے روز کرسی کا فیصلوں کے لئے رکھا جانا ذکر ہے۔ ظاہر یہ ہے کہ اس آیت میں یہ ذکر نہیں واللہ اعلم۔ مسلمان ہیئت دان متکلمین کہتے ہیں کہ کرسی آٹھواں آسمان ہے۔ جسے فلک ثوابت کہتے ہیں اور جس پر نواں آسمان اور ہے جسے فلک اثیر کہتے ہیں اور طلس بھی لیکن دوسرے لوگوں نے اس کی تردید کی ہے۔ حسن بصری رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کرسی ہی عرش ہے لیکن صحیح بات یہ ہے کہ کرسی اور ہے اور عرش ہے جو اس سے بہت بڑا ہے۔ جیسے کہ آثار و احادیث میں ہے۔ علامہ ابن جریر رحمتہ اللہ علیہ تو اس بارے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ والی روایت پر اعتماد کئے ہوئے ہیں لیکن میرے نزدیک اس کی صحت میں کلام ہے۔ واللہ اعلم۔

پھر فرمایا کہ خدا پر ان کی حفاظت گراں نہیں۔ بلکہ سہل اور آسان ہے۔ وہ ساری مخلوق کے اعمال پر خبردار تمام چیزوں پر نگہبان ہے۔ کوئی چیز اس سے پوشیدہ اور چھپی ہوئی نہیں ہے۔ تمام مخلوق اس کے سامنے حقیر' متواضع' ذلیل' پست' محتاج اور فقیر ہے۔ وہ غنی وہ حمید ہے۔ وہ جو کچھ چاہے کہ گزرنے والا ہے۔ کوئی اس پر حاکم نہیں۔ باز پرس کرنے والا نہیں۔ ہر چیز پر وہ غالب ہے۔ ہر چیز کا حافظ اور مالک ہے۔ وہ علو' بلندی اور رفعت والا ہے۔ وہ عظمت بڑائی اور کبریائی والا ہے۔ اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں۔ نہ اس کے سوا کوئی خبر گیری کرنے والا نہ پالنے پوسنے والا۔ وہ کبریائی والا اور فخر والا ہے۔ اسی لئے فرمایا: ﴿وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيمُ﴾ بلندی اور عظمت والا وہی ہے۔ یہ آیتیں اور ان جیسی اور آیتیں اور صحیح حدیثیں جتنی کچھ ذات و صفات باری میں ذکر ہوئی ہیں۔ ان سب پر ایمان لانا بغیر کیفیت معلوم کئے اور بغیر تشبیہ دیئے' جن الفاظ میں وہ وارد ہوئی ہیں' ضروری ہے اور یہی طریقہ ہمارے سلف صالحین رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کا تھا۔

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ۙ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۚ فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى ۤ لَا انْفِصَامَ لَهَا ۭ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ (۲۵۶)

دین میں زبردستی (کا فی نفسہ کوئی موقع) نہیں (کیونکہ) ہدایت یقیناً گمراہی سے ممتاز ہو چکی ہے۔ سو جو شخص شیطان سے بد اعتقاد ہو اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ خوش اعتقاد ہو (یعنی اسلام قبول کرے) تو اس نے بڑا مضبوط حلقہ تھام لیا۔ جس کو کسی طرح شکستگی نہیں (ہو سکتی) اور اللہ تعالیٰ خوب سننے والا (اور) خوب جاننے والا ہے۔ ○

دین کو قبول کرنے پر مجبور نہیں کیا جائے گا ☆

یہاں بیان ہو رہا ہے کہ کسی کو جبراً اسلام میں داخل نہ کرو۔ اسلام کی حقانیت واضح اور روشن ہو چکی ہے۔ اس کے دلائل و براہین بیان ہو چکے۔ پھر کسی پر جبر اور زبردستی کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ جسے خدا ہدایت دے گا۔ جس کا سینہ کھلا ہوا' دل روشن اور آنکھیں بینا ہوں گی وہ خود بخود اس کا دالہ وشیدا ہو جائے گا۔ ہاں اندھے دل والے' بہرے کانوں والے' چھوٹی آنکھوں والے اس سے دور رہیں گے۔ پھر اگر انہیں جبراً اسلام میں داخل بھی کیا تو کیا فائدہ؟ کسی پر اسلام قبول کرانے کے لئے جبر اور زبردستی نہ کرو۔ اس آیت کا شانِ نزول یہ ہے کہ مدینہ کی مشرکہ عورتیں جب انہیں اولاد نہ ہوتی تھی تو نذر مانتی تھیں کہ اگر ہمارے ہاں اولاد ہوئی تو ہم اسے یہود بنا دیں گے۔ یہودیوں کے سپرد کر دیں گے۔ اس طرح ان کے بہت سے بچے یہودیوں کے پاس تھے۔ جب یہ لوگ مسلمان بنے اور اور دین اللہ کے انصار بنے۔ ادھر یہودیوں سے جنگ ہوئی اور آخر ان کی اندرونی سازشیں اور فریب کاریوں سے نجات پانے کے لئے سرور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ حکم جاری کیا کہ ان بنی نضیر کے یہودیوں کو جلا وطن کر دیا جائے۔ اس وقت انصاریوں نے اپنے بچے جوان کے پاس تھے۔ ان سے طلب کئے تاکہ انہیں اپنے اثر سے مسلمان بنائیں۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی کہ جبر اور زبردستی نہ کرو۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ انصار کے قبیلے بنو سالم بن عوف کا ایک شخص حصینی نامی تھا۔ جس کے دو لڑکے نصرانی تھے اور خود مسلمان تھا۔ اس نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک بار عرض

کی کہ مجھے اجازت دی جائے کہ میں ان لڑکوں کو جبراً مسلمان بنالوں' ویسے تو عیسائیت سے ہٹتے نہیں۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی اور ممانعت کر دی گئی اور روایت میں اتنی زیادتی بھی ہے کہ نصرانیوں کا ایک قافلہ ملک شام سے تجارت کے لئے کشمش لے کر آیا تھا۔ جن کے ہاتھوں یہ دونوں لڑکے نصرانی ہو گئے تھے جب وہ قافلہ جانے لگا تو یہ بھی جانے پر تیار ہو گئے۔ ان کے باپ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ ذکر کیا اور کہا کہ اگر آپ اجازت دیں تو میں انہیں اسلام لانے کے لئے کچھ تکلیف دوں اور جبراً مسلمان بنالوں۔ ورنہ پھر آپ کو انہیں واپس لانے کے لئے اپنے آدمی بھیجنے پڑیں گے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا غلام اسبق نصرانی تھا۔ آپ اس پر سلام پیش کرتے تو وہ انکار کرتا۔ آپ کہہ دیتے کہ خیر تیری مرضی۔ اسلام جبر سے روکتا ہے۔ علماء کی ایک جماعت کا یہ خیال ہے کہ یہ آیت ان اہل کتاب کے حق میں ہے جو نسخ و تبدیل توراۃ و انجیل سے پہلے دین مسیحی اختیار کر چکے تھے اور اب وہ جزیہ پر رضامند ہو جائیں۔ بعض اور کہتے ہیں آیت قتال نے اسے منسوخ کر دیا۔

اسلام کی دعوت عام طور پر دی جانی چاہیے ☆ تمام انسانوں کو اس پاک دین کی دعوت دینا ضروری ہے۔ اگر کوئی انکار کرے اور مسلمانوں کی ماتحتی بھی اختیار نہ کرے۔ نہ جزیہ دینا قبول کرے تو بے شک مسلمان اس سے جہاد کریں گے جیسے اور جگہ ہے: ﴿سَتُدْعَوْنَ اِلٰی قَوْمٍ......﴾ عنقریب تمہیں اس قوم کی طرف بلایا جائے گا۔ جو بڑی لڑاکا ہے۔ یا تو تم اس سے لڑو گے یا وہ اسلام لائیں گے اور جگہ ہے' اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کافروں اور منافقوں سے جہاد کرو' اور ان پر سختی کرو اور جگہ ہے' ایماندارو! اپنے آس پاس کے کفار سے جہاد کرو' تم میں وہ سختی پائیں اور یقین رکھو کہ خدا متقیوں کے ساتھ ہے۔ صحیح حدیث میں ہے' تیرے رب کو ان لوگوں پر تعجب آتا ہے جو زنجیروں میں جکڑے ہوئے جنت کی طرف گھسیٹے جاتے ہیں یعنی وہ کفار جو میدان جنگ سے قیدی ہو کر طوق و سلاسل پہنا کر یہاں لائے جاتے ہیں۔ پھر وہ اسلام قبول کر لیتے ہیں اور ان کا ظاہر و باطن اچھا ہو جاتا ہے اور وہ جنت کے لائق بن جاتے ہیں۔ مسند احمد میں ہے کہ ایک شخص سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا' مسلمان ہو جاؤ۔ اس نے کہا میرا دل نہیں مانتا۔ آپ نے فرمایا گو دل نہ چاہتا ہو۔ یہ حدیث ثلاثی ہے یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک اس کے صرف تین راوی ہیں لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ آپ نے اسے مجبور کیا۔ مطلب یہ ہے کہ تو کلمہ تو پڑھ لے۔ پھر ایک دن وہ بھی آئے گا کہ خدا تیرے دل کو کھول دے اور تو دل سے بھی اسلام کا دلدادہ ہو جائے۔ حسن نیت اور اخلاص عمل تجھے نصیب ہو جائے۔ جو شخص بت اور معبودان باطل کو چھوڑے۔ اللہ کی توحید کا اقرار کرتا ہوا عامل بن جائے' وہ سیدھی اور صحیح راہ پر ہے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں جبت سے مراد جادو ہے اور طاغوت سے مراد شیطان ہے۔ دلیری اور نامردی دونوں اونٹ کے دونوں طرف کے برابر کے بوجھ ہیں جو لوگوں میں ہوتے ہیں۔ ایک دلیر آدمی تو انجان شخص کی حمایت میں بھی جان دینے پر تل جاتا ہے لیکن ایک بزدل اور ڈرپوک اپنی سگی ماں کی خاطر بھی قدم آگے نہیں بڑھاتا۔ انسان کا حقیقی کرم اس کا دین ہے انسان کا سچا نسب حسن خلق ہے۔ گو وہ فارسی ہو یا نبطی' حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا طاغوت کو شیطان کے معنی میں لینا بہت ہی اچھا ہے۔ اس لئے کہ یہ ہر اس برائی کو شامل ہے جو اہل جاہلیت میں تھی۔ بت کی پوجا کرنی۔ ان کی طرف حاجتیں لے جانی۔ ان سے سختی کے وقت طلب امداد کرنی وغیرہ۔

پھر فرمایا اس شخص نے مضبوط کڑا تھام لیا یعنی دین کے اعلیٰ اور قوی سبب کو لے لیا جو نہ ٹوٹے نہ پھٹے۔ خوب مضبوط مستحکم

اور گڑا ہوا۔ عروۃ وثقیٰ سے مراد ایمان اسلام توحید باری قرآن اور خدا کی راہ کی محبت اور اسی کے لئے دشمنی کرنا ہے۔ یہ کڑا بھی نہ ٹوٹے گا یعنی اس کے جنت میں پہنچنے تک اور جگہ ہے: ﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ﴾ (الرعد ۱۱) اللہ تعالیٰ کسی قوم کی حالت نہیں بگاڑتا جب تک وہ خود اپنی حالت نہ بگاڑ لیں۔ مسند احمد کی ایک حدیث میں ہے حضرت قیس بن عبادہ رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں میں مسجد نبوی میں تھا تو ایک شخص آیا' جس کا چہرہ خدا ترس تھا۔ دو ہلکی رکعتیں نماز کی اس نے ادا کیں۔ لوگ انہیں دیکھ کر کہنے لگے یہ جنتی ہیں۔ جب وہ باہر نکلے تو میں بھی ان کے پیچھے گیا۔ باتیں کرنے لگا۔ جب وہ متوجہ ہوئے تو میں نے کہا جب آپ تشریف لائے تھے' تب لوگوں نے آپ کی نسبت یوں کہا تھا؟ کہا سبحان اللہ کسی کو وہ نہ کہنا چاہئے جس کا علم اسے نہ ہو۔ ہاں البتہ اتنی بات تو ہے کہ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں ایک خواب دیکھا کہ گویا میں ایک لہراتے ہوئے سرسبز گلشن میں ہوں۔ اس کے درمیان لوہے کا ایک ستون ہے جو زمین سے آسمان کی طرف چلا گیا ہے۔ اس کی چوٹی پر ایک کڑا ہے۔ مجھ سے کہا گیا کہ اس پر چڑھ جاؤ۔ میں نے کہا میں تو نہیں چڑھ سکتا۔ چنانچہ ایک شخص نے مجھے تھاما اور میں با آسانی چڑھ گیا اور اس کڑے کو تھام لیا۔ اس نے کہا دیکھو مضبوط پکڑے رہنا۔ پس اس حالت میں میری آنکھ کھل گئی کہ وہ کڑا میرے ہاتھ میں تھا۔ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنا یہ خواب بیان کیا تو آپ نے فرمایا گلشن باغ اسلام ہے اور ستون ستونِ دین ہے اور کڑا عروۃ وثقیٰ ہے۔ تو مرتے دم تک اسلام پر قائم رہے گا۔ یہ شخص حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں۔ یہ حدیث بخاری و مسلم دونوں میں مروی ہے۔

مسند احمد کی اسی حدیث میں ہے کہ اس وقت آپ بوڑھے تھے اور لکڑی پر ٹیک لگائے ہوئے مسجد نبوی میں آئے تھے اور ایک ستون کے پیچھے نماز پڑھی تھی اور سوال کے جواب میں فرمایا تھا کہ جنت اللہ تعالیٰ کی چیز ہے۔ جسے چاہے اس میں لے جائے۔ خواب کے ذکر میں فرمایا کہ ایک شخص آیا مجھے لے چلا۔ ایک لمبے چوڑے صاف شفاف میدان میں ہم پہنچے میں نے وہاں بائیں طرف جانا چاہا' تو اس نے کہا تم ایسے نہیں ہو۔ میں دائیں طرف چلنے لگا تو اچانک ایک چکنے پتھروں کا پہاڑ نظر آیا۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر اوپر چڑھا لیا اور میں اس کی چوٹی تک پہنچ گیا۔ وہاں میں نے ایک اونچا ستون لوہے کا دیکھا۔ جس کے سرے پر ایک سونے کا کڑا تھا۔ مجھے اس نے اس ستون پر چڑھا دیا۔ یہاں تک کہ میں نے اس کڑے کو تھام لیا۔ اس نے پوچھا خوب مضبوط تھام لیا ہے؟ میں نے کہا ہاں۔ اس نے زور سے ستون پر اپنا پاؤں مارا اور وہ نکل گیا اور کڑا میرے ہاتھ میں رہ گیا۔ جب یہ خواب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو میں نے سنایا تو آپ نے فرمایا۔ میدان محشر ہے۔ بائیں طرف کا راستہ جہنم کا راستہ ہے تو ان لوگوں میں نہیں۔ دائیں جانب کا راستہ جنتیوں کا راستہ ہے۔ چکنا پہاڑ شہداء کی منزل ہے۔ کڑا اسلام کا کڑا ہے۔ مرتے دم تک اسے مضبوط تھامے رکھو۔ اس کے بعد حضرت عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا اُمید تو مجھے بھی یہی ہے کہ خدا مجھے جنت میں لے جائے گا۔

اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۬ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَوْلِيٰٓـُٔهُمُ الطَّاغُوْتُ يُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَى الظُّلُمٰتِ ؕ

اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۵۷﴾

اللہ تعالیٰ ساتھی ہے ان لوگوں کا جو ایمان لائے ان کو (کفر کی تاریکیوں) سے نکال کر یا بچا کر نور (اسلام) کی طرف لاتا ہے اور جو لوگ کافر ہیں ان کے ساتھی شیاطین ہیں (انسی یا جنی) وہ ان کو نور (اسلام) سے نکال کر یا بچا کر (کفر کی) تاریکیوں کی طرف لے جاتے ہیں۔ ایسے لوگ دوزخ میں رہنے والے ہیں (اور) یہ لوگ اس میں ہمیشہ ہمیشہ کو رہیں گے۔O

ہدایت وضلالت ☆

اللہ تعالیٰ خبر دیتا ہے کہ اس کی رضامندی کے طلبگار کو وہ سلامتی کی رہنمائی کرتا ہے اور شک وشبہ کے کفر وشرک کے اندھیروں سے نکال کر نورِ حق کی صاف روشنی میں لا کر کھڑا کرتا ہے۔ کفار کے ولی شیاطین ہیں' جو جہالت وضلالت کو کفر وشرک کو مزین کر کے انہیں ایمان سے اور توحید سے روکتے ہیں اور یوں نورِ حق سے ہٹا کر ناحق کی اندھیریوں میں جھونک دیتے ہیں۔ یہی کافر ہیں اور یہ ہمیشہ دوزخ میں ہی پڑے رہیں گے۔ لفظ نور کو واحد لانا اور ظلمات کو جمع لانا اس لئے ہے کہ حق اور ایمان اور سچا راستہ ایک ہی ہے اور کفر کی کئی قسمیں ہیں۔ کفر کی بہت سی شاخیں ہیں۔ جو سب کی سب باطل اور ناحق ہیں۔ جیسے اور جگہ ہے: ﴿وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا......﴾ (الانعام:۱۵۳) میری سیدھی راہ یہی ہے۔ تم اس کی تابعداری کرو۔ اس کے علاوہ دوسرے راستوں پر نہ چلو۔ ورنہ اس راہ سے بھٹک جاؤ گے۔ یہ وصیت تمہارے بچاؤ کے لئے کر دی گئی ہے اور جگہ ہے ﴿وَجَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَالنُّوْرَ﴾ (الانعام:۱) اور بھی اس قسم کی بہت سی آیتیں ہیں' جن سے ثابت ہوتا ہے کہ حق ایک ہی ہے اور باطل ہی میں تفریق وانتشار ہے۔ حضرت ایوب بن خالد فرماتے ہیں۔ اہل ہوا یا اہل فتنہ کھڑے کئے جائیں گے۔ جس کی چاہت صرف ایمان ہی کی ہو وہ تو روشن صاف اور نورانی ہو گا اور جس کی خواہش کفر کی ہو' وہ سیاہ اور اندھیریوں والا ہو گا۔ پھر آپ نے اس آیت کی تلاوت فرمائی۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْ حَآجَّ اِبْرٰهٖمَ فِيْ رَبِّهٖٓ اَنْ اٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ ۘ اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّيَ الَّذِيْ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ۙ قَالَ اَنَا اُحْيٖ وَاُمِيْتُ ۭ قَالَ اِبْرٰهٖمُ فَاِنَّ اللّٰهَ يَاْتِيْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَاْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ فَبُهِتَ الَّذِيْ كَفَرَ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۲۵۸﴾

(اے مخاطب) کیا تجھ کو اس شخص کا قصہ تحقیق نہیں ہوا (یعنی نمرود کا) جس نے حضرت ابراہیم سے مباحثہ کیا تھا اپنے پروردگار کے (وجود کے) بارہ میں۔ اس وجہ سے کہ خدا تعالیٰ نے اس کو سلطنت دی تھی۔ جب ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا کہ میرا پروردگار ایسا ہے کہ وہ جلاتا ہے اور مارتا ہے۔ کہنے لگا میں بھی جلاتا ہوں اور مارتا ہوں۔ ابراہیم

علیہ السلام نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ آفتاب کو (روز کے روز) مشرق سے نکالتا ہے تو (ایک ہی دن) مغرب سے نکال دے۔ اس پر متحیر رہ گیا وہ کافر (اور کچھ جواب نہ بن آیا) اور اللہ تعالیٰ کی عادت ہے کہ ایسے بیجا راہ پر چلنے والوں کو ہدایت نہیں فرماتے۔ ○

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا نمرود کی خدائی کو چیلنج ☆

اس بادشاہ کا نام نمرود بن کنعان بن کوس بن سام بن نوح تھا۔ اس کا پایہ تخت بابل تھا۔ اس کے نسب نامہ میں کچھ اختلاف بھی ہے۔ حضرت مجاہد فرماتے ہیں' دنیا میں مشرق و مغرب کی سلطنت رکھنے والے چار ہوئے ہیں۔ جن میں سے دو مؤمن ہیں اور دو کافر ہیں۔ حضرت سلیمان بن داؤد علیہ السلام اور حضرت ذوالقرنین اور کافروں میں نمرود اور بخت نصر۔ فرمان ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم تم نے اپنے دل سے اسے نہیں دیکھا جو حضرت ابراہیم علیہ السلام سے وجود باری تعالیٰ میں مباحثہ کرنے لگا۔ یہ شخص خود خدا ہونے کا مدعی تھا۔ جیسے اس کے بعد فرعون نے بھی اپنی رعیت والوں میں دعویٰ کیا تھا کہ میں اپنے سوا کسی کو تمہارا خدا نہیں جانتا چونکہ ایک مدت مدید سے اور عرصہ بعید سے یہ بادشاہ چلا آ رہا تھا۔ اس لئے دماغ میں رعونت اور انانیت پیدا ہو گئی تھی۔ سرکشی اور تکبر' نخوت اور غرور طبیعت میں سما گیا تھا۔ بعض کہتے ہیں چار سو سال تک حکومت کرتا رہا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے جب اس نے وجود باری تعالیٰ پر دلیل مانگی تو آپ نے نیست سے ہست اور ہست سے نیست کرنے کی دلیل دی۔ جو ایک بدیہی اور مثل آفتاب روشن دلیل تھی اور موجودات کا پہلے کچھ نہ ہونا' پھر ہونا' پھر مٹ جانا کھلی دلیل ہے۔ موجد اور پیدا کرنے والے کے موجود ہونے کی اور وہی اللہ ہے۔ نمرود نے جواباً کہا یہ تو میں کرتا ہوں یہ کہہ کر دو شخصوں کو اس نے بلوایا جو واجب القتل تھے۔ ایک کو قتل کیا اور دوسرے کو رہا کر دیا۔ دراصل یہ جواب اور یہ دعویٰ کس قدر لچر اور پوچ ہے۔ اس کے بیان کی بھی ضرورت نہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تو صفات باری میں سے ایک صفت پیدا کرنا اور پھر نیست کر دینا بیان کی تھی اور اس نے نہ تو انہیں پیدا کیا نہ ان کی اور اپنی موت و حیات پر اسے قدرت۔ لیکن جہلا کو بھڑکانے کے لئے اور عیت جتانے کے لئے باوجود اپنی غلطی اور مباحثہ کے اصول سے فراری کو جانتے ہوئے صرف ایک بات بنالی۔ ابراہیم علیہ السلام بھی اس کو سمجھ گئے اور آپ نے اس کند ذہن کے سامنے ایسی دلیل پیش کر دی کہ صورتاً بھی اس کی مشابہت نہ کر سکے۔ چنانچہ فرمایا کہ جب تو پیدائش اور موت تک کا اختیار رکھتا ہے تو مخلوق پر تصرف تیرا پورا ہونا چاہئے۔ میرے خدا نے تو یہ تصرف کیا ہے کہ سورج کو حکم ہے کہ وہ مشرق کی طرف سے نکلا کرے۔ چنانچہ وہ نکل رہا ہے۔ اب تو اسے حکم دے کہ وہ مغرب کی طرف سے نکلے۔ اس کا کوئی ظاہری ٹوٹا پھوٹا جواب بھی اس سے نہ بن پڑا اور بے زبان ہو کر اپنی عاجزی کا اقراری ہو گیا اور خدا کی حجت اس پر پوری ہوئی لیکن چونکہ ہدایت نصیب نہ تھی' راہ یافتہ نہ ہو سکا۔ ایسے بدوضع لوگوں کو خدا کوئی دلیل نہیں سمجھاتا اور وہ حق کے مقابلے میں بغلیں جھانکتے ہی نظر آتے ہیں۔ ان پر خدا کا غضب و غصہ اور اس کی ناراضگی ہوتی ہے اور ان کے لئے اس جہان میں بھی سخت عذاب ہوتے ہیں۔ بعض منطقیوں نے کہا ہے کہ حضرت خلیل اللہ علیہ السلام نے یہاں ایک واضح دلیل کے بعد دوسری اس سے بھی زیادہ واضح دلیل پیش کر دی۔ لیکن درحقیقت یوں نہیں بلکہ پہلی دلیل دوسری کا مقدمہ تھا اور ان دونوں سے نمرود کے دعویٰ کا بطلان بالکل واضح ہو گیا۔ اصل دلیل پیدائش و موت ہی ہے۔ چونکہ اس کا دعویٰ اس ناسمجھ مشت خاک نے بھی کیا تو لازم تھا کہ جو بنانے بگاڑنے پر نہ صرف قادر ہو بلکہ بناؤ بگاڑ کا بھی خالق ہو۔ اس کی ملکیت پوری طرح اسی کے

قبضہ میں ہونی چاہئے اور جس طرح موت وحیات کے احکام اس کے جاری ہو جاتے ہیں اسی طرح دوسرے احکام بھی جاری ہو جائیں۔ پھر کیا وجہ کہ سورج جو کہ ایک مخلوق ہے اس کی فرمانبرداری اور اطاعت گزاری نہ کرے اور اسکے کہے سے بجائے مشرق کے مغرب سے نہ نکلے؟۔ پس ابراہیم علیہ السلام نے اس پر اس مباحثہ میں کھلا غلبہ پایا اور اسے لاجواب کر دیا۔ فالحمد للہ۔

حضرت سدی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں یہ مناظرہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے آگ سے نکل آنے کے بعد ہوا تھا۔ اس سے پہلے آپ کی اس ظالم بادشاہ سے کوئی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ زید بن اسلم کا قول ہے کہ قحط سالی تھی۔ لوگ نمرود کے پاس جاتے تھے اور غلہ لے آتے تھے۔ حضرت خلیل اللہ بھی گئے وہاں یہ مناظرہ ہو گیا۔ بد بخت نے آپ کو غلہ نہ دیا۔ آپ خالی ہاتھ واپس آئے۔ گھر کے قریب پہنچ کر آپ نے دونوں بوریوں میں ریت بھر لی کہ گھر والے سمجھیں کچھ لے آئے۔ گھر آتے ہی بوریاں رکھ کر سو گئے۔ آپ کی بیوی صاحبہ حضرت سارہ اٹھیں بوریوں کو دیکھا کہ عمدہ اناج سے دونوں پُر ہیں۔ کھانا پکا کر تیار کیا۔ آپ کی آنکھ کھلی دیکھا کہ کھانا تیار ہے۔ پوچھا اناج کہاں سے آیا؟ کہا دو بوریاں جو آپ بھر کر لائے ہیں۔ انہیں میں سے یہ اناج نکالا ہے۔ آپ سمجھ گئے کہ یہ خدا کی طرف سے برکت اور اس کی رحمت ہے۔ اس نانہجار بادشاہ کے پاس خدا تعالیٰ نے اپنا ایک فرشتہ بھیجا۔ اس نے آکر اسے توحید کی دعوت دی لیکن اس نے قبول نہ کی۔ دوبارہ دعوت دی لیکن انکار کیا۔ تیسری مرتبہ خدا کی طرف بلایا۔ لیکن پھر بھی یہ منکر ہی رہا۔ اس بار بار کے انکار کے بعد فرشتے نے اس سے کہا' اچھا تو اپنا لشکر تیار کر۔ میں اپنا لشکر لے آتا ہوں۔ نمرود نے بڑا بھاری لشکر اور زبردست فوج کو لے کر سورج نکلنے کے وقت میدان میں آڈٹا۔ ادھر اللہ تعالیٰ نے مچھروں کا ایک دروازہ کھول دیا۔ بڑے بڑے مچھر اس کثرت سے آئے کہ لوگوں کو سورج بھی نظر نہ آتا تھا۔ یہ خدائی فوج نمرودیوں پر گری اور تھوڑی دیر میں ان کا خون تو کیا' ان کا گوشت پوست سب کھا پی گئی اور سارے کے سارے وہیں ہلاک ہو گئے۔ صرف ہڈیوں کے ڈھانچے باقی رہ گئے تھے۔ انہی مچھروں میں سے ایک نمرود کے نتھنے میں گھس گیا اور چار سو سال تک اس کا دماغ چاٹتا رہا۔ ایسے سخت عذاب میں وہ رہا کہ موت اس سے ہزاروں درجہ بہتر تھی۔ اپنا سر دیواروں اور پتھروں سے مارتا پھرتا تھا۔ ہتھوڑے سے کچلواتا تھا۔ بدنصیب اسی طرح ذلیل ہو کر مرا۔ اعاذنا اللہ منہ۔

اَوْ كَالَّذِيْ مَرَّ عَلٰى قَرْيَةٍ وَّ هِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا ۚ قَالَ اَنّٰى يُحْيِ هٰذِهِ اللّٰهُ بَعْدَ مَوْتِهَا ۚ فَاَمَاتَهُ اللّٰهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهٗ ؕ قَالَ كَمْ لَبِثْتَ ؕ قَالَ لَبِثْتُ يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ ؕ قَالَ بَلْ لَّبِثْتَ مِائَةَ عَامٍ فَانْظُرْ اِلٰى طَعَامِكَ وَشَرَابِكَ لَمْ يَتَسَنَّهْ ۚ وَ انْظُرْ اِلٰى حِمَارِكَ وَ لِنَجْعَلَكَ اٰيَةً لِّلنَّاسِ وَانْظُرْ اِلَى الْعِظَامِ كَيْفَ نُنْشِزُهَا

ثُمَّ نَكْسُوْهَا لَحْمًا ۭ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗ ۙ قَالَ اَعْلَمُ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۲۵۹﴾

یا تم کو اس طرح کا قصہ بھی معلوم ہے جیسے ایک شخص تھا کہ ایک بستی پر ایسی حالت میں اس کا گزر ہوا کہ اس کے مکانات اپنی چھتوں پر گر گئے تھے کہنے لگا اللہ تعالیٰ اس بستی (کے مردوں) کو اس کے مرے پیچھے کس کیفیت سے زندہ کر دیں گے۔ سو اللہ تعالیٰ نے اس شخص کو سو برس تک مردہ رکھا پھر اس کو زندہ کر اٹھایا اور پھر پوچھا کہ تو کتنے دنوں اس حالت میں رہا۔ اس شخص نے جواب دیا کہ ایک دن رہا ہوں گا یا ایک دن سے بھی کم۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ نہیں بلکہ تو سو برس رہا۔ تو اپنے کھانے (کی چیز) اور پینے (کی چیز) کو دیکھ لے کہ نہیں سڑی گلی اور (دوسرے) اپنے گدھے کی طرف نظر کر اور تاکہ ہم تجھ کو ایک نظیر لوگوں کے لئے بنا دیں اور (اس گدھے کی) ہڈیوں کی طرف نظر کر ہم ان کو کس طرح ترکیب دیتے ہیں۔ پھر ان پر گوشت چڑھاتے ہیں پھر جب یہ سب کیفیت اس شخص پر واضح ہو گئی تو کہہ اٹھا کہ میں یقین رکھتا ہوں کہ بے شک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر پوری قدرت رکھتے ہیں۔ ○

خدا کی کرشمہ کاریاں ☆

اوپر جو واقعہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مباحثہ کا گزرا اس پر اس کا عطف ہے یہ گزرنے والے یا حضرت عزیر علیہ السلام تھے جیسا کہ مشہور ہے یا ارمیاہ بن خلقیا تھے اور یہ نام حضرت خضر کا ہے یا حزقیل بن بوار تھے یا بنی اسرائیل کا ایک شخص تھا۔ یہ بستی بیت المقدس تھی اور یہی قول مشہور ہے۔ بخت نصر نے جب اسے اجاڑا یہاں کے باشندوں کو تہ تیغ کیا۔ مکانات گرا دیئے اور آباد کو بالکل ویرانہ کر دیا۔ اس کے بعد یہ بزرگ یہاں سے گزرے انہوں نے دیکھا کہ ساری بستی ویرانہ بن چکی ہے۔ نہ مکان ہیں نہ مکین' تو وہاں ٹھہر کر سوچنے لگے کہ بھلا ایسا بڑا پر رونق شہر جو اس طرح اجڑا ہے پھر یہ کیسے آباد ہوگا؟ اللہ تعالیٰ نے خود ان پر موت نازل فرمائی۔ یہ اسی حالت میں رہے اور وہاں ستر سال کے بعد بیت المقدس پھر آباد ہو گیا۔ بھاگے ہوئے بنی اسرائیل بھی پھر آ پہنچے اور شہر کھچا کھچ بھر گیا۔ وہی اگلی سی رونق اور چہل پہل ہو گئی اب سو سال کامل کے بعد اللہ تعالیٰ نے انہیں زندہ کیا اور سب سے پہلے روح آنکھوں میں آئی۔ تاکہ اپنا جی اُٹھنا خود دیکھ سکیں۔ جب سارے بدن میں روح پھونک دی گئی تو اللہ تعالیٰ نے فرشتے کے ذریعہ پچھوایا کہ کتنی مدت تک تم مردہ رہے؟ جس کے جواب میں کہا کہ ابھی تو ایک دن بھی پورا نہیں ہوا۔ وجہ یہ ہوئی کہ صبح کے وقت ان کی روح نکلی تھی اور سو سال بعد جب جئے تو شام کا وقت ہے خیال کیا کہ یہ وہی دن ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تم ایک سو سال کامل تک مردہ رہے۔ اب ہماری قدرت دیکھو کہ تمہارا توشہ بھتا جو تمہارے ساتھ ہے' باوجود سو سال گزر جانے کے بھی ویسا ہی ہے نہ سڑا نہ خراب ہوا۔ یہ توشہ انگور اور انجیر اور عصیر تھا۔ نہ تو یہ شیرہ بگڑا تھا نہ انجیر کھٹے ہوئے تھے۔ نہ انگور خراب ہوئے تھے بلکہ ٹھیک اپنی اصلی حالت پر تھے۔ اب فرمایا یہ تیرا گدھا' جس کی بوسیدہ ہڈیاں تیرے سامنے پڑی ہیں' انہیں دیکھ' دیکھتے ہی ہم اسے زندہ کرتے ہیں۔ ہم خود تیری ذات کو لوگوں کے لئے دلیل بنانے والے ہیں کہ انہیں قیامت کے دن اپنے دوبارہ جی اٹھنے پر کامل یقین ہو جائے۔ چنانچہ ان کے دیکھتے ہی ہڈیوں میں جان پیدا ہوئی۔ وہ ایک دوسرے سے جڑ گئیں۔ مستدرک میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی قراءت نُنْشِزُهَا زے کے ساتھ ہی ہے اور اسے نُنْشِرُهَا

رے کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے۔ یعنی زندہ کریں گے۔ مجاہد کی قراءت یہی ہے۔ سدی وغیرہ کہتے ہیں' یہ ہڈیاں ان کے دائیں بائیں پھیلی پڑی تھیں اور بوسیدہ ہونے کی وجہ سے ان کی سفیدی چمک رہی تھی۔ ہوا سے یہ سب یکجا ہو گئیں پھر ایک ایک ہڈی اپنی اپنی جگہ جڑ گئی اور ہڈیوں کا پورا ڈھانچہ قائم ہو گیا۔ جس پر گوشت مطلق نہ تھا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اسے گوشت رگیں پٹھے اور کھال پہنا دی۔ پھر فرشتے کو بھیجا۔ جس نے اس کے نتھنے میں پھونک ماری۔ بس اللہ کے حکم سے اسی وقت زندہ ہو گیا اور آواز نکالنے لگا۔ ان تمام باتوں کو حضرت عزیر دیکھتے رہے اور قدرت کی یہ ساری کاریگری ان کی آنکھوں کے سامنے ہی ہوئی۔ جب یہ سب کچھ دیکھ چکے تو کہنے لگے۔ اس بات کا علم تو تھا ہی کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے لیکن اب میں نے اپنی آنکھوں کے سامنے بھی دیکھ لیا' تو میں اپنے زمانہ کے تمام لوگوں سے زیادہ علم و یقین والا ہوں۔ بعض لوگوں نے اَعْلَمُ کو اِعْلَمْ بھی پڑھا ہے۔ یعنی خدا نے فرمایا کہ جان لے کہ اللہ تعالیٰ کو ہر چیز پر قدرت ہے۔

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اَرِنِیْ كَیْفَ تُحْیِ الْمَوْتٰی ؕ قَالَ اَوَلَمْ تُؤْمِنْ ؕ قَالَ بَلٰی وَلٰكِنْ لِّیَطْمَىِٕنَّ قَلْبِیْ ؕ قَالَ فَخُذْ اَرْبَعَةً مِّنَ الطَّیْرِ فَصُرْهُنَّ اِلَیْكَ ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰی كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا ثُمَّ ادْعُهُنَّ یَاْتِیْنَكَ سَعْیًا ؕ وَاعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ ﴿۲۶۰﴾

اور اس وقت کو یاد کرو جبکہ ابراہیم علیہ السلام نے عرض کیا کہ اے میرے پروردگار مجھے دکھلا دیجئے کہ آپ مردوں کو کس کیفیت سے زندہ کریں گے۔ ارشاد فرمایا کیا تم یقین نہیں لائے۔ انہوں نے عرض کیا یقین کیوں نہ لاتا لیکن اس غرض سے یہ درخواست کرتا ہوں کہ میرے قلب کو سکون ہو جائے۔ ارشاد ہوا کہ اچھا تو تم چار پرندے لو۔ پھر (ان کو) اپنے لئے ہلاؤ پھر ہر پہاڑ پر ان میں کا ایک ایک حصہ رکھ دو (اور) پھر ان سب کو بلاؤ دیکھو تمہارے پاس سب دوڑے چلے آئیں گے اور خوب یقین رکھو اس بات کا کہ حق تعالیٰ زبردست ہیں حکمت والے ہیں۔ O

احیاءِ موتیٰ کا ایک منظر ☆

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اس سوال کی بہت سی وجہیں تھیں۔ ایک تو یہ کہ چونکہ یہی دلیل آپ نے نمرود مردود کے سامنے پیش کی تھی تو آپ نے چاہا کہ علم الیقین سے عین الیقین حاصل ہو جائے۔ جانتا تو ہوں ہی لیکن دیکھ بھی لوں صحیح بخاری شریف میں اس آیت کی موقعہ کی ایک حدیث ہے۔ جس میں ہے کہ ہم شک کے حقدار بہ نسبت ابراہیم کے زیادہ ہیں۔ جبکہ انہوں نے کہا: ﴿رَبِّ اَرِنِیْ......﴾ تو اس سے کوئی جاہل یہ نہ سمجھے کہ حضرت خلیل اللہ علیہ السلام کو خدا کی اس صفت میں شک تھا۔ اس حدیث کے بہت سے جواب ہیں۔ جن میں سے ایک یہ ہے (شاید یہ ہو گا کہ ہم خلیل اللہ علیہ السلام سے کمزور ایمان والے ہونے کے باوجود خلاق عالم کی اس صفت میں شک نہیں کرتے تو خلیل خدا کو شک کیوں ہو گا؟ مترجم) اب رب العالمین خالق کل فرماتا ہے کہ چار پرندے لو' مفسرین کے اس بارے میں کئی قول ہیں کہ کون کونسے پرندے حضرت ابراہیم علیہ السلام

نے لئے تھے لیکن ظاہر ہے کہ اس کا علم ہمیں کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتا اور اس کا نہ جاننا ہمیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ کوئی کہتا ہے وہ کلنگ اور مور اور مرغ اور کبوتر تھے۔ کوئی کہتا ہے کہ وہ مرغابی اور سیمرغ کا بچہ اور مرغ اور مور تھے۔ کوئی کہتا ہے کبوتر' مرغ' مور اور کوا تھے۔ پھر انہیں کاٹ کر ان کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالو۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما یہی فرماتے ہیں اور روایت میں ہے' اپنے پاس رکھ لیا۔ جب ہل گئے' انہیں ذبح کر دیا۔ پھر ٹکڑے ٹکڑے الگ الگ کر دیئے۔ پس آپ نے چار پرند لئے۔ ذبح کر کے ان کے ٹکڑے کئے۔ پر اکھیڑ دیئے اور سارے مختلف ٹکڑے آپس میں ملائے۔ پھر چار پہاڑوں پر یا سات پہاڑوں پر وہ ٹکڑے رکھ دیئے اور سب پرندوں کے سر اپنے ہاتھ میں رکھے۔ پھر بحکم خدا انہیں بلانے لگے جس جس جانور کو آواز دیتے۔ اس کے بکھرے ہوئے پَر اِدھر اُدھر سے اُڑتے اور آپس میں جڑتے' اسی طرح خون خون سے ملتا اور باقی اجزاء بھی جس جس پہاڑ پر ہوتے' آپس میں مل جاتے اور پرندہ اڑتا ہوا آپ کے پاس آتا۔ آپ اسے دوسرے پرندے کا سر دیتے تو قبول نہ کرتا۔ خود اس کا سر دیتے تو وہ بھی جڑ جاتا۔ یہاں تک کہ ایک ایک کر کے یہ چاروں پرندے زندہ ہو کر اُڑ گئے اور خدائے تعالیٰ کی قدرت کا اور مردوں کے زندہ ہونے کا یہ ایمان افروز نظارہ خلیل خدا نے اپنی آنکھوں دیکھ لیا۔

پھر فرماتا ہے کہ جان لے کہ اللہ تعالیٰ غالب ہے کوئی چیز اسے عاجز نہیں کر سکتی۔ جس کام کو وہ چاہے بے روک ہو جاتا ہے۔ ہر چیز اس کے قبضہ میں ہے۔ وہ اقوال و افعال میں حکیم ہے۔ اسی طرح اپنے انتظام میں اور شریعت کے مقرر کرنے میں بھی۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرمایا کرتے تھے کہ ابراہیم علیہ السلام سے جناب باری کا یہ سوال کرنا کہ کیا تو ایمان نہیں لایا اور حضرت خلیل اللہ کا یہ جواب دینا کہ ہاں ایمان تو ہے لیکن دلی اطمینان چاہتا ہوں۔ یہ آیت مجھے تو اور تمام آیتوں سے زیادہ امید دلانے والی معلوم ہوتی ہے مطلب یہ ہے کہ ایک ایماندار کے دل میں اگر کوئی خطرہ وسوسہ شیطانی پیدا ہو تو اس پر پکڑ نہیں۔ حضرت عبداللہ بن عباس اور حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی ملاقات ہوتی ہے۔ تو پوچھتے ہیں کہ قرآن میں سب سے زیادہ امید پیدا کرنے والی آیت کونسی ہے۔ عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں: ﴿لَا تَقْنَطُوْا......﴾ (الزمر:۵۳) والی ایت جس میں ارشاد ہے کہ اے میرے گنہگار بندو میری رحمت سے نا اُمید نہ ہونا۔ میں سب گناہوں کو بخش دیتا ہوں۔ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا' میرے نزدیک تو اس اُمت کے لئے سب سے زیدہ ڈھارس بندھانے والی آیت حضرت ابراہیم کا یہ قول' پھر خدا تعالیٰ کا یہ سوال اور آپ کا جواب۔

(عبدالرزاق وابن ابی حاتم وغیرہ)

مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ ؕ وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۶۱﴾

جو لوگ اللہ کی راہ میں اپنے مالوں کو خرچ کرتے ہیں۔ ان کے خرچ کئے ہوئے مالوں کی حالت (عنداللہ) ایسی ہے جیسے ایک دانہ کی حالت جس سے (فرض کرو) سات بالیں جمیں (اور) ہر بالی کے اندر سو دانے ہوں اور یہ افزونی

خدا تعالیٰ جس کو چاہتا ہے عطا فرماتا ہے اور اللہ تعالیٰ بڑی وسعت والا ہے۔ جاننے والا ہے۔ ○

ایک نیکی پر لامتناہی نعمتیں ☆

اس آیت میں بیان ہو رہا ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کی رضامندی کی طلب میں اپنے مال کو خرچ کرے اسے بڑی برکتیں اور بڑے ثواب ملتے ہیں اور نیکیاں سات سات سو گنی کر کے دی جاتی ہیں۔ تو فرمایا جو لوگ راہِ خدا یعنی خدا کی فرمانبرداری میں جہاد میں' گھوڑوں کے پالنے میں' ہتھیار خریدنے میں' حج کرنے کرانے میں وغیرہ وغیرہ اللہ کے نام پر دیئے ہوئے مال کی مثال کس پاکیزگی سے بیان ہو رہی ہے جو آنکھوں میں کھپ جائے اور دل میں گھر کر جائے۔ ایک دم یوں فرما دینا کہ ایک کے بدلے سات سو ملیں گے۔ اس طرح ایک ترغیب اور تحریص اس کلام میں اور اس مثال میں ہے اور پھر اس میں اشارہ ہے کہ اعمال صالحہ خدا کے پاس بڑھتے رہتے ہیں۔ جس طرح تمہارے بوئے ہوئے بیج کھیت میں خدا کی قدرت سے بڑھتے بڑھاتے رہتے ہیں۔ مسند احمد میں حدیث ہے کہ رسول خدا احمد مجتبیٰ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں' جو شخص اپنی بچی ہوئی چیز راہِ خدا میں دیتا ہے' اسے سات سو کا ثواب ملتا ہے اور جو شخص اپنی جان پر اور اپنے اہل عیال پر خرچ کرے' اسے دس گناہ ملتا ہے اور بیمار کی عیادت کا ثواب بھی دس گناہ ملتا ہے۔ روزہ ڈھال ہے جب تک کہ اسے خراب نہ کرے۔ جس شخص پر کوئی جسمانی بلا مصیبت دکھ درد بیماری آئے وہ اس کے گناہوں کو جھاڑ دیتی ہے۔ یہ حدیث حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس وقت بیان فرمائی تھی' جبکہ آپ سخت بیمار تھے اور لوگ عیادت کے لئے گئے تھے۔ آپ کی بیوی صاحبہ سرہانے بیٹھی تھیں۔ ان سے پوچھا کہ رات کیسے گزری؟ انہوں نے کہا نہایت سختی سے۔ آپ کا منہ اس وقت دیوار کی جانب تھا۔ یہ سنتے ہی لوگوں کی طرف منہ کیا اور فرمایا میری یہ رات سختی کی نہیں گزری۔ اس لئے کہ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ سنا ہے۔

مسندِ احمد کی اور حدیث میں ہے کہ ایک شخص نے نکیل والی اونٹنی خیرات کی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا' یہ قیامت کے دن سات سو ایسی اونٹنیاں پائے گا۔ مسند کی ایک اور حدیث کہ اللہ تعالیٰ نے ابن آدم کی ایک نیکی کو دس نیکیوں کے برابر کر دیا ہے اور پھر وہ بڑھتی رہتی ہیں سات سو تک۔ مگر روزہ کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وہ خاص میرے لئے ہے اور میں خود اس کا اجر و ثواب دوں گا۔ روزے دار کو دو خوشیاں ہیں۔ ایک افطار کے وقت دوسری قیامت کے دن۔ روزے دار کی منہ کی بو اللہ تعالیٰ کو مشک کی خوشبو سے زیادہ پسند ہے۔ دوسری حدیث میں اتنی زیادتی اور ہے کہ روزے دار اپنے کھانے پینے کو صرف میری وجہ سے چھوڑتا ہے۔ آخر میں روزہ ڈھال ہے۔ مسند کی اور حدیث میں ہے' نماز روزہ' ذکر اللہ' اللہ کی راہ میں خرچ پر سات سو گنے بڑھ جاتے ہیں۔ ابن ابی حاتم کی حدیث میں ہے کہ جو شخص جہاد میں کچھ مالی مدد۔ گو خود نہ جائے۔ تاہم اسے ایک کے بدلے سات سو کے خرچ کرنے کا ثواب ملتا ہے اور خود بھی شریک ہو تو ایک درہم کے بدلے سات لاکھ درہم کے خرچ کا ثواب ان ملتا ہے۔ پھر آپ نے اسی آیت کی تلاوت کی: ﴿وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ﴾ یہ حدیث غریب ہے اور حضرت ابو ہریرہ والی حدیث: ﴿مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰهَ﴾ (البقرۃ:۲۴۵) کی تفسیر میں پہلے گزر چکی ہے۔ جس میں ہے کہ ایک کے بدلے دو کروڑ کا ثواب ملتا ہے۔ ابن مردویہ میں ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو نبی علیہ صلوات اللہ نے دعا کی کہ خدایا میری اُمت کے لئے کچھ اور زیادتی فرما تو: ﴿مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰهَ﴾ والی آیت اُتری۔ آپ نے پھر بھی یہی دعا کی تو آیت: ﴿اِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ﴾ (الزمر:۱۰) اُتری پس ثابت ہوا کہ جس قدر اخلاص عمل ہو' اسی قدر ثواب میں زیادتی

ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ بڑا وسیع فضل و کرم والا ہے۔ وہ جانتا بھی ہے کہ کون کس قدر مستحق ہے اور کسے استحقاق نہیں۔ فَسُبْحَانَ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ۔

اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ لَا يُتْبِعُوْنَ مَآ اَنْفَقُوْا مَنًّا وَّلَآ اَذًى ۙ لَّهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۲۶۲﴾ قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ وَّمَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ يَّتْبَعُهَآ اَذًى ۗ وَاللّٰهُ غَنِيٌّ حَلِيْمٌ ﴿۲۶۳﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى ۙ كَالَّذِيْ يُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَيْهِ تُرَابٌ فَاَصَابَهٗ وَابِلٌ فَتَرَكَهٗ صَلْدًا ۭ لَا يَقْدِرُوْنَ عَلٰي شَيْءٍ مِّمَّا كَسَبُوْا ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۶۴﴾

جو لوگ اپنا مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں پھر خرچ کرنے کے بعد نہ تو (اس پر) احسان جتلاتے ہیں نہ (برتاؤ سے) اس کو آزار پہنچاتے ہیں۔ ان لوگوں کو ان کے اعمال کا ثواب ملے گا ان کے پروردگار کے پاس اور نہ ان پر کوئی خطرہ ہوگا اور نہ یہ مغموم ہوں گے۔ مناسب بات کہہ دینا اور درگزر کرنا ہزار درجہ بہتر ہے ایسی خیرات (دینے) سے جس کے بعد آزار پہنچایا جائے اور اللہ تعالیٰ غنی ہیں حلیم ہیں۔ اے ایمان والو تم احسان جتلا کر یا ایذا پہنچا کر اپنی خیرات کو برباد مت کرو۔ جس طرح وہ شخص جو اپنا مال خرچ کرتا ہے (محض) لوگوں کے دکھلاوے کی غرض سے اور ایمان نہیں رکھتا اللہ پر اور یوم قیامت پر سو اس شخص کی حالت ایسی ہے جیسے ایک چکنا پتھر: اس پر کچھ مٹی آ گئی ہو پھر اس پر زور کی بارش پڑ جائے سو اس کو بالکل صاف کر دے ایسے لوگوں کو اپنی کمائی ذرا بھی ہاتھ نہ لگے گی اور اللہ تعالیٰ کافر لوگوں کو (جنت کا) راستہ نہ بتلا دیں گے۔ ○

خدا کے نزدیک اخلاص کے ساتھ صدقہ کرنے والوں کا مرتبہ:

اللہ تبارک و تعالیٰ اپنے اُن بندوں کی تعریف و مدح کرتا ہے۔ جو خیرات و صدقات کرتے ہیں اور پھر جسے دیتے ہیں اس پر احسان نہیں جتاتے۔ نہ تو اپنی زبان سے نہ اپنے کسی فعل سے اور نہ اس شخص کو کوئی برائی پہنچاتے ہیں۔ ان سے پھر جزائے خیر کا وعدہ فرماتا ہے کہ ان کا اجر و ثواب خداوند عالم کے ذمہ ہے۔ ان پر قیامت کے دن کوئی ہول اور خوف و خطر نہ ہوگا اور نہ دنیا اور بال بچے چھوٹ جانے کا انہیں کوئی اور رنج و غم ہوگا۔ اس لئے کہ وہاں پہنچ کر اس سے بہتر چیزیں انہیں مل چکی ہیں۔ پھر فرماتا

ہے کہ کلمہ خیر زبان سے نکالنا کسی مسلمان بھائی کے لئے دعا کرنا اور درگزر کرنا' خطاوار کو معاف کر دینا اس صدقہ سے بہت ہے جس کی تہ میں ایذاء دہی ہو۔ ابن ابی حاتم میں ہے کہ رسول اکرم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں' کوئی نیک کام اس سے افضل نہیں۔ کیا تم نے فرمانِ باری: ﴿قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ...... ﴾ نہیں سنا۔ اللہ تعالیٰ اپنی تمام مخلوق سے بے نیاز ہے اور ساری مخلوق اس کی محتاج ہے۔ وہ حلیم اور بردبار ہے۔ گناہوں کو دیکھتا ہے اور حلم و کرم کرتا ہے بلکہ معاف فرما دیتا ہے۔ تجاوز کر لیتا ہے اور بخش دیتا ہے۔ صحیح مسلم شریف کی حدیث ہے کہ تین قسم کے لوگوں کے لئے دردناک عذاب ہے۔ ایک تو دے کر احسان جتانے والا۔ دوسرا ٹخنوں کے نیچے پاجامہ اور تہبند لٹکانے والا۔ تیسرا اپنے سودے کو جھوٹی قسم کھا کر بیچنے والا۔ ابن ماجہ وغیرہ کی حدیث میں ہے کہ ماں باپ کا نافرمان' خیرات صدقہ کر کے احسان جتانے والا' شرابی اور تقدیر کو جھٹلانے والا جنت میں داخل نہ ہوگا۔ نسائی میں ہے تین شخصوں کی طرف اللہ تعالیٰ قیامت کے دن دیکھے گا بھی نہیں۔ ماں باپ کا نافرمان' شراب کا عادی اور دے کر احسان جتانے والا۔

نسائی کی ایک اور حدیث میں ہے یہ تینوں شخص جنت میں داخل نہ ہوں گے۔ اسی لئے اس آیت میں بھی ارشاد ہوتا ہے کہ اپنے صدقات وخیرات کو منت واحسان رکھ کر اور تکلیف پہنچا کر برباد نہ کرو۔ اس احسان کو جتانے اور تکلیف پہنچانے کا گناہ صدقہ اور خیرات کا ثواب باقی نہیں رکھتا۔ پھر مثال دی کہ احسان اور تکلیف دہی کے صدقہ کے غارت ہو جانے کی مثال اس صدقہ جیسی ہے جو ریاکاری کے طور پر لوگوں کے دکھاوے کے لئے دیا جائے۔ اپنی سخاوت اور فیاضی اور نیکی کی شہرت مدنظر ہو۔ لوگوں میں تعریف وستائش کی چاہت ہو۔ صرف خدائے تعالیٰ کی رضامندی کی طلب نہ ہو۔ نہ اس کے ثوابوں پر نظر ہو۔ اسی لئے اس جملے کے بعد فرمایا' کہ اللہ تعالیٰ پر اور قیامت کے دن پر ایمان نہ ہو تو اس ریاکارانہ صدقے کی اور اس احسان جتانے اور تکلیف پہنچانے کے صدقہ کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی چٹیل پتھر کی چٹان ہو' جس پر مٹی بھی پڑی ہو۔ پھر سخت شدت کی بارش ہو تو جس طرح اس پتھر کی تمام مٹی ڈھل جاتی ہے اور کچھ باقی نہیں رہتا۔ اسی طرح ان دونوں قسم کے لوگوں کے خرچ کی کیفیت ہے کہ لوگ سمجھتے ہوں کہ اس کے صدقہ کی نیکی اس کے پاس ہے۔ جس طرح بظاہر پتھر پر مٹی نظر آتی تھی لیکن جیسے کہ بارش سے وہ مٹی جاتی رہی۔ اسی طرح اس کے احسان جتانے یا تکلیف پہنچانے یا ریاکاری کرنے سے وہ ثواب بھی جاتا رہا اور خدا کے پاس پہنچے گا تو کچھ بھی جزا نہ پائے گا۔ اپنے اعمال میں سے کسی چیز پر قدرت نہ رکھے گا۔ اللہ تعالیٰ کافر گروہ کی راہ راست کی طرف رہبری نہیں کرتا۔

وَمَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَتَثْبِيْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ كَمَثَلِ جَنَّةٍ بِرَبْوَةٍ اَصَابَهَا وَابِلٌ فَاٰتَتْ اُكُلَهَا ضِعْفَيْنِ فَاِنْ لَّمْ يُصِبْهَا وَابِلٌ فَطَلٌّ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۲۶۵﴾

اور ان لوگوں کے خرچ کئے ہوئے مال کی حالت جو اپنے مالوں کو خرچ کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کی غرض سے کہ اپنے نفسوں (کو اس عمل شاق کا خوگر بنا کر ان میں) پختگی پیدا کریں' مثل حالت ایک باغ کے ہے جو کسی

ٹیلے پر ہو کہ اس پر زور کی بارش پڑی ہو پھر وہ دونا (چوگنا) پھل لایا ہو اور اگر ایسے زور کا مینہ نہ پڑے تو ہلکی پھوار بھی اس کو کافی ہے اور اللہ تعالیٰ تمہارے کاموں کو خوب دیکھتا ہے۔ ○

صدقہ دینے والوں کی مثال ☆

یہ مثال مؤمنوں کے صدقات کی دی۔ جن کی نیتیں خدا کو خوش کرنے کی ہوتی ہیں اور جزائے خیر ملنے کا بھی پورا یقین ہوتا ہے۔ جیسے حدیث میں ہے' جس شخص نے رمضان کے روزے ایمانداری کے ساتھ ثواب ملنے کے یقین کے ساتھ رکھے۔ رَبْوَۃٌ کہتے ہیں اونچی زمین کو' جہاں نہریں چلتی ہوں اس لفظ کو بِرُبْوَۃٍ اور بِرِبْوَۃٍ بھی پڑھا گیا ہے۔ وَابِلٌ کے معنی سخت بارش کے ہیں۔ وہ دوگنا پھل لاتی ہے یعنی بہ نسبت دوسرے باغوں کے زمین کے یہ باغ ایسا ہے اور ایسی جگہ واقع ہے کہ بالفرض بارش نہ بھی ہو' تاہم صرف شبنم سے ہی پھلتا پھولتا ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ موسم خالی جائے۔ اسی طرح ایمانداروں کے اعمال کبھی بے اجر نہیں رہتے۔ وہ ضرور بدلہ دلواتے ہیں۔ ہاں اس جزا میں فرق ہوتا ہے جو ہر ایماندار کے خلوص اور نیک کام کی اہمیت کے اعتبار سے بڑھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ پر اپنے بندوں میں سے کسی بندہ کا کوئی عمل مخفی اور پوشیدہ نہیں۔

أَيَوَدُّ أَحَدُكُمْ أَنْ تَكُونَ لَهُ جَنَّةٌ مِنْ نَخِيلٍ وَأَعْنَابٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ لَهُ فِيهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرَاتِ وَأَصَابَهُ الْكِبَرُ وَلَهُ ذُرِّيَّةٌ ضُعَفَاءُ فَأَصَابَهَا إِعْصَارٌ فِيهِ نَارٌ فَاحْتَرَقَتْ كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمُ الْآيَاتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُونَ ﴿٢٦٦﴾

ع ٣٦

بھلا تم میں سے کسی کو یہ بات پسند ہے کہ اس کا ایک باغ ہو کھجوروں اور انگوروں کا۔ اس کے (درختوں کے) نیچے نہریں چلتی ہوں اس شخص کے ہاں اس باغ میں اور بھی ہر قسم کے (مناسب) میوے ہوں اور اس شخص کو بڑھاپا آ گیا ہو اور اس کے اہل و عیال بھی ہوں جن میں (کمانے کی) قوت نہیں۔ سو اس باغ پر ایک بگولا آیا' جس میں آگ (کا مادہ) ہو۔ پھر وہ باغ جل جائے اللہ تعالیٰ اسی طرح نظائر بیان فرماتا ہے تمہارے لئے تاکہ تم سوچا کرو۔ ○

ہدایت کے بعد ضلالت مثال کے آئینہ میں ☆

صحیح بخاری میں ہے کہ امیر المؤمنین حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک دن صحابہؓ سے پوچھا' جانتے ہو کہ یہ آیت کس کے بارے میں اتری؟ انہوں نے کہا اللہ زیادہ جاننے والا ہے۔ آپ نے ناراض ہو کر فرمایا تم جانتے ہو یا نہیں' اس کا صاف جواب دو۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا' امیر المؤمنین میرے دل میں ایک بات ہے۔ آپ نے فرمایا بھتیجے کہو اور اپنے نفس کو اتنا حقیر نہ کرو۔ فرمایا ایک عمل کی مثال دی گئی ہے۔ پوچھا کون سا عمل؟ کہا' ایک مالدار شخص جو اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کے کام کرتا ہے۔ پھر شیطان اسے بہکاتا ہے اور وہ گناہوں میں مشغول ہو جاتا ہے اور اپنے نیک اعمال کو

کھو بیٹھتا ہے۔ پس یہ روایت اس کی پوری تفسیر ہے۔ اس میں بیان ہو رہا ہے کہ ایک شخص نے ابتداً اچھے عمل کئے۔ پھر اس کے بعد اس کی حالت بدل گئی اور برائیوں میں پھنس گیا اور پہلے کی نیکیوں کا ذخیرہ برباد کر دیا اور آخری وقت جبکہ نیکیوں کی بہت زیادہ ضرورت تھی' یہ خالی ہاتھ رہ گیا۔ جس طرح ایک شخص جس نے ایک باغ لگایا اس کے پھل سے فائدہ حاصل کرتا رہا لیکن جب بڑھاپے کے زمانہ کو پہنچا' چھوٹے بچے بھی زیر پرورش ہیں۔ خود کسی کام کاج کے قابل بھی نہیں اور اب مدار زندگی صرف وہ ایک باغ رہ گیا تھا کہ اتفاقاً آندھی چلی' باغ میں آگ لگ گئی اور وہ ہرا بھرا الہلہاتا باغ دم بھر میں خاکستر بن گیا۔

اسی طرح یہ شخص ہے کہ پہلے تو نیکیاں کرلیں' لیکن پھر برائیوں میں مبتلا ہو گیا اور خاتمہ اچھا نہ ہوا تو جب ان نیکیوں کے بدلے کا وقت آیا تو خالی ہاتھ رہ گیا۔ کافر شخص بھی جب اللہ کے پاس جاتا ہے تو وہاں تو کچھ کرنے کی طاقت نہیں' جس طرح بڈھے کو اور جو کیا ہے وہ کفر کی آگ والی آندھی نے برباد کر دیا۔ اب پیچھے سے بھی کوئی اسے فائدہ نہیں پہنچا سکتا۔ جس طرح اس بڈھے کی کم سن اولاد اسے کوئی فائدہ نہیں دے سکتی۔ متدرک حاکم میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک دعا یہ بھی تھی: اَللّٰهُمَّ اجْعَلْ اَوْسَعَ رِزْقِكَ عَلَىٰ عِنْدَكِبَرِ سِنِّىْ وَانْقِضَاءِ عُمُرِىْ۔ اے اللہ اپنی روزی کو سب سے زیادہ مجھے اس وقت عنایت فرما' جب میری عمر بڑی ہو جائے اور ختم ہونے کو آئے۔ اللہ تعالیٰ نے تمہارے سامنے یہ مثالیں بیان فرمادیں۔ تم بھی غور و فکر تدبر و تفکر سوچو سمجھو اور عبرت و نصیحت حاصل کرو جیسے فرمایا: ﴿وَتِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ وَمَا يَعْقِلُهَآ اِلَّا الْعٰلِمُوْنَ﴾ (العنکبوت: ۴۳) ان مثالوں کو ہم نے لوگوں کے لئے بیان فرمادیا۔ انہیں علما ہی خوب سمجھ سکتے ہیں۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّآ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ ۠ وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ وَلَسْتُمْ بِاٰخِذِيْهِ اِلَّآ اَنْ تُغْمِضُوْا فِيْهِ ؕ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ ﴿۲۶۷﴾ اَلشَّيْطٰنُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَيَاْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَآءِ ۚ وَاللّٰهُ يَعِدُكُمْ مَّغْفِرَةً مِّنْهُ وَفَضْلًا ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۶۸﴾ ۖۙ يُّؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا ؕ وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ ﴿۲۶۹﴾

اے ایمان والو (نیک کام میں) خرچ کیا کرو عمدہ چیز کو اپنی کمائی میں سے اور اس میں سے جو کچھ ہم نے تمہارے لئے زمین سے پیدا کیا ہے اور ردی (ناکارہ) چیز کی طرف نیت مت لے جایا کرو کہ اس میں سے خرچ کرو حالانکہ تم کبھی اس کے لینے والے نہیں۔ ہاں مگر چشم پوشی کر جاؤ (تو اور بات ہے) اور یہ یقین کر رکھو کہ اللہ تعالیٰ کسی کا محتاج

نہیں تعریف کے لائق ہے۔ شیطان تم کو محتاجی سے ڈراتا ہے اور تم کو بری بات (یعنی بخل) کا مشورہ دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ تم سے وعدہ کرتا ہے اپنی طرف سے گناہ معاف کر دینے کا اور زیادہ دینے کا اور اللہ تعالیٰ وسعت والے ہیں خوب جاننے والے ہیں۔ دین کا فہم جس چاہے دے دیتے ہیں اور (سچ تو ہے) کہ جس کو دین کا فہم مل جائے اس کو بڑی خیر کی چیز مل گئی اور نصیحت وہی لوگ قبول کرتے ہیں جو عقل والے ہیں (یعنی جو عقل صحیح رکھتے ہیں)۔ ○

انفاق فی سبیل اللہ کی فضیلت اور اس کی ترغیب ☆

اللہ تعالیٰ اپنے مؤمن بندوں کو صدقہ کرنے کا حکم دیتا ہے کہ مال تجارت جو خدا نے تمہیں دیا ہے۔ سونا' چاندی اور پھل' اناج وغیرہ جو اس نے تمہیں زمین سے نکال کر دیئے ہیں۔ اس میں سے بہترین' مرغوب طبع اور پسند خاطر عمدہ عمدہ چیزیں اللہ کی راہ میں دو۔ ردی' واہیات' سڑی گلی' گری پڑی' بے کار' فضول اور خراب چیز راہ اللہ نہ دو۔ اللہ خود طیب ہے۔ وہ بری اور نکمی چیزوں کو قبول نہیں کرتا۔ تم اس کے نام پر یعنی گویا اسے وہ خراب چیز دینا چاہتے ہو' جو اگر تمہیں دی جاتی تو نہ قبول کرتے۔ پھر خدا کیسے لے لے گا۔ ہاں مال جاتا دیکھ کر اپنے حق کے بدلے کوئی گری پڑی چیز بھی مجبور ہو کر لے لو تو اور بات ہے لیکن خدا ایسا مجبور بھی نہیں وہ کسی چیز کو قبول نہیں فرماتا۔ یہ بھی مطلب ہے کہ حلال چیز کو چھوڑ کر حرام چیز یا حرام مال سے خیرات نہ کرو۔

مسند احمد میں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں' اللہ تعالیٰ نے جس طرح تمہاری روزیاں تم میں تقسیم کی ہیں۔ تمہارے اخلاق بھی تم میں بانٹ دیئے ہیں۔ دنیا تو اللہ تعالیٰ اپنے دوستوں کو بھی دیتا ہے اور دشمنوں کو بھی۔ دین صرف دوستوں کو ہی عطا فرماتا ہے۔ جسے دین مل جائے وہ خدا کا محبوب ہے۔ خدا کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے' کوئی بندہ مسلمان نہیں ہوتا۔ جب تک کہ اس کا دل اور اس کی زبان مسلمان نہ ہو جائے۔ کوئی بندہ مؤمن نہیں ہوتا جب تک کہ اس کے پڑوسی اس کی ایذاؤں سے محفوظ نہ ہو جائیں۔ لوگوں کے سوال پر آپؐ نے فرمایا' ایذا سے مراد دھوکہ بازی اور ظلم وستم ہے۔ جو شخص حرام طریقہ سے مال حاصل کرے۔ اس میں اللہ برکت نہیں دیتا نہ اس کے صدقے خیرات کو قبول کرتا ہے اور جو چھوڑ کر جاتا ہے وہ سب اس کے لئے آگ میں جانے کا توشہ اور سبب بنتا ہے۔ اللہ تعالیٰ برائی کو برائی سے نہیں مٹاتا بلکہ برائی کو اچھائی سے دفع کرتا ہے۔ خباثت سے خباثت نہیں مٹتی۔ پس دو قول ہوئے۔ ایک تو ردی چیزیں' دوسرے حرام مال' آیت میں پہلا قول مراد لینا ہی زیادہ اچھا معلوم ہوتا ہے۔

ایک واقعہ اور وہی آیت کا شان نزول ☆ حضرت براء بن عازب رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کھجوروں کے موسم میں انصار اپنی اپنی وسعت کے مطابق کھجوروں کے خوشے لا کر دو ستونوں کے درمیان ایک رسی لٹک رہی تھی' اس میں لٹا دیتے۔ جسے اصحاب صفہ اور مسکین مہاجر بھوک کے وقت کھا لیتے۔ کسی نے' جسے صدقہ کی رغبت کم تھی' اس میں ردی کھجوروں کا ایک خوشہ لٹکا دیا' جس پر یہ آیت نازل ہوئی کہ اگر تمہیں ایسی ہی چیز ہدیہ میں دی جائے تو ہرگز نہ لو گے۔ ہاں اگر شرم ولحاظ سے بادل نخواستہ لے لو تو اور بات ہے۔ اس کے نازل ہونے کے بعد ہم میں کا ہر شخص بہتر سے بہتر چیز لاتا تھا۔ (ابن جریر) ابن ابی حاتم میں ہے کہ ہلکی قسم کی کھجوریں اور خراب پھل لوگ خیرات میں نکالتے۔ جس پر یہ آیت اُتری۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان چیزوں سے صدقہ دینا منع فرمایا۔ حضرت عبداللہ بن مغفل فرماتے ہیں' مؤمن کی کمائی کبھی بری نہیں ہوتی۔ مراد یہ ہے کہ بیکار چیز صدقہ میں نہ دو۔ مسند میں حدیث ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے گوہ کا گوشت لایا گیا۔ آپؐ نے نہ کھایا نہ کسی کو

کھانے سے منع فرمایا تو حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے کہا' کسی مسکین کو دے دیں؟ آپ نے فرمایا جو تمہیں پسند نہیں اور جسے تم کھانا گوارا نہیں کرتے' اسے اور کو کیا دو گی۔ حضرت براء فرماتے ہیں جب تمہارا حق کسی پر ہو اور وہ تمہیں وہ چیز دے' جو بے قدر و قیمت ہو' تو تم اسے نہ لو گے۔ مگر اس وقت جب تمہیں اپنے حق کی بربادی دکھائی دیتی ہو تو خیر تم چشم پوشی کر کے اس کو لے لو گے۔ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں' مطلب یہ ہے کہ تم نے کسی کو اچھا مال دیا اور ادائیگی کے وقت وہ ناقص مال لے کر آیا تو تم ہرگز نہ لو گے اور اگر لو گے بھی تو اس کی قیمت گھٹا کر۔ تو تم جس چیز کو اپنے حق میں لینا پسند نہیں کرتے' اسے خدا کے حق کے عوض کیوں دیتے ہو؟ پس بہترین اور مرغوب مال اس کی راہ میں خرچ کرو اور یہی معنی ہیں آیت: ﴿لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ...﴾ (آل عمران ۹۲) کے بھی۔ پھر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں اپنی راہ میں خرچ کرنے کا حکم دیا اور عمدہ چیز دینے کا۔ کہیں اس سے یہ نہ سمجھ لینا کہ وہ محتاج ہے۔ نہیں نہیں وہ تو محض بے نیاز ہے اور تم سب اس کے محتاج ہو۔ یہ حکم صرف اس کے لئے ہے کہ غربا بھی دنیا کی نعمتوں سے محروم نہ رہیں۔ جیسے اور جگہ قربانی کے حکم کے بعد فرمایا: ﴿لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ......﴾ اللہ تعالیٰ نہ اس کا خون لے نہ گوشت۔ وہ تمہارے تقویٰ کی آزمائش کرتا ہے۔ وہ کشادہ فضل والا ہے۔ اس کے خزانہ میں کوئی کمی نہیں۔ صدقہ اپنے چہیتے حلال مال سے نکال کر خدا کے فضل اس کی بخشش اس کے کرم اور اس کی سخاوت پر نظریں رکھو۔ وہ اس کا بدلہ اس سے بہت بہت بڑھ چڑھ کر تمہیں عطا فرمائے گا۔ وہ مفلس نہیں وہ ظالم نہیں۔ وہ حمید ہے۔ تمام اقوال' افعال' تقدیر شریعت' سب میں اسی کی تعریفیں ہی کی جاتی ہیں۔ اس کے سوا کوئی عبادت کے قابل نہیں۔ وہ ہی تمام جہانوں کا پالنے والا ہے۔ اس کے سوا کسی کی پرورش نہیں کرتا۔ حدیث میں ہے کہ ایک چوکا شیطان مارتا ہے اور ایک توفیق کی رہبری فرشتہ کرتا ہے۔ شیطان تو شرارت پر آمادہ کرتا ہے اور حق کو جھٹلانے پر اور فرشتہ نیکی اور حق کی تصدیق کرنے پر۔ جس کے دل میں یہ خیال آئے وہ اللہ کا شکر کرے اور جان لے کہ یہ خدا کی طرف سے ہے اور جس کے دل میں وہ وسوسہ پیدا ہو وہ اعوذ پڑھے۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے آیت: ﴿اَلشَّيْطٰنُ......﴾ تلاوت فرمائی۔ (ترمذی)

یہ حدیث عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے موقوف بھی مروی ہے۔ مطلب آیت شریف کا یہ ہے کہ خدا کی راہ میں خرچ کرنے سے شیطان روکتا ہے اور دل میں وسوسہ ڈالتا ہے کہ اس طرح فقیر ہو جائیں گے۔ اس نیک کام سے روک کر پھر بے حیائیوں اور بدکاریوں کی رغبت دلاتا ہے اور گناہوں پر' نافرمانیوں پر' حرام کاریوں پر اور مخالفت حق پر اکساتا ہے اور اللہ تعالیٰ تمہیں اس کے خلاف حکم دیتا ہے کہ خرچ فی سبیل اللہ سے ہاتھ نہ روکو اور شیطان کی دھمکی کے خلاف وہ فرماتا ہے کہ اس صدقہ کے باعث میں تمہاری خطاؤں کو بھی معاف کر دوں گا اور جو تمہیں فقیری سے ڈراتا ہے۔ میں اس کے مقابلہ میں تمہیں اپنے فضل کا یقین دلاتا ہوں۔ مجھ سے بڑھ کر رحم و کرم' فضل و لطف کس کا زیادہ وسیع ہو گا اور انجام کار علم بھی مجھ سے زیادہ اچھا کسے حاصل ہو سکتا ہے۔

حکمت کی تشریح' حکمت سے کیا مراد ہے اور حکمت کے فضائل ☆

حکمت سے مراد یہاں پر قرآن کریم اور حدیث نبوی کی پوری مہارت ہے۔ جس سے ناسخ منسوخ' محکم متشابہ' مقدم مؤخر' حلال و حرام کی معرفت حاصل ہو جائے۔ پڑھنے کو تو اسے ہر برا بھلا پڑھتا ہے لیکن اس کی تفسیر اور اس کی سمجھ وہ حکمت ہے جسے خدا چاہتا ہے۔ عنایت فرماتا ہے کہ وہ اصل مطلب کو پالے اور بات کی تہہ کو پہنچ جائے اور زبان سے

اس کے صحیح مطلب ادا ہوں۔ سچا علم، صحیح سمجھ اسے عطا ہو۔ اللہ کا ڈر اس کے دل میں ہو۔ چنانچہ ایک مرفوع حدیث بھی ہے کہ حکمت کا سر اللہ کا ڈر ہے۔ ایسے لوگ بھی ہیں جو دنیا کے علم کے بڑے ماہر ہیں۔ ہر امر دنیوی کو عقلمندی سے سمجھ لیتے ہیں لیکن دین میں بالکل اندھے ہیں اور ایسے لوگ بھی ہیں جو دنیوی علم میں کمزور ہیں، لیکن علوم شرعی میں بڑے ماہر ہیں۔ پس یہ ہے کہ وہ حکمت جسے خدا نے اسے دی اور اسے اس سے محروم رکھا۔ سدی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں یہاں حکمت سے مراد نبوت ہے لیکن صحیح یہ ہے کہ حکمت کا لفظ ان تمام چیزوں پر شامل ہے اور نبوۃ بھی اس کا اعلیٰ اور بہترین حصہ ہے اور اس سے بالکل خاص چیز ہے جو انبیا کے سوا اور کسی کو حاصل نہیں۔ ان کے تابع فرمان لوگوں کو خدا کی طرف سے محرومی نہیں، سچی اور اچھی سمجھ کی دولت سے بھی یہ مالا مال ہوتے ہیں۔ بعض احادیث میں ہے کہ جس نے قرآن کریم کو حفظ کرلیا، اس کے دونوں بازوؤں کے درمیان نبوت چڑھ گئی۔ وہ صاحب وحی نہیں لیکن دوسرے طریق سے کہ وہ ضعیف ہے، منقول ہے کہ یہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا اپنا قول ہے۔ مسند کی حدیث میں ہے کہ قابل رشک صرف دو شخص ہیں۔ جسے اللہ نے مال دیا اور اسے اپنے راہ میں خرچ کرنے کی توفیق بھی دی اور جسے اللہ نے حکمت دی اور ساتھ ہی فیصلے کرنے اور اس کی تعلیم دینے کی توفیق بھی عطا فرمائی۔ وعظ و نصیحت اس کو نفع پہنچاتی ہے۔ جو عقل سے کام لے، سمجھ رکھتا ہو، بات کو یاد رکھے اور مطلب پر نظریں رکھے۔

وَمَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ نَّفَقَةٍ اَوْ نَذَرْتُمْ مِّنْ نَّذْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُهٗ ۭ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ﴿۲۷۰﴾ اِنْ تُبْدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا هِىَ ۚ وَاِنْ تُخْفُوْهَا وَتُؤْتُوْهَا الْفُقَرَآءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۭ وَيُكَفِّرُ عَنْكُمْ مِّنْ سَيِّاٰتِكُمْ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿۲۷۱﴾

اور تم لوگ جو کسی قسم کا خرچ کرتے ہو یا کسی طرح کی نذر مانتے ہو سو حق تعالیٰ کو سب کی یقیناً اطلاع ہے اور بے جا کام کرنے والوں کا کوئی ہمراہی (اور حمایتی) نہ ہوگا اگر تم ظاہر کر کے دو صدقوں کو تب بھی اچھی بات ہے اور اگر اخفا کرو اور فقیروں کو دے دو تو یہ اخفا تمہارے لئے زیادہ بہتر ہے اور اللہ تعالیٰ (اس کی برکت سے) تمہارے کچھ گناہ بھی دور کر دیں گے اور اللہ تعالیٰ تمہارے کئے ہوئے کاموں کی خوب خبر رکھتا ہے۔ ○

تم جو کچھ دیتے لیتے ہو یا جو کرتے سنتے ہو اُس کی خبر خدا تعالیٰ کو ہے ☆

اللہ تعالیٰ خبر دیتا ہے کہ ہر ایک خرچ اور نذر کو اور بھلے عمل کو اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے۔ وہ اپنے نیک بندوں کو جو اس کا حکم بجالاتے ہیں اس سے ثواب کی اُمید رکھتے ہیں۔ اس کے وعدوں کو سچا جانتے ہیں۔ اس کے فرمان پر ایمان رکھتے ہیں، بہترین بدلہ عطا فرمائے گا اور ان کے خلاف جو لوگ اس کی حکم برداری سے جی چراتے ہیں گناہ کے کام کرتے ہیں۔ اس کی خبروں کو جھٹلاتے ہیں۔ اس کے ساتھ دوسروں کی عبادت کرتے ہیں یہ ظالم ہیں۔ قیامت کے دن قسم قسم کے سخت اور المناک عذاب انہیں ہوں گے اور کوئی نہ ہوگا جو انہیں چھڑائے یا ان کی مدد کرے۔ پھر فرمایا کہ ظاہر کر کے صدقہ دینا بھی اچھا ہے اور چھپا کر

فقراء مساکین کو دینا بھی بہت ہی بہتر ہے۔ اس لئے کہ یہ ریاکاری سے کوسوں دور ہے۔ ہاں یہ اور بات ہے کہ ظاہر کرنے میں کوئی دینی مصلحت یا دینی فائدہ ہو۔ مثلاً اس لئے کہ اور لوگ بھی دیں وغیرہ۔ حدیث شریف میں ہے کہ صدقہ کا ظاہر کرنے والا مثل بلند آواز سے قرآن پڑھنے والے کے ہے اور اسے چھپانے والا آہستہ پڑھنے والے کی طرح ہے۔ پس اس آیت سے صدقہ جو پوشیدہ دیا جائے۔ اس کی افضلیت ثابت ہوتی ہے۔ بخاری مسلم میں بروایت حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا سات شخصوں کو قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اپنے سایہ میں جگہ دے گا۔ جس کے سایہ کے سوا اور کوئی سایہ نہ ہوگا: ۱) عادل بادشاہ' ۲) وہ نوجوان جو اپنی جوانی خدا کی عبادت میں گزارے اور شریعت کی فرمانبرداری میں گزارے' ۳) وہ دو شخص جو اللہ تعالیٰ کے لئے دلوں میں محبت رکھیں' اسی پر جمع ہوں اور اسی پر جدا ہوں' ۴) وہ شخص جس کا دل مسجد میں لگا رہے' نکلنے کے وقت جانے کے وقت تک' ۵) وہ شخص جو خلوت میں اللہ کا ذکر کر کے رو دے' ۶) وہ شخص جسے کوئی منصب و جمال والی عورت بدکاری کی طرف بلائے اور وہ کہہ دے کہ میں تو اللہ تعالیٰ رب العالمین سے ڈرتا ہوں اور ۷) وہ شخص جو اپنا صدقہ اس قدر چھپا کر دے کہ بائیں ہاتھ کو دائیں ہاتھ کے خرچ کی خبر تک نہ ہو۔

مسند احمد کی حدیث میں ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے زمین کو پیدا کیا تو وہ ہلنے لگی۔ اللہ تعالیٰ نے پہاڑ پیدا کر کے انہیں گاڑ دیا۔ جس میں زمین کا ہلنا موقوف ہو گیا۔ فرشتوں کو پہاڑوں کی ایسی سنگین پیدائش پر تعجب ہوا۔ انہوں نے دریافت کیا کہ باری تعالیٰ کیا تیری مخلوق میں پہاڑ میں زیادہ سخت چیز بھی کوئی ہے؟ فرمایا ہاں ہوا۔ دریافت کیا اس سے بھی زیادہ سخت؟ فرمایا کہ ابن آدم جو اس طرح صدقہ کرتا ہے کہ بائیں ہاتھ کو دائیں ہاتھ کے خرچ کی خبر نہیں ہوتی۔ آیت الکرسی کی تفسیر میں وہ حدیث گزر چکی ہے جس میں ہے کہ افضل صدقہ وہ ہے جو پوشیدگی سے کسی حاجت مند کو دے دیا جائے۔ باوجود مال کی قلت کے پھر بھی راہ خدا میں خرچ کیا جائے۔ پھر اسی آیت کی تلاوت کی۔ (ابن ابی حاتم) ایک اور حدیث میں ہے چھپا کر صدقہ کرنا خدا کے غضب کو بجھا دیتا ہے۔

آیت کا شانِ نزول ☆ حضرت شعبی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں' یہ آیت حضرت ابو بکر صدیق اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے بارے میں اُتری ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ تو آدھا مال حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لائے اور حضرت صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جو کچھ تھا' لا کر رکھ دیا۔ آپ نے پوچھا اپنے گھر والوں کے لئے کیا چھوڑ آئے ہو۔ فاروق رضی اللہ تعالیٰ نے جواب دیا' اتنا ہی۔ صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ظاہر نہیں کرنا چاہتے تھے اور چپکے سے سب کا سب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے کر چکے تھے۔ لیکن جب ان سے بھی پوچھا گیا تو کہنا پڑا کہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ اور اس کے رسول کی تیاری کافی ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ یہ سن کر رو دیئے اور فرمانے لگے خدا کی قسم' جس کسی نیکی کے کام کا ہم نے ارادہ کیا اس میں اسے صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ آپ کو آگے ہی آگے پاتے ہیں' رضی اللہ تعالیٰ عنہما۔ آیت کے الفاظ عام ہیں۔ صدقہ خواہ فرضی ہو یا نفلی' زکوٰۃ ہو یا خیرات' اس کو چھپا کر کرنا اظہار سے افضل ہے۔ لیکن حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ نفلی صدقہ تو پوشیدہ دینا ستر گنا فضیلت رکھتا ہے لیکن فرض زکوٰۃ کو علانیہ ادا کرنا پچیس گناہ فضیلت رکھتا ہے۔ پھر فرمایا صدقے کے بدلے اللہ تعالیٰ تمہاری خطاؤں اور برائیوں کو دور کر دے گا۔ بالخصوص اس وقت جبکہ وہ چھپا کر دیا جائے گا۔ تمہیں بہت سی بھلائی ملے گی' درجات بڑھیں گے۔ گناہوں کا کفارہ ہوگا۔ یُکَفِّرُ کو یُکَفِّرِ بھی پڑھا گیا ہے۔ اس میں صورتاً یہ جواب شرط

کے محل پر عطف ہو گا جو فنعماھی پر ہے۔ جیسے ﴿فَاَصَّدَّقَ وَاَكُنْ﴾ (المنافقون ۱۰) میں وَاَكُنْ اللہ تعالیٰ پر تمہاری کوئی نیکی، بدی، سخاوت، بخیلی پوشیدگی اور اظہار نیک نیتی اور دنیا طلبی پوشیدہ نہیں وہ پورا بدلہ دے گا۔

لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰىهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلِاَنْفُسِكُمْ ؕ وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ ؕ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ يُّوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ ﴿۲۷۲﴾ لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِي الْاَرْضِ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ ۚ تَعْرِفُهُمْ بِسِيْمٰهُمْ ۚ لَا يَسْـَٔلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا ؕ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ﴿۲۷۳﴾ اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۲۷۴﴾ ع

ان (کافروں) کی ہدایت پر لے آنا کچھ آپ کے ذمہ (فرض واجب) نہیں لیکن خدا تعالیٰ جس کو چاہیں ہدایت پر لے آئیں اور (اے مسلمانوں) جو کچھ تم خرچ کرتے ہو اپنے فائدہ کی غرض سے کرتے ہو اور تم اور کسی غرض کے لئے خرچ نہیں کرتے بجز رضا جوئی ذات پاک حق تعالیٰ اور (نیز) جو کچھ مال خرچ کر رہے ہو یہ سب (یعنی اس کا ثواب) پورا پورا تم کو مل جائے گا اور تمہارے لئے اس میں کمی نہ کی جائے گی۔ (صدقات) اس کا حق ان حاجتمندوں کا ہے جو مقید ہو گئے ہوں اللہ کی راہ میں (اور اسی وجہ سے) وہ لوگ کہیں ملک میں چلنے پھرنے کا (عادۃً) امکان نہیں رکھتے اور ناواقف ان کو تونگر خیال کرتا ہے۔ ان کے سوال سے بچنے کے سبب (البتہ) تم ان کے طرز سے پہچان سکتے ہو (کہ فقر و فاقہ سے چہرہ پر اثر ضرور آ جاتا ہے) اور لوگوں سے لپٹ کر مانگتے نہیں پھرتے اور جو مال خرچ کرو گے بے شک حق تعالیٰ کو اس کی خوب اطلاع ہے۔ جو لوگ خرچ کرتے ہیں اپنے مالوں کو رات میں اور دن میں (یعنی بلا تخصیص اوقات) پوشیدہ اور آشکارا (یعنی بلا تخصیص حالات) سو ان لوگوں کو ان کا ثواب ملے گا ان کے رب کے پاس اور نہ ان پر کوئی خطرہ ہے اور نہ وہ مغموم ہوں گے۔ ○

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا ایک تذبذب اور خدا تعالیٰ کا واضح ارشاد ☆

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ مسلمان صحابہ اپنے مشرک رشتہ داروں کے ساتھ سلوک کرنا ناپسند کرتے تھے۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال ہوا اور یہ آیت اُتری اور انہیں رخصت دی۔ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے کہ صدقہ صرف مسلمانوں کو دیا جائے۔ جب یہ آیت اُتری تو آپ نے فرمایا' ہر سائل کو دو۔ گو وہ کسی مذہب کا ہو۔ (ابن ابی حاتم) حضرت اسماء والی روایت آیت: ﴿لَا یَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ......﴾ (الممتحنۃ:۸) کی تفسیر میں آئے گی ان شاء اللہ۔ یہاں فرمایا تم جو نیکی کرو گے اپنے لئے ہی کرو گے۔ جیسے اور جگہ ہے: ﴿مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهٖ﴾ (حم السجدۃ:۴۶) اور اس جیسی اور آیتیں بھی بہت ہیں۔ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔ ایماندار کا ہر خرچ اللہ ہی کے لئے ہوتا ہے گو وہ خود کھائے پیئے۔ عطا خراسانی رحمۃ اللہ علیہ اس کا مطلب یہ بیان کرتے ہیں کہ جب تم نے مرضی مولا اور رضائے رب کے لئے دیا تو لینے والا خواہ کوئی ہو اور کیسے ہی اعمال کرنے والا ہو۔ یہ مطلب بھی بہت اچھا ہے۔ حاصل یہ ہے کہ نیک نیتی سے دینے والے کا اجر تو خدا کے ذمے ثابت ہو گیا۔ اب خواہ وہ کسی نیک کے ہاتھ لگے یا بد کے مستحق کے یا غیر مستحق کے۔ اسے اپنے قصد اور اپنی نیک نیتی کا ثواب مل گیا۔ جبکہ اس نے دیکھ بھال کر لی۔ پھر غلطی ہوئی تو ثواب ضائع نہیں جاتا۔ اس لئے آیت کے آخر میں بدلہ ملنے کی بشارت دی گئی۔

ایک عجیب واقعہ ☆ اور صحیحین کی حدیث میں آیا ہے کہ ایک شخص نے قصد کیا کہ آج رات میں صدقہ دوں گا۔ لے کر نکلا اور چپکے سے ایک عورت کو دے کر چلا آیا۔ صبح لوگوں میں یہ باتیں ہونے لگیں کہ آج رات کوئی شخص ایک بدکار عورت کو کوئی خیرات دے گیا۔ اس نے سنا اور خدا کا شکر ادا کیا۔ پھر اپنے جی میں کہا کہ آج رات اور صدقہ کروں گا۔ لے کر چلا اور ایک شخص کی مٹھی میں رکھ کر چلا آیا۔ صبح سنتا ہے کہ لوگوں میں چرچا ہو رہا ہے کہ آج رات ایک مالدار کو کوئی صدقہ دے گیا۔ اس نے پھر خدا کی حمد کی اور ارادہ کیا کہ آج رات کو تیسرا صدقہ دوں گا۔ دے آیا۔ دن کو پھر معلوم ہوا کہ وہ چور تھا۔ تو کہنے لگا خدایا تیری تعریف ہے۔ زانیہ عورت کے دیئے جانے پر بھی' مالدار شخص کو دیئے جانے پر بھی اور چور کے دیئے جانے پر بھی۔ خواب میں دیکھتا ہے کہ فرشتہ آیا اور کہہ رہا ہے' تیرے تینوں صدقے قبول ہو گئے۔ شاید بدکار عورت مال پا کر اپنی حرام کاری سے رُک جائے اور شاید مالدار کو عبرت حاصل ہو اور وہ صدقہ کی عادت ڈال لے اور شاید چور مال پا کر چوری سے باز رہے۔ پھر فرمایا کہ صدقہ ان مہاجرین کا حق ہے جو دنیوی تعلقات کاٹ کر ہجرتیں کر کے وطن چھوڑ کر کنبے قبیلے سے منہ موڑ کر خدا کی رضامندی کے لئے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آ گئے ہیں۔ جن کی معاش کا کوئی ایسا ذریعہ نہیں جو انہیں کافی ہو اور نہ وہ سفر کر سکتے ہیں کہ چل پھر کر اپنی روزی حاصل کریں۔ ﴿ضَرْبًا فِی الْاَرْضِ﴾ کے معنی مسافرت کے ہیں جیسے: ﴿اِنْ ضَرَبْتُمْ فِی الْاَرْضِ﴾ (النساء:۱۰۱) اور ﴿یَضْرِبُوْنَ فِی الْاَرْضِ﴾ (المزمل:۲۰) میں ان کے حال سے جو لوگ ناواقف ہیں' وہ ان کے لباس اور ظاہری حال اور گفتگو سے انہیں مالدار کہتے ہیں۔ ایک صحیح حدیث میں ہے۔ مسکین وہی نہیں جو در بدر جاتے ہیں۔ کہیں سے دو ایک کھجوریں مل گئیں' کہیں سے دو ایک لقمے مل گئے' کہیں سے دو ایک وقت کا کھانا مل گیا۔ بلکہ وہ بھی مسکین ہے جس کے پاس اتنا نہیں جس سے وہ بے پرواہ ہو جائے اور اس نے اپنی حاجت بھی ایسی نہیں بتائی۔ جس سے ہر شخص اس کی ضرورت کا احساس کرے اور کچھ احسان کرے اور نہ وہ سوال کے عادی ہیں۔ تو انہیں ان کی حالت سے جان لے گا۔ جو صاحب بصیرت پر مخفی

نہیں رہتی جیسے اور جگہ ہے: ﴿سِيمَاهُمْ فِي وُجُوهِهِمْ﴾ (الفتح: ۲۹) ان کی نشانیوں ان کے چہروں پر ہیں اور فرمایا: ﴿وَلَتَعْرِفَنَّهُمْ فِي لَحْنِ الْقَوْلِ﴾ (محمد: ۳۰) ان کے لب ولہجہ سے تم انہیں پہچان لو گے۔ سنن کی ایک حدیث میں ہے مؤمن کی دانائی (فراست) سے بچو وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے۔ (ترمذی)

اسلام بھکاری پن کو پسند نہیں کرتا ☆ قرآن کا فرمان ہے: ﴿إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّلْمُتَوَسِّمِينَ﴾ (الحجر ۷۵) بالیقین اس میں اہل بصیرت کے نشانیاں ہیں۔ یہ لوگ کسی پر بوجھ نہیں ہیں کسی سے ڈھٹائی کے ساتھ سوال نہیں کرتے۔ نہ اپنے پاس ہوتے ہوئے کسی سے کچھ طلب کرتے ہیں' جس کے پاس ضرورت کے مطابق ہو اور پھر بھی وہ سوال کرے۔ وہ لوگوں کو پریشان کر کے مانگنے والا کہلاتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں' ایک دو کھجوریں اور ایک دو لقمے لے کر چلے جانے والے ہی مسکین نہیں بلکہ حقیقتاً مسکین وہ ہیں جو باوجود حاجت کے خود داری برتیں اور سوال سے بچیں۔ دیکھو قرآن کہتا ہے: ﴿لَا يَسْأَلُونَ النَّاسَ إِلْحَافًا﴾ (بخاری) یہ حدیث بہت سی کتابوں میں بہت سی سندوں سے موجود ہے۔ قبیلہ مزنیہ کے ایک شخص کو ان کی والدہ فرماتی ہیں' تم بھی جا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ مانگ لاؤ۔ جس طرح اور لوگ جا کر لے آتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں' میں جب گیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہوئے خطبہ فرما رہے تھے کہ جو شخص سوال سے بچے گا' اللہ تعالیٰ بھی اسے سوال سے بچالے گا۔ جو شخص بے پروائی برتے گا اللہ تعالیٰ اسے فی الواقع بے نیاز کر دے گا۔ جو شخص پانچ اوقیہ کے برابر مال رکھتے ہوئے بھی سوال کرے گا وہ چمٹنے والا سوالی ہے۔ میں نے اپنے دل میں سوچا کہ ہمارے پاس تو ایک اونٹنی ہے جو پانچ اوقیہ سے بہت بہتر ہے۔ ایک اونٹنی غلام کے پاس ہے وہ بھی پانچ اوقیہ سے زیادہ قیمت کی ہے۔ پس میں تو یونہی سوال کئے بغیر ہی واپس چلا آیا اور روایت میں ہے کہ یہ واقعہ ابو سعید کا ہے۔ اس میں ہے کہ آپ نے مجھ سے فرمایا اور یہ بھی فرمایا کہ جو لوگوں سے کنارہ کرے گا' اللہ اسے آپ کفایت کرے گا اور جو ایک اوقیہ رکھتے ہوئے سوال کریگا وہ چمٹ کر سوال کرنے والا ہے۔ انکی اونٹنی کا نام یاقوتہ تھا۔ ایک اوقیہ چالیس درہم کا ہوتا ہے۔ چالیس درہم کے تقریباً دس روپے ہوتے ہیں۔

ایک حدیث میں ہے کہ جس کے پاس ضرورت[1] کے مطابق ہو۔ پھر بھی سوال کرے۔ قیامت کے دن اس کے چہرہ پر اس سوال کا نشان ہوگا۔ اس کا منہ نچا ہوا ہوگا۔ لوگوں نے کہا' حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کتنا پاس ہو تو؟ فرمایا پچاس درہم یا اس قیمت کا سونا۔ یہ حدیث شریف ضعیف ہے۔ شام میں ایک قریشی تھے' جنہیں معلوم ہوا کہ حضرت ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ضرورت مند ہیں تو تین سو اشرفیاں انہیں بھجوائیں۔ آپ خفا ہو کے فرمانے لگے۔ اس اللہ کے بندے کو کوئی مسکین ہی نہیں ملا جو میرے پاس یہ بھیجیں میں نے تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ چالیس درہم جس کے پاس ہوں اور پھر سوال کرے تو وہ چمٹ کر سوال کرنے والا ہے اور ابوذر کے گھرانے والوں کے پاس تو چالیس درہم بھی ہیں۔ چالیس بکریاں بھی ہیں

[1] آج ہم جب اپنے اردگرد نظر دوڑاتے ہیں تو ہمیں اپنے اردگرد بھکاریوں کا ایک جال سا بچھا نظر آتا ہے بالیقین جانئے کہ یہ قطعاً مستحق لوگ نہیں بلکہ یہ تو پیشہ ور لوگ ہیں۔ اگر ان میں سے کسی سے کہا جائے کہ تم کام کر کے کماؤ تو جواب ملتا ہے کہ ہاتھ سے کام کرنے والے کو ہماری برادری سے نکال دیا جاتا ہے' اناللہ وانا الیہ راجعون۔ اب تو ہر شخص کو میڈیا کے ذریعہ اس بات کا پتہ چل چکا ہے کہ یہ تمام زخم کے نشان اور ایسی ہی دوسری چوٹیں وغیرہ شعبدہ بازی کے مظاہروں کے سوا کچھ نہیں ہوتیں جو ان کے جسموں پر لگی ہوتی ہیں' براہ مہربانی اوپر بیان کی گئی احادیث کو ایک بار پھر غور سے پڑھئے اور غور کیجئے کہ کیا ہم ان پہ ترس کھا کر اپنے ہی ملک میں منگتوں کی تعداد میں اضافہ کرنے کا باعث تو نہیں بن رہے۔ اپنے قیمتی پیسے کو حقیقی فقراء' مساکین وطلباء پہ خرچ کرکے ہم حقدار کو ان کا حق پہنچا سکتے ہیں۔ فتدبر۔ (حافظ)

اور دو غلام بھی ہیں۔ ایک روایت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ الفاظ بھی ہیں کہ چالیس درہم ہوتے ہوئے سوال کرنے والا الحاف کرنے والا مثل ریت کے ہے۔ پھر فرمایا تمہارے صدقات کا اللہ کو علم ہے اور جبکہ تم پورے محتاج ہو گئے۔ اللہ پاک اس وقت تمہیں اس کا بدلہ دے گا۔ اس پر کوئی چیز مخفی نہیں۔ پھر ان لوگوں کی تعریفیں ہو رہی ہیں جو ہر وقت خدا کے فرمان کے مطابق خرچ کرتے رہتے ہیں انہیں اجر ملے گا اور ہر خوف سے امن پائیں گے۔ بال بچوں کے کھلانے پر انہیں ثواب ملے گا۔ جیسے صحیحین کی حدیث میں ہے کہ فتح مکہ کے سال آپ حضرت سعد بن ابی وقاص کی عیادت کو گئے تو فرمایا' ایک روایت میں ہے کہ حجتہ الوداع والے سال فرمایا' تو جو کچھ خدا کی خوشی کے لئے خرچ کرے گا۔ اللہ تعالیٰ اس کے بدلے تیرے درجات بڑھائے گا۔ یہاں تک کہ تو جو اپنی بیوی کو کھلائے پلائے' اس کے بدلے بھی۔ مسند میں ہے مسلمان طلب ثواب کی نیت سے اپنے بال بچوں پر جو خرچ کرتا ہے وہ صدقہ ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں' اس آیت کا شانِ نزول مسلمان مجاہدین کا وہ خرچ ہے جو وہ اپنے گھوڑوں پر کرتے ہیں۔ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے بھی یہی روایت ہے۔ حضرت جبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس چار درہم تھے جن میں سے ایک راہِ للہ کو دیا' ایک دن کو' ایک پوشیدہ' ایک ظاہر۔ تو یہ آیت اُتری۔ یہ حدیث ضعیف ہے۔ دوسری سند سے بھی منقول ہے۔ اطاعت خدا میں جو مال ان لوگوں نے خرچ کیا' اس کا بدلہ قیامت کے دن اپنے پروردگار کے پاس لیں گے۔ نڈر اور بے غم یہ لوگ ہیں۔

اَلَّذِیْنَ یَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا یَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا یَقُوْمُ الَّذِیْ یَتَخَبَّطُهُ الشَّیْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْۤا اِنَّمَا الْبَیْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا ۘ وَ اَحَلَّ اللّٰهُ الْبَیْعَ وَ حَرَّمَ الرِّبٰوا ؕ فَمَنْ جَآءَهٗ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ فَانْتَهٰى فَلَهٗ مَا سَلَفَ ؕ وَ اَمْرُهٗۤ اِلَى اللّٰهِ ؕ وَ مَنْ عَادَ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۷۵﴾

اور جو لوگ سود کھاتے ہیں' نہیں کھڑے ہوں گے (قیامت کے دن قبروں سے) مگر جس طرح کھڑا ہوتا ہے ایسا شخص جس کو شیطان خبطی بنا دے لپٹ کر (یعنی حیران و مدہوش) یہ (سزا) اسی لئے ہو گی کہ ان لوگوں نے کہا تھا کہ بیع بھی تو مثل سود کے ہے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے بیع کو حلال فرمایا ہے اور سود کو حرام کر دیا ہے۔ پھر جس شخص کو اس کے پروردگار کی طرف سے نصیحت پہنچی اور وہ باز آ گیا تو جو کچھ پہلے (لینا) ہو چکا ہے وہ اسی کا رہا اور (باطنی) معاملہ اس کا خدا کے حوالے رہا اور جو شخص پھر عود کرے تو یہ لوگ دوزخ میں جائیں گے وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ ○

سودی کاروبار کی ممانعت ☆

چونکہ پہلے ان لوگوں کا بیان ہوا جو نیک کار صدقہ خیرات کرنے والے زکوٰۃ دینے والے حاجتمندوں اور رشتہ داروں

خبر گیری کرنے والے ہر حال میں اور ہر وقت دوسرے کے کام آنے والے تھے۔ تو اب ان کا بیان ہو رہا ہے جو دنیا تو ایک طرف اور چھین لینے والے ظلم کرنے والے ناحق اپنے پرایوں کا مال ہضم کر جانے والے ہیں۔ فرمایا کہ سود خور لوگ اپنی قبروں سے اُٹھیں گے تو دیوانوں اور پاگلوں' خبطیوں اور بے ہوش لوگوں کی طرح اٹھیں گے۔ مجنون اور دیوانے ہوں گے۔ کھڑے ہی نہ ہو سکتے ہوں گے۔ ﴿مِنَ الْمَسِّ﴾ کے بعد ﴿يَوْمَ الْقِيَامَةِ﴾ کا لفظ بھی ایک قراءت میں ہے اور ان سے کہا جائے گا کہ لے اب ہتھیار تھام لے اور اپنے رب سے لڑنے کے لئے تیار ہو جا۔

شب معراج میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ لوگوں کو دیکھا جن کے پیٹ بڑے بڑے گھروں کی مانند تھے۔ پوچھا یہ کون لوگ ہیں؟ بتایا سود خوار بیاج لینے والے ہیں اور روایت میں ہے کہ ان کے پیٹوں میں سانپ بھرے ہوئے تھے' جو ڈستے رہتے ہیں اور ایک طویل حدیث میں ہے کہ ہم جب ایک سرخ رنگ نہر پر پہنچے' جس کا پانی خون کی طرح سرخ تھا۔ تو میں نے دیکھا اس میں کچھ لوگ ہیں' وہ بمشکل تمام کنارے پر آتے ہیں لیکن کنارے پر ایک فرشتہ بہت سے پتھر لئے بیٹھا ہے۔ وہ ان کا منہ پھاڑ کر ایک پتھر منہ میں اتار دیتا ہے۔ وہ پھر بھاگتے ہیں۔ پھر یہی ہوتا ہے۔ پوچھا تو معلوم ہوا کہ یہ سود خواروں کا گروہ ہے۔ یہ وبال ان پر اس باعث ہے کہ یہ کہتے تھے کہ تجارت بھی مثل سود خواری ہے۔ یہ اعتراض ان کا شریعت پر اور احکام خداوندی پر تھا اور اس سے وہ سود کو مثل بیع کے حلال جانتے تھے۔ یہ یاد رہے سود کا قیاس بیع پر نہیں۔ اس لئے کہ مشرکین تو سرے سے بیع کی مشروعیت کے قائل نہ تھے اور اس لئے بھی کہ اگر یہ قیاس ہوتا تو یوں کہتے کہ سود مثل بیع کے ہے۔ ان کا مطلب یہ تھا کہ یہ دونوں ایک جیسی چیزیں ہیں۔ پھر کیا وجہ کہ ایک کو حلال کہا جائے اور دوسری کو حرام بتایا جائے۔ پھر انہیں جواب دیا جاتا ہے کہ یہ حلت وحرمت خدا کے حکم کی بنا پر ہیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ جملہ بھی کافروں کا قول ہی ہو تو اس میں لطافت کے ساتھ ایک جواب بھی ہو گیا کہ باوجود اس علم کے کہ ایک کو خدا نے حرام ٹھہرایا ہے۔ دوسرے کو حلال بتایا ہے۔ پھر اعتراض کیسا؟ علیم و حکیم خدا کے حکموں پر تعاقب کرنے والے تم کون؟ اس سے باز پرس کرنے کی کس کی ہستی ہے۔ تمام کاموں کی اصلیت کا علم تو وہی ہے۔ وہ خوب جانتا ہے کہ بندوں کا حقیقی نفع کس چیز میں ہے اور فی الواقع نقصان کس چیز میں ہے۔ تو وہ نفع والی چیزیں حلال کرتا ہے اور نقصان رساں چیزیں حرام کرتا ہے کوئی ماں اپنے دودھ پیتے بچے پر اتنی مہربان نہ ہوگی جتنا خدا اپنے بندوں پر ہے۔ وہ روکتا ہے تو مصلحت سے اور حکم دیتا ہے تو مصلحت سے۔ اپنے رب کی نصیحت سن کو جو باز آ جائے' اس کے اگلے کئے کرائے تمام گناہ معاف ہیں۔ جیسے فرمایا: ﴿عَفَا اللّٰهُ عَمَّا سَلَفَ﴾ (المائدہ:٩٥) اور جیسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ والے دن فرمایا تھا' جاہلیت کے تمام سود میرے ان قدموں تلے برباد ہیں۔ سب سے پہلا سود جسے میں ختم کرنا چاہتا ہوں وہ عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا سود ہے۔ پس جاہلیت میں جو سود لے چکے تھے' ان کے لوٹانے کا حکم نہیں ہوا۔ ایک روایت میں ہے کہ ام بحنہ کا جو حضرت زید بن ارقم کی اُم ولد تھیں' حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے پاس آئیں اور کہا کہ میں نے ایک غلام حضرت زید کے ہاتھوں آٹھ سو کا بیچا کہ جب ان کے پاس عطا آئے وہ رقم ادا کر دیں۔ اس کے بعد انہیں نقدی کی ضرورت آئی تو وقت سے پہلے ہی وہ اسے فروخت کرنے کو تیار ہو گئے۔ میں نے چھ سو کا خرید لیا۔ حضرت صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے فرمایا' تو نے بھی اور اس نے بھی بہت برا کیا' بالکل خلاف شرع کیا۔ جا زید سے کہہ دے کہ اگر تو توبہ نہ کرے گا تو اس کا جہاد بھی غارت ہوا۔ جو اس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کیا ہے۔ میں نے کہا اگر دو سو جو مجھے اس سے لینے ہیں' چھوڑ دوں اور

صرف چھ سو وصول کرلوں۔ تا کہ مجھے میری پوری رقم آٹھ سو کی مل جائے۔ آپ نے فرمایا پھر کوئی حرج نہیں پھر آپ نے:
﴿فَمَنْ جَآءَهٗ مَوْعِظَةٌ......﴾ والی آیت پڑھ کر سنائی۔ (ابن ابی حاتم)
یہ مشہور ہے اور دلیل ہے ان لوگوں کی جو عینہ کے مسئلہ کو حرام بتلاتے ہیں۔ اس بارے میں اور احادیث بھی ہیں' جن کی جگہ کتاب الاحکام میں ہے۔ والحمدللہ۔ پھر فرمایا کہ اب جبکہ حرمت کا مسئلہ اس کے کانوں میں پڑ چکا ہے' پھر بھی سود لے تو وہ سزا کا سزاوار ہے۔ ہمیشہ کے لئے جہنمی ہے۔ جب یہ آیت اُتری تو آپ نے فرمایا جو مخابرہ کو اب بھی نہ چھوڑے وہ خدا کے رسول سے لڑنے کے لئے تیار ہو جائے۔ (ابوداؤد)

بعض معاملات کی صورتیں اور ان کے احکام ☆ مخابرہ کہتے ہیں اسے کہ ایک شخص دوسرے کی زمین میں کھیتی بوئے اور یہ ٹھہرائے کہ اس زمین کے اس ٹکڑے سے جتنا نکلے وہ میرا باقی تیرا اور مزابنہ کہتے ہیں اس کے درخت میں جو کھجوریں ہیں وہ میری اور میں اس کے بدلے اپنے پاس سے تجھے اتنی اتنی کھجوریں دیتا ہوں اور محاقلہ کہتے ہیں اسے کہ کھیت میں جو اناج بالوں میں ہے اسے اپنے پاس سے کچھ اناج دے کر خریدنا' ان تمام صورتوں کو شریعت نے حرام قرار دیا ہے۔ تا کہ سود کی جڑ کٹ جائے۔ اس لئے کہ ان صورتوں میں صحیح طور پر معلوم نہیں ہو سکتا۔ بعض علما نے اس کی کچھ علت نکالی' بعض نے کچھ۔ اس جماعت نے اپنی علت پر قیاس کر کے ان تمام کاروبار سے روکا۔ جس میں یہ علت پائی جاتی تھی۔ دوسری جماعت نے دوسری علت کی بنا پر۔ حقیقت یہ ہے کہ ہے یہ مسئلہ ذرا مشکل۔ یہاں تک کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ تین مسئلے افسوس کہ پوری طرح میری سمجھ میں نہیں آئے۔ دادا کی میراث کا' کلالہ کا اور سود کی صورتوں کا یعنی بعض ان صورتوں کا جن میں سود کا شبہ ہے۔ پھر جو وسائل ان تک لے جانے والے ہیں' جب یہ حرام ہے تو وہ بھی حرام ہی ٹھہریں گے جیسے کہ وہ چیز واجب ہو جاتی ہے۔ جس کے بغیر کوئی واجب پورا نہ ہوتا ہو۔ صحیحین کی حدیث میں ہے کہ حلال ظاہر ہے اور حرام بھی ظاہر ہے لیکن کچھ کام درمیانی شبہ والے ہیں۔ ان میں شبہات سے بچنے والے نے اپنے دین اور اپنی عزت کو بچا لیا اور ان مشتبہ چیزوں پر پڑنے والا حرام میں پڑنے والا ہے۔ جس طرح کوئی چرواہا' جو کسی کی چراگاہ کے آس پاس اپنے جانور چراتا ہو ممکن ہے کوئی جانور اس چراگاہ میں بھی منہ مار لے۔

ایک اہم اصول ☆ سنن میں حدیث ہے کہ جو چیز تجھے شک میں ڈالے' اسے چھوڑ' اور اسے لے جو شک شبہ سے پاک ہو۔ دوسری حدیث میں ہے۔ گناہ وہ ہے جو دل میں کھٹکے' طبیعت میں تردد ہو اور اس پر لوگوں کا واقف ہو جانا برا لگتا ہو۔ ایک اور روایت میں ہے' اپنے دل سے فتویٰ پوچھ لے اگرچہ لوگ کچھ بھی فتویٰ دیتے ہوں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں۔ سود کی حرمت سب سے آخر میں نازل ہوئی۔ (بخاری) حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ یہ فرما کر کہتے ہیں کہ اس کی پوری تفسیر بھی افسوس کہ مجھ تک نہ پہنچ سکی اور حضور ﷺ کا انتقال ہو گیا۔ لوگو! سود کو بھی چھوڑ دو اور ہر اس چیز کو بھی جس میں سود کا کچھ بھی شائبہ ہو۔ (مسند احمد) حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے ایک خطبہ میں فرمایا' شاید میں تمہیں بعض ان چیزوں سے روک دوں' جو تمہارے لئے نفع والی ہوں اور ممکن ہے میں تمہیں ایسے احکام بھی دوں جو تمہاری مصلحت کے خلاف ہوں۔ قرآن مجید میں سب سے آخر میں سود کی حرمت کی آیت اُتری۔ حضور ﷺ کا انتقال ہو گیا اور افسوس کہ اسے کھول کر ہمارے سامنے بیان نہ فرمایا۔ پس تم ہر اس چیز کو چھوڑ دو جو تمہیں شک میں ڈالتی ہو۔ (ابن ماجہ)

سود خوری ایک جرم ہے اور اس کی سزا نہایت سخت ☆ ایک حدیث میں ہے کہ سود کے تہتر گناہ ہیں۔ جن میں سب سے ہلکا گناہ یہ ہے کہ انسان اپنی ماں سے بدکاری کرے سب سے بڑا سود مسلمان کی ہتک عزت کرنا ہے (مستدرک حاکم) فرماتے ہیں ایسا زمانہ بھی آئے گا کہ لوگ سود کھائیں گے۔ صحابہؓ نے پوچھا' کیا سب کے سب؟ فرمایا جو نہ کھائے گا اسے غبار تو پہنچے گا ہی (مسند احمد) پس غبار سے بچنے کے لئے ان اسباب کے پاس بھی نہ بھٹکنا چاہئے جو ان حرام کاموں کی طرف پہنچانے والے ہوں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی ہے کہ جب سورہ بقرہ کی آخری آیت حرمتِ سود میں نازل ہوئی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد میں آکر اس کی تلاوت کی اور سودی کاروبار اور سودی تجارت کو حرام قرار دے دیا۔ بعض ائمہ فرماتے ہیں کہ اسی طرح شراب اور اس کی ہر طرح کی خرید و فروخت وغیرہ وہ وسائل جو اس تک پہنچانے والے ہوں' سب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حرام کئے ہیں۔ صحیح حدیث میں ہے' اللہ تعالیٰ نے یہودیوں پر لعنت کی ہے اس لئے کہ جب ان پر چربی حرام ہوئی تو انہوں نے حیلہ سازی کر کے چربی کو پگھلا کر بیچا اور اس کی قیمت کھائی۔ غرض دھوکہ بازی کر کے اور حیلہ سازی کر کے حرام کو حلال بنانے کی کوشش بھی حرام ہے اور موجب لعنت ہے۔ اسی طرح پہلے وہ حدیث بھی بیان ہو چکی ہے۔ جس میں ہے کہ جو شخص دوسرے کی تین طلاقوں والی عورت سے اس لئے نکاح کرے کہ اگلے خاوند کے لئے وہ حلال ہو جائے' اس پر اور اس خاوند پر دونوں پر خدا کی پھٹکار اور اس کی لعنت ہے۔ آیت: ﴿حَتّٰی تَنْكِحَ زَوْجًا غیرہ﴾ کی تفسیر میں ہے سود کھانے والے پر کھلانے والے' شہادت دینے والے پر' گواہ بننے والوں پر' لکھنے والوں پر سب پر اللہ کی لعنت ہے۔ تو ظاہر ہے کہ کاتب و شاہد کو کیا ضرورت پڑی' جو خواہ مخواہ لعنت اللہ اپنے اوپر لے۔ مراد یہ ہے کہ بظاہر عقد شرعی کی صورت میں لا کر حیلہ کر کے اس سود کو لکھتے پڑھتے ہیں لیکن پھر بھی ملعون ہیں۔ حضرت علامہ امام تیمیہ رحمتہ اللہ علیہ نے ان حیلوں حوالوں کے رد میں ایک مستقل کتاب ابطال التحلیل لکھی ہے جو اس موضوع میں بہترین کتاب ہے۔ خدا ان پر اپنی رحمتیں نازل فرمائے اور ان سے خوش ہو۔

يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرْبِي الصَّدَقٰتِ ۗ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ اَثِيْمٍ ﴿۲۷۶﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ لَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۲۷۷﴾

اللہ تعالیٰ سود کو مٹاتے ہیں اور صدقات کو بڑھاتے ہیں اور اللہ پسند نہیں کرتے کسی کفر کرنے والے کو (اور) کسی گناہ کے کام کرنے والے کو بیشک جو لوگ ایمان لائے ہیں اور انہوں نے نیک کام کئے اور (بالخصوص) نماز کی پابندی کی اور زکوٰۃ دی ان کیلئے انکا ثواب ہوگا انکے پروردگار کے نزدیک اور (آخرت میں) اُن پر کوئی خطر نہیں ہوگا اور نہ وہ مغموم ہونگے۔ ○

سودی کاروبار سے کوئی پائیدار نفع نہیں پہنچتا ☆

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ وہ سود کو برباد کرتا ہے یعنی یا تو اسے بالکل غارت کر دیتا ہے یا اسکی خیر و برکت ہٹا دیتا ہے۔ دنیا

میں بھی وہ تباہی کا باعث بنتا ہے اور آخرت میں عذاب کا سبب۔ جیسے اور جگہ ہے۔ ﴿قُلْ لَّا يَسْتَوِي الْخَبِيْثُ وَالطَّيِّبُ ....﴾ (المائدہ۔ ۱۰۰) یعنی پاک اور ناپاک برابر نہیں۔ گو تمہیں ناپاک کی زیادتی تعجب میں ڈالے اور جگہ ہے: ﴿وَيَجْعَلَ الْخَبِيْثَ بَعْضَهُ عَلَى بَعْضٍ فَيَرْكُمَهُ جَمِيْعًا فَيَجْعَلَهُ فِيْ جَهَنَّمَ﴾ (الانفال: ۳۷) خباثت والی چیزوں کو تہ و بالا کر کے وہ جہنم میں جھونک دیگا اور جگہ ہے: ﴿وَمَا آتَيْتُمْ مِّنْ رِّبًا .....﴾ (الروم) یعنی تمہارے لئے ہوئے سود سے جو مال تم بڑھانا چاہو وہ دراصل بڑھتا نہیں۔ اس واسطے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ والی روایت میں ہے لیکن انجام کار کمی ہی کمی ہے۔ (مسند احمد)

مسند کی ایک اور روایت ہے کہ امیر المؤمنین حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ مسجد سے نکلے اور اناج پھیلا ہوا دیکھا' پوچھا یہ غلہ کہاں سے آ گیا؟ لوگوں نے کہا بکنے کے لئے آیا ہے۔ آپ نے دعا کہ کہ خدایا اس میں برکت دے۔ لوگوں نے کہا یہ غلہ گراں بھاؤ بیچنے کے لئے جمع کر لیا تھا۔ پوچھا کس نے جمع کیا تھا؟ لوگوں نے کہا' ایک تو فروخ جو حضرت عثمان کے مولیٰ ہیں اور دوسرے آپ کے آزاد کردہ غلام نے۔ آپ نے دونوں کو بلوایا اور فرمایا تم نے ایسا کیوں کیا؟ جواب دیا کہ ہم اپنے مالوں سے خریدتے ہیں اور جب چاہیں بیچیں' ہمیں اختیار ہے۔ آپ نے فرمایا سنو! میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ جو شخص مسلمانوں میں مہنگا بیچنے کے خیال سے غذا روک رکھے' اسے خدا مفلس کر دے گا یا جذامی[1]۔ یہ سن کر حضرت فروخ فرمانے لگے کہ میری توبہ ہے۔ میں خدا سے پھر آپ سے عہد کرتا ہوں کہ پھر یہ کام نہ کروں گا لیکن حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے غلام نے پھر بھی یہی کہا کہ ہم اپنے مال سے خریدتے ہیں اور نفع اٹھا کر بیچتے ہیں' اس میں کیا حرج ہے۔ راوی حدیث حضرت یحییٰ فرماتے ہیں' میں نے پھر دیکھا کہ اسے جذام ہو گیا اور جذامی بنا پھرتا تھا۔ ابن ماجہ میں ہے جو شخص مسلمانوں کا غلہ گراں بھاؤ بیچنے کے لئے روک رکھے' اللہ تعالیٰ اسے مفلس کر دے گا یا جذامی۔ پھر فرماتا ہے وہ صدقہ کو بڑھاتا ہے۔ يُرْبِي کی دوسری قراءت يُرَبِّي بھی ہے۔

صحیح بخاری شریف کی حدیث میں ہے' جو شخص اپنی پاک کمائی میں سے ایک کھجور بھی خیرات کرے' اسے اللہ تعالیٰ اپنے داہنے ہاتھ میں لیتا ہے۔ پھر پال کر بڑا کرتا ہے۔ جس طرح تم لوگ اپنے بچھیروں کو پالتے ہو اور اس کا ثواب پہاڑ کے برابر بنا دیتا ہے اور پاک چیز کے سوا وہ ناپاک چیز کو قبول نہیں فرماتا۔ ایک اور روایت میں ہے کہ احد کے پہاڑ کے برابر ثواب ایک کھجور کا ملتا ہے اور روایت میں ہے کہ ایک لقمہ مثل اُحد کے ہو کر ملتا ہے۔ پس تم صدقہ خیرات کیا کرو۔ پھر فرمایا کہ کافروں اور نافرمان زبان زور اور نافرجام فعل والوں کو خدا پسند نہیں کرتا۔ مطلب یہ ہے کہ جو لوگ صدقہ خیرات نہ کریں اور اللہ کی وعدہ کی ہوئی زیادتی صرصبر و شکر نہ کر کے مالِ دنیا جمع کرتے پھریں اور بدترین اور خلافِ شرع طریقوں سے کمائیاں کریں اور لوگوں کے مال باطل اور ناحق کے ساتھ کھا جائیں' یہ خدا کے دشمن ہیں۔ ان ناشکروں اور گنہگاروں پر خدا تعالیٰ کی رحمت نہیں۔

پھر ان بندں کی تعریف ہو رہی ہے جو اپنے رب کے احکام کی بجا آوری کریں۔ مخلوق کے ساتھ سلوک و احسان کریں۔ نماز قائم کریں۔ زکوٰۃ دیتے رہیں۔ یہ قیامت کے دن تمام دُکھ درد سے امن میں رہیں گے۔ کوئی کھٹکا بھی ان کے دل پر نہ گزرے گا بلکہ رب العالمین اپنے انعام و اکرام سے انہیں سرفراز فرمائے گا۔

---

[1] غلہ کو اسٹاک کرنا اسلامی نقطہ نظر سے سنگین ترین جرم ہے۔

يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۲۷۸﴾ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۚ وَاِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ ۚ لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ ﴿۲۷۹﴾

اے ایمان والوں اللہ سے ڈرو اور جو کچھ سود کا بقایا ہے اس کو چھوڑ دو۔ اگر تم ایمان والے ہو پھر اگر تم اس پر عمل نہ کرو گے تو اشتہار سن لو جنگ کا اللہ کی طرف سے اور اس کے رسول کی طرف سے (یعنی تم پر جہاد ہوگا) اور اگر تم توبہ کرلو گے تو تمہارے اصل اموال مل جائیں گے۔ نہ تم کسی پر ظلم کرنے پاؤں گے اور نہ تم پر کوئی ظلم کرنے پائے گا۔ ○

وَاِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ ۭ وَاَنْ تَصَدَّقُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۸۰﴾ وَاتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ اِلَى اللّٰهِ ۣ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۲۸۱﴾

ع ۳۸

اور اگر تنگ دست ہو تو مہلت دینے کا حکم ہے آسودگی تک اور یہ (بات) کہ معاف ہی کر دو اور زیادہ بہتر ہے تمہارے لئے اگر تم کو اس کے ثواب کی خبر ہو اور اس دن سے ڈرو جس میں تم اللہ تعالیٰ کی پیشی میں لائے جاؤ گے۔ پھر ہر شخص کو اس کا کیا ہوا (نیکی کا بدلہ) پورا پورا ملے گا اور ان پر کسی قسم کا ظلم نہ ہوگا۔ ○

سودی کاروبار کرنے والوں کے خلاف خدائے قہار کا اعلانِ جنگ ☆

اللہ تعالیٰ اپنے ایماندار بندوں کو تقویٰ کا حکم دے رہا ہے اور ان کاموں سے روک رہا ہے جن سے اس کی ناراضگی ہو۔ تو فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا لحاظ کرو۔ اپنے تمام کاموں میں اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو اور جو سود تمہارے لوگوں پر باقی ہے۔ خبردار اگر مسلمان ہو تو اسے اب نہ لو۔ جبکہ وہ حرام ہو گیا۔ یہ آیت نازل ہوئی ہے ثقیف کے قبیلے بنی عمرو بن عمیر اور بنو مخزوم کے قبیلے بنو مغیرہ کے بارے میں جاہلیت کے زمانہ میں ان کے سودی کاروبار تھے۔ اسلام کے بعد بنو عمرو نے مغیرہ سے اپنا سود طلب کیا اور انہوں نے کہا کہ اب ہم اسے اسلام لانے کے بعد ادا نہ کریں گے۔ آخر جھگڑا بڑھا حضرت عتاب بن اسید رضی اللہ تعالیٰ عنہ جو مکہ شریف کے نائب تھے انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ لکھا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ لکھوا کر بھیج دی۔ اس طرح سود لینا حرام قرار دیا۔ چنانچہ وہ تائب ہوئے اور اپنا سود بالکل چھوڑ دیا۔

اس آیت میں زبردست وعید ہے ان لوگوں پر جو سود کی حرمت کا علم ہونے کے باوجود بھی لیتے ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں' سود خوار سے قیامت کے دن کہا جائے گا کہ اپنے ہتھیار لے لے اور خدا سے لڑنے کے لئے آمادہ ہو جا۔ آپ فرماتے ہیں' امام وقت کا فرض ہے کہ سود خوار لوگ جو اسے نہ چھوڑیں' ان سے توبہ کرائے اور اگر نہ کریں تو ان کی گردن مار دے۔ حسن اور ابن سیرین رحمتہ اللہ علیہما کا فرمان بھی یہی ہے۔ حضرت قتادہ فرماتے ہیں' دیکھو اللہ نے انہیں

ہلاک کرنے کی دھمکی دی۔ انہیں ذلیل کئے جانے کے قابل ٹھہرایا۔ خبردار سود سے اور سودی لین دین سے بچتے رہو۔ حلال چیزیں اور حلال خرید وفروخت بہت کچھ ہے فاقے گزرتے ہوں۔ تاہم خدا کی معصیت سے رکو۔ وہ روایت بھی یاد ہوگی جو پہلے گزر چکی کہ حضرت عائشہؓ نے ایک ایسے معاملہ کی نسبت جس میں سود تھا' حضرت زید بن ارقم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں فرمایا تھا کہ ان کا جہاد بھی برباد ہو گیا۔ اس لئے کہ جہاد خدا کے دشمنوں سے مقابلہ کرنے کا نام ہے اور سود خواری خود خدا سے مقابلہ کرنا ہے لیکن اس کی اسناد کمزور ہیں۔ پھر ارشاد ہوتا ہے۔ اگر توبہ کرلو تو اصل مال جو کسی پر قرض ہے' بے شک لے لو۔ نہ زیادہ لے کر اس پر تم ظلم کرو نہ کم دے کر یا بالکل نہ دے کہ وہ تم پر ظلم کرے۔ حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما بن عبدالمطلب کا تمام سود میں ختم کرتا ہوں۔ پھر ارشاد ہوتا ہے کہ اگر تنگی والا شخص ہو اور اسکے پاس تمہارے قرض کی ادائیگی کے قابل مال نہ ہو تو اسے مہلت دو کہ کچھ اور مدت بعد ادا کردے۔ یہ نہ کرو کہ سود در سود لگائے چلے جاؤ کہ مدت گزر گئی اب اتنا سود لیں گے۔

قرض وصول کرنے میں سہولت اور آسانی دینا اجر عظیم کا باعث ہے ☆ بلکہ بہتر بات تو یہ ہے کہ ایسے غرباء کو اپنا قرض معاف کر دو۔ طبرانی کی حدیث میں ہے کہ جو شخص قیامت کے دن خدا کے عرش کا سایہ چاہتا ہو وہ یا تو ایسے تنگی والے شخص کو مہلت دے یا معاف کر دے۔ مسند احمد کی حدیث میں ہے جو شخص مفلس آدمی پر اپنا قرض وصول کرنے میں نرمی کرے اور اسے ڈھیل دے۔ اس کو جتنے دن وہ قرض کی رقم ادا نہ کر سکے اتنے دنوں تک ہر دن اتنی رقم خیرات کرنے کا ثواب ملتا ہے اور روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا ہر دن اس سے دگنی رقم کے صدقہ کرنے کا ثواب ملتا ہے۔ یہ سن کر حضرت بریدہؓ نے عرض کیا' حضورؐ پہلے تو آپ نے ہر دن اس کے مثل ثواب ملنے کے لئے فرمایا تھا۔ اب دو مثل فرماتے ہیں۔ فرمایا ہاں جب تک میعاد ختم نہیں ہوئی ایک مثل ثواب۔ میعاد گزرنے کے بعد دو مثل کا۔ حضرت قتادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قرض ایک شخص کے ذمے تھا۔ وہ تقاضا کرنے کو آتے لیکن یہ چھپ رہتے اور نہ ملتے۔ ایک دن آئے' گھر سے ایک بچہ نکلا۔ آپ نے اس سے پوچھا' اس نے کہا ہاں گھر میں موجود ہیں' کھانا کھا رہے ہیں۔ اب حضرت ابوقتادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اونچی آواز سے انہیں پکارا اور فرمایا' مجھے معلوم ہو گیا کہ تم گھر میں موجود ہو' آؤ باہر آؤ جواب دو۔ وہ بیچارے باہر نکلے آپ نے کہا کیوں چھپ رہے ہو۔ کہا بات یہ ہے کہ حضرت میں مفلس ہوں۔ اس وقت میرے پاس رقم نہیں۔ بوجہ شرمندگی کے آپ سے نہیں ملتا۔ آپ نے کہا' قسم کھاؤ۔ اس نے قسم کھالی۔ آپ رو دیئے اور فرمانے لگے میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے۔ جو شخص نادار قرضدار کو ڈھیل دے یا اپنا قرضہ معاف کر دے۔ وہ قیامت کے دن اللہ کے عرش کے سایہ تلے ہوگا۔ (صحیح مسلم)

مصارفِ خیر کے کچھ اور گوشے ☆ ابو یعلی نے ایک حدیث روایت کی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ قیامت کے دن ایک بندہ خدا کے سامنے لایا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ سے سوال کرے گا کہ بتلا میرے لئے تو نے کیا نیکی کی ہے؟ وہ کہے گا خدایا ایک ذرے کے برابر بھی کوئی ایسی نیکی مجھ سے نہیں ہوئی' جو آج میں اس کی جزا طلب کرسکوں۔ اللہ اس سے پھر پوچھے گا۔ وہ پھر یہی جواب دے گا۔ پھر پوچھے گا۔ وہ پھر یہی کہے گا کہ پروردگار ایک چھوٹی سی بات البتہ یاد پڑتی ہے کہ تو نے اپنے فضل سے کچھ مال بھی مجھے دے رکھا تھا۔ میں تجارت پیشہ شخص تھا لوگ ادھار لے جاتے تھے۔ میں اگر دیکھتا کہ یہ غریب شخص ہے اور وعدہ پر قرض ادا نہ کر سکا تو میں اسے اور کچھ مدت کے لئے مہلت دے دیتا؟ عیالداروں پر سختی نہ کرتا۔ زیادہ تنگی والا اگر پاتا تو معاف بھی کر دیتا۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا' پھر میں تجھ پر آسانی کیوں نہ کروں۔ میں تو سب سے زیادہ آسانی کرنے والا

ہوں۔ جا میں نے تجھے بخشا' جنت میں داخل ہو جا۔ متدرک حاکم میں ہے۔ جو شخص اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرنے والے غازی کی مدد کرے یا قرضدار بے مال کی اعانت کرے یا غلام جس نے لکھ کر دیا ہو کہ اتنی رقم دے دوں تو آزاد ہوں' اس کی مدد کرے اللہ تعالیٰ اسے اس دن سایہ دے گا۔ جس دن اس کے سایہ کے سوا اور کوئی سایہ نہ ہوگا۔

مسند احمد میں ہے جو شخص یہ چاہتا ہو کہ اس کی دعائیں قبول کی جائیں اور اس کی تکلیف و مصیبت دور ہو جائے اسے چاہئے کہ تنگی والے لوگوں پر کشادگی کرے۔ عباد بن ولید رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں اور میرے والد طلب علم میں نکلے اور ہم نے کہا کہ انصاریوں سے حدیث سنیں۔ سب سے پہلے ہماری ملاقات حضرت ابوالیسر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ہوئی۔ ان کے ساتھ ان کے غلام تھے۔ جن کے ہاتھ میں ایک دفتر تھا اور غلام اور آقا کا ایک ہی لباس تھا۔ میرے والد نے کہا چچا آپ تو اس وقت غصہ میں نظر آتے ہیں۔ فرمایا ہاں سنو! فلاں شخص پر میرا کچھ قرض تھا۔ مدت ختم ہو چکی تھی۔ میں قرض مانگنے گیا۔ سلام کیا اور پوچھا کہ کیا وہ مکان پر ہیں؟ گھر میں سے جواب ملا کہ نہیں ہیں۔ اتفاقاً ان کا ایک چھوٹا بچہ باہر آیا میں نے اس سے پوچھا کہ تمہارے والد کہاں ہیں؟ اس نے کہا کہ آپ کی آواز سن کر چارپائی تلے جا چھپے ہیں۔ میں نے پھر آواز دی اور کہا کہ تمہارا اندر ہونا مجھے معلوم ہو گیا ہے۔ اب چھپو نہیں' آؤ جواب دو۔ وہ آئے' میں نے کہا کیوں چھپ رہے ہو؟ کہا محض اس لئے کہ میرے پاس روپیہ تو اس وقت ہے نہیں۔ آپ سے ملوں گا یا تو کوئی جھوٹ عذر حیلہ بیان کروں گا۔ اس لئے سامنے ہونے سے جھجکتا تھا۔ آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی ہیں' آپ سے جھوٹ کیا کہوں۔ میں نے کہا سچ کہتے ہو خدا کی قسم تمہارے پاس روپیہ نہیں؟ اس نے کہا' ہاں سچ کہتا ہوں خدا کی قسم کچھ نہیں۔ تین مرتبہ میں نے قسم کھلائی اور انہوں نے کھائی۔ میں نے دفتر میں ان کا نام کاٹ دیا اور رقم جمع کر لی اور کہہ دیا کہ جاؤ میں نے تمہارے نام سے یہ رقم کاٹ دی ہے۔ اب اگر تمہیں مل جائے تو دے دینا ورنہ معاف ہے۔ سنو! میری ان دونوں آنکھوں نے دیکھا اور میرے ان دونوں کانوں سے سنا اور میرے اس دل نے اسے خوب یاد رکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص کسی تنگی میں مبتلا کو ڈھیل دے یا معاف کر دے۔ اللہ تعالیٰ اسے اپنے سایہ میں جگہ دے گا۔

مسند احمد کی ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد آتے ہوئے زمین کی طرف اشارہ کر کے فرمایا جو شخص کسی نادار پر آسانی کر دے یا اسے معاف کر دے۔ اللہ تعالیٰ اسے جہنم کی گرمی سے بچا لے۔ سنو! جنت کے کام غم والے ہیں اور خواہش کے خلاف ہیں اور جہنم کے کام آسانی والے اور خواہش نفس کے مطابق ہیں۔ نیک بخت وہ لوگ ہیں جو فتنوں سے بچ جائیں۔ وہ گھونٹ جو انسان غصہ کا پی لے' اس سے زیادہ اللہ تعالیٰ کو کوئی اور گھونٹ پسندیدہ نہیں۔ ایسا کرنے والے کا دل اللہ تعالیٰ ایمان سے پُر کر دیتا ہے۔ طبرانی میں ہے جو شخص کسی مفلس شخص پر رحم کر کے اپنے قرض کی وصولی میں اس پر سختی نہ کرے' اللہ تعالیٰ بھی اس کے گناہوں پر اسے نہیں پکڑتا۔ یہاں تک کہ وہ توبہ کر لے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو نصیحت کرتا ہے اور انہیں دنیا کا زوال اور مال کی فنا اور آخرت کا آنا اور اللہ کی طرف لوٹنا اور خدا کو اپنے اعمال کا حساب دینا اور ان تمام اعمال پر جزا و سزا کا ملنا یاد دلاتا ہے اور اپنے عذاب سے ڈراتا ہے۔ یہ بھی روایت ہے کہ قرآن کریم کی سب سے آخری آیت یہی ہے۔ اس آیت کے نازل ہونے کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم صرف نو شب زندہ رہے اور ربیع الاول کی دوسری تاریخ کو پیر کے دن آپ کا انتقال ہو گیا۔ اللّٰھم صلی علیه وسلم۔ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے ایک روایت میں ہے کہ اس

کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی اکتیس دن کی ہے۔ ابن جریج فرماتے ہیں کہ سلف کا قول ہے کہ اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نو رات زندہ رہے۔ ہفتہ کے دن سے ابتدا ہوئی اور پیر والے دن انتقال ہوا۔ الغرض قرآن مجید میں سب سے آخر میں یہی آیت نازل ہوئی۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوْهُ ۭ وَلْيَكْتُبْ بَّيْنَكُمْ كَاتِبٌۢ بِالْعَدْلِ ۠ وَلَا يَاْبَ كَاتِبٌ اَنْ يَّكْتُبَ كَمَا عَلَّمَهُ اللّٰهُ فَلْيَكْتُبْ ۚ وَلْيُمْلِلِ الَّذِيْ عَلَيْهِ الْحَقُّ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ وَلَا يَبْخَسْ مِنْهُ شَـيْــًٔـا ۭ فَاِنْ كَانَ الَّذِيْ عَلَيْهِ الْحَقُّ سَفِيْهًا اَوْ ضَعِيْفًا اَوْ لَا يَسْتَطِيْعُ اَنْ يُّمِلَّ ھُوَ فَلْيُمْلِلْ وَلِيُّهٗ بِالْعَدْلِ ۭ وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ ۚ فَاِنْ لَّمْ يَكُوْنَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَّامْرَاَتٰنِ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَاۗءِ اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰىھُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰىهُمَا الْاُخْرٰى ۭ وَلَا يَاْبَ الشُّهَدَاۗءُ اِذَا مَا دُعُوْا ۭ وَلَا تَسْــَٔـــمُوْٓا اَنْ تَكْتُبُوْهُ صَغِيْرًا اَوْ كَبِيْرًا اِلٰٓى اَجَلِهٖ ۭ ذٰلِكُمْ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ وَاَقْوَمُ لِلشَّهَادَةِ وَاَدْنٰٓى اَلَّا تَرْتَابُوْٓا اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً حَاضِرَةً تُدِيْرُوْنَهَا بَيْنَكُمْ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَلَّا تَكْتُبُوْھَا ۭ وَاَشْهِدُوْٓا اِذَا تَبَايَعْتُمْ ۠ وَلَا يُضَاۗرَّ كَاتِبٌ وَّلَا شَهِيْدٌ ڛ وَاِنْ تَفْعَلُوْا فَاِنَّهٗ فُسُوْقٌۢ بِكُمْ ۭ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ وَيُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ ۭ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۲۸۲﴾

اے ایمان والوں جب معاملہ کرنے لگو ادھار کا ایک میعاد (معین تک کے لئے) تو اس کو لکھ لیا کرو اور یہ ضرور ہے

کہ تمہارے آپس میں (جو) کوئی لکھنے والا ہو انصاف کے ساتھ لکھے اور لکھنے والا لکھنے سے انکار بھی نہ کرے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو (لکھنا) سکھلا دیا اس کو چاہئے کہ لکھ دیا کرے اور وہ شخص لکھوا دے۔ جس کے ذمے وہ حق واجب ہو اور ڈرتا ہے اللہ تعالیٰ سے جو اس کا پروردگار ہے اور اس میں سے ذرہ برابر (بتانے میں) کمی نہ کرے۔ پھر جس شخص کے ذمے حق واجب تھا وہ اگر خفیف العقل ہو یا ضعیف البدن ہو یا خود لکھانے کی قدرت نہ رکھتا ہو تو اس کا رکن ٹھیک ٹھیک طور پر لکھوا دے اور دو شخصوں کو اپنے مردوں میں سے گواہ بھی کر لیا کرو پھر اگر وہ دو گواہ مرد (میسر) نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں (گواہ بنائی جائیں) ایسے گواہوں میں سے جن کو پسند کرتے ہو۔ تا کہ ان دونوں عورتوں میں سے کوئی ایک بھی بھول جائے تو ان میں ایک دوسری کو یاد دلائے اور گواہ بھی انکار نہ کریں جب (گواہ بننے کے لئے) بلائے جایا کریں اور تم اس (دین) کے (بار بار) لکھنے سے اکتایا مت کرو خواہ وہ معاملہ چھوٹا ہو یا بڑا یہ لکھ لینا انصاف کا زیادہ قائم رکھنے والا ہے۔ اللہ کے نزدیک اور شہادت کا زیادہ درست رکھنے والا ہے اور زیادہ سزاوار ہے اس بات کا کہ تم (معاملہ کے متعلق) کسی شبہ میں نہ پڑو مگر یہ کہ کوئی سودا دست بدست ہو جس کو باہم لیتے دیتے ہو تو اس کے نہ لکھنے پر بھی کوئی الزام نہیں اور (اتنا اس میں ضرور کیا کرو کہ) خرید و فروخت کے وقت گواہ کر لیا کرو اور کسی کاتب کو تکلیف نہ دی جائے اور نہ کسی گواہ کو اور اگر تم ایسا کرو گے تو اس میں تم کو گناہ ہوگا خدا تعالیٰ سے ڈرو اور اللہ تعالیٰ (کا تم پر احسان ہے کہ) کہ تم کو تعلیم فرماتا ہے اور اللہ تعالیٰ سب چیزوں کے جاننے والے ہیں۔ ○

کاروبار اور لین دین کے سلسلے میں بعض احکام اور بعض مشورے ☆

یہ آیت قرآن کریم کی تمام آیتوں سے بڑی ہے حضرت سعید بن مسیب رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ قرآن کی سب سے نئی آیت عرش کے ساتھ یہی آیت الدین ہے۔ یہ آیت جب نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا سب سے پہلے انکار کرنے والے حضرت آدم علیہ السلام ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے جب حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا کیا ان کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا اور قیامت تک کی تمام ان کی اولاد نکالی۔ آپ نے اپنی اولاد کو دیکھا۔ ایک شخص کو تر و تازہ اور نورانی دیکھ کر پوچھا کہ خدایا ان کا نام کیا ہے؟ جناب باری نے فرمایا' یہ تمہارے لڑکے کے داؤد ہیں۔ پوچھا خدایا ان کی عمر کیا ہے؟ فرمایا ساٹھ سال۔ کہا خدایا اس کی عمر کچھ اور بڑھا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا نہیں۔ ہاں اگر تم اپنی عمر میں سے انہیں دینا چاہو تو دے دو۔ کہا خدایا میری عمر میں سے چالیس سال اسے دیئے جائیں چنانچہ دے دیئے گئے۔ حضرت آدم علیہ السلام کی اصلی عمر ایک ہزار سال کی تھی۔ لیکن حضرت آدم علیہ السلام کی اس بخشش کو لکھا گیا اور فرشتوں کو اس پر گواہ کیا گیا حضرت آدم علیہ السلام کی موت جب آئی تو کہنے لگے خدایا میری عمر میں سے تو ابھی چالیس سال باقی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا وہ تو تم نے اپنے لڑکے حضرت داؤد علیہ السلام کو دے دیئے ہیں تو حضرت آدم علیہ السلام نے انکار کیا۔ جس پر وہ لکھا ہوا دکھایا گیا اور فرشتوں کی گواہی گزری۔ دوسری روایت میں ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کی عمر پھر اللہ تعالیٰ نے ایک ہزار کر دی اور حضرت داؤد علیہ السلام کی ایک سو سال کی (مسند احمد) لیکن یہ حدیث بہت ہی غریب ہے[1] اس کے راوی علی بن زید بن جدعان کی حدیثیں منکر ہوتی ہیں۔

[1] ابن کثیر نے جیسا کہ تصریح کی یہ حدیث ناقابل اعتبار ہے۔ اس لئے اس پر مبنی اشکالات اور پھر ان کے جوابات غیر ضروری ہیں۔ یہ انسان فطری طور پر بھول چوک کا پیکر ہے۔ اس لئے اگر واقعہ کو صحیح مان بھی لیا جائے تو کیا مضائقہ ہے۔ نیز اگر داؤد علیہ السلام کی عمر سو سال کی بھی ہوئی تو وہ آدم علیہ السلام کی بخشش کے نتیجے میں نہیں بلکہ تقدیر اور خدا تعالیٰ کے اندازہ ہی کے مطابق ہوئی۔ واللہ اعلم۔ ۱۲

مستدرک حاکم میں بھی یہ روایت ہے۔

اِس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنے ایماندار بندوں کو ارشاد فرمایا ہے کہ وہ ادھار کے معاملات لکھ لیا کریں تا کہ رقم اور معیاد خوب یاد رہی۔ گواہ کو بھی غلطی نہ ہو۔ اس سے ایک وقت مقررہ کے لئے ادھار دینے کا جواز بھی ثابت ہوا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرمایا کرتے تھے کہ رقم اور میعاد مقرر کر کے قرض کے لین دین کی اجازت اس آیت اس سے بخوبی ثابت ہوتی ہے۔ صحیح بخاری شریف میں ہے کہ مدینے والوں کا ادھار لین دین دیکھ کر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ناپ تول یا وزن مقرر کر لیا کرو۔ بھاؤ تاؤ چکا لیا کرو اور مدت کا بھی فیصلہ کر لیا کرو۔ قرآن کریم حکم دیتا ہے کہ لکھ لیا کرو اور حدیث شریف میں ہے کہ ہم ان پڑھ امت ہیں نہ لکھنا جانیں نہ حساب۔ ان دونوں میں تطبیق اسی طرح ہے کہ دینی مسائل اور شرعی امور کے لکھنے کی تو مطلق ضرورت ہی نہیں۔ خود خدا تعالیٰ کی طرف سے یہ بے حد آسان اور بالکل سہل کر دیا گیا ہے۔ قرآن کا حفظ اور حدیثوں کا حفظ قدرتاً لوگوں پر سہل ہے۔ لیکن دنیوی چھوٹی بڑی لین دین کی باتیں اور وہ معاملات جو اُدھار کے ہوں۔ ان کی بابت بیشک لکھ لینے کا حکم ہوا اور یہ بھی یاد رہی کہ یہ حکم بھی وجوباً نہیں۔ پس نہ لکھنا دینی امور کا ہے اور لکھ لینا دنیوی کام کاج کا ہے۔ اگر بعض لوگ اس کو واجب بھی کہتے ہیں۔ ابن جریج فرماتے ہیں جو اُدھار دے وہ لکھ لے اور جو بیچے وہ گواہ کر لے۔ ابو سلیمان مرعشی رحمتہ اللہ علیہ جنہوں نے حضرت کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی صحبت بہت اٹھائی تھی انہوں نے ایک دن اپنے پاس والوں سے کہا اس مظلوم کو بھی جانتے ہو جو اللہ کو پکارتا ہے اور اس کی دعا قبول نہیں ہوتی۔ لوگوں نے کہا یہ کس طرح؟ فرمایا یہ وہ شخص ہے جو ایک مدت کے لئے ادھار دیتا ہے اور نہ گواہ رکھتا ہے نہ لکھت پڑھت کرتا ہے۔ پھر مدت گزرنے پر تقاضا کرتا کرتا ہے اور دوسرا شخص انکار کر جاتا ہے۔ اب یہ خدا سے دعا کرتا ہے لیکن پروردگار قبول نہیں کرتا۔ اس لئے کہ اس نے کام اس کے فرمان کے خلاف کیا ہے اور اپنے ربّ کا نافرمان ہوا ہے۔ حضرت ابوسعید شعبی ربیع بن انس حسن بن جریج بن زید رحمتہ اللہ علیہم وغیرہ کا قول ہے کہ پہلے تو واجب تھا' پھر وجوب منسوخ ہو گیا اور فرمایا کہ اگر ایک کو ایک پر اطمینان ہو تو جسے امانت دی گئی ہے اسے چاہئے کہ ادا کرے اور اس کی دلیل یہ حدیث ہے۔ گو یہ واقعہ اگلی امت کا ہے لیکن تاہم ان کی شریعت ہماری شریعت ہے۔ جب تک کہ ہماری شریعت کا اس پر انکار نہ ہو۔ اس واقعہ میں جسے اب ہمیں بیان کرتے ہیں۔ لکھت پڑھت کے نہ ہونے اور گواہ مقرر نہ کئے جانے پر شارع علیہ السلام نے انکار نہیں کیا۔

دیکھئے مسند میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا' بنی اسرائیل کے ایک شخص نے دوسرے شخص سے ایک ہزار دینار ادھار مانگے' اس نے کہا گواہ لاؤ' جواب دیا' خدا کی گواہی کافی ہے۔ کہا ضمانت لاؤ۔ جواب دیا خدا کی ضمانت کافی۔ کہا تو نے سچ کہا' ادائیگی کی میعاد مقرر ہو گئی اور اس نے اسے ایک ہزار دینار گن دیئے۔ اس نے بحری سفر کیا اور اپنے کام سے فارغ ہوا۔ جب میعاد پوری ہونے کو آئی تو یہ سمندر کے قریب آیا کہ کوئی جہاز کشتی وغیرہ ملے تو اس میں بیٹھ جاؤں اور رقم ادا کر آؤں لیکن کوئی جہاز نہ ملا۔ جب دیکھا کہ وقت پر نہیں پہنچ سکتا ہے تو اس نے ایک لکڑی لی' اسے بیچ میں کھوکھلی کر لی اور اس میں ایک ہزار دینار رکھ دیئے اور ایک پرچہ بھی رکھ دیا۔ پھر منہ بند کر دیا اور خدا سے دعا کی' اے پروردگار تجھے خوب علم ہے کہ میں نے فلاں شخص سے ایک ہزار دینار قرض لئے۔ اس نے مجھ سے ضمانت طلب کی۔ میں نے تجھے ضامن بنایا اور اس پر وہ خوش ہو گیا۔ گواہ مانگا' میں نے گواہ بھی تجھی کو رکھا۔ اب میں اس رقم کو تجھے سونپتا ہوں اور سمندر میں ڈال دیتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ رقم اسے

پہنچا دے۔ پھر اس لکڑی کو سمندر میں ڈال دیا اور خود چلا گیا لیکن پھر کشتی کی تلاش میں رہا کہ مل جائے تو جاؤں۔ یہاں تو یہ ہوا وہاں جس شخص نے اسے قرض دیا۔ جب اس نے دیکھا کہ وقت پورا ہوا اور آج اسے آ جانا چاہئے تو وہ بھی دریا کے کنارے آ کھڑا ہوا کہ وہ آئے گا اور میری رقم مجھے دے گا۔ یا کسی کے ہاتھ بھجوائے گا۔ مگر شام ہونے تک کوآئی اور کشتی کوئی بھی اس طرف سے نہیں آئی۔ تو یہ واپس لوٹا' کنارے پر ایک لکڑی دیکھی تو یہ سمجھ کر کہ خالی ہاتھ تو جا ہی رہا ہوں۔ آؤ اس لکڑی کو لے چلوں' پھاڑ کر سکھالوں گا۔ جلانے کے کام آئے گی۔ گھر پہنچ کر اسے جب چیرتا ہے تو کھنا کھن بجتی ہوئی اشرفیاں نکلتی ہیں' گنتا ہے تو پوری ایک ہزار ہیں' پرچہ پر بھی نظر پڑتی ہے۔ اسے بھی اٹھا کر پڑھ لیتا ہے پھر ایک دن وہی شخص آتا ہے اور ایک ہزار دینار پیش کر کے کہتا ہے یہ لیجئے آپ کی رقم۔ معاف کیجئے گا میں نے ہر چند کوشش کی کہ وعدہ خلافی نہ ہو لیکن کشتی نہ ملنے کی وجہ سے مجبور ہو گیا اور دیر لگ گئی۔ آج کشتی ملی' آپ کی یہ رقم لے کر حاضر ہوا۔ اس نے کہا کہ کیا آپ نے میری رقم بھجوائی بھی ہے۔ اس نے کہا میں تو کہہ چکا کہ مجھے کشتی نہ ملی۔ اس نے کہا اپنی رقم واپس لے لو خوش ہو کر چلے جاؤ۔ آپ نے جو رقم لکڑی میں ڈال کر توکلاً علی اللہ ڈال دی تھی اسے خدا نے مجھ تک پہنچا دیا اور میں نے اپنی پوری رقم وصول پالی اس کی سند بالکل صحیح ہے۔ صحیح بخاری شریف میں سات جگہ یہ حدیث آئی ہے۔[1]

تحریر لکھنے والوں کے لئے کچھ خاص ہدایات ☆ پھر فرمان ہے کہ لکھنے والا عدل کے ساتھ لکھے۔ کتابت میں کسی کے ساتھ ظلم نہ کرے۔ اِدھر اُدھر کچھ کمی بیشی نہ کرے۔ بلکہ لین دین والے دونوں متفق ہو کر جو لکھوائیں وہی لکھے۔ لکھا پڑھا شخص معاملہ کو لکھنے سے انکار نہ کرے۔ جب اسے لکھنے کو کہا جائے لکھ دے۔ جس طرح خدا کا یہ احسان اس پر ہے کہ اس نے اسے لکھنا سکھایا۔ اسی طرح جو لکھنا نہ جانتے ہوں۔ ان پر یہ احسان کرے اور ان کے معاملہ کو لکھ دیا کرے۔ حدیث میں ہے یہ بھی صدقہ ہے کہ کسی کام کرنے والے کا ہاتھ بٹا دے۔ کسی گرے پڑے کا کام کر دے اور حدیث میں ہے جو علم کو جان کر پھر اسے چھپائے قیامت کے دن اسے آگ کی لگام پہنچائی جائے گی۔ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت عطا رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں' کاتب پر لکھ دینا اس آیت کی رو سے واجب ہے۔ جس کے ذمہ حق ہو وہ لکھوائے اور اللہ سے ڈرے نہ کمی بیشی کرے نہ خیانت کرے۔ اگر یہ شخص بے سمجھ ہے' اسراف وغیرہ کی وجہ سے روک دیا گیا ہے یا کمزور ہے یا بچہ یا حواس درست نہیں' یا جہالت اور کند ذہنی کی وجہ سے لکھوانا بھی نہیں جانتا تو جو اس کا والی اور بڑا ہو وہ لکھوائے۔

گواہی کے کچھ خاص اصول ☆ پھر فرمایا کتابت کے ساتھ شہادت بھی ہونی چاہئے تاکہ معاملہ خوب مضبوط اور بالکل صاف ہو جائے۔ دو مردوں کو گواہ کر لیا کرو۔ اگر نہ مل سکیں تو خیر ایک مرد اور دو عورتیں سہی۔ یہ حکم مال کے اور مقصود مال کے بارے میں ہے۔ دو عورتوں کو قائم مقام ایک مرد کے کرنا سبب عورت کے عقل کے نقصان کے ہے۔ جیسے صحیح مسلم شریف میں حدیث ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے عورتو' صدقہ کرو اور بکثرت استغفار کرتی رہو۔ میں نے دیکھا کہ جہنم میں تم بہت زیادہ تعداد میں جاؤ گی۔ ایک عورت نے پوچھا' حضور صلی اللہ علیہ وسلم یہ کیوں؟ آپ نے فرمایا تم لعنت زیادہ بھیجا کرتی

---

[1] نیت اگر صحیح ہو تو اس قسم کے واقعات ناممکن نہیں لیکن توکل اور اعتبار کامل ہونا چاہئے پھر اس قسم کے نتائج اور صورتیں سامنے آ سکتی ہیں۔ نیز یہ بھی ضروری نہیں کہ ایسی صورتوں میں ہمیشہ اس قسم کے نتائج سامنے آ جائیں بلکہ گاہے گاہے قدرت اس قسم کے مظاہرے کچھ خاص قسم کی مصالح کے تحت کرتی ہے۔ ۱۲

ہو اور اپنے خاوندوں کی ناشکری کرتی ہو۔ میں نے نہیں دیکھا کہ باوجود عقل و دین کی کمی کے مردوں کی عقل مارنے والی تم سے زیادہ کوئی ہو۔ اس نے پھر پوچھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہم میں دین کی اور عقل کی کمی کیسے ہے؟ فرمایا عقل کی کمی تو اس سے ظاہر ہے کہ دو عورتوں کی گواہی ایک مرد کی گواہی کے برابر ہے اور دین کی کمی یہ ہے کہ ایام حیض میں نہ نماز ہے نہ روزہ[1]۔ گواہوں کی نسبت فرمایا کہ یہ شرط ہے کہ وہ عدالت والے ہوں۔ امام شافعی کا مذہب ہے کہ جہاں کہیں قرآن شریف میں گواہ کا ذکر ہے۔ وہاں عدالت کی شرط ضروری ہے گو وہاں لفظوں میں نہ ہو اور جن لوگوں نے انکی گواہی رد کر دی ہے جن کا عادل ہونا معلوم نہ ہو۔ انکی دلیل بھی یہی آیت ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ گواہ عادل اور پسندیدہ ہونا چاہئے۔ دو عورتیں مقرر کرنے کی حکمت بھی بیان کر دی کہ اگر ایک گواہی کو بھول جائے تو دوسری یاد دلا دے گی۔ فَتُذَكِّرَ کی دوسری قراءت فَتُذْكِرَ بھی ہے۔ جو لوگ کہتے ہیں کہ اسکی شہادت اس کے ساتھ مل کر مثل شہادت مرد کے کر دے گی۔ انہوں نے تکلف کیا ہے۔ صحیح بات پہلی ہی ہے واللہ اعلم۔

گواہوں کو چاہیے کہ وہ جب بلائے جائیں تو انکار نہ کریں یعنی جب ان سے کہا جائے کہ آؤ اس معاملہ پر گواہ رہو تو انہیں انکار نہ کرنا چاہئے۔ جیسے کاتب کی بابت بھی یہی فرمایا گیا ہے۔ یہاں سے یہ بھی فائدہ حاصل کیا گیا ہے کہ گواہ رہنا بھی فرض کفایہ ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ جمہور کا مذہب یہی ہے اور یہ معنی بھی بیان کئے گئے ہیں کہ جب گواہ گواہی دینے کے لئے طلب کیا جائے یعنی جب اس سے واقعہ پوچھا جائے تو وہ بیان کرنے سے انکار نہ کرے۔ چنانچہ حضرت ابومجلز مجاہد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جب گواہ رہنے کے لئے تو تمہیں اختیار ہے خواہ جاؤ خواہ نہ جاؤ۔ لیکن جب گواہ ہو چکے پھر گواہی دینے کے لئے جب بلایا جائے تو ضرور جانا پڑے گا۔ صحیح مسلم اور سنن کی حدیث میں ہے 'اچھے گواہ وہ ہیں جو بے پوچھے ہی گواہی دے دیا کریں۔ صحیحین کی دوسری حدیث میں جو آیا ہے کہ بدترین گواہ وہ ہیں جن سے گواہی طلب نہ کی جائے اور وہ گواہی دینے بیٹھ جائیں اور وہ حدیث جس میں ہے کہ پھر ایسے لوگ آئیں گے جن کی قسمیں گواہیوں پر اور گواہیاں قسموں پر پیش پیش رہیں گی اور روایت میں آیا ہے کہ ان سے گواہی نہ لی جائے گی تاہم وہ گواہی دیں گے۔ تو یاد رہے کہ یہ مذمت جھوٹی گواہی دینے والوں کی ہے اور وہ تعریف سچی گواہی دینے والی کی ہے اور یہی تطبیق ہے ان مختلف حدیثوں میں۔ حضرت ابن عباسؓ وغیرہ فرماتے ہیں' آیت دونوں حالتوں کو شامل ہے۔ یعنی گواہی دینے کے لئے بھی اور گواہ رہنے کے لئے بھی' انکار نہ کرنا چاہئے۔

پھر فرمایا چھوٹا معاملہ ہو یا بڑا لکھنے سے کسمساؤ نہیں۔ مدت وغیرہ لکھ لیا کرو۔ ہمارا یہ حکم پورے عدل والا اور گواہی کو خوب ثابت رکھنے والا ہے کیونکہ اپنی تحریر دیکھ کر بھولی بسری بات بھی یاد آ جاتی ہے۔ نہ لکھا ہو تو ممکن ہے کہ بھول ہو جائے جیسے اکثر ہوتا ہے اور اس میں شک و شبہ کے نہ ہونے کا بھی زیادہ موقع ہے کیونکہ اختلاف کے وقت تحریر دیکھ سکتے ہیں اور بغیر شک و شبہ فیصلہ ہو سکتا ہے۔ پھر فرمایا جبکہ نقد خرید و فروخت ہو رہی ہو تو چونکہ باقی کچھ نہیں رہتا۔ اس لئے اگر نہ لکھا جائے تو کسی جھگڑے کا احتمال نہیں۔ پس کتاب تو گھٹا دی۔ اب رہی شہادت تو سعید بن مسیب رضی اللہ تعالیٰ عنہ تو فرماتے ہیں کہ اُدھار ہو یا نہ ہو ہر حال میں اپنے حق پر گواہ کر لیا کرو۔ دیگر بزرگوں سے نقل ہے کہ: فان امن...... فرما کر اس حکم کو بھی ختم کر دیا۔ یہ بھی ذہن نشین رہے کہ جمہور کے نزدیک یہ حکم واجب نہیں۔ بلکہ استحباب کے طور پر اچھائی کے لئے ہے اور اس کی دلیل یہ حدیث ہے جس سے ظاہر ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خرید و فروخت کی اور گواہ شاہد نہ تھا۔ چنانچہ مسند احمد میں ہے کہ آپ صلی اللہ

[1] یہ اگرچہ خلقی وفطری مجبوریاں ہیں' تاہم صنف نازک کی کمزوری اور خلق نزاکت پر اس سے استدلال میں کوئی حرج بھی نہیں۔ ۱۲

علیہ وسلم نے ایک اعرابی سے ایک گھوڑا خریدا اور اعرابی آپ کے پیچھے پیچھے آپ کے دولت خانہ کی طرف رقم لینے کے لئے چلا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تو ذرا جلد نکل گئے اور وہ آہستہ آہستہ آ رہا تھا۔ لوگوں کو یہ تو معلوم نہ تھا کہ یہ گھوڑا بک گیا ہے۔ انہوں نے قیمت لگانی شروع کر دی یہاں تک کہ جتنے داموں اس نے آپ کے ہاتھ بیچا تھا' اس سے زیادہ دام لگ گئے۔ اعرابی کی نیت پلٹی اور اس نے آپ کو آواز دے کر کہا' حضرت یا تو لے لیجئے یا میں اور کے ہاتھ بیچ دیتا ہوں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم یہ سن کر رک گئے اور فرمانے لگے تو اسے میرے ہاتھ بیچ چکا ہے۔ پھر یہ کیا کہہ رہا ہے؟ اس نے کہا نہیں اللہ کی قسم میں نے تو نہیں بیچا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا غلط کہتا ہے میرے تیرے درمیان معاملہ ہو چکا ہے۔ اب لوگ ادھر ادھر سے بیچ میں بولنے لگے۔ اس گنوار نے کہا' اچھا تو گواہ لائیے کہ میں نے آپ کے ہاتھ بیچ دیا۔ مسلمانوں نے ہر چند کہا کہ بدبخت آپ تو خدا کے پیغمبر ہیں۔ آپ کی زبان سے تو حق ہی نکلتا ہے لیکن وہ یہی کہتا رہا کہ لاؤ گواہ پیش کرو۔ اتنے میں حضرت خزیمہ رضی اللہ عنہ آ گئے اور اعرابی کے اس قول کو سن کر فرمانے لگے' میں گواہی دیتا ہوں کہ تو نے بیچ دیا ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ تو فروخت کر چکا ہے۔ آپ نے فرمایا تو کیسے شہادت دے رہا ہے؟ حضرت خزیمہؓ نے فرمایا کہ آپ کی سچائی اور تصدیق کی بنا پر چنانچہ آپ نے فرما دیا کہ آج سے حضرت خزیمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی گواہی دو گواہوں کے برابر ہے۔[1]

پس اس حدیث سے خرید و فروخت پر گواہی ضروری نہ رہی لیکن احتیاط اسی میں ہے کہ تجارت پر بھی گواہ ہوں کیونکہ ابن مردویہ اور حاکم میں ہے کہ تین شخص ہیں جو اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں لیکن قبول نہیں کی جاتی۔ ایک تو وہ جس کے گھر بداخلاق عورت ہو اور وہ اسے طلاق نہ دے[2]۔ دوسرا وہ شخص جو کسی یتیم کا مال اس کی بلوغت سے پہلے اسے سونپ دے۔ تیسرا وہ شخص جو کسی کو مال قرض دے اور گواہ نہ رکھے۔ امام حاکم اسے شرط صحیحین پر بتلاتے ہیں۔ بخاری و مسلم اس لئے اسے نہیں لائے کہ شعبی کے شاگرد اس روایت کو حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر موقوف بتلاتے ہیں پھر فرماتے ہیں کہ کاتب کو چاہئے کہ لکھوانے کے خلاف نہ لکھے اور گواہ کو چاہئے کہ وہ واقعہ کے خلاف گواہی نہ دے نہ گواہی کو چھپائے۔ حسن قتادہ رحمتہ اللہ علیہ وغیرہ کا یہی قول ہے۔ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما یہ مطلب بیان کرتے ہیں کہ دونوں کو ضرر نہ پہنچایا جائے۔ مثلاً انہیں بلانے کے لئے گئے۔ وہ کسی اپنے کام کاج میں مشغول ہیں۔ تو یہ کہنے لگے کہ تم پر یہ فرض ہے اپنا ہرج کرو اور چلو۔ یہ حق انہیں نہیں اور بہت سے لوگوں سے بھی یہ مروی ہے۔ پھر ارشاد ہوتا ہے کہ میں جس سے روکوں اس کا کرنا جس کے کرنے کو کہوں اس سے رک جانا' یہ بدکاری ہے۔ جس کا وبال تم سے چھٹے گا نہیں۔ پھر فرمایا اللہ سے ڈرو۔ اس کا لحاظ رکھو۔ اس کی فرمانبرداری کرو۔ اس کے منہیات سے رک جاؤ۔ اللہ تعالیٰ تمہیں سمجھا رہا ہے۔ جیسے اور جگہ فرمایا: ﴿يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنْ تَتَّقُوا اللَّهَ يَجْعَلْ لَكُمْ فُرْقَانًا﴾ (الانفال: ۲۹) اے ایمان والو! اگر تم اللہ سے ڈرتے رہو گے تو وہ تمہیں ہدایت کی روشنی دے دے گا اور جگہ ہے ایمان والو اللہ سے ڈرو' اس کے رسول پر ایمان رکھو وہ تمہیں دوہری رحمتیں دے گا اور وہ تمہیں وہ نور عطا فرمائے گا۔ جس کی روشنی میں تم چلتے رہو گے۔

---

[1] آپ کا یہ ارشاد حضرت خزیمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی صداقت بیانی کی بنا پر ہے۔ آج بھی ایک صادق القول شخص کا بیان سینکڑوں کے مقابلے میں ترجیح کے قابل سمجھا جاتا ہے۔ انظر شاہ

[2] ہر بداخلاق عورت کو طلاق دینا ضروری نہیں ہاں اگر اس کے افعال سے پورے گھرانے اور معاشرہ کو کوئی تباہ کن نقصان پہنچ رہا ہو تو پھر علیحدہ کرنا ہی اچھا ہے۔ ۱۲

پھر فرمایا تمام کاموں کے انجام اور حقیقت سے ان مصلحتوں اور دور اندیشوں سے خدا آگاہ ہے۔ اس سے کوئی چیز مخفی نہیں اس کا علم تمام کائنات کو گھیرے ہوئے ہے اور ہر چیز کا اسے حقیقی علم ہے۔[1]

وَاِنْ كُنْتُمْ عَلٰى سَفَرٍ وَّلَمْ تَجِدُوْا كَاتِبًا فَرِهٰنٌ مَّقْبُوْضَةٌ ؕ فَاِنْ اَمِنَ بَعْضُكُمْ بَعْضًا فَلْيُؤَدِّ الَّذِى اؤْتُمِنَ اَمَانَتَهٗ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ ؕ وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ ؕ وَمَنْ يَّكْتُمْهَا فَاِنَّهٗۤ اٰثِمٌ قَلْبُهٗ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ ﴿۲۸۳﴾

اور اگر تم کہیں سفر میں ہو اور (وہاں) کوئی کاتب نہ پاؤ سورہن رکھنے کی چیزیں (ہیں) جو قبضہ میں دے دی جائیں اور اگر ایک دوسرے کا اعتبار کرتا ہو تو جس شخص کا اعتبار کر لیا گیا ہو (یعنی مدیون) اس کو چاہئے کہ دوسرے کا حق پورا پورا ادا کر دے اور اللہ تعالیٰ سے جو کہ اس کا پروردگار ہے ڈرتے رہو اور شہادت کا اخفا مت کرو اور جو شخص اس کا اخفا کرے اس کا قلب گنہگار ہوگا اور اللہ تعالیٰ تمہارے گئے ہوئے کاموں کو خوب جانتا ہے۔○

سفر میں احکام یہ ہیں ☆

یعنی حالت سفر میں اگر اُدھار کا لین دین ہوگا اور کوئی لکھنے والا نہ ملے یا ملے مگر قلم دوات یا کاغذ نہ ہو تو رہن رکھ لیا کرو اور جس چیز کو رہن رکھنا ہو۔ اس حقدار کے قبضہ میں دے دو۔ مَقْبُوْضَةٌ کے لفظ سے استدلال کیا گیا ہے کہ رہن جب تک قبضہ میں نہ آ جائے لازم نہیں ہوتا جیسے کہ امام شافعی رحمتہ اللہ علیہ اور جمہور کا مذہب ہے اور دوسری جماعت نے استدلال کیا ہے کہ رہن کا مرتہن کے ہاتھ میں مقبوض ہونا ضروری ہے۔ امام احمد رحمتہ اللہ علیہ اور ایک دوسری جماعت سے یہی منقول ہے۔ ایک اور جماعت کا قول ہے کہ رہن صرف سفر میں ہی مشروع ہے جیسے مجاہد وغیرہ لیکن صحیح بخاری صحیح مسلم شریف میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس وقت فوت ہوئے اس وقت آپ کی زرہ مدینے کے ایک یہودی ابوالشحم کے پاس تیس وسق جو کے بدلے گروی تھی' جو آپ نے اپنے گھر والوں کے کھانے کے لئے تھے۔ ان مسائل کے بسط و تفصیل کی جگہ تفسیر نہیں۔ بلکہ احکام کی بڑی بڑی کتابیں ہیں۔ وَلِلّٰهِ الْحَمْدُ وَالْمِنَّةُ وَبِهِ الْمُسْتَعَانُ۔ اس کے بعد کے جملے: ﴿فَاِنْ اَمِنَ......﴾ حضرت ابوسعید خدریؓ فرماتے ہیں کہ اس کے پہلے کا حکم منسوخ ہو گیا۔ شعبی فرماتے ہیں۔ جب نہ دینے کا خوف نہ ہو تو نہ لکھنے اور نہ گواہ رکھنے میں کوئی حرج نہیں۔ جسے امانت دی جائے اسے خوف خدا رکھنا چاہئے۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ ہاتھ پر ہے جو اس نے لیا' جب تک کہ ادا نہ کرے۔ شہادت کو نہ چھپاؤ۔ نہ اس میں خیانت کرو۔ نہ اس کے اظہار کرنے سے رکو۔

ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں جھوٹی شہادت دینی یا شہادت کو چھپانا کبیرہ گناہ ہے۔ یہاں بھی فرمایا' اس کا چھپانے والا خطا کار دل کا ہے جیسے اور جگہ ہے: وَلَا نَكْتُمُ شَهَادَةَ اللّٰهِ اِنَّاۤ اِذًا لَّمِنَ الْاٰثِمِيْنَ ۞ (المائدۃ:۱۰۶) یعنی ہم اللہ کی شہادت کو نہیں چھپاتے اگر ہم ایسا کریں تو یقیناً ہم گنہگاروں میں سے ہیں اور جگہ فرمایا' ایمان والوں عدل و انصاف کے ساتھ خدائی گواہیوں پر ثابت قدم رہو گو اس کی برائی خود تمہیں پہنچے یا تمہارے ماں باپ کو یا رشتے کنبے والوں کو۔ اگر وہ مالدار ہو اور

[1] اس سے جو ادھر مدنیے جارہے ہیں' اس میں دو مصالح ملحوظ ہیں جن سے معاہدہ کی فلاح وابستہ ہے۔ ۱۲

فقیر ہو تو۔ اللہ تعالیٰ ان دونوں سے اولیٰ ہے۔ خواہشوں کے پیچھے پڑ کر عدل سے نہ ہٹو۔ اگر تم زبان دباؤ گے یا پہلو تہی کرو گے تو سمجھ لو کہ اللہ بھی تمہارے اعمال سے خبردار ہے۔ اسی طرح یہاں بھی فرمایا کہ گواہی کو نہ چھپاؤ۔ اس کا چھپانے والا گنہگار دل والا ہے اور اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال کو خوب جانتا ہے۔

لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِيْۤ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ ؕ فَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۲۸۴﴾

اللہ تعالیٰ ہی کی ملک ہیں سب جو کچھ آسمانوں میں ہیں اور جو کچھ زمین میں ہیں اور جو باتیں تمہارے نفسوں میں ہیں ان کو اگر تم ظاہر کرو گے یا پوشیدہ رکھو گے حق تعالیٰ تم سے حساب لیں گے۔ پھر (بجز کفر و شرک کے) جس کے لئے منظور ہوگا بخش دیں گے اور جس کو منظور ہوگا سزا دیں گے اور اللہ تعالیٰ ہر شے پر پوری قدرت رکھنے والا ہے۔ ○

دلوں کے راز پر بھی خدا تعالیٰ مطلع ہے ☆

یعنی زمین و آسمان کا مالک اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ چھوٹی موٹی چھپی کھلی کا وہ جاننے والا ہے ہر چھپے کھلے کا وہ حساب لینے والا ہے۔ جیسے اور جگہ فرمایا: ﴿قُلْ اِنْ تُخْفُوْا مَا فِيْ صُدُوْرِكُمْ اَوْ تُبْدُوْهُ يَعْلَمْهُ اللّٰهُ...... ﴾ (آل عمران: ۲۹) کہہ دے کہ تمہارے سینوں میں جو کچھ ہے۔ اسے خواہ تم چھپاؤ یا ظاہر کرو۔ اللہ تعالیٰ کو اس کا بخوبی علم ہے وہ آسمان و زمین کی ہر چیز کا علم رکھتا ہے اور ہر چیز پر قادر ہے اور جگہ فرمایا ہے' وہ چھپی چیزوں کو اور علانیہ کو خوب جانتا ہے اور بھی اس معنی میں بہت آیتیں ہیں۔ یہاں اس کے ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ وہ اس پر حساب لے گا۔ جب یہ آیت نازل ہوئی تو صحابہ پر دہشت طاری ہوگئی کہ چھوٹی بڑی تمام چیزوں کا حساب ہوگا اور اپنے ایمان کی زیادتی اور یقین کی پختگی کی وجہ سے وہ کانپ اُٹھے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آ کر عاجزی سے عرض پیرا ہوئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نماز' روزہ' جہاد' صدقہ وغیرہ کا تو ہمیں حکم ہوا جو ہماری طاقت میں تھا لیکن اب جو یہ آیت اُتری ہے' اس کی برداشت کی طاقت تو ہم میں نہیں۔ آپ نے فرمایا' پھر کیا تم یہود و نصاریٰ کی طرح یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ہم نے سنا اور نہیں مانا۔ تمہیں چاہئے کہ یوں کہو کہ ہم نے سنا اور مانا' خدایا ہم تیری بخشش چاہتے ہیں۔ ہمارے رب ہمیں تو تیری ہی طرف لوٹنا ہے۔ چنانچہ صحابہ کرام نے اسے تسلیم کرلیا اور زبانوں پر یہ کلمات جاری ہوگئے تو آیت: ﴿اٰمَنَ الرَّسُوْلُ ﴾ اُتری اور اللہ تعالیٰ نے اس تکلیف کو دور کر دیا اور آیت: ﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ ﴾ نازل ہوئی (مسند احمد) صحیح مسلم میں بھی یہ حدیث ہے' اس میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ تکلیف اٹھا کر آیت: ﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ ﴾ اتاری اور جب مسلمانوں نے کہا کہ خدایا ہماری بھول چوک اور خطا پر ہماری پکڑ نہ کر تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا نَعَم یعنی میں یہی کروں گا۔ انہوں نے کہا: ﴿رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ...... ﴾ خدایا ہم پر یہ بوجھ نہ ڈال' جو ہم سے اگلوں پر ڈالا[1]۔ اللہ تعالیٰ نے یہ بھی فرمایا۔ پھر کہا'

[1] امم سابقہ پر ان کے مزاج' سخت طبیعتوں اور جسمانی طاقتوں کے پیش نظر خدا تعالیٰ کے احکام بھی سخت ہوئے۔ امت محمدیہ کے مزاج کو سامنے رکھ کر احکام نرم کا مکلف قرار دیا گیا۔ یہ مطلب ہرگز نہیں کہ خدا تعالیٰ نے پہلی امتوں پر ظلماً احکام سخت عائد کئے تھے۔ والعیاذ باللہ۔

﴿رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا ...... ﴾ خدایا ہم پر ہماری طاقت سے زیادہ بوجھ نہ ڈال۔ اسے بھی قبول کیا گیا۔ پھر دعا مانگی خدایا ہمیں معاف فرما دے ہمارے گناہ بخش دے اور کافروں کے مقابلہ میں ہماری مدد کیجئے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے قبول فرمایا۔ یہ حدیث اور بھی بہت سے طریق سے روایت ہے۔

ایک روایت میں یہ بھی ہے۔ حضرت مجاہد رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں' میں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے جا کر واقعہ بیان کیا کہ حضرت عبداللہ بن عمر نے اس آیت: ﴿وَاِنْ تُبْدُوْا﴾ کی تلاوت فرمائی اور بہت روئے۔ آپ نے فرمایا' یہی حال صحابہ کا اس کے نازل ہونے کے وقت تھا۔ وہ سخت غمگین ہو گئے اور یہ بھی کہا کہ دلوں کے مالک ہم دل کے خیالات پر بھی پکڑے گئے تو بڑی مشکل ہے آپ نے فرمایا: ﴿سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا﴾ کہو۔ چنانچہ صحابہ نے کہا اور پھر بعد والی آیتیں نازل ہوئیں اور عمل پر تو حساب باقی رہا لیکن دل کے خطرات اور نفس کے وسوسے سے محاسبہ ختم ہو گیا۔ دوسرے طریق سے یہ روایت ابن مرہانہ سے بھی اسی طرح ہے اور اس میں یہ بھی ہے کہ قرآن نے فیصلہ کر دیا کہ تم سے اپنے نیک و بد اعمال پر حساب کتاب ہو گا۔ خواہ زبان کے ہوں' خواہ اور اعضا کے ہوں لیکن دلی وسواس معاف ہیں اور بھی بہت سے اصحاب اور تابعین سے اس کا منسوخ ہونا نقل ہے۔ صحیح حدیث میں ہے اللہ تعالیٰ نے میری اُمت کے دلی خیالات سے درگزر فرما لیا۔ پکڑ اسی پر ہے جو کہیں یا کریں بخاری مسلم میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالیٰ فرماتا ہے' جب میرا بندہ برائی کا ارادہ کرے تو اسے مت لکھو جب تک کر نہ گزرے۔ کر گزرے تو ایک برائی لکھو اور جب نیکی کا ارادہ کرے تو صرف ارادہ ہی سے نیکی لکھ لو اور اگر نیکی کر بھی لے تو ایک کے بدلے دس نیکیاں لکھو[1] (مسلم) اور روایت میں ہے کہ ایک نیکی کے بدلے سات سو تک لکھی جاتی ہیں۔[2] اور روایت میں ہے کہ جب بندہ برائی کا ارادہ کرتا ہے تو فرشتے جناب باری میں عرض کرتے ہیں کہ خدایا تیرا بندہ بدی کرنا چاہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے رکے رہو جب تک نہ کر لے۔ اس کے نامہ اعمال میں نہ لکھو۔ اگر کر لے تو ایک لکھنا اور اگر چھوڑ دے تو ایک نیکی لکھ لینا کیونکہ مجھ سے ڈر کر چھوڑتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں جو پختہ اور پورا مسلمان بن جائے۔ اس کی ایک ایک نیکی کا ثواب دس سے لے کر سات سو تک بڑھتا جاتا ہے اور برائی نہیں بڑھتی اور روایت میں ہے کہ سات سو سے بھی کبھی کبھی نیکی بڑھا دی جاتی ہے۔ ایک اور روایت میں یہ بھی ہے کہ برباد ہونے والا وہ ہے جو باوجود اس رحم و کرم کے بھی برباد ہو۔ ایک مرتبہ اصحابؓ نے آ کر کہا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کبھی کبھی تو ہمارے دل میں ایسے وسوسے اُٹھتے ہیں کہ زبان سے ان کا بیان کرنا بھی ہم پر گراں گزرتا ہے۔ آپ نے فرمایا ایسا ہونے لگا؟ انہوں نے کہا ہاں' آپ نے فرمایا یہ صریح ایمان ہے۔[3]
(مسلم وغیرہ)

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے یہ بھی روایت ہے کہ یہ آیت منسوخ نہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ قیامت کے دن جب ساری مخلوق کو اللہ تعالیٰ جمع کرے گا۔ تو فرمائے گا کہ میں تمہیں تمہارے دلوں کے بھید بتلاتا ہوں۔ جس پر میرے

۱۔ یہ ان کی رحمت ہے

۲۔ یہ ارحم الراحمین ہونے کا تقاضا ہے۔

۳۔ مطلب یہ ہے کہ اگر خدا کی عظمت' ہیبت اور کبریائی کا یقین تمہارے قلوب میں جاگزیں نہ ہوتا تو اپنی اس خیال کے اظہار میں تم کوئی تکلیف محسوس نہ کرتے اور جب ان خیالات کی اظہار کی تم میں جرأت نہیں تو معلوم ہوا کہ خدائے سمیع و بصیر کی عظمت کے جذبات سے قلب معمور ہے اور یہی ایمان اور اس کی علامت ہے۔

فرشتے بھی آگاہ نہیں۔ مومنوں کو تو خبر دے کر پھر معاف کر دے گا ہاں منافق اور شک وشبہ والے لوگوں کو ان کی تکذیب کی پوشیدگی پر اطلاع دے کر پھر ان کی پکڑ ہو گی جیسے اور جگہ ہے: وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوْبُكُمْ (البقرہ ۲۲۵) یعنی اللہ تعالیٰ تمہیں تمہارے دل کے وساوس پر پکڑے گا۔ یعنی دلی شک اور دلی نفاق پر۔ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ بھی اسے منسوخ نہیں کہتے۔ امام ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ بھی اسی قول کو پسند کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ حساب اور چیز ہے عذاب اور چیز ہے۔ حساب ہونے پر عذاب ضروری نہیں ہو سکتا کہ حساب لے کر معاف کر دیا جائے اور سزا دی جائے چنانچہ ایک حدیث میں ہے کہ ہم طواف کر رہے تھے کہ ایک شخص نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے پوچھا کہ تم نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سرگوشی کے متعلق کیا سنا ہے۔ آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ ایمان والے کو اپنے پاس بلا لے گا۔ یہاں تک کہ اپنا بازو[1] اس کے اوپر رکھ دے گا۔ پھر اس سے کہے گا بتا تو نے فلاں فلاں گناہ کیا؟ وہ غریب اقرار کرتا جائے گا۔ جب بہت سے گناہوں کا اقرار کر لے گا تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا۔ سن دنیا میں بھی میں نے تیرے ان عیوب کی پردہ پوشی کی اور اب آج کے دن میں ان تمام گناہوں کو معاف فرمائے دیتا ہوں۔ اب اسے اس کی نیکیوں کا صحیفہ اس کے داہنے ہاتھ میں دے دیا جائے۔ ہاں البتہ کفار و منافق کو تمام مجمع کے سامنے رسوا کیا جائے گا۔ ان کے گناہ ظاہر کئے جائیں گے اور پکار دیا جائے کہ یہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے رب پر جھوٹ باندھا۔ ان ظالموں پر خدا کی پھٹکار ہے۔ (بخاری)

حضرت زید رحمۃ اللہ علیہ نے ایک مرتبہ اس آیت کے بارے میں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے سوال کیا تو آپ نے فرمایا' جب سے میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بارے میں پوچھا ہے تب سے لے کر آج تک مجھ سے کسی شخص نے نہیں پوچھا۔ آج تو نے پوچھا ہے۔ سن اس سے مراد بندے کو دنیوی تکلیفیں مثلاً بخار وغیرہ تکلیفیں پہنچنا ہے۔ یہاں تک کہ مثلاً ایک جیب میں نقدی رکھی ہے اور خیال رہا کہ اس کی دوسری جیب میں ہے ہاتھ ڈالا وہاں نہ نکلی۔ دل پر چوٹ سی پڑی۔ پھر دوسری جیب میں ہاتھ ڈالا وہاں سے مل گئی۔ اسی پر بھی اس کے گناہ معاف ہوتے ہیں یہاں تک کہ وہ مرنے کے وقت گناہوں سے اس طرح پاک ہو جاتا ہے جس طرح خالص سونا ہو۔ ترمذی وغیرہ میں یہ حدیث غریب ہے۔

اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَ الْمُؤْمِنُوْنَ ؕ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ ۟ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ ۟ وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۫ غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ ﴿۲۸۵﴾ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ؕ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ ؕ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِيْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ اِصْرًا

[1] خدا تعالیٰ کا ہمارے جیسا جسم نہیں ہے یہ سب تعبیرات ہمیں سمجھانے کیلئے اختیار کی ہیں۔ اس سے پرہیز نہ سمجھنا کہ اسکے بازو' ہاتھ' آنکھ' کان' ناک وغیرہ ہیں اہلسنت کے مسلک کے خلاف ہے۔

كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ ۚ وَاعْفُ عَنَّا ۗ وَاغْفِرْ لَنَا ۗ وَارْحَمْنَا ۗ اَنْتَ مَوْلٰىنَا فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۸۶﴾

اعتقاد رکھتے ہیں رسول صلی اللہ علیہ وسلم اس چیز کا جو ان کے پاس ان کے رب کی طرف سے نازل کی گئی ہے اور مؤمنین بھی سب کے سب عقیدہ رکھتے ہیں اللہ کے ساتھ اور اس کے فرشتوں کے ساتھ اور اس کی کتابوں کے ساتھ اور اس کے پیغمبروں کے ساتھ کہ ہم اس کے سب پیغمبروں میں سے کسی کو تفریق نہیں کرتے اور ان سب نے یوں کہا کہ ہم نے (آپ کا ارشاد) سنا اور خوشی سے مانا۔ ہم آپ کی بخشش چاہتے ہیں اے ہمارے پروردگار اور آپ ہی کی طرف (ہم سب کو) لوٹنا ہے۔ اللہ تعالیٰ کسی شخص کو مکلف نہیں بناتا مگر اس کا جو اس کی طاقت اور اختیار میں ہو۔ اس کو ثواب بھی اس کا ہوتا ہے جو ارادہ سے کرے اور اس پر عذاب بھی اسی طرح کا ہوگا جو ارادہ سے کرے اے ہمارے رب ہم پر دارو گیر نہ کر اگر ہم بھول جائیں یا چوک جائیں۔ اے ہمارے رب اور ہم پر کوئی سخت حکم نہ بھیجئے جیسے کہ ہم سے پہلے لوگوں پر آپ نے بھیجے تھے اور اے ہمارے رب اور ہم پر کوئی ایسا بار (دنیا و آخرت کا) نہ ڈالئے جس کی ہم کو سہار نہ ہو اور درگزر کیجئے ہم سے اور بخشش دیجئے ہم کو اور رحم کیجئے ہم پر آپ ہمارے کارساز ہیں اور کارساز طرفدار ہوتا ہے سو آپ ہم کو کافر لوگوں پر غالب کیجئے۔ ○

سورۂ بقرہ کا اختتام' تمام مضامین کا اجمالی بیان اور بعض حقائق پر ایک مکمل تبصرہ ☆

ان دونوں آیتوں کی فضیلت کی حدیثیں سنیے۔ صحیح بخاری میں ہے جو شخص ان دونوں آیتوں کو رات کو پڑھ لے' اسے یہ دونوں کافی ہیں۔ مسند احمد میں ہے' میں سورہ بقرہ کے خاتمہ کی آیتیں عرش تلے کے خزانہ سے دیا گیا ہوں۔ مجھ سے پہلے کسی نبی کو یہ نہیں دیا گیا۔ صحیح مسلم شریف میں ہے کہ جب حضور کو معراج کرائی گئی اور سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچے' جو ساتویں آسمان میں ہے' جو چیز آسمان کی طرف چڑھتی ہے' وہ یہیں تک پہنچتی ہے اور یہاں سے لے لی جاتی ہے اور جو چیز اوپر سے اترتی ہے وہ بھی یہیں تک پہنچتی ہے پھر یہاں سے لے لی جاتی ہے۔ اسے سونے کی ٹڈیاں ڈھکے ہوئے تھیں۔ وہاں حضور کو تین چیزیں دی گئیں۔ پانچوں وقت کی نمازیں سورہ بقرہ کے خاتمہ کی آیتیں اور توحید والوں کے تمام گناہوں کی بخشش۔ مسند میں ہے کہ حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا سورہ بقرہ کی ان دونوں آخری آیتوں کو پڑھتے رہا کرو' مجھے یہ عرش کے نیچے کے خزانوں سے دی گئی ہیں۔ ابن مردویہ میں ہے کہ ہمیں لوگوں پر تین فضیلتیں دی گئی ہیں۔ میں سورۂ بقرہ کی یہ آخری آیتیں عرش تلے کے خزانے سے دیا گیا ہوں۔ جو نہ میرے پہلے کسی کو دی گئیں۔ نہ میرے بعد کسی کو دی جائیں گی۔ ابن مردویہ میں ہے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں' میں نہیں جانتا کہ اسلام کے جاننے والوں سے کوئی شخص آیت الکرسی اور سورہ بقرہ کی آخری آیتیں پڑھے بغیر سو جائے۔ یہ وہ خزانہ ہے جو تمہارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو عرش تلے کے خزانے سے دیا گیا ہے اور حدیث ترمذی میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آسمان و زمین کو پیدا کرنے سے دو ہزار برس پہلے ایک کتاب لکھی۔ جس میں دو آیتیں اتار کر سورہ بقرہ ختم کی۔ جس گھر میں یہ تین راتوں تک پڑھی جائیں اس گھر کے قریب بھی

شیطان نہیں جا سکتا۔ امام ترمذی اسے غریب بتلاتے ہیں لیکن حاکم اپنی مستدرک میں اسے صحیح کہتے ہیں۔

ابن مردویہ میں ہے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم سورہ بقرہ کا خاتمہ اور آیت الکرسی پڑھتے تو ہنس دیتے اور فرماتے' یہ دونوں رحمٰن کے عرش تلے کا خزانہ ہیں اور جب آیت: ﴿مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا يُّجْزَ بِهٖ﴾ (النساء ۱۲۳) اور آیت: ﴿وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى وَاَنَّ سَعْيَهٗ سَوْفَ يُرٰى ثُمَّ يُجْزٰىهُ الْجَزَآءَ الْاَوْفٰى﴾ (النجم ۴۱) پڑھتے۔ تو زبان سے: انا للہ وانا الیہ راجعون' نکل جاتا اور ست ہو جاتے۔ ابن مردویہ میں ہے' مجھے سورہ فاتحہ اور سورہ بقرہ کی آخری آیتیں عرش کے نیچے سے دی گئی ہیں اور مفصل کی سورتیں اور زیادہ ہیں۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ حضرت جبرئیل علیہ السلام بھی تھے کہ اچانک ایک دہشت ناک بہت بڑے دھماکے کی آواز آسمان سے آئی۔ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے اوپر کو آنکھیں اٹھائیں اور فرمایا آسمان کا یہ دروازہ کھلا ہے جو آج تک کبھی نہیں کھلا تھا۔ اس سے ایک فرشتہ اُترا۔ اس نے حضور ﷺ سے کہا کہ آپ خوش ہو جائیے' آپ کو وہ دو نور دیئے جاتے ہیں جو آپ سے پہلے کسی نبی کو نہیں دیئے گئے۔ سورہ فاتحہ اور سورۂ بقرہ کی آخری آیتیں' ان میں سے ایک ایک حرف پر آپ کو نور دیا جائے گا۔ (مسلم)

پس یہ دس حدیثیں ان مبارک آیتوں کی فضیلت میں ہیں۔ مطلب آیت کا یہ ہے کہ رسول یعنی حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم اس پر ایمان لائے' جو اہل ایمان کی طرف سے ان کے رب کی جانب سے نازل ہوا' اسے اُن کر آپ نے فرمایا وہ ایمان لانے کو پورا مستحق تھا اور دوسرے ایماندار بھی ایمان لائے۔ ان سب نے مان لیا کہ اللہ اکیلا ہے وہ وحدانیت والا ہے وہ تنہا ہے وہ بے نیاز ہے۔ اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں' نہ اس کے سوا کوئی پالنہار ہے۔ یہ تمام انبیاء کو مانتے ہیں۔ تمام رسولوں پر ایمان رکھتے ہیں آسمانی کتابوں کو سچی مانتے ہیں جو انبیاء کرام پر اُتری ہیں۔ وہ نبیوں میں جدائی نہیں کرتے کہ ایک کو نہ مانیں بلکہ سب کو سچا جانتے ہیں اور ایمان رکھتے ہیں کہ وہ پاکباز' طبقہ رشد و ہدایت والا اور لوگوں کی خیر کی رہبری کرنے والا ہے۔ گو بعض بعض احکام ہر نبی کے زمانہ میں ادل بدل ہوتے رہے یہاں تک کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت سب کی ناسخ ٹھہری۔ خاتم انبیاء و مرسلین آپ تھے۔ قیامت تک کی شریعت باقی رہے گی اور ایک جماعت اس کی اتباع بھی کرتی رہے گی۔ انہوں نے اقرار بھی کیا کہ ہم نے کلام اللہ سنا اور احکام خدا ہمیں تسلیم ہیں۔ انہوں نے کہا خدایا ہمیں مغفرت رحمت اور لطف عنایت فرما۔ تیری ہی طرف ہمیں لوٹنا ہے یعنی حساب والے دن۔ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے فرمایا۔ اے اللہ کے رسول' آپ کی اور آپ کی تابعدار امت کی یہاں ثناء و صفت بیان ہو رہی ہے۔ آپ ﷺ اس موقع پر دعا کیجئے قبول کی جائے۔ مانگئے کہ خدا طاقت سے زیادہ تکلیف نہ دے۔ پھر فرمایا کسی کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف اللہ تعالیٰ نہیں دیتا۔ یہ اس کا لطف و کرم اور احسان و انعام ہے۔ صحابہ کو جو کھٹکا ہوا تھا اور ان پر جو یہ فرمان گراں گزرا تھا کہ دل کے خطرات پر بھی حساب لیا جائے گا۔ وہ حرج اس آیت سے اُٹھ گیا۔ مطلب یہ ہے کہ گو حساب ہو' سوال ہو' لیکن جو چیز طاقت سے باہر ہے اس پر عذاب نہیں کیونکہ دل میں کسی کا خیال دفعتاً آ جانا روکے رک نہیں سکتا۔ بلکہ حدیث سے بھی معلوم ہو چکا کہ ایسے وسوسوں کو برا جاننا دلیل ایمان ہے بلکہ اپنی اپنی بھرنی' اعمال صالحہ کرو گے جزا پاؤ گے' اعمال خبیثہ کرو گے سزا بھگتو گے۔ پھر دعا تعلیم کی اور اس کی قبولیت کا وعدہ فرمایا کہ خدایا بھولے چوکے جو احکام ہم سے چھوٹ گئے ہوں یا جو برے کام ہو گئے ہوں یا شرعی احکام میں غلطی کر کے جو خلاف شرعی کام ہم سے ہو گئے ہوں' وہ معاف فرما۔

پہلے صحیح مسلم کے حوالے سے حدیث گزر چکی ہے کہ اس دعا کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا' میں نے اسے قبول فرما لیا۔ میں نے یہی کیا اور حدیث میں آ چکا ہے کہ میری امت کی بھول چوک معاف ہے اور جو کام زبردستی کرائے جائیں وہ بھی معاف ہیں۔ (ابن ماجہ) خدایا ہم پر مشکل اور سخت اعمال کی مشقت نہ ڈال۔ جیسے اگلے دین والوں پر سخت سخت احکام تھے۔ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو نبی رحمت بنا کر بھیج کر دور کئے گئے اور آپ کو ایک سہل اور آسان دین دیا گیا۔ اسے بھی اللہ تعالیٰ نے قبول فرمایا۔ حدیث میں بھی ہے کہ میں یک سوئی والا اور آسان دین دے کر بھیجا گیا ہوں۔ خدایا وہ تکلیفیں بلائیں اور مشقتیں ہم پر نہ ڈال جن کی برداشت کی طاقت ہمیں نہیں۔ حضرت مکحول رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں اس سے مراد فریب اور غلبہ شہوت ہے۔ اس کے جواب میں بھی قبولیت کا اعلان خدائے عالم کی طرف سے کیا گیا اور ہماری تقصیروں کو معاف فرما جو تیری راہ میں ہوئی ہیں اور ہمارے گناہوں کو بخش۔ ہماری برائیوں اور بداعمالیوں کی پردہ پوشی کر۔ ہم پر رحم و کرم کر تا کہ پھر ہم سے تیری نامرضی کا کوئی کام نہ ہو۔ اسی لئے بزرگوں کا قول ہے کہ گنہگار کو تین باتوں کی ضرورت ہے۔ ایک تو خدا کی معافی کی تا کہ عذاب سے نجات پائے دوسرے پردہ پوشی کی تا کہ رسوائی سے بچے' تیسرے عصمت کی تا کہ وہ دوبارہ گناہ میں مبتلا نہ ہو۔ اس پر بھی جناب باری نے قبولیت کا اعلان کیا۔ تو ہمارا ولی و ناصر ہے تجھی پر بھروسہ ہے تجھی سے مدد طلب کرتے ہیں' تو ہی ہمارا سہارا ہے۔ تیری مدد کے سوا نہ تو ہم کسی نفع کے حاصل کرنے پر قادر ہیں نہ کسی برائی سے بچ سکتے ہیں۔ تو ہماری ان لوگوں پر مدد کر' جو تیرے دین کے منکر ہیں۔ تیری وحدانیت نہیں مانتے۔ تیرے نبی کی رسالت کو تسلیم نہیں کرتے۔ تیرے ساتھ دوسروں کی عبادت کرتے ہیں' مشرک ہیں۔ خدایا تو ہمیں ان پر غالب کر۔ دنیا اور دین میں ہم ہی ان پر غالب رہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے جواب میں بھی فرمایا' ہاں میں نے یہ بھی کر دیا حضرت معاذ جب اس آیت کو ختم کرتے' آمین کہتے۔ (ابن جریر)

تفسیر سورۃ آل عمران

سُوْرَۃُ اٰلِ عِمْرَانَ مَدَنِیَّۃٌ وَّھِیَ مِائَتَا اٰیَۃٍ وَّعِشْرُوْنَ رُکُوْعًا

کل رکوع: ۲۰ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ کل آیات: ۲۰۰

شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان' نہایت رحم والا ہے

یہ سورت مدنی ہے اسکے شروع کی تراسی آیتیں نجران کے عیسائیوں کے جوایلچی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ۹ ھ میں آئے تھے۔انکے بارے میں نازل ہوئی ہیں۔جس کا مفصل بیان مباہلہ کی آیت: ﴿قُلْ تَعَالَوْا﴾ کی تفسیر میں عنقریب آئے گا انشاءاللہ تعالیٰ۔اسکی فضیلت میں جو حدیثیں ہیں وہ سورہ بقرہ کی تفسیر کے شروع میں بیان کی گئی ہیں۔

الٓمّٓ ۝۱ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ ۝۲ نَزَّلَ عَلَیْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیْهِ وَاَنْزَلَ التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِیْلَ ۝۳ مِنْ قَبْلُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَاَنْزَلَ الْفُرْقَانَ ؕ اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا بِاٰیٰتِ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِیْدٌ ؕ وَاللّٰهُ عَزِیْزٌ ذُو انْتِقَامٍ ۝۴

اللہ تعالیٰ ایسے ہیں کہ ان کے سوا کوئی قابل معبود بنانے کے نہیں وہ زندہ (جاوید) ہیں۔سب چیزوں کے سنبھالنے والے ہیں اللہ تعالیٰ نے آپ کے پاس قرآن بھیجا ہے واقعیت کے ساتھ' اس کیفیت کے ساتھ کہ وہ تصدیق کرتا ہے ان (آسمانی) کتابوں کی جو اس سے پہلے نازل ہو چکی ہیں اور (اسی طرح) بھیجا تھا تورات اور انجیل کو اس کے قبل لوگوں کی ہدایت کے واسطے اور اللہ تعالیٰ بھیجے معجزات۔بے شک جو لوگ منکر ہیں اللہ تعالیٰ کی آیتوں کے ان کے لئے سزائے سخت ہے اور اللہ تعالیٰ غلبہ (اور قدرت) والا ہے' بدلا لینے والا ہے۔○

اسم اعظم کے متعلق تفصیل ☆

آیت الکرسی کی تفسیر کے بیان میں پہلے یہ حدیث گزر چکی ہے کہ اسم اعظم اس آیت اور آیت الکرسی میں ہے اور ﴿الٓمّٓ﴾ کی تفسیر سورۂ بقرہ کے شروع میں بیان ہو چکی ہے۔جسے دوبارہ یہاں لکھنے کی ضرورت نہیں۔﴿اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ﴾ کی تفسیر بھی آیت الکرسی کی تفسیر میں لکھ آئے ہیں۔پھر فرمایا اللہ تعالیٰ نے آپ پر اے محمدؐ! قرآنِ کریم کو حق کے ساتھ نازل فرمایا۔جس میں کوئی شک نہیں۔بلکہ یقیناً وہ خدا کی طرف سے ہے' جسے اپنے علم کے ساتھ اتارا ہے اور فرشتے اس پر گواہ ہیں اور خدا کی شہادت کافی ہے۔[1] یہ قرآن اپنے سے پہلے کے تمام آسمانی کتابوں کی تصدیق کرنے والا ہے اور وہ

[1] آنحضورﷺ کو قرآن مجید کے کلام اللہ ہونے میں کوئی شبہ و شک نہ تھا۔یہ طرز یہاں صرف دوسروں کے لئے ہے آپ اس کے مخاطب نہیں۔مولانا روم فرماتے ہیں۔ خوشتر آں باشد کہ سر دلبراں ☆ گفتہ آید در حدیث دیگراں

کتابیں اس قرآن کی سچائی پر دلیل ہیں۔ اس لئے کہ ان میں جو اس کے آنے میں اور اس کتاب کے اُترنے کی خبر تھی' وہ سچی ثابت ہوئی۔ اسی نے حضرت موسیٰ بن عمران علیہما السلام پر توراۃ اتاری اور حضرت عیسیٰ علیہ بن مریم علیہ السلام پر انجیل اتاری۔ یہ دونوں بھی اسی زمانے کے لوگوں کے لئے ہدایت دینے والی تھیں۔ اس نے فرقان اتارا جو حق و باطل ہدایت و ضلالت میں گمراہی اور راہ راست میں فرق کرنے والا ہے۔ اس کی واضح اور روشن دلیلیں اور زبردست برہان ہر ایک کو کفایت کرنے والے ہیں۔ حضرت قتادہ رحمتہ اللہ علیہ حضرت ربیع بن انس کا بیان ہے کہ فرقان سے مراد قرآن ہے۔ گو یہ مصدر ہے لیکن چونکہ قرآن کا ذکر اس سے پہلے گزر چکا ہے اس لئے یہاں فرقان فرمایا۔ ابو صالح" سے یہ بھی مروی ہے کہ مراد اس سے توراۃ ہے مگر یہ ضعیف ہے۔ اس لئے کہ تورات کا ذکر اس سے پہلے گزر چکا ہے۔ واللہ اعلم۔ قیامت کے دن منکروں اور باطل پرستوں کو سخت عذاب ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ غالب ہے بڑی شان والا ہے۔ اعلیٰ سلطنت والا ہے۔ انبیاء کرام اور معزز رسولوں کے مخالفوں سے اور خدا کی آیتوں کی تکذیب کرنے والوں سے جناب باری زبردست انتقام لے گا۔

إِنَّ اللَّهَ لَا يَخْفَىٰ عَلَيْهِ شَيْءٌ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي السَّمَاءِ ۝ هُوَ الَّذِي يُصَوِّرُكُمْ فِي الْأَرْحَامِ كَيْفَ يَشَاءُ ۚ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ۝٦

بے شک اللہ تعالیٰ سے کوئی چیز چھپی ہوئی نہیں ہے نہ (کوئی چیز) زمین میں اور نہ (کوئی چیز) آسمان میں وہ ایسی ذات (پاک) ہے کہ تمہاری صورت (شکل) بناتا ہے ارحام میں جس طرح چاہتا ہے کوئی عبادت کے لائق نہیں بجز اس کے وہ غلبہ والا ہے حکمت والا ہے۔ ۝

توحید کے دلائل ☆

اللہ تعالیٰ خبر دیتا ہے کہ آسمان و زمین کے غیب کو وہ بخوبی جانتا ہے۔ اس پر کوئی چیز مخفی نہیں۔ وہ تمہیں تمہارے ماں باپ کے پیٹ میں صورتیں عنایت کرتا ہے۔ جس طرح کی چاہتا ہے اچھی بری نیک بد۔ اس کے سوا عبادت کے لائق کوئی نہیں۔ وہ غالب ہے' حکمت والا ہے جبکہ صرف اسی ایک نے تمہیں بنایا اور پیدا کیا' پھر عبادت دوسروں کی کیوں کرو؟ وہ لازوال عزتوں والا۔ غیر فانی حکمتوں والا۔ اٹل حکموں والا ہے اس میں اشارہ بلکہ تصریح ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی خدا ہی کے پیدا کئے ہوئے اور اسی کی چوکھٹ پر جھکنے والے تھے۔ جس طرح کل انسان ہیں' انہی انسانوں میں ایک آپ بھی ہیں۔ وہ ماں کے رحم میں بنائے گئے اور میرے پیدا کرنے سے پیدا ہوئے۔ پھر وہ خدا کیسے بن گئے۔ جیسے کہ اس جماعت نصاریٰ نے سمجھ رکھا ہے حالانکہ وہ تو ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف رگ و ریشہ میں اِدھر اُدھر پھرتے پھراتے رہے جیسے اور جگہ ہے: ﴿يَخْلُقُكُمْ فِي بُطُونِ أُمَّهَاتِكُمْ خَلْقًا مِّن بَعْدِ خَلْقٍ فِي ظُلُمَاتٍ ثَلَاثٍ﴾ (الزمر:۶) وہ خدا تمہیں تمہاری ماؤں کے پیٹوں میں پیدا کرتا ہے۔ ایک پیدائش کے بعد دوسری طرح کی بناوٹ تین تین اندھیروں میں ہوتی ہے۔

هُوَ الَّذِي أَنزَلَ عَلَيْكَ الْكِتَابَ مِنْهُ آيَاتٌ مُّحْكَمَاتٌ هُنَّ أُمُّ الْكِتَابِ وَ

اُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ ؕ فَاَمَّا الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ زَیْغٌ فَیَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَآءَ تَاْوِیْلِهٖ ۚ وَمَا یَعْلَمُ تَاْوِیْلَهٗۤ اِلَّا اللّٰهُ ۘؔ وَالرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ یَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ ۙ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا ۚ وَمَا یَذَّكَّرُ اِلَّاۤ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۝٧ رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَیْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ ۝٨ رَبَّنَاۤ اِنَّكَ جَامِعُ النَّاسِ لِیَوْمٍ لَّا رَیْبَ فِیْهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا یُخْلِفُ الْمِیْعَادَ ۝٩ ع

وہ ایسا ہے جس نے نازل کیا تم پر کتاب کو جس میں ایک حصہ وہ آیتیں ہیں جو کہ اشتباہ مراد سے محفوظ ہیں اور یہی آیتیں اصلی مدار ہیں۔ اس پر کتاب کا اور دوسری آیتیں ایسی ہیں جو مشتبہ المراد ہیں۔ سو جن لوگوں کے دلوں میں کجی ہے وہ اس کے اسی حصہ کے پیچھے ہو لیتے ہیں جو مشتبہ المراد ہیں (دین میں) شورش ڈھونڈنے کی غرض سے اور اس کے غلط مطلب ڈھونڈنے کی غرض سے حالانکہ ان کا (صحیح) مطلب بجز حق تعالیٰ کے کوئی نہیں جانتا۔ جو لوگ علم (دین) میں پختہ کار (اور فہیم) ہیں وہ یوں کہتے ہیں کہ ہم اس پر (اجمالاً) یقین رکھتے ہیں (یہ) سب ہمارے پروردگار کی طرف سے ہیں اور نصیحت وہی لوگ قبول کرتے ہیں جو کہ اہل عقل ہیں۔ اے ہمارے پروردگار ہمارے دلوں کو کج نہ کیجئے بعد اس کے کہ آپ ہم کو ہدایت کر چکے ہیں اور ہم کو اپنے پاس سے رحمت (خاصہ) عطا فرمائیے بلاشبہ آپ بڑے عطا فرمانے والے ہیں اے پروردگار ہمارے آپ بلاشبہ تمام آدمیوں کو (میدانِ محشر میں) جمع کرنے والے ہیں۔ اس دن میں جس میں ذرا شک نہیں (اور) بلاشبہ اللہ تعالیٰ خلاف کرتے نہیں وعدے کو۔ ○

قرآن کے مضامین کی تقسیم ☆

یہاں بیان ہو رہا ہے کہ قرآن میں ایسی آیتیں بھی ہیں جن کا بیان بہت واضح بالکل صاف اور سیدھا ہے۔ ہر شخص ان کے مطلب تک پہنچ سکتا ہے اور بعض آیتیں ایسی بھی ہیں۔ جن کے مطلب تک عموماً ذہن رسائی نہیں کر سکتے۔ اب جو لوگ دوسری قسم کی آیتوں کو پہلی قسم کی طرف لوٹائیں یعنی جس مسئلہ کی صراحت جس آیت میں پائیں لے لیں تو وہ راستی پر ہیں اور جو صاف صریح آیتوں کو چھوڑ کر ایسی آیتوں کو دلیل بنائیں جو ان کے فہم سے بالاتر ہیں اور ان میں الجھ جائیں۔ یہ وہ ہیں جو منہ کے بل گر پڑے۔ امّ الکتاب یعنی اصل اصول کتاب اللہ کی وہ صاف اور واضح آیتیں ہیں۔ شک و شبہ میں نہ پڑو اور کھلے احکام پر عمل کرو۔ انہی کو فیصلہ کرنے والی مانو اور جو نہ سمجھ میں آئے اسے بھی ان سے سمجھو۔ بعض آیتیں ایسی بھی ہیں کچھ معنی تو ان کے ایسے ہیں جو ظاہر آیتوں کے موافق ہوں اور ممکن ہے اس کے سوا اور معانی بھی نکلیں۔ گو وہ حرف لفظ اور ترکیب کے اعتبار سے

ہوں نہ کہ واقعی طور پر تو ان غیر ظاہر معنوں میں نہ پھنسو۔ محکم اور متشابہ کے بہت سے معنی سلف سے منقول ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما تو فرماتے ہیں کہ محکمات وہ ہیں جو ناسخ ہوں۔ جن میں حلال حرام احکام نہی عن ممنوعات حدیں اور اعمال کا بیان ہو۔ اسی طرح آپ سے یہ بھی روایت ہے: ﴿قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَاحَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ ...... ﴾ (الانعام ۱۵۱) اور اس کے بعد کی حکمت والی آیتیں محکمات ہیں اور: ﴿وَقَضٰی رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْا ...... ﴾ (اسراء: ۲۳) اور اس کے بعد کی تین آیتیں ہیں۔

سعید بن جبیر رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں انہیں اصل کتاب اس لئے کہا جاتا ہے کہ یہ تمام کتابوں میں ہیں۔ حضرت مقاتل رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں اس لئے کہ تمام مذاہب والے انہیں مانتے ہیں۔ متشابہات اور ان آیتوں کو ہیں جو منسوخ ہیں اور جو پہلے کی ہیں اور جو پیچھے کی ہیں اور جن میں مثالیں دی گئی ہیں اور قسمیں کھائی گئی ہیں اور جن پر صرف ایمان لایا جاتا ہے اور عمل کے لئے وہ احکام نہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا بھی یہی فرمان ہے۔ حضرت مقاتل رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔ اس سے مراد سورتوں کے شروع کے حروف مقطعات ہیں۔ حضرت مجاہد کا قول ہے کہ یہ ایک دوسرے کی تصدیق کرنے والی ہیں۔ جیسے کہ اور جگہ ہے: كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِيَ (الزمر ۲۳) اور یہ بھی مذکور ہے کہ یہ وہ کلام ہے جو ایک طرز کے ماتحت ہو اور مثانی وہ ہے جہاں دو مقابل کی چیزوں کا ذکر ہو۔ جیسے صفت جنت دوزخ کی اور حال نیکیوں اور بدوں کا وغیرہ وغیرہ۔ اس آیت میں متشابہ محکم کے مقابلہ میں ہے۔ اس لئے ٹھیک طلب وہی ہے۔ جو ہم نے پہلے بیان کیا اور یہی فرمان ہے حضرت محمد بن اسحاق بن یسار رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔ یہ رب کی حجت ہے ان میں بندوں کا بچاؤ ہے جھگڑوں کا فیصلہ ہے باطل کا قمع قلع ہے۔ ان کے صحیح اور اصل مطلب سے کوئی انہیں ہٹا نہیں سکتا۔ نہ ان کے معنی میں ہیر پھیر کر سکتا ہے۔ متشابہات کی سچائی میں کلام نہیں نہ ان میں تصرف و تاویل کرنی چاہئے۔ ان سے خدا تعالیٰ اپنے بندوں کے ایمان کو آزماتا ہے۔ جیسے حلال حرام سے آزماتا ہے۔ انہیں باطل کی طرف لے جانا اور حق سے پھیر نہ دینا چاہئے۔

پھر فرماتا ہے کہ جن کے دل میں کجی 'ٹیڑھ پن' گمراہی اور حق سے باطل کی طرف جانا ہے۔ وہ تو متشابہ آیتوں کو لے کر اپنے بدترین مقصد کو پورا کرنا چاہتے ہیں اور لفظی اختلافات سے ناجائز فائدہ اٹھا کر اپنی طرف موڑ دیتے ہیں اور جو محکم آیتیں ہیں ان میں ان کا وہ مقصد پورا نہیں ہوتا کیونکہ ان کے الفاظ بالکل صاف اور کھلے ہوئے ہوتے ہیں۔ وہ نہ انہیں ہٹا سکتے ہیں نہ ان میں اپنے لئے کوئی دلیل پاتے ہیں۔ اس لئے فرمان ہے کہ اس سے مقصد ان کا فتنہ کی تلاش ہوتی ہے تا کہ اپنے ماننے والوں کو بہکائیں۔ اپنی بدعتوں کی دلیل قرآن سے لانا چاہتے ہیں۔ حالانکہ قرآن تو بدعتوں کی تردید کرتا ہے۔ جیسے کہ عیسائیوں نے دلیل پیش کی ہے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے خدا کا لڑکا ہونے پر قرآن کے الفاظ روح اللہ سے اور کلمۃ اللہ سے۔ پس اس متشابہ آیت کو لے کر صاف آیت جس میں یہ لفظ ہیں کہ: ﴿اِنْ هُوَ اِلَّا عَبْدٌ ...... ﴾ (الزخرف: ۵۹) یعنی حضرت عیسیٰ خدا کے غلام ہیں جن پر خدا کا انعام ہے اور جگہ ہے: ﴿اِنَّ مَثَلَ عِيْسٰى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ ...... ﴾ (آل عمران: ۵۹) یعنی حضرت عیسیٰ کی مثال اللہ تعالیٰ کے نزدیک حضرت آدم علیہ السلام کی طرح ہے کہ انہیں خدا نے مٹی سے پیدا کیا۔ پھر اسے کہا کہ ہو جا وہ ہو گیا اور اسی طرح کی اور بھی بہت سی صریح آیتیں ہیں۔ ان سب کو چھوڑ کر اور متشابہ آیتوں سے حضرت عیسیٰ کے خدا کے بیٹا ہونے پر دلیل پیش کی حالانکہ آپ خدا کی مخلوق ہیں۔ خدا کے بندے ہیں اس کے رسول ہیں۔ پھر فرماتا ہے کہ دوسری

غرض آیت کی تحریف ہوتی ہے کہ اسے اس کے معنی پر باقی نہ رکھیں۔ حضور ﷺ نے یہ آیت پڑھ کر فرمایا کہ جب تم ان لوگوں کو دیکھو جو متشابہ آیتوں میں جھگڑتے ہیں تو انہیں چھوڑ دو۔ یہی لوگ اس آیت سے مراد لئے گئے ہیں۔ یہ حدیث مختلف طریق سے بہت سی کتابوں میں موجود ہیں۔ صحیح بخاری شریف میں بھی یہ حدیث اس آیت کی تفسیر میں منقول ہے۔ ملاحظہ ہو کتاب القدر۔ ایک اور حدیث میں ہے یہ لوگ خوارج ہیں (مسند احمد) پس اس حدیث کو زیادہ سے زیادہ موقوف سمجھ لیا جائے تاہم اس کا مضمون صحیح ہے۔

بدعت کی بنیاد آپ ﷺ کی ایک پیشگوئی ☆ پہلی بدعت خوارج نے ہی پھیلائی۔ یہ فرقہ محض دنیوی رنج کی وجہ سے مسلمانوں سے الگ ہوا۔ حضور ﷺ نے جس وقت حنین کی غنیمت کا مال تقسیم کیا۔ اس وقت ان لوگوں نے اسے خلاف عدل سمجھا اور ان میں سے ایک نے جسے ذوالخویصرہ کہا جاتا تھا۔ اس نے حضور ﷺ کے سامنے آ کر صاف کہا کہ حضرت عدل کیجئے۔ آپ نے فرمایا اس تقسیم میں عدل نہیں کیا۔ آپ نے فرمایا مجھے تو خدا نے امین بنایا تھا' اگر میں بھی عدل نہ کروں تو پھر تو تو برباد ہوا اور نقصان میں پڑا۔ جب وہ لوٹا تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے درخواست کی کہ مجھے اجازت دی جائے کہ اسے مار ڈالوں۔ آپ نے فرمایا' چھوڑ دو اس کی جنس سے ایک ایسی قوم نکلے گی کہ تم لوگ اپنی نمازوں کو ان کی نمازوں کے مقابلہ میں اور ان کی قرآن خوانی اپنی قرآن خوانی کے مقابلہ میں حقیر سمجھو گے۔ حالانکہ وہ دین سے اس طرح نکل جائیں گے۔ جس طرح تیر شکار سے نکل جاتا ہے۔ تم جہاں کہیں انہیں پاؤ قتل کرو۔ ان کے قتل کرنے کا بڑا ثواب ملے گا۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خلافت کے زمانہ میں ان کا ظہور ہو گیا اور آپ نے انہیں نہروان میں قتل کیا پھر ان میں پھوٹ پڑی اور ان کے مختلف الخیال فرقے ہو گئے اور نئی نئی بدعتیں دین میں جاری کر لیں اور خدا کی راہ سے دور جا پڑے ان کے بعد قدریہ فرقے کا ظہور ہوا۔ پھر معتزلہ نکلے پھر جہمیہ وغیرہ پیدا ہوئے اور حضور ﷺ کی یہ پیشگوئی پوری ہوئی کہ میری اُمت میں عنقریب تہتر فرقے ہوں گے۔ سب جہنمی ہوں گے سوائے ایک جماعت کے۔ صحابہ نے پوچھا وہ کون لوگ ہوں گے۔ آپ نے فرمایا وہ جو اس چیز پر ہوں جس پر میں ہوں اور میرے اصحاب۔ (مستدرک حاکم)

ابو یعلی کی حدیث میں ہے کہ آپ نے فرمایا میری اُمت میں ایک قوم ہوگی جو قرآن تو پڑھے گی لیکن اسے اس طرح پھینکے گی جیسے کوئی کھجور کی گٹھلیاں پھینکتا ہو۔ اس کے مطالب بیان کرے گی۔ پھر فرمایا اس کی حقیقی تاویل اور واقعی مطلب خدا ہی جانتا ہے۔ لفظ اللہ پر وقف ہے یا نہیں؟ اس میں اختلاف ہے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں' تفسیر چار قسم کی ہے۔ ایک وہ جس کے سمجھنے میں کوئی معذور نہیں۔ ایک وہ جسے عرب اپنی لغت سے سمجھتے ہیں۔ ایک وہ جسے جید علما اور پورے علم والے ہی جانتے ہیں اور ایک وہ جسے بجز ذات باری کے اور کوئی نہیں جانتا۔ یہ روایت پہلے بھی گزر چکی ہے۔ حضرت عائشہؓ وغیرہ کا بھی یہی قول ہے۔ معجم کبیر میں حدیث ہے کہ مجھے اپنی اُمت پر صرف تین باتوں کا ڈر ہے۔ مال کی کثرت کا' جس سے حسد و بغض پیدا ہوگا اور آپس کی سر پھٹول شروع ہوگی۔ دوسرے یہ کتاب اللہ کی تاویل کے پیچھے پڑ جائیں گے حالانکہ اصلی مطلب ان کا اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے اور گہرے علم والے کہہ دیتے ہیں کہ ہمارا اس پر ایمان ہے تیسرے یہ کہ علم حاصل کر کے اسے بے پروائی سے ضائع کر دیں گے۔ یہ حدیث بالکل غریب ہے اور حدیث میں ہے کہ قرآن اس لئے نہیں اترا کہ ایک آیت دوسری آیت کے خلاف ہو' جس کا تمہیں علم ہو اس پر علم کرو اور جو متشابہ ہوں' ان پر ایمان لاؤ۔ (ابن مردویہ)

ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت مالک بن انسؒ سے بھی یہی منقول ہے کہ گہرے علم والے بھی اس حقیقت سے آگاہ نہیں ہوتے۔ ہاں اس پر ایمان رکھتے ہیں۔ ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں اس کی تاویل کا علم اللہ ہی کو ہے۔ پختہ علم والے یہی کہتے ہیں کہ ہمارا اس پر ایمان ہے۔ اُبی بن کعب بھی یہی فرماتے ہیں۔ امام ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ بھی اسی کو پسند کرتے ہیں۔ یہ تو تھی وہ جماعت جو ﴿اِلَّا اللّٰهُ﴾ پر وقف کرتی تھی اور بعد کے جملے کو اس سے الگ کرتی تھی اور لوگ یہاں نہیں ٹھہرتے اور ﴿فِي الْعِلْمِ﴾ پر وقف کرتے ہیں اکثر مفسرین اور اہل اصول بھی یہی کہتے ہیں۔ ان کی بڑی دلیل یہ ہے کہ جو سمجھ میں نہ آئے ایسی بات کہنی ٹھیک نہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرمایا کرتے تھے میں ان راسخ علما میں ہوں جو تاویل جانتے ہیں مجاہد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں راسخ علم والے تفسیر جانتے ہیں حضرت محمد بن جعفر بن زبیر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اصل تفسیر اور مراد اللہ ہی جانتا ہے اور مضبوط علم والے کہتے ہیں کہ ہم اس پر ایمان لائے۔ پھر متشابہ آیتوں کی تفسیر محکمات سے کرتے ہیں جن میں کسی کو مجال سخن نہیں رہتی۔ مضامین ٹھیک ٹھاک ہو جاتے ہیں دلیل جاری ہوتی ہے عذر ظاہر ہو جاتا ہے۔ باطل چھٹ جاتا ہے اور کفر دفع ہو جاتا ہے حدیث میں ہے کہ حضور ﷺ نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے لئے دعا کی کہ خدایا انہیں دین کی سمجھ دے اور تفسیر کا علم دے۔

تاویل کی حقیقت ☆ بعض علما نے یہاں تفصیل کی ہے وہ فرماتے ہیں تاویل دو معنی میں قرآن کریم میں آئی ہے۔ ایک معنی تو ایک چیز کی اصلی حقیقت اور صحیح اصلیت جیسے قرآن میں ہے: ﴿يٰۤاَبَتِ هٰذَا تَاْوِيْلُ رُءْيَايَ﴾ (یوسف:۱۰۰) میرے باپ خواب کی یہی تعبیر ہے اور جگہ ہے: ﴿هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا تَاْوِيْلَهٗ يَوْمَ يَاْتِيْ تَاْوِيْلُهٗ......﴾ (الاعراف:۵۸) کافروں کو انتظار صرف اس کی حقیقت ظاہر ہونے کا ہے۔ جس دن اس کا مصداق آ جائے گا۔ پس ان دونوں جگہ مراد تاویل سے حقیقت ہے۔ اگر اس آیت مبارکہ میں تاویل سے مراد یہی تاویل لی جائے تو ﴿اِلَّا اللّٰهُ﴾ پر وقف ضروری ہے۔ اس لئے کہ تمام کاموں کی حقیقت اور اصلیت بجز ذات پاک کے اور کوئی نہیں جانتا تو: ﴿وَالرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ﴾ مبتدا ہوگا اور ﴿يَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ﴾ خبر ہو گی اور یہ جملہ بالکل الگ ہوگا اور دوسرے معنی تاویل کے تفسیر اور بیان اور ایک شی کی تعبیر دوسری شے سے ہوتے ہیں۔ جیسے قرآن میں ہے: ﴿نَبِّئْنَا بِتَاْوِيْلِهٖ﴾ (یوسف:۳۶) ہمیں اس کی تاویل بتاؤ یعنی تفصیل اور بیان۔ اگر آیت مذکور میں تاویل سے یہ مراد لی جائے تو ﴿فِي الْعِلْمِ﴾ پر وقف کرنا چاہئے۔ اس لئے کہ پختہ علم والے علماء جانتے ہیں اور سمجھتے ہیں کیونکہ خطاب انہی سے ہے۔ گو حقائق علم انہیں بھی نہیں تو اس بنا پر ﴿اٰمَنَّا بِهٖ﴾ حال ہوگا اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ معطوف ہو بغیر معطوف الیہ کے۔ جیسے اور جگہ ہے: ﴿لِلْفُقَرَآءِ الْمُهٰجِرِيْنَ......﴾ سے ﴿يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا......﴾ (الحشر:۱۰) تک اور جگہ ہے: ﴿وَّجَآءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا﴾ یعنی ﴿وَّجَآءَ الْمَلٰٓئِكَةُ صُفُوْفًا صُفُوْفًا﴾ (الفجر:۲۲) اور ان کی طرف سے یہ خبر کہ ہم اس پر ایمان لائے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ متشابہ پر پھر اقرار کرتے ہیں کہ یہ سب یعنی محکم اور متشابہ حق ہے اور ان میں سے ہر ایک دوسرے کی تصدیق کرتا ہے اور گواہی دیتا ہے کہ یہ سب خدا کی طرف سے ہے۔ اس میں کوئی اختلاف نہیں اور تضاد نہیں۔ جیسے اور جگہ ہے: ﴿اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا﴾ (النساء ۸۲) یعنی کیا یہ لوگ قرآن میں غور فکر نہیں کرتے۔ اگر یہ خدا کے سوا اور کی طرف سے ہوتا تو اس میں بہت اختلاف ہوتا۔ اسی لئے یہاں یہ بھی فرمایا کہ اسے صرف عقلمند ہی سمجھتے ہیں جو اس میں غور و تدبر کریں۔ جو عقل والے ہوں جن کے دماغ درست ہوں۔

راسخین فی العلم کون ہیں؟ ☆ حضور ﷺ سے سوال ہوتا ہے کہ پختہ علم والے کون ہیں؟ آپ نے فرمایا' جس کی قسم سچی ہو جس کی زبان راست گو ہو' جس کا دل سلامت ہو۔ جس کا دل بچا ہوا ہو اور جس کی شرمگاہ زنا کاری سے بچی ہوئی ہو۔ وہ مضبوط علم والے ہیں۔ (ابن ابی حاتم) اور حدیث میں ہے کہ آپ نے چند لوگوں کو دیکھا کہ وہ قرآن شریف کے بارے میں لڑ جھگڑ رہے ہیں۔ آپ نے فرمایا سنو! تم سے پہلے لوگ بھی اسی میں ہلاک ہوئے کہ انہوں نے کتاب اللہ کی آیتوں کو ایک دوسرے کے خلاف بتا کر اختلاف کیا۔ حالانکہ کتاب اللہ کی ہر آیت ایک دوسرے کی تصدیق کرتی ہیں۔ تم ان میں اختلاف نکال کر ایک کو دوسری کے متضاد نہ بتاؤ۔ جتنا جانتے ہو کہو اور جو معلوم نہیں اسے جاننے والوں کے سپرد کر دو (مسند احمد) اور حدیث میں ہے کہ قرآن سات حرفوں پر اُترا۔ قرآن میں اختلاف اور تضاد پیدا کرنا کفر ہے۔ قرآن میں جھگڑنا کفر ہے۔ جو جو جانو اس پر عمل کرو۔ جو نہ جانو اسے جاننے والوں کی طرف سونپو۔ جل جلالہ۔ (ابو یعلی)

راسخ فی العلم سے مراد ☆ نافع ابن یزید کہتے ہیں۔ راسخ فی العلم وہ لوگ ہیں جو متواضع ہوں جو عاجزی کرنے والے ہوں۔ رب کی رضا کے طالب ہوں اپنے سے بڑوں سے دبنے والے نہ ہوں[1]۔ اپنے سے چھوٹے کو حقیر بنانے والے نہ ہوں۔ پھر فرمایا کہ یہ لوگ دعا کرتے ہیں کہ ہمارے دلوں کو جبکہ تو نے ہدایت پر لگا دیا ہے۔ انہیں ان لوگوں کے دلوں کی طرح نہ کر' جو متشابہ کے پیچھے پڑ کر خراب ہو جاتے ہیں بلکہ اپنے صراطِ مستقیم پر قائم رکھ اور مضبوط دین پر دائم رکھ اور ہم پر اپنی رحمت نازل فرما کر ہمارے دل کو استقلال دے۔ ہماری پراگندگی کو دور فرما۔ ہمارے ایمان و یقین کو بڑھا تو بہت بڑا دینے والا ہے۔ رسول اللہ ﷺ دعا مانگا کرتے تھے: یَامُقَلِّبَ الْقُلُوْبِ ثَبِّتْ قَلْبِیْ عَلٰی دِیْنِكَ اے دلوں کے پھیرنے والے میرے دل کو اپنے دین پر جما ہوا رکھ۔ پھر یہ دعا: رَبَّنَا لَا تُزِغْ...... (ترمذی) پڑھتے اور حدیث میں ہے کہ آپ بکثرت یہ دعا پڑھا کرتے تھے: اَللّٰهُمَّ مُقَلِّبَ الْقُلُوْبِ ثَبِّتْ قَلْبِیْ عَلٰی دِیْنِكَ۔ حضرت اسماءؓ نے ایک دن پوچھا کیا دل الٹ پٹ ہو جاتا ہے؟ آپ نے فرمایا ہاں ہر انسان کا دل اللہ تعالیٰ کی انگلیوں میں سے دو انگلیوں کے درمیان ہوتا ہے۔ اگر چاہے قائم رکھے اگر چاہے پھیر دے۔ ہماری دعا ہے کہ ہمارا رب ہمارے دلوں کو ہدایت کے بعد ٹیڑھا نہ کر دے اور ہمیں اپنے پاس سے رحمتیں عنایت فرمائے۔ وہ بڑی دین والا ہے۔ ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ میں نے کہا کہ یا رسول اللہ ﷺ مجھے کوئی ایسی دعا سکھایئے کہ میں اپنے لئے وہ دعا مانگا کروں۔ آپ نے فرمایا یہ دعا مانگ: اللهم رب محمد النبی اغفرلی ذنبی واذهب غیظ قلبی واجرنی من مضلات الفتن اے اللہ' اے محمد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے رب' میرے گناہوں کو معاف فرما' میرے دل کا غصہ اور رنج اور سختی دور کر دے اور مجھے گمراہ کرنے والے فتنوں سے بچا لے۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے بھی آپ کی دعا یا مقلب القلوب سن کر حضرت اسماء رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی طرح سوال کیا اور آپ نے وہی جواب دیا اور پھر قرآن کی یہ دعا پڑھ کر سنائی۔ یہ حدیث غریب ہے لیکن آیت قرآنی کی تلاوت کے بغیر تو بخاری مسلم میں بھی مروی ہے نسائی وغیرہ میں ہے کہ حضور ﷺ جب رات کو جاگتے تو یہ دعا پڑھتے لا اله الا انت سبحنك استغفرك لذنبی واسئلك رحمة اللهم زدنی علما ولا تزغ قلبی بعد اذ

[1] یعنی دنیا کے بااقتدار لوگوں کی طاقت اور اقتدار کی رعایت کرتے ہوئے اظہار حق سے گریز نہ کرے۔ ... معاملات میں حق گوئی و دین کے معاملہ میں انسان کے حق گوئی ... سب سے بڑی ضمانت ہے۔

تِلْكَ الرُّسُلُ ③

هَدَیْتَنِیْ وَهَبْ لِیْ مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ. خدایا تیرے سوا کوئی معبود نہیں۔ میں تجھ سے اپنے گناہوں کا استغفار کرتا ہوں اور تجھ سے تیری رحمت کا سوال کرتا ہوں۔ خدایا میرے علم میں زیادتی کر اور میرے دل کو جب تو نے ہدایت دی ہے۔ پھر گمراہ نہ کر اور مجھے اپنے پاس سے رحمت بخش تو بہت کچھ دینے والا ہے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے مغرب کی نماز پڑھائی پہلی دو رکعتوں میں الحمد شریف کے بعد مفصل کی چھوٹی سی سورتیں پڑھیں اور تیسری رکعت میں سورہ الحمد شریف کے بعد یہی آیت پڑھی۔ ابو عبداللہ صنابحی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں میں اس وقت ان کے قریب چلا گیا تھا۔ یہاں تک کہ میرے کپڑے ان کے کپڑوں سے لگ گئے تھے اور میں نے خود اپنے کان سے حضرت صدیق کو یہ پڑھتے سنا (عبدالرزاق) حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے جب تک یہ حدیث نہیں سنی تھی۔ آپ اس رکعت میں سورہ قُلْ هُوَ اللّٰهُ پڑھا کرتے تھے لیکن یہ حدیث سننے کے بعد امیر المومنین نے بھی اسی کو پڑھنا شروع کر دیا اور کبھی ترک نہیں کیا۔ پھر فرمایا وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ خدایا تو قیامت کے دن اپنی تمام مخلوق کو جمع کرنے والا ہے اور ان میں فیصلے اور حکم کرنے والا ہے۔ ان کے اختلاف کو ختم کرنے والا ہے اور ہر ایک کے بھلے برے عمل کا بدلہ دینے والا ہے۔ اس دن کے آنے میں اور تیرے وعدوں کے سچے ہونے میں کوئی کلام نہیں۔

اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا لَنْ تُغْنِیَ عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ وَلَاۤ اَوْلَادُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَیْـًٔا ؕ وَاُولٰٓىِٕكَ هُمْ وَقُوْدُ النَّارِ ۝۱۰ كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ ۙ وَالَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ كَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا ۚ فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوْبِهِمْ ؕ وَاللّٰهُ شَدِیْدُ الْعِقَابِ ۝۱۱

بالیقین جو لوگ کفر کرتے ہیں ہرگز ان کے کام نہیں آ سکتے ان کے مال (دولت) اور نہ ان کی اولاد اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں ذرہ برابر بھی اور ایسے لوگ جہنم کا سوختہ ہوں گے جیسا کہ معاملہ تھا فرعون والوں کا اور ان سے پہلے (کافر) لوگوں کا کہ انہوں نے ہماری آیات کو جھوٹا بتلایا اس پر اللہ تعالیٰ نے ان پر دار و گیر فرمائی ان کے گناہوں کے سبب اور اللہ تعالیٰ سخت سزا دینے والا ہے۔ ○

متشابہات کو نہ سمجھ کر ان کا انکار کرنے والے کافر ہیں ☆

فرماتا ہے کہ کافر جہنم میں جلنے والی لکڑیاں ہیں۔ ان ظالموں کو اس دن عذر معذرت کام نہ آئے گی ان پر لعنت ہے ان کا برا گھر ہے۔ ان کے مال اور ان کی اولادیں بھی انہیں کچھ نفع نہیں پہنچائیں گی' خدا کے عذاب سے نہیں بچا سکیں گی۔ اور جگہ فرمایا: ﴿فَلَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ......﴾ (التوبۃ: ۵۵) تو ان کے مال و اولاد پر تعجب نہ کر خدا کا ارادہ اس کی وجہ سے انہیں دنیا میں بھی عذاب کرنے کا ہے۔ ان کی جانیں کفر ہی میں نکل جائیں گی۔ اسی طرح ارشاد ہے' کافروں کا شہروں میں گھومنا تجھے فریب میں نہ ڈالے۔ یہ تو معمولی سا فائدہ ہے۔ پھر ان کی جگہ جہنم ہی ہے جو بدترین بچھونا ہے۔ اسی طرح یہاں

ارشاد ہے کہ خدا کی باتوں کے جھٹلانے والے اس کے رسولوں کے منکر اس کی کتاب کے مخالف اس کی وحی کے نافرمان اپنی اولاد اور اپنے مال سے کوئی بھلائی کی توقع نہ رکھیں۔ یہ جہنم کی لکڑیاں ہیں جن سے جہنم سلگائی اور بھڑکائی جائے گی۔ جیسے اور جگہ ہے ﴿اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ......﴾ (الانبیاء ۹۸) تم اور تمہارے معبود جہنم کی لکڑیاں ہو۔

اسلام ایک مذہب کی حیثیت سے قبولیت عام حاصل کرے گا ☆ ابن ابی حاتم میں ہے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی والدہ صاحبہ حضرت اُم فضل رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا بیان ہے کہ مکہ شریف میں ایک رات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہو گئے اور باآواز بلند فرمانے لگے لوگو کیا میں نے خدا کی باتیں تم تک پہنچا دیں۔ لوگو! کیا میں نے تبلیغ کر دی؟ لوگو! کیا میں وحدانیت اور رسالت پہنچا چکا؟ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرمانے لگے ہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم بیشک آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خدا کا دین ہمیں پہنچایا۔ پھر جب صبح ہوئی تو آپ نے فرمایا سنو! خدا کی قسم اسلام غالب ہوگا اور خوب پھیلے گا یہاں تک کہ کفر اپنی جگہ جا چھپے گا۔ مسلمان اسلام کو لے کر سمندروں کو چیرتے پھاڑتے نکل جائیں گے اور اسلام کی اشاعت کریں گے۔ یاد رکھو وہ زمانہ بھی آنے والا ہے کہ لوگ قرآن کو سیکھیں گے پڑھیں گے۔ (پھر تکبر بڑائی اور خود بینی کے طور پر) کہنے لگیں گے ہم قاری ہیں ہم عالم ہیں کون ہے جو ہم سے بڑھ چڑھ کر ہو؟ کیا ان لوگوں میں کچھ بھی بھلائی ہوگی؟ لوگوں نے پوچھا حضور صلی اللہ علیہ وسلم وہ کون لوگ ہیں؟ آپ نے فرمایا وہ تم ہی مسلمانوں میں سے ہوں گے لیکن خیال رہے کہ وہ جہنم کا ایندھن ہیں۔ ابن مردویہ میں بھی یہ حدیث ہے۔ اس میں بھی یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جواب میں کہا ہاں خدا کی قسم آپ نے بڑی جدوجہد سے تبلیغ کی۔ آپ نے پوری جدوجہد اور دوڑ دھوپ کی۔ آپ نے ہماری زبردست خیر خواہی کی اور ہمارا فائدہ ملحوظ رکھا۔ پھر فرماتا ہے جیسا حال فرعونیوں کا تھا اور جیسے کرتوت ان کے تھے۔ لفظ کداب ہمزہ کے جزم سے بھی آتا ہے اور ہمزہ کے زبر سے بھی آتا ہے۔ جیسے نَهْرٌ اور نَهَرٌ اس کے معنی شان اور عادت حال طریقے کے آتے ہیں۔ امراء القیس کے شعروں میں بھی یہ لفظ اس معنی میں آیا ہے۔ مطلب آیہ شریفہ کا یہ ہے کہ مال و اولاد اللہ کے ہاں کچھ کام نہ آئے گی۔ جیسے فرعونیوں اور ان سے اگلے کفار کو کچھ کام نہ آئی۔ اللہ کی پکڑ سخت ہے۔ اس کا عذاب دردناک ہے۔ کوئی کسی طاقت سے اس سے بچ نہیں سکتا۔ نہ اسے ہٹا سکتا ہے۔ وہ خدا جو چاہے کرتا ہے ہر چیز کے سامنے پست ہے نہ اس کے سوا کوئی معبود نہ رب۔

قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَتُغْلَبُوْنَ وَتُحْشَرُوْنَ اِلٰى جَهَنَّمَ ۭ وَبِئْسَ الْمِهَادُ ﴿۱۲﴾ قَدْ كَانَ لَكُمْ اٰيَةٌ فِيْ فِئَتَيْنِ الْتَقَتَا ۭ فِئَةٌ تُقَاتِلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَاُخْرٰى كَافِرَةٌ يَّرَوْنَهُمْ مِّثْلَيْهِمْ رَاْيَ الْعَيْنِ ۭ وَاللّٰهُ يُؤَيِّدُ بِنَصْرِهٖ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّاُولِي الْاَبْصَارِ ﴿۱۳﴾

آپ ان کفر کرنے والوں سے فرما دیجئے کہ عنقریب تم (مسلمانوں کے ساتھ) مغلوب کئے جاؤ گے اور (آخرت میں) جہنم کی طرف جمع کر کے لے جائے جاؤ گے اور وہ جہنم ہے برا ٹھکانا ہے۔ بیشک تمہارے لئے بڑا نمونہ ہے دو

گروہوں (کے واقعہ) میں جو کہ باہم ایک دوسرے کے مقابل ہوئے تھے۔ ایک گروہ تو اللہ کی راہ میں لڑتے تھے۔ (یعنی مسلمان) اور دوسرا گروہ کافر لوگ تھے۔ یہ کافر اپنے کو دیکھ رہے تھے کہ ان مسلمانوں سے کئی حصہ زیادہ ہیں کھلی آنکھوں دیکھنا اور اللہ تعالیٰ اپنی امداد سے جس کو چاہتے ہیں قوت دے دیتے ہیں۔ (سو) بلاشبہ اس میں بڑی عبرت ہے (دانش) بینش والے لوگوں کو۔ ○

کفر کا قلع قمع ہونا یقینی ہے ☆

اللہ تعالیٰ فرمایا ہے کہ اے محمد ﷺ کافروں سے کہہ دیجئے کہ تم دنیا میں بھی پست اور مغلوب کئے جاؤ گے۔ مغلوب اور ماتحت بنو گے اور قیامت کے دن بھی ہانک کر جہنم کی طرف جمع کئے جاؤ گے جو بدترین بچھونا ہے۔ سیرت ابن اسحاق میں ہے کہ جب بدر کی جنگ سے حضور ﷺ مظفر و منصور واپس لوٹے تو بنو قینقاع کے بازار میں یہودیوں کو جمع کیا اور فرمایا اے یہودیو اس سے پہلے اسلام قبول کر لو کہ تمہیں بھی وہ ذلت و پستی پہنچے جو قریش کو پہنچی۔ تو اس سرکش جماعت نے جواب دیا کہ چند قریشیوں کو جو فنون جنگ سے ناآشنا تھے آپ نے ہرا لیا۔ تو کیا دماغ میں کچھ غرور سما گیا؟ اگر ہم سے لڑائی ہوئی تو ہم بتلا دیں گے کہ جنگجو ایسے ہوتے ہیں۔ آپ کو ہم سے اب تک واسطہ نہیں پڑا۔ اس پر یہ آیت اُتری اور فرمایا گیا کہ فتح بدر نے ظاہر کر دیا ہے کہ خدا تعالیٰ اپنے سچے اچھے اور پسندیدہ دین اور اس دین والوں کو عزت و حرمت عطا فرمانے والا ہے۔ وہ اپنے رسول ﷺ کا اور آپ کی اطاعت گزار اُمت کا خود مددگار ہے۔ وہ اپنی باتوں کو ظاہر اور غالب کرنے والا ہے۔

اسلام کا کفر سے پہلا معرکہ کفر کی شکست ☆ دو جماعتیں لڑائی میں گتھ گئی تھیں۔ ایک تو صحابہ کرام ؓ کی دوسری مشرکین قریش کی۔ یہ واقعہ جنگ بدر کا ہے۔ اس دن مشرکین پر اس قدر رعب غالب آیا اور خدا نے اپنوں کی اس طرح کی مدد کی کہ باوجود یکہ مسلمان گنتی میں مشرکین سے کہیں کم تھے لیکن مشرکوں کو اپنے سے دوگنے نظر آتے تھے۔ مشرکوں نے لڑائی چھیڑنے سے پہلے جاسوسی کے لئے عمیر بن سعد کو بھیجا تھا۔ جس نے آکر اطلاع دی تھی کہ تین سو ہیں کچھ کم یا زائد ہوں اور واقعہ بھی یہی تھا کہ صرف تین سو دس اور کچھ تھے لیکن لڑائی کے شروع ہوتے ہی اللہ عزوجل نے اپنے خاص اور چیدہ فرشتے ایک ہزار بھیجے۔ ایک معنی تو یہ ہیں۔ دوسرا مطلب یہ بھی بیان کیا ہے کہ مسلمان دیکھتے تھے اور جانتے تھے کہ کافر ہم سے دو چند ہیں۔ پھر بھی خدائے عزوجل نے انہی کو مدد دی۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ بدری صحابہ تین سو تیرہ تھے اور مشرکین چھ سو سولہ تھے لیکن تاریخ میں مشرکین کی تعداد نو سو سے ایک ہزار بیان کی گئی ہے تو شاید حضرت عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا الفاظ قرآن سے یہ استدلال ہوگا۔ بنو الحجاج قبیلہ کا جو سیاہ فام غلام پکڑا ہوا آیا تھا اس سے جب حضور ﷺ نے پوچھا کہ قریش کی تعداد کتنی ہے اس نے کہا بہت ہے۔ آپ نے پھر پوچھا اچھا روز کے کتنے اونٹ کٹتے ہیں؟ اس نے کہا ایک دن نو اور دوسرے دن دس۔ آپ نے فرمایا بس تو ان کی گنتی نو سو اور ایک ہزار کے درمیان ہے۔ پس مشرکین مسلمانوں سے تین گنے تھے۔ واللہ اعلم۔

لیکن یہ یاد رہے کہ عرب کہہ دیا کرتے ہیں کہ میرے پاس ایک ہزار تو ہیں لیکن ضرورت مجھے ایسے ہی دو چند کی ہے اور مراد ان کی تین ہزار کی ہوتی ہے۔ اس توجیہہ کے بعد کوئی اشکال باقی نہ رہا۔ لیکن ایک سوال اور ہے وہ یہ کہ قرآن کریم میں اور جگہ ہے: وَاِذْ يُرِيكُمُوهُمْ اِذِ الْتَقَيْتُمْ فِيْٓ اَعْيُنِكُمْ قَلِيْلًا وَّيُقَلِّلُكُمْ فِيْٓ اَعْيُنِهِمْ لِيَقْضِيَ اللّٰهُ اَمْرًا كَانَ مَفْعُوْلًا

(الانفال ۴۴) یعنی جب آمنے سامنے آ گئے تو خدا نے انہیں تمہاری نگاہوں میں کم کر کے دکھایا تا کہ جس کے کرنے کا فیصلہ خدا کر چکا تھا' وہ ہو جائے۔ پس اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اصل تعداد سے بھی کم جچے اور مندرجہ بالا آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ زیادہ بلکہ دوگنا جچے۔ تو دونوں آیتوں میں تطبیق کیا ہوگی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ دونوں معاملے علیحدہ علیحدہ وقت پر پیش آئے۔ چنانچہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ بدر والے دن میں مشرکین کچھ زیادہ نہیں معلوم ہوئے۔ ہم نے غور سے دیکھا' پھر بھی یہی معلوم ہوا کہ ہم سے زیادہ گنتی ان کی نہیں۔ دوسری روایت میں ہے کہ مشرکین کی تعداد ہمیں اس قدر کم معلوم ہوئی کہ میں نے اپنے پاس کے ایک شخص سے کہا یہ لوگ تو کوئی ستر ہوں گے۔ اس نے کہا نہیں نہیں سو ہوں گے۔ جب ان میں سے ایک شخص پکڑا گیا تو ہم نے اس سے مشرکین کی گنتی پوچھی' اس نے کہا ایک ہزار ہیں۔ اب جبکہ دونوں فریق ایک دوسرے کے سامنے صفیں باندھ کر کھڑے ہو گئے تو مسلمانوں کو یہ معلوم ہونے لگا کہ مشرکین ہم سے دو گنے ہیں۔ یہ اس لئے کہ انہیں اپنی کمزوری کا یقین ہو جائے اور یہ خدا پر بھروسہ کر لیں اور ان کی تمام تر توجہ خدا کی جانب ہو اور اپنے رب عزوجل سے اعانت اور امداد کی دعائیں کرنے لگیں۔ ٹھیک اسی طرح مشرکین کو مسلمانوں کی تعداد دوگنی معلوم ہونے لگی۔ تا کہ ان کے دلوں میں رعب اور خوف بیٹھ جائے اور گھبراہٹ اور پریشانی بڑھ جائے پھر جب دونوں بھڑ گئے اور لڑائی ہونے لگی تو ہر فریق دوسرے کو اپنی نسبت کم نسبت کم نظر آنے لگا تا کہ ہر ایک دل کھول کر حوصلے نکال لے اور خدا تعالیٰ حق و باطل کا صاف فیصلہ کر دے۔ ایمان کفر پر غالب آ جائے۔ مومنوں کو عزت اور کافروں کو ذلت ہو۔ جیسے اور جگہ ہے: ﴿وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ وَّاَنْتُمْ اَذِلَّةٌ﴾ (آل عمران: ۱۲۳) یعنی البتہ اللہ تعالیٰ نے بدر والے دن تمہاری مدد کی' حالانکہ تم اس وقت کمزور تھے۔ اسی لئے یہاں بھی فرمایا اللہ جسے چاہے اپنی مدد سے قوی بنائے۔ پھر فرماتا ہے اس میں عبرت و نصیحت ہے' اس شخص کے لئے جو آنکھوں والا ہو۔ جس کا دماغ صحیح سالم ہو وہ خدا کے احکام کی بجا آوری میں لگ جائے گا اور سمجھ لے گا کہ خدا اپنے پسندیدہ بندوں کی اس جہان میں بھی مدد کرتا ہے اور قیامت کے دن ان کا بچاؤ کرے گا۔

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ؕ ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ ﴿۱۴﴾ قُلْ اَؤُنَبِّئُكُمْ بِخَيْرٍ مِّنْ ذٰلِكُمْ ؕ لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَاَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ وَّرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ ﴿۱۵﴾ ۚ

خوشنما معلوم ہوتی ہے (اکثر) لوگوں کو محبت مرغوب چیزوں کی (مثلاً) عورتیں ہوئیں بیٹے ہوئے لگے ہوئے ڈھیر ہوئے سونے اور چاندی کے نمبر (یعنی نشان) لگے ہوئے گھوڑے ہوئے (یا دوسرے) مواشی ہوئے اور زراعت ہوئی لیکن یہ سب استعمالی چیزیں ہیں دنیاوی زندگانی کی اور انجام کار کی خوبی تو اللہ ہی کے پاس ہے۔ آپ فرما دیجئے کہ میں تم کو ایسی چیز بتلا دوں جو (بدرجہا) بہتر ہو ان چیزوں سے (سو سنو) ایسے لوگوں کے لئے جو (اللہ سے) ڈرتے ہیں ان کے مالک (حقیقی) کے پاس ایسے ایسے باغ ہیں جن کے پائیں میں نہریں جاری ہیں ان میں ہمیشہ ہمیشہ کو رہیں گے اور (ان کے لئے) ایسی بیبیاں ہیں جو صاف ستھری کی ہوئی ہیں اور (ان کے لئے) خوشنودی ہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے اور اللہ تعالیٰ خوب دیکھتے بھالتے ہیں بندوں کو۔○

دُنیا اور یہاں کی تمام لذتیں فانی ہیں ☆

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ دنیا کی زندگی کو طرح طرح کی لذتوں سے زینت دی گئی ہے۔ ان سب چیزوں میں سب سے پہلے عورتوں کو بیان فرمایا۔ اس لئے کہ ان کا فتنہ بڑا زبردست ہے۔ صحیح حدیث میں ہے رسول خدا فرماتے ہیں۔ میں نے اپنے بعد مردوں پر عورتوں سے زیادہ خوفناک اور کوئی فتنہ نہیں چھوڑا۔ ہاں جب کسی شخص کی نیت نکاح کر کے زنا سے بچنے کی اور اولاد کی کثرت کی ہو۔ تو بے شک یہ نیک کام ہے۔ اس کی رغبت شریعت نے دلائی ہے اور اس کا حکم بھی دیا ہے اور بہت سی حدیثیں نکاح کرنے بلکہ بکثرت نکاح[1] کرنے کی فضیلت میں آئی ہیں اور اس امت میں سب سے بہتر وہ ہے جو سب سے زیادہ بیویوں والا ہو۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں' دنیا ایک فائدہ ہے اور اس کا بہترین فائدہ نیک بیوی ہے کہ خاوند اگر اس کی طرف دیکھے تو یہ اسے خوش کر دے اور حکم دے تو بجالائے اور اگر کہیں چلا جائے تو اپنے نفس کی اور خاوند کے مال کی حفاظت کرے۔ دوسری حدیث میں ہے مجھے عورتیں اور خوشبو بہت پسند ہیں اور میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سب سے زیادہ محبوب عورتیں تھیں۔ ہاں گھوڑے ان سے بھی زیادہ پسند تھے۔ ایک اور روایت میں ہے گھوڑوں سے زیادہ آپ کی محبوب چیز کوئی اور نہ تھی۔ ہاں صرف عورتیں[2]۔ پس عورتوں کی محبت بھلی بھی ہے اور بُری بھی۔[3] اسی طرح لڑکوں کی کہ اگر ان کی کثرت اس لئے چاہتا ہے کہ فخر و غرور کرے تو وہ بری چیز ہے اور اگر اس لئے ان کی زیادتی چاہتا ہے کہ نسل بڑھے اور موحد مسلمانوں کی گنتی امت محمد صلی اللہ علیہ وسلم میں زیادہ ہو تو بے شک یہ بھلائی کی چیز ہے۔ حدیث شریف میں ہے' محبت رکھنے والیوں اور زیادہ اولاد ہونے والی عورتوں سے نکاح کرو۔ قیامت کے دن میں تمہاری زیادتی سے اور اُمتوں پر فخر کرنے والا ہوں۔ ٹھیک اسی طرح مال بھی ہے کہ اگر اس کی محبت نادار لوگوں کو حقیر سمجھنے کے لئے اور غریبوں مسکینوں پر فخر کرنے کے لئے ہے تو بے حد بُری چیز ہے اور اگر مال کی خواہش اپنوں اور غیروں سے سلوک کرنے نیکیاں کرنے

---

[1] بکثرت سے مراد ہی چار نکاح ہیں۔ جن کی اجازت شریعت سے ایک عام مسلمان کو ہے۔ ابن کثیر کا یہ مطلب نہیں کہ چار سے زیادہ سے بھی کر سکتا ہے۔

[2] قضائے شہوت کا جائز اور صحیح راستہ صرف عورت ہے اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی منکوحہ عورتوں (امہات المومنین) سے ایک گونہ تعلق تھا۔ گویا کہ یہ تعلق بھی اپنی پیغمبرانہ عفت وعصمت کی حفاظت کے لئے ایک کوشش تھی۔ یہ تعلق کسی تفریح کا پیش خیمہ نہیں نہ اس میں لذت کوشی مقصود تھی۔ اسلام نے نکاح کا سب سے پہلا مقصد عفت قرار دیا ہے اور نکاح محض برائے لذت اس کی نظر میں جرم ہے۔

[3] اگر جائز حدود میں ہے تو بھلی اور اگر حدود شرعیہ سے یہ تعلق بڑھ جائے تو یہی چیز بری ہوگی۔

بھلی راہوں میں خرچ کرنے کے لئے ہے تو ہر طرح شرعاً اچھی اور بہت اچھی چیز ہے۔

قنطار کی مقدار میں مفسرین کا اختلاف ہے۔ ماحصل یہ ہے کہ بہت زیادہ مال کو قنطار کہتے ہیں۔ جیسے حضرت ضحاک کا قول ہے اور اقوال بھی ملاحظہ ہوں۔ ایک ہزار دینار' بارہ سو دینار' بارہ ہزار' چالیس ہزار' ساٹھ ہزار' ستر ہزار' اسی ہزار وغیرہ وغیرہ۔ مسند احمد کی ایک مرفوع حدیث میں ہے ایک قنطار بارہ ہزار اوقیہ کا ہے اور ہر اوقیہ بہتر ہے زمین و آسمان سے۔ غالباً یہاں مقدار ثواب کی بیان ہوئی ہے۔ جو ایک قنطار ملے گا واللہ اعلم۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بھی ایسی ہی ایک موقوف روایت مروی ہے اور یہی زیادہ صحیح ہے۔ اسی طرح ابن جریر میں حضرت معاذ بن جبل اور حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے بھی روایت ہے اور ابن ابی حاتم میں ابو ہریرہ اور حضرت ابوالدرداء رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ قنطار بارہ سو اوقیہ ہیں۔ ابن جریر کی ایک مرفوع حدیث میں بھی بارہ سو اوقیہ آئے ہیں لیکن وہ حدیث بھی منکر ہے ممکن ہے کہ وہ حضرت اُبی بن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قول ہو۔ جیسے اور صحابہ کا بھی یہی فرمان ہے۔ ابن مردویہ میں ہے رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں' جو شخص سو آیتیں پڑھ لے غافلوں میں نہیں لکھا جائے گا اور جس نے سو سے ہزار تک پڑھ لیں' اسے خدا کی طرف سے ایک قنطار اجر ملے گا اور قنطار بڑے پہاڑ کے برابر ہے مستدرک حاکم میں ہے۔ اس آیت کے اس لفظ کا مطلب رسول ﷺ سے پوچھا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا دو ہزار اوقیہ۔ امام حاکم رحمتہ اللہ علیہ اسے صحیح اور شرط شیخین پر بتلاتے ہیں۔ اگرچہ بخاری مسلم نے اس حدیث کو ذکر نہیں کیا۔ طبرانی وغیرہ میں ہے ایک ہزار دینار' حضرت حسن بصری سے موقوفاً اور مرسلاً روایت ہے کہ بارہ سو دینار' حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے بھی یہی روایت ہے۔ ضحاک رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں بعض عرب قنطار کو بارہ سو کا بتاتے ہیں۔ بعض بارہ ہزار کا۔ حضرت ابوسعید خدری فرماتے ہیں۔ بیل کی کھال کے بھر جانے کے برابر سونے کو قنطار کہتے ہیں۔ یہ مرفوعاً بھی روایت ہے لیکن زیادہ صحیح موقوفاً ہے۔

گھوڑوں کی محبت کے بھی تین اسباب ہیں۔ ایک تو وہ لوگ جو گھوڑوں کو پالتے ہیں خدا کی راہ میں ان پر سوار ہو کر جہاد کرنے کے لئے۔ ان کے لئے تو یہ گھوڑے اجر و ثواب کا سبب ہیں۔ دوسرے وہ جو فخر و غرور کے طور پر پالتے ہیں۔ یہ ان کے ذمے وبال ہے۔ تیسرے وہ جو سوال سے بچنے[1] اور ان کی نسل کی حفاظت کے لئے پالتے ہیں اور خدا کا حق نہیں بھولتے۔ اس میں نہ اجر ہے اور نہ عذاب ہے۔ اسی مضمون کی حدیث آیت: ﴿وَاَعِدُّوْا لَهُمْ......﴾ (الانفال: ۶۰) کی تفسیر میں آئے گی ان شاء اللہ تعالیٰ۔

مُسَوَّمَہ کے معنی چرنے والا اور پنچ کلیان وغیرہ کے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں۔ ہر عربی گھوڑا فجر کے وقت خدا کی اجازت سے دو دعائیں کرتا ہے۔ کہتا ہے خدایا' جس کے قبضہ میں تو نے مجھے دیا ہے تو اس کے دل میں اس کے اہل و مال سے زیادہ محبت میری دے اَنْعَام سے مراد اونٹ بکریاں گائیں ہیں۔ حَرْث سے مراد وہ زمین ہے جو کھیتی بونے یا باغ لگانے کیلئے تیار کی جائے۔ مسند احمد کی حدیث میں ہے انسان کا بہتر مال زیادہ نسل والا گھوڑا ہے اور زیادہ پھلدار درخت کھجور ہے۔

---

[1] ہر مسلمان کے لئے اعلاء کلمتہ اللہ کے لئے ہر وقت تیار رہنا ضروری ہے اور اس مقصد کے لئے گاہے گاہے کفر سے نبرد آزما ہونا ہوگا اور جنگ کے لئے قدیم زمانہ میں گھوڑوں کا وجود سب سے زیادہ ضروری تھا۔ اس لئے ہر شخص سے آخرت میں سوال ہوگا۔ جس نے جہاد کی نیت سے گھوڑا اپنے یہاں رکھا ہو۔ عہد جدید کے جنگی ہتھیار کیونکہ قطعاً بدل گئے ہیں اب غالباً گھوڑا رکھنا اس قدر ضروری نہ ہو لیکن یہ راقم الحروف کی اپنی رائے ہے کسی مستند عالم سے مزید دریافت کر لیا جائے۔

پھر فرمایا کہ یہ سب دنیاوی فائدہ کی چیزیں ہیں اور یہیں کی زینت فریفتگی کی چیزیں ہیں' جو فانی اور زوال پانے والی ہیں۔ اچھی لوٹنے کی جگہ اور بہترین ثواب کا مقام خدا کے پاس ہے۔ مسند احمد میں ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا خدایا جبکہ تو نے اسے زینت دے دی۔ تو اب اس پر اس کے بعد والی آیت اتری کہ اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم آپ ان سے کہہ دیجئے کہ میں تمہیں اس سے بہترین چیزیں بتلاتا ہوں۔ یہ تو ایک نہ ایک روز زائل ہونے والی ہیں اور میں جن کی طرف تمہیں بلا رہا ہوں وہ دیرپا ہی نہیں بلکہ ہمیشگی والی ہیں۔ سنو خدا سے ڈرنے والوں کے لئے جنت ہے۔ جس کے کنارے کنارے اور جس کے درختوں کے درمیان قسم قسم کی نہریں بہہ رہی ہیں۔ کہیں شہد کی کہیں دودھ کی۔ کہیں پاک شراب کی اور نفیس پانی کی اور وہ وہ نعمتیں ہیں جو نہ کسی کان نے سنی نہ کسی آنکھ نے دیکھی ہوں۔ نہ کسی دل میں خیال بھی گزرا ہو۔ ان جنتوں میں یہ متقی لوگ ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے نہ یہ نکالے جائیں گے۔ نہ انہیں دی ہوئی نعمتیں گھٹیں گی نہ فنا ہوں گے۔ پھر وہاں بیویاں ملیں گی جو میل کچیل سے' خباثت اور برائی سے حیض اور نفاس سے گندگی اور پلیدی سے پاک صاف ہیں۔ ہر طرح ستھری اور پاکیزہ ہیں۔ ان سب سے بڑھ کر یہ خدا کی رضا مندی انہیں حاصل ہو جائے گی اور ایسی کہ اس کے بعد ناراضگی کا کھٹکا ہی نہیں۔ اسی لئے سورہ برات کی آیت میں فرمایا: ﴿وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ﴾ (التوبۃ:۷۲) خدا کی تھوڑی سی رضا مندی کا حاصل ہو جانا بھی سب سے بڑی چیز ہے یعنی تمام نعمتوں سے اعلیٰ نعمت رضائے رب اور مرضی مولا ہے۔ تمام بندے خدا کی نگاہ میں ہیں۔ وہ بخوبی جانتا ہے کہ مہربانی کا مستحق کون ہے۔

اَلَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اِنَّنَآ اٰمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۝۱۶ اَلصّٰبِرِيْنَ وَالصّٰدِقِيْنَ وَالْقٰنِتِيْنَ وَالْمُنْفِقِيْنَ وَالْمُسْتَغْفِرِيْنَ بِالْاَسْحَارِ ۝۱۷

(یہ) ایسے لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ ہمارے پروردگار ہم ایمان لے آئے سو آپ ہمارے گناہوں کو معاف کر دیجئے اور ہم کو عذابِ دوزخ سے بچایئے اور وہ لوگ صبر کرنے والے ہیں اور راست باز ہیں اور (اللہ کے سامنے) فروتنی کرنے والے ہیں اور (مال) خرچ کرنے والے ہیں اور گناہوں کی معافی چاہنے والے ہیں اخیر شب میں (اٹھ اٹھ کر)۔ ○

صفاتِ نیکو کاراں ☆

اللہ تعالیٰ اپنے متقی بندوں کے اوصاف بیان فرماتا ہے کہ وہ کہتے ہیں اے پروردگار ہم تجھ پر اور تیری کتاب پر اور تیرے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے۔ ہمارے اس ایمان کے باعث جو تیری ذات پر اور تیری شریعت پر ہے۔ تو ہماری تقصیروں کو اپنے فضل و کرم سے معاف فرما اور ہمیں جہنم کے عذاب سے نجات دے۔ یہ متقی لوگ اطاعتِ خدا بجا لاتے ہیں اور حرام چیزوں سے الگ رہتے ہیں۔ صبر و تحمل سے کام لیتے ہیں اور اپنے ایمان کے دعوے میں بھی سچے ہیں۔ کل اعمال خیر بجا لاتے ہیں۔ خواہ وہ نفس پر بھاری پڑیں۔ اطاعت اور خشوع والے ہیں۔ اپنے مال خدا کی ہر راہ میں جہاں جہاں حکم ہے خرچ کرتے

ہیں صلہ رحمی میں رشتہ داری کو باقی رکھنے میں برائیوں کو روکنے میں ہمدردی اور خیر خواہی کرنے میں حاجت مندوں مسکینوں اور فقیروں کے ساتھ احسان کرنے میں سخاوت سے کام لیتے ہیں اور سحری کے وقت اُٹھ اُٹھ کر پچھلی رات میں استغفار کرتے ہیں۔ معلوم ہوا[1] کہ اس وقت استغفار بہت افضل ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ قرآن کریم کی اس آیت میں حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے بیٹوں سے جو فرمایا تھا کہ: ﴿سَوْفَ اَسْتَغْفِرُ لَكُمْ رَبِّيْ﴾ میں ابھی تھوڑی دیر میں تمہارے لئے اپنے رب سے بخشش طلب کروں گا۔ اس سے مراد بھی سحری کا وقت ہے۔ اپنی اولاد سے فرماتے ہیں کہ سحری کے وقت میں تمہارے لئے استغفار کروں گا۔

صحیحین وغیرہ کی حدیث میں جو بہت سے صحابیوں سے روایت ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد موجود ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ ہر رات آخری تہائی رات باقی رہتے ہوئے آسمان دنیا پر اترتا ہے[2] اور فرماتا ہے کہ کوئی سائل ہے' جسے میں دوں؟ کوئی دعا مانگنے والا ہے کہ میں اس کی دعا قبول کروں کوئی استغفار کرنے والا ہے کہ میں اسے بخشوں؟ حافظ ابوالحسن دار قطنی رحمتہ اللہ علیہ نے اس مسئلہ پر ایک مستقل کتاب لکھی ہے اور اس حدیث کی تمام سندوں کو اور اس کے کل الفاظ کو نقل کیا ہے۔ صحیحین میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اوّل رات اور درمیانی اور آخری رات میں وتر پڑھا ہے۔ سب سے آخر وقت حضور ﷺ کے وتر پڑھنے کا سحری تک تھا۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما رات کو تہجد پڑھتے رہتے اور اپنے غلام حضرت نافع رحمتہ اللہ علیہ سے پوچھتے ہیں کیا سحر ہوگئی؟ جب وہ کہتے ہاں تو آپ پھر صبح صادق کے نکلنے تک دعا و استغفار میں مشغول رہتے۔ حضرت حاطب رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں' سحری کے وقت میں نے سنا کہ کوئی شخص مسجد کے کسی گوشہ میں کہہ رہا ہے' خدایا تو نے مجھے حکم کیا میں بجا لایا۔ یہ سحر کا وقت ہے مجھے بخش دے میں نے دیکھا تو وہ حضرت عبداللہ بن مسعود تھے۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں' ہمیں حکم کیا جاتا تھا کہ ہم جب تہجد کی نماز پڑھیں تو سحری کے آخری وقت ستر مرتبہ استغفار کریں اور خدا سے بخشش کی دُعا کریں۔

شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًۢا بِالْقِسْطِ ؕ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۱۸﴾ اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ ۗ وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ ؕ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَاِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ﴿۱۹﴾ فَاِنْ

---

[1] کیونکہ اس وقت رحمتِ خداوندی اپنے بندوں کی طرف خاص طور پر متوجہ ہوتی ہے۔ بظاہر جس کی وجہ یہ ہے کہ وقت سونے اور آرام کرنے کا ہے لیکن اللہ کے مقبول بندے اپنا آرام و راحت چھوڑ کر خدائے کریم و رحیم کے حضور میں سجدہ ریز ہوتے ہیں۔ پھر اس عزیمت پر خدا تعالیٰ کی رحمت کیوں متوجہ نہ ہو۔

[2] یعنی آسمان دنیا پر رحمتوں کا خاص اثر ہوتا ہے ورنہ وہ ہر جگہ موجود ہیں۔ کہیں سے آنا اور کسی جگہ کو چھوڑنا جسم کے خواص ہیں اور اللہ تعالیٰ جسم نہیں رکھتے۔

حَآجُّوْكَ فَقُلْ اَسْلَمْتُ وَجْهِيَ لِلّٰهِ وَمَنِ اتَّبَعَنِ ؕ وَقُلْ لِّلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَالْاُمِّيّٖنَ ءَاَسْلَمْتُمْ ؕ فَاِنْ اَسْلَمُوْا فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ ؕ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ ﴿۲۰﴾ ع

گواہی دی ہے اللہ نے اس کی کہ بجز اس ذات کے کوئی معبود ہونے کے لائق نہیں اور فرشتوں نے بھی اور اہل علم نے بھی اور معبود بھی وہ اس شان سے ہیں کہ اعتدال کے ساتھ انتظام رکھنے والے ہیں۔ ان کے سوا کوئی معبود ہونے کے لائق نہیں۔ وہ زبردست ہیں حکمت والے ہیں۔ بلاشبہ دین (حق اور مقبول) اللہ تعالیٰ کے نزدیک صرف اسلام ہی ہے اور اہل کتاب نے جو اختلاف کیا (کہ اسلام کو باطل کہا) تو ایسی حالت کے بعد کہ ان کو دلیل پہنچ چکی تھی محض ایک دوسرے سے بڑھنے کے وجہ سے اور جو شخص اللہ تعالیٰ کے احکام کا انکار کرے گا تو بلاشبہ اللہ تعالیٰ بہت جلد اس کا حساب لینے والے ہیں۔ پھر بھی اگر یہ لوگ آپ سے حجتیں نکالیں تو آپ فرما دیجئے کہ (تم مانو یا نہ مانو) میں تو اپنا رخ خاص اللہ کی طرف کر چکا اور جو میرے پیرو تھے وہ بھی اور کہئے اہل کتاب سے اور مشرکین عرب سے کہ کیا تم بھی اسلام لاتے ہو؟ سو اگر وہ اسلام لے آئیں تو وہ لوگ بھی راہ پر آ جائیں گے اور اگر وہ لوگ روگردانی رکھیں تو آپ کے ذمے صرف پہنچا دینا ہے اور اللہ تعالیٰ خود دیکھ اور سمجھ لیں گے بندوں کو۔ ○

اسلام کے مقبول عند اللہ ہونے پر خود خدائے قدوس کی شہادت ☆

اللہ تعالیٰ خود شہادت دیتا ہے بس اس کی شہادت کافی ہے۔ وہ سب سے زیادہ سچا شاہد ہے۔ سب سے زیادہ سچی بات اسی کی ہے۔ وہ فرماتا ہے کہ تمام مخلوق اس کی غلام ہے اور اسی کی پیدا کی ہوئی ہے اور اسی کی طرف محتاج ہے۔ وہ سب سے بے نیاز ہے۔ الوہیت میں اللہ ہونے میں وہ یکتا اور لاشریک ہے۔ اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں۔ جیسے فرمان ہے: ﴿لٰكِنِ اللّٰهُ يَشْهَدُ بِمَآ اَنْزَلَ اِلَيْكَ......﴾ (النساء:۱۶۶) لیکن اللہ تعالیٰ بذریعہ اس کتاب کے جو وہ تیری طرف اپنے علم سے اتار رہا ہے گواہی دے رہا ہے اور فرشتے بھی گواہی دیتے ہیں اور اللہ کی شہادت کافی ہوتی ہے۔ پھر اپنی شہادت کے ساتھ فرشتوں کی اور علما کی شہادت کو ملا رہا ہے۔ یہاں سے علما کی بہت بڑی فضیلت ثابت ہوتی ہے۔ بلکہ ایک ایسی خصوصیت جس میں کوئی ان کا شریک نہیں۔ قَآئِمًا کا نصب حال ہونے کی وجہ سے ہے۔ وہ خدا ہر وقت اور ہر حال میں ایسا ہی ہے پھر تاکید اً دوبارہ ارشاد ہوتا ہے کہ معبودِ حقیقی صرف وہی ہے وہ غالب ہے عظمت اور کبریائی والی اس کی بارگاہ ہے وہ اپنے اقوال افعال شریعت اور تقدیر میں حکمتوں والا ہے۔ مسند احمد میں ہے کہ نبی ﷺ نے عرفات میں اس آیت کی تلاوت کی اور: ﴿الْحَكِيْمُ﴾ تک پڑھ کر فرمایا وَاَنَا عَلٰى ذٰلِكَ مِنَ الشَّاهِدِيْنَ يَارَبِّ۔ ابن ابی حاتم میں ہے آپ نے یوں فرمایا وَاَنَا اَشْهَدُ اَيْ رَبِّ۔ طبرانی میں ہے۔

حدیث کا شوق، قرنِ اوّل کی بعض عبرت خیز شہادتیں ☆ حضرت غالب قطان رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں میں کوفے میں تجارتی غرض سے گیا اور حضرت اعمش کے قریب ٹھہرا۔ رات کو حضرت اعمش تہجد کے لئے کھڑے ہوئے پڑھتے

پڑھتے جب اس آیت تک پہنچے اور: ﴿اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ﴾ پڑھا تو فرمایا: وَاَنَا اَشْهَدُ بِمَا شَهِدَ اللّٰهُ بِهٖ وَاَسْتَوْدِعُ اللّٰهَ بِهٖ وَاَسْتَوْدِعُ اللّٰهَ هٰذِهِ الشَّهَادَةَ وَهِيَ لِيْ عِنْدَ اللّٰهِ وَدِيْعَةٌ۔ یعنی میں شہادت دیتا ہوں اس کی جس کی شہادت خدا نے دی اور میں اس شہادت کو خدا کے سپرد کرتا ہوں۔ یہ میری امانت خدا کے پاس ہے۔ پھر کئی دفعہ: ﴿اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ﴾ پڑھا۔ میں نے اپنے دل میں خیال کیا کہ شاید اس بارے میں کوئی حدیث سنی ہوگی۔ صبح ہی صبح میں حاضر خدمت ہوا اور عرض کیا کہ ابو محمد رحمتہ اللہ علیہ کیا بات تھی جو آپ اس آیت کو بار بار پڑھتے رہے۔ کہا کیا اس کی فضیلت تمہیں معلوم نہیں؟ میں نے عرض کیا۔ حضرت میں تو مہینہ بھر سے آپ کی خدمت میں ہوں لیکن آپ نے حدیث بیان ہی نہیں کی۔ کہنے لگے خدا کی قسم میں تو سال بھر تک بیان نہ کروں گا۔ اب میں سال بھر تک اس حدیث کو سننے کے لئے ٹھہرا رہا اور ان کے دروازے پر پڑا رہا۔ جب سال کامل گزر چکا تو میں نے کہا اے ابو محمد رحمتہ اللہ علیہ سال گزر چکا۔ بولے مجھ سے ابو وائل نے حدیث بیان کی۔ اس نے عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے سنا وہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اس کے پڑھنے والے کو قیامت کے دن لایا جائے گا اور اللہ عزوجل فرمائے گا۔ میرے اس بندے نے میرا عہد لیا ہے اور میں عہد پورا کرنے میں سب سے زیادہ ہوں۔ میرے اس بندے کو جنت میں لے جاؤ۔ پھر اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتا ہے کہ وہ صرف اسلام ہی کو قبول فرماتا ہے۔

اب ہدایت کا ایک ہی راستہ اور وہ صرف اسلام ہے ☆ اسلام ہر زمانے کے پیغمبر کی وحی کی تابعداری کا نام ہے سب سے آخر اور سب رسولوں کو ختم کرنے والے ہمارے پیغمبر حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ ہیں۔ آپ ﷺ کی نبوت کے بعد سب راستے بند ہوگئے۔ اب جو شخص آپ کی شریعت کے سوا کسی چیز پر عمل کرے خدا کے نزدیک وہ دیندار نہیں۔ جیسے اور جگہ ہے: ﴿وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ﴾ (آل عمران: ۸۵) جو شخص اسلام کے سوا اور دین کی تلاش کرے وہ اس سے قبول نہیں کیا جائے گا۔ اسی طرح اس آیت میں دین کا انحصار صرف اسلام میں کر دیا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی قراءت میں: شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ ہے اور ﴿اَنَّ الْاِسْلَامَ﴾ ہے۔ تو معنی یہ ہوں گے کہ خود خدا کی گواہی ہے اور اس کے فرشتوں کی اور ذی علم انسانوں کی کہ خدا کے نزدیک مقبول ہونے والا دین صرف اسلام ہی ہے۔ جمہور کی قراءت میں اِنَّ زیر کے ساتھ ہے اور معنی کے لحاظ سے دونوں ہی ٹھیک ہے لیکن جمہور کی تحقیق زیادہ ظاہر ہے۔ واللہ اعلم۔

پھر ارشاد ہوتا ہے کہ اگلی کتابوں والوں نے اپنے پاک خدا کے پیغمبروں کے آ جانے اور خدائی کتابیں اترنے کے بعد اختلاف کیا اور اس کی وجہ صرف آپ کا بغض و عناد تھا کہ یہ جو کہتا ہے میں اس کے خلاف کہوں گو وہ حق ہی کہتا ہو۔ پھر ارشاد ہے کہ جب خدا کی آیتیں اُتر چکیں۔ اب جو ان کا انکار کرے انہیں نہ مانے تو اللہ تعالیٰ بھی اس سے اس کی اس تکذیب کا بہت جلد حساب لے گا اور کتاب اللہ کی مخالفت کی وجہ سے اسے سخت عذاب کرے گا اور اسے اس کی شرارت کا لطف چکھا دے گا۔ پھر فرمایا اگر یہ لوگ تجھ سے توحید باری میں جھگڑیں تو تُو کہہ دے کہ میں تو خالص اللہ ہی کی عبادت کروں گا۔ جس کا نہ کوئی شریک ہے نہ اس جیسا کوئی ہے نہ اس کی اولاد ہے نہ بیوی جو بھی میرے اُمتی ہیں۔ میرے دین پر ہیں۔ ان سب کا قول بھی یہی ہے جیسے اور جگہ فرمایا: ﴿قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ ......﴾ (یوسف ۱۰۸) میری راہ یہی ہے۔ میں خوب سوچ سمجھ کر دیکھ بھال کر تمہیں خدا کی طرف بلا رہا ہوں میں بھی اور میرے تابعدار بھی۔ پھر حکم دیتا ہے کہ اے

نبی صلی اللہ علیہ وسلم یہود و نصاریٰ سے جن کے ہاتھوں میں کتاب اللہ ہے اور مشرکین جو بے پڑھے ہیں کہہ دو کہ تم سب کی ہدایت اسلام میں ہی ہے اور اگر یہ نہ مانیں تو کوئی بات نہیں آپ اپنا فرض تبلیغ ادا کر چکے خدا خود ان سے سمجھ لے گا۔ اب سب کو لوٹ کر اسی کے پاس جانا ہے۔ وہ جسے چاہے راہ راست دکھادے' جسے چاہے گمراہ کر دے۔ اپنی حکمت کو وہی خوب جانتا ہے۔ اس کی حجت تو پوری ہو کر رہتی ہے۔ اس کی اپنے بندوں پر نظر ہے۔ اسے خوب معلوم ہے کہ مستحق ہدایت کون ہے اور کون مستحق ضلالت ہے۔ اس سے کوئی باز پرس نہیں کرسکتا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت عام پر بعض شہادتیں ☆ یہ اور ان جیسی آیتوں میں صاف صراحت ہے اس امر پر کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم تمام مخلوق کی طرف خدا کے نبی بن کر آئے ہیں اور خود آپ کے دین کے احکام اس پر دلالت کرتے ہیں اور کتاب و سنت میں بہت سی آیتیں اور حدیثیں اس مضمون کی ہیں۔ قرآن پاک میں ایک جگہ ہے: ﴿يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّىْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا﴾ (الاعراف: ۱۵۸) لوگو! میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہوں (سلام علیہ) اور آیت میں ہے: ﴿تَبٰرَكَ الَّذِىْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا﴾ (الفرقان: ۱) بابرکت ہے وہ خدا جس نے اپنے بندے پر قرآن نازل فرمایا' تاکہ وہ تمام دنیا والوں کے لئے تنبیہ کرنے والا بن جائے۔ صحیحین وغیرہ میں کئی کئی واقعات سے تواتر کے ساتھ ثابت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ادھر اُدھر کے تمام بادشاہوں کو اور دوسرے لوگوں کو خطوط بھجوائے۔ جن میں انہیں خدا کی طرف آنے کی دعوت دی۔ خواہ وہ عرب ہوں یا عجم ہوں۔ اہل کتاب ہوں' اور مذہب والے ہوں اور اس طرح آپ نے فرض تبلیغ کو تمام و کمال تک پہنچا دیا (صلی اللہ علیہ وسلم) مسند عبدالرزاق میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس خدا کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے' اس امت میں سے جس کسی کے کان میں میری نبوت کی آواز پہنچے اور وہ میری لائی ہوئی چیز پر ایمان نہ لائے۔ خواہ یہودی ہو خواہ نصرانی اور اسی کفر کی حالت میں مر جائے تو قطعی جہنمی ہوگا۔ مسلم شریف میں بھی یہ حدیث ہے اور آنحضرت کا یہ ارشاد بھی ہے کہ میں ہر ایک سرخ و سیاہ کی طرف خدا کا نبی بنا کر بھیجا گیا ہوں۔ مسند احمد میں حضرت انس سے روایت ہے کہ ایک یہودی لڑکا جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے وضو کا پانی رکھا کرتا تھا اور جوتیاں لا کر رکھ دیتا تھا' وہ بیمار پڑ گیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس کی بیمار پرسی کے لئے تشریف لائے۔ اس وقت اس کا باپ بھی اس کے سرہانے بیٹھا ہوا تھا۔ آپ نے فرمایا اے فلاں: لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہہ۔ اس نے اپنے باپ کی طرف دیکھا اور باپ کو خاموش دیکھ کر خود بھی چپکا ہو گیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دوبارہ یہی فرمایا' اس نے پھر اپنے باپ کی طرف دیکھا۔ باپ نے کہا' ابوالقاسم کی مان لے (صلی اللہ علیہ وسلم) پس بچے نے کہا: اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنَّكَ رَسُوْلُ اللّٰهِ۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم وہاں سے یہ فرماتے ہوئے اُٹھے کہ اللہ کا شکر ہے' جس نے میری وجہ سے اسے جہنم سے بچا لیا۔ اسے صحیح بخاری میں حضرت امام بخاری لائے ہیں۔ ان کے سوا اور بھی بہت سی صحیح حدیثیں اور قرآن کریم کی آیتیں ہیں۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ حَقٍّ ۙ وَّيَقْتُلُوْنَ الَّذِيْنَ يَاْمُرُوْنَ بِالْقِسْطِ مِنَ النَّاسِ ۙ فَبَشِّرْهُمْ

بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴿٢١﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا

وَالْاٰخِرَةِ ۫ وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ﴿٢٢﴾

بے شک جولوگ کفر کرتے ہیں اللہ کی آیات کے ساتھ اور قتل کرتے ہیں پیغمبروں کو ناحق اور قتل کرتے ہیں ایسے شخصوں کو جو (افعال واخلاق کے) اعتدال کی تعلیم دیتے ہیں۔ سو ایسے لوگوں کو خبر سنا دیجئے ایک سزائے دردناک کی (اور) یہ وہ لوگ ہیں کہ ان کے سب اعمالِ صالحہ غارت ہو گئے دنیا میں اور آخرت میں اور (سزا کے وقت) ان کا کوئی حامی مددگار نہ ہوگا۔○

اَمر بالمعروف کرنے والوں کو تکلیف دینے والے مجرم ☆

یہاں اہل کتاب کی مذمت بیان ہو رہی ہے' جو گناہ اور حرام کام کرتے رہتے تھے۔ خدا کی اگلی پچھلی باتوں کو جو اس نے اپنے رسولوں کے ذریعے سے پہنچائیں' جھٹلاتے رہتے تھے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ پیغمبروں کو مار ڈالا کرتے تھے۔ بلکہ اس قدر سرکش تھے کہ جو لوگ انہیں عدل وانصاف کی سنائیں' انہیں بے دریغ تہ تیغ کر دیا کرتے تھے۔ حدیث میں ہے کہ کبر وغرور یہی ہے کہ حق کو نہ ماننا اور حق والوں کو ذلیل جاننا۔ مسند ابو حاتم میں ہے حضرت ابو عبیدہ بن جراح رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا کہ سب سے زیادہ سخت عذاب کسے ہوگا۔ آپ نے فرمایا اسے جو کسی نبی کو مار ڈالے یا کسی ایسے شخص کو جو بھلائی کا بتانے والا اور برائی سے بچانے والا ہو۔ پھر حضور ﷺ نے اس آیت کی تلاوت فرمائی اور فرمایا اے عبیدہؓ بنو اسرائیل نے تینتالیس نبیوں کو دن کے اوّل حصہ میں ایک ساعت میں قتل کیا۔ پھر ایک سو ستر بنو اسرائیل کے ایماندار جو انہیں اس سے روکنے کے لئے کھڑے ہوئے تھے اور انہیں بھلائی کا حکم دے رہے تھے اور برائی سے روک رہے تھے۔ ان سب کو اسی دن کے آخری حصہ میں مار ڈالا۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ انہی کا ذکر کر رہا ہے۔ ابن جریر میں ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں بنو اسرائیل نے تین سو نبیوں کو شروع دن میں[1] قتل کیا اور شام کو سبزی پالا بیچنے بیٹھ گئے۔ پس لوگوں کی اس سرکشی تکبر اور خود پسندی کی بنا پر خدا تعالیٰ نے انہیں دنیا میں پست و ذلیل کر دیا اور آخرت کے بھی رسوائی والے بدترین عذاب ان کے لئے تیار کئے۔ اسی لئے فرمایا کہ انہیں دردناک ذلت والے عذابوں کی خبر پہنچا دو۔ ان کے اعمال دنیا میں بھی غارت اور آخرت میں بھی برباد اور ان کا کوئی مددگار اور سفارشی بھی نہ ہوگا۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يُدْعَوْنَ اِلٰى كِتٰبِ اللّٰهِ لِيَحْكُمَ

بَيْنَهُمْ ثُمَّ يَتَوَلّٰى فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ وَهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿٢٣﴾ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لَنْ

[1] بیک وقت بہت سے انبیاء کا ہونا ناممکن نہیں ہے جیسے ایک دور میں ہزاروں علما ایک ہی فن میں ممتاز پائے جاتے ہیں۔ اسی طرح ایک ہی وقت میں سینکڑوں انبیاء بھی موجود ہو سکتے ہیں۔ اس میں کوئی حرج نہیں۔۱۲

تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ ۪ وَّغَرَّهُمْ فِيْ دِيْنِهِمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿۲۴﴾ فَكَيْفَ اِذَا جَمَعْنٰهُمْ لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيْهِ ۣ وَوُفِّيَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَھُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۲۵﴾

(اے محمد ﷺ) آپ نے ایسے لوگ نہیں دیکھے جن کو کتاب (توراۃ) کا ایک (کافی) حصہ دیا گیا اور اسی کتاب اللہ کی طرف اس غرض سے ان کو بلایا بھی جاتا ہے کہ وہ ان کے درمیان فیصلہ کر دے پھر (بھی) ان میں سے بعض لوگ انحراف کرتے ہیں بے رخی کرتے ہوئے (اور) یہ اس سبب سے ہے کہ وہ لوگ یوں کہتے ہیں کہ ہم کو صرف گنتی کے تھوڑے دنوں تک دوزخ کی آگ لگے گی اور ان کو دھوکے میں ڈال رکھا ہے۔ ان کی تراشی ہوئی باتوں نے سو اُن کا کیا (برا) حال ہوگا جبکہ ہم انکو اس تاریخ میں جمع کر لینگے جسکے آنے میں ذرا شبہ نہیں اور (اس تاریخ میں) پورا پورا بدلہ مل جائے گا ہر شخص کو جو کچھ اُس نے (دُنیا میں) کیا تھا اور ان شخصوں پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔ ○

کتاب اللہ سے اعراض پر مواخذہ ☆

یہاں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ یہود ونصاریٰ اپنے اس دعوے میں بھی جھوٹے ہیں کہ ان کا تورات انجیل پر ایمان ہے کیونکہ ان کتابوں کی ہدایت کے مطابق جب انہی اس نبی آخر الزمان ﷺ کی اطاعت کی طرف بلایا جاتا ہے تو یہ بھاگتے دکھائی دیتے ہیں۔ اس سے ان کی سرکشی تکبر اور عناد ومخالفت ظاہر ہو رہی ہے۔ اس مخالفت حق اور اس بے جا سرکشی پر انہیں اس چیز نے دلیر کر دیا ہے کہ انہوں نے باوجود خدا کی کتاب میں نہ ہونے کے اپنی طرف سے افترا کر کے یہ بیان بنا لیا ہے کہ ہم تو صرف چند روز ہی آگ میں رہیں گے۔ یعنی فقط سات روز۔ دنیا کے حساب کے ہر سال کے پیچھے ایک دن۔ اس کی پوری تفسیر سورہ بقرہ میں گزر چکی ہے۔ اسی واہی نے اور بے سروپا خیال نے اس باطل دین پر انہیں جما دیا ہے۔ حالانکہ یہ خود ان کا خیال ہے خدا نے نہ ایسی بات کہی نہ اس کی کوئی دلیل ان کے پاس ہے۔ پھر خدائے تبارک وتعالیٰ انہیں ڈانٹتا اور دھمکاتا ہے اور فرماتا ہے ان کا قیامت والے دن کیا حال ہوگا؟ کہ انہوں نے خدا پر جھوٹ باندھا رسولوں کو جھٹلایا۔ انبیاء کو اور حق گو علما کو قتل کیا۔ ایک ایک بات کا خدا کو جواب دینا پڑے گا اور ایک ایک گناہ کی سزا بھگتنی پڑے گی اس دن کے آنے میں کوئی شک وشبہ نہیں۔ اس دن ہر شخص کو پورا پورا بدلہ دیا جائے گا اور کسی پر بھی کسی طرح کا ظلم روا نہ رکھا جائے گا۔

قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَاۗءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَاۗءُ ۡ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَاۗءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَاۗءُ ۭ بِيَدِكَ الْخَيْرُ ۭ اِنَّكَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۲۶﴾ تُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَتُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ ۡ وَتُخْرِجُ الْحَيَّ

مِنَ الْمَیِّتِ وَتُخْرِجُ الْمَیِّتَ مِنَ الْحَیِّ وَتَرْزُقُ مَنْ تَشَآءُ بِغَیْرِ حِسَابٍ ﴿٢٧﴾

(اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) آپ (اللہ تعالیٰ سے) یوں کہئے کہ اے اللہ مالک تمام ملک کے آپ ملک جس کو چاہیں دے دیتے ہیں اور جس سے چاہیں ملک لے لیتے ہیں اور جس کو آپ چاہیں غالب کر دیتے ہیں اور جس کو آپ چاہیں پست کر دیتے ہیں۔ آپ ہی کے اختیار میں ہے سب بھلائی بلاشبہ آپ ہر چیز پر پوری قدرت رکھنے والے ہیں۔ آپ رات (کے اجزاء) کو دن میں داخل کر دیتے ہیں اور بعض فصلوں میں دن (کے اجزا) کو رات میں داخل کر دیتے ہیں اور آپ جاندار چیز کو بے جان سے نکال لیتے ہیں (جیسے بیضہ سے بچہ) اور بے جان چیز کو جاندار سے نکال لیتے ہیں (جیسے پرندے سے بیضہ) اور آپ جس کو چاہتے بے شمار رزق عطا فرماتے ہیں۔ ○

خدائے قادر ہر چیز پر قادر ہے' اس کے سوا کسی اور کو قدرت کسی بات کی بھی نہیں ☆

اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتا ہے کہ اے محمد ﷺ آپ اپنے رب کی تعظیم کے طور پر اور اس کا شکریہ بجالانے کے لئے اور اسے اپنے تمام کام سونپ دینے کے لئے اور اس کی ذات پاک پر پورا بھروسہ کرتے ہوئے ان الفاظ میں اس کی بڑائیاں بیان کیجئے جو اوپر بیان ہوئے۔ یعنی اللہ مالک الملک تو ہے تمام ملک تیری ملکیت میں ہے جسے تو چاہے دے اور جس سے چاہے دیا ہوا بھی لے لے۔ تو ہی دینے لینے والا ہے۔ تو جو چاہتا ہے ہو جاتا ہے اور جو نہ چاہے ہو ہی نہیں سکتا۔ اس آیت میں اس بات کی بھی تنبیہ اور اس نعمت کے شکر کا بھی حکم ہے جو آنحضرت ﷺ اور آپ کی امت کو مرحمت فرمائی گئی' کہ نبوت بنی اسرائیل سے ہٹا کر نبی عربی قریشی امی مکی حضرت محمد ﷺ کو دے دی گئی اور آپ کو علی الاطلاق نبیوں کے ختم کرنے والے اور تمام انس وجن کی طرف رسول بن کر آنے والے بنا کر بھیجا۔ تمام اگلوں کی خوبیاں آپ میں جمع کر دیں اور وہ فضیلتیں آپ کو دی گئیں' جن سے اور تمام انبیاء بھی محروم رہے۔ خواہ وہ خدا کے علم کی بابت ہوں یا اس رب کی شریعت کے معاملہ میں ہوں یا ہو چکی اور آنے والی خبروں کے متعلق ہوں۔ آپ پر خدائے تعالیٰ نے آخرت کے تمام حقائق کھول دیئے۔ آپ کی امت کو مشرق و مغرب تک پھیلا دیا۔ آپ کے دین اور آپ کی شریعت کو تمام دینوں اور کل مذہبوں پر غالب کر دیا۔ اللہ تعالیٰ کا درود وسلام آپ پر نازل ہو۔ اب سے لے کر قیامت تک جب تک رات دن کی گردش باقی رہے خدا آپ پر اپنی رحمتیں دوام کے ساتھ نازل فرماتا رہے۔ آمین۔

پس فرمایا کہو خدایا تو ہی خلق میں انقلاب لاتا رہتا ہے' جو چاہے کر گزرتا ہے۔ جو لوگ کہتے تھے کہ ان دو بستیوں میں سے کسی بہت بڑے شخص پر خدا نے اپنا کلام کیوں نہ نازل کیا؟ اس کی رد کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿اَھُمْ یَقْسِمُوْنَ رَحْمَتَ رَبِّكَ...﴾ (الزخرف ٣٢) کیا تیرے رب کے بانٹنے والے یہ ہیں۔ جب ان کے رزق تک کے مالک ہم ہیں' جسے چاہیں کم دیں' جسے چاہیں زیادہ دیں۔ تو ہم پر حکومت کرنے والے یہ کون؟ فلاں کو نبی کیوں نہ بنایا، نبوت بھی ہمارے اختیار کی چیز ہے۔ ہم ہی جانتے ہیں کہ اس کے دیئے جانے کے قابل کون ہے جیسے اور جگہ ہے: ﴿اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَیْثُ یَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ﴾ (الانعام ١٢۴) جہاں کہیں اللہ تعالیٰ اپنی رسالت نازل فرماتا ہے اسے وہی سب سے بہتر جانتا ہے اور جگہ فرمایا: ﴿اُنْظُرْ كَیْفَ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰی بَعْضٍ﴾ (بنی اسرائیل ٢١) دیکھ لے کہ ہم نے کس طرح ان میں آپس میں ایک کو دوسرے پر برتری دے رکھی ہے۔ پھر فرماتا ہے کہ تو ہی رات کی زیادتی کو دن میں بڑھا کر دن رات کو برابر کر دیتا ہے۔ پھر ادھر کا حصہ اُدھر؛ ے

کر دونوں کو چھوٹا بڑا کر دیتا ہے پھر برابر کر دیتا ہے۔زمین آسمان پر سورج چاند پر پورا پورا قبضہ اور تمام تر تصرف تیرا ہی ہے۔ اسی طرح جاڑے کو گرمی سے اور گرمی کو جاڑے سے بدلنا بھی تیری قدرت میں ہے۔بہار خزاں پر قادر تو ہی ہے۔تو ہی ہے کہ زندہ سے مردے کو اور مردے سے زندہ کو نکالے۔کھیتی دانے سے اور دانہ کھیتی سے درخت کھجور گٹھلی سے اور گٹھلی کھجور سے تو ہی پیدا کرتا ہے۔مؤمن کو کافر کے ہاں اور کافر کو مؤمن کے ہاں تو ہی پیدا کرتا ہے۔مرغی انڈے سے اور انڈا مرغی سے اور اسی طرح کی تمام چیزیں تیرے ہی قبضہ میں ہیں۔تو جسے چاہے اتنا مال دے دے جو نہ گنا جائے نہ احاطہ کیا جائے اور جسے چاہے ضرورت کے مطابق روٹی بھی نہ دے۔ہم مانتے ہیں کہ یہ کام حکمت سے پُر ہیں اور تیرے ارادے اور مصلحتوں سے ہوتے ہیں۔طبرانی کی حدیث میں ہے خدا کا اسم اعظم اس آیت: ﴿قُلِ اللّٰهُمَّ﴾ میں ہے کہ جب اس نام سے اس سے دعا کی جائے تو وہ قبول فرما لیتا ہے۔

لَا یَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْكٰفِرِیْنَ اَوْلِیَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِیْنَ ۚ وَمَنْ یَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَلَیْسَ مِنَ اللّٰهِ فِیْ شَیْءٍ اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰىةً ؕ وَ یُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ ؕ وَاِلَى اللّٰهِ الْمَصِیْرُ ﴿۲۸﴾

مسلمانوں کو چاہئے کہ کفار کو (ظاہراً یا باطناً) دوست نہ بنائیں مسلمانوں (کی دوستی) سے تجاوز کر کے اور جو شخص ایسا (کام) کرے گا سو وہ شخص اللہ کے ساتھ دوستی رکھنے کے کسی شمار میں نہیں مگر ایسی صورت میں کہ تم ان سے کسی قسم کا اندیشہ رکھتے ہو اور اللہ تعالیٰ تم کو اپنی ذات سے ڈراتا ہے اور خدا ہی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔○

ترکِ موالات ☆

یہاں اللہ تعالیٰ ترک موالات کا حکم دیتا ہے کہ مسلمانوں کو زیبا نہیں کہ کفار سے میل ملاپ اور تعلق کریں۔انہیں آپس میں ایمانداروں سے میل ملاپ اور محبت رکھنی چاہئے۔پھر انہیں حکم سناتا ہے کہ جو ایسا کرے گا۔اس سے خدا بالکل بیزار ہو جائے گا جیسے اور جگہ ہے: ﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّیْ وَعَدُوَّكُمْ اَوْلِیَآءَ ......﴾ (الممتحنۃ:۱) یعنی مسلمانو! میرے اور اپنے دشمنوں سے دوستی نہ کرو اور جگہ ہے فرمایا مؤمنو یہ یہود و نصاریٰ آپس میں ایک دوسرے کے دوست ہیں۔تم میں سے جو ان میں سے دوستی کرے وہ انہی میں سے ہے اور جگہ پروردگار عالم نے مہاجر انصار اور دوسرے مؤمنوں کے بھائی چارہ کا ذکر کر کے فرمایا ہے کہ کافر آپس میں ایک دوسرے کے محب و محبوب ہیں۔تم اگر ایسا نہ کرو گے تو زمین میں فتنہ پھیل جائے گا اور زبردست فساد برپا ہو پڑے گا۔پھر ان لوگوں کو رخصت دی جو کسی شہر میں کسی وقت ان کی بدی اور ان کی برائی سے ڈر کر دفع الوقتی کے طور پر بظاہر کچھ میل ملاپ ظاہر کر دیں لیکن دل میں ان کی طرف رغبت اور ان سے حقیقی محبت نہ ہو۔جیسے صحیح بخاری شریف میں حضرت ابو درداء رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ ہم بعض قوموں سے کشادہ پیشانی سے ملتے ہیں لیکن ہمارے دل ان پر لعنت بھیجتے رہتے ہیں[1]۔حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ صرف زبان سے اظہار کرے لیکن عمل میں

[1] ... حقیقت میل ملاپ اور پھر آپس میں نشست و برخاست اپنے اثرات ایک دوسرے پر اس طرح ڈالتے ہیں کہ محسوس

ان کا ساتھ ایسے وقت بھی ہرگز نہ دے۔ یہی بات اور مفسرین سے منقول ہے اور اسی کی تائید اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان بھی کرتا ہے ﴿مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنْ بَعْدِ اِيْمَانِهٖٓ اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَقَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّ بِالْاِيْمَانِ﴾ (النحل: ۱۰۶) جو شخص اپنے ایمان کے بعد اللہ سے کفر کرے سوائے ان کے جن پر زبردستی کی جائے اور دل اس کا ایمان کے ساتھ مطمئن ہو۔ بخاری میں ہے' حضرت حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں' یہ حکم قیامت تک کے لئے ہے پھر فرمایا خدا تمہیں اپنے آپ سے ڈراتا ہے یعنی اپنے دبدبے اور اپنے عذاب سے۔ اس شخص کو خبردار کئے دیتا ہے۔ جو اس کے فرمان کی مخالفت کر کے اس کے دشمنوں سے تعلق رکھے اور اس کے دوستوں سے دشمنی کرے۔ پھر فرمایا اللہ ہی کی طرف لوٹنا ہے۔ ہر عاقل کو اس کے عمل کا بدلہ وہیں ملے گا۔ حضرت معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کھڑے ہو کر فرمایا اے بنی ازد میں خدا کے رسول ﷺ کا قاصد ہو کر تمہاری طرف آیا ہوں۔ جان لو کہ خدا ہی کی طرف پھر سب کو جانا ہے۔ پھر یا تو جنت ٹھکانہ ہوگا یا جہنم۔

قُلْ اِنْ تُخْفُوْا مَا فِيْ صُدُوْرِكُمْ اَوْ تُبْدُوْهُ يَعْلَمْهُ اللّٰهُ ؕ وَيَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۲۹﴾ يَوْمَ تَجِدُ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ مِنْ خَيْرٍ مُّحْضَرًا ۚۛ وَّمَا عَمِلَتْ مِنْ سُوْٓءٍ ۚۛ تَوَدُّ لَوْ اَنَّ بَيْنَهَا وَبَيْنَهٗٓ اَمَدًۢا بَعِيْدًا ؕ وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ ؕ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ ﴿۳۰﴾ ع

آپ فرما دیجئے اگر تم پوشیدہ رکھو گے اپنا مافی الضمیر یا اس کو ظاہر کرو گے اللہ تعالیٰ اس کو (ہر حال) جانتے ہیں اور وہ تو سب کو جانتے ہیں جو کچھ کہ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قدرت بھی کامل رکھتے ہیں۔ جس روز (ایسا ہوگا) کہ ہر شخص اپنے اچھے کئے ہوئے کاموں کو سامنے لایا ہوا پائے گا اور اپنے برے کئے ہوئے کاموں کو (بھی اور) اس بات کی تمنا کرے گا کہ کیا خوب ہوتا جو اس شخص کے اور اس روز کے درمیان دور دراز کی مسافت (حائل) ہوتی اور خدا تعالیٰ تم کو اپنی ذات (عظیم الشان) سے ڈراتے ہیں اور اللہ تعالیٰ نہایت مہربان ہیں بندوں پر۔ O

خدا تعالیٰ سب کچھ جانتے ہیں ☆

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وہ چھپی ہوئی باتوں کو اور ظاہر کی ہوئی باتوں کو بخوبی جانتا ہے۔ کوئی چھوٹی سے چھوٹی بات بھی اس سے پوشیدہ نہیں۔ اس کا علم سب چیزوں کو ہر وقت اور ہر لحظہ گھیرے ہوئے ہے۔ زمین کے گوشوں میں' پہاڑوں میں' سمندروں

= بھی نہیں ہوتا۔ ادھر مسلمان طبعاً سادے ہوتے ہیں جبکہ ان کے مخالف فطرتاً عیار و مکار۔ اس لئے عام مسلمانوں کا معاند مشرکین و کفار کے تعلقات سے روک دیا گیا ہے لیکن اسلام میں مکارم اخلاق اور حسن خلق ایک بڑا اہم باب ہے اس لئے اس کا بھی حکم ہے کہ بظاہر ان سے کوئی اخلاق سے گرا ہوا معاملہ نہ ہو۔ ہاں ان کے دین و مذہب سے بیزاری لازم ایمان ہے۔ یہی مطلب ہے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے اس ارشاد کا۔

میں' آسمانوں میں' ہواؤں میں' سوراخوں میں' غرض جو کچھ جہاں کہیں ہے سب اس کے علم میں ہے۔ پھر ان سب پر اس کی قدرت ہے۔ جس طرح چاہے رکھے' جو چاہے جزا سزا دے۔ پس اتنے بڑے وسیع علم والے اتنی بڑی زبردست قدرت والے سے ہر شخص کو ڈرتے ہوئے رہنا چاہئے۔ اس کی فرمانبرداری میں مشغول رہنا چاہئے اور اس کی نافرمانیوں سے علیحدہ رہنا چاہئے۔ وہ عالم بھی ہے اور قادر بھی ہے۔ ممکن ہے کسی کو ڈھیل دے دے لیکن جب پکڑے گا' تب دبوچ لے گا۔ پھر نہ مہلت ملے گی نہ رخصت۔ ایک دن آنے والا ہے' جس دن تمام عمر کے سب کام سامنے رکھ دیئے جائیں گے۔ نیکیوں کو دیکھ کر خوشی ہوگی اور برائیوں پر نظریں ڈال کر دانت پیسے گا اور حسرت و افسوس کرے گا اور چاہے گا اس سے کوسوں دور ہوتا اور پرے ہی پرے رہتا۔ قرآن نے اور جگہ فرمایا ہے: ﴿يُنَبَّؤُا الْإِنْسَانُ يَوْمَئِذٍ بِمَا قَدَّمَ وَأَخَّرَ﴾ (القیامۃ: ۱۳) سب اگلی پچھلی کی کرائی باتیں اس دن پیش کر دی جائیں گی۔ شیطان جو اس کے ساتھ ساتھ دنیا میں رہتا تھا اور اسے برائیوں پر اکساتا تھا۔ اس سے بھی اس دن بیزاری کرے گا اور کہے گا: ﴿يٰلَيْتَ بَيْنِي وَبَيْنَكَ بُعْدَ الْمَشْرِقَيْنِ فَبِئْسَ الْقَرِيْنُ﴾ (الزخرف: ۳۸) کیا اچھا ہوتا اے شیطان میرے اور تیرے درمیان مشرق اور مغرب کا فاصلہ ہوتا' تو تو بڑا برا ساتھی ہے۔ خدا تمہیں ڈرا دھمکا رہا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ جل جلالہٗ اپنے نیک بندوں کو خوشخبری دیتا ہے کہ وہ اس کے لطف و کرم سے کبھی ناامید نہ ہوں۔ وہ نہایت ہی مہربان بہت ہی رحم اور پیار رکھنے والا ہے۔ امام حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔ یہ بھی اس کی سراسر مہربانی اور لطف و محبت ہے کہ اس نے اپنے سے ہی اپنے بندوں کو ڈرایا۔ یہ بھی مطلب ہے کہ خدا اپنے بندوں پر رحیم ہے۔ بندوں کو بھی چاہئے کہ صراطِ مستقیم سے قدم نہ ہٹائیں۔ دین پاک کو نہ چھوڑیں۔ رسول کریم ﷺ کی فرمانبرداری سے منہ نہ موڑیں۔

قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ۗ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۳۱﴾ قُلْ أَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ ۚ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۳۲﴾

آپ فرما دیجئے کہ اگر تم خدا تعالیٰ سے محبت رکھتے ہو تو تم لوگ میرا اتباع کرو خدا تعالیٰ تم سے محبت کرنے لگیں گے اور تمہارے سب گناہوں کو صاف کر دیں گے اور اللہ تعالیٰ بڑے معاف کرنے والے بڑی عنایت فرمانے والے ہیں۔ (اور) آپ (یہ بھی) فرما دیجئے کہ تم اطاعت کیا کرو اللہ کی اور اس کے رسول کی پھر (اس پر بھی) اگر وہ لوگ اعتراض کریں سو (سن رکھیں) کہ اللہ کافروں سے محبت نہیں کرتے۔ ○

اتباع نبی (ﷺ) خدا تعالیٰ کی رحمتوں کا پیش خیمہ ہے ☆

اس آیت نے فیصلہ کر دیا کہ جو شخص خدا کی محبت کا دعویٰ کرے اور اس کے اعمال' افعال' عقائد' مطابق فرمان نبوی نہ ہوں' طریقہ محمدیہ پر وہ کاربند نہ ہو تو وہ اپنے اس دعویٰ میں جھوٹا ہے۔ صحیح حدیث میں ہے' رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں جو شخص کوئی ایسا عمل کرے جس پر ہمارا حکم نہ ہو وہ مردود ہے۔ اسی لئے یہاں بھی ارشاد ہوتا ہے کہ اگر تم خدا سے محبت رکھنے کے دعویٰ میں سچے ہو تو میری سنتوں پر عمل کرو۔ اس وقت خدا تمہاری تمنا سے زیادہ تمہیں دے گا یعنی وہ خود تمہارا چاہنے والا بن جائے گا۔

جیسے کہ بعض حکیم علماء نے کہا ہے کہ تیرا چاہنا کوئی چیز نہیں۔ لطف تو اس وقت ہے کہ خدا تجھے چاہنے لگ جائے محبت کی نشانی یہی ہے کہ ہر کام میں اتباع سنت مدنظر ہو۔ ابن ابی حاتم میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا' دین صرف اللہ کے لئے محبت اور اسی کے لئے دشمنی کا نام ہے۔ پھر آپ نے اسی آیت کی تلاوت کی لیکن یہ حدیث سنداً منکر ہے۔ پھر فرماتا ہے کہ سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم پر چلنے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ تمہارے تمام تر گناہوں کو معاف فرما دے گا۔[1] پھر ہر عام و خاص کو حکم ملتا ہے کہ سب خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی مانتے ہیں۔ جو اس سے لوٹ جائیں۔ یعنی خدا اور رسول کی اطاعت سے ہٹ جائیں تو وہ کافر ہیں اور خدا ان سے محبت نہیں رکھتا۔ اس سے صاف واضح ہو گیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ کی مخالفت کفر ہے ایسے لوگ خدا کے دوست نہیں ہو سکتے گو ان کا دعویٰ ہو لیکن جب تک خدا کے سچے نبی اُمّی خاتم الرسل رسول جن و بشر کی تابعداری پیروی اور اتباع سنت نہ کریں' وہ اپنے دعویٰ میں جھوٹے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تو وہ ہیں کہ اگر آج انبیاء اور رسول بلکہ بہترین اور اولوالعزم پیغمبر بھی زندہ ہوتے تو انہیں آپ کے مانے بغیر اور آپ کی شریعت پر کاربند ہوئے بغیر چارہ ہی نہیں' اس کا بیان بسط اور تفصیل کے ساتھ آیت: ﴿وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ﴾ (آل عمران: ۸۱) کی تفسیر میں آئے گا انشاء اللہ تعالیٰ۔

اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰۤى اٰدَمَ وَ نُوْحًا وَّ اٰلَ اِبْرٰهِيْمَ وَ اٰلَ عِمْرٰنَ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ۝۳۳ ذُرِّيَّةًۢ بَعْضُهَا مِنْۢ بَعْضٍ ۗ وَ اللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝۳۴ اِذْ قَالَتِ امْرَاَتُ عِمْرٰنَ رَبِّ اِنِّيْ نَذَرْتُ لَكَ مَا فِيْ بَطْنِيْ مُحَرَّرًا فَتَقَبَّلْ مِنِّيْ ۚ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝۳۵

بے شک اللہ تعالیٰ نے (نبوت کے لئے) منتخب فرمایا (حضرت) آدم علیہ السلام کو اور (حضرت) نوح علیہ السلام اور (حضرت) ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں بعضوں کو اور عمران کی اولاد میں سے بعضوں کو تمام جہان پر بعضے ان میں سے بعضوں کی اولاد ہیں اور اللہ تعالیٰ خوب سننے والے ہیں خوب جاننے والے ہیں۔ ۝

انبیاء علیہم السلام خدا کے برگزیدہ بندے ہیں یعنی اللہ و تبارک و تعالیٰ نے ان بزرگ حضرات کو تمام جہان پر برگزیدگی عنایت فرمائی۔ حضرت آدم علیہ السلام کو اپنے ہاتھ سے پیدا کیا۔ اپنی روح ان میں پھونکی۔ ہر چیز کے نام انہیں بتلائے جنت میں انہیں بسایا پھر اپنی حکومت کے اظہار کے لئے زمین پر اُتار دیا۔ حضرت نوح علیہ السلام کو جبکہ زمین پر بت پرستی قائم ہوگئی' تو سب سے پہلا رسول بنا کر بھیجا۔ پھر جب ان کی قوم نے سرکشی کی۔ پیغمبر کی ہدایت پر عمل نہ کیا۔ حضرت نوح علیہ السلام نے دن رات پوشیدہ اور ظاہر خدا کی طرف دعوت دی' لیکن قوم نے کان نہ دھرے تو سوائے تابعداران نوح علیہ السلام کے باقی سب کو اپنا پانی کا عذاب یعنی مشہور طوفان نوح بھیج کر ڈبو دیا۔ خاندان خلیل اللہ علیہ صلوٰت اللہ کو خدا نے برگزیدگی عنایت فرمائی۔ اسی خاندان میں سے سید البشر خاتم الانبیاء محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ عمران کے خاندان کو بھی اس نے منتخب کر لیا۔ عمران نام ہے حضرت

[1] سنت پر عمل پیرا ایک بہترین کام ہے اور اچھے کام برائیوں کو مٹاتے ہیں۔ اس لئے جو گناہ زندگی میں ہو چکے وہ ختم کر دیئے جاتے ہیں۔ یعنی ان پر کوئی مواخذہ اور عذاب نہ ہوگا۔ بشرطیکہ سنت کے مطابق زندگی گزار کر اپنی زندگی کی تلافی کی گئی ہو۔

مریم کے والد صاحب کا' جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی والدہ ہیں ان کا نسب نامہ بقول محمد اسحاق یہ ہے عمران بن ہاشم بن میثا بن حزقیا ابن ابراہیم بن عزرایا بن احزبن بہوابن نازم بن مقاصد بن اسیث بن ایاز بن رخعیم بن سلیمان بن داؤد علیہ السلام ۔ پس عیسیٰ علیہ السلام بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نسل سے ہیں ۔ اس کا مفصل بیان سورۂ انعام کی تفسیر میں آئے گا ۔ ان شاء اللہ تعالیٰ ۔

اِذْ قَالَتِ امْرَاَتُ عِمْرٰنَ رَبِّ اِنِّیْ نَذَرْتُ لَكَ مَا فِیْ بَطْنِیْ مُحَرَّرًا فَتَقَبَّلْ مِنِّیْ ۚ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ﴿۳۵﴾ فَلَمَّا وَضَعَتْهَا قَالَتْ رَبِّ اِنِّیْ وَضَعْتُهَاۤ اُنْثٰى ؕ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا وَضَعَتْ ؕ وَلَیْسَ الذَّكَرُ كَالْاُنْثٰى ۚ وَاِنِّیْ سَمَّیْتُهَا مَرْیَمَ وَاِنِّیْۤ اُعِیْذُهَا بِكَ وَذُرِّیَّتَهَا مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ﴿۳۶﴾

جبکہ عمران (پدر مریم علیہ السلام) کی بی بی نے (حالت حمل میں) عرض کیا کہ اے میرے پروردگار میں نے نذر مانی ہے آپ کے لئے اس بچہ کی جو میرے شکم میں ہے کہ وہ آزاد رکھا جائے گا سو آپ مجھ سے (بعد ولادت) قبول کر لیجئے بے شک آپ خوب سننے والے خوب جاننے والے ہیں ۔ پھر جب لڑکی جنی (حسرت) سے کہنے لگیں کہ اے میرے پروردگار میں نے تو وہ حمل لڑکی جنی ۔ حالانکہ خدا تعالیٰ زیادہ جانتے ہیں اس کو جو انہوں نے جنی اور وہ لڑکا (جو انہوں نے چاہا تھا) اس لڑکی کے برابر نہیں اور میں نے اس لڑکی کا نام مریم رکھا اور اس کو اور اس کی اولاد کو (اگر کبھی اولاد ہو) آپ کی پناہ میں دیتی ہوں شیطان مردود سے ۔ 〇

مریم علیہا السلام کا نصیحت آمیز واقعہ ☆

حضرت عمران کی ان بیوی صاحبہ کا نام جو حضرت مریم علیہا السلام کی والدہ تھیں ۔ حسنہ بنت فاقوذ تھا ۔ حضرت محمد اسحاق رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں' انہیں اولاد نہیں ہوتی تھی ۔ ایک دن ایک چڑیا کو دیکھا کہ وہ اپنے بچوں کو کھلا رہی ہے تو انہیں ولولہ اٹھا اور اللہ تعالیٰ سے اسی وقت دعا کی اور خلوص کے ساتھ خدا کو پکارا ۔ اللہ تعالیٰ نے بھی ان کی دعا قبول فرمائی اور اسی رات انہیں حمل ٹھہر گیا ۔ جب حمل کا یقین ہو گیا تو نذر مانی کہ اللہ تعالیٰ مجھے جو اولاد دے گا اسے بیت المقدس کی خدمت کے لئے خدا کے نام پر آزاد کر دوں گی ۔ پھر خدا سے دعا کی کہ پروردگار تو میری اس مخلصانہ نذر کو قبول فرما' تو میری دعا کو سن رہا ہے ۔ تو میری نیت کو بھی خوب جان رہا ہے ۔ اب یہ تو معلوم نہ تھا کہ لڑکا ہو گا یا لڑکی ۔ جب بچہ تولد ہوا تو دیکھا کہ وہ لڑکی ہے اور لڑکی تو اس قابل نہیں کہ وہ مسجد مقدس کی خدمت انجام دے سکے ۔ اس کے لئے تو لڑکا ہونا چاہئے تو عاجزی کے طور پر اپنی مجبوری جناب باری میں ظاہر کی کہ خدایا میں تو اسے تیرے نام پر وقف کر چکی تھی لیکن لڑکی ہوئی ۔ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا وَضَعْتُ بھی پڑھا گیا ہے ۔ یعنی یہ قول بھی حضرت حسنہ کا تھا کہ خدا خوب جانتا ہے کہ میرے ہاں لڑکی ہوئی اور "ت" کے جزم کے ساتھ بھی آیا ہے ۔ یعنی خدا کا یہ فرمان ہے کہ اللہ تعالیٰ کو بخوبی معلوم ہے کہ کیا اولاد ہوئی ہے اور فرماتی ہیں کہ مرد عورت برابر نہیں ۔ میں اسکا نام مریم رکھتی ہوں ۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جس دن بچہ ہو اسی دن نام رکھنا بھی جائز ہے کیونکہ ہم سے پہلے لوگوں کی شریعت ہماری شریعت ہے[1] اور یہاں یہ بیان کیا گیا اور تردید نہیں کی گئی بلکہ اسے ثابت اور مقرر رکھا گیا۔ اسی طرح حدیث شریف میں بھی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا' آج میرے ہاں رات کو بچہ ہوا ہے اور میں نے اس کا نام اپنے باپ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے نام پر ابراہیم رکھا۔ ملاحظہ ہو بخاری و مسلم۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنے بھائی کو جبکہ وہ تولد ہوئے' لے کر حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ نے انہیں اپنے ہاتھ سے گھٹی دی اور ان کا نام عبداللہ رکھا۔ یہ حدیث بھی صحیحین میں موجود ہے۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ حضرت ابو اسید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ہاں بچہ ہوا جسے لے کر آپ حاضر خدمت نبوی ہوئے تا کہ آپ اپنے دست مبارک سے اس بچہ کو گھٹی دیں۔ آپ اور طرف متوجہ ہو گئے۔ بچہ کا خیال نہ رہا حضرت ابو اسید رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بچہ کو واپس بھیج دیا۔ جب آپ فارغ ہوئے بچہ کی طرف نظر ڈالی تو اسے نہ پایا۔ گھبرا کر پوچھا اور معلوم کر کے کہا' اس کا نام منذر رکھو (یعنی ڈرانے والا)۔ ایک حدیث میں ہے کہ ایک شخص نے آ کر کہا یا رسول اللہ ﷺ میرے ہاں رات کو بچہ پیدا ہوا ہے کیا نام رکھوں' فرمایا عبدالرحمن نام رکھو۔ (بخاری)

مسند احمد اور سنن میں ایک حدیث مروی ہے' جسے امام ترمذی صحیح کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا' ہر بچہ اپنے عقیقہ میں گروی ہے' ساتویں دن عقیقہ کرے۔ یعنی جانور ذبح کرے اور نام رکھے اور بچہ کا سر منڈوائے۔ ایک روایت میں ہے اور خون بہایا جائے اور یہ سند کے اعتبار سے مضبوط روایت ہے۔ واللہ اعلم۔ لیکن زبیر بن بکار کی روایت جس میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے صاحبزادے حضرت ابراہیم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا عقیقہ کیا اور نام ابراہیم رکھا۔ یہ حدیث سنداً ثابت نہیں اور صحیح حدیث اس کے خلاف موجود ہے اور یہ تطبیق بھی ہو سکتی ہے کہ اس نام کی شہرت اسی دن ہوئی ہو۔ واللہ اعلم۔

حضرت مریم علیہا السلام کی والدہ صاحبہ پھر اپنی بچی کو اور اس کی ہونے والی اولاد کو شیطان کے شر سے خدا کی پناہ میں دیتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی اس دعا کو بھی قبول فرمایا۔ چنانچہ مسند عبدالرزاق میں ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں ہر بچے کو شیطان اس کی پیدائش کے وقت چوکا دیتا ہے۔ اسی سے وہ چیخ کر رونے لگتا ہے لیکن حضرت مریم اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام اس سے بچے رہے اس حدیث کو بیان فرما کر حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں' اگر تم چاہو تو اس آیت کو پڑھ لو: ﴿اِنِّیْۤ اُعِیْذُهَا بِكَ ......﴾ یہ حدیث بخاری و مسلم میں بھی موجود ہے۔ یہ حدیث اور بھی بہت سی کتابوں میں مختلف الفاظ میں موجود ہے۔ کسی میں ہے ایک یا دو چوکے مارتا ہے۔ ایک حدیث میں صرف حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر ہے کہ شیطان نے انہیں بھی چوکا مارنا چاہا لیکن انہیں نہ لگا' پردے میں لگ کر رہ گیا۔

فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُوْلٍ حَسَنٍ وَّاَنْۢبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا ۙ وَّكَفَّلَهَا زَكَرِيَّا ۚ كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ ۙ وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا ۚ قَالَ يٰمَرْيَمُ اَنّٰى لَكِ هٰذَا ۭ

[1] بشرطیکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سابقہ شریعت کے احکام ہمارے حق میں باقی رکھے ہوں یا ان کا انکار نہ کیا ہو۔ ورنہ سابقہ شریعتیں دین محمدی کے بعد منسوخ ہو گئیں۔

قَالَتۡ هُوَ مِنۡ عِنۡدِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَرۡزُقُ مَنۡ يَّشَآءُ بِغَيۡرِ حِسَابٍ ۝۳۷

پس ان (مریم علیہا السلام) کو ان کے رب نے بوجہ احسن قبول فرمالیا اور عمدہ طور پر ان کو نشو ونما دیا اور (حضرت) زکریا علیہ السلام کو ان کا سرپرست بنایا۔ سو جب کبھی زکریا (علیہ السلام) ان کے پاس عمدہ مکان میں تشریف لاتے تو ان کے پاس کچھ کھانے پینے کی چیزیں پاتے (اور) یوں فرماتے کہ اے مریم علیہ السلام یہ چیزیں تمہارے واسطے کہاں سے آئیں۔ وہ کہتیں کہ اللہ تعالیٰ کے پاس سے آئیں بیشک اللہ تعالیٰ جس کو چاہتے ہیں بے استحقاق رزق عطا فرماتے ہیں۔○

رزق رسانی کے حیرت انگیز طریقے ☆

اللہ تعالیٰ خبر دیتا ہے کہ حضرت حسنہ کی نذر کو خدا تعالیٰ نے بخوشی قبول کرلیا اور اسے بہترین طور سے نشو ونما بخشی۔ ظاہری طور پر بھی خوبی عطا فرمائی اور باطنی خوبی سے سرفراز فرمایا اور اپنے نیک بندوں سے ان کی پرورش کرائی۔ تاکہ علم اور خیر اور دین سیکھ لیں۔ حضرت زکریا کو ان کا کفیل بنا دیا۔ ابن اسحاق رضی اللہ تعالیٰ عنہ تو فرماتے ہیں یہ اس لئے کہ حضرت مریم علیہا السلام یتیم ہوگئی تھیں لیکن دوسرے بزرگ فرماتے ہیں کہ قحط سالی کی وجہ سے ان کی کفالت کا بوجھ حضرت زکریا نے اپنے ذمہ لے لیا تھا۔ ہوسکتا ہے کہ دونوں وجہیں مل گئی ہوں۔ واللہ اعلم۔ حضرت ابن اسحاق وغیرہ کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت زکریا علیہ السلام ان کے خالو تھے اور بعض لوگ کہتے ہیں کہ ان کے بہنوئی تھے۔ جیسے معراج والی صحیح حدیث میں ہے کہ آپ حضرت یحییٰ اور حضرت عیسیٰ علیہ علیہم السلام سے ملاقات کی' جو دونوں خالہ زاد بھائی ہیں۔ ابنِ اسحاق کے قول پر یہ حدیث ٹھیک ہے کیونکہ اصطلاح عرب میں ماں کی خالہ کے لڑکے کو بھی خالہ زاد بھائی کہہ دیتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ حضرت مریم علیہا السلام اپنی خالہ کی پرورش میں تھیں۔ صحیح حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی یتیم صاحبزادی عمرہ کو ان کی خالہ حضرت جعفر بن ابو طالب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بیوی صاحبہؓ کے سپرد کیا تھا اور فرمایا کہ خالہ قائم مقام ماں کے ہے۔

اب اللہ تعالیٰ حضرت مریم علیہا السلام کی بزرگی اور ان کی کرامت بیان فرماتا ہے کہ حضرت زکریا علیہ السلام جب کبھی ان کے پاس ان کے حجرے میں جاتے تو بے موسمی میوے ان کے پاس پاتے۔ مثلاً جاڑوں میں گرمیوں کے میوے اور گرمیوں میں جاڑے کے میوے۔ حضرت مجاہد رضی اللہ تعالیٰ عنہ' حضرت عکرمہ' حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہم' حضرت ابو الشعثاء' حضرت ابراہیم نخعی' حضرت ضحاک' حضرت قتادہ' حضرت ربیع بن انس' حضرت عطیہ عوفی' حضرت سدی رحمتہ اللہ علیہم اس آیت کی تفسیر میں یہی فرماتے ہیں۔

حضرت مجاہد سے یہ بھی روایت ہے کہ یہاں رزق سے مراد علم اور صحیفے ہیں جن میں علمی باتیں ہوتی تھیں لیکن اول قول ہی زیادہ صحیح ہے۔ اس آیت میں اولیاء اللہ کی کرامات کی دلیل ہے اور اس کے ثبوت میں بہت سی حدیثیں بھی آتی ہیں۔ حضرت زکریا علیہ السلام ایک دن پوچھ بیٹھے کہ مریم تمہارے پاس یہ چیزیں کہاں سے آتی ہیں۔ صدیقہ نے جواب دیا کہ خدا کے پاس سے۔ وہ جسے چاہے بے حد وحساب روزی دیتا ہے۔ مسند حافظ ابو یعلیٰ میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر کئی دن بغیر کچھ کھائے گزر گئے۔ بھوک سے آپ کو تکلیف ہونے لگی۔ اپنی سب بیویوں کے گھر ہو آئے لیکن کہیں کچھ نہ پایا۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے پاس آئے اور دریافت کیا کہ بیٹی تمہارے پاس کچھ ہے' مجھے بھوک لگ رہی ہے' وہاں سے بھی یہی جواب ملا کہ حضور

ﷺ میرے ماں باپ صدقے ہوں' کچھ بھی نہیں ہے۔ اللہ کے نبی اللّٰھم صلی وسلم علیہ۔ وہاں سے نکلے ہی تھے کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی لونڈی نے دو روٹیاں اور ٹکڑا گوشت حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے پاس بھیجا۔ آپ نے اسے لے کر لگن میں رکھ دیا اور فرمانے لگے' گو مجھے' میرے خاوند اور بچوں کو بھی بھوک ہے لیکن ہم سب فاقے سے ہی گزار دیں گے اور خدا کی قسم آج تو یہ رسول اللہ ﷺ کو ہی دوں گی۔ حضرت حسن یا حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو آپ کی خدمت میں بھیجا کہ آپ کو بلا لائیں۔ حضور ﷺ راستے ہی میں تھے' لوٹ آئے۔ کہنے لگیں' میرے ماں باپ آپ پر فدا ہوں' خدا نے کچھ بھجوا دیا ہے۔ جسے میں نے آپ کے لئے چھپا کر رکھ دیا ہے۔ آپ نے فرمایا' لے آؤ۔ اب جو کونڈا کھولا تو دیکھتی ہیں کہ روٹی سالن سے بھرا ہوا ہے۔ دیکھ کر حیران ہو گئیں لیکن فوراً سمجھ گئیں کہ خدا کی طرف سے اس میں برکت نازل ہو گئی ہے۔ اللہ کا شکر کیا۔ نبی ﷺ پر درود پڑھا اور آپ کے پاس لا کر پیش کر دیا۔ آپ نے بھی اسے دیکھ کر خدا کی تعریف کی اور دریافت فرمایا کہ بیٹی یہ کہاں سے آیا؟ جواب دیا کہ ابا جان خدا کے پاس سے۔ وہ جسے چاہے بے حساب روزی دے۔ آپ نے فرمایا خدا کا شکر ہے کہ تجھے بھی اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کی تمام عورتوں کی تمام سردار جیسا کر دیا۔ انہیں جب کبھی اللہ تعالیٰ کوئی چیز عطا فرماتا اور ان سے پوچھا جاتا تو یہی جواب دیا کرتی تھیں کہ خدا کے پاس سے ہے۔ اللہ جسے چاہے بے حساب رزق دیتا ہے۔ پھر حضور ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بلایا اور آپ نے اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اور حضرت حسنؓ نے اور حضرت حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اور آپ کی سب ازواجِ مطہراتؓ اور اہل بیتؓ نے خوب شکم سیر ہو کر کھایا۔ پھر بھی اتنا ہی باقی رہا جتنا پہلے تھا جو آس پاس کے پڑوسیوں کے ہاں بھیجا گیا۔ یہ تھی خیر کثیر اور برکت خدا تعالیٰ کی طرف سے۔

هُنَالِكَ دَعَا زَكَرِيَّا رَبَّهٗ ۚ قَالَ رَبِّ هَبْ لِىْ مِنْ لَّدُنْكَ ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً ۚ اِنَّكَ سَمِيْعُ الدُّعَآءِ ﴿۳۸﴾ فَنَادَتْهُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَهُوَ قَآئِمٌ يُّصَلِّىْ فِى الْمِحْرَابِ ۙ اَنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكَ بِيَحْيٰى مُصَدِّقًاۢ بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَسَيِّدًا وَّحَصُوْرًا وَّ نَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۳۹﴾ قَالَ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِىْ غُلٰمٌ وَّقَدْ بَلَغَنِىَ الْكِبَرُ وَامْرَاَتِىْ عَاقِرٌ ۗ قَالَ كَذٰلِكَ اللّٰهُ يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ ﴿۴۰﴾ قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِّىْٓ اٰيَةً ۗ قَالَ اٰيَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ اِلَّا رَمْزًا ۗ وَاذْكُرْ رَّبَّكَ كَثِيْرًا وَّسَبِّحْ بِالْعَشِىِّ وَالْاِبْكَارِ ﴿۴۱﴾ ع ۴/۱۱/۱۲

اس موقع پر دعا کی (حضرت) زکریا (علیہ السلام) نے اپنے رب سے عرض کیا اے میرے رب عنایت کیجئے مجھ کو

خاص اپنے پاس سے کوئی اچھی اولاد بے شک آپ بہت بہت سنتے ہیں دعا کے۔ بس پکار کے کہا ان سے فرشتوں نے اور وہ کھڑے نماز پڑھ رہے تھے۔ محراب میں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو بشارت دیتے ہیں کہ یحییٰ کی جن کے احوال یہ ہوں گے کہ وہ کلمۃ اللہ کی تصدیق کرنے والے ہوں گے اور مقتدا ہوں گے اور اپنے نفس کو بہت روکنے والے ہوں گے اور اعلیٰ درجہ کے شائستہ ہوں گے۔ زکریا نے عرض کیا کہ اے میرے پروردگار میرے ہاں لڑکا کس طرح ہوگا حالانکہ مجھ کو بڑھاپا آ پہنچا ہے اور میری بی بی بھی بچہ جننے کے قابل نہیں رہی۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ اسی حالت میں لڑکا ہو جائے (کیونکہ) اللہ تعالیٰ جو کچھ ارادہ کریں کر دیتے ہیں۔ انہوں نے عرض کیا کہ اے میرے پروردگار میرے واسطے کوئی نشانی مقرر کیجئے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تمہاری نشانی یہی ہے کہ تم لوگوں سے تین روز تک باتیں نہ کر سکو گے بجز اشارہ کے اور اپنے رب کو (دل سے) بکثرت یاد کرنا (زبان سے بھی) تسبیح (و تقدیس) کرنا دن ڈھلے بھی اور صبح کو بھی (کہ اس کی قدرت رہے گی)۔ ○

اُمید کی کرن ☆

حضرت زکریا علیہ السلام نے دیکھا کہ اللہ تعالیٰ حضرت مریم علیہا السلام کو بے موسم میوہ دیتا ہے۔ جاڑوں میں گرمیوں کے پھل اور گرمی میں جاڑوں کے میوے ان کے پاس رکھے رہتے ہیں تو باوجود اپنے پورے بڑھاپے کے اور بیوی کے بانجھ پن ہونے کے باوجود آپ بھی بے موسم میوہ یعنی نیک اولاد طلب کرنے لگے اور چونکہ یہ طلب بظاہر ایک ناممکن چیز کی طلب تھی۔ اس لئے نہایت پوشیدگی سے دعا مانگی جیسے اور جگہ ہے: ﴿نِدَآءً خَفِيًّا﴾ یہ اپنے عبادت خانے میں ہی تھے جو فرشتوں نے انہیں آواز دی اور انہیں سنا کر کہا کہ آپ کے ہاں ایک لڑکا پیدا ہوگا۔ اس کا نام یحییٰ رکھنا۔ ساتھ ہی یہ بھی فرمادیا کہ یہ بشارت ہماری طرف سے نہیں بلکہ خدا کی طرف سے ہے۔ یحییٰ نام کی وجہ یہ ہے کہ ان کی حیات ایمان کے ساتھ ہوگی۔ وہ خدا کا کلمہ کی یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام بن مریم کی تصدیق کریں گے۔ حضرت ربیع بن انس رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں سب سے پہلے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت کو تسلیم کرنے والے بھی حضرت یحییٰ علیہ السلام ہیں حضرت قتادہ کا قول ہے کہ حضرت یحییٰ علیہ السلام ٹھیک حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی روش اور آپ کے طریق پر تھے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ یہ دونوں خالہ زاد بھائی تھے۔ حضرت یحییٰ کی والدہ حضرت مریم علیہا السلام سے اکثر ذکر کیا کرتی تھیں کہ میں اپنے پیٹ کی چیز کو تیرے پیٹ کی چیز کو سجدہ کرتی ہوئی پاتی ہوں۔ یہ تھی حضرت یحییٰ کی تصدیق دنیا میں آنے سے پیشتر۔ سب سے پہلے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی سچائی انہوں نے ہی مانی۔ یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے عمر میں بڑے تھے۔

سید کے معنی حلیم بردبار، علم و عبادت میں بڑھا ہوا، متقی پرہیزگار، فقیہ، عالم، خلق و دین میں سب سے افضل، جسے غصہ اور غضب مغلوب نہ کر سکے، شریف اور کریم کے ہیں۔ حَصُوْرَ کے معنی ہیں، جو عورتوں کے پاس نہ آ سکے۔ جس کے ہاں نہ اولاد ہو نہ جس میں شہوت کا پانی ہو[1]۔ اس معنی کی ایک مرفوع حدیث بھی ابن ابی حاتم میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے یہ لفظ تلاوت کر کے زمین سے کچھ اٹھا کر فرمایا، اس کا عضو اس جیسا تھا۔ حضرت عبداللہ بن عمر بن عاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ ساری مخلوق میں صرف حضرت یحییٰ علیہ السلام ہی خدا سے بے گناہ ملیں گے۔ پھر آپ نے یہ الفاظ پڑھے اور زمین سے کچھ اٹھایا اور

[1] مطلب یہ ہے کہ وہ مردمی کے باوجود نکاح نہ کرے ورنہ عنین (نامرد) ہونا عیب ہے اور انبیاء علیہم السلام جسمانی کمزوریوں سے بھی اس طرح محفوظ رکھے جاتے ہیں جیسا کہ اخلاقی برائیوں سے۔

فرمایا حَصُوْرًا اسے کہتے ہیں' جس کا عضواس جیسا ہو اور حضرت یحییٰ بن سعید قطان رحمتہ اللہ علیہ نے اپنی کلمہ کی انگلی سے اشارہ کیا۔ یہ روایت جو مرفوع بیان ہوئی ہے اس کی سند سے اس موقوف کی سند زیادہ صحیح ہے اور مرفوع روایت میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک کپڑے کے پھندنے کی طرف اشارہ کر کے فرمایا' ایسا تھا اور روایت میں یہ بھی ہے کہ آپ نے زمین میں ایک مرجھوڑا (مرجھایا ہوا' مترجم) تنکا اٹھا کر اس کی طرف اشارہ کر کے یہ فرمایا۔ اس کے بعد حضرت زکریا علیہ السلام کو دوسری بشارت دی جاتی ہے کہ وہ تمہارا لڑکا نبی ہوگا۔ یہ بشارت پہلی خوشی سے بڑھ گئی۔ جب بشارت آ چکی' تب حضرت زکریا علیہ السلام کو خیال پیدا ہوا کہ بظاہر اسباب تو اس کا ہونا محال ہے۔ تو کہنے لگے خدایا میرے ہاں بچہ کیسے ہوسکتا ہے۔ میں بوڑھا 'میری بیوی بالکل بانجھ' فرشتے نے اسی وقت جواب دیا کہ خدا کا امر سب سے بڑا ہے۔ اس کے پاس کوئی چیز انہونی نہیں۔ نہ اسے کوئی کام بھاری پڑے۔ نہ وہ کسی کام سے عاجز۔ اس کا ارادہ ہو چکا' وہ اسی طرح کرے گا۔ اب زکریا علیہ السلام خدا سے اس کی علامت طلب کرنے لگے تو ذات باری سبحانہ وتعالیٰ کی طرف سے ارشاد فرمایا گیا کہ نشان یہ ہے کہ تو تین دن تک لوگوں سے بات نہ کر سکے گا۔ رہے گا تندرست صحیح سالم لیکن زبان سے لوگوں سے بات چیت نہ کی جائے گی۔ صرف اشاروں سے کام لینا پڑے گا۔ جیسے اور جگہ ہے: ﴿ثَلٰثَ لَیَالٍ سَوِیًّا﴾ (مریم ۱۰) یعنی تین راتیں تندرستی کی حالت میں[1]۔ پھر حکم دیا کہ اس حال میں تمہیں چاہئے کہ ذکر اور تسبیح اور تکبیر میں زیادہ مشغول رہو۔ صبح شام اسی میں لگے رہو۔ اس کا دوسرا حصہ اور پورا بیان تفصیل کے ساتھ سورہ مریم کے شروع میں آئے گا۔ ان شاءاللہ تعالیٰ۔

وَاِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ یٰمَرْیَمُ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىكِ وَطَهَّرَكِ وَاصْطَفٰىكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۴۲﴾ یٰمَرْیَمُ اقْنُتِیْ لِرَبِّكِ وَاسْجُدِیْ وَارْكَعِیْ مَعَ الرّٰكِعِیْنَ ﴿۴۳﴾ ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَیْبِ نُوْحِیْهِ اِلَیْكَ ؕ وَمَا كُنْتَ لَدَیْهِمْ اِذْ یُلْقُوْنَ اَقْلَامَهُمْ اَیُّهُمْ یَكْفُلُ مَرْیَمَ ۪ وَمَا كُنْتَ لَدَیْهِمْ اِذْ یَخْتَصِمُوْنَ ﴿۴۴﴾

اور (وہ وقت) قابل ذکر ہے جبکہ فرشتوں نے کہا کہ اے مریم بلاشک اللہ تعالیٰ نے تم کو منتخب (یعنی مقبول) فرمایا ہے اور پاک بنایا ہے اور تمام جہان بھر کی بیبیوں کے مقابلہ میں منتخب فرمایا ہے۔ اے مریم اطاعت کرتی رہو اپنے پروردگار کی اور سجدہ کیا کرو اور رکوع کیا کرو ان لوگوں کے ساتھ جو رکوع کرنے والے ہیں۔ یہ قصے منجملہ غیب کی خبروں کے ہیں ہم ان کی وحی بھیجتے ہیں آپ کے پاس اور آپ ان لوگوں کے پاس نہ تو اس وقت موجود تھے جبکہ وہ (قرعہ کے طور پر) اپنے اپنے قلموں کو (پانی میں) ڈالتے تھے کہ ان سب میں کون شخص (حضرت مریم کی) کفالت

---

[1] اس طرح تین دن مکمل حضرت زکریا علیہ السلام کی تسبیح وتقدیس کا قدرتی انتظام ہوگیا۔ علامت کی علامت اور معروف تسبیح کا اہتمام بھی۔

کرے اور نہ آپ ان کے پاس اس وقت موجود تھے جبکہ باہم اختلاف کر رہے تھے۔ ○

مریم علیہا السلام کی خصوصیات ☆

یہاں بیان ہو رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے مریم علیہا السلام کو فرشتوں نے خبر پہنچائی کہ خدا نے انہیں ان کی عبادت کی کثرت' ان کی دنیا کی بے رغبتی' ان کی شرافت اور شیطانی وساوس سے دوری کی وجہ سے اپنے قرب خاص کا درجہ عنایت فرما دیا ہے اور تمام جہان کی عورتوں پر انہیں خاص فضیلت دے رکھی ہے۔ صحیح مسلم شریف وغیرہ میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے' فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا' جتنی عورتیں اونٹ پر سوار ہونے والیاں ہیں' ان میں سے بہتر عورتیں قریش کی ہیں' جو اپنے چھوٹے بچوں پر بہت شفقت اور پیار کرنے والی' اپنے خاوندوں کی چیزوں کی پوری حفاظت کرنے والی ہیں۔ حضرت مریم بنت عمران رضی اللہ تعالیٰ عنہا اونٹ پر کبھی سوار نہیں ہوئیں۔ صحیحین کی ایک حدیث میں ہے عورتوں میں بہتر عورت حضرت مریم بنت عمران رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں اور عورتوں میں بہتر عورت حضرت خدیجہ بنت خویلد ہیں (رضی اللہ تعالیٰ عنہما)۔ ترمذی کی صحیح حدیث میں ہے ساری دنیا کی عورتوں میں سے تجھے مریمؑ بنت عمران' خدیجہؓ بنت خویلد' فاطمہؓ بنت محمد صلی اللہ علیہ وسلم' آسیہ فرعون کی بیوی بس ہیں۔۔۔۔ اور حدیث میں ہے یہ بیویاں تمام عالم کی عورتوں سے افضل اور بہتر ہیں اور حدیث میں ہے مردوں میں کامل مرد بہت سے ہیں لیکن عورتوں میں کمال والی عورتیں صرف تین ہیں۔ مریمؑ بنت عمران' آسیہؓ فرعون کی بیوی اور خدیجہؓ بنت خویلد اور عائشہؓ کی فضیلت عورتوں پر ایسی ہے جیسے ثرید' یعنی گوشت کے شوربے میں بھگوئی ہوئی روٹی کی تمام کھانوں پر[1]۔ یہ حدیث سوا ابوداؤد کے باقی کتابوں میں ہے۔ صحیح بخاری شریف کی اس حدیث میں حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا ذکر نہیں۔ میں نے اس حدیث کی تمام سندیں اور ہر سند کے الفاظ اپنی کتاب البدایہ والنہایہ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ذکر میں جمع کر دیئے ہیں: وَلِلّٰهِ الْحَمْدُ وَالْمِنَّةُ۔

پھر فرشتے فرماتے ہیں کہ اے مریمؑ تو خشوع خضوع رکوع سجود میں رہا کر۔ اللہ تبارک وتعالیٰ تجھے اپنی قدرت کا ایک عظیم الشان نشان بنانے والا ہے۔ اس لئے تجھے ربّ کی طرف پوری رغبت رکھنی چاہئے قنوت کے معنی اطاعت کے ہیں۔ جو عاجزی اور دل کی حاضری کے ساتھ ہو۔ جیسے ارشاد ہے: ﴿وَلَهٗ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ﴾ (الروم:۲۶) یعنی اس کی ماتحتی اور ملکیت میں زمین وآسمان کی ہر چیز ہے۔ سب کے سب اس کے محکوم ہیں اور تابع فرمان ہیں۔ ابن ابی حاتم کی ایک مرفوع حدیث میں ہے کہ قرآن میں جہاں کہیں قنوت کا لفظ ہے۔ اس سے مراد اطاعت گزاری ہے۔ یہی حدیث ابن جریر میں بھی ہے۔ لیکن سند میں نکارت ہے۔ حضرت مجاہد فرماتے ہیں کہ حضرت مریم علیہا السلام نماز میں اتنا لمبا قیام کرتی تھیں کہ دونوں ٹخنوں پر ورم چڑھ جاتا تھا۔ قنوت سے مراد یہی نماز میں لمبے لمبے رکوع کرنا ہے۔ حسن بصری رحمتہ اللہ علیہ کا قول ہے کہ مراد یہ ہے کہ اپنے ربّ کی عبادت میں مشغول رہ اور رکوع سجدہ کرنے والوں میں سے ہو جا۔ حضرت اوزاعی فرماتے ہیں کہ مریمؑ' صدیقہؓ اپنے عبادت خانے میں اس قدر بکثرت اور باخشوع اور لمبی نمازیں پڑھا کرتی تھیں کہ دونوں پیروں میں پانی اتر آیا۔ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهَا وَ اَرْضَاهَا۔

علم غیب کا انکار ☆ یہ اہم خبریں بیان کر کے خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ اے نبی ان باتوں کا علم تمہیں صرف میری وحی سے ہوا اور

[1] آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ غذا سب سے زیادہ پسند تھی اور طبی اعتبار سے بھی اس کے فائدے بہت زیادہ ہیں۔

نہ تمہیں کیا خبر؟ تم کچھ اس وقت ان کے پاس تھوڑے ہی موجود تھے۔ جو ان واقعات کی خبر لوگوں کو پہنچاتے؟ لیکن اپنی وحی سے ہم نے ان واقعات کو اس طرح آپ پر کھول دیا۔ گویا آپ اس وقت خود موجود تھے جبکہ حضرت مریم علیہا السلام کی پرورش کے بارے میں ہر ایک دوسرے پر سبقت کرتا تھا۔ سب کی خواہش تھی کہ اس دولت سے میں مالا مال ہو جاؤں اور یہ اجر مجھے مل جائے۔ جب آپ کی والدہ صاحبہ آپ کو لے کر بیت المقدس کی مسجد سلیمانی میں تشریف لائیں اور وہاں کے خادموں سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بھائی حضرت ہارون علیہ السلام کی نسل میں سے تھے کہا کہ میں انہیں اپنی نذر کے مطابق نام خدا پر آزاد کر چکی ہوں تم اسے سنبھالو۔ یہ ظاہر ہے کہ یہ لڑکی ہے اور یہ معلوم ہے کہ حیض کی حالت میں عورتیں مسجد میں نہیں آ سکتیں۔ اب تم جانو تمہارا کام۔ میں تو اسے گھر واپس نہیں لے جاؤں گی کیونکہ نام خدا پر اسے نذر کر چکی ہوں۔ حضرت عمران علیہ السلام یہاں کے امام نماز تھے اور قربانیوں کے مہتمم تھے اور یہ ان کی صاحبزادی تھیں تو ہر ایک نے بڑے چاؤ سے ان کے لئے ہاتھ پھیلا دیئے۔ ادھر سے حضرت زکریا علیہ السلام نے اپنا ایک حق اور جتایا کہ میں رشتہ میں بھی ان کا خالو ہوتا ہوں تو یہ لڑکی مجھی کو ملنی چاہئے لیکن اور لوگ راضی نہ ہوئے۔ آخر قرعہ ڈالا گیا اور قرعہ میں ان سب نے اپنی وہ قلمیں ڈالیں جن سے تورات لکھتے تھے۔ تو قرعہ حضرت زکریا علیہ السلام کے نام نکلا اور یہی اس سعادت سے مشرف ہوئے۔ دوسری مفصل روایتوں میں یہ بھی ہے کہ نہر اُردن پر جا کر یہ قلمیں ڈالی گئیں۔ پانی کے بہاؤ کے ساتھ جو قلم نکل جائے اور جس کا قلم ٹھہر جائے وہ حضرت مریمؑ کا کفیل بنے۔ چنانچہ سب کی قلمیں تو پانی بہا لے گیا اور صرف حضرت زکریا علیہ السلام کا قلم ٹھہر گیا۔ بلکہ الٹا اوپر کو چڑھنے لگا۔ تو ایک قرعے میں ان کا نام نکلا' دوسرے قریب کی رشتہ داری تھی۔ پھر یہ خود ان تمام کے سردار امام عالم بلکہ نبی تھے۔ صَلٰوتُ اللهِ وَسَلَامُهٗ عَلَيْهِ پس انہی کو حضرت مریم سونپ دی گئیں۔

اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ ۖ اسْمُهُ الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ وَجِيْهًا فِى الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَ مِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ﴿۴۵﴾ وَيُكَلِّمُ النَّاسَ فِى الْمَهْدِ وَكَهْلًا وَّمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۴۶﴾ قَالَتْ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِىْ وَلَدٌ وَّلَمْ يَمْسَسْنِىْ بَشَرٌ ۭ قَالَ كَذٰلِكِ اللّٰهُ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ۭ اِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴿۴۷﴾

(اُس وقت کو یاد کرو) جبکہ فرشتوں نے (یہ بھی) کہا کہ اے مریم بے شک اللہ تعالیٰ تم کو بشارت دیتے ہیں ایک کلمہ کی جو منجانب اللہ ہوگا۔ اس کا نام (ولقب) مسیح عیسیٰ بن مریم ہوگا۔ باآبرو ہوں گے دنیا میں اور آخرت میں اور منجملہ مقربین کے ہوں گے اور آدمیوں میں کلام کریں گے گہوارہ میں اور بڑی عمر میں اور شائستہ لوگوں میں سے ہوں گے۔ (حضرت مریم علیہا السلام) بولیں اے میرے پروردگار کس طرح ہوگا میرے بچہ۔ حالانکہ مجھ کو کسی بشر نے ہاتھ نہیں لگایا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ویسے ہی (بلا مرد کے) ہوگا کیونکہ اللہ تعالیٰ جو چاہیں پیدا کر دیتے ہیں۔ جب

کسی چیز کو پورا کرنا چاہتے ہیں تو اس کو کہہ دیتے ہیں کہ ہو جا' بس وہ ہو جاتی ہے۔O

عیسیٰ علیہ السلام' اُن کی حیرت انگیز پیدائش' نبوت اور دم عیسیٰ ☆

یہ خوشخبری حضرت مریم علیہا السلام کو فرشتے سنا رہے ہیں کہ انہیں ایک لڑکا ہو گا بڑی شان والا جو صرف خدا کے کلمہ کن کے کہنے سے ہو گا اور یہی تفسیر ہے خدا کے فرمان: ﴿مُصَدِّقًا بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ﴾ (آل عمران:۳۹) کی۔ جیسا کہ جمہور نے ذکر کیا۔ جو بیان اس سے پہلے گزر چکا جس کا نام مسیح ہو گا' عیسیٰ بیٹا مریم کا' علیہ السلام۔ ہر مؤمن اسے اسی نام سے پہچانے گا۔ مسیح نام ہونے کی وجہ یہ ہے کہ زمین میں وہ بکثرت سیاحت کریں گے۔ ماں کی طرف منسوب کرنے کی وجہ یہ ہے کہ ان کا باپ کوئی نہ تھا۔ خدا کے نزدیک وہ دونوں جہان میں برگزیدہ ہیں' اور مقربان خاص میں سے ہیں۔ ان پر خدا کی شریعت اور کتاب اُترے گی اور بڑی بڑی مہربانیاں ان پر دنیا میں نازل ہوں گی اور آخرت میں بھی اور اولوالعزم پیغمبروں کی طرح خدا کے حکم سے جسکے لئے خدا چاہے گا' وہ شفاعت کریں گے۔ جو قبول ہو جائے گی: صَلَوَاتُ اللّٰهِ وَسَلَامُهٗ عَلَيْهِ وَعَلَيْهِمْ اَجْمَعِيْنَ۔

وہ اپنے بچپن میں اور ادھیڑ عمر میں باتیں کریں گے یعنی خدائے وحدہٗ لاشریک لہ کی عبادت کی لوگوں کو بچپن ہی میں دعوت دینگے۔ جوان کا معجزہ ہو گا اور بڑی عمر میں؛ جب خدا ان کی طرف وحی کرے گا۔ وہ اپنے قول و فعل میں علم صحیح رکھنے والے اور عمل صالح کرنے والے ہوں گے۔ ایک حدیث میں ہے کہ بچپن میں کلام صرف حضرت عیسیٰؑ نے کیا ہے اور جریج کے ساتھی نے اور حدیث میں ایک اور بچے کا کلام کرنا بھی موجود ہے' تو یہ تین ہوئے۔ حضرت مریمؑ اس بشارت کو سن کر اپنی مناجات میں کہنے لگیں' خدایا مجھے بچہ کیسا ہو گا؟ میں نے تو نکاح نہیں کیا اور نہ میرا ارادہ نکاح کرنے کا ہے اور نہ میں ایسی بدکار عورت ہوں حاشا للہ۔ اللہ کی طرف سے فرشتے نے جواب میں کہا کہ اللہ کا امر بہت بڑا ہے۔ اسے کوئی چیز عاجز نہیں کر سکتی۔ وہ جو چاہے پیدا کرے۔ اس نکتے کو خیال میں رکھنا چاہئے کہ حضرت زکریاؑ کے اس سوال کے جواب میں اس جگہ لفظ یَفْعَلُ تھا۔ یہاں لفظ یَخْلُقُ ہے۔ یعنی پیدا کرتا ہے' اس لئے کہ کسی باطل پرست کو کوئی شبہ کا موقع باقی نہ رہے اور صاف لفظوں میں حضرت عیسیٰؑ کا خدا کی مخلوق ہونا معلوم ہو جائے۔ پھر اسکی مزید تاکید کی اور فرمایا وہ جس کام کو جب بھی کرنا چاہتا ہے تو صرف اتنا فرما دیتا ہے کہ ہو جا' بس وہ وہیں ہو جاتا ہے۔ اسکے حکم کے بعد ڈھیل اور دیر نہیں لگتی جیسے اور جگہ ہے: ﴿وَمَآ اَمْرُنَآ اِلَّا وَاحِدَةٌ كَلَمْحٍ بِالْبَصَرِ﴾ (القمر:۵۰) یعنی ہمارے صرف ایک مرتبہ کے حکم سے بلا تاخیر فی الفور آنکھ جھپکتے ہی وہ کام ہو جاتا ہے۔ ہمیں دوبارہ اسے کہنا نہیں پڑتا۔

وَيُعَلِّمُهُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ ﴿۴۸﴾ وَرَسُوْلًا اِلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۙ اَنِّيْ قَدْ جِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۙ اَنِّيْٓ اَخْلُقُ لَكُمْ مِّنَ الطِّيْنِ كَهَيْـَٔةِ الطَّيْرِ فَاَنْفُخُ فِيْهِ فَيَكُوْنُ طَيْرًۢا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ وَاُبْرِئُ الْاَكْمَهَ وَالْاَبْرَصَ وَاُحْيِ الْمَوْتٰى بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ وَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا تَاْكُلُوْنَ وَمَا تَدَّخِرُوْنَ

فِیْ بُیُوْتِکُمْ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیَةً لَّکُمْ اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ﴿۴۹﴾ وَمُصَدِّقًا لِّمَا

بَیْنَ یَدَیَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَلِاُحِلَّ لَکُمْ بَعْضَ الَّذِیْ حُرِّمَ عَلَیْکُمْ وَجِئْتُکُمْ

بِاٰیَةٍ مِّنْ رَّبِّکُمْ ۟ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوْنِ ﴿۵۰﴾ اِنَّ اللّٰهَ رَبِّیْ وَرَبُّکُمْ فَاعْبُدُوْهُ ؕ

هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِیْمٌ ﴿۵۱﴾

اور اللہ تعالیٰ ان کو تعلیم فرمائیں گے (آسمانی) کتابیں اور سمجھ کی باتیں اور (بالخصوص) توریت اور انجیل اور ان کو تمام بنی اسرائیل کی طرف بھیجیں گے (پیغمبر بنا کر) کہ میں تم لوگوں کے پاس (اپنی نبوت پر) کافی دلیل لے کر آیا ہوں وہ یہ ہے کہ میں تم لوگوں کے لئے گارے سے ایسی شکل بناتا ہوں جیسے پرندہ کی شکل ہوتی ہے۔ پھر اس کے اندر پھونک مار دیتا ہوں جس سے وہ (جاندار) پرندہ بن جاتا ہے خدا کے حکم سے اور میں اچھا کرتا ہوں مادرزاد اندھے کو اور برص (جذام) کے بیمار کو اور زندہ کر دیتا ہوں مردوں کو خدا کے حکم سے اور میں تم کو بتلا دیتا ہوں جو کچھ اپنے گھروں میں کھا (کر) آتے ہو اور جو کچھ رکھ آتے ہو بلاشبہ ان میں (میری نبوت کی) کافی دلیل ہے تم لوگوں کے لئے اگر تم ایمان لانا چاہو اور میں اس طور پر آیا ہوں کہ تصدیق کرتا ہوں اس کتاب کی جو مجھ سے پہلے تھی یعنی توراۃ کی اور اس لئے آیا ہوں کہ تم لوگوں کے واسطے بعضی ایسی چیزیں حلال کر دوں جو تم پر حرام کر دی گئی تھیں اور میں تمہارے پاس دلیل (نبوت) لے کر آیا ہوں۔ حاصل یہ کہ تم لوگ اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور میرا کہنا مانو۔ بے شک اللہ تعالیٰ میرے بھی رب ہیں اور تمہارے بھی رب ہیں سو تم لوگ اس کی عبادت کرو۔ بس یہ ہے راہ راست۔ ○

معجزات کی تفصیل ☆

فرشتے حضرت مریم سے کہتے ہیں کہ تیرے اس لڑکے کو یعنی عیسیٰ علیہ السلام کو پروردگار عالم لکھنا سکھائے گا اور حکمت سکھائے گا۔ حکمت کی تفسیر سورۂ بقرہ میں گزر چکی ہے اور اسے تورات سکھائے گا۔ جو حضرت موسیٰ بن عمران پر اتری تھی اور انجیل سکھائے گا۔ جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر اُتری۔ چنانچہ آپ کو یہ دونوں کتابیں حفظ تھیں۔ انہیں بنی اسرائیل کی طرف اپنا رسول بنا کر بھیجے گا۔ اس بات کے کہنے کے لئے میرا معجزہ دیکھو کہ مٹی لی اس کا پرندہ بنایا پھر پھونک مارتے ہی وہ سچ مچ کا جیتا جاگتا پرندہ بن کر سب کے سامنے اُڑنے لگا۔ یہ خدا کے حکم سے اور اس کے فرمان سے تھا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی اپنی قدرت سے نہیں۔ یہ ایک معجزہ تھا جو آپ کی نبوت کا نشان تھا۔ اَکْمَہ اس اندھے کو کہتے ہیں جسے دن کے وقت دکھائی نہ دے اور رات کو دکھائی دے۔ بعضوں نے کہا ہے اَکْمَہ اس نابینا کو کہتے ہیں جسے دن کو دکھائی دے اور رات کو دکھائی نہ دے۔ بعض کہتے ہیں بھینگا اور ترچھا اور کانا مراد ہے۔ بعض کا قول یہ ہے کہ ماں کے پیٹ سے بالکل اندھا پیدا ہوا ہو۔ یہاں یہ ترجمہ زیادہ مناسب ہے کیونکہ اس میں معجزہ کا کمال ہے اور مخالفین کو عاجز کرنے کے لئے یہ صورت اس کی دوسری صورتوں سے اعلیٰ ہے۔ اَبْرَص سفید داغ والے کوڑھی کو کہتے ہیں۔ ایسے بیمار بھی خدا کے حکم سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام اچھے کر دیتے تھے اور مردوں کو خدا کے حکم سے آپ جلا دیا کرتے تھے۔ اکثر علماء کا قول ہے کہ ہر ہر زمانے کے نبی کو اس زمانے والوں کی مناسبت سے خاص

خاص معجزات حضرت باری عزاسمہٗ نے عطا فرمائے ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں جادو کا بڑا چرچا تھا اور جادو گروں کی قدر و تعظیم تھی۔ تو خدا نے آپ کو وہ معجزہ دیا کہ تمام جادوگروں کی آنکھیں کھل گئیں اور ان پر حیرت طاری ہوگئی اور انہیں کامل یقین ہوگیا کہ یہ خدائے واحد قہار کی طرف سے عطیہ ہے جادو ہرگز نہیں چنانچہ ان کی گردنیں جھک گئیں اور یک لخت وہ حلقہ بگوش اسلام ہوگئے اور بالآخر خدا کے مقرب بندے بن گئے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں طبیبوں اور حکیموں کا دور دورہ تھا۔ کامل اطباء اور ماہر حکیم علم طبیعت کے پورے عالم اور لاجواب کامل الفن استاد موجود تھے۔ پس آپ کو وہ معجزے دیئے گئے جس سے وہ سب عاجز تھے۔ بھلا مادرزاد اندھوں کو بالکل بینا کر دینا اور کوڑھیوں کو اس مہلک بیماری سے آرام دینا۔ اتنا ہی نہیں بلکہ جمادات جو محض بے جان چیز ہے اس میں روح ڈال دینا اور قبروں[1] کے مردوں کو زندہ کر دینا یہ کسی کے بس کی بات ہے؟ صرف خدا کے حکم سے بطور معجزہ یہ باتیں آپ سے ظاہر ہوئیں۔

قرآن کریم کا سب سے بڑا معجزہ ☆ ٹھیک اسی جب ہمارے نبی اکرم حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ تشریف لائے اس وقت فصاحت بلاغت نکتہ رسی اور بلند خیالی بول چال میں نزاکت و لطافت کا زمانہ تھا۔ اس فن میں بلند پایہ شاعروں نے وہ کمال حاصل کر لیا تھا کہ دنیا ان کے قدموں پر جھک پڑی تھی۔ پس حضور ﷺ کو کتاب اللہ ایسی عطا فرمائی گئی کہ ان سب کی کوندتی ہوئی بجلیاں ماند پڑ گئیں اور کلام اللہ کے نور نے انہیں نیچا دکھایا اور یقین کامل ہوگیا کہ یہ انسانی کلام نہیں۔ تمام دنیا سے کہہ دیا گیا اور جتا جتا کر بتا بتا کر سنا سنا کر منادی کر کر کے بار بار اعلان دے کر کہا گیا کہ ہے کوئی جو اس جیسا کلام کہہ سکے؟ اکیلے اکیلے نہیں سب مل کر اور انسان ہی نہیں جنات کو بھی اپنے ساتھ شامل کر لو۔ پھر سارے قرآن کے برابر بھی نہیں صرف دس سورتوں کے برابر ہی سہی اور اچھا یہ بھی نہ سہی ایک ہی سورت اس کے مثل تو بنا کر لاؤ لیکن سب کی کمریں ٹوٹ گئیں۔ ہمتیں پست ہوگئیں۔ گلے خشک ہوگئے۔ زبان گنگ ہوگئی اور آج تک قرآن کا جواب ساری دنیا سے نہ بن پڑا اور نہ کبھی ہو سکے گا۔ بھلا کہاں خدا کا کلام اور کہاں مخلوق کا۔ پس اس زمانہ کی اعتبار سے اس معجزے نے اپنا اثر کیا اور مخالفین کو ہتھیار ڈالتے ہی بن پڑی اور جوق در جوق اسلامی حلقے میں آگئے۔ پھر حضرت مسیح علیہ السلام کا اور معجزہ بیان ہو رہا ہے کہ آپ نے فرمایا بھی اور کر کے دکھایا بھی۔ کہ جو کوئی تم میں سے آج اپنے گھر میں جو کچھ کھا کر آیا ہو میں اسے بھی خدا کے بتانے سے بتا دوں گا اور کل کے لئے بھی اس نے جو تیاری کی ہو مجھے خدا کے معلوم کرانے سے معلوم رہتا ہے۔ اس میں میری سچائی کی دلیل ہے کہ میں جو تعلیم تمہیں دے رہا ہوں وہ برحق ہے۔ ہاں اگر تم میں ایمان ہی نہیں تو پھر کیا؟ میں اپنے پہلی کتاب تورات کو بھی ماننے والا ہوں۔ اس کی سچائی کا دنیا میں اعلان کرنے والا ہوں۔ میں تم پر وہ چیزیں حلال کرنے آیا ہوں جو مجھ سے پہلے تم پر حرام کی گئی ہیں۔ اس سے ثابت ہوا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے تورات کے بعض احکام منسوخ کیے ہیں۔ گو اس کے خلاف بھی مفسرین کا خیال ہے لیکن درست بات یہی ہے۔ بعض حضرات فرماتے ہیں کہ تورات کا کوئی حکم آپ نے منسوخ نہیں کیا۔ البتہ بعض حلال چیزوں میں جو اختلاف تھا اور بڑھتے بڑھتے گویا ان کی حرمت پر اجماع ہو چکا تھا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ان کی حقیقت بیان فرما دی اور انکے حلال ہونے پر مہر کر دی۔ جیسے قرآن میں اور جگہ فرمایا: ﴿وَلِاُبَیِّنَ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِیْ تَخْتَلِفُوْنَ فِیْهِ﴾ (الزخرف: ۶۳)

---

[1] روایات میں ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام نے نوح علیہ السلام کے لڑکے کو انکی قبر سے زندہ کیا تھا۔ روایت میں یہ بھی ہے کہ جب وہ قبر سے باہر آئے تو انکے سر کے بال سفید ہوگئے تھے۔ عیسیٰ نے دریافت کیا کہ تمہارے سر کے بال سفید ہوگئے؟ انہوں نے جواب دیا کہ قیامت کی دہشت سے میرے بال سفید ہوگئے۔ عیسیٰ نے ان سے زندہ رہنے کے متعلق پوچھا تو انہوں نے معلوم کیا کہ جان کنی کی تکلیف سے محفوظ رہوں گا؟ عیسیٰ نے فرمایا کہ نہیں موت تو جب آئی گی نزع کی تکلیف بہرحال اٹھانا پڑے گی۔ انہوں نے کہا کہ پھر مجھے قبر میں آپ اسی طرح لوٹا دیجئے تو عیسیٰ نے لوٹا دیا۔

میں تمہارے بعض آپس کے اختلاف میں صاف فیصلہ کر دوں گا۔ واللہ اعلم۔ پھر فرمایا کہ میرے پاس اپنی سچائی کی خدائی دلیلیں موجود ہیں۔ تم اللہ سے ڈرو اور میرا کہا مانو۔ جس کا خلاصہ صرف اسی قدر ہے کہ اسے پوجو جو میرا اور تمہارا پالنہار ہے۔ سیدھی راہ تو صرف یہی ہے۔

فَلَمَّآ اَحَسَّ عِيْسٰى مِنْهُمُ الْكُفْرَ قَالَ مَنْ اَنْصَارِيْٓ اِلَى اللّٰهِ ۭ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ ۚ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ ۚ وَاشْهَدْ بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ﴿۵۲﴾ رَبَّنَآ اٰمَنَّا بِمَآ اَنْزَلْتَ وَاتَّبَعْنَا الرَّسُوْلَ فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ ﴿۵۳﴾ وَمَكَرُوْا وَمَكَرَ اللّٰهُ ۭ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ ﴿۵۴﴾

ع ۵ ۱۴

سو جب حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) نے ان سے انکار دیکھا تو آپ نے فرمایا کوئی ایسے آدمی بھی ہیں جو میرے مددگار ہو جائیں اللہ کے واسطے۔ حواریین بولے کہ ہم ہیں مددگار اللہ (کے دین) کے ہم اللہ پر ایمان لائے ہیں اور آپ اس کے گواہ رہئے کہ ہم فرمانبردار ہیں۔ اے ہمارے رب ہم ایمان لے آئے ان چیزوں پر (یعنی احکام) پر جو آپ نے نازل فرمائیں اور پیروی اختیار کی ہم نے (ان) رسول کی سو ہم کو ان لوگوں کے ساتھ لکھ دیجئے جو تصدیق کرتے ہیں اور ان لوگوں نے خفیہ تدبیر کی اور اللہ تعالیٰ نے خفیہ تدبیر فرمائی اور اللہ تعالیٰ سب تدبیریں کرنے والوں سے اچھے ہیں ۔O

عیسیٰ علیہ السلام کے خلاف سازشیں اور بروقت خدائی امداد ☆

یعنی جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ان کی معاندت اور عداوت کو دیکھ لیا کہ اپنی گمراہی' کج روی اور کفر و انکار سے یہ ہٹتے ہی نہیں تو فرمانے لگے کہ کوئی ایسا بھی ہے کہ میری تابعداری کرے خدا کی طرف پہنچنے کے لئے؟ اور یہ مطلب بھی بیان کیا گیا ہے کہ کوئی ہے جو خدا کے ساتھ میرا مددگار بنے؟ لیکن پہلا قول زیادہ ٹھیک ہے۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے فرمایا خدا کی طرف پکارنے میں میرا ہاتھ بٹانے والا کون ہے؟ جیسے نبی اللہ حضرت محمد ﷺ بھی مکہ شریف سے ہجرت کرنے سے پہلے موسم حج کے موقع پر فرمایا کرتے تھے کہ کوئی ہے جو مجھے خدا کا کلام پہنچانے کے لئے جگہ دے؟ قریش تو کلام خدا کی تبلیغ سے مجھے روک رہے ہیں۔ یہاں تک کہ مدینہ شریف کے باشندے انصار کرامؓ اس خدمت کے لئے کمربستہ ہوئے۔ آپ کو جگہ بھی دی' آپ کی مدد بھی کی اور جب آپ ان کے ہاں تشریف لے گئے تو پوری خیر خواہی اور بے نظیر ہمدردی کی۔ ساری دنیا کے مقابلہ میں اپنا سینہ سپر کر دیا اور حضور ﷺ کی حفاظت خیر خواہی اور آپ کے مقاصد کی کامیابی میں ہمہ تن مصروف ہو گئے رضی اللہ تعالیٰ عنہم وارضاھم۔ اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی آواز پر بھی چند بنی اسرائیلیوں نے لبیک کہی۔ آپ پر ایمان لائے' آپ کی تائید کی تصدیق کی اور پوری مدد پہنچائی اور اس نور کی اطاعت میں لگ گئے۔

حواری کون تھے؟ یہ لوگ دھوبی تھے اور حواری انہیں ان کے کپڑوں کی سفیدی کی وجہ سے کہا گیا ہے۔ بعض کہتے ہیں یہ

شکاری تھے۔ صحیح یہ ہے کہ حواری کہتے ہیں مددگار کو۔ جیسے کہ صحیحین کی حدیث میں ہے کہ جنگ خندق کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کوئی ہے جو سینہ سپر ہو جائے؟ اس آواز کو سنتے ہی حضرت زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ تیار ہو گئے۔ آپ نے دوبارہ یہی فرمایا۔ پھر بھی حضرت زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ہی قدم اٹھایا۔ پس حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ہر نبی کے حواری ہوتے ہیں اور میرا حواری زبیرؓ ہے۔ پھر یہ لوگ اپنی دعا میں کہتے ہیں' ہمیں شاہدوں میں لکھ لے۔ اس سے مراد حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے نزدیک امت محمد صلی اللہ علیہ وسلم میں لکھ لینا ہے۔ اس تفسیر کی روایت سنداً بے غل وغش ہے۔ پھر بنی اسرائیل کے اس ناپاک گروہ کا ذکر ہو رہا ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف سے بھرے تھے کہ یہ شخص لوگوں کو بہکاتا پھرتا ہے۔ ملک میں بغاوت کر رہا ہے اور رعایا کو بگاڑ رہا ہے۔ باپ بیٹوں میں فساد کرا رہا ہے بلکہ اپنی خباثت' خیانت' کذب و دروغ میں یہاں تک بڑھ گئے کہ آپ کو زانیہ کا بیٹا کہا اور بڑے بڑے بہتان آپ پر باندھے یہاں تک کہ بادشاہ بھی دشمن جان بن گیا اور اپنی فوج کو بھیجا کہ اسے گرفتار کر کے سخت سزا کے ساتھ پھانسی دے دو۔ یہاں سے پولیس جاتی ہے اور جس گھر میں آپ تھے اسے ہر طرف سے گھیر لیتی ہے۔ تالہ بندی کر کے پھر گھر میں گھستے ہیں لیکن خدا تعالیٰ آپ کو ان مکاروں کے ہاتھ سے صاف بچا لیتا ہے۔ اس گھر کے روزن سے آپ کو آسمان کی طرف اُٹھا لیتا ہے اور آپ کی شباہت ایک اور شخص پر ڈال دی جاتی ہے جو اسی گھر میں تھا۔ یہ لوگ رات کے اندھیرے میں اس کو عیسیٰ علیہ السلام سمجھ لیتے ہیں۔ گرفتار کر کے لے جاتے ہیں' سخت توہین کرتے ہیں اور سر پر کانٹوں کا تاج رکھ کر اسے صلیب پر چڑھا دیتے ہیں۔ یہی ان کے ساتھ اللہ کا مکر تھا۔ کہ وہ اپنے نزدیک یہ سمجھتے رہے کہ ہم نے اللہ کے نبی کو پھانسی پر لٹکا دیا۔ حالانکہ خدا تعالیٰ نے اپنے نبی کو تو نجات دے دی تھی۔ اس بدبختی اور بدنیتی کا ثمرہ انہیں یہ ملا کہ ان کے دل ہمیشہ کے لئے سخت ہو گئے' باطل پر اَڑ گئے اور دنیا میں ذلیل و خوار ہو گئے اور آخر دنیا تک اس ذلت میں ہی رہ پڑے۔ اسی کا بیان ہے اس آیت ہیں' کہ اگر انہیں مکر آتے ہیں تو کیا ہم نہیں جانتے۔ ہم تو ان سے بہتر کرنے والے ہیں۔

اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسٰۤى اِنِّىْ مُتَوَفِّيْكَ وَرَافِعُكَ اِلَىَّ وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَجَاعِلُ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۚ ثُمَّ اِلَىَّ مَرْجِعُكُمْ فَاَحْكُمُ بَيْنَكُمْ فِيْمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ﴿۵۵﴾ فَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَاُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا فِى الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۡ وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ﴿۵۶﴾ وَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَيُوَفِّيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ ؕ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۵۷﴾ ذٰلِكَ نَتْلُوْهُ عَلَيْكَ مِنَ الْاٰيٰتِ

وَالذِّكْرِ الْحَكِيمِ ﴿۵۸﴾

جبکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے عیسیٰ (کچھ غم نہ کرو) بے شک میں تم کو وفات دینے والا ہوں اور (فی الحال) میں تم کو اپنی طرف اُٹھائے لیتا ہوں اور تم کو ان لوگوں سے پاک کرنے والا ہوں جو منکر ہیں اور جو لوگ تمہارا کہنا ماننے والے ہیں ان کو غالب رکھنے والا ہوں ان لوگوں پر جو کہ (تمہارے) منکر ہیں روز قیامت تک۔ پھر میری طرف ہوگی ان سب کی واپسی سو میں تمہارے درمیان (عملی) فیصلہ کردوں گا ان امور میں جن میں تم باہم اختلاف کرتے تھے۔ تفصیل (فیصلہ کی) یہ ہے کہ جو لوگ (ان اختلاف کرنے والوں میں) کافر تھے۔ سو ان کو سخت سزا دوں گا دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی اور ان لوگوں کا کوئی حامی (طرفدار) نہ ہوگا اور جو لوگ مؤمن تھے اور انہوں نے نیک کام کئے تھے۔ سو ان کو اللہ تعالیٰ ان کے (ایمان اور نیک کاموں کے) ثواب دیں گے اور اللہ محبت نہیں رکھتے ظلم کرنے والوں سے یہ ہم کو پڑھ پڑھ کر سناتے ہیں جو کہ (آپ کے) منجملہ دلائل (نبوت) کے ہے اور منجملہ حکمت آمیز مضامین کے ہیں۔ ○

رفع عیسیٰ علیہ السلام' مسئلہ کی نزاکت اور ایمان وکفر کا معیار ☆

قتادہ رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ بعض مفسرین تو فرماتے ہیں' مطلب یہ ہے کہ میں تجھے اپنی طرف اُٹھالوں گا۔ پھر اس کے بعد تجھے فوت کروں گا۔ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں' میں تجھے مارنے والا ہوں۔ وہب بن منبہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔ خدا نے آپ کو اٹھانے کے وقت شروع دن میں تین ساعت تک فوت کر دیا تھا۔ ابن اسحاق رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں' نصاریٰ کا خیال ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو سات ساعت تک فوت رکھا پھر زندہ کیا۔ وہب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں' تین دن تک موت رہی۔ پھر زندہ کر کے اُٹھالیا۔ ایک مفسر فرماتے ہیں' یعنی میں تجھے دنیا میں پورا پورا دینے والا ہوں' یہاں وفات موت مراد نہیں۔ اسی طرح ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔ توف سے یہاں مراد ان کا رفع ہے اور اکثر مفسرین کا قول ہے کہ وفات سے مراد یہاں نیند ہے' جیسے اور جگہ قرآن حکیم میں ہے: ﴿هُوَ الَّذِيْ يَتَوَفّٰكُمْ بِالَّيْلِ﴾ (الانعام ۶۰) وہ خدا جو تمہیں رات کو فوت کر دیتا ہے یعنی سلا دیتا ہے اور جگہ ہے: ﴿اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِيْ لَمْ تَمُتْ فِيْ مَنَامِهَا﴾ (زمر ۴۰) یعنی اللہ تعالیٰ جانوں کو فوت کرتا ہے ان کو موت کے وقت اور جو نہیں مرتیں انہیں ان کی نیند کے وقت۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب نیند سے بیدار ہوتے ہیں تو فرماتے: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ اَحْيَانَا بَعْدَ مَآ اَمَاتَنَا۔ یعنی خدا کا شکر ہے جس نے مار ڈالنے کے بعد دوبارہ زندہ کر دیا۔ اور جگہ فرمان باری: ﴿وَبِكُفْرِهِمْ﴾ سے ﴿شَهِيْدًا﴾ (النساء ۱۵۶) تک پڑھو۔ جہاں فرمایا گیا ہے' ان کے کفر کی وجہ سے اور حضرت مریم علیہا السلام پر بہتان عظیم دھرنے کی بنا پر اور اس باعث کہ وہ کہتے ہیں کہ ہم نے مسیح عیسیٰ بن مریم رسول اللہ کو قتل کر دیا۔ حالانکہ نہ قتل کیا ہے اور ان کے لئے شبہ ڈال دیا گیا۔ مَوْتِهٖ کی ضمیر کا مرجع حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں۔ یعنی تمام اہل کتاب حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لائیں گے جبکہ وہ قیامت سے پہلے زمین پر اُتریں گے۔ اس کا تفصیلی بیان عنقریب آرہا ہے ان شاء اللہ تعالیٰ۔

پس اس وقت تمام اہل کتاب ان پر ایمان لائیں گے کیونکہ نہ وہ جزیہ لیں گے نہ سوائے اسلام کے اور کوئی بات قبول کریں گے۔ ابن ابی حاتم میں حضرت حسن سے اِنِّيْ مُتَوَفِّيْكَ کی تفسیر یہ نقل ہے کہ ان پر نیند ڈالی اور نیند کی حالت میں

ہی اللہ تعالیٰ نے انہیں اُٹھالیا۔ حضرت حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے یہودیوں سے فرمایا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام مرے نہیں' وہ تمہاری طرف قیامت سے پہلے لوٹنے والے ہیں۔

پھر فرماتا ہے میں تجھے اپنی طرف اٹھا کر کافروں سے پاک کرنے والا ہوں اور تیرے تابعداروں کو کافروں پر غالب رکھنے والا ہوں قیامت تک چنانچہ ایسا ہی ہوا جب اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو آسمان پر اُٹھالیا تو ان کے بعد ان کے ساتھیوں کے کئی فریق ہو گئے۔ ایک فرقہ تو آپ کی بعثت پر ایمان رکھنے والا تھا کہ آپ اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں اور اس کی ایک بندی کے لڑکے ہیں۔ بعض وہ تھے جنہوں نے غلو سے کام لیا اور بڑھ گئے اور آپ کو خدا کا بیٹا کہنے لگے' اوروں نے خود خدا آپ کو کہا۔ دوسروں نے تین میں کا ایک آپ کو بتلایا۔ اللہ تعالیٰ ان کے عقائد کا ذکر قرآن مجید میں فرماتا ہے۔ پھر ان کی تردید بھی کر دی ہے۔ تین سو سال تک تو یہ اسی طرح رہے۔

پھر یونان کے بادشاہوں میں سے ایک بادشاہ جو بڑا فیلسوف تھا۔ جس کا نام قسطنطین تھا کہا جاتا ہے کہ صرف اس دین کو بگاڑنے کے لئے منافقانہ بطور حیلہ جوئی کے وہ اس دین میں داخل ہوا یا جہالت سے داخل ہوا۔ بہر حال اس نے دین مسیح کو بالکل بدل ڈالا اور بڑی تحریف کی اور کمی زیادتی بھی اس دین میں کر ڈالی۔ بہت سے قانون ایجاد کئے اور امانت کبریٰ بھی اس کی ایجاد ہے جو دراصل کمینہ پن کی خیانت ہے۔ اسی نے اپنے زمانے میں سؤر کو حلال کیا۔ اس کے حکم سے عیسائی مشرق کی طرف نماز پڑھنے لگے۔ اسی نے گرجاؤں اور کنیسوں' میں عبادت خانوں اور خانقاہوں میں تصویریں بنوائیں اور اپنے ایک گناہ کے باعث دس روزے روزوں میں بڑھوا دیئے۔ غرض اس کے زمانہ سے دین مسیح مسیحی دین نہ رہا بلکہ دین قسطنطین ہو گیا۔ اس نے ظاہری رونق تو خوب دی۔ بارہ ہزار سے زائد تو عبادت گاہیں بنوائیں اور ایک شہر اپنے نام سے بسایا۔ ملکیہ گروہ نے اس کی تمام باتیں مان لیں لیکن باوجود ان سب سیاہ کاریوں یہودی ان کے ہاتھ تلے رہے اور دراصل نسبتاً حق سے زیادہ قریب یہی تھے۔ گو فی الواقع سارے کے سارے کفار تھے۔ خدا کی ان پر پھٹکار ہو۔

اب جبکہ ہمارے نبی حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے اپنا برگزیدہ رسول بنا کر بھیجا تو آپ پر جو لوگ ایمان لائے۔ ان کا ایمان خدا کی ذات پر بھی تھا۔ اس کے فرشتوں پر بھی تھا۔ اس کتابوں پر بھی تھا اور اس کے تمام رسولوں پر بھی تھا۔ پس حقیقت میں نبیوں کے سچے تابع فرمان یہی لوگ تھے یعنی امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ اس لئے کہ یہ بھی اُمی عربی خاتم الرسل سید اولاد آدم کے ماننے والے تھے اور حضور ﷺ کی تعلیم تمام حقانیت کو سچا ماننے کی تھی۔ پس دراصل ہر نبی کے سچے تابعدار صحیح معنی میں اُمتی کہلانے کے مستحق یہی تھے کیونکہ ان لوگوں نے جو اپنے تئیں عیسیٰ علیہ السلام کی اُمت کہتے تھے دین عیسوی کو بالکل مسخ کر دیا تھا۔

علاوہ ازیں پیغمبر آخر الزماں ﷺ کا دین بھی اور تمام اگلی شریعتوں کا ناسخ تھا۔ پھر محفوظ رہنے والا تھا۔ جس کا شوشہ بھی قیامت تک بدلے گا نہیں۔ اس لئے اس آیت کے وعدے کے مطابق خدا تعالیٰ نے کافروں پر اس امت کو غلبہ دیا اور یہ مشرق سے لے کر مغرب تک چھا گئے۔ ملکوں کو اپنے پاؤں تلے روند دیا اور بڑے بڑے جابر اور معاند کافروں کی گردنیں مروڑ دیں اور دولتیں ان کے پیروں میں آ گئیں۔ فتح و غنیمت ان کی رکاب چومنے لگی۔ مدتوں کی پرانی سلطنتوں کے تختے انہوں نے اُلٹ دیئے۔ کسریٰ کی پرشان سلطنت' ان کے بھڑکتے ہوئے آتش کدے ان کے ہاتھوں ویران اور سرد ہوئے۔ قیصر کا تاج و تخت

ان خداوالوں نے تاخت وتاراج کیا اور مسیح پرستی کا خوب مزہ چکھایا اور ان کے خزانوں کو خدائے واحد کی رضامندی میں اور اس کے سچے رسول کے دین کی اشاعت میں دل کھول کر خرچ کیا اور خدا کے نوشتے اور نبی کے وعدے چڑھے ہوئے سورج کی اور چودھویں کے روشن چاند کی طرح سچے ہوتے ہوئے لوگوں نے دیکھ لئے۔ مسیح علیہ السلام کے نام کو بدنام کرنے والے مسیح کے نام شیطانوں کو پوجنے والے ان پاک باز خدا پرستوں کے ہاتھوں مجبور ہو کر شام کے لہلہاتے ہوئے باغ اور آباد شہروں کو ان کے حوالے کر کے بے پناہ بھاگتے ہوئے روم میں جا بسے۔ پھر وہاں سے بھی یہ بے عزت کر کے نکالے گئے اور اپنے بادشاہ کے خاص شہر قسطنطنیہ میں پہنچے لیکن پھر وہاں سے بھی ذلیل وخوار کر کے نکال دیئے گئے اور ان شاء اللہ العزیز اسلام اور اہل اسلام قیامت تک ان کے اوپر ہی رہیں گے۔ سب سچوں کے سردار جن کی سچائی پر مہر خدائی لگ چکی ہے۔ یعنی آنحضرت ﷺ خبر دے چکے ہیں۔ جو اٹل ہے۔ نہ کاٹے کٹے نہ توڑے ٹوٹے نہ ٹالے ٹلے۔ فرماتے ہیں کہ آپ کی امت کا آخری گروہ قسطنطنیہ کو فتح کرے گا اور وہاں کے تمام خزانے اپنے قبضے میں کرے گا اور رومیوں سے ان کی وہ گھمسان کی لڑائی ہو گی اس کی نظیر سے دنیا خالی ہو۔ ہماری دعا ہے کہ ہر زمانے میں خدا اس امت کا حامی و ناصر رہے اور روئے زمین کے کفارہ پر انہیں غالب رکھے اور انہیں سمجھ دے کہ نہ یہ خدا کے سوا کسی کی عبادت کریں نہ محمد ﷺ کے کسی کی اطاعت کریں۔ یہی اصل ہے اسلام کی اور یہی گر ہے عروج دینوی کا۔ میں نے اس کو ایک علیحدہ کتاب میں جمع کر دیا ہے۔ آگے کے قول خدا پر نظر ڈالئے کہ مسیح علیہ السلام کے ساتھ کفر کرنے والے یہود اور آپ کی شان میں بڑھ چڑھ کر باتیں بنا کر بہکنے والے نصرانیوں کو قتل وقید کی مال اور سلطنت کے تباہ ہو جانے کی سزا اور آخرت کا عذاب وہیں دیکھ لینا' جہاں نہ کوئی بچا سکے گا نہ مدد کر سکے گا اور ان کے برخلاف ایمانداروں کو پورا اجر خدا تعالیٰ عطا فرمائے گا۔ دنیا میں فتح و نصرت' عزت و حرمت عطا ہو گی اور عقبیٰ میں بھی خاص رحمتیں اور نعمتیں ملیں گی۔ اللہ تعالیٰ ظالموں کو ناپسند رکھتا ہے۔

پھر فرمایا اے نبی ﷺ یہ تھی حقیقت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی اور ان کی ابتدائے پیدائش کی اور ان کے امر کی' جو اللہ تعالیٰ نے لوح محفوظ سے آپ کی طرف بذریعہ اپنی خاص وحی کے اتار دی۔ جس میں کوئی شک وشبہ نہیں۔ جیسے سورۂ مریم میں فرمایا۔ عیسیٰ بن مریم یہی ہیں۔ یہی سچی حقیقت ہے۔ جس میں شک وشبہ میں پڑے ہو۔ خدا کو لائق ہی نہیں کہ اس کی اولاد ہو وہ اس سے بالکل پاک ہے۔ وہ جو کرنا چاہے' کہہ دیتا ہے ہو جا' بس وہ ہو جاتا ہے۔ اب یہاں بھی اس کے بعد بیان ہو رہا ہے۔

إِنَّ مَثَلَ عِيسَىٰ عِندَ اللَّهِ كَمَثَلِ آدَمَ ۖ خَلَقَهُ مِن تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهُ كُن فَيَكُونُ ﴿٥٩﴾ الْحَقُّ مِن رَّبِّكَ فَلَا تَكُن مِّنَ الْمُمْتَرِينَ ﴿٦٠﴾ فَمَنْ حَاجَّكَ فِيهِ مِن بَعْدِ مَا جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ أَبْنَاءَنَا وَأَبْنَاءَكُمْ وَنِسَاءَنَا وَنِسَاءَكُمْ وَأَنفُسَنَا وَأَنفُسَكُمْ ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَل

لَّعۡنَتَ اللّٰهِ عَلَى الۡكٰذِبِيۡنَ ﴿۶۱﴾ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الۡقَصَصُ الۡحَقُّ ۚ وَمَا مِنۡ اِلٰهٍ اِلَّا اللّٰهُ ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ الۡعَزِيۡزُ الۡحَكِيۡمُ ﴿۶۲﴾ فَاِنۡ تَوَلَّوۡا فَاِنَّ اللّٰهَ عَلِيۡمٌۢ بِالۡمُفۡسِدِيۡنَ ﴿۶۳﴾

بیشک حالت عجیبہ (حضرت) عیسیٰ کی اللہ تعالیٰ کے نزدیک مشابہ حالت عجیبہ (حضرت) آدم کے ہے کہ ان (کے قالب) کو مٹی سے بنایا۔ پھر ان کو حکم دیا کہ (جاندار) ہو جا بس وہ (جاندار) ہو گئے۔ یہ امر واقعی آپ کے پروردگار کی طرف سے (بتلایا گیا) سو آپ شبہ کرنے والوں میں سے نہ ہو جائے۔ پس جو شخص آپ سے عیسیٰ علیہ السلام کے باب میں (اب بھی) حجت کرے آپ کے پاس علم (قطعی) آئے پیچھے تو آپ فرما دیجئے کہ آ جاؤ ہم (اور تم) بلالیں اپنے بیٹوں کو اور تمہارے بیٹوں کو اور اپنی عورتوں کو اور تمہاری عورتوں کو خود اپنے تنوں کو اور تمہارے تنوں کو پھر ہم (سب مل کر) خوب دل سے دعا کریں اس طور پر کہ اللہ کی لعنت بھیجیں ان پر جو (اس بحث میں) ناحق پر ہوں۔ بے شک یہ (جو کچھ) مذکور (ہوا) وہی ہے سچی بات اور کوئی معبود ہونے کے لائق نہیں بجز اللہ تعالیٰ کے اور بلا شک اللہ تعالیٰ ہی غلبہ والے ہیں حکمت والے ہیں پھر (بھی) اگر سر تابی کریں تو بے شک اللہ تعالیٰ خوب جاننے والے ہیں فساد والوں کو۔ ○

عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت کوئی حیرت انگیز امر نہیں ☆

حضرت باری جل اسمہٗ وعلی قدرہٗ اپنی قدرتِ کاملہ کا بیان فرما رہا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا تو صرف باپ نہ تھا اور میں نے انہیں پیدا کر دیا تو اس میں تعجب کیا ہے؟ میں نے حضرت آدم علیہ السلام کو ان سے پہلے پیدا کیا تھا حالانکہ ان کا بھی باپ نہ تھا بلکہ ماں بھی نہ تھی مٹی سے پتلا بنایا اور کہہ دیا آدم ہو جا' اسی وقت ہو گیا پھر صرف ماں سے پیدا کرنا کیا مشکل جبکہ بغیر ماں باپ کے بھی میں نے پیدا کر دیا۔ لیں اگر صرف باپ نہ ہونے کی وجہ سے عیسیٰ علیہ السلام خدا کا ہو سکتے ہیں تو آدم بطریق اولیٰ اس کا استحقاق رکھتے ہیں اور انہیں خود تم بھی نہیں مانتے۔ پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اس درجہ سے بطور اولیٰ ہٹانا چاہئے کیونکہ اہلیت کے دعوے کا بطلان اور فساد یہاں اس سے زیادہ ہے۔ یہاں ماں تو ہے وہاں نہ ماں تھی نہ باپ۔ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ جل جلالہٗ کی کامل قدرتوں کا ظہور ہے کہ آدم علیہ السلام کو بغیر مرد و عورت کے پیدا کیا۔ اسی لئے سورہ مریم میں فرمایا: ﴿وَلِنَجۡعَلَهٗۤ اٰيَةً لِّلنَّاسِ﴾ ہم نے عیسیٰ کو لوگوں کے لئے اپنی قدرت کا نشان بنایا اور یہاں فرمایا ہے عیسیٰ کے بارے میں خدائی سچا فیصلہ یہی ہے۔ اس کے سوا کچھ کمی زیادتی کی گنجائش ہی نہیں ہے۔ کیونکہ حق کے بعد گمراہی ہی ہوتی ہے۔ پس تجھے اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہرگز ان شکی لوگوں میں نہ ہونا چاہئے۔[1]

اللہ رب العالمین اس کے بعد اپنے نبی کو حکم دیتا ہے کہ اگر اس قدر واضح اور کامل بیان کے بعد بھی کوئی شخص تجھ سے امر

[1] العیاذ باللہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس میں کوئی شک یا ادنیٰ درجہ کا تامل بھی نہیں تھا۔ دراصل ان لوگوں کو یہ خطاب ہے جو ان حقائق کو شبہ کی نظر سے دیکھتے ہیں۔

عیسیٰ کے بارے میں جھگڑے تو انہیں مباہلہ کی دعوت دے کہ ہم فریقین مع اپنے بیٹوں اور بیویوں کے مباہلہ کے لئے نکلیں اور خدا سے بہ عاجزی کہیں کہ خدایا ہم دونوں میں جو جھوٹا ہے اس پر تو اپنی لعنت نازل فرما۔ اس مباہلہ کے نازل ہونے کا اور ابتداء سورت سے یہاں تک کی ان تمام آیتوں کے نازل ہونے کا سبب نجران کے نصاریٰ کا وفد تھا۔ یہ لوگ یہاں آ کر حضور ﷺ سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام خدائی کے حصہ دار اور خدا کے بیٹے ہیں۔ پس ان کی تردید اور ان کے جواب میں یہ سب آیتیں نازل ہوئیں۔

وفدِ نجران ☆ ابن اسحاق رحمتہ اللہ تعالیٰ اپنی مشہور عام سیرت میں لکھتے ہیں اور دوسرے مؤرخین نے بھی اپنے کتابوں میں لکھا ہے کہ نجران کے نصرانیوں نے بطور وفد کے حضور ﷺ کی خدمت میں اپنے ساٹھ آدمی بھیجے تھے۔ جن میں چودہ شخص ان کے سردار تھے۔ جن کے نام یہ ہیں۔ (۱) عاقب' جس کا نام عبدالمسیح تھا۔ (۲) سید جس کا نام ایہم تھا (۳) ابوحارثہ بن علقمہ جو بکر بن وائل کا بھائی تھا اور (۴) اویس بن حارث اور (۵) زید اور (۶) قیس اور (۷) یزید اور (۸-۹) اس کے دونوں لڑکے اور (۱۰) خویلد اور (۱۱) عمرو اور (۱۲) خالد اور (۱۳) عبداللہ اور (۱۴) محسن۔ یہ سب چودہ سردار تھے لیکن پھر ان میں بڑے سردار تین شخص تھے۔ عاقب جو امیر قوم تھا اور عقلمند سمجھا جاتا تھا اور صاحب مشورہ تھا اور اس کی رائے پر یہ لوگ مطمئن ہو جاتے تھے اور سید جوان کا لاٹ پادری تھا اور مدرسِ اعلیٰ تھا۔ یہ بنو بکر بن وائل کے عرب قبیلے سے تھا لیکن نصرانی بن گیا تھا اور رومیوں کے ہاں ان کے آؤ بھگت تھی۔ اس کے لئے انہوں نے بڑے بڑے گرجے بنا دیئے تھے اور اس کے دین کی مضبوطی دیکھ کر اس کی بہت کچھ خاطر مدارت اور خدمت وعزت کرتے رہتے تھے۔ یہ شخص حضور ﷺ کی صفت وشان سے واقف تھا اور اگلی کتابوں میں آپ کی صفتیں پڑھ چکا تھا۔ دل سے آپ کی نبوت کا قائل تھا لیکن نصرانیوں میں جو اس کی تکریم وتعظیم تھی اور وہاں جو جاہ ومنصب اسے حاصل تھا' اس کے چھن جانے کے خوف سے راہ حق کی طرف نہیں آتا تھا۔

غرض یہ وفد مدینہ میں رسولِ خدا ﷺ کی خدمت میں مسجد نبوی میں حاضر ہوا۔ آپ اس وقت عصر کی نماز سے فارغ ہو کر بیٹھے ہی تھے' یہ لوگ نفیس پوشاک پہنے ہوئے تھے۔ خوبصورت نرم چادریں اوڑھے ہوئے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا' جیسے بنو حارث بن کعب کے خاندان کے لوگ ہیں۔ صحابہ کہتے ہیں ان کے بعد ان جیسا باشوکت وفد کوئی نہیں آیا۔ ان کی نماز کا وقت آیا' تو آپ کی اجازت سے انہوں نے مشرق کی طرف منہ کر کے مسجد نبوی میں ہی اپنے طریق پر نماز ادا کر لی۔ بعد نماز کے حضور ﷺ سے ان کی گفتگو ہوئی ادھر سے بولنے والے یہ تین شخص تھے۔ حارثہ بن علقمہ' عاقب یعنی عبدالمسیح اور سید یعنی ایہم۔ یہ گو شاہی مذہب پر تھے لیکن کچھ امور میں اختلاف رکھتے تھے۔ حضرت مسیح کی نسبت تینوں خیالات ان کے تھے۔ یعنی وہ خود خدا ہے اور خدا کا لڑکا ہے اور تین میں کا تیسرا ہے۔ اللہ ان کے اس ناپاک قول سے مبرا ہے اور بہت ہی بلند وبالا۔ تقریباً تمام نصاریٰ کا یہی عقیدہ ہے۔ مسیح کے خدا ہونے کی دلیل تو ان کے پاس یہ تھی کہ وہ مردوں کو زندہ کرتا تھا اور اندھوں کو اور کوڑھیوں اور بیماروں کو شفا دیتا تھا۔ غیب کی خبریں دیتا تھا اور مٹی کی چڑیا بنا کر پھونک مار کر اڑا دیا کرتا تھا اور جواب اس کا یہ ہے کہ ساری باتیں اس سے خدا کے حکم سے سرزد ہوتی تھیں۔ اس لئے کہ خدا کی نشانیاں خدا کی باتوں کے سچ ہونے پر اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت پر قائم ہو جائیں۔ خدا کا لڑکا ماننے والوں کی حجت یہ تھی کہ ان کا بظاہر کوئی باپ نہ تھا اور گہوارے میں سے بولنے لگے تھے۔ یہ باتیں بھی ایسی ہیں کہ ان سے پہلے دیکھنے میں ہی نہیں آئی تھیں اور تین میں کا تیسرا اس لئے کہتے تھے کہ اس نے

اپنے کلام میں فرمایا ہم نے کیا' ہمارا امر' ہماری مخلوق' ہم نے فیصلہ کیا وغیرہ پس اگر خدا اکیلا ہوتا تو یوں نہ فرماتا بلکہ فرماتا میں نے کیا میرا امر میری مخلوق' میں نے فیصلہ کیا وغیرہ۔ پس ثابت ہوا کہ خدا تین ہیں۔ خود خدا اور عیسیٰ اور مریم۔ خدا تعالیٰ ان ظالموں منکروں کے قول سے پاک اور بلند ہے۔ ان کے تمام عقائد کا بطلان قرآن کریم میں اُترا ہے۔

جب یہ دونوں پادری حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بات چیت کر چکے تو آپ نے فرمایا تم مسلمان ہو جاؤ۔ انہوں نے کہا ہم تو ماننے والے ہی ہیں۔ آپ نے فرمایا نہیں نہیں تمہیں چاہئے کہ اسلام قبول کر لو۔ وہ کہنے لگے کہ ہم تو آپ سے پہلے کے مسلمان ہیں' فرمایا نہیں تمہارا یہ اسلام قبول نہیں' اس لئے کہ تم خدا کی اولاد مانتے ہیں۔ صلیب کی پوجا کرتے ہو۔ خنزیر کھاتے ہو۔ انہوں نے کہا اچھا یہ تو فرمایئے کہ حضرت عیسیٰ کا باپ کون تھا؟ حضور ﷺ تو اس پر خاموش رہے اور سورہ آل عمران کے شروع سے لے کر اسی کے اوپر تک کی آیتیں ان کے جواب میں نازل ہوئیں۔ ابن اسحاق ان سب کی مختصر تفسیر بیان کر کے پھر لکھتے ہیں۔ آپ نے یہ سب تلاوت کر کے انہیں سمجھا دیں۔ اس مباہلہ کی آیت کو پڑھ کر آپ نے فرمایا' اگر نہیں مانتے تو آؤ مباہلہ کو نکلو۔ یہ سن کو وہ کہنے لگے۔ اے ابو القاسم ﷺ ہمیں مہلت دیجئے کہ ہم آپس میں مشورہ کر لیں۔ پھر تمہیں اس کا جواب دیں گے۔

ضمیر بیدار ہو گیا ☆ اب تنہائی میں بیٹھ کر انہوں نے عاقب سے مشورہ لیا' جو بڑا دانا اور عقلمند سمجھا جاتا تھا۔ اس نے اپنا حتمی فیصلہ ان الفاظ میں سنایا کہ اے جماعت نصاریٰ تم نے یقین کے ساتھ اتنا تو معلوم کر لیا کہ حضرت محمد ﷺ خدا کے سچے رسول ہیں اور یہ بھی تم جانتے ہو کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی حقیقت وہی ہے جو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی زبانی تم سن چکے ہو اور تمہیں بخوبی علم ہے کہ جو قوم نبی کے ساتھ ملاعنہ کرتی ہے نہ ان کے بڑے باقی رہتے ہیں نہ چھوٹے بڑے ہوتے ہیں بلکہ سب کے سب جڑ بنیاد سے اُکھیڑ کر پھینک دیئے جاتے ہیں۔ یاد رکھو اگر تم نے مباہلہ کے لئے قدم بڑھایا تو تمہارا استیاناس ہو جائے گا۔ پس یا تو تم اسی دین کو قبول کر لو اور اگر کسی طرح ماننا چاہتے ہی نہیں ہو اور اپنے دین پر اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق اپنے ہی خیالات پر قائم رہنا چاہتے ہو تو آپ (ﷺ) سے صلح کر لو اور اپنے وطن کو لوٹ جاؤ۔

چنانچہ یہ لوگ مشورہ کر کے پھر حاضر دربار نبوی ہوئے اور کہنے لگے' اے ابو القاسم (صلی اللہ علیہ وسلم) ہم آپ سے ملاعنہ کرنے کے لئے تیار نہیں۔ آپ اپنے دین پر رہئے اور ہم اپنے خیالات پر ہیں لیکن آپ ہمارے ساتھ صحابیوں میں سے کسی ایسے شخص کو بھیج دیجئے' جن سے آپ خوش ہوں کہ وہ ہمارے مالی جھگڑوں کا ہم میں فیصلہ کر لیں۔ آپ لوگ ہماری نظروں میں ہی پسندیدہ ہیں۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا' اچھا دوپہر کو تم پھر آنا۔ میں تمہارے ساتھ مضبوط ایماندار کو کر دوں گا۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں میں نے کسی دن سردار بننے کی خواہش نہیں کی' سوائے اس دن کے۔ صرف اس خیال سے کہ حضور ﷺ نے جو تعریف کی ہے' اس کا مصداق خدا کے نزدیک میں بن جاؤں۔ اسی لئے میں اس روز سویرے سویرے ظہر کی نماز کے لئے چل پڑا۔ حضور ﷺ تشریف لائے' نمازِ ظہر پڑھائی' پھر دائیں بائیں نظریں دوڑانے لگے۔ میں بار بار اپنی جگہ اونچا ہوا کرتا تھا۔ تا کہ آپ کی نگاہیں مجھ پر پڑیں۔ آپ برابر بغور دیکھتے ہی رہے۔ یہاں تک کہ نگاہیں حضرت ابو عبیدہ بن جراح رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر پڑیں۔ انہیں طلب فرمایا اور کہا کہ ان کے ساتھ جاؤ اور ان کے اختلاف کا فیصلہ حق

کرو۔ چنانچہ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ان کے ساتھ تشریف لے گئے[1]۔ ابن مردویہ میں بھی یہ واقعہ اسی طرح منقول ہے لیکن وہاں سرداروں کی گنتی زیادہ کی ہے اور اس واقعہ میں بھی قدرے طول ہے اور کچھ زائد باتیں بھی ہیں۔

صحیح بخاری شریف میں بروایت حضرت حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے نقل ہے' نجرانی سردار عاقب اور سید ملاعنہ کے ارادے سے حضور ﷺ کے پاس آئے لیکن ایک نے دوسرے سے کہا یہ نہ کر۔ خدا کی قسم اگر یہ نبی ہیں اور ہم نے ان سے ملاعنہ کیا تو ہم اپنی اولادوں سمیت تباہ ہو جائیں گے۔ چنانچہ دونوں نے متفق ہو کر کہا کہ حضرت آپ ہم سے جو طلب فرماتے ہیں ہم وہ سب ادا کر دیں گے۔ یعنی جزیہ دینا قبول کر لیا۔ آپ ہمارے ساتھ کسی امین آدمی کو کر دیجئے اور امین ہی کو بھیجنا۔ آپ نے فرمایا بہتر میں تمہارے ساتھ پورے اور کامل امین کو کر دوں گا۔ اصحاب رسول ادھر اُدھر سے تکنے لگے کہ دیکھیں حضور ﷺ کس کا انتخاب کرتے ہیں۔ آپ نے فرمایا اے ابوعبیدہ بن جراح (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) تم کھڑے ہو جاؤ۔ جب یہ کھڑے ہوئے تو آپ نے فرمایا یہ ہیں اس امت کے امین۔ صحیح بخاری شریف کی ایک حدیث میں ہے' ہر امت کا امین ہوتا ہے اور اس امت کا امین ابوعبیدہ بن جراح ہے (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) مسند احمد میں حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ ابوجہل ملعون نے کہا کہ اگر میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو کعبہ میں نماز پڑھتے دیکھ لوں گا تو اس کی گردن توڑ دوں گا۔ فرماتے ہیں کہ آپ نے فرمایا اگر وہ ایسا کرتا تو سب کے سب دیکھتے کہ فرشتے اسے دبوچ لیتے اور یہودیوں سے جب قرآن نے کہا تھا کہ آؤ باطل پرستوں کے لئے موت مانگو۔ اگر وہ موت مانگتے تو یقیناً سب کے سب مر جاتے اور اپنی جگہیں جہنم کی آگ میں دیکھ لیتے اور جن نصرانیوں کو مباہلہ کی دعوت دی گئی تھی' اگر حضور کے مقابلہ میں مباہلے کے لئے نکلتے تو لوٹ کر اپنے مالوں اور بال بچوں کو نہ پاتے۔ صحیح بخاری' ترمذی اور نسائی میں بھی یہ حدیث ہے۔ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ اسے حسن صحیح کہتے ہیں۔

ایک واقعہ' عبرت خیز نتائج اور اسلام کو قبول نہ کرنے کے اسباب ☆ امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب دلائل النبوۃ میں بھی وفد نجران کے قصہ کو تفصیلاً بیان کیا ہے۔ ہم اسے یہاں نقل کرتے ہیں کیونکہ اس میں بہت سے فوائد ہیں۔ گو اس میں غرابت بھی ہے اور اس مقام سے نہایت مناسبت رکھتا ہے۔ سلمہ بن عبد یسوع اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں' جو پہلے نصرانی تھے پھر مسلمان ہو گئے کہ رسول اللہ ﷺ نے سورہ طٰس کے نازل ہونے سے پیشتر اہل نجران کو نامہ مبارک لکھا' جس کی عبارت یہ تھی: ((بِسْمِ اِلٰهِ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ مِنْ مُحَمَّدٍ النَّبِيِّ رَسُوْلِ اللّٰهِ اِلٰى اُسْقُفِ نَجْرَانَ وَاَهْلِ نَجْرَانَ اَسْلِمْ اَنْتُمْ فَاِنِّيْ اَحْمَدُ اِلَيْكُمْ اِلٰهَ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ - اَمَّا بَعْدُ فَاِنِّيْ اَدْعُوْكُمْ اِلٰى عِبَادَةِ اللّٰهِ مِنْ عِبَادَةِ الْعِبَادِ وَاَدْعُوْكُمْ اِلٰى وَلَايَةِ اللّٰهِ مِنْ وَلَايَةِ الْعِبَادِ فَاِنْ اَبَيْتُمْ فَالْجِزْيَةُ فَاِنْ اَبَيْتُمْ فَقَدْ اٰذَنْتُكُمْ بِحَرْبٍ وَالسَّلَامُ)) یعنی اس خط کو شروع کرتا ہوں حضرت ابراہیم' حضرت اسحٰق اور حضرت یعقوب علیہم السلام کے خدا کے نام سے' یہ خط ہے محمد (ﷺ) کی طرف سے' جو خدا کے نبیؐ اور آخری رسولؐ ہیں نجران کے سردار کی طرف۔ اللہ تعالیٰ کی میں تمہارے سامنے حمد و ثناء بیان کرتا ہوں جو حضرت ابراہیم' حضرت اسحٰق اور حضرت یعقوب کا معبود ہے۔ پھر میں تمہیں

[1] ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کے انتخاب اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے منتخب نہ ہونے پر یہ ہرگز مت خیال کیجئے کہ عمر فاروق رضی اللہ عنہ میں یا کسی دوسرے صحابی میں ابوعبیدہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ جیسی امانت و دیانت نہ تھی حاشا وکلا۔ بلکہ عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ ان گنے چنے اشخاص میں سے تھے جن کی رائے' تدبیر' فراست اور سوجھ بوجھ کی بنا پر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کو اپنے سے جدا نہیں کرنا چاہتے تھے۔

دعوت دیتا ہوں کہ بندوں کی عبادت چھوڑ کر خدا کی عبادت کی طرف آ جاؤ اور بندوں کی حاکمیت کو چھوڑ کر خدا کی حاکمیت کی طرف آ جاؤ اگر تم اسے نہ مانو تو جزیہ دو اور ماتحتی اختیار کرو۔ اگر اس سے انکار ہو تو تمہیں لڑائی کا اعلان ہے۔

جب یہ خط اسقف کو پہنچا تو بڑا اسٹ پٹایا' گھبرا گیا اور تھرانے لگا۔ جھٹ سے شرحبیل بن وداعہ کو بلایا' جو قبیلہ ہمدان کا تھا۔ سب سے بڑا مشیر سلطنت یہی تھا۔ جب کبھی کوئی اہم کام آ پڑتا تو سب سے پہلے یعنی ایہم اور سید اور عاقب سے بھی پیشتر اس سے مشورہ ہوتا۔ جب یہ آ گیا تو اسقف نے حضور ﷺ کا خط اسے دیا۔ جب اس نے پڑھ لیا تو اسقف نے پوچھا' بتاؤ کیا خیال ہے؟ شرحبیل نے کہا کہ بادشاہ کو خوب علم ہے کہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی اولاد میں سے خدا کے ایک نبی ﷺ کے آنے کا وعدہ خدا کی کتاب میں ہے کیا عجب کہ وہ نبی یہی ہو۔ امر نبوت میں کیا رائے دے سکتا ہوں۔ ہاں اگر امور سلطنت کی کوئی بات ہوتی تو بے شک میں اپنے دماغ پر زور ڈال کر کوئی بات نکال لیتا۔ اسقف نے انہیں تو الگ بٹھا دیا اور عبداللہ بن شرحبیل کو بلایا۔ یہ بھی مشیر سلطنت تھا اور حمیر کے قبیلے میں سے تھا۔ اسے خط دیا پڑھایا' رائے پوچھی تو اس نے بھی ٹھیک وہی بات کہی جو پہلا مشیر کہہ چکا تھا۔ اسے بھی بادشاہ نے بٹھا دیا۔ پھر جبار بن فیض کو بلایا' جو بنو حارث میں سے تھا۔ اس نے بھی یہی کہا جو ان دونوں نے کہا تھا۔ بادشاہ نے جب دیکھا کہ ان تینوں کی رائے متفق ہے تو حکم دیا کہ ناقوس بجائے جائیں' آگ جلائی جائے اور گرجوں میں جھنڈے بلند کر دیئے جائیں۔ وہاں کا یہ دستور تھا کہ جب سلطنت کو کوئی اہم کام ہوتا اور رات کو جمع کرنا مقصود ہوتا تو یہی کرتے اور اگر دن کا وقت ہوتا تو گرجوں میں آگ جلائی جاتی اور ناقوس زور زور سے بجائے جاتے۔ اس حکم کے ہوتے ہی چاروں طرف آگ جلا دی گئی اور ناقوس کی آواز نے ہر ایک کو ہوشیار کر دیا اور جھنڈے اونچے دیکھ دیکھ کر آس پاس کے تمام لوگ جمع ہو گئے۔ اس وادی کا طول اتنا تھا کہ تیز سوار صبح سے شام تک دوسرے کنارے پہنچتا تھا۔ اس میں تہتر گاؤں آباد تھے اور ایک لاکھ بیس ہزار تلوار چلانے والے یہاں آباد تھے۔ جب یہ سب لوگ آ گئے تو اسقف نے انہیں رسول خدا ﷺ کا نامہ مبارک پڑھ کر سنایا اور پوچھا بتاؤ تمہاری کیا رائے ہے؟ تو تمام عقل مندوں نے کہا کہ شرحبیل بن وداعہ' ہمدانی عبداللہ بن شرحبیل اصبحی اور جبار بن فیض حارثی کو بطور وفد کے بھیجا جائے۔ یہ وہاں سے پختہ خبر لائیں۔

اب یہاں سے یہ وفد ان تینوں کی سرداری میں روانہ ہوا۔ مدینہ پہنچ کر انہوں نے سفر لباس اتارا اور ضمیرہ کے بنے ہوئے لمبے لمبے حُلے پہن لئے اور سونے کی انگوٹھیاں انگلیوں میں ڈال لیں اور اپنی چادروں کے پلّے تھامے ہوئے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ سلام کیا لیکن آپ نے جواب نہ دیا۔ بہت دیر تک انتظار کیا کہ حضور ﷺ کچھ بات چیت کریں لیکن ان ریشمی حلول اور سونے کی انگوٹھیوں کی وجہ سے آپ نے ان سے کلام نہ کیا۔ اب یہ لوگ حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تلاش میں نکلے۔ ان دونوں بزرگوں سے ان کی پہلے سے ملاقات تھی۔ مہاجرین اور انصار کے مجمع میں ان دونوں کو پا لیا۔ ان سے واقعہ بیان کیا کہ تمہارے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ہمیں خط لکھا۔ ہم اس کا جواب دینے کے لئے خود حاضر ہوئے۔ آپ کے پاس گئے۔ سلام کیا' لیکن جواب نہ دیا۔ پھر بہت دیر تک انتظار میں بیٹھے رہے کہ آپ سے کچھ باتیں ہو جائیں۔ لیکن آپ نے ہم سے کوئی بات نہ کی۔ آخر ہم لوگ تھک کر چلے آئے۔ اب آپ حضرات فرمائیے کہ کیا ہم یونہی واپس چلے جائیں۔ ان دونوں نے حضرت علی ابن طالب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کہا کہ آپ ہی انہیں جواب دیجئے۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا میرا خیال ہے کہ یہ لوگ اپنے یہ حُلے اور اپنی یہ

انگوٹھیاں اُتار دیں اور وہی سفری معمولی لباس پہن لیں اور حضور ﷺ کی خدمت میں دوبارہ جائیں۔ چنانچہ انہوں نے یہی کیا۔ اسی معمولی لباس میں گئے' سلام کیا' آپ نے جواب دیا۔ پھر فرمایا' اس خدا کی قسم جس نے مجھے حق کے ساتھ بھیجا ہے' یہ جب میرے پاس پہلی مرتبہ آئے تھے تو ان کے ساتھ ابلیس تھا۔[1]

اب سوال و جواب بات چیت شروع ہوئی حضور ﷺ بھی پوچھتے تھے اور جواب بھی دیتے تھے۔ اسی طرح وہ سائل بھی تھے اور مجیب بھی۔ آخر میں انہوں نے پوچھا آپ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بابت کیا فرماتے ہیں؟ تاکہ اپنی قوم کے پاس جا کر وہ کہیں' ہمیں اس کی خوشی ہے کہ آپ اگر نبی ہیں تو آپ کی زبانی سنیں کہ آپ کا ان کی بابت کیا خیال ہے۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا میرے پاس اس کا جواب آج تو نہیں' تم ٹھہرو تو میرا رب مجھ سے اس کی بابت جو فرمائے گا وہ میں تمہیں سنا دوں گا۔

دوسرے دن وہ پھر آئے تو آپ نے اسی وقت کی اُتری ہوئی اس آیت: اِنَّ مَثَلَ عِیۡسٰی کی کذبین تک تلاوت کر کے سنائی۔ انہوں نے اس بات کا اقرار کرنے سے انکار کر دیا۔ دوسرے دن صبح ہی صبح رسول اللہ ﷺ ملاعنہ کے لئے حضرت حسن کو اور حضرت حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو اپنی چادر میں لئے ہوئے تشریف لائے۔ پیچھے پیچھے حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا آ رہی تھیں۔ اس وقت آپ کی کئی ایک بیویاں تھیں۔ شرحبیل یہ دیکھتے ہی اپنے دونوں ساتھیوں سے کہنے لگا تم جانتے ہو کہ نجران کی ساری وادی میری بات کو مانتی ہے اور میری رائے پر کاربند ہوتی ہے۔ سنو خدا کی قسم یہ معاملہ بڑا بھاری ہے۔ اگر یہ شخص (صلی اللہ علیہ وسلم) مبعوث کیا گیا ہے تو سب سے پہلے اس کی نگاہوں میں ہم ہی مطعون ہوں گے اور سب سے پہلے اس کی تردید کرنے والے ہم ہی ٹھہریں گے۔ یہ بات اس کے اور اس کے ساتھیوں کے دلوں سے نہیں جائے گی اور ہم پر کوئی نہ کوئی مصیبت و آفت آئے گی۔ عرب بھر میں سب سے زیادہ قریب ان سے میں ہی ہوں اور سنو! اگر یہ شخص نبی مرسل ہے تو ملاعنہ کرتے ہی روئے زمین پر ایک بال یا ایک ناخن بھی ہمارا باقی نہ رہے گا۔ اس کے دونوں ساتھیوں نے کہا' پھر اے ابو مریم آپ کی کیا رائے ہے؟ اس نے کہا کہ میری رائے یہ ہے کہ اسی کو ہم حاکم بنا دیں۔ جو کچھ یہ حکم دے ہم اسے منظور کر لیں۔ یہ کبھی بھی خلاف عدل حکم نہ دے گا۔ ان دونوں نے اس کی بات تسلیم کر لی۔ اب شرحبیل نے حضور ﷺ سے کہا کہ میں اس ملاعنہ سے بہتر چیز جناب کے پیش کرتا ہوں۔ آپ نے دریافت فرمایا وہ کیا؟ کہا آج کا دن آنے والی رات اور کل صبح تک آپ ہمارے بارے میں جو حکم کریں' ہمیں منظور ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا' شاید اور لوگ تمہارے اس فیصلہ کو نہ مانیں۔ شرحبیل نے کہا' اس کی بابت میرے ان دونوں ساتھیوں سے دریافت فرمائیے۔ آپ نے ان دونوں سے پوچھا' انہوں نے جواب دیا کہ ساری وادی کے لوگ انہی کی رائے پر چلتے ہیں۔ وہاں ایک بھی ایسا نہیں جو ان کے فیصلے کو ٹال سکے۔ پس حضور ﷺ نے یہ درخواست قبول فرمائی۔ ملاعنہ نہ کیا اور واپس لوٹ گئے۔ دوسرے دن صبح ہی وہ حاضر ہوئے تو آپ نے ایک تحریر انہیں لکھ کر دی۔ جس میں بسم اللہ کے یہ مضمون تھا۔ کہ:

یہ تحریر اللہ تعالیٰ کے نبی محمد رسول اللہ ﷺ کی طرف سے نجرانیوں کے لئے ہے۔ ان پر اللہ کے رسول ﷺ کا حکم جاری

---

[1] کسی نبی اور پیغمبر کو عام انسانوں پر خیال کرنا کھلی ہوئی غلطی ہے۔ سائنس کا ایک ماہر عالم میں کیا مشاہدات کر رہا ہے۔ عام انسان اس سے قطعاً ناواقف ہیں۔ یا ایک ڈاکٹر پانی کے چند قطروں میں ہزاروں جراثیم خوردبین سے پکڑتا ہے۔ اسی طرح نبی اور پیغمبر کی نظر وہ کچھ دیکھتی ہے جو ہم اور آپ نہیں دیکھ پاتے۔

تھا۔ ہر پھل میں اور ہر زرد سفید و سیاہ میں اور ہر غلام میں' لیکن اللہ کے رسول ﷺ یہ سب انہی کو دیتے ہیں۔ یہ ہر سال صرف دو ہزار حُلے دے دیا کریں۔ ایک ہزار رجب میں اور ایک ہزار صفر میں وغیرہ وغیرہ۔ پورا عہد نامہ انہیں عطا فرمایا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا یہ وفد ۹ ھ ہجری میں آیا تھا۔ اس لئے کہ حضرت زہری رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں' سب سے پہلے جزیہ انہی اہل نجران نے حضور ﷺ کو ادا کیا اور یہ جزیہ کی آیت فتح مکہ کے بعد اُتری ہے جو یہ ہے: ﴿قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا يُحَرِّمُوْنَ ...... ﴾ (التوبۃ:۲۹) اس آیت میں اہل کتاب سے جزیہ لینے کا حکم ہوا ہے۔ ابن مردویہ میں ہے کہ عاقب اور طیب حضور ﷺ کے پاس آئے۔ آپ نے انہیں ملاعنہ کے لئے کہا اور صبح کو حضرت علی اور حضرت فاطمہ اور حضرت حسن اور حضرت حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو لئے ہوئے آپ تشریف لائے اور کہلا بھیجا۔ انہوں نے قبول نہ کیا اور خراج دینا منظور کر لیا۔ آپ نے فرمایا اس کی قسم جس نے مجھے حق کے ساتھ بھیجا ہے۔ اگر یہ دونوں ''نہیں'' کہتے تو ان پر یہی وادی آگ ہو جاتی۔ حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں: ﴿نَدْعُ اَبْنَآءَنَا ...... ﴾ والی آیت انہی کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ اَنْفُسَنَا سے مراد خود رسول کریم ﷺ ہیں اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اَبْنَآءَنَا سے مراد حسن اور حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہم نِسَآءَنَا سے مراد حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا۔ مستدرک حاکم وغیرہ میں بھی اس معنی کی حدیث مروی ہے۔ پھر جناب باری کا ارشاد ہے یہ جو ہم نے شان عیسیٰ علیہ السلام بیان فرمائی ہے' حق اور سچ ہے اس میں بال برابر کمی زیادتی نہیں۔ اللہ قابل عبادت ہے کوئی اور نہیں اور وہی غلبہ والا اور حکمت والا ہے۔ اب بھی اگر یہ منہ پھیر لیں اور دوسری باتوں میں پڑیں تو اللہ تعالیٰ بھی ایسے باطل پسندوں کو اور مفسدوں کو بخوبی جانتا ہے۔ انہیں بدترین سزا دے گا۔ اس میں پوری قدرت ہے کوئی اسے نہ بھاگ سکے' نہ اس کا مقابلہ کر سکے۔ وہ پاک ہی اور تعریفوں والا ہے۔ ہم اس کے عذابوں سے اس کی پناہ چاہتے ہیں۔

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْئًا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ﴿۶۴﴾

آپ فرما دیجئے کہ اے اہل کتاب آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو کہ ہمارے اور تمہارے درمیان (مسلم ہونے میں) برابر ہے یہ کہ بجز اللہ تعالیٰ کے ہم کسی اور کی عبادت نہ کریں اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں اور ہم میں سے کوئی کسی دوسرے کو رب نہ قرار دے خدا تعالیٰ کو چھوڑ کر پھر اگر وہ لوگ (حق سے) اعراض کریں تو تم کہہ دو کہ تم (ہمارے) اس (اقرار) کے گواہ رہو کہ ہم تو ماننے والے ہیں۔ ○

دعوت مباہلہ حق اور باطل ☆

یہودیوں' نصرانیوں اور اپنے لوگوں سے یہاں خطاب ہو رہا ہے۔ کلمہ کا اطلاق مفید جملے پر ہوتا ہے جیسے یہاں کلمہ کہہ کر پھر ''سَوَآءٍ......'' کے ساتھ اس کا وصف بیان کیا گیا ہے۔ سواء کے معنی عدل و انصاف والا۔ جس میں ہم تم برابر ہیں۔ پھر اس

کی تفسیر کی کہ وہ بات یہ ہے کہ ایک خدا ہی کی عبادت کریں اور اس کے ساتھ نہ کسی بت کو پوجیں نہ صلیب کو نہ تصویر کو نہ خدا کے سوا کسی اور کو۔ نہ آگ کو نہ کسی چیز کو بلکہ تنہا اللہ تعالیٰ وحدۂ لاشریک لہٗ کی عبادت کرو۔ یہی دعوت تمام انبیاؑ کی تھی۔ جیسے فرمان ہے: ﴿وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْٓ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ﴾ (الانبیاء ۲۵) یعنی تجھ سے پہلے جس جس رسول کو ہم نے بھیجا ہے سب کی طرف یہی وحی کی کہ میرے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں تم سب میری ہی عبادت کیا کرو۔

اور جگہ ارشاد ہے: ﴿وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ﴾ (النحل ۳۶) یعنی ہر اُمت میں ہم نے رسول بھیج کر یہ منادی کرادی کہ خدا کی عبادت کرو اور اس کے سوا سے بچو۔ پھر فرماتا ہے کہ آپس میں بھی ہم خدا کو چھوڑ کر ایک دوسرے کو ربّ نہ بنالیں۔ ابن جریج رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں یعنی خدا کی نافرمانی میں ایک دوسرے کی اطاعت نہ کریں۔ عکرمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کسی کو سوائے خدا کے سجدہ نہ کریں۔ پھر یہ لوگ اگر اس انصاف والی دعوت کو بھی قبول نہ کریں تو انہیں اپنی اطاعت پر گواہ بنالو۔ ہم نے بخاری کی شرح میں اس واقعہ کا مفصل ذکر کردیا ہے۔ جس میں ہے کہ ابوسفیان جبکہ دربار قیصر میں بلوائے گئے اور شاہِ قیصر روم نے حضور ﷺ کے نسب کا حال پوچھا تو انہیں باوجود کافر اور دشمن رسول ہونے کے آپ کی خاندانی شرافت کا اقرار کرنا پڑا اور اسی طرح ہر ہر سوال کا صاف اور سچا جواب دیا۔ یہ واقعہ صلح حدیبیہ کے بعد کا اور فتح مکہ سے پہلے کا ہے۔ اسی باعث قیصر کے اس سوال کے جواب میں کہ کیا وہ (یعنی رسول اللہ ﷺ) بد عہدی کرتے ہیں؟ ابوسفیان نے کہا نہیں کرتے لیکن اب ایک معاہدہ ہمارا ان سے ہوا ہے نہ جانے اس میں وہ کیا کریں؟ یہاں صرف یہ مقصد ہے کہ ان تمام باتوں کے بعد حضور ﷺ کا نامۂ مبارک پیش کیا جاتا ہے۔ جس میں بسم اللہ کے بعد یہ لکھا ہوتا ہے کہ یہ خط محمد ﷺ کی طرف سے ہے جو اللہ کے رسول ہیں (ﷺ) ہرقل کی طرف جو روم کا شاہ ہے۔ خدا کی طرف سے سلام ہو۔ اسے جو ہدایت کا متبع ہے۔ اس کے بعد اسلام قبول کر سلامت رہے گا۔ اسلام قبول کر اللہ تعالیٰ تجھے دوہرا اجر دے گا اور اگر تو نے منہ موڑا تو تمام رئیسوں کا بوجھ تجھ پر رہے۔ پھر یہی آیت لکھی تھی۔ امام محمد بن اسحاق وغیرہ نے لکھا ہے کہ اس سورت یعنی سورۃ آل عمران کی شروع سے لے کر اسی سے کچھ اوپر تک آیتیں وفد نجران کے بارے میں بیان ہوئی ہیں۔

امام زہری رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں سب سے پہلے جزیہ انہی لوگوں نے ادا کیا ہے اور اس میں مطلقاً خلاف نہیں کہ آیت جزیہ فتح مکہ کے بعد اُتری ہے۔ پس یہ اعتراض پڑتا ہے کہ جب یہ آیت فتح مکہ کے بعد اُتری ہے پھر فتح سے پہلے حضور ﷺ نے اپنے خط میں ہرقل کو یہ آیت کیسے لکھی؟ اس اشکال کے جواب میں مختلف ہو سکتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ ممکن ہے وفد نجران کے بارے میں شروع سورہ سے لے کر اس آیت تک اُتری ہو اور یہ آیت پہلے اُتر چکی ہو۔ اس صورت میں ابن اسحاق رحمتہ اللہ علیہ کا یہ فرمانا کہ اسّی کے اوپر کچھ آیتیں اسی وفد کے بارے میں اُتری ہیں' یہ محفوظ نہ ہو کیونکہ ابوسفیان والا واقعہ سراسر اس کے خلاف ہے۔ تیسرا جواب یہ ہے کہ وفدِ نجران حدیبیہ سے پہلے آیا ہو اور انہوں نے جو کچھ دینا منظور کیا ہو یہ صرف مباہلہ سے بچنے کے لئے بطور مصالحت کے دیا ہو نہ کہ جزیہ دیا ہو اور یہ اتفاق کی بات ہو کہ آیت جزیہ اس واقعہ کے بعد اُتری' جس میں اس کی موافقت ہوگئی۔ جیسے کہ عبداللہ بن جحش رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بدر سے پہلے ایک غزوے میں مال غنیمت کو پانچ حصوں میں تقسیم کیا اور پانچواں حصہ باقی رکھ کر اور حصے لشکر میں تقسیم کردیئے۔ پھر اس کے بعد مالِ غنیمت کی تقسیم کی آیتیں بھی اسی کے

مطابق اُتریں اور یہی حکم ہوا۔ چوتھا جواب یہ ہے کہ احتمال ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے خط میں جو ہرقل کو بھیجا' اس میں یہ بات اسی طرح بطور خود لکھی ہو۔ پھر آنحضرت ﷺ کے الفاظ ہی میں وحی بھی نازل ہوئی ہو۔ جیسے کہ حضرت عمر بن خطاب ؓ کے پردے کے حکم کے بارے میں اسی طرح آیت اُتری اور بدری قیدیوں کے بارے میں انہی کے موافقت میں فرمانِ باری نازل ہوا اور منافقوں کی نماز جنازہ نہ پڑھنے کے بارے میں بھی انہی کی بات قائم رکھی گئی اور مقام ابراہیم کو مصلیٰ بنانے کی بابت بھی اسی طرح وحی نازل ہوئی۔ ﴿عَسٰی رَبُّهٗۤ اِنْ طَلَّقَكُنَّ......﴾ (التحریم: ۵) یعنی انہی کی موافقت میں اُتری۔ پس یہ آیت بھی اسی طرح رسول اللہ ﷺ کے فرمان کی موافقت میں ہی اُتری ہو۔ یہ آخری جواب زیادہ مناسب اور برجستہ ہے۔

يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تُحَآجُّوْنَ فِیْۤ اِبْرٰهِیْمَ وَمَاۤ اُنْزِلَتِ التَّوْرٰىةُ وَالْاِنْجِیْلُ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِهٖ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۶۵﴾ هٰۤاَنْتُمْ هٰۤؤُلَآءِ حَاجَجْتُمْ فِیْمَا لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ فَلِمَ تُحَآجُّوْنَ فِیْمَا لَیْسَ لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ ؕ وَاللّٰهُ یَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۶۶﴾ مَا كَانَ اِبْرٰهِیْمُ یَهُوْدِیًّا وَّلَا نَصْرَانِیًّا وَّلٰكِنْ كَانَ حَنِیْفًا مُّسْلِمًا ؕ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ ﴿۶۷﴾ اِنَّ اَوْلَى النَّاسِ بِاِبْرٰهِیْمَ لَلَّذِیْنَ اتَّبَعُوْهُ وَهٰذَا النَّبِیُّ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ؕ وَاللّٰهُ وَلِیُّ الْمُؤْمِنِیْنَ ﴿۶۸﴾

اے اہلِ کتاب کیوں حجت کرتے ہو (حضرت) ابراہیم کے بارے میں حالانکہ نہیں نازل کی گئی تورات اور انجیل مگر ان کے (زمانہ کے) بہت بعد۔ کیا پھر سمجھتے نہیں ہو ہاں تم ایسے ہو کہ ایسے بات میں تو حجت کر ہی چکے تھے جس سے تم کو کسی قدر تو واقفیت تھی سو ایسی بات میں کیوں حجت کرتے ہو جس سے تم کو اصلاً واقفیت نہیں اور اللہ تعالیٰ جانتے ہیں اور تم نہیں جانتے۔ ابراہیم (علیہ السلام) نہ تو یہودی تھے اور نہ نصرانی تھے (البتہ) طریق مستقیم والے (یعنی) صاحب اسلام تھے مشرکین اور میں سے (بھی) نہ تھے۔ بلاشبہ سب آدمیوں میں زیادہ خصوصیت رکھنے والے (حضرت) ابراہیم کے ساتھ البتہ وہ لوگ تھے جنہوں نے ان کا اتباع کیا تھا اور یہ نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) ہیں اور یہ ایمان والے اور اللہ تعالیٰ حامی ہیں ایمان والوں کے۔ ○

اہلِ کتاب کی معاندت' حقائق سے ناواقفیت کے باوجود ضد اور ہٹ دھرمی ☆

یہودی حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنے میں سے اور نصرانی بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنا ہی کہتے تھے اور آپس میں اس پر بحث کرتے رہتے تھے۔ اللہ تعالیٰ ان آیتوں میں دونوں کے دعوے کی تردید کرتا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ

تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ نجران کے نصرانیوں کے پاس یہودیوں کے علماء آئے اور حضور ﷺ کے سامنے ان کا جھگڑا شروع ہوا ہر فریق اس بات کا مدعی تھا کہ حضرت خلیل اللہ علیہ السلام ہم میں سے تھے۔ اس پر یہ آیت اُتری کہ اے یہود یو تم خلیل خدا کو اپنے میں سے کیسے بتاتے ہو؟ حالانکہ ان کے زمانے میں نہ موسیٰ علیہ السلام تھے نہ تورات۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور کتاب تورات شریف تو خلیل اللہ علیہ السلام کے بعد آئے۔ اسی طرح نصرانیو! تم حضرت ابراہیم علیہ السلام کو نصرانی کیسے کہہ سکتے ہو؟ حالانکہ نصرانیت تو ان کے صدیوں بعد ظہور میں آئی۔ کیا اتنی موٹی بات سمجھنے کی عقل بھی نہیں رکھتے؟ پھر ان دونوں فرقوں کے اس بے علمی کے جھگڑے پر انہیں خدائے عالم ملامت کرتا ہے کہ اگر تم بحث مباحثہ دینی امور میں جو تمہارے پاس ہیں کرتے تو بھی خیر ایک بات تھی۔ تم تو اس میں گفتگو کرتے ہو جس میں دونوں کو مطلق علم نہیں۔ تمہیں چاہئے کہ جس چیز کا علم نہ ہو اسے اس علیم خدا کے حوالے کرو جو ہر چیز کی حقیقت کو جانتا ہے اور تمام چیزوں کا علم رکھتا ہے۔ اس لئے فرمایا اللہ جانتا ہے اور تم محض بے خبر ہو۔ دراصل خدا کے خلیل حضرت ابراہیم علیہ السلام نہ تو یہودی تھے نہ نصرانی تھے۔ وہ شرک سے بیزار مشرکوں سے الگ صحیح اور کامل ایمان والے تھے اور ہرگز مشرک نہ تھے۔ یہ آیت مثل اس آیت کے ہے جو سورہ بقر میں گزر چکی ہے۔ ﴿وَقَالُوْا كُوْنُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى تَهْتَدُوْا﴾ (البقرۃ:۱۳۵) یعنی یہ لوگ کہتے ہیں یہودی نصرانی بننے میں ہدایت ہے پھر فرمایا کہ سب سے زیدہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے حقدار ان کے دین پر ان کے زمانے میں چلنے والے تھے اور اب یہ نبی محمد ﷺ ہیں اور آپ کے ساتھ ایمانداروں کی جماعت جو مہاجرین وانصار ہیں اور پھر جو بھی ان کی پیروی کرتے ہیں قیامت تک رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں ہر نبی کے ولی دوست نبیوں میں سے ہوتے ہیں۔ میرے ولی دوست انبیاء میں سے میرے باپ اور خدا کے خلیل حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام ہیں۔ پھر آپ نے اسی آیت کی تلاوت فرمائی (ترمذی وغیرہ) پھر فرمایا جو بھی خدا کے رسول پر ایمان رکھے اس کا ولی اللہ تعالیٰ ہے۔

وَدَّتْ طَّآىِٕفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يُضِلُّوْنَكُمْ ؕ وَمَا يُضِلُّوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۶۹﴾ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ ﴿۷۰﴾ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَلْبِسُوْنَ الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۷۱﴾ ع وَقَالَتْ طَّآىِٕفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اٰمِنُوْا بِالَّذِيْٓ اُنْزِلَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَجْهَ النَّهَارِ وَاكْفُرُوْٓا اٰخِرَهٗ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿۷۲﴾ ۚۖ وَلَا تُؤْمِنُوْٓا اِلَّا لِمَنْ تَبِعَ دِيْنَكُمْ ؕ قُلْ اِنَّ الْهُدٰى

هُدَى اللّٰهِ اَنْ يُّؤْتٰۤى اَحَدٌ مِّثْلَ مَاۤ اُوْتِيْتُمْ اَوْ يُحَآجُّوْكُمْ عِنْدَ رَبِّكُمْ ؕ

قُلْ اِنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللّٰهِ ۚ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۷۳﴾

يَّخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ﴿۷۴﴾

دل سے چاہتے ہیں لوگ اہل کتاب میں سے اس امر کو کہ تم کو (دین حق سے) گمراہ کر دیں اور وہ کسی کو گمراہ نہیں کر سکتے مگر خود اپنے آپ کو اور اس کی اطلاع نہیں رکھتے اے اہل کتاب کیوں کفر کرتے ہو اللہ تعالیٰ کی آیتوں کے ساتھ حالانکہ تم اقرار کرتے ہو۔ اے اہل کتاب کیوں مخلوط کرتے ہو واقعی (مضمون یعنی نبوت محمدیہ) کو غیر واقعی سے اور چھپاتے ہو واقعی بات کو حالانکہ تم جانتے ہو اور بعضے لوگوں نے اہل کتاب میں سے کہا کہ ایمان لے آؤ اسی پر جو نازل کی گئی ہے مسلمانوں پر (یعنی قرآن) شروع دن میں اور (پھر) انکار کر بیٹھو آخر دن میں (یعنی شام کو) عجب کیا ہے کہ وہ پھر جائیں اور (صدق دل سے) کسی کے روبرو اقرار مت کرنا مگر ایسے شخص کے روبرو جو تمہارے دین کا پیرو ہو۔ اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ کہہ دیجئے کہ یقیناً ہدایت تو ہدایت اللہ کی ہے ایسی باتیں اس لئے کرتے ہیں کہ کسی اور کو بھی ایسی چیز مل رہی ہے جیسی تم کو ملی تھی۔ یا وہ لوگ تم پر غالب آ جائیں تمہارے رب کے نزدیک۔ (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کہہ دیجئے کہ بیشک فضل تو خدا کے قبضہ میں ہے وہ اس کو جسے چاہیں عطا فرمائیں اور اللہ بڑی وسعت والے ہیں۔ خوب جاننے والے ہیں خاص کر دیتے ہیں اپنی رحمت (وفضل) کے ساتھ جس کو چاہیں اور اللہ تعالیٰ بڑے فضل والے ہیں۔ O

فریب دہی کی ناکام کوششیں ☆

یہاں بیان ہو رہا ہے کہ ان یہودیوں کے حسد کو دیکھو کہ مسلمانوں سے کیسے جل کڑھ رہے ہیں۔ انہیں بہکانے کی کیا کیا پوشیدہ ترکیبیں کرتے ہیں۔ کیسے کیسے مکروفریب کے جال بچھاتے ہیں۔ حالانکہ دراصل ان تمام چیزوں کا وبال خود ان کی جانوں پر ہے لیکن انہیں ان کا بھی شعور نہیں۔ پھر انہیں ان کی یہ ذلیل حرکت یاد دلائی جاتی ہے کہ سچائی جانتے ہوئے' حق کو پہچانتے ہوئے خدا کی آیتوں سے منکر ہو رہے ہیں۔ باوجود علم کے یہ بدخصلت بھی ان میں ہے کہ حق و باطل کو ملا دیتے ہیں اور ان کتابوں میں جو جو صفتیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہیں' ان کو چھپا لیتے ہیں۔ بہکانے کی جو صورتیں گھڑتے ہیں' ان میں سے ایک کا بیان ہو رہا ہے کہ آپس میں مشورہ کرتے ہیں کہ صبح جا کر ایمان لے آؤ' مسلمانوں کے ساتھ نمازیں پڑھو اور شام کو پھر مرتد ہو جاؤ۔ تاکہ جاہل لوگوں کے دل میں بھی خیال گزرے کہ آخر یہ لوگ جو پلٹ گئے ہیں' تو ظاہر ہے کہ انہوں نے اس دین میں نقصان یا برائی ہی دیکھی ہوگی تو کیا عجب کہ ان میں سے کوئی ہماری طرف لوٹ آئے۔ غرض یہ ایک حیلہ جوئی ہے کہ شاید اس سے کمزور ایمان والا لوٹ جائے کہ جاننے بوجھنے والے لوگ جب اس دین میں آئے' نمازیں پڑھیں' پھر جو اسے چھوڑ دیا تو ضرور کوئی یہاں خرابی اور نقصان دیکھا۔ یہ لوگ کہتے تھے کہ بھروسہ اپنے والوں پر ہی کرو' مسلمانوں پر نہ کرو۔ نہ اپنے بھید ان پر ظاہر ہونے دو۔ نہ اپنی کتاب کی باتیں ان پر کھولو۔ جس سے یہ ان پر ایمان لائیں اور خدا کے ہاں بھی ان کے لئے ہم پر حجت

بن جائیں۔ تو خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ تو اے نبی کہہ دے کہ ہدایت خدا ہی کے ہاتھ میں ہے۔ وہ مؤمنوں کے دلوں کو ہر اس چیز پر ایمان لانے کے لئے آمادہ کر دیتا ہے' جو خدا نے نازل فرمائی ہو۔ انہیں ان دلائل پر کامل ایمان نصیب ہوتا ہے۔ گو تم نبی اُمّی ﷺ کی صفتیں چھپاتے پھرو۔ لیکن پھر بھی خوش قسمت لوگ تو آپ کی نبوت کے ظاہر نشان بیک نگاہ پہچان لیں گے۔ اسی طرح وہ کہتے تھے کہ تمہارے پاس جو علم ہے اسے مسلمانوں پر ظاہر نہ کرو کہ اسے سیکھ کر تم جیسے ہو جائیں بلکہ اپنی ایمانی قوت کی وجہ سے تم سے بھی بڑھ جائیں یا خدا کے سامنے ان کی حجت و دلیل قائم ہو جائے یعنی خود تمہاری کتابوں سے وہ تمہیں الزام نہ دینے لگیں اور تم ہی پر تمہاری ہی دلیلیں نہ قائم کرنے لگیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ تم کہہ دو فضل تو خدا کے ہاتھوں میں ہے جسے چاہے دے۔ سب کام اسی کے قبضے میں ہیں۔ وہی دینے لینے والا ہے' جسے چاہے ایمان عمل اور علم و فضل کی دولت سے مالا مال کر دے اور جسے چاہے راہ حق سے اندھا اور کلمۂ اسلام سے بہرا اور صحیح سمجھ سے محروم کر دے۔ اس کے سب کام حکمت سے ہی ہوتے ہیں۔ وہ وسعت و علم والا ہے۔ جسے چاہے اپنی رحمت کے ساتھ خاص کر دے۔ وہ بڑا فضل والا ہے۔ اے مسلمانوں اللہ نے بے حد بے پایاں احسانات تم پر کیے ہیں' تمہارے نبی ﷺ کو تمام انبیاء پر فضیلت دی اور بہت ہی کامل اور ہر حیثیت سے پوری شریعت اس نے تمہیں دی۔

وَمِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مَنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِقِنْطَارٍ يُّؤَدِّهٖٓ اِلَيْكَ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِدِيْنَارٍ لَّا يُؤَدِّهٖٓ اِلَيْكَ اِلَّا مَا دُمْتَ عَلَيْهِ قَآئِمًا ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لَيْسَ عَلَيْنَا فِى الْاُمِّيّٖنَ سَبِيْلٌ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿۷۵﴾ بَلٰى مَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ وَاتَّقٰى فَاِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۷۶﴾

اور اہلِ کتاب میں سے بعض شخص ایسے ہیں کہ (اے مخاطب) اگر تم اس کے پاس انبار کا انبار مال بھی امانت رکھ دو تو وہ مانگنے کے ساتھ ہی اس کو تمہارے پاس لا رکھے اور ان ہی میں سے بعض وہ شخص ہے کہ اگر تم اس کے پاس ایک دینار بھی امانت رکھ دو تو وہ بھی تم کو ادا نہ کرے مگر جب تک کہ تم اس کے سر پر کھڑے رہو۔ یہ (امانت کا ادا نہ کرنا) اس سبب سے ہے کہ وہ لوگ کہتے ہیں کہ ہم پر غیر اہل کتاب کے (مال کے بارے میں) کسی طرح کا الزام نہیں ہے اور وہ لوگ اللہ تعالیٰ پر جھوٹ لگاتے ہیں اور (دل میں) وہ بھی جانتے ہیں کہ (خائن پر) الزام کیوں نہ لگا ہوگا۔ جو شخص اپنے عہد کو پورا کرے اور اللہ تعالیٰ سے ڈرے تو بے شک اللہ تعالیٰ محبوب رکھتے ہیں (ایسے) متقیوں کو۞

یہود مالی خیانتوں میں مبتلا ہیں' دین کے سلسلہ میں ان کی خیانت حیرت انگیز کیوں ہو؟

اللہ تعالیٰ مؤمنوں کو یہودیوں کی خیانت پر تنبیہ کرتا ہے کہ ان کے دھوکے میں نہ آ جائیں۔ ان میں بعض تو امانت دار ہیں اور بعض بڑے خائن ہیں کہ خزانے کا خزانہ ان کی امانت میں ہو تو جوں کا توں حوالے کر دیں گے۔ پھر چھوٹی موٹی چیز میں وہ بددیانتی کیسے کریں گے؟ اور بعض ایسے بددیانت ہیں کہ ایک دینار بھی واپس نہ دیں۔ ہاں اگر ان کے سر ہو جاؤ' تقاضہ برابر

جاری رکھو اور حق طلب کرتے رہو تو خواہ امانت نکل بھی آئے ورنہ ہضم ہی کر جائیں۔ جب ایک دینار پر یہ بددیانتی ہے تو بڑی رقم کو کیوں چھوڑنے لگے۔ لفظ قنطار کی پوری تفسیر سورت کے اول میں ہی بیان ہو چکی ہے اور دینار تو مشہور ہی ہے۔ ابن ابی حاتم میں حضرت مالک بن دینار رحمتہ اللہ علیہ کا قول ہے کہ دینار کو اس لئے دینار کہتے ہیں کہ وہ دین یعنی ایمان بھی ہے اور نار یعنی آگ بھی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ حق کے ساتھ لو تو دین' ناحق لو تو نار یعنی آتشِ دوزخ۔

حسن نیت کی عجوبہ زائیاں' ایک حیرت انگیز واقعہ ☆ اس موقعہ پر اس حدیث کا بیان کرنا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے جو صحیح بخاری شریف میں کئی جگہ ہے اور کتاب الکفالہ میں بہت پوری ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا' بنی اسرائیل میں ایک شخص تھا جس نے کسی اور شخص سے ایک ہزار دینار قرض مانگے اس نے کہا گواہ دو۔ کہا خدا کی گواہی کافی ہے۔ اس نے کہا ضامن لاؤ۔ اس نے کہا میں ضمانت بھی خدا ہی کی دیتا ہوں۔ وہ اس پر راضی ہو گیا اور وقت ادائیگی مقرر کر کے رقم دے دی۔ وہ اپنے بحری سفر میں نکل گیا۔ جب کام کاج سے فارغ ہو گیا تو دریا کے کنارے کسی جہاز کا انتظار کرنے لگا تاکہ جا کر اس کا قرض ادا کر دے لیکن سواری نہ ملی تو اس نے ایک لکڑی لی اور اسے بیچ میں سے کھوکھلا کر کے اس میں ایک ہزار دینار رکھ دیئے اور ایک خط بھی اس کے نام رکھ دیا۔ پھر بند کر کے اسے دریا میں ڈال دیا اور کہا خدایا تو بخوبی جانتا ہے کہ میں نے فلاں شخص سے ایک ہزار دینار قرض لئے تیری شہادت اور تیری ضمانت پر اور اس نے خوش ہو کر مجھے دے دیئے۔ اب میں نے ہر چند کشتی ڈھونڈی کہ جا کر اس کا حق مدت کے اندر ہی اندر دے دوں لیکن نہ ملی۔ پس اب عاجز آ کر تجھ پر بھروسہ کر کے میں اسے دریا میں ڈال دیتا ہوں تو اسے اس تک پہنچا دے۔ یہ دعا کر کے لکڑی کو سمندر میں ڈال کر چل دیا۔ لکڑی پانی میں ڈوب گئی۔ یہ پھر بھی تلاش میں رہا کہ کوئی سواری ملے تو جائے اور اس کا حق ادا کرے ادھر یہ قرض خواہ دریا کے کنارے پر آیا کہ شاید وہ کسی کشتی میں اس کی رقم لے کر آ رہا ہو۔ جب دیکھا کہ کوئی کشتی نہیں آئی اور جانے لگا تو ایک لکڑی کنارے پر پڑی ہوئی تھی' یہ سمجھ کر لے لی کہ جلانے کے کام آئے گی۔ گھر جا کر اسے چیرا تو مال اور خط نکل پڑا۔ پھر قرض لینے والا شخص آیا اور کہا خدا جانتا ہے۔ میں نے ہر چند کوشش کی کہ کوئی سواری ملے تو آپ کے پاس آؤں اور مدت گزرنے سے پہلے آپ کا قرض ادا کر دوں لیکن سواری نہ ملی۔ اس لئے دیر لگ گئی اس نے کہا تو نے جو رقم بھیجی تھی وہ خدا نے مجھے پہنچا دی۔ تو اب اپنی رقم واپس لے جا اور راضی خوشی لوٹ جا۔

یہ حدیث بخاری شریف میں تعلیق کے ساتھ بھی ہے لیکن جزم کے صیغے کے ساتھ اور بعض جگہ سند وار بھی ہے اور کتابوں میں بھی یہ روایت ہے پھر فرماتا ہے کہ امانت میں خیانت کرنے پر حقدار کے حق کو نہ ادا کرنے پر آمادہ کرنے والی چیز ان کا یہ غلط خیال ہے کہ ان بددینوں' ان پڑھوں کا مال کھا جانے میں ہمیں کوئی حرج نہیں' ہم پر یہ مال حلال ہے۔ جس پر خدا فرماتا ہے کہ یہ خدا پر جھوٹ ہے اور اس کا علم خود انہیں بھی ہے کیونکہ ان کی کتابوں میں بھی ناحق مال کو خدا نے حرام قرار دیا ہے لیکن یہ بے وقوف خود اپنی من مانی اور دل بھاتی باتیں گھڑ کر شریعت کے رنگ میں انہیں رنگ لیتے ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے لوگ مسئلہ پوچھتے ہیں کہ ذمی کفار کی مرغی' بکری وغیرہ کبھی غزوے کی حالت میں ہمیں مل جاتی ہے تو ہم تو سمجھتے ہیں کہ اس کے لینے میں کوئی حرج نہیں۔ تو آپ نے فرمایا ٹھیک یہی اہل کتاب بھی کہتے تھے کہ اُمیوں کے مال کے لے لینے میں ہم پر کوئی حرج نہیں۔ سنو! جب وہ جزیہ ادا کر رہے ہیں تو ان کا کوئی مال تم پر حلال نہیں ہاں وہ اپنی خوشی سے دے دیں تو اور بات ہے۔ (عبدالرزاق) سعید بن جبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں' جب اہل کتاب سے حضور ﷺ نے یہ بات سنی' تو فرمایا دشمنان

خدا جھوٹے ہیں جاہلیت کی تمام باتیں میرے قدموں تلے مٹ گئیں مگر امانت کہ وہ ہر فاسق و فاجر کی بھی ادا کرنی پڑے گی۔ پھر ارشاد ہوتا ہے کہ لیکن جو شخص اپنے عہد کو پورا کرے اور ڈرتا رہے اہل کتاب ہو کر پھر اپنی کتاب کی ہدایت کے مطابق آنحضرت ﷺ پر ایمان لائے۔ جو عہد تمام انبیاء سے بھی ہو چکا ہے اور جس عہد کی پابندی ان کی اُمتوں پر بھی ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ کی حرام کردہ چیزوں سے اجتناب کرے۔ اس کی شریعت کی اطاعت کرے۔ رسولوں کے خاتم اور انبیاء کے سردار حضرت محمد ﷺ کی پوری تابعداری کرے۔ وہ متقی ہے اور متقی خدا کے دوست ہیں۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَاَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيْلًا اُولٰٓئِكَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِى الْاٰخِرَةِ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ وَلَا يَنْظُرُ اِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَلَا يُزَكِّيْهِمْ ۠ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۷۷﴾

یقیناً جو لوگ معاوضہ حقیر لے لیتے ہیں بمقابلہ اس عہد کے جو اللہ تعالیٰ سے (انہوں نے) کیا ہے اور (بمقابلہ) اپنی قسموں کے ان لوگوں کو کچھ حصہ آخرت میں (وہاں کی نعمت کا) نہ ملے گا اور نہ خدا تعالیٰ ان سے (لطف کا) کلام فرمائیں گے اور نہ ان کی طرف (نظر محبت سے) دیکھیں گے قیامت کے روز اور نہ ان کو پاک کریں گے اور ان کے لئے دردناک عذاب ہوگا۔ ○

کتمانِ حق پر سزائیں ☆

یعنی جو اہل کتاب خدا کے عہد کا پاس نہیں کرتے نہ حضور ﷺ کی اتباع کرتے ہیں نہ آپ کی صفتوں کا ذکر لوگوں سے کرتے ہیں۔ نہ آپ کے متعلق لوگوں سے بیان کرتے ہیں اور اسی طرح جھوٹی قسمیں کھاتے ہیں اور ان بدکاریوں سے وہ اس ذلیل اور فانی دنیا کا فائدہ حاصل کرتے ہیں۔ ان کے لئے آخرت میں کوئی حصہ نہیں۔ نہ ان سے خدا تعالیٰ کوئی پیار محبت سے بات کرے گا نہ ان پر رحمت کی نظر ڈالے گا۔ نہ انہیں ان کے گناہوں سے پاک کرے گا۔ بلکہ انہیں جہنم میں داخل کرنے کا حکم دے گا اور وہاں دردناک سزائیں پائیں گے۔ اس آیت کے متعلق بہت سی حدیثیں ہیں جن میں سے بعض کا ذکر ہم یہاں کرتے ہیں۔

① مسند احمد میں ہے رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں' تین قسم کے لوگ ہیں' جن سے نہ تو خدا کلام کرے گا اور نہ ان کی طرف قیامت کے دن نظر رحمت سے دیکھے گا اور نہ انہیں پاک کرے گا۔ حضرت ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہ سن کر کہا یہ کون لوگ ہیں؟ یا رسول اللہ ﷺ! یہ تو بڑے گھاٹے اور نقصان میں پڑے۔ حضور ﷺ نے تین مرتبہ یہی فرمایا' پھر جواب دیا کہ: ۱۔ ٹخنوں کے نیچے کپڑا لٹکانے والا' ۲۔ جھوٹی قسموں سے اپنا سودا بیچنے والا' ۳۔ دے کر احسان جتانے والا۔ مسلم وغیرہ میں بھی یہ حدیث ہے۔

② مسند احمد میں ہے ابو احمس فرماتے ہیں' میں حضرت ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ملا اور ان سے ذکر کیا کہ میں نے سنا ہے کہ آپ رسول اللہ ﷺ سے ایک حدیث بیان فرماتے ہیں۔ انہوں نے فرمایا سنو! میں رسول اللہ ﷺ پر جھوٹ نہیں

بول سکتا۔ جبکہ میں نے حضور ﷺ سے سن لیا ہو تو تم کہو وہ حدیث کیا ہے؟ میں نے کہا یہ کہ تین قسم کے لوگوں کو خدا دوست رکھتا ہے تو فرمانے لگے ہاں یہ حدیث میں نے بیان بھی کی ہے اور میں نے حضور ﷺ سے سنی بھی ہے۔ میں نے پوچھا کس کس کو دوست رکھتا ہے؟ فرمایا' ایک تو وہ جو مردانگی سے دشمنان خدا کے مقابلہ میں میدانِ جہاد میں کھڑا ہو جائے۔ یا تو اپنا سینہ چھدوا دے یا فتح کر کے لوٹے اور دوسرا وہ شخص جو کسی قافلے کے ساتھ مسافری میں ہے' بہت رات گئے تک قافلہ چلتا رہا جب تھک کر چور ہو گئے تو اُترے' سب تو پڑ کر سو رہے اور یہ تو جاگتا رہا اور نماز میں مشغول رہا۔ یہاں تک کہ کوچ کے وقت سب کو جگا دیا۔ تیسرا وہ شخص جس کی عادت ہو جو اسے ایذا پہنچانے والا ہو اور یہ اس پر صبر و سہارا کرے۔ یہاں تک کہ موت ان دونوں میں جدائی کرے یا سفر۔ میں نے کہا وہ تین کون ہیں' جن سے خدا ناخوش ہے۔ فرمایا: (۱) بہت قسمیں کھانے والا تاجر' (۲) تکبر کرنے والا فقیر اور' (۳) وہ بخیل جس سے کبھی کسی پر احسان ہو گیا ہو تو جتانے بیٹھے۔ یہ حدیث اس سند سے غریب ہے۔

③ مسند احمد میں ہے کندہ قبیلے کے ایک شخص امرأ القیس بن عامر کا جھگڑا ایک حضرمی شخص سے زمین کے بارے میں تھا جو حضور ﷺ کے سامنے پیش ہوا تو آپ نے فرمایا کہ حضرمی اپنا ثبوت پیش کرے۔ اس کے پاس کوئی ثبوت نہ تھا تو آپ نے فرمایا اب کندی قسم کھا لے۔ تو حضرمی کہنے لگا یارسول اللہ ﷺ جب اس کی قسم پر ہی فیصلہ ٹھہرا تو ربّ کعبہ کی قسم یہ میری زمین لے جائے گا۔ آپ نے فرمایا' جو شخص جھوٹی قسم سے کسی کا مال اپنا کرے گا تو جب وہ خدا سے ملے گا' اللہ تعالیٰ اس سے ناخوش ہوگا پھر آنحضرت ﷺ نے اس آیت کی تلاوت فرمائی تو امرأ القیس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا یا رسول اللہ ﷺ اگر کوئی چھوڑ دے تو اسے اجر کیا ملے گا؟ آپ نے فرمایا جنت۔ تو کہنے لگے یارسول اللہ ﷺ گواہ رہیے کہ میں نے وہ ساری زمین اس کے نام چھوڑ دی۔ یہ حدیث نسائی میں بھی ہے۔

④ مسند احمد میں ہے رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں' جو شخص جھوٹی قسم کھائے تاکہ اس سے کسی مسلمان کا مال چھین لے تو خدا سے جب یہ ملے گا' خدا اس پر سخت غضبناک ہوگا۔ حضرت اشعث رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں' خدا کی قسم میرے ہی بارے میں یہ ہے۔ ایک یہودی کی اور میری شرکت میں ایک زمین تھی۔ اس نے میری زمین کا انکار کر دیا۔ میں اسے خدمت نبوی ﷺ میں لایا۔ حضور ﷺ نے مجھ سے فرمایا' تیرے پاس کچھ ثبوت ہے' میں نے کہا نہیں۔ آپ نے یہودی سے فرمایا تو قسم کھا لے۔ میں نے کہا' حضور ﷺ یہ تو قسم کھا لے گا اور میرا مال لے جائے گا۔ پس اللہ عزوجل نے یہ آیت نازل فرمائی۔ یہ حدیث بخاری مسلم میں بھی ہے۔

⑤ مسند احمد میں ہے' حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا' جو شخص کسی مرد مسلم کا مال بغیر حق کے لے لے' وہ خدا سے اس حال میں ملے گا کہ خدا تعالیٰ اس سے ناراض ہوگا۔ وہیں حضرت اشعث بن قیس رضی اللہ تعالیٰ عنہ آ گئے اور فرمانے لگے ابو عبدالرحمٰن تم سے کیا حدیث بیان کرتے ہیں؟ ہم نے دوہرا دی' تو فرمایا یہ حدیث میرے ہی بارے میں حضور ﷺ نے ارشاد فرمائی ہے۔ میرا اپنا چچا کے لڑکے سے ایک کنوئیں کے بارے میں جھگڑا تھا' جو اس کے قبضہ میں تھا۔ حضور ﷺ کے پاس جب ہم اپنا مقدمہ لے گئے تو آپ ﷺ نے فرمایا یا تو اپنی دلیل اور ثبوت لا کہ یہ کنواں تیرا ہے ورنہ اس کی قسم پر فیصلہ ہوگا۔ میں نے کہا یا حضرت میرے پاس تو کوئی دلیل نہیں اور اگر

اس کی قسم پر معاملہ رہا تو یہ تو میرا کنواں لے جائے گا۔ میرا مقابل تو فاجر شخص ہے' اس وقت حضور ﷺ نے یہ حدیث بھی بیان فرمائی اور اس آیت کی بھی تلاوت کی۔

⑥ مسند احمد میں ہے' رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں خدا کے کچھ بندے ایسے بھی ہیں جن سے خدا تعالیٰ قیامت کے دن بات نہ کرے گا۔ نہ ان کی طرف دیکھے گا۔ پوچھا گیا کہ یا رسول اللہ ﷺ وہ کون ہیں؟ فرمایا اچھے ماں باپ سے بیزار ہونے والی اور ان سے بے رغبتی کرنے والی لڑکی اور اپنی اولاد سے بیزار ہونے والا باپ اور وہ شخص کہ جس پر کسی قوم کا احسان ہو وہ اس سے انکار کر جائے اور آنکھیں پھیرے اور ان سے یک سوئی کر لے۔

⑦ ابن ابی حاتم میں ہے حضرت عبداللہ ابن ابی اوفی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک شخص نے اپنا سودا بازار میں رکھا اور قسم کھائی کہ اس کو اتنا اتنا بھاؤ دیا جاتا تھا تا کہ کوئی مسلمان اس میں پھنس جائے۔ پس یہ آیت نازل ہوئی۔ صحیح بخاری میں بھی یہ روایت مروی ہے۔

⑧ مسند احمد میں ہے رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں' تین شخصوں سے جناب باری تعالیٰ قیامت کے دن بات نہ کرے گا' نہ ان کی طرف دیکھے گا نہ انہیں پاک کرے گا اور ان کے لئے دکھ درد کے عذاب ہیں۔ ایک وہ جس کے پاس بچا ہوا پانی ہے پھر وہ کسی مسافر کو نہیں دیتا۔ دوسرا وہ جو عصر کے بعد جھوٹی قسم کھا کر اپنا مال فروخت کرتا ہے۔ تیسرا وہ جو بادشاہ مسلمان سے بیعت کرتا ہے۔ پس اگر وہ اسے مال دے تو وفا کرتا ہے اور اگر نہ دے تو بیعت پوری نہیں کرتا۔ یہ حدیث ابوداؤد اور ترمذی میں بھی ہے اور امام ترمذی رحمتہ اللہ علیہ اسے حسن کہتے ہیں۔

وَاِنَّ مِنْهُمْ لَفَرِيْقًا يَّلْوٗنَ اَلْسِنَتَهُمْ بِالْكِتٰبِ لِتَحْسَبُوْهُ مِنَ الْكِتٰبِ وَمَا هُوَ مِنَ الْكِتٰبِ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَمَا هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿۷۸﴾

اور بے شک ان میں سے بعضے ایسے ہیں کہ کج کرتے ہیں اپنی زبانوں کو کتاب (پڑھنے) میں تا کہ تم لوگ اس (ملائی ہوئی چیز) کو بھی کتاب کا جز سمجھو حالانکہ وہ کتاب کا جز نہیں اور کہتے ہیں کہ یہ (لفظ مطلب) خدا کے پاس سے ہے حالانکہ وہ (کسی طرح) خدا تعالیٰ کے پاس سے نہیں اور اللہ تعالیٰ پر جھوٹ بولتے ہیں اور وہ جانتے ہیں۔ ○

کلام باری میں ردوبدل سب سے بڑا جرم ہے ☆

یہاں بھی انہی ملعون یہودیوں کا ذکر ہو رہا ہے کہ ان کا ایک گروہ یہ بھی کرتا ہے کہ کلام کو اس جگہ سے ہٹا دیتا ہے۔ خدائی کتاب بدل دیتا ہے۔ اصل مطلب اور صحیح معنی خبط کر دیتا ہے اور جاہلوں کو اس چکر میں ڈال دیتا ہے کہ کتاب اللہ یہی ہے۔ پھر خود بھی اسے کتاب اللہ کہہ کر جاہلوں کے اس خیال کو اور مضبوط کر دیتے ہیں اور جان بوجھ کر خدا پر افترا کرتے ہیں اور جھوٹ بکتے ہیں۔ زبان موڑنے سے مطلب یہاں تحریف کرنا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے صحیح بخاری شریف میں مروی ہے کہ یہ لوگ تحریف کرتے تھے اور ازالہ کر دیتے تھے۔ مخلوق میں ایسا کوئی نہیں جو کسی کتابِ خدا کا لفظ بدل دے۔ ہاں یہ

لوگ تحریف اور بے جا تاویل کرتے تھے۔ وہب بن منبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ تورات وانجیل اسی طرح ہیں جس طرح اللہ تعالیٰ نے اتاریں۔ ایک حرف بھی ان میں سے نہیں بدلا لیکن یہ لوگ تحریف اور تاویل سے لوگوں کو گمراہ کرتے ہیں اور جو کتابیں انہوں نے اپنی طرف سے لکھ لی ہیں اور جسے وہ خدا کی طرف سے مشہور کر رہے ہیں ان سے لوگوں کو بہکاتے ہیں حالانکہ دراصل وہ خدا کی طرف سے نہیں لیکن خدا کی اصلی کتابیں تو محفوظ ہیں جو بدلتی نہیں۔ (ابن ابی حاتم) حضرت وہب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اس فرمان کا اگر مطلب یہ ہو کہ ان کے پاس اب جو کتاب ہے تو ہم بالیقین کہتے ہیں کہ وہ بدلی ہوئی ہے اور محرف ہے اور زیادتی اور نقصان سے ہرگز پاک نہیں اور پھر جو زبانِ عربی میں ہمارے ہاتھوں میں ہے اس میں تو بڑی خطا ہے اور بہت ہی زیادتی ہے اور کمی بھی اصل سے بہت ہے اور کھلے ہوئے وہم اور صاف صاف غلطیاں موجود ہیں۔ بلکہ دراصل اسے ترجمہ کہنا زیبا ہی نہیں۔ وہ تو تفسیر اور وہ بھی بے اعتبار تفسیر ہے اور پھر ان سمجھداروں کی لکھی تفسیر ہے۔ جن میں اکثر بلکہ کل کے کل محض اُلٹی سمجھ والے ہیں اور اگر حضرت وہب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے فرمان کا یہ مطلب ہو کہ خدا کی کتاب جو درحقیقت خدائی کتاب ہے پس وہ بے شک محفوظ ومصون ہے اس میں کمی زیادتی ناممکن ہے۔

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ ﴿۷۹﴾ وَلَا يَاْمُرَكُمْ اَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلٰٓئِكَةَ وَالنَّبِيّٖنَ اَرْبَابًا ۭ اَيَاْمُرُكُمْ بِالْكُفْرِ بَعْدَ اِذْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۸۰﴾

کسی بشر سے یہ بات نہیں ہو سکتی کہ اللہ تعالیٰ اسے کتاب اور فہم اور نبوت عطا فرمائیں پھر وہ لوگوں سے کہنے لگے کہ میرے بندے بن جاؤ خدا تعالیٰ کو چھوڑ کر وہ لیکن کہے گا کہ تم لوگ اللہ والے بن جاؤ بوجہ اس کے کہ تم کتاب سکھاتے اور بوجہ اس کے کہ تم پڑھتے ہو اور نہ یہ بات بتلا دے گا کہ تم فرشتوں کو اور نبیوں کو رب قرار دے لو کیا وہ تم کو کفر کی بات بتلائے گا بعد اس کے کہ تم مسلمان ہو۔ ○

معبود صرف خداوند ربّ العزت ہے ☆

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جب یہودیوں کے اور نجرانی نصرانیوں کے علماء جمع ہوئے اور آپ نے انہیں اسلام قبول کرنے کی دعوت دی تو ابو رافع قرظی کہنے لگا کہ آپ کیا چاہتے ہیں کہ جس طرح نصرانیوں نے حضرت عیسیٰ بن مریم کی عبادت کی ہم بھی آپ کی عبادت کریں؟ تو نجران کے ایک نصرانی نے بھی جسے آئیس کہا جاتا تھا' یہی کہا کہ کیا آپ کی یہی خواہش ہے؟ اور یہی دعوت ہے؟ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا معاذ اللہ نہ ہم خود خدا کے سوا دوسرے کی پوجا کریں نہ کسی اور کو اللہ کے سوا

دوسرے کی عبادت کی تعلیم دیں۔ نہ میری پیغمبری کا یہ مقصد نہ مجھے خدا کا یہ حکم۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئیں کہ کسی انسان کو کتاب وحکمت ونبوت ورسالت پالینے کے بعد یہ لائق ہی نہیں کہ اپنی پوجاپاٹ کرائے اور اپنی بندگی کی تعلیم لوگوں کو کرے۔ امام حسن بصری رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں ادنیٰ مومن سے یہ نہیں ہوسکتا کہ وہ لوگوں کو اپنی بندگی کی دعوت دے۔ یہاں یہ اس لئے فرمایا کہ یہ یہود ونصاریٰ آپس میں ہی ایک دوسرے کو پوجتے تھے۔

قرآن شاہد ہے۔ جو فرماتا ہے: ﴿اتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ...﴾ (التوبۃ ۳۱) یعنی ان لوگوں نے خدا کو چھوڑ کر اپنے عالموں اور درویشوں کو اپنا ربّ بنالیا ہے۔ مسند ترمذی کی وہ حدیث بھی آرہی ہے کہ حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے رسول مقبول ﷺ کی خدمت میں عرض کیا کہ وہ تو ان کی عبادت نہیں کرتے تھے۔ تو آپ نے فرمایا کیوں نہیں؟ وہ ان پر حرام کو حلال اور حلال کو حرام کردیتے تھے اور یہ ان کو مانتے چلے جاتے تھے۔ یہی ان کی عبادت تھی۔

پس جاہل درویش اور بےسمجھ علماء اور مشائخ اس مذمت اور ڈانٹ ڈپٹ میں داخل ہیں۔ رسول اللہ ﷺ اور ان کی اتباع کرنے والے علمائے کرام اس سے یکسو ہیں۔ اس لئے کہ وہ تو صرف خدائی فرمان اور کلام رسول اللہ ﷺ کی تبلیغ کرتے ہیں اور ان کاموں سے روکتے ہیں جن سے انبیاء کرام روک گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے حضرات انبیاء تو خالق ومخلوق کے درمیان سفیر ہیں۔ حق رسالت ادا کرتے ہیں اور خدائی امانت احتیاط کے ساتھ بندگان خدا کو پہنچا دیتے ہیں۔ نہایت بیدار مغزی، ہوشیاری، کمال نگرانی اور پوری حفاظت کے ساتھ۔ وہ ساری خدائی کے خیرخواہ ہوتے ہیں۔ وہ احکامِ خدا کے پہنچانے والے ہوتے ہیں۔ رسولوں کی ہدایت تو لوگوں کو ربانی بنانے کی ہوتی ہے کہ وہ حکمتوں والے اور حلم والے بن جائیں۔ سمجھدار اور عابد وزاہد، متقی اور پارسا بنیں۔ حضرت ضحاک فرماتے ہیں قرآن سیکھنے والوں پر حق ہے کہ وہ باسمجھ ہوں۔ ﴿تَعْلَمُوْنَ﴾ اور ﴿تُعَلِّمُوْنَ﴾ قراءت ہیں۔ پہلے کے معنی ہیں سمجھنے کے، دوسرے کے معنی ہیں تعلیم حاصل کرنے کے۔ ﴿تَدْرُسُوْنَ﴾ کے معنی ہیں الفاظ یاد کرنے کے۔ پھر ارشاد ہے کہ وہ یہ حکم نہیں کرتے کہ خدا کے سوا اور کی عبادت کرو۔ خواہ وہ نبی ہو بھیجا ہوا۔ خواہ فرشتہ وہ قرب خدا والا۔ یہ تو وہی کرسکتا ہے جو خدا کے سوا دوسرے کی عبادت کی دعوت دے اور جو ایسا کرے اس نے کفر کیا اور کفر نبیوں کا کام نہیں۔ ان کا کام تو ایمان ہے اور ایمان نام ہے اللہ واحد کی عبادت اور پرستش کا اور یہی تمام انبیاء کی دعوت ہے۔ جیسے خود قرآن نے فرمایا: ﴿وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْٓ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ﴾ (الانبیاء ۲۵) یعنی تجھ سے پہلے بھی ہم نے جتنے رسول بھیجے سب پر یہی وحی نازل فرمائی کہ میرے سوا کوئی معبود ہے ہی نہیں۔ تم سب میری عبادت کرتے رہو اور جگہ فرمان ہے: ﴿وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ﴾ (النحل ۳۶) یعنی ہم نے ہر اُمت میں رسول بھیجا کہ تم اللہ کی عبادت کرو اور خدا کے سوا ہر کسی کی عبادت سے بچو اور جگہ ارشاد ہے۔ تجھ سے پہلے تمام رسولوں سے پوچھ لے کہ کیا ہم نے اپنی ذات رحمان کے سوا ان کی عبادت کے لئے کسی اور کو مقرر کیا تھا؟ فرشتوں کی طرف سے خبر دیتا ہے کہ: ﴿وَمَنْ يَّقُلْ مِنْهُمْ ....﴾ (الانبیاء ۲۹) ان میں سے اگر کوئی کہہ دے کہ میں معبود ہوں بجز اللہ کے تو اسے بھی جہنم کی سزا دیں اور اسی طرح ہم ظالموں کو بدلہ دیتے ہیں۔

وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ ثُمَّ

جَاءَكُمْ رَسُولٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ ؕ قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَاَخَذْتُمْ عَلٰى ذٰلِكُمْ اِصْرِيْ ؕ قَالُوْۤا اَقْرَرْنَا ؕ قَالَ فَاشْهَدُوْا وَاَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ ﴿۸۱﴾ فَمَنْ تَوَلّٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۸۲﴾

اور جب کہ اللہ تعالیٰ نے عہد لیا انبیاء سے کہ جو کچھ میں تم کو کتاب اور علم دوں پھر تمہارے پاس کوئی پیغمبر آئے جو مصداق ہو اس کا جو تمہارے پاس ہے اور تم ضرور اس رسول پر اعتقاد بھی لانا اور اس کی طرفداری بھی کرنا۔ فرمایا کہ آیا تم نے اقرار کیا اور اس پر میرا عہد قبول کیا۔ وہ بولے ہم نے اقرار کیا ارشاد فرمایا تو گواہ رہنا اور میں اس پر تمہارے ساتھ گواہوں میں سے ہوں۔ سو جو شخص روگردانی کرے گا بعد اسکے تو ایسے ہی لوگ بے حکمی کرنے والے ہیں۔ ○

میثاق کی یاددہانی ☆

یہاں بیان ہو رہا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک کے تمام انبیائے کرام سے اللہ تعالیٰ نے وعدہ لیا کہ جب کبھی ان میں سے کسی کو بھی خدائے تعالیٰ وتبارک کتاب وحکمت دے اور وہ بڑے مرتبے تک پہنچ جائے۔ پھر اس کے بعد اسی کے زمانے میں رسول آ جائے تو اس پر ایمان لانا اور اس کی نصرت وامداد کرنا اس کا فرض ہوگا۔ یہ نہیں کہ اپنے علم ونبوت پر نظر ڈال کر اپنے بعد والے نبی کی اتباع اور امداد سے رک جائے' ان سے کہا کہ کیا تم اقرار کرتے ہو اور مجھ سے مضبوط وعدہ کر رہے ہو؟ سب نے کہا ہاں اقرار ہے۔ تو فرمایا گواہ رہو اور میں خود بھی گواہ ہوں۔ اب اس عہد و میثاق سے جو پھر جائے وہ قطعی فاسق' سرکش اور بدکار ہے۔ حضرت علی بن ابو طالب رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہر نبی سے عہد لیا کہ اس کی زندگی میں اگر اللہ تعالیٰ اپنے نبی حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھیجے تو اس پر فرض ہے کہ وہ آپ کی امداد کرے اور اپنی امت کو بھی یہی تلقین کر دے کہ وہ بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے اور آپ کی تابعداری کرے اور آپ کی امداد کرے۔ طاؤس' حسن بصری اور قتادہ رحمتہ اللہ علیہم فرماتے ہیں' نبیوں سے اللہ تعالیٰ نے عہد لیا کہ ایک دوسرے کی تصدیق کریں۔ کوئی یہ نہ سمجھے کہ یہ تفسیر اوپر کی تفسیر کے خلاف ہے بلکہ یہ اس کی تائید ہے۔ چنانچہ حضرت طاؤس رحمتہ اللہ علیہ سے ان کے لڑکے کی روایت کی طرح حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے بھی یہ حدیث روایت کی ہے۔

مسند احمد میں ہے کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں نے ایک دوست قریظی یہودی سے کہا تھا کہ وہ تورات کی جامع باتیں مجھے لکھ دے۔ تو اگر فرمائیں تو انہیں پیش کروں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ متغیر ہو گیا۔ حضرت عبداللہ بن ثابت رحمتہ اللہ علیہ نے کہا کہ تم نہیں دیکھتے کہ آپ کے چہرے کا کیا حال ہے؟ تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہنے لگے میں اللہ کے رب ہونے پر' اسلام کے دین ہونے پر' محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے رسول ہونے پر خوش ہوں (صلی

اللہ علیہ وسلم) اس وقت حضور ﷺ کا غصہ دور ہوا اور فرمایا قسم ہے اس خدا کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام تم میں آ جائیں تو تم ان کی تابعداری میں لگ جاؤ' مجھے چھوڑ دو تو یہ بھی تمہاری گمراہی ہی مقصود ہو گی۔ تمام اُمتوں میں سے میرے حصے کی امت تم ہو اور تمام نبیوں میں سے تمہارے حصے کا نبی میں ہوں۔ مسند ابو یعلی میں ہے اہل کتاب سے کچھ نہ پوچھو وہ خود گمراہ ہیں' تمہیں راہ راست کیسے دکھائیں گے بلکہ ممکن ہے تم کسی باطل کی تصدیق کر لو یا کسی حق کی تکذیب کر بیٹھو۔ خدا کی قسم اگر موسیٰ بھی تم میں موجود ہوتے تو ان کے لئے بجز میری تابعداری کے اور کوئی راہ نہ تھی۔ بعض حدیثوں میں ہے کہ اگر موسیٰ علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام زندہ ہوتے تو انہیں بھی میری اتباع کے سوا چارہ نہ تھا۔ پس ثابت ہوا کہ ہمارے رسول حضرت محمد ﷺ خاتم الانبیاء اور سید الانبیاء ہیں جس زمانے میں بھی آپ کی نبوت ہوتی' آپ واجب الاطاعت تھے اور تمام انبیاء کی تابعداری پر جو اس وقت ہوں آپ کی فرمانبرداری مقدم رہتی۔ یہی وجہ ہے کہ معراج کے وقت بیت المقدس میں تمام انبیاء کے امام آپ ہی بنائے گئے۔ اسی طرح میدانِ حشر میں بھی خدا تعالیٰ کو فیصلوں کے لئے لانے میں شفیع آپ ہی ہوں گے۔ یہی وہ مقام محمود ہے جو آپ کے سوا اور کسی کے لائق نہیں۔ تمام انبیاء اور کل رسول اس دن کام سے منہ پھیر لیں گے۔ بالآخر آپ ہی خصوصیت کے ساتھ اس مقام میں کھڑے ہوں گے۔ خدا تعالیٰ اپنے درود و سلام آپ پر ہمیشہ بھیجتا رہے قیامت تک۔ آمین۔

اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ وَلَهٗٓ اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا وَّاِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ ﴿۸۳﴾ قُلْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَالنَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ ۪ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ۡ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ﴿۸۴﴾ وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ ۚ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۸۵﴾

کیا پھر دین خداوندی کے سوا اور کسی طریقہ کو چاہتے ہیں حالانکہ حق تعالیٰ کے سامنے سب سرافگندہ ہیں جتنے آسمانوں اور زمینوں میں ہیں خوشی سے اور بے اختیاری سے اور سب خدا ہی کی طرف لوٹائے جائیں گے۔ آپ فرما دیجئے کہ ہم ایمان رکھتے ہیں اللہ پر اور اس پر جو ہمارے پاس بھیجا گیا اور اس پر جو ابراہیم اور اسمٰعیل و اسحٰق و یعقوبؑ اور اولادِ یعقوب کی طرف بھیجا گیا اور اس پر بھی جو موسیٰ و عیسیٰ اور دوسرے نبیوں کو دیا گیا۔ ان کے پروردگار کی طرف سے اس کیفیت سے کہ ہم ان میں سے کسی ایک میں بھی تفریق نہیں کرتے اور ہم تو اللہ تعالیٰ ہی کے مطیع ہیں اور جو شخص اسلام کے سوا کسی دوسرے دین کو طلب کرے گا وہ اس سے مقبول نہ ہو گا اور وہ آخرت میں

تباہ کاروں میں سے ہوگا۔O

اسلام کے علاوہ کوئی دین مقبول نہ ہوگا ☆

اللہ تعالیٰ کے سچے دین کے سوا جو اس نے رسولوں کی معرفت نازل فرمایا ہے یعنی اللہ وحدہٗ لاشریک لہٗ کی عبادت کرنا کوئی شخص اور دین کی تلاش کرے اور اسے مانے۔ اس کی تردید یہاں بیان ہو رہی ہے۔ پھر فرمایا کہ آسمان و زمین کی تمام چیزیں اس کے مطیع ہیں۔ خواہ خوشی سے ہوں خواہ ناخوشی سے جیسے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا......﴾ (الرعد:۱۵) یعنی زمین و آسمان کی تمام مخلوق خدا کے سامنے سجدے کرتی ہے اپنی خوشی سے یا جبراً اور جگہ ہے: ﴿اَوَلَمْ يَرَوْا اِلٰى مَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنْ شَيْءٍ......﴾ (النحل:۴۸) کیا وہ نہیں دیکھتے کہ تمام مخلوق کے سائے دائیں بائیں جھک کر خدا کو سجدہ کرتے ہیں اور اللہ ہی کے لئے سجدہ کرتی ہیں۔ آسمانوں کی سب چیزیں اور زمینوں کے کل جاندار اور سب فرشتے۔ کوئی بھی تکبر نہیں کرتا۔ سب کے سب اپنے اُوپر والے ربّ سے ڈرتے ہیں اور جو حکم دیئے جائیں، بجا لاتے ہیں۔ پس مؤمنوں کا تو ظاہر باطن، قلب و قالب دونوں خدا تعالیٰ کے مطیع اور اس کے فرمانبردار ہوتے ہیں اور کافر بھی خدا کے قبضے میں ہے اور جبراً خدا کی جانب جھکا ہوا ہے۔ اس کے تمام فرمان اس پر جاری ہیں اور وہ ہر طرح قدرت و مشیتِ خدا کے تحت ہے کوئی چیز بھی اس کے غلبے اور قدرت سے باہر نہیں۔ اس آیت کی تفسیر میں ایک غریب حدیث نقل بھی کی جاتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا آسمانوں والے تو فرشتے ہیں جو بخوشی خدا کے فرمانبردار ہیں اور زمین والے وہ ہیں جو اسلام پر پیدا ہوئے ہیں۔ یہ بھی بہ شوق تمام خدا کے زیرِ فرمان ہیں اور ناخوش سے ماتحت وہ ہیں جو لوگ مسلمان مجاہدین کے ہاتھوں میدان جنگ میں قید ہوتے ہیں، اور طوق زنجیر میں جکڑے ہوئے لائے جاتے ہیں۔ یہ لوگ ہیں جو جنت کی طرف گھسیٹے جاتے ہیں اور وہ نہیں چاہتے۔

ایک صحیح حدیث میں ہے، تیرے ربّ کو ان لوگوں سے تعجب ہوتا ہے جو جنت کی طرف کھینچے جاتے ہیں زنجیروں اور رسیوں میں باندھ کر۔ اس حدیث کی اور سند بھی ہے لیکن اس آیت کے معنی تو وہی زیادہ قوی ہیں جو پہلے بیان ہوئے۔ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں یہ آیت اس جیسی ہے: ﴿وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ﴾ (لقمان: ۲۵) اگر تو ان سے پوچھے کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے پیدا کیا۔ تو یقیناً وہ یہی جواب دیں گے کہ اللہ تعالیٰ نے۔ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں۔ اس سے مراد وہ وقت ہے جب روزِ ازل میں تمام انسانوں سے میثاق اور عہد لیا تھا اور سب اسی کی طرف لوٹائے جائیں گے یعنی قیامت والے دن اور ہر ایک کو وہ اس کے عمل کا بدلہ دے گا۔

پھر فرماتا ہے تو کہہ ہم اللہ پر ایمان لائے اور قرآن پر اور ابراہیم، اسماعیل، اسحاق اور یعقوب علیہم السلام پر جو صحیفے اور وحی اُتری۔ ہم اس پر بھی ایمان لائے اور ان کی اولادوں پر جو اُترا اس پر بھی ہمارا ایمان ہے۔ اسباط سے مراد بنو اسرائیل کے قبائل ہیں، حضرت یعقوب علیہ السلام کی نسل میں سے تھے۔ یہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے بارہ بیٹوں کی اولاد تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تورات دی گئی اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو انجیل اور بھی جتنے انبیائے کرام خدا کی طرف سے کچھ لائے، ہمارا ان پر ایمان ہے۔ ہم ان میں کوئی فرق اور جدائی نہیں ڈالتے کہ کسی کو مانیں کسی کو نہ مانیں بلکہ ہمارا سب پر ایمان ہے اور ہم خدا کے فرمان گزار ہیں۔ پس اس امت کے مومن تمام انبیاء اور کل خدائی کتابوں کو مانتے ہیں کسی کے ساتھ کفر نہیں کرتے۔ ہر

کتاب اور ہر نبی کی تصدیق کرتے ہیں۔ پھر فرمایا کہ دین خدا کے سوا جو شخص ایسا عمل کرے جس پر ہمارا حکم نہ ہو وہ مردود ہے
مسند احمد میں ہے رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں۔ قیامت کے دن اعمال آئیں گے۔ نماز آ کر کہے گی کہ خدایا میں نماز ہوں۔ اللہ
تعالیٰ فرمائے گا تو اچھی چیز ہے صدقہ آئے گا اور کہے گا پروردگار میں صدقہ ہوں۔ جواب ملے گا تو بھی خیر ہے۔ روزہ آ کر کہے گا
میں روزہ ہوں' اللہ تعالیٰ فرمائے گا تو بھی بہتر ہے۔ پھر اسی طرح اور اعمال بھی آتے جائیں گے اور سب کو یہی جواب ملتا رہے
گا۔ پھر اسلام آئے گا اور کہے گا خدایا تو سلام ہے اور میں اسلام ہوں۔ اللہ فرمائے گا تو خیر پر ہے۔ آج تیرے ہی باعث میں
پکڑوں گا اور تیری ہی وجہ سے انعام دوں گا۔ اللہ تعالیٰ اپنی کتاب میں فرماتا ہے: ﴿وَمَنْ يَبْتَغِ﴾ یہ حدیث صرف مسند احمد
میں ہے اور اس کے راوی حسن کا حضرت ابو ہریرہ سے سننا ثابت نہیں۔

كَيْفَ يَهْدِي اللّٰهُ قَوْمًا كَفَرُوْا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ وَشَهِدُوْٓا اَنَّ الرَّسُوْلَ حَقٌّ وَّجَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۸۶﴾ اُولٰۗىِٕكَ جَزَاۗؤُهُمْ اَنَّ عَلَيْهِمْ لَعْنَةَ اللّٰهِ وَالْمَلٰۗىِٕكَةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ﴿۸۷﴾ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ ﴿۸۸﴾ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ وَاَصْلَحُوْا ۣ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۸۹﴾

اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو کیسے ہدایت کریں گے جو کافر ہو گئے بعد اپنے ایمان لانے کے اور بعد اپنے اس اقرار کے
رسول سچے ہیں اور بعد اس کے کہ ان کو واضح دلائل پہنچ چکے تھے اور اللہ ایسے بے ڈھنگے لوگوں کو ہدایت نہیں کرتے۔
ایسے لوگوں کی سزا یہ ہے کہ ان پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہوتی ہے اور فرشتوں کی بھی اور آدمیوں کی بھی سب کی اور وہ
ہمیشہ ہمیشہ کو اس میں رہیں گے۔ ان پر عذاب ہلکا بھی نہ ہونے پائے گا اور نہ ان کو مہلت ہی دی جائے گی۔ ہاں مگر
جو لوگ توبہ کر لیں اس کے بعد اور اپنے کو سنواریں سو بے شک خدا تعالیٰ بخشش دینے والے رحمت والے ہیں۔ ○

صدقِ دل سے توبہ بہر حال قبول ہوتی ہے ☆

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں ایک انصاری مرتد ہو کر مشرکین سے جا ملا۔ پھر پچھتانے لگا اور
اپنی قوم سے کہلوایا کہ رسول اللہ ﷺ سے دریافت کرو کیا میری توبہ پھر بھی قبول ہو سکتی ہے؟ ان کے دریافت کرنے پر یہ آیتیں
اُتریں۔ اس کی قوم نے اسے کہلوا بھیجا۔ وہ پھر توبہ کر کے نئے سرے سے مسلمان ہو کر حاضر ہو گیا۔ (ابن جریر) نسائی' حکم اور
ابن حبان میں بھی یہ روایت موجود ہے۔ امام حاکم رحمتہ اللہ علیہ اسے صحیح الاسناد کہتے ہیں۔ مسند عبدالرزاق میں ہے کہ حارث

۱؎ یعنی جس نے اسلام اختیار کیا ہو گا۔ ان کی نجات ہے اور جنہوں نے اسلام سے روگردانی کی ہے وہ آج خدا تعالیٰ کے عذاب میں مبتلا
ہوں گے۔

بن سوید رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اسلام قبول کیا۔ پھر کفار سے مل گیا اور اسلام سے پھر گیا۔ اس کے بارے میں یہ آیتیں اُتریں۔ اس کی قوم کے ایک شخص نے یہ آیتیں اسے پڑھ کر سنائیں تو اس نے کہاں جہاں تک میرا خیال ہے خدا کی قسم تو سچا ہے اور اللہ کے نبی ﷺ تو تجھ سے بہت زیادہ سچے ہیں اور خدا تعالیٰ سب سچوں سے زیادہ سچا ہے۔ پھر وہ حضور ﷺ کی طرف لوٹ آئے' اسلام لائے اور بہت اچھی طرح اسلام کو نبھایا۔ بَیِّنَات سے مراد رسول ﷺ کی تصدیق پر حجتوں اور دلیلوں کا بالکل واضح ہو جانا ہے۔ پس جو لوگ ایمان لائے رسول کی حقانیت مان چکے۔ دلیلیں دیکھ چکے۔ پھر شرک کے اندھیروں میں گر گئے۔ یہ لوگ مستحق ہدایت نہیں کیونکہ آنکھوں کے ہوتے ہوئے اندھے بن جانے کو انہوں نے پسند کیا۔ اللہ تعالیٰ حد سے گزر جانے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ انہیں خدا لعنت کرتا ہے اور اس کی مخلوق بھی جو لعنت دائمی ہے۔ نہ تو کسی وقت ان کے عذابوں میں تخفیف ہوگی نہ موقوفی۔ پھر اپنا لطف و احسان' رأفت و رحمت کا بیان فرماتا ہے کہ اس بدترین جرم کے بعد بھی جو میری طرف جھکے اور اپنے بداعمال کی اصلاح کرے۔ میں بھی اس سے درگزر کر لیتا ہوں۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ ثُمَّ ازْدَادُوْا كُفْرًا لَّنْ تُقْبَلَ تَوْبَتُهُمْ ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الضَّآلُّوْنَ ﴿۹۰﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَمَاتُوْا وَهُمْ كُفَّارٌ فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْ اَحَدِهِمْ مِّلْءُ الْاَرْضِ ذَهَبًا وَّلَوِ افْتَدٰى بِهٖ ؕ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ وَّمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ﴿۹۱﴾ ع

بے شک جو لوگ کافر ہوئے اپنے ایمان لانے کے بعد پھر بڑھتے رہے کفر میں۔ ان کی توبہ ہرگز قبول نہ ہوگی اور ایسے لوگ پکے گمراہ ہیں۔ بے شک جو لوگ کافر ہوئے اور وہ مر بھی گئے حالت کفر ہی میں سو ان میں سے کسی کا زمین بھر سونا بھی نہ لیا جائے گا اگر وہ معاوضوں میں اس کا دینا بن چاہے۔ ان لوگوں کو سزائے دردناک ہوگی اور ان کے کوئی حامی بھی نہ ہوں گے۔ ○

ایک وقت ایسا بھی ہے کہ توبہ کے دروازے بند کر دیئے جائیں گے ☆

ایمان کے بعد کفر کرنے والوں کو' پھر اسی کفر پر مرنے والوں کو پروردگارِ عالم ڈرا رہا ہے کہ موت کے وقت کی تمہاری توبہ قبول نہ ہوگی جیسے اور جگہ فرمایا ہے: ﴿وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِيْنَ ......﴾ (النساء:۱۸) آخر دم تک یعنی موت کے وقت تک گناہوں میں مبتلا رہنے والے موت کو دیکھ کر جو توبہ کریں وہ خدا کے ہاں قبول نہیں اور یہی یہاں ہے کہ ان کی توبہ ہرگز قبول نہ ہوگی اور یہی لوگ وہ ہیں جو راہ حق سے بھٹک کر باطل پر لگ گئے۔ حضرت ابن عباس فرماتے ہیں کہ کچھ لوگ مسلمان ہوئے پھر مرتد ہو گئے پھر اسلام لائے پھر مرتد ہو گئے' پھر اپنی قوم کے پاس آدمی بھیج کر دریافت کیا کہ اب بھی توبہ قبول ہو سکتی ہے۔ انہوں نے حضور ﷺ سے سوال کیا۔ اس پر یہ آیت اُتری۔ (بزار) اس کی اسناد بہت عمدہ ہیں۔

پھر فرماتا ہے کہ کفر پر مرنے والوں کی کوئی نیکی قبول نہیں۔ گو اس نے زمین بھر کر سونا خدا کی راہ میں خرچ کیا ہو۔ نبی ﷺ سے پوچھا گیا کہ عبداللہ بن جدعان جو بڑا مہمان نواز غلام آزاد کرنے والا اور خیر خیرات کرنے والا شخص تھا۔ کیا اسے اس کی یہ نیکی کام آئے گی؟ تو آپ نے فرمایا نہیں۔ اس نے ساری عمر ایک دفعہ بھی: ﴿ یَغْفِرَ لِیْ خَطِیْٓـَٔتِیْ یَوْمَ الدِّیْنِ﴾ (الشعراء: ۸۲) نہیں کہا۔ یعنی اے میرے رب میری خطاؤں کو قیامت والے دن بخش۔ جس طرح اس کی خیرات نامقبول ہے اسی طرح فدیہ اور معاوضہ بھی جیسے اور جگہ ہے: ﴿وَلَا یُقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا تَنْفَعُهَا شَفَاعَةٌ﴾ (البقرۃ: ۱۲۳) اس سے نہ بدلہ مقبول ﴿اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا لَوْ اَنَّ لَهُمْ......﴾ (المائدہ: ۳۶) یعنی اگر کافروں کے پاس زمین میں جو کچھ ہے ہو اور اتنا ہی اور بھی ہو پھر وہ اس کو قیامت کے عذابوں کے بدلے فدیہ دیں تو بھی نامقبول ہے۔ ان تکلیف والے المناک عذابوں کو سہنا ہی پڑے گا۔ یہی مضمون یہاں بھی بیان فرمایا گیا ہے۔ بعضوں نے وَلَوِ افْتَدٰى کی واؤ کو زائد کہا ہے لیکن واؤ کو عطف کی ماننا اور وہ تفسیر کرنا جو ہم نے کی بہت بہتر ہے واللہ اعلم۔

پس ثابت ہوا کہ خدا کے عذاب سے کفار کو کوئی چیز چھڑا نہیں سکتی۔ گو وہ بڑے نیک اور نہایت سخی ہوں۔ گو زمین بھر سونا راہ خدا میں لٹائیں یا پہاڑوں اور ٹیلوں مٹی اور ریت نرم زمین اور سخت زمین خشکی اور تری کے ہم وزن سونا عذاب کے بدلے میں دینا چاہیں دیں۔ مسند احمد میں ہے رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں' جہنمی سے قیامت کے دن کہا جائے گا کہ زمین پر جو کچھ ہے اگر تیرا ہو جائے تو کیا تو ان سب کو اپنی سزاؤں کے بدلے اپنے فدیے میں دے ڈالے گا۔ وہ کہے گا ہاں۔ تو جناب باری کا ارشاد ہو گا کہ میں تجھ سے بہ نسبت اس کے بہت ہی کم چاہا تھا۔ میں نے تجھ سے اس وقت وعدہ لیا تھا۔ جب تو اپنے باپ آدم علیہ السلام کی پیٹھ میں تھا کہ میرے ساتھ کسی کو شریک نہ بنانا لیکن تو بے شرک کئے نہ رہا۔ یہ حدیث بخاری و مسلم میں بھی دوسری سند کے ساتھ ہے۔

مسند احمد کی ایک اور حدیث میں ہے حضرت ابن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں' رسول کریم ﷺ نے فرمایا ایک جنتی کو لایا جائے گا اور اس سے اللہ تعالیٰ فرمائے گا۔ کہو تم نے کیسی جگہ پائی۔ وہ جواب دے گا خدایا بہت ہی بہتر۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا اچھا اور جو کچھ مانگنا چاہو' مانگو دل میں جو تمنا ہو کہو۔ تو یہ کہے گا باری تعالیٰ مجھے صرف یہی تمنا ہے اور میرا ایک یہی سوال ہے کہ مجھے دنیا میں پھر بھیج دیا جائے۔ میں تیری راہ میں جہاد کروں اور پھر شہید کیا جاؤں۔ پھر زندہ کیا جاؤں پھر شہید کیا جاؤں۔ دس مرتبہ ایسا ہی ہو کیونکہ وہ شہادت کی فضیلت اور شہید کے مرتبے دیکھ چکا ہے۔ اسی طرح ایک جہنمی کو بلایا جائے گا اور اس سے خدا تعالیٰ فرمائے گا' اے ابن آدم تو نے اپنی جگہ کیسی پائی' وہ کہے گا خدایا بہت بُری۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا' کیا ساری زمین بھر سونا دے کر ان عذابوں سے چھوٹنا تجھے پسند ہے' وہ کہے گا ہاں باری تعالیٰ۔ اس وقت جناب باری عزاسمہٗ فرمائے گا تو جھوٹا ہے۔ میں نے اس سے بہت ہی کم اور بالکل آسان چیز تجھ سے طلب کی تھی[1] لیکن تو نے اسے بھی نہ کیا۔ چنانچہ وہ جہنم میں بھیج دیا جائے گا۔ پس یہاں فرمایا' ان کے لئے تکلیف وہ عذاب ہیں اور کوئی انہیں ان دردناک عذابوں سے نہیں بچا سکتا۔ (اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے عذاب سے نجات دے' آمین)۔

---

[1] یعنی اسلام' خدا کی وحدانیت' رسول اللہ ﷺ کی رسالت پر ایمان و یقین اور شرک سے پرہیز' یہ معمولی مطالبے کئے گئے تھے۔ جب ان مطالبات کو پورا نہیں کیا گیا تو اب جہنم کے علاوہ کفار و مشرکین کا اور کوئی ٹھکانہ نہیں ہے۔

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ؕ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَیْءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِیْمٌ ﴿۹۲﴾

تم خیر کامل کو کبھی نہ حاصل کر سکو گے یہاں تک کہ اپنی پیاری چیز کو خرچ نہ کرو گے اور جو کچھ بھی خرچ کرو گے اللہ تعالیٰ اس کو خوب جانتے ہیں۔○

سب سے زیادہ پسندیدہ مال راہِ الٰہی میں دینے کا بدلہ جنت ہے ☆

حضرت عمرو بن میمونؒ فرماتے ہیں بر سے مراد جنت ہے یعنی اگر تم اپنی پسند کی چیزیں اللہ تعالیٰ کی راہ میں صدقہ کرتے رہو گے تو تمہیں جنت ملے گی۔ مسند احمد میں ہے کہ حضرت ابوطلحہؓ مالدار صحابی تھے۔ مسجد کے سامنے ہی بیرحا نامی آپ کا ایک باغ تھا جس میں کبھی کبھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی تشریف لے جایا کرتے تھے اور یہاں کا خوش ذائقہ پانی پیا کرتے تھے۔ جب یہ آیت اتری تو حضرت ابوطلحہؓ بارگاہ نبوی ﷺ میں حاضر ہو کر عرض کرنے لگے کہ یا رسول اللہ! میرا تو سب سے زیادہ پیارا مال یہی باغ ہے۔ میں آپ کو گواہ کرتا ہوں کہ میں نے اسے راہ للہ صدقہ کیا' اللہ تعالیٰ مجھے بھلائی عطا فرمائے اور اپنے پاس اسے میرے لئے ذخیرہ کرے۔ آپ کو اختیار ہے جس طرح چاہیں' اسے تقسیم کر دیں۔ آپ بہت ہی خوش ہوئے اور فرمانے لگے' مسلمانوں کو اس سے بہت فائدہ پہنچے گا' تم اسے اپنے قرابت داروں میں تقسیم کر دو' چنانچہ حضرت ابوطلحہؓ نے اسے اپنے رشتہ داروں اور چچازاد بھائیوں میں بانٹ دیا۔

بخاری و مسلم میں ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی خدمت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں حاضر ہوئے اور کہا کہ حضور ﷺ مجھے اپنے تمام مال میں سب سے زیادہ مرغوب مال خیبر کی زمین کا حصہ ہے۔ میں اسے راہ للہ دینا چاہتا ہوں' فرمائیے کیا کروں؟ آپ نے فرمایا' اسے وقف کر دو' اصل روک لو اور پھل وغیرہ راہ اللہ کر دو۔ مسند بزار میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں' میں نے اس آیت کی تلاوت کر کے سوچا تو مجھے کوئی چیز ایک کنیز سے زیادہ پیاری نہ تھی' میں نے اس لونڈی کو راہ للہ آزاد کر دیا' اب تک بھی میرے دل میں اس کی ایسی محبت ہے کہ اگر کسی چیز کو اللہ تعالیٰ کے نام پر دے کر پھر لوٹا دینا جائز ہوتا تو میں اس سے نکاح کر لیتا۔

كُلُّ الطَّعَامِ كَانَ حِلًّا لِّبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اِلَّا مَا حَرَّمَ اِسْرَآءِیْلُ عَلٰى نَفْسِهٖ مِنْ قَبْلِ اَنْ تُنَزَّلَ التَّوْرٰىةُ ؕ قُلْ فَاْتُوْا بِالتَّوْرٰىةِ فَاتْلُوْهَآ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ﴿۹۳﴾ فَمَنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَاُولٰٓىِٕكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۹۴﴾ قُلْ صَدَقَ اللّٰهُ ۫ فَاتَّبِعُوْا مِلَّةَ اِبْرٰهِیْمَ حَنِیْفًا ؕ وَمَا كَانَ مِنَ

الْمُشْرِكِينَ ﴿٩٥﴾

سب کھانے کی چیزیں (نزول تورات کے قبل) باستثناء اس کے جس کو یعقوبؑ نے اپنے نفس پر حرام کر لیا تھا بنی اسرائیل پر حلال تھیں فرما دیجئے کہ پھر تورات لاؤ پھر اس کو پڑھو اگر تم سچے ہو۔ سو جو شخص اس کے بعد اللہ تعالیٰ پر جھوٹ بات کی تہمت لگائے تو ایسے لوگ بڑے بے انصاف ہیں آپ کہہ دیجئے کہ اللہ تعالیٰ نے سچ کہہ دیا سو تم ملت کا اتباع کرو جس میں ذرا کجی نہیں اور وہ مشرک نہ تھے۔ ○

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اہلِ کتاب کو چیلنج ☆

مسند احمد میں ہے کہ یہودیوں کی ایک جماعت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئی اور کہنے لگی کہ ہم آپ سے چند سوال کرنا چاہتے ہیں جن کے جواب نبیوں کے سوا اور کوئی نہیں جانتا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا پوچھو لیکن پہلے تم لوگ وعدہ کرو اگر میں صحیح صحیح جواب دے دوں تو تمہیں میری نبوت کے تسلیم کر لینے میں کوئی عذر نہ ہوگا۔ انہوں نے اس شرط کو منظور کر لیا کہ اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سچے جواب دیئے تو ہم اسلام قبول کر لیں گے' ساتھ ہی انہوں نے بڑی قسمیں بھی کھائیں پھر پوچھا کہ بتایئے حضرت اسرائیل نے کیا چیز اپنے اوپر حرام کی تھی؟ عورت اور مرد کے پانی کی کیا کیفیت ہے؟ اور کیوں کبھی لڑکا ہوتا ہے اور کبھی لڑکی؟ اور نبی اُمی کی نیند کیسی ہے؟ اور فرشتوں میں سے کون سا فرشتہ اس کے پاس وحی لے کر آتا ہے؟

اس کے بعد پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوبارہ ان سے قسمیں لیں اور پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب حضرت اسرائیل سخت بیمار ہوئے تو نذر مانی کہ اگر اللہ تعالیٰ مجھے شفا دے گا تو میں سب سے زیادہ پیاری چیز کھانے پینے کی چھوڑ دوں گا' جب شفا یاب ہو گئے تو اونٹ کا گوشت اور دودھ چھوڑ دیا' مرد کا پانی سفید رنگ کا اور گاڑھا ہوتا ہے اور عورت کا پانی زردی مائل پتلا ہوتا ہے' دونوں میں سے جو اوپر آ جائے اس پر اولاد نر مادہ پیدا ہوتی ہے اور شکل و شباہت میں بھی اسی پر جاتی ہے۔ اس نبی اُمی کی نیند میں اس کی آنکھیں تو سوتی ہیں لیکن دل جاگتا رہتا ہے۔ میرے پاس وحی لے کر وہی فرشتہ آتا ہے جو تمام انبیاء کے پاس بھی آتا رہا یعنی جبرئیلؑ' بس اس پر وہ چیخ اٹھے اور کہنے لگے کہ کوئی دوسرا فرشتہ آپ کا ولی ہوتا تو ہمیں آپ کی نبوت تسلیم کرنے میں کوئی عذر نہ ہوتا۔ ہر سوال کے جواب کے وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم انہیں قسم دیتے اور ان سے دریافت فرماتے اور وہ اقرار کرتے کہ ہاں جواب صحیح ہے' انہیں کے بارے میں آیت: ﴿مَن كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيلَ﴾ (البقرہ:۹۷) نازل ہوئی۔ اور روایت میں ہے کہ حضرت اسرائیلؑ کو عرق النساء کی بیماری تھی اور اس میں ان کا ایک پانچواں سوال یہ بھی ہے کہ یہ رعد کیا چیز ہے؟ آپ نے فرمایا اللہ عزوجل کے فرشتوں میں سے ایک فرشتہ ہے جو بادلوں پر مقرر ہے۔ اس کے ہاتھ میں ایک آگ کا کوڑا ہے جس سے بادلوں کو جہاں اللہ تعالیٰ کا حکم ہو لے جاتا ہے اور یہ گرج کی آواز اسی کی آواز ہے۔ جبرئیل کا نام سن کر یہ کہنے لگے وہ تو عذاب اور جنگ و جدال کا فرشتہ ہے اور ہمارا دشمن ہے' اگر پیداوار اور بارش کا فرشتہ حضرت میکائیلؑ آپ کے رفیق ہوتے تو مان لیتے۔ حضرت یعقوبؑ کی روش پر ان کی اولاد بھی رہی اور وہ بھی اونٹ کے گوشت سے پرہیز کرتی رہی۔ اس آیت کو اگلی آیت سے مناسبت ایک تو یہ ہے کہ جس طرح حضرت اسرائیلؑ نے اپنی چہیتی چیز اللہ کی نذر کر دی' اسی طرح تم بھی کیا کرو لیکن یعقوبؑ کی شریعت میں اس کا طریقہ یہ تھا کہ اپنی پسندیدہ اور مرغوب چیز کو نام اللہ پر ترک کر دیتے تھے اور ہماری شریعت میں یہ طریقہ نہیں بلکہ ہمیں یہ فرمایا گیا ہے کہ ہم اپنی پسندیدہ چیزیں اللہ کے نام پر خرچ کر دیا کریں۔ جیسے فرمایا: ﴿وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ

(البقرہ:۱۷۷) اور فرمایا: ﴿يُطْعِمُونَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ﴾ (الدھر:۸) باوجود محبت اور پسندیدگی کے وہ ہماری راہ میں مال خرچ کرتے ہیں اور مسکینوں کو کھانا دیتے ہیں۔ دوسری مناسبت یہ بھی ہے کہ پہلی آیتوں میں نصرانیوں کی تردید تھی تو یہاں یہودیوں کا رد ہو رہا ہے۔ ان کے رد میں حضرت عیسیٰ کی پیدائش کا صحیح واقعہ بتا کر ان کے عقیدے کا رد کیا تھا۔

خدا کی طرف سے احکام میں ردوبدل ☆

یہاں نسخ کا صاف بیان کر کے ان کے باطل عقیدے کی تردید میں ارشاد ہو رہا ہے۔ ان کی کتاب میں صاف موجود تھا کہ جب حضرت نوح کشتی میں سے خشکی پر اترے تو ان تمام جانوروں کا کھانا حلال تھا۔ پھر حضرت یعقوبؑ نے اونٹ کا گوشت اور اونٹ کا دودھ اپنے اُوپر حرام کر لیا تو ان کی اولاد بھی اسے حرام جانتی رہی چنانچہ تورات میں بھی اس کی حرمت نازل ہوئی' اسی طرح اور بھی بعض چیزیں حرام کی گئیں۔ یہ نسخ نہیں تو اور کیا ہے؟ حضرت آدمؑ کی صلبی اولاد کا آپس میں بہن بھائی کا نکاح ابتداءً جائز ہوتا تھا لیکن بعد میں حرام ہو گیا' عورتوں پر لونڈیوں سے نکاح کرنا شریعت ابراہیمی میں مباح تھا' خود حضرت ابراہیم علیہ السلام حضرت سارہ اور حضرت حاجرہؑ کو لائے۔ لیکن پھر تورات میں اس سے روکا گیا۔ دو بہنوں سے ایک ساتھ نکاح کرنا حضرت یعقوب علیہ السلام کے زمانہ میں جائز تھا بلکہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے بیک وقت دو سگی بہنیں تھیں۔ لیکن پھر تورات میں یہ حرام ہو گیا اسی کو نسخ کہتے ہیں۔ اسے وہ دیکھ رہے ہیں۔ اپنی کتاب میں پڑھ رہے ہیں۔ لیکن نسخ کا انکار کر کے انجیل کو اور حضرت عیسیٰ کو نہیں مانتے اور ان کے بعد ختم المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بھی یہی کرتے ہیں تو فرمایا کہ تورات کے نازل ہونے سے پہلے تمام کھانے حلال تھے۔ سوائے اس کے جسے اسرائیلؑ نے اپنی جان پر حرام کر لیا تھا۔ تم تورات لاؤ اور پڑھو اس میں موجود ہے۔ پھر باوجود اس کے تمہاری یہ بہتان بازیاں اور افترا پردازیاں کہ خدا نے ہمارے لئے ہفتہ ہی کے دن کو ہمیشہ کے لئے عید کا دن مقرر کیا ہے اور ہم سے عہد کر لیا ہے کہ ہم ہمیشہ تورات کے ہی عامل رہیں اور کسی نبی کو نہ مانیں۔ یہ کس قدر ظلم ہے۔ ان تمام باتوں کے باوجود تمہاری یہ روش تمہارے حد سے آگے بڑھ جانے کی دلیل ہے۔ اللہ نے سچی خبر دے دی ابراہیمی دین وہی ہے جسے قرآن بیان کر رہا ہے۔ تم اس کتاب اور اس نبی کی پیروی کرو۔ نہ ان سے اعلیٰ کوئی نبی' نہ اس سے بہتر اور زیادہ واضح کوئی شریعت۔ جیسے ایک اور جگہ ہے: ﴿اِنَّنِيْ هَدٰىنِيْ رَبِّيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ...﴾ (انعام:۱۶۱) اے نبی تم کہہ دو کہ مجھے میرے ربّ نے سیدھی راہ ابراہیم حنیف موحد کے مضبوط دین کی دکھا دی ہے۔ اور جگہ ہے ہم نے تیری طرف وحی کی کہ ابراہیم علیہ السلام حنیف موحد کے دین کی تابعداری کرو۔

اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِيْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّهُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿٩٦﴾ فِيْهِ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ مَّقَامُ اِبْرٰهِيْمَ ۚ وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا ۭ وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا ۭ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ ﴿٩٧﴾

یقیناً وہ مکان جو سب سے پہلے لوگوں کے واسطے مقرر کیا گیا وہ مکان ہے جو کہ مکہ میں ہے جس کی حالت یہ ہے کہ وہ برکت والا ہے اور جہاں بھر کے لوگوں کا رہنما ہے اس میں کھلی نشانیاں ہیں منجملہ ان کے ایک مقام ابراہیم ہے اور جو شخص اس میں داخل ہو جائے وہ امن والا ہو جاتا ہے اور اللہ کے واسطے لوگوں کے ذمہ اس مکان کا حج کرنا ہے یعنی اس شخص کے ذمہ جو کہ طاقت رکھے وہاں تک کی سبیل کی اور جو شخص منکر ہو تو اللہ تعالیٰ تمام جہانوں سے غنی ہیں۔ ○

خداوند کریم کا پہلا گھر اور اس کی برکات ☆

یعنی لوگوں کی عبادت قربانی' طواف' نماز' اعتکاف وغیرہ کے لئے خانہ خدا جس کے بانی حضرت ابراہیم خلیل اللہ ہیں۔ جن کی تابعداری کا دعویٰ یہود و نصاریٰ مشرکین اور مسلمان سب کو ہے، وہ ہے جو سب سے پہلے مکہ میں بنایا گیا ہے۔ یہی خلیل اللہ حج کے پہلے منادی ہیں۔ پھر تعجب اور افسوس ہے ان پر جو ملت حنفی کا دعویٰ کریں اور اس کا احترام نہ کریں۔ حج کو یہاں نہ آئیں بلکہ اپنے قبلے اور کعبے الگ الگ کرتے پھریں۔ اس بیت اللہ کی تعمیر میں تمام دنیا کے لئے خیر و برکت ہے۔ حضرت ابوذرؓ نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ سب سے پہلے کونسی مسجد بنائی گئی۔ آپ ﷺ نے فرمایا: مسجد حرام۔ پوچھا: پھر کونسی؟ فرمایا: مسجد بیت المقدس۔ پوچھا: ان دونوں کے درمیان کتنے زمانہ کا فاصلہ ہے؟ فرمایا: چالیس سال۔ پوچھا: پھر کونسی؟ آپ نے فرمایا: جہاں کہیں نماز کا وقت آ جائے نماز پڑھ لیا کرو ساری زمین مسجد ہے۔ (مسند احمد و بخاری و مسلم)۔

حضرت علیؓ فرماتے ہیں' گھر تو پہلے بہت سے تھے، لیکن خاص خدا کی عبادت کے لئے سب سے پہلے یہی گھر ہے، کسی شخص نے آپ سے پوچھا کہ زمین پر پہلا گھر یہی بنا ہے؟ تو آپ نے فرمایا: نہیں البتہ بابرکت مقام ابراہیم اور امن کا پہلا گھر یہی ہے۔ بیت اللہ شریف کے بنانے کی پوری کیفیت سورہ بقرہ کی آیت: ﴿وَعَهِدْنَا اِلٰى اِبْرٰهٖمَ﴾ کی تفسیر پہلے گزر چکی ہے۔ وہیں ملاحظہ فرمائیے۔ یہاں دوبارہ بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ سدیؒ کہتے ہیں سب سے پہلے روئے زمین پر یہی گھر بنا لیکن صحیح قول حضرت علیؓ کا ہی ہے اور وہ حدیث جو بیہقی میں ہے کہ آدم و حوا نے بحکم خدا بیت اللہ بنایا اور طواف کیا اور خدا نے کہا کہ تو سب سے پہلا انسان ہے اور یہ سب سے پہلا گھر ہے۔ اس حدیث میں ابن لہیعہ راوی ضعیف ہے۔ ممکن ہے یہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا اپنا قول ہو اور یرموک والے انہیں جو دو پورے اہل کتاب کی کتابوں کے ملے تھے، انہی میں یہ بھی لکھا ہوا ہو۔ بکہ۔ مکہ شریف کا مشہور نام ہے۔ چونکہ بڑے بڑے جابر شخصوں کی گردنیں یہاں ٹوٹ جاتی تھیں۔ یہاں پر بڑائی والا پست ہو جاتا تھا۔ اس لئے اسے بکہ کہا گیا اور اس لئے بھی کہ یہاں لوگ غلط ملط ہو جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ کبھی عورتیں آگے نماز پڑھتی ہوتی ہیں اور مردان کے پیچھے ہوتے ہیں۔ حالانکہ ایسا اور کہیں نہیں ہوتا۔

حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں فج سے تنعیم تک تو مکہ ہے اور بیت اللہ سے بطحا تک بکہ ہے۔ بیت اللہ اور مسجد کو بکہ کہا گیا ہے۔ بیت اللہ اور اس کے آس پاس کی جگہ کو بکہ اور باقی شہر کو مکہ بھی کہا گیا ہے۔ اس کے اور بھی بہت سے نام ہیں۔ مثلاً بیت العتیق، بیت الحرام، بلد الامین، بلد المامون، ام رحم، ام القریٰ، صلاح عرش، قادش، مقدس، ناسیہ، ناسسہ، حاطمہ، اس کو ناء البلدة البینہ الکعبة بھی کہا گیا ہے اس کے ظاہری اعلام اس کی عظمت و شرافت پر دلیل ہیں اور جن سے ظاہر ہے کہ خلیل خدا کی بنا یہی ہے۔ اس میں مقام ابراہیم بھی ہے جس پر کھڑے ہو کر حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ پتھر لیتے تھے اور کعبہ کی دیواریں اونچی کر دیتے تھے۔ یہ پہلے تو بیت اللہ شریف کی دیوار سے لگا ہوا تھا۔ لیکن حضرت عمرؓ نے اپنی خلافت کے زمانہ

میں اسے ذرا ہٹا کر مشرق رُخ کر دیا تا کہ طواف پوری طرح ہو سکے اور جو لوگ طواف کے بعد مقام ابراہیم کے پیچھے نماز پڑھتے ہیں۔ انہیں تشویش اور بھیڑ بھاڑ نہ ہو۔ اسی کی طرف نماز پڑھنے کا حکم ہوا ہے۔ اس کے متعلق بھی پوری تفسیر ﴿وَاتَّخِذُوا مِن مَّقَامِ إِبْرَاهِيمَ﴾ (البقرہ ۱۲۵) کی تفسیر میں پہلے گزر چکی ہے۔ فالحمدللہ۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ خلیل اللہ کے نشان قدم جو مقام ابراہیم پر تھے، یہ بھی آیات بینات میں سے ہے۔ حرم حطیم اور سارے ارکانِ حج کو بھی مقام ابراہیم کی تفسیر میں مفسرین نے داخل کیا ہے۔ اس میں آنے والا امن میں آ جاتا ہے۔ جاہلیت کے زمانہ میں بھی مکہ مقام امن تھا۔ باپ کے قاتل کو بھی یہاں پاتے تو نہ چھیڑتے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں' بیت اللہ پناہ چاہنے والے کو پناہ دیتا ہے لیکن جگہ اور کھانا پینا نہیں دیتا۔ ایک اور جگہ ہے: ﴿أَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّا جَعَلْنَا حَرَمًا آمِنًا﴾ (العنکبوت: ۶۷) کیا یہ نہیں دیکھتے کہ ہم نے حرم کو امن کی جگہ بنایا اور جگہ ہے: ﴿وَآمَنَهُم مِّنْ خَوْفٍ﴾ (القریش: ۴) ہم نے انہیں خوف سے امن دیا۔ نہ صرف انسان کو امن ہے بلکہ شکار کرنا اور شکار کو بھگانا' اسے خوفزدہ کرنا، اُسے اس کے ٹھکانے یا گھونسلے سے ہٹانا اور اڑانا بھی منع ہے۔ اس کے درخت کاٹنا، یہاں کی گھاس اُکھیڑنا بھی ناجائز ہے[1] اس مضمون کی بہت سی احادیث پورے بسط کے ساتھ آیت: ﴿عَهِدْنَا﴾ کی تفسیر میں سورہ بقرہ میں گزر چکی ہیں۔

مسند احمد، ترمذی اور نسائی میں حدیث ہے، جسے امام ترمذی نے حسن صحیح کہا ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ کے بازار حرورہ میں کھڑے ہو کر فرمایا کہ: اے مکہ تو اللہ تعالیٰ کو ساری زمین سے بہتر اور پیارا ہے۔ اگر میں زبردستی تجھ میں سے نہ نکالا جاتا تو ہرگز تجھے نہ چھوڑتا اور اس آیت کے ایک معنی یہ بھی ہیں کہ وہ جہنم سے بچ گیا۔ بیہقی کی ایک مرفوع حدیث میں ہے جو بیت اللہ میں داخل ہوا، وہ نیکی میں آیا اور برائیوں سے دُور ہوا۔ اس کے گناہ بخش دیئے گئے۔ لیکن اس کے ایک راوی عبداللہ بن نوفل قوی نہیں۔ آیت کا یہ آخری حصہ حج کی فرضیت پر دلیل ہے۔ بعض کہتے ہیں: ﴿وَأَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلَّهِ﴾ (البقرہ ۱۹۶) والی آیت دلیل فرضیت ہے لیکن پہلی بات زیادہ ظاہر ہے کئی ایک احادیث میں وارد ہے کہ حج ارکان اسلام میں سے ایک رکن ہے۔ اس کی فرضیت پر مسلمانوں کا اجماع ہے اور یہ بات بھی ثابت ہے کہ عمر بھر میں ایک مرتبہ استطاعت والے مسلمان پر حج فرض ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ میں فرمایا، لوگو! تم پر اللہ تعالیٰ نے حج فرض کیا ہے تم حج کرو۔ ایک شخص نے پوچھا: حضور ﷺ کیا ہر سال؟ آپ ﷺ خاموش ہو گئے۔ اس نے تین مرتبہ یہی سوال کیا۔ آپ نے فرمایا: اگر میں ہاں کہہ دیتا تو فرض ہو جاتا۔ پھر بجا نہ لا سکتے۔ میں جو نہ کہوں تم اس کی پوچھ پاچھ نہ کرو۔ تم سے اگلے لوگ سوالوں کی بھرمار سے نبیوں پر اختلاف کرنے سے ہلاک ہو گئے۔ میرے حکموں کو طاقت بھر بجا لاؤ اور جس چیز سے منع کروں اس سے رک جاؤ۔ (مسند احمد) صحیح مسلم شریف میں اتنی زیادتی اور ہے کہ یہ پوچھنے والے اقرع بن حابسؓ تھے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب میں یہ بھی فرمایا کہ عمر میں ایک مرتبہ فرض ہے اور پھر نفل۔ ایک اور روایت میں ہے، کہ اسی سوال کے بارے میں آیت: ﴿لَا تَسْأَلُوا عَنْ أَشْيَاءَ﴾ (یعنی زیادتی سوال سے بچو) نازل ہوئی۔ (مسند احمد)

ایک اور روایت میں ہے اگر میں ہاں کہتا اور ہر سال حج واجب ہوتا تو بجا نہ لا سکتے اور عذاب نازل ہوتا۔ (ابن ماجہ)

---

[1] اذخر ایک گھاس ہے اس کا ضرورۃً اُکھاڑنا جائز ہے جیسا کہ روایات احادیث سے معلوم ہوتا ہے۔

[2] کیونکہ اکثر حالات میں نبی کا قول ہی قانون کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے اس لیے نبی کریم ﷺ نے موشگافیوں سے روک دیا۔

ہاں حج میں تمتع کرنے کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع میں امہات المومنین یعنی اپنی بیویوں سے فرمایا تھا کہ حج ہو چکا، اب گھر سے نہ نکلنا۔ وہی استطاعت اور طاقت، سو وہ کبھی تو خود انسان کو بغیر کسی ذریعہ لئے ہوتی ہے۔ کبھی کسی اور کے واسطے سے جیسے کہ کتب احکام میں اس کی تفصیل موجود ہے۔ ترمذی میں ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ: یا رسول اللہ ﷺ حاجی کون ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا پراگندہ بالوں اور میلے کچیلے کپڑوں والا۔ ایک اور نے پوچھا، یا رسول ﷺ اللہ کون سا حج افضل ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: جس میں قربانیاں کثرت سے کی جائیں اور لبیک زیدہ پکارا جائے۔ ایک اور شخص نے سوال کیا، حضور ﷺ سبیل سے کیا مراد ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا توشہ، کھانے پینے کے لائق خرچ اور سواری۔ اس حدیث کا ایک راوی گو ضعیف ہے۔ مگر حدیث کی متابعت اور سندوں سے بھی ہے۔ بہت سے صحابہ سے مختلف سندوں سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ﴿مَنِ اسۡتَطَاعَ اِلَيۡهِ سَبِيۡلًا﴾ کی تفسیر میں زاد و راحلہ یعنی توشہ اور سوری بتلائی ہے۔ مسند کی ایک اور حدیث میں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں، فرض حج جلدی ادا کر لیا کرو، نہ معلوم کیا پیش آ جائے۔ ابوداؤد وغیرہ میں ہے، حج کا ارادہ کرنے والے کو جلد اپنا ارادہ پورا کر لینا چاہئے۔ ابن عباسؓ فرماتے ہیں، جس کے پاس تین سو درہم ہوں وہ طاقت والا ہے۔ عکرمہ فرماتے ہیں مراد صحت جسمانی ہے پھر فرمایا جو کفر کرے یعنی فرضیت حج سے انکار کرے۔ حضرت عکرمہ فرماتے ہیں، جب یہ آیت اُتری کہ دین اسلام کے سوا جو شخص کوئی اور دین تلاش کرے اس سے قبول نہ کیا جائے تو یہودی کہنے لگے ہم بھی مسلمان ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، پھر مسلمانوں پر تو حج فرض ہے تم بھی حج کرو تو وہ صاف انکار کر بیٹھے۔ جس پر یہ آیت اُتری کہ اس کا انکار کرنے والا کافر ہے اور اللہ تمام جہان والوں سے بے پرواہ ہے۔

حضرت علیؓ فرماتے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، جو شخص کھانے پینے اور سواری پر قدرت رکھتا ہو، اتنا مال اس کے پاس ہو، پھر حج نہ کرے تو اس کی موت یہودیت یا نصرانیت پر ہو گی۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اللہ کے لئے لوگوں پر حج بیت اللہ ہے جو اس کے راستے کی طاقت رکھیں اور جو کفر کریں تو اللہ تعالیٰ تمام جہان والوں سے بے پرواہ ہے۔ اس کے راوی پر بھی کلام ہے۔ حضرت عمر فاروقؓ فرماتے ہیں طاقت رکھ کر حج نہ کرنے والا یہودی ہو کر مرے گا یا نصرانی ہو کر۔ اس کی سند بالکل صحیح ہے (حافظ ابوبکر اسماعیلی) سند سعید بن منصور میں ہے کہ فاروقِ اعظمؓ نے فرمایا، میرا مقصد ہے کہ میں لوگوں کو مختلف شہروں میں بھیجوں، وہ دیکھیں جو لوگ باوجود مال رکھنے کے حج نہ کرتے ہوں، ان پر جزیہ لگا دیں۔ وہ مسلمان نہیں ہیں۔

قُلۡ يٰۤاَهۡلَ الۡكِتٰبِ لِمَ تَكۡفُرُوۡنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ۖ وَاللّٰهُ شَهِيۡدٌ عَلٰى مَا تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۹۸﴾

قُلۡ يٰۤاَهۡلَ الۡكِتٰبِ لِمَ تَصُدُّوۡنَ عَنۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ مَنۡ اٰمَنَ تَبۡغُوۡنَهَا عِوَجًا وَّاَنۡتُمۡ شُهَدَآءُ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۹۹﴾

آپ فرما دیجئے کہ اے اہل کتاب تم کیوں انکار کرتے ہو اللہ تعالیٰ کے احکام کا حالانکہ اللہ تعالیٰ تمہارے سب

۱ مطلب نبی کریم ﷺ کا یہ ہے کہ جو حج کی فرضیت کا قائل نہ ہو تو ایسا شخص کافر ہے لیکن اگر حج کی فرضیت کا تو قائل ہو مگر تساہل کی بناء پر کرتا نہیں تو گنہگار ہے لیکن اس کو کافر نہیں کہہ سکتے۔ اس طرح کی وعید نبی کریم ﷺ سے نماز کے بارے میں بھی وارد ہوئی ہے۔

کاموں کی اطلاع رکھتے ہیں آپ فرما دیجئے اے اہل کتاب کیوں ہٹاتے ہو اللہ تعالیٰ کی راہ سے ایسے شخص کو جو ایمان لا چکا اس طور پر کہ کجی ڈھونڈتے ہو اس راہ کے لئے حالانکہ تم بھی اطلاع رکھتے ہو اور اللہ تعالیٰ تمہارے کاموں سے بے خبر نہیں ۔O

آیات اللہ کا انکار بڑا جرم ہے ☆

اہل کتاب کے کافروں کو اللہ تعالیٰ دھمکاتا ہے جو حق سے عناد کرتے تھے اور اللہ تعالیٰ کی آیتوں سے کفر کرتے تھے اور لوگوں کو بھی پورے زور سے اسلام سے روکتے تھے۔ باوجودیکہ رسول کی حقانیت کا انہیں یقینی علم تھا۔ اگلے انبیاء اور رسولوں کی پیش گوئیاں اور ان کی بشارتیں ان کے پاس موجود تھیں نبی اُمی ہاشمی عربی مکی مدنی سید اولاد آدم خاتم الانبیاء رسول ربّ ارض وسما علی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا ذکر ان کی کتابوں میں موجود تھا۔ پھر بھی اپنی بے ایمانی پر اڑے ہوئے تھے اس لئے اب سے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں خوب دیکھ رہا ہوں، تم کس طرح میرے نبیوں کی تکذیب کرتے ہو اور کس طرح خاتم النبین کو ستاتے ہو اور کس طرح میرے مخلص بندوں کی راہ میں روڑے اٹکا رہے ہو۔ میں تمہارے اعمال سے غافل نہیں ہوں تمام برائیوں کا بدلہ دوں گا۔ اس دن پکڑوں گا۔ جس دن کوئی سفارشی اور مددگار نہ ملے گا۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ تُطِيْعُوْا فَرِيْقًا مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ يَرُدُّوْكُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ كٰفِرِيْنَ ۝۱۰۰ وَكَيْفَ تَكْفُرُوْنَ وَاَنْتُمْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ اٰيٰتُ اللّٰهِ وَفِيْكُمْ رَسُوْلُهٗ ۭ وَمَنْ يَّعْتَصِمْ بِاللّٰهِ فَقَدْ هُدِيَ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝۱۰۱ؑ

اے ایمان والو اگر تم کہنا مانو گے کسی فرقے کا ان لوگوں میں سے جن کو کتاب دی گئی ہے تو وہ لوگ تم کو تمہارے ایمان لائے پیچھے کافر بنا دیں گے اور تم کفر کیسے کر سکتے ہو حالانکہ تم کو اللہ تعالیٰ کے احکام پڑھ کر سنائے جاتے ہیں اور تم میں اللہ کے رسول موجود ہیں اور جو شخص اللہ تعالیٰ کو مضبوط پکڑتا ہے تو ضرور راہ راست کی ہدایت کیا جاتا ہے۔O

کفار سے کوئی تعلق نہیں رکھا جا سکتا ☆

اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے مومن بندوں کو اہل کتاب کے اس بدباطن فرقہ کی اتباع کرنے سے روک رہا ہے۔ کیونکہ یہ حاسد ایمان کے دشمن ہیں اور عرب کی رسالت انہیں ایک آنکھ نہیں بھائی[1]۔ جیسے اور جگہ ہے: ﴿وَدَّ كَثِيْرٌ﴾ یہ لوگ جل بھن رہے ہیں اور تمہیں ایمان سے ہٹانا چاہتے ہیں تم ان کے بھروں میں نہ آ جانا۔ گو کفر تم سے بہت دور ہے۔ تاہم میں تمہیں آگاہ کئے دیتا ہوں۔ خدا کی آیتیں دن رات تم میں پڑھی جا رہی ہیں اور خدا کا سچا رسول صلی اللہ علیہ وسلم تم میں موجود ہے۔ جیسے اور جگہ ہے: ﴿مَا لَكُمْ لَا تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ﴾ (الحدید:۸) تم ایمان کیوں نہ لاؤ گے رسول صلی اللہ علیہ وسلم تمہیں تمہارے رب کی طرف بلا رہے ہیں اور تم سے عہد بھی ہو چکا ہے۔

[1] اہل کتاب منتظر تھے کہ نبی آخر الزمان (صلی اللہ علیہ وسلم) انہیں میں سے ہو گا لیکن خدائی فیصلہ کے مطابق جب نبوت عرب میں بنو ہاشم میں منتقل ہو گئی تو اہل کتاب اس پر بہت چراغ پا ہوئے۔

ایمان بالغیب افضل ہے ☆

حدیث شریف میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک روز اپنے اصحاب سے پوچھا: تمہارے نزدیک سب سے بڑا ایمان والا کون ہے؟ انہوں نے کہا: فرشتے، فرمایا: وہ ایمان کیوں نہ لاتے انہیں تو وحی خدا ہے۔ صحابہ نے کہا پھر ہم؟ فرمایا: تم ایمان کیوں نہ لاتے، تم میں خود موجود ہوں۔ صحابہ نے کہا: پھر حضور خود ہی ارشاد فرمائیں۔ فرمایا: کہ تمام لوگوں سے زیادہ افضل ایمان والے وہ ہیں جو تمہارے بعد آئیں گے۔ وہ کتابوں میں لکھا پائیں گے اور اس پر ایمان لائیں گے۔ پھر فرمایا کہ: باوجود اس کے تمہارا مضبوطی سے دین خدا کو تھام رکھنا اور خدا کی پاک ذات پر پورا توکل رکھنا ہی موجب ہدایت ہے۔ اسی سے گمراہی دور ہوتی ہے۔ یہی رشد و رضا کا باعث ہے۔ اسی سے صحیح راستہ حاصل ہوتا ہے اور کامیابی اور مراد ملتی ہے۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۱۰۲﴾ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا ۠ وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَاۗءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا ۚ وَكُنْتُمْ عَلٰي شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا ۭ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿۱۰۳﴾

اے ایمان والو اللہ سے ڈرا کرو جیسا ڈرنے کا حق ہے اور بجز اسلام کے اور کسی حالت پر جان مت دینا اور مضبوط پکڑے رہو اللہ تعالیٰ کے سلسلہ کو اس طور پر کہ باہم سب متفق بھی رہو اور باہم نا اتفاقی مت کرو اور تم پر جو اللہ کا انعام ہے اس کو یاد کرو جب کہ تم دشمن تھے بس اللہ نے تمہارے قلوب میں الفت ڈال دی سو تم خدا تعالیٰ کے انعام سے آپس میں بھائی بھائی ہو گئے اور تم لوگ دوزخ کے گڑھے کے کنارے پر تھے۔ سو اس سے خدا تعالیٰ نے تمہاری جان بچائی اسی طرح اللہ تعالیٰ تم لوگوں کو اپنے احکام بیان کر کے بتلاتے رہتے ہیں تا کہ تم لوگ راہ پر رہو۔ ○

تقویٰ شعارِ ایمان ہے ☆

اللہ تعالیٰ سے پورا پورا ڈرنا یہ ہے کہ اس کی اطاعت کی جائے اور نافرمانی نہ کی جائے۔ اس کا ذکر کیا جائے اور اس کی یاد نہ بھلائی جائے۔ اس کا شکر کیا جائے کفر نہ کیا جائے۔ بعض روایتوں میں یہ تفسیر مرفوع بھی موجود ہے لیکن ٹھیک بات یہی ہے کہ یہ موقوف ہے یعنی عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قول ہے۔ واللہ اعلم۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ کا فرمان ہے کہ انسان خدا سے ڈرنے کا حق نہیں بجا لا سکتا جب تک اپنی زبان کو محفوظ نہ رکھے۔ اکثر مفسرین نے کہا ہے کہ یہ آیت: ﴿فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ﴾ (التغابن:۱۶) کی آیت سے منسوخ ہے۔ اس دوسری آیت میں فرما دیا کہ اپنی طاقت کے مطابق اس سے ڈرتے رہا کرو۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں، منسوخ نہیں

بلکہ مطلب یہ ہے کہ اللہ کی راہ میں جہاد کرتے رہو۔ اس کے کاموں میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کا خیال نہ کرو عدل پر جم جاؤ۔ یہاں تک کہ خود اپنے نفس پر عدل کے احکام جاری کرو۔ اپنے ماں باپ اور اپنی اولاد کے بارے میں بھی عدل وانصاف برتا کرو۔ پھر بتایا کہ اسلام ہی پر مرنا یعنی تمام زندگی اس پر قائم رہنا، تاکہ موت بھی اس پر آئے اس ربّ کریم کی عادت یہی ہے کہ انسان اپنی زندگی جیسے رکھے ویسی ہی اسے موت آتی ہے اور جس موت پر مرے، اسی پر قیامت کے دن اُٹھایا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کے خلاف سے اپنی پناہ میں رکھے۔ آمین۔

مسند احمد میں ہے کہ لوگ بیت اللہ شریف کا طواف کر رہے تھے اور حضرت ابن عباسؓ بھی وہاں تھے۔ ان کے ہاتھ میں لکڑی تھی۔ بیان فرمانے لگے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کی تلاوت کی پھر فرمایا اگر زقوم کا ایک قطرہ بھی زمین پر گرا دیا جائے تو دنیا والوں کی کھانے پینے کی چیزیں بگڑ جائیں۔ وہ کوئی چیز کھا پی نہ سکیں۔ پھر خیال کرو کہ ان جہنمیوں کا کیا حال ہوگا جن کا کھانا پینا ہی زقوم ہوگا اور حدیث میں ہے کہ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں جو شخص جہنم سے الگ ہونا اور جنت میں جانا چاہتا ہو، اُسے چاہئے کہ مرتے دم تک اللہ تعالیٰ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھے اور لوگوں سے وہ برتاؤ کرے جسے وہ خود اپنے لیئے چاہتا ہو۔ (مسند احمد)

حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ میرا بندہ میرے ساتھ جیسا گمان رکھے میں اس کے گمان کے پاس ہی ہوں۔ اگر اس کا میرے ساتھ حسن ظن ہے تو میں اس کے ساتھ اچھائی کروں گا اور اگر وہ میرے ساتھ بدگمانی کرے گا تو میں اس سے اسی طرح پیش آؤں گا (مسند احمد) اس کا اگلا حصہ بخاری و مسلم میں ہے۔ مسند بزار میں ہے کہ ایک بیمار انصاریؓ کی بیمار پرسی کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے گئے اور سلام کر کے فرمانے لگے کہ کیسے مزاج ہیں؟ اس نے کہا: الحمد اللہ، اچھا ہوں، ربّ کی رحمت کا اُمیدوار ہوں اور اس کے عذابوں سے ڈر رہا ہوں۔ آپ ﷺ نے فرمایا سنو! ایسے وقت میں جس دل میں خوف وطمع دونوں ہوں تو اسے اللہ تعالیٰ اس کی اُمید کی چیز دیتا ہے اور ڈر خوف کی چیز سے بچاتا ہے۔ مسند احمد کی ایک حدیث میں ہے کہ حضرت حکیم بن حزام رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت کی کہ میں کھڑے کھڑے ہی گروں۔ اس کا مطلب امام نسائی نے تو سنن نسائی میں باب باندھ کر یہ بیان کیا ہے کہ سجدے میں اس طرح جانا چاہیے اور یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ میں مسلمان مردوں اور یہ بھی مطلب بیان کیا گیا ہے کہ جہاد میں میں پیٹھ دکھاتا ہوا نہ مارا جاؤں۔

اتفاق واتحاد کی اپیل ☆

پھر فرمایا اتفاق کرو، اختلاف سے بچو۔ جبل اللہ سے مراد عہد خدا ہے۔ جیسے: ﴿اِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ﴾ (آل عمران:۱۱۲) میں بعض کہتے ہیں مراد قرآن ہے۔ ایک مرفوع حدیث میں ہے کہ قرآن خدا کی مضبوط رسی ہے اور اس کی سیدھی راہ ہے اور روایت میں ہے کہ کتاب اللہ خدا کی آسمان سے زمین کی لٹکائی ہوئی رسی ہے اور حدیث میں ہے کہ یہ قرآن خدا کی مضبوط رسی ہے۔ یہ ظاہر نور ہے یہ شفا دینے والا اور نفع بخش ہے۔ اس پر عمل کرنے والے کے لئے یہ حفاظت کا ذریعہ ہے۔ اس کی تابعداری کرنے والے کے لئے یہ نجات ہے۔ حضرت عبداللہ فرماتے ہیں، ان راستوں میں تو شیاطین چل پھر رہے ہیں۔ تم خدائی راستے پر آجاؤ۔ تم اللہ کی رسی کو مضبوط تھام لو۔ وہ رسی قرآن کریم ہے۔ اختلاف نہ کرو۔ پھوٹ نہ ڈالو۔ جدائی نہ

کرو۔اختلافات سے بچو۔صحیح مسلم میں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔تین باتوں سے خدا خوش ہوتا ہے اور تین باتوں سے وہ ناخوش ہوتا ہے۔ایک تو یہ کہ اسی کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو۔دوسرے اللہ کی رسّی اتفاق سے پکڑو، تفرقہ نہ ڈالو۔تیسرے مسلمان بادشاہوں کی خیرخواہی کرو[1]۔(۱) فضول بکواس' (۲) زیادتی سوال[2] اور (۳) بربادیِ مال۔یہ تینوں چیزیں ربّ کی ناراضگی کا سبب ہیں۔بہت سی تو آیتیں ایسی ہیں جن میں ہے کہ اتفاق کے وقت وہ خطا سے بچ جائیں اور بہت سی حدیثوں میں نااتفاقی سے ڈرایا بھی ہے۔لیکن باوجود اس کے اُمت میں اختلاف افتراق پڑا، ان کے تہتر فرقے ہوگئے جن میں سے ایک نجات پاکر جنتی ہوگا اور جہنم کے عذابوں سے بچ رہے گا اور یہ وہ لوگ ہیں جو اس پر قائم ہیں جس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب تھے۔

اتفاق کی برکتیں ☆

پھر اپنی نعمت یاد دلائی۔جاہلیت کے زمانہ میں اوس خزرج کے درمیان بڑی لڑائیاں اور سخت عداوت تھی۔آپس میں برابر جنگ جاری رہتی تھی۔جب دونوں قبیلے اسلام لائے تو خدا کے فضل سے بالکل ایک ہوگئے۔سب حسد بغض جاتا رہا۔اور آپس میں بھائی بھائی بن گئے اور نیکی اور بھلائی کے کاموں میں ایک دوسرے کے مددگار اور خدا کے دین میں ایک دوسرے کے ساتھ متفق ہوگئے۔جیسے اور جگہ ہے: ﴿هُوَ الَّذِىٓ اَيَّدَكَ بِنَصْرِهٖ وَبِالْمُؤْمِنِيْنَ وَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ﴾ (الانفال ٦٢) وہ خدا جس نے تیری تائید کی اپنی امداد سے اور مؤمنوں کے ساتھ اور ان دلوں میں الفت ڈال دی اپنے دوسرے احسان کا ذکر کرتا ہے کہ تم لوگ آگ کے کنارے پہنچ چکے تھے اور تمہارا کفر تمہیں اس میں دھکیل دیتا۔لیکن اسلام کی توفیق فرما کر میں نے تمہیں اس سے بھی الگ کرلیا۔حنین کی فتح کے بعد جب مالِ غنیمت تقسیم کرتے ہوئے مصلحت دینی کے مطابق حضور علیہ اسلام نے بعض لوگوں کو زیادہ مال دیا تو کسی شخص نے کچھ ایسے ہی ناملائم الفاظ زبان سے نکال دیئے۔اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جماعت انصار کو جمع کرکے ایک خطبہ پڑھا اس میں بھی فرمایا تھا کہ: اے جماعت انصار! کیا تم گمراہ نہ تھے؟ پھر خدا نے میری وجہ سے تمہیں ہدایت دی؟ کیا تم متفرق نہ تھے؟ پھر خدا نے میری وجہ سے تمہارے دلوں میں اُلفت ڈال دی۔کیا تم فقیر نہ تھے؟ اللہ تعالیٰ نے تمہیں میری وجہ سے غنی کردیا۔ہر ہر سوال کے جواب میں یہ پاکباز کماعت اور یہ باخدا گروہ کہتا جاتا تھا کہ ہم پر خدا اور رسول کے اور بھی بہت سے احسان ہیں اور بہت بڑے بڑے ہیں۔

یہود نا بہبود کی ایک سازش ☆

حضرت بن اسحٰق فرماتے ہیں کہ جب اوس خزرج جیسے صدیوں سے آپس کے دشمنوں کو یوں بھائی بھائی بنا ہوا دیکھا تو یہودیوں کی آنکھوں میں خار سا کھٹکنے لگا۔انہوں نے آدمی مقرر کئے کہ وہ ان کی بیٹھک اور مجلس میں جایا کریں اور اگلی لڑائیاں اور پرانی عداوتیں انہیں یاد دلائیں، ان کے مقتولوں کی یاد تازہ کرائیں اور اس طرح انہیں بھڑکائیں۔چنانچہ ان کا یہ فریب ایک مرتبہ چل بھی گیا اور دونوں قبیلوں میں پرانی آگ بھڑک اُٹھی۔یہاں تک کہ تلواریں کھینچ گئیں۔دونوں جماعتیں صف آرا ہو گئیں اور جاہلیت کے نعرے لگنے لگے۔ہتھیار بجنے لگے اور ایک دوسرے کے خون کے پیاسے بن گئے اور یہ ٹھہر گیا کہ حرہ

[1] مسلمان ہونے کے ساتھ ساتھ وہ عادل بھی ہوں ورنہ فاسق بادشاہ کی حمایت ونصرت حرام ہے۔' خواہ مسلمان ہی ہو۔

[2] شریعت کے معاملات' موشگافیوں سے اجتناب اور اسراف وفضول خرچی سے ممانعت مقصود ہے۔

کے میدان میں جا کر دل کھول کر لڑیں اور داد مردانگی دیں اور پیاسی زمین کو اپنے خون سے سیراب کریں۔ لیکن حضور علیہ سلام کو پتہ چل گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فوراً موقعہ پر تشریف لائے اور دونوں گروہ کو ٹھنڈا کیا اور فرمانے لگے پھر جاہلیت کے نعرے تم لگانے لگے۔ میری موجودگی میں ہی تم نے پھر کھچ کھچاؤ شروع کر دیا۔ پھر آپ ﷺ نے یہی آیت پڑھ کر سنائی۔ سب نادم ہوئے اور اپنی دو گھڑی پہلے کی حرکت پر افسوس کرنے لگے اور آپس میں نئے سرے سے معانقہ و مصافحہ کیا اور پھر بھائیوں کی طرح گلے مل گئے۔ ہتھیار ڈال دیئے اور صلح صفائی ہو گئی۔ حضرت عکرمہ رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ آیت اس وقت نازل ہوئی جب حضرت صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا پر منافقوں نے تہمت لگائی اور آپ کی برأت نازل ہوئی تھی۔ تب ایک دوسرے کے مقابلہ میں تن گئے تھے واللہ اعلم۔

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۱۰۴﴾ وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ تَفَرَّقُوْا وَ اخْتَلَفُوْا مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ ؕ وَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۰۵﴾ يَّوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوْهٌ وَّ تَسْوَدُّ وُجُوْهٌ ۚ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اسْوَدَّتْ وُجُوْهُهُمْ ۟ اَكَفَرْتُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ﴿۱۰۶﴾ وَاَمَّا الَّذِيْنَ ابْيَضَّتْ وُجُوْهُهُمْ فَفِيْ رَحْمَةِ اللّٰهِ ؕ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۱۰۷﴾ تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ ؕ وَمَا اللّٰهُ يُرِيْدُ ظُلْمًا لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۰۸﴾ وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ﴿۱۰۹﴾

اور ان میں ایک جماعت ایسی ہونا ضرور ہے کہ غیر کی طرف بلایا کریں اور نیک کاموں کے کرنے کو کہا کریں اور بُرے کاموں سے روکا کریں اور ایسے لوگ پورے کامیاب ہوں گے اور تم لوگ ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جنہوں نے باہم تفریق کر لی اور باہم اختلاف کر لیا۔ ان کے پاس احکام واضح پہنچنے کے بعد اور ان لوگوں کے لئے سزائے عظیم ہوگی۔ اس روز بعضے چہرے سفید ہو جائیں گے اور بعضے چہرے سیاہ ہو گئے ہوں گے سو جن کے چہرے سیاہ ہو گئے ہونگے ان سے کہا جائے گا کیا تم لوگ کافر ہوئے تھے اپنے ایمان لانے کے بعد۔ سزا چکھو بسبب اپنے کفر کے اور جن کے چہرے سفید ہو گئے ہونگے وہ اللہ کی رحمت میں ہوں گے وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے یہ اللہ تعالیٰ کی آیتیں ہیں جو صحیح طور پر ہم تم کو پڑھ کی سناتے ہیں اور اللہ تعالیٰ مخلوقات پر ظلم کرنا نہیں چاہتے اور اللہ ہی کا ملک

ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اور اللہ ہی کی طرف سب مقدمات رجوع کئے جائیں گے۔ ○

ایک جماعت خیر پر قائم رہے گی خدا کا وعدہ یا ایک سچی پیشگوئی ☆

حضرت ضحاکؒ فرماتے ہیں، اس جماعت سے مراد خاص صحابہ اور خاص راویان حدیث ہیں۔ یعنی مجاہد اور علماء۔ امام ابو جعفر رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کی تلاوت کی۔ پھر فرمایا صبر سے مراد قرآن و حدیث کی اتباع ہے۔ یہ یاد رہے کہ ہر متنفس پر تبلیغ حق فرض ہے۔ تاہم ایک جماعت تو خاص اسی کام میں مشغول رہنی چاہئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: تم میں سے جو کوئی کسی بُرائی کو دیکھے اسے ہاتھ سے دفع کرے۔ اگر اس کی طاقت نہ ہو تو زبان سے روکے۔ اگر یہ بھی نہ کر سکتا ہو تو دل میں اسے متغیر کرے یہ ضعیف ایمان ہے اور روایت میں اس کے بعد یہ بھی ہے کہ اس کے بعد رائی کے دانے کے برابر بھی ایمان نہیں (صحیح مسلم) مسند احمد میں ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے تم اچھائی کا حکم اور بُرائیوں کی مخالفت کرتے رہو، ورنہ عنقریب اللہ تعالیٰ تم پر اپنا عذاب نازل فرمادے گا۔ پھر گو تم دعائیں کرو لیکن قبول نہ ہوں گی۔ اس مضمون کی اور بھی بہت سی حدیثیں ہیں۔ جو کسی اور مقام پر ذکر کی جائیں گی انشاء اللہ تعالیٰ۔

پھر فرمایا جاتا ہے کہ تم اگلے لوگوں کی طرح افتراق و اختلاف نہ کرنا۔ تم نیک باتوں کا حکم اور خلاف شرع باتوں سے روکنے کا فریضہ ترک نہ کرنا۔ مسند احمد میں ہے، حضرت معاویہ بن ابی سفیانؓ حج کے لئے جب مکہ آئے تو ظہر کی نماز کے بعد کھڑے ہو کر فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے اہل کتاب اپنے دین میں اختلاف کر کے بہتر گروہ بن گئے اور اس میری اُمت کے تہتر فرقے بن جائیں گے اور میری اُمت میں ایسے بھی لوگ ہوں گے، جن کی رگ رگ میں اس طرح نفسانی خواہش گھس جائیں گی۔ جس طرح کتے کا کاٹا ہوا انسان، جس کی ایک ایک رگ اور ایک ایک جوڑ میں اس کا اثر پہنچ جاتا ہے۔ اے عرب کے لوگو! اگر تم ہی اپنے نبی کی لائی ہوئی چیز پر قائم نہ رہو گے، تو اور لوگ بہت دور ہو جائیں گے۔ اس حدیث کی بہت سی سندیں ہیں، پھر فرمایا: اس دن سفید چہرے ہوں گے اور سیاہ مُنہ بھی ہوں گے۔ ابن عباس کا ارشاد ہے کا اہلسنّت والجماعت کے منہ سفید نورانی ہوں گے اور اہل بدعت و فرقت کے کالے مُنہ ہوں گے۔ حسن بصریؒ فرماتے ہیں یہ کالے مُنہ والے منافق ہوں گے۔ جن سے کہا جائے گا کہ تم نے ایمان کے بعد کفر کیوں کیا؟ اب اس کا مزا چکھو اور سفید مُنہ والے رحمت خدا میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے حضرت ابو امامہؓ نے جب خارجیوں کے سر دمشق کی مسجد کے زینوں پر لٹکے ہوئے دیکھے تو فرمانے لگے یہ جہنم کے کتے ہیں۔ ان سے بدتر مقتول روئے زمین پر کوئی نہیں۔ انہیں قتل کرنے والے بہترین مجاہد ہیں پھر آیت: ﴿یَوۡمَ تَبۡیَضُّ﴾ تلاوت فرمائی۔ ابو غالب نے کہا: کیا جناب نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ سنا ہے۔ فرمایا ایک دو دفعہ نہیں بلکہ سات مرتبہ۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو میں زبان سے یہ الفاظ نکالتا ہی نہیں۔ ابن مردویہ نے یہاں حضرت ابو ذرؓ کی روایت سے ایک لمبی حدیث نقل کی ہے، جو بہت ہی عجیب ہے لیکن سنداً غریب ہے۔ دنیا اور آخرت کی یہ باتیں ہم تم پر اے نبی کھول رہے ہیں۔ اللہ عادل حاکم ہے وہ ظالم نہیں اور ہر چیز کو خوب جانتا ہے اور ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔ پھر نا ممکن ہے کہ وہ کسی پر ظلم کرے۔ کالے مُنہ جن کے ہوئے وہ اسی لائق تھے۔ زمین اور آسمان کی کل چیزیں اس کی ملکیت میں ہیں اور اسی کی غلامی میں اور ہر کام کا آخری حکم اسی کی طرح اس متصرف اور با اختیار حاکم دنیا اور آخرت کا وہی ہے۔

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ ۗ وَلَوْ آمَنَ أَهْلُ الْكِتٰبِ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ ۚ مِنْهُمُ الْمُؤْمِنُونَ وَأَكْثَرُهُمُ الْفٰسِقُونَ ﴿۱۱۰﴾ لَنْ يَّضُرُّوْكُمْ إِلَّا أَذًى ۖ وَإِنْ يُّقَاتِلُوْكُمْ يُوَلُّوْكُمُ الْأَدْبَارَ ۙ ثُمَّ لَا يُنْصَرُوْنَ ﴿۱۱۱﴾ ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ أَيْنَ مَا ثُقِفُوْا إِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ وَبَاءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الْمَسْكَنَةُ ۚ ذٰلِكَ بِأَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ الْأَنْبِيَاءَ بِغَيْرِ حَقٍّ ۚ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ﴿۱۱۲﴾

تم لوگ اچھی جماعت ہو کہ وہ لوگوں کے لئے ظاہر کی گئی ہے۔ تم لوگ نیک کاموں کو بتلاتے ہو اور بری باتوں سے روکتے ہو اور اللہ تعالیٰ پر ایمان لاتے ہو اور اگر اہل کتاب ایمان لے آتے تو ان کے لئے زیادہ اچھا ہوتا۔ ان میں سے بعض تو مسلمان ہیں اور زیادہ حصہ ان میں سے کافر ہیں۔ وہ تم کو ہرگز کوئی ضرر نہ پہنچا سکیں گے مگر ذرا خفیف سی اذیت اگر وہ تم سے مقاتلہ کریں تو تم کو پیٹھ دکھا کر بھاگ جائیں گے۔ پھر کسی طرف سے ان کی حمایت بھی نہیں کی جائے گی جما دی گئی ان پر بے قدری جہاں کہیں بھی پائے جائیں گے مگر ہاں ایک تو ایسے ذریعے کے سبب جو اللہ کی طرف سے ہے اور ایک ایسے ذریعہ کے سبب جو آدمیوں کی طرف سے ہے اور مستحق ہو گئے غضب الٰہی کے اور جما دی گئی ان پر پستی اور یہ اس وجہ سے ہوا کہ وہ لوگ منکر ہو جاتے تھے احکام الٰہیہ کے اور قتل کر دیا کرتے تھے پیغمبروں کو ناحق اور یہ اس وجہ سے ہوا کہ ان لوگوں نے اطاعت کی اور دائرہ سے نکل نکل جاتے تھے

اُمت محمدیہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو اِن کے مقام و منصب کی یاد دہانی ☆

اللہ تعالیٰ خبر دے رہا ہے کہ اُمت محمدیہ (صلی اللہ علیہ وسلم) تمام اُمتوں سے بہتر ہے۔ صحیح بخاری شریف میں ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں: تم اوروں کے حق میں سب سے بہتر ہو تم لوگوں کی گردنیں پکڑ پکڑ کر اسلام کی طرف جھکاتے ہو[1] اور مفسرین بھی یہی فرماتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ تم تمام اُمتوں سے بہتر ہو اور سب سے زیادہ لوگوں کو نفع پہنچانے والے ہو۔ ابولہب کی بیٹی حضرت درہؓ فرماتی ہیں: ایک مرتبہ کسی نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا، آپؐ اس وقت منبر

[1] یہ مطلب نہیں کہ لوگوں کو اسلام کے قبول کرنے پر مجبور کرتے ہو کیونکہ دین کے بارے میں جبر قطعاً نہیں ہو سکتا۔ اس کا مطلب =

پر تھے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کون سا شخص بہتر ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا سب لوگوں سے بہتر وہ شخص ہے جو سب سے زیادہ قاری قرآن ہو۔ سب سے زیادہ پرہیز گار ہو۔ سب سے زیادہ اچھائیوں کا حکم کرنے والا، سب سے زیادہ برائیوں سے روکنے والا۔ سب سے زیادہ رشتے ناتے ملانے والا ہو۔ (مسند احمد)

حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں: یہ وہ صحابہ ہیں، جنہوں نے مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کی۔ صحیح بات یہ ہے۔ کہ یہ آیت ساری اُمت کو شامل ہے۔ بے شک یہ حدیث میں ہے کہ سب سے بہتر میرا زمانہ ہے۔ پھر اس کے بعد اس سے ملا ہوا زمانہ، پھر اس کے بعد والا زمانہ۔ ایک اور روایت میں ہے ﴿وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا﴾ (البقرہ ۱۴۳) ہم نے تمہیں بہتر اُمت بنایا ہے تا کہ تم لوگوں پر گواہ بنو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں، تم سے اگلی اُمتوں کی تعداد کو ستر تک پہنچا دیا ہے۔ خدا کے نزدیک تم ان سب سے بہتر ہو اور زیادہ بزرگ ہو۔ یہ مشہور حدیث ہے۔ امام ترمذی نے اسے حسن کہا ہے۔ اس اُمت کی افضلیت کی ایک بڑی دلیل اس اُمت کے نبی کی افضلیت ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم تمام مخلوق کے سردار تمام رسولوں سے زیادہ اکرم و عزت والے ہیں۔ آپ کی شریعت اتنی کامل اور اتنی پوری ہے کہ ایسی شریعت کسی نبی کی نہیں۔ تو ظاہر بات ہے کہ ان فضائل کو سمیٹنے والی اُمت بھی تمام اُمتوں سے سب سے اعلیٰ و افضل ہے۔ اس شریعت کا تھوڑا سا عمل بھی اور اُمتوں کے زیادہ عمل سے بہتر و افضل ہے۔ حضرت علی بن ابو طالب رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، مجھے وہ نعمتیں دی گئی ہیں جو مجھ سے پہلے کسی کو نہیں دی گئیں۔ لوگوں نے پوچھا وہ کیا باتیں ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: (۱) میری مدد رعب سے کی گئی ہے (۲) مجھے زمین کی کنجیاں دی گئیں (۳) میرا نام احمد رکھا گیا (۴) میرے لیے مٹی پاک کی گئی ہے، میری اُمت سب اُمتوں سے بہتر بنائی گئی ہے۔ (مسند احمد) اس حدیث کی اسناد حسن ہے۔ حضرت ابو الدرداء رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں۔ میں نے ابو القاسم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ سے فرمایا کہ میں تمہارے بعد ایک اُمت پیدا کرنے والا ہوں۔ جو رحمت پر حمد و شکر کریں گے اور مصیبت پر طلب ثواب اور صبر کریں گے، حالانکہ انہیں حلم و علم نہ ہو گا۔ آپ نے تعجب سے پوچھا کہ بغیر بردباری اور دوراندیشی اور پختہ علم کے یہ کیسے ممکن ہے۔ رب العالمین نے فرمایا میں انہیں اپنا حلم و علم عطا فرماؤں گا۔

خیر الامم کی خصوصیات ☆

میں یہ چاہتا ہوں کہ یہاں پر بعض وہ حدیثیں بھی بیان کر دوں جن کا ذکر کرنا مناسب ہے۔ سنیئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں، میری اُمت میں سے ستر ہزار شخص بغیر حساب کتاب کے جنت میں جائیں گے۔ جن کے چہرے چودھویں رات کے چاند کی طرح روشن ہوں گے۔ سب یک دل ہوں گے۔ میں نے اپنے ربّ سے گزارش کی کہ: خدایا اس تعداد میں اضافہ فرما۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا ہر ایک کے ساتھ ستر ہزار اور بھی۔ حضرت صدیق اکبرؓ یہ حدیث بیان کر کے فرمایا کرتے تھے کہ پھر تو اس تعداد میں گاؤں اور دیہات والے بلکہ بادیہ نشین بھی آ جائیں گے (مسند احمد) حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: مجھے میرے ربّ نے ستر ہزار آدمیوں کو میری اُمت میں سے بغیر حساب کے جنت میں داخل ہونے کی خوشخبری دی۔

= تو فقط یہ ہے کہ تمہارے حسن عمل، مکارم اخلاق اور اخلاص کو دیکھ کر لوگ اسلام کو ایک اچھا مذہب سمجھتے ہوئے اس کے قبول کرنے پر خود کو مجبور پاتے ہیں۔ اسلام کی تاریخ اس پر شاہد ہے کہ لوگوں نے اس دین کو عموماً اس کی اچھائیوں پر ہی پرکھ کر قبول کیا ہے۔

حضرت عمرؓ نے یہ سن کر کہا، حضور ﷺ کچھ اور زیادتی طلب کرتے۔ آپؐ نے فرمایا: میں نے اپنے ربّ سے سوال کیا تو مجھے خوشخبری ملی کی ہر ہزار کے ساتھ ستر ہزار اور ہوں گے۔ فاروق اعظمؓ نے کہا، حضور ﷺ اور برکت کی دعا کرتے: آپ ﷺ نے فرمایا: میں نے پھر کی، تو ہر ہر شخص کے ساتھ ستر ستر ہزار کا وعدہ ہوا۔ حضرت عمرؓ نے پھر گزارش کی کہ اللہ کے نبی ﷺ اور کچھ بھی مانگتے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: مانگا تو مجھے اتنی زیادتی اور ملی۔ پھر دونوں ہاتھ پھیلا کر بتلایا کہ اس طرح۔ راوئی حدیث کہتے ہیں، اس طرح جب خدا سمیٹے تو خدا ہی جانتا ہے کہ کس قدر مخلوق اس میں آئے گی۔ (فسبحان اللہ وبحمدہٖ)۔

(مسند احمد)

حضرت ثوبان رضی اللہ تعالیٰ عنہ حمص میں بیمار پڑ گئے، عبداللہ بن قرط وہاں کے امیر تھے، وہ عیادت کو نہ آسکے۔ ایک کلاعی شخص جب آپ کی بیمار پرسی کے لئے گیا تو آپ نے اس سے دریافت کیا کہ لکھنا جانتے ہو؟ اس نے کہا: ہاں۔ فرمایا: لکھو، یہ خط ہے امیر عبداللہ بن قرط کی طرف ثوبان کی طرف سے، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خادم ہیں۔ بعد حمد وصلوٰۃ کے واضح ہو کہ اگر حضرت عیسیٰؑ یا حضرت موسیٰؑ کا کوئی خادم یہاں ہوتا اور بیمار پڑتا تو عیادت کے لئے جاتے۔ پھر کہا یہ خط لے جاؤ اور امیر کو پہنچا دو۔ جب یہ خط امیر حمص کے پاس پہنچا، تو گھبرا کر اُٹھ کھڑے ہوئے اور سیدھے یہاں تشریف لائے۔ کچھ دیر بیٹھ کر عیادت کر کے جب جانے کا ارادہ کیا تو حضرت ثوبان نے چادر پکڑ کر روکا اور فرمایا: ایک حدیث سنتے جاؤ، میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے سنا ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: میری اُمت میں سے ستر ہزار شخص بغیر حساب وعذاب کے جنت میں جائیں گے۔ ہر ہزار کے ساتھ ستر ہزار اور ہوں گے۔ (مسند احمد) یہ حدیث بھی صحیح ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں۔ ایک رات ہم خدمت نبوی ﷺ میں دیر تک باتیں کرتے رہے۔ پھر صبح جب حاضر خدمت ہوئے، تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: سنو آج رات انبیاء اپنی اپنی اُمتوں کے ساتھ مجھے دکھائے گئے۔ بعض نبی کے ساتھ صرف تین شخص تھے۔ بعض کے ساتھ مختصر سا گروہ۔ بعض کے ساتھ ایک جماعت تھی۔ کسی کے ساتھ کوئی بھی نہ تھا۔ جب موسیٰؑ آئے تو ان کے ساتھ بہت سے لوگ تھے۔ مجھے یہ جماعت پسند آئی۔ میں نے پوچھا: یہ کون ہیں؟ تو جواب ملا، یہ آپ کے بھائی موسیٰؑ ہیں اور ان کے ساتھ بنی اسرائیل ہیں۔ مین نے کہا، پھر میری اُمت کہاں ہے؟ جواب ملا، اپنی داہنی طرف دیکھو۔ اب جو دیکھتا ہوں تو بے شمار مجمع ہے۔ جس سے پہاڑیاں بھی ڈھک گئی ہیں۔ مجھ سے پوچھا گیا: کہو خوش ہو؟ میں نے کہا: میرے ربّ میں راضی ہوگیا۔ فرمایا لوگو سنو! ان کے ساتھ ستر ہزار اور ہیں، جو بغیر حساب کے جنت میں داخل ہوں گے۔ اب نبی ﷺ نے فرمایا: (آپ پر میرے ماں باپ فدا ہوں) اگر ہو سکے تو ان ستر ہزار میں سے ہی ہونا۔ اگر یہ نہ ہو سکے تو ان میں سے ہونا، جو پہاڑیوں کو چھپائے ہوئے تھے۔ اگر یہ بھی نہ ہو سکے تو ان میں سے ہونا' جو آسمان کے کناروں پر تھے، حضرت عکاشہ بن محصنؓ نے کھڑے ہو کر کہا۔ حضور ﷺ میرے لئے دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ مجھے ان ستر ہزار میں سے کرے۔ آپ نے دعا کی تو ایک دوسرے صحابیؓ نے بھی اُٹھ کر یہی گزارش کی۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا، تم پر حضرت عکاشہؓ سبقت کر گئے۔ اب ہم آپس میں کہنے لگے کہ شاید یہ ستر ہزار وہ لوگ ہوں گے، جو اسلام پر ہی پیدا ہوئے ہوں، اور پوری عمر میں کبھی خدا کے ساتھ شرک کیا ہی نہ ہو۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب یہ معلوم ہوا تو فرمایا: یہ وہ لوگ ہیں، جو جادو ٹونا نہیں کراتے۔ آگ کے داغ نہیں لگواتے۔ شگون نہیں لیتے اور اب اپنے ربّ پر پورا بھروسہ رکھتے ہیں (مسند احمد)

ایک اور سند سے اتنی زیادتی اور بھی اس میں ہے کہ جب میں نے اپنی رضامندی ظاہر کی تو مجھ سے کہا گیا۔ اب اپنی بائیں جانب دیکھو۔ میں نے دیکھا تو بے شمار مجمع ہے۔ جس نے آسمان کے کناروں کو بھی ڈھک لیا ہے۔ ایک اور روایت میں ہے کہ موسم حج کا یہ واقعہ ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں مجھے اپنی اُمت کی یہ کثرت بہت پسند آئی۔ تمام پہاڑیاں اور میدان ان سے پُر تھے۔ (مسند احمد) ایک روایت میں ہے کہ حضرت عکاشہؓ کے بعد کھڑے ہونے والے ایک انصاری تھے۔ (طبرانی) ایک اور روایت میں ہے کہ میری اُمت میں سے ستر ہزار یا سات لاکھ آدمی جنت میں جائیں گے۔ جو ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے ہوئے ہونگے۔ سب ایک ساتھ جنت میں جائیں گے۔ چمکتے ہوئے چودھویں رات کے چاند جیسے انکے چہرے ہوں گے۔

(بخاری، مسلم، طبرانی)

حصین بن عبدالرحمٰن کہتے ہیں کہ میں سعید بن جبیرؒ کے پاس تھا تو آپ نے دریافت کیا کہ رات کو جو ستارہ ٹوٹا تھا تم میں سے کسی نے دیکھا تھا؟ میں نے کہا: ہاں میں نے دیکھا تھا۔ یہ نہ سمجھئے گا کہ میں نماز میں تھا، نہیں، بلکہ مجھے بچھو نے کاٹ کھایا تھا۔ حضرت سعیدؒ نے پوچھا، پھر تم نے کیا کیا، میں نے کہا: دم کر دیا تھا، کہا: کیوں، میں نے کہا: حضرت شعبی نے بریدہ بن حسیب کی روایت سے حدیث بیان کی ہے کہ نظر بد اور زہریلے جانوروں کا دم جھاڑ کرانا ہے۔ کہنے لگے، خیر جسے جو پہنچے، اس پر عمل کرے۔ ہمیں تو ابن عباسؓ نے سنایا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مجھ پر امتیں پیش کی گئیں۔ کسی نبی کے ساتھ ایک جماعت تھی، کسی کے ساتھ ایک شخص اور دو شخص اور کسی نبی کے ساتھ کوئی نہ تھا۔ اب جو دیکھا ایک بڑی جماعت پر نظر پڑی۔ میں سمجھا یہ تو میری اُمت ہوگی۔ پھر معلوم ہوا موسیٰ کی اُمت ہے۔ مجھ سے کہا گیا، آسمان کے کناروں کی طرف دیکھو، میں نے دیکھا تو وہاں بے شمار لوگ تھے۔ مجھ سے کہا گیا، یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت ہے اور ان کے ساتھ ستر ہزار اور ہیں جو بے حساب اور بے عذاب جنت میں جائیں گے۔ یہ حدیث بیان کر کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم تو مکان پر چلے گئے اور صحابہ آپس میں کہنے لگے، شاید یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی ہوں گے کسی نے کہا نہیں اسلام میں پیدا ہونے اور اسلام ہی پر مرنے والے ہوں گے وغیرہ وغیرہ۔ آپ تشریف لائے اور پوچھا کیا باتیں کر رہے ہو۔ ہم نے ذکر کیا تو آپ نے فرمایا نہیں یہ وہ لوگ ہیں جو جادو ٹونہ نہ کرائیں، نہ داغ لگوائیں، نہ شگون لیں بلکہ اپنے ربّ پر بھروسہ رکھیں۔ حضرت عکاشہؓ نے دعا کی درخواست کی۔ آپ نے دعا کی کہ یا اللہ تو اسے ان میں سے کر لے۔ پھر دوسرے شخص نے بھی یہی کہا، آپ نے کہا عکاشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ آگے بڑھ گئے۔ یہ حدیث بخاری میں ہے، لیکن اس میں جادو ٹونہ نہ کرنے کا لفظ نہیں۔ صحیح مسلم میں یہ لفظ بھی ہے۔ ایک طویل حدیث میں ہے کہ پہلی جماعت تو نجات پائے گی۔ ان کے چہرے چودھویں رات کے چاند کی طرح روشن ہوں گے۔ ان سے حساب بھی نہ لیا جائے گا۔ پھر ان کے بعد والے سب سے زیادہ روشن ستارے جیسے چمکدار چہرے والے ہوں گے (مسلم) آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں، مجھ سے میرے رب کا وعدہ ہے کہ میری اُمت سے ستر ہزار شخص بغیر حساب و عذاب کے بہشت میں داخل ہوں گے۔ ہر ہزار کے ساتھ ستر ہزار اور ہوں گے تین مٹھیاں اور میرے رب عزوجل کی لپوں سے (کتاب السنن لحافظ ابی بکر بن عاصم) اس کی اسناد بہت عمدہ ہیں۔ ایک حدیث میں ہے کہ آپ سے ستر ہزار کی تعداد سن کر یزید بن اخنسؓ نے کہا، حضور ﷺ یہ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت کے مقابلہ میں بہت ہی تھوڑے ہیں، تو آپ نے فرمایا: ہر ہزار کے ساتھ ستر ہزار اور ہیں اور پھر خدا نے تین لپیں بھر کر اور بھی عطا فرمائے ہیں۔ اس کی اسناد بھی حسن ہے (کتاب السنن) ایک اور

حدیث میں ہے کہ میرے رب نے جو عزت اور جلال والا ہے، مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ ستر ہزار کو بلاحساب جنت میں لے جایا جائے گا۔ پھر ایک ایک ہزار کی شفاعت سے ستر ستر ہزار آدمی اور جائیں گے۔ پھر میرا رب اپنے دونوں ہاتھوں سے تین لپیں بھر کر اور ڈالے گا۔ حضرت عمرؓ نے یہ سن کر خوش ہو کر اللہ اکبر کہا اور فرمایا کہ ان کی شفاعت ان کے باپ دادوں اور بیٹوں بیٹیوں اور خاندان وقبیلہ میں ہو گی۔ اللہ کرے میں تو ان میں سے ہو جاؤں، جنہیں اللہ تعالیٰ اپنی لپوں میں بھر کر آخر میں جنت میں لے جائے گا (طبرانی) اس حدیث کی سند میں کوئی علت نہیں۔ واللہ علم۔

کرید میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث فرمائی، جس میں یہ بھی فرمایا، یہ ستر ہزار جو بلاحساب جنت میں داخل کئے جائیں گے میرا خیال ہے کہ ان کے آتے آتے تو تم اپنے لئے اور اپنے بال بچوں اور بیویوں کے لئے جنت میں جگہ مقرر کر چکے ہو گے (مسند احمد) اس کی سند بھی شرط مسلم پر ہے۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اللہ کا وعدہ ہے کہ میری اُمت میں سے چار لاکھ آدمی جنت میں جائیں گے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا حضور کچھ اور زیادہ کیجئے۔ اسے سن کر حضرت عمرؓ نے فرمایا: ابوبکر بس کر۔ صدیقؓ نے جواب دیا: کیوں صاحب! اگر ہم سب کے سب جنت میں چلے جائیں تو آپ کا کیا نقصان ہے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا: اگر اللہ چاہے تو ایک ہی ہاتھ میں ساری مخلوق کو جنت میں ڈال دے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، عمرؓ سچ کہتے ہیں (مسند عبدالرزاق) اسی حدیث کا ایک اور سند سے بھی بیان ہے اس میں تعداد ایک لاکھ آئی ہے (اصبہانی) ایک اور روایت میں ہے کہ جب صحابہ نے ستر ہزار اور پھر ہر ایک کے ساتھ ستر ہزار پھر خدا کا لپ بھر کر جنتی بنانا سنا تو کہنے لگے، پھر تو اس کی بدنصیبی میں کیا شک رہ گیا۔ جو باوجود اس کے بھی جہنم میں جائے (ابویعلی) اوپر والی حدیث ایک اور سند سے بھی بیان ہوئی ہے۔ اس میں تعداد تین لاکھ کی ہے۔ پھر حضرت عمر کا قول اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق کا بیان ہے۔ (طبرانی)۔

ایک اور حدیث میں جنت میں جانے والوں کا ذکر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، میری اُمت کے سارے مہاجر تو اس میں آ ہی جائیں گے۔ پھر باقی تعداد اعرابیوں سے پوری ہو گی (محمد بن سہل) حضرت ابو سعید کہتے ہیں: حضور ﷺ کے سامنے حساب کیا گیا تو جملہ تعداد چار کروڑ نوے ہزار ہوئی۔ ایک اور حسن حدیث طبرانی میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، قسم ہے اس ذات کی کہ جان محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اس کے ہاتھ میں ہے، تم ایک اندھیری رات کی طرح بے شمار ایک ساتھ جنت کی طرف بڑھو گے۔ زمین تم سے پر ہو جائے گی۔ تمام فرشتے پکار اُٹھیں گے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جو جماعت آئی وہ تمام نبیوں کی جماعت سے بہت زیادہ ہے۔ حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا آپ نے فرمایا: صرف میری تابعدار اہل جنت کی چوتھائی ہو گی۔ صحابہؓ نے خوش ہو کر نعرہ تکبیر بلند کیا۔ پھر فرمایا کہ: مجھے تو امید ہے کہ تم اہل جنت کا تیسرا حصہ ہو جاؤ۔ ہم نے پھر تکبیر کہی۔ پھر فرمایا: میں امید کرتا ہوں کہ تم آدھوں آدھ ہو جاؤ (مسند احمد) اور حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے صحابہؓ سے فرمایا: کیا تم راضی نہیں ہو کہ تم تمام جنتیوں کے چوتھائی ہو، ہم نے خوش ہو کر اللہ کی بڑائی بیان کی۔ پھر فرمایا کہ: تم راضی نہیں ہو کہ تم اہل جنت کی تہائی ہو۔ ہم نے پھر تکبیر کہی۔ پھر فرمایا: مجھے تو امید ہے کہ تم جنتیوں کے آدھوں آدھ ہو جاؤ گے (بخاری، مسلم) طبرانی میں یہ روایت حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا کہتے ہو، تم جنتیوں کا چوتھا حصہ بننا چاہتے ہو کہ چوتھائی جنت تمہارے پاس ہو، اور تین

اور چوتھائیوں میں تمام اور اُمتیں ہوں؟ ہم نے کہا اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول ﷺ خوب جانتا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا اچھا تہائی حصہ ہو تو؟ ہم نے کہا یہ بہت ہے۔ فرمایا: کہو اگر آدھوں آدھ ہو تم؟ انہوں نے کہا: پھر تو بہت ہی زیادہ ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: سنو! کل اہل جنت کی ایک سو بیس صفیں ہیں، جن میں سے اسّی صفیں صرف میری اُمت کی ہیں۔ مسند احمد میں بھی ہے کہ اہل جنت کی ایک سو بیس صفیں ہیں۔ ان میں سے اسّی صفیں صرف اس اُمت کی ہیں۔ یہ حدیث طبرانی، ترمذی وغیرہ میں بھی ہیں۔

طبرانی کی ایک اور روایت میں ہے کہ جب آیت ﴿ثُلَّةٌ مِنَ الْاَوَّلِیْنَ وَثُلَّةٌ مِنَ الْاٰخِرِیْنَ﴾ (الواقعہ ۱۳) اُتری تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم اہل جنت کی چوتھائی ہو، پھر فرمایا: بلکہ ثلث ہو۔ پھر فرمایا: بلکہ نصف ہو، پھر فرمایا دو تہائی ہو۔ (اے وسیع رحمتوں والے اور بے روک نعمتوں والے خدا، ہم تیرا بے انتہا شکر ادا کرتے ہیں کہ تو نے ہمیں اپنے معزز محترم رسول (ﷺ) کی اُمت میں پیدا کیا۔ تیرے سچے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی سچی زبان سے تیرے اس بڑھتے چڑھتے فضل و کرم کا حال سن کر ہم گنہگاروں کے منہ میں پانی بھر آیا۔ اے باپ سے زیادہ مہربان خدا ہماری آس نہ توڑ، اور ہمیں بھی ان نیک ہستیوں کے ساتھ جنت میں داخل فرما۔ باری تعالیٰ تیری رحمت کی ان گنت اور بے شمار بوندوں میں سے اگر ایک قطرہ بھی گنہگاروں پر برس جائے تو ہمارے گناہوں کو دھو ڈالے اور ہمیں تیری رحمت و رضوان کے لائق بنانے کے لئے کافی ہے۔ خدایا اس پاک ذکر کے موقعہ پر ہم ہاتھ اُٹھا کر، دامن پھیلا کر، آنسو بہا کر امیدوں بھرے دل سے تیری رحمت کا سہارا لے کر۔ تیرے نام کا دامن تھام کر تجھ سے بھیک مانگتے ہیں تو قبول فرما اور اپنی رحمت سے ہمیں بھی اپنی رضامندی کا گھر جنت الفردوس عطا فرما (آمین الہ الحق آمین)۔ (صحیح بخاری)

مسلم میں ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: ہم دنیا میں سب سے آخر میں آئے اور جنت میں سب سے پہلے جائیں گے اور ان کو کتاب اللہ پہلے ملی ہمیں بعد میں ملی۔ جن باتوں میں انہوں نے اختلاف کیا۔ ان میں اللہ نے ہمیں صحیح طریق کی توفیق دی۔ جمعہ کا دن بھی ایسا ہی ہے کہ یہود ہمارے پیچھے ہیں، ہفتہ کے دن اور نصرانی ان کے پیچھے اتوار کے دن۔ دار قطنی میں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، جب تک میں جنت میں داخل نہ ہو جاؤں انبیاء پر دخول جنت حرام ہے اور جب تک میری اُمت نہ داخل ہو، دوسری اُمتوں پر دخول جنت حرام ہے، یہ تھیں وہ حدیثیں، جنہیں ہم اس آیت کے تحت میں وارد کرنا چاہتے تھے۔ فالحمدللہ۔

اُمت کو بھی چاہئے کہ یہاں اس آیت میں جتنی صفتیں ہیں، ان پر مضبوطی کے ساتھ قائم رہیں۔ یعنی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اور ایمان باللہ۔

حضرت عمر بن خطابؓ نے اپنے حج میں اس آیت کی تلاوت فرما کر لوگوں سے کہا کہ تم اس آیت کی تعریف میں داخل ہونا چاہتے ہو تو یہ اوصاف بھی اپنے میں داخل کرو۔ امام ابن جریرؒ فرماتے ہیں، اہل کتاب ان کاموں کو چھوڑ بیٹھے تھے۔ جن کی مذمت کتاب اللہ نے کی۔ فرمایا: ﴿كَانُوْا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ﴾ (المائدہ ۷۹) وہ لوگ برائی کی باتوں سے لوگوں کو روکتے نہ تھے۔ چونکہ مندرجہ بالا آیت میں ایمانداروں کی تعریف و توصیف بیان ہوئی ہے تو اس کے بعد اہل کتاب کی مذمت بیان ہو رہی ہے۔ اس لئے فرمایا کہ اگر یہ لوگ بھی میرے نبی آخر الزمان پر ایمان لاتے تو انہیں بھی یہ فضیلتیں ملتیں۔ لیکن ان میں سے اکثر کفر و فسق و عصیان پر جمے ہوئے ہیں۔ ہاں کچھ باایمان بھی ہیں۔ پھر اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو بشارت دیتا ہے کہ تم نہ

گھبرانا، خدا تمہیں تمہارے مخالفین پر غالب رکھے گا۔ چنانچہ خیبر والے دن اللہ تعالیٰ نے انہیں ذلیل کیا اور ان سے پہلے بنو قینقاع، بنو نضیر، بنو قریظہ کو بھی خدا نے ذلیل و پست کیا۔ اسی طرح شام کے نصرانی صحابہ کے وقت میں مغلوب ہوئے اور ملک شام ان کے ہاتھوں سے بالکل نکل گیا اور ہمیشہ کے لئے مسلمانوں کے قبضہ میں آ گیا اور وہاں ایک حق والی جماعت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے آنے تک قائم رہے گی۔ حضرت عیسیٰؑ آ کر ملت اسلام اور شریعت محمد ﷺ کے مطابق حکم کریں گے۔ صلیب توڑیں گے۔ خنزیر کو قتل کریں گے۔ جزیہ قبول نہ کریں گے۔ صرف اسلام ہی قبول کریں گے۔ پھر فرمایا کہ ان کے اُوپر ذلت اور پستی ڈال دی گئی۔ کہیں بھی امن و امان اور عزت نہیں۔ ہاں اللہ کی پناہ کے ساتھ یعنی جب جزیہ دینا اور مسلم بادشاہ کی اطاعت کرنا قبول کرلیں اور لوگوں کی پناہ یعنی ذمہ مقرر ہو جائے یا کوئی مسلمان امن دے۔ اگرچہ کوئی عورت ہو بلکہ اگرچہ کوئی غلام ہو۔ علماء کا ایک قول یہ بھی ہے۔ حضرت ابن عباسؓ کا قول ہے کہ جس سے مراد عہد ہے غضب کے مستحق ہو گئے۔ ذلت ان کے لئے دائمی طور پر طے کر دی گئی۔ یہ ان کے کفر، ان کے قتل انبیاء، ان کے تکبر، حسد، سرکشی وغیرہ کا بدلہ ہے۔ اسی باعث ان پر ذلت، پستی اور مسکنت[1] ہمیشہ کے لئے ڈال دی گئی۔ ان کی نافرمانیوں اور تجاوز حق کا یہ بدلہ ہے العیاذ باللہ۔ ابوداؤد طیالسی میں حدیث ہے کہ بنی اسرائیل ایک ایک دن میں تین تین سونبیوں کو قتل کر ڈالتے تھے اور دن کے آخری حصہ میں اپنے اپنے کاموں پر بازاروں میں لگ جاتے تھے۔

لَيْسُوْا سَوَآءً ؕ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اُمَّةٌ قَآئِمَةٌ يَّتْلُوْنَ اٰيٰتِ اللّٰهِ اٰنَآءَ الَّيْلِ وَهُمْ يَسْجُدُوْنَ ﴿۱۱۳﴾ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُسَارِعُوْنَ فِى الْخَيْرٰتِ ؕ وَ اُولٰٓئِكَ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۱۴﴾ وَمَا يَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلَنْ يُّكْفَرُوْهُ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ ۢ بِالْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۱۵﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَنْ تُغْنِىَ عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَيْـئًا ؕ وَ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ

[1] آج دُنیا میں یہود ریاست میں بھی دُنیا کی دوسری اقوام پر غالب ہیں اور یورپ کی اسلام کے خلاف سازشوں کے نتیجہ میں ان کو عرب کے بعض حصوں پر حکومت کرنے کے لیے جگہ بھی مل گئی ہے لیکن اس سے قرآنِ مجید کی اس پیش گوئی پر کوئی اثر نہیں پڑتا کیونکہ قرآن کا یہ دعویٰ تھا کہ مستقل کوئی حکومت یہ قائم نہ کرسکیں گے۔ بعض اقوام وامم کی حمایت ونصرت سے کچھ علاقے انہیں ضرور مل سکتے ہیں۔ اگر ''اسرائیل'' کے حلیف آج اس کی حمایت سے دستبردار ہو جائیں تو یقیناً ان کی حکومت چند گھنٹے بھی قائم نہیں رہ سکتی اور رہی ریاست سواس کا حال تو یہ ہے کہ بے پناہ مال ودولت کے باوجود اور دل کے فقیر اور روایات کے ذلیل ہیں ۱۲'

هُمۡ فِيۡهَا خٰلِدُوۡنَ ﴿۱۱۶﴾ مَثَلُ مَا يُنۡفِقُوۡنَ فِىۡ هٰذِهِ الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا كَمَثَلِ رِيۡحٍ فِيۡهَا صِرٌّ اَصَابَتۡ حَرۡثَ قَوۡمٍ ظَلَمُوۡۤا اَنۡفُسَهُمۡ فَاَهۡلَكَتۡهُ‌ ؕ وَمَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ وَلٰـكِنۡ اَنۡفُسَهُمۡ يَظۡلِمُوۡنَ ﴿۱۱۷﴾

اور یہ سب برابر نہیں ان اہل کتاب میں سے ایک جماعت وہ بھی ہے جو قائم ہیں، اللہ کی آیتیں اوقات شب میں پڑھتے ہیں اور وہ نماز بھی پڑھتے ہیں۔ اللہ پر اور قیامت والے دن پر ایمان رکھتے ہیں اور نیک کام بتلاتے ہیں اور بُری باتوں سے روکتے ہیں اور نیک کاموں میں دوڑتے ہیں اور یہ لوگ شائستہ لوگوں میں ہیں اور یہ لوگ جو نیک کام کریں گے اس سے محروم نہ کئے جائیں گے اور اللہ تعالیٰ اہل تقویٰ کو خوب جانتے ہیں۔ جو لوگ کافر رہے ہرگز ان کے کام نہ آئیں گے ان کے مال اور نہ ان کی اولاد اللہ کے مقابلہ میں ذرا بھی اور لوگ دوزخ والے ہیں اور وہ ہمیشہ اسی میں رہیں گے۔ وہ جو کچھ خرچ کرتے ہیں اس دینوی زندگانی میں اس کی حالت کے مثل ہے کہ ایک ہوا ہو جس میں تیز سردی ہو وہ لگ جائے ایسے لوگوں کی کھیتی کے جنہوں نے اپنا نقصان کر رکھا ہو پس وہ اس کو برباد کر ڈالے اور اللہ تعالیٰ نے ان پر ظلم نہیں کیا لیکن وہ خود ہی اپنے آپ کو ضرر پہنچا رہے تھے۔ ○

اچھے ہر جگہ ہو سکتے ہیں ☆

حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں، اہل کتاب اور اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم برابر نہیں۔ مسند احمد میں ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عشاء کی نماز میں ایک مرتبہ دیر لگا دی۔ پھر جب آئے تو جو اصحاب منتظر تھے، ان سے فرمایا کسی دین والا اس وقت ذکر نہیں کر رہا ہوگا، صرف تم ہی ذکر اللہ میں ہو۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ لیکن اکثر مفسرین کا قول ہے کہ اہل کتاب کے علماء مثلاً حضرت عبداللہ بن سلامؓ، حضرت اسد بن عبیدؓ، حضرت ثعلب بن شعبہؓ وغیرہ کے بارے میں یہ آیت اُتری کہ یہ جماعت ان اہل کتاب میں شامل نہیں، جن کی مذمت پہلے گزری۔ بلکہ یہ ایمان، اطاعت امر اللہ پر قائم ہے۔ شریعت محمدیہ کی تابع ہے۔ استقامت و یقین اس میں ہے۔ یہ پاک باز لوگ راتوں کے وقت تہجد کی نماز میں کلام اللہ کی تلاوت کرتے رہتے ہیں۔ اللہ پر، قیامت پر ایمان رکھتے ہیں اور لوگوں کو بھی انہی باتوں کا حکم دیتے ہیں۔ ان کے خلاف سے روکتے ہیں۔ نیک کاموں میں پیش پیش رہا کرتے ہیں۔ اب خدا تعالیٰ انہیں خطاب فرماتا ہے کہ یہ صالح لوگ ہیں[1]۔ اس سورت کے آخر میں بھی فرمایا: ﴿وَاِنَّ مِنۡ اَهۡلِ الۡكِتٰبِ لَمَنۡ يُّؤۡمِنُ بِاللّٰهِ﴾ الخ بعض اہل کتاب اللہ پر، اس قرآن پر اور تورات و انجیل پر بھی ایمان رکھتے ہیں، اللہ سے ڈرتے ہیں۔ یہاں بھی فرمایا کہ ان کے یہ نیک اعمال ضائع نہ ہوں گے۔ بلکہ پورا بدلہ ملے گا۔ تمام پرہیزگار لوگ خدا کی نظروں میں ہیں۔ وہ کسی کے اچھے عمل کو برباد نہیں کرتا۔ ہاں ان بے دین لوگوں کو خدا کے ہاں مال نفع دے نہ اولاد۔ یہ تو جہنمی ہیں۔ صِرٌّ کے معنی سخت سردی کے ہیں۔ جو کھیتوں کو جلا دیتی ہے۔ غرض جس طرح کسی کی تیار کھیتی پر پالا پڑے اور وہ جل کر خاکستر ہو جائے۔ نفع چھوڑ اصل بھی غارت ہو جائے اور امیدوں پر پانی پھر جائے۔ اسی طرح یہ کفار ہیں جو

[1] یاد رکھئے کہ یہ تعریف انہیں اہل کتاب کی ہو رہی ہے جو ایمان لے آئے تھے اور آج اس تعریف و ستائش کے وہی مستحق ہوں گے جو حلقۂ اسلام میں داخل ہو جائیں گے۔

کچھ یہ خرچ کرتے ہیں اسکا نیک بدلہ تو کہاں اور عذاب ہوگا۔ یہ کچھ خدا کی طرف سے ظلم نہیں بلکہ یہ انکی بداعمالیوں کی سزا ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا بِطَانَةً مِنْ دُونِكُمْ لَا يَأْلُونَكُمْ خَبَالًا وَدُّوا مَا عَنِتُّمْ قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَاءُ مِنْ أَفْوَاهِهِمْ وَمَا تُخْفِي صُدُورُهُمْ أَكْبَرُ قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْآيَاتِ إِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُونَ ﴿۱۱۸﴾ هَا أَنْتُمْ أُولَاءِ تُحِبُّونَهُمْ وَلَا يُحِبُّونَكُمْ وَتُؤْمِنُونَ بِالْكِتَابِ كُلِّهِ وَإِذَا لَقُوكُمْ قَالُوا آمَنَّا وَإِذَا خَلَوْا عَضُّوا عَلَيْكُمُ الْأَنَامِلَ مِنَ الْغَيْظِ قُلْ مُوتُوا بِغَيْظِكُمْ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ ﴿۱۱۹﴾ إِنْ تَمْسَسْكُمْ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ وَإِنْ تُصِبْكُمْ سَيِّئَةٌ يَفْرَحُوا بِهَا وَإِنْ تَصْبِرُوا وَتَتَّقُوا لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ شَيْئًا إِنَّ اللَّهَ بِمَا يَعْمَلُونَ مُحِيطٌ ﴿۱۲۰﴾

اے ایمان والو اپنے سوا کسی کو صاحب خصوصیت مت بناؤ۔ وہ لوگ تمہارے ساتھ فساد کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھتے۔ تمہاری مضرت کی تمنا رکھتے ہیں۔ واقعی بغض ان کے منہ سے ظاہر ہو پڑتا ہے اور جس قدر ان کے دلوں میں ہے وہ تو بہت کچھ ہے ہم علامات تمہارے سامنے ظاہر کر چکے ہیں۔ اگر تم عقل رکھتے ہو۔ ہاں تم ایسے ہو کہ ان لوگوں سے محبت رکھتے ہو اور یہ لوگ تم سے اصلاً محبت نہیں رکھتے حالانکہ تم تمام کتابوں پر ایمان رکھتے ہو اور یہ لوگ جب تم سے ملتے ہیں کہہ دیتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے اور جب الگ ہوتے ہیں تو تم پر اپنی انگلیاں کاٹ کاٹ کھاتے ہیں مارے غیظ کے۔ آپ کہہ دیجئے کہ تم مر رہو اپنے غصہ میں۔ بے شک خدا تعالیٰ خوب جانتے ہیں دلوں کی باتوں کو۔ اگر تم کو اچھی حالت پیش آتی ہے تو ان کے لئے موجب رنج ہوتی ہے اور اگر تم کو کوئی ناخوشگوار حالت پیش آتی ہے تو اس سے خوش ہوتے ہیں اور اگر تم استقلال اور تقویٰ کے ساتھ رہو تو ان لوگوں کی تدبیر تم کو ذرا بھی ضرر نہ پہنچا سکے گی بلاشبہ اللہ تعالیٰ ان کے اعمال پر احاطہ رکھتے ہیں۔

کفار سے ترکِ تعلق ضروری ہے ☆

اللہ تعالیٰ ایمانداروں کو کافروں اور منافقوں کی دوستی اور تعلق سے روکتا ہے کہ یہ تو تمہارے دشمن ہیں۔ ان کی چکنی چپڑی باتوں میں بہک نہ جانا اور ان کے مکر کے پھندے میں پھنس نہ جانا۔ ورنہ موقعہ پا کر یہ تمہیں سخت ضرر پہنچائیں گے اور اپنی باطنی عداوت نکالیں گے۔ تم انہیں اپنا رازدار ہرگز نہ سمجھنا' راز کی باتیں ان کے کانوں تک نہ پہنچانا۔ بِطَانَة کہتے ہیں

انسان کے رازدار دوست کو اور مِنْ دُوْنِكُمْ سے مراد اہل اسلام کے سوا تمام فرقے ہیں۔ بخاری وغیرہ میں حدیث ہے' حضور علیہ اسلام فرماتے ہیں: جس نبی کو خدا نے مبعوث فرمایا اور جس خلیفہ کو مقرر کیا۔ اس کے لئے دو بطانہ مقرر کئے۔ ایک تو بھلائی کی بات سمجھانے والا اور اس پر رغبت دینے والا' دوسرا برائی کی رہبری کرنے والا اور اس پر آمادہ کرنے والا۔ بس پھر خدا جسے بچائے وہی بچ سکتا ہے۔ حضرت عمر بن خطابؓ سے کہا گیا کہ یہاں پر حنیفہ کا ایک شخص بڑا اچھا لکھنے والا اور بہت اچھے حافظہ والا ہے۔ آپ اپنا محرر اور منشی مقرر کرلیں۔ آپ نے فرمایا: پھر تو میں غیر مؤمن کو اپنا بطانہ بنالوں گا جو خدا نے منع کیا ہے۔ اس واقعہ کو اور اس آیت کو سامنے رکھ کر ذہن اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ ذمی کفار کو بھی ایسے کاموں میں نہ لگانا چاہئے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ مخالفین کو مسلمانوں کے پوشیدہ ارادوں سے واقف کردے اور ان کے دشمنوں کو ان سے ہوشیار کردے کیونکہ اب کی تمنا ہی مسلمانوں کو نیچا دکھانے کی ہوتی ہے[1]۔

ازہر بن راشد کہتے ہیں کہ لوگ حضرت انسؓ سے حدیثیں سنتے تھے۔ اگر کسی حدیث کا مطلب سمجھ میں نہ آتا تو حضرت حسن بصریؒ سے جاکر مطلب حل کرلیتے۔ ایک دن حضرت انسؓ نے حدیث بیان کی کہ مشرکوں کی آگ سے روشنی طلب نہ کرو اور اپنی انگوٹھی میں عربی نقش نہ کرو۔ انہوں نے آکر خواجہ صاحب سے اس کی تشریح دریافت کی' تو آپ نے فرمایا کہ پچھلے جملہ کا تو یہ مطلب ہے کہ انگوٹھی پر محمد صلی اللہ علیہ وسلم نہ کھداؤ اور پہلے جملہ کا مطلب یہ ہے کہ مشرکوں سے اپنے کاموں میں مشورہ نہ لو۔ دیکھو کتاب اللہ میں بھی ہے کہ ایماندار واپنے سوا دوسروں کو ہم راز نہ بناؤ (ابویعلی) لیکن خواجہ صاحب کی یہ تشریح قابل غور ہے۔ حدیث کا ٹھیک مطلب غالباً یہ ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عربی خط میں اپنی انگوٹھیوں پر نقش نہ کراؤ۔ چنانچہ اور حدیث میں صاف ممانعت موجود ہے۔ یہ اس لئے تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مہر کے ساتھ مشابہت نہ ہو اور اوّل جملے کا مطلب یہ ہے کہ مشرکوں کی بستی کے پاس نہ رہو۔ ان کے پڑوس سے دور رہو۔ انکے شہروں سے ہجرت کر جاؤ[2]۔ جیسے ابوداؤد میں ہے کہ مسلمانوں اور مشرکوں کے درمیان کی لڑائی کی آگ کو کیا تم نہیں دیکھتے اور حدیث میں ہے جو مشرکوں سے میل جول کرے یا ان کے ساتھ رہے بسے' وہ بھی انہی جیسا ہے۔ پھر فرمایا ان کی باتوں سے بھی ان کی عداوت ٹپک رہی ہے۔ ان کے چہروں سے بھی قیافہ شناس ان کی باطنی خباشتوں کو معلوم کرسکتا ہے۔ پھر جو ان کے دلوں میں تباہ کن شرارتیں ہیں' وہ تو تم سے مخفی ہیں۔ لیکن ہم نے تو صاف صاف بیان کردیا ہے۔ عاقل لوگ ایسے مکاروں کی مکاری میں نہیں آتے۔ پھر فرمایا دیکھو کتنی کمزوری کی بات ہے کہ تم ان سے محبت رکھو اور وہ تمہیں نہ چاہیں تمہارا ایمان کل کتاب پر ہو اور یہ شک وشبہ میں ہی پڑے ہوئے ہوں۔ ان کی کتاب کو تم تو مانو' لیکن یہ تمہاری کتاب کا انکار کریں تو چاہئے تھا یہ کہ تم خود انہیں کڑی نظروں سے دیکھتے لیکن برخلاف اس کے یہ تمہاری عداوت کی آگ میں جل رہے ہیں سامنا ہوجائے تو ایمانداری کی داستان بیان کرنے بیٹھ جاتے ہیں۔ لیکن جب ذرا الگ ہوتے ہیں تو غیظ وغضب سے جلن اور حسد سے اپنی انگلیاں چباتے ہیں۔

پس مسلمانوں کو بھی ان کی ظاہر داری پر نہ ریجھنا (دلدادہ ہونا) چاہیے یہ گو جلتے جھلتے رہیں لیکن اللہ تعالیٰ اسلام اور

---

[1] اگر کسی کافر کے بارے میں بالیقین یہ معلوم ہوجائے کہ وہ اسلام اور مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کے درپے ہے تو اس سے احتیاط ضروری ہے ورنہ عام حالات میں کفار کو اپنے کاروبار میں ملازم رکھنے میں کچھ مضائقہ نہیں' ۱۲

[2] یہ ہجرت واجب اور ضرور اطاعت الٰہی نہیں ہے' صرف احتیاط کے لیے ایسا کرنا چاہیے کیونکہ باہمی طور پر رہنے سہنے سے مذہبی اثرات بھی ایک دوسرے کے ضرور اختیار کرتے ہیں' اس لیے علیحدہ رہنے میں بہر حال خیر ہے۔ ۱۲

مسلمانوں کو ترقی ہی دیتا رہے گا۔ یہ دن رات ہر حیثیت سے بڑھتے ہی رہیں گے۔ گو وہ مارے غصے کے مرجائیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے دلوں کے بھیدوں سے واقف ہے۔ ان کے تمام منصوبوں پر خاک پڑے گی۔ یہ اپنی شرارتوں میں کامیاب نہ ہوسکیں گے۔ اپنی خواہش کے خلاف مسلمانوں کی دن دُونی ترقی دیکھیں گے اور آخرت میں بھی انہیں نعمتوں والی جنت میں پائیں گے۔ برخلاف اس کے یہ خود یہاں بھی رسوا ہوں گے اور وہاں بھی جہنم کا ایندھن بنیں گے۔ ان کی شدت عداوت کی یہ کتنی بڑی دلیل ہے کہ جہاں تمہیں کوئی نفع پہنچا اور یہ کلیجہ مسوسنے لگا اور اگر خدانخواستہ تمہیں کوئی نقصان پہنچ گیا تو ان کی باچھیں کھل گئیں۔ بغلیں بجاتے اور خوشیاں منانے لگے۔ اگر خدا کی طرف سے مؤمنوں کی مدد ہوئی' یہ کفار پر غالب آئے۔ انہیں غنیمت کا مال ملا۔ یہ تعداد میں بڑھ گئے تو وہ جل بھجے اور اگر مسلمانوں پر تنگی آ گئی یا دشمنوں میں گھر گئے تو ان کے ہاں عید منائی جائے گی۔ اب اللہ تعالیٰ ایمانداروں کو خطاب کر کے فرماتا ہے کہ تم شریروں کی شرارت اور ان بدبختوں کے مکر سے اگر نجات چاہتے ہو تو صبرو تقویٰ اور توکل کرو۔ خدا تمہارے دشمنوں کو گھیر لے گا۔ کسی بھلائی کے حاصل کرنے' کسی بُرائی سے بچنے کی کسی میں طاقت نہیں۔ جو خدا چاہتا ہے ہوتا ہے اور جو نہیں چاہتا نہیں ہوسکتا۔ جو اس پر توکل کرے' اسے وہ کافی ہے اسی مناسبت سے اب جنگ اُحد کا ذکر شروع ہوتا ہے جس میں مسلمانوں کے صبر و تحمل کا بیان ہے اور جس میں آزمائش خدا کا پورا نقشہ ہے اور جس میں مؤمن و منافق کی ظاہر تمیز ہے۔ سنیئے ارشاد ہوتا ہے

وَاِذْ غَدَوْتَ مِنْ اَهْلِكَ تُبَوِّئُ الْمُؤْمِنِيْنَ مَقَاعِدَ لِلْقِتَالِ ؕ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۲۱﴾ اِذْ هَمَّتْ طَّآئِفَتٰنِ مِنْكُمْ اَنْ تَفْشَلَا ۙ وَاللّٰهُ وَلِيُّهُمَا ؕ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۲۲﴾ وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ وَّاَنْتُمْ اَذِلَّةٌ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۱۲۳﴾

اور جب کہ آپ صبح کے وقت اپنے گھر سے چلے مسلمانوں کو مقاتلہ کرنے کے لئے مقامات پر جا رہے تھے اور اللہ تعالیٰ سب سن رہے تھے سب جان رہے تھے۔ جب تم میں سے دو جماعتوں نے دل میں خیال کیا کہ ہمت ہار دیں اور اللہ تعالیٰ تو ان دونوں جماعتوں کا مددگار تھا اور پس مسلمانوں کو تو اللہ ہی پر اعتماد کرنا چاہیئے اور یہ بات محقق ہے کہ حق تعالیٰ نے تم کو بدر میں منصور فرمایا حالانکہ تم بے سروسامان تھے سو اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہا کرو تا کہ تم شکر گزار بنو۔ ○

تاریخ اسلام میں حق و باطل کی دوسری نبرد آزمائی ☆

یہ اُحد کے واقعہ کا ذکر ہے۔ گو بعض مفسرین نے اسے جنگ خندق کا قصہ بھی کہا ہے لیکن ٹھیک یہی ہے کہ یہ واقعہ جنگِ اُحد کا ہے جو ۳ھ ۱۱ شوال بروز ہفتہ پیش آیا تھا۔ جنگ بدر میں مشرکین کو کامل شکست ہوئی تھی۔ ان کے سردار موت کے گھاٹ اُترے تھے اب اس کا بدلہ لینے کے لئے مشرکین نے بھاری تیاری کی۔ تمام وہ تجارتی مال جو بدر والی لڑائی کے موقع پر دوسرے راستے سے بچ کر آ گیا تھا' وہ سب اس لڑائی کے لئے روک رکھا تھا اور چاروں طرف سے لوگوں کو جمع کر کے تین ہزار کا ایک لشکرِ

جرار تیار کیا تھا اور پورے ساز وسامان کے ساتھ مدینہ پر چڑھائی کی ادھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جمعہ کی نماز کے بعد مالک بن عمروؓ کے جنازے کی نماز پڑھائی۔ جو قبیلہ بنی النجار میں سے تھے۔ پھر لوگوں سے مشورہ کیا کہ ان کی مدافعت کی کیا صورت تمہارے نزدیک بہتر ہے؟ تو عبداللہ بن اُبی نے کہا کہ ہمیں مدینہ سے باہر نہیں نکلنا چاہئے۔ اگر وہ آئے اور ٹھہرے تو گویا جیل خانہ میں آ گئے رکے کھڑے رہیں اور اگر مدینہ میں گھسے تو ایک طرف سے ہمارے بہادروں کی چادریں ہوں گی۔ دوسری جانب سے تیراندازوں کے بے پناہ تیر ہوں گے۔ پھر اُوپر سے عورتوں اور بچوں کی سنگ باری ہو گی اور اگر یوں لوٹ گئے تو بربادی اور خسارے کے ساتھ لوٹیں گے لیکن اس کے برخلاف بعض ان صحابہ کی رائے تھی' جو جنگ بدر میں شریک نہ ہو سکے تھے' یہ زور لگا رہے تھے کہ مدینہ کے باہر جا کر میدان میں خوب دِل کھول کر ان سے مقابلہ کرنا چاہئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم گھر میں تشریف لے گئے اور ہتھیار لگا کر باہر آئے۔ ان صحابہ کو اب خیال ہوا کہ کہیں ہم نے اللہ کے نبی کے خلافِ منشاء تو میدان کی لڑائی پر زور نہیں دیا۔ اس لئے یہ کہنے لگے کہ حضور ﷺ! اگر یہیں ٹھہر کر لڑنے کا ارادہ ہو تو یونہی کیجئے۔ ہماری جانب سے کوئی اصرار نہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ کے نبی ﷺ کے لئے زیبا نہیں کہ وہ ہتھیار پہن کر اُتارے۔ اب تو میں نہ لوٹوں گا جب تک کہ وہ نہ ہو جائے جو خدا کو منظور ہو۔ چنانچہ ایک ہزار کا لشکر لے کر آپ ﷺ مدینہ شریف سے نکل کھڑے ہوئے۔ شوط پر پہنچ کر اس منافق عبداللہ بن اُبی نے دغابازی کی' اور اپنی تین سو کی جماعت لے کر واپس مڑ گیا۔ یہ لوگ کہنے لگے' ہم جانتے ہیں کہ لڑائی تو ہونی ہی نہیں خواہ مخواہ زحمت کیوں اُٹھائیں؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی کوئی پرواہ نہ کی اور صرف سات سو صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو لے کر آپ نے اُحد پہاڑ کا رُخ کیا۔ پہاڑ کو پیٹھ کی طرف کر کے دامنِ کوہ میں لشکر کو اُتارا۔ حکم دے دیا کہ جب تک میں نہ کہوں لڑائی شروع نہ کرنا پچاس تیرانداز صحابیوں کو الگ کر کے ان کا امیر حضرت عبداللہ بن جبیرؓ کو بنایا اور ان سے فرمادیا کہ پہاڑی پر چڑھ جاؤ اور اس بات کا خیال رکھو کہ دشمن پیچھے سے نہ آ جائے۔ دیکھو ہم غالب آ جائیں یا (خدانخواستہ) مغلوب ہو جائیں تم ہرگز ہرگز اپنی جگہ سے نہ ہٹنا۔ یہ انتظامات کر کے خود آپ صلی اللہ علیہ وسلم بھی تیار ہو گئے۔ دُہری زرہ پہنی حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو جھنڈا دیا۔ آج چند لڑکے بھی لشکرِ محمدی میں نظر آئے تھے۔ یہ چھوٹے سپاہی بھی جانبازی کے لئے بہ ہمہ تن مستعد تھے۔ بعض اور جن بچوں کو حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ساتھ نہیں لیا تھا۔ انہیں جنگِ خندق لشکر میں بھرتی کیا گیا۔

جنگِ خندق اس کے دو سال بعد میں ہوئی تھی۔ قریش کا لشکر بڑے ٹھاٹھ سے مقابلہ پر آ ڈٹا۔ یہ تین ہزار سپاہیوں کا گروہ تھا۔ ان کے ساتھ دو سو کوتل گھوڑے تھے جنہیں موقعہ پر کام آنے کے لئے ساتھ رکھا۔ ان کے داہنے حصہ پر خالد بن ولید[1] اور بائیں حصہ پر عکرمہ[2] بن ابو جہل تھا (یہ دونوں سردار بعد میں مسلمان ہو گئے تھے رضی اللہ تعالیٰ عنہما) ان کا جھنڈا بردار قبیلہ بنو عبدالدار تھا۔ پھر لڑائی شروع ہوئی جسکے تفصیلی واقعات انہی آیتوں کی موقع بہ موقع تفسیر کے ساتھ آتے رہیں گے ان شاء اللہ تعالیٰ۔

الغرض اس آیت میں اسی کا بیان ہو رہا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ شریف سے نکلے اور لوگوں کو لڑائی کی جگہ پر

---

[1] خالد (رضی اللہ عنہ) اب تک مسلمان نہیں ہوئے تھے۔

[2] عکرمہ (رضی اللہ عنہ) بھی بعد میں مسلمان ہو گئے تھے اور ابو جہل کی جانب نسبت سے عار محسوس کرتے تھے اس لیے زبانِ رسالت (ﷺ) نے آپ کو عکرمہ (رضی اللہ عنہ) کہنے کی تلقین کی ہے۔

مقرر کرنے لگے۔ لشکر کا میمنہ میسرہ مقرر کیا۔ اللہ تعالیٰ تمام باتوں کو سننے والا اور سب کے دِلوں کے بھید کو جاننے والا ہے۔
روایتوں میں یہ آچکا ہے کہ حضور علیہ السلام جمعہ کے دن مدینہ شریف سے لڑائی کے لئے نکلے۔ قرآن فرماتا ہے صبح ہی صبح تم لشکریوں کی جگہ مقرر کرتے تھے تو مطلب یہ ہے کہ جمعہ کے دن تو جا کر پڑاؤ ڈال دیا۔ باقی کارروائی ہفتہ کی صبح کو شروع ہوئی۔ حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ہمارے بارے میں یعنی بنو حارثہ اور بنو سلمہ کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی ہے کہ دو گروہوں نے بزدلی کا ارادہ کیا تھا گو اس میں ہماری ایک کمزوری کا بیان ہے لیکن ہم اپنے حق میں اس آیت کو بہت بہتر جانتے ہیں۔ کیونکہ اس میں یہ بھی فرمادیا گیا ہے کہ اللہ ان دونوں کا ولی ہے۔

پھر فرمایا کہ دیکھو میں نے بدر والے دن بھی تمہیں غالب کیا۔ حالانکہ تم بہت ہی کم اور بے سروسامان تھے۔ بدن کی لڑائی ۲ھ ۱۷ رمضان بروز جمعہ ہوئی تھی۔ اس کا نام یوم الفرقان رکھا گیا۔ اس دن اسلام اور اہل اسلام کو عزت ملی شرک برباد ہوا محل شرک اُجڑ گیا۔ حالانکہ مسلمان صرف تین سو تیرہ تھے۔ ان کے پاس صرف دو گھوڑے تھے۔ فقط ستر اونٹ تھے۔ باقی سب پیدل تھے۔ ہتھیار بھی اتنے کم تھے کہ گویا نہ تھے اور دشمن کی تعداد اس سے تین گنی تھے۔ ایک ہزار سے کچھ ہی کم تھے۔ ہر ایک زرہ بکتر لگئے ہوئے ضرورت سے زیادہ ہتھیار عمدہ عمدہ گھوڑے مالداری کا یہ حال کہ سونے کے زیور پہنے ہوئے۔ اس موقعہ پر اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو عزت اور غلبہ دیا۔ اپنی وحی ظاہر کی۔ اپنے نبی ﷺ اور آپ ﷺ کے ساتھیوں کو سرخرو کیا اور شیطان اور اس کے لشکریوں کو ذلیل وخوار کیا۔ اپنے مؤمن بندوں کو اور جنتی لشکریوں کو اس آیت میں یہ احسان یاد دلاتا ہے کہ باوجود تمہاری تعداد کی کمی اور ظاہری اسباب کی غیر موجودگی کے تمہیں کو غالب رکھا تا کہ تم معلوم کرلو کہ غلبہ ظاہری اسباب پر موقوف نہیں اسی لئے دوسری آیت میں صاف فرمادیا کہ جنگ حنین میں تم نے ظاہری اسباب پر نظر ڈالی اور اپنی کثرت کو دیکھ کر خوش ہوئے لیکن اس کثرت تعداد اور موجودگی اسباب نے تمہیں کچھ فائدہ نہ دیا۔

حضرت عباس اشعری فرماتے ہیں کہ جنگ یرموک میں ہمارے پانچ سردار تھے۔ حضرت ابوعبیدہؓ، حضرت یزید بن ابی سفیانؓ، حضرت ابن حسنہؓ، حضرت خالد بن ولیدؓ اور حضرت عیاضؓ اور خلیفہ المؤمنین حضرت عمرؓ کا حکم تھا کہ لڑائی کے وقت حضرت ابوعبیدہ سرداری کریں۔ اس لڑائی میں ہمیں چاروں طرف سے شکست کے آثار نظر آنے لگے۔ تو ہم نے خلیفہ وقت کو خط لکھا کہ ہمیں موت نے گھیر رکھا ہے امداد بھیجئے۔ حضرت فاروق کا مکتوب گرامی ہماری گزارش کے جواب میں آیا۔ جس میں تحریر تھا کہ تمہارا طلب امداد کا خط پہنچا۔ میں تمہیں ایک ایسی ہستی بتلاتا ہوں جو سب سے زیادہ مددگار اور سب سے زیادہ مضبوط لشکر والی ہے۔ وہ ذات اللہ تبارک وتعالیٰ کی ہے جس نے اپنے بندے اور رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی مدد بدر والے دن کی تھی۔ بدری لشکر تو تم سے بہت ہی کم تھے۔ میرا یہ خط پڑھتے ہی جہاد شروع کر دو اور اب مجھے کچھ نہ لکھنا۔ نہ پوچھنا۔ اس خط سے ہماری جراتیں بڑھ گئیں۔ ہمتیں بلند ہوگئیں۔ پھر ہم نے جم کر لڑنا شروع کی دیا۔ الحمدللہ دشمن کو شکست ہوئی اور وہ بھاگے۔ ہم نے بارہ میل تک ان کا تعاقب کیا۔ بہت سامال غنیمت ہمیں ملا' جو ہم نے آپس میں بانٹ لیا۔ پھر حضرت ابوعبیدہؓ کہنے لگے: میرے ساتھ دوڑ کون کرے گا؟ ایک نوجوان نے کہا: اگر آپ ناراض نہ ہوں تو میں حاضر ہوں۔ چنانچہ دوڑنے میں وہ آگے نکل گئے۔ میں نے دیکھا کہ ان کی دونوں زلفیں ہوا میں اڑ رہی ہیں اور وہ اس نوجوان کے پیچھے گھوڑا اُڑائے چلے جارہے تھے۔ بدر بن نارین ایک شخص تھا' اس کے نام سے ایک کنواں مشہور تھے اور اس میدان کا جس میں یہ کنواں تھے' یہی نام ہو گیا تھا۔ بدر کی

جنگ بھی اسی نام سے مشہور ہوگی۔ یہ جگہ مکہ اور مدینہ کے درمیان ہے۔ پھر فرمایا کہ اللہ سے ڈرتے رہا کرو تا کہ شکر کی توفیق ملے اور اطاعت گزاری کرسکو۔

اِذْ تَقُوْلُ لِلْمُؤْمِنِيْنَ اَلَنْ يَّكْفِيَكُمْ اَنْ يُّمِدَّكُمْ رَبُّكُمْ بِثَلٰثَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُنْزَلِيْنَ ﴿۱۲۴﴾ بَلٰٓى ۙ اِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا وَيَاْتُوْكُمْ مِّنْ فَوْرِهِمْ هٰذَا يُمْدِدْكُمْ رَبُّكُمْ بِخَمْسَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُسَوِّمِيْنَ ﴿۱۲۵﴾ وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰى لَكُمْ وَلِتَطْمَئِنَّ قُلُوْبُكُمْ بِهٖ ۭ وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ﴿۱۲۶﴾ لِيَقْطَعَ طَرَفًا مِّنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَوْ يَكْبِتَهُمْ فَيَنْقَلِبُوْا خَآئِبِيْنَ ﴿۱۲۷﴾ لَيْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ اَوْ يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ اَوْ يُعَذِّبَهُمْ فَاِنَّهُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿۱۲۸﴾ وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۲۹﴾ ع

جب کہ آپ مسلمانوں سے یوں فرمار ہے تھے کہ کیا تم کو یہ امر کافی نہ ہوگا کہ تمہارا رب تمہاری امداد کرے تین ہزار فرشتوں کے ساتھ جو اتارے جاویں گے۔ ہاں کیوں نہیں اگر مستقل رہو گے اور متقی رہو گے اور وہ لوگ تم پر یک دم سے آ پہنچیں گے تو تمہارا رب تمہاری امداد کرے گا پانچ ہزار فرشتوں کے ساتھ جو کہ ایک خاص وضع بنائے ہوئے ہوں گے اور اللہ تعالیٰ نے یہ امداد محض اس لئے کی کہ تمہارے لئے بشارت ہو اور تا کہ تمہارے دلوں کو قرار ہو جائے اور نصرت صرف اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہے جو کہ زبردست ہیں حکیم ہیں۔ تا کہ کفار میں سے ایک گروہ کو ہلاک کردے۔ پھر وہ ناکام لوٹ جائیں آپ کو کوئی دخل نہیں یہاں تک کہ خدا تعالیٰ ان پر یا تو متوجہ ہو جائیں یا ان کو کوئی سزا دے دیں کیونکہ وہ ظلم بھی بڑا کر رہے ہیں اور اللہ تعالیٰ ہی کی ملک ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے وہ جس کو چاہیں بخش دیں اور جس کو چاہیں عذاب دیں اور اللہ تعالیٰ تو بڑے مغفرت کرنے والے بڑے رحمت کرنے والے ہیں۔ ○

سرورِ کائنات ﷺ کا اطمینان دلانا ☆

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ تسلیاں دینا بعض تو کہتے ہیں بدر والا دن تھا۔ حسن بصریؒ، عامر شعبیؒ، ربیع بن انسؒ وغیرہ کا یہی قول ہے۔ ابن جریرؒ بھی اسی کو پسند کرتے ہیں۔ عامر شعبی کا قول ہے کہ مسلمانوں کو یہ خبر ملی تھی کہ کرز بن جابر مشرکوں کی

امداد میں آئے گا اس پر اس امداد کا وعدہ ہوا تھا۔ لیکن پھر وہ نہ آیا۔ یہ ربیع بن انس فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی مدد کے لئے پہلے تو ایک ہزار فرشتے بھیجے پھر تین ہزار ہو گئے۔ پھر پانچ ہزار۔ یہاں اس آیت میں تین ہزار اور پانچ ہزار تھے مدد کرنے کا وعدہ ہے اور بدر کے واقعہ کے بیان کے وقت ایک ہزار فرشتوں کی امداد کا وعدہ ہے۔ فرمایا: ﴿اِنِّی مُمِدُّکُمْ بِاَلْفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِکَۃِ مُرْدِفِیْنَ﴾ (الانفال: ۹) اور تطبیق دونوں آیتوں میں یہی ہے۔ کیونکہ مُرْدِفِیْن کا لفظ موجود ہے۔ پس پہلے ایک ہزار اُترے۔ پھر ان کے بعد تین ہزار پورے ہوئے۔ آخر پانچ ہزار ہو گئے۔ بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ وعدہ جنگِ بدر کے لئے تھا۔ نہ کہ جنگِ اُحد کے لئے۔ بعض کہتے ہیں کہ جنگ اُحد کے موقعہ پر وعدہ ہوا تھا۔ مجاہد عکرمہ ضحاک زہری موسیٰ ابن عقبہ وغیرہ کا یہی قول ہے لیکن وہ کہتے ہیں کہ چونکہ مسلمان میدان چھوڑ کر ہٹ گئے اس لئے یہ فرشتے نازل نہ ہوئے۔ کیونکہ اِن تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا کا ساتھ ہی فرمایا تھا۔ یعنی اگر تم صبر کرو اور تقویٰ کرو فَوْر کے معنی وجہ اور غضب کے ہیں۔ مُسَوِّمِیْنَ کے علامت والے کے ہیں۔

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں: فرشتوں کی نشانی بدر والے دن سفید رنگ صوف کی تھی اور ان کے گھوڑوں کی نشانی ماتھے کی سفیدی تھی۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں: سُرخ اونٹ کی نشانی تھی۔ حضرت مجاہد فرماتے ہیں گردن کے بالوں اور دم کا نشان تھا اور یہی نشان آپ کے لشکریوں کا تھا یعنی صوف کا کھول کہتے ہیں فرشتوں کی نشانی اُون کی پگڑیاں تھیں جو سیاہ رنگ کے عمامے تھے اور حنین والے دن سرخ عمامے تھے۔ ابن عباس فرماتے ہیں بدر کے علاوہ فرشتے کبھی جنگ میں شریک نہیں ہوئے اور سفید رنگ عماموں کی علامت تھی۔ یہ صرف مدد کے لئے اور گنتی بڑھانے کے لئے تھے نہ کہ لڑتے ہوں۔ یہ بھی روایت ہے کہ جنگ بدر میں حضرت زبیرؓ کے سر پر سفید رنگ کا صافہ تھا اور فرشتوں پر زرد رنگ کا۔ پھر فرمایا کہ یہ فرشتوں کا نازل کرنا اور تمہیں اس کی خبر دینا صرف تمہاری خوشی دلجوئی اور اطمینان کے لئے ہے۔ ورنہ خدا کو قدرت ہے کہ بغیر ان کے اتارے بلکہ بغیر تمہارے بھی تمہیں غالب کر دے۔ مدد اسی کی طرف سے ہے۔ جیسے اور جگہ ہے ﴿وَلَوْ یَشَآءُ اللّٰہُ لَا نْتَصَرَ مِنْھُمْ﴾ (محمد: ۴) اگر خدا چاہتا تو ان سے خود ہی بدلہ لے لیتا۔ لیکن وہ ہر ایک کو آزما رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی راہ میں جو قتل کئے جائیں اُن کے اعمال اکارت نہیں ہوتے۔ اللہ انہیں راہ دکھائے گا۔ ان کے اعمال سنوارے گا اور انہیں جنت میں لے جائے گا۔ جس کی تعریف وہ کر چکا ہے۔ وہ عزت والا ہے اور اپنے ہر کام میں حکمت رکھتا ہے یہ حکم جہاد بھی طرح طرح کی حکمتوں پر مبنی ہے۔ اس سے کفار ہلاک ہوں گے یا نامراد واپس ہو جائیں گے۔ اس کے بعد بیان ہوتا ہے کہ دنیا اور آخرت کے کل اُمور اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہیں۔ اے نبی تمہیں کسی امر کا اختیار نہیں۔ جیسے فرمایا: ﴿اِنَّمَا عَلَیْکَ الْبَلٰغُ وَعَلَیْنَا الْحِسَابُ﴾ (الرعد: ۴۰) تم پر صرف تبلیغ ہے حساب تو ہمارے ذمہ ہے اور جگہ ہے: ﴿لَیْسَ عَلَیْکَ ھُدٰھُمْ﴾ (البقرہ: ۲۷۲) تمہارے ذمہ ان کی ہدایت نہیں اللہ جسے چاہے ہدایت دے اور جگہ فرمایا: ﴿اِنَّکَ لَا تَھْدِیْ مَنْ اَحْبَبْتَ﴾ (القصص: ۵۶) تو جسے چاہے ہدایت نہیں کر سکتا بلکہ اللہ جسے چاہے ہدایت کرتا ہے۔ پس میرے بندوں میں تجھے کوئی اختیار نہیں جو حکم پہنچے اسے اوروں کو پہنچا دے تیرے ذمے یہی ہے۔ ممکن ہے خدا انہیں توبہ کی توفیق دے اور برائی کے بعد وہ بھلائی کرنے لگیں اور خدا ان کی توبہ قبول فرمائے یا ممکن ہے کہ انہیں ان کے کفر و گناہ کی بناء پر عذاب کرے تو یہ ظالم اس کے بھی مستحق ہیں۔

صحیح بخاری میں ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صبح کی نماز میں جب دوسری رکعت کے رکوع سے سر اٹھاتے اور سمع

اللّٰہُ لِمَنْ حَمِدَہٗ۔ رَبَّنَا لَکَ الْحَمْدُ کہہ لیتے تو کفار پر بددعا کرتے کہ خدایا فلاں فلاں پر لعنت کر۔ اس کے بارے میں یہ آیت: ﴿لَیْسَ مِنَ الْاَمْرِ شَیْءٌ﴾ نازل ہوئی۔

مسند احمد میں ان کافروں کے نام بھی آئے ہیں مثلاً حارث بن ہشام' سہیل بن عمرو' صفوان بن اُمیہ اور اسی میں ہے کہ بالآخران کو ہدایت نصیب ہوئی اور یہ مسلمان ہو گئے۔ ایک روایت میں ہے کہ چار آدمیوں پر بددعا دی تھی۔ جس سے روک دیئے گئے۔ صحیح بخاری میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جب کسی پر بددعا کرتے یا کسی کے حق میں نیک دعا کرنا چاہتے تو رکوع کے بعد سَمِعَ اللّٰہُ اور رَبَّنَا پڑھ کر دعا مانگتے۔ کبھی کہتے: اے اللہ ولید بن ولید' سلمہ بن ہشام' عیاش بن ابو ربیعہ اور کمزور مسلمانوں کو کفار سے نجات دے۔ اے اللہ قبیلہ مضر پر اپنی پکڑ اور اپنا عذاب نازل فرما اور ان پر ایسی قحط سالی بھیج' جیسی یوسف کے زمانہ میں تھی۔ یہ دعا باآوازِ بلند ہوا کرتی تھی اور بعض مرتبہ صبح کی نماز کے قنوت میں یوں بھی کہتے کہ خدایا فلاں فلاں پر لعنت بھیج اور عرب کے بعض قبیلوں کے نام لیتے تھے اور روایت میں ہے کہ جنگ اُحد میں جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دندانِ مبارک شہید ہوئے' چہرہ زخمی ہوا۔ خون بہنے لگا' تو زبان سے نکل گیا کہ وہ قوم کیسے فلاح پائے گی' جس نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ یہ کیا۔ حالانکہ نبی خدا کی طرف انہیں بلاتا تھا۔ اس وقت یہ آیت: لَیْسَ لَکَ نازل ہوئی۔ آپ اس غزوے میں ایک گڑھے میں گر پڑے تھے اور خون بہت نکل گیا تھا۔ کچھ اس ضعف کی وجہ سے کہ دوہری زرہ پہنے ہوئے تھے' اُٹھ نہ سکے۔ حضرت حذیفہ کے مولیٰ حضرت سالمؓ پہنچے اور چہرے پر سے خون پونچھا۔ جب افاقہ ہوا' آپ نے فرمایا اور یہ آیت نازل ہوئی ہے۔ پھر فرمایا ہے کہ زمین و آسمان کی ہر چیز اسی کی ہے۔ سب اس کے غلام ہیں' وہ جسے چاہے عذاب کرے۔ متصرف وہی ہے' جو چاہے حکم کرے' کوئی اس سے پرسش نہیں کر سکتا۔ وہ غفور الرحیم ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوا الرِّبٰوٓا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً ۠ وَّاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝۱۳۰ وَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْٓ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ ۝۱۳۱ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ۝۱۳۲ وَسَارِعُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ ۙ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ ۝۱۳۳ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ فِي السَّرَّاۗءِ وَالضَّرَّاۗءِ وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ ۭ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ۝۱۳۴ وَالَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَھُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ ۠ وَمَنْ يَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا

اللّٰہَ ۟ وَلَمْ یُصِرُّوْا عَلٰی مَا فَعَلُوْا وَھُمْ یَعْلَمُوْنَ ﴿۱۳۵﴾ اُولٰٓئِکَ جَزَآؤُھُمْ مَّغْفِرَۃٌ مِّنْ رَّبِّھِمْ وَ جَنّٰتٌ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِھَا الْاَنْھٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْھَا ؕ وَنِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِیْنَ ﴿۱۳۶﴾

اے ایمان والو سود مت کھاؤ (یعنی نہ لو اصل سے) کئی حصے زائد (کر کے) اور اللہ تعالیٰ سے ڈرو امید ہے کہ تم کامیاب ہو اور اس آگ سے بچو جو کافروں کے لئے تیاری کی گئی ہے اور خوشی سے کہنا مانو اللہ تعالیٰ کا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا امید ہے کہ تم رحم کئے جاؤ گے اور دوڑو طرف مغفرت کی جو تمہارے پروردگار کی طرف سے ہو اور طرف جنت کے جس کی وسعت ایسی ہے جیسے سب آسمان اور زمین وہ تیار کی گئی ہے خدا سے ڈرنے والوں کے لئے ایسے لوگ جو خرچ کرتے ہیں فراغت میں اور تنگی میں اور غصہ کے ضبط کرنے والے ہیں اور لوگوں سے درگزر کرنے والے ہیں اور اللہ تعالیٰ ایسے نیکوکاروں کو محبوب رکھتا ہے اور ایسے لوگ کہ جب کوئی کام کی گزرتے ہیں جس میں زیادتی ہو یا اپنی ذات پر نقصان اُٹھاتے ہیں۔ تو اللہ تعالیٰ کو یاد کر لیتے ہیں۔ پھر اپنے گناہوں کی معافی چاہنے لگتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے سوا اور ہے کون جو گناہوں کو بخشتا ہو اور وہ لوگ اپنے فعل پر اصرار نہیں کرتے اور وہ جانتے ہیں کہ ان لوگوں کی جزا بخشش ہے۔ ان کے رب کی طرف سے اور ایسے باغ ہیں کہ ان کے نیچے سے نہریں چلتی ہوں گی۔ ان میں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہنے والے ہوں گے اور یہ اچھا حق الخدمت ہے ان کام کرنے والوں کا۔○

سودی لین دین کی ممانعت☆

اللہ تعالیٰ مؤمن بندوں کو سودی لین دین سے اور سود خوری سے روک رہا ہے۔ اہل جاہلیت سودی قرضہ دیتے تھے۔ مدت مقرر ہوتی تھی۔ اگر اس مدت پر روپیہ وصول نہ ہوتا تو مدت بڑھا کر سود پر سود بڑھا دیا کرتے تھے۔ اسی طرح سود در سود مل کر اصل رقم کئی گنا بڑھ جاتی تھی۔ اللہ تعالیٰ ایمانداروں کو اس طرح ناحق لوگوں کے مال برباد کرنے سے روک رہا ہے اور تقویٰ کا حکم دے کر اس پر نجات کا وعدہ کر رہا ہے۔ پھر نارِ جہنم سے ڈراتا ہے اور اپنے عذابوں سے دھمکاتا ہے۔ پھر اپنی اور اپنے رسول کی اطاعت پر آمادہ کرتا ہے اور اس پر رحم و کرم کے وعدے دیتا ہے۔ پھر سعادت دارین کے حصول کے لئے نیکیوں کی طرف سبقت کرنے کو فرماتا ہے اور جنت کی تعریف کرتا ہے۔ چوڑائی کو بیان کر کے لمبائی کا اندازہ سننے والوں پر ہی چھوڑا جاتا ہے۔ جس طرح جنتی فرش کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا: ﴿بَطَآئِنُھَا مِنْ اِسْتَبْرَقٍ﴾ (الرحمٰن:۵۴) یعنی اس کا استر نرم ریشم کا ہے تو مطلب یہ ہے کہ جب استر ایسا ہے تو ابرے کا کیا ٹھکانا ہے۔ اسی طرح یہاں بھی بیان ہو رہا ہے کہ جب عرض ساتوں آسمانوں اور ساتوں زمینوں کے برابر ہے تو طول کتنا بڑا ہوگا اور بعض نے کہا ہے کہ عرض وطول یعنی لمبائی چوڑائی دونوں برابر ہے۔ کیونکہ جنت مثل قبہ کے عرش کے نیچے ہے اور جو چیز قبہ نما ہو یا متدیرہ ہو۔ اس کا عرض وطول یکساں ہوتا ہے۔ ایک صحیح حدیث میں ہے جب تم اللہ تعالیٰ سے جنت مانگو تو فردوس کا سوال کرو وہ سب سے اونچی اور سب سے اچھی جنت ہے۔ اسی جنت سے سب نہریں جاری ہوتی ہیں اور اس کی چھت اللہ رحمٰن ورحیم کا عرش ہے۔ مسند امام احمد میں ہے کہ ہرقل نے حضور صلی

اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بطور اعتراض کے ایک سوال لکھ بھیجا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم مجھے اس جنت کی دعوت دے رہے ہیں۔ جس کی چوڑائی آسمان وزمین کے برابر ہے تو یہ تو فرمایئے کہ پھر جہنم کہاں گئی؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا سبحان اللہ جب دن آتا ہے تو رات کہاں جاتی ہے؟ جو قاصد ہرقل کا یہ خط لے کر خدمت نبویہ میں حاضر ہوا تھا۔ اس سے حضرت یعلیٰ بن مرہؓ کی ملاقات حمص میں ہوئی تھی۔ کہتے ہیں اس وقت یہ بہت ہی بڈھا ہو گیا تھا۔ کہنے لگا جب میں نے یہ خط حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا تو آپ ﷺ نے اپنی بائیں طرف کے ایک صحابی کو دیا۔ میں نے لوگوں سے پوچھا ان کا کیا نام ہے؟ لوگوں نے کہا یہ حضرت معاویہؓ ہیں۔ حضرت عمرؓ سے بھی یہی سوال ہوا تھا تو آپ ﷺ نے فرمایا تھا کہ دن کے وقت رات اور رات کے وقت دن کہاں جاتا ہے؟ یہودی نے جواب سن کر کھسیانے ہو کر کہنے لگا کہ تورات سے ماخوذ ہوگا۔ حضرت ابن عباسؓ سے بھی یہ جواب نقل ہے۔ ایک مرفوع حدیث میں ہے کسی نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا تو آپ ﷺ نے جواب میں فرمایا: جب ہر چیز پر رات آجاتی ہے تو دن کہاں جاتا ہے؟ اس نے کہا: جہاں اللہ چاہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اسی طرح جہنم بھی جہاں اللہ چاہے (بزار) اس جملہ کے دو معنی ہوتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ رات کے وقت ہم دن کو نہیں دیکھ سکتے لیکن تاہم دن کا کسی جگہ ہونا ناممکن نہیں۔ اسی طرح گو جنت کا عرض اتنا ہی ہے۔ لیکن پھر جہنم دجود سے انکار نہیں ہو سکتا۔ جہاں خدا چاہے وہ بھی ہے۔ دوسرے معنی یہ بھی ہیں کہ جب دن ایک طرف سے چڑھنے لگے رات دوسری جانب ہوتی ہے۔ اسی طرح جنت اعلیٰ علیین میں ہے اور دوزخ اسفل السافلین میں تو کوئی منافات نہ رہی واللہ اعلم۔

جنتیوں کے اوصاف ☆

پھر اللہ تعالیٰ اہل جنت کے وصف بیان فرماتا ہے کہ وہ سختی میں اور آسانی میں، خوشی میں اور غمی میں، تندرستی اور بیماری میں غرض ہر حال میں راہ للہ اپنا مال خرچ کرتے رہتے ہیں۔ جیسے اور جگہ ہے: ﴿الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً﴾ (البقرہ: ۲۷۴) یعنی وہ لوگ دن رات کھلے چھپے خرچ کرتے رہتے ہیں۔ کوئی امر انہیں اللہ تعالیٰ کی اطاعت سے باز نہیں رکھ سکتا۔ اس کی مخلوق پر اس کے حکم سے احسان کرتے رہتے ہیں۔ یہ غصے کو پی جانے والے اور لوگوں کی برائیوں سے درگزر کرنے والے ہیں۔ کَظم کے معنی چھپانے کے بھی ہیں یعنی اپنے غصہ کا اظہار بھی نہیں کرتے۔ بعض روایتوں میں ہے اے ابن آدم اگر غصے کے وقت تو مجھے یاد رکھے گا۔ یعنی میرا حکم مان کر غصہ پی جائے گا تو میں بھی اپنے غصہ کے وقت تجھے یاد رکھوں گا۔ یعنی ہلاکت کے وقت تجھے ہلاکت سے بچا لوں گا (ابن ابی حاتم) اور حدیث میں ہے رسول صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: جو شخص اپنا غصہ روک لے اللہ تعالیٰ اس پر سے اپنے عذاب ہٹا لیتا ہے اور جو شخص اپنی زبان (خلاف شرع باتوں سے) روک لے اللہ تعالیٰ اس کی پردہ پوشی کرے گا اور جو شخص اللہ تعالیٰ کی طرف اپنی معذرت لے جائے اللہ تعالیٰ اس کا عذر قبول فرماتا ہے (مسند ابویعلیٰ) یہ حدیث غریب ہے اور اس کی سند میں بھی کلام ہے اور حدیث شریف میں ہے آپ ﷺ فرماتے ہیں: پہلوان وہ نہیں جو کسی کو پچھاڑ دے۔ بلکہ حقیقتاً پہلوان وہ ہے جو غصہ کے وقت اپنے نفس پر قابو رکھے۔ (احمد)

صحیح بخاری وصحیح مسلم میں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں تم میں سے کوئی ایسا ہے جسے اپنے وارث کا مال اپنے مال سے زیادہ محبوب ہو؟ لوگوں نے کہا حضور کوئی نہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: میں تو دیکھتا ہوں کہ تم اپنے مال سے زیادہ اپنے وارث کا مال چاہتے ہو۔ اس لئے کہ تمہارا مال تو درحقیقت وہ ہے جو تم راہ اللہ اپنی زندگی میں خرچ کر دو اور جو چھوڑ کر جاؤ وہ

تمہارا مال نہیں' بلکہ تمہارے وارثوں کا مال ہے۔ تو تمہارا راہ اللہ خرچ کرنا اور جمع زیادہ کرنا یہ دلیل ہے اس امر کی کہ تم اپنے مال سے اپنے وارثوں کے مال کو زیادہ عزیز رکھتے ہو۔ پھر فرمایا: تم پہلوان کسے کہتے ہو؟ لوگوں نے کہا: حضور ﷺ! اسے جسے کوئی گرا نہ سکے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: نہیں' بلکہ حقیقتاً طاقت ور پہلوان وہ ہے' جو غصہ کے وقت اپنے جذبات پر قابو رکھے۔ پھر فرمایا: بے اولاد کسے کہتے ہیں؟ لوگوں نے کہا جس کی اولاد نہ ہو۔ فرمایا: نہیں بلکہ فی الواقع بے اولاد وہ ہے جس کے سامنے اُس کی کوئی اولاد مری نہ ہو۔ (صحیح مسلم)

ایک اور روایت میں یہ بھی ہے کہ آپ ﷺ نے دریافت فرمایا کہ جانتے ہو مفلس کنگال کون ہے؟ لوگوں نے کہا' جس کے پاس مال نہ ہو۔ آپ ﷺ نے فرمایا بلکہ وہ جس نے اپنا مال اپنی زندگی میں راہ اللہ نہ دیا ہو (مسند احمد) حضرت حارثہ بن قدامہ سعدیؓ حاضر خدمت نبوی ہو کر عرض کرتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم مجھے کوئی نفع کی بات کہئے اور مختصر ہو۔ تا کہ میں یاد بھی رکھ سکوں۔ آپ ﷺ نے فرمایا غصہ نہ کر۔ اس نے پھر پوچھا' آپ ﷺ نے پھر یہی جواب دیا۔ کئی کئی مرتبہ یہی کہا سنا (مسند احمد) کسی شخص نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا' مجھے کچھ وصیت کیجئے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: غصہ نہ کر۔ وہ کہتے ہیں' میں نے جو غور کیا تو معلوم ہوا کہ تمام برائیوں کی جڑ غصہ ہی ہے (مسند احمد) ایک روایت میں ہے کہ حضرت ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو غصہ آیا تو آپ بیٹھ گئے اور پھر لیٹ گئے۔ ان سے پوچھا گیا یہ کیا؟ تو فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا' آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے: جسے غصہ آئے وہ کھڑا ہو تو بیٹھ جائے۔ اگر اس سے بھی غصہ نہ جائے تو لیٹ جائے (مسند) مسند احمد کی ایک روایت میں ہے کہ عروہ بن محمد کو غصہ چڑھا' آپ وضو کرنے بیٹھ گئے اور فرمانے لگے میں نے اپنے استادوں سے یہ حدیث سنی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ غصہ شیطان کی طرف سے ہے اور شیطان آگ سے پیدا ہوا ہے اور آگ کو بجھانے والی چیز پانی ہے۔ پس تم غصہ کے وقت وضو کرنے بیٹھ جاؤ۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ بھی ارشاد ہے کہ جو شخص کسی تنگدست کو مہلت دے یا اپنا قرض اسے معاف کر دے۔ اللہ تعالیٰ اسے جہنم سے آزاد کر دیتا ہے۔ لوگو سنو! جنت کے اعمال سخت اور مشکل ہیں اور جہنم کے کام آسان اور سہل ہیں۔ نیک بخت وہی ہے جو فتنوں سے بچ جائے۔ کسی گھونٹ کا پینا اللہ کو ایسا پسند نہیں جتنا غصہ کے گھونٹ پی جانا۔ ایسے شخص کے دل میں ایمان جم جاتا ہے۔ (مسند احمد)

حقیقی طاقتور کون ☆

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام فرماتے ہیں جو شخص غصہ اتارنے کی طاقت رکھتے ہوئے پھر بھی ضبط کر لے اللہ تعالیٰ اس کا دل امن و امان سے پر کر دیتا ہے' جو شخص باوجود عمدہ لباس کے شہرت کے کپڑے کو تواضع کے خیال سے چھوڑ دے' اسے اللہ تعالیٰ کرامت اور عزت کا حلہ قیامت کے دن پہنے گا اور جو کسی کا سر چھپائے' اللہ تعالیٰ اسے قیامت کے دن بادشاہت کا تاج پہنائے گا (ابوداؤد) حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: جو شخص باوجود قدرت کے اپنا غصہ ضبط کر لے' اسے اللہ تعالیٰ تمام مخلوق کے سامنے بلا کر اختیار دے گا کہ جس حور کو چاہے پسند کر لے۔ (مسند احمد) اس مضمون کی اور بھی حدیثیں ہیں۔ پس آیت کا مطلب یہ ہوا کہ وہ اپنے غصہ میں آپے سے باہر ہوتے۔ لوگوں کو ان کی طرف سے برائی نہیں پہنچتی بلکہ اپنے جذبات کو دبائے رکھتے ہیں اور اللہ کے ڈر سے ثواب کی اُمید پر معاملہ سپرد خدا کرتے ہیں' لوگوں سے درگزر کرتے ہیں۔ ظالموں کے ظلم کا بدلہ ابھی نہیں لیتے۔ اسی کو احسان کہتے ہیں اور ان محسن بندوں سے خدا محبت رکھتا ہے۔

آنحضور ﷺ کی ایک قسم ☆

حدیث میں ہے کہ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں' تین باتوں پر میں قسم کھاتا ہوں' ایک تو یہ کہ صدقہ سے مال نہیں گھٹتا۔ دوسرے یہ کہ عفو ودرگزر کرنے سے انسان کی عزت بڑھتی ہے۔ تیسرے یہ کہ تواضع' فروتنی اور عاجزی کرنے والے کو اللہ تعالیٰ بلند مرتبہ کرتا ہے۔ مستدرک کی حدیث میں ہے جو شخص یہ چاہے کہ اس کی بنیاد بلند ہو اور اس کے درجے بڑھیں تو اسے ظالموں سے درگزر کرنا چاہئے اور نہ دینے والوں کو دینا چاہئے اور توڑنے والوں سے جوڑنا چاہئے اور حدیث میں ہے کہ قیامت کے دن پکارنے والا پکارے گا کہ اے لوگوں سے درگزر کرنے والو! اپنے رب کے پاس آؤ اور اپنا اجر لو۔ مسلمانوں کی خطاؤں کے معاف کرنے والے جنتی لوگ ہیں پھر فرمایا: یہ لوگ گناہ کے بعد فوراً ذکر اللہ اور استغفار کرتے ہیں۔ مسند احمد میں حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں جب کوئی شخص گناہ کرتا ہے پھر خدا کے سامنے حاضر ہو کر کہتا ہے کہ پروردگار مجھ سے گناہ ہو گیا تو معاف فرما۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے' میرے بندے سے گو گناہ ہو گیا' لیکن اس کا ایمان ہے کہ اس کا رب گناہ پر پکڑ بھی کرتا ہے اور اگر چاہے تو معاف بھی فرما دیتا ہے۔ میں نے اپنے بندے کا گناہ معاف فرمایا۔ اس سے پھر گناہ ہوتا ہے' پھر توبہ کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ پھر معاف فرماتا ہے۔ پھر تیسری مرتبہ اس سے گناہ ہو جاتا ہے یہ پھر توبہ کرتا ہے' اللہ تعالیٰ پھر بخشتا ہے۔ چوتھی مرتبہ پھر گناہ کر بیٹھتا ہے۔ پھر توبہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ معاف فرما کر کہتا اب میرا بندہ جو چاہے کرے۔[۱] (مسند احمد)

یہ حدیث صحیحین میں بھی ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں ہم نے ایک مرتبہ جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ یا رسول اللہ (ﷺ) جب ہم آپ (ﷺ) کو دیکھتے ہیں تو ہمارے دلوں میں رقت طاری ہو جاتی ہے اور ہم اللہ والے بن جاتے ہیں لیکن جب آپ ﷺ کے پاس سے چلے جاتے ہیں تو وہ حالت نہیں رہتی۔ عورتوں بچوں میں پھنس جاتے ہیں۔ گھر بار کے دھندوں میں لگ جاتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا سنو! جو کیفیت تمہارے دلوں میں میرے سامنے ہوتی ہے' اگر یہی ہر وقت رہتی تو فرشتے تم سے مصافحہ کرتے اور تمہاری ملاقات کو تمہارے گھروں پر آتے۔ سنو! اگر تم گناہ نہ کرو تو اللہ تعالیٰ تمہیں یہاں سے ہٹا دے اور دوسری قوم کو لے آئے۔ جو گناہ کرے پھر بخشش مانگے اور خدا انہیں بخشے۔ ہم نے کہا: حضور ﷺ! یہ تو فرمائیے کہ جنت کی بنا کیا ہے؟ آپ نے فرمایا' ایک اینٹ سونے کی' ایک چاندی کی' اس کا گارہ مشک خالص ہے۔ اس کا کنکر لولو اور یاقوت ہیں۔ اس کی مٹی زعفران ہے۔ جنتیوں کی نعمتیں کبھی ختم نہ ہوں گی۔ ان کی زندگی ہمیشگی والی ہوگی۔ ان کے کپڑے پرانے نہ ہوں گے۔ ان کی جوانی فنا نہ ہوگی۔

دُعا رَد نہیں ہوتی ☆

تین شخصوں کی دعا رَد نہیں ہوتی: (۱) عادل بادشاہ (۲) روزہ رکھنے والا (۳) مظلوم۔ اس کی دُعا بادلوں میں اٹھائی جاتی ہے اور اس کے لئے آسمانوں کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں اور جناب باری ارشاد فرماتا ہے' مجھے میری عزت کی

[۱] لیکن گناہ میں جرأت اور بار بار توبہ کو کھیل نہ بنا لینا چاہیے۔ کسی صوفی نے خوب کہا ہے کہ کیا صرف اس وجہ سے کہ مرہم تمہارے گھر میں رکھا ہے تم اپنے ہاتھ کو جلا لو گے کہ جلنے کے بعد پھر مرہم لگا ئیں گے۔ دُنیا میں ہرگز کوئی بھی ایسا احمق نہیں تو اسی طرح معافی اور توبہ کی اُمید پر گناہ کرنا بے حد مذموم ہے۔ ہاں! گناہ کے بعد توبہ نہ کرنا اور اللہ کی رحمت سے مایوس ہونا شیطانی وسوسہ ہے۔

قسم میں تیری ضرور مدد کروں گا۔ اگر چہ وقت کے بعد ہو (مسند احمد) امیر المؤمنین حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا' جو شخص کوئی گناہ کرے۔ پھر وضو کر کے دو رکعت نماز ادا کرے اور اپنے گناہ کی معافی چاہے تو اللہ عزوجل اس کے گناہ معاف فرما دیتا ہے (مسند احمد) صحیح مسند میں امیر المؤمنین حضرت عمر بن خطابؓ سے روایت ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں' تم میں سے جو شخص کامل وضو کر کے اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ پڑھے۔ اس کے لئے جنت کے آٹھوں دروازے کھل جاتے ہیں جس سے چاہے اندر چلا جائے۔ امیر المؤمنین حضرت عثمان بن عفانؓ سنت کے مطابق وضو کرتے ہیں۔ پھر فرماتے ہیں' میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے' آپ نے فرمایا ہے جو شخص مجھ جیسا وضو کرے پھر دو رکعت نماز ادا کرے' جس میں اپنے دل سے باتیں نہ کرے تو اللہ تعالیٰ اس کے تمام گناہ معاف فرما دیتا ہے[1]۔ (بخاری و مسلم) پس یہ حدیث تو حضرت عثمانؓ سے' اس سے اگلی روایت حضرت عمرؓ سے۔ اس اگلی روایت حضرت ابوبکر سے اور اس سے تیسری روایت کو حضرت علیؓ روایت کرتے ہیں تو الحمد للہ۔ اللہ تعالیٰ کی وسیع مغفرت اور اس کی بے انتہا مہربانی کی خبر سید الاولین الآخرین کی زبانی آپ کے چاروں برحق خلفاء کی معرفت ہمیں پہنچی۔ آؤ اس موقعہ پر ہم گنہگار بھی ہاتھ اٹھائیں اور اپنے مہربان رحیم و کریم خدا کے سامنے اپنے گناہوں کا اقرار کر کے اس سے معافی طلب کریں۔ خدایا! اے ماں باپ سے زیادہ مہربان! اے عفو درگزر کرنے والے اور کسی بھکاری کو اپنے در سے خالی نہ پھیرنے والے! تم ہم خطا کاروں کی سیاہ کاریوں سے بھی درگزر فرما اور ہمارے کل گناہ معاف فرما دے۔ آمین۔ (مترجم) یہی وہ مبارک آیت ہے کہ جب یہ نازل ہوئی تو ابلیس رونے لگا مسند عبدالرزاق' مسند ابو یعلی میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کثرت سے پڑھا کرو اور استغفار پر مداومت مت کرو۔ ابلیس گناہوں سے لوگوں کو ہلاک کرنا چاہتا ہے اور اس کی اپنی ہلاکت لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ اور استغفار سے ہے۔ یہ حالت دیکھ ابلیس نے لوگوں کو خواہش پرستی پر ڈال دیا۔ پس وہ اپنے تئیں راہِ راست پر جانتے ہیں۔ حالانکہ ہوتے ہیں ہلاکت میں لیکن اس حدیث کے دو راوی ضعیف ہیں۔ مسند احمد میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ ابلیس نے کہا: اے رب مجھے تیری عزت کی قسم' میں بنی آدم کو آخری دم تک بہکاتا رہوں گا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: مجھے بھی میرے جلال اور میری عزت کی قسم' جب تک وہ مجھ سے بخشش مانگتے رہیں گے میں انہیں بخشتا رہوں گا۔ مسند بزار میں ہے کہ ایک شخص نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا: مجھ سے گناہ ہو گیا' آپ ﷺ نے فرمایا: توبہ کر لے۔ اس نے کہا: مجھ سے پھر گناہ ہو گیا' آپ ﷺ نے فرمایا: پھر استغفار کر۔ اس نے پھر کہا: مجھ سے اور گناہ ہو گیا' فرمایا: استغفار کئے جا۔ یہاں تک کہ شیطان تھک[2] جائے۔ پھر فرمایا کہ گناہ کو بخشنا اللہ ہی کے اختیار میں ہے۔ مسند احمد میں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک قیدی آیا اور کہنے لگا: یا اللہ میں تیری طرف توبہ کرتا ہوں۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف توبہ نہیں کرتا (یعنی خدایا میں

[1] یعنی نماز میں اِدھر اُدھر کے خیالات نہ آئیں اور اگر آئیں تو ان خیالات کو دفع کرنے کی کوشش کرے اور اپنی تمام توجہات اللہ عزوجل ہی کی طرف لگائے رکھے۔

[2] شیطان کثرتِ استغفار سے بھاگتا ہے' جب بندہ استغفار کی کثرت رکھے گا تو شیطان قریب نہیں آئے گا اور شیطانی تصرفات سے اگر بچ گیا تو گناہ بھی نہ کرے گا۔ ان شاء اللہ۔

تیری ہی بخشش چاہتا ہوں) آپ ﷺ نے فرمایا: اس نے حق حقدار کو پہنچایا۔ اصرار کرنے سے مراد یہ ہے کہ معصیت پر بغیر توبہ کئے اڑنہیں جاتے۔ اگر کئی مرتبہ گناہ ہو جائے تو کئی مرتبہ استغفار بھی کرتے ہیں۔ مسند ابو یعلی میں ہے رسول اللہ صلی علیہ وسلم فرماتے ہیں' وہ اصرار کرنے والا اور اڑنے والا جو استغفار کرتا رہتا ہے۔ اگرچہ (بالفرض) اس سے ایک دن میں ستر مرتبہ بھی گناہ ہو جائے۔

پھر فرمایا کہ وہ جانتے ہیں یعنی اس بات کو کہ اللہ توبہ قبول کرنے والا ہے جیسے اور جگہ ہے: ﴿اَلَمْ يَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ هُوَ يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهٖ﴾ (التوبہ: ۱۰۴)۔ کیا یہ نہیں جانتے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی توبہ قبول فرمایا ہے اور جگہ ہے: ﴿وَمَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا اَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهٗ﴾ (النساء: ۱۱۰) جو شخص کوئی برا کام کر لے یا گناہ کر کے اپنی جان پر ظلم کرے۔ پھر اللہ تعالیٰ سے بخشش طلب کرے تو وہ دیکھ لے گا کہ اللہ عزوجل بخشش کرنے والا مہربان ہے۔ مسند احمد میں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منبر پر بیان فرمایا: لوگو! تم اوروں پر رحم کرو' اللہ تم پر رحم کرے گا۔ لوگو! تم دوسروں کی خطائیں معاف کرو۔ اللہ تمہارے گناہوں کو بخشے گا۔ باتیں بنانے والوں کو ویل ہے۔ پھر فرمایا' ان کاموں کے بدلے ان کی جزا مغفرت ہے اور طرح طرح کی بہتی نہروں والی جنت ہے جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ یہ بڑے اچھے عامل ہیں۔

قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنٌ ۙ فَسِيْرُوْا فِى الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۱۳۷﴾ هٰذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ وَهُدًى وَّمَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۳۸﴾ وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۳۹﴾ اِنْ يَّمْسَسْكُمْ قَرْحٌ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِّثْلُهٗ ۚ وَتِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ ۚ وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَيَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَآءَ ۗ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۴۰﴾ وَلِيُمَحِّصَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَيَمْحَقَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۴۱﴾ اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ وَيَعْلَمَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۴۲﴾ وَلَقَدْ كُنْتُمْ تَمَنَّوْنَ الْمَوْتَ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَلْقَوْهُ ۠ فَقَدْ رَاَيْتُمُوْهُ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ﴿۱۴۳﴾ ع

باتحقیق تم سے قبل مختلف طرق گزر چکے ہیں تو تم روئے زمین پر چلو پھر اور دیکھ لو کہ آخیر انجام تکذیب کرنے والوں

کا کیسا ہوا یہ بیان کافی ہے تمام لوگوں کے لئے اور ہدایت اور نصیحت ہے خدا سے ڈرنے والوں کے لئے اور تم ہمت مت ہارو اور رنج مت کرو اور غالب تم ہی رہو گے اور تم پورے مؤمن رہے۔ اگر تم کو زخم پہنچ جائے تو اس قوم کو بھی ایسا ہی زخم پہنچ چکا ہے اور ہم ان ایام کو ان لوگوں کے درمیان ادلتے بدلتے رہا کرتے ہیں اور تا کہ اللہ تعالیٰ ایمان والوں کو جان لیں اور تم میں سے بعضوں کو شہید بنانا تھا اور اللہ تعالیٰ ظلم کرنے والوں سے محبت نہیں رکھتے اور تا کہ میل کچیل سے صاف کر دے ایمان والوں کو اور مٹا دے کافروں کو ہاں کیا تم یہ خیال کرتے ہو کہ جنت میں داخل ہو۔ حالانکہ ہنوز اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو دیکھا ہی نہیں' جنہوں نے تم میں سے جہاد کیا ہو اور نہ ان کو دیکھا جو ثابت قدم رہنے والے ہیں اور تم تو مرنے کی تمنا کر رہے تھے موت کے سامنے آنے سے پہلے ہی' سو اس کو تو کھلی آنکھوں دیکھ لیا تھا۔ ○

مسلمانوں کو تسلی ☆

چونکہ اُحد والے دن ستر مسلمان صحابی شہید ہوئے تھے تو اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو تسلی دیتا ہے کہ اس سے پہلے بھی دین دار لوگ نقصان مال و جان اٹھاتے رہے' لیکن بالآخر غلبہ انہی کا ہوا۔ تم اگلے واقعات پر ایک نگاہ ڈال لو تو یہ راز تم پر کھل جائے گا۔ اس قرآن میں لوگوں کے لئے اگلی امتوں کا بیان بھی ہے اور یہ ہدایت وعظ بھی ہے یعنی تمہارے دلوں کی ہدایت اور تمہیں برائی بھلائی سے آگاہ کرنے والا یہی قرآن ہے مسلمانوں کو یہ واقعات یاد دلائیے پھر مزید تسلی کے طور پر فرمایا کہ تم اس جنگ کے نتائج دیکھ کر بددل نہ ہو جانا۔۔ مغموم بن کر بیٹھ رہنا۔ فتح و نصرت غلبہ اور علو بالآخر اے مؤمنو! تمہارے لئے ہی ہے۔ اگر تمہیں زخم لگے ہیں اور تمہارے آدمی شہید ہوئے تو اس سے پہلے تمہارے دشمن بھی تو قتل ہو چکے ہیں وہ بھی تو زخم خوردہ ہیں۔ یہ تو چڑھتی ڈھلتی چھاؤں ہے۔ ہاں بھلا وہ ہے جو انجام کار غالب رہے اور یہ ہم نے تمہارے لئے لکھ دیا ہے۔ یہ بعض مرتبہ کی شکست بالخصوص اسی جنگ احد کی اس لئے تھی کہ ہم صابروں اور غیر صابروں کا امتحان کر لیں[1] اور جو مدت سے شہادت کی تمنا لئے بیٹھے تھے۔ انہیں کامیاب بنائیں کہ وہ اپنا مال جان ہماری راہ میں خرچ کریں اور اللہ تعالیٰ ظالموں کو پسند نہیں فرماتا۔ یہ جملہ معترضہ بیان کر کے فرمایا: یہ اِس لئے بھی کہ ایمان والوں کے گناہ اگر ہوں تو دور ہو جائیں ورنہ ان کے درجات بڑھیں اور اس میں کافروں کو مٹانا بھی ہے۔ کیونکہ وہ غالب ہو کر پھولیں گے اور سرکشی اور تکبر میں اور بڑھیں گے اور یہی ان کی ہلاکت اور بربادی کا سبب بنے گا اور پھر مٹ گھپ جائیں گے۔ ان سختیوں' ان زلزلوں اور ان آزمائشوں کے بغیر کوئی جنت میں نہیں جاسکتا۔ جیسے سورہ بقرہ میں ہے کہ کیا تم یہ چاہتے ہو کہ تم سے پہلے لوگوں کی جیسی آزمائش ہوئی ایسی تمہاری نہ ہو اور تم جنت میں چلے جاؤ' یہ نہیں ہوگا اور جگہ ہے ﴿ الٓمّٓ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ یُّتْرَکُوْٓا اَنْ یَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَھُمْ لَا یُفْتَنُوْنَ ﴾ (العنکبوت: ۱-۲) کیا لوگوں نے یہ گمان کر رکھا ہے کہ تم صرف انکے اس قول پر کہ تم ایمان لائے' انہیں چھوڑ دیں گے اور انکی آزمائش نہ کی جائیگی[2]۔ یہاں بھی یہی

[1] یعنی مظاہرہ صبر و استقامت اور غیر مستقل مزاجی و تلون کے بعد دوسروں کو معلوم ہو جائے کہ کون ثابت قدم رہا اور کس کے قدم اُکھڑ گئے۔ امتحان وہ لیتا ہے جس کو معلوم نہ ہو۔ خدا تعالیٰ کو ہر ایک کے بارے میں تفصیلی علم ہے اس لیے ان کا امتحان لینا اپنے لیے نہیں بلکہ دوسروں کے لیے ہے۔

[2] ایمان کا دعویٰ عشق کا دعویٰ ہے جو محبوب بھی اپنے عاشق کو آزما کر اس کے سچے عشق اور جھوٹی محبت کا امتحان لیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ بھی ایمان کا دعویٰ کرنے والوں کا امتحان لیں گے۔ ۱۲ انظر شاہ

فرمان ہے کہ جب تک صبر کرنے والے معلوم نہ ہو جائیں یعنی دنیا کے سامنے ظہور میں نہ جائیں تب تک جنت نہیں مل سکتی۔
پھر فرمایا کہ تم اس سے پہلے تو اس موقعہ کی آرزو میں تھے کہ تم اپنا صبر اور اپنی سختی اور مضبوطی اور استقامت خدا کو دکھاؤ' راہ خدا میں شہادت پاؤ۔ لو اب ہم نے تمہیں یہ موقعہ دیا' تم بھی اپنی ثابت قدمی اور اولوالعزمی دکھاؤ[1]۔ حدیث شریف میں ہے دشمن سے سابقہ کی آرزو نہ کرو۔ اللہ تعالیٰ سے عافیت طلب کرو اور جب مقابلہ ہو جائے' پھر لوہے کی طرح جم جاؤ اور صبر کے ساتھ ثابت قدم رہو اور جان لو کہ جنت تلواروں کے سائے تلے ہے۔ پھر فرمایا کہ تم نے اپنی آنکھوں سے اس منظر کو دیکھ لیا کہ نیزے تنے ہوئے ہیں' تلواریں کھچ رہی ہیں۔ بھالے اُچھل رہے ہیں۔ تیر برس رہے ہیں۔ گھمسان کا رن پڑا ہوا ہے اور اِدھر اُدھر لاشیں گر رہی ہیں۔

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ۭ اَفَا۟ىِٕنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ ۭ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰي عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَـيْــــًٔـا ۭ وَسَيَجْزِي اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ ﴿۱۴۴﴾ وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا ۭ وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِھٖ مِنْھَا ۚ وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الْاٰخِرَةِ نُؤْتِھٖ مِنْھَا ۭ وَسَنَجْزِي الشّٰكِرِيْنَ ﴿۱۴۵﴾ وَكَاَيِّنْ مِّنْ نَّبِيٍّ قٰتَلَ ۙ مَعَهٗ رِبِّيُّوْنَ كَثِيْرٌ ۚ فَمَا وَهَنُوْا لِمَآ اَصَابَھُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَمَا ضَعُفُوْا وَمَا اسْتَكَانُوْا ۭ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۴۶﴾ وَمَا كَانَ قَوْلَھُمْ اِلَّآ اَنْ قَالُوْا رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَاِسْرَافَنَا فِيْٓ اَمْرِنَا وَثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَي الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۴۷﴾ فَاٰتٰىھُمُ اللّٰهُ ثَوَابَ الدُّنْيَا وَحُسْنَ ثَوَابِ الْاٰخِرَةِ ۭ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۴۸﴾

ع ۱۵ ۵ ۶

[1] جیسا کہ گزرا ہے بعض صحابہ جنہوں نے بدر کے معرکہ میں شرکت نہیں فرمائی تھی اور شوقِ شہادت میں کسی اور معرکہ حق و باطل کے منتظر تھے ۱۲

اور محمد ﷺ رسول ہی تو ہیں آپ ﷺ سے پہلے اور بھی بہت رسول گزر چکے ہیں سو اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا انتقال ہو جائے یا آپ ﷺ شہید ہی ہو جائیں تو کیا تم لوگ الٹے پھر جاؤ گے اور جو شخص الٹا پھر بھی جائے گا تو خدا تعالیٰ کا کوئی نقصان نہ کرے گا اور خدا تعالیٰ جلد ہی عوض دے گا حق شناس لوگوں کو اور کسی شخص کو موت آنا ممکن نہیں بدون حکم اور خدا تعالیٰ کے اس طور سے کہ اس کی میعاد معین لکھی ہوئی رہتی ہے اور جو شخص دنیاوی نتیجہ چاہتا ہے تو ہم اس کو دنیا کا حصہ دے دیتے ہیں اور جو شخص اُخروی نتیجہ چاہتا ہے تو ہم اس کو آخرت کا حصہ دیں گے اور ہم بہت جلد عوض دیں گے حق شناسوں کو اور بہت نبی ہو چکے ہیں' جن کے ساتھ ہو کر بہت بہت اللہ والے لڑے ہیں۔ سو نہ تو ہمت ہاری انہوں نے ان مصائب کی وجہ سے جو ان پر اللہ کی راہ میں واقع ہوئیں اور نہ ان کا زور گھٹا اور نہ وہ دبے اور اللہ تعالیٰ کو ایسے مستقل مزاجوں سے محبت ہے اور ان کی زبان سے بھی تو اس کے سوا کچھ نہیں نکلا انہوں نے عرض کیا: اے ہمارے پروردگار گناہوں کو اور ہمارے کاموں میں ہمارے حد سے نکل جانے کو بخش دیجئے اور ہم کو ثابت قدم رکھیے اور ہم کو کافر لوگوں پر غالب کیجئے سو ان کو اللہ تعالیٰ نے دنیا کا بھی بدلہ دیا اور آخرت کا بھی عمدہ بدلہ اور اللہ تعالیٰ کو ایسے نیکو کاروں سے محبت ہے۔ ۞

رسول کا مقام ☆

میدان احد میں مسلمانوں کو شکست بھی ہوئی اور ان میں سے بعض قتل بھی کیے گئے۔ اس دن شیطان نے بھی یہ مشہور کر دیا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم شہید ہو گئے ہیں اور ابن قمیئہ کافر نے مشرکوں میں جا کر یہ خبر اڑا دی کہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کر کے آیا ہوں اور دراصل وہ افواہ بھی بے اصل تھی اور اس شخص کا یہ قول بھی غلط تھا۔ اس نے حضور ﷺ پر حملہ تو کیا تھا۔ لیکن اس سے صرف آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ قدرے زخمی ہو گیا تھا اور کوئی بات نہ تھی۔ اس غلط بات کی شہرت نے مسلمانوں کے دل توڑ دیئے' ان کے قدم اکھڑ گئے اور لڑائی سے بددل ہو کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ اسی بارے میں یہ آیت نازل ہوئی کہ اگلے انبیاء کی طرح یہ بھی ایک نبی ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ میدان میں قتل کر دیئے جائیں۔ لیکن کچھ خدا کا دین جاتا نہیں رہے گا۔ ایک روایت میں ہے کہ ایک مہاجر نے دیکھا کہ ایک انصاری جنگ احد میں زخموں سے چور زمین پر گر پڑا ہے اور خاک و خون میں لوٹ رہا ہے۔ اس سے کہا کہ آپ کو بھی معلوم ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم قتل کر دیئے گئے۔ اس نے کہا کہ اگر یہ صحیح ہے تو اپنا کام کر گئے۔ اب آپ ﷺ کے دین پر سے تم سب قربان ہو جاؤ۔ اسی کے بارے میں یہ آیت اتری۔

پھر فرمایا: حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا قتل یا انتقال ایسی چیز نہیں کہ تم خدا کے دین سے پچھلے پیروں پھر جاؤ اور ایسا کرنے والے خدا کا کچھ نہیں بگاڑیں گے۔ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو جزائے خیر دے گا۔ جو اس کی اطاعت کریں اور اس کے دین کی نصرت ان کا شعار بنے' اس کے رسول (ﷺ) کی تابعداری میں مضبوط ہو جائیں۔ خواہ رسول زندہ ہوں یا نہ ہوں۔ صحیح بخاری شریف میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال کی خبر سن کی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سنح (ایک مقام کا نام ہے) سے گھوڑے پر سوار ہو کر آئے۔ مسجد میں تشریف لے گئے۔ لوگوں کی حالت دیکھی اور بغیر کچھ کہے سنے حضرت عائشہؓ کے گھر پر آئے۔ یہاں حضور ﷺ پر حبرہ[1] کی چادر اُوڑھا دی گئی تھی۔ آپؓ نے چادر کا کونہ چہرۂ مبارک پر سے ہٹا کر بے ساختہ بوسہ لے لیا اور روتے ہوئے فرمانے لگے۔ میرے ماں باپ آپ ﷺ پر قربان ہوں۔ خدا کی قسم اللہ تعالیٰ آپ ﷺ پر دو مرتبہ موت نہ

[1] حبرہ: پھولدار یمنی چادر۔ یہ ہدیۂ آپ ﷺ کے لیے آئی تھی' ۱۲

لائے گا۔ جو موت آپ ﷺ پر لکھ دی گئی تھی وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو آ چکی۔ اس کے بعد مسجد میں آئے اور دیکھا کہ حضرت عمرؓ خطبہ سنا رہے ہیں۔ ان سے فرمایا کہ خاموش ہو جاؤ۔ انہیں چپ کرا کر آپ نے لوگوں سے فرمایا کہ جو شخص محمد (ﷺ) کی عبادت کرتا تھا' وہ جان لے کہ محمد ﷺ وفات پا چکے ہیں اور جو شخص اللہ کی عبادت کرتا تھا' وہ خوش رہے کہ اللہ تعالیٰ زندہ ہے۔ اس پر موت نہیں آتی۔ پھر آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی۔ لوگوں کو ایسا معلوم ہونے لگا گویا آیت اب اتری ہے۔ پھر تو ہر شخص کی زبان پر یہ آیت چڑھ گئی اور لوگوں نے یقین کر لیا کہ آپ ﷺ فوت ہو گئے۔ حضرت صدیقؓ کی زبانی اس آیت کی تلاوت سن کر حضرت عمرؓ کے ہوش و حواس بجا ہو گئے اور انہیں بھی یقین ہو گیا کہ حضور ﷺ اس جہانِ فانی کو چھوڑ کر چل بسے۔ حضرت علیؓ رسول (ﷺ) کی زندگی ہی میں فرماتے تھے کہ نہ ہم حضور ﷺ موت پر مرتد ہوں گے نہ آپ کی شہادت پر۔ خدا کی قسم اگر حضور قتل کیے جائیں تو ہم بھی اس دین پر مر مٹیں۔ جس پر آپ ﷺ شہید ہوئے۔ خدا کی قسم میں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا بھائی ہوں' آپ (ﷺ) کا ولی ہوں۔ آپ کا چچا زاد بھائی ہوں اور آپ (ﷺ) کا وارث ہوں' مجھ سے زیادہ حقدار آپ (ﷺ) کا کون ہو گا؟

پھر ارشاد ہوتا ہے کہ ہر شخص اللہ تعالیٰ کے مقدر سے اور اپنی مدت پوری کر کے ہی مرتا ہے۔ جیسے اور جگہ ہے: ﴿وَمَا يُعَمَّرُ مِن مُّعَمَّرٍ وَّلَا يُنْقَصُ مِنْ عُمُرِهٖٓ اِلَّا فِیْ كِتَابٍ﴾ (فاطر:۱۱) نہ کوئی عمر دیا جاتا ہے' نہ عمر گھٹائی جاتی ہے' مگر سب کتاب اللہ میں موجود ہے اور جگہ ہے: ﴿هُوَ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ طِيْنٍ﴾ (الانعام:۲) جس خدا نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا' پھر وقت پورا کیا اور اجل مقرر کی۔ اس آیت میں بزدل لوگوں کو شجاعت کی رغبت دلائی گئی ہے اور راہ خدا کے جہاد کا شوق دلایا جا رہا ہے اور بتایا جا رہا ہے کہ جوانمردی کی وجہ سے کچھ عمر گھٹ نہیں جاتی۔ موت تو اپنے وقت پر آ کر ہی رہے گی۔ خواہ شجاعت اور بہادری برتو' خواہ نامردی اور بزدلی دکھاؤ۔

حجر بن عدیؓ جب دشمنانِ دین کے مقابلہ میں جاتے ہیں اور دریائے دجلہ بیچ میں آ جاتا ہے اور لشکر اسلام کھڑا ہو جاتا ہے تو آپ اس آیت کی تلاوت کر کے فرماتے ہیں کہ کوئی بھی بے اجل نہیں مرتا۔ آؤ! اسی دجلہ میں گھوڑے ڈال دو۔ یہ فرما کر آپ اپنا گھوڑا ڈال دیتے ہیں۔ آپ کو دیکھ کر اور لوگ بھی اپنے جانوروں کو پانی میں ڈال دیتے ہیں۔ دشمن کا خون خشک ہو جاتا ہے اور اس پر ہیبت طاری ہو جاتی ہے اور کہنے لگتے ہیں کہ یہ تو دیوانے آدمی ہیں' یہ تو پانی کی موجوں سے بھی نہیں ڈرتے۔ بھاگو بھاگو۔ چنانچہ سب بھاگ کھڑے ہوتے ہیں۔ پھر ارشاد ہوتا ہے کہ جس کا عمل صرف دنیا کے لئے ہو تو اس میں جتنا اس کے مقدر میں ہوتا ہے مل جاتا ہے لیکن آخرت میں وہ خالی ہاتھ رہ جاتا ہے اور جس کا مقصد آخرت طلبی ہو' اسے آخرت تو ملتی ہے لیکن دنیا میں بھی اپنا مقدر پا لیتا ہے جیسے اور جگہ فرمایا: ﴿مَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الْاٰخِرَةِ﴾ (الشوریٰ ۲۰) آخرت کی کھیتی چاہنے والوں کو ہم زیادتی کے ساتھ دیتے ہیں اور دنیا کی کھیتی چاہنے والوں کو ہم گو دنیا دے دیں لیکن آخرت میں کوئی حصہ نہیں۔ اور جگہ ہے: ﴿مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْاٰخِرَةَ﴾ (بنی اسرائیل:۱۸) جو شخص صرف دنیا کا طالب ہی ہو' ہم ان میں سے جسے چاہیں جس قدر چاہیں' دنیا دے دیتے ہیں پھر وہ جہنمی بن جاتا ہے اور ذلت و رسوائی کے ساتھ اس میں جاتا ہے اور جو آخرت کا خواہاں ہو اور اس کے لئے کوشاں بھی ہو اور باایمان بھی ہو۔ ان کی کوشش خدا کے ہاں مشکور بھی ہے۔ اس لئے یہاں بھی فرمایا کہ ہم شکر گزاروں کو اچھا بدلہ دیتے ہیں۔ پھر اللہ تعالیٰ احد کے مجاہدین کو خطاب کرتا ہوا فرماتا ہے کہ اس سے پہلے بھی بہت نبی اپنی

جماعتوں کو ساتھ لے کر دشمنان دین سے لڑے بھڑے اور تمہاری طرح راہ خدا میں تکلیفیں بھی پہنچائے گئے لیکن پھر بھی مضبوط دل اور صابر شاکر رہے۔ سُست اور ضعیف نہ ہوئے اور اس صبر کے بدلے انہوں نے خدا کی محبت مول لی۔ ایک یہ معنی بھی بیان کئے گئے ہیں کہ اے مجاہدین احد! تم یہ سن کر کہ حضور ﷺ شہید ہو گئے' کیوں ہمت ہار بیٹھے؟ اور کفر کے مقابلہ میں کیوں دب گئے؟ حالانکہ تم سے اگلے لوگ اپنے انبیاء کی شہادت کو دیکھ کر بھی نہ دبے نہ جھجے بلکہ اور تیزی کے ساتھ لڑے' یہ اتنی بڑی مصیبت بھی ان کے قدم نہ ڈگمگا سکی اور ان کے دل تھوڑے نہ کر سکی۔ پس قرآن کریم ان کی اس مصیبت کے وقت کی دعا نقل کرتا ہے۔ پھر فرماتا ہے کہ انہیں دُنیا کا ثواب نصرت و مدد ظفر و اقبال ملا اور آخرت کی بھلائی اور اچھائی بھی اسی کے ساتھ جمع ہوئی۔ یہ محسن لوگ خدا کے برگزیدہ بندے ہیں۔

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِن تُطِيعُوا الَّذِينَ كَفَرُوا يَرُدُّوكُمْ عَلَىٰ أَعْقَابِكُمْ فَتَنقَلِبُوا خَاسِرِينَ ﴿١٤٩﴾ بَلِ اللَّهُ مَوْلَاكُمْ ۖ وَهُوَ خَيْرُ النَّاصِرِينَ ﴿١٥٠﴾ سَنُلْقِي فِي قُلُوبِ الَّذِينَ كَفَرُوا الرُّعْبَ بِمَا أَشْرَكُوا بِاللَّهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهِ سُلْطَانًا ۖ وَمَأْوَاهُمُ النَّارُ ۚ وَبِئْسَ مَثْوَى الظَّالِمِينَ ﴿١٥١﴾ وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللَّهُ وَعْدَهُ إِذْ تَحُسُّونَهُم بِإِذْنِهِ ۖ حَتَّىٰ إِذَا فَشِلْتُمْ وَتَنَازَعْتُمْ فِي الْأَمْرِ وَعَصَيْتُم مِّن بَعْدِ مَا أَرَاكُم مَّا تُحِبُّونَ ۚ مِنكُم مَّن يُرِيدُ الدُّنْيَا وَمِنكُم مَّن يُرِيدُ الْآخِرَةَ ۚ ثُمَّ صَرَفَكُمْ عَنْهُمْ لِيَبْتَلِيَكُمْ ۖ وَلَقَدْ عَفَا عَنكُمْ ۗ وَاللَّهُ ذُو فَضْلٍ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ ﴿١٥٢﴾ إِذْ تُصْعِدُونَ وَلَا تَلْوُونَ عَلَىٰ أَحَدٍ وَالرَّسُولُ يَدْعُوكُمْ فِي أُخْرَاكُمْ فَأَثَابَكُمْ غَمًّا بِغَمٍّ لِّكَيْلَا تَحْزَنُوا عَلَىٰ مَا فَاتَكُمْ وَلَا مَا أَصَابَكُمْ ۗ وَاللَّهُ خَبِيرٌ بِمَا

تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۱۵۳﴾

اے ایمان والو اگر تم کہنا مانو گے کافروں کا تو وہ تم کو الٹا پھیر دیں گے پھر تم ناکام ہو جاؤ گے۔ بلکہ اللہ تعالیٰ تمہارا دوست ہے اور وہ سب سے بہتر مدد کرنے والا ہے۔ ہم ابھی ڈالے دیتے ہیں ہول کافروں کے دلوں میں بسبب اس کے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کا شریک ایسی چیز کو ٹھیرایا ہے جس پر کوئی دلیل اللہ تعالیٰ نے نازل نہیں فرمائی اور ان کی جگہ جہنم ہے اور وہ بری جگہ ہے بے انصافوں کی اور یقیناً اللہ تعالیٰ نے تو تم سے اپنے وعدہ کو سچا کر دکھلایا تھا جس وقت کہ تم ان کفار کو بحکم خداوندی قتل کر رہے تھے۔ یہاں تک کہ تم جب خود ہی کمزور ہو گئے اور باہم حکم میں اختلاف کرنے لگے اور تم کہنے پر نہ چلے بعد اس کے کہ تمہاری دلخواہ بات دکھلا دی تھی تم میں سے بعض تو وہ شخص تھے جو دنیا کو چاہتے تھے اور بعض تم میں سے وہ تھے جو آخرت کے طلبگار تھے اس لئے اللہ تعالیٰ نے آئندہ کے لئے اپنی نصرت کو بلند کر لیا اور پھر تم کو ان کفار سے ہٹا دیا تاکہ خدا تمہاری آزمائش فرمادے اور یقین سمجھو کہ اللہ تعالیٰ نے تم کو معاف کر دیا اور اللہ بڑے فضل والے ہیں مسلمانوں پر۔ وہ وقت یاد کرو کہ جب تم چڑھے چلے جاتے تھے اور کسی کو مڑ کر بھی نہ دیکھتے تھے اور رسول تمہارے پیچھے کی جانب سے تم کو پکار رہے تھے سو خدا تعالیٰ نے تم کو پاداش میں غم دیا بسبب غم دینے کے تاکہ مغموم نہ ہوا کرو نہ اس چیز پر جو تمہارے ہاتھ سے نکل جائے اور نہ اس چیز پر جو تم پر مصیبت پڑے اور اللہ تعالیٰ سب خبر رکھتے ہیں تمہارے سب کاموں کی۔ ○

کفار کی اطاعت نقصانِ عظیم کا پیش خیمہ ہے ☆

اللہ تعالیٰ اپنے ایماندار بندوں کو کافروں اور منافقوں کی باتوں کے ماننے سے روک رہا ہے اور بتلا رہا ہے کہ اگر ان کی مانی تو دنیا اور آخرت کی ذلت تم پر آئے گی۔ ان کی تمنا تو یہی ہے کہ تمہیں دین اسلام سے ہٹا دیں۔ پھر فرمایا ہے کہ مجھی کو مولا اور مددگار جانو۔ مجھی سے عبدیت اور بندگی کا تعلق پیدا کرو۔ مجھی سے مدد چاہو۔ پھر فرمایا کہ ان شریروں کے دلوں میں بوجہ ان کے کفر کے میں ڈر خوف ڈال دوں گا۔ بخاری و مسلم میں حضرت جابر بن عبداللہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے۔ مجھے پانچ باتیں دی گئی ہیں جو مجھ سے پہلے کسی نبی کو نہیں دی گئیں (۱) میری مدد رعب سے کی گئی ہے۔ مہینہ بھر کی راہ تک۔ (۲) میرے لئے زمین مسجد اور وضو کی پاک چیز بنائی گئی ہے۔ میرے لئے غنیمت کے مال حلال کئے گئے اور (۴) مجھے شفاعت دی گئی اور (۵) ہر نبی صرف اپنی قوم کی طرف بھیجا جاتا تھا اور میری بعثت میری نبوت تمام دنیا کے لئے عام ہوئی۔

مسند احمد میں ہے۔ آپ ﷺ فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ نے تمام نبیوں پر اور بعض روایتوں میں ہے تمام امتوں پر مجھے چار فضیلتیں عطا فرمائی ہیں (۱) مجھے تمام دنیا کی طرف رسول بنا کر بھیجا گیا۔ میرے اور میری امت کے لئے تمام زمین مسجد اور پاک بنا دی گئی۔ (۲) میرے امتی کو جہاں نماز کا وقت آ جائے وہیں اس کی مسجد اور اس کا وضو ہے (۳) میرا دشمن مجھ سے مہینے بھر کی راہ پر ہو وہیں سے خدا اس کا دل رعب سے پر کر دیتا ہے وہ کانپنے لگتا ہے اور (۴) میرے لئے غنیمت کے مال حلال کئے گئے اور روایت میں ہے کہ میں مدد کیا گیا ہوں رعب سے ہر دشمن پر۔ مسند کی ایک اور حدیث میں ہے' مجھے پانچ چیزیں دی گئیں: (۱) ہر سرخ و سفید کی طرف بھیجا گیا (۲) میرے لئے تمام زمین وضو اور مسجد بنائی گئی اور (۳) میرے لئے غنیمتوں کے مال حلال کئے گئے۔ جو مجھ سے پہلے کسی کے لئے حلال نہ تھے اور (۴) میری مدد رعب سے مہینہ بھر کی راہ تک کی گئی اور (۵) مجھے شفاعت دی گئی۔ تمام انبیاء نے شفاعت مانگ لی۔ لیکن میں نے اپنی شفاعت کو اپنی امت کے ان لوگوں کے لئے جنہوں

نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کیا ہو چھپا رکھی ہے۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ نے ابوسفیان کے دل میں رعب ڈال دیا اور لڑائی سے لوٹ گیا۔ پھر ارشاد ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنا وعدہ سچا کر دکھایا اور تمہاری مدد کی۔ اس سے یہ بھی استدلال ہو سکتا ہے کہ یہ وعدہ احد کے دن کا تھا۔ تین ہزار کا لشکر دشمنوں کا تھا۔ تاہم مقابلہ پر آتے ہی ان کے قدم اکھڑ گئے اور مسلمانوں کو فتح مندی حاصل ہوئی۔ لیکن پھر تیر اندازوں کی نافرمانی کی وجہ سے اور بعض حضرات کی پست ہمتی کی وجہ سے وہ وعدہ جو مشروط تھا رک گیا۔ پس فرمایا ہے کہ تم انہیں اپنے ہاتھوں سے کاٹتے تھے۔ شروع دن میں ہی خدا نے تمہیں ان پر غالب کر دیا۔ لیکن تم نے پھر بزدلی دکھائی اور نبی کی نافرمانی کی ان کی بتلائی ہوئی جگہ سے ہٹ گئے اور آپس میں اختلاف کرنے لگے۔ حالانکہ خدا نے تمہیں تمہاری رغبت کی چیز دکھادی تھی۔ یعنی مسلمان صاف طور پر غالب آ گئے تھے۔ مالِ غنیمت آنکھوں کے سامنے موجود تھا۔ کفار پیٹھ پھر کر بھاگ کھڑے ہوئے تھے۔ تم میں سے بعض نے دنیا طلبی کی اور کفار کو شکست دیکھ کر نبی کے فرمان کا خیال نہ کر کے مالِ غنیمت کی طرف لپکے۔ گو بعض اور نیک بخت آخرت طلب بھی تھے لیکن اس نافرمانی وغیرہ کی بنا پر کفار کی پھر بن آئی اور ایک مرتبہ تمہاری پوری آزمائش ہو گئی۔ غالب ہو کر مغلوب ہو گئے۔ فتح کے بعد شکست ہو گئی۔ لیکن پھر بھی خدا نے تمہارے اس جرم کو معاف فرما دیا۔ کیونکہ وہ جانتا ہے کہ بظاہر تم ان سے تعداد میں اور اسباب میں کم تھے۔ خطا کا معاف ہونا بھی عَفَا عَنۡكُمۡ میں داخل ہے اور یہ مطلب ہے کہ کچھ معمولی سی گوشمالی کر کے کچھ بزرگوں کی شہادت کے بعد اس نے اپنی آزمائش کو اٹھا لیا اور باقی لوگوں کو معاف فرما دیا۔ اللہ تعالیٰ باایمان لوگوں پر فضل و کرم، لطف، رحم ہی کرتا ہے۔

حضرت عبداللہ ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مدد جیسی احد میں ہوئی ہے کہیں نہیں ہوئی ہے۔ اسی کے بارے میں ارشاد باری ہے کہ اللہ نے تم سے اپنا وعدہ سچا کر دکھایا۔ لیکن پھر تمہاری بعض فروگزاشت سے معاملہ برعکس ہو گیا۔ بعض لوگوں نے دنیا طلبی کر کے رسول کی نافرمانی کی۔ یعنی بعض تیر اندازوں نے جنہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پہاڑ کے درّے پر کھڑا کیا تھا اور فرمادیا تھا کہ تم یہاں سے دشمنوں کی نگہبانی کرو۔ وہ ہماری پیٹھ کی طرف سے نہ آ جائیں۔ اگر تم دیکھو ہم ہار بھی گئے تو تم اپنی جگہ سے نہ ہٹنا اور اگر تم دیکھو کہ ہم غالب آ گئے تو بھی تم غنیمت جمع کرنے کے لئے بھی اپنی جگہ نہ چھوڑنا۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم غالب آ گئے تو تیر اندازوں نے حکم عدولی کی۔ وہ اپنی جگہ چھوڑ کر مسلمانوں میں آ ملے اور مالِ غنیمت جمع کرنا شروع کر دیا۔ صفوں کا کوئی خیال نہ رہا۔ درّے کو خالی پا کر مشرکوں نے بھاگنا بند کر دیا اور غور و فکر کر کے اس جگہ حملہ کر دیا۔ چند مسلمان جواب تک وہاں جمے کھڑے تھے وہ شہید ہو گئے اور اب ان لوگوں نے مسلمانوں کی پیٹھ کے پیچھے سے ان کی بے خبری میں اس زور کا حملہ کیا کہ مسلمانوں کے پیر نہ جم سکے اور شروع دن کی فتح اب شکست میں بدل گئی اور یہ مشہور ہو گیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی شہید ہو گئے اور لڑائی کے رنگ نے مسلمانوں کو یقین کرا دیا۔ تھوڑی دیر بعد جبکہ مسلمانوں کی نظریں چہرۂ مبارک پڑیں تو اپنی کوفت اور ساری مصیبت بھول گئے اور خوشی کے مارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف دوڑے۔ آپ ﷺ ادھر ہی آ رہے تھے اور فرماتے تھے کہ خدا کا سخت غضب نازل ہوا ان لوگوں پر جنہوں نے اللہ کے رسول ﷺ کے چہرے کو زخمی کر دیا۔ انہیں کوئی حق نہ تھا کہ اس طرح ہم پر غالب آ جائیں۔

تھوڑی دیر میں سنا کہ ابن سفیان پہاڑ کے نیچے کھڑا ہوا کہہ رہا تھا: اُعۡلُ هُبَلُ اُعۡلُ هُبَلُ ہبل بت کا بول بالا ہو۔ ابوبکر کہاں ہے؟ عمر کہاں ہے؟ حضرت عمرؓ نے پوچھا، حضور ﷺ اسے جواب دوں؟ آپ ﷺ نے اجازت دی تو حضرت فاروق

نے اس کے جواب میں فرمایا: اَللّٰہُ اَعْلٰی وَاَجَلُّ اللّٰہُ اَعْلٰی وَاَجَلُّ اللہ بہت بلند ہے اور جلال وعزت والا ہے۔ وہ پوچھنے لگا بتاؤ محمد (ﷺ) کہاں ہیں؟ ابوبکر کہاں ہیں؟ عمر کہاں ہیں؟ آپ نے فرمایا یہ ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور یہ ہیں ابوبکر صدیقؓ اور یہ ہوں میں عمر فاروقؓ۔ ابوسفیان کہنے لگا یہ بدر کا بدلہ ہے یونہی دھوپ چھاؤں الٹتی پلٹتی رہتی ہے۔ لڑائی کی مثال تو کنوئیں کے ڈول کی سی ہے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا برابری ہرگز نہیں' تمہارے مقتول جہنم میں گئے اور ہمارے شہدا جنت میں پہنچے۔ ابوسفیان کہنے لگا اگر یوں ہی ہے تو یقیناً ہم نقصان اور گھاٹے میں رہے سنو! اپنے مقتولین میں بعض ناک کان کٹے لوگ بھی تم پاؤ گے۔ گو یہ ہمارے سرداروں کی رائے سے نہیں ہوا لیکن ہمیں برا بھی نہیں معلوم ہوا۔ یہ حدیث غریب ہے اور یہ قصہ بھی عجیب ہے۔ یہ ابن عباسؓ کی مرسلات سے ہے وہ یا ان کے والد جنگ احد میں موجود نہ تھے۔ مستدرک حاکم میں بھی یہ روایت موجود ہے۔ ابن ابی حاتم اور بیہقی کو دلائل النبوۃ میں بھی ہے اور صحیح حدیثوں میں اس کے بعض حصوں کے شواہد بھی ہیں۔

مسند احمد میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ احد والے دن عورتیں مسلمانوں کے پیچھے تھیں جو زخمیوں کی دیکھ بھال کرتی تھیں۔ مجھے تو پوری طرح یقین تھا کہ آج کے دن ہم میں کوئی ایک بھی طالب دنیا نہیں۔ بلکہ اس وقت اگر مجھے اس بات پر قسم کھلوائی جاتی تو کھا لیتا لیکن قرآن میں یہ آیت اتری: ﴿مِنكُم مَّن يُرِيدُ الدُّنْيَا﴾ یعنی تم میں سے بعض طالب دنیا بھی ہیں۔ جب صحابہ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اختلاف رائے ہوا اور آپ کی نافرمانی سرزد ہوئی تو ان کے قدم اکھڑ گئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ صرف سات انصاری اور دو مہاجر باقی رہ گئے۔ جب مشرکین نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو گھیر لیا' تو آپ ﷺ فرمانے لگے اللہ تعالیٰ اس شخص پر رحم فرما جو انہیں ہٹا دے۔ تو ایک انصاری اٹھ کھڑے ہوئے اور اس جم غفیر کے مقابل تن تنہا دادِ شجاعت دینے لگے۔ یہاں تک کہ شہید ہو گئے۔ پھر کفار نے حملہ کیا۔ آپ ﷺ نے یہی فرمایا' پھر ایک انصاری تیار ہو گئے اور اس بے جگری سے لڑے کہ انہیں آگے نہ بڑھنے دیا لیکن بالآخر یہ بھی شہید ہو گئے۔ یہاں تک کہ ساتوں صحابہؓ خدا کے ہاں پہنچ گئے۔ اللہ ان سے خوش ہو۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مہاجرین سے فرمایا' افسوس ہم نے اپنے ساتھیوں سے منصفانہ معاملہ نہ کیا۔ اب ابوسفیان نے بلند آواز سے کہا کہ اُعْلُ ھُبَل۔ آپ ﷺ نے فرمایا: کہو اَللّٰہُ اَعْلٰی وَاَجَلُّ۔ ابوسفیان نے کہا: لَنَا الْعُزّٰی وَلَا عُزّٰی لَکُمْ ہمارا عزیٰ بت ہے تمہارا کوئی عزیٰ نہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہو: اَللّٰہُ مَوْلَانَا وَالْکَافِرُوْنَ لَا مَوْلٰی لَھُمْ اللہ ہمارا مولا ہے اور کافروں کا کوئی مولا نہیں۔ ابوسفیان کہنے لگا آج کا دن بدر کے دن کا بدلہ ہے کوئی دن ہمارا اور کوئی دن تمہارا' یہ تو ہاتھوں ہاتھ کا سودا ہے۔ ایک کے بدلے ایک ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہرگز برابری نہیں ہمارے شہداء زندہ ہیں اور روزیاں دیئے جاتے ہیں اور تمہارے مقتول جہنم میں عذاب دیئے جا رہے ہیں۔ پھر ابوسفیان بولا: اپنے مقتولوں میں تم دیکھو گے کہ بعض کے کان ناک وغیرہ کاٹ لئے گئے ہیں۔ لیکن میں نے نہ یہ کہا نہ اس سے روکا اسے میں نے پسند کیا نہ ناپسند کیا۔ نہ مجھے یہ بھلا معلوم ہوا نہ بُرا۔

اب جو دیکھا تو معلوم ہوا کہ حضرت حمزہؓ کا پیٹ چاک کر دیا گیا تھا اور ہندہ نے ان کا کلیجہ لے کر چبایا تھا۔ لیکن نگل نہ سکی تو اگل دیا۔ حضور ﷺ نے فرمایا ناممکن تھا کہ اس کے پیٹ میں حمزہؓ کا ذرا سا گوشت بھی جاتا اور خدا تعالیٰ حمزہؓ کے کسی عضو بدن کو جہنم میں لے جانا نہیں چاہتا۔ چنانچہ حضرت حمزہؓ کے جنازے کو اپنے سامنے رکھ کر نماز جنازہ ادا کی۔ پھر ایک انصاریؓ کا جنازہ لایا گیا۔ وہ حضرت حمزہ کے پہلو میں رکھا گیا اور آپ ﷺ نے پھر نماز جنازہ پڑھائی' انصاری کا جنازہ اٹھا لیا گیا' لیکن حمزہؓ

کا جنازہ وہیں رہا۔ اسی طرح ستر شخص لائے گئے اور حضرت حمزہؓ کی ستر دفعہ جنازہ کی نماز پڑھی گئی (مسند) صحیح بخاری شریف میں حضرت براد سے روایت ہے کہ احد والے دن مشرکوں سے ہماری مڈبھیڑ ہوئی' حضور ﷺ نے تیراندازوں کی ایک جماعت کو الگ بٹھا دیا اور ان کی سرداری حضرت عبداللہ بن جبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو سونپی اور فرمادیا کہ اگر تم ہمیں ان پر غالب آتا ہوا دیکھو تو بھی یہاں سے نہ ہٹنا اور وہ ہم پر غالب آجائیں تو بھی اپنی جگہ نہ چھوڑنا۔ لڑائی شروع ہوتے ہی خدا کے فضل سے مشرکوں کے قدم پیچھے پڑنے لگے۔ یہاں تک کہ عورتیں بھی تہمد اونچا کر کے پہاڑوں میں ادھر اُدھر دوڑنے لگیں۔ اب تیرانداز گروہ غنیمت غنیمت کہتا ہوا نیچے اتر آیا۔ گو ان کے امیر نے ہر چند انہیں سمجھایا' لیکن کسی نے ان کی نہ سنی۔ بس اب مشرکین مسلمانوں کی پیٹھ کی طرف سے آپڑے اور ستر بزرگ شہید ہو گئے۔ ابوسفیان ایک ٹیلے پر چڑھ کر کہنے لگا کیا محمد ﷺ حیات ہیں؟ کیا ابوبکرؓ موجود ہیں؟ کیا عمرؓ زندہ ہیں۔ لیکن حضور ﷺ کے فرمان سے صحابہ خاموش رہے تو وہ خوشی کے مارے اچھل پڑا اور کہنے لگا یہ سب ہماری تلواروں کے گھاٹ اتر گئے۔ اگر زندہ ہوتے تو جواب دیتے۔ اب حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو تاب ضبط نہ رہی۔ فرمانے لگے: اے دشمنِ خدا تو جھوٹا ہے۔ بحمد اللہ ہم سب موجود ہیں اور تیری تباہی اور بربادی کرنے والے خدا نے باقی رکھے ہیں۔ پھر وہ باتیں ہوئیں جو اُوپر بیان ہو چکی ہیں۔

صحیح بخاری شریف میں حضرت عائشہ سے روایت ہے کہ جنگ احد میں مشرکوں کو ہزیمت ہوئی اور ابلیس نے آواز لگائی' اے اللہ کے بندو اپنے پیچھے کی خبر لو۔ اگلی جماعتیں پچھلی جماعتوں پر ٹوٹ پڑیں۔ حضرت حذیفہ نے دیکھا کہ مسلمانوں کی تلواریں ان کے والد حضرت یمانؓ پر برس رہی ہیں۔ ہر چند کہتے رہے کہ اے اللہ کے بندو! یہ میرے باپ یمان ہیں۔ مگر کون سنتا تھا۔ وہ تو یوں ہی شہید ہو گئے۔ لیکن حضرت حذیفہؓ نے کچھ نہ کہا بلکہ فرمایا: اللہ تمہیں معاف کرے۔ حضرت حذیفہؓ کی یہ بھلائی ان کے آخر دم تک ان میں رہی۔

سیرت ابن اسحاق میں ہے حضرت زبیر بن عوامؓ فرماتے ہیں: میں نے خود دیکھا کہ مسلمانوں کے اوّل حملہ میں ہی مشرک بھاگ کھڑے ہوئے۔ یہاں تک کہ ان کی عورتیں ہندہ وغیرہ تہمد اُٹھائے تیز تیز دوڑ رہی تھیں۔ لیکن اس کے بعد جب تیراندازوں نے مرکز چھوڑا اور کفار نے سمت کر پیچھے کی طرف سے ہم پر حملہ کر دیا۔ ادھر کسی نے آواز لگائی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم شہید ہو گئے۔ پس پھر معاملہ برعکس ہو گیا۔ ورنہ ہم مشرکین کے علمبرداروں تک پہنچ چکے تھے اور جھنڈا ان کے ہاتھ سے گر پڑا تھا۔ لیکن عمرہ بنت علقمہ حارثیہ عورت نے تھام لیا اور قریش کا مجمع پھر یہاں جمع ہو گیا۔ حضرت انس بن مالکؓ کے چچا حضرت انس بن نضرؓ یہ رنگ دیکھ کر حضرت عمرؓ، حضرت طلحہؓ وغیرہ کے پاس آتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ تم نے کیوں ہمتیں چھوڑ دیں۔ وہ جواب دیتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تو شہید ہو گئے۔ حضرت انسؓ نے فرمایا: پھر تم جی کر کیا کرو گے؟ یہ کہا اور مشرکین میں گھسے' پھر لڑتے رہے یہاں تک کہ خدا سے جا ملے رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔ بدر والے دن جہاد میں شریک نہیں ہو سکے تھے۔ تو عہد کیا تھا کہ آئندہ اگر کوئی موقعہ آیا تو میں دکھا دوں گا۔ چنانچہ اس جنگ میں وہ موجود تھے۔ جب مسلمانوں میں کھلبلی مچی' تو انہوں نے کہا: خدایا میں مسلمانوں کے اس کام سے معذور ہوں اور مشرکوں کے اس کام سے بری ہوں۔ پھر اپنی تلوار لے کر آگے بڑھ گئے۔ راہ میں حضرت سعد بن معاذ سے ملے اور کہنے لگے کہاں جا رہے ہو؟ مجھے تو جنت کی خوشبو کی لپٹیں احد پہاڑ سے محسوس ہو رہی ہیں۔ چنانچہ مشرکوں میں گھس گئے اور بڑی بے جگری سے لڑے۔ یہاں تک کہ شہادت حاصل کی۔ اسی سے اُوپر تیر و تلوار

کے زخم بدن پر آئے تھے۔ پہچانے نہ جاتے تھے۔ پوریاں دیکھ کر پہچانے گئے رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔

صحیح بخاری شریف میں ہے کہ ایک حاجی نے بیت اللہ شریف میں ایک مجلس دیکھ کر پوچھا کہ یہ کون لوگ ہیں؟ لوگوں نے کہا: یہ قریشی ہیں۔ پوچھا: ان کے شیخ کون ہیں؟ جواب ملا: حضرت عبداللہ بن عمرؓ ہیں۔ وہ آیا اور کہنے لگا' میں کچھ دریافت کرنا چاہتا ہوں۔ حضرت عبداللہؓ نے فرمایا پوچھو۔ اس نے کہا آپ کو اس بیت اللہ کی حرمت کی قسم کیا آپ کو علم ہے۔

ایک الزام اور اِس کی حقیقت ☆

(حضرت عثمان بن عفانؓ) احد والے دن بھاگ گئے تھے؟ آپ نے جواب دیا: ہاں۔ کہا: کیا آپ کو معلوم ہے کہ وہ بدر والے دن بھی حاضر نہیں ہوئے تھے؟ فرمایا: ہاں! کہا: کیا آپ جانتے ہیں کہ وہ بیت الرضوان میں شریک نہیں ہوئے تھے۔ فرمایا: یہ بھی ٹھیک ہے۔ اب اس نے خوش ہو کر تکبیر کہی۔ حضرت عبداللہ نے فرمایا: ادھر آ اب میں تجھے پورے واقعات سناؤں۔ احد کے دن بھاگنا تو اللہ تعالیٰ نے معاف فرمادیا۔ بدر کے دن کی غیر حاضری کا باعث یہ ہوا کہ آپ کے گھر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی تھیں اور وہ اس وقت سخت بیمار تھیں۔ تو خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا تھا کہ تم مدینہ میں ہی رہو۔ تمہیں اللہ تعالیٰ اس جنگ میں حاضر ہونے کا اجر دے گا اور غنیمت میں بھی تمہارا حصہ ہے۔ بیعت رضوان کا واقعہ یہ ہے کہ انہیں رسول اللہ ﷺ نے مکہ والوں کے پاس اپنا پیغام دے کر بھیجا تھا۔ اس لئے کہ مکہ میں جو عزت انہیں حاصل تھی کسی اور کو نہ تھی۔ ان کے تشریف لے جانے کے بعد یہ بیعت لی گئی تو رسول اللہ ﷺ نے اپنا داہنا ہاتھ کھڑا کر کے کہا کہ یہ عثمان کا ہاتھ ہے' پھر اپنے دوسرے ہاتھ پر رکھا (گویا بیعت لی) پھر اس شخص سے کہا' اب جا اور اسے بھی ساتھ لے جا۔ پھر فرمایا: اِذْتُصْعِدُوْنَ یعنی تم اپنے دشمن سے بھاگ کر پہاڑ پر چڑھ رہے تھے اور مارے خوف ودہشت کے دوسری جانب توجہ بھی نہیں کرتے تھے۔ رسول کو بھی تم نے وہیں چھوڑ دیا تھا۔ وہ تمہیں آوازیں دے رہے اور سمجھا رہے تھے کہ بھاگو نہیں لوٹ آؤ۔ حضرت عدیؓ فرماتے ہیں کہ مشرکین کے اس پرزور اور اچانک حملہ سے مسلمانوں کے قدم اکھڑ گئے۔ کچھ تو مدینہ کی طرف لوٹ آئے' کچھ پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ گئے۔ اللہ کا نبی ﷺ آوازیں دیتا رہا کہ اللہ کے بندو میری طرف آؤ۔ اللہ کے بندو میری طرف آؤ۔ اس واقعہ کا بیان اس آیت میں ہے۔ عبداللہ بن زبعری شاعر نے اس واقعہ کو نظم میں ادا کیا ہے۔ آنحضرت ﷺ اس وقت صرف بارہ آدمیوں کے ساتھ رہ گئے تھے۔ مسند احمد کی ایک طویل حدیث میں بھی ان تمام واقعات کا ذکر ہے۔

دلائل النبوۃ میں ہے کہ جب ہزیمت ہوئی تب حضور ﷺ کے ساتھ صرف گیارہ شخص رہ گئے تھے اور ایک حضرت طلحہ بن عبیداللہؓ تھے۔ آپ پہاڑ پر چڑھنے لگے لیکن مشرکین نے آگھیرا۔ آپ ﷺ نے اپنے ساتھیوں کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا کوئی ہے جو ان سے مقابلہ کرے؟ حضرت طلحہؓ نے اس آواز پر فوراً لبیک کہا اور تیار ہو گئے۔ لیکن آپ نے فرمایا: تم ابھی ٹھیر جاؤ۔ اب ایک انصاری تیار ہوئے اور وہ ان سے لڑنے لگے۔ یہاں تک کہ شہید ہوئے۔ اسی طرح سب کے سب ایک ایک کر کے شہید ہو گئے اور اب صرف حضرت طلحہ رہ گئے۔ تو یہ بزرگ ہر مرتبہ تیار ہو جاتے تھے۔ لیکن حضور ﷺ نے انہیں روک لیا کرتے تھے۔ آخر یہ مقابلہ پر آئے اور اس طرح جم کر لڑے کہ ان سا کی لڑائی ایک طرف اور ان کی ایک طرف اس لڑائی میں ان کی انگلیاں کٹ گئیں۔ آپ نے فرمایا: اگر تم بسم اللہ کہہ دیتے یا اللہ کا نام لیتے تم تمہیں فرشتے اُٹھا لیتے اور آسمان کی بلندی کی طرف لے چڑھتے اور لوگ دیکھتے رہتے۔ اب نبی ﷺ اپنے صحابہ کے مجمع میں پہنچ چکے تھے۔ صحیح بخاری شریف میں ہے۔ حضرت قیس بن

حازمؒ فرماتے ہیں' میں نے دیکھا حضرت طلحہ کا وہ ہاتھ' جسے انہوں نے سپر بنایا تھا' شل ہو گیا تھا۔ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ فرماتے ہیں میرے پاس حضور ﷺ نے اپنی ترکش سے احد والے دن تمام تیر پھیلا دیئے تھے اور فرمایا: تجھ پر میرے ماں باپ فدا ہوں[1]' لے مشرکین کو مار۔ آپ ﷺ اُٹھا اُٹھا کر دیتے جاتے تھے اور میں تاک تاک کر مشرکین کو مارتا جاتا تھا۔ اس دن میں نے دو شخصوں کو دیکھا کہ حضور ﷺ کے دائیں بائیں تھے اور خوب لڑ رہے تھے۔ میں نے نہ تو اس سے پہلے کبھی انہیں دیکھا تھا نہ اس کے بعد یہ دونوں حضرت جبرئیلؑ اور حضرت میکائیلؑ تھے۔ ایک اور روایت میں ہے کہ جو بزرگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے اور ایک ایک کر کے شہید ہوئے تھے۔ انہیں آپ فرمائے جاتے تھے کوئی ہے جو انہیں روکے اور جنت میں جائے' جنت میں میرا رفیق بنے۔ ابی بن خلف نے مکہ میں قسم کھائی تھی کہ میں رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کروں گا۔ جب حضور کو اس کا علم ہوا تو آپ ﷺ نے فرمایا: وہ تو نہیں بلکہ میں' انشاء اللہ اسے قتل کر دوں گا۔ احد والے دن یہ خبیث سر تا پا لوہے میں غرق زرہ بکتر لگائے ہوئے حضور ﷺ کی طرف بڑھا اور یہ کہتا آتا تھا کہ اگر محمد (ﷺ) بچ گئے تو میں اپنے تئیں ہلاک کر ڈالوں گا۔ ادھر سے حضرت مصعب بن عمیرؓ اس نابکار کی طرف بڑھے لیکن آپ شہید ہو گئے۔ اب حضور ﷺ اس طرف بڑھے اس کا سارا جسم لوہے میں چھپا ہوا تھا۔ صرف ذرا سی پیشانی نظر آ رہی تھی۔ آپ ﷺ نے اپنا نیزہ تاک کر وہیں لگایا جو ٹھیک نشانے پر بیٹھا اور وہ تڑپ کر گھوڑے سے گرا۔ گو اس زخم سے خون بھی نہ نکلا تھا' لیکن اس کی یہ حالت تھی کہ بلبلا رہا تھا۔ لوگوں نے اسے اٹھا لیا' لشکر میں لے گئے اور تشفی دینے لگے کہ ایسا کوئی کاری زخم نہیں لگا۔ کیوں اس قدر نامردی کرتا ہے۔ آخر ان کے طعنوں سے مجبور ہو کر اس نے کہا کہ حضور ﷺ نے فرمایا ہے میں ابی کو قتل کروں گا۔ سچ مانو اب میں کبھی نہیں بچ سکتا۔ تم اس پر نہ جاؤ کہ مجھے ذرا سے خراش ہی آئی ہے۔ خدا کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے اگر کل اہل ذی المجاز کو اتنا زخم اس ہاتھ سے لگ جاتا تو سب ہلاک ہو جاتے۔ پس یونہی تڑپتے تڑپتے اور بلکتے بلکتے اس جہنمی کی ہلاکت ہوئی اور مر کر جہنم رسید ہوا۔

مغازی محمد بن اسحاق میں ہے جب یہ شخص حضور ﷺ کے سامنے ہوا تو صحابہؓ نے اس کے مقابلہ کی خواہش کی لیکن آپ ﷺ نے روک دیا اور آپ نے فرمایا: اسے آنے دو۔ جب وہ قریب آ گیا تو آپ نے حضرت حارث بن صمہ سے نیزہ لے کر اس پر حملہ کر دیا۔ حضور ﷺ کے ہاتھ میں نیزہ دیکھ کر وہ کانپ اٹھا۔ ہم نے اسی وقت سمجھ لیا کہ اس کی خیر نہیں۔ آپ نے اس کی گردن پر وار کیا اور لڑکھڑا کر گھوڑے پر سے گر پڑا۔ حضرت ابن عمرؓ کا بیان ہے کہ بطن رابغ میں اس کافر کو موت آئی۔ ایک مرتبہ میں رات کے آخری حصہ میں یہاں سے گزرا تو میں نے ایک جگہ سے دہشت ناک شعلے اٹھتے دیکھے اور دیکھا کہ ایک شخص کو زنجیروں میں جکڑے ہوئے اس آگ میں گھسیٹا جا رہا ہے اور وہ پیاس پیاس کر رہا ہے اور دوسرا شخص کہتا ہے' اس کو پانی نہ دینا' یہ پیغمبر کے ہاتھ کا مارا ہوا ہے۔ یہ ابی بن خلف ہے۔

صحیحین کی ایک حدیث میں ہے آپ اپنے سامنے کے چار دانتوں کی طرف' جنہیں مشرکین نے احد والے دن شہید کیا تھا' اشارہ کر کے فرما رہے تھے: خدا کا سخت تر غضب ان لوگوں پر ہے جنہوں نے اپنے نبی ﷺ کے ساتھ یہ کیا اور اس پر بھی خدا کا غضب ہے' جسے اللہ کا رسول قتل کرے[2] اور روایت میں یہ لفظ ہیں کہ جن لوگوں نے خدا کے رسول ﷺ کا چہرہ زخمی کیا'

---

[1] سعد بن ابی وقاص واحد صحابی ہیں جن کے متعلق زبانِ رسالت (ﷺ) سے ایسے الفاظ نکلے۔ سبحان اللہ
[2] رسول سراپا رحمت ہوتا ہے' اپنی اُمت کے لیے اس کی شفقتیں ایسی ہوتی ہیں جیسا کہ باپ کا لطف و کرم اپنی اولاد کے لیے ....

عتبہ بن ابی وقاص کے ہاتھ سے حضور ﷺ کو یہ زخم لگا تھا۔ سامنے کے چار دانت ٹوٹ گئے تھے۔ رخسار پر زخم آیا تھا اور ہونٹ بھی۔ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ فرمایا کرتے تھے: مجھے جس قدر اس شخص کے قتل کی تمنا تھی' کسی اور قتل کی نہ تھی۔ یہ شخص بڑا بد خلق تھا اور ساری قوم اس کی دشمن تھی۔ اس کی برائی میں حضور ﷺ کا یہ فرمان کافی ہے کہ نبیؐ کو زخمی کرنے والے پر خدا سخت غضبناک ہے۔ عبدالرزاق میں ہے کہ حضور ﷺ نے اس کے لئے بددعا کی کہ خدایا سال ہی میں یہ ہلاک ہو جائے اور کفر پر اس کی موت ہو[1]۔ چنانچہ یہی ہوا اور یہ بد بخت کافر مرا اور جہنم واصل ہوا۔ ایک مہاجر کا بیان ہے کہ احد میں حضور ﷺ پر ہر طرف سے تیر برس رہے تھے۔ لیکن خدا کی قدرت سے ان سب کے رخ پھر دیئے جاتے تھے۔ عبداللہ بن شہاب زہری نے اس دن قسم کھا کر کہا کہ مجھے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو دکھا دو۔ وہ آج میرے ہاتھ سے بچ نہیں سکتا۔ اگر وہ نجات پا گیا تو میری نجات نہیں۔ اب وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف لپکا اور بالکل آپ ﷺ کے پاس آ گیا اور اس وقت حضور ﷺ کے ساتھ کوئی نہ تھا۔ لیکن خدا نے اس کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا۔ اسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نظر ہی نہ آئے۔ جب وہ نامراد پلٹا تو صفوان نے اسے طعنہ زنی کی۔ اس نے کہا خدا کی قسم میں نے آپ (ﷺ) کو دیکھا ہی نہیں۔ واللہ وہ خدا کی طرف سے محفوظ ہیں۔ ہمارے ہاتھ نہیں لگیں گے۔ سنو! ہم چار شخصوں نے انکے قتل کا پختہ مشورہ کیا تھا اور آپس میں عہد و پیمان کئے تھے۔ ہم نے ہر چند چاہا لیکن کامیابی نہ ہوئی۔

واقدی کہتے ہیں کہ حضور (ﷺ) کی پیشانی کو زخمی کرنے والا ابن قمیئہ اور ہونٹ اور دانتوں پر صدمہ پہنچانے والا عتبہ بن ابی وقاص تھا۔ ام المؤمنین حضرت عائشہ کا بیان ہے کہ میرے والد حضرت ابو بکرؓ جب احد کا ذکر فرماتے تو صاف کہتے کہ اس دن کی تمام تر فضیلت کا سہرا حضرت طلحہؓ کے سر ہے۔ جب میں لوٹ کر آیا تو میں نے دیکھا کہ ایک شخص حضور (ﷺ) کی حمایت میں جان توڑ کر لڑ رہا ہے۔ میں نے کہا خدا کرے یہ طلحہ ہو۔ اب جو قریب آ کر دیکھا تو طلحہؓ ہی تھے۔ میں نے کہا الحمدللہ میری ہی قوم کا ایک شخص ہے۔ میرے اور مشرکوں کے درمیان ایک شخص تھا۔ جو مشرکین میں کھڑا ہوا تھا۔ لیکن اس کے بے پناہ حملے مشرکوں کی ہمت توڑ رہے تھے۔ غور سے دیکھا تو وہ حضرت ابو عبیدہ بن جراح رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھے۔ اب جو میں نے بغور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف دیکھا تو آپ ﷺ کے سامنے کے دانت ٹوٹ گئے ہیں' چہرہ زخمی ہو رہا ہے اور پیشانی میں زرہ کی دو کڑیاں گھس گئی ہیں۔ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف لپکا۔ لیکن آپ ﷺ نے فرمایا: ابن طلحہؓ کی خبر لو۔ میں نے چاہا کہ حضور ﷺ کے چہرہ میں سے وہ دونوں کڑیاں نکال لوں۔ لیکن حضرت ابو عبیدہؓ نے مجھے قسم دے کر روک دیا اور خود قریب آئے اور ہاتھ سے نکالنے میں زیادہ تکلیف محسوس کر کے دانتوں سے پکڑ کر ایک کو نکال لیا۔ لیکن حضرت ابو عبیدہ کا بھی اس میں دانت ٹوٹ گیا۔ میں نے اب پھر چاہا کہ دوسری میں نکال لوں لیکن حضرت ابو عبیدہؓ نے پھر قسم دی تو میں رک رہا۔ انہوں نے پھر دوسری کڑی نکالی۔ اب کی مرتبہ بھی ان کے دانت ٹوٹے۔ اس سے فارغ ہو کر ہم حضرت طلحہؓ کی طرف متوجہ ہوئے۔ ہم نے دیکھا کہ ستر سے زیادہ زخم انہیں لگ چکے ہیں۔ انگلیاں کٹ گئی ہیں۔ ہم نے پھر ان کی بھی خبر لی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زخم

= ...... اور پھر رسول اللہ ﷺ تو رحمۃ للعالمین تھے۔ آپ ﷺ نے اگر کسی کو اپنے دست مبارک سے تہ تیغ کیا تو اس کے کسی شدید اور خطرناک جرم ہی کی بناء پر اور شدید گناہوں اور جرائم پر اللہ عزوجل کے عذاب کا بڑھ جانا غیر ممکن نہیں ہے۔

[1] یہ بددُعا انتقاماً نہیں تھی بلکہ خدائی فیصلہ کے مطابق تھی جیسا کہ نوح علیہ السلام نے اپنی اُمت کے حق میں اور موسیٰ علیہ السلام نے اپنی اُمت کے لیے بددُعا کی۔ ۱۲

کا خون حضرت ابوسعید خدریؓ نے چوسا' تاکہ خون تھم جائے۔ پھر ان سے کہا گیا کہ کلی کر ڈالو۔ لیکن انہوں نے کہا: خدا کی قسم میں کلی نہ کروں گا۔ پھر میدان جنگ میں چلے گئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر کوئی شخص جنتی کو دیکھنا چاہتا ہو تو انہیں دیکھ لے۔ چنانچہ یہ اسی میدان میں شہید ہو گئے۔

صحیح بخاری شریف میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ زخمی ہوا۔ سامنے کے دانت ٹوٹے۔ سر کا خود ٹوٹا۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ خون دھوتی تھیں اور حضرت علیؓ ڈھال میں پانی لا لا کر ڈالتے جاتے تھے۔ جب دیکھا کہ خون کسی طرح تھمتا ہی نہیں تو حضرت فاطمہؓ نے بوریا جلا کر اس کی راکھ زخم پر رکھ دی۔ جس سے خون بند ہوا۔ پھر فرماتا ہے: تمہیں غم پر غم پہنچا بِغَم کا بِ معنی میں علی کے ہے۔ جیسے فِی جُذُوعِ النَّخلِ میں فِی معنی میں عَلٰی (ظہ) کے ہے۔ ایک غم تو شکست کا جبکہ یہ مشہور ہو گیا کہ خدانخواستہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی جان پر بن آئی۔ دوسرا غم مشرکوں کا پہاڑ کے اوپر غالب آ کر چڑھ جانے کا۔ جبکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے: انہیں یہ بلندی لائق نہ تھی۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ فرماتے ہیں: ایک شکست کا دوسرا غم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کی خبر کا اور یہ غم اگلے غم سے بھی زیادہ تھا۔ اسی طرح یہ بھی ہے کہ ایک غم تو غنیمت کا ہاتھ میں آ کر نکل جانے کا دوسرا ہزیمت کا۔ اسی طرح ایک غم اپنے بھائیوں کے قتل کا دوسرا غم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت ایسی منحوس خبر کا۔ پھر فرماتا ہے جو غنیمت اور فتح مندی تم سے فوت ہوئی اور جو زخم و شہادت ملی اس پر غم نہ کھاؤ۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ جو بلندی اور جلال والا وہ تمہارے اعمال سے خبردار ہے۔

ثُمَّ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ الْغَمِّ اَمَنَةً نُّعَاسًا يَّغْشٰى طَآئِفَةً مِّنْكُمْ ۙ وَ طَآئِفَةٌ قَدْ اَهَمَّتْهُمْ اَنْفُسُهُمْ يَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ غَيْرَ الْحَقِّ ظَنَّ الْجَاهِلِيَّةِ ؕ يَقُوْلُوْنَ هَلْ لَّنَا مِنَ الْاَمْرِ مِنْ شَيْءٍ ؕ قُلْ اِنَّ الْاَمْرَ كُلَّهٗ لِلّٰهِ ؕ يُخْفُوْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ مَّا لَا يُبْدُوْنَ لَكَ ؕ يَقُوْلُوْنَ لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ مَّا قُتِلْنَا هٰهُنَا ؕ قُلْ لَّوْ كُنْتُمْ فِيْ بُيُوْتِكُمْ لَبَرَزَ الَّذِيْنَ كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقَتْلُ اِلٰى مَضَاجِعِهِمْ ۚ وَلِيَبْتَلِيَ اللّٰهُ مَا فِيْ صُدُوْرِكُمْ وَلِيُمَحِّصَ مَا فِيْ قُلُوْبِكُمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴿۱۵۴﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَلَّوْا مِنْكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ ۙ اِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّيْطٰنُ بِبَعْضِ مَا كَسَبُوْا ۚ وَلَقَدْ عَفَا اللّٰهُ عَنْهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ

ع ۱٦

حَلِیۡمٌ ﴿۱۵۵﴾

پھر اللہ تعالیٰ نے اس غم کے بعد تم پر چین بھیجی یعنی اونگھ کہ تم میں سے ایک جماعت پر تو اس کا غلبہ ہو رہا تھا اور ایک جماعت وہ تھی کہ ان کو اپنی جان ہی کی فکر پڑ رہی تھی۔ وہ لوگ اللہ کے ساتھ خلاف واقع خیالات کر رہے تھے۔ جو کہ محض حماقت کا خیال تھی۔ وہ یوں کہہ رہے تھے کیا ہمارا کچھ اختیار چلتا ہے آپ فرما دیجئے کہ اختیار تو سب اللہ ہی کا ہے۔ وہ لوگ اپنے دلوں میں ایسی بات پوشیدہ رکھتے ہیں جس کو آپ کے سامنے ظاہر نہیں کرتے کہتے ہیں کہ اگر ہمارا کچھ اختیار چلتا تو ہم یہاں مقتول نہ ہوتے۔ آپ فرما دیجئے کہ اگر لوگ اپنے گھروں میں بھی رہتے تب بھی جن لوگوں کے لئے قتل مقدر ہو چکا تھا وہ لوگ ان مقامات کی طرف نکل پڑتے جہاں وہ گرے ہیں اور یہ جو کچھ ہوا اس لئے ہوتا کہ اللہ تعالیٰ تمہارے باطن کی بات کی آزمائش کرے اور تاکہ تمہارے دلوں کی بات صاف کر دے اور اللہ تعالیٰ سب باطن کی باتوں کو خوب جانتے ہیں۔ یقیناً تم میں جن لوگوں نے پشت پھیر دی تھی' جس روز کہ دونوں جماعتیں باہم مقابل ہوئیں اس کے سوا اور کوئی بات نہیں ہوئی کہ ان کو شیطان نے لغزش دے دی ان کے بعض اعمال کے سبب سے اور یقین سمجھو کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو معاف فرما دیا۔ واقعی اللہ تعالیٰ بڑی مغفرت کرنے والے ہیں بڑے علم والے ہیں۔ ○

رحمت کی ہوائیں ☆

اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر اس غم و رنج کے وقت جو احسان فرمایا' اس کا بیان ہو رہا ہے کہ اس نے ان پر اونگھ ڈال دی۔ ہتھیار ہاتھ میں ہیں' دشمن سامنے ہے۔ لیکن دل میں اتنی تسکین ہے کہ آنکھیں اونگھ سے جھکی جا رہی ہیں۔ جو امن امان کا نشان ہے۔ جیسے سورۂ انفال میں بدر کے واقعہ میں ہے ﴿اِذۡ یُغَشِّیۡکُمُ النُّعَاسَ اَمَنَۃً مِّنۡہُ﴾ (الانفال ۱۱) یعنی خدا کی طرف سے امن بصورت اونگھ نازل ہوا۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں' لڑائی کے وقت کی اونگھ خدا کی طرف سے ہے اور نماز میں اونگھ آنا شیطانی حرکت ہے۔ حضرت ابو طلحہ کا بیان ہے کہ احد والے دن مجھے اس زور کی اونگھ آنے لگی کہ بار بار تلوار میرے ہاتھ سے چھوٹ چھوٹ گئی۔ آپ فرماتے ہیں: جب میں نے آنکھ اٹھا کر دیکھا تو تقریباً ہر شخص کو اسی حالت میں پایا۔ ہاں البتہ ایک جماعت وہ بھی تھی۔ جن کے دِلوں میں نفاق تھا۔ یہ خوف و دہشت کی وجہ سے ہلاک ہو رہے تھے اور ان کی بدگمانیاں اور برے خیال انتہا کو پہنچ چکے تھے۔ پس اہل ایمان' اہل یقین' اہل ثبات' اہل صدق تو یقین کرتے تھے کہ خدا اپنے رسول کی ضرور مدد کرے گا اور ان کی منہ مانگی مراد پوری ہو کر رہے گی۔ لیکن اہل نفاق' اہل شک' بے یقین' ڈھل مل ایمان والوں کی عجب حالت تھی۔ ان کی جان عذاب میں تھی۔ وہ ہائے وائے کر رہے تھے اور ان کے دل میں طرح طرح کے وسوسے تھے۔ انہیں یقین کامل تھا کہ اب مرے۔ وہ جان چکے تھے کہ رسول اور مؤمن نہیں رہے۔ اب بچاؤ کی کوئی صورت نہیں۔ فی الواقع منافقوں کا یہی حال ہے کہ جہاں ذرا نیچا پانسہ دیکھا اور ناامیدی کی گھنگھور گھٹاؤں نے انہیں گھیر لیا۔ برخلاف ان کے ایماندار بد سے بدتر حالت میں بھی خدا سے نیک گمان رکھتا ہے۔ ان کے دلوں کے خیالات یہ تھے کہ ہمارا کچھ بھی بس چلتا تو آج کی موت سے بچ رہتے اور چپکے چپکے اس کو کہتے بھی تھے۔

حضرت زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا بیان ہے کہ اس سخت خوف کے وقت ہمیں تو اس قدر نیند آنے لگی کہ ہماری ٹھوڑیں سینوں سے لگ گئیں۔ میں نے اپنی اسی حالت میں معتب بن قشیر کے یہ الفاظ سنے کہ اگر ہمیں کچھ بھی اختیار ہوتا تو یہاں قتل نہ

ہوتے۔ اللہ تعالیٰ انہیں فرماتا ہے کہ یہ تو مقدرات خدا ہیں' مرنے کا وقت نہیں ٹلتا۔ گو تم گھروں میں ہوتے لیکن پھر بھی جن پر یہاں کٹنا لکھ چکا تھا وہ گھروں کو چھوڑ کر نکل کھڑے ہوتے اور یہاں میں آ ڈٹتے (سینہ سپر ہو جاتے) اور خدا کا لکھا پورا اترتا۔ یہ وقت اس لئے تھا کہ خدا تمہارے دلوں کے ارادوں اور تمہارے مخفی بھیدوں اور ارادوں کو ظاہر کر دے۔ اس آزمائش سے بھلے اور برے نیک اور بد میں تمیز ہو گئی۔ اللہ تعالیٰ جو دلوں کے بھیدوں اور ارادوں سے پوری طرح واقف ہے۔ اس نے اس ذرا سے واقعہ سے منافقوں کو ظاہر کر دیا اور مسلمانوں کا بھی ظاہری امتحان ہو گیا۔

مسلمانوں کی ایک لغزش ☆

اب سچے مسلمانوں کی لغزش کا بیان ہو رہا ہے جو انسانی کمزوری کی وجہ سے ان سے سرزد ہوئی۔ فرمایا ہے: یہ لغزش ان سے شیطان نے کرا دی اور دراصل یہ ان کے عمل کا نتیجہ تھا۔ نہ یہ نافرمانی رسول (ﷺ) کرتے نہ ان کے قدم اکھڑتے۔ انہیں خدا تعالیٰ معذور جانتا ہے اور ان سے اس نے درگزر فرما دیا اور ان کی اس خطا کو معاف فرما دیا۔ خدا کا کام ہی تجاوز کرنا بخشنا' معاف فرمانا' حلم اور بردباری برتنا' تحمل اور عفو کرنا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ حضرت عثمانؓ وغیرہ کی اس لغزش کو اللہ تعالیٰ نے معاف فرما دیا۔ مسند احمد میں ہے کہ ولید بن عقبہ نے ایک مرتبہ حضرت عبدالرحمٰن ابن عوفؓ سے کہا: آخر تم امیر المؤمنین حضرت عثمان بن عفان سے اس قدر کیوں بگڑے ہوئے ہو؟ انہوں نے کہا ان سے کہہ دو کہ میں نے احد والے دن فرار نہیں کیا۔ بدر کے غزوے میں غیر حاضر نہیں رہا اور نہ سنت عمرؓ ترک کی۔ ولید نے جا کر حضرت عثمانؓ سے یہ واقعہ بیان کیا۔ تو آپ نے اس کے جواب میں فرمایا کہ قرآن کہہ رہا ہے کہ: ﴿وَلَقَدْ عَفَا اللّٰهُ عَنْهُمْ﴾ یعنی احد والے دن کی اس لغزش سے اللہ تعالیٰ نے درگزر فرمایا۔ پھر جس خطا کو خدا نے معاف کر دیا' اس پر عار دلانا کیسا؟ بدر والے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی اپنی بیوی حضرت رقیہؓ کی تیمارداری میں مصروف تھا' یہاں تک کہ وہ اس بیماری میں فوت ہو گئیں۔ چنانچہ مجھے رسول اللہ ﷺ نے مال غنیمت میں سے پورا حصہ دیا اور ظاہر ہے کہ حصہ انہیں ملتا ہے جو موجود ہوں۔ پس علماء میری موجودگی ثابت ہوئی۔ رہی سنت عمرؓ اس کی طاقت نہ مجھ میں ہے نہ عبدالرحمٰن میں۔ جاؤ انہیں یہ جواب بھی پہنچا دو۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَقَالُوْا لِاِخْوَانِهِمْ اِذَا ضَرَبُوْا فِي الْاَرْضِ اَوْ كَانُوْا غُزًّى لَّوْ كَانُوْا عِنْدَنَا مَا مَاتُوْا وَمَا قُتِلُوْا ۚ لِيَجْعَلَ اللّٰهُ ذٰلِكَ حَسْرَةً فِيْ قُلُوْبِهِمْ ۗ وَاللّٰهُ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ۗ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿١٥٦﴾ وَلَئِنْ قُتِلْتُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَوْ مُتُّمْ لَمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَحْمَةٌ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ ﴿١٥٧﴾ وَلَئِنْ مُّتُّمْ اَوْ

قُتِلْتُمْ لَاِلَى اللّٰهِ تُحْشَرُوْنَ ﴿۱۵۸﴾

اے ایمان والو تم ان لوگوں کی طرح مت ہو جانا جو کہ کافر ہیں اور کہتے ہیں اپنے بھائیوں کی نسبت جب کہ وہ لوگ کسی سرزمین میں سفر کرتے ہیں یا وہ لوگ کہیں غازی بنتے ہیں کہ اگر یہ لوگ ہمارے پاس رہتے تو نہ مرتے اور نہ مارے جاتے تا کہ اللہ تعالیٰ اس بات کو ان کے قلوب میں موجب حسرت کر دیں اور مارتا جلاتا تو اللہ ہی ہے اور اللہ تعالیٰ جو کچھ تم کرتے ہو سب کچھ دیکھ رہے ہیں اور اگر تم اللہ کی راہ میں مارے جاؤ یا کہ مر جاؤ تم بالضرور اللہ تعالیٰ کے پاس کی مغفرت اور رحمت ان چیزوں سے بہتر ہے جن کو یہ لوگ جمع کرتے ہیں اور اگر تم لوگ مر گئے یا مارے گئے بالضرور اللہ ہی کے پاس جمع کئے جاؤ گے۔ ۞

یہ عقائد بے بنیاد اور غلط ہیں ☆

اللہ تعالیٰ اپنے مؤمن بندوں کو کافروں جیسے فاسد اعتقاد رکھنے کی ممانعت فرما رہے ہیں۔ یہ کفار سمجھتے تھے کہ ان کے لوگ جو سفر میں یا لڑائی میں مرے اگر وہ سفر اور لڑائی نہ کرتے تو نہ مرتے۔ پھر فرماتا ہے کہ یہ باطل خیال بھی انکی حسرت و افسوس کو بڑھانے والا ہے۔ دراصل موت و حیات خدا کے ہاتھ ہے۔ مرتا ہے اس کی مشیت سے اور زندگی ملتی ہے تو اسکے ارادے سے۔ تمام امور کا جاری کرنا اسکے قبضے میں ہے۔ اس کی قضا و قدر ٹلتی نہیں اس کے علم سے اور اسکی نگاہ سے کوئی باہر نہیں۔ تمام مخلوق کے ہر ہر امر کو وہ بخوبی جانتا ہے۔ دوسری آیت بتلا رہی ہے کہ راہ خدا میں قتل ہونا یا مرنا خدا کی مغفرت و رحمت کا ذریعہ ہے اور یہ قطعاً دنیا و مافیا سے بہتر ہے۔ کیونکہ یہ فانی ہے اور وہ باقی اور ابدی ہے۔ پھر ارشاد ہوتا ہے کہ خواہ کسی طرح دنیا چھوڑ و مر کر یا قتل ہو کر لوٹنا تو اللہ ہی کی طرف ہے۔ پھر اپنے اعمال کا بدلہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لو گے۔ برا ہو تو اور بھلا ہو تو۔

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ۚ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ ۖ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ ۚ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ ﴿۱۵۹﴾ اِنْ يَّنْصُرْكُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ ۚ وَاِنْ يَّخْذُلْكُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِيْ يَنْصُرُكُمْ مِّنْ بَعْدِهٖ ۭ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۶۰﴾ وَمَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّغُلَّ ۭ وَمَنْ يَّغْلُلْ يَاْتِ بِمَا غَلَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۚ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۱۶۱﴾ اَفَمَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَ اللّٰهِ كَمَنْ بَاۗءَ بِسَخَطٍ مِّنَ اللّٰهِ وَمَاْوٰىهُ جَهَنَّمُ ۭ وَ

بِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿١٦٢﴾ هُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ﴿١٦٣﴾ لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَي الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِھِمْ يَتْلُوْا عَلَيْھِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُھُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۚ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿١٦٤﴾

بعد اِس کے خدا ہی کی رحمت کے سبب آپ ان کے ساتھ نرم رہے اور اگر آپ تند خو سخت طبیعت ہوتے تو یہ آپ کے پاس سے سب منتشر ہو جاتے۔ سو آپ ان کو معاف کر دیجئے اور آپ ان کے لئے استغفار کر دیجئے اور ان خاص باتوں میں مشورہ لیتے رہا کیجئے۔ پھر جب آپ رائے پختہ کر لیں تو خدا تعالیٰ پر اعتماد کیجئے۔ بیشک اللہ تعالیٰ ایسے اعتماد کرنے والوں سے محبت فرماتے ہیں۔ اگر حق تعالیٰ تمہارا ساتھ دیں۔ تب تو تم سے کوئی نہیں جیت سکتا اور اگر تمہارا ساتھ نہ دیں تو اس کے بعد ایسا کون ہے جو تمہارا ساتھ دے اور غالب کر دے اور صرف اللہ تعالیٰ پر ایمان والوں کو اعتماد رکھنا چاہئے اور نبی کی یہ شان نہیں کہ وہ خیانت کرے۔ حالانکہ جو شخص خیانت کرے گا وہ شخص اپنی اس خیانت کی ہوئی چیز کو قیامت کے دن حاضر کرے گا۔ پھر ہر شخص کو اس کے کئے کا پورا عوض ملے گا اور ان پر بالکل ظلم نہ ہوگا۔ سو ایسا شخص جو کہ رضائے حق کا تابع ہو کیا وہ اس شخص کے مثل ہو جائے گا جو کہ غضب الٰہی کا مستحق ہو اور اس کا ٹھکانہ دوزخ ہو اور وہ جانے کی بری جگہ ہے یہ مذکورین درجات میں مختلف ہوں گے اللہ تعالیٰ کے نزدیک اور اللہ تعالیٰ خوب دیکھتے ہیں ان کے اعمال کو۔ حقیقت میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر احسان کیا جبکہ ان ہی کی جنس سے ایک ایسے پیغمبر کو بھیجا کہ وہ خود ان لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی آیتیں پڑھ پڑھ کر سناتے ہیں اور ان لوگوں کی صفائی کرتے رہتے ہیں اور ان کو کتاب اور فہم کی باتیں بتلاتے رہتے ہیں اور بالیقین یہ لوگ اس سے پہلے صریح غلطی میں تھے۔○

آنحضور ﷺ سے بھی مؤمنین کے لئے عفو وصفح کی خواہش ☆

اللہ تعالیٰ اپنے نبی ﷺ اور مسلمانوں پر احسان جتاتا ہے کہ نبی کے ماننے والوں اور ان کی نافرمانی سے بچنے والوں کے لئے خدا نبی ﷺ کے دل کو نرم کر دیا ہے۔ اگر اس کی رحمت نہ ہوتی تو اتنی نرمی اور آسانی نہ ہوتی۔ حضرت قتادہؒ فرماتے ہیں ما صلہ ہے جو معرفہ کے ساتھ عرب ملا دیا کرتے ہیں جیسے ﴿فَبِمَا نَقْضِهِمْ﴾ (النساء: ۱۵۵) میں اور نکرہ کے ساتھ بھی ملا دیتے ہیں جیسے ﴿عَمَّا قَلِيْلٍ﴾ (المؤمنون: ۴۰) میں۔ اسی طرح یہاں ہے یعنی اللہ کی رحمت سے تو ان کے لئے دل نرم ہوا ہے۔ حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں: یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق ہیں، جن پر آپ کی بعثت ہوئی ہے۔ یہ آیت ٹھیک اس آیت جیسی ہے: لَقَدْ جَاءَكُمْ (التوبۃ: ۱۲۸) یعنی تمہارے پاس تمہیں میں سے ایک رسول آئے، جس پر تمہاری مصیبتیں گراں گزرتی ہیں جو تمہارے ایمان اور خیر کی تمنا رکھتے ہیں۔ جو مؤمنوں پر شفقت اور رحم والے ہیں۔ مسند احمد میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابو امامہ باہلی کا ہاتھ پکڑ کر فرمایا: اے ابو امامہ بعض مؤمن وہ ہیں جن کے لئے میرا دل تڑپ اٹھتا ہے فظًا سے مراد یہاں سخت کلام ہے کیونکہ اس کے بعد غَلِيْظَ الْقَلْبِ کا لفظ ہے یعنی سخت دل فرمان ہے کہ اے نبی ﷺ اگر تم سخت کلام

اور سخت دل ہوتے تو یہ لوگ تمہارے پاس سے منتشر ہو جاتے اور تمہیں چھوڑ دیتے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے انہیں آپ کا والہ وشیدا بنا دیا ہے اور ان کو آپ کے ساتھ قلبی تعلق ہے۔ اس لئے آپ کو بھی ان کے حق میں نرمی اور محبت عطا فرمائی ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صفتوں کو اگلی کتابوں میں بھی پاتا ہوں کہ آپ سخت کلام، سخت دل، بازاروں میں شور مچانے والے اور برائی کا بدلہ برائی سے لینے والے نہیں، بلکہ درگزر کرنے والے اور معافی دینے والے ہیں۔

ترمذی کی ایک غریب حدیث میں ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: لوگوں کے ساتھ خیر خواہی اور چشم پوشی کا مجھے خدا کی جانب سے اسی طرح حکم کیا گیا ہے جس طرح فرائض کی پابندی کا۔ چنانچہ اس آیت میں بھی فرمان ہے: تو ان سے درگزر کر، ان کے لئے استغفار کر، کاموں کا مشورہ ان سے لیا کر۔ اسی لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت مبارک تھی کہ لوگوں کی دلجوئی کے لئے اپنے کاموں میں ان سے مشورہ کیا کرتے تھے۔ جیسے کہ بدر والے دن قافلہ کی طرف بڑھنے کے لئے مشورہ لیا اور صحابہ نے کہا کہ اگر سمندر کے کنارے پر کھڑا کر کے ہمیں فرمائیں گے کہ اس میں کود پڑو اور اس پار نکلو تو بھی سرتابی نہ کریں گے اور اگر ہمیں برک الغماد تک لے جانا چاہیں تو بھی ہم آپ کے ساتھ ہیں۔ ہم وہ نہیں کہ موسیٰ علیہ السلام کے صحابیوں کی طرح کہہ دیں کہ تو اور تیرا رب لڑے ہم تو یہاں بیٹھے ہیں بلکہ ہم تو آپ ﷺ کے دائیں بائیں صفیں باندھ کر جم کر دشمنوں کا مقابلہ کریں گے۔ اسی لئے آپ ﷺ نے اس بات کا مشورہ بھی لیا کہ منزل کہاں ہوئی اور منذر بن عمروؓ نے مشورہ دیا کہ ان لوگوں سے آگے بڑھ کر ان کے سامنے ہو۔ اسی طرح احد کے موقع پر بھی آپ نے شوریٰ کیا کہ آیا مدینہ میں رہ کر لڑیں یا باہر نکلیں اور جمہور کی رائے یہی ہوئی کہ باہر میدان میں جا کر لڑنا چاہئے، چنانچہ آپ نے یہی کیا اور آپ نے جنگ احزاب کے موقعہ پر بھی اپنے اصحاب سے مشورہ کیا کہ مدینہ کے پھلوں کی پیداوار کا تہائی حصہ دینے کا وعدہ کر کے مخالفین سے مصالحت کر لی جائے؟ تو حضرت سعد بن عبادہ اور حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس کا انکار کیا اور آپ نے بھی اس مشورہ کو قبول کیا اور مصالحت چھوڑ دی۔ اسی طرح آپ نے اپنے حدیبیہ والے اس امر کا شوریٰ کیا کہ آیا مشرکین کے گھروں پر دھاوا بول دیں؟ تو حضرت صدیق نے فرمایا: ہم کسی سے لڑنے نہیں آئے۔ ہمارا ارادہ صرف عمرے کا ہے۔ چنانچہ اسے بھی آپ نے منظور فرمالیا۔

اسی طرح جب منافقین نے ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ پر تہمت لگائی تو آپ نے فرمایا: اے مسلمانو! مجھے مشورہ دو کہ ان لوگوں کا میں کیا کروں، جو میرے گھر والوں کو بدنام کر رہے ہیں۔ خدا کی قسم میرے علم میں تو میرے گھر والوں میں کوئی برائی نہیں اور جس شخص کے ساتھ تہمت لگا رہے ہیں، واللہ میرے نزدیک تو وہ بھی بھلائی والا ہی ہے اور آپ نے حضرت عائشہؓ کی جدائی کے لئے حضرت علیؓ اور حضرت اسامہؓ سے مشورہ لیا۔ غرض لڑائی کے کاموں میں بھی، دیگر امور میں بھی حضور ﷺ صحابہ کرام سے مشورے کیا کرتے تھے۔

اس میں علماء کا اختلاف ہے کہ یہ مشورے کا حکم آپ کو بطور وجوب کے تھا یا اختیاری امر تھا، تاکہ لوگوں کے دل خوش رہیں۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں، اس آیت میں حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ سے مشورہ کرنے کا حکم ہے (حاکم) یہ دونوں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حواری اور آپ کے وزیر تھے اور مسلمانوں کے باپ ہیں (کلبی) مسند احمد میں ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں بزرگوں سے فرمایا اگر تمہاری دونوں کی کسی امر میں ایک رائے ہو جائے تو میں تمہارے خلاف کبھی نہ کروں گا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال ہوتا ہے کہ عزم کے کیا معنی ہیں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: جب عقل مند لوگوں سے مشورہ ہو

جائے پھر ان کی مان لینا (ابن مردویہ) ابن ماجہ میں آپ کا یہ ارشاد بھی موجود ہے کہ جس سے مشورہ کیا جائے وہ امین ہے۔ ابوداؤ' ترمذی' نسائی وغیرہ میں بھی یہ روایت ہے۔ امام ترمذیؒ اسے حسن کہتے ہیں اور روایت میں ہے کہ جب تم میں سے کوئی اپنے بھائی سے مشورہ لے تو اسے چاہئے بھلی بات کا مشورہ دے۔ (ابن ماجہ) پھر فرمایا: جب تم کسی کام کا مشورہ کر چکو پھر اس کے کرنے کا پختہ ارادہ ہو جائے تو اب خدا پر بھروسہ کرو۔ اللہ تعالیٰ بھروسہ کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔ پھر دوسری آیت کا ارشاد بالکل اسی طرح کا ہے' جو پہلے گزرا کہ ﴿وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ﴾ (آل عمران:۱۲۶) یعنی مدد صرف اللہ ہی کی طرف سے ہے۔ جو غالب ہے اور حکمتوں والا ہے کہ مومنوں کو کل اور بھروسہ ذات باری ہی پر ہونا چاہئے۔

نبی خائن نہیں ہوتا ☆

پھر فرماتا ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو لائق نہیں کہ وہ خیانت کرے۔ ابن عباسؓ فرماتے ہیں' بدر کے دن ایک سرخ رنگ چادر نہیں ملتی تھی تو لوگوں نے کہا کہ شاید رسول اللہ ﷺ نے لے لی ہو۔ اس پر یہ آیت اتری (ترمذی) اور روایت میں ہے کہ منافقوں نے حضور ﷺ پر کسی چیز کی تہمت لگائی تھی۔ جس پر یہ آیت وما کان اتری۔ پس ثابت ہوا کہ اللہ کے رسول' رسولوں کے سردار صلی اللہ علیہ وسلم ہر قسم کی خیانت سے بیجا طرفداری سے مبرا اور منزہ ہیں۔ خواہ وہ مال کی تقسیم ہو یا امانت کی ادائیگی ہو۔ حضرت ابن عباسؓ سے یہ بھی روایت ہے کہ نبی غلول نہیں کر سکتا کہ بعض لشکریوں کو دے اور بعض کو ان کا حصہ نہ پہنچائے۔ اس آیت کی یہ تفسیر بھی کی گئی ہے کہ یہ نہیں ہو سکتا کہ نبی خدا کی نازل کردہ کسی چیز کو چھپا لے اور امت تک اسے نہ پہنچائے۔ یُغُلَّ کو یا کے پیش سے بھی پڑھا گیا ہے۔ تو معنی یہ ہوں گے کہ نبی کی ذات ایسی نہیں کہ ان کے پاس والے ان کی خیانت کریں۔ چنانچہ حضرت قتادہؒ اور حضرت ربیعؒ سے روایت ہے کہ بدر کے دن آپ ﷺ کے اصحاب نے مال غنیمت میں سے تقسیم سے پہلے کچھ لے لیا تھا۔ اس پر یہ آیت اتری۔ (ابن جریر)

پھر خائن لوگوں کو ڈرایا جاتا ہے اور سخت عذاب کی خبر دی جاتی ہے۔ احادیث میں بھی اس کی بابت بہت کچھ سخت وعید ہے۔ چنانچہ مسند احمد میں ہے کہ سب سے بڑا خیانت کرنے والا وہ شخص ہے جو پڑوسی کے کھیت کی زمین یا اس کے گھر کی زمین دبا لے۔ اگر ایک ہاتھ زمین بھی ناحق اپنی طرف کر لے گا۔ تو ساتوں زمینوں کا طوق اسے پہنایا جائے گا۔ مسند کی ایک اور حدیث میں ہے جسے ہم حاکم بنائیں' اگر اس کا گھر نہ ہو تو وہ گھر بنا سکتا ہے۔ بیوی نہ ہو تو کر سکتا ہے۔ خادم نہ ہو تو رکھ سکتا ہے' سواری نہ ہو تو مہیا کر سکتا ہے۔ اس کے سوا اور کچھ لے گا تو خائن ہوگا۔ یہ حدیث ابوداؤد میں بھی دیگر الفاظ سے منقول ہے۔ ابن جریر کی حدیث میں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: میں تم میں سے اس شخص کو پہچانتا ہوں جو چلاتی ہوئی بکری کو اٹھائے ہوئے قیامت کے دن آئے گا اور میرا نام لے لے کر مجھے پکارے گا' میں کہہ دوں گا کہ میں خدا کے مقابلے میں کام نہیں آ سکتا۔ میں تو پہنچا چکا تھا۔ اسے بھی پہچانتا ہوں جو اونٹ کو اٹھائے ہوئی آئے گا۔ جو بول رہا ہوگا۔ یہ کہے گا کہ اے محمد ﷺ میں کہوں گا: میں تیرے لئے خدا کے پاس کسی چیز کا مالک نہیں ہوں۔ میں تو تبلیغ کر چکا تھا۱ اور میں اس کو بھی پہچانوں گا جو اسی طرح گھوڑے لادے ہوئے آئے گا جو ہنہنا رہا ہوگا۔ وہ مجھے پکارے گا اور میں کہہ دوں گا کہ میں تو پہنچا چکا تھا۔ آج کچھ کام نہیں

۱ یعنی تمام احکام کی صحیح صحیح تبلیغ کر چکا تھا اور خیانت پر اللہ تعالیٰ کے شدید عذاب کی بھی اطلاع دے چکا تھا پھر تو نے ایسا کیوں کیا؟ اب جو کچھ کیا اس کو خود ہی بھگت۔

آ سکتا اور اس شخص کو بھی میں پہچانتا ہوں' جو کھالیں لئے ہوئے حاضر ہوگا اور کہہ رہا ہوگا: یا محمد ﷺ! میں کہوں گا میں خدا کے پاس کسی نفع کا اختیار نہیں رکھتا' میں تو تجھے بتا چکا تھا۔ یہ حدیث صحاح ستہ میں نہیں۔

حاکم کے لئے تحفہ لینا جائز نہیں ☆

مسند احمد میں کہ حضور ﷺ نے قبیلہ ازد کے ایک شخص کو حاکم بنا کر بھیجا' جسے ابن اللتبیہ کہتے تھے۔ یہ جب زکوٰۃ وصول کر کے آئے تو کہنے لگے یہ تو تمہارا ہے اور یہ مجھے[1] تحفہ ملا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم منبر پر کھڑے ہوگئے اور فرمانے لگے' ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ ہم انہیں کسی کام پر بھیجتے ہیں تو یہ کہتے ہیں یہ تمہارا اور ہمارے تحفے کا۔ یہ اپنے گھروں میں ہی بیٹھے رہتے پھر دیکھتے کہ انہیں تحفہ دیا جاتا ہے یا نہیں؟ اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں محمد کی جان ہے' تم میں سے جو کوئی بھی چیز لے لے گا' وہ قیامت کے دن اسے گردن پر اٹھائے لائے گا اونٹ ہے تو چلا رہا ہوگا۔ گائے ہے تو بول رہی ہوگی۔ بکری ہے تو چیخ رہی ہوگی۔ پھر آپ ﷺ نے اپنے ہاتھ اس قدر بلند کئے کہ بغلوں کی سفیدی نظر آنے لگی اور تین مرتبہ فرمایا: خدایا کیا میں نے پہنچا دیا۔ مسند کی ایک ضعیف حدیث میں ہے' ایسے تحصیلداروں اور حاکموں کو جو تحفے ملیں وہ خیانت ہیں۔ یہ روایت صرف مسند احمد میں ہے اور ضعیف ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا طویل روایت کا خلاصہ ہے۔ ترمذی میں ہے: حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں: مجھے رسول ﷺ نے یمن بھیجا۔ جب میں چل دیا تو آپ ﷺ نے مجھے بلوایا' جب میں واپس آیا تو فرمایا میں نے تمہیں صرف ایک بات کہنے کے لئے بلوایا ہے کہ میری اجازت کے بغیر جو کچھ تم لوگے وہ خیانت ہے اور ہر خائن اپنی خیانت کو لئے ہوئے قیامت کے دن آئے گا۔ بس یہی کہنا تھا۔ جاؤ اپنے کام میں لگو۔ مسند احمد میں ہے کہ حضور ﷺ نے ایک روز کھڑے ہو کر خیانت کا ذکر کیا اور اس کے بڑے بڑے گناہ اور وبال بیان کئے۔ ہمیں ڈرایا۔ پھر جانوروں کو لئے ہوئے قیامت کے دن آنے' حضور ﷺ سے فریاد رسی کرنے اور آپ کے انکار کر دینے کا ذکر کیا' جو پہلے بیان ہو چکا ہے۔ اس میں سونے چاندی کا بھی ذکر ہے یہ حدیث بخاری مسلم میں بھی ہے۔

مسند احمد میں ہے کہ رسول مقبول ﷺ نے فرمایا: اے لوگو! جسے ہم عامل بنائیں اور پھر وہ ہم سے ایک سوئی یا اس سے بھی حقیر چیز چھپائے تو وہ خیانت ہے۔ جسے لے کر وہ قیامت کے دن حاضر ہوگا۔ یہ سن کر ایک سانولے رنگ کے انصاری حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کھڑے ہو کر کہنے لگے: حضورؐ میں تو عامل بننے سے دست بردار ہوتا ہوں۔ فرمایا کیوں؟ کہا: آپ نے جو اس طرح فرمایا۔ آپ نے فرمایا: ہاں! اب بھی سنو! جسے ہم کوئی کام سونپیں۔ اسے چاہئے کہ تھوڑا بہت سب کچھ لائے جو اسے دیا جائے وہ لے لے اور جس سے روک دیا جائے رک جائے۔ یہ حدیث مسلم اور ابوداؤد میں بھی ہے۔

حضرت ابورافع فرماتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم عموماً نماز عصر کے بعد بنوعبدالاشہل کے ہاں تشریف لے جاتے اور تقریباً مغرب تک وہیں مجلس رہتی۔ ایک دن مغرب کے وقت وہاں سے واپس چلے۔ وقت تنگ تھا' تیز تیز چل رہے تھے۔ بقیع میں آ کر فرمانے لگے: تف ہے تجھے تف ہے تجھے۔ میں سمجھا آپ مجھے فرما رہے ہیں۔ میں اپنے کپڑے ٹھیک ٹھاک کرنے لگا اور پیچھے رہ گیا۔ آپ نے فرمایا: کیا بات ہے؟ میں نے کہا حضور آپ کے اس فرمان کی وجہ سے رک گیا۔ آپ نے فرمایا میں نے

[1] نبی کریم ﷺ اتنے سخت غصہ میں آ گئے کہ چہرہ مبارک سرخ ہو گیا اور فرمایا یہ تو کیا ہفوات بکتا ہے؟ جا اپنی ماں کی گود میں بیٹھا رہے پھر جو تحفے تجھے ملیں گے وہ رکھ لیں۔ یعنی پھر تو کوئی تجھے گھاس بھی نہ ڈالے گا۔ (حافظ)

تجھے نہیں کہا بلکہ یہ قبر فلاں شخص کی ہے۔ اسے میں نے فلاں قبیلے کی طرف عامل بنا کر بھیجا تھا۔ اس نے ایک چادر لے لی۔ وہ چادر اب آگ بن کر اس کے اوپر بھڑک رہی ہے (مسند احمد) حضرت عبادہ بن صامتؓ فرماتے ہیں: رسول اللہ ﷺ مال غنیمت کے اونٹ کی پیٹھ کے چند بال لیئے۔ پھر فرماتے میرا بھی اس میں وہی حق ہے جو تم میں سے کسی ایک کا۔ خیانت سے بچو۔ خیانت کرنے والے کی رسوائی قیامت کے دن ہوگی۔ سوئی دھاگے تک پہنچا دو اور اس سے حقیر چیز بھی خدا کی راہ میں نزدیک والوں اور دور والوں سے جہاد کرو۔ وطن میں بھی اور سفر میں بھی۔ جہاد جنت کے دروازوں میں سے ایک دروازہ ہے۔ جہاں کی وجہ سے اللہ تعالیٰ مشکلات سے اور رنج و غم سے نجات دیتا ہے۔ خدا کی حدیں نزدیک و دور والوں میں جاری کرو۔ خدا کے بارے میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت تمہیں نہ روکے۔ (مسند احمد)

اس حدیث کا بعض حصہ ابن ماجہ میں بھی ہے۔ حضرت ابو مسعود انصاریؓ فرماتے ہیں کہ مجھے جب رسول ﷺ نے عامل بنا کر بھیجنا چاہا' تو فرمایا: اے ابو مسعود! جاؤ ایسا نہ ہو کہ میں تمہیں قیامت کے دن اس حال میں پاؤں کہ تمہاری پیٹھ پر اونٹ ہو جو آواز نکال رہا ہو۔ جسے تم نے خیانت سے لے لیا ہو۔ میں نے کہا حضور پھر میں تو نہیں جاتا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اچھا میں تمہیں زبردستی بھیجتا بھی نہیں (ابو داؤد) ابن مردویہ میں ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: اگر کوئی پتھر جہنم میں ڈالا جائے تو ستر سال تک چلا جائے تو تہہ تک نہیں پہنچتا۔ خیانت کی چیز کو اسی طرح جہنم میں پھینک دیا جائے گا پھر خیانت والے سے کہا جائے گا جا اسے لے آ۔ یہی معنی ہیں خدا کے اس فرمان کے ﴿وَمَنْ يَّغْلُلْ يَاْتِ بِمَا غَلَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ﴾ مسند احمد میں ہے کہ خیبر کی جنگ والے دن صحابہ کرام آنے لگے اور کہنے لگے فلاں شہید ہے فلاں شہید ہے۔ جب ایک شخص کی نسبت یہ کہا تو رسول ﷺ نے فرمایا: ہرگز نہیں' میں نے اسے جہنم میں دیکھا ہے۔ کیونکہ اس نے غنیمت کے مال کی ایک چادر خیانت کر لی تھی۔ پھر آپ نے فرمایا: اے عمرؓ بن خطاب تم جاؤ اور لوگوں میں منادی کر دو کہ جنت میں صرف ایماندار ہی جائیں گے چنانچہ میں چلا اور سب میں یہ ندا کر دی۔ یہ حدیث مسلم اور ترمذی میں بھی ہے۔ امام ترمذی اسے حسن صحیح کہتے ہیں۔ ابن جریر میں ہے کہ ایک دن حضرت عمرؓ نے حضرت عبداللہ بن انیس سے صدقات کے بارے میں تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا: کیا تم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان نہیں سنا؟ کہ آپ ﷺ نے صدقات میں خیانت کرنے والے کی نسبت فرمایا: اس میں جو شخص اونٹ یا بکری لے لے' وہ اسے قیامت والے دن اٹھائے ہوئے آئے گا۔ حضرت عبداللہ نے فرمایا: ہاں۔ یہ روایت ابن ماجہ میں بھی ہے۔ ابن جریر میں حضرت سعد بن عبادہؓ سے روایت ہے کہ انہیں صدقات وصول کرنے کے لئے حضور ﷺ نے بھیجنا چاہا اور فرمایا: اے سعد ایسا نہ ہو کہ قیامت کے دن تو بلبلاتے اونٹ کو اٹھا کر لائے تو حضرت سعد کہنے لگے کہ نہ میں اس عہدہ کو لوں اور نہ ایسا ہونے کا احتمال رہے۔ چنانچہ حضور ﷺ نے بھی اس کام سے انہیں معاف رکھا۔ مسند احمد میں ہے کہ حضرت مسلم بن عبدالملک کے ساتھ روم کی جنگ میں حضرت سالم بن عبداللہ بھی تھے۔ ایک شخص کے اسباب سے کچھ خیالات کا مال بھی نکلا۔ سردار لشکر نے حضرت سالمؒ سے اس کے بارے میں فتویٰ پوچھا تو آپ نے فرمایا: مجھ سے میرے باپ عبداللہ نے اور ان سے ان کے باپ عمرؓ بن خطاب نے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس کے اسباب میں تم چوری کا مال پاؤ اسے جلا دو۔ راوی کہتا ہے کہ میرا خیال ہے یہ بھی فرمایا اور اسے سزا دو۔ چنانچہ جب اس کا مال بازار میں نکالا تو اس میں ایک قرآن شریف

بھی تھا۔ حضرت سالم سے پھر اس کی بابت پوچھا گیا۔ آپ نے فرمایا: اسے بیچ دو اور اس کی قیمت صدقہ کر دو۔ یہ حدیث ابوداؤد اور ترمذی میں ہے۔ امام علی بن مدینیؒ اور امام بخاریؒ وغیرہ فرماتے ہیں: یہ حدیث منکر ہے۔ امام دارقطنیؒ فرماتے ہیں: صحیح یہ ہے کہ حضرت سالم کا اپنا فتویٰ ہے۔ حضرت امام احمدؒ اور ان کے ساتھیوں کا بھی یہی قول ہے۔ حضرت حسنؒ بھی یہی کہتے ہیں۔ حضرت علیؓ فرماتے ہیں: اس کا اسباب جلا دیا جائے اور اسے مملوک کی حد سے کم مارا جائے اور اس کا حصہ نہ دیا جائے۔ ابو حنیفہؒ، مالکؒ، شافعیؒ اور جمہور کا مذہب اس کے خلاف ہے۔ یہ کہتے ہیں کہ اس کا اسباب نہ جلایا جائے۔ بلکہ اس کے مثل اسے تعزیر یعنی سزا دی جائے۔ امام بخاریؒ فرماتے ہیں: رسول ﷺ نے خائن کے جنازے کی نماز سے انکار کر دیا اور اس کا اسباب نہیں جلایا۔ واللہ اعلم۔

مسند احمد میں ہے کہ قرآن شریفوں کے جب تغیر کا حکم کیا گیا تو حضرت ابن مسعودؓ فرمانے لگے: تم میں سے جس سے ہو سکے وہ اسے چھپا کر رکھ لے۔ کیونکہ جو شخص جس چیز کو چھپا کر رکھ لے گا' اسی کو لے کر قیامت کے روز آئے گا۔ پھر فرمانے لگے: میں نے ستر دفعہ رسول خدا ﷺ سے پڑھا ہے۔ پس کیا میں رسول خدا ﷺ کی پڑھائی ہوئی آیت کو چھوڑ دوں؟ امام وکیع نے بھی اپنی تفسیر میں اسے ذکر کیا ہے۔ ابوداؤد میں ہے کہ آنحضور کی عادت مبارکہ تھی کہ جب مال غنیمت آتا تو آپ حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حکم دیتے اور وہ لوگوں میں منادی کرتے کہ جس جس کے پاس جو جو ہو لے آئے۔ پھر آپ ﷺ اس میں پانچواں حصہ نکال لیتے اور باقی کو تقسیم کر دیتے۔ ایک مرتبہ ایک شخص اس کے بعد بالوں کا ایک گچھا لے کر آیا اور کہنے لگا: یا رسول اللہ ﷺ میرے پاس یہ رہ گیا تھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: کیا تو نے حضرت بلالؓ کی منادی سنی تھی؟ جو تین مرتبہ ہوئی تھی۔ اس نے کہا ہاں۔ فرمایا پھر تو اس وقت کیوں نہ لایا؟ اس نے عذر بیان کیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اب میں ہرگز نہ لوں گا۔ تو ہی اسے لے کر قیامت کے دن آنا۔ خدائے عالم پھر فرماتا ہے کہ خدا کی شرع پر چل کر اللہ تعالیٰ کی رضامندی کے مستحق ہونے والے اس کے ثوابوں کو حاصل کرنے والے اس کے عذابوں سے بچنے والے اور وہ لوگ جو خدا کے غضب کے مستحق ہوئے اور مر کر جہنم میں ٹھکانا پائیں گے' کی یہ دونوں برابر ہو سکتے ہیں؟ قرآن کریم میں اور جگہ ہے کہ خدا کی باتوں کو حق ماننے والا اور اس سے اندھار ہنے والا برابر نہیں۔ اسی طرح فرمان ہے کہ جن سے خدا کا اچھا وعدہ ہو چکا ہے اور جو اسے پانے والا ہے' وہ اور دنیا کا نفع حاصل کرنے والا برابر نہیں۔ پھر فرماتا ہے کہ بھلائی اور برائی والے مختلف درجوں پر ہیں' وہ جنت کے درجوں میں ہیں اور یہ جہنم کے طبقوں میں۔ جیسے اور جگہ ہے ﴿وَلِكُلٍّ دَرَجَاتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا﴾ (الانعام:۱۳۲) ہر ایک کے لئے ان کے اعمال کے مطابق درجات ہیں۔

پھر فرمایا: اللہ ان کے اعمال دیکھ رہا ہے اور عنقریب ان سب کو پورا بدلہ دے گا۔ نہ نیکی ضائع کی جائے گی اور نہ بدی بڑھائی جائے گی۔ بلکہ عمل کے مطابق ہی جزا سزا ہو گی۔ پھر فرماتا ہے کہ مومنوں پر اللہ کا بڑا احسان ہے کہ انہی کی جنس سے ان میں اپنا پیغمبر بھیجا تاکہ یہ اس سے بات چیت کر سکیں' کچھ پوچھ سکیں۔ ساتھ بیٹھ اٹھ سکیں اور پوری طرح نفع حاصل کر سکیں۔ جیسے اور جگہ ہے: ﴿وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا﴾ (الروم:۲۱) یہاں بھی یہی مطلب ہے کہ تمہاری جنس سے تمہارے جوڑے اس نے پیدا کئے اور جگہ ہے: ﴿قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ﴾ (الکہف:۱۱۰) کہہ دے کہ میں تو تم جیسا ہی انسان ہوں۔ میری طرف وحی کی جاتی ہے کہ تم سب کا معبود ایک ہی ہے اور فرمان ہے: ﴿وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنَ

الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّآ اِنَّهُمْ لَيَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ وَيَمْشُوْنَ فِي الْاَسْوَاقِ ﴾ (الفرقان: ۲۰) یعنی تم سے پہلے بھی جتنے رسول ہم نے بھیجے' وہ سب کھانا کھاتے تھے اور بازاروں میں چلتے پھرتے تھے اور جگہ ہے: ﴿ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ مِّنْ اَهْلِ الْقُرٰى ﴾ (یوسف: ۱۰۹) یعنی تم سے پہلے بھی ہم نے مردوں ہی کو وحی کی تھی' جو بستیوں کے رہنے والے تھے اور ارشاد ہے: ﴿ يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اَلَمْ يَاْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ ﴾ (الانعام: ۱۳۰) یعنی جنوں اور انسانوں! کیا تمہارے پاس تم میں سے ہی رسول نہیں آئے تھے؟ الغرض یہ پورا احسان ہے۔ کہ مخلوق کی طرف انہی میں سے رسول بھیجے گئے۔ تاکہ وہ پاس بیٹھ اُٹھ کر بار بار سوال کر کے پوری طرح دین سیکھ لیں۔ پس خدا فرماتا ہے کہ وہ اللہ کی آیتیں یعنی قرآن کریم انہیں پڑھاتا ہے اور اچھی باتوں کا حکم دے کر اور برائیوں سے روک کر انکے دلوں کی پاکیزگی کرتا ہے اور شرک و جاہلیت کی ناپاکی کے اثرات ان سے زائل کرتا ہے اور انہیں کتاب اور سنت سکھاتا ہے۔ اس رسول کے آنے سے پہلے تو یہ صاف بھٹکے ہوئے تھے۔ ظاہر برائی اور پوری جہالت میں تھے۔

اَوَلَمَّآ اَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةٌ قَدْ اَصَبْتُمْ مِّثْلَيْهَا ۙ قُلْتُمْ اَنّٰى هٰذَا ۭ قُلْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اَنْفُسِكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۶۵﴾ وَمَآ اَصَابَكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ فَبِاِذْنِ اللّٰهِ وَلِيَعْلَمَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۶۶﴾ وَلِيَعْلَمَ الَّذِيْنَ نَافَقُوْا ښ وَقِيْلَ لَھُمْ تَعَالَوْا قَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَوِ ادْفَعُوْا ۭ قَالُوْا لَوْ نَعْلَمُ قِتَالًا لَّاتَّبَعْنٰكُمْ ۭ ھُمْ لِلْكُفْرِ يَوْمَىِٕذٍ اَقْرَبُ مِنْھُمْ لِلْاِيْمَانِ ۚ يَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِھِمْ مَّا لَيْسَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ ۭ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا يَكْتُمُوْنَ ﴿۱۶۷﴾ اَلَّذِيْنَ قَالُوْا لِاِخْوَانِهِمْ وَقَعَدُوْا لَوْ اَطَاعُوْنَا مَا قُتِلُوْا ۭ قُلْ فَادْرَءُوْا عَنْ اَنْفُسِكُمُ الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۶۸﴾

اور جب تمہاری ایسی ہار ہوئی جس سے دو حصے تم جیت چکے تھے۔ تو کیا ایسے وقت میں تم یوں کہتے ہو کہ یہ کدھر سے ہوئی آپ فرما دیجئے کہ یہ ہار خاص تمہاری طرف سے ہوئی۔ بیشک اللہ تعالیٰ کو ہر چیز پر پوری قدرت ہے اور جو مصیبت تم پر پڑی جس روز کہ وہ دونوں گروہ باہم مقابل ہوئے سو اللہ تعالیٰ کی مشیت سے ہوئی اور تاکہ اللہ تعالیٰ مؤمنین کو بھی دیکھ لیں اور ان لوگوں کو بھی دیکھ لیں جنہوں نے نفاق کا برتاؤ کیا اور ان سے یوں کہا کہ آؤ اللہ کی راہ میں لڑنا یا دشمنوں کا دفعیہ بن جانا۔ وہ بولے اگر ہم کوئی ڈھنگ کی لڑائی دیکھتے تو ضرور تمہارے ساتھ ہو لیتے۔ یہ

منافقین اس روز کفر سے نزدیک تر ہو گئے بہ نسبت اس حالت سے کہ وہ ایمان کے نزدیک تھے۔ یہ لوگ اپنے منہ سے ایسی باتیں کرتے ہیں۔ جو ان کے دل میں نہیں اور اللہ تعالیٰ خوب جانتے ہیں جو کچھ یہ اپنے دل میں رکھتے ہیں۔ یہ ایسے لوگ ہیں کہ اپنے بھائیوں کی نسبت بیٹھے ہوئے باتیں بناتے ہیں کہ اگر ہمارا کہنا مانتے تو قتل نہ کئے جاتے۔ آپ فرما دیجئے کہ اچھا تو اپنے اوپر سے موت کو ہٹاؤ اگر تم سچے ہو۔ ○

اِس دُنیا میں مصائب اور راحتوں کا جوڑ دامن اور چولی کا ہے☆

یہاں جس مصیبت کا بیان ہو رہا ہے یہ اُحد کی مصیبت ہے۔ جس میں ستر صحابہ شہید ہوئے تھے اور اس سے دوگنا نقصان مسلمانوں نے کافروں کو پہنچایا تھا۔ یعنی بدر والے دن ستر کافر قتل اور ستر کافر قید کئے گئے تھے تو مسلمان کہنے لگے کہ یہ مصیبت کیسے آ گئی؟ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: یہ تمہاری اپنی طرف سے ہے۔ حضرت عمر بن خطاب کا بیان ہے کہ بدر کے دن مسلمانوں نے فدیہ لے کر جن کفار کو چھوڑ دیا تھا۔ اس کی سزا میں اگلے سال ان میں سے ستر مسلمان شہید کئے گئے اور صحابہ کے پاؤں اُکھڑ گئے۔ حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کے چار دانت ٹوٹ گئے۔ آپ ﷺ کے سر مبارک پر خود تھا' وہ بھی ٹوٹا اور چہرہ مبارک لہولہان ہو گیا۔ اس کا بیان اس آیہ مبارکہ میں ہو رہا ہے (ابن ابی حاتم و مسند امام احمد بن حنبل)۔

حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ جبریلؑ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور فرمایا: اے محمد ﷺ! آپ کی قوم کا کفار کو قیدی بنا کر پکڑ لینا اللہ کو پسند نہ آیا۔ اب انہیں دو باتوں میں سے ایک کے اختیار کر لینے کا حکم دیجئے۔ یا تو یہ کہ ان قیدیوں کو مار ڈالیں یا یہ کہ ان کو فدیہ وصول کر کے چھوڑ دیں۔ مگر پھر ان مسلمانوں میں سے اتنی ہی تعداد شہید ہو گی۔ حضور علیہ السلام نے لوگوں کو جمع کر کے دونوں باتیں پیش کیں تو انہوں نے کہا کہ یا رسول اللہ ﷺ یہ لوگ ہمارے قبائل کے ہیں۔ ہمارے رشتہ دار بھی ہیں۔ ہم کیوں نہ ان سے فدیہ لے کر چھوڑ دیں اور اس مال سے ہم طاقت قوت حاصل کر کے اپنے دوسرے دشمنوں سے جنگ کریں گے اور پھر جو ہم میں سے اتنے ہی آدمی شہید ہوں گے تو اس میں ہماری کیا بُرائی ہے۔ چنانچہ جرمانہ وصول کر کے ستر قیدیوں کو چھوڑ دیا اور ٹھیک ستر ہی کی تعداد مسلمانوں کی اس کے بعد کے غزوہ اُحد میں شہید ہوئی۔ (ترمذی' نسائی)

پس ایک مطلب تو یہ ہوا کہ یہ خود تمہاری طرف سے ہے۔ یعنی تم نے بدر کے قیدیوں کو زندہ چھوڑنا اور ان سے جرمانہ جنگ وصول کرنا اس شرط پر منظور کیا تھا کہ تمہارے بھی اتنے ہی آدمی شہید ہوں تو وہ شہید ہوئے۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ تم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی کی تھی۔ اس باعث تمہیں یہ نقصان پہنچا۔ تیر اندازوں کو رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا تھا کہ وہ اپنی جگہ سے نہ ہٹیں' لیکن وہ ہٹ گئے۔ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے جو چاہے کرے۔ جو ارادہ ہو' حکم دے۔ کوئی نہیں جو اس کے حکم کو ٹال سکے۔ دونوں جماعتوں کی مڈبھیڑ کے دن جو نقصان تمہیں پہنچا' کہ دشمنوں کے مقابلہ میں بھاگ کھڑے ہوئے۔ تم میں سے بعض لوگ شہید بھی ہوئے اور زخمی بھی ہوئے۔ یہ سب اللہ تعالیٰ کی قضا و قدر سے تھا۔ اس کی حکمت اسی کی مقتضی تھی۔ اس کا ایک سبب یہ تھا کہ ثابت قدم غیر متزلزل ایمان والے' صابر بندے بھی معلوم ہو جائیں اور منافقین کا حال بھی کھل جائے۔ جیسے عبداللہ بن ابی بن سلول اور اس کے ساتھی کہ راستے میں سے لوٹ آئے۔ ایک مسلمان نے انہیں سمجھایا بھی' کہ آؤ راہ خدا میں جہاد کرو یا کم از کم ان چڑھ آنے والوں کو تو ہٹاؤ۔ لیکن انہوں نے ٹال دیا کہ ہم تو فنونِ جنگ سے بے خبر ہیں۔ اگر جانتے ہوتے تو ضرور تمہاری بات مانتے۔ یہ بھی مدافعت میں تھا کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ تو رہتے۔ جس سے مسلمانوں کی گنتی زیادہ معلوم

ہوتی۔ یا دعائیں کرتے رہتے یا تیاریاں ہی کرتے۔ ان کے جواب کا ایک مطلب یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ اگر ہمیں یہ معلوم ہوتا کہ تم سچ مچ دشمنوں سے لڑو گے تو ہم بھی تمہارا ساتھ دیتے۔ لیکن ہم جانتے ہیں کہ لڑائی ہونے کی ہی نہیں۔ سیرۃ محمد بن اسحاق میں ہے کہ ایک ہزار آدمی لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میدان اُحد کی جانب بڑھے۔ آدھے راستے میں عبداللہ بن ابی بن سلول بگڑ بیٹھا اور کہنے لگا اوروں کی مان لی اور مدینہ سے نکل کھڑے ہوئے اور میری نہ مانی۔ اللہ کی قسم ہمیں نہیں معلوم کہ ہم کس فائدے کو مدنظر رکھ کر اپنی جانیں دیں؟ لوگو! کیوں جانیں کھو رہے ہو۔ جس قدر نفاق اور شک وشبہ والے لوگ تھے۔ اس کی آواز پر لگ گئے اور تہائی لشکر لے کر یہ واپس لوٹ گیا۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن حزام بنوسلمہ ہر چند انہیں سمجھاتے رہے کہ میری قوم اپنے نبی کو اپنی قوم کو رسوا نہ کرو۔ انہیں دشمنوں کے سامنے چھوڑ کر پیٹھ نہ پھیرو۔ لیکن انہوں نے بہانہ بنا دیا کہ ہمیں معلوم ہے کہ لڑائی ہونے کی ہی نہیں۔ جب یہ بیچارے عاجز آ گئے تو فرمانے لگے: جاؤ تمہیں اللہ غارت کرے اللہ کے دشمنو! تمہاری کوئی حاجت نہیں۔ اللہ اپنے نبی کا مددگار ہے۔ چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی انہیں چھوڑ کر آگے بڑھ گئے۔

جناب باری ارشاد فرماتا ہے کہ وہ اس دن بہ نسبت ایمان کے کفر سے بہت ہی نزدیک تھے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کے احوال مختلف ہیں۔ کبھی وہ کفر سے قریب ہو جاتا ہے اور ایمان کے نزدیک ہو جاتا ہے۔ پھر فرمایا: یہ اپنے منہ سے وہ باتیں بناتے ہیں' جو ان کے دل میں نہیں۔ جیسے ان کا یہ قول کہ اگر ہم جنگ جانتے تو ضرور تمہارا ساتھ دیتے۔ حالانکہ انہیں یقیناً معلوم ہے کہ مشرکین دور دراز سے چڑھائی کر کے مسلمانوں کو نیست ونابود کر دینے کی ٹھان کر آ گئے ہیں۔ وہ بڑے جلے کٹے ہوئے ہیں۔ کیونکہ ان کے سردار بدر والے دن میدان میں رہ گئے تھے اور ان کے اشراف کو قتل کر دیا گیا تھا۔ تو وہ اب غریب مسلمانوں پر ٹوٹے پڑے ہیں اور یقیناً جنگ عظیم برپا ہونے والی ہے۔ پس جناب باری فرماتے ہیں: ان کے دلوں کی چھپی ہوئی باتوں کا مجھے بخوبی علم ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں' جو اپنے بھائیوں کے بارے میں کہتے ہیں۔ اگر یہ ہمارا مشورہ مانتے' یہیں بیٹھے رہتے اور جنگ میں شرکت نہ کرتے تو ہرگز نہ مارے جاتے۔ اس کے جواب میں جناب باری جل وعلا کا ارشاد ہوتا ہے کہ اگر یہ ٹھیک ہے اور تم اپنی اس بات میں سچے ہو کہ بیٹھ رہنے اور میدان جنگ میں نہ نکلنے سے انسان قتل وموت سے بچ جاتا ہے تو چاہئے کہ تم مرو ہی نہیں۔ اس لئے کہ تم تو گھروں میں بیٹھتے ہو۔ لیکن ظاہر ہے کہ ایک روز تم بھی چل پڑو گے۔ گو تم مضبوط برجوں میں پناہ گزیں ہو جاؤ۔ پس ہم تو تمہیں تب سچا مانیں کہ تم موت کو اپنی جانوں سے ٹال دو۔ حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں: یہ آیت عبداللہ بن ابی بن سلول اور اس کے ساتھیوں کے بارے میں اتری ہے۔

وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ قُتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتًا ۚ بَلْ أَحْيَاءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُونَ ﴿١٦٩﴾ فَرِحِينَ بِمَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ وَيَسْتَبْشِرُونَ بِالَّذِينَ لَمْ يَلْحَقُوا بِهِمْ مِنْ خَلْفِهِمْ أَلَّا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿١٧٠﴾ يَسْتَبْشِرُونَ بِنِعْمَةٍ مِنَ اللَّهِ وَفَضْلٍ وَأَنَّ اللَّهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُؤْمِنِينَ ﴿١٧١﴾

اَلَّذِیْنَ اسْتَجَابُوْا لِلّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ مِنْۢ بَعْدِ مَاۤ اَصَابَهُمُ الْقَرْحُ ۛؕ لِلَّذِیْنَ اَحْسَنُوْا مِنْهُمْ وَ اتَّقَوْا اَجْرٌ عَظِیْمٌ ﴿۱۷۲﴾ اَلَّذِیْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ اِیْمَانًا ۖۗ وَّ قَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَ نِعْمَ الْوَكِیْلُ ﴿۱۷۳﴾ فَانْقَلَبُوْا بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ فَضْلٍ لَّمْ یَمْسَسْهُمْ سُوْٓءٌ ۙ وَّ اتَّبَعُوْا رِضْوَانَ اللّٰهِ ؕ وَ اللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَظِیْمٍ ﴿۱۷۴﴾ اِنَّمَا ذٰلِكُمُ الشَّیْطٰنُ یُخَوِّفُ اَوْلِیَآءَهٗ ۪ فَلَا تَخَافُوْهُمْ وَ خَافُوْنِ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ﴿۱۷۵﴾

اور (اے مخاطب) جولوگ اللہ کی راہ میں قتل کئے گئے ان کو مردہ مت خیال کرو بلکہ وہ لوگ زندہ ہیں اپنے پروردگار کے مقرب ہیں ان کو رزق بھی ملتا ہے۔ وہ خوش ہیں اس چیز سے جوان کو اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے عطا فرمائی ہے اور جولوگ ان کے پاس نہیں پہنچے ان سے پیچھے رہ گئے ہیں ان کی بھی اس حالت پر خوش ہوتے ہیں کہ ان پر بھی کسی طرح کا خوف واقع ہونے والا نہیں اور نہ وہ مغموم ہوں گے وہ خوش ہوتے ہیں بوجہ نعمت وفضل خداوندی کے اور بوجہ اس کے کہ اللہ تعالیٰ کا اجر ضائع نہیں کرتے۔ جن لوگوں نے اللہ اور رسول کے کہنے کو قبول کرلیا بعد اس کے کہ ان کو زخم لگا تھا ان لوگوں میں جو نیک اور متقی ہیں ان کے لئے ثواب عظیم ہیں یہ ایسے لوگ ہیں کہ لوگوں نے ان سے کہا کہ ان لوگوں نے تمہارے لئے سامان جمع کیا ہے سوتم کو ان سے اندیشہ کرنا چاہئے تو اس نے ان ایمان کو اور زیادہ کردیا اور کہہ دیا کہ ہم کو حق تعالیٰ کافی ہے اور وہی سب کام سپرد کرنے کے لئے اچھا ہے۔ پس یہ لوگ خدا کی نعمت اور فضل سے بھرے ہوئے واپس آئے کہ ان کو کوئی ناگواری ذرا پیش نہ آئی اور وہ لوگ رضائے حق کے تابع رہے اور اللہ بڑا فضل والا ہے۔ اس سے زیادہ کوئی بات نہیں کہ یہ شیطان ہے کہ وہ اپنے دوستوں سے ڈراتا ہے سو تم ان سے مت ڈرنا اور مجھ ہی سے ڈرنا اگر تم ایمان والے ہو۔ ○

حیاتِ ابدی ☆

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے گو شہید فی سبیل اللہ دنیا میں مار ڈالے جاتے ہیں لیکن آخرت میں ان کی روحیں زندہ رہتی ہیں اور روزیاں پاتے ہیں۔ اس آیت کا شان نزول یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چالیس یا ستر صحابیوں کو بیر معونہ کی طرف بھیجا تھا۔ یہ جماعت جب اس غار تک پہنچی' جو اس کنوئیں کے اوپر تھا انہوں نے وہاں پڑاؤ کیا اور آپس میں کہنے لگے کہ کون ہے جو اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر اللہ کے رسول کا کلمہ ان تک پہنچائے۔ ایک صحابی اس کے لئے تیار ہوئے اور ان لوگوں کے گھروں کے پاس آ کر آواز بلند فرمایا: اے بیر معونہ والو سنو! میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا قاصد ہوں' میری گواہی ہے کہ معبود صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے اور محمد ﷺ اس کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔ یہ سنتے ہی ایک کافی اپنا تیر سنبھالے ہوئے

اپنے گھر سے نکلا اور اس طرح تاک کر لگایا کہ ادھر کی پسلی سے ادھر کی پسلی پار نکل گیا۔ اس صحابی کی زبان سے بے ساختہ نکلا: فُزْتُ وَ رَبِّ الْكَعْبَةِ۔ کعبہ کے اللہ کی قسم میں مراد کو پہنچ گیا۔ اب کفار نشانات ٹٹولتے ہوئے اس غار تک جا پہنچے اور عامر بن طفیل نے جوان کا سردار تھا۔ ان سب مسلمانوں کو شہید کر دیا۔ حضرت انسؓ فرماتے ہیں: ان کے بارے میں قرآن اترا کہ ہماری جانب سے ہمارے قوم کو یہ خبر پہنچا دو کہ ہم اپنے رب سے ملے وہ ہم سے راضی ہو گیا اور ہم اس سے راضی ہو گئے۔ ہم ان آیتوں کو برابر پڑھتے رہے۔ پھر ایک مدت کے بعد یہ منسوخ ہو کر اٹھائی گئی اور آیت: وَلَا تَحْسَبَنَّ اتری۔

(محمد بن جریر)

صحیح مسلم شریف میں ہے۔ حضرت مسروق فرماتے ہیں: ہم نے عبداللہ سے اس آیت کا مطلب پوچھا تو حضرت عبداللہ نے فرمایا کہ ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس آیت کا مطلب دریافت کیا تھا تو آپ ﷺ نے فرمایا ان کی روحیں سبز رنگ پرندوں کے قالب میں ہیں۔ عرش کی قندیلیں ان کے لئے ہیں۔ ساری جنت میں جہاں کہیں چاہیں' کھائیں پئیں اور ان قندیلوں میں آرام کریں۔ ان کے رب نے ان کی طرف ایک مرتبہ نظر کی اور دریافت فرمایا: کچھ چاہتے ہو؟ کہنے لگے: خدایا اور کیا مانگیں' ساری جنت میں سے جہاں کہیں سے چاہیں' کھائیں پئیں اختیار ہے پھر کیا طلب کریں؟ اللہ تعالیٰ نے ان سے پھر یہی پوچھا۔ تیسری مرتبہ یہی سوال کیا۔ جب انہوں نے دیکھا کہ بغیر مانگے چارہ ہی نہیں تو کہنے لگے۔ اے رب! ہم چاہتے ہیں کہ تو ہماری روحوں کو جسموں کی طرف لوٹا دے۔ ہم پھر دنیا میں جا کر تیری راہ میں جہاد کریں گے اور مارے جائیں۔ اب معلوم ہوا کہ انہیں کسی اور چیز کی حاجت نہیں تو ان سے پوچھنا چھوڑ دیا کہ کیا چاہتے ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: جو لوگ مر جائیں اور اللہ کے یہاں بہتری پائیں' وہ ہرگز دنیا میں آنا پسند نہیں کرتے۔ مگر شہید کہ وہ تمنا کرتا ہے کہ وہ دنیا میں دوبارہ لوٹایا جائے اور دوبارہ راہ اللہ میں شہید ہو۔ کیونکہ شہادت کے درجات کو وہ دیکھ رہا ہے۔ (مسند احمد) صحیح مسلم شریف میں بھی یہ حدیث ہے۔ مسند احمد میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت جابر بن عبداللہؓ سے فرمایا: اے جابر! تمہیں معلوم بھی ہے کہ اللہ نے تمہارے والد کو زندہ کیا اور ان سے کہا اے میرے بندے! مانگ کیا مانگتا ہے؟ تو کہا: خدایا! دنیا میں پھر بھیج دے۔ تاکہ میں دوبارہ تیری راہ میں مارا جاؤں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: یہ تو فیصلہ کر چکا ہوں کہ کوئی یہاں سے دوبارہ لوٹایا نہیں جائے گا۔ ان کا نام حضرت عبداللہ بن عمرو بن حرام انصاری تھا۔ اللہ ان سے راضی ہو۔ صحیح بخاری شریف میں ہے۔ حضرت جابر فرماتے ہیں: اپنے باپ کی شہادت کے بعد رونے لگا اور ابا کے منہ سے کپڑا ہٹا ہٹا کی بار بار ان کے چہرہ کو دیکھ رہا تھا۔ صحابہؓ مجھے منع کرتے تھے لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خاموش تھے۔ پھر حضور ﷺ نے فرمایا: جابر رومت۔ جب تک تیرے والد کو اٹھایا نہیں گیا' فرشتے اپنے پروں سے اس پر سایہ کئے رہے۔ مسند احمد میں ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: جب تمہارے بھائی اُحد والے دن شہید کئے گئے تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان کی روحیں سبز پرندوں کے قالب میں ڈال دیں۔ جو جنتی درختوں کے پھل کھائیں اور جنتی نہروں کا پانی پئیں اور عرش کے سائے تلے وہاں کی لٹکتی ہوئی قندیلوں میں آرام و راحت حاصل کریں۔ جب کھانے پینے رہنے سہنے کی یہ بہترین نعمتیں انہیں ملیں۔ تو کہنے لگے: کاش کہ ہمارے بھائیوں کو جو دنیا میں ہیں۔ ہماری ان نعمتوں کی خبر مل جاتی تاکہ وہ جہاد سے منہ نہ پھیر لیں اور راہ خدا کی لڑائیوں سے تھک کر نہ بیٹھ رہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان سے فرمایا: تم بےفکر رہو۔ میں یہ خبر ان تک پہنچا دیتا ہوں۔ چنانچہ یہ آیتیں نازل فرمائیں۔ حضرت ابن عباسؓ سے نقل

ہے کہ حضرت حمزہؓ اور آپ کے ساتھیوں کے بارے میں یہ آیتیں اتریں۔ (مستدرک حاکم)

یہ بھی مفسرین نے فرمایا ہے کہ احد کے شہیدوں کے بارے میں یہ آیتیں نازل ہوئی ہیں۔ ابوبکر بن مردویہ میں حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے دیکھا اور فرمانے لگے: جابر کیا بات ہے کہ تم مجھے غمگین نظر آتے ہو؟ میں نے کہا یا رسول اللہ ﷺ میرے والد شہید ہو گئے جن پر بار قرض بہت ہے اور میرے چھوٹے چھوٹے بہن بھائی ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: سن! میں تجھے بتاؤں، جس کسی سے اللہ نے کلام کیا پردے کے پیچھے سے کیا۔ لیکن تیرے باپ سے آمنے سامنے بات چیت کی۔ فرمایا: مجھ سے مانگ جو مانگے گا دوں گا۔ تیرے باپ نے کہا: خدایا! میں یہ مانگتا ہوں کہ تو مجھے دنیا میں دوبارہ بھیجے اور میں تیری راہ میں دوسری مرتبہ شہید کیا جاؤں۔ رب عزوجل نے فرمایا: یہ بات تو میں پہلے ہی مقرر کر چکا ہوں کہ کوئی بھی لوٹ کر دوبارہ دنیا میں نہیں جائے گا۔ کہنے لگے: پھر میرے بعد والوں کو ان مراتب کی خبر پہنچا دی جائے چنانچہ اللہ تعالیٰ نے آیت ﴿وَلَا تَحْسَبَنَّ﴾ نازل فرمائی۔ بیہقی میں اتنا اور زیادہ ہے کہ حضرت عبداللہؓ نے فرمایا: میں تو خدایا تیری عبادت کا حق بھی ادا نہیں کر سکا۔ مسند احمد میں ہے۔ شہید لوگ جنت کے دروازے پر نہر کے کنارے گنبد سبز میں ہے۔ صبح شام انہیں جنت کی نعمتیں پہنچ جاتی ہیں۔ دونوں حدیثوں میں تطبیق یہ ہے کہ بعض شہداء وہ ہیں جن کی روحیں پرندوں کے قالب میں ہے اور بعض وہ ہیں، جن کا ٹھکانا یہ گنبد ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ جنت میں سے پھرتے پھراتے یہاں جمع ہوتے ہوں اور پھر یہ کھانے یہیں کھلائے جاتے ہوں۔ واللہ اعلم۔

یہاں پر اس حدیث کا ذکر کرنا مناسب ہوگا، جس میں ہر مؤمن کے لئے یہی بشارت ہے۔ چنانچہ مسند احمد میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مؤمن کی روح ایک پرند کی طرح ہے جو جنت کے درختوں کے پھل کھاتی پھرتی ہے۔ یہاں تک کہ قیامت والے دن جبکہ اللہ تعالیٰ سب کو کھڑا کریں گے۔ تو اسے بھی اس کے جسم کی طرف لوٹا دیں گے۔ اس حدیث کے راویوں میں تین جلیل القدر امام ہیں جو ان چار اماموں میں سے ہیں، جن کے مذاہب مانے جا رہے ہیں۔ ایک تو امام احمد بن حنبلؒ، آپ اس حدیث کو روایت کرتے ہیں۔ امام محمد بن ادریس شافعیؒ ان کے استاد ہیں، حضرت امام مالک بن انس اصبحیؒ۔ پس امام احمدؒ، امام شافعیؒ، امام مالکؒ تینوں زبردست پیشوا اس حدیث کے راوی ہیں۔ پس اس حدیث سے ثابت ہوا کہ ایماندار کی روح جنتی پرند کی شکل میں جنت میں رہتی ہیں اور شہیدوں کی روحیں جیسا کہ پہلے گزر چکا۔ سبز رنگ کے پرندوں کے قالب میں رہتی ہیں۔ یہ روحیں مثل ستاروں کے ہیں۔ جو عام مؤمنین کی روحوں کو یہ مرتبہ حاصل نہیں۔ یہ اپنے طور پر آپ ہی اڑتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے جو بہت بڑا مہربان اور زبردست احسانوں والا ہے، ہماری دعا ہے کہ وہ ہمیں اپنے فضل و کرم سے ایمان و اسلام پر موت دے۔ آمین۔ پھر فرمایا کہ یہ شہید جن جن نعمتوں اور آسائشوں میں ہیں، ان سے بے حد مسرور اور بہت ہی خوش ہیں اور انہیں یہ بھی راحت اور خوشی ہے کہ ان کے بھائی بند جو ان کے بعد راہ خدا میں شہید ہوں گے اور ان کے پاس آئیں گے۔ انہیں آئندہ کا کچھ خوف نہ ہوگا اور اپنے پیچھے چھوڑی ہوئی چیزوں پر انہیں حسرت بھی نہ ہوگی۔ اللہ ہمیں جنت نصیب کرے۔ حضرت محمد بن اسحاق فرماتے ہیں: مطلب یہ ہے کہ وہ خوش ہیں کہ اور بھائی بند بھی جو جہاد میں لگے ہوئے ہیں، وہ بھی شہید ہو کر ان کی نعمتوں میں ان کے شریک حال ہوں گے اور خدا کے ثواب سے فائدہ اٹھائیں گے۔ حضرت سدیؒ فرماتے ہیں کہ شہید کو ایک کتاب دی جاتی ہے کہ فلاں دن تیرے پاس فلاں آئے گا اور فلاں دن فلاں آئے گا۔ پس جس طرح دنیا والے

اپنے کسی غیر حاضر کے آنے کی خبر سن کر خوش ہوتے ہیں۔ اسی طرح یہ شہیدان شہیدوں کے آنے کی خبر سے مسرور ہوتے ہیں۔ حضرت سعید بن جبیرؒ فرماتے ہیں: مطلب یہ ہے کہ جب شہید جنت میں گئے اور وہاں اپنی منزلیں اور رحمتیں اور راحتیں دیکھیں تو کہنے لگے: کاش کہ اس کا علم ہمارے ان بھائیوں کو بھی ہوتا' جواب تک دنیا ہی میں ہیں۔ تا کہ وہ جوانمردی سے جان توڑ کر جہاد کرتے اور ان جگہوں میں جا گھستے جہاں سے زندہ آنے کی امید نہ ہوتی[1]۔ تو وہ بھی ہماری ان نعمتوں میں حصہ دار بنتے۔ پس نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو ان کے اس حال کی خبر پہنچادی اور اللہ نے ان سے کہہ دیا کہ میں نے تمہاری خبر تمہارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دے دی ہے۔ اس سے وہ بہت ہی مسرور محظوظ ہوئے۔ بخاری و مسلم میں بیر معونہ والوں کا قصہ بیان ہو چکا ہے۔ جو ستر انصاری صحابی تھے اور ایک ہی دن صبح کے وقت سب کو بے دردی سے کفار نے تہ تیغ کیا تھا جن قاتلوں کے حق میں ایک ماہ تک نماز کے قنوت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بددعا کی تھی اور جن پر لعنت بھیجی تھی۔ شہداء کے بارے میں قرآن کی یہ آیت اتری تھی کہ ہماری قوم کو ہماری خبر پہنچادو کہ ہم اپنے رب سے ملے' وہ ہم سے راضی ہوا اور ہم اس سے راضی ہو گئے۔ وہ خدا کی نعمت و فضل کو دیکھ دیکھ کر مسرور ہیں۔ حضرت عبدالرحمٰن فرماتے ہیں: یہ آیت يَسْتَبْشِرُوْنَ تمام ایمانداروں کے حق میں ہے' خواہ شہید ہوں خواہ غیر۔ بہت کم ایسے مواقع ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے نبیوں کی فضیلت اور ان کے ثوابوں کا ذکر کرے اور اس کے بعد مؤمنوں کے ثوابوں کا ذکر نہ ہو۔

غزوہ حمراء اسد ☆

پھر ان سچے مؤمنین کا بیان تعریف سے ہو رہا ہے۔ جنہوں نے حمراء اسد والے دن حکم رسول ﷺ پر باوجود زخموں سے چور ہونے سے جہاد پر کمر کس لی تھی۔ مشرکین نے مسلمانوں کو مصیبتیں پہنچائیں اور اپنے گھروں کی طرف واپس چل دیئے۔ لیکن پھر انہیں اس کا خیال آیا کہ موقعہ اچھا تھا۔ مسلمان ہار چکے تھے۔ زخمی ہو چکے تھے۔ اگر ہم اور جم کر لڑتے تو فیصلہ ہی ہو جاتا۔ نبی کریم ﷺ ان کا یہ ارادہ معلوم کر کے مسلمانوں کو تیار کرنے لگے کہ میرے ساتھ چلو' ہم مشرکین کے پیچھے جائیں تا کہ ان پر رعب طاری ہو اور یہ جان لیں کہ مسلمان ابھی کمزور نہیں ہوئے۔ اُحد میں جو لوگ موجود تھے۔ صرف انہی کو ساتھ چلنے کا حکم ملا۔ ہاں صرف حضرت جابر بن عبداللہ کو ان کے علاوہ بھی ساتھ لیا۔ اس آواز پر بھی مسلمانوں نے لبیک کہا۔ باوجود یہ کہ زخموں میں چور اور خون میں شرابور تھے۔ لیکن خدا اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کے لئے کمر بستہ ہو گئے۔ حضرت عکرمہ کا بیان ہے کہ جب مشرکین اُحد سے لوٹے تو راستے میں سوچنے لگے کہ نہ تو تم نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کیا نہ مسلمانوں کی عورتوں کو پکڑا۔ افسوس تم نے کچھ نہ کیا۔ واپس لوٹو۔ جب یہ خبر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو پہنچی تو آپ ﷺ نے مسلمانوں کو تیاری کا حکم دیا۔ یہ تیار ہو گئے اور مشرکین کے تعاقب میں نکل کھڑے ہوئے۔ یہاں تک کہ حمراء الاسد تک یا بیر ابی عیینہ تک پہنچ گئے۔ مشرکین کے دل رعب و خوف سے بھر گئے اور یہ کہہ کر مکہ کی طرف چل دیئے کہ اچھا اگلے سال دیکھا جائے گا۔ حضور ﷺ بھی واپس مدینہ تشریف لائے۔ یہ بھی ایک الگ لڑائی سمجھی جاتی ہے۔ اسی کا ذکر اس آیت میں ہے۔ اُحد کی لڑائی پندرہ شوال بروز ہفتہ ہوئی تھی۔ سولھویں تاریخ بروز اتوار منادی رسول ﷺ نے ندا دی کہ لوگو! دشمن کی طلب میں چلو اور وہی

[1] مطلب یہ ہے کہ کفار سے گر جنگ خطرناک حدود میں داخل ہو جائے اور اُن کا مقابلہ گویا کہ موت کو دعوت دینا ہو تو مسلمان کو چاہیے کہ اس خوفناک موقع سے فرار اختیار نہ کرے بلکہ خوشی خوشی اپنی جان دے دے کہ یہی شہادت کا اعلیٰ مقام ہے۔۱۲

لوگ چلیں جو کل میدان میں تھے۔ اس آواز پر حضرت جابرؓ حاضر ہوئے اور عرض کرنے لگے: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! کل کی لڑائی میں میں نہ تھا۔ اس لئے کہ میرے والد حضرت عبداللہؓ نے مجھ سے کہا کہ بیٹے تمہارے ساتھ یہ چھوٹی چھوٹی بہنیں ہیں اسے تو میں پسند کروں اور نہ تو' کہ انہیں یہاں تنہا چھوڑ کر میں اور تم دونوں ہی چل دیں۔ ایک جائے اور ایک یہاں رہے گا۔ مجھ سے یہ نہیں ہو سکتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم رکاب تم جاؤ اور میں بیٹھا رہوں۔ اس لئے میری خوشی ہے کہ تم اپنی بہنوں کے پاس رہو اور میں جاتا ہوں۔ اس وجہ سے میں تو وہاں رہا اور میرے والد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ آئے۔ اب میری عین تمنا ہے کہ آپ مجھے اجازت دیجئے کہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ چلوں۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت دی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ سفر اس غرض سے تھا کہ دشمن خوفزدہ ہو جائے اور پیچھے آتا ہوا دیکھ کر سمجھ لے کہ ان میں بہت کچھ قوت ہے اور ہمارے مقابلہ سے عاجز نہیں۔ قبیلہ بنو الشہل کے ایک صحابی کا بیان ہے کہ غزوہ اُحد میں ہم دونوں بھائی شامل تھے اور سخت زخمی ہو کر ہم واپس لوٹے تھے۔ جب اللہ تعالیٰ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے منادی نے دشمن کے پیچھے جانے کی ندا دی۔ تو ہم دونوں بھائیوں نے آپس میں کہا کہ افسوس نہ ہمارے پاس سواری ہے کہ اس پر سوار ہو کر اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جائیں نہ زخموں کے مارے جسم میں اتنی طاقت ہے کہ پیدل ساتھ ہو لیں۔ پس افسوس کہ یہ غزوہ ہمارے ہاتھ سے نکل جائے گا۔ ہمارے بے شمار گہرے ہمیں آپ کے جانے سے روک دیں گے۔ لیکن پھر ہم نے ہمت باندھی۔ مجھے اپنے بھائی کی نسبت ذرا ہلکے زخم تھے۔ جب میرے بھائی بالکل عاجز آ جاتے' قدم نہ اٹھتا تو میں انہیں جوں توں کر کے اٹھا لیتا جب تھک جاتا اتار دیتا۔ یوں ہی جوں توں کر کے ہم لشکر گاہ تک پہنچ ہی گئے (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) (سیرت ابن اسحاق)۔

صحیح بخاری شریف میں ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہؓ نے حضرت عروہؓ سے کہا: اے بھانجے! تیرے دونوں باپ انہی لوگوں میں سے ہیں' جن کے بارے میں اَلَّذِیْنَ اسْتَجَابُوْا آیت اتری ہے' حضرت زبیر اور حضرت صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔ جبکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو احد کی جنگ میں نقصان پہنچا اور مشرکین آگے چلے۔ تو آپ کو خیال ہوا کہ کہیں یہ پھر واپس نہ لوٹیں لہٰذا آپ نے فرمایا کوئی ہے جو ان کے پیچھے جائے۔ اس پر ستر لوگ اس کام کے لئے مستعد ہو گئے۔ جن میں ایک حضرت ابو بکرؓ تھے۔ دوسرے حضرت زبیرؓ تھے۔ یہ روایت اور بہت سی سندوں سے بہت سی کتابوں میں ہے۔

ابن مردویہ میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہؓ سے فرمایا کہ تیرے دونوں باپ ان لوگوں میں سے ہیں لیکن یہ مرفوع بیان محض غلطی ہے۔ اس لئے بھی کہ اس کی اسناد میں ثقہ راویوں کا خلاف ہے جو حضرت عائشہؓ سے اس روایت کو موقوف لائے ہیں اور اس لئے بھی کہ معنی کی رو سے بھی اس کا خلاف ثابت ہے۔ حضرت زبیرؓ' حضرت عائشہؓ کے باپ دادوں میں نہیں۔ صحیح یہ ہے کہ یہ بات حضرت عائشہؓ نے اپنے بھانجے حضرت اسماء بنت ابی بکر کے لڑکے عروہ سے کہی ہے۔ حضرت ابن عباسؓ کا بیان ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ابوسفیان کے دل میں رعب ڈال دیا اور باوجودیکہ وہ اُحد کی لڑائی میں قدرے کامیاب ہو گیا تھا۔ لیکن تاہم مکہ کی طرف چل دیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ابوسفیان تمہیں نقصان پہنچا کر لوٹ گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے دل کو مرعوب کر دیا ہے۔ اُحد کی لڑائی شوال میں ہوئی تھی اور تاجر لوگ ذی قعدہ میں مدینہ آتے تھے اور بدر صغریٰ میں اپنے ڈیرے ہر سال اس ماہ میں ڈالا کرتے تھے۔ اب کے بھی اس واقعہ کے بعد لوگ آئے۔ مسلمان اپنے زخموں سے چور تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنی تکالیف بیان کرتے تھے اور سخت صدمہ میں تھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ

چلیں اور فرمایا کہ یہ لوگ اب کوچ کر جائیں گے اور پھر حج کو آئیں گے اور پھر یہ قدرت انہیں اگلے سال تک نہ ہوگی۔ لیکن شیطان نے اپنے دوستوں کو دھمکانا شروع کر دیا اور کہنے لگا کہ لوگوں نے تمہارے استیصال کے لئے لشکر تیار کر لئے ہیں۔ جس کی بناپر لوگ ڈھیلے پڑ گئے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: سنو! خواہ تم میں سے ایک بھی نہ چلے' میں تن تنہا جاؤں گا۔ پھر آپ کے رغبت دلانے پر حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت علی، حضرت زبیر، حضرت سعد، حضرت طلحہ، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف، حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت حذیفہ بن یمان، حضرت ابوعبیدہ بن جراح وغیرہ ستر صحابہ آپ کے زیر رکاب چلنے پر آمادہ ہوئے (رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین)۔ یہ مبارک لشکر ابوسفیان کی جستجو میں بدر صغریٰ تک پہنچ گیا۔ انہی کی اس فضیلت اور جاں بازی کا ذکر اس مبارک آیت میں ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس سفر میں مدینہ سے آٹھ میل حمراء الاسد تک پہنچ گئے۔ مدینہ میں اپنا نائب آپ نے حضرت ابن مکتوم کو بنایا تھا۔ وہاں آپ نے پیر منگل بدھ تک قیام فرمایا پھر مدینہ لوٹ آئے۔

اثنائے قیام میں قبیلہ خزاعہ کا سردار خزاعہ یہاں سے نکلا تھا۔ یہ خود مشرک تھا۔ لیکن اس پورے قبیلے نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صلح صفائی تھی۔ اس قبیلہ کے مشرک' مؤمن سب آپ کے خیر خواہ تھے۔ اس نے کہا کہ حضور کے ساتھیوں کو جو تکلیف پہنچی' اس پر ہمیں سخت رنج ہے۔ خدا آپ کو ان کی خوشی نصیب فرمائے۔ حمراء الاسد پر آپ کے پہنچنے سے پہلے ابوسفیان چل دیا تھا۔ گویا اس نے اور اس کے ساتھیوں نے واپس آنے کا ارادہ کیا تھا کہ جب ہم ان پر غالب آ گئے۔ انہیں قتل کیا' مارا پیٹا' زخمی کیا پھر ادھورا کام کیوں چھوڑ دیں۔ واپس جا کر سب کو تہ تیغ کر دیں۔ یہ مشورے ہو ہی رہے تھے۔ کہ معبد خزاعی وہاں پہنچا۔ ابو سفیان نے اس سے پوچھا کہ کہو کیا خبریں ہیں۔ اس نے کہا کہ آنحضور ﷺ مع صحابہ کے تم لوگوں کے تعاقب میں آ رہے ہیں۔ وہ لوگ سخت غصہ میں ہیں' جو پہلے لڑائی میں شریک نہ تھے وہ بھی آ گئے ہیں سب کے تیور بدلے ہوئے ہیں اور پوری قوت کے ساتھ حملہ آور ہوئے ہیں۔ میں نے تو ایسا لشکر کبھی نہیں دیکھا یہ سن کر ابوسفیان کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے اور کہنے لگا اچھا ہی ہوا جو تم سے ملاقات ہوگئی' ورنہ ہم تو خود ان کی طرف جانے کے لئے تیار تھے۔ معبد نے کہا: ہرگز یہ ارادہ نہ کرو اور میری بات کا کیا ہے' غالباً تم یہاں سے کوچ کرنے سے پہلے ہی لشکر اسلام کے گھوڑوں کو دیکھ لو گے۔ میں ان کے لشکر ان کے غصے' ان کی تیاری اور اولوالعزمی کا حال بیان نہیں کر سکتا۔ میں تو تم سے صاف کہتا ہوں کہ بھاگو اور اپنی جانیں بچاؤ۔ میرے پاس ایسے الفاظ نہیں' جن سے اسلامیوں کے غیظ وغضب اور تہور شجاعت اور سختی اور پختگی کا بیان کر سکوں پس مختصر یہ کہ جان کی خیر مناتے ہو تو فوراً یہاں سے کوچ کرو۔ ابوسفیان اور اس کے ساتھیوں اور اس کے ساتھیوں کے چھکے چھوٹ گئے اور انہوں نے یہاں سے مکہ کی راہ لی۔ قبیلہ عبدالقیس کے آدمی جو کاروبار کی غرض سے مدینہ جا رہے تھے' ان سے ابوسفیان نے کہا کہ حضور کو یہ خبر پہنچا دینا کہ ہم نے انہیں یہ تیغ کر دینے کے لئے لشکر جمع کر لئے ہیں اور ہم واپس لوٹنے کے ارادے میں ہیں۔ اگر تم نے یہ پیغام پہنچا دیا تو ہم تمہیں سوق عکاظ میں کشمش بہت ساری دیں گے۔ چنانچہ ان لوگوں نے حمراء الاسد میں آ کر بطور ڈراوے کے نمک مرچ لگا کر یہ وحشت اثر خبر سنائی۔ لیکن صحابہ نے نہایت استقلال اور پامردی سے جواب دیا کہ ہمیں اللہ کافی ہے اور وہی بہتر کارساز ہے۔ جناب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میں نے ان کے لئے ایک پتھر کا نشان مقرر رکھا ہے اگر یہ لوٹیں گے تو وہاں پہنچ کر اس طرح مٹ جائیں گے جیسے گزشتہ کل کا دن۔

بعض لوگوں نے بھی کہا ہے کہ یہ آیت بعد کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ لیکن صحیح تر یہی ہے کہ حمراء الاسد کے

بارے میں نازل ہوئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اعدائے اللہ نے انہیں مردہ دل کرنے کے لئے دشمنوں کے سازوسامان اور ان کی کثرت و بہتات سے ڈرایا۔ لیکن صبر کے پہاڑ ثابت ہوئے۔ ان کے غیر متزلزل یقین میں کچھ فرق نہ آیا بلکہ وہ توکل میں اور بڑھ گئے اور اللہ کی طرف نظریں کر کے اس سے امداد طلب کی۔ صحیح بخاری شریف میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ حسبنا اللہ حضرت ابراہیمؑ نے آگ میں پڑتے وقت پڑھا تھا اور حضرت محمد ﷺ نے اس وقت جب کہ کافروں کے ٹڈی دل لشکر سے لوگوں نے آپ کو خوفزدہ کرنا چاہا۔ تعجب کی بات ہے کہ امام حاکمؒ نے اس روایت کو ذکر کر کے فرمایا ہے کہ یہ بخاری و مسلم میں نہیں۔ بخاری کی ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ یہ آخری کلمہ تھا جو خلیل اللہؑ کی زبان سے آگ میں پڑتے وقت نکلا تھا۔ حضرت انس والی روایت میں ہے کہ اُحد کے موقعہ پر جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کفار کے لشکروں کی خبر دی گئی تو آپ نے یہ کلمہ فرمایا اور روایت میں ہے کہ حضرت علیؓ کی سرداری میں جب حضور ﷺ نے ایک چھوٹا سا لشکر روانہ کیا اور راہ میں خزاعہ کے ایک اعرابی نے یہ خبر سنائی تو آپ نے یہ فرمایا۔

ابن مردویہ کی حدیث میں ہے آپ فرماتے ہیں جب تم پر کوئی بہت بڑا کام آ پڑے تو تم حَسْبُنَا اللّٰهُ آخر تک پڑھو۔ مسند احمد میں ہے کہ دو شخصوں کے درمیان حضور ﷺ نے فیصلہ کیا تو جس کے خلاف فیصلہ صادر ہوا تھا' اس نے یہی کلمہ پڑھا۔ آپ ﷺ نے اسے واپس بلوا کر فرمایا: عاجزی اور کاہلی پر اللہ کی ملامت ہوتی ہے۔ دانائی' دوراندیشی اور عقل مندی سے کام کیا کرو۔ پھر کسی امر میں پھنس جاؤ تو یہ پڑھ لو۔ مسند کی اور حدیث میں ہے۔ میں کس طرح فارغ ہو کر بہ آرام رہوں۔ حالانکہ صاحب صور نے صور منہ میں لے رکھا ہے اور پیشانی جھکائے حکم اللہ کا منتظر ہے کہ کب حکم ہو اور وہ صور پھونک دے۔ صحابہؓ نے کہا: حضور ﷺ! ہم کیا پڑھیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيلُ عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا پڑھو۔

ام المؤمنین حضرت زینب اور ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت زینب نے فخر سے فرمایا کہ میرا نکاح تو خود اللہ تعالیٰ نے کر دیا ہے اور تمہارے نکاح تمہارے ولی وارثوں نے کئے ہیں۔ صدیقہؓ نے فرمایا: میری برأت اور پاکیزگی کی آیتیں اللہ تعالیٰ نے آسمان سے اپنے کلام میں نازل فرمائی ہیں۔ حضرت زینبؓ اسے مان گئیں اور پوچھا: یہ تو بتاؤ' تم نے حضرت صفوان بن معطل کی سواری پر سوار ہوتے وقت کیا پڑھا تھا؟ صدیقہؓ نے فرمایا: حَسْبِيَ اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيلُ یہ سن کر حضرت زینب نے کہا: تم نے ایمان والوں کا کلمہ کہا تھا۔ چنانچہ اس آیت میں بھی رب رحیم کا ارشاد ہے کہ ان توکل کرنے والوں کی کفایت اللہ تعالیٰ نے کی اور ان کے ساتھ جو لوگ برائی کا ارادہ رکھتے تھے۔ انہیں ذلت اور بربادی کے ساتھ پسپا کیا۔ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے اپنے شہروں کی طرف بغیر کسی نقصان اور برائی کے لوٹے۔ دشمن اپنی مکاریوں میں ناکام رہا۔ ان سے اللہ خوش ہو گیا۔ کیونکہ انہوں نے اس کی خوشی کا کام انجام دیا تھا۔ اللہ تعالیٰ بڑے فضل و کرم والا ہے۔ ابن عباس کا فرمان ہے کہ نعمت تو یہ تھی کہ وہ سلامت رہے اور فضل یہ تھا کہ حضور ﷺ نے تاجروں کے ایک قافلہ سے مال خرید لیا۔ جس میں بہت ہی نفع ہوا اور اس کل نفع کو آپ ﷺ نے اپنے ساتھیوں میں تقسیم کر دیا۔ حضرت مجاہد فرماتے ہیں کہ ابوسفیان نے حضور ﷺ سے کہا کہ اب وعدے کی جگہ بدر ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ممکن ہے چنانچہ آپ ﷺ وہاں پہنچے یہ ڈرپوک آیا نہیں۔ وہاں بازار کا دن تھا مال خرید لیا جو نفع سے بکا۔ اسی کا نام غزوۂ بدر صغریٰ ہے۔ پھر فرماتا ہے کہ یہ شیطان تھا جو اپنے دوستوں سے تمہیں دھمکا رہا تھا اور گیدڑ بھبکیاں دے رہا تھا۔ تمہیں چاہئے کہ ان سے نہ ڈرو۔ صرف میرا ہی خوف دل میں

رکھو۔ کیونکہ ایمانداروں کی شرط یہ ہے کہ جب کوئی ڈرائے دھمکائے اور دینی امور سے تمہیں باز رکھنا چاہے تو مسلمان اللہ پر بھروسہ کرے۔ اس کی طرف سمٹ جائے اور یقین مانے کہ کافی اور ناصر وہی ہے۔ جیسے اور جگہ ہے کہ: ﴿اَلَیْسَ اللّٰهُ بِكَافٍ عَبْدَهٗ﴾ (الزمر:۳۶) کیا اللہ اپنے بندوں کو کافی نہیں؟ یہ لوگ تجھے اس کے سوا اوروں سے ڈرا رہے ہیں۔ (یہاں تک فرمایا) تو کہہ کہ مجھے اللہ کافی ہے توکل کرنے والوں کو اسی پر بھروسہ کرنا چاہئے۔

اور جگہ فرمایا: اولیاء شیطان سے لڑو شیطان کا مکر بڑا بودا ہے اور جگہ ارشاد ہے یہ شیطانی لشکر ہے۔ یاد رکھو شیطانی لشکر ہی گھاٹے اور خسارے میں ہے اور جگہ ارشاد ہے: ﴿كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِیْ﴾ (المجادلہ:۲۱) اللہ تعالیٰ لکھ چکا ہے کہ غلبہ یقیناً مجھے اور میرے رسولوں کو ہی ہوگا۔ اللہ قوی اور عزیز ہے۔ اور جگہ ارشاد ہے: ﴿وَلَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ﴾ (الحج:۴۰) جو اللہ کی مدد کرے گا اللہ اس کی مدد فرمائے گا اور فرمان ہے: ﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ﴾ (محمد:۷) اے ایمان والو! اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو اللہ تمہاری مدد کرے گا اور آیت میں ہے ﴿اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا﴾ (مؤمن:۵۱) بالیقین ہم اپنے رسولوں کی اور ایمانداروں کی مدد دنیا میں بھی کریں گے اور اس دن بھی جس دن گواہ کھڑے ہوں گے۔ جس دن ظالموں کی عذر معذرت نفع نہ دے گی۔ ان کے لئے لعنت ہے اور ان کے لئے برا گھر۔

وَلَا يَحْزُنْكَ الَّذِيْنَ يُسَارِعُوْنَ فِي الْكُفْرِ ۚ اِنَّهُمْ لَنْ يَّضُرُّوا اللّٰهَ شَيْئًا ۗ يُرِيْدُ اللّٰهُ اَلَّا يَجْعَلَ لَهُمْ حَظًّا فِي الْاٰخِرَةِ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۷۶﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الْكُفْرَ بِالْاِيْمَانِ لَنْ يَّضُرُّوا اللّٰهَ شَيْئًا ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۷۷﴾ وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اَنَّمَا نُمْلِيْ لَهُمْ خَيْرٌ لِّاَنْفُسِهِمْ ۗ اِنَّمَا نُمْلِيْ لَهُمْ لِيَزْدَادُوْۤا اِثْمًا ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴿۱۷۸﴾ مَا كَانَ اللّٰهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلٰى مَاۤ اَنْتُمْ عَلَيْهِ حَتّٰى يَمِيْزَ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ ۗ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَجْتَبِيْ مِنْ رُّسُلِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ۖ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ۚ وَاِنْ تُؤْمِنُوْا وَتَتَّقُوْا فَلَكُمْ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۷۹﴾ وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ بِمَاۤ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ هُوَ خَيْرًا لَّهُمْ ۗ بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ ۗ سَيُطَوَّقُوْنَ مَا

بَخِلُوْا بِهٖ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ وَلِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿۱۸۰﴾

اور آپ کے لئے وہ لوگ موجب غم نہ ہونے چاہئیں جو جلدی سے کفر میں جا پڑتے ہیں۔ یقیناً وہ لوگ اللہ تعالیٰ کو ذرہ برابر بھی ضرر نہیں پہنچا سکتے۔ اللہ تعالیٰ کو یہ منظور ہے کہ آخرت میں ان کو اصلاً بہرہ نہ دے اور ان لوگوں کو سزائے عظیم ہوگی۔ یقیناً جتنے لوگوں نے ایمان کی جگہ کفر کو اختیار کر رکھا ہے یہ لوگ اللہ تعالیٰ کو ذرہ برابر ضرر نہیں پہنچا سکتے اور ان کو دردناک سزا ہوگی او جو لوگ کفر کر رہے ہیں۔ وہ یہ خیال ہرگز نہ کریں کہ ہمارا ان کو مہلت دینا ان کے لئے بہتر ہے۔ ہم ان کو صرف اس لئے مہلت دے رہے ہیں تا کہ جرم میں ان کو اور ترقی ہو جائے اور ان کو توہین آمیز سزا ہوگی۔ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو اس حالت پر رکھنا نہیں چاہتا جس پر تم اب ہو جب تک کہ ناپاک کو پاک سے متمیز فرما دے اور اللہ تعالیٰ ایسے امور غیبیہ پر تم کو مطلع نہیں کرتے ولیکن ہاں جس کو خود چاہیں اور وہ اللہ تعالیٰ کے پیغمبر ہیں ان کو منتخب فرما لیتے ہیں۔ پس اب اللہ پر اور اس کے سب رسولوں پر ایمان لے آؤ اور اگر تم ایمان لے آؤ اور پرہیز رکھو پھر تم کو اجر عظیم ملے اور ہرگز نہ خیال کریں ایسے لوگ جو ایسی چیز میں بخل کرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے فضل سے دی ہے کہ یہ بات کچھ انکے لئے اچھی ہوگی۔ بلکہ یہ بات ان کیلئے بہت ہی بری ہے۔ وہ لوگ قیامت کے روز طوق پہنا دیئے جائیں گے۔ اس کا جس میں انہوں نے بخل کیا تھا اور اخیر میں آسمان اور زمین اللہ کا رہ جائے گا اور اللہ تعالیٰ تمہارے سب اعمال کی پوری خبر رکھتے ہیں۔ ○

کفر سے ایمان و اسلام کو نقصان نہیں پہنچتا ☆

چونکہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں پر بے حد مشفق و مہربان تھے۔ اس لئے کفار کی بے راہ روی آپ پر گراں گزرتی تھی۔ وہ جوں جوں کفر کی جانب بڑھتے' حضور صلی اللہ علیہ وسلم غمگین ہوتے۔ اس لئے جناب باری آپ ﷺ کو اس سے روکتا ہے اور فرماتا ہے کہ حکمت اللہ اسی کی مقتضی ہے۔ ان کا کفر آپ کو یا اللہ کو کوئی نقصان نہیں پہنچائے گا۔ یہ لوگ اپنا اخروی حصہ برباد کر رہے ہیں اور اپنے لئے بہت بڑے عذاب کو دعوت دے رہے ہیں۔ ان کی مخالفت سے اللہ آپ کو محفوظ رکھے گا۔ آپ ان پر غم نہ کریں۔ پھر فرمایا یہ بھی مقررہ قاعدہ ہے کہ جو لوگ ایمان کو کفر سے بدل ڈالیں' وہ بھی میرا کچھ نہیں بگاڑتے بلکہ اپنا ہی نقصان کر رہے ہیں اور اپنے لئے المناک عذاب مہیا کر رہے ہیں۔ پھر کافروں کا خدا کی مہلت پر اترانا بیان فرماتا ہے۔ جیسے اور جگہ ارشاد ہوتا ہے: ﴿اَيَحْسَبُوْنَ اَنَّمَا نُمِدُّهُمْ﴾ (المؤمن: ۵۵) یعنی کیا کفار کا یہ گمان ہے کہ ان کے مال و اولاد کی ترقی ہماری طرف سے ان کی خیریت کا نشان ہے؟ نہیں بلکہ وہ بے شعور ہیں اور فرمایا: ﴿فَذَرْنِيْ وَمَنْ يُّكَذِّبُ﴾ (القلم: ۴۴) یعنی مجھے اور اس بات کے جھٹلانے والوں کو چھوڑ دے' ہم انہیں آہستہ آہستہ پکڑیں کہ انہیں علم بھی نہ ہو اور ارشاد ہے ﴿وَلَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ وَاَوْلَادُهُمْ﴾ (التوبۃ: ۵۵) یعنی ان کے مال اور اولاد سے کہیں دھوکے میں نہ پڑ جانا۔ اللہ انہیں ان کے باعث دنیا میں بھی عذاب کرنا چاہتا ہے اور کفر پر ہی ان کی جان جائے گی۔ پھر فرماتا ہے کہ یہ طے شدہ امر ہے کہ بعض احکام اور بعض امتحانات سے اللہ جانچ لے گا اور ظاہر کر دے گا کہ ان کا ولی کون ہے؟ اور اس کا دشمن کون ہے؟ مؤمن اور منافق فاجر بالکل جدا جدا ہو جائیں گے۔ اس سے مراد اُحد کی جنگ کا دن ہے۔ جس میں ایمانداروں کا صبر و استقامت' پختگی و توکل

فرمانبرداری اور اطاعت شعاری اور منافقین کے بے صبری اور مخالفت' تکذیب اور ناموافقت' انکار اور خیانت صاف ظاہر ہو گئی۔ غرض جہاد کا حکم' ہجرت کا حکم' یہ گویا ایک آزمائش تھی' جس نے بھلے برے کی تمیز کردی۔ سدیؒ فرماتے ہیں کہ لوگوں نے کہا تھا کہ اگر محمد ﷺ سچے ہیں تو ذرا بتلائیں تو' کہ ہم میں سے سچا مؤمن کون ہے؟ اور کون نہیں؟ اس پر آیت: ﴿مَا كَانَ اللّٰهُ﴾ نازل ہوئی۔ (ابن جریر)

پھر فرمان ہے کہ اللہ کے غیب کو تم نہیں جان سکتے' ہاں وہ ایسے اسباب پیدا کر سکتا ہے کہ مؤمن اور منافق میں صاف تمیز ہو جائے۔ لیکن اللہ تعالیٰ اپنے رسولوں میں سے جسے چاہے پسند کر لیتا ہے۔ جیسے اور جگہ ہے: ﴿عَالِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖ اَحَدًا﴾ اللہ عالم الغیب ہے۔ پس اپنے غیب پر کسی کو مطلع نہیں کرتا۔ مگر جس رسول کو پسند کرے اس کے بھی آگے پیچھے نگہبان فرشتوں کو چلاتا رہتا ہے۔ پھر فرمایا اللہ پر' اس کے پیغمبروں پر ایمان لاؤ یعنی اطاعت کرو۔ شریعت کے پابند رہو۔ یاد رکھو ایمان اور تقویٰ میں تمہارے لئے اجر عظیم ہے۔

پھر فرمان ہے کہ بخیل شخص اپنے مال کو اپنے لئے بہتر نہ سمجھے۔ وہ اس کے لئے سخت مضر چیز ہے۔ دین میں تو ہے ہی لیکن بسا اوقات دینوی طور پر بھی اس کا انجام اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس بخیلی کے مال کا اسے قیامت کے دن طوق ڈالا جائے گا۔ صحیح بخاری میں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: جسے اللہ مال دے اور وہ اس کی زکوٰۃ ادا نہ کرے۔ اس کا مال قیامت کے دن گنجا سانپ بن کر جس کی آنکھوں پر دو نشان ہوں گے' طوق کی طرح اس کے گلے میں لپٹ جائے گا اور اس کی باچھوں کو چیرتا رہے گا اور کہتا جائے گا میں تیرا مال ہوں میں تیرا خزانہ ہوں۔ پھر آپ ﷺ نے اسی آیت ﴿وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ﴾ کی تلاوت فرمائی۔ مسند احمد کی ایک حدیث میں یہ بھی ہے کہ یہ بھاگتا پھرے گا اور سانپ اس کے پیچھے دوڑے گا۔ پھر اسے پکڑ کر طوق کی طرح لپٹ جائے گا اور کاٹتا رہے گا۔ مسند ابویعلیٰ میں ہے جو شخص اپنے پیچھے خزانہ چھوڑ کر مرے۔ وہ خزانہ ایک چنکوڑیا سانپ کی صورت میں جس کی دونوں آنکھوں میں دو نقطے ہوں گے۔ اسکے پیچھے دوڑے گا۔ یہ بھاگے گا اور کہے گا: تو کون ہے؟ یہ کہے گا: میں تیرا خزانہ ہوں' جسے تو اپنے پیچھے چھوڑ کر مرا تھا۔ یہاں تک کہ وہ اسے پکڑ لے گا اور اسکا ہاتھ چبا جائے گا۔ پھر باقی جسم بھی۔ طبرانی کی حدیث میں ہے جو شخص اپنے آقا کے پاس جا کر اس سے اپنی حاجت طلب کرے اور وہ باوجود بچت ہونے کے نہ دے۔ اسکے لئے قیامت کے دن زہریلا اژدہا بلایا جائے گا۔ دوسری روایت میں ہے کہ جو رشتہ دار محتاج اپنے مالدار رشتہ دار سے سوال کرے' اور یہ نہ دے اسکی یہ سزا ہوگی اور وہ سانپ کے گلے کا ہار بن جائے گا۔ (ابن جریر)

ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں۔ اہل کتاب جو اپنی کتابی باتوں کے پہنچانے میں بخل کرتے تھے' ان کی سزا کا بیان اس آیت میں ہو رہا ہے۔ لیکن صحیح بات پہلی ہی ہے۔ گو یہ قول بھی آیت کے عموم میں داخل ہے بلکہ یہ بطور راوی داخل ہے۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔ پھر فرماتا ہے کہ آسمان اور زمین کی میراث کا مالک اللہ ہی ہے اس نے جو تمہیں دے رکھا ہے' اس میں سے اس کی راہ میں خرچ کرو۔ تمام کاموں کا مرجع اسی کی طرف ہے۔ سخاوت کرو تاکہ اس دن کام آئے اور خیال رکھو کہ تمہاری نیتوں اور دلی ارادوں اور کل اعمال سے اللہ خبردار ہے۔

لَقَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ فَقِيْرٌ وَّنَحْنُ اَغْنِيَاۤءُ ۘ

سَنَكْتُبُ مَا قَالُوْا وَقَتْلَهُمُ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ ۙ وَّنَقُوْلُ ذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ ﴿۱۸۱﴾ ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْكُمْ وَاَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ﴿۱۸۲﴾ اَلَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ عَهِدَ اِلَيْنَآ اَلَّا نُؤْمِنَ لِرَسُوْلٍ حَتّٰى يَاْتِيَنَا بِقُرْبَانٍ تَاْكُلُهُ النَّارُ ۭ قُلْ قَدْ جَاۗءَكُمْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِيْ بِالْبَيِّنٰتِ وَبِالَّذِيْ قُلْتُمْ فَلِمَ قَتَلْتُمُوْھُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۸۳﴾ فَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقَدْ كُذِّبَ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ جَاۗءُوْ بِالْبَيِّنٰتِ وَالزُّبُرِ وَالْكِتٰبِ الْمُنِيْرِ ﴿۱۸۴﴾

بے شک اللہ تعالیٰ نے سن لیا ہے ان لوگوں کا قول جنہوں نے یوں کہا کہ اللہ تعالیٰ مفلس ہے اور ہم مالدار ہیں ہم ان کے کہے ہوئے کو لکھ کر رہیں گے اور ان کا انبیاء کو ناحق قتل کرنا بھی اور ہم کہیں گے کہ چکھو آگ کا عذاب یہ ان اعمال کی وجہ سے ہے جو تم اپنے ہاتھوں سمیٹتے ہو اور یہ امر ثابت ہی ہے کہ اللہ تعالیٰ بندوں پر ظلم کرنے والے نہیں۔ وہ ایسے لوگ ہیں کہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہم کو حکم فرمایا تھا کہ ہم کسی پیغمبر پر اعتقاد نہ لائیں گے جب تک وہ ہمارے سامنے معجزہ نذر و نیاز خداوندی کا ظاہر نہ کرے کہ اس کو آگ کھا جائے۔ آپ فرما دیجئے کہ بالیقین بہت سے پیغمبر مجھ سے پہلے بہت دلائل لے کر آئے اور خود یہ معجزہ بھی جس کو تم کہہ رہے ہو سو تم نے ان کو کیوں قتل کیا تھا اگر تم سچے ہو۔ سو اگر یہ لوگ آپ کی تکذیب کریں تو بہت سے پیغمبروں کی جو آپ سے پہلے گزرے ہیں (تکذیب کی جا چکی ہے) جو معجزات لے کر آئے تھے اور صحیفے لے کر اور روشن کتاب لے کر۔ ○

ایک گستاخی ☆

حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ یہ آیت اتری کہ کون ہے جو اللہ کو قرض حسنہ دے اور وہ اسے چند در چند کر دے تو یہود کہنے لگے: اے نبی ﷺ! تیرا رب فقیر ہو گیا ہے اور اپنے بندوں سے قرض مانگ رہا ہے۔ اس پر یہ آیت لقد نازل ہوئی۔ ابن ابی حاتم میں ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ یہودیوں کے مدرسے میں گئے۔ یہاں کا بڑا معلم فخاص تھا اور اس کے ماتحت ایک بہت بڑا عالم اشیع تھا۔ لوگوں کا مجمع تھا اور وہ ان سے مذہبی باتیں سن رہے تھے۔ آپ نے فرمایا: فخاص! اللہ سے ڈر اور مسلمان ہو جا۔ اللہ کی قسم! تجھے خوب معلوم ہے کہ آنحضرت ﷺ اللہ کے سچے رسول ہیں وہ س...... پاس سے حق لے کر آئے ہیں۔ ان کی صفتیں تورات انجیل میں تمہارے ہاتھوں میں موجود ہیں۔ تو فخاص نے جواب میں کہا: ابوبکر سن! اللہ کی قسم اللہ ہمارا

محتاج ہے۔ ہم اس کے محتاج نہیں۔ اس کی طرف اس طرح نہیں گڑگڑاتے' جیسے وہ ہماری طرف عاجزی کرتا ہے۔ بلکہ ہم تو اس سے بے پرواہیں۔ ہم غنی اور تونگر ہیں۔ اگر وہ غنی ہوتا تو ہم سے قرض طلب نہ کرتا۔ جیسے کہ تمہارا پیغمبر کہہ رہا ہے۔ ہمیں تو سود سے روکے اور خود سود دے۔ اگر غنی ہوتا تو ہمیں سود کیوں دیتا۔ اس پر حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کو غصہ آیا اور فخاص کے منہ پر زور سے تھپڑ مارا اور فرمایا: اللہ کی قسم' جس کے ہاتھ میں میری جان ہے اگر تم یہود سے معاہدہ نہ ہوتا تو میں دشمن اللہ کا سر کاٹ دیتا۔ جاؤ بدنصیبو تھٹا! نے ہی رہو اگر سچے ہو۔ فخاص نے جا کر اس کی شکایت سرکار محمدی صلی اللہ علیہ وسلم میں کی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صدیق اکبر سے پوچھا کہ اسے کیوں مارا؟ حضرت صدیق نے واقعہ بیان کیا۔ لیکن فخاص اپنے قول سے مکر گیا کہ میں نے تو ایسا کہاہی نہیں۔ اس بارے میں یہ آیت اتری۔ پھر اللہ تعالیٰ انہیں اپنے عذاب کی خبر دیتا ہے کہ ان کا یہ قول اور ساتھ ہے اس جیسا ان کا بڑا گناہ یعنی قتل انبیاء ہم نے ان کے نامۂ اعمال میں لکھ لیا ہے۔ ایک طرف ان کا جناب باری کی شان میں گستاخی کرنا دوسری جانب نبیوں کو مار ڈالنا' ان کاموں پر انہیں سخت سزا ہوگی۔ ان کو ہم کہیں گے کہ جلنے والے عذابوں کا مزہ چکھو اور ان سے کہا جائے گا کہ یہ تمہارے کرتوت کا بدلہ ہے۔ یہ کہہ کر انہیں ذلیل و رسوا کر کے عذاب پر عذاب ہوں گے۔ یہ سراسر عدل و انصاف ہے اور ظاہر ہے کہ مالک اپنے غلاموں پر ظلم کرنے والا نہیں ہے۔ پھر ان کو اس خیال سے جھوٹا ثابت کیا جا رہا ہے۔ یہ کہتے تھے کہ آسمانی کتابیں جو پہلے نازل ہوئیں' ان میں اللہ تعالیٰ نے ہمیں یہ حکم دے رکھا ہے کہ جب تک کوئی رسول ہمیں یہ معجزہ نہ دکھائے کہ اس کی اُمت میں سے جو شخص قربانی کرے' اوّل کی قربانی کو کھا جانے کے لئے آسمان سے قدرتی آگ آئے اور کھا جائے۔ ان کے اس قول کے جواب میں ارشاد ہوتا ہے کہ پھر اس معجزے والے پیغمبروں کو' جو اپنے ساتھ دلائل اور براہین لے کر آئے تھے' تم نے کیوں مار ڈالا؟ انہیں تو اللہ تعالیٰ نے یہ معجزہ بھی دے رکھا تھا کہ ہر ایک قبول شدہ قربانی آسمانی آگ کھا جاتی تھی۔ لیکن تم نے انہیں بھی سچا نہ مانا۔ ان کی بھی مخالفت اور دشمنی کی' بلکہ انہیں قتل کر ڈالا۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ تمہیں تمہاری اپنی بات کا بھی پاس ولحاظ نہیں۔ نہ تم حق کے ساتھی ہو' نہ کسی نبی کے ماننے والے ہو۔ تم یقیناً جھوٹے ہو۔ پھر اللہ تعالیٰ اپنے نبی کو تسلی دیتا ہے کہ ان کے جھٹلانے سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم تنگدل اور غمناک نہ ہوں۔ اگلے اولوالعزم پیغمبروں کے واقعات کو اپنے لئے باعث تسلی بنائیں کہ وہ بھی باوجود دلیلیں ظاہر کر دینے کے باوجود اپنی حقانیت کی بخوبی واضح کر دینے کے' پھر بھی جھٹلائے گئے۔ زُبُر سے مراد آسمانی کتابیں ہیں' جو ان صحیفوں کی طرح آسمان سے آئیں جو رسولوں پر اتارے گئے تھے اور مُنِیر سے مراد واضح جلی اور روشن چیز ہے۔

كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ۗ وَاِنَّمَا تُوَفَّوْنَ اُجُوْرَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۗ فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَاُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ ۗ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ﴿۱۸۵﴾ لَتُبْلَوُنَّ فِيْٓ اَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ۫ وَلَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْٓا

اَذًى كَثِيْرًا ۭ وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ﴿١٨٦﴾

ہر جان کو موت کا مزہ چکھنا ہے اور تم کو پوری پاداش تمہاری قیامت کے روز ملے گی تو جو شخص دوزخ سے بچالیا گیا اور جنت میں داخل کیا گیا سو پورا کامیاب وہ ہوا اور دنیاوی زندگی تو کچھ بھی نہیں صرف دھوکا کا سودا ہے البتہ آگے اور آزمائے جاؤ گے اپنے مالوں میں اور اپنی جانوں میں اور البتہ آگے کو اور سنو گے بہت سی باتیں دل آزاری کی ان لوگوں سے جو تم سے پہلے کتاب دیئے گئے ہیں اور ان لوگوں سے جو کہ مشرک ہیں اور اگر صبر کرو گے اور پرہیز رکھو گے تو یہ تاکیدی احکام میں سے ہے۔O

موت کا مرحلہ درپیش ہے اور دنیا کی زندگی ایک بے حقیقت چیز ہے☆

تمام مخلوق کو عام اطلاع ہے کہ ہر جاندار مرنے والا ہے۔ جیسے فرمایا: ﴿كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ وَّيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ﴾ (الرحمٰن ۲۶) یعنی اس زمین پر جتنے ہیں سب فانی ہیں۔ صرف تیرے رب کا چہرہ باقی ہے جو بزرگی اور انعام والا ہے۔ پس صرف وہی خدائے واحد ہمیشگی کی زندگی والا ہے جو کبھی فنا نہ ہوگا۔ جن انسان کل کے کل مرنے والے ہیں۔ اسی طرح فرشتے اور حاملان عرش بھی مرجائیں گے اور صرف اللہ واحد لاشریک دوام اور بقاوالا باقی رہ جائے گا۔ پہلے بھی وہی تھا اور آخر بھی وہی رہے گا۔ جب سب مرجائیں گے۔ مدت ختم ہو جائے گی۔ صلب آدم سے جتنی اولاد ہونے والی تھی ہو چکی اور پھر سب موت کے گھاٹ اتر گئے۔ مخلوقات کا خاتمہ ہو گیا۔ اسی وقت اللہ تعالیٰ قیامت قائم کرے گا اور مخلوق کو ان کے کل اعمال کی چھوٹے بڑے چھپے کھلے صغیرہ کبیرہ سب کی جزا سزا ملے گی۔ کسی پر ذرہ برابر ظلم نہ ہوگا۔ یہی اس کے بعد کے جملہ میں فرمایا جا رہا ہے۔ حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال کے بعد ہمیں ایسا محسوس ہوا کہ گویا کوئی آ رہا ہے۔ پاؤں کی آہٹ سنائی دیتی تھی۔ لیکن کوئی شخص دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اس نے آ کر کہا: اے اہل بیت! تم پر سلام ہو اور اللہ کی رحمت و برکت ہر جان موت کا مزہ چکھنے والی ہے۔ تم سب کو تمہارے اعمال کا بدلہ پورا پورا قیامت کے دن دیا جائے گا۔ ہر مصیبت کی تلافی اللہ کے پاس ہے۔ ہر مرنے والے کا بدلہ ہے اور ہر فوت ہونے والے کا حاصل کر لینا ہے۔ اللہ ہی پر بھروسہ رکھو اسی سے بھلی امیدیں رکھو سمجھ لو کہ سچ مچ مصیبت زدہ وہ شخص ہے جو ثواب سے محروم رہ جائے۔ تم پر اللہ کی طرف سے سلامتی نازل ہو اور اس کی رحمتیں اور برکتیں (ابن ابی حاتم)۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا خیال ہے کہ یہ خضر تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ پورا کامیاب وہ انسان ہے جو جہنم سے نجات پالے اور جنت میں چلا جائے۔ حضور علیہ السلام فرماتے ہیں کہ جنت میں ایک کوڑے جتنی جگہ مل جانا دنیا و مافیہا سے بہتر ہے اگر تم چاہو تو پڑھو: ﴿فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَاُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ﴾ اس پچھلی زیادتی کے بغیر یہ حدیث بخاری مسلم وغیرہ میں بھی ہے اور زیادتی سمیت ابن حاتم میں ہے اور ابن مردویہ میں بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جس کی خواہش آگ سے بچ جائے جنت میں داخل ہونے کی ہو اسے چاہئے کہ مرتے دم تک اللہ پر اور قیامت پر ایمان رکھے اور لوگوں سے وہ سلوک کرے جسے اپنے لئے پسند کرتا ہو یہ حدیث پہلے ﴿وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ﴾ کی گزر چکی ہے۔ مسند احمد اور وکیع بن جراح کی تفسیر میں یہ حدیث ہے۔ اس کے بعد دنیا کی حقارت اور ذلت بیان ہو رہی ہے کہ یہ نہایت ذلیل فانی اور زوال پذیر ہے۔ جیسے اور جگہ ہے ﴿بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى﴾ (الاعلیٰ: ۱۶-۱۷) یعنی تم تو حیوۃ دنیا پر ریجھے جا رہے ہو حالانکہ دراصل بہتری

اور بقا والی چیز آخرت ہے۔ دوسری آیت میں ہے تمہیں جو کچھ دیا گیا ہے یہ تو حیاۃ دنیا کا فائدہ ہے اور اس کی زینت بہترین معلوم ہوتی ہے۔ حالانکہ باقی تو وہ ہے جو اللہ کے پاس ہے۔ حدیث شریف میں ہے۔ اللہ کی قسم دنیا آخرت کے مقابلہ میں صرف ایسی ہے جیسے کوئی آدمی اپنی انگلی سمندر میں ڈبو لے۔ اس انگلی کے پانی کو سمندر کے پانی کے مقابلہ میں جو نسبت ہے وہ ہی دنیا کو آخرت کے مقابلہ میں ہے۔ حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد ہے: دنیا کیا ہے ایک دھوکے کی ٹٹی ہے جسے چھوڑ چھاڑ کر تمہیں چل دینا ہے۔ اس اللہ کی قسم جس کے سوا کوئی لائق عبادت نہیں کہ یہ تو عنقریب تم سے جدا ہونے والی ہے اور برباد ہو جانے والی چیز ہے۔ پس تمہیں چاہئے کہ ہوش مندی برتو اور یہاں طاعت اللہ کرلو اور طاقت بھر نیکیاں کمالو۔ اللہ کی دی ہوئی توفیق بغیر کوئی کام نہیں بنتا۔

پھر انسانی آزمائش کا ذکر ہو رہا ہے۔ جیسے اور جگہ ہے ﴿وَلَنَبْلُوَنَّكُم بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ﴾ (البقرہ: ۱۵۵) مطلب یہ ہے کہ مؤمن کا امتحان ضرور ہوتا ہے کبھی جانی کبھی مالی کبھی اہل و عیال میں کبھی اور کسی طرح۔ یہ آزمائش دینداری کے انداز کے مطابق ہوتی ہے۔ سخت دیندار کی ابتلا بھی سخت اور کمزور دین والے کا امتحان بھی کمزور۔ پھر پروردگار جل شانہ صحابہ کرام کو خبر دیتا ہے کہ بدر سے پہلے مدینہ میں تمہیں کتابیوں اور مشرکوں سے تکلیف دہ باتیں سننی پڑیں گی۔ پھر تسلی دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ تم صبر کرلیا کرو اور پرہیزگاری برتو یہ بڑا بھاری کام ہے۔ حضرت اسامہ بن زید فرماتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب مشرکین سے اور اہل کتاب سے بہت کچھ درگزر فرمایا کرتے تھے اور ان کی ایذاؤں کو برداشت کرلیا کرتے تھے اور اللہ کے اس فرمان پر عامل تھے۔ یہاں تک کہ جہاد کی آیات اتریں۔

صحیح بخاری شریف میں اس آیت کی تفسیر کے موقعہ پر ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے گدھے پر سوار ہو کر حضرت اسامہ کو اپنے پیچھے بٹھا کر حضرت سعد بن عبادہ کی عیادت کے لئے بنو حارث بن خوارج کے قبیلے میں تشریف لے چلے۔ یہ واقعہ جنگ بدر سے پہلے کا ہے۔ راستہ میں ایک مجلس جمی ہوئی ملی۔ جس میں مسلمان بھی تھے۔ یہودی بھی تھے۔ مشرکین بھی تھے اور عبداللہ بن ابی بن سلول بھی تھا۔ یہ بھی اب تک کفر کے کھلے رنگ میں تھا۔ مسلمانوں میں حضرت عبداللہ بن رواحہ بھی تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سواری سے گرد و غبار جو اُڑا تو عبداللہ بن ابی بن سلول نے ناک پر کپڑا رکھ لیا اور کہنے لگا: غبار نہ اڑاؤ۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پاس پہنچ ہی چکے تھے سواری سے اتر آئے سلام کیا اور انہیں اسلام کی دعوت دی اور قرآن کی چند آیتیں سنائیں۔ تو عبداللہ بول پڑا: سنیے صاحب! آپ کا یہ طریقہ ہمیں پسند نہیں۔ آپ کی باتیں حق ہی سہی۔ لیکن اس کی کیا وجہ کہ آپ ہماری مجلسوں میں آکر ہمیں ایذا دیں۔ اپنے گھر جائیے جو آپ کے پاس آئے اسے سنائیے۔ یہ سن کر حضرت عبداللہ بن رواحہ نے فرمایا: حضور بے شک ہماری مجلسوں میں تشریف لایا کریں ہمیں تو اس کی بہت ضرورت ہے۔ پھر ان میں آپس میں خوب جھگڑا ہوا۔ ایک دوسرے کو برا بھلا کہنے لگے اور قریب تھا کہ کھڑے ہو کر لڑنے لگیں۔ لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سمجھانے سے امن و امان ہو گیا اور سب خاموش ہو گئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی سواری پر ہو کر حضرت سعد کے ہاں تشریف لے گئے اور وہاں جا کر حضرت سعد سے فرمایا کہ ابولباب عبداللہ بن ابی نے آج تو یوں یوں کیا۔ حضرت سعد نے کہا: یارسول اللہ! آپ صلی اللہ علیہ وسلم جانے دیجئے معاف کیجئے اور درگزر کیجئے۔ قسم اللہ کی جس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن اُتارا سنیے اسے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے بے حد دشمنی ہے اور ہونی چاہئے۔ ادھر اللہ تعالیٰ نے آپ کو اپنا نبی برحق بنا کر بھیجا لوگوں نے آپ کو نبی برحق مانا اس کی سرداری جاتی رہی جس کا اسے

رنج ہے۔ اسی باعث یہ اپنے دل کے پھپھولے پھوڑ رہا ہے جو کہہ دیا کہہ دیا آپؐ اسے اہمیت نہ دیں۔ چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے درگزر کیا اور یہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت تھی اور آپ کے اصحاب کی بھی۔ یہودیوں سے مشرکوں سے درگزر فرماتے سنی ان سنی کر ڈالا کرتے وراس فرمان پر عمل کرتے یہی حکم آیت ﴿وَدَّ كَثِيرٌ﴾ (البقرہ:۱۰۷) عفو درگزر کا اس آیت ﴿وَلَتَسْمَعُنَّ﴾ میں ہے۔

اِس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو جہاد کی اجازت دی گئی اور پہلا غزوہ بدر کا ہوا۔ جس میں سرداران کفار قتل ہوئے۔ یہ حالت اور یہ شوکت اسلام دیکھ کر اب عبداللہ بن ابی سلول اور اس کے ساتھی گھبرائے بجز اس کے کوئی چارہ انہیں نظر نہیں آیا کہ بیعت کر لیں اور بظاہر مسلمان ہو جائیں۔ یاد رکھنا چاہئے کہ ہر حق والے پر جو نیکی اور بھلائی کا حکم کرتا ہے اور جو برائی اور خلاف شرع کام سے روکتا ہے ضرور مصیبتیں اور آفتیں آتی ہیں اسے چاہئے کہ ان تمام تکلیفوں کو جھیلے اور راہ اللہ میں صبر سے کام لے۔ اسی کی ذات پاک پر بھروسہ رکھے اسی سے مدد طلب کرتا رہے، بہترین مددگار کارساز وہی ہے۔

وَإِذْ أَخَذَ اللَّهُ مِيثَاقَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ لَتُبَيِّنُنَّهُ لِلنَّاسِ وَلَا تَكْتُمُونَهُ فَنَبَذُوهُ وَرَاءَ ظُهُورِهِمْ وَاشْتَرَوْا بِهِ ثَمَنًا قَلِيلًا ۖ فَبِئْسَ مَا يَشْتَرُونَ ﴿۱۸۷﴾ لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ يَفْرَحُونَ بِمَا أَتَوْا وَيُحِبُّونَ أَنْ يُحْمَدُوا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوا فَلَا تَحْسَبَنَّهُمْ بِمَفَازَةٍ مِنَ الْعَذَابِ ۖ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿۱۸۸﴾ وَلِلَّهِ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۗ وَاللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿۱۸۹﴾

ع ۱۹ ۱۰

اور جب کہ اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب سے عہد لیا کہ اس کتاب کو عام لوگوں کے روبرو ظاہر کر دینا اور اس کو پوشیدہ مت کرنا سو ان لوگوں نے اس کو اپنی پس پشت پھینک دیا اور اس کے مقابلہ میں کم حیثیت معاوضہ لے لیا۔ سو بری چیز ہے جس کو وہ لے رہے ہیں۔ جو لوگ ایسے ہیں کہ اپنے کردار پر خوش ہوتے ہیں اور جو کام نہیں کیا اس پر چاہتے ہیں کہ اُنکی تعریف ہو۔ سو ایسے شخصوں کو ہرگز ہرگز مت خیال کرو کہ وہ خاص طور کے عذاب سے بچاؤ میں رہیں گے اور انکو دردناک سزا ہوگی اور اللہ ہی کیلئے سلطنت آسمانوں کی اور زمین کی اور اللہ تعالیٰ ہر شے پر پوری قدرت رکھتے ہیں۔ ○

عہد شکنی ☆

اللہ تعالیٰ یہاں اہل کتاب کو تنبیہ فرما رہے ہیں کہ پیغمبروں کی وساطت سے جو عہد ان کا جناب باری سے ہوا تھا کہ حضور پیغمبر آخر الزماں پر یہ ایمان لائیں گے اور آپؐ کے ذکر کو اور آپؐ کی بشارت کو پیش گوئی کو لوگوں میں پھیلائیں گے اور انہیں آپ کی تابعداری پر آمادہ کریں گے اور پھر جس وقت آپ آ جائیں تو آپؐ کے تابعدار ہو جائیں گے۔ لیکن انہوں نے اس

عہد کو چھپالیا اور اس کے ظاہر کرنے پر جب دنیا و آخرت کی بھلائیوں کا ان سے وعدہ کیا گیا تھا۔ ان کے بدلے دنیا کی تھوڑی سی پونجی میں الجھ کر رہ گئے۔ ان کی یہ خرید و فروخت بد سے بدتر ہے۔ اس میں علما کو تنبیہ ہے کہ وہ ان کی طرح نہ کریں۔ ورنہ ان پر بھی وہی سرزنش ہوگی جو اُن پر ہوئی اور انہیں بھی اللہ کی وہ ناراضگی اٹھانا پڑے گی جو انہوں نے اٹھائی۔ علمائے کرام کو چاہیئے کہ ان کے پاس جو نفع دینے والا دینی علم ہو۔ جس سے لوگ نیک عمل کر سکتے ہوں' اسے پھیلاتے رہیں اور کسی بات کو نہ چھپائیں۔ حدیث شریف میں ہے۔ جس شخص سے کوئی مسئلہ پوچھا جائے اور وہ اسے چھپالے تو قیامت کے دن آگ کی لگام پہنایا جائے گا۔ دوسری آیت میں ریاکاروں کی مذمت ہو رہی ہے۔ صحیحین کی حدیث میں ہے جو شخص جھوٹا دعویٰ کر کے زیادتی کرے اُسے اللہ تعالیٰ اور کم کر دے گا۔ صحیحین کی دوسری حدیث میں ہے جو نہ دیا گیا ہو اس کے ساتھ آسودگی جتانے والا مثل دو جھوٹے کپڑے پہننے والے کے ہے۔ مسند احمد میں ہے کہ ایک مرتبہ مروان نے اپنے دربان رافع سے کہا کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے پاس جاؤ اور ان سے کہو کہ اگر اپنے کام پر خوش ہونے اور نہ کئے ہوئے کام پر تعریف پسند کرنے کے باعث اللہ کا عذاب ہوگا۔ تو ہم میں سے کوئی اس سے چھٹکارا نہیں پا سکتا۔ حضرت عبداللہ نے اس کے جواب میں فرمایا کہ تمہیں اس آیت سے کیا تعلق؟ یہ تو اہل کتاب کے بارے میں ہے۔ پھر آپ نے ﴿وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ﴾ سے اس آیت کے ختم تک تلاوت کی اور فرمایا کہ ان سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی چیز کے بارے میں سوال کیا تھا تو انہوں نے اس کا کچھ اور ہی غلط جواب دیا اور باہر نکل کر گمان کرنے لگے کہ ہم نے آپ کے سوال کا جواب دے دیا اور ساتھ ہی ان کی یہ بھی خواہش تھی کہ آپ کے پاس ہماری تعریف ہوگی اور اصلی سوال کے جواب کے چھپا لینے پر اور یہ فقرہ چل جانے پر بھی وہ خوش تھے اسی کا بیان اس آیت میں ہے۔ یہ حدیث بخاری وغیرہ میں بھی ہے اور صحیح بخاری شریف میں یہ بھی ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میدان جنگ میں تشریف لے جاتے تو منافقین اپنے گھروں میں گھسے بیٹھے رہتے' ساتھ نہ جاتے۔ پھر خوشیاں مناتے کہ ہم لڑائی سے بچ گئے۔ اب جب اللہ کے نبی ﷺ واپس لوٹتے تو یہ باتیں بناتے' جھوٹے سچے عذر کرتے اور قسمیں کھا کھا کر اپنے معذور ہونے کا آپ کو یقین دلاتے اور چاہتے کہ نہ کئے ہوئے کام پر بھی ہماری تعریفیں ہوں جس پر یہ آیت اتری۔

تفسیر ابن مردویہ میں ہے کہ مروان نے حضرت ابوسعیدؓ سے اس آیت کے بارے میں سوال کیا تھا جس طرح اوپر گزرا کہ حضرت ابن عباسؓ سے پچھوایا تو حضرت ابوسعیدؓ نے اس کا مصداق اور اس کا شان نزول ان منافقوں کو قرار دیا' جو غزوہ کے وقت بیٹھ جاتے۔ اگر مسلمانوں کو نقصان پہنچا تو بغلیں بجاتے۔ اگر فائدہ ہوا تو اپنا معذور ہونا ظاہر کرتے اور فتح و نصرت کی خوشی کا اظہار کرتے اس پر مروان نے کہا: کہاں یہ واقعہ کہاں یہ آیت؟ تو حضرت ابوسعیدؓ نے فرمایا کہ یہ زید بن ثابت بھی اس سے واقف ہیں۔ مروان نے زید سے پوچھا: آپ نے بھی اس کی تصدیق کی۔ پھر حضرت ابوسعیدؓ نے فرمایا: اس کا علم حضرت رافع بن خدیج کو بھی ہے جو مجلس میں موجود تھے۔ لیکن انہیں ڈر ہے کہ اگر یہ خبر کر دیں گے تو آپ ان کی اونٹنیاں' جو صدقہ کی ہیں چھین لیں گے۔ باہر نکل کر حضرت زیدؓ نے کہا میری شہادت پر تم میری تعریف نہیں کرتے؟ حضرت ابوسعیدؓ نے فرمایا: تم نے سچی شہادت ادا کر دی۔ تو حضرت نے فرمایا: پھر بھی سچی شہادت پر میں مستحق تعریف ہوں۔ یہ مروان اس زمانہ میں مدینہ پر امیر تھا۔ دوسری روایت میں ہے کہ مروان کا یہ سوال رافع بن خدیج سے ہی پہلے ہوا تھا۔ اس سے پہلے کی روایت میں یہ گزر چکا ہے کہ مروان نے اس آیت کی بابت حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے دریافت کرایا تھا تو یاد رہے کہ ان دونوں میں کوئی تضاد اور منافات

نہیں۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ آیت عام ہے اسے بھی شامل ہے اور اسے بھی۔ مروان والی روایت میں بھی ممکن ہے پہلے ان دونوں صاحبوں نے جواب دیئے ہوں۔ پھر مزید تشفی کے طور پر حبر الامہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے بھی مروان نے بذریعہ اپنے آدمی کے سوال کیا ہو۔ حضرت ثابت بن قیس انصاریؓ حاضر خدمت نبوی ہو کر عرض کرتے ہیں کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! مجھے تو اپنی ہلاکت کا بڑا اندیشہ ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیوں؟ جواب دیا: ایک تو اس وجہ سے کہ اللہ تعالیٰ نے اس بات سے روکا ہے کہ جو نہ کیا ہوں۔ اس پر تعریف کو پسند کریں اور میرا یہ حال ہے کہ میں تعریف کو پسند کرتا ہوں۔ دوسری بات یہ ہے کہ تکبر سے اللہ نے روکا ہے اور میں جمال کو پسند کرتا ہوں۔ تیسرے یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز سے بلند آواز کرنا ممنوع ہے اور میں بلند آواز ہوں۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا تو اس بات سے خوش نہیں کہ تیری زندگی بہترین اور باخیر ہو اور تیری موت شہادت کی موت ہو اور تو جنتی بن جائے۔ خوش ہو کر کہنے لگے: کیوں نہیں یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! یہ تو بہت ہی اچھی بات ہے۔ چنانچہ یہی ہوا کہ آپ کی زندگی حمید ہوئی اور موت شہادت ہوئی۔ مسیلمہ کذاب کے ساتھ مسلمانوں کی جو جنگ ہوئی۔ اس میں آپ نے شہادت پائی۔ تَحْسَبَنَّهُمْ کو يَحْسَبَنَّهُمْ بھی پڑھا گیا ہے۔

پھر فرمان ہے کہ تو انہیں عذاب سے نجات پانے والا خیال کر۔ انہیں عذاب ضرور ہوگا اور وہ بھی دردناک۔ پھر ارشاد ہوتا ہے کہ ہر چیز کا مالک اور ہر چیز پر قادر اللہ تعالیٰ ہے۔ اسے کوئی عاجز نہیں کر سکتا۔ پس تم اس سے ڈرتے رہو اور اس کی مخالفت نہ کرو اس کے غضب سے بچنے کی کوشش کرو۔ اس کے عذابوں سے اپنا بچاؤ کر لو نہ تو کوئی اس سے بڑا نہ اس سے زیادہ قدرت والا۔

إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰيٰتٍ لِّأُولِي الْأَلْبَابِ ﴿١٩٠﴾ الَّذِينَ يَذْكُرُونَ اللّٰهَ قِيَامًا وَّقُعُودًا وَّعَلٰى جُنُوبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُونَ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿١٩١﴾ رَبَّنَا إِنَّكَ مَنْ تُدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ أَخْزَيْتَهُ وَمَا لِلظّٰلِمِينَ مِنْ أَنْصَارٍ ﴿١٩٢﴾ رَبَّنَا إِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِيًا يُّنَادِي لِلْإِيمَانِ أَنْ اٰمِنُوا بِرَبِّكُمْ فَاٰمَنَّا رَبَّنَا

فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَكَفِّرْ عَنَّا سَيِّاٰتِنَا وَتَوَفَّنَا مَعَ الْاَبْرَارِ ﴿۱۹۳﴾

رَبَّنَا وَاٰتِنَا مَا وَعَدْتَّنَا عَلٰى رُسُلِكَ وَلَا تُخْزِنَا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ اِنَّكَ لَا

تُخْلِفُ الْمِيْعَادَ ﴿۱۹۴﴾

بلاشبہ آسمانوں کے اور زمین کے بنانے میں اور یکے بعد دیگرے رات اور دن کے آنے جانے میں دلائل ہیں اہل عقل کے لئے جن کی حالت یہ ہے کہ وہ لوگ اللہ تعالیٰ کی یاد کرتے ہیں کھڑے بھی اور بیٹھے بھی اور لیٹے بھی اور آسمانوں اور زمین کے پیدا ہونے میں غور کرتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار آپ نے اس کو لایعنی پیدا نہیں کیا ہم آپ کو منزہ سمجھتے ہیں سو ہم کو عذابِ دوزخ سے بچایئے اے ہمارے پروردگار بے شبہ آپ جس کو دوزخ میں داخل کریں اس کو واقعی رسوا ہی کر دیا اور ایسے بے انصافوں کا کوئی بھی ساتھ دینے والا نہیں۔ اے ہمارے پروردگار ہم نے ایک پکارنے والے کو سنا کہ وہ ایمان لانے کے واسطے اعلان کر رہے ہیں کہ تم اپنے پروردگار پر ایمان لاؤ سو ہم ایمان لے آئے۔ اے ہمارے پروردگار پھر ہمارے گناہوں کو معاف فرما دیجئے اور ہماری بدیوں کو بھی ہم سے زائل کر دیجئے اور ہم کو نیک لوگوں کی ساتھ موت دیجئے۔ اے ہمارے پروردگار اور ہم کو وہ چیز بھی دیجئے جس کا ہم سے اپنے پیغمبروں کی معرفت آپ نے وعدہ فرمایا اور ہم کو قیامت کے روز رسوا نہ کیجئے یقیناً آپ وعدہ خلافی نہیں کرتے۔ ○

دلائلِ توحید ☆

طبرانی میں ہے' حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ قریش یہودیوں کے پاس گئے اور ان سے پوچھا کہ حضرت موسیٰ تمہارے پاس کیا کیا معجزات لے کر آئے تھے؟ انہوں نے کہا: اژدہا بن جانے والی لکڑی اور چمکیلا ہاتھ۔ پھر نصرانیوں کے پاس گئے' ان سے کہا تمہارے پاس حضرت عیسیٰ کیا نشانیاں لائے تھے؟ جواب ملا کہ مادرزاد اندھوں کو بینا کر دینا اور کوڑھی کو اچھا کر دینا اور مردوں کو زندہ کر دینا۔ اب یہ قریش آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور آپ سے کہا: اللہ تعالیٰ سے دعا کیجئے کہ ہمارے لئے صفا پہاڑ کو سونے کا بنا دے۔ آپ نے دعا کی' جس پر یہ آیت نازل ہوئی: ﴿اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ یعنی نشان قدرت دیکھنے والوں کے لئے اسی میں بڑی نشانیاں ہیں۔ یہ اسی میں غور کریں گے تو ان قدرتوں والے اللہ کے سامنے جھک جائیں گے۔ لیکن اس روایت میں ایک اشکال ہے۔ وہ یہ کہ سوال مکہ شریف میں ہوا تھا اور یہ آیت مدینہ شریف میں نازل ہوئی ہے واللہ اعلم۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ آسمان جیسی بلند اور وسعت والی مخلوق اور زمین کی بڑی بڑی پیداوار مثلاً پہاڑ اور جنگل اور درخت اور گھاس اور کھیتیاں اور پھل اور مختلف قسم کے جاندار اور کانیں اور الگ الگ ذائقے والے اور طرح طرح کی خوشبوؤں والے اور مختلف خواص والے میوے وغیرہ۔ کیا یہ سب آیات ایک سوچ سمجھ والے انسان کی رہبری اللہ کی طرف نہیں کر سکتیں جو اور نشانیاں دیکھنے کی ضرورت باقی رہے۔ پھر دن رات کا آنا جانا اور ان کا کم زیادہ ہونا پھر برابر ہو جانا' یہ سب اس عزیز و علیم اللہ کی قدرت کاملہ کی پوری پوری نشانیاں ہیں۔ اسی لئے آخر میں فرمایا کہ ان عقل مندوں کے لئے کافی نشانیاں ہیں۔ جو پاک نفس والے ہر چیز کی حقیقت پر نظریں ڈالنے کی عادی ہیں اور بیوقوفوں کی طرح آنکھ کے اندھے

اور کان کے بہرے نہیں۔ جن کی حالت اور جگہ بیان ہوئی ہے کہ وہ آسمان اور زمین کی بہت سے نشانیاں پیروں تلے روندتے ہوئے گزر جاتے ہیں اور غور وفکر نہیں کرتے۔ ان میں اکثر باوجود اللہ کے ماننے کے پھر بھی شرک نہیں چھوڑتے۔ اب ان عقلمندوں کی صفتیں بیان ہو رہی ہیں کہ وہ اُٹھتے بیٹھتے لیٹتے اللہ کا نام جپا کرتے ہیں۔

صحیحین کی ایک حدیث میں ہے کہ حضور ﷺ نے حضرت عمران بن حصینؓ سے فرمایا: کھڑے ہو کر نماز پڑھا کرو۔ اگر طاقت نہ ہو تو بیٹھ کر اور یہ بھی نہ ہو سکے تو لیٹے لیٹے ہی سہی۔ یعنی کسی حالت میں ذکر اللہ سے غافل مت رہو۔ دل میں اور پوشیدہ اور زبان سے ذکر اللہ کرتے رہا کرو۔ یہ لوگ آسمان اور زمین کے پیدائش میں نظریں دوڑاتے ہیں اور ان کی حکمتوں پر غور کرتے ہیں۔ جو اس خالق یکتا کی عظمت وقدرت، علم وحکمت، اختیار ورحمت پر دلالت کرتی ہیں۔ حضرت شیخ سلیمان دارانی فرماتے ہیں: گھر سے نکل کر جس جس چیز پر میری نظر پڑتی ہے۔ میں دیکھتا ہوں کہ اس میں اللہ کی ایک نعمت موجود ہے اور میرے لئے وہ باعث عبرت ہے۔ حضرت امام حسن بصریؒ کا قول ہے کہ ایک ساعت غور وفکر کرنا رات بھر کے قیام کرنے سے افضل ہے۔ حضرت فضیلؒ فرماتے ہیں کہ حضرت حسنؒ کا قول کہ غور وفکر اور مراقبہ ایک ایسا آئینہ ہے جو تیرے سامنے تیری برائیاں بھلائیاں پیش کر دے گا۔ حضرت سفیان بن عیینہؒ فرماتے ہیں: غور وفکر ایک نور ہے جو تیرے دل پر اپنا پرتو ڈالے گا اور بسا اوقات یہ بیت پڑھتے۔

اِذَا لمَرأ كَانَتْ لَهُ فِكرَةٌ ☆ فَفِي كُلِّ شَيْءٍ لَهُ عِبْرَةٌ

یعنی جس انسان کو باریک بینی کی عادت اور سوچ سمجھ کی عادت پڑ گئی، اسے ہر چیز میں ایک عبرت اور آیت نظر آتی ہے۔ حضرت عیسیٰ فرماتے ہیں، خوش نصیب ہے وہ شخص جس کا بولنا ذکر اللہ اور نصیحت ہو اور اس کا خاموش رہنا غور وفکر ہو اور اس کا دیکھنا عبرت اور تنبیہ ہو۔ لقمان حکیم کا یہ حکمت آموز مقولہ بھی یاد رہے کہ تنہائی کی گوشہ نشینی جس قدر زیادہ ہو، اسی قدر غور وفکر اور انجام بینی زیادہ ہوتی ہے اور جس قدر یہ بڑھ جائے اسی قدر وہ راستے انسان پر کھل جاتے ہیں۔ جو اسے جنت میں پہنچا دیں۔ حضرت وہب بن منبہ فرماتے ہیں۔ جس قدر مراقبہ زیادہ ہوگا، اسی قدر سمجھ بوجھ تیز ہوگی اور جتنی سمجھ زیادہ ہوگی اُتنا علم نصیب ہوگا اور جس قدر علم زیادہ ہوگا، نیک اعمال بھی بڑھیں گے۔ حضرت عمر بن عبداللہ بن عبدالعزیزؒ کا ارشاد ہے کہ اللہ عزوجل کے ذکر میں زبان کا تر رہنا بہت اچھا ہے اور اللہ کی نعمتوں میں غور وفکر کرنا افضل عبادت ہے۔ حضرت مغیث اسودؒ مجلس میں بیٹھے ہوئے فرماتے ہیں کہ لوگو! قبرستان ہر روز جایا کرو، تاکہ تمہیں انجام کا خیال پیدا ہو۔ پھر اپنے دل میں اس منظر کو حاضر کرو کہ تم اللہ کے سامنے کھڑے ہو۔ پھر ایک جماعت کو جہنم میں لے جانے کا حکم ہوتا ہے اور ایک جماعت جنت میں جاتی ہے، اپنے دلوں کو اس حال میں جذب کر دو اور اپنے بدن کو بھی وہیں حاضر جان لو۔ جہنم کو اپنے سامنے دیکھو، اس کے ہتھوڑوں کو، اس کی آگ کے قید خانوں کو اپنے سامنے لاؤ، اتنا فرماتے ہی دھاڑیں مار مار کر رونے لگتے ہیں، یہاں تک کہ بے ہوش ہو جاتے ہیں۔

حضرت عبداللہ بن مبارکؒ فرماتے ہیں ایک شخص نے ایک راہب سے ایک قبرستان اور ایک کوڑا ڈالنے کی جگہ پر ملاقات کی اور اس سے کہا: اے راہب! تیرے پاس اس وقت دو خزانے ہیں، ایک خزانہ لوگوں کا یعنی قبرستان، ایک خزانہ مال کا یعنی کوڑا کرکٹ پاخانہ پیشاب ڈالنے کی جگہ۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کھنڈرات پر جاتے اور کسی ٹوٹے پھوٹے دروازے پر کھڑے رہ کر نہایت حسرت وافسوس کے ساتھ آواز نکالتے اور فرماتے: اے اُجڑے ہوئے مکانو! تمہارے رہنے والے کہاں

گئے؟ پھر خود فرماتے سب زیر زمین چلے گئے۔ سب فنا کا جام پی کے۔ صرف ذات اللہ کو بقا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا ارشاد ہے: دو رکعتیں جو دل جمعی کے ساتھ ساتھ ادا کی جائیں۔ اس نماز سے افضل ہیں' جس میں ساری رات گزار دی لیکن دلچسپی نہ تھی۔ خواجہ حسن بصریؒ فرماتے ہیں: اے ابن آدم! اپنے پیٹ کے تیسرے حصہ میں کھا۔ تیسرے حصہ میں پانی پی اور تیسرا ان سانسوں کے لئے چھوڑ' جس میں تو آخرت کی باتوں پر' اپنے انجام پر اور اپنے اعمال پر غور و فکر کر سکے بعض حکیموں کا قول ہے جو شخص دنیا کی چیزوں پر بغیر عبرت حاصل کئے نظر ڈالتا ہے۔ اس غفلت کے اندازے سے اس کی دلی آنکھیں کمزور پڑ جاتی ہیں۔ حضرت بشیر بن حارث حافی کا فرمان ہے کہ اگر لوگ اللہ تعالیٰ کی عظمت کا خیال کرتے تو ہرگز ان سے نافرمانیاں نہ ہوتیں۔ حضرت عامر بن قیسؒ فرماتے ہیں کہ میں نے بہت سے صحابہؓ سے سنا ہے کہ ایمان کی روشنی اور جودت' غور و فکر اور مراقبہ ہے۔ مسیح ابن مریم سیدنا حضرت عیسیٰؑ کا فرمان ہے کہ ابن آدم اے ضعیف انسان جہاں کہیں تو ہو اللہ تعالیٰ سے ڈرتا رہ۔ دنیا میں عاجزی اور مسکینی کے ساتھ رہ اپنا گھر مسجدوں کو بنا لے[1]۔ اپنی آنکھوں کو رونا سکھا۔ اپنے جسم کو صبر کی عادت سکھا۔ اپنے دل کو غور و فکر کرنے والا بنا' کل کی روزی کی فکر نہ کر۔

امیر المومنین حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ ایک مرتبہ ایک مجلس میں بیٹھے تھے' رو دیئے۔ لوگوں نے وجہ پوچھی تو آپ نے فرمایا: میں نے دنیا میں' اور اس کی لذتوں میں اور اس کی خواہشوں میں غور و فکر کیا اور عبرت حاصل کی۔ جب نتیجہ پر پہنچا تو میری امنگیں ختم ہو گئیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر شخص کے لئے اس میں عبرت و نصیحت ہے اور وعظ و پند ہے۔ حسین بن عبدالرحمٰنؒ نے بھی اپنے اشعار میں اس مضمون کو خوب نبھایا ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے اپنے ان بندوں کی مدح و ثنا بیان کی' جو مخلوقات اور کائنات سے عبرت حاصل کریں اور نصیحت لیں اور ان لوگوں کی مذمت بیان کی جو قدرت کی نشانیوں پر غور نہ کریں۔ مومنوں کی مدح میں بیان ہو رہا ہے کہ یہ لوگ اُٹھتے بیٹھتے اللہ کا ذکر کرتے ہیں زمین و آسمان کی پیدائش میں غور و فکر کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یا اللہ تو نے اس خلق کو عبث اور بیکار نہیں بنایا بلکہ حق کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ تاکہ بروں کی برائی کا بدلہ اور نیکوں کی نیکیوں کا بدلہ عطا فرمائے۔ پھر اللہ کی پاکیزگی بیان کرتے ہیں کہ تو اس سے منزہ ہے کہ کسی چیز کو مہمل بنائے۔ اے خالق خلق اور عدل و انصاف سے کائنات کو چلانے والے' اے نقصانوں اور عیبوں سے پاک ذات ہمیں اپنی طاقت و قوت سے ان اعمال کی توفیق و فیق فرما۔ جن سے ہم تیرے عذاب سے نجات پالیں اور تیری نعمتوں سے مالا مال ہو کر جنت میں داخل ہو جائیں۔ یہ یوں بھی کہتے ہیں کہ خدایا جسے تو جہنم میں لے جائے' اسے تو نے برباد کر دیا۔ ذلیل و خوار کر دیا اور مجمع حشر کے سامنے انہیں رسوا کیا۔ ظالموں کا کوئی مددگار نہیں۔ انہیں نہ کوئی چھڑانے والا ہے کہ تیرے ارادے کے آگے آ سکے۔ اے رب ہم نے پکارنے والے کی پکار کو سن لیا' جو ایمان اسلام کی طرف بلاتا ہے۔ مراد اس سے آنحضرت ﷺ ہیں۔ جو فرماتے ہیں کہ اپنے رب پر ایمان لاؤ' ہم ایمان لا چکے اور اس کی تابعداری اختیار کر چکے۔ پس ہمارے ایمان اور اتباع کی وجہ سے ہمارے گناہوں کو معاف فرما' ان کی پردہ پوشی کر اور ہماری برائیوں کو ہم سے دور کر دے اور ہمیں صالح اور نیک لوگوں کے ساتھ ملا دے۔ تو نے ہم سے جو وعدے اپنے رسولوں کی زبانی کئے ہیں' انہیں پورا کر اور یہ مطلب بھی بیان کیا گیا ہے کہ جو وعدہ تو نے اپنے رسولوں پر ایمان لانے کا کیا

[1] یعنی مسجد میں ایسا سکون اور راحت حاصل ہو جیسا کہ اپنے گھر میں ہوتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ گھر کی نسبت زیادہ اوقات مسجد میں گزارنا چاہئے اور اس میں عبادت وغیرہ کا اہتمام رکھنا چاہیے۔

تھا۔لیکن پہلے معنی ظاہر ہے۔

مسند احمد کی حدیث میں ہے' عسقلان دو عروس میں سے ایک ہے۔ یہیں سے قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ستر ہزار شخصوں کو کھڑا کرے گا۔ جن پر حساب کتاب ہی نہیں۔ یہیں سے پچاس ہزار شہید اُٹھیں گے۔ جو وفد بن کر اللہ کے یہاں جائیں گے۔ یہیں شہیدوں کی صفیں ہوں گی' جن کے سر کٹے ہوئے ان کے ہاتھوں میں ہوں گے۔ ان کی گردن کی رگوں سے خون جاری ہوگا۔ یہ کہتے ہوں گے خدایا ہم سے جو وعدے اپنے رسولوں کی معرفت تو نے کیے ہیں انہیں پورا کر۔ ہمیں قیامت کے دن رسوا نہ کر تو وعدہ خلافی سے پاک ہے۔ اللہ فرمائے گا: میرے یہ بندے سچے ہیں۔ انہیں نہر بیضہ میں غسل دو۔ وہ یہاں میں غسل کر کے پاک صاف گورے چٹے رنگ کے ہو کر نکلیں گے اور ساری جنت ان کے لئے مباح ہوگی۔ جہاں چاہیں جائیں آئیں' جو چاہیں کھائیں پئیں' یہ حدیث غریب ہے اور بعض تو کہتے ہیں موضوع ہے واللہ اعلم۔ ہمیں قیامت کے دن تمام لوگوں کے مجمع میں رسوا نہ کر۔ تیرے وعدے سچے ہی ہیں۔ تو نے جو کچھ خبریں اپنے رسولوں کی زبانی پہنچائی ہیں' سب سچی ہیں' روز قیامت ضرور آنا ہے پس تو ہمیں اس دن کی رسوائی سے نجات دے۔ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں کہ بندے پر رسوائی' ذلت ڈپٹ' عار' اور شرمندگی اس قدر ڈالی جائے گی اور اس طرح اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑا کر کے اسے قائل معقول کیا جائے گا کہ وہ کہے گا کہ کاش جہنم میں ہی ڈال دیا جاتا۔ (ابو یعلی) اس حدیث کی سند بھی غریب ہے۔ احادیث سے یہ بھی ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ رات کو تہجد کے لئے جب اُٹھتے تب سورہ آل عمران کی دس آخری آیتوں کی تلاوت فرماتے۔ چنانچہ بخاری شریف میں ہے' حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں: میں نے اپنی خالہ حضرت میمونہؓ کے گھر رات گزاری۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جب آئے تو تھوڑی دیر تک تو آپ حضرت میمونہؓ سے باتیں کرتے رہے۔ پھر سو گئے۔ جب آخری تہائی رات باقی رہ گئی تو آپ اُٹھ بیٹھے اور آسمان کی طرف نگاہ کر کے ﴿إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ﴾ سے آخر سورت تک کی آیتیں تلاوت فرمائیں۔ پھر کھڑے ہوئے مسواک کر کے وضو کیا اور گیارہ رکعت نماز ادا کی۔ حضرت بلال کی صبح کی اذان سن کر پھر دو رکعتیں صبح کی سنتیں پڑھیں۔ پھر مسجد میں تشریف لا کر لوگوں کو صبح کی نماز پڑھائی۔ صحیح بخاری میں یہ روایت دوسری جگہ بھی ہے کہ بستر کے عرض میں تو میں سویا اور لمبائی میں آنحضرت ﷺ اور آپ کی بیوی صاحبہ ام المومنین حضرت میمونہؓ لیٹیں۔ آدھی رات کے قریب قریب کچھ پہلے یا کچھ بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم جاگے اور اپنے ہاتھوں سے اپنی آنکھیں ملتے ہوئے ان دس آیتوں کی تلاوت کی۔ پھر ایک لٹکتی ہوئی مشک میں سے پانی لے کر بہت اچھی طرح کامل وضو کیا اور نماز کو کھڑے ہوگئے' میں نے بھی اسی طرح سب کچھ کیا اور آپ کی بائیں جانب آپ کی اقتدار میں نماز کے لئے کھڑا ہوگیا۔ حضور ﷺ نے اپنے داہنے ہاتھ سے میرے کان کو پکڑ کر مجھے دائیں جانب کر لیا اور دو دو رکعتیں کر کے چھ مرتبہ یعنی بارہ رکعتیں پڑھیں۔ پھر وتر پڑھا اور لیٹ گئے۔ یہاں تک کہ مؤذن نے آ کر نماز کی اطلاع دی۔ آپ نے کھڑے ہو کر دو ہلکی رکعتیں پڑھیں اور باہر آ کر صبح کی نماز پڑھائی۔

ابن مردویہ کی اس حدیث میں ہے۔ حضرت عبداللہ فرماتے ہیں۔ مجھے میرے والد حضرت عباسؓ نے فرمایا کہ تم آج کی رات حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی آل میں گزار دو اور آپ کی رات کی نماز کی کیفیت دیکھو۔ رات کو جب عشاء کی نماز پڑھ کر لوگ چلے گئے۔ میں بیٹھا رہا۔ جب حضور ﷺ جانے لگے تو مجھے دیکھ کر فرمایا: عبداللہ؟ میں نے کہا: جی ہاں۔ فرمایا کیوں رکے ہوئے ہو؟ میں نے کہا: والد صاحب کا حکم ہے کہ رات آپ کے گھر گزاروں۔ تو فرمایا: بہت اچھا آؤ۔ گھر آ کر فرمایا بستر

بچھاؤ۔ ٹاٹ کا تکیہ آیا اور حضور ﷺ اس پر سر رکھ کر سو گئے۔ یہاں تک کہ مجھے آپ کے خراٹوں کی آواز آنے لگی۔ پھر آپ جاگے اور سیدھی طرح بیٹھ کر آسمان کی طرف دیکھ کر تین مرتبہ سُبحَانَ المَلِكِ القُدُّوس پڑھا اور پھر سورہ آل عمران کے خاتمہ کی یہ آیتیں پڑھیں اور روایت میں ہے کہ آیتوں کی تلاوت کے بعد حضور ﷺ نے یہ دعا پڑھی: اَللّٰھُمَّ اجعَل فِي قَلبِي نُوراً وَّفِي سَمعِي نُوراً وَّفِي بَصَرِي نُوراً وَّعَن يَّمِينِي نُوراً وَّعَن شِمَالِي نُوراً وَّمِن بَينِ يَدَيَّ نُوراً وَّمِن خَلفِي نُوراً وَّمِن فَوقِي نُوراً وَّمِن تَحتِي نُوراً وَّاَعظِم لِي نُوراً يَّومَ القِيَامَةِ (ابن مردویہ) یہ دعا بعض صحیح طرق سے بھی مروی ہے۔

اس آیت کی تفسیر کے شروع میں طبرانی کے حوالہ سے جو حدیث گزری ہے اس سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت مکی ہے لیکن مشہور اس کے خلاف ہے۔ یعنی یہ کہ یہ آیت مدنی ہے اور اس کی دلیل میں یہ حدیث پیش ہو سکتی ہے جو ابن مردویہ میں ہے کہ حضرت عطا، حضرت ابن عمر، حضرت عبید بن عمیر، حضرت عائشہ صدیقہ کے پاس آئے۔ آپ کے اور ان کے درمیان پردہ تھا۔ حضرت صدیقہ نے پوچھا: عبید تم کیوں نہیں آیا کرتے؟ حضرت عبید نے جواب دیا: اماں جان صرف اس لئے کہ کسی شاعر کا قول ہے: زُر غِبًّا تَزدَد حُبًّا یعنی ملاقات کم کیا کرو تا کہ محبت بڑھے۔ حضرت ابن عمرؓ نے کہا اب ان باتوں کو چھوڑیئے۔ اُم المومنین ہم یہ پوچھنے کے لئے حاضر ہوئے ہیں کہ سب سے زیادہ عجیب بات جو آپ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دیکھی ہو وہ ہمیں بتایئے؟ حضرت عائشہ رو دیں اور فرمانے لگیں: حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام کام عجیب تر تھے۔ اچھا ایک واقعہ سنو ایک رات میری باری میں حضور ﷺ میرے پاس آئے اور میرے ساتھ سوئے۔ پھر مجھ سے فرمانے لگے عائشہ میں اپنے رب کی کچھ عبادت کرنا چاہتا ہوں مجھے جانے دے میں نے کہا: یارسول اللہ کی قسم میں آپ کا قرب چاہتی ہوں اور یہ بھی میری خواہش ہے کہ آپ رب عزوجل کی عبادت بھی کریں۔ اب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہوئے اور ایک مشک میں سے پانی لے کر آپ ﷺ نے ہلکا سا وضو کیا اور نماز کے لئے کھڑے ہو گئے۔ پھر جو رونا شروع کیا تو اتنا روئے کہ داڑھی مبارک تر ہو گئی۔ پھر سجدے میں گئے اور اس قدر روئے کہ زمین تر ہو گئی۔ پھر کروٹ کے بل لیٹ گئے اور روتے ہی رہے۔ یہاں تک کہ حضرت بلالؓ نے آکر نماز کے لئے بلایا اور آپ ﷺ کے آنسو رواں دیکھ کر دریافت کیا کہ اے اللہ کے سچے رسول آپ کیوں رو رہے ہیں؟ اللہ تعالیٰ نے تو آپ ﷺ کے تمام اگلے پچھلے گناہ معاف فرما دیئے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: بلال میں کیوں نہ روؤں! مجھ پر آج کی رات یہ آیت اتری ہے: ﴿اِنَّ فِي خَلقِ السَّمٰوٰتِ﴾ ویل ہے اس شخص کے لئے جو اسے پڑھے اور پھر اس میں غور و تدبر نہ کرے۔ عبد بن حمید کی تفسیر میں بھی یہ حدیث ہے۔ اس میں یہ بھی ہے کہ جب ہم حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے پاس گئے۔ ہم نے سلام کیا تو آپ نے پوچھا تم کون ہو؟ ہم نے اپنے نام بتائے اور آخر میں یہ بھی ہے کہ نماز کے بعد آپ ﷺ اپنی داہنی کروٹ پر لیٹے۔ رخسار تلے ہاتھ رکھا اور روتے رہے۔ یہاں تک کہ آنسوؤں سے زمین تر ہو گئی اور حضرت بلالؓ کے جواب میں آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا کہ کیا میں شکر گزار بندہ نہ بنوں؟ اور آیتوں کے نازل ہونے کے بارے میں ﴿عَذَابَ النَّارِ﴾ تک آپ ﷺ نے تلاوت کی۔ ابن مردویہ کی ایک ضعیف سند والی حدیث میں حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ سورۃ آل عمران کے آخر کی دس آیتیں ہر رات کو پڑھتے۔ اس روایت میں مظاہر بن اسلم ضعیف ہیں۔

فَاسۡتَجَابَ لَهُمۡ رَبُّهُمۡ اَنِّيۡ لَاۤ اُضِيۡعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنۡكُمۡ مِّنۡ ذَكَرٍ اَوۡ اُنۡثٰى‌ۚ بَعۡضُكُمۡ مِّنۡۢ بَعۡضٍ‌ۚ فَالَّذِيۡنَ هَاجَرُوۡا وَاُخۡرِجُوۡا مِنۡ دِيَارِهِمۡ وَاُوۡذُوۡا فِىۡ سَبِيۡلِىۡ وَقٰتَلُوۡا وَقُتِلُوۡا لَاُكَفِّرَنَّ عَنۡهُمۡ سَيِّاٰتِهِمۡ وَلَاُدۡخِلَنَّهُمۡ جَنّٰتٍ تَجۡرِىۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ‌ۚ ثَوَابًا مِّنۡ عِنۡدِ اللّٰهِ‌ؕ وَاللّٰهُ عِنۡدَهٗ حُسۡنُ الثَّوَابِ ﴿۱۹۵﴾

سو منظور کر لیا ان کی درخواست کو ان کے رب نے اس وجہ سے کہ میں کسی شخص کے کام کو جو کہ تم میں سے کام کرنے والا ہوا کارت نہیں کرتا۔ خواہ وہ مرد ہو یا عورت ہو۔ تم آپس میں ایک دوسرے کے جزو ہو سو جن لوگوں نے ترک وطن کیا اور اپنے گھروں سے نکالے گئے اور تکلیفیں دیئے گئے میری راہ میں اور جہاد کیا اور شہید ہو گئے ضرور ان لوگوں کی تمام خطائیں معاف کر دوں گا اور ضرور ان کو ایسے باغوں میں داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی یہ عوض ملے گا اللہ کے پاس سے اور اللہ ہی کے پاس اچھا عوض ہے

نیک عمل کبھی ضائع نہیں ہوتا ☆

یہاں اِستَجَابَ معنی میں اَجَابَ کے ہے اور عربی زبان میں مستعمل ہے۔ حضرت ام سلمہؓ نے ایک روز حضور ﷺ سے پوچھا کہ کیا بات ہے عورتوں کی ہجرت کا کہیں قرآن میں اللہ ذکر ہی نہیں کرتا۔ اس پر یہ آیت اتری۔ انصار کا بیان ہے کہ عورتوں میں سب سے پہلے مہاجرہ عورت جو ہودج میں آئیں حضرت ام سلمہؓ ہی تھیں۔ ام سلمہؓ سے یہ بھی روایت ہے کہ یہ آیت سب سے آخر میں اتری ہے۔ مطلب آیت کا یہ ہے کہ صاحب عقل اور صاحب ایمان لوگوں نے جب اللہ تعالیٰ سے دعائیں مانگیں' جن کا ذکر پہلے کی آیتوں میں تھا تو اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے بھی ان کی منہ مانگی مراد انہیں عطا فرمائی۔ اسی لئے اس آیت کو ف سے شروع کیا۔ جیسے اور جگہ ہے: ﴿وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيۡ﴾ (البقرہ:۱۸۶) یعنی میرے بندے تجھ سے میرے بارے میں سوال کریں تو تو کہہ دے کہ میں تو بہت ہی نزدیک ہوں۔ جب بھی کوئی پکارنے والا مجھے پکارتا ہے میں اس کی پکار کو قبول فرما لیتا ہوں۔ پس انہیں بھی چاہئے کہ میری بھی مان لیا کریں اور مجھ پر ایمان رکھیں۔ کیا عجب کہ یہ رشد و ہدایت پا لیں۔ پھر قبولیت دعا کی تفسیر ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ خبر دیتا ہے کہ وہ کسی عامل کے عمل کو ضائع نہیں کرتا۔ بلکہ ہر ایک کو پورا پورا بدلہ عطا فرماتا ہوں۔ خواہ مرد ہو خواہ عورت۔ ہر ایک میرے پاس ثواب میں اور اعمال کے بدلے میں یکساں ہے۔ پس جو لوگ شرک کی جگہ کو چھوڑیں اور ایمان کی جگہ آ جائیں۔ دار الکفر سے ہجرت کریں' بھائیوں' دوستوں' پڑوسیوں اور اپنوں کو اللہ کے نام پر ترک کر دیں۔ مشرکوں کی ایذائیں سہہ سہہ کر' تھک کر عاجز آ کر ایمان کو تو نہ چھوڑیں بلکہ اپنے پیارے وطن سے منہ موڑ لیں۔ لوگوں کا انہوں نے کوئی نقصان نہیں کیا تھا۔ جس کے بدلے میں انہیں ستایا جاتا۔ بلکہ ان کا صرف یہ قصور تھا کہ میری راہ کے

پیچھے لگنے والے تھے۔ صرف میری توحید کی وجہ سے دنیا کی دشمنی مول لے لی تھی۔ میری راہ پر چلنے کے باعث طرح طرح سے ستائے جاتے تھے۔

جیسے اور جگہ ہے: ﴿يُخْرِجُوْنَ الرَّسُوْلَ وَاِيَّاكُمْ اَنْ تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ رَبِّكُمْ﴾ (الممتحنہ:۱) یہ لوگ رسول کو اور تمہیں صرف اس بنا پر دیس نکالا دیتے ہیں کہ تم اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔ جو تمہارا رب ہے اور ارشاد ہے: ﴿وَمَا نَقَمُوْا مِنْهُمْ اِلَّا اَنْ يُّؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ﴾ (البروج ۸) ان سے دشمنی اس وجہ سے ہے کہ یہ اللہ عزیز وحمید پر ایمان لائے ہیں۔ پھر فرماتا ہے انہوں نے جہاد بھی کئے اور یہ شہید بھی ہوئے۔ یہ اعلیٰ درجہ ہے اور بلند مرتبہ ہے کہ اللہ کی راہ میں جہاد کرتا ہے۔ سواری کٹ جاتی ہے۔ منہ خاک وخون میں مل جاتا ہے۔ صحیحین میں ہے کہ ایک شخص نے کہا: یارسول اللہ ﷺ! اگر میں صبر کے ساتھ نیک نیتی سے دلیری سے پیچھے نہ ہٹ کر راہ اللہ میں جہاد کروں اور پھر شہید کر دیا جاؤں' تو اللہ تعالیٰ میری خطائیں معاف کر دے گا؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں۔ پھر دوبارہ آپ ﷺ نے اس سے سوال کیا کہ ذرا پھر کہنا تم نے کیا کہا تھا؟ اس سے دوبارہ سوال دہرایا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں' مگر قرض معاف نہ ہوگا۔ یہ بات جبرئیل علیہ السلام ابھی مجھ سے کہہ گئے۔

پس یہاں فرماتے ہے کہ میں ان کی بدیاں معاف فرمادوں گا اور انہیں جنتوں میں لے جاؤں گا۔ جس میں چاروں طرف نہریں بہہ رہی ہیں۔ جن میں سے کسی میں دودھ ہے' کسی میں شہد' کسی میں شراب' کسی میں صاف پانی اور اس میں وہ نعمتیں ہوں گی' جو نہ کسی کان نے سنی نہ کسی آنکھ نے دیکھیں۔ نہ کبھی انسانی دل پر خیال گزرا۔ یہ ہے بدلہ اللہ کی طرف سے۔ ظاہر ہے کہ جو ثواب اس شہنشاہ عالی کی طرف سے ہو وہ کس قدر زبردست اور بے انتہا ہوگا۔ جیسے کسی شاعر کا قول ہے کہ اگر وہ عذاب کرے تو وہ بھی مہلک اور برباد کر دینے والا' اور اگر انعام دے تو وہ بھی بے حساب۔ قیاس سے بڑھ کر۔ کیونکہ اس کی ذات بے پرواہ ہے۔ نیک اعمال لوگوں کا بہترین بدلہ اللہ ہی کے پاس ہے۔ حضرت شداد بن اوس فرماتے ہیں: لوگو! اللہ تعالیٰ کے فیصلہ پر غمگین اور بے صبرے نہ ہو جایا کرو۔ سنو مومن پر ظلم وجور نہیں ہوتا۔ اگر تمہیں خوشی اور راحت پہنچے تو اللہ کی حمد اور اس کا شکر کرو اور اگر برائی پہنچے تو صبر وتحمل کرو اور نیکی اور ثواب کی تمنا رکھو۔ اللہ تعالیٰ کے پاس بہترین بدلے اور پاکیزہ ثواب ہیں۔

لَا يَغُرَّنَّكَ تَقَلُّبُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِي الْبِلَادِ ﴿۱۹۶﴾ مَتَاعٌ قَلِيْلٌ ثُمَّ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ط وَبِئْسَ الْمِهَادُ ﴿۱۹۷﴾ لٰكِنِ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا نُزُلًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ط وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ لِّلْاَبْرَارِ ﴿۱۹۸﴾

تجھ کو ان کافروں کا شہروں میں چلنا پھرنا مغالطہ میں نہ ڈال دے چند روز بہار ہے پھر ان کا ٹھکانہ دوزخ ہوگا اور وہ بری آرام گاہ ہے لیکن جو لوگ اللہ سے ڈریں ان کیلئے باغات ہیں جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی۔ وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے یہ مہمانی ہوگی اللہ کی طرف سے اور جو چیزیں اللہ کے پاس ہیں وہ نیک بندوں کیلئے بدرجہا بہتر ہیں۔ ۝

متاعِ قلیل ☆

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ان کافروں کی بدمستی' ان کے ناز ونعم' ان کی راحت و آرام' ان کی خوش حالی اور فارغ البالی کی طرف اے نبی آپ نظریں نہ ڈالئے۔ یہ سب کچھ زائل ہو جائے گا اور صرف ان کی بداعمالیاں عذاب کی صورت میں ان پر باقی رہ جائیں گی۔ ان کی یہ تمام نعمتیں آخرت کے مقابلہ میں بالکل ہیچ ہیں۔ اسی مضمون کی بہت سی آیتیں قرآن کریم میں ہیں۔ مثلاً: ﴿مَا يُجَادِلُ فِيْٓ اٰيٰتِ اللّٰهِ اِلَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَلَا يَغْرُرْكَ تَقَلُّبُهُمْ فِي الْبِلَادِ﴾ (المؤمن:۴) اللہ کی آیتوں میں کافر ہی جھگڑتے ہیں۔ ان کا شہروں گھومنا پھرنا تجھے دھوکے میں نہ ڈال دے اور جگہ ہے ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ﴾ (یونس:۶۹'۷۰) جو لوگ اللہ پر جھوٹ باندھتے ہیں۔ وہ فلاح نہیں پاتے۔ دنیا میں چاہے معمولی سا فائدہ اٹھالیں۔ لیکن آخر لوٹنا تو ہماری طرف ہی ہے۔ پھر ہم انہیں ان کے کفر کی پاداش میں سخت تر سزائیں دیں گے اور جگہ ہے' انہیں ہم تھوڑا سا فائدہ پہنچا کر پھر سخت عذاب سے بےبس کر دیں گے اور جگہ ہے کافروں کو کچھ ڈھیل دے دے اور جگہ ہے کیا وہ شخص ہمارے عمدگی کے وعدے کو پا لینے والا ہے اور جو دنیا میں آرام سے گزار رہا ہے اور قیامت کے دن عذاب میں مبتلا ہونے والا ہے' برابر ہو سکتے ہیں؟ چونکہ کافروں کا دینوی اور اُخروی حال بیان ہوا ہے۔ اسلئے ساتھ ہی مؤمنوں کا ذکر ہو رہا ہے کہ یہ متقی گروہ قیامت کے دن نہروں والی بہشتوں میں ہوگا۔ ابن مردویہ میں ہے رسول ﷺ فرماتے ہیں: انہیں ابرار اسلئے کہا جاتا ہے کہ یہ ماں باپ کے ساتھ اور اولاد کے ساتھ نیک سلوک کرنے والے تھے۔ جس طرح تیرے ماں باپ کا تجھ پر حق ہے' اسی طرح تیری اولاد کا تجھ پر حق ہے۔ یہی روایت حضرت ابن عمرو سے موقوفاً بھی نقل ہے اور موقوف ہونا ہی زیادہ ٹھیک نظر آتا ہے۔ واللہ اعلم۔

حضرت حسن فرماتے ہیں ابرار وہ ہیں جو کسی کو ایذا نہ دیں۔ حضرت عبداللہ بن مسعود فرماتے ہیں' ہر شخص کے لئے خواہ نیک ہو خواہ بد موت اچھی چیز ہے اگر نیک ہے تو جو کچھ اس کے اللہ کے پاس ہے وہ بہت ہی بہتر ہے اور اگر بد ہے تو اللہ کے عذاب اور اس کے گناہ بھی اس کی زندگی میں بڑھ رہے تھے۔ اب بڑھوتری ختم ہوئی۔ پہلے کی دلیل ﴿وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ لِّلْاَبْرَارِ﴾ اور دوسرے کی دلیل ﴿لَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنَّمَا نُمْلِيْ لَهُمْ خَيْرٌ لِّاَنْفُسِهِمْ﴾ (آل عمران:۱۷۸) یعنی کافر ہماری ڈھیل دینے کو اپنے حق میں بہتر نہ خیال نہ کریں۔ یہ ڈھیل انہیں گناہوں میں بڑھا رہی ہے اور ان کے لئے رسوا کن عذاب ہیں۔ حضرت ابو الدردؓ سے بھی یہی منقول ہے۔

وَاِنَّ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَمَنْ يُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ خٰشِعِيْنَ لِلّٰهِ ۙ لَا يَشْتَرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۭ اُولٰۗىِٕكَ لَھُمْ اَجْرُھُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ﴿۱۹۹﴾ يٰٓاَيُّھَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا ۣ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۲۰۰﴾ ع ۲۰

اور بالیقین بعض لوگ اہل کتاب میں ایسے بھی ضرور ہیں ۔ جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ اعتقاد رکھتے ہیں اور اس کتاب کے ساتھ بھی جو تمہارے پاس بھیجی گئی اور اس کتاب کے ساتھ بھی جو ان کے پاس بھیجی گئی اس طور پر کہ اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہیں ۔ اللہ تعالیٰ کی آیات کے مقابلہ میں کم حقیقت معاوضہ نہیں لیتے ایسے لوگوں کو ان کا نیک عوض ملے گا ان کے پروردگار کے پاس' بلاشبہ اللہ تعالیٰ جلدی حساب کردیں گے ۔ اے ایمان والو! خود صبر کرو اور مقابلہ میں صبر کرو اور مقابلہ کے لئے مستعد رہو اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو تا کہ تم پورے کامیاب ہو ۔ ○

اہلِ کتاب ☆

اللہ تعالیٰ اہل کتاب کے اس فرقے کی تعریف کرتا ہے جو پورے ایمان والا ہے' قرآن کو بھی مانتا ہے اور اپنے نبی کی کتاب پر بھی ایمان رکھتا ہے ۔ اللہ تعالیٰ کا ڈر دل میں رکھ کر خدائی فرمانوں کی بجا آوری میں نہایت تندہی کے ساتھ مشغول ہے ۔ رب کے سامنے عاجزی اور گریہ وزاری کرتا رہتا ہے ۔ پیغمبر آخرالزماں صلی اللہ علیہ وسلم کے جو پاک اوصاف اور صاف نشانیاں ان کی کتابوں میں ہیں' اسے چھپاتا نہیں' بلکہ ہر ایک کو دکھاتا ہے اور آپ کے مان لینے کی رغبت دلاتا ہے ۔ ایسی جماعت اللہ کے پاس اجر پائے گی ۔ خواہ وہ یہودیوں کی ہو' خواہ نصرانیوں کی ۔ سورہ قصص میں یہ مضمون اس طرح بیان ہوا ہے: ﴿الَّذِیۡنَ اٰتَیۡنٰهُمُ الۡكِتٰبَ ﴾ (القصص: ۵۲) جنہیں ہم نے اس سے پہلے کتاب دے رکھی ہے وہ اس پر بھی ایمان لاتے ہیں اور جب یہ کتاب ان پر پڑھی جاتی ہے تو صاف کہہ دیتے ہیں کہ ہم اس پر ایمان لائے ۔ یہ برحق کتاب میرے ربّ کی ہے ۔ ہم تو پہلے ہی اسے مانتے تھے ۔ انہیں ان کے صبر کا دوہرا اجر دیا جائے گا اور جگہ ہے جنہیں ہم نے کتاب دی اور جو اسے صحیح طور پر پڑھتے ہیں تو وہ اس قرآن پر بھی فوراً ایمان لاتے ہیں اور جگہ ارشاد ہے: ﴿وَمِنۡ قَوۡمِ مُوۡسٰۤى اُمَّةٌ يَّهۡدُوۡنَ بِالۡحَـقِّ وَبِهٖ يَعۡدِلُوۡنَ ﴾ (الاعراف: ۱۵۹) حضرت موسیٰ کی قوم میں سے ایک جماعت حق کی ہدایت والی اور حق کے ساتھ عدل کرنے والی ہے اور مقام پر بیان ہے: ﴿لَيۡسُوۡا سَوَآءً ﴾ (آل عمران: ۱۱۳) یعنی اہل کتاب سب یکساں نہیں' ان میں ایک جماعت رات کے وقت بھی کتاب اللہ پڑھنے والی ہے اور سجدے کرنے والی ہے اور جگہ ہے: اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم تم کہو کہ لوگو تم ایمان لاؤ یا نہ لاؤ پہلے سے جنہیں علم دیا گیا ہے' جب ان پر اس کلام مجید کی آیتیں تلاوت کی جاتی ہیں ۔ تو وہ اپنے چہروں کے بل سجدے میں گر پڑتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمارا ربّ پاک ہے ۔ یقیناً اس کا وعدہ سچا ہے اور ہو کر رہنے والا ہے ۔ یہ لوگ روتے ہوئے منہ کے بل گرتے ہیں اور خشوع اور خضوع میں بڑھ جاتے ہیں ۔ یہ صفتیں یہودیوں میں پائی گئیں ۔ گو بہت کم لوگ ایسے تھے ۔ مثلاً حضرت عبداللہ بن سلامؓ اور آپ ہی جیسے اور یہودی علماء لیکن ان کی گنتی دس تک بھی نہیں پہنچتی ۔ ہاں نصرانی اکثر ہدایت پر آ گئے اور حق کے فرمانبردار ہو گئے ۔ جیسے اور جگہ ہے: ﴿لَتَجِدَنَّ اَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِّلَّذِيۡنَ اٰمَنُوا الۡيَهُوۡدَ وَالَّذِيۡنَ اَشۡرَكُوۡا﴾ سے ﴿خٰلِدِيۡنَ فِيۡهَا ﴾ (المائدہ ۶۲) آخر آیت تک ۔ مطلب یہ ہے کہ ایمان والوں سے عداوت اور دشمنی رکھنے میں سب سے زیادہ بڑھے ہوئے یہود ہیں اور مشرک اور ایمان والوں سے محبت رکھنے والوں میں پیش پیش نصرانی ہیں ۔ اب فرماتا ہے ایسے لوگ اللہ کے ہاں اجر عظیم کے مستحق ہیں ۔ حدیث میں یہ بھی آ چکا ہے کہ حضرت جعفر بن ابو طالبؓ نے جب سورہ مریم کی تلاوت شاہ نجاشی کے دربار میں بادشاہ اور ارا کین سلطنت اور علمائے بصریٰ کے سامنے کی اور اس میں آپ پر رقت طاری ہوئی تو سب حاضرین مع بادشاہ کے رو دیئے اور اس قدر متاثر ہوئے کہ روتے روتے ان کی داڑھیاں تر ہو گئیں ۔ صحیح بخاری اور

مسلم میں ہے کہ نجاشی کے انتقال کی خبر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب کو دی اور فرمایا کہ تمہارا بھائی حبشہ میں انتقال کر گیا ہے اس کے جنازے کی نماز ادا کرو اور میدان میں جا کر صحابہ کی صفیں مرتب کر کے آپ نے ان کے جنازے کی نماز ادا کی۔ ابن مردویہ میں ہے کہ جب نجاشی فوت ہوئے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اپنے بھائی کے لئے استغفار کرو تو بعض لوگوں نے کہا: دیکھئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں اس نصرانی کے لئے استغفار کرنے کا حکم دیتے ہیں جو حبشہ میں مرا ہے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی گویا اس کے مسلمان ہونے کی شہادت قرآن کریم نے دی ابن جریر میں ہے کہ ان کی موت کی خبر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دی کہ تمہارا بھائی اصحمہ انتقال کر گیا۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم باہر نکلے اور جس طرح جنازے کی نماز پڑھاتے تھے اسی طرح چار تکبیروں سے نماز جنازہ پڑھائی۔ اس پر منافقوں نے وہ اعتراض کیا اور یہ آیت اتری۔ ابوداؤد میں ہے کہ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ نجاشی کے انتقال کے بعد ہم یہی سنتے رہے کہ ان کی قبر پر نور دیکھا جاتا ہے۔ مستدرک حاکم میں ہے کہ نجاشی کا ایک دشمن اسی کی سلطنت میں سے نجاشی پر چڑھ آیا تو مہاجرین نے کہا: آپ اس سے مقابلہ کرنے کے لئے چلئے ہم بھی آپ کے ساتھ ہیں آپ ہماری بہادری کے جوہر دیکھ لیں گے اور جو حسن سلوک آپ نے ہمارے ساتھ کیا ہے اسکا بدلہ بھی ہو جائے گا۔ لیکن نجاشیؓ نے فرمایا کہ لوگوں کی امداد کے ذریعے بچاؤ کرنے سے اللہ کی امداد حاصل کرنا بہتر ہے اس بارے میں یہ آیت نازل ہوئی۔

حضرت مجاہدؒ فرماتے ہیں: اس سے مراد اہل کتاب کے مسلمان لوگ ہیں۔ حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں: اس سے مراد وہ اہل کتاب ہیں جو حضورؐ سے پہلے تھے۔ اسلام کو پہچانتے تھے اور حضور کی رسالت پر ایمان کا بھی شرف انہیں حاصل ہوا تو انہیں اجر بھی دوہرا ملا۔ ایک تو حضور سے پہلے کے ایمان کا۔ دوسرا آپ پر ایمان لانے کا۔ بخاری مسلم میں حضرت ابوموسیٰؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تین قسم کے لوگوں کو دوہرا اجر ملتا ہے۔ جن میں سے ایک اہل کتاب کا وہ شخص جو اپنے نبی پر ایمان لایا اور مجھ پر بھی ایمان لایا اور باقی دو کا بھی ذکر کیا۔ اللہ کی آیتوں کو تھوڑی قیمت پر نہیں بیچتے یعنی اپنے پاس کی علمی باتوں کو چھپاتے نہیں۔ جیسے کہ ان میں سے ایک رذیل جماعت کا شیوہ تھا۔ بلکہ یہ لوگ تو اسے پھیلاتے اور خوب ظاہر کرتے۔ ان کا بدلہ ان کے رب کے پاس ہے۔ اللہ تعالیٰ جلد حساب لینے والا ہے۔ یعنی جلد سمیٹنے اور گھیرنے اور شمار کرنے والا ہے۔ پھر فرماتا ہے کہ اسلام جیسے میرے پسندیدہ دین پر جمے رہو شدت اور نرمی کے وقت مصیبت اور راحت کے وقت غرض کسی حال میں اسے نہ چھوڑو۔ یہاں تک کہ دم بھی نکلے تو اسی پر نکلے اور اپنے ان دشمنوں سے بھی صبر و تحمل کرو جو اپنے دین کو چھپاتے ہیں۔ امام حسن بصریؒ وغیرہ علمائے سلف نے یہی تفسیر کی ہے۔

مُرَابَطَة کہتے ہیں عبادت کی جگہ میں ہمیشگی کرنے کو اور ثابت قدمی سے جم جانے کو اور کہا گیا ہے ایک نماز کے بعد دوسری نماز کے انتظار کو۔ یہی قول ہے حضرت عبداللہ بن عباسؓ، سہیل بن حنیف اور محمد بن کعب قرظی کا صحیح مسلم شریف اور نسائی میں ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: آؤ میں تمہیں بتاؤں کہ کس چیز سے اللہ تعالیٰ گناہوں کو ختم کر دیتا ہے اور درجات کو بڑھاتا ہے۔ تکلیف ہوتے ہوئے کامل وضو کرنا[1] دور سے چل کر مسجدوں میں آنا۔ ایک نماز کے بعد دوسری نماز کا انتظار کرنا یہی رباط ہے یہی مرابط ہے یہی اللہ کی راہ کی مستعدی ہے۔ ابن مردویہ میں ہے کہ ابوسلمہؓ سے ایک دن حضرت ابوہریرہؓ نے

[1] مثلاً نہایت سردی کا زمانہ ہے ساتھ ہے ٹھنڈا پانی جس کے استعمال سے تکلیف ہوتی ہے لیکن پھر بھی باسی پانی کو استعمال کرتا ہے اور وضو پوری طرح احتیاط سے کرتا ہے۔

پوچھا: اے میرے بھتیجے! جانتے ہو اس آیت کا شان نزول کیا ہے؟ انہوں نے کہا مجھے معلوم نہیں' آپ نے فرمایا: سنو! اس وقت کوئی غزوہ نہ تھا' یہ آیت ان لوگوں کے حق میں نازل ہوئی ہے جو مسجدوں کو آباد رکھتے تھے اور نمازوں کو ٹھیک وقت پر ادا کرتے تھے۔ پھر اللہ کا ذکر کرتے تھے انہیں یہ حکم دیا جاتا ہے کہ تم پانچوں نمازوں پر جمے رہو اور اپنے نفس کو اور اپنی خواہش کو روکے رکھو اور مسجدوں میں مرابطہ کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو۔ یہی اعمال موجب فلاح ہیں۔ ابن جریر کی حدیث میں ہے کہ کیا تمہیں وہ اعمال نہ بتاؤں' جو گناہوں کا کفارہ ہو جاتے ہیں۔ کامل وضو کرنا ناپسندیدگی کے وقت اور انتظار کرنا ایک نماز کے بعد دوسری نماز کا۔ تمہاری مستعدی اسی میں ہونی چاہئے اور حدیث میں زیادہ قدم رکھ کر چل کر مسجد میں آنا بھی ہے[1] اور روایت میں ہے کہ گناہوں کی معافی کے ساتھ ہی درجے بھی ان اعمال میں بڑھتے رہتے ہیں اور یہی اس آیت کا مطلب ہے۔ لیکن یہ حدیث بالکل غریب ہے۔ ابو سلمہ بن عبدالرحمٰن فرماتے ہیں' یہاں رَابِطُوا سے مطلب انتظار نماز ہے لیکن اُوپر بیان ہو چکا ہے کہ یہ فرمان حضرت ابو ہریرہؓ کا ہے واللہ اعلم۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ رَابِطُوا سے دشمن سے جہاد کرنا اور اسلامی ملک کی حدود کی نگہبانی کرنا اور دشمنوں کو اسلامی شہروں میں نہ گھسنے دینا ہے۔ اس کی ترغیب میں بھی بہت سی حدیثیں ہیں اور اس پر بھی بڑے ثواب کا وعدہ ہے۔ صحیح بخاری شریف میں ہے' ایک دن کی یہ تیاری ساری دنیا سے اور جو اس میں ہے' سب سے افضل ہے۔ مسلم شریف کی حدیث میں ہے۔ ایک دن رات کی جہاد کی تیاری ایک ماہ کے کامل روزوں اور ایک ماہ کی تمام شب بیداری سے افضل ہے اور اسی تیاری کی حالت میں موت آ جائے تو جتنے اعمال صالحہ کرتا تھا' سب کا ثواب ملتا رہے گا اور اللہ کے پاس سے روزی پہنچائی جاتی ہے اور فتنوں سے امن پاتا ہے۔ مسند احمد میں ہے ہر مرنے والے کے اعمال ختم ہو جاتے ہیں۔ مگر جو شخص اللہ کی راہ میں تیاری میں ہو اور اسی حال میں مر جائے' اس کا عمل قیامت تک بڑھتا رہتا ہے اور اسے فتنہ قبر سے نجات ملتی ہے۔ ابن ماجہ کی روایت میں یہ بھی ہے کہ قیامت کے دن گھبراہٹ سے اسے امن ملے گا۔ مسند کی اور حدیث میں ہے اسے صبح شام جنت سے روزی ملتی ہے اور قیامت کے دن تک اس کے مرابطہ کا اجر ملتا رہتا ہے۔ مسند احمد میں ہے' جو شخص مسلمانوں کی سرحد کے کسی کنارے پر تین دن تیاری میں گزارے' اسے سال بھی کی اور جگہ کی اس تیاری کا اجر ملتا ہے۔

امیر المومنین حضرت عثمان بن عفانؓ نے اپنے منبر پر خطبہ پڑھتے ہوئے ایک مرتبہ فرمایا: میں تمہیں رسول اللہ ﷺ سے اپنی سنی ہوئی بات سناتا ہوں۔ میں نے اب تک ایک خاص خیال سے ایسے نہیں سنایا آپ کا فرمان ہے: راہ اللہ میں ایک رات کا پہرہ ایک ہزار راتوں کی عبادت سے افضل ہے۔ جو تمام راتیں قیام اور تمام دن صیام میں گزارے جائیں۔ اس حدیث کو اب بیان کرنے کی وجہ خلیفہ رسول نے یہ بتائی کہ مجھے ڈر تھا کہ اس فضیلت کو حاصل کرنے کے لئے کہیں تم سب مدینہ چھوڑ کر میدان جنگ میں نہ چل دو۔ اب سناتا ہوں۔ ہر شخص کو اختیار ہے کہ جو بات اپنے لئے پسند کرتا ہے۔ اس کا پابند ہو جائے۔ دوسری روایت میں یہ بھی ہے کہ آپ نے پھر فرمایا: کیا میں نے پہنچا دی۔ لوگوں نے کہا: ہاں! آپ نے فرمایا: اے جناب باری! تو گواہ رہے۔ ترمذی شریف میں ہے کہ حضرت شرجیل بن سمط محافظت سرحد میں تھے اور زمانہ زیادہ گزر جانے

---

[1] مطلب یہ ہے کہ گھر سے مسجد اگر دور فاصلہ پر ہو پھر بھی مسجد ہی میں باجماعت نماز پڑھنے کا اہتمام موجب اجر عظیم ہے۔ ویسے بھی مشہور و معروف حدیث (حضرت عبداللہ بن مکتوم h والی) تو زبانِ زد خاص و عام ہے ہی کہ ایک نابینا صحابی تک کو مسجد میں آنے کی تاکید ہوئی تھی۔

کے بعد کچھ تنگ دل ہو رہے تھے کہ حضرت سلمان فارسیؓ ان کے پاس آئے اور فرمایا کہ میں تمہیں پیغمبر اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث سناتا ہوں' آپ نے فرمایا ہے: ایک دن کی سرحد کی حفاظت ایک مہینہ کے صیام و قیام سے افضل ہے اور جو اسی حالت میں مرجائے وہ فتنہ قبر سے محفوظ رہتا ہے اور اس کے اعمال قیامت تک جاری رہتے ہیں۔

ابن ماجہ میں ہے کہ ایک رات راہ اللہ میں پہرہ دینا تا کہ مسلمان امن سے رہیں۔ ہاں نیت نیک ہو' گو وہ رات رمضان کی نہ ہو' ایک سو سال کی عبادت سے افضل ہے۔ جس کے دن روزے میں اور جس کی راتیں تہجد میں گزری ہوں اور ایک دن کی اللہ کی راہ کی تیاری تا کہ مسلمان بحفاظت رہیں' طلب ثواب کی نیت سے بغیر ماہ رمضان کے اللہ کے نزدیک ہزار سال کے روزوں اور تہجد سے افضل ہے۔ اب اگر یہ غازی سلامتی اور زندگی کے ساتھ اپنے لوگوں میں آ گیا تو ایک ہزار سال کی برائیاں اس کے نامۂ اعمال میں نہ لکھی جائیں گی اور نیکیاں لکھی جائیں گی اور مرابطہ کا اجر قیامت تک اسے ملتا رہے گا۔ یہ حدیث غریب ہے بلکہ منکر ہے۔ اس کے راوی عمرو بن صبیح متہم ہیں۔ ابن ماجہ کی ایک اور غریب حدیث ہے کہ ایک رات کی مسلم لشکر کی چوکیداری ایک ہزار سال کی راتوں کے قیام اور دنوں کے صیام سے افضل ہے۔ سال کے تین سو ساٹھ دن اور ہر دن مثل ایک ہزار سال کے اس کے راوی سعید بن خالد کو ابوزرعہؒ وغیرہ ائمہ نے ضعیف کہا ہے۔ بلکہ امام حاکم فرماتے ہیں اس کی روایت سے موضوع حدیثیں بھی ہیں۔ ایک منقطع حدیث میں ہے لشکر اسلام کے چوکیدار پر اللہ کا رحم ہوا۔ (ابن ماجہ)

حضرت سہل بن حنظلہ فرماتے ہیں کہ حنین والے دن ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ چلے۔ شام کی نماز میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ادا کی وہاں ایک گھوڑے سوار آیا اور کہا یا رسول اللہ ﷺ میں آگے نکل گیا تھا اور فلاں پہاڑ پر چڑھ کر میں نے نگاہ ڈالی تو دیکھا کہ قبیلہ ہوازن کے لوگ میدان میں آ گئے ہیں۔ یہاں تک کہ ان کی اونٹنیاں' بکریاں' عورتیں اور بچے بھی ساتھ ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم مسکرائے اور فرمایا یہ سب کل مسلمانوں کی غنیمت میں ہوگا۔ پھر فرمایا: بتاؤ! آج کی رات پہرہ کون دے گا؟ حضرت انس بن ابی مرشدؓ نے کہا: یا رسول اللہ میں حاضر ہوں۔ آپ نے فرمایا: جاؤ سواری لے کر آؤ۔ وہ اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر حاضر ہوئے۔ آپ نے فرمایا: اس گھاٹی میں چلے جاؤ اور اس پہاڑی کی چوٹی پر چڑھ جاؤ۔ خبردار تمہاری طرف سے ان کے ساتھ کوئی چھیڑ چھاڑ صبح تک نہ ہو۔ صبح جس وقت نماز کے لئے حضور ﷺ نماز کی جگہ آئے دو سنتیں ادا کیں اور لوگوں سے پوچھا: کہو تمہیں اپنے پہرہ دار سوار کی تو کوئی آہٹ سنائی نہیں دی؟ لوگوں نے کہا: نہیں یا رسول اللہ ﷺ۔ اب تکبیر کہی گئی اور آپ نے نماز شروع کی۔ خیال آپ کا اسی گھاٹی کی طرف تھا۔ نماز سے سلام پھیرتے ہی آپ نے فرمایا: خوش ہو جاؤ تمہارا گھوڑ اسوار آ رہا ہے۔ ہم نے جھاڑیوں میں سے جھانک کر دیکھا تو تھوڑی دیر میں ہمیں بھی کھائی دے گئے۔ آ کر حضور ﷺ سے کہا: یا رسول اللہ ﷺ! میں اس وادی کے اوپر کے حصے پر پہنچ گیا تھا اور ارشاد کے مطابق وہیں رات گزاری۔ صبح میں نے دوسری گھاٹی بھی دیکھ ڈالی لیکن وہاں بھی کوئی نہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: کیا رات کو وہاں سے نیچے بھی اترے تھے؟ جواب دیا نہیں۔ صرف نماز کے لئے اور قضائے حاجت کے لئے تو نیچے اترا تھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: تم نے اپنے لئے جنت واجب کر لی۔ اب تم اس کے بعد کوئی عمل نہ کرو تو بھی تم پر کوئی حرج نہیں۔ (ابوداؤد و نسائی)

مسند احمد میں ہے ایک غزوہ کے موقع پر ایک رات کو ہم بلند جگہ پر تھے اور سخت سردی تھی۔ یہاں تک کہ لوگ زمین میں گڑھے کھود کر اپنے اوپر ڈھالیں لے لے کر پڑے ہوئے تھے۔ آنحضرت ﷺ نے اس وقت آواز دی کہ کوئی ہے جو آج کی

رات ہماری چوکیداری کرے اور مجھ سے بہترین دعا لے؟ تو ایک انصاری کھڑا ہو گیا اور کہا حضور ﷺ میں تیار ہوں۔ آپ ﷺ نے اسے پاس بلا کر نام دریافت کر کے اس کے لئے دعا کی۔ ابو ریحانہؓ یہ دعائیں سن کر آگے بڑھے اور کہنے لگے: یارسول اللہ ﷺ! میں بھی پہرہ دوں گا۔ آپ نے مجھے بھی پاس بلایا اور نام پوچھ کر میرے لئے بھی دعائیں کیں۔ لیکن اس انصاری صحابیؓ سے یہ دعا کم تھی۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا: اس آنکھ پر جہنم کی آگ حرام ہے جو اللہ کے ڈر سے روئے اور اس آنکھ پر بھی جو راہ اللہ میں شب بیداری کرے۔ مسند احمد میں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: جو شخص مسلمانوں کے پیچھے سے ان کا پہرہ دے اپنی خوشی سے بغیر سلطان کی اجرت و تنخواہ کے وہ اپنی آنکھوں سے بھی جہنم کی آگ کو نہ دیکھے گا۔ مگر صرف قسم پوری ہونے کے لئے جو اس آیت میں ہے ﴿وَاِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا﴾ یعنی تم سب اس پر وارد ہو گے۔

صحیح بخاری میں ہے برباد ہوا دینار کا بندہ اور کپڑوں کا بندہ۔ اگر مال دیا جائے تو وہ خوش ہے اور اگر نہ دیا جائے تو ناخوش ہے یہ برباد ہوا اور خراب ہو گیا۔ اسے اگر کانٹا چبھ جائے تو نکالنے کی کوشش بھی نہ کی جائے۔ خوش نصیب ہوا اور خوب بھلا بھولا وہ شخص جو راہ اللہ میں جہاد کے لئے اپنے گھوڑے کی لگام تھامے ہوئے ہے' بکھرے ہوئے بال ہیں اور گرد آلود قدم ہیں۔ اگر چوکیداری پر مقرر کر دیا گیا ہے تو حفاظت کر رہا ہے اور اگر لشکر کے اگلے حصے میں مقرر کر دیا گیا ہے تو وہیں خوش ہے۔ لوگوں کی نظروں میں اتنا گرا پڑا ہے کہ اگر کہیں جانا چاہے تو اجازت نہ ملے اور اگر کسی کی سفارش کرے تو قبول نہ ہو۔ الحمدللہ۔ اس آیت کے متعلق خاص حدیثیں بیان ہو گئیں۔ اللہ تعالیٰ کے اس فضل و کرم پر ہم اس کا شکر ادا کرتے ہیں اور شکر گزاری سے رہتی دنیا تک فارغ نہیں ہو سکتے۔ تفسیر ابن جریر میں ہے کہ حضرت ابو عبیدہؓ بن جراح نے امیر المؤمنین خلیفۃ المسلمین حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو میدان جنگ سے ایک خط لکھا اور اس میں رومیوں کی فوج کی کثرت' ان کے آلات حرب کی حالت اور ان کی تیاریوں کی کیفیت بیان کی اور لکھا کہ سخت خطرہ کا موقعہ ہے۔ یہاں سے فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا جواب دیا گیا۔ جس میں حمد و ثنا کے بعد تحریر تھا کہ کبھی کبھی مؤمن بندوں پر سختیاں بھی آ جاتی ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ ان کے بعد آسانیاں بھیج دیتے ہیں۔ سنو! ایک سختی دو آسانیوں پر غالب نہیں آ سکتی سنو! پروردگار عالم کا فرمان ہے: ﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا﴾ حضرت عبداللہ بن مبارکؒ نے ۱۷۰ھ یا ۱۷۷ھ میں شہر طرسوس میں حضرت محمد بن ابراہیم بن سکینہ کو جبکہ وہ ان کے وداع کے لئے آئے تھے اور یہ جہاد کو جا رہے تھے۔ یہ اشعار لکھوا کر حضرت فضیل بن عیاض رحمۃ اللہ علیہ کو بھجوائے

يَا عَابِدَ الْحَرَمَيْنِ لَوْ اَبْصَرْتَنَا ☆ لَعَلِمْتَ اِنَّكَ فِي الْعِبَادَةِ تَلْعَبُ

مَنْ كَانَ يَخْضِبُ خَدَّهٗ بِدُمُوْعِهٖ ☆ فَنُحُوْرُنَا بِدِمَائِنَا تَتَخَضَّبُ

مَنْ كَانَ تَتْعَبُ خَيْلُهٗ فِيْ بَاطِلٍ ☆ فَخُيُوْلُنَا يَوْمَ الصَّبِيْحَةِ تَتْعَبُ

رِيْحُ الْعَبِيْرِ لَكُمْ وَنَحْنُ عَبِيْرُنَا ☆ رَهْجُ السَّنَابِكِ وَالْغُبَارُ الْاَطْيَبُ

وَلَقَدْ اَتَانَا مِنْ مَّقَالِ نَبِيِّنَا ☆ قَوْلٌ صَحِيْحٌ صَادِقٌ لَا يَكْذِبُ

لَا يَسْتَوِيْ غُبَارُ خَيْلِ اللّٰهِ فِيْ ☆ اَنْفِ امْرِئٍ وَّدُخَانُ نَارٍ تَلْهَبُ

هٰذَا كِتَابُ اللّٰهِ يَنْطِقُ بَيْنَنَا ☆ لَيْسَ الشَّهِيْدُ بِمَيِّتٍ لَا يَكْذِبُ

''اے مکہ مدینہ میں رہ کر عبادت کرنے والے اگر تو ہم مجاہدین کو دیکھ لیتا تو بالیقین تجھے معلوم ہو جاتا کہ تیری عبادت تو ایک کھیل ہے۔ایک وہ شخص ہے جس کے آنسو اس کے رخساروں کو تر کرتے ہیں اور ایک ہم ہیں جو اپنی گردن راہ اللہ کٹوا کر اپنے خون میں آپ نہا لیتے ہیں۔ایک وہ شخص ہے' جس کا گھوڑا باطل اور بے کار کام میں تھک جاتا ہے اور ہمارے گھوڑے لڑائی اور حملے کے دن ہی تھکتے ہیں۔اگر کی خوشبوئیں تمہارے لئے ہیں اور ہمارے لئے اگر کی خوشبو گھوڑوں کے خاک اور پاکیزہ گردوغبار ہے۔یقین مانو ہمیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث پہنچ چکی ہے جو سراسر راستی اور درستی والی بالکل سچی ہے کہ جس کسی کے ناک میں اس خدائی لشکر کی گرد بھی پہنچ گئی۔اس کے ناک میں شعلے مارنے والی جہنم کی آگ کا دھواں بھی نہ جائے اور لو یہ ہے اللہ تعالیٰ کی پاک کتاب جو ہم میں موجود ہے اور صاف کہہ رہی ہے اور سچ کہہ رہی ہے کہ شہید مردہ نہیں۔''

محمد بن ابراہیمؒ فرماتے جب میں نے مسجد حرام پہنچ کر حضرت فضیل بن عیاض رحمۃ اللہ علیہ کو یہ اشعار دکھائے تو آپ پڑھ کر زار زار روئے اور فرمایا: ابو عبدالرحمٰن نے اللہ کی رحمتیں ان پر ہوں۔صحیح اور سچ فرمایا اور مجھے نصیحت کی اور میری بے حد خیر خواہی کی۔پھر مجھ سے فرمایا کہ تم حدیث لکھتے ہو۔میں نے کہا: جی ہاں۔کہا: اچھا تم جو نصیحت نامہ میرے پاس لائے' اس کے بدلے میں میں تمہیں ایک حدیث لکھواتا ہوں۔وہ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے ایک شخص نے درخواست کی کہ یارسول اللہ ﷺ نے مجھے ایسا عمل بتایئے جس سے میں مجاہد کا ثواب پالوں۔آپ نے فرمایا کیا تجھ میں یہ طاقت ہے کہ نماز ہی پڑھتا رہے اور تھکے نہیں اور روزے رکھتا چلا جائے اور کبھی بے روزہ نہ رہے؟ اس نے کہا: حضور اس کی طاقت کہاں۔میں اس سے بہت ضعیف ہوں۔آپ نے فرمایا: اگر تجھ میں اتنی طاقت ہوتی اور ایسا تو کر بھی سکتا تو بھی مجاہد سبیل اللہ کے درجے کو نہ پہنچ سکتا تو یہ بھی جانتا ہے کہ مجاہد کے گھوڑے کی رسی دراز ہو جائے اور ادھر اُدھر چڑھ جائے تو اس پر مجاہد کو نیکیاں ملتی ہیں۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ حکم دیتا ہے کہ اللہ سے ڈرتے رہو اور ہر حال میں ہر وقت ہر معاملہ میں خوف اللہ کیا کرو۔جناب رسول اکرم ﷺ نے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو جب یمن کی طرف بھیجا تو فرمایا: اے معاذ جہاں بھی ہو اللہ کا خوف دل میں رکھ اور اگر تجھ سے کوئی برائی ہو جائے تو فوراً کوئی نیکی بھی کر لے تاکہ وہ برائی مٹ جائے اور لوگوں سے خلق و مروت کے ساتھ پیش آیا کر۔پھر فرمایا کہ ان چار کاموں کے کر لینے سے تم مقصد میں کامیاب اور بامراد ہو جاؤ گے۔دنیا اور آخرت میں فلاح و نجات پالو گے۔حضرت محمد بن کعب قرظیؒ فرماتے ہیں: مطلب یہ ہے کہ تم میرا لحاظ رکھو۔میرے خوف سے کانپتے رہو۔مجھ سے ڈرتے رہو۔میرے اور اپنے معاملہ میں متقی رہو تو کل جب کہ تم مجھ سے ملو گے نجات یافتہ اور بامراد ہو جاؤ گے۔

تفسیر سورۃ نساء

شانِ نزول اور متعلقہ بحث

حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ یہ سورت مدینہ شریف میں اتری ہے۔ حضرت عبداللہ بن زبیر اور حضرت زید بن ثابت بھی یہی فرماتے ہیں۔ حضرت ابن عباسؓ سے بھی یہی مروی ہے کہ جب یہ سورت اتری تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اب روک رکھنا نہیں ہے۔ مستدرک حاکم میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے مروی ہے کہ سورہ نساء میں پانچ آیتیں ایسی ہیں کہ اگر ساری دنیا مجھے مل جائے' تب بھی مجھے اس قدر خوشی نہ ہو جتنی ان آیتوں سے ہے۔ یعنی آیت ﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ﴾ (النساء:۴۰) اللہ تعالیٰ کسی پر ذرّہ برابر ظلم نہیں کرتا اور جس کی جو نیکی ہوتی ہے اس کا ثواب بڑھا چڑھا کر دیتا ہے اور اپنی طرف سے جو بطور انعام اجر عظیم دے۔ وہ جداگانہ ہے اور آیت ﴿اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَآئِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ﴾ (النساء:۳۱) اگر تم کبیرہ گناہوں سے بچ جاؤ تو تمہارے صغیرہ گناہ خود ہی معاف فرما دیں گے اور تمہیں جنت میں لے جائیں گے اور آیت ﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَ يَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ﴾ (النساء:۴۸) یعنی اللہ تعالیٰ اپنے ساتھ شریک کرنے والے کو تو نہیں بخشتا' باقی جس گنہگار کو چاہے بخش دے اور آیت ﴿وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ جَآءُوْكَ﴾ (النساء:۶۴) یعنی یہ لوگ اگر گناہ سرزد ہو چکنے کے بعد تیرے پاس آ جاتے اور خود بھی اللہ تعالیٰ سے اپنے گناہوں کی معافی طلب کرتے اور رسول بھی ان کے لئے استغفار طلب کرتا تو بے شک وہ اللہ تعالیٰ کو مہربانی کرنے والا پاتے۔ امام حاکم فرماتے ہیں: یوں تو اس کی اسناد صحیح ہیں' لیکن اس کے ایک راوی عبدالرحمٰن کے اپنے باپ سے سننے میں اختلاف ہے۔ عبدالرزاق کی اس روایت میں آیت ﴿وَلَوْ اَنَّهُمْ﴾ کے بدلے ﴿وَمَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا اَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهٗ ثُمَّ يَسْتَغْفِرِ اللّٰهَ يَجِدِ اللّٰهَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا﴾ (النساء:۱۱۰) یعنی جس شخص سے کوئی برا کام ہو جائے یا اپنے نفس پر ظلم کر گزرے پھر اللہ تعالیٰ سے معافی چاہنے لگ جائے تو بیشک اللہ تعالیٰ کو بخشنے والا مہربان پائے گا۔ دونوں حدیثوں میں تطبیق اس طرح پر ہے کہ ایک آیت کا بیان کرنا پہلی حدیث میں تو رہ گیا ہے اور اس کا بیان دوسری حدیث میں ہے تو چار آیتیں پہلی حدیث کی اور پانچویں آیت اس حدیث کی ﴿وَمَنْ يَّعْمَلْ﴾ مل کر پانچ ہو گئیں۔ یا یہ ہے کہ ﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ﴾ ہی پر آیت پوری ہے اور ﴿وَاِنْ تَكُ حَسَنَةً﴾ کو الگ آیت شمار کی ہے اور دونوں حدیثوں میں پانچ پانچ آیتیں ہو گئیں۔

ابن جریر میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے مروی ہے کہ اس سورت میں آٹھ آیتیں ہیں' جو اس امت کے لئے ہر اس چیز سے بہتر ہیں' جن پر سورج نکلتا اور غروب ہوتا ہے۔ پہلی آیت: ﴿يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُبَيِّنَ لَكُمْ﴾ (النساء:۲۶) اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ اپنے احکام تم پر صاف صاف بیان کر دے اور تمہیں ان اچھے لوگوں کی راہ راست دکھا دے جو تم سے پہلے گزر چکے ہیں اور تم پر مہربانی کرے۔ اللہ تعالیٰ دانا اور حکمت والا ہے۔ دوسری آیت: ﴿وَاللّٰهُ يُرِيْدُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْكُمْ﴾ (النساء:۲۷) یعنی اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ تم پر اپنی رحمت نازل کرے۔ تمہاری توبہ قبول کرے اور خواہشوں کے پیچھے پڑے ہوئے لوگوں کی خواہش ہے کہ تم راہ راست سے بہت دُور ہٹ جاؤ۔ تیسری آیت: ﴿يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّخَفِّفَ عَنْكُمْ وَخُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِيْفًا﴾

(النساء: ۲۸) یعنی انسان چونکہ ضعیف پیدا کیا گیا ہے اللہ تعالیٰ اس پر تخفیف کرنی چاہتا ہے باقی کل آیتیں وہی جو اوپر گزریں۔
ابن ابی ملیکہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: میں نے حضرت ابن عباسؓ سے سورۂ نساء کی بابت سنا پس میں نے قرآن پڑھا اور آنحالیکہ میں چھوٹا بچہ تھا۔ (حاکم)

سُوْرَةُ النِّسَاءِ مَدَنِيَّةٌ وَهِيَ مِائَةٌ وَسِتٌّ وَسَبْعُوْنَ اٰيَةً وَاَرْبَعٌ وَعِشْرُوْنَ رُكُوْعًا

کل رکوع: ۲۴ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ کل آیات: ۱۷۶

شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّنِسَآءً ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيْبًا ①

اے لوگو! اپنے پروردگار سے ڈرو جس نے تم کو ایک جاندار سے پیدا کیا اور اس جاندار سے اس کا جوڑا پیدا کیا اور ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورتیں پھیلائیں اور تم اللہ تعالیٰ سے ڈرو جس کے نام سے ایک دوسری سے مطالبہ کیا کرتے ہیں اور قرابت سے ڈرو۔ بالیقین اللہ تعالیٰ سب کی اطلاع رکھتے ہیں۔ ○

انسان کے فرائض ☆

اللہ تعالیٰ اپنے تقویٰ کا حکم دیتا ہے کہ جسم سے اسی ایک ہی کی عبادتیں کی جائیں اور دل میں صرف اسی کا خوف رکھا جائے۔ پھر اپنی قدرت کاملہ کا بیان فرمایا ہے کہ اس نے تم سب کو ایک ہی شخص یعنی حضرت آدمؑ سے پیدا کیا ہے۔ ان کی بیوی یعنی حضرت حواؑ کو بھی انہی سے پیدا کیا۔ آپ سوئے ہوئے تھے کہ بائیں طرف کی پسلی سے حضرت حواؑ کو پیدا کیا۔ آپ نے بیدار ہو کر انہیں دیکھا اور اپنی طبیعت کو ان کی طرف راغب پایا اور انہیں بھی ان سے انس پیدا ہو۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں عورت مرد سے پیدا کی گئی ہے۔ اس لئے اس کی حاجت و شہوت مرد میں رکھی گئی ہے اور مرد زمین سے پیدا کئے گئے ہیں۔ اس لئے ان کی حاجت زمین میں رکھی گئی ہے۔ پس تم اپنی عورتوں کو روکے رکھو۔ صحیح حدیث میں ہے عورت پسلی سے پیدا کی گئی ہے اور سب سے بلند پسلی سب سے زیادہ ٹیڑھی ہے۔ پس اگر تم ایک دم سیدھی کرنے کی کوشش کرو گے تو ٹوٹ جائے گی اور اگر اس میں کچھ کجی چھوڑتے ہوئے فائدہ اٹھانا چاہو تو فائدہ اٹھا سکتے ہو۔ پھر فرمایا: ان دونوں سے یعنی آدم وحوا سے بہت سے انسان مرد اور عورت چاروں طرف پھیلا دیئے۔ جن کی قسمیں صفتیں رنگ روپ بول چال میں بہت کچھ اختلاف ہے۔ جس طرح یہ سب پہلے اللہ کے قبضے میں تھے اور پھر انہیں اس نے ادھر اُدھر پھیلا دیا ایک وقت ان سب کو سمیٹ کر پھر اپنے قبضہ میں کر کے ایک میدان میں جمع کرے گا پس اللہ سے ڈرتے رہو۔ اس کی عبادت بجالاتے رہو اسی اللہ کے واسطے سے اور اس

کے پاک نام پر تم آپس میں ایک دوسرے سے مانگتے ہو۔ مثلاً یہ کہنا کہ میں تجھے اللہ کو یاد دلا کر اور رشتے کو یاد دلا کر یوں کہتا ہوں۔ اسی کے نام کی قسمیں کھاتے ہو اور عہد و پیمان مضبوط کرتے ہو۔ اللہ سے ڈر کر رشتوں ناتوں کی حفاظت کرو۔ انہیں توڑو نہیں بلکہ جوڑو۔ صلہ رحمی، نیکی اور سلوک آپس میں کرتے رہو۔

ارحام بھی ایک قراءت میں ہے۔ یعنی اللہ کے نام پر اور رشتے کے واسطے سے اللہ تعالیٰ تمہارے تمام احوال اور اعمال پر مطلع ہے خوب دیکھ بھال رہا ہے۔ جیسے اور جگہ ہے ﴿وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ شَهِیْدٌ﴾ (المجادلۃ: ٦) اللہ ہر چیز پر گواہ اور حاضر ہے۔ صحیح حدیث میں ہے اللہ کی ایسی عبادت کرو گویا تم اسے دیکھ رہے ہو۔ پس اگر تم اسے نہیں دیکھ رہے تو وہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس کا لحاظ رکھو جو تمہارے ہر اٹھنے بیٹھنے چلنے پھرنے پر نگراں ہے۔ یہاں فرمایا گیا کہ لوگو! تم سب ایک ہی ماں باپ کے ہو۔ ایک دوسرے پر شفقت کیا کرو۔ کمزور اور ناتواں کا ساتھ دو اور ان کے ساتھ سلوک کرو۔ صحیح مسلم شریف میں حدیث ہے کہ جب قبیلہ مضر کے چند لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس چادریں لپیٹے ہوئے آئے۔ کیونکہ ان کے جسم پر کپڑا تک نہ تھا۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کھڑے ہو کر نماز ظہر کے بعد وعظ بیان فرمایا جس میں اس آیت کی تلاوت فرمائی۔ پھر آیت ﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَلْتَنْظُرْ﴾ (الحشر: ١٨) کی تلاوت کی۔ پھر لوگوں کو خیرات کرنے کی ترغیب دی۔ چنانچہ جس سے جو ہو سکا ان لوگوں کے لئے دیا۔ درہم دینار بھی اور کھجور گیہوں بھی۔ مسند اور سنن میں خطبہ حاجات کے بیان میں ہے۔ پھر تین آیتیں پڑھیں۔ جن میں سے ایک آیت یہی ہے۔

وَاٰتُوا الْیَتٰمٰۤى اَمْوَالَهُمْ وَلَا تَتَبَدَّلُوا الْخَبِیْثَ بِالطَّیِّبِ ۪ وَلَا تَاْكُلُوْۤا اَمْوَالَهُمْ اِلٰۤى اَمْوَالِكُمْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ حُوْبًا كَبِیْرًا ۝٢ وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِی الْیَتٰمٰى فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ ۚ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً اَوْ مَا مَلَكَتْ اَیْمَانُكُمْ ؕ ذٰلِكَ اَدْنٰۤى اَلَّا تَعُوْلُوْا ۝٣ وَاٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً ؕ فَاِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَیْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا فَكُلُوْهُ هَنِیْٓـًٔا مَّرِیْٓـًٔا ۝۴

اور جن بچوں کا باپ مر جائے ان کے مال انہی کو پہنچاتے رہو اور تم اچھی چیز کو مت بدلو اور ان کے مال مت کھاؤ۔ اپنے مالوں (کے رہنے) تک ایسی کارروائی کرنا بڑا گناہ ہے پس اگر تم کو احتمال اس کا ہو کہ تم یتیم لڑکیوں کے بارے میں انصاف نہ کر سکو گے اور عورتوں سے جو تم کو پسند ہوں نکاح کر لو دو دو عورتوں سے اور تین تین عورتوں سے اور چار چار عورتوں سے۔ پس اگر تم کو احتمال ہو کہ عدل نہ رکھو گے تو پھر ایک ہی بی بی پر بس کرو۔ یا جو لونڈی تمہاری ملک میں ہو وہی سہی اس امر مذکور میں زیادتی نہ ہونے کی توقع قریب تر ہے اور تم لوگ بیبیوں کو انکے مہر خوشدلی سے دے

دیا کرو۔ ہاں اگر وہ بیبیاں خوشدلی سے چھوڑ دیں تم کو اس مہر کا کوئی حصہ تو تم اس کو کھاؤ مزہ دار خوشگوار سمجھ کر۔ ○

یتیموں اور کمزوروں کی نگہداشت ضروری ہے ☆

اللہ تعالیٰ یتیموں کے والیوں کو حکم دیتا ہے کہ جب یتیم بلوغت اور سمجھداری کو پہنچ جائیں تو ان کے جو مال تمہارے پاس ہوں انہیں سونپ دو پورے پورے بغیر کمی اور خیانت کے ان کے حوالے کرو۔ اپنے مالوں کے ساتھ ملا کر گڈمڈ کر کے کھا جانے کی نیت نہ رکھو۔ حلال رزق جب اللہ تمہیں دے رہا ہے۔ پھر حرام کی طرف کیوں منہ اٹھاؤ؟ تقدیر کی روزی مل کر ہی رہے گی۔ اپنے حلال مال چھوڑ کر لوگوں کے مالوں کو جو تم پر حرام ہیں نہ لو۔ کمزور نحیف جانور دے کر موٹا تازہ نہ لو۔ بوٹی دے کر بکرے کی فکر نہ کرو۔ ردی دے کر اچھے کی کھوٹا دے کر کھرے کی نیت نہ رکھو۔ پہلے لوگ ایسا کر لیا کرتے تھے کہ یتیموں کے بکریوں کے ریوڑ میں سے عمدہ بکری لے لی اور اپنی کمزور بکری دے کر گنتی پوری کر دی۔ کھوٹا درہم اس کے مال میں ڈال کر کھرا نکال لیا اور پھر سمجھ لیا کہ ہم نے بکری کے بدلے بکری درہم کے بدلے درہم لیا ہے۔ ان کے مالوں میں اپنا مال غلط ملط کر کے پھر یہ حیلہ کر کے کہ اب امتیاز کیا ہے۔ ان کے مال تلف نہ کرو۔ یہ بڑا گناہ ہے۔ ایک ضعیف میں بھی یہی معنی آخری جملے کے مروی ہیں۔ ابوداؤد کی حدیث میں ایک دعا میں بھی حُوب کا لفظ گناہ کے معنی میں آیا ہے۔ حضرت ابوایوبؓ نے جب اپنی بیوی صاحبہ کو طلاق دینے کا ارادہ کیا تھا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا کہ اس طلاق میں گناہ ہے۔ چنانچہ وہ اپنے ارادے سے باز رہے۔ ایک روایت میں یہ واقعہ حضرت ابوطلحہ اور ام سلیم کا مروی ہے۔ پھر فرماتا ہے کہ تمہاری پرورش میں کوئی یتیم لڑکی ہو اور تم اس سے نکاح کرنا چاہتے ہو لیکن چونکہ اس کا کوئی اور نہیں اس لئے تم ایسا نہ کرو کہ مہر اور حقوق کی کمی کر کے اسے اپنے گھر ڈال لو۔ اس سے بازرہو اور عورتیں بہت ہیں جس سے چاہو نکاح کر لو۔ حضرت عائشہ صدیقہ فرماتی ہیں: ایک یتیم لڑکی تھی؛ جس کے پاس مال بھی تھا اور باغ بھی؛ جس کی پرورش میں وہ تھی اس نے صرف اس مال کے لالچ میں بغیر اس کا پورا مہر وغیرہ مقرر کرنے کے اس سے نکاح کر لیا جس پر یہ آیت اتری۔ میرا خیال ہے کہ اس باغ میں اور مال میں یہ لڑکی حصہ دار تھی۔

صحیح بخاری شریف میں ہے کہ حضرت ابن شہابؒ نے حضرت عائشہؓ سے اس آیت کا مطلب پوچھا' تو آپؓ نے فرمایا: بھانجے! یہ ذکر اس یتیم لڑکی کا ہے جو اپنے ولی کے قبضہ میں ہے۔ اس کے مال میں شریک ہے اور اسے اس کا مال اور جمال اچھا لگتا ہے۔ چاہتا ہے کہ اس سے نکاح کر لے۔ لیکن جو مہر وغیرہ اور جگہ سے اسے ملتا ہے اتنا نہیں دیتا' تو اسے منع کیا جا رہا ہے کہ پھر یہ اس کی نیت چھوڑ دے اور دوسری عورت سے جس سے چاہے اپنا نکاح کر لے۔ پھر اس کے بعد لوگوں نے رسول اللہ ﷺ سے اسی کی بابت دریافت کیا اور آیت: ﴿وَيَسْتَفْتُوْنَكَ فِي النِّسَآءِ﴾ (النساء: ۱۲۷) نازل ہوئی وہاں فرمایا گیا ہے کہ جب یتیم لڑکی کم مال والی اور کم جمال والی ہوتی ہے' اس وقت تو اس کے والی اس سے بے رغبتی کرتے ہیں۔ پھر کوئی وجہ نہیں کہ مال و جمال پر مائل ہو کر اس کے پورے حقوق نہ ادا کر کے اس سے اپنا نکاح کر لیں۔

ہاں عدل و انصاف سے پورا مہر وغیرہ مقرر کریں تو کوئی حرج نہیں۔ ورنہ پھر عورتوں کی کمی نہیں اور جس سے چاہیں اپنا نکاح کر لیں۔ اگر چاہیں دو دو عورتیں اپنے نکاح میں رکھیں اگر چاہیں تین تین رکھیں اگر چاہیں چار چار۔ جیسے اور جگہ بھی یہ الفاظ ان ہی معنی میں ہیں۔ فرماتا ہے: ﴿جَاعِلِ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا اُولِيْٓ اَجْنِحَةٍ مَّثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ﴾ (فاطر: ۱) یعنی جن فرشتوں کو اللہ اپنا قاصد بنا کر بھیجتا ہے' ان میں سے بعض دو دو پروں والے ہیں بعض تین تین پروں والے بعض چار پروں

والے۔ فرشتوں میں اس سے زیادہ پروالے فرشتے بھی ہیں۔ کیونکہ دلیل سے یہ ثابت شدہ ہے۔ لیکن مرد ایک وقت میں چار سے زیادہ بیویوں کا جمع کرنا منع ہے۔ جیسے کہ اس آیت میں موجود ہے اور جیسے کہ حضرت ابن عباسؓ اور جمہور کا قول ہے۔ یہاں خدائے تعالیٰ اپنے احسان اور انعام بیان فرما رہا ہے۔ پس اگر چار سے زیادہ کی اجازت دینی منظور ہوتی تو ضرور فرما دیا جاتا۔ حضرت امام شافعیؒ فرماتے ہیں: حدیث جو قرآن کی وضاحت کرنے والی ہے۔ اس نے بتلا دیا ہے کہ سوائے رسول اللہ ﷺ کے کسی کے لئے چار سے زیادہ بیویوں کا بیک وقت جمع کرنا جائز نہیں' اسی پر علمائے کرام کا اجماع ہے۔ البتہ بعض شیعہ کا قول ہے کہ نو تک جمع کرنی جائز ہیں۔ بلکہ بعض شیعہ نے تو کہا ہے کہ نو سے بھی زیادہ جمع کر لینے میں بھی کوئی حرج نہیں۔ کوئی تعداد مقرر ہے ہی نہیں۔ ان کا استدلال ایک تو رسول کریم ﷺ کے فعل سے ہے۔ جیسا کہ صحیح حدیث میں آ چکا ہے کہ آپ کی نو بیویاں تھیں اور بخاری شریف کی معلق حدیث کے بعض راویوں نے گیارہ کہا ہے۔

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے پندرہ بیویوں سے عقد کیا۔ تیرہ کی رخصتی ہوئی۔ ایک وقت میں گیارہ بیویاں آپ کے پاس تھیں۔ انتقال کے وقت آپ کی نو بیویاں تھیں۔ ہمارے علمائے کرام اس کے جواب میں فرماتے ہیں کہ یہ آپ کی خصوصیت[1] تھی۔ امتی کو ایک وقت میں چار سے زیادہ بیویاں پاس رکھنے کی اجازت نہیں جیسے کہ یہ حدیثیں اس امر پر دلالت کرتی ہیں۔ حضرت میلان بن سلمہ ثقفیؓ جب مسلمان ہوتے ہیں تو ان کے پاس ان کی دس بیویاں تھیں حضور ارشاد فرماتے ہیں کہ ان میں سے جنہیں چاہو چار رکھ لو اور باقی چھوڑ دو۔ چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا' پھر حضرت عمرؓ کی خلافت کے زمانہ میں اپنی ان بیویوں کو بھی طلاق دے دی اور اپنے لڑکوں کو اپنا مال بانٹ دیا۔ حضرت عمر کو جب یہ معلوم ہوا تو آپ نے فرمایا: شاید تیرے شیطان نے بات اچک لی اور تیرے دل میں یہ خیال جما دیا کہ تو عنقریب مرنے والا ہے۔ اس لئے اپنی بیویوں کو تو نے الگ کر دیا کہ وہ تیرا مال نہ پائیں اور اپنا مال اپنی اولاد میں تقسیم کر دیا۔ میں تجھے حکم دیتا ہوں کہ اپنی بیویوں سے رجوع کر لے اور اپنی اولاد سے مال واپس لے لے۔ اگر تو نے ایسا نہ کیا تو میں تیرے بعد تیری ان مطلقہ بیویوں کو بھی تیرا وارث بناؤں گا۔ کیونکہ تو نے انہیں اسی ڈر سے طلاق دی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ تیری زندگی اب قریب الختم ہے اور اگر تو نے میری بات نہ مانی تو یاد رکھ میں حکم دوں گا کہ لوگ تیری قبر پر پتھر پھینکیں۔ جیسے کہ ابو رغال کی قبر پر پتھر پھینکے جاتے ہیں (مسند شافعی ترمذی ابن ماجہ دار قطنی بیہقی وغیرہ) مرفع حدیث تک تو ان سب کتابوں میں ہے ہاں حضرت عمرؓ والا واقعہ صرف مسند احمد میں ہے۔ لیکن یہ زیادتی حسن ہے۔ اگرچہ امام بخاری نے اسے ضعیف کہا ہے اور اس کی اسناد کا دوسرا طریقہ بتا کر اس طریقہ کو غیر محفوظ کہا ہے۔ مگر اس تحلیل میں بھی نظر ہے واللہ اعلم اور بزرگ محدثین نے بھی اس پر کلام کیا ہے لیکن مسند احمد والی حدیث کے تمام راوی ثقہ ہیں اور شرط شیخین پر ہیں۔ ایک اور روایت میں ہے کہ یہ دسوں عورتیں بھی اپنے خاوند کے ساتھ مسلمان ہوئی تھیں۔ ملاحظہ ہو سنن نسائی۔ اس حدیث سے صاف ظاہر ہو گیا کہ اگر چار سے زیادہ کا ایک وقت میں نکاح میں رکھنا جائز ہوتا۔ تو حضور ان سے یہ نہ فرماتے کہ اپنی ان دس بیویوں میں سے چار کو جنہیں تم چاہو روک لو۔ باقی کو چھوڑ دو کیونکہ یہ سب بھی اسلام لا چکی

---

[1] اس میں بعض دینی مصلحتیں تھیں اور بعض دنیاوی۔ مثلاً آپ ﷺ نے بعض نکاح قبیلہ کے معزز افراد کی لڑکیوں سے کیے جس سے آپ ﷺ کا مقصد اس قبیلہ میں دین کی اشاعت کے ذرائع پیدا کرنا تھا اور اس کے ساتھ ہی عورتوں میں بھی آپ ﷺ کو دین کی تبلیغ کرنا مقصود تھا اور اسلام کے احکام کی نشر و اشاعت اور اس مقصد کے لیے عورتوں کی کثرت خاص طور پر مفید تھی۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بکثرت نکاح کے شافی جوابات دوسری کتابوں میں بھی مطالعہ کر لیے جائیں۔

تھیں۔ یہاں اس بات کا بھی خیال ہے کہ ثقفی کے ہاں تو یہ دس عورتیں موجود تھیں اس پر بھی آپ نے چھ علیحدہ کرادیں پھر بھلا کیسے ہوسکتا ہے کہ کوئی شخص چار سے زیادہ جمع کرے؟ واللہ اعلم بالصواب۔

دوسری حدیث ابوداؤد ابن ماجہ وغیرہ میں ہے۔ حضرت عمیرہ اسدیؓ فرماتے ہیں: میں نے جس وقت اسلام قبول کیا میرے نکاح میں آٹھ عورتیں تھیں میں نے رسول کریم ﷺ سے ذکر کیا۔ آپ نے فرمایا: ان میں سے جنہیں چاہو چار رکھ لو۔ اس کی سند حسن ہے اور اس کے شواہد بھی ہیں۔ راویوں کے ناموں کا جزوی اختلاف وغیرہ ایسی روایات میں نقصان دہ نہیں ہوتا۔ تیسری حدیث مسند شافعی میں ہے۔ حضرت نوفل بنؓ معاویہ فرماتے ہیں کہ جب میں نے اسلام قبول کیا اس وقت میری پانچ بیویاں تھیں مجھ سے حضور ﷺ نے فرمایا: ان میں سے پسند کر کے چار کو رکھ لو اور ایک کو الگ کر دو۔ میں نے جو سب سے زیادہ عمر کی بڑھیا اور بے اولاد بیوی ساٹھ سال کی تھی طلاق دے دی۔ پس یہ حدیثیں حضرت غیلانؓ والی پہلی حدیث کی شواہد میں ہیں۔ جیسے کہ حضرت امام بیہقیؒ نے فرمایا ہے۔ پھر فرماتا ہے: ہاں اگر ایک سے زیادہ بیویوں میں عدل وانصاف نہ ہوسکنے کا خوف ہو تو صرف ایک ہی پر اکتفا کر دیا لونڈیوں ہی پر۔ جیسے اور جگہ ہے: ﴿وَلَنْ تَسْتَطِيْعُوا اَنْ تَعْدِلُوْا بَيْنَ النِّسَآءِ وَلَوْ حَرَصْتُمْ﴾ (النساء: ۱۲۹) یعنی گو تم چاہو لیکن تم سے نہ ہو سکے گا کہ عورتوں کے درمیان پوری طرح عدل وانصاف کو قائم رکھ سکو۔ پس بالکل ایک ہی طرف جھک کر دوسری کو مصیبت میں ڈال دو۔ ہاں یاد رہے کہ لونڈیوں میں باری وغیرہ کی تقسیم واجب نہیں البتہ مستحب ہے جو کرے اس نے اچھا کیا اور جو نہ کرے اس پر حرج نہیں۔ اس کے بعد کے جملے کا مطلب بعضوں نے کہا ہے کہ یہ قریب ہے اس کے تمہاری عیال یعنی فقیری زیادہ نہ ہو۔ جیسے اور جگہ ہے ﴿وَاِنْ خِفْتُمْ عَيْلَةً﴾ یعنی اگر تمہیں فقر کا ڈر ہو۔ عربی شاعر کہتا ہے ۔

فَمَا يَدْرِى الْفَقِيْرُ مَتٰى غِنَاهُ ☆ وَمَا يَدْرِى الْغَنِىُّ مَتٰى يَعِيْلُ

یعنی فقیر نہیں جانتا کہ کب امیر ہو جائے گا اور امیر کو معلوم نہیں کہ کب فقیر بن جائے گا جب کوئی مسکین محتاج ہو جائے تب عرب کہتے ہیں عَالَ الرَّجُلُ یعنی یہ شخص فقیر ہو گیا۔ غرض اس معنی میں فقط مستعمل تو ہے لیکن یہاں یہ تفسیر کچھ زیادہ اچھی نہیں معلوم ہوتی۔ کیونکہ اگر آزاد عورتوں کی کثرت فقیری کا باعث بن سکتی ہے تو لونڈیوں کی کثرت بھی فقیری کا سبب بن سکتی ہے۔ پس صحیح قول جمہور کا ہے کہ مراد یہ ہے کہ یہ قریب ہے اس کے کہ تم ظلم سے بچ جاؤ۔ عرب میں کہا جاتا ہے: عَالَ فِى الْحُكْمِ جب کہ ظلم وجور کیا ہو۔ ابوطالب کے مشہور قصیدے میں ہے۔

بِمِيْزَانِ قِسْطٍ لَّا يَخِيْسُ شَعِيْرَةٍ ☆ لَهٗ شَاهِدٌ مِنْ نَفْسِهٖ غَيْرُ عَائِلِ

یعنی ایسی ترازو سے تولتا ہے جو جو برابر کی بھی کمی نہیں کرتی۔ اس کے پاس اس کا گواہ خود اس کا نفس ہے جو ظالم نہیں ہے۔ ابن جریر میں ہے کہ جب کوفیوں نے حضرت عثمانؓ پر ایک خط میں کچھ الزام لکھ کر بھیجے تو ان کے جواب میں خلیفہ رسول ﷺ نے لکھا کہ: اِنِّىْ لَسْتُ بِمِيْزَانٍ اَعُوْلُ میں ظلم کی ترازو نہیں ہوں۔ صحیح ابن حبان وغیرہ میں ایک مرفوع حدیث اس جملہ کی تفسیر میں منقول ہے کہ اس کا معنی ہے تم ظلم نہ کرو۔ ابو حاتم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں اس کا مرفوع ہونا تو خطا ہے۔ ہاں یہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا قول ہے۔ اسی طرح ﴿لَا تَعُوْلُوْا﴾ کے بھی معنی ہیں تم ظلم نہ کرو۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرت عائشہؓ، حضرت مجاہدؒ، حضرت عکرمہؒ، حضرت حسنؒ وغیرہ۔ حضرت ابو مالکؒ، حضرت ابورزینؒ، حضرت نخعیؒ، حضرت شعبیؒ، حضرت ضحاک،

حضرت عطا خراسانی، حضرت قتادہؒ، حضرت سدیؒ، حضرت مقاتل بن حبانؒ سے بھی یہی مروی ہے۔ حضرت عکرمہؒ نے بھی ابو طالب کا وہی شعر پیش کیا ہے۔ امام ابن جریر نے اسے روایت کیا ہے اور خود امام صاحب بھی اسی کو پسند کرتے ہیں۔

پھر فرماتا ہے اپنی بیویوں کے مہر خوش دلی سے ادا کر دیا کرو۔ جو بھی مقرر ہوئے ہوں اور جن کو تم نے منظور کیا ہے۔ ہاں اگر عورت خود اپنا سارا یا تھوڑا بہت مہر اپنی خوشی سے مرد کو معاف کر دے تو اسے اختیار ہے اور اس صورت میں بیشک مرد کو اس کا اپنے استعمال میں لانا حلال طیب ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی کو جائز نہیں کہ بغیر مہر واجب کے نکاح کرے۔ نہ یہ کہ مہر کا نام ہی نام ہو۔ ابن ابی حاتم میں حضرت علی کا قول ہے تم میں سے جب کوئی بیمار پڑ جائے تو اسے چاہئے کہ اپنی بیوی سے اس کے مال کے تین درہم یا کم وبیش لے۔ ان کا شہد خرید لے اور بارش کا پانی آسمان اس میں ملا لے تو تین تین بھلائیاں مل جائیں گی۔ هَنِيئًا مَّرِيئًا تو مال عورت اور شفا شہد اور مبارک بارش کا پانی۔ حضرت ابو صالح فرماتے ہیں کہ لوگ اپنی بیٹیوں کا مہر آپ لے لیتے تھے۔ جس پر یہ آیت اتری اور انہیں اس سے روک دیا گیا (ابن ابی حاتم اور ابن جریر)۔ اس حکم کو سن کر لوگوں نے رسول مقبول ﷺ سے پوچھا کہ ان میں آپس میں مہر کیا ہے؟ آپ نے فرمایا: جس چیز پر بھی رضا مند ہو جائیں۔ (ابن ابی حاتم) حضور ﷺ نے اپنے خطبہ میں تین مرتبہ فرمایا کہ بیوہ عورتوں کا نکاح کر دیا کرو۔ ایک شخص نے کھڑے ہو کر پوچھا کہ رسول اللہ ﷺ ان کا مہر کیا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: جس پر ان کے گھر والے راضی ہو جائیں۔ اس کے ایک راوی ابن سلیمانی ضعیف۔ پھر اس میں انقطاع بھی ہے۔

وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَاءَ أَمْوَالَكُمُ الَّتِي جَعَلَ اللَّهُ لَكُمْ قِيَامًا وَارْزُقُوهُمْ فِيهَا وَاكْسُوهُمْ وَقُولُوا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوفًا ۝ وَابْتَلُوا الْيَتَامَىٰ حَتَّىٰ إِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ فَإِنْ آنَسْتُم مِّنْهُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوا إِلَيْهِمْ أَمْوَالَهُمْ ۖ وَلَا تَأْكُلُوهَا إِسْرَافًا وَبِدَارًا أَن يَكْبَرُوا ۚ وَمَن كَانَ غَنِيًّا فَلْيَسْتَعْفِفْ ۖ وَمَن كَانَ فَقِيرًا فَلْيَأْكُلْ بِالْمَعْرُوفِ ۚ فَإِذَا دَفَعْتُمْ إِلَيْهِمْ أَمْوَالَهُمْ فَأَشْهِدُوا عَلَيْهِمْ ۚ وَكَفَىٰ بِاللَّهِ حَسِيبًا ۝٦

اور تم کم عقلوں کو اپنے وہ مال مت دو' جن کو اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے مایۂ زندگانی بنایا ہے اور ان مالوں میں سے ان کو کھلاتے رہو پہناتے رہو اور ان سے معقول بات کہتے رہو اور تم یتیموں کو آزمالیا کرو یہاں تک کہ جب وہ نکاح کو پہنچ جاویں پھر اگر ان میں ایک گونہ تمیز دیکھو تو ان کے اموال ان کے حوالے کر دو اور ان اموال کی ضرورت

سے زائد اٹھا کر اور اس خیال سے کہ یہ بالغ ہو جاویں گے جلدی جلدی اڑا کر مت کھا ڈالو اور جو شخص مستغنی ہو سو وہ اپنے آپ کو بالکل بچائے اور جو شخص حاجت مند ہو تو وہ مناسب مقدار سے کھا لے پھر جب ان کے اموال ان سے حوالے کرنے لگو تو ان پر گواہ بھی کر لیا کرو اور اللہ تعالیٰ ہی سے لینے والا کافی ہیں۔ ○

اموال کی حفاظت ☆

اللہ سبحانہ تعالیٰ لوگوں کو منع فرماتا ہے کہ کم عقل بیوقوفوں کے مال کی تصرف سے روکیں' مال کو اللہ تعالیٰ نے تجارت وغیرہ میں لگا کر انسان کا ذریعہ معاش بنایا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ کم عقل لوگوں کو ان کے مال کے خرچ سے روک دینا چاہئے۔ مثلاً نابالغ بچہ ہو یا مجنون و دیوانہ ہو یا کم عقل بے وقوف ہو اور بے دین ہو بری طرح اپنے مال کو اڑا رہا ہو۔ اسی طرح ایسا شخص جس پر قرض بہت چڑھ گیا ہو' جسے اپنے کل مال سے بھی ادا نہیں کر سکتا۔ اگر قرض خواہ حاکم وقت سے درخواست کریں۔ تو حاکم وہ سب مال اس کے قبضے سے لے لیگا اور اسے بے دخل کر دے گا۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں' یہاں سُفَهَآءَ سے مراد عورتیں اور بچے ہیں۔ حضرت سعید بن جبیر فرماتے ہیں: یتیم مراد ہیں۔ مجاہد عکرمہؒ اور قتادہ کا قول ہے کہ عورتیں مراد ہیں۔ ابن ابی حاتم میں ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: بے شک عورتیں بیوقوف ہیں مگر وہ جو اپنے خاوند کی اطاعت گزار ہوں ابن مردویہ میں بھی یہ حدیث موجود ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ اس سے مراد سرکش خادم ہیں۔ پھر فرماتے ہے انہیں کھلاؤ پہناؤ اور اچھی بات کہو۔ ابن عباسؓ فرماتے ہیں' یعنی تیرا مال جس پر تیری گزر بسر موقوف ہے اسے اپنے بیوی بچوں کو نہ دے ڈال کہ انکا ہاتھ تکتا پھرے۔ بلکہ اپنا مال اپنے قبضہ میں رکھ۔ اس کی اصلاح کرتا رہ اور خود اپنے ہاتھ سے انکے کھانے کپڑے کا بندوبست کر اور انکے خرچ اٹھا۔ ابو موسیٰؓ فرماتے ہیں: تین قسم کے لوگ ہیں کہ وہ اللہ سے دعا کرتے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ قبول نہیں کرتا ایک وہ شخص جس کی بیوی بدخلق ہو اور پھر بھی وہ اسے طلاق نہ دے اور دوسرا[1] وہ شخص جو اپنا مال بیوقوف کو دے دے' حالانکہ اللہ کا فرمان ہے: بیوقوف کو اپنا مال نہ دو۔ تیسرا وہ شخص جس کا قرض کسی پر ہو اور اس نے اس قرض پر کسی کو گواہ نہ کیا ہو۔ ان سے بھلی بات کہو۔ یعنی ان سے نیکی اور صلہ رحمی کرو۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ محتاجوں سے سلوک کرنا چاہئے اور جسے تصرف کا حق نہ ہو' اسکے کھانے کپڑے کی خبر گیری کرنی چاہئے اور اس کے ساتھ نرم زبانی اور خوش خلقی سے پیش آنا چاہئے۔

پھر فرمایا: یتیموں کی دیکھ بھال رکھو یہاں تک کہ وہ جوانی کو پہنچ جائیں۔ یہاں نکاح سے مراد بلوغت ہے اور بلوغت اس وقت ثابت ہوتی ہے جب اسے خاص قسم کے خواب آنے لگیں' جن میں خاص پانی اچھل کر نکلتا ہے[2]۔ حضرت علیؓ فرماتے ہیں: مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان بخوبی یاد ہے کہ احتلام کے بعد یتیمی نہیں اور نہ چپ[3] رہنا ہے سارے دن رات تک۔ دوسری حدیث میں ہے: تین قسم کے لوگوں سے قلم اٹھا لیا گیا۔ بچے سے جب تک بالغ نہ ہو۔ سوتے سے جب تک نجاگ نہ جائے۔ مجنون سے جب تک ہوش نہ آ جائے پس ایک تو علامت بلوغ یہ ہے۔ دوسری علامت بلوغ بعض کے نزدیک یہ ہے کہ پندرہ سال کی عمر ہو جائے۔ اس کی دلیل بخاری مسلم کی حضرت ابن عمرؓ والی حدیث ہے۔ جس میں وہ فرماتے

---

[1] یہ صرف ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کی اپنی رائے ہے' حدیث نہیں کہ واجب العمل ہو۔ انظر شاہ

[2] یعنی احتلام ہونے لگے۔

[3] یعنی اب معاملات میں خاموشی رضامندی کی علامت نہ ہو گی بلکہ کھل کر یا انکار کرنا ہو گا یا اقرار۔

ہیں کہ احد والی لڑائی میں مجھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ساتھ نہ لیا۔ اس وقت میری عمر چودہ سال کی تھی اور خندق کی لڑائی میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبول فرمالیا۔ اس وقت میں پندرہ سال کا تھا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کو یہ جب حدیث پہنچی تو آپ نے فرمایا: نابالغ بالغ کی حد یہی ہے تیسری علامت بلوغت کی زیر ناف بالوں کا نکلنا ہے۔ اس میں علما کے تین قول ہیں ایک یہ کہ علامت بلوغ ہے' دوسرے یہ کہ نہیں' تیسرے یہ کہ مسلمانوں میں نہیں اور ذمیوں میں ہے۔ اس لئے کہ ممکن ہے کسی دوا سے یہ بال جلد آتے ہوں اور ذمی پر جوان ہوتے ہی جزیہ لگ جاتا ہے تو اسے کیوں استعمال کرنے لگا۔ لیکن صحیح بات یہ ہے کہ سب کے حق میں یہ علامت بلوغت ہے۔ کیونکہ اولاً تو جبلی امر ہے۔ علاج معالجہ کا احتمال بہت دور کا احتمال ہے۔ ٹھیک یہی ہے کہ یہ بال اپنے وقت پر ہی نکلتے ہیں۔

دوسری دلیل مسند احمد کی حدیث ہے۔ جس میں حضرت عطیہ قرظی کا بیان ہے کہ بنو قریظہ کی لڑائی کے بعد ہم لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش کئے گئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ ایک شخص دیکھے کہ بال نکل آئے ہوں' اسے قتل کر دیا جائے اور جسے نہ نکلے ہوں' اسے چھوڑ دیا جائے۔ چنانچہ میرے ابھی نہ نکلے تھے' مجھے چھوڑ دیا گیا۔ سنن اربعہ میں بھی یہ حدیث ہے اور امام ترمذیؒ اسے حسن صحیح فرماتے ہیں۔ حضرت سعد کے فیصلے پر راضی ہو کر یہ قبیلہ لڑائی سے باز آیا تھا۔ پھر حضرت سعدؓ نے یہ فیصلہ کیا کہ ان سے لڑنے والے تو قتل کر دیئے جائیں اور بچے سب قیدی بنا لئے جائیں۔ غرائب ابی عبید میں ہے کہ ایک لڑکے نے ایک نوجوان لڑکی کی نسبت کہا کہ میں نے اس سے بدکاری کی ہے دراصل یہ تہمت تھی۔ حضرت عمرؓ نے اس تہمت کی حد لگانی چاہی لیکن فرمایا کہ دیکھ لو اگر اس کے زیر ناف بال اگ آئے ہوں تو اس پر حد جاری کر دو ورنہ نہیں۔ دیکھا تو اگے نہیں تھے چنانچہ اس پر سے حد ہٹا دی۔

پھر فرماتا ہے: جب تم دیکھو کہ یہ اپنے دین کی صلاحیت اور مال کی حفاظت کے لائق ہو گئے ہیں تو ان کے ولیوں کو چاہئے کہ ان کے مال انہیں دے دیں بغیر ضروری حاجت کے صرف اس ڈر سے کہ یہ بڑے ہوتے ہی اپنا مال ہم سے لے لیں گے تو ہم اس سے پہلے ہی ان کے مال کو ختم کر دیں۔ ان کا مال نہ کھاؤ' جسے ضرورت نہ ہو' خود امیر ہو' کھاتا پیتا ہو تو اسے چاہئے کہ ان کے مال میں سے کچھ لے۔ مثل مردار اور بہے ہوئے خون کے یہ مال اس پر حرام محض ہے۔ ہاں اگر کوئی والی مسکین محتاج ہو تو بے شک اسے جائز ہے کہ اپنی پرورش کے حق کے مطابق وقت کی حاجت اور دستور کے بموجب اس مال میں کھا پی لے۔ اپنی حاجت کو دیکھے اور اپنی محنت کو۔ اگر حاجت محنت سے کم ہو تو حاجت کے مطابق لے اور اگر محنت حاجت سے کم ہو تو محنت کا بدلہ لے لے۔ پھر ایسا ولی اگر مالدار بن جائے تو اسے اس کھائے ہوئے اور لئے ہوئے مال کو واپس کرنا پڑے گا یا نہیں؟ اس میں دو قول ہیں' ایک یہ کہ واپس نہ دینا ہو گا اس لئے کہ اس نے اپنے کام کا بدلہ لیا ہے۔ امام شافعیؒ کے شاگردوں کے نزدیک یہی صحیح ہے۔ اس لئے کہ آیت نے بغیر بدل کے مباح قرار دیا ہے اور مسند احمد وغیرہ میں ہے کہ ایک شخص نے کہا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے پاس مال نہیں' ایک یتیم میری پرورش میں ہے تو کیا میں اس کے کھانے میں سے کھا سکتا ہوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہاں اس یتیم کا مال اپنے کام میں لا سکتا ہے۔ بشرطیکہ حاجت سے زیادہ نہ لے نہ جمع کرے نہ یہ ہو کہ اپنے مال کو تو بچا رکھے اور اس کے مال کو کھائے چلا جائے۔ ابن ابی حاتم میں بھی ایسی ہی روایت ہے۔ ابن حبان وغیرہ میں ہے کہ ایک شخص نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ میں اپنے یتیم کو ادب سکھانے کے لئے ضرورتاً کس چیز سے ماروں؟ فرمایا جس سے تو اپنے بچے

کو تنبیہ کرتا ہے۔ اپنا مال بچا کر اس کا مال تباہ نہ کر۔ نہ اس کے مال سے دولت مند بننے کی کوشش کر۔ حضرت ابن عباسؓ سے کسی نے پوچھا کہ میرے پاس بھی اونٹ ہیں اور میرے ہاں جو یتیم پل رہے ہیں ان کے بھی اونٹ ہیں۔ میں اپنی اونٹنیاں دودھ پینے کے لئے فقیروں کو تحفۃً دے دیتا ہوں تو کیا میرے لئے جائز ہے کہ ان یتیموں کی اونٹنیوں کا دودھ پی لوں۔ آپ نے فرمایا کہ اگر ان یتیموں کی اونٹنیوں کی گم شدہ کو تو ڈھونڈ لاتا ہے۔ ان کے چارے پانی کی خبر گیری رکھتا ہے۔ ان کے حوض درست کرتا رہتا ہے اور ان کی نگہبانی کیا کرتا ہے تو بے شک دودھ سے فائدہ اٹھا۔ لیکن اس طرح کہ ان بچوں کو نقصان نہ پہنچے اور نہ حاجت سے زیادہ لے (موطا مالک)۔ حضرت عطا بن ابی باح' حضرت عکرمہ، حضرت ابراہیم نخعی، حضرت عطیہ عوفی، حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ اجمعین کا یہی قول ہے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ تنگدستی دور ہو جانے کے بعد وہ مال یتیم کو واپس دینا پڑے گا۔ اس لئے کہ اصل تو ممانعت ہے۔ ایک وجہ سے جواز ہو گیا تھا جب وہ وجہ جاتی رہی تو اس کا بدل دینا پڑے گا۔ جیسے کوئی بے بس اور مضطر ہو کر کسی غیر کا مال کھائے۔ لیکن حاجت کے نکل جانے کے بعد اسے واپس دینا ہوگا۔ دوسری دلیل یہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے جب مسند خلافت پر بیٹھے تو اعلان فرمایا کہ میری حیثیت یہاں یتیم کے والی کی حیثیت ہے۔ اگر مجھے ضرورت ہی نہ ہوئی تو میں بیت المال میں سے کچھ نہ لوں گا اور محتاجی ہوئی تو بطور قرض کے لوں گا۔ جب آسانی ہوئی پھر واپس کر دوں گا (ابن ابی الدینا)۔ حدیث سعید بن منصور میں بھی ہے اور اس کی اسناد صحیح ہیں۔ بیہقی میں بھی یہ حدیث ہے ابن عباسؓ آیت کے اس جملہ کی تفسیر میں منقول ہے کہ بطور قرض کے کھائے اور بھی مفسرین سے یہی منقول ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں معروف سے کھانے کا مطلب یہ ہے کہ تین انگلیوں سے کھائے اور روایت میں آپ ﷺ سے یہ مروی ہے کہ وہ اپنے ہی مال کو صرف اپنی ضرورت پوری ہو جانے کے لائق ہی خرچ کرے تاکہ اسے یتیم کے مال کی حاجت ہی نہ رہے۔ حضرت عامر شعبی فرماتے ہیں: اگر ایسی بے بسی ہو جس میں مردار کھانا جائز ہو جاتا ہے تو بے شک کھالے' لیکن پھر ادا کرنا ہوگا۔ یحییٰ بن سعید انصاری اور ربیعہ سے اس کی تفسیر منقول ہے کہ اگر یتیم فقیر ہے تو اسے ولی کی ضرورت کے موافق دے اور پھر اس ولی کو کچھ نہ ملے گا' عبادت میں یہ ٹھیک نہیں بیٹھتا۔ اس لئے کہ اس سے پہلے یہ جملہ بھی ہے کہ جو غنی ہو وہ رک جائے یعنی جو ولی غنی ہو۔ تو یہاں بھی یہی مطلب ہوگا کہ جو ولی فقیر ہو نہ کہ جو یتیم ہو۔ دوسری آیت میں ہے ﴿وَلَا تَقْرَبُوا مَالَ الْيَتِيمِ إِلَّا بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ حَتّٰى﴾ (الانعام: ۱۵۲) یعنی یتیم کے مال کے قریب بھی نہ جاؤ' ہاں بطور اصلاح کے۔ پھر اگر تمہیں حاجت ہو تو جب حاجت بطریق معروف اس میں سے کھاؤ پیو۔ پھر اولیاء سے کہا جاتا ہے کہ جب وہ بلوغت کو پہنچ جائیں اور تم دیکھ لو کہ ان میں تمیز آ چکی ہے تو گواہ رکھ کر ان کے مال ان کے سپرد کر دو تاکہ انکار کرنے کا وقت ہی نہ آئے۔ یوں تو دراصل سچا شاہد اور پورا نگراں اور مکمل حساب لینے والا اللہ تعالیٰ ہی ہے وہ خوب جانتا ہے کہ ولی نے یتیم کے مال میں نیت کیسی رکھی۔ آیا خورد برد کیا' تباہ برباد کیا۔ جھوٹ سچ حساب لکھا اور دیا یا صاف دلی اور نیک نیتی سے نہایت جوکسی اور صفائی سے اس کے مال کا پورا پورا خیال رکھا اور حساب کتاب صاف رکھا۔ ان سب باتوں کا حقیقی علم تو اسی دانا بینا نگران ونگہبان کو ہے۔ صحیح مسلم شریف میں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوذرؓ سے فرمایا: اے ابوذر! میں تمہیں ناتواں پاتا ہوں اور جو اپنے لئے چاہتا ہوں' وہی تیرے لئے پسند کرتا ہوں خبردار ہرگز ہرگز دو شخصوں کا بھی سردار اور امیر نہ بننا اور نہ کبھی کسی یتیم کا ولی بننا۔

لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ أَوْ كَثُرَ نَصِيبًا مَّفْرُوضًا ﴿٧﴾ وَإِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ أُولُوا الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينُ فَارْزُقُوهُم مِّنْهُ وَقُولُوا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوفًا ﴿٨﴾ وَلْيَخْشَ الَّذِينَ لَوْ تَرَكُوا مِنْ خَلْفِهِمْ ذُرِّيَّةً ضِعَافًا خَافُوا عَلَيْهِمْ فَلْيَتَّقُوا اللَّهَ وَلْيَقُولُوا قَوْلًا سَدِيدًا ﴿٩﴾ إِنَّ الَّذِينَ يَأْكُلُونَ أَمْوَالَ الْيَتَامَىٰ ظُلْمًا إِنَّمَا يَأْكُلُونَ فِي بُطُونِهِمْ نَارًا ۖ وَسَيَصْلَوْنَ سَعِيرًا ﴿١٠﴾

مردوں کے لئے بھی حصہ ہے اس چیز میں سے جس کو ماں باپ اور بہت نزدیک کے قرابتدار چھوڑ جاویں اور عورتوں کے لئے بھی حصہ ہے اس چیز میں سے جس کو ماں باپ اور بہت نزدیک کے قرابتدار چھوڑ جاویں خواہ وہ چیز قلیل ہو یا کثیر حصہ قطعی اور جب (وارثوں میں ترکہ کے) تقسیم ہونے کے وقت آ موجود ہوں رشتہ دار (دور کے) اور یتیم اور غریب لوگ تو ان کو بھی اس (ترکہ) میں جس قدر بالغوں کا ہے اس میں سے کچھ دیدو اور ان کے ساتھ خوبی سے بات کرو اور ایسے لوگوں کو ڈرنا چاہئے کہا کہ اگر اپنے بعد چھوٹے چھوٹے بچے چھوڑ جائیں تو ان کی ان کو فکر ہو سوان لوگوں کو چاہئے کہ اللہ تعالیٰ سے ڈریں اور موقع کی بات کہیں۔ بلاشبہ جو لوگ یتیموں کا مال بلا استحقاق کھاتے (برتتے) ہیں اور کچھ نہیں اپنے شکم میں آگ بھر رہے ہیں اور عنقریب جلتی آگ میں داخل ہوں گے۔ ○

ایک بری رسم اور اس کی اصلاح ☆

مشرکین عرب کا دستور تھا جب کوئی مرجاتا تو ان کی بڑی اولاد کو اس کا مال مل جاتا۔ چھوٹی اولاد اور عورتیں بالکل محروم رہتیں۔ اسلام نے یہ حکم نازل فرما کر سب کی مساویانہ حیثیت قائم کردی کہ وارث تو سب ہوں گے۔ خواہ قرابت حقیقی ہو۔ خواہ بوجہ عقد زوجیت کے ہو یا بوجہ نسبت آزادگی ہو حصہ سب کو ملے گا گو کم وبیش ہو۔ ام الحرؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کرتی ہیں کہ حضور میرے دولڑکے ہیں ان کے والد فوت ہو گئے اور ان کے پاس کچھ نہیں۔ پس یہ آیت نازل ہوئی۔ یہی حدیث دوسرے الفاظ سے میراث کی اور دونوں آیتوں کی تفسیر میں بھی عنقریب انشاء اللہ آئے گی واللہ اعلم۔

دوسری آیت کا مطلب یہ ہے کہ جب کسی مرنے والے کا ورثہ بٹنے لگے اور وہاں اس کا کوئی رشتہ دار دور کا بھی

آ جائے۔ جس کا کوئی حصہ مقرر نہ ہو اور یتیم اور مساکین آ جائیں تو انہیں کچھ نہ کچھ دے دو۔ ابتداء اسلام میں تو یہ واجب تھا اور بعض کہتے ہیں مستحب تھا اور اب بھی یہ حکم باقی ہے یا نہیں؟ اس میں دو قول ہیں۔ حضرت ابن عباسؓ تو اسے باقی بتاتے ہیں۔ حضرت مجاہدؒ، حضرت ابن مسعودؓ، حضرت ابو موسیٰؓ، حضرت عبدالرحمٰن بن ابو بکرؓ، حضرت ابو العالیہؒ، حضرت ابراہیم نخعیؒ، حضرت عطا بن ابی رباحؒ، حضرت شعبیؒ، حضرت حسنؒ، حضرت ابن سیرینؒ، حضرت سعید بن جبیرؒ، حضرت مکحولؒ، حضرت زہریؒ، حضرت یحییٰ بن معمرؒ بھی باقی بتلاتے ہیں۔ بلکہ یہ حضرات سوائے حضرت ابن عباسؓ کے وجوب کے قائل ہیں۔ حضرت ابو عبیدہ ایک وصیت کے ولی تھے۔ انہوں نے ایک بکری ذبح کی اور ان تینوں قسم کے لوگوں کو کھلائی اور فرمایا اگر یہ آیت نہ ہوتی تو یہ بھی میرا مال تھا۔ حضرت عروہ نے حضرت مصعبؓ کے مال کی تقسیم کے وقت بھی دیا حضرت زہری کا بھی قول ہے کہ یہ آیت محکم ہے منسوخ نہیں۔ ایک روایت میں حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ یہ موقوف ہے وصیت پر۔ چنانچہ جب عبدالرحمٰن بن ابو بکرؓ کے انتقال کے بعد ان کے بیٹے حضرت عبداللہ نے اپنے باپ کا ورثہ تقسیم کیا اور یہ واقعہ حضرت عائشہؓ کی موجودگی کا ہے۔ پس گھر میں جتنے مسکین اور قرابت دار تھے۔ سب کو دیا اور اسی آیت کی تلاوت کی۔ حضرت ابن عباسؓ کو جب یہ معلوم ہوا تو فرمایا: اس نے ٹھیک نہیں کیا۔ اس آیت سے مراد یہ ہے کہ جب مرنے والے نے اس کی وصیت کی ہو (ابن ابی حاتم)۔

بعض حضرات کا قول ہے کہ یہ آیت بالکل منسوخ ہی ہے۔ مثلاً عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں' یہ آیت منسوخ ہے اور ناسخ آیت ﴿يُوْصِيْكُمُ اللّٰهُ﴾ (النساء:۱۱) ہے۔ حصے مقرر ہونے سے پہلے یہ حکم تھا اور پھر جب حصے مقرر ہو چکے اور ہر حقدار کو خود اللہ تعالیٰ نے حق پہنچا دیا' تو صدقہ تو صرف وہی رہ گیا جو مرنے والا کہہ گیا ہو۔ حضرت سعید بن میسبؒ بھی یہی فرماتے ہیں کہ ہاں اگر وصیت ان لوگوں کے لئے ہو تو اور بات ہے۔ ورنہ یہ آیت منسوخ ہے۔ جمہور کا اور چاروں اماموں کا مذہب یہی ہے۔ امام ابن جریر نے یہاں ایک عجیب قول اختیار کیا ہے۔ ان کی تحریر کا ماحصل یہ ہے کہ مال وصیت کی تقسیم کے وقت جب میت کے رشتہ دار آ جائیں تو انہیں بھی دے دو اور یتیم اور مسکین جو آ گئے ہوں۔ ان سے نرم کلامی سے اور اچھے جواب سے پیش آؤ۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ تحقیق محل نظر ہے۔ واللہ اعلم۔ حضرت ابن عباسؓ وغیرہ فرماتے ہیں' تقسیم سے مراد یہاں ورثے کی تقسیم ہے۔ پس یہ قول امام ابن جریر عطیہ کے خلاف ہے۔ ٹھیک مطلب آیت کا یہ ہے کہ جب یہ غریب لوگ ترکے کی تقسیم کے وقت آ جائیں اور تم اپنا اپنا حصہ الگ الگ کر کے لے جاتے ہو اور یہ بے چارے تک رہے ہوں تو انہیں بھی خالی ہاتھ نہ پھیرو۔ ان کا وہاں سے خالی ہاتھ واپس جانا اللہ تعالیٰ رؤف و رحیم کو اچھا نہیں لگتا۔ بطور صدقہ کے راہ اللہ ان سے بھی کچھ سلوک کرو۔ تاکہ یہ خوش ہو کر جائیں۔ جیسے اور فرمان باری ہے کہ کھیتی کے کٹنے کے دن اس کا حق ادا کرو اور فاقہ زدہ اور مسکینوں سے چھپا کر اپنے باغ کے پھل لانے والوں کی اللہ تعالیٰ نے بڑی مذمت فرمائی ہے جیسے کہ سورہ نون میں ہے کہ وہ رات کے وقت چھپ کر کھیت اور باغ کے دانے اور پھل لانے کے لئے چلتے ہیں وہاں اللہ کے عذاب ان سے پہلے پہنچ جاتا ہے اور سارے باغ کو جلا کر راکھ سیاہ کر دیتا ہے۔ دوسروں کے حق برباد کرنے والوں کا یہی حشر ہوتا ہے۔ حدیث شریف میں ہے: جس مال میں صدقہ مل جائے' یعنی جو شخص اپنے مال سے صدقہ نہ دے' اس کا مال اس کے باعث غارت ہو جاتا ہے۔ پھر فرمایا ہے' ڈریں وہ لوگ جو اگر اپنے پیچھے چھوڑ جائیں۔ یعنی ایک شخص اپنی موت کے وقت وصیت کر رہا ہے اور اس میں اپنے وارثوں کو ضرر پہنچا رہا ہے تو اس وصیت کے سننے والے کو چاہئے کہ اللہ کا خوف کرے اور اسے ٹھیک بات کی رہنمائی کرے اور اس کے وارثوں کے لئے ایسی بھلائی

چاہئے جیسے اپنے وارثوں کے ساتھ بھلائی کرانا چاہتا ہے جب کہ ان کی بربادی اور تباہی کا خوف ہو۔

صحیحین میں ہے کہ جب رسول اللہ علیہ وسلم جب سعد بن ابی وقاصؓ کے پاس ان کی بیماری کے زمانہ میں ان کی عیادت کو گئے اور حضرت سعدؓ نے کہا: یارسول اللہ ﷺ! میرے پاس مال بہت ہے اور صرف ایک لڑکی ہی میرے پیچھے ہے تو اگر آپ اجازت دیں تو میں اپنے مال کی دو تہائیاں اللہ کی راہ میں صدقہ کردوں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: نہیں۔ انہوں نے کہا: اچھا آدھے کی تو اجازت دیجئے۔ آپ نے فرمایا نہیں۔ کہا: پھر ایک تہائی کی اجازت دیجئے۔ آپ نے فرمایا: خیر لیکن ہے یہ بھی زیادہ۔ تو اگر اپنے پیچھے اپنے وارثوں کو تونگر چھوڑ کر جائے یہ بہتر ہے کہ تو انہیں فقیر چھوڑ کر جائے کہ وہ ہاتھ پھیلاتے پھریں۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں: لوگ ایک تہائی سے بھی کم یعنی چوتھائی کی ہی وصیت کریں تو اچھا ہے اس لئے کہ رسول اللہ ﷺ نے تہائی کو بھی زیادہ فرمایا ہے۔ فقہاء فرماتے ہیں اگر میت کے وارث امیر ہوں تب تو خیر تہائی وصیت کرنا مستحب ہے اور اگر فقیر ہیں تو مستحب ہے کہ اس سے کم کی وصیت کرے۔ دوسرا مطلب اس آیت کا یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ تم یتیموں کا اتنا ہی خیال رکھو جتنا تم چاہتے ہو کہ تمہاری چھوٹی اولاد کا تمہارے مرنے کے بعد اور لوگ خیال رکھیں۔ جس طرح تم نہیں چاہتے کہ ان کے مال دوسرے ظلم سے کھا جائیں اور وہ بالغ ہو کر فقیر ہو جائیں، اسی طرح تم دوسروں کی اولادوں کے مال نہ کھا جاؤ۔ یہ مطلب بھی بہت برمحل ہے۔ اسی لئے اس کے بعد ہی یتیموں کا مال ناحق مار لینے والوں کی سزا بیان فرمائی ہے کہ یہ لوگ اپنے پیٹ میں انگارے بھرنے والے ہیں اور جہنم واصل ہونے والے ہیں۔

صحیحین میں ہے، حضور ﷺ نے فرمایا: سات گناہوں سے بچو، جو ہلاکت کا باعث ہیں۔ پوچھا گیا کیا کیا؟ فرمایا: (۱) اللہ کے ساتھ شرک، (۲) جادو، (۳) بے وجہ قتل، (۴) سود خواری، (۵) مال یتیم کا کھا جانا، (۶) جہاد سے منہ موڑنا، (۷) بھولی بھالی عفیف و پاکدامن مسلمان عورت پر تہمت[1] لگانا۔ ابن ابی حاتم میں ہے کہ صحابہؓ نے حضور ﷺ سے معراج کی رات کا واقعہ پوچھا، جس میں آپ نے فرمایا کہ میں نے بہت سے لوگوں کو دیکھا کہ ان کے ہونٹ لٹک رہے ہیں اور فرشتے انہیں گھسیٹ کر ان کا منہ خوب کھول دیتے ہیں۔ پھر جہنم کے گرم پتھر ان میں ٹھونس دیتے ہیں، جو ان کے پیٹ میں اتر کر پیچھے کے راستے سے نکل جاتے ہیں اور بری طرح چیخ چلا رہے ہیں۔ ہائے وائے مچا رہے ہیں۔ میں نے حضرت جبرئیل سے پوچھا: یہ کون لوگ ہیں؟ کہا: یتیموں کا مال کھا جانے والے ہیں جو اپنے پیٹوں میں آگ بھر رہے ہیں اور عنقریب جہنم میں جائیں گے۔ حضرت سدیؒ فرماتے ہیں: یتیم کا مال کھا جانے والا قیامت کے روز اپنی قبر سے اس طرح اٹھایا جائے گا کہ اس کے منہ آنکھوں اور نتھنوں اور روئیں روئیں سے آگ کے شعلے نکل رہے ہوں گے۔ ہر شخص دیکھتے ہی پہچان لے گا کہ اس نے کسی یتیم کا مال ناحق کھا رکھا ہے۔ ابن مردویہ میں ایک مرفوع حدیث بھی اسی مضمون کے قریب قریب ہے اور حدیث میں ہے، میں تمہیں وصیت کرتا ہوں کہ ان دونوں ضعیفوں کا مال پہنچا دو۔ عورتوں کا اور یتیموں کا۔ ان کے مال سے بچو۔ سورۃ بقرہ میں یہ روایت گزر چکی ہے کہ جب یہ آیت اتری تو جن کے پاس یتیم تھے انہوں نے ان کا اناج پانی بھی الگ کر دیا۔ اب عموماً ایسا ہوتا کہ کھانے پینے کی اگر ان کی کوئی چیز بچ رہتی تو یا تو دوسرے وقت اسی باسی چیز کو وہ کھائے یا سڑ کر پھینکی جائے۔ گھر والوں میں

[1] حدیث میں مسلمان کی قید کا یہ مطلب نہیں کہ غیر مسلم پاک دامن عورتوں پر زنا وغیرہ کے الزام لگانے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ ایسا مطلب لینا غلط ہوگا بلکہ مسلمان کی قید کو ذکر کرنے سے صرف اتنا سمجھانا ہے کہ مسلم عورتوں کے متعلق یہی حسن ظن ہے کہ وہ اس بد اخلاقی سے یقیناً محفوظ ہونگی۔

سے کوئی اسے ہاتھ بھی نہیں لگاتا تھا۔ یہ بات دونوں طرف ناگوار گزری۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے بھی اس کا ذکر آیا، اس پر آیت ﴿وَيَسْـَٔلُونَكَ عَنِ الْيَتٰمٰى﴾ (البقرہ:۲۲۰) اتری۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ جس کام میں یتیموں کی بہتری سمجھو کرو۔ چنانچہ پھر کھانا پینا ایک ساتھ ہوا۔

يُوصِيكُمُ اللّٰهُ فِيٓ اَوْلَادِكُمْ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ ۚ فَاِنْ كُنَّ نِسَآءً فَوْقَ اثْنَتَيْنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ ۚ وَاِنْ كَانَتْ وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصْفُ ۭ وَلِاَبَوَيْهِ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ مِمَّا تَرَكَ اِنْ كَانَ لَهٗ وَلَدٌ ۚ فَاِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهٗ وَلَدٌ وَّوَرِثَهٗٓ اَبَوٰهُ فَلِاُمِّهِ الثُّلُثُ ۚ فَاِنْ كَانَ لَهٗٓ اِخْوَةٌ فَلِاُمِّهِ السُّدُسُ مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصِيْ بِهَآ اَوْ دَيْنٍ ۭ اٰبَاۗؤُكُمْ وَاَبْنَاۗؤُكُمْ ۚ لَا تَدْرُوْنَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعًا ۭ فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ⑪

اللہ تعالیٰ تم کو حکم دیتا ہے تمہاری اولاد کے باب میں لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے برابر اور اگر صرف لڑکیاں ہی ہوں گو دو سے زیادہ ہوں تو ان لڑکیوں کو دو تہائی ملے گا اس مال کا جو کہ مورث چھوڑ مرا ہے اور اگر ایک ہی لڑکی ہو تو اس کو نصف ملے گا اور ماں باپ یعنی دونوں میں سے ہر ایک کے لئے میت کے ترکہ میں سے چھٹا حصہ ہے اگر میت کی کچھ دار اولاد ہے اور اگر اس میت کے کچھ اولاد نہ ہو اور اس کے ماں باپ ہی اس کے وارث ہوں تو اس کی ماں کا ایک تہائی ہے اور اگر میت کے ایک سے زیادہ بھائی یا بہن ہوں تو اس کی ماں کو چھٹا حصہ ملے گا اور باقی باپ کو ملے گا۔ وصیت نکال لینے کے بعد کہ میت اس کی وصیت کر جائے یا دین کے بعد تمہارے اصول وفروع جو ہیں یہ نہیں جان سکتے ہو کہ ان میں کون سا شخص تم کو نفع پہنچانے میں نزدیک تر ہے حکم منجانب اللہ مقرر کر دیا گیا۔ بالیقین اللہ تعالیٰ بڑے علم والے اور حکمت والے ہیں۔ ○

میراث کے کچھ احکام ☆

یہ آیہ کریمہ اور اس کے بعد کی آیت اور اس سورۃ کا خاتمہ کی آیت علم فرائض کی آیتیں ہیں۔ یہ پورا علم ان آیتوں اور میراث کی حدیثوں سے استنباط کیا گیا ہے جو حدیثیں ان آیتوں کی گویا تفسیر اور توضیح ہیں۔ یہاں ہم اس آیت کی تفسیر لکھتے ہیں۔ باقی جو میراث کے مسائل کی پوری تقریر ہے اور اس میں جن دلائل کی سمجھ میں جو کچھ اختلاف ہوا ہے اس کے بیان کرنے کی مناسب جگہ احکام کی کتابیں ہیں نہ کہ تفسیر۔ اللہ تعالیٰ ہماری مدد فرمائے۔ علم فرائض کے سیکھنے کی فضیلت میں بہت سی حدیثیں ہیں ان آیتوں میں جن فرائض کا ذکر ہے یہ سب سے زیادہ اہم ہیں۔ ابوداؤد اور ابن ماجہ میں ہے' علم دراصل تین ہیں اور اس

کے ماسوا ضرورت سے زیادہ آیات قرآنیہ ہو مضبوط ہیں اور جن کے احکام باقی ہیں۔ سنت قائمہ یعنی احادیث جو ثابت شدہ ہیں اور فریضہ عادلہ یعنی مسائل میراث جو ان دو سے ثابت ہیں۔ ابن ماجہ کی دوسری ضعیف سند والی حدیث میں ہے کہ فرائض سیکھو اور دوسروں کو سکھاؤ۔ یہ نصف علم ہے اور یہ بھول بھال جاتے ہیں اور یہی پہلی وہ چیز ہے جو میری امت سے چھن جائے گی۔ حضرت ابن عیینہ فرماتے ہیں: اسے آدھا علم اس لئے کہا گیا ہے کہ تمام لوگوں کو عموماً یہ پیش آتے ہیں۔

صحیح بخاری شریف میں اس آیت کی تفسیر میں حضرت جابر بن عبداللہؓ سے روایت ہے کہ میں بیمار تھا' آنحضرت ﷺ اور حضرت ابوبکر صدیقؓ میری بیمار پرسی کے لئے بنو سلمہ کے محلہ میں پیادہ پا تشریف لائے۔ میں اس وقت بے ہوش تھا۔ آپ نے پانی منگوا کر وضو کیا۔ پھر وضو کے پانی کا چھینٹا مجھے دیا۔ جس سے مجھے ہوش آیا۔ تو میں نے کہا: حضور ﷺ میں اپنے مال کی تقسیم کس طرح کروں؟ اس پر یہ آیت شریفہ نازل ہوئی۔ صحیح مسلم شریف' نسائی شریف وغیرہ میں بھی یہ حدیث موجود ہے۔ ابو داؤد' ترمذی' ابن ماجہ' مسند امام احمد ابن حنبل وغیرہ میں ہے کہ حضرت سعد بن ربیع رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بیوی صاحبہؓ رسول اللہ ﷺ کے پاس آئیں اور کہا: یا رسول اللہ ﷺ! یہ دونوں حضرت سعد کی لڑکیاں ہیں۔ ان کے والد جنگ احد میں شریک تھے اور وہیں شہید ہوئے۔ ان کے چچا نے ان کا کل مال لے لیا ہے ان کے لئے کچھ نہیں چھوڑا اور یہ ظاہر ہے کہ ان کا نکاح بغیر مال کے نہیں ہو سکتا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اس کا فیصلہ خود اللہ کرے گا۔ چنانچہ آیت میراث نازل ہوئی۔ آپ ﷺ نے ان کے چچا کے پاس آدمی بھیج کر حکم بھیجا کہ دو تہائی تو ان دونوں لڑکیوں کو دو اور آٹھواں حصہ ان کی ماں کو دو اور باقی مال تمہارا ہے۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت جابرؓ کے سوال پر اس سورت کی آخری آیت اتری ہوگی۔ جو عنقریب آ رہا ہے انشاء اللہ تعالیٰ۔ اس لئے کہ ان کی وارث صرف ان کی بہنیں ہی تھیں وہ تو کلالہ تھے اور یہ آیت اسی سلسلے میں یعنی حضرت سعد بنؓ ربیع کے ورثے کے بارے میں نازل ہوئی ہے اور اس کے راوی بھی خود حضرت جابرؓ ہیں۔ ہاں حضرت امام بخاریؒ نے اس حدیث کی اسی آیت کی تفسیر میں ذکر کیا ہے۔ اس لئے ہم نے بھی ان کی موافقت کی واللہ اعلم۔ مطلب آیت کا یہ ہے کہ اللہ تمہیں تمہاری اولاد کے بارے میں عدل سکھاتا ہے۔ اہل جاہلیت تمام مال لڑکوں کو دیتے تھے اور لڑکیاں خالی ہاتھ رہ جاتی تھیں تو اللہ تعالیٰ نے ان کا حصہ بھی مقرر کر دیا۔ ہاں دونوں کے حصوں میں فرق رکھا اس لئے کہ مردوں کے ذمہ جو ضروریات ہیں وہ عورتوں کے ذمہ نہیں۔ مثلاً اپنے متعلقین کے کھانے پینے اور خرچ کے اخراجات کی کفالت اور کسب اور اسی طرح کی اور مشقتیں۔ تو انہیں ان کی حاجت کے مطابق عورتوں سے دوگنا دلوایا۔ بعض دانا بزرگوں نے یہاں ایک نہایت باریک نکتہ بیان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر بہ نسبت ماں باپ کے زیادہ مہربان ہے۔ باپ کو ان کی اولاد کے بارے میں وصیت کر رہا ہے۔

پس معلوم ہوا کہ ماں باپ اپنی اولاد پر اتنے مہربان نہیں جتنا مہربان ہمارا خالق اپنی مخلوق پر ہے۔ چنانچہ ایک صحیح حدیث میں ہے کہ قیدیوں میں سے ایک عورت کا بچہ اس سے چھوٹ گیا۔ وہ دیوانوں کی طرح اسے ڈھونڈتی پھرتی تھی اور جس بچہ کو پالیتی اپنے سینہ سے لگا کر اسے دودھ پلاتی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دیکھ کر اپنے اصحاب سے فرمایا: بھلا بتاؤ تو کیا یہ عورت باوجود اپنے اختیار کے اپنے بچہ کو آگ میں ڈال دے گی؟ لوگوں نے کہا: یا رسول اللہ ﷺ! ہرگز نہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ کی قسم اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر اس سے بھی زیادہ مہربان ہے۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ پہلے حصہ دار اور حقدار مال کا صرف لڑکا تھا' ماں باپ کو بطور وصیت کے کچھ مل جاتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اسے منسوخ کر دیا اور لڑکے کو لڑکی سے

دوگنا دلوایا اور ماں باپ کو چھٹا حصہ دلوایا اور تیسرا حصہ بھی اور بیوی کو آٹھواں حصہ اور چوتھا حصہ اور خاوند کو آدھا اور پاؤ۔ فرماتے ہیں میراث کے احکام اُترنے پر بعض لوگوں نے کہا یہ اچھی بات ہے کہ عورت کو چوتھا اور آٹھواں حصہ دلوایا جارہا ہے اور لڑکی کو آدھوں آدھ دلوایا جارہا ہے اور ننھے منے بچوں کا حصہ مقرر کیا جارہا ہے حالانکہ ان میں سے کوئی بھی نہ لڑائی میں نکل سکتا ہے نہ مالِ غنیمت لاسکتا ہے۔ اچھا تم اس حدیث سے خاموشی برتو۔ شاید رسول اللہ ﷺ بھول جائیں یا ہمارے کہنے کی وجہ سے آپ ﷺ ان احکام کو بدل دیں۔ پھر انہوں نے آپ ﷺ سے کہا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم لڑکی کو اس کے باپ کا آدھا مال دلوا رہے ہیں۔ حالانکہ نہ وہ گھوڑے پر بیٹھنے کے لائق' نہ دشمن سے لڑنے کے قابل' آپ ﷺ بچے کو ورثہ دلا رہے ہیں بھلا وہ کیا فائدہ پہنچا سکتا ہے؟ یہ لوگ جاہلیت کے زمانہ میں ایسا ہی کرتے تھے کہ میراث صرف اسے دیتے تھے جو لڑنے بھڑنے کے قابل ہو سب سے بڑے لڑکے کو وارث کرتے تھے۔ لفظ فَوْقَ کو بعض لوگ زائد بتلاتے ہیں۔ جیسے: ﴿فَاضْرِبُوْا فَوْقَ الْاَعْنَاقِ﴾ میں لفظ فوق زائد ہے۔ لیکن ہم یہ نہیں مانتے نہ اِس آیت میں نہ اُس آیت میں۔ کیونکہ قرآن میں کوئی ایسی زائد چیز نہیں ہے جو محض بے فائدہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کے کلام میں ایسا ہونا محال ہے۔ پھر یہ خیال فرمایئے کہ اگر ایسا ہی ہوتا تو اس کے بعد فَلَهُنَّ نہ آتا بلکہ فَلَهُمَا آتا۔ ہاں اسے ہم جانتے ہیں کہ اگر لڑکیاں دو سے زائد نہ ہوں یعنی صرف دو ہوں تو بھی یہی حکم ہے۔ یعنی انہیں بھی دو ثلث ملے گا۔ کیونکہ دوسری آیت میں دو بہنوں کو دو ثلث دلوایا گیا ہے اور جبکہ دو بہنیں دو ثلث پاتی ہیں تو دو لڑکیوں کو دو ثلث کیوں نہ ملے گا؟ ان کے لئے تو دو تہائی بطور اولیٰ ہونا چاہئے اور حدیث میں آچکا کہ دو لڑکیوں کو رسول اللہ ﷺ نے دو تہائی مال ترکہ کا دلوایا۔ جیسا کہ اس آیت کی شانِ نزول کے بیان میں حضرت سعدؓ کی لڑکیوں کے ذکر میں اس سے پہلے بیان ہو چکا ہے۔ پس کتاب وسنت سے یہ ثابت ہوگیا۔ اسی طرح اس کی دلیل میں بھی ہے کہ ایک لڑکی اگر ہو یعنی لڑکا نہ ہونے کی صورت میں تو اسے آدھوں آدھ دلوایا گیا ہے۔ پس اگر دو کو بھی آدھا ہی دینے کا حکم کرنا مقصود ہوتا تو یہیں بیان ہو جاتا۔ جب ایک کو الگ کر دیا تو معلوم ہوا کہ دو کا حکم وہی ہے جو دو سے زائد کا ہے۔ واللہ اعلم۔

پھر باپ کا حصہ بیان ہو رہا ہے ان کے ورثے کی مختلف صورتیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ مرنے والے کی اولاد ایک لڑکی سے زیادہ ہو اور ماں باپ بھی ہوں تو انہیں چھٹا حصہ ملے گا۔ یعنی چھٹا حصہ باپ کو۔ اگر مرنے والے کی صرف ایک لڑکی ہو تو آدھا مال تو وہ لڑکی لے لے گی اور چھٹا حصہ ماں لے لے گی چھٹا حصہ باپ کو ملے گا اور چھٹا حصہ جو باقی رہا وہ بھی بطور عصبہ باپ کو مل جائے گا۔ پس اس حالت میں باپ فرض اور تعصیب دونوں کو جمع کر لے گا۔ یعنی مقررہ چھٹا حصہ اور بطور عصبہ بچت کا مال۔ دوسری صورت یہ ہے کہ صرف ماں باپ ہی وارث ہوں تو ماں کو تیسرا حصہ مل جائے گا اور باقی کا کل مال باپ کو بطور عصبہ کے مل جائے گا۔ تو گویا دو ثلث مال اس کے ہاتھ لگے گا۔ یعنی بہ نسبت ماں کے دوگنا باپ کو مل جائے گا۔ اب مرنے والی عورت کا خاوند بھی ہے یا مرنے والے مرد کی بیوی ہے۔ یعنی اولاد نہیں ماں باپ ہے اور خاوند ہے یا بیوی ہے تو اس پر اتفاق ہے کہ خاوند کو آدھا اور بیوی کو پاؤ ملے گا۔ پھر علماء کا اس میں اختلاف ہے کہ ماں کو اس صورت میں کیا ملے گا؟ تین قول ہیں ایک تو یہ ہے کہ جو مال باقی رہا اس میں سے تیسرا حصہ ملے گا دونوں صورتوں میں یعنی خواہ عورت خاوند چھوڑ کر مری ہو خواہ مرد عورت چھوڑ کر مرا ہو۔ اس لئے کہ باقی کا مال ان کی نسبت سے گویا کل مال ہے اور ماں کا حصہ باپ سے آدھا ہے تو اس باقی کے مال سے تیسرا حصہ یہ لے لے اور دو دوسرے حصے جو باقی رہے وہ باپ لے لے گا۔ حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ اور باعتبار زیادہ صحیح روایت ہے حضرت

علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہی فیصلہ ہے۔ حضرت ابن مسعود اور حضرت زید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہی قول ہے۔ ساتوں فقہاء اور چاروں اماموں اور جمہور علمائے کرام کا بھی یہی فتویٰ ہے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ ان دونوں صورتوں میں بھی ماں کو کل مال کا ثلث دلوایا گیا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہی قول ہے۔ حضرت علیؓ اور معاذ بن جبلؓ سے بھی اسی طرح منقول ہے۔ حضرت شریح رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت داؤد ظاہری بھی یہی فرماتے ہیں۔ حضرت ابوالحسین بن لبتان بصری بھی اپنی کتاب ایجاز میں جو علم فرائض کے بارے میں ہے اسی قول کو درست قرار دیتے ہیں۔ لیکن یہ قول محل نظر ہے۔ بلکہ زیادہ درست یہ ہے کہ قول ضعیف ہے۔ کیونکہ آیت نے اس کا یہ حصہ اس پر مقرر فرمایا ہے جبکہ کل مال کی وراثت صرف ماں باپ کو ہی پہنچتی ہو اور جبکہ زوج یا زوجہ ہے اور وہ اپنے مقررہ حصہ کے مستحق ہیں تو پھر جو باقی رہ جائے گا۔ بیشک وہ ان دونوں ہی کا حصہ ہے تو اس میں ثلث ملے گا۔ تیسرا قول یہ ہے کہ اگر میت مرد ہے اور اس کی بیوی موجود ہے تو فقط اس صورت میں تو اسے کل مال کا تہائی ملے گا کیونکہ اس عورت کو کل مال کا چوتھائی ملے گا۔ اگر کل مال کے بارہ حصے کئے جائیں تو تین حصے یہ لے گی اور چار ماں کو ملیں گے۔ باقی بچے پانچ حصے وہ باپ لے لے گا۔ لیکن اگر عورت مری ہے اور اس کا خاوند موجود ہے تو ماں کو باقی مال کا تیسرا حصہ ملے گا۔ اگر کل مال کا تیسرا حصہ اس صورت میں بھی ماں کو دلوایا جائے تو اس باپ سے زیادہ پہنچ جاتا ہے۔ مثلاً میت کے مال کے چھ حصے کئے تین تو خاوند لے گیا دو ماں لے گئی تو باپ کے پلے ایک ہی پڑے گا۔ جو ماں سے بھی تھوڑا ہے۔ اس لئے اس صورت میں چھ میں سے تین تو خاوند کو دیئے جائیں گے۔ ایک ماں کو اور دو باپ کو۔ ابن سیرین رحمۃ اللہ علیہ کا یہی قول ہے۔ یوں سمجھنا چاہئے کہ یہ قول دو قولوں سے مرکب ہے۔ ضعیف یہ بھی ہے اور صحیح قول پہلا ہی ہے۔ واللہ اعلم۔

ماں باپ کے احوال میں سے تیسرا حال یہ ہے کہ وہ بھائیوں کے ساتھ ہوں۔ خواہ وہ سگے ہوں یا صرف باپ کی طرف سے یا صرف ماں کی طرف سے تو وہ باپ کے ہوتے ہوئے اپنے بھائی کے ورثے میں سے کچھ پائیں گے نہیں لیکن ہاں ماں کو تہائی سے ہٹا کر چھٹا حصہ دلوائیں گے اور اگر کوئی اور وارث ہی نہ ہو اور صرف ماں کے ساتھ باپ ہی ہو تو باقی مال کل کا کل باپ لے لے گا۔ دو بھائی بھی حکم میں بہت سے بھائیوں کے ہیں۔ جمہور کا یہی قول ہے۔ ہاں ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ آپ نے ایک مرتبہ حضرت عثمانؓ سے کہا کہ دو بھائی ماں کو ثلث ہٹا کر سدس تک نہیں لے جاتے۔ قرآن میں اِخْوَۃٌ جمع کا لفظ ہے دو بھائی اگر مراد ہوتے اَخَوان کہا جاتا۔ خلیفہ ثالثؓ نے جواب دیا کہ پہلے ہی سے یہ چلا آتا ہے اور ہر طرف یہ مسئلہ اسی طرح پہنچا ہوا ہے تمام لوگ اس کے عامل ہیں میں اس کو نہیں بدل سکتا۔ اولاً تو یہ ثابت ہی نہیں۔ اس کے راوی حضرت شعبہ کے بارے میں حضرت امام مالکؒ کی جرح موجود ہے۔ پھر یہ قول ابن عباسؓ کا نہ ہونے کی دلیل یہ ہے کہ خود حضرت ابن عباسؓ کے خاص اصحاب اور اعلیٰ شاگرد بھی اس کے خلاف ہیں۔ حضرت زید فرماتے ہیں دو کو اخوۃ کہا جاتا ہے۔ الحمد للہ میں نے اس مسئلہ کو پوری طرح ایک علیحدہ رسالہ میں لکھا ہے۔ حضرت سعید ابن قتادہ سے بھی اسی طرح منقول ہے۔ ہاں میت کا اگر ایک ہی بھائی ہو تو ماں کو تیسرے حصے سے ہٹا نہیں سکتا۔ علمائے کرام کا فرمان ہے کہ اس میں حکمت یہ ہے کہ میت کے بھائیوں کی شادیوں کا اور کھانے پینے کا کل خرچ باپ کے ذمہ ہے نہ کہ ماں کے ذمہ۔ اس لے مقتضائے حکمت یہی تھا کہ باپ کو زیادہ دیا جائے۔ یہ توجیہہ بہت ہی عمدہ ہے۔ لیکن حضرت ابن عباس کا قول ہے کہ کَلٰلَہ اسے کہتے ہیں جس کا بیٹا اور باپ نہ ہو۔ پھر

فرمایا وصیت اور قرض کے بعد تقسیم میراث ہوگی۔ تمام سلف خلف کا اجماع ہے کہ قرض وصیت پر مقدم ہے اور فوائے آیت وجمی اگر بغور دیکھا جائے تو یہی معلوم ہوتا ہے۔ ترمذی وغیرہ میں ہے حضرت علی بن ابی طالب فرماتے ہیں کہ تم قرآن میں وصیت کا حکم پہلے پڑھتے ہو اور قرض کا بعد میں۔ لیکن یاد رکھنا چاہئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرض پہلے ادا کرایا ہے پھر وصیت جاری کی ہے۔ ایک ماں زاد بھائی آپ میں وارث ہوں گے بغیر علاتی بھائیوں کے۔ آدمی اپنے سگے بھائیوں کا وارث ہوگا نہ اس کا جس کی ماں دوسری ہو۔ یہ حدیث صرف حارث سے روایت ہے اور ان پر بعض محدثین نے جرح کی ہے۔ لیکن یہ حافظ فرائض تھے۔ اس علم میں آپ کو خاصی دلچسپی اور دسترس تھی اور حساب کے بھی بڑے ماہر تھے۔ واللہ اعلم۔

پھر فرمایا کہ ہم نے باپ بیٹوں کو اصل میراث میں اپنا اپنا حصہ مقرر لینے والا بنایا اور جاہلیت کی رسم ہٹا دی۔ بلکہ اسلام میں بھی پہلے جو یہ حکم تھا کہ مال اولاد کو مل جایا کرتا تھا۔ ماں باپ کو صرف وصیت کے طور پر ملتا تھا۔ جیسے حضرت ابن عباسؓ سے پہلے بیان ہو چکا ہے۔ یہ منسوخ کر کے اب یہ حکم ہوا۔ تمہیں یہ نہیں معلوم کہ تمہیں باپ سے زیادہ نفع پہنچے گا یا اولاد نفع دے گی۔ امید دونوں سے نفع کی ہے یقین کسی پر بھی دوسرے سے زیادہ نہیں۔ ممکن ہے باپ سے زیادہ بیٹا کام آئے اور نفع پہنچائے اور ممکن ہے بیٹے سے زیادہ باپ سے نفع پہنچے اور وہ کام آئے۔ پھر فرماتے ہے کہ یہ مقررہ حصے اور میراث کے یہ احکام اللہ کی طرف سے فرض ہیں۔ اس میں کسی کی بیشی کی کسی امید یا کسی خوف کی گنجائش نہیں۔ نہ کسی محروم کو دینا لائق نہ کسی کو زیادہ دلوا دینا۔ اللہ تعالیٰ علیم وحکیم ہے۔ جو جس کا مستحق ہے اسے اتنا دلوا دیتا ہے ہر چیز کی جگہ وہ بخوبی جانتا ہے۔ تمہارے نفع نقصان کا اسے پورا علم ہے۔ اسکا کوئی کام اور کوئی حکم حکمت سے خالی نہیں۔ تمہیں چاہئے کہ اسکے احکام اسکے فرمان مانتے چلے جاؤ۔

وَلَكُمْ نِصْفُ مَا تَرَكَ أَزْوَاجُكُمْ إِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهُنَّ وَلَدٌ ۚ فَإِنْ كَانَ لَهُنَّ وَلَدٌ فَلَكُمُ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْنَ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوصِينَ بِهَا أَوْ دَيْنٍ ۚ وَلَهُنَّ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْتُمْ إِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّكُمْ وَلَدٌ ۚ فَإِنْ كَانَ لَكُمْ وَلَدٌ فَلَهُنَّ الثُّمُنُ مِمَّا تَرَكْتُمْ مِّنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ تُوصُونَ بِهَا أَوْ دَيْنٍ ۗ وَإِنْ كَانَ رَجُلٌ يُّورَثُ كَلٰلَةً أَوِ امْرَأَةٌ وَّلَهٗ أَخٌ أَوْ أُخْتٌ فَلِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ ۚ فَإِنْ كَانُوا أَكْثَرَ مِنْ ذٰلِكَ فَهُمْ شُرَكَاءُ فِي الثُّلُثِ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوصٰى بِهَا أَوْ دَيْنٍ ۙ غَيْرَ مُضَارٍّ ۚ وَصِيَّةً مِّنَ اللّٰهِ ۗ وَاللّٰهُ عَلِيمٌ حَلِيمٌ ﴿۱۲﴾

اور تم کو آدھا ملے گا اس ترکہ کا جو تمہاری بیبیاں چھوڑ جائیں اگر ان کے کچھ اولاد نہ ہو اور اگر ان بیبیوں کے کچھ

اولاد ہو تو تم کو ان کے ترکہ سے ایک چوتھائی ملے گا۔ وصیت نکالنے کے بعد کہ وہ اس کی وصیت کر جائیں یا دین کے بعد اور ان بیبیوں کو چوتھائی ملے گا اس ترکہ کا جس کو تم چھوڑ جاؤ اگر تمہارے کچھ اولاد نہ ہو اور اگر تمہارے کچھ اولاد ہو تو ان کو تمہارے ترکہ میں سے آٹھواں حصہ ملے گا وصیت نکالنے کے بعد کہ تم اس کی وصیت کر جاؤ یا دین کے بعد اور اگر کوئی میت جس کی میراث دوسروں کو ملے گی خواہ وہ میت مرد ہو یا عورت ایسا ہو جس کے نہ اصول ہوں نہ فروع ہوں اور اس کے ایک بھائی یا ایک بہن ہو تو ان دونوں میں سے ہر ایک کو چھٹا حصہ ملے گا اور اگر یہ لوگ اس سے زیادہ ہوں تو یہ سب تہائی میں شریک ہوں گے۔ وصیت نکالنے کے بعد جس کی وصیت کر دی جائے یا دین کے بعد بشرطیکہ کسی کو ضرر پہنچائے۔ حکم کیا گیا ہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے اور اللہ تعالیٰ خوب جاننے والے ہیں اور حلیم ہیں۔ ○

کچھ اور مسائل ☆

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اے مردو! تمہاری عورتیں جو چھوڑ مریں، اگر ان کی اولاد نہ ہو تو اس میں آدھوں آدھ تمہارا ہے اور اگر ان کے بال بچے ہوں تو تمہیں چوتھائی ملے گا۔ وصیت اور قرض کے بعد۔ ترتیب اس طرح ہے، سب سے پہلے قرض ادا کیا جائے۔ پھر وصیت پوری کی جائے۔ پھر ورثہ تقسیم ہو یہ ایسا مسئلہ ہے جس پر تمام علمائے امت کا اجماع ہے۔ پوتے بھی اس مسئلہ کے حکم میں بیٹوں کے ہیں۔ بلکہ ان کی اولاد اور اولاد کا بھی یہی حکم ہے کہ ان کی موجودگی میں خاوند کو چوتھائی ملے گا۔ پھر عورتوں کا حصہ بتایا کہ انہیں یا چوتھائی ملے گا یا آٹھواں حصہ۔ چوتھائی تو اس حالت میں کہ فوت ہونے والے خاوند کی اولاد نہ ہو اور آٹھواں حصہ اس حالت میں کہ اولاد ہو۔ اس چوتھائی یا آٹھواں حصے میں مرنے والے کی سب بیویاں شامل ہیں۔ چار ہوں تو ان میں یہ برابر تقسیم ہو جائے گا۔ تین یا دو ہوں تب بھی اور اگر ایک ہو تب بھی اسی کا یہ حصہ ہے ﴿مِن بَعۡدِ وَصِيَّةٍ﴾۔ تفسیر اس سے پہلی آیت میں گزر چکی ہے۔

کلالہ کی تحقیق اور احکام ☆

كَلاَلَه مشتق ہے اِكۡلِيلُ سے۔ اِكۡلِيل کہتے ہیں اس تاج وغیرہ کو جو سر کی ہر طرف سے گھیر لے۔ یہاں مراد یہ ہے کہ اس کے وارث اردگرد کے حاشیہ کے لوگ ہیں۔ اصل اور فروع یعنی جڑ یا شاخ نہیں۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ سے کلالہ کے معنی پوچھے گئے۔ تو آپؓ فرماتے ہیں۔ اپنی رائے سے جواب دیتا ہوں اگر ٹھیک ہے تو اللہ کی طرف سے ہے اور اگر غلط ہے تو میرے اور شیطان کی طرف سے ہے اور اللہ اور اس کا رسول اس سے بری الذمہ ہیں۔ کلالہ وہ ہے جس کا نہ لڑکا ہو نہ باپ۔ حضرت عمر فاروقؓ جب خلیفہ ہوئے تو آپ نے اس سے موافقت کی اور فرمایا: مجھے ابوبکر کی رائے سے خلاف کرتے ہوئے شرم آتی ہے (ابن جریر وغیرہ)۔ ابن عباسؓ فرماتے ہیں سب سے آخری زمانہ پانے والا میں ہوں، میں نے سنا فرماتے تھے، بات وہی ہے جو میں نے کہی۔ ٹھیک اور درست یہی ہے کہ کلالہ اسے کہتے ہیں جس کا نہ والد ہو نہ والدہ۔ حضرت علی ابن مسعود، ابن عباس، زید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔ شعبی نخعی، حسن، قتادہ، جابر بن زید، حکم رحمۃ اللہ علیہم اجمعین بھی یہی فرماتے ہیں۔ اہل مدینہ، اہل کوفہ، اہل بصرہ کا بھی یہی قول ہے۔ ساتوں فقہاء، چاروں امام اور جمہور سلف وخلف بلکہ تمام یہی فرماتے ہیں۔ بہت سے بزرگوں نے اس پر اجماع نقل کیا ہے۔ ایک مرفوع حدیث میں بھی یہی ہے۔ ابن حبان فرماتے ہیں کہ حضرت ابن عباسؓ سے یہ بھی روایت ہے کہ کلالہ وہ ہے جس کی اولاد نہ ہو۔ لیکن صحیح پہلا ہی ہے اور ممکن ہے کہ راوی نے مراد سمجھی ہی نہ ہو۔

پھر فرمایا کہ اس کا بھائی یا بہن ہو یعنی ماں شریک۔ جیسے کہ سعد بن وقاص وغیرہ بعض سلف کی قرأت ہے۔ حضرت صدیق وغیرہ سے بھی یہ منقول ہے تو ان میں سے ہر ایک کے لئے چھٹا حصہ ہے۔ اگر زیادہ ہوں تو ایک ثلث میں سب شریک ہیں۔ ماں شریک بھائی باقی وارثوں سے کئی وجہ سے مختلف ہیں۔ ایک تو یہ کہ باوجود اپنے ورثہ کے دلانے والے کے بھی وارث ہوتے ہیں۔ مثلاً ماں۔ دوسرے یہ کہ ان کے مرد وعورت یعنی بہن بھائی میراث میں برابر ہیں۔ تیسرے یہ کہ اسی وقت وارث ہوتے ہیں' جبکہ میت کلالہ ہو پس باپ دادا کے بیٹے کے بیٹے کی موجودگی میں یہ وارث نہیں ہوتے۔ چوتھے یہ کہ انہیں ثلث سے زیادہ نہیں ملتا۔ گو یہ کتنے ہی ہوں' مرد ہوں یا عورت۔ حضرت عمر کا فیصلہ ہے کہ ماں شریک بہن بھائی کا ورثہ آپس میں اس طرح بٹے گا کہ مرد کے لئے دوہرا اور عورت کے لئے اکہرا۔ حضرت زہریؒ فرماتے ہیں: حضرت عمرؓ ایسا فیصلہ نہیں کر سکتے تا وقتیکہ انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ نہ سنا ہو۔ آیت میں اتنا تو صاف ہے کہ اگر اس سے زیادہ ہوں تو ثلث میں شریک ہیں۔ اس صورت میں علماء کا اختلاف ہے کہ اگر میت کے وارثوں میں خاوند ہو اور ماں ہو یا دادی ہو اور ماں شریک بھائی ہوں' ایک یا ایک سے زیادہ باپ کی طرف سے بھائی ہوں تو جمہور تو کہتے ہیں کہ اس صورت میں خاوند کو آدھا ملے گا اور ماں یا دادی کو چھٹا حصہ ملے گا اور ماں شریک بھائی کو تہائی ملے گا اور اسی میں سگے بھائی بھی شامل ہوں گے۔ قدر مشترک کے طور پر جو ماں شریک بھائی ہے۔ امیر المؤمنین حضرت عمر فاروق کے زمانہ میں ایک ایسی ہی صورت پیش آئی تھی تو آپ نے خاوند کو آدھا دلوایا اور ثلث ماں شریک بھائیوں کو دلوایا تو سگے بھائیوں نے بھی اپنے تئیں پیش کیا۔ آپ نے فرمایا: تم ان کے ساتھ شریک ہو۔ حضرت عثمانؓ سے بھی اس طرح شریک کر دینا روایت ہے اور دو روایتوں میں سے ایک روایت ایسی ہی ابن مسعود اور زید بن ثابت اور ابن عباسؓ سے مروی ہے۔ حضرت سعید بن مسیّب، قاضی شریح، مسروق، طاؤس، محمد بن سیرین، ابراہیم نخعی، عمر بن عبدالعزیز، ثوری اور شریک کا قول بھی یہی ہے۔ امام مالکؒ اور امام شافعی اور امام اسحٰق بن راہویہ بھی اسی طرف گئے ہیں۔ ہاں حضرت علی بن ابو طالب ان میں شرکت کے قائل نہ تھے۔ بلکہ آپ اولاد ام کو اس حالت میں ثلث دلواتے تھے اور ایک ماں باپ کی اولاد کو کچھ نہیں دلواتے تھے۔ اس لئے کہ یہ عصبہ ہیں اور عصبہ اس وقت پاتے ہیں' جب ذوالفروض سے بچ جائے۔ بلکہ وکیع بن جراح کہتے ہیں حضرت علیؓ سے اس کے خلاف روایت ہی نہیں۔ حضرت ابی بن کعبؓ، حضرت ابوموسیٰ اشعری کا یہ قول بھی یہی ہے۔ ابن عباسؓ سے بھی مشہور یہی ہے۔ شعبی' ابن ابی لیلیٰ، ابوحنیفہ، ابویوسف، محمد بن حسن بن زیاد، زفر بن ہذیل، امام احمد، یحییٰ بن آدم، نعیم بن حماد، ابوثور، داؤد بن ظاہری بھی اسی طرف گئے ہیں۔ ابوالحسین بن لبان فرضی نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے۔ ملاحظہ ہو ان کی کتاب الایجاد۔

پھر فرمایا: یہ وصیت کے جاری کرنے کے بعد ہے۔ وصیت ایسی ہو' جس میں خلاف عدل نہ ہو۔ کسی کو ضرر اور نقصان نہ پہنچایا گیا ہو۔ نہ کسی پر ظلم و جبر کیا گیا ہو۔ کسی وارث کا نہ ورثہ مارا گیا ہو نہ کم بیش کیا گیا ہو۔ اس کے خلاف وصیت کرنے والا اور ایسی خلاف شرع وصیت میں کوشش کرنے والا۔ اللہ تعالیٰ کے حکم اور اس کی شریعت میں اس کے خلاف کرنے والا اور اس سے لڑنے والا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: وصیت میں کسی کو ضرر پہنچانا کبیرہ گناہ ہے (ابن ابی حاتم)۔ نسائی میں حضرت ابن عباس کا قول بھی اسی طرح مروی ہے۔ بعض روایتوں میں حضرت ابن عباسؓ سے اس فرمان کے بعد آیت کے اس ٹکڑے کی تلاوت کرنا بھی مروی ہے۔ امام ابن جریر کے قول کے مطابق ٹھیک بات یہی ہے کہ یہ مرفوع حدیث نہیں موقوف

قول ہے۔ ائمہ کرام کا اس میں اختلاف ہے کہ وارث کے لئے جو اقرار میت کر جائے آیا وہ صحیح ہے یا نہیں؟ بعض تو کہتے ہیں کہ صحیح نہیں ہے۔ اس لئے اس میں تہمت لگنے کی گنجائش ہے۔ حدیث شریف میں بسند صحیح آ چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر حقدار کو اس کا حق پہنچایا ہے۔ اب وارث کے لئے کوئی وصیت نہیں۔ مالکؒ، احمد بن حنبلؒ، ابو حنیفہؒ کا قول بھی یہی ہے۔ شافعیؒ کا بھی پہلا قول یہی تھا۔ لیکن آخری قول یہی ہے کہ اقرار کرنا صحیح مانا جائے گا۔ طاؤس، عطا، حسن بن عبدالعزیز کا قول بھی یہی ہے۔ حضرت بخاری بھی اسی کو پسند کرتے ہیں اور اپنی کتاب صحیح بخاری شریف میں اسی کو ترجیح دیتے ہیں۔ ان کی دلیل ایک یہ روایت بھی ہے کہ حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے وصیت کی کہ فزاریہ نے جس چیز پر اپنے دروازے بند کر رکھے ہوں وہ نہ کھولے جائیں۔ امام بخاریؒ نے پھر فرمایا ہے کہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ اس کا یہ اقرار جائز نہیں بسبب وارثوں کے ساتھ بدگمانی کے لیکن میں کہتا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تو فرمایا ہے کہ بدگمانی سے بچو بدگمانی سب سے زیادہ جھوٹ ہے۔

قرآن کریم میں فرمان خداوندی موجود ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں حکم دیتا ہے کہ جس کی جو امانت ہو وہ اسے پہنچاؤ۔ اس میں وارث اور غیر وارث کی کوئی تخصیص نہیں۔ یہ یاد رہے کہ یہ اختلاف اس وقت ہے جب اقرار فی الواقع صحیح ہو اور نفس الامر کے مطابق ہو اور اگر صرف حیلہ سازی ہو اور بعض وارثوں کو زیادہ دینے اور بعض کو کم پہنچانے کے لئے ایک بہانہ بنایا ہو تو بالا اجماع اسے پورا کرنا حرام ہے اور اس آیت کے صاف الفاظ بھی اس کی حرمت کا فتویٰ دیتے ہیں۔ پھر فرمایا: یہ اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے احکام ہیں جو اللہ علم و حلم والا ہے۔

تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ ؕ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِىْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ وَذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۱۳﴾ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَتَعَدَّ حُدُوْدَهٗ يُدْخِلْهُ نَارًا خَالِدًا فِيْهَا ۖ وَلَهٗ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴿۱۴﴾

ع ۲ / ۱۳

یہ سب احکام مذکورہ خداوندی ضابطے ہیں اور جو شخص اللہ اور رسول کی پوری اطاعت کرے گا اللہ تعالیٰ اس کو ایسی بہشتوں میں داخل کر دیں گے جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی اور وہ ہمیشہ ہمیشہ ان میں رہیں گے اور یہ بڑی کامیابی ہے اور جو شخص اللہ اور رسول کا کہنا نہ مانے گا اور بالکل ہی اس کے ضابطوں سے نکل جائے گا اس کو آگ میں داخل کریں گے اس طور سے کہ وہ اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہے گا اور اس کو ایسی سزا ہوگی جس میں ذلت بھی ہے۔

حدود شکنی کی سزا ☆

اور جو شخص اللہ تعالیٰ کی اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے اور اس کی مقرر کی ہوئی حدوں سے آگے نکل جائے۔ اسے وہ جہنم میں ڈال دے گا۔ جس میں وہ ہمیشہ رہے گا۔ ایسوں کے لئے اہانت کرنے والا عذاب ہے۔ یعنی یہ فرائض اور یہ مقدار جسے اللہ تعالیٰ نے مقرر کیا ہے اور میت کے وارثوں کو ان کی قرابت کی نزدیکی اور ان کی حاجت کے مطابق جتنا حصہ جسے دلوایا
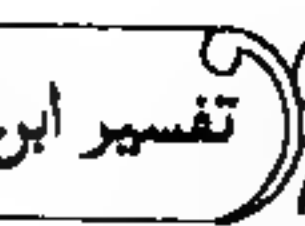
ہے۔ یہ سب کے قائم کردہ حدود ہیں، تم ان حدود کو نہ توڑو نہ اس سے آگے بڑھو، جو شخص ان احکام اللہ کو مان لے، کوئی عذر، تاویل کر کے کسی وارث کو کم و بیش دلوانے کی کوشش نہ کرے۔ حکم اللہ اور فریضۂ اللہ جوں کا توں بجا لائے۔ اللہ کا وعدہ ہے کہ وہ اسے ہمیشگی والی جاری پانی والی نہروں کی جنت میں داخل کرے گا۔ یہ کامیاب نصیب ور اور مقصد کو پہنچنے والا اور مراد کو پانے والا ہے اور جو اللہ کے کسی حکم کو بدل دے۔ کسی وارث کے ورثے کو کم و بیش کر دے۔ رضائے اللہ کو پیش نظر نہ رکھتے ہوئے اس کے حکم کو رد کر دے اور اس کے خلاف عمل کرے، گویا اللہ کی تقسیم کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتا اور اس کے حکم کو ٹھیک نہیں سمجھتا تو ایسا شخص ہمیشگی والی رسوائی اور اہانت والے دردناک اور ہیبت ناک عذاب میں مبتلا رہے گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ ایک شخص ستر سال تک نیک عمل کرتا رہتا ہے۔ پھر وصیت کے وقت ظلم کرتا ہے۔ اس کا خاتمہ برے عمل پر ہوتا ہے اور وہ جہنمی بن جاتا ہے اور ایک شخص برائی کا عمل ستر سال تک کرتا رہتا ہے پھر اپنی وصیت کے وقت عدل کرتا ہے اور خاتمہ اس کا بہتر ہوتا ہے تو جنت میں داخل ہو جاتا ہے۔ پھر اس حدیث کے راوی حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ اس آیت کو پڑھو: ﴿تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ﴾ سے ﴿عَذَابٌ مُّهِيْنٌ﴾ تک۔ سنن ابی داؤد کے باب الاضرار فی الوصیۃ میں ہے، رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں کہ ایک مرد یا عورت اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں ساٹھ سال تک لگے رہتے ہیں، پھر موت کے وقت وصیت میں ضرور نقصان[1] پہنچا جاتے ہیں تو ان کے لئے جہنم واجب ہو جاتی ہے۔ پھر حضرت ابو ہریرہؓ نے مِنۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ سے آخر آیت تک پڑھی۔ ترمذی اور ابن ماجہ میں بھی یہ حدیث ہے۔ امام ترمذیؒ اسے حسن غریب کہتے ہیں۔ مسند احمد میں یہ حدیث تمام و کمال کے ساتھ موجود ہے۔

وَالّٰتِيْ يَاْتِيْنَ الْفَاحِشَةَ مِنْ نِّسَآئِكُمْ فَاسْتَشْهِدُوْا عَلَيْهِنَّ اَرْبَعَةً مِّنْكُمْ ۚ فَاِنْ شَهِدُوْا فَاَمْسِكُوْهُنَّ فِي الْبُيُوْتِ حَتّٰى يَتَوَفّٰىهُنَّ الْمَوْتُ اَوْ يَجْعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِيْلًا ﴿۱۵﴾ وَالَّذٰنِ يَاْتِيٰنِهَا مِنْكُمْ فَاٰذُوْهُمَا ۚ فَاِنْ تَابَا وَاَصْلَحَا فَاَعْرِضُوْا عَنْهُمَا ۗ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا ﴿۱۶﴾

اور جو عورتیں بے حیائی کا کام کریں تمہاری بیبیوں میں سے سو تم لوگ ان عورتوں پر چار آدمی اپنوں میں سے گواہ کر لو سو اگر وہ گواہی دے دیں تو تم ان کو گھروں کے اندر مقید رکھو یہاں تک کہ موت ان کا خاتمہ کر دے یا اللہ تعالیٰ ان کے لئے کوئی اور راہ تجویز فرما دیں اور جون سے دو شخص بھی وہ بے حیائی کا کام کریں تم میں سے تو ان دونوں کو اذیت پہنچاؤ پھر اگر وہ دونوں توبہ کر لیں اور اصلاح کر لیں تو ان دونوں سے کچھ تعرض نہ کرو۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ توبہ قبول کرنے والے ہیں رحمت کرنے والے ہیں۔ ○

[1] یعنی بعض عزیز و اقارب کو ان کے شرعی حصہ سے زیادہ اور بعض کو اُن کے واجبی حصہ سے کم دینے کی وصیت کرتے ہیں اور اس طرح کسی کو نفع اور کسی کو نقصان پہنچاتے ہیں۔

عورتوں سے متعلق بعض احکام ☆

ابتدائے اسلام میں یہ حکم تھا کہ جب عادل گواہوں کی سچی گواہی سے کسی عورت کی سیاہ کاری ثابت ہو جائے تو اسے گھر سے باہر نہ نکلنے دیا جائے۔ گھر میں ہی قید کر دیا جائے۔ یہ ہمیشہ کے لئے قید ہے یعنی موت سے پہلے اسے نہ چھوڑا جائے۔ اس کا بیان فرما کر فرمایا کہ ہاں یہ اور بات ہے کہ اللہ ان کے لئے کوئی اور راہ بتا دے۔ پھر جب دوسری صورت کی سزا تجویز ہوئی تو وہ ناسخ ٹھہری اور یہ حکم ہٹ گیا۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں' جب تک سورۃ نور کی آیت نہ اتری' زنا کار عورت کے لئے یہی حکم رہا۔ پھر اس آیت میں شادی شدہ کو رجم کرنے یعنی پتھر مار کر مار ڈالنے اور بے شادی شدہ کو کوڑے مارنے کا حکم اترا۔ حضرت عکرمہؒ، حضرت سعید بن جبیرؒ، حضرت حسنؒ، حضرت عطا خراسانیؒ، حضرت ابو صالحؒ، حضرت قتادہ بن سامتؒ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جب وحی اتری تو آپ ﷺ پر اس کا اثر پڑتا اور تکلیف محسوس ہوتی اور چہرہ کا رنگ بدل جاتا۔ پس اللہ تعالیٰ نے ایک دن اپنے نبی ﷺ پر وحی نازل فرمائی۔ جب وہ ہٹ گئی تو آپ نے فرمایا میری یہ بات لے لو۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے راستہ نکال دیا ہے۔ اگر شادی شدہ مرد اور شادی شدہ عورت ہو تو ایک سو کوڑے اور پھر پتھروں سے مار ڈالنا اور بغیر شادی شدہ ہوں تو سو کوڑے اور ایک سال کی جلا وطنی (مسلم وغیرہ) ترمذی وغیرہ میں بھی یہ حدیث الفاظ کے جزوی اختلاف کے ساتھ موجود ہے۔ امام ترمذی اسے حسن صحیح کہتے ہیں۔ اسی طرح ابوداؤد میں بھی۔

ابن مردویہ کی غریب حدیث میں کنوارے اور بیاہے ہوئے کے اس حکم کے ساتھ ہی یہ بھی ہے کہ دونوں اگر بڑھے ہوں تو انہیں رجم کر دیا جائے لیکن یہ حدیث غریب ہے۔ طبرانی میں ہے حضور ﷺ نے فرمایا: سورۂ نساء کے اترنے کے بعد اب روک رکھنے کا حکم نہیں رہا۔ امام احمدؒ کا مذہب اس حدیث کے مطابق یہی ہے کہ زانی شادی شدہ کو کوڑے بھی لگائے جائیں گے اور رجم کیا جائے گا اور جمہور کہتے ہیں کہ کوڑے نہیں لگتے' صرف رجم کیا جائے۔ اس لئے کہ نبی ﷺ نے حضرت ماعز رضی اللہ عنہ کو اور غامدیہ عورت کو رجم کیا لیکن کوڑے نہیں مارے۔ اسی طرح دو یہودیوں کو بھی آپ نے رجم کا حکم دیا اور رجم سے پہلے انہیں بھی کوڑے نہیں لگوائے۔ پس جمہور کے اس قول کے مطابق معلوم ہوا کہ انہیں کوڑے لگانے کا حکم منسوخ ہے' ضروری نہیں واللہ اعلم۔

پھر فرمایا اس بے حیائی کے کام کو دو مرد اگر آپس میں (اغلام بازی) کریں' انہیں ایذا پہنچائیں۔ یعنی برا بھلا کہہ کر شرم و غیرت دلا کر جوتیاں لگا کر۔ یہ حکم بھی اسی طرح پر رہا۔ یہاں تک کہ اسے بھی اللہ تعالیٰ نے کوڑے اور رجم سے منسوخ فرمایا۔ حضرت عکرمہ، عطا، حسن، عبداللہ بن کثیر فرماتے ہیں، اس سے مراد بھی مرد عورت ہیں۔ سدی فرماتے ہیں مراد وہ نوجوان ہیں، جو شادی شدہ نہ ہوں۔ حضرت مجاہدؒ فرماتے ہیں: لواطت کے بارے میں یہ آیت ہے۔ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں' جسے تم لوطی کا فعل کرتے دیکھو اسے اور دوسرے (مفعول) کو دونوں کو قتل کر ڈالو۔ اگر یہ دونوں باز آ جائیں اپنی بدکاری سے توبہ کریں' اپنے اعمال کی اصلاح کر لیں اور ٹھیک ٹھاک ہو جائیں' تو اب ان کے ساتھ درشت کلامی اور سختی سے پیش نہ آئیں۔ اس لئے کہ گناہ سے توبہ کر لینے والا مثل گناہ نہ کرنے والے کے ہے۔ اللہ تعالیٰ توبہ قبول کرنے والا اور بردباری کرنے والا ہے۔ صحیحین میں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: اگر کسی کی لونڈی بدکاری کرے تو اس کا مالک اسے حد لگا دے اور ڈانٹ ڈپٹ نہ کرے۔ یعنی حد لگائے جانے کے بعد پھر اسے نہ ڈانٹے کیونکہ حد کفارہ ہے۔

اِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللّٰهِ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوْبُوْنَ مِنْ قَرِيْبٍ فَاُولٰٓئِكَ يَتُوْبُ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۱۷﴾ وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ ۚ حَتّٰٓى اِذَا حَضَرَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ اِنِّىْ تُبْتُ الْـٰٔنَ وَلَا الَّذِيْنَ يَمُوْتُوْنَ وَهُمْ كُفَّارٌ ؕ اُولٰٓئِكَ اَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ﴿۱۸﴾

توبہ جس کا قبول کرنا اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہے وہ تو ان ہی کی ہے جو حماقت سے کوئی گناہ کر بیٹھتے ہیں پھر قریب ہی وقت میں توبہ کر لیتے ہیں سو ایسوں پر تو اللہ تعالیٰ توجہ فرماتے ہیں اور اللہ تعالیٰ خوب جانتے ہیں اور حکمت والے ہیں اور ایسے لوگوں کی توبہ نہیں جو گناہ کرتے رہتے ہیں یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی کے سامنے موت ہی آ کھڑی ہوئی تو کہنے لگا کہ میں اب توبہ کرتا ہوں اور نہ ان لوگوں کی جن کو حالت کفر پر موت آ جاتی ہے ان لوگوں کے لئے ہم نے ایک دردناک سزا تیار کر رکھی ہے۔ ○

توبہ کی حدود ☆

مطلب یہ ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ اپنے بندوں کی توبہ قبول فرماتا ہے جو ناواقفیت کی وجہ سے برا کام کر بیٹھیں پھر توبہ کر لیں۔ لیکن توبہ فرشتہ موت کو دیکھ لینے کے بعد غرغرے سے پہلے ہونا چاہئے۔ حضرت مجاہدؒ فرماتے ہیں جو بھی قصداً یا غلطی سے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرے وہ جاہل ہے جب تک کہ اس سے باز نہ آ جائے۔ ابو العالیہ فرماتے ہیں: صحابہ کرامؓ فرمایا کرتے تھے کہ بندہ جو گناہ کرے وہ جہالت[1] ہے۔ حضرت قتادہؒ بھی صحابہ کے ایک مجمع سے اس طرح کی روایت کرتے ہیں۔ عطا اور حضرت ابن عباسؓ سے بھی اسی طرح روایت ہے۔ جلدی توبہ کر لینے کی تفسیر میں روایت ہے کہ ملک الموت کو دیکھ لینے سے پہلے عالم سکرات کے قریب کہا گیا ہے۔ اپنی صحت میں توبہ کر لینی چاہئے۔ غرغرے کے وقت سے پہلے کی توبہ قبول ہے۔ حضرت عکرمہؒ فرماتے ہیں دنیا کل کی کل قریب ہی ہے۔ اس کے متعلق احادیث سنئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی توبہ قبول فرماتے ہیں جب تک غرغرہ شروع نہ ہو۔ (ترمذی) جو بھی مؤمن بندہ اپنی موت سے مہینہ بھر پہلے توبہ کر لے اس کی توبہ اللہ تعالیٰ قبول فرما لیتا ہے یہاں تک کہ اس کے بعد بھی بلکہ موت سے ایک دن پہلے بلکہ ایک ساعت پہلے بھی۔ جو بھی اخلاص اور سچائی کے ساتھ اپنے رب کی طرف جھکے۔ اللہ تعالیٰ اسے قبول فرماتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے

[1] مطلب یہ ہے کہ مسلمان سے حسن ظن کی بناء پر بھی توقع ہے کہ وہ کوئی گناہ دیدہ دانستہ ہرگز نہیں کرے گا۔ اس سے جو کچھ ہو جاتا ہے وہ بھول چوک اور غلط فہمی کی بناء پر ہو جاتا ہے یا یہ مطلب ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کی ہیبت اور دہشت قلب میں ہوتی تو کبھی اس سے نہ ہوتا۔ یہ اللہ تعالیٰ کے مواخذہ وہ محاسبہ سے غفلت کا نتیجہ ہے کہ آدمی سے گناہ ہو جاتا ہے۔ بہر حال گناہ کا پس منظر ناواقفیت اور غفلت ہی ہے۔ ۱۲

ہیں جو اپنی موت سے ایک سال پہلے توبہ کرے اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول فرماتا ہے اور جو مہینہ بھر پہلے توبہ کرے اللہ تعالیٰ اس کی بھی توبہ قبول فرماتا ہے اور جو ہفتہ بھر پہلے توبہ کرے اللہ تعالیٰ اس کی توبہ بھی قبول فرماتا ہے اور جو ایک دن پہلے توبہ کر لے اللہ تعالیٰ اس کی توبہ بھی قبول فرماتا ہے۔ یہ سن کر حضرت ایوبؓ نے یہ آیت پڑھی تو آپ نے فرمایا: میں وہی کہتا ہوں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے۔

مسند احمد میں ہے کہ چار صحابی جمع ہوئے ان میں سے ایک نے کہا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ جو شخص اپنی موت سے ایک دن پہلے بھی توبہ کر لے اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول فرماتا ہے۔ دوسرے نے پوچھا: کیا تم نے حضور ﷺ سے اسے سنا ہے؟ اس نے کہا: ہاں، تو دوسرے نے کہا میں نے حضور ﷺ سے سنا ہے کہ اگر آدھا دن پہلے بھی توبہ کر لے تو بھی اللہ تعالیٰ قبول فرماتا ہے۔ تیسرے نے کہا: تم نے یہ سنا ہے؟ کہا: ہاں میں نے خود سنا کہ اگر پہر پہلے توبہ نصیب ہو جائے تو وہ قبول ہوتی ہے۔ چوتھے نے کہا: تم نے یہ سنا ہے؟ اس نے کہا: ہاں۔ کہا میں نے تو حضور ﷺ سے یہاں تک سنا ہے کہ جب تک اس کے نرخرے میں روح نہ آ جائے توبہ کے دروازے اس کے لئے کھلے رہتے ہیں۔ ابن مردویہ میں موجود ہے کہ جب تک غرغرہ شروع نہ ہو تب تک توبہ قبول ہوتی ہے۔ کئی ایک مرسل حدیثوں میں بھی یہ مضمون ہے۔ حضرت ابوقلابہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جب ابلیس پر لعنت نازل فرمائی تو اس نے مہلت طلب کی اور کہا: تیری عزت اور تیرے جلال کی قسم کہ ابن آدم کے جسم میں جب تک روح رہے گی میں اس کے دل سے نہ نکلوں گا۔ اللہ تعالیٰ عزوجل نے فرمایا: مجھے اپنی عزت اور اپنے جلال کی قسم کہ میں بھی جب تک اس کی روح رہے گی، اس کی توبہ قبول کروں گا۔ ایک مرفوع حدیث میں بھی اس کے قریب قریب موجود ہے۔

پس ان تمام احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جب تک بندہ زندہ ہے اور اسے اپنی حیات و زندگی کی امید ہے تب تک وہ اللہ کی طرف جھکے توبہ کرے تو اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول فرماتا ہے اور اس پر رجوع کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ علیم و حکیم ہے۔ ہاں جب زندگی سے مایوس ہو جائے، فرشتوں کو دیکھ لے اور روح بدن سے نکل کر حلق تک پہنچ جائے، سینے میں گھٹنے لگے، حلق میں اٹکے، غرغرہ شروع ہو تو اس کی توبہ قبول نہیں ہوتی۔ اس لئے اس کے بعد فرمایا کہ مرتے دم تک جو گناہوں پر اڑا رہا ہے اور موت دیکھ کر کہنے لگے کہ اب میں توبہ کرتا ہوں تو ایسے شخص کی توبہ قبول نہیں ہوتی۔ جیسے اور جگہ ہے: ﴿فَلَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا قَالُوْۤا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗ﴾ (غافر: ۸۴) دو آیتوں تک۔ مطلب یہ ہے کہ ہمارے عذابوں کا معائنہ کر لینے کے بعد ایمان کا اقرار کرنا نفع نہیں دیتا اور جگہ ہے: ﴿یَوْمَ یَاْتِیْ بَعْضُ اٰیٰتِ رَبِّكَ﴾ (الانعام: ۱۵۸) مطلب یہ ہے کہ جب مخلوق سورج کو مغرب کی طرف سے چڑھتے ہوئے دیکھ لے گی، اس وقت جو ایمان لائے یا نیک عمل کرے اسے نہ اس کا عمل نفع دے گا نہ اس کا ایمان۔ پھر فرماتا ہے کہ کفر و شرک پر مرنے والے کو بھی ندامت و توبہ فائدہ نہ دے گی نہ فدیہ اور بدلہ قبول کیا جائے گا گو زمین بھر سونا دینا چاہے۔ حضرت ابن عباسؓ وغیرہ فرماتے ہیں یہ آیت اہل شرک کے بارے میں نازل ہوئی۔ مسند احمد میں ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ اپنے بندے کی توبہ قبول کرتا ہے اور اسے بخش دیتا ہے، جب تک پردہ نہ پڑ جائے۔ کہا گیا کہ پردہ پڑنے سے کیا مطلب ہے؟ فرمایا شرک کی حالت میں جان نکل جانا ایسے لوگوں کے لئے اللہ تعالیٰ نے سخت دردناک المناک دائمی عذاب تیار کر رکھے ہیں۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَرِثُوا النِّسَآءَ كَرْهًا ؕ وَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ لِتَذْهَبُوْا بِبَعْضِ مَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ ۚ وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ فَاِنْ كَرِهْتُمُوْهُنَّ فَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّيَجْعَلَ اللّٰهُ فِيْهِ خَيْرًا كَثِيْرًا ﴿۱۹﴾ وَاِنْ اَرَدْتُّمُ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مَّكَانَ زَوْجٍ ۙ وَّاٰتَيْتُمْ اِحْدٰىهُنَّ قِنْطَارًا فَلَا تَاْخُذُوْا مِنْهُ شَيْئًا ؕ اَتَاْخُذُوْنَهٗ بُهْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِيْنًا ﴿۲۰﴾ وَكَيْفَ تَاْخُذُوْنَهٗ وَقَدْ اَفْضٰى بَعْضُكُمْ اِلٰى بَعْضٍ وَّاَخَذْنَ مِنْكُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا ﴿۲۱﴾ وَلَا تَنْكِحُوْا مَا نَكَحَ اٰبَآؤُكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ ؕ اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً وَّمَقْتًا ؕ وَسَآءَ سَبِيْلًا ﴿۲۲﴾

اے ایمان والو! تم کو یہ بات حلال نہیں کہ عورتوں کے جبراً مالک ہو جاؤ اور ان عورتوں کو اس غرض سے مقید مت کرو کہ جو کچھ تم لوگوں نے ان کو دیا ہے اس میں کوئی حصہ وصول کر لو مگر یہ کہ وہ عورتیں کوئی صریح ناشائستہ حرکت کریں اور عورتوں کے ساتھ خوبی کے ساتھ گزران کیا کرو اور اگر وہ تم کو ناپسند ہیں تو ممکن ہے تم ایک شے کو ناپسند کرو اور اللہ تعالیٰ اس کے اندر کوئی بڑی منفعت رکھ دے اور اگر تم بجائے ایک بی بی کے دوسری بی بی کرنا چاہو اور تم اس ایک کو انبار کا انبار مال دے چکے ہو تو تم اس میں سے کچھ بھی مت لو کیا تم اس کو لیتے ہو بہتان رکھ کر اور صریح گناہ کے مرتکب ہو کر اور تم اس کو کیسے لیتے ہو حالانکہ تم باہم ایک دوسرے سے بے حجابانہ مل چکے ہو اور وہ عورتیں تم سے ایک گاڑھا اقرار لے چکی ہیں اور تم ان عورتوں سے نکاح مت کرو جن سے تمہارے باپ (دادا' ابا' نانا) نے نکاح کیا ہو مگر جو بات گزر گئی گزر گئی بیشک یہ (عقلاً بھی) بڑی بے حیائی اور نہایت نفرت کی بات ہے اور (شرعاً بھی) بہت برا طریقہ ہے۔ ○

عورتوں سے جبر و تشدد کی ممانعت ☆

صحیح بخاری شریف میں ہے حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ جب کوئی شخص مر جاتا ہے تو اس کے وارث اس کی عورت کے پورے حقدار سمجھے جاتے تھے۔ اگر ان میں سے کوئی چاہتا تو اپنے نکاح میں لے لیتا۔ اگر وہ چاہتے تو دوسرے کی نکاح میں دے دیتے۔ اگر چاہتے تو نکاح میں نہ کرنے دیتے عورت والوں سے زیادہ حقدار اس عورت کے یہی گنے جاتے تھے۔ جاہلیت کی اس رسم کے خلاف یہ آیت نازل ہوئی۔ دوسری روایت میں یہ بھی آیا ہے کہ وہ لوگ اس عورت کو مجبور کرتے

کہ وہ مہر کے حق سے دست بردار ہو جائے یا یونہی بیٹھی رہے۔ یہ بھی روایت ہے کہ ان میں سے کوئی آ کر اس عورت کا خاوند مرتے ہی اس پر اپنا کپڑا ڈال دیتا اور وہی اس کا مختار سمجھا جاتا اور روایت میں ہے کہ یہ کپڑا ڈالنے والا اسے حسین پاتا تو نکاح کر لیتا۔ اگر یہ بدصورت ہوتی تو اسے یونہی روکے رکھتا۔ یہاں تک کہ مر جائے۔ پھر اس کے مال کا یہ وارث بنتا۔ یہ بھی روایت ہے کہ مرنے والے کا کوئی دوست کپڑا ڈال دیتا' پھر وہ عورت اگر فدیہ اور بدلہ دے دیتی تو وہ اسے نکاح کرنے کی اجازت دے دیتا ورنہ یونہی مر جاتی۔ حضرت زید بن اسلمؒ فرماتے ہیں اہل مدینہ کا یہ دستور تھا کہ وارث اس عورت کا بھی وارث بن جاتا تھا۔ یہ لوگ عورتوں کے ساتھ بڑی بُری طرح پیش آتے تھے۔ یہاں تک کہ طلاق دیتے وقت بھی شرط کر لیتے تھے کہ جہاں میں چاہوں تیرا نکاح ہو۔ اس طرح کی قید و بند سے آزادگی کی صورت یہ ہوتی تھی کہ وہ عورت کچھ دے دلائے۔ پس اللہ تعالیٰ نے مؤمنوں کو اس سے منع فرما دیا۔ ابن مردویہ میں ہے کہ جب ابوقیس ابن اسلمت کا انتقال ہوا تو ان کے بیٹے نے ان کی بیوی سے نکاح کرنا چاہا' جیسے کہ جاہلیت میں یہ دستور تھا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ حضرت عطاؒ فرماتے ہیں کہ کسی بچہ کی امید[1] پر اسے لگا دیتے تھے۔ حضرت مجاہدؒ فرماتے ہیں کہ جب کوئی مر جاتا تو اس کا لڑکا اس کی بیوی کا زیادہ حق دار سمجھا جاتا۔ اگر چاہتا خود اپنی اس سوتیلی ماں سے نکاح کر لیتا اور اگر چاہتا تو دوسرے کے نکاح میں دے دیتا۔ مثلاً بھائی کے بھتیجے کے یا جس کے چاہے۔

حضرت عکرمہؒ کی روایت ہے کہ ابوقیس کی بیوی کا نام کبیشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا تھا۔ اس نے اس صورت کی خبر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دی کہ نہ مجھے یہ لوگ میرے خاوند کا ورثہ دیتے ہیں نہ مجھے چھوڑتے ہیں کہ میں کہیں اور نکاح کر لوں۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ ایک روایت میں ہے کہ کپڑا ڈالنے کی رسم سے پہلے ہی اگر عورت بھاگ کھڑی ہو اور اپنے میکے آ جائے تو وہ چھوٹ جاتی تھی۔ حضرت مجاہدؒ فرماتے ہیں: جو یتیم بچی ان کی ولایت میں ہوتی' اسے یہ روکے رکھتے تھے' اس امید پر کہ جب ہماری بیوی مر جائے گی' ہم اس سے نکاح کر لیں گے یا اپنے لڑکے سے اس کا نکاح کرا دیں گے۔ ان سب قوال سے معلوم ہوا کہ ان تمام صورتوں کی ممانعت اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے کر دی اور عورتوں کی جان اسی مصیبت سے چھڑا دی۔ واللہ اعلم۔

پھر فرماتا ہے: عورتوں کی بود و باش میں انہیں تنگ کر کے مجبور نہ کرو کہ وہ اپنا سارا مہر چھوڑ دیں۔ یا اس میں سے کچھ چھوڑ دیں یا کسی اپنے اور واجبی حق سے دست بردار ہو جائیں۔ کیونکہ انہیں ستایا اور مجبور کیا جا رہا ہے۔ حضرت ابن عباس فرماتے ہیں: مطلب یہ ہے کہ عورت ناپسند ہے دل نہیں ملا' چھوڑنا چاہتا ہے۔ لیکن اس صورت میں مہر وغیرہ تمام حقوق دینے پڑیں گے۔ اس سے بچنے کے لئے اسے ستاتا ہے' طرح طرح سے تنگ کرتا ہے تاکہ وہ خود اپنے حقوق چھوڑنے پر آمادہ ہو جائے۔ تو اس صورت سے قرآن پاک نے مسلمانوں کو روک دیا۔ ابن سلمانی فرماتے ہیں: ان دونوں کی آیتوں میں سے پہلی آیت امر جاہلیت کو مٹانے کے لئے اور دوسری امر اسلام کی اصلاح کے لئے نازل ہوئی۔ ابن مبارک بھی یہی فرماتے ہیں۔ مگر اس صورت میں کہ ان سے کھلی بے حیائی کا کام صادر ہو جائے' اس سے مراد بقول اکثر مفسرین صحابہ و تابعین وغیرہ زناکاری ہے یعنی اس صورت میں مہر لوٹا لینا چاہئے اور اسے تنگ کرے تاکہ خلع پر رضامند ہو' جیسے سورۂ بقرہ کی آیت میں ہے: ﴿وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ﴾ (البقرہ ۲۲۹) یعنی تمہیں حلال نہیں کہ تم انہیں دیئے ہوئے میں سے کچھ بھی لے لو۔ مگر اس حالت میں کہ دونوں کو اللہ کی

[1] غالباً یہ مطلب ہے کہ کسی کم سن بچہ کے متعلق کہہ دیتے کہ جب جوان ہوگا تو اس سے تیرا نکاح ہوگا اور وہ غریب سالہا سال اسی انتظار میں بیٹھی رہتی۔ ۱۲

حدیں قائم نہ رکھ سکنے کا خوف ہو۔ بعض بزرگوں نے فرمایا ہے کہ ﴿فَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ﴾ سے مراد خاوند کا خلاف کرنا' اس کی نافرمانی کرنا' بدزبانی کرنا' کج خلقی کرنا' حقوقِ زوجیت اچھی طرح ادا نہ کرنا وغیرہ ہے۔ امام ابن جریر فرماتے ہیں کہ آیت کے الفاظ عام ہیں' زنا کو اور اس کو دونوں کو شامل ہیں۔ یعنی ان تمام صورتوں میں خاوند کو مباح ہے کہ اسے تنگ کرے تاکہ وہ اپنے کل حق یا تھوڑا حق چھوڑ دے اور پھر یہ اسے الگ کر دے۔ امام صاحب کا یہ فرمان بہت ہی مناسب ہے۔ واللہ اعلم۔

یہ روایت بھی پہلے گزر چکی ہے کہ اس آیت کے نزول کا سبب وہی جاہلیت کی رسم ہے جس سے اللہ نے منع فرما دیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پورا بیان امر جاہلیت کو اسلام میں سے ہٹا دینے کے لئے ہوا ہے ابن زید فرماتے ہیں' مکہ کے قریش میں یہ بات جاری تھی کہ کسی شخص نے کسی شریف عورت سے نکاح کیا اور موافقت نہ ہوئی تو یہ اسے طلاق دے دیتا تھا۔ لیکن یہ شرط کر لیتا تھا کہ بغیر اس کی اجازت کے یہ دوسری جگہ نکاح نہیں کر سکتی۔ اس بات پر گواہ شاہد مقرر ہو جاتے اور اقرار نامہ لکھ لیا جاتا۔ اب اگر کہیں سے پیغام آئے اور وہ عورت راضی ہو تو یہ کہتا مجھے اتنی رقم دے تو میں تجھے نکاح کی اجازت دوں گا۔ اگر وہ ادا کر دیتی تو خیر' ورنہ یونہی اسے روکے رکھتا اور دوسرا نکاح نہ کرنے دیتا۔ اس کی ممانعت اس آیت میں نازل ہوئی ۔ بقول مجاہدؒ یہ حکم اور سورہ بقرہ کی آیت کا حکم دونوں ایک ہی ہیں۔

بیوی کے ساتھ حسن سلوک:

پھر فرمایا عورتوں کے ساتھ خوش سلوکی سے رہو سہو۔ ان کے ساتھ اچھا برتاؤ برتو۔ نرم بات کہو۔ نیک سلوک کرو۔ اپنی حالت بھی اپنی طاقت کے مطابق اچھی رکھو' جیسے اور جگہ فرمایا: ﴿وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ﴾ (البقرہ ۲۲۸) یعنی جیسے تمہارے حقوق ان پر ہیں' ان کے حقوق بھی تم پر ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: تم میں سب سے بہتر شخص وہ ہے جو اپنی گھر والی کے ساتھ سب سے بہتر سلوک کرنے والا ہو۔ میں اپنی بیویوں سے بہت اچھی گھر داری برتتا ہوں۔ نبی کریم ﷺ اپنی بیویوں کے ساتھ بہت لطف وخوشی سے بہت نرمی اور خندہ پیشانی سے پیش آتے تھے۔ انہیں خوش رکھتے تھے۔ ان سے ہنسی اور دل لگی کی باتیں کیا کرتے تھے۔ ان کے دِل مٹھی میں رکھتے تھے۔ انہیں اچھی طرح کھانے پینے کو دیتے۔ کشادہ دلی کے ساتھ ان پر خرچ کرتے تھے۔ ایسی خوش طبعی کی باتیں بیان فرماتے جن سے وہ ہنس دیتیں۔ ایسا بھی ہوا ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہؓ کے ساتھ آپ نے دوڑ کی' جس دوڑ میں صدیقہ آگے نکل گئیں۔ کچھ مدت کے بعد پھر دوڑ ہوئی اب حضرت عائشہؓ پیچھے رہ گئیں۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا ادلا بدلا ہو گیا۔ اس سے بھی آپ کا مطلب یہ تھا کہ حضرت صدیقہؓ خوش رہیں' ان کا دل بہلے۔ جس بیوی صاحبہ کے ہاں رات گزارنی ہوتی وہیں آپ کی کل بیویاں جمع ہو جاتیں۔ دو گھڑی بیٹھتیں بات چیت ہوتی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ اب سب کے ساتھ ہی حضور ﷺ رات کا کھانا تناول فرماتے پھر سب اپنے اپنے گھر چلی جاتیں اور آپ ﷺ وہیں آرام فرماتے' جن کی باری ہوتی۔ اپنی بیوی صاحبہ کے ساتھ ایک ہی چادر میں سوتے۔ کرتا نکال دیتے صرف تہمند بندھا ہوا ہوتا۔ عشاء کی نماز کے بعد گھر جا کر دو گھڑی ادھر اُدھر کی باتیں کرتے۔ جس سے گھر والیوں کا جی خوش ہوتا۔

الغرض نہایت ہی محبت پیار کے ساتھ اپنی بیویوں کو آپ رکھتے تھے۔ صلی اللہ علیہ وسلم۔ پس مسلمانوں کو بھی چاہئے کہ اپنی بیویوں کے ساتھ اچھی طرح راضی خوشی محبت پیار سے رہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: تمہاری اچھائی میرے نبی کی پیروی میں ہے۔ اس کے تفصیلی احکام کی جگہ تفسیر نہیں بلکہ اسی مضمون کی کتابیں ہیں والحمدللہ۔ پھر فرمایا ہے کہ باوجود جی نہ چاہنے کے

بھی عورتوں سے اچھی بود و باش رکھنے میں عین ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ بہت بڑی بھلائی عطا فرما دے۔ ممکن ہے نیک اولاد ہو جائے اور اس سے اللہ تعالیٰ خیر نصیب کرے۔ صحیح حدیث میں ہے: مؤمن مرد مؤمنہ عورت کو الگ نہ کرے اگر اس میں کی ایک آدھ بات سے ناراض ہوگا تو ایک آدھ خصلت اچھی بھی ہوگی۔ پھر فرماتا ہے کہ جب تم میں سے کوئی اپنی بیوی کو طلاق دینا چاہے اور اس کے جگہ دوسری عورت سے نکاح کرنا چاہے تو اسے دیئے ہوئے مہر میں سے کچھ بھی واپس نہ لے۔ گو ایک خزانہ کا خزانہ دیا ہوا ہو۔ سورہ آل عمران کی تفسیر میں قنطار کا پورا بیان گزر چکا ہے اس لئے یہاں دوبارہ بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مہر میں بہت سارا مال دینا بھی جائز ہے۔ امیر المؤمنین حضرت عمر فاروقؓ نے پہلے بہت لمبے چوڑے مہر سے منع فرما دیا تھا۔ پھر اپنے قول سے رجوع کیا۔ جیسے کہ مسند احمد میں ہے کہ آپ نے فرمایا: عورتوں کے مہر میں زیادتی نہ کرو۔ اگر یہ دنیوی طور پر کوئی بھلی چیز ہوتی یا اللہ کے نزدیک یہ تقویٰ کی چیز ہوتی تو اس پر اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عمل کرتے۔ حضور ﷺ نے اپنی کسی بیوی کا یا کسی بیٹی کا مہر بارہ اوقیہ سے زیادہ مقرر نہیں کیا (تقریباً سوا سو روپے)۔ انسان لمبا مہر باندھ کر پھر مصیبت میں پڑ جاتا ہے۔ یہاں تک کہ رفتہ رفتہ اس کی بیوی اسے بوجھ معلوم ہونے لگتی ہے اور اس کے دل میں دشمنی بیٹھ جاتی ہے اور کہنے لگتا ہے کہ تم نے میرے کندھے پر مشک لٹکوا دی ہے۔ یہ حدیث بہت سی کتابوں میں مختلف الفاظ سے موجود ہے۔ ایک میں ہے کہ آپ (عمر رضی اللہ عنہ) نے منبر نبوی پر کھڑے ہو کر فرمایا: لوگو! تم نے کیوں لمبے چوڑے مہر باندھنے شروع کر دیئے ہیں؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب نے تو چار سو درہم (تقریباً سو روپے) مہر باندھا ہے۔ اگر یہ زیادتی تقویٰ اور کرامت کا سبب ہوتی تو تم اس کی طرف سبقت نہ لے جاتے۔ خبردار آج سے میں یہ نہ سنوں کہ کسی نے چار سو درہم سے زیادہ مہر مقرر کیا ہے۔ یہ فرما کر آپ نیچے اترے تو ایک قریشیہ عورت آپ کے سامنے آئیں اور کہنے لگیں: امیر المؤمنین کیا آپ نے چار سو درہم سے زیادہ کے مہر سے لوگوں کو منع فرما دیا ہے؟ آپ نے فرمایا: ہاں۔ کہا: آپ نے اللہ کا کلام جو اس نے نازل فرمایا ہے نہیں سنا؟ سنیے اللہ تعالیٰ فرماتے ہے ﴿وَاٰتَيْتُمْ اِحْدٰىهُنَّ قِنْطَارًا﴾۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا: یا اللہ! معاف فرما، عمر سے تو ہر شخص زیادہ سمجھدار ہے۔ پھر آپ واپس چلے گئے اور اسی وقت منبر پر کھڑے ہو کر لوگوں سے فرمایا: اے لوگو! میں نے تمہیں چار سو درہم سے زیادہ کے مہر سے روک دیا تھا۔ لیکن اب کہتا ہوں جو شخص اپنے مال میں سے مہر جتنا چاہے دے۔ اپنی خوشی جتنا مہر مقرر کرنا چاہے کرے میں نہیں روکتا اور ایک روایت میں اس عورت کا اس آیت کو اس طرح پڑھنا روایت ہے وَاٰتَيْتُمْ اِحْدٰىهُنَّ قِنْطَارًا مِّنْ ذَهَبٍ۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی قرأت میں بھی اسی طرح ہے اور حضرت عمر کا یہ فرمانا بھی موجود ہے کہ ایک عورت عمر پر غالب آ گئی اور روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا تھا: گو ذی القصہ یعنی یزید بن حصین حارثی کی بیٹی ہو پھر بھی مہر اس کا زیادہ مقرر نہ کرو اور اگر تم نے کیا تو وہ زیادتی کی رقم بیت المال میں لے لوں گا۔ اس پر ایک دراز قد چوڑی ناک والی عورت نے کہا کہ حضرت آپ یہ حکم نہیں دے سکتے۔

پھر فرماتا ہے کہ تم اپنی بیوی کو دیئے ہوئے مہر کیسے واپس لوٹا سکتے ہو؟ حالانکہ تم نے اس سے فائدہ اٹھایا یا حاجت روائی کی وہ تم سے اور تم اس سے مل گئے۔ یعنی میاں بیوی کے تعلقات بھی قائم ہو گئے۔ صحیحین کی اس حدیث میں ہے جس میں ایک شخص کا اپنی بیوی کی نسبت زنا کاری کرنے کا الزام حضور ﷺ کے سامنے عائد کرنا پھر ان دونوں کا قسمیں کھانا اور اس کے بعد آپ کا یہ فرمانا کہ اللہ تعالیٰ کو بخوبی علم ہے کہ دونوں میں کون جھوٹا ہے؟ کیا تم میں سے کوئی اب بھی توبہ کرتا ہے تین دفعہ یہ فرمایا تو

اس مرد نے کہا: میں نے جو اپنا مال اس کے مہر میں دیا ہے اس کی بابت کیا فرماتے ہیں؟ آپ نے فرمایا اسی کے بدلے تو یہ تیرے لئے حلال ہوئی تھی۔ اب اگر تو نے اس پر جھوٹی تہمت باندھی ہے تو پھر اور بھی دور کی بات ہوگئی۔ اسی طرح ایک اور حدیث میں ہے کہ حضرت نضرہؓ نے ایک کنواری سے نکاح کیا۔ جب اس سے ملے تو دیکھا کہ اسے زنا کا حمل ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ذکر کیا تو آپ نے اسے الگ کرادیا اور مہر دلوادیا اور اس عورت کو کوڑے مارنے کا حکم دیا اور فرمایا: جو بچہ ہوگا وہ تیرا غلام ہے اور مہر تو سبب تھا اس کی حلت کا۔ (ابوداؤد) غرض آیت میں بھی مطلب یہی ہے کہ دونوں میاں بیوی میں خلوت و صحبت ہو چکی ہے پھر مہر واپس لینا کیا معنی رکھتا۔ پھر فرمایا کہ عقد نکاح جو مضبوط عہد و پیمان ہے۔ اس میں تم جکڑے جا چکے ہو۔ اللہ کا یہ فرمان تم سن چکے ہو کہ بساؤ تو اچھی طرح سے اور الگ کرو تو عمدہ طریقے سے۔ چنانچہ حدیث میں بھی ہے کہ تم ان عورتوں کو اللہ کی امانت سے لیتے ہو اور ان کو اپنے لئے اللہ تعالی کے کلمہ سے حلال کرتے ہو یعنی خطبہ نکاح کے تشہد سے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو معراج والی رات جو بہترین انعامات عطا ہوئے۔ ان میں ایک یہ بھی تھا کہ آپ سے فرمایا گیا: تیری امت کا کوئی خطبہ جائز نہیں جب تک وہ اس امر کی گواہی نہ دیں کہ تو میرا بندہ اور میرا رسول ہے۔ (ابن ابی حاتم)

صحیح مسلم میں حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حجۃ الوداع کے خطبہ میں فرمایا ہے: تم نے عورتوں کی اللہ تعالیٰ کی امانت سے لیا ہے اور انہیں اللہ تعالیٰ کے کلمہ سے اپنے لئے حلال کیا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ سوتیلی ماؤں کی حرمت بیان فرماتا ہے اور ان کی تعظیم اور توقیر ظاہر کرتا ہے۔ یہاں تک کہ باپ نے کسی عورت سے صرف نکاح کیا' ابھی وہ رخصت ہو کر بھی نہیں آئی تو طلاق ہوگئی یا باپ مر گیا وغیرہ تو بھی عورت اس کے بیٹے پر حرام ہو جاتی ہے۔ اس پر اجماع ہے۔ حضرت ابوقیسؓ جو بڑے بزرگ اور نیک انصاری صحابی تھے۔ ان کے انتقال کے بعد ان کے لڑکے قیس نے ان کی بیوی سے رشتہ کرنا چاہا جو ان کی سوتیلی ماں تھیں۔ اس پر اس بی بی صاحبہؓ نے فرمایا: بے شک تو اپنی قوم میں نیک ہے لیکن میں تو تجھے اپنا بیٹا شمار کرتی ہوں۔ خیر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جاتی ہوں۔ یہاں آئیں اور حضور ﷺ سے ساری کیفیت بیان کی۔ آپ نے فرمایا اپنے گھر لوٹ جاؤ۔ پھر یہ آیت اتری کہ جس سے باپ نے نکاح کیا اس سے بیٹے کا نکاح حرام ہے۔ ایسے واقعات اور بھی اس وقت موجود تھے۔ جنہیں اس ارادہ سے باز رکھا گیا۔ ایک تو یہی ابوقیس والا واقعہ۔ ان بی بی صاحبہ کا نام ام عبید اللہ ضمرہ تھا۔ دوسرا واقعہ خلف کا تھا۔ اس کے گھر میں ابوطلحہ کی صاحبزادی تھی۔ ان کے انتقال کے بعد اس کے لڑکے صفوان نے اسے اپنے نکاح میں لانا چاہا تھا۔ سہیلی کہتے ہیں' جاہلیت میں اس نکاح کا معمول تھا اور اسے باقاعدہ نکاح سمجھا جاتا تھا۔ اسی لئے یہاں بھی فرمایا گیا کہ جو پہلے گزر چکا سو گزر چکا۔ جیسے دو بہنوں کو نکاح میں جمع کرنے کی حرمت کو بیان فرما کر بھی یہی کہا گیا۔ کنانہ بن خزیمہ نے بھی یہی کیا تھا کہ اپنے باپ کی بیوی سے اپنا نکاح کیا تھا۔ نضر اسی کے بطن سے پیدا ہوا تھا اور رسول اللہ ﷺ کا فرمان موجود ہے کہ میری اوپر کی نسل بھی باقاعدہ نکاح سے ہی ہے نہ کہ زنا سے' تو معلوم ہوا کہ یہ بات ان میں برابر جاری تھی اور جائز بھی اور اسے نکاح شمار کرتے تھے۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں: جن جن رشتوں کو اللہ نے حرام کیا ہے ان سب کو جاہلیت والا بھی حرام جانتے تھے' سوائے اپنی سوتیلی ماں کے اور دو بہنوں کو ایک ساتھ نکاح میں رکھنے کے۔ پس اللہ تعالی نے اپنے کلام پاک میں ان دونوں رشتوں کو بھی حرام ٹھہرا دیا۔ حضرت عطاؒ اور حضرت قتادہؒ بھی یہی فرماتے ہیں یاد رہے کہ سہیلی نے کنانہ کا جو واقعہ نقل کیا ہے وہ غور طلب ہے۔ واللہ اعلم۔

بہر صورت یہ رشتہ اس امت والوں پر حرام ہے اور نہایت قبیح امر ہے۔ یہاں تک کہ فرمایا یہ نہایت فحش اور برا کام ہے اور بغض کا سبب ہے اور برا راستہ ہے اور جگہ فرمان ہے: ﴿وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ﴾ (الانعام:۱۵۱) یعنی کسی برائی' بے حیائی' اور فحش کام کے قریب بھی نہ جاؤ۔ خواہ وہ بالکل ظاہر ہو خواہ پوشیدہ ہو اور فرمان ہے: ﴿وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنَا﴾ (بنی اسرائیل:۳۲) زنا کے قریب نہ جاؤ یقیناً وہ فحش کام ہے اور بری راہ ہے۔ یہاں اس سے بھی زیادہ فرمایا کہ یہ کام ساتھ ہی ساتھ بڑے بغض کا ہے۔ یعنی فی نفسہ بھی بڑا برا ہے۔ اس سے باپ بیٹے میں عداوت پڑ جاتی ہے اور دشمنی ظاہر ہو جاتی ہے۔ یہ ظاہر ہے اور عموماً پایا جاتا ہے کہ جو شخص عورت سے نکاح کرتا ہے وہ اس کے پہلے خاوند سے بغض ہی رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویاں ام المؤمنین قرار دی گئیں اور امت پر مثل ماں کے حرام کی گئیں۔ کیونکہ وہ نبی کی بیویاں ہیں اور آپ مثل باپ کے ہیں۔ بلکہ اجماعاً ثابت ہے کہ آپ کا حق باپ دادا کے حقوق سے بھی بہت زیادہ اور بہت بڑا ہے۔ بلکہ آپ ﷺ کی محبت خود اپنی جانوں کی محبت پر مقدم ہے۔ ﷺ۔ یہ بھی کہا ہے کہ یہ کام اللہ کے غضب کا موجب ہے۔ اور برا راستہ ہے اب جو ایسا کام کرے وہ دین سے مرتد ہے' اسے قتل کر دیا جائے اور اس کا مال بیت المال میں بطور فے کے داخل کر لیا جائے۔ سنن اور مسند احمد میں ہے کہ ایک صحابی کو رسول اللہ ﷺ نے اس شخص کی طرف بھیجا' جس نے اپنے باپ کی بیوی سے باپ کے بعد نکاح کیا تھا کہ اسے قتل کر ڈالو اور اس کا مال لے لو۔ حضرت براء بن عازب رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ میرے چچا حارث بن عمیرؓ اپنے ہاتھ میں نبی کا دیا ہوا جھنڈا لے کر میرے پاس سے گزرے۔ میں نے پوچھا کہ چچا! حضور ﷺ نے آپ کو کہاں بھیجا ہے؟ فرمایا اس شخص کی طرف جس نے اپنے باپ کی بیوی سے نکاح کیا ہے' مجھے حکم ہے کہ میں اس کی گردن ماروں۔

(مسند احمد)

مسئلہ ☆ اس پر تو علما کا اجماع ہے کہ جس عورت سے باپ نے مباشرت کر لی' خواہ نکاح کر کے' خواہ ملکیت میں لا کے' خواہ شبہ سے' وہ عورت بیٹے پر حرام ہے۔ ہاں اگر جماع نہ ہوا ہو' صرف مباشرت ہوئی ہو یا وہ اعضا دیکھے ہوں' جن کا دیکھنا اجنبی ہونے کی صورت میں حلال نہ تھا۔ تو اس میں اختلاف ہے۔ امام احمد تو اس صورت میں اس عورت کو لڑکے پر حرام بتلاتے ہیں۔ حافظ ابن عساکر کے اس واقعہ سے بھی اس مذہب کی تقویت ہوتی ہے کہ حضرت خدیج حمصی نے جو حضرت معاویہؓ کے مولیٰ تھے' حضرت معاویہؓ کے لئے ایک لونڈی خریدی' جو گورے رنگ کی اور خوبصورت تھی اور بغیر کپڑوں کے اسے ان کے پاس بھیج دیا۔ ان کے ہاتھ میں ایک چھڑی تھی۔ اس سے اشارہ کر کے کہنے لگے: اچھا نفع تھا اگر اس کے اسباب ہوتا۔ پھر کہنے لگے: اسے یزید بن معاویہ کے پاس لے جاؤ۔ پھر کہا: نہیں نہیں ٹھہرو' ربیعہ بن عمرو حرسی کو میرے پاس بلا لاؤ۔ یہ بڑے فقیہ تھے۔ جب آئے تو حضرت معاویہ نے ان سے مسئلہ پوچھا کہ میں نے اس عورت کے یہ یہ اعضا دیکھے' یہ کپڑے پہنے ہوئے نہیں تھی۔ اب میں اسے اپنے لڑکے یزید کے پاس بھیجنا چاہتا ہوں۔ تو کیا اس کے لئے حلال ہے؟ حضرت ربیعہؓ نے فرمایا: امیر المؤمنین ایسا نہ کیجئے' یہ اس قابل نہیں رہی۔ فرمایا تم ٹھیک کہتے ہو' اچھا جاؤ۔ عبداللہ بن مسعدہ فزاریؓ کو بلا لاؤ۔ وہ آئے وہ گندم گوں رنگ کے تھے۔ ان سے حضرت معاویہؓ نے فرمایا: اس لونڈی کو میں تمہیں دیتا ہوں تاکہ تمہاری اولاد سفید رنگ پیدا ہو۔ یہ عبداللہ بن مسعدہؓ وہ ہیں' جنہیں رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو دیا تھا۔ آپ نے انہیں پالا پرورش کی' پھر نام اللہ آزاد کر دیا۔ پھر یہ حضرت معاویہؓ کے پاس چلے گئے تھے۔

حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ أُمَّهٰتُكُمْ وَبَنٰتُكُمْ وَأَخَوٰتُكُمْ وَعَمّٰتُكُمْ وَخٰلٰتُكُمْ وَبَنٰتُ الْأَخِ وَبَنٰتُ الْأُخْتِ وَأُمَّهٰتُكُمُ الّٰتِيْ أَرْضَعْنَكُمْ وَأَخَوٰتُكُمْ مِّنَ الرَّضَاعَةِ وَأُمَّهٰتُ نِسَآئِكُمْ وَرَبَآئِبُكُمُ الّٰتِيْ فِيْ حُجُوْرِكُمْ مِّنْ نِّسَآئِكُمُ الّٰتِيْ دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَإِنْ لَّمْ تَكُوْنُوْا دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ وَحَلَآئِلُ أَبْنَآئِكُمُ الَّذِيْنَ مِنْ أَصْلَابِكُمْ وَأَنْ تَجْمَعُوْا بَيْنَ الْأُخْتَيْنِ إِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ إِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۲۳﴾

تم پر حرام کی گئی ہیں تمہاری مائیں اور تمہاری بیٹیاں اور تمہاری بہنیں اور تمہاری پھوپھیاں اور تمہاری خالائیں اور بھتیجیاں اور بھانجیاں اور تمہاری وہ مائیں جنہوں نے تم کو دودھ پلایا ہے اور تمہاری وہ بہنیں جو دودھ پینے کی وجہ سے ہیں اور تمہاری بیبیوں کی مائیں اور تمہاری بیبیوں کی بیٹیاں جو کہ تمہاری پرورش میں رہتی ہیں اور ان بیبیوں سے کہ جن کے ساتھ تم نے صحبت کی ہو اور اگر تم نے ان بیبیوں سے صحبت نہ کی ہو تو تم کو کوئی گناہ نہیں اور تمہارے ان بیٹیوں کی بیبیاں جو کہ تمہاری نسل سے ہوں اور یہ کہ تم دو بہنوں کو ایک ساتھ رکھو لیکن جو پہلے ہو چکا ہے بیشک اللہ تعالیٰ بڑے بخشنے والے بڑے رحمت والے ہیں۔ ○

ان سے نکاح جائز نہیں ☆

نسبی رضاعی اور سسرالی رشتے سے جو عورتیں مرد پر حرام ہیں۔ ان کا بیان اس آیۃ کریمہ میں ہو رہا ہے۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں: سات عورتیں بوجہ نسب کے حرام ہیں اور سات بوجہ سسرال کے۔ پھر آپ نے اس آیت کی تلاوت کی جس میں لڑکیوں تک تو نسبی رشتوں کا ذکر ہے۔ جمہور علمائے کرام نے اس آیت سے استدلال کیا ہے کہ زنا سے جو لڑکی پیدا ہو گی وہ بھی اس زانی پر حرام ہے۔ کیونکہ یہ بھی بنی ہے اور بیٹیاں حرام ہیں۔ یہی مذہب ابو حنیفہؒ، مالکؒ اور احمد بن حنبلؒ کا ہے۔ امام شافعیؒ سے کچھ اس کی اباحت میں بھی نقل کیا گیا ہے۔ اس لئے کہ شرعاً یہ بیٹی نہیں۔ پس جیسے کہ ورثے کے بارے میں یہ بیٹی کے حکم میں شامل نہ ہو کر ورثہ نہیں پاتی' اس لئے اس آیت حرمت میں بھی وہ داخل نہیں ہے۔ واللہ اعلم۔ پھر فرماتا ہے کہ جس طرح تم پر تمہاری سگی ماں حرام ہے اسی طرح رضاعی ماں بھی حرام ہے۔ صحیحین میں ہے کہ رضاعت بھی اسے حرام کرتے ہے۔ جسے ولادت حرام کرتے ہے۔ صحیح مسلم میں ہے رضاعت سے بھی وہ حرام ہے جو نسب سے حرام ہے۔ بعض فقہا نے اس میں سے چار صورتیں اور بعضوں نے چھ صورتیں مخصوص کی ہیں۔ جو احکام کی فروع کی کتابوں میں ہیں۔ لیکن تحقیقی بات یہ ہے کہ اس میں سے کچھ بھی مخصوص نہیں۔ اس لئے کہ اسی کی مثل بعض صورتیں نسب میں بھی پائی جاتی ہیں اور ان صورتوں میں کی

بعض صرف سسرالی رشتہ کی وجہ سے حرام ہیں۔پس حدیث پر کچھ اعتراض نہیں پڑتا۔ والحمدللہ۔

مدتِ رضاعت ☆

ائمہ کا اس میں بھی اختلاف ہے کہ کتنی مرتبہ دودھ پینے سے جو حرمت ثابت ہوتی ہے۔ بعض تو کہتے ہیں کہ تعداد معین نہیں۔ دودھ پیتے ہی حرمت ثابت ہوگئی۔ امام مالکؒ یہی فرماتے ہیں۔ ابن عمرؓ، سعید بن مسیبؒ، عروہ بن زبیرؒ اور زہریؒ کا قول بھی یہی ہے۔ دلیل یہ ہے کہ رضاعت یہاں عام ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ تین مرتبہ جب پیے تو حرمت ثابت ہوگی۔ جیسے کہ صحیح مسلم میں ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ایک مرتبہ کا چوسنا یا دو مرتبہ کا پی لینا حرام نہیں کرتا۔ یہ حدیث مختلف الفاظ سے روایت ہے۔ امام احمدؒ، اسحاق بن راہویہؒ، ابوعبیدہؒ، ابوثور بھی یہی فرماتے ہیں۔ حضرت علیؓ، حضرت عائشہؓ، حضرت ام الفضل، حضرت ابن زبیرؓ، سلیمان بن یسارؒ، سعید بن جبیرؒ سے بھی یہی مروی ہے۔ بعض کہتے ہیں پانچ مرتبہ کے دودھ پینے سے حرمت ثابت ہوتی ہے۔ اس سے کم میں نہیں۔ ان کی دلیل صحیح مسلم کی یہ روایت ہے۔ حضرت عائشہؓ صدیقہ فرماتی ہیں کہ پہلے قرآن کے دس مرتبہ کے دودھ پلانے پر حرمت کا حکم اترا تھا پھر وہ منسوخ ہو کر پانچ مرتبہ رہ گئی ہے۔ حضور ﷺ کے فوت ہونے تک وہ قرآن میں پڑھا جاتا رہا۔ دوسری دلیل سہلہ بن سہیل کی روایت ہے کہ ان کو رسول ﷺ نے حکم دیا کہ حضرت سالم کو جو حضرت ابوحذیفہ کے مولیٰ تھے کو پانچ مرتبہ دودھ پلا دیں۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اسی حدیث کے مطابق جو عورت کسی کا آنا جانا پسند کرتی اسے یہی حکم دیتیں۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے اصحاب کا فرمان بھی یہی ہے کہ پانچ مرتبہ دودھ پینا معتبر[1] ہے۔

یہ بھی یاد رہے کہ جمہور کا مذہب یہ ہے کہ یہ رضاعت دودھ چھٹنے سے پہلے یعنی دو سال کے اندر اندر کی عمر میں ہو۔ اس کا مفصل بیان آیت حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ کی تفسیر میں سورہ میں گزر چکا[2] ہے۔ پھر اس میں بھی اختلاف ہے کہ اس رضاعت کا اثر رضاعی ماں کے خاوند تک بھی پہنچے گا یا نہیں؟ تو جمہور کا اور ائمہ اربعہ کا فرمان تو یہ ہے کہ پہنچے گا اور بعض سلف کا قول ہے کہ صرف

---

[1] کیا رضاعت ایک مرتبہ دودھ پینے سے ثابت ہوتی ہے یا پانچ مرتبہ پینے کے بعد رضاعت کا حکم جاری ہوگا؟ جمہور علماء کا مذہب یہ ہے کہ ایک مرتبہ پینے سے رضاعت ثابت ہو جائے گی۔ ابن منذر نے حضرت علیؓ، عبداللہ بن مسعودؓ، ابن عمرؓ، ابن عباس رضی اللہ عنہم، عطاء، طاؤس، حسن، ابن مسیب، مکحول، زہری، قتادہ، حاکم، حماد، مالک، اوزاعی رحمۃ اللہ علیہم کا مذہب یہی نقل کیا ہے اور یہی امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب ہے لیکن امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ رضاعت کے ثبوت کے لیے پانچ مرتبہ دودھ پینا ضروری ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی دلیل یہ ہے کہ قرآنِ کریم کی آیت: ﴿وَأُمَّهَاتُكُمُ اللَّاتِي أَرْضَعْنَكُمْ وَأَخَوَاتُكُم مِّنَ الرَّضَاعَةِ﴾ میں حدود کی کوئی قید نہیں۔ اس لئے پانچ مرتبہ کا اضافہ کرنا صحیح نہ ہوگا۔ افسوس کہ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے مذہب کو جس کی پشت پر عقلی ونقلی دلائل کا انبار ہے اور جو اجل صحابہ ومشہور فقہاء کا مذہب ہے، ذکر کرنے کی ضرورت بھی محسوس نہ کی۔ فالی اللہ المشتکی۔

[2] یہ مسئلہ بھی اختلافی ہے کہ مدت رضاعت کیا ہے؟ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ دو سال کی مدت رضاعت قرار دیتے ہیں اور استدلال قرآن مجید کی اس آیت سے کرتے ہیں: ﴿وَالْوَالِدَاتُ يُرْضِعْنَ أَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ أَرَادَ أَن يُتِمَّ الرَّضَاعَةَ﴾ لیکن امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے مذہب کے مطابق مدتِ رضاعت ڈھائی سال ہے، ان کا استدلال قرآن مجید کی یہ آیت ہے: ﴿وَحَمْلُهُ وَفِصَالُهُ ثَلَاثُونَ شَهْرًا﴾ عیون نامی کتاب میں تصریح ہے کہ امام حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب جمہور صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعین رحمۃ اللہ علیہم کا پسندیدہ ہے۔ طحاوی نے اسی مذہب کو اختیار کیا ہے اور صاحب ہدایہ بھی اسی کو واضح کہتے ہیں۔

دودھ پلانے والی تک ہی رہے گا اور رضاعی باپ تک نہیں پہنچے گا۔ اس کی تفصیل کی جگہ احکام کی بڑی بڑی کتابیں ہیں نہ کہ تفسیر۔ پھر فرماتا ہے ساس حرام ہے۔ جس لڑکی سے نکاح ہوا۔ نکاح ہونے کے اس کی ماں اس پر حرام اس پر ہوگئی خواہ صحبت کرے یا نہ کرے۔ ہاں جس عورت کے ساتھ نکاح کرتا ہے اور اس کی لڑکی اس کے اگلے خاوند سے اس کے ساتھ ہے تو اگر اس سے صحبت کی تو وہ لڑکی حرام ہوگئی۔ اگر مجامعت سے پہلے ہی اس عورت کو طلاق دے دی تو وہ اس پر حرام نہیں۔ اسی لئے اس آیت میں یہ قید لگائی۔ بعض لوگوں نے ضمیر کو ساس اور ان کی پرورش کی ہوئی لڑکیوں دونوں کی طرف لوٹایا ہے وہ کہتے ہیں کہ ساس بھی اس وقت حرام ہوتی ہے جب اس کی لڑکی سے اس کے داماد نے خلوت کی ورنہ نہیں۔ صرف عقد سے نہ تو عورت کی ماں حرام ہو نہ عورت کی بیٹی۔ حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ جس شخص نے کسی لڑکی سے نکاح کیا' پھر دخول سے پہلے ہی طلاق دے دی، تو وہ اس کی ماں سے نکاح کرسکتا ہے۔ جیسا کہ ربیبہ (پرورش کردہ) لڑکی سے اس کی ماں کو اسی طرح کی طلاق دینے کے بعد نکاح کرسکتا ہے۔ حضرت زید بن ثابتؓ سے بھی یہی ثابت ہے۔ ایک اور روایت میں آپ سے نقل ہے کہ آپ فرماتے تھے۔ جب وہ عورت غیر مدخولہ مرجائے اور یہ خاوند اس کی میراث لے تو پھر اس کی ماں کو لانا مکروہ ہے۔ ہاں اگر دخول سے پہلے طلاق دے دی ہے تو کرسکتا ہے۔ حضرت ابوبکر کنانہ فرماتے ہیں کہ میرا نکاح میرے باپ نے طائف کی ایک عورت سے کرایا' ابھی رخصتی نہیں ہوئی تھی کہ اس کا باپ میرا چچا فوت ہوگیا۔ اس کی بیوی یعنی میری ساس بے خاوند رہ گئی اور تھیں وہ بہت مالدار۔ تو میرے باپ نے مجھے مشورہ دیا کہ میں اس لڑکی کو چھوڑ دوں اور اس سے نکاح کرلوں۔ میں نے حضرت ابن عباسؓ سے یہ مسئلہ پوچھا' تو آپ نے فرمایا: تمہارے لئے یہ جائز ہے۔ پھر میں نے حضرت ابن عمرؓ سے پوچھا تو انہوں نے فرمایا: یہ جائز نہیں۔ میں نے اپنے والد سے ذکر کیا۔ انہوں نے حضرت امیر معاویہؓ کو لکھا اور ان دونوں بزرگوں کے فتوے بھی لکھے۔ اس کے جواب میں حضرت معاویہؓ نے تحریر فرمایا کہ میں نہ تو حلال کو حرام کروں نہ حرام کو حلال جانو اور تمہارا کام۔ تم حالت دیکھ رہے ہو' معاملہ کے تمام پہلو تمہاری نگاہ میں ہیں۔ اس کے سوا بھی عورتیں بہت ہیں۔ غرض نہ اجازت نہ انکار کیا۔ چنانچہ میرے باپ نے اپنا خیال اس کی ماں کی طرف سے ہٹالیا اور میرا پھر نکاح اس سے نہ کرایا۔

حضرت عبداللہ بن زبیرؓ فرماتے ہیں کہ عورت کی لڑکی اور عورت کی ماں کا حکم ایک ہی ہے اگر عورت سے دخول نہ کیا ہو تو یہ دونوں حلال ہیں۔ لیکن اس کی اسناد میں مبہم راوی ہے۔ حضرت مجاہد کا بھی یہی قول ہے۔ ابن جبیرؒ اور حضرت ابن عباسؓ بھی اسی طرف گئے ہیں۔ حضرت معاویہؓ نے اس میں توقف فرمایا ہے۔ شافعیوں میں سے ابوالحسن احمد بن محمد بن صابونی سے بھی بقول رافعی یہی منقول ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے بھی اسی کے مثل نقل ہے لیکن پھر آپ نے اپنے قول سے رجوع کرلیا ہے۔ طبرانی میں ہے کہ قبیلہ فزارہ کی شاخ قبیلہ بنو کخ کے ایک شخص نے ایک عورت سے نکاح کیا۔ پھر اس کی رانڈ ماں کی طرف طبیعت جھکی تو حضرت ابن مسعودؓ سے مسئلہ پوچھا کہ مجھے اس کی ماں سے نکاح کرنا جائز ہے۔ آپ نے فرمایا: ہاں۔ چنانچہ اس نے اس لڑکی کو طلاق دے دی اور اس کی ماں سے نکاح کرلیا۔ اس سے اولاد بھی ہوئی۔ پھر حضرت ابن مسعودؓ مدینہ آئے اور اس مسئلہ کی تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ یہ حلال نہیں۔ چنانچہ آپ واپس کوفے گئے اور کہا: اس عورت کو الگ کردے' یہ تجھ پر حرام ہے۔ اس نے اس فرمان پر تعمیل کی اور اسے الگ کردیا۔ جمہور علماء اس طرف ہیں کہ لڑکی تو صرف عقد نکاح سے حرام نہیں ہوتی تاوقتیکہ اس کی ماں سے مباشرت نہ کی ہو۔ ہاں صرف لڑکی کے عقد نکاح ہوتے ہی ماں حرام ہوجاتی ہے گو مباشرت نہ ہوئی ہو۔

حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ جب کوئی شخص اپنی بیوی کو دخول سے پہلے طلاق دے یا وہ عورت مر جائے تو اس کی ماں اس پر حلال نہیں۔ چونکہ یہ مبہم ہے اس لئے اسے ناپسند فرمایا۔ حضرت ابن مسعودؓ، عمران بن حصینؓ، مسروق، طاؤس، عکرمہ، عطا، حسن، مکحول، ابن سیرین، قتادہ اور زہریؒ سے بھی اسی طرح نقل ہے۔ چاروں اماموں ساتوں فقہا اور جمہور علما اور سلف کا یہی مذہب ہے۔ والحمدللہ۔

امام ابن جریج فرماتے ہیں۔ ٹھیک قول انہی حضرات کا ہے جو ساس کو دونوں صورتوں میں حرام بتلاتے ہیں۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی حرمت کے ساتھ دخول کی شرط نہیں لگائی۔ جیسے کہ لڑکی کی ماں کے لئے یہ شرط لگائی ہے۔ پھر اس پر اجماع ہے جو ایسی دلیل ہے کہ اس کا خلاف کرنا اس وقت جائز نہیں' جبکہ اس پر اتفاق ہوا اور ایک غریب حدیث میں بھی یہ ہے گو اس کی سند میں کلام ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا جبکہ کوئی مرد کسی عورت سے نکاح کرے' اس کی ماں سے نکاح کرنا حلال نہیں اس لڑکی سے مل لیا ہو تو بھی اور نہ ملا ہو تو بھی ہاں جس عورت سے نکاح کیا ہے۔ پھر ملنے سے پہلے ہی اسے طلاق دے دی ہے تو اس کی لڑکی سے نکاح کر سکتا ہے۔ تو اس کی سند اور ہے۔ لیکن اس مسئلہ پر اجماع ہو چکا ہے' جو اس کی صحت پر ایسا گواہ ہے' جس کے بعد دوسری گواہی کی ضرورت نہیں۔

پھر فرماتا ہے: تمہاری پرورش کی ہوئی وہ لڑکیاں جو تمہاری گود میں ہوں' یہ بھی تم پر حرام ہیں' بشرطیکہ تم نے اپنی سوتیلی لڑکیوں کی ماں سے صحبت کی ہو۔ جمہور کا فرمان ہے کہ خواہ گود میں پلی ہوں یا نہ پلی ہوں حرام ہیں۔ چونکہ عموماً ایسی لڑکیاں اپنی ماں کے ساتھ ہی ہوتی ہیں اور اپنے سوتیلے باپ کے ہاں ہی پرورش پاتی ہیں۔ اس لئے یہ کہہ دیا گیا ہے یہ کوئی قید نہیں۔ جیسے اس آیت میں ہے: ﴿وَلَا تُكْرِهُوْا فَتَيٰتِكُمْ عَلَى الْبِغَآءِ اِنْ اَرَدْنَ تَحَصُّنًا﴾ (النور: ۳۳) یعنی لونڈیاں اگر پاک دامن رہنا چاہتی ہیں تو تم انہیں بدکاری پر مجبور نہ کرو۔ یہاں بھی یہ قید کہ اگر وہ پاک دامن رہنا چاہیں' صرف باعتبار واقعہ کے غلبہ کے ہے۔ یہ نہیں کہ اگر وہ خود ایسی نہ ہوں تو انہیں بدکاری پر آمادہ کرو۔ اسی طرح اس آیت میں ہے کہ گود میں گو نہ ہوں' پھر بھی حرام ہی ہیں۔ صحیحین میں ہے کہ حضرت ام حبیبہؓ نے کہا: یارسول اللہ آپ میری بہن ابوسفیان کی لڑکی عزہ سے نکاح کر لیجئے۔ آپ نے فرمایا: کیا تم یہ چاہتی ہو؟ انہوں نے کہا ہاں میں آپ کو خالی تو رکھ نہیں سکتی۔ پھر میں اس بھلائی میں اپنی بہن ہی کو کیوں نہ شامل کروں۔ آپ نے فرمایا: سنو! مجھے وہ حلال نہیں۔ ام المؤمنین نے کہا: ہم تو سنتی ہیں آپ ابوسلمہ کی بیٹی سے نکاح کرنا چاہتے ہیں۔ آپ نے فرمایا: ان کی بیٹی جو ام سلمہ سے ہے؟ کہا: ہاں' فرمایا: سنو! اولاً تو مجھ پر اس وجہ سے حرام ہے کہ وہ میری ربیبہ ہے جو میرے ہاں پرورش پا رہی ہے۔ دوسرے یہ کہ اگر ایسا نہ ہوتا تو بھی مجھ پر حرام تھیں۔ اس لئے کہ وہ میرے دودھ بھائی کی بیٹی میری بھتیجی ہیں مجھے اور اس کے باپ ابوسلمہ کو ثوبیہ نے دودھ پلایا ہے۔ خبردار اپنی بیٹیاں اور اپنی بہنیں مجھ پر پیش نہ کرو۔ بخاری کی روایت میں یہ الفاظ ہیں اگر میرا نکاح ام سلمہ سے نہ ہوا ہوتا تو بھی وہ مجھ پر حلال نہ تھیں پس حرمت کی اصل صرف نکاح کو آپ نے قرار دیا۔ یہی چاروں اماموں، ساتوں فقیہوں اور جمہور سلف و خلف کا ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اگر وہ اس کے ہاں پرورش پاتی ہو تو حرام ہے ورنہ نہیں۔

حضرت مالک بن اوس بن حدثان فرماتے ہیں: میری بیوی اولاد چھوڑ کر مر گئیں' مجھے ان سے بہت محبت تھی۔ اس وجہ سے ان کی موت کا مجھے بڑا صدمہ ہوا۔ حضرت سے میری اتفاقیہ ملاقات ہوئی تو آپ نے مغموم پا کر دریافت کیا کہ کیا بات

ہے؟ میں نے واقعہ سنایا تو آپ نے فرمایا تجھ سے اگلے خاوند سے بھی اس کی کوئی اولاد ہے؟ میں نے کہا: ہاں ایک لڑکی ہے اور وہ طائف میں رہتی ہے فرمایا: اس سے نکاح کر لو۔ میں نے قرآن کریم کی یہ آیت پڑھی کہ پھر اس کا مطلب کیا ہوگا؟ آپ نے فرمایا: یہ تو اس وقت ہے جب کہ اس نے تیرے ہاں پرورش پائی ہو اور وہ تو بقول تیرے طائف میں ہے۔ تیرے پاس ہے ہی نہیں۔ گو اس کی اسناد صحیح ہے لیکن یہ قول بالکل غریب ہے۔ حضرت داؤد بن علی ظاہری اور ان کے اصحاب بھی اسی طرف گئے ہیں۔ رافعی نے حضرت امام مالکؒ کا بھی یہی قول بتلایا ہے۔ ابن حزم نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے۔ ہمارے شیخ حافظ عبداللہ ذہبی نے ہم سے کہا کہ میں نے یہ بات شیخ امام تقی الدین ابن تیمیہؒ کے سامنے پیش کی تو آپ نے اسے بہت مشکل محسوس کیا اور توقف فرمایا۔ واللہ اعلم۔ حجور سے مراد گھر ہے۔ جیسے کہ حضرت ابوعبیدہ سے روایت ہے۔ ہاں جو لونڈی ملکیت میں ہو اور اس کے ساتھ اس کی لڑکی ہو اس کے بارے میں حضرت عمر سے سوال ہوا کہ ایک کے بعد دوسری جائز ہوگی یا نہیں؟ تو آپ نے فرمایا: میں اسے پسند نہیں کرتا۔ اس کی سند منقطع ہے۔ حضرت ابن عباسؓ نے ایسے ہی سوال کے جواب میں فرمایا ہے کہ ایک آیت سے یہ حلال معلوم ہوتی ہے دوسری آیت سے حرام۔ اس لئے میں تو اسے ہرگز نہ کروں۔ شیخ ابوعمر بن عبداللہ فرماتے ہیں کہ علماء میں اس مسئلہ میں کوئی اختلاف نہیں کہ کسی کو حلال نہیں کہ کسی عورت سے بوجہ اس کی ملکیت ہونے کے وطی کرے پھر اس کی لڑکی سے بھی اسی ملکیت کی بنا پر وطی کرے۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے نکاح میں بھی حرام قرار دے دیا ہے۔ یہ آیت ملاحظہ ہو اور علماء کے نزدیک ملکیت احکام نکاح کے تابع ہے۔ مگر جو روایت حضرت عمرؓ اور ابن عباسؓ سے کی جاتی ہے۔ لیکن ائمہ فتاویٰ اور ان کے متبعین میں سے کوئی بھی اس پر نہیں۔ حضرت قتادہ فرماتے ہیں: ربیبہ کی لڑکی اور لڑکی کی لڑکی اس طرح جس قدر نیچے یہ رشتہ چلا جائے سب حرام ہیں۔ حضرت ابوالعالیہ سے بھی اسی طرح بروایت قتادہ نقل ہے۔ دَخَلْتُم بِهِنَّ سے مراد حضرت ابن عباسؓ تو فرماتے ہیں: ان سے نکاح کرنا ہے۔ حضرت عطاؒ فرماتے کہ وہ رخصت کر دی جائے کپڑا ہٹا دیا جائے چھیڑ ہو جائے اور ارادے سے مرد بیٹھ جائے۔ ابن جریج نے سوال کیا کہ اگر یہ کام عورت ہی کے گھر میں ہوا ہو فرمایا: وہاں یہاں دونوں کا حکم ایک ہی ہے۔ ایسا اگر ہو گیا تو اس کی لڑکی اس پر حرام ہو گئی۔

امام ابن جریرؒ فرماتے ہیں کہ صرف خلوت اور تنہائی ہو جانے سے اس کی لڑکی کی حرمت ثابت نہیں ہوتی اگر مباشرت کرنے اور ہاتھ لگانے اور شہوت سے اس کے عضو کی طرف دیکھنے سے پہلے ہی طلاق دے دی ہے تو تمام کے اجماع سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ لڑکی اس پر حرام نہ ہوگی تاوقتیکہ جماع نہ ہوا ہو۔ پھر فرمایا: تمہاری بہوئیں بھی تم پر حرام ہیں جو تمہاری اپنی اولاد کی بیویاں ہوں۔ یعنی لے پالک لڑکوں کی بیویاں حرام نہیں۔ ہاں لڑکے کی بیوی یعنی بہو اپنے سسر پر حرام ہے جیسے اور جگہ ہے: ﴿فَلَمَّا قَضٰى زَيْدٌ مِّنْهَا وَطَرًا زَوَّجْنٰكَهَا لِكَيْلَا يَكُوْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ حَرَجٌ فِيْٓ اَزْوَاجِ اَدْعِيَآئِهِمْ﴾ (الاحزاب۔ ۳۷) یعنی جب زید نے اس سے اپنی حاجت پوری کر لی تو ہم نے اسے تیرے نکاح میں دے دیا تاکہ مومنوں پر ان کے لے پالک لڑکوں کی بیویوں کے بارے میں کوئی تنگی نہ رہے۔ حضرت عطا فرماتے ہیں کہ ہم سنا کرتے تھے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زید کی بیوی سے نکاح کر لیا تو مکہ کے مشرکوں نے ہنگامہ شروع کر دیا۔ اس پر یہ آیت: ﴿وَمَا جَعَلَ اَدْعِيَآءَكُمْ اَبْنَآءَكُمْ﴾ (الاحزاب ۴) اور آیت: ﴿مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ﴾ (دخان: ۲۶) نازل ہوئیں۔ یعنی بے شک صلبی لڑکے کی بیوی حرام ہے۔ تمہارے لے پالک لڑکے شرعاً تمہاری اولاد کے حکم

میں نہیں ۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تم میں سے کسی مرد کے باپ نہیں۔حسن بن محمدؒ فرماتے ہیں کہ یہ آیتیں مبہم ہیں' جیسے تمہارے لڑکوں کی بیویاں تمہاری ساسیں حضرت طاؤس، ابراہیم، زہری اور مکحول سے بھی اسی طرح نقل ہے۔میں کہتا ہوں مبہم سے مراد عام ہیں یعنی مدخول بہا اور غیر مدخول دونوں کو شامل ہیں۔صرف نکاح کرتے ہی حرمت ثابت ہو جاتی ہے خواہ صحبت ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہو۔اس مسئلہ پر اتفاق ہے۔اگر کوئی شخص سوال کرے کہ رضاعی بیٹے کی بیوی کی حرمت کیسے ثابت ہوئی۔کیونکہ آیت میں تو صلبی بیٹے کا ذکر ہے تو جواب یہ ہے کہ وہ حرمت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث سے ثابت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: رضاعت سے وہ حرام ہے جو نسب سے حرام ہے۔جمہور کا مذہب یہی ہے کہ رضاعی بیٹے کی بیوی بھی حرام ہے۔بعض لوگوں نے تو اس پر اجماع کیا ہے۔

پھر فرماتا ہے دو بہنوں کا نکاح میں جمع کرنا بھی تم پر حرام ہے۔اسی طرح ملکیت کی لونڈیوں کا حکم ہے کہ دو بہنوں سے ایک ہی وقت وطی حرام ہے مگر جاہلیت کے زمانہ میں جو ہو چکا ہم اس سے درگزر کرتے ہیں۔پس معلوم ہوا کہ اب یہ کام آئندہ کسی وقت جائز نہیں۔جیسے اور جگہ ہے: ﴿لَا يَذُوقُونَ فِيهَا الْمَوْتَ إِلَّا الْمَوْتَةَ الْأُولَى﴾ (الدخان:۵۶) یعنی وہاں موت نہ پائیں گے۔ہاں پہلی موت جو آئی تھی وہ آ چکی۔تو معلوم ہوا کہ اب آئندہ کبھی موت نہیں آئے گی صحابہ تابعین ائمہ سلف وخلف کے علمائے کرام کا اجماع ہے کہ دو بہنوں سے ایک ساتھ نکاح کرنا حرام ہے اور جو شخص مسلمان ہو اور اس کے نکاح میں دو عورتیں تھیں جو آپس میں بہنیں ہوں' تو اسے اختیار دیا جائے گا کہ ایک کو رکھ لے اور دوسری کو طلاق دے دے اور یہ اسے کرنا ہی پڑے گا۔حضرت فیروز فرماتے ہیں: میں جب مسلمان ہوا تو میرے نکاح میں دو عورتیں جو آپس میں بہنیں تھیں۔پس آنحضرت ﷺ نے مجھے حکم دیا کہ ان میں سے ایک کو طلاق دے دوں۔(مسند احمد)۔ابن ماجہ، ابوداؤد اور ترمذی میں بھی یہ حدیث ہے۔ترمذی میں یہ بھی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: ان میں سے جسے چاہو ایک کو رکھ لو اور ایک کو طلاق دے دو۔امام ترمذیؒ اسے حسن کہتے ہیں۔ابن ماجہ میں ابوخراش کا ایسا ہی واقعہ بھی مذکور ہے ممکن ہے کہ ضحاک بن فیروز کی کنیت ابوخراش ہو اور یہ واقعہ ایک ہی ہو اور اس کے خلاف بھی ممکن ہے۔حضرت دیلمی نے رسول ﷺ سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ! میرے نکاح میں دو بہنیں ہیں۔آپ ﷺ نے فرمایا: ان میں سے جسے چاہو ایک کو طلاق دے دو۔(ابن مردویہ)

پس دیلمی سے مراد ضحاک بن فیروز ہیں۔رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔یہ یمن کے ان سرداروں میں سے تھے جنہوں نے اسود عنسی متنبی ملعون کو قتل کیا۔دو لونڈیوں کو جو آپس میں بہنیں ہوں' ایک ساتھ جمع کر کے ان سے وطی کرنا بھی حرام ہے اس کی دلیل اس آیت کا عموم ہے جو بیویوں اور لونڈیوں کو شامل ہے۔حضرت ابن مسعودؓ سے اس کا سوال ہوا تو آپ نے مکروہ بتلایا۔سائل نے کہا: قرآن میں جو ہے ﴿إِلَّا مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ﴾ (النساء:۲۴) یعنی مگر وہ جو جن کے مالک تمہارے ہاتھ میں ہیں۔اس پر حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا: تیرا اونٹ بھی تو تیری ملکیت میں ہے۔جمہور کا قول بھی یہی مشہور ہے اور ائمہ اربعہؒ وغیرہ بھی یہی فرماتے ہیں۔گو بعض سلف نے اس مسئلہ میں توقف فرمایا ہے۔حضرت عثمان بن عفانؓ سے جب یہ مسئلہ پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا: تو آپ نے فرمایا ایک آیت اسے حلال کرتی ہے دوسری حرام میں تو اس سے منع نہیں کرتا۔سائل وہاں سے آ نکلا' تو راستے میں ایک صحابی سے ملاقات ہوئی۔اس نے ان سے بھی یہی سوال کیا۔انہوں نے فرمایا: اگر مجھے کچھ اختیار ہوتا تو میں تو ایسا کرنے والے کو عبرت ناک سزا دیتا ہے۔حضرت امام مالکؒ فرماتے ہیں میرا گمان ہے کہ یہ فرمانے والے غالباً حضرت علیؓ

تھے۔حضرت زبیر بن عوام سے بھی یہی نقل ہے۔

استذکار ابن عبدالبر میں ہے کہ اس واقعہ کے راوی قبیصہ بن ذوب نے حضرت علی کا نام اس لئے نہیں لیا کہ وہ عبدالملک بن مروان کا مصاحب تھا اوران لوگوں کو آپ کا نام گراں گزرتا تھا۔حضرت ایاس بن عامرؒ کہتے ہیں: میں نے علی ابن ابی طالبؓ سے سوال کیا کہ میری ملکیت میں دو لونڈیاں ہیں۔دونوں آپس میں بہنیں ہیں۔ایک سے میں نے تعلقات قائم کر رکھے ہیں اور میرے ہاں اس کی اولاد بھی ہوئی ہے۔اب میرا جی چاہتا ہے کہ اس کی بہن سے جو میری لونڈی ہے تعلقات قائم کروں تو آپ فرمائیں شریعت میں اس کا کیا حکم ہے؟ آپ نے فرمایا: پہلی لونڈی کو آزاد کر کے اس کی بہن سے تعلقات قائم کر سکتے ہو۔اس نے کہا اور لوگ تو کہتے ہیں کہ میں اس کا نکاح کرادوں۔پھر اس کی بہن سے مل سکتا ہوں۔حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا: دیکھو اس صورت میں بھی خرابی ہے وہ یہ کہ اس کا خاوند اسے طلاق دے دے یا انتقال کر جائے تو وہ پھر لوٹ کر تمہاری طرف آ جائے گی۔اسے تو آزاد کر دینے میں ہی سلامتی ہے۔پھر آپ نے میرا ہاتھ پکڑ کر فرمایا: سنو! آزاد عورتوں اور لونڈیوں کے احکام حلت و حرمت کے لحاظ سے یکساں ہی ہیں۔ہاں البتہ تعداد میں فرق ہے۔یعنی آزاد عورتیں چار سے زیادہ جمع نہیں کر سکتے اور لونڈیوں میں کوئی تعداد کی قید نہیں اور دودھ پلائی کے رشتے سے بھی وہ تمام عورتیں اس رشتہ کی حرام ہو جاتی ہیں جو نسل اور نسب کی وجہ سے حرام ہیں۔اس کے بعد تفسیر ابن کثیر کے اصل نسخے میں کچھ عبارت چھوٹی ہوئی ہے۔بظاہر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ عبارت یوں ہوگی کہ یہ روایت ایسی ہے کہ اگر کوئی شخص مشرق سے یا مغرب سے یا صرف اس روایت کو سننے کے لئے سفر کر کے آئے اور سن کے جائے تو بھی اس کا سفر سود مند رہے گا اور اس نے گویا بہت سستے داموں بیش بہا چیز حاصل کی۔یہ یاد رہے کہ حضرت علیؓ سے بھی اسی طرح نقل ہے۔جس طرح حضرت عثمانؓ سے روایت ہے۔چنانچہ ابن مردویہ میں ہے کہ آپ نے فرمایا: دو لونڈیوں کو جو آپس میں بہنیں ہوں' ایک وقت جمع کر کے ان سے مباشرت کرنا ایک آیت سے حرام ثابت ہوتا ہے اور دوسری سے حلال۔حضرت ابن عباس فرماتے ہیں: لونڈیاں مجھ پر میرے قرابت کی وجہ سے جو ان سے ہے بعض اور لونڈیوں کو حرام کر دیتی ہیں۔لیکن ان میں خود آپس میں جو قرابت ہو اس سے مجھ پر حرام نہیں کرتیں۔جاہلیت والے ان عورتوں کو حرام سمجھتے تھے۔جنہیں تم حرام سمجھتے ہو۔مگر اپنے باپ کی بیوی جو ان کی سگی ماں نہ ہو اور دو بہنوں کو ایک ساتھ ایک وقت میں نکاح میں جمع کرنے کو وہ حرام نہیں جانتے تھے۔لیکن اسلام نے آ کر ان دونوں کو بھی حرام کیا۔اسی وجہ سے ان دونوں کی حرمت کے بیان کے ساتھ ہی فرمادیا کہ جو نکاح ہو چکے وہ ہو چکے۔حضرت ابن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ جو آزاد عورتیں حرام ہیں وہی لونڈیاں بھی حرام ہیں۔ہاں عدد میں حکم ایک نہیں' یعنی آزاد عورتیں چار سے زیادہ جمع نہیں کر سکتے۔لونڈیوں کے لئے یہ حد نہیں۔حضرت شعبی بھی یہی فرماتے ہیں۔حضرت ابو عمروؓ فرماتے ہیں: حضرت عثمانؓ نے اس بارے میں جو فرمایا ہے۔وہی سلف کی ایک جماعت بھی کہتی ہے۔جن میں سے حضرت ابن عباسؓ بھی ہیں۔

لیکن اولاً تو اس کی نقل میں خود انہی حضرات سے بہت کچھ اختلاف پڑا ہوا ہے۔دوسرے یہ کہ اس قول کی طرف سمجھدار پختہ رائے علمائے کرام نے مطلقاً توجہ نہیں فرمائی اور نہ اسے قبول کیا حجاز، عراق، شام بلکہ مشرق مغرب کے تمام فقہا اس کے خلاف ہیں۔سوائے ان چند کے جنہوں نے الفاظ کو دیکھ کر اور سوچ سمجھ اور غور و غرض کئے بغیر ان سے علیحدگی اختیار کی ہے اور اس اجماع کا خلاف کیا ہے۔کامل علم والوں اور سچی سمجھ والوں کو تو اتفاق ہے کہ دو بہنوں کو جس طرح جمع نہیں کر سکتے دو لونڈیوں

سے بھی جو آپس میں بہنیں ہوں' بوجہ ملکیت کے ایک ساتھ مل جل نہیں سکتے۔ اسی طرح مسلمانوں کا اجماع ہے کہ اس آیت میں ماں بیٹی بہن وغیرہ حرام کی گئی ہیں۔ ان سے جس طرح نکاح حرام ہے' اس طرح اگر چہ لونڈیاں بن کر ماتحتی میں ہوں تو بھی میل جول حرام ہے۔ غرض نکاح کی اور ملکیت کے بعد کے دونوں حالتوں میں یہ سب کی سب برابر ہیں۔ نہ ان سے نکاح کر کے میل جول حلال' نہ ملکیت کے بعد میل جول حلال۔ اسی طرح ٹھیک یہی حکم دو بہنوں کے جمع کر لے گا اور ساس اور دوسرے خاوند سے عورت کی جولڑکی ہو اس کا ہے۔ خود ان کے جمہور کا بھی یہی مذہب ہے اور یہی وہ دلیل ہے جو ان چند مخالفین پر پوری سند اور کامل حجت ہے۔ الغرض دو بہنوں کی ایک وقت میں رکھنا بھی حرام اور دو بہنوں کی بطور لونڈی کے رکھ کر ان سے ملنا جلنا بھی حرام ہے۔

وَّالْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ۚ كِتٰبَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ ۚ وَاُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ مُّحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ ۭ فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ فَرِيْضَةً ۭ وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا تَرٰضَيْتُمْ بِهٖ مِنْۢ بَعْدِ الْفَرِيْضَةِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۲۴﴾

اور وہ عورتیں جو کہ شوہر والیاں ہیں مگر جو کہ تمہاری مملوک ہو جائیں اللہ تعالیٰ نے ان احکام کو تم پر فرض کر دیا ہے اور ان عورتوں کے سوا اور عورتیں تمہارے لئے حلال کی گئی ہیں یعنی یہ کہ تم ان کو اپنے مالوں کے ذریعے چاہو اس طرح سے کہ تم بیوی بناؤ صرف مستی ہی نہ نکالنا ہو پھر جس طریق سے تم ان عورتوں سے منتفع ہوئے ہو اور سو ان کو ان کے مہر دو جو کچھ مقرر ہو چکے ہیں اور مقرر ہوئے بعد بھی جس پر تم باہم رضامند ہو جاؤ۔ اس میں تم پر کوئی گناہ نہیں۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ بڑے جاننے والے ہیں بڑے حکمت والے ہیں۔ ○

ان عورتوں سے نکاح حرام ہے ☆

یعنی خاوندوں والی عورتیں بھی حرام ہیں۔ ہاں کفار کی جو عورتیں میدان جنگ میں قید ہو کر تمہارے قبضے میں آ جائیں تو ایک حیض گزرنے کے بعد وہ تم پر حلال ہیں۔ مسند احمد میں حضرت ابو سعید خدریؓ سے روایت ہے کہ جنگ اوطاس میں قیدی عورتیں آئیں جو خاوند والیاں تھیں تو ہم نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کی بابت سوال کیا۔ جس کی بابت یہ آیت اتری اور ان سے مقاربت حلال کی گئی۔ ترمذی' ابن ماجہ اور صحیح مسلم وغیرہ میں بھی یہ حدیث ہے۔ طبرانی کی روایت ہے کہ یہ واقعہ جنگ خیبر کا ہے۔ سلف کی ایک جماعت اس آیت کے عموم سے استدلال کرتی ہے کہ لونڈی کو اس کے خاوند کی طرف سے بیچ ڈالنا اس سے طلاق کا مل جانا ہے۔ ابراہیم سے جب یہ مسئلہ پوچھا گیا تو آپ نے حضرت عبداللہؓ کا یہی فتویٰ بیان کیا اور اس آیت کی تلاوت فرمائی اور سند سے روایت ہے کہ حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا: جب کوئی خاوند والی لونڈی بیچی جائے تو اس کے جسم کا زیادہ حقدار اس کا مالک ہے۔ حضرت ابی بن کعب، حضرت جابر بن عبداللہؓ، حضرت ابن عباس کا بھی یہی فتویٰ ہے کہ اس کا بکنا ہی اس کی

طلاق ہے۔ ابن جریر میں ہے کہ لونڈی کی طلاقیں چھ ہیں۔ بیچنا بھی طلاق ہے۔ آزاد کرنا بھی' ہبہ کرنا بھی' برأت کرنا بھی اور اس کے خاوند کا طلاق دینا بھی۔ حضرت ابن المسیبؒ فرماتے ہیں کہ خاوند والی عورتوں سے نکاح حرام ہے۔ لیکن لونڈیاں کہ ان کی طلاق ان کا بک جانا ہے۔ حضرت معمرؒ اور حضرت حسنؒ بھی یہی فرماتے ہیں ان بزرگوں کا تو یہ قول ہے۔ لیکن جمہور ان کے مخالف ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ بیچنا طلاق نہیں۔ اس لئے کہ خریدار بیچنے والے کا نائب ہے اور بیچنے والا اس نفع کو اپنی ملکیت سے نکال رہا ہے اور اسے اس سے سلب کر کے بیچ رہا ہے۔ ان کی دلیل حضرت بریرہؓ والی حدیث ہے جو صحیحین وغیرہ میں ہے کہ ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ نے جب انہیں خرید کر آزاد کر دیا تو ان نکاح مغیث سے فسخ نہیں ہو گیا تھا۔ بلکہ رسول اللہ ﷺ نے انہیں فسخ کرنے اور باقی رکھنے کا اختیار دے دیا تھا اور حضرت بریرہؓ نے فسخ کرنے کو پسند کیا۔ یہ واقعہ مشہور ہے۔ پس اگر بک جانا ہی طلاق ہوتا جیسے ان بزرگوں کا قول ہے تو آنحضرت ﷺ حضرت بریرہؓ کو ان کے بک جانے کے بعد اپنے نکاح میں باقی رکھنے نہ رکھنے کا اختیار نہ دیتے۔ اختیار دینا دلیل ہے نکاح کے باقی رکھنے کی۔ تو آیت سے مراد صرف وہ عورتیں ہیں جو جہاد میں قبضہ میں آئیں۔ واللہ اعلم۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ محصنات مراد پاک دامن عورتیں ہیں۔ یعنی عفیفہ عورتیں تم پر حرام ہیں کہ جب تک کہ تم نکاح اور گواہ اور مہر اور ولی سے ان کی عصمت کے مالک نہ بن جاؤ خواہ ایک ہو خواہ دو خواہ تین خواہ چار ہیں۔ ابوالعالیہ اور طاؤس یہی مطلب بیان کرتے ہیں۔ عمرؒ اور عبیدہؒ وغیرہ فرماتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ چار سے زائد عورتیں تم پر حرام ہیں۔ ہاں لونڈیوں میں یہ گنتی نہیں۔ پھر فرمایا کہ یہ حرمت اللہ تعالیٰ نے تم پر لکھ دی ہے یعنی چار کی۔ پس تم اس کی کتاب کو لازم پکڑو اور اس کی حد سے آگے نہ بڑھو۔ اس کی شریعت اور اس کے فرائض کے پابند رہو۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ حرام عورتیں اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں ظاہر کر دیں۔ پھر فرماتا ہے کہ جن عورتوں کا حرام ہونا بیان کر دیا گیا ہے ان کے علاوہ اور سب حلال ہیں ایک مطلب یہ بیان کیا گیا ہے کہ ان چار سے کم تم پر حلال ہیں۔ لیکن یہ قول بہت بعید اور خلاف قیاس ہے اور صحیح مطلب پہلا ہی ہے اور یہی حضرت عطاء کا قول ہے۔ قتادہؒ اس کہ یہ مطلب بیان کرتے ہیں کہ اس سے مراد لونڈیاں ہیں۔ یہی آیت دلیل ہے ان لوگوں کی جو دو بہنوں کے جمع کرنے کی عظمت کے قائل ہیں اور ان کی بھی جو کہتے ہیں کہ ایک آیت اسے حلال کرتی ہے اور دوسری حرام۔ پھر فرمایا تم ان حلال عورتوں کو اپنے مال سے حاصل کرو۔ چار تک تو آزاد عورتیں اور لونڈیاں بغیر تعین کے' لیکن بطریق شرع۔ اسی لئے فرمایا: زناکاری سے بچنے کے لئے ہو اور شہوت رانی مقصود نہ ہو۔ پھر فرمایا کہ جن عورتوں سے تم فائدہ اٹھاؤ ان کے اس فائدہ کے مقابلہ کا مہر دے دیا کرو۔ جیسے اور آیت میں ہے: ﴿وَكَيْفَ تَأْخُذُونَهٗ وَقَدْ اَفْضٰى بَعْضُكُمْ اِلٰى بَعْضٍ﴾ یعنی تم مہر کو عورتوں سے کیسے لو گے حالانکہ ایک دوسرے سے مل چکے ہو اور فرمایا: ﴿وَاٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً﴾ (النساء ۲۱) عورتوں کے مہر بخوشی دے دیا کرو اور جگہ فرمایا: ﴿وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ شَيْئًا﴾ (النساء ۴) تم نے جو کچھ عورتوں کو دے دیا ہو اس میں سے واپس لینا تم پر حرام ہے۔

متعہ اور اِس کی حرمت ☆

اس آیت سے نکاح متعہ پر استدلال کیا ہے۔ بیشک متعہ ابتدائے اسلام میں مشروع تھا۔ لیکن پھر منسوخ ہو گیا۔ امام شافعی اور علمائے کرام کی ایک جماعت نے فرمایا ہے کہ دو مرتبہ متعہ مباح ہوا پھر منسوخ ہوا۔ بعض کہتے ہیں اس سے بھی زیادہ

بار مباح اور منسوخ ہوا اور بعض کا قول ہے کہ صرف ایک بار مباح ہوا اور پھر منسوخ ہو گیا۔ پھر مباح نہیں ہوا۔ حضرت ابن عباسؓ اور چند دیگر صحابہ سے ضرورت کے وقت اس کی اباحت منقول ہے۔ حضرت امام احمد بن حنبلؒ سے بھی ایک روایت ایسی ہی مروی ہے۔ ابن عباسؓ اور ابی بن کعبؓ، سعید بن جبیرؒ اور سدی سے مِنْهُنَّ کے بعد اِلٰی اَجَلٍ مُّسَمًّی کی قرأت مروی ہے۔ مجاہد فرماتے ہیں یہ آیت نکاح متعہ کی بابت نازل ہوئی ہے۔ لیکن جمہور اس کے خلاف ہیں اور اس کا بہترین فیصلہ صحیحین کی حضرت علی والی روایت کر دیتی ہے۔ جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر والے دن نکاح متعہ سے اور پالتو گدھوں کے گوشت سے منع فرما دیا۔ اس حدیث کے الفاظ کتب احکام میں موجود ہیں۔ صحیح مسلم شریف میں حضرت سعید بن معبد جہنیؓ سے روایت ہے کہ فتح مکہ کے غزوہ میں وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اے لوگو! میں نے تمہیں عورتوں سے متعہ کرنے کی رخصت دی تھی۔ یاد رکھو بیشک اب اللہ تبارک وتعالیٰ نے اسے قیامت تک کے لئے حرام کر دیا ہے۔ جس کے پاس اس قسم کی کوئی عورت ہو تو اسے چاہئے کہ اسے چھوڑ دے اور تم نے جو کچھ انہیں دے رکھا ہو اس میں ان سے کچھ نہ لو۔ صحیح مسلم شریف کی ایک اور روایت میں کہ آپ نے حجۃ الوداع میں یہ فرمایا تھا۔ حدیث کئے الفاظ سے روایت ہے جن کی تفصیل احکام کی کتابوں میں ہے۔

پھر فرمایا: تقرر کے بعد بھی اگر تم بہ رضامندی کچھ طے کر لو تو کوئی حرج نہیں۔ اگلے جملہ کو متعہ پر محمول کرنے والے تو اس کا مطلب یہ بیان کرتے ہیں کہ مدت مقررہ گزر جائے۔ پھر مدت کو بڑھا لینے اور جو دیا ہو اس کے علاوہ کچھ اور دینے میں کوئی گناہ نہیں، سدی کہتے ہیں: اگر چاہے تو پہلے کے مقررہ مہر کے بعد جو دے چکا ہے وقت کے ختم ہونے سے پیشتر پھر کہہ دے کہ میں اتنی مدت کے لئے پھر متعہ کرتا ہوں۔ پس اگر اس نے رحم کی پاکیزگی سے پہلے زیادتی ٹھہرنے والی تو جب مدت پوری ہو جائے تو پھر اس کا کوئی دباؤ نہیں۔ وہ عورت الگ ہو جائے گی اور ایک حیض تک ٹھہر کر اپنے رحم کی صفائی کر لے گی۔ ان دونوں میں میراث نہیں۔ نہ یہ عورت اس مرد کی وارث ہوگی۔ نہ یہ مرد اس عورت کا اور جن حضرات نے اس جملہ کو نکاح مسنون کے مہر کی بابت کہا ہے۔ ان کے نزدیک تو مطلب صاف ہے کہ مہر کی ادائیگی کی تاکید بیان ہو رہی ہے۔ جیسے فرمایا: مہر بہ آسانی اور بہ خوشی دے دیا کرو۔ ہاں اگر مہر کے مقرر ہو جانے کے بعد عورت اپنے پورے حق کو یا تھوڑے حق کو چھوڑ دے معاف کر دے اس سے دست بردار ہو جائے تو میاں بیوی میں سے کسی پر کوئی گناہ نہیں۔ حضرت حضرمی فرماتے ہیں کہ لوگ مہر مقرر کر دیتے ہیں۔ پھر ممکن ہے کہ تنگی ہو جائے تو اگر عورت اپنا حق چھوڑ دے تو جائز ہے۔ امام ابن جریر بھی اسی قول کو پسند کرتے ہیں۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں: مراد یہ ہے کہ مہر کی رقم پوری پوری اس کے حوالے کر دے۔ پھر اسے بسنے اور الگ ہونے کا پورا پورا اختیار دے۔ پھر ارشاد ہوتا ہے اللہ علیم وحکیم ہے۔ ان کے احکام میں جو حلت وحرمت کے متعلق ہیں جو حکمتیں اور مصلحتیں ہیں انہیں وہی بخوبی جانتا ہے۔

وَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلًا اَنْ يَّنْكِحَ الْمُحْصَنٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ فَمِنْ مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ مِّنْ فَتَيٰتِكُمُ الْمُؤْمِنٰتِ ؕ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِاِيْمَانِكُمْ ؕ بَعْضُكُمْ مِّنْ بَعْضٍ ۚ

فَانْكِحُوهُنَّ بِإِذْنِ أَهْلِهِنَّ وَآتُوهُنَّ أُجُورَهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ مُحْصَنَاتٍ غَيْرَ مُسَافِحَاتٍ وَلَا مُتَّخِذَاتِ أَخْدَانٍ ۚ فَإِذَا أُحْصِنَّ فَإِنْ أَتَيْنَ بِفَاحِشَةٍ فَعَلَيْهِنَّ نِصْفُ مَا عَلَى الْمُحْصَنَاتِ مِنَ الْعَذَابِ ۚ ذَٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ الْعَنَتَ مِنْكُمْ ۚ وَأَنْ تَصْبِرُوا خَيْرٌ لَكُمْ ۗ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿٢٥﴾

ع

اور جو شخص تم میں پوری وسعت اور گنجائش رکھتا ہو آزاد مسلمان عورتوں سے نکاح کرنے کی تو وہ اپنے آپس کی مسلمان لونڈیوں سے جو کہ تم لوگوں کی مملوکہ ہیں نکاح کرے اور تمہارے ایمان کی پوری حالت اللہ ہی کو معلوم ہے تو سب آپس میں ایک دوسرے کے برابر ہو۔ سو ان سے نکاح کرلیا کرو ان کے مالکوں کی اجازت سے اور ان کو ان کے مہر قاعدہ کے موافق دے دیا کرو اس طور پر کہ وہ منکوحہ بنائی جائیں نہ تو علانیہ بدکاری کرنے والی ہوں اور نہ خفیہ آشنائی کرنے والی ہوں۔ پھر جب وہ لونڈیاں منکوحہ بنائی جائیں پھر اگر وہ بڑی بے حیائی کا کام (زنا) کریں تو ان پر اس سزا سے نصف سزا ہوگی جو کہ آزاد عورتوں پر ہوتی ہے یہ اس شخص کے لئے ہے جو تم میں زنا کا اندیشہ رکھتا ہو اور تمہارا ضبط کرنا زیادہ بہتر ہے (بہ نسبت نکاح کنیز کے) اور اللہ تعالیٰ بڑے بخشنے والے ہیں بڑے رحمت والے ہیں۔ ○

ایک اجازت ☆

ارشاد ہوتا ہے کہ جسے آزاد مسلمان عورتوں سے نکاح کرنے کی وسعت وقدرت نہ ہو ربیعہ فرماتے ہیں: طولؒ سے مراد قصد خواہش یعنی لونڈی سے نکاح کی خواہش' امام ابن جریرؒ نے اس قول کو نقل کر کے پھر اسے غلط قرار دیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ایسا حال جب ہو تو مسلمانوں کی ملکیت میں جو مسلمان لونڈیاں ہیں۔ ان سے وہ نکاح کرے تمام کاموں کی حقیقت اللہ تعالیٰ پر آشکارا ہے۔ تم صرف ظاہر بین ہو۔ تم سب آزاد غلام ایمانی رشتے میں ایک ہو۔ لونڈیوں سے نکاح ان کے مالکوں کی اجازت سے کیا کرو۔ معلوم ہوا کہ لونڈی کا ولی اس کا سردار ہے۔ اس کی اجازت کے بغیر اس کا نکاح منعقد نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح غلام بھی اپنے سردار کی رضامندی حاصل کئے بغیر اپنا نکاح نہیں کر سکتا۔ حدیث میں ہے جو غلام بغیر اپنے آقا کی اجازت کے اپنا نکاح کرلے وہ زانی ہے۔ ہاں اگر کسی لونڈی کی مالکہ کوئی عورت ہو تو اس کی اجازت سے اس لونڈی کا نکاح وہ کرائے جو عورت کا نکاح کرا سکتا ہے۔ کیونکہ حدیث میں ہے: عورت عورت سے نکاح نہ کرائے نہ عورت اپنا نکاح کرائے۔ وہ عورتیں زنا کار ہیں جو اپنا نکاح آپ کرتی ہیں۔ پھر فرمایا: عورتوں کے مہر خوش نفسی سے دے دیا کرو۔ گھٹا کر کم کر کے' تکلیف پہنچا کر لونڈی سمجھ کر کمی کر کے نہ دو۔ پھر فرمایا کہ دیکھ لیا کرو یہ عورتیں بدکاری کی طرف از خود مائل نہ ہوں' نہ ایسی ہوں کہ اگر کوئی ان کی طرف مائل ہو تو یہ جھک جائیں۔ یعنی نہ تو اعلانیہ زنا کار ہوں نہ خفیہ بدکار ہوں کہ ادھر اُدھر آشنائیاں کرتی پھریں اور چپ چاپ دوست آشنا بناتی جائیں جو ایسی بداطوار ہوں' ان سے نکاح کرنے کو اللہ تعالیٰ منع فرما رہا ہے۔ اُحْصِنَّ اور دوسری قرأت

اَحْصِنَّ بھی ہے۔ کہا گیا ہے کہ دونوں کا معنی ایک ہی ہے۔ یہاں احصان سے مراد اسلام ہے یا نکاح والی ہو جانا ہے۔ ابن ابی حاتم کی ایک مرفوع حدیث میں ہے کہ ان کا احصان اسلام اور عفت ہے۔ لیکن یہ حدیث منکر ہے اس میں ضعف بھی ہے ایک راوی کا نام نہیں حدیث ایسی حجت کے لائق نہیں ہوتی۔ دوسرا قول یعنی احسان سے مراد نکاح ہے۔ حضرت ابن عباسؓ، مجاہدؒ، عکرمہؒ، طاؤس ابن جبیرؒ، حسن، قتادہ وغیرہ کا یہی قول ہے۔ امام شافعیؒ سے ابوعلی طبریؒ نے اپنی کتاب ایضاح میں یہی نقل کیا ہے۔ مجاہد فرماتے ہیں: لونڈی کا محصن ہونا یہ ہے کہ وہ کسی آزاد کے نکاح میں چلی جائے۔ اسی طرح غلام کا احصان یہ ہے کہ وہ کسی آزاد مسلمہ سے نکاح کر لے۔ ابن عباسؓ سے بھی یہی منقول ہے۔ شعبی اور نخعی بھی یہی کہتے ہیں۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ ان دونوں قراتوں کے اعتبار سے معنی بھی بدل جاتے ہیں۔ اُحْصِنَّ سے مراد تو نکاح ہے اور اَحْصَنَّ سے مراد اسلام ہے۔ امام ابن جریر اسی کو پسند کرتے ہیں۔ لیکن بظاہر مراد یہاں نکاح کرنا ہی ہے۔ واللہ اعلم۔ اس لئے کہ سیاق آیت کی دلالت اسی پر ہے۔ ایمان کا ذکر تو لفظوں میں موجود ہے۔ بہر دوصورت جمہور کے مذہب کے مطابق آیت کے معنی میں ابھی اشکال باقی ہے۔ اس لئے کہ جمہور کا قول ہے کہ لونڈی کو زنا کی وجہ سے پچاس کوڑے لگائے جائیں۔ خواہ وہ مسلمہ ہو یا کافرہ ہو۔ شادی شدہ ہو یا غیر شادی شدہ ہو۔ باوجودیکہ آیت کے مفہوم کا تقاضا یہ ہے کہ غیر محصنہ لونڈی پر حد ہی نہ ہو۔ پس اس کے مختلف جوابات ہوئے ہیں۔ جمہور کا قول یہ ہے کہ بے شک منطوق مفہوم پر مقدم ہے اس لئے ہم نے ان عام حدیثوں کو جن میں لونڈیوں کو مارنے کا بیان ہے اس آیت کے مفہوم پر مقدم کیا۔ صحیح مسلم کی حدیث میں ہے کہ حضرت علیؓ نے اپنے خطبے میں فرمایا: لوگو! اپنی لونڈیوں پر حدیں قائم رکھو وہ محصنہ ہوں یا نہ ہوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے اپنی لونڈی کے زنا پر حد مارنے کو فرمایا۔ چونکہ وہ نفاس میں تھی۔ اس لئے مجھے ڈر لگا کہ کہیں حد کے کوڑے لگنے سے یہ مر نہ جائے۔ چنانچہ میں نے اس وقت اسے حد نہ لگائی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں واقعہ بیان کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: تم نے اچھا کیا' جب تک وہ ٹھیک ٹھاک نہ ہو جائے حد نہ مارنا۔ مسند احمد میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: جب یہ نفاس سے فارغ ہو تو اسے پچاس کوڑے لگانا۔ حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں: میں نے حضور ﷺ سے سنا' فرماتے تھے: جب تم میں سے کسی کی لونڈی زنا کرے اور زنا ظاہر ہو جائے تو اسے وہ حد مارے اور برا بھلا نہ کہے۔ پھر اگر وہ دوبارہ زنا کرے تو بھی حد لگائے اور ڈانٹ جھڑک نہ کرے۔ پھر اگر تیسری مرتبہ زنا کرے اور ظاہر ہو تو اسے بیچ ڈالے۔ اگرچہ رسی کے ٹکڑے کے بدلے ہی ہو اور صحیح مسلم میں ہے کہ جب تین مرتبہ یہ فعل اس سے سرزد ہو تو چوتھی دفعہ فروخت کر دے۔ عبداللہ بن عیاش بن ابوربیعہ مخزومی فرماتے ہیں کہ ہم چند قریشی نوجوانوں کو حضرت فاروقؓ نے امارت کی لونڈیوں میں سے کئی ایک پر حد جاری کرنے کو فرمایا: ہم نے انہیں زنا کی حد میں پچاس پچاس کوڑے لگائے۔ دوسرا جواب ان کا یہ ہے جو اس بات کی طرف گئے ہیں کہ لونڈی پر بغیر احصان حد نہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ یہ مارنا صرف بطور ادب سکھانے اور باز رکھنے کے ہے۔ ابن عباسؓ اسی طرف گئے ہیں۔ طاؤس، سعید، ابوعبید، داؤد، ظاہری کا مذہب بھی یہی ہے۔ ان کی بڑی دلیل مفہوم آیت ہے اور یہ شرط کے مفہوموں میں سے ہے اور اکثر کے نزدیک یہ حجت ہے۔ اس لئے ان کے نزدیک عموم پر مقدم ہو سکتا ہے اور ابو ہریرہ اور زید بن خالد کی حدیث جس میں ہے کہ آنحضرت ﷺ سے پوچھا گیا کہ جب لونڈی زنا کرے اور محصنہ نہ ہو' یعنی منکوحہ نہ ہو تو کیا کیا جائے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: اگر وہ زنا کرے تو اسے حد لگاؤ۔ پھر زنا کرے تو پھر کوڑے لگاؤ۔ پھر بیچ ڈالو۔ گو ایک رسی کے ٹکڑے کے عوض ہی کیوں نہ

بیچنا پڑے۔ راوی حدیث ابن شہابؒ فرماتے ہیں: میں نہیں جانتا کہ تیسری مرتبہ کے بعد فرمایا یا چوتھی مرتبہ کے بعد۔ پس اس حدیث کے مطابق وہ جواب دیتے ہیں کہ دیکھو یہاں حد کی مقدار اور کوڑوں کی تعداد بیان نہیں فرمائی۔ جیسے کہ محصنہ کے بارے میں صاف فرما دیا ہے اور جیسے کہ قرآن میں مقرر طور پر فرمایا گیا ہے کہ محصنات کی نسبت نصف حد ان پر ہے۔ پس آیت و حدیث میں اس طرح تطبیق دینی واجب ہوگئی۔ واللہ اعلم۔

اس سے بھی زیادہ صراحت والی وہ روایت ہے جو سعید بن منصور نے بروایت ابن عباس نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کسی لونڈی پر حد نہیں جب تک کہ وہ احصان والی نہ ہو جائے۔ یعنی جب تک کہ وہ نکاح والی نہ ہو جائے۔ پس جب خاوند والی بن جائے تو اس پر آدھی حد ہے بہ نسبت اس حد کے جو آزاد نکاح والیوں پر ہے یہ حدیث ابن خزیمہ میں بھی ہے۔ لیکن وہ فرماتے ہیں اسے مرفوع کرنا خطا ہے۔ یہ موقوف ہے یعنی حضرت ابن عباس کا قول ہے۔ بیہقی میں بھی یہ روایت ہے اور آپ کا بھی یہی فیصلہ ہے اور کہتے ہیں کہ حضرت علیؓ اور حضرت عمرؓ والی حدیثیں ایک واقعہ کا فیصلہ ہے اور ابو ہریرہؓ والی حدیث کے بھی کئی جوابات ہیں۔ ایک تو یہ کہ یہ محمول ہے اس لونڈی پر جو شادی شدہ ہو۔ اس طرح ان دونوں حدیثوں میں تطبیق اور جمع ہو جاتی ہے۔ دوسرے یہ کہ اس حدیث میں لفظ حد کسی راوی کا داخل کیا ہوا ہے اور اس دلیل جواب کا فقرہ ہے۔ تیسرا جواب یہ ہے کہ یہ حدیث صرف دو صحابہ کی ہے اور وہ حدیث صرف ایک صحابی کی ہے اور وہ دو والی مقدم ہے ایک والی پر اور اسی طرح یہ حدیث نسائی میں بھی مروی ہے اور مسلم کی شرط پر اس کی سند ہے کہ حضرت عباد بن تمیم اپنے چچا سے جو بدری صحابیؓ تھے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب لونڈی زنا کرے تو اسے کوڑے لگاؤ۔ پھر جب زنا کرے تو کوڑے لگاؤ' پھر جب زنا کرے تو بیچ دو' اگرچہ ایک رسی کے ٹکڑے کے بدلے ہی بیچنا پڑے[1] چوتھا جواب یہ ہے کہ یہ بھی بعید نہیں کہ کسی راوی نے جلد پر لفظ حد کا اطلاق کر دیا ہو اور اس نے جلد کو حد خیال کر لیا ہو۔ یا لفظ حد کا اطلاق تادیب کے طور پر سزا دینے پر کر دیا ہو۔ جیسے کہ لفظ حد کا اطلاق اس سزا پر بھی کیا گیا ہے جو بیمار زانی کو کھجور کا ایک خوشہ مارا تھا۔ جس میں ایک سو چھوٹی چھوٹی شاخیں تھیں اور جیسے کہ لفظ حد کا اطلاق اس شخص پر بھی کیا گیا ہے' جس نے اپنی بیوی کی اس لونڈی کے ساتھ زنا کیا جسے بیوی نے اس کے لئے حلال کر دیا تھا۔ حالانکہ اسے سو کوڑوں کا لگنا تعزیز کے طور پر صرف ایک سزا ہے جیسے کہ امام احمد وغیرہ سلف کا خیال ہے۔ حد حقیقی صرف یہ ہے کہ کنوارے کو سو کوڑے اور بیاہے ہوئے کو رجم یا واللہ اعلم۔ ابن ماجہ وغیرہ میں حضرت سعید بن جبیر کا فرمان ہے کہ لونڈی نے جب تک نکاح نہیں کیا اسے زنا پر نہ مارا جائے اس کی اسناد تو صحیح ہے۔ لیکن معنی دو ہو سکتے ہیں۔ ایک تو یہ بالکل مارا ہی نہ جائے نہ حد نہ اور کچھ۔ تو یہ قول بالکل غریب ہے ممکن ہے آیت کے الفاظ پر نظر کر کے یہ فتویٰ دے دیا ہو اور حدیث نہ پہنچی ہو۔ دوسرے معنی یہ ہیں کہ حد کے طور پر نہ مارا جائے۔ پس یہ حضرت ابن عباسؓ وغیرہ کے فتوے کے مطابق ہو جائے گا۔ واللہ اعلم۔

تیسرا جواب یہ ہے آیت میں دلالت ہے کہ محصنہ لونڈی پر بہ نسبت آزاد عورت کے آدھی حد ہے۔ لیکن محصنہ ہونے سے پہلے کتاب و سنت کے عموم میں یہ بھی شامل ہے کہ اسے بھی سو کوڑے مارے جائیں۔ جیسے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ کا فرمان

[1] مطلب یہ ہے کہ اس کے بیچنے کا اس قدر اہتمام اور فروخت کرنے میں اس قدر عجلت ہو کہ اگر پوری اور واجبی قیمت اس کی حاصل نہ ہو سکے اور وہ کوڑیوں ہی کے مول دینا پڑے تو ایسی بدکار کو کوڑیوں ہی کے مول فروخت کر دینا بہتر اور مناسب ہے۔

ہے: ﴿اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِيْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ﴾ (النور:۲) یعنی زنا کار عورت اور زنا کار مرد کو ہر ایک کو سو سو کوڑے مارے جائیں اور جیسے حدیث میں حضور ﷺ فرماتے ہیں: میری بات لے لو میری بات سمجھ لو۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے راستہ نکال دیا۔ اگر دونوں جانب غیر شادی شدہ ہیں تو سو کوڑے اور ایک سال کی جلاوطنی اور اگر دونوں طرف شادی شدہ ہیں تو سو کوڑے اور پتھروں سے رجم کر دینا۔ یہ حدیث صحیح مسلم کی ہے اور اسی طرح کی اور حدیثیں بھی ہیں۔ حضرت داؤد بن علی ظاہریؒ کا یہی قول ہے لیکن یہ سخت ضعیف ہے۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے محصنہ لونڈیوں کو بہ نسبت آزاد کے آدھے کوڑے مارنے کا عذاب بیان فرمایا یعنی پچاس کوڑے۔ تو پھر جب تک وہ محصنہ نہ ہوں اس سے بھی زیادہ سزا کی سزاوار کس طرح ہو سکتی ہیں۔ حالانکہ قاعدہ شریعت یہ ہے کہ احصان سے پہلے کم سزا ہے اور احصان کے بعد زیادہ سزا ہے۔ پھر اس کے برعکس کیسے صحیح ہو سکتا ہے۔ دیکھئے شارع علیہ السلام سے آپ ﷺ کے صحابہ غیر شادی شدہ لونڈی کے زنا کی سزا پوچھتے ہیں اور آپ ﷺ انہیں جواب دیتے ہیں کہ اسے کوڑے مارو۔ لیکن یہ نہیں فرماتے کہ ایک سو کوڑے لگاؤ۔ پس اگر اس کا حکم وہی ہوتا' جو داؤد سمجھتے ہیں تو اسے بیان کر دینا حضور پر واجب تھا۔ اس لئے کہ ان کا یہ سوال تو صرف اسی وجہ سے تھا کہ لونڈی کے شادی شدہ ہو جانے کے بعد اسے سو کوڑے مارنے کا بیان نہیں۔ ورنہ اس قید کے لگانے کی کیا ضرورت تھی کہ سوال میں کہتے وہ غیر شادی شدہ ہے۔ کیونکہ پھر تو شادی شدہ اور غیر شادی شدہ میں کوئی فرق ہی نہ رہا۔ اگر یہ آیت اتری ہوئی نہ ہوتی۔ لیکن چونکہ ان دونوں صورتوں میں سے ایک کا علم تو انہیں ہو چکا تھا۔ اس لئے دوسری کی بابت سوال کیا اور حضور ﷺ نے جواب دے کر معلوم کرا دیا۔ جیسے صحیحین میں ہے کہ جب صحابہؓ نے حضور ﷺ سے آپ ﷺ پر درود پڑھنے کی نسبت پوچھا تو آپ ﷺ نے اسے بیان فرما دیا اور فرمایا اسلام تو اسی طرح ہے جس طرح تم خود جانتے ہو۔

ایک روایت میں ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کا فرمان: ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا﴾ (الاحزاب:۵۶) نازل ہوا اور صلوٰۃ وسلام آپ ﷺ پر بھیجنے کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا تو صحابہ نے کہا کہ سلام کا طریقہ اور اس کے الفاظ ہمیں معلوم ہیں۔ اور صلوٰۃ کی کیفیت بیان فرما دیئے۔ پس ٹھیک اسی طرح یہ سوال ہے۔ مفہوم آیت کا چوتھا جواب ابو ثور کا ہے جو داؤد کے جواب سے زیادہ رکیک ہے۔ وہ فرماتے ہیں: جب لونڈیاں شادی شدہ ہو جائیں' تو ان کی زنا کاری کی حد ان پر آدھی ہے۔ اس کی حد جو شادی شدہ آزاد عورتوں کی زنا کاری کی حد تو ظاہر ہے کہ آزاد عورتوں کی حد اس صورت میں رجم ہے اور یہ بھی ظاہر ہے کہ رجم آدھا نہیں ہو سکتا۔ تو لونڈی کی اس صورت میں رجم کرنا پڑے گا اور شادی سے پہلے اسے پچاس کوڑے لگیں گے۔ کیونکہ آزاد عورت پر اس حالت میں سو کوڑے ہیں۔ پس دراصل آیت کا مطلب سمجھنے میں اس سے خطا ہوئی اور اس میں جمہور کا بھی خلاف ہے۔ بلکہ امام شافعیؒ فرماتے ہیں کسی مسلمان کا اس میں اختلاف ہی نہیں کہ مملوک پر زنا کی سزا میں رجم ہے ہی نہیں۔ اس لئے کہ آیت دلالت کرتی ہے کہ ان پر محصنات کا نصف عذاب ہے اور محصنات کے لفظ میں جو الف لام ہے وہ عہد کا ہے۔ یعنی وہ محصنات جن کا بیان آیت کے شروع میں ﴿اَنْ يَّنْكِحَ الْمُحْصَنٰتِ﴾ میں گزر چکا ہے۔ مراد صرف آزاد عورتیں ہیں۔ اس وقت یہاں آزاد عورتوں کے نکاح کے مسئلہ پر بحث نہیں' بحث یہ ہے کہ پھر آگے چل کر ارشاد ہوتا ہے کہ ان پر زنا کاری کی جو سزا تھی اس سے آدھی ان لونڈیوں پر ہے تو معلوم ہوا کہ یہ اس سزا کا ذکر ہے جو آدھی ہو سکتی ہے اور سو کوڑے ہیں کہ سو سے آدھے پچاس رہ جائیں گے رجم یعنی سنگسار کرنا ایسی سزا ہے جس کے حصے نہیں ہو سکتے۔ واللہ اعلم۔

مسند احمد میں ایک واقعہ ہے جو ابو ثور کے مذہب کی پوری تردید کرتا ہے۔ اس میں ہے کہ صفیہ لونڈی نے ایک غلام سے زنا کی اور اسی زنا سے بچہ ہوا۔ جس کا دعویٰ زانی نے کیا۔ مقدمہ حضرت عثمانؓ کے پاس پہنچا۔ آپ نے حضرت علی کو اس کا تصفیہ سونپا۔ حضرت علیؓ نے فرمایا: میں اس میں وہی فیصلہ کروں گا' جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ ہے بچہ تو اس کا سمجھا جائے گا۔ جس کی یہ لونڈی ہے اور زانی کو پتھر ملیں گے۔ پھر ان دونوں کو پچاس پچاس کوڑے لگائے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ مراد مفہوم سے تنبیہ ہے اعلیٰ کے ساتھ ادنیٰ پر یعنی جب کہ وہ شادی شدہ ہوں تو ان پر بہ نسبت آزاد عورتوں کے آدھی حد ہے۔ پس ان پر رجم تو سرے سے کسی صورت میں ہے ہی نہیں۔ نہ قول از نکاح نہ بعد از نکاح۔ دونوں حالتوں میں صرف کوڑے ہیں۔ جس کی دلیل حدیث ہے۔ صاحب الایضاح یہی فرماتے ہیں اور حضرت امام شافعیؒ سے بھی اسی کو ذکر کرتے ہیں۔ امام بیہقی نے اپنی کتاب سنن و آثار میں اس کا ذکر کیا ہے لیکن یہ قول لفظ آیت سے بہت دور ہے۔ اس طرح کہ آدھی حد ہونے کی دلیل صرف آیت ہے۔ اس کے سوا کچھ نہیں۔ پس اس کے سوا میں آدھا ہونا کس طرح سمجھا جائے گا اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ مطلب یہ ہے کہ شادی شدہ ہونے کی حالت میں صرف امام ہی حد قائم کر سکتا ہے۔ اس لونڈی کا مالک اس حال میں اس پر حد جاری نہیں کر سکتا۔ امام احمدؒ کے مذہب میں ایک قول یہی ہے۔ ہاں شادی سے پہلے اس کے مالک کو حد جاری کرنے کا اختیار بلکہ حکم ہے۔ لیکن دونوں صورتوں میں حد آدھی ہی آدھی رہے گی اور یہ بھی خلافِ قیاس ہے۔ اس لئے کہ آیت میں اس کی دلالت بھی نہیں اور اگر یہ آیت نہ ہوتی تو ہم نہیں جان سکتے تھے کہ لونڈیوں کے بارے میں آدھی حد ہے' اور صورت میں انہیں بھی عموم میں داخل کر کے پوری حد یعنی سو کوڑے اور رجم ان پر بھی جاری کرنا واجب ہو جاتا ہے۔ جیسے کہ عام روایتوں سے ثابت ہے۔ حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ لوگو! اپنے ماتحتوں پر حد جاری کرو شادی شدہ یا غیر شادی شدہ اور وہ عام حدیثیں جو گزر چکی ہیں' خاوند والی اور کنواری کی کوئی تفصیل نہیں۔ حضرت ابو ہریرہؓ کی حدیث' جس سے جمہور نے دلیل پیش کی ہے یہ ہے کہ جب تم میں سے کسی کی لونڈی زنا کرے اور پھر اس زنا ظاہر ہو جائے تو اسے چاہئے کہ حد جاری کرے اور ڈانٹ ڈپٹ نہ کرے (ملخصاً) الغرض لونڈی کے زنا کی حد میں کئی قول ہیں۔ ایک تو یہ کہ جب تک اس کا شکار نہیں ہوا' اسے پچاس کوڑے مارے جائیں گے اور نکاح ہونے کے بعد بھی یہی حد رہے گی اور اسے جلاوطن بھی کیا جائے گا یا نہیں۔ اس میں تین اقوال ہیں: ایک یہ کہ جلاوطنی ہوگی' دوسرے یہ کہ نہ ہوگی' تیسرے یہ کہ جلاوطنی میں نصف کو ملحوظ رکھا جائے گا یعنی چھ مہینے دیس نکالا دیا جائے گا نہ کہ پورے سال کا۔ پورا سال آزاد عورتوں کے لئے ہے۔

یہ تینوں اقوال امام شافعیؒ کے مذہب میں ہیں۔ لیکن امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک جلاوطنی تعزیز کے طور پر ہے۔ وہ حد میں سے نہیں ہے امام کی رائے پر موقوف ہے۔ اگر چاہے جلاوطن کرے یا نہ کرے۔ مرد عورت سب اسی حکم میں داخل ہیں۔ ہاں امام مالک کے مذہب میں ہے کہ جلاوطنی صرف مردوں کے لئے ہے عورتوں پر نہیں۔ اس لئے کہ جلاوطنی صرف اس کی حفاظت کے لئے ہے اور اگر عورت کو جلاوطن کیا گیا تو حفاظت میں سے نکل جائے گی اور مردوں یا عورتوں کے بارے میں دیس نکالے کی حدیث صرف حضرت عبادہؓ اور حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اس زانی کے بارے میں جس کی شادی نہیں ہوتی تھی' حد لگانے اور ایک سال دیس نکالا دینے کا حکم فرمایا تھا۔ (بخاری) اس سے معنوی مراد یہی ہے کہ اس کی حفاظت رہے اور عورت کو وطن سے نکا لنے میں یہ حفاظت بالکل ہی نہیں ہو سکتی واللہ اعلم۔ دوسرا قول یہ ہے کہ لونڈی کو اس کی زنا

اس قدر خوش ہوئے کہ اگر ہمیں سرخ رنگ کے اونٹ ملتے تو بھی اس قدر خوش نہ ہوتے۔ اب آپ ﷺ فرمانے لگے جو بندہ پانچوں نمازیں پڑھے اور رمضان کے روزے رکھے اور زکوٰۃ ادا کرتا رہے اور سات کبیرہ گناہوں سے بچے اس کے لئے جنت کے تمام دروازے کھل جائیں گے اور اس سے کہا جائے گا کہ سلامتی کے ساتھ اس میں سے جس میں سے چاہو چلے جاؤ۔ جن سات گناہوں کا اس میں ذکر ہے ان کی تفصیل بخاری مسلم کی حدیث میں اس طرح پر آئی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ان سات گناہوں سے بچو جو ہلاک کرنے والے ہیں۔ پوچھا گیا کہ حضور ﷺ وہ کون سے گناہ ہیں۔ فرمایا: اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کرنا اور اسے قتل کرنا جس کا قتل حرام ہے۔ ہاں اگر کسی شرعی وجہ سے اس کا خون حلال ہوگیا ہو تو اور بات ہے اور جادو کرنا اور سود کھانا اور یتیم کا مال کھانا اور میدان جنگ سے کفار کے مقابلے بھاگنا اور بھولی بھالی پاک دامن مسلمان عورتوں پر تہمت لگانا۔ ایک روایت میں جادو کے بدلے ہجرت کر کے پھر واپس اپنے دیس میں قیام کرنا۔ یہ یاد رہے کہ ان سات کو کبیرہ کہنے سے یہ مطلب نہیں کہ کبیرہ گناہ صرف یہی ہیں جیسے کہ بعض اور لوگوں کا خیال ہے جن کے نزدیک مفہوم مخالف معتبر ہے۔ دراصل یہ بہت بودا قول ہے اور غلط اصول ہے۔ بالخصوص اس وقت جبکہ اس کے خلاف دلیل موجود ہو اور یہاں تو صاف لفظوں میں کبیرہ گناہوں کا ذکر بھی موجود ہے۔ مندرجہ ذیل حدیثیں ملاحظہ ہوں۔ مستدرک حاکم میں ہے کہ حجۃ الوداع میں رسول مقبول ﷺ نے فرمایا: لوگو! سن رکھو اللہ کے ولی صرف نمازی ہی ہیں۔ جو پانچوں وقت کی فرض نمازوں کی باقاعدہ بجا لاتے ہیں جو رمضان شریف کے روزے رکھتے ہیں فرض جان کر اور ثواب حاصل کرنے کی نیت رکھ کر اسی طرح ہنسی خوشی زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور تمام کبیرہ گناہوں سے دور رہتے ہیں جن سے اللہ تعالیٰ نے روک دیا ہے۔ ایک شخص نے پوچھا: یارسول اللہ ﷺ وہ کبیرہ گناہ کیا ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: شرک، قتل، میدانِ جنگ سے بھاگنا، مالِ یتیم کا کھانا، سود خواری، پاک دامنوں پر تہمت لگانا، ماں باپ کی نافرمانی کرنا، بیت اللہ کی حرمت کو توڑنا جو زندگی اور موت میں تمہارا قبلہ ہے۔ سنو جو شخص مرتے دم ان بڑے گناہوں سے اجتناب کرتا ہے اور نماز اور زکوٰۃ کی پابندی کرتا ہے۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جنت میں سونے کے محلوں میں ہوگا۔ حضرت طیلسہ بن میاس فرماتے ہیں مجھ سے ایک گناہ ہوگیا جو میرے نزدیک کبیرہ ہے میں نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے اس کا ذکر کیا تو آپ نے فرمایا: وہ کبیرہ نو ہیں اللہ کے ساتھ شرک کرنا، کسی کو بلاوجہ مار ڈالنا، میدانِ جنگ میں دشمنانِ دین کو پیٹھ دکھانا، پاک دامن عورتوں پر تہمت لگانا، سود کھانا، یتیم کا مال ظلم سے کھا جانا، مسجد الحرام میں الحاد پھیلانا اور جادو جائز جاننا اور ماں باپ کو بوجہ نافرمانی کے رُلانا۔ حضرت طیلسہؒ فرماتے ہیں کہ اس کے بیان کے بعد بھی حضرت ابن عمرؓ نے دیکھا کہ میرا ڈر خوف کم نہیں ہوا تو فرمایا: کیا تجھے جہنم کی آگ میں داخل ہونے کا ڈر اور جنت میں جانے کی خواہش ہے۔ میں نے کہا بہت کچھ فرمایا: سنو! تمہارے ماں باپ زندہ ہیں میں نے کہا: صرف والدہ حیات ہیں فرمایا: بس تو تم ان سے نرمی سے بولا کرو اور انہیں کھانا کھلاتے رہا کرو اور ان کبیرہ گناہوں سے بچتا رہا کرو۔ تم یقیناً جنت میں جاؤ گے اور روایت میں ہے کہ حضرت طیلسہ حضرت ابن عمرؓ سے میدانِ عرفات میں عرفہ کے دن پیلو کے درخت کے تلے ملے تھے۔ اس وقت حضرت عبداللہؓ اپنے سر اور چہرے پر پانی بہا رہے تھے۔ اس میں یہ بھی ہے کہ جب حضرت عبداللہؓ نے تہمت دھرنے کا ذکر کیا تو میں نے کہا: یہ بھی مثل قتل کے بہت بڑا گناہ ہے۔ آپ نے فرمایا: ہاں ہاں اور اس میں گناہوں کے ذکر میں جادو کا ذکر بھی ہے اور روایت ہے کہ میری ان کی ملاقات شام میں ہوئی تھی اور میں نے ان سے کبائر کے بارے میں سوال کیا تو انہوں

نے فرمایا: میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ کبائر سات ہیں میں نے پوچھا: کیا کیا؟ تو فرمایا: شرک اور تہمت۔ میں نے کہا کیا یہ بھی مثل خون کے ہے؟ فرمایا: ہاں ہاں اور کسی مؤمن کو بے سبب مار ڈالنا اور لڑائی سے بھاگنا اور جادو اور سود خواری اور مال یتیم اور نافرمانی والدین اور بیت اللہ میں الحاد جو زندگی میں اور موت میں تمہارا قبلہ ہے۔

مسند احمد میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: جو اللہ کا بندہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرے نماز قائم رکھے زکوۃ ادا کرے۔ رمضان کے روزے رکھے اور کبیرہ گناہوں سے بچے وہ جنتی ہے۔ ایک شخص نے پوچھا: کبائر کیا ہیں آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ کے ساتھ شریک کرنا مسلمان کو قتل کرنا لڑائی والے دن بھاگ کھڑے ہونا۔ ابن مردویہ میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل یمن کو ایک خط لکھوا کر بھجوایا جس میں فرائض سنن تھے۔ دیت یعنی جرمانوں کے احکام تھے اور خط حضرت عمر بن حزمؓ کے ہاتھ اہل یمن کو بھجوایا تھا۔ اس خط میں یہ بھی تھا کہ قیامت کے دن تمام کبیرہ گناہوں میں سب بڑا کبیرہ گناہ یہ ہے کہ انسان اللہ کے ساتھ کسی کو شریک کرے اور ایماندار شخص کا قتل بغیر حق کے اور اللہ کی راہ میں جہاد کے میدان میں جا کر لڑتے ہوئے نامردی سے جان بچانے کی خاطر بھاگ کھڑا ہونا اور ماں باپ کی نافرمانی کرنا اور بے گناہ عورتوں پر الزام لگانا اور جادو سیکھنا اور سود کھانا اور مال یتیم برباد کرنا۔ ایک اور روایت میں کبیرہ گناہوں کے بیان میں جھوٹی بات یا جھوٹی شہادت بھی ہے اور حدیث میں ہے کہ کبیرہ گناہوں کے بیان کے وقت آپ ٹیک لگا کر بیٹھے ہوئے تھے۔ لیکن جب یہ بیان فرمایا کہ جھوٹی گواہی اور جھوٹ بات اس وقت آپ تکیے سے ہٹ گئے اور بڑے زور سے اس بات کو بیان فرمایا اور بار بار اسی کو دہراتے رہے۔ یہاں تک کہ ہم نے کہا: کاش اب تو آپ نہ دہرائیں۔ بخاری و مسلم میں ہے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے جناب رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا کہ حضور ﷺ کون سا گناہ سب سے بڑا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا یہ کہ اللہ تعالیٰ کا کسی کو شریک ٹھہرانا باوجودیکہ تجھے صرف اُسی نے پیدا کیا ہے۔ میں نے پوچھا: اس کے بعد فرمایا کہ تو اپنے بچے کو اس ڈر سے قتل کر دے کہ وہ تیرے ساتھ کھائے گا۔ میں نے پوچھا: پھر کون سا بڑا گناہ ہے فرمایا کہ تم اپنی پڑوسن سے بدکاری کرے۔ پھر حضور ﷺ نے آیت: ﴿وَالَّذِينَ لَا يَدْعُونَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ اِلَّا مَنْ تَابَ﴾ تک پڑھی۔

ابن ابی حاتم میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرو مسجد الحرام میں حطیم کے اندر بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک شخص نے شراب کے بارے میں سوال کیا تو آپ نے فرمایا: مجھ جیسا بوڑھا بڑی عمر کا آدمی اس جگہ بیٹھ کر اللہ کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جھوٹ بول سکتا ہے؟ شراب کا پینا تمام گناہوں سے بڑا گناہ ہے۔ یہ تمام خباثتوں کی ماں ہے۔ شرابی تارک نماز ہوتا ہے۔ وہ اپنی ماں اور خالہ اور پھوپھی سے بھی بدکاری کرنے سے نہیں چوکتا۔ یہ حدیث غریب ہے۔ ابن مردویہ میں ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق، حضرت عمر فاروقؓ اور دوسرے بہت سے صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین ایک مرتبہ ایک مجلس میں بیٹھے ہوئے تھے۔ وہاں کبیرہ گناہوں کا ذکر نکلا کہ سب سے بڑا گناہ کیا ہے تو کسی کے پاس انتہائی جواب نہ تھا۔ اس لئے انہوں نے حضرت عبداللہ بن عمر کو بھیجا کہ تم جا کر حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاصؓ سے دریافت کر آؤ۔ میں گیا تو انہوں نے جواب دیا کہ سب سے بڑا گناہ شراب پینا ہے میں نے واپس آ کر اس مجلس میں یہ جواب سنا دیا۔ اس پر اہل مجلس کو تسکین نہ ہوئی اور سب حضرات اٹھ کر حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاصؓ کے گھر چلے اور خود ان سے دریافت کیا تو انہوں نے بیان کیا کہ لوگوں نے نبی ﷺ کے سامنے ایک واقعہ بیان کیا کہ بنی اسرائیل کے بادشاہوں میں سے ایک نے ایک شخص کو گرفتار کیا۔ پھر اس نے کہا یا تو تجھے قتل کر دیا

اے ایمان والو! آپس میں ایک دوسرے کے مال ناحق طور پر مت کھاؤ لیکن کوئی تجارت ہو جو باہمی رضامندی سے ہو تو مضائقہ نہیں اور تم ایک دوسرے کو قتل بھی مت کرو۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ تم پر بڑے مہربان ہیں اور جو شخص ایسا فعل کرے گا اور اس طور پر کہ حد سے گزر جائے اور اس طور پر کہ ظلم کرے تو ہم عنقریب اس کو آگ میں داخل کریں گے اور یہ امر اللہ تعالیٰ کو آسان ہے۔ جن کاموں سے تم کو منع کیا جاتا ہے ان میں جو بھاری بھاری کام ہیں اگر تم ان سے بچتے رہو تو ہم تمہاری خفیف برائیاں تم سے دور فرمادیں گے اور ہم تم کو ایک معزز جگہ میں داخل کردیں گے۔ ○

کچھ اور احکام ☆

اللہ تعالیٰ اپنے ایمانداروں کو ایک دوسرے کے مال باطل کے ساتھ کھانے کی ممانعت فرمارہا ہے۔ خواہ اس کمائی کے ذریعہ سے ہو جو شرعاً حرام ہے۔ جیسے سود خواری قمار بازی اور ایسے ہی ہر طرح کی حیلہ سازی گو اس شرعی صورت جواز کی دے دی ہو اللہ کو خوب معلوم ہے کہ اصل حقیقت کیا ہے۔ حضرت ابن عباسؓ سے سوال ہوتا ہے کہ ایک شخص کپڑا خریدتا ہے اور کہتا ہے کہ اگر مجھے پسند آیا تو رکھ لوں گا۔ ورنہ کپڑا اور ایک درہم واپس کردوں گا۔ آپ نے اس آیت کی تلاوت کی۔ یعنی اس کو باطل مال کھانے میں شامل کیا۔ حضرت عبداللہ فرماتے ہیں: یہ آیت محکم ہے یعنی منسوخ نہیں نہ قیامت تک منسوخ ہوسکتی ہے۔ آپ سے مروی ہے کہ جب یہ آیت اتری تو مسلمانوں نے ایک دوسرے کے ہاں کھانا چھوڑ دیا۔ جس پر آیت: ﴿لَيْسَ عَلَى الْاَعْمٰى﴾ (النور:۶۱) اتری تِجَارَةً کو تِجَارَةٌ بھی پڑھا گیا ہے۔ یہ استثنا منقطع ہے۔ گویا یوں فرمایا جارہا ہے کہ حرمت والے طریقوں سے مال نہ لو۔ ہاں شرعی طریق پر تجارت سے نفع اٹھانا جائز ہے جو خریدار اور بیچنے والے کی رضامندی سے ہو۔ جیسے اور جگہ ہے: کسی بے گناہ جان کو نہ مارو۔ ہاں حق کے ساتھ ہو تو جائز ہے اور جیسے دوسری آیت میں ہے وہاں صرف ایک مرتبہ موت طاری ہوگی۔ حضرت امام شافعیؒ اس آیت سے استدلال کر کے فرماتے ہیں 'خرید و فروخت بغیر قبولیت کے صحیح نہیں ہوتی۔ اس لئے کہ رضامندی کی پوری سند یہی ہے۔ صرف لین دین کر لینا کبھی کبھی رضامندی پر پوری دلیل نہیں بن سکتا اور جمہور اس کے برخلاف ہیں۔ تینوں اور اماموں کا قول ہے کہ جس طرح زبانی بات چیت رضامندی کی دلیل ہے اسی طرح لین دین بھی رضامندی کی دلیل ہے۔ بعض حضرات فرماتے ہیں: کم قیمت معمولی چیزوں میں صرف لینا دینا ہی کافی ہے اور اسی طرح بیوپار کا جو طریقہ ہو۔ صحیح مذہب میں احتیاطی نظر سے تو بات چیت میں قبولیت کا ہونا اور بات ہے' واللہ اعلم۔

مجاہدؒ فرماتے ہیں: خرید و فروخت ہو یا بخشش ہو سب کو یہ حکم شامل ہے۔ ابن جریر کی مرفوع حدیث میں ہے 'تجارت رضامندی سے ہے اور بیوپار کے بعد اختیار ہے۔ کسی مسلمان کو جائز نہیں کہ دوسرے مسلمان کو دھوکہ دے۔ یہ حدیث مرسل ہے' پوری رضامندی مجلس کے خاتمے تک کا اختیار بھی ہے۔ صحیحین میں ہے: حضور فرماتے ہیں: بائع مشتری دونوں کو اختیار ہے جب تک جدا نہ ہوں۔ بخاری شریف میں ہے جب دو شخص خرید و فرخت کریں تو ہر ایک کو اختیار ہے جب تک الگ الگ نہ ہوں۔ اسی حدیث کے مطابق امام احمدؒ، امام شافعیؒ اور ان کے سب ساتھیوں کا فتویٰ ہے اور جمہور سلف خلف کا بھی اور اسی پوری رضامندی میں داخل ہے خرید و فروخت کے تین دن بعد میں اختیار دینا بھی۔ تو اختیار سال بھر تک کا ہو' جیسے گاؤں والوں میں وغیرہ۔ امام مالکؒ کا مشہور مذہب یہی ہے۔ گو ان کے نزدیک صرف لین دین سے ہی بیع صحیح ہو جاتی ہے۔ شافعی مذہب میں بھی ایک قول یہ ہے اور ان میں سے بعض فرماتے ہیں کہ معمولی کم قیمت چیزوں میں جنہیں لوگ بیوپار کے لئے رکھتے ہوں۔ صرف لین دین ہی کافی ہے۔ بعض اصحاب کا اختیار یہی ہے جیسے کہ متفق علیہ ہے۔ پھر فرماتا ہے: اللہ تعالیٰ کے حرام

کاموں کا ارتکاب کر کے اور اس کی نافرمانیاں کر کے اور ایک دوسرے کے مال بے جا طور پر مار کھا کر اپنے آپ کو ہلاک نہ کرو۔ اللہ تعالیٰ تم پر رحیم ہے۔ ہر حکم اور ہر ممانعت رحمت والی ہے۔

مسند احمد میں ہے کہ حضرت عمرو بن عاص کو ذات السلاسل والے سال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھیجا تھا۔ آپ فرماتے ہیں مجھے ایک رات احتلام ہو گیا۔ سردی بہت سخت تھی۔ یہاں تک کہ مجھے نہانے میں، جان جانے کا خطرہ ہو گیا تو میں نے تیمم کر کے اپنی جماعت کو صبح کی نماز پڑھا دی۔ جب وہاں سے واپس ہم لوگ آنحضرت کی خدمت میں حاضر ہوا تو میں نے یہ واقعہ کہہ سنایا۔ آپ نے فرمایا: کیا تو نے اپنے ساتھیوں کو جنبی ہونے کی حالت میں نماز پڑھا دی؟ میں نے کہا حضور جاڑا سخت تھا اور مجھے اپنی جان جانے کا اندیشہ تھا تو مجھے یاد پڑا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے اپنے تئیں ہلاک نہ کر ڈالو۔ اللہ رحیم ہے۔ پس میں نے تیمم کر کے نماز صبح پڑھا دی۔ تو آپ ہنس دیئے اور کچھ نہ فرمایا۔ ایک روایت میں ہے کہ اور لوگوں نے حضور ﷺ سے بیان کیا اور پھر آپ کے دریافت کرنے پر حضرت عمرو بن عاصؓ نے یہ عذر پیش کیا۔ صحیحین میں ہے کہ جو شخص کسی لوہے سے خودکشی کرے گا وہ قیامت تک جہنم کی آگ میں لوہے سے خودکشی کرتا رہے گا اور جو جان بوجھ کر مر جانے کی نیت سے زہر کھالے۔ وہ ہمیشہ ہمیشہ آگ جہنم میں زہر کھاتا رہے گا اور روایت میں ہے کہ جو شخص اپنے تئیں جس چیز سے قتل کرے گا وہ قیامت والے دن اسی چیز سے عذاب کیا جائے گا۔ حضور کا ارشاد ہے کہ تم سے پہلے کے لوگوں میں سے ایک کو زخم لگے اس نے چھری سے اپنا ہاتھ کاٹ ڈالا۔ خون نہ تھما اور وہ اسی میں مر گیا۔ تو اللہ عزوجل نے فرمایا: میرے بندے نے اپنے تئیں فنا کرنے میں جلدی کی' میں نے اس پر جنت کو حرام کیا۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ یہاں فرماتا ہے: جو شخص اسے ظلم و زیادتی کے ساتھ کرے یعنی حرام جانتے ہوئے اس کا مرتکب ہو اور دلیرانہ طور پر حرام پر کاربند ہو وہ جہنمی ہے۔ پس ہر عاقل کو اس سخت ڈراوے سے ڈرنا چاہئے۔ دل کے کان کھول کر اللہ کے اس فرمان کو سن کر حرام کاریوں سے اجتناب کرنا چاہئے۔ پھر فرماتا ہے: اگر تم بڑے بڑے گناہوں سے بچتے رہو گے تو ہم تمہارے چھوٹے چھوٹے گناہ معاف فرما دیں گے اور تمہیں جنتی بنا دیں گے۔ حضرت انسؓ سے مرفوعاً مروی ہے کہ ہم نے نہیں دیکھا مثل اس کے' جو ہمیں ہمارے رب کی طرف سے پہنچی ہے۔ پھر ہم اس کے لئے اپنے اہل و مال سے جدا نہ ہو جائیں کہ وہ ہمارے چھوٹے چھوٹے گناہوں سے درگزر کرتا ہے' سوائے کبیرہ گناہوں کے۔ پھر اس آیت کی تلاوت کی۔ اس آیت کے متعلق بہت سی حدیثیں بھی ہیں۔ تھوڑی بہت ہم یہاں بیان کرتے ہیں۔

مسند احمد میں حضرت سلمان فارسیؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جانتے ہو جمعہ کا دن کیا ہے؟ میں نے جواب دیا کہ یہ وہ دن ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے ہمارے باپ آدم کو پیدا کیا آپ ﷺ نے فرمایا: سنو! اب جو میں جانتا ہوں وہ سنو۔ جو شخص اس دن اچھی طرح پاکیزگی حاصل کر کے نماز جمعہ کے لئے آئے اور نماز ختم ہو جانے تک خاموش رہے تو اس کا یہ عمل اگلے جمعہ تک کے گناہوں کا کفارہ ہو جاتا ہے۔ جب تک کہ وہ قتل سے بچا ہوا ہے۔ ابن جریر میں ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ نے خطبہ سناتے ہوئے فرمایا: اس اللہ کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے۔ تین مرتبہ یہی فرمایا' پھر سر نیچا کر لیا۔ ہم سب نے بھی سر نیچا کر لیا۔ بہت سے لوگ رونے لگے۔ ہم خوفزدہ ہو گئے کہ اللہ جانے اللہ کے رسول ﷺ نے کس چیز پر قسم کھائی ہے اور پھر کیوں خاموشی اختیار فرمائی ہے۔ تھوڑی دیر میں آپ ﷺ نے سر اٹھایا اور آپ کا چہرہ بشاش تھا۔ جس سے ہم

کاری پر شادی کے بعد پچاس کوڑے مارے جائیں گے اور تنبیہ کے لئے اسے کچھ مار پیٹ کی جائے گی۔ لیکن اس کی کوئی مقررہ گنتی نہیں۔ پہلے گزر چکا ہے کہ شادی سے پہلے اسے مارا نہ جائے گا۔ جیسے حضرت سعید بن مسیب کا قول ہے لیکن اگر اس سے یہ مراد لی جائے کہ سرے سے کچھ مارنا ہی نہ چاہئے تو یہ تاویلی مذہب ہوگا۔ ورنہ قول ثانی میں اسے داخل کیا جا سکتا ہے اور قول یہ ہے کہ شادی سے پہلے سو کوڑے اور شادی کے بعد پچاس۔ جیسے کہ داؤد کا قول ہے اور یہ ضعیف قول ہے اور یہ کہ شادی سے پہلے پچاس کوڑے اور اس کے بعد رجم جیسے کہ ابو ثور کا قول ہے لیکن یہ قول کمزور ہے۔ واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

پھر فرمان ہے کہ لونڈیوں سے نکاح کرنا ان شروط کی موجودگی میں جو بیان ہوئیں ان کے لئے ہے جنہیں زنا میں واقع ہونے کا خطرہ ہو اور تجرد اس پر بہت شاق گزر رہا ہو۔ اس کی وجہ سے سخت تکلیف میں ہو تو بے شک اسے پاک دامن لونڈیوں سے نکاح کر لینا جائز ہے۔ تو اس حالت میں بھی اپنے نفس کو روکے رکھنا اور ان سے نکاح نہ کرنا بہت بہتر ہے۔ اس لئے کہ اس سے جو اولاد ہوگی وہ اس کے مالک کی لونڈی غلام ہوگی ہاں اگر خاوند غریب ہو تو اس کی یہ اولاد اس کے آقا کی ملکیت امام شافعیؒ کے قول قدیم کے مطابق نہ ہوگی۔ پھر فرمایا: اگر تم صبر کرو تو تمہارے لئے افضل ہے اور اللہ غفور و رحیم ہے۔ جمہور علماء نے اس آیت سے استدلال کیا ہے کہ لونڈی سے نکاح جائز ہے۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ اس وقت میں ہے جب آزاد عورتوں سے نکاح کرنے کی طاقت نہ ہو اور نہ رکے رہنے کی طاقت ہو۔ بلکہ زنا میں واقع ہونے کا خوف ہو۔ کیونکہ اس میں ایک خرابی تو یہ ہے کہ اولاد غلامی میں جاتی ہے۔ دوسرے ایک طرح کی سبکی ہے کہ آزاد عورتوں سے ہٹ کر لونڈیوں کی طرف متوجہ ہوں۔ ہاں جمہور کے مخالف امام ابو حنیفہؒ اور ان کے ساتھی ہیں وہ کہتے ہیں یہ دونوں باتیں شرط نہیں۔ بلکہ جس کے نکاح میں کوئی آزاد عورت نہ ہو اسے لونڈی سے نکاح جائز ہے۔ وہ لونڈی خواہ مؤمنہ ہو خواہ اہل کتاب میں ہوں۔ گو اسے آزاد عورت سے نکاح کی طاقت بھی ہو اور گو اسے بدکاری کرنے کا خوف بھی نہ ہو۔ اس کی بڑی دلیل یہ آیت ہے: ﴿وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ﴾ (المائدہ: ۵) یعنی آزاد عورتیں ان میں سے جو تم میں سے پہلے کتاب اللہ دیئے گئے۔ پس وہ کہتے ہیں یہ آیت عام ہے۔ آزاد غیر آزاد سب کو شامل ہے اور محصنات سے مراد پاک دامن با عصمت عورتیں ہیں۔ لیکن اس کی ظاہری دلالت بھی اسی مسئلہ پر ہے جو جمہور کا مذہب[1] ہے۔ واللہ اعلم۔

يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُبَيِّنَ لَكُمْ وَيَهْدِيَكُمْ سُنَنَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَيَتُوْبَ عَلَيْكُمْ ۗ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۶﴾ وَاللّٰهُ يُرِيْدُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْكُمْ ۫ وَيُرِيْدُ الَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الشَّهَوٰتِ اَنْ تَمِيْلُوْا مَيْلًا عَظِيْمًا ﴿۲۷﴾ يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّخَفِّفَ عَنْكُمْ ۚ وَخُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِيْفًا ﴿۲۸﴾

[1] حیرت ہے کہ اس کی دلالت جمہور کے مذہب پر کیسے ہے؟ بات اصل میں یہ ہے کہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے استدلال کا جواب نہ بن سکا تو جواب کی ابن کثیر نے یہ حیرت انگیز صورت نکالی۔

اللہ تعالیٰ کو یہ منظور ہے کہ تم سے بیان کر دے اور تم سے پہلے لوگوں کے احوال تم کو بتا دے اور تم پر توجہ فرمائے اور اللہ تعالیٰ بڑے علم والے ہیں بڑے حکمت والے ہیں اور اللہ تعالیٰ کو تو تمہارے حال پر توجہ فرمانا منظور ہے اور جو لوگ شہوت پرست ہیں وہ یوں چاہتے ہیں کہ تم بڑی بھاری کجی میں پڑ جاؤ اللہ تعالیٰ کو تمہارے ساتھ تخفیف منظور ہے اور آدمی کمزور پیدا کیا گیا ہے۔○

احکام واضح طور پر بیان کئے جاتے ہیں☆

ارشاد ہوتا ہے کہ اے مومنو! اللہ ارادہ کر چکا ہے کہ حلال وحرام تم پر واضح کھول کھول کر بیان فرما دے۔ جیسے کہ اس عورت اور دوسری سورتوں میں اس نے بیان فرمایا۔ وہ چاہتا ہے کہ اگلے لوگوں کی قابل اتباع راہیں تمہیں سمجھا دے۔ تا کہ تم اس کی اس شریعت پر عمل کرو جو اس کی محبوب اور اس کی رضامندی کی ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ تمہاری توبہ قبول فرمائے۔ جس گناہ سے جس حرام کاری سے تم توبہ کرو وہ فوراً قبول فرمالیتا ہے۔ وہ علم وحکمت والا ہے۔ اپنی شریعت اپنے انداز سے اپنے کام اور اپنے فرمان میں وہ صحیح علم اور کامل حکمت رکھتا ہے۔ خواہش نفسانی کے پیروکار یعنی شیطانوں کے غلام یہود ونصاریٰ اور بدکار لوگ تمہیں حق سے ہٹانا اور باطل کی طرف جھکانا چاہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے حکم احکام میں روکنے ہٹانے میں شریعت اور انداز بے مقرر کرنے میں تمہارے لئے آسانیاں چاہتا ہے اور اسی بنا پر چند شرائط کے ساتھ اس نے لونڈیوں کے ساتھ نکاح کر لینا تم پر حلال کر دیا۔ انسان چونکہ پیدائشی کمزور ہے۔ اس لئے اللہ نے اپنے احکام میں کوئی سختی نہیں رکھی۔ یہ فی نفسہ بھی کمزور' اس کے ارادے اور حوصلے بھی کمزور یہاں آ کر بالکل بے وقوف بن جانے والا۔ چنانچہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شب معراج میں سدرۃ المنتہٰی سے لوٹے اور حضرت موسیٰ کلیم اللہ علیہ السلام سے ملاقات ہوئی۔ تو آپ ﷺ نے دریافت کیا کہ آپ پر کیا فرض کیا گیا ہے؟ فرمایا: ہر دن رات میں پچاس نمازیں۔ تو کلیم اللہؑ نے فرمایا: واپس جایئے اور اللہ تعالیٰ سے تخفیف طلب کیجئے۔ آپ کی اُمت میں اس کی طاقت نہیں۔ میں اس سے پہلے لوگوں کا تجربہ کر چکا ہوں۔ وہ اس سے بہت کم میں گھبرا گئے تھے اور آپ کی اُمت تو کانوں آنکھوں اور دل کی کمزوری میں ان سے بھی بڑھی ہوئی ہے۔ چنانچہ آپ ﷺ واپس گئے' دس معاف کرالائے پھر بھی یہی باتیں ہوئیں' پھر گئے پھر دس ہوئیں' یہاں تک کہ آخری مرتبہ پانچ رہ گئیں۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ ۣ وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيْمًا ﴿۲۹﴾ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ عُدْوَانًا وَّظُلْمًا فَسَوْفَ نُصْلِيْهِ نَارًا ۭ وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا ﴿۳۰﴾ اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَاۗىِٕرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَنُدْخِلْكُمْ مُّدْخَلًا كَرِيْمًا ﴿۳۱﴾

جائے گا۔ ورنہ ان کاموں میں سے کسی ایک کو کرلو۔ یعنی یا تو شراب پی یا خون ناحق کر یا زنا کر یا سؤر کا گوشت کھا۔ اس نے غور و تامل کے بعد جان کے ڈر سے شراب کو ہلکی چیز سمجھ کر منظور کرلیا۔ جب شراب پی لی تو نشہ میں وہ ان تمام کاموں کو گزرا' جن سے وہ پہلے رکا تھا۔ حضور ﷺ نے یہ واقعہ گوش گزار فرما کر ہم سے فرمایا: جو شخص شراب پیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کی نمازیں چالیس رات تک قبول نہیں فرماتا اور جو شراب پینے کی عادت میں ہی مرجائے اور اسکے مثانہ میں تھوڑی سے شراب ہو' اس پر اللہ جنت حرام کردیتا ہے۔ اگر شراب پینے کے بعد چالیس راتوں کے اندر اندر مرے تو اسکی موت جاہلیت کی موت ہوتی ہے۔ یہ حدیث غریب ہے۔ ایک اور غریب حدیث میں جھوٹی قسم کو بھی رسول اللہ ﷺ نے کبیرہ گناہوں میں شمار فرمایا ہے۔ (بخاری وغیرہ)

ابن ابی حاتم میں جھوٹی قسم کے بیان کے بعد یہ فرمان بھی ہے کہ جو شخص اللہ کی قسم کھا کر کوئی بات کہے اور اس میں مچھر کے برابر زیادتی کرے' اس کے دل میں ایک سیاہ داغ ہو جاتا ہے' جو قیامت تک باقی رہتا ہے۔ ابن حاتم میں ہے کہ انسان کا اپنے ماں باپ کو گالی دینا کبیرہ گناہ ہے۔ لوگوں نے پوچھا: حضور ﷺ اپنے ماں باپ کو کیسے گالی دے گا؟ آپ ﷺ نے فرمایا: اس نے دوسرے کے باپ کو گالی دی۔ اُس نے اس کے باپ کو گالی دی۔ اس نے اس کی ماں کو برا بھلا کہا۔ اس نے اس کی ماں کو۔ بخاری شریف میں ہے' سب سے بڑا گناہ کبیرہ یہ ہے کہ آدمی اپنے ماں باپ پر لعنت کرے۔ لوگوں نے کہا یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ فرمایا: دوسرے کے ماں باپ کو کہہ کر اپنے ماں باپ کو کہلوانا۔ صحیح حدیث میں ہے کہ مسلمان کو گالی دینا فسق ہے اور قتل کرنا کفر ہے۔ ابن ابی حاتم میں ہے اکبر الکبائر یعنی تمام کبیرہ گناہوں میں بڑا کسی مسلمان کی آبروریزی کرنا ہے اور ایک گالی کے بدلے دو گالیاں دینا ہے۔ ترمذی میں ہے' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو شخص دو نمازوں کو عذر کے بغیر جمع کرے وہ کبیرہ گناہوں کے دروازوں میں سے ایک دروازے میں گھسا۔ ابن ابی حاتم میں ہے کہ حضرت عمر بن خطابؓ کی کتاب جو ہمارے سامنے پڑھی گئی۔ اس میں یہ تھا کہ دو نمازوں کو بغیر شرعی عذر کے جمع کرنا کبیرہ گناہ ہے اور لڑائی کے میدان سے بھاگ کھڑے ہونا اور لوٹ کھسوٹ کرنا بھی کبیرہ گناہ ہے۔ الغرض ظہر' عصر یا مغرب عشا پہلے وقت یا پچھلے وقت شرعی رخصت کے جمع کرکے پڑھنا کبیرہ گناہ ہے۔ پھر جو شخص کہ بالکل ہی نہ پڑھے اس کے گناہ کا تو یہی ٹھکانا ہے۔ چنانچہ صحیح مسلم شریف میں ہے کہ بندے اور شرک کے درمیان نماز چھوڑ دینا ہے[1] سنن کی ایک حدیث میں ہے کہ ہم میں اور کافر میں فرق کرنے والی چیز نماز کا چھوڑ دینا ہے۔ جس نے اسے چھوڑا اس نے کفر کیا اور روایت میں آپ کا یہ فرمان بھی منقول ہے کہ جس نے عصر کی نماز ترک کی اس کے اعمال غارت ہوگئے اور حدیث میں ہے جس کی عصر کی نماز فوت ہوئی گویا اس کا مال اور اس کے اہل وعیال ہلاک ہوگئے۔

بڑے بڑے گناہ ☆

ابن ابی حاتم میں ہے کہ ایک شخص نے رسول ﷺ سے سوال کیا کہ کبیرہ گناہ کیا کیا ہیں؟ آپ نے فرمایا اللہ کے ساتھ شرک کرنا' اللہ تعالیٰ کی نعمت اور اس کی رحمت سے نا اُمید ہونا اور اس کی گرفت سے بے خوف ہو جانا اور یہ سب سے بڑا کبیرہ ہے۔ اسی کے مثل ایک روایت اور بھی بزار میں موجود ہے۔ لیکن زیادہ ٹھیک یہ ہے کہ وہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ پر موقوف ہے۔ ابن مردویہ میں ہے۔ حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں سب سے بڑھ کر کبیرہ گناہ اللہ عزوجل کے ساتھ بدگمانی کرنا ہے۔ یہ روایت بہت ہی غریب ہے۔ پہلے وہ حدیث بھی گزر چکی ہے جس میں ہجرت کے بعد کفرستان میں آکر بسنے کو بھی کبیرہ گناہ

[1] یعنی ایمان وشرک میں امتیاز صرف نماز سے ہے اگر کوئی شخص نماز کا پابند ہے تو وہ مسلمان ہے اور نماز ترک کرنا کفر کے مرادف ہے۔ والعیاذ باللہ۔

فرمایا ہے۔ یہ حدیث ابن مردویہ میں ہے۔ سات کبیرہ گناہوں میں ایک گناہ ہے۔ لیکن اس کی اسناد محلِ نظر ہے اور اسے مرفوع کہنا بالکل غلط ہے۔ ٹھیک بات یہ ہے جو تفسیر ابن جریر میں ہے کہ حضرت علی کوفے کی مسجد میں ایک مرتبہ منبر پر کھڑے ہو کر لوگوں کو خطبہ سنا رہے تھے۔ جس میں فرمایا: لوگو! کبیرہ گناہ سات ہیں۔ اسے سن کر لوگ چیخ اٹھے۔ آپ نے اسی کو پھر دہرایا۔ پھر دہرایا۔ پھر فرمایا: مجھ سے ان کی تفصیل کیوں پوچھتے۔ لوگوں نے کہا: امیر المؤمنین فرمایئے وہ کیا ہیں؟ آپ نے فرمایا: اللہ کے ساتھ شرک کرنا۔ جس جان کو مار ڈالنا اللہ نے حرام کیا ہے اسے مار ڈالنا۔ پاک دامن عورتوں پر تہمت لگانا' یتیم کا مال کھا جانا' سود خواری کرنا' لڑائی کے دن پیٹھ دکھانا۔ ہجرت کے بعد پھر دارالکفر میں آ بسنا۔ راوی حدیث حضرت محمد بن سہلؒ نے اپنے والد حضرت سہل بن خیثمہ سے پوچھا کہ اسے کبیرہ گناہوں میں کیسے داخل کیا۔ تو جواب ملا کہ پیارے بچے اس سے بڑھ کر ستم کیا ہوگا کہ ایک شخص ہجرت کر کے مسلمانوں میں جا ملے۔ مال غنیمت میں اس کا حصہ مقرر ہو جائے۔ مجاہدین میں اس کا نام درج کر دیا جائے۔ پھر وہ ان تمام چیزوں کو چھوڑ اعرابی بن جائے اور دارلکفر میں چلا جائے اور جیسا تھا ویسا ہی ہو جائے مسند احمد میں ہے کہ حضور ﷺ نے اپنے حجۃ الوداع کے خطبے میں فرمایا: خبردار ہو جاؤ وہ چار ہیں۔ اللہ ساتھ کسی کو شریک نہ کرو۔ خون ناحق سے بچو' ہاں شرعی اجازت اور چیز ہے[1] زنا نہ کرو' چوری نہ کرو۔ وہ حدیث پہلے گزر چکی ہے جس میں ہے کہ وصیت کرنے میں کسی کو نقصان پہنچانا بھی کبیرہ گناہ ہے۔ ابن جریر میں ہے کہ صحابہ میں ایک مرتبہ کبیرہ گناہوں کا ذکر یہ کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک کرنا' یتیم کا مال کھانا' لڑائی سے بھاگ کھڑا ہونا' پاک دامن عورتوں پر تہمت لگانا' ماں باپ کی نافرمانی' جھوٹ بولنا' دھوکہ دینا' خیانت کرنا' جادو کرنا' سود کھانا۔ یہ سب کبیرہ گناہ ہیں۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اور اس گناہ کو کہاں رکھتے ہو جو لوگ اللہ کے عہد اور اپنی قسموں کو تھوڑی تھوڑی قیمت پر بیچتے پھرتے ہیں۔ آخر آیت تک آپ ﷺ نے تلاوت کی۔ اس کی اسناد میں ضعف ہے اور یہ حدیث حسن ہے۔ پس ان تمام حدیثوں میں کبیرہ گناہوں کا ذکر ہے۔ اب اس بارے میں سلف صالحینؒ کے جو قول ہیں وہ ملاحظہ ہوں۔

ابن جریر میں ہے' چند لوگوں نے مصر میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے پوچھا کہ بہت سی باتیں کتاب اللہ میں ہم ایسی پاتے ہیں کہ جن پر ہمارا عمل نہیں۔ اس لئے ہم امیر المؤمنین حضرت عمرؓ سے اس بارے میں دریافت کرانا چاہتے ہیں۔ حضرت ابن عمر انہیں لے کر مدینہ آئے۔ اپنے والد سے ملے۔ آپ نے پوچھا: کب آئے ہو۔ جواب دیا کہ اتنے دن ہوئے۔ پوچھا اجازت سے آئے ہو۔ اس کا جواب دیا اور پھر ان لوگوں کا ذکر کیا۔ آپ نے فرمایا انہیں جمع کرو۔ پھر ان کے پاس آئے اور ان میں سے ایک سے پوچھا تجھے اللہ کی اور حق اسلام کی قسم ہے تو نے پورا قرآن کریم پڑھا ہے اس نے کہا: ہاں۔ فرمایا تو نے اسے محفوظ بھی کر لیا ہے۔ اس نے کہا: نہیں اور اگر ہاں کہتا تو حضرت عمرؓ اسے دلائل سے عاجز کر دیتے پھر فرمایا اپنی نگاہ میں اپنی زبان پر اپنی چال میں اسے گھیر لیا ہے[2] پھر ایک ایک سے یہی سوال کیا۔ پھر فرمایا: تم عمر کو اس مشقت میں ڈالنا چاہتے ہو کہ لوگوں کو کتاب اللہ کے مطابق ہی ٹھیک ٹھاک کر دے۔ ہمارے رب کو پہلے ہی سے ہماری خطاؤں کا علم تھا۔ پھر آپ نے

---

[1] یعنی اگر شریعت ہی نے کسی کا مارنا جائز کر دیا ہو تو وہ اور بات ہے۔ مثلاً قاتل کو مارنا' زانی کو سنگسار کرنا' اس کی اجازت تو بہر حال شریعت سے ہے۔

[2] مطلب یہ ہے کہ رفتار و گفتار میں' قول میں اور عمل میں ہر بات میں قرآن مجید ہی کے احکام پر عمل کرتے ہو یا نہیں؟

نبھائے جائیں اور بھلائے نہ جائیں۔ لیکن میراث انہیں پہنچ سکتی۔ صحیح بخاری شریف میں حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ موالی سے مراد وارث ہیں اور بعد کے جملہ سے مراد یہ ہے کہ مہاجرین جب مدینہ شریف میں آئے تو یہ دستور تھا کہ ہر مہاجر اپنے انصاری بھائی کا وارث ہوتا۔ اس کے ذورحم رشتہ دار وارث نہ ہوتے۔ پس اس آیت نے اس طریقہ کو منسوخ کر دیا اور حکم ہوا کہ ان کی مدد کرو اور انہیں فائدہ پہنچاؤ۔ ان کی خیر خواہی کرو لیکن میراث انہیں نہیں پہنچتی ہاں وصیت کر جاؤ۔

قبل از اسلام میں یہ دستور تھا کہ دو شخصوں میں عہد و پیان ہو جاتا تھا۔ میں تیرا وارث اور تو میرا وارث۔ اسی طرح قبائل عرب عہد کر لیتے تھے۔ پس حضور علیہ اسلام نے فرمایا: جاہلیت کی قسمیں اور عہد و پیان کو اسلام اور مضبوط کرتا ہے[1]۔ لیکن اب اسلام میں قسمیں اور اس قسم کے عہد نہیں۔ اسے اس آیت نے منسوخ قرار دیا اور فرمایا: ذی رحم رشتہ دار کتاب اللہ کے حکم سے زیادہ اولی ہیں' بہ نسبت معاہدہ والوں کے۔ ایک روایت میں ہے کہ حضور ﷺ نے جاہلیت کی قسموں اور عہدوں کے بارے میں یہاں تک تاکید فرمائی کہ فرمایا: اگر مجھے سرخ اونٹ[2] دیئے جائیں اور اس قسم کے توڑنے کو کہا جائے جو دارلندوہ میں ہوئی تھی تو میں اسے بھی پسند نہیں۔ ابن جریر میں ہے' حضور ﷺ فرماتے ہیں: میں اپنے بچپن میں اپنے ماموؤں کے ساتھ حلف طیبین میں تھا۔ مجھے گو سرخ اونٹ ملیں۔ لیکن اس قسم کو توڑنا ہرگز پسند نہیں کرتا۔ پس یاد رہے کہ قریش و انصار میں جو تعلق رسول ﷺ نے قائم کیا تھا۔ وہ صرف اتحاد اور یگانگت پیدا کرنے کے لئے تھا۔ لوگوں کے سوال کے جواب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان روایت ہے کہ جاہلیت کے حلف نبھاؤ۔ اب اسلام میں کوئی حلف نہیں۔ فتح مکہ والے دن بھی آپ نے کھڑے ہو کر اپنے خطبہ میں اس بات کا اعلان کیا تھا۔ داؤد بن حصینؒ کہتے ہیں: میں حضرت اُم سعد بنت ربیع رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے قرآن پڑھتا تھا۔ میرے ساتھ ان کے پوتے موسیٰ بن سعد بھی پڑھ رہے تھے' جو حضرت ابوبکرؓ کی گود میں یتیمی کے ایام گزار رہے تھے۔ میں اِسی آیت عَاقَدَت کو پڑھا تو مجھے میری استانی جی نے روکا اور فرمایا عَقَدَت پڑھو۔ سنو یہ آیت حضرت ابوبکرؓ اور ان کے صاحبزادے حضرت عبدالرحمٰن کے بارے میں نازل ہوئی ہے' یہ پہلے اسلام کے منکر تھے۔ حضرت صدیق نے قسم کھائی کہ اسے وارث نہ کریں گے۔ بالآخر جب یہ مسلمانوں کی بے پناہ تلواروں سے اسلام لانے پر آمادہ ہوئے اور مسلمان ہو گئے تو جناب صدیقؓ کو حکم ہوا کہ انہیں ان کے ورثے کے حصے سے محروم نہ فرمائیں' لیکن یہ قول زیادہ مشہور نہیں ہے اور صحیح قول پہلا ہی ہے۔ الغرض اس آیت اور ان حدیثوں سے ان کا قول رد ہوتا ہے۔ جو قسم اور وعدوں کی بنا پر آج بھی ورثہ پہنچنے کے قائل ہیں۔ جیسے کہ امام ابوحنیفہؒ اور ان کے ساتھیوں کا خیال ہے اور امام احمد سے بھی ایک روایت اسی قسم کی ہے۔ لیکن صحیح مذہب جمہور کا ہے اور امام مالکؒ اور امام شافعیؒ کا ہے اور مشہور قول کی بنا پر امام احمد کا بھی[3]۔ پس آیت میں ارشاد ہے کہ ہر شخص کے وارث اس کے رشتہ دار ہیں اور کوئی نہیں۔

صحیحین میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: حصہ دار وارثوں کو ان کے حصوں کے مطابق دے کر پھر جو بچ رہے تو عصبہ کو ملے اور وارث وہ ہیں جن کا ذکر فرائض کی دو آیتوں میں ہے اور جن سے تم نے مضبوط عہد و پیان اور قسما قسمی کی

۱۔ بشرطیکہ وہ اسلام کی کسی تعلیم کے مخالف نہ ہوں۔

۲۔ سرخ اونٹ کی عرب میں بہت زیادہ قیمت تھی اور ان کو بڑا بیش قیمت جانور تصور کیا جاتا ہے۔

۳۔ اور اس قول کی تصویب ابن کثیر کو کرنا ہی چاہیے تھی کیونکہ وہ خود ان کا مذہب ہے۔
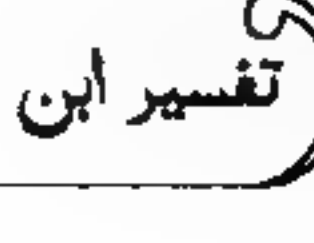
ہے یعنی اس آیت کے نازل ہونے سے پہلے انہیں ان کا حصہ دو یعنی میراث اور اس کے بعد جو حلف ہوا وہ تو ثیہ وار نہ تہی جائے گی اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ خواہ اس سے پہلے کے وعدے اور قسمیں ہوں' خواہ اس آیت کے اترنے کے بعد ہوں سب کا یہی حکم ہے کہ ایسے حلیفوں کو میراث نہ ملے گی اور بقول ابن عباسؓ ان کا حصہ نصرت' امداد' خیر خواہی اور وصیت ہے' میراث نہیں۔ آپ فرماتے ہیں: لوگ عہد و پیمان کر لیا کرتے تھے کہ ان میں سے جو پہلے مرے گا۔ بعد والا دوسرا اس کا وارث بنے گا۔ پس اللہ تبارک وتعالیٰ نے آیت: ﴿وَاُولُوا الْاَرْحَامِ﴾ (الانفال ۷۵) نازل فرما کر حکم دے دیا۔ کہ ذی رحم محرم ایک سے ایک اولیٰ ہے۔ ہاں اپنے دوستوں کے ساتھ سلوک کرو۔ یعنی ان کے لئے ثلث مال میں وصیت کر جاؤ تو جائز ہے۔ معروف ومشہور امر بھی یہی ہے اور بھی بہت سے سلف سے منقول ہے کہ یہ آیت منسوخ ہے اور ناسخ آیت: ﴿وَاُولُوا الْاَرْحَامِ﴾ (الاحزاب: ۶) والی ہے۔ حضرت سعید بن جبیر فرماتے ہیں: انہیں ان کا حصہ دو یعنی میراث۔ حضرت ابوبکرؓ نے ایک صاحب کو اپنا مولیٰ بنایا تھا' تو انہیں وارث کیا۔ ابن المسیب فرماتے ہیں یہ آیت ان لوگوں کے لئے اتری ہے جو اپنے بیٹوں کے سوا اوروں کو اپنا بیٹا بناتے ہیں اور انہیں اپنی جائیداد جائز وارث قرار دیتے تھے۔ پس اللہ تعالیٰ نے ان کا حصہ وصیت میں سے دینے کو فرمایا اور میراث کو موالی یعنی ذی رحم محرم رشتہ داروں کی اور عصبہ کی طرف لوٹا دیا اور اس سے منع فرمایا اور سے ناپسند فرمایا کہ صرف زبانی دعووں اور منہ بولے بیٹوں کو ورثہ دیا جائے' ہاں ان کے لئے وصیت میں سے دینے کے لئے فرمایا۔ امام ابن جریرؒ فرماتے ہیں: میرے نزدیک مختار قول یہ ہے کہ انہیں حصہ دو یعنی نصرت' نصیحت اور معونت کا۔ یہ نہیں کہ انہیں ان کے ورثہ کا حصہ دو۔ تو یہ معنی کرنے سے پھر آیت کو منسوخ بتلانے کی کوئی وجہ باقی نہیں رہتی نہ یہ کہنا پڑتا ہے کہ یہ حکم پہلے تھا' اب نہیں رہا۔ بلکہ آیت کی دلالت صرف اسی امر پر ہے کہ جو عہد و پیمان آپس کی امداد و اعانت' خیر خواہی اور بھلائی کے ہوتے ہیں' انہیں وفا کرو۔ پس یہ آیت محکم اور غیر منسوخ ہے۔ لیکن امام صاحب کے اس قول میں ذرا نظر ہے۔ اس لئے کہ اس میں تو شک نہیں کہ بعض عہد و پیمان صرف نصرت و امداد کے ہی ہوتے تھے۔ لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ بعض عہد و پیمان ورثے کے ہوتے تھے۔ جیسے کہ بہت سے سلف صالحین سے مروی ہے اور جیسا کہ ابن عباسؓ کی تفسیر بھی گزری ہے۔ جس میں انہوں نے صاف فرمایا ہے کہ مہاجر' انصاری کا وارث ہوتا تھا اس کے قرابتی لوگ وارث نہیں ہوتے تھے نہ ذی رحم رشتہ دار وارث ہوتے تھے۔ یہاں تک کہ یہ منسوخ ہو گیا۔ پھر امام صاحب کیسے فرما سکتے ہیں کہ یہ آیت محکم اور غیر منسوخ ہے۔ واللہ اعلم۔

اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ ؕ فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ ؕ وَالّٰتِيْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ وَاهْجُرُوْهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ ۚ فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَيْهِنَّ سَبِيْلًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ

ہیں کبائر سات ہیں: بے وجہ کسی کو مار ڈالنا' زنا لواطت' شراب نوشی' چوری غصب' تہمت اور ایک آٹھویں چیز بھی دوسری روایت میں ہے یعنی جھوٹی گواہی اور اسی کے ساتھ یہ بھی شامل کئے گئے ہیں۔ سود خواری' رمضان کے روزے کا بلا عذر ترک کرنا' جھوٹی قسم' قطع رحمی' ماں باپ کی نافرمانی' جہاد سے بھاگنا' مال یتیم کا کھا جانا' ناپ تول میں خیانت کرنا' نماز وقت سے پہلے بلا عذر وقت گزار کر ادا کرنا' مسلمان کو بلاوجہ مارنا' رسول اللہ ﷺ پر جان کر جھوٹ باندھنا' آپ ﷺ کے صحابیوں کو گالی دینا' بے سبب گواہی چھپانا' رشوت لینا' میاں بیوی میں ناچاقی کرا دینا' بادشاہ کے پاس چغل خوری کرنا' زکوٰۃ روک لینا' باوجود قدرت کے بھلی باتوں کا حکم نہ کرنا' بری باتوں سے نہ روکنا' قرآن سیکھ کر بھول جانا' جاندار چیز کو آگ سے جلانا' عورت کا اپنے خاوند کے پاس بے سبب نہ آنا' رب کی رحمت سے ناامید ہو جانا' اللہ کی گرفت سے بے خوف ہو جانا' اہل علم اور حاملان قرآن کی برائیاں کرنا' ظہار کرنا' سور کا گوشت کھانا' مردار کھانا' ہاں اگر بوجہ ضرورت اور اضطرار کے کھایا ہو تو اور بات ہے۔ امام رافعی فرماتے ہیں: ان میں بعض میں توقف کی گنجائش ہے۔ کبائر کے بارے میں بزرگان دین نے بہت سی کتابیں بھی تصنیف کی ہیں۔ ہمارے شیخ حافظ ابو عبداللہ ذہبیؒ نے بھی ایک کتاب لکھی ہے۔ جس میں سترہ کبیرہ گناہ گنوائے ہیں اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ کبیرہ گناہ وہ ہے جس پر شارع علیہ السلام نے جہنم کی وعید سنائی ہے اس قسم کے گناہ ہی اگر گنے جائیں تو بہت نکلیں گے اور اگر کبیرہ گناہ ہر اس کام کو کہا جائے' جس سے شارع علیہ السلام نے روک دیا ہے تو بہت ہی ہو جائیں گے۔ واللہ اعلم۔

وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ ؕ لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا ؕ وَلِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ ؕ وَسْئَلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا ﴿۳۲﴾

اور تم ایسے کسی امر کی تمنا مت کیا کرو جس میں اللہ تعالیٰ نے بعضوں کو بعضوں پر فوقیت بخشی ہے۔ مردوں کے لئے ان کے اعمال کا حصہ ثابت ہے اور عورتوں کے لئے ان کے اعمال کا حصہ ثابت ہے اور اللہ تعالیٰ سے اس کے فضل کی درخواست کیا کرو۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کو خوب جانتے ہیں۔ ○

حکیمانہ فیصلے ☆

حضرت ام سلمہؓ نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ یا رسول اللہ ﷺ مرد جہاد کرتے ہیں اور ہم عورتیں اس ثواب سے محروم ہیں۔ اسی طرح میراث میں بھی ہمیں بہ نسبت مردوں کے آدھا ملتا ہے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ (ترمذی) اور روایت میں ہے کہ اس کے بعد پھر آیت اِنِّیْ لَآ اُضِیْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْکُمْ مِّنْ ذَکَرٍ اَوْ اُنْثٰی (آل عمران ۱۹۵) اور روایت میں ہے عورتوں نے یہ آرزو کی تھی کہ کاش ہم بھی مرد ہوتے تو جہاد میں جاتے اور روایت میں ہے کہ ایک عورت نے خدمت نبوی ﷺ میں حاضر ہو کر کہا تھا کہ دیکھئے مرد کو دو عورتوں کے برابر حصہ ملتا ہے۔ دو عورتوں کی شہادت مثل ایک مرد کے سمجھی جاتی ہے۔ پھر

[1] مطلب یہ ہے کہ خاوند اپنی عورت کو ہم بستری کے لیے کہے اور وہ کسی عذر کے بغیر اس سے انکار کر دے۔ اگر عذر ہو مثلاً حیض آ رہا ہو' طبیعت خراب ہو تو پھر اس میں کوئی حرج نہیں۔

عمل میں اس طرح ہیں کہ ایک نیکی کی آدھی رہ جاتی ہے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ سدی فرماتے ہیں مردوں نے یہ
کہ جب دوہرے حصے کے مالک ہم ہیں تو دوہرا اجر بھی ہمیں کیوں نہ ملے اور عورتوں نے درخواست کی تھی کہ جب ہم پر
فرض ہی نہیں اور ہم نہیں کرتے تو شہادت کا ثواب ہمیں کیوں نہ ملے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے دونوں کو روکا اور حکم دیا کہ میرا فضل
طلب کرتے رہو۔ حضرت ابن عباسؓ سے یہ مطلب بیان کیا گیا کہ انسان یہ آرزو نہ کرے کہ کاش فلاں کا مال اور ... میرا
ہوتا۔ اس پر اس حدیث سے کوئی اشکال ثابت نہیں ہو سکتا۔ جس میں ہے کہ حسد کے قابل صرف دو ہیں ایک مالدار جو ...
میں اپنا مال لٹاتا ہے اور دوسرا کہتا ہے کاش میرے پاس بھی مال ہوتا تو میں بھی اسی طرح فی سبیل اللہ خرچ کرتا رہتا۔ پس یہ
دونوں اللہ کے نزدیک اجر میں برابر ہیں۔ اس لئے کہ یہ ممنوع نہیں۔ یعنی ایسی نیکی کی حرص بری نہیں۔ یہاں اس جیسے چیز
اس جیسے نیک کام کے کرنے کی غرض سے حاصل ہونے کی تمنا ہے جو محمود ہے اور وہاں دوسرے کی اپنی چیز پر قبضہ کرنے کی
نیت ہے جو ہر طرح مذموم ہے۔ پس دینی اور دنیوی فضیلت کی تمنا اس طرح منع ہے پھر فرمایا ہر ایک کو اس کے عمل کا بدلہ ملے
گا۔ خیر کے بدلے خیر اور شر کے بدلے شر اور یہ بھی مطلب ہو سکتا ہے کہ ہر ایک کو اس کے حق کے مطابق ثواب دیا جاتا ہے۔

پھر ارشاد ہوتا ہے کہ ہم سے ہمارا فضل مانگتے رہو آپس میں ایک دوسرے کی فضیلت کی تمنا بے سود ہے۔ ہاں مجھ سے
میرا فضل طلب کرو تو میں بخیل نہیں کریم ہوں وہاب ہوں دوں گا اور بہت کچھ دوں گا۔ جناب رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں
لوگو! اللہ تعالیٰ سے اس کا فضل طلب کرو۔ اللہ تعالیٰ سے مانگنا اللہ تعالیٰ کو بہت پسند ہے۔ یاد رکھو سب سے اعلیٰ عبادت کشادگی
اور وسعت رحمت کا انتظار کرنا اور اس کی امید رکھنا ہے اور روایت میں ہے ایسی امید رکھنے والے اللہ کو بہت بھاتے ہیں۔ اللہ
علیم ہے اسے غیب معلوم ہے کہ کس کو دینا چاہئے اور کس کو غریب ہی رکھنا بہتر ہے اور کون آخرت کی نعمتوں کا مستحق ہے اور کون
وہاں کی رسوائیوں کا سزاوار ہے اس کے اسباب اور اسے اس کے وسائل وہ مہیا اور آسان کر دیتا ہے۔

وَلِكُلٍّ جَعَلْنَا مَوَالِيَ مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ ۭ وَالَّذِيْنَ عَقَدَتْ اَيْمَانُكُمْ فَاٰتُوْهُمْ نَصِيْبَهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدًا ۝ ع

اور ہر ایسے مال کے لئے جس کو والدین اور رشتہ دار چھوڑ دیں ہم نے وارث مقرر کر دیئے ہیں اور جن لوگوں سے
تمہارے عہد بندھے ہوئے ہیں ان کو ان کا حصہ دے دو۔ بے شک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر مطلع ہیں۔ ○

میراث کے بعض احکام ☆

بہت سے مفسرین سے روایت ہے کہ موالی سے مراد وارث ہیں۔ بعض کہتے ہیں عصبہ مراد ہیں۔ چچا کی اولاد کو بھی مولیٰ
کہا جاتا ہے جیسے ابن عباس کے شعر میں ہے۔ مطلب آیت کا یہ ہوا کہ اے لوگو! تم میں سے ہر ایک کے لئے ہم نے عصبہ بنا
دیئے ہیں۔ جو اس مال کے وارث ہوں گے جسے ان کے ماں باپ اور قرابت دار چھوڑ مریں اور تمہارے جو منہ بولے بھائی
ہیں قسمیں کھا کر جن کے تم بھائی بنے ہو اور وہ تمہارے بھائی بنے ہیں۔ انہیں ان کی میراث کا حصہ دو۔ جیسے کہ قسموں کے
وقت تم میں عہد و پیمان ہو چکا تھا۔ یہ حکم ابتدائے اسلام میں تھا۔ پھر منسوخ ہو گیا اور حکم ہوا کہ جن سے عہد و پیمان ہوئے ہیں وہ

آیت: اِن تَجتَنِبُوا کی تلاوت کی۔ پھر فرمایا: کیا اہل مدینہ کو تمہارے آنے کا یہ سبب معلوم ہے۔ انہوں نے کہا: نہیں۔ فرمایا: اگر انہیں بھی اس کا علم ہوتا تو مجھے اس بارے میں انہیں بھی وعظ کہنا پڑتا۔ اس کی اسناد حسن ہے اور متن بھی حسن ہے۔ گو یہ روایت حسن کی حضرت عمرؓ سے ہے۔ جس میں انقطاع ہے۔ لیکن اتنے سے نقصان کو اس کی پوری شہرت کافی ہے۔ ابن ابی حاتم میں ہے۔ حضرت علیؓ فرماتے ہیں کبیرہ گناہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک کرنا۔ کسی کو مار ڈالنا۔ یتیم کا مال کھانا' پاک دامن عورتوں کو تہمت لگانا' لڑائی سے بھاگ جانا' ہجرت کے بعد دارالکفر میں قیام کر لینا' جادو کرنا' ماں باپ کی نافرمانی کرنا' سود کھانا' جماعت سے جدا ہونا[1] خرید و فروخت توڑ دینا۔ پہلے گزر چکا ہے کہ حضرت ابن مسعودؓ فرماتے ہیں: بڑے سے بڑا گناہ اللہ کے ساتھ کرنا ہے اور اللہ کی رحمت سے مایوس ہونا ہے اور اللہ عزوجل کی گرفت سے بے خوف ہونا ہے۔

ابن جریر میں آپ ہی سے روایت ہے کہ سورہ نساء کے شروع سے لے کر تیس آیتوں تک کبیرہ گناہ کا بیان ہے۔ پھر آپ نے آیت: ﴿اِنْ تَجتَنِبُوا﴾ کی تلاوت کی۔ حضرت بریدہؓ فرماتی ہیں: کبیرہ گناہ اللہ کے ساتھ شرک کرنا' ماں باپ کو ناخوش کرنا' پانی کو حاجت مندوں سے روک رکھنا' اپنے پاس کے نر جانور کو کسی کی مادہ کے لئے بغیر کچھ لئے نہ دینا ہیں[2] صحیحین کی ایک مرفوع حدیث میں ہے: بچا ہوا پانی نہ روکا جائے اور نہ بچی ہوئی گھاس روکی جائے اور روایت میں ہے: تین قسم کے گناہ گاروں کی طرف قیامت کے دن اللہ تعالیٰ نظر رحمت نہ دیکھے گا اور نہ انہیں پاک کرے گا۔ بلکہ ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔ ایک شخص جو جنگل میں بچے ہوئے پانی پر قبضہ کر کے مسافروں کو اس سے روکے۔ مسند احمد میں ہے جو شخص زائد پانی کو اور زائد گھاس کو روک رکھے' اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس پر اپنا فضل نہیں کرے گا۔ حضرت عائشہ فرماتی ہیں: کبیرہ گناہ دو ہیں جو عورتوں سے بیعت لینے کے ذکر میں بیان ہوئے یعنی آیت: ﴿عَلٰٓی اَنْ لَّا یُشْرِکْنَ بِاللّٰهِ شَیْـًٔا﴾ (الممتحنہ:۱۲) میں انس بن مالکؓ اس آیت کو اللہ کے عظیم الشان احسانوں میں بیان فرماتے ہیں اور اس پر بڑی خوشنودی کا اظہار فرماتے ہیں۔

یعنی آیت اِن تَجتَنِبُوا کو ایک مرتبہ حضرت ابن عباسؓ کے سامنے لوگوں نے کہا: کبیرہ گناہ سات ہیں۔ آپ نے کئی کئی مرتبہ فرمایا کہ ہاں سات ہیں۔ دوسری روایت میں ہے سات ہلکا درجہ ہیں ورنہ ستر ہیں۔ ایک شخص کے اس کہنے پر آپ نے فرمایا: وہ سات سو تک ہیں اور سات تو بہت ہی قریب ہیں' ہاں یہ یاد رکھو کہ استغفار کے بعد کبیرہ کبیرہ نہیں رہتا اور اصرار سے صغیرہ صغیرہ نہیں رہتا[3] اور سند سے ہے کہ آپ نے فرمایا: جس گناہ پر جہنم کی وعید ہے یا غضب اللہ کی یا لعنت کی یا عذاب کی' وہ کبیرہ ہے اور روایت میں ہے: جس سے اللہ منع فرما دے وہ کبیرہ ہے۔ جس کام میں اللہ عزوجل کی نافرمانی ہو وہ بڑا گناہ ہے۔

تابعین کے اقوال بھی ملاحظہ ہوں۔

عبیدہؒ فرماتے ہیں: کبیرہ گناہ یہ ہیں۔ اللہ کے ساتھ شرک' قتل نفس بغیر حق میدان جہاد میں پیٹھ دکھانا' یتیم کا مال کھانا' سود خواری' بہتان بازی' ہجرت کے بعد وطن دوستی' راوی حدیث ابن عون نے اپنے استاد محمد سے پوچھا: کیا جادو کبیرہ گناہ میں نہیں؟ فرمایا: یہ بہتان میں آ گیا۔ یہ لفظ بہت سی برائیوں کو شامل ہیں۔ حضرت عبید بن عمیر نے کبیرہ گناہوں پر آیات

---

[1] یعنی مسلمانوں کی اکثریت جس کو حق سمجھ کر اس پر قائم ہو گئی اس سے انحراف کرنا۔

[2] عرب جاہلیت میں رواج تھا کہ نر جانور پالتے' اگر کوئی شخص مادہ لے کر آتا تو اُجرت لے کر اس کی مادہ جانور سے جفتی کراتے۔ حدیث میں اس کی ممانعت ہے۔ انظر شاہ۔

[3] چھوٹے گناہوں پر اصرار اور ان کو چھوڑنے کے بجائے برابر کرتے رہو تو یہ کبیرہ بن جاتا ہے۔

قرآنی بھی تلاوت کر کے سنائیں۔ شرک پر ﴿وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَكَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ﴾ (الحج:۳۱) یعنی اللہ کے ساتھ شرک کرے گویا آسمان سے گر پڑا۔ پس اسے پرند لپک لے جائیں گے۔ یا ہوا کسی دور دراز نامعلوم اور بدترین جگہ میں پھینک دے گی۔ یتیم کے مال پر ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْيَتٰمٰى ظُلْمًا﴾ (النساء:۱۰) یعنی جو لوگ ظلم سے یتیموں کا مال کھاتے ہیں۔ وہ اپنے پیٹ میں جہنم کے انگارے بھرتے ہیں۔ سود خواری پر ﴿اَلَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا﴾ (البقرۃ:۲۷۵) یعنی جو لوگ سود خواری کرتے ہیں وہ قیامت کے دن مخبوط الحواس اور پاگل بن کر کھڑے ہوں گے۔ بہتان پر ﴿وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ﴾ (النور:۴) جو لوگ پاک دامن بھولی با ایمان عورتوں پر تہمت لگائیں میدان جنگ سے بھاگنے پر ﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا زَحْفًا﴾ (الانفال:۱۵) ایمان والو جب کافروں سے تمہاری مدبھیڑ ہو جائے تو پیٹھ نہ دکھاؤ۔ ہجرت کے بعد کفرستان میں قیام کرنے پر ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ ارْتَدُّوْا عَلٰۤى اَدْبَارِهِمْ﴾ الخ (محمد:۲۵) یعنی جو لوگ ہدایت کے بعد مرتد ہو جائیں۔ قتل مومن پر ﴿وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خَالِدًا فِيْهَا﴾ (النساء:۹۳) یعنی جو شخص مسلمان کو جان بوجھ کر مار ڈالے اس کی سزا جہنم ابدی داخلہ ہے۔ حضرت عطاء سے بھی کبیرہ گناہوں کا بیان مروی ہے اور اس میں جھوٹی گواہی ہے۔ حضرت مغیرہؒ فرماتے ہیں: یہ کہا جاتا تھا کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو برا کہنا کبیرہ گناہ ہے۔ میں کہتا ہوں علماء کی ایک جماعت نے اسے کافر کہا ہے جو صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کو برا کہے۔

حضرت امام بن انسؒ سے یہ منقول ہے۔ امام محمد بن سیرینؒ فرماتے ہیں: میں یہ باور نہیں کر سکتا کہ کسی کے دل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت ہو اور وہ حضرت ابوبکر صدیقؓ سے دشمنی رکھے۔ (ترمذی) حضرت زید بن اسلمؒ اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں کبائر یہ ہیں: اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کرنا، اللہ تعالیٰ کی آیتوں اور اس کے رسولوں سے کفر کرنا، جادو کرنا، اولاد کو مار ڈالنا، اللہ تعالیٰ کی اولاد اور بیوی بتانا اور اسی جیسے وہ اعمال اور اقوال ہیں جن کے بعد کوئی نیکی قبول نہیں ہوتی۔ ہاں ایسے گناہ ہیں جن کے ساتھ دین رہ سکتا ہے اور عمل قبول کیا جا سکتا ہے۔ ایسے گناہوں کو نیکی کے بدلے اللہ عزوجل معاف فرماتا ہے۔ حضرت قتادہؒ فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ نے مغفرت کا وعدہ ان سے کیا ہے جو کبیرہ گناہوں سے بچیں اور ہم سے یہ بھی ذکر کیا گیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: کبیرہ گناہوں سے بچو، ٹھیک ٹھاک اور درست رہو اور خوشخبری سنو۔ مسند عبدالرزاق میں بہ سند صحیح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میری شفاعت میری اُمت کے کبیرہ گناہ کرنے والوں کے لئے بھی ہے۔ امام ترمذیؒ بھی اسے حسن صحیح فرماتے ہیں۔ گو اس روایت کی اور سندیں ضعف سے خالی نہیں مگر اس کے جو شواہد ہیں ان میں بھی صحیح روایات ہیں۔ مثلاً ایک حدیث میں ہے: کیا تم یہ جانتے ہو کہ میری شفاعت صرف متقیوں اور مؤمنوں کے لئے ہی ہے؟ نہیں نہیں بلکہ خطا کاروں اور گناہوں میں آلودہ لوگوں کے لئے بھی ہے۔

اب علمائے کرام کے قول سنئے جن میں یہ بتایا گیا ہے کہ کبیرہ گناہ کسے کہتے ہیں۔ بعض تو کہتے ہیں کبیرہ وہ ہے جس پر حد شرعی ہو۔ بعض کہتے ہیں: جس پر قرآن میں یا حدیث میں کسی سزا کا ذکر ہو۔ بعض کا قول ہے: جس سے دینداری کم ہوتی ہو اور دیانتداری میں کمی واقع ہوتی ہو۔ قاضی ابوسعید ہرویؒ فرماتے ہیں: جس کا حرام ہونا لفظوں سے ثابت ہو اور جس کی نافرمانی پر کوئی حد ہو۔ جیسے قتل وغیرہ۔ اسی طرح ہر فریضہ کا ترک اور جھوٹی گواہی اور جھوٹی روایت اور جھوٹی قسم۔ قاضی رویانی فرماتے

عَلِيًّا كَبِيْرًا ﴿۳۴﴾

مرد حاکم ہیں عورتوں پر اس سبب سے کہ اللہ تعالیٰ نے بعضوں کو بعضوں پر فضیلت دی ہے اور اس سبب سے کہ مردوں نے اپنے مال خرچ کیے ہیں۔ سو جو عورتیں نیک ہیں اطاعت کرتی ہیں مرد کی عدم موجودگی میں بحفاظت الٰہی نگہداشت کرتی ہیں اور جو عورتیں ایسی ہوں کہ تم کو ان کی بدد ماغی کا احتمال ہو تو ان کو زبانی نصیحت کرو اور ان کو ان کے لیٹنے کی جگہ میں تم چھوڑ دو اور ان کو مارو۔ پھر اگر وہ تمہاری اطاعت کرنا شروع کر دیں تو ان پر بہانہ مت ڈھونڈ و بلاشبہ اللہ تعالیٰ بڑے رفعت اور عظمت والے ہیں۔ ○

مرد اور عورت کے حدود ☆

جناب باری ارشاد فرماتا ہے کہ مرد عورت کا حاکم رئیس اور سردار ہے۔ اسے درست اور ٹھیک ٹھاک رکھنے والا ہے۔ اس لئے کہ مرد عورتوں سے افضل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ نبوت مردوں میں رہی اور اسی طرح شرعی طور پر خلیفہ بھی مرد ہی بن سکتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: وہ لوگ کبھی نجات نہیں پا سکتے جو اپنا والی کسی عورت کو بنائیں۔ (بخاری) اسی طرح منصب قضا وغیرہ بھی صرف مردوں کے لائق ہی ہیں دوسری فضیلت کی یہ ہے کہ مرد عورتوں پر اپنا مال خرچ کرتے ہیں جو کتاب وسنت سے ان کے ذمہ ہے۔ مثلاً مہر میں' نان ونفقہ میں اور دیگر ضروریات کے کے پورا کرنے میں۔ پس مرد فی نفسہ افضل اور باعتبار نفع کے اور حاجت براری کے بھی اس کا درجہ بڑا ہے۔ پس اس کو عورت پر سردار بنایا گیا۔ جیسے اور جگہ فرمان ہے: ﴿وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ﴾ (البقرہ: ۲۲۸) ابن عباسؓ فرماتے ہیں مطلب یہ ہے کہ عورتوں کو مردوں کی اطاعت کرنی پڑے گی۔ اس کے بال بچوں کی نگہداشت۔ اس کے مال کی حفاظت وغیرہ اس کا کام ہے۔ حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں۔ ایک عورت نے نبی ﷺ کے سامنے اپنے خاوند کی شکایت کی کہ اس نے اسے تھپڑ مارا ہے۔ پس آپ نے بدلہ لینے کا حکم دیا ہی تھا' تو یہ آیت اتری اور بدلہ نہ دلوایا ایک روایت میں ہے کہ ایک انصاریؓ اپنی بیوی صاحبہ کو لئے ہوئے حاضر خدمت ہوئے۔ اس عورت نے حضور ﷺ سے عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ! میرے اس خاوند نے مجھے تھپڑ مارا۔ جس کا نشان اب تک میرے چہرے پر موجود ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اسے حق نہ تھا۔ وہیں یہ آیت اتری کہ ادب سکھانے کے لئے مرد عورتوں پر حاکم ہیں۔ تو آپ نے فرمایا: میں نے اور چاہا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اور چاہا۔ شعبیؒ فرماتے ہیں مال خرچ کرنے سے مراد مہر کا ادا کرنا ہے۔ دیکھو اگر مرد عورت پر زنا کی تہمت لگائے تو لعان کا حکم ہے اور اگر عورت اپنے مرد کی نسبت یہ بات کہے اور ثابت نہ کر سکے تو اسے کوڑے لگیں گے۔ پس عورتوں میں نیک نفس وہ ہیں جو اپنے خاوند کی اطاعت گزار ہوں۔ اپنے خاوند کے مال اور اپنے نفس کی حفاظت کرنے والیاں ہوں۔ جسے خود اللہ تعالیٰ نے محفوظ رکھنے کا حکم دیا ہے۔ رسول اللہ فرماتے ہیں بہتر عورت وہ ہے کہ جب اس کا خاوند اس کی طرف دیکھے وہ اسے خوش کر دے اور جب حکم دے بجالائے اور جب کہیں باہر جائے تو اپنے نفس کو برائی سے محفوظ رکھے اور اپنے خاوند کے مال کی محافظت کرے۔ پھر آپ ﷺ نے اس آیت کی تلاوت فرمائی۔

مسند احمد میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: جب کوئی عورت پانچوں وقت کی نماز ادا کرے' رمضان کے روزے رکھے۔ اپنی شرم گاہ کی حفاظت کرے۔ اپنے خاوند کی فرمانبرداری کرے' اس سے کہا جائے گا کہ جنت کے جس دروازے سے چاہے جنت میں چلی جا۔ پھر فرمایا: جن عورتوں کی سرکشی سے تم ڈرو۔ یعنی جو تم سے بلند ہونا چاہتی ہوں' نافرمانی کرتی ہوں' بے

پروائی برتتی ہوں، دشمنی رکھتی ہوں تو پہلے اسے زبانی نصیحت کرو۔ ہر طرح سمجھاؤ بجھاؤ۔ اللہ کا خوف دلاؤ۔ حقوق زوجیت یاد دلاؤ۔ اس سے کہو کہ دیکھو خاوند کے اتنے حقوق ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: اگر میں کسی کو حکم کرسکتا کہ وہ ماسوائے اللہ تعالیٰ کے دوسرے کو سجدہ کرے تو عورت کو حکم کرتا کہ وہ اپنے خاوند کو سجدہ کرے۔ کیونکہ سب سے بڑا حق اس پر اسی کا ہے۔ بخاری شریف میں ہے کہ جب کوئی شخص اپنی بیوی کو اپنے بستر پر بلائے (ہم بستری کے لیے) اور وہ انکار کردے تو صبح تک فرشتے اس پر لعنت بھیجتے رہتے ہیں۔ صحیح مسلم میں ہے کہ جس رات کو کوئی عورت روٹھنے کی وجہ سے اپنے خاوند کے بلانے پر ہم بستری کے لئے نہ آئے، تو صبح تک اللہ کی رحمت کے فرشتے اس پر لعنت بھیجتے رہتے ہیں۔ تو یہاں ارشاد فرماتا ہے کہ ایسی نافرمان عورتوں کو پہلے تو سمجھاؤ بجھاؤ۔ پھر بستر سے الگ کرو[1]۔ ابن عباسؓ فرماتے ہیں: یعنی سلائے تو بستر ہی پر، مگر خود اس سے کروٹ منہ موڑ لے اور مجامعت نہ کرے۔ بات چیت اور کلام ترک کرسکتا ہے اور یہ عورت کی بڑی بھاری سزا ہے۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ ساتھ سلانا ہی چھوڑ دے۔ حضور علیہ السلام سے سوال ہوتا ہے کہ عورت کا حق اس کے میاں پر کیا ہے؟ فرمایا: یہ کہ جب تم کھاؤ تو اسے کھلاؤ، جب تم پہنو تو اسے بھی پہناؤ، اس کے منہ پر نہ مارو، گالیاں نہ دو اور گھر سے الگ نہ کرو۔ غصہ میں اگر تم اس سے بطور سزا بات چیت ترک کردو تو بھی اسے گھر سے نہ نکالو۔ پھر فرمایا: اس سے بھی اگر ٹھیک ٹھاک نہ ہو تو تمہیں اجازت ہے کہ معمولی سی ڈانٹ ڈپٹ اور مار پیٹ سے بھی راہ راست پر لاؤ۔ صحیح مسلم میں ہے کہ نبی ﷺ کے حجۃ الوداع کے خطبہ میں ہے کہ عورتوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہا کرو۔ وہ تمہاری خدمت گزار اور ماتحت گزار ہیں۔ تمہارا حق ان پر یہ ہے کہ جس کے آنے جانے سے تم خفا ہوا سے نہ آنے دیں۔ اگر وہ ایسا نہ کریں تو انہیں معمولی سی تنبیہ کرسکتے ہو۔ لیکن سخت مار نہیں مار سکتے۔ تم پر اس کا حق ہے کہ انہیں کھلاتے پلاتے اور پہناتے اوڑھاتے رہو۔ پس ایسی مار نہ مارنی چاہئے جس کا نشان باقی رہے۔ جس سے کوئی عضو ٹوٹ جائے یا کوئی زخم آئے۔

حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ اس پر بھی اگر وہ باز نہ آئے تو فدیہ لے لو اور طلاق دے دو۔ ایک حدیث میں ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: اللہ کی لونڈیوں کو مارو نہیں۔ اس کے بعد ایک مرتبہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ آئے اور عرض کرنے لگے: یارسول اللہ ﷺ! عورتیں آپ کے اس حکم کو سن کر اپنے مردوں پر دلیر ہوگئیں۔ اس پر حضور ﷺ نے انہیں مارنے کی اجازت دی۔ اب مردوں کی طرف سے مار پیٹ شروع ہوئی اور بہت سے عورتیں شکایت لے کر آنحضرت ﷺ کے پاس آئیں۔ تو آپ نے لوگوں سے کہا: سنو! میرے پاس عورتوں کی فریاد پہنچی۔ یاد رکھو! تم میں سے جو اپنی عورتوں کو مارتے ہیں وہ اچھے آدمی نہیں۔ (ابوداؤد وغیرہ) حضرت شعثؓ فرماتے ہیں: ایک مرتبہ میں حضرت فاروق اعظم کا مہمان ہوا۔ اتفاقاً اس روز میاں بیوی میں کچھ ناچاقی ہوگئی اور حضرت عمرؓ نے اپنی بیوی صاحبہ کو مارا۔ پھر مجھ سے کہنے لگے۔ اشعث تین باتیں یاد رکھنا جو میں نے آنحضرت ﷺ سے سن کر یاد رکھی ہیں۔ ایک تو یہ کہ کسی سے یہ نہ پوچھا جائے گا کہ اُس نے اپنی عورت کو کس بنا پر مارا (سرزنش کی) ہے۔ دوسری یہ کہ وتر پڑھے بغیر سونا مت اور تیسری بات راوی کے ذہن سے نکل گئی (نسائی) پھر فرمایا: اگر اب عورتیں تمہاری فرمانبردار بن جائیں تو ان پر کسی قسم کی سختی نہ کرو، نہ مارو نہ پیٹو، نہ بیزاری کا اظہار کرو۔ اللہ بلندیوں اور بڑائیوں والا ہے یعنی اگر عورتوں کی طرف سے قصور سرزد ہوئے بغیر یا قصور کے بعد ٹھیک ہوجانے کے باوجود بھی تم نے انہیں ستایا تو یاد رکھو کہ ان کی مدد پر

[1] مطلب یہ ہے کہ تنبیہاً کچھ دن کے لیے ان سے جماع (ہم بستری) چھوڑ دو۔

اوران کا انتقام لینے پر خود اللہ تعالیٰ موجود ہے اور یقیناً وہ بہت زور آور اور زبردست ہے۔

وَاِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَابْعَثُوْا حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَ حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا ۚ اِنْ يُّرِيْدَآ اِصْلَاحًا يُّوَفِّقِ اللّٰهُ بَيْنَهُمَا ۗ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا خَبِيْرًا ﴿۳۵﴾

اور اگر تم اوپر والوں کو ان دونوں میاں بیوی میں کشاکش کا اندیشہ ہو تو تم لوگ ایک آدمی جو تصفیہ کرنے کی لیاقت رکھتا ہو مرد کے خاندان سے اور ایک آدمی جو تصفیہ کرنے کا لیاقت رکھتا ہو عورت کے خاندان سے بھیجو۔ اگر دونوں آدمیوں کو اصلاح منظور ہوگی تو اللہ تعالیٰ ان میاں بی بی کے درمیان اتفاق فرما دیں گے۔ بیشک اللہ تعالیٰ بڑے علم اور بڑے خبر والے ہیں۔ ○

مصالحت کی کوشش ☆

اوپر اس صورت کو بیان فرمایا کہ نافرمانی اور کجی عورتوں کی جانب سے ہو۔ اب یہاں اس صورت کا بیان ہو رہا ہے کہ اگر دونوں ایک دوسرے سے نالاں ہوں تو کیا کیا جائے؟ پس علمائے کرام فرماتے ہیں کہ ایسی حالت میں حاکم ثقہ اور سمجھ دار کو مقرر کرے جو یہ دیکھے کہ ظلم اور زیادتی کس طرف سے ہے۔ پس ظالم کو ظلم سے روکا جائے۔ اگر اس پر بھی کوئی بہتری کی صورت نہ نکلے تو عورت والوں میں سے ایک اس کی طرف سے اور مرد والوں میں سے ایک بہتر شخص اس کی جانب سے منصف مقرر کر دے اور یہ دونوں مل کر تحقیقات کریں اور جس امر میں مصلحت سمجھیں اس کا فیصلہ کر دیں۔ یعنی خواہ الگ کرا دیں خواہ ملاپ کرا دیں۔ لیکن شارع نے تو اس امر کی ترغیب دی ہے کہ جہاں تک ہو سکے کوشش کریں کہ کوئی شکل نباہ کی نکل آئے۔ اگر دونوں کی تحقیق میں خاوند کی طرف سے بُرائی ثابت ہو تو یہ اس کی عورت کو اس سے روک لیں اور اسے مجبور کریں گے کہ اپنی عادت ٹھیک ہونے تک اس سے الگ رہے اور اس کے خرچ اخراجات ادا کرتا رہے اور اگر شرارت عورت کی طرف سے ثابت ہو تو اسے نان نفقہ نہیں دلائیں گے اور خاوند سے ہنسی خوشی بسر کرنے پر مجبور کریں گے۔ اسی طرح اگر وہ طلاق کا فیصلہ دیں' تو خاوند کو طلاق دینی پڑے گی۔ اگر وہ آپس میں رہنے کا فیصلہ کریں تو بھی انہیں ماننا پڑے گا۔ بلکہ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں: اگر دونوں پنچ اس پر متفق ہو گئے کہ انہیں رضامندی کے ساتھ ایک دوسرے سے اپنے تعلقات نباہنے چاہئیں اور اس فیصلہ کو ایک نے منظور کر لیا اور دوسرا نہیں کرتا اور اسی حالت میں ایک کا انتقال ہو گیا تو جو راضی تھا وہ اس کا وارث بنے گا جو ناراض تھا۔ لیکن جو ناراض تھا' اسے اس کا ورثہ نہیں ملے گا' جو راضی تھا۔ (ابن جریر) ایک ایسے ہی جھگڑے میں حضرت عثمانؓ نے حضرت ابن عباسؓ اور حضرت معاویہؓ کو حکم مقرر کیا تھا۔ اگر تم ان میں میل کرانا چاہو تو میل ہو گا اور اگر جدائی کرنا چاہو تو جدائی ہو جائے گی۔ ایک روایت میں ہے کہ عقیل بن ابی طالب نے فاطمہ بنت عقبہ بن ربیعہ سے نکاح کیا۔ تو اس نے کہا: تو میرے پاس آئے گا اور میں ہی تیرا خرچ بھی برداشت کروں گی۔ اب یہ ہونے لگا کہ جب عقیل ان کے پاس آنا چاہے تو وہ پوچھتی عقبہ بن ربیعہ اور شیبہ بن ربیعہ کہاں ہیں؟ یہ فرماتے: تیرے بائیں جانب جہنم میں۔ اس پر وہ بگڑ کہ اپنے کپڑے ٹھیک کر لیتیں ایک

مرتبہ یہ حضرت عثمانؓ کے پاس آئیں اور یہ واقعہ بیان کیا۔ خلیفۃ المسلمین اس پر ہنسے اور حضرت ابن عباسؓ اور حضرت معاویہ کو ان کا پنچ مقرر کیا۔ حضرت ابن عباس تو فرماتے تھے ان دونوں میں علیحدگی کرادی جائے۔ لیکن حضرت معاویہ فرماتے تھے بنو عبد مناف میں یہ تفریق میں ناپسند کرتا ہوں اب یہ دونوں حضرات عقیلؓ کے گھر پہنچے۔ دیکھا دروازہ بند ہے اور دونوں میاں بیوی اندر ہیں۔ یہ دونوں لوٹ گئے۔

مسند عبدالرزاق میں ہے کہ حضرت علیؓ کی خلافت کے زمانہ میں ایک میاں بیوی اپنی ناچاقی کا جھگڑا لے کر آئے۔ اس کے ساتھ ان کی برادری کے لوگ تھے اور اس کے ہمراہ اس کے گھرانے کے۔ حضرت علیؓ نے دونوں میں سے ایک ایک کو چنا اور اسے حکم مقرر کیا۔ پھر دونوں پنچوں سے کہا: جانتے بھی ہو تمہارا کام کیا ہے؟ تمہارا منصب یہ ہے کہ اگر چاہو دونوں میں صلح صفائی کرادو۔ اگر چاہو تفریق کرادو۔ یہ سن کر عورت نے کہا: میں اللہ تعالیٰ کے فیصلہ پر راضی ہوں۔ خواہ صلح و مصالحت کی صورت میں ہو خواہ جدائی کی صورت میں۔ مرد کہنے لگا: مجھے جدائی نامنظور ہے۔ اس پر حضرت علیؓ نے فرمایا: نہیں نہیں قسم اللہ کی تجھے دونوں صورتیں منظور کرنی پڑیں گی۔ پس علما کا اجماع ہے کہ ایسی صورت میں ان دونوں منصفوں کو دونوں اختیار ہیں۔ یہاں تک کہ حضرت ابراہیم نخعیؒ فرماتے ہیں کہ اگر وہ چاہیں دو اور تین طلاقیں بھی دے سکتے ہیں۔ حضرت امام مالکؒ سے بھی یہی منقول ہے۔ ہاں حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ انہیں اجتماع کا اختیار ہے تفریق کا نہیں حضرت قتادہؒ اور زید بن اسلمؒ کا بھی یہی قول ہے۔ امام احمد اور ابو ثور اور داؤد کا بھی یہی مذہب ہے۔ ان کی دلیل ﴿إِن يُرِيدَا إِصْلَاحًا﴾ والا جملہ ہے کہ اس میں تفریق کا ذکر نہیں۔ ہاں اگر یہ دونوں شوہر اور بیوی دونوں کی طرف وکیل ہیں تو بیشک ان کا حکم جمع اور تفریق دونوں میں نافذ ہوگا اور اس میں تو کسی کے خلاف منقول بھی نہیں۔ پھر بھی یہ خیال رہے کہ یہ دونوں پنچ حاکم کی طرف سے مقرر ہوں گے اور فیصلہ کریں گے۔ گو ان سے فریقین ناراض ہوں یا یہ دونوں میاں بیوی کی طرف سے وکیل ہوں گے۔ جمہور کا مذہب تو پہلا ہے اور دلیل یہ ہے کہ ان کا نام قرآن حکیم نے حکم رکھا ہے اور حکم کے فیصلے سے کوئی خوش ہو یا ناخوش۔ بہر صورت اس کا فیصلہ ہوگا۔ آیت کے ظاہری الفاظ بھی جمہور کے ساتھ ہیں۔ امام شافعی کا نیا قول بھی یہی ہے اور امام ابو حنیفہ اور ان کے اصحاب کا بھی یہی قول ہے۔

دوسرا قول جن کا ہے وہ کہتے ہیں کہ اگر یہ حکم کی صورت میں ہوتے تو پھر حضرت علیؓ اور اس خاوند کو کیوں فرماتے کہ عورت نے جن دونوں صورتوں کا اقرار کیا ہے تو بھی اگر نہ کرے تب تک تو جھوٹا ہے۔ واللہ اعلم۔

امام ابن عبدالبرؒ فرماتے ہیں کہ علمائے کرام کی اجماع ہے کہ دونوں پنچوں کا قول جب مختلف ہو تو دوسرے کے قول کا کوئی اعتبار نہیں اور اس امر پر بھی اجماع ہے کہ یہ اتفاق کرانا چاہیں تو ان کا فیصلہ نافذ ہے ہاں اگر وہ جدائی کرنا چاہیں تو بھی ان کا فیصلہ نافذ ہے یا نہیں اس میں اختلاف ہے۔ لیکن جمہور کا مذہب یہی ہے کہ اس میں بھی ان کا فیصلہ نافذ ہے گو انہیں وکیل نہ بنایا گیا ہو۔

وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّبِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبٰى وَالْجَارِ الْجُنُبِ

وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْۢبِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۙ وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرَا ۙ﴿۳۶﴾

اور تم اللہ تعالیٰ کی عبادت اختیار کرو اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک مت کرو اور والدین کے ساتھ اچھا معاملہ کرو اور اہل قرابت کے ساتھ بھی اور یتیموں کے ساتھ بھی اور غریب غربا کے ساتھ بھی اور پاس والے پڑوسی کے ساتھ بھی اور دور والے پڑوسی کے ساتھ بھی اور ہم مجلس کے ساتھ بھی اور راہگیر کے ساتھ بھی جو تمہارے مالکانہ قبضہ میں ہیں۔ بیشک اللہ تعالیٰ ایسے شخصوں سے محبت نہیں رکھتے جو اپنے کو بڑا سمجھتے ہوں شیخی کی باتیں کرتے ہوں۔○

صلہ رحمی کی ترغیب ☆

اللہ تبارک وتعالیٰ اپنی عبادت کا حکم دیتا ہے اور اپنی توحید کے ماننے کو فرماتا ہے اور اپنے ساتھ کسی کو شریک کرنے سے روکتا ہے۔ اس لئے کہ خالق رزاق نعمتیں دینے والا تمام مخلوق پر ہر وقت اور ہر حال میں انعام کی بارش کرنے والا صرف وہی ہے تو لائق عبادت بھی صرف وہی ہوا۔ حضرت معاذؓ سے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: جانتے ہو اللہ تعالیٰ کا حق بندوں پر کیا ہے؟ آپ جواب دیتے ہیں: اللہ اور اس کا رسول صلی اللہ علیہ وسلم زیادہ جاننے والے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ کہ وہ اسی کی عبادت کریں۔ اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں۔ پھر فرمایا: جانتے ہو جب بندے یہ کریں تو ان کا حق اللہ کے ذمہ کیا ہے؟ یہ کہ انہیں وہ عذاب نہ کرے۔ پھر فرماتا ہے: ماں باپ کے ساتھ احسان کرتے رہو وہی سبب بنے ہیں۔ تمہارے عدم سے وجود میں آنے کا[1]۔ قرآن کریم کی بہت سی آیتوں میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اپنی عبادت کے ساتھ ہی ماں باپ سے سلوک واحسان کرنے کا حکم دیا ہے۔ جیسے فرمایا: ﴿اَنِ اشْكُرْ لِيْ وَلِوَالِدَيْكَ﴾ (لقمان:۱۴) اور ﴿وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا﴾ (الاسراء:۲۳) یہاں بھی یہ بیان فرما کر پھر حکم دیتا ہے کہ اپنے رشتہ داروں سے بھی سلوک واحسان کرتے رہو۔ حدیث میں ہے مسکین کو صدقہ دینا صرف صدقہ ہی ہے۔ لیکن قریبی رشتہ دار کو دینا صدقہ بھی اور صلہ رحمی بھی ہے۔ پھر فرمایا کہ یہ یتیموں کے ساتھ بھی سلوک واحسان کرو۔ اس لئے کہ ان کی خبر گیری کرنے والا ان کے سر پر محبت سے ہاتھ پھیرنے والا ان کے ناز ونخرے اٹھانے والا انہیں محبت کے ساتھ کھلانے پلانے والا ان کے سر سے اٹھ گیا ہے۔ پھر مسکینوں کے ساتھ نیکی کرنے کا ارشاد کیا کہ وہ حاجت مند ہیں خالی ہاتھ ہیں محتاج ہیں۔ ان کی ضرورتیں تم پوری کرو ان کی احتیاج تم رفع کرو ان کے کام تم کر دیا کرو۔ فقیر ومسکین کا پورا بیان سورہ براۃ کی تفسیر میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

اپنے پڑوسیوں کا خیال رکھو ان کے ساتھ بھی اچھا برتاؤ کرو اور نیک سلوک رکھو خواہ وہ قرابت دار ہوں یا نہ ہوں۔ خواہ وہ مسلمان ہوں یا یہود ونصرانی ہوں۔ یہ بھی کہا گیا ہے بجَارِ ذِی الْقُرْبٰی سے مراد بیوی ہے اور: جَارِ الْجُنُبِ سے مراد رفیق سفر ہے۔ پڑوسیوں کے حق کے سلسلہ میں بہت سی حدیثیں ہیں۔ کچھ سن لیجئے۔ مسند احمد میں ہے رسول اللہ فرماتے ہیں: مجھے حضرت جبرئیلؑ پڑوسیوں کے بارے میں یہاں تک وصیت ونصیحت کرتے رہے کہ مجھے گمان ہوا کہ شاید یہ پڑوسیوں کو وارث بنا دیں گے فرماتے ہیں بہتر ساتھی اللہ تعالیٰ کے نزدیک وہ ہے جو اپنے ساتھیوں کے ساتھ خوش سلوک ہو اور پڑوسیوں میں

[1] مطلب یہ ہے کہ حقیقی خالق تو تمہارا اللہ تعالیٰ ہے لیکن ظاہر میں تھوڑا بہت دخل ماں باپ کو بھی ہے۔ انظر شاہ کشمیری

سب سے بہتر اللہ کے نزدیک وہ ہے جو ہمسایوں سے نیک سلوک زیادہ کرتا ہو۔ فرماتے ہیں: انسان کو ہرگز نہ چاہئے کہ اپنے پڑوسی کی آسودگی کے بغیر خود شکم سیر ہو جائے۔ ایک مرتبہ آپ نے صحابہؓ سے سوال کیا زنا کے بارے میں تم کیا کہتے ہو؟ لوگوں نے کہا: وہ حرام ہے۔ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے حرام کیا ہے اور قیامت تک حرام ہی رہے گا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا: سنو! دس عورتوں سے زنا کرنے والا اس شخص کے گناہ سے کم گنہگار ہے جو اپنے پڑوسی کی عورت سے زنا کرے۔ پھر دریافت فرمایا: تم چوری کی نسبت کیا کہتے ہو؟ انہوں نے جواب دیا کہ اسے بھی اللہ تعالیٰ نے اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے حرام کیا ہے اور وہ قیامت تک حرام ہے۔ آپ نے فرمایا: سنو! دس گھروں سے چوری کرنے والے کا گناہ اس شخص کے گناہ سے ہلکا ہے جو اپنے پڑوسی کے گھر سے کچھ چرائے۔ صحیحین کی حدیث میں ہے: حضرت ابن مسعودؓ سوال کرتے ہیں کہ یا رسول اللہ کونسا گناہ سب سے بڑا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ کہ تم اللہ کے ساتھ شریک ٹھہرائے۔ حالانکہ اسی ایک نے تجھے پیدا کیا ہے۔ میں نے پوچھا: پھر کونسا؟ فرمایا: یہ کہ تو اپنی پڑوس کی عورت کے ساتھ زنا کرے۔ ایک انصاری صحابیؓ فرماتے ہیں: میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہونے کے لئے گھر سے چلا۔ وہاں پہنچ کر دیکھتا ہوں کہ ایک صاحب کھڑے ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہیں اور باتیں ہو رہی ہیں۔ دیر ہوگئی یہاں تک کہ مجھے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے تھک جانے خیال نے بے چین کر دیا بہت دیر کے بعد آپ لوٹے اور میرے پاس آئے۔ میں نے عرض کیا: حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس شخص نے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت دیر تک کھڑا رکھا۔ میں تو پریشان ہوگیا آپ کے پاؤں تھک گئے ہوں گے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اچھا تم نے انہیں دیکھا۔ میں نے کہا خوب اچھی طرح دیکھا۔ فرمایا جانتے ہو وہ کون تھے؟ وہ جبرئیلؑ تھے۔ مجھے پڑوسیوں کے حق کی تلقین کرتے رہے۔ یہاں تک کہ ان کے حقوق بیان کئے کہ مجھے خیال ہوا کہ غالباً آج پڑوسی کو وارث ہی ٹھہرا دیں گے۔ (مسند احمد)

مسند عبد بن حمید میں ہے، حضرت جابر بن عبداللہؓ فرماتے ہیں: ایک شخص عوالی مدینہ سے آیا۔ اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت جبرئیلؑ اس جگہ نماز پڑھ رہے تھے۔ جہاں جنازہ کی نماز پڑھی جاتی تھی۔ جب آپ فارغ ہوئے تو اس شخص نے کہا: حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ یہ دوسرا کون شخص نماز پڑھ رہا تھا؟ آپ نے فرمایا: تم نے انہیں دیکھا؟ اس نے کہا: ہاں۔ فرمایا: تو نے بہت بڑی بھلائی دیکھی یہ جبرئیلؑ تھے مجھے پڑوسی کے بارے میں وصیت کرتے رہے۔ مجھے خیال ہوا کہ عنقریب اسے وارث بنا دیں گے۔ آٹھویں حدیث بزار میں ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: پڑوسی تین قسم کے ہیں، ایک حق والے یعنی ادنیٰ، دو حق والے اور تین حق والے یعنی اعلیٰ۔ ایک حق والا وہ ہے جو مشرک ہو اور اس سے رشتہ داری نہ ہو۔ دو حق والا وہ ہے جو مسلمان ہو اور رشتہ دار نہ ہو۔ ایک حقِ اسلام دوسرا حقِ پڑوسی کا۔ تین حق والا وہ ہے جو مسلمان بھی ہو پڑوسی بھی ہو اور رشتے ناتے کا بھی ہو تو حق اسلام، حق ہمسائیگی، حق صلہ رحمی، تین تین حق اس کے ہو گئے۔ نویں حدیث مسند احمد میں ہے، حضرت عائشہؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ میرے دو پڑوسی ہیں، میں ایک کو ہدیہ بھیجنا چاہتی ہوں تو کسے بھجواؤں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس کا دروازہ قریب ہو، دسویں حدیث طبرانی میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وضو کیا۔ لوگوں نے آپ کے پانی کو لینا اور ملنا شروع کیا۔ آپ نے پوچھا: ایسا کیوں کرتے ہو؟ انہوں نے کہا: اللہ اور اس کے رسول کی محبت میں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جسے یہ اچھا معلوم ہوتا ہے کہ اللہ اور اس کا رسول اس سے محبت کریں تو اسے چاہئے کہ جب بات کرے سچ کرے اور

جب امانت دیا جائے تو ادا کرے۔ (تفسیر ابن کثیر) میں یہ حدیث یہیں پر ختم ہے۔ لیکن اگلا جملہ اس کا سہوارہ گیا ہے۔ جس کا حقیقی تعلق اس مسئلہ سے ہے۔ وہ یہ کہ اسے چاہئے پڑوسی کے ساتھ سلوک واحسان کرے' گیارہویں حدیث مسند احمد میں ہے کہ قیامت کے دن سب سے پہلے جو جھگڑا اللہ کے سامنے پیش ہوگا وہ دو پڑوسیوں کا ہوگا۔ پھر حکم ہوتا ہے: صَاحِبِ الْجَنْبِ کے ساتھ سلوک کرنے کا۔ اس سے مراد بہت سے مفسرین کے نزدیک عورت ہے اور بہت سے فرماتے ہیں مراد سفر کا ساتھی ہے اور یہ بھی نقل ہے کہ اس سے مراد دوست اور ساتھی ہے۔ عام اس سے کہ سفر میں ہو یا قیام کی حالت میں۔ ابن سبیل سے مراد مہمان ہے اور یہ بھی کہ جو راہ گزرتے ہوئے ٹھہر گیا ہو۔ پس اگر مہمان سے بھی یہ مراد لی جائے کہ سفر میں جاتے ہوئے مہمان بنا تو دونوں ایک ہو گئے۔ اس کا پورا بیان سورہ برأت میں آ رہا ہے انشاء اللہ تعالیٰ۔

پھر غلاموں کے بارے میں فرمان ہو رہا ہے کہ ان کے ساتھ بھی نیک سلوک رکھو۔ اس لئے کہ وہ غریب تو تمہارے ہاتھوں اسیر ہے۔ اس پر تو تمہارا کامل اختیار ہے۔ تو تمہیں چاہئے کہ اس پر رحم کھاؤ اور اس کی ضروریات کا خیال رکھو۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم تو اپنے مرض الموت میں بھی اپنی اُمت کو اس کی وصیت فرما گئے۔ فرماتے ہیں: لوگو! نماز کا اور غلاموں کا خوب خیال رکھو۔ بار بار فرماتے رہے۔ یہاں تک کہ زبان رکنے لگی۔ مسند کی حدیث میں ہے آپ فرماتے ہیں تو خود جو کھائے وہ بھی صدقہ ہو جو اپنے بچوں کو کھلائے وہ بھی صدقہ ہے' جو اپنی بیوی کو کھلائے وہ بھی صدقہ ہے جو اپنے خادم کو کھلائے وہ بھی صدقہ ہے۔ مسلم میں ہے کہ حضرت ابن عمرؓ نے ایک مرتبہ اپنے داروغہ سے فرمایا کہ کیا غلاموں کو تم نے ان کی خوراک دے دی؟ اس نے کہا: اب تک نہیں دی۔ فرمایا: جاؤ دے کر آؤ۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: انسان کو یہی گناہ کافی ہے کہ جن کی خوراک کا وہ مالک ہے ان سے روک رکھے۔ مسلم میں ہے مملوک ماتحت کا حق ہے کہ اسے کھلایا پلایا پہنایا اوڑھایا جائے اور اس کی طاقت سے زیادہ کام اس سے نہ لیا جائے۔ بخاری شریف میں ہے' جب تم میں کسی کا خادم اس کا کھانا لے کر آئے تو تمہیں چاہئے کہ اگر ساتھ بٹھا کر نہیں کھلاتے تو کم از کم اسے لقمہ دو لقمہ دے دو۔ خیال کرو کہ اس کے پکانے کی گرمی اور تکلیف اسی نے اٹھائی ہے۔ دوسری روایت میں ہے' چاہئے تو یہ کہ اسے اپنے ساتھ بٹھا کر کھلائے اور اگر کھانا کم ہو تو لقمہ دو لقمہ ہی دے دیا کرو۔ آپ فرماتے ہیں: تمہارے غلام بھی تمہارے بھائی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں تمہارے ماتحت کر دیا ہے۔ پس جس کے ہاتھ تلے اس کا بھائی ہو۔ اسے اپنے کھانے میں سے کھلائے اور اپنے پہننے میں سے پہنائے اور ایسا کام نہ لے کہ وہ عاجز ہو جائے۔ اگر کوئی ایسا ہی مشکل کام آ پڑے تو خود بھی اس کا ساتھ دے۔ (بخاری ومسلم)

پھر فرمایا کہ خود بیں' متنجب متکبر' خود پسند لوگوں پر اپنی فوقیت جتانے والا' اپنے آپ کو تولنے والا۔ اپنے تئیں دوسروں سے بہتر جاننے والا اللہ کا پسندیدہ بندہ نہیں۔ گو وہ اپنے آپ کو بڑا سمجھے' لیکن اللہ کے ہاں وہ ذلیل ہے۔ لوگوں کی نظروں میں وہ حقیر ہے۔ بھلا کتنا اندھیر ہے کہ خود تو کسی سے سلوک کرے تو اپنا احسان اس پر رکھے۔ لیکن رب کی نعمتوں کا جو اللہ نے اسے دے رکھی ہیں' شکر نہ بجالائے۔ لوگوں میں بیٹھ کر فخر کرے کہ میں اتنا بڑا آدمی ہوں میرے پاس یہ ہے اور وہ ہے۔ حضرت ابو جابر ہوئیؒ فرماتے ہیں کہ ہر بد خلق متکبر اور خود پسند ہوتا ہے۔ پھر اسی آیت کو تلاوت کیا اور فرمایا: ہر ماں باپ کا نافرمان سرکش اور بدنصیب ہوتا ہے۔ پھر آپ نے آیت: ﴿وَبَرًّا بِوَالِدَتِي وَلَمْ يَجْعَلْنِي جَبَّارًا شَقِيًّا﴾ (مریم: ۳۲'۳۳) پڑھی۔ حضرت عوام بن حوشب بھی یہی فرماتے ہیں۔ حضرت مطرفؒ فرماتے ہیں۔ مجھے حضرت ابوذرؓ کی ایک روایت پہنچی تھی اور میرے دل میں تمنا تھی

کہ کسی وقت خود حضرت ابوذرؓ سے مل اس روایت کو انہی کی زبانی سنوں چنانچہ ایک مرتبہ ملاقات ہو گئی تو میں نے کہا: مجھے یہ خبر ملی ہے کہ آپ ایک حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیان کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ تین قسم کے لوگوں کو دوست رکھتا ہے اور تین قسم کے لوگوں کو ناپسند کرتا ہے۔ حضرت ابوذرؓ نے فریا: ہاں یہ سچ ہے' میں بھلا اپنے خلیل ﷺ پر بہتان کیسے باندھ سکتا ہوں۔ میں نے کہا: اچھا وہ تین کون ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ دشمن رکھتا ہے؟ آپ نے اسی آیت کی تلاوت کی اور فرمایا: اسے تم کتاب اللہ میں بھی پاتے ہو۔ بنو جہیم کا ایک شخص رسول مقبول ﷺ سے کہتا ہے: مجھے کچھ نصیحت کیجئے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: کپڑا ٹخنے سے نیچے نہ لٹکاؤ[1] کیونکہ یہ تکبر اور خود پسندی ہے جسے اللہ ناپسند کرتا ہے۔

الَّذِينَ يَبْخَلُونَ وَيَأْمُرُونَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ وَيَكْتُمُونَ مَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ ۗ وَأَعْتَدْنَا لِلْكَافِرِينَ عَذَابًا مُهِينًا ﴿٣٧﴾ وَالَّذِينَ يُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ رِئَاءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْآخِرِ ۗ وَمَنْ يَكُنِ الشَّيْطَانُ لَهُ قَرِينًا فَسَاءَ قَرِينًا ﴿٣٨﴾ وَمَاذَا عَلَيْهِمْ لَوْ آمَنُوا بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَأَنْفَقُوا مِمَّا رَزَقَهُمُ اللَّهُ ۚ وَكَانَ اللَّهُ بِهِمْ عَلِيمًا ﴿٣٩﴾

جو کہ بخل کرتے ہیں اور دوسرے لوگوں کو بھی بخل کی تعلیم کرتے ہوں اور وہ اس چیز کو پوشیدہ رکھتے ہو جو اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے دی ہے اور ہم نے ایسے ناسپاسوں کے لئے اہانت آمیز سزا تیار کر رکھی ہے اور جو لوگ کہ اپنے مالوں کو لوگوں کے دکھانے کے لئے خرچ کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ پر اور آخری دن پر اعتقاد نہیں رکھتے اور شیطان جس کا مصاحب ہو اسکا برا مصاحب ہے اور ان پر کیا مصیبت نازل ہو جائے گی اگر وہ لوگ اللہ تعالیٰ پر اور آخری دن پر ایمان لے آئیں اور اللہ تعالیٰ نے جو انکو دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے رہا کریں اور اللہ تعالیٰ انکو خوب جانتے ہیں۔ ○

بخل کی ممانعت ☆

ارشاد ہوتا ہے کہ جو لوگ ان مواقع میں خرچ کرنے سے جی چراتے ہیں جہاں خرچ کرنے سے اللہ تعالیٰ خوش ہو مثلاً ماں باپ کو دینا' قرابت داروں سے سلوک کرنا' یتیم مسکین پڑوسی' رشتہ دار غیر رشتہ دار پڑوسی' ساتھی' مسافر' غلام اور ماتحت کو ان کی محتاجی کے وقت اخلاص کے ساتھ اللہ کے لئے دینا اور اتنا ہی نہیں بلکہ لوگوں کو بخل کا اور فی سبیل اللہ خرچ نہ کرنے کا مشورہ دیتے ہیں۔ حدیث شریف میں ہے کونسی بیماری بخل کی بیماری سے بڑھ کر ہے اور حدیث میں ہے لوگو بخیلی سے بچو۔ اسی نے تم سے اگلوں کو تاخت و تاراج کیا۔ اسی کے باعث ان سے قطع رحمی اور فسق و فجور جیسے برے کام صادر ہوئے۔ پھر فرمایا یہ لوگ ان

[1] مطلب یہ ہے کہ عام طور پر پاجامے کے پائینچے جو ٹخنوں کے نیچے رکھے جاتے ہیں تکبر اور غرور کی علامت ہے۔ احادیث میں اس پر زبردست وعید آئی ہے اور اللہ تعالیٰ کے قہر کا اس کو سبب قرار دیا گیا ہے۔

دونوں برائیوں کے ساتھ ایک تیسری بُرائی کے مرتکب بھی ہیں۔ یعنی اللہ کی نعمتوں کو چھپاتے ہیں انہیں ظاہر نہیں کرتے نہ ان کے کھانے پینے میں وہ ظاہر ہوتی ہیں۔ نہ پہننے میں نہ اوڑھنے میں نہ دینے لینے میں جیسے اور جگہ ہے: ﴿اِنَّ الْاِنْسَانَ لِرَبِّهٖ لَكَنُوْدٌ وَ اِنَّهٗ عَلٰى ذٰلِكَ لَشَهِيْدٌ﴾ (العادیات: ۶۔ ۷) یعنی انسان اپنے رب کا ناشکرا ہے اور وہ خود ہی اپنی اس حالت اور اس خصلت پر گواہ ہے پھر: ﴿وَاِنَّهٗ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيْدٌ﴾ (العادیات: ۸) وہ مال کی محبت میں مست ہے۔ پس یہاں بھی فرمان ہے کہ اللہ کے فضل کو یہ چھپاتا رہتا ہے۔

پھر انہیں دھمکایا جاتا ہے کہ کافروں کے لئے ہم نے اہانت آمیز عذاب تیار کر رکھے ہیں۔ کفر کے معنی ہیں پوشیدہ رکھنا اور چھپالینا۔ پس بخیل بھی اللہ کی نعمتوں کا چھپانے والا ان پر پردہ ڈالنے بلکہ ان کا انکار کرنے والا ہے۔ پس وہ ان نعمتوں کا کافر ہوا۔ حدیث شریف میں ہے۔ اللہ تعالیٰ جب کسی بندے پر اپنی نعمت انعام فرماتا ہے تو چاہتا ہے کہ اس کا اثر اس پر ظاہر ہو۔ دعائے نبوی میں ہے: وَاجْعَلْنَا شَاكِرِيْنَ لِنِعْمَتِكَ مُثْنِيْنَ بِهَا عَلَيْكَ قَابِلِيْهَا وَاَتِمَّهَا عَلَيْنَا ۔ خدایا ہمیں اپنی نعمتوں پر شکر گزار بنا اور انکی وجہ سے ہمیں اپنا ثنا خواں بنا۔ ان کا قبول کرنے والا بنا اور ان نعمتوں کو ہمیں خوب عطا فرما۔ بعض سلف کا قول ہے کہ یہ آیت یہودیوں کے اس بخل کے بارے میں ہے جو اپنی کتاب میں حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات کو چھپانے میں کرتے تھے۔ اسی لئے اس کے آخر میں ہے کافروں کے لئے ذلت آمیز عذاب ہم نے تیار کر رکھے ہیں۔ کوئی شک نہیں کہ اس آیت کو ان بھی محمول کیا جاسکتا ہے۔ لیکن بظاہر یہاں مال کا بخل بیان ہو رہا ہے۔ گو علم کا بخل بھی اس میں بطور اولیٰ داخل ہے۔ خیال کیجئے کہ بیان آیت اقربا ضعفا کو مال دینے کے بارے میں ہے۔ اسی طرح اس کے بعد والی آیت میں ریا کے طور پر للہ مال دینے والوں کی مذمت بیان ہو رہی ہے۔ یہاں بیان ہوا ان مسک اور بخیلوں کا جو کوڑی کوڑی کو دانتوں سے تھام رکھتے ہیں پھر بیان ہوا ان کا جو دیتے ہیں لیکن بدنیتی سے دُنیا میں اپنی واہ واہ ہونے کی خاطر۔ چنانچہ ایک حدیث میں ہے کہ جن تین قسم کی لوگوں سے جہنم کی آگ سلگائی جائے گی۔ وہ یہی ریا کار ہوں گے۔ ریا کار عالم ریا کار غازی ریا کار سخی۔ یہ سخی کہے گا بھی کہ باری تعالیٰ تیری ہر ہر راہ میں میں نے اپنا مال خرچ کیا۔ تو اسے اللہ تعالیٰ کی جانب سے جواب ملے گا کہ تو جھوٹا ہے۔ تیرا ارادہ تو صرف یہ تھا تو سخی اور جواد مشہور ہو جائے۔ سو وہ ہو چکا یعنی تیرا مقصود دنیا کی شہرت تھی۔ وہ میں تجھے دنیا ہی میں دے چکا ہے۔ پس تیری مراد حاصل ہو چکی اور حدیث میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عدی بن حاتم سے فرمایا کہ تیرے باپ نے اپنی سخاوت سے جو چاہا تھا وہ اسے حاصل ہو گیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال ہوتا ہے کہ عبداللہ بن جدعان تو بڑا سخی تھا۔ جس نے مساکین وفقرا کے ساتھ بڑے سلوک کئے اور نام اللہ بہت سے غلام آزاد کئے۔ تو کیا اسے ان کا نفع ملے گا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نہیں اس نے تو عمر بھر میں ایک دن بھی نہ کہا کہ خدایا میرے گناہوں کو قیامت کے دن معاف فرما دینا۔ اسی لئے یہاں بھی فرماتا ہے کہ ان کا ایمان اللہ تعالیٰ پر اور قیامت پر نہیں۔ ورنہ شیطان کے پھندے میں نہ پھنس جاتے اور بد کو بھلا نہ سمجھ بیٹھتے۔ یہ شیطان کے ساتھی ہیں اور شیطان انکا ساتھی ہے۔ ساتھی کی برائی پر ان کی برائی بھی سوچ لو۔ عرب شاعر کہتا ہے۔

عَنِ الْمَرْءِ لَا تَسْأَلْ وَسَلْ عَنْ قَرِيْنِهٖ ☆ فَكُلُّ قَرِيْنٍ بِالْمُقَارِنِ يَقْتَدِيْ

انسان کے بارے میں نہ پوچھ اس کے ساتھیوں کا حال دریافت کر لے۔ ہر ساتھی اپنے ساتھی کا ہی پیروکار ہوتا ہے۔

پھر ارشاد فرماتا ہے کہ انہیں اللہ پر ایمان لانے اور صحیح راہ پر چلنے اور ریاکاری کو چھوڑ دینے اور اخلاص و یقین پر قائم ہو جانے سے کون سی چیز مانع ہے۔ ان کا اس میں کیا نقصان ہے۔ بلکہ سراسر فائدہ ہے کہ ان کی عاقبت سنور جائے گی۔ یہ لوگ اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنے سے تنگ دلی کر رہے ہیں۔ اللہ کی محبت اور اس کی رضامندی حاصل کرنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے۔ اللہ انہیں خوب جانتا ہے ان کی بھلی اور بری نیتوں کا اسے علم ہے۔ اہل توفیق سب اس پر ظاہر ہیں۔ وہ بھلوں کو عمل صالح کی توفیق عطا فرما کے اپنی خوشنودی کے کام ان سے لے کر اپنی قربت انہیں عطا فرماتے ہے اور بروں کو اپنی عالی جناب اور زبردست سرکار سے دھکیل دیتا ہے۔ جس سے ان کی دنیا اور آخرت بربار ہوتی ہے عَيَاذًا بِاللّٰهِ مِنْ ذٰلِكَ۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ ۚ وَاِنْ تَكُ حَسَنَةً يُّضٰعِفْهَا وَيُؤْتِ مِنْ لَّدُنْهُ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۴۰﴾ فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ بِشَهِيْدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيْدًا ﴿۴۱﴾ يَوْمَئِذٍ يَّوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَعَصَوُا الرَّسُوْلَ لَوْ تُسَوّٰى بِهِمُ الْاَرْضُ ۭ وَلَا يَكْتُمُوْنَ اللّٰهَ حَدِيْثًا ﴿۴۲﴾ ع ۶

بلاشبہ اللہ تعالیٰ ایک ذرہ برابر بھی ظلم نہ کریں گے اور اگر نیکی ہوگی تو اس کو کئی گنا کر دیں گے اور اپنے پاس سے اجر عظیم دیں گے۔ سو اس وقت کیا حال ہوگا جب کہ ہم ہر امت میں سے ایک ایک گواہ کو حاضر کریں گے اور آپ کو بھی ان لوگوں پر گواہی دینے کے لئے حاضر کریں گے۔ اس روز جن لوگوں نے کفر کیا ہوگا اور رسول کا کہنا نہ مانا ہوگا وہ اس بات کی آرزو کریں گے کہ کاش ہم زمین کے پیوند ہو جاویں اور اللہ تعالیٰ سے کسی بات کا اخفاء نہ کر سکیں گے۔ ○

اللہ تعالیٰ عالم ہیں ☆

باری تعالیٰ رب العالمین فرماتا ہے کہ وہ کسی پر ظلم نہیں کرتا۔ کسی کی نیکی کو ضائع نہیں کرتا بلکہ بڑھا چڑھا کر قیامت کے روز اس کا اجر و ثواب عطا فرمائے گا۔ جیسے اور آیت میں ہے: ﴿وَنَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ﴾ (الانبیاء: ۴۷) ہم عدل کی ترازو رکھیں گے اور فرمایا کہ حضرت لقمان نے اپنے صاحبزادے سے فرمایا تھا: ﴿يٰبُنَيَّ اِنَّهَآ اِنْ تَكُ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ﴾ اے بیٹے! اگر کوئی چیز رائی کے دانے برابر ہو گو وہ کسی پتھر میں یا آسمانوں میں ہو یا زمین کے اندر ہو اللہ اسے لائے گا۔ بے شک اللہ تعالیٰ باریک بین خبردار ہے اور جگہ فرمایا: ﴿يَوْمَئِذٍ يَّصْدُرُ النَّاسُ﴾ (الزلزال: ۶) اس دن لوگ مختلف حالتوں میں لوٹیں گے تاکہ انہیں ان کے اعمال دکھائے جائیں۔ پس جس نے ذرہ برابر نیکی کی ہوگی۔ وہ اسے دیکھ لے گا اور جس نے ذرہ برابر برائی کی ہوگی وہ اسے دیکھ لے گا۔ صحیحین میں شفاعت کے ذکر والی مطول حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ فرمائے گا۔ لوٹ کر جاؤ اور جس کے دل میں رائی کے دانے کے برابر ایمان دیکھو اسے جہنم سے نکال لاؤ۔ پس بہت سی مخلوق جہنم سے آزاد ہوگی حضرت ابو سعید یہ حدیث بیان فرما کر فرماتے ہیں۔ اگر تم چاہو تو آیت قرآنی کے اس جملہ کو پڑھ لو ﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ﴾ ابن ابی حاتم میں حضرت عبداللہ بن مسعود کا فرمان ہے کہ قیامت کے دن کسی امت کے بندے یا بندی کو بیچ

جائے گا اور ایک پکارنے والا تمام اہل محشر کو سنا کر بآواز بلند کہے گا۔ یہ فلاں کا بیٹا یا بیٹی ہے اس کا یہ نام ہے جس کسی کا کوئی حق اس کے ذمہ باقی ہو وہ آئے اور لے جائے۔ اس وقت یہ حالت ہوگی کہ عورت چاہے گی کہ اس کا کوئی حق اس کے باپ پر ماں پر بھائی پر یا شوہر پر ہو تو دوڑ کر آئے اور لے۔ رشتے ناتے کٹ جائیں گے۔ کوئی کسی کا پرسان حال نہ ہوگا۔ اللہ تعالیٰ اپنا جو حق چاہے گا معاف فرما دے گا۔ لیکن لوگوں کے حقوق میں سے کوئی حق معاف نہ فرمائے گا۔ جب حقدار آ جائیں گے تو اس سے کہا جائے گا کہ ان کے حق ادا کر۔ یہ کہے گا' دنیا ختم ہو چکی' آج میرے ہاتھ میں کیا ہے جو میں دوں۔ پس اس کے نیک اعمال لئے جائیں گے اور حقداروں کو دیئے جائیں گے اور ہر ایک کا حق اسی طرح دیا جائے گا۔ اب یہ شخص اگر اللہ کا دوست ہے تو اس کے پاس ایک رائی کے دانے کے برابر نیکی بچ رہے گی۔ جسے بڑھا چڑھا کر صرف اسی کی بنا پر اللہ تعالیٰ اسے جنت میں لے جائے گا۔ پھر آپ نے اسی آیت کی تلاوت کی اور اگر وہ بندہ اللہ کا دوست نہیں ہے بلکہ بد بخت ہے اور سرکش ہے تو یہ حال ہوگا کہ فرشتہ کہے گا: باری تعالیٰ اس کی سب نیکیاں ختم ہو گئیں اور ابھی حقدار باقی رہ گئے۔ حکم ہوگا کہ ان کی برائیاں لے کر اس پر لاد دو۔ پھر اسے جہنم میں داخل کرو۔ اعاذنا اللہ منھا۔ اس موقوف اثر کے بعد شواہد مرفوع احادیث میں بھی موجود ہیں۔

ابن ابی حاتم میں ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا فرمان ہے کہ آیت: ﴿مَنْ جَاءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهُ عَشْرُ أَمْثَالِهَا﴾ (الانعام: ۱۶۰) اعراب کے بارے میں اتری ہے۔ اس پر ان سے سوال ہوا کہ پھر مہاجرین کے بارے میں کیا ہے۔ آپ نے اس سے بہت ہی اچھی آیت: ﴿إِنَّ اللَّهَ لَا يَظْلِمُ﴾ ہے۔ حضرت سعید بن جبیر فرماتے ہیں: مشرک کے عذابوں میں بھی اس کے باعث کمی کر دی جاتی ہے۔ ہاں جہنم سے نکلے گا تو نہیں۔ چنانچہ صحیح حدیث میں ہے کہ حضرت عباسؓ نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا: یا رسول اللہ ﷺ! آپ کے چچا ابو طالب آپ کی پشت پناہ بنے ہوئے تھے۔ آپ کو لوگوں کی ایذاؤں سے بچاتے رہتے تھے۔ آپ کی طرف سے ان سے لڑتے تھے۔ تو کیا انہیں کچھ نفع بھی پہنچے گا۔ آپ نے فرمایا: ہاں وہ تھوڑی سی آگ میں ہیں اور اگر میرا یہ تعلق نہ ہوتا تو جہنم کے نچلے طبقے میں ہوتے۔ لیکن یہ بہت ممکن ہے کہ یہ فائدہ صرف ابو طالب کے لئے ہی ہو۔ یعنی اور کفار اس حکم میں نہ ہوں۔ اس لئے کہ مسند طیالسی کی حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ مؤمن کی کسی نیکی پر ظلم نہیں کرتا۔ دنیا میں روزی رزق وغیرہ کی صورت میں اس کا بدلہ ملتا ہے اور آخرت میں جزا اور ثواب کی شکل میں بدلہ ملے گا۔ ہاں کافر تو اپنی نیکی دنیا میں ہی کھا جاتا ہے۔ قیامت میں اس کے پاس کوئی نیکی نہ ہوگی۔ اجر عظیم سے مراد اس آیت میں جنت ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے فضل وکرم لطف ورحم سے اپنی رضامندی عطا فرمائے اور جنت نصیب کرے۔ آمین۔

مسند احمد کی ایک غریب حدیث میں ہے' حضرت ابو عثمانؒ فرماتے ہیں: مجھے خبر لگی کہ حضرت ابو ہریرہؓ نے فرمایا ہے: اللہ تعالیٰ اپنے مؤمن بندے کو ایک نیکی کے بدلے ایک لاکھ نیکی کا ثواب دے گا۔ مجھے بڑا تعجب ہوا اور میں نے کہا: حضرت ابو ہریرہؓ کی خدمت میں تو سب سے زیادہ رہا ہوں' میں نے تو کبھی آپ سے یہ حدیث نہیں سنی۔ اب میں نے یہ پختہ ارادہ کر لیا کہ جاؤں حضرت ابو ہریرہؓ سے مل کر ان سے خود پوچھ آؤں۔ چنانچہ میں نے سامان سفر درست کیا اور اس روایت کی چھان کیلئے روانہ ہوا۔ معلوم ہوا کہ وہ حج کو گئے ہیں۔ میں نے حج کی نیت کی اور وہاں پہنچا۔ ملاقات کی تو میں نے کہا: اے ابو ہریرہؓ! میں نے سنا ہے آپ نے یہ حدیث بیان کی ہے' کیا یہ سچ ہے؟ آپ نے فرمایا: کیا تمہیں تعجب معلوم ہوتا ہے؟ تم نے قرآن میں نہیں پڑھا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: جو شخص اللہ کو اچھا قرض دے' اللہ اسے بہت زیادہ بڑھا کر عنایت فرماتا ہے اور

دوسری آیت میں ساری دنیا کو کم کہا گیا ہے۔ اللہ کی قسم میں نے آنحضرت ﷺ سے سنا ہے کہ ایک نیکی کو بڑھا کر اس کے بدلے دو لاکھ ملیں گے۔ یہ حدیث اور طریقوں سے مروی ہے۔ پھر قیامت کے دن کی سختی اور ہولنا کی کا بیان ہو رہا ہے کہ اس دن انبیاء علیہم السلام کو بطور گواہ پیش کیا جائے گا۔ جیسے اور آیت میں ہے: ﴿ وَاَشْرَقَتِ الْاَرْضُ بِنُوْرِ رَبِّهَا وَوُضِعَ الْكِتٰبُ وَجِايْٓءَ بِالنَّبِيّٖنَ وَالشُّهَدَآءِ ﴾ (الزمر: ۶۹) زمین اپنے رب کے نور سے چمکنے لگے گی۔ نامہ اعمال دیئے جائیں گے اور نبیوں اور گواہوں کو لا کھڑا کیا جائے گا اور جگہ فرمان ہے: ﴿ وَيَوْمَ نَبْعَثُ فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ شَهِيْدًا عَلَيْهِمْ مِّنْ اَنْفُسِهِمْ ﴾ (النحل ۸۹) ہر اُمت پر انہیں میں سے ہم گواہ کھڑے کریں گے۔ صحیح بخاری شریف میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے فرمایا: مجھے کچھ قرآن پڑھ کر سناؤ۔ حضرت عبداللہؓ نے کہا: یا رسول اللہ ﷺ! میں آپ کو پڑھ کر کیا سناؤں گا۔ آپ پر تو اترا ہے۔ فرمایا: ہاں، لیکن میرا جی چاہتا ہے کہ کسی دوسرے سے سنوں۔ پس میں نے سورہ نساء کی تلاوت شروع کی، پڑھتے پڑھتے جب میں اس آیت فَكَيْفَ کی تلاوت کی تو آپ نے فرمایا: بس کرو۔ میں نے دیکھا کہ آپ کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ حضرت محمد بن خضالہ انصاریؓ فرماتے ہیں کہ قبلہ بنی ظفر کے پاس رسول اللہ آئے اور اس صخرہ پر بیٹھ گئے جو اب تک ان کے محلہ میں ہے۔ آپ کے ساتھ ابن مسعودؓ، معاذ بن جبلؓ، اور دیگر صحابہ بھی تھے۔ آپ نے ایک قاری سے فرمایا: قرآن پڑھو۔ وہ پڑھتے پڑھتے جب آیت فَكَيْفَ تک پہنچے تو آپ اس قدر روئے کہ دونوں رخسار اور داڑھی تر ہو گئی اور عرض کرنے لگے۔ یا رب جو موجود ہیں ان پر تو خیر میری گواہی ہو گی۔ لیکن جن لوگوں کو میں نے دیکھا ہی نہیں۔ ان کی بابت کیسے گواہی ہو سکے گی۔ (ابن ابی حاتم)

ابن جریر میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: میں ان پر گواہ ہوں جب تک کہ میں ان میں ہوں۔ پس جب تو مجھے فوت کرے گا تب تو تو ہی ان پر نگہبان ہے۔ ابو عبداللہ قرطبیؒ نے اپنی کتاب تذکرہ میں ایک باب قائم کیا ہے کہ نبی کی اپنی امت پر شہادت کے بارے میں کیا آیا ہے۔ اس میں حضرت سعید بن مسیب کا قول پیش کیا ہے کہ ہر دن صبح شام نبی ﷺ پر آپ کی امت کے اعمال پیش کئے جاتے ہیں، بعد ناموں کے۔ پس آپ قیامت کے دن ان سب پر گواہی دیں گے۔ پھر یہی آیت تلاوت فرمائی۔ لیکن اوّلاً تو یہ حضرت سعید کا قول ہے دوسرے یہ کہ اس کی سند میں انقطاع ہے، اس میں ایک راوی مبہم ہے۔ جس کا نام ہی نہیں۔ تیسرے یہ حدیث مرفوع بیان ہی نہیں کرتے۔ ہاں امام قرطبیؒ اسے قبول کرتے ہیں۔ وہ اسکا ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے سامنے ہر پیر اور ہر جمعرات کو اعمال پیش کئے جاتے ہیں۔ پس وہ انبیاء اور ماں باپ پر ہر جمعہ کو پیش کئے جاتے ہیں اور اس میں کوئی تعارض نہیں۔ ممکن ہے کہ ہمارے نبی ﷺ پر بھی ہر جمعہ کو پیش کئے جاتے ہوں اور ہر دن بھی۔

پھر فرماتا ہے کہ اس دن کافر اور نافرمان آرزو کرے گا کہ کاش کہ زمین پھٹ جاتی اور یہ اس میں سما جاتا، پھر برابر ہو جاتی۔ کیوں کہ ناقابل برداشت ہولنا کیوں، رسوائیوں اور ڈانٹ ڈپٹ سے گھبرا اُٹھے گا جیسے اور آیت میں ﴿ يَوْمَ يَنْظُرُ الْمَرْءُ ﴾ (النبا: ۴۰) جس دن انسان اپنے آگے پیچھے ہوئے اعمال اپنی آنکھوں سے دیکھ لے گا اور کافر کہے گا کاش کہ میں مٹی ہو گیا ہوتا۔ پھر فرمایا یہ ان تمام بد افعالیوں کا اقرار کریں گے جو انہوں نے کی تھیں اور ایک چیز بھی پوشیدہ نہ رکھ سکیں گے۔ ایک شخص نے حضرت ابن عباسؓ سے کہا: ایک جگہ تو قرآن میں ہے کہ مشرکین قیامت کے دن کہیں گے: ﴿ وَاللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِيْنَ ﴾ (الانعام: ۲۳) اللہ کی قسم رب کی قسم ہم نے شرک نہیں کیا اور دوسری جگہ ہے: ﴿ لَا يَكْتُمُوْنَ اللّٰهَ حَدِيْثًا ﴾ اللہ سے

ایک بات بھی نہ چھپائیں گے۔ پھران دونوں آیتوں کا کیا مطلب ہے۔ آپ نے فرمایا: اس کا اور وقت ہے اس کا وقت اور ہے۔ جب موحدوں کو جنت میں جاتے ہوئے دیکھیں گے تو کہیں گے آؤ تم بھی اپنے شرک کا انکار کرو۔ کیا عجب کام چل جائے پھرانکے منہ پر مہریں لگ جائیں گی اور ہاتھ پاؤں بولنے لگیں گے۔ اب اللہ تعالیٰ سے ایک بات بھی نہ چھپائیں گے۔ (ابن جریر)

مسند عبدالرزاق میں ہے کہ اس شخص نے کہا تھا بہت سی چیزیں مجھ پر قرآن میں مختلف ہوتی ہیں تو آپ نے فرمایا: کیا مطلب تجھے کیا قرآن میں شک ہے؟ اس نے کہا: شک تو نہیں۔ ہاں میرے خیال میں اختلاف نظر آ رہا ہے۔ آپ نے فرمایا: جہاں جہاں اختلاف نظر آ رہا ہے۔ ان مقامات کو پیش کر۔ تو اس نے یہ دو آیتیں پیش کیں کہ ایک سے چھپانا پایا جاتا ہے دوسرے سے نہ چھپانا ثابت ہوتا ہے تو آپ نے اسے یہ جواب دے کر دونوں آیتوں کی تطبیق سمجھا دی۔ ایک اور روایت میں سائل کا نام بھی آیا ہے کہ وہ حضرت نافع بن رزاق تھا اور یہ بھی ہے کہ حضرت ابن عباسؓ ان سے بھی یہ فرمایا کہ شاید تم کسی مجلس سے آ رہے ہو۔ وہاں بھی تذکرہ ہو رہا ہوگا۔ تم نے کہا ہوگا کہ میں جاتا ہوں اور ابن عباسؓ سے دریافت کرتا ہوں اگر میرا یہ گمان صحیح ہے تو تمہیں لازم ہے کہ جواب سن کر انہیں بھی سنا دو۔ پھر یہ جواب دیا۔

يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ وَلَا جُنُبًا اِلَّا عَابِرِيْ سَبِيْلٍ حَتّٰى تَغْتَسِلُوْا ؕ وَاِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰٓى اَوْ عَلٰى سَفَرٍ اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآئِطِ اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَاَيْدِيْكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا غَفُوْرًا ﴿۴۳﴾

اے ایمان والو! نماز کے پاس بھی ایسی حالت میں مت جاؤ کہ تم نشہ میں ہو۔ یہاں تک کہ تم سمجھنے لگو کہ منہ سے کیا کہتے ہو اور حالت جنابت میں بھی باستثنا تمہارے مسافر ہونے کی حالت کے یہاں تک غسل کرلو اور اگر تم بیمار ہو یا حالت سفر میں ہو یا تم میں سے کوئی شخص استنجے سے آیا ہو یا تم نے بیبیوں سے قربت کی ہو پھر تم کو کوئی پانی نہ ملے تو تم پاک زمین سے تیمم کر لیا کرو یعنی اپنے چہرے اور ہاتھوں پر پھیر لیا کرو۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ بڑے معاف کرنے والے بڑے بخشنے والے ہیں۔ ○

شراب کی ممانعت ☆

اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے ایماندار بندوں کو نشے کی حالت میں نماز پڑھنے سے روک رہا ہے۔ کیونکہ اس وقت نمازی معلوم ہی نہیں کر سکتا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ ساتھ ہی محل نماز یعنی مسجد میں آنے سے بھی ممانعت ہے۔ اسے بھی اور جنبی شخص کو

بھی۔یعنی نہانے کی حاجت ہو۔ہاں ایسا شخص کسی کام کی وجہ سے مسجد کے ایک دروازے سے جا کر دوسرے سے نکل جائے۔وہاں ٹھہرے نہیں تو یہ گزرنا جائز ہے۔نشے کی حالت میں نماز کے قریب نہ جانے کا حکم شراب کی حرمت سے پہلے تھا۔جیسے اس حدیث سے ظاہر ہے جو ہم نے سورۂ بقرہ کی آیت ﴿یَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَیْسِرِ﴾ (البقرہ ۲۱۹) کی تفسیر میں ذکر کی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جب وہ آیت حضرت عمرؓ کے سامنے تلاوت کی۔تو آپ نے دعا کی کہ خدایا شراب کے بارے میں اور صاف صاف بیان نازل فرما۔پھر یہ آیت اتری یعنی نشے کی حالت میں نماز کے قریب نہ جانے کی اس پر نمازوں کے وقت اس کا پینا چھوڑ دیا۔اسے سن کر بھی جناب فاروقؓ نے یہی دعا مانگی۔تو آیت: ﴿یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَیْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّیْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ﴾ سے ﴿فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ﴾ (المائدہ ۹۱-۹۰) تک نازل ہوئی جس میں شراب سے بچنے کا حکم صاف موجود ہے۔اسے سن کر فاروق اعظمؓ نے فرمایا: ہم باز آئے۔اسی روایت کی ایک سند میں ہے کہ جب سورہ نساء کی یہ آیت نازل ہوئی اور نشے کے وقت نماز پڑھنے کی ممانعت ہوئی۔اس وقت یہ دستور تھا کہ جب نماز کھڑی ہوتی تو ایک شخص آواز لگاتا کہ کوئی نشہ والا نماز کے قریب نہ آئے۔

ابن ماجہ شریف میں ہے' حضرت سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں: میرے بارے میں چار آیتیں نازل ہوئیں۔ایک انصاری نے دعوت کی۔ہم نے خوب کھایا پیا پھر شراب پی اور مخمور ہو گئے۔پھر آپس میں فخر جتانے لگے۔ایک شخص نے اونٹ کے جبڑے کی ہڈی اٹھا کر حضرت سعدؓ کے ماری جس سے ناک پر زخم آیا اور اس کا نشان باقی رہ گیا۔اس وقت تک شراب کو اسلام نے حرام نہیں کیا تھا۔پس یہ آیت نازل ہوئی۔یہ حدیث صحیح مسلم شریف میں بھی ہے۔ابن ابی حاتم کی روایت میں بھی ہے کہ عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے دعوت کی۔لوگ گئے' کھانا کھایا' پھر شراب پی اور مست ہو گئے۔اتنے میں نماز کا وقت آ گیا۔ایک شخص کو امام بنایا۔اس نے نماز میں سورۂ: ﴿قُلْ یٰاَیُّهَا الْكٰفِرُوْنَ﴾ میں اس طرح پڑھا مَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ۔ وَنَحْنُ نَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ۔اس پر یہ آیت اتری اور نشے کی حالت میں نماز کا پڑھنا منع کیا گیا۔یہ حدیث ترمذی میں بھی ہے اور حسن ہے۔ابن جریر کی روایت میں ہے کہ حضرت علیؓ' حضرت عبدالرحمٰنؓ اور تیسرے ایک اور صاحب نے شراب پی اور حضرت عبدالرحمٰن نماز میں امام بنائے گئے اور قرآن کی قراءت خلط ملط کر دی۔اس پر یہ آیت اتری۔ابوداؤد اور نسائی میں بھی یہ روایت ہے۔ابن جریر کی ایک اور روایت میں ہے' حضرت علیؓ نے امامت کی اور جس طرح پڑھنا چاہئے تھا' نہ پڑھ سکے۔اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ایک اور روایت میں ہے کہ حضرت عبدالرحمٰن ابن عوفؓ نے امامت کرائی اور اس طرح پڑھا: قُلْ یٰاَیُّهَا الْكٰفِرُوْنَ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ وَاَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ وَاَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدْتُّمْ لَكُمْ دِیْنُكُمْ وَلِیَ دِیْنِ۔پس یہ آیت نازل ہوئی اور اس حالت میں نماز پڑھنا حرام کر دیا گیا۔ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ شراب کی حرمت سے پہلے لوگ نشہ کی حالت میں نماز کے لئے کھڑے ہو جایا کرتے تھے۔پس اس آیت سے انہیں ایسا کرنے سے روک دیا گیا۔(ابن جریر)

حضرت قتادہ فرماتے ہیں: اس کے نازل ہونے کے بعد لوگ اس سے رک گئے۔پھر شراب کی مطلق حرمت نازل ہوئی۔حضرت ضحاکؒ فرماتے ہیں: اس سے شراب کا نشہ مراد نہیں بلکہ نیند کا خمار مراد ہے۔امام ابن جریر فرماتے ہیں: ٹھیک یہی ہے کہ مراد اس سے شراب کا نشہ ہے اور یہاں خطاب ان سے کیا گیا ہے جو نشہ میں ہیں۔لیکن نہ اتنے کہ احکام شرع ان پر جاری ہی نہ ہو سکیں۔کیونکہ نشہ کی ایسی حالت والا شخص مجنوں کے حکم میں ہے۔بہت سے اصولی حضرات کا قول ہے کہ خطاب ان

لوگوں سے ہے جو کلام کو سمجھ سکیں۔ نہ نشے والوں سے جو سمجھتے ہی نہیں کہ ان سے کیا کہا جا رہا ہے۔ اس لئے کہ خطاب کا سمجھنا شرط ہے تکلیف کی اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ گو الفاظ یہ ہیں کہ نشہ کی حالت میں نماز نہ پڑھو۔ لیکن مراد یہ ہے نشے کی چیز کھاؤ پیو بھی نہیں۔ اس لئے کہ دن رات میں پانچ وقت نماز فرض ہے تو کیسے ممکن ہے کہ ایک شرابی ان پانچ وقتوں کی نمازیں ٹھیک وقت پر ادا کر سکے۔ حالانکہ شراب برابر پی رہا ہے۔ واللہ اعلم۔ پس یہ حکم بھی اسی طرح ہوگا جس طرح یہ حکم ہوگا کہ ایمان والو! اللہ سے ڈرتے رہو جتنا اس سے ڈرنے کا اس کا حق ہے اور تم کو اسلام پر ہی مرنا چاہئے تو اس سے مراد یہ ہے کہ ایسی تیاری ہر وقت رکھو اور ایسے پاکیزہ اعمال ہر وقت کرتے رہو کہ جب تمہیں موت آئے تو اسلام پر دم نکلے۔ یہ جو آیت میں ارشاد ہوا ہے کہ یہاں تک کہ تم اس کو معلوم کر سکو جو تم کہہ رہے ہو' یہ نشہ کی حد ہے۔ یعنی نشہ کی حالت میں اس شخص کو سمجھا یا جائے گا۔ جو یہ بات صحیح طور پر سمجھ سکے۔ نشہ والا انسان قراءت میں خلط ملط کر دے گا۔ اسے سوچنے سمجھنے اور غور و فکر کرنے کا موقعہ نہ ملے گا۔ نہ اس سے عاجزی اور خشوع خضوع ہو سکتا ہے۔ مسند احمد میں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: جب تم میں سے کوئی اونگھنے لگے اور ہو وہ نماز میں تو اسے چاہئے کہ لوٹ جائے اور سو جائے جب تک کہ جاننے لگے۔ جو کچھ کہہ رہا ہے۔ بخاری اور نسائی میں یہ حدیث ہے اور اس کے بعض طرق میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ ممکن ہے کہ چاہے تو وہ اپنے لئے استغفار کرنا' لیکن زبان سے اس کے خلاف نکلے۔

پھر فرمان ہے کہ نہ جنبی نماز کے قریب جائے جب تک غسل نہ کر لے۔ ہاں مسجد میں سے صرف گزرنا جائز ہے۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں: ایسی ناپاکی کی حالت میں مسجد میں جانا ناجائز ہے۔ ہاں مسجد کے ایک طرف سے دوسری طرف نکل جانے میں کوئی حرج نہیں۔ مسجد میں بیٹھے نہیں اور بھی بہت سے صحابہ اور تابعین کا یہی قول ہے۔ حضرت یزید بن ابو حبیب فرماتے ہیں: بعض انصار جو مسجد کے اردگرد رہتے تھے اور جنبی ہوتے تھے۔ گھر میں پانی نہیں ہوتا اور گھر کے دروازے مسجد سے متصل تھے' انہیں اجازت ہوئی کہ مسجد سے اس حالت میں گزر سکتے ہیں۔ بخاری شریف کی ایک حدیث سے بھی یہ بات صاف طور ثابت ہوتی ہے کہ لوگوں کے گھروں کے دروازے مسجد میں تھے۔ چنانچہ حضور ﷺ نے اپنے مرض الموت میں فرمایا تھا کہ مسجد میں جن جن لوگوں کے دروازے پڑتے ہیں' سب کو بند کر دو۔ صرف ابو بکر کا دروازہ رہنے دو۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ آپ کے بعد آپ کے جانشین حضرت ابو بکرؓ ہوں گے تو انہیں ہر وقت اور بکثرت مسجد میں آنے جانے کی ضرورت رہے گی۔ تاکہ مسلمانوں کے اہم امور کا فیصلہ کر سکیں۔ اس لئے آپ نے سب کے دروازے بند کرنے اور صدیق اکبرؓ کا دروازہ کھلا رکھنے کی ہدایت فرمائی۔ بعض سنن کی اس حدیث میں بجائے حضرت ابو بکرؓ کے حضرت علی کا نام ہے۔ وہ بالکل غلط ہے' صحیح یہی ہے جو صحیح میں ہے۔ آیت سے اکثر ائمہ نے دلیل پیش کی ہے کہ جنبی شخص کو مسند میں ٹھہرنا حرام ہے۔ ہاں گزر جانا جائز ہے۔ اسی طرح حیض و نفاس والی عورتوں کو بھی اور بعض کہتے ہیں ان دونوں کو گزرنا بھی جائز نہیں۔ ممکن ہے مسجد میں آلودگی ہو اور بعض کہتے ہیں اگر اس بات کا خوف نہ ہو۔ تو ان کا گزرنا بھی جائز ہے۔ صحیح مسلم شریف کی حدیث میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے حضرت عائشہؓ سے فرمایا کہ مسجد سے مجھے بوریا اٹھا دو' انہوں نے عرض کیا کہ حضور میں حیض ہوں۔ آپ نے فرمایا: تیرا حیض تیرے ہاتھ میں نہیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ حائضہ مسجد میں آ جا سکتی ہے اور نفاس والی کا بھی یہی حکم ہے۔ ابو داؤد میں فرمان رسول ﷺ ہے کہ میں حائض اور جنبی کے لئے مسجد کو حلال نہیں کرتا۔ امام ابو مسلم خطابی فرماتے ہیں:

اس حدیث کو ایک جماعت نے ضعیف کہا ہے۔ کیونکہ افلت اس کا راوی مجہول ہے۔ لیکن ابن ماجہ میں یہ روایت ہے اس میں افلت کی جگہ محدوج ذہلی ہیں۔ پہلی حدیث بروایت حضرت عائشہؓ ہے اور یہ دوسری بروایت حضرت ام سلمہ ہے لیکن ٹھیک نام حضرت عائشہ کا ہی ہے۔ ایک اور حدیث ترمذی میں ہے جس میں ہے کہ اے علی اس مسجد میں جنبی ہونا میرے اور تیرے سوا کسی کو حلال نہیں۔ یہ حدیث بالکل ضعیف ہے اور ہرگز ثابت نہیں ہوسکتی۔ اس میں سالم راوی ہیں جو متروک ہے اور ان کے استاد عطیہ بھی ضعیف ہیں۔ واللہ اعلم۔ اس آیت کی تفسیر میں حضرت علیؓ فرماتے ہیں: مطلب یہ ہے کہ جنبی شخص اسی حالت میں بغیر غسل کئے نماز نہیں پڑھ سکتا۔ لیکن اگر وہ مسافرت میں ہو اور پانی نہ ملے تو پانی ملنے تک پڑھ سکتا ہے۔ ابن عباس، سعید بن جبیر، اور ضحاک سے بھی یہی روایت ہے۔ حضرت مجاہد، حسن، زید اور عبدالرحمٰن سے بھی یہی نقل ہے۔ عبداللہ بن کثیرؒ فرماتے ہیں: ہم سنا کرتے تھے کہ یہ آیت سفر کے حکم میں ہے۔ اس حدیث سے بھی اس مسئلہ کی شہادت ہوسکتی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: پاک مٹی مسلمان کی طہارت ہے گو دس سال تک پانی نہ ملے اور جب مل جائے تو اسی کا استعمال کرے۔ یہ تیرے لئے بہتر ہے۔

(سنن اور احمد)

امام ابن جریر فرماتے ہیں: ان دونوں اقوال میں اولیٰ قول ان لوگوں کا ہے جو کہتے ہیں کہ مراد مسجد میں جانا ہے۔ کیونکہ جس مسافر کو جنب کی حالت میں پانی نہ ملے اس کا حکم تو آگے صاف بیان ہوا ہے۔ پس اگر یہی مطلب یہاں بھی لیا جائے تو پھر اسے لوٹانے کی دوسرے جملہ میں کچھ ایسی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

معنی آیت کے اب یہ ہوئے کہ ایمان والو نماز کے لئے مسجد میں نہ جاؤ جب کہ تم نشے میں ہو' جب تک تم اپنی بات کو آپ نہ سمجھنے لگو۔ اسی طرح جنابت کی حالت میں بھی مسجد میں نہ جاؤ۔ جب تک نہانہ لو' ہاں بطور گزر جانے کے جائز ہے۔ عابر کے معنی آنے جانے یعنی گزر جانے والے ہیں۔ اس کا مصدر عَبرًا اور عُبُورًا آتا ہے۔ جب کوئی نہر سے گزر جائے تو عرب کہتے ہیں: عَبَرَ فُلَانُ النَّهرَ فلاں شخص نے نہر کو عبور کرلیا۔ اسی طرح قوی اونٹنی کو جو سفر طے کرتی ہو عَبرَ الاَسنَاء کہتے ہیں۔ امام ابن جریرؒ جس قول کی تائید کرتے ہیں' یہی قول جمہور کا ہے اور آیت سے ظاہر یہی ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ اس ناقص حالت میں نماز سے منع فرمارہا ہے جو مقصود نماز کے خلاف ہے۔ اسی طرح نماز کی جگہ میں ایسی حالت سے آنے کو روکتا ہے۔ جو اس جگہ کی عظمت اور پاکیزگی کے خلاف ہیں واللہ اعلم۔

پھر جو فرمایا کہ یہاں تک کہ تم غسل کرلو۔ یہ دلیل ہے امام ابوحنیفہؒ اور امام مالکؒ کی اور امام شافعیؒ کی کہ جنبی کو مسجد میں ٹھہرانا حرام ہے جب تک کہ غسل نہ کرلے۔ یا اگر پانی نہ ملے یا پانی ہو۔ لیکن اس کے استعمال کی قدرت نہ ہو تو تیمم کرلے۔ حضرت امام احمدؒ فرماتے ہیں: جب جنبی نے وضو کرلیا تو اسے مسجد میں ٹھہرنا جائز ہے۔ چنانچہ مسند احمد اور سنن سعید بن منصور میں ہے' حضرت عطا بن یسارؒ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کے صحابہ کو دیکھا کہ وہ جنبی ہوتے اور وضو کرکے مسجد میں بیٹھے رہتے۔ واللہ اعلم۔ پھر تیمم کے مواقع بیان فرماتے۔ جس بیماری کی وجہ سے تیمم جائز ہوتا ہے وہ بیماری ہے کہ اس وقت پانی کے استعمال سے کسی عضو کے ختم ہوجانے یا اس کے خراب ہوجانے یا مرض کے بڑھ جانے کا خوف ہو۔ بعض علما نے ہر مرض کی جازت کا فتویٰ دیا ہے کیونکہ آیت میں عموم ہے۔ حضرت مجاہد فرماتے ہیں کہ ایک انصاری بیمار تھے۔ نہ تو کھڑے ہوکر وضو کرسکتے تھے' نہ اُن کا کوئی خادم تھا جو انہیں پانی دے۔ انہوں نے آنحضرت ﷺ سے اس کا ذکر کیا۔ اس پر یہ حکم اترا۔ یہ

روایت مرسل ہے۔ دوسری حالت تیمّم کی سفر ہے خواہ لمبا ہو یا چھوٹا۔ غائط کہتے ہیں نرم زمین کو۔ یہاں اس سے پاخانہ پیشاب سے کنایہ کیا گیا ہے۔

لمس کی تشریح ☆

لَمَسْتُمُ کی دوسری قرأت لَمَسْتُم ہے۔ اس کی تفسیر میں دو قول ہیں۔ ایک یہ کہ مراد جماع ہے۔ جیسے اور آیت میں ہے: وَإِن طَلَّقْتُمُوهُنَّ مِن قَبْلِ أَن تَمَسُّوهُنَّ (البقرہ: ۲۳۷) یعنی اگر تم اپنی بیویوں کو مجامعت سے پہلے طلاق دو اور ان کا مہر مقرر ہو تو جو مقرر ہوا اس سے آدھا دے دو اور آیت میں ہے: اے ایمان والو! جب تم ایمان والی عورتوں سے نکاح کرو پھر مجامعت سے پہلے انہیں طلاق دے دو تو ان کے ذمہ عدت نہیں۔ یہاں بھی لفظ: ﴿مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ﴾ ہے۔ حضرت ابن عباس سے منقول ہے کہ ﴿اَوْلٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ﴾ سے مراد مجامعت ہے۔ حضرت علیؓ، حضرت ابی بن کعبؓ، حضرت مجاہد، حضرت طاؤسؒ، حضرت حسنؒ، حضرت عبیدہؒ بن عمیر، حضرت سعید بن جبیرؒ، حضرت شعبیؒ، حضرت قتادہؒ، حضرت مقاتل بن حبان سے بھی یہی منقول ہے۔ سعید بن جبیرؒ فرماتے ہیں: ایک دفعہ اس لفظ پر مذاکرہ ہوا تو چند موالی نے کہا: یہ جماع نہیں اور چند عرب نے کہا جماع ہے۔ میں نے حضرت ابن عباسؓ سے اس کا بیان کیا۔ آپ نے پوچھا: تم کن کے ساتھ تھے؟ میں نے کہا: موالی کے۔ فرمایا: موالی مغلوب ہو گئے۔ لمس اور مس اور مباشرت کے معنی جماع کے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے یہاں کنا یہ کیا ہے۔ بعض اور حضرات نے اس سے مراد مطلق چھونا لیا ہے۔ خواہ اپنے جسم کو عورت کے کسی حصہ کو جسم سے ملایا جائے تو وضو واجب ہو جاتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں: لمس جماع کے علاوہ اور معنی میں آتا ہے۔ آپ فرماتے ہیں: بوسہ بھی لمس میں آتا ہے اور اس سے بھی وضو کرنا پڑے گا۔ فرماتے ہیں: مباشرت سے ہاتھ لگانے سے بوسہ لینے سے وضو کرنا پڑے گا لمس سے مراد چھونا ہے۔ ابن عمرؓ بھی عورت کا بوسہ لینے سے وضو کرنے کا قائل تھے۔ اسے مس میں داخل جانتے تھے۔ عبیدہؒ، ابو عثمانؒ، ثابتؒ ابراہیم، زیدؒ بھی کہتے ہیں لمس سے مراد جماع کے علاوہ ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر فرماتے ہیں: انسان کا اپنی بیوی کا بوسہ لینا اور اسے ہاتھ لگانا ملامت ہے۔ اس سے وضو کرنا پڑے گا۔ (موطا امام مالک) دار قطنی میں خود حضرت عمرؓ سے بھی اسی طرح منقول ہے۔ لیکن دوسری روایت آپ سے اس کے خلاف بھی پائی جاتی ہے کہ آپ باوضو تھے۔ آپ نے اپنی بیوی کا بوسہ لیا۔ پھر وضو نہ کیا اور نماز ادا کی۔ پس دونوں روایتوں کے ثابت ماننے کے بعد یہ فیصلہ کرنا پڑے گا کہ آپ وضو کو مستحب جانتے تھے واللہ اعلم۔

مطلق چھونے سے وضو کے قائل امام شافعیؒ اور ان کے ساتھی ہیں اور امام مالکؒ ہیں اور مشہور امام احمد حنبلؒ سے بھی ہے۔ اس قول کے قائل کہتے ہیں کہ یہاں دو قرأتیں ہیں۔ لَمَسْتَم اور لٰمَسْتُم اور لمس کا اطلاق ہاتھ لگانے پر بھی قرآن کریم میں آیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے: ﴿وَلَوْ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ كِتٰبًا فِيْ قِرْطَاسٍ فَلَمَسُوْهُ بِاَيْدِيْهِمْ﴾ (الانعام: ۷) ظاہر ہے کہ یہاں ہاتھ لگانا ہی مراد ہے۔ اس طرح حضرت ماعز بن مالک کو رسول اللہ کا یہ فرمانا کہ شاید تم نے بوسہ لیا ہو گا یا ہاتھ لگایا ہو گا۔ وہاں بھی لفظ لَمَسْتَ ہے اور صرف ہاتھ لگانے کے معنی میں ہی ہے اور حدیث میں ہے: وَالْيَدُ زِنَاهَا اللَّمْسُ ہاتھ کا زنا چھونا اور ہاتھ لگانا ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتی ہیں: بہت کم دن ایسے گزرتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ ہمارے پاس آکر بوسہ نہ لیتے ہوں اور ہاتھ نہ لگاتے ہوں۔ صحیحین کی حدیث میں ہے کہ حضور ﷺ نے بیع ملامست سے فرمایا ہے: یہ

بھی ہاتھ لگانے کی بیع ہے۔ پس یہ لفظ جس طرح جماع پر بولا جاتا ہے۔ شاعر کہتا ہے: وَلَمَسْتُ كَفِّي كَفَّهُ اَطْلُبُ الْغِنٰى میرا ہاتھ اس کے ہاتھ سے ملا۔ میں تو نگری چاہتا تھا۔ ایک اور روایت میں ہے کہ ایک شخص سرکار محمدی صلی اللہ علیہ وسلم میں حاضر ہو کر عرض کرتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس شخص کے بارے میں کیا فیصلہ ہے جو ایک اجنبیہ عورت کے ساتھ وہ کام کرتا ہے جو میاں بیوی میں ہوتے ہیں۔ سوائے جماع کے۔ تو آیت: ﴿اِذَا قُمْتُمْ﴾ (المائدہ:۶) نازل ہوئی اور حضور فرماتے ہیں: وضو کر کے نماز ادا کرے۔ اس پر حضرت معاذ پوچھتے ہیں: کیا یہ اسی کے لئے خاص ہے یا سب مسلمانوں کے لئے عام ہیں؟ آپ نے فرمایا: تمام مسلمانوں کے لئے عام ہے۔ امام ترمذی اسے زائدہ کی حدیث سے روایت کر کے فرماتے ہیں: اس کی سند متصل نہیں۔ امام نسائی اسے مرسلاً روایت کرتے ہیں۔

الغرض اس قول کے قائل اس حدیث سے یہ کہتے ہیں کہ اسے وضو کا حکم اسی لئے دیا گیا ہے کہ اس عورت کو چھوا تھا جماع نہیں کیا تھا۔ اس کا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ اوّلاً تو یہ منقطع ہے۔ ابن ابی یعلیٰ اور معاذ کے درمیان ملاقات کا ثبوت نہیں۔ دوسرے یہ کہ ہوسکتا ہے اسے وضو کا حکم فرض نماز کی ادائیگی کے لئے دیا ہو۔ جیسے حضرت صدیقؓ والی حدیث میں ہے کہ جو بندہ کوئی گناہ کرے۔ پھر وضو کر کے دو رکعت نماز ادا کرے تو اللہ تعالیٰ اس کے گناہ معاف فرما دیتا ہے۔ یہ پوری حدیث سورہ آل عمران میں آیت: ﴿ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ﴾ (آل عمران:۱۳۵) کی تفسیر میں گزر چکی ہے۔ امام ابن جریرؒ فرماتے ہیں: ان دونوں قولوں میں سے اولیٰ قول ان کا ہے جو کہتے ہیں کہ مراد اس سے جماع ہے۔ کیونکہ ایک مرفوع حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی کسی بیوی صاحبہ کا بوسہ لیا اور وضو نہ کیا اور نماز پڑھی حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم وضو کرتے، پھر بوسہ لیتے پھر نماز پڑھتے اور وضو کرتے۔ حضرت حبیبؒ فرماتے ہیں: حضرت عائشہ نے فرمایا: حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنی کسی بیوی کا بوسہ لیتے پھر نماز کو جاتے اور وضو نہ کرتے۔ میں نے کہا وہ آپ ہی ہوں گی۔ تو آپ مسکرا دیں۔ اس کی سند میں کلام ہے۔ لیکن دوسری سندوں سے ثابت ہے کہ اوپر کے راوی یعنی حضرت صدیقہ سے سننے والے حضرت عروہ بن زبیرؒ ہیں اور روایت میں ہے کہ وضو کے بعد حضور میرا بوسہ لیتے پھر وضو دہراتے اور سند سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بوسہ لیا۔ پھر وضو نہ کیا اور نماز ادا کی۔ حضرت ام سلمہؓ فرماتی ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بوسہ لیتے حالانکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم روزے سے ہوتے۔ پھر نہ تو روزہ جاتا نہ تو وضو کرتے۔ (ابن جریر) حضرت زینب سہمیہ فرماتی ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بوسہ لینے کے بعد وضو نہ کرتے اور نماز پڑھتے۔

تیمّم کے مسائل اور احکام ☆

پھر فرماتا ہے اگر پانی نہ پاؤ تو پاک مٹی سے تیمم کرلو۔ اس سے اکثر فقہا نے استدلال کیا ہے کہ پانی نہ پانے والے کے لئے تیمم کی اجازت پانی کی تلاش کے بعد ہے۔ کتب فروع میں تلاش کی کیفیت بھی لکھی ہے۔ صحیحین میں ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو دیکھا کہ علیحدہ کھڑا ہے اور لوگوں کے ساتھ نماز نہیں پڑھی تو آپ نے اس سے پوچھا: تو نے لوگوں کے ساتھ نماز کیوں نہ پڑھی، کیا تو مسلمان نہیں ہے۔ اس نے کہا: یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہوں تو مسلمان، لیکن جنبی ہو گیا ہوں اور پانی نہ ملا۔ آپ نے فرمایا: پھر اس صورت میں تجھے مٹی کافی تھی۔ تیمم کے لفظی معنی قصد کرنے کے ہیں عرب کہتے ہیں تَيَمَّمَكَ اللّٰهُ بِحِفْظِهٖ یعنی اللہ اپنی حفاظت کے ساتھ تیرا قصد کرے۔ امراؤالقیس کے شعر میں بھی یہ لفظ اسی معنی میں آیا ہے اور صعید کے معنی ہر وہ چیز

جوز مین سے اوپر کو چڑھی۔ اس میں مٹی' ریت' درخت' پتھر' گھاس بھی داخل ہو جائیں گے۔ امام مالک کا قول یہی ہے اور کہا گیا ہے کہ جو چیز مٹی کی جنس سے ہو۔ جیسے ریت' ہڑتال اور چونا یہ مذہب ابوحنیفہ کا ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ صرف مٹی ہی یہ قول ہے۔ حضرت امام شافعیؒ، امام احمد حنبل اور ان کے تمام ساتھیوں کا۔ اس کی دلیل ایک تو قرآن کریم کے یہ الفاظ ہیں ﴿فَتُصْبِحَ صَعِيْدًا زَلَقًا﴾ (الکہف: ۴۰) یعنی ہو جائے وہ مٹی پھسلتی۔ دوسری دلیل صحیح مسلم شریف کی یہ حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ہمیں تمام لوگوں پر تین فضیلتیں دی گئی ہیں۔ ہماری صفیں مثل فرشتوں کے کی گئیں۔ ہمارے لئے ساری زمین مسجد بنائی گئی اور زمین کی مٹی ہمارے لئے پاک اور پاک کرنے والی بنائی گئی۔ جب کہ ہم پانی نہ پائیں اور ایک سند سے بجائے تربت کے تراب کا لفظ مروی ہے۔ پس اس حدیث میں احسان کے جتانے کے وقت مٹی کی تخصیص کی گئی۔ اگر کوئی اور چیز بھی وضو کے قائم مقام کام آنے[1] والی ہوتی تو اس کا ذکر بھی ساتھ ہی کر دیتے۔ یہاں پر لفظ طیب جو ہے اس کے معنی میں کہا گیا ہے کہ مراد حلال ہے اور کہا گیا ہے کہ مراد پاک ہے۔ جیسے حدیث میں ہے' رسول اللہ فرماتے ہیں: پاک مٹی مسلمان کا وضو ہے گو دس سال تک پانی نہ ملے۔ پھر جب پانی ملے تو اسے استعمال کرے۔ یہ اس کے لئے بہتر ہے۔ امام ترمذیؒ اسے حسن بھی کہتے ہیں۔ حافظ ابوالحسن قطانؒ بھی اسے صحیح کہتے ہیں۔ ابن عباسؓ فرماتے ہیں: سب سے زیادہ پاک مٹی کھیت کی زمین کی مٹی ہے بلکہ تفسیر ابن مردویہ میں تو اسے مرفوعاً بھی ذکر کیا ہے۔

پھر فرمان ہے کہ اسے اپنے چہرے پر اور ہاتھ پر ملو۔ تیمم وضو کا بدل ہے صرف پاکیزگی حاصل کرنے میں نہ کہ تمام اعضا کے بارے میں۔ تو صرف منہ اور دونوں ہاتھوں پر ملنا کافی ہے اور اس پر اجماع ہے۔ لیکن کیفیت تیمم اور ائمہ کا اختلاف ہے۔ جدید مذہب شافعیؒ ہے کہ دو دفعہ کر کے منہ اور دونوں ہاتھوں کا کہنیوں تک مسح کرنا واجب ہے۔ اس لئے کہ يَدَيْنِ کا اطلاق بغلوں تک اور کہنیوں تک ہوتا ہے۔ جیسے آیت وضو میں اور اسی لفظ کا اطلاق ہوتا ہے اور دوسرا صرف ہتھیلیاں ہی ہوتی ہیں جیسے چور کی حد کے بارے فرمایا: ﴿فَاقْطَعُوْٓا اَيْدِيَهُمَا﴾ (المائدہ: ۳۸) کہتے ہیں۔ یہاں تیمم کے حکم میں ہاتھ کا ذکر مطلق ہے اور وضو کے حکم میں مقید ہے۔ اس لئے اس مطلق کو اس مقید پر محمول کیا جائے گا۔ کیونکہ طہوریت جامع موجود ہے اور بعض لوگ اس کی دلیل میں دارقطنی والی حدیث پیش کرتے ہیں کہ حضور ﷺ نے فرمایا: تیمم کی دو ضربیں ہیں' ایک مرتبہ ہاتھ مار کر منہ پر ملنا اور ایک مرتبہ ہاتھ مار کر دونوں ہاتھوں کی کہنیوں تک ملنا۔ لیکن یہ حدیث صحیح نہیں۔ اس لئے کہ اس کی اسناد میں ضعف ہے حدیث ثابت نہیں۔ ابو داؤد کی ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے ہاتھ ایک دیوار پر مارے اور منہ پر ملے۔ لیکن اس کی اسناد میں محمد بن ثابت عبدی ضعیف ہیں۔ انہیں بعض حافظان حدیث نے ضعیف کہا ہے اور یہی حدیث بعض ثقہ راویوں نے بھی روایت کی ہے لیکن وہ مرفوع کرتے۔ بلکہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا فعل بتلاتے ہیں۔ امام بخاریؒ، امام ابو زرعہ اور امام ابن عدی کا فیصلہ ہے کہ یہ موقوف ہی ہے اور امام بیہقی فرماتے ہیں: اس حدیث کو مرفوع کرنا منکر ہے۔ امام شافعی کی دلیل یہ حدیث بھی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے تیمم کی اور اپنے چہرے اور اپنے دونوں بازوؤں پر ہاتھ پھیرا۔ حضرت ابوجہمؓ فرماتے ہیں: میں نے دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ پیشاب کر رہے ہیں۔ میں نے آپ کو سلام کیا۔ لیکن آپ نے جواب نہ دیا۔ فارغ ہو کر آپ ایک دیوار کے پاس گئے اور اپنے دونوں ہاتھ مار کر اپنے منہ پر ملا۔ پھر دیوار پر دونوں ہاتھ مار کر دونوں

---

[1] دلیل میں درجہ بندی ہے' اس پر متنبہ کرنے کی بھی ضرورت نہیں۔ کیا ہر موقع پر اس کا لحاظ ہوتا ہے کہ تمام چیزوں کا ذکر کیا جائے اور کسی بھی چیز کو نہ چھوڑنے کا اہتمام ہو۔

ہاتھوں کی کہنیوں تک ملا۔ پھر میرے سلام کا جواب دیا۔ (ابن جریر)

یہ تو تھا امام شافعیؒ کا جدید مذہب۔ آپ کا قدیم مذہب یہ ہے کہ ضربیں تو تیمم میں دو ہی ہیں۔ لیکن دوسری ضرب میں ہاتھوں کو پہنچوں تک ملنا چاہئے۔ تیسرا قول یہ ہے کہ صرف ایک ہی ضرب یعنی ایک ہی مرتبہ دونوں ہاتھوں کا مٹی پر مار لینا کافی ہے گرد آلود ہاتھوں کو منہ پر پھیر لے اور دونوں پہنچے تک۔ مسند احمد میں ہے کہ ایک شخص ایک مرتبہ حضرت امیر المؤمنین عمر فاروقؓ کے پاس آیا کہ میں جنبی ہوں اور مجھے پانی نہ ملا تو مجھے کیا کرنا چاہئے؟ آپ نے فرمایا: نماز نہ پڑھنی چاہئے۔ دربار میں حضرت عمارؓ بھی موجود تھے۔ فرمانے لگے: امیر المؤمنین کیا آپ کو یاد نہیں کہ میں اور آپ ایک لشکر میں تھے اور ہم جنبی ہو گئے تھے اور پانی ہمیں نہ ملا۔ تو آپ نے تو نماز نہ پڑھی اور میں نے مٹی میں لوٹ پوٹ کر نماز ادا کر لی جب ہم واپس پلٹے اور میں اس واقعہ کا بیان حضور ﷺ سے کیا تو آپ نے فرمایا: تجھے اتنا کافی تھا۔ پھر حضور ﷺ نے اپنے ہاتھ زمین پر مارے اور ان میں پھونک ماری اور اپنے منہ کو ملا اور ہتھیلیوں کو ملا۔ مسند احمد میں ہے حضرت شقیقؒ فرماتے ہیں کہ میں حضرت عبداللہ اور حضرت ابو موسیٰ کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ تو حضرت ابو یعلیٰؒ نے حضرت عبداللہ سے کہا کہ اگر کوئی شخص پانی نہ پائے تو نماز نہ پڑھے۔ اس پر حضور عبداللہ نے فرمایا: کیا تمہیں یاد نہیں جب کہ مجھے اور آپ کو رسول اللہ ﷺ نے اونٹوں میں بھیجا تھا۔ وہاں میں جنبی ہو گیا اور مٹی میں لوٹ پوٹ لیا۔ واپس آ کر حضور ﷺ سے یہ بیان کیا تو آپ ہنس دیئے اور فرمایا: تجھے اس طرح کرنا کافی تھا۔ پھر آپ نے دونوں ہاتھ زمین پر مارے اور اپنی دونوں ہتھیلیوں کو ایک ساتھ مل لیا اور اپنے چہرہ پر ایک بار ہاتھ پھیر لئے۔ ضرب ایک ہی رہی تو حضرت عبداللہؓ نے فرمایا۔ لیکن حضرت عمرؓ نے اس پر قناعت نہ کی۔ یہ سن کر حضرت ابو موسیٰ نے فرمایا: پھر تم اس آیت کا کیا کرو گے جو سورہ نساء میں ہے کہ پانی نہ پاؤ تو پاک مٹی کا قصد کرو۔ اس کا جواب حضرت عبداللہ نہ دے سکے۔ سنو! اگر ہم لوگوں کو تیمم کی رخصت دے دی تو بہت ممکن ہے کہ پانی جب انہیں ٹھنڈا معلوم ہوگا تو وہ تیمم کرنے لگیں گے۔

سورہ مائدہ میں فرمان ہے: ﴿فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَاَيْدِيْكُمْ مِّنْهُ﴾ (المائدہ:۶) سے اپنے ہاتھ پر ملو۔ اس سے حضرت امام شافعیؒ نے دلیل پیش کی ہے کہ تیمم کا پاک مٹی سے ہونا اور اس کا بھی غبار آلود ہونا جس سے ہاتھوں پر غبار لگے اور وہ منہ اور ہاتھ پر ملا جائے ضروری ہے۔ جیسے کہ حضرت ابوجہمؓ والی حدیث میں گزرا کہ انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو استنجا کرتے ہوئے دیکھا اور سلام کیا۔ اس میں یہ بھی ہے کہ فارغ ہو کر آپ ایک دیوار کے پاس گئے اور اپنی لکڑی سے کھرچ کو پھر ہاتھ مار کر تیمم کیا۔ پھر فرمان ہے کہ اللہ تعالیٰ تم پر تمہارے دین میں تنگی اور سختی کرنا پسند نہیں کرتا۔ بلکہ وہ تمہیں پاک صاف کرنا چاہتا ہے۔ اسی پانی نہ پانے کے وقت مٹی کے ساتھ تیمم کر لینے کو مباح قرار دے کر تم پر اپنی نعمت انعام فرمائی تا کہ تم شکر کرو۔ پس یہ اُمت اس نعمت کے ساتھ مخصوص ہے جیسے کہ صحیحین میں ہے۔

بعض خصوصیات ☆

حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: مجھے پانچ چیزیں ایسی دی گئی ہیں جو مجھ سے پہلے کسی کو نہیں دی گئیں۔ مہینے بھر کی راہ تک میری مدد رعب سے کی گئی ہے۔ میرے لئے ساری زمین مسجد اور پاک کرنے والی بنائی گئی ہے۔ میرے جس امتی کو نماز کا وقت یہاں آ جائے وہ وہیں پڑھ لے۔ اس کی مسجد اور اس کا وضو وہیں اس کے پاس موجود ہے۔ میرے لئے غنیمت کے مال حلال کئے گئے۔ جو مجھ سے پہلے کسی کے لئے حلال نہ تھے۔ مجھے شفاعت دی گئی۔ تمام انبیاء صرف اپنی اپنی قوم کی طرف بھیجے

جاتے رہے۔ لیکن میں تمام دنیا کی طرف بھیجا گیا۔

اُمتِ محمدیہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بعض امتیازات ☆

اور صحیح مسلم کے حوالے سے وہ حدیث بھی پہلے گزر چکی ہے کہ تمام لوگوں پر ہمیں تین فضیلتیں عنایت کی گئیں۔ ہماری صفیں فرشتوں کی صفوں کی طرح بنائی گئیں۔ ہمارے لئے ساری زمین مسجد بنائی گئی اور اس کی مٹی وضو بنائی گئی۔ جب کہ ہمیں پانی نہ ملے۔ اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ بزرگ و برتر حکم دیتا ہے کہ اپنے چہرے اور اپنے ہاتھ پر مسح کرلو۔ پانی نہ ملنے کے وقت اللہ تعالیٰ معاف کرنے والا اور بخشنے والا ہے۔ اس کی عفو در گزر کی شان ہے کہ اس نے تمہارے لئے پانی نہ ملنے کے وقت تیمم شروع کر کے نماز پڑھنے کی اجازت مرحمت فرمائی۔ اگر یہ رخصت نہ ہوتی تو تم ایک گونہ مشکل میں پڑ جاتے۔ کیونکہ اس آیۂ کریمہ میں نماز کو ناقص حالت میں ادا کرنا منع کیا گیا ہے۔ مثلاً نشے کی حالت میں یا جنابت کی حالت میں یا بے وضو ہو تو جب تک اپنی باتیں خود سمجھنے جتنا ہوش اور باقاعدہ غسل اور شرعی طریق پر وضو نہ ہو' نماز نہیں پڑھ سکتا۔ لیکن بیماری کی حالت میں اور پانی نہ ملنے کی صورت میں غسل اور وضو کے قائم مقام تیمم کر دیا۔ پس اللہ تعالیٰ کے اس احسان پر ہم اس کے شکر گزار ہیں الحمدللہ۔

شانِ نزول ☆

تیمم کی رخصت نازل ہونے کا وقعہ بھی سن لیجئے۔ ہم اس واقعہ کو سورہ نساء کی اس تفسیر میں اس لئے بیان کرتے ہیں کہ سورہ مائدہ میں جو تیمم کی آیت ہے' وہ نازل ہونے میں اس کی بعد کی ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ یہ ظاہر ہے کہ یہ آیت شراب کی حرمت سے پہلے کی ہے اور شراب جنگ احد سے کچھ عرصہ بعد جب کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم بنونضیر کے یہودیوں کا محاصرہ کئے ہوئے تھے۔ حرام ہوئی اور سورہ مائدہ آخیر میں جو قرآن نازل ہوا اس میں سے ہے۔ بالخصوص اس سورۃ کا ابتدائی حصہ تو مناسب یہی ہے کہ تیمم کا شانِ نزول یہاں بیان کیا جائے۔ اللہ تعالیٰ نیک توفیق دے' اسی کا بھروسہ ہے۔ مسند احمد میں ہے کہ حضرت عائشہؓ نے حضرت اسماءؓ سے ایک ہار واپس کر دینے کے وعدہ پر مستعار لیا تھا۔ وہ سفر میں کہیں گم ہو گیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے ڈھونڈنے کے لئے آدمی بھیجے۔ انہیں ہار تو مل گیا لیکن نماز کے وقت اس کی تلاش میں ہی آ گیا اور ان کے ساتھ پانی نہ تھا۔ انہوں نے بے وضو نماز ادا کی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچ کر اس کی شکایت کی۔ اس پر تیمم کا حکم نازل ہوا۔ حضرت اسید بن حضیرؓ کہنے لگے: اے عائشہؓ اللہ تعالیٰ تمہیں جزائے خیر دے۔ قسم اللہ کی جو تکلیف تمہیں پہنچتی ہے' اس کا انجام تمہارے اور مسلمانوں کے لئے خیر ہی خیر ہوتا ہے۔ بخاری میں ہے حضرت صدیقہ فرماتی ہیں: ہم کسی سفر میں تھے' بیدا میں یا ذات الجیش میں' میرا ہار ٹوٹ کر کہیں گر پڑا۔ جس کے ڈھونڈنے کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم مع قافلہ ٹھہر گئے۔ اب تو ہمارے پاس پانی تھا نہ وہاں اس میدان میں کہیں پانی تھا۔ لوگ میرے والد حضرت ابو بکر صدیقؓ کے پاس شکایتیں کرنے لگے کہ دیکھو ہم ان کی وجہ سے کیسی مصیبت میں پڑ گئے۔ چنانچہ میرے والد میرے پاس آئے۔ اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میری ران پر اپنا سر مبارک رکھ کر سو گئے تھے۔ آتے ہی کہنے لگے: تو نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اور (دیگر) لوگوں کو روک دیا۔ اب نہ تو ان کے پاس پانی ہے نہ یہاں اور کہیں پانی نظر آتا ہے۔ الغرض مجھے خوب ڈانٹا ڈپٹا اور اللہ جانے کیا کیا کہا اور میرے پہلو میں اپنے ہاتھ سے کچوکے بھی مارتے رہے۔ لیکن میں ذرا سی جنبش نہ کی کہ ایسا نہ ہو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے آرام میں خلل پڑے۔ ساری رات گزر گئی۔ صبح کو لوگ جاگے۔ لیکن پانی نہ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے تیمم کی آیت نازل فرمائی اور سب نے تیمم کیا۔ حضرت اسید بن حضیرؓ کہنے لگے: اے ابو بکرؓ

کے گھرانے والو! یہ کچھ تمہاری پہلی حرکت نہیں۔ اب جب ہم نے اس اونٹ کو اٹھایا' جس پر میں سوار تھی تو اس کے نیچے سے ہی ہار مل گیا۔

مسند احمد میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ اپنی اہلیہ صاحبہ حضرت عائشہؓ کے ہمراہ اولات جیش سے گزرے۔ حضرت عائشہ کا یمنی خرمہروں کا ہار ٹوٹ کر کہیں گر پڑا اور گم ہو گیا تھا۔ اس کی تلاش میں یہاں ٹھہر گئے۔ ساری رات آپ ﷺ کے ساتھ مسلمانوں نے اور آپ ﷺ نے یہیں رات گزاری۔ صبح اٹھے تو پانی بالکل نہ تھا۔ پس اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی پاک ﷺ پر پاک مٹی سے تیمم کر کے پاکی حاصل کرنے کی رخصت کی آیت اتاری اور مسلمان حضور ﷺ کے ساتھ کھڑے ہوئے زمین پر اپنے ہاتھ مارے اور جو مٹی ان میں لگی' اسے جھاڑے بغیر اپنے چہروں پر اور اپنے ہاتھوں پر مونڈھوں تک اور ہاتھوں کے نیچے سے بغل تک مل لی۔ ابن جریر کی روایت میں ہے کہ اس سے پہلے تو حضرت ابوبکر صدیقؓ حضرت عائشہؓ پر سخت غصے ہو کر گئے تھے۔ لیکن تیمم کی رخصت کے حکم کو سن کر خوشی خوشی اپنی صاحبزادی صاحبہؓ کے پاس آئے اور کہنے لگے: تم بڑی مبارک ہو۔ مسلمانوں کو اتنی بڑی رخصت ملی۔ پھر مسلمانوں نے ایک ضرب سے چہرے ملے اور دوسری ضرب سے کہنیوں تک اور بغلوں تک ہاتھ۔

ابن مردویہ میں روایت ہے حضور اسلع بن شریکؓ فرماتے ہیں: میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اونٹنی کو چلا رہا تھا۔ جس پر حضور ﷺ سوار تھے۔ جاڑوں کا موسم تھا۔ رات کا وقت' سردی پڑ رہی تھی اور میں جنبی ہو گیا۔ ادھر حضور ﷺ نے کوچ کا ارادہ کیا تو میں نے اپنی اس حالت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اونٹنی کو چلانا پسند نہ کیا۔ ساتھ ہی یہ بھی خیال آیا کہ اگر سرد پانی سے نہاؤں گا تو مر جاؤں گا' یا بیمار پڑ جاؤں گا۔ میں نے چپکے سے ایک انصاری کو کہا کہ آپ اونٹنی کی نکیل تھام لیجئے۔ چنانچہ وہ چلاتے رہے اور میں نے آگ سلگا کر پانی گرم کر کے غسل کیا۔ پھر دوڑ بھاگ کر قافلہ میں پہنچ گیا۔ آپ ﷺ نے مجھ سے فرمایا: اسلع کیا بات ہے اونٹنی کی چال کیسے بگڑی ہوئی ہے۔ میں نے کہا: یا رسول اللہ ﷺ! میں اسے نہیں چلا رہا تھا۔ بلکہ فلاں انصاری صاحب چلا رہے تھے۔ آپ نے فرمایا: کیوں۔ میں نے سارا واقعہ کہہ سنایا۔ اس پر اللہ عزوجل نے آیت: لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ سے غَفُوْرًا تک نازل ہوئی۔ یہ آیت دوسری سند سے بھی مروی ہے۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يَشْتَرُوْنَ الضَّلٰلَةَ وَيُرِيْدُوْنَ اَنْ تَضِلُّوا السَّبِيْلَ ﴿۴۴﴾ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِاَعْدَآئِكُمْ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَلِيًّا ۤ وَّكَفٰى بِاللّٰهِ نَصِيْرًا ﴿۴۵﴾ مِنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ وَ يَقُوْلُوْنَ سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا وَاسْمَعْ غَيْرَ مُسْمَعٍ وَّرَاعِنَا لَيًّا بِاَلْسِنَتِهِمْ وَطَعْنًا فِى الدِّيْنِ ۭ وَلَوْ اَنَّهُمْ قَالُوْا سَمِعْنَا وَ

أَطَعْنَا وَاسْمَعْ وَانْظُرْنَا لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ وَأَقْوَمَ ۙ وَلَٰكِن لَّعَنَهُمُ اللَّهُ بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُونَ إِلَّا قَلِيلًا ﴿٤٦﴾

کیا تو نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جن کو کتاب کا ایک بڑا حصہ ملا ہے وہ لوگ گمراہی کو اختیار کر رہے ہیں اور یوں چاہتے ہیں کہ تم راہ سے بے راہ ہو جاؤ اور اللہ تعالیٰ تمہارے دشمنوں کو خوب جانتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کافی رفیق ہے اور اللہ تعالیٰ کافی حامی ہے یہ لوگ یہودیوں میں سے ہیں کلام کو اس کے مواقع سے دوسری طرف پھیر دیتے ہیں اور یہ کلمات کہتے ہیں سمعنا وعصینا اور اسمع غیر مسمع اور راعنا اس طور پر کہ اپنی زبانوں کو پھیر کر اور دین میں طعنہ زنی کی نیت سے اور اگر یہ لوگ یہ کلمات کہتے سمعنا واطعنا اور اسمع اور انظرنا تو یہ بات ان کے لئے بہتر ہو گی اور موقع کی بات تھی۔ مگر ان کو اللہ تعالیٰ نے ان کے کفر کے سبب اپنی رحمت سے دور پھینک دیا اب وہ ایمان نہ لائیں گے ہاں مگر تھوڑے سے آدمی۔ ۞

اہل کتاب کی خباثت ☆

اللہ تبارک وتعالیٰ بیان فرماتا ہے کہ یہودیوں کی ایک مذموم خصلت یہ بھی ہے کہ وہ گمراہی کو ہدایت پر اختیار کرتے ہیں۔ نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم پر جو اترا ہے۔ اس سے بھی روگردانی کرتے ہیں اور جو علم خدا ان کے پاس ہے انہیں بھی پس پشت ڈال دیتے ہیں۔ خود اپنی کتابوں میں نبی موعود کی بشارتیں پڑھتے ہیں۔ لیکن تاہم اپنے مریدوں سے چڑھاوا لینے کے لالچ میں ظاہر نہیں کرتے بلکہ ساتھ ہی خواہش رکھتے ہیں کہ خود مسلمان بھی راہ راست سے بھٹک جائیں۔ اللہ کی کتاب کے منکر بن جائیں۔ ہدایت کو اور سچے علم کو چھوڑ دیں۔ اللہ تعالیٰ تمہارے دشمنوں سے خوب باخبر ہے۔ وہ تمہیں ان سے ہوشیار کر رہا ہے کہ کہیں تم ان سے دھوکے میں نہ آ جاؤ۔ اللہ تعالیٰ کی حمایت کافی ہے۔ تم یقین رکھو کہ وہ اپنی طرف جھکنے والوں کی ضرور حمایت کرتا ہے وہ اس کا مددگار بن جاتا ہے۔ تیسری آیت جو لفظ من سے شروع ہوتی ہے اس میں من بیان جنس کے لئے ہے جیسے: ﴿فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْأَوْثَانِ﴾ (الحج:۳۰) میں۔ پھر یہودیوں کے اس فرقے کی جس تحریف کا ذکر ہے' اس سے مراد یہ ہے' وہ کلام اللہ کے مطلب کو بدل دیتے ہیں اور خلاف منشا تفسیر کرتے ہیں اور یہ فعل ان کا جان بوجھ کر قصداً ہوتا ہے۔ جس سے یہ اللہ کے ذمے افتراء پردازی کے مرتکب ہوتے ہیں۔ پھر کہتے ہیں کہ اے پیغمبر! جو آپ نے کہا ہم نے سنا لیکن ہم ماننے کے نہیں۔ خیال کیجئے' ان سے کفر والحاد کو دیکھئے کہ جان بوجھ کر کھلے لفظوں میں اپنے ناپاک خیال کا اظہار کرتے ہیں اور کہتے ہیں آپ سنیئے: اللہ کرے آپ نہ سنیں۔ یا یہ مطلب ہے کہ آپ سنئے آپ کی نہ سنی جائے۔ لیکن پہلا مطلب زیادہ اچھا ہے۔ یہ کہنا ان کا بطور تمسخر اور مذاق کے تھا۔ اللہ انہیں لعنت کرے اور راعنا کہتے تھے۔ جس سے بظاہر سمجھا جاتا تھا کہ یہ لوگ کہتے ہیں ہماری طرف کان لگایئے۔ لیکن وہ اس لفظ سے مراد یہ لیتے تھی کہ تم بڑی رعونت والے ہو۔ اس کا پورا مطلب ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقُولُوا رَاعِنَا﴾ (البقرہ:۱۰۴) کی تفسیر میں گزر چکا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ جو ظاہر کرتے تھے اس کے خلاف اپنی زبانوں کو موڑ کر طعن آمیز لہجہ میں اپنے دل میں مخفی رکھتے تھے۔ دراصل حضور علیہ السلام کی بے ادبی اور گستاخی کرتے تھے۔ پس انہیں ہدایت کی جاتی ہے کہ وہ ان دو معنی والے الفاظ کو بولنا چھوڑ دیں اور صاف صاف کہیں کہ ہم نے سنا' مانا' آپ ہماری عرض

سنیے آپ ہماری طرف دیکھئے۔ یہ کہنا ہی ان کے لئے بہتر ہے اور یہی صاف سیدھی سچی اور مناسب بات ہے لیکن ان کے دل بھلائی سے دور ڈال دیئے گئے ہیں اصل ایمان کامل طور سے ان کے دل میں جگہ ہی نہیں پاتا۔ اس جملہ کی تفسیر بھی پہلے گزر چکی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ نفع دینے والا ایمان ان میں نہیں۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اٰمِنُوْا بِمَا نَزَّلْنَا مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّطْمِسَ وُجُوْهًا فَنَرُدَّهَا عَلٰٓى اَدْبَارِهَآ اَوْ نَلْعَنَهُمْ كَمَا لَعَنَّآ اَصْحٰبَ السَّبْتِ ۭ وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُوْلًا ﴿٤٧﴾ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَاۗءُ ۚ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدِ افْتَرٰٓى اِثْمًا عَظِيْمًا ﴿٤٨﴾

اے وہ لوگو جو کتاب دیئے گئے ہو تم اس کتاب پر ایمان لاؤ جس کو ہم نے نازل فرمایا ہے ایسی حالت پر کہ وہ سچ بتلاتی ہے اس کتاب کو جو تمہارے پاس ہے اس سے پہلے پہلے کہ ہم چہروں کو بالکل مٹا ڈالیں اور ان کو ان کی الٹی جانب کی طرح بنا دیں۔ یا ان پر ہم ایسی لعنت کریں جیسی لعنت ان ہفتہ والوں پر کی تھی اور اللہ تعالیٰ کا حکم پورا ہی ہو کر رہتا ہے۔ بیشک اللہ تعالیٰ اس بات کو نہ بخشیں گے کہ ان کے ساتھ کسی کو شریک قرار دیا جائے اور اس کے سوا اور جتنے گناہ ہیں جس کے لئے منظور ہو گا وہ گناہ بخشش دیں گے اور جو شخص اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک ٹھہراتا ہے وہ بڑے جرم کا مرتکب ہوا۔ ○

اہل کتاب کو وعید☆

اللہ عزوجل یہود و نصاریٰ کو حکم دیتا ہے کہ میں نے اپنی زبردست کتاب اپنے بہترین نبی کے ساتھ نازل فرمائی ہے۔ جس میں خود تمہاری اپنی کتاب کی بھی تصدیق ہے۔ اس پر ایمان لاؤ اس سے پہلے کہ ہم تمہاری صورتیں مسخ کر دیں۔ یعنی منہ الٹے کر دیں۔ آنکھیں بجائے اِدھر کے اُدھر کر دیں۔ یا یہ مطلب کہ تمہارے چہرے مٹا دیں۔ آنکھیں کان سب مٹ جائیں۔ پھر یہ مسخ چہرہ بھی ہو جائے۔ یہ عذاب ان کے کرتوت کا پورا بدلہ ہے۔ یہ بھی حق سے ہٹ کر باطل کی طرف ہدایت سے پھر کر ضلالت کی جانب بڑھے چلے جا رہے ہیں تو اللہ بھی انہیں دھمکاتا ہے کہ میں بھی اسی طرح تمہارا منہ الٹ دوں گا۔ تاکہ تمہیں پچھلے پیروں چلنا پڑے۔ تمہاری آنکھیں گدی کی طرف کر دوں گا اور اسی جیسی تفسیر بعض نے ﴿اِنَّا جَعَلْنَا فِيْٓ اَعْنَاقِهِمْ﴾ (یٰسین ۸) کی آیت میں بھی کی ہے۔ غرض یہ بُری مثال ان کی گمراہی اور ہدایت سے دور پڑ جانے کی بیان ہوئی ہے۔ حضرت مجاہدؒ سے روایت ہے کہ مطلب یہ ہے کہ ہم تمہیں سچ مچ حق کے راستے سے دھکیل دیں اور گمراہی اور ہدایت کی طرف متوجہ کر دیں۔ ہم تمہیں کافر بنا دیں اور تمہارے چہرے بندروں جیسے کر دیں۔ ابو زید فرماتے ہیں کہ لوٹا دینا یہ تھا کہ ارض حجاز سے بلادِ شام میں پہنچا دیا۔

کعب احبار رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا اسلام ☆

یہ بھی مذکور ہے کہ اسی آیت کو سن کر کعبؓ احبار مشرف با سلام ہوئے تھے۔ ابن جریر میں ہے کہ حضرت ابراہیمؒ کے سامنے حضرت کعبؓ کے اسلام کا تذکرہ ہوا تو آپ نے فرمایا: حضرت کعبؓ، حضرت عمرؓ کے زمانہ میں مسلمان ہوئے۔ یہ بیت المقدس جاتے ہوئے مدینہ میں آئے۔ حضرت عمرؓ ان کے پاس گئے اور فرمایا: اے کعب مسلمان ہو جاؤ۔ انہوں نے جواب دیا: تم تو قرآن میں پڑھتے ہو۔ توراۃ جن سے اٹھوائی گئی اور انہوں نے اسے نہ اٹھایا' ان کی مثال گدھے کی سی ہے جو بوجھ لادے ہوئے ہو اور یہ بھی تم جانتے ہو کہ میں بھی ان لوگوں میں سے جو تورات اٹھوالئے گئے۔ اس پر حضرت عمرؓ نے اسے چھوڑ دیا۔ یہ یہاں سے چل کر حمص پہنچے۔ وہاں سنا کہ ایک شخص جوان کے گھرانے میں تھا۔ اس آیت کی تلاوت کر رہا ہے۔ جب اس نے آیت ختم کی انہیں ڈر لگنے لگا کہ کہیں سچ مچ اس آیت کی وعید مجھ پر صادق نہ آ جائے اور میرا منہ مسخ ہو کر پلٹ نہ جائے۔ یہ جھٹ سے کہنے لگے: یَا رَبِّ اَسْلَمْتُ میرے اللہ میں ایمان لایا۔ پھر حمص سے فوراً ہی اپنے وطن یمن میں آئے اور یہاں سے اپنے تمام گھر والوں کو لے کر سارے کنبے سمیت مسلمان ہو گئے۔ ابن ابی حاتم میں حضرت کعبؓ کے اسلام کا واقعہ اس طرح روایت ہے کہ ان کے استاد ابو مسلم جلیلی ان کے حضور ﷺ پر ایمان لانے میں دیر لگانے کی وجہ سے ہر وقت انہیں ملامت کرتے رہتے تھے۔ پھر انہیں بھیجا کہ یہ دیکھیں کہ آپ وہی پیغمبر ہیں جن کی خوشخبری اور اوصاف تورات میں ہیں۔ یہ آئے تو فرماتے ہیں: جب میں مدینہ پہنچا تو ناگہاں میں نے سنا کہ ایک شخص قرآن کریم کی اس آیت کی تلاوت کر رہا ہے کہ اے اہل کتاب! جو ہم نے اتارا ہے۔ جو تمہارے پاس کی کتاب کو سچا کرنے والا ہے۔ اس پر اس سے پہلے ایمان لاؤ کہ ہم تمہارے منہ مٹا دیں اور انہیں الٹا کر دیں۔ میں چونک اٹھا اور جلدی جلدی غسل کرنے بیٹھ گیا اور اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرتا جاتا تھا کہ کہیں مجھے ایمان لانے میں دیر نہ لگ جائے اور میرا چہرہ الٹا نہ ہو جائے۔ پھر میں بہت جلد آ کر مسلمان ہو گیا۔ پھر فرماتا ہے یا ہم ان پر لعنت کریں جیسے ہفتہ والوں پر ہم نے لعنت نازل کی۔ یعنی جن لوگوں نے ہفتہ والے دن حیلے بہانے کر کے شکار کھیلا تھا۔ حالانکہ انہیں اس کام سے ممانعت کر دی گئی تھی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ بندر اور سور بنا دیئے گئے۔ ان کا مفصل واقعہ سورہ اعراف میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔ پھر فرمایا: خدائی کام پورے ہو کر ہی رہتے ہیں۔ وہ جب کوئی حکم کر دے تو کوئی نہیں جو اس کی مخالفت یا ممانعت کر سکے۔ پھر خبر دیتا ہے کہ اللہ تعالیٰ شرک کے گناہ کو نہیں بخشتا۔ یعنی جو شخص اللہ تعالیٰ سے اس حال میں ملاقات کرے کہ وہ مشرک ہو۔ اس پر بخشش کے دروازے بند ہیں۔ اس جرم کے سوا اور گناہوں کو خواہ وہ کیسے ہی ہوں' جس کے چاہے بخش دیتا ہے۔ اس آیہ کریمہ کے متعلق بہت سے احادیث ہیں' ہم بھی کچھ احادیث ذکر کرتے ہیں۔

پہلی حدیثِ مبارکہ بحوالہ مسند احمد ☆

اللہ تعالیٰ کے نزدیک گناہوں کے تین دفتر ہیں۔ ایک تو وہ جس کی اللہ تعالیٰ کچھ پروا نہیں کرتا' دوسرا وہ جس میں سے اللہ تعالیٰ کچھ نہیں چھوڑتا' تیسرا وہ جسے اللہ تعالیٰ ہرگز نہیں بخشتا۔ پس جسے وہ بخشتا نہیں وہ بخشتا نہیں وہ شرک ہے۔ اللہ عزوجل خود فرماتا ہے کہ اللہ تعالیٰ شرک کو معاف نہیں فرماتا اور جگہ ارشاد ہے جو شخص اللہ کے ساتھ کوئی شریک کرے۔ اس پر وہ جنت کو حرام کر دیتا ہے اور جس دفتر کی اللہ کے یہاں کوئی ایسے وقعت نہیں وہ بندے کا اپنی جان پر ظلم کرنا ہے۔ جس کا تعلق اس سے اور اللہ تعالیٰ سے ہے۔ کسی دن کا روزہ جسے اس نے چھوڑ دیا یا نماز۔ پس اللہ تعالیٰ اسے بخش دیتا ہے اور جس دفتر کی اللہ تعالیٰ کوئی چیز

ترک نہیں کرتا' وہ بندوں کے آپس کے ظلم ہیں۔ جن کا بدلہ اور قصاص ضروری ہے۔

دوسری حدیث بحوالہ مسند بزار۔ اگرچہ الفاظ مختلف ہیں لیکن مطلب وہی ہے۔

تیسری حدیث بحوالہ مسند احمد ممکن ہے' اللہ تعالیٰ ہر گناہ کو بخش دے گا مگر جو شخص کفر کی حالت میں مرا اور جس نے کسی ایماندار کو جان بوجھ کر قتل کر ڈالا۔

چوتھی حدیث بحوالہ مسند احمد' اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اے میرے بندے! تو جب تک میری عبادت کرتا رہے گا اور مجھ سے نیک امید رکھے گا۔ میں بھی جو تقصیریں (خطائیں) تیری ہیں انہیں معاف فرماتا رہوں گا۔ اسے میرے بندے اگر تو ساری زمین بھر تک خطائیں لے کر میرے پاس آئے گا تو میں بھی مغفرت لے کر تجھ سے ملوں گا۔ بشرطیکہ تو نے میرے ساتھ شریک نہ کیا ہو۔

پانچویں حدیث بحوالہ مسند احمد' جو بندہ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه کہے۔ پھر اسی پر اس کا انتقال ہو' وہ جنت میں ضرور جائے گا۔ یہ سن کر حضرت ابوذرؓ نے دریافت کیا کہ اگر وہ اس نے زنا اور چوری بھی کی ہو۔ آپ ﷺ نے فرمایا: گو اس نے زنا اور چوری بھی کی ہو۔ تین مرتبہ یہی سوال جواب ہوا۔ چوتھے سوال پر آپ ﷺ نے فرمایا ابوذر کی ناک خاک آلود ہو[1]۔ پس حضرت ابوذرؓ وہاں سے اپنی چادر گھسیٹتے ہوئے (مسرت وخوشی سے) نکلے کہ گو ابوذر کی ناک خاک آلود ہو اور اس کے بعد جب کبھی آپ یہ حدیث بیان فرماتے تو یہ جملہ ضرور کہتے۔ یہ حدیث دوسری سند سے قدرے زیادتی کے ساتھ بھی روایت ہے۔ اس میں حضرت ابوذرؓ فرماتے ہیں: میں نبی ﷺ کے ساتھ مدینہ کے میدان میں چلا جا رہا تھا۔ اُحد پہاڑ کی طرف ہماری نگاہیں تھیں کہ حضور ﷺ نے فرمایا: اے ابوذر! میں نے کہا: لبیک یا رسول اللہ ﷺ۔ آپ ﷺ نے فرمایا: سنو! میرے پاس اگر اس احد پہاڑ کے برابر بھی سونا ہو تو میں نہ چاہوں کہ تیسری شام کو اس میں سے کچھ باقی رہ جائے' اس دینار کے جسے میں قرضہ چکانے کے لئے رکھ لوں۔ باقی تمام مال اس طرح اور اس طرح راہ اللہ اللہ کے بندوں کو دے ڈالوں اور آپ نے دائیں بائیں اور سامنے لپیں پھینکیں۔ پھر کچھ دیر ہم چلتے رہے۔ پھر حضور ﷺ نے مجھے پکارا اور فرمایا: جن کے پاس یہاں زیادتی ہے وہی وہاں کمی والے ہوں گے۔ مگر جو اس طرح کرے اور آپ نے اپنے دائیں سامنے اور بائیں پھر کر دیتے ہوئے اشارہ کیا پھر کچھ دیر چلنے کے بعد فرمایا: ابوذر میں آتا ہوں ابھی' تم یہیں ٹھہرو۔ آپ تشریف لے گئے اور میری نگاہوں سے اوجھل ہو گئے اور مجھے آوازیں سنائی دینے لگیں۔ دل بے چین ہو گیا کہ کہیں تنہائی میں کوئی دشمن نہ آ گیا ہو۔ میں نے قصد کیا کہ پہنچوں۔ لیکن ساتھ ہی حضور ﷺ کا یہ فرمان یاد آ گیا کہ میں جب تک نہ آؤں تم یہیں ٹھہرے رہو۔ چنانچہ میں ٹھہرا رہا۔ یہاں تک کہ آپ واپس

---

[1] آنحضور ﷺ کو حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے بے حد تعلق تھا اور ابوذر رضی اللہ عنہ کی سادگی کی وجہ سے بعض اوقات آپ ﷺ ایسے ایسے جملے فرما دیتے تھے۔ اس جملہ کا مطلب یہ ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کا معاملہ ہے۔ اگرچہ ابوذر (رضی اللہ عنہ) کے خلاف توقع اور علی الرغم ہے۔ تاہم ایسا نہیں کہ معاذ اللہ ابوذر رضی اللہ عنہ اللہ عزوجل کی رحمت کو محدود کرنا چاہتے تھے لیکن انہوں نے بار بار جو حیرت سے سوال کیا تو اس پر آپ ﷺ نے "علی الرغم انف ابی ذر" فرمایا۔ پھر ابوذر رضی اللہ عنہ اس جملہ کی اس طرح قدر فرماتے کہ جب کبھی اس حدیث کو نقل کرنے کا موقع آتا تو "علی الرغم انف ابی ذر" ضرور کہتے اور نہ صرف یہی بلکہ مُصر تھے کہ دوسرے راوی بھی اس کو ضرور ذکر کریں۔

حضرت مولانا محمود احسن (شیخ الہند) رحمہ اللہ کے ایک بے تکلف اور سادہ مزاج شاگرد تھے۔ انہوں نے ایک روز حضرت رحمہ اللہ سے دعوت کے لیے اصرار کیا۔ حضرت نے اُن کی دلداری کے لیے قبول فرمالیا۔ تشریف لے گئے تو عزیز شاگرد نے اصرار کیا کہ ایک قصیدہ جو آپ کی شان میں کہا ہے سن لیجئے۔ حضرت مرحوم کو اپنی تعریف سے طبعاً نفرت تھی لیکن ان کے اصرار پر اجازت دی۔ قصیدہ کا مطلع تھا

"اجی وہ سڑک! جو یہاں سے گئی ہے مدینہ تلک"

تشریف لے آئے تو میں نے کہا: حضور ﷺ یہ آوازیں کسی آ رہی تھیں۔ آپ نے فرمایا: میرے پاس جبریل علیہ السلام آئے تھے اور فرما رہے تھے کہ آپ اُمت میں جو انتقال کرے اور وہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرتا ہو۔ وہ جنت میں جائے گا میں نے کہا گو زنا اور چوری بھی کرتا ہو۔ تو فرمایا: ہاں گو زنا اور چوری بھی ہوئی ہو۔

یہ حدیث بخاری اور مسلم میں بھی ہے اور بخاری میں یہ بھی ہے کہ حضرت ابوذرؓ فرماتے ہیں: میں رات کے وقت نکلا' دیکھا کہ رسول ﷺ اللہ تنہا تشریف لے جا رہے ہیں' تو مجھے خیال ہوا کہ شاید اس وقت آپ کسی کو ساتھ لے جانا نہیں چاہتے تو میں چاند کی چھاؤں میں حضور ﷺ کے پیچھے ہولیا۔ آپ نے جب مڑ کر مجھے دیکھا تو پوچھا کون ہے؟ میں نے کہا: ابوذر! اللہ مجھے آپ پر قربان کر دے۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا: آؤ میرے ساتھ چلو۔ تھوڑی دیر تم ہم چلتے رہے۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا: زیادتی والے ہی قیامت کے دن کمی والے ہوں گے۔ مگر وہ جنہیں اللہ تعالیٰ نے مال دیا پھر وہ دائیں بائیں آگے پیچھے نیک کاموں میں خرچ کرتے رہے۔ پھر کچھ دیر چلنے کے بعد آپ نے مجھے ایک جگہ بٹھا کر جس کے اردگرد پتھر تھے۔ فرمایا: میری واپسی تک یہیں بیٹھے رہنا۔ پھر آپ آگے نکل گئے۔ یہاں تک کہ میری نظر سے پوشیدہ ہو گئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو زیادہ دیر لگ گئی۔ پھر میں نے دیکھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لا رہے ہیں اور زبان مبارک سے فرماتے آتے ہیں' گو زنا کیا ہو گو چوری کی ہو۔ جب میرے پاس پہنچے تو میں پوچھنے سے رک نہ سکا۔ کہ نبی اللہ ﷺ، اللہ مجھے آپ ﷺ پر قربان کرے۔ اس میدان کے کنارے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کس سے باتیں کر رہے تھے۔ میں نے سنا' کوئی آپ کو جواب بھی دے رہا تھا؟ آپ ﷺ نے فرمایا: وہ جبریل تھے۔ یہاں میرے پاس آئے اور فرمایا: اپنی اُمت کو خوشخبری سنا دو کہ جو مرے گا اور اللہ کے ساتھ اس نے شریک نہ ہو وہ جنتی ہے۔ میں نے کہا: اے جبریل گو اس نے چوری کی ہو اور زنا کیا ہو' فرمایا: ہاں۔ میں نے پھر یہی سوال کیا' جواب دیا: ہاں۔ میں نے پھر یہی پوچھا تو فرمایا: ہاں' اور اگرچہ اس نے شراب پی ہو۔

چھٹی حدیث بحوالہ مسند عبد بن حمید' ایک شخص حضور ﷺ کے پاس آیا اور کہا: یا رسول اللہ ﷺ! واجب کر دینے والی چیزیں کیا ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: جو شخص بغیر شرک کئے مرا۔ اس کے لئے جنت واجب ہے اور جو شرک کرتے ہوئے مرا۔ اس کے لئے جہنم واجب ہے۔ یہی حدیث اور طریق سے ہے' جس میں ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک نہ کرتا ہوا مرا۔ اس کے لئے بخشش حلال ہے۔ اگر اللہ چاہے اسے عذاب کرے اگر چاہے بخش دے۔ اللہ اپنے ساتھ شرک کئے جانے کو نہیں بخشتا' اس کے سوا جسے چاہے بخش دے (ابن ابی حاتم) اور مسند سے ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: بندے پر مغفرت ہمیشہ رہتی ہے جب تک کہ پردے نہ پڑ جائیں۔ دریافت کیا گیا کہ حضور ﷺ پردے پڑ جانا کیا ہے؟ فرمایا: شرک۔ جو شخص شرک نہ کرتا ہو اللہ تعالیٰ سے ملاقات کرے گا اس کے لئے بخشش خداوندی حلال ہو گئی اگر چاہے بخش دے' اگر چاہے عذاب کرے۔ پھر آپ ﷺ نے آیت ﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ﴾ تلاوت فرمائی۔ (مسند ابو یعلیٰ)

ساتویں حدیث بحوالہ مسند احمد جو شخص اس حال میں مرے کہ اللہ کے ساتھ شریک نہ کرتا ہو تو وہ جنت میں داخل ہو گیا۔

= لطف یہ ہے کہ ''اجی وہ سڑک'' کو اتنا کھینچ کر پڑھتے کہ مصرع ثانی ''جو یہاں سے گئی ہے مدینہ تلک'' کا وزن ہو جاتا۔ اس پر شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے ہنس کر فرمایا ''تم تو چغد الشعراء'' ہو۔ عزیز شاگرد نے اس کو اپنے فخر و مباہات کا ایسا سامان سمجھا کہ ہر ایک سے لڑتے پھرتے اور کہتے کہ مجھے چغد الشعراء کہو۔ یہ تعلق اور استوار محبت کا مظاہرہ ہے۔ ابوذر رضی اللہ عنہ کو بھی آنحضور ﷺ سے ایسا ہی عشق اور وارفتگی کا معاملہ تھا۔ اللہ تعالیٰ راقم السطور کو بھی آپ ﷺ کی ذات والا صفات سے عشق و وارفتگی کا یہی تعلق عطا فرمائے۔ وما ذالك علی اللّٰه العزیز۔

آٹھویں حدیث بحوالہ مسند احمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک مرتبہ صحابہؓ کے پاس آئے اور فرمایا: تمہارے رب عزوجل نے مجھے اختیار دیا کہ میری اُمت میں سے ستر ہزار کا بے حساب جنت میں جانا پسند کرلوں یا اس بات کو کہ اللہ تعالیٰ کے پاس جو چیز میرے لئے میری اُمت کی بابت پوشیدہ محفوظ ہے اسے تو بعض صحابہ نے کہا: کیا اللہ تعالیٰ آپ کے لئے یہ محفوظ چیز بچا کر رکھے گا؟ آپ یہ سن کر اندر تشریف لے گئے۔ پھر تکبیر پڑھتے ہوئے باہر اور فرمانے لگے: میرے رب نے مجھے ہر ہزار کے ستر ہزار کی زیادتی کی ہے اور وہ پوشیدہ حصہ بھی۔ حضرت ابوایوب انصاریؓ جب یہ حدیث بیان فرما چکے تو حضرت ابورھم نے سوال کیا کہ وہ پوشیدہ محفوظ چیز کیا ہے؟ اس پر لوگوں نے انہیں کچھ کچھ کہنا شروع کیا کہ کہاں تم اور کہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے اختیار کردہ چیز۔ حضرت ابوایوب نے فرمایا: سنو! جہاں تک ہمارا گمان ہے جو بالکل یقین کے قریب ہے یہ ہے کہ وہ چیز جنت میں جانا ہے ہر اس شخص کا جو سچے دل سے گواہی دے کہ اللہ ایک ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے بندے اور رسول ہیں۔

نویں حدیث بحوالہ ابن ابی حاتم۔ ایک شخص حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! میرا بھتیجا حرام سے باز نہیں آتا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس کی دینداری کیسی ہے؟ کیا نمازی ہے اور توحید والا ہے آپ نے فرمایا جاؤ اس سے اس کا دین بطور ہبہ کے طلب کرو۔ اگر انکار کرے تو اس سے خرید لو۔ اس نے جا کر اس سے طلب کیا تو اس نے انکار کر دیا۔ اس نے آ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر دی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں نے اس اپنے دین سے چمٹا ہوا پایا اس پر یہ آیت: ﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ﴾ نازل ہوئی۔

دسویں حدیث بحوالہ حافظ ''ابویعلیٰ''۔ ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور کہا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! میں نے کوئی حاجت یا حاجت والا نہیں چھوڑا۔ مگر میں سب پوری کر چکا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا تو یہ گواہی نہیں دیتا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد اللہ کے رسول ہیں۔ تین مرتبہ اس نے کہا ہاں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ ان سب پر غالب آ جائے گا۔

گیارہویں حدیث بحوالہ مسند احمد' حضرت ابوہریرہؓ نے ضمضم بن جوش یمامی سے کہا کہ اے یمامی کسی شخص سے ہرگز یہ نہ کہنا کہ اللہ تجھے نہ بخشے یا تجھے جنت میں داخل کرے گا۔ یمامیؒ نے کہا۔ حضرت یہ بات تو ہم اپنے بھائیوں اور دوستوں سے بھی غصے میں کہہ جاتے ہیں۔ آپ نے فرمایا: خبردار ہرگز نہ کہنا۔ سنو! میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے۔ آپ نے فرمایا: بنی اسرائیل میں دو شخص تھے ایک تو عبادت میں بہت چست و چالاک اور دوسرا اپنی جان پر زیادتی کرنے والا اور دونوں میں دوستانہ اور بھائی چارہ تھا۔ عابد بسا اوقات اس دوسرے کو کسی نہ کسی گناہ میں دیکھتا رہتا تھا اور کہتا رہتا تھا: اے شخص! باز رہ وہ جواب دیتا تو مجھے میرے رب پر چھوڑ دے۔ کیا تو مجھ پر نگہبان بنا کر بھیجا گیا ہے۔ ایک مرتبہ عابد نے دیکھا کہ وہ پھر کسی گناہ کے کام کو کر رہا ہے جو اسے بہت برا معلوم ہوا تو کہا افسوس تجھ پر باز آ۔ اس نے وہی جواب دیا کہ عابد نے کہا اللہ کی قسم اللہ تجھے ہرگز نہ بخشے گا یا جنت نہ دے گا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے پاس فرشتہ بھیجا۔ جس نے ان کی روحیں قبض کر لیں۔ جب یہ دونوں اللہ کے یہاں جمع ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے اس گنہگار سے فرمایا: جا اور میری رحمت کی بنا پر جنت میں داخل ہو جا اور اس عابد سے فرمایا: تو کیا یہ تیرے حقیقی علم میں تھا' کیا تو میری چیز پر قادر تھا؟ اسے جہنم کی طرف لے جاؤ۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرما کر فرمایا: اس کی قسم جس کے ہاتھ میں ابوالقاسم (نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی کنیت) کی جان ہے اس نے کلمہ زبان سے ایسا نکال دیا جس نے اس کی عبادت

اور آخرت برباد کر دی ہے۔

بارہویں حدیث بحوالہ طبرانی' جس نے اس بات کا یقین کر لیا کہ میں گناہوں کی بخشش پر قادر ہوں تو میں اسے بخش ہی دیتا ہوں اور کوئی پروا نہیں کرتا۔ جب تک کہ وہ میرے ساتھ شریک نہ کرے۔ تیرھویں حدیث بحوالہ بزار و ابویعلی۔ جس عمل پر اللہ تعالیٰ نے کسی ثواب کا وعدہ کیا ہے اسے تو مالک ضرور پورا فرمائے گا اور جس پر سزا کا وعدہ فرمایا ہے۔ وہ اس کے اختیار میں ہے۔ حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں: ہم صحابہؓ کے قاتل کے بارے میں اور یتیم کا مال کھا جانے والے کے بارے میں اور پاک دامن عورتوں پر تہمت لگانے والے کے بارے میں اور جھوٹی گواہی دینے والے کے بارے میں کوئی شک وشبہ ہی نہیں کرتے تھے۔ یہاں تک کہ آیت: ﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا یَغْفِرُ﴾ اتری اور اصحابؓ رسول صلی اللہ علیہ وسلم گواہی سے رک گئے۔ (ابن ابی حاتم) ابن جریر کی یہ روایت اس طرح پر ہے کہ جن گناہوں پر جہنم کا ذکر کتاب اللہ میں ہے اسے کرنے والے کے جہنمی ہونے میں کوئی شک ہی نہ تھا۔ یہاں تک ہم پر یہ آیت اتری۔ جب ہم نے اسے سنا تو ہم شہادت سے رک گئے اور تمام امور اللہ تعالیٰ کی طرف سونپ دیئے۔ بزار میں آپ ہی کی ایک روایت ہے کہ کبیرہ گناہ کرنے والوں کے لئے استغفار کرنے سے ہم رکے ہوئے تھے۔ یہاں تک کہ ہم نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ آیت سنی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا کہ میں اپنی شفاعت کو اپنے امت میں کبیرہ گناہوں کے کرنے والوں کے لئے مؤخر کر رکھا ہے۔ ابو جعفر رازی کی روایت میں آپ کا یہ فرمان ہے کہ جب آیت: ﴿یٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اَسْرَفُوْا﴾ (الزمر: ۵۳) نازل ہوئی۔ یعنی اے میرے وہ بندو جنہوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے' تم میری رحمت سے مایوس نہ ہو جاؤ۔ تو ایک شخص نے کھڑے ہو کر پوچھا: حضور صلی اللہ علیہ وسلم شرک کرنے والا بھی۔ آپ کو اس کا یہ سوال ناپسند آیا۔ پھر آپ نے ﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا یَغْفِرُ﴾ پڑھ کر سنائی۔ سورہ تنزیل کی یہ آیت مشروط ہے توبہ کے ساتھ پس جو شخص جس گناہ سے توبہ کرے اللہ تعالیٰ اس کی طرف رجوع کرتا ہے گو یا بار بار کرے۔ پس مایوس نہ ہونے کی آیت میں توبہ کی شرط ضرور ہے ورنہ اس میں شرک بھی آ جائے گا اور پھر مطلب صحیح نہ ہوگا۔ کیونکہ اس آیت میں وضاحت کے ساتھ یہاں موجود ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کرنے والے کی بخشش نہیں ہوگی۔ ہاں اس کے سوا جسے چاہے۔ یعنی گو اس نے توبہ بھی نہ کی ہو۔ اس مطلب کے ساتھ اس آیت میں جو اُمید دلانے والی ہے اور زیادہ اُمید کی آس پیدا ہو جاتی ہے۔ واللہ اعلم۔

پھر فرماتا ہے جو اللہ کے ساتھ شرک کرے اس نے بڑے گناہ کا افترا باندھا۔ جیسے اور آیت میں ہے' شرک بہت بڑا ظلم ہے۔ بخاری مسلم میں حضرت ابن مسعودؓ سے روایت ہے۔ فرماتے ہیں میں نے کہا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سب سے بڑا گناہ کیا ہے؟ فرمایا: یہ کہ تو اللہ تعالیٰ کا شریک ٹھہرائے۔ حالانکہ اسی نے تجھے پیدا کیا ہے۔ پھر پوری حدیث بیان فرمائی۔ ابن مردویہ میں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: میں تمہیں سب سے بڑا کبیرہ گناہ بتلاتا ہوں۔ وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک کرنا ہے۔ پھر آپ نے اسی آیت کا یہ آخری حصہ تلاوت فرمایا: پھر ماں باپ کی نافرمانی کرنا۔ پھر آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی کہ: ﴿اَنِ اشْکُرْ لِیْ وَلِوَالِدَیْكَ اِلَیَّ الْمَصِیْرُ﴾ (لقمان: ۱۴) میرا شکر ادا کرو اور اپنے ماں باپ کا شکریہ کر میری طرف لوٹنا ہے۔

اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ یُزَکُّوْنَ اَنْفُسَهُمْ ۚ بَلِ اللّٰهُ یُزَکِّیْ مَنْ یَّشَآءُ وَلَا

يُظْلَمُونَ فَتِيلًا ﴿۴۹﴾ اُنْظُرْ كَيْفَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ ۭ وَكَفٰى بِهٖٓ اِثْمًا مُّبِيْنًا ﴿۵۰﴾ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يُؤْمِنُوْنَ بِالْجِبْتِ وَالطَّاغُوْتِ وَيَقُوْلُوْنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا هٰٓؤُلَاۗءِ اَهْدٰى مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا سَبِيْلًا ﴿۵۱﴾ اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ ۭ وَمَنْ يَّلْعَنِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ نَصِيْرًا ﴿۵۲﴾

کیا تو نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو اپنے کو مقدس بتلاتے ہیں بلکہ اللہ تعالیٰ جس کو چاہیں مقدس بتلا دیں اور ان پر تاگے برابر بھی ظلم نہ ہوگا۔ دیکھ تو یہ لوگ اللہ پر کیسی جھوٹی تہمت لگاتے ہیں اور یہ بات صریح مجرم ہونے کے لئے کافی ہے۔ کیا تو نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جن کو کتاب کا ایک حصہ ملا ہے وہ بت اور شیطان کو مانتے ہیں اور وہ لوگ کفار کی نسبت کہتے ہیں کہ یہ لوگ بہ نسبت ان مسلمانوں کے زیادہ راہ راست پر ہیں۔ یہ لوگ وہ ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے ملعون بنا دیا ہے اور اللہ تعالیٰ جن کو ملعون بنا دے اس کا کوئی حامی نہ پاؤ گے۔ ۞

اپنے منہ میاں مٹھو☆

یہود اور نصاریٰ کا قول تھا کہ ہم اللہ تعالیٰ کی اولاد اور اس کے چہیتے ہیں اور کہتے تھے جنت میں صرف یہود جائیں گے یا نصرانی۔ ان کے اس قول کی تردید میں یہ آیت اَلَمْ تَرَ نازل ہوئی اور یہ قول حضرت مجاہد کا ہے۔ اس آیت کا شان نزول یہ ہے کہ یہ لوگ اپنے بچوں کو امام بناتے تھے کہ یہ بے گناہ ہیں۔ یہ مروی ہے کہ ان کا خیال تھا کہ ہمارے جو بچے فوت ہو گئے ہیں وہ ہمارے لئے قربت اللہ کا ذریعہ ہیں۔ ہمارے سفارشی ہیں اور ہمیں وہ پاک کر دیں گے۔ پس یہ آیت اتری۔ حضرت ابن عباسؓ یہودیوں کو اپنے بچوں کو آگے کرنے کا واقعہ کر کے فرماتے ہیں: وہ جھوٹے ہیں اللہ تعالیٰ کسی بے گناہ کی وجہ کسی گناہ گار کو پاک نہیں کر دیتا۔ یہ کہتے تھے کہ جیسے ہمارے بچے بے خطا ہیں ایسے ہی ہم بھی بے گناہ ہیں اور یہ بھی خیال ہے کہ یہ آیت دوسروں کی مبالغہ آمیز مدح و ثنا کرنے کے رد میں اتری ہے۔ صحیح مسلم شریف میں ہے کہ ہمیں رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا کہ ہم مدح کرنے والوں کے منہ مٹی سے بھر دیں۔ صحیحین میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ایک مرتبہ ایک شخص کو دوسرے کی مدح و ستائش کرتے ہوئے سن کر فرمایا: افسوس تو نے اس اپنے ساتھی کی گردن توڑ دی۔ پھر فرمایا: اگر تم میں سے کسی کی ضرورت کی وجہ سے کسی کی تعریف کرنی ہو تو یوں کہے کہ میں فلاں شخص کو ایسا سمجھتا ہوں حقیقی پاکیزگی کہ یہ اللہ کے نزدیک ایسا ہی ہے نہ کرے۔

مسند احمد میں حضرت عمر بن خطابؓ کا قول ہے کہ جو کہے میں مومن ہوں وہ کافر ہے اور جو کہے میں عالم ہوں وہ جاہل ہے اور جو کہے میں جنتی ہوں وہ جہنمی ہے۔ ابن مردویہ میں ہے آپ کا فرمان یہ بھی ہے کہ مجھے تم پر سب سے زیادہ خوف اس بات کا ہے کہ کوئی شخص خود پسندی کرنے لگے اور اپنی سمجھ پر آپ فخر کرنے بیٹھ جائے۔ مسند احمد میں ہے کہ حضرت معاویہؓ بہت

ہی کم حدیث بیان کرتے اور یہ حدیث شاید دو چار ہی موقعوں پر آپ نے سنائی ہو کہ جس کے ساتھ اللہ کا ارادہ بھلائی کا ہوتا ہے اسے اپنے دین کی سمجھ عطا فرماتا ہے اور یہ مال میٹھا اور سبز رنگ ہے جو اسے اس کے حق کے ساتھ لے گا اسے اس میں برکت دی جائے گی۔ تم آپس میں ایک دوسرے کی مدح دستائش سے پرہیز کرو۔ اس لئے کہ یہ چھری پھیرنا ہے۔ یہ پچھلا جملہ ان سے ابن ماجہ میں بھی ہے۔ حضرت ابن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ انسان صبح کو اپنا دین لے کر نکلتا ہے پھر جب وہ لوٹتا ہے تو اس کے پاس اس کے دین میں سے کچھ بھی نہیں ہوتا۔ (اس طرح کہ) وہ کسی سے ملا اور اس کی مدح سرائی شروع کی اور قسمیں کھا کھا کر کہنے لگا: آپ ایسے ہی ہیں اور ایسے ہی ہیں۔ حالانکہ نہ وہ اس کے نقصان کا مالک ہے نہ نفع کا اور بسا ممکن ہے کہ ان تعریفی کلمات کے بعد بھی اس سے اس کا کام نہ نکلے۔ لیکن اس نے تو اللہ کو ناخوش کر دیا۔ پھر آپ ﷺ نے اسی آیت تزکیہ کی تلاوت فرمائی۔ (ابن جریر) اور اسکا تفصیلی بیان آیت: ﴿فَلَا تُزَكُّوٓا اَنْفُسَكُمْ﴾ (النجم:۳۲) کی تفسیر میں آئیگا انشاء اللہ تعالیٰ۔ پس یہاں ارشاد ہوتا ہے کہ اللہ ہی ہے وہ جسے چاہے پاک کر دے۔ کیونکہ تمام چیزوں کی حقیقت اور اصلیت کا جاننے والا وہی ہے۔

پھر فرمایا کہ اللہ ایک دھاگے کے وزن کے برابر بھی کسی کی نیکی چھوڑ نہ دے گا۔ فتیل کے معنی ہیں کھجور کی گٹھلی کے درمیان کا دھاگہ اور یہ بھی ہے کہ وہ دھاگہ جسے کوئی اپنی انگلیوں سے بٹ لے۔ پھر فرماتا ہے: ان کی افترا پردازی تو دیکھو کہ کس طرح اللہ کی اولاد اور محبوب بننے کے دعویدار ہیں اور کیسے کہہ رہے ہیں کہ ہمیں تو صرف چند دن آگ میں رہنا ہوگا اور کس طرح اپنے بڑوں کے نیک اعمال پر اعتماد کئے ہوئے ہیں۔ حالانکہ کسی کا عمل دوسرے کو کچھ نفع نہیں دیتا۔ جیسے ارشاد ہے: ﴿تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ﴾ (البقرہ:۱۴۱) یہ ایک گروہ ہے جو گزر چکا۔ ان کے اعمال ان کے ساتھ اور تمہارے عمل تمہارے ساتھ۔ پھر فرماتا ہے ان کا یہ کھلا کذب و افترا ہی ان کے لئے بس ہے۔ جبت کے معنی حضرت عمر فاروق وغیرہ سے جادو کے اور طاغوت کے معنی شیطان کے منقول ہیں۔ یہ بھی قول ہے کہ جبت حبشی زبان کا لفظ ہے۔ اس کے معنی شیطان کے ہیں۔ شرک 'بت' کاہن وغیرہ کے معنی میں بھی آئے ہیں۔ بعض کہتے ہیں اس سے مراد حیی بن اخطب ہے۔ بعض کہتے ہیں کعب بن اشرف ہے۔ ایک حدیث میں ہے' فال اور پرندوں کو ڈانٹنا یعنی ان کے نام یا ان کے اڑنے یا بولنے سے شگون لینا اور زمین پر لکیریں کھینچنا اور معاملہ طے کرنا' یہ سب جبت ہے۔ حسن کہتے ہیں' جبت شیطان کی گنگناہٹ ہے۔ طاغوت کی نسبت پہلے سورہ بقرہ میں کلام گزر چکا ہے۔ اس لئے یہاں دوبارہ بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ حضرت جابرؓ سے جب طاغوت کی نسبت سوال ہوتا ہے تو فرماتے ہیں کہ یہ کاہن لوگ ہیں جن کے پاس شیطان آتے تھے۔ مجاہد فرماتے ہیں: انسانی صورت میں یہ شیاطین ہیں جن کے پاس لوگ اپنے جھگڑے لے کر جاتے ہیں اور انہیں حاکم مانتے ہیں۔ حضرت امام مالکؒ فرماتے ہیں: اس سے مراد ہر وہ چیز ہے جس کی عبادت اللہ کے سوا کی جائے۔ پھر فرمایا کہ ان کی جہالت' بے دینی اور خود اپنی کتاب کے ساتھ کفر کی نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ کافروں کو مسلمانوں پر ترجیح اور افضلیت دیتے ہیں۔ ابن ابی حاتم میں ہے کہ حیی بن اخطب اور کعب بن اشرف مکہ والوں کے پاس آئے اور اہل مکہ نے ان سے کہا: تم اہل کتاب اور اہل علم ہو تو ہم بہتر ہیں یا محمد صلی اللہ علیہ وسلم؟ انہوں نے کہا: تم کیا ہو اور وہ کیا ہیں۔ تو اہل مکہ نے کہا: ہم صلہ رحمی کرتے ہیں۔ تیار اونٹنیاں ذبح کر کے کھلاتے ہیں' لسی پلاتے ہیں' غلاموں کو آزاد کرتے ہیں' حاجیوں کو پانی پلاتے ہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم تو صنبور ہیں۔ ہمارے رشتے ناتے تڑواتے ہیں۔ ان کا ساتھ حاجیوں کے چوروں نے دیا ہے' جو قبیلہ غفار میں سے ہیں۔ اب بتلاؤ! ہم اچھے ہیں یا وہ؟ تو ان دونوں نے

کہا: تم بہتر ہو اور تم زیادہ سیدھے راستے پر ہو۔ اس پر یہ آیت اتری۔ دوسری روایت میں ہے کہ انہی کے بارے میں ﴿اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ﴾ (الکوثر: ۳) اتری ہے۔

بنو وائل اور بنو نضیر کے چند سردار جب عرب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف آگ لگا رہے تھے اور جنگ عظیم کی تیاری میں تھے۔ اس وقت جب یہ قریش کے پاس آئے تو قریشیوں نے انہیں عالم و درویش جان کر ان سے پوچھا کہ بتاؤ ہمارا دین اچھا ہے یا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا؟ تو ان لوگوں نے کہا کہ تم اچھے دین والے ہو اور ان سے زیادہ صحیح راستے پر ہو۔ اس پر یہ آیت اتری اور خبر دی گئی کہ یہ لعنتی گروہ ہے اور ان کا مدد و معاون دنیا اور آخرت میں کوئی نہیں۔ اس لئے کہ صرف کفار کو اپنے ساتھ ملانے کے لئے بطور چاپلوسی اور خوشامد کے یہ کلمات اپنی معلومات کے خلاف کہہ رہے ہیں۔ لیکن یاد رکھیں کہ یہ کامیاب نہیں ہو سکتے۔ چنانچہ یہی ہوا۔ زبردست لشکر لے کر سارے عرب کو اپنا کر کے تمام تر قوت و طاقت اکٹھی کر کے ان لوگوں نے مدینہ شریف پر چڑھائی کی۔ یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ کے ارد گرد خندق کھودنی پڑی۔ لیکن بالآخر دنیا نے دیکھ لیا کہ ان کے مکر کا نقصان انہیں کو پہنچا۔ یہ خائب و خاسر ہوئے نامراد و ناکام پلٹے دامن مراد خالی رہا بلکہ نامرادی اور مایوسی و نقصان عظیم کے ساتھ لوٹنا پڑا۔ اللہ تعالیٰ نے مومنوں کی حفاظت کی اور اپنی قوت و عزت سے انہیں اوندھے منہ گرایا۔ فالحمد للہ الکبیر المتعال۔

اَمْ لَهُمْ نَصِيْبٌ مِّنَ الْمُلْكِ فَاِذًا لَّا يُؤْتُوْنَ النَّاسَ نَقِيْرًا ﴿۵۳﴾ اَمْ يَحْسُدُوْنَ النَّاسَ عَلٰى مَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۚ فَقَدْ اٰتَيْنَآ اٰلَ اِبْرٰهِيْمَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاٰتَيْنٰهُمْ مُّلْكًا عَظِيْمًا ﴿۵۴﴾ فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ بِهٖ وَمِنْهُمْ مَّنْ صَدَّ عَنْهُ ۭ وَكَفٰى بِجَهَنَّمَ سَعِيْرًا ﴿۵۵﴾

ہاں کیا ان کے پاس کوئی حصہ ہے سلطنت کا سو ایسی حالت میں تو اور لوگوں کو ذرا سی چیز بھی نہ دیتے یا دوسرے آدمیوں سے ان چیزوں کی وجہ سے جلتے ہیں۔ جو اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے فضل سے عطا فرمائی ہیں۔ سو ہم نے ابراہیم کے خاندان کو کتاب بھی دی ہے اور علم بھی دیا اور ہم نے ان کو بڑی بھاری سلطنت بھی دی ہے سو ان میں سے بعضے تو ان پر ایمان لائے اور بعضے ایسے تھے کہ اس سے روگرداں ہی رہے اور دوزخ کی یہ آتش سوزاں کافی ہے۔ ○

بخل کا بیان اور اس کی مذمت ☆

یہاں بطور انکار کے سوال ہوتا ہے کہ کیا وہ ملک کے کسی حصہ کے مالک ہیں یعنی نہیں ہیں۔ پھر ان کی بخیلی بیان ہوتی ہے کہ اگر ایسا ہوتا تو یہ کسی کو ذرا سا بھی نفع پہنچانے کے روادار نہ ہوتے۔ خصوصاً اللہ کے آخری پیغمبر کو اتنا بھی نہ دیتے۔ جتنا کھجور کی گٹھلی کے درمیان کا پردہ ہوتا ہے جیسے اور آیت میں ہے: ﴿قُلْ لَّوْ اَنْتُمْ تَمْلِكُوْنَ خَزَآئِنَ رَحْمَةِ رَبِّيْٓ﴾ (بنی اسرائیل: ۱۰۰) یعنی اگر تم میرے رب کی رحمتوں کے خزانوں کے مالک ہوتے تو تم خرچ ہو جانے کے خوف سے بالکل ہی روک

لیتے۔ گو ظاہر ہے کہ وہ کم نہیں ہو سکتے۔ لیکن تمہاری کنجوسی تمہیں ڈرا دیتی۔ اسی لئے فرمایا کہ انسان بڑا ہی بخیل ہے۔ اس بخل کے بیان کے بعد پھر ان کا حسد بیان ہو رہا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے جو بڑی رفیع القدر نبوت عطا فرمائی ہے اور آپ چونکہ عرب میں سے ہیں، بنی اسرائیل نہیں ہیں اس لئے یہ جلے جاتے ہیں اور لوگوں کو آپ کی تصدیق سے روک رہے ہیں۔ ابن عباسؓ فرماتے ہیں یہاں الناس سے مراد ہم ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ہم نے آلِ ابراہیم کو جو بنی اسرائیل کے قبائل میں اولاد ابراہیم سے ہیں نبوت دی، کتاب نازل فرمائی، طریقے تعلیم کئے۔ ان میں بادشاہت بھی دی۔ باوجود اس کے ان میں سے بعض تو مؤمن ہوئے اس اکرام وانعام کو مانا لیکن بعضوں نے پھر اس کے ساتھ کفر کیا۔ اسے تسلیم نہ کیا اور لوگوں کو بھی اس سے روکا۔ حالانکہ وہ بھی بنی اسرائیل ہی تھے۔ تو جب کہ اپنے والوں ہی سے منکر ہو چکے ہیں تو پھر اے نبی آخر الزماں ﷺ آپ کا انکار ان سے کیا دور ہے۔ جب کہ آپ ان میں سے بھی نہیں۔ یہ مطلب ہو سکتا ہے کہ بعض اس پر یعنی محمد ﷺ پر ایمان لائے اور بعض نہ لائے۔ پس یہ کافر اپنے کفر میں بہت سخت پکے اور نہایت پختہ ہیں اور ہدایت وحق سے بہت ہی دور ہیں۔ پھر انہیں ان کی سزا سنائی جا رہی ہے کہ جہنم کا جلنا انہیں بس ہے۔ ان کے کفر عناد کی، ان کی تکذیب اور سرکشی کی یہ سزا کافی ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِنَا سَوْفَ نُصْلِيهِمْ نَارًا ۖ كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُودُهُمْ بَدَّلْنَاهُمْ جُلُودًا غَيْرَهَا لِيَذُوقُوا الْعَذَابَ ۗ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَزِيزًا حَكِيمًا ﴿٥٦﴾ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ سَنُدْخِلُهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا ۖ لَهُمْ فِيهَا أَزْوَاجٌ مُطَهَّرَةٌ ۖ وَنُدْخِلُهُمْ ظِلًّا ظَلِيلًا ﴿٥٧﴾

بلاشک جو لوگ ہماری آیات کے منکر ہوئے ہم ان کو عنقریب ایک سخت آگ میں داخل کریں گے۔ جب ایک دو دفعہ ان کی کھال جل چکے گی تو ہم اس کی پہلی کھال کی جگہ فوراً دوسری کھال پیدا کریں گے تاکہ عذاب ہی بھگتتے رہیں۔ بلاشک اللہ تعالیٰ زبردست ہیں حکمت والے ہیں اور جو لوگ ایمان لائے اور اچھے کام کئے ہم ان کو عنقریب ایسے باغوں میں داخل کریں گے کہ ان کے نیچے نہریں جاری ہوں گی ان میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے ان کے واسطے ان میں پاک صاف بیبیاں ہوں گی اور ہم ان کو نہایت گنجان سایہ میں داخل کریں گے۔ ○

منکرین پر عذاب ☆

اللہ کی آیتوں کو نہ ماننے اور رسولوں کو برگشتہ کرنے والوں کی سزا اور ان کے برے انجام کا ذکر ہو رہا ہے کہ انہیں اس آگ میں دھکیلا جائے گا جو انہیں ہر طرف سے گھیر لے گی اور ان کے رونگٹے رونگٹے کو جلا دے گی اور یہی نہیں بلکہ یہ عذاب دائمی ہوگا۔ ایک چمڑا جل گیا تو دوسرا بدل گیا جو سفید کاغذ کے مثال ہوگا۔ ایک ایک کافر کی سو سو کھالیں ہوں گی۔ ہر ہر کھال پر

طرح طرح کے عذاب ہوتے ہوں گے۔ ایک ایک دن میں ستر ہزار مرتبہ کھال الٹ پلٹ ہوگی۔ یعنی کہہ دیا جائے گا کہ پھر لوٹ آئے وہ پھر لوٹ آئے گی۔ حضرت عمرؓ کے سامنے جب اس آیت کی تلاوت ہوتی ہے تو آپ پڑھنے والے سے دوبارہ سنانے کی فرمائش کرتے ہیں۔ وہ دوبارہ پڑھتے ہیں' تو معاذ بن جبلؓ فرماتے ہیں میں آپ کو اس کی تفسیر سناؤں۔ ایک ساعت میں سو سو بار بدلی جائے گی۔ اس پر حضرت عمرؓ نے فرمایا: میں نے رسول اللہ ﷺ سے یہی سنا ہے۔ (ابن مردویہ وغیرہ)

دوسری روایت میں ہے کہ اس وقت کعبؓ نے کہا تھا کہ مجھے اس آیت کی تفسیر یاد ہے۔ میں نے یہ اسلام لانے سے پہلے پڑھی تھی۔ آپ نے فرمایا: اچھا بیان کرو۔ اگر وہ وہی ہے' جو میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنی ہے تو ہم اسے قبول کریں گے ورنہ ہم اسے قابلِ التفات نہ سمجھیں گے۔ تو آپ نے فرمایا: ایک ساعت میں بیس مرتبہ۔ اس پر حضرت عمر فاروقؓ نے فرمایا: میں نے اسی طرح حضور ﷺ سے سنا ہے۔ حضرت ربیع بن انسؒ فرماتے ہیں کہ دوسری آسمانی کتابوں میں ہے کہ ان کی کھال چالیس ہاتھ یا چھہتر ہاتھ کی ہوگی اور ان کے پیٹ اتنے بڑے ہوں گے کہ اگر ان میں پہاڑ رکھا جائے تو سما جائے۔ جب ان کھالوں کو آگ کھالے گی تو اور کھالیں آجائیں گی۔ ایک حدیث میں اس سے بھی زیادہ ہے۔ مسند احمد میں ہے کہ جہنمی جہنم میں اس قدر بڑے بڑے بنا دیئے جائیں گے کہ ان کے کان کی نوک سے مونڈھا سات سو سال کی راہ پر ہوگا اور ان کی کھال کی موٹائی ستر ذراع ہوگی اور کچلی مثل احد پہاڑ کے ہوگی اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ مراد کھال سے لباس ہے۔ لیکن یہ ضعف ہے اور ظاہر الفاظ کے خلاف ہے۔ پھر نیک لوگوں کا انجام بیان ہو رہا ہے کہ وہ جنت عدن میں ہوں گے۔ جس کے چپے چپے پر نہریں جاری ہوں گی۔ جہاں چاہیں انہیں لے جائیں۔ اپنے محلات میں' باغات میں' راستوں میں غرض جہاں جی چاہے وہیں وہ پاک نہریں بہنے لگیں گی' پھر سب سے لطیف یہ ہے کہ یہ تمام نعمتیں ابدی اور پائیدار ہوں گی۔ نہ انہیں زوال آئے' نہ ان میں کمی ہو۔ نہ وہ واپس لی جائیں۔ نہ فنا ہوں نہ سڑیں۔ نہ بگڑیں نہ خراب ہوں نہ ختم ہوں۔ پھر ان کے لئے وہاں حیض ونفاس سے گندگی اور پلیدی سے' میل کچیل' اور بو باس سے' رذیل صفتوں اور واہی اخلاق سے پاک بیویاں ہوں گی اور گھنے لمبے چوڑے سائے ہوں گے۔ جو بہت فرحت والے بڑے سرور والے پر راحت افزا دل خوش کن ہوں گے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: جنت میں ایک درخت ہے جس کے سائے تلے ایک سو سال تک بھی ایک سوار چلا جائے تو اس کا سایہ ختم نہ ہو۔ یہ شجرۃ الخلد ہے۔ (ابن جریر)

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا ۙ وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ نِعِمَّا يَعِظُكُمْ بِهٖ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ سَمِيْعًۢا بَصِيْرًا ﴿۵۸﴾

بے شک اللہ تعالیٰ تم کو اس بات کا حکم دیتے ہیں کہ اہل حقوق کو ان کے حقوق پہنچا دیا کرو اور یہ کہ جب لوگوں کا تصفیہ کیا کرو تو عدل سے تصفیہ کیا کرو۔ بیشک اللہ تعالیٰ جس بات کی تم کو نصیحت کرتے ہیں وہ بات بہت اچھی ہے بیشک اللہ تعالیٰ خوب سنتے ہیں خوب دیکھتے ہیں۔ O

امانت و دیانت کا حکم ☆

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: جو تیرے ساتھ امانت داری کا برتاؤ کرے تو اس کی امانت ادا کر اور جو تیرے

ساتھ خیانت کرے تو اس کے ساتھ خیانت مت کر۔ (مسند احمد وسنن) آیت کے الفاظ عام ہیں۔ اللہ تعالیٰ عزوجل کو کل حقوق کی ادائیگی کو بھی شامل ہیں جیسے روزہ' نماز' زکوٰۃ' کفارہ نذر وغیرہ اور بندوں کے آپس کے کل حقوق کو بھی شامل ہیں جیسے امانت دی ہوئی چیزیں وغیرہ۔ پس جس حق کو جو ادا نہ کرے گا اس کی پکڑ قیامت کے دن ہوگی۔ صحیح حدیث میں ہے' قیامت کے دن ہر حقدار کا حق اسے دلوایا جائے گا۔ یہاں تک کہ بے سینگ والی بکری کو اگر سینگوں والی بکری نے مارا ہے تو اس کا بدلہ دلوایا جائے گا۔ حضرت عبداللہ بن مسعود فرماتے ہیں کہ شہادت کی وجہ سے تمام گناہ مٹ جاتے ہیں۔ مگر امانت نہیں مٹتی۔ گو کوئی شخص اللہ کی راہ میں شہید ہوا ہو اسے بھی قیامت کے دن لایا جائے گا کہ اپنی امانت ادا کرو۔ وہ جواب دے گا کہ دنیا تو اب ہے نہیں' میں کہاں سے اسے ادا کروں؟ فرماتے ہیں: پھر وہ چیز اسے جہنم کی تہہ میں نظر آئے گی اور کہا جائے جا اسے لے آ۔ وہ اسے اپنے کندھے پر لاد کر لے چلے گا۔ لیکن وہ گر پڑے گا۔ پھر وہ اسے لینے جائے گا۔ پس اسی عذاب میں مبتلا رہے گا۔ حضرت زاذان اس روایت کو سن کر حضرت براءؓ کے پاس آ کر بیان کرتے ہیں وہ کہتے ہیں: میرے بھائی نے سچ کہا۔ پھر قرآن کی یہ آیت پڑھتے ہیں۔ ابن عباسؓ وغیرہ فرماتے ہیں: ہر نیک بد پر یہی حکم ہے۔ ابوالعالیہ فرماتے ہیں: جس چیز کا حکم دیا گیا اور جس چیز سے منع کیا گیا وہ سب امانت ہے۔ حضرت ابی بن کعبؓ فرماتے ہیں: عورت اپنی شرم گاہ کی بھی امانت دار ہے۔ ربیع بن انسؓ فرماتے ہیں: جو جو معاملات تیرے اور دوسرے لوگوں کے درمیان ہوں' یہ سب کو شامل ہیں۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں: اس میں یہ بھی داخل ہے کہ سلطان عید والے دن عورتوں کو خطبہ سنائے گا۔

اس آیت کے شانِ نزول میں مروی ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ نے مکہ فتح کیا اور اطمینان کے ساتھ بیت اللہ شریف میں آئے تو اپنی اونٹنی پر سوار ہو کر طواف کیا۔ طواف میں آپ حجر اسود کو اپنی لکڑی سے چھوتے تھے۔ اس کے بعد عثمان بن طلحہ کو جو کعبہ کے کنجی بردار تھے۔ بلایا: ان سے کنجی طلب کی۔ انہوں نے دینی چاہی' اتنے میں حضرت عباسؓ نے کہا: یارسول اللہؐ اب یہ مجھے سونپئے تاکہ میرے گھرانے پر زمزم کا پکانا اور کعبہ کی کنجی کا رکھنا دونوں ہی باتیں ہو جائیں۔ یہ سنتے ہی حضرت عثمان بن طلحہؓ نے اپنا ہاتھ روک لیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دوبارہ طلب کی۔ پھر وہی واقعہ ہوا۔ آپ نے سہ بارہ طلب کی' حضرت عثمانؓ نے یہ کہا کہ اللہ کی امانت کے ساتھ دیتا ہوں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کعبہ کا دروازہ کھولا' اندر گئے۔ وہاں جو بت اور تصویریں تھیں' سب تڑوا کر باہر پھینکوائیں۔ حضرت ابراہیم کا بت بھی تھا۔ جس کے ہاتھ میں فال کے تیر بھی تھے۔ آپ نے فرمایا: اللہ ان مشرکین کو غارت کرے۔ بھلا خلیل اللہ کو ان تیروں سے کیا سروکار۔ پھر ان تمام چیزوں کو برباد کر کے ان کی جگہ پانی ڈال کر انہیں مٹا کر آپ باہر آئے۔ کعبہ کے دروازے پر کھڑے ہو کر آپ نے کہا: کوئی معبود نہیں اللہ تعالیٰ کے۔ وہ اکیلا ہے جس کا کوئی شریک نہیں اس نے اپنے وعدے کو سچا کیا' اپنے بندوں کی مدد کی اور تمام لشکروں کو شکست دی۔ پھر آپ نے ایک طویل خطبہ دیا۔ جس میں یہ بھی فرمایا کہ جاہلیت کے تمام جھگڑے اب میرے پاؤں تلے کچل دیئے گئے' خواہ مالی ہوں خواہ جانی ہوں ہاں بیت اللہ کی چوکیداری کا اور حاجیوں کی پانی پلانے کا منصب جوں کا توں رہے گا۔ اس خطبہ کو پورا کر کے آپ ﷺ بیٹھے ہی تھے کہ حضرت علیؓ نے آگے بڑھ کر کہا: حضور کنجی مجھے عنایت فرمائی جائے تاکہ بیت اللہ کی چوکیداری کا اور حاجیوں کو زمزم پلانے کا منصب دونوں یک جا ہو جائیں۔ لیکن آپ ﷺ نے انہیں نہ دی۔ مقام ابراہیم کو کعبہ کے اندر سے نکال کر آپ نے کعبہ کی دیوار سے ملا کر رکھ دیا اور لوگوں کو کہہ دیا کہ تمہارا قبلہ یہی ہے۔ پھر آپ طواف میں مشغول ہو

گئے۔ ابھی آپ دو پھیرے ہی پھیرے تھے کہ حضرت جبرائیل نازل ہوئے اور آپ نے اپنی زبان مبارک سے اس آیت کی تلاوت شروع کی۔ اس پر حضرت عمرؓ نے فرمایا: میرے ماں باپ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر قربان ہوں' میں نے تو اس سے پہلے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس آیت کی تلاوت کرتے نہیں سنا۔ اب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عثمان بن طلحہ کو بلایا اور انہیں کنجی سونپی اور فرمایا: آج کا دن وفا کا اور نیکی کا اور سلوک کا دن ہے۔ یہ عثمان بن طلحہ جن کی نسل میں آج تک کعبۃ اللہ کی کنجی چلی آتی ہے' یہ صلح حدیبیہ اور فتح مکہ کے درمیان اسلام لائے تھے۔ جب کہ خالد بن ولید اور عمرو بن عاص مسلمان ہوئے تھے۔ ان کا چچا عثمان بن طلحہ اُحد کی لڑائی میں مشرکوں کے ساتھ تھا۔ بلکہ جھنڈا بردار تھا اور وہیں بحالت کفر مارا گیا۔

الغرض مشہور تو یہی ہے کہ یہ آیت اسی بارے میں اُتری ہے۔ اب خواہ اس بارے میں نازل ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہو۔ بہر صورت اس کا حکم عام ہے۔ جیسے عبداللہ بن عباسؓ اور حضرت محمد بن حنفیہ کا قول ہے کہ ہر ہر شخص کو اپنی امانت کی ادائیگی کا حکم ہے پھر ارشاد ہے کہ فیصلے عدل کے ساتھ کرو۔ حاکموں کو احکم الحاکمین کا حکم ہے کہ کسی حالت میں عدل کا دامن نہ چھوڑو۔ حدیث میں ہے اللہ حاکم کے ساتھ ہوتا ہے جب تک وہ ظلم نہ کرے۔ جب ظلم کرتا ہے تو اسے اسی کی طرف سونپ دیتا ہے۔ ایک اثر میں ہے ایک دن کا عدل چالیس سال کی عبادت کے برابر ہے۔ پھر فرماتا ہے یہ ادائیگی امانات کا اور عدل و انصاف کا حکم اور اسی طرح شریعت کے تمام احکام اور ممنوعات تمہارے لئے بہترین اور نافع چیزیں ہیں جن کا امر پروردگار تمہیں کر رہا ہے۔ (ابن ابی حاتم) ایک روایت میں ہے حضرت ابو ہریرہؓ نے اس آیت کے آخری الفاظ پڑھتے ہوئے اپنا انگوٹھا اپنے کان میں رکھا اور شہادت کی انگلی اپنی آنکھ پر رکھی یعنی اشارے سے سنتا' دیکھتا' کان اور آنکھ پر انگلی رکھ کر بتایا' فرمایا: میں نے اسی طرح پڑھتے اور کرتے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا ہے۔ راوی حدیث حضرت ابو زکریا فرماتے ہیں۔ ہمارے استاد مقریؒ نے بھی اسی طرح پڑھ کر اشارہ کر کے ہمیں بتایا۔ اپنے داہنے ہاتھ کا انگوٹھا اپنی دائیں آنکھ پر رکھا اور اس کے پاس کی انگلی اپنے داہنے کان پر رکھی۔ (ابن ابی حاتم) یہ حدیث اسی طرح امام ابوداؤد نے بھی روایت کی ہے اور امام ابن حبان بھی اپنی صحیح میں اسے لائے ہیں اور حاکم نے مستدرک میں اور ابن مردویہ نے اسے اپنی تفسیر میں بھی بیان کیا ہے۔ اس کی سند میں جو ابو یونس ہیں۔ وہ حضرت ابو ہریرہؓ کے مولی ہیں اور ان کا سلیم بن جبیر ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ۝۵۹

ع ۸ / ۹ / ۵

اے ایمان والو تم اللہ کا کہنا مانو اور رسول کا کہنا مانو اور تم میں جو لوگ اہل حکومت ہیں ان کا بھی پھر اگر کسی امر میں تم باہم اختلاف کرنے لگو تو اس امر کو اللہ اور رسول کے حوالے کر دیا کرو۔ اگر تم اللہ پر اور یوم قیامت پر ایمان رکھتے ہو یہ امور سب بہتر ہیں اور ان کا انجام خوش تر ہے۔ ○

اللہ عزوجل اور رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اطاعت ہر حال میں ضروری ہے ☆

صحیح بخاری شریف میں بروایت حضرت عبداللہ بن عباسؓ مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک چھوٹے سے لشکر میں حضرت عبداللہ بن حذافہ بن قیس کو بھیجا تھا۔ ان کے بارے میں یہ آیت اتری ہے۔ بخاری و مسلم میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک لشکر بھیجا جس کی سرداری ایک انصاری کو دی۔ ایک مرتبہ وہ لوگوں پر سخت غصہ ہو گئے اور فرمانے لگے: کیا تمہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میری فرمانبرداری کا حکم نہیں دیا؟ سب نے کہا: ہاں بے شک دیا ہے۔ فرمانے لگے: اچھا لکڑیاں جمع کرو۔ پھر آگ منگوا کر لکڑیاں جلائیں۔ پھر حکم دیا کہ تم سب اس آگ میں کود پڑو۔ ایک نوجوان نے کہا: لوگو سنو! آگ سے بچنے کے لئے ہی تم نے دامن رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) میں پناہ لی ہے۔ اس لئے جلدی نہ کرو جب تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات نہ ہو جائے۔ پھر اگر آپ بھی یہی فرمائیں تو بے جھجک اس میں کود پڑنا۔ چنانچہ یہ لوگ واپس حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سارا واقعہ کہہ سنایا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر تم آگ میں کود پڑتے تو ہمیشہ آگ ہی میں رہتے۔ سنو فرمانبرداری معروف میں ہے۔ ابوداؤد میں ہے کہ مسلمان پر سننا اور ماننا فرض ہے گو جی چاہے یا نہ چاہے۔ لیکن جب تک کہ اللہ اور رسول کی نافرمانی کا حکم ملے تو نہ سنے نہ مانے۔ صحیحین میں ہے حضرت عبادہ بن صامتؓ فرماتے ہیں: ہم سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیعت لی' سننے کی اور ماننے کی۔ گو ہماری خوشی ہو یا ناخوشی ہو۔ ہماری سختی ہو یا ہماری آسانی ہو اور گو ہم دوسرے کو ترجیح دی جا رہی ہو اور ہم سے بیعت کی کہ کام کے اہل سے اس کام کو نہ چھینیں۔ فرمایا: مگر یہ کہ تم کھلا کفر دیکھو جس کے بارے میں تمہارے پاس کوئی واضح دلیل ہو۔ بخاری شریف میں ہے سنو اور اطاعت کرو۔ اگرچہ تم پر حبشی غلام امیر بنا دیا گیا ہو۔ گویا کہ اس کا سر کشمکش ہے۔ مسلم شریف میں ہے' ابوہریرہؓ فرماتے ہیں: مجھے میرے خلیل (صلی اللہ علیہ وسلم) نے وصیت کی سننے کی اور ماننے کی اگرچہ امیر بغیر ہاتھ پاؤں کے حبشی غلام ہو۔ مسلم کی اور حدیث میں ہے کہ حضورؐ نے حجۃ الوداع کے خطبہ میں فرمایا: گو تم پر غلام عامل بنایا جائے جو تمہیں کتاب اللہ کے ساتھ ساتھ لے جانا چاہے تو تم اسکو سنو اور مانو۔ ایک اور روایت میں غلام حبشی جس کے اعضا کٹے ہوئے ہوں' کے الفاظ ہیں۔ ابن جریر میں ہے کہ میرے بعد آنے والے تم سے ملیں گے۔ نیکوں سے نیک اور بدوںؐ سے بد۔ تم ہر ایک کی اس امر کی جو مطابق ہو اسکی سنو اور مانو اور انکے پیچھے نمازیں پڑھتے رہو اگر وہ نیکی کرینگے تو انکے لئے نفع اور تمہارے لئے بھی۔ اگر وہ بدی کرینگے تو تمہارے لئے تمہاری اچھائی ہے اور انہیں انکی بدعملی کا ثمرہ ملے گا۔ ابوہریرہؓ فرماتے ہیں۔ نبیؐ نے فرمایا: بنو اسرائیل میں مسلسل لگاتار رسول آیا کرتے تھے۔ ایک کے بعد ایک اور میرے بعد کوئی نبی نہیں مگر خلفا ہوں گے اور بکثرت ہونگے۔ لوگوں نے پوچھا: پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں کیا حکم ہے؟ فرمایا: پہلے کی بیعت پوری کرو۔ پھر اسکے بعد والے کی' ان کے حقوق انہیں دے دو۔ اللہ تعالیٰ ان سے ان کی رعیت کے بارے میں سوال کرنے والا ہے۔ آپ فرماتے ہیں جو شخص اپنے امیر کا کوئی ناپسندیدہ کام دیکھے' اسے صبر کرنا چاہئے۔ جو شخص جماعت سے بالشت بھی جدا ہو گیا' وہ تو جاہلیت کی موت مرے گا۔ (بخاری مسلم)

ارشاد ہے جو شخص اطاعت سے ہاتھ کھینچ لے قیامت کے دن اللہ سے حجت و دلیل کے بغیر ملاقات کرے گا اور جو اس حالت میں مرے کہ اس کی گردن میں بیعت نہ ہو وہ جاہلیت کی موت مرے گا (مسلم)۔ حضرت عبدالرحمٰن فرماتے ہیں: میں بیت اللہ شریف گیا۔ دیکھا کہ حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص کعبہ کے سایہ میں تشریف فرما ہیں اور لوگوں کا ایک مجمع جمع ہے۔ میں بھی اس مجلس میں ایک طرف بیٹھ گیا۔ اس وقت حضرت عبداللہ نے یہ حدیث بیان کی۔ فرمایا: ایک سفر میں ہم رسول مقبول

صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے۔ایک منزل میں اترے۔کوئی اپنا خیمہ ٹھیک کرنے لگا۔کوئی اپنے تیر سنبھالنے لگا۔کوئی کسی اور کام میں مشغول ہو گیا۔اچانک ہم نے سنا کہ منادی ندا کر رہا ہے۔ہم ہمہ تن گوش ہو گئے تو سنا کہ رسول اللہ ﷺ فرما رہے ہیں: ہر نبی پر اللہ کی طرف سے فرض ہوتا ہے کہ اپنی اُمت کو تمام نیکیاں جو وہ جانتا ہے سکھا دے اور تمام برائیوں کو جو اس کی نگاہ میں ہیں آگاہ کر دے۔سنو اس میری اُمت کی عافیت کا زمانہ اس کا اوّل زمانہ ہے۔آخر زمانے میں بڑی بڑی بلائیں آئیں گی اور ایسے ایسے امور نازل ہوں گے جنہیں مسلمان پسند نہیں کریں گے اور تابڑتوڑ آتے رہیں گے۔ایک فتنہ آئے گا کہ مؤمن سمجھ لے گا اسی میں میری ہلاکت ہے۔پھر اس سے ہٹ کر دوسرا اُس سے بھی بڑا آئے گا۔جس میں اسے اپنی ہلاکت کا کامل یقین آ جائے گا۔بس یونہی لگاتار فتنے اور زبردست آزمائشیں اور کامل تکلیفیں آتی رہیں گی۔پس جو شخص اس بات کو پسند کرے کہ جہنم سے دُوری ہو اور جنت میں حصہ میں آئے' اسے چاہئے کہ مرتے دَم تک اللہ تعالیٰ پر اور قیامت کے دن پر پورا ایمان رکھے اور لوگوں سے وہ برتاؤ کرے جو خود اپنے ساتھ پسند کرتا ہے سنو! جس نے امام سے بیعت کر لی۔اس نے اپنے ہاتھ کا قبضہ اور اپنے دل کا پھل اسے دے دیا۔اب اسے چاہئے کہ اس کی اطاعت کرے۔اگر کوئی اور آ کر اس سے چھیننا چاہے تو اس کی گردن اڑا دو۔عبد الرحمٰنؒ فرماتے ہیں: میں یہ سن کر قریب گیا اور کہا آپ کو میں اللہ کی قسم دیتا ہوں کیا خود آپ نے اپنے رسول ﷺ کی زبانی سنا ہے۔تو آپ نے اپنے دونوں ہاتھ اپنے کان اور دل کی طرف بڑھا کر فرمایا: میں نے حضور ﷺ سے اپنے دونوں کانوں سے سنا اور اپنے دل میں محفوظ رکھا۔میں نے کہا: دیکھئے آپ کے چچا زاد بھائی حضرت معاویہ کو کہ وہ ہمیں مال کو غلط طریقے سے کھانے اور آپس میں ایک دوسرے سے جنگ کرنے کا حکم دیتے ہیں۔حالانکہ اللہ تعالیٰ ان دونوں کاموں سے ممانعت فرماتا ہے۔ارشاد ہے: ﴿يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ﴾ (النسآء:۲۹) اسے سن کر حضرت عبد اللہ ذرا سی دیر خاموش رہے۔پھر فرمایا: اللہ کی اطاعت میں ان کی اطاعت کرو اور اللہ کی نافرمانی کا حکم جو وہ دیں اسے نہ مانو۔(مسلم) اس بارے کی حدیثیں اور بھی بہت ہیں۔

اس آیت کی تفسیر میں حضرت سدی سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک لشکر بھیجا' جس کا امیر حضرت خالدؓ بن ولید کو بنایا۔اس لشکر میں عمار بنؓ یاسر بھی تھے۔یہ لشکر جس قوم کی طرف بھیجا جانا تھا اسی طرف چلا اور رات کے وقت اس بستی کے پاس پہنچ کر پڑاؤ کیا۔ان لوگوں کو اپنے جاسوسوں سے پتہ چل گیا اور راتوں رات بھاگ کھڑے ہوئے۔صرف ایک شخص رہ گیا۔اس نے اپنے قبیلہ والوں سے کہا اور انہوں نے اس کا سب اسباب جلا دیا۔پھر یہ رات کے اندھیرے میں حضرت خالد کے لشکر میں چلا آیا اور یہ پتہ لگا کر حضرت عمارؓ کے پاس پہنچا اور ان سے کہا کہ اے ابو الیقظان' میں اسلام قبول کر چکا ہوں اور گواہی دے چکا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور یہ کہ محمد ﷺ اس کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔میری ساری قوم تمہارا یہاں آنا سن کر بھاگ گئی ہے۔صرف میں باقی رہ گیا ہوں تو کل کیا یہ میرا اسلام مجھے نفع دے گا؟ اگر نفع نہ دے تو میں بھی بھاگ جاؤں۔حضرت عمار نے فرمایا: یقیناً یہ اسلام تمہیں نفع دے گا تم نہ بھاگو۔بلکہ ٹھہرے رہو۔صبح کے وقت حضرت خالد نے لشکر کشی کی تو سوائے اس شخص کے وہاں کسی کو نہ پایا۔اسے اس کے مال سمیت گرفتار کر لیا گیا۔حضرت عمارؓ کو معلوم ہوا تو حضرت خالدؓ کے پاس آئے اور کہا: اسے چھوڑ دیجئے۔یہ اسلام لا چکا ہے اور میری پناہ میں ہے۔حضرت خالدؓ نے کہا: تم کون ہو جو کسی کو پناہ دے سکو۔اس پر دونوں بزرگوں میں کچھ تیز کلامی ہو گئی اور قصہ بڑھا۔یہاں تک کہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں سارا واقعہ

بیان کیا گیا۔ آپ نے حضرت عمارؓ کو پناہ کو جائز قرار دیا اور فرمایا: آئندہ تم کسی شخص کو امیر کی طرف سے پناہ نہ دینا۔ پھر دونوں میں کچھ تیز کلامی ہونے لگی۔ اس پر حضرت خالدؓ نے حضور ﷺ سے کہا: اس ناک کٹے غلام کو آپ کچھ نہیں کہتے۔ دیکھئے تو مجھے برا بھلا کہہ رہا ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا: خالدؓ عمار کو بڑا بھلا نہ کہو' عمار کو گالیاں دینے والے اللہ کو گالیاں دے گا۔ عمار سے دشمنی کرنے والے سے اللہ دشمنی رکھے گا۔ عمار پر جو لعنت بھیجے گا اس پر اللہ کی لعنت ہو گی۔ اب تو حضرت خالدؓ بہت گھبرائے۔ حضرت عمار غصہ میں چلے گئے تھے۔ آپ دوڑے بھاگے ان کے پاس گئے۔ دامن تھام لیا۔ عذر معذرت کی اور اپنی تقصیر معاف کرائی۔ پیچھا نہ چھوڑا۔ جب تک کہ حضرت عمارؓ راضی رضامند نہ ہو گئے۔ پس اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ (امر امامت و خلافت کے متعلق شرائط وغیرہ کا بیان آیت: ﴿وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّىْ جَاعِلٌ فِى الْاَرْضِ خَلِيْفَةً﴾ (البقرہ:۳۰) کی تفسیر میں گزر چکا ہے وہاں ملاحظہ ہو' (مترجم)۔

حضرت ابن عباسؓ سے بھی یہ روایت مروی ہے۔ (ابن جریر اور ابن مردویہ) حضرت ابن عباسؓ وغیرہ فرماتے ہیں اولی الامر سے مراد سمجھ بوجھ والے اور دین والے ہیں یعنی علما۔ ظاہر بات تو یہ معلوم ہوتی ہے آگے حقیقی علم اللہ کو ہے کہ یہ لفظ عام ہے امراء اور علما دونوں اس سے مراد ہیں جیسے کہ پہلے گزرا ہے۔ اور جگہ ہے: ﴿لَوْلَا يَنْهٰىهُمُ الرَّبّٰنِيُّوْنَ﴾ (المائدہ:۶۳) یعنی ان کے علما نے انہیں جھوٹ بولنے اور حرام کھانے سے کیوں نہ روکا اور جگہ ہے: ﴿فَسْـَٔلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ﴾ حدیث و قرآن کے جاننے والوں سے پوچھ لیا کرو۔ اگر تمہیں علم نہ ہو صحیح حدیث میں ہے میری اطاعت کرنے والا اللہ کی اطاعت کرنے والا ہے اور جس نے میری نافرمانی کی' اس نے اللہ کی نافرمانی کی اور جس نے میرے امیر کی اطاعت کی' اس نے میری فرمانبرداری کی اور جس نے میرے مقرر کردہ امیر کی نافرمانی کی اس نے میری نافرمانی کی۔ پس یہ ہیں احکام علماء امرا کی اطاعت کے۔ اس آیت میں ارشاد ہوتا ہے کہ اللہ کی اطاعت کرو۔ یعنی اس کتاب کی اتباع کرو۔ اللہ کے رسول ﷺ کی اطاعت کرو۔ یعنی ان کی سنتوں پر عمل کرو اور حاکموں کی اطاعت کرو اور عمل کرو اور حاکموں کی اطاعت کرو۔ لیکن اس چیز میں جو اللہ کی اطاعت ہو اللہ کے فرمان کے خلاف اگر ان کا کوئی حکم ہو تو اطاعت نہ کرنی چاہئے۔ کیونکہ ایسے وقت علماء یا امراء کی بات ماننا حرام ہے۔ جیسے کہ پہلی حدیث گزر چکی ہے کہ اطاعت صرف معروف میں ہے یعنی فرمان اللہ تعالیٰ فرمان رسول ﷺ کے دائرے میں ہیں۔

مسند احمد میں اس سے بھی زیادہ صاف حدیث ہے جس میں ہے کوئی عبادت اللہ کے فرمان کے خلاف نہیں آگے چل کر فرمایا اگر تم میں سے کسی بارے میں جھگڑا پڑے تو اسے اللہ کی طرف لوٹاؤ۔ یعنی کتاب اللہ تعالیٰ اور سنت رسول اللہ ﷺ کی طرف جیسے کہ حضرت مجاہدؒ کی تفسیر ہے۔ پس یہاں صریح اور صاف لفظوں میں اللہ عزوجل کا حکم ہو رہا ہے کہ لوگ جس مسئلہ میں اختلاف کریں۔ خواہ وہ مسئلہ اصول دین سے متعلق ہو۔ خواہ فروع دین سے' اس کے تصفیہ کی صرف یہی صورت ہے کہ کتاب و سنت کو حاکم مان لیا جائے۔ جو اس میں ہو' قبول کیا جائے' جیسے اور آیت قرآنی میں ہے: ﴿وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيْهِ مِنْ شَىْءٍ فَحُكْمُهٗٓ اِلَى اللّٰهِ﴾ (الشوریٰ:۱۰) یعنی جس چیز میں تمہارا اختلاف پڑے' اس کا فیصلہ اللہ کی طرف ہے۔ پس کتاب و سنت جو حکم دے اور جس مسئلہ پر صحت کی شہادت دے وہی حق ہے باقی سب باطل ہے۔ قرآن فرماتا ہے: حق کے بعد جو کچھ ہے ضلالت و گمراہی ہے۔ اسی لئے یہاں بھی اس حکم کے ساتھ ہی ارشاد ہوتا ہے کہ اگر تم اللہ پر اور قیامت پر ایمان رکھتے ہو۔ یعنی اگر تم ایمان کے دعوے میں سچے ہو تو تمہیں جس مسئلہ میں علم نہ ہو۔ جس مسئلہ میں اختلاف ہو۔ جس امر میں جدا جدا رائیں ہوں۔ ان سب کا

فیصلہ کتاب اللہ اور حدیث رسول اللہ سے کیا کرو۔ جو ان دونوں میں ہو مان لیا کرو۔ پس ثابت ہوا کہ جو شخص اختلافی مسائل کا تصفیہ کتاب و سنت کی طرف نہ لے جائے۔ وہ اللہ اور قیامت پر ایمان نہیں رکھتا۔ پھر ارشاد ہوتا ہے کہ جھگڑوں میں اور اختلافات میں کتاب اللہ و سنت رسول اللہ ﷺ کی طرف فیصلہ لانا اور ان کی طرف رجوع کرنا ہی بہتر ہے اور اسی کام کا انجام بہتر ہوتا ہے اور یہی اچھے بدلے دلانے والا کام ہے، بہت اچھی جزا اسی کا پھل ہے۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يَزْعُمُوْنَ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَحَاكَمُوْٓا اِلَى الطَّاغُوْتِ وَقَدْ اُمِرُوْٓا اَنْ يَّكْفُرُوْا بِهٖ ۭ وَيُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّضِلَّهُمْ ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا ﴿٦٠﴾ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَاِلَى الرَّسُوْلِ رَاَيْتَ الْمُنٰفِقِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْكَ صُدُوْدًا ﴿٦١﴾ فَكَيْفَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ ثُمَّ جَاۗءُوْكَ يَحْلِفُوْنَ ڰ بِاللّٰهِ اِنْ اَرَدْنَآ اِلَّآ اِحْسَانًا وَّتَوْفِيْقًا ﴿٦٢﴾ اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ يَعْلَمُ اللّٰهُ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ ۤ فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ وَعِظْهُمْ وَقُلْ لَّھُمْ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ قَوْلًۢا بَلِيْغًا ﴿٦٣﴾

کیا آپ نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ اس کتاب پر بھی ایمان رکھتے ہیں جو آپ کی طرف نازل کی گئی اور اس کتاب پر بھی جو آپ سے پہلے نازل کی گئی؟ اپنے مقدمے شیطان کے پاس لے جانا چاہتے ہیں حالانکہ ان کو یہ حکم ہوا ہے کہ اس کو نہ مانیں اور شیطان ان کو بھٹکا کر بہت دور دور لے جانا چاہتا ہے اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ آؤ اس حکم کی طرف جو اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا ہے اور رسول کی طرف تو آپ منافقوں کی یہ حالت دیکھیں گے کہ آپ سے پہلو تہی کرتے ہیں پھر کسی جان پر بنتی ہے جب ان پر کوئی مصیبت پڑتی ہے ان کی اس حرکت کی بدولت جو کچھ وہ پہلے کر چکے ہیں پھر آپ کے پاس آتے ہیں اللہ کی قسمیں کھاتے ہوئے کہ ہمارا اور کچھ مقصود نہ تھا سوا اس کے کہ کوئی بھلائی نکل آئے اور باہم موافقت ہو جائے یہ وہ لوگ ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو معلوم ہے جو کچھ ان کے دلوں میں ہے سو آپ ان سے تغافل کر جایا کیجئے اور ان کو نصیحت فرماتے رہئے اور ان سے خاص ان کی ذات کے متعلق کافی مضمون کہہ دیجئے۔ ○

منافقین کو تنبیہ ☆

اُوپر کی آیت میں اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کے دعوے کو جھٹلایا ہے جو زبانی اقرار کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی تمام پچھلی کتابوں پر اور اس قرآن پر بھی ہمارا ایمان ہے۔ لیکن جب کبھی کسی مسئلہ کی تحقیق کرنی ہو جب کبھی کسی جھگڑے کا فیصلہ کرنا ہو تو قرآن و حدیث کی طرف رجوع نہیں کرتے بلکہ کسی اور طرف جاتے ہیں۔ یہ آیت نازل بھی ہوئی ہے ان دو شخصوں کے بارے میں جن میں کچھ اختلاف تھا ایک تو یہودی تھا دوسرا انصاری یہودی تو کہتا تھا کہ چل محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے فیصلہ کرا لیں اور انصاری کہتا تھا کہ کعب بن اشرف کے پاس چلو۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ آیت ان منافقوں کے بارے میں اتری ہے جو اسلام کو ظاہر کرتے تھے۔ اس کے علاوہ اور اقوال بھی ہیں۔ آیت اپنے حکم اور الفاظ کے اعتبار سے عام ہے اور ان تمام واقعات کو شامل ہے۔ ہر اس شخص کی مذمت اور برائی کا اظہار کرتی ہے جو کتاب و سنت سے ہٹ کر کسی اور باطل کی طرف اپنا فیصلہ لے جائے اور یہی مراد یہاں طاغوت سے ہے۔ یعنی قرآن و حدیث کے سوا کی چیز یا شخص صدود سے مراد تکبیر سے منہ موڑ لینا ہے جیسے اور آیت میں ہے: ﴿وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا﴾ (لقمان:۲۱) یعنی جب ان سے کہا جائے کہ اللہ کی اتاری ہوئی وحی کی فرمانبرداری کرو تو جواب دیتے ہیں کہ ہم تو اپنے باپ دادوں کی پیروی پر رہیں گے۔ ایمان والوں کو جواب یہ نہیں ہوتا بلکہ ان کا جواب دوسری آیت میں اس طرح مذکور ہے۔ ﴿اِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ (النور:۵۱) یعنی ایمان والوں کو جب اللہ رسول کے فیصلے اور حکم کی طرف بلایا جائے تو ان کا جواب یہی ہوتا ہے کہ ہم نے سنا اور ہم نے تہ دل سے قبول کیا الخ۔ پھر منافقوں کی مذمت میں بیان ہو رہا ہے کہ ان کے گناہوں کے باعث جب انہیں تکلیفیں پہنچتی ہیں اور تیری ضرورت محسوس ہوتی ہے تو دوڑے بھاگے آتے ہیں اور تجھے خوش کرنے کے لئے عذر معذرت کرنے بیٹھ جاتے ہیں اور قسمیں کھا کر اپنی نیکی اور صلاحیت کا یقین دلانا چاہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ آپ کے سوا دوسروں کی طرف ان مقدمات کے لے جانے سے ہمارا مقصود صرف یہی تھا کہ ذرا دوسروں کا دل رکھ لیا جائے اور آپس کا میل جول نبھ جائے۔ ورنہ دل سے ہم بھی کوئی ان کی اچھائی کے معتقد نہیں۔ جیسے اور آیت میں: ﴿فَتَرَى الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ﴾ سے ﴿نٰدِمِيْنَ﴾ تک بیان ہوا ہے تو دیکھے گا کہ بیمار دل یعنی منافق یہود و نصاریٰ کی دوستی کی تمام تر سعی کرتے پھرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمیں آفت میں پھنس جانے کا خطرہ ہے۔ پس بہت ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ فتح لائے یا اپنا کوئی حکم لائے اور یہ لوگ ان ارادوں پر پشیمان ہونے لگیں جو ان کے دلوں میں پوشیدہ ہیں۔

حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں: ابو برزہ اسلمی کاہن شخص تھا۔ یہود اپنے بعض فیصلے اس سے کراتے تھے۔ ایک واقعہ میں مشرکین بھی اس کی طرف دوڑے اس پر یہ آیتیں اَلَمْ تَرَ سے تَوْفِيْقًا تک نازل ہوئیں۔ پھر فرماتا ہے کہ اس قسم کے منافقین کے دلوں میں کیا ہے۔ اس کا علم اللہ تعالیٰ کو پورا پورا ہے۔ اس پر کوئی چھوٹی سے چھوٹی چیز بھی مخفی نہیں۔ وہ ان کے ظاہر باطن کو جاننے والا ہے تو ان سے چشم پوشی کر۔ ان کے باطنی ارادوں پر ڈانٹ ڈپٹ نہ کر۔ ہاں انہیں نفاق سے اور دوسروں میں شر و فساد رکھنے سے باز رہنے کی نصیحت کر اور دل پر اثر کرنے والی باتیں ان سے کر۔ ان کے لئے دعا بھی کر۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْٓا

اَنْفُسَهُمْ جَآءُوْكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا ﴿٦٤﴾ فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ﴿٦٥﴾

اور ہم نے تمام پیغمبروں کو خاص اسی واسطے مبعوث فرمایا ہے کہ بحکم خداوندی ان کی اطاعت کی جائے اور اگر جس وقت اپنا نقصان کر بیٹھے تھے اس وقت آپ کی خدمت میں حاضر ہو جاتے' پھر اللہ تعالیٰ سے معافی چاہتے اور رسول بھی ان کے لئے اللہ تعالیٰ سے معافی چاہتے تو ضرور اللہ تعالیٰ قبول کرنے اور رحمت کرنے والا پاتے۔ پھر قسم ہے آپ کے رب کی یہ لوگ ایماندار نہ ہوں گے جب تک یہ بات نہ ہو کہ ان کے آپس میں جو جھگڑا واقع ہو اس میں یہ لوگ آپ سے تصفیہ کرائیں گے پھر اس آپ کے تصفیہ سے اپنے دلوں میں تنگی نہ پاویں اور پورا پورا تسلیم کر لیں۔ ○

رسول ﷺ واجب اطاعت ہے ☆

مطلب یہ ہے کہ ہر زمانے کے رسول کی تابعداری اس کی اُمت پر اللہ کی طرف سے فرض ہوتی ہے۔ منصب رسالت یہی ہے کہ اس کے تمام احکام کو خدائی احکام سمجھا جائے۔ حضرت مجاہد فرماتے ہیں بِاِذْنِ اللّٰهِ سے یہ مراد ہے کہ اس کی توفیق اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ اس کی قدرت اور مشیت پر موقوف ہے جیسا کہ دوسری آیت میں ہے اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ بِاِذْنِهٖ (آل عمران: ۱۵۲) یہاں بھی اذن سے مراد امر قدرت اور مشیت ہے۔ یعنی اس نے تمہیں ان پر غلبہ دیا۔ پھر اللہ تعالیٰ عاصیوں اور خطا کاروں کو ارشاد فرماتا ہے کہ انہیں رسول اللہ ﷺ کے پاس اللہ سے استغفار کرنا چاہئے اور خود رسول سے بھی عرض کرنا چاہئے کہ آپ ہمارے لئے دعا کیجئے۔ جب وہ ایسا کریں گے تو یقیناً ان کی طرف رجوع کرے گا انہیں بخش دے گا اور ان پر رحم فرمائے گا۔ ابو منصور صباغ کی کتاب میں جس میں مشہور قصے لکھے ہیں۔ لکھا ہے کہ عتبی کا بیان ہے میں حضور ﷺ کی تربت کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ ایک اعرابی آیا اور اس نے کہا: اسلام علیک یا رسول اللہ میں نے قرآن کریم کی یہ آیت سنی تو آپ کے پاس آیا تا کہ آپ کے سامنے اپنے گناہوں سے توبہ کروں اور آپ کی شفاعت طلب کروں۔ پھر اس نے یہ اشعار پڑھے

يَاخَيْرَ مَنْ دُفِنَتْ بِالْقَاعِ اَعْظُمُهٗ ☆ فَطَابَ مِنْ طِيْبِهِنَّ الْقَاعُ وَالْاَكَمُ

نَفْسِي الْفِدَآءُ لِقَبْرٍ اَنْتَ سَاكِنُهٗ ☆ فِيْهِ الْعَفَافُ وَفِيْهِ الْجُوْدُ وَالْكَرَمُ

''جن جن کی ہڈیاں میدانوں میں دفن کی گئی ہیں اور ان کی خوشبو سے وہ میدان اور ٹیلے مہک اٹھے ہیں۔ اے ان تمام میں سے بہترین ہستی میری جان اس قبر پر صدقے ہو جس کے رہنے والے آپ ہیں جس میں پارسائی اور سخاوت اور کرم ہے۔''

پھر اعرابی تو لوٹ گیا اور مجھے نیند آ گئی۔ خواب میں کیا دیکھتا ہوں کہ گویا حضور ﷺ مجھ سے فرما رہے ہیں۔ جا اس اعرابی کو خوشخبری سنا کہ اللہ نے اس کے گناہ معاف فرما دیئے ہیں۔

پھر اللہ تعالیٰ اپنی مقدس اور بزرگ ذات کی قسم کھا کر فرماتا ہے کہ کوئی شخص ایمان کی حدود میں نہیں آ سکتا۔ جب تمام امور اللہ تعالیٰ کے اس آخر الزمان افضل ترین رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا سچا حاکم نہ مان لے اور آپ کے ہر ہر حکم' ہر ہر فیصلے' ہر ہر سنت اور ہر ہر حدیث کو قبول اور حق صریح تسلیم نہ کرنے لگے۔ دل کو اور جسم کو بالکل تابع رسول نہ کر دے۔ غرض ظاہر باطن' چھوٹے بڑے کل امور میں حدیث رسول کو اصل سمجھے' وہی مؤمن ہے۔ پس فرمان ہے کہ تیرے احکام کو یہ کشادہ دلی سے تسلیم کر لیا کریں۔ اپنے دل میں تنگی نہ لائیں۔ کل احادیث کے ساتھ تسلیم کرنے کا معاملہ رہے۔ نہ تو احادیث کے ماننے سے انکار کریں نہ انہیں ختم کرنے کی کوشش کریں نہ ان کے مرتبہ کی کسی اور چیز کو سمجھیں نہ ان کی تردید کریں نہ ان کا مقابلہ کریں نہ ان کے تسلیم کرنے میں جھگڑا کریں۔ جیسے فرمان رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) ہے: اس کی قسم جس کے ہاتھوں میں میری جان ہے تم میں سے کوئی مؤمن نہیں ہو سکتا۔ جب تک کہ وہ اپنی خواہش کو اس چیز کا پیرو کار نہ بنا دے جسے میں لایا ہوں۔

ایک واقعہ صحیح بخاری شریف میں ہے کہ حضرت زبیر کا کسی شخص سے نالیوں کے ذریعے باغ میں پانی لینے کے بارے میں جھگڑا ہو گیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: زبیر تم پانی لے لو پھر پانی کو انصاری کے باغ میں جانے دو۔ اس پر انصاری نے کہا: ہاں یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ تو آپ کی پھوپھی کے لڑکے ہیں۔ یہ سن کر آپ کا چہرہ متغیر ہو گیا اور فرمایا: زبیر تم پانی لے لو پھر پانی کو روکے رکھو یہاں تک کہ باغ کی دیواروں تک پہنچ جائے۔ پھر تم اپنے پڑوسی کی طرف چھوڑ دو۔ پہلے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ایسی صورت نکالی تھی کہ جس میں حضرت زبیر کو تکلیف نہ ہو اور انصاری کو کشادگی ہو جائے۔ لیکن جب انصاری نے اسے اپنے حق میں بہتر نہ سمجھا تو آپ نے حضرت زبیر کو پورا حق دلوایا۔ حضرت زبیرؓ فرماتے ہیں: میرا خیال ہے یہ آیت: فَلَا وَرَبِّكَ اسی بارے میں نازل ہوئی ہے۔ مسند احمد کی ایک مرسل حدیث ہے کہ یہ انصاریؓ بدری تھے اور دونوں میں جھگڑا یہ تھا کہ پانی کی نہر سے پہلے حضرت زبیر کا کھجوروں کا باغ پڑتا تھا۔ پھر اس انصاری کا۔ انصاری کہتے تھے کہ پانی روکو مت۔ یونہی دونوں باغوں میں ایک ساتھ آئے۔

ابن ابی حاتم میں ہے کہ دونوں دعویدار حضرت زبیر اور حضرت حاطب بن ابی بلتعہ تھے۔ آپ کا فیصلہ ان میں یہ ہوا کہ پہلے اونچے والا پانی لے لے پھر نیچے والا۔ دوسری ایک غریب حدیث میں شان نزول یہ ہے کہ دو اشخاص اپنا ایک جھگڑا لے کر دربار محمدی صلی اللہ علیہ وسلم میں آئے' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فیصلہ کر دیا لیکن جس کے خلاف فیصلہ تھا۔ اس نے کہا: حضور صلی اللہ علیہ وسلم آپ ہمیں حضرت عمرؓ کے پاس بھیج دیجئے۔ آپ نے فرمایا: بہت اچھا' حضرت عمر کے پاس چلے جاؤ۔ جب یہاں آئے تو جس کے موافق فیصلہ ہوا تھا۔ اس نے سارا واقعہ کہہ سنایا۔ حضرت عمرؓ نے اس دوسرے سے پوچھا: کیا یہ سچ ہے؟ اس نے اقرار کیا۔ آپ نے فرمایا: اچھا تم دونوں یہاں ٹھہرو' میں آتا ہوں اور فیصلہ کر دیتا ہوں۔ تھوڑی دیر میں تلوار تانے آ گئے اور اس شخص کی' جس نے کہا تھا کہ ہمیں حضرت عمرؓ کے پاس بھیج دیجئے' گردن اڑا دی۔ دوسرا شخص یہ دیکھتے ہی دوڑا بھاگا' آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچا اور کہا: حضور صلی اللہ علیہ وسلم میرا ساتھی تو مار ڈالا گیا اور اگر میں بھی جان بچا کر بھاگ نہ آتا تو میری بھی خیر نہ تھی۔ آپ نے فرمایا: میں عمر کو ایسا نہ جانتا تھا کہ وہ اس جرأت کے ساتھ ایک مؤمن کا خون بہا دے گا۔ اس پر یہ آیت اتری اور اس کا خون برباد ہو گیا اور اللہ تعالیٰ نے حضرت عمر کو بری کر دیا۔ لیکن یہ طریقہ لوگوں میں اس کے بعد بھی جاری نہ ہو جائے۔ اس لئے اس کے بعد ہی یہ آیت اتری وَلَوْ كَتَبْنَا جو آگے آتی ہے۔ (ابن ابی حاتم) ابن مردویہ میں بھی یہ روایت ہے جو غریب اور مرسل ہے اور ابن ابی لہیعہ

راوی ضعیف ہے۔ واللہ اعلم۔

دوسری سند سے ہے دو شخص رسول اللہ ﷺ کے پاس اپنا جھگڑا لائے۔ آپ ﷺ نے حق والے کے حق میں فیصلہ کر دیا۔ لیکن جس کے خلاف ہوا تھا' اس نے کہا: میں راضی نہیں ہوں۔ آپ ﷺ نے پوچھا: تو کیا چاہتا ہے؟ کہا: یہ کہ حضرت ابوبکرؓ کے پاس چلیں۔ دونوں وہاں پہنچے' جب یہ واقعہ جناب صدیقؓ نے سنا تو فرمایا تمہارا فیصلہ وہی ہے جو حضور ﷺ نے کیا۔ وہ اب خوش نہ ہوا اور کہا: حضرت عمرؓ کے پاس چلو۔ وہاں گئے' پھر وہ ہوا جو آپ نے اوپر پڑھا۔ (تفسیر حافظ ابواسحاق)

وَلَوْ اَنَّا كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ اَنِ اقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ اَوِ اخْرُجُوْا مِنْ دِيَارِكُمْ مَّا فَعَلُوْهُ اِلَّا قَلِيْلٌ مِّنْهُمْ ؕ وَلَوْ اَنَّهُمْ فَعَلُوْا مَا يُوْعَظُوْنَ بِهٖ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ وَاَشَدَّ تَثْبِيْتًا ﴿۶۶﴾ وَّاِذًا لَّاٰتَيْنٰهُمْ مِّنْ لَّدُنَّآ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۶۷﴾ وَّلَهَدَيْنٰهُمْ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا ﴿۶۸﴾ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ ۚ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا ﴿۶۹﴾ ذٰلِكَ الْفَضْلُ مِنَ اللّٰهِ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ عَلِيْمًا ﴿۷۰﴾ ع

اور ہم اگر لوگوں پر یہ بات فرض کر دیتے کہ تم خودکشی کیا کرو یا اپنے وطن سے بے وطن ہو جایا کرو تو معدودے چند لوگوں کے اس حکم کو کوئی بھی بجا نہ لاتا اور یہ لوگ جو کچھ ان کو نصیحت کی جاتی ہے اس پر عمل کیا کرتے تو ان کے لئے بہتر ہوتا اور ایمان کو زیادہ پختہ کرنے والا ہوتا اور اس حالت میں ہم ان کو خاص اپنے پاس سے اجر عظیم عنایت فرماتے اور ہم ان کو سیدھا راستہ بتلا دیتے اور جو شخص اللہ اور رسول کا کہنا مان لے گا تو ایسے اشخاص بھی ان حضرات کے ساتھ جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام فرمایا ہے یعنی انبیاء اور صدیقین اور شہداء اور صلحاء اور یہ حضرات بہت اچھے رفیق ہیں یہ فضل ہے اللہ تعالیٰ کی جانب سے اور اللہ تعالیٰ کافی جاننے والے ہیں۔ ○

احکام پر عمل کرنے سے اعراض ☆

اللہ تعالیٰ خبر دیتا ہے کہ اکثر لوگ ایسے ہیں کہ انہیں ان منع کردہ کاموں کا بھی حکم دیا جاتا' جنہیں وہ اس وقت کر رہے ہیں تو وہ ان کاموں کو بھی نہ کرتے۔ اس لئے کہ ان کی ذلیل طبیعتیں حکم اللہ کی مخالفت پر ہی بنائی گئی ہیں۔ پس یہاں اللہ تعالیٰ نے اپنے اس علم کی خبر دی ہے جو ہوا نہیں لیکن ہوتا تو کس طرح ہوتا؟ اس آیت کو سن کر ایک بزرگ نے فرمایا کہ اگر اللہ تعالیٰ ہم کو یہ حکم دیتا تو یقیناً ہم کر گزرتے۔ لیکن اس کا شکر ہے کہ اس نے ہمیں اس سے بچا لیا۔ جب آنحضرت ﷺ کو یہ بات پہنچی تو

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بے شک میری اُمت میں ایسے ایسے لوگ بھی ہیں جن کے دلوں میں ایمان مضبوط پہاڑوں سے بھی زیادہ راسخ اور ثابت ہے۔ (ابن ابی حاتم) اس روایت کی دوسری سند میں ہے کہ کئی ایک صحابہؓ نے یہ فرمایا تھا۔ سدی کا قول ہے کہ ایک یہودی نے حضرت ثابت بن قیس بن شماسؓ سے فخریہ کہا: اللہ تعالیٰ نے ہم پر خود ہمارا قتل فرض کیا تو ہم وہ بھی کرگزرتے۔ اس پر حضرت ثابتؓ نے فرمایا: واللہ اگر ہم پر یہ فرض ہوتا تو ہم بھی کرگزرتے۔ اس پر یہ آیت اتری اور روایت میں ہے کہ جب یہ آیت اتری تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر یہ حکم ہوتا تو اس کے بجالانے والوں میں ایک ابن امّ عبد بھی ہوتے۔ (ابن ابی حاتم)

روایت میں ہے کہ آپ نے اس آیت کو پڑھ کر حضرت عبداللہ بن رواحہؓ کی طرف ہاتھ سے اشارہ کر کے فرمایا کہ یہ بھی اس عمل کرنے والوں میں سے ایک ہیں۔ پھر فرماتا ہے اگر یہ لوگ ہمارے حکم بجالاتے اور ہماری منع کردہ چیزوں اور کاموں سے رک جاتے تو یہ ان کے حق میں اس سے بہتر ہوتا کہ وہ حکم کی مخالفت کریں اور ممانعت میں مبتلا ہوں اور یہی زیادہ سچائی والا ہوتا۔ اس وقت ہم انہیں جنت عطا فرماتے اور دنیا اور آخرت کی بہتر راہ کی رہنمائی کرتے۔ پھر فرماتا ہے: جو شخص اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام پر عمل کرتے اور منع کردہ کاموں سے باز رہے۔ اسے اللہ تعالیٰ عزت کے گھر لے جائے گا اور نبیوں کا رفیق بنائے گا اور صدیقوں کا جو مرتبہ میں نبیوں کے بعد ہیں۔ پھر شہیدوں کا پھر تمام مؤمنوں کا جنہیں صالح کہا جاتا ہے۔ جن کا ظاہر باطن آراستہ ہے۔ خیال تو کرو کہ یہ کیسے پاکیزہ اور بہترین رفیق ہیں۔

نبی کا اختیار ☆

صحیح بخاری شریف میں ہے حضرت عائشہ فرماتی ہیں: میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا تھا کہ ہر نبی کو اس کے مرض کے زمانہ میں دنیا میں رہنے اور آخرت میں جانے کا اختیار دیا جاتا ہے۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم بیمار پڑے۔ جس میں آپ کی وفات ہوئی تو آپ کی آواز بڑی مشکل سے نکلتی تھی۔ لیکن میں نے سنا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے ہیں: ان کا ساتھ جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام کیا ہے جو نبی ہیں صدیق ہیں شہید ہیں اور نیکوکار ہیں۔ میں نے معلوم کرلیا کہ اب آپ کو اختیار دیا گیا ہے۔ یہی مطلب ہے ان الفاظ کا جو دوسری حدیث میں ہیں کہ اے اللہ! میں بلند و بالا رفیق طلب کرتا ہوں۔ تین مرتبہ آپ نے یہ کلمہ مبارک سے ارشاد فرمایا، پھر فوت ہو گئے۔ علیہ افضل الصلوٰۃ والتسلیم۔

شانِ نزول ☆

اس آیت کا شان نزول کا بیان ابن جریر میں ہے کہ ایک انصاری حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے۔ آپ نے دیکھا وہ سخت مغموم ہیں۔ سبب دریافت کیا تو جواب ملا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم یہاں تو صبح شام ہم آپ کی خدمت میں آ بیٹھتے ہیں۔ دیدار بھی ہو جاتا ہے اور دو گھڑی صحبت بھی میسر ہو جاتی ہے۔ لیکن کل قیامت کے دن آپ تو نبیوں کی اعلیٰ مجلس میں ہوں گے۔ تو ہم آپ تک پہنچ بھی نہ سکیں گے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ جواب نہ دیا۔ اس پر حضرت جبرئیلؑ آیت لائے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آدمی بھیج کر انہیں خوشخبری سنائی۔ یہی اثر مرسل سند سے بھی منقول ہے۔ جو سند بھی بہت ہی اچھی ہے۔ حضرت ربیع فرماتے ہیں: صحابہ رسول نے کہا کہ یہ ظاہر ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا درجہ آپ پر ایمان لانے والوں سے یقیناً بہت ہی بڑا ہے۔ پس جب کہ جنت میں یہ سب جمع ہوں گے تو آپس میں ایک دوسرے کو کیسے دیکھیں گے اور کیسے ملیں گے۔ پس یہ آیت اتری اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اُوپر کے درجے والے نیچے والوں کے پاس اُتر آئیں گے اور گلزار پُر بہار میں سب جمع ہوں گے اور اللہ کے احسانات کا ذکر اور اس کی تعریفیں کریں گے اور جو چاہیں گے پائیں گے اور ناز و نعم سے ہر وقت رہیں گے۔ ابن مردویہ میں ہے ایک شخص حضور ﷺ کے پاس آئے اور کہنے لگے: یارسول اللہ ﷺ میں آپ کو اپنی جان سے اپنے اہل عیال سے اور اپنے بچوں سے بھی زیادہ محبوب رکھتا ہوں۔ میں گھر ہوتا ہوں لیکن شوقِ زیارت مجھے بے قرار کر دیتا ہے صبر نہیں ہو سکتا۔ دوڑتا بھاگتا آتا ہوں اور دیدار کر کے چلا جاتا ہوں۔ لیکن جب مجھے آپ کی اور اپنی موت یاد آتی ہے اور اس کا یقین ہے کہ آپ جنت میں نبیوں کے ساتھ بڑے اونچے درجے میں ہوں گے تو ڈر لگتا ہے کہ پھر میں حضور ﷺ کے دیدار سے محروم ہو جاؤں گا۔ آپ نے تو کوئی جواب نہیں دیا، لیکن یہ آیت نازل ہوئی۔ اس روایت کے اور بھی طریقے ہیں۔ صحیح مسلم شریف میں ہے ربیعہ بن کعب اسلمیؓ فرماتے ہیں: میں رات کو حضور ﷺ کی خدمت میں رہتا تھا۔ ایک بار آپؐ نے مجھ سے فرمایا: کچھ مانگ، میں نے کہا: جنت میں آپ کی رفاقت مانگتا ہوں، فرمایا: اس کے سوا اور، میں نے کہا: وہ بھی یہ ہے، فرمایا پس میری مدد کر، تو خود بھی بکثرت سجدے کیا کر۔[1]

مسند احمد میں ہے کہ ایک شخص نے آنحضرت ﷺ سے کہا: میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کا کوئی شریک نہیں ہے اور آپ کے رسول ﷺ ہونے کی گواہی دیتا ہوں۔ پانچوں وقت کی نماز پڑھتا ہوں، اپنے مال کی زکوٰۃ دیتا ہوں اور رمضان کے روزے رکھتا ہوں۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا: جو مرتے دم تک اسی پر رہے گا۔ وہ قیامت کے دن نبیوں، صدیقوں اور شہیدوں کے ساتھ اس طرح ہوگا۔ پھر آپ نے اپنی دو انگلیاں اٹھا کر اشارہ کر کے بتلایا لیکن شرط یہ ہے کہ ماں باپ کا نافرمان نہ ہو۔ مسند احمد میں ہے جس نے اللہ کی راہ میں ایک ہزار آیتیں پڑھیں، وہ انشاء اللہ قیامت کے دن انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین کے ساتھ لکھا جائے گا۔ ترمذی میں ہے سچا امانتدار تاجر انبیاء صدیقین اور شہداء کے ساتھ ہوگا۔ ان سب سے زیادہ زبردست بشارت اس حدیث میں ہے جو صحاح اور مسانید وغیرہ میں صحابہ کرام رضوان اللہ اجمعین کی ایک زبردست جماعت سے بتواتر روایت ہے کہ نبی ﷺ سے اس شخص کے بارے میں دریافت کیا گیا جو ایک قوم سے محبت رکھتا تھا۔ حضرت انسؓ فرماتے ہیں: مسلمان جس قدر اس حدیث نے خوش ہوئے، اتنا کسی اور چیز سے خوش نہیں ہوئے۔ حضرت انسؓ فرماتے ہیں: واللہ میری محبت تو آنحضرت ﷺ سے ہے اور حضرت ابوبکر سے ہے اور عمر سے ہے تو مجھے امید ہے کہ اللہ مجھے بھی انہی کے ساتھ اُٹھائے گا۔ گو میرے اعمال ان جیسے نہیں۔ (یا اللہ تو ہمارے دل بھی اپنے نبی ﷺ اور ان کے چاہنے والوں کی محبت سے بھی دے اور ہمارا حشر بھی ان ہی کے ساتھ کر دے آمین)۔ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں: جنتی لوگ اپنے سا بلند درجہ والے جنتیوں کو ان کے بالا خانوں میں اس طرح دیکھیں گے جیسے تم کسی چمکیلے ستارے کو جو مشرق یا مغرب میں ہو دیکھتے ہو۔ ان میں بہت کچھ فاصلہ ہوگا۔ صحابہؓ نے کہا: یہ منزلیں تو انبیائے کرام کے لئے ہی مخصوص ہوں گی کہ کوئی اور تو وہاں تک پہنچ کیسے سکتا ہے۔ آپ نے فرمایا: کیوں نہیں اس کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، ان منزلوں تک وہ بھی پہنچیں گے جو اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے اور رسولوں کو سچا جانا اور مانا۔ (بخاری و مسلم)

ایک حبشی حاضر ہوتا ہے پوچھو اور سمجھو۔ وہ کہتا ہے: یارسول اللہ ﷺ! آپ لوگوں کو صورت میں، رنگ میں، نبوت میں، اللہ نے ہم پر فضیلت دے رکھی ہے۔ کیا اگر میں اس چیز پر ایمان لاؤں، جس پر آپ ایمان لائے ہیں اور ان احکام کو بجا

---

[1] یعنی نماز، نوافل وغیرہ علاوہ فرائض کے بکثرت پڑھا کرو۔ اس سے میرا قرب آخرت میں تم کو حاصل ہوگا۔

لاؤں' جنہیں آپ بجا لا رہے ہیں تو کیا جنت میں آپ کا ساتھ ملے گا؟ حضور ﷺ نے فرمایا: ہاں' اُس اللہ کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے جنتی حبشی تو ایسا گورا چٹا ہو کر جنت میں جائے گا کہ اس کا چہرہ ایک ہزار برس کے فاصلے سے ہی نورانیت کے ساتھ جگمگاتا ہوا نظر آئے گا۔ پھر فرمایا: لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہنے والے کے لئے اللہ کے پاس عہد و وعدہ ہے اور سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ کہنے والے کے لئے ایک لاکھ چوبیس ہزار نیکیاں لکھی جاتی ہیں۔ اس پر ایک صاحب نے کہا: حضور ﷺ جب یہ ہے تو پھر ہم کیسے ہلاک ہو سکتے ہیں۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ ایک انسان قیامت کے دن اس قدر اعمال لے کر آئے گا کہ اگر کسی پہاڑ پر رکھے جائیں تو اس پر بھی بوجھل ہو جائیں۔ لیکن ایک نعمت جو کھڑی ہو گی تو محض اس کے شکر یہ میں ہی یہ اعمال کم نظر آئیں گے۔ ہاں یہ اور بات ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت کاملہ سے اُسے ڈھانک لے اور جنت دے دے اور یہ آیتیں اُتریں ﴿هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ﴾ سے ﴿مُلْكًا كَبِيْرًا﴾ (الانسان: ۱ تا ۲۰) تک۔ تو حبشی صحابیؓ کہنے لگے: یا رسول اللہ ﷺ کیا جنت میں جن جن چیزوں کو آپ کی آنکھیں دیکھیں گیں میری آنکھیں بھی دیکھ سکیں گی؟ آپ نے کہا: ہاں۔ اس پر وہ روئے اور اس قدر روئے کہ اسی میں فوت ہو گئے (رضی اللہ تعالیٰ عنہ)۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں: میں نے دیکھا کہ ان کی نعش مبارک کو خود رسول اللہ ﷺ قبر میں اتار رہے تھے۔ یہ روایت غریب ہے اور اس میں نکارت بھی ہے اور اس کی سند بھی ضعیف ہے۔ پھر فرماتے ہیں یہ خاص اللہ تعالیٰ کی عنایت ہے اور اس کا فضل ہے۔ اس کی رحمت سے ہی یہ اس کے قابل ہوئے نہ کہ اپنے اعمال سے۔ اللہ خوب جانتا ہے اسے بخوبی معلوم ہے کہ مستحق ہدایت و توفیق کون ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا خُذُوْا حِذْرَكُمْ فَانْفِرُوْا ثُبَاتٍ اَوِ انْفِرُوْا جَمِيْعًا ﴿۷۱﴾ وَاِنَّ مِنْكُمْ لَمَنْ لَّيُبَطِّئَنَّ ۚ فَاِنْ اَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةٌ قَالَ قَدْ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيَّ اِذْ لَمْ اَكُنْ مَّعَهُمْ شَهِيْدًا ﴿۷۲﴾ وَلَئِنْ اَصَابَكُمْ فَضْلٌ مِّنَ اللّٰهِ لَيَقُوْلَنَّ كَاَنْ لَّمْ تَكُنْۢ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهٗ مَوَدَّةٌ يّٰلَيْتَنِيْ كُنْتُ مَعَهُمْ فَاَفُوْزَ فَوْزًا عَظِيْمًا ﴿۷۳﴾ فَلْيُقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يَشْرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ ۭ وَمَنْ يُّقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيُقْتَلْ اَوْ يَغْلِبْ فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۷۴﴾

اے ایمان والو! اپنی تو احتیاط رکھو پھر متفرق طور پر یا مجتمع طور پر نکلو اور تمہارے مجمع میں بعض بعض شخص ایسا ہے جو ہٹتا ہے۔ پھر اگر تم کو کوئی حادثہ پہنچ گیا تو کہتا ہے کہ بے شک اللہ تعالیٰ نے مجھ پر بڑا فضل کیا کہ میں ان لوگوں کے ساتھ

حاضر نہیں ہوا اور اگر تم پر اللہ تعالیٰ کا فضل ہو جاتا ہے تو ایسے طور پر کہ گویا تم میں اور اس میں کچھ تعلق ہی نہیں۔ کہتا ہے کہ ہائے کیا خوب ہوتا کہ میں بھی ان لوگوں کا شریک حال ہوتا۔ تو مجھ کو بھی بڑی کامیابی ہوتی۔ تو ہاں اس شخص کو چاہئے کہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں ان لوگوں سے بڑے جو آخرت کے بدلے دنیوی زندگی کو اختیار کئے ہوئے ہیں اور جو شخص اللہ کی راہ میں لڑے گا پھر خواہ جان سے مارا جائے یا غالب آ جائے تو ہم اس کو اجر عظیم دیں گے۔ ○

ہتھیار بندی ☆

اللہ رب العزت مسلمانوں کو حکم دیتا ہے کہ وہ ہر وقت اپنے بچاؤ کے لئے اسباب مہیا رکھیں۔ ہر وقت ہتھیار بند رہیں تاکہ دشمن ان پر بآسانی کامیاب نہ ہو جائے۔ ضرورت کے ہتھیار رکھیں۔ اپنی تعداد بڑھاتے رہیں۔ قوت مضبوط کرتے رہیں۔ باقاعدہ مردانہ وار جہاد کے لئے بیک آواز اٹھ کھڑے ہوں۔ چھوٹے چھوٹے لشکروں میں بٹ کر یا بڑی پوری فوج کی صورت میں جیسا موقعہ ہو آواز آتے ہیں کوچ بول دیں۔ یہ منافقین کی خصلت ہے کہ خود بھی راہ اللہ سے جی چرائیں اور دوسروں کو بھی بہکائیں۔ جیسے عبداللہ بن ابی بن سلول سردار منافقین کا فعل تھا۔ اللہ اسے رسوا کرے۔ ان کی حالت یہ ہے کہ اگر حکمت خداوندی سے مسلمانوں کو دشمنوں کے مقابلہ میں کامیابی نہ ہوئی۔ دشمن ان پر غالب آ گیا' انہیں نقصان پہنچا' ان کے آدمی شہید ہوئے تو یہ گھر بیٹھا پھولتا رہا اور اپنی دانائی پر اکڑتا رہا اور اپنا اس جہاد میں شریک نہ ہونا اپنے حق میں اللہ کا انعام شمار کرتا ہے۔ لیکن بے خبر یہ نہیں سمجھتا کہ جو اجر و ثواب ان مجاہدین کو ملا۔ اس سب سے یہ بدنصیب یک لخت محروم رہا۔ اگر یہ ہوتا تو یا تو غازی کا درجہ پاتا اور اپنے صبر کے ثواب سمیٹتا یا شہادت کے بلند مرتبے تک پہنچ جاتا اور اگر مسلمان مجاہدین کو اللہ کا فضل مل گیا۔ یعنی یہ دشمنوں پر غالب آ گئے ان کی فتح ہوگئی' دشمنوں کو انہوں نے پامال کیا اور مال غنیمت لونڈی غلام لے کر خیر عافیت ظفر و نصرت کے ساتھ لوٹے تو یہ انگاروں پر لوٹتا ہے اور ایسے ایسے لمبے لمبے سانس لے کر ہائے وائے کرتا ہے اور اس طرح پچھتا ہے اور ایسے کلمات زبان سے نکالتا ہے گویا یہ کبھی تمہارا تھا ہی نہیں۔ گویا اس کا دین ہی اور ہے۔ کہتا ہے ہائے ہائے میں ان کے ساتھ نہ ہوا اور نہ مجھے بھی حصہ ملتا۔ لونڈی غلام والا' مال متاع والا بن جاتا۔ الغرض دنیا ہی پر ریجھا رہا اور اسی پر مٹا ہوا ہے۔ پس اللہ کی راہ میں نکل کھڑے ہونے والے مؤمنوں کو چاہئے کہ ان سے جہاد کریں جو اپنے دین کو دنیا کے بدلے فروخت کئے دے رہے ہیں۔ اپنے کفر اور عدم ایمان کے باعث اپنی آخرت کو برباد کر کے دینا بناتے ہیں۔ سو راہ اللہ کا مجاہد کبھی نقصان نہیں اٹھاتا۔ وہ ہر حال میں نفع میں ہے۔ قتل کیا گیا تو اجر موجود غالب رہا تو ثواب حاضر۔ بخاری و مسلم میں ہے اللہ کی راہ کے مجاہد کا ضامن خود اللہ ہے یا تو اسے فوت کر کے جنت میں پہنچائے گا۔ یا جس جگہ سے وہ چلا ہے وہیں اجر و غنیمت کے ساتھ صحیح سالم واپس لائے گا۔ فالحمد للہ۔

وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا ۚ وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا ۙ وَّاجْعَلْ

لَنَا مِنۡ لَّدُنۡكَ نَصِيۡرًا ۝٧٥ اَلَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا يُقَاتِلُوۡنَ فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ ۚ وَالَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا يُقَاتِلُوۡنَ فِىۡ سَبِيۡلِ الطَّاغُوۡتِ فَقَاتِلُوۡۤا اَوۡلِيَآءَ الشَّيۡطٰنِ ۚ اِنَّ كَيۡدَ الشَّيۡطٰنِ كَانَ ضَعِيۡفًا ۝٧٦

اور تمہارے پاس کیا عذر ہے کہ تم جہاد کرو اللہ کی راہ میں اور کمزوروں کی خاطر جن سے میں کچھ مرد ہیں اور کچھ عورتیں ہیں اور کچھ بچے ہیں جو دعا کر رہے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! ہم کو اس بستی سے باہر نکال جس کے رہنے والے سخت ظالم ہیں اور ہمارے لئے غیب سے کسی کو؟ کھڑا کیجئے اور ہمارے لئے غیب سے کسی کو حامی بھیجئے جو لوگ ایمان والے ہیں وہ تو اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ہیں اور جو لوگ کافر ہیں وہ شیطان کی راہ میں لڑتے ہیں تو تم شیطان کے ساتھیوں سے جہاد کرو واقع میں شیطانی تدبیر لچر ہوتی ہے۔ ○

جہاد کی ضرورت اور اہمیت ☆

اللہ تعالیٰ مومنوں کو جہاد کی رغبت دلاتا ہے اور فرماتا ہے کہ وہ کمزور بے بس لوگ جو مکہ میں ہیں جن میں عورتیں اور بچے بھی ہیں جو وہاں کے قیام سے اکتا گئے ہیں۔ جن پر کفار نت نئی مصیبتیں توڑ رہے ہیں جو محض بے بال و پر ہیں انہیں آزاد کراؤ جو بے کس دعائیں مانگ رہے ہیں کہ اس بستی یعنی مکہ سے ہمارا نکالا ہو۔ مکہ شریف کو اس آیت میں بھی قریہ کہا گیا ہے۔ ﴿وَكَاَيِّنۡ مِّنۡ قَرۡيَةٍ هِىَ اَشَدُّ قُوَّةً مِّنۡ قَرۡيَتِكَ الَّتِىۡۤ اَخۡرَجَتۡكَ﴾ (محمد:۱۳) یعنی بہت سی بستیاں اس بستی سے کہیں زیادہ طاقت وقوت والی تھیں۔ جس بستی نے یعنی جس بستی والوں نے تجھے نکالا مکہ کے رہنے والے کافروں کے ظلم کی شکایت وہ کر رہے ہیں اور ساتھ ہی اپنی دعاؤں میں کہتے ہیں کہ اے رب! ہمارا رب ہمارا ولی اور مددگار اپنے پاس سے مقرر کر۔ صحیح بخاری شریف میں ہے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں: میں اور میری والدہ بھی انہیں کمزوروں میں سے تھے اور روایت میں ہے کہ آپ نے ﴿اِلَّا الۡمُسۡتَضۡعَفِيۡنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالۡوِلۡدَانِ﴾ پڑھ کر فرمایا: میں اور میری والدہ صاحبہ بھی انہیں لوگوں میں ہیں اور کفار اطاعت شیطان میں لڑتے ہیں تو مسلمانوں کو چاہئے کہ شیطان کے دوستوں سے جو اللہ کے دشمن ہیں دل کھول کر جنگ کریں اور یقین مانیں کہ شیطان کے ہتھکنڈے اور اس کے مکروفریب نقش برآب ہیں۔

اَلَمۡ تَرَ اِلَى الَّذِيۡنَ قِيۡلَ لَهُمۡ كُفُّوۡۤا اَيۡدِيَكُمۡ وَاَقِيۡمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ۚ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيۡهِمُ الۡقِتَالُ اِذَا فَرِيۡقٌ مِّنۡهُمۡ يَخۡشَوۡنَ النَّاسَ كَخَشۡيَةِ اللّٰهِ اَوۡ اَشَدَّ خَشۡيَةً ۚ وَقَالُوۡا رَبَّنَا لِمَ كَتَبۡتَ عَلَيۡنَا الۡقِتَالَ ۚ لَوۡلَاۤ اَخَّرۡتَنَاۤ

اِلٰۤى اَجَلٍ قَرِيْبٍ ؕ قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيْلٌ ۚ وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّمَنِ اتَّقٰى ۟ وَلَا تُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا ﴿۷۷﴾ اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يُدْرِكْكُّمُ الْمَوْتُ وَلَوْ كُنْتُمْ فِیْ بُرُوْجٍ مُّشَيَّدَةٍ ؕ وَاِنْ تُصِبْهُمْ حَسَنَةٌ يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۚ وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِكَ ؕ قُلْ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ؕ فَمَالِ هٰۤؤُلَاۤءِ الْقَوْمِ لَا يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ حَدِيْثًا ﴿۷۸﴾ مَاۤ اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ ۫ وَمَاۤ اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ ؕ وَاَرْسَلْنٰكَ لِلنَّاسِ رَسُوْلًا ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ﴿۷۹﴾

کیا تو نے ان لوگوں کونہیں دیکھا کہ ان کو یہ کہا گیا تھا کہ اپنے ہاتھوں کو تھامے رہو اور نمازوں کی پابندی رکھو اور زکوۃ دیتے رہو۔ پھر جب ان پر جہاد کرنا فرض کر دیا گیا۔ تو قصہ کیا ہوا کہ ان میں سے بعض بعض آدمی لوگوں سے ایسا ڈرنے لگے جیسا اللہ سے ڈرنا ہو۔ بلکہ اس سے زیادہ بھی زیادہ ڈرنا اور یوں کہنے لگے اے ہمارے پروردگار! آپ نے ہم پر جہاد کیوں فرض فرما دیا ہم کو اور تھوڑی مدت مہلت دے دی ہوتی۔ آپ فرما دیجئے کہ دنیا کا نفع محض چند روز ہے اور آخرت ہر طرح سے بہتر ہے اس شخص کے لئے جو اللہ کی مخالفت سے اور تم پر تاگہ برابر ظلم نہ کیا جائے۔ تم چاہے کہیں بھی ہو وہاں بھی موت تم کو آ دبائے گی۔ اگر چہ تم قلعی چونے کے قلعے ہی میں ہو اور اگر ان کو کوئی اچھی حالت پیش آتی ہے تو کہتے ہیں کہ یہ منجانب اللہ تعالیٰ ہوگئی اور اگر ان کو کوئی بری حالت پیش آتی ہے تو کہتے ہیں کہ یہ آپ کے سبب سے ہے آپ فرما دیجئے کہ سب کچھ اللہ ہی کی طرف سے تو ان لوگوں کو کیا ہوا کہ بات سمجھنے کے پاس کو بھی نہیں نکلتے۔ اے انسان تجھ کو کوئی خوش حالی پیش آتی ہے تو وہ محض اللہ کی جانب سے ہے اور جو کوئی بدحالی پیش آئے وہ تیرے ہی سبب سے ہے اور ہم نے آپ کو تمام لوگوں کی طرف پیغمبر بنا کر بھیجا ہے اور اللہ تعالیٰ گواہ کافی ہیں۔ O

جہاد سے خوف ☆

واقعہ بیان ہو رہا ہے کہ ابتدائے اسلام میں جب کہ مسلمان مکہ شریف میں تھے کمزور تھے کم تھے۔ حرمت والے شہر میں تھے۔ کفار کا غلبہ تھا۔ یہ انہی کے شہر میں تھے۔ وہ بکثرت تھے جنگی اسباب میں ہر طرح فوقیت رکھتے تھے۔ اس لئے اس وقت اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو جہاد و قتال کا حکم نہیں دیا تھا۔ بلکہ ان سے فرمایا تھا کہ یہ کافروں کی شرارتوں پر خاموش رہیں۔ ان کی مخالفت برداشت کریں۔ ان کے ظلم و ستم سہہ لیا کریں۔ جو احکام اللہ نازل ہو چکے ہیں اُن پر عامل رہیں۔ نمازیں ادا کرتے

رہیں زکوٰۃ دیتے رہا کریں۔ گو ان میں عموماً مال کی زیادتی بھی نہ تھی۔ لیکن تاہم مسکینوں اور محتاجوں کے کام آنے کا اور ان کی ہمدردی کرنے کا انہیں حکم دیا گیا تھا۔ مصلحت خداوندی کا اقتضا یہ تھا کہ سردست یہ کفار سے نہ لڑیں بلکہ صبر و تحمل سے کام لیں۔ ادھر کافر بڑی دلیری سے اُن پر ستم کے پہاڑ توڑ رہے تھے۔ ہر چھوٹے بڑے کو سخت سے سخت سزائیں دے رہے تھے۔ مسلمانوں کے ناک میں دم کر رکھا تھا۔ اس لئے ان کے دل میں رہ رہ کر جوش اُٹھتا تھا اور زبان سے الفاظ نکل جاتے تھے کہ ان روزمرہ کی مصیبتوں سے تو یہی بہتر ہے کہ ایک مرتبہ دل کی بھڑاس نکل جائے۔ دو دو ہاتھ میدان میں ہو جائیں۔ کاش کہ اللہ تعالیٰ ہمیں جہاد کا حکم دے دے۔ لیکن اب تک نہ حکم ہوا۔ جب انہیں ہجرت کی اجازت ملی اور مسلمان اپنی زمین' زر' رشتہ کنبہ اللہ پر قربان کر کے اپنا دین لے کر مکہ سے بھاگ کھڑے ہوئے۔ مدینہ پہنچے' یہاں انہیں ہر طرح کی سہولت دی۔ امن کی جگہ دی۔ امداد کے لئے انصار مدینہ مل گئے۔ تعداد میں کثرت ہوگئی۔ قوت طاقت قدرے بڑھ گئی۔ تو اب اللہ کی طرف سے اجازت ملی کہ ہاں اپنے لڑنے والوں سے لڑو۔ جہاد کا حکم اُترتے ہی بعض لوگ سٹ پٹائے' خوف زدہ ہوئے' جہاد کا تصور کر کے میدان میں قتل کئے جانے کا تصور' عورتوں کی بیوگی کا خیال' بچوں کی یتیمی کا منظر آنکھوں کے سامنے آ گیا۔ گھبراہٹ میں کہہ اُٹھے کہ خدایا ابھی سے جہاد کیوں فرض کر دیا۔ کچھ تو مہلت دی ہوتی۔ اسی مضمون کو دوسری آیتوں میں اس طرح بیان کیا ہے: ﴿وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَوْ لَا نُزِّلَتْ سُوْرَةٌ﴾ (محمد: ۲۰) مختصر مطلب یہ ہے کہ ایماندار کہتے ہیں کہ کوئی سورت کیوں نازل نہیں کی جاتی۔ جب کوئی سورت اتاری جاتی ہے اور اس میں جہاد کا ذکر ہوتا ہے تو کمزور دل لوگ چیخ اُٹھتے ہیں اور ٹیڑھے تیوروں سے تجھے گھورتے ہیں اور موت کی غشی والوں کی طرح اپنی آنکھیں بند کر لیتے ہیں ان پر افسوس ہے الخ۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ اور آپ کے ساتھ مکہ شریف میں رسول اللہ ﷺ کے پاس آتے ہیں اور کہتے ہیں: اے نبی! اللہ ہم کفر کی حالت میں ذی عزت تھے۔ آج اسلام کی حالت میں ذلیل سمجھے جانے لگے ہیں۔ (مطلب یہ تھا آپ کی حکم برداری ضروری ہے اور آپ مقابلہ سے روکتے ہیں جس سے کفار کی جرأت بڑھ گئی ہے اور وہ ذلیل کرنے لگے ہیں تو ہمیں مقابلہ کی اجازت کیوں نہیں فرماتے۔ لیکن آپ ﷺ نے جواب دیا: مجھے اللہ کا حکم یہی ہے کہ ہم درگزر کریں۔ خبردار کافروں سے جنگ نہ کرنا۔ پھر جب ہجرت ہوئی اور جہاں جہاد کے احکام نازل ہوئے تو لوگ رکنے لگے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

(نسائی حاکم ابن مردویہ)

سدیؒ فرماتے ہیں: صرف صلوٰۃ و زکوٰۃ کا حکم ہی تھا تو تمہیں کہتے تھے کہ جہاد فرض ہو' جب فریضہ جہاد نازل ہوا تو کمزور دل انسانوں سے ایسا ڈرنے لگے۔ جیسے اللہ سے ڈرنا چاہئے۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ اور کہنے لگے: اے رب! تو نے ہم پر جہاد کیوں فرض کر دیا۔ کیوں ہمیں زندگی کا فائدہ اُٹھانے نہ دیا۔ انہیں جواب ملتا ہے کہ دنیوی فائدہ بالکل ہی ناپائیدار اور ساتھ ہی بہت کم ہے۔ ہاں آخرت متقیوں کے لئے دنیا سے بہت ہی بہتر اور پاکیزہ تر ہے۔ حضرت مجاہدؒ فرماتے ہیں: یہ آیت یہودیوں کے بارے میں اتری ہے۔ جواباً کہا گیا ہے کہ پرہیزگاروں کا انجام آغاز سے بہت ہی اچھا ہے تمہیں تمہارے اعمال کا اجر پورا پورا دیا جائے گا کوئی نیک عمل غارت نہ کیا جائے گا۔ ناممکن ہے کہ ایک بال برابر ظلم اللہ کی طرف سے کسی پر کیا جائے۔ اس جملے میں انہیں دنیا سے بے رغبتی دلائی جا رہی ہے اور آخرت کی طرف توجہ دلائی جا رہی ہے اور جہاد کی رغبت دی جا رہی ہے۔ حضرت حسن فرماتے ہیں: اللہ اس بندے پر رحم کرے جو دنیا کے ساتھ ایسا ہی رہے۔ ساری دُنیا اوّل سے آخر تک اس

طرح ہے جیسے کوئی سویا ہوا شخص اپنے خواب میں اپنی پسندیدہ چیز کو دیکھے لیکن آنکھ کھلتے ہی معلوم ہو جاتا ہے کہ کچھ نہ تھا۔ حضرت ابومضہر کا یہ کلام کتنا پیارا ہے ۔

وَلَا خَيْرَ فِي الدُّنْيَا لِمَنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهُ ☆ مِنَ اللّٰهِ فِي دَارِ الْمُقَامِ نَصِيبُ

فَإِنْ تُعْجِبِ الدُّنْيَا رِجَالًا فَإِنَّهَا ☆ مَتَاعٌ قَلِيْلٌ وَالزَّوَالُ قَرِيْبُ

یعنی اس شخص کے لئے دنیا بھلائی سے یکسر خالی ہے۔ جسے کل آخرت میں کوئی حصہ ملنے والا نہیں۔ گو دنیا کو دیکھ دیکھ کر بعض لوگ ریجھ رہے ہیں۔ لیکن دراصل یہ معمولی سا فائدہ ہے اور وہ بھی جلد فنا ہو جانے والا ہے۔

پھر ارشادِ باری ہے کہ آخر موت کا مزہ ہر ایک کو چکھنا ہی ہے کوئی کسی کو اس سے بچا نہیں سکتا۔ جیسے فرمان ہے: ﴿كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ﴾ (الرحمٰن:۲۶) جتنے یہاں ہیں سب فانی ہیں اور جگہ ارشاد ہے ﴿كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ﴾ (آل عمران:۱۸۵) ہر جاندار مرنے والا ہے۔ فرماتا ہے ﴿وَمَا جَعَلْنَا لِبَشَرٍ مِّنْ قَبْلِكَ الْخُلْدَ﴾ (الانبیاء:۳۴) تجھ سے اگلے لوگوں میں سے بھی کسی کے لئے ہم نے ہمیشگی کی زندگی مقرر نہیں کی۔ مقصد یہ ہے کہ خواہ کوئی جہاد کرے یا نہ کرے ذات اللہ کے سوا موت کا مزہ ایک نہ ایک دن ہر کسی کو چکھنا پڑے گا۔ ہر ایک کا ایک وقت مقرر ہے اور ہر ایک کی موت کی جگہ بھی معین ہے۔

خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی جرأت ☆

حضرت خالد بن ولیدؓ اس وقت جبکہ آپ بستر مرگ پر ہیں: فرماتے ہیں: قسم اللہ کی فلاں جگہ غرض بیسیوں لڑائیوں، سینکڑوں معرکوں میں میں گیا، ثابت قدمی، پامردی کے ساتھ دلیرانہ جہاد کئے۔ آؤ دیکھ لو میرے جسم کا کوئی عضو ایسا نہ پاؤ گے، جہاں کوئی نشان نیزے یا برچھے، تیر یا بھالے کا، تلوار کا اور ہتھیار کا نہ ہو۔ لیکن چونکہ میدان جنگ میں موت نہ لکھی تھی اب دیکھو اپنے بستر پر اپنی موت مر رہا ہوں۔ کہاں ہیں لڑائی سے جی چرانے والے نامرادمیری ذات سے سبق سیکھیں۔ (رضی اللہ تعالیٰ عنہ)

موت سے مفر نہیں ☆

پھر فرماتا ہے کہ موت کے پنجے سے بلند و بالا مضبوط اور محفوظ قلعے اور محل بھی نہیں بچا سکتے۔ بعضوں نے کہا: مراد اس سے آسمان کے برج ہیں، لیکن قول ضعیف ہے۔ صحیح یہی ہے کہ مراد محفوظ مقامات ہیں۔ یعنی کتنی ہی حفاظت موت سے کی جائے لیکن وہ اپنے وقت سے آگے پیچھے نہیں ہو سکتی۔ زبیر کا شعر ہے کہ موت سے بھاگنے والا گو زینہ لگا کر اسبابِ آسمانی بھی جمع کر لے تاہم اسے کوئی نفع نہیں پہنچ سکتا۔ ایک قول ہے مُشَيَّدَةٌ بہ تشدید اور مشید بغیر تشدید ایک ہی معنی میں ہیں اور دونوں میں فرق کے قائل ہیں کہ اوّل کا معنی مطول اور دوسرے کا معنی مزین یعنی چونے سے۔

ایک واقعہ ☆

ابن جریر اور ابن ابی حاتم میں ہے کہ اس موقعہ پر ایک طویل قصہ بزبان حضرت مجاہدؒ مروی ہے کہ اگلے زمانے میں ایک عورت حاملہ تھی۔ جب اسے درد لگا اور بچی تولد ہوئی تو اس نے اپنے ملازم سے کہا کہ جاؤ کہیں سے آگ لے آؤ۔ وہ باہر نکلا تو دیکھا کہ دروازے پر ایک شخص کھڑا ہے۔ پوچھتا ہے کہ کیا ہوا لڑکی یا لڑکا؟ اس نے کہا: لڑکی ہوئی ہے۔ کہا: سن یہ لڑکی سو آدمیوں کے ساتھ زنا کرے گی۔ پھر اس کے ہاں اب جو شخص ملازم ہے اسی سے اس کا نکاح ہوگا اور ایک مکڑی اس کی موت کا

باعث بنے گی۔ یہ شخص یہیں سے پلٹ آیا اور آتے ہی ایک تیز چھری لے کر اس لڑکی کا پیٹ کو چیر ڈالا اور اسے مردہ سمجھ کر وہاں سے بھاگ نکلا۔ اس کی ماں نے یہ حال دیکھ کر اپنی بچی کے پیٹ میں ٹانکے دیئے اور علاج معالجہ شروع کیا۔ جس سے اس کا زخم بھر گیا۔ اب ایک زمانہ گزر گیا۔ ادھر یہ لڑکی بلوغت کو پہنچ گئی اور تھی بھی شکل وصورت کی۔ بدچلنی میں پڑ گئی اُدھر وہ ملازم سمندر کے راستے کہیں چلا گیا۔ کام کاج شروع کیا اور اس میں اس شخص نے بہت رقم پیدا کی۔ کل مال سمیٹ کر بہت مدت بعد یہ پھر اسی اپنے گاؤں میں آ گیا اور ایک بڑھیا عورت کو بلا کر کہا: میں نکاح کرنا چاہتا ہوں۔ گاؤں میں جو بہت خوبصورت عورت ہو اس سے میرا نکاح کرادو۔ یہ عورت گئی اور چونکہ شہر بھر میں اس لڑکی سے زیادہ خوش شکل کوئی عورت نہ تھی۔ انہیں پیغام ڈالا۔ منظور ہو گیا۔ نکاح بھی ہو گیا اور وداع ہو کر یہ اس کے یہاں آ بھی گئی۔ دونوں میاں بیوی میں بہت محبت ہو گئی۔ ایک دن اس عورت نے اس سے پوچھا: آپ کون ہیں کہاں سے آئے ہیں' یہاں کیسے آ گئے وغیرہ۔ اس نے اپنا تمام ماجرا بیان کر دیا کہ میں یہاں ایک عورت کے ہاں ملازم تھا۔ وہاں سے اس کی لڑکی کے ساتھ یہ حرکت کی اور بھاگ گیا تھا۔ اب اتنے برسوں کے بعد یہاں آیا ہوں تو اس لڑکی نے کہا: جس کا پیٹ چیر کر تم بھاگے تھے میں وہی ہوں۔ یہ کہہ کر اپنے اس زخم کا نشان بھی دکھایا۔ تب تو اسے یقین آ گیا' کہنے لگا: جب تو وہی ہے تو ایک بات تیری نسبت مجھے اور بھی معلوم ہے۔ وہ یہ کہ تو ایک سو آدمیوں سے مجھ سے پہلے مل چکی ہو گی۔ اس نے کہا ٹھیک ہے۔ یہ کام تو مجھ سے ہوا ہے لیکن گنتی یاد نہیں۔ اس نے کہا کہ مجھے تیری نسبت ایک اور بات بھی معلوم ہے۔ وہ یہ کہ تیری موت کا سبب ایک مکڑی بنے گی خیر چونکہ مجھے تجھ سے بہت زیادہ محبت ہے۔ میں تیرے لئے ایک بلند و بالا پختہ اور اعلیٰ محل تعمیر کرا دیتا ہوں۔ اسی میں تو رہنا تاکہ وہاں تک ایسے کیڑے مکوڑے پہنچ ہی نہ سکیں۔ چنانچہ ایسا ہی محل تیار ہوا اور یہ وہاں رہنے سہنے لگی۔ ایک مدت کے بعد ایک روز دونوں میاں بیوی اکٹھے بیٹھے تھے کہ اچانک چھت پر ایک مکڑی دکھائی دی۔ اسے دیکھتے ہی اس شخص نے کہا: دیکھو آج یہاں مکڑی دکھائی دی۔ عورت بولی: اچھا یہ میری جان لیوا ہے۔ جب ہی سہی کہ میں ہی اس کی جان لوں۔ غلاموں کو حکم دیا کہ اسے زندہ پکڑ کر میرے سامنے لاؤ۔ وہ پکڑ کر لائے۔ اس نے زمین پر رکھ کر اپنے پیر کے انگوٹھے سے اسے مسل ڈالا۔ اس کی جان نکل گئی۔ اس میں سے جو پیپ نکلا' ایک قطرہ اس کا اُس کے انگوٹھے کے ناخن اور گوشت کے درمیان اُڑ کر پڑا' اس کا زہر چڑھا پیر سیاہ پڑ گیا اور اسی میں آخر مر گئی۔

سیّدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے دو اشعار☆

حضرت عثمانؓ پر جب باغی چڑھ دوڑے تو آپ نے اُمت محمد ﷺ کی خیر خواہی اور ان کے اتفاق کی دعا کے بعد دو شعر پڑھے۔ جن کا مطلب بھی یہی ہے کہ موت کو ٹالنے والی کوئی چیز اور کوئی حیلہ کوئی قوت اور چالاکی نہیں۔

ایک اور واقعہ☆

حضر کے بادشاہ ساطرون کو کسریٰ صابور ذوالا کتاف نے جو قتل کیا۔ وہ واقعہ بھی ہم یہاں لکھتے ہیں' ابن ہشام میں ہے جب سابور عراق میں تھا تو اس کے علاقے پر ساطرون نے چڑھائی کی تھی۔ اس کے انتقام میں اس نے چڑھائی کی تو یہ قلعہ بند ہو گیا۔ دو سال تک محاصرہ رہا۔ لیکن قلعہ فتح نہ ہو سکا۔ ایک روز ساطرون کی بیٹی نضیرہ اپنے باپ کے قلعہ کا گشت لگا رہی تھی۔ جو اچانک اس کی نظر سابور پر پڑی۔ یہ اس وقت شاہانہ پر تکلف ریشمی لباس میں تاج شاہی سر پر رکھے ہوئے تھا۔ نضیرہ کے دل میں آیا کہ اس سے میری شادی ہو جائے تو کیا ہی اچھا ہو۔ چنانچہ اس نے خفیہ پیغام بھیجنے شروع کئے اور وعدہ ہو گیا کہ اگر یہ لڑکی

اس قلعہ پر سابور کا قبضہ کرادے تو سابور اس سے اپنا نکاح کر لے گا۔ اس کا باپ ساطرون بڑا شرابی تھا۔ ساری رات اس کی نشہ میں کٹتی تھی۔ اس کی لڑکی نے موقعہ پاکر رات کو اپنے باپ کو نشہ میں مدہوش دیکھ کر اس کے سرہانے سے قلعہ کے دروازے کی کنجیاں چپکے سے نکال لیں اور اپنے ایک معتمد غلام کے ہاتھ سابور تک پہنچا دیں جس سے اس نے دروازہ کھول لیا اور شہر میں قتل کرایا اور قابض ہو گیا۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس قلعہ میں ایک جادو تھا۔ جب تک اس طلسم کو توڑا نہ جائے' قلعہ کا فتح ہونا ممکن تھا۔ اس لڑکی نے اس کے توڑنے کا گر اسے بتلا دیا۔ کہ ایک چت کبرا کبوتر لے کر اس کے پاؤں کسی باکرہ کے پہلے حیض کے خون سے رنگ دو۔ پھر اس کبوتر کو چھوڑ دو۔ وہ جا کر اس قلعہ کی دیوار بیٹھے فوراً طلسم ٹوٹ جائے گا اور قلعہ کا پھاٹک کھل جائے گا۔ چنانچہ سابور نے یہی کیا اور قلعہ فتح کر کے ساطرون کو قتل کر دیا۔ تمام لوگوں کو یہ تیغ کیا اور سارے شہر کو اجاڑ دیا اور اس لڑکی کو اپنے ہمراہ لے گیا اور اس سے نکاح کر لیا۔ ایک رات جب کہ یہ لڑکی نضیرہ اپنے بستر پر لیٹی ہوئی تھی اسے نیند نہیں آ رہی تھی' تلملا رہی تھی اور بے چینی سے کروٹیں بدل رہی تھی تو سابور نے پوچھا: کیا بات ہے؟ اس نے کہا: شاید بستر ے میں کچھ ہے۔ جس سے مجھے نیند نہیں آ رہی۔ شمع جلائی گئی۔ بستر ٹٹولا گیا تو آس کی ایک پتی نکلی۔ سابور اس نزاکت پر حیران رہ گیا کہ ایک اتنی سے چھوٹی سے پتی بستر ے میں ہونے کی بنا پر اسے نیند نہیں آئی۔ پوچھا کہ تیرے والد کے ہاں تیرے لئے کیا ہوتا تھا۔ اس نے کہا: کہ نرم ریشم کا بستر ہ تھا۔ صرف باریک ریشمی لباس تھا۔ صرف نلیوں کا گودا کھایا کرتی تھی اور صرف انگوری خالص شراب پیتی تھی۔ یہ انتظام میرے باپ نے میرے لئے کر رکھا تھا۔ یہ تھی بھی ایسی کہ اس کی پنڈلی کا گودا تک باہر سے نظر آتا تھا۔ ان باتوں نے سابور پر ایک اور رنگ چڑھا دیا اور اس نے کہا: جس باپ نے تجھے اس طرح پالا پوسا' اس کے ساتھ تو نے یہ سلوک کیا کہ میرے ہاتھوں سے قتل کرایا۔ اس کے ملک کو تاخت و تاراج کرایا۔ پھر مجھے تجھ سے کیا امید رکھنی چاہیے۔ اللہ جانے میرے ساتھ تو کیا سلوک کرے۔ اسی وقت حکم دیا کہ اس کے سر کے بال گھوڑے سے باندھ دیے جائیں اور گھوڑے کو بے لگام چھوڑ دیا جائے۔ چنانچہ یہی ہوا۔ گھوڑا بدکا' بھاگا' اچھلنے کودنے لگا اور اس کے ٹاپوں سے زمین پر پچھاڑیں کھاتے ہوئے اس کے جسم کا چورا چورا ہو گیا۔ چنانچہ اس واقعہ کو عرب شعرا نے نظم بھی کیا ہے۔

پھر فرماتا ہے کہ اگر انہیں تر سالی پھلواری اولاد کھیتی ہاتھ لگے تو کہتے ہیں یہ اللہ کی طرف سے ہے اور اگر قحط سالی پڑے۔ تنگ روزی' موت اور کمی اولاد و مال کی اور کھیت اور باغ کی ہو تو جھٹ سے کہہ اٹھتے ہیں کہ یہ نتیجہ ہے اللہ کی تابعداری کا۔ یہ فائدہ ہے مسلمان ہونے کا۔ یہ پھل ہے دیندار بننے کا۔ فرعون بھی اسی طرح برائیوں میں حضرت موسیٰ اور مسلمانوں کی طرف سے بدشگونی لیا کرتے تھے۔ جیسے کہ قرآن نے متعدد مواقع پر اس کا ذکر کیا۔ ایک آیت میں ہے: ﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ﴾ (الحج: ۱۱) یعنی بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو ایک کنارے کھڑے رہ کر عبادت کرتے ہیں۔ یعنی اگر بھلائی ملی تو باچھیں کھل گئیں اور برائی پہنچے تو الٹے پیروں سرک جاتے ہیں۔ یہ ہیں جو دونوں جہان میں برباد ہوں گے الخ۔ پس یہاں بھی ان منافقوں کی جو بظاہر مسلمان ہیں برائی بیان ہو رہی ہے کہ جہاں کچھ نقصان ہوا اور بگڑ گئے کہ یہ تو اسلام لانے کی وجہ سے ہمیں نقصان ہوا۔ سدی فرماتے ہیں کہ۔ حَسَنَه سے مراد یہاں بارشوں کا ہونا' جانوروں میں زیادتی ہونا۔ بال بچے بکثرت ہونا' خوشحالی میسر ہونا وغیرہ ہے۔ اگر یہ ہوتا تو کہتے کہ یہ سب من منجانب اللہ ہے اور اگر اس کے خلاف ہوتا تو اس بے برکتی کا باعث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بتاتے اور کہتے یہ سب تیری طرف سے ہے۔ یعنی ہم نے اپنے بڑوں کی راہ چھوڑ دی اور اس نبی

کی تابعداری اختیار کی۔ اس لئے اس مصیبت میں پھنس گئے اوار اس بلا میں پڑ گئے۔ پس پروردگار ان غلط باتوں کی تردید کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ سب کچھ اللہ کی طرف سے ہے۔ اس کی قضاوقدر ہر بھلے برے فاسق فاجر نیک و بد مؤمن کافر پر جاری ہے۔ بھلائی برائی سب اس کی طرف ہے۔ پھر ان کے اس قول کی جو محض شک وشبہ کم علمی بے وقوفی جہالت اور ظلم کی بنا پر ہے۔ تردید کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ انہیں کیا ہو گیا ہے جو بات سمجھنے کی قابلیت بھی ان میں سے جاتی رہی۔ ایک غریب حدیث میں جو کُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰہِ کے متعلق ہے اسے بھی سنیئے۔

ایک حدیث مبارکہ: ☆

بزار میں ہے ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ بیٹھتے تھے کہ کچھ لوگوں کے ہمراہ حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمر آئے۔ ان دونوں کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں اور حضور ﷺ کے قریب آ کر دونوں بیٹھ گئے تو حضور ﷺ نے دریافت کیا: تیز تیز گفتگو کیا ہو رہی تھی؟ ایک شخص نے کہا: یا رسول اللہ ﷺ حضرت ابو بکر تو کہہ رہے تھے۔ نیکیاں اور بھلائیاں اللہ کی طرف سے ہیں اور برائیاں اور بدیاں ہماری طرف سے ہیں۔ آپ نے حضرت عمرؓ سے پوچھا: تم کیا کہہ رہے تھے؟ حضرت عمر نے کہا: میں کہہ رہا تھا کہ دونوں باتیں اللہ کی طرف سے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: یہی بحث اوّل اوّل حضرت جبریلؑ اور میکائیلؑ میں ہوئی تھی۔ میکائیلؑ وہی کہتے تھے جو ابو بکر کہہ رہے ہیں اور جبریلؑ وہ کہہ رہے تھے: جو اے عمر تم کہہ رہے ہو۔ پس آسمان والوں میں ہی جبکہ اختلاف ہو تو زمین والوں میں تو ہونا ہی تھا۔ آخر حضرت اسرافیل کی طرف فیصلہ کیا اور انہوں نے فیصلہ کیا کہ حسنات و سیئات دونوں اللہ کی طرف سے ہیں۔ پھر آپ نے دونوں بزرگوں کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا: میرا فیصلہ سنو اور یاد رکھو اگر اللہ تعالیٰ اپنی نافرمانی کی جانے کو نہ چاہتا تو ابلیس کو پیدا ہی نہ کرتا[۱]۔ لیکن شیخ الاسلام امام تقی الدین ابو العباس حضرت ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں یہ حدیث موضوع ہے اور تمام ان محدثین کا جو حدیث کا گہرا علم رکھتے ہیں اتفاق ہے کہ یہ روایت گھڑی ہوئی ہے۔

پھر اللہ تعالیٰ اپنے نبی ﷺ سے خطاب کر کے فرماتا ہے اور مراد عموم ہے۔ یعنی سب سے ہی خطاب ہے کہ تمہیں جو بھلائی پہنچتی ہے وہ اللہ تعالیٰ کا فضل لطف رحمت ہے اور جو برائی پہنچتی ہے وہ خود تمہاری طرف سے ہے۔ تمہارے اعمال کا نتیجہ ہے۔ جیسے اور آیت میں ہے: ﴿وَمَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ﴾ (الشوریٰ: ۳۰) یعنی جو مصیبت تمہیں پہنچتی ہے وہ تمہارے بعض اعمال کی وجہ سے ہے اور ابھی تو اللہ تعالیٰ بہت سے بداعمالیوں سے درگزر فرماتا رہتا ہے ﴿فَمِنْ نَّفْسِكَ﴾ سے مراد بہ سبب گناہ ہے یعنی شامت اعمال۔ آنحضرت ﷺ سے منقول ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: جس شخص کا ذرا سا جسم کسی لکڑی سے چھل جائے یا اس کا قدم پھسل جائے یا اسے ذرا سی محنت کرنی پڑے۔ جس سے پسینہ آ جائے وہ بھی کسی نہ کسی گناہ پر ہوتا ہے اور ابھی تو اللہ تعالیٰ جن گناہوں سے چشم پوشی فرماتے ہے۔ جنہیں معاف فرماتا ہے: وہ بہت سارے ہیں۔ اس مرسل حدیث کا مضمون ایک متصل صحیح حدیث میں بھی ہے۔ حضور فرماتے ہیں: اس کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ ایماندار کو غم ورنج تکلیف و مشقت پہنچتی ہے یہاں تک کہ جو کانٹا بھی لگتا ہے۔ اس کی وجہ سے بھی اللہ تعالیٰ

---

[۱] اس سے سمجھنا کہ اللہ تعالیٰ نافرمانی کو بھی پسند کرتا ہے غلط ہوگا۔ ایک ہے کسی چیز کا پسند کرنا اور ایک ہے کسی چیز کے لیے راہ ہموار کرنا۔ کفر اور نافرمانی کو اللہ تعالیٰ پسند نہیں فرماتے۔ ہاں! اگر کوئی بندہ اختیار کرتا ہے تو اس کے لیے اسباب و وسائل بہم پہنچا دیتے ہیں یہی سنت اللہ ہے۔ یہ مسئلہ اہم اور لاینحل مسائل میں سے ہے۔ عوام اس پر زیادہ غور و خوض کی زحمت نہ اٹھائیں اور بلا چون و چراء قرآنی بیانات پر ایمان لانے کی کوشش کریں۔

اس کی خطاؤں کا کفارہ کر دیتا ہے۔ ابو صالح فرماتے ہیں: مطلب اس آیت کا یہ ہے کہ برائی تجھے پہنچتی ہے اس کا باعث تیرا گناہ ہے۔ ہاں اسے مقدر کرنے والا اللہ تعالیٰ آپ ہے۔ حضرت مطرف بن عبداللہ فرماتے ہیں تم تقدیر کے بارے میں کیا جانتے ہو؟ کیا تمہیں سورۂ نساء کی یہ آیت کافی نہیں۔ پھر اس آیت کو پڑھ کر فرماتے ہیں: اللہ کی قسم لوگ اللہ کی طرف سونپ دیئے گئے ہیں اور اس کی طرف لوٹتے ہیں یہ قول بہت قوی اور مضبوط ہے۔ قدریہ اور جبریہ کی پوری تردید کرتا ہے۔ تفسیر اس بحث کا موضوع نہیں۔ پھر فرماتا ہے: تیرا کام اے نبی شریعت کی تبلیغ کرنا ہے۔ اس کی رضامندی اور ناراضگی کے کام کو اس کے احکام اور اس کی ممانعت کو لوگوں تک پہنچا دینا ہے۔ اللہ کی گواہی کافی ہے۔ اس نے تجھے رسول بنا کر بھیجا ہے۔ اسی طرح اس کی گواہی کافی ہے کہ تو نے تبلیغ کر دی۔ تیرے ان کے درمیان جو ہو رہا ہے اسے بھی وہ مشاہدہ کر رہا ہے۔ یہ جس طرح عناد اور تکبر تیرے ساتھ برتتے ہیں اسے بھی وہ دیکھ رہا ہے۔

مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ۚ وَمَنْ تَوَلّٰى فَمَآ اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا ﴿۸۰﴾ وَيَقُوْلُوْنَ طَاعَةٌ ۡ فَاِذَا بَرَزُوْا مِنْ عِنْدِكَ بَيَّتَ طَآئِفَةٌ مِّنْهُمْ غَيْرَ الَّذِيْ تَقُوْلُ ۭ وَاللّٰهُ يَكْتُبُ مَا يُبَيِّتُوْنَ ۚ فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ وَ تَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ﴿۸۱﴾

جس شخص نے رسول کی اطاعت کی اس نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی اور جو شخص روگردانی کرے سو ہم نے تجھ کو نگران کر کے نہیں بھیجا اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ ہمارا کام اطاعت کرنا ہے پھر جب آپ کے پاس سے باہر جاتے ہیں تو شب کے وقت مشورے کرتے ہیں ان میں کی ایک جماعت برخلاف اس کے جو کچھ کہ زبان سے کہہ دیتے اور اللہ تعالیٰ لکھتے جاتے ہیں جو کچھ وہ راتوں کو مشورے کیا کرتے ہیں سو آپ ان کی طرف التفات نہ کیجئے اور اللہ تعالیٰ کے حوالہ کیجئے اور اللہ تعالیٰ کافی کارساز ہے۔○

اطاعت رسول صلی اللہ علیہ وسلم ☆

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ میرے بندے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اطاعت گزار صحیح معنی میں میرا اطاعت گزار ہے۔ آپ کا نافرمان میرا نافرمان ہے۔ اس لئے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی طرف سے کچھ نہیں کہتے۔ جو فرماتے ہیں وہ وہی ہوتا ہے جو میری طرف سے وحی کیا جاتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: میری ماننے والا اللہ کی ماننے والا ہے اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے اللہ کی بات نہ مانی۔ جس نے امیر کی اطاعت کی اس نے میری اطاعت کی اور جس نے امیر کی نافرمانی کی اس نے میری نافرمانی کی[1] ۔ یہ حدیث صحیحین میں ہے۔ پھر فرماتا ہے: جو اعراض کرتے ہیں تو اسکا گناہ اے نبی آپ پر نہیں۔ آپ پر تو صرف پہنچا دینا ہے۔ نیک نصیب مان لیں گے نجات اور اجر حاصل کر لیں گے۔ ہاں ان کی نیکیوں کا ثواب آپ کو بھی ہوگا کیونکہ

[1] بشرطیکہ امیر المؤمنین فاسق و فاجر اور احکام اسلام کے خلاف حکومت کرنے والا نہ ہو۔

دراصل اس راہ کے راہبر اس نیکی کے معلم آپ ہیں اور جو نہ مانے نہ عمل کرے تو نقصان اٹھائے گا۔ بدنصیب بنے گا۔ اس کا گناہ آپ پر نہیں۔ اس لئے کہ آپ نے سمجھانے بجھانے راہ حق دکھانے میں کوئی کمی نہیں کی حدیث میں ہے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کرنے والا رشد و ہدایت والا ہے اور اللہ تعالیٰ اور رسول کا نافرمان اپنے ہی نفس کو ضرور نقصان پہنچانے والا ہے۔

منافقین ☆

پھر منافقوں کا حال بیان ہو رہا ہے کہ ظاہری طور پر تو اطاعت گزاری کا اقرار موافقت کا اظہار ہے۔ لیکن نظروں سے دور ہوئے یہاں سے ہٹ کر اپنی جگہ پہنچے تو جو کچھ یہاں کہا تھا اس کے بالکل برعکس راتوں کو چھپ چھپاتے اسلام کے خلاف سازشیں کرنے بیٹھ گئے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ ان کی پوشیدگیوں چالاکیوں اور چالوں کو بخوبی جانتا ہے اس کے مقرر کردہ زمین کے فرشتے ان سب کو توتوں اور ان تمام باتوں کو اس کے حکم سے ان کے نامہ اعمال میں لکھ رہے ہیں۔ پس انہیں ڈانٹا جا رہا ہے کہ یہ بیہودہ حرکت ہے اس سے جس نے تمہیں پیدا کیا ہے۔ تمہاری کوئی بات اس سے چھپ سکتی ہے جو تم ظاہر باطن یکساں نہیں رکھتے۔ ظاہر باطن کا جاننے والا تمہیں اس بے ہودہ حرکت پر سخت سزا دے گا اور آیت میں بھی منافقوں کی اس خصلت کا بیان ان الفاظ میں فرمایا ہے کہ ﴿وَيَقُولُونَ آمَنَّا بِاللَّهِ وَبِالرَّسُولِ وَأَطَعْنَا﴾ (النور: ۴۷) پھر اپنے نبی کو حکم دیتا ہے کہ آپ ان درگزر کیجئے۔ بردباری برتئے ان کی خطا معاف کیجئے۔ ان کا حال ان کے نام سے دوسروں سے نہ کہئے۔ ان سے بالکل بے خوف رہئے۔ اللہ پر بھروسہ کیجئے جو اس پر بھروسہ کرتے جو اس کی طرف رجوع کرے اسے وہ کافی وافی ہے۔

أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ ۚ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللَّهِ لَوَجَدُوا فِيهِ اخْتِلَافًا كَثِيرًا ﴿۸۲﴾ وَإِذَا جَاءَهُمْ أَمْرٌ مِنَ الْأَمْنِ أَوِ الْخَوْفِ أَذَاعُوا بِهِ ۖ وَلَوْ رَدُّوهُ إِلَى الرَّسُولِ وَإِلَىٰ أُولِي الْأَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِينَ يَسْتَنْبِطُونَهُ مِنْهُمْ ۗ وَلَوْلَا فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهُ لَاتَّبَعْتُمُ الشَّيْطَانَ إِلَّا قَلِيلًا ﴿۸۳﴾

تو کیا پھر قرآن میں غور نہیں کرتے اور اگر یہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو اس میں بکثرت تفاوت پاتے اور جب ان لوگوں کو کسی امر کی خبر پہنچتی ہے خواہ امن ہو یا خوف تو اس کو مشہور کر دیتے ہیں اور اگر یہ لوگ اس کو رسول کے اور جو ان میں ایسے امور کو سمجھتے ہیں ان کے اوپر حوالہ رکھتے تو اس کو وہ حضرات تو پہچان ہی لیتے جو ان میں اس کا تحقیق کر لیا کرتے اور اگر تم لوگوں پر اللہ کا فضل اور رحمت نہ ہوتی تو تم سب کے سب شیطان کے پیرو ہو جاتے تھوڑے سے آدمیوں کے۔ ○

قرآن کلام اللہ ہے اس پر بعض دلائل قاہر ☆

اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو حکم دیتا ہے کہ وہ قرآن کو غور و تفکر تامل تدبر سے پڑھیں۔ اس سے اعراض نہ کریں۔ بے

پروائی نہ برتیں۔ اس کے مضبوط مضمون اس کے حکمت بھرے احکام اس کے فصیح و بلیغ الفاظ کو سوچیں۔ ساتھ ہی خبر دیتا ہے کہ یہ پاک کتاب اختلاف اضطراب تعارض اور تضاد سے پاک ہے۔ اس لئے کہ حمید و حکیم اللہ کا کلام ہے۔ وہ خود حق ہے اور اسی طرح اس کا کلام سراسر حق ہے۔ چنانچہ اور فرمایا: ﴿اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰی قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا﴾ (محمد ۲۴) یہ لوگ یوں قرآن میں غور نہیں کرتے۔ کیا ان کے دلوں پر سنگین قفل لگ گئے ہیں۔ پھر فرماتا ہے: اگر یہ قرآن اللہ کی طرف سے نازل شدہ نہ ہوتا۔ جیسا کہ مشرکین کا اور منافقین کا زعم ہے اگر یہ فی الواقع کسی کا اپنی طرف سے گھڑ لیا ہوا ہوتا تو ضروری بات تھی کہ اس میں لوگوں کو اختلاف ملتا یعنی ناممکن ہے کہ انسانی کلام اضطراب و تضاد سے محفوظ ہو۔ (جیسا کہ تجربہ شاہد ہے) پھر تو یہ ہوتا کہ کہیں کچھ پاتے اور کہیں کچھ اور یہاں ایک بات کہی آگے جا کر اس کے خلاف بھی کہہ گئے۔ پس اس پاک کتاب کا ایسی متضاد باتوں سے بچا ہوا ہونا صاف دلیل ہے کہ اللہ کا کلام ہے۔

دوسری جگہ عالموں کا قول بیان کیا گیا ہے کہ وہ کہتے ہیں ہم ان پر ایمان لائے یہ سب ہمارے رب کی طرف ہے۔ یعنی محکم اور متشابہ سب حق یہ اسی لئے متشابہ کو محکم کی طرف لٹا دیتے ہیں اور ہدایت پا لیتے ہیں اور جن کے دلوں میں کجی ہے وہ محکم کو متشابہ کی طرف لوٹا کر گمراہ ہو جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے اوّل قسم والوں کی تعریف کی اور دوسری قسم کے لوگوں کی برائی بیان فرمائی۔

ایک واقعہ ☆

عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ والی حدیث میں ہے کہ میں اور میرے بھائی ایک ایسی مجلس میں بیٹھے کہ سرخ اونٹوں کا مل جانا بھی اس کے شکل لئے نہیں۔ ہم دونوں آئے دیکھا کہ حضور ﷺ کے دروازے پر چند بزرگ صحابہ کھڑے ہوئے ہیں۔ ہم ادب کے ساتھ ایک طرف بیٹھ گئے۔ ان میں قرآن کریم کی کسی آیت کی بابت مذاکرہ ہو رہا تھا اور کچھ اختلاف تھا آخر بات بڑھ گئی اور زور زور سے آپس میں بات چیت ہونے لگی۔ رسول اللہ ﷺ اسے سن کر سخت غضب ناک ہو کر باہر تشریف لائے۔ چہرہ مبارک سرخ ہو رہا تھا۔ ان پر مٹی ڈالنے لگے اور فرمانے لگے۔ بس خاموش رہو تم سے اگلی امتیں اسی باعث تباہ ہو گئیں کہ انہوں نے اپنے انبیاء پر اختلاف کیا اور کتاب اللہ کی ایک آیت کو دوسری کے خلاف بتایا۔ یاد رکھو قرآن کی کوئی آیت دوسری آیت کے خلاف اسے جھٹلانے والی نہیں۔ بلکہ قرآن کی ایک ایک آیت ایک دوسری کی تصدیق کرتی ہیں۔ تم جسے جان لو عمل کرو جسے نہ معلوم کر سکو اسے اس کے جاننے والے کے لئے چھوڑ دو[1] اور روایت میں ہے کہ صحابہ تقدیر کے بارے میں مباحثہ کر رہے تھے۔ راوی کہتے ہیں کہ کاش کہ میں اس مجلس میں نہ بیٹھتا۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں۔ میں دوپہر کے وقت حاضر حضور (ﷺ) ہوا۔ بیٹھا ہی ہوں کہ ایک ایک آیت کے بارے میں دو شخصوں کے درمیان اختلاف ہوا اور آوازیں اونچی ہوئیں تو آپ ﷺ نے فرمایا: تم سے پہلی امتوں کی ہلاکت کا باعث صرف ان کا کتاب اللہ میں اختلاف کرنا ہی تھا۔ (مسند احمد)

تحقیق کا حکم ☆

پھر ان جلد بازوں کو روکا جا رہا ہے جو کسی امن کی یا خوف کی خبر پاتے ہی بے تحقیق اسے ادھر ادھر تک پہنچا دیتے

[1] یعنی ان کے بارے میں علماء کی رائے اور تحقیق پر عمل کرو بشرطیکہ وہ علماء دیندار صحیح العقیدہ اور متقی وغیرہ ہو۔ انظر شاہ

ہیں۔ حالانکہ ممکن ہے وہ بالکل ہی غلط ہو۔ صحیح مسلم شریف کے مقدمہ میں حدیث ہے کہ انسان کو یہی جھوٹ کافی ہے کہ جو سنے اسی کو بیان کرنے لگ جائے۔ ابوداؤد میں بھی یہ روایت ہے۔ صحیحین میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے قیل وقال سے منع فرمایا۔ یعنی سنی سنائی باتیں بیان کرنے سے جن کی تحقیق اچھی طرح سے نہ کی ہو۔ ابوداؤد کی حدیث میں ہے انسان کو یہ برافعل ہے کہ یوں کہتا پھرے لوگوں نے یہ خیال کیا یہ کہا اور صحیح حدیث میں ہے جو شخص کوئی بات بیان کرتے اور وہ گمان کرتا ہو کہ یہ غلط ہے وہ بھی جھوٹوں میں کا ایک جھوٹا ہے۔ یہاں پر ہم حضرت عمرؓ والی روایت کا وارد کرنا بھی مناسب جانتے ہیں کہ جب انہیں یہ خبر پہنچی کہ حضور علیہ السلام نے اپنی بیویوں کو طلاق دے دی ہے تو آپ اپنے گھر سے مسجد میں آئے۔ یہاں بھی لوگوں کو یہی کہتے سنا تو بذاتِ خود رسول کریم ﷺ کے پاس پہنچے اور خود آپ ﷺ سے دریافت کیا کہا یہ سچ ہے کہ آپ ﷺ نے اپنی ازواج مطہرات کو طلاق دے دی؟ آپ ﷺ نے فرمایا: غلط ہے۔ چنانچہ فاروق اعظمؓ نے اللہ کی بڑائی بیان کی صحیح مسلم میں ہے کہ پھر آپ آئے اور مسجد کے دروازے پر کھڑے رہ کر با آواز بلند فرمایا: لوگو! رسول مقبول ﷺ نے اپنی بیویوں کو طلاق نہیں دی۔ اسی پر یہ آیت نازل ہوئی۔ پس حضرت عمرؓ وہ ہیں' جنہوں نے اس معاملہ کی تحقیق کی۔ استنباط کہتے ہیں کسی چیز کو اس کے ٹھکانے اور مخزن سے نکالنے کو۔ جب کوئی شخص کسی کان کو کھود کر اس کے نیچے سے کوئی چیز نکالے تو عرب کہتے ہیں: اِسْتَنْبَطَ الرَّجُلُ پھر فرماتا ہے اگر اللہ تعالیٰ کا فضل و رحم تم پر نہ ہوتا تو تم سب کے سب سوائے کامل ایماندار لوگوں کے شیطان کے تابعدار بن جاتے ہیں ایسے موقعوں پر یہ بھی معنی ہوتے ہیں کہ کل کے کل چنانچہ عرب کے ایسے شعر بھی ہیں۔

فَقَاتِلْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ۚ لَا تُكَلَّفُ اِلَّا نَفْسَكَ وَحَرِّضِ الْمُؤْمِنِیْنَ ۚ عَسَی اللّٰهُ اَنْ یَّكُفَّ بَاْسَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا ؕ وَاللّٰهُ اَشَدُّ بَاْسًا وَّاَشَدُّ تَنْكِیْلًا ﴿۸۴﴾ مَنْ یَّشْفَعْ شَفَاعَةً حَسَنَةً یَّكُنْ لَّهٗ نَصِیْبٌ مِّنْهَا ۚ وَمَنْ یَّشْفَعْ شَفَاعَةً سَیِّئَةً یَّكُنْ لَّهٗ كِفْلٌ مِّنْهَا ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ مُّقِیْتًا ﴿۸۵﴾ وَاِذَا حُیِّیْتُمْ بِتَحِیَّةٍ فَحَیُّوْا بِاَحْسَنَ مِنْهَاۤ اَوْ رُدُّوْهَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ حَسِیْبًا ﴿۸۶﴾ اَللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ لَیَجْمَعَنَّكُمْ اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَةِ لَا رَیْبَ فِیْهِ ؕ وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ حَدِیْثًا ﴿۸۷﴾ ع ۱۱ ۸

پس آپ اللہ کی راہ میں قتال کیجئے آپ کو آپ کے ذاتی فعل کے کوئی حکم نہیں اور مسلمانوں کو ترغیب دے دیجئے اللہ تعالیٰ سے امید ہے کہ کافروں کے زور جنگ کو روک دیں گے اور اللہ تعالیٰ زور جنگ میں زیادہ شدید ہیں اور سخت سزا دیتے ہیں جو شخص اچھی سفارش کرے اس کو اس کی وجہ سے حصہ ملے گا اور جو شخص بری سفارش کرے اس کو اس

کی وجہ سے حصہ ملے گا اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے اور جب تم کو کوئی (شروع طور پر) سلام کرے تو تم اس سلام سے اچھے الفاظ میں سلام کرو۔ یا ویسے ہی الفاظ کہہ دو۔ بلا شبہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر حساب لیں گے۔ اللہ ایسے ہیں کہ ان کے سوا کوئی معبود ہونے کے قابل نہیں۔ وہ ضرور تم سب کو جمع کریں گے قیامت کے دن میں اس میں کوئی شبہ نہیں اور اللہ تعالیٰ سے زیادہ کس کی بات سچی ہوگی۔ ○

جہاد کا حکم اور ترغیبِ جہاد☆

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہو رہا ہے کہ خود اپنی ذات سے راہ اللہ میں جہاد کریں۔ اگر چہ کوئی بھی آپ کا ساتھ نہ دے۔ ابو اسحاقؒ، حضرت براء بن عازبؓ سے دریافت فرماتے ہیں کہ ایک مسلمان اکیلا تنہا ہو اور دشمن ایک سو ہوں تو کیا وہ ان سے جہاد کرے۔ آپ نے فرمایا: ہاں۔ تو کہا پھر قرآن کی اس آیت سے تو کچھ اور ثابت ہوتا ہے۔ دیکھئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اپنے آپ کو دیدہ دانستہ ہلاکت میں نہ ڈالو۔ تو حضرت براء نے فرمایا: سنو! اللہ تعالیٰ اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے فرماتا ہے: اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کر، تجھے فقط تیرے نفس کی تکلیف دی جاتی ہے اور حکم دیا جاتا ہے کہ مؤمنوں کو بھی ترغیب دیتا رہ۔ (ابن ابی حاتم) مسند احمد میں اتنا اور بھی ہے کہ مشرکین پر تنہا حملہ کرنے والا ہلاکت کی طرف بڑھنے والا نہیں بلکہ اس سے مراد اللہ کی راہ میں خرچ کرنے سے رکنے والا ہے۔ دوسری روایت میں ہے کہ جب یہ آیت اتری تو آپ نے صحابہؓ سے فرمایا: مجھے ربّ نے جہاد کا حکم دیا ہے۔ پس تم بھی جہاد کرو۔ یہ حدیث غریب ہے۔ پھر فرماتا ہے کہ مؤمنوں کی حوصلہ افزائی کر اور جہاد کی انہیں رغبت دلا۔ چنانچہ بدر والے دن میدانِ جہاد میں مسلمانوں کی صفیں درست کرتے ہوئے حضور علیہ السلام نے فرمایا: اُٹھ کھڑے ہو اس جنت کی طرف جس کی چوڑائی آسمان و زمین ہے۔ جہاد کی ترغیب کی بہت سی حدیثیں ہیں۔ بخاری میں ہے جو اللہ پر ایمان لائے، نماز قائم کرے، زکوٰۃ دیتا رہے، رمضان کے روزے رکھے۔ اللہ پر حق ہے کہ اسے جنت میں داخل کرے۔ اللہ کی راہ میں ہجرت کی ہو یا جہاں پیدا ہوا ہو وہیں ٹھہرا رہا ہو۔ لوگوں نے کہا: حضورؐ! کیا لوگوں کو اس کی خوشخبری ہم نہ دیں؟ آپ نے فرمایا: سنو! جنت میں سو درجے ہیں۔ جن میں سے ایک ایک درجے میں اس قدر بلندی ہے جتنی زمین و آسمان میں۔ یہ درجے اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے تیار کئے ہیں جو اس کی راہ میں جہاد کریں پس تم اللہ سے جب مانگو تو جنت الفردوس مانگو وہ بہتر جنت ہے اور سب سے اعلیٰ ہے۔ اس کے اوپر رحمان کا عرش ہے اور اسی سے جنت کی سب نہریں جاتی ہوتی ہیں۔ مسلم کی حدیث میں ہے۔ جو شخص اللہ کے رب ہونے پر، اسلام کے دین برحق ہونے پر، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے رسول و نبی ہونے پر راضی ہو جائے، اس کے لئے جنت واجب ہے۔ حضرت ابو سعید اسے سن کر خوش ہو کر کہنے لگے: حضور صلی اللہ علیہ وسلم دوبارہ ارشاد ہو۔ آپ نے دوبارہ اسی کو بیان کر کے کہا ایک اور عمل ہے۔ جس کے باعث اللہ تعالیٰ اپنے بندے کے سو درجے بلند کرتا ہے۔ ایک درجے سے دوسرے تک اتنی بلندی ہے جتنی زمین و آسمان میں ہے۔ پوچھا وہ عمل کیا ہے؟ فرمایا: اللہ کی راہ میں جہاد کرنا۔ پھر فرماتا ہے: جب آپ جہاد کے لئے تیار ہو جائیں گے، مسلمان آپ کی تعلیم سے جہاد پر آمادہ ہو جائیں گے۔ تو پھر اللہ کی مدد شامل حال رہے گی۔ اللہ تعالیٰ کفر کا زور توڑ دے گا۔ کفار کی ہمت پست کر دے گا۔ ان کو اتنا حوصلہ نہ ہوگا کہ تمہارے مقابلہ میں آئیں۔ اللہ تعالیٰ سے زیادہ جنگی قوت رکھنے والا اور اس سے سخت سزا دینے والا کوئی نہیں۔ وہ قادر ہے کہ دنیا میں انہیں مغلوب کرے اور یہیں انہیں عذاب کرے۔ اسی طرح آخرت میں بھی اسی کو قدرت حاصل ہے۔ جیسے اور آیت میں ہے: ﴿وَلَوْ يَشَآءُ اللّٰهُ لَانْتَصَرَ

مِنْهُمْ ﴾ (محمد: ۴) اگر اللہ چاہے ان سے خود بدلہ لے لے۔ لیکن وہ اُن کو اور تمہیں آزمارہا ہے۔ اس کی کوشش اور نیت کا اس پر بھی اس کا بوجھ ہوگا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں سفارش کرو اجر پاؤ گے۔ اللہ اپنے نبی کی زبان پر وہ جاری کرے گا جو چاہے۔ یہ آیت ایک دوسرے کی سفارش کرنے کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ اس مہربانی کو بھی دیکھئے کہ فرمایا: محض شفاعت پر ہی اجر مل جائیگا۔ خواہ اس سے کام بنے یا نہ بنے۔ اللہ ہر چیز کا حافظ ہے۔ ہر چیز کا حساب لینے والا ہے۔ ہر چیز پر قادر ہے۔ ہر چیز پر ہیشگی کرنے والا ہے۔ ہر ایک کو روزی دینے والا ہے۔ ہر انسان کے اعمال کا اندازہ کرنے والا ہے۔

سلام اور اِس کے فضائل ☆

مسلمانو! جب تمہیں کوئی مسلمان سلام کرے تو اس کے سلام کے الفاظ سے بہتر الفاظ میں اس کا جواب دو یا کم سے کم انہی الفاظ میں دوہرا دو۔ پس زیادتی مستحب ہے اور برابری فرض ہے۔ ابن جریر میں ہے ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا: اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ فرمایا: وَعَلَيْكَ السَّلَامُ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ پھر دوسرا آیا' اس نے کہا: اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب میں فرمایا: وَعَلَيْكَ السَّلَامُ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ وَبَرَكَاتُهٗ۔ پھر ایک اور صاحب آئے انہوں نے کہا: اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ وَبَرَكَاتُهٗ۔ آپ نے جواب میں فرمایا: وَعَلَيْكَ تو اس نے کہا: اے اللہ کے نبی! فلاں اور فلاں نے آپ کو سلام کیا تو آپ نے جواب کچھ زیادتی کے ساتھ دیا۔ جو مجھے نہیں دیا۔ آپ نے فرمایا: تم نے ہمارے لئے کچھ باقی ہی نہیں چھوڑا۔ فرمان اللہ ہے جب تم پر سلام کیا جائے تو تم اس سے اچھا جواب دو یا اسی کو لوٹا دو۔ اس لئے ہم نے وہی الفاظ لوٹا دیئے۔ یہ روایت ابن ابی حاتم میں بھی اسی طرح معلق مروی ہے۔ اسے ابو بکر بن مردویہ نے روایت کیا ہے اور میں نے اسے مسند میں نہیں دیکھا' واللہ اعلم۔ اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ سلام کے کلمات میں اس سے زیادتی نہیں۔ اگر ہوتی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس آخر صحابی کے جواب میں وہ لفظ کہہ دیتے۔ مسند احمد میں ہے ایک شخص حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ کہہ کر بیٹھ گئے۔ آپ نے جواب دیا اور فرمایا: دس نیکیاں ملیں۔ دوسرے آئے اور اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ کہہ کر بیٹھ گئے۔ آپ نے جواب دیا اور فرمایا: بیس نیکیاں ملیں۔ پھر تیسرے صاحب آئے انہوں نے کہا: اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ وَبَرَكَاتُهٗ آپ نے فرمایا: تیس نیکیاں ملیں۔ امام ترمذیؒ اسے حسن غریب بتلاتے ہیں۔ حضرت ابن عباسؓ اس آیت کو عام لیتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ خلق اللہ میں سے کوئی سلام کرے اسے جواب دو۔ گو وہ مجوسی ہو۔

حضرت قتادہ فرماتے ہیں: سلام کا اس سے بہتر جواب دینا تو مسلمانوں کے لئے ہے اور اسی کو لوٹا دینا اہل ذمہ کے لئے ہے۔ لیکن اس تفسیر میں ذرا نظر ہے۔ جیسے کہ اوپر کی حدیث میں گزر چکا ہے۔ مراد یہ ہے کہ اس کے سلام سے اچھا جواب دے اور اگر مسلمان سلام کے سب ہی الفاظ کہہ دے تو پھر جواب دینے والا انہی کو لوٹا دے۔ ذمی لوگوں کو خود سلام کی ابتدا کرنی تو ٹھیک نہیں اور وہ خود کریں تو جواب میں اتنے ہی الفاظ کہہ دے۔ صحیحین میں ہے جب کوئی یہودی تمہیں سلام کرے تو خیال رکھو یہ کہہ دیتے ہیں: اسام عَلَيْكَ تو تم کہہ دو: وَعَلَيْكَ صحیح مسلم میں ہے یہود و نصاریٰ کو تم پہلے سلام نہ کرو اور جب راستے میں مڈبھیڑ ہو جائے تو انہیں تنگی کی طرف سے مضطرب کر دو۔ امام حسن بصریؒ فرماتے ہیں۔ سلام نفل ہے اور جواب سلام فرض ہے اور علمائے کرام کا فرمان بھی یہی ہے پس اگر جواب نہ دے گا تو گنا ہگار ہوگا۔ اس لئے کہ جواب سلام کا اللہ حکم ہے۔ بہت سے

محدثین نے کہا ہے: پھر اللہ تعالیٰ اپنی توحید بیان فرماتا ہے اور الوہیت میں اپنا یکتا ہونا ظاہر کرتا ہے اور اس میں ضمناً قسم بھی ہے۔ اسی لئے دوسرے جملے کو لام سے شروع کیا ہے جو قسم کے جواب میں آتا ہے تو اگلا جملہ خبر ہے اور قسم بھی ہے کہ وہ عنقریب تمام اگلے پچھلوں کو میدانِ محشر میں جمع کرے گا اور وہاں ہر ایک کو اس کے عمل کا بدلہ دے گا۔ اس اللہ سے زیادہ سچی بات والا اور کوئی نہیں۔ اس کی خبر۔ اس کا وعدہ اس کی وعید سب سچ ہے۔ وہی معبود برحق ہے۔ اس کے سوا کوئی مربی نہیں۔

فَمَا لَكُمْ فِي الْمُنٰفِقِيْنَ فِئَتَيْنِ وَاللّٰهُ اَرْكَسَهُمْ بِمَا كَسَبُوْا ؕ اَتُرِيْدُوْنَ اَنْ تَهْدُوْا مَنْ اَضَلَّ اللّٰهُ ؕ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ سَبِيْلًا ﴿۸۸﴾ وَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ كَمَا كَفَرُوْا فَتَكُوْنُوْنَ سَوَآءً فَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ اَوْلِيَآءَ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَخُذُوْهُمْ وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ ۪ وَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ﴿۸۹﴾ اِلَّا الَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ اِلٰى قَوْمٍ ۭ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ اَوْ جَآءُوْكُمْ حَصِرَتْ صُدُوْرُهُمْ اَنْ يُّقَاتِلُوْكُمْ اَوْ يُقَاتِلُوْا قَوْمَهُمْ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَسَلَّطَهُمْ عَلَيْكُمْ فَلَقٰتَلُوْكُمْ ۚ فَاِنِ اعْتَزَلُوْكُمْ فَلَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ وَاَلْقَوْا اِلَيْكُمُ السَّلَمَ ۙ فَمَا جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ عَلَيْهِمْ سَبِيْلًا ﴿۹۰﴾ سَتَجِدُوْنَ اٰخَرِيْنَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّاْمَنُوْكُمْ وَيَاْمَنُوْا قَوْمَهُمْ ؕ كُلَّمَا رُدُّوْٓا اِلَى الْفِتْنَةِ اُرْكِسُوْا فِيْهَا ۚ فَاِنْ لَّمْ يَعْتَزِلُوْكُمْ وَيُلْقُوْٓا اِلَيْكُمُ السَّلَمَ وَيَكُفُّوْٓا اَيْدِيَهُمْ فَخُذُوْهُمْ وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ ؕ وَاُولٰٓئِكُمْ جَعَلْنَا لَكُمْ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا ﴿۹۱﴾

ع ۱۲ / ۹

پھر تم کو کیا ہوا کہ ان منافقوں کے باب میں تم دو گروہ ہو گئے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے ان کو الٹا پھیر دیا ان کے عمل کے سبب کیا تم لوگ اس کا ارادہ رکھتے ہو کہ ایسے لوگوں کو ہدایت کرو جن کو اللہ تعالیٰ نے گمراہی میں ڈال رکھا ہے اور جس شخص کو اللہ تعالیٰ گمراہی میں ڈال دیں اس کیلئے کوئی سبیل نہ پاؤ گے وہ اس تمنا میں ہیں کہ جیسے وہ کافر ہیں تم بھی کافر بن جاؤ جن میں تم اور وہ سب ایک طرح کے ہو جاؤ سو ان میں سے کسی کو دوست مت بنانا جب تک کہ وہ اللہ کی راہ میں ہجرت نہ کریں اور اگر وہ اعراض کریں تو ان کو پکڑو اور قتل کرو جس جگہ ان کو پاؤ اور نہ ان میں سے کسی کو دوست بناؤ اور نہ مددگار بناؤ مگر جو لوگ ایسے ہیں جو کہ ایسے لوگوں سے جا ملتے ہیں کہ تمہارے اور ان کے درمیان عہد ہے یا خود تمہارے پاس اس حالت میں آویں کہ ان کا دل تمہارے ساتھ اور نیز اپنی قوم کے ساتھ لڑنے سے منقبض ہو اور اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو ان کو تم پر مسلط کر دیتا پھر وہ تم سے لڑنے لگتے پھر اگر وہ تم سے کنارہ کش رہیں۔ یعنی تم سے نہ لڑیں تم سے سلامت روی رکھیں۔ تو اللہ تعالیٰ نے تم کو ان پر کوئی راہ نہیں دی۔ بعضے ایسے تم کو ضرور ملیں گے کہ وہ یہ چاہتے ہیں کہ تم سے بھی بے خطر ہو کر رہیں اور اپنی قوم سے بھی بے خطر ہو کر رہیں۔ جب کبھی ان کو شرارت کی طرف متوجہ کیا جاتا ہے تو وہ اس میں جا گرتے ہیں سو یہ لوگ اگر تم سے کنارہ کش نہ ہوں اور نہ تم سے سلامت روی رکھیں اور نہ اپنے ہاتھوں کو روکیں تو تم ان کو پکڑو اور قتل کرو جہاں کہیں ان کو پاؤ اور ہم نے تم کو ان پر صاف حجت دی ہے۔ ○

منافقین کے بارے میں سب کی رائے ایک ہونی چاہیے ☆

اس میں اختلاف ہے کہ منافقوں کے کس امر میں مسلمانوں کے دو قسم کے خیالات ہونے تھے۔ حضرت زید بن ثابتؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب میدان اُحد میں تشریف لے گئے' تب آپ کے ساتھ منافق تھے' جو جنگ سے پہلے ہی واپس لوٹ آئے تھے۔ ان کے بارے میں بعض مسلمان تو کہتے تھے کہ انہیں قتل کر دینا چاہئے اور بعض کہتے تھے نہیں یہ بھی ایماندار ہیں۔ اس پر یہ آیت اتری تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: یہ شہر طیبہ ہے۔ یہ خود بخود میل کچیل کو اس طرح دور کر دے گا جس طرح بھٹی لوہے کے میل کچیل کو چھانٹ دیتی ہے۔ (صحیحین)

ابن اسحاق میں ہے کہ کل لشکر جنگ اُحد میں ایک ہزار کا تھا۔ عبداللہ بن ابی سلول تین سو آدمیوں کو اپنے ہمراہ لے کر واپس لوٹ آیا تھا اور حضور ﷺ کے ساتھ پھر سات سو ہی رہ گئے تھے۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں: مکہ میں کچھ لوگ تھے جو کلمہ گو تھے۔ لیکن مسلمانوں کے خلاف مشرکوں کی مدد کرتے تھے۔ یہ اپنی کسی ضروری حاجت کے لئے مکہ سے نکلے۔ انہیں یقین تھا کہ اصحاب رسول ﷺ سے ان کی کوئی روک نہ ہوگی۔ کیونکہ بظاہر کلمہ کے قائل تھے ادھر جب مدنی مسلمانوں کو اس کا علم ہوا تو ان میں بعض تو کہنے لگے کہ ان نامردوں سے پہلے جہاد کرو۔ یہ ہمارے دشمنوں کے طرفدار ہیں اور بعضوں نے کہا: سبحان اللہ جو لوگ تم جیسا کلمہ پڑھتے ہیں تم ان سے لڑو گے' صرف اس وجہ سے کہ انہوں نے ہجرت نہیں کی اور اپنے گھر نہیں چھوڑنے' ہم کس طرح ان کے خون اور ان کے مال حلال کر سکتے ہیں۔ ان کا اختلاف رسول اللہ ﷺ کے سامنے آیا۔ آپ خاموش تھے' جو یہ آیت نازل ہوئی۔ (ابن ابی حاتم)

حضرت سعد بن معاذ کے لڑکے فرماتے ہیں: حضرت عائشہ صدیقہؓ پر جب تہمت لگائی گئی تو رسول اللہ ﷺ نے منبر پر کھڑے ہو کر فرمایا: کوئی ہے جو مجھے عبداللہ بن ابی کی ایذا سے بچائے۔ اس پر اوس و خزرج کے درمیان جو اختلاف ہوا اس کی

بابت یہ آیت نازل ہوئی۔لیکن یہ قول غریب ہے۔ان کے سوا اور اقوال بھی ہیں۔اللہ نے انہیں ان کی نافرمانی کی وجہ سے ہلاک کر دیا۔ان کی ہدایت کی کوئی راہ نہیں۔یہ تو چاہتے ہیں کہ سچے مسلمان بھی ان جیسے گمراہ ہو جائیں۔اس قدر عداوت ان کے دلوں میں ہے۔تو تمہیں ممانعت کی جاتی ہے کہ جب تک یہ ہجرت نہ کریں انہیں اپنا نہ سمجھو۔یہ خیال نہ کرو کہ یہ تمہارے دوست اور مددگار ہیں۔بلکہ یہ خود اس لائق ہیں کہ ان سے جہاد کیا جائے۔پھر ان میں سے ان حضرات کا استثنا کیا جاتا ہے جو کسی ایسی قوم کی پناہ میں چلے جائیں جس سے مسلمانوں کا عہد و پیمان صلح و سلوک ہے تو ان کا حکم بھی وہی ہوگا جو معاہدہ والی قوم کا ہے۔سراقہ بن مالک مدلجی فرماتے ہیں: جب جنگ بدر اور جنگ اُحد میں مسلمان غالب آئے اور آس پاس کے لوگوں میں اسلام کی بخوبی اشاعت ہوگئی تو مجھے معلوم ہوا کہ حضور ﷺ کا ارادہ ہے کہ خالد بن ولید کو ایک لشکر دے کر میری قوم بنو مدلج کی گوشمالی کے لئے روانہ فرمائیں تو میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا میں آپ کو احسان یاد دلاتا ہوں۔لوگوں نے مجھ سے کہا: خاموش رہ۔لیکن حضور ﷺ نے فرمایا: اسے کہنے دو۔کہو کیا کہنا چاہتے ہو۔میں نے کہا: مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ میری طرف لشکر بھیجنے والے ہیں۔میں چاہتا ہوں کہ آپ ان سے صلح کر لیں اس بات پر کہ اگر قریش اسلام لائیں تو وہ بھی مسلمان ہو جائیں گے اور اگر وہ اسلام نہ لائیں تو ان پر بھی چڑھائی نہ کریں۔حضور ﷺ نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور فرمایا: ان کے ساتھ جاؤ اور ان کے کہنے کے مطابق ان کی قوم سے صلح کر آؤ۔بس اس بات پر صلح ہوگئی کہ وہ دشمنانِ دین کی کسی قسم کی مدد نہ کریں اور اگر قریش اسلام لائیں تو یہ بھی مسلمان ہو جائیں گے۔پس اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اتاری کہ یہ چاہتے ہیں کہ تم بھی کفر کرو۔جیسے کہ وہ کفر کرتے ہیں۔پھر تم اور وہ برابر ہو جاؤ۔پس ان میں سے کسی کو دوست نہ جانو۔یہی روایت ابن مردویہ میں ہے اور اس میں ہے آیت: ﴿اِلَّا الَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ﴾ نازل ہوئی۔پس جو ان سے مل جاتا وہ انہی کی طرح پر امن رہتا۔کلام کے الفاظ سے زیادہ مناسبت اسی کو ہے۔صحیح بخاری شریف میں صلح حدیبیہ کے قصے میں ہے کہ پھر جو چاہتا' کفار کی جماعت میں داخل ہو جاتا اور امن پا لیتا اور جو چاہتا مدنی مسلمانوں سے ملتا اور عہد نامہ کی وجہ سے مامون ہو جاتا۔حضرت ابن عباس کا قول ہے کہ اس حکم کو پھر اس آیت نے منسوخ کر دیا کہ ﴿فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ﴾ (التوبہ:۵) یعنی حرمت والے مہینے گزر جائیں تو مشرکین سے جہاد کرو۔جہاں کہیں پاؤ۔

پھر ایک دوسری جماعت کا ذکر ہو رہا ہے جسے مستثنیٰ کیا ہے' جو میدان میں لائے جاتے ہیں۔لیکن بیچارے بے بس ہوتے ہیں۔وہ نہ تو تم سے لڑنا چاہتے ہیں نہ تمہارے ساتھ مل کر اپنی قوم سے لڑنا پسند کرتے ہیں۔بلکہ وہ ایسے لوگ ہیں جو نہ تمہارے دشمن کہے جا سکتے ہیں نہ کہ دوست۔یہ بھی اللہ کا فضل ہے کہ اس نے ان لوگوں کو تم پر مسلط نہیں کیا اگر وہ چاہتا تو انہیں زور و طاقت دیتا اور ان کے دِل میں ڈال دیتا کہ وہ تم سے لڑیں۔پس اگر یہ تمہاری لڑائی سے باز رہیں اور صلح صفائی سے یک سو ہو جائیں۔تو تمہیں بھی ان سے لڑنے کی اجازت نہیں۔اسی قسم کے لوگ تھے جو بدر کے دن بنو ہاشم کے قبیلے میں سے مشرکین کے ساتھ آئے تھے۔جو دِل سے اسے ناپسندر کھتے تھے۔جیسے حضرت ابن عباسؓ وغیرہ یہی وجہ تھی کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت عباسؓ کے قتل کو منع فرمایا تھا اور حکم دیا کہ انہیں زندہ گرفتار کر لیا جائے۔پھر ایک اور گروہ کا ذکر کیا جاتا ہے جو بظاہر تو اوپر والوں جیسا ہے لیکن دراصل نیت میں بہت بل (کھوٹ) ہے۔یہ لوگ منافق ہیں۔حضور ﷺ کے پاس آ کر اسلام ظاہر کر کے اپنے جان مال مسلمانوں سے محفوظ کرا لیتے ہیں۔ادھر کفار سے مل کر ان کے معبودانِ باطل کی پرستش کر کے' ان میں سے ہونا ظاہر کر

کے ان سے ملے رہتے ہیں۔ تاکہ ان کے ہاتھوں میں بھی امن سے رہیں۔ دراصل یہ لوگ کافر ہیں۔ جیسے اور جگہ ہے اپنے شیاطین کے پاس تنہائی میں جا کر کہتے ہیں۔ ہم تمہارے ساتھ ہیں یہاں بھی فرماتا ہے کہ جب بھی فتنہ انگیزی کی طرف لوٹائے جاتے ہیں تو جی کھول کر پوری سرگرمی سے اس میں حصہ لیتے ہیں' جیسے کوئی اوندھے منہ گرا ہوا ہو۔ فتنہ سے مراد یہاں شرک ہے۔ حضرت مجاہدؒ فرماتے ہیں: یہ لوگ بھی مکہ والے تھے۔ یہاں آ کر نفاق کے طور پر اسلام قبول کرتے تھے اور وہاں جا کر ان کے بت پوجتے تھے۔ تو مسلمانوں کو فرمایا جاتا ہے کہ اگر یہ اپنی اس منافقانہ روش سے باز نہ آئیں' تمہاری ایذا رسانی سے الگ نہ ہوں' صلح نہ کریں تو انہیں امن و امان نہ دو۔ ان سے بھی جہاد کرو۔ انہیں قیدی بناؤ اور جہاں پاؤ قتل عام کرو۔ بے شک ان پر ہم نے تمہیں ظاہر غلبہ اور کھلی حجت عطا فرمائی ہے۔

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ اَنْ يَّقْتُلَ مُؤْمِنًا اِلَّا خَطَـًٔا ۚ وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَـًٔا فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ وَّدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰٓى اَهْلِهٖٓ اِلَّآ اَنْ يَّصَّدَّقُوْا ۭ فَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ عَدُوٍّ لَّكُمْ وَھُوَ مُؤْمِنٌ فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ ۭ وَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍۢ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَھُمْ مِّيْثَاقٌ فَدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰٓى اَھْلِهٖ وَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ ۚ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ ۡ تَوْبَةً مِّنَ اللّٰهِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِــيْمًا حَكِـيْمًا ﴿٩٢﴾ وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَاۗؤُهٗ جَهَنَّمُ خٰلِدًا فِيْھَا وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهٗ وَاَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِيْمًا ﴿٩٣﴾

اور کسی مؤمن کی شان نہیں کہ وہ کسی مومن کو قتل کرے لیکن غلطی سے اور جو شخص کسی مؤمن کو غلطی سے قتل کر دے۔ تو اس پر ایک مسلمان غلام یا لونڈی کا آزاد کرنا ہے اور خون بہا ہے جو اس کے خاندان والوں کو حوالہ کر دی جائے مگر یہ کہ وہ لوگ معاف کر دیں اور اگر وہ ایسی قوم سے ہے جو تمہارے مخالف ہے اور وہ شخص خود مؤمن ہے تو ایک غلام یا لونڈی مسلمان آزاد کرے اور اگر وہ ایسی قوم سے ہے کہ تم میں اور ان میں معاہدہ ہو تو خون بہا ہے جو اس کے خاندان والوں کے حوالہ کر دی جائے اور ایک غلام یا لونڈی مسلمان کا آزاد کرنا پھر جس شخص کو نہ ملے تو متواتر دو ماہ کے روزے بطریق توبہ کے جو اللہ کی طرف سے مقرر ہوئی ہے اور اللہ تعالیٰ بڑے علم اور حکمت والے ہیں اور جو شخص کسی مسلمان کو قصداً قتل کر ڈالے تو اس کی سزا جہنم ہے کہ ہمیشہ ہمیشہ کو اس میں رہنا اور اس پر اللہ تعالیٰ غضبناک ہوں گے اور اس کو اپنی رحمت سے دور کر دیں گے اور اس کے لئے بڑی سزا کا سامان کریں گے۔ O

بلا وجہ شرعی مسلمان کا خون بہانا جائز نہیں ☆

ارشاد ہوتا ہے کہ کسی مسلمان کو لائق نہیں کہ کسی حال میں اپنے مسلمان بھائی کا خونِ ناحق کرے۔ صحیحین میں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: کسی مسلمان کا جو اللہ کے ایک ہونے کی اور میرے رسول ہونے کی شہادت دیتا ہو' خون بہانا جائز نہیں۔ مگر تین حالتوں میں ایک تو یہ کہ اس نے کسی کو قتل کر دیا ہو۔ دوسرے شادی شدہ ہو کر زنا کرے۔ تیسرے یہ کہ اسلام چھوڑ کر مرتد ہو گیا ہو۔ پھر یہ بھی یاد رہے کہ جب ان تینوں کاموں میں سے کوئی کام کسی سے واقع ہو جائے تو رعایا میں سے کسی کو اس کے قتل کا اختیار نہیں۔ امام یا نائب کا یہ منصب ہے۔ اس کے بعد استثنا منقطع ہے۔ عرب شاعروں کے کلام میں بھی اس قسم کے استثنا بہت سے ملتے ہیں۔ اس آیت کے شانِ نزول میں ایک قول تو یہ بھی مروی ہے کہ عیاش بن ابی ربیعہ جو ابوجہل کا ماں کی طرف سے بھائی تھا۔ جس کی ماں کا نام اسما بنت مخرمہ تھا۔ اس کے بارے میں اتری ہے اس نے ایک شخص کو قتل کر ڈالا تھا' جسے وہ اسلام لانے کی وجہ سے سزائیں دے رہا تھا۔ یہاں تک کہ اس کی جان لے لی۔ ان کا نام حارث بن یزید عامری تھا۔ حضرت عیاش کے دل میں یہ خار رہ گیا اور انہوں نے ٹھان لی کہ موقعہ پا کر اسے قتل کر ڈالوں گا۔ اللہ تعالیٰ نے کچھ دنوں بعد قاتل کو بھی اسلام کی ہدایت دے دی۔ وہ مسلمان ہو گئے اور ہجرت بھی کر لی۔ لیکن حضرت عیاش کو یہ معلوم نہ تھا۔ فتح مکہ والے دن ان کی نظر پڑ گئے۔ یہ جان کر کہ یہ اب تک کفر پر ہیں' ان پر اچانک حملہ کر دیا اور قتل کر دیا۔ اس پر یہ آیت اتری۔ دوسرا قول یہ ہے کہ یہ آیت حضرت ابودرداء کے بارے میں نازل ہوئی ہے جبکہ انہوں نے ایک کافر پر حملہ کیا۔ ابھی تلوار اٹھائی ہی تھی کہ اس نے کلمہ پڑھ لیا۔ لیکن ان کی تلوار چل گئی اور اسے قتل کر ڈالا۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ واقعہ بیان ہوا تو حضرت ابودرداء نے اپنا یہ عذر پیش کیا کہ اس نے صرف جان بچانے کی خاطر کلمہ پڑھا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ناراض ہو کر فرمانے لگے: کیا تم نے اس کا دل چیر کر دیکھا تھا۔ یہ واقعہ صحیح حدیث میں بھی ہے لیکن وہاں دوسرے صحابی کا ہے۔

پھر قتل خطا کا ذکر ہو رہا ہے کہ اس میں دو چیزیں واجب ہیں۔ ایک تو غلام آزاد کرنا دوسرے دیت دینا۔ اس غلام کے لئے بھی شرط ہے کہ وہ ایماندار ہو' کافر کو آزاد کرنا کافی نہ ہوگا۔ چھوٹا نابالغ بچہ بھی کافی نہ ہوگا۔ جب تک کہ وہ اپنے ارادے سے ایمان کا قصد کرنے والا اور اتنی عمر کا نہ ہو۔ امام ابن جریر کا مختار قول یہ ہے کہ اگر اس کے ماں باپ دونوں مسلمان ہوں تو جائز ہے ورنہ نہیں۔ جمہور کا مذہب یہ ہے کہ مسلمان ہونا شرط ہے۔ چھوٹے بڑے کا کوئی قید نہیں۔ ایک انصاری سیاہ فام لونڈی کو لے کر حاضر حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہوتے ہیں اور کہتے ہیں: میرے ذمے ایک مسلمان گردن کا آزاد کرنا ہے اگر یہ مسلمان ہو تو میں اسے آزاد کر دوں؟ آپ نے اس لونڈی سے پوچھا: کیا تو گواہی دیتی ہے کہ میں اللہ کا رسول ہوں؟ اس نے کہا: ہاں۔ فرمایا: کیا مرنے کے بعد جی اٹھنے کی بھی قائل ہے؟ اس نے کہا: ہاں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اسے آزاد کر دو۔ اس کی اسناد صحیح ہے اور صحابی کون تھے۔ اس کا مخفی رہنا سند میں مضر نہیں۔ یہ روایت حدیث کی اور بہت سی کتابوں میں اس طرح ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے پوچھا: اللہ کہاں ہے؟ اس نے کہا: آسمانوں میں۔ دریافت کیا: میں کون ہوں؟ جواب دیا؟ آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ آپ نے فرمایا: اسے آزاد کر دو۔ یہ ایماندار ہے۔ پس ایک تو گردن آزاد کرنا واجب ہے دوسرے خون بہا دینا' جو مقتول کے گھر والوں کو سونپ دیا جائے گا۔ یہ عوض ہے ان کے مقتول کا۔ یہ دیت سو اونٹ ہے۔ پانچ قسموں کے' بیس تو دوسری سال کی عمر کی اونٹنیاں اور بیس اسی عمر کے اونٹ اور بیس تیسرے سال میں لگی ہوئی اونٹنیاں اور بیس پانچویں سال میں لگی ہوئی اور بیس چوتھے

سال میں لگی ہوئی۔ یہی فیصلہ قتل خطا کے خون بہا کا رسول اللہ ﷺ نے کیا ہے۔ ملاحظہ ہو سنن و مسند احمد۔ یہ حدیث حضرت عبداللہ پر موقوفاً بھی مروی ہے۔ حضرت علیؓ اور ایک جماعت سے یہ منقول ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ دیت چار چوتھائیوں میں بٹی ہوئی ہے۔ یہ خون بہا قاتل کے عاقلہ اور اس عصبہ یعنی وارثوں کے بعد کے قریبی رشتہ داروں پر ہے۔ اس کے اپنے مال پر نہیں۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں: میں اس امر میں کسی کو مخالف نہیں جانتا' کہ حضور ﷺ نے دیت کا فیصلہ انہی لوگوں پر کیا ہے اور یہ حدیث خاصہ سے اکثر ہے۔ امام صاحب جن حدیثوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں وہ بہت سی ہیں۔

صحیحین میں حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ ہذیل قبیلہ کی دو عورتیں آپس میں لڑیں۔ ایک نے دوسری کو پتھر مارا' وہ حاملہ تھی' بچہ بھی ضائع ہو گیا اور وہ بھی مرگئی۔ قصہ آنحضرت ﷺ کے پاس آیا تو آپ ﷺ نے یہ فیصلہ کیا کہ اس بچہ کے عوض تو ایک جان لونڈی یا غلام' عورت مقتولہ کے بدلے دیت اور وہ دیت قاتلہ کے حقیقی وارثوں کے بعد کے رشتہ داروں کے ذمہ ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جو قتل عمد خطا ہے وہ بھی حکم میں خطا محض کے ہے۔ یعنی دیت کے اعتبار سے۔ ہاں اس میں تقسیم ثلث پر ہوگی۔ تین حصے ہوں گے۔ کیونکہ اس میں شباہت عمد یعنی قصداً قتل کی بھی ہے۔ صحیح بخاری شریف میں ہے۔ بنو جذیمہ کی جنگ کے لئے حضرت خالدؓ بن ولید کو حضور ﷺ نے ایک لشکر پر سردار بنا کر بھیجا۔ انہوں نے دعوت اسلام دی۔ انہوں نے دعوت تو قبول کر لی۔ لیکن بوجہ ناواقفی بجائے اَسْلَمْنَا یعنی ہم مسلمان ہوئے کے صَبَانَا کہا۔ یعنی ہم بے دین ہوئے۔ خالدؓ نے انہیں قتل کرنا شروع کر دیا۔ جب حضور ﷺ کو یہ خبر پہنچی تو آپ نے ہاتھ اٹھا کر جناب باری تعالیٰ میں عرض کی: یا اللہ! خالدؓ کے اس فعل سے میں اپنی بیزاری اور برأت تیرے سامنے ظاہر کرتا ہوں۔ پھر جب حضرت علیؓ کو بلا کر انہیں بھیجا کہ جاؤ ان مقتولوں کی دیت چکا آؤ اور جو ان کا مالی نقصان ہوا ہے اسے بھی کوڑی کوڑی چکا آؤ۔ اس سے ثابت ہوا کہ امام یا نائب امام کی خطا کا بوجھ بیت المال پر ہوگا۔ پھر فرماتا ہے: خون بہا' واجب ہے۔ اگر اولیائے مقتول از خود اس سے دست بردار ہو جائیں تو انہیں اختیار ہے۔ وہ بطور صدقہ کے انہیں معاف کر سکتے ہیں

پھر فرمان ہے کہ اگر مقتول مسلمان ہو' لیکن اس کے اولیاء حربی کافر ہوں تو قاتل پر دیت نہیں۔ قاتل پر اس صورت میں صرف آزادی گردن ہے اور اس کے ولی وارث میں قوم میں سے ہوں جن سے تمہاری صلح اور عہد و پیمان ہو تو دیت دینی پڑے گی۔ اگر مقتول مؤمن تھا تو کامل خون بہا اور اگر مقتول کافر تھا تو بعض کے نزدیک تو پوری دیت ہے۔ بعض کے نزدیک آدھی' بعض کے نزدیک تہائی' تفصیل کتب احکام ملاحظہ ہو اور قاتل پر مؤمن بردے کو آزاد کرنا بھی لازم ہے۔ اگر کسی کو اس کی طاقت بوجہ مفلسی کے نہ ہو تو اس کے ذمے دو مہینے کے روزے ہیں جو لگاتار' پے در پے رکھنے ہوں گے۔ اگر کسی شرعی عذر مثلاً بیماری یا حیض یا نفاس کے بغیر کوئی روزہ بیچ میں چھوڑ دیا تو پھر نئے سرے سے روزے شروع کرنے پڑیں گے۔ سفر کے بارے میں دو قول ہیں۔ ایک یہ کہ یہ بھی شرعی عذر ہے۔ دوسرے یہ کہ یہ عذر نہیں۔ پھر فرماتا ہے: قتل خطا کی توبہ کی صورت یہ ہے کہ ساٹھ مسکینوں کو کھلائے۔ جیسے کہ ظہار کے کفارے میں ہے۔ وہاں صاف بیان فرما دیا۔ یہاں اس لئے بیان نہیں کیا گیا ہے کہ یہ ڈرانے اور خوف دلانے کا مقام ہے۔ آسانی کی صورت اگر بیان کر دی جاتی تو ہیبت و عظمت اتنی باقی نہ رہتی۔ دوسرا قول یہ ہے کہ روزے کے علاوہ کچھ نہیں' اگر ہوتا تو بیان کے ساتھ ہی بیان کر دیا جاتا۔ حاجت کے وقت سے بیان کو مؤخر کرنا ٹھیک نہیں۔ اللہ علیم و حکیم ہے۔ اس کی تفسیر کئی مرتبہ گزر چکی۔

قتل خطا کے بعد اب قتل عمد کا بیان ہو رہا ہے۔ اس کی سخت بُرائی اور نہایت تاکید والی خوفناک وعید سنائی جا رہی ہے۔ یہ وہ گناہ ہے جسے اللہ تعالیٰ نے شرک کے ساتھ ملا دیا ہے۔ فرماتا ہے: ﴿وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ وَلَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ﴾ یعنی مسلمان بندے وہ ہیں جو اللہ کے ساتھ کسی اور کو معبود ٹھہرا کر نہیں پکارتے اور نہ وہ کسی شخص کو ناحق قتل کرتے ہوئے شرک اور قتل کرتے ہیں۔ دوسری جگہ فرمان ہے: ﴿قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ﴾ (الانعام: ۱۵۱) یہاں بھی اللہ کے حرام کیے ہوئے کاموں کا ذکر کرتے ہوئے شرک اور قتل کا ذکر فرمایا ہے اور بھی اس مضمون کی آیتیں بہت سی ہیں اور حدیثیں بھی اس باب میں بہت سی ہیں۔ مسلم و بخاری میں ہے' سب سے پہلے خون کا فیصلہ قیامت کے دن ہوگا۔ ابوداؤد میں ہے' ایماندار نیکیوں اور بھلائیوں میں بڑھتا رہتا ہے۔ جب تک خون ناحق نہ کرے۔ اگر ایسا کرلیا تو تباہ ہو جاتا ہے اور حدیث میں ہے ساری' دنیا کا زوال اللہ کے نزدیک ایک مسلمان کے قتل سے کم درجے کا ہے اور حدیث میں ہے اگر تمام روئے زمین کے اور آسمان کے لوگ کسی ایک مسلمان کے قتل میں شریک ہوں تو اللہ تعالیٰ سب کو اندھے منہ جہنم میں ڈال دے اور حدیث میں ہے۔ جس شخص نے کسی مسلمان کے قتل پر آدھے کلمہ سے بھی اعانت[1] کی وہ قیامت کے دن اللہ کے سامنے اس حالت میں آئے گا کہ اس کی پیشانی پر لکھا ہوا ہو کہ یہ شخص اللہ کی رحمت سے محروم ہے۔

حضرت ابن عباس کا تو قول ہے کہ جس نے مؤمن کو قصداً قتل کیا اس شخص کی توبہ قبول ہی نہیں۔ اہل کوفہ جب اس مسئلہ میں اختلاف کرتے ہیں تو ابن جبیرؒ، ابن عباسؓ کے پاس آ کر دریافت کرتے ہیں۔ آپ فرماتے ہیں یہ آخری آیت ہے جسے کسی آیت نے منسوخ نہیں کیا اور آپ فرماتے ہیں کہ دوسری آیت: ﴿وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ﴾ جس میں توبہ کا ذکر ہے وہ اہل شرک کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ پس جب کہ کسی شخص نے اسلام کی حالت میں کسی مسلمان کو غیر شرعی وجہ سے قتل کیا' اس کی سزا جہنم ہے اور اس کی توبہ قبول نہیں۔ حضرت مجاہدؒ سے جب یہ قول ابن عباسؓ سے بیان ہوا تو فرمانے لگے مگر جو نادم ہو۔ سالم بن ابوالجعدؒ فرماتے ہیں: حضرت ابن عباسؓ جب نابینا ہوگئے تھے۔ ایک مرتبہ ہم ان کے پاس بیٹھے ہوئے تھے تو ایک شخص آیا اور آپ کو آواز دے کر پوچھا کہ اس بارے میں آپ کیا فرماتے ہیں' جس نے کسی مؤمن کو جان بوجھ کر مار ڈالا؟ آپ نے فرمایا: اس کی سزا جہنم ہے۔ جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ کا اس پر غضب ہے اس پر اللہ کی لعنت ہے اور اس کے لئے عذابِ عظیم تیار ہے۔ اس نے پھر پوچھا: اگر وہ توبہ کرے' نیک عمل کرے اور ہدایت پر جم جائے؟ تو فرمانے لگے: اس کی ماں اسے روئے' اسے توبہ اور ہدایت کہاں۔ اس کی قسم جس کے ہاتھ میں میرا نفس۔ میں نے تمہارے نبی ﷺ سے سنا ہے اس کی ماں اسے روئے' جس نے مؤمن کو جان بوجھ کر مار ڈالا ہے وہ قیامت کے روز اسے دائیں بائیں ہاتھ سے تھامے ہوئے رحمٰن کے عرش کے سامنے آئے گا' اس کی رگوں میں سے خون اُچھل رہا ہوں گا اور اللہ تعالیٰ سے کہے گا کہ خدایا اس سے پوچھ کہ اس نے مجھے کیوں قتل کیا؟ اس اللہ کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ اس آیت کے نازل ہونے کے بعد حضور ﷺ کی وفات تک اسے منسوخ کرنے والی کوئی آیت نہیں اتری اور روایت میں اتنا اور بھی ہے کہ نہ حضور ﷺ کے بعد کوئی وحی اترے گی۔ حضرت زید بن ثابتؓ، حضرت ابو ہریرہؓ، عبداللہ ابن عمرؓ، حضرت ابوسلمہ بن عبدالرحمٰن، عبداللہ بن عمیرؒ، قتادہؒ، ضحاکؒ بھی حضرت ابن عباسؓ کے خیال کے ساتھ ہیں۔ ابن مردویہ میں ہے کہ مقتول اپنے قاتل کو پکڑ کر قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے

---

[1] مطلب یہ ہے کہ کسی مسلمان کے قتل میں اعانت کی' اگرچہ وہ اعانت نہایت حقیر تھی تاہم اس کا مواخذہ اللہ تعالیٰ سخت فرمائیں گے کیونکہ قتل مسلمان جرم ہی بہت بڑا ہے۔

سامنے لائے گا۔ دوسرے ہاتھ میں اپنا سر اٹھائے ہوئے ہوگا اور کہے گا: میرے رب اس سے پوچھ کہ اس نے مجھے کیوں قتل کیا؟ قاتل کہے گا: پروردگار اس لئے کہ تیری عزت ہو۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: پس یہ میری راہ میں ہے۔ دوسرا مقتول بھی اپنے قاتل کو پکڑے ہوئے ہوگا اور یہ کہے گا: میرے رب اس سے پوچھ اس نے مجھے کیوں قتل کیا؟ قاتل کہے گا اس لئے کہ فلاں کی عزت ہو۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: اس کا گناہ وہ لے کر لوٹا۔ پھر اسے آگ میں جھونک دیا جائے گا۔ جس گڑھے میں ستر سال تک نیچے ہی چلا جائے گا۔ مسند احمد میں ہے' ممکن ہے اللہ تعالیٰ تمام گناہ بخش دے۔ لیکن ایک تو وہ شخص جو کفر کی حالت میں مرا۔ دوسرا وہ جو کسی مؤمن کا قصداً قاتل بنا کہ ان دو کے گناہ کبھی معاف نہ ہوں گے۔

ابن مردویہ میں ایسے ہی حدیث ہے اور وہ بالکل غریب ہے۔ محفوظ وہ حدیث ہے جو بحوالہ سند بیان ہوئی۔ ابن مردویہ میں اور حدیث ہے کہ جان بوجھ کر ایماندار کو مار ڈالنے والا کافر ہے۔ یہ حدیث منکر ہے اور اس کی اسناد میں بہت کلام ہے۔ حمید کہتے ہیں: میرے پاس ابوالعالیہ آئے۔ میرے ایک دوست اس وقت میرے پاس تھے۔ ہم سے کہنے لگے تم دونوں مجھ سے کم عمر اور زیادہ حفظ والے ہو۔ آؤ میرے ساتھ بشیر بن عاصم کے پاس چلو۔ جب وہاں پہنچے تو حضرت بشیر نے فرمایا: انہیں بھی وہ حدیث سنادو۔ انہوں نے سنانی شروع کی کہ عقبہ بن مالک لیثیؓ نے کہا: رسول اللہ ﷺ نے ایک چھوٹا سا لشکر بھیجا تھا۔ اس نے ایک قوم پر چھاپا مارا۔ وہ لوگ بھاگ کھڑے ہوئے۔ ان کے ساتھ ایک شخص بھاگا جا رہا تھا۔ اس کے پیچھے ایک لشکر بھاگا۔ جب اس کے قریب ننگی تلوار لئے ہوئے پہنچ گیا تو اس نے کہا: میں تو مسلمان ہوں۔ اس نے کچھ خیال نہ کیا۔ تلوار چلا دی۔ اس واقعہ کی خبر حضور ﷺ کو ہوئی تو آپ بہت ناراض ہوئے اور سخت سست کہا۔ یہ خبر اس شخص کو بھی پہنچی۔ ایک روز رسول کریم ﷺ خطبہ پڑھ رہے تھے کہ اس قاتل نے کہا: حضور ﷺ اللہ کی قسم اس نے تو یہ بات محض قتل سے بچنے کے لئے کہی تھی۔ آپ ﷺ نے اس کی طرف نگاہ پھیر لی اور خطبہ سناتے رہے۔ اس نے دوبارہ کہا: آپ ﷺ نے پھر منہ پھیر لیا۔ اس سے صبر نہ ہوسکا۔ تیسری بار کہا تو آپ ﷺ نے اس کی طرف توجہ کی اور ناراضگی آپ کے چہرے پر ٹپک رہی تھی۔ فرمانے لگے: قاتل مؤمن پر اللہ کا انکار ہے۔ تین بار یہی فرمایا۔ یہ روایت نسائی میں بھی ہے۔

قاتل کا حکم ☆

پس ایک مذہب تو یہ ہے کہ قاتل مؤمن کی توبہ نہیں۔ دوسرا مذہب یہ ہے کہ توبہ اس کے اور اللہ کے درمیان ہے۔ جمہور سلف وخلف کا یہی مذہب ہے کہ اگر اس نے توبہ کی' اللہ کی طرف رجوع کیا' خضوع وخشوع میں لگا رہا' نیک اعمال کرنے لگ گیا تو اللہ اس کی توبہ قبول کرے گا اور مقتول کو اپنے پاس سے عوض دے کر اسے راضی کرلے گا۔ اللہ فرماتا ہے: ﴿اِلَّا مَنْ تَابَ﴾ یہ خبر ہے اور خبر نسخ کا احتمال ہی نہیں اور اس آیت کو مشرکوں کے بارے میں اور اس آیت کو مؤمنوں کے بارے میں خاص کرنا یہ ظاہر کے خلاف ہے اور کسی خاص دلیل کا محتاج ہے۔ واللہ اعلم۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿قُلْ یٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓی اَنْفُسِهِمْ﴾ (الزمر: ۵۳) اے میرے وہ بندو جنہوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے۔ تم میری رحمت سے مایوس نہ ہو۔ یہ آیت اپنے عموم کے اعتبار سے ہر گناہ کو شامل ہے۔ خواہ کفر وشرک ہو' خواہ شک ونفاق ہو۔ خواہ قتل وفسق ہو۔ کچھ ہی ہو۔ جو اللہ کی طرف رجوع کرے۔ اللہ اس کی طرف مائل ہوگا۔ جو توبہ کرے اللہ اسے معاف فرمائے گا فرماتا ہے: ﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَكَ بِهٖ﴾ (النساء: ۴۸) اللہ شرک کو بخشتا نہیں۔ اس کے سوا تمام گناہ جسے چاہے بخش دے۔ اللہ کی اس کریمی کے صدقے

جائیے کہ اس نے اسی سورت میں اسی آیت سے پہلے بھی جس کی تفسیر اب ہم کر رہے ہیں' اپنی عام بخشش کی آیت بیان فرمائی اور پھر اس آیت کے بعد ہی اسی طرح اپنی عام بخشش کا اعلان پھر کیا تا کہ بندوں کو اسکی کامل امید ہو جائے واللہ اعلم۔

رحمت کا مظاہرہ ☆

بخاری و مسلم میں وہ حدیث بھی اس موقعہ پر یاد رکھنے کے قابل ہے۔ جس میں ہے کہ ایک بنی اسرائیلی نے ایک سو قتل کئے تھے۔ پھر ایک عالم سے پوچھتا ہے کہ کیا میری توبہ قبول ہو سکتی ہے۔ وہ جواب دیتا ہے کہ تجھ میں اور تیری توبہ میں کون ہے جو حائل ہو؟ اور اسے کہتا ہے کہ تو اس بدمستی کو چھوڑ کر نیکوں کے شہر میں جا بس۔ چنانچہ ہجرت کرتا ہے اور راستے میں فوت ہو جاتا ہے اور رحمت کے فرشتے اسے لے جاتے ہیں۔ یہ حدیث پوری پوری کئی مرتبہ بیان ہو چکی ہے۔ جب کہ بنی اسرائیل میں یہ ہے تو اس اُمت مرحومہ میں قاتل کے لئے توبہ کے دروازے بند کیوں ہوں۔ ان پر تو ہم سے بہت زیادہ پابندیاں تھیں۔ جن سب سے اللہ نے ہمیں آزاد کر دیا اور رحمۃ العالمین (ﷺ) جیسے سردار انبیاء کو بھیج کر وہ دین ہمیں دیا جو آسانیوں اور راحتوں والا سیدھا صاف اور سہل ہے پس اب یہاں جو سزا قاتل کی بیان فرمائی ہے۔ اس سے یہ مراد ہے کہ اس کی سزا یہ ہے اگر اسے سزا دے۔ چنانچہ ابو ہریرہؓ اور سلف کی ایک جماعت یہی فرماتی ہے۔ بلکہ اس معنی کی ایک حدیث بھی ابن مردویہ میں ہے۔ لیکن سنداً وہ صحیح نہیں اور اسی طرح ہر وعید کا مطلب یہی ہے کہ اگر کوئی عمل صالح وغیرہ اس کے مقابل میں نہیں تو اس بدی کا بدلہ وہ ہے جو وعید میں بیان ہوا اور یہی طریقہ وعیدہ کے بارے میں ہمارے نزدیک نہایت دوست اور صحیح ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

قاتل کے جہنم میں جانے کی صورت میں بھی۔ خواہ وہ بقول ابن عباسؓ وغیرہ توبہ نہ ہونے کی وجہ سے ہو۔ خواہ بقول جمہور دوسرا نیک عمل نجات دہندہ نہ ہونے کی وجہ سے ہو۔ وہ ہمیشہ جہنم میں نہ رہے گا۔ بلکہ یہاں خلود سے مراد بہت دیر تک رہنا ہے۔ جیسا کہ متواتر حدیثوں سے ثابت ہے کہ جہنم میں سے وہ بھی نکل آئیں گے' جن کے دل میں رائی کے چھوٹے سے چھوٹے دانے برابر بھی ایمان ہوگا اوپر جو حدیث بیان ہوئی ہے کہ ممکن ہے اللہ تعالیٰ تمام گناہوں کو کفر اور قتل مؤمن کے معاف فرما دے۔ اس میں عسٰی ترجی کا ہے تو ان دونوں صورتوں میں ترجی یعنی امید گو اُٹھ جائے۔ پھر بھی وقوع یعنی ایسا ہونا ان دونوں میں سے ایک میں نہیں اٹھتا اور وہ قتل ہے۔ کیونکہ شرک و کفر کا معاف ہونا تو الفاظ قرآن سے ثابت ہے اور جو حدیثیں گزریں جن میں ہے کہ قاتل کو مقتول لے کر آئے گا یہ بالکل ٹھیک ہیں۔ چونکہ اس میں انسانی حق ہے۔ وہ توبہ سے ٹل نہیں جاتا۔ بلکہ انسانی حق تو توبہ ہونے کی صورت میں بھی حقدار کو پہنچانا ضروری ہے۔ اس میں جس طرح قتل ہے اسی طرح چوری ہے۔ غصب ہے۔ تہمت ہے اور دوسرے حقوق انسانی ہیں' جن کا توبہ سے معاف نہ ہونا اجماعاً ثابت ہے بلکہ توبہ کی صحت کی شرط ہے۔ کہ ان کے حقوق کو ادا کرے اور جب ادائیگی محال ہے۔ تو قیامت کے روز اس کا مطالبہ ضروری ہے۔ لیکن مطالبہ سے سزا کا واقع ہونا ضروری نہیں۔ ممکن ہے کہ قاتل کے اور سب اعمال صالحہ مقتول کو دیئے جائیں یا بعض دے دیئے جائیں اور اس کے پاس پھر بھی کچھ رہ جائیں اور یہ بخش دیا جائے اور یہ بھی ممکن ہے کہ مقتول کا مطالبہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے اپنے پاس سے اور اپنی طرف سے حور و قصور اور بلند درجات جنت دے کر پورا کر دے اور اس کے عوض وہ اپنے قاتل سے درگزر کرنے پر خوش ہو جائے اور قاتل کو اللہ تعالیٰ بخش دے وغیرہ۔ واللہ اعلم۔

قاتل پر ورثاء مقتول کو ترجیح ☆

جان بوجھ کر مار ڈالنے والے کے لئے کچھ تو دنیوی احکام ہیں اور کچھ اُخروی۔ دنیا میں تو اللہ نے مقتول کے ولیوں کو اس پر غلبہ دیا ہے۔ فرماتا ہے: ﴿وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُوْمًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهٖ سُلْطٰنًا﴾ (بنی اسرائیل:۳۳) جو ظلم سے قتل کیا جائے۔ ہم نے اس کے پیچھے والوں کو غلبہ دیا ہے۔ انہیں اختیار ہے کہ یا تو بدلہ دلیں یعنی قاتل کو قتل کرائیں یا معاف کر دیں یا دیت یعنی خون بہا یعنی جرمانہ وصول کر لیں اور اس کے جرمانہ میں سختی ہے' تین قسموں پر ہے۔ تیس تو چوتھے سال میں لگے ہوئے اونٹ اور تیس پانچویں سال میں لگے ہوئے اور چالیس گابھن اونٹنیاں۔ جیسے کہ کتب احکام میں ثابت ہیں اس میں ائمہ نے اختلاف کیا ہے کہ اس پر غلام کا آزاد کرنا یا دو ماہ کے پے در پے روزے رکھنے یا کھانا کھلانا ہے یا نہیں؟ پس امام شافعی اور ان کے اصحاب اور علماء کی ایک جماعت تو اس کی قائل ہے کہ جب خطا میں یہ ہے تو عمد میں بطور اولیٰ ہونا چاہئے اور ان پر جواباً جھوٹی غیر شرعی قسم کے کفارے کو پیش کیا گیا ہے۔ انہوں نے اس کا عذر عمداً چھوڑ دی ہوئی نماز کی قضا کو بنایا ہے جیسے کہ اس پر اجماع ہے خطا میں۔ امام احمد کے اصحاب اور دوسرے کہتے ہیں۔ قتل عمد کفارے سے بہت بڑھ چڑھ کر ہے۔ اس لئے اس میں کفارہ نہیں اور اسی طرح جھوٹی قسم اور ان کے لئے ان دونوں صورتوں میں اور عمداً چھوڑی ہوئی نماز میں فرق کرنے کی کوئی راہ نہیں۔ اس لئے کہ یہ عمداً چھوڑی ہوئی نماز کی قضا کے وجوب کے قائل ہیں۔ اگلی جماعت کی ایک دلیل یہ حدیث بھی ہے جو مسند احمد میں مروی ہے کہ لوگ حضرت واثلہ بن اسقعؓ کے پاس آئے اور کہا کوئی ایسی حدیث سناؤ' جس میں کمی زیادتی نہ ہو تو بہت ناراض ہوئے اور فرمانے لگے: کیا تم قرآن لے کر جب پڑھتے ہو تو اس میں کمی زیادتی بھی کرتے ہو؟ انہوں نے کہا: حضرت ہمارا مطلب یہ ہے کہ خود رسول اللہ ﷺ سے آپ نے جو سنی ہو۔ کہا: ہم حضور ﷺ کے پاس اپنے ایک آدمی کی بابت گئے۔ جس نے قتل کر کے خود کو جہنمی بنا لیا تھا۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا: اس کی طرف سے ایک غلام آزاد کرو۔ اس کے ایک ایک عضو کے بدلے اس کا ایک ایک عضو اللہ تعالیٰ جہنم سے آزاد کرے گا۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا ضَرَبْتُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَتَبَيَّنُوْا وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ اَلْقٰٓى اِلَيْكُمُ السَّلٰمَ لَسْتَ مُؤْمِنًا ۚ تَبْتَغُوْنَ عَرَضَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۡ فَعِنْدَ اللّٰهِ مَغَانِمُ كَثِيْرَةٌ ۭ كَذٰلِكَ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلُ فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ فَتَبَيَّنُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ﴿۹۴﴾

اے ایمان والو! جب تم اللہ کی راہ میں سفر کیا کرو تو ہر کام کو تحقیق کر کے کیا کرو اور ایسے شخص کو جو کہ تمہارے سامنے اطاعت ظاہر کرے یوں مت کہہ دیا کرو تو مسلمان نہیں ہے۔ اس طور پر کہ تم دنیوی زندگی کے سامان کی خواہش کرتے ہو۔ کیونکہ اللہ کے پاس بہت غنیمت کے مال ہیں۔ پہلے تم بھی ایسے ہی تھے پھر اللہ تعالیٰ نے تم پر احسان کیا سو غور کرو۔ بے شک اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال کی پوری خبر رکھتے ہیں۔ ۞

احتیاط کا حکم ☆

ترمذی وغیرہ میں ایک حدیث میں ہے کہ بنوسلیم کا ایک شخص بکریاں چراتا ہوا صحابہ کی ایک جماعت کے پاس سے گزرا اور اسلام کیا تو صحابہ آپس میں کہنے لگے: یہ مسلمان تو ہے نہیں' صرف اپنی جان بچانے کے لئے سلام کرتا ہے۔ چنانچہ اسے قتل کر دیا اور بکریاں لے کر چلے آئے۔ اس پر یہ آیت اتری۔ یہ حدیث تو صحیح ہے لیکن بعض محدثین نے اس کو مجروح قرار دیا ہے کہ ضحاک راوی سے سوائے اس طریقے کے اور کوئی مخرج ہی اس کا نہیں اور یہ کہ عکرمہ سے اس کے روایت کرنے میں بھی تامل ہیں اور یہ کہ اس آیت کے شانِ نزول میں اور واقعات بھی مروی ہیں۔ بعض کہتے ہیں محکم بن جثامہ کے بارے میں اتری ہے۔ بعض کہتے ہیں: اسامہ بن زیدؓ کے بارے میں نازل ہوئی ہے اور اس کے سوا بھی اقوال ہیں۔ لیکن میں کہتا ہوں کہ یہ سب کلام مردود ہے۔ ضحاک سے اسے بہت سے ائمہ کبار نے روایت کیا ہے۔ عکرمہ سے صحیح میں دلیل لی گئی ہے۔ یہی روایت دوسرے طریق سے حضرت ابن عباسؓ سے بخاری میں مروی ہے۔ سعید بن منصور میں بھی مروی ہے۔ ابن جریر اور ابن ابی حاتم میں ہے کہ ایک شخص کو اس کے والد اور اس کی قوم نے اپنے اسلام کی خبر پہنچانے کے لئے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں بھیجا۔ راستے میں اس کی حضور ﷺ کے بھیجے ہوئے ایک لشکر سے رات کے وقت ملاقات ہوئی۔ اس نے ان سے کہا: میں مسلمان ہوں۔ میں مسلمان ہوں۔ لیکن انہیں یقین نہ آیا اور اسے دشمن سمجھ کر قتل کر ڈالا۔ ان کے والد کو جب علم ہوا تو یہ خود رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور واقعہ بیان کیا۔ چنانچہ آپ ﷺ نے انہیں ایک ہزار دینار دیئے اور دیت ادا کی اور انہیں عزت کے ساتھ رخصت کیا۔ اس پر یہ آیت اتری۔ محکم بن جثامہ کا واقعہ یہ ہے کہ حضور ﷺ نے اپنا ایک چھوٹا سا لشکر اَضم کی طرف بھیجا۔ جب یہ لشکر بطن اَضم میں پہنچا تو عامر بن اضبط اشجعی اپنی سواری پر سوار مع اسباب کے آ رہے تھے۔ پاس پہنچ کر سلام کیا۔ سب تو رک گئے۔ لیکن محکم جثامہ نے کچھ آپس کی بنا پر اس پر جھپٹ کر حملہ کیا' انہیں قتل کر ڈالا اور اسباب قبضہ میں کر لیا۔ پھر ہم حضور ﷺ کے پاس پہنچے اور آپ ﷺ سے یہ واقعہ بیان کیا' اس پر یہ آیت اتری' ایک اور روایت میں ہے کہ عامرؓ نے اسلامی طریقہ کے مطابق سلام کیا تھا۔ لیکن جاہلیت کی پہلی عداوت کے باعث محکم نے تیر مار کر مار ڈالا۔ آپ ﷺ نے یہ خبر پا کر عامر کے لوگوں سے کہا سنا۔ لیکن عیینہ نے کہا: نہیں نہیں اللہ کی قسم جب تک اس کی عورتوں پر بھی وہی مصیبت نہ آئے جو میری عورتوں پر آئی۔

نبی ﷺ کی بددعا اور اس کا اثر ☆

محکم اپنی دونوں چادریں اوڑھے ہوئے آئے اور رسول کریم ﷺ کے سامنے بیٹھ گئے اس پر امید پر کہ حضور ﷺ ان کے لئے استغفار کریں۔ لیکن آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ تجھے نہ بخشے۔ یہ یہاں سے سخت نادم شرمسار روتے ہوئے اٹھے اپنی چادروں سے اپنے آنسو پونچھتے جاتے تھے۔ سات روز بھی نہ گزرنے پائے تھے جو انتقال کر گئے۔ لوگوں نے انہیں دفن کیا۔ لیکن زمین نے ان کی نعش اگل دی۔ حضور ﷺ سے جب اس کا ذکر ہوا تو آپ ﷺ نے فرمایا: تمہارے اس ساتھی سے نہایت ہی بدتر لوگوں کو زمین سنبھال لیتی ہے۔ لیکن اللہ کا ارادہ ہے کہ وہ تمہیں مسلمان کی حرمت دکھائے۔ چنانچہ ان کے لاشے کو پہاڑ پر ڈال دیا گیا اور اوپر سے پتھر رکھ دیئے گئے اور یہ آیت نازل ہوئی۔ (ابن جریر) صحیح بخاری شریف میں تعلیقاً موجود ہے کہ حضور ﷺ نے حضرت مقدادؓ سے فرمایا جبکہ انہوں نے قوم کفار کے ساتھ جو مسلمان مخفی ایمان لانے والا تھا' اسے قتل کر دیا

تھا۔ باوجودیکہ اس نے اپنے اسلام کا ظہار کر دیا تھا کہ تم بھی مکہ میں اسی طرح تھے کہ ایمان چھپائے ہوئے تھے۔ بزار میں یہ واقعہ پورا اسی طرح مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک چھوٹا سا لشکر بھیجا تھا جس میں حضرت مقداد بھی آئے تھے۔ جب دشمنوں کے پاس پہنچے تو دیکھا کہ سب تو ادھر اُدھر بھاگ گئے ہیں' ایک شخص مالدار وہاں رہ گیا ہے۔ اس نے انہیں دیکھتے ہیں کہا: اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ لیکن تاہم انہوں نے حملہ کر دیا اور اسے قتل کر دیا۔ ایک شخص نے جس نے یہ واقعہ دیکھا تھا۔ وہ سخت برہم ہوا اور کہنے لگا: مقداد تم نے سے قتل کر ڈالا جس نے کلمہ پڑھا تھا؟ میں اس کا ذکر حضور ﷺ سے کروں گا۔ جب یہ لشکر واپس پہنچا تو اس شخص نے یہ واقعہ حضور ﷺ کی خدمت میں پیش کیا۔ آپ ﷺ نے مقداد کو بلوایا اور فرمایا: تم نے یہ کیا کیا؟ کل قیامت کے دن لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کے سامنے کیا کرو گے؟ پس اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اتاری اور آپ نے فرمایا کہ اے مقداد وہ شخص مسلمان تھا۔ جس طرح تو مکہ میں اپنے ایمان کو مخفی رکھتا تھا۔ پھر تو نے اس کے اسلام ظاہر کرنے کے باوجود اسے مارا۔ پھر ارشاد ہوتا ہے کہ جس غنیمت کے لالچ میں تم غفلت برت رہے ہو اور اسلام قبول کرنے والوں کے ایمان میں شک وشبہ کر کے انہیں قتل کر ڈالتے ہو۔ سنو! یہ غنیمت بھی اللہ کی طرف سے ہے۔ اس کے پاس بہت سے غنیمتیں ہیں جو وہ تمہیں حلال ذرائع سے دے گا اور وہ تمہارے لئے اس مال سے بہت بہتر ہوں گی۔ تم بھی اپنا وہ وقت یاد کرو کہ تم بھی ایسے ہی تھے۔ اپنے ضعف اور اپنی کمزوری کی وجہ سے ایمان ظاہر کرنے کی جرأت نہ کر سکتے تھے۔ قوم میں چھپے لگے پھرتے تھے۔ آج اللہ نے تم پر احسان کیا تمہیں قوت دی اور تم کھلے بندوں اپنے اسلام کا اظہار کر رہے ہو تو جو بے اسباب اب تک دشمنوں کے پنجے میں پھنسے ہوئے ہیں اور ایمان کا اعلان کھلے طور پر نہیں کر سکے۔ جب وہ اپنا ایمان ظاہر کریں تمہیں تسلیم کر لینا چاہئے اور آیت میں ہے:
﴿وَاذْكُرُوْٓا اِذْ اَنْتُمْ قَلِيْلٌ﴾ (الانفال: ۲۶) یاد کرو جب تم کم تھے' کمزور تھے۔

الغرض ارشاد ہوتا ہے کہ جس طرح یہ بکری کا چرواہا اپنا ایمان چھپائے ہوئے تھا۔ اسی طرح اس سے پہلے جبکہ بے سروسامانی اور قلت کی حالت میں تم مشرکوں کے درمیان تھے' ایمان چھپائے پھرتے تھے۔ یہ مطلب بھی بیان کیا گیا ہے کہ تم بھی پہلے اسلام والے نہ تھے۔ اللہ نے تم پر احسان کیا اور تمہیں اسلام نصیب فرمایا۔ حضرت اسامہؓ نے قسم کھائی تھی کہ میں کبھی کسی لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہنے والے کو قتل نہ کروں گا۔ کیونکہ انہیں بھی اس بارے میں پوری سرزنش ہوئی تھی۔ پھر تاکیداً دوبارہ فرمایا کہ بخوبی تحقیق کر لیا کرو۔ پھر دھمکی دی جاتی ہے کہ اللہ کو اپنے اعمال سے غافل نہ سمجھو جو تم کر رہے ہو وہ سب کی پوری خبر رکھتا ہے۔

لَا يَسْتَوِي الْقٰعِدُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ غَيْرُ اُولِي الضَّرَرِ وَالْمُجٰهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ۭ فَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ عَلَي الْقٰعِدِيْنَ دَرَجَةً ۭ وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰي ۭ وَفَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ عَلَي الْقٰعِدِيْنَ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۹۵﴾ دَرَجٰتٍ مِّنْهُ وَمَغْفِرَةً وَّرَحْمَةً ۭ وَكَانَ

اللّٰهُ غَفُورًا رَّحِيمًا ﴿٩٦﴾

برابر نہیں وہ مسلمان جو بلا کسی عذر کے گھر میں بیٹھے رہیں اور وہ لوگ جو اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور جانوں سے جہاد کریں اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کا درجہ بہت زیادہ بنایا ہے جو اپنے مالوں اور جانوں سے جہاد کرتے ہیں بہ نسبت گھر میں بیٹھنے والوں کے اور سب اللہ تعالیٰ نے اچھے گھر کا وعدہ کر رکھا ہے اور اللہ تعالیٰ نے مجاہدین کو بمقابلہ گھر میں بیٹھنے والوں کے بڑا اجر عظیم دیا ہے یعنی بہت سے درجے جو اللہ کی طرف سے ملیں گے اور مغفرت اور رحمت اور اللہ تعالیٰ بڑے مغفرت والے بڑے رحمت والے ہیں۔ ○

مجاہدین اور جہاد نہ کرنے والے ☆

صحیح بخاری شریف میں ہے کہ جب اس آیت کے ابتدائی الفاظ اترے کہ بیٹھ رہنے والے اور جہاد کرنے والے مومن برابر نہیں۔ آپ ﷺ حضرت زید کو بلا کر اسے لکھوا رہے تھے' جو حضرت ام مکتومؓ نابینا آئے اور کہنے لگے: حضور ﷺ میں تو نابینا ہوں۔ اس پر الفاظ ﴿غَيْرُ أُولِي الضَّرَرِ﴾ نازل ہوئے۔ یعنی وہ بیٹھ رہنے والے جو بے عذر ہوں اور روایت ہیں ہے کہ حضرت زید اپنے ساتھ قلم' دوات اور شانہ لے کر آئے تھے اور حدیث میں ہے کہ ابن مکتومؓ نے فرمایا تھا: یا رسول اللہ ﷺ! اگر مجھ میں طاقت ہوتی تو میں ضرور جہاد میں شامل ہوتا۔ اس پر وہ الفاظ اُترے۔ اس وقت حضور ﷺ کی ران حضرت زیدؓ کی ران پر تھی' اس قدر بوجھ ان پر پڑا کہ قریب تھا ران ٹوٹ جائے اور حدیث میں ہے کہ جس وقت ان الفاظ کی وحی اُتری اور سکینت آپ پر اُتری' میں آپ کے پہلو میں تھا۔ اللہ کی قسم وہ بوجھ مجھ پر رسول اللہ ﷺ کی ران کا پڑا کہ میں نے اس زیادہ بوجھل چیز کوئی نہیں اُٹھائی۔ پھر وحی ہٹ جانے کے بعد آپ نے عَظِيمًا تک آیت لکھوائی اور میں نے اسے شانہ کی ہڈی پر لکھ لیا اور حدیث میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ ابھی تو ابن مکتومؓ کے الفاظ ختم بھی نہ ہوئے تھے کہ آپ پر وحی نازل ہونی شروع ہوئی۔ حضرت زیدؓ فرماتے ہیں: وہ منظر اب تک میری آنکھوں کے سامنے ہے۔ گویا میں دیکھ رہا ہوں کہ یہ بعد میں اُترے ہوئے الفاظ میں نے ان کی جگہ پر اپنی تحریر میں بعد میں بڑھائے ہیں۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں: مراد بدر کی لڑائی میں جانے والے اور اس میں حاضر نہ ہونے والے ہیں۔ غزوۂ بدر کے موقعہ پر حضرت عبداللہ بن جحشؓ اور حضرت عبداللہ بن مکتومؓ آ کر حضور ﷺ سے کہنے لگے' ہم دونوں نابینا ہیں' کیا ہمیں رخصت ہے؟ تو انہیں آیت قرآنی میں رخصت دی گئی۔ پس مجاہدین کو جن بیٹھ رہنے والوں پر فضیلت دی گئی ہے۔ وہ وہ ہیں جو صحت و تندرستی والے ہیں۔ پس پہلے تو مجاہدین کو بیٹھ رہنے والوں پر مطلق فضیلت تھی۔ لیکن پھر اسی وحی کے ساتھ جو الفاظ اُترے اس نے ان لوگوں کو جنہیں مباح عذر ہوں' عام بیٹھے رہنے والوں سے مستثنیٰ کر لیا جیسے اندھے' لنگڑے' لولے اور بیمار۔ یہ مجاہدین کے درجے ہیں۔

پھر مجاہدین کی جو فضیلت بیان ہوئی ہے وہ بھی ان لوگوں پر ہے جو بے وجہ جہاد میں شامل نہ ہوئے ہوں جیسے کہ ابن عباسؓ کی تفسیر گزری اور یہی ہونا بھی چاہئے۔ بخاری میں ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مدینہ میں ایسے لوگ بھی ہیں کہ تم جس جہاد کے لئے سفر کرو اور جس جنگل میں کوچ کرو وہ تمہارے ساتھ اُجر میں یکساں ہیں۔ صحابہ نے کہا۔ باوجودیکہ وہ مدینہ میں مقیم ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں۔ اس لئے کہ انہیں عذر نے روک رکھا تھا اور روایت میں ہے کہ تم جو خرچ کرتے ہو اس کا ثواب بھی جو تمہیں ملتا ہے انہیں بھی ملتا ہے' اسی مطلب کو ایک شاعر نے ان الفاظ میں منظوم کیا ہے ؎

یَا رَاحِلِیْنَ اِلَی الْبَیْتِ الْعَتِیْقِ لَقَدْ ☆ سِرْتُمْ جُسُوْمًا وَّسِرْنَا نَحْنُ اَرْوَاحًا
اِنَّا اَقَمْنَا عَلٰی عُذْرٍ وَّعَنْ قَدَرٍ ☆ وَمَنْ اَقَامَ عَلٰی عُذْرٍ فَقَدْ رَاحَا

یعنی اے اللہ کے گھر کے حج کو جانے والو! اگر تم اپنے جسموں سمیت اس طرف چل رہے ہو لیکن ہم بھی اپنی روحانی روش سے اسی طرف لپکے جا رہے ہیں۔ سنو! بے طاقتی اور عذر نے ہمیں روک رکھا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ عذر سے رک جانے والا کچھ جانے والے سے کم نہیں۔ پھر فرماتا ہے: ہر ایک سے اللہ تعالیٰ کا وعدہ جنت کا اور بہت بڑے اجر کا ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ جہاد (قتال) فرض عین نہیں۔ بلکہ فرض کفایہ ہے۔ پھر ارشاد ہے: مجاہدین کو غیر مجاہدین پر بڑی فضیلت ہے۔ پھر ان کے بلند درجات ان کے گناہوں کی معافی اور ان پر جو برکت رحمت ہے اس کا بیان فرمایا ہے اور اپنی عام بخشش اور عام رحم کی خبر دی ہے۔ بخاری و مسلم میں ہے' جنت میں سو درجے ہیں۔ انہیں اللہ تعالیٰ نے اپنی راہ کے مجاہدین کے لئے تیار کیا ہے۔ ہر دو درجوں میں اس قدر فاصلہ ہے' جتنا آسمان و زمین میں ہے اور حدیث میں ہے' حضور ﷺ نے فرمایا: جو شخص اللہ کی راہ میں تیر چلائے اسے جنت کا درجہ ملتا ہے۔ ایک شخص نے پوچھا: درجہ کیا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: وہ تمہارے یہاں گھروں کے بالا خانوں جتنا نہیں بلکہ دو درجوں میں سو سال کا فاصلہ ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ تَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓىِٕكَةُ ظَالِمِیْٓ اَنْفُسِهِمْ قَالُوْا فِیْمَ كُنْتُمْ ؕ قَالُوْا كُنَّا مُسْتَضْعَفِیْنَ فِی الْاَرْضِ ؕ قَالُوْٓا اَلَمْ تَكُنْ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوْا فِیْهَا ؕ فَاُولٰٓىِٕكَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ؕ وَسَآءَتْ مَصِیْرًا ۙ﴿۹۷﴾ اِلَّا الْمُسْتَضْعَفِیْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ لَا یَسْتَطِیْعُوْنَ حِیْلَةً وَّلَا یَهْتَدُوْنَ سَبِیْلًا ۙ﴿۹۸﴾ فَاُولٰٓىِٕكَ عَسَى اللّٰهُ اَنْ یَّعْفُوَ عَنْهُمْ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَفُوًّا غَفُوْرًا ﴿۹۹﴾ وَمَنْ یُّهَاجِرْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ یَجِدْ فِی الْاَرْضِ مُرٰغَمًا كَثِیْرًا وَّسَعَةً ؕ وَمَنْ یَّخْرُجْ مِنْۢ بَیْتِهٖ مُهَاجِرًا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ یُدْرِكْهُ الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ اَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ

غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۱۰۰﴾ ع

بے شک جب ایسے لوگوں کی جان فرشتے قبض کرتے ہیں جنہوں نے اپنے کو گناہگار کر رکھا تھا تو وہ ان سے کہتے ہیں کہ تم کس کام میں تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم سرزمین میں محض مغلوب تھے۔ وہ کہتے ہیں کیا اللہ تعالیٰ کی زمین وسیع نہ تھی۔ تم کو ترک وطن کر کے اس میں چلا جانا چاہئے تھا۔ سوان لوگوں کا ٹھکانہ جہنم ہے اور جانے کے لئے وہ بری جگہ ہے لیکن جو مرد اور عورتیں اور بچے قادر نہ ہوں کہ نہ کوئی تدبیر کر سکتے ہوں اور نہ رستہ سے واقف ہوں سوان کے لئے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ معاف کر دیں اور اللہ تعالیٰ بڑے معاف کرنے والے اور بڑے مغفرت والے ہیں اور جو شخص اللہ کی راہ میں ہجرت کرے گا تو اس کو روئے زمین پر جانے کی بہت جگہ ملے گی اور بہت گنجائش اور جو شخص اپنے گھر سے اس نیت سے نکل کھڑا ہو کہ اللہ اور رسول کی طرف ہجرت کروں گا۔ پھر اس کو موت آ پکڑے تب بھی اس کا ثواب ہو گیا اللہ تعالیٰ کے ذمہ اور اللہ تعالیٰ بڑے مغفرت کرنے والے ہیں بڑے رحمت والے ہیں۔ ○

ایک تنبیہ ☆

محمد بن عبدالرحمٰن ابوالاسود فرماتے ہیں: اہل مدینہ سے جنگ کرنے کے لئے جو لشکر تیار کیا گیا۔ اس میں میرا نام بھی تھا۔ میں حضرت ابن عباسؓ کے مولیٰ حضرت عکرمہؒ سے ملا اور اس بات کا ذکر کیا تو انہوں نے مجھے اس میں شمولیت کرنے سے بہت سختی سے روکا اور کہا: سنو! حضرت ابن عباسؓ سے میں نے سنا ہے کہ بعض مسلمان لوگ جو حضور ﷺ کے زمانے میں مشرکوں کے ساتھ تھے اور ان کی تعداد بڑھاتے تھے۔ بسا اوقات ایسا بھی ہوتا کہ ان میں کوئی کسی تیر سے ہلاک کر دیا جاتا یا مسلمانوں کی تلواروں سے قتل کر دیا جاتا۔ انہی کے بارے میں یہ آیت اُتری ہے۔ یعنی موت کے وقت ان کا اپنی بے طاقتی کا حیلہ اللہ کے ہاں قبول نہیں ہوتا اور روایت میں ہے کہ ایسے لوگ جو اپنے ایمان کو مخفی رکھتے تھے۔ جبکہ وہ بدر کی لڑائی میں کافروں کے ساتھ آئے اور بعض مسلمانوں کے ہاتھوں شہید ہوئے۔ جس پر مسلمان غمگین ہوئے کہ افسوس یہ تو ہمارے ہی بھائی تھے اور ہمارے ہی ہاتھوں مارے گئے۔ ان کے لئے استغفار کرنے لگے۔ اس پر یہ آیت اُتری۔ پس باقی ماندہ مسلمانوں کی طرف سے یہ آیت لکھی کہ ان کا کوئی عذر نہیں تھا۔ کہا یہ نکلے اور ان سے مشرکین ملے اور انہوں نے تقیہ کیا۔ پس یہ آیت اُتری: ﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ﴾ (البقرہ:۸) حضرت عکرمہ فرماتے ہیں: یہ آیت ان لوگوں کے بارے میں اُتری ہے جو اسلام کا کلمہ پڑھتے تھے اور تھے مکے میں ہی۔ ان میں علی بن اُمیہ بن خلف اور ابو قیس بن ولید بن مغیرہ اور ابو منصور بن حجاج اور حارث بن زمعہ تھے۔ ضحاکؒ کہتے ہیں: یہ آیت ان منافقوں کے بارے میں اُتری ہے جو رسول اللہ ﷺ کی ہجرت کے بعد بھی مکے میں رہ گئے تھے اور بدر کی لڑائی میں مشرکوں کے ساتھ آئے تھے۔ پھر بعض میدان جنگ میں بھی شہید ہوئے۔ بہر حال آیت کا حکم عام ہے اور ہر اُس شخص کو شامل ہے جو ہجرت پر قادر ہو پھر بھی مشرکوں میں پڑا رہے اور دین پر مضبوط نہ رہے۔ وہ اللہ کے نزدیک ظالم ہے اور اس آیت کی رو سے اور مسلمانوں کے اجماع سے وہ حرام کام کا مرتکب ہے۔ اس آیت میں ہجرت کے چھوڑ دینے کو ظلم کہا گیا ہے۔ ایسے لوگوں سے ان کے نزع کے عالم میں فرشتے کہتے ہیں کہ تم یہاں کیوں ٹھہرے رہے؟ کیوں ہجرت نہ کی؟ یہ جواب دیتے ہیں کہ ہم اپنے شہر سے دوسرے شہر میں کہیں نہیں جا سکتے تھے جس کے جواب میں فرشتے کہتے ہیں کہ اللہ کی زمین میں کشادگی نہ تھی؟ ابوداؤد میں ہے جو شخص مشرکین سے ملا جلا رہے۔ ان ہی کے ساتھ رہے سہے وہ بھی ن

جیسا ہے۔ یہ ہے دوستی کا نتیجہ۔ سدی فرماتے ہیں: جبکہ حضرت عباسؓ عقیل اور نوفل گرفتار کئے گئے تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا: عباس تم اپنا فدیہ بھی دو اور اپنے بھتیجے کا بھی۔

حضرت عباس نے کہا: یارسول اللہ ﷺ! کیا ہم آپ کے قبلہ کی طرف نمازیں نہیں پڑھتے تھے؟ کیا ہم کلمہ شہادت ادا نہیں کرتے تھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: عباس تم نے بحث چھیڑ دی لیکن اس میں تم ہار جاؤ گے۔ سنو! اللہ تعالیٰ فرماتا ہے' پھر آپ نے یہی آیت تلاوت فرمائی۔ یعنی تم نے ہجرت کیوں نہ کی؟ پھر جن لوگوں کو ہجرت کے چھوڑ دینے پر ملامت نہ ہوگی۔ ان کا ذکر فرماتا ہے کہ جو لوگ مشرکین کے ہاتھوں سے نہ چھوٹ سکیں اور اگر کبھی چھوٹ جائیں تو راستے کا علم انہیں نہیں۔ ان سے اللہ تعالیٰ درگزر فرمائے گا۔ عسیٰ کا کلمہ اللہ کے کلام میں وجوب اور یقین کے لئے ہوتا ہے۔ اللہ درگزر کرنے والا اور بہت ہی معافی دینے والا ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے عشاء کی نماز میں سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ کہنے کے بعد سجدے میں جانے سے پہلے یہ دعا مانگی کہ خدایا عیاش بن ابو ربیعہ کو، سلمہ بن ہشام کو، ولید بن ولید کو اور تمام بے بس اور کمزور مسلمانوں کو کفار کے مظالم سے نجات عطا فرما۔ اے اللہ! اپنا سخت عذاب قبیلہ مضر پر ڈال' اے اللہ! ان پر ایسی قحط سالی نازل فرما جیسے حضرت یوسفؑ کے زمانہ میں آئی تھی۔ ابن ابی حاتم میں حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے سلام پھیرنے کے بعد قبلہ کی طرف ہی منہ کئے ہوئے ہاتھ اُٹھا کر دعا مانگی: اے اللہ! ولید بن ولید کو، عیاش بن ابو ربیعہ کو، سلمہ بن ہشام کو اور تمام ناتواں وضعیف مسلمانوں کو جو کافروں کی قید میں پڑے ہوئے ہیں' ان کے ہاتھوں سے نجات دے۔

ابن جریر میں ہے حضور ﷺ کی نماز کے بعد یہ دعا مانگا کرتے تھے۔ اس حدیث کے شواہد صحیح میں بھی اس سند کے سوا اور سندوں سے بھی ہیں۔ جیسے کہ پہلے گزرا۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں: میں اور میری والدہ ان ضعیف عورتوں اور بچوں میں تھے۔ جن کا ذکر اس آیت میں ہے' ہمیں اللہ نے معذور رکھا' ہجرت کی ترغیب دیتے ہوئے اور مشرکوں سے الگ ہونے کی ہدایت کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ راہ اللہ میں ہجرت کرنے والا ہراساں نہ ہو وہ جہاں جائے گا' اللہ تعالیٰ اس کے اسباب پناہ تیار کر دے گا اور وہ بہ آرام وہاں اقامت کر سکے گا۔ مراغم کے ایک معنی ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے کے بھی ہیں۔ مجاہد فرماتے ہیں: وہ اپنے دکھ سے بچاؤ کی بہت سی صورتیں پا لے گا' امن کے بہت سے اسباب اسے مل جائیں گے۔ دشمنوں کے شر سے بچ جائے گا اور وہ روزی بھی پائے گا۔ گمراہی سے ہدایت اسے ملے گی اور فقیری تونگری سے بدل جائے گی۔ پھر فرماتا ہے: جو شخص بہ نیت ہجرت اپنے گھر سے نکلا' پھر ہجرت گاہ پہنچنے سے پہلے ہی راستے میں اسے موت آ گئی' اسے بھی ہجرت کا کامل ثواب مل گیا۔ حضور ﷺ فرماتے ہیں: ہر عمل کا مدار نیت پر ہے اور ہر شخص کو اس کی نیت کے مطابق بدلہ ملتا ہے۔ پس جس کی ہجرت اللہ اور اس کے رسول کی طرف ہو' اس کی ہجرت اللہ تعالیٰ کی رضامندی اور رسول کی خوشنودی کا باعث ہوگی اور جس کی ہجرت دنیا حاصل کرنے کے لئے ہو یا کسی عورت سے نکاح کرنے کے لئے ہو تو اس کی یہ ہجرت اسی طرف سمجھی جائے گی۔ جس کی نیت سے اس نے ہجرت کی۔ یہ حدیث عام ہے۔ ہجرت وغیرہ تمام اعمال کو شامل ہے۔ صحیحین کی حدیث میں اس شخص کے بارے میں ہے جس نے ننانوے قتل کئے تھے' پھر ایک عابد کو قتل کر کے سو پورے کئے' پھر ایک عالم سے پوچھا کہ کیا اس کی توبہ قبول ہو سکتی ہے؟ اس نے کہا: تیری توبہ کے اور تیرے درمیان کوئی چیز حائل نہیں تو اپنی بستی سے ہجرت کر کے فلاں شہر چلا جا' جہاں اللہ کے عابد بندے رہتے ہیں۔ چنانچہ یہ ہجرت کر کے اس طرف پہنچے راستہ میں ہی تھا کہ موت آ گئی۔ رحمت

اور عذاب کے فرشتوں میں اس کے بارے میں اختلاف ہوا۔ یہ تو کہہ رہے تھے یہ شخص توبہ کر کے ہجرت کر کے چل کھڑا ہوا اور وہ کہہ رہے تھے یہ وہاں پہنچا تو نہیں۔ پھر انہیں حکم کیا گیا کہ وہ اس طرف کی اور اس طرف کی زمین ناپیں، جس بستی سے یہ شخص قریب ہو اس کے رہنے والوں میں اسے ملا دیا جائے۔ پھر زمین کو اللہ نے حکم دیا کہ بُری بستی کی جانب سے دور ہو جائے اور نیک بستی والوں کی طرف قریب ہو جائے۔ جب زمین ناپی گئی تو توحید والوں کی بستی سے ایک بالشت برابر قریب نکلی اور اسے رحمت کے فرشتے لے گئے۔ ایک روایت میں ہے کہ موت کے وقت یہ اپنے سینے کے بل نیک لوگوں کی طرف گھسٹتا ہوا گیا۔ مسند احمد کی حدیث میں ہے، جو شخص اپنے گھر سے راہ اللہ کی ہجرت کی نیت سے نکلا۔ پھر آپ نے اپنی تینوں انگلیوں یعنی کلمہ، بیچ اور انگوٹھے کی انگلی کو ملا کر کہا، پھر فرمایا: کہاں ہیں مجاہد؟ پھر وہ اپنی سواری پر سے گر پڑا یا اسے کسی جانور نے کاٹ کھایا یا اپنی موت مر گیا تو اس کی ہجرت کا ثواب اللہ تعالیٰ کے ذمے ثابت ہو گیا۔ (راوی کہتے ہیں اپنی موت مرنے کے لئے جو کلمہ حضور ﷺ نے استعمال کیا) واللہ میں نے اس کلمہ کو آپ سے پہلے کسی عرب کی زبانی نہیں سنا اور جو شخص غضب کی حالت میں قتل کیا گیا وہ جگہ کا مستحق ہو گیا۔ (احمد) حضرت خالد بن حزام ہجرت کر کے حبشہ کی طرف چلے۔ لیکن راہ میں انہیں ایک سانپ نے ڈس لیا اور اسی میں ان کی روح قبض ہو گئی۔ ان کے بارے میں یہ آیت اُتری۔

حضرت زبیر فرماتے ہیں: میں چونکہ ہجرت کر کے حبشہ پہنچ گیا تھا اور مجھے ان کی خبر مل گئی تھی کہ یہ بھی ہجرت کر کے آ رہے ہیں اور میں جانتا تھا کہ قبیلہ بنو اسد سے ان کے سوا اور کوئی ہجرت کر کے آنے والا نہیں اور کم و بیش جتنے مہاجر تھے ان کے ساتھ رشتے کنبے کے لوگ تھے۔ لیکن میرے ساتھ کوئی نہ تھا میں ان کا یعنی حضرت خالد کا بے چینی سے انتظار کر رہا تھا جو مجھے ان کی اس طرح اچانک شہادت کی خبر ملی تو مجھے بہت ہی رنج ہوا یہ اثر بہت ہی غریب ہے۔ یہ بھی وجہ ہے کہ یہ قصہ مکہ کا ہے اور آیت مدینہ میں اُتری ہے لیکن بہت ممکن ہے راوی کا مقصود یہ ہو کہ آیت کا حکم عام ہے، گو شانِ نزول یہ نہ ہو۔ واللہ اعلم۔ اور روایت میں ہے کہ حضرت ضمرہ بن جندبؓ ہجرت کر کے رسول اللہ ﷺ کی طرف چلے لیکن آپ کے پاس پہنچنے سے پہلے ہی راستے میں انتقال کر گئے۔ ان کے بارے میں یہ آیت شریفہ نازل ہوئی۔

ایک اور روایت میں ہے کہ حضرت سعد بن ابی ضمرہ جن کو آنکھوں سے دکھائی نہ دیتا تھا، جب وہ آیت اِلَّا الْمُسْتَضْعَفِيْنَ سنتے ہیں تو کہتے ہیں میں مالدار ہوں اور چارہ کار بھی رکھتا ہوں، مجھے ہجرت کرنی چاہئے۔ چنانچہ سامانِ سفر تیار کیا اور حضور ﷺ کی طرف چل دیئے۔ لیکن ابھی موضع تنعیم ہی میں تھے کہ موت آ گئی۔ ان کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی۔ طبرانی میں ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے جو شخص میری راہ میں غزوہ کرنے کے لئے نکلا، صرف میرے وعدوں کو سچا جان کر اور میرے رسولوں پر ایمان رکھ کر۔ پس وہ اللہ کی ضمانت میں ہے یا تو وہ لشکر کے ساتھ فوت ہو کر جنت میں پہنچے گا، یا اللہ کی ضمانت میں واپس لوٹے گا، غنیمت اور فضل اللہ لے کر۔ اگر وہ اپنی موت مر جائے یا مار ڈالا جائے یا گھوڑے سے گر جائے یا اونٹ پر سے گر پڑے یا کوئی زہریلا جانور کاٹ لے یا اپنے بستر پر سے کسی طرح بھی فوت ہو جائے وہ شہید ہے۔ ابوداؤد میں اتنی زیادتی بھی ہے کہ وہ جنتی ہے۔ بعض الفاظ ابوداؤد میں نہیں ہیں۔ ابو یعلی میں ہے جو شخص حج کے لئے نکلا پھر مر گیا قیامت کے تک اس کے لئے حج کا ثواب لکھا جاتا ہے۔ جو عمرے کے لئے نکلا اور راستے میں فوت ہو گیا اس کے لئے قیامت تک عمرے کا ثواب لکھا جاتا ہے۔ جو جہاد کے لئے نکلا اور فوت ہو گیا اس کے لئے قیامت تک جہاد کا ثواب

لکھا جاتا ہے۔ یہ حدیث بھی غریب ہے۔

وَإِذَا ضَرَبْتُمْ فِي الْأَرْضِ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَقْصُرُوا مِنَ الصَّلٰوةِ ۖ إِنْ خِفْتُمْ أَنْ يَفْتِنَكُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا ۚ إِنَّ الْكٰفِرِينَ كَانُوا لَكُمْ عَدُوًّا مُبِينًا ﴿۱۰۱﴾

اور جب تم زمین میں سفر کرو سوتم کو اس میں کوئی گناہ نہ ہوگا کہ تم نماز کو کم کردو اگر تم کو یہ اندیشہ ہو کہ تم کو کافر لوگ پریشان کریں گے۔ بلاشبہ کافر لوگ تمہارے صریح دشمن ہیں

سفر کی حالت میں عبادت میں تخفیف ☆

فرمان ہے کہ تم کہیں سفر میں جا رہے ہو۔ یہی الفاظ سفر کے لئے سورہ مزمل میں بھی آئے ہیں تو تم پر نماز کی تخفیف کرنے میں کوئی گناہ نہیں۔ یہ کمی یا تو کمیت میں یعنی بجائے چار رکعت کے دو رکعت جیسا کہ جمہور نے اس میں سمجھا ہے۔ لیکن پھر جمہور میں بھی اختلاف ہے۔ بعض کہتے ہیں یہ شرط ہے کہ سفر اطاعت کا ہو۔ مثلاً جہاد کے لئے یا حج وعمرے کے لئے یا طلب علم وزیارت کے لئے وغیرہ ابن عمر عطا، یحییٰ اور ایک روایت کی رو سے امام مالک کا یہی قول ہے۔ کیونکہ اس سے آگے فرمان ہے۔ اگر تمہیں کفار کی ایذارسانی کا خوف ہو۔ بعض کہتے ہیں اس قید کی کوئی ضرورت نہیں کہ سفر قربت خداوندی کا ہو۔ بلکہ نماز کی کمی ہر مباح سفر کے لئے ہے۔ جیسے اضطرار اور بے بسی کی صورت میں مردار کھانے کی اجازت ہے۔ ہاں شرط یہ ہے کہ سفر معصیت کا نہ ہو۔ امام شافعیؒ اور امام احمدؒ وغیرہ ائمہ کا یہی قول ہے۔ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا کہ میں تجارت کے سلسلے میں دریائی سفر کرتا ہوں۔ تو آپ ﷺ نے انہیں دو رکعت پڑھنے کا حکم دیا۔ یہ حدیث مرسل ہے۔ بعض لوگوں کا مذہب ہے کہ ہر سفر میں نماز کو قصر کرنا چاہئے۔ سفر خواہ مباح ہو خواہ ممنوع ہو۔ یہاں تک کہ اگر کوئی ڈاکہ ڈالنے کے لئے اور مسافروں کو ستانے کے لئے نکلا ہو اسے بھی نماز قصر کرنے کی اجازت ہے۔ امام ابوحنیفہؒ ثوری اور داؤد کا یہی قول ہے کہ آیت عام ہے۔ لیکن یہ قول جمہور کے قول کے خلاف ہے۔ کفار سے ڈر کی جو شرط لگائی ہے یہ باعتبار اکثریت کے ہے۔ آیت کے نازل ہونے کے وقت چونکہ عموماً یہی حال تھا۔ اس لئے آیت میں بھی اسے بیان کر دیا گیا۔ ہجرت کے بعد کے سفر مسلمانوں کے سب کے سب خوف والے ہی ہوتے تھے۔ قدم قدم پر دشمن کا خطرہ رہتا تھا بلکہ مسلمان سفر کے لئے نکل ہی نہ سکتے تھے بجز اس کے کہ یا تو جہاد کو جائیں یا خاص کسی لشکر کے ساتھ جائیں اور یہ قاعدہ ہے کہ جب منطوق باعتبار غالب کے آئے تو اس کا مفہوم معتبر نہیں ہوتا۔ جیسے اور آیت میں ہے اگر تمہاری باندیاں پاک دامن رہنا چاہیں تو بدکاری کے لئے مجبور نہ کرو۔ یا جیسے فرمایا: ان کی بیٹیاں جو تمہاری پرورش میں ہیں۔ جن عورتوں سے تم نے صحبت کی ہے پس جیسے کہ ان دونوں آیتوں میں قید کا بیان ہے لیکن اس کے ہونے پر ہی حکم کا دارومدار نہیں بلکہ بغیر اس کے بھی حکم وہی ہے یعنی لونڈیوں کو بدکاری کے لئے مجبور کرنا حرام ہے' گو وہ پاک دامنی چاہتی ہوں یا نہ چاہتی ہوں۔ اسی طرح اس عورت کی لڑکی حرام ہے جس سے نکاح ہو کر صحبت ہو گئی ہو۔ خواہ وہ اس کی پرورش میں ہو یا نہ ہو۔ حالانکہ دونوں جگہ قرآن میں یہ قید موجود ہے۔ پس جس طرح ان دونوں موقعوں کے بغیر ان کے

قیود کے بھی حکم یہی ہے۔ اسی طرح یہاں بھی گو خوف نہ ہو۔ تاہم صرف سفر کی وجہ سے نماز کو قصر کرنا جائز ہے۔ مسند احمد میں ہے کہ حضرت یعلی بن اُمیہ نے حضرت عمر فاروقؓ سے پوچھا کہ نماز کی تخفیف کا حکم تو خوف کی حالت میں ہے اور اب تو امن ہے؟ حضرت عمرؓ نے جواب دیا کہ یہی خیال مجھے ہوا تھا اور یہی سوال میں نے رسول اللہ ﷺ سے کیا تھا۔ تو آپ نے فرمایا: یہ اللہ تعالیٰ کا صدقہ ہے جو اس نے تمہیں دیا ہے' تم اس کے صدقے کو قبول کرو۔ ۹۰

مسلم اور سنن وغیرہ میں بھی یہ حدیث ہے بالکل صحیح روایت ہے۔ ابو حنظلہ خداءؒ نے حضرت عمرؓ سے سفر کی نماز کو پوچھا' تو آپ نے فرمایا: دو رکعتیں ہیں۔ انہوں نے کہا: قرآن میں تو خوف کے وقت دو رکعتیں ہیں اور اس وقت پوری طرح امن امان ہے۔ تو آپ نے فرمایا: یہی سنت ہے رسول اللہ ﷺ کی۔ (ابن ابی شیبہ) ایک اور شخص کے سوال پر حضرت عمرؓ نے فرمایا تھا کہ آسمان سے تو یہ رخصت اُتر چکی ہے۔ اب اگر چاہو تو اسے لوٹا دو۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں: مکہ اور مدینہ کے درمیان ہم نے باوجود امن کے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ دو دو رکعتیں پڑھیں۔ (نسائی وغیرہ) اور حدیث میں ہے کہ نبی کریم ﷺ مدینہ سے مکہ کی طرف چلے بجز خوف اللہ کے کسی دشمن کا خوف نہ تھا اور برابر دو رکعتیں ہی ادا فرماتے رہے۔ بخاری کی حدیث میں ہے کہ واپسی میں بھی یہی دو رکعتیں آپ پڑھتے رہے اور مکے میں اس سفر میں آپ نے دس روزہ قیام کیا تھا۔ مسند احمد میں حضرت حارثہؓ سے روایت ہے کہ میں نے نبی ﷺ کے ساتھ منیٰ میں ظہر کی اور عصر کی نماز دو رکعتیں پڑھی ہیں۔ لیکن حضرت عثمانؓ اب اپنی خلافت کے آخری زمانہ میں پوری پڑھنے لگے ہیں۔ بخاری کی اور روایت میں ہے کہ جب حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے حضرت عثمانؓ کی چار رکعتوں کا ذکر آیا تو آپ نے اِنَّا لِلّٰہِ الخ پڑھ کر فرمایا: میں نے تو حضور ﷺ کے ساتھ بھی منیٰ میں دو رکعتیں پڑھی ہیں اور صدیق اکبرؓ کے ساتھ بھی اور عمرؓ کے ساتھ بھی۔ کاش کہ بجائے ان چار رکعتوں کے میرے حصے میں دو ہی مقبول رکعتیں آتیں۔ پس یہ حدیثیں صاف دلیل ہیں اس بات کی کہ سفر کی دو رکعتوں کے لئے خوف کا ہونا شرط نہیں۔ بلکہ نہایت امن واطمینان میں دو ہی ادا کرسکتا ہے۔ اسی لئے علما کرام نے فرمایا ہے کہ یہاں کیفیت میں یعنی قرأت قومہ رکوع سجود وغیرہ میں قصر اور کمی مراد ہے نہ کہ کمیت میں یعنی تعداد رکعات میں تخفیف کرنا۔ ضحاکؒ، مجاہدؒ اور سدیؒ کا یہی قول ہے جیسے کہ آرہا ہے۔ اس کی ایک دلیل امام مالک کی روایت کردہ یہ حدیث بھی ہے کہ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں: نماز دو رکعتیں ہی سفر حضر میں فرض کی گئی تھی۔ پھر سفر میں تو دو ہی رکعتیں رہیں اور اقامت کی حالت میں دو اور بڑھا دیں۔ پس علما کی یہ جماعت کہتی ہے کہ اصل نماز دو رکعتیں تھیں تو پھر اس آیت میں قصر سے مراد کمیت' یعنی رکعتوں کی تعداد میں کمی کیسے ہوسکتی ہے؟

اس قول کی بہت بڑی تائید صراحۃً اس حدیث سے بھی ہوتی ہے۔ جو مسند احمد میں حضرت عمرؓ کی روایت سے ہے کہ بزبان نبی ﷺ سفر کی دو رکعتیں ہیں اور ضحی کی نماز بھی دو رکعت ہے اور عید الفطر کی نماز بھی دو رکعت ہے اور جمعہ کی بھی دو رکعت ہے۔ یہی پوری نماز ہے قصر والی نہیں۔ یہ حدیث نسائی' ابن ماجہ اور صحیح ابن حبان میں بھی ہے۔ اس کی سند بشرط مسلم ہے۔ اس کے راوی ابن ابی لیلیٰ کا حضرت عمرؓ سے سننا ثابت ہے۔ جیسے کہ امام مسلم نے اپنے صحیح کے مقدمہ میں لکھا ہے اور خود اس روایت میں اور اس کے سوا بھی صراحۃً موجود ہے اور یہی ٹھیک بھی ہے ان شاء اللہ۔ گو بعض محدثین اس کے سننے کے قائل نہیں۔ لیکن اسے مانتے ہوئے بھی اس سند میں نقصان نہیں آتا۔ کیونکہ بعض طرق میں ابن ابی لیلیٰ کا ایک ثقہ سے اور ان کا حضرت عمرؓ سے سننا روایت ہے اور ابن ماجہ میں ان کا کعب بن عجرہ سے روایت کرنا اور ان کا حضرت عمرؓ سے روایت کرنا بھی منقول ہے۔ فاللہ اعلم

مسلم وغیرہ میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے نبی حضرت محمد ﷺ کی زبانی نماز اقامت کی حالت میں چار رکعت فرض کی ہے اور سفر میں دو رکعت اور خوف میں دو رکعت۔ پس جیسے کہ حضر میں اس سے پہلے اور اس کے پیچھے نماز پڑھتے تھے یا پڑھی جاتی تھی۔ اسی طرح سفر میں بھی اور اس روایت میں اور حضرت عائشہؓ والی روایت میں جو اوپر گزری کہ حضر میں اللہ تعالیٰ نے دو رکعتیں ہی فرض کی تھیں' کچھ منافات نہیں۔ اس لئے کہ اصل دو ہی تھیں۔ بعد میں دو اور بڑھا دیں گئیں۔ پھر حضر کی چار رکعتیں ہو گئیں۔ تو اب کہہ سکتے ہیں کہ اقامت کی حالت میں فرض چار رکعتیں ہیں۔ جیسے کہ ابن عباسؓ کی اس روایت میں ہے۔ واللہ اعلم۔ الغرض یہ دونوں روایتیں اسے ثابت کرتی ہیں کہ سفر میں دو رکعت نماز ہے اور وہی پوری نماز ہے کمی والی نہیں اور یہی حضرت عمر ﷺ والی روایت سے ثابت ہو چکا ہے تو مراد اس میں قصر کیفیت ہے جیسے کہ صلوٰۃ خوف میں۔ اسی لئے فرمایا ہے: اگر تم ڈرو اس بات سے کہ کافر تمہیں فتنے میں ڈال دیں گے اور اس کے بعد فرمایا جب تو ان میں ہو اور نماز پڑھا تو' الخ۔ پھر قصر کا مقصود' صفت اور کیفیت بھی بیان فرما دی۔

امام المحدثین حضرت امام بخاریؒ نے کتاب صلوٰۃ خوف اسی آیت وَاِذَا ضَرَبْتُمْ سے مُّهِيْنًا تک لکھ کر شروع کی ہے۔ ضحاکؒ اس کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ یہ لڑائی کا وقت ہے۔ انسان اپنی سواری پر نماز دو تکبیریں پڑھ لے۔ اس کا منہ جس طرف بھی ہو اسی طرف ہی۔ سدیؒ فرماتے ہیں کہ سفر میں جب تو نے دو رکعتیں پڑھیں تو وہ قصر کی پوری مقدار ہے۔ ہاں جب کافروں کی فتنہ انگیزی کا خوف ہو تو ایک ہی رکعت قصر ہے اور یہ بجز ایسے خوف کے وقت کے حلال نہیں۔ مجاہد فرماتے ہیں: اس آیت سے مراد وہ دن ہے جبکہ حضور ﷺ مع صحابہؓ کے عسفان میں تھے اور مشرک ضجنان میں تھے۔ ایک دوسرے سے برسرپیکار بالکل تیار' ادھر ظہر کی نماز کا وقت آ گیا۔ حضور ﷺ نے تمام صحابہؓ کے ساتھ حسب معمول چار رکعتیں پوری ادا کیں۔ ادھر مشرکین نے سامان واسباب ٹوٹ لینے کا ارادہ کیا۔ ابن جریر اسے مجاہدؒ' سدیؒ' جابرؓ اور ابن عمرؓ سے روایت کرتے ہیں اور اسی کو اختیار کرتے ہیں اور اسی کو کہتے ہیں کہ یہی ٹھیک ہے۔ حضرت خالد بن اُسید' حضرت عبداللہ بن عمر سے کہتے ہیں: صلوٰۃ خوف کے قصر کا حکم تو ہم کتاب اللہ میں پاتے ہیں' لیکن صلوٰۃ مسافر کے قصر کا حکم کتاب اللہ میں نہیں ملتا۔ تو حضرت عمرؓ جواب دیتے ہیں ہم نے اپنے نبی ﷺ کو سفر میں نماز کو قصر کرتے ہوئے پایا اور ہم نے بھی اس پر عمل کیا۔ خیال فرمایئے کہ اس میں قصر کا اطلاق خوف پر کیا اور آیت سے مراد بھی صلوٰۃ خوف لی اور صلوٰۃ مسافر کو اس میں شامل نہیں کیا اور حضرت ابن عمرؓ نے بھی اس اقرار کیا۔ اس آیت میں مسافرت کی نماز کی قصر بیان نہیں فرمایا بلکہ اس کے لئے فعل رسول (ﷺ) کو سند بتایا۔ اس سے زیادہ صراحت والی روایت ابن جریرؒ کی ہے کہ حضرت سماک آپ سے صلوٰۃ سفر کا مسئلہ پوچھتے ہیں۔ آپ فرماتے ہیں سفر کی نماز دو رکعت ہے اور یہی دو رکعت سفر کی پوری نماز ہے قصر نہیں۔ قصر تو صلوٰۃ خوف میں ہے کہ امام ایک جماعت کو ایک رکعت پڑھاتا ہے۔ دوسری جماعت دشمن کے سامنے ہے۔ پھر یہ چلے گئے وہ آ گئے ایک رکعت امام نے انہیں پڑھائی تو امام کی دو رکعتیں ہوئیں اور ان دونوں جماعتوں کی ایک ایک رکعت ہوئی۔

وَاِذَا كُنْتَ فِيْهِمْ فَاَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلٰوةَ فَلْتَقُمْ طَآئِفَةٌ مِّنْهُمْ مَّعَكَ وَلْيَاْخُذُوْٓا اَسْلِحَتَهُمْ فَاِذَا سَجَدُوْا فَلْيَكُوْنُوْا مِنْ وَّرَآئِكُمْ وَلْتَاْتِ

طَآئِفَةٌ اُخْرٰی لَمْ یُصَلُّوْا فَلْیُصَلُّوْا مَعَكَ وَلْیَاْخُذُوْا حِذْرَهُمْ وَ اَسْلِحَتَهُمْ ۚ وَدَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا لَوْ تَغْفُلُوْنَ عَنْ اَسْلِحَتِكُمْ وَ اَمْتِعَتِكُمْ فَیَمِیْلُوْنَ عَلَیْكُمْ مَّیْلَةً وَّاحِدَةً ؕ وَلَا جُنَاحَ عَلَیْكُمْ اِنْ كَانَ بِكُمْ اَذًی مِّنْ مَّطَرٍ اَوْ كُنْتُمْ مَّرْضٰۤی اَنْ تَضَعُوْۤا اَسْلِحَتَكُمْ ۚ وَ خُذُوْا حِذْرَكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ اَعَدَّ لِلْكٰفِرِیْنَ عَذَابًا مُّهِیْنًا ﴿۱۰۲﴾

اور جب آپ ان میں تشریف رکھتے ہوں پھر آپ ان کو نماز پڑھانا چاہیں تو یوں چاہئے کہ ان میں سے ایک گروہ تو آپ کے ساتھ کھڑا ہو جائے اور وہ لوگ ہتھیار لے لیں پھر جب یہ لوگ سجدہ کر چکیں تو یہ لوگ تمہارے پیچھے ہو جائیں اور دوسرا گروہ جنہوں نے ابھی نماز نہیں پڑھی آ جائے اور آپ کے ساتھ نماز پڑھ لیں اور یہ لوگ بھی اپنے بچاؤ کا سامان اور ہتھیار لے لیں۔ کافر لوگ یوں چاہتے ہیں کہ اگر تم اپنے ہتھیاروں اور سامانوں سے غافل ہو جاؤ تو تم پر یک بارگی حملہ کر بیٹھیں اور اگر تم بارش کی وجہ سے تکلیف میں ہو یا تم بیمار ہو تو تم کو اس میں کچھ گناہ نہیں کہ ہتھیار اتار رکھو اور اپنا بچاؤ لے لو۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے کافروں کے لئے سزا اہانت آمیز مہیا کر رکھی ہے۔ ○

نمازِ خوف ☆

نمازِ خوف کی کئی قسمیں ہیں اور مختلف صورتیں اور حالتیں ہیں۔ کبھی تو ایسا ہوتا ہے کہ دشمن قبلہ کی طرف ہے کبھی دشمن دوسری طرف ہوتا ہے۔ نماز بھی کبھی چار رکعت کی ہوتی ہے کبھی تین رکعت کی جیسے مغرب۔ کبھی دو جیسے فجر اور صلوٰۃ سفر۔ کبھی جماعت سے ادا کرنی ممکن ہوتی ہے کبھی لشکر اس طرح گتھے ہوئے ہوتے ہیں کہ نماز با جماعت ممکن نہیں ہوتی۔ بلکہ الگ الگ قبلہ کی طرف اور غیر قبلہ کی طرف پیدل اور سوار جس طرح بن پڑے بلکہ ایسا بھی ہوتا ہے اور جائز بھی ہے کہ دشمنوں کے حملوں سے بچتے جائیں ان پر برابر حملے کرتے جائیں نماز بھی ادا کرتے جائیں۔ ایسی حالت میں صرف ایک رکعت ہی نماز کا علما کا فتویٰ ہے اور دلیل حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی حدیث ہے جو اگلی آیت کی تفسیر میں بیان ہو چکی ہے۔ عطا، جابر، حسن، مجاہد، حکم، قتادہ، حماد، طاؤس، ضحاک، محمد بن نصر مروزی۔ ابن حزم کا یہی فتویٰ ہے۔ صبح کی نماز میں ایک ہی رکعت اس حالت میں رہ جاتی ہے۔ اسحاق بن راہویہ فرماتے ہیں: ایسی دوڑ دھوپ کے وقت ایک ہی رکعت کافی ہے۔ اشارے سے ادا کر لے۔ اگر اس قدر بھی قادر نہ ہو تو سجدہ کر لے۔ یہ بھی ذکر اللہ ہے اور لوگ کہتے ہیں صرف ایک تکبیر ہی کافی ہے۔ لیکن یہ ہو سکتا ہے کہ ایک سجدہ اور ایک تکبیر سے مراد بھی ایک رکعت ہو۔ جیسے کہ امام احمد بن حنبلؒ اور ان کے اصحاب کا فتویٰ ہے اور یہی قول ہے جابر بن عبداللہ، عبداللہ بن عمر، کعب وغیرہ صحابہ کا رضی اللہ عنہم اجمعین۔ سدیؒ بھی یہی فرماتے ہیں لیکن جن لوگوں کا قول صرف ایک تکبیر کا ہی بیان ہوا ہے۔ اس کے بیان کرنے والے اسے پوری رکعت پر محمول نہیں کرتے۔ بلکہ صرف تکبیر ہی جو ظاہر ہے مراد

لیتے ہیں جیسے کہ اسحاق بن راہویہ کا مذہب ہے۔ امیر عبدالوہاب بن بخت مکی کا بھی یہ خیال ہے۔ یہاں تک کہ وہ کہتے ہیں اگر اس پر بھی قدرت نہ ہو تو اسے اپنے نفس میں بھی نہ چھوڑے۔ یعنی نیت ہی کر لے۔ واللہ اعلم۔

بعض علمائے ایسے خاص اوقات نماز کو تاخیر کر کے پڑھنے کی رخصت بھی دی ہے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ نبی ﷺ نے جنگ خندق میں سورج ڈوب جانے کے بعد ظہر' عصر کی نماز پڑھی تھے۔ پھر مغرب' عشا کی۔ پھر اس کے بعد بنوقریظہ کی جنگ کے دن ان کی طرف جنہیں بھیجا تھا۔ انہیں تاکید بھی کر دی تھی کہ تم میں سے کوئی بھی بنوقریظہ تک پہنچنے سے پہلے عصر کی نماز نہ پڑھے۔ یہ جماعت ابھی راستے میں ہی تھی کہ عصر کا وقت آ گیا۔ تو بعض نے تو کہا: حضور ﷺ کا مقصد اس فرمان سے صرف یہی تھا کہ جلدی بنوقریظہ پہنچیں۔ نہ یہ کہ نماز کا وقت ہو جائے تو بھی نماز نہ پڑھیں۔ چنانچہ ان لوگوں نے تو راستے میں ہی بروقت نماز ادا کر لی۔ اوروں نے بنوقریظہ پہنچ کر نماز پڑھی۔ جب کہ سورج غروب ہو چکا تھا۔ جب اس بات کا ذکر حضور ﷺ سے ہوا تو آپ نے دونوں جماعتوں میں سے کسی ایک کو بھی ڈانٹ ڈپٹ نہ کی۔ ہم نے اس پر تفصیلی بحث اپنی کتاب السیرۃ میں کی ہے اور اسے ثابت کیا ہے کہ صحیح بات کے قریب وہ جماعت تھی جنہوں نے وقت پر نماز ادا کر لی۔ گو دوسری جماعت بھی معذور تھی۔ مقصود یہ ہے کہ اس جماعت نے جہاد کے موقع پر دشمنوں پر حملہ کرتے ہوئے اور ان کے قلعے کی طرف یورش جاری رکھتے ہوئے نماز کو مؤخر کر دیا دشمنوں کا یہ گروہ ملعون یہودیوں کا تھا جنہوں نے عہد توڑ دیا تھا اور صلح کے خلاف کیا تھا۔ لیکن جمہور کہتے ہیں صلوٰۃ خوف کے حکم کے بعد اب جہاد کے وقت نماز کو وقت سے ٹالنا جائز نہیں رہا۔

ابوسعید کی روایت سے بھی یہی ظاہر ہے جسے شافعیؒ نے روایت کیا ہے۔ لیکن صحیح بخاری کے باب **الصَّلٰوۃُ عِندَ مُنَاهَضَةِ الحُصُون** میں ہے کہ اوزاعیؒ فرماتے ہیں اگر فتح کی تیاری ہو اور نماز باجماعت کا امکان نہ ہو۔ تو ہر ہر شخص اپنی اپنی نماز اشارے سے ادا کر لے۔ یہ بھی نہ ہو سکتا ہو تو نماز میں تاخیر کر لیں۔ یہاں تک کہ جنگ ختم ہو' یا امن مل جائے' اس وقت دو رکعت پڑھ لیں اور اگر امن نہ ملے تو ایک رکعت ادا کر لیں۔ صرف تکبیر کہہ لینا کافی نہیں ایسا ہی ہو تو نماز کو دیر کر کے پڑھ لیں۔ جبکہ اطمینان نصیب ہو جائے۔ حضرت مکحول کا فرمان بھی یہی ہے۔ حضرت انس بن مالک فرماتے ہیں کہ میں تستر کے قلعہ کے محاصرے میں موجود تھا۔ صبح صادق کے وقت دست بدست جنگ شروع ہوئی اور سخت رن پڑا ہم لوگ نماز نہ پڑھ سکے اور برابر جہاد میں مشغول رہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے ہمیں قلعہ پر قابض کر دیا۔ اس وقت ہم نے دن چڑھے نماز پڑھی اس جنگ میں ہمارے امام حضرت ابوموسیٰ تھے۔ حضرت انس فرماتے ہیں: اس نماز کے بدلے ساری دنیا اور اس کی تمام چیزیں بھی مجھے خوش نہیں کر سکتیں۔ امام بخاریؒ اس کے بعد جنگِ خندق میں حضور ﷺ کا نمازوں کو تاخیر کرنا بیان کرتے ہیں۔ پھر بنوقریظہ والا واقعہ اور حضور ﷺ کا فرمان کہ تم بنوقریظہ پہنچنے سے پہلے عصر کی نماز نہ پڑھنا وارد کرتے ہیں۔ گویا امام ہمام حضرت امام بخاریؒ اسی کو پسند کرتے ہیں کہ ایسے اشد لڑائی اور پورے خطرے اور قریب فتح کے موقعہ اور پر اگر نماز مؤخر ہو جائے تو کوئی حرج نہیں۔ حضرت ابوموسیٰ والا فتح تستر کا واقعہ حضرت عمر کی خلافت کے زمانہ کا ہے اور یہ منقول نہیں کہ خلیفۃ المسلمین نے یا کسی اور صحابی نے اس پر اعتراض کیا ہو اور یہ لوگ بھی کہتے ہیں کہ خندق کے موقعہ پر بھی صلوٰۃ خوف کی آیتیں موجود تھیں۔ اس لئے کہ یہ آیتیں غزوۂ ذات الرقاع میں نازل ہوئی ہیں اور یہ غزوہ غزوۂ خندق سے پہلے کا ہے اور اس پر جمہور علمائے سیر و مغازی کا اتفاق ہے۔ محمد بن اسحاق' موسیٰ بن عقبہ واقدی' محمد بن سعد' کاتب واقدی اور خطیفہ بن خیاط وغیرہ اسی کے قائل ہیں۔ ہاں

امام بخاری وغیرہ کا قول ہے کہ غزوہ ذات الرقاع خندق کے بعد ہوا تھا۔ بسبب ابوموسیٰ کے اور یہ خود خیبر ہی میں آئے تھے واللہ اعلم۔

لیکن تعجب تو اس امر پر ہے کہ قاضی ابو یوسف مزنی ابراہیم بن اسمٰعیل بن علیہ کہتے ہیں کہ صلوٰۃ خوف منسوخ ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے غزوۂ خندق میں دیر کر کے نماز پڑھنے سے یہ قول بالکل ہی غریب ہے۔ اس لئے کہ غزوہ خندق کے بعد کی صلوٰۃ خوف کی حدیثیں ثابت ہیں۔ اس دن کی نماز کی تاخیر کو مکحول اور اوزاعی کے قول پر ہی محمول کرنا زیادہ قوی اور زیادہ درست ہے۔ یعنی ان کا وہ قول جو بحوالہ بخاری بیان ہوا کہ قرب فتح اور عدم امکان صلوٰۃ کے وقت تاخیر جائز ہے واللہ اعلم۔

آیت میں حکم ہوتا ہے کہ جب تو انہیں باجماعت نماز پڑھائے۔ پہلی حالت کے سوا ہے۔ اس وقت یعنی انتہائی خوف تو ایک ہی رکعت ہے اور وہ بھی الگ الگ پیدل سوار قبلے کی طرف منہ کر کے یا نہ کر کے جس طرح ممکن ہے جیسے کہ حدیث گزر چکی ہے۔ یہ حال امامت اور جماعت بیان ہو رہا ہے۔ جماعت کے واجب ہونے پر یہ آیت بہترین اور مضبوط دلیل ہے کہ جماعت کی وجہ سے بہت کمی کر دی گئی اگر جماعت واجب نہ ہوتی تو یہ صورت جائز نہ کی جاتی۔ بعضوں نے اس سے ایک اور استدلال بھی کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس میں چونکہ یہ لفظ ہیں کہ جب قرآن میں ہو اور یہ خطاب نبی کریم علیہ افضل الصلوۃ والتسلیم سے ہے تو معلوم ہوا کہ صلوٰۃِ خوف کا حکم آپ کے بعد منسوخ ہے۔

یہ استدلال تو ایسا ہی ہے جیسا استدلال ان لوگوں کا تھا جو زکوٰۃ خلفائے راشدین سے روک بیٹھے تھے اور کہتے تھے کہ قرآن میں ہے: ﴿خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً﴾ (التوبہ: ۱۰۳) یعنی تو ان لوگوں کے مالوں سے زکوٰۃ لے۔ جس سے تم انہیں پاک صاف کرے اور تو ان کے لئے رحمت کی دعا کر تیری دعا ان کے لئے باعث تسکین ہے۔ تو ہم آپ کے بعد کسی کو زکوٰۃ نہیں دیں گے بلکہ ہم آپ خود اپنے ہاتھ سے جسے چاہیں دیں گے اور صرف اسی کو دیں گے جس کی دعا ہمارے لئے سبب سکون بنے۔ لیکن یہ استدلال ان کا واہی تھا۔ اسی لئے صحابہؓ نے اسے رد کر دیا اور انہیں مجبور کر دیا کہ یہ زکوٰۃ ادا کر دیں۔ بلکہ ان میں جن لوگوں نے اسے روک لیا تھا۔ ان سے جنگ کی۔ آؤ ہم آیت کی صفت بیان کرنے سے پہلے اس کا شانِ نزول بیان کر دیں۔ ابن جریر میں ہے کہ بنو نجار کی ایک قوم نے حضور رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا کہ ہم برابر ادھر اُدھر آمد و رفت کیا کرتے ہیں تو ہم نماز کس طرح پڑھیں؟ تو اللہ عزوجل نے یہ قول نازل فرمایا: ﴿وَاِذَا ضَرَبْتُمْ فِي الْاَرْضِ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَقْصُرُوْا مِنَ الصَّلٰوةِ﴾ (النساء: ۱۰۱) پھر سال بھر تک کوئی وحی نہ آئی۔ پھر جب آپؐ ایک غزوے میں تھے ظہر کی نماز کے لئے کھڑے ہوئے۔ مشرکین کہنے لگے: افسوس کیا ہی اچھا موقعہ ہاتھ سے جاتا رہا۔ کاش کہ ان کی نماز کی حالت میں ہم یکبارگی اچانک حملہ ان پر کر دیتے' اس پر بعض مشرکین نے کہا: یہ موقعہ تو تمہیں پھر بھی ملے گا۔ اس کے تھوڑی دیر بعد ہی یہ دوسری نماز (یعنی نماز عصر) کے لئے کھڑے ہوں گے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے عصر کی نماز سے پہلے اور ظہر کی نماز کے بعد ﴿اِنْ خِفْتُمْ﴾ سے پوری دو آیتوں تک نازل فرما دیں اور کافرنا کام رہے۔ خود اللہ تعالیٰ و تقدس نے صلوٰۃ خوف کی تعلیم دی۔ گو یہ سیاق نہایت ہی غریب ہے۔ لیکن اسے مضبوط کرنے والی اور روایتیں بھی ہیں۔

حضرت ابو عیاش زرقیؓ فرماتے ہیں عسفان میں ہم نبی کریم ﷺ کے ساتھ تھے۔ خالد بن ولید اس وقت کفر کی حالت میں تھے اور مشرکین کے لشکر کے سردار تھے۔ یہ لوگ ہمارے سامنے پڑے تھے۔ یہ قبلہ رخ ظہر کی نماز جب ہم نے ادا کی تو

مشرکوں کے منہ میں پانی بھر آیا اور وہ کہنے لگے: افسوس ہم نے موقعہ ہاتھ سے کھو دیا۔ وقت تھا کہ یہ ادھر نماز میں مشغول تھے اور ہم ان پر دفعۃً دھاوا بول دیتے۔ پھر ان میں کے بعض جاننے والوں نے کہا: خیر کوئی بات نہیں اس کے بعد ان کی اور نماز کا وقت آ رہا ہے اور وہ نماز تو انہیں اپنے بال بچوں سے بھی زیادہ عزیز ہے۔ اس وقت سہی۔ پس ظہر عصر کے درمیان اللہ عزوجل نے حضرت جبریل علیہ السلام کو نازل فرمایا اور آیت: ﴿اِذَا كُنْتَ فِیْهِمْ﴾ اتاری۔ چنانچہ عصر کی نماز کے وقت ہمیں رسول اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا۔ ہم نے ہتھیار سجا لئے اور اپنی دو صفیں کر کے حضور ﷺ کے پیچھے کھڑے ہو گئے۔ قیام میں رکوع میں قومہ میں سب کے سب ساتھ رہے۔ جب آپ سجدے میں گئے تو دو صفوں میں پہلی صف آپ ﷺ کے ساتھ سجدے میں اور دوسری صف کھڑی کی کھڑی ان کی نگہبانی کرتی رہی۔ جب سجدوں سے فارغ ہو کر یہ لوگ کھڑے ہو گئی تو اب دوسری صف والے سجدے میں گئے۔ جب یہ دونوں سجدے کر چکے تو اب پہلی صف والے دوسری صف کی جگہ چلے گئے اور دوسری صف والے پہلی صف والوں کی جگہ آ گئے۔ پھر قیام رکوع اور قومہ سب نے حضور ﷺ کے ساتھ ہی ساتھ ادا کی اور جب آپ سجدے میں گئے تو صف اول آپ کے ساتھ سجدہ میں گئی اور دوسری صف والے کھڑے ہوئے پہرے دیتے رہے۔ جب یہ دونوں سجدوں سے فارغ ہو گئے اور التحیات میں بیٹھے۔ تب دوسری صف کے لوگوں نے سجدے کئے اور التحیات میں سب کے سب ساتھ مل گئے اور سلام بھی حضور اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سب نے ایک ساتھ پھیرا۔ صلوٰۃ خوف ایک بار تو آپ نے یہاں عسفان میں پڑھی اور دوسری مرتبہ بنو سلیم کی زمین میں۔ یہ حدیث مسند احمد ابو داؤد اور نسائی میں بھی ہے۔ اس کی اسناد صحیح ہے اور شاہد بھی بکثرت ہیں۔ بخاری میں بھی یہ روایت اختصار کے ساتھ ہے اور اس میں ہے باوجودیکہ سب لوگ نماز میں تھے لیکن ایک دوسرے کی چوکیداری کر رہے تھے۔

ابن جریر میں ہے کہ سلیمان بن قیس لشکری نے حضرت جابر بن عبداللہؓ سے پوچھا: نماز کے قصر کرنے کا حکم کب نازل ہوا؟ تو آپ نے فرمایا: قریشیوں کا ایک قافلہ شام سے آ رہا تھا۔ ہم اس کی طرف چلے۔ جب نخل میں پہنچے تو ایک شخص رسول اللہ ﷺ کے پاس پہنچ گیا اور کہنے لگا: کیا آپ مجھ سے ڈرتے نہیں؟ آپ نے فرمایا: نہیں۔ اس نے کہا: آپ کو مجھ سے کون بچا سکتا ہے؟ آپ نے فرمایا: اللہ مجھے تجھ سے بچائے گا۔ پھر تلوار کھینچ لی اور ڈرایا دھمکایا پھر کوچ کی منادی ہوئی اور آپ ہتھیار سجا کر چلے۔ پھر اذان ہوئی اور صحابہ دو حصوں میں تقسیم ہو گئے۔ ایک حصہ آپ کے ساتھ نماز ادا کر رہا تھا اور دوسرا حصہ پہرہ دے رہا تھا۔ جو آپ ﷺ کے متصل تھے وہ دو رکعتیں آپ ﷺ کے ساتھ پڑھ کر پیچھے ہٹ کر پیچھے والوں کی جگہ چلے گئے اور پیچھے والے اب آگے بڑھ آئے اور ان اگلوں کی جگہ کھڑے ہو گئے۔ انہیں بھی حضور ﷺ نے دو رکعتیں پڑھائیں۔ پھر سلام پھیر دیا۔ پس حضور ﷺ کی چار رکعتیں ہوئیں اور سب کی دو دو ہوئیں اور اللہ تعالیٰ نے نماز کی کمی کا اور ہتھیار لئے رہنے کا حکم فرمایا۔ مسند احمد کی اس حدیث میں ہے کہ جو شخص تلوار تانے رسول اللہ ﷺ پر حملہ آور ہوا تھا۔ یہ دشمن کے قبیلے کا تھا۔ اس کا نام غورث بن حارث تھا۔ جب آپ نے اللہ کا نام لیا تو اس کے ہاتھ سے تلوار چھوٹ گئی۔ آپ نے تلوار اپنے ہاتھ میں لے لی اور اس سے کہا' اب تو بتا کہ تجھے کون بچائے گا؟ تو وہ معافی مانگنے لگا کہ مجھ پر آپ رحم کیجئے۔ آپ نے فرمایا: کیا تو اللہ کے ایک ہونے کی اور میرے رسول ہونے کی شہادت دیتا ہے؟ اس نے کہا: یہ تو نہیں' ہاں میں اقرار کرتا ہوں کہ آپ سے لڑوں گا نہیں اور ان لوگوں کا ساتھ نہ دوں گا جو آپ سے برسرپیکار ہوں۔ آپ نے اسے معافی دے دی۔ جب اپنے والوں میں آیا تو کہنے لگا:

روئے زمین پر حضور ﷺ سے بہتر کوئی شخص نہیں اور روایت میں ہے کہ یزید فقیر نے حضرت جابرؓ سے پوچھا کہ سفر میں جو دو رکعتیں ہیں کیا یہ قصر کی ہیں؟ آپ نے فرمایا: یہ پوری نماز ہے۔ قصر تو بوقت جہاد ایک نماز ہے۔ پھر صلوٰۃ خوف کا اسی طرح ذکر کیا کہ اس میں یہ بھی ہے کہ آپ کے سلام کے ساتھ آپ کے پیچھے والوں نے اور ان لوگوں نے سلام پھیرا اور اس میں دونوں حصہ فوج کے ساتھ ایک ایک رکعت پڑھنے کا بیان ہے۔ بس سب کی ایک ایک رکعت ہوئی اور حضور ﷺ کی دو رکعتیں اور روایت میں ہے کہ ایک جماعت آپ کے پیچھے صف بستہ نماز میں تھی اور ایک جماعت دشمن کے مقابل تھی۔ پھر ایک رکعت کے بعد آپ کے پیچھے والے اگلوں کی جگہ آ گئے اور پیچھے والے آگے آ گئے۔ یہ حدیث بہت سی کتابوں میں بہت سی سندوں کے ساتھ حضرت سے مروی ہے۔ ایک اور حدیث جو براویت سالم عَنْ اَبِیْہ مروی ہے۔ اس میں یہ بھی ہے کہ پھر کھڑے ہو کر صحابہؓ نے ایک ایک رکعت اپنی اپنی ادا کر لی۔ اس حدیث کی بھی بہت سی سندیں اور بہت سے الفاظ ہیں۔ حافظ ابو بکر ابن مردویہ نے ان سب کو جمع کر دیا ہے اور اسی طرح ابن جریر نے بھی۔ ہم اسے کتاب احکام کبیر میں لکھنا چاہتے ہیں۔ ان شاء اللہ۔ خوف کی نماز میں ہتھیار لئے رہنے کا حکم بعض کے نزدیک تو بطور وجوب کے ہے۔ کیونکہ آیت کے ظاہری الفاظ یہی ہیں۔ امام شافعیؒ کا بھی ایک قول یہی ہے اور اسی کی تائید اس آیت کے پچھلے فقرے سے بھی ہوتی ہے کہ بارش یا بیماری کی وجہ سے ہتھیار اُتار رکھنے میں تم پر گناہ نہیں۔ اپنا بچاؤ ساتھ لیئے رہو۔ یعنی ایسے تیار رہو کہ وقت آتے ہی بے تکلف و بے تکلیف ہتھیار سے آراستہ ہو جاؤ۔ اللہ نے کافروں کے لئے اہانت والا عذاب تیار کر رکھا ہے۔

فَاِذَا قَضَيْتُمُ الصَّلٰوةَ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ قِيَامًا وَّ قُعُوْدًا وَّ عَلٰى جُنُوْبِكُمْ ۚ فَاِذَا اطْمَاْنَنْتُمْ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ ۚ اِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا ﴿۱۰۳﴾ وَلَا تَهِنُوْا فِي ابْتِغَآءِ الْقَوْمِ ؕ اِنْ تَكُوْنُوْا تَاْلَمُوْنَ فَاِنَّهُمْ يَاْلَمُوْنَ كَمَا تَاْلَمُوْنَ ۚ وَتَرْجُوْنَ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا يَرْجُوْنَ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۱۰۴﴾

ع ۱۵ ۱۲

پھر جب تم اس نماز کو ادا کر چکو تو اللہ تعالیٰ کی یاد میں لگ جاؤ کھڑے بھی اور بیٹھے بھی اور لیٹے بھی پھر جب تم مطمئن ہو جاؤ تو نماز قاعدہ کے موافق پڑھنے لگو۔ یقیناً نماز مسلمانوں پر فرض ہے اور وقت کے ساتھ محدود ہے اور ہمت مت ہارو اس مخالف قوم کے تعاقب کرنے میں۔ اگر تم الم رسیدہ ہو تو وہ بھی تو الم رسیدہ ہیں جیسے تم الم رسیدہ ہو اور تم اللہ تعالیٰ سے ایسی ایسی چیزوں کی امید رکھتے ہو کہ وہ لوگ امید نہیں رکھتے اور اللہ تعالیٰ بڑے علم والے ہیں بڑے حکمت والے ہیں۔ ○

ذکر اللہ کی اہمیت اور اس کی ترغیب ☆

جناب باری عزاسمہ اس آیت میں حکم دیتا ہے کہ نماز خوف کے بعد اللہ کا ذکر بکثرت کیا کرو۔ گو ذکر اللہ کا حکم اور اس کی ترغیب و تاکید اور نمازوں کے بعد بلکہ ہر وقت ہی ہے لیکن یہاں خصوصیت سے اس لئے بیان فرمایا کہ یہاں بہت بڑی رخصت عنایت فرمائی ہے۔ نماز میں تخفیف کر دی۔ پھر حالت نماز میں اِدھر اُدھر ہٹنا' جانا آنا مصلحت کے مطابق جائز رکھا۔ جیسے حرمت والے مہینوں کے متعلق فرمایا: ان میں اپنی جانوں پر ظلم نہ کرو گو اور اوقات میں بھی ظلم ممنوع ہے۔ لیکن ان پاک مہینوں میں سے سے بچاؤ کی مزید تاکید کی تو فرمان ہوتا ہے کہ اپنی ہر حالت میں خدا کا ذکر کرتے رہو اور جب اطمینان حاصل ہو جائے' ڈر خوف نہ رہے تو باقاعدہ خشوع خضوع سے ارکان نماز کی پابندی سے بمطابق شرع بجالاؤ۔ یہ نماز پڑھنا وقت مقررہ میں من جانب اللہ فرض عین ہے۔ جس طرح حج کا وقت معین ہے اسی طرح نماز کا وقت بھی مقرر ہے۔ ایک وقت کے بعد دوسرا پھر دوسرے کے بعد تیسرا۔ پھر فرماتا ہے: دشمنوں کی تلاش میں کم ہمتی نہ کرو' چستی اور چالاکی سے گھات کی جگہ بیٹھ کر ان کی خبر لو۔ اگر قتل و زخم و نقصان تمہیں پہنچتا ہے تو انہیں نہیں پہنچتا؟ اسی مضمون کو ان الفاظ میں بھی ادا کیا گیا ہے: ﴿اِنْ یَّمْسَسْكُمْ قَرْحٌ﴾ (آل عمران: ۱۴۰) پس مصیبت اور تکلیف کے پہنچنے میں تو تم اور وہ برابر ہو۔ لیکن ہاں فرق اور بہت بڑا فرق یہ ہے کہ تمہیں ذات اللہ سے وہ امیدیں اور وہ آسرے ہیں جو انہیں نہیں۔ انہیں اجر و ثواب بھی ملے گا' تمہاری نصرت و تائید بھی ہو گی۔ جیسے کہ خود اللہ تعالیٰ نے خبر دی ہے اور وعدہ کیا ہے۔ نہ اس کی خبر جھوٹی نہ اس کا وعدہ ٹلنے والا۔ پس تمہیں بہ نسبت ان کے بہت تگ و دو چاہئے۔ تمہارے دلوں میں جہاد کا ولولہ ہونا چاہئے۔ تمہیں اس کی رغبت کامل ہونی چاہئے۔ تمہارے دلوں میں اللہ کے کلمے کو قائم کرنے' مضبوط کرنے' پھیلانے اور بلند کرنے کی تڑپ ہر وقت موجود رہنی چاہئے۔ اللہ تعالیٰ جو کچھ مقدر کرتا ہے' جو فیصلہ کرتا ہے جو حکم جاری کرتا ہے جو شرع مقرر کرتا ہے' جو کام کرتا ہے سب میں پوری خبر والا۔ صحیح اور سچے علم والا ساتھ حکمت والا۔ ہر حال میں ہر وقت سزاوار تعریف و حمد وہی ہے۔

اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰىكَ اللّٰهُ ؕ وَلَا تَكُنْ لِّلْخَآئِنِيْنَ خَصِيْمًا ﴿۱۰۵﴾ وَّاسْتَغْفِرِ اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۱۰۶﴾ وَلَا تُجَادِلْ عَنِ الَّذِيْنَ يَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ خَوَّانًا اَثِيْمًا ﴿۱۰۷﴾ يَّسْتَخْفُوْنَ مِنَ النَّاسِ وَلَا يَسْتَخْفُوْنَ مِنَ اللّٰهِ وَهُوَ مَعَهُمْ اِذْ يُبَيِّتُوْنَ مَا لَا يَرْضٰى مِنَ الْقَوْلِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطًا ﴿۱۰۸﴾ هٰٓاَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ جٰدَلْتُمْ

عَنْهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا فَمَنْ يُّجَادِلُ اللّٰهَ عَنْهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَمْ مَّنْ يَّكُوْنُ عَلَيْهِمْ وَكِيْلًا ﴿۱۰۹﴾

بے شک ہم نے آپ کے ساتھ یہ نوشتہ بھیجا ہے واقع کے موافق تا کہ آپ ان لوگوں کے درمیان اس کے موافق فیصلہ کریں جو کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو بتلا دیا ہے اور آپ ان خائنوں کی طرفداری کی بات مت کیجئے اور آپ استغفار فرمائیے بلاشبہ اللہ تعالیٰ بڑے مغفرت والے بڑے رحمت والے ہیں اور آپ ان لوگوں کی طرف سے کوئی جواب دہی کی بات نہ کیجئے جو کہ اپنا ہی نقصان کر رہے ہیں۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ ایسے شخص کو نہیں چاہتے جو بڑا خیانت کرنے والا بڑا گناہ کرنے والا ہو جن لوگوں کی یہ کیفیت ہے کہ آدمیوں سے تو چھپاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے نہیں چھپاتے۔ حالانکہ وہ اس وقت ان کے پاس ہے جبکہ وہ خلاف مرضی الٰہی کے گفتگو کے متعلق تدبیریں کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ان کے سب اعمال کو اپنے احاطہ میں لئے ہوئے ہیں۔ ہاں تم ایسے ہو کہ تم نے دینوی زندگی میں تو ان کی طرف سے جواب دہی کی باتیں کر لیں۔ سو اللہ تعالیٰ کے رو برو قیامت کے روز ان کی طرف سے کون جوابدہی کرے گا یا وہ کون شخص ہو گا جو ان کا کام بنانے والا ہو گا۔ ○

راست بازی ☆

اللہ تعالیٰ اپنے نبی اکرم ﷺ سے فرماتا ہے کہ یہ قرآن کریم جو آپ پر اللہ تعالیٰ نے اتارا ہے وہ سراسر اور یکسر حق ہے۔ اس کی خبریں بھی حق۔ اس کے فرمان بھی حق۔ پھر فرماتا ہے تا کہ تم لوگوں کے درمیان وہ انصاف کرو جو اللہ تمہیں سمجھائے۔ بعض علمائے اصول نے اس سے استدلال کیا ہے کہ نبی ﷺ کو اجتہاد کرنے کا اختیار تھا۔ اس کی دلیل وہ حدیث ہے جو بخاری ومسلم میں ہے کہ حضور ﷺ نے اپنے دروازے پر جھگڑنے والوں کی آواز سنی تو آپ باہر آئے اور فرمانے لگے: سنو! میں ایک انسان ہوں جو سنتا ہوں اس کے مطابق فیصلہ کرتا ہوں۔ بہت ممکن ہے کہ ایک شخص بڑا صاحب لسان اور فصیح و بلیغ ہو اور میں اس کی باتوں کو صحیح جان کر اس کے حق میں فیصلہ دے دوں۔ پس جس کے حق میں میں فیصلہ کر دوں ورنی الواقع وہ حقدار نہ ہو تو وہ سمجھ لے کہ وہ اس کے لئے جہنم کا ٹکڑا ہے۔ اب اسے اختیار ہے کہ لے لے یا چھوڑ دے۔ مسند احمد میں ہے کہ دو انصاری ایک ورثے کے بارے میں حضور ﷺ کے پاس اپنا قضیہ لائے۔ واقعہ کو زمانہ گزر چکا ہو شاید گواہ کوئی نہ تھا۔ تو اس وقت آپ ﷺ نے وہی حدیث بیان فرمائی اور فرمایا کہ وہ اس میرے فیصلے کی بنا پر اپنے بھائی کا حق نہ لے لے۔ اگر ایسا کرے گا تو قیامت کے دن اپنی گردن میں جہنم کی آگ لٹکا کر آئے گا۔ اب وہ دونوں بزرگ رونے لگے اور ہر ایک کہنے لگا۔ میں اپنا حق بھی اپنے بھائی کو دے رہا ہوں۔ حضور ﷺ نے فرمایا: اب تو ایسا کر لو کہ جاؤ اپنے طور پر جہاں تک تم سے ہو سکے ٹھیک ٹھیک حصے تقسیم کر لو۔ پھر قرعہ ڈال کر حصہ لے لو اور ہر ایک دوسرے کو اپنا رہا سہا غلطی کا حق معاف کر دے۔ ابوداؤد میں بھی یہ حدیث ہے اور اس میں یہ الفاظ ہیں کہ میں تمہارے درمیان اپنی سمجھ سے ان امور میں فیصلہ کرتا ہوں جن کوئی وحی نازل شدہ نہیں ہوتی۔

ابن مردویہ میں ہے کہ انصار کا ایک گروہ ایک جہاد میں حضور ﷺ کے ساتھ تھا۔ وہاں ایک شخص کی چادر کسی نے چرا لی اور اس کا گمان اس چوری کا طعمہ بن اُبیرق کی طرف تھا۔ حضور ﷺ کی خدمت میں پیش ہوا۔ چور نے اس چادر کو ایک شخص کے

گھر میں اس کی بے خبری میں ڈال دیا اور اپنے کنبے قبیلے والوں سے کہا: میں نے چادر فلاں کے گھر میں ڈال دی ہے۔ تم رات کو حضور ﷺ کے پاس جاؤ اور آپ سے ذکر کرو کہ ہمارا ساتھی تو چور نہیں چور فلاں ہے اور ہم نے پتہ لگا لیا ہے کہ چادر بھی اس کے گھر میں موجود ہے۔ پس آپ ﷺ ہمارے ساتھی کی تمام لوگوں کے روبرو بریت کر دیجئے اور اس کی حمایت کیجئے ورنہ ڈر ہے کہ کہیں وہ ہلاک نہ ہو جائے۔ آپ نے ایسا ہی کیا۔ اس پر یہ آیتیں اُتریں اور جو لوگ اپنے جھوٹ کو پوشیدہ کر کے حضور ﷺ کے پاس آئے تھے۔ ان کے بارے میں یَسْتَخْفُوْنَ سے دو آیتیں نازل ہوئیں پھر اللہ عزوجل نے فرمایا: جو بُرائی اور بدی کا کام کرے اس سے مراد بھی یہ لوگ ہیں اور چور کے اور اس کے حمایتیوں کے بارے میں فرمان اُترا کہ جو گناہ اور خطا کرے اور ناکردہ گناہ کے ذمہ الزام لگائے وہ بہتان باز اور کھلا گنہگار ہے لیکن یہ سیاق غریب ہے۔ بعض بزرگوں سے مروی ہے کہ یہ آیت بنواُبیرق کے چور کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔

یہ طویل قصہ ترمذی کی کتاب التفسیر میں بروایت حضرت قتادہؓ اس طرح ہے کہ ہمارے قبیلہ بنواُبیر میں کا ایک خاندان تھا جس میں بشر بشیر اور مبشر تھے۔ بشیر ایک منافق شخص تھا۔ اشعار میں رسول اللہ ﷺ کے صحابہ کی ہجو کرتا۔ پھر ان اشعار کو کسی اور کی طرف منسوب کر کے خوب مزے لے لے کر پڑھا کرتا تھا۔ اصحابؓ رسول ﷺ جانتے تھے کہ یہی خبیث ان شعروں کا بنانے والا ہے۔ یہ لوگ جاہلیت کے زمانہ سے فاقہ مست چلے آتے تھے۔ مدینے کے لوگوں کا اکثر کھانا جو اور کھجوریں تھیں۔ ہاں تونگر لوگ شام کے آئے ہوئے قافلے والوں سے میدہ خرید لیتے جسے وہ خود اپنے لئے مخصوص کر لیتے۔ باقی گھر والے عموماً جو اور کھجوریں ہی کھاتے۔ میرے چچا رفاعہ بن زید نے بھی شام کے آئے ہوئے قافلے سے ایک بوجھ (بورا) میدا خرید لیا اور اپنے بالا خانے میں اسے محفوظ کر دیا۔ جہاں ہتھیار زرہیں تلواریں وغیرہ بھی رکھی ہوئی تھیں۔ رات کو چوروں نے نیچے سے نقب لگا کر اناج غلہ بھی نکال لیا اور ہتھیار بھی اٹھا لئے گئے۔ صبح میرے چچا میرے پاس آئے اور سارا واقعہ بیان کیا۔ اب ہم تجسس کرنے لگے تو پتہ چلا کہ آج رات کو بنواُبیرق کے گھر میں آگ جل رہی تھی اور کچھ کھا پکا رہے تھے۔ غالباً وہ تمہارے ہاں سے چوری کر گئے ہیں۔ اس سے پہلے ہی جب اپنے گھرانے والوں سے پوچھ گچھ کر رہے تھے تو اس قبیلے کے لوگوں نے ہم سے کہا تھا۔ تمہارا چور لبید بن سہل ہے۔ ہم جانتے تھے کہ لبید کا یہ کام نہیں وہ ایک دیانتدار اور سچا مسلمان تھا۔ حضرت لبید کو یہ خبر ملی تو وہ آپے سے باہر ہو گئے۔ بنواُبیرق کے پاس آئے اور کہنے لگے: یا تو تم میری چوری ثابت کر دو۔ ورنہ میں تمہیں قتل کر دوں گا۔ ان لوگوں نے برأت کی اور معافی چاہ لی۔ وہ چلے گئے۔ ہم سب کے سب پوری تحقیقات کے بعد اسی نتیجہ پر پہنچے کہ چوری بنو اُبیرق نے کی ہے۔ میرے چچا نے مجھے کہا کہ جاؤ اور رسول اللہ ﷺ سے خبر تو کر دو۔ میں نے جا کر حضور ﷺ سے سارا واقعہ کہا اور یہ بھی کہا کہ آپ ﷺ ہمیں ہتھیار دلوائیے۔ غلہ کی واپسی کی ضرورت نہیں۔ حضور ﷺ نے مجھے اطمینان دلایا کہ اچھا میں اس کی تحقیق کروں گا۔ یہ خبر جب بنواُبیرق کو ہوئی تو انہوں نے اپنا ایک آدمی آپ ﷺ کے پاس بھیجا۔ جن کا نام اُسید بن عروہ تھا۔ انہوں نے آ کر کہا کہ یا رسول اللہ ﷺ یہ تو ظلم ہو رہا ہے۔ بنواُبیرق تو صلاحیت اور اسلام والے لوگ ہیں۔ انہیں قتادہ بن نعمان اور ان کے چچا چور بتلاتے ہیں اور بغیر کسی ثبوت اور دلیل کے چوری کا بدنما الزام ان پر رکھتے ہیں وغیرہ۔

پھر جب میں خدمت نبوی ﷺ میں پہنچا تو آپ ﷺ نے مجھ سے فرمایا: یہ تو تم بہت بُرا کرتے ہو کہ دیندار اور بھلے لوگوں پر چوری کا الزام لگاتے ہو۔ حالانکہ تمہارے پاس اس کا کوئی ثبوت نہیں ہوتا۔ میں چپ چاپ واپس چلا آیا اور دل میں

سخت پریشان اور پشیمان تھا۔ خیال آتا تھا کہ کاش میں اس مال سے چپ چپاتے دست بردار ہو جاتا اور آپ ﷺ سے اس کا ذکر ہی نہ کرتا تو اچھا تھا۔ اتنے میں میرے چچا آئے اور مجھ سے پوچھا: کہو کیا کیا؟ میں نے سارا واقعہ ان سے بیان کیا۔ جسے سن کر انہوں نے اَللّٰهُ الْمُسْتَعَانُ۔ اللہ ہی سے ہم مدد چاہتے ہیں۔ ان کا جانا تھا جو حضور ﷺ پر وحی میں یہ آیتیں اُتریں۔ پس خائنین سے مراد بنو اُبیرق ہیں۔ اپ کو استغفار کا حکم ہوا۔ اس فرمان سے جو آپ نے حضرت قتادہؓ کو فرمایا تھا۔ پھر ساتھ ہی فرما دیا گیا کہ اگر یہ لوگ استغفار کریں تو اللہ انہیں بخش دے گا۔ پھر فرمایا: ناکردہ گناہ کے ذمہ اپنا گناہ تھوپنا بدترین جرم ہے اَحۡوًا عَظِيْمًا تک۔ یعنی انہوں نے حضرت لبیدؓ کی نسبت کہا کہ چور یہ ہیں۔ جب یہ آیتیں اُتریں تو حضور ﷺ نے بنو اُبیرق سے ہمارے ہتھیار دلوائے۔ میں انہیں لے کر اپنے چچا کے گھر آیا۔ یہ بیچارے بڈھے تھے۔ آنکھوں سے کم نظر آتا تھا۔ مجھ سے فرمانے لگے: بیٹا جاؤ یہ سب ہتھیار اللہ کے نام خیرات کر دو۔ میں آج تک اپنے چچا کی نسبت قدرے بدگمان تھا کہ یہ دل سے اسلام میں پورے طور پر داخل نہیں ہوئے۔ لیکن اس واقعہ نے یہ بدگمانی میرے دل سے دور کر دی اور میں ان کے سچے اسلام کا قائل ہو گیا۔ بشیر یہ آیتیں سن کر مشرکین سے جا ملا اور سلافہ بنت سعد بن سمیہ کے ہاں جا کر اپنا قیام کیا۔ انہی کے بارے میں آیت: وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ سے بَعِيْدًا تک نازل ہوئیں اور حضرت حسانؓ نے اس کے اس فعل کی مذمت کی اور اس کی ہجو اپنے شعروں میں کی۔ ان اشعار کو سن کر اس کی عورت کو بڑی غیرت آئی اور بشیر کا سب اسباب اپنے سر پر رکھ کر ابطح میدان میں پھینک آئی اور کہا کہ تو کوئی بھلائی لے کر میرے پاس نہیں آیا بلکہ حسان کی ہجو کے اشعار لے کر آیا ہے۔ میں تجھے اپنے ہاں نہیں ٹھہراؤں گی۔ یہ روایت بہت سی کتابوں میں بہت سی سندوں سے مطول اور مختصر مروی ہے۔ ان منافقوں کی کم عقلی کا بیان ہو رہا ہے کہ وہ جو اپنی سیاکاریوں کو لوگوں سے چھپاتے پھرتے ہیں۔ بھلا اس سے کیا نتیجہ؟ اللہ تعالیٰ سے تو پوشیدہ نہیں رکھ سکتے۔ پھر انہیں دھمکایا جا رہا ہے کہ تمہارے پوشیدہ راز بھی اللہ سے چھپ نہیں سکتے۔ پھر فرماتا ہے کہ یہ تو ہو سکتا ہے کہ احکام کے وقت ہاں جن کی نظر صرف ظاہر پر ہوتی ہے تم کوئی کامیابی اپنی طاقت لسانی کی وجہ سے حاصل کر لو۔ لیکن اللہ جو ہر پوشیدہ اور ظاہر سے باخبر ہے اس سے تم اپنے کو نہیں چھپا سکتے۔ قیامت کے دن تمہارا کوئی حامی نہیں ہو گا۔ جو تمہارے جھوٹے دعوے کی تائید کر سکے۔ مطلب یہ ہے کہ اس دن تمہاری کچھ نہیں چلے گی۔

وَمَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا اَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهٗ ثُمَّ يَسْتَغْفِرِ اللّٰهَ يَجِدِ اللّٰهَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۱۱۰﴾ وَمَنْ يَّكْسِبْ اِثْمًا فَاِنَّمَا يَكْسِبُهٗ عَلٰى نَفْسِهٖ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۱۱۱﴾ وَمَنْ يَّكْسِبْ خَطِيْٓئَةً اَوْ اِثْمًا ثُمَّ يَرْمِ بِهٖ بَرِيْٓـــًٔا فَقَدِ احْتَمَلَ بُهْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِيْنًا ﴿۱۱۲﴾ ۧ وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ وَرَحْمَتُهٗ لَهَمَّتْ طَّاۗىِٕفَةٌ مِّنْهُمْ اَنْ يُّضِلُّوْكَ ۭ وَمَا يُضِلُّوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَھُمْ وَمَا يَضُرُّوْنَكَ

ع ۱۶ ۸ ۱۳

مِنۡ شَیۡءٍ ؕ وَ اَنۡزَلَ اللّٰہُ عَلَیۡکَ الۡکِتٰبَ وَ الۡحِکۡمَۃَ وَ عَلَّمَکَ مَا لَمۡ تَکُنۡ تَعۡلَمُ ؕ وَ کَانَ فَضۡلُ اللّٰہِ عَلَیۡکَ عَظِیۡمًا ﴿۱۱۳﴾

اور جو شخص کوئی بُرائی کرے یا اپنی جان کا ضرر کرے پھر اللہ تعالیٰ سے معافی چاہے تو اللہ تعالیٰ کو بڑی مغفرت والا بڑا رحمت والا پائے گا اور جو شخص کچھ گناہ کا کام کرتا ہے تو وہ فقط اپنی ذات پر اس کا اثر پہنچاتا ہے اور اللہ تعالیٰ بڑے علم والے اور حکمت والے ہیں اور جو شخص کوئی چھوٹا گناہ کرے یا بڑا گناہ پھر اس کی تہمت کسی بے گناہ پر لگائے سو اس نے تو بڑا بھاری بہتان اور صریح گناہ کیا' اپنے اوپر لادا اور اگر آپ پر اللہ کا فضل اور رحمت نہ ہوں تو ان لوگوں میں سے ایک گروہ نے تو آپ کو غلطی ہی میں ڈال دینے کا ارادہ کر لیا تھا اور غلطی میں نہیں ڈال سکتے لیکن اپنی جان کو اور آپ کو ذرہ برابر ضرر نہیں پہنچا سکتے اور اللہ تعالیٰ نے آپ پر کتاب اور علم کی باتیں نازل فرمائیں اور آپ کو وہ وہ باتیں بتلائیں ہیں جو آپ نہ جانتے تھے اور آپ پر اللہ تعالیٰ کا بڑا فضل ہے۔ ○

بے گناہوں پر تہمت تراشی جرم عظیم ہے ☆

اللہ تعالیٰ اپنے کرم اور اپنی مہربانی کو بیان فرماتا ہے کہ جس گناہ سے جو کوئی توبہ کرے اللہ تعالیٰ اس کی طرف مہربانی سے رجوع کرتا ہے۔ ہر وہ شخص جو ربّ کی طرف جھکے' رب اپنی مہربانی سے اور اپنے وسعت رحمت سے اسے ڈھانپ لیتا ہے اور اس کے صغیرہ اور کبیرہ گناہ کو بخش دیتا ہے گو وہ آسمان و زمین اور پہاڑوں سے بھی بڑے ہوں۔ بنو اسرائیل میں جب کوئی گناہ کرتا تو اس کے دروازہ پر قدرتی حروف میں اس کا کفارہ لکھا ہوا نظر آ جاتا۔ جو اسے ادا کرنا پڑتا اور انہیں یہ بھی حکم تھا کہ ان کے کپڑوں پر اگر پیشاب لگ جائے تو اتنا کپڑا اکتروا ڈالیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس اُمت پر آسانی کر دی پانی سے دھو لینا ہی کپڑے کی پاکی رکھی اور صرف توبہ سے گناہ معاف کر دیتا ہے۔ ایک عورت نے حضرت عبداللہ بن مغفلؓ سے سوال کیا کہ ایک عورت نے بدکاری کی' پھر جب بچہ ہوا تو اسے مار ڈالا۔ آپ نے فرمایا اس کی سزا جہنم ہے۔ وہ روتی ہوئی واپس چلی تو آپ نے اسے بلایا اور آیت: ﴿مَنۡ یَّظۡلِمۡ﴾ پڑھ کر سنائی تو اس نے اپنے آنسو پونچھ ڈالے اور واپس لوٹ گئی۔ حضور ﷺ فرماتے ہیں: جس مسلمان سے کوئی گناہ سرزد ہو جائے۔ پھر وہ وضو کر کے دو رکعت نماز ادا کر کے اللہ سے استغفار کرے۔ تو اللہ اس کے گناہ بخش دیتا ہے۔ پھر آپ نے یہ آیت اور آیت: ﴿وَالَّذِیۡنَ اِذَا فَعَلُوۡا فَاحِشَۃً﴾ (آل عمران: ۱۳۵) کی تلاوت کی۔ اس حدیث کا پورا بیان ہم نے مسند ابو بکر میں کر دیا ہے اور کچھ بیان سورہ آل عمران کی تفسیر میں بھی گزر رہا ہے

حضرت ابو داؤدؒ فرماتے ہیں: رسول اللہ ﷺ کی عادتِ مبارکہ تھی کہ مجلس میں سے اُٹھ کر اپنے کسی کام کے لئے بھی جاتے اور واپس تشریف لانے کا ارادہ بھی ہوتا تو جوتی یا کپڑا کچھ نہ کچھ چھوڑ جاتے۔ ایک مرتبہ آپ ﷺ اپنی جوتی چھوڑے ہوئے تھے اور ڈولچی پانی کی ساتھ لے کر چلے۔ میں بھی آپ کے پیچھے ہو لیا۔ آپ کچھ دور جا کر بغیر حاجت پوری کئے بغیر واپس آئے اور فرمانے لگے: میرے پاس میرے ربّ کی طرف سے ایک آنے والا آیا اور مجھے یہ پیغام دے گیا۔ پھر آپ ﷺ نے آیت: ﴿وَمَنۡ یَّعۡمَلۡ﴾ پڑھی اور فرمایا میں اپنے صحابہ کو یہ خوشخبری سنانے کے لئے راستے میں سے ہی لوٹ آیا ہوں۔ اس سے پہلے چونکہ آیت: ﴿مَنۡ یَّعۡمَلۡ سُوۡٓءًا یُّجۡزَ بِہٖ﴾ (النساء: ۱۲۳) یعنی ہر بُرائی کرنے والے کو اس کی بُرائی کا بدلہ

ملے گا' اُتر چکا تھا' اس لئے صحابہ مشقت میں تھے۔ میں نے کہا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اگر کسی نے زنا کیا ہو چوری کی ہو۔ پھر وہ استغفار کرے تو اسے بھی اللہ بخش دے گا؟ آپ نے فرمایا: ہاں۔ میں نے دوبارہ پوچھا: آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر یہی ہاں' میں نے سہ بارہ دریافت کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہاں ہاں' گو ابو درداء کی ناک خاک آلود ہو۔ پس حضرت ابو درداء جب یہ حدیث بیان کرتے اپنی ناک پر مار کر بتلاتے۔ اس کی اسناد ضعیف ہے اور یہ حدیث غریب ہے۔

پھر فرماتا ہے: گناہ کمانے والا اپنا ہی بُرا کرتا ہے۔ جیسے اور جگہ ہے کوئی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔ ایک دوسرے کو نفع نہ پہنچا سکے گا۔ ہر شخص اپنے کرتوت کا ذمہ دار ہے۔ کوئی نہ ہوگا جو بوجھ بٹائے۔ خدائی علم' خدائی حکمت' خدائی عدل' خدائی رحمت کے خلاف ہے کہ ایک کے گناہ پر دوسرا پکڑا جائے۔ پھر فرماتا ہے جو خود بُرا کام کرے کسی بے گناہ پر اس کا الزام تھوپ دے۔ جیسے بنو اُبیرق نے لبید کا نام لے دیا۔ جو واقعہ تفصیل وار اس سے اگلی آیت کی تفسیر میں بیان ہو چکا ہے۔ یا مراد زید بن سمین یہودی ہے۔ جیسے بعض اور مفسرین کا خیال ہے کہ اس چوری کی تہمت اس قبیلے نے اس بے گناہ کے ذمے لگائی تھی اور خود ہی خائن اور ظالم تھے۔ آیت گو شانِ نزول کے اعتبار سے خاص ہے لیکن حکم کے اعتبار سے عام ہے۔ جو ایسا کرے خدائی سزا کا مستحق ہے۔ اس کے بعد کی آیت وَلَوْلَا کا تعلق بھی اسی واقعہ سے ہے۔ یعنی لبید بن عروہ اور ان کے ساتھیوں نے بنو اُبیرق کے چوروں کی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے برأت کر کے ان کی پاک دامنی کا اظہار کر کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اصلیت سے ہٹانے کا سارا کام کر لیا تھا۔ لیکن اللہ نے جو آپ کی عصمت کا حقیقی نگہبان ہے۔ آپ کو اس خطرناک موقعہ پر خائنوں کی طرفداری سے بچا لیا اور اصلی واقعہ صاف کر دیا۔ کتاب سے مراد قرآن اور حکمت سے مراد سنت ہے۔ نزولِ وحی سے پہلے آپ جو نہ جانتے تھے ان کا علم پروردگار نے آپ کو بذریعہ وحی کر دیا۔ جیسے اور آیت میں ہے: ﴿وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا﴾ (الشوری ۵۲) سے پوری سورت تک اور آیت میں ہے: ﴿وَمَا كُنْتَ تَرْجُوْٓا اَنْ يُّلْقٰٓى اِلَيْكَ الْكِتٰبُ﴾ (القصص ۸۶) اسی لئے یہاں بھی فرمایا: یہ سب باتیں اللہ کا فضل ہیں جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے شامل حال ہیں۔

لَا خَيْرَ فِيْ كَثِيْرٍ مِّنْ نَّجْوٰىهُمْ اِلَّا مَنْ اَمَرَ بِصَدَقَةٍ اَوْ مَعْرُوْفٍ اَوْ اِصْلَاحٍۢ بَيْنَ النَّاسِ ؕ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۱۱۴﴾ وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ ؕ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا ﴿۱۱۵﴾ ع

عام لوگوں کی اکثر سرگوشیوں میں خیر نہیں ہوتی۔ ہاں مگر جو لوگ ایسے ہیں کہ خیرات کی اور کسی نیک کام کی یا لوگوں میں باہم اصلاح کر دینے کی ترغیب دیتے ہیں اور جو شخص یہ کام کرے گا حق تعالیٰ کی رضائی جوئی کے واسطے سو ہم

اس کو عنقریب اجر عظیم عطا فرمائیں گے اور جو شخص رسول کی مخالفت کرے گا بعد اس کے اس کو امر حق ظاہر ہو چکا تھا اور مسلمانوں کا رستہ چھوڑ کر دوسرے رستہ ہو لیا تو ہم اس کو جو وہ کچھ کرتا ہے کرنے دیں گے اور اس کو جہنم میں داخل کریں گے اور وہ بُری جگہ ہے جانے کی۔ ○

زبان سے خیر ہی نکالنا چاہئے ☆

لوگوں کے اکثر کلام بے خیر ہوتے ہیں۔ سوائے ان کے جن کی باتیں خیرات کرنے کی' اچھائی کی' لوگوں میں میل ملاپ کی ہوں۔ حضرت سفیان ثوری کی عیادت کے لئے لوگ جاتے ہیں۔ ان میں سعید بن حسان بھی ہوتے ہیں' تو آپ فرماتے ہیں: سعید تم نے ام صالح کی روایت سے جو حدیث بیان کی تھی آج اسے پھر سناؤ۔ آپ سند بیان کر کے فرماتے ہیں' حضور ﷺ نے فرمایا: انسان کی تمام باتیں اس پر وبال ہی ہیں ذکر اللہ کے اور اچھے کاموں کے بتلانے کے اور بُرے کاموں سے روکنے کے۔ حضرت سفیان نے کہا: یہی مضمون اس آیت میں ہے۔ یہی مضمون آیت: ﴿يَوْمَ يَقُوْمُ الرُّوْحُ﴾ (النبا: ۳۸) میں ہے۔ یہی مضمون سورہ والعصر میں ہے۔ مسند احمد میں فرمان رسول ہے کہ لوگوں میں میل ملاپ اور اصلاح کرنے کے لئے جو بھی بات کہے یا اِدھر سے اُدھر کوئی بات کرے وہ جھوٹوں میں داخل نہیں۔ حضرت ام کلثوم بنت عقبہ فرماتی ہیں میں نے آپ کو ایسی باتوں کی تین موقعوں پر اجازت دیتے ہوئے سنا ہے۔ جہاد میں لوگوں کے درمیان اصلاح کرانے میں اور میاں بیوی کی باتوں میں دونوں کی اصلاح کے واسطے' یہ مائی صاحبہ ہجرت کرنے والیوں اور بیعت کرنے والیوں میں سے ہیں اور حدیث میں ہے' کیا میں تمہیں ایک ایسا عمل بتاؤں جو روزے نماز اور صدقہ سے بھی افضل ہے۔ لوگوں نے خواہش کی تو آپ نے فرمایا وہ آپس میں اصلاح کرانا ہے۔ فرماتے ہیں اور آپس کا فساد نیکیوں کو مونڈ ڈالتا ہے۔ (ابوداؤد وغیرہ) بزار میں ہے حضور ﷺ نے حضرت ابوایوب سے فرمایا: آؤ میں تمہیں ایک تجارت بتاؤں۔ لوگ جب لڑ جھگڑ رہے ہوں تو ان میں مصالحت کرادے جب ایک دوسرے سے کھچ گئے ہوں تو انہیں ملا دے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ایسی بھلی باتیں رب کی رضا مندی کے لئے خلوص اور نیک نیتی سے جو کرے اور وہ اجر عظیم پائے گا۔ جو شخص غیر شرعی طرق پر چلے۔ شرع ایک طرف ہو اور اس کی راہ ایک طرف ہو۔ فرمان رسول کچھ ہو اور اس کا منتہائے نظر اور ہو حالانکہ اس پر حق کھل چکا ہو۔ دلیل دیکھ لی۔ پھر بھی مخالفت رسول کر کے مسلمانوں کی صاف روش سے ہٹ جائے۔ تو ہم بھی اسے ٹیڑھی اور بُری راہ پر ہی اسے لگا دیتے ہیں۔ اسے پھر وہی اچھی اور بھلی معلوم ہونے لگتی ہے یہاں تک کہ بیچوں بیچ جہنم میں پہنچ جاتا ہے۔ مؤمنوں کی راہ کے علاوہ راہ ڈھونڈنا دراصل رسول ﷺ سے خلاف کرنا ہی ہے۔ لیکن کبھی تو شارع کی صاف بات کا خلاف ہوتا ہے۔ کبھی اس چیز کا خلاف ہوتا ہے جس پر ساری امت محمدیہ متفق ہو۔ جس میں انہیں خطا سے اللہ نے بوجہ ان کی شرافت و کرامت کے محفوظ کر رکھا ہے۔ اس بارے میں بہت سی حدیثیں بھی ہیں اور ہم نے بھی احادیث اصول میں ان کا بڑا حصہ بیان کر دیا ہے۔ بعض علما تو ان کے تواتر معنی کے قائل ہیں۔

حضرت امام شافعیؒ نے غور و فکر کے بعد اس آیت سے اتفاق اُمت کے دلیل ہونے پر استدلال کیا ہے۔ حقیقتاً یہی اس بارے میں بہترین اور قوی تر چیز ہے بعض دیگر ائمہ نے اس دلالت کو مشکل اور دور از آیت بھی بتلایا ہے۔ غرض ایسا کرنے والے کی رسی اللہ میاں بھی ڈھیل چھوڑ دیتے ہیں' جیسے فرمان ہے: ﴿سَنَسْتَدْرِجُهُمْ﴾ (الاعراف: ۱۸۲) اور ﴿فَلَمَّا زَاغُوْٓا﴾

(الصف:۵) اور ﴿نَذَرُهُمْ﴾ یعنی ہم انہیں ان کی بے خبری میں ہیچ بڑھاتے رہتے ہیں۔ان کے بہکتے ہی ہم بھی ان کے دلوں کو ٹیڑھا کر دیتے ہیں۔ہم انہیں ان کی سرکشی میں حیران چھوڑ دیتے ہیں۔ بالآخران کی جائے بازگشت جہنم بن جاتی ہے۔ جیسے فرمان ہے ظالموں کا مع ان کے جوڑوں کے حشر کرو اور جیسے فرمایا ظالم آگ کو دیکھ کر جان لیں گے کہ اس میں کودنا پڑے گا۔ لیکن کوئی صورت چھٹکارے کی نہ پائیں گے۔

إِنَّ اللَّهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذَٰلِكَ لِمَنْ يَشَاءُ ۚ وَمَنْ يُشْرِكْ بِاللَّهِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلَالًا بَعِيدًا ﴿١١٦﴾ إِنْ يَدْعُونَ مِنْ دُونِهِ إِلَّا إِنَاثًا وَإِنْ يَدْعُونَ إِلَّا شَيْطَانًا مَرِيدًا ﴿١١٧﴾ لَعَنَهُ اللَّهُ ۘ وَقَالَ لَأَتَّخِذَنَّ مِنْ عِبَادِكَ نَصِيبًا مَفْرُوضًا ﴿١١٨﴾ وَلَأُضِلَّنَّهُمْ وَلَأُمَنِّيَنَّهُمْ وَلَآمُرَنَّهُمْ فَلَيُبَتِّكُنَّ آذَانَ الْأَنْعَامِ وَلَآمُرَنَّهُمْ فَلَيُغَيِّرُنَّ خَلْقَ اللَّهِ ۚ وَمَنْ يَتَّخِذِ الشَّيْطَانَ وَلِيًّا مِنْ دُونِ اللَّهِ فَقَدْ خَسِرَ خُسْرَانًا مُبِينًا ﴿١١٩﴾ يَعِدُهُمْ وَيُمَنِّيهِمْ ۖ وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطَانُ إِلَّا غُرُورًا ﴿١٢٠﴾ أُولَٰئِكَ مَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ وَلَا يَجِدُونَ عَنْهَا مَحِيصًا ﴿١٢١﴾ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ سَنُدْخِلُهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا ۖ وَعْدَ اللَّهِ حَقًّا ۚ وَمَنْ أَصْدَقُ مِنَ اللَّهِ قِيلًا ﴿١٢٢﴾

بے شک اللہ تعالیٰ اس بات کو نہ بخشیں گے کہ ان کے ساتھ کسی کو شریک قرار دیا جائے اور اس کے سوا اور جتنے گناہ ہیں جس کے لئے منظور ہو گا وہ گناہ بخش دیں گے اور جو شخص اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک ٹھہراتا ہے وہ بڑی دور کی گمراہی میں جا پڑا۔ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر صرف چند زنانی چیزوں کی عبادت کرتے ہیں اور صرف شیطان کی عبادت کرتے ہیں جو کہ حکم سے باہر ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے دور ڈال رکھا ہے اور جس نے یوں کہا

تھا کہ ضرور ہیں تیرے بندوں سے اپنا مقرر حصہ اطاعت کا لوں گا اور میں ان کو گمراہ کروں گا اور میں ان کو ہوسیں دلاؤں گا اور میں ان کو تعلیم دوں گا۔ جس سے وہ چارپاؤں کے کانوں کو تراشا کریں گا اور میں ان کو تعلیم دوں گا جس سے وہ اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی صورت کو بگاڑا کریں گے اور جو شخص اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر شیطان کو اپنا رفیق بنا دے گا وہ صریح نقصان میں واقع ہوگا۔ شیطان ان لوگوں سے وعدے کیا کرتا ہے اور ان کو ہوسیں دلاتا ہے اور شیطان ان سے وعدے کرتا ہے ایسے لوگوں کا ٹھکانا جہنم ہے اور اس سے کہیں بچنے کی جگہ نہ پائیں گے اور جو لوگ ایمان لے آئے اور اچھے کام کیے ہم ان کو عنقریب ایسے باغوں میں داخل کریں گے کہ ان کے نیچے نہریں جاری ہوں گی وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کا وعدہ فرمایا ہے اور وہ سچا وعدہ فرماتا ہے اور اللہ تعالیٰ سے زیادہ کس کا کہنا صحیح ہوگا۔○

شرک سب سے بڑا جرم ہے☆

اس سورت کے شروع میں پہلی آیت کے متعلق ہم پوری تفسیر کر چکے ہیں اور وہیں اس آیت سے تعلق رکھنے والی حدیثیں بھی بیان کر دی ہیں۔ حضرت علیؓ فرمایا کرتے تھے: قرآن کی کوئی آیت مجھے اس آیت سے زیادہ محبوب نہیں (ترمذی) مشرکین سے دنیا اور آخرت کی بھلائی چھٹ جاتی ہے وہ راہ حق سے دور جا پڑتے ہیں وہ اپنے نفس کو اور اپنے دونوں جہان کو برباد کر لیتے ہیں۔ یہ مشرکین عورتوں کے پرستار ہیں۔ حضرت کعب فرماتے ہیں: ہر صنم کے ساتھ ایک جنیہ عورت ہے۔ حضرت عائشہ فرماتی ہیں: اناثا سے مراد بت ہیں۔ یہ قول اور مفسرین کا بھی ہے۔ ضحاکؒ کا قول ہے کہ مشرک فرشتوں کو پوجتے تھے اور انہیں اللہ کی لڑکیاں مانتے تھے اور کہتے تھے ان کی عبادت سے ہماری اصلی غرض اللہ کی نزدیکی حاصل کرنا ہے اور ان کی تصویریں عورتوں کی شکل میں قائم کرتے تھے کہ یہ صورتیں فرشتوں کی ہیں' جو اللہ کی لڑکیاں ہیں۔

یہ تفسیر ﴿اَفَرَءَيْتُمُ اللّٰتَ﴾ (النجم: ۱۹) کے مضمون سے خوب ملتی ہے۔ یہاں ان کے بتوں کے نام لے کر اللہ نے فرمایا ہے کہ یہ خوب انصاف ہے کہ لڑکے تو تمہارے اور لڑکیاں میری اور آیت میں ہے: ﴿وَجَعَلُوا الْمَلٰٓئِكَةَ الَّذِيْنَ هُمْ عِبٰدُ الرَّحْمٰنِ اِنَاثًا﴾ (سورۂ زخرف: ۱۹) ان لوگوں نے اللہ کے غلام فرشتوں کو مؤنث سمجھ رکھا ہے اور جگہ ہے: اللہ میں اور جنات میں نسب نکالتے ہیں۔ ابن عباسؓ فرماتے ہیں: مراد مردے ہیں۔ حسن فرماتے ہیں: ہر بے روح چیز اناث ہے۔ خواہ خشک لکڑی ہو خواہ پتھر ہو۔ لیکن یہ قول غریب ہے۔ پھر ارشاد ہے کہ دراصل یہ شیطان کے پجاری ہیں۔ کیونکہ وہی انہیں یہ راہ دکھاتا ہے اور یہ دراصل میں اسی کی مانتے ہیں۔ جیسے ارشاد ہے: ﴿اَلَمْ اَعْهَدْ اِلَيْكُمْ ......﴾ (یٰسین: ۶۰) اے بنی آدم کیا میں نے تم سے شیطان کی عبادت نہ کرنے کا وعدہ نہیں لیا تھا؟ اسی وجہ سے فرشتے قیامت کے دن صاف کہہ دیں گے کہ ہماری عبادت کے دعویدار دراصل شیطانی پوجا کے پھندے میں تھے۔ شیطان کو رب نے اپنی رحمت سے یک سو کر دیا ہے اور پاس سے نکال کر باہر کر دیا ہے۔ اس نے بھی بیڑا اُٹھا رکھا ہے کہ اللہ کے بندوں کو معقول تعداد میں بہکا لے گا۔ قتادہ فرماتے ہیں: یعنی ہر ہزار میں سے نو سو ننانوے کو اپنے ساتھ جہنم میں لے جائے گا ایک بچ رہے گا جو جنت کا مستحق ہوگا۔ اس نے کہا ہے کہ میں انہیں حق سے بہکاؤں گا اور انہیں امیدیں دلاتا رہوں گا کہ یہ توبہ ترک کر بیٹھیں گے۔ نفس پروری میں آخرت سے دور ہو جائیں گے۔ جانوروں کے کان کاٹ کر سوراخ دار کر کے اللہ کے سوا دوسروں کے نام کرنے کی انہیں تلقین کروں گا۔ اللہ کی بنائی ہوئی صورتوں کو بگاڑنا سکھاؤں گا۔ جیسے جانوروں کو خصی کرنا۔ ایک حدیث میں اس سے بھی ممانعت آئی ہے (شاید مراد اس سے نسل

منقطع کرنے کی غرض سے ایسا کرنا ہے) ایک معنی یہ بھی کئے گئے ہیں کہ چہرے پر گودنا گدوانا' جو صحیح مسلم کی حدیث میں ممنوع ہے اور جس کے کرنے والے پر اللہ کی لعنت ہوتی ہے۔

ابن مسعودؓ سے صحیح سند سے مروی ہے کہ گودنے والیوں اور گدوانے والیوں' پیشانی کے بال نوچنے والیوں اور نچوانے والیوں اور دانتوں میں کشادگی کرنے والیوں پر جو حسن وخوبصورتی کیلئے اللہ کی بناوٹ کو بگاڑتی ہیں' اللہ کی لعنت ہے' میں ان پر لعنت کیوں نہ کروں جن پر رسولؐ نے لعنت کی ہے اور جو کتاب اللہ میں موجود ہے۔ پھر آپ نے آیت: ﴿وَمَا اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ﴾ (الحشر: ۷) پڑھی۔ بعض اور مفسرین کرام سے مروی ہے کہ مراد اللہ کے دین کو بدل دینا ہے۔ جیسے اور آیت میں ہے: ﴿فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ﴾ (الروم: ۳۰) یعنی اپنا چہرہ قائم رکھ کر اللہ کے یک طرفہ دین کی جانب یہ اللہ کی وہ فطرت ہے جس پر تمام انسانوں کو اس نے پیدا کیا ہے۔ اللہ کی خلق میں کوئی تبدیلی نہیں۔ اس پچھلے کو جب امر کے معنی میں لیا جائے تو وہ تفسیر ٹھیک ہو جاتی ہے۔ یعنی فطرت اللہ کو نہ بدلو۔ لوگوں کو جس فطرت پر پیدا کیا ہے' اسی پر رہنے دو۔ صحیحین میں ہے ہر بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے لیکن اُسکے ماں باپ پھر اسے یہودی یا نصرانی یا مجوسی بنا لیتے ہیں۔ جیسے بکری کا صحیح سالم بچہ بالکل بے عیب ہوتا ہے۔ لیکن پھر لوگ اسکے کان وغیرہ کاٹ دیتے ہیں اور اسے عیب دار کر دیتے ہیں۔

صحیح مسلم میں ہے اللہ عزوجل فرماتا ہے: میں نے اپنے بندوں کو یک سوئی والے دین پر پیدا کیا۔ لیکن شیطان نے آ کر انہیں بہکا دیا۔ پھر میں نے اپنے حلال کو ان پر حرام کر دیا۔ شیطان کو دوست بنانے والا اپنا نقصان کرنے والا ہے۔ جس نقصان کی کبھی تلافی نہ ہو سکے۔ کیونکہ شیطان انہیں سبز باغ دکھاتا رہتا ہے۔ فلاح و بہبود ان کی غلط راہ میں انہیں سمجھاتا ہے اور دراصل وہ بڑا فریب اور صاف دھوکا ہوتا ہے۔ چنانچہ قیامت کے دن صاف کہے گا کہ اللہ کے وعدے سچے تھے اور میں تو وعدہ خلاف ہوں ہی۔ میرا کوئی زور تم پر تھا ہی نہیں۔ میری پکار کو سننے کے ساتھ ہی تم کیوں اپنی عقل کھو بیٹھے۔ اب مجھے کوستے ہو؟ خود کو برا کہو شیطانی وعدوں کو صحیح جاننے والے۔ اس کی دلائی ہوئی امیدوں کو پوری ہونے والی سمجھنے والے آخر جہنم واصل ہوں گے۔ جہاں سے چھٹکارا محال ہے۔ ان بدبختوں کے ذکر کے بعد اب نیک لوگوں کا حال بیان ہو رہا ہے کہ جو دل سے میرے ماننے والے ہیں اور جسم سے میری تابعداری کرنے والے ہیں۔ میرے احکام پر عمل کرتے ہیں۔ میری منع کردہ چیزوں سے باز رہتے ہیں۔ انہیں نعمتیں دوں گا۔ انہیں جنتوں میں لے جاؤں گا۔ جن کی نہریں جہاں یہ چاہیں خود بخود بہنے لگیں گی۔ جس میں زوال وانتقال اور نقصان بھی نہیں۔ اللہ کا یہ وعدہ اٹل اور بالکل سچا ہے اور یقیناً ہونے والا ہے۔ اللہ سے سچی بات اور کس کی ہو گی؟ اس کے سوا کوئی معبود برحق نہیں نہ اس کے کوئی مربی ہے۔ رسول اللہ ﷺ اپنے خطبے میں فرمایا کرتے تھے: سب سے زیادہ سچی بات کلام اللہ ہے اور سب سے بہتر ہدایت محمد ﷺ کی ہدایت ہے اور تمام کاموں میں سب سے برا کام دین میں نئی نکلی ہوئی بات ہے اور ہر ایسی نئی بات کا نام بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے اور ہر گمراہی جہنم میں لے جاتی ہے۔

لَيْسَ بِاَمَانِيِّكُمْ وَلَآ اَمَانِيِّ اَهْلِ الْكِتٰبِ ۭ مَنْ يَّعْمَلْ سُوْۗءًا يُّجْزَ بِهٖ ۙ وَلَا يَجِدْ لَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ﴿۱۲۳﴾ وَمَنْ يَّعْمَلْ

مِنَ الصّٰلِحٰتِ مِنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُوْنَ نَقِيْرًا ﴿۱۲۴﴾ وَمَنْ اَحْسَنُ دِيْنًا مِّمَّنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ وَّاتَّبَعَ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا وَاتَّخَذَ اللّٰهُ اِبْرٰهِيْمَ خَلِيْلًا ﴿۱۲۵﴾ وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيْطًا ﴿۱۲۶﴾

نہ تمہاری تمناؤں سے کام چلتا ہے نہ اہل کتاب کی تمناؤں سے جو شخص کوئی برا کام کرے گا وہ اس کے عوض میں سزا دیا جائے گا اور اس شخص کو اللہ کے سوا نہ کوئی یار ملے گا نہ مددگار ملے گا اور جو شخص کوئی نیک کام کرے گا خواہ وہ مرد ہو یا عورت ہو بشرطیکہ مومن ہو سو ایسے لوگ جنت میں داخل ہوں گے اور ان پر ذرا بھی ظلم نہ ہوگا اور ایسے شخص سے زیادہ اچھا کس کا دین ہوگا جو کہ اپنا رخ اللہ کی طرف جھکا دے اور وہ مخلص بھی ہو اور وہ ملت ابراہیم کا اتباع کرے۔ جس میں کجی کا نام نہیں اور اللہ تعالیٰ نے ابراہیم کو اپنا دوست بنایا تھا اور اللہ تعالیٰ ہی کی ملک ہے جو کچھ بھی آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور اللہ تعالیٰ تمام چیزوں کو احاطہ فرمائے ہوئے ہے۔ ○

سب سے بڑی فضیلت اسلام ہے ☆

حضرت قتادہؒ فرماتے ہیں: ہم سے ذکر کیا گیا کہ اہل کتاب اور مسلمانوں میں چہ مگوئیاں ہونے لگیں کہ اہل کتاب اپنی فضیلت یوں بیان کرتے تھے کہ ہمارے نبی تمہارے نبی سے پہلے کے ہیں اور ہماری کتاب سے تمہاری کتاب پہلی ہے اور مسلمان کہہ رہے تھے کہ ہمارے نبی خاتم النبیین ہیں اور ہماری کتاب تمام اگلی کتابوں کے فیصلے کرنے والی ہے۔ اس پر یہ آیتیں اُتریں اور مسلمانوں کی اور دین والوں کی فضیلت بیان ہوئی۔ مجاہد سے مروی ہے کہ عرب نے کہا: نہ تو ہم مرنے کے بعد جییں گے نہ ہمیں عذاب ہوگا۔ یہودیوں نے کہا: صرف ہم جنتی ہیں۔ یہی قول نصرانیوں کا بھی تھا اور کہتے تھے کہ آگ ہمیں صرف چند دن ستائے گی۔ آیت کا مضمون یہ ہے کہ صرف اظہار کرنے اور دعویٰ کرنے سے صداقت وحقانیت ثابت نہیں ہوتی۔ بلکہ ایماندار وہ ہے جس کا دل صاف ہو اور عمل شاہد ہوں اور خدائی دلیل اس کے ہاتھوں میں ہو۔ نہ تمہاری خواہشیں اور تیرے دعوے کوئی وقعت رکھیں نہ اہل کتاب کی تمنائیں اور بلند باتیں۔ نجات کا مدار صرف زبانی دعوے نہیں ہیں۔ بلکہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی فرمانبرداری اور رسولوں کی تابعداری ہے۔ برائی کرنے والے کسی نسبت کی وجہ سے ناممکن ہے کہ اس برائی کے خمیازے سے چھوٹ جائیں بلکہ رتی رتی بھلائی برائی قیامت کے دن اپنی آنکھوں سے اپنے سامنے دیکھ لیں گے۔ یہ آیت صحابہؓ پر بہت گراں گزری تھی اور حضرت صدیقؓ نے کہا کہ حضور ﷺ اب نجات کیسے ہوگی؟ جبکہ ایک ایک عمل کا بدلہ ضروری ہے تو آپ نے فرمایا: اللہ تجھے بخشے۔ ابوبکر یہ جزا وہی ہے جو کبھی تیری بیماری کی صورت میں ہوتی ہے' کبھی تکلیف کی صورت میں اور کبھی بلاؤ مصیبت کی شکل میں (مسند احمد) اور روایت میں ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا: ہر برائی کرنے والا دنیا میں بدلہ پائے گا۔ ابن

مردو یہ میں ہے' حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے فرمایا: دیکھو جس جگہ حضرت عبداللہ بن زبیر کو سولی دی گئی ہے وہاں تم نہ جانا۔ غلام بھول گیا اور حضرت عبداللہ کی نظر ابن زبیرؓ پر پڑی تو فرمانے لگے: واللہ جہاں تک میری معلومات ہیں' میری گواہی ہے کہ تو روزے دار' نمازی اور رشتے ناتے جوڑنے والا تھا۔ مجھے اللہ سے امید ہے کہ جو لغزشیں تجھ سے ہو گئیں' ان کا بدلہ دنیا میں ہی ہو گا۔ اب تجھے اللہ کوئی عذاب نہ کرے گا۔ پھر حضرت مجاہد کی طرف دیکھ کر فرمانے لگے: میں نے حضرت ابو بکرؓ سے سنا ہے وہ فرماتے ہیں: رسول اللہ ﷺ سے میں نے سنا ہے جو شخص برائی کرتا ہے اس کا بدلہ دنیا میں ہی پا لیتا ہے۔ دوسری روایت ہے کہ حضرت ابن عمرؓ نے حضرت ابن زبیر کو سولی پر دیکھ کر فرمایا: اے ابو حبیب! اللہ تعالیٰ تجھ پر رحم کرے میں نے تیرے والد کی زبانی یہ حدیث سنی ہے۔

ابن مردو یہ میں ہے حضرت ابو بکرؓ کی موجودگی میں یہ آیت اتری۔ جب حضور ﷺ نے اسے پڑھ کر سنایا تو حضرت صدیقؓ غمناک ہو گئے۔ انہیں یہ معلوم ہونے لگا کہ گویا ہر عمل کا بدلہ ہی ملنا جب ٹھہرا تو نجات مشکل ہو جائے گی۔ آپ ﷺ نے فرمایا: سنو صدیقؓ! تم اور تمہارے ساتھی یعنی مؤمن تو دنیا میں بدلہ دے دیئے جائیں گے۔ قیامت کے دن پاک صاف اٹھو گے۔ ہاں اور لوگ جو ہیں' ان کی برائیاں جمع ہوتی جاتی ہیں اور قیامت کے دن انہیں سزا دی جائے گی۔ یہ حدیث ترمذی نے بھی روایت کی ہے اور کہا ہے کہ اس کا راوی موسیٰ بن عبیدہ ضعیف ہے اور دوسرا راوی مولی بن سباع مجہول ہے اور بھی بہت سے طریق ہے اس روایت کا ماحصل مروی ہے۔ ایک اور حدیث میں ہے حضرت عائشہؓ نے کہا: یا رسول اللہ ﷺ! یہ آیت سب سے زیادہ ہم پر بھاری پڑتی ہے تو آپ ﷺ نے فرمایا: مؤمن کا یہ بدلہ وہی ہے جو مختلف قسم کی پریشانیوں اور تکلیفوں کی صورت میں اسے دنیا میں ہی مل جاتا ہے اور حدیث میں ہے کہ آپ نے فرمایا: یہاں تک کہ مؤمن اپنی نقدی جیب میں رکھ لے۔ پھر ضرورت کے وقت تلاش کرے تھوڑی دیر نہ ملے۔ پھر جیب میں ہاتھ ڈالنے سے نکل آئے تو اتنی دیر میں جو اسے صدمہ ہوا' اس سے بھی اس کے گناہ معاف ہوتے ہیں اور یہ بھی اس کی برائیوں کا بدلہ ہو جاتا ہے۔ یونہی مصائب دنیا اسے ایسا کندن بنا دیتے ہیں کہ قیامت کا کوئی بوجھ اس پر نہیں رہتا۔ جس طرح سونا بھٹی میں تپا کر نکال لیا جاتا ہے اسی طرح یہ دنیا سے پاک صاف ہو کر اللہ تعالیٰ کے پاس جاتا ہے۔ ابن مردو یہ میں ہے: رسول اللہ ﷺ سے اس آیت کے بارے میں سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا: مؤمن کو ہر چیز میں اجر دیا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ موت کی سختی کا بھی۔

مسند احمد میں ہے جب بندے کے گناہ زیادہ ہو جاتے ہیں اور انہیں دور کرنے والے بکثرت نیک اعمال نہیں ہوتے تو اللہ اس پر کوئی غم ڈال دیتا ہے جس سے اس کے گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ سعید بن منصور لائے ہیں کہ جب صحابہ پر اس آیت کا مضمون گراں گزرا تو حضور ﷺ نے ان سے فرمایا: ٹھیک ٹھاک رہو اور ملے جلے رہو۔ مسلمان کی ہر تکلیف اس کے گناہ کا کفارہ ہے یہاں تک کہ کانٹا لگنا بھی اور روایت میں ہے کہ صحابہ رو رہے تھے اور رنج میں تھے۔ جو حضور ﷺ نے ان سے فرمایا: ایک شخص نے حضور ﷺ سے پوچھا کہ ہماری ان بیماریوں میں ہمیں کیا ملتا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: یہ تمہارے گناہوں کا کفارہ ہو جاتی ہیں۔ اسے سن کر حضرت کعب بن عجرہؓ نے دعا کی کہ یا اللہ مرتے دم تک مجھ سے بخار جدا نہ ہو۔ لیکن حج و عمرہ جہاد اور نماز باجماعت سے محروم نہ ہوں۔ ان کی یہ دعا قبول ہوئی۔ جب ان کے جسم پر ہاتھ لگایا جاتا' بخار چڑھتا رہتا۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔ (مسند احمد) حضور ﷺ سے ایک مرتبہ کہا گیا کہ کیا ہر برائی کا بدلہ دیا جائے گا؟ آپ نے فرمایا: ہاں۔ لیکن اسی جیسا۔ لیکن

ہر بھلائی کا بدلہ دس گنا کر کے دیا جائے۔ پس اس پر افسوس ہے جس کی اکائیاں دہائیوں سے بڑھ جائیں۔ (ابن مردویہ)

حضرت حسنؒ فرماتے ہیں: یہاں برائی سے مراد شرک ہے۔ یہ شخص اللہ کے سوا اپنا کوئی ولی اور مددگار نہ پائے گا۔ ہاں یہ اور بات ہے کہ توبہ کر لے۔ امام ابن جریر فرماتے ہیں: ٹھیک بات یہی ہے کہ ہر برائی کو یہ آیت شامل ہے جیسے کہ احادیث گزر چکی ہے۔ واللہ اعلم۔ بدعملیوں کی سزا کا ذکر کر کے اب نیک اعمال کی جزا کا بیان ہو رہا ہے۔ بدی کی سزا یا تو دنیا میں مل جاتی ہے اور بندے کے لئے یہی اچھا ہے یا آخرت میں ہوتی ہے۔ اللہ اس سے محفوظ رکھے۔ ہم اللہ تعالیٰ سے سوال کرتے ہیں کہ وہ ہمیں دونوں جہان کی عافیت عطا فرمائے اور مہربانی اور درگزر کرے اور اپنی پکڑ دھکڑ اور ناراضگی سے بچا لے۔ اعمال صالحہ کو اللہ تعالیٰ پسند کرتا ہے اور اپنے احسان و کرم رحم سے انہیں قبول کرتا ہے۔ کسی مرد و عورت کے کسی نیک عمل کو ضائع نہیں کرتے ہاں یہ شرط ہے کہ ہو وہ ایماندار۔ ان نیک لوگوں کو وہ اپنی جنت میں داخل کرے گا اور ان کی حسنات میں کوئی کمی نہیں آنے دے گا۔ نقیر کہتے ہیں کھجور کی گٹھلی کی پشت پر جو ذرا سی جھلی ہوتی ہے فتیل کہتے ہیں اور گٹھلی کے درمیان جو ہلکا سا چھلکا ہوتا ہے اس کو۔ یہ دونوں تو کھجور کے بیج میں ہوتے ہیں اور قطمیر کہتے ہیں اس بیج کے اوپر کے لفافے کو اور یہ تینوں لفظ اس موقعہ پر قرآن میں آئے ہیں۔ پھر فرمایا: اس سے اچھے دین والا کون ہے جو اپنے اعمال خالص اسی کے لئے کرے۔ ایمانداری اور نیک نیتی کے ساتھ اس کے فرمان کے مطابق اس کے احکام بجالائے اور ہو بھی وہ محسن یعنی شریعت کا پابند۔ دین حق اور ہدایت پر چلنے والے رسول کی حدیث پر عمل کرنے والا ہر نیک عمل کی قبولیت کے لئے یہ دونوں باتیں شرط ہیں۔ یعنی خلوص اور وحی کے مطابق ہونا۔ خلوص سے یہ مطلب ہے کہ فقط اللہ کی رضامندی مطلوب ہو اور ٹھیک ہونا یہ ہے کہ شریعت کی ماتحتی میں ہو۔ پس ظاہر تو قرآن حدیث کے موافق ہونے سے ٹھیک ہو جاتا ہے اور اس سے بھی عمل پایہ قبولیت سے گر جاتا ہے اور چونکہ مؤمن کا عمل ریاکاری سے شریعت کے خلاف سے بچا ہوا ہوتا ہے اس کا عمل سب سے اچھا عمل ہو جاتا ہے جو اللہ کو پسند آتا ہے اور اس کی جزا کا بلکہ اور گناہوں کی بخشش کا سبب بن جاتا ہے۔ اسی لئے اس کے بعد ہی فرمایا: ملت ابراہیم حنیف کی پیروی کرو۔ یعنی آنحضرت ﷺ کی اور آپ ﷺ کے قدم بہ قدم چلنے والوں کی، جو بھی قیامت تک ہوں۔ جیسے اور آیت میں ہے: ﴿اِنَّ اَوْلَى النَّاسِ بِاِبْرٰهِیْمَ﴾ (آل عمران: ۶۸) یعنی ابراہیم سے قریب تر وہ لوگ ہیں جو ان کی حکم برداری کرتے رہے اور یہ نبی ﷺ۔

ایک اور روایت میں فرمایا: ﴿ثُمَّ اَوْحَیْنَآ اِلَیْكَ﴾ (النحل: ۱۲۳) پھر ہم نے تیری طرف وحی کی کہ ابراہیم حنیف کی ملت کی پیروی کرو جو مشرک نہ تھے۔ حنیف کہتے ہیں قصداً شرک سے بیزاری کرنے اور پوری طرح حق کی طرف متوجہ ہو جانے والے کو جسے کوئی روکنے والا نہ روک سکے اور کوئی ہٹانے والا نہ ہٹا سکے۔ پھر حضرت خلیل اللہ کی اتباع کی تاکید اور ترغیب کے لئے ان کا وصف بیان کیا کہ وہ اللہ کے دوست ہیں یعنی بندہ ترقی کر کے جس اعلیٰ سے اعلیٰ درجے تک پہنچ سکتا ہے اس تک وہ پہنچ گئے۔ خلت کے درجے سے کوئی درجہ بڑا نہیں محبت کا یہ اعلیٰ مقام ہے اور حضرت ابراہیمؑ اسی مقام پر فائز تھے۔ اس کی وجہ ان کی کامل اطاعت ہے۔ جیسے فرمان ہے: ﴿وَاِبْرٰهِیْمَ الَّذِیْ وَفّٰۤی﴾ (النجم: ۳۷) یعنی ابراہیم کو جو حکم ملا وہ اسے بخوشی بجا لائے۔ کبھی اللہ کی مرضی سے منہ نہ موڑا کبھی عبادت سے نہ اُکتائے۔ کوئی چیز انہیں عبادت اللہ سے مانع نہ ہوئی اور روایت میں ہے: ﴿وَاِذِ ابْتَلٰۤی اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ﴾ (البقرہ: ۱۲۴) جب جب جس جس طرح اللہ نے ان کی آزمائش کی وہ پورے اُترے۔ جو جو اللہ نے فرمایا انہوں نے کر دکھایا۔ فرمان ہے کہ ابراہیم یک سوئی سے توحید کے رنگ میں شرک سے بچتا

ہوا ہمارا تابع فرمان بنا رہا۔ حضرت معاذؓ نے یمن میں صبح کی نماز میں جب یہ آیت پڑھی تو ایک شخص نے کہا: لَقَدْ قَرَّتْ عَيْنُ أُمِّ اِبْرَاهِيْمَ۔ ابراہیم کی ماں کی آنکھیں ٹھنڈی ہوئیں۔

بعض کہتے ہیں کہ خلیل اللہ لقب کی وجہ یہ ہوئی کہ ایک مرتبہ قحط سالی کے موقعہ پر آپ اپنے ایک دوست کے پاس مصر یا موصل گئے کہ وہاں سے کچھ اناج وغیرہ لے آئیں۔ لیکن یہاں کچھ نہ ملا اور خالی ہاتھ لوٹنا پڑا۔ جب اپنی بستی کے قریب پہنچے تو خیال آیا آؤ اس ریت کے تودے میں سے اپنی بوریاں بھر کر لے چلوں۔ تاکہ گھر والوں کو قدرے تسکین ہو جائے۔ چنانچہ بھر لیں اور جانوروں پر لاد کر لے چلے۔ قدرت اللہ سے وہ ریت سچ مچ آٹا بن گیا۔ آپ تو گھر پہنچ کر لیٹ رہے۔ تھکے ہارے تو تھے ہی۔ آنکھ لگ گئی۔ گھر والوں نے بوریاں کھولیں اور انہیں بہترین آٹے سے پُر پایا۔ آٹا گوندھا روٹیاں پکائیں' جب یہ جاگے اور گھر میں سب کو خوش پایا اور روٹیاں بھی تیار دیکھیں تو تعجب سے پوچھنے لگے: آٹا کہاں سے آیا؟ جو تم نے روٹیاں پکائیں۔ انہوں نے کہا: آپ ہی تو اپنے دوست کے ہاں سے لائے ہیں۔ اب آپ سمجھ گئے اور فرمایا: ہاں یہ میں اپنے دوست اللہ عزوجل سے لایا ہوں۔ پس اللہ تعالیٰ نے بھی آپ کو اپنا دوست بنالیا اور خلیل اللہ نام رکھ دیا۔ لیکن اس کی صحت اور اس واقعہ سے ذرا تامل ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ یہ بنی اسرائیل کی روایت ہو۔ جسے ہم سچا نہیں کہہ سکتے۔ گو جھٹلا بھی نہیں سکتے۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ کو لقب اس لئے ملا کہ آپ کے دل میں اللہ کی محبت حد درجہ کی تھی۔ کامل اطاعت شعاری اور فرمانبرداری تھی۔ اپنی عبادتوں سے اللہ کو خوش کر لیا تھا۔ نبی کریم ﷺ نے بھی اپنے آخری خطبہ میں فرمایا تھا۔ لوگو! اگر میں زمین والوں سے کسی کو خلیل اور ولی و دوست بنانے والا ہوتا تو ابوبکر بن ابوقحافہ کو بناتا۔ بلکہ تمہارے ساتھی اللہ کے خلیل ہیں۔

(بخاری ومسلم)

ایک اور روایت میں ہے اللہ نے جس طرح ابراہیمؑ کو خلیل بنالیا تھا۔ اسی طرح مجھے بھی اپنا خلیل کر لیا ہے۔ ایک مرتبہ اصحابِ رسول آپ ﷺ کے انتظار میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ذکر و افکار چل رہے تھے۔ ایک صاحب بولے تعجب ہے کہ اللہ نے اپنی مخلوق میں سے حضرت ابراہیم کو اپنا خلیل بنایا۔ دوسرے نے کہا: اس سے بڑھ کر مہربانی یہ کہ حضرت موسیٰ سے خود باتیں کیں اور انہیں کلیم اللہ بنایا۔ ایک نے کہا: اور عیسیٰ روح اللہ اور کلمۃ اللہ ہیں۔ ایک نے آدم صفی اللہ اور اللہ کے پسندیدہ ہیں۔ حضور جب باہر تشریف لائے سلام کیا اور یہ باتیں سنیں تو فرمایا: بیشک تمہارا قول صحیح ہے ابراہیم خلیل اللہ ہیں اور موسیٰ کلیم اللہ ہیں اور عیسیٰ روح اللہ اور کلمۃ اللہ ہیں اور آدم صفی اللہ ہیں اور اسی طرح محمد ﷺ ہیں۔ سنو! میں واقعہ بیان کرتا ہوں: کچھ فخر کے طور پر نہیں کہتا کہ میں حبیب اللہ ہوں۔ میں سب سے پہلے شفاعت کرنے والا ہوں اور سب سے پہلے کنڈا کھٹکھٹانے والا ہوں۔ اللہ تعالیٰ میرے لئے جنت کو کھولے گا اور مجھے اس میں داخل کرے گا اور میرے ساتھ مؤمن فقراء ہوں گے۔ قیامت کے دن تمام اگلوں اور پچھلوں سے زیادہ اکرام اور عزت والا میں ہوں گا۔ یہ بطور فخر کے نہیں بلکہ بطور واقعہ اور حقیقت یہ حدیث اس سند سے تو غریب ہے۔ لیکن اس کے بعض کے شاہد موجود ہیں۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں: کیا تم اس سے تعجب کرتے ہو کہ خلت ابراہیمؑ کے لئے تھی اور کلام حضرت موسیٰ کے لئے تھا اور دیدار حضرت محمد ﷺ کے لئے صَلَوٰتُ اللّٰهِ وَسَلَامُهُ عَلَيْهِمْ أَجْمَعِيْنَ۔ (مستدرک حاکم)

اسی طرح کی روایت حضرت انس بن مالک اور بہت سے صحابہؓ، تابعینؒ اور سلف وخلف سے مروی ہے۔ ابن ابی حاتم

میں ہے حضرت ابراہیمؑ کی عادت تھی کہ مہمانوں کے ساتھ کھائیں۔ ایک دن آپ مہمان کی جستجو میں نکلے لیکن کوئی نہ ملا۔ واپس آئے گھر میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ ایک شخص کھڑا ہوا ہے۔ پوچھا: اے بندے! تجھے میرے گھر میں آنے کی اجازت کس نے دی؟ اس نے کہا: اس مکان کے حقیقی مالک نے پوچھا: تم کون ہو؟ کہا میں ملک الموت ہوں۔ مجھے اللہ تعالیٰ نے اپنے بندے کے پاس اس لئے بھیجا ہے کہ میں اسے بشارت سنا دوں کہ اللہ نے اسے اپنا خلیل بنالیا ہے۔ یہ سن کر حضرت ابراہیمؑ نے کہا: پھر تو مجھے ضرور بتایئے کہ وہ بزرگ کون ہیں؟ اللہ کی قسم گو وہ زمین کے کسی دور کے گوشے میں ہو ضرور میں جا کر ان سے ملاقات کروں گا۔ پھر اپنی باقی زندگی ان کے قدموں میں ہی گزار دوں گا۔ یہ سن کر حضرت ملک الموت نے کہا: وہ شخص خود آپ ہیں۔ آپ نے پھر دریافت فرمایا: کیا سچ مچ میں ہی ہوں؟ فرشتے نے کہا: ہاں آپ ہی ہیں۔ آپ نے پھر دریافت فرمایا کہ کیا آپ مجھے یہ بھی بتائیں گے کہ کس بنا پر کن کاموں پر اللہ تعالیٰ نے مجھے اپنا خلیل بنایا ہے؟ فرشتے نے کہا: اس لئے کہ تم ہر ایک کو دیتے رہتے ہو اور کسی سے خود کچھ طلب نہیں کرتے اور روایت میں ہے جب سے حضور ابراہیمؑ کو خلیل اللہ کے ممتاز اور مبارک لقب سے اللہ نے لقب فرمایا: تب سے تو ان کے دل میں اس قدر خوف اللہ اور ہیبت رب سما گئی کہ ان کے دل کا اچھلنا دور سے اس طرح سنا جاتا تھا۔ جس طرح فضا میں پرندے کے پرواز کی آواز۔ صحیح حدیث میں ہے جناب رسول اللہ ﷺ کی نسبت بھی وارد ہے کہ جس وقت خوف اللہ آپ پر غالب آ جاتا تھا تو آپ کے رونے کی آواز جسے آپ ضبط کرنے کی کوشش فرماتے تھے اس طرح دور و نزدیک والوں کو سنائی دیتی تھی جیسے کسی ہنڈیا کی کھدبدی کی آواز ہو۔ پھر فرماتا ہے کہ زمین و آسمان میں جو کچھ ہے سب اللہ کی ملکیت میں اور اس کی غلامی میں ہے اور اسی کا پیدا کیا ہوا ہے۔ جس طرح جب جو تصرف ان میں وہ کرنا چاہتا ہے بغیر کسی روک ٹوک کے بغیر کسی مشورے کے اور بغیر کسی شرکت کے اور مدد کے کر گزرتا ہے۔ کوئی نہیں جو اس کے ارادے سے اسے باز رکھ سکے کوئی نہیں جو اس کے حکم میں حائل ہو سکے۔ کوئی نہیں جو اس کی مرضی کو بدل سکے۔ وہ عظمتوں اور قدرتوں والا وہ عدل و حکمت والا وہ لطف و رحم والا واحد و صمد اللہ ہے۔ اس کا علم ہر چھوٹی بڑی چیز کو گھیرے میں لئے ہوئے ہے۔ مخفی سے مخفی اور چھوٹی سے چھوٹی اور دور سے دور والی چیز کو بھی پوشیدہ نہیں۔ ہماری نگاہوں سے جو پوشیدہ ہیں اس کے علم میں سب ظاہر ہیں۔

وَيَسْتَفْتُوْنَكَ فِي النِّسَآءِ ؕ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ فِيْهِنَّ ۙ وَمَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ فِيْ يَتٰمَى النِّسَآءِ الّٰتِيْ لَا تُؤْتُوْنَهُنَّ مَا كُتِبَ لَهُنَّ وَتَرْغَبُوْنَ اَنْ تَنْكِحُوْهُنَّ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الْوِلْدَانِ ۙ وَاَنْ تَقُوْمُوْا لِلْيَتٰمٰى بِالْقِسْطِ ؕ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِهٖ عَلِيْمًا ﴿۱۲۷﴾

اورلوگ آپ سے عورتوں کے بارے میں حکم دریافت کرتے ہیں آپ فرما دیجئے کہ اللہ تعالیٰ ان کے بارے میں حکم دیتے ہیں اور وہ آیات بھی جو کہ قرآن کے اندر تم کو پڑھ کر سنائی جایا کرتی ہیں جو کہ ان یتیم عورتوں کے باب میں ہیں' جن کو جو ان کا حق مقرر ہے نہیں دیتے ہو اور ان کے ساتھ نکاح کی خواہش رکھتے ہو اور کمزور بچوں کے بارے میں اور اس باب میں کہ یتیموں کی کارگزاری انصاف کے ساتھ کرو اور جو نیک کام کرو گے سو بلاشبہ اللہ تعالیٰ اس کو خوب جانتے ہیں۔ O

یتیم لڑکیوں کے بارے میں کچھ ہدایات ☆

بخاری شریف میں ہے' حضرت عائشہ صدیقہ فرماتی ہیں: اس سے مراد وہ شخص ہے جس کی پرورش میں کوئی یتیم بچی ہو' جس کا والی وارث وہی ہو۔ مال میں شریک ہو گیا ہو۔ اب چاہتا ہو کہ اس یتیمہ سے میں نکاح کر لوں اس بناء پر اور جگہ کی شادی روکتا ہو۔ ایسے شخص کے بارے میں یہ آیت اتری ہے۔ ایک روایت میں ہے کہ اس آیت کے اترنے کے بعد جب پھر لوگوں نے حضور ﷺ سے ان یتیم لڑکیوں کے بارے میں سوال کیا تو اللہ تعالیٰ نے آیت: ﴿وَيَسْتَفْتُونَكَ﴾ نازل فرمائی۔ فرماتے ہیں کہ اس آیت میں جو یہ فرمایا گیا ہے: ﴿وَمَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ﴾ اس سے مراد پہلی آیت ﴿وَاِنْ خِفْتُمْ اَنْ لَّا تُقْسِطُوْا فِي الْيَتٰمٰى﴾ (النساء:۳) ہے۔ آپ ﷺ سے یہ بھی منقول ہے کہ یتیمہ لڑکیوں کے وارث جب ان کے پاس مال کم پاتے یا وہ حسین نہ ہوتیں تو ان سے نکاح نہ کرتے اور اگر مالدار اور صاحب جمال پاتے تو نکاح کرتے لیکن اس حال میں بھی چونکہ ان لڑکیوں کا اور کوئی نہیں ہوتا تھا' ان کے مہر اور حقوق میں کمی کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں روک دیا کہ تمہیں پورا مہر اور پورے حقوق ادا کئے بغیر نکاح کی اجازت نہیں۔ مقصد یہ ہے کہ ایسی یتیم بچی کی جس سے اس کے ولی کو نکاح حلال ہے تو وہ اس سے کر سکتا ہے بشرطیکہ جو مہر اس جیسی اس کے کنبے قبیلے کی لڑکیوں کو ملا ہے۔ اسے بھی دے اور اگر ایسا نہ کرے تو اسے چاہئے کہ اس سے نکاح بھی نہ کرے۔ اس سورت کے شروع کی اس مضمون کی پہلی آیت کا بھی یہی مطلب ہے اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اس یتیم بچی سے خود اس کا ایسا ولی جسے اس سے نکاح کرنا حلال ہے۔ اسے اپنے نکاح میں لانا نہیں چاہتا۔ خواہ کسی وجہ سے ہو لیکن یہ جان کر کہ جب یہ دوسرے کے نکاح میں چلی جائے گی تو جو مال میرے اور اس لڑکی کے درمیان شراکت میں ہے وہ بھی میرے قبضہ سے جاتا رہے گا۔ تو ایسے نامناسب فعل سے اس آیت میں روک دیا گیا ہے۔ یہ بھی ہے کہ جاہلیت میں دستور تھا کہ یتیم لڑکی کا ولی جب لڑکی کو اپنی ولایت میں لیتا تو اس پر ایک کپڑا ڈال دیتا۔ اب کسی کی مجال نہ تھی کہ اس سے نکاح کر سکے۔ اب اگر وہ خوش شکل ہوتی تو اس سے خود نکاح کر لیتا اور مال بھی ہضم کر جاتا اور اگر وہ شکل صورت میں اچھی نہ ہوتی اور مالدار ہوتی تو اسے دوسری جگہ نکاح کرنے سے روک دیتا اور وہ بیچاری یونہی مر جاتی اور یہ اس کا مال قبضے میں کر لیتا۔ اس سے اللہ اس آیت میں منع فرما رہا ہے۔ ابن عباسؓ سے اسکے ساتھ ہی یہ بھی مروی ہے کہ جاہلیت والے چھوٹے لڑکوں کو اور چھوٹی بڑی لڑکیوں کو وارث نہیں سمجھتے تھے۔ اس رسم کو بھی قرآن نے ختم کر دیا اور ہر ایک کو حصہ دلوایا اور فرمایا کہ لڑکی کو اور لڑکے کو خواہ چھوٹے ہوں یا بڑے حصہ ضرور دو۔ ہاں لڑکی کو آدھا اور لڑکے کو پورا یعنی دو لڑکیوں کے برابر اور یتیم لڑکیوں کے بارے میں انصاف کا حکم دیا کہ جب جمال و مال والی سے خود تم اپنا نکاح کر لیتے ہو تو پھر ان سے بھی کر لیا کرو۔ جو مال و جمال میں کم ہوں۔ پھر فرمایا: یقین مانو کہ تمہارے تمام اعمال سے اللہ تعالیٰ باخبر ہے تو تمہیں چاہئے کہ خیر کے کام کرو۔ حکم برداری کرو اور نیک بدلے حاصل کرو۔

وَاِنِ امْرَاَةٌ خَافَتْ مِنْۢ بَعْلِهَا نُشُوْزًا اَوْ اِعْرَاضًا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ اَنْ يُّصْلِحَا بَيْنَهُمَا صُلْحًا ۭ وَالصُّلْحُ خَيْرٌ ۭ وَاُحْضِرَتِ الْاَنْفُسُ الشُّحَّ ۭ وَاِنْ تُحْسِنُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ﴿۱۲۸﴾ وَلَنْ تَسْتَطِيْعُوْٓا اَنْ تَعْدِلُوْا بَيْنَ النِّسَاۗءِ وَلَوْ حَرَصْتُمْ فَلَا تَمِيْلُوْا كُلَّ الْمَيْلِ فَتَذَرُوْھَا كَالْمُعَلَّقَةِ ۭ وَاِنْ تُصْلِحُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۱۲۹﴾ وَاِنْ يَّتَفَرَّقَا يُغْنِ اللّٰهُ كُلًّا مِّنْ سَعَتِهٖ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ وَاسِعًا حَكِيْمًا ﴿۱۳۰﴾

اور اگر کسی عورت کو اپنے شوہر سے غالب احتمال بد دماغی یا بے پروائی کا ڈر ہو سو دونوں کو اس امر میں کوئی گناہ نہیں کہ دونوں باہم ایک خاص طور پر صلح کر لیں اور یہ صلح بہتر ہے اور نفوس کو حرص کے ساتھ اقتران ہوتا ہے اور اگر تم اچھا برتاؤ رکھو اور احتیاط رکھو تو بلاشبہ حق تعالیٰ تمہارے اعمال کی پوری خبر رکھتے ہیں اور تم سے یہ تو کبھی نہ ہو سکے گا کہ سب بیبیوں میں برابری رکھو تمہارا کتنا ہی جی چاہے تو تم بالکل تو ایک ہی طرف نہ ڈھل جاؤ جس سے اس کو ایسا کر دو جیسے کوئی ادھر میں لٹکی ہو اور اگر اصلاح کر لو اور احتیاط رکھو تو بلاشبہ اللہ تعالیٰ بڑی مغفرت والے بڑی رحمت والے ہیں اور اگر دونوں میاں بی بی جدا ہو جائیں تو اللہ تعالیٰ اپنی وسعت سے ہر ایک کو بے احتیاطی کر دے گا اللہ تعالیٰ بڑی وسعت والے اور بڑی حکمت والے ہیں۔○

شکر رنجی اور مصالحت کی کوششیں ☆

اللہ تعالیٰ میاں بیوی کے حالات اور ان کے احکام بیان فرما رہا ہے۔ کبھی مرد اس سے ناخوش ہو جاتا ہے کبھی چاہنے لگتا ہے اور کبھی الگ کر دیتا ہے۔ بس پہلی حالت میں جبکہ عورت کو اپنے شوہر کی ناراضگی کا خیال ہے اور اسے خوش کرنے کے لئے اپنے تمام حقوق سے یا کسی خاص حق سے وہ دستبرداری کر لے تو کر سکتی ہے۔ مثلاً اپنا کھانا کپڑا چھوڑ دے یا شب باشی کا حق معاف کر دے تو دونوں کے لئے یہ جائز ہے۔ پھر اسی کی رغبت دلاتا ہے کہ صلح ہی بہتر ہے۔ حضرت سودہ بنت زمعہؓ جب بہت عمر (رسیدہ) کی ہو جاتی ہیں اور انہیں معلوم ہوتا ہے کہ حضور ﷺ انہیں جدا کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ تو کہتی ہیں میں اپنی باری کا حق حضرت عائشہ کو دیتی ہوں۔ چنانچہ اس پر صلح ہو گئی اور حضور ﷺ نے قبول فرما لیا۔ ابو داؤد میں ہے کہ اسی پر یہ آیت اتری۔ ابن عباسؓ فرماتے ہیں: میاں بیوی جس بات پر راضی ہو جائیں وہ جائز ہے۔ آپ ﷺ فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ کے وصال کے وقت آپ ﷺ کی نو بیویاں تھیں۔ جن میں سے آپ ﷺ نے آٹھ کو باریوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ بخاری مسلم میں

ہے کہ حضرت سودہؓ کا دن بھی حضور ﷺ حضرت عائشہؓ کو دیتے تھے۔ حضرت عروہ کا قول ہے کہ حضرت سودہؓ نے بڑی عمر میں جب معلوم کیا کہ حضور ﷺ انہیں چھوڑ دینا چاہتے ہیں تو خیال کیا کہ آپ کو صدیقہؓ سے بڑی محبت ہے۔ اگر میں اپنی باری انہیں دے دوں تو کیا عجب ہے کہ حضور ﷺ راضی ہو جائیں اور میں آپ کی بیویوں میں آخر دم تک رہ جاؤں۔ حضرت عائشہؓ کا بیان ہے کہ حضور ﷺ رات گزارنے میں اپنی تمام بیویوں کو برابر کے درجے پر رکھا کرتے تھے۔ عموماً ہر روز سب بیویوں کے ہاں آتے بیٹھتے بولتے چالتے مگر ہاتھ نہ بڑھاتے۔ پھر آخر میں جن بیوی صاحبہ کی باری ہوتی ان کے یہاں جاتے اور رات وہیں گزارتے۔ پھر سودہؓ کا واقعہ بیان فرمایا۔ جو اوپر گزرا (ابوداؤد) معجم ابوالعباس کی ایک مرسل حدیث میں ہے کہ حضور ﷺ نے حضرت سودہؓ کو طلاق کی خبر بھجوائی۔ یہ حضرت عائشہؓ کے یہاں جا بیٹھیں۔ جب آپ تشریف لائے تو کہنے لگیں: آپ کو اس اللہ کی قسم، جس نے آپ پر اپنا کلام نازل فرمایا اور اپنی مخلوق میں سے آپ کو برگزیدہ اور اپنا پسندیدہ بنایا۔ آپ مجھ سے رجوع کر لیجئے۔ میری عمر بڑی ہو گئی ہے۔ مجھے مرد کی خاص خواہش نہیں رہی۔ لیکن تمنا ہے کہ قیامت کے دن آپ کی بیویوں میں اٹھائی جاؤں۔ چنانچہ آپ نے یہ منظور فرما لیا اور رجوع کر لیا۔ پھر یہ کہنے لگیں: یا رسول اللہ ﷺ! میں اپنی باری کا دن اور رات آپ کی محبوبہ حضرت عائشہؓ کو ہبہ کرتی ہوں۔

بخاری شریف میں ہے کہ اس آیت سے مراد یہ ہے کہ بڑھیا عورت جو اپنے خاوند کو دیکھتی ہے کہ وہ اس سے نبت کر سکتا بلکہ اسے الگ کرنا چاہتا ہے تو وہ کہتی ہے کہ میں اپنا حق چھوڑتی ہوں تو مجھے جدا نہ کر۔ تو آیت دونوں کو رخصت دیتی ہے۔ یہی صورت اس وقت بھی ہے۔ جب کسی کی دو بیویاں ہوں اور ایک سے اسے بوجہ بڑھاپے یا بدصورتی کے محبت نہ ہو اور وہ اسے جدا کرنا چاہتا ہو اور یہ اپنے تعلق یا بعض اور مصالح کی بناء پر الگ ہونا پسند نہ کرتی ہو تو اسے حق ہے کہ اپنے بعض یا سب حقوق سے الگ ہو جائے اور خاوند اس کی بات کو منظور کر کے اس کو جدا نہ کرے۔ ابن جریر میں ہے کہ ایک شخص نے حضرت عمرؓ سے ایک سوال کیا (جسے اس کی بیہودگی کی وجہ سے) ناپسند فرمایا اور اسے کوڑا مار دیا۔ پھر ایک اور نے اسی آیت کی بابت سوال کیا تو آپ نے فرمایا: ہاں یہ باتیں پوچھنے کی ہیں۔ اس سے ایسی صورت مراد ہے کہ مثلاً ایک شخص کی بیوی ہے لیکن وہ بڑھیا ہو گئی ہے اولاد نہیں ہوتی۔ اس نے اولاد کی خاطر کسی جوان عورت سے اور نکاح کیا۔ پھر یہ دونوں جس چیز پر آپس میں اتفاق کر لیں جائز ہے۔ حضرت علیؓ سے جب اس آیت کی نسبت پوچھا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ اس سے مراد وہ عورت ہے جو بوجہ اپنے بڑھاپے کے یا بدصورتی کے یا بدخلقی کے یا گندگی کے اپنے خاوند کی نظروں سے گر جائے اور اس کی تمنا ہو کہ خاوند مجھے چھوڑے تو یہ اپنا پورا یا آدھا مہر معاف کر دے یا اپنی باری معاف کر دے وغیرہ۔ تو اس طرح صلح کر سکتے ہیں۔ سلف اور ائمہ سے برابر اس کی یہی تفسیر منقول ہے بلکہ اس پر تقریباً اتفاق ہے۔ میرے خیال سے تو اس کا کوئی مخالف نہیں۔ واللہ اعلم۔ محمد بن مسلم کی صاحبزادی حضرت رافع بن خدیج کے گھر میں تھیں، بوجہ بڑھاپے کے یا کسی امر کے یہ انہیں چاہتے نہ تھے۔ یہاں تک طلاق دینے کا ارادہ کر لیا۔ اس پر انہوں نے کہا: آپ مجھے طلاق تو دیجئے نہیں ہاں جو آپ چاہیں وہی مجھے منظور ہے۔ اس پر یہ آیت اتری۔ ان دونوں آیتوں میں ذکر ہے اس عورت کا جس سے اس کا خاوند بگڑا ہوا ہو۔ اسے چاہئے کہ اپنی بیوی سے کہہ دے کہ اگر وہ چاہے تو اسے طلاق دے دے اور اگر وہ چاہے تو اس بات کو پسند کر کے اس کے گھر میں رہے کہ وہ مال کی تقسیم میں اور باری کی تقسیم میں اس پر دوسری بیوی کو ترجیح دے گا۔ اب اسے اختیار ہے اگر یہ دوسری شق کو منظور کر لے تو شرعاً خاوند کو

جائز ہے کہ اسے باری نہ دے اور جو مہر وغیرہ اس نے چھوڑا ہے اسے اپنی ملکیت سمجھے۔

حضرت رافع بن خدیج انصاریؓ کی بیوی صاحبہ جب سن رسید ہو گئیں تو انہوں نے ایک نوجوان لڑکی سے نکاح کیا اور پھر اسے زیادہ چاہنے لگے اور اسے اگلی بیوی پر مقدم رکھنے لگے۔ آخر اس نے تنگ آ کر طلاق طلب کی۔ آپ نے دے دی۔ پھر عدت ختم ہونے کے قریب لوٹا لی لیکن پھر وہی حال ہوا کہ جوان بیوی کو زیادہ چاہنے لگے اور اس کی طرف جھک گئے اس نے پھر طلاق مانگی آپ نے دوبارہ طلاق دے دی۔ پھر لوٹا لیا۔ لیکن پھر وہی نقشہ پیش آیا۔ پھر اس نے قسم دی کہ مجھے طلاق دے دو۔ تو آپ نے فرمایا کہ دیکھو اب یہ تیسری طلاق ہے۔ اگر تم چاہو تو میں دے دوں اور اگر چاہو تو اسی طرح رہنا منظور کر لو۔ اس نے سوچ کر جواب دیا کہ اچھا مجھے اسی طرح رہنا منظور ہے۔ چنانچہ وہ اپنے حقوق سے دست بردار ہو گئیں اور اس طرح رہنے سہنے لگیں۔ اس جملے کا کہ صلح خیر ہے ایک معنی تو یہ بیان کیا گیا ہے کہ خاوند کا اپنی بیوی کو یہ اختیار دینا کہ اگر تو چاہے تو اسی طرح رہ کر دوسری بیوی کے برابر تیرے حقوق نہ ہوں گے اور اگر چاہے تو طلاق لے لے۔ یہ بہتر ہے اس سے کہ یونہی دوسری پر ترجیح دیئے ہوئے رہے۔ لیکن اس کا اچھا مطلب یہ ہے کہ بیوی اپنا کچھ حق چھوڑ دے اور خاوند اسے طلاق نہ دے اور آپس میں مل کر رہیں۔ یہ طلاق دینے اور لینے سے بہتر ہے۔ جیسے کہ خود نبی ﷺ نے حضرت سودہؓ بنت زمعہ کو اپنی زوجیت میں رکھا اور انہوں نے اپنا دن حضرت عائشہ کو ہبہ کر دیا۔ آپ ﷺ کے اس فعل میں بھی آپ ﷺ کی امت کے لئے بہترین نمونہ ہے کہ عدم موافقت کی صورت میں طلاق کی نوبت نہ آئے۔ چونکہ اللہ کے نزدیک صلح افتراق سے بہتر ہے۔ اس لئے یہاں فرمادیا کہ صلح خیر ہے بلکہ ابن ماجہ وغیرہ کی حدیث میں ہے تمام حلال چیزوں میں سے سب سے زیادہ ناپسند چیز اللہ کے نزدیک طلاق ہے۔

پھر فرمایا: تمہارا احسان اور تقویٰ کرنا یعنی عورت کی طرف کی ناراضگی سے درگزر کرنا اور اسے ناپسندیدگی کے باوجود جو اس کا پورا حق دینا باری میں لین دین میں برابری کرنا یہ بہترین فعل ہے۔ جسے اللہ بخوبی جانتا ہے جس پر وہ بہت اچھا بدلہ عطا فرمائے گا۔

پھر ارشاد ہوتا ہے کہ گو تم چاہو کہ اپنی کئی ایک بیویوں کے درمیان ہر طرح بالکل پورا عدل و انصاف اور برابری کرو تو بھی تم نہیں کر سکتے۔ اس لئے کہ گو ایک ایک دن کی باری باندھ لو لیکن محبت شہوت جماع وغیرہ میں برابری کیسے کر سکتے ہو؟ ابن ملیکہ فرماتے ہیں: یہ آیت حضرت عائشہؓ کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ حضور ﷺ انہیں بہت چاہتے تھے۔ اسی لئے ایک حدیث میں ہے حضور ﷺ عورتوں کے درمیان صحیح طور پر مساوات رکھتے تھے۔ لیکن پھر بھی اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہوئے فرماتے تھے الٰہی یہ وہ تقسیم ہے جو میرے بس میں تھی۔ اب جو چیز میرے قبضہ سے باہر ہے یعنی دلی تعلق اس میں تو مجھے ملامت نہ کرنا۔ (ابوداؤد) اس کی اسناد صحیح ہے۔

لیکن امام ترمذی فرماتے ہیں: دوسری سند سے یہ مرسلاً مروی ہے اور وہ زیادہ صحیح ہے۔ پھر فرمایا: بالکل ہی ایک جانب جھک نہ جاؤ کہ دوسری کو لٹکا دو۔ وہ نہ بے خاوند کے رہے نہ خاوند والی۔ تم اس سے بے رخی برتو اور ہو وہ تمہاری زوجیت میں۔ نہ تو اسے طلاق ہی دو جو اپنا دوسرا نکاح کر لے۔ نہ اس کے وہ حق ادا کرو جو ہر بیوی کے اس کے میاں پر ہیں۔ حضور ﷺ فرماتے ہیں جس کی دو بیویاں ہوں پھر وہ بالکل ہی ایک طرف جھک جائے تو قیامت کے دن اللہ کے سامنے اس طرح آئے گا کہ اس کا آدھا جسم ساقط ہوگا۔ (احمد وغیرہ) امام ترمذی فرماتے ہیں: یہ حدیث مرفوع طریق سے سوائے ہمام اور کسی ذریعہ سے روایت نہیں ہے۔ پھر فرماتا ہے: اگر تم اپنے کاموں کی اصلاح کر لو اور جہاں تک تمہارے اختیار میں عورتوں کے درمیان عدل و

انصاف اور برابری ہے' کرو اور ہر حال میں اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہا کرو۔ تو اگر تم کسی وقت ایک کی طرف مائل ہو گئے ہو تو اللہ تعالیٰ معاف فرما دیگا۔ پھر تیسری حالت بیان فرماتا ہے کہ اگر کوئی صورت ہی نباہ کی نہ ہو اور دونوں الگ ہو جائیں۔ تو اللہ ایک کو دوسرے سے بے نیاز کر دیگا۔ اسے اس سے اچھا شوہر اور اسے اس سے اچھی بیوی دیگا۔ اللہ تعالیٰ کا فضل بہت وسیع ہے وہ بڑے احسانوں والا ہے اور ساتھ ہی وہ حکیم ہے۔ تمام افعال اور ساری تقدیریں اور پوری شریعت حکمت سے سراسر بھرپور ہے۔

وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ وَلَقَدْ وَصَّيْنَا الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَاِيَّاكُمْ اَنِ اتَّقُوا اللّٰهَ ۭ وَاِنْ تَكْفُرُوْا فَاِنَّ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ غَنِيًّا حَمِيْدًا ﴿۱۳۱﴾ وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ﴿۱۳۲﴾ اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ اَيُّهَا النَّاسُ وَيَاْتِ بِاٰخَرِيْنَ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰي ذٰلِكَ قَدِيْرًا ﴿۱۳۳﴾ مَنْ كَانَ يُرِيْدُ ثَوَابَ الدُّنْيَا فَعِنْدَ اللّٰهِ ثَوَابُ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ سَمِيْعًا بَصِيْرًا ﴿۱۳۴﴾

ع ۱۹/۸/۱۶

اور اللہ تعالیٰ کی ملک ہیں جو چیزیں کہ آسمانوں میں ہیں اور جو چیزیں زمین میں ہیں اور واقعی ہم نے ان لوگوں کو بھی حکم دیا تھا جن کو تم سے پہلے کتاب دی تھی اور تم کو بھی کہ اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور اگر تم ناسپاسی کرو گے تو اللہ تعالیٰ کو ملک ہیں جو چیزیں کہ آسمانوں میں ہیں اور جو چیزیں کہ زمین میں ہیں اور اللہ تعالیٰ کسی کے حاجتمند نہیں' خود اپنی ذات میں محمود ہیں اور اللہ تعالیٰ ہی کی ملک ہیں جو چیزیں کہ آسمانوں میں ہیں اور جو چیزیں کہ زمین میں ہیں اور اللہ تعالیٰ کافی کارساز ہیں اگر ان کو منظور ہو تو اے لوگو: تم سب کو فنا کر دیں اور دوسروں کو موجود کر دیں اور اللہ تعالیٰ اس پر پوری قدرت رکھتے ہیں۔ جو شخص دنیا کا معاوضہ چاہتا ہو تو اللہ تعالیٰ کے پاس تو دنیا اور آخرت دونوں کا معاوضہ ہے اور اللہ تعالیٰ بڑا سننے والا اور بڑا دیکھنے والے ہیں۔ ○

احکام کی تعمیل کا حکم ☆

اللہ تعالیٰ خبر دیتا ہے کہ زمین و آسمان کا مالک اور حاکم وہی ہے۔ فرماتا ہے جو احکام تمہیں دیئے جاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ سے ڈرو اس کو ایک مانو۔ اس کی عبادت کرو اور کسی اور کی عبادت نہ کرو۔ یہی احکام تم سے پہلے اہل کتاب کو دیئے گئے تھے اور اگر تم کفر کرو گے تو اللہ کا کیا بگاڑو گے؟ وہ تو زمین و آسمان کا تنہا مالک ہے۔ جیسے موسیٰ نے اپنی قوم سے فرمایا تھا کہ اگر تم اور تمام

روئے زمین کے انسان کفر کرنے لگو تو بھی اللہ تعالیٰ بے پروا اور لائق ستائش ہے اور جگہ فرمایا ہے: ﴿فَكَفَرُوْا وَتَوَلَّوْا وَّاسْتَغْنَى اللّٰهُ وَاللّٰهُ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ﴾ (التغابن:٦) انہوں نے کفر کیا اور منہ موڑ لیا۔ اللہ تعالیٰ نے ان سے بے نیازی کی اور اللہ تعالیٰ بہت ہی بے نیاز اور ہر تمام تعریفوں کا حقیقی مستحق ہے۔ اپنے تمام بندوں سے غنی اور تمام کاموں میں حمد کیا گیا ہے۔ آسمان اور زمین کی ہر چیز کا مالک ہے اور ہر شخص کے تمام افعال پر وہ گواہ ہے اور ہر چیز کا وہ عالم اور شاہد ہے۔ وہ قادر ہے کہ اگر تم اس کی نافرمانیاں کرو تو وہ تمہیں برباد کر دے اور غیروں کو آباد کر دے۔ جیسے اور آیت میں ہے: ﴿وَاِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُوْنُوْٓا اَمْثَالَكُمْ﴾ (محمد:٣٨) اگر تم منہ موڑو گے تو اللہ تعالیٰ تمہیں بدل کر تمہارے سوا اور قوم کو لائے گا۔ جو تم جیسے نہ ہوں گے بعض سلف سے منقول ہے کہ اس آیت پر غور کرو اور سوچو کہ گنہگار بندے اللہ کے نزدیک کس قدر ذلیل اور فرومایہ ہیں اور آیت میں یہ بھی فرمایا کہ اللہ پر یہ کام کچھ مشکل نہیں۔ پھر فرماتا ہے: اے وہ شخص جس کا پورا قصد اور جس کی تمام تر کوشش صرف دنیا کے لئے ہے جان لے کہ دونوں جہان دنیا اور آخرت کی بھلائیاں اللہ کے قبضے میں ہیں۔ تو جب اس سے دونوں ہی طلب کرے گا تو وہ تجھے دے گا اور وہ تجھے بے پروا کر دے گا اور آسودہ بنا دے گا اور جگہ فرمایا: بعض لوگ وہ ہیں جو کہتے ہیں: خدایا ہمیں دنیا دے۔ ان کا کوئی حصہ آخرت میں نہیں اور ایسے بھی ہیں جو دعائیں کرتے ہیں کہ اے ہمارے رب ہمیں دنیا کی بھلائیاں عطا فرما اور جہنم کے عذاب سے ہمیں نجات عطا فرما۔ یہ جنہیں ان کے اعمال کا پورا حصہ ملے گا اور جگہ ہے جو آخرت کی کھیتی کا ارادہ رکھے ہم اس کی کھیتی میں زیادتی کریں گے۔

ایک اور آیت میں ہے: ﴿مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعَاجِلَةَ﴾ (الاسراء:١٨) جو شخص دنیا طلب ہے تو ہم جسے چاہیں جتنا چاہیں دے دیں۔ امام ابن جریر نے اس آیت کے یہ معنی بیان کئے ہیں کہ جن منافقوں نے دنیا کی جستجو میں ایمان قبول کیا تھا۔ انہیں دنیا تو مل گئی یعنی مسلمانوں سے مال غنیمت میں حصہ بنالیا لیکن آخرت کی زندگی میں ان کے لئے اللہ کے پاس جو تیاری ہے وہ انہیں وہاں ملے گی۔ یعنی جہنم کی آگ اور وہاں کے گوناگوں عذاب۔ تو امام صاحب مذکور کے نزدیک یہ آیت مثل آیت ﴿مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا﴾ (ہود:١٥) کے ہے۔ کوئی شک نہیں کہ اس آیت کے معنی تو بظاہر یہی ہیں لیکن پہلی آیت کو بھی اسی معنی میں لینا غور طلب امر ہے۔ کیونکہ اس آیت کے الفاظ تو صاف بتا رہے ہیں کہ دنیا اور آخرت کی خیر کا دینا اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ تو ہر شخص کو چاہئے کہ وہ ایک ہی چیز کی جستجو میں نہ لگا رہے۔ بلکہ دونوں چیزوں کے حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ جو تمہیں دنیا دیتا ہے وہی آخرت کا مالک بھی ہے۔ یہ بڑی پست ہمتی ہوگی کہ تم اپنی آنکھیں بند کر لو اور بہت دینے والے سے تھوڑا مانگو۔ نہیں نہیں بلکہ تم دنیا اور آخرت کے بڑے بڑے کاموں اور بہترین مقاصد کو حاصل کرنے کی کوشش و سعی کرو۔ یاد رکھو کہ دونوں جہان کا مالک وہی ہے۔ ہر ہر نفع و نقصان اسی کے ہاتھ میں ہے۔ کوئی نہیں جو اس کے ساتھ شریک ہو یا اس کے کاموں میں دخل رکھتا ہو۔ سعادت و شقاوت اس نے تقسیم کی ہے۔ خزانوں کی کنجیاں اس نے اپنی مٹھی میں رکھ لی ہیں وہ ہر ایک مستحق کو جانتا ہے اور جس کا وہ مستحق ہوتا ہے اسے وہی پہنچاتا ہے۔ بھلا تم غور تو کرو کہ تمہیں دیکھنے سننے کی طاقت دینے والے کا دیکھنا سننا کیسا کچھ ہوگا۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰٓى

اَنۡفُسِكُمۡ اَوِ الۡوَالِدَيۡنِ وَالۡاَقۡرَبِيۡنَ‌ ۚ اِنۡ يَّكُنۡ غَنِيًّا اَوۡ فَقِيۡرًا فَاللّٰهُ اَوۡلٰى بِهِمَا‌ فَلَا تَتَّبِعُوا الۡهَوٰٓى اَنۡ تَعۡدِلُوۡا‌ ۚ وَاِنۡ تَلۡوٗۤا اَوۡ تُعۡرِضُوۡا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ خَبِيۡرًا ﴿۱۳۵﴾

اے ایمان والو! انصاف پر خوب قائم رہنے والے اللہ کے لئے گواہی دینے والے رہو اگر چہ اپنی ہی ذات کے لئے ہو یا والدین یا دوسرے رشتہ داروں کے مقابلہ میں ہو۔ وہ شخص اگر امیر ہے تو اور غریب ہے تو دونوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کو زیادہ تعلق ہے سو تم خواہش نفس کا اتباع مت کرنا کہ کبھی تم حق سے ہٹ جاؤ اور اگر تم کج بیانی کرو گے یا پہلو تہی کرو گے تو بلاشبہ اللہ تعالیٰ تمہارے سب اعمال کی پوری طرح خبر رکھتے ہیں۔ ○

انصاف دوستی ☆

اللہ تعالیٰ ایمانداروں کو حکم دیتا ہے کہ وہ عدل وانصاف پر مضبوطی سے جمے رہیں۔ اس سے ایک انچ ادھر اُدھر نہ ہٹیں۔ ایسا نہ ہو کسی کے ڈر کی وجہ سے یا کسی لالچ کی بنا پر یا کسی خوشامد میں کسی پر رحم کھا کر یا کسی سفارش سے عدل وانصاف چھوڑ بیٹھیں۔ سب مل کر عدل وانصاف کو جاری کریں۔ ایک دوسرے کی اس معاملہ میں مدد کریں اور خلق اللہ میں عدالت کو عام کر دیں۔ اللہ کے لئے گواہ بن جائیں۔ جیسے اور جگہ ہے: ﴿ وَاَقِيۡمُوا الشَّهَادَةَ لِلّٰهِ ﴾ (الطلاق: ۲) یعنی گواہیاں اللہ کی رضا جوئی کے لئے دو۔ جو بالکل صحیح صاف اور بے لاگ ہوں' بدخو نہیں' چھپاؤ نہیں' چبا کر نہ بولو[1]۔ صاف صاف سچی شہادت دو۔ گو وہ خود تمہارے خلاف ہو۔ تم حق گوئی سے نہ رکو اور یقین مانو کہ اللہ تعالیٰ اپنے اطاعت گزار غلاموں کی نجات کی صورتیں بہت سی نکال دیتا ہے۔ کچھ اسی پر موقوف نہیں کہ جھوٹی شہادت سے ہی اس کا چھٹکارا ہوگا۔ گو سچی اطاعت ماں باپ کے خلاف ہوتی ہو گو اس شہادت سے رشتہ داروں کا نقصان ہوتا ہو۔ لیکن تم سچ کو ہاتھ سے نہ جانے دو۔ گواہی سچی دے دو۔ اسی لئے کہ حق ہر ایک پر حاکم ہے۔ گواہی کے وقت نہ تونگر کا لحاظ کرو نہ غریب پر رحم کرو۔ ان کی مصلحتوں کو اللہ تم سے بہتر جانتا ہے۔ تم ہر صورت اور ہر ہر حالت میں سچی شہادت ادا کرو۔ دیکھو کسی کے برے میں آ کر خود اپنا برا نہ کر لو۔ کسی کی دشمنی میں عصبیت اور قومیت میں فنا ہو عدل وانصاف ہاتھ سے نہ چھوڑ بیٹھو۔ بلکہ ہر حال' ہر آن عدل کا انصاف کا مجسمہ بنے رہو۔ جیسے اور جگہ فرمان باری ہے: ﴿ وَلَا يَجۡرِمَنَّكُمۡ شَنَاٰنُ قَوۡمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعۡدِلُوۡا‌ ؕ اِعۡدِلُوۡا هُوَ اَقۡرَبُ لِلتَّقۡوٰى ﴾ (المائدہ: ۸) کسی قوم کی عداوت تمہیں خلاف عدل کرنے پر آمادہ نہ کرے۔ عدل کرتے رہو۔ یہی تقویٰ کی شان کے قریب تر ہے۔ حضرت عبداللہ بن رواحہ کو جب رسول اللہ ﷺ نے خیبر والوں کے کھیتوں اور باغوں کا اندازہ کرنے کو بھیجا تو انہوں نے آپؓ کو رشوت دینی چاہی کہ آپ مقدار کم بتائیں تو آپ نے فرمایا: سنو! اللہ کی قسم نبی ﷺ مجھے تمام مخلوق سے زیادہ عزیز ہیں اور تم میرے نزدیک کتوں اور خنزیروں سے بدتر ہو۔ لیکن باوجود اس کے حضور ﷺ کی محبت میں آ کر یا تمہاری عداوت کو سامنے رکھ کر ناممکن ہے کہ میں انصاف سے ہٹ جاؤں اور تم میں عدل نہ کروں۔ سن کر وہ کہنے لگے۔ بس اسی سے تو زمین وآسمان قائم ہے۔ یہ پوری سورہ مائدہ کی تفسیر میں آئے گی ان شاء اللہ تعالیٰ۔ پھر فرماتا ہے کہ اگر تم نے شہادت میں تحریف کی غلط گوئی سے کام لیا۔ واقعہ کے خلاف گواہی دی۔ دلی زبان سے

[1] یعنی آدھی بات منہ میں اور آدھی پیٹ میں جیسا کہ بعض آدمیوں کی عادت ہوتی ہے کہ صاف گوئی سے کام لینے کے بجائے ایسے حربے استعمال کرتے ہیں۔

پیچیدہ الفاظ کہے۔ واقعات کم بیش کر دیئے یا کچھ چھپالیا' کچھ بیان کر دیا تو یاد رکھو اللہ تعالیٰ جیسے باخبر حاکم کے سامنے یہ چال نہیں چل سکتی۔ وہاں جا کر اس کا بدلہ پاؤ گے اور سزا بھگتو گے۔ حضور ﷺ رسول مقبول ﷺ کا ارشاد پاک ہے: بہترین گواہ وہ ہیں جو دریافت کرنے سے پہلے ہی سچی گواہی دے دیں۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْ نَزَّلَ عَلٰي رَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ ۭ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاللّٰهِ وَمَلٰۗىِٕكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا ﴿١٣٦﴾

اے ایمان والو! تم اعتقاد رکھو اللہ کے ساتھ اور اس کے رسول کے ساتھ اور اس کتاب کے ساتھ جو اس نے اپنے رسول پر نازل فرمائی اور ان کتابوں کے ساتھ جو کہ پہلے نازل ہو چکی ہیں اور جو شخص اللہ کا انکار کرے اور اس کے فرشتوں کا اور اس کی کتابوں کا اور اس کے رسولوں کا اور روز قیامت کا تو وہ شخص گمراہی میں بڑی دور جا پڑا۔ O

ایمان پر استقامت کا حکم ☆

ایمان والوں کو حکم ہو رہا ہے کہ ایمان میں پورے پورے داخل ہو جائیں تمام احکام کو کل شریعت کو ایمان کی تمام جزئیات کو مان لیں۔ یہ خیال نہ ہو کہ اس میں تحصیل حاصل ہے۔ نہیں بلکہ تکمیل کامل ہے۔ ایمان لائے ہو تو اب اسی پر قائم رہو۔ اللہ کو مانا ہے تو جیسے جس طرح وہ منوائے مانتے چلے جاؤ۔ یہی مطلب ہر مسلمان کی اس دعا کا ہے کہ ہمیں صراط مستقیم کی ہدایت کر یعنی ہماری ہدایت کو ثابت قدم رکھ مدام رکھ۔ اس میں ہمیں مضبوط کر اور دن بدن بڑھاتا رہ۔ اسی طرح یہاں بھی مؤمنوں کو اپنی ذات پر اور اپنے رسول پر ایمان لانے کو فرمایا گیا ہے اور آیت میں ایمانداروں سے خطاب کر کے فرمایا: اللہ سے ڈرو اور اس کے رسول ﷺ پر ایمان لاؤ' پہلی کتاب سے مراد قرآن ہے اور اس سے پہلے کی کتاب سے مراد تمام نبیوں پر جو جو کتابیں نازل ہوئیں سب ہیں۔ قرآن کے لئے لفظ نَزَّلَ بولا گیا اور دیگر کتابوں کے لئے اَنْزَلَ۔ اس لئے کہ قرآن بتدریج وقتاً فوقتاً تھوڑا تھوڑا کر کے اترا اور باقی کتابیں پوری کی پوری ایک ساتھ نازل ہوئیں۔ پھر فرمایا جو شخص اللہ کے ساتھ' اس کے فرشتوں کے ساتھ' اس کی کتابوں کے ساتھ اس کے رسولوں کے ساتھ' آخرت کے دن کے ساتھ کفر کرے[1] وہ راہ ہدایت سے بہک گیا اور بہت دور کی غلط راہ پر پڑ گیا۔ گمراہی میں ادھر سے اُدھر ہو گیا۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا ثُمَّ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا ثُمَّ ازْدَادُوْا كُفْرًا لَّمْ يَكُنِ اللّٰهُ لِيَغْفِرَ لَھُمْ وَلَا لِيَهْدِيَھُمْ سَبِيْلًا ﴿١٣٧﴾ بَشِّرِ الْمُنٰفِقِيْنَ بِاَنَّ لَھُمْ

[1] یعنی آخرت کے دن کا انکار کرے اور کہے کہ قیامت وغیرہ کوئی چیز نہیں ہے' والعیاذ باللہ ۱۲

عَذَابًا اَلِيْمَا ﴿١٣٨﴾ اِلَّذِيْنَ يَتَّخِذُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۭ اَيَبْتَغُوْنَ عِنْدَهُمُ الْعِزَّةَ فَاِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ﴿١٣٩﴾ وَقَدْ نَزَّلَ عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ اَنْ اِذَا سَمِعْتُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ يُكْفَرُ بِهَا وَيُسْتَهْزَاُ بِهَا فَلَا تَقْعُدُوْا مَعَهُمْ حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖٓ ڮ اِنَّكُمْ اِذًا مِّثْلُهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ جَامِعُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْكٰفِرِيْنَ فِيْ جَهَنَّمَ جَمِيْعَا ﴿١٤٠﴾

بلاشبہ جو لوگ مسلمان ہوئے پھر کافر ہو گئے پھر مسلمان ہوئے پھر کافر ہو گئے پھر کفر میں بڑھتے چلے گئے اللہ تعالیٰ ایسوں کو ہرگز نہ بخشیں گے اور نہ ان کو راستہ دکھائیں گے۔ منافقین کو خوشخبری سنا دیجئے اس امر کی کہ ان کے واسطے بڑی دردناک سزا ہے جس کی حالت یہ ہے کہ کافروں کو دوست بناتے ہیں مسلمانوں کو چھوڑ کر۔ کیا ان کے پاس معزز رہنا چاہتے ہیں سو اعزاز تو سارا اللہ کے قبضہ میں ہے اور اللہ تعالیٰ تمہارے پاس یہ فرمان بھیج چکا ہے کہ جب احکام الٰہیہ کے ساتھ کفر اور استہزاء ہوتا ہوا سنو تو ان لوگوں کے پاس مت بیٹھو جب تک کہ وہ کوئی اور بات شروع نہ کر دیں کہ اس حالت میں تم بھی ان ہی جیسے ہو جاؤ گے۔ یقیناً اللہ تعالیٰ منافقوں کو اور کافروں کو سب کو دوزخ میں جمع کر دیں گے۔○

ارتداد کی سزا ☆

ارشاد ہو رہا ہے کہ جو ایمان لا کر پھر مرتد ہو جائے۔ پھر مومن ہو کر کافر بن جائے۔ پھر اپنے کفر پر جم جائے اور اسی حالت میں مر جائے نہ اس کی توبہ قبول نہ اس کی بخشش کا امکان نہ انہیں چھٹکارا نہ فلاح نہ اللہ انہیں بخشے نہ راہ پر لائے۔ حضرت علیؓ اس کی تلاوت فرما کر فرماتے تھے۔ مرتد تین بار کہا جائے کہ توبہ کر لے۔ پھر فرمایا: یہ منافقوں کا حال ہے کہ آخر ان کے دلوں پر مہر لگ جاتی ہے۔ پھر وہ مومنوں کو چھوڑ کر کافروں سے تعلق رکھتے ہیں۔ ادھر بظاہر مومنوں سے ملے جلے رہتے ہیں ادھر کافروں میں بیٹھ کر مومنوں کا مذاق اڑاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم تو انہیں بیوقوف بنا رہے ہیں' دراصل ساتھ تو ہم تمہارے ہیں۔ پس اللہ تعالیٰ ان کے مقصد اصلی کو ان کے سامنے اس میں ان کی ناکامی کو بیان فرماتا ہے کہ تم چاہتے ہو ان کے پاس تمہاری عزت ہو' یہ غلط فہمی ہے اور تم غلطی کر رہے ہو۔ سنو عزت کا مالک تو اللہ تعالیٰ وحدہٗ لاشریک ہے' جسے وہ چاہے عزت دیتا ہے اور آیت میں ہے: ﴿مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعِزَّةَ﴾ اور فرمایا: ﴿وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ﴾ (فاطر ١٠) یعنی عزت اللہ کے لئے ہے اور اس کے رسول کے لئے اور مومنوں کی۔ لیکن منافق بے سمجھ لوگ ہیں۔ مقصود یہ ہے کہ اگر حقیقی عزت چاہتے ہو تو اللہ کے نیک بندوں کے ساتھ مل جاؤ۔ اس کی عبادت کرو اور اس جناب باری سے عزت کے خواہاں بنو۔ دنیا و آخرت میں تمہیں عزیز بنا دے گا۔ مسند احمد بن حنبلؒ کی یہ حدیث اس جگہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: جو شخص فخر و غرور کے طور پر اپنی عزت ظاہر

کرنے کے لئے اپنا نسب اپنے کفار باپ دادوں سے لگائے اور نوتک پہنچ جائے[1] وہ بھی دسواں جہنمی ہوگا۔ پھر فرمان ہے جب میں تمہیں منع کر چکا کہ جس مجلس میں اللہ کی آیتوں کا انکار کیا جا رہا ہو اور انہیں مذاق میں اڑایا جا رہا ہو۔ اس میں مت بیٹھو۔ پھر بھی اگر تم ایسی مجلسوں میں شریک ہوتے رہو گے تو یاد رکھو میرے ہاں تم بھی ان کے شریک کار سمجھے جاؤ گے۔ ان کے گناہ میں تم بھی ان ہی جیسے ہو جاؤ گے۔ جیسے ایک حدیث میں ہے کہ جس مجلس دستر خوان پر شراب نوشی ہو رہی ہو۔ اس پر کسی ایسے کو نہ بیٹھنا چاہئے جو اللہ پر اور روز قیامت پر ایمان رکھتا ہو۔ اس آیت میں جس ممانعت کا حوالہ دیا گیا ہے وہ سورہ انعام کی جو مکی ہے یہ آیت ہے: ﴿وَاِذَا رَاَیْتَ الَّذِیْنَ یَخُوْضُوْنَ فِیْٓ اٰیٰتِنَا فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ﴾ (الانعام:۶۸) جب تو انہیں دیکھے جو میری آیتوں میں غلط طور پر فکر کرنے بیٹھ جاتے ہیں تو تو ان سے منہ موڑ لے۔ حضرت مقاتل بن حیان فرماتے ہیں۔ اس آیت کا یہ حکم ﴿اِنَّكُمْ اِذًا مِّثْلُهُمْ﴾ (الانعام:۶۹) اللہ تعالیٰ کے اس فرمان: ﴿وَمَا عَلَى الَّذِیْنَ یَتَّقُوْنَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِّنْ شَیْءٍ وَّلٰكِنْ ذِكْرٰى لَعَلَّهُمْ یَتَّقُوْنَ﴾ سے منسوخ ہو گیا ہے۔ یعنی متقیوں پر ان کے حساب کا کوئی بوجھ نہیں۔ لیکن نصیحت ہے کیا عجب کہ وہ بچ جائیں۔ پھر فرمان باری ہے: اللہ تعالیٰ تمام منافقوں کو اور سارے کافروں کو جہنم میں جمع کرنے والا ہے۔ یعنی جس طرح یہ منافق ان کافروں کے کفر میں یہاں شریک ہیں قیامت کے دن جہنم میں ہمیشہ رہنے کے لئے اور وہاں کے سخت تر دل ہلانے والے عذابوں کے سہنے میں بھی ان کے شریک حال رہیں گے۔ وہاں کی سزاؤں میں وہاں کی قید و بند میں طوق و زنجیر میں گرم پانی کے کڑوے گھونٹ اتارنے میں اور پیپ لہو کے زہر مار کرنے میں بھی ان کے ساتھ ہوں گی اور دائمی سزا کا اعلان سب کے ساتھ ہی سنا دیا جائے گا۔

الَّذِیْنَ یَتَرَبَّصُوْنَ بِكُمْ ۚ فَاِنْ كَانَ لَكُمْ فَتْحٌ مِّنَ اللّٰهِ قَالُوْٓا اَلَمْ نَكُنْ مَّعَكُمْ ۖ وَاِنْ كَانَ لِلْكٰفِرِیْنَ نَصِیْبٌ ۙ قَالُوْٓا اَلَمْ نَسْتَحْوِذْ عَلَیْكُمْ وَنَمْنَعْكُمْ مِّنَ الْمُؤْمِنِیْنَ ؕ فَاللّٰهُ یَحْكُمُ بَیْنَكُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ ؕ وَلَنْ یَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِیْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِیْنَ سَبِیْلًا ﴿۱۴۱﴾

وہ ایسے ہیں کہ تم پر افتاد پڑنے کے منتظر رہتے ہیں۔ پھر اگر تمہاری فتح منجانب اللہ ہوگئی تو باتیں بناتے ہیں کہ کیا ہم تمہارے ساتھ نہ تھے اور اگر کافروں کو کچھ حصہ مل گیا تو باتیں بناتے ہیں کہ ہم تم پر غالب نہ آنے لگے تھے اور کیا ہم نے تم کو مسلمانوں سے بچا نہیں لیا۔ سو اللہ تعالیٰ تمہارا اور ان کا قیامت میں فیصلہ فرما دیں گے اور ہرگز اللہ تعالیٰ کافروں کو مسلمانوں کے مقابلہ میں غالب نہ فرمائیں گے۔ ○

[1] یعنی اپنی خاندانی نو پشت شمار کرتے ہوئے ہر پشت میں کافروں کے ساتھ اپنا تعلق بیان کرے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اگر نو سے کم پشتیں ذکر کرے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ یہ سمجھنا غلط ہوگا کہ کفار کے ساتھ اپنا تعلق ظاہر کرنا یا اس تعلق پر فخر کرنا ہر حال میں ناپسندیدہ ہے۔ نو کا عدد محض اتفاقاً ذکر کر دیا ہے۔

منافقین کا حال ☆

منافقوں کی بد باطنی کا ذکر ہے کہ مسلمانوں کی بربادی ان کی پستی کی تلاش میں لگے رہتے ہیں۔ حالات معلوم کرتے رہتے ہیں۔ اگر کسی جہاد میں مسلمان کامیاب وکامران ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ کی مدد سے یہ غالب آ گئے تو ان کو دھوکہ دینے کے لئے کہتے ہیں: کیوں جی ہم بھی تو تمہارے ساتھی ہیں اور اگر کسی وقت مسلمانوں کی آزمائش کے لئے اللہ نے کافروں کو غلبہ دے دیا جیسے احد میں ہوا تھا' گو انجام کار حق ہی غالب رہا۔ تو ان کی طرف لپکتے ہیں اور کہتے ہیں دیکھو پوشیدہ طور پر تو ہم تمہاری تائید ہی کرتے رہے اور انہیں نقصان پہنچاتے رہے۔ یہ ہماری ہی چالاکی تھی' جس کی بدولت آج تم نے ان پر فتح پالی۔ یہ ہیں ان کے کرتوت کہ دو کشتیوں میں پاؤں رکھ چھوڑتے ہیں۔ دھوبی کا کتا نہ گھر کا نہ گھاٹ کا۔ گو یہ اپنی مکاری کو باعث فخر جانتے ہیں' لیکن دراصل یہ سراسر ان کی بے ایمانی اور کم یقینی کی دلیل ہے۔ بھلا کچا رنگ کب تک؟ گاجر کی پونگی کب تک بجے گی؟ کاغذ کی ناؤ کب تک چلے گی۔ وقت آ رہا ہے کہ اپنے کئے پر نادم ہوں گے۔ اپنی بیوقوفی پر ہاتھ ملیں گے۔ اپنے شرمناک کرتوت پر آنسو بہائیں گے۔ اللہ کا سچا فیصلہ سن لیں گے اور تمام بھلائیوں سے ناامید ہو جائیں گے۔ بھرم کھل جائے گا۔ راز فاش ہو جائے گا۔ اندر کا باہر آ جائے گا۔ یہ پالیسی اور حکمت عملی۔ یہ مصلحت وقت اور اقتضائے موقع نہایت ڈراؤنی صورت میں سامنے آ جائے گا۔ عالم الغیب کے بے پناہ عذابوں کا شکار بن جائیں گے۔ ناممکن ہے کہ کافروں کو اللہ تعالیٰ مؤمنوں پر کامیابی دے دے۔ حضرت علیؓ سے ایک شخص نے اس کا مطلب پوچھا تو آپ نے اول جملے کے ساتھ ملا کر پڑھ دیا۔ مطلب یہ تھا کہ قیامت کے دن ایسا نہ ہوگا۔ یہ بھی مروی ہے کہ سبیل سے مراد حجت ہے لیکن تاہم اس کے ظاہری معنی مراد لینے میں بھی کوئی مانع نہیں۔ یعنی ناممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ اب سے لے کر قیامت تک کوئی ایسا وقت لائے کہ کافر اس قدر غلبہ حاصل کریں کہ مسلمانوں کا نام مٹا دیں۔ یہ اور بات ہے کہ کسی جگہ کسی وقت دنیوی طور پر انہیں غلبہ مل جائے۔ لیکن انجام کار مسلمانوں کے حق میں مفید ہوگا۔ دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔

فرمان خداوندی ہے: ﴿اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا﴾ (۴۰: ۵۱) ہم اپنے رسولوں کی اور ایمانداروں کی مدد دنیا میں بھی لازمی طور پر ضرور کریں گے اور اس معنی کے کرنے میں ایک لطافت یہ بھی ہے کہ منافقوں کو جو مسلمانوں کی ذلت کے اور ان کی بربادی کے آنے کے وقت کا انتظار تھا' مایوس کر دیا گیا کہ کفار کو مسلمانوں پر اللہ تعالیٰ اس طرح غالب نہ کر دے کہ تم پھولے نہ سماؤ اور وہ جس ڈر سے مسلمانوں کا ساتھ کھلے طور پر نہ دیتے تھے۔ اس ڈر کو بھی زائل کر دیا۔ کہ یہ نہ سمجھو کہ کسی وقت بھی مسلمان مٹ جائیں گے۔ اسی مطلب کی وضاحت آیت: ﴿فَتَرَى الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ﴾ (المائدہ ۵۲) میں کر دی ہے۔ اس آیت کریمہ سے حضرات علماء کرام نے اس امر پر بھی استدلال کیا ہے کہ مسلمان غلام کو کافر کے ہاتھ بیچنا جائز نہیں۔ کیونکہ اس صورت میں ایک کافر کو ایک مسلمان پر غالب کر دینا ہے اور اس میں مسلم کی ذلت ہے جن بعض ذی علم حضرات نے اس سودے کو جائز رکھا ہے وہ اسے حکم کرتے ہیں کہ اپنی ملک اس سے اسی وقت زائل کر دے۔

اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَهُوَ خَادِعُهُمْ ۚ وَاِذَا قَامُوْٓا اِلَى الصَّلٰوةِ

قَامُوْٓا كُسَالٰى ۙ يُرَآءُوْنَ النَّاسَ وَلَا يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ اِلَّا قَلِيْلًا ۝۱۴۲ مُّذَبْذَبِيْنَ بَيْنَ ذٰلِكَ ۖ لَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ وَلَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ ۭ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ سَبِيْلًا ۝۱۴۳

بلا شبہ منافق لوگ چالبازی کرتے ہیں اللہ سے حالانکہ اللہ تعالیٰ اس چال کی سزا ان کو دینے والے ہیں اور جب نماز کو کھڑے ہوتے ہیں تو بہت ہی کاہلی کے ساتھ کھڑے ہوتے ہیں صرف آدمیوں کو دکھلاتے ہیں اور اللہ کا ذکر بھی نہیں کرتے مگر بہت ہی مختصر۔ معلق ہو رہے ہیں دونوں کے درمیان نہ ادھر نہ اُدھر اور جس کو اللہ تعالیٰ گمراہی میں ڈال دیں ایسے شخص کے لئے کوئی سبیل نہ پاؤ گے۔ ○

منافقین کا فریب ☆

سورۂ بقرہ کے شروع میں بھی آیت: ﴿یُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ﴾ اس مضمون کی گزر چکی ہے۔ یہاں بھی بیان ہو رہا ہے کہ یہ کم سمجھ منافق اس اللہ کے سامنے چالیں چلتے ہیں جو سینوں میں چھپی ہوئی باتوں اور کل کے پوشیدہ رازوں سے آگاہ ہے۔ کم فہمی سے یہ خیال کئے ہوئے بیٹھے ہیں کہ جس طرح ان کا نفاق دنیا میں چل گیا اور مسلمانوں میں ملے جلے رہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کے پاس بھی یہ مکاری چل جائے گی۔ چنانچہ قرآن میں ہے کہ قیامت کے دن بھی یہ لوگ اللہ کے سامنے اپنی یکرنگی کی قسمیں کھائیں گے۔ جیسے یہاں کھاتے ہیں۔ لیکن اس عالم الغیب کے سامنے یہ قسمیں ہرگز کارآمد نہیں ہو سکتیں۔ اللہ بھی انہیں دھوکے میں رکھ رہا ہے۔ وہ ڈھیل دیتا ہے بڑھوتری دیتا ہے۔ یہ پھولتے ہیں خوش ہوتے ہیں اور اپنے لئے اسے اچھائی سمجھتے ہیں۔ قیامت میں بھی ان کا یہی حال ہوگا۔ مسلمانوں کے نور کے سہارے میں ہوں گے۔ وہ آگے نکل جائیں گے۔ یہ آوازیں دیں گے کہ ٹھہرو ہم بھی تمہاری روشنی میں چلیں گے۔ جواب ملے گا کہ پیچھے مڑ جاؤ اور روشنی میں تلاش کر لاؤ۔ یہ مڑیں گے ادھر حجاب حائل ہو جائے گا۔ مسلمانوں کی جانب رحمت اور ان کی جانب زحمت۔ حدیث شریف میں ہے جو ستائے گا اللہ بھی اسے ستائے گا اور جو ریاکاری کرے گا اللہ بھی اسے دکھائے گا ایک اور حدیث میں ہے۔ ان منافقوں میں وہ بھی ہوں گے کہ بظاہر لوگوں کے سامنے اللہ تعالیٰ ان کی نسبت فرمائے گا انہیں جنت میں لے جاؤ۔ فرشتے لے جا کر دوزخ میں ڈال دیں گے۔ اللہ تعالیٰ اپنی پناہ میں رکھے۔

پھر ان منافقوں کی بدذوقی کا بیان ہو رہا ہے کہ نماز جیسی بہترین عبادت بھی مشغولیت اور دلچسپی سے ادا کرنی انہیں نصیب نہیں ہوتی۔ کیونکہ نیک نیتی حسن عمل حقیقی ایمان سچا یقین ان میں ہے ہی نہیں۔ حضرت ابن عباسؓ تھکے ہارے ہوئے بدن سے کسمسا کر نماز پڑھنا مکروہ جانتے تھے اور فرماتے تھے نمازی کو چاہیے کہ ذوق وشوق سے راضی خوشی پوری رغبت سے اور انتہائی توجہ کے ساتھ نماز میں کھڑا ہو اور یقین مانے کہ اس کی آواز پر اللہ کے کان ہیں۔ اس کی طلب پوری کرنے پر اللہ تعالیٰ تیار ہے۔ یہ تو ہوئی ان منافقوں کی ظاہری حالت کہ تھکے ہارے تنگ دلی کے ساتھ بطور بیگار ٹالنے کے نماز کے لئے آتے ہیں۔ پھر اندرونی حالت یہ ہے کہ اخلاص سے کوسوں دور ہیں۔ رب سے کوئی تعلق نہیں رکھتے۔ نمازی مشہور ہونے کے لئے

لوگوں میں اپنے ایمان کو ظاہر کرنے کے لئے نمازیں پڑھ رہے ہیں۔ بھلا ان صنم آشنا دل والوں کو نماز میں کیا مے گا۔ یہی وجہ ہے کہ ان نمازوں میں جن میں لوگ ایک دوسرے کو کم دیکھ سکیں۔ یہ غیر حاضر رہتے ہیں مثلاً عشاء کی نماز اور فجر کی نماز۔ بخاری مسلم میں ہے۔ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں: سب سے زیادہ بوجھل نماز منافقوں پر عشاء اور فجر کی ہے۔ اگر دراصل یہ ان نمازوں کے فضائل کے دل سے قائل ہوتے تو گھٹنوں چل کر آنا پڑے یہ ضرور آ جاتے۔ میں تو ارادہ کر رہا ہوں کہ تکبیر ہوا کر کسی کو اپنی جگہ کھڑا کر کے نماز شروع کرا کر کچھ لوگوں سے لکڑیاں اٹھوا کر ان کے گھروں میں جاؤں جو جماعت میں شامل نہیں ہوتے اور لکڑیاں ان کے گھروں کے اردگرد لگا کر حکم دوں کہ آگ لگا دو اور ان کے گھروں کو جلا دو۔ ایک روایت میں ہے اللہ کی قسم اگر انہیں ایک چرب ہڈی یا دو اچھے کھر ملنے کی امید ہو تو دوڑے چلے آئیں لیکن آخرت کی اور اللہ کے ثوابوں کی انہیں اتنی بھی قدر نہیں۔ اگر بال بچوں اور عورتوں کا جو گھروں میں رہتے ہیں مجھے خیال نہ ہوتا۔ تو قطعاً میں ان کے گھر جلا دیتا۔

ابو یعلی میں ہے حضور ﷺ فرماتے ہیں جو شخص لوگوں کی موجودگی میں تو نماز کو سنوار کر ٹھہر ٹھہرا کر ادا کرے۔ لیکن جب کوئی نہ ہو تو بری طرح نماز پڑھ لے۔ یہ وہ ہے جس نے اپنے رب کی اہانت کی۔ پھر فرمایا: یہ لوگ ذکر اللہ بھی بہت ہی کم کرتے ہیں۔ یعنی نماز میں ان کا دل نہیں لگتا۔ یہ اپنی کہی ہوئی بات سمجھتے بھی نہیں بلکہ غافل دل اور بے پروا نفس سے نماز پڑھ دیتے ہیں۔ آنحضرت ﷺ فرماتے ہیں: یہ نماز منافق کی ہے۔ یہ نماز منافق کی ہے کہ بیٹھا ہوا سورج کو دیکھ رہا ہے۔ یہاں تک کہ وہ ڈوبنے لگا اور شیطان نے اپنے دونوں سینگ اس کے اردگرد لگا دیئے تو یہ کھڑا ہوا اور جلدی جلدی چار رکعتیں پڑھ لیں جن میں اللہ کا ذکر برائے نام ہی کیا (مسلم وغیرہ) یہ منافق متحیرہ ششدرو پریشان حال ہیں۔ ایمان و کفر کے درمیان ان کا دل ڈانواں ڈول ہو رہا ہے۔ نہ تو صاف طور پر مسلمانوں کے ساتھی ہیں نہ بالکل کفار کے ساتھ۔ کبھی نور ایمان چمک اٹھا۔ تو اسلام کی صداقت کرنے لگے۔ کبھی کفر کی اندھیریاں غالب آ گئیں تو ایمان سے یکسو ہو گئے۔ نہ تو حضور ﷺ کے صحابہؓ کی طرف ہیں نہ یہودیوں کی جانب۔ رسول اللہ کا ارشاد ہے کہ منافق کی مثال ایسی ہے دو ریوڑ کے درمیان کی بکری کہ کبھی تو وہ میں میں کرتی اس ریوڑ کی طرف دوڑتی ہے کبھی اس طرف اس کے نزدیک بھی طے نہیں ہوا کہ اس میں جائے یا اس کے پیچھے لگے۔ ایک روایت میں ہے کہ اس معنی کی حدیث حضرت عبید بن عمیر نے حضور عبداللہ بن عمرؓ کی موجودگی میں کچھ الفاظ کے ہیر پھیر سے بیان کی تو حضرت عبداللہ نے اسے سنتے ہوئے الفاظ دوہرا کر کہا: یوں نہیں بلکہ دراصل حدیث یوں ہے۔ جس پر حضرت عبید ناراض ہوئے۔ ممکن ہے ایک بزرگ نے ایک طرح کے حالات سنے ہوں دوسرے نے دوسری قسم کے۔

منافق کی مثال ☆

ابن ابی حاتم میں ہے مؤمن کافر اور منافق کی مثال ان تین شخصوں جیسی ہے۔ جو ایک دریا پر گئے۔ ایک تو کنارے پر کھڑا رہ گیا' دوسرا اتر کر پار ہو کر منزل مقصود تک پہنچ گیا' تیسرا اترا چلا' جب بیچوں بیچ پہنچا تو ادھر والے نے پکارنا شروع کیا کہ کہاں ہلاک ہونے چلا۔ ادھر آ واپس چلا آ۔ ادھر والے نے آواز دی کہ آ جاؤ نجات کے ساتھ منزل مقصود پر میری طرح پہنچ جاؤ' آدھا راستہ طے کر چکے ہو۔ اب یہ حیران ہو کر کبھی ادھر دیکھتا ہے کبھی ادھر نظر ڈالتا ہے۔ مذبذب ہے کہ کدھر جاؤں کدھر نہ جاؤں؟ ایک زبردست موج آئی اور بہا کر لے چلی۔ غوطے پر غوطے کھا کھا کر مر گیا۔ پس پار ہو جانے والا تو مسلمان ہے۔ کنارے پر کھڑا رہ جانے والا کافر ہے اور موج میں ڈوب مرنے والا منافق ہے اور حدیث میں ہے منافق کی مثال اس بکری

جیسی ہے جو ہرے بھرے ٹیلے پر بکریوں کو دیکھ کر آئی اور سونگھ کر چلی گئی۔ پھر دوسرے ٹیلے پر چڑھی اور سونگھ کر آ گئی۔ پھر فرمایا: جسے اللہ کی راہ حق سے پھیر دے۔ اس کا ولی و مرشد کون ہو؟ اس کے گمراہ کردہ کو راہ کون دکھا سکے؟ اللہ تعالیٰ نے ان منافقوں کو ان کی بدترین بدعملی کے باعث راستے سے دھکیل دیا ہے۔ اب نہ انہیں کوئی راہ راست پر لا سکے نہ چھٹکارا دلا سکے۔ اللہ تعالیٰ کی مرضی کے خلاف کون کر سکتا ہے۔ وہ سب پر حاکم ہے اس پر کسی کی حکومت نہیں۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۭ اَتُرِيْدُوْنَ اَنْ تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ عَلَيْكُمْ سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا ﴿١٤٤﴾ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ ۚ وَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ نَصِيْرًا ﴿١٤٥﴾ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا وَاَصْلَحُوْا وَاعْتَصَمُوْا بِاللّٰهِ وَاَخْلَصُوْا دِيْنَهُمْ لِلّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۭ وَسَوْفَ يُؤْتِ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿١٤٦﴾ مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ اِنْ شَكَرْتُمْ وَاٰمَنْتُمْ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ شَاكِرًا عَلِيْمًا ﴿١٤٧﴾

اے ایمان والو! تم مومنین کو چھوڑ کر کافروں کو دوست مت بناؤ کیا تم چاہتے ہو کہ اپنے اوپر اللہ تعالیٰ کی حجت صریح قائم کر لو۔ بلا شبہ منافقین دوزخ کے سب سے نیچے کے طبقے میں جاویں گے اور تو ہرگز ان کا مددگار نہ پاوے گا۔ لیکن جو لوگ توبہ کر لیں اور اصلاح کر لیں اور اللہ تعالیٰ پر وثوق رکھیں اور اپنے دین کو خالص اللہ کے لئے کیا کریں تو یہ لوگ مومنین کے ساتھ ہوں گے اور مومنین کو اللہ تعالیٰ اجر عظیم عطا فرمائیں گے۔ اللہ تعالیٰ تم کو سزا دے کر کیا کریں گے اگر تم سپاس گزاری کرو اور ایمان لے آؤ اللہ تعالیٰ بڑی قدر کرنے والے خوب جاننے والے ہیں۔ ○

کفار سے تعلق کی ممانعت ☆

کافروں سے دوستیاں کرنے سے ان سے دلی محبت کر رکھنے سے ان کے ساتھ ہر وقت اُٹھنے بیٹھنے سے مسلمانوں کے بھید ان کو دینے سے پوشیدہ تعلقات ان سے قائم رکھنے سے اللہ تعالیٰ ایمانداروں کو روک رہا ہے۔ جیسے اور آیت میں ہے: ﴿ لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴾ (آل عمران: ۲۸) مومنوں کو چاہئے کہ کفار سے دوستی نہ کریں۔ ایسا کرنے والا اللہ کے ہاں کسی بھلائی کا مستحق نہیں۔ ہاں اگر صرف بچاؤ کے طور پر ظاہرداری ہو تو اور بات ہے۔ اللہ تمہیں ڈرا رہا ہے۔ یعنی تم اس کی نافرمانیاں کرو گے تو اس کے عذابوں سے ڈرنا چاہئے۔ ابن ابی حاتم میں حضرت عبداللہ بن عباس کا فرمان روایت ہے کہ آپ نے فرمایا کہ قرآن میں جہاں کہیں ایسی عبارتوں میں سلطان کا لفظ آیا ہے وہاں اس کی مراد حجت ہے۔ یعنی اگر تم نے مومنوں کو چھوڑ کر کفار سے دلی دوستی کے تعلقات پیدا کئے تو تمہارا یہ فعل کافی ثبوت ہوگا اور پوری دلیل ہوگی۔ اس امر

کی دلیل کی اللہ تعالیٰ تمہیں سزا دے۔ کئی ایک سلف مفسرینؒ نے اس آیت کی یہی تفسیر کی ہے۔

منافقوں کا حسرت ناک انجام☆

پھر منافقوں کا انجام بیان فرماتا ہے کہ یہ اپنے اس سخت کفر کی وجہ سے جہنم کے سب سے نچلے طبقہ میں داخل کئے جائیں گے۔ درک مقابل ہے درجہ کے۔ بہشت میں درجے ہیں ایک سے ایک بالا اور دوزخ میں درک ہیں ایک سے ایک پست۔ حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں: انہیں آگ کے صندوقوں میں بند کر کے جہنم میں ڈالا جائے گا اور یہ جلتے جھلستے رہیں گے۔ حضرت ابن مسعود فرماتے ہیں: یہ صندوق لوہے کے ہوں گے جو آگ لگتے ہی آگ کے ہو جائیں گے ہر طرف سے بالکل بند ہو جائیں گے اور کوئی نہ ہوگا جو ان کی کسی طرح کی مدد کرے، جہنم سے نکال سکے یا عذابوں میں ہی کچھ کمی کرا سکے۔ ہاں ان میں سے جو توبہ کرلیں، نادم ہو جائیں اور سچے دل سے نفاق سے ہٹ جائیں اور رب سے اپنے اس گناہ کی معافی چاہیں۔ پھر اپنے اعمال میں اخلاص پیدا کریں۔ صرف خوشنودی اللہ اور مرضی مولیٰ کے لئے نیک اعمال پر کمر کس لیں۔ ریاکاری کو اخلاص سے بدل دیں۔ اللہ کے دین کو مضبوطی سے تھام لیں۔ تو بے شک اللہ تعالیٰ ان کی توبہ قبول فرمالے گا اور انہیں سچے مومنوں میں داخل کرے گا اور بڑے ثواب اور اعلیٰ اجر عنایت فرمائے گا۔ ابن ابی حاتم میں ہے' آنحضرت ﷺ فرماتے ہیں: اپنے دین کو خالص کرلو تو تھوڑا عمل بھی تمہیں کافی ہو جائے گا۔ پھر ارشاد ہوتا ہے کہ اللہ غنی ہے بے نیاز ہے۔ بندوں کو سزا کرنی وہ نہیں چاہتا۔ ہاں جب گناہوں پر دلیر ہو جائیں تو گوشمالی ضرور ہے۔ پس فرمایا: اگر تم اپنے اعمال کو سنوار لو اور اللہ پر اور اس کے رسول پر سچے دل سے ایمان لاؤ تو کوئی نہیں کہ اللہ تمہیں عذاب کرے۔ وہ تو چھوٹی چھوٹی نیکیوں کی بھی قدر کرنے والا ہے۔ جو اس کا شکر کرے وہ اس کی عزت افزائی کرتا ہے وہ پورے اور صحیح علم والا ہے جانتا ہے کہ کس کا عمل اخلاص والا ہے اور قبولیت اور قدر کے لائق ہے۔ اسے معلوم ہے کہ کس دل میں قوی ایمان ہے اور کون سا دل ایمان سے خالی ہے جو اخلاص اور ایمان والے ہیں' انہیں بھرپور اور کامل بدلے اللہ تعالیٰ عنایت فرمائے گا۔ (اللہ تعالیٰ ہمیں ایمان و اخلاص کی دولت سے مالا مال کرے اور پھر اجر و ثواب سے نہال کرے[1]) آمین۔

---

[1] اور یہی دعا حقیر محشی اپنے لیے' اپنے ماں باپ کے لیے' عزیز و اقارب کے لیے' اساتذہ کے لیے اور بزرگوں کے لیے اور تمام مسلمانوں کے لیے کرتا ہے۔ قارئین سے انہیں دعاؤں کی درخواست و عاجزانہ گزارش ہے۔

لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ سَمِيْعًا عَلِيْمًا ﴿۱۴۸﴾ اِنْ تُبْدُوْا خَيْرًا اَوْ تُخْفُوْهُ اَوْ تَعْفُوْا عَنْ سُوْٓءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا قَدِيْرًا ﴿۱۴۹﴾

اللہ تعالیٰ بری بات زبان پر لانے کو پسند نہیں کرتے بجز مظلوم کے۔ اللہ تعالیٰ سنتے ہیں خوب جانتے ہیں۔ اگر نیک کام علانیہ کردیا اس کو خفیہ کردیا کسی برائی کو معاف کردو تو اللہ تعالیٰ بڑے معاف کرنے والے ہیں پوری قدرت والے ہیں۔ ○

برائیوں کی اشاعت مکروہ ہے ☆

حضرت ابن عباسؓ اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ کسی مسلمان کو دوسرے کے لئے بددعا کرنی جائز نہیں۔ ہاں جس پر ظلم کیا گیا ہو۔ اسے اپنے ظالم کے لئے بددعا کرنی جائز ہے اور وہ بھی صبر و تحمل کرے تو فضیلت اسی میں ہے۔ ابوداؤد میں ہے حضرت عائشہ صدیقہؓ کی کوئی چیز چور چرا کر لے گئے تو آپؓ اُن کے لئے بددعا کرنے لگیں۔ حضور ﷺ نے سن کر فرمایا: کیوں اس کا بوجھ ہلکا کر رہی ہو[1] حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں: اس کے لئے بددعا نہ کرنی چاہئے بلکہ یہ دعا کرنی چاہئے: اَللّٰهُمَّ اَعِنِّيْ عَلَيْهِ وَاسْتَخْرِجْ حَقِّيْ مِنْهُ۔ خداوندا اس چور پر تو میری مدد کر اور اس سے میرا حق دلوادے۔ آپ سے ایک اور روایت میں ہے کہ اگرچہ مظلوم کو ظالم کے حق میں بددعا کی رخصت ہے۔ مگر یہ خیال رہے کہ حد سے بڑھ نہ جائے[2] عبدالکریم بن مالک جزری اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں: گالی دینے والے کو یعنی برا بھلا کہنے والے کو برا تو کہہ سکتے ہو۔ لیکن بہتان باندھنے والے پر بہتان نہ باندھو۔ ایک دوسری آیت میں ہے: ﴿وَلَمَنِ انْتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِهٖ فَاُولٰٓئِكَ مَا عَلَيْهِمْ مِّنْ سَبِيْلٍ﴾ (الشوریٰ:۴۱) جو مظلوم اپنے ظالم سے اس کے ظلم کا بدلہ لے اس پر کوئی مواخذہ نہیں۔ ابوداؤد میں ہے کہ رسول ﷺ فرماتے ہیں دو گالیاں دینے والے جو کہیں اس کا وبال اس پر ہے جس نے ابتدا کی ہو۔ ہاں اگر مظلوم حد سے بڑھ جائے تو اور بات ہے۔ حضرت مجاہد فرماتے ہیں: جو کسی کے ہاں مہمان بن کر جائے اور میزبان اس کا حق مہمانی ادا نہ کرے تو اسے جائز ہے کہ لوگوں کے سامنے اپنے میزبان کی شکایت کرے۔ جب تک کہ وہ حق ضیافت ادا نہ کرے۔ ابوداؤد اور ابن ماجہ وغیرہ میں ہے کہ صحابہ نے رسول ﷺ سے شکایت کی کہ آپ ہمیں اِدھر اُدھر بھیجتے ہیں۔ بعض مرتبہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہاں کے لوگ ہماری مہمانداری نہیں کرتے۔ آپؐ نے فرمایا: سنو! اگر وہ اپنے لائق میزبانی کریں تو خیر ورنہ تم ان سے اپنے لائق لے لیا کرو۔ مسند احمد کی حدیث میں فرمان رسولؐ ہے کہ جو مسلمان کسی اہل قبیلہ کے ہاں مہمان بن کر جائے۔ ساری رات گزر جائے لیکن وہ لوگ اس کی مہمانداری نہ کریں۔ تو ہر مسلمان پر اس مہمان کی نصرت ضروری ہے۔ اس شخص کے مال سے اس کی کھیتی

[1] مطلب یہ ہے کہ اس نے تو ظلم اور چوری کر کے زیادتی کی تو اب تم اس کو بددعا دے کر اپنا انتقام لے رہے ہو۔ اس طرح اس پر مواخذہ ہلکا ہو جائے گا اور اس کے گناہ کا بار ہلکا ہو جائے گا۔ انظر شاہ

[2] یہ بھی ممانعت کا ایک لطیف انداز ہے کیونکہ غصہ میں حدود کا باقی رہنا از بس مشکل ہے اور ادھر زیادتی حرام قرار دے دی گئی تو سمجھدار اپنی عافیت بددعا نہ کرنے میں ہی پائے گا۔

سے بقدر اس کی مہمانی دلوادیں[1]۔ مسند کی اور حدیث میں ہے ضیافت کی رات ہر مسلمان پر واجب ہے۔ اگر کوئی مسافر صبح تک محروم رہ جائے تو اس میزبان کا ذمہ فرض ہے خواہ ادا کرے خواہ باقی رکھے۔ اب احادیث کی وجہ سے امام احمد وغیرہ کا مذہب ہے کہ ضیافت واجب ہے۔

ابوداؤد وغیرہ میں ہے کہ ایک شخص سرکار رسالت میں حاضر ہو کر عرض کرتا ہے کہ یارسول اللہ ﷺ مجھے میرا پڑوسی بہت ایذا پہنچاتا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: جا ایک کام کر اپنا کل مال اسباب گھر سے نکال باہر رکھ دے۔ اس نے ایسا ہی کیا اور راستے پر اسباب ڈال کر وہیں بیٹھ گیا۔ اب جو گزرتا ہے پوچھتا ہے: کیا بات ہے؟ یہ کہتا ہے کہ میرا پڑوسی مجھے ستاتا ہے میں تنگ آ گیا ہوں' وہ اسے برا بھلا کہتا ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ اللہ کی مار اس پر۔ کوئی کہتا ہے اللہ اسے غارت کرے۔ جب پڑوسی کو اپنی اس رسوائی کا حال معلوم ہوا تو اس کے پاس آیا' منتیں کر کے لے گیا کہ اپنے گھر چلو۔ اللہ کی قسم اب مرتے دم تک آپ کو کسی طرح نہ ستاؤں گا پھر ارشاد ہے کہ اے لوگو! تم کسی نیکی کو ظاہر کرو اور پوشیدہ کرو تو تم پر کسی نے ظلم کیا ہو اور تم اس پر درگزر کرو تو اللہ کے پاس تمہارے لئے بڑا ثواب اور اجر اور اعلیٰ درجے ہیں۔ وہ خود بھی معاف کرنے والا ہے اور بندوں کی بھی یہ عادت اسے بھاتی ہے۔ وہ باوجود انتقام کی قدرت کے پھر بھی معاف فرماتا رہتا ہے۔ ایک روایت میں ہے کہ عرش کے اٹھانے والے فرشتے اللہ کی تسبیح بیان کرتے رہتے ہیں۔ بعض تو کہتے ہیں: سُبْحَانَكَ عَلٰى حِلْمِكَ بَعْدَ عِلْمِكَ. خدایا تیری ذات پاک ہے تو باوجود جاننے کے پھر بھی بردباری اور چشم پوشی کرتا ہے۔ بعض کہتے ہیں: سُبْحَانَكَ عَلٰى عَفْوِكَ بَعْدَ قُدْرَتِكَ۔ اے قدرت کے باوجود درگزر کرنے والے اللہ تمام پاکیاں تیری ذات کے لائق ہیں۔ گویا کہ آنحضور ﷺ کو معلوم ہو کہ اس ایذا دینے والے پڑوسی کی طبیعت ایسی ہے کہ وہ لوگوں کے لعن طعن سے متاثر ہو گا۔ اس لئے آپ نے یہ حکم دیا اور یہ کارگر بھی ہوا۔ لیکن یہ حکم کوئی قانون شریعت نہیں کہ اس پر عمل کیا جائے محض ایک علاج ہے۔ صحیح حدیث میں ہے صدقے اور خیرات سے کسی کا مال گھٹتا نہیں۔ عفو درگزر کرنے اور معاف کر دینے سے اللہ تعالیٰ اور عزت بڑھاتا ہے اور جو شخص اللہ کے حکم سے تواضع فروتنی اور عاجزی کرے۔ اللہ اس کے مرتبے اور اس کی توقیر کو اور بڑھا دیتا ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَيُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّفَرِّقُوْا بَيْنَ اللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَيَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّنَكْفُرُ بِبَعْضٍ ۙ وَّيُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَّخِذُوْا بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا ۙ﴿۱۵۰﴾ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ حَقًّا ۚ وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا ﴿۱۵۱﴾ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَلَمْ يُفَرِّقُوْا بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ اُولٰٓئِكَ سَوْفَ يُؤْتِيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۱۵۲﴾ ع

جو لوگ کفر کرتے ہیں اللہ کے ساتھ اور اس کے رسولوں کے ساتھ اور یوں چاہتے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسولوں

[1] غالباً اس پر فتویٰ نہیں ہے۔ میزبان کو مہمان کی خاطر تواضع کرنے کی ترغیب کا یہ ایک انداز ہے۔

کے درمیان فرق رکھیں اور کہتے ہیں کہ ہم بعضوں پر تو ایمان لاتے ہیں اور بعضوں کے منکر ہیں اور یوں چاہتے ہیں کہ بین بین ایک راہ تجویز کریں۔ ایسے لوگ یقیناً کافر ہیں اور کافروں کے لئے ہم نے اہانت آمیز سزا تیار کر رکھی ہے اور جو لوگ اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتے ہیں اور اس کے سب رسولوں پر بھی اور ان میں سے کسی میں فرق نہیں کرتے ان لوگوں کو اللہ تعالیٰ ضرور ثواب دیں گے اور اللہ تعالیٰ بڑے مغفرت والے ہیں بڑے رحمت والے ہیں۔ ○

انبیاء ورسل (علیہم السلام) پر ایمان واجب ہے ☆

اِس آیت میں بیان ہو رہا ہے کہ ایک نبی کو بھی اگر نہ مانے تو کافر ہے۔ یہودی سوائے حضرت عیسیٰ اور حضرت محمد ﷺ کے اور تمام نبیوں کو مانتے تھے۔ نصرانی افضل الرسل خاتم الانبیاء حضرت محمد ﷺ کے سوا اور انبیاء پر ایمان رکھتے تھے۔ سامری یوشع علیہ السلام کے بعد کسی کی نبوت کے قائل نہ تھے۔ حضرت یوشعؑ حضرت موسیٰؑ کے خلیفہ تھے لیکن ان کی شریعت کے جب یہ منکر ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے وہ شریعت ہی ان سے اٹھالی۔ واللہ اعلم۔ پس یہ لوگ ہیں جنہوں نے اللہ اور اس کے رسولوں میں تفریق کی یعنی کس نبی کو مانا کسی کا انکار کر دیا۔ کسی خدائی دلیل کی بنا پر نہیں بلکہ محض اپنی نفسیانی خواہش جوش تعصب اور تقلید آبائی کی وجہ سے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ایک نبی کو نہ ماننے والا اللہ کے نزدیک تمام نبیوں کا منکر ہے۔ اس لئے کہ اگر اور انبیا کو بوجہ ان کے نبی ہونے کے مانتا تو اس کا ماننا بھی اسی وجہ سے اس پر ضروری تھا۔ جب وہ ایک کو نہیں مانتا تو معلوم ہوا کہ جنہیں وہ مانتا ہے انہیں بھی کسی دنیوی غرض اور ہوا وہوس کی وجہ سے مانتا ہے۔ پس ان کی شریعت ماننے نہ ماننے کے درمیان کی ہے۔ یہ یقینی اور حتمی کفار ہیں۔ کسی نبی پر ان کا شرعی ایمان نہیں بلکہ تقلیدی اور تعصبی ایمان ہے جو قابل قبول نہیں۔ پس ان کفار کو اہانت اور رسوائی والے عذاب ہوں گے۔ کیونکہ جن پر یہ ایمان نہ لا کر ان کی توہین کرتے تھے اس کا بدلہ یہی ہے کہ ان کی توہین ہو اور انہیں ذلت والے عذاب میں ڈالا جائے۔ ان کے ایمان نہ لانے کی وجہ سے خواہ غور وفکر نہ کر کے نبوت کی تصدیق نہ کرنا ہو خواہ حق واضح ہو چکنے کے بعد دنیوی وجہ سے منہ موڑ کر نبوت سے انکار کیا جاتا ہو۔

آپ ﷺ کی نبوت کا انکار ہوا وہوس کی وجہ سے تھا ☆

جیسے اکثر یہودی علماء کا شیوہ حضور ﷺ کے بارے میں تھا کہ محض حسد کی وجہ سے آپ ﷺ کی عظیم الشان نبوت کے منکر ہو گئے اور آپ ﷺ کی مخالفت وعداوت میں آ کر مقابلے پر تل گئے۔ پس اللہ نے ان پر دنیا کی ذلت بھی ڈالی اور آخرت کی ذلت کی مار ان کے لئے تیار کر رکھی ہے۔ پھر امت محمدیہ کی تعریف ہو رہی ہے کہ یہ اللہ پر ایمان رکھ کر تمام انبیاء علیہم السلام کو بلا تفریق مانتے ہیں۔ اللہ کی اس آخری کتاب پر ایمان لا کر اور تمام آسمانی کتابوں کو بھی خدائی کتابیں تسلیم کرتے ہیں۔ جیسے ایک آیت میں ہے: ﴿ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ ﴾ پھر ان کے لئے اجر عظیم اور ثواب عظیم اس نے تیار کر رکھا ہے اسے بھی بیان فرمادیا کہ ان کے ایمان کامل کے باعث انہیں اجر وثواب عطا ہوں گے۔ اگر ان سے کوئی گناہ بھی سرزد ہو گیا تو اللہ تعالیٰ معاف فرمائے گا اور ان پر اپنی رحمت کی بارش برسائے گا۔

يَسْـَٔلُكَ اَهْلُ الْكِتٰبِ اَنْ تُنَزِّلَ عَلَيْهِمْ كِتٰبًا مِّنَ السَّمَآءِ فَقَدْ سَاَلُوْا مُوْسٰٓى اَكْبَرَ مِنْ ذٰلِكَ فَقَالُوْٓا اَرِنَا اللّٰهَ جَهْرَةً فَاَخَذَتْهُمُ الصّٰعِقَةُ

بِظُلْمِهِمْ ۚ ثُمَّ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ فَعَفَوْنَا عَنْ ذٰلِكَ ۚ وَاٰتَيْنَا مُوسٰى سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا ﴿١٥٣﴾ وَرَفَعْنَا فَوْقَهُمُ الطُّوْرَ بِمِيْثَاقِهِمْ وَقُلْنَا لَهُمُ ادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَّقُلْنَا لَهُمْ لَا تَعْدُوْا فِي السَّبْتِ وَاَخَذْنَا مِنْهُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا ﴿١٥٤﴾

آپ سے اہل کتاب یہ درخواست کرتے ہیں کہ آپ ان کے پاس ایک خاص نوشتہ آسمانی منگوا دیں سو انہوں نے موسیٰ سے اس سے بھی بڑی بات کی درخواست کی تھی اور یوں کہا تھا کہ ہمیں اللہ تعالیٰ کو کھلم کھلا دکھلا دو جس پر ان کی اس گستاخی کے سبب ان پر کڑک بجلی آ پڑی پھر انہوں نے گوسالہ کو تجویز کیا۔ بعد اس کے کہ بہت سے دلائل ان کو پہنچ چکے تھے۔ پھر ہم نے اس سے درگزر کر دیا تھا اور موسیٰ کو ہم نے بڑا رعب دیا تھا اور ہم نے ان لوگوں سے قول قرار لینے کے واسطے کوہ طور کو اٹھا کر ان کے اوپر معلق کر دیا تھا اور ہم نے ان کو یہ حکم دیا تھا کہ دروازہ میں عاجزی سے داخل ہونا اور ہم نے ان کو یہ حکم دیا تھا کہ یوم ہفتہ کے بارے میں تجاوز مت کرنا اور ہم نے ان سے قول و قرار نہایت شدید لئے۔ ○

یہودیوں کے لغو مطالبے ☆

یہودیوں نے رسول اللہ ﷺ سے کہا کہ جس طرح حضرت موسیٰ اللہ کی طرف سے تورات لکھی ہوئی مکمل ہمارے پاس لائے آپ بھی کوئی آسمانی کتاب پوری لکھی لکھائی لے آئیے یہ بھی روایت ہے کہ انہوں نے کہا تھا کہ ہمارے نام اللہ تعالیٰ کو خط بھیجے کہ ہم آپ کی نبوت کو مان لیں۔ یہ سوال بھی ان کا بدنیتی سے بطور مذاق کے اور بطور کفر کے تھا۔ جیسے کہ اہل مکہ نے بھی اسی طرح کا ایک سوال کیا تھا جو سورہ سبحان میں مذکور ہے کہ جب تک عرب کی سرزمین پر دریاؤں کی ریل پیل اور تروتازگی کا دور دورہ نہ ہو جائے۔ ہم آپ پر ایمان نہیں لائیں گے۔ پس بطور تسلی کے آنحضرت ﷺ سے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ان کی اس سرکشی اور مہمل سوال پر آپ کبیدہ خاطر نہ ہوں۔ ان کی یہ عادت پرانی ہے۔ انہوں نے حضرت موسیٰ سے اس سے بھی زیادہ بیہودہ سوال کیا تھا کہ ہمیں اللہ تعالیٰ دکھا دے۔ اس تکبر اور سرکشی اور فضول سوال کی پاداش بھی یہ بھگت چکے ہیں۔ یعنی ان پر آسمانی بجلی گری تھی۔ جیسے سورہ بقرہ میں تفصیل وار بیان گزر چکا ہے۔ ملاحظہ ہو آیت: ﴿وَاِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً﴾ یعنی جب تم نے کہا تھا کہ اے موسیٰ! ہم تجھ پر ہرگز ایمان نہ لائیں گے جب تک کہ اللہ تعالیٰ کو ہم صاف طور پر اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لیں۔ پس تمہیں بجلی کے کڑاکے نے پکڑ لیا اور ایک دوسرے کے سامنے سب ہلاک ہو گئے۔ پھر بھی ہم نے تمہاری موت کے بعد پھر تمہیں زندہ کر دیا تاکہ تم شکر گزار بنو۔

پھر فرماتا ہے کہ بڑی بڑی نشانیاں دیکھ چکنے کے بعد بھی ان لوگوں نے بچھڑے کو پوجنا شروع کر دیا۔ مصر میں اپنے دشمن فرعون کا حضرت موسیٰ کے مقابلہ میں ہلاک ہونا۔ اس کے لشکروں کا نامرادی کی موت مرنا۔ ان کا اس دریا میں سے بچ کر پار نکل آنا ابھی ابھی ان کی نگاہوں کے سامنے ہوا تھا۔ لیکن وہاں سے چل کر کچھ دور جا کر بت پرستوں کو بت پرستی کرتے ہوئے

دیکھ کر اپنے پیغمبرؑ سے کہتے ہیں: ہمارا بھی ایک ایسا ہی معبود بنا دو۔ جس کا پورا بیان سورہ اعراف میں ہے اور سورہ طٰہٰ میں بھی۔ پھر حضرت موسیٰ اللہ تعالیٰ کے سامنے مناجات کرتے ہیں۔ ان کی توبہ کی قبولیت کی یہ صورت ٹھہرتی ہے کہ جنہوں نے گوسالہ پرستی نہیں کی وہ گوسالہ پرستوں کو قتل کریں۔ جب قتل شروع ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول کر لی اور مرے ہوؤں کو دوبارہ زندہ کر دیتا ہے۔

پس یہاں فرماتا ہے ہم نے اس سے بھی درگزر کیا اور جرم عظیم بھی بخش دیا اور موسیٰ کو ظاہر حجت اور کھلا غلبہ عنایت فرمایا اور جب ان لوگوں نے تورات کے احکام ماننے سے انکار کر دیا اور حضرت موسیٰ کی فرمانبرداری سے بیزاری ظاہر کی تو ان کے سروں پر طور پہاڑ کو معلق کر دیا اور ان سے کہا تھا کہ اب بولو پہاڑ گرا کر دبا دوں یا احکام قبول کرتے ہو؟ تو یہ سب سجدے میں گر پڑے اور گریہ زاری شروع کی اور احکام اللہ بجالانے کا مضبوط عہد و پیمان کیا۔ یہاں تک دل میں دہشت تھی کہ سجدے میں بھی کن اکھیوں سے اوپر کو دیکھ رہے تھے کہ کہیں پہاڑ نہ گر پڑے اور دب کر نہ مر جائیں۔ پھر پہاڑ ہٹا لیا گیا ان کی دوسری سرکشی کا بیان ہو رہا ہے کہ قول و فعل دونوں کو بدل دیا۔ حکم ملا تھا کہ بیت المقدس کے دروازے میں سجدے کرتے ہوئے جائیں اور حِطَّةٌ کہیں۔ یعنی اے اللہ ہماری خطائیں بخش کہ ہم نے جہاد چھوڑ دیا اور تھک بیٹھ رہے۔ جس کی سزا میں چالیس سال میدان تیہ میں سرگشتہ و حیران و پریشان رہے۔ لیکن ان کا یہاں بھی مظاہرہ ہوا اور اپنی رانوں کے بل گھسٹتے ہوئے دراز ے میں جانے لگے اور حِنطَةٌ فِي شَعْرَةٍ کہنے لگے۔ یعنی گیہوں کی بالیں ہمیں دے۔ پھر ان کی اور شرارت سنیے! ہفتہ والے دن کی تعظیم و تکریم کرنے کا ان سے وعدہ لیا گیا اور مضبوط عہد و پیمان ہو گیا۔ لیکن انہوں نے اس کی بھی مخالفت کی۔ نافرمانی پر کمر بستہ ہو کر حرمت کے ارتکاب کے حیلے نکال لئے۔ جیسے کہ سورہ اعراف میں مفصل بیان ہے۔ ملاحظہ ہو آیت: ﴿وَاسْئَلْهُمْ عَنِ الْقَرْيَةِ الَّتِي كَانَتْ حَاضِرَةَ الْبَحْرِ﴾۔ ایک حدیث میں بھی ہے کہ یہودیوں سے خصوصاً اللہ نے ہفتہ والے دن کی تعظیم کا عہد لیا تھا۔ یہ پوری حدیث سورہ سبحان کی آیت: ﴿وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى تِسْعَ اٰيٰتٍ بَيِّنٰتٍ﴾ کی تفسیر میں آئے گی ان شاء اللہ تعالیٰ۔

فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ وَكُفْرِهِمْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَقَتْلِهِمُ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ وَّقَوْلِهِمْ قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ؕ بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۱۵۵﴾ وَّبِكُفْرِهِمْ وَقَوْلِهِمْ عَلٰى مَرْيَمَ بُهْتَانًا عَظِيْمًا ﴿۱۵۶﴾ وَّقَوْلِهِمْ اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيْحَ عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُوْلَ اللّٰهِ ۚ وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ ؕ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِيْهِ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ ؕ مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ ۚ وَمَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا ﴿۱۵۷﴾ بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا

حَكِيمًا ﴿١٥٨﴾ وَإِن مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ إِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهِ قَبْلَ مَوْتِهِ ۖ وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ يَكُونُ عَلَيْهِمْ شَهِيدًا ﴿١٥٩﴾

سو ہم نے سزا میں مبتلا کیا ان کی عہد شکنی کی وجہ سے اور ان کے کفر کی وجہ سے احکام الٰہیہ کے ساتھ اور ان کے قتل کرنے کی وجہ سے انبیاء کو ناحق اور ان کے اس مقولہ کی وجہ سے کہ ہمارے قلوب محفوظ ہیں بلکہ ان کے کفر کے سبب ان قلوب پر اللہ تعالیٰ نے بند لگا دیا ہے۔ سو ان میں ایمان نہیں مگر قدرے قلیل اور ان کے کفر کی وجہ سے اور حضرت مریمؑ پر ان کے بڑا بھاری بہتان دھرنے کی وجہ سے اور ان کے اس کہنے کی وجہ سے کہ ہم نے مسیح عیسیٰ بن مریمؑ کو جو کہ رسول اللہ تعالیٰ ہیں قتل کر دیا حالانکہ انہوں نے نہ ان کو قتل کیا اور نہ ان کو سولی پر چڑھایا لیکن ان کو اشتباہ ہو گیا اور جو لوگ ان کے بارہ میں اختلاف کرتے ہیں وہ غلط خیال میں ہیں ان کے پاس اس پر کوئی دلیل نہیں تخمینی باتوں پر عمل کرنے اور انہوں نے ان کو یقینی بات ہے کہ قتل نہیں کیا۔ بلکہ ان کو اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف اٹھا لیا اور اللہ تعالیٰ بڑے زبردست حکمت والے ہیں اور کوئی اہل کتاب سے نہیں رہتا مگر وہ عیسیٰؑ کی اپنے مرنے سے ضرور تصدیق کر لیتا ہے اور قیامت کے روز وہ ان پر گواہی دیں گے۔ ○

یہود کی ان کی مسلسل نافرمانیوں پر عبرتناک سزا ☆

اہل کتاب کے ان گناہوں کا بیان ہو رہا ہے جن کی وجہ سے وہ اللہ کی رحمتوں سے محروم ہو گئے اور ملعون اور مطرود ہو گئے۔ اولاً تو ان کی عہد شکنی کی جو وعدے اللہ سے انہوں نے کئے تھے ان پر قائم نہ رہے۔ دوسرے اللہ کی آیتوں میں حجت و دلیل اور نبیوں کے معجزوں سے انکار اور کفر تیسرے بے وجہ ناحق انبیائے کرام کا قتل و خون اللہ کے رسولوں کی ایک بڑی جماعت ان کے ہاتھوں قتل ہوئی۔ چوتھے ان کا یہ خیال اور یہ قول کہ ہمارے دل غلافوں میں ہیں یعنی پردے میں ہیں۔ جیسے مشرکین نے کہا تھا: قُلُوبُنَا فِي أَكِنَّةٍ مِّمَّا تَدْعُونَا إِلَيْهِ یعنی اے نبی تیری دعوت سے ہمارے دل پردے میں ہیں اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ان کے اس قول کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے دل علم کے ظروف ہیں وہ علم عرفان سے پُر ہیں۔ سورہ بقرہ میں بھی اس کی نظیر گزر چکی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کے اس قول کی تردید کرتا ہے کہ یوں نہیں بلکہ ان پر اللہ تعالیٰ نے مہر لگا دی ہے۔ کیونکہ یہ کفر میں پختہ ہو چکے تھے۔ پس اپنی تفسیر کی بناء پر یہ مطلب ہوا کہ وہ عذر کرتے تھے کہ ہمارے دل بوجہ ان پر غلاف ہونے کے نبی کی باتوں کو یاد نہیں کر سکتے' تو انہیں جواب دیا گیا کہ ایسا نہیں بلکہ تمہارے کفر کی وجہ سے تمہارے دل مسخ ہو گئے ہیں اور دوسری تفسیر کی بنا پر تو جواب ہر طرح ظاہر ہے۔ سورہ بقرہ کی تفسیر میں اس کی پوری تفصیل و تشریح گزر چکی ہے۔ پس بطور نتیجہ کے فرما دیا کہ ان کے دل کفر و سرکشی میں اور ناقص ایمان پر ہی رہیں گے۔ پھر ان کا پانچواں جرم عظیم بیان ہو رہا ہے کہ انہوں نے سیدہ مریمؑ پر زنا کاری جیسی بدترین و شرمناک تہمت لگائی اور اسی زنا کاری کے عمل سے حضرت عیسیٰ کو پیدا شدہ بتایا۔ بعض نے اس سے بھی ایک قدم آگے رکھا اور کہا یہ بدکاری حیض کی حالت میں ہوئی تھی۔ اللہ کی ان پر پھٹکار ہو کہ ان کی بدزبانی سے اللہ کے مقبول بندے بھی نہ بچ سکے۔ پھر ان کا چھٹا گناہ یہ بیان ہو رہا ہے کہ یہ بطور تمسخر اور اپنی لڑائی کے یہ بکواس بھی کرتے ہیں کہ ہم نے حضرت عیسیٰ کو مار ڈالا۔ جیسے کہ بہ طور تمسخر کے حضور ﷺ سے مشرکین کہتے ہیں کہ اے وہ شخص جس پر قرآن اتارا گیا ہے تو تو مجنون ہے۔ پورا واقعہ یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ کو نبوت پر سرفراز فرما کر بھیجا اور آپ کے ہاتھ پر بڑے معجزے دکھلائے۔

مثلاً پیدائشی اندھوں کو بینا کرنا۔ کوڑھیوں کو اچھا کرنا۔ مردوں کو زندہ کرنا۔ مٹی سے پرند بنا کر پھونک مارنا اور ان کا جاندار ہو کر رہ جانا وغیرہ تو یہودیوں کو بہت طیش آیا اور یہ مخالفت پر کمربستہ ہو گئے اور ہر طرح سے ایذارسانی شروع کر دی۔ آپ کی زندگی تنگ کر دی۔ کسی بستی میں چند دن آرام کرنا بھی آپ کو نصیب نہ ہوا۔ ساری عمر جنگلوں اور بیابانوں میں اپنی والدہ کے ساتھ سیاحت میں گزار دی۔ پھر بھی انہیں چین نہ آیا۔

عیسیٰ علیہ السلام کا رفع آسمانی ☆

آخر یہ اپنے زمانے کے دمشق کے بادشاہ کے پاس گئے' یہ ستارہ پرست مشرک شخص ہو۔ اس مذہب والوں کو اس وقت یونان کہا جاتا تھا۔ یہاں آ کر یہ بہت روئے پیٹے اور بادشاہ کو حضرت عیسیٰ کے خلاف اکسایا اور کہا کہ یہ شخص بڑا مفسد ہے۔ لوگوں کو بہکا رہا ہے۔ روز ہی نئے نئے فتنے کھڑے کرتا ہے۔ امن میں خلل ڈالتا ہے۔ لوگوں کو بغاوت پر اکساتا ہے وغیرہ۔ بادشاہ نے اپنے گورنر کو جو بیت المقدس میں تھا' ایک فرمان لکھا کہ وہ حضرت عیسیٰ کو گرفتار کر لے اور سولی پر چڑھا کر اس کے سر پر کانٹوں کا تاج رکھ کر لوگوں کو اس کے دکھ سے نجات دلوائے' اس نے فرمان شاہی پڑھ کر یہودیوں کے ایک گروہ کو ساتھ لے کر اس مکان کا محاصرہ کر لیا۔ جس میں روح اللہ تھے۔ آپ کے ساتھ بارہ یا تیرہ یا زیادہ سے زیادہ سترہ آدمی تھے۔ جمعہ کے دن عصر کے بعد اس نے محاصرہ کر لیا اور ہفتہ کی رات تک مکان کو گھیرے میں لئے رکھا۔ حضرت عیسیٰ نے یہ محسوس کر لیا کہ اب یا تو مکان میں گھس کر آپ کو گرفتار کر لیں گے یا آپ کو خود باہر نکلنا پڑے گا تو آپ نے صحابہ سے فرمایا: تم میں سے کون اس بات کو پسند کرتا ہے کہ اس پر میری مشابہت ڈال دی جائے یعنی اس کی صورت مجھ جیسی بنا دی جائے اور ان کے ہاتھ گرفتار ہو اور مجھے اللہ مخلصی دے۔ میں اس کے لئے جنت کا ضامن ہوں۔ یہ سن کر ایک نوجوان نے کہا: یہ مجھے منظور ہے۔ لیکن حضرت عیسیٰ نے انہیں اس قابل نہ جان کر دوبارہ یہی کہا۔ تیسری دفعہ کہا مگر ہر مرتبہ صرف یہی تیار ہوئے رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔ اب آپ نے بھی منظور فرما لیا اور دیکھتے دیکھتے اس کی صورت قدرتاً بدل گئی۔ بالکل یہ معلوم ہونے لگا کہ حضرت عیسیٰ یہی ہیں اور چھت کی طرف یک روزن نمودار ہو گیا اور حضرت عیسیٰ پر اونگھ کی سی حالت طاری ہو گئی اور اسی طرح وہ آسمان پر اٹھا لئے گئے تھے جیسے قرآن کریم میں ہے: ﴿اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسٰٓى اِنِّىْ مُتَوَفِّيْكَ وَرَافِعُكَ اِلَيَّ﴾ یعنی اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے عیسیٰ! میں تجھے پورا لینے والا ہوں اور اپنی طرف اٹھانے والا ہوں۔ حضرت روح اللہ کے آسمان پر اٹھائے جانے کے بعد یہ لوگ اس گھر سے باہر نکلے۔ یہودیوں کی جماعت نے اس بزرگ صحابی کو جس کو جناب مسیح علیہ والسلام کے مشابہ کر دیا تھا' عیسیٰ سمجھ کر پکڑ لیا اور راتوں رات اسے سولی پر چڑھا کر اس کے سر پر کانٹوں کا تاج رکھ دیا۔ اب یہود خوشیاں منانے لگے۔ کہ ہم نے عیسیٰ ابن مریم کو قتل کر دیا اور لطف تو یہ ہے کہ عیسائیوں کی کم عقل اور جاہل جماعت نے بھی یہودیوں کی ہاں میں ہاں ملا دی ہاں صرف وہ لوگ جو مسیح علیہ السلام کے ساتھ اس مکان میں تھے اور یقینی طور پر معلوم تھا کہ مسیح علیہ السلام آسمان پر اٹھائے گئے اور یہ فلاں شخص ہے جو دھوکہ میں ان کی جگہ شہید ہو گیا۔ باقی عیسائی بھی یہودیوں کی سی راگنی الاپنے لگے۔ یہاں تک کہ پھر بھی گھڑ لیا کہ عیسیٰ کی والدہ سولی تلے بیٹھ کر روتی چلاتی رہی اور یہ بھی کہتے ہیں کہ آپ نے ان سے کچھ باتیں بھی کیں واللہ اعلم۔

دراصل یہ سب باتیں اللہ کی طرف سے اپنے بندوں کا امتحان ہیں جو اس کی حکمت بالغہ کا تقاضا ہے۔ پس اس غلطی کو اللہ تعالیٰ نے واضح اور ظاہر کر کے حقیقت حال سے اپنے بندوں کو مطلع فرما دیا اور اپنے سب سے بہتر رسول اور بڑے مرتبے والے پیغمبر کی زبانی اپنے پاک اور سچے اور بہترین کلام میں صاف فرما دیا کہ حقیقتاً نہ کسی نے حضرت عیسیٰ کو قتل کیا نہ سولی دی بلکہ

ان کی شبیہ جس شخص پر ڈالی گئی تھی اسے عیسیٰ ہی سمجھ بیٹھے۔ جو یہود و نصاریٰ آپ کے قتل کے قائل ہو گئے ہیں وہ سب کے سب شک و شبہ میں حیرت و ضلالت میں مبتلا ہیں' ان کے پاس کوئی دلیل نہیں نہ انہیں خود کچھ علم ہے۔ سنی سنائی باتوں کے سوا کوئی دلیل نہیں۔ اسی لئے پھر اسی کے ساتھ فرمادیا کہ یقینی امر ہے کہ روح اللہ کو کسی نے قتل نہیں کیا۔ بلکہ جناب باری عزاسمہ نے جو غالب تر ہے اور جس کی قدرتیں بندوں کے فعل میں بھی نہیں آسکتیں اور جس کی حکمتوں کی تہ تک اور جس کے کاموں کی لم تک کوئی نہیں پہنچ سکتا۔ اپنے خاص بندوں کو جنہیں اپنی روح کہا تھا۔ اپنے پاس اٹھالیا۔

حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں: جب اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ کو آسمان پر اٹھانا چاہا تو آپ گھر میں آئے۔ اس وقت مکان میں بارہ حواری تھے۔ آپ کے بالوں میں سے پانی کے قطرے ٹپک رہے تھے۔ آپ نے فرمایا: تم میں سے بعض ایسے ہیں جو مجھ پر ایمان لاچکے ہیں۔ مگر بارہ بارہ بار مجھ سے کفر کریں گے۔ پھر آپ نے فرمایا: تم میں سے کون شخص اسے پسند کرتا ہے کہ اس پر میری شبیہ ڈالی جائے اور میری جگہ وہ قتل کر دیا جائے اور جنت میں میرا رفیق بنے الخ۔ اس روایت میں یہ بھی ہے کہ روح اللہ کی پیش گوئی کے مطابق بعضوں نے آپ سے بارہ بار کفر کیا۔

عیسائیت متعدد فرقوں میں ☆

پھر ان کے تین گروہ ہو گئے۔ یعقوبیہ' نسطوریہ اور مسلمان۔ یعقوبیہ تو کہنے لگے خود اللہ ہم میں تھا۔ جب تک چاہا رہا۔ پھر آسمان پر چڑھ گیا۔ نسطوریہ کا خیال ہو گیا کہ اللہ کا لڑکا ہم میں تھا جسے ایک زمانہ تک ہم میں رکھ کر پھر اللہ نے اپنے پاس بلالیا اور مسلمانوں کا یہ عقیدہ رہا کہ اللہ کا بندہ اور رسول ہم میں تھا جب تک اللہ نے چاہا وہ ہم میں رہا۔ پھر اللہ نے اسے اپنی طرف اٹھالیا۔ ان پہلے دو گمراہ فرقوں کا زور ہو گیا اور انہوں نے تیسرے سچے اور اچھے فرقے کو کچلنا اور دبانا شروع کیا۔ چنانچہ یہ مغزور ہوتے گئے۔ یہاں تک اللہ تعالیٰ نے پیغمبر آخر الزماں کو مبعوث فرما کر اسلام کو غالب کیا۔ اس کی اسناد بالکل صحیح ہے اور نسائی میں حضرت ابو معاویہ سے بھی یہ منقول ہے۔ اسی طرح سلف میں بہت سے بزرگوں کا قول ہے۔ حضرت وہب بن منبہ فرماتے ہیں کہ جس وقت شاہی سپاہی اور یہودی حضرت عیسیٰ پر چڑھ کر آئے اور محاصرہ میں لیا' اس وقت آپ کے ساتھ ستر ہ حواری تھے' ان لوگوں نے جب دروازے کھول کر دیکھا تو سب لوگ حضرت عیسیٰ کی شکل و صورت کے ہیں وہ یہ دیکھ کر کہنے لگے تم لوگوں نے ہم پر جادو کر دیا ہے۔ اب یا تو تم اسے جو حقیقی عیسیٰ ہوں ہمیں سونپ دو یا اسے منظور کرلو کہ ہم تم سب کو قتل کر رہے ہیں۔ یہ سن کر روح اللہ نے فرمایا: کوئی ہے جو جنت میں میرا رفیق بننا اور یہاں میرے بدلے سولی پر چڑھنا منظور کرلے۔ ایک صحابی اس کے لئے تیار ہو گئے اور کہنے لگے عیسیٰ میں ہوں چنانچہ دشمنان دین نے انہیں گرفتار کیا اور سولی پر چڑھایا اور پھر بغلیں بجانے لگے کہ ہم نے عیسیٰ کو قتل کر دیا۔ حالانکہ دراصل نہیں ہوا۔ بلکہ وہ دھوکے میں پڑ گئے اور اللہ نے اپنے رسول کو اسی وقت اپنے پاس بلا کر رفعت بخشی۔

تفسیر ابن جریر میں ہے کہ جب حضرت عیسیٰ کو اللہ تعالیٰ نے القا کیا کہ وہ دنیا سے واپس ہونے والے ہیں۔ تو آپ پر بہت گراں گزرا اور موت کی گھبراہٹ بڑھ گئی تو آپ نے اپنے حواریوں کی دعوت کی۔ کھانا تیار کیا اور سب سے کہہ دیا کہ آج رات کو تم سب میرے پاس ضرور آنا' مجھے ایک ضروری کام ہے۔ جب حوارین آئے تو خود کھانا کھلایا' سب کام کاج اپنے ہاتھوں کرتے رہے جب وہ کھانے سے فارغ ہوئے تو خود ان کے ہاتھ دھلائے اور اپنے کپڑوں سے ان کے ہاتھ پونچھے۔ یہ ان پر گراں گزرا اور اچھا معلوم نہیں ہوا۔ آپ نے فرمایا: سنو! اس رات میں جو کچھ کر رہا ہوں اگر تم میں سے کسی نے مجھے اس

سے روکا تو میرا اس سے کچھ واسطہ نہیں۔ نہ وہ میرا نہ میں اس کا۔ چنانچہ تمام معتقدین مسیح خاموش ہو گئے اور جب آپ اس عزت افزا دعوت سے فارغ ہو گئے تو فرمایا: دیکھو تمہارے نزدیک میں تم سب زیادہ مرتبے والا ہوں۔ اس کے باوجود میں نے تمہاری خدمت کی ہے۔ یہ اس لئے کہ تم میری اس سنت پر عامل بن جاؤ۔ خبردار تم میں سے کوئی اپنے آپ کو اپنے بھائیوں سے بڑا نہ سمجھے بلکہ ہر بڑے چھوٹے کی خدمت کرے جس طرح میں نے خود تمہاری کی ہے۔ اب تم میں سے جو میرا خاص کام تھا اور جس کی وجہ سے آج میں نے تمہیں بلایا ہے وہ بھی سن لو۔ تم سب مل کر آج رات بھر خشوع و خضوع سے میرے لئے دعائیں کرو کہ اللہ میری اجل کو مؤخر کر دے۔ چنانچہ سب نے دعایں کیں۔ لیکن خضوع و خشوع کا وقت آنے سے پہلے ہی بری طرح نیند آنے لگی کہ زبان سے ایک لفظ نکالنا مشکل ہو گیا۔ آپ انہیں بیدار کرنے لگے اور ایک ایک کو جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر کہنے لگے، تمہیں کیا ہو گیا' ایک رات بھی نہ جاگ سکے' میری کچھ مدد نہیں کرتے؟ لیکن سب نے جواب دیا کہ اے رسول اللہ ہم خود حیران ہیں کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ ایک ہی نہیں بلکہ کئی کئی راتیں جاگتے تھے۔ جاگنے کے عادی تھے۔ لیکن اللہ جانے کیا بات ہے کہ نیند نے گھیر رکھا ہے۔ دعا کے اور ہمارے درمیان کوئی قدرتی رکاوٹ پیدا ہو گئی ہے تو آپ نے فرمایا: پھر چرواہا نہ رہے تو بکریاں بھاگ جائیں گی۔ غرض اشاروں کنایوں میں صورتِ حال کا اظہار کرتے رہے۔ پھر فرمایا: تم میں ایک شخص صبح کے مرغ بولنے سے پہلے تین مرتبہ میرے ساتھ کفر کرے گا اور تم میں سے ایک چند درہم کے بدلے مجھے بیچ دے گا اور میری قیمت کھائے گا۔ اب یہ لوگ یہاں سے باہر نکلے۔ ادھر ادھر چلے گئے۔ یہود جو اپنی جستجو میں تھے انہوں نے شمعون حواری کو پہچان کر اسے پکڑا اور کہا کہ یہ بھی اس کا ساتھی ہے۔ مگر شمعون نے کہا غلط ہے میں اس کا ساتھی نہیں ہوں۔ انہوں نے یہ باور کر کے اسے چھوڑ دیا۔ لیکن کچھ آگے جا کر یہ دوسری جماعت کے ہاتھ لگ گیا اور وہاں سے بھی اسی طرح انکار کر کے اپنے آپ کو چھڑا دیا۔ اتنے میں مرغ نے اذان دے دی۔ اب یہ افسوس کرنے اور سخت غمگین ہوئے۔ صبح کو ایک حواری یہودیوں کے پاس پہنچتا ہے اور کہتا ہے کہ اگر میں تمہیں عیسیٰ کا پتہ بتا دوں تو تم کیا دلواؤ گے؟ انہوں نے کہا تمیں درہم۔ چنانچہ اس نے یہ رقم لے لی اور حضرت کا پتہ بتا دیا۔ اس سے پہلے وہ شبہ میں تھے۔ اب انہوں نے گرفتار کر لیا اور رسیوں میں جکڑ کر گھسیٹتے ہوئے چلے اور بطور طعنہ زنی کے کہتے جاتے تھے کہ آپ تو مردوں کو زندہ کر دیا کرتے تھے۔ جنات کو بھگا دیا کرتے تھے۔ مجنوں کو اچھا کر دیا کرتے تھے۔ اب کیا بات ہے کہ خود اپنی ذات کو بھی نہیں بچا سکتے۔ ان رسیوں کو نہیں توڑ سکتے۔ تف ہے تم پر یہ کہتے جاتے تھے اور کانٹے ان کے اوپر ڈالتے جاتے تھے۔ اسی طرح بے دردی سے گھسیٹتے ہوئے جب اس لکڑی کے پاس لائے۔ جہاں سولی دینی تھی اور ارادہ کیا کہ سولی چڑھائیں۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو اپنی طرف چڑھا لیا اور انہوں نے دوسرے شخص کو جو آپ کے مشابہ تھا' سولی پر چڑھا۔ پھر سات دن بعد حضرت مریمؑ اور وہ عورت جس کو حضرت عیسیٰؑ نے جن سے نجات دلائی تھی۔ وہاں آئیں اور گریہ زاری کرنے لگیں تو ان کے پاس حضرت عیسیٰ آئے اور ان سے کہا کیوں روتی ہو؟ مجھے تو اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف اٹھا لیا ہے اور مجھے ان کی ایذائیں نہیں پہنچتیں۔ ان تو پر شبہ ڈال دیا گیا ہے۔ میرے حواریوں سے کہو کہ مجھ سے فلاں جگہ ملیں۔ چنانچہ یہ بشارت جب حواریوں کو ملی تو سب کے سب گیارہ آدمی اس جگہ پہنچے' جس حواری نے آپ کو بیچا تھا۔ اسے انہوں نے وہاں نہ پایا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ ندامت اور شرمندگی کی وجہ سے اپنا گلا گھونٹ کر آپ ہی مر گیا۔ اس نے خودکشی کر لی۔ آپ نے فرمایا: اگر وہ توبہ کرتا تو اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول فرمالیتا۔ پھر پوچھا کہ یہ بچہ جو تمہارے ساتھ ہے' اس کا نام یحییٰ ہے اب یہ تمہارا ساتھی ہے۔ سنو صبح کو تمہاری زبانیں بدل دی جائیں گی۔ ہر شخص اپنی اپنی قوم کی زبان بولنے لگے گا۔ تو اسے چاہئے کہ اس قوم میں جا کر اسے میری دعوت پہنچائے اور اللہ سے ڈرائے۔ یہ واقعہ نہایت ہی غریب ہے۔

ابن اسحاق کا قول ہے کہ بنو اسرائیل کا یہ بادشاہ جس نے حضرت عیسیٰ کے قتل کے لئے فوج بھیجی تھی' اس کا نام داوٗد تھا۔ حضرت اس وقت سخت گھبراہٹ میں تھے۔ کوئی شخص اپنی موت سے اس قدر پریشان ہوا اس باختہ اور اس قدر ہائے وائے کرنے والا نہ ہوگا۔ جس قدر آپ نے اس وقت کی۔ یہاں تک فرمایا: خدایا اگر موت کے پیالے کو کسی سے بھی ٹالنے والا ہے تو مجھ سے ٹال دے اور یہاں تک کہ گھبراہٹ اور خوف کی وجہ سے ان کے جسم سے خون پھوٹنے لگا۔ اس وقت اس مکان میں آپ کے ساتھ بارہ حواری تھے۔ جن کے نام یہ ہیں۔ فرطوس، یعقوبس، یلاونحس (یہ یعقوب کا بھائی تھا)، اندریس، فلیس، ابن یلما، متنا، طوماس، یعقوب بن حلقایا، نداوسیس، قتابیا، لیودس، زکریا یوطا۔ بعض کہتے ہیں کہ تیرہ آدمی تھے۔ ایک اور کا نام سرجس تھا اس نے اپنے آپ کو سولی پر چڑھایا جانا حضرت عیسیٰ کی بشارت پر منظور فرمایا تھا۔

یہودیوں کا باہمی اختلاف ☆

جب حضرت عیسیٰ آسمان پر چڑھائے گئے اور بقیہ لوگ یہودیوں کے ہاتھوں میں اسیر ہو گئے۔ اب جو شکار کرتے ہیں تو ایک کم ہے۔ ایک شخص کی کمی ہو جانے سے ان کے درمیان اختلاف ہو گیا۔ یہ لوگ جب اس جماعت پر چھاپہ مارتے ہیں اور انہیں گرفتار کرنا چاہتے ہیں تو حضرت عیسیٰ کو پہچانتے نہ تھے۔ تو لیودس زکریا یوطا نے تیس درہم لے کر ان سے کہا تھا کہ میں سب سے پہلے جاتا ہوں جس شخص کو جا کر میں بوسہ دوں' تم سمجھ لینا کہ عیسیٰ وہی ہیں۔ جب یہ اندر پہنچتے ہیں تو اس وقت حضرت عیسیٰ اٹھا لئے گئے تھے اور حضرت سرجس آپ کی صورت میں بنا دیئے گئے تھے۔ اس نے جا کر حسب قرارداد انہی کا بوسہ لیا اور بس گرفتار کر لئے گئے۔ اس ارتکاب اور مخبری کے بعد یہ حواری بہت نادم ہوا اور اپنے گلے میں رسی ڈال کر پھانسی پر لٹک گیا اور نصرانیوں میں ملعون بنا۔ بعض کہتے ہیں: اس کا نام لیودس زکریا یوطا تھا۔ یہ جیسے حضرت عیسیٰ کی شناخت کے لئے اس گھر میں داخل ہوا تو عیسیٰ تو اٹھا لئے گئے اور خود اس کی شکل صورت حضرت عیسیٰ جیسی بنا دی گئی اور اسی کو لوگوں نے پکڑ لیا۔ یہ ہزار چیختا چلاتا رہا کہ میں عیسیٰ نہیں ہوں۔ میں تو تمہارا ساتھی ہوں۔ میں نے تو تمہیں عیسیٰ کا پتہ دیا تھا۔ لیکن کون سنے؟ آخر اسی کو تختہ دار پر لٹکا دیا گیا۔ اب اللہ ہی کو علم ہے کہ عیسیٰ کی شکل میں سرفروشی کرنے والا مؤمن صادق سرجس تھا یا لیودس زکریا یوطا منافق حواری؟ حضرت مجاہد کا قول ہے کہ حضرت روح اللہ کی مشابہت جس پر ڈالی گئی تھے' اسے صلیب پر چڑھایا اور حضرت عیسیٰ کو اللہ تعالیٰ نے زندہ آسمان پر اٹھا لیا۔ امام ابن جریر فرماتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ کی شبیہ آپ کے ان تمام ساتھیوں پر ڈال دی گئی تھی۔

ایک پیش گوئی ☆

اس کے بعد بیان ہوتا ہے کہ جناب روح اللہ کی موت سے پہلے جملہ اہل کتاب آپ پر ایمان لائیں گے اور قیامت کے دن آپ ان کے گواہ ہوں گے۔ امام ابن جریر فرماتے ہیں کہ اس کی تفسیر میں کئی قول ہیں۔ ایک تو یہ کہ موت عیسیٰ سے پہلے یعنی آپ قتل دجال کے لئے دوبارہ زمین پر آئیں گے۔ اس وقت مذاہب اٹھ جائیں گے اور صرف ملت اسلامیہ جو دراصل ابراہیم حنیفؑ کی ملت ہے رہ جائے گی۔ ابن عباسؓ فرماتے ہیں: مَوْتِهٖ سے مراد حضرت عیسیٰ کی موت ہے۔ ابو مالک فرماتے ہیں: جناب مسیح اتریں گے۔ اس وقت اہل کتاب آپ پر ایمان لائیں گے۔ ابن عباسؓ سے دوسری روایت میں ہے خصوصاً یہودی ایک بھی باقی نہیں رہے گا۔ حسن بصری فرماتے ہیں: یعنی نجاشی اور ان کے ساتھی۔ آپ سے روایت ہے کہ قسم اللہ کی حضرت عیسیٰ اللہ کے پاس اب بھی زندہ موجود ہیں' جب آپ زمین پر نازل ہوں گے اس وقت اہل کتاب میں سے ایک بھی باقی نہ بچے گا۔ جو آپ پر ایمان نہ لائے۔ آپ سے جب اس آیت کی تفسیر پوچھی جاتی ہے تو آپ فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ نے

مسیح کو اپنے پاس اٹھالیا ہے اور قیامت سے پہلے آپ کو دوبارہ زمین پر اس حیثیت سے بھیجے گا کہ ہر نیک و بد آپ پر ایمان لائے گا۔ حضرت قتادہ اور حضرت عبدالرحمٰن وغیرہ بہت سے مفسرین کا یہی فیصلہ ہے اور یہی قول حق ہے اور یہی تفسیر بالکل ٹھیک ہے۔ انشاء اللہ۔ اللہ تعالیٰ کی مدد سے اور اس کی توفیق سے ہم اسے بہ دلائل ثابت کریں گے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ ہر اہل کتاب آپ پر اپنی موت سے پہلے ایمان لاتا ہے۔ اس لئے کہ موت کے وقت حق و باطل سب پر واضح ہو جاتا ہے کہ ہر کتابی یعنی ہر اہل کتاب حضرت عیسیٰؑ کی حقانیت کی اس دار فانی سے روانگی کے پیشتر ہی ماور کر لیتا ہے۔ ابن عباسؓ فرماتے ہیں: کوئی یہودی نہیں مرتا جب تک کہ وہ حضرت روح اللہ پر ایمان نہ لائے اور حضرت مجاہد کا یہی قول ہے بلکہ ابن عباسؓ سے تو یہاں تک روایت ہے کہ اگر کسی اہل کتاب کی گردن تلوار سے اڑا دی جائے تاہم اس کی روح نہیں نکلتی۔ جب تک کہ وہ حضرت عیسیٰؑ پر ایمان نہ لائے اور یہ نہ کہہ دے کہ آپ اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔

حضرت ابی کی قرابت میں قبل مَوْتِهِمْ ہے۔ ابن عباسؓ سے پوچھا گیا کہ فرض کرو کوئی دیوار سے گر کر مر جائے؟ فرمایا: پھر بھی اس درمیانی فاصلہ میں وہ ایمان لا چکتا ہے۔ عکرمہؒ محمد بن سیرینؒ ضحاک اور جو بیر سے بھی یہی مروی ہے۔ ایک قول امام حسنؒ سے بھی روایت ہے: جس کا مطلب سابقہ قول کی تائید میں بھی ہو سکتا ہے اور حضرت عیسیٰؑ کی موت سے پہلے کا بھی ہو سکتا ہے۔ تیسرا قول یہ ہے کہ اہل کتاب میں سے کوئی نہیں مگر یہ کہ وہ آنحضرت ﷺ پر اپنی موت سے پہلے ایمان لائے گا۔ عکرمہ بھی یہی فرماتے ہیں۔ ابن جریر فرماتے ہیں: ان سب اقوال میں زیادہ ترصحیح قول پہلا ہی ہے کہ جب حضرت عیسیٰؑ آسمان سے قریب قیامت کے اتریں گے اس وقت کوئی اہل کتاب آپ پر ایمان لائے بغیر نہ رہے گا۔

روایت اور پھر درایت ☆

فی الواقع امام صاحب کا یہ فیصلہ حق بجانب ہے۔ اس لئے کہ اس مؤقف کی آیتوں سے صاف ظاہر ہے کہ اصل مقصود یہودیوں کے اس دعوے کو غلط ثابت کرتا ہے کہ ہم نے جناب مسیح کو قتل کیا اور سولی دی اور اسی طرح جن جاہل عیسائیوں نے بھی یہ کہا ہے ان کے قول کو بھی باطل کرنا ہے تو اللہ تعالیٰ خبر دیتا ہے کہ فی الواقع نہ تو روح اللہ مقتول ہوئے نہ مصلوب ہوئے بلکہ ان کے لئے شبہ میں ڈال دیا گیا اور انہوں نے حضرت عیسیٰ کے ایک ہم شکل شخص کو قتل کیا۔ لیکن خود انہیں اس حقیقت کا علم نہ ہو سکا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو تو اپنے پاس اٹھالیا' وہ زندہ ہیں' اب تک باقی ہیں۔ قیامت کے قریب اتریں گے۔ جیسے صحیح متواتر حدیثوں میں ہے۔ مسیح دجال کو قتل کریں گے۔ اعلان کر دیں گے کہ یا تو اسلام کو قبول کرو یا تلوار سے مقابلہ کرو۔ پس اس آیت میں اللہ خبر دیتا ہے کہ اس وقت تمام اہل کتاب آپ کے ہاتھ پر ایمان قبول کریں گے اور ایک بھی ایسا نہیں رہے گا جو اسلام سے رک سکے یا رکے۔ پس جسے یہ گمراہ یہود اور جاہل نصرانی مرا ہوا جانتے ہیں اور سولی پر چڑھا ہوا مانتے ہیں۔ یہ ان کی حقیقی موت سے پہلے ہی ان پر ایمان لائیں گے اور جو کام انہوں نے ان کی موجودگی میں کئے ہیں اور کریں گے۔ یہ ان پر قیامت کے دن اللہ کے سامنے گواہی دیں گے۔ یعنی آسمان پر اٹھائے جانے کے قبل کی زندگی کے معائنے کئے ہوئے کام اور دوبارہ کی آخری زندگی جو زمین پر گزاری' اس میں ان کے سامنے جو کام انہوں نے کئے وہ سب آپ کی نگاہوں کے سامنے ہوں گے اور اللہ تعالیٰ کے سامنے انہیں پیش کریں گے۔ ہاں اس کی تفسیر میں جو دو قول اور بیان ہوئے ہیں' وہ بھی واقعہ کے اعتبار سے بالکل صحیح اور درست ہیں۔ فرشتہ موت کے آ جانے کے بعد احوال آخرت سچ جھوٹ کا معائنہ ہو جاتا ہے۔ اس وقت ہر شخص سچائی کو سچ کہنے اور سمجھنے لگتا ہے۔ لیکن وہ ایمان اللہ کے نزدیک معتبر نہیں۔ اسی سورۃ کے شروع میں ﴿وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِيْنَ

يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ حَتّٰۤى اِذَا حَضَرَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ اِنِّىْ تُبْتُ الْـٰٔنَ (النساء ۱۸) اور دوسری جگہ فرمان ہے فَلَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا قَالُوْۤا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗ (المؤمن ۸۴) یعنی جولوگ موت کے آجانے تک برائیوں میں مشغول رہے ان کی توبہ قبول نہیں اور جولوگ عذاب اللہ دیکھ کر ایمان لائیں گے۔انہیں بھی ان کا ایمان نفع نہیں دے گا پس ان دونوں آیتوں کو سامنے رکھ کر ہم کہتے ہیں کہ پچھلے دو اقوال کی جو امام ابن جریر نے تردید کی ہے یہ ٹھیک نہیں ہے۔اس لئے کہ امام صاحب فرماتے ہیں اگر پچھلے دونوں قولوں کی اس آیت کی تفسیر میں صحیح مانا جائے تو لازم آتا ہے کہ کسی یہودی یا نصرانی کے اقربا اس کے وارث نہ ہوں۔اس لئے کہ وہ تو حضرت عیسیٰ پر اور حضرت محمد ﷺ پر ایمان لا کر مرا اور اس کے وارث یہود نصاریٰ ہیں اور مسلمان کا وارث کافر ہو نہیں سکتا۔لیکن ہم کہتے ہیں یہ اس وقت ہے جب ایسے وقت لائے کہ اللہ کے نزدیک معتبر ہو ورنہ ایسے وقت ایمان لانا بالکل بے سود ہے۔ابن عباسؓ کے قول پر گہری نظر ڈالئے کہ دیوار سے گرتے ہوئے درندے کے چباتے وقت تلوار کے چلتے ہوئے وہ ایمان لاتا ہے پس صاف ظاہر ہے کہ ایسی حالت کا ایمان مطلق نفع نہیں دے سکتا۔جیسے قرآن کی مندرجہ بالا آیتیں ظاہر کر رہی ہیں۔ واللہ اعلم۔میرے خیال سے تو یہ بات بہت صاف ہے کہ اس آیت کی تفسیر کے پچھلے دونوں قول معتبر مان لینے سے کوئی اشکال پیش نہیں آتا۔اپنی جگہ وہ بھی ٹھیک ہیں۔لیکن ہاں آیت سے واقعہ مطلب تو یہی ہے جو پہلا قول ہے تو اس سے مراد یہ ہے کہ عیسیٰ آسمانوں پر زندہ موجود ہیں۔قیامت کے قریب زمین پر اتریں گے اور یہودیوں اور نصرانیوں کو جھوٹا بتائیں گے اور جو افراط و تفریط انہوں نے کی ہے اسے باطل قرار دیں گے۔ایک طرف ملعون جماعت یہودیوں کی ہے۔جنہوں نے آپ کو آپ کے مقام سے بہت گرا دیا اور ایسی ناپاک باتیں آپ کی شان میں کہیں جن سے ایک بھلا انسان نفرت کرے۔دوسری جانب نصرانی ہیں جنہوں نے آپ کے مرتبے کو بڑھایا کہ جو آپ میں نہ تھا اس کا بھی اثبات کیا اور مقام نبوت سے مقام ربوبیت تک پہنچا دیا۔جس سے اللہ کی ذات بالکل پاک ہے۔

احادیثِ مبارکہ ☆

اب ان حدیثوں کو سنئے جن میں بیان ہے کہ حضرت عیسیٰ آخری زمانے میں قیامت کے قریب آسمان سے زمین پر اتریں گے اور اللہ وحدہ لاشریک لہ کی عبادت کی طرف سب کو بلائیں گے۔صحیح بخاری جسے ساری امت نے قبول کیا ہے۔اس میں امام بخاری کتاب ذکر انبیاء میں یہ حدیث لائے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اس کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ عنقریب تم میں ابن مریم نازل ہوں گے۔عادل حاکم بن کر صلیب کو توڑ دیں گے۔خنزیر کو قتل کر دیں گے۔جزیہ ہٹا دیں گے۔مال اس قدر بڑھ جائے گا کہ اسے کوئی لینا منظور نہ کریگا۔ایک سجدہ کر لینا دنیا اور دنیا کی سب چیزوں سے محبوب تر ہوگا۔

اس حدیث کو بیان کر کے راوی حدیث حضرت ابوہریرہؓ نے بہ طور شہادت قرآنی کے اسی آیت وَاِنْ مِّنْ کی آخر تک تلاوت کی۔صحیح مسلم میں بھی یہ حدیث ہے اور سند سے یہی روایت بخاری مسلم میں مروی ہے۔اس میں ہے کہ سجدہ اس وقت فقط رب العالمین کے لئے ہی ہوگا اور اس آیت کی تلاوت میں قبل موته کے بعد یہ فرمان ہے کہ قبل موت عیسی بن مریم پھر اسے حضرت ابوہریرہ کا تین مرتبہ دہرانا بھی ہے۔مسند احمد کی حدیث میں ہے حضرت عیسیٰ حج یا عمرے پر یا دونوں پر لبیک کہیں گے۔میدان فج روحا میں یہ حدیث مسلم میں بھی ہے۔مسند کی دوسری حدیث میں ہے عیسیٰ بن مریم اتریں گے خنزیر کو قتل کریں گے۔صلیب کو مٹائیں گے۔نماز باجماعت ہوگی اور مال راہ اللہ میں اس کثرت سے دیا جائے گا کہ کوئی قبول کرنے والا نہ ملے گا۔

خراج چھوڑ دیں گے روحا میں جائیں گے اور وہاں سے حج یا عمرہ کریں گے یا دونوں ایک ساتھ کریں گے۔ پھر ابو ہریرہؓ نے یہی آیت پڑھی۔ لیکن آپ کے شاگرد حضرت حنظلہ کا خیال ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ نے فرمایا کہ عیسیٰ کے انتقال سے پہلے آپ پر ایمان لائیں گے۔ مجھے نہیں معلوم کہ یہ سب حدیث کے ہی الفاظ ہیں یا ابو ہریرہ کے اپنے۔ صحیح بخاری میں ہے اس وقت کیا ہوگا جب تمہارے درمیان مسیح بن مریمؑ اتریں گے اور تمہارا امام تمہیں میں سے ہوگا۔

ابو داؤد مسند احمد وغیرہ میں ہے حضور ﷺ نے فرمایا: انبیاء کرام علیہم السلام سب ایک باپ کے بیٹے بھائی کی طرح ہیں۔ مائیں جدا اور دین ایک۔ عیسیٰ بن مریمؑ سے زیادہ تر نزدیک میں ہوں۔ اس لئے کہ میرے اور ان کے درمیان کوئی اور نبی نہیں یقیناً وہ اترنے والے ہیں۔

سیدنا عیسیٰ علیہ السلام ☆

پس تم انہیں پہچان لو۔ درمیانہ قد ہے۔ سرخ و سفید رنگ ہے۔ صعر (زرد) کپڑے اوڑھے باندھے ہوئے ہوں گے۔ ان کے سر سے قطرے ٹپک رہے ہوں گے۔ گو تری نہ پہنچی ہو۔ صلیب توڑ دیں گے۔ خنزیر کو قتل کریں گے۔ جزیہ قبول نہ کریں گے۔ لوگوں کو اسلام کی طرف بلائیں گے۔ ان کے زمانہ میں تمام ملتیں مٹ جائیں گی۔ صرف اسلام ہی اسلام رہے گا۔ ان کے زمانے میں اللہ تعالیٰ مسیح دجال کو ہلاک کرے گا۔ پھر زمین پر امانت واقع ہوگی۔ یہاں تک کہ کالے ناگ اونٹوں کے ساتھ چیتے گایوں کے ساتھ اور بھیڑیے بکریوں کے ساتھ چرتے پھریں گے اور بچے سانپوں کے ساتھ کھیلیں گے۔ انہیں وہ کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے۔ چالیس برس ٹھہریں گے۔ پھر فوت ہوں گے اور مسلمان آپ کے جنازے کی نماز ادا کریں گے۔ ابن جریر کی اس روایت میں ہے آپ لوگوں سے ان کو مسلمان کرنے کے لئے جہاد کریں گے۔ اس حدیث کا ایک ٹکڑا صحیح بخاری میں بھی ہے اور روایت میں ہے سب سے زیادہ قریب تر حضرت عیسیٰؑ سے دنیا اور آخرت میں ہوں گے۔ صحیح مسلم میں ہے قیامت قائم نہ ہوگی۔ جب تک رومی اعماق یا دابق میں نہ اتریں گے اور ان کے مقابلہ کے لئے مدینہ سے مسلمانوں کا لشکر نہ جائے جو اس وقت تمام زمین کے لوگوں سے زیادہ اللہ کے پسندیدہ بندے ہوں گے۔ جب صفیں بندھ جائیں گی تو رومی کہیں گے ہم تم سے لڑنا نہیں چاہتے۔ ہم میں سے جو دین بدل کر تم میں جا ملے ہیں ہم ان سے لڑنا چاہتے ہیں تم درمیان سے ہٹ جاؤ۔ لیکن مسلمان کہیں گے: واللہ یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ ہم اپنے ان کمزور بھائیوں کو تمہارے حوالے کر دیں۔ چنانچہ لڑائی شروع ہوگی۔ مسلمانوں کے اس لشکر کا کچھ حصہ تو شکست کھا کر بھاگ کھڑا ہوگا ان لوگوں کی توبہ اللہ تعالیٰ ہرگز قبول نہ فرمائے گا اور تہائی حصہ شہید ہو جائے گا۔ جو اللہ کے نزدیک سب سے افضل شہید ہیں۔ لیکن آخری تہائی حصہ فتح حاصل کر لے گا اور رومیوں پر غالب آ جائے گا۔ یہ پھر کسی فتنے میں نہ پڑیں گے۔ قسطنطنیہ کو فتح کریں گے۔

خروجِ دجال ☆

وہ اپنی تلواریں زیتون میں لٹکائے ہوئے مال غنیمت تقسیم کر رہے ہوں گے عین اسی حالت میں شیطان چیخ کر کہے گا کہ تمہارے بال بچوں میں دجال آ گیا۔ اس کے اس جھوٹ کو سچ جان کر مسلمان یہاں سے نکل کھڑے ہوں گے۔ شام میں پہنچیں گے۔ دشمنوں سے جنگ آزما ہونے کے لئے صفیں ٹھیک کر رہے ہوں گے کہ دوسری جانب نماز کی اقامت ہوگی اور حضرت عیسیٰؑ بن مریم نازل ہوں گے۔ ان کی امامت کرائیں گے۔ جب دشمن اللہ انہیں دیکھے گا تو اس طرح گھلنے لگے گا جس طرح نمک پانی میں گھلتا ہے۔ اگر عیسیٰؑ اسے یوں ہی چھوڑ دیں جب بھی وہ گھلتے گھلتے ختم ہو جائے لیکن اللہ تعالیٰ اسے آپ کے

ہاتھ سے قتل کرائے گا اور آپ اپنے نیزہ پر اس کا خون لوگوں کو دکھائیں گے۔ مسند احمد اور ابن ماجہ میں ہے' حضور ﷺ فرماتے ہیں: معراج والی رات میں نے ابراہیمؑ و موسیٰؑ اور عیسیٰؑ سے ملاقات کی۔ آپس میں قیامت کے بارے میں بات چیت ہونے لگی۔ ابراہیمؑ نے اپنی لاعلمی ظاہر کی۔ اسی طرح موسیٰؑ نے بھی۔ لیکن حضرت عیسیٰؑ نے فرمایا: اس کے آنے کا ٹھیک وقت تو سوائے اللہ تعالیٰ عزوجل کے کوئی نہیں جانتا۔ ہاں مجھ سے میرے رب نے جو عہد لیا ہے وہ یہ ہے کہ دجال نکلے گا۔ اس کے ہمراہ دو شاخیں ہوں گی۔ مجھے دیکھ کر وہ اس طرح پگھلنے لگے گا جس طرح سیسہ پگھلتا ہے۔ پس اللہ تعالیٰ اسے ہلاک کرے گا۔ جب وہ مجھے دیکھ لے گا۔ یہاں تک کہ پتھر اور درخت بھی بولنے لگیں گے کہ اے مسلمان یہاں میرے پیچھے ایک کافر ہے آ اور اسے قتل کر۔ پس اللہ تعالیٰ ان سب کو غارت کر دے گا اور لوگ امن امان کے ساتھ اپنے اپنے وطن اور شہروں کو لوٹ جائیں گے۔

یاجوج و ماجوج ☆

اس کے بعد یاجوج ماجوج نکلیں گے اور ہر طرف چڑھ آئیں گے۔ تمام شہروں کو روند ڈالیں گے۔ جس جس چیز پر ان کا گزر ہوگا اسے ہلاک کر دیں گے۔ جس پانی کے پاس سے گزریں گے پی جائیں گے۔ لوگ پھر لوٹ کر میرے پاس آئیں گے میں اللہ تعالیٰ سے دعا کروں گا تو اللہ تعالیٰ ان سب کو ایک ساتھ فنا کر دیں گے۔ لیکن ان کے مردہ جسموں سے ہوا متعفن ہو جائے گی۔ بدبو پھیل جائے گی۔ پھر مینہ برسے گا اور اس قدر کہ ان کی تمام لاشوں کو بہا کر سمندر میں ڈال دے گا۔

بس اس وقت قیامت کی اس طرح آمد آمد ہوگی جس طرح پورے دن کی حاملہ عورت ہو کہ اس کے گھر والے نہیں جانتے کہ صبح کو بچہ ہو جائے یا شام کو ہو جائے گا۔ رات کو پیدا ہو جائے یا دن کو[1]؟ مسند احمد میں ہے کہ حضرت ابونفرہ فرماتے ہیں: ہم عثمان بن ابوالعاص کے پاس جمعہ کے روز آئے تاکہ اپنا لکھا ہوا قرآن ان کی قرأت سے ملائیں۔ جمعہ کا جب وقت آیا تو آپ نے ہم سے فرمایا: غسل کر لو' پھر خوشبو لے آئے جو ہم نے ملی' پھر مسجد میں آئے اور ایک شخص کے پاس بیٹھ گئے۔ جنہوں نے ہم سے دجال والی حدیث بیان کی۔ پھر عثمان بن ابوالعاصؓ آئے ہم کھڑے ہو گئے۔ پھر سب بیٹھ گئے۔

قیامت کی نشانیاں ☆

آپ نے فرمایا: میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ مسلمانوں کے تین شہر ہو جائیں گے۔ ایک دونوں سمندر ملنے کی جگہ پر۔ ایک جبرہ میں اور ایک شام میں۔ پھر تین گھبراہٹیں لوگوں کو ہوں گی۔ پھر دجال نکلے گا یہ پہلے شہر کی طرف جائے گا۔ وہاں کے لوگ تین حصوں میں ہو جائیں گے۔ ایک حصہ تو کہے گا کہ ہم اس کے مقابلہ پر ٹھہرے رہیں گے اور دیکھیں گے کیا ہوتا ہے؟ اور دوسری جماعت گاؤں کے لوگوں میں مل جائے گی اور تیسری جماعت دوسرے شہر میں چلی جائے گی جو ان سے قریب ہوگا۔ دجال کے ساتھ ستر ہزار لوگ ہوں گے۔ جن کے سروں پر تاج ہوں گے۔ ان کی اکثریت یہودیوں اور عورتوں کی ہوگی۔ یہاں کے یہ مسلمان ایک گھاٹی میں سمٹ کر محصور ہو جائیں گے۔ ان کے جانور جو چرنے چگنے کو گئے ہوں گے وہ بھی ہلاک ہو جائیں گے۔ اس وجہ سے ان کے مصائب بہت بڑھ جائیں گے اور بھوک کی وجہ سے بُرا حال ہو جائے گا۔ یہاں تک کہ اپنی کمانوں کی تانیں بھون بھون کر کھالیں گے۔ جب سخت تنگی میں ہوں گے تو انہیں سمندر میں سے آواز آئے گی کہ لوگو! تمہارے لئے امداد آگئی۔ اس آواز کو سن کر یہ لوگ خوش ہوں گے۔ کیونکہ آواز سے جان لیں گے کہ یہ کسی آسودہ شخص کی آواز ہے۔

---

[1] مطلب یہ ہے کہ ایام حمل (عام حالات میں نو ماہ) پورے ہونے کے بعد جس طرح صبح و شام میں بچہ پیدا ہی ہونے والا ہو۔ اسی طرح قیامت کسی صبح و شام میں قائم ہو ہی جائے گی۔

نزولِ عیسیٰ علیہ السلام ☆

عین صبح نماز کے وقت حضرت عیسیٰ بن مریمؑ نازل ہوں گے۔ان کا امیر آپ سے کہے گا کہ اے روح اللہؑ آگے بڑھئے اور نماز پڑھایئے لیکن آپ کہیں گے کہ اس امت کے بعض لوگ بعض کے امیر ہیں‘ چنانچہ انہیں کا امیر آگے بڑھے گا اور نماز پڑھائے گا۔فارغ ہونے کے بعد آپ اپنا حربہ ہاتھوں میں لے کر مسیح دجال کا رخ کریں گے۔دجال آپ کو دیکھ کر سیسے کی طرح پگھلنے لگے گا۔آپ اس سے سینہ پر وار کریں گے جس سے وہ ہلاک ہو جائے گا اور اس کے ساتھی شکست کھا کر بھاگ کھڑے ہوں گے۔لیکن انہیں کہیں امن نہیں ملے گا یہاں تک کہ اگر وہ کسی درخت تلے چھپے ہوں گے تو وہ درخت پکار کر کہے گا کہ اے مؤمن یہ ایک کافر میرے پاس چھپا ہوا ہے اور اسی طرح پتھر بھی۔

دجال اور اُس کی نشانیاں ☆

ابن ماجہ میں ہے کہ حضور ﷺ نے اپنے ایک خطبہ کا کم وبیش حصہ دجال کا واقعہ بیان کرنے اور اس سے ڈرانے میں ہی صرف کیا۔جس میں یہ بھی فرمایا کہ دنیا کی ابتداء سے لے کر انتہا تک کوئی فتنہ اس سے بڑا نہیں۔تمام انبیاء اپنی اپنی امتوں کو اس سے آگاہ کرتے رہے ہیں۔میں سب سے آخری نبی ہوں اور تم سب سے آخری امت ہو۔وہ یقیناً تم ہی میں آئے گا۔اگر میری موجودگی میں آ گیا تب تو میں اس سے نمٹ لوں گا اور اگر بعد میں آیا تو ہر شخص کو خود کو اس سے بچانا پڑے گا۔میں اللہ تعالیٰ کو ہر مسلمان پر اپنا خلیفہ بناتا ہوں۔وہ شام و عراق کے درمیان نکلے گا دائیں بائیں خوب گھومے گا۔لوگو! اے اللہ کے بندو! دیکھو دیکھو تم ثابت قدم رہنا۔سنو! میں تمہیں اس کی ایسی صفت سناتا ہوں‘ جو کسی نبی نے اپنی امت کو نہیں سنائی۔وہ ابتداً دعویٰ کرے گا کہ میں نبی ہوں۔پس تم یاد رکھنا کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں‘ پھر وہ اس سے بڑھ جائے گا اور کہے گا کہ میں خدا ہوں۔پس تم یاد رکھنا کہ اللہ کو ان آنکھوں سے کوئی نہیں دیکھ سکتا۔مرنے کے بعد عالم آخرت میں دیدار باری ہو سکتا ہے اور سنو وہ کانا ہو گا اور تمہارا رب کانا نہیں‘ اس کی دونوں آنکھوں کے درمیان کافر لکھا ہوا ہوگا۔جسے پڑھا لکھا اور ان پڑھ غرض ہر ایماندار پڑھ لے گا۔اس کے ساتھ آگ ہوگی اور باغ ہوگا۔اس کی آگ دراصل جنت ہوگی اور اس کا باغ دراصل جہنم ہوگا۔سنو تم میں سے جسے وہ آگ میں ڈالے وہ اللہ سے فریاد رسی چاہے اور سورہ کہف سے ابتدائی آیات پڑھے‘ اس کی وہ آگ تم پر ٹھنڈک اور سلامتی کا باعث بن جائے گی‘ جیسے کہ خلیل اللہ پر نمرود کی آگ ہو گئی تھی۔اس کا ایک فتنہ یہ بھی ہوگا کہ وہ ایک اعرابی سے کہے گا کہ اگر میں تیرے مرے ہوئے باپ کو زندہ کر دوں‘ تو تو مجھے ربّ مان لے گا‘ وہ اقرار کرے گا۔اتنے میں دو شیطان اس کی ماں اور باپ کی شکل میں ظاہر ہوں گے اور اس سے کہیں گے‘ بیٹے یہی تیرا رب ہے تو اسے مان لے۔اس کا ایک فتنہ یہ بھی ہوگا کہ وہ ایک شخص پر مسلط کر دیا جائے گا۔اسے آرے سے چروا کر دو ٹکڑے کر دے گا پھر لوگوں سے کہے گا: میرے اس بندے کو دیکھنا۔اب میں اس کو زندہ کروں گا۔لیکن پھر بھی یہ کہے گا کہ اس میرے رب کے سوا اور ہے۔چنانچہ یہ اسے اٹھائے گا‘ بٹھائے گا اور خبیث اس سے پوچھے گا کہ تیرا رب کون ہے‘ وہ جواب دے گا: میرا ربّ اللہ تعالیٰ ہے اور تو اللہ کا دشمن دجال ہے۔اللہ کی قسم اب تو مجھے پہلے سے زیادہ یقین ہو گیا۔دوسری سند سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: یہ مؤمن میری تمام امت سے زیادہ بلند درجہ کا جنتی ہوگا۔حضرت ابو سعید خدریؓ فرماتے ہیں: اس حدیث کو سن کر ہمارا یہ خیال تھا کہ وہ شخص حضرت عمر بن خطاب ہی ہو سکتے ہیں اور آپ کی شہادت تک ہمارا یہی خیال رہا۔

ایک فتنہ☆

حضور ﷺ فرماتے ہیں: اس کا ایک فتنہ یہ بھی ہوگا کہ وہ آسمان کو پانی برسانے کا حکم دے گا اور آسمان سے بارش ہو گی۔ وہ زمین کو پیداوار اگانے کا حکم دے گا اور زمین سے پیداوار ہوگی۔ اس کا ایک فتنہ یہ بھی ہوگا کہ وہ ایک قبیلے کے پاس جائے گا وہ اسے نہ مانیں گے۔ اسی وقت ان کی تمام چیزیں برباد اور ہلاک ہو جائیں گی۔ دوسرے قبیلے کے پاس جائے گا جو اسے اللہ مان لے گا۔ اسی وقت اس کے حکم سے ان پر آسمان سے بارش برسے گی اور زمین پھل اور کھیتی اگائے گی۔ ان کے جانور پہلے سے زیادہ موٹے تازے اور دودھ والے ہو جائیں گے۔ سوائے مکہ اور مدینہ کے تمام زمین (ممالک) کا دورہ کرے گا۔ جب مدینہ کا رخ کرے گا تو یہاں ہر ہر راہ پر فرشتوں کو کھلی تلواریں لئے ہوئے پائے گا۔ تو سنجہ کی انتہائی حد ضریب احمر کے پاس ٹھہر جائے گا۔ پھر مدینہ میں تین بھونچال آئیں گے۔ اس وجہ سے جتنے منافق مرد اور منافقہ عورتیں ہوں گی۔ سب مدینہ سے نکل کر اس کے لشکر سے مل جائیں گے اور مدینہ ان گندے لوگوں کو اس طرح اپنے سے دور پھینک دے گا۔ جس طرح بھٹی لوہے کے میل کچیل کو الگ کر دیتی ہے۔ اس دن کا نام یوم الخلاص ہوگا۔ ام شریک نے حضور ﷺ سے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ اس دن عرب کہاں ہوں گے؟ فرمایا: اولاً تو ہوں گے ہی بہت کم اور اکثریت ان کی بیت المقدس میں ہوگی۔ ان کا امام ایک صالح شخص ہوگا' جو آگے بڑھ کر صبح کی نماز پڑھا رہا ہوگا۔ جب حضرت عیسیٰ بن مریم علیہ السلام نازل ہوں گے۔ یہ امام پچھلے پیروں پیچھے ہٹے گا تا کہ آپ آگے بڑھ کر امامت کرائیں۔ لیکن آپ اس کی کمر پر ہاتھ رکھ کر فرمائیں گے کہ آگے بڑھو اور نماز پڑھاؤ۔ اقامت تمہارے لئے کی گئی ہے۔ پس ان کا امام ہی نماز پڑھائے گا۔ نماز سے فارغ ہو کر آپ فرمائیں گے کہ دروازہ کھول دو۔ پس کھول دیا جائے گا۔ ادھر دجال ستر ہزار یہودیوں کا لشکر لئے ہوئے موجود ہوگا۔ جن کے سر پر تاج اور جن کی تلواروں پر سونا ہوگا۔ دجال آپ کو دیکھ کر اس طرح گھلنے لگے گا۔ جس طرح نمک پانی میں گھلتا ہے اور ایک دم پیٹھ پھیر کر بھاگنا شروع کر دے گا۔ لیکن آپ فرمائیں گے: اللہ نے مقرر کر دیا ہے کہ تو میرے ہاتھ سے ایک ضرب کھائے گا تو اسے ٹال نہیں سکتا۔ چنانچہ آپ اسے مشرقی باب لد کے پاس پکڑ لیں گے اور وہیں اسے قتل کریں گے۔ اب یہودی بدحواسی سے منتشر ہو کر بھاگیں گے۔ لیکن انہیں کہیں سر چھپانے کو جگہ نہ ملے گی۔ ہر پتھر ہر درخت ہر دیوار اور ہر جانور بولتا ہوگا کہ اے مسلمان! یہودی یہاں ہے آ کر اسے مار ڈال۔ ہاں ہول کا درخت یہودیوں کا درخت ہے یہ نہیں بولے گا۔ حضور ﷺ فرماتے ہیں: اس کا رہنا چالیس سال تک ہوگا۔ سال آدھے سال کے برابر ہوگا اور آدھا سال مہینہ بھر کی طرح اور مہینہ جمعہ جیسا اور باقی دن مثل شرارہ کے[1] صبح ہی ایک شخص شہر کے دروازے سے چلے گا اور ابھی دوسرے دروازے تک نہیں پہنچا ہوگا تو شام ہو جائے گی۔ لوگوں نے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ پھر ان کے چھوٹے دنوں میں ہم نمازیں کیسے پڑھیں گے۔ آپ نے فرمایا: اندازہ کر لیا کرو جس طرح ان لمبے دنوں میں اندازہ سے پڑھا کرتے تھے۔

برکاتِ عیسیٰ علیہ السلام☆

حضور ﷺ فرماتے ہیں: پس عیسیٰ بن مریمؑ میری امت میں حاکم ہوں گے۔ عادل ہوں گے امام ہوں گے۔ باانصاف ہوں گے۔ صلیب کو توڑ دیں گے۔ خنزیر کو قتل کریں گے۔ جزیے کو ہٹا دیں گے۔ صدقہ چھوڑ دیا جائے گا۔ بس بکری اور اونٹ پر کوشش نہ کی جائے گی۔ حسد اور بغض بالکل جاتا رہے گا۔ ہر زہریلے جانور کا زہر جاتا رہے گا۔ بچے اپنی انگلی سانپ کے

[1] یعنی یہ ایام نہایت تیزی اور جلدی سے گزر جائیں گے۔

منہ میں ڈالیں گے لیکن وہ انہیں ضرر نہیں پہنچائے گا۔ شیروں سے لڑ کے کھیلیں گے۔ نقصان کچھ نہ ہوگا۔ بھیڑیئے بکریوں کے گلے میں اس طرح پھریں گے جیسے رکھوالا کتا ہو۔ تمام زمین اسلام اور اصلاح سے اس طرح بھر جائے گی۔ جیسے کوئی برتن پانی سے لبالب بھرا ہوا ہو۔ سب کا کلمہ ایک ہو جائے گا اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ ہوگی۔ لڑائی اور جنگ بالکل موقوف ہو جائے گی۔ قریش اپنا ملک سلب کر لیں گے۔ زمین مثل سفید چاندی کے منور ہو جائے گی اور جیسے برکتیں زمانہ آدمؑ میں تھیں اگا دے گی۔ ایک جماعت کو ایک انگور کا خوشہ پیٹ بھرنے کے لئے کافی ہوگا۔ ایک انار اتنا بڑا ہوگا کہ ایک جماعت کھائے اور سیر ہو جائے۔ بیل اتنی اتنی قیمت پر ملے گا اور گھوڑا چند درہموں پر ملے گا۔ لوگوں نے پوچھا: اس کی قیمت گر جانے کی کیا وجہ ہوگی؟ اس لئے کہ لڑائیوں میں اس کی سواری بالکل نہ لی جائے گی[1] دریافت کیا گیا کہ بیل کی قیمت بڑھ جانے کی کیا وجہ ہے؟ فرمایا: اس لئے کہ تمام زمین میں کھیتیاں ہونی شروع ہو جائیں گی[2] دجال کے ظہور سے تین سال پیشتر سخت قحط سالی ہوگی۔ پہلے سال بارش کا تیسرا حصہ بحکم اللہ روک لیا جائے اور زمین کی پیداوار کا بھی تیسرا حصہ کم ہو جائے گا۔ پھر دوسرے اللہ آسمان کو حکم دے گا کہ بارش کی دو تہائیاں کم کر دے۔ تیسرے سال آسمان سے بارش کا ایک قطرہ بھی نہ برسے گا۔ نہ زمین سے کوئی روئید گی پیدا ہوگی۔ تمام جانور اس قحط سے ہلاک ہو جائیں گے۔ مگر جسے اللہ چاہے۔ آپ سے پوچھا گیا کہ پھر اس وقت لوگ زندہ کیسے رہ سکتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ان کی غذا کے قائم مقام اس وقت ان کا **لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ** کہنا اور **اَللّٰہُ اَکْبَرُ** اور **سُبْحَانَ اللّٰہِ** کہنا اور **اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ** کہنا ہوگا۔[3] امام ابن ماجہ فرماتے ہیں: میرے استاد نے اپنے استاد سے سنا' وہ فرماتے تھے: یہ حدیث اس قابل ہے کہ بچوں کے استاد اسے بچوں کو بھی سکھا دیں' بلکہ لکھوا دیں تاکہ انہیں یاد بھی رہے۔ یہ حدیث اس سند سے ہے تو غریب۔ لیکن اس کے بعض حصوں کے شواہد دوسری حدیثیں ہیں' اسی حدیث کے مثل ایک حدیث حضرت نواس بن سمعانؓ سے روایت ہے۔ اسے بھی ہم یہاں بیان کرتے ہیں۔

صحیح مسلم میں ہے ایک دن صبح کو آنحضرتؐ نے دجال کا ذکر کیا اور اس طرح اسے بلند و پست کیا کہ ہم سمجھے کہیں مدینہ کے نخلستان میں موجود نہ ہو۔ پھر جب ہم لوٹ کر آپ کی طرف آئے تو ہمارے چہروں سے آپ نے جان لیا اور دریافت فرمایا: کیا بات ہے؟ ہم نے بیان کر دیا تو آپ نے فرمایا: دجال کے علاوہ مجھے تو تم پر اور اس سے بھی بڑھ کر خوف ہے۔ اگر وہ میری موجودگی میں نکلا تو میں خود بخود اس سے سمجھ لوں گا اور اگر وہ میرے بعد آیا تو ہر مسلمان اس سے آپ بھگت لے گا۔ میں اپنا خلیفہ ہر مسلمان پر اللہ کو بناتا ہوں۔ وہ جوان ہوگا' آنکھ اسکی ابھری ہوئی ہوگی۔ پس یوں سمجھ لو کہ عبدالعزیٰ بن قطن کی

---

[1] عہد حاضر میں جنگ کے طریقے جس طرح بدل گئے اور گھوڑوں کے بجائے جہازوں ٹینکوں اور سینکڑوں نئے اسلحہ جات جنگ سے کام لیا جانے لگا۔ آپ ﷺ کی پیش گوئی کس قدر صحیح اور سچی ثابت ہو رہی ہے' ساتھ ہی قیامت کی نشانیاں ہر شعبہ زندگی میں کتنی تیزی کے ساتھ نمودار ہو رہی ہیں' یہاں تک کہ جنگ کا میدان بھی اب قیامت کی اطلاعات دے رہا ہے۔

[2] ان تمام برکات پر حیرت کیوں ہو؟ انصاف وعدالت کی پختہ بنیادوں پر جب بھی کبھی دنیا میں حکومتیں قائم ہوئیں تو ان کے عدل پرور عہد میں بھی برکات کا دامن وسیع ہو گیا اور چونکہ عیسیٰ علیہ السلام کی حکومت خدائی قانونِ عدل وانصاف کی بے نظیر اسٹیٹ ہوگی اس لیے اس میں برکات کا ظہور بھی قوت کے ساتھ ہوگا۔

[3] دجال کی حکومت خدائی قوانین کے خلاف حکومتِ الٰہیہ کے دستور سے ہٹ کر شیطان وطاغوت کی ایک فرمانروائی ہوگی ایسے کٹھن اوقات میں اللہ جل جلالہٗ کا غضب بڑھ جاتا ہے اور زمین خیر وبرکت سے محروم ہو جاتی ہے۔ چنانچہ دجال کے عہد میں بھی یہی کچھ ہوگا۔

طرح ہوگا۔ تم میں سے جو اسے دیکھے اس کو چاہئے کہ سورہ کہف کی ابتدائی آیتیں پڑھے۔ وہ شام وعراق کے درمیانی گوشے سے نکلے گا اور دائیں بائیں گشت کرے گا۔ اے اللہ کے بندو! خوب ثابت قدم رہنا۔ ہم نے پوچھا: حضور صلی اللہ علیہ وسلم وہ کتنی مدت رہے گا؟ آپ نے فرمایا: چالیس دن۔ ایک دن ایک سال کے برابر۔ ایک دن ایک مہینے کے برابر۔ ایک دن جمعہ کے برابر اور باقی تمہارے معمولی دنوں کے برابر۔ ہم نے پھر دریافت کیا کہ جو دن سال کے برابر ہوگا' کیا اس ہی دن کی نمازیں کافی ہوں گی؟ آپ نے فرمایا: نہیں' بلکہ اندازہ کرلو۔ ہم نے پھر پوچھا: یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کی رفتار کی سرعت کیسی ہوگی؟ فرمایا: ایسی جیسے بادل ہواؤں کے ذریعہ بھاگتے ہیں۔ ایک قوم کو اپنی طرف بلائے گا وہ مان لیں گے تو آسمان سے سب پر بارش ہوگی۔ زمین سے کھیتی اور پھل اُگیں گے۔ ان کے جانور تروتازہ ہوں گے اور زیادہ دودھ دینے والے ہو جائیں گے۔ ایک قوم کے پاس جائے گا جو اسے جھٹلائے گی اور اس کا انکار کردے گی۔ یہ یہاں سے واپس ہوگا۔ تو ان کے ہاتھ کچھ نہ رہے گا۔ وہ بنجر زمین پر کھڑا ہو کر حکم دے گا کہ اے زمین کے خزانو! نکل آؤ تو وہ سب نکل آئیں گے اور شہد کی مکھیوں کی طرح اس کے پیچھے پھریں گے۔ یہ ایک نوجوان کو بلائے گا اسے قتل کردے گا اور اس کے ٹھیک دو ٹکڑے کر کے اتنی اتنی دور ڈال دے گا کہ ایک تیز رفتار رہو۔ پھر اسے آواز دے گا تو وہ زندہ ہو کر ہنستا ہوا اس کے پاس آ جائے گا۔ اب اللہ تعالیٰ مسیح بن مریم علیہ السلام کو بھیجے گا اور وہ دمشق کے سفید شرقی مینار کے پاس کو چادریں اوڑھے باندھے دو فرشتوں کے پروں پر بازو رکھے ہوئے اُتریں گے۔ جب سر جھکائیں گے تو قطرے ٹپکیں گے اور جب اٹھائیں گے تو مثل موتیوں کے دو قطرے لڑھکیں گے۔ جس کافر تک ان کا سانس پہنچ جائے گا وہ مر جائے گا اور آپ کا سانس وہاں تک پہنچے گا۔ جہاں تک نگاہ پہنچے۔ آپ دجال کا پیچھا کریں گے اور باب لُد کے پاس اسے پا کر قتل کریں گے۔ پھر ان لوگوں کے پاس آئیں گے جنہیں اللہ نے اس فتنے سے بچا رکھا ہوگا۔ ان کے چہروں پر ہاتھ پھیریں گے اور ان کے اعلیٰ مراتب کی انہیں خبر دیں گے۔ اب اللہ کی طرف سے حضرت عیسیٰ کے پاس وحی آئے گی کہ میں اپنے بندوں کو بھیجتا ہوں' جن کا مقابلہ کوئی نہیں کر سکتا۔ تو تم میرے ان خاص بندوں کو طور کی طرف لے جاؤ۔ پھر یاجوج ماجوج نکلیں گے اور وہ ہر طرف سے کودتے پھاندتے آ جائیں گے۔ بحیرہ طبریہ پر ان کا پہلا گروہ آئے گا اور اس کا سارا پانی پی جائے گا۔ جب ان کے بعد دوسرا گروہ آئے گا تو وہ ایسا سوکھا پڑا ہوگا کہ وہ کہیں گے شاید کبھی پانی نہیں رہا۔ حضرت عیسیٰ اور آپ کے ساتھی مؤمن وہاں اس قدر محصور رہیں گے کہ ایک بیل کا سرا نہیں اس سے بھی اچھا لگے گا۔ جیسے تمہیں آج سو دینار محبوب ہیں۔[1] اب آپ اور مؤمن اللہ سے دعائیں اور التجائیں کریں گے۔ اللہ ان پر گردن کی گلٹی کی بیماری بھیج دے گا۔ جس میں وہ سب ایک ساتھ فنا ہو جائیں گے۔ پھر حضرت عیسیٰ اور آپ کے ساتھی زمین پر اتریں گے۔ مگر زمین پر بالشت بھر جگہ بھی ایسی نہ پائیں گے جو ان کی لاشوں سے اور بدبو سے خالی ہو۔ پھر آپ اللہ تعالیٰ سے دعائیں اور التجائیں کریں گے تو بختی اونٹوں کی گردنوں کے برابر ایک قسم کے پرند اللہ تعالیٰ بھیجے گا جو ان کی لاشوں کو اٹھا کر جہاں اللہ چاہے ڈال آئیں گے۔ پھر بارش ہوگی' جس سے تمام زمین دھل دھلا کر ہتھیلی جیسی صاف ہو جائے گی۔ پھر زمین کو حکم ہوگا کہ اپنے پھل نکال اور اپنی برکتیں ظاہر کر۔ اس دن ایک انار ایک جماعت کو کافی ہوگا اور وہ

---

[1] یعنی اس محاصرہ میں رہنے کی وجہ سے اور کھانے پینے کی ضروریات مہیا نہ ہونے کی بناء پر بیل کی معمولی سی قیمت سو دینار سے بھی زیادہ ہوگی اور ایک لقمہ کے ملنے سے وہ خوشی محسوس کریں گے جو ان کو سو دینار کے ملنے سے بھی نہ ہوں۔

سب اس کے چھلکے تلے آرام حاصل کر سکیں گے۔[1] ایک اونٹنی کا دودھ ایک پورے قبیلے سے نہیں پیا جائے گا۔ پھر پروردگار عالم ایک لطیف اور پاکیزہ ہوا چلائے گا' جو تمام ایمانداروں مرد عورتوں کی بغل تلے سے نکل جائے گی اور ساتھ ہی ان کی روح بھی پرواز کر جائے گی اور بدترین لوگ باقی رہ جائیں گے۔ جو آپس میں گدھوں کی طرح دھینگا مشتی میں مشغول ہو جائیں گے۔ ان پر قیامت قائم ہو گی۔

مسند احمد میں بھی ایک ایسی ہی حدیث ہے اسے ہم سورہ انبیاء کی آیت ﴿حَتّٰى اِذَا فُتِحَتْ يَاْجُوْجُ وَمَاْجُوْجُ﴾ کی تفسیر میں بیان کریں گے۔ انشاء اللہ۔ صحیح مسلم میں ہے کہ ایک شخص حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے پاس آیا اور کہا کہ یہ کیا بات ہے جو مجھے پہنچی ہے کہ آپ فرماتے ہیں: قیامت یہاں یہاں تک آ جائے گی۔ آپ نے سبحان اللہ یا لا الہ الا اللہ کہہ کر فرمایا: میرا تو اب جی چاہتا ہے کہ تمہیں کوئی حدیث نہ سناؤں۔[2] میں نے تو یہ کہا تھا کہ کچھ زمانے کے بعد تم بڑے بڑے امر دیکھو گے۔ بیت اللہ جلا دیا جائے گا اور یہ ہو گا اور وہ ہو گا وغیرہ۔ پھر فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ دجال نکلے گا اور میری امت میں چالیس تک ٹھہرے گا۔ مجھے نہیں معلوم کہ چالیس دن یا چالیس مہینے یا چالیس سال۔ پھر اللہ تعالیٰ عیسیٰ بن مریمؑ کو بھیجے گا۔ آپ کی صورت مثل عروہ بن مسعود کی ہے۔ آپ اسے تلاش کر کے قتل کریں گے۔ پھر سات سال تک لوگ اس طرح رہیں گے کہ دو میں کچھ عداوت نہ ہو گی۔ پھر ایک ٹھنڈی ہوا شام کی طرف سے چلے گی اور سب ایمان والوں کو فوت کر دے گی۔ جس کے دل میں ذرہ برابر بھی بھلائی یا ایمان ہو گا۔ اگرچہ وہ کسی پہاڑ کے غار میں ہو فوت ہو جائے گا۔ پھر بدترین لوگ باقی رہ جائیں گے جو پرندوں جیسے ہلکے اور درندوں جیسے دماغوں والے ہوں گے اچھائی برائی کی کوئی تمیز ان میں نہ ہو گی۔ شیطان ان میں انسانی صورت میں آ کر انہیں بت پرستی کی طرف مائل کر دے گا۔ لیکن ان کی اس حالت میں بھی ان کی روزیوں کے دروازے ان پر کھلے ہوئے ہوں گے اور زندگی آرام سے گزر رہی ہو گی۔ پھر صور پھونکا جائے گا۔ جس سے لوگ لڑنے لگیں گے۔ ایک شخص جو اپنے اونٹوں کو پانی پلانے کے لئے ان کا حوض ٹھیک کر رہا ہو گا' سب سے پہلے صور کی آواز اس کے کان میں پڑے گی جس سے یہ اور تمام لوگ بے ہوش ہو جائیں گے۔ غرض سب کے فنا ہو چکنے کے بعد اللہ تعالیٰ مینہ برسائیں گے جو مثل شبنم کے یا مثل سائے کے ہو گا۔ اس سے دوبارہ جسم پیدا ہوں گے۔ پھر دوسرا صور پھونکا جائے گا سب کے سب جی اٹھیں گے۔ پھر کہا جائے گا: لوگو! اپنے رب کی طرف چلو انہیں ٹھہراؤ۔ ان سے سوال کیا جائے گا۔ پھر فرمایا جائے گا: جہنم کا حصہ نکالو۔ پوچھا جائے گا کتنوں سے کتنے؟ جواب ملے گا: ہر ہزار سے نو سو ننانوے یہ دن ہے جو بچوں کو بوڑھا بنا دے گا اور یہی دن ہے جس میں پنڈلی کھولی جائے گی۔

مسند احمد میں ہے ابن مریم باب لد کے پاس یا لد کی جانب مسیح دجال کو قتل کریں گے' ترمذی میں باب لد ہے اور یہ حدیث صحیح ہے۔ اس کے بعد امام ترمذی نے چند اور صحابہ کے نام لئے ہیں کہ ان سے بھی اس باب کی حدیثیں مروی ہیں۔ تو اس سے مراد وہ حدیثیں ہیں۔ جن سے دجال کا مسیح علیہ السلام کے ہاتھ سے قتل ہونا مذکور ہے۔ صرف دجال کے ذکر کی حدیثیں تو

---

[1] مطلب یہ ہے کہ اتنے بڑے بڑے انار ہوں گے کہ اس کا عرق بہت سوں کے لیے کافی ہو جائے گا اور اُس کے چھلکے کے سایہ میں بہت سے آدمی بیٹھ سکیں گے۔ آج بھی اُتر پردیش (بھارت) کے کئی علاقوں میں کئی کلو کے خربوزے ملتے ہیں اور فلسطین و شام کے علاقوں میں غیر معمولی وزن کے انار پیدا ہوتے ہیں۔ اس لیے ان خبروں میں کوئی عقلی استبعاد بھی نہیں۔

[2] اس وجہ سے کہ تم حدیث کو سمجھتے ہی نہیں پھر سنانے سے کیا فائدہ ہے؟

بے شمار ہیں، جنہیں جمع کرنا سخت دشوار ہے۔ مسند میں ہے کہ عرفے سے آتے ہوئے حضور ﷺ اپنے صحابہ کے ایک مجمع کے پاس سے گزرے۔ اس وقت وہاں قیامت کے ذکراذکار ہو رہے تھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: جب تک دس باتیں نہ ہولیں قیامت قائم نہ ہوگی۔ (۱) آفتاب کا مغرب کی جانب سے نکلنا (۲) دھوئیں کا آنا (۳) دآبہ الارض کا نکلنا (۴) یاجوج ماجوج کا آنا (۵) عیسیٰ بن مریمؑ کا نازل ہونا (۶) دجال کا آنا (۷) تین جگہ کا دھنس جانا (۸) مشرق میں غرب میں اور جزیرہ عرب میں اور عدن سے ایک آگ کا نکلنا۔ جو لوگوں کو ہنکا کر یک جا کر دے گی۔ وہ شب باشی بھی انہی کے ساتھ کرے گی اور جب دو پہر کو وہ آرام کریں گے یہ آگ ان کے ساتھ ہی رہے گی۔ یہ حدیث مسلم اور سنن میں بھی ہے اور حضرت حذیفہ بن اسید غفاری سے موقوفاً مروی ہے واللہ اعلم۔

پس آنحضرت ﷺ کی یہ متواتر حدیثیں جو حضرت ابو ہریرہ، حضرت ابن مسعود، حضرت عثمان بن ابوالعاص، حضرت ابوامامہ، حضرت نواس بن سمعان، حضرت عبداللہ بن عمرو، حضرت مجمع بن جاریہ، حضرت ابوشریحہ، حضرت حذیفہ بن اسید رضی اللہ عنہم سے مروی ہیں۔ یہ صاف دلالت کرتی ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول ہوگا۔ ساتھ ہی ان میں یہ بیان ہے کہ کس طرح اتریں گے اور کہاں اتریں گے اور کس وقت اتریں گے۔ یعنی صبح کی نماز کی اقامت کے وقت شام کے شہر دمشق کے شرقی منارہ پر آپ اتریں گے۔ اس زمانہ میں یعنی سن سات سو اکتالیس میں جامع اموی کا منارہ سفید پتھر سے بہت مضبوط بنایا گیا ہے۔ اس لئے کہ آگ کے صدمہ سے یہ جل گیا ہے اور یہ آگ لگانے والے غالباً ملعون عیسائی تھے۔ کیا عجب کہ یہی وہ مینار ہو، جس پر مسیح عیسیٰ بن مریمؑ نازل ہوں اور خنزیروں کو قتل کریں گے۔ صلیبوں کو توڑ دیں گے۔ جزئیے کو ہٹا دیں گے اور سوائے دین اسلام کے اور دین قبول نہ فرمائیں۔ جیسے کہ صحیحین کی حدیثیں گزر چکی ہیں۔ جن میں پیغمبر صادق و مصدوق علیہ السلام نے یہ خبر دی ہے اور اسے ثابت بتلایا ہے یہ وہ وقت ہوگا جبکہ تمام شک شبہ مٹ جائیں گے اور لوگ حضرت عیسیٰ کی پیروی میں اسلام قبول کرلیں گے جیسے اس آیت میں ہے اور جیسے فرمان ہے ﴿وَاِنَّهٗ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ﴾ (الزخرف:۶۱) اور ایک قرأت میں لَعَلَمٌ ہے۔ یعنی جناب مسیح کا نزول قیامت کا ایک زبردست نشان ہے۔ یعنی قرب قیامت کا۔ اس لئے کہ آپ دجال کے آچکنے کے بعد تشریف لائیں گے اسے قتل کریں گے جیسے کہ صحیح حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کوئی بیماری ایسی پیدا نہیں کی۔ جس کا علاج نہ مہیا کیا ہو۔ آپ ہی کے وقت میں یاجوج ماجوج نکلیں گے جنہیں اللہ تعالیٰ آپ کی دعا کی برکت سے ہلاک کرے گا قرآن پاک ان کے نکلنے کی بھی خبر دیتا ہے۔ فرمان ہے: ﴿حَتّٰۤى اِذَا فُتِحَتْ يَاْجُوْجُ وَمَاْجُوْجُ وَهُمْ مِّنْ كُلِّ حَدَبٍ يَّنْسِلُوْنَ۔ وَاقْتَرَبَ الْوَعْدُ الْحَقُّ﴾ (الانبیاء:۹۶) یعنی ان کا نکلنا بھی قرب قیامت کی دلیل ہے۔ اب حضرت عیسیٰؑ کی صفتیں ملاحظہ ہو۔

انبیاء علیہم السلام کا حلیہ ☆

پہلے کی دو حدیثوں میں بھی آپ کی صفت گزر چکی ہے۔ بخاری و مسلم میں ہے کہ لیلۃ المعراج میں میں نے حضرت موسیٰ سے ملاقات کی۔ وہ سرخ رنگ میانہ قد صاف بالوں والے ہیں جیسے شنوہ قبیلے کے لوگ ہوتے ہیں اور حضرت عیسیٰؑ سے بھی ملاقات کی۔ وہ سرخ میانہ قد ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا ابھی حمام سے نکلے ہیں۔ حضرت ابراہیمؑ کو بھی میں نے دیکھا کہ بس وہ بالکل مجھ جیسے تھے۔ بخاری کی ایک اور روایت میں ہے حضرت عیسیٰؑ سرخ رنگ، گھونگریالے بالوں والے، چوڑے چکلے سینے والے تھے۔ حضرت موسیٰ گندمی رنگ کے جسم اور سیدھے بالوں والے تھے۔ جیسے زط کے لوگ ہوتے ہیں۔ اسی طرح آپ نے دجال کی شکل وصورت بھی بیان فرما دی کہ اس کی داہنی آنکھ کانی ہوگی۔ جیسے پھولا ہوا انگور۔ آپ فرماتے

ہیں: مجھے کعبہ کے پاس خواب دکھلایا گیا کہ ایک بہت گندمی رنگ والے جن کے سر کے پٹھے دونوں مونڈھوں تک تھے۔ صاف بالوں والے جن کے سر سے پانی کے قطرے ٹپک رہے تھے۔ دو شخصوں کے مونڈھوں پر ہاتھ رکھے طواف کر رہے تھے۔ میں نے پوچھا: یہ کون ہیں؟ تو مجھے بتلایا گیا کہ مسیح بن مریمؑ ہیں۔ میں نے ان کے پیچھے ہی ایک شخص کو دیکھا جس کی داھنی آنکھ کانی تھی۔ ابن قطن سے بہت ملتا جلتا تھا۔ سخت الجھے ہوئے بال تھے۔ وہ بھی دو شخصوں کے مونڈھوں پر ہاتھ رکھے بیت اللہ کا طواف کر رہا ہے۔ میں نے کہا: یہ کون ہے؟ کہا گیا یہ مسیح دجال ہے۔ بخاری کی ایک اور روایت میں ہے حضرت عبداللہؓ سے مروی ہے کہ اللہ کی قسم حضور ﷺ نے حضرت عیسیٰ کو سرخ رنگ کا نہیں بتلایا۔ بلکہ آپ نے گندمی رنگ بتلایا ہے۔ پھر اوپر والی پوری حدیث ہے۔ حضرت زہری فرماتے ہیں: ابن قطن قبیلہ خزاعہ کا ایک شخص تھا۔ جو جاہلیت میں مر چکا تھا۔ وہ حدیث بھی گزر چکی ہے۔ جس میں یہ بیان ہے کہ جناب مسیح علیہ السلام اپنے نزول کے بعد چالیس سال یہاں رہیں گے پھر فوت ہوں گے اور مسلمان آپ کے جنازے کی نماز ادا کریں گے۔ ہاں مسلم کی ایک حدیث میں ہے کہ آپ یہاں سات سال رہیں گے۔ تو ممکن ہے کہ چالیس سال کا فرمان اس مدت سمیت کا ہو جو آپ نے دنیا میں آسمانوں پر اٹھائے جانے سے پہلے گزاری ہے۔ جس وقت آپ اٹھائے گئے۔ اس وقت آپ کی عمر تینتیس سال کی تھی اور سات سال اب آخر زمانے کے۔ تو پورے چالیس سال ہو گئے۔ واللہ اعلم۔ (ابن عساکر)

بعض کا قول ہے کہ جب آپ آسمانوں پر چڑھائے گئے اس وقت آپ کی عمر ڈیڑھ سال کی تھی۔ یہ بالکل واہی اور دور کا قول ہے۔ ہاں حافظ ابوالقاسمؒ نے اپنی تاریخ میں بعض سلف سے یہ بھی نقل کیا ہے کہ حضور ﷺ کے حجرے میں آپ کے ساتھ ہی دفن کیے جائیں گے۔ واللہ اعلم۔

پھر ارشاد ہے کہ یہ قیامت کے دن ان پر گواہ ہوں گے یعنی اس بات کے کہ اللہ کی رسالت آپ نے انہیں پہنچا دی تھی اور آپ نے اللہ کی عبودیت کا اقرار کیا تھا۔ جیسے سورہ مائدہ کے آخر میں وَاِذْ قَالَ اللّٰهُ سے الْحَكِيْمُ (المائدہ:۱۱۶-۱۱۸) تک ہے۔ یعنی آپ کی گواہی کا وہاں ذکر ہے اور اللہ کے سوال کا۔

فَبِظُلْمٍ مِّنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ طَيِّبٰتٍ اُحِلَّتْ لَهُمْ وَبِصَدِّهِمْ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَثِيْرًا ﴿۱۶۰﴾ وَّاَخْذِهِمُ الرِّبٰوا وَقَدْ نُهُوْا عَنْهُ وَاَكْلِهِمْ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ ۭ وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ مِنْهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ﴿۱۶۱﴾ لٰكِنِ الرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ مِنْهُمْ وَالْمُؤْمِنُوْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ وَالْمُقِيْمِيْنَ الصَّلٰوةَ وَالْمُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَالْمُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ سَنُؤْتِيْهِمْ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۱۶۲﴾ ع ۲۲

سو یہود کے ان ہی بڑے بڑے جرائم کے سبب ہم نے بہت سی پاکیزہ چیزیں جو ان کے لئے حلال تھیں ان پر حرام کر دیں اور بسبب اس کے کہ وہ بہت آدمیوں کو اللہ تعالیٰ کو راہ میں مانع بن جاتے تھے اور بسبب اس کے وہ سود لیا کرتے تھے۔ حالانکہ ان کو اس سے ممانعت کی گئی تھی اور بسبب اس کے کہ وہ لوگوں کے مال ناحق طریقہ سے کھا جاتے تھے اور ہم نے ان لوگوں کے لئے جو ان میں کافر ہیں دردناک سزا کا سامان کر رکھا ہے۔ لیکن ان یہود میں جو لوگ علم (دین) میں پختہ ہیں اور جو ان میں ایمان لے آنے والے ہیں کہ اس (کتاب) پر بھی ایمان لاتے ہیں جو آپ کے پاس بھیجی گئی اور اس پر بھی (ایمان رکھتے ہیں) جو آپ سے پہلے بھیجی گئی اور جو (ان میں) نماز کی پابندی کرنے والے ہیں اور جو (ان میں) زکوٰۃ دینے والے ہیں اور جو (ان میں) اللہ تعالیٰ پر اور قیامت کے دن پر اعتقاد رکھنے والے ہیں سو ایسے لوگوں کو ہم ضرور (آخرت میں) ثواب عظیم عطا فرمائیں گے۔ ○

نافرمانی اللہ کی نعمتوں سے محروم ہونے کا سبب:

اس آیت کے دو مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ حرمت قدری ہو یعنی مقدرات اللہ میں یہ تھا کہ یہ لوگ اپنی کتاب کو بدل دیں اس میں تحریف کر لیں اور حرام چیزوں کو اپنے اوپر حرام کر لیں۔ صرف اپنے تشدد اور اپنی سخت گیری کی وجہ سے۔ دوسرا یہ کہ یہ حرمت شرعی ہے۔ یعنی نزول تورات سے پہلے جو بعض چیزیں ان پر حلال تھیں۔ تورات کے اترنے کے وقت ان کی بعض بدکاریوں کی وجہ سے وہ حرام قرار دے دی گئی۔ جیسے فرمان ہے: ﴿كُلُّ الطَّعَامِ كَانَ حِلاًّ لِّبَنِي إِسْرَائِيلَ﴾ (آل عمران ۹۳) یعنی اونٹ کا گوشت اور دودھ جو حضرت اسرائیلؑ نے اپنے اوپر حرام کر لیا تھا۔ اس کے ماسوا تمام طعام بنی اسرائیل کے لئے حلال تھے پھر تورات میں ان پر بعض چیزیں حرام کی گئیں۔ جیسے سورہ انعام میں فرمایا: ﴿وَعَلَى الَّذِينَ هَادُوا حَرَّمْنَا﴾ (الانعام: ۱۴۶) یہودیوں پر ہم نے ہر ناخن دار جانور حرام کر دیا اور گائے بکری کی چربی بھی جو الگ تھلگ ہو ہم نے ان پر حرام قرار دے دی۔ یہ اس لئے کہ یہ باغی طاغی اور مخالف رسول اور اختلاف کرنے والے لوگ تھے۔ پس یہاں بھی یہی بیان ہو رہا ہے کہ ان کے ظلم و زیادتی کے باعث خود راہ اللہ سے یک سو ہو کر دوسروں کو اس سے بھٹکانے کے باعث جو ان کی پرانی عادت تھی رسولوں کے دشمن بن جاتے تھے۔ انہیں قتل کر ڈالتے تھے۔ انہیں جھٹلاتے تھے۔ مقابلہ کرتے تھے اور طرح طرح کے حیلے کر کے سود خواریاں کرتے تھے۔ جو محض حرام تھیں اور بھی جس طرح بن پڑتا لوگوں کے مال مار کھانے کی تاک میں لگے رہتے اور اس بات کو جانتے ہوئے کہ اللہ نے یہ کام حرام کئے ہیں۔ جرأت سے انہیں کر گزرتے تھے۔ اس باعث ان پر ہم نے حلال چیزیں بھی بعض بعض حرام کر دیں۔ ان کفار کے لئے دردناک عذاب تیار ہیں۔ لیکن ان میں جو سچے دین والے اور پختہ علم والے ہیں۔ اس جملہ کی تفسیر سورہ آل عمران میں گزر چکی ہے اور جو با ایمان ہیں یہ تو قرآن کو اور تمام پہلی کتابوں کو مانتے ہیں۔

حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں: اس سے مراد حضرت عبداللہ بن سلام، حضرت ثعلبہ بن سعید، حضرت زید بن سعید، حضرت اسید بن عبید رضی اللہ تعالیٰ عنہم ہیں جو اسلام میں آ گئے تھے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کو مان چکے تھے۔ آگے کا جملہ ﴿وَالْمُقِيمِينَ الصَّلٰوةَ﴾ تمام ائمہ کے قرآن میں اور ابی بن کعبؓ کے مصحف میں اسی طرح ہے۔ لیکن بقول علامہ ابن جریرؒ ابن مسعود کے صحیفے میں وَالْمُقِيمُونَ الصَّلٰوةَ ہے صحیح قرأت اگلی ہی ہے۔ جن بعض لوگوں نے اسے کتابت کی غلطی بتایا ہے

ان کا قول ہے بعض تو کہتے ہیں اس کی نصبی حالت مدح کی وجہ سے ہے۔ جیسے: ﴿وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا وَالصّٰبِرِيْنَ﴾ (البقرہ:۱۷۷) میں ہے اور کلام عرب میں اور شعروں میں برابر یہ قاعدہ موجود پایا جاتا ہے۔ بعض کہتے ہیں یہ عطف ہے اگلے جملے پر یعنی ﴿بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ﴾ پر۔ یعنی وہ اس پر بھی ایمان لاتے ہیں اور نماز کے قائم کرنے پر بھی ان کا ایمان ہے۔ یعنی اسے واجب اور برحق مانتے ہیں۔ یا یہ مطلب ہے کہ اس سے مراد فرشتے ہیں۔ یعنی ان کا قرآن پر اور خدائی کتابوں پر فرشتوں پر ایمان ہے امام ابن جریر اسی کو پسند کرتے ہیں لیکن اس میں تامل کی ضرورت ہے۔ واللہ اعلم اور زکوٰۃ ادا کرنے والے ہیں۔ یعنی مال کی یا جان کی اور دونوں بھی مراد ہو سکتے ہیں واللہ اعلم اور صرف اللہ ہی کو عبادت جانتے ہیں اور موت کے بعد کی زندگانی پر بھی کامل یقین رکھتے ہیں کہ ہر بھلے برے عمل کی جزا سزا اس دن ملے گی۔ یہی لوگ ہیں جنہیں ہم اجر عظیم یعنی جنت دیں گے۔

اِنَّآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ كَمَآ اَوْحَيْنَآ اِلٰى نُوْحٍ وَّالنَّبِيّٖنَ مِنْۢ بَعْدِهٖ ۚ وَاَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَعِيْسٰى وَاَيُّوْبَ وَيُوْنُسَ وَهٰرُوْنَ وَسُلَيْمٰنَ ۚ وَاٰتَيْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا ﴿۱۶۳﴾ وَرُسُلًا قَدْ قَصَصْنٰهُمْ عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ وَرُسُلًا لَّمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَيْكَ ۭ وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا ﴿۱۶۴﴾ رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ﴿۱۶۵﴾

ہم نے آپ کے پاس وحی بھیجی ہے جیسے نوح کے پاس بھیجی تھی اور ان کے بعد اور پیغمبروں کے پاس اور ہم نے ابراہیم اور اسمٰعیل اور اسحٰق اور یعقوب اور اولاد یعقوب اور عیسیٰ اور ایوب اور یونس اور ہارون اور سلیمان کے پاس وحی بھیجی اور ہم نے داؤد کو زبور دی تھی اور ایسے پیغمبروں کو صاحب وحی بنایا جن کا حال اس کے قبل ہم آپ کو بیان کر چکے ہیں اور پیغمبروں کو جن کا حال ہم نے آپ سے بیان نہیں کیا اور موسیٰ سے اللہ تعالیٰ نے خاص طور پر کلام فرمایا ان سب کو خوشخبری دینے والے اور خوف سنانے والے پیغمبر بنا کر اس لئے بھیجا تاکہ لوگوں کے پاس اللہ تعالیٰ کے سامنے ان پیغمبروں کے بعد کوئی عذر باقی نہ رہے اور اللہ تعالیٰ پورے زور والے ہیں بڑی حکمت والے ہیں۔ ○

وحدتِ دین:

حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ سکین اور عدی بن زید نے کہا: اے محمد ﷺ ہم نہیں مانتے کہ حضرت موسیٰ کے بعد اللہ نے کسی انسان پر کچھ اتارا ہو اس پر یہ آیتیں اتریں۔ محمد بن کعب قرظیؒ فرماتے ہیں: جب آیت يَسْـَٔلُكَ اَهْلُ الْكِتٰبِ...... عَظِيْمًا (النساء:۱۵۳-۱۵۶) تک اتری اور یہودیوں کے برے اعمال کا آئینہ ان کے سامنے رکھ دیا گیا تو انہوں نے صاف

کہہ دیا کہ کسی انسان پر اللہ نے کوئی اپنا کلام نازل ہی نہیں فرمایا نہ موسیٰ پر نہ عیسیٰ پر نہ کسی اور نبی پر۔ آپ ﷺ اس وقت گوٹ لگائے بیٹھے تھے[1] اسے آپ ﷺ نے کھول دیا اور کسی پر نہیں؟ پس اللہ تعالیٰ نے آیت ﴿وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ﴾ (الانعام ۹۱) نازل فرمائی۔ لیکن یہ قول قابل طلب ہے۔ اس لئے کہ یہ آیت سورہ انعام میں ہے جو مکی ہے اور سورہ نساء کی مندرجہ بالا آیات آیت مدنی ہے جوان کے رد میں ہے۔ جب کہ انہوں نے کہا تھا کہ آسمان سے کوئی کتاب آپ پر اتار لائیں۔ جس کے جواب میں فرمایا کہ حضرت موسیٰ سے انہوں نے اس سے بڑا سوال کیا تھا۔ پھر ان کے عیوب بیان فرمائے اور ان کی پہلی اور اب کی سیاہ کاریاں کھولیں۔ پھر فرمایا کہ اللہ نے اپنے بندے اور رسول حضرت محمد ﷺ کی طرف وحی نازل فرمائی ہے جس طرح اور انبیاء کی طرف۔ زبور اس کتاب کا نام ہے جو حضرت داؤدؑ پر اتری تھی۔ ان انبیاء کے قصے سورہ قصص کی تفسیر میں ہم بیان کریں گے۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔ پھر فرماتا ہے: اس آیت یعنی مکی سورت کی آیت سے پہلے بہت سے انبیاء کا ذکر ہو چکا ہے اور بہت سوں کا نہیں بھی ہوا۔ جن انبیاء کرام کے نام لفظوں میں آ گئے ہیں یہ ہیں۔ آسم، ادریس، نوح، ہود، صالح، ابراہیم، لوط، اسمٰعیل، اسحٰق، یعقوب، یوسف، شعیب، موسیٰ، ہارون، یونس، داؤد، سلیمان، یسع، زکریا، عیسیٰ، یحییٰ، اور بقول اکثر مفسرین ذوالکفل (اور ایوب اور الیاس) اور ان سب کے سردار حضرت محمد ﷺ اور بہت سے ایسے بھی رسول ہیں جن کا ذکر قرآن میں نہیں کیا۔

انبیاء علیہم السلام کی تعداد☆

اسی وجہ سے انبیاء اور مرسلین کی تعداد میں اختلاف ہے۔ اس بارے میں حدیث مشہور حضرت ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ہے۔ جو تفسیر ابن مردویہ میں یوں ہے کہ آپ نے پوچھا: یارسول اللہ ﷺ انبیاء کتنے ہیں؟ فرمایا: ایک لاکھ چوبیس ہزار۔ میں نے پوچھا: ان میں رسول کتنے ہیں؟ فرمایا: تین سو تیرہ بہت بڑی جماعت میں نے پھر دریافت کیا سب سے پہلے کون سے ہیں؟ فرمایا: آدمؑ۔ میں نے کہا: کیا وہ بھی رسول تھے۔ فرمایا: ہاں اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنے ہاتھ سے پیدا کیا۔ پھر ان میں اپنی روح پھونکی۔ پھر درست اور ٹھیک ٹھاک کیا۔ پھر فرمایا: اے ابوذر! چار سریانی ہیں۔ آدم، شیث، نوح، خنوح جن کا مشہور نام ادریس ہے، انہی نے پہلے قلم سے خط لکھا۔ چار عربی ہیں ہودؑ، صالحؑ، شعیبؑ اور تمہارے نبی ﷺ۔ اے ابوذر بنو اسرائیل کے پہلے نبی حضرت موسیٰؑ ہیں اور آخری حضرت عیسیٰؑ ہیں۔ تمام نبیوں میں سب سے پہلے نبی حضرت آدمؑ ہیں اور سب سے آخری نبی تمہارے نبی ﷺ ہیں۔ اس پوری حدیث کو جو بہت طویل ہے۔ حافظ ابو حاتم نے اپنی کتاب الانواع والتقاسیم میں روایت کیا ہے اور جس پر صحت کا حکم لگایا ہے۔ لیکن ان کے برخلاف امام ابوالفرج بن جوزیؒ اسے بالکل موضوع بتلاتے ہیں اور ابراہیم بن ہاشم اس کے ایک راوی پر وضاع ہونے کا وہم کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ائمہ جرح و تعدیل میں سے بہت سے لوگوں نے ان پر اس حدیث کی وجہ سے کلام کیا ہے۔ واللہ اعلم۔ لیکن یہ حدیث دوسری سند سے حضرت ابوامامہ سے بھی روایت ہے۔ لیکن اس میں معان بن رفاعہ سلامی ضعیف ہیں اور علی بن یزید بھی ضعیف ہیں اور قاسم بن عبدالرحمٰن بھی ضعیف ہیں۔ ایک اور حدیث ابویعلیٰ میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آٹھ ہزار نبی بھیجے۔ چار ہزار بنو اسرائیل کی طرف اور چار ہزار باقی اور لوگوں کی طرف۔ یہ حدیث بھی ضعیف ہے۔ اس سے زیدی اور ان کے استاد قاشی دونوں ضعیف ہیں اور علی بن یزید بھی ضعیف ہیں۔ واللہ اعلم۔

---

[1] عرب کا دستور تھا کہ دوزانو بیٹھ کر کپڑا پنڈلی سے باندھ لیتے تھے۔ یہاں بھی ایسی ہی کیفیت ''گوٹ مار کر بیٹھنا'' مراد ہے۔

ابو یعلی کی ایک اور حدیث میں ہے کہ آپ نے فرمایا: آٹھ ہزار انبیاء میرے بھائی گزر چکے ہیں۔ ان کے بعد حضرت عیسیٰ آئے اور ان کے بعد میں آیا ہوں اور حدیث میں ہے' میں آٹھ ہزار نبیوں کے بعد آیا ہوں۔ جن میں سے چار ہزار تو بنی اسرائیل میں سے تھے۔ یہ حدیث اس سند سے غریب تو ضرور ہے لیکن اس کے تمام راوی معروف ہیں اور سند میں کوئی نقص نہیں۔ احمد بن طارق کے کہ ان کے بارے میں مجھے کوئی علالت یا جرح نہیں ملی۔ واللہ اعلم۔

ابوذر غفاریؓ والی طویل حدیث جو انبیاء کی گنتی کے بارے میں ہے: اسے بھی سن لیجئے۔ آپ فرماتے ہیں: میں مسجد میں آیا اس وقت حضور ﷺ تنہا تشریف فرما تھے۔ میں بھی آپ ﷺ کے پاس بیٹھ گیا اور کہا: آپ نے نماز کا حکم دیا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں وہ بہتر چیز ہے چاہے کوئی زیادتی کرے چاہے کمی۔ میں نے کہا: حضور ﷺ! کون سے اعمال افضل ہیں؟ فرمایا: اللہ پر ایمان لانا اس کی راہ میں جہاد کرنا۔ میں نے کہا: حضور ﷺ کونسا مؤمن افضل ہے؟ فرمایا: سب سے اچھے اخلاق والا۔ میں نے کہا: حضور ﷺ! کون سا مسلمان اعلیٰ ہے؟ فرمایا: جس کی زبان اور ہاتھ سے مسلمان سلامت رہیں۔ میں نے پوچھا: کون سی ہجرت افضل ہے؟ فرمایا: برائیوں کو چھوڑ دینا۔ میں نے پوچھا: کون سی نماز افضل ہے؟ فرمایا: لمبے قنوت والی۔ میں نے پوچھا: کون سا روزہ افضل ہے؟ فرمایا: فرض کفایت کرنے والا ہے اور اللہ کے پاس بہت بے حد ثواب ہے۔ میں نے پوچھا: کون سا جہاد افضل ہے؟ فرمایا جس کا گھوڑا بھی کاٹ دیا جائے اور خود اس کا بھی خون بہا دیا جائے[1] میں نے کہا: کون سا غلام آزاد کرنا افضل ہے؟ فرمایا: جس قدر گراں قیمت ہو اور مالک کو زیادہ پسند ہو۔ میں نے پوچھا: صدقہ کون سا افضل ہے؟ فرمایا: کم مال والے کا کوشش کرنا اور چپکے سے محتاج کو دے دینا۔ میں نے کہا: قرآن میں سب بڑی[2] آیت کون سی ہے؟ فرمایا: آیت الکرسی' پھر فرمایا: اے ابوذر ساتوں آسمان کرسی کے مقابلہ میں ایسے ہیں' جیسے کوئی حلقہ کسی چٹیل میدان کے مقابلہ میں اور عرش کی فضیلت کرسی پر بھی ایسی ہے جیسے وسیع میدان کی حلقے پر۔ میں نے کہا: حضور ﷺ! کتنے انبیاء ہیں؟ فرمایا: ایک لاکھ چوبیس ہزار۔ میں نے کہا: ان میں سے رسول کتنے ہیں؟ فرمایا: تین سو تیرہ۔ بہت بڑی پاک جماعت۔ میں نے پوچھا: سب سے پہلے کون ہیں؟ فرمایا: آدمؑ۔ میں نے کہا: کیا وہ بھی نبی تھے؟ فرمایا: ہاں' انہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے ہاتھ سے پیدا کیا اور اپنی روح ان میں پھونکی اور انہیں صحیح تر بنایا۔ پھر آپ نے فرمایا: سنو چار تو سریانی ہیں آدمؑ، شیثؑ، خنوخ اور یہی ادریس ہیں' جس نے سب سے پہلے قلم سے لکھا اور نوحؑ اور چار عربی ہیں ہودؑ، شعیبؑ، صالحؑ اور تمہارے نبی ﷺ۔ سب سے پہلے رسول حضرت آدمؑ ہیں اور سب سے آخری رسول حضرت محمد ہیں (ﷺ)۔

میں نے پوچھا: یارسول اللہ ﷺ! اللہ تعالیٰ نے کتابیں کس قدر نازل فرمائی ہیں؟ فرمایا: ایک سو چار۔ حضرت شیث علیہ السلام پر پچاس صحیفے۔ حضرت خنوخ علیہ السلام پر تیس صحیفے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام پر دس صحیفے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام پر تورات سے پہلے دس صحیفے اور تورات انجیل زبور اور فرقان۔ میں نے کہا: یارسول اللہ ﷺ حضرت ابراہیمؑ کے صحیفوں میں کیا تھا؟ فرمایا: اس کا کل یہ تھا۔ اے بادشاہ مسلط کیا ہوا مبتلی مغرور' میں نے تجھے دنیا جمع کرنے کے لئے نہیں بھیجا بلکہ اس لئے کہ تو مظلوم کی پکار کو میرے سامنے سے ہٹا دے۔ اگر میرے پاس پہنچے تو میں اسے رد نہ کروں گا۔ گو وہ مظلوم کافر ہی ہو اور ان میں

[1] یعنی اس بے جگری سے لڑے کہ جہاد میں وہ اور اس کا گھوڑا دونوں قتل ہو جائیں تو یہی شہادت کا اعلیٰ مقام ہے۔ اس ارشاد میں پوری تندہی اور اعلاء کلمۃ اللہ کے لیے لڑنے کی ترغیب ہے۔

[2] یعنی اجر کے اعتبار سے۔

مثالیں بھی تھیں' یہ کہ عاقل کو لازم ہے کہ وہ اپنے اوقات کے کئی حصے کرے۔ ایک وقت اپنے نفس کا حساب لے' ایک وقت اللہ کی صفات میں غور کرے' ایک وقت اپنے کھانے پینے کی فکر کرے۔ عاقل کو تین چیزوں کے سوا کسی میں منہمک نہ ہونا چاہئے یا تو توشہ آخرت یا فکر معاش یا غیر حرام چیزوں سے سرور ولذت۔ عاقل کو چاہئے کہ اپنا وقت دیکھتا رہے۔ اپنے کام میں لگا رہے۔ اپنی زبان کی نگہداشت کرے۔ جو شخص اپنے قول کو اپنے فعل سے ملاتا رہے گا[1] وہ بہت کم گو ہوگا۔ کلام وہی کرو جو نفع دے۔ میں نے پوچھا: موسیٰ علیہ السلام کے صحیفوں میں کیا تھا؟ فرمایا: سراسر عبرتیں۔ مجھے تعجب ہے اس شخص پر جو موت کا یقین رکھتا ہے پھر مست ہے۔ تقدیر کا یقین رکھتا ہے' پھر ہائے ہائے کرتا ہے۔ دنیا کی بے ثباتی دیکھتا ہے پھر اس پر اطمینان کئے ہوئے ہے قیامت کے دن کے حساب کو جانتا ہے پھر بے عمل ہے۔ میں نے کہا: حضور ﷺ اگلے انبیاء کی کتابوں میں جو تھا اس میں سے بھی کچھ ہماری کتاب میں ہمارے ہاتھوں میں ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں پڑھو ﴿قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى﴾ (الاعلیٰ ۱۴) آخر سورت تک۔ میں نے کہا: حضور ﷺ مجھے وصیت کیجئے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: میں تجھے اللہ سے ڈرتے رہنے کی وصیت کرتا ہوں۔ یہی تیرے کام کی چیز ہے۔ میں نے کہا: یارسول اللہ ﷺ! کچھ اور بھی۔ آپ ﷺ نے فرمایا: تلاوت قرآن اور ذکر اللہ میں مشغول رہے۔ وہ تیرے لئے آسمانوں میں ذکر کا اور زمین میں نور کا باعث ہوگا۔ میں نے پھر کہا: حضور ﷺ! اور زیادہ فرمایئے۔ فرمایا: خبردار زیادہ ہنسی سے بچ۔ وہ دل مردہ کر دیتی ہے اور چہرہ کا نور دور کر دیتی ہے۔ میں نے کہا: اور زیادہ' فرمایا: جہاد میں مشغول رہ۔ میری امت کی رہبانیت درویشی یہی ہے۔ میں نے کہا اور وصیت کیجئے۔ فرمایا: سوائے بھلی بات کہنے کے زبان بند رکھ۔ اس سے شیطان بھاگ جائے گا اور دینی کاموں میں بڑی تائید ہو گی۔ میں نے کہا: کچھ اور بھی فرما دیجئے۔ فرمایا: اپنے سے نیچے درجے کے لوگوں کو دیکھا کر اور اپنے سے اعلیٰ درجہ کے لوگوں پر نظریں نہ ڈال۔ اس سے تیرے دل میں اللہ کی نعمتوں کی عظمت ہوگی۔ میں نے کہا: مجھے اور نصیحت کیجئے۔ فرمایا: مسکینوں سے محبت رکھ اور ان کے ساتھ بیٹھ۔ اس سے اللہ کی رحمتیں تجھے بہت بڑی معلوم ہوں گی۔ میں نے کہا: اور فرمایئے' فرمایا قرابت داروں سے ملا کرو گو وہ تجھ سے نہ ملیں۔ میں نے کہا اور۔ فرمایا: حق گوئی کر' گو وہ کسی کو کڑوی لگے۔ میں نے اور بھی نصیحت طلب کی۔ فرمایا: اللہ کے بارے میں ملامت کرنے والے کو ملامت کا خوف نہ کر۔ میں نے کہا: اور فرمایئے۔ فرمایا: اپنے عیبوں پر نظر ڈال کر دوسروں کی عیب گیری سے باز آ جا۔ پھر میرے سینے پر آپ ﷺ نے دست مبارک رکھ کر فرمایا: اے ابوذر! تدبیر کے برابر کوئی عقل مندی نہیں اور حرام سے رک جانے کے برابر کوئی پرہیز گاری نہیں اور اچھے اخلاق جیسا کوئی نسب نہیں۔ مسند احمد میں بھی یہ حدیث کچھ کمی کے ساتھ مذکور ہے۔

حضرت ابوسعید خدریؓ پوچھتے ہیں کہ کیا خارجی بھی دجال کے قائل ہیں؟ لوگوں نے کہا: نہیں۔ فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: میں نے ایک ہزار بلکہ زیادہ نبیوں کو ختم کرنے والا ہوں۔ ہر ہر نبی نے اپنی امت کو دجال سے ڈرایا ہے۔ لیکن میرے سامنے اللہ نے اس کی وہ علامت بیان فرمائی ہے جو کسی اور سے نہیں فرمائی سنو وہ بھینگا ہے اور رب ایسا ہو نہیں سکتا۔ اس کی داہنی آنکھ بھینگی کانی ہے۔ دیدہ اس کا اوپر کو اٹھا ہوا ایسا ہے جیسے چونے کی صاف دیوار پر کسی کا کھنکار پڑا ہوا اور اس کی بائیں آنکھ ایک چمکیلے ستارے جیسی ہے۔ وہ تمام زبانیں بولے گا۔ اس کے ساتھ جنت کی صورت ہوگی ہر سبز اور پانی والی دوزخ کی صورت ہوگی سیاہ دھوئیں دار۔ ایک حدیث میں ہے میں ایک لاکھ نبیوں کو ختم کرنے والا ہوں بلکہ زیادہ کا پھر فرمایا ہے:

[1] یعنی قول وفعل میں مطابقت رکھے گا' ایسا نہ ہو کہ کہے کچھ کرے کچھ کہ یہ نفاق کی علامت ہے۔ انظر شاہ کشمیری

موسیٰ سے خود اللہ تعالیٰ نے صاف طور پر کلام فرمایا ہے یہ ان کی خاص صفت ہے کہ وہ کلیم اللہ تھے۔ ایک شخص ابوبکر بن عیاشؒ کے پاس آتا ہے اور کہتا ہے کہ ایک شخص اس جملہ کو یوں پڑھتا ہے وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا ۔ یعنی موسیٰ نے اللہ سے بات کی۔ اس پر آپ بہت بگڑے اور فرمایا: یہ کسی کافر نے پڑھا ہوگا۔ میں نے اعمش سے۔ اعمش نے یحییٰ سے۔ یحییٰ نے عبدالرحمٰن سے۔ عبدالرحمٰن نے علیؓ سے۔ علیؓ نے رسول اللہ ﷺ سے پڑھا ہے کہو: كَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا۔ غرض اس شخص کی معنوی اور لفظی تحریف پر اس قدر ناراض ہوئے۔ عجب نہیں یہ کوئی معتزلی ہو۔ اس لئے کہ معتزلہ کا یہ عقیدہ ہے کہ اللہ نے موسیٰ سے کلام کیا نہ کسی اور سے کسی معتزلی نے ایک بزرگ کے سامنے اسی آیت کو اس طرح پڑھا تو انہوں نے اسے برا کہہ کر فرمایا: پھر اس آیت میں یہ بے ایمانی کیسے کرو گے؟ جہاں فرمایا ہے: ﴿وَلَمَّا جَاءَ مُوْسٰى لِمِيْقَاتِنَا وَكَلَّمَهٗ رَبُّهٗ﴾ (الاعراف:۱۴۳) یعنی موسیٰ ہمارے وعدے پر آئے اور ان سے ان کے رب نے کلام کیا۔ مطلب یہ ہے کہ یہاں تو یہ تاویل وتحریف نہیں چلے گی۔

ابن مردویہ کی حدیث میں ہے کہ آنحضور ﷺ نے فرمایا: جب اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ سے کلام کیا تو وہ سیاہ چیونٹی کا اندھیری رات میں کسی صاف پتھر پر چلنا بھی دیکھ لیتے تھے۔ یہ حدیث غریب ہے اور اس کی اسناد صحیح نہیں اور جب موقوفاً بقول ابی ہریرہ ثابت ہو جائے تو پھر ٹھیک ہے۔ مستدرک حاکم وغیرہ میں ہے کہ کلیم اللہ سے جب اللہ نے کلام کیا وہ صوف کی چادر اور صوف کی سردول اور غیر مذبوح گدھے کی کھال کی جوتیاں پہنے ہوئے تھے۔ ابن عباسؓ فرماتے ہیں: ایک لاکھ چوبیس ہزار باتیں اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ سے کیں۔ جو سب وصیتیں تھیں۔ پھر تو لوگوں کا کلام حضرت موسیٰ سے سنا نہیں جاتا تھا۔ کیونکہ کانوں میں اسی پاک کلام کی گونج تھی۔ اس کی سند بھی غریب ہیں۔ پھر اس میں انقطاع بھی ہے۔ ایک اور ابن مردویہ وغیرہ میں ہے۔ حضرت جابر فرماتے ہیں: طور والے دن حضرت موسیٰ سے جو کلام اللہ تعالیٰ نے کیا۔ اس کی صفت جس دن پکارا تھا۔ اس کلام کی صفت سے الگ تھی تو موسیٰ علیہ السلام نے اس کا بھید معلوم کرنا چاہا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: موسیٰ ابھی تو میں نے دس ہزار زبانوں کے برابر کی قوت سے کلام کیا ہے۔ حالانکہ مجھے تمام زبانوں کی قوت ہے۔ بلکہ ان سب سے بھی بہت زیادہ بنو اسرائیل آپ سے صفت کلام ربانی جب پوچھنے لگے تو آپ نے فرمایا: میں تو کچھ نہیں کہہ سکتا۔ انہوں نے کہا: اچھا کوئی تشبیہ تو بیان کرو۔ آپ نے فرمایا: تم نے کڑاکے کی آواز تو سنی ہوگی وہ اس کے مشابہ تھی۔ لیکن ویسی نہ تھی۔ اس کے ایک راوی فضل رقاشی ضعیف ہیں اور بہت ہی ضعیف ہیں۔ حضرت کعب فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ سے کلام کیا تو وہ زبانوں سے ہوا۔ اپنے کلام کے درمیان حضرت کلیم اللہ نے پوچھا: باری تعالیٰ یہ تیرا کلام ہے؟ فرمایا نہیں اور نہ تو میرے کلام کو برداشت کر سکتا ہے۔ حضرت موسیٰ نے دریافت کیا کہ اے رب تیری مخلوق میں سے کسی کا کلام تیرے کلام سے مشابہ ہے؟ فرمایا: نہیں سوائے سخت تڑاکے کے۔ یہ روایت بھی موقوف ہے اور یہ ظاہر ہے کہ حضرت کعبؓ اگلی کتابوں سے روایت کیا کرتے تھے۔ جن میں بنو اسرائیل کی حکایتیں ہر طرح کی صحیح اور غیر صحیح ہوتی ہیں۔ رسول ہیں جو اللہ کی اطاعت کرنے والوں اور اس کی رضامندی کے متلاشیوں کو خوشخبریاں جنتوں کی دیتے ہیں اور اس کے فرمان کا خلاف کرنے والوں اور اس کے رسولوں کو جھٹلانے والوں کو عذاب وسزا سے ڈراتے ہیں۔ پھر فرمایا ہے: اللہ تعالیٰ نے اپنی کتابیں جو نازل فرمائی ہیں اور اپنے رسول جو بھیجے ہیں اور ان سے مرضی اور نامرضی جو معلوم کرائی ہے یہ اس لئے کہ کسی کو کوئی حجت کسی کا کوئی عذر باقی نہ رہے۔ جیسے اور آیت میں ہے: ﴿وَلَوْ اَنَّا اَهْلَكْنٰهُمْ بِعَذَابٍ مِّنْ قَبْلِهٖ﴾ (طٰہٰ:۱۳۴) یعنی اگر ہم انہیں اس سے پہلے ہی اپنے عذاب سے ہلاک کر دیتے تو وہ یہ کہہ سکتے تھے کہ اے ہمارے رب تو نے ہماری طرف رسول کیوں نہیں بھیجے جو ہم ان کی باتیں مانتے اور اس ذلت ورسوائی سے بچ جاتے۔ اسی جیسی یہ آیت بھی ہے ﴿لَوْلَآ اَنْ تُصِيْبَهُمْ﴾ (القصص:۴۷) صحیحین کی حدیث میں ہے حضور ﷺ فرماتے ہیں:

اللہ سے زیادہ باغیرت کوئی نہیں۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے تمام برائیوں کو حرام کیا ہے۔ خواہ ظاہر ہوں خواہ پوشیدہ اور ایسا بھی کوئی نہیں جسے بہ نسبت اللہ کے مدح زیادہ پسند ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے خود اپنی مدح آپ کی ہے اور کوئی ایسا نہیں جسے اللہ سے زیادہ عذر پسند ہو۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے نبیوں کو خوشخبریاں سنانے والے اور ڈرانے والے بنا کر بھیجا۔ دوسری روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ اسی وجہ سے اس نے رسول بھیجے اور کتابیں اتاریں۔

لٰكِنِ اللّٰهُ يَشْهَدُ بِمَآ اَنْزَلَ اِلَيْكَ اَنْزَلَهٗ بِعِلْمِهٖ ۚ وَالْمَلٰٓئِكَةُ يَشْهَدُوْنَ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ﴿۱۶۶﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ قَدْ ضَلُّوْا ضَلٰلًا ۢ بَعِيْدًا ﴿۱۶۷﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَظَلَمُوْا لَمْ يَكُنِ اللّٰهُ لِيَغْفِرَ لَهُمْ وَلَا لِيَهْدِيَهُمْ طَرِيْقًا ﴿۱۶۸﴾ اِلَّا طَرِيْقَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ؕ وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا ﴿۱۶۹﴾ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمُ الرَّسُوْلُ بِالْحَقِّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَاٰمِنُوْا خَيْرًا لَّكُمْ ؕ وَاِنْ تَكْفُرُوْا فَاِنَّ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۱۷۰﴾

لیکن اللہ تعالیٰ بذریعہ اس کتاب کے جس کو آپ کے پاس بھیجا ہے اور بھیجا بھی اپنے علمی کمال کے ساتھ شہادت دے رہے ہیں اور فرشتے تصدیق کر رہے ہیں اور اللہ تعالیٰ ہی کی شہادت کافی ہے جو لوگ منکر ہوئے اور خدائی دین سے مانع ہوتے ہیں بڑی دور کی گمراہی میں جا پڑے ہیں بلاشبہ جو لوگ منکر ہیں اور دوسروں کا بھی نقصان کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو کبھی نہیں بخشیں گے اور نہ ان کو سوا جہنم کی راہ کے کوئی راہ دکھلائیں گے اس طرح پر کہ اس میں ہمیشہ ہمیشہ کو رہا کریں گے اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہ سزا معمولی بات ہے۔ اے تمام لوگو تمہارے پاس یہ رسول سچی بات لے کر تمہارے پروردگار کی طرف سے تشریف لائے ہیں۔ سو تم یقین رکھو یہ تمہارے لئے بہتر ہوگا اور اگر تم منکر ہے تو اللہ تعالیٰ کی ملک ہے یہ سب جو کچھ آسمانوں میں ہے اور زمین میں ہے اور اللہ تعالیٰ پوری اطلاع رکھتے ہیں۔ کامل حکمت والے ہیں۔ ○

قرآن مجید اللہ کا کلام ہے ☆:

چونکہ پچھلی آیتوں میں حضور ﷺ کی نبوت کا ثبوت تھا اور آپ ﷺ کی نبوت کے منکروں کا رد تھا۔ اس لئے یہاں فرماتا ہے کہ گو کچھ لوگ تجھے جھٹلائیں' تیرے خلاف کریں۔ لیکن اللہ خود تیری رسالت کا شاہد ہے۔ وہ فرماتا ہے کہ اس نے اپنی کتاب پاک قرآن کریم کو تجھ پر نازل فرمایا: جس کے پاس باطل پھٹک ہی نہیں سکتا۔ اس میں ان چیزوں کا علم ہے جن پر اس نے اپنے

بندوں کو مطلع فرمانا چاہا۔ یعنی دلائل ہدایت اور فرقان اور اللہ کو راضی کرنے والے اعمال اور ناراضگی پیدا کرنے والی بداعمالیاں اور گزشتہ کی اور آئندہ کی خبریں اور اللہ تبارک وتعالیٰ کی وہ مقدس صفتیں جنہیں نہ تو کوئی نبی مرسل جانتا ہے اور نہ کوئی مقرب فرشتہ اس کے کہ وہ خود معلوم کرائے۔ جیسے ارشاد ہے: ﴿وَلَا يُحِيطُونَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهِ إِلَّا بِمَا شَاءَ﴾ (البقرہ: ۲۵۵) اور فرمان ہے: ﴿وَلَا يُحِيطُونَ بِهِ عِلْمًا﴾ (طٰہٰ: ۱۱۰)۔ حضرت عطاء بن سائبؒ جب ابوعبدالرحمٰن سلمی سے قرآن مجید پڑھ چکے تو آپ فرماتے ہیں: تو نے اللہ کا علم حاصل کیا ہے۔ پس آج تجھ سے افضل کوئی نہیں' اس کے جو عمل میں تجھ سے بڑھ جائے۔ پھر آپ نے آیت ﴿اَنْزَلَهٗ بِعِلْمِهٖ﴾ سے آخر تک پڑھی۔ پھر فرماتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی شہادت کے ساتھ ہی ساتھ فرشتوں کی شہادت بھی ہے کہ جو تیرے پاس آیا' جو وحی تجھ پر اتری ہے وہ بالکل سچ اور سراسر حق ہے۔ یہودیوں کی ایک جماعت حضور ﷺ کے پاس آتی ہے تو آپ فرماتے ہیں: اللہ کی قسم مجھے خوب معلوم ہے کہ تم میری رسالت کا علم رکھتے ہو۔ ان لوگوں نے اس کا انکار کر دیا۔ پس اللہ عزوجل نے یہ آیت اتاری۔

پھر فرماتا ہے: جن لوگوں نے کفر کیا' حق کی اتباع نہ کی بلکہ اور لوگوں کو بھی راہ حق سے روکتے رہے۔ یہ صحیح راہ سے ہٹ گئے ہیں اور صداقت سے الگ ہو گئے ہیں اور ہدایت سے دور جا پڑے ہیں۔ یہ لوگ جو ہماری آیتوں کے منکر ہیں' ہماری کتاب کو نہیں مانتے۔ اپنی جان پر ظلم کرتے ہیں۔ ہماری راہ سے روکتے اور ٹوکتے ہیں۔ ہمارے منع کردہ کاموں کو کر رہے ہیں۔ ہمارے احکام سے روگرداں ہیں۔ انہیں ہم نہ بخشیں گے۔ نہ خیر اور بھلائی کی طرف ان کی رہبری کریں گے۔ ہاں انہیں جہنم کا راستہ دکھا دیں گے۔ جس میں وہ ہمیشہ پڑے رہیں۔ لوگو! تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے حق کو لے کر اللہ کے رسول آ گئے۔ تم اس پر ایمان لاؤ اور اس کی فرمانبرداری کرو۔ یہی تمہارے حق میں اچھا ہے اور اگر تم کفر کرو گے تو اللہ تم سے بے نیاز ہے۔ تمہارا ایمان نہ اسے نفع پہنچائے گا' نہ تمہارا کفر اسے ضرر پہنچائے گا۔ زمین وآسمان کی چیزیں اس کی ملکیت میں ہیں۔ یہی قول حضرت موسیٰ کا اپنی قوم سے تھا کہ تم اور روئے زمین کے تمام لوگ بھی اگر کفر پر اجماع کر لیں تو اللہ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ وہ تمام جہان سے بے پرواہ ہے۔ وہ علیم ہے جانتا ہے کہ مستحق ہدایت کون ہے۔ وہ حکیم ہے اس کے اقوال اس کے افعال' اس کی شرع اس کی تقدیر سب حکمت سے پر ہیں۔

يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ وَلَا تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ ؕ اِنَّمَا الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَكَلِمَتُهٗ ۚ اَلْقٰهَآ اِلٰى مَرْيَمَ وَرُوْحٌ مِّنْهُ ۫ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ۚ وَلَا تَقُوْلُوْا ثَلٰثَةٌ ؕ اِنْتَهُوْا خَيْرًا لَّكُمْ ؕ اِنَّمَا اللّٰهُ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ؕ سُبْحٰنَهٗٓ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗ وَلَدٌ ۘ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ﴿۱۷۱﴾ ع ۲۳/۹

اے اہل کتاب تم اپنے دین میں حد سے نکلو اور اللہ تعالیٰ کی شان میں غلط بات مت کہو۔ مسیح عیسیٰ بن مریم تو اور کچھ بھی

نہیں البتہ اللہ کے رسول ہیں اور اللہ تعالیٰ کے ایک کلمہ ہیں جس کو اللہ تعالیٰ نے مریم تک پہنچا دیا اور اللہ کی طرف سے ایک جان ہیں۔ سو اللہ پر اور اس کے تمام رسولوں پر ایمان لاؤ اور یوں مت کہو کہ تین ہیں۔ باز آ جاؤ تمہارے لئے بہتر ہوگا۔ معبود حقیقی تو ایک ہی معبود ہے۔ وہ صاحب اولاد ہونے سے منزہ ہے جو کچھ آسمانوں میں زمین میں موجودات ہیں۔ سب اسی کی ملک ہیں اور اللہ تعالیٰ کارساز ہونے میں کافی ہے۔ ○

عیسیٰ علیہ السلام رسول اللہ ہیں ☆

اہل کتاب کو حد سے آگے بڑھ جانے سے اللہ تعالیٰ روک رہا ہے۔ عیسائی حضرت عیسیٰ کے بارے میں حد سے گزر گئے تھے اور ان کی نبوت سے بڑھا کر خدائی تک پہنچا رہے تھے۔ بجائے اطاعت کرنے کے عبادت کرنے لگے تھے۔ بلکہ اور بزرگان دین کی نسبت بھی ان کے عقیدہ خراب ہو چکا تھا۔ وہ انہیں بھی خدائی دین کے جو عالم اور عامل تھے' معصوم محض جاننے لگے تھے اور یہ خیال کر لیا تھا کہ جو کچھ یہ ائمہ دین کہہ دیں' اس کا ماننا ہمارے لئے ضروری ہے۔ سچ جھوٹ' حق' باطل ہدایت و ضلالت کے پرکھنے کا کوئی حق ہمیں حاصل نہیں۔ جس کا ذکر قرآن کی اس آیت میں ہے: ﴿اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ﴾ (التوبۃ: ۳۱)۔ مسند احمد میں ہے' حضور ﷺ نے فرمایا: مجھے تم ایسا نہ بڑھانا جیسے نصاریٰ نے عیسیٰ بن مریم کو بڑھایا۔ میں تو صرف ایک بندہ ہوں پس مجھے تم عبداللہ رسول کہنا۔ یہ حدیث بخاری' وغیرہ میں بھی ہے۔

مسند کی احادیث میں ہے کہ کسی شخص نے آپ سے کہا: اے محمد ﷺ! اے ہمارے سردار کے لڑکے' اے ہم سب سے بہتر اور بہتر کے لڑکے تو آپ ﷺ نے فرمایا: لوگو! اپنی بات کا خود خیال کر لیا کرو۔ تمہیں شیطان ادھر اُدھر نہ کر دے۔ میں محمد بن عبداللہ ہوں۔ میں اللہ کا غلام اور اس کا رسول ہوں۔ قسم اللہ کی میں نہیں چاہتا کہ تم مجھے میرے مرتبے سے بڑھا دو۔ پھر فرماتا ہے: اللہ پر افترا نہ باندھو۔ اس کے لئے بیوی اور اولاد تجویز نہ کرو۔ اللہ اس سے پاک ہے۔ اس سے بلند بالا ہے۔ اس کی بڑائی اور عزت میں کوئی اس کا شریک نہیں۔ اس کے سوا نہ تو کوئی معبود نہ رب۔ مسیح عیسیٰ بن مریم رسول اللہ ہیں۔ وہ اللہ کے غلاموں میں سے ایک غلام ہیں اور اس کی مخلوق ہیں۔ وہ صرف کلمہ کن کے کہنے سے پیدا ہوئے ہیں۔ جس کلمہ کو لے کر حضرت جبریل علیہ السلام حضرت مریم صدیقہ کے پاس گئے اور اللہ کی اجازت سے اس میں پھونک دیا۔ پس حضرت عیسیٰ پیدا ہوئے۔ چونکہ محض اسی کلمہ سے بغیر باپ کے آپ پیدا ہوئے اس لئے خصوصیت سے کلمۃ اللہ کہا گیا۔ قرآن کی اور آیت میں ہے: ﴿مَا الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ اِلَّا رَسُوْلٌ﴾ (المائدہ: ۷۵) یعنی مسیح بن مریم صرف رسول اللہ ہیں۔ ان سے پہلے بھی بہت سے رسول گزر چکے ہیں۔ ان کی والدہ سچی ہیں۔ یہ دونوں کھانا کھایا کرتے تھے اور آیت میں ہے: ﴿اِنَّ مَثَلَ عِيْسٰى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ﴾ (آل عمران: ۵۹) عیسیٰ کی مثال اللہ کے نزدیک آدم کی طرح ہے۔ جسے مٹی سے بنا کر فرمایا ہو جا پس وہ ہو گیا۔ قرآن کریم اور جگہ فرماتا ہے: ﴿وَالَّتِيْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا﴾ (التحریم: ۱۲) جس نے اپنی شرمگاہ کی حفاظت کی اور ہم نے اپنی روح پھونکی اور خود اسے اور اس کے بچے کو لوگوں نے نشان بنایا اور جگہ فرمایا: ﴿مَرْيَمَ ابْنَتَ عِمْرٰنَ﴾ (التحریم: ۱۲) سے آخر سورت تک۔

حضرت عیسیٰ کی بابت اور آیت میں ہے ﴿اِنْ هُوَ اِلَّا عَبْدٌ اَنْعَمْنَا عَلَيْهِ﴾ (الزخرف: ۵۹) وہ ہمارا ایک بندہ تھا جس پر ہم نے انعام کیا تھا۔ پس یہ مطلب نہیں کہ خود کلمہ اللہ عیسیٰ بن گیا بلکہ یہ کہ کلمہ اللہ سے حضرت عیسیٰ پیدا ہوئے۔ امام ابن جریر نے ﴿اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ﴾ (آل عمران: ۴۲) کی تفسیر میں جو کہا ہے اس سے یہ مراد ٹھیک ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کلمہ جو حضرت جبرئیل کی معرفت پھونکا گیا۔ اس سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام پیدا ہوئے۔

صحیح بخاری میں ہے' جس نے شہادت دی اللہ کے ایک اور لاشریک اور محمد ﷺ کے عبد و رسول ہونے کی اور عیسیٰ علیہ

السلام کے عبد اور رسول ہونے کی اور یہ کہ آپ اللہ کے حکم سے پیدا ہوئے جو مریم کی طرف ڈالا گیا تھا اور اللہ کی پھونکی ہوئی روح تھے اور جس نے جنت اور دوزخ کو بحق مانا اور خواہ کیسے ہی اعمال پر ہو اللہ پر حق ہے کہ اسے جنت میں لے جائے اور روایت میں اتنی زیادتی بھی ہے کہ بہشت کے آٹھوں دروازوں میں سے جس سے چاہے داخل ہو جائے۔ جیسے کہ جناب عیسیٰ کو آیت وحدیث میں رُوحٌ مِنهُ کہا ہے۔ ایسے ہی قرآن کی ایک آیت میں ہے ﴿وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيعًا مِّنْهُ﴾ (الجاثیہ: ۱۳) اس نے مسخر کیا تمہارے لئے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے تمام کا تمام اپنی طرف سے یعنی اپنی مخلوق سے اور اپنے پاس سے یہی مطلب رُوحٌ مِنهُ کا ہے یعنی اپنی مخلوق اور اپنے پاس کی روح سے۔ پس لفظ میں لبحیض کے لئے نہیں جیسے ملعون نصرانیوں کا خیال ہے کہ حضرت عیسیٰ اللہ کا ایک جزد تھے۔ بلکہ من ابتدا کے لئے ہے۔ جیسے کہ دوسری آیت میں ہے۔ حضرت مجاہد فرماتے ہیں۔ رُوحٌ مِنهُ سے مراد رَسُولٌ مِنهُ ہے اور لوگ کہتے ہیں مَحَبَّةٌ مِنهُ لیکن زیادہ واضح پہلا قول ہے۔ یعنی آپ پیدا کئے گئے ہیں روح سے جو خود اللہ کی مخلوق ہے۔ پس آپ کو روح اللہ کہنا ایسا ہی ہے جیسے ناقۃ اللہ اور بیت اللہ کہا گیا ہے۔ یعنی صرف شرافت کے اظہار کے لئے اپنی طرف نسبت کی اور حدیث میں بھی ہے کہ میں اپنے رب کے پاس اس کے گھر میں جاؤں گا۔

پھر فرماتا ہے: تم اس کا یقین کر لو کہ اللہ ایک ہے۔ بیوی بچوں سے پاک ہے اور یقین کر لو کہ جناب عیسیٰ اللہ کے غلام اللہ کی مخلوق اور اس کے برگزیدہ رسول ہیں۔ تم تین نہ کہو۔ یعنی عیسیٰ بن مریمؑ کو شریک اللہ نہ بناؤ۔ اللہ شرکت سے مبرا ہے۔ سورہ مائدہ میں فرمایا: ﴿لَقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ قَالُوْا اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ﴾ (المائدہ: ۷۳) یعنی جو کہتے ہیں کہ اللہ تین میں کا تیسرا ہے[1] وہ کافر ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ ایک ہی ہے۔ اس کے سوا کوئی اور عبادت کے لائق نہیں۔ سورہ مائدہ کے آخر میں ہے کہ قیامت کے دن حضرت عیسیٰؑ سے سوال ہوگا کہ اپنی والدہ کی عبادت کا حکم ان لوگوں کو تم نے دیا تھا۔ آپ صاف انکار کر دیں گے۔ نصرانیوں کا اس بارے میں کوئی ضابطہ ہی نہیں ہے۔ وہ بری طرح بھٹک رہے ہیں اور خود کو برباد کر رہے ہیں۔ ان میں سے بعض تو حضرت عیسیٰ کو خود خدا مانتے ہیں اور بعض شریک اللہ مانتے ہیں اور بعض اللہ کا بیٹا کہتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ اگر دس نصرانی جمع ہوں تو ان کے خیالات گیارہ ہوں گے۔

سعید بن بطریق اسکندری جو ۴۰۰ھ کے قریب گزرا ہے۔ اس نے اور ان کے بڑے علما نے ذکر کیا ہے کہ قسطنطین بانی قسطنطنیہ کے زمانے میں اس زمانہ کے نصرانیوں کا اس بادشاہ کے حکم سے اجتماع ہوا۔ جہاں دو ہزار سے زیادہ ان کے لاٹ پادری تھے۔ پھر اس قدر اختلاف ہوا آپس میں کہ کسی بات پر ستر اسی آدمیوں سے زیادہ اتفاق ہی نہیں کرتے۔ دس کا ایک اور عقیدہ ہے۔ بیس کا ایک خیال ہے۔ چالیس اور ہی بات کہتے ہیں۔ ساٹھ اور طرف جا رہے ہیں۔ غرض ہزارہا کی تعداد میں سے بمشکل تمام تین سو اٹھارہ آدمی ایک قول پر جمع ہو گئے۔ بادشاہ نے اسی عقیدہ کو لے لیا باقی کو چھوڑ دیا اور اسی کی تائید و نصرت کی اور ان کے لئے کنیسے اور گرجے بنا دیئے اور کتابیں لکھوا دیں اور قوانین ضبط کر دیئے یہیں انہوں نے امانت کبریٰ کا مسئلہ گھڑا اور جو در اصل بدترین خیانت ہے۔ ان لوگوں کو ملکانیہ کہتے ہیں۔

پھر دوبارہ ان کا اجتماع ہوا۔ اس وقت جو فرقہ بنا اس کا نام یعقوبیہ ہے۔

پھر تیسری مرتبہ کے اجتماع میں جو فرقہ بنا اس کا نام نسطوریہ ہے۔

---

[1] عیسائیوں کی بعض جماعتیں قائل تھیں کہ خدا تین ہیں: عیسیٰ، مریم اور خدا تعالیٰ۔ انہیں کو اقانیم ثلاثہ بھی کہا جاتا ہے۔ یہ عقیدہ بھی کفر ہے۔ قرآن مجید کی اس آیت میں بھی اسی عقیدہ کی تردید کی گئی ہے۔

یہ تینوں فرقے اقانیم ثلاثہ کو حضرت عیسیٰ کے لئے ثابت کرتے ہیں ان میں بھی باہم دگر اختلاف ہے اور ہر ایک دوسرے کو کافر کہتے ہیں اور ہمارے نزدیک تو تینوں کافر ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اس سے باز آؤ۔ یہ باز رہنا ہی تمہارے لئے اچھا ہے۔ اللہ تو ایک ہی ہے وہ توحید والا ہے۔ اس کی ذات اس سے پاک ہے کہ اس کے ہاں اولاد ہو۔ تمام چیزیں اس کی مخلوق ہیں اور اس کی ملکیت میں ہیں۔ سب اس کی غلامی میں ہیں اور سب اس کے قبضے میں ہیں۔ وہ ہر چیز کا نگراں ہے۔ پھر مخلوق میں سے کوئی اس کی بیوی کوئی اس کا بچہ کیسے ہو سکتا ہے؟ دوسری آیت میں ہے: ﴿بَدِیْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَنّٰی یَكُوْنُ لَهٗ وَلَدٌ﴾ (الانعام:۱۰۱) یعنی وہ تو آسمان وزمین کی ابتدائی آفرینش کرنے والا ہے اس کا لڑکا کیسے ہو سکتا ہے؟ سورہ مریم میں وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ سے فَرْدًا تک میں بھی اس کا مفصلاً انکار فرمایا ہے۔

لَنْ يَّسْتَنْكِفَ الْمَسِيْحُ اَنْ يَّكُوْنَ عَبْدًا لِّلّٰهِ وَلَا الْمَلٰٓئِكَةُ الْمُقَرَّبُوْنَ ۭ وَمَنْ يَّسْتَنْكِفْ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَيَسْتَكْبِرْ فَسَيَحْشُرُهُمْ اِلَيْهِ جَمِيْعًا ﴿۱۷۲﴾ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَيُوَفِّيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ وَ يَزِيْدُهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ۚ وَاَمَّا الَّذِيْنَ اسْتَنْكَفُوْا وَاسْتَكْبَرُوْا فَيُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ڏ وَّلَا يَجِدُوْنَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ﴿۱۷۳﴾

مسیح ہرگز خدا کے بندے بننے سے عار نہیں کریں گے اور مقرب فرشتے اور جو شخص اللہ تعالیٰ کی بندگی سے عار کرے گا اور تکبر کرے گا تو اللہ تعالیٰ ضرور سب لوگوں کو اپنے پاس جمع کریں گے پھر جو لوگ ایمان لائے ہوں گے اور انہوں نے اچھے کام کئے ہوں گے تو ان کو ان کا پورا ثواب دیں گے اور ان کو اپنے فضل سے اور زیادہ دیں گے اور جن لوگوں نے عار کیا ہو گا اور تکبر کیا ہو گا تو ان کو سخت دردناک عذاب دیں گے اور وہ لوگ کسی غیر اللہ کو اپنا یار اور مددگار نہ پاویں گے۔ O

عیسیٰ علیہ السلام کا امتیاز عبدیت میں ہے ☆

مطلب یہ ہے کہ مسیح علیہ السلام اور مقرب فرشتے بھی بندگی سے تکبر اور انکار نہیں کر سکتے۔ نہ یہ ان کی شان کے لائق ہے بلکہ جو جس قدر مرتبے میں قریب ہوتا ہے وہ اسی قدر اللہ کی عبادت میں زیادہ ہوتا ہے۔ بعض لوگوں نے اس آیت سے استدلال کیا ہے کہ فرشتے انسانوں سے افضل ہیں۔ لیکن دراصل اس کا کوئی ثبوت اس آیت میں نہیں۔ اس لئے کہ یہاں ملائکہ کا عطف مسیح پر ہے اور استنکاف کے معنی رکنے کے ہیں اور فرشتوں میں یہ قدرت بہ نسبت مسیح کے زیادہ ہے۔ اس لئے یہ فرمایا گیا ہے: اور رک جانے پر زیادہ قادر ہونے سے افضلیت لازم نہیں آتی اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ جس طرح مسیح علیہ السلام کو لوگ پوجتے تھے۔ اسی طرح فرشتوں کی بھی عبادت کرتے تھے۔ تو اس آیت میں مسیح علیہ السلام کو اللہ کی عبادت سے نہ رکنے والے بتا کر پھر فرشتوں کی بھی یہی حالت بیان کر دی۔ جس سے ثابت ہو گیا کہ جنہیں تم پوجتے ہو وہ اللہ کو پوجتے ہیں' پھر ان کی پوجا

کیسے؟ ﴿بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ﴾ (الانبیاء: ٢٦) اور اسی لئے یہاں بھی فرمایا کہ جو اس کی عبادت سے انکار اعتراض کرے اور خود کو اس طرح ہلاک کرے۔ وہ ایک وقت اسی کے پاس لوٹنے والا ہے اور اپنے بارے میں اس کا فیصلہ سننے والا ہے۔ جو ایمان لائیں جو نیک عمل کریں' ان کا پورا ثواب بھی دیا جائے گا۔ پھر رحمت ایزدی اپنی طرف سے بھی انعام عطا فرمائے گی۔ ابن مردویہ کی حدیث میں ہے کہ اجر تو یہ ہے کہ جنت میں پہنچا دیا اور زیادتی فضل یہ ہے کہ جو لوگ قابل دوزخ ہوں' انہیں بھی ان کی شفاعت ہوگی۔ جن سے انہوں نے بھلائی اور اچھائی کی تھی۔ لیکن اس کی سند ثابت شدہ نہیں۔ ہاں اگر ابن مسعود کے قول پر ہی اسے روایت کیا جائے تو ٹھیک ہے۔ پھر فرمایا: جو لوگ اللہ کی عبادت و اطاعت سے رک جائیں اور اس سے تکبر کریں' انہیں پروردگار دردناک عذاب دے گا اور یہ اللہ کے سوا کسی کو ہمدرد و مددگار نہ پائیں گے جیسے اور آیت میں ہے ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِيْ سَيَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دَاخِرِيْنَ﴾ (غافر: ٦٠) جو لوگ میری عبادت سے تکبر کریں' وہ ذلیل و حقیر ہو کر جہنم میں جائیں گے۔ یعنی ان کے انکار اور ان کے تکبر کا یہ بدلہ انہیں ملے گا کہ ذلیل و حقیر خوار ناچار ہو کر جہنم میں داخل کئے جائیں گے۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمْ بُرْهَانٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ نُوْرًا مُّبِيْنًا ﴿١٧٤﴾ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَاعْتَصَمُوْا بِهٖ فَسَيُدْخِلُهُمْ فِيْ رَحْمَةٍ مِّنْهُ وَفَضْلٍ ۙ وَّيَهْدِيْهِمْ اِلَيْهِ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا ﴿١٧٥﴾

اے لوگو! یقیناً تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی طرف سے ایک دلیل آ چکی ہے اور ہم نے تمہارے پاس ایک صاف نور بھیجا ہے سو جو لوگ اللہ پر ایمان لائے اور انہوں نے اللہ کو مضبوط پکڑا۔ سو ایسوں کو اللہ تعالیٰ اپنی رحمت میں داخل کریں گے اور اپنے فضل میں اور اپنے تک ان کو سیدھا رستہ بتلا دیں گے۔ ○

دلائل اور براہین حقانیت پر قائم کیے جا چکے:

اللہ تبارک و تعالیٰ تمام انسانوں کو خطاب کر کے فرماتا ہے کہ میری طرف سے کامل دلیل اور عذر معذرت کو توڑ دینے والی چیز[1] اور شک و شبہ کو الگ کرنے والی برہان تمہاری طرف نازل ہو چکی ہے اور ہم نے تمہاری طرف کھلا نور' صاف روشنی پورا اجالا اتار دیا ہے۔ جس سے حق کی راہ صحیح طور پر واضح ہو جاتی ہے۔ ابن جریج وغیرہ فرماتے ہیں: اس سے مراد قرآن کریم ہے۔ اب جو لوگ اللہ پر ایمان لائیں اور توکل اور بھروسہ اسی پر کریں۔ اسی کی اطاعت کو خود پر لازم کریں۔ مقام عبودیت اور مقام توکل کو اختیار کریں۔ تمام امور اسی کو سونپ دیں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایمان اللہ پر لائیں اور مضبوطی کے ساتھ اللہ کی کتاب کو تھام لیں۔ ان پر اللہ اپنا رحم کرے گا اور اپنا فضل ان پر نازل فرمائے گا۔ نعمتوں اور سرور والی جنت میں انہیں لے جائے گا۔ ان کے ثواب بڑھا دے گا۔ ان کے درجے بلند کر دے گا اور انہیں اپنی طرف سیدھی اور صاف راہ دکھا دے گا۔ جو کہیں سے ٹیڑھی نہیں۔ کہیں سے تنگ نہیں۔ پس مؤمن دنیا میں صراط مستقیم پر ہوتا ہے اور راہ اسلام پر ہوتا ہے اور آخرت میں راہ جنت

[1] مطلب یہ ہے کہ ایسے صاف اور واضح احکام آ چکے ہیں' جن کے بعد عمل نہ کرنے کے سلسلے میں کوئی عذر سنا نہ جائے گا۔

پر اور راہ سلامتی پر ہوتا ہے۔ شروع تفسیر میں ایک پوری حدیث گزر چکی ہے۔ جس میں فرمان رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے کہ اللہ کی سیدھی راہ اور اللہ کی مضبوط رسی قرآن ہے۔

يَسْتَفْتُونَكَ ۭ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ فِي الْكَلٰلَةِ ۭ اِنِ امْرُؤٌا هَلَكَ لَيْسَ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَهٗٓ اُخْتٌ فَلَهَا نِصْفُ مَا تَرَكَ ۚ وَهُوَ يَرِثُهَآ اِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهَا وَلَدٌ ۭ فَاِنْ كَانَتَا اثْنَتَيْنِ فَلَهُمَا الثُّلُثٰنِ مِمَّا تَرَكَ ۭ وَاِنْ كَانُوْٓا اِخْوَةً رِّجَالًا وَّنِسَاۗءً فَلِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ ۭ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اَنْ تَضِلُّوْا ۭ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۱۷۶﴾ ع

لوگ آپ سے حکم دریافت کرتے ہیں۔ آپ فرما دیجئے کہ اللہ تعالیٰ تم کو کلالہ کے باب میں حکم دیتا ہے۔ اگر کوئی شخص مر جائے جس کے اولاد نہ ہو (اور نہ ماں باپ) اور اس کی ایک (عینی یا علاتی) بہن ہو تو اس کو اس کے تمام ترکہ کا نصف ملے گا اور وہ شخص اس اپنی بہن کا وارث ہوگا۔ (وہ بہن مر جائے اور) اس کے اولاد نہ ہو اور والدین بھی نہ ہوں اگر ایسی چند بہنیں دو ہوں (یا زیادہ) تو ان کو اس کے کل ترکہ میں سے دو تہائی ملیں گے اور اگر وارث بھائی بہن ہوں مرد اور عورت تو ایک مرد کو دو عورتوں کے حصہ کے برابر ملے گا اللہ تعالیٰ تم سے (دین کی باتیں) اس لئے بیان کرتے ہیں کہ تم گمراہی میں نہ پڑو اور اللہ تعالیٰ ہر چیز کو خوب جانتے ہیں۔ ○

بعض مسائل میراث ☆

حضرت براء رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں: سورتوں میں سب سے آخری سورت سورہ برأت اتری اور آیتوں میں سب سے آخری آیت: ﴿یَسْتَفْتُوْنَكَ﴾ اتری۔ (بخاری) حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں: میں اپنی بیماری میں بے ہوش پڑا تھا تو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم میری عیادت کے لئے تشریف لائے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وضو کیا اور وہ پانی مجھ پر ڈالا۔ جس سے مجھے افاقہ ہوا اور میں نے کہا حضور صلی اللہ علیہ وسلم وارثوں کے لحاظ سے میں کلالہ ہوں۔ میری میراث کیسے بٹے گی؟ اس پر اللہ تعالیٰ نے آیت فرائض نازل فرمائی۔ (بخاری ومسلم) اور روایت میں اسی آیت کا اترنا بھی آیا ہے۔ پس فرماتا ہے کہ لوگ تجھ سے پوچھتے ہیں یعنی کلالہ کے بارے میں۔ پہلے یہ بیان گزر چکا ہے کہ لفظ کلالہ ماخوذ ہے اکلیل سے جو کہ سر کو چاروں طرف سے گھیرے ہوتا ہے۔ اکثر علماء نے کہا ہے کہ کلالہ وہ ہے، جس میت کے لڑکے پوتے نہ ہوں اور بعض کا قول یہ بھی ہے کہ جس کے لڑکے نہ ہوں، جیسے کہ آیت میں ہے وَلَیْسَ لَهٗ وَلَدٌ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو جو نئے مسائل دشوار اور نا قابل حل معلوم ہوتے تھے۔ ان میں ایک یہ بھی تھا۔ چنانچہ صحیحین میں ہے کہ آپ سے فرمایا: تین چیزوں کی نسبت میری تمنا رہ گئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان میں ہماری طرف کوئی ایسا عہد کرتے کہ ہم اسی کی طرف رجوع کرتے۔ دادا، کلالہ اور سود کے ابواب اور روایت میں ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ کلالہ کے بارے میں میں نے جس قدر سوالات حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کئے اتنے کسی مسئلہ میں

نہیں کئے۔ یہاں تک کہ آپ ﷺ نے اپنی انگلی سے میرے سینے میں کچوکہ لگا کر فرمایا کہ تجھے گرمیوں کی وہ آیت کافی ہے جو سورہ نساء کے آخر میں ہے اور حدیث میں ہے آپ فرماتے ہیں: اگر میں حضور ﷺ سے مزید اطمینان کر لیتا تو وہ میرے لئے سرخ اونٹوں کے ملنے سے زیادہ بہتر تھا۔ حضور ﷺ کے فرمان کا مطلب یہ ہے کہ یہ آیت موسم گرما میں نازل ہوئی ہو گی واللہ اعلم اور چونکہ حضور ﷺ نے اس کے سمجھنے کی طرف رہنمائی کی تھی اور اس میں کفایت بتلائی تھی۔ اب فاروق اعظم اس کے معنی پوچھنے بھول گئے جس پر افسوس کر رہے ہیں۔ ابن جریر میں ہے جناب فاروق اعظمؓ نے حضور ﷺ سے کلالہ کے بارے میں پوچھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ نے اسے بیان نہیں فرمایا۔ پھر یہ آیت اتری۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنے خطبہ میں فرماتے ہیں۔ جو آیت سورہ نساء کے شروع میں فرائض کے بارے میں ہے وہ ولد و والد کے لئے ہے اور دوسری آیت میاں بیوی کے لئے ہے اور ماں زاد بہنوں کے لئے اور جس آیت سے سورہ نساء کو ختم کیا ہے وہ سگے بہن بھائیوں کے بارے میں ہے۔ جو رحمی رشتہ عصبہ میں چلتا ہے۔ (ابن جریر) اس آیت کے معنی هَلَكَ کے معنی ہیں مر گیا۔ جیسے فرمان ہے ﴿كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ﴾ (القصص: ۸۸) یعنی ہر چیز فنا ہونے والی ہے۔ سوائے ذات اللہ کے جو ہمیشہ باقی رہنے والا ہے۔ جیسے اور آیت میں فرمایا: ﴿كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ وَّ يَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ﴾ (الرحمٰن: ۲۶-۲۷) یعنی ہر ایک جو اس پر ہے فانی ہے اور تیرے رب کا چہرہ باقی رہے گا جو جلال و اکرام والا ہے۔

پھر فرمایا: اس کا ولد نہ ہو۔ اس سے بعض لوگوں نے دلیل پکڑی ہے کہ کلالہ کی شرط میں باپ کا نہ ہونا نہیں بلکہ جس کی اولاد نہ ہو وہ کلالہ ہے۔ بروایت ابن جریر حضرت عمر بن خطاب سے بھی یہی منقول ہے۔ لیکن صحیح قول جمہور کا ہے اور حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا فیصلہ بھی یہی ہے کہ کلالہ وہ ہے جس کا نہ ولد ہو نہ والد اور اسی کی دلالت آیت کے اس کے بعد کے الفاظ سے بھی ہوتی ہے جو فرمایا ﴿وَلَهٗٓ اُخْتٌ فَلَهَا نِصْفُ مَا تَرَكَ﴾ یعنی اس کی بہن ہو تو اس کے لئے کل چھوڑے ہوئے مال کا آدھوں آدھ ہے۔ اگر بہن باپ کے ساتھ ہو تو باپ اسے ورثہ پانے سے روک دیتا ہے اور اسے کچھ بھی اجماعاً ملتا نہیں۔ پس ثابت ہوا کہ کلالہ وہ ہے جس کا ولد نہ ہو اور یہ نص ثابت ہے لیکن قدرے غور کے بعد۔ اس لئے کہ بہن کا نصف حصہ باپ کی موجودگی میں ہوتا ہی نہیں۔ بلکہ وہ ورثے سے محروم ہوتی ہے حضرت زید بن ثابتؓ سے مسئلہ پوچھا جاتا ہے کہ ایک عورت مر گئی۔ اس کا خاوند ہے اور اس کی ایک حقیقی بہن ہے تو آپ نے فرمایا: آدھا بہن کو دے دو آدھا خاوند کو۔ جب آپ سے اس کی دلیل پوچھی گئی تو آپ نے فرمایا: میری موجودگی میں رسول اللہ ﷺ نے ایسی صورت میں یہی فیصلہ فرمایا تھا۔ (احمد)

حضرت ابن عباس اور ابن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ابن جریر میں منقول ہے کہ ان دونوں کا فتویٰ اس میت کے بارے میں جو ایک لڑکی اور ایک بہن چھوڑ جائے یہ تھا کہ اس صورت میں بہن محروم رہے گی۔ اسے کچھ بھی نہیں ملے گا۔ اس لئے کہ قرآن کی اس آیت میں بہن کو آدھا ملنے کی صورت یہ بیان کی گئی ہے کہ میت کی اولاد نہ ہو اور یہاں اولاد ہے۔ لیکن جمہور ان کے خلاف ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اس صورت میں بھی آدھا لڑکی کو ملے گا۔ فرض ہونے کی بناء پر اور آدھا بہن کو ملے گا عصبہ ہونے کی وجہ سے۔ ابراہیم بن اسود کہتے ہیں: ہمارا حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں فیصلہ کیا کہ آدھا لڑکی کا اور آدھا بہن کا۔

صحیح بخاری کی ایک اور روایت میں ہے کہ حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے لڑکی اور پوتی اور بہن کے بارے میں فتویٰ دیا کہ آدھا لڑکی کو اور آدھا بہن کو۔ پھر فرمایا: ذرا ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس بھی ہو آ و۔ وہ بھی میری موافقت ہی کریں گے۔ لیکن جب حضرت ابن مسعودؓ سے سوال ہوا اور حضرت ابوموسیٰ کا فیصلہ بھی انہیں سنایا گیا تو آپ نے فرمایا: پھر تو

میں گمراہ ہو جاؤں اور راہ یافتہ لوگوں میں میرا شمار نہ رہے[1] سنو میں اس میں فیصلہ کرتا ہوں جو رسول اللہ ﷺ نے کیا ہے۔ آدھا تو بیٹی کو اور چھٹا حصہ پوتی کو۔ اس طرح دو ثلث پورے ہو گئے اور جو باقی بچا' وہ بہن کو ہم پھر واپس آئے اور ابو موسیٰ کو یہ خبر دی تو آپ نے فرمایا: جب تک یہ علامہ تم میں موجود ہے مجھ سے یہ مسائل نہ پوچھا کرو۔ پھر فرمان ہے کہ یہ اس کا وارث ہو گا۔ اگر اس کی اولاد نہ ہو۔ یعنی بھائی اپنی بہن کے کل مال کا وارث ہے جبکہ وہ کلالہ مرے یعنی اس کی اولاد اور باپ نہ ہو۔ اس لئے کہ باپ کی موجودگی میں تو بھائی کو ورثے میں سے کچھ نہ ملے گا ہاں اگر بھائی کے ساتھ ہی اور کوئی مقررہ حصے والا وارث ہو۔ جیسے خاوند یا ماں شریک بھائی تو اسے اس کا حصہ دے دیا جائے گا اور باقی کا وارث بھائی ہوگا۔ صحیح بخاری میں ہے' حضور علیہ السلام فرماتے ہیں: فرائض اس کے اہل تک پہنچا دو۔ پھر جو باقی بچے وہ اس مرد کا ہے جو سب سے زیادہ قریب ہو۔

پھر فرماتا ہے اگر بہنیں دو ہوں تو انہیں مال متروکہ کے دو ثلث ملیں گے۔ یہی حکم دو سے زیادہ کا بھی ہے۔ یہیں سے ایک جماعت نے دو بیٹیوں کا حکم لیا ہے جیسے کہ دو سے زیادہ بہنوں کا حکم لڑکیوں کے حکم سے لیا ہے جس کے الفاظ یہ ہیں ﴿فَإِن كُنَّ نِسَاءً فَوْقَ اثْنَتَيْنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ﴾ (النساء:۱۱)۔ پھر فرماتا ہے: اگر بہن بھائی دونوں ہوں تو ہر مرد کا حصہ دو عورتوں کے برابر ہے۔ یہی حکم عصبات کا ہے خواہ وہ لڑکے ہوں یا پوتے ہوں جب کہ ان میں مرد عورت دونوں موجود ہوں تو جتنا دو عورتوں کو ملے گا اتنا ایک مرد کو۔ اللہ تعالیٰ اپنے فرائض بیان فرما رہا ہے' اپنی حدیں مقرر کر رہا ہے۔ اپنی شریعت واضح کر رہا ہے تا کہ تم بہک نہ جاؤ۔ اللہ تعالیٰ تمام کاموں کے انجام سے واقف اور ہر مصلحت کا جاننے والا ہے۔ بندوں کی بھلائی برائی جاننے والا ہے۔ مستحق کے استحقاق کو پہچاننے والا ہے۔ ابن جریر کی روایت میں ہے کہ حضور ﷺ اور صحابہ کہیں سفر میں تھے۔ حذیفہؓ کی اونٹنی کا سر رسول اللہ ﷺ کے پاس بیٹھے ہوئے صحابیؓ کے کجاوے کے پاس تھا اور حضرت عمرؓ کی سواری کا سر حذیفہ کی سواری کے دوسرے سوار کے پاس تھا جو یہ آیت اتری۔ پس حضور ﷺ نے حضرت حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو سنائی اور حضرت حذیفہؓ نے حضرت فاروق اعظم کو۔ اس کے بعد پھر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جب اس کے بارے میں سوال کیا تو کہا: واللہ تم بے سمجھ ہو اس لئے کہ جیسے مجھے حضور ﷺ نے سنائی ویسے ہی میں نے آپ کو سنا دی۔ واللہ میں تو اس پر کچھ زیادتی نہیں کر سکتا پس حضرت فاروق فرمایا کرتے تھے: خدایا گو تو نے ظاہر کر دیا ہو مگر مجھ پر تو کھلا نہیں۔ لیکن یہ روایت منقطع ہے اسی روایت کی اور سند میں ہے کہ حضرت عمرؓ نے دوبارہ یہ سوال اپنی خلافت کے زمانے میں کیا تھا اور حدیث میں ہے کہ حضرت عمرؓ نے آنحضرت ﷺ سے پوچھا تھا کہ کلالہ کا ورثہ کس طرح تقسیم ہوگا اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اتاری لیکن چونکہ حضرت کی پوری تشفی نہ ہوئی تھی اس لئے اپنی صاحبزادی زوجۂ رسول اللہ ﷺ حضرت حفصہؓ سے فرمایا کہ جب رسول اللہ ﷺ خوشی میں ہوں تو تم پوچھ لینا۔ چنانچہ حضرت حفصہؓ نے ایک روز موقعہ پا کر دریافت کر لیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: شاید تیرے باپ نے تجھے اس کے پوچھنے کی ہدایت کی ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ اسے معلوم نہ کر سکیں گے۔ حضرت عمرؓ نے جب یہ سنا تو فرمانے لگے: جب حضور ﷺ نے یہ فرما دیا ہے تو بس میں اسے جان ہی نہیں سکتا اور روایت میں ہے کہ حضرت عمرؓ کے حکم پر جب حفصہؓ نے سوال کیا تو آپ ﷺ نے شانے پر یہ آیت لکھوا دی پھر فرمایا: کیا عمرؓ نے تم سے اس کے پوچھنے کو کہا تھا؟ میرا خیال

[1] اس کا ایک مطلب تو یہ ہو سکتا ہے کہ اگر میں سنت کے خلاف کوئی فتویٰ دوں تو یہ کھلی گمراہی ہے اور ایک مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کا فیصلہ سنت کے مطابق نہیں ہے تو اگر میں ابو موسیٰ کے فتویٰ کی تائید کروں تو یہ ہدایت نہ ہوگی بلکہ اس کا نام گمراہی ہے۔

[2] آدمی خوش ہوتا ہے تو سوالات سے اُلجھن نہیں ہوتی اور اگر رنج و غم ہوتا ہے تو سوالات بلکہ لوگوں کے ملنے ملانے سے بھی کوفت ہوتی ہے گویا کہ عمر فاروق رضی اللہ عنہ چاہتے تھے کہ مسئلہ بھی معلوم ہو جائے اور آپ ﷺ کو کوئی تکلیف بھی نہ پہنچے۔

ہے وہ اسے ٹھیک ٹھاک نہ کر سکیں گے۔ کیا انہیں وہ آیت جو سورہ نساء میں ہے کافی نہیں؟ وہ آیت ﴿وَاِنْ كَانَ رَجُلٌ يُّوْرَثُ كَلٰلَةً﴾ (النساء:۱۲) ہے پھر جب دوسرے لوگوں نے حضور ﷺ سے سوال کیا تو وہ آیت اتری جو سورہ نساء کے خاتمہ پر ہے اور شانہ ڈال دیا۔ یہ حدیث مرسل ہے ایک مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے صحابہ کو جمع کیا اور شانے کے ٹکڑے کو لے کر فرمایا: میں کلالہ کے متعلق آج فیصلہ کروں گا کہ پردہ نشین عورتوں تک کو معلوم رہے۔ اسی وقت گھر میں ایک سانپ نکل آیا اور سب لوگ ادھر اُدھر ہو گئے۔ پس آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اگر اللہ عزوجل کا ارادہ اس کام کو پورا کرنے کا ہوتا تو اسے کرنے دیتا۔ اس کی اسناد صحیح ہیں۔

مستدرک حاکم میں ہے' حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: کاش میں تین مسئلے رسول مقبول ﷺ سے دریافت کر لیتا تو مجھے سرخ اونٹوں کے ملنے سے زیادہ محبوب ہوتا۔ ایک تو یہ کہ آپ ﷺ کے بعد خلیفہ کون ہوگا؟ دوسرے یہ کہ جو لوگ زکوٰۃ کے قائل تو ہوں' لیکن کہیں کہ ہم تیری طرف ادا نہیں کریں گے' ان سے لڑنا حلال ہے یا نہیں؟ تیسرے کلالہ کے بارے میں۔ ایک حدیث میں بجائے زکوٰۃ ادا نہ کرنے والوں کے سودی مسائل کے بارے کا بیان ہے۔ (حاکم) ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے آخری وقت میں نے سنا' فرماتے تھے: قول وہی تھا جو میں نے کہا: تو میں نے پوچھا: وہ کیا؟ فرمایا: یہ کہ کلالہ وہ ہے جس کی اولاد نہ ہو (حاکم) اور روایت میں ہے' حضرت فاروق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میرے اور صدیق رضی اللہ عنہ کے درمیان کلالہ کے بارے میں اختلاف ہوا اور بات وہی تھی کہ جو میں کہتا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حقیقی بھائیوں اور ماں شریک بھائیوں کو جب کہ وہ جمع ہوں' ثلث میں شریک کیا تھا اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اس کے خلاف تھے۔ ابن جریر میں ہے کہ خلیفہ المؤمنین جناب فاروق رضی اللہ عنہ نے رقعہ پر دادا کے ورثے اور کلالہ کے بارے میں کچھ لکھا' پھر استخارہ کیا اور ٹھہرے رہے اور اللہ سے دعا کی کہ پروردگار اگر تیرے علم میں اس میں بہتری ہے تو تو اسے جاری کر دے۔ پھر جب آپ کو زخم لگایا گیا تو آپ نے اس رقعہ کو منگوا کر پھاڑ دیا اور کسی کو علم نہ ہوا کہ اس میں کیا تحریر تھا پھر خود فرمایا کہ میں نے اس میں دادا کا اور کلالہ کا حکم لکھا تھا اور میں نے استخارہ کیا تھا۔ پھر میرا خیال ہوا کہ تمہیں اس پر چھوڑ دوں جس پر تم ہو۔ ابن جریر میں ہے" میں اس بارے میں ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے خلاف کرتے ہوئے شرماتا ہوں اور ابوبکر رضی اللہ عنہ کا فرمان تھا کہ کلالہ وہ ہے جس کا بچہ نہ ہو اور نہ باپ ہو اور اسی پر جمہور صحابہ رضی اللہ عنہم' تابعین اور ائمہ دین رحمۃ اللہ علیہم ہیں اور یہی چاروں اماموں اور ساتوں فقہا کا مذہب ہے اور اسی پر دلالت ہے قرآن کریم کی۔ جیسے باری تعالیٰ نے اسے واضح کر کے فرمایا: اللہ تعالیٰ تمہارے لیے کھول کھول کر بیان کرتا ہے تاکہ تم گمراہ نہ ہو جاؤ اور اللہ ہر چیز کو جاننے والا ہے۔ واللہ اعلم۔